۵۳

دا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

تماہی

خدابخش لائبریری

پـــٹـــنـــہ

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

رجسٹریشن نمبر ۲۳۴۲۴/۷۷ — قیمت فی شمارہ : پچیس رُپے

شمارہ : ۵۳ — سالانہ : ۱۰۰ رُپے (ہند)

قیمت : پچیس رُپے — ۲۰ ڈالر ایشیا، ۴۰ ڈالر دیگر ممالک

۱۹۹۰ء

فہرست

انگریزی حصہ :

مصطفےٰ کمال ہاشمی نے لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ)، دہلی میں چھپوا کر خدابخش لائبریری سے شائع کیا۔

مغربی تعلیم کا تصور

اور

اس کا نفاذ علیگڑھ میں

پروفیسر رشید احمد صدیقی

مرتبہ

م۔ ندیم

(ڈاکٹر مہر الٰہی)

علیگڑھ

سرسید اور علی گڑھ تحریک کے ایک بہت بڑے مبصر لکھتے ہیں مسلمانوں کی تباہی بربادی اور ابتری کو دیکھنے کے بعد سب سے بڑا مسئلہ ان کے سامنے یہ تھا کہ قوم کو اس ورطۂ مذلت سے کیوں کر نکالا جائے بہت غور و فکر کے بعد سرسید اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کا علاج صرف تعلیم یعنی جدید مغربی تعلیم ہے[1]۔

اس سلسلے میں سرسید کے ایک خط کا حسب ذیل اقتباس بھی قابل غور ہے۔ یہ خط سرسید نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی فاؤنڈیشن کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے سرسالار جنگ صدر اعظم حیدرآباد دکن کو ۵ اگست سنہ ۱۸۸۲ء کو لکھا تھا:

> "... it ıs the chief aım and earnest endeavour of the Committee to bring up scholars in their college to the same standard of learning as it attained by the students of the Englısh Universities of Oxford and Cambridge, the only dıstınction being that instead of the Christıan faıth taught ın tne Englısh Universities, the Muhammadan faith would be here taught..."2

سرسید کے ہمہ گیر تعلیمی و اصلاحی پروگرام کے ایک اہم پہلو کی نہایت بلیغ وضاحت حالی نے حسب ذیل ایک جملے میں کی ہے: "ان کو ... سائنس اور مذہب میں دائمی صلح کی بنیاد ڈالنے والا کہا جا سکتا ہے[3]۔"

سرسید کا عہد انیسویں صدی کا ہندوستان تھا۔ ہندوستانی تاریخ میں اس صدی کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اس صدی کی مثال ایک قالب (Matrix) کی ہے جس میں ان تمام تاریخی، تہذیبی، مذہبی، تعلیمی، سیاسی، معاشرتی، تمدنی، نسلی، لسانی، اور علاقائی عوامل کا کسر و انکسار ملتا ہے جنھوں نے موجودہ صدی میں ابھرنے والی ان اہم اور فیصلہ کن قوتوں اور عناصر کو پیدا کیا اور ان کی تشکیل کی جنھوں نے اس برصغیر کی تاریخ و تہذیب کو وہ مخصوص شکل دی جس سے ہم موجودہ صدی میں دوچار ہیں۔ ظاہر ہے ہر صدی اپنے ماقبل صدی کے بطن سے پیدا ہوتی ہے اور اس سے کم و بیش متاثر ہوتی ہے لیکن جن معنوں میں انیسویں صدی کے اثرات کا ذکر کیا گیا ہے وہ محض زمانی اور تاریخی رشتے کی اہمیت جتانے کے لیے نہیں ہے بلکہ ان عوامل کی کثرت، شدت و ہمہ گیری اور ان کے دائرۂ عمل کی وسعت و اہمیت کو واضح کرنے کے لیے ہے جن سے ایک بہت بڑے جغرافیائی

---

[1] "سرسید احمد خاں" حالات و افکار" از عبدالحق مطبوعہ اردو مرکز اردو بازار دہلی ۱۹۴۰ء ص ۱۹۔ [2] "سائنٹفک سوسائٹی سے متعلق غیر مطبوعہ خطوط" مرتبہ پروفیسر ڈاکٹر یوسف حسین خاں "فکر و نظر" جنوری ۱۹۶۴ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ [3] "مقالات حالی" حصہ اول از الطاف حسین حالی، مطبوعہ انجمن ترقی اردو ۱۹۳۴ء ص ۲۲۰۔

علاقے اور اس کی بہت بڑی آبادی بنیادی طور پر متاثر ہوئی۔ اس قالب میں مثبت اور منفی دونوں قسم کے عوامل کام کر رہے تھے اور یہ پورا عمل تین بنیادی حقیقتوں کے محور پر گردش کر رہا تھا، ایک حقیقت بدیسی استعمار کا تسلط دوسری اس استعمار کے خلاف ہندوستانی انسانیت کا اتحاد اور تیسری ہندوستانی انسانیت میں ایسے عناصر کی موجودگی تھی جو ایک طرف تہذیبی اتحاد کے بجائے تہذیبی وحدت کو بطور سیاسی آلے کے استعمال کر کے اور تعداد کی کثرت کو معیار بنا کر آنے والی ہندوستانی ریاست میں منصفانہ قوت کو بحال کرنے کے بجائے فیصلہ کن غلبہ حاصل کرنے کے درپے تھی تو دوسری طرف تعداد کی کمی کی بنا پر اپنے تہذیبی وجود کو محفوظ و برقرار رکھنے کی دشواریوں کے احساس سے ہراساں اور آئندہ ہندوستانی ریاست میں تحفظات کو متیقن کرانے کے لیے کوشاں تھی۔ اس طور پر ہندوستان کی ریاست ایک نہایت پیچیدہ اور نازک صورت حال سے دوچار تھی۔ اتفاق اور افتراق کی متوازی اور متضاد سیاسی تحریکوں نے ملک کے مختلف علاقوں کو مختلف طریقوں سے متاثر کر رکھا تھا۔

ان تحریکوں پر یہاں تفصیل سے بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ اجمالاً یہ کہنا ہے کہ سنہ ۱۸۵۷ء کے آس پاس ہندوستانی انسانیت کے اتحاد کو فروغ ہوا اور اس نے بدیسی استعمار کے خلاف متفقہ مہم کا آغاز کیا لیکن بالآخر استعمار کو شکست دینے میں ناکام رہی۔ اس ناکامی کا نہایت المناک نتیجہ یہ ہوا کہ استعمار کی گرفت مضبوط ہوئی اور ہندوستانی انسانیت کا اتحاد کمزور ہو گیا۔ اس طرح ان عناصر کو استعمار کی حمایت حاصل ہو گئی جو ہندوستانی انسانیت میں وصل نہیں فصل پیدا کرنے کے درپے تھے۔ سرسید نے اس المئے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کی فکر پر اس کا ایک مستقل اثر پڑا۔ ان کے نزدیک ہندوستانی سیاست کی کمزوری کا سب سے بڑا سبب صحیح تاریخی شعور کا فقدان تھا۔ جس بدیسی قوت سے ان کا مقابلہ تھا وہ علوم و فنون میں کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھی اور اس سے ٹکر لینے کے لیے جس تنظیم، اخلاقی تربیت، علمی دسترس اور مادی وسائل کی ضرورت تھی وہ اس وقت فراہم نہ تھے۔ ان حالات میں قومی کامیابی کیلئے خالص سیاست کا راستہ اختیار کرنا مفید تھا نہ ممکن العمل۔

شکست و ریخت اور بے بسی و بے قراری کے اس نازک دور میں سرسید نے تخلیقی و تعمیری طریقہ ہائے فکر و عمل کو وضع کرنے کی نہتم بالشان کوشش کا جس غیر معمولی احساس ذمہ داری اور عظیم ذہنی قوت کی مدد سے آغاز کیا اور ان کے اس پروگرام میں تعلیم کو جو کلیدی اہمیت حاصل ہے اور جس کے بارے میں متذکرہ صدر اقتباسات میں اشارے ملتے ہیں یہاں اسی کی وضاحت اور افہام و تفہیم مقصود ہے۔

سرسیّد کی شخصیت اور ان کا قومی تعلیم کا تصوّر

سرسیّد، ہند اسلامی تہذیب کی اصلی روایات و اقدار کے ساختہ پرداختہ تھے۔ ان کے خاندان کے بزرگ شاہجہاں کے دورِ حکومت میں ہندوستان آئے اور مغلیہ تاج و حکومت کی خدمت اختیار کی۔ ان کے خاندان کا یہ تعلق حکومت کے خاتمے تک مسلسل و مستقل رہا۔ اعلیٰ نسب سیاد تھے۔ ولادت ۱۷ اکتوبر سنہ ۱۸۱۷ء کو دہلی میں ہوئی۔ بچپن سے اٹھارہ سال کی عمر تک متداول علوم عقلی و نذہبی کی جو بیشتر فارسی اور عربی زبانوں میں پڑھائے جاتے تھے، دہلی کے اعلیٰ علمی ماحول میں تحصیل کی۔ مذہب، زبان، ادب اور فلسفہ کے علاوہ انھوں نے ریاضی اور تاریخ کا مطالعہ بطورِ خاص کیا اور اوائل سن شعور ہی سے سنجیدہ تصنیف و تالیف کا آغاز کیا۔ ابتدا سے مطالعہ کا غیر معمولی شوق تھا جو انتہائی مصروف زندگی کے باوجود تادمِ آخر قائم رہا۔ دہلی میں وقت کے جید علما، ادبا، شعرا اور حکما کی صحبت نصیب رہی۔ قلعہ معلّیٰ سے توسل قائم رہا۔ آدابِ شاہی اور انصرام سلطنت سے واقفیت حاصل کی۔ خانگی ضروریات اور تقاضائے وقت کے پیشِ نظر انگریزی سرکار میں ملازمت اختیار کی۔ عدالت کی سررشتہ داری سے اس کی ابتدا ہوئی۔ تھوڑے عرصے میں

نصفی کا امتحان پاس کرکے دہلی میں عہدۂ منصفی پر فائز ہوئے۔ ملازمت کے باوجود تصنیف وتالیف کا
سلسلہ برابر جاری رہا۔ بعض قانونی رسائل تصنیف کیے، مذہبی مباحث پر بھی تحریریں شائع کیں۔ سنہ
۱۸۴۷ء میں ان کی شہرۂ آفاق تصنیف آثار الصنادید منظرِ عام پر آئی جو ایک نہایت اعلیٰ علمی کارنامہ تھا۔
س کا اعتراف وستائش ہندوستان کے علمی حلقوں کے علاوہ بیرون ملک بالخصوص فرانس اور انگلستان کے
ناز علمی حلقوں اور تحقیقی اداروں نے کیا جس کے صلے میں ان کو اعلیٰ علمی اعزازات سے نوازا گیا۔ دوسرا عالمانہ اور
لمی کارنامہ آئینِ اکبری کی تصحیح وتدوین ہے۔ یہ کام تحقیق وتدوین کے اعلیٰ معیار کے مطابق انجام پایا اور اس کو
رانقدر حیثیت حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ انھوں نے مشہور ومستند تصنیف تاریخ فیروز شاہی اور تزک
جہانگیری کو ایڈٹ کیا جن کی علمی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی ان کی بڑی مشہور وگرانقدر علمی مذہبی تصنیف
طبات احمدیہ ہے جو انھوں نے ولیم میور کی کتاب لائف آف محمد کے جواب میں لکھی جس کے بارے میں
ئل گریہم نے لکھا ہے:

"میں خیال کرتا ہوں کہ بے تعصب اور دقیقہ سنج ناظرین کتاب میں بہت سی
باتوں میں سر ولیم میور کے خلاف فیصلہ دینے میں اتفاق کریں گے۔"[۱]

ایک اور عیسائی عالم ریورنڈ ہوپر نے کہا: خطبات احمدیہ لکھنے سے سید احمد خاں نے اسلام کی ایسی خدمت
کی ہے جو تیرہ سو برس میں کسی مسلمان سے بن نہیں آئی۔"[۲]

ان کی ایک اور اہم اور فکر انگیز تصنیف تفسیر القرآن ہے جو تقریباً نصف قرآن پاک پر حاوی ہے
بیشتر علما نے اس کی مخالفت کی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں جس تحقیق سے کام لیا گیا ہے
اس سے ایک عجیب وغریب تھیالوجیکل (مذہبی) قابلیت ان کے دماغ کی ثابت ہوتی ہے"[۳] اور "سرسید
اپنی اس نئی طرز کی تفسیر سے جن جن مقامات میں پوری کامیابی ہوئی ہے (اور ایسے مقامات کی تعداد کچھ
کم نہیں) ان میں فی الواقع بمقابلہ علوم جدیدہ کے اسلام میں ایک نئے علم کلام کی بنیاد پڑ گئی"[۴] ان کے علاوہ
کی بہت سی اور تصانیف اور علمی کارنامے ہیں جو رسائل، مقدمین، یادداشتوں، لکچر اور خطوط کی شکل میں
موجود ہیں اور تاریخی قدر وقیمت رکھتی ہیں۔ ان کا تعلق ان واقعات وسانحات سے ہے جو سنہ ۱۸۵۷ء میں
پیش آئے اور نہ صرف ان عواقب اور مکافات کے جائزے اور تجزیے پر مبنی ہیں جو اس وقت سامنے تھے

---

[۱] منقول از مقالات حالی حوالہ سابق ص ۲۲۱ [۲] منقول از مقالات حالی حوالہ سابق ص ۲۲۱ [۳] منقول از مقالات حالی حوالہ سابق ص ۲۲۰ [۴] ایضاً ص ۲۲۵، ۲۲۶

بلکہ ان تمام کوششوں اور تجاویز سے عبارت ہیں جو سرسید نے قوم کی آبادکاری کے جامع پروگرام کی تشکیل و تعمیل کے سلسلے میں پیش کیں۔

اس ضمن میں ان کا رسالہ اسباب بغاوت ہند خاص طور پر قابل لحاظ ہے جس میں انھوں نے نہایت دلیری اور دانش مندی سے اپنے تمام ہم وطنوں بالخصوص مسلمانوں کی طرف سے جو انگریزوں کے غیظ و غضب کا خاص طور پر نشانہ تھے، ان تمام الزامات کے مدلل جواب دیے ہیں جو حکومت وقت نے نہایت نامنصفانہ طور پر ان پر عائد کیے تھے۔ اس تحریر سے نہ صرف ان کی وطن دوستی ظاہر ہوتی ہے بلکہ یہ ان کے ایک باہمت مدبر ہونے پر دلالت کرتی ہے جس نے نہایت نازک اور خطرناک وقت پر قومی وجود اور وقار کو ہلاک ہونے سے بچا لیا۔ وہ عجیب وقت تھا جب ایسی کتاب لکھنا جان سے کھیلنے کا مساوی تھا۔ مثال کے طور پر اس کتاب سے یہ اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

"اصل سبب اس فساد کا میں تو ایک ہی سمجھتا ہوں۔ باقی جس قدر ہیں وہ سب اس کی شاخیں ہیں اور یہ سمجھ میری کچھ وہمی اور قیاسی نہیں ہے بلکہ اگلے زمانے کے بہت سے عقلمندوں کی رائے کا اس بات پر اتفاق ہو چکا ہے اور تمام مصنفین پرنسپل آف گورنمنٹ کے اس باب میں میرے طرف دار ہیں اور تمام تاریخیں یورپ اور افریقہ کی میری رائے کی صداقت پر معتمد گواہ ہیں۔ سب لوگ تسلیم کرتے چلے آئے ہیں کہ واسطے اسلوبی اور خوبی اور پائداری گورنمنٹ کے مداخلت رعایا کی حکومت ملک میں واجبات سے ہے.... اور بلاشبہ پارلیمنٹ میں ہندوستان کی رعایا کی مداخلت غیر ممکن اور بے فائدہ محض تھی مگر لیجسلیٹو کونسل میں مداخلت نہ رکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ پس یہی ایک بات ہے جو جڑ ہے تمام ہندوستان کے فساد کی اور جتنی باتیں اور جمع ہوتی گئیں وہ سب اس کی شاخیں ہیں"[1]

اس کتاب سے قوم کو جو سہارا ملا ہوگا اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ خود حکومت پر بالآخر اس کا گہرا اور صحت مند اثر پڑا اور رشک و شبہ کی اس زہریلی فضا میں تبدیلی آئی جس کی وجہ قوم کے نہ جانے کتنے چشم و چراغ اور جیالے سولی پر چڑھا دیے گئے اور ملک کے بے شمار خانوادے محرومی و تباہی کے شکار ہوئے تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے ہنٹر کی کتاب The Indian Mussalmans (جو کتاب گویا مسلمانوں کے خلاف سخت زہریلے حالات کا پشتارہ تھی) کا جواب لکھا اور بہتان طرازی اور فریب کو فاش کیا جس سے وہ کتاب

---

[1] اسباب بغاوت ہند، سرسید احمد خاں، اُردو اکیڈمی سندھ ص ۱۱۱ - ۱۱۴

مملو تھی۔ اس سلسلہ میں ان کی تصنیف "لائل محمڈنز آف انڈیا" کو بجا طور پر تاریخی اہمیت حاصل ہے جس میں نہایت احتیاط و جرات کے ساتھ صحیح واقعات مع پوری شہادتوں کے فراہم کیے گئے ہیں اور مسلمانوں کو اس الزام سے بری کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ حکومت کے سب سے خطرناک اور بدترین دشمن ہیں اور واضح شواہد سے ان کی خیرخواہی اور وفاداری ثابت کی گئی ہے۔ فی الواقع انھوں نے مسلمانوں اور عیسائیوں میں اس مذہبی تعصب و عناد کو دور کرنے کے لیے جو ان میں عرصۂ دراز سے چلی آ رہی تھی ایک نہایت مبارک اور سنجیدہ کوشش کی یعنی انھوں نے بائبل کی تفسیر لکھنی شروع کی جو تبیین الکلام کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ تفسیر وہ مکمل نہ کر سکے اور کاموں نے اس کی فرصت ہی نہ دی۔ ان کے اس کام کے بارے میں یہ رائے قابل توجہ ہے:

"The basic idea in undertaking this work was to show the Muslims that despite serious differences with Islam, Christianity was not so foreign to their own sense of values, and beliefs as they imagined."[1]

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت سرسید کی پوری کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں پر حکومت کے عتاب کی جو سختی تھی وہ کسی نہ کسی طرح دور ہو اور اس سلسلہ میں انھوں نے حکومت سے وفاداری کی پالیسی کو اپنانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ ان کے نزدیک قوم کی اس وقت کی دشواریوں کو دور کرنے کے لیے ایک حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرنا بمنزلہ ایک فریضہ کے تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی یہ پالیسی سو فی صدی صحیح تھی۔ لیکن ان کی اس پالیسی کے جواز میں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت اس کی کامیابی کے امکانات کسی اور طرز عمل کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھے۔ سرسید کا یہ طریقۂ کار ایک مناسب اور سازگار ماحول پیدا کرنے کا ایک بڑا کارگر وسیلہ ثابت ہوا اور اس کا مقصد بھی یہی تھا۔ لیکن بعد میں آنے والوں نے اگر بدلے ہوئے حالات میں بھی اس پالیسی کو برقرار رکھنے پر اصرار کیا اور اسے ایک مستقل سیاسی فلسفے کے طور پر استعمال کیا تو ان کے اس فعل کو سرسید بھی صحیح نہ قرار دیتے۔ سرسید کا سیاست کا تصور کچھ اس طرح کا تھا کہ ایک حقیقت پسندانہ سیاسی شعور پیدا کرنے کے لیے وقت کے رنگ و رخ کو نہ پہچاننا اور مستقبل کے امکانات سے واقفیت بہم نہ پہنچانا ایک بدیہی ضرورت سے روگردانی کا مترادف تھا۔ اس حقیقت شناسی سے اجتماعی سیاست کے مقاصد متعین و

---

(1) The Muslim Community of the Indo-Pakistan subcontinent (610-1947) I.H.Quraishi (1962 p.238

متیقن ہوتے ہیں، لیکن ان مقاصد کے حصول کے لیے ایسے طریقہ کار کا انتخاب بھی ضروری ہے جو ان حالات کو مطلوبہ طور پر تبدیل کر دینے کی زیادہ سے زیادہ ضمانت دیتا ہو۔ اقدار و مقاصد اضافی ہوتے ہوں یا نہیں، اس پر اختلاف رائے کی پوری گنجائش ہے لیکن طریق کار و عمل ہمیشہ اضافی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس پر سب کا اتفاق ہے۔ اس لیے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ جہاں تک مقاصد قومی کے انتخاب کا تعلق ہے اس میں سرسید نے بے نظیر لیاقت، بے خوف فکر اور بے لوث عمل کا ثبوت دیا ہے۔ مگر جہاں تک طریقہ ہائے کار کے اختیار کرنے کا سوال ہے، انھوں نے وقت کے تقاضوں، مصلحتوں اور اس کی نزاکتوں کا خصوص طور پر لحاظ رکھا ہے۔ بہر صورت اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی حکومت کی ملازمت میں ہونے کے باوجود سرسید نے اپنے ذہن، فکر اور طریق کار کو حکومت کی مصلحت یا پالیسی کی غیر مشروط پابندی سے جس طرح آزاد رکھا اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

انھوں نے سنہ ۱۸۵۷ء میں حیات قومی کے شیرازے کو جس طرح بکھرتے دیکھا اور ان کے دل کی جو حالت ہوئی، اس کا نقشہ خود ان کے قلم نے یوں کھینچا ہے:

"۔۔۔۔۔۔ اور جو حال اس وقت قوم کا تھا مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔۔۔۔ آپ یقین کیجیے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیے مگر اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں نہیں۔ اس کی مصیبت میں شریک ہونا چاہیے اور جو مصیبت پڑے اس کو دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔۔۔۔"

اپنے ارادہ اور عزم کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"تو یہ سوال پیش آتا ہے کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے۔ ہماری رائے میں اس کا جواب صاف ہے: استقلال، استقلال، استقلال۔ ہمت، ہمت، ہمت۔ کوشش، کوشش، کوشش، ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پروا کرنی چاہیے اور اگر ہم میں سلف ریسپکٹ کا کچھ اثر باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہیے کہ بلاشبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے مگر لوگوں کی رائے پر نہیں۔"[1]

---

[1] مکمل مجموعۂ لکچرز و اسپیچز ص ۲۹۸۔ اجلاس آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، اجلاس چہارم منعقدہ علی گڑھ

سرسید کے ان چند الفاظ میں کیا کچھ نہیں ہے۔ ان میں ان کے چاروں طرف پھیلی ہوئی مایوسی و مسماری پر
ی کی روح کا کرب جھلکتا ہے۔ ان میں قومی حمیت کا شدید احساس اور فرض کی بجاآوری میں ذاتی آسائش و
سودگی کو ترک کردینے کا تہیہ ملتا ہے۔ ان میں وہ وطن دوستی ملتی ہے جو صحیح معنوں میں انسان دوستی سے
منعار ہے۔ ان میں ایک فرد کا وہ آہنی عزم ہے جو جماعت کے انتشار و اضمحلال کو ایک ناقابل تسخیر قوت
ا تبدیل کردیتا ہے۔ ان میں اس مثبت جذبے کی کارفرمائی ملتی ہے جو تخریب کو تعمیر کے لیے ایک تازیانہ
نتا ہے۔ یہ صرف الفاظ نہیں تھے بلکہ ایک ہمہ جہت، ہمہ گیر اور عظیم الشان قومی خدمت کے پروگرام کے اظہار
غاز کا اعلان تھا۔ یوں تو ہر شخص اپنی صلیب خود اٹھانے پر مجبور ہے اور بہت کم ایسے ہیں جو اس فرض سے
ش اسلوبی سے عہدہ برآ ہوتے ہیں، لیکن پوری انسانیت اور قوم کی صلیب کو اٹھا لینے کا شرف و سعادت
اکے بندگان محترم ہی کو حاصل ہوتا ہے اور ان کی کامیابی صرف تائید الٰہی کی رہین منت ہوتی ہے۔ سرسید نے
ماندہ قوم کی بے اماں اور بے کراں ذمہ داری کے بوجھ کو اپنے شانوں پر جس کشادہ دلی، اخلاص، دردمندی،
بری، دانش مندی اور قابلیت کے ساتھ اٹھالیا اس کا اعتراف دوست دشمن سبھی نے کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید نے اپنی جملہ ذہنی اور جسمانی قوتوں کو قومی زندگی کی تعمیر، ترقی اور استحکام کے
ے لیے وقف کردیا تھا۔ انھوں نے اس وقت سے لے کر زندگی کے آخری لمحات تک حیات قومی کے ہر مسئلے
ر گہری اور دقیق توجہ کی اور مناسب حل کی جستجو میں انتہائی ذہنی کاوش اور سخت جسمانی مشقت اٹھائی۔
ن کی ذات فی الواقع علم و عمل کا ایک معجزہ تھی وہ بیک وقت قوم کا قلب بھی تھے اور دماغ بھی۔ ان کا قلب
م کے سود و زیاں کو اسی طرح محسوس اور ریکارڈ کرتا تھا، جس طرح موسم کا مقیاس اور ان کا دماغ قومی
فع و ترقی کی تدابیر کا خزینہ تھا۔

جس وقت ملک سنہ ۱۸۵۷ء کے تہلکے سے دوچار ہوا سرسید بجنور میں تھے۔ یہ علاقہ ان حالات
حوادث سے پورے طور پر متاثر تھا جو اس وقت گرد و پیش میں رونما ہوئے۔ ہر طرف تباہی و تاریکی تھی۔
رسید نے ان حالات پر قابو پانے کے لیے بڑے جتن کیے، جن کی بنا پر ان سے اپنے اور پرائے دونوں
بن ہوئے۔ سرسید اسے جانتے تھے لیکن ظلم و زیادتی سے وہ کسی طرح مفاہمت نہیں کرسکتے تھے۔ جب دو
دہوں میں مخالفت و مخاصمت انتہا کو پہنچ جائے تو کسی ایسے شخص کا جو امن، عافیت اور عاقبت اندیشی کی
طر ان میں سے کسی ایک کی مکمل تائید یا طرفداری سے اجتناب کرے تو اس کا فریقین کا مورد عتاب ہونا

تعجب کی بات نہیں۔ بعینہٖ یہی صورت سرسید کو پیش آئی لیکن جب ہنگامہ فرو اور حقائق کی سنگینی کا احسا(س)
پیدا ہوا تو سرسید کے رویے کو صحیح قرار دیا گیا۔ سب کو ان سے مدد ملی۔[1] غدر کے بعد محض سرسید کی بدولت
یہ ضلع تمام سزاؤں اور آفتوں سے محفوظ رہا۔[2] اور پھر باغیوں کی تحقیقات کے لیے جو کمیشن مقرر ہوا تھا اس میں
بھی (سرسید) ایک ہندوستانی ممبر تھے۔ انھوں نے معصوم اور بے خطا لوگوں کی بڑی دلیری سے حمایت کی اور
بیسیوں کو پھانسی سے بچا لیا۔[3] سنہ ۱۸۵۸ء میں سرسید کا تبادلہ بجنور سے مرادآباد کا ہوا۔ وہاں کے حالات بھی
نہایت خراب تھے اور باشندوں کی بہت بڑی تعداد ابتری و آزمائش سے دوچار تھی۔ سرسید کی موجودگی سے ضلع
کے لوگوں کو بڑی مدد ملی اور رفاہ عام کے کئی کاموں کی ابتدا ہوئی۔ خاص کر جب سنہ ۱۸۶۰ء میں ایک بڑا قحط پڑا
تو سرسید نے مشکلات و مصائب کو دور کرنے میں دن رات سخت جدوجہد کی جس کا اعتراف حکومت اور ابنائے
وطن دونوں نے کیا۔ سنہ ۱۸۶۲ء میں ان کا تبادلہ غازی پور کا ہوا۔ اس سال انھوں نے اپنی ایک تاریخی تجویز
بعنوان "التماس بخدمت ساکنان ہندوستان در باب ترقی تعلیم اہل ہند" پیش کی۔ یہ تجویز سائنٹیفک سوسائٹی
کے قیام کا پیش خیمہ تھی۔ ۹ جنوری سنہ ۱۸۶۴ء کو انھوں نے غازی پور میں اپنی اس تجویز کو ہندو مسلمان اور انگریزوں
کے ایک نمائندہ جلسہ میں پیش کیا۔ سوسائٹی کے قیام کے مقاصد کیا تھے، حالی اس طرح بیان کرتے ہیں[4]:

"جو (یعنی سائنٹیفک سوسائٹی) اس غرض سے قائم کی گئی تھی کہ لٹریری اور علمی کتابیں انگریزی سے اردو
میں ترجمہ کرا کر مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کا مذاق اہل وطن میں پیدا کیا جائے۔ علمی مضامین پر لکچر دیے
جائیں۔ رعایا کے خیالات گورنمنٹ کے اصول حکمرانی رعایا پر ایک ایسے اخبار کے ذریعہ سے ظاہر کیے جائیں
جو اردو انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوا کرے۔ ہندو مسلمان اور انگریز تینوں قوم کے ممبر اس میں شامل کیے
جائیں اور اس طرح قومی معاشرت اور مذہبی تعصبات اور جو جھجک ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں
کی طرف سے ہے اس کو آہستہ آہستہ کم کیا جائے۔"[5]

اس سوسائٹی کے قائم ہونے کے فوراً ہی بعد سرسید کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا۔ سب کی یہی رائے ہوئی کہ
سوسائٹی کو بھی وہیں منتقل کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور سرسید کی رہنمائی میں سوسائٹی کا کام علی گڑھ
میں شروع ہو گیا۔ عمارت کا سنگ بنیاد ۳ نومبر ۱۸۶۴ء کو رکھا گیا اور ۳۰ مارچ سنہ ۱۹۶۶ء کو اس کی تکمیل پر

---

[1] سرسید احمد خاں۔ حالات و افکار حوالہ سابق ص ۱۸۵ [2] ایضاً ص۔ ۱۸۵
[3] ایضاً ۔ ۱۳۹ [4] ایضاً ص۔ ۱۴۰

ں کا افتتاح ہوا۔ سوسائٹی کے مقاصد حسب ذیل قرار پائے۔

۱۔ ان علوم و فنون کی کتابوں کا جن کو انگریزی زبان میں یا یورپ کی کسی اور زبان میں ہونے کے سبب سے ہندوستانی نہیں سمجھ سکتے ایسی زبانوں میں ترجمہ کرنا جو ہندوستانیوں کے عام استعمال میں ہوں۔

۲۔ جب کبھی سوسائٹی مناسب سمجھے تو کوئی ایسا اخبار یا گزٹ یا روزنامچہ یا میگزین وغیرہ چھاپ کر مشتہر کرنا جن سے ہندوستانیوں کی فہم و فراست کی ترقی مقصود ہو۔

۳۔ ایشیا کے قدیم مصنفین کی کمیاب اور نفیس کتابوں کا تلاش کرا کر بہم پہنچانا اور چھاپنا۔

۳۰ مارچ سنہ ۱۸۶۶ء سے سوسائٹی نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا اجرا کیا جس کے ایڈیٹر خود سرسید تھے۔ اس اخبار کے بارے میں حالیؔ نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس کی اہمیت اور اس کے اثرات کو بخوبی ظاہر کرتا ہے:

"اول اول سرسید زیادہ تر اس میں پولیٹیکل معاملات پر مضامین اور نوٹ لکھتے تھے اس لیے ان کی ابتدائی جلدوں کو ان کے پولیٹیکل ورکس کا ایک مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ اس اخبار کی بڑی خصوصیت ..... گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرز حکومت سے آشنا کرنا اور ان میں پولیٹیکل خیالات اور قابلیت اور مذاق پیدا کرنا تھا۔ اس کی ابتدائی جلدوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی خیالات کو ہندوستانی اور ہندوستانی خیالات کو انگریزی لباس میں ظاہر کر کے قوموں کو ملانا چاہتا ہے۔

ایک خاص وصف جو اس اخبار کے ساتھ مخصوص تھا اور جو اس کو ہندوستانیوں کے عام انگریزی اور دیسی زبانوں سے ممتاز ٹھہراتا تھا، وہ یہ تھا کہ اس نے اپنے طرز تحریر میں برخلاف اپنے تمام ہم عصروں کے کبھی کسی قوم یا فرقے یا کسی خاص شخص کی دل آزاری نہیں رکھی..... اس نے ہندوستان کے کسی قوم کی نسبت دوستی اور خیر خواہی کے خلاف کبھی ایک حرف نہیں لکھا۔ کبھی کسی ہندو یا مسلمان ریاست یا اس کے اہلکاروں پر زہر نہیں اگلا۔ ہندو مسلمانوں کے مذہبی جھگڑوں سے وہ ہمیشہ بے تعلق رہا اور کبھی کچھ بولا تو دونوں کو صلح و آشتی کی نصیحت کی۔"[1]

سوسائٹی کا قیام، ترقی اور کامیابی تقریباً تمام تر سرسید کی کوششوں کی رہین منت تھی۔ وہ اس کے ہر کام میں دل و جان سے شریک تھے۔ مالی وسائل کو استوار کرنے کے لیے انھوں نے اپنے وسیع اثرات استعمال

---

[1] منقول از ایضاً ص ۱۴۳-۱۴۴

کیے۔ اس کی عمارت کی تعمیر اور ضروری آلات و سامان فراہم کرنے میں بڑی تگ و دو کی۔" دو کتابوں کی تالیف کا بیڑہ اٹھایا۔ ایک تمام اُردو مطبوعہ کتب نظم و نثر کی فہرست کی ترتیب بطور تاریخ زبان اُردو .... معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے لکھنے کی نوبت نہیں آئی ...... دوسرے اُردو لغات جو سرسید نے لکھنی شروع کر دی تھی۔ اس کا نمونہ موجود ہے۔ ... سرسید کے صحیح ادبی ذوق اور دور بینی کا اسی ایک بات سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ۶۹ برس پہلے اس چیز کا ڈول ڈالا تھا جس کی تکمیل پر ہم آج غور کر رہے ہیں[1]۔" خود اس کے لکچر پروگرام میں داخل ہوتے حتیٰ کہ ان عملی تجربات میں حصہ لیتے جو سوسائٹی میں کئے جاتے تھے مثلاً" نو قسم کے گندم لندن سے منگائے گئے، خود سرسید نے ایک ایک دانہ بونے کے لیے ایک آہنی تلی ایجاد کی اور علم فلاحت پر ایک رسالہ لکھنا شروع کیا[2]۔ اس سوسائٹی نے تصنیف اور ترجمے کے بڑے قابل قدر نمونے پیش کئے اور کئی عمدہ تعلیمی تحریکیں شروع کیں اور اس کے اثرات ملک کے ایک بڑے حصے پر پڑے اور جا بجا اس کے نمونے پر انجمنیں قائم ہوئیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب سرسید کی شخصیت تھی۔ جس کی سب سے نمایاں صفت یہ تھی کہ وہ دوسروں کو اپنا ہم خیال بنانے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔ علم و فکر کی گہرائی اور بلندی، خلوص کی سادگی اور سچائی، کام کرنے کی لگن اور ہمت، جاں نثاری جانفشانی اعلیٰ اخلاق اور شائستہ مذاق، تجربہ اور خیر اندیشی ایسی فطری و اکتسابی خوبیاں تھیں جو دوسروں کو فی الفور مسخر کر لیتی تھیں اور کبھی جدا نہ ہونے دیتیں۔

سرسید نے ۱۸۶۶ء میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن نامی ایک انجمن قائم کی جس کا مقصد حسب ذیل الفاظ میں بیان ہوا ہے:

> "ہندوستانیوں کو گورنمنٹ سے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے پارلیمنٹ سے تعلق پیدا کرنا چاہیے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری میں ہندوستان کے لیے بڑی دقت یہ تھی کہ اس کے تقریباً تمام معاملات صرف کورٹ آف ڈائرکٹرس تک پہنچتے تھے اور پارلیمنٹ سے بہت کم تصفیہ پاتے تھے۔ مگر اب حکومت ہندوستان کی ملکۂ معظمہ نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے اور ہندوستان کے امورات کو زیادہ تر پارلیمنٹ سے تعلق رہے گا۔ بس اس غرض کے لیے کہ پارلیمنٹ کے ممبر ہمارے حالات اور معاملات سے بخوبی واقفیت حاصل کریں،

---

[1] ایضاً ص ۱۵۱ [2] ایضاً ص ۱۵۰

ہم کو ایسی تدبیر کرنا چاہیے جس سے ہم اپنے صحیح حالات اور مناسب خواہش سے ان کو
مطلع کر سکیں اور جس طرح ان انگریزوں نے جو ہندوستان میں رہتے ہیں ایک ایسوسی
ایشن انگلستان میں قائم کرنی چاہی ہے۔ اسی طرح ہم بھی تمام اضلاع شمال و مغرب کی
طرف سے ایک ایسوسی ایشن اپنے ملک میں قائم کریں اور اس کے ذریعہ سے اپنے تمام
مطالب اور مقاصد گورنمنٹ اور پارلیمنٹ تک پہنچائیں۔"[1]

اس ایسوسی ایشن کی جانب سے حکومت کے سامنے مختلف تجاویز رکھی گئیں۔ اور اس طور پر حکومت
اور رعایا کے درمیان ایک سنجیدہ اور مفید رشتے کے قیام میں بڑی مدد ملی۔ انجمن نے ایک اہم اور دور رس تجویز
سرسید کی وساطت سے سنہ ۱۸۶۷ء میں حکومت میں پیش کی جو ایک ورناکولر یونیورسٹی کے قیام کے بارے
میں تھی۔ اس عرضداشت سے جستہ جستہ اقتباس پیش کیے جاتے ہیں جن سے اس تجویز و تحریک کے اہم اور
قابل قدر پہلو واضح ہوتے ہیں۔

"ہم اقرار کرتے ہیں کہ جو علوم و فنون اب ایشیا کے ملکوں میں جاری ہیں جن کے موضوع
اور تاریخی حالات ہمارے بہت سے مصنفوں کی کتابوں میں موجود ہیں اور اپنی اصلی حالت
میں بغیر کسی طرح کے تغیر تبدل اور ترقی کے ہم تک پہنچے ہیں ان میں سے اکثر ایسے اصول پر
مبنی ہیں جو زمانہ حال میں علم کی ترقی ہونے سے بالکل غلط اور ناجائز ٹھہرے ہیں اور
بعضے علم ایسے ہیں کہ اگرچہ بنیاد ان کی صحیح اور مضبوط اصول پر ہے مگر زمانہ حال کی نئی نئی
تحقیقاتوں اور تلاشوں کے سبب سے ان کا رنگ ڈھنگ بالکل بدل گیا ہے اور
بعضے علم ایسے ہیں کہ اب تحصیل ان کی فضول اور غیر مروج ہو گئی ہے اور برخلاف
اس کے آج کل دنیا میں بہت سے ایسے علوم و فنون کی گرم بازاری ہے جو زمانہ
حال کی ایجاد ہیں اور ان کا حال ہمارے بزرگوں کو بالکل معلوم نہ تھا پس یہ ایک ایسی
بات ہے جس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ ایشیا میں جو علوم اور زبانیں اب جاری
ہیں ان کی تحصیل ہمارے علم کی ترقی اور روشن ضمیری کے لیے محض غیر کافی ہے اور یہ
بات بھی ایسی ہی محقق اور مسلم ہے کہ مذکورہ فائدے کے حاصل کرنے کے واسطے کوئی

[1] ایضاً ص ۱۰۲ - ۱۰۳

ذریعہ اس سے بہتر نہیں ہے کہ ہم انگریزی زبان کو سیکھیں..... بالفعل بڑے بڑے علموں سے صرف زبان انگریزی کے ذریعہ سے واقفیت حاصل ہوسکتی ہے اور یہی بات ایسی ہے جس کے سبب سے ملک میں مفید علموں کے عموماً جلد شائع ہونے میں بڑے بڑے موانع اور ہرج واقع ہوتے ہیں..... جس تک سب کی رسائی آسان اور سہل ہونی چاہیے .... مگر ایک اور طریقہ تعلیم کا جو عام تعلیم کی ترقی کے لیے زیادہ موثر تصور کیا جاتا ہے قائم اور جاری کیا جائے..... وہ طریقہ یہ ہے کہ بجائے اس بات کے کہ صرف انگریزی ہی زبان میں تعلیم کی جائے دیسی زبان کو بھی تعلیم کے اعلیٰ درجہ کے مضمون اور مطالب میں لوگوں کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ گردانا جائے.....اگر علم کی تحصیل غیر ملکی زبان کے ذریعہ سے کی جائے تو اس میں دو چند وقت صرف ہوتا. اوّل تو خود زبان ہی کے سیکھنے میں وقت خرچ ہوتا ہے اور اس کی تحصیل میں ہزاروں طالب علم اس قدر وقت کھوتے ہیں کہ پھر اس زبان کے ذریعہ سے جس کو انھوں نے حاصل کیا ہے کسی مفید علم کے تحصیل کرنے کے واسطے وقت باقی نہیں رہتا ہے۔ دوسرے علم کی تحصیل خاص علم کے فائدوں کے لحاظ سے ضرور ہوتی ہے اور شاذ و نادر ایسے طالب علم پائے جاتے ہیں جن کو زبان اور علم دونوں کی تحصیل میں کامیابی حاصل ہو مگر جب کہ اس کے دیس کی زبان میں علم کی تحصیل ہو تو طالب علم کا کچھ بھی وقت ضائع نہیں ہوتا۔

...... پس اگر دیسی زبان کو تعلیم کا ذریعہ ٹھہرایا جائے تو اس درجہ کا علم جس تک اب چند ایم۔ اے کے سند یافتہ طالب علموں کو رسائی ہوتی ہے، بے انتہا لوگوں کو حاصل ہونے لگے گا۔ اب جو سررشتہ تعلیم کا غیر ملکی زبان کے ذریعہ جاری ہے اس کی بدولت طالب علم جس علم کو ایک مرتبہ حاصل کرتا ہے اس کو وہ یونیورسٹی چھوڑنے اور زندگی کے معمولی کام کاج میں مصروف ہو جانے کے بعد جلد بھول جاتا ہے اور جلد اس کے ذہن سے وہ علم اتر جاتا ہے مگر جو طریقہ ہم نے تجویز کیا ہے اس کے ذریعہ سے جو علم ایک مرتبہ حاصل ہو جائے گا صرف وہی باقی اور برقرار نہیں رہے گا بلکہ علم کی تحصیل کا ذریعہ اس معمولی زبان کے ہونے سے جس میں ہر وقت اس کے خیالات ظاہر اور پیدا ہوتے ہیں وہ علم کی استعداد

اور قابلیت کی مناسبت سے ہمیشہ ترقی اور شگفتگی پاتا رہے گا..... اس بات کا خیال کرنا بے جا ہے کہ دیسی زبان کے ذریعہ سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم کرنا انگریزی زبان کی اشاعت کو مضر اور خارج ہوگا کیونکہ یہ کہنا بھی تو اسی طرح سے صحیح نہیں ہے کہ نہر اور سڑکوں دونوں کا ایسے مقاموں میں بنانا جہاں دونوں کی ضرورت ہے، مضر اور ایک دوسرے کا مخالف اور مانع ہوگا، حالانکہ یہ دونوں کام ایسے جداگانہ ہیں کہ اپنی ذات سے ہر ایک فیض بخش ہے اور ایک دوسرے کا حارج اور مزاحم نہیں ہے.... خاتمہ پر ہم اپنا یہ قوی یقین ظاہر کرتے ہیں کہ جس تجویز کی ہم تائید کرتے ہیں اگر اس کو جاری کیا جائے تو اس ملک کی حالت کو از سر نو عمدہ اور بہتر کرنے اور اس کے باشندوں کی طبیعتوں میں سے غلطی اور جہالت کو دور کرنے اور سب حاکموں اور محکوموں کو برابر فائدہ پہنچانے کا یہ تجویز ایک موثر وسیلہ اور ذریعہ ہوگی...."[1]

اس عرضداشت کا جواب حکومت کی جانب سے ای.سی. بیلی صاحب سکرٹری گورنمنٹ ہندوستان کی تحریر نمبر ۱۲۱۴ ۔ ۵ ستمبر سنہ ۱۸۶۷ء کے ذریعہ موصول ہوا۔ اس کی وضاحت حسب ذیل تحریر میں ملتی ہے:

"گورنمنٹ کی طرف سے جو جواب اس کا موصول ہوا اس میں چند باتیں قابل غور ہیں۔ گورنمنٹ اس امر کو تسلیم کرتی ہے کہ جمہور انام کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دینے کے لیے دیسی زبانیں کارآمد ہوں گی لیکن دیسی زبانوں میں ابھی اس اعلیٰ درجہ کی تعلیم کے لیے کافی سامان اور لوازمہ موجود نہیں ہے۔ دوسری بات جو زیادہ قابل لحاظ ہے یہ کہ صرف ان کتابوں کا ترجمہ جو یونیورسٹی کے نصاب تعلیم میں داخل ہیں اس قدر کافی نہ ہوگا جس کی بنا پر اس تجویز کو عمل میں لانے کی ہمت ہو سکے کیونکہ تعلیم یونیورسٹی کا مقصد صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ بعض خاص خاص کتب سے واقفیت ہو جائے بلکہ یہ مقصد ہے کہ یورپ کے علوم وفنون کے دائرے میں علم کی تحصیل کے لیے طبیعت کو مستعد اور تیار کیا جائے اور کچھ عرصہ تک غالباً ہندوستان کے باشندے صرف انگریزی کے ذریعہ سے اس بات کو حاصل

---

[1] منقول از ایضاً ص ۱۰۴ - ۱۱۸ بحوالہ اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ مورخہ ۱۹ اگست سنہ ۱۸۶۷ء

کر سکتے ہیں۔ تیسری بات جس کا گورنمنٹ نے اظہار کیا ہے ؟ درصورت پسندیدہ ہونے کے بھی گورنمنٹ کے واسطے یہ غیر ممکن ہے کہ ایسے گنجان آباد ملک کو جیسا کہ ہندوستان ہے، کامل تعلیم دینے کا کل خرچ اپنے ذمہ لے؛ یعنی ملک کے اہل دولت کو بھی اپنی رضا و رغبت سے اپنے روپے اور اثر سے اس کام میں مدد دینی چاہیے جس کی تکمیل پر ہندوستان کی بہبودی اور ترقی کا انحصار ہے۔"

" اس خط و کتابت کے بعد پھر کچھ نہ معلوم ہوا کہ کیا ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ یہیں ختم ہو گیا۔[1] اس میں شبہ نہیں کہ یہ تجویز ملک کی تعلیمی ترقی کے لیے ایک بنیادی حیثیت رکھتی تھی اور اس کے پیش کرنے میں سرسید نے بڑے غور و فکر سے کام لیا تھا لیکن یہ امر تعجب خیز ہے کہ سرسید جو نہایت مضبوط قوت ارادی کے مالک تھے کس طرح گورنمنٹ کے صرف ایک جواب سے اس تجویز کو ملتوی کر دینے پر آمادہ ہو گئے۔ اس بارے میں حالی صرف اتنا لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں؛

" .... ورناکیولر یونیورسٹی کے قائم کرنے میں بعض مشکلات ایسی تھیں جن کا حل کرنا نہایت دشوار تھا...... پھر ان دنوں ان کو سفر انگلستان کا خیال پیدا ہو گیا جس میں طرح طرح کی مشکلات حائل تھیں اور ان کا حل کرنا بجائے خود ایک بڑا کام تھا۔ ان وجوہ سے سرسید اور ان کے ساتھ جتنے آمین کہنے والے تھے سب ورناکیولر یونیورسٹی کے خیال سے دست بردار ہو گئے۔"[2]

یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ سرسید نے اس تجویز کو صرف ملتوی کیا تھا اس لیے کہ بعد کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید دیسی زبان میں اعلیٰ تعلیم کی اشاعت و کامیابی کی طرف سے نہ صرف مشتبہ یا مایوس ہو گئے تھے بلکہ وہ اس کو مضر سمجھنے لگے تھے اور انھوں نے بوجوہ آئندہ سے اس سرکاری تجویز کی شدت سے مخالفت کی جو دیسی زبان میں اعلیٰ تعلیم کی ترویج کے سلسلے میں کی گئی۔ انگریزی مستشرقین، کلکتہ میں سنسکرت کالج کے قیام پر زور دیتے تھے لیکن راجہ رام موہن رائے نے سنہ ۱۸۲۳ء میں حکومت سے اصرار کیا کہ انگریزی تعلیم دی جائے۔ اگر برطانوی پارلیمنٹ کا منشا ہندوستان کو جہالت میں رکھنا ہو تو سنسکرتی نظام تعلیم اس مقصد کی تکمیل کے لیے بہترین آلہ تھا لیکن چونکہ مقصد ہندوستانی آبادی کی اصلاح ہے اس لیے اسے جدید اور ترقی یافتہ

---

[1] منقول از ایضاً ص ۱۴۴ [2] منقول از ایضاً ص ۴۴۔

نظامِ تعلیم جاری کرنا چاہیے۔"[1]

اس سلسلے میں ایک فاضل کا یہ بیان اور توجیہ خصوصیت کے ساتھ قابلِ لحاظ ہے:

سرسید نے تو سائنٹیفک سوسائٹی کے ذریعہ دیسی زبان کی توسیع کا تجربہ بھی کر لیا تھا لیکن کلکتہ اور بمبئی جیسی یونیورسٹیوں کے قیام کے بعد انگریزی زبان کے سیل کا تھام لینا اب کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ ہندوستان کی کوئی دوسری زبان اس بات کی دعویدار نہ تھی کہ دانش کدوں میں نئی علوم کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ عربی اور فارسی کے علمی وقار کی وجہ سے اُردو نے تو سنہ ۱۸۰۰ تا سنہ ۱۸۶۷ء یہ دعویٰ بھی کر لیا۔ سرسید ابتدا میں اس تعلیمی اسکیم کو عملی طور پر رائج کرنا چاہتے تھے لیکن شرقی صیغے کی ناکامی اور انگریزی تعلیم کے عام چلن کی وجہ سے ان کا نقطۂ نظر بدلتا گیا اور بالخصوص سنہ ۱۸۸۱ء میں جب انھیں سرکار برطانیہ کے علمداروں کی نیت پر شبہ ہونے لگا کہ وہ پنجاب یونیورسٹی کالج قائم کر کے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم اور زبان سے ناآشنا رکھنا چاہتے ہیں تو انھوں نے تہذیب الاخلاق میں تابڑ توڑ تین مضمون لکھ کر السنہ مشرقی کی اس یونیورسٹی کو ایک ایسا 'جال' بتایا جس میں مسلمانوں کو پھنسایا جا رہا ہے۔ سرسید کی اس زبردست ذہنی انقلاب کی داستان انھیں کے الفاظ میں مختصر طور پر بیان کی جاتی ہے۔ فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج اور سائنٹیفک سوسائٹی کی ناکام خدمت کا ذکر کرتے ہوئے وہ پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت میں یوں رقم طراز ہیں:[2]

"یہ خیال بہت پرانا ہے کہ اگر ہماری تعلیم ہماری زبان میں ہو تو ہمارے لیے اور ملک کی ترقی کے لیے زیادہ تر مفید ہے۔ لارڈ میکالے سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس پر بہت کچھ عمل کیا تھا۔۔۔ جن ملکوں نے اس زمانے میں اعلیٰ درجے کی ترقی کی ہے اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ انھوں نے تمام علوم و فنون کو اپنی زبان میں کر لیا ہے مگر جن ملکوں نے ایسا کیا ان میں اور ہندوستان میں بڑا فرق ہے ان ملکوں میں ایک ہی قوم اور ایک ہی زبان حکومت کرتی ہے مگر ہندوستان میں نہ ہندوستانی حکومت کرتے

---

[1] انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ۔ از عبداللہ یوسف علی ص ۱۵۴۔ منقول از (زبان کا مسئلہ، ڈاکٹر گیان چند، رسالہ شاعر، جولائی سنہ ۱۹۶۵ء ص ۱۴۔

[2] علی گڑھ تحریک، مسلم یونیورسٹی اور اُردو زبان از ڈاکٹر مسعود حسین خاں (علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سنہ ۱۹۶۰ء ص ۳۶۳

ہیں نہ یہاں زبان حکمران ہے پھر ان ملکوں میں ہندوستان کا قیاس ایک بہت بڑی غلطی ہے۔"

"..... ہندوستان میں اس خیال کا پیدا کرنا کہ ہم مشرقی علوم اور دیسی زبان اور دیسی علوم کو ترقی دے کر عزت و دولت، حشمت و حکومت حاصل کریں گے، بعینہٖ ایسا ہی ہے جیسے کوئی امریکہ کے اصل باشندوں کو خیال دلائے کہ تم اپنی دیسی زبان اور دیسی علوم میں (جو کچھ کہ ہوں) ترقی کر کے اپنی حکمران قوم میں عزت و دولت حشمت و حکومت حاصل کرو گے۔"[1]

خود سرسید نے اپنے خیالات میں اس زبردست تبدیلی کا حال یوں بیان کیا ہے:

"ہم کو طعنہ دیا جاتا ہے کہ خود ہم نے اسی اصول پر سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی تھی اور بہت کچھ مباحثہ اور تکرار گورنمنٹ سے کی تھی اور اب ہم اس کے برخلاف ہیں اور ہاں یہ بات سچ ہے..... مگر اس زمانہ اور حال کے زمانے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اس میں انگریزی علوم کی حاجت نہ تھی یا یوں کہو کہ قدر نہ تھی۔ اعلیٰ کہ اعلیٰ عہدوں کے لیے ادنیٰ درجہ کی مشرقی تعلیم کافی تھی..... اس میں ریل و تار برقی کو کروروں ہندوستانیوں نے دیکھا بھی نہ تھا اور جو خیالات تجارت و ترقی کے اب پیدا ہوئے ہیں وہ اس زمانے میں کسی کے خیال میں بھی نہ تھے..... اس زمانے کے مناسب حال بلاشبہ اس شخص کو جو سچے دل سے اپنی قوم و ملک کی ترقی کا خواہاں ہو، اس خیال کا پیدا ہونا کہ ہم دیسی زبانوں کے ذریعہ سے اپنے ملک و قوم کو ترقی دیں نہایت واجب اور سچا خیال ہو سکتا ہے مگر رفتہ رفتہ تمام حجابات رفع ہوتے گئے اور خود زمانے نے بتا دیا کدھر جاتے ہو اور ٹھیک رستہ کدھر ہے۔"[2]

اس بات کو زمانے نے بتا دیا کہ کدھر جاتے ہو اور ٹھیک رستہ کدھر ہے ان واقعات خیالات اور تجربات کی طرف اشارہ ہے جو سرسید کو ورنا کولر یونیورسٹی کی تحریک کرنے کے بعد پیش آئے۔ اس سلسلے میں ایک بات جو وثوق سے کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ سنہ ۱۸۵۷ء سے لے کر یکم اپریل سنہ ۱۸۶۹ء تک جب سرسید بنارس سے انگلستان کے لیے روانہ ہوئے تو ان کی شب و روز کے غور و فکر نے ان پر یہ حقیقت

---

[1] ایضاً بحوالہ تہذیب الاخلاق سنہ ۱۸۸۱ء ص ۱۳۲-۱۳۳۔ [2] حوالہ سابق۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔ ص ۳۶۔

بحوالہ تہذیب الاخلاق سنہ ۱۸۸۱ء ص ۱۴۰۔

واضح کر دی تھی کہ قومی زندگی کی نئی تعمیر و ترقی کے لیے ایک ایسا جامع اور ہمہ جہت پروگرام درکار تھا جس کا پورے طور پر قابل عمل ہونا از بس ضروری تھا۔ سرسید کی ذہنی و فکری صلاحیت غیر معمولی اور نہایت اعلیٰ درجے کی تھی اگر وہ یکسو ہو کر صرف قوم کی ذہنی نشوونما کے لیے لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تو تحقیق و تخلیق کے ایسے کارنامے وقوع میں آتے کہ سرسید کا شمار دنیا کے بڑے سے بڑے مفکرین اور دانشوروں میں ہوتا۔ انھوں نے بے پناہ مصروفیات کے سیل میں بھی کچھ لکھا ہے اس سے ان کی جامع صفات ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سرسید کے خلاق ذہن میں کیسے اور کیا کچھ خیالات نہ آتے ہوں گے۔ لیکن ان کے ذہن کے ڈسپلن کی داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے صرف ان خیالات کو اپنے دل میں جگہ دی اور قوم میں عام کیا جو ان کے نزدیک قابل عمل اور نفع بخش تھے۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ ذہنی و فکری تاریخ میں دائمی شہرت حاصل کرنا بہت بڑا امتیاز ہے۔ اگر وہ چاہتے تو خانقاہ میں بیٹھ جاتے اور ایک عالم کے رشد و ہدایت کا وسیلہ بنتے۔ خالص سیاست کا راستہ اختیار کرتے تو ایک بہت بڑی جماعت کے قائد ہوتے۔ منصب اور عہدے کی فکر کرتے تو سب سے اونچی کرسی پر بیٹھتے۔ ادیب و شاعر ہونا پسند کرتے تو ایک زمانے سے داد حاصل کرتے۔ مورخ ہوتے تو قوموں کے عروج و زوال پر استاد کا درجہ پاتے۔ فلسفے اور مذہب کی وادی میں نکل جاتے تو کتنے قافلوں کے سالار بن جاتے۔ صرف عمارت کی تعمیر سے دلچسپی رکھتے تو دورِ شاہجہانی کی بازیافت کرتے۔ قانون پر اکتفا کرتے تو اپنے عہد کے بہت بڑے مقنن ہوتے۔ محض تعلیم سے تعلق رکھتے تو ایک نئے نظام تعلیم کے بانی ہوتے۔ اور کیا کیا نہ ہوتے! لیکن تخصیص اور تخصص کا راستہ اختیار نہ کرنے کے باوجود کون کہہ سکتا ہے کہ متذکرۂ صدر کم و بیش تمام حیثیتیں ان کی شخصیت میں جلوہ گر نہ تھیں۔

سرسید کا سفر انگلستان ان کے لیے براہ راست اور قوم کے لیے بالواسطہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ انگلستان کے دوران قیام میں ان کو مغربی تہذیب و دانش اور اثر و اقتدار کے ایک نمائندہ ملک کا جسے اس وقت کی دنیا کی سیاست میں مرکزی حیثیت اور ہندوستان کی مطلق العنان بادشاہی نصیب تھی بہ نظر غائر مشاہدہ و مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ اس سفر و قیام سے ان کو وہ ذہنی یکسوئی بھی حاصل ہوئی جو طرح طرح کی مصروفیات و مشکلات کے سبب سے ہندوستان میں میسر نہ تھی۔ گو خود انگلستان میں ان کی مصروفیات علمی اور سوشل دونوں اقسام کی بے انتہا تھیں پھر بھی دو تہذیبوں کے بے لاگ تقابلی مطالعہ کے امکانات وہاں کہیں زیادہ تھے۔ سرسید نے تقریباً ڈیڑھ سال کے اس قیام

کے ہر لمحے کو کسی نہ کسی مفید کام کے لیے استعمال کیا۔ بااثر ارباب حکومت سے ملک کے مسائل پر تبادلۂ خیال کیا ——————— ارباب علم و دانش سے مختلف مباحث پر گفتگو کی۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ خطبات احمدیہ کی تدوین و اشاعت کا انتظام کیا۔ اعلیٰ تعلیم گاہوں اور علمی اداروں کا معائنہ اور مطالعہ کیا۔ وہاں کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی تنظیم سے واقفیت بہم پہنچائی۔ اپنے مسائل کے حل کی تدبیریں سوچیں۔ غرض کہ تنہا اتنا کچھ کیا جو ان دنوں کئی کمیٹیاں اور ڈیلی گیشن زر کثیر صرف کر کے مدتوں تک نہیں کر پاتیں۔ یہ سفر ذاتی طور پر بڑی مالی زیر باری اٹھا کیا تھا اور ہر لمحہ خدا کی بڑائی اور قوم و ملک کی بھلائی کی تدبیریں سوچنے اور اختیار کرنے میں صرف کیا۔ وہاں اس پیر دانا کے عظیم کام میں ان کا اصل ساتھی اور مددگار ان کا "سعادت مند" بیٹا سید محمود تھا۔ بوڑھے باپ کے عزم جواں کے پیچھے نوجوان بیٹے کی غیر معمولی فراست و محنت تھی۔ قومی تعلیم کا وہ منصوبہ جو عرف عام میں علی گڑھ تحریک کہلاتا ہے دونوں نے اس زمانہ قیام میں مرتب کیا اور وطن واپس آنے کے بعد اس منصوبے کی تکمیل میں زندگی کے آخری لمحات تک مصروف رہے۔

علی گڑھ تحریک بالخصوص انگریزی تعلیم کے نفاذ و اشاعت کے پیچھے کیا خیالات و مقاصد تھے اور سرسید اپنے عہد کے ملکی و بیرونی حالات و واقعات سے کس طرح اور کس حد تک متاثر ہوئے اور ان کے خیال و عمل سے قومی زندگی پر کیا اثرات پڑے، موجودہ بحث کے بنیادی موضوعات ہیں۔

سرسید کے فکر و عمل کی سب سے واضح اور ترقی یافتہ شکل علی گڑھ تحریک ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں دو بڑی تہذیبوں کے سیاسی تصادم سے جو ابتری اور تباہی پھیلی اور جو کشمکش اور آزمائش شروع ہوئی اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے مختلف اوقات میں سرسید نے مختلف تجاویز پیش کیں جن کا مختصر بیان اوپر آچکا ہے۔ ان تمام تجاویز میں ایک مشترک عنصر پایا جاتا ہے اور وہ ہے سرسید کا حقیقت شناس اور زمانہ شناس ذہن۔ اس سیاسی تصادم نے ہندوستان کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص بعض بڑی سنگین حقیقتوں سے دوچار کر دیا تھا جس کے نتیجہ میں تقریباً پورا شمالی ہندوستان اور اس میں بسنے والے ایک ہمہ گیر انتشار کا شکار تھے اور ناعاقبت اندیش اور ناکارہ سیاست کا دور دورہ تھا۔ صنعت و حرفت زراعت و تجارت غرض کہ پوری معیشت قومی ٹھٹھر کر رہ گئی تھی۔ نیم مذہبی سیاسی تحریکات، ناممکن الحصول اور غیر حقیقت پسندانہ مقاصد اور دعووں کے سہارے ایک ہاری ہوئی جماعت کے باقی ماندہ جوش اور

حرارت ایمانی کو غیر فطری طور پر قائم رکھنے پر مصر تھیں۔ یہ حالات تھے جن میں استعمار کا تسلط قوی سے قوی تر ہوتا جاتا تھا۔ قوم کی بنیادی کمزوریاں سرسید کی بے خطا نگاہوں کے سامنے تھیں اور ان حالات کے محرکات اور نتائج ان کے ذہن و دماغ پر نقش ہو رہے تھے۔ سرسید روح عصر سے واقفیت رکھنے میں اپنے تمام ہم عصروں سے ممتاز تھے۔ ان کو یقین تھا کہ مغرب یعنی انگریزوں کا غلبہ آج تو ہرگز نہیں کل ضرور ختم ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کے علوم و فنون، فلسفہ، سائنس اور ٹکنالوجی، انسانی تاریخ، اس لیے ہندوستان کی زندگی میں ایک بڑے تہذیبی اور ذہنی انقلاب کی نشاندہی کرتے ہیں۔ انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ مغربی تہذیب بین الاقوامی عناصر رکھتی ہے اور ایک ترقی پذیر تحریک ہونے کی حیثیت سے عالمگیر ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جس طرح چند صدی پہلے اسلامی تہذیب نے اپنی ترقی پذیر صلاحیتوں کے باعث ایک وسیع رقبہ پر اپنا اپنا اثر و اقتدار پھیلا دیا تھا اور متمدن دنیا کے لیے ایک نمونہ بن گئی تھی۔ سرسید جانتے تھے کہ صلیبی جنگوں میں اسلام اور عیسائیت کا ایک زبردست تصادم ہوا تھا اور اس معرکے میں اسلام کی فتح مسلمانوں کے مضبوط عقیدے، علوم و فنون میں ان کی دستگاہ اور مجموعی حیثیت سے یورپ سے زیادہ منظم، تربیت یافتہ اور ترقی پذیر معاشرہ کی بنا پر ہوئی تھی۔ اس تصادم سے عرصہ تک شکست و ریخت کا سلسلہ قائم رہا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ اسلامی تہذیب اور عیسائیت کے اس تضاد و تصادم نے ایک مثبت حرکی تہذیبی عمل کو بھی جنم دیا۔ یورپ کے دور ظلمت و وحشت میں نیے علوم و فنون کے چراغ انھیں چنگاریوں کی مدد سے جلائے گئے جو عیسائی معرکہ آرا واپسی پر اپنے ساتھ لائے۔ یہ صحیح ہے کہ اس تہذیبی عمل کو فروغ دینے کی خاطر غیر کی فتح کو تسلیم کرنا یا کرانا کوئی نیک عمل نہیں ہے۔ مقصد صرف یہ کہنا ہے کہ سرسید نے مغربی تہذیب و تعلیم کے چراغ سے قومی تہذیب و تعلیم کی بجھتی ہوئی شمع کو منور کرنا چاہا ٹھیک اسی طرح جیسے نظام جسمانی کے ضعف و اضمحلال کو دور کرنے کے لیے مریض کو تازہ خون دیا جاتا ہے۔ مریض کی جان بچانے میں اچھا طبیب یہ نہیں دیکھتا کہ وہ شخص جس کا خون دیا جانے والا ہے وہ حاکم ہے یا محکوم، کالا ہے یا گورا، مشرق کا ہے یا مغرب کا۔ وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ جو خون دیا جائے وہ مریض کے خون سے میل کھاتا ہے یا نہیں۔ سرسید جدید مغربی علوم اور سائنس کو اپنی قوم میں عام کرنا چاہتے تھے اور اس امر کے خواہاں تھے کہ ان کے ہم قوم اس تعصب اور منفی انداز فکر و عمل کو چھوڑ دیں جن کی وجہ سے ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ انھوں نے مغربی تہذیب کے فعال مثبت اور کارآمد عناصر سے گہرا اثر قبول کیا

اور ترقی علوم و سائنس کو دورِ جدید کا سب سے اہم واقعہ قرار دیا۔ بقول اقبال "وہ (سید احمد خاں) دورِ جدید کے پہلے مسلمان ہیں جس نے آنے والے زمانے کے ایجابی مزاج کی ایک جھلک دیکھ لی: اس کے علاوہ ان کا تاریخی شعور جو خاص طور پر اسلام اور دیگر سامی مذاہب کی تاریخ کے مطالعہ پر مبنی تھا اپنے عہد کے حالات کو تاریخی پس منظر میں دیکھنے پر مجبور تھا۔ اس تاریخی پس منظر کا اجمالی بیان حسب ذیل اقتباسات میں ملاحظہ ہو:

"The world conquered by Muslims in the first rush of their expansion was one where there was already a highly developed intellectual tradition. It was by no means a homogenous tradition, but an intermingling of several different traditions that had originally been separate. The chief common factor was probably the Greek philosophical scientific tradition, but this had several branches, and some of these had been combined with judaism and various forms of Christianity not to mention gnosticism and Manichaeism. The Arabs who found themselves rulers of this cultured world came to it with only a naive world view... When men who had been brought up in the higher intellectual cultures became Muslims, there was an inevitable transition between their general world-view and the identical system which was the basis of the Islamic religion __ It was, therefore, not sufficient for the Muslim intellectuals to effect greater harmony and balance within the peculiarly Islamic ideation; they had also to bring about some integration of this ideation with the older intellectual tradition of the heart lands of the Caliphate...1 An external intellectual influence on Islam perhaps even more important than the Judeo-Christian historical traditiion was that of Greek philosophy."2

"... The Muslims not only mastered Greek science and eventually handed it on to Europe through Spain, but added to it in the process."3

---

1. Islam and the integration of Society, W.M.Watt. Rutledge and Kegan Paul, London 1961 pp. 228-229.

2. Ibid, p.232

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔

3. Ibid, p.234, The Legacy of Islam(ed) Sir Thomas Arnold & A. Guillaume, Oxford 1931.

خود سرسید کے عہد میں یا اس سے کچھ پہلے عالم اسلام جس تہذیبی کشمکش سے دوچار تھا اس کا نقشہ یہ تھا :

"In the Ottoman Empire, which included the Arabic-speaking countries the impact of Europe and the West may be said to have been first felt about 1800, after the invasion of Egypt by Napoleon in 1798. The Muslim intellectuals (more particularly, those of the religious institution) were not adequately prepared to meet the challenges which now came to them. They had turned it on themselves. Their historical tradition had little interest in what lay outside the Islamic world, and their main educational tradition had little interest in any thing outside the Quranic Sciences and their ancillary disciplines. The Muslim intellectuals were, therefore, not at all interested in European learning. The ruling institutions, on the other hand, in places like Cairo, Constantinople and Taheran, were very interested in European Technology and those branches of European learning subservient to it, for they realised that European Technology (along with other features of European Society) gave the Europeans military superiority. In their endeavour to increase their military power the ruling institutions gradually took over or adopted various features of culture and civilization.

In course of time they realized that they must have a completely Western Educational system, and this has been or is in process of being established in all the Islamic countries."1

اوپر بیان کی ہوئی صورتحال سے سرسید پورے طور پر واقف تھے۔ اس بارے میں ایک فاضل کی رائے یہ ہے :

۱۔ حوالہ سابق ص ۲۳۶-۲۳۷

لیکن علی گڑھ تحریک میں بین الاقوامی عنصر نہ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اس تحریک کا بانی بین الاقوامی حالات سے بھی نابلد تھا یا اس کو عالم اسلام کی زبوں حالی کا اندازہ نہیں تھا۔ ۴؍ ستمبر سنہ ۱۸۶۷ء کو بنارس میں تقریر کرتے ہوئے سید احمد خاں نے کہا تھا:

"ترک عرب اور فارس آج کل اسی نتیجہ پر پہنچے ہوئے ہیں جس نتیجہ کی ذلت و خواری ہم اٹھا رہے ہیں"

ان کو فواد پاشا، خیر الدین تیونسی وغیرہ کی تحریکوں کا پوری طرح علم تھا۔ تہذیب الاخلاق کے مقاصد کو بیان کرتے ہوئے انھوں نے فواد پاشا کی رپورٹ سے یہ جملے نقل کئے تھے اور ان کو اپنی کوششوں کی بھی اساس قرار دیا تھا۔

"اسلام میں وہ سب سچی باتیں ہیں جو کہ دنیا کی ترقی کو حاصل کرنے والی انسانیت اور تہذیب اور رحمدلی کو کمال کے درجے تک پہنچانے والی ہیں۔ مگر ہم کو اپنی بہت سی رسوم و عادات کو جو اگلے زمانے میں مفید تھیں مگر حال کے زمانے میں نہایت مضر ہوگئی ہیں چھوڑنا چاہیے"

خیر الدین تیونسی کی کتاب "اقوام المسالک" کو انھوں نے جلسوں میں پڑھ کر سنایا تھا اور قوموں کے عروج و زوال پر ان کے نظریات کو وضاحت سے بیان کیا تھا۔ اس طرح انھوں نے ایک حد تک ہندستان کے مسلمانوں کو عالم اسلام کے فکری رجحانات سے آشنا رکھنے کی کوشش کی تھی۔ علاوہ ازیں اس سلسلے میں ان کے پیش نظر وہ ممالک بھی تھے جو علوم و فنون کی ترقی میں اپنے ہمسایوں سے پیچھے رہ گئے تھے اور بعد کو اصلاحی تحریکوں کے ذریعہ ان کی ترقی کے دروازے کھلے تھے [1]

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ابتدائے عمر ہی سے سرسید کو تاریخ اور ریاضیات سے گہرا شغف پیدا ہو گیا تھا۔ ان کے فکر و عمل میں یہ علوم بنیادی عوامل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قومی تہذیب کے تجزیے و تعبیر میں انھوں نے غیر معمولی تاریخی بصیرت سے کام لیا ہے اور اس کی نئی تشکیل و تعمیر کے لیے صحت اور وضاحت کے مستند معیاروں کے مطابق لائحہ عمل کا انتخاب کیا۔ قدرت سے ان کو خدمت کا بے لوث و بے پایاں جذبہ عطا ہوا تھا اس لیے ان کا خیال اور عمل ان مواقع و مشکلات کو دور کرنے میں قومی رہبری کے

---

[1] سید احمد خاں اور سید جمال الدین افغانی از پروفیسر خلیق احمد نظامی علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز حوالہ سابق ص ۲۴۴ تا ۲۴۵

فرائض انجام دینے کی نہایت اعلیٰ صلاحیت رکھتا تھا جن میں ان کا ملک اور قوم اس وقت پھنسے ہوئے تھے۔
انیسویں صدی میں ہندوستان اور وہ ممالک جن پر مغربی استعمار کا تسلط تھا کئی طور پر ایک ہی قسم کی صورت حال سے دوچار تھے، لیکن ہندوستان کی تہذیب اور سیاست کی بوقلمونی مخصوص انداز رکھتی تھی۔ صورت حال کا مشترک ہونا حسب ذیل حالات کی بنا پر تھا۔ قومی تعلیم کے نظام کا بے جان ہو جانا، معاشرے میں طبقاتی تفاوت کا بہت بڑھ جانا، اندرونی سیاسی قوت کا شخصی یا چند شخصی ہونا، قومی معیشت کی پیداواری کی سطح کا بہت نیچا ہونا یعنی بیشتر آبادی کا محض گزارے کی سطح پر ہونا، ادب اور ثقافت کا آرائشی اور نمائشی ہو جانا، مذہب کو برتنے کے بجائے دور از کار بحثوں میں الجھا دینا، کسی اعلیٰ نصب العین کے پیش نظر ہونے کے بجائے تنگ نظری، پست خیالی اور ہوسناکی میں مبتلا ہو جانا۔ بحیثیت مجموعی اس اجتماعی تخلیقی فکر و عمل کا فقدان جو صرف ایک جمہوری معاشرے میں جہاں فرد کی آزادی محفوظ و متیقن ہو، حاصل ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ ہندوستان میں بعض مخصوص حالات کی کارفرمائی مثلاً ملک کے جغرافیائی رقبے کا بہت بڑا ہونا اور بیک وقت متعدد نسلی، لسانی اور مذہبی آبادیوں کی موجودگی جن میں دو بڑی جماعتیں ہندو اور مسلمان تھیں۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے ملک کے بیشتر حصے پر مسلمانوں کی حکمرانی جو تعداد کے لحاظ سے ملک میں دوسروں سے بہت کم تھے لیکن سیاسی اور تہذیبی اثرات کی وجہ سے ایک خاص اہمیت رکھتے تھے۔ اس طور پر ملک میں لین دین یا عمل و ردعمل کا سلسلہ جاری تھا کہیں اور کبھی اتحاد کی قوتیں ابھرتیں تو کبھی اور کہیں افتراق کی۔ بدیسی حکمران کے آنے کے بعد ہندوستان میں ان قوتوں نے زور پکڑا جو نفاق کی تائید میں تھیں۔ اس طور پر سرسید کے زمانے کا ہندوستان ایک سہ طاقتی سیاست کا مرکب تھا۔ ہندو، مسلمان اور انگریز۔ سرسید نے ان حالات پر غور کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی کہ ہندوستان کا جو نقشہ آئندہ بنے اس میں انصاف، رواداری، مفاہمت اور روشن خیالی سے کام لینا ہوگا۔ یعنی اس ملک کے تمام بسنے والوں کو مستقل اور دیرپا فوائد اسی وقت حاصل ہوں گے جب وہ ایک دوسرے کے حقوق کا احترام کریں گے اور ملک میں روشن خیالی آئے گی۔ سرسید کے نزدیک اس مقصد کے حصول کا سب سے قوی اور موثر وسیلہ وہ تعلیم ہوگی جو ان کے نزدیک ایک نہایت ترقی یافتہ شکل میں مغرب سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اس تعلیم کے اپنانے سے ہم خود اپنے تاریخی، تہذیبی اور علمی ورثے کا بہتر اندازہ کر سکیں گے اور اس کی قدر و قیمت پہچانیں گے۔ سرسید مغربی تعلیم کی اشاعت کو قومی تہذیب و تمدن کو مالا مال کرنے کے مترادف قرار دیتے تھے۔

وہ ہندوستان کی زبوں حالی کو ایک بڑے ذہنی زوال کا نتیجہ سمجھتے تھے اس لیے قوم کی حیات نو کے لیے تعلیم کو سب سے موثر و مجرب علاج بتاتے تھے ۔

مغرب میں سائنس کی ترقی سے جو ذہنی انقلاب آیا اور جس طرح علمی اور مادی ترقی و کامرانی کے بیشمار نئے دروازے کھلے سرسید ان سے گہرے طور پر متاثر ہوئے ۔ وہ اپنے ملک میں بھی ایک سائنسی ذہن پیدا کرنا چاہتے تھے ۔ اسی لیے انھوں نے اپنی قوم میں جامد مذہبی خیالات و توہمات کے خلاف سخت جدوجہد کی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ سائنس کی ترقی مذہب کے منافی نہ تھی ۔ اوہام پرستی اور قدامت پسندی کو مذہب کا دشمن بتایا اور سائنس کو اصلاً ایک ناطرفدار عمل قرار دیا جس کے امکانات لاتعداد اور لامحدود ہیں جو انسانی معاشرے کی مسلسل اور مستقل ترقی کی ضمانت دیتی ہے ۔ انھوں نے مغربی تعلیم و سائنس کی بڑی شدت سے حمایت اور وکالت کی ۔ یہ قوم کی عام غفلت اور شدید تعصب کے خلاف ایک جہاد تھا جس میں سرسید تمام عمر مصروف رہے ۔ انھوں نے اپنے اس اصلاحی بلکہ اس زمانے کی فضا کو دیکھتے ہوئے ، انقلابی خیالات کی تبلیغ و اشاعت کے لیے مثبت اور مصالحتی طریقۂ کار کو اپنایا اور اس حقیقت کو بھی تسلیم کیا کہ وہ ہندوستانی انسانیت کے جس مخصوص تہذیبی حصے سے تعلق رکھتے ہیں اس کے مسائل تاریخی اور عمرانی اسباب کی بنا پر ایک خاص نوعیت کے ہیں اور اس گہرے ذاتی روحانی اور ثقافتی تعلق کی بنا پر جو ان کو اس سے حاصل تھا ، وہ ذہنی طور پر اسی حصے کی ترجمانی اور نمائندگی بہتر طور سے کر سکتے تھے ۔ یہ ان کی حقیقت پسندی کا ثبوت تھا " اس لیے کہ جن مسائل پر وہ اظہار خیال کرنا چاہتے تھے ، خاص طور پر مذہبی موضوعات پر ، وہ بڑی نزاکت رکھتے تھے اور طرح طرح کی غلط فہمیوں کا باعث ہو سکتے تھے ۔ جیسا کہ بعد میں وہ ہوئے بھی ۔ بایں ہمہ یہ بھی واقعہ تھا کہ ہندوستان کے مذاہب اور فلسفے کے بارے میں ان کی معلومات بہت محدود تھیں اور یہ ان کے لیے کسی طرح ممکن نہ تھا کہ وہ اس حصے کے خیالات میں تبدیلی لانے کے لیے اس بے لاگ تنقیدی طریقۂ کار کو کام میں لائے جس کی وہ صورت حال متقاضی تھی ۔ مگر ان کو یقین تھا کہ ہندوستانی تہذیب کے مختلف اجزا ہیں ۔ ان اجزا کی یک جائی و امتزاج ہی سے عہد جدید میں ایک ہم آہنگ اور دلکش ہندوستان کی تعمیر ہوگی ــــــــــــــــــــ اس لیے انھوں نے صلح کل اور دوستی کی پالیسی کو اپنایا اور بلا لحاظ مذہب و فرقہ ہر اس شخص اور تحریک کا خیر مقدم کیا جس نے تعلیم سائنس اور روشن خیالی (بالفاظ سرسید روشن ضمیری) پھیلانے کی کوشش کی ۔ انھوں نے اپنی فکری اور

علمی تگ و دو کے لیے تعلیم کے میدان کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ اس میں تخلیقی اور تعمیری اتحاد فکر و عمل کی سب
سے زیادہ گنجائش تھی۔ ملک میں مذہبی اور سیاسی تخلیقی اور تعمیری اتحاد فکر و عمل کی سب سے زیادہ گنجائش تھی۔
ملک میں مذہبی اور سیاسی اختلافات کی بنا پر جو مریضانہ اجتماعی ذہنیت پیدا ہو گئی تھی اس کی اصلاح اور قومی
ذہن و فکر میں صحت مند تبدیلی لانے کا سب سے موثر ذریعہ تعلیم کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ سرسید کے خیال
میں ہندوستان نہ صرف ایک اندرونی کش مکش سے دوچار تھا بلکہ تاریخ عالم کے اس دور سے گذر رہا تھا جب
دو بڑی تہذیبیں مشرقی و مغربی یا قدیم و جدید سیاسی آویزش کے بڑے نازک و خطرناک عمل میں گرفتار تھیں اور
بین الاقوامی انسانیت کی نمو و نشو و نما کو ناممکن بنا دینے کی انسانیت سوز اور تہذیب کش تحریک کو مہمیز کر رہی
تھیں۔ سرسید انسانی تہذیب کی وحدت کو اپنے تاریخی شعور کی بنا پر ایک ایسی حقیقت مانتے تھے جو ہر چھوٹی
بڑی تہذیب کا احاطہ کرتی تھی اس لیے اس وحدت کے حسن اور معنویت کو جلوؤں کی اس کثرت میں دکھانا چاہتے
تھے جو دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف رنگ و آہنگ میں بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ایک ایسا پل بنانے
کی فکر میں تھے جو فاصلوں کو کم کرتا اور جس سے انسانوں کے کاروانِ علم و فکر گذرتے۔ ان کا تعلیم پر عقیدہ
اور ان کے تعلیمی پروگرام کا یہی رول ہے۔ انھوں نے ملک کی بے شمار اندرونی دشواریوں اور اختلافات نیز
بیرونی طاقتوں کی موجودگی سے پیدا ہونے والے طرح طرح کے مسائل کی اصلاح کے لیے وقتاً فوقتاً
مختلف تجاویز پیش کیں لیکن ان سب کا محور جدید تعلیم کی ہمہ گیر ترویج و اشاعت تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اسلامی
تہذیب، ہندو تہذیب اور مغربی تہذیب اپنے اپنے بہترین عناصر کو کام میں لا کر بقائے باہمی کے قابل عمل پروگرام
کو اپنائیں اور اپنے مقاصد اور آدرشوں کی تکمیل میں اخلاص اور افہام و تفہیم سے کام لیں۔

ان لوگوں کے لیے جو صرف سیاسی یا مذہبی عینک سے مسائل کو دیکھنے کے عادی ہیں سرسید کے اس
ایجابی تہذیبی میلان کی معنویت اور گہرائی کو پورے طور پر سمجھنا شاید آسان نہ ہوگا۔ مسائل کے تجزیے اور
تفہیم میں ایسے لوگوں کا موقف بالعموم نظریاتی ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے خیالات کے اظہار میں
کامیاب ہوتے ہوں یا نہیں خود زیر نظر مسئلے، صورت حال یا شخصیت کی ترجمانی میں اس حد تک کامیاب
نہیں ہوتے جس حد تک ان سے توقع کی جاتی ہے۔ سرسید نے بہت سے ذہنی اور عملی کام علیحدہ کیے ہیں:
علیحدہ ان کا تجزیہ کیا جائے اور جائزہ لیا جائے تو خاصے مختلف نتائج برآمد ہوں گے اور ان کی روشنی میں
جو حکم لگایا جائے گا وہ قرین حقیقت ہوگا۔ سرسید ہی پر موقوف نہیں کسی بھی تاریخی دور یا شخصیت کے
مطالعہ میں اس علمی طریقہ کو اختیار کرنے سے کسی ایک خاص پہلو کو نمایاں کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ لیکن

کسی عمومی نتیجہ پر پہنچنے کے لیے بالآخر اس دوریا شخصیت کی اصل حقیقت سے واقفیت پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ سرسید کی جملہ ذہنی وعملی سرگرمیوں کے مطالعہ سے، اس میں شک نہیں، ان کی شخصیت کی جو تصویر ابھرتی ہے اس کے بنیادی خطوط اور رنگ ان کے ان تعلیمی اور تہذیبی تصورات وخیالات سے عبارت معلوم ہوتے ہیں جو ازمنۂ وسطیٰ کی قومی تہذیب اور ورثے کو عصر جدید میں وقیع اور فعال بنانے اور مغربی تہذیب و تعلیم کے امتزاج سے جدید قومی تہذیب کو ایک حرکی تحریک بنانے سے متعلق تھے۔ سرسید تاریخ کے اس دوراہے پر کھڑے تھے جہاں پرانا نظام اور اس کے اقدار رخصت ہو رہے تھے اور عصر نو اپنے پورے امکانات کی توانائی وتابانی کے ساتھ رونما ہو رہا تھا۔ یہ وقت اس حساس مگر بیدار مغز شخص کے لیے بڑی آزمائش کا تھا۔ جو نظام رخصت ہو رہا تھا اس سے اس کا خون کا رشتہ تھا۔ اس سے مہر ووفا، وضعداری ذوق وظرف کی کیسی کیسی یادیں اور روایات وابستہ تھیں۔ لیکن خدا نے ان کو صبر، علم، یقین اور عمل کی جن صفات سے غیر معمولی حد تک نوازا تھا ان کے فیض سے نہ صرف یہ کہ سب کچھ برداشت کر گئے بلکہ عصر نو کے سخت گیر اور ہمہ جہت تقاضوں کے فشار کو بھی سہا اور قوم کی حیات تازہ کے لیے ضروری برگ وسامان فراہم کرنے میں مصروف ہو گئے۔

پہلے اور نئے زمانے میں جو فرق پیدا ہو چکا تھا اور اس طور پر جو نئی ذمہ داریاں سامنے آئیں ان کا سرسید نے نہایت سنجیدہ اور گہرا تجزیہ کیا اور اس کے نتیجہ سے قوم کو یوں آگاہ کیا:

> "ہمارے بزرگوں کو نہایت آسانی تھی کہ مسجدوں اور خانقاہوں کے حجروں میں بیٹھے بیٹھے قیاسی مسائل کو قیاسی دلائل سے اور عقلی کو عقلی براہین سے توڑتے پھوڑتے رہیں اور ان کو تسلیم نہ کریں۔ مگر اس زمانے میں نئی صورت پیدا ہوئی جو اس زمانے کے فلسفے وحکمت کی تحقیقات سے بالکل علیحدہ ہے۔ اب مسائل طبعی تجربہ سے ثابت کیے جاتے ہیں اور وہ ہم کو دکھائے جاتے ہیں۔ یہ مسائل ایسے نہیں ہیں جو قیاسی دلائل سے اٹھا دئے جاویں۔"[1]

مستقل اور باقاعدہ تصانیف کے علاوہ سرسید نے اپنی تعلیمی تصورات کی مسلسل اور وسیع اشاعت کے لیے سنہ ۱۸۶۶ء میں سائنٹیفک سوسائٹی کے آرگن علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے نکالا جو ان کے دم

---

[1] سید احمد خاں اور سید جمال الدین افغانی حوالہ سابق ص ۲۴۹ بحوالہ لکچر بمقام لاہور بتاریخ یکم فروری سنہ ۱۸۸۴ء لکچروں کا مجموعہ ص ۲۰۷)

واپسیں تک جاری رہا۔ سنہ ۱۸۷۰ء میں انھوں نے تہذیب الاخلاق جاری کیا سرسید کے عزم کا پتہ تہذیب الاخلاق سے چلتا ہے۔ ان کا تعلیمی پروگرام بہت ہمہ گیر اور وسیع تھا جس کے بارے میں خود لکھتے ہیں :

"تہذیب الاخلاق کا پرچہ ابتدا میں اس واسطے جاری کیا گیا تھا کہ ہندوستانیوں کے دل جو مردہ ہو گئے ہیں ان میں کچھ تحریک لائی جاوے۔ ہندوستان کی حالت ایک بند پانی کی سی ہو گئی تھی جس سے طرح طرح کے نقصان اور مضرت کا اندیشہ تھا۔ اس کے واسطے ایک پچھو کی ضرورت تھی کہ وہ اس کو ہلاوے۔ اس لیے اپنا کچھ کام کیا۔ اب تحریک پیدا ہو گئی ہے"[1]

تہذیب الاخلاق کے پہلے پرچے میں اس کے اغراض و مقاصد کے بیان میں لکھتے ہیں :

"اس پرچے کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجے کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے ......"

"سویلزیشن انگریزی لفظ ہے جس کا تہذیب ہم نے ترجمہ کیا ہے مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں۔ اس سے مراد ہے انسان کے تمام افعال ارادی اور اخلاقی اور معاشرت تمدن اور طریقہ تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجے کی عمدگی پر پہنچانا اور ان کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصلی خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے اور تمکین و وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔"[2]

سرسید کے نزدیک قوم کی ذہنی تربیت قومی مقاصد میں سب سے اونچا درجہ رکھتی تھی۔ وہ ہر ممکن کوشش اس احساس کو عام کرنے کے لیے کرتے تھے کہ قوم کی بنیادی ترقی کے لیے ایک ترقی پذیر اور جامع نظام تعلیم کا منصوبہ تیار کرنا تمام دوسری تدبیروں پر مقدم ہے اس خیال کو وہ طرح طرح سے پیش کرتے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک تعلیم یافتہ معاشرے کے ان تمام امکانات کا شعور رکھتے تھے جن کی نشاندہی ترقی یافتہ تہذیبوں میں ملتی ہے۔ ہر معاشرے میں اصلاً تعلیم ہی ایک ترقی پذیر قوت ہے۔ اس کی توضیح ایک مبصر نے اس طرح کی ہے :

"All institutions have an instinct of self preservation growing out of the selfishness of those

---

[1] حوالہ سابق ص ۲۵۰ [2] ایضاً بحوالہ لکچروں کا مجموعہ ص ۲۴۳-۲۴۱

connected with them. Being dependent for their vitality upon the continuance of existing arrangements they naturally uphold them. Their roots are in the past and the present, never in the future. Change threatens, modifies them, eventually destroys them;hence to change they are uniformly opposed. On the other hand, education, properly so called, is closely associated with change - is its pioneer - is the never-sleeping agent of revolution - is always fitting men for higher things, and unfitting them for things as they are. Therefore, between constitutions whose very existence depends upon man continuing what he is, and true education, which is one of the instruments for making him something other than he is, there must always be an amity."1

تعلیم کا یہ دوہرا عمل کہ وہ افراد کو بہتر اور اعلیٰ کی جانب مسلسل اور مستقل طور پر مائل کرتی ہے اور حال کی چیزوں سے صحت مند بے اطمینانی پیدا کرتی ہے اس رمز کو غالب نے اپنے مخصوص انداز میں اس طرح پیش کیا ہے :

با من میاویز اے پسر، فرزند آدم را نگر   آں کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگان خوش نکرد

دراصل انسانی تہذیب کو اس کے اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچانے کا مؤثر ترین وسیلہ تعلیم ہے۔ اس لیے جس قوم اور تہذیب کو تعلیم کے اس تخلیقی عمل کا حقیقی احساس ہوتا ہے اس کی ہمہ جہت و ہمہ وقت ترقی کی راہیں ہمیشہ کھلی رہتی ہیں۔ سرسید کے تعلیمی افکار میں سب سے نمایاں جگہ اس خیال کو حاصل ہے کہ سب سے مفید اور بامعنی تعلیم وہ ہے جو عصری فکر کے تمام میلانات اور رجحانات کا احاطہ کرتی ہو اور ان تمام ذرائع یا ٹیکنک سے واقفیت پیدا کرانے میں مدد دیتی ہو جن کے استعمال اور عمل سے سماجی اور معاشرتی ارتقاء حرکت میں آتا ہے۔ اس سلسلہ میں خود سرسید کا طریقۂ کار و فکر یہ ہے کہ وہ متنوع اور تغیر پذیر حقائق کی روشنی میں اپنے پچھلے افکار و تجربات کو مسلسل ان نئے تجربات اور خیالات میں سمونے کی کوشش کرتے ہیں جن کا نامیاتی تعلق ان بنیادی اور حرکی تحریکات کے مستقبل سے ہوتا تھا جو انیسویں صدی کے نصف آخر کے ہندوستان میں رونما ہو رہی تھیں۔ یہی سبب ہے کہ بعض لوگوں کو ان کی تبدیلیٔ خیالات سے شکایت ہے مثلاً..... "افسوس ہے کہ تدریجی طور پر ملک کے عام حالات جس طرح بدلتے گئے سرسید کے ذہن و

(1) Social Statistics:or the conditions Essential to Human Happiness, Herbert Spencer, London:John Chapman 1851, page 341.1

فکر میں بھی ساتھ ساتھ تبدیلی پیدا ہوتی رہی اور وہ کسی ایک ہی مقام پر جم کر نہیں رہتے۔ ایک ایسے فـ
اور ذہین شخصیت سے جیسی کہ سرسید کی تھی اس کی توقع کرنا کہ وہ ملکی حالات کی تبدیلی سے اپنے فکر
نہ ہونے دے گی یا صرف کسی ایک ہی مقام پر جم کر رہ جائے گی جب کہ قومی زندگی کے گوناگوں اہم مـ
اور تقاضے اس کی توجہ کے منتظر ہوں کسی طرح درست نہیں۔ اس کے برخلاف عمل کرنا شاید صرف ا
لوگوں کے لیے ممکن ہو جو حقائق سے صرف نظر کر کے محض عقیدے، مجرد خیالات اور ان کے منطقی استد
تاریخ کے ناقابلِ تسخیر دھارے میں مختصر مدت کے لیے ایک بند باندھ لینے پر اکتفا کر لیتے ہوں۔ ان کی
نیتی کی داد ضرور دی جا سکتی ہے لیکن روحِ عصر سے ان کے علم کی لاتعلقی اور ان کے دائرہ عمل کی تنگی کو
مشکل ہے۔ بایں ہمہ اس میں بھی شک نہیں کہ افراط و تفریط سے بچنے کے لیے ان دونوں قسم کے ذہن و عمـ
موجود ہونا بہرحال مفید ہے۔ سرسید کے فکر و عمل کی سب سے بڑی خوبی اور مسلمہ افادیت یہ تھی کہ اس ـ
ملک اور قوم کے اہم مسائل پر سنجیدہ فکر اور مباحثہ کا آغاز ہوا۔ اس طور پر قومی سرگرمیوں کو ایک باقا
سمت دینے اور مناسب رفتار متعین کرنے میں بڑی مدد ملی۔ یہاں اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چ
کہ سرسید کے مخالفوں (پیشوایانِ مذہب) کا نشانہ صرف سرسید تھے۔ یہ مخالفین نہ کسی دوسرے کا بد
تھے نہ کسی کے جواب دہ۔ دوسری طرف سرسید تھے جو قومی مسائل کی وکالت میں بیک وقت ابنائے
ابنائے مذہب، انگریزی حکومت و سیاست، روحِ عصر اور دوسری تمام قوتوں اور تقاضوں کے سا
جواب دہ تھے اور ان سب سے عہدہ برا ہونا تھا۔ اپنی کوششوں کے مثبت ردِ عمل سے سرسید پورے
پر آگاہ تھے، فرماتے ہیں:

> "مجوزہ مدرسۃ العلوم مسلمانان پر جو بحث اخباروں میں ہوئی (بلا لحاظ اس بات کے کہ وہ
> ہماری تدابیر کے موافق تھی یا مخالف) اس سے ہم کو نہایت خوشی ہوئی ہے اور اس بات
> کے دیکھنے سے کہ لوگوں نے اس پر توجہ کی اور مباحثہ کیا ہم کو اپنے مقصود کے حاصل ہونے
> کی قوی تر امید ہوتی ہے۔"[۲]

سرسید کے تعلیمی تصورات اور خیالات کا پورے طور پر احاطہ کرنا آسان نہیں۔ سب سے بڑی
یہ ہے کہ وہ ان کی کسی ایک تصنیف میں یکجا نہیں ملتے بلکہ بے شمار تحریروں، بیشتر رسائل، تجاو
عرضداشتوں، لکچروں اور خطوط کی شکل میں بکھرے پڑے ہیں۔ تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ اب تـ

---

[۱] دیوبند اور علی گڑھ از مولانا سعید احمد اکبر آبادی، علی گڑھ تحریک کا آغاز نامرود، ص ۲۲۶ [۲] مقالات سرسید مرتبہ محمد اسمٰعیل

ان پر اس فن کے کسی ماہر نے باقاعدہ کام نہیں کیا ہے۔ اتنا ضرور ہوا ہے کہ علی گڑھ تحریک یا سرسید
متعلق جتنا کام ہوا ہے اس میں لکھنے والوں نے ضمنی طور پر ان کے تصورات و خیالات پر اظہار خیال
لیکن سیر حاصل بحثیں بہت کم ہوئی ہیں تعلیم کے علم نے دوسرے علوم کی طرح تخصص کا درجہ حا
ہے اور یہ صرف ماہرین فن کا کام ہے کہ وہ اپنے مخصوص موضوع کے مطابق ان کی توضیح و تنقید کر
کام میں خاص طور سے تاریخ تعلیم، فلسفہ تعلیم، اصول تعلیم اور اعلیٰ تعلیم کے ماہرین کے اشتراک
ضرورت ہے۔ آئندہ اوراق میں ایک عامی نے اسی درخواست کی طرف اکابر فن کی توجہ مائل
کی کوشش کی ہے اور بس۔

○

انگلستان میں کم و بیش ڈیڑھ سال قیام کے بعد اکتوبر سنہ ۱۸۷۰ء میں سرسید ہندوستان وا
ان کی اس وقت کی تحریروں اور سرگرمیوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کس نئی ذہنی توانائی او
کے ساتھ واپس آئے تھے۔ قومی تعلیم کے بارے میں اپنے خیالات کو باضابطہ طور پر مرتب کر چکے تھے۔
کے مقصد و منہاج اور سمت منزل نے ان کے ذہن میں ایک متعین صورت اختیار کر لی تھی۔ کام کر
کر ڈالنے کا جذبہ عروج پر تھا۔ اس کے تقریباً دو ماہ بعد یعنی ۲۴ دسمبر سنہ ۱۸۷۰ء کو انھوں نے تہذیب الا
کا پہلا پرچہ شائع کر دیا جس کا مقصد قومی تعمیر نو کے لیے ایک نئی دعوت فکر و عمل دینا تھا۔ تہذیب الاخلا
قوم کا ذہنی جمود ٹوٹا۔ سنجیدہ مباحث پر گفتگو کرنے کی ابتدا ہوئی۔ اختلاف بھی رہا مخالفت بھی ہو
سے قومی ذہن کو نئی تحریک روشنی اور گرمی ملی جس کی نہایت ممتاز خصوصیات آزادی رائے بے لو
و جستجو اور عقلیت دوستی تھی۔ ان سب کے اندر اصلاح قوم کے لیے ایک زبردست لگن ملتی ہ

کتنے پاکیزہ کتنے اعلیٰ عظیم اور مشکل یہ کام تھے۔ فرماتے ہیں۔

"...... پس ہندوستان میں اسٹیل اور ایڈیسن ہی کی ضرورت نہیں ہے مقدس لوتھر کی بھی بڑی حاجت ہے" [۱]

لیکن صورت حال کیا تھی اس کا نقشہ یوں پیش کیا ہے:

"اسٹیل اور ایڈیسن کی خوش قسمتی تھی کہ ان کے زمانے کے لوگ ان کی تحریروں کو پڑھتے تھے اور قدر کرتے تھے اور ہماری بدنصیبی ہے کہ ہماری تحریروں کو مذہب کے خلاف کہا جاتا ہے اور ان کا پڑھنا باعث عذاب سمجھا جاتا ہے۔ اسٹیل اور ایڈیسن اپنے ہر پرچے کے مشتہر ہونے کے بعد واہ واہ کی آواز سننے سے اپنی محنت اور مشقت فکر و خیال کی کلفت کو دور کرتے ہوں گے اور ہم اپنی تحریروں کے مشتہر ہونے کے بعد بجز لعنت و ملامت سننے کے اور کسی بات کی توقع نہیں رکھتے ہیں۔ اسٹیل اور ایڈیسن جن لوگوں کی بھلائی کرتے تھے ان سے بھلا سنتے۔ ہم جن کی بھلائی چاہتے ہیں۔ ان سے برائی پاتے ہیں۔ جن کے حق میں بھلا کہتے ہیں ان سے برا سنتے ہیں۔ اسٹیل اور ایڈیسن کو ہزاروں دل اپنی طرف کر لینے کچھ مشکل نہ تھے اور ہم کو ایک دل بھی اپنی طرف کرنا نہایت مشکل ہے۔ اسٹیل اور ایڈیسن کو بنے بنائے دل اپنی طرف جھکانے تھے۔ ہم کو مشکل یہ ہے کہ دل بھی ہم کو بنانا ہے اور ہم ہی کو اس کا جھکانا ہے...... ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم ایک مسکین پرچے کے ذریعہ سے ہندوستان میں وہ کچھ کریں گے جو اسٹیل اور ایڈیسن نے انگلستان میں کیا، بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جہاں تک ہم سے ہو سکتا ہے ہم اپنا فرض پورا کرتے ہیں۔" [۲]

تہذیب الاخلاق کو جن منزلوں سے گزرنا پڑا اور اس نے قومی زندگی کو جس طرح متاثر کیا حالی نے اس کی وضاحت اس طور پر کی ہے۔

"اس پرچے کے دو تین ہی پرچے نکلنے پائے تھے کہ چاروں طرف سے اس کی مخالفت ہونی شروع ہوئی اور ساتھ ہی اس مدرسے سے بھی جس کو سرسید قائم کرنا چاہتے تھے عموماً سوء ظن پیدا ہونے لگا...... یہاں صرف اس قدر کہا جاتا ہے کہ اگر سرسید یہ پرچہ جاری نہ کرتے اور مسلمانوں کی اصلاح کا خیال چھوڑ دیتے بلکہ صرف ان کی تعلیم کا انتظام کرتے تو

---

[۱] مقالات سرسید مرتبہ محمد اسمٰعیل پانی پتی۔ باہتمام مجلس ترقی ادب طبع اول [۲] حیات جاوید الطاف حسین حالی مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علیگڑھ طبع سوم ص ۱۱۲ - ۱۱۳

ظاہراً ان کی مخالفت کم ہوتی بلکہ شاید نہ ہوتی۔ مگر اس کے ساتھ ہی اعانت و امداد بھی کم ہوتی اور جو تحریک چند سال میں مسلمانوں میں پیدا ہوگئی اس کا صدیوں تک کہیں نام و نشان نہ ہوتا۔[1]

قوم کے کس خاص طبقہ پر اس کا واقعی اثر ہوا اس کے بارے میں حالی اس رائے کا اظہار کرتے ہیں:

"اوّل اوّل لوگ اس سے بہت بھڑکے مگر رفتہ رفتہ مسلمانوں کے محدود دائرہ میں اس کا اثر پھیل گیا۔ ان پڑھ مسلمان کی تعداد ہمیشہ ایک گری ہوئی قوم میں پڑھے لکھوں کی نسبت بہت زیادہ ہوتی ہے وہ تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ تہذیب الاخلاق کس جانور کا نام ہے مولویوں اور واعظوں پر بھی اس کا منتر نہیں چل سکتا تھا کیونکہ وہ اس کو نہ صرف مذہب کے حق میں بلکہ شاید اپنے حق میں بھی مضر جانتے تھے۔ امرا تک اس کی رسائی ہونی سخت دشوار تھی کیونکہ ان کو مسلمانوں کے تنزل کا یقین دلانا ایسا ہی مشکل تھا جیسا کہ مرغابی کو طوفان سے خوف دلانا۔ اس لیے تہذیب الاخلاق کا اثر صرف متوسط درجہ کے لوگوں میں محدود رہا جو نہ محض جاہل تھے اور نہ جامع علوم عقلیہ و نقلیہ اور مقدور کے لحاظ سے نہ نہایت پست حالت میں تھے اور نہ اعلیٰ درجہ میں۔ پھر خاص کر دلی اور لکھنؤ اور ان کے نواح میں جہاں مسلمانوں کی قدیم شائستگی کے کچھ دھندلے نشان باقی تھے اس کا اثر بہت کم ہوا۔ باوجود اس کے چونکہ اس کی آواز زمانے کے گونج کے موافق تھی اس نے توقع سے بہت زیادہ کامیابی حاصل کی۔"[2]

اوپر کے اقتباسات سے دو باتیں واضح ہوئی ہیں پہلی تو یہ کہ سرسید نے اپنے خیالات و تصورات کو قائم کرنے میں مغربی تہذیب کی تاریخ کے ایک اہم دور اور اس کے عظیم نمائندوں سے گہرا اثر لیا دوسرے یہ کہ ان کی آواز زمانے کی گونج کے موافق تھی اس لیے اس کو کامیابی حاصل ہوئی۔ ان باتوں سے جس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ سرسید ایک غیر معمولی تاریخی شعور رکھتے تھے جس نے ان کو ان تمام حقائق اور محرکات کو سمجھنے میں مدد دی جس نے مغربی تہذیب کی تشکیل کی تھی جس کے مفید اور صحت مند عناصر کو اپنے تمدنی احوال میں جگہ دے کر وہ نہ صرف قومی زندگی کے ذہنی معیار کو بلند کرنے کی توقع رکھتے تھے بلکہ مستقبل کے ان

---

[1] ایضاً ص ۱۱۴ [2] حیات جاوید۔ الطاف حسین حالی۔ مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ طبع سوم سنہ ۱۹۲۲ء ص ۱۱۴

تہذیبی اور فکری رجحانات سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے جو ایک عالمگیر بین الاقوامی شائستگی و تہذیب کی نشوونما و برومندی سے متعلق تھے رہی یہ بات کہ ان کے مخاطب خاص طور پر مسلمان تھے ان کی فکر کو محدود نہیں کرتی۔ اس لیے کہ کسی تہذیب کا بجائے خود منفرد ہونا یا کسی کا اس سے منسلک ہونا نہ اس تہذیب کی خامی ہے نہ اس شخص کا گناہ۔ کیونکہ جب تک کسی تہذیب کے اقدار ایک اعلیٰ معاشرے اور اعلیٰ انسان کی تخلیق و تعمیر سے عبارت ہیں انسانیت کے لیے اس تہذیب کی قدر و قیمت مسلم ہے خواہ وہ ہندی ہو یا اسلامی یا مسیحی مغربی ہو یا مشرقی۔ جب تک وہ تہذیب ہے بربریت نہیں وہ قابل احترام بھی ہے اور قابل تسلیم بھی۔ کسی کا محض ہندو ہونا یا مسلم مسیحی یا بودھی ہونا اتنا اہم نہیں ہے جتنا اس کا اپنے مذہب و ملک کا اچھا پیرو ہونا۔ بالفاظ دیگر آدمی کا فوق البشر ہونا نہیں بلکہ اس کا خیر البشر ہونا اس کے لیے شرف و سعادت کا باعث ہے۔ پہلی شکل اس کی عارضی کامیابی اور دوسری صورت اس کی ابدی فتح ہے۔ حقیقی تہذیب کا مقصود و منتہا اچھے اور بڑے انسان کو ظہور میں لانا ہے۔ ورنہ اس کی قدر و قیمت محض الفاظ و علامات یا در و دیوار کی بے جان نمائش سے زیادہ نہیں۔ اگر سرسید کا کارنامہ ہندوستانی زندگی کے ایک اہم تہذیبی عنصر کی بالیدگی اور بقا کے لیے تہذیب و دانش کے اعلیٰ اور مسلم معیاروں کے مطابق ہے تو ان کی ذات نہ صرف ہندوستان بلکہ ان تمام لوگوں کے لیے قابل توجہ و تکریم ہے جو ایسے کام کی قدر کرنا ایک انسانی فریضہ سمجھتے ہیں۔

سرسید کے تعلیمی افکار اور مشن کی سب سے نمایاں صفت اس کی ہم عصریت اور ایجابیت ہے جس کے حصول میں انھوں نے غیر معمولی مطالعہ اور بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ یہ کام آسان نہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان قوتوں اور رجحانات کا صحیح علم رکھتے ہوں جن کی توضیح ایک فاضل نے حسب ذیل الفاظ میں کی ہے:

> there is always a system of live ideas which represents the superior level of age, a system which is essentially a characteristic of its times; and this system is the culture of the age."1

وہ معاشرے یا اشخاص جو اس کا علم نہیں رکھتے یا وہ جو اس سے کام لینے کے اہل ہوتے ہیں ان کے بارے میں یہ رائے بھی قابل لحاظ ہے:

---

(1) Mission of the University by Jose Ortega Y.Gasset Kegan Paul, London 1946 P.65.

"He who lives at a lower level, on archaic ideas, condemns himself to a lower life, more difficult, toilsome, unrefined. They ride through life in the ox-cart while others speed by them in automobiles. Their concept of the world wants truth, it wants richness, and it wants acumen. The man who lives on a plane beneath the enlightened level of his time is condemned to the life of an infra-man."[1]

سرسید اپنے عہد کی عمومی محدودیت اور حقائق سے چشم پوشی کو شدت سے محسوس کرتے تھے مثلاً فرماتے ہیں۔

"...... مشکل تو یہ ہے کہ قوم کی قوم جہل مرکب میں مبتلا۔ علوم جن کا رواج ہماری قوم میں تھا یا ہے اور جن کے تکبر اور غرور سے ہر ایک پھولا ہوا ہے دین اور دنیا دونوں میں کار آمد نہیں۔ غلط اور بے اصل باتوں کی پیروی کرنا اور بے اصل اور اپنے آپ پیدا کئے ہوئے خیالات کو امور واقعی اور حقیقی سمجھ لینا اور پھر ان پر فرضی بحثیں بڑھاتے جانا اور دوسری بات کو گو وہ کیسی ہی سچی اور واقعی کیوں نہ ہو نہ ماننا لفظی بحثوں پر علم فضیلت کا دارمدار ان کا نتیجہ ہے۔"[2]

"علم دین تو وہ خواب ہوا ہے جیسا خواب ہونے کا حق۔ اس معصوم سیدھے سادے سچے اور نیک طبیعت والے پیغمبر نے جو خدا تعالیٰ کے احکام بہت سدھاوٹ و صفائی و بے تکلفی سے جاہل ان پڑھ بادیہ نشین عرب کی قوم کو پہنچاتے تھے، اس میں وہ نکتہ چینیاں باریکیاں گھسیٹری گئیں اور وہ مسائل قطعیہ اور دلائل عقلیہ ملائی گئیں کہ اس صفائی سدھاوٹ اور سادہ پن کا مطلق اثر نہیں رہا۔ بہ مجبوری لوگوں کو اصل احکام جو قرآن و معتمد حدیثوں میں تھے چھوڑنا پڑا اور زید و عمر کے بنائے ہوئے اصول کی پیروی کرنی پڑی۔"[3]

تہذیب الاخلاق کی ان تحریروں سے سرسید کا اصل مقصد یہ تھا کہ پراگندگی افکار کے سبب

---

[1] ایضاً ص ۶۵۔ ۶۶ [2] مقالات سرسید، حوالہ سابق ص ۴۲

[3] منقول از Mission of the University حوالہ سابق ص ۳۳

سے قوم اپنی بہترین صلاحیتوں کو بر سر کار لانے سے قاصر اور اپنے اجتماعی بہبود سے ناآشنا ہو چکی تھی اس
میں کس طرح مثبت خود احتسابی بیدار ہو جو ایک ہمہ گیر اجتماعی تخلیقی فکر و عمل کے لیے ازبس ضروری تھی۔
اس طرح کی کوشش میں اسی وقت کامیابی ہو سکتی تھی جب قوم کے بیشتر افراد میں اتحاد مقاصد کا جذبہ پوری طاقت
سے بر سر کار ہو اور ہر اجتماعی تحریک میں ایک دوسرے کے ہمدوش و ہم عنان رہ سکیں۔ سرسید جانتے تھے کہ
ان کے تعلیمی پروگرام کی کامیابی کی اولین شرط ایک سازگار اجتماعی ذہنیت کی موجودگی تھی۔ تہذیب الاخلاق کی
سخت مخالفت ہوئی۔ یہاں تک کہ سرسیّد کو اس کو بند کرنا پڑا۔ اس لیے کہ اس مخالفت سے کالج کے ترقی کے
کاموں میں خلل پڑنے کا خطرہ تھا جو سرسید کو کسی قیمت پر گوارہ نہ تھا۔ لیکن خود سرسیّد نے اپنی ہار نہیں تسلیم کی
تھی کہ قوم کا متوسط طبقہ جسے تعلیم کے کام کو آگے بڑھانا تھا سرسیّد کے مشن سے متاثر اور وابستہ ہو چکا تھا
تہذیب الاخلاق کے سب سے اہم مفید اور دور رس نتائج یہ تھے کہ اس نے قوم کو مخالفین اور موافقین
دونوں کے خیالات کی وضاحت اور تجزیے کا پورا موقعہ فراہم کیا۔ اس طور پر مسائل سے بہتر آگاہی اور
ان کے حل سے عام دلچسپی پیدا کرنے میں معاون ہوا۔ سرسید کو ہم خیال رفقائے کار بھی تہذیب الاخلاق ہی کی
وساطت سے حاصل ہوئے جنھوں نے علی گڑھ میں قومی تعلیم کی تنظیم میں نمایاں کارنامے انجام دیے
سرسیّد نے سنہ ۱۸۷۲ء میں "کمیٹی خواستگاران تعلیم مسلمانان" کی تشکیل کے بعد اپنی پوری ذہنی اور جسمانی قوت
مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے قیام، استحکام اور ترقی پر مرکوز کر دی اور قومی تعلیم کو حیات قومی کے بقا و استحکام کے
منصوبے میں اولین ترجیح (top priority) دی۔ جو بات اٹھارویں صدی میں فرنانڈو گالیانی
(Farnando Galiani) نے سوسائٹی آف جیسوئٹس (Society of Jesuits) کے بارے
میں کہی تھی:
"It is a sword with its hilt in Rome and its point everywhere."
یہی بات علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم کے بارے میں کہی جا سکتی ہے یعنی قومی تعلیم اس شمشیر کی مانند تھی
جس کا دستہ علی گڑھ کے قبضہ میں تھا اور جس کی نوک تعصب و تاریکی کے مواد فاسد کے لیے نشتر کا اور ترقی
قومی کے ہر میدان میں عمل صالح کے مہمیز کا کام کرتی تھی۔

سرسید نے ہندوستان میں انگریزی نظام تعلیم سے متعلق بڑے پر مغز گر ناقدانہ خیالات کو حکومت اور اہل انگلستان
کے سامنے جرأت اور صفائی کے ساتھ پیش کیا تھا۔ یہ خیالات انکے مشہور رسالے (S)trictures upon the
Present Educational System in India کی شکل میں ظاہر ہوئے جو انہوں نے ۱۸۶۹ء

لندن میں شائع کیا تھا۔ اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سرکاری نظام تعلیم کی بنیادی کمزوریوں کا مبصرانہ علم اور اپنے مشرقی تعلیمی ورثے کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ اس رسالے کے ذریعہ حکومت اور انگلستان کے تعلیمی حلقوں میں سرسید کا تعارف بحیثیت ایک اہم ہندوستانی مدبر اور عظیم ترین خیرخواہ تعلیم کے ہوا۔ اس رسالے سے بعض اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں

"The system of public Education as now established in India is, and must, for ever remain a useless one, unless some effective change be introduced."1

دیسی اور انگریزی اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم کی خامیوں کی معتبر اور ناقابل تردید مثالیں دیتے ہوئے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

"Now it is my firm opinion that even supporting the present system of instruction European as well as vernacular were to prove successful in educating the Natives up to the desired point - such instruction could not be of the least benefit to India, because as it will ever be found an impossibility for the English language to supercede that of Hindustani, the utmost that these college can effect will be to train up a very small number of Natives. But as the Vernacular Education is of so low a degree to produce any, the smallest, expectation of India being, in any degree enlightened thereby; the greatest necessity consequently exists for that education being carried to the highest possible point, so that it may impress the general morals of so many Millions of people, dispel the puerile and extravagent notions floating in their brains, and direct their thought and inclination to the acquring such a knowledge of machinery and the mechanical appliances, without which the national products of the country can never be made available to the fullest extent."2

پورے سرکاری نظام تعلیم کی کتنی صحیح اور بنیادی تنقید ان الفاظ میں ملتی ہے:

"Can a country, I would ask, be in a worse condition with respect to education, than when a boy

---

(1) Strictures upon the present Educational System in India by Sir Syed Ahmad Khan, Henrys King & 1869 p.3. (2) Ibid pp.31-32

who begins to learn while yet a child, who regularly attends his school, working hard at his studies up to the age of twenty is, after all, found to be of little, if any, benefit to the Society around him ?"1

حکومت کو نہایت واضح الفاظ میں سرزنش کرتے ہیں۔

"The Government can not be exonerated from its duty until it shall have established such a system of education as shall enable Indian youth to acquire so much knowledge, by the age of twenty, that they may come to England, and there compete, in the Civil Service Examination, with their fair-complexioned fellow subjects... Indian boys being neither idle nor deficient in mental abilities it must necessarily the fault of the system itself, if they are not found to have acquired, at the age of twenty, the knowledge expected of them".2

رسالے کا اختتام ان الفاظ پر ہوا ہے۔

"Having thus ventured to give the result of my experience upon the subject which is of vast importance to my country, having stated my conscious opinion, and supported the same by the production of unquestionable facts, it only remains for me to express the fervent hope that, at a day not far remote. India may be blessed by receiving the inestimable benefit of a sound, liberal, and timely enlightened education".3

ہر چند کہ رسالہ صرف ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے لیکن اپنے موضوع کا نہایت جامع احاطہ اور استدلال علمی کا نمونہ پیش کرتا ہے اس میں سرکاری تعلیم کی اہمیت اور اس کے مقاصد اسکولوں اور کالجوں کی نگرانی وانتظام سے پیدا ہونے والے مضر نتائج کو نہایت مختصر مستند و موثر شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ سرسید کی اس

۱؎ ایضاً ص ۱۶ - ۱۷ ۲؎ ایضاً ص ۱۸ ۳؎ ایضاً ص ۳۲

قسم کی تحریروں کا اگر توجہ اور محنت کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس تنقید کا زور کم ہو جائے گا جو اکثر ان تحریروں میں ملتا ہے جن کے لکھنے والے محض ایک عام سرسری اور سطحی رائے قائم کرنے اور اس کے پھیلانے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

علی گڑھ کے تعلیمی پروگرام کی ابتدا ایک پمفلٹ کی اشاعت سے ہوئی جس کو دراصل سرسید نے اپنے دوران قیام انگلستان ہی میں مرتب کر لیا تھا جو ان کی واپسی کے سوا سال بعد شائع ہو سکا اس کا عنوان تھا: "التماس بخدمت اہل اسلام و حکام ہند درباب ترقی مسلمانان ہندوستان" اس التماس کا خلاصہ یہ تھا۔

"انگریزی حکومت سے جو تعلیم کے فائدے لوگ عام طور پر اٹھا رہے ہیں اور مسلمان ان سے مستفید نہیں ہوتے اس کے اسباب دریافت کرنے کی طرف خود مسلمانوں کو متحد ہونا چاہیے کیونکہ جو اسباب اور لوگوں نے اب تک بیان کیے ہیں ان پر کافی بھروسہ نہیں ہو سکتا اور بالیقین نہیں کہا جا سکتا کہ درحقیقت وہی اسباب ہوں۔ نیز یہ کہ اس بیماری کی اصل جڑ دریافت کرنی گورنمنٹ کو بھی ضروری ہے پس مناسب ہے کہ ایک انعامی اشتہار جاری کیا جائے اور مسلمانوں کو اس مسئلہ پر مضامین لکھنے کی ترغیب دی جائے اور اس کام کے لیے مسلمانوں اور انگریزوں سے چندہ جمع کیا جائے جب چندہ بقدر ضرورت جمع ہو جائے اس وقت چندہ دھندگان میں سے ممبر منتخب کر کے ایک کمیٹی خواستگار ترقی مسلمانان منعقد کی جائے۔"[1]

متذکرہ صدر تحریر میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ سرسید نے قومی تعلیم کے اس پروگرام کو شروع کرنے سے پہلے معاشرے کے سنجیدہ اور پڑھے لکھے طبقے کو دعوت فکر دی۔ اس طور پر اجتماعی جمہوری طرز فکر کی بنا ڈالی جس کی کارفرمائی ان کے تقریباً تمام منصوبوں اور کاموں میں ملتی ہے۔ معاشرے کی زندگی کا تعلیم کے کردار پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ تعلیمی ادارے معاشرتی نظام سے علیحدہ یا اس سے باہر نہیں ہوتے۔ ان کا اصلی مقصد نوجوان نسل کو اس کے معاشرتی نظام کی مفید اور ان کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے قابل بنانا ہوتا ہے پھر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ:

---

[1] منقول از حیات جاوید حوالہ سابق ص ۱۱۶

"... a society can teach the hope, the knowledge the beliefs which it has"1.

سرسید نے مضامین کے لیے جو اشتہار دیا تھا اس کا مقصد قوم کی انھیں امیدوں علم اقدار و عقائد سے صحیح واقفیت حاصل کرنا تھا۔

الغرض ۲۶ دسمبر سنہ ۱۸۷۱ء کو بمقام بنارس "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ہندوستان" منعقد ہوگئی جس کے سکریٹری سرسید قرار پائے۔[1] اس اشتہار کے جواب میں ۲۲ مضامین موصول ہوئے جن کا خلاصہ خود سرسید نے تیار کیا۔ اس کی روشنی میں ایک مفصل رپورٹ مرتب کی جو اجلاس منعقدہ ۱۲ مئی سنہ ۱۸۷۲ء بنارس میں پیش ہوئی اس اجلاس کی روئداد، قواعد کارروائی مجلس خزنتہ البضاعتہ لتاسیس مدرستہ العلوم للمسلمین اور رپورٹ سلکٹ کمیٹی، ایم اے او کالج اور اس کے کالجیٹ اسکول کے اساسی دستاویز ہیں۔ رپورٹ سلکٹ کمیٹی میں "مسلمانوں کے تنزل تعلیم کے اسباب سے بحث ہے اور ان کی ترقی تعلیم کی تدبیریں مذکور ہیں اور ایک خاص طریقہ ان کی تعلیم کا تجویز ہوا ہے"[2] اس رپورٹ کے تین حصے ہیں۔ اول میں ان رسالوں کا ذکر ہے جو انعام کے لیے منتخب ہوئے تھے حصہ دوم میں مفصلہ ذیل چار بحثیں ہیں بحث اوّل جو گورنمنٹ کالجوں اور اسکولوں سے متعلق ہے بحث دوم جو تحصیل اور حلقہ بندی مکتبوں سے متعلق ہے بحث سوم جو مسلمانوں کے علوم قدیمہ کے گھٹ جانے سے علاقہ رکھتی ہے۔ بحث چہارم جو علوم جدیدہ کے مسلمانوں میں رواج نہ پانے کے اسباب سے متعلق ہے۔ حصہ سوم میں ان اسباب کا ذکر ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے کون عمدہ طریقہ ہے اور کون کون سی زبان کون کون سے علوم اور کس طرح پر ان کو پڑھانے چاہئیں۔"[3]

اس رپورٹ کے تفصیلی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ممبران میں ہر نقطہ نظر کے لوگ تھے جنھوں نے اپنی رائے کے اظہار میں بڑی صفائی سے کام لیا ہے اور بالعموم اعلی طرز استدلال اختیار کیا ہے۔ اختلاف رائے کے باوجود تمام اہم مسائل پر متفقہ فیصلے کیے گئے اس کا بڑا سبب سرسید کی قابلیت اور دل سوزی تھی

---

(1) The experimental college by Alexander Meiklejohn. Quoted in Education and the University by F.R. Leavis p.15.

[1] حیات جاوید بحوالہ سابق ص ۱۱۶ [2] رپورٹ سلکٹ کمیٹی مرتبہ سید احمد خاں سکریٹری کمیٹی بنارس سنہ ۱۸۷۲ء ص سرورق [3] رپورٹ سلکٹ کمیٹی فہرست مضامین۔

کا اعتراف سب نے کیا ہے۔ اسے سرسید کی شخصیت کا اعجاز کہنا چاہیے کہ وہ مختلف الرائے ساتھیوں
ی خوبی اور خوب صورتی سے قوم کی خدمت میں یکساں جوش کے ساتھ معروف رکھ سکتے تھے۔ اس رپورٹ
بعض اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جن سے اہم تعلیمی امور میں کمیٹی کی رائے کا پتہ چلتا ہے۔ علوم قدیمہ کے
فائدہ ہو جانے سے متعلق کمیٹی میں سرسید نے اس رائے کا اظہار کیا جو بیک وقت پرانی مروجہ تعلیم
تنقید بھی ہے اور نئی تعلیم کا جواز بھی۔

"..... تو وہ علوم اس سبب سے کہ فی نفسہ مفید اور کامل اصولوں پر نہ تھے تنزل میں
آ گئے۔ اگر وہ علوم فی نفسہ مفید ہوتے تو کسی قوم اور سلطنت میں ان کا تنزل نہ ہوتا۔۔۔
ہمارے ہاں کے علوم یا اجزائے علوم جس قدر کہ فی نفسہ مفید تھے اور وہ اب تک ترقی پر
موجود ہیں تنزل انھیں علوم یا اجزائے علوم کا ہوا ہے جو فی نفسہ انسان کے لیے
مفید نہ تھے اور چونکہ فی نفسہ مفید نہ تھے اس لیے اس زمانہ میں ان سے کچھ فائدہ مندی
بھی نہیں ہے۔"[1]

...ت چہارم کی ابتدا میں سرسید علوم جدیدہ کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"علوم جدیدہ سے وادیٔن قسم کے علوم ہیں۔ ایک وہ جو متقدمین یونانیہ اور حکمائے
اسلامیہ کے زمانے میں مطلق نہ تھے اور اب حال میں ایجاد ہوئے مثلاً جیالوجی الکٹرسٹی
وغیرہ۔ دوسرے وہ علوم ہیں جن کا نام تو حکمائے متقدمین یونانیہ اور حکمائے اسلامیہ
میں تھا مگر جن اصولوں پر وہ علوم مبنی تھے وہ اصول غلط ثابت ہو کر متروک ہو گئے
اور اب نئے اصول قائم ہوئے جن کو اصل قدیمہ سے کچھ مناسبت نہیں ہے اور جز
اتحاد نام کے اور کچھ باقی نہیں رہا مثلاً علم ہیئت اور کمسٹری وغیرہ۔ تیسرے وہ علوم ہیں
جو حکمائے متقدمین یونانیہ اور حکمائے اسلامیہ کے زمانے میں بھی تھے اور ان کے
اصولوں میں بھی کچھ اختلاف نہیں ہوا مگر اب ان کو کمال وسعت ہو گئی ہے کہ زمانہ
حال میں بالکل نئے معلوم ہوتے ہیں مثلاً میکینکس یعنی علم آلات جو ہمارے ہاں بلفظ
جر ثقیل مستعمل ہے اور علم حساب اور ہندسہ وغیرہ۔ پس اس حصہ میں اسی بات سے

---

[1] ایضاً ص ۳۴-۳۵

بحث ہے کہ ان علوم نے مسلمانوں میں کیوں نہیں رواج پایا۔[1]

سرسید نے کس اختصار اور جامعیت کے ساتھ یہ تشریح کی ہے۔ اب سے تقریباً سو سال پہلے جدید علوم کے بارے میں اتنی واضح اور جامع رائے دینا سرسید کے اس وسیع فکر و نظر کی دلیل ہے جو ان کو اس عہد کی نو بنو علمی اور تہذیبی ترقی اور تبدیلیوں کے بارے میں حاصل تھا۔

حصہ سوم دفعہ ۲۰ کے تحت یہ تحریر ہے:

"سرسید احمد خاں نے کہا تھا کہ اس وقت دو ایک باتیں اور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ صاحب اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ تعلیم ہمیشہ کسی ایک خاص مقصد کے لیے نہیں ہوتی اور نہ کسی ایک گروہ کثیر کا ہمیشہ ایک ہی مقصد ہوتا ہے بلکہ ایک گروہ کثیر میں سے مختلف جماعتوں کے مختلف مقصد ہوتے ہیں۔ ہم جس طریقہ تعلیم کے قرار دینے کی فکر میں ہیں وہ ایک بہت بڑے گروہ سے علاقہ رکھتا ہے اور یقینی مختلف جماعتوں کے مختلف مقاصد تعلیم سے ہے۔ پس اس وقت ہم کو ایسا طریقہ تعلیم تجویز کرنا چاہیے جو مختلف جماعتوں کے مختلف مقاصد کے پورا کرنے کو کافی ہو...... اس مطلب کو دوبارہ زیادہ تر وضاحت سے بیان کیا اور یہ بات کہی کہ مثلاً ہم مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی ہے جو گورنمنٹ کے اعلیٰ اعلیٰ عہدوں کے حاصل کرنے اور انتظام گورنمنٹ میں شامل ہو کر دنیاوی عزت حاصل کرنے اور اپنے ملک کو فائدہ پہونچانے کی آرزو رکھتی ہے۔ ایک جماعت ایسی ہے کہ اس کو گورنمنٹ کے عہدوں کے حاصل کرنے کا کچھ خیال نہیں ہے بلکہ وہ اپنے قوت بازو سے بذریعہ تجارت یا اجرائے کارخانجات کے اپنی معاش پیدا کرنے کی خواہش مند ہے۔ ایک جماعت ایسی ہے کہ وہ علوم و فنون کو حاصل کرنا اور ان میں واقفیت کامل حاصل کرنا پسند کرتی ہے ایک جماعت ایسی ہے کہ اس کو ان تمام چیزوں سے چنداں تعلق نہیں ہے بلکہ بلحاظ اپنے مفاد کے علوم دین میں دستگاہ کامل حاصل کرنا اور اسی میں اپنی زندگی بسر کرنا چاہتی ہے اور ایک جماعت عوام الناس کی ہے جن کے لیے کسی قدر عام تعلیم کا ہونا ضروری

[1] ایضاً ص ۴۵

ہے۔ بایں ہمہ ہر ایک کو اپنی اولاد کی نسبت یہ خواہش ہے کہ اس کے عقائدِ مذہبی بھی درست رہیں اور وہ ادائے فرائضِ مذہبی سے بھی غافل نہ ہو جاوے۔ پس جب کہ ہم تمام مسلمانوں کی تعلیم کا طریقہ قرار دیتے ہیں تو ہم کو ایسی تجویز کرنی چاہئے جس سے تمام مقاصد مذکورہ اور نیز دیگر مقاصد جو تعلیم سے متعلق ہیں حاصل ہوں۔"[1]

سرسید نے قومی تعلیم کے لیے آزاد رضاکارانہ قومی کوشش کو نہایت ضروری قرار دیا۔ فرماتے ہیں۔

"قوم کو یہ سب مقاصد جب تک کہ وہ خود ان مقاصد کے حاصل کرنے پر مستعد نہ ہو حاصل نہیں ہو سکتے۔ پس ہم کو اپنے تمام مقاصد کے انجام کو صرف گورنمنٹ ہی پر منحصر رکھنا نہ چاہئے بلکہ یقین کرنا چاہئے کہ ان تمام مقاصد کا گورنمنٹ سے حاصل ہونا غیر ممکن اور مانند ممتنع بالذات کے ہے۔ پس اس وقت ہم کو دو قسم کی تجویزیں کرنا چاہئیں۔ ایک کامل اور پوری، ادنیٰ سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم تک کی جو ہمارے تمام مقاصد کو پورا کر سکیں اور جن میں ہم کو گورنمنٹ سے اس کی تعلیم کرانے کی کچھ خواہش نہ ہو بلکہ ہم کو خود اپنی سعی اور کوشش سے آپ اس کا انجام کرنا مدنظر ہو۔

دوسری تجویز ہم کو اس بات کی کرنی چاہئے کہ جب تک کہ ہم اس اول تجویز کو انجام دیں یا اس کے انجام دینے کے لائق ہوں اس وقت تک ان اصول و قواعد سے جو گورنمنٹ نے تعلیم کے لیے مقرر کیے ہیں کیونکر فائدہ اٹھاویں اور ہمارے متعدد مقاصدوں سے جون جون سا مقصد تعلیم معینہ گورنمنٹ سے حاصل ہو سکتا ہے اس کو کیوں کر حاصل کریں۔"[2]

سرسید نے اس تمہید کے بعد اپنی تفصیلی تجویز کمیٹی کے سامنے رکھی جو حسبِ ذیل عنوانات پر مشتمل تھی ذکرِ علوم (ص ۴۰۔۴۴) طریقۂ تعلیم و تربیت (ص ۴۸۔۴۹) مدرسۃ العلوم (ص ۴۹۔۵۲) مدارس مکتب حفاظتی مکتب عمرِ تعلیم (ص ۵۲۔۵۴) سلسلۂ تعلیم (ص ۵۴۔۵۸) ہر عنوان کے تحت نہایت فکر انگیز خیالات درج ہیں۔ ان خیالات سے بعض ممبران نے سخت اختلاف کیا اور خاصی بحث ہوئی مثلاً "مولوی سید فریدالدین احمد صاحب نے اپنی رائے یہ لکھی ہے کہ میں اپنے لائق فائق مسیح عصر حکیم دھر روشن ضمیر

---

[1] ایضاً ص ۴۳۔۴۴ [2] ایضاً ص ۴۴

عالی دماغ سید احمد خاں صاحب بہادر سی ایس آئی عمدہ ممبر کی رائے سے بالکل اتفاق نہیں کر سکتا بلکہ بالآخر کیا ہوا۔ جو طریقہ تعلیم کا تجویز ہوا اس سے تمام ممبروں نے اتفاق رائے کیا ہے۔ پس اب میں نہایت خوشی سے اس رپورٹ کو ختم کرتا ہوں اور بموجب ہدایت ممبران سلکٹ کمیٹی کے تمام ممبران کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان کے اس امید سے شروع کرتا ہوں کہ ممبران کمیٹی ممدوح در باب تعمیل اور اجرا اس طریقہ تعلیم کے بتدابیر مناسبہ سعی و کوشش فرمانی شروع کریں"۔ [1]

اس رپورٹ نے ہندی مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات، ان کی مشکلات اور ان کے خیالات و تصورات کی نہایت واضح اور موثر ترجمانی کی اور علی گڑھ کے تعلیمی پروگرام کی طرح ڈالی۔ اس رپورٹ کی منظوری کے فوراً بعد کمیٹی خزنۃ البضاعۃ قائم ہو گئی جس کا لائف سکریٹری سر سید کو مقرر کیا گیا اور مدرسۃ العلوم کے قیام کے لیے چندے کی مہم کا آغاز ہوا۔ جولائی سنہ ۱۸۷۲ء میں سر سید نے کمیٹی خواستگار تعلیم کی جانب سے ایک استفسار کیا کہ مجوزہ مدرسۃ العلوم کس شہر میں قائم کیا جائے۔ سب سے زیادہ رائے علی گڑھ کے حق میں آئیں، اس لیے کہ لوگ عام طور سے اس بات سے واقف ہو گئے تھے کہ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد سرسید علی گڑھ میں سکونت پذیر ہوں گے۔ [2] اس طور پر سنہ ۱۸۷۲ء کے اواخر میں مدرسۃ العلوم کے قیام سے متعلق تمام بنیادی باتیں طے پا چکی تھیں جن سے قومی تعلیم کے مقاصد کی ضروری نشان دہی ہوتی تھی۔

ان امور کے طے پا جانے کے بعد مجلس خزنۃ البضاعۃ تاسیس مدرسۃ العلوم کا ایک اہم اجلاس ۱۰ فروری سنہ ۱۸۷۳ء کو بنارس میں منعقد ہوا جس میں سید محمود نے کالج اور اسکول کے قیام سے متعلق اپنی مشہور اسکیم پیش کی۔ پیش کرنے سے پہلے ایک مختصر تقریر کی

"جب میں ولایت میں تھا اور اس کمیٹی کے اس ارادہ کا حال سنا کہ بعد تحقیقات اسباب موانع ترقی تعلیم مسلمانان یہ ٹھہرا ہے کہ مدرسہ خاص مسلمانوں کے لیے بنایا جائے جس میں تعلیم مسلمانوں کے حال کے مناسب ہو......... میں نے اس بات پر توجہ کی کہ ولایت کے اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے انتظام اور طریقہ تعلیم کو دیکھوں اور ایک تدبیر جو کہ میری رائے میں ہماری قوم کے حالات کے مناسب ہو......اس مدرسۃ العلوم کے لیے تیار کر کے کمیٹی میں پیش کروں....... اس تجویز میں میں نے مدرسوں کو دو

---

[1] ایضاً ص ۵۹ [2] ایضاً ص ۶۱ [3] حیات جاوید بحوالہ سابق ۱۸۱

حصوں میں منقسم کر دیا ہے۔ ایک صیغہ اسکول کا ہے جس کا نام مدرسہ رکھا ہے۔ دوسرا صیغہ کالج کا ہے جس کا نام مدرستہ العلوم رکھا ہے اور یہ دونوں صیغے علیحدہ علیحدہ قائم کئے ہیں۔ اور قبل قائم ہونے مدرستہ العلوم کے اور مدرسوں کا جو اس کے تحت میں ہوں گے، قائم ہونا ممکن ہے۔"[1]

سید محمود نے اسکیم کے آغاز میں کہا:

"This committee calls itself 'The Mohammedan Anglo-Oriental College Fund Committee'. I think what we mean to found is not a college but a University...".2

مجوزہ ادارے کی تنظیم اور نصاب کے بارے میں حسب ذیل چھ بنیادی نکات پیش کئے گئے

1stly - I have to mention first of all that the management of this Institution should be perfectly free from any control of the Government, beyond mere supervision.

2ndly - That the University should have for itself sufficient annual income to keep it independent of any external aid.

3rdly - That the subjects which are not exactly of any practical importance, but which improve the mind, should also be taught.

4thly - That the success in the course of study, appointed by the University, should bring with it pecuniary advantage to the students.

5thly - That at the end of a successful course of study, emoluments should be offered to successful students without any special duties attached to them.

6thly - That the residence within the precinct of the University and under its discipline should be as indispensable as education in the course of study itself".3

بعد میں ان نکات کی وضاحت بڑے شرح و بسط سے کی گئی۔ خاص طور سے پہلے نکتہ کی نہایت

---

[1] روئداد اجلاس ممبران خزنتہ البضاعت لتاسیس مدرستہ العلوم ایم اے او کالج سے متعلق غیر مطبوعہ انگریزی خط مرتبہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں، فکر و نظر جلد ۵ نمبر ۲ اپریل سنہ ۱۹۶۴ء ص ۲۲۰-۲۲۱

[2] ایضاً ص ۲۲۲-۲۲۳ (2) A scheme for the proposed M.A.O. College.

پرزور وکالت قوی دلائل کے ساتھ کی گئی ہے۔ اور اس کو سب سے اہم قرار دیا گیا ہے۔ بقیہ نکات پر بھی کافی زور دیا گیا ہے اور کمیٹی سے درخواست کی گئی ہے کہ ان کو بطور اساسی اصولوں کے منظور کیا جائے۔
کمیٹی نے بالاتفاق اس اسکیم کو منظور کیا۔[1] ۱۰ اگست سنہ ۱۸۷۳ء کو علی گڑھ میں جو سب کمیٹی کا جلسہ ہوا ...... وہاں مولوی سمیع اللہ خاں سکریٹری سب کمیٹی اور سید محمود نے اپنی اسپیچوں میں مدرسہ ماتحت قائم کرنے کی دوبارہ تحریک کی۔ پھر ۲۱ دسمبر سنہ ۱۸۷۳ء کو دوسرا جلسہ علی گڑھ میں ہوا ...... صدر کمیٹی بنارس نے علی گڑھ سب کمیٹی کی تجویز کو پسند کیا اور سکریٹری سے درخواست کی کہ علی گڑھ میں مدرسہ قائم کیا جائے ...... ۲۴ مئی سنہ ۱۸۷۵ء ...... مدرسہ کے افتتاح کی تاریخ قرار پائی۔ تاریخ مذکورہ پر سرسید بنارس سے علی گڑھ آ گئے اور ایک جلسہ میں جس کے صدر انجمن مولوی محمد کریم (مرحوم) ڈپٹی کلکٹر علی گڑھ تھے، رسم افتتاح عمل میں آئی اور یکم جون ۱۸۷۵ء سے جماعت بندی ہوکر تعلیم شروع ہوگئی۔[2] مدرسہ کے قیام کے تقریباً ایک سال بعد سرسید جولائی سنہ ۱۸۷۶ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوکر علی گڑھ میں سکونت پذیر ہو گئے۔ ان کی آمد کے موقع پر شہر کے عمائدین نے ان کے اعزاز میں ایک شاندار جلسہ کیا اور ایڈریس پیش کیا۔ سرسید کی جوابی تقریر سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"ہاں یہ بات سچ ہے کہ میں نے اپنے اس قدیم اور پرانے شہر کو جہاں میرے بزرگوں اور عزیزوں کی ہڈیاں اب تک زمین میں پڑی ہیں اور جہاں میرے بہت سے عزیز اب تک رہتے ہیں جس کی مٹی سے لوگوں نے خیال کیا تھا میں بنا ہوں اور پھر اسی میں میری خاک مل جائے گی۔ صرف مدرسۃ العلوم کی محبت اپنی قوم کی بھلائی اور رئیسان ضلع علی گڑھ و بلند شہر کی محبت و عنایت کے خیال سے چھوڑا ہے اور یہاں ایک غریب مسافر کی طرح سکونت اختیار کی ہے۔ میں نے صرف اس خیال سے کہ کیا راہ ہے جس سے قوم کی حالت درست ہو، دور دراز کا سفر اختیار کیا اور بہت کچھ دیکھا جو دیکھنے کے لائق تھا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی، جب کبھی عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا، جب کبھی علمی مجلسیں دیکھیں، جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے جہاں کہیں عمدہ پھول دیکھے، جب کبھی کھیل کود عیش و آرام کے دیکھے یہاں تک کہ

---

[1] روداد اجلاس حوالہ سابق ص ۲۲۱ [2] حیات جاوید حوالہ سابق ص ۱۲۸

جب کبھی کسی خوب صورت شخص کو دیکھا، مجھ کو ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں۔ جہاں تک ہو سکا ہر موقع پر میں نے قومی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا۔ سب سے اول یہی تدبیر سوجھی کہ قوم کے لیے قوم ہی کے ہاتھ سے ایک مدرسۃ العلوم قائم کیا جاوے جس کی بنا آپ کے شہر میں اور آپ کے زیر سایہ پڑی ہے۔[1]

یہ تقریر ایک چھوٹے سے شہر میں، ایک چھوٹے سے مجمع کے سامنے، ایک چھوٹی سی تقریب کے موقع پر کی گئی۔ ہماری تقدیر کے کس موڑ پر کون شخص، شام کے سنسان سمٹتے اور گہرے ہوتے ہوئے سائے میں کھڑا ہو کر، عزم و اُمید کے ساتھ، تھکے ہارے، بیزار و بے خبر ساتھیوں کو، کہیں سہارا کبھی ہمت دلاتا، کیسے دور دراز و دشوار گزار سفر پر، کس ساز و برگ کے ساتھ ارض موعود کی بشارت یا افق تازہ کی تلاش یا تعمیر کی دعوت دیتا ہے! آج بھی تقریباً ایک صدی گزر جانے کے بعد اس کے الفاظ کی تاثیر، اس کے خیال کی عظمت، اس کے جذبے کی صداقت۔ اس کی ہمت کی بلندی، اس کے فکر کی گہرائی، اس کی خطابت کا حسن اور اس کی شخصیت کا جمال و جلال سن سکتے ہیں، دیکھ سکتے ہیں، اکثر ایسا محسوس ہوا ہے جیسے چھو بھی سکتے ہوں کس سچائی اور سادگی سے یہ باتیں کہی گئیں اور کس خوبی اور خوب صورتی سے عمل میں آئیں، کون نہیں جانتا اور کس کو انکار ہو سکتا ہے۔

سرسید کے علی گڑھ میں سکونت پذیر ہونے کے بعد علی گڑھ صرف دار العلوم ہی نہیں بلکہ رفتہ رفتہ قومی ہمدردی، قومی اتحاد، قومی مصالح اور قومی مقاصد کا صدر مقام اور مرکز بننے لگا۔[2] اب سرسید کی تمام تر توجہ کالج کے قیام پر مرکوز ہو گئی اور انھوں نے اس سے متعلق تمام تجاویز کو عملی شکل دینا شروع کر دیا۔ کالج انتظامیہ کی تشکیل کی، اس کے نصاب اور اسٹاف کی نوعیت اور حیثیت متعین کی، اس کی عمارات کے نقشے بنائے اور بنوائے اور بڑے پیمانے پر تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ سرسید کے علی گڑھ آنے کے تقریباً ڈیڑھ سال کے اندر تمام انتظامات مکمل ہو گئے اور ۸ جنوری سنہ ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن وائسرائے کی خدمت میں سید محمود نے ایڈریس پیش کیا اور سرسید نے سنگ بنیاد رکھنے کی درخواست کی۔ یہ ایڈریس ملک کی تعلیمی زندگی میں بالعموم اور ہندی مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ میں بالخصوص صرف ایک تاریخی اور یادگار واقعہ کی یاد نہیں دلاتا بلکہ اسلامی تہذیب کو کل ہندی تہذیب

---

[1] حیات جاوید حوالہ ص ۱۲۰، ۱۳۱۔ [2] حیات جاوید حوالہ سابق ص ۱۳۰

کا ایک قابل قدر حصّہ تسلیم کرتے ہوئے ایک عظیم اور مشترک قومی تہذیب کی خدمت اور پاسبانی کے لیے اپنے بہترین اقدار و روایات کی مستقل پرداخت و نگہداشت کی ضمانت دیتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مشرق و مغرب اور قدیم و جدید کی سیاسی اور منفی آویزش کو ایک اعلیٰ تہذیبی و تعلیمی رفاقت میں تبدیل کرنے کی مثبت اور مستقل کوشش سے بھی عبارت ہے۔

کالج کے قیام کے بارے میں ایڈریس٭ میں کہا گیا:

"The college of which your Excellency is about to lay the foundation-stone differs in many respects from all other educational Institutions which this country has seen. There have been schools and colleges founded and endorsed by private individuals. There have been others built by Sovereigns and supported by the revenue of the State. But this is the first time in the history of Mohammandans in India, that a college owes its establishment not to the charity or love of learning of an individual, nor to the splendid patronage of a Monarch, but to the combined wishes and the united efforts of a whole community. It has its origin in causes which the history of this country has witnessed before. It is based upon the principles of toleration and progress such as find no parallel in the annals of the East."1

خود انگریزی حکمرانوں سے یہ کہا گیا:

"But that they who have thus become the masters of this soil, should rule its inhabitants not with those feelings and motives which inspired the conquerors of the ancient world, but should make it the first principle of their Government to advance the happiness of the Millions of a subject race, by establishing peace, by administering justice, by spreading education, by introducing the comforts of life which modern civilization has bestowed on mankind, is to us a manifestation of the hand of Providence and an assurance of long life to the Union of India with England."2

٭ اصل ایڈریس انگریزی میں تھا اس لیے اقتباسات انگریزی میں دیے جاتے ہیں۔

(1) Address and speaches relating to the M.A.O. College by Nawab Muhsinul Mulk, Institute Press Aligarh, December 24, 1896 p.31

(۲) ایضاً ص ۳

توقعات اور تمناؤں کا اظہار ان الفاظ سے کیا گیا:

"... so that from the seed which we sow today there may spring up a mighty tree whose branches, like those of the Banayan of the soil, shall in their turn strike firm roots into the earth and themselves send forth new and rigorous saplings; that this college may expand into a University whose sons shall go forth throughout the length and the breadth of the land to spread the gospel of free enquiry, of large hearted toleration, and of pure morality."[1]

علی گڑھ کی تعلیمی و تہذیبی تحریک کا کتنا جلیل و جمیل نقشہ ان الفاظ میں نمایاں ہے اور مشترک انسانی ذیب کی توسیع، استحکام اور بقا کے لیے کتنی عظیم اور گرانقدر روایت کی ابتدا ہوتی ہے جس میں ملک کے روڑوں بسنے والوں کے لیے روشنی اور اُمید اور عزت و عقیدت ملتی ہے۔

اس موقع پر اس امر کا اعادہ ضروری ہے کہ سرسید اور ان کے ساتھی ایک کالج نہیں بلکہ یونیورسٹی قائم یا چاہتے تھے اور ان کا منشا راسے قومی تعلیم کی ایک ایسی درس گاہ بنانا تھا جو حکومت کی مداخلت سے محفوظ ہو۔ خیال کی صراحت سید محمود نے ۱۵ جنوری سنہ ۱۸۷۳ء کو کمیٹی خواستگار تعلیم کے سامنے اپنی اسکیم پیش کرتے وقت ردی تھی۔ اس کے مطابق کیمبرج یونیورسٹی کے خطوط پر فیلو سسٹم جاری کرنا تھا نیز "..... جو طالب علم فارغ التحصیل جائے اس کو کسی خاص علم میں جس سے وہ خاص مناسبت رکھتا ہو، مصروف رہے اور اس میں کمال حاصل نے کے لیے فیلو شپ دی جایا کرے اور اس طرح ایک گروہ عالموں اور محققوں کا قوم میں پیدا کیا جائے جو م قوم میں علم و کمال پھیلانے کے لیے بمنزلہ آلہ کے ہو۔"[2] لیکن اس سلسلے میں دو دقتیں ایسی پیش آئیں کہ رسید کا یونیورسٹی کا منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔ پہلی دقت تو یہ تھی کہ ایسی یونیورسٹی صرف قوم کے بھروسے پر قائم کرنا ئی آسان کام نہ تھا، نہ طالب علم اور نہ ان کے مربی کوئی اس بات پر رضامند ہونے والا تھا کہ یونیورسٹی کی ریوں سے جو گورنمنٹ کی نوکری کا ذریعہ ہے قطع نظر کی جائے اور فی الحقیقت مسلمانوں کی حالت اس بات کی ستضی تھی کہ صرف موجودہ یونیورسٹیوں کی ڈگریاں حاصل کرنے ہی کو فوز عظیم سمجھا جائے۔"[3] دوسری دقت حکومت ا پیدا کردہ تھی، جو باوجود سرسید کی کوششوں کے یونیورسٹی کے قیام پر کسی طرح آمادہ نہ ہوئی اور بذریعۂ مجبوری

۱۔ ایضاً ص ۴۳ ۲۔ حیات جاوید حوالہ سابق ص ۱۴۲ ۳۔ ایضاً ص ۱۴۲

نہ العلوم میں وہی کورس اختیار کرنا پڑا جو موجودہ یونیورسٹیاں تجویز کریں۔[1] اس طور پر کالج سرسید کے پورے
وبے کی جزوی تکمیل تھا لیکن اسکے باوجود کالج میں جو ہمہ جہتی تعلیمی اور تہذیبی فضا قائم ہوئی اس کا رنگ
ک بڑی حد تک وہی تھا جو ایک یونیورسٹی کا ہوتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا سبب اس عالی دماغ شخص کی
براہی اور ان مقاصد کی وسعت وگہرائی تھی جس کے زیر سایہ یہ ادارہ وجود میں آیا۔ حالی شاہد ہیں کہ ایک ایرانی
ح مدرسہ اور اس کی عمارت کو دیکھ کر بے اختیار کہہ اٹھا: "واللہ معجزہ می نماید۔ کارے کہ از سلطنت بر نیاید
ونہ از یک فرد رعیت سرانجام شد"۔[2] خود حالی کی طبیعت پر جو اثر ہوا اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:
شبہ جو شعر نظیری نیشاپوری نے بیت اللہ کی زیارت کے وقت پڑھا تھا وہ اس مدرسہ کو دیکھ کر ہمیں یاد آیا
بہت دیر تک ہم اس کو اپنے دل ہی دل میں پڑھ کر گنگناتے رہے۔

این کعبہ را بنا نہ بباطل نہادہ اند　　صد معنی وجمال دریں گل نہادہ اند

اس کالج کی ..... ہمارے دل میں تاج گنج کے روضہ اور اکبر کے مقبرہ سے زیادہ عظمت
شوکت ہے کیونکہ ان سے قوم کو نہ اس وقت فائدہ پہنچنے کی اُمید تھی اور نہ اب ہے اور نہ ان سب کی بنیاد
ص قوم کی بہبودی اور عزت پر رکھی گئی تھی۔[3]

کالج کے ایک ممتاز انگریز مہمان کے تاثرات یہ تھے:

کل شام مجھ کو میرے ایک دوست علی گڑھ کی دو تواریخی عمارتوں کے دیکھنے کے واسطے
لے گئے تھے۔ ان میں سے ایک سیندھیا کے فرانسیسی عسکری مشیر پیرون
کا قلعہ تھا جو صاحب باغ کے نام سے مشہور ہوا۔ دوسری وہ یادگاری عمارت جو
علی گڑھ کے سندھیا قلعہ کو فتح کرنے میں ہلاک ہونے والے انگریز سپاہیوں کی یاد میں
قائم کی گئی تھی ..... یہ عمارت اکیلی کھڑی ہوئی ہے اور انسانوں کے مسکنوں سے دور
ہے ..... گھر کو جاتے وقت جب کہ ہم محمدن کالج کے قریب ہو کر گزرے تو میرے
دل میں خواہ مخواہ یہ خیال گزرا، یہ خوشنما سلسلہ مکانات کا جن میں ہم اس وقت جمع
ہیں ہمارے زمانے کی کس قدر عمدہ یادگار ہے۔ وہ ویران کھنڈر جو میدان میں واقع
ہیں ان کی پر درد داستان اور اولوالعزمی اور جفاکشی اور دلیرانہ کوششوں کی گویا اس زمانہ

---

[1] ایضاً ص ۱۲۲ [2] ایضاً ص ۱۲۳ [3] مقالات حالی حوالہ سابق ص ۱۳۱ - ۱۳۲

کی تواریخ بیان کرتی ہے جب کہ ہندوستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ایک قوم دوسری سے دشمنی رکھتی تھی اور ہر ایک شخص کا ہاتھ اپنی ہمسایہ کے مارنے کے واسطے اٹھا ہوا تھا۔ لے صاحبو آپ لوگ جنھوں نے یہ کالج بنایا ہے آئندہ نسل کے واسطے ایک زیادہ عالی شان یادگار چھوڑیں گے۔ آپ اپنے پیچھے کچھ نااتفاقی کی نہیں بلکہ قوموں کی ملاپ کی ایک عالیشان یادگار ایک یادگار بھلائی پہونچانے والی مستعدی کی، نہ کہ برباد کرنے والی قوت چھوڑیں گے اور جو ایک ایسی یادگار ہوگی جو بخلاف ان بھاری پتھر کی عمارتوں کے جواب انسان کے تعلقات اور مسکنوں سے دور پڑی ہوئی ہیں۔ ہمیشہ انسان کی نہایت اعلیٰ درجہ کی کوششوں کا ایک مرکز رہے گی اور لڑکوں کی آواز سے گونجتی رہے گی اور ان کی امیدوں اور اولوالعزمیوں سے بہت کچھ پر رونق رہے گی۔[1]

اور یہ سب انجام کیسے پایا، سرسید کی کوششوں سے وہ بھی کس طرح "... تعمیر کا کام ایسے چاؤ اور امنگ سے سرانجام کرتا جیسے کوئی اپنا محل تیار کراتا ہے۔... انھوں نے اس قطعہ زمین کے آباد و سرسبز کرنے میں فوق العادہ کوشش اور توجہ کی۔ برسوں بلاناغہ دو دو پہر اور تمام تمام دن سخت سے سخت موسموں میں وہ خود مدرسہ پر جا جا کر بیٹھے ہیں اور اپنے سامنے راج مزدوروں اور سنگ تراشوں سے کام لیا۔ باوجود اس تن و توش کے وہ کالج کے باغ کی تیاری میں پہروں دھوپ اور لوؤں میں پھرتے تھے، روشیں بنواتے تھے، دور دور سے ہر قسم کی پود منگواتے تھے جو ان کے روبرو باغ میں لگائی جاتی تھی۔ باوجود ان تمام باتوں کے تعمیر وغیرہ کے متعلق یہ کام ان کو اپنی رائے سے کرنا پڑتا تھا۔ نہ کوئی انجینیر یا اورسیر تھا جس سے صلاح لی جائے نہ کوئی لائق مستری تھا جس کی تجویز اور رائے پر اطمینان ہو جن دیہاتی معماروں سے یہ کام لیے گئے انھوں نے کبھی اس قسم کی عمارتیں نہیں بنائی تھیں۔ اس لیے سرسید کو ہر ایک عمارت کا نقشہ خود ہی تجویز کرنا پڑتا تھا اور خود اس کے تمام نشیب و فراز سوچنے پڑتے تھے۔ معماروں اور سنگتراشوں کو خود بیٹھ کر ایک ایک بات بتانی پڑتی اور پھر جب تک وہ ختم ہو خود ہی اس کی نگرانی کرنی پڑتی تھی کہ جس طرح بنایا گیا ہے اسی طرح کا بنا ہے یا نہیں۔

(1) Address and speaches relating to M.A.O. College.

حوالہ سابق جواب ایڈریس از طرف ڈبلو ہنٹر ص ۵۵ تا ۵۱

ہم نے سنا ہے کہ بعض یورپین انجینیروں نے کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی عمارتوں کو دیکھ کر تعجب ظاہر کیا ہے اور جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ بغیر کسی تعلیم یافتہ انجنیر کی صلاح اور مشورہ کے یہ عمارتیں تیار ہوئی ہیں تو وہ اور بھی زیادہ متعجب ہوئے ہیں۔ بایں ہمہ ممکن ہے ان عمارتوں میں انجینیرنگ کے اصول کے موافق طلبہ کے آرام و آسائش کے لحاظ سے کوئی کمی یا نقص رہ گیا ہو لیکن ہم کو اس قومی انسٹی ٹیوشن کے لیے ایسا انجنیر ملنا ناممکن تھا جو خود ہی تعمیر کے لیے روپیہ فراہم کرے، خود ہی عمارت بنوائے اور ایک کوڑی تنخواہ نہ لے۔ نہایت دیانت داری سے اپنا کام انجام دے اور ہر ایک عمارت کو ایسے شوق سے بنوائے کہ گویا اپنا گھر بنواتا ہے۔[1]

ہر چند کہ یہ ادارہ خاص طور پر مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے کلیتہً مسلم انتظام کے تحت قائم ہوا لیکن ابتدا ہی سے اس کی پالیسی تمام ہم وطنوں کے لیے غیر سگالی اور ہمدردی کی تھی اور اس کی تعلیمی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کے ان کو پورے مواقع حاصل رہے۔ نواب محسن الملک نے اس پالیسی کی وضاحت ان الفاظ میں کی: " ...... کبھی یہ خیال نہیں کیا گیا تھا کہ ہندو یا عیسائی یا یہودی اس جگہ تعلیم نہ پاویں گے.... بانیوں نے ابتدا سے ارادہ کیا تھا کہ مثل قرطبہ اور غرناطہ کی مسلمان یونیورسٹیوں کے سب قوم کے لوگوں کو بلا تعصب اس میں تعلیم دی جاوے۔ چنانچہ موجودہ کالج میں ہندو عیسائی پارسی سب تعلیم پاتے ہیں اور سب کو تعلیم کے باب میں برابر استحقاق دیے جاتے ہیں۔"[2] اسی بات کو اس ایڈرس میں بھی بیان کیا گیا ہے جو کالج نے سرکاری طور پر ۱۸ نومبر ۱۸۸۴ء کو مارکوئس آف رپن وائسرائے و گورنر جنرل ہند کی خدمت میں پیش کیا تھا:

...... اگر ہم اس کالج کی آئندہ امیدوں کا ذکر کرتے ہیں تو اس کی یہ وجہ ہے کہ ہم کو یقین واثق ہے کہ بغیر امید کے کوئی بات حاصل نہیں ہو سکتی اور بغیر بلند ارادوں کے کوئی بڑا کام پورا نہیں ہو سکتا ہے...... قوم اور زبان اور مذہب کا اختلاف ہندوستان کے باشندوں کے مختلف فرقوں کا دیگر ادنیٰ درجہ کے اسباب سے مل کر کم اختلاطی قائم رہنے کا باعث ہو گیا ہے۔ مگر ہم یقین کرتے ہیں کہ تعلیم کی ترقی ہونے سے یہ اسباب کم ہو جاویں گے اور علم، روشن ضمیری اور شائستگی کی اشاعت سے باہمی میل جول کے واسطے ایک عام

---

[1] حیات جاوید حوالۂ سابق ص ۱۴۵ [2]

(1) Address and speaches relating to M.A.O. College.

حوالہ سابق ص ۴

موقع بہم پہونچ جائے گا اور قومی اختلاف ناپید ہو جائے گا۔[1]

اس امر کا اعتراف ان لوگوں نے اکثر کیا ہے جو کالج کا معائنہ بچشم خود کرنے آتے تھے مثلاً ڈبلو۔ ڈبلو ہنٹر نے جو بحیثیت پریزیڈنٹ ایجوکیشن کمیشن برائے ہند، ۱۸ اگست سنہ ۱۸۸۲ء کالج میں تشریف لائے فرمایا:

اس مدرسہ کے بانیوں نے جو ٹھیک ایک مسلمانی مدرسہ ہے، اپنا دروازہ تمام اقوام اور مذاہب کے لڑکوں کے واسطے کھول دیا ہے۔ مجھ کو معلوم ہوتا ہے کہ منجملہ ۲۵۹ طالب علموں کے ۵۷ ہندو یا کل میں سے تقریباً ایک چہارم ہندو ہیں۔ عیسائیوں اور پارسیوں کے لڑکوں نے بھی اس کے اندر فیاضانہ تعلیم حاصل کی ہے۔[2]

کالج کے ابتدائی زمانے کے نامور طالب علم سید طفیل احمد منگلوری فرماتے ہیں: "۔۔۔ ہندو اور مسلمان طلبا بھی اس زمانے میں ایسی یگانگت کے ساتھ کالج کے بورڈنگ ہاؤسوں میں رہتے اور ایک دوسرے کے رنج و راحت میں یکساں شریک ہوتے تھے۔ اس زمانے میں ایک نمایاں بات یہ ہوئی کہ علی گڑھ کالج سے سب سے اول ایک ہندو طالب علم باؤ ایشری پرشاد نے بی اے کیا۔ انھیں سنہ ۱۸۸۲ء کے سالانہ جلسہ میں سرسید نے اپنے ہاتھ سے تمغہ پہنایا تھا"[3] مختلف فرقوں کے درمیان باہمی رواداری اور یگانگت کے اصول کو جس طرح عملی طور پر کالج نے اپنایا اور فروغ دیا اس کی مثال اس وقت کے کسی دوسرے ادارے میں مشکل سے ملے گی۔ کالج کے بااختیار منتظمین نے اس اصول کو مسلسل پیش نظر رکھا اور خاص موقعوں پر اس کا اعادہ کیا۔

---

[1] ایضاً ص ۱۰۱ [2] ایضاً ص ۹۰ [3] مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ سید طفیل احمد منگلوری۔ نظامی پریس بدایوں سنہ ۱۹۴۰ء بار سوم ص ۲۱۲ ۔۔ اس سلسلے میں یہ اعداد و شمار قابل لحاظ ہیں۔ اسکول میں طلباء کی تعداد (جلد اول نمبر ا)

	۱۸۷۵ء	۱۸۷۶ء	۱۸۷۷ء	۱۸۷۸ء	۱۹۰۹	۱۸۸۰
ہندو	-	۶	۱۲	۴۱	۳۰	۴۰
مسلمان	۶۶	۸۹	۱۲۳		۱۳۴	۱۳۲

۱۸۸۱ء	۱۸۸۲ء	۱۸۸۳ء	۱۸۸۴ء
۵۰	۵۳	۵۳	۷۷
۱۰۶	۱۰۹	۱۹۳	۱۹۳

(باقی حاشیہ صفحہ ۵۴ پر)

سید محمود نے بحیثیت لائف آنریری جائنٹ سکریٹری کالج اپنی رپورٹ مورخہ ۲۴ جون سنہ ۱۸۹۳ء میں کہا:

اُبتدا سے اس کالج کا صحیح اصول سب کا مساوی سمجھا رہا ہے اور گو کہ اس کا اصل مقصد مسلمانوں کی تعلیمی ضرورت کو پورا کرنا تھا لیکن اس کے دروازے ہندوؤں کے اور دیگر اقوام کے طالب علموں کی آسائش اور تعلیم اور کالج میں رہنے کے برابر کھلے رہے ہیں۔" خیال ہوتا ہے کہ اگر ام اے او کالج کی طرح دوسروں کے کسی مسلمہ ادارے نے ایسی ہی کوشش کی ہوتی تو ملک میں اتحاد و یگانگت کی فضا قائم کرنے میں مدد ملتی جس کا اثر برصغیر کی تہذیبی ترقی پر نہایت صحت مند ہوتا۔

کالج کے بارے میں سرسید کی رپورٹ بابت سنہ ۱۸۸۲ء میں یہ معلومات فراہم کی گئی ہیں:

اس مدرسۃ العلوم میں تعلیم کے دو صیغے ہیں:

اوّل۔ انگلش ڈپارٹمنٹ جس میں تمام علوم انگریزی زبان میں اور عربی یا فارسی یا سنسکرت بطور سکنڈ لینگویج پڑھائی جاتی ہے۔

دوم۔ اورینٹل ڈپارٹمنٹ جس میں علم ادب عربی یا فارسی زبان میں اور تاریخ و جغرافیہ و حساب و ریاضی وغیرہ علوم و فنون اردو زبان میں پڑھائے جاتے ہیں اور انگریزی بطور سکنڈ لینگویج کے تعلیم ہوتی ہے۔

یہ مدرسہ ۲۴ مئی سنہ ۱۸۷۵ء میں کھولا گیا اور یکم جون سنہ ۱۸۷۵ء سے اسکول کلاس اور یکم جنوری سنہ ۱۸۷۸ء سے کالج کلاس قائم ہوگئے۔ یکم جنوری سنہ ۱۸۷۸ء سے مدرسہ یونیورسٹی کلکتہ میں فرسٹ آرٹس کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۴ کا) کالج میں طلبا کی تعداد (جدول نمبر ۲)

	۱۸۸۰ء	۱۸۸۱ء	۱۸۸۲ء	۱۸۸۳ء	۱۸۸۴ء	۱۸۸۵ء	۱۸۸۶ء
ہندو	۷	۸	۱۳	۱۳	۲۳	۳۰	۲۶
مسلمان	۸	۸	۱۴	۱۴	۲۴	۱۹	۲۳

۱۸۸۷ء	۱۸۸۹ء
۳۳	۳۰
۱۹	۳۹

حوالہ افتخار عالم (تاریخ مدرسۃ العلوم علی گڑھ، ص ۱۲۵) منقول از "سید احمد خاں اور ہندو مسلم اتحاد" عبادن خاں شروانی۔ علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز۔ ۲۰۴

امتحان تک اور یکم جنوری سنہ ۱۸۸۱ء سے لا مین افیلیٹ ہوگیا۔ اس کالج کا انتظام چار کمیٹیوں کے تحت میں ہے جن سے علیحدہ علیحدہ کام متعلق ہیں:

۱۔ کمیٹی مدیران تعلیم السنہ مختلفہ و علوم دنویہ
۲۔ کمیٹی مدیران تعلیم مذہب اہل سنت و جماعت
۳۔ کمیٹی مدیران تعلیم مذہب اثنا عشریہ
۴۔ کمیٹی منتظم مدرسۃ العلوم جس کے ہاتھ میں مدرسۃ العلوم اور بورڈنگ ہاؤس کے اندرونی انتظام کا اختیار ہے[1]:

سنہ ۱۸۸۳ء ہی کے جلسہ تقسیم انعامات میں جو انگریز کلکٹر ضلع کی صدارت میں ہوا سرسید نے کالج کی ترقی کے بارے میں کہا: "مگر جو فخر کہ اس کالج کو ہے اور جو ہمیشہ اس کو رہے گا وہ یہ ہے کہ ہم نیم وحشی ہندوستانیوں ہی نے بغیر کسی دوسری مدد کے زمین کو جوتا ہے اور اس میں بیج ڈالا ہے اور جو پودا اس میں اُگا اس کو پالا ہے جو اس وقت اس قدر سایہ دار اور بار آور درخت ہوگیا ہے" ۔

کالج کے نتائج امتحانات از سنہ ۱۸۸۳ء تا سنہ ۱۸۹۳ء کے مطالعہ سے یہ خوش آیند بات معلوم ہوتی ہے کہ ان تمام برسوں میں کالج کے جتنے طلبا مختلف امتحانات میں بیٹھے تقریباً وہ سب کامیاب ہوئے۔ اس وجہ سے اس کالج کی پڑھائی کے معیار کو تعلیمی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ کالج کے منتظمین اس غیر معمولی خالص تدریسی کامیابی ہی کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ انھوں نے طلبا کی عام ذہنی و جسمانی تربیت میں گہری دلچسپی لی۔ سنہ ۱۸۹۳ء کالج کے انگریز پرنسپل تھیوڈور بک نے اپنی سالانہ رپورٹ میں یہ بات کہی:

"گو ایک ہندوستانی کالج کے واسطے یونیورسٹی کے امتحانوں میں عمدہ نتیجہ کا ہونا بہت ہی ضروری امر ہے مگر صرف اس نتیجہ ہی سے یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ اس کالج میں کس قسم کی تعلیم ہوتی ہے چونکہ ہندوستان میں یہ چیز بہت زیادہ ضروری سمجھی جاتی ہے اور ہندوستانی یونیورسٹیوں میں فی صدی زیادہ فیل ہونے کا زور ڈالا جاتا ہے، میں یقین کرتا ہوں کہ اس وجہ سے تعلیم کے اور صیغوں پر برا اثر پڑتا ہے اور اس وجہ سے استادوں'

---

[1] رپورٹ ترقی تعلیم مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علی گڑھ۔ میڈیکس ہال۔

طالب علموں اور پبلک کا خیال مارلز وضع، چال چلن اور علمیت حاصل کرنے اور جسمانی تعلیم کی طرف سے بالکل ہٹا ہوا ہے۔ عمدہ نتیجہ فوراً ایک انسی ٹیوشن کو کامیاب اور نامور کر دیتا ہے لیکن طالب علموں کے چال چلن سے ناموری حاصل کرنا بہت دنوں میں نصیب ہوتا ہے لیکن اس قسم کی ناموری سے چاہے وہ کسی مقدار کی ہو کتنے ہی دنوں میں حاصل کی گئی ہو ہم اپنے کالج کی کامیابی اور ناکامیابی کا اندازہ کریں گے۔"[1]

آگے چل کر پرنسپل صاحب لکھتے ہیں:

"تعلیم کے نہایت عمدہ وسائل میں مختلف سوسائٹیاں بھی شامل ہیں جن کے ذریعہ سے طلبائے بورڈنگ کے قوائے عقل نشوونما پاتے ہیں اور طالب علم گویا ایک دوسرے کی تعلیم میں امداد کرتے ہیں۔ ام اے او کالج میں اب ایسی سوسائٹی کی تعداد سات ہے۔"

ان سوسائٹیوں کی کارکردگی کے بارے میں سید محمود لکھتے ہیں:

"ان میں سے پہلے سڈنس کلب ہے جس میں مباحثے، پبلک ریڈنگ اور دیگر مشاغل ہوتے ہیں، جو کہ طالب علموں کی عقلی اخلاقی اور تمدنی تعلیم میں ترقی دینے کے لیے ہیں...... چونکہ مجھے سڈنس یونین کلب کے مباحثوں میں موجود ہونے اور سننے کا اکثر موقع ملا ہے، میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہاں کا اسٹینڈرڈ انگریزی میں تقریر کرنے کا بہت اچھا ہے اور ہندوستان کی بہت سی ڈبیٹنگ سوسائٹیوں کی نسبت جن کے دیکھنے کا مجھے اتفاق ہوا ہے۔ عمدہ ہے۔ اخوان الصفا ایک سوسائٹی مضمون نویسی کی غرض سے قائم کی گئی ہے اس میں مضامین پڑھے جاتے ہیں۔ ایک سوسائٹی طالب علموں کی بنام ڈیوٹی یعنی الفرض ہے جس کا مقصد اغراض کالج کے واسطے قلیل رقموں میں چندہ جمع کرنا ہے اور اس کے مقاصد میں یہ بھی شامل ہے کہ قومی خیالات کے لیے طالب علموں کے دلوں کو تحریک کریں اور رفاہ عام کے کاموں میں جوش دلائیں...... سب سے ہونہار سوسائٹی جس کو طالب علموں نے قائم کیا ہے ام اے او کالج برادرہڈ ہے۔ یہ سوسائٹی کالج اور اس کے پرانے طالب علموں کے تعلقات مضبوط کرنے اور کالج کی مالی حالت کو تقویت دینے کی غرض سے قائم کی گئی ہے اور اس کے ممبروں نے

جو برادرس یعنی اخوان کے نام سے موسوم ہیں آپس میں معاہدہ کیا ہے کہ اپنی آمدنی کا ایک فیصدی ایک انڈومنٹ فنڈ قائم کرنے کے لیے کالج کو دیا کریں گے

کرکٹ کلب نے ..... امتیاز حاصل کیا ہے .... فٹ بال کلب جس کو زیادہ تر پروفیسر ہارین صاحب نے قائم کیا ہے بہت کامیابی سے چل رہا ہے .....
ایک کالج میگزین نکالا گیا ہے جس میں ان طلبار کے واسطے جن کو علم و ادب سے زیادہ دلچسپی ہے مشق کی گنجائش ہوگی اور یہ ثابت ہوا ہے کہ ایک بڑی ضرورت کو رفع کرتا ہے۔"

اس سلسلے میں ایک بیان اور ملاحظہ ہو:

"...... نومبر ۱۸۸۳ء مسٹر تھیوڈر بیک ایک ایسے انگریز ملے جو طلبار سے بڑی محبت کا برتاؤ رکھتے تھے اور اپنا تمام تر وقت ان کی بہبودی میں صرف کرتے تھے۔ ان کے آنے کے بعد جو انگریز استاد آتے رہے وہ مسٹر بک کا طریقہ اختیار کرتے گئے... ان انگریز استادوں کی وجہ سے حکام ضلع کالج کے طلبا سے کھیلوں اور پارٹیوں وغیرہ میں ملتے تھے اور ان سے اچھا برتاؤ کرتے تھے... جو سرسید کی انتہائی خوشی کا باعث تھا۔ چنانچہ جب سر کلینڈ کالون لفٹیننٹ گورنر صوبہ متحدہ علیگڑھ آئے تو انھوں نے فرمایا:

"علی گڑھ کے طلبا اپنی تعلیم و تربیت کی علامات ایسی ہی واضح طور پر ظاہر کرتے ہیں جیسے انگلستان میں ہمارے پبلک اسکولوں اور ہماری یونیورسٹیوں کے کامیاب طلبا ظاہر کرتے ہیں۔ علی گڑھ کالج کا ایک طالب علم فیاضانہ خیالات اور اعلیٰ تربیت اور آزادانہ خصائل رکھنے والا شخص خیال کیا جاتا ہے۔"[۱]

سرسید اور سید محمود نے کالج کے اسٹاف کے انتخاب میں غیر معمولی دقت نظر اور مردم شناسی سے کام لیا۔ [پھ]ر بھی اس زمانے میں جب انگریز حکمراں تھے ایسے انگریز اسٹاف کو رکھنا جو اسی جوش اور قابلیت سے علی گڑھ [جی]سی قومی درس گاہ کی خدمت کرتے جیسی کہ خود اس قوم کے کم افراد کر سکتے تھے۔ حیرت انگیز ہے۔ اس کا اصلی [سب]ب سرسید، سید محمود اور ان کے دیگر رفقا کی شخصیتیں اور خیالات تھے جس سے غیر قوم کے لوگ بھی متاثر ہوئے [ب]نہ رہ سکے۔ اس کا برملا اعتراف حکومت کے ایک بڑے ذمہ دار رکن نے ان الفاظ میں کیا ہے:

---

[۱] مسلمانوں کا روشن مستقبل، حوالہ سابق ص ۲۱۲ - ۲۱۳

"۔۔۔۔ اعتقاد سے اعتقاد پیدا ہوتا ہے۔ آ
کے دوسرے خیر خواہوں دونوں ہندوا
یہ کالج تمام ہندوستان کے واسطے ت
تعلیم ہے جو ایک عمدہ کام پر مستحکم اعتقاد
سید محمود نے پرنسپل بیک کے بارے میں ان
جن کے ارادوں کی دیانتداری، س
ہیں اور جن کی وجہ سے عام مسلمانوں کو
بالخصوص اور خیر خواہ مسلمانان بالعموم ہو
سچائی سے بغیر کسی بناوٹ کے کہتا ہوں
ایک ایسی قوم سے فیاضانہ ہمدردی پر
ان کی جانفشانی اور طالب علموں کی فلا
مولانا سید طفیل احمد منگلوری لکھتے ہیں:
"اگر انصاف سے دیکھا جائے تو ع
وابستہ کرنے کا تمام تر سہرا مسٹر بیک، مسٹر
سر تھا۔ طلبا کی مختلف انجمنیں بنانے، آ
چھوڑنے کے بعد ان سے مستقل تعلقات
ان کے ذریعہ تمام ملک میں کالج کی خوبیا
کرانے کے تمام تر کام جو انگریز استادوں
کمال کو پہنچا دیے۔ انھیں کی بدولت یہ
ہو گئی جنھوں نے علیگڑھ کی خدمت کو اپنی

پیل سید احمد خاں کو اپنے کام پر اعتقاد اور اس کار
ریو پین ....کو سید احمد خاں پر اعتبار تھا.....
رت سلف ہلپ کی بلکہ اس اثر کی بھی ایک عمدہ
یکھنے سے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے" ۔ ؎
یالات کا اظہار کیا ہے:
ل اور اخلاقی اوصاف کی عمدگی کو ہم خوب جانتے
ن کے صادق اور شریف النفس، خیر خواہ کالج
ے کی نسبت پورا ہو گیا ہے۔ میں اپنی نسبت نہایت
مسٹر بیک کی عقل اور اخلاقی خوبیوں پر، ان کی
ں سے ان کا کوئی نسلی تعلق نہیں کالج کے امور
ح میں ان کی ہمدردانہ دلچسپی پر رشک آتا ہے" ؎

گڑھ کالج کے سابق طلبا کو اپنی مادر درسگاہ سے
یین، مسٹر آرنلڈ اور اس زمانے کے انگریز استادوں کے
یں نظم کرتے، ان سے برادرانہ برتاؤ کرتے، کالج
رکھتے، ان کے سالانہ جلسے اور ڈنر منعقد کرتے
ں کا پروپیگنڈا کراتے تھے۔ کالج کے لیے چندے جمع
نے کئے وہ سب انھیں کی ایجاد تھی جنھوں نے درجہ
ں کے پڑھے ہوئے طلبا کی ایک مستقل برادری تو
مدگی کا مقصد اور علی گڑھ کالج کو تمام ہندوستان سے

"....اعتقاد سے اعتقاد پیدا ہوتا ہے۔ آنریبل سید احمد خاں کو اپنے کام پر اعتقاد اور اس کالج کے دوسرے خیر خواہوں دونوں ہندو اور یورپین ....کو سید احمد خاں پر اعتبار تھا..... یہ کالج تمام ہندوستان کے واسطے نہ صرف سلف ہلپ کی بلکہ اس اثر کی بھی ایک عمدہ نظیر ہے جو ایک عمدہ کام پر مستحکم اعتقاد رکھنے سے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔"[1]

سید محمود نے پرنسپل بیک کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

جن کے ارادوں کی دیانتداری، سوشل اور اخلاقی اوصاف کی عمدگی کو ہم خوب جانتے ہیں اور جن کی وجہ سے عام مسلمانوں کو ان کے صادق اور شریف النفس، خیر خواہ کالج بالخصوص اور خیر خواہ مسلمانان بالعموم ہونے کی نسبت پورا ہو گیا ہے۔ میں اپنی نسبت نہایت سچائی سے بغیر کسی بناوٹ کے کہتا ہوں کہ مسٹر بیک کی عقل اور اخلاقی خوبیوں پر، ان کی ایک ایسی قوم سے فیاضانہ ہمدردی پر جن سے ان کا کوئی نسلی تعلق نہیں کالج کے امور میں ان کی جانفشانی اور طالب علموں کی فلاح میں ان کی ہمدردانہ دلچسپی پر رشک آتا ہے۔"[2]

مولانا سید طفیل احمد منگلوری لکھتے ہیں:

"اگر انصاف سے دیکھا جائے تو علی گڑھ کالج کے سابق طلبا کو اپنی مادر درسگاہ سے وابستہ کرنے کا تمام تر سہرا مسٹر بیک، مسٹر ماریسن، مسٹر آرنلڈ اور اس زمانے کے انگریز استادوں کے سر تھا۔ طلبا کی مختلف انجمنیں بناتے، انہیں منظم کرتے، ان سے برادرانہ برتاؤ کرتے، کالج چھوڑنے کے بعد ان سے مستقل تعلقات رکھتے، ان کے سالانہ جلسے اور ڈنر منعقد کرتے، ان کے ذریعہ تمام ملک میں کالج کی خوبیوں کا پروپیگنڈا کراتے تھے۔ کالج کے لیے چندہ جمع کرانے کے تمام تر کام جو انگریز استادوں نے کئے وہ سب انھیں کی ایجاد تھی جو انھوں نے درجہ کمال کو پہنچا دئے۔ انھیں کی بدولت یہاں کے پڑھے ہوئے طلبا کی ایک مستقل برادری قائم ہو گئی جنھوں نے علیگڑھ کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد اور علی گڑھ کالج کو تمام ہندوستان کے مسلمانوں کا مرکز بنا دیا۔"[3]

---

[1] ایڈریس اور اسپیچز متعلق ام اے او کالج علی گڑھ حوالہ سابق ڈبلو ڈبلو نیٹر [2] رپورٹ لائف آنریری جوائنٹ سکریٹری ام اے او کالج علی گڑھ حوالہ سابق ص ۲۴ [3] مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۲۱۸

سرسیّد کی تعلیمی پالیسی اور اس کا تاریخی پس منظر

اصل را در یافت بگذشت از فروع بہر حکمت کرد در پرسش شروع (رومی)

"میں تعلیم کی ترقی کو اور صرف تعلیم ہی کو ذریعہ قومی ترقی کا سمجھتا ہوں ہماری قوم کو اس وقت بجز ترقی تعلیم کے اور کسی چیز پر کوشش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہماری قوم میں تعلیم کی کافی ترقی ہو جاوے گی تو ہم کو وہی کافی ذریعہ تنزل کی حالت سے نکلنے کا ہوگا۔"[1]

اوپر کے اقتباس میں سرسید کے لفظ تعلیم سے اصلاً مغربی طرز تعلیم مراد ہے اور وہ قومی ترقی کے لیے اس تعلیم کی اشاعت کو تمام دوسرے کاموں سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اس کا یقین رکھتے ہیں ہ تنزل کی حالت سے قوم اس کی مدد سے نکل سکے گی۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ہر عہد اور زمانے میں م کے مخصوص مقاصد قرار پائے ہیں۔ ایسا ہونا اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ انسانی معاشرے کے بنیادی عوامل ن حالات کی بنا پر مخصوص درجے اور نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اسی لیے ایسے طریقے اور ذرائع کا استعمال آتا ہے جس سے مختلف تعلیمی نظام وجود میں آئے ہیں کسی تعلیمی نظام کو بالعموم تین مراحل میں تقسیم کیا ہے۔ ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ۔ ان میں ہر مرحلے کی اپنی اہمیت ہے۔ اس کے اپنے خاص مسائل ہوتے ۔ عام طور پر ابتدائی تعلیم کے زمانے میں کم سن بچوں کی ذہنی نشوونما اور تربیت کا اس طور پر بندوبست جاتا ہے۔ جس سے ان کی فطری صلاحیتیں صحت مند اور فطری طور پر ظہور پائیں اور ان کے معصوم میلان ں کو بامعنی اور ان کی خداداد ذہانت کو باکار بنائے ان کی جبلتوں اور دیگر خاصیتوں کو ان کے چاروں طرف ہوئی کائنات سے جو قدرت کی بنائی ہوئی ہوتی ہے انسان کی بھی، ساز گار کرنے میں مدد ملے۔ اس میں ود، حرفہ، دستکاری، لکھنا پڑھنا، سیر سفر سب شامل ہیں۔ جب بچہ لڑکا بنتا ہے یعنی جب وہ اپنے

---

[1] سید احمد خاں اور سید جمال الدین افغانی حوالہ سابق بحوالہ لکچروں کا مجموعہ ص ۲۵۰

گردوپیش سے قابل لحاظ واقفیت پیدا کرتا ہے اور اس کا ابتدائی اور بالارادہ شعور حاصل کرتا ہے تو ثانوی تعلیم کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ اس دوران میں باقاعدہ مضامین کی تعلیم کا آغاز ہوتا ہے اور ایک بنیادی لیاقت اور شعور پیدا کرانے میں مدد دی جاتی ہے۔ اس مرحلے کی تکمیل پر اسے بالعموم اس کا حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ آئندہ اعلیٰ تعلیم یعنی کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کا انتخاب کرے یا مخصوص حرفے یا پیشے کی مستند و معیاری تعلیم کا۔ اس طور پر اعلیٰ تعلیم کا مرحلہ باقاعدہ تعلیم کا آخری و انتہائی ترقی یافتہ مرحلہ ہے۔ یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ان میں سے ہر مرحلہ اپنے طور پر خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ایک اچھے اور کامیاب قومی نظام تعلیم کے معنی یہ ہیں کہ تعلیم کے تمام مراحل میں ایک ترقی پذیر عمل مستقلاً جاری رہے تاکہ اجتماعی طور پر وہ سارے نتائج حاصل ہوں جن سے ایک ترقی پذیر معاشرہ کا مسلسل وجود میں رہنا لازم آتا ہو۔ ترقی پذیر معاشرے کی کوئی بندھی ٹکی تعریف کرنا مشکل ہے لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ہر وہ معاشرہ ترقی پذیر ہو سکتا ہے جو فرد کی اعلیٰ صلاحیتوں کو برگ و بار لانے کے لیے آزاد اور مساوی مواقع فراہم کرنے کی جستجو میں، عصری، ذہنی و مادی تبدیلیوں سے ہم آہنگ اور باشعور شخصیت کی نشوونما میں، جملہ تمدنی و فطری علوم و مسائل کی بہتر تفہیم و عمل میں، قدیم، جدید اور مستقبل کے کارناموں اور امکانات کی توسیع و ترقی میں، بالفاظ دیگر انسانی تہذیب کے ارتقا اور ترفع کے مناسب حال ماحول پیدا کرنے میں مدد دے۔

سرسید کا ملک اور ان کی قوم ایک ایسے معاشرے کی تصویر تھے جس میں حرکی تخلیقی قوتوں کا فقدان تھا یا وہ ایک ایسی شکستہ کشتی کے مانند تھا جو سمندر کی سطح پر بمشکل قائم تھی۔ سمندر کے افق پر نئے طوفان کے جو آثار ابھر رہے تھے اور امواج بحر جس طرح تیز و تند ہو رہی تھیں ان کو دیکھتے ہوئے نہایت پر اُمید ناخدا بھی اس کے غرق ہو جانے کی مدت کو کچھ زیادہ نہیں بتاتے تھے۔ کشتی سوار خواب غفلت میں تھے۔ وقت اور وسائل کی قلت و دقت کے باوجود اس ناخدا نے کم سے کم مدت میں اس کشتی کو ساحل مراد تک پہنچانے کا عزم کیا تاکہ وہاں پہنچ کر نئی کشتی بنانے کی فکر کی جائے جو آنے والے سخت طوفان کا مقابلہ کر سکے اور نئی دنیا کی دریافت میں مدد دے سکے وہ نئی کشتی قوم کی نئی تعلیم کا منصوبہ تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ نئی تعلیم کیا تھی اور اس نے پیش نظر مقاصد کہاں تک پورے کئے۔

سرسید نے سفر انگلستان سے پہلے ہی قومی تعلیم کے کام کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا تھا۔ اس سلسلے میں ان کی کوشش سے تین ادارے قائم ہو چکے تھے، ایک مدرسہ مراد آباد میں، دوسرا غازی پور میں، تیسرا ادارہ سائنٹفک

سوسائٹی جس کی ابتدا غازی پور میں ہوئی لیکن بالآخر اس کا مستقر علی گڑھ طے پایا۔ اوّل الذکر مدرسے ان کی ابتدائی کوشش کا ثمرہ تھے جو مقامی حیثیت رکھتے ہوئے بھی دوسرے لوگوں کے لیے اجتماعی تعلیمی کوشش کا کامیاب نمونہ تھے۔ سائنٹفک سوسائٹی ایک جامع پروگرام کے ماتحت بڑے پیمانے پر سوچی اور قائم کی گئی تھی اور ملک کے لیے ایک عمومی کوشش رکھتی تھی ان اداروں کے قائم کرنے اور چلانے میں سرسید کو ابتدائی تعلیم اور عمومی تعلیم کا خاص طور پر تجربہ ہوا۔ انھوں نے مدرسوں کے نصاب کی تشکیل اور ان میں مناسب ماحول پیدا کرنے میں ذاتی غور و فکر سے کام لیا اور سوسائٹی کے پروگرام کو اس طور پر مرتب کیا کہ ایک طرف وہ اعلیٰ سطح پر بنیادی کام یعنی مستند و معیاری کتابوں کی تالیف، تصنیف و ترجمے پر دھیان دے تو دوسری طرف خاص طور سے جدید سائنس کے نظری اور عملی نتائج سے عام پبلک کو روشناس کرائے۔ کسی ملک کی تہذیبی ترقی کے لیے دونوں یعنی ابتدائی اور عام سطح میں مناسب تعلیم کا انتظام کرنا کس قدر ضروری تھا، سرسید اس سے پورے طور پر باخبر تھے۔ ان کے تعلیمی تصورات میں ملک کی اقتصادی اور سماجی خصوصیات اور تقاضوں کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ہندوستانی معیشت میں زراعت کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے بایں ہمہ زراعت کی پیداوار بہت کم رہی ہے اور اسی لیے عام کاشتکاروں کے رہن سہن کی سطح بہت نیچی رہی ہے۔ سرسید نے زراعت کی تعلیم کی اہمیت کو کئی موقعوں پر واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ ہندوستانی زراعتی نظام میں موثر تبدیلی عمل میں لائی جائے۔ ان کی اس دلچسپی کا حال اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے:

"سنہ ۱۸۶۶ء کے اس لکچر میں انھوں (سرسید) نے ہندوستانی سرداروں اور عمائدین قوم کو یہ بتایا ہے کہ وہ اپنے ہموطنوں کی بھلائی کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ سرسید کی رائے میں تعلیم کے لیے اسکیمیں ہونی چاہئیں اور ان میں سے ایک اہم صنف کاشت کاری کی تعلیم ہے جس کا ذریعہ تعلیم دیسی زبان ہو جس میں سانوں کو لکھنے پڑھنے اور حساب کی تعلیم دی جائے۔ لیکن سرسید کا تخیل کتابی تعلیم کی حد بندیوں پر آکر رک نہیں جاتا بلکہ ایک چڑھتے ہوئے دریا کی طرح اسے توڑ کر آگے نکلتا ہے۔ ان کی رائے میں کاشتکاری سکھانے کے لیے مدرسے قائم ہونے چاہئیں۔ کسان کو اچھے مویشی پالنے کا فن سکھانا چاہیے۔ اسٹریلیا کی طرح بھیڑوں بکریوں کی نسل بہتر بنانے کا گر بتانا چاہیے۔ گایوں اور بیلوں کی اچھی نسل تیار کرنے میں امداد دینا چاہیے۔ ایک زمانے ں بنگال کے ایک زمیندار نے حکومت بنگال کو ایک زراعتی مدرسہ کھولنے کا مشورہ دیا تھا جسے گورنر نے ل نہیں کیا۔ اس پر سرسید افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ حکومت نے ایسی معقول اور مفید تجویز کو منظور نہیں

کیا لیکن ایک بلند ہمت پیش رو کی طرح وہ راستے کی ان مصیبتوں سے آزردہ خاطر نہیں ہوتے۔ اس گرد راہ کو چلتے دامن سے جھٹک دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زمیندار کو چاہیے ہر کام میں گورنمنٹ کی امداد کی آرزو نہ کرے ...." اور ملاحظہ ہو۔

"اس لکچر میں سرسید امرا کو مشورہ دیتے ہیں کہ انھیں مفید علم کی ارزانی سے اشاعت کرنی چاہیے تاکہ علم اتنا عام اور سستا ہو جائے کہ لوگ چھوٹی سستی کتابیں گلی کوچوں میں بیچتے پھریں۔ جہاں صبح شام جمع ہوتے ہیں وہاں سستا اخبار سنایا جائے۔ لیکن ان کی رائے میں ان اخبارات کا مطمح نظر تخریبی نہ ہو بلکہ تعلیمی ہو۔ اس کا مطالعہ نظر میں وسعت اور قلب میں گہرائی پیدا کر دے نہ کہ دماغ میں بارود کی طرح چڑھ جائے۔ ان کے اپنے الفاظ میں اخبار کے ذریعہ ایسی غذا دی جائے جس میں گرمی اور جوش نہ ہو بلکہ ملائم اور ٹھنڈی ہو۔ اس کے علاوہ عوام کے لیے لکچروں کا بھی انتظام کیا جائے۔ مردوں اور عورتوں کی تعلیم کا انتظام ہو۔ تعلیم خاص اور تعلیم عام کا لحاظ رکھا جائے۔ ذہنی اور جسمانی تربیت دونوں ساتھ ساتھ ترقی کریں۔ علم کی اشاعت کے لیے ایسوسی ایشن اور سوسائٹی قائم کی جائیں۔ عمدہ عمدہ علوم وفنون کو ترقی دی جائے۔ ان کے رواج کے لیے علمی روزنامے نکالے جائیں۔ علمی لیاقت اور خوبی خصلت کے لیے انعام مقرر کیے جائیں[۲]"

سرسید کے ان خیالات کو پیش کرنے کے بعد فاضل مصنف ان کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

"آج اتنے سال گزرنے پر ہم تعلیم بالغان کے میدان میں اپنے کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو اس تعلیم کا وہ بالیدہ تخیل نہیں پاتے جس کی طرف سرسید نے اتفاقیہ طور پر سرسری سے الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔ لیکن آج مابعد جنگ کی دنیا میں تعلیم بالغان کی بنیادیں انھیں خطوط پر استوار ہو رہی ہیں۔ سارجنٹ اسکیم بھی تعلیم بالغان کو محض لکھائی پڑھائی اور کتابی سے آگے بڑھا کر اس تخیل کی سطح پر لے جانا چاہتی ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ سرسید کے ذہن میں ڈنمارک کے فوک اسکولوں کی تصویر موجود تھی یا وہ دہلی کے کوچوں بازاروں میں بالشوک روس کے سے کوچہ کلب کھول دینا چاہتے تھے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان کے سامنے اس طرز کی تعلیم کا ایک ایسا تخیل موجود تھا جسے ہمارے ماہرین ایک عرصے تک پا نہیں سکے۔ اس لکچر میں آگے چل کر انھوں نے محض تعلیم کے نہیں

---

[۱] سرسید کی تعلیمی تحریک از چودھری عبدالغفور۔ علی گڑھ تحریک آغاز امروز ص ۲۹ ۲ [۲] سرسید کی تعلیمی تحریک ص ۳۰

بلکہ پورے ملک کی شادابی اور اس کے عوام کی فلاح اور بہبودی کے لیے مشورے دیئے ہیں ان کی رائے میں ملک کی کانوں کا امتحان ہونا چاہیے۔ حرفہ اور فنون کے ادارے صنعت کے کارخانے قائم کئے جائیں۔ شہر کے لیے نئے نئے نقشے اور خاکے بنائے جائیں۔ ان میں صفائی اور دوائی ہر قسم کی آسانیاں مہیا کرنی چاہئیں۔"[1]

یہ کہنا صحیح ہے کہ سرسید کے ذہن میں ڈینمارک کے فوک اسکول یا روس کے کوچہ کلب جیسے مخصوص اداروں کی کوئی واضح تصویر نہ تھی لیکن ان خیالات میں قومی تہذیب اور ملکی زندگی میں ایسے اداروں کی ضرورت کا صاف و صحیح نقشہ ملتا ہے جس کا بنیادی مقصد ایسی تعلیمی مہم جوئی یا منصوبہ بندی کا آغاز کرنا تھا جو تقریباً ہر سطح اور ہر درجہ میں ایک مفید، مہذب اور لائق معاشرہ کی تربیت اور تنظیم میں مدد دے۔ ایک صحت مند اور روشن خیال معاشرہ کا سب سے نمایاں وصف یہ ہوتا ہے کہ فرد اور جماعت دونوں میں خود ارادیت، حقیقت شناسی اور ہم آہنگی حاصل کرنے کے پورے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ خود ارادیت کا مفہوم یہ ہے کہ فرد اور جماعت آزادانہ مگر عاقلانہ فیصلے کرنے کی مجاز ہو۔ حقیقت شناسی کے معنی یہ ہیں کہ ہر فکر و عمل کے امکانات کا معروضی اور بے لاگ جائزہ لینے کے بعد فیصلہ کرنے کی عادت ہو اور ہم آہنگی وہ صفت ہے جو ہمارے مقاصد اور فیصلوں میں پوشیدہ الجھنوں اور اختلافات کو دور کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس طور پر انفرادی اور اجتماعی نفسیات کو نارمل صحت کے معیاروں کے مطابق برقرار رکھنے میں مدد دیتی ہو سرسید کی تعلیمی تحریک کے اصلی محرکات یہی خیالات تھے۔ ایک موقع پر وہ کہتے ہیں:

"دوستو! ہماری پوری پوری تعلیم اسی وقت ہوگی جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔ یونیورسٹیوں کی غلامی سے آزاد ہوگی۔ ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے۔ بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں تعلیم پھیلائیں گے..... ہم آدمی بھی ہوں گے جب تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔"[2]

ان الفاظ میں تعلیم کے مسئلے پر حق خود ارادیت کے اصول کی کیسی صاف اور پر زور وکالت ملتی ہے یونیورسٹی کی غلامی سے مراد حکومت کے عائد کردہ قواعد و ضوابط کی ناروا پابندی ہے۔ انگریزی حکومت نے جن شرائط کے ساتھ یونیورسٹیاں قائم کی تھیں سرسید کے نزدیک وہ قومی مزاج اور تہذیب کی فطری اور اعلیٰ نشوونما

---

[1] ایضاً ص ۳۰-۴۲۱ [2] منقول از سرسید احمد خاں۔ افکار و حالات۔ حوالہ سابق ص ۱۸ بحوالہ جواب ایڈرس بمقام جالندھر

کے لیے بڑی حد تک ناساز گار تھیں۔ وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ حکومت کی سیاسی مصلحتوں کے پروردہ تعلیمی ادارے ان بنیادی قومی مقاصد کو پورا کرنے میں ناکام رہتے ہیں جن کی تکمیل سے ملکی تہذیب کی فی الواقع توسیع و ترقی ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سرسید نے مغربی طرزِ تعلیم اور اس کے ادارے گہرا اثر لیا تھا اور وہ ان کے قائل تھے لیکن جب وہ تعلیم کو سیاست کا پابند دیکھتے۔ اور انگریزی دورِ حکومت میں اس کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں تو وہ اس کے غیر صحت مند پہلو کو بے نقاب کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ ان کا آخری جملہ کہ "ہم آدمی بھی ہوں گے جب تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی" ہمارے لیے کتنا بصیرت افروز ہے اور ان کی گہری فکر کی کتنی اچھی ترجمانی کرتا ہے۔ سرسید کے اس خیال کو ان کی تعلیمی افکار و تصورات میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس بات کا خاص طور سے اظہار کیا جاتا ہے کہ وہ مغربی نظام تعلیم کے بہت بڑے مؤید تھے لیکن اس کا احساس کم لوگوں کو ہے کہ وہ اس نظام تعلیم کے اتنے ہی سخت ناقد بھی تھے جو انگریزی دورِ حکومت میں ہندوستان میں رائج کیا جا رہا تھا۔ وہ نہ صرف خود ان خطرات سے آگاہ تھے بلکہ قوم کو بھی اس سے متنبہ کرتے تھے۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ ایسا تھا تو انھوں نے خود اس نظام سے مفاہمت کی روش کیوں اختیار کی تو یہ ایک علیحدہ سوال ہے جس پر آئندہ صفحات میں بحث کی جائے گی۔ سردست اتنا کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے فکر کی پابندی کبھی قبول نہیں کی۔ عمل کی پابندی پر غالباً مجبور تھے۔

سرسید نے قومی تعلیم کے منصوبے کی تشکیل میں آرزومندی سے زیادہ حقیقت شناسی سے کام لیا۔ آرزومندی بجائے خود کوئی ناپسندیدہ صفت نہیں ہے۔ وہ انسانی فکر و خیال کے حدود کی مسلسل توسیع کا باعث ہوتی ہے اور اس کے عمل اور جستجو کو تب و تاب بخشتی ہے اور مجموعی طور پر حیات انسانی کی اس بنیادی صفت کو ظاہر کرتی ہے جو تمناؤں، امنگوں اور خوابوں کے ایک لامتناہی سلسلے سے عبارت ہے۔ آدمی کا شاید ہی کوئی ایسا عمل ہو جس کی قوتِ محرکہ یہی آرزومندی نہ ہو۔ لیکن اگر یہ صفت زندگی کے حقائق سے گریز اور عملی و مادی امکانات سے فرار کی صورت اختیار کرے تو شاید انفرادی طور پر فرد کی نجات یا مکتی کا باعث ہو لیکن اجتماعی زندگی کی ترقی و کامیابی کو شدید خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ شخصی زندگی ہو یا اجتماعی، آرزومندی اور حقیقت شناسی کے صحیح امتزاج ہی سے دونوں کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔
سرسید کے فکر و عمل کا اصلی مقصد اجتماعی زندگی کو بہتر بنانا تھا۔ اس لیے انھوں نے ایک ایسا عملی تعلیمی پروگرام وضع کیا جس کا مقصود قومی ترقی اور جس کی حقیقت وہ تاریخی تجربات اور مشاہدات تھے جو

قوم کو اجتماعی طور پر حاصل ہوئے۔ اس طور پر سرسید کے تعلیمی تصورات میں شخصی احساسات یا ذاتی پسند یا ناپسند کا اتنا اظہار نہیں ملتا جتنی قوم اور معاشرہ کے اجتماعی تجربات اور فکر کی ترجمانی ملتی ہے بالفاظ دیگر قومی زندگی کے حقائق کے اجتماعی شعور کو سرسید کی شخصیت میں ذاتی عرفان کا درجہ حاصل ہوگیا۔ جب وہ یہ کہتے ہیں: "تجویز اور عمل ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ تجویز ہم کو پوری اور کامل کرنا چاہئے اور اس تجویز پر عمل اسی قدر جتنا کہ وقتاً فوقتاً کر سکتے ہوں۔"[1] تو ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تجاویز کو مرتب کرنے میں ذہنی کوتاہی یا محدود فکر سے بچنا چاہئے اور ایک آزاد جامع ذہنی کاوش کو عمل میں لانا چاہئے۔ لیکن فی الحقیقت ان تجاویز کے مفید مطلب ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ قابل عمل ہوں۔ سرسید اصلاً عملیت پسند طرز فکر رکھتے ہیں جس کا سبب وہ گہرے تاثرات تھے جو انھوں نے اپنے اس ماحول سے قبول کئے جو دراصل عمل گریز عناصر پر مشتمل تھا۔ قومی تعلیم کے بے شمار مسائل تھے۔ ان سے عہدہ برا ہونے کے لیے بے شمار تجاویز تھیں۔ لیکن بے شمار وسائل تو موجود نہ تھے! اس لیے وسائل کے استعمال میں کفایت سے کام لینا تھا۔ ترجیحات قائم کرنا ضروری تھا، ورنہ وسائل کا غلط استعمال ہوسکتا تھا، جو مزید بے دلی اور بے عملی کا باعث ہوتے۔ سرسید نے ان حقائق کو ہمیشہ مدنظر رکھا۔ ایک موقع پر وہ کہتے ہیں:

"...... پس بلحاظ امورات متعلق تعلیم کے ہیں ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ ادنیٰ درجہ کی تعلیم پھیلانے کی قوم میں بڑی ضرورت ہے۔ دوسرا کہہ سکتا ہے کہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم نہ ہونے سے روز بروز تنزل ہوتا جاتا ہے۔ دونوں کا کہنا بلحاظ قوم کی حالت کے صحیح ہے اور انکے دلائل قابل رد و قدح نہیں ہیں۔ مگر سوال یہ ہے وہ لوگ جو اس گری ہوئی قوم کو سنبھالنا چاہتے ہیں جو ادنیٰ سے اعلیٰ درجہ تک کی محتاج ہے اس کے سنبھلنے کا ان کو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ کیا سب چیزوں کو ایک ساتھ اختیار کرنا جن کا انجام محالات سے ہے اور قوتوں کے متفرق ہو جانے سے ایک چیز کا بھی ہونا ناممکن ہے، ہم کو مناسب ہے۔ یا کسی ایک چیز کو جو سب خرابیوں کی جڑ ہے اختیار کرنا لازم ہے۔

فرض کرو کہ ایک شخص بیمار ہے اور متعدد بیماریاں اس کو لاحق ہیں۔ اس طبیب کو جو اس کا معالج ہے دفعتہً تمام بیماریوں کا ایک دم علاج کرنا مناسب ہے یا اول اس بیماری

---

[1] منقول از مسلم یونیورسٹی کے بھولے ہوئے اصول، مرتبہ حاجی محمد موسیٰ خاں ص ۵

کا تدارک کرنا اس کو مناسب ہے جو مہلک ہے۔ قوم من حیث المجموع ایک شخص واحد کا حکم رکھتی ہے۔ در حقیقت اس کو بہت سی بیماریاں لاحق ہیں۔ سوال بحث طلب صرف یہی ہے کہ کون سی بیماری سب سے زیادہ سخت اور مہلک ہے جس کے علاج میں سب سے اوّل ہم سب کو متفق ہو کر کوشش کرنی چاہیے۔[1]

سرسید نے قومی تعلیم کے تقریباً تمام اہم پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ایک مخصوص تعلیمی پروگرام مرتب کیا تھا۔ اس تجزیے سے جو نتائج اخذ کیے اس کو یوں بیان فرماتے ہیں:

کوئی قوم عزت نہیں پا سکتی جب تک کہ تعلیم اس مقدار مناسب سے اس قوم میں رائج نہ ہو اور اس مقدار مناسب کا اندازہ حسب تفصیل ذیل ہو سکتا ہے۔ ضرور ہے کہ اس قوم میں ایک گروہ معتد بہ اعلیٰ تعلیم کا ایسا ہو جس میں سے کوئی کسی علم میں دستگاہ کامل رکھتا ہو اور اسی طرح تمام علوم کے کامل لوگ اس قوم میں موجود ہوں۔ جن کی عقل و فہم اور سعی و کوشش سے علم و فن کو روز بروز ترقی ہو اور جن کے عقل و فہم سے ہماری قوم کو عزت و فخر ہو اور پھر ان لوگوں کی تعداد کثیر ایسی ہو جن پر اطلاق النادر کالمعدوم کا نہ ہو۔ اس کے بعد ایک بہت بڑا گروہ متوسط درجہ تعلیم کا اس قوم میں ہونا چاہیے جو عالی رتبہ مصنفوں کی علمی تصنیفات کو نہایت عمدگی سے جانتا ہو اور ہر ایک دقیقہ اور باریک سے باریک اصول سے بخوبی واقف ہو۔ اور تعلیم کا اس قوم میں ہونا چاہیے جو عالی مصنفوں کی علمی تصنیفات کو نہایت عمدگی سے جانتا ہو، ہر ایک دقیقہ اور باریک سے باریک اصول سے بخوبی واقف ہو۔ اور تعلیم کے ذریعے سے وہ سب باتیں اپنی قوم کو سکھا سکتا ہو۔ اس گروہ کی تعداد ایسی ہونی چاہیے کہ بلحاظ قومی تعداد کے ایک مناسبت رکھتی ہو۔ اس کے بعد ادنیٰ درجہ تعلیم کا ہے۔ مگر اس میں تین قسم کے گروہوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک گروہ ایسا ہو جو کل قوم سے تعداد میں ایک مناسبت معقول رکھتا ہو اور اس نے اس قدر تعلیم پائی ہو کہ خاص اپنی عقل و علم سے اپنے کاموں کو انجام دے سکے۔ اس کے بعد اس درجہ کے ایسے لوگ جو تعداد کثیر ہونے چاہئیں جو اپنے دنیوی کاموں کا انجام بخوبی تمام کر سکتے ہوں اور جو کہ یہ لوگ محض جاہل نہیں ہونے

---

[1] مجموعہ لکچرز و اسپیچز سرسید احمد خاں مرتبہ مولانا محمد امام الدین گجراتی سنہ ۱۹۰۰ء ص ۲۸۴

کے تو ضرور ان میں اس قدر علم کی روشنی ہوگی کہ جو ترقیاں علوم و فنون میں ہر روز ہوتی جاتی ہیں اس کے وسیلے سے ان سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔

اس کے بعد ان لوگوں کا درجہ ہے جو جسمانی محنت کرنے کی لیاقت رکھتے ہوں۔ ان میں بھی اس قدر استعداد ہونی چاہیے کہ آسان آسان کتابیں اور سہل سہل چھوٹے چھوٹے اخبار اور مذہبی مسائل کی کتابیں پڑھ سکتے ہوں۔ تھوڑا بہت اپنا مطلب لکھ لیتے ہوں۔ حساب کر سکتے ہوں۔

جن قوموں میں ان سب مراتب کے تعلیم یافتہ مناسب تعداد سے موجود نہ ہوں اس قوم کو کبھی ترقی نہیں ہو سکتی اور نہ دوسری قوم کی نگاہ میں وہ قوم کچھ عزت حاصل کر سکتی ہے۔ مدت سے میں نے اپنی اس رائے پر غور کیا ہے جس پر میں نہایت مضبوط ہوں۔۔۔۔ اور میری اس رائے کی صحت ان قوموں کے حالات پر نظر کرنے سے بخوبی ثابت ہوتی ہے جو اب دنیا میں درجہ بدرجہ ترقی یافتہ موجود ہیں۔ جن میں یہ باتیں پوری پوری پائی جاتی ہوں وہ پوری ترقی میں ہیں اور جس میں جتنی کمی ہے اتنا ہی اس میں نقصان ہے[1]

اوپر کے اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سرسید ملک و قوم کی ہمہ جہتی ترقی کے لیے ہر مرحلے اور درجے میں نہ صرف مناسب تعلیمی سہولتوں کو فراہم کرنے میں غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے بلکہ وہ ہر مرحلے اور درجہ کی تعلیم کی نوعیت اور اہمیت کا پورا احساس رکھتے تھے۔

سرسید نے اعلیٰ تعلیم خاص کر اعلیٰ انگریزی تعلیم کے جس پروگرام کو ایم۔ اے او کالج علی گڑھ کے ذریعہ عملی شکل دینے کی کوشش کی اس کی تشکیل میں ان تمام مخصوص تاریخی عوامل یا تمدنی احوال بالخصوص اس تعلیمی پالیسی کے مقاصد و اثرات کا پورا لحاظ رکھا جو ہندوستان میں انگریزوں کی عملداری کی ابتدا سے انیسویں صدی کے آخر تک کم و بیش ایک صدی کے عرصے میں ظہور پذیر ہوئے تھے۔ انگریزی حکومت کی اس تعلیمی پالیسی سے کیا نتائج برآمد ہوئے تھے اور قومی زندگی کے مختلف تہذیبی عناصر خاص طور سے ہندو اور مسلمان جو اپنی آبادی اور تاریخ کی بنا پر ملک میں بنیادی حقیقت رکھتے تھے اس سے کس طرح متاثر ہوئے تھے، سرسید کو ان سے پوری واقفیت تھی۔ سرسید اور ان کے دوسرے رفقائے کار کو یہ معلومات دراصل سید محمود کی وساطت

---

[1] مکمل لکچرز و اسپیچز حوالہ ماسبق ص ۱۲۲۔ ۱۲۳

سے حاصل ہوئی تھی جنھوں نے اس مسئلہ کا نہایت مستند عالمانہ اور فکر انگیز مطالعہ کیا تھا جو بالآخران کی معرکہ آرا کتاب "ہندوستان میں انگریزی تعلیم کی تاریخ"[1] کی شکل میں سب کے سامنے آئی۔ سرسید کے تعلیمی تصورات کا حقیقی پس منظر وہ حالات وواقعات تھے جو اس کتاب میں بیان ہوئے ہیں۔ ان حالات وحوادث سے مناسب واقفیت حاصل کیے بغیر علی گڑھ کے تعلیمی پروگرام کی صحت وصواب کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی دور میں ہندوستانی باشندوں میں تعلیم کی اشاعت پر مطلق کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ اس بات کو مشہور برطانوی مورخ مارش مین (John Clark Marshman) نے انگلستان کے دارالامرا کی ایک سلکٹ کمیٹی کے سامنے ۱۵ر جون سنہ ۱۸۵۳ء کو ان الفاظ میں بیان کیا:

"For a considerable time after the British Government had been established in India, there was great opposition to any system of instruction for the Natives. The feelings of the public authorities in this country were first tested upon the subject in the year 1792, when Mr.Wilberforce proposed to add two clauses of the Charter Act of that year, for sending out school masters to India; this encountered the greatest opposition in the court of Proprietors and it was found necessary to withdraw the clauses. On that occasion one of the Directors stated "We had just lost America from our folly, in having allowed the establishment of schools and colleges and that it would not do for us to repeat the same act of folly in regard to India, and that if the Natives required anything in the way of education, they must come to England..." In the year 1813, Parliament for the first time, ordered that the sum of 10,000/- should be appropriated to the Education of the Natives, at all the three Presidencies. In 1817, Lord Hastings, after he had broken the power of Marhattas, for the first time announced that the Government of India did not consider

1. A history of English Education in India (1781-1893) by Syed Mahmood, M.A.O. College, Aligarh 1895

it necessary to keep the Natives in a state of ignorance, in order to retain its power; consequent on this announcement, the Calcutta School-book Society and the Hindu College were immediately founded. Lord Hastings also gave the largest encouragement to Vernacular Education, and even to the establishment of Native news papers; but those who at that time, and for a considerable time after, enjoyed the confidence of the Government of India, were entirely in favour of confining the assistance given to Education to the Encouragement of Sanskrit and Arabic literature. This state of things continued down t the year 1835, when Lord Bantinck, acting under t advice of Mr.Macauly and Sir Charles Trevelyan, dete mined to withdraw Govt. support from the Sanskrit and Arabic Institutions, and to appropriate all the funds which were at its disposal exclusively to English Education"1.

ابتدا میں تعلیمی مسائل کی طرف اس عام بے توجہی کے باوجود کمپنی نے اپنی مخصوص ضروریات کے پیش نظر وارن ہسٹنگز کی گورنر جنرلی کے دوران سنہ ۱۷۸۲ء میں کلکتہ مدرسہ یا محمڈن کالج قائم کیا جس کا مقصد عدالتوں کے لیے مفید اہلکار پیدا کرنا تھا اور کالج کے نصاب میں عربی فارسی یا اسلامی قانون کی تعلیم شامل تھی۔ سنہ ۱۷۸۰ء اور سنہ ۱۷۹۱ء میں کالج میں چند اصلاحات کی گئیں جن کے سبب سے نصاب میں بعض نئے مضامین کا اضافہ ہوا یعنی فلسفہ، دینیات، قانون، فلکیات، اقلیدس، حساب، منطق، قواعد وغیرہ لیکن انگریزی تعلیم کا کوئی نظام نہیں کیا گیا۔ سنہ ۱۷۹۱ء میں بنارس میں انگریز ریزیڈنٹ نے ہندو سنسکرت کالج کے قیام کی تجویز کی جس کا مقصد ہندو فلسفہ و ثقافت کی حفاظت و توسیع سے زیادہ عدالتی افسران کی تربیت تھی سنہ ۱۸۱۱ء میں لارڈ منٹو نے کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرز کو ایک نوٹ بھیجا جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں احیائے علوم کی تحریک کو قبول بنانے کی درخواست اور اس سے متعلق تجاویز پیش کی گئی تھیں جن پر اس وقت کوئی خاص توجہ نہیں

---

(1) The History of English Education in India pp.2-3

Printed Parliamentary Papers ___ Second Report of the school committee of the house of Lords 1852-53 on Indian territories, p.11,31

کی گئی[1]۔ دراصل انگریزی حکومت کی باقاعدہ تعلیمی پالیسی کا آغاز سنہ ۱۸۱۳ء کے برطانوی پارلیمنٹ کے ایکٹ ۴۳ باب ۱۵۵ (Section 43 of the Act of Parliament, st, 53 Geo III, Ch. 155) سے ہوتا ہے کیونکہ اس لیے کہ اس کے مطابق انگریزی حکومت نے اپنے زیر نگیں علاقوں میں تعلیمی در و بست کی ذمہ داری کو بطور اصول تسلیم کیا ہے۔ پارلیمنٹ کے اس فیصلے کی کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرز نے اپنے مراسلہ مورخہ ۳ رجون سنہ ۱۸۱۴ء بنام گورنر جنرل میں اطلاع دی اور اس کی وضاحت کی۔ اس تجویز میں ہندوستانیوں کی تعلیم سے متعلق خالص استعماری نقطہ نظر کا پتہ چلتا ہے اور حکومت کے ان سیاسی عزائم کی نشان دہی بھی ہوتی ہے جو وہ ہندوستان میں اپنی سیاسی قوت کو قوی تر بنانے کے لیے کرنا چاہتی تھی۔ مراسلے میں اس کا اظہار ان الفاظ میں ہوا:

> "We propose in this Dispatch to convey to you our sentiment as to the mode in which it will be advisable you should proceed, and the measures it may be proper you should adopt with reference to that subject. In the consideration of it we have kept in view those peculiar circumstances of our political relation with India, which, having necessarily transferred all power and pre-eminence from Native to European Agency, have rendered it incumbent upon us, from motives of policy as well as from a principle of justice, to consult the feeling, and even to yield to the prejudices, of the Natives, whenever it can be done with safety to our dominions".[3]

بقول سید محمود اس مراسلے کے تین نکات خاص طور پر قابل لحاظ ہیں۔ اوّل یہ کہ اس میں صرف ہندوؤں کے واسطے سنسکرت کے مطالعہ کے لیے خاص سہولتیں فراہم کرنے پر صاف الفاظ میں زور دیا گیا ہے۔ دوم یہ کہ اس میں مسلمانوں کے مفاد و منفعت کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ نہ ان کے علوم اور عربی فارسی مطالعہ کے لیے کسی انتظام کا کوئی ذکر ملتا ہے۔ سوم یہ کہ اس میں انگریزی زبان کی تعلیم یا دیگر مغربی علوم کی ترویج و اشاعت کے کسی عندیے کا اظہار نہیں کیا گیا ہے کیونکہ اس طور یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس دوران میں انگریزی حکومت نے ہندوستانیوں

---

[1] History of Education in British Indian. حوالہ سابق ص ۱۰-۱۱ [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۲۴

کی باقاعدہ تعلیم کے مسئلے کو کوئی اہمیت نہ دی اور انگریزی تعلیم کے رواج اور اشاعت کیلیے بنگال میں بعض بیدار ہندوستانی حلقوں نے خود پہلی آواز اٹھائی جس کی وضاحت ریورنڈ اے ڈف (Rev.A.Duff) نے ۳ جون سنہ ۱۸۵۳ء کو برطانوی دارالامرا کی ایک سلکٹ کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے ان الفاظ میں کی:

"English Education was in a manner forced upon the British Government; it did not itself spontaneously originate it. The system of English Education commenced in the following very simple way in Bengal. There were two persons who had to do with it, one was Mr.David Hare, and the other was a Native, Ram Mohan Roy ... In the beginning of 1817, the college, or rather school was opened, and it was the very first English Seminary in Bengal, or even in India, as far as I know ... The Government... did come forward and proffer its aid, upon certain reasonable terms and conditions, and it was in this way that the British Government was first brought into active participation in the cause of English Education".1

اس کالج نے بڑی ترقی کی۔ اس کی رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ کلکتہ کے اعلیٰ خاندانوں نے اپنے بچوں کو بڑی خوشی سے اس کالج میں داخل کیا اور ہر طرح سے کالج کے منتظمین کی ہمت افزائی کی۔ سنہ ۱۸۲۸ء میں طالب علموں کی تعداد ۴۳۶ تک پہنچ گئی تھی۔ کلکتہ کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی ہندوؤں نے انگریزی تعلیم کی ترویج و ترقی سے دلچسپی لینی شروع کردی تھی۔ سنہ ۱۸۱۴ء میں جب گورنر جنرل بالائی صوبجات (Upper Provinces) کے دورہ پر گئے تو بنارس کے ایک شہری جے نرائن گوپال نے ان کے سامنے ایک عرضداشت پیش کی جس میں اس شہر کے اطراف میں ایک اسکول کھولنے کی درخواست کی گئی تھی اور اس کام کے لیے بیس ہزار روپے اور آراضی کی پیش کش کی۔ حکومت نے اس تجویز کی تائید کی جس کے نتیجے میں سنہ ۱۸۱۸ء میں مجوزہ اسکول قائم ہوگیا۔ اس وقت تک خود حکومت نے ہندوستانیوں کے لیے اپنی مرضی سے جدید تعلیم کا کوئی مرکز نہیں کھولا تھا بلکہ سنہ ۱۸۲۱ء میں ایک تعلیمی ادارہ کھولا بھی تو وہ کلکتہ سنسکرت کالج تھا۔ سنہ ۱۸۲۳ء

(1) History of Education in British India p.25-26. Printed Parliamentary Paper (1852-53) Second Report of the House of Lords on Indian territories pp. 48,49.

بت قابل ذکر بات یہ ہوئی کہ ہولٹ میکنزی (Holt Mackenzi) سکریٹری محکمۂ علاقہ جات (territor-
ial departmer کی ایک تجویز کو حکومت نے منظور کرلیا جس کے تحت بنگال پریزیڈنسی میں تعلیم عامہ کی ایک
کمیٹی (A general Committee of Public Instruction) مقرر ہوگئی اور ایک لاکھ
بیہ سالانہ کی اسی رقم کو جو حکومت کی تعلیمی سرگرمیوں کیلیے پارلیمنٹ نے سنہ ۱۸۱۳ء کے ایکٹ ۵۳ باب ۱۵۵ کے
بق منظور کی تھی اس کمیٹی کی تحویل اور انصرام میں دے دی۔ جیسے ہی اس کمیٹی نے اپنا کام شروع کیا اسکو بعض اہم مسئلوں سے
بقہ ہوا۔ دسمبر ۱۸۲۳ء میں راجہ رام موہن رائے نے گورنر جنرل کے نام ایک یادداشت بھیجی جس میں کلکتہ سنسکرت کالج
قیام کی شدید مخالفت کی گئی تھی اور ہندوستانیوں کے لیے انگریزی تعلیم کی ترویج و اشاعت کو بے حد ضروری
ر دیا گیا تھا۔ اس یادداشت سے راجہ رام موہن رائے اور ان کے ہم خیال ہندو صاحبان کے بنیادی عصری
جانات سے آگاہی اور مستقبل کے امکانات سے گہری واقفیت کا پتہ چلتا ہے اس یادداشت سے بعض اقتباسات
ش کیے جاتے ہیں :

"We find the Government are establishing a Sanskrit School under Hindu Pandits, to impart such knowledge as is already current in India. This Seminary (similar in character to those which existed in Europe before the time of Lord Bacon) can only be expected to load the minds of youth with grammatical niceties and metaphysical distinctions, of little or no practical use to the possessor or to society. The pupils will there acquire what was known two thousand years ago: with the addition of vain and empty subtleties since produced by speculative men, such as is already commonly taught in all parts of India ...

"In order to enable your Lordship to appreciate the utility of encouraging such imaginary learning as above characterised, I beg your Lordship will be pleased to compare the state of science and literature in Europe before the time of Lord Becon with the progress of knowledge made since he wrote.

"If it had been intended to keep the British

Nation in ignorance of real knowledge the Bacorian philosophy would not have been allowed to displace the system of the schoolmen which was the best calculated to perpetrate ignorance. In the same manner the sanskrit system of education would be the best calculated to keep their country in darkness, if such had been the policy of the British Legislation."1

اس یادداشت کا حکومت کی پالیسی پر کوئی فوری اثر نہیں ہوا۔ نہ یہ سنسکرت کالج کے قیام میں حائل ہوئی، لیکن اس یادداشت کو ملک کی تعلیمی تاریخ میں ہمیشہ ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل رہے گی، اس لیے کہ انیسویں صدی کی ابتدا میں یہ قدیم اور جدید ذہنی رجحانات کے درمیان نہ صرف ایک حد فاصل کا کام دیتی ہے بلکہ ہندوستانی ذہن کی مثبت اثر پذیری کا بڑا قابل قدر نمونہ پیش کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ راجہ رام موہن رائے کی کوششوں سے ملک کی وخاص طور پر بنگال کی رائے عامہ کافی حد تک متاثر ہوئی۔

تھوڑے عرصہ بعد حکومت کو تعلیمی پالیسی پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ہندوستانیوں کو کس قسم کی تعلیم دی جائے۔ گورنمنٹ نے مشرقی علوم کی تعلیم کے جو ادارے قائم کئے ان سے کس قسم کے تجربات حاصل ہوئے۔ ان مسائل پر سنجیدہ بحث کا آغاز ہوا۔ اس ضمن میں حکومت بنگال کے نام کورٹ آف ڈائرکٹرس کا مراسلہ مورخہ ۱۸ فروری سنہ ۱۸۲۴ء خاص طور پر قابل ذکر ہے (اس مراسلے کے بارے میں قیاس ہے کہ یہ جیمس مل (James Mill) کا مرتب کردہ ہے جو برطانوی ہند کی تاریخ پر ایک فلسفی مورخ کا درجہ رکھتے تھے اور اس وقت انڈیا آفس میں ملازم تھے)[2] اس میں بیان کیا گیا ہے کہ حکومت کی پالیسی کے دو مقاصد تھے۔ ایک یہ کہ مشرقی علوم کی ہمت افزائی سے دیسی باشندوں کے دلوں میں حکومت کی طرف سے خوشگوار جذبات پیدا ہوں۔ دوسرے یہ کہ علوم مفیدہ کی توسیع و اشاعت ہو۔ کورٹ نے حکومت بنگال کی رائے کا اعتراف کیا ہے جس میں کہا گیا تھا کہ پہلے مقصد میں کسی حد تک کامیابی ہوئی لیکن دوسرے میں تمام تر ناکامی۔ یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا گیا کہ دوسرے مقصد کی ناکامی اتنی شدید ہے کہ وہ شاید پہلی کامیابی کو بھی مشکوک کر دے، اس لیے اس کی ضرورت ہے کہ خالص مشرقی تعلیم کی بجائے اب علوم مفیدہ کی اشاعت کی جائے۔ اس مراسلے کا جواب حکومت بنگال کی طرف سے اس کی تعلیم عامہ کی کمیٹی نے دیا، جس میں مسائل معلومہ سے متعلق طویل بحث کی گئی ہے۔

---

[1] ایضاً ص ۲۸-۲۹ [2] ایضاً ص ۳۰ (فٹ نوٹ)

جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت کو اپنے تعلیمی فرائض کا زیادہ حقیقت پسندانہ احساس ہونے لگا تھا۔ باوجود ان تمام تبدیلیوں کے جو حالات و خیالات میں ہوئی تھیں، کمیٹی نے کلکتہ میں نو قائم کردہ سنسکرت کالج کی تکمیل کے منصوبے کا ارادہ کیا اور وویالہ یا ہندو کالج کی سرکاری سرپرستی قبول کی۔ کمیٹی نے دو اور نئے کالج قائم کئے، یعنی سنہ ۱۸۲۳ء میں آگرہ کالج اور سنہ ۱۸۲۹ء میں دہلی کالج۔ ان چاروں کالجوں میں انگریزی کلاسیں بھی کھولی گئیں۔ انگریزی تعلیم کو رائج کرنے کے سلسلے میں اب حکومت کی پالیسی میں فیصلہ کن فرق آچکا تھا جس کا واضح ثبوت کورٹ آف ڈائرکٹرز کے مراسلہ بنام حکومت بنگال مورخہ ۲۹ ستمبر سنہ ۱۸۳۰ء سے ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"... and it is of the greatest importance, that... the means should be afforded by the cultivating the English language and literature and acquiring a knowledge of European Science, and a familiarity with European ideas, in a higher degree than has yet been within their power.

"The documents now under review afford most gratifying proofs that a scheme of this extended nature would now be warmly welcome by the higher ranks of the Natives under your Government. Of the spirit which prevails in the down Provinces, the establishment and success of the Anglo Indian College is sufficient evidence. And we learn with extreme pleasure the opinion of the General Committee of Public Instruction, partly founded on the personal observation and enquiries of several of their members, that the time has arrived when English tuition will be widely acceptable to the Natives in the Upper Provinces".1

اس مراسلے میں حکومت بنگال کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنے زیر نگرانی کالجوں میں انگریزی زبان وادب اور جدید علوم کی انگریزی زبان میں تعلیم شروع کردے اور خاص طور سے سائنس کی درسی اور بنیادی کتابوں کی مشرقی زبان میں تراجم کرانے کی داغ بیل ڈالے جس سے باشندگان ہندوستان کے ذہن میں ان

۱۔ ایضاً ص ۴۴

علوم جدیدہ سے رغبت پیدا ہو۔ بالفاظ دیگر سنہ ۱۸۴۰ء کے آس پاس بنگال پریزیڈنسی کے وسیع علاقہ میں انگریزی حکومت کی تعلیمی پالیسی نے ایک واضح اور متعین صورت اختیار کرلی تھی اور اس پالیسی کو بڑے پیمانے پر نافذ کرنے کے کام کی ابتدا ہو چکی تھی جس کا مقصد مروجہ دیسی نظامہائے تعلیم کی جگہ ایک سرکاری انگریزی نظام تعلیم کو رائج کرنا تھا۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تعلیمی سرگرمیوں کا بھی تذکرہ کیا جائے جو مدراس اور بمبئی کی پریزیڈنسیوں میں انجام پا رہی تھیں۔ مدراس پریزیڈنسی میں ابتدا ہی سے سوسائٹی برائے اشاعت تعلیم مسیحی (Society for Promoting Christian Knowledge) کے تحت ایک پروٹسٹنٹ مشن نے مقامات مثلاً مدراس، کڈلور، تنجور اور ترچناپلی میں دیسی باشندوں کی تعلیم کیلیے اسکول قائم کر دیے تھے۔ اس کام کے لیے سوسائٹی کو مقامی حکومت نے اور سوسائٹی کے صدر دفتر لندن سے عطیات اور رقوم ملتی رہتی ہیں۔ سنہ ۱۸۸۷ء بورڈ آف ڈائرکٹرز نے سوسائٹی کو مستقل گرانٹ بشکل اراضی دینے کا فیصلہ کیا اور بطور اصول اس امر کو تسلیم کیا کہ ہر نئے اسکول کے کھولے جانے پر مقررہ گرانٹ حاصل کی جا سکتی ہے۔ انگریزی حکومت کی اس پالیسی کی بنا پر مدراس یونیورسٹی میں تیزی سے بکثرت مشنری اسکول قائم ہوئے۔ حکومت کی طرف سے براہ راست پہلا قدم ٹامس منرو (Thomas Munro) گورنر پریزیڈنسی نے ۲۵ جون سنہ ۱۸۲۲ء کو اٹھایا۔ جب انھوں نے ضلع کے کلکٹروں سے تفصیلی حالات معلوم کرنے کے لیے ایک گشتی چٹھی جاری کی۔ اس چٹھی کے جوابات کی روشنی میں انھوں نے ۱۰ مارچ سنہ ۱۸۲۶ء کو اس مسئلے پر مفصل نوٹ پیش کیا جسے مدراس کونسل نے معمولی ترمیموں کے بعد تسلیم کر لیا۔ اس کی بنا پر حکومت نے علاقے کے باشندوں کی تعلیم کو پورے طور پر اپنے ہاتھوں میں لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نوٹ سے گورنر منرو کی معاملہ فہمی اور روشن خیالی دونوں کا اظہار ہوتا ہے۔

"Whatever expense Government may incur in the education of the people, will be amply repaid by the improvement of the country, for the general diffusion of knowledge is inseparably followed by more orderly habits, by increasing industry, by a taste for the comforts of life, by exertion to acquire them, and by the growing prosperity of the people. It will be advisable to appoint a Committee of Public Instruction, in order to superintendent the establi-

shing of the public schools, to fix on the places most proper for them, and the books to be used in them, to ascertain in what manner the instruction of the Natives may be best promoted, and to report to Government the result of their enquiries on this important subject".1

اس فیصلے کی روشنی میں سنہ ۲۶-۱۸ء میں پریزیڈنسی میں کمیٹی برائے تعلیم عامہ (Committee of Public Instruction) قائم ہوگئی جو حکومت کی تعلیمی پالیسی کے باقاعدہ نفاذ کی ذمہ دار ہوئی۔ ابتدا میں اس نے صرف ابتدائی تعلیم کے انتظام سے سروکار رکھا۔ اس لیے کورٹ آف ڈائرکٹرز نے اپنے مراسلے بنام حکومت مدراس مورخہ ۲۹ ستمبر سنہ ۱۸۳۰ء کے ذریعہ پریزیڈنسی کی کمیٹی برائے تعلیم عامہ کو خاص ہدایات بھیجیں جن میں سب سے اہم ہدایت یہ تھی کہ کمپنی کو چاہیے کہ اعلیٰ انگریزی تعلیم کو فروغ دینے کے پروگرام کو آگے بڑھائے اور اونچے تعلیمی مراکز کا قیام عمل میں لائے۔²

ابتدا میں بمبئی یونیورسٹی میں بھی صورت حال کچھ مدراس ہی جیسی تھی یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کے پادری ملازمین نے کچھ اسکول قائم کیے تھے جو عام طور پر (Charity Schools) کے نام سے معروف تھے۔ ان اسکولوں کے علاوہ کوئی اور قابل ذکر تعلیمی سرگرمی نظر نہ آتی تھی۔ یونیورسٹی کی تعلیمی تاریخ میں پہلا قابل ذکر واقعہ ۲۹ جنوری سنہ ۱۸۱۵ء کو پیش آیا جب رضاکارانہ طور پر بمبئی کے چند شہریوں نے جمع ہو کر ایک انجمن ناداروں کی تعلیم (Society for Promoting the Education of the Poor within the Government of Bombay) کے لیے قائم کی۔ اس سوسائٹی نے بمبئی میں ایک منڈل اسکول کھولا اور سنہ ۱۹-۱۸۱۸ء میں شہر میں چار اور دیسی مدرسے قائم کیے اور پریزیڈنسی کے اور مقامات یعنی سورت، تنا اور بھروچ میں بھی اسکول قائم کیے۔ دوسرا قابل ذکر واقعہ سنہ ۱۸۲۱ء میں پونا میں ہندو کالج کا تھا جس کے لیے کمیٹی نے فوراً سوا پندرہ ہزار روپے کی سالانہ گرانٹ منظور کی۔ اس یونیورسٹی میں انگریزی حکومت کی باقاعدہ تعلیمی پالیسی کا آغاز ایم الفنسٹن (M. Elphinston) گورنر بمبئی کے نوٹ مورخہ ۱۳ دسمبر سنہ ۱۸۲۳ء سے ہوا۔ اس نوٹ کا مواد اور لہجہ کم و بیش وہی تھا جو گورنر منرو کی تحریر کا تھا سوا اس کے کہ الفنسٹن نے اسکولوں کی تنظیم اور نصاب کے بارے میں زیادہ

(1) ایضاً ص ۳۶ بحوالہ Printed Parliamentary Papers relating to the affairs of India. General Appendix I, Published (1832) pp. 506, 507.

² ایضاً ص ۳۶-۳۰

تفصیلی غور و فکر سے کام لیا تھا۔ نئے کالجوں میں انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے سلسلے میں حکومت کی ہمت افزائی کے ساتھ مقامی باشندوں کا جوش عمل بھی شامل تھا جس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ جب سنہ ۱۸۰۰ء میں الفنسٹن اپنے عہدے سے مستعفی ہونے والے تھے تو دیسی راجگان اور عمائدین نے ان کی خدمات کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے چندہ کیا جس سے ایک کثیر رقم تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار روپے کی جمع ہوئی۔ اس کے استعمال کے بارے میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس کی مستقل آمدنی سے تین پروفیسر شپ جو مخصوص طور پر انگریزی زبان اور دیگر یورپی فنون و سائنس کے لیے ہوں قائم کی جائیں جو بعد میں الفنسٹن پروفیسر شپ کے نام سے موسوم ہوئیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہالیان بمبئی پریزیڈنسی نے اصولاً اور عملاً انگریزی تعلیم کی اشاعت و ترویج کو پورے جوش اور جذبے کے ساتھ اپنا لیا تھا لیکن اس دوران یعنی مارچ سنہ ۱۸۲۸ء میں حکومت کے اعلیٰ ترین حلقوں میں یعنی جان مالکم (John Malcom) گورنر بمبئی اور فرانسس وارڈن (Francis Warden) رکن کونسل کے مابین ایک اہم بحث شروع ہوگئی۔ وارڈن انگریزی زبان میں تعلیم دینے کے حامی تھے، دوسری طرف گورنر مالکم دیسی زبان میں تعلیم دینے کی وکالت کرتے تھے۔ بالآخر اس بحث کا فیصلہ کورٹ آف ڈائرکٹرز کے مراسلہ بنام حکومت بمبئی مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۸۲۹ء کے مطابق انگریزی زبان میں تعلیم دینے کے حق میں ہوا۔ اس مراسلے میں بنگال پریزیڈنسی میں انگریزی تعلیم کی اشاعت میں جو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی تھی اس کو بطور مثال پیش کیا گیا تھا۔ اس فیصلے کا فوری نتیجہ بمبئی میں الفنسٹن انسٹی ٹیوشن کے قیام کی تجویز میں ظاہر ہوا۔ چنانچہ نومبر سنہ ۱۸۳۰ء میں اس ادارے کے قیام کے لیے باشندگان بمبئی نے دو لاکھ پندرہ ہزار روپے چندے سے جمع کر لیا جس کو حکومت نے بہت پسند کیا اور ادارے کو ہر قسم کی مالی امداد دینے کا فیصلہ کیا۔[1]

سطور بالا سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۳۰ء کے لگ بھگ تینوں پریزیڈنسیوں میں حکومت نے ممتاز ہندوستانی شہریوں نے انگریزی تعلیم کے حق میں فیصلہ کر لیا تھا۔ اس طور پر ملک کے ایک بڑے حصے میں ایک نئی اور منظم تعلیمی پالیسی کا آغاز ہو چکا تھا۔ درحقیقت سنہ ۱۸۳۰ء تا سنہ ۱۸۳۵ء کا زمانہ ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کے پہلے چارٹر کی میعاد ۱۰ اپریل سنہ ۱۸۳۴ء کو ختم ہوتی تھی اور کمپنی کے نئے چارٹر پر بحث کا آغاز ہو چکا تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ نے کمپنی کے چارٹر کی

---

[1] ایضاً ص ۳۶۔ ۳۷

میعاد میں ۳۰ اپریل سنہ ۱۸۵۴ء تک توسیع کرنے کا ایکٹ ۲۸ اگست ۱۸۳۳ء کو پاس کر دیا۔ اس ایکٹ کے تحت ہندوستان میں انگریزی حکومت کی انتظامی مشینری میں بہت سی تبدیلیاں عمل میں آئیں اور اسی ایکٹ کی رو سے لارڈ میکالے کو گورنر جنرل کی کونسل کا ممبر قانون مقرر کیا گیا۔ اس تقرر کا نقش سرکاری تعلیمی پالیسی پر بہت گہرا اثر پڑا۔ میکالے کے تصورات کو تقریباً حکومت کے تعلیمی فلسفے کا درجہ حاصل ہوا۔ ہندوستان میں آئندہ انگریزی تعمیر کا نقشہ میکالے کے اس سرکاری تجویز (Minute) کے مطابق بنا جو انھوں نے ۲ فروری سنہ ۱۸۳۵ء کو پیش کیا۔ میکالے کی تجویز انیسویں صدی کے برطانوی ذہن کی بڑی واضح عکاسی کرتی ہے۔ اس وقت برطانیہ کو دنیا میں سب سے زیادہ سیاسی اقتدار حاصل تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جزیرے اور خالص یورپی نو آبادیوں کو چھوڑ کر جہاں کہیں بھی ان کی حکومت ہے وہاں ان کی حیثیت غیر مہذب اقوام کو مہذب بنانے کی تدابیر سے عبارت تھی۔ ہندوستان جو مختلف العقائد نسل و روایات کا گہوارہ اور محکوم ملک تھا وہاں اس قسم کی کوشش اور زیادہ ضروری تھی جو ایک طویل مدت تک برطانوی اقتدار کو محفوظ و مستحکم کرنے اور مغربی مسیحی تہذیب کو ہندوستانی ذہن میں نفوذ کرنے میں مدد دے۔ میکالے کے نزدیک ان مقاصد کے حصول کے لیے ایک موثر انگریزی نظام تعلیم کا نفاذ از حد ضروری تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے ان کی آمد سے پیشتر اس بارے میں راہ بہت کچھ ہموار ہو چکی تھی۔ اس لیے ان کو اپنے پروگرام کے نفاذ کے لیے سازگار فضا ملی۔ یہ بیان ملاحظہ ہو:

"How stands the case? We have to educate People who cannot at present be educated by means of their mother tongue. We must teach them some foreign language. The claims of our own language it is hardly necessary to recapitulate. It stands prominent even among the languages of the west... In India English is the language spoken by the ruling class. It is spoken by the higher class of Natives at the seats of Government... Whether we look at the intrinsic value of our literature or at the strongest reason to think that, of all foreign tongues, the English tongue is that which should be the most useful to our native subjects".1

۱؎ ایضاً ص ۵۰ بحوالہ Trevelyan's Life of Macauly, Edition 1881 p.90.

آگے چل کر ایک مثال دیتے ہوئے انگریزی تعلیم کی مکمل کامیابی پر اپنے یقین کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے :

"The language of western Europe civilized Russia, I cannot doubt that they will do for the Hindoo what they have done for the Tartar".1

میکالے کے اس نوٹ سے ولیم بنٹک (William Bantick) گورنر جنرل نے اتفاق کیا اور کونسل نے ، رمارچ ۱۸۳۵ء کو اس کی تعمیل میں ایک رزولیشن پاس کر دیا جس سے اس مسئلے کا واضح فیصلہ ہو گیا۔ رزولیشن کی خاص مدیں یہ تھیں :

(الف) برطانوی حکومت کو دیسی باشندوں میں انگریزی تعلیم کی اشاعت پر پوری توجہ دینا چاہیے اور تعلیم کے لیے جو فنڈ ہے آئندہ اس کا استعمال کلیۃً انگریزی تعلیم کی ترویج پر ہونا چاہیے۔

(ب) حکومت ان مشرقی اداروں کو بند تو نہیں کرے گی جو پہلے سے قائم ہیں لیکن اب مزید ایسے ادارے کھولنے پر پابندی ہوگی۔ بہرصورت اس تعلیم کے لیے طلبا کو جو وظائف دیے جاتے تھے وہ بند کر دیے جائیں گے۔ مشرقی علوم کے کسی پروفیسر کی جگہ خالی ہوگی تو اس کی اطلاع کمیٹی کو دی جائے گی جو حالات پر غور کر کے یہ طے کرے گی کہ اس جگہ کو قائم رکھا جائے یا نہیں۔

(ج) مشرقی علوم کی کتابوں پر ایک کثیر رقم صرف ہو چکی تھی اس کے پیش نظر حکومت فیصلہ کرتی ہے کہ آئندہ سے تعلیمی فنڈ میں اس کی کوئی گنجائش نہ رکھی جائے گی۔

(د) متذکرہ اصلاحات سے جو رقم بچے گی اس کو تمام تر یورپی ادب وفنون اور سائنس کی بزبان انگریزی اشاعت پر صرف کیا جائے گا۔ اس بنا پر حکومت کمیٹی کو ہدایت کرتی ہے کہ ان تمام امور پر جلد از جلد عملدرآمد کے لیے فی الفور منصوبے پیش کرے۔[۱]

ظاہر ہے حکومت کا یہ فیصلہ ایک اچانک قدم نہیں تھا۔ ہندوستانی شہریوں کی ایک بڑی تعداد یعنی ہندوؤں نے انگریزی تعلیم میں، جیسا کہ سطور بالا میں بیان ہو چکا ہے گہری دلچسپی لینا شروع کر دیا تھا اور حکومت ان کے بدلتے ہوئے فکر و ذہن سے اثر پذیر ہو رہی تھی۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انیسویں صدی کی ابتدا ہی سے انھوں نے انگریزی حکومت اور انگریزی تعلیم کی تائید شروع کر دی تھی۔

---

[۱] ایضاً ص ۱۵ حوالہ سابق

______ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ حکومت نے انگریزی نظام تعلیم کو نافذ کرنے کا فیصلہ کیا تو اس فیصلے میں ان کی خواہش اور منظوری دونوں شامل تھے۔ بہر حال انگریزوں کی تعلیمی پالیسی بنیادی طور پر گہرے اور دور رس سیاسی مقاصد رکھتی تھی۔ اور در حقیقت وسیلہ تھی ہندوستانی ذہن کو مغربی تہذیب و تمدن سے متاثر و منقلب کر دینے کا۔ بظاہر مذہبی تعلیم کو سرکاری نظام تعلیم سے آزاد رکھا گیا لیکن اس سے کیا توقعات تھیں اور ان کے پورے ہونے کے کیا امکانات تھے اس کے بارے میں یہ رائیں قابل توجہ ہیں:

"... although Christianity is entirely excluded from the Government Institutions, yet the instruction which is given in them has had the effect of raising the Natives infinitely above their own creed. There are few of those who have received a complete education at the Government Institutions, who do not hold the doctrines and principles of Hindoism in the most thorough contempt... although unaccompanied with religious instruction or instruction on the truths of Christianity, has produced the great effect of shaking the fabric of Hindoism to its very foundation, and that in the indirect result which has followed exertions of the Government in the cause of Education is highly satisfactory".1

سنہ ۱۸۵۷ء سے پہلے سرکاری تعلیمی پالیسی کے پہلے دور کی تکمیل کورٹ آف ڈائرکٹرز کے مراسلہ بنام کمیٹی مورخہ ۱۹ جولائی سنہ ۱۸۵۴ء کے ذریعہ ہوئی۔ یہ مراسلہ چارلس اوڈز (Charles Woods) کا مراسلہ تعلیم کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے مطابق ہندوستان میں برطانوی نظام تعلیم ایسی مستقل بنیادوں پر قائم ہوا جو معمولی رد و بدل کے ساتھ ان کے بقیہ دور حکومت میں نافذ رہا۔ یہ مراسلہ حسب ذیل جامع تجاویز پر مشتمل تھا:[2]

(الف) تعلیمی انتظامات کے لیے ایک علیحدہ مستقل ڈپارٹمنٹ کا قیام (ب) استادوں کی تربیت کے لیے ٹریننگ کالجوں کا قیام (ج) پریزیڈنسیوں کے صدر مقامات پر یونیورسٹیوں کا قیام

---

[1] ایضاً ص ٦٦ بحوالہ Marshman; Printed Parliamentary Paper (1853);.. Sixth Report of the Select Committee.

[2] ایضاً ص ۸۵

(د) قائم شدہ اسکولوں اور کالجوں کی نگرانی و نگہداشت اور ان کی تعداد کو بڑھانا۔

(ہ) نئے مڈل اسکول کا قیام۔ (و) پرائمری تعلیم کے لیے دیسی زبان کے اسکولوں کا قیام۔

(ز) امدادی رقوم (Grant in aid) کی تقسیم کے لیے مناسب نظام

اس مراسلے میں حکومت کی ہندوستانیوں کی اعلیٰ تعلیم کے اہم مقاصد کی ان الفاظ میں ترجمانی کی گئی ہے :

"... We have, by the establishment and support of the olleges, pointed out the manner in which a liberal educa-ion is to be obtained, and assisted them to a very consi-erable extent from the public funds. In addition to this, e are now prepared to give, by sanctioning the establis-ment of the wishes, full development to the highest course f education to which the Natives of India, or of any other ountry, can aspire and besides, by the division of Univer-ity degree and distinctions into different branches, the xertions of highly educated men will be directed to the tudies which are necessary to success in various active rofessions of life. We shall, therefore, have done as much s Government can do to place the benefits of education lainly and practically before the higher classes in India".1

حکومت نے اپنی اس پالیسی کی پیروی بڑی تیزی سے کی اور سنہ ۱۸۵۷ء کی سیاسی اور فوجی دقتوں اور عام افراتفری و انتشار کے باوجود، اسی سال کلکتہ، مدراس اور بمبئی کی یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آیا۔ ان یونیورسٹیوں کو یونیورسٹی آف لندن کے طرز پر قائم کیا گیا اور ان علاقوں کے کالجوں کا ان سے الحاق کردیا گیا۔ بعد کی کم و بیش تمام دوسری سرکاری یونیورسٹیاں انھیں یونیورسٹیوں کے نمونے پر قائم ہوئیں۔

یہ ایک اجمالی خاکہ ہے انگریزی حکومت کی اس وقت تک کی تعلیمی پالیسی کا جب سرسید نے اپنے تعلیمی کاموں کی ابتدا کی۔ اس موقع پر ایک خاص امر قابل توجہ یہ ہے کہ نئی سرکاری تعلیمی پالیسی سے مسلمانوں نے

۱۔ ایضاً ص ۸۶ بحوالہ ... Report of the Indian Education Commission (1882) p.24.

بحیثیت جماعت کوئی قابل ذکر دلچسپی نہیں لی تھی۔ یہی سبب ہے کہ وہ اس کی تشکیل میں کوئی موثر حصہ لینے سے قاصر رہے اور ایک پسماندہ اور بے لیاقت حیثیت اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ بڑے تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں نے تعلیمی مسائل سے اتنی بے تعلقی کا اظہار کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے سیاسی زوال کا اصلی سبب وہ ذہنی زوال تھا جو تعلیم کی طرف سے بے توجہی کے باعث ان کی معاشرے میں عرصے سے رونما تھا۔
اس میں شک نہیں کہ مسلم دور حکومت میں ہندوستان میں تہذیب و دانش کی ایک عظیم اور قابل قدر روایت قائم ہوئی جس کا اثر و احترام ہمہ گیر تھا اور جس سے ایک مہذب معاشرہ وجود میں آیا۔ لیکن فی نفسہٖ تعلیم کے میدان میں شخصی کوششوں کو جتنا دخل تھا اتنا اجتماعی یا ریاستی ارادے اور کوشش کو نہ تھا۔ مسلم حکومتوں یا سلاطین نے علما، ادبا، اطبا، شعرا اور دوسرے ائمہ فن اور ملک میں بے شمار مکتبوں، خانقاہوں اور علمی اداروں کی سرپرستی کی اور ان کو بیش بہا مدد دی۔ اور اس طور پر ایک وقیع ہند اسلامی تہذیب کی تعمیر کی جس نے مجموعی طور پر برصغیر میں صحت مند ہم آہنگ اور انسانیت نواز تحریکوں کی آبیاری کی لیکن ان سب کوششوں میں ایک قابل لحاظ کمی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ وقت آجانے پر انھوں نے دنیوی تعلیم سے جو تفہیم و تسخیر فطرت سے متعلق ہے اور جو مسلسل منظم اجتماعی عملی و ذہنی کاوش چاہتی ہے غفلت برتی۔ اس طور پر ایک اہم دور میں ہندوستانی تاریخ کے ترقی پذیر عمل میں فعال عنصر ہونے کے بجائے ایک مضمحل تشتے بن کر رہ گئے۔ اس موقع پر کسی نظری بحث کو چھیڑنا مقصود نہیں ہے صرف ان حقائق کی طرف اشارہ کرنا ہے جن سے ہندوستانی مسلمان اپنی تعلیم کے سلسلے میں انیسویں صدی کے نصف آخر میں دوچار تھے اور جن کی رہنمائی اور قیادت کا فریضہ تاریخ نے سرسید کو سونپا۔ علی گڑھ کے تعلیمی پروگرام کا جائزہ لینے سے قبل مناسب ہوگا اگر ہم تعلیم کے میدان میں اس وقت کے مسلمانوں کی پسماندگی سے متعلق مختصر مگر حقیقت آمیز معلومات حاصل کرلیں۔

ہندوستان میں اعلیٰ مغربی تعلیم کی اشاعت سے مسلمان بالعموم کس حد تک مستفید تھے اس کو واضح کرنے کے لیے ان اعداد و شمار پر نظر رکھنا کارآمد ہوگا جو اصلاً ایک تقابلی مطالعے پر مبنی ہیں۔ سنہ ۱۸۸۱ء کے لگ بھگ برطانوی ہند میں دو بڑی آبادیوں یعنی ہندو اور مسلمانوں کی مجموعی تعداد کے پیش نظر ان کا فیصدی تناسب یہ تھا۔

ہندو ۶۶ء۲۵، مسلمان ۲۲ء۷۵ بالفاظ دیگر برطانوی ہند میں مسلم ہندو تناسب ۲۲ء۷۵/۶۶ء۲۵ ۱ء۳۱ یا ۳/۱ء۰ یعنی مسلم آبادی ایک چوتھائی سے زیادہ تھی لیکن ہندوؤں کی تعداد سے ایک تہائی سے کچھ کم تھی۔[1]

---

(۱) ایضاً ص ۵۹

اس کو مدنظر رکھتے ہوئے اعلیٰ انگریزی تعلیم کے اداروں سے فارغ التحصیل ہونے والے ہندو مسلمان طلباء کے ان اعداد و شمار کو دیکھئے جو ہندوستانی یونیورسٹیوں کی مختلف فیکلٹیوں (آرٹس، لا، میڈیسن، سرجری اور انجینئرنگ) سے نکلے ہوئے ہندو اور مسلمان گریجوئیٹوں کی اس تعداد پر مبنی ہیں جو چھتیس "۳۶" سال یعنی سنہ ۱۸۵۸ء تا سنہ ۱۸۹۳ء کی مدت پر محیط ہیں۔" پہلے چھ سال (سنہ ۱۸۵۸ء تا سنہ ۱۸۶۳ء) میں صورت حال یہ تھی کہ صرف ۲ مسلمانوں نے یونیورسٹی ڈگری حاصل کی جب کہ ہندوؤں کی تعداد ۱۸۷ تھی۔ دوسرے چھ سال میں مسلمان ۱۶ ہندو ۸۴۸، تیسرے میں مسلمان ۲۶ ہندو ۱۶۵۲، چوتھے میں مسلمان ۳۱ ہندو ۲۰۸۶ یا یوں سمجھئے کہ یونیورسٹیوں کے قیام سے پہلے چوبیس سال میں مسلمان گریجوئیٹوں کی کل تعداد ۷۵ تھی جب کہ صرف پہلے چھ سال میں ہندو گریجوئیٹوں کی تعداد ۱۸۷ تھی اور چوبیس سال میں ۴۷۷۲۔ اس عرصے میں کسی وقت بھی مسلمانوں کا تناسب گریجوئیٹوں کی کل تعداد میں ۱٫۸ فی صد سے زیادہ نہیں رہا۔[1] اس صورت حال کے بارے میں سید محمود کی یہ رائے بالکل صحیح ہے:

"... a state of things so unsatisfactory as to satisfy the observation that during a quarter of a century succeeding the establishment of the Indian Universities, the Mohammadans remained almost totally dormant and oblivious of their interests, so far as high English education was concerned".2

اگلے چھ سال (سنہ ۱۸۸۲ء تا سنہ ۱۸۸۷ء) میں حالات کے قدرے بہتر ہونے کا پتہ چلتا ہے اس مدت میں مسلمان گریجوئیٹوں کی تعداد ۱۵۴ ہوگئی اور ہندوؤں کی ۴۲۲۰۔ اس طرح تناسب ۳٫۶ ہوگیا۔ آخری چھ سال (۱۸۸۸ء تا سنہ ۱۸۹۳ء) میں مسلمانوں کی تعداد ۳۱۲ اور ہندوؤں کی ۶۰۸۱ تھی۔[3] سید محمود نے متعدد جدول اور نقشوں کی مدد سے اعلیٰ تعلیم میں مسلمانوں کی پسماندگی کی طرح طرح سے وضاحت کی ہے جس سے اس وقت کی ان کی حالت کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"... the backwardness of Mohammadans is nine times as great as their success, they having fallen 90 p.c. short of the standard which they should have achieved if the progress of high education among them had been proportionately as great as among the Hindoos. To put the idea in a more

---

[1] ایضاً ص ۱۰۵ [2] ایضاً ص ۱۸۵، ۱۸۶ [3] ایضاً ص ۱۸۶

concrete form, the condition of high English Education among Mohammadans may be compared to a bank of which the assets are 546 and the debts 4,895. To put the matter shortly, the Mohammadans of India may be said to be suffering from all the evils of bankruptcy in the matter of high Education".[1]

سید محمود نے اس رائے کا اظہار ان تمام سرکاری تجاویز اور کوششوں کے مطالعہ کے بعد کیا جو وقتاً فوقتاً مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی اشاعت کے سلسلے میں کی گئیں۔ بالفاظ دیگر اعلیٰ انگریزی تعلیم کے میدان میں مسلمانوں کی پسماندگی قومی زندگی کا ایک اہم مسئلہ بن گئی تھی جس میں ملک کے مستقبل کے لیے ناقابل اندازہ امکانات، اچھے کم برے زیادہ مضمر تھے۔ ان حالات میں علی گڑھ کے تعلیمی پروگرام سے کس طرح ایک مثبت عمل کا آغاز ہوا جو بعد میں ان تمام تعلیمی و تہذیبی کوششوں اور سرگرمیوں کا سرچشمہ ثابت ہوا جنھوں نے انیسویں صدی کے ربع آخر میں مسلمانوں کی تہذیب و تعلیم کو بالخصوص اور ملک کی تہذیبی و تعلیمی زندگی کو بالعموم گہرے طور پر متاثر کیا۔ آئندہ اوراق میں گفتگو کا یہی موضوع ہوگا۔

○

کالج میں جو تعلیمی و تہذیبی فضا قائم ہوئی اس میں تجربہ کار مخلص اور فرض شناس انگریز اسٹاف کی کوششوں کو یقیناً بڑا دخل تھا لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ ان میں سے بیشتر بالخصوص تھیوڈر بک نے کالج میں اپنی اس حیثیت سے مسلمانوں کی سیاسی زندگی کو سرکاری مفاد و مصالح کے پیش نظر ایک نئی سمت دینے میں خاصی تائید حاصل کی چنانچہ یہ خیال ایک حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کامیابی کا بڑا سبب یہ تھا کہ آخر میں وہ اپنے بعض خیالات کے لیے سر سید کی تائید حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے[2] لیکن اس مسئلے پر ابھی تحقیق کی ضرورت ہے اس لیے کہ اس وقت کی پیچیدہ صورت حال کے بارے میں متضاد بیانات

---

[1] ایضاً ص ۱۹۱

[2] مسلمانوں کا روشن مستقبل باب ہشتم ص ۲۷۵-۳۶۵

ملتے ہیں اور کسی قطعی نتیجہ پر پہنچنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ بریں خالص سیاسی پہلو ہماری بحث کا موضوع بھی نہیں ہیں۔ اصل بحث تو اس عام ماحول اور تربیت سے ہے جو طالب علموں کو کالج میں میسر تھی اور جس کا نہایت قابل قدر اثر ان نوجوان نسلوں پر پڑا جو یہاں پروان چڑھیں، کالج کی اقامتی زندگی کو دلچسپ بامعنی پرکشش اور بارآور بنانے کے لیے جو غیر معمولی پرخلوص توجہ و محنت کی گئی اور اس میں جو کامیابی حاصل ہوئی وہ بے مثل ہے۔

ام اے او کالج میں طالب علموں کی تربیت و تہذیب کے لیے کیا اقدامات کیے گئے اس کا ذکر حالی یوں کرتے ہیں ۔

"سب سے زیادہ ضرورت مسلمانوں کی موجودہ اور آئندہ نسلوں سے اتفاق و یک جہتی و قومی ہمدردی پیدا کرنے کی ہے..... ان میں اتفاق پیدا ہونے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ ان کی نسلیں اتفاق کے سائے میں نشو و نما پائیں اور ایک مدت تک ایسی سوسائٹی میں بسر کریں جہاں مختلف خاندانوں مختلف صوبوں اور مختلف مذہبوں کے لڑکے ایک ہال میں کھانا کھائیں، ایک مسجد میں نماز پڑھیں، ایک فیلڈ میں مردانہ کھیل کھیلیں اور ایک میدان میں گھوڑے دوڑائیں، ایک کلب میں ڈبیٹ کریں ایک کالج میں پڑھیں اور ایک احاطہ میں دن رات سگے بھائیوں کی طرح شیر و شکر ہو کر رہیں اور اس طرح اتفاق کی حلاوت ماں کے دودھ کی طرح ان کی رگ و پے میں سرایت کر جائے۔

ریاضت جسمانی کا سامان محمڈن کالج میں ہندوستان کے تمام کالجوں سے زیادہ مہیا کیا گیا ہے .... اس لیے اس کا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے کہ جو طالب علم یہاں سے نکلیں وہ قوم میں مستعدی اور جفاکشی کی مثال ہوں اور سستی اور کاہلی جو مسلمانوں کی ایک قومی خصلت سمجھی جانے لگی ہے بجائے اس کے وہ ان میں چستی و چالاکی کی بنیاد ڈالیں ..... وہ ہندوستان کے عام خیالات کے برخلاف جہاں ایک شخص کا سپاہی اور عالم ہونا اجتماعِ ضدین سمجھا جاتا ہے، تعلیم یافتہ بھی ہوں اور سپاہی بھی... اور حق یہ ہے کہ محض تعلیم سے کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ اس میں دلیری اور مستعدی کا عنصر پیدا نہ ہو..... غرض ہر ایک کام کے لیے خاص اوقات مقرر ہیں جن میں بیماری کے سوا کبھی فرق نہیں آتا۔[1] تمام تفصیلات بیان کے بعد یہ اجمالی رائے قائم کرتے ہیں۔

"یہ سچ ہے کہ انگلستان کے جن کالجوں کی تقلید سے اس کالج میں تربیت کا مذکورہ بالا سامان مہیا

---

[1] حیات جاوید حوالہ سابق ۲۷۲ تا ۲۷۷

کیا گیا ہے ان کے مقابلہ میں اس کالج کو شکل سے ایک خاکہ یا ایک ادھورا نمونہ ان کالجوں کا کہا جا سکتا ہے لیکن اس کے ساتھ جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ انگلستان کے مذکورہ بالا کالج کتنی کتنی مدت میں موجودہ حالت تک پہنچے ہیں تو جس حد تک علی گڑھ محمڈن کالج بیس بائیس برس کے عرصہ میں پہنچ گیا ہے۔ اس سے کچھ کم تعجب نہیں ہوتا۔ انگلستان کے بڑے بڑے نامور کالج اور یونیورسٹیاں جو آج تمام یورپ میں مشہور و معروف ہیں کئی کئی سو برس تک نہایت گمنامی اور پستی کی حالت میں رہی ہیں اور جس طرح بتدریج قوم کی تعلیم بڑھتی گئی اسی طرح آہستہ آہستہ ان کی حالت ترقی کرتی گئی۔ پس ہم کو اس کالج کی موجودہ حالت پر نظر نہیں کرنی چاہیے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ جن اصول پر وہ قائم کیا گیا اگر انہیں اصول کے موافق ترقی کرتا چلا گیا تو پچاس ساٹھ ہی برس میں کس درجہ پر پہنچ جائے گا۔[1]

سرسید نے طالب علموں کی اس ذہنی اور جسمانی تربیت کے اہم مسئلے پر گہرے غور و فکر سے کام لیا تھا اور کالج کے قائم ہونے سے پہلے اور اس کے قیام کے بعد اس کی جزئیات تک سے غیر معمولی دلچسپی لی۔ اس کا بڑا سبب وہ اثرات تھے جو ان کے ذہن پر انگلستان کے اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیر تربیت یا تربیت یافتہ طالب علموں کو دیکھنے کے بعد مرتب ہوئے تھے۔ اس نے ان پر یہ حقیقت پورے طور پر آشکار کر دی تھی کہ قوم کی اعلیٰ اور ہمہ جہتی ترقی و نشو و نما کے لیے اعلیٰ تعلیم سے بہرہ مند اور اعلیٰ اخلاقی صفات سے متصف نوجوانوں کی ایک معتدبہ تعداد کی مستقل و غیر منقطع موجودگی نہایت ضروری ہے۔ نوجوانوں کی تربیت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"...... جس کو ہم تربیت کہتے ہیں اور جو قوم کو قوم بننے کے لیے ایسی ہے جیسے جان بدن کے لیے اور بغیر اس کے قوم کا قوم بننا محالات سے ہے۔"[2] اس سلسلے میں تفصیل سے گفتگو کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

"پھر اس سب کے ساتھ اس کا خیال رہے کہ کھیل کود اور ورزشیں تعلیم میں اور لکھنے پڑھنے میں حارج نہ ہوں بلکہ اس کے مدد و معاون ہوں۔ تعلیم کے ایسے سامان مہیا کرنے چاہئیں جن سے ان کو شوق اور رغبت اور ان کے دل کو خوشی ہو اور اس میں شریک ہونے کا اور جو کچھ انھوں نے پڑھا ہے اس کو ترقی دینے کا ان کو شوق پیدا ہو۔ درخت کو صرف پانی ہی دے دینا کافی نہیں ہے جب تک کہ اس کے پتے اور ٹہنیاں ہوا کے جھونکوں سے ہلتی جلتی اور لہلہاتی ہوائے خیط کو اور اس کے اجزا کو جذب کرتی نہ رہیں کبھی پھول پھل نہیں

---

[1] حیات جاوید بحوالہ سابق ص ۲۶۱ [2] مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز بحوالہ سابق ص ۲۹۲

لا سکتے۔"[1] آخر میں تربیت کا کتنا روشن اور وسیع تصور پیش کیا ہے۔

"اگر ہم اپنی قوم کے نوجوانوں کی نسبت چاہتے ہیں کہ نیکی اور نیک راہ اختیار کریں تو یہ مطلب تاکید و تنبیہہ سے اور ان پر قیود مالا یطاق کے لگانے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ پروفیسر مارسن کا نہایت عمدہ قول ہے کہ کوئی شخص اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ہزار نوجوانوں کے خیالات و خواہشوں کو اپنی مرضی کا بالکل تابع کرے۔ اس طرح سے اپنا مطیع نہیں کر سکتے جس طرح ایک فوجی افسر قواعد داں سپاہیوں کی ایک جماعت کو اپنے حکم کا تابع رکھتا ہے۔ اس لیے یہ ہماری خواہش ہونی چاہیے کہ ہم اپنے طلبا کے واسطے ایسے اسباب مہیا کر دیں اور ان کی تعلیم و تربیت کے لیے ایسی عمدہ صحبت پیدا کر دیں جن سے ان میں نیکی کی طرف رغبت اور برائی سے نفرت پیدا ہوتی رہے۔ پس ہم کو اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے اور ان کے انسان بنانے کے لیے اور اپنی قوم کو قوم بنانے کے لیے ان کو دین و دنیا دونوں مقرر کرنے کے لیے ایسے سامانوں کا جمع کرنا اور اس طرح پر ان کو تربیت دینا لازم و فرض ہے۔"[2]

اس موضوع پر ان کے خیالات کی بڑی اچھی ترجمانی اس لکچر سے ہوتی ہے جو انھوں نے ۷ر دسمبر ۱۸۹۴ء کو مدرسۃ العلوم کے طالب علموں کو دیا۔ لکچر کا آغاز اس دلنشیں انداز سے ہوا۔

"...... آج میں تم کو اس کتاب سے سبق دینا چاہتا ہوں جو نہ کاغذ پر لکھی ہوئی ہے نہ کسی پریس کی چھپی ہوئی ہے نہ کسی مصنف کی بنائی ہوئی ہے بلکہ قدرت نے اپنے کامل اور فیاض ہاتھوں سے اس کو بنایا ہے۔ اس کے حروف بہت پرکار اور مجسم ہیں مگر ان کا دیکھنا پڑھنا کس قدر مشکل ہے...... اس کے پڑھنے کے لیے اس کے کھولنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تمھاری آنکھ کے سامنے ہر وقت کھلی ہوئی ہے۔ اس کتاب کو تم اپنے کالج کی لائبریری یا اپنی میز کی کتابوں میں مت ڈھونڈو۔ وہ ہر وقت تمہارے پاس موجود ہے۔ وہ کتاب کیا ہے۔ خود تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا اس کالج میں ایک جگہ جمع ہونا ہے۔ اے عزیزو اس کتاب کا نام ہے کالج لیف یانی زندگی یہی اصلی کتاب ہے اور اس کا پڑھنا اور اس کا سمجھنا اصلی فائدہ اور اصلی مقصود زندگی کا اور اس کالج کا ہے۔"[3] اقامتی زندگی کے مقاصد اور اس کے قواعد و قوانین کی وضاحت کے بعد طالب علموں کو یہ مشورہ دیا ہے۔

بورڈنگ ہاؤس ایک کل ہے قوم کو قوم بنانے کی۔ اگر اس کے پرزے درستی سے چلتے رہیں تو وہ اپنا کام کرے گی ورنہ کسی کام کی نہیں۔ تم اس کل کے پرزے ہو اس لیے اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہو۔

---

[1] مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز، حوالہ سابق ص ۲۹۱ [2] ایضاً ص ۲۵۳ [3] ۵۲۵-۵۲۴

تمہارا درست اور کام کے قابل بنا رہنا سب سے مقدم ہے..... یہ سب باتیں اس لیے ہیں کہ آپس میں محبت اور دوستی ایک دوسرے کی ہمدردی پیدا ہو جو بنیاد قوم کے قوم بننے کی ہے۔ پھر اگر تم نے اس میں قصور کیا تو تمام قوم کا مظلمہ تمہارے سر ہوگا اور تم پر افسوس ہوگا کہ جس عمارت کی تم خود اینٹ ہو اس عمارت کو تم برباد کرنا چاہتے ہو۔[1]

اس لکچر میں وہ دلچسپ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر مولوی عبدالحق نے کیا ہے یعنی سرسید کو علم ہو گیا تھا کہ انگریزی اسٹاف خاص طور سے پرنسپل بیک اس یونیفارم کو نہیں پسند کرتے جو سرسید نے تجویز کیا تھا یعنی ترکی ٹوپی اور کوٹ اور انگلش بوٹ۔ اس بارے میں سرسید یوں گویا ہوئے "ہندوستان میں بعض کوتاہ نظر مغرور اور اور کم ہمت انگریز جو ہندوستانیوں کو ذلیل رکھنا چاہتے ہیں یا ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ایسی ٹوپی کوٹ اور بوٹ پہنے ہوئے جانے پر اعتراض کرتے ہیں"۔ باقی آنکھوں دیکھا یہ حال تھا "اس آخری فقرے پر زور سے چیرز ہوئیں کہ سارا ہال گونج اٹھا مسٹر بیک کا رنگ فق ہو گیا اور منہ پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں۔ اس ہال میں بیسیوں کیا سینکڑوں جلسے ہوئے ہیں اور بعض بڑے اہتمام اور شان و شوکت سے ہوئے لیکن کسی جلسے میں اس جوش و خروش اور زور سے تالیاں نہیں پٹی گئیں جیسی اس موقع پر۔ اس کے بعد یہ فرمایا:

جو انگریز ان باتوں میں تکرار کرتے ہیں میرے یقین میں وہ اس امر کے ماسٹر ہیں کہ کبھی ہندوستانیوں اور انگریزوں میں دوستی و محبت و اخلاص کا برتاؤ نہ ہو۔ باوجود ان کوششوں کے جو میں نے مسلمانوں اور انگریزوں میں اتحاد اور دوستی پیدا کرنے کی کی ہیں ایسے انگریز سے جو باتوں میں کاوش کرتا ہو میں خود کبھی اس سے نہیں ملتا اور دوستی کرنا نہیں چاہتا۔[2]

کالج میں ہونہار طالب علموں کے وظائف کے لیے خاص اہتمام کیا گیا اور سرسید نے خود اس سلسلہ میں پوری قوم کو بڑی دلسوزی کے ساتھ توجہ دلائی۔ اس بارہ...... خاص میں ان کے خیالات سے پوری واقفیت حاصل کیے بغیر بعض صاحبوں نے کالج پر یہ الزام لگایا کہ وہ صرف دولتمندوں کے لڑکوں کے لیے تعلیمی سہولت فراہم کرتا تھا اس ضمن میں سرسید کی یہ رائے خاص طور پر قابل توجہ ہے۔

سب سے بڑی ضرورت اس وقت قوم کی بھلائی کے لیے طالب علموں کو اخراجات تعلیم میں وظیفوں یا اسکالرشپوں سے امداد کرنا ہے۔ امیروں کے لڑکوں سے بہت کم توقع ہے کہ وہ باعتبار علم و فضل کے قوم کے فخر کا

---

[1] حوالہ سابق، ص ۵۳۶ [2] سرسید احمد خاں: خیالات و افکار، ص ۳۵

باعث ہوں گے اگر کچھ توقع ہے تو اشراف خاندانوں کے لڑکوں سے ہے مگر افسوس سے یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ بغیر امداد کے وہ اپنی تعلیم پوری نہیں کر سکتے۔ کالج کے پاس بجز قلیل بلکہ نہایت قلیل سرمایہ کے کوئی فنڈ اسکالرشپوں یا وظیفوں کے لیے نہیں ہے۔ ہر سال سکریٹری کو بھیک مانگنی پڑتی ہے دوستوں سے سوال کرنا پڑتا ہے کہ دوست بھی اس روز کے سوال سے تنگ ہو جاتے ہیں۔ کتابیں بیچ کر، کتابوں کے بیچنے کی دوکان کر کے، تھیٹر میں ناچ سوانگ بھر کر کچھ روپیہ اسکالرشپوں کے لیے جمع کرنا پڑتا ہے اور پھر آئندہ سال کے لیے فکر لگی رہتی ہے۔ یہاں ہمارے دوست کہتے ہیں کہ کہیں دنیا میں بھی ہوا ہے کہ سکریٹری اس سے زیادہ جس کی اجازت کمیٹی نے دی ہے کوئی اسکالرشپ یا وظیفہ کیسی ہی ضرورت ہو دے سکے[۱] اور ان درد بھرے الفاظ میں شکوہ کرتے ہیں۔

"ارے صاحب تم پہلے اپنے خزانے میں اسکالرشپوں اور وظیفوں کے لیے روپیہ تو جمع کرلو پھر کسی کو خرچ مت کرنے دو"[۲]

سرسید نے ملک اور قوم کے سامنے کالج کے مقاصد کی جو پیہم پرخلوص فکر انگیز تشریح کی اور جس بے باک صداقت سے کی اس نے کالج میں اور اس کے باہر ایک مناسب اور صحت مند تہذیبی اور تعلیمی فضا پیدا کرنے میں بیش بہا مدد دی۔ اس طور پر کالج ایک وسیع المشرب ذہنی تحریک کی نشو و نما کا مؤثر وسیلہ بنا۔ وہ تعمیر کے مشکل مگر عظیم اور دل کش کام کو انھوں نے مختلف طریقوں سے بیان کیا اور طرح طرح سے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی مثلاً۔

"...... جو حصہ کہ انسان ہیں اس کے ابنائے جنس کا ہے اس سے اس کو غرض رکھنا چاہیے اور وہ حصہ آپس کی محبت باہمی دوستی ایک دوسرے کی اعانت ایک دوسرے کی ہمدردی ہے جس کے مجموعہ کا نام قومی ہمدردی ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے خدا کے حکم کی بھی اطاعت اور آپس میں برادرانہ برتاؤ قومی ہمدردی قائم ہو سکتی ہے جو قومی ترقی کے لیے پہلی منزل ہے۔

مگر ہم کو یہ بات بھی بھولنی نہیں چاہیے کہ ان روحانی بھائیوں کے سوا اور بھی ہمارے وطنی بھائی ہیں گو ہمارے ساتھ ایک کلمہ میں جس نے ہم مختلف قوموں اور فرقوں کو ایک قوم اور آپس میں روحانی بھائی بنایا شریک نہیں ہیں مگر بہت سے تمدنی امور ایسے ہیں جن میں ہم اور وہ مثل بھائیوں کے شریک ہیں اس زمین ہندوستان کی ہو یا پنجاب کی دکن کی ہو یا ہمالیہ کی ہم دونوں رہتے ہیں اس ملک کی ہوا سے اس ملک کے پانی

---

[۱] ایضاً ص ۱۵ ۴ تا ۱۶ ۴ ۔ [۲] ایضاً ص ۱۵ ۴

سے اس ملک کی پیداوار سے دونوں کی زندگی ہے۔ ہزاروں امور تمدن ایسے ہیں کہ بغیر ہمارے ان کو اور بغیر ان کے ہم کو چارہ نہیں ہمسایہ کا ادب ہمارے مذہب کا ایک جزو ہے اور یہی ہمسائگی وسعت پاتے پاتے ہم ملکی و ہموطنی کی وسعت تک پہنچ گئی ہے۔ ان ہم وطن بھائیوں میں بھی دو حصے ہیں ایک خدا کا اور ایک ابنائے جنس کا۔ خدا کا حصہ خدا کے لیے چھوڑو اور جو حصہ ان میں ابنائے جنس کا ہے اس سے غرض رکھو۔ تمام امور انسانیت میں جو تمدن اور معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں ایک دوسرے کے مددگار رہو۔ آپس میں سچی محبت سچی دوستی، دوستانہ بردباری رکھو کہ دونوں قوموں کو ترقی کرنے کا یہی راستہ ہے۔"[1]

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں۔

"پس قوم کی اس خراب حالت نے میرے دل کو بے چین کر رکھا ہے اور میں در بدر پڑا پھرتا ہوں۔ یہ صدا کہتا ہوا اٹھائیو جاگو، ہوشیار ہو۔ اپنی قوم کی خبر لو ورنہ تھوڑی دیر میں ایسا حال ہو جائے گا کہ تم خبر لینی چاہو گے اور خبر لینے کے قابل بھی نہ رہو گے۔"

"قومی ترقی اور قومی عزت حاصل کرنے کے دو ذریعہ ہیں اوّل امن و امان ملک میں دوسرے تعلیم و تربیت قوم میں"[2]

"قومی ترقی اور قومی عزت" سے سرسید کی کیا مراد تھی اس کی تفصیل مندرجہ ذیل اقتباس میں ملے گی۔

"میں نے..... کئی جگہ قومی عزت کا ذکر کیا مگر میں نے یہ نہیں بیان کیا کہ عزت قومی کیا چیز ہے اور وہ کیونکر حاصل ہو سکتی ہے..... میری مراد قومی عزت سے ایسی حالت کا ہونا ہے جس میں قوم درجہ بدرجہ آسودہ حال ہو۔ اکثر لوگ زیور علم و ہنر و اخلاق سے آراستہ ہوں۔ علوم و فنون جو دنیا میں جاری ہیں، صنائع و بدائع جو روز بروز دنیا میں پھیلتے جاتے ہیں اس قوم میں بھی موجود ہوں، آپس میں قوموں کا ربط و اتحاد اور میل جول جو تہذیب و شائستگی کی بنیاد ہے، ملکوں کی سیاحت اور قوموں کے حالات سے واقفیت جو سرچشمہ تمام نیکیوں اور ترقیوں کا ہے اس قوم کے لوگوں میں پایا جاتا ہو متانت اور نیکی سچائی رحم و رحمدلی، ہمدردی و خدا پرستی جو عمدہ انسانی خصلتیں ہیں ان میں بھی موجود ہوں۔ صرف دنیاوی عزت ہی قوم کو حاصل نہیں ہوگی بلکہ اپنی عزت کا باعث بھی یہی امور ہیں۔ غور کرو کہ ہر ایک قوم کے لیے اس کا مذہب بمنزلہ ایک روحانی معلم کے ہے اور اس مذہب کی خوبی اس کے پیروؤں کے حال کی بھلائی یا برائی سے ثابت ہوتی ہے..."[3]

---

[1] ایضاً ص ۱۹۰-۱۹۰ [2] ایضاً ص ۱۱۶-۱۱۰ [3] ایضاً ص ۱۵ تا ۱۶

اس قومی ترقی کے لیے ملک میں امن و امان کی ضرورت پر زور دینے کے بعد اور مصلحت وقت کی بنا پر حکومت کی اس سلسلے میں کوشش کی تعریف کرتے ہوئے بالآخر اپنے دل کی بات کا اظہار کر ہی ڈالتے ہیں۔

"..... میرا خیال ہے کہ جس گورنمنٹ کی رعایا کے دل میں یہ بات ہے کہ گورنمنٹ خوشامد کی بات سے خوش اور برخلاف بات سے ناراض ہوگی تو اس سے زیادہ بدتر کوئی گورنمنٹ نہیں ہو سکتی۔ اگر انگلش گورنمنٹ ایسی ہے تو اس کی حکومت اور ایک ناتربیت یافتہ گورنمنٹ میں کوئی فرق نہیں رہے گا..... "[1]

قومی ترقی اور قومی عزت حاصل کرنے کے کیا ذرائع ہیں ان کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"....... جن جن قوموں نے تعلیم و تربیت میں ترقی کی ہے وہی قومیں دنیا میں ترقی و عزت پر ہیں اور مال و دولت وجاہ و حشمت سے بھی نہال ہیں..... اب ہم کو اپنی قوم کی ترقی دولت و عزت کے لیے جو کچھ تدبیر کرنی ہے وہ یہی ہے کہ تعلیم و تربیت کے لیے نہایت عمدہ اور مفید سامان مہیا کریں۔ بعض بزرگوں کا جو ہماری تدبیروں سے اختلاف رائے رکھتے ہیں یہ خیال ہے کہ ہندوستان میں ہماری قوم کی تعلیم و تربیت کے لیے کافی سامان موجود ہے اور جو علوم کہ ہم ہمیشہ پڑھتے آئے ہیں وہی علوم اس زمانہ میں بھی ہماری قومی عزت اور قومی ترقی کے لیے کافی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ (یہ رائے) ہرگز صحیح نہیں ہے۔ ہماری قوم کے لیے تعلیم و تربیت کا کچھ بھی سامان موجود نہیں ہے...... اصل یہ ہے کہ ہمارے ہندوستان میں کسی زمانے میں قومی تعلیم کا سلسلہ جاری نہ تھا۔ امیروں اور دولت مندوں کے لڑکے پڑھنے لکھنے سے بہت ہی کم سروکار رکھتے تھے متوسط درجہ کے اشراف خاندان بھی لکھنے پڑھنے کو کوئی عمدہ چیز نہیں سمجھتے تھے۔ ادنیٰ درجہ کے خاندان کے لوگ بجز سپاہی پیشہ ہونے کے اور کچھ نہیں جانتے تھے۔ معدودے چند خاندان تھے جن کے یہاں نسل اور پشتوں کے پڑھنے لکھنے کا پیشہ ہوتا آتا تھا۔ وہ لوگ بھی درحقیقت بطور ایک پیشہ کے اس کو کام میں لاتے تھے۔ وہ لوگ محتاج طالب علموں کو اپنے یہاں جمع کر کے ان کو پڑھاتے تھے اور امیر لوگ یہ سمجھ کر کہ ان کے مدرسہ میں یا خانقاہ میں محتاج لوگ جمع رہتے ہیں کچھ روپیہ بطور خیرات کے بھیجتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ محتاج طالب علموں کی روٹی کپڑے میں خرچ ہوگا اور دینے والا سمجھتا تھا کہ جس طرح اور خیرات دینے میں ثواب ہوتا ہے اسی طرح اس خیرات کا بھی ثواب ہوگا۔ وہی خیالات اور وہی عادتیں اب تک لوگوں کے دلوں میں جمی ہوئی ہیں۔ وہ جانتے ہی نہیں کہ قومی تعلیم و تربیت کیا چیز ہے اور وہ کس طرح ہو سکتی ہے

---

[1] ایضاً ص ۱۱

اور قوم کو کس طرح اس پر متوجہ ہونا لازم ہے"۔[1]

کالج کے مقاصد کی کتنی واضح اور جامع ترجمانی سرسید کے ان الفاظ میں ملتی ہے:"یہی خیالات میرے دل میں تھے جب کہ میں نے علی گڑھ میں کالج کی بنیاد ڈالنے کا ارادہ کیا اور اس کو ایک وسیع تعلیم گاہ بنانا تجویز کیا جس میں کافی تعداد ہماری قوم یعنی ملک کے باشندوں ہندو اور مسلمانوں دونوں کی گنجائش ہو اور دونوں گروہ عمدہ طور سے وہاں تعلیم و تربیت پاویں۔ جب یہ خیال میرے دل میں آیا تو میں لندن گیا۔ وہاں کے کالجوں بورڈنگ ہاؤسوں کیمبرج کے طلبا کے رہنے کا حال دیکھا اور سمجھا کہ حقیقت میں جب تک اپنے ملک کے بچوں کے لیے ایسی جگہ نہ بناویں تو تعلیم و تربیت ناممکن ہے"[2] کالج قائم ہوا تو فرماتے ہیں:

"مسلمان اور ہندو دونوں بورڈنگ ہاؤسوں میں رہتے ہیں...... ایک جگہ رہنے سے آپس میں محبت بڑھتی ہے ایک دوسرے کا ہمدرد ہوتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کالج میں ان سب باتوں کا برتاؤ ہوتا ہے...... یہ تمام باتیں باہم اتفاق قائم ہونے کی ہیں جس کی ہندوستان میں اشد ضرورت ہے۔ اے صاحبو! صدیاں گزر گئیں جب سے خدا کو یہ منظور ہوا کہ ہندو اور مسلمان اس ملک کی ہوا اور پیداوار کھائیں۔ اس زمین پر جییں اور اسی پر مریں۔ ان واقعات سے خدا کی یہ مرضی پائی جاتی ہے کہ یہ دونوں گروہ اس ملک میں باہم دوست ہو کر بلکہ دو بھائی کی طرح ہندوستان میں رہیں۔ ہندوستان کے خوب صورت چہرہ کی یہ دونوں دو آنکھیں ہیں۔ یہ دونوں قومیں جو دال اور چاول کی طرح سے مل گئی ہیں متفق ہو کر رہیں جب تک یہ اتفاق نہیں ہوگا بے شک قومی تعلیم کا بھی بندوبست نہیں ہو سکتا۔ اگر ہندو اپنی دو تیھروں کی اور مسلمان اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جدا جدا عمارت بنائیں گے تو کچھ نہ ہو سکے گا۔ ان دونوں کو چاہیے کہ متفق ہو کر پہلے ایک کام کو پورا کریں اور جب وہ ختم ہو جائے تب دوسرے میں ہاتھ لگائیں۔ مجھ کو اس بات کے ظاہر کرنے میں خوشی ہے کہ ہمارے کالج میں ہندو بھائیوں نے مدد کی ہے اور خدا ترسی کے خیال سے اپنے محتاج مسلمان بھائیوں کا حق ادا کیا ہے۔

کالج کے منتظموں نے کبھی اس احسان کو بھلایا نہیں۔ انھوں نے ایک جگہ پر رہنا ایک بنچ پر بیٹھ کر تعلیم پانا ایک احاطہ میں رہنا پھرنا کھیلنا دونوں قوموں کے لیے ایک ہی طرح پر قرار دیا ہے جس سے باہمی دوستی کو ترقی ہوتی ہے۔ میرے خیال میں اس سے عمدہ کوئی اور طریقہ نہیں ہے مگر میری غرض یہ نہیں ہے کہ ہمارے ملک میں لوگ قوم کی بھلائی کی کوئی اور بات نہ سوچیں۔ ان کو چاہیے کہ وہ اس پر غور کریں کہ جو کچھ میں کہتا

---

[1] الفناًص ۱۳۰ [2] ایضاً ص ۳۰۰ - ۳۰۷

ہوں اگر اس کے سوا کوئی اور چیز ان کو نظر آوے تو اس کو وہ کریں۔[1]

سرسید کو اپنے قومی تہذیبی ورثہ پر ناز تھا اور اپنے زمانے کی پستی کا اس زمانے کے عروج سے مقابلہ کرتے ہیں جب اسلامی اور ہندو تہذیبیں اپنے اپنے اوج کمال پر تھیں۔ اپنے ہم وطنوں کی غیرت قومی کو یوں جوش دلاتے ہیں۔

"صاحبان یہ ملک ہندوستان ایسا ملک نہیں ہے جس میں لوگ تعلیم وعلم کو نہ جانتے ہوں۔ یہ نہایت قدیم اور پرانا مقدس ملک ہے جس میں ایک قوم جو اس میں رہتی تھی ان میں بہت بڑے عالم بہت ذی رتبہ لوگ گزرے تھے جن کی زبان سنسکرت تھی جس کی خوبی اور عمدگی فوائد علوم کے لیے بالتحقیق مشہور ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ اس میں نہایت عمدہ اور نفیس کتابیں فلسفہ اور لاجک کی موجود ہیں جو ایسی نہیں ہیں کہ جن پر ملک کو کچھ کم فخر نہ ہو۔ اس کے بعد ایک زمانہ آیا جب ہم لوگ یہاں آئے۔ ہمارے باپ دادا علم میں کچھ کم مشہور نہ تھے۔ شاید ہندوستان میں انھوں نے بہت کچھ نہ کیا ہو مگر ہمارے اسلاف وہ لوگ تھے جنھوں نے علم کو بہت ترقی دی۔ بغداد و قرطبہ غرناطہ کے دار العلوم کسی کو بھول نہ گئے ہوں گے۔ ہمارے اسلاف ہی تھے جنھوں نے پرانے یونانی علوم کو ایسی ترقی دی کہ اگر مقابلہ کیا جاوے تو انھوں نے ان پرانے علوم کو گویا ذرہ سے آفتاب بنادیا تھا۔ یورپ اگرچہ اس زمانے میں علوم وفنون میں مشہور ہے مگر پرانی تاریخ سے معلوم ہوگا کہ اسپین کے دار العلوم نے اس کو یہ نعمت بخشی۔"[2]

قوم کے لیے ایک ہمہ گیر تعلیمی پروگرام کی اہمیت کا ان کو پورا احساس تھا فرماتے ہیں:

"اے دوستو، بڑی مشکل تو یہ ہے کہ اگر قوم میں سے دو چار دس پانچ شخصوں نے اپنی ذات میں جوہر لیاقت پیدا کرلیا تو اس سے کچھ فائدہ نہیں اور قوم وحشی و نالائق ہونے کے خطاب سے بری نہیں ہوسکتی۔ اور وہ دس پانچ شخص قوم کے لیے کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ ایک سور یا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ پس جب تک تمام قوم تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ نہ ہو قوم کی آسودگی اور خوش حالی نہیں ہوسکتی اور اس کی بدنامی نہیں مٹ سکتی۔"[3]

سرسید کے ان خیالات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ قومی تعلیم کے مسائل پر بڑی بلند اور حکیمانہ نظر رکھتے تھے اور ایک جامع تعلیمی نظام کی ضرورت سے پورے طور پر باخبر تھے۔ ان کی فکر نے اُن پر یہ حقیقت

---

[1] ایضاً ص ۳۰۷ - ۳۰۸ [2] ایضاً ص ۲۵۳ [3] ایضاً ۵۶۲

روشن کردی کہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہندی مسلمانوں کے لیے ایک اعلیٰ تعلیمی درس گاہ کا قیام تھا۔
اس سلسلے میں ان کے دلائل بہت قوی تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانی قومیت کے اتحاد کے لیے مسلمانوں
تعلیمی پس ماندگی اور بے لیاقتی کو دور کرنا نہایت ضروری تھا۔ اس کے لیے جلد سے جلد ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ
نوجوانوں کی جماعت پیدا کرنا لازم آتا تھا جو ملک میں عام تعلیم کی اشاعت اور ایک ہوش مند وسیع النظر
معاشرے کے قیام میں معاون ہوں۔ ان کی فکر و عمل کا ثمرہ ایم اے او کالج کی شکل میں ظاہر ہوا۔ انھوں نے
یہ کام بڑے نامساعد اور صبر آزما حالات میں انجام دیئے۔ ان کی نیک نیتی وسیع النظری اور سلامت فکر سے
قومی ذہن گہرے طور پر متاثر ہوا۔ سرسید اپنے عہد کے تاریخی اور ترقی پذیر عناصر و عوامل کے نقیب بھی تھے
داعی اور نمونہ بھی۔ ان کی بعض باتوں سے آج اتفاق نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ اس کا تعلق ان مخصوص حالات
سے تھا جو آج موجود نہیں ہیں لیکن ان کی زیادہ باتیں ایسی ہیں جو آج بھی قابلِ قبول ہیں اس لیے کہ وہ بنیادی
قدر و قیمت رکھتی ہیں۔ اس ضمن میں ایک فاضل کی یہ رائے قابلِ لحاظ ہے ـــــ

> "ہندوستان کے اندر مسلمانوں کے دلوں کو ٹٹولیے تو ان میں یہ احساس عام پایئے گا کہ آج ان کی حالت اس سے بھی بدتر ہے جتنی ۱۸۵۷ء کی چھوٹی قیامت کے بعد چوتھائی صدی تک رہی۔ یہ بات اور چیزوں کے لحاظ سے صحیح ہو یا نہ ہو اس اعتبار سے بالکل صحیح ہے کہ اس زمانے میں عام افلاس جہالت قدامت پرستی اور تعصب کے ساتھ ساتھ کم سے کم کچھ لوگوں میں خصوصاً سید احمد خاں اور ان کے مخلص ساتھیوں میں ان خرابیوں کا شعور اور ان کی اصلاح کی خواہش اور حوصلہ تھا۔ اور آج یہ خرابیاں کم و بیش اسی طرح موجود ہیں لیکن یا تو کسی کو ان کا پوری طرح احساس نہیں یا ان کو دور کرنے کی لگن اور ہمت نہیں۔
>
> ایک نئی اور بنیادی خرابی جو مسلمانوں کی ذہنی اور اخلاقی نشوونما کے لیے مہلک نظر آتی ہے یہ پیدا ہو گئی ہے کہ مختلف تصورات زندگی مثلاً قدیم اور جدید عقل اور عقیدے مذہب اور سائنس کا تضاد، جسے مصالحت کے ذریعہ رفع کرنے میں سید احمد خاں اور ان کے ساتھیوں کو عمر بھر سر کھپانا پڑا اب پہلے سے کہیں زیادہ ہیں لیکن کسی کو اس کے دور کرنے کی فکر نہیں بلکہ سچ پوچھیے تو کوئی اسے محسوس ہی نہیں کرتا۔ ایک ہی شخص مذہبی حیثیت سے

کائنات کے بطلیموسی تصور کا قائل ہے اور عملی حیثیت سے نظام کوپرنکس کو مانتا ہے، اصولاً حکومت الہیہ کا کلمہ پڑھتا ہے اور واقعتاً لادینی جمہوری ریاست سے تعاون کرتا ہے اخلاق ومعاشرت میں رسم پرستی کا مسلک اور شعر وادب میں رندی والحاد کا مسلک رکھتا ہے یہاں تک کہ ایک شخص تہذیب کے لحاظ سے مسلمان اور ہر لحاظ سے کمیونسٹ ہے ......" [1]

اور ان مشکلات پر قابو پانے اور ان مسائل کو حل کرنے کے لیے نظر پڑتی ہے تو کس پر اسی سید اور ان کے علی گڑھ پر:

" اگر آج سید احمد خاں کے علی گڑھ سے کوئی مرد خدا ان کے خواب کی ادھوری تعبیر کو پورا کرنے کے لیے ایسی تحریک اٹھائے تو شاید اس کی اتنی شدید اور زبردست مخالفت نہ ہو جتنی آج سے تقریباً ایک صدی قبل ہوئی تھی ..... لیکن کیا ارباب علی گڑھ کو اسی مرد خدا اس سوار اشہب دوراں کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا چاہیے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اگر ان کے دل میں سید کے سوز محبت کی ذرا سی بھی آنچ باقی ہے تو ان کا کام یہ ہے کہ نوجوانوں خصوصاً مسلمان نوجوانوں میں طلب حق کی لگن وسعت نظر رواداری روشن خیالی اور اصلاح وترقی کا جذبہ پیدا کردیں تاکہ ایک دن ان ہی میں سے کوئی نیا سید پیدا ہو جائے اور اسے اپنی اصلاحی مہم میں وہ معاون ومددگار رفیق وہم کار بھی مل جائیں جن کے لیے سید احمد خاں ترستے رہے" [2]

کالج قائم ہو گیا اور اس کا کام چل نکلا تو ۱۸۸۶ء میں سرسید نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی جس کے بارے میں حالی لکھتے ہیں۔

..... سرسید کو یہ خیال ہوا کہ ..... اس سے قومی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اور ایک کالج چھ کروڑ مسلمانوں کی تعلیم کی کفالت نہیں کر سکتا اس کے سوا مسلمانوں کی قوم جو ہندوستان کے دور دراز حصوں میں پھیلی ہوئی ہے وہ سب ایک دوسرے کی حالت سے محض بے خبر ہیں اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں کہ مختلف اضلاع کے لوگ کسی موقع پر آپس میں

---

[1] سید کا خواب اور اس کی تعبیر، از ڈاکٹر سید عابد حسین، علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز، ص ۱۴-۱۵ [2] ایضاً ص ۱۵-۱۶

ایک جگہ جمع ہوں۔ اپنے اپنے خیالات قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت ایک دوسرے پر ظاہر کریں۔ ہر حصہ ملک کے مسلمانوں کی ترقی یا تنزل کا حال تمام قوم کو معلوم ہو اور مسلمان جو باوجود ایک قوم ہونے کے بمنزلہ مختلف قوموں کے ہیں ان میں قومی یگانگت اور ہمدردی پیدا ہو۔ اس بنا پر جیسا کہ سرسید نے پہلے اجلاس میں بیان کیا تھا یہ کانفرنس قائم کی گئی اور اس کا پہلا جلسہ ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو بمقام علیگڑھ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں منعقد ہوا۔

اس کانفرنس کے مقاصد اولاً حسب تفصیل ذیل قرار دئے گئے تھے۔

(۱) مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو اعلیٰ درجہ تک پہنچانے میں کوشش کرنا (۲) مسلمانوں کی تعلیم کے لیے جو انگریزی مدرسے مسلمانوں کی طرف سے جاری ہوں ان میں مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور تابمقدور عمدگی سے اس تعلیم کے انجام پانے میں کوشش کرنا (۳) علوم مشرقی اور دینیات کی تعلیم جو علمائے اسلام جابجا بطور خود دیتے ہیں اس کو تقویت دینا اور اس کو بدستور جاری رکھنے کی مناسب تدبیریں عمل میں لانا (۴) جو تعلیم قدیم طرز پر دیسی مکتبوں میں جاری ہے اس کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان میں جو تنزل پیدا ہو گیا ہے اس کی ترقی و توسیع کی تدبیریں اختیار کرنا۔ قرآن خوانی اور حفظ قرآن کے لیے جو مکتب جاری ہیں اور جن کو روز بروز تنزل ہوتا جاتا ہے ان کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان کے قائم رکھنے اور استحکام دینے کی تدبیریں عمل میں لانا۔[1]

یہ کانفرنس سرسید کی تعلیمی تحریک کی تبلیغ و اشاعت کے لیے ایک مستقل و مستحکم جماعت ثابت ہوئی جس نے ملک کے طول و عرض میں اپنے سالانہ اجلاس منعقد کرکے ایک وسیع تعلیمی مہم چلانے میں بیش بہا مدد دی۔ کانفرنس کے ان اجلاسوں میں قوم اور ملک کے مشاہیر اور علم و فن کے اکابر شرکت کرتے اور تعلیمی مسائل پر اپنے خیالات پیش کرتے جو سنجیدہ اور صحت مندیت کا درجہ اختیار کرتے اور قوم کے قوائے فکر و عمل کو مہمیز کرتے۔ کانفرنس کے مقاصد اور اس کے اثرات کا ایک دلچسپ بیان نواب محسن الملک کے اس صدارتی خطبے میں ملتا ہے جو انھوں نے کانفرنس کے آٹھویں اجلاس میں دیا تھا۔ ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"....... نکتہ چینی فی نفسہ نہایت مفید بلکہ ایک قسم کی مدد ہے بشرطیکہ نیک نیتی سے کی جاوے

---

[1] حیات جاوید حوالہ سابق ص ۱۷۱ تا ۱۷۲

ہمارا یہ مجمع خود نکتہ چینی کے لیے قائم ہے اور نکتہ چینی ہی اس کا اصل مقصود ہے تاکہ جو غلطی ایک کے خیال میں ہو وہ دوسرے کے خیال سے اصلاح پاوے۔ اے صاحبو پھر ہماری کارروائیاں ہمارے مباحثے اور ہماری تجویزیں ملکیت عام ہیں۔ اور ہر ایک شخص کو اس پر بُری بھلی رائے ظاہر کرنے کا حق ہے ہم ہر ایک کی بات دل سے سننے کے لیے تیار ہیں اور ہم ہر ایک نکتہ چینی پر خیر مقدم کہنے کو تیار ہیں۔"[1]

بعض حلقوں سے سرسید اور کانفرنس کے کاموں پر سطحی اور تنگ نظر تنقید بڑی شدت سے کی جاتی تھی اس کے بارے میں فرمایا ـــــ

"صاحبو یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کانفرنس ایک مجمع ہے صرف نو تعلیم یافتہ اور نئے خیالات رکھنے والوں کا...... اور اس کی تجویزیں صرف ایک محدود اور مختصر فرقہ کی رائے ہیں نہ عام مسلمانوں کی۔ میں اس کے جواب میں نہایت ادب سے کہتا ہوں کہ اگر کل قوم تعلیم یافتہ ہوتی اور زمانہ کی ضرورتوں سے واقف اور اپنی ترقی کے وسائل مہیا کرنے کے لائق تو ایسی کانفرنس کی ضرورت ہی نہ ہوتی اور جب خدا کی مہربانی سے قوم کا ایک بہت بڑا حصہ تعلیم یافتہ ہو جاوے گا تو وہ وقت ہوگا کام کرنے کا نہ سوچنے کا وہ زمانہ ہوگا ترقی کے نتیجوں کے دیکھنے کا اس کے اسباب جمع کرنے کا اور رغبت دلانے کا وہ دن ہوگا مبارکباد دینے کا نہ رونے رلانے کا۔ وہ وقت ہوگا فصل کاٹنے کا اور پھل کھانے نہ زمین جوتنے اور بیج بونے کا۔ ہم خود قبول کرتے ہیں کہ یہ مجمع ہے ایسے لوگوں کا جن کے خیالات نئے ہیں جو تعلیم و تربیت کا اصول سمجھتے ہیں جو قومی ترقی کی تدبیریں جانتے ہیں جن کو اپنی موجودہ حالت میں بہت کچھ اصلاح اور درستی کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ مگر کوئی مہربانی کر کے مجھے بتلائے کہ دنیا کی تاریخ میں کسی قوم نے بغیر ایسے فرقے کے ترقی کی ہے اور جب تک کہ کوئی قوم ترقی نہ کرے ایسے خیال کے لوگ کہاں کثرت سے پائے گئے ہیں۔"[2]

لیکن جب مخالفت مناسب حدود سے متجاوز ہونے لگی تو محسن الملک کا بھی لہجہ بدلا کیسی بلند اور بھرپور طنز سے کام لیتے ہیں ـــــ

---

[1] خطبات عالیہ (حصہ اوّل)، مرتبہ انوار احمد مارہروی آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۲۷ء ص ۸۳ [2] ایضاً ص ۸۵

مانا کہ ہم نے مغربی علوم کا شوق دلا کر مسلمانوں کو خراب کیا، مانا کہ ہم نے انگریزی تعلیم و تربیت کے جاری کرنے میں الحاد پھیلایا، مانا کہ ہم نے کانفرنس قائم کر کے مسلمانوں کو بہکایا مگر ہم پر طعنہ کرنے والے خدا کے لیے یہ بتا دیں کہ انھوں نے اپنی قوم کے لیے کیا کیا اور اس ڈوبتی ہوئی کشتی کے بچانے میں کون سی کوشش کی۔ اگر ہم نے مسلمانوں کے لیے دیر وکنشت بنایا، مانا کہ گناہ کیا، مگر یہ فرمائیے کہ ان کا بنایا ہوا بیت المقدس کہاں ہے جہاں جا کر ہم سجدہ کریں، اگر ہم نے اپنے بھائیوں کے واسطے قومی کانفرنس قائم کی ہم قبول کرتے ہیں کہ ایک بے سود کام کیا، مگر ہمارے دوست برائے مہربانی یہ فرما دیں کہ انھوں نے قوم کے حال پر مرثیہ پڑھنے، قوم کی مصیبت پر ماتم کرنے پر کون سی مجلس بنائی ہے کہ ہم وہیں جا کر نوحہ کریں اور سر پیٹیں۔ ہم اگر مضر یا بے سود کام کرنے کے گناہگار ہیں تو قوم کو مرتے دیکھنے اور کچھ نہ کرنے کا ذمہ دار کون ہے۔

گرد سر تو گشتن و مردن گناہ من | دیدن ہلاک و رحم نہ کردن گناہ کیست
گیرم کہ وقت ذبح طپیدن گناہ من | دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہ کیست[1]

انسان کی پوری تمدنی زندگی مختلف و متنوع ادوار سے عبارت ہے اور ہر دور میں اس کی مادی اور روحانی حیات بعض نئے عناصر قبول کرتی ہے تو کچھ پرانے عناصر ترک کرتی ہے۔ اس طور پر گذشتہ اور موجودہ حقیقتوں میں ایک نامیاتی ہم آہنگ اور غیر منقطع تعلق پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس پورے عمل کا مقصود مستقبل کے وہ امکانات ہوتے ہیں جن کا استقصار عقل انسانی لازمی طور پر ہر دور میں کرتی ہے اور جس سے اس کی فکر و عمل کی سمت و رفتار متعین ہوتی ہے۔ انسانی عقل کی اس کوشش اور جدوجہد کا دوسرا نام اس کی تعلیم ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ معاشرے کی مسلسل ترقی صرف ایک ترقی پذیر نظام تعلیم پر مبنی ہے۔ جہاں ایسا نہ ہوگا انسان اور اس کے ماحول میں ایک فصل یا خلیج حائل ہوتی جائے گی جو بالآخر اس کی تمدنی زندگی کی تباہی کا باعث ہوگی۔ اس لیے کہ انسان کی غذا اس کے اپنے ماحول سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر وہ اس ماحول سے دور یا محروم ہو گیا تو غذا کہاں سے آئے گی[2]۔ اس طور پر حقیقی معنوں میں تعلیم ایک سعی ہے انتشار

---

[1] ایضاً، ۸۸

[2] Arts as Experience by John Deway (New York: Minton; Balch & Co., 1934) p. 14-15.

کے خلاف ایک کوشش ہے جمود کے خلاف اور ایک جہاد ہے جہالت و غفلت کے خلاف، اور اس طرح یہ ایک عمل ہے تہذیب کے اثبات کے لیے ایک جستجو ہے اعلیٰ کے لیے اور ایک عزم ہے تسخیر فطرت کے لیے۔ قدرتی عناصر اور انسان کی فطری جبلتیں آزاد چھوڑ دی جائیں تو نتیجہ صرف اختلال، انتشار، اور عصیاں ہوگا ان سرکش قوتوں کو قابو میں رکھنا اور صحت مند و نفع بخش راستے پر ڈالنا عقل (یا توفیق) انسانی کا فریضہ بھی ہے اور اس کا شرف بھی۔ عقل کی تربیت و تہذیب بامقصد تعلیم سے ہوتی ہے۔ سرسید اور ان کے رفقائے کار نے جو تحریک شروع کی اور جس دانش کدے کی بنیاد رکھی اس کی کیا قدر و قیمت ہے اس کے بارے میں ملک کے ایک ممتاز مدبر اور ماہر تعلیم کی یہ رائے ہے ـــ

مگر سچ یہ ہے کہ جن حالات میں ان بزرگوں نے جو کام کیا جس انتشار کا سامنا تھا اس میں جس یک سوئی پامردی کا ثبوت انھوں نے دیا اپنی ہی قوم کی نادان اکثریت کی بےسمجھی اور تعصب کا جس صبر سے مقابلہ کیا۔ غلامی کی تیرگی میں جس طرح آزادئ فکر کا چراغ روشن کیا، تنگ دلی کے دور میں وسعت نظر پیدا کرنے کی جو کوشش کی، جمود ذہنی کے عالم میں تحقیق و تفتیش کی جو طرح ڈالی توہم و تعصب کے مقابلے میں جس طرح عقل و دانش کو لا کھڑا کیا، قدامت پرستی کو جو ہر نئی چیز ہر نئے خیال سے بدکتی تھی جس اصرار کے ساتھ یہ سبق سکھایا کہ اچھی بات کہیں سے آئے مشرق سے کہ مغرب سے، کسی سے ملے۔ اپنے سے کہ غیر سے، ہماری اپنی ہی کھوئی ہوئی پونجی ہے اسے اٹھا لینا اپنا لینا چاہیے۔ بےبسی اور بےوسیلگی کے عالم میں جس ہمت و عزم سے انھوں نے قوم کی مخلصانہ بےغرض خدمت کی ان سب باتوں کو یاد نہ کرنا اور ان پر احسان مندی کے دو پھول نہ چڑھانا بڑی ہی ناشکری ہوگی۔ ہمیں یہ سب یاد ہیں اور ان کے لیے ہمارے دل دردمندی سے پُر ہیں۔ ان عاشقان پاک طینت کو خدا اپنی رحمتوں سے مالامال فرمائے اور ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ بدلے ہوئے حالات میں اسی عزم اور خلوص سے ہم اپنے قومی کاموں کو انجام دیں۔“ [1]

سرسید کی فکر نے ان پر یہ نکتہ واضح کیا کہ قومی تہذیب کے زوال کا سب سے بڑا سبب

---

[1] تعلیمی خطبات از ڈاکٹر ذاکر حسین۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔ پانچویں بار جولائی ۱۹۶۹ء ص ۲۴۲

یہ تھا کہ عرصہ سے ہندوستانیوں میں بالعموم اور مسلمانوں میں بالخصوص مقاصد قومی کا نہ کوئی واضح اور اعلیٰ تصور ملتا تھا نہ کسی منظم اور ہم آہنگ اشتراک کی کوشش نظر آتی تھی جس کا نتیجہ وہ سیاسی اقتصادی اور اجتماعی انتشا تھا جس میں تقریباً ایک صدی سے پورا ملک گرفتار تھا۔ بدامنی اور بدحالی نے قوم کے قوائے ذہنی و عملی کو کو اس طرح متاثر و ماؤف کر دیا تھا کہ وہ مثبت فکر اور عمل سے محروم ہو گئے تھے یہ صورت حال غماز تھی ہندوستانی ذہن کی عام ناتربیتی، ناپختگی اور نارسی کی۔ باہر کی دنیا میں علوم و فنون کو جو ترقی حاصل ہوئی تھی اس سے ہندوستانیوں کو نہ دلچسپی تھی نہ واقفیت۔ اس طور پر ان جدید ذہنی تحریکوں اور سیاسی طاقتوں کا نہ وہ احاطہ کر سکتے تھے نہ مقابلہ جن کی قوت اور اثرات اندرون و بیرون ملک بڑی تیزی سے پھیل رہے تھے۔ سرسید نے اس صورت حال سے مقابلہ کرنے کے لیے قوم کی ذہنی تربیت اور تعلیم کے کام کو سب سے زیادہ اہمیت دی اور ملک میں امن و امان کو بحال کرنے اور رکھنے پر زور دیا۔ امن و آشتی کی حمایت میں انھوں نے جو کچھ کہا اس سے بعض لوگ یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ انگریزی حکومت کی پاسداری کرتے تھے یا سرکار پرستی کی پالیسی پر عمل پیرا تھے ایسے لوگوں کا قومی سیاست کا تصور جتنا جذباتی ہے اتنا عقلی نہیں۔ جذبے کا احترام ضرور کیا جائے گا لیکن اس کو معیار نہیں قرار دیا جا سکتا۔ حقائق کے معروضی افہام و تفہیم کے لیے کبھی کبھی سرد منطق سے کام لینا بہتر ہوتا ہے۔ سرسید اپنے پروگرام کو کامیابی سے چلانا چاہتے تھے اور سب جانتے ہیں کہ تعلیم کا کام ایک دن میں پورا نہیں ہوتا۔ اس کے لیے مناسب اور سازگار فضا تیار کرنا ضروری تھا۔ قومی زندگی کے ہر شعبے میں اصلاح کا کام کرنا تھا نوجوان نسل کو اعلیٰ تعلیم سے بہرہ مند کرنا تھا۔ قوم میں اتفاق رائے اور اتحاد مقاصد پیدا کرنا تھا کہ اس کے بغیر کوئی اجتماعی بہبود اور کامیابی کا کام پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ مغرب ہو کہ مشرق اس کے ترقی یافتہ یا ترقی پذیر علوم و فنون سے روشناس کرانا تھا۔ اس بڑے کام میں ان کو اس سیاست سے کوئی مدد ملتی نظر نہ آئی جو قوم یا حکومت کو تشدد آمیز عمل پر اکسائے۔ ان کے نزدیک اچھی تعلیم سے اچھی سیاست پیدا ہوتی ہے۔ ناقص تعلیم سے صحت مند سیاست کا ظہور پانا محال تھا۔ تعلیم ہی سے قوم اور افراد دونوں میں وہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے جو گرد و پیش کے حالات و خیالات کا مستند اور بھرپور احاطہ کرنے میں ممد ہوتی ہے۔ اس طور پر زیادہ صحیح، بامعنی، اثر پذیر اور ہمہ گیر ذہن کی تشکیل میں معاون ہوتی ہے خود سرسید کی تعلیم پرانے طرز پر ہوئی تھی لیکن ان کا ذہن جدید تھا اس لیے کہ انھوں نے ان دریچوں کو

کھلا رکھا جس سے تازہ ہوا اور روشنی آسکتی تھی۔ چنانچہ باوجود اس کے وہ جدید علوم میں کوئی ماہرانہ دسترس نہیں رکھتے تھے انھوں نے اس روح کو پالیا جوان کے عہد کے علوم وسائنس میں کارفرما تھی اور نئی بین الاقوامی تہذیب وتمدن کی صورت میں بالیدہ ہورہی تھی۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ملک اور قوم کو ذہنی اور عملی طور پر اس عالمگیر انسانی تحریک سے منسلک کردیا جو آزادی، روشن خیالی، مساوات، انصاف اور جمہوریت کے فوز وفروغ سے عبارت تھی۔ اپنے ان خیالات کو وہ طرح طرح سے ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً قومی ذہن کو مثبت خود احتسابی یا خودنگری کی تلقین کرتے ہیں تاکہ اس میں ایک نیا تعمیری نقطہ نظر پیدا ہو

"میں اس طوائف الملوکی کے زمانہ کا ذکر نہیں کرتا جو اٹھارہویں صدی میں ہندوستان میں تھا بلکہ میں آپ کو تاریخانہ زمانہ کو یاد دلاتا ہوں جب کہ ہندوستان ایک سلطنت شخصیہ کی حکومت میں تھا ایک بادشاہ یا راجہ کروڑہا مخلوق خدا پر حکمراں تھا..... تمہارے پرانے بزرگ اس زمانہ کو بھگت چکے اور تمہارے ورے کے بزرگوں نے اس طوائف الملوکی کے زمانے کو دیکھا تھی...... جب کبھی تمہارا دل انصاف واخلاق کی طرف توجہ کرے گا تو تم خود اس زمانے کے نقصانوں اور وقت کی حکومتوں کی برائیوں کا اقرار کروگے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس زمانہ کی حکومتیں نہ مسلمانوں کی شرع کے مطابق تھیں اور ہندوؤں کے دھرم شاستر کے مطابق البتہ زبردستی اور مردم آزاری کے قانون کی پابند تھیں[1]"

نئی حکومت جو انگریزوں نے قائم کی تھی اس کی طرف ہندوستانیوں کا کیا رویہ ہونا چاہیے اس بارے میں فرماتے ہیں۔

"....... تم کیسے ہی مسکین بنو اور ہاتھ جوڑو ایسی حالت میں جس میں کہ تم اب ہو کبھی تم کو ایک عقلمند گورنمنٹ اپنا خیرخواہ نہیں سمجھ سکتی ..... اگر رعایا اپنی ناراضی کو چھپائے اور اس کو علانیہ گورنمنٹ کے سامنے پیش نہ کرے اور دل میں رنج رکھے اور ظاہر میں ہاتھ جوڑے تو یہ علانیہ ثبوت اس بات کا ہے کہ وہ رعیت گورنمنٹ کی خیرخواہ نہیں ہے اور اپنے اس رنج کو دور کرنے کے لیے اور کچھ فکر یا کسی توقع میں ہے۔ پس رعیت کا ادب اور مخلصانہ نیک نیتی سے اپنے تمام رنجوں کو گورنمنٹ پر

---

[1] مجموعہ لکچرز وا سپیچز۔ حوالہ سابق ص ۲۲

ظاہر کرنا اور اپنے تمام حقوق کا نہایت مضبوطی اور استقلال سے اپنی گورنمنٹ سے دعویٰ کرنا ایک بہت بڑا ثبوت خیر خواہی گورنمنٹ کا ہے۔

آپ مجھ کو معاف کیجیے میں صاف صاف کہنا چاہتا ہوں ہندوستان کی رعایا کی یہ عادت ہوگئی ہے کہ گھر میں بیٹھ کر گورنمنٹ کی ہزاروں شکائتیں کریں گے۔ انتظام حکام پر اپنے گھر میں ہزار عیب لگادیں گے جن میں سے بہت صحیح اور درست بھی ہوں گے مگر جب انگریزوں سے ملیں گے تو کہیں گے کہ ہم تو گورنمنٹ کے بڑے خیر خواہ ہیں اور حکام کا انتظام حد تعریف سے بھی بہت عمدہ ہے اور نہایت ہی خوب ہے کوئی عقل مند آدمی ایسی رعیت کو خیر خواہ نہیں سمجھ سکتا ہے[1]

یہ بات جو اوپر بیان ہوئی ہے ایک خاص زمانے کو مد نظر رکھ کر لکھی گئی ہے لیکن اس میں جو اصول بیان ہوا ہے وہ ہر ملک کے شہریوں کی عام اخلاقی تربیت کے لیے ہر وقت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ ایک اور موقع پر عمائدین قوم کو ان کے فرائض اور اس کی بجا آوری کے طریقوں کے بارے میں یہ رائے دی۔

"...... ہم نے کئی کروڑ آدمیوں کے باہمی ارتباط اور میل جول اور علم و ہنر اور مال و دولت کے نہایت عمدہ فوائد کو ترقی دینے اور ان کو عمدہ عمدہ طریقوں کی رہنمائی کرنے کا بوجھ اپنے سر پر اٹھایا ہے۔ پس ہم کو اپنے حال کی دیکھ بھال کرنی چاہیے کہ ہماری نیت اور ہمارا ارادہ پاک صاف ہے اور ہمارا مقصود اور ہمارا منشا نیک اور درست ہے اور ہماری کارروائی کے طریقے ایسے ہیں یا نہیں جو از روئے عقل اور تجربہ کے ہونے چاہئیں اور پھر ہم کو غور کرنا اور سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ ترقی ہم نے اپنے کاروبار میں کی ہے وہ کیا کی ہے اور کہاں تک کی ہے تاکہ ہم کو اپنا حال معلوم ہو کہ ہم کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں اور آئندہ کو کیا کریں گے"[2]

سرسید کی شخصیت ان خیالات کی عملی تفسیر تھی۔ وہ جو کچھ کہتے تھے خود کر کے بھی دکھاتے تھے اس لیے قوم اور ملک کا انہیں جو اعتماد حاصل ہوا اور ان کی قیادت کو جیسی ہمہ گیر مقبولیت حاصل ہوئی وہ اس عہد میں ان کے کسی ہم عصر کو مشکل ہی سے نصیب ہوئی۔ ان کے فکر و عمل میں جو صحیح مطابقت پائی جاتی ہے وہ مثالی بھی

[1] مجموعہ لکچرز و اسپیچز۔ حوالہ سابق ص ۲۵-۲۶ [2] ایضاً ص ۲۵-۲۶

ہے اور حیرت انگیز بھی۔ وہ جتنے عظیم پیمانے پر کوئی منصوبہ سوچتے تھے اتنی ہی مستعدی سے اسے تمام جزئیات کا لحاظ رکھتے ہوئے انجام دینے کی لیاقت بھی رکھتے تھے ان کی اس صفت کا اعتراف واحترام کیا جاتا تھا مثلاً

"In addition to great breadth of views in question of national importance, he possesses a power of work as regards minute details which is astonishing".1

"حقیقت آمیز، ہم آہنگ اور بامعنی فکر مجموعی طور پر تین باتوں سے تشکیل پاتی ہے۔ ایک حقائق کے صحیح علم سے دوسرے منطق کی پیروی سے اور تیسرے وقت اور موقع کے مطابق خیال یا تصور کی موجودگی سے یہ تینوں عناصر چند باہم متعلق سوالات کی موجودگی کو ظاہر کرتے ہیں، پہلے کا تعلق کیا اور کیسے سے ہے دوسرے کا ایک حد تک کیوں سے ہے اور تیسرے کا اس سے کہ کیا ہونا چاہیے"۲ سرسید کی فکر یا خیالات کو اگر اس معیار کے مطابق جانچا جائے تو وہ بیشتر اس کے مطابق پائے جائیں گے۔ انھوں نے ہم وطنوں کو ملک کی صورت حال سے کہ وہ کیا اور کیسے تھی بخوبی آگاہ کیا وہ کیوں تھی اس کی انھوں نے تفصیلی اور عالمانہ وضاحت کی۔ اور یہ کہ اسے کیسے تبدیل کرنا چاہیے یعنی اس کو کیا ہونا چاہیے اس کے لیے گہری فکر اور پرخلوص جدوجہد سے کام لیا۔ ان کی یہ فکر اور جدوجہد نہ مشرق سے بیزاری سکھاتی ہے نہ مغرب سے حذر۔ یہ فطرت کے اس اشارے کی مانند ہے جو ہر شب کو سحر کرنا چاہتی ہے ۳

(1) The life and work of Sir Syed Ahmad Khan by G.F.I. Graham, Hodder and Sloughton 1909, p.226

(2) Earl S.Johnson, "Ways of Knowing", Social Education, Vol.XXVII No.1, 1963, p.7.

۳ مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر ✦ فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر! (اقبال)

غرض سرسید نے علی گڑھ کے ذریعہ نہ صرف ایک اعلیٰ تعلیم گاہ کی بنا ڈالی بلکہ ایک ایسا مبارک وممتاز ادا
قائم کیا جو ملک وقوم کی مجموعی ذہنی واخلاقی تربیت کے لیے بہت موثر ومفید ثابت ہوا۔ عالی منش مدیران قوم کی نز
لائق اساتذہ کی موجودگی محبت اور مستعدی سے ہونہار اور حوصلہ مند نوجوانوں کی اعلیٰ ذہنی واخلاقی نشوونما کے
آزاد اور صحت مند فضا میسر آئی اور ان کے جذبات واحساسات کی تہذیب وترفع کے لیے سازگار ماحول وجود
میں آیا جس سے قوم کی بہترین تخلیقی ذہنی صلاحیتیں اجاگر ہوئیں اور قومی مقاصد اور ذمہ داریوں کا گہرا اد
پیدا ہوا اور

"اس سکا دل کش، قابل رشک اور اہم پہلو اس ہمہ گیر اور ہم آہنگ تہذیبی زندگی کی تشکیل
وترقی تھا جو ہندوستان کا دیرینہ امتیاز مانا جاتا ہے اور جس کی بنا پر اس ادارے کو ایک
اعلیٰ درس گاہ بالفاظ دیگر تہذیبی ریاست (Culture State) کا درجہ حاصل
ہوا علی گڑھ کی اس تہذیبی ریاست کا قابل قدر اور شاندار کارنامہ اس طرز فکر اور طریق
کار کو سمجھتا ہوں جن کی رو سے خیالات ومعتقدات کا خواہ وہ کسی نوعیت کے ہوں
جارحانہ یا مفسدانہ اظہار وابلاغ قابل نفرین قرار دیا گیا۔"[۱]

اس کے پیش نظر یہ عرض کرنا شاید بے موقع نہ ہوگا کہ

"جس طرح دنیا میں ہندوستان کو جغرافیائی طور پر ایک محدود رقبہ زمین لیکن اعلیٰ
نصب العین ومقاصد کے اعتبار سے ایک عالمی ریاست (World State) کا
درجہ دیتا ہوں اور اس کے مسائل کو سیاسی طور پر اندرونی وملکی لیکن اخلاقی اعتبار
سے بین الاقوامی یا آفاقی معیار کے مطابق دیکھنے اور پرکھنے پر اصرار کرتا ہوں اس طرح ہندوستان
میں علی گڑھ کو جغرافیکی رو سے ایک نہایت مختصر رقبہ زمین سمجھنے کے باوجود ثقافتی اعتبار
سے اس کو نئے ہندوستان میں سماجی انصاف پر مبنی ایک مہذب انسانیت دوست
سوسائٹی کے قیام واستحکام کا بڑا موثر وسیلہ سمجھتا ہوں۔ اس لیے کہ علی گڑھ نے شائستگی،
معقول پسندی اور روشن خیالی کی ان روایات کو ابتدا سے عزیز رکھا اور پروان چڑھایا جن
کی اہمیت وضرورت حالات حاضرہ کے پیش نظر آج پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔"[۱]

---

[۱] پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ" از رشید احمد صدیقی ۔ فکر ونظر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جولائی ۱۹۶۴ء ص ۶، ۷

○

جن حالات وحوادث کے ماتحت مدرسۃ العلوم کا قیام علی گڑھ میں عمل میں آیا ان کا ذکر گذشتہ اوراق میں آچکا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ اس کی پذیرائی ملک وقوم میں کیسی ہوئی۔ مدرسۃ العلوم کا قیام دراصل ایک وسیع سماجی احساس، صحت مند سیاسی شعور اور قومی یگانگت کا پیغام لایا اور اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس کی بنیاد ملک کے بدلے ہوئے حالات مغربی انداز فکر و علم وحکمت کی ترویج، مشرقی اقدار کی تنظیم وتکریم اور ملک کی ہمہ جہتی فلاح کے تصور پر مبنی تھی۔ اس کے محرک اعظم سرسید تھے جو اپنے خاندانی وقار روایات سیرت وشخصیت وسیع المشربی اور گوناگوں علمی ذہنی سیاسی اور قومی خدمات کی بنا پر ہر طبقے میں معتبر مانے جاتے تھے۔ انگریز اور انگریزی حکومت جو اس عہد میں حاکم کی نہیں قضا وقدر کی حیثیت رکھتی تھی، سرسید کے اعلیٰ صفات وخدمات کی ہر حال میں اور ہر موقع پر براہ راست تجربہ کرکے مطمئن ہو چکی تھی۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ اس لیے کہ غدر کے بعد انگریز اور انگریزی حکومت کی نظر میں مسلمانوں سے زیادہ مقہور ومغضوب کوئی دوسرا نہ تھا۔ دوسری طرف خود مسلمانوں کی عام حالت نہایت زار وزبوں تھی جس کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے۔

اس طرح سرسید کا رول سہ گانہ تھا۔ ایک طرف وہ مسلمانوں کو مایوسی پست حالی اور درماندگی سے نجات دلانا چاہتے تھے دوسری طرف انگریزوں کو مسلمانوں سے جو تاریخی ومذہبی عناد اور سیاسی پرخاش تھی اس کو دور کرنے کے لیے کوشاں تھے تیسری طرف ہم وطنوں سے برادرانہ اور دوستانہ تعلقات پیدا کرنے اور رکھنے کے متمنی تھے۔ سرسید کی یہ پوزیشن ایسی نہ تھی جس کو قبول کرنے کی کوئی شخص آسانی سے ہمت کر سکتا تھا۔ انھوں نے علی گڑھ تحریک کے وسیلے سے جو بیک وقت اور بڑی حد تک ہمارے لیے "ریفرمیشن" (اصلاح دین) اور "رینا ئسنس" (احیاء علوم) دونوں کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ سب کر دکھایا جو ان مشہور عالم تحریکوں سے

مغرب کو نصیب ہوا۔ اور ان سے مہذب انسانیت کو دور دور تک پہنچا۔

مدرسۃ العلوم کے قیام پر ملک کے وقیع اخبارات نے جو تبصرے کئے ہیں ناظرین کرام آئندہ اوراق میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ ان سے اس ادارے اور اس کے بانی اعظم کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کا موقع ملے گا۔ اخبار پانیر کے بارے میں مشہور تھا کہ انگریزی حکومت میں اس کا کوئی خریدار دیہات میں بود و باش رکھتا تھا تو اس اخبار کے طفیل وہاں ایک ڈاکخانہ کھول دیا جاتا تھا۔ اقتباس درج ذیل ہیں ۔

پانیئر مورخہ ۸ر جنوری ۱۸۷۷ء :

جو تقریب آج علی گڑھ میں منعقد ہو رہی ہے وہ اس منزل کی نشاندہی کر رہی ہے جس کی ابتدا ایک ایسی تحریک سے ہوئی جو ہندوستانی تہذیب کو ترقی دینے کے لیے آج سے پہلے کبھی نہیں کی گئی تھی اور جس کے نہایت درجہ محکم مقبول اور امید افزا ہونے میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں۔ محمڈن اورینٹل کالج کے سالار و سربراہ کار سید احمد خاں ہیں جن کا نام ان کے زیادہ سے زیادہ ہموطن ہمیشہ شکر گذاری کے ساتھ یاد رکھیں گے۔ لیکن اب تک ان کو شاید ہی اس امر کا احساس ہو کہ ان کی ذہنی بالیدگی اور سیاسی شعور پر سر سید کی ان خدمات کا کتنا اچھا اور اہم اثر پڑا ہے۔ اس ابھرتے ہوئے نئے کالج میں اس امر کی بشارت ملتی ہے کہ وہ اس ملک میں ایک حقیقی طاقت ثابت ہوگا۔ اور اس کی توسیع و ترقی کی ضمانت اس حقیقت میں ملتی ہے کہ اس کی نشوونما تمام تر بے منت غیرے اور بطور خود ہوئی ہے بالفاظ دیگر یہ حکومت کا لایا اور حکام کا پروان چڑھایا ہوا کوئی بدیسی ادارہ نہیں ہے بلکہ اسی دیش کے باشندوں کی فرزانگی اور عزم محکم کا گل سرسبد ہے۔ اس وقت جب کہ وائسرائے علی گڑھ میں اس ادارہ کی خوبی اور خدمات پر مہر تصدیق ثبت کر رہے ہوں گے اور ہر شخص کی نظر اس کے مستقبل پر مرکوز ہو گی بے محل نہ ہوگا۔ اگر ہم ناظرین کی دلچسپی کی خاطر ان حالات واسباب کا مختصر جائزہ لیں جو ایک ایسے کالج کو معرض وجود میں لانے کا باعث ہوئے جو اس ملک میں عدیم المثال ہے ۔

---

(1) An account of the ceremony of the laying the foundation stone of the Mohammadan Anglo Oriental College Allyghur, toghether with some articles on subjects connected with the movement. Printed by Wm.Jns.Dare, at the Pioneer Press Allahabad, 1877, pp. 43- 75 (Aligarh Muslim University Library)

پانچ سال ہوئے حکومت کی توجہ اس طرف مائل کرائی گئی کہ مسلمانوں کی تعلیم کا انتظام خاطر خواہ نہیں تھا۔ چنانچہ گورنر جنرل باجلاس کونسل نے یہ رزولیوشن پاس کیا کہ مدراس بمبئی اور بنگال کی مقامی حکومتوں کو تاکید کی جاتی ہے کہ وہ اس امر کی تفتیش کریں کہ مسلمان اس تعلیم سے کیوں نہیں فائدہ اٹھاتے جو اسٹیٹ مہیا کرتی ہے۔ رزولیوشن میں کہا گیا تھا بڑے افسوس کی بات ہے کہ اتنی بڑی اور اہم جماعت جس کا کلاسکی ادب نہایت درجہ گراں قدر علوم کا خزینہ ہو اور جس میں ایسے علما ملتے ہیں جنھوں نے اپنی پوری زندگی علم کی تحصیل و توسیع کے لیے وقف کر دی ہو ہمارے نظام تعلیم سے بے تعلق رہ کر اور اس میں حصہ نہ لے کر ان تمام مادی اور اجتماعی فوائد سے محروم رہ جائیں جن سے دوسرے بہرہ مند ہو رہے ہیں۔ مقامی حکومتیں باتفاق آرا انہی نتائج پر پہنچیں جن پر حکومت ہند کے رزولیشن کا مدار تھا۔ گورنمنٹ کالجوں اور اسکولوں میں مسلمان لڑکوں کی تعداد باعتبار تناسب نہایت قلیل تھی اور جہاں تک اونچی آسامیوں کا تعلق تھا ہندوستان کے بعض علاقوں میں مسلمان عہدہ داروں کی تعداد تیزی سے گرتی جا رہی تھی۔ اس غیر اطمینان بخش صورت حال کا نتیجہ تشویشناک تھا۔ ایسے ملک میں جہاں تعلیم دینے کا ذمہ حکومت نے اپنے ذمہ لے رکھا ہو وہاں آبادی کا معتدبہ حصہ حکومت کے نظام تعلیم سے اپنے کو علیحدہ رکھے خود ایک ایسا سانحہ ہے جو تعلیم سے محض بے التفاتی کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمانوں میں جس طرح تعلیم گھٹتی جا رہی ہے۔ ان کا افلاس بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ صورت حال ان کے مذہبی کٹرپن کو مہمیز کرتی رہتی ہے مسلمان جس تبدیلی کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور نقصان اٹھا رہے ہیں اس سے بہت غیر مطمئن ہیں۔ اس طور پر ان برائیوں کے شدائد اور بڑھ گئے ہیں جن میں وہ مبتلا ہیں۔

ان تمام امور کے پیش نظر روشن خیال ممبروں کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس کا مقصد مسلمانان ہند کی تعلیم کی بہتر توسیع و ترقی کے تدابیر پر غور کرنا تھا۔ کمیٹی کا مستقر بنارس تھا۔ کمیٹی کو ہندوستان کے مختلف حصوں کے آزاد خیال مسلمانوں کی نمایندگی حاصل تھی جن کی آرا سکریٹری کو بھیج دی گئیں۔ کمیٹی نے تین انعامی مضامین کا اعلان کیا۔ مضمون کا عنوان تھا برطانوی ہند میں مسلمانوں کی تعلیم۔ زیر بحث مسائل یہ تھے تعلیم کی موجودہ حالت، زوال کے اسباب اور ان کو دور کرنے کی تدابیر۔ ۳۲ مقالے موصول ہوئے جس کا خلاصہ سکریٹری نے مرتب کر کے رپورٹ کے ساتھ پیش کیا۔ تفصیل یہ ہے۔

(۱) مذہبی تعلیم کا فقدان۔

(۲) انگریزی تعلیم سے ایمان میں خلل آتا ہے۔

(۳)۔ انگریزی تعلیم اخلاق شائستگی و تواضع کو مسخ کر دیتی ہے۔

(۴)، تعصب اور سوء ظن پیدا کرتی ہے مثلاً انگریزی پڑھنا خلاف شرع ہے اور قانون اسلام کی رو سے ممنوع۔ گورنمنٹ کالجوں اور اسکولوں میں مسلمانوں کو مذہبی فرائض ادا کرنے اور نماز جمعہ پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ محمڈن کالجوں اور اسکولوں میں مسلمان معلم نہیں ہیں۔ ہندو اور عیسائی ماسٹر مسلمان شاگردوں کی طرف توجہ نہیں کرتے اور ان سے سختی کا سلوک کرتے ہیں۔ گورنمنٹ کالجوں اور اسکولوں کے ماسٹر بالعموم شائستہ نہیں ہوتے ان کے طور طریقے سے بدوضعی ٹپکتی ہے اور شاگردوں کو مناسب طور پر نہیں سکھلاتے پڑھاتے بدیسی زبان میں سائنس کی جو باتیں ہیں مسلمانوں کے نزدیک ان کی وقعت ان علوم کے مقابلے میں بہت کم ہے جن کی حامل ان کی اپنی کتابیں ہیں ان سائنسی علوم کے پروفیسر علم ولیاقت کے اعتبار سے کم مایہ ہوتے ہیں۔ حکومت کا نظام تعلیم مسلمانوں کی قومی عادت واطوار اور رسم ورواج سے متناقض ہے

(۵)، حکومت کے نظام تعلیم کے نقائص کا اظہار حسب ذیل امور میں ملتا ہے۔

تعلیم کا پورا انتظام وانصرام تنہا ایک ڈائرکٹر کے ہاتھ میں ہے جو مسلمانوں کے جذبات کا احترام نہیں کرتا۔ مزائد اور دور از کار مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے جس سے طالب علموں کا ذہن اصلی مضامین سے بھٹکتا ہے۔ اساتذہ کی تعداد کافی نہیں ہوتی اور بچوں کو جس نوعیت کی تعلیم دی جاتی ہے اس سے ان طالب علموں کو بڑی دشواری پیش آتی ہے جو مبتدی ہوتے ہیں۔ امتحانات کا طریقہ ایسا ہے جس سے مضامین میں درک نہیں پیدا ہوتا بلکہ رٹ لینے کی عادت ہو جاتی ہے۔ مشرقی علوم کی تعلیم کا انتظام قابل اطمینان نہیں ہے گورنمنٹ کالج اور اسکولوں میں ایسی کتابیں داخل نصاب ہیں جن میں اسلام سے خصومت کے مضامین ملتے ہیں۔

مسلم باشندوں کے عادات واطوار کے ذیل میں بتایا گیا ہے۔

(الف) دولت مند طبقہ اپنے بچوں کو گھر پر تعلیم دیتا ہے اور ان کو گورنمنٹ کے تعلیمی اداروں میں بھیجنا اپنے منصب ومنزلت کے خلاف سمجھتا ہے جہاں ہر طبقے کے طالب علم ملتے جلتے رہتے ہیں۔

(ب) معاش وملکیت کی طرف سے مطمئن اور اولاد سے احمقانہ حد تک محبت رکھنے کے سبب سے یہ سمجھتے ہیں کہ ان کو تعلیم کی حاجت نہیں۔

(ج) اونچے طبقے کے مسلمان عیاش اور متوسط درجے کے کاہل، تعلیم کی طرف سے بے پروا اور ناعاقبت اندیش۔

(د) مسلمان بالعموم انگریزوں سے دوستانہ مراسم نہیں رکھتے۔ کوئی رابطہ یا وسیلہ بھی نہیں جس سے ان میں انگریزی تعلیم مقبول ہو۔

(ہ) مسلمان پیدائشی طور پر توجی ملازمت پسند کرتا ہے اس لیے تعلیم حاصل کرنے کی طرف کم مائل ہوتا ہے۔

مذکرہ کمیٹی نے اپنی ایک میٹنگ میں جو بنارس میں منعقد ہوئی تھی یہ فیصلہ کیا کہ وہ اس امر کی پابند نہیں ہیں کہ صرف ایسے ذرائع اور وسائل متعین کریں جو موجودہ زمانے کے حسب حال اور اس میں قابل عمل ہوں" بلکہ ان "تدابیر کو بھی مدنظر رکھنا ہے جو موجودہ حالات سے قطع نظر مسلمانوں کے آئندہ سود و بہبود کے حقیقی طور پر ضامن ہوں" چنانچہ وہ آئندہ نسلوں کے لیے ایسا ہی ایک نظام تعلیم منضبط کرنے اور اس کے نافذ کرنے کے خواہاں اور کوشاں ہیں (خواہ اس نظام کا نفاذ "فی الفور" نہ ہو سکے) اور اس کے در و بست پر غور کر سکتے ہیں نیز ایسے حصوں کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں جو فی الوقت ممکن ہو سکیں گے"؛ اس کے بعد سب نے اس پر اتفاق کیا کہ وقت، روح عصر، علوم طبعی (سائنس) اور ان کے دریافت کیے ہوئے نتائج سب بدل چکے ہیں۔ قدیم اسلامی کتب ان کے مصنفین ان کا انداز بیان اور لب و لہجہ ایسا نہیں ہے جو مسلمانوں کو آزادی افکار سادگی اور سلاست کا سبق دے سکے۔ اس کے علاوہ ان کتابوں اور ان کے مصنفین میں اس کی بھی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کو حقیقت حال تک پہنچانے میں معین ہوں بلکہ یہ لوگوں کو دھوکا دیتے اور اس امر کی تلقین کرتے ہیں کہ وہ مطالب پر پردہ ڈالتے رہیں۔ خوب صورت الفاظ اور فقروں سے اپنی گفتار کو آراستہ کریں۔ غلط اور غیر متعلق بیانات سے کام لیں۔ چاپلوسی کریں غلامی کی زندگی اختیار کریں۔ ساتھیوں سے غرور خود پسندی اور بد دماغی سے پیش آئیں۔ ان سے ہمدردی نہ رکھیں۔ مبالغہ آرائی سے کام لیں۔ سلف کی تاریخ کو مشکوک اور حقیقت کو افسانہ قرار دیں۔

ظاہر ہے قدیم اسلامی نظام تعلیم کے خلاف ایسے معاندانہ جذبات کے اظہار سے بیشتر مسلمانوں کو کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ کمیٹی کی مساعی کو ابتدا میں شدید مخالفت کا سامنا ہوا اور یہ کمیٹی کے اس تحمل و استقامت کا نتیجہ ہے جس سے اس نے اس مہم کا آغاز کیا تھا کہ آج ایک محمڈن کالج کے منتقلاً وجود میں آجانے کی خبر سننے میں آرہی ہے۔ جن اصولوں پر اس ادارے کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ ان سے مشابہ ہے جن پر انگلستان کے اسکولوں کی تنظیم ہوئی ہے۔ اس کالج کا ایک پہلو جو اس کو ہندوستان کے دوسرے تعلیمی اداروں سے ممتاز کرتا ہے یہ ہے کہ اس میں بیشتر طلبا کو حدود کالج کے اندر اقامتی زندگی اختیار کرنی پڑے گی۔ اس طرح وہ ان مضر اثرات سے محفوظ رہیں گے جن سے ہندوستانی گھروں کی فضا نوجوان ذہنوں

تاثر کرتی رہتی ہے۔ یہ پابندی کسی یوروپین پر گراں نہ گزرے گی لیکن جو لوگ اس ملک کے باشندوں
ی گھریلو زندگی سے واقف ہیں وہ آسانی سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ کالج کے بانیوں کو کیسی دشواریوں کا سابقہ
ہوگا کہ وہ والدین کو اس پر آمادہ کر سکیں کہ اپنے بچوں کو ایسی تعلیم گاہ میں بھیجیں جہاں قیام کی شرط لازمی
ں۔ اس کے بعد کمیٹی برائے ترقی واشاعت تعلیم مسلمانان ہند محمڈن اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی کے نام سے موسوم
ئی اور اس نے اپنے تمام مساعی اس پر مرکوز کر دیں کہ ایک ایسے کالج کے لیے سرمایہ جمع کریں جو انگریزی اصول
ہم کے خطوط پر قائم کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی مشرقی علوم اور مسلم مذہب کی تعلیم کا بھی بندوبست ہو۔
رے کی غایت مسلمانوں کے بہتر و برتر طبقے کے لڑکوں کو ایسی آزاد تعلیم سے بہرہ مند کرنا ہے جو انگریزی تعلیم
سرکاری ملازمتوں کے لیے ایک طرح ٹکنیکل تربیت نہ سمجھیں بلکہ ایک شریف و شائستہ شخص کے لیے لازمی
بھتے ہوں خواہ وہ شخص نسل و نسب کے اعتبار مشرقی ہو یا مغربی۔ کالج کا نصاب پانچ سال کا ہوگا جس میں
کول کی چار سال کی مدت تعلیم شمار نہ ہوگی۔ اس میں وہ فوقانی نصاب تعلیم کے لیے تیاری کریں گے۔ کالج
جن ..... مضامین کی تعلیم دی جائے گی وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ زبان ـــــ انگریزی و عربی (جس میں مسلم دینیات کا ابتدائی کورس شامل ہوگا)

۲۔ علم اخلاق ـــــ (۱) منطق، خطابت ذہنی و اخلاقی فلسفہ (۲)۔ سیاسی معاشیات اور علم تاریخ

۳۔ مسلم قانون، اصول قانون، دینیات

یہ سارے مضامین لازمی نہیں ہیں لیکن ایسے ضوابط مقرر کیے گئے ہیں جن کی رو سے طلبا اپنی پسند
ے مضامین منتخب کر سکتے ہیں جس کا مدار اس عام امتحان کے نتیجہ پر ہوگا جو طالب علم کے تہذیبی صلاحیت
شعور کو پرکھنے کے لیے لیا جائے گا۔ کافی بحث مباحثے کے بعد کمیٹی کے اراکین کی بھاری اکثریت کے ساتھ
س میں اطراف ملک سے آئے ہوئے تقریباً ساٹھ اراکین تھے یہ طے پایا کہ موزوں آب و ہوا اور مسلم اضلاع
ں مرکزی جائے وقوع کی حیثیت حاصل ہونے کے سبب سے کالج کا قیام علی گڑھ میں عمل میں آئے۔ جن
مارات کا آج لارڈ لٹن سنگ بنیاد رکھیں گے۔ ان کا ایک کواڈرینگل (Quadrangle) ہوگا جس میں
قریباً دو سو طلبا کے رہنے کے لیے کمرے ہوں گے۔ ایک مرکزی ہال ہوگا۔ لائبریری عجائب خانہ اور کچھ کمرے لیکچرر
ر فیلوز کے قیام کے لیے ہوں گے۔ شیعہ سنی طلبا کے لیے دو مسجدوں کی تعمیر کا بھی خیال ہے۔ ایک کشادہ ہال بھی
وگا جہاں شام کا کھانا تمام لڑکے ساتھ کھائیں گے۔ جیسا کہ انگلستان کے پبلک اسکولوں اور یونیورسٹی میں ہوتا

ہے جس آراضی پر کالج کی عمارات تعمیر ہوں گی اسے حکومت شمالی مغربی نے ایک سال ہوئے کالج کو
مرحمت کر دیا ہے۔ اس رقبے کو ایک پارک کی حیثیت دی جائے گی جس میں کالج کے طلبا کے لیے کرکٹ کا میدان
بھی ہوگا۔ محمڈن اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی کی مساعی تا حال بے مثل کامیابی سے ہمکنار ہوئی ہیں۔ بہت سے
انگریز اکابر نے فراخدلی سے کمیٹی کی حمایت کی ہے اور کالج فنڈ میں فیاضی سے مالی عطیات دیے ہیں۔ لارڈ نارتھ
بروک نے دس ہزار روپے مرحمت کیے۔ ان کی تقلید میں سر ولیم میور اور سر جان اسٹریچی نے چندے مرحمت
فرمائے ـــــــــــــــ۔ دونوں صاحبان کالج کے
حقیقی خیر اندیش ہیں۔ اہل ہنود میں جو اصحاب کالج سے ہمدردی رکھتے ہیں ان میں آنجہانی مہاراجہ پٹیالہ کا نام
سب سے ممتاز ہے جنھوں نے اٹھاون ہزار کی گرانقدر رقم ارزانی فرمائی۔ مہاراجہ صاحبان وزیانگرم اور
بنارس سے بھی کمیٹی کو بیش قرار رقوم موصول ہوئی ہیں۔ ان کی تقلید میں بہت سے ہندو اکابر نے بھی کالج کی
مالی اعانت فرمائی ہے۔ مسلمانوں میں سر سالار جنگ نے کالج کی مدد فرمانے میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے
انھوں نے وزیٹر کا منصب قبول فرمایا اور تیس ہزار کی جاگیر کالج کے لیے وقف کر دی ہے۔ ہز ہائنس نظام حیدر
نے نوے ہزار کی جاگیر مرحمت فرمائی اور نواب صاحب رام پور نے جو کمیٹی کے پیٹرن ہیں پچیس ہزار روپے عطا

پائنیر ۱۱ر جنوری ۱۸۷۷ء:

محمڈن اورینٹل کالج

وائسرائے نے سنگ بنیاد رکھا

(۱۱ر جنوری ۱۸۷۷ء کے پائنیر کے خصوصی نامہ نگار کے قلم سے)

علی گڑھ۔ ۸ر جنوری ۱۸۷۷ء

ہندوستان کے مسلمانوں میں جو طبقہ زیادہ ترقی یافتہ ہے اس کی ایک بڑی اہم تحریک آج محسوس دم
شکل میں سامنے آرہی ہے جس کی طرف ہندوستان کے ذہین باشندوں نیز انگلو انڈین جماعت دونوں کی تو
یقینی طور پر مائل ہوئی ہوگی۔ عرصے سے یہ بات تسلیم کی جارہی ہے کہ کچھ دنوں سے ہندوستانی مسلمانوں کے
طبقے میں ترقی اور روشن خیالی کا جذبہ کار فرما ہے جسے سید احمد خاں بہادر جن کا شمار ان کی جماعت کی نہا

درجہ ناموشخصیتوں میں ہوتا ہے کی انتھک کوششوں نے ایسے نتائج سے روشناس کیا ہے جو چند سال پہلے ناممکن تصور کئے جاتے تھے اس عمیق بصیرت سے جو بر سر عمل آنے میں اتنی ہی اور جنل تھی جتنی قرین صواب سید احمد نے اس مسلمہ حقیقت کو پالیا تھا کہ اگر مسلمان آبادی کو ایسی حیثیت حاصل ہوئی تھی جہاں ان کی ذہنی صلاحیتوں اور فطری قوتیں پورے طور پر بر سر کار لائی جا سکتی تھیں تو مغرب کے تعلیمی اصولوں کو قبول کرنا پڑے گا۔ اور ان موانع کی شکست و ریخت لازم آتی تھی جو ان کے ہموطنوں کی ترقی کے راستے میں حائل تھے۔ کسی ایسے نظام تعلیم کے بغیر جو ایک نوجوان مسلمان کو اس قابل بنائے کہ وہ انگریز حریفوں سے ملک کی حکومت کے تحت مناصب جلیلہ کے لیے مقابلہ کر سکے۔ سرسید اس حقیقت حال سے پورے طور پر آشنا ہو چکے تھے کہ کوئی بڑا مقصد حاصل نہ ہو سکے گا اور ان کی زندگی میں ان کی بے پناہ کوشش چاہے جو کچھ کرلے ان کی ذاتی توجہ کے ختم ہوتے ہی اس کے نتائج بھی نقش بر آب ثابت ہوں گے لیکن اگر عمل پیہم سے وہ ایک ایسا آئین نو بروئے کار لا سکے جو عام حالات میں مسلمانوں کی پوری جماعت کی کارکردگی پر مستقلاً و براہ راست اثر انداز ہو سکتا تھا تو اس طرح کی محنت و مساعی سے قطعاً دریغ نہ کرنا چاہئے اس لیے کہ اس کا انجام بجائے خود اپنا انعام ہوگا۔ ایک ایسی نسل کی اخلاقی و اجتماعی سطح کو بلند کرنا جس کی روایات اور تعصبات و توہمات بھی جو مغربی حکومتوں سے زیادہ نہیں تو ان کے برابر تھیں، بجائے خود ایک ایسا مشکل کام تھا جس سے عہدہ برآ ہونے کی شاید ہی کوئی مشرقی ہمت کرتا لیکن ہندوستان میں ترقی یافتہ اسلام کے قائد کو اپنے راستے پر عزم و یقین کے ساتھ آگے بڑھنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی تھی خواہ اس کے عواقب میں کتنے ہی محن و مصیبت کا سامنا کیوں نہ ہوتا۔ ان کے تصورات نے جو مخصوص ہیئت اختیار کی وہ ایک ایسے کالج کا قیام تھا جو اپنے نظم و نہاد کے اعتبار سے انگریزی یونیورسٹیوں کا قریب ترین نمونہ ہو غیر معمولی دشواریوں اور مخالفتوں کو جھیلنے کے بعد وہ ان موانع کو شکست کر پائے جن کو ان کے قدامت پرست ہم وطنوں نے قائم کر رکھے تھے تا آنکہ ایم اے او کالج کی تاسیس کا امکان وقوع میں آیا۔ اس تحریک کو نہ صرف سرسید احمد خاں کے ہم مشربوں کی تائید حاصل رہی ہے بلکہ انسانیت دوست انگریز اور وسیع الخیال ہندو بھی شریک ہیں جس سے اس ادارے کے مستقبل کے امکانات نہایت دور رس اور امید افزا معلوم ہوتے ہیں۔

یہ پہلا اتفاق نہیں ہے کہ کالج اور اس کے مخصوص مقاصد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور یہ امر نہایت درجہ قابل امتنان و اطمینان ہے کہ اس ادارے کا سنگ بنیاد رکھنے کی جو رسم آج ادا کی جا رہی ہے

اس کی صدارت وائسرائے بنفس نفیس کر رہے ہیں اور ہز اکسلنسی کو مسلمان نمائندوں کی ایسی بڑی جماعت سے روشناس ہونے کا موقع ملا جن کی وفا شعاری ہر شبہ سے پاک ہے اور جن کی یہ آرزو کہ اپنے ساتھیوں کے سوشل حالات کو بلند اور بہتر کریں کسی خود غرضی یا نا صواب اغراض پر مبنی نہیں ہے۔

وائسرائے اسپیشل ٹرین سے ۹ بجے صبح پٹیالے سے تشریف لائے۔ اسٹیشن پر مسٹر لوپ لک سی۔ اس (ڈویژن کے کمشنر) مسٹر چیز سی۔ ایس (مقامی جج) مسٹر جیمس کالون (کلکٹر اور مجسٹریٹ) سید احمد خاں، کنور لطف علی خاں او نائب صدر کالج فنڈ کمیٹی اور ضلع کے سول حکام استقبال کے لیے موجود تھے۔ وائسرائے کے ساتھ لیڈی لٹن لا اور لیڈی ڈون، ڈاکٹر تھارنٹن لفٹنٹ کرنل برن سی۔ ایس۔ آئی ڈاکٹر بارونٹ، کپتان راس اور کپتان آنر یبل و (اے۔ ڈی سی) تھے۔ ناشتے کا انتظام سید احمد کے جائے قیام پر تھا جہاں بہت سے ہندوستانی اصحاب اور ممبر کمیٹی وائسرائے سے متعارف کرائے گئے۔ اس کے بعد وائسرے کالج تشریف لائے جہاں ایک محدود تعد ایسے طلبا کی موجود تھی جو بجا طور پر وائسرائے سے متعارف ہونے کے لیے خاص طور پر اس لیے مشتاق منتظر تھی کہ وہ مادر علمی کے اولین طالب علم تھے اس کے بعد لارڈ لٹن اپنے میزبا کے مکان پر واپس آئے۔ سہ پہر میں گاڑیوں میں بیٹھ کر جلوس شامیانے تک آیا جو کالج کے میدان میں نصب کیا گ تھا۔ شامیانہ نصف کے قریب مسلمان اور دیگر اکابر سے بھر چکا تھا جن ممتاز افراد کو وائسرائے کے جلوس میں مو کا مخصوص امتیاز حاصل تھا یہ تھے: مسٹر لوپ لک، مسٹر چیز، مسٹر کالون، خان بہادر محمد حیات خاں سی۔ ایس۔ آئی را شمبھو نرائن سنگھ بہادر، راجہ جے کشن داس بہادر سی۔ ایس۔ آئی رائے کشن کمار، کنور لطف علی خاں اور سید برکت علی خ لارڈ لٹن کا استقبال سید احمد نے کیا۔ وائسرائے کے شامیانے میں داخل ہوتے ہی سارا مجمع کھڑا ہو گیا۔ دائیں ہندوستانی حضرات کی نشست تھی جو ملک کے تمام اطراف سے آئے تھے۔ پنجاب، دکن اور زیریں بنگال کے ن موجود تھے مسٹر کین سی۔ ایس، مسٹر ڈیٹن اور مسٹر جارج روز کی نشستیں پلیٹ فارم پر تھیں۔ شامیانہ ٹری سے آراستہ کیا گیا تھا۔ سبز پتوں سے ڈھکے ہوئے ستون اور رنگ برنگ کے لہراتے ہوئے ہار پھول اور جھالریں نئے لباس کے ساتھ ملے جلے نہایت درجہ دل آویز معلوم ہوتی تھیں ہر ایک کی توجہ مرکزی نشست پر جمی ہوئی جہاں سے کچھ فاصلہ پر ہندوستانی باشندوں کی کثیر تعداد جمع ہو گئی تھی جو اس تقریب کا نظارہ انتہائی محویت سے کر رہی تھی۔ کالج کا رقبہ کافی وسیع ہے اور ان تمام لوگوں کی نشستوں کا معقول انتظام کیا گیا تھا۔

تقریب میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ میدان کے حاشیہ پر بے شمار گاڑیاں کھڑی تھیں جن میں کچھ ہاتھی بھی تھے جو زرق برق عماریوں کے ساتھ اس جلسے کی رونق میں اضافہ کر رہے تھے۔

خیر مقدم کا اعتراف کرتے ہوئے وائسرائے اپنی نشست پر جلوہ افروز ہوئے تو سید محمود آگے بڑھے اور حسب ذیل سپاسنامہ پڑھا جس میں کالج کے قیام سے جن مقاصد کے حصول کی توقع کی گئی تھی ان کا اظہار وضاحت سے ملے گا۔

[مذکرہ سپاسنامہ علی گڑھ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے نیا نہیں ہے یوں بھی اس کے جستہ جستہ اجزا پچھلے اوراق میں دیے جا چکے ہیں۔ اس لیے اس کو نقل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ پائنیر کے زیر نظر شمارے میں سپاسنامہ اور اس کا جواب دونوں پورے کے پورے شائع کئے گئے ہیں۔ البتہ سپاسنامے کے جواب سے کچھ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جن کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا]

وائسرائے نے فرمایا: "آپ نے اپنے ایڈریس میں یہ بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کی قوم اپنے مذہب کو نہ صرف ذہنی واصولی دلائل پر مبنی سمجھتی ہے بلکہ اس کو دنیاوی تعلقات میں سب سے عمدہ اور سب سے بڑھ کر رہنما خیال کرتی ہے۔ اے صاحبو۔ میں اس قسم کے مذہبی یقین کو یہ سمجھتا ہوں کہ ایسا یقین تمام سچے مذہبی یقین کی سب سے عمدہ شکل ہے۔ کیونکہ ہر ایک مذہب کا خواہ اس کا کچھ ہی نام ہو اور اس کی کیسی ہی شکل ہو۔ سب سے مانا ہوا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانی مشاغل کی دنیاوی زندگی کے مختلف فرائض میں رہنمائی کرے اور میں یقین کرتا ہوں کہ کہ آپ اس بات کے اعتراف کرنے میں ذرا دریغ نہ کریں گے کہ مذہب اسلام میں کوئی اصول ایسا نہیں ہے جو اعلیٰ درجے کی دماغی ترقی کا مانع خیال کیا جا سکتا ہو مسلمانوں نے علم و ہنر و سائنس کے میدان میں بڑی بڑی فتوحات حاصل کی ہیں اس قوم نے نہ صرف ایشیائی براعظم کے اس بڑے قطعہ میں ایسی بڑی بڑی و عالی شان عمارات قائم کی ہیں جن کو آج تک ایک عالم دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے اور جن کی تعریف میں تمام دنیا رطب اللسان ہے بلکہ ایسے زمانے میں جب کہ یورپ کی عیسائی قومیں اپنی جہالت کی تاریکی اور سوشل برائیوں سے نکلی ہی نہ تھیں مسلمانوں کی قوم نے تمام جزیرہ نما آئبیرین کو طب و فلسفہ و ریاضی کے دارالعلوم سے مملو کر دیا تھا اور ان علوم میں وہ تمام اپنے ہم عصروں سے بڑھے ہوئے تھے ...... مگر خالق مطلق نے کسی خاص قوم کے لیے یہ بات مخصوص نہیں کر دی ہے کہ وہی ہمیشہ انسانی خیالات کو ترقی دیا کرے اور انسانی تہذیب کے نشو و نما کے سامان بہم

پہنچایا کرے۔ مغربی دنیا کی تعلیم جدید اب اس درجہ تک پہنچ گئی ہے کہ وہ مشرقی دنیا کا قرض ادا کرے جو اس نے پہلے مشرقی عقل
کی تعلیم جدید اب اس درجہ تک پہنچ گئی ہے کہ وہ مشرقی دنیا کا وہ قرض ادا کردے جو اس نے پہلے مشرقی عقل
و دانش و علم و ہنر سے لیا تھا اور جس کی وہ شروع زمانہ سے مقروض رہی ہے۔ ہندوستان کی ملکی و تمدنی ترقی کے لیے
ہم کو چاہیے کہ ہم مغربی خیالات و مغربی علوم کی تحصیل کی طرف مائل ہوں اور میں مسلمانوں کو انہی خیالات اور انہی علوم
کی تحصیل کے لیے نصیحت کرتا ہوں کہ وہ علمی دنیا میں نئی فتوحات حاصل کریں اور ان کو اپنے لیے اعلیٰ مقصد کی تحصیل
کے لیے نئے مواقع ملیں ..... مجھے اس بات کی اجازت دیجیے کہ میں سرسری طور سے یہ بتاؤں کہ وہ کون سی مخصوص
وجہ مسرت ہے کہ جس سے میں اس کالج کے قائم ہونے سے خوش ہوں۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کا سب سے
بڑا مقصد جس کی وہ دلدادہ ہے یہ ہے کہ اس کی طرز حکومت کے سیدھے سادے اصول جن پر وہ مبنی ہے اعلیٰ
سے ادنیٰ تک سب لوگ اچھی طرح سے سمجھ جائیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ گورنمنٹ کا یہ مقصد اس وقت تک پورے
طور پر حاصل نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ انگریزی نظام سیاست کے اصول نہ صرف ہندوستانی زبانوں میں
ترجمہ ہو جائیں بلکہ دیسی خیالات میں بھی پیوست ہو جائیں ..... میں آپ سے اظہار ہمدردی و صدق دل سے
آپ کو مبارکباد دیے بغیر نہیں رہ سکتا اور یہ خیال نہ فرمائے کہ میں آپ کی اس بڑی کامیابی پر صرف آپ ہی
کو مبارکباد دیتا ہوں بلکہ تمام ملک و تمام سلطنت کو مبارکباد دیتا ہوں اور میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ کی یہ
کامیابی اسی طرح کی دوسری سرگرمیوں کے لیے بھی جو نہ صرف ذہنی شائستگی کو پھیلانے بلکہ جو سب سے بڑی
چیز ہے یعنی ذہنی شائستگی کی قدر و قیمت کو جاننے اور پہچاننے کے حق میں ہوں گی ان کے لیے بھی نہایت سود
مند محرک ثابت ہوگی ..... میں نہایت خوشی کے ساتھ آپ کی اس مسرت بخش تجویز کو قبول کرتا ہوں کہ آپ
میرے نام کی یادگار قائم کرنا چاہتے ہیں[1]۔ ایک کتاب خانہ جو آپ میرے نام سے منسوب کرنا چاہتے ہیں سب سے
مناسب سوسائٹی ہے۔ اگر ان میں کسی شخص کو دخل ملے یہ دنیا کے معزز ترین خیر خواہوں کی ایک جماعت ہوتی ہے
تمام زمانہ کے عقل مند اور نیک لوگ یہاں رہتے ہیں۔ اس جگہ وہ لوگ رہتے ہیں جو اس دنیا میں رہنے کے قابل

---

(1) Addresses and speeches relating to the M.A.O. College in Aligarh from its foundation in 1875 to 1898 (Dec. 24. 1898) Institute Press Aligarh (Maulana Azad Library Aligarh) page 35.

ہیں۔ لہذا میں ایک ایسی عمارت کی بنیاد رکھنے میں کہ جس میں ایسے بڑے بڑے لوگوں کی تعداد روز افزوں ہوتی رہے گی اپنی بڑی خوش نصیبی خیال کرتا ہوں[1]۔"

[اس کے بعد ہز اکسلنسی نے سنگ بنیاد رکھا اور وہ تمام رسوم عمل میں آئیں اور آداب بجالائے گئے جو ایسے موقعوں پر ملحوظ رکھے جاتے ہیں۔ شکریہ کے بعد تین بجے دن کو وائسرائے اور پارٹی ریلوے اسٹیشن آئے اور آگرہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ پانیر کے نامہ نگار نے اسے تفصیل سے بیان کیا ہے لیکن یہاں اس کا من وعن نقل کرنا ضروری نہیں معلوم ہوتا۔ البتہ اسی دن شب میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ میں جو ڈنر دیا گیا اور تقریریں ہوئیں ان کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے]

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ میں ڈنر:

محمڈن کالج کمیٹی نے شب میں علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ میں ڈنر دیا جس میں کم و بیش ساٹھ مہمان مدعو کئے گئے تھے۔ مسلمان اور یورپین مہمانوں کی تعداد مساوی تھی کنور لطف علی خاں صدر اور راجہ سید باقر علی خاں نائب صدر تھے۔ سید احمد خاں اور خاں بہادر محمد حیات بھی موجود تھے۔ پہلا ٹوسٹ "ملکہ معظمہ ہند اور ہندوستان میں برطانوی حکمرانی کی کامرانی" کا تھا۔ کمیٹی کے صدر کی طرف سے سید محمود نے دوران تقریر فرمایا کہ ایک ایسے ملک میں جو انگلستان سے اتنے دور دراز فاصلے پر واقع تھا جیسا کہ ہندوستان ہے وہاں کے باشندے اپنے تخیلہ میں اپنے فرماں روا کا قطعی تصور نہیں قائم کر سکتے تھے بایں ہمہ اس کے بہت سے وجوہ ہو سکتے ہیں کہ جنھوں نے ملکہ معظمہ کو نہیں دیکھا تھا وہ ملکہ سے وہی محبت و عقیدت رکھتے ہوں جنھوں نے ان کو بار بار دیکھا ہو (ہیر ہیر) ایسے لوگ ملکہ معظمہ کا تصور اس حیرت انگیز اور بہتر طرز حکومت سے کر سکتے ہیں جس کے طفیل ملک سرسبز اور مرفہ الحال ہے اور وہ خوشی اور امن وچین نصیب ہے جو اسے صدیوں سے میسر نہ تھے (ہیر ہیر) جہاں تک ٹوسٹ کے موخر الذکر حصے کا تعلق ہے یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ مسلمان ذہن میں ہندوستان میں برطانوی حکومت اور ملکہ معظمہ کی ذات خاص کا تصور ایک اور یکساں ہیں طویل عرصے تک وہ محکومی کی زندگی بسر کر چکے ہیں۔ انگریزی حکومت کے عہد اولین سے ہندوستان کے باشندے بالخصوص مسلمان انگریزوں سے وہ سوشل روابط قائم نہ کر سکے جو ان کو یقیناً کرنا چاہئے تھا (ہیر ہیر) اس ناقابل اطمینان صورت حال کے بہت سے اسباب ہیں مسلسل مباحثوں کے دوران

---

(1) "A Library is the 1st society to which any man could be admitted; for it is an assemblage of the worlds greatest benefactors - the wise and good of all ages - here live those who are worthy to live."

اکثر انھوں نے یہ سنا کہ دونوں قوموں میں مغائرت کا سبب یہ تھا کہ خیالات و تصورات کے اعتبار سے انگریز علیحدگی پسند واقع ہوئے تھے۔ مقرر نے اپنے انگریز دوستوں سے یہ بھی سنا تھا کہ ہندوستانی باشندے ایسے تعصبات اور جذبات رکھتے تھے جو انگریزوں سے ملنے میں مانع آتے تھے۔ خود مقرر کا خیال تھا کہ اس ناقابل اطمینان صورت حال کا سبب یہ تھا کہ مسلمان مناسب تعلیم و تربیت سے ناآشنا تھے (ہیر، ہیر) جس کالج کا سنگ بنیاد آج رکھا گیا ہے اس کا اصلی مقصد یہ ہے کہ اس غیر اطمینان بخش صورت حال کا ازالہ ہو۔ اور خود وائسرے کا فرمانا یہ ہے کہ اس کے ازالے سے ہم اُس بین الاقوامی موانع کو دور کرسکیں گے جو انگریزوں اور مسلمان قوموں کے راستے اور روابط میں حائل ہیں۔ مقرر نے فرمایا کہ ان کو اس کا پوری طور پر یقین تھا کہ فی الوقت یہ روابط برائے نام ہی کیوں نہ ہوں۔ ہندوستان میں انگریز اور مسلمان جماعتوں میں ایسے لوگوں کی تعداد کافی ہے جو ایک دوسرے کو ساتھی رعایا سمجھتے ہیں اور ان میں کوئی ایک بھی یہ نہیں سمجھتا تھا کہ ایک دوسرے پر حکمرانی کرتا تھا (ہیر، ہیر) اور ان کو اس پر اعتماد تھا کہ یہ رشتہ کہ دونوں ایک بادشاہ کی رعایا ہیں، ایک ہی قانون کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں اور سوشل لائف کے یکساں ضوابط کے پابند ہیں (اس لیے کہ معاشرہ ملک کے قانون کا پابند نہ ہے) دراصل ہماری زندگی پر کہیں زیادہ اثر انداز ہوتا ہے بہ نسبت اس کے کہ دونوں نسلوں کے افراد کے شخصی طور طریقے کیا اور کیسے ہیں (ہیر، ہیر) فاضل مقرر نے فرمایا میرے دوستوں اراکین کمیٹی خاص طور پر صدر کے دلوں میں جو جذبات موجزن ہیں ان کا اظہار میں نے کتنا ہی ناکافی حد تک کیوں نہ کیا ہو مجھے اُمید ہے یہ جام صحت اسی گرم جوشی سے انگریز حاضرین نوش فرمائیں گے جس سے کہ ہندوستانی اس میں مسٹر جینیز کا بھی نام شامل کرتا ہوا یہ جام صحت وفاشعاری کے برملا اظہار کے ساتھ نہایت گرم جوشی سے نوش کیا گیا۔

جواب میں مسٹر جینیز نے مختصر الفاظ میں اس امر کا اظہار کیا کہ ان کا کئی سال سے ہندوستان میں قیام تھا انھوں نے یہاں نہ صرف امن و امان کا زمانہ دیکھا تھا بلکہ وہ اس دور سے بھی گذرے ہیں جب یہ خطہ ہراس و ہیجان کی گرفت میں تھا۔ انھوں نے اپنے مسلمان دوستوں کو دیکھا تھا کہ کس طرح انھوں نے ملک میں امن و فراغت قائم رکھنے کے لیے اپنا سب کچھ خطرے میں ڈال دیا تھا یہاں تک کہ جان سے بھی دریغ نہیں کیا۔ ان کو اس امر کا اعتراف کرنے میں تامل نہ تھا کہ مسلمانوں سے زیادہ نہ کوئی اور بلکہ معظمہ کا وفاشعار تھا نہ اس امر خواستگار کہ اُن کے ساتھی راحت و عافیت کی زندگی سے ہم کنار رہیں۔ میری درخواست اور تجویز ہے کہ ہم "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج" کی ترقی اور کامرانی کا جام صحت نوش کریں جس کے ساتھ صدر اور اراکین کمیٹی..

کے نام نامی بھی شامل ہوں۔

ٹوسٹ نوش کیا گیا۔ مسٹر محمود دوبارہ اس عذر کے ساتھ تقریر کرنے کھڑے ہوئے کہ صدر انگریزی زبان سے آشنا نہ تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ نئے کالج کی تاسیس کا تمام تر مدار ان چند روشن خیال مسلمانوں کی مساعی کا نتیجہ تھا جنھوں نے نہ صرف ملک کے موجودہ سیاسی حالات کا خاص طور پر مطالعہ کرنے کی زحمت اٹھائی تھی بلکہ جن کی نظر سلطنت کی گذشتہ تاریخ پر بھی تھی۔ ان کو اس امر کا علم تھا جیسا کہ ہر غور و فکر کرنے والے مسلمان کو ہونا چاہیے تھا کہ جس وقت دہلی میں سب سے بڑے بادشاہ کی حکمرانی تھی، جب اس کے دربار کے شوکت و حشمت کا شہرہ عالمگیر تھا جب جہانگیر حق پسند، شاہجہاں شاندار اور اکبر اعظم کہلاتا تھا اس وقت کی بہترین حکومت بھی ہندوستان کے موجودہ نظم و نسق کے مقابلہ میں ہیچ تھی۔ جو صاحبان اس حقیقت سے آگاہ نہ تھے کہ یہ صرف اس امن و امان کا فیضان تھا جسے انگریز قوم نے روشناس کرایا تھا سفر اور سیاحت کے وہ شائستہ وسائل تھے جسے مشین نے ملک کو تفویض کیے تھے اور ان لوگوں کی دل سوزی اور خیر منشی تھی جن کے ہاتھ میں ملک کی حکومت تھی جس نے ہم کو کامیابی سے دوچار کیا تھا۔ (ہیر۔ ہیر) کمیٹی کو اس امر کا احساس ہے اور وہ تمام حضرات جو کالج سے دلچسپی رکھتے ہیں اس احساس میں ان کے شریک ہیں کہ اراکین کمیٹی کے دلوں میں کالج سے متعلق جو محرکات کارفرما ہیں ان کی نوعیت وہی ہے جو انگلستان کی ترقی یافتہ جماعتوں کے تھے (ہیر۔ ہیر) کمیٹی کی طرف سے جس کے وہ (سید محمود) ممبر تھے۔ حاضرین کی خدمت میں نہایت درجہ مخلصانہ شکر گذاری کا ہدیہ پیش کرتے ہیں اور ان کی صحت کا جام صحت نوش کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔ ایسا کرنے میں وہ اپنے اس جذبے کا اظہار کرنا چاہتے ہیں جو وہ خود اور ان کے مسلمان بھائی اُن کے لیے محسوس کرتے ہیں (ہیر۔ ہیر) اس شب میں ان کی موجودگی محض ایک سوشل تقریب میں شرکت تک محدود نہ تھی بلکہ اس کے معنی یہ تھے کہ ایسے انگریز شرفا جو اپنا قیمتی وقت اس تقریب میں شرکت کے لیے پس انداز کر سکتے تھے کمیٹی کے اغراض و مقاصد سے پورے طور پر واقف تھے اور ان کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے وہ سب کرنے کے لیے تیار تھے جو ان کے اختیار میں تھا (ہیر ہیر) اب میں مہمانوں کا جام صحت نوش فرمانے کی درخواست کروں گا جن میں مسٹر کینس کا نام شامل ہے۔

مسلمان حاضرین نے جام صحت نوش کیا۔ اس کا جواب دینے کے لیے مسٹر کینس کھڑے ہوئے اور ساتھ ہی مہمانوں کی طرف سے اپنی قدر شناسی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ میں صرف اس قدر افزائی کا اقرار نہیں کرتا جو میرے فاضل دوست مسٹر محمود نے فرمائی ہے بلکہ اس مہمان نوازی اور مدارت کا بھی اعتراف کرتا ہوں جس سے اس شان

سے میرے اور میرے رفقا کی پذیرائی کی گئی اور باوجود اس کے کہ میں جلد سے جلد اپنی نشست اختیار کر لینا چاہتا ہوں۔ ایک ایسے فریضہ کا بجا لانا ضروری سمجھتا ہوں جس میں پس و پیش کو دخل نہ دینا چاہیئے۔ سید احمد خاں نے سوسائٹی کی جیسی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اس کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرانے میں مجھے یہ سہولت حاصل ہے کہ میں ایک خاصی طویل مدت سے محترم سید سے واقف ہوں اس شریف شخص کا کم و بیش بارہ سال سے ایک ہی ضلع میں ساتھ رہنے کا مجھے امتیاز و افتخار رہا ہے اور میں کسی طرح اس وفا شعاری اور ذہانت کو نہیں بھول سکتا۔ جن سے انھوں نے فرائض مفوضہ انجام دیئے۔ سید احمد کی وسیع النظری اور انسانی ہمدردی سے کون نہیں واقف ہے اور مجھے اس امر کی حقیقی مسرت ہے کہ آج ان کو اپنے مزرع مساعی کا ثمر اولین نصیب ہے۔ (ہیر، ہیر) سید جیسے فکر و ذہن کا آدمی تعجب نہیں اگر تمام دنیا کو ہلا دے۔ اس طور پر مجھے یقین ہے کہ نہایت درجہ مرتب و منظم وہ تقریب جو آج منعقد ہوئی محض ایک اسکول کا قیام نہیں ہے بلکہ اس ملک میں ایک عہد کی نشاندہی کرتا ہے۔ (ہیر، ہیر) وائسرائے کی دلآویز تقریر کے بعد میرے لیے کوئی وجہ جواز نہیں ہے کہ اس موضوع پر کچھ اور کہوں لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ہم سب نے آج جو کچھ مشاہدہ کیا ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے انسانی کارگذاری کے بارے میں جو پیشین گوئی کی جا سکتی ہے وہ نقطۂ آغاز ہے ایک ایسی اہم اور ہمہ گیر تحریک کا جو تاریخ میں زندہ رہے گی اور جو اس اچھے اور اعلیٰ شخص کو زندہ رکھے گی جس کی بے پایاں عقیدت و ریاضت کی یہ تحریک رہین منت ہے (صدائے تحسین) اس کے جواب میں سید احمد خاں نے کہا۔

آپ نے جس گرم جوشی سے میرا جام صحت نوش فرمایا ہے اس کا اثر مجھ پر کئی طرح سے ہوا ہے عزت افزائی کا شکر گذار ہوں اور آج کی تقریب جس خیر خوبی سے اتمام کو پہنچی اس سے خوش ہوں لیکن ان جذبات کے ساتھ اس امر کا احساس ہے کہ میں نہ تو اس عزت کا مستحق ہوں جس سے آپ نے نوازا ہے نہ اس کامیابی کا اس حد تک ذمہ دار اور حقدار ہوں جو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے حصہ میں اب تک آئی ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ یہ میری جانفشانی کا نتیجہ ہے لیکن حضرات ایک بات جس کا میں کسی تامل کے بغیر نہایت سچائی سے اعتراف کروں گا یہ ہے کہ جس کالج کا سنگ بنیاد آج رکھا گیا ہے سالہا سال سے وہ میری زندگی کا مقصد اولی و اولین رہا ہے جس دن سے میں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ برطانوی ہند میں ہمارے سوشل مسائل کیا اور کس نوعیت کے تھے۔ میرے دل میں یہ بات نہایت محکمی سے جاگزیں ہو گئی ہے کہ دونوں نسلوں میں جن کو خدا نے اس ملک میں اس درجہ ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہے۔ حقیقی ہمدردی و ہم طرحی کا فقدان ہے۔ میں نے اکثر اپنے دل

سے سوال کیا ہے کہ آخر اس کا سبب کیا تھا کہ ایک صدی کی برطانوی حکومت کے بعد بھی ہندوستان کے باشندے
اس قوم سے قریب تر نہ ہو سکے جن کے سپرد خدا نے اس ملک کے نظم و نسق کا انصرام کیا تھا۔ آپ حضرات ایک
صدی سے اوپر ایسے ملک میں رہتے سہتے آرہے ہیں۔ جس میں ہم ہیں اسی ہوا اور فضا میں سانس لیتے ہیں جس میں ہم
رہتے ہیں۔ آپ نے وہی پانی پیا ہے جو ہم پیتے ہیں۔ اسی زرعی پیداوار سے غذا حاصل کی ہے جس سے آپ کے
بے شمار ساتھی رعایا پرورش پاتی ہے اس کے باوجود انگریز اور دیسی باشندوں میں اس سوشل یگانگت کا نہ ہو
جو دوستی کے مفہوم میں مضمر ہے نہایت درجہ افسوسناک ہے۔ اور جب بھی میں نے ان عوامل پر غور کیا ہے جو
اس ناقابل اطمینان صورت حال کی ذمہ دار رہے ہیں تو میں ہمیشہ اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ دونوں قوموں میں و
جذباتی ہم آہنگی نہ تھی جس کا باعث خیالات اور مقاصد کا عدم اشتراک تھا اور میرے دوستو میں اس کا بھی
قائل ہوں کہ جب تک یہ صورت حال باقی رہے گی، ہندوستان کے مسلمان برطانوی حکومت میں کوئی ترقی
نہ کر سکیں گے۔ اس کے بعد میں نے محسوس کی کہ ترقی کے راستے سے ان موانع کے دور کرنے کی سبیل اپنے وسیع
ترین مفہوم میں تعلیم اور صرف تعلیم ہو سکتی تھی اس مقصد کو آگے بڑھانے میں میں نے اپنی زندگی کے بڑے سنجیدہ
لمحات صرف کئے ہیں اور بہترین مساعی جو مجھ ناچیز کے بس میں تھیں ان کے حصول میں صرف کر دیں (غلغلہ تحسین)
یہ صحیح ہے کہ یہ کالج کسی حد تک میری کوششوں کا نتیجہ ہے لیکن اس میں کارفرمائی ایسے گراں بہا اور کا
کشا ہاتھوں کی بھی ہے جس کی تائید و تصرف کے بغیر یہ مہم کامیاب نہیں ہو سکتی تھی اور میں محسوس کرتا ہوا
کہ جو کامیابی ہم کو حاصل ہوئی ہے اس کا سہرا میرے بجائے ان کے سر ہے لیکن اے صاحبو جو امتیاز و افتخ
آج کی شب آپ نے مجھے بخشا ہے اس نے مجھے ایک اہم حقیقت کا یقین دلایا ہے اور ایسے جذبات سے
برتر کر دیا ہے جس کی نوعیت محض ذاتی اظہار تشکر سے کہیں زیادہ بلند و برتر ہے۔ مجھے اس کا یقین ہو گیا ہے
کہ آپ صاحبان جو اس وقت یہاں برطانوی حکومت کے نمائندے کی حیثیت رکھتے ہیں ہماری مساعی
سے ہمدردی رکھتے ہیں میرے لیے یہ یقین دہانی نہایت درجہ گرانقدر اور سرمایہ شادمانی ہے عمر کی جس منزل
میں اس وقت میں ہوں میرے لیے یہ احساس باعث تقویت و طمانیت ہے کہ جو مہم میری زندگی کا مقصد
اولیٰ سالہا سال سے اب تک رہی ہے اس نے ایک طرف ہمارے ہم وطنوں کی قوت عمل کو ابھارا ہے اور
دوسری طرف ہماری ساتھی انگریزی رعایا کی ہمدردی اور حکمرانوں کی تائید حاصل کر لی ہے، چنانچہ ان چند برس
کے بعد جو شاید میری عمر کے باقی ہیں۔ جب میں آپ کے درمیان موجود نہ ہوں گا یہ کالج کامیابی و کامرانی کے

قریب ہوگا۔ اور میرے ہم وطنوں کو یہ سبق ذہن نشین کرانے میں کامیاب ہوگا کہ اپنے وطن سے وہی محبت رکھیں برطانوی حکومت کے اسی طرح وفادار رہیں اس کی برکات کا ویسا ہی احساس کریں اور ساتھ ہی برطانوی رعایا سے وہی مخلصانہ رسم و راہ ہو۔ جو میری زندگی کا سب سے قوی جذبہ رہا ہے (اظہار تحسین) صاحبو آپ نے جو عزت مجھے بخشی ہے اس کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں اور نہایت خلوص کے ساتھ آپ کے خیر اندیشی کے جذبات کو اپناتے ہوئے اپنی طرف سے نذر خدمت کرتا ہوں۔ (غلغلۂ تحسین و تشکر)

اس تقریر پر آخری ٹوسٹ ختم ہوا اور تھوڑی دیر میں مہمان رخصت ہو گئے۔

انڈین ڈیلی نیوز ۱۳ر جنوری ۱۸۷۷ء

مسلمان سلاطین کے خاندان

۱۳ر جنوری ۱۸۷۷ء)

یہ بات اکثر کہی گئی ہے کہ محمڈن کونسٹی (مسلمان فرقہ) ہندوستان میں اس درجے گر گئی ہے جس پر اب ہندو فائز ہیں جو کبھی مسلمانوں کے زیر نگیں تھے۔ اس کے مختلف اسباب بتائے جاتے ہیں ان میں سے خاص سبب یہ ہے کہ مسلمان سلاطین کے خاندان کے عزل کے بعد مسلمانوں نے حکمراں قوم سے بالکل علیحدگی اختیار کرلی جو آزردگی اور بیزاری کا خاصہ ہے۔ ہندوؤں کے سامنے اس طرح کے افتخار و امتیاز کے مٹنے اور اس سے نپٹنے کا کوئی مسئلہ نہ تھا اس لیے انھوں نے آسانی سے سر تسلیم خم کر دیا اور جس صورت حال کا ان کو سابقہ تھا اس سے اپنے کو سازگار کر لیا۔ جہاں وہ حکومت نہیں کر سکتے تھے وہاں انھوں نے حکم برداری قبول کرلی۔ اس طرح بیشتر حالات میں انھوں نے جہاں کہیں جیسا موقع دیکھا اس میں اپنے آپ کو ڈھال لیا۔ اس طور پر انھوں اپنے مسلمان محکوم ساتھیوں سے سماجی مراتب اور سرکاری مناصب میں برتری حاصل کرلی بعض اعتبار سے ہندو باشندے بھی محکوم مسلمان ساتھیوں کی مانند اپنے سماجی و مذہبی رسم و رواج کی بنا پر نہایت درجہ التزام کے ساتھ الگ تھلگ رہے لیکن مسلمانوں کی طرح انھوں نے ان تمام تبدیلیوں سے اغماض نہیں کیا جو ملک میں

رونما تھیں۔ اس معاملے میں مسلمانوں کا طرز عمل دانش مندانہ نہ تھا۔ ممکن ہے ان کا یہ خیال رہا ہو کہ جس پندار سے انھوں نے اپنے آپ کو علیحدہ رکھا اس سے کچھ اور نہیں تو اس پوزیشن کو برقرار رکھ سکیں گے جس کو وہ بدل نہیں سکتے تھے۔ یہ خیال مغالطہ پر مبنی تھا تبدیلی جس مفہوم میں قوموں اور نسلوں میں راہ پاتی ہے اس سے مفر ناممکن ہے۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ جہاں تک خود ان کا تعلق تھا وہ کسی تبدیلی کے لیے اپنے آپ کو آمادہ نہ کریں گے اور ہر ان تحریکات کی مقاومت مجہول بڑی سختی سے کریں گے جو تبدیلی کے متقاضی ہوں گے اس طور پر کیا وہ توقع کر سکتے ہیں کہ نسبتاً کوئی تبدیلی راہ نہ پائے گی۔ اس مفہوم میں ان کی تمام ایسی کوششیں کہ برہم و بیزار سب سے الگ تھلگ رہ کر وہ اپنی موجودہ پوزیشن قائم رکھ سکیں گے۔ لازمی طور پر ناکامیاب ہوں گی جس وقت مسلمانوں کی حکومت کی شکست و ریخت ہوئی اگر ان کی ساتھی ہندو رعایا بھی انہی کی طرح تبدیلی قبول کرنے سے بے گانہ یا بے خبر رہتی اس وقت ہندو اور مسلمان دونوں ہم سطح رہ سکتے تھے لیکن یہ سطح اس وقت قائم نہیں رہ سکتی جب ان میں سے کوئی ایک بھی اسے ترک کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ مدتوں محکوم رہنے کے سبب سے ہندوؤں میں وقت کے تقاضوں سے اپنے کو فی الفور سازگار کر لینے کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی چنانچہ انھوں نے یہی کیا۔ مسلمانوں نے اپنے آپ کو تمام ملازمتوں سے علیحدہ رکھ کر اس تعلیم سے محروم کر لیا جسے انگریزی حکومت یا دوسری ایجنسیاں ان کے لیے فراہم کرتی تھیں اور جو ان کو سرکاری آسامیوں کے لیے سزاوار بنا سکتی تھی۔ ممکن ہے وہ خیال کرتے ہوں کہ لیل و نہار کی دوسری کوئی گردش ان کو گذشتہ اختیار و اقتدار سے ہمکنار کر دے گی۔ کیسا فریب اور کتنا بڑا مغالطہ! اس دوران میں ہندو، بالخصوص کمزور و حقیر بنگالی نے اس حقیقت کو پالیا کہ علم زور بھی ہے اور زر بھی اور اس وقت جب کہ مسلمان یہ خیال کرتے رہے کہ وہ اپنی پوزیشن پر مضبوطی سے قائم ہیں محکوم و منکوب ہندو کے برسر عروج آنے سے وہ درحقیقت غرقاب ہو رہے تھے۔ کیسی المناک یہ صورتحال تھی ایک ایسی قوم کی جیسی کہ مسلمانوں کی تھی جنھوں نے عہد وسطیٰ میں دنیا کی تاریخ میں ایسی ناموری حاصل کی تھی اور اس کے بعد بھی ان کے کارنامے کچھ ہی کم حیثیت تھے وہ اب اپنے ہاتھوں پست و پامال تھے۔ خوش نصیبی سے ان میں بعض نے صورت حال کا احساس کیا اور عزم کر لیا کہ وہ خود ایسی مثال پیش کریں گے کہ وہ کیا عوامل ہیں جنھوں نے دوسری قوموں کو اس قابل بنایا کہ وہ مسلمانوں پر غالب آگئے اور جن سے محروم رہ کر مسلمان اسفل السافلین تک پہنچ جائیں گے تاوقتیکہ وہ الگ تھلگ رہنے کی پوزیشن اور پالیسی ترک

نہ کردیں اور ان قوموں کے ساتھ نہ ہولیں جو ترقی کے راستے پر گامزن ہیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ وہ عضو معطل ہوکر نہیں رہ سکتے دوسرے مسلمانوں کی بہ نسبت شمالی ہند کے مسلمانوں نے جلد تر اس حقیقت کو پہچانا۔ ان کی خوش نصیبی ہے کہ ایسے اشخاص مل گئے جنھوں نے اپنے تعصب اور خام خیالی پر قابو پالیا اپنی کمزوریوں کو جانا علیحدہ رہنے کے مغالطہ کو سمجھا اور اس امر کا مصمم ارادہ کرلیا کہ وہ ان موانع کو دور کرکے آگے بڑھیں گے۔ اس کی نہایت نمایاں مثال علی گڑھ میں وہ محمڈن کالج ہے جس کا سنگ بنیاد اسی ماہ کی ۸ر کو وائسرائے نے رکھا ہے ایسے مواقع پر جو رسوم بجالائے جاتے ہیں وہ وہی ہیں۔ جو ہر جگہ ملحوظ رکھے جاتے ہیں اس لیے ان پر اظہار خیال کی ایسی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اس ادارے کو معرض وجود میں لانے میں جو روح کارفرما ہے وہ یقیناً مسلمانوں کے مستقبل میں ایک امید افزا تبدیلی کی خبر دیتی ہے۔ زیادہ تر یہ سید احمد خاں بہادر کی جدوجہد کا نتیجہ ہے جن کا عقیدہ ہے کہ اگر ان کے ہم وطن و ہم مذہب ترقی کے راستے پر گامزن ہونا چاہتے ہیں تو ان کو وہ طور طریقے اختیار کرنے پڑیں گے جن سے دوسری قوموں کو عروج و عظمت نصیب ہوئی۔

جس طاقت نے سید احمد کو کامیابی سے ترین کیا تھا وہی ان کے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کو بھی کرے گی۔ ان کو مغربی تہذیب کے تصور کو قبول کرنا اور روح عصر کے ساتھ ہونا پڑے گا۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر وہ کام کرتے رہے ہیں اور سیرت کی اس پختگی سے جو اس عقیدہ کا فیضان ہے انھوں نے کچھ رفیقوں کی تائید حاصل کرلی ہے۔ ان کی مساعی جلد ہی مشکور ہوں گی مسٹر سید محمود نے سپاسنامہ پڑھا اور وائسرائے نے اس کا مناسب جواب دیا۔ اکثر یہ کہا گیا ہے کہ دو قوموں میں حقیقی طور پر قلب روابط نہیں پیدا ہوسکتے جب تک وہ ایک دسترخوان پر شانہ بیک خوردونوش نہ ہوں۔ علیگڑھ کے مسلمانوں نے اس راز کو سمجھ لیا ہے۔ سپاسنامے تو پیش کیے جاتے ہی رہتے ہیں لیکن دوشنبہ کی شام کو علی گڑھ میں ایک ڈنر دیا گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ حاضرین میں یوروپین اور مسلمانوں کی تعداد مساوی تھی۔ صدر اور نائب دونوں مسلمان تھے۔ یہ دو سید تو تھے ہی سید محمود مقرر خصوصی تھے اس لیے کہ صدر انگریزی سے ناآشنا تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ ٹوسٹ کی تجویز پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا۔

(یہ تقریر گذشتہ اوراق میں آچکی ہے۔ اس لیے یہاں حذف کی جاتی ہے)

اطلاع یہ ہے کہ ٹوسٹ نہایت گرم جوشی سے نوش کیا گیا اور سید نے اپنی توقع کا اظہار کیا کہ یہ یہ ٹوسٹ انگریز اسی گرم جوشی سے نوش کریں گے جس سے کہ مسلمان" اس کارروائی کا حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ جس طرح تجویز کی گئی اسی شوق سے پوری کی گئی۔ رپورٹ میں یہ فقرہ جابجا ملتا ہے کہ ٹوسٹ ان مسلمانوں نے

پیا جو تقریب میں موجود تھے۔ سید محمود کا فقرہ یہ ہے" مہمانان محترم بشمول مسٹر کین۔ موخرالذکر نے اس کا جواب دیا اور سید احمد کا نام شامل کیا۔ سید احمد خاں نے جو تقریر کی وہ خلوص اور ذوق سلیم کا اعلیٰ نمونہ تھی۔

(سر سید کی یہ تقریر اس سے پہلے دی جاچکی ہے اس لیے یہاں نقل کی ضرورت نہیں سمجھی گئی)

ان خیالات وجذبات سے مترشح ہوتا ہے کہ شخص " مسلمان اور انگریز ہونے کی سطح سے بلند و برتر ہو چکا ہے اس میں وہ مردانگی ملتی ہے جو اپنی بعض معذوریوں سے مبّرا ہے۔ اس تقریر پر جو صدائے تحسین بلند ہوئی اس کا سمجھنا دشوار نہیں ہے محض مسلمانوں کا ٹوسٹ نوش کرنا بجائے خود کوئی اہم واقعہ نہیں ہے۔ یہ محض عیش کوشی یا ادیان موسوی اور محمدی کے اوامر ونواہی کے علی الرغم یا کسی دوسری واضع قانون کے عائد کردہ ضوابط سے انحراف کی بنا پر ہو سکتا ہے لیکن جب ان کا تجویز اور تسلیم کیا جانا کشادہ قلبی اور وسعت نظر کی اسپرٹ میں ہو جس کی محرک اخلاقی مفاہمت ہو نہ کہ تعصب و تنگ نظری تو یہ بڑی امید افزا علامت ہے اور باوجود اس کے کہ دیر آید کی مصداق ہے۔ اصلاح کے آثار ایک ایسی قوم میں ہویدا ہیں جو ہندوستان کی سربرآوردہ قوموں میں سب سے کم روشن خیال ہے

ٹائمز آف انڈیا ۱۵ر جنوری ۱۸۷۷ء:

اینگلو محمڈن کالج جس کا افتتاح پچھلے دنوں وائسرائے نے کیا ہے یقیناً نہایت درجہ نمایاں مثال ہے اس مسلم توانائی و تب وتاب کی جسے لارڈ لٹن نے مسلم کریکٹر کی نمایاں صفت بتائی ہے۔ یہ ان چند روشن خیال مسلمانوں کے ایثار و محنت شاقہ کی رہون منت ہے جن کو غیر معمولی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا یہ کوئی سرکاری ادارہ نہیں ہے جس کا قیام کسی خاص جماعت کی پاسداری میں عمل میں آیا ہو بلکہ ایک پرائیویٹ فاؤنڈیشن ہے جس طرح دو معروف انگلش یونیورسیٹوں کے کالج یا ہمارے زمانے کا کیبل کالج تھا۔

برطانوی ہند کی سوشل ترقی میں یہ ایک نیا اور نہایت امید افزا واقعہ ہے اور مسلمانوں کا اس پر فخر کرنا حق بجانب ہے اس طرح انھوں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ وہ کوئی ایسی قوم نہیں ہیں جو ذہنی سرگرمیوں کی اہلیت نہیں رکھتی اور ان میں سوا اس کے کہ حرب وضرب میں سب سے آگے رہیں کسی اور حوصلے کی گنجائش نہیں۔ درحقیقت یہ غلط فہمی بے بنیاد تھی لیکن اس کو تائید ملی اس بے اعتنائی یا نفرت سے جو مسلمانوں کو سرکاری نظام تعلیم سے تھی۔ اس بے اعتنائی کا سبب اچھی اور بری نیتیں یا قابل ستائش جذبات اور افسوسناک تعصب و تنگ نظری ہو سکتے ہیں جن میں سے بعض کے بارے میں ہمارا اندیشہ ہے کہ ابھی عرصہ تک

باقی رہیں گی لیکن ہم اس کا نہایت صفائی سے اقرار کریں گے کہ مسلمانوں کے لیے زیادہ قابل اطمینان ہوتا
وہ ہندوؤں کی طرح اس تعلیم کو قبول کر لیتے جو گورنمنٹ تمام باشندگان ملک کے لیے مہیا کرتی ہے۔ اس میں
شک نہیں کہ گورنمنٹ کے اس نظام میں کچھ نقائص بھی ہیں لیکن اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ فرقہ وارانہ
اور ذات پات کے قیود کی بیخ کنی میں معین ہوتا ہے۔ آئرلینڈ کی طرح ہندوستان میں بھی اس مقصد کو اولیت
اہمیت دینی چاہیے کہ ہر فرقے کے لڑکوں کو ابتدائے زندگی ہی میں ایک دوسرے سے قریب تر رکھنے کی
کوشش کی جائے۔ اس طرح وہ اس حقیقت سے بھی آشنا ہو جائیں گے کہ فطرت نے ان کی ساخت یا نہاد
میں کوئی ایسی بات نہیں رکھی ہے جس کے سبب سے وہ ایک دوسرے سے متنفر رہیں۔ فرقے کے پادریوں
کی مستقل سرگرمیوں کے سبب سے آئرلینڈ میں اس تحریک کو صرف جزوی کامیابی حاصل ہوئی ہے لیکن
ہندوستان میں مسلمانوں کے علاوہ اسے دوسرے فرقوں میں کامیابی ہوئی ہے اور چونکہ اس کی بہت
کم اُمید ہے کہ مسلمان اس پر آمادہ ہو سکیں کہ اسکول اور کالج کے نصاب تعلیم سے ان کے مذہبی
عقائد و مسائل کو حذف کر دیا جائے اس لیے نہایت مناسب ہوگا کہ ان کے اپنے ایسے اسکول اور
کالج ہوں جہاں دینوی تعلیم اتنی بہتر ہو جتنی کہ ممکن ہے اور جس کے عام تصورات جدید ترقی کے
تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں۔ اس امر کے باور کرنے کے کافی وجوہ ہیں کہ علی گڑھ کالج میں ایسا ہی ہوگا
مسلمانوں کی گذشتہ تاریخ بالخصوص اسپین کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ رہی ہے کہ بعض مسلم ممالک میں
فلسفیانہ اور لبرل خیالات کو روایتی عقائد اور دینی حکومتوں کا انتشار ختم نہ کر سکا یہ خیالات کافی مدت تک
ان کا مقابلہ نہایت شاندار طریقے پر کرتے رہے۔

اس دلچسپ موقع پر لارڈ لٹن نے جو تقریر کی وہ ان کی بہترین اسلوب و انداز کی آئینہ دار تھی اس
لیے کہ یہ موضوع ان کی فطری قابلیت کے عین مطابق تھا تعلیم کا موضوع کچھ ایسا ہے کہ اس سے اکثر شائق
بھی کتراتے ہیں اس لیے کہ ان موضوعات پر مشکل سے دس فقرے بھی نہیں صرف ہو چکے ہوتے کہ مقرر
ناقابل معافی فرسودہ گفتاری پر اتر آتا ہے اگر کوئی مقرر کامیاب ہونا چاہتا ہے تو اسے ان تمام امور کو نظر
کر دینا چاہیے جن پر تمام دنیا کا اتفاق ہو چکا ہے۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ انھی موضوعات پر ہر مقرر کے
لیے گفتگو کرنا آسان بھی ہے۔ اگر وہ ایسے انفرادی نکات دریافت کر سکے جن کو تاریخی اور معاصر حالات
و واقعات نیز سماجی ترقی کے مصدقہ قوانین سے ربط دیا جا سکے۔ اس دشوار کام سے کوئی شخص عہدہ بر

نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اس نے نہ صرف کافی مطالعہ و مشاہدے سے کام لیا ہو بلکہ اس کی کبھی مشق بہم پہنچائی ہو
کہ ان کو ذہنی اور اخلاقی اصول اور نصب العین دونوں سے مطابقت دے سکتا ہے اس کے علاوہ یہ بھی
لازم آتا ہے کہ وہ نہایت خلوص اور کشادہ دلی سے انسانی فطرت پر پختہ اعتماد اور ایک حد تک بے لوچ گریز پا نظریہ
پرستی سے ذہن کو بے تعلق رکھتا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ذہنی ترقی کے لیے وسیلہ کار اور منزل مقصود کا
تصور اس کا اپنا ہوتا ہے نیز یہ کہ وہ کونسی شاہراہیں ہیں جن پر اخلاق انسانی رہ نورد ہے لیکن جن
فارمولوں کے پیرہنوں میں وہ اپنی تصورات پیش کرتا ہو ان کو ضرورت سے زیادہ باون تولہ پاؤ رتی نہ ہونا
چاہیے۔ تعلیمی مقرروں کی عام غلطی یہ ہوتی ہے کہ وہ فارمولوں پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے ہیں اور تربیت
یافتہ ذہنوں کی رہنمائی کے ایسے راستے بناتے ہیں جو نہایت درجہ بے کم و کاست ہوتے ہیں۔ کم لوگ ایسے
ہوں گے جنھوں نے تعلیم کے مسئلہ پر M.Guizot سے زیادہ فصاحت و بلاغت سے اظہار خیال کیا
ہو گا۔ انھوں نے وزیر تعلیم کی حیثیت سے فرانس کی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے
ان کے پاس ذوق اور عقیدوں کے ایسے ڈھلے ڈھلائے اور نوک پلک سے آراستہ نمونے ہوتے تھے جن کا
پابند ہونا ہر تربیت یافتہ شخص پر لازم آتا تھا۔ اگر ان نمونوں کو بہتر بنانے کا کوئی شخص اقدام کرتا یا ان کی ابدی
قدر و قیمت کو نہایت احترام و تکریم کے ساتھ بھی معرض بحث میں لاتا تو اس سے آزردہ ہوتے تھے اس تماثر
کے ایک اور فرانسیسی بزرگ ہیں جو M.Guizot سے نہایت قریب اور مشابہ ہیں۔ گو پہلی نظر میں ایسے
نہ معلوم ہوں گے یہ Positive Philosophy (ثبوتی فلسفہ) کے بانی ہیں۔ انھوں نے ضابطے کی پابندی
کو جسے فرانسیسیوں کا جنون کہنا چاہیے یہاں تک پہنچایا اور نہایت شرح و بسط سے یہاں تک تفصیل پیش
کر دی کہ کون سی کتابیں پڑھنی اور ان کی تعریف کرنی چاہیے۔ نیز ہر روز اس کے کتنے صفحات کا مطالعہ میں آ
جائیں۔ کچھ دنوں سے نظم و ضابطے کے اس غلو کے آثار انگلستان میں بھی نظر آنے لگے ہیں اور امتحانات کا تمام تر
رجحان اس طرف ہو گیا ہے کہ مطالعہ میں ذاتی و انفرادی پسند یا ناپسند کی آزادی دی جائے جس مقرر کے ذہن
میں اس طرح کے تعصبات جاگزیں ہوں وہ پچھلے دنوں علی گڑھ میں جو تقریب منعقد ہوئی اس میں یقیناً ان کا
اظہار کرتا اس طرح بے نتیجہ و بے لطف موعظت اور فضیلت مآبی سے تقریب کا سارا مزا کرکرا کر دیتا۔
لارڈ لٹن کی تقریر میں اس طرح کے سراب یا سیہ زاغ نہ تھے بلکہ اس کا انداز اس طرح کا تھا کہ مسلمان سامعین
میں امید و افتخار کی لہر دوڑ گئی۔ دوسری طرف اس میں سیاسی فوائد کا وہ جرأت مندانہ اعتماد ملتا ہے جس کی

برطانوی حکومت کسی باشندوں کی ذہنی تربیت کو ترقی دینے کی توقع رکھتی تھی۔ یہ تھی وہ صحیح نے اور لہجہ جو ایک مدبر اور صاحب قلم کو اس موقع پر بلند کرنا لازم آتا تھا اور زیب دیتا تھا۔ باشندگان ہند پر اس حقیقت کا اظہار مناسب تھا کہ یہ نامبارک عقیدہ کہ ہماری سب سے زبردست حکمت عملی یہ تھی کہ ہم ہندوستانیوں کو جاہل رکھنا چاہتے تھے، حکومت یا انگریز قوم کے دانشور طبقے کے نزدیک سراسر بے بنیاد تھا۔ اس امر کو پورے طور پر واضح کرنا اس لیے اور زیادہ ضروری تھا کہ حال ہی میں دہلی میں ان اصولوں کا بڑے اخلاص و احترام سے اعلان کیا گیا تھا جن پر برطانوی حکومت کی بنیاد تھی یوم اعلان کے موقع پر لارڈ لٹن نے ہندوستانیوں کے اس مطالبے کا حوالہ دیا تھا کہ ملکہ معظمہ کی دیسی رعایا کو حکومت کے انتظام و انصرام میں شرکت کا موقع ملنا چاہیے۔ اس سے ان کے اشتیاق اور امید کو بجا طور پر تحریک ملی۔ ساتھ ہی ساتھ مایوسی بھی۔ اس لیے کہ ملک کے باشندوں کو اس طرح یقین دلایا گیا تھا کہ حکمراں طبقہ اس موقع پر اپنے وعدے کی کوئی عملی مثال بھی پیش کرے گا اس طرح وہ جس مایوسی سے دوچار ہوئے اس کی تلافی یہ وعدہ نہ کر سکا کہ ہندوستانی باشندے موجودہ سے بہتر لیاقت کا ثبوت دیں گے تو اس کا لحاظ رکھا جائے گا۔ علی گڑھ میں اس طرح کے کالج کا قیام اس کا بہت اچھا ثبوت ہے کہ جن لوگوں کے ذہن میں اس کا خاکہ آیا اور جنھوں نے اس کو عملی جامہ پہنایا وہ اس شاہراہ پر گامزن ہیں جو لارڈ لٹن کے بتائے ہوئے معیار کے مطابق ہے اور جس کا اظہار انھوں نے اپنی یوم اعلان کی تقریر میں کیا ہے۔ اسی طرح یہ بڑا نیک شگون تھا کہ افتتاح کے نہایت سنجیدہ اور پرتمکین مراسم کی بجاآوری کے بعد لارڈ لٹن نے اپنی پہلی سرکاری تقریر میں ایک بار پھر اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا کہ برطانوی حکومت کا استحکام اور تعلیم کی ترقی و اشاعت ایک دوسرے پر منحصر تھے۔ انھوں نے تحریک کی سربراہ جماعت کو اس امر پر مبارکباد دی کہ ان کی آزاد و محکم مساعی اس لازم و ملزوم تعلق کو ان کی جماعت کے افراد بہتر طور پر سمجھنے کے قابل ہوں گے اور اس کی ترقی و اشاعت میں معین ہوں گے۔

اپنی تقریر کے ایک حصہ میں لارڈ لٹن نے اس رشتہ پر اظہار خیال کیا ہے جو مذہبی عقائد کا ان انسانی افعال سے ظاہر ہوتا ہے جو فرائض زندگی کی بجاآوری سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہ بیان اس امر کا ثبوت ہے کہ ان کا ذہن اس جہالت اور شقاوت سے بری ہے جو تہی مغزوں کا شیوہ ہوتا ہے اور کلاس روم یا لکچر ہال سے ان تازہ و تابندہ محرکات کو نکال باہر کرتا ہے جو عظیم تاریخی مذاہب کے روح رواں ہوتے ہیں تعلیم میں خیالات کا بہت بڑا اور اہم حصہ ہوتا ہے جس کو تسلیم کرنا مناسب بھی ہے اور مفید بھی بالخصوص مسلمان حالات

کی موجودگی میں انکا اظہار قرینِ مصلحت بھی تھا۔ جو اس بنا پر خصوصیت سے فخر کرتے ہیں کہ ان کا مذہب نہایت درجہ معمولی دنیوی امور پر بھی نظر نگرانی رکھتا ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ وہ خیالات اس طور کام میں لائے جا سکتے ہیں کہ ذہنی اصلاح کے حق میں نہایت مضر ثابت ہوں اور اخلاق کے لیے بھی سود مند نہ ہوں۔ مسلم اور مسیحی عالمی تاریخوں کو پیش نظر رکھا جائے تو مذکرہ صدر اندیشوں کے صحیح ہونے کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔ نظر براں اپنے بیان میں لارڈ لٹن کا اس امر کی تصریح کر کے سامعین کی ہمت افزائی کرنا مقتضائے دانش مندی تھا کہ مسلک اسلام میں کوئی بات ایسی نہیں تھی جو اعلیٰ ترین ذہنی کلچر سے متناقض ہو۔ بعض امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ بات صحیح ہے لیکن اس کا تمام تر دارومدار اس پر ہے کہ مسلک اسلام کی تعبیر کیا کی جاتی ہے اور اس سے زیادہ اہمیت ان اشخاص کی ہے جو تعبیر کرنے کے مجاز ہوں گے۔ ایک کیتھولک یونیورسٹی جس کی وکالت ڈاکٹر نیومین نے اپنے مشہور ڈبلن لکچرز میں بڑے شد و مد کے ساتھ ہی بڑی وسعت نظر سے کی تھی عملاً ناکامیاب رہی اس لیے کہ اسقفی جماعت (Episcopate) نے اس امر کا تہیہ کر لیا تھا کہ وہ پروفیسروں کی فکر و نظر پر مکمل احتساب رکھے گی اور اس امر میں کسی قسم کی رو رعایت سے کام نہ لے گی۔ اس طور پر یہ پروفیسر محض بندھے ٹکے عقائد کے مفسر یا پرچارے رہ گئے تھے۔ حال ہی میں انگلستان کے منیجر پادریوں کے اس شدید مطالبے نے کہ رضا کارانہ کالج کھولے جائیں لندن اسکول بورڈس کے حالیہ انتخاب میں ایسا رد عمل پیدا کیا ہے جسے گذشتہ سال کے نہایت درجہ اہم سیاسی واقعات سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہم کو ٹھیک طور پر نہیں معلوم کہ علی گڑھ کالج میں وہ کون سی جماعتیں ہوں گی جن کے سپرد دینیات کی تعلیم کا انصرام ہوگا۔ لیکن امید ہے کہ مقدس کتب اور احادیث کے دینی مفسر اور قانونی مبصر پروفیسروں نیز ان نتائج پر جن کی طرف ان کی تعلیم رہبری کرتی ہے اپنی کم سے کم گرفت رکھیں گے۔

انڈین میرر ۱۷ جنوری ۱۸۷۷ء:

ایک ایسی بڑی جماعت کا جیسی کہ مسلمانوں کی ہے اپنے آپ کو اس تہذیب جدید سے الگ تھلگ رکھنا جو تمام ہندوستان کے باشندوں کے راسخ اور مقدس عقائد کو زیر و زبر کر رہی ہو یقیناً نہایت حیرت کی بات ہے۔ لیکن ذہنی کی ترقی کے لیے ایک ایسی جامع اسکیم وضع کی اور اس کو اس حد تک پہنچا دیا کہ اس کی تقریب کی صدارت ملک کے سب سے بڑے حاکم نے کی اور سنگ بنیاد رکھا۔ مگر سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہوگی جب یہ منصوبہ تکمیل کو پہنچ جائے گا اور سید احمد خاں بجا طور پر وہ ناموری حاصل کریں گے جس کے وہ پورے

طور پر مستحق ہیں اگر ان کی رحلت کے بعد محمڈن کالج توسیع و ترقی کے اسی راہ پر گامزن رہا جس پر اپنے بانی کی زندگی میں رہا ہے اور یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔

انڈین ٹربیون ۲۵ جنوری ۱۸۷۷ء

اس ملک میں جو سرکاری نظام تعلیم مروج ہے اس کے مخالف کافی تعداد میں ملتے ہیں بنائے مخالفت بہت سے امور ہیں۔ ایک سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ ملکہ معظمہ کی مسلمان رعایا کے مطالبات کو یہ نظام پورا نہیں کرتا۔ مسلمانوں نے اصولاً اپنے آپ کو ان اسکولوں اور کالجوں سے علیحدہ رکھا ہے جو حکومت نے کھول رکھے ہیں وہ اس تعلیم سے فائدہ اٹھانے کی پروا نہیں کرتے جو حکومت نے ان کی دسترس میں رکھی ہے۔ ملک کے بعض حصوں مثلاً اودھ میں مسلمان اپنے بچوں کو تعلیم کے لیے معمولی انگلش اسکولوں میں بھیجتے ہیں مسٹر نسفیلڈ کی اس رپورٹ سے جو حال میں شائع کی گئی ہے اور گذشتہ سرکاری سال میں ریاست میں جو تعلیمی ترقی ہوئی اس پر مشتمل ہے اس صورت حال کی پوری طور پر شہادت ملتی ہے لیکن وہ لوگ جو ریاست کے حالات سے کماحقہ واقفیت رکھتے ہیں اس امر کا اعتراف کریں گے کہ لارڈ کیننگ کی اس چہیتی ریاست کی حیثیت استثنائی ہے اس معاملے میں جیساکہ عام طور پر مانا جاتا ہے۔ استثنار سے اصول کی تصدیق ہوتی ہے۔ انگریزی سیکھنے میں پیچھے رہ جانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان ہندوؤں سے پیچھے رہ گئے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب ذمہ داری اور مشاہرہ و منفعت کے عہدوں پر تمام تر اول الذکر قابض تھے لیکن جب حکومت نے انگریزی تعلیم یافتہ دیسی باشندوں کو سرکاری عہدوں پر فائز کرنا شروع کر دیا تو جیساکہ ہونا چاہیے تھا ہندو عنصر غالب آنے لگا۔ سرکاری عہدوں کے حصول کے لیے جو شرائط مقرر تھے ان سے غفلت برتنے کے سبب سے مسلمان ہندوؤں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اس طور پر جیساکہ خیال کیا جا سکتا ہے مسلمانوں کا درجہ نیچا ہو گیا۔ اس صورت حال نے لارڈ میو کی حکومت کی سنجیدہ توجہ کو اپنی طرف مائل کیا جب کہ کچھ ہی پہلے جسٹس نارمنس کے قتل کا حادثہ کلکتہ ٹاؤن ہال میں پیش آچکا تھا۔ ۱۸۷۲ء کے آغاز میں پورٹ بلیر کے نامسعود سفر سے کچھ ہی پہلے لارڈ میو نے اس مسئلے کا از سر نو جائزہ لیا اور یہ رزولیشن پاس کیا ـــــ اس زمانے میں حکومت ہند کی ایما سے ڈاکٹر ڈبلو ڈبلو ہنٹر نے اپنی ہیجان انگیز تصنیف ”ہندوستانی مسلمان“ شائع کی۔ یہ موضوع قدرتی طور پر دلچسپی کا موجب ہوا اور رائے عامہ تحریک میں آئی۔ پانچ سال ہوئے یہ موضوع اس شد و مد سے اخبارات میں زیر بحث آیا جس طرح آج غریب سفید فام اور یوروشین قوم کے مسئلے سے عہدہ برا ہونے کی سعی ہو رہی ہے سر جارج کیمبل نے بڑی تندہی سے اس مسئلے کو ہاتھ میں لیا۔ چونکہ تمام

مسلمانان ہند کا نصف صرف بنگال میں آباد ہے اس لیے وہیں ان کی تعلیم کا بطور خاص انتظام کیا گیا محمد محسن کا وقف جو عرصہ سے بدنظمی کا شکار تھا بدعنوانیوں سے پاک کیا گیا اور مسلمانوں کی فلاح و ترقی کے ان منصوبوں میں لگایا گیا جو وصیت کنندہ کا منشا تھا۔ اس وقف کی آمدنی سے چار اسپیشل مدرسے مشرقی اور مرکزی بنگال میں جہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی قائم کیے گئے اور مسلمان لڑکوں کو ضلع اسکولوں میں داخلے کی سہولتیں فراہم کی گئیں۔ اس طور پر بنگال میں مسلمان قوم کی ضروریات کا انصرام ہوگیا۔ ہم کو اب تک یہ نہیں معلوم ہوسکا ہے کہ سر جارج کیمبل کا مذکورہ نظام کس طرح چل رہا ہے۔ شمالی ہند میں روشن خیال سید احمد خاں نے مسلمانوں کی ترقی کے مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے جن کی مساعی جمیلہ اپنے ہم مذہبوں کے حق میں سب کو اچھی طرح معلوم ہیں اور سبھی اس کے بارے میں رطب اللسان ہیں ـــــ مسلمانوں کو سرکاری تعلیم سے اپنے آپ کو الگ رکھنے اور اپنے بچوں کو سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں نہ بھیجنے کا سبب زیادہ تر یہ تھا کہ وہ ان کی خصوصی ضروریات کو پورا نہیں کرتی تھی ان کو اس کا بھی اندیشہ تھا کہ اس سے بچوں کے دین و ایمان میں خلل پڑے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے علاوہ دوسرے اسباب بھی ہوں گے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ حکومت اپنی رعایا کی کسی مخصوص جماعت کی تعلیم و تربیت کو پیش نظر رکھ کر اپنے نظام تعلیم کو مخصوص سانچے میں نہیں ڈھال سکتی۔ وہ اس امر کی ضامن اور ذمہ دار ہے کہ مذہبی امور میں قطعاً دخل نہ دے۔ ہندو مسلمان عیسائی بدھ سب اس کی نظر میں یکساں ہیں۔ ہر سمجھ دار اور سلیم الطبع شخص اس امر کو تسلیم کرے گا کہ ملک کے باشندوں کے لیے حکومت صرف سیکیولر (دنیوی) تعلیم کا انتظام کر سکتی تھی۔ پچھلے دنوں وائسرائے کو علی گڑھ میں جو سپاسنامہ پیش کیا گیا اس میں حسب ذیل بیان قابل توجہ ہے۔

"یہ ایک حقیقت ہے کہ حکومت نے جس تعلیم کا بندوبست کیا ہے ہم نے اس سے کماحقہ فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس کے مختلف وجوہ ہیں۔ مثلاً ہماری جماعت کی سوشل حالت جسے ماضی کی روایات نے مخصوص کشش دے رکھی ہے جو اتنی ہی مبہم ہیں جتنی مفروضہ مذہبی جذبات و تاثرات جن کو ایام طفولیت سے ان کو تلقین کی گئی جو ایسے ہی رہے ہیں اور اب بھی ہیں جنھوں نے ہم کو انگریزی تعلیم کی اہمیت سے آشنا نہیں ہونے دیا۔ ہماری تعلیمی ضروریات کئی اعتبار سے ہندوستان کے بقیہ باشندوں کی ضروریات سے اتنی مختلف ہیں کہ بہتر سے بہتر طریقہ کار بھی جو حکومت اختیار کر سکتی تھی۔ اور جو اس کی پالیسی کے مطابق ہوتا ہمارے لیے ناکافی ہوتا اور اگر وہ حکومت کی دانشمندانہ پالیسی یعنی مذہبی امور میں عدم مخالفت کے خلاف نہ ہوتا جب بھی وہ ان دشواریوں

کو دور نہیں کر سکتی تھی جن کا مدار مذہبی عقائد اور تصورات پر ہے جن پر صرف مذہبی بحث و تمحیص سے قابو پایا جاسکتا ہے۔ حکومت نہ تو مذہبی تعلیم کا کوئی نظام وضع کر سکتی تھی نہ وہ اپنی مساعی ان امور سے نپٹنے پر مرکوز کر سکتی تھی جو ایک ایسی قوم یا نسل کے تعصب پر مبنی تھے جو مذہب کو نہ صرف عقائد مجردہ تک محدود سمجھتا تھا بلکہ زندگی کے تمام دنیوی کاروبار پر حاوی جانتا تھا۔"

غریب سفید فام یوروشین اقوام کی حمایت میں ضرورت سے زیادہ سرگرم اور غلط رہنمائی کا شکار ہوئے بعض احباب جس نامناسب شور وشین کا اظہار کر رہے ہیں ہم کو اُمید ہے ان عالی ظرفانہ جذبات سے فائدہ اٹھائیں گے جن کا تذکرہ صدر بیان میں اظہار کیا گیا ہے یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ حکومت کی تعلیمی پالیسی کسی فرقے کی مخصوص ضروریات کو پیش نظر رکھ کر نہیں وضع کی جاسکتی۔ ہمارے حکمراں جو کچھ کر سکتے ہیں یہ ہے کہ وسیع تر بنیادوں پر دنیوی تعلیم کا بندوبست کریں اور جو لوگ اس سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے اپنا انتظام بطور خود کریں اور اس میں حکومت ان کی مدد کرے گی۔

ان دشواریوں کا لحاظ کرتے ہوئے جن کے سبب سے مسلمان اپنے بچوں کو سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں نہیں بھیجتے تھے، مذکورہ صدر کمیٹی (خواستگاران تعلیم) نے اس امر کا عزم کیا کہ اپنے مذہبیوں کے لیے ایک مخصوص ادارہ قائم کرے ــــ اس سلسلہ میں جس مخالفت کا سامنا ہوا سید احمد جیسے عزم و استقامت سے کمتر درجے کے شخص کو ہوتا تو وہ کسی طرح اس کی تاب نہیں لا سکتا تھا لیکن سیّد ان دشواریوں سے زیر ہونے والے نہ تھے۔ بالآخر کمیٹی کے مقاصد توقعات سے زیادہ پورے ہوئے ــــ یہ وہ سبق ہے جو یوروشین قوم اور ان کے دوستوں کو جلد سے جلد سیکھنا چاہیے ــــ اس تحریک کے بانیوں نے نہ صرف اپنی قوم کو فیض دوام بخشا ہے بلکہ بحیثیت مجموعی اس سے پورے ملک کو بہرہ یاب کیا ہے ہندوستان کی زندگی نو کا تمام تر مدار انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں پر ہے۔ ملک کی نظر انہی جوانوں پر مرکوز ہے جو اس کے مرتبے کو اقوام عالم میں بلند کر سکیں گے۔ مسلمانان ہند انگریزی میں درک حاصل کر لیں گے تو وہ خلیج جو بد نصیبی سے ان کے اور ہندوؤں کے درمیان حائل ہو گئی ہے قابل عبور ہو جائے گی۔ اس طور پر ملک کی تعلیم یافتہ رائے عامہ سلطنت میں ایک حقیقی طاقت کی حیثیت اختیار کرے گی۔ ہم کو بے تابی سے اس دن کا انتظار ہے جب ہندوستان کے تمام انگریزی تعلیم یافتہ باشندے ہندو مسلمان عیسائی برہمو اپنے ملک کی حالت کو سدھارنے سنوارنے میں متفق و متحد ہو جائیں گے۔

اس امر کے پیش نظر محمڈن انگلو اورینٹل کالج ہماری نظروں میں ایک مخصوص اہمیت رکھتا ہے اب جب کہ سید احمد

پنے ہم مذہبوں کی فلاح و ترقی میں اپنی پوری طاقت اور وقت کو وقف کردینے کے لیے سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں ہم کو کامل امید ہے کہ یہ کالج کامیاب ہوگا اور ایسا وسیلہ بنے گا جس سے مغرب کی طاقت خزانِ علیم اور کلچر ملکہ معظمہ کے چار کروڑ مسلمان رعایا میں شیوع پائیں گے۔

ٹائمز ۲۲ جنوری ۱۸۷۷ء :

گزشتہ دوشنبہ کو ہمارے کلکتہ آفس سے جو خبر موصول ہوئی ہے اس میں ایک مختصر اطلاع یہ دی گئی ہے کہ لارڈ لٹن نے علی گڑھ میں محمڈن کالج کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس وقت عام دلچسپی کا مرکز وہ تقریب بھی جو دہلی میں منعقد ہو رہی تھی اس کے باوجود نیا کالج ہماری خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ اساتذہ، لکچر کے کمرے ابتدائی اور کالجیٹ شعبوں سے متعلق دارالاقامے فراہم کرنے کے لیے مئی ۱۸۷۵ء تک مشکل سے ۵ لاکھ کا پانچواں حصہ بھی جمع ہو سکا تھا۔ لیکن اسی سال نومبر سے پہلے تحتانی مدرسے میں جو اس دوران میں قائم کردیا گیا تھا۔ سر ولیم میور نے بحیثیت وزیٹر جو خطبہ دیا اس وقت چندے کی رقم ساڑھے چار لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ بیش قرار عطیہ دینے والوں میں سر سالار جنگ ہیں جو کالج کے وزیٹر بھی ہیں۔ گذشتہ ہفتہ کی تقریب سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان یہ محسوس کرنے لگے ہیں یا ان کا خیال ہے کہ وہ ایسا محسوس کرتے ہیں کہ چار سال پہلے انھوں نے جو اس بات کی ضمانت دی تھی کہ وہ آکسفورڈ اور کیمبرج کے انداز کا ایک کالج ہندوستان میں قائم کردیں گے وہ اسے پورا کر دکھائیں گے۔ ان کے لوراسکول (تحتانی مدرسہ) کا نصاب پانچ سال کا ہوگا۔ چنانچہ طالب علم کو کلکتہ یونیورسٹی یا علی گڑھ کے کالجوں میں انٹرنس کا امتحان دینے کا حق حاصل ہو جائے گا۔ اس ڈپارٹمنٹ میں بیس وظائف رکھے گئے ہیں جو ایک سال تک ملتے رہیں گے لیکن مقابلہ کے امتحان کے بعد پھر حاصل کیے جاسکیں گے۔ کالج میں دو شعبے اور ہیں ایک عام ادبی اور سائنسی نصاب پر مشتمل ہے جیسا کہ انگلش یونیورسٹی میں رائج ہوتا ہے۔ دوسرا سنی اور شیعہ مسلمان طلباء کے لیے دینیات کا ہوگا۔ اس کے لیے ساٹھ وظائف ۱۰ سے ۶۰ سالانہ تک کے ہوں گے۔ انگریزی معیار کے پیش نظر یہ رقمیں حقیر ہیں لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ ہندوستان کا ایک باشندہ ۸ شلنگ ماہوار پر گذر بسر کرلیتا ہے یہ رقم اس کی کفالت کرسکتی ہے۔ اس گریڈ میں چار سال کی تعلیمی مدت کامیابی سے ختم کرنے کے بعد طالب علم اسی مضمون میں آنرز کورس لینے کے لیے مقابلے کے امتحان میں شریک ہونے کا مجاز ہو جائے گا۔

س کے لیے اس نے مخصوص صلاحیت حاصل کرلی ہوگی۔ آخر میں فیلو شپ کے لیے ایسے بیس[20]
بہترین طلبا کا انتخاب کیا جائے گا جن کو چھ سو[2] روپے سالانہ کا وظیفہ سات سال تک ملتا رہے گا۔ ان
ں قیام وطعام کے شرائط اسکیم کی ایسی مدیں ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پریسیڈنسی کالجوں
ر گونمنٹ یونیورسٹیوں کے نظام کی دو نہایت درجہ سنگین نقائص کی تلافی کر سکیں گی " فرسٹ کلاس کلاسیکی
بو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک ناواقف اور بزخود غلط مخلوق ہوتا ہے اس لیے کہ اس کی تعلیم
ہایت درجہ پراگندہ اور بکھری ہوئی ہوتی ہے اور چونکہ یونیورسٹیاں زیادہ تر امتحان لینے والے ادارے
کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے وہ طلبا ر میں رٹ لینے کی عادت ڈال دیتی ہیں۔ مطبوعہ اسکیم میں نہایت
رائت مندانہ اور عاقلانہ فقرہ یہ آیا ہے کہ ہندوستانی طلبا کی بداخلاقی کا سبب یہ ہے کہ ان کی نگرانی و نگہداشت
ہیں ہوتی۔ نیز اس کا بھی اعتراف کیا گیا ہے کہ ان طلبار کی تعلیمی اصلاح کی اتنی زیادہ ضرورت نہیں محسوس
وتی جتنی اخلاقی تہذیب کی۔ علی گڑھ آکسفورڈ کالج کا مثنیٰ ہوتے ہوئے بھی مشرقی خصوصیات کا حامل
ہوگا۔ مثلاً کھانا پکانے اور کھانے میں ذات پات کے طریقوں کا لحاظ، موذن یا نماز جمعہ کی اذان۔ شیعہ ڈان
ن میں تین بار مسجد کو جایا کرے گا اور سنی ڈان "امام یا واعظ کے حلقے میں بیٹھے گا جسے قرآن حفظ ہوگا"۔ یہ نہیں
ہے کہ اقامت پذیر تمام طلبا مسلمان ہوں گے اور مسجد جایا کریں گے بلکہ اس کے برخلاف بعض حالتوں میں کالج
کے مشاہرے اور مناصب کافر ہندو اور عیسائیوں کے لیے بھی کھلے ہوں گے۔ اس کا لحاظ رکھتے ہوئے کہ
یہ چیز کہاں سے آئی ہے، یہ وسیع المشربی کا قابل لحاظ مظاہرہ قرار دینا پڑتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس کالج کی بنیاد
برانڈیا کے لبرل مسلمانوں کی فتح ہے جو انگریزوں کی تائید میں ہوتے ہوئے "محبان وطن" میں شمار ہوتے
ہیں۔ اس سیکشن کے نمائندہ سید احمد خاں کہے جا سکتے ہیں جو اس اسکیم کے موسس ہیں۔ ابتدا میں متعصب
سلمانوں کی طرف سے اس منصوبے کی مخالفت ہوئی جنھوں نے سرسید پر الحاد و ارتداد کا الزام عائد کیا۔
سالار جنگ کے چندہ دینے سے دربار نظام کے کٹر درباری مخالفت پر تل گئے لیکن رفتہ رفتہ اس منصوبے
کو مقبولیت حاصل ہونے لگی۔ اب اس کی سرپرستی ممالک مغربی و شمالی اور پنجاب کے سر برآوردہ مسلمان
کر رہے ہیں مسلمان اور ہندو دونوں کی طرف سے یہ ایک نمایاں مثال اس ملکی تحریک کی ہے جو تعلیمی اور سماجی
صلاح کے لیے از خود بیدار ہوئی ہے۔ یورپین ادب سے ترجمہ یا تالیف کے ذریعہ اردو زبان کے سرمایہ میں
اضافہ کرنا، علی گڑھ کے نمونہ کے ابتدائی مدارس کی تعداد کو بڑھانے کی کوشش میں معین ہونا اور ان کے

لیے کالج سے نہایت درجہ تربیت یافتہ معلم فراہم کرنا۔ اور اس ادارے کو ہندوستانی ریاستوں میں سب سے بڑی ریاست کے مسلمانوں کی ذہنی زندگی کی سرگرمیوں کے لیے ایک مرکز بنا دینا اس کا مقصد ہوگا اور یہ کارنمایاں یقیناً اعلیٰ حوصلہ مندی اور بلند ترین فطری صلاحیتوں کے شایان شان ہوگا۔ علی گڑھ میں اس وقت جو کام ہو رہا ہے اس کی مقدار یقیناً کم ہے لیکن اس سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ اپر انڈیا کے مسلمانوں کے سماجی اصلاح کے دھارے کا رُخ و رفتار کیا ہے۔ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی سے متعلق سر رچرڈ ٹمپل کی مشہور یادداشت موجود اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ ہمارے ساتھی مسلمان رعایا کی پُرافتخار علیحدگی پسندی اگر بالکل دور نہیں ہو چکی ہے تو بتدریج کم ہوتی جارہی ہے۔

○

انڈیا سے ان دنوں جو خبریں موصول ہوئی ہیں ان میں دہلی میں منائی جانے والی عظیم الشان شاہی تقریب کی تفاصیل تقریباً زیادہ حصہ رہا ہے، یا ان پر اس کی قحط کی پرچھائیاں اتنی گہری پڑ رہی تھیں جن کے شدائد روز بروز احاطہ بمبئی اور مدراس میں بڑھتے جارہے تھے کہ اب یہ محسوس کر کے یک گونہ تازگی محسوس ہوتی ہے کہ ہماری توجہ کو بعض اُمید افزا اور بلند تر ہندوستانی مسائل کی طرف مائل ہونے کا موقع مل رہا ہے۔ اس طور پر آج صبح ہم نے جو تفصیل علی گڑھ میں ایک نئے اینگلو انڈین کالج کے قیام اور اس سے توقعات کی شائع کی ہے وہ ایک طور پر ہماری دوگونہ خوشی اور خیر مقدم کا موجب ہے۔ اس ادارے کے بانیوں نے جس مشکل مہم کو اپنے سامنے رکھا ہے وہ یقیناً قابل لحاظ اور غیر معمولی ہے۔ ایک دیسی کالج جو تقریباً انگلش نمونہ پر قائم کیا گیا ہو، جس کے اساتذہ کو پابندی سے تنخواہیں ملتی ہوں۔ اس کے وظائف، فیلوشپ اور تمام وہ دوسری باتیں جو ایک تسلیم شدہ کالج کے در و بست میں ملحوظ رکھی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں ہندوستانی باشندوں کے ہاتھوں رضاکارانہ طور پر برسرِ عمل آئیں اور انجام پائیں بجائے خود ایسا واقعہ ہے جو پُرانے خیال کے ہندوستانی باشندوں کے لیے بڑی حیرت کا باعث ہوگا۔ وہ یہ سن کر اور زیادہ متعجب ہوں گے کہ یہ کام مسلمانوں نے شروع کیا ہے اور جس کے لیے وہ جگہ تجویز کی گئی ہے جو مسلم اثر و اقتدار کا مرکز رہے اور دہلی سے اتنی قریب ہے کہ دہلی کی توپ کی آواز سُنی جا سکتی ہے نیز اس کا مقصد ایسی تعلیم دینا ہے جو یورپین خیالات اور یورپین ادب سے ان لوگوں کو روشناس کرائے جو اب تک دونوں سے نہایت درجہ حقارت انگیز عناد رکھتے تھے۔ اس نئے اور انوکھے منصوبے کو بروئے کار لانے کے لیے سرمایہ

اکٹھا کرنے میں کچھ دشواری محسوس ہوئی اور اب بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس دشواری پر پورے طور سے قابو پا لیا گیا ہے۔ کام کی تکمیل کے لیے ایک لاکھ پونڈ کی رقم ضروری بتائی جاتی ہے لیکن باوجود اس کے کہ ضابطہ سے کالج کا افتتاح کیا جا چکا ہے اس رقم کا نصف بھی جمع نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ رقم اس وقت تک فراہم ہو جائے گی جب اس کی ضرورت ہو گی۔ علی گڑھ میں جن طلبا کا آئندہ داخلہ ہو گا وہ اب تک تحتانی اسکول سے فارغ التحصیل نہیں ہوئے ہیں۔ ان میں جو سب سے زیادہ منازل طے کر چکے ہیں ان کو بھی کالج تک پہنچنے میں ابھی چار سال درکار ہوں گے۔ ہم کو یقین ہے کہ آمدنی کے ذرائع اور وسائل کا تکلیف دہ مسئلہ اس وقت تک اطمینان بخش طور پر طے پا چکا ہو گا۔ اس کا بہت کم امکان ہے کہ اس اسکیم کے بانیوں کی ہمت پست ہو جائے گی جب کہ وہ اس حد تک کامیابی کے قریب ہو چکے ہیں اور ایک طور پر ساری دنیا ان کے کارنامے کی شاہد عادل ہے۔

ہندوستان کے باشندوں کو تعلیم سے آشنا کرانے میں ہم کو دوگونہ دقت کا سامنا رہا ہے جہاں تک بنگال کا تعلق ہے ہندوؤں نے ایک طور پر مجہول انداز میں اس اثر کو قبول کر لیا ہے جس سے ہم اس کے ذہن کو متاثر کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے ہماری زبان سیکھ لی ہے۔ ہماری تاریخ کا آموختہ بھی اسے یاد ہے۔ ہمارے سائنس میں کچھ شد بد پیدا کر لی ہے اور اس تمام زمانے میں اس نے ان اسباق کو ازبر کر لینے کی غیر معمولی صلاحیت دکھائی ہے جو ہم نے سکھا دیے ہیں لیکن نئے علم سے اس نے جو کچھ افادہ کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا علم صرف چھلکے تک محدود ہے۔ نئے علم نے اس کو بالکل وہیں تک محدود رکھا ہے جہاں وہ اس سے پہلے متعارف ہوا تھا یا اگر اس علم نے اسے پہلے سے زیادہ برخود غلط بنا دیا ہے تو اس نے اس میں کسی ایسی ٹھوس شے کا اضافہ نہیں کیا ہے جسے وہ اپنے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم کرنے کا معقول سبب قرار دے سکتا۔ ہم کو نہ تو فتح حاصل کر لینے سے کوئی خوشی ہوئی نہ ان قوموں سے جن کو ہم نے فتح کیا۔ ہندو اگر اپنی انتہائی مسکینیت کے باعث ہم سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے تو مسلمان ایسے ضدی تھے کہ انھوں نے ہم سے سرے سے کچھ حاصل ہی نہیں کیا۔ ہمارے لیے مسلمانوں کے سخت تر طبیعت پر قابو پانا زیادہ مشکل تھا اور اس کو قابو میں لانا قدر و قیمت کے اعتبار سے بھی بہتر تھا لیکن یہ کام بے انتہا دشوار تھا۔ اپنے مسلک اور اپنی تاریخ کے پیش نظر وہ ہم کو اپنا حریف سمجھتا ہے۔ طاقت سے محروم ہو جانے کے سبب سے وہ افسردہ رہا ہے کہ پہلے کی طرح وہ اپنا اثر و اقتدار منوا نہیں سکتا تھا لیکن وہ برابر

اس کا متوقع اور منتظر رہا ہے کہ اس کی غلامی کا عہد ختم ہو جائے گا اور وہ اس زنجیر سے آزاد ہو جائے گا جس سے اس کے نئے آقا تدبیر و تزویر سے اس کو جکڑتے جاتے تھے۔ تحصیل علم سے بے پروا اور اس پر سختی سے بضد کہ وہ اپنے تصورات کے بجائے دوسروں کے خیالات کے آگے ہرگز سرِ تسلیم خم نہ کرے گا۔ باوجود اس کے کہ ہم نے مسلمانوں پر حکم چلانے کا زیادہ تر اختیار ہندوؤں کو دے رکھا ہے۔ ہندوستان کا مسلمان انتظامی امور کے انصرام میں ہندوؤں سے زیادہ موزوں ہے۔ ہم نے انتخاب کا جو اصول اختیار کیا ہے اس سے قدرتی طور جو نتیجہ برآمد ہوا ہے وہ بالکل اس کے برعکس ہوا ہے جو کہ ہونا چاہیے تھا۔ امتحان لینے میں وہ کوئی بھی تعلیمی معیار مقرر کریں ہندو یقینی طور پر مسلمان سے برتر ثابت ہوگا۔ ہندوستان کی آبادی کا کوئی بھی حصّہ ہو جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے وہ ناقص اور نامکمل رہی ہے اور باوجود اس کے کہ ہمارے پاس مکمل شمار و اعداد نہیں ہیں ہم اتنا یقیناً جانتے ہیں اور یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ بعض امور کے پیشِ نظر جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے ہندو فائدے میں رہے ہیں۔ گزشتہ مردم شماری سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی جتنی تعداد ہے اس نسبت سے زیادہ ہی وہ تعلیم سے بہرہ مند ہوتے ہیں اور جیسا کہ سول سروس کے امتحانات سے ثابت ہوتا ہے ان میں کچھ تعداد ایسی بھی ہے جو تربیت و تہذیب کے اعتبار سے اپنے پرانے فاتحوں اور آقاؤں سے بہت آگے نکل گئی ہے۔ اس طور پر یہ امر باعثِ حیرت و مسرت ہے کہ یہ جدید تعلیمی تحریک کہاں سے آئی اور کس غیر متوقع سمت اس کا رخ ہے۔ علی گڑھ کا یہ کالج اس امر کا مستقل ثبوت ہے کہ بالآخر ہماری مساعی کتنی سنگلاخ شے پر اثر انداز ہوئیں جن کا ہم کو سابقہ تھا اور اسی بنا پر اس تحریک کو شکل دینا اور اس کی ترقی میں معاون ہونا جتنا زیادہ مشکل ہے اتنا ہی حق بجانب ہے۔ دینے اور پانے والے دونوں کے حق میں یہ بہتر ہوگا اگر تعلیم مسلمانوں کو اس قابل بنا سکے کہ وہ انگریزی سرکاری مراتب و مناصب میں زیادہ حصّہ پا سکیں اور یہ کہیں بہتر ہوگا وہ اس مقصد کے حصول میں اپنی مدد آپ کر سکیں تاکہ اس کے لیے جس مناسب طریقۂ کار کی ضرورت ہو اس کو اختیار کیا جا سکے۔

جب تک مطلوبہ بنیادی سرمایہ ہاتھ میں نہ آ جائے اس پر بحث کرنا قبل از وقت معلوم ہوتا ہے کہ علی گڑھ کی آئندہ ترقی کے امکانات کیا ہیں اور جن اصولوں پر وہ چلایا جانے والا ہے وہ کہاں تک صحیح ہیں ہم جو بہترین نتیجہ نکال سکتے ہیں ان کا مدار فی الحال امیدوں پر ہے نہ کہ پیشین گوئیوں پر۔ البتہ بعض باتیں ایسی ہیں جن پر ہم قیاس آرائی کر سکتے ہیں۔ مشنری کا خاکہ مکمل ہے۔ صرف جزئیات کی خانہ پری باقی ہے اور

یہ دفعتاً فوقتاً جیسے جیسے ضرورت پیش آتی رہے گی اور سرمایہ فراہم ہوتا رہے گا پوری ہوتی رہیں گی۔

[اس کے بعد کی نو دس سطروں کا مفہوم واضح نہیں ہے ممکن ہے ان اصلاحات کی طرف اشارہ کیا گیا ہو جو اسی زمانہ میں آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کی بدنظمی کے ازالے کے لیے ایک اصلاحی کمیشن نے تجویز کیے تھے۔ ان کا ذکر یہاں ضروری نہ معلوم ہوا اس لیے ترجمہ نظر انداز کیا گیا۔ مترجم]

علاوہ بریں ایک امید افزا علامت غیر متوقع لامذہبی رواداری کی روح کی کارفرمائی ہے۔ ظاہر ہے مسلک اسلامی ہوگا لیکن مسلمانوں کے ساتھ ساتھ بے دین (Giaour) کو بھی اس کا حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنی قابلیت سے یہاں کے فوائد حاصل کرنے کا اپنے کو مستحق ثابت کریں۔ آزادی خیال کے راستے میں یقیناً یہ ایک پیش قدمی ہے جس امتیاز کو تقریباً حال ہی میں لیکن نامکمل طور پر ہم نے حاصل کیا ہے اور جس کے بارے میں ہم کو بہت کم توقع تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کی مستحکم صفت میں اس طرح تمام و کمال راہ پا سکے گی جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں کالج کا تعلیمی نقشہ بہت صحیح مرتب ہوا ہے۔ اگر یہ اسکیم ادارے کے بانیوں کی موجودہ غرض و غایت کے مطابق بر سر کار لائی جا سکی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انگریزی کلچر کی فوقیت اور ہندوستانی تعلیم کو انگریزی اثرات سے متاثر ہونے کے فوائد کو صدق دل سے تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو بہت سی ان خوبیوں اور خوب صورتیوں کے منکر ہوں جو ہندوستانی ادب میں ملتی ہیں لیکن ظاہر ہے ہندوستان کے موجودہ حالات میں یہاں کے باشندوں کے لیے انگریزی ادب اور زبان مدتوں وہ سب کچھ رہے گی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ جو کبھی کلاسکی ادبیات ہمارے لیے تھیں۔ مدتوں عملاً ان کی حیثیت نہ ختم ہونے والے ذخیرہ کی ہوگی، جس کی بیش از بیش قدر و قیمت کا اندازہ لگانا تقریباً ناممکن ہے جن کے بارے میں یہاں تک اندیشہ ہے کہ ناتربیت یافتہ ذہن جن کے لیے یہ فراہم کی جائیں گی شاید ان کو ہضم نہ کر پائیں۔ ایک ایسے منصوبے کے بارے میں جسے ہم دل سے پسند کرتے ہیں اور جس کے بارے میں ہم کو امید ہے کہ بہترین نتائج کا باعث ہوگا ہم کو ایسی بات نہیں کہنا چاہیے جو ہمتوں کو پست کرے لیکن یہ بہتر ہوگا اگر ہم اپنے آپ کو اس کے لیے تیار رکھیں کہ ابتدائے کار میں مایوسی کا سامنا ہو بہت ممکن ہے نتائج زیادہ دیر میں برآمد ہوں اور کچھ دنوں اتنے واضح بھی نظر نہ آئیں جتنا کہ اس اسکیم کے بانیوں کو توقع ہے۔ اس طرح کی تخلیقات میں جو اس سے بھی زیادہ امید افزا اگرد و پیش میں وجود میں آتے ہیں اس کا بڑا امکان رہتا ہے کہ وہ ابتدا

میں ناکامیاب رہتے معلوم ہوں اور یہی ناکامیابی بڑی افسردہ کن اور ہمتوں کو پست کر دینے والی ہوتی ہے۔ انگلستان میں جو کالج قائم کیے گئے شروع شروع میں بہت ہی معمولی کامیابی سے دوچار ہوئے، یہی حال اُن نئے مضامین کا ہوا جن کی پیوندکاری پُرانے اور تسلیم شدہ نصاب میں کی گئی۔ آخر جس طرح حاصل کیے گئے یا ڈگریاں تفویض کی گئیں وہ مضحکہ خیز تھیں ہم نے یہ سیکھا ہے کہ نامساعد حالات کو کس طرح گوارا کرنا اور بہتر حالات کا متوقع رہنا چاہیے۔ بہت ممکن ہے علی گڑھ کالج کے خیر اندیش بانیوں کو بھی اسی صورت حال کا سامنا ہو۔ ہم کو امید ہے ان حالات میں وہ ثابت قدم رہیں گے۔ ان کا منصوبہ شاندار ہے۔ ابتدائی موانع پر قابو پانے کے باوجود ہم یہ خیال کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے کہ وہ اس منصوبے کی تکمیل بہت جلد یا آسانی سے کر پائیں گے۔ ہندوستان کی سرزمین پر ذہنی سرگرمیوں کا ایسا مرکز قائم کرنا جو رفتہ رفتہ اپنی سرعت پذیر روح کو ہر چہار طرف جاری و ساری کر سکے نیز ایسی کشش رکھتا ہو اور اپنی ہی وضع قطع پر اس کی تشکیل کر سکتا ہو کہ بہترین ذہن و دماغ اس کے دم بدم وسیع تر ہوتے ہوئے حلقے کی طرف کھنچتے چلے آئیں یقیناً ایک بلند و برتر منصوبے کے شایان شان ہے۔ اس سے جو توقعات ہیں اس کی بنا پر ہم اس کا دل سے خیر مقدم کرتے ہیں اس بنا پر اور بھی کہ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ ہماری ساتھی رعایا مسلمانوں میں مشرب اور مقاصد کی کشادگی شہادت پیش کرتے ہیں۔

سٹرڈے ریویو ۲۷ جنوری ۱۸۷۷ء:

یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ برطانوی ہندوستانی مسلمانوں کی 'علحدگی پر قائم رہنے کی ضد' عرصۂ دراز سے اینگلو انڈین مباحث کا جزبن چکی ہے۔ یوں بھی سمجھدار طبقہ بھی اس امر کو تسلیم کرنے پر مائل ہونے لگا ہے کہ صورتِ حال کو اگنیز کر لیا جائے اس لیے کہ قانون فطرت یہی ہے جس کے خلاف ہر کارروائی بے سود ہوگی۔ ان جیسی نسل کے مزاج کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نیز جن مخصوص بدلے ہوئے حالات کی گرفت میں وہ ہیں ایسا ہونا خلاف توقع نہیں ہے۔ گئے دنوں کی اپنی محکوم رعایا کے دوش بدوش کھڑا کر دیا جانا جو کسی حال میں گوارا نہ ہوتا کیا کم تھا کہ اس بنا پر دس گنا اور زیادہ ناقابل قبول ہو گیا کہ وہ رعایا قوت اور مردانگی یا بحیثیت مجموعی کیرکٹر کے اعتبار سے ان سے کم درجے کی تھی۔ بزعم خود مسلمانوں کے پندار کو اس سے ٹھیس لگتی تھی کہ وہ سماجی اعتبار سے اس سطح پر کھڑے کر دیے جائیں جہاں ہندو تھے جو بردبار اور پست ہمت تھے نیز حکومت سے مناصب پانے کے لیے مساویانہ حیثیت سے اتر

مقابلہ کرنے پر مجبور ہو یا بالکل نہ کرے۔ جیسا کہ دنیا جانتی ہے اس نے موخر الذکر راستہ اختیار کیا۔ اس طرح
ایک طرف اس میں اور ہندو میں جسے وہ حقیر سمجھتا تھا سماجی فاصلہ بڑھتا گیا دوسری طرف اسی تناسب سے
جس سے اس کی تنگ نظری بڑھتی گئی وہ انگریزوں سے بھی جو ایک حد تک اس کے ہمدرد و حامی تھے
دور ہوتا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے نئی تہذیب سے برگشتہ رہنے کی مسلمان قسم کھا چکے ہیں لیکن اپنا نفع
دیکھ کر ہندو اس میں حصہ لے رہے تھے۔ درجنوں ہندو سبھائیں (سیاسی سماجی انجمنیں) تمام ملک میں پھیل
گئی تھیں جو اکثر رائے عامہ کی بڑی مفید ترجمانی کرتی تھیں۔ کلکتہ کی نہایت درجہ قابل قدر محمڈن لٹریری سوسائٹی
جس کی تجاویز کو لوکل گورنمنٹ نے ہمیشہ بہ نظر استحسان دیکھا مدتوں یکہ و تنہا مسلمانوں کی پبلک اسپرٹ
کی ترجمانی کرتی رہی۔ مسلمانوں کی ضد کا مظاہرہ خاص طور پر حکومت کی تعلیمی پالیسی کے خلاف تھا اور کوئی
عیسائی مشنری بے دین کالجوں (Godless Colleges) کے خلاف اس درجہ لعن طعن نہیں کر سکتا تھا
جتنا کہ مسلمان لیکن گذشتہ تین چار سال سے ان میں بتدریج ایک تبدیلی نمایاں ہونے لگی ہے وہ بھی ایسے
حلقے میں جہاں اس کی سب سے کم توقع تھی۔ سر رچرڈ ٹمپل کی یادداشت کے بعض دلچسپ حصوں کے مطالعہ
سے پتہ چلتا ہے کہ بنگال کے مسلمان نہایت خاموشی سے تعلیمی اصلاح کی طرف گامزن ہیں۔ یہاں تک کہ اس
قدامت پرست نسل کے با اثر اور معزز افراد میں تعلیم نسواں کی تائید کی جانے لگی ہے۔ اسی طرح کا رجحان پنجاب
کے مسلمانوں میں بھی نمایاں ہے اور ان کے یہاں بھی اس کا محرک یہ یقین اور عزم ہے کہ پبلک فرائض،
ذمہ داریوں، مسابقت باہمی اور نقد و نفع کے پیش نظر الگ تھلگ رہنے کے کوئی معنی نہیں۔

لیکن چند دن ہوئے علی گڑھ میں لارڈ لٹن نے جس تقریب میں حصہ لیا اس سے اس امر کا نہایت
واضح ثبوت ملتا ہے کہ مسلمان اپنی سماجی تاریخ کا ایک نیا ورق الٹ رہے ہیں۔ ظاہر ہے اپر انڈیا کے بعض
ممتاز مسلمان جو بہ حیثیت مجموعی اس امر کی کوشش کر رہے ہیں کہ ایک ایسا کالج قائم کیا جائے جو تکمیل
اور کارکردگی کے اعتبار سے ہندوستان کے دوسرے اداروں میں منفرد ہو اس کا ثبوت نہیں ہے کہ مسلمانوں
کے معاشرتی احیاء کا عہد نمودار ہونے کے قریب آگیا ہے لیکن جیسا کہ طبیعات کا حال ہے اسی طرح سیاسیات
میں بھی کسی نتیجہ کی وقعت کا مدار اس پر نہیں ہوتا کہ جو واقعات مشاہدے میں آئے ہیں وہ کتنے ہیں بلکہ
کیسے ہیں۔ گذشتہ دوشنبہ کے ٹائمز میں جو دلچسپ تفصیل شائع ہوئی ہے وہ کچھ اسی نوعیت کی ہے کہ سیاسی
بصر اس پر غور کریں۔ جس تحریک کی تفصیل شائع ہوئی ہے وہ اس کی مستحق ہے کہ اس کی تائید پریس اور

حکومت دونوں دل کھول کر کریں۔ مسلمانوں کی اس دیرینہ حقارت کو ذہن میں رکھتے ہوئے جوان کو یورپین جدت و بدعت سے تھی اور وہ فرقہ وارانہ توتو میں میں جو علی گڑھ کا نام لیتے ہی شروع ہو گئی ہو گی۔ یہ خبر کہ لارڈ لٹن نے ایک محمڈن کالج کا سنگ بنیاد رکھا محض رضا کارانہ کوششوں کا نتیجہ اور انگریزی تعلیم گاہوں کے انداز پر تھا جس میں اسکالرشپ، فیلوشپ، پروفیسر شپ، لکچرر شپ کا انتظام تھا اور درس گاہ کے حدود کے اندر قیام لازمی تھا اور مذہبی موانع حائل نہ تھے۔ ایسی باتیں تھیں جن کو پرانے انداز کے مسلمان، جیسا کہ ٹائمز کے نامہ نگار نے لکھا ہے نہایت درجہ متحیر ہوئے ہوں گے۔ یہ نئی تحریک یقیناً اس نمونے کی ہے جو بنگال اور دوسرے مقامات پر نظر آتی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ ایک ایسی دیسی ہندستانی کوشش ہے جو تعلیمی ترقی کے لیے عمل میں لائی گئی ہے اور جتنی منفرد ہے اتنی ہی بے ساختہ ہے۔ ابتدا کرنے میں مسلمان سست رہے ہیں لیکن اب جب کہ انھوں نے کام شروع کر دیا ہے وہ اس کو بھرپور طریقے سے پورا کرنے میں تل گئے ہیں۔ انھوں نے تقریباً نصف کام ختم کر لیا ہے اور محنت اور گرم جوشی نے رفاقت کی تو بقیہ نصف بھی پورا ہو جائے گا۔ علی گڑھ میں ایک عظیم الشان مرکزی کالج کے قیام کا منصوبہ چند سال ہوئے سید احمد خاں کے ذہن میں آیا جو ممالک مغربی شمالی کے روشن خیال مسلمانوں کے بڑے مشہور و مقبول لیڈر ہیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ایک مکمل نظام تعلیم مرتب کیا جائے جس میں مغربی سائنس و ادب کے پہلو بہ پہلو فارسی، اردو، عربی، سنسکرت اور ان دوسرے مضامین کی تعلیم کا بندوبست ہو جو مشرقی نصاب تعلیم میں شامل ہوں نیز قانون اور دینیات کا انتظام ان طلبا کے لیے ہو جو ان مضامین کو اختیار کرنا چاہتے ہوں۔ محمڈن فاونڈیشن ہونے کے باوجود اس کالج کے دروازے ہندو اور عیسائی طلبار کے لیے بھی کھلے ہوں گے جو بعض نوعیت اور علمی قابلیت کے شرائط پورے کرتے ہوں گے۔ یہاں تک کہ وہ کالج کے امتیازات و اعزازات کے بھی مستحق ہوں گے۔ اس اسکیم کو شروع کرنے کے لیے ایک لاکھ پونڈ کے جس سرمائے کی ضرورت ہے وہ پرائیوٹ طور پر عطیات حاصل کرنے سے پورا کیا جائے گا جس میں گورنمنٹ گرانٹ بھی شامل ہو گی۔ آغاز کار میں سب سے زیادہ دشواری ان چندہ دینے والوں کی طرف سے پیش آئی جو مذہبی تربیت کی طرف سے طرح طرح کے شبہات رکھتے تھے: تاوقتیکہ کوئی شخص اپنا عطیہ "سُنّی شعبہ" کے لیے نہ دے کوئی سُنّی اسے گوارا نہ کرے گا کہ اس کا روپیہ شیعہ طالب علم کی تربیت پر صرف کیا جائے۔ کوئی سُنّی کالج میں شیعہ مسجد کی تعمیر گوارا نہ کرے گا۔ شیعہ چندہ دینے والوں کو بھی اسی طرح کا اصرار تھا۔ لیکن بالآخر اس دشواری پر قابو پا لیا گیا اور اس امر کی

بے کم و کاست ضمانت دی گئی کہ جو چندہ وصول ہوگا وہ نہایت احتیاط کے ساتھ معطی کی مرضی کے مطابق خرچ کیا جائے گا۔ بانیان کالج اس بارے میں اس درجہ محتاط ہیں کہ انھوں نے ڈاکٹری اور طبی معالجہ میں بھی اس کا لحاظ رکھا ہے مثلاً" کالج سے وابستہ ایک ڈاکٹر ہوگا اور ایک حکیم (طبیب) بھی۔ کالج میں داخلے کے وقت طالب علم یا اس کے سرپرست سے دریافت کر لیا جائے گا کہ علالت میں طالب علم کے علاج کے لیے ڈاکٹر کو ترجیح دی جائے گی یا حکیم کو۔ اور جب کبھی ایسا موقع آئے گا تو اس کی تعمیل کی جائے گی اور اس کی اطلاع فی الفور سرپرست کو دی جائے گی اور ان کی ہر بات پر کامل طور پر عمل کیا جائے گا" غرض منصوبہ عمل میں لایا گیا اٹھارہ ماہ ہوئے پرائیویٹ عطیات کی رقم ۲۰ ہزار پونڈ تک پہنچی جو چھ مہینے میں دگنے سے زائد ہوگی۔۔۔۔ یہ نہایت درجہ قابل لحاظ F.P او اور حوصلہ مندانہ تحریک جزوی طور پر بھی کامیاب ہو جائے تو اس کے بانی تبریک و تہنیت کے مستحق ہوں گے ان کو امید ہے کہ آج سے آٹھ سال بعد علی گڑھ انگریزی نمونے کے ایک کالج کی حیثیت اختیار کرے گا جس میں گذرے زمانے کی عقل و دانش کے رمز آشنا شیعہ اور سنی Dons ہوں گے۔ جہاں تیس گرانقدر فیلو شپ اور ساٹھ اسکالرشپ مہیا ہیں جن سے طالب علم کے شوق علم کو تحریک ہوگی۔ اس کے ۔۔۔ اسکالرشپ ابتدائی اور تحتانی اسکول کے۔۔۔ طلبا کے لیے ہیں۔ سائنسی اور ادبی نصاب ایسا ہی ہمہ گیر ہے جتنا کسی یوروپین یونیورسٹی کا ہو سکتا ہے۔ مزید یہ کہ اس کو ہندوستانی پریسیڈنسی کالجوں سے زیادہ مکمل بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔
اس اسکیم کی نہایت درجہ نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اسپیشل آنرز اور خصوصی اکتسابات کے لیے خصوصی انعامات رکھے گئے ہیں تیس فیلو شپس کی تقسیم یوں ہوگی زبان کے لیے آٹھ۔ ریاضیات کے لیے پانچ منطق، خطابت اور فلسفہ کے لیے چار، نیچرل سائنس کے لیے چار اور پانچ مسلم قانون اور اصول قانون کے لیے جو سنی اور شیعہ عقائد سے متعلق ہوں گے۔ "علی گڑھ فیلو شپس صرف سات سال کیلیے یافتنی ہونگے۔ جہاں تک کالج میں قیام و طعام کے ضوابط کا تعلق ہے علی گڑھ کو پریسیڈنسی اور دوسرے کالجوں پر یقیناً ترجیح حاصل ہے جن کے طلبا کے ناپسندیدہ اطوار کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ ان پر کالج اتھارٹیز کی نگہداشت نہیں رہتی۔ یہ دقت بھی محسوس کی گئی کہ مختلف ملت و مسلک کے طلبا کو ایک ہی چھت کے نیچے کس طرح رکھا جا سکے گا لیکن جو پروگرام بنایا گیا ہے اس نے اس دشواری کو قابل اطمینان طور پر حل کر دیا ہے (Dons) ڈان صاحبان نہ تو نوجوانوں کے مذہب میں مداخلت کریں گے نہ کھانے پکانے کے اہتمام میں۔ علی گڑھ کی وسیع المشربی کا مزید ثبوت یہ ہے کہ اس امر کی آزادی دے رکھی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اس ادارہ اور اس کے انعامات کو کلکتہ یونیورسٹی آنرز کے

یہ وسیلہ بنا سکتے ہیں۔ ایسے بھی قواعد رکھے گئے ہیں کہ سست کار اور نا اہل لڑکوں کو ادارے سے علیحدہ کیا جا سکے کسی غیر کوالیفائڈ نوجوان کو نچلے درجے سے ترقی دے کر کالیجیٹ ڈیپارٹمنٹ میں داخل نہ کیا جا سکے گا۔ اور جن طلبا کو وظائف ملتے ہوں گے ان کو اختیار ہوگا کہ وہ ہر سال کے آخر میں ان وظائف کو بار دگر حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ بالآخر امید کی جاتی ہے کہ آئندہ کے فیلوز ان پراونشل اسکولوں کے ماسٹر صاحبان ہوں گے جو علی گڑھ تحریک کی تائید میں ملک میں جا بجا قائم ہو سکیں گے۔ Dons ایسے صاحبان ہوں گے جن پر ان کے ہم وطنوں کو اطمینان ہوگا کہ وہ ان کی مشترک زبان کو ایک ایسا موثر آلہ بنائیں گے جس سے تمام شمالی ہند کی مسلمانی آبادی یورپ کے ادبی اور سائنٹفک علوم کی نشر و اشاعت کی جا سکے گی۔ یہ فرقہ وارانہ اور ساتھ ہی غیر فرقہ وارانہ موقف کا حیرت انگیز مجموعہ ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے بانیوں نے کم سے کم اب تک ایک ایسی مذہبی دشواری پر قابو پا رکھا ہے جو انگلستان کے ماہرین تعلیم کے لیے درد سر بنا رہا ہے۔ آئندہ کامیابی کی توقعات سے قطع نظر اس کے بانی اپنی مجاہدانہ عزائم اور بلند پایہ مساعی کے لیے ہماری اعلیٰ ترین تبریک و تہنیت کے مستحق ہیں ان کی کوششوں کا بہترین نتیجہ اس امر کی شہادت ہے کہ مسلم آبادی کے ذہین طبقہ کا حقیقی رخ و رجحان کس طرف ہے۔

پایونیر ۲۷ جنوری ۱۸۷۷ء :

وائسرائے کا علی گڑھ تشریف لے جانا اور اس سے متعلق نیو محمڈن ازم کی تحریک ایسے واقعات ہیں جو حالات حاضرہ کے پیش نظر خاصی دلچسپی کا موجب ہیں۔ ان اشخاص میں جو ماڈرن کلچر سے پورے طور پر آشنا ہیں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو مسٹر لے فری مین کے اس خیال سے متفق ہیں کہ اسلام ازمنہ قدیم کے تعصب و تاریکی کا کا ایک نظام ہے جس کو مکڑی کے جالے کی طرح جلد سے جلد دور کر دینا چاہیے۔ ان میں ایسے بھی کچھ کم نہیں ہیں جو اس پر معترض ہوں گے کہ ناصاف چیزوں سے کوئی تعرض نہ کرنا چاہیے اور یہ دلیل پیش کرنا کہ چونکہ پیغمبر آنحضرت صلعم کا دین فی الاصل ناقابل اصلاح حد تک غیر اجتماعی ہے اس لیے یہ کسی روشن خیال حکمراں کی سرپرستی کا مستحق نہیں۔ دوسرے جو اس طرح کے مجردات کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے وہ لارڈ لٹن کے عمل کو سیاسی نقطہ نظر سے قابل اعتراض قرار دیتے ہیں یہ کہہ سکتے ہیں کہ سید احمد اور ان کے رفقا نے جو تحریک شروع کی ہے وہ دراصل اسلام کی مخالفت پر مبنی ہے اس لیے متقشف مسلمانوں کی ہمدردی حاصل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ وہ اس طرح کے دلائل پیش کر سکتے ہیں کہ ایسے ملک کے حکمراں جہاں اس طرح کے باشندے کثرت سے آباد ہوں

کسی ایسی تحریک سے وابستہ نہیں رہ سکتا۔ یہ جواب ان اصحاب کے غور و فکر کا مستحق ہے جنھوں نے اب تک کوئی رائے قائم نہ کی ہوگی۔ اسلام دراصل وہ نہیں ہے جو متذکرہ صدر حضرات نے فرض کر رکھا ہے اور باوجود اس امر کے کہ جو چیزیں مدتوں انسانی دستبرد میں رہ چکی ہوتی ہیں ان میں بہت کچھ قباحتیں راہ پا جاتی ہیں ان کے ماننے والوں میں بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو آبا و اجداد کے مسلک سے پورے طور پر وابستہ رہنے کے باوجود ماڈرن کلچر کے نتائج کو قبول کرنے کے لیے ہمیشہ آمادہ رہتے ہیں محترم سید (سرسید) انھی غیر معمولی شخصیتوں میں ہیں جو اپنے آبا کے مسلک میں سے کسی چیز کو ترک کیے بغیر دوسروں کے عقائد کو رواداری کے ساتھ اپنے فکر و نظر میں جگہ دے سکتے ہیں اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ان کے بہت سے رفقائے کار اسی رجحان طبع کے ہیں۔ اسلام کی پوری تاریخ اس کی گواہ ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ منو اور موسی یا دنیا کے اس طرح کے دوسرے نظریہ شعاروں کے ضوابط کے مانند جو نسل انسانی کو اپنے مصنوعی چوکھٹوں پر چڑھانے منڈھنے کے درپے رہتے ہیں۔ اسلام کوئی ڈھلا ڈھلایا ضابطہ قانون نہیں ہے۔ یہ انسانوں کا مرتب کیا ہوا غیر مربوط اور غیر متناقض مضامین کا مجموعہ یا معجون مرکب ہے جو بہت سے مواقع اور حالات سے برآمد ہوا ہے۔ اس میں خوبیوں کے ساتھ خرابیاں بھی ملی جلی ملیں گی بایں ہمہ اس نے اپنے عہد میں انسانیت کی تائید میں نیک خدمات انجام دی ہیں۔ بحیثیت مجموعی کہا جا سکتا کہ نویں صدی سے تیرہویں صدی عیسوی تک مسلمان یورپ کے معلم رہے ہیں اور روشن خیالی کے جو وسائل اور آئین اقوام اپنے بعد آنے والی نسلوں کو مہیا کر رہی ہیں وہ دراصل اس قرض کا ادا کرنا ہے جو ان پر عائد تھا یونانی کلچر کا احیاء دراصل بغداد کے پُر شکوہ خلفا ہارون الرشید اور اس کے فوراً بعد کے جانشینوں کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ قرطبہ کے عربوں اور غرناطہ میں ان کے موری (Moorish) جانشینوں کا یورپ کئی اعتبار سے ممنون احسان ہے۔ انھوں نے یورپ کو فن عمارت اور انجینیرنگ کے کتنے نمونوں سے آشنا کیا، شجاعت اور شہامت کا جذبہ دیا، جس نے اس کے غیر متمدن اور جاگیردارانہ نظام میں ایک طرح کی آن واد ا پیدا کر دی تھی۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان تمام امور کا شمار انسانیت کی خدمات میں ہونا ہے تاوقتیکہ ایسے من چلے یا خیرہ سر نہ ہوں جن کا مسلک یہ ہو کہ کلچر ہو یا علم یا تہذیب ان میں سے کسی کو قرون مظلمہ کی خلیج سے باہر نکال کر محفوظ کر لینا چاہیے۔ دوسری طرف لارڈ لٹن کے طرز عمل میں کوئی ایسا خطرہ مضمر نہیں ہے جس کا تصور کیا جا سکے اس لیے کہ بہت سے اچھے مسلمان ایسے ہیں جو اس بات کو بغیر تامل تسلیم کریں گے کہ وہ اس نئی تحریک کو دنیوی اغراض و مقاصد کے پیش نظر کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کو اپنے دینی مسلک

کے مستقبل سے قطعاً علٰحدہ سمجھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے علاوہ قدیم دبستان کے ایسے مسلمان بھی ہیں جو اپنے دین کو ایک ایسا نظام قرار دیتے ہیں جس میں مغربی تعلیم خواہ وہ کسی نوعیت کی ہو زیاں وضرر سے خالی نہیں۔ لیکن جن واقعات کی طرف یہاں توجہ دلائی گئی ہے ان سے ظاہر ہوگا کہ ایسے لوگ یقیناً غلطی پر ہیں جن کا خیال ہے کہ مذہب میں راسخ العقیدگی کو سائنس کے حقائق سے کسی طرح کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ یا یہ جاننا پڑے گا کہ انسانی ذہن میں ماورائیت (یا فوق الفطرت) کے نظریے اور سائنسی علوم یک جا نہیں ہو سکتے۔ ان تمام لوگوں کو جو اسلام اور روشن خیالی کو اجتماع ضدین سمجھتے ہیں یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ سبب کچھ ہی رہا ہو آج سے پہلے ایسے مسلمان تھے کہ وہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی روشن خیال تھے۔

خلاصۃ الانساب

کا

تجزیاتی مطالعہ

جناب دلدار نصری
رامپور (یوپی)
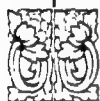
خلاصۃ الانساب روہیلوں کے نسب کے بارے میں ایک اہم تصنیف ہے۔ کنگڈم آف کابل میں اس کے متعدد حوالے موجود ہیں۔ نجم الغنی خاں نے بھی اخبار الصنادید میں اس سے مواد حاصل کیا ہے دو ایک جگہ اس کے اقتباس بھی دیے ہیں۔ گلستان رحمت اور گل رحمت کے مصنفین جو حافظ الملک کے بیٹے اور پوتے تھے اور ان کے علاوہ دیگر مورخین نے بھی جہاں کہیں پٹھانوں کے نسب کا ذکر کیا ہے وہ اسی کا مرہون منت ہے۔ چاہے براہ راست حاصل کیا ہو اور چاہے بالواسطہ حاصل ہوا ہو۔ اس قدر اہمیت کے باوجود یہ مسئلہ اختلافی بنا رہا ہے کہ اس کا مصنف کون تھا؟ ایلیٹ نے گلستان رحمت مصنفہ ۱۷۹۵ء کا انگریزی ترجمہ ۱۸۳۱ء میں کیا تھا۔ اسمیں اس نے خلاصۃ الانساب کو شیخ شہاب الدین عرف کوٹہ بابا کی تصنیف بتایا تھا۔ جو حافظ الملک کے پردادا تھے۔

ایلیٹ ۲۰ سال سے زیادہ عرصہ تک روہیل کھنڈ کا کمشنر رہا۔ حافظ الملک کے دو ایک بیٹوں کو چھوڑ کر جو لکھنؤ میں سکونت رکھتے تھے ان کے تمام بیٹے روہیل کھنڈ میں تھے۔ ان کو بریلی کے انگریزی خزانہ سے ماہانہ پینشن ملتی تھی اس کے علاوہ انگریزی حکومت نے انھیں جاگیریں بھی دی تھیں۔ ایک پینشن روزینہ کے نام سے بھی دی جاتی تھی جو ۱۷۷۴ء کی جنگ کے بعد دوران قید منظور ہوئی تھی اور بعد میں بھی برقرار رہی۔ اس کی تقسیم اس زمانہ میں روزانہ ہوا کرتی تھی۔ حافظ الملک کی اولاد اپنے سالانہ اور روزینہ وظائف اور اپنی جاگیروں کے مسائل کی وجہ سے اور اس لیے بھی کہ انگریز حاکموں سے تعلقات خوش گوار رہیں، کمشنر روہیل کھنڈ سے ملتی رہتی تھی۔ اس لیے حافظ الملک کے خاندان کے بارے میں ایلیٹ نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کا ذریعہ معلومات حافظ الملک کے بیٹے اور پوتے خاص طور پر مستجاب خاں مصنف گلستان رحمت اور سعادت یار خاں مصنف گل رحمت تھے۔ اس لیے ۱۸۳۱ء تک حافظ الملک کی اولاد خلاصۃ الانساب کو کوٹہ بابا کی تصنیف سمجھتی تھی۔

سر جان اسٹریچی گورنر برٹش جب ہیسٹنگز اینڈ روہیلہ وار مصنفہ ۱۷۹۲ء کی تصنیف میں مشغول تھا تو اس نے انگلستان کے کتب خانوں سے خلاصۃ الانساب کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ وہاں فہرست کتب میں حافظ رحمت خاں کو مصنف لکھا گیا ہے۔ اسٹریچی کو اس پر بڑا تعجب ہوا لیکن اس نے اس معمہ کو حل کرنے کی کوشش نہیں کی

انگلستان کے کتب خانے میری دسترس سے باہر تھے۔ لیکن خدا بخش لائبریری پٹنہ کی گراں قدر عنایت سے خلاصۃ الانساب کی فوٹو اسٹیٹ کاپی کے مطالعہ کا موقعہ مجھے مل گیا! اصل نسخہ بھوپال میں ہے اور نسخہ بھوپال ۱۸۸۱ء کی نقل ہے۔ نسخہ میں کل ۱۴۶ صفحات ہیں۔ اور ہر صفحہ میں ۱۱ سطریں ہیں۔ لیکن صفحات پر نمبر نہ تھے۔ وہ مجھے خود ڈالنے پڑے۔ اس نسخہ بھوپال / پٹنہ کے سرورق پر تصنیف کا نام خلاصۃ الانساب درج ہے۔ لیکن مصنف کا نام غائب ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بروقت نقل یہ بات طے شدہ نہ تھی کہ مصنف کون ہے؟ سرورق کی پیشانی پر قرآن پاک کی آیت بطور تبرک درج ہے اور سرورق کے نیچے کے کنارہ پر یہ عبارت درج ہے۔

"بتاریخ ۲ جمادی الاول ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۱ء) بقلم عاصی کلب حسین بغایت استعمال ۵ یوم اختتام پذیرفت"

لیکن یہ کہیں بھی لکھا ہوا نہیں ہے کہ نقل کس کے نسخہ سے کی گئی ہے اور کس کے لیے تیار ہوئی ہے اور اس قدر عجلت کی وجہ کیا تھی؟ اور مصنف کا نام سرورق پر کیوں نہیں ہے؟ نسخہ کے صفحہ آخر پر ترقیمہ درج ہے جس کی عبارت یہ ہے۔

"تمام شد ہذا کتاب رسالہ خلاصۃ الانساب عرف زرد الرافع والمرتاب تصنیف . . . (طول طویل القاب کے بعد) مکرم الدولہ حافظ الملک نواب حافظ رحمت خاں بہادر نصیر جنگ والی کٹھرا . . . کہ بتاریخ یازدہم صفر المظفر ۱۱۸۸ھ مطابق ۲۸ اپریل ۱۷۷۴ء روز شنبہ متصل فتح گنج شرقی بمقابلہ نواب شجاع الدولہ از ضرب گولہ توپ شربت خوشگوار شہادت نوشیدہ متوجہ ملک آخرت شدند۔ انا للہ وانا الیہ راجعون تمت الکتاب"

اس ترقیمہ میں حافظ الملک کی شہادت کا ذکر موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ترقیمہ حافظ الملک کی شہادت کے بعد اس وقت لگایا گیا ہے کہ جب انگریزی حکومت بطور یادگار فتح ۱۷۷۴ء کے میدان جنگ میں ایک بستی فتح گنج شرقی کے نام سے آباد کر چکی تھی۔ بریلی ضلع میں ایک بستی فتح گنج غربی بھی ہے جو ۱۷۹۴ء کی جنگ روہیلہ دوئم کی یادگار کے بطور آباد کی گئی ہے۔ چونکہ ترقیمہ میں شرقی لکھا ہوا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ شرقی اور غربی دونوں فتح گنج بسائے جا چکے تھے۔ ۱۷۷۴ء کی جنگ کے بعد روہیل کھنڈ کا علاقہ ریاست اودھ میں شامل کر دیا گیا تھا۔ ۱۷۹۴ء کی دوسری جنگ کے بعد بھی روہیل کھنڈ اودھ کی عملداری میں رہا۔ ۱۸۰۱ء میں روہیل کھنڈ براہ راست ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ میں آیا۔ اور یہاں کمشنر مقرر کیا گیا۔ یہ دونوں بستیاں اس کے کافی عرصہ کے بعد بسائی گئی ہیں۔ اور ترقیمہ اس

ت لکھا گیا ہے جب یہ دونوں بستیاں کافی مشہور ہو چکی تھیں۔ یہ ترقیمہ ۱۸۳اھ کے بعد کا ہے جب کہ ایلیٹ گلستان
ت کا ترجمہ کر چکا تھا۔ اور کچھ عجب نہیں کہ ۱۸۸۱ء کا ہو جس وقت یہ نقل تیار کی گئی ہے۔ ترقیمہ کا مصنف کوئی شخص نامعلوم
جس نے اصل ترقیمہ کو ہٹا کر اپنا ترقیمہ لگایا۔ اس کا ثبوت صفحہ ۱۰ کے اس بیان میں ملتا ہے۔

"مابقیہ رالسبب عدم گنجائش دیباچہ بخاتمہ کتاب حوالہ نمودہ"

بن خاتمہ کتاب پر اس ترقیمہ کے علاوہ اور کوئی عبارت موجود نہیں ہے۔ اس ترقیمہ میں دو واضح غلطیاں موجود ہیں۔
یہ بات ظاہر کر رہی ہیں کہ لکھنے والے نے عجلت میں تصنیف کو پڑھنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی تھی۔ ترقیمہ میں
لاصۃ الانساب کی عرفیت رد الروافض والمرتاب بتائی گئی ہے۔ جبکہ اندرونی صفحہ ۱۲ پر حافظ رحمت خاں سے منسوب یہ بیان ملتا ہے۔

"یہ خلاصۃ الانساب (جس میں کوٹھ بابا کی اولاد کے نام تحریر ہوئے ہیں) خود اپنی معلومات سے مرتب کیا اور
اس میں خلاصۃ الانساب (جس میں افغان قبائل کی شاخوں کا ذکر ہے) معہ رسالہ رد الروافض (جس میں خلفائے
راشدین اور ازواج رسول اللہ صلعم کی تعریف ہے) کے شامل کر دیا ہے۔"

ٰس کو خلاصۃ الانساب کہا جاتا ہے وہ تین رسائل پر مشتمل ہے ا۔ خلاصہ انساب ۲۔ خلاصۃ الانساب ۳۔ رد الروافض
اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ خلاصۃ الانساب کی عرفیت رد الروافض نہیں بلکہ وہ الگ رسالہ ہے۔

عبارت سے یہ ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ دونوں رسائل کس کی تصنیف تھے۔ پہلا جزو حافظ الملک کی معلومات سے
لکھا گیا ہے۔ ایلیٹ کی روایت کے مطابق خلاصۃ الانساب کوٹھ بابا کی تصنیف ہے۔ لیکن کوٹھ بابا سے قبل فارسی زبان
میں اخوند درویزہ بابا اپنے تذکرۃ الابرار والاشرار میں افغان قبائل کی شاخوں کا تذکرہ کر چکے تھے۔ جس کی تصدیق ص ۱۱ پر
حافظ رحمت خاں سے منسوب یہ بیان کر رہا ہے۔ جس میں کوٹھ بابا کا کوئی حوالہ موجود نہیں ہے۔

"اگرچہ بندہ کی غرض اس رسالہ کی تصنیف سے اپنے نسب کا اظہار ہے تاکہ بندہ کی اولاد واقف رہے لیکن
ضمناً جملہ افغانان کا نسب جس کا مختصر ذکر اخوند درویزہ بابا نے اپنے تذکرہ میں کیا ہے اور جس کی تفصیل تاریخ شیر شاہی اور
تاریخ خانجہانی میں موجود ہے ان سے قبول کر کے لکھ دیا ہے"

ایلیٹ کا بیان جو واضح طور پر حافظ رحمت کے بیٹوں کا تصدیق شدہ ہے۔ خلاصۃ الانساب کو کوٹھ بابا کی تصنیف
بتایا ہے۔ ان دونوں بیانوں میں مفاہمت کے پیش نظر یہ سمجھنا چاہیے کہ ابتداء میں کوٹھ بابا نے اخوند درویزہ بابا کے
فارسی تذکرہ سے مضامین حاصل کر کے اور کچھ اپنی معلومات سے اضافہ کر کے پشتو زبان میں خلاصۃ الانساب کے نام
سے مسودہ مرتب کیا تھا اس مسودہ کو حافظ الملک کی ایما سے دوبارہ مرتب کرتے وقت مرتب نے کوٹھ بابا کا ذکر درمیان

نکال دیا۔ اور چونکہ ان کا مسودہ اخوند درویزہ بابا کے تذکرۃ الابرار والاشرار کے مضامین سے اخذ ہوا تھا اس لیے صرف اخوند درویزہ بابا کے تذکرہ کا ذکر کافی سمجھا۔ اور پھر اس کا مقابلہ تاریخ شیر شاہی اور تاریخ خانجہانی سے کر کے اس میں کچھ تبدیلی اور کچھ اضافہ بھی کیا گیا۔ اور کوڑہ بابا کی اولاد کا حال جو حافظ الملک کی معلومات سے تحریر ہوا تھا اس میں شامل کر دیا۔ اس طرح اس کی تکمیل ہوئی۔ اس مقام پر اخوند درویزہ بابا کا تھوڑا سا ذکر کرنا ضروری ہے۔

اخوند درویزہ بابا کے مرشد پیر بابا (سید علی ترمذی) تھے جن کے والد ترمذ علاقہ افغانستان سے ترک سکونت کر کے یوسف زئی علاقہ میں بونیر خیل پٹھانوں میں مقیم ہو گئے تھے۔ مرشد اور خلیفہ دونوں کی معرکہ آرائی پیر روشن سے جاری تھی۔ جن کو پٹھان لوگ پیر روخان کہتے تھے۔ اصل نام بایزید انصاری تھا وہ نسلاً پٹھان تھے۔ انصاری پٹھانوں کا ایک قبیلہ بھی ہے (بحوالہ حواشی تاریخ رحمت خانی ص ۴۵) اگرچہ اب انصاری عام طور پر شیوخ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اخوند درویزہ بابا نے پیر روشن کا نام پیر تاریک رکھ دیا تھا۔ اور اس کی مصنفہ کتاب خیر البیان کو شر البیان اور خر البیان کہتے تھے۔ پیر روشن کے اعتقادات کیا تھے اور کیا نہ تھے یہ بحث فضول ہے؟ لیکن اخوند درویزہ بابا کا کہنا تھا کہ پیر تاریک اپنے کو پیغمبر اور رسول کہتا ہے اور اپنے اوپر وحی نازل ہونے کا دعوی کرتا ہے۔ اور اپنی کتاب کو مثل قرآن پاک کے بتاتا ہے۔ اس نے مذہب میں متعدد بدعتیں جاری کر دی ہیں اگر میں نے اس کی تردید میں اس قدر کوشش اور جد و جہد نہ کی ہوتی تو وہ سارے پٹھانوں کو شرک اور کفر میں مبتلا کر دیتا۔

یہ مقابلہ آرائی اگرچہ مذہب کے نام پر جاری تھی لیکن اس میں تھوڑی بہت سیاست بھی شامل تھی۔ پیر روشن افغان قبائل میں نسلی تعصب بھڑکا کر انھیں مغل حکومت کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر رہا تھا۔ اس کی تبلیغ سے بعض قبائل باغی بھی ہو گئے تھے۔ لیکن پیر بابا ترمذی اور ان کے خلیفہ اخوند درویزہ بابا مغل حکومت کو اسلامی حکومت قرار دے کر اس کی حمایت کر رہے تھے۔ کچھ افغان قبائل ان کے ساتھ تھے اور اس کے علاوہ مغل حکومت ان کی شریک تھی۔ دونوں کے حمایتی قبائل میں جنگ کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ اس میں اخوند درویزہ بابا دلی کی مغل حکومت کی امداد کی وجہ سے بھاری پڑتے رہے۔ ایک لمبے عرصہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ جس کے دوران پیر بابا ترمذی اور پیر روشن کا بھی انتقال ہو گیا۔ پیر روشن کے مرنے پر اس کا بیٹا میدان میں آگیا اور دوسری طرف اخوند درویزہ بابا مورچہ بدستور سنبھالے ہوئے تھے۔ پیر روشن کے بیٹے عمر نے باپ کی میت کو ایک تابوت میں رکھا اور تابوت بطور نشان لشکر کاندھوں پر اٹھا کر لشکر کے آگے چلتا تھا تاکہ پیر روشن کی خیر و برکت سے فتح حاصل ہو۔ لیکن بیٹے کو بھی شکست ہوئی اور قتل کر دیا گیا۔ اس تابوت کو معہ پیر روشن کی نعش کے اخوند درویزہ بابا کے حکم سے جلا دیا گیا اور اس کی راکھ دریائے سندھ

...ں بہا دی گئی۔ اس کے بعد پیر روشن کے پوتے بلالہ کو مغل بادشاہ نے اپنے پاس رکھ لیا۔ تاکہ اس کے مزاج کی شورش کم ہو اور اس کے دماغ میں فتنہ و فساد کی تخم ریزی نہ ہو۔ لیکن اس کو جیسے ہی موقعہ ملا وہ بھاگ کر افغان قبائل میں پہنچ گیا۔ اور تھوڑا بہت فتنہ اور فساد مچاتا رہا۔ پیر روشن کے نام کی نسبت سے یہ تحریک روشنائی کہلاتی تھی اور ایک مدت تک چلتی رہی۔ اخوند درویزہ بابا نے طویل عمر پائی ۱۶۳۸ء میں ایک سو آٹھ سال کی عمر (بحساب سال ہجری) پشاور میں انتقال کیا اور پشاور میں ہی مدفون ہوئے۔

کوٹہ بابا کی نشینی شوراوک متصل قندھار سے آمد اخوند درویزہ بابا کی حیات میں ہوگئی تھی۔ کیونکہ شاہ عالم خاں اور حسن خاں ان کے پوتے آغاز شباب میں ۱۶۷۳ء میں کٹیہر (روہیل کھنڈ) میں بغرض ملازمت آئے تھے۔ اس واقعہ سے ۳۵ سال قبل اخوند درویزہ کی وفات ہوئی ہے۔ اس لیے ان کے والد محمود خاں عرف موتی بابا اور دادا کوٹہ بابا کا تعلق اخوند درویزہ بابا سے ذاتی طور پر قائم رہا ہوگا کوٹہ بابا نے ان کے تذکرۃ الابرار والاشرار کے کچھ اجزا کا ترجمہ پشتو میں خلاصۃ الانساب کے نام سے کیا غالباً اخوند درویزہ بابا ان کے مرشد تھے بیعت ہونے کا ذکر خلاصۃ الانساب میں موجود ہے اگرچہ مرشد کا نام نہیں ہے۔

کوٹہ بابا کی وفات کے بعد بھی ان کی اولاد کا تعلق پیر بابا ترمذی کی اولاد اور ان کے سلسلہ سے قائم رہا۔ نواب علی محمد خاں نے جیسے ہی آنولہ میں استحکام پایا تو پیر بابا ترمذی کی اولاد میں سے سید علی شاہ ترمذی کو بصد احترام آنولہ بلا لیا تھا تاکہ ان کی خیر و برکت سے پٹھانوں کو جنگ میں فتح حاصل ہو۔ نواب علی محمد خاں ان کے ساتھ غیر معمولی طور پر مدارات اور سلوک کرتے تھے۔ سید علی شاہ ترمذی کا انتقال نواب علی محمد خاں کی وفات کے بعد ہوا اور نواب صاحب کے مقبرہ میں ہی ان کی تدفین ہوئی۔ میاں حسن شاہ صاحبؒ جن کا مزار شہر رامپور کے متصل موضع نانکار میں ہے وہ سید علی شاہ ترمذی کے فرزند تھے۔ ۱۷۴۹ء کی جنگ بنگش میں میاں حسن شاہ صاحبؒ نواب سعد اللہ خاں کو اپنی گود میں لے کر ہاتھی پر بیٹھے تھے اور جنگ کے درمیان خود زخمی ہو کر ان کی جان بچائی تھی۔ میاں حسن شاہ صاحبؒ کا تعلق نوابین رامپور سے زندگی بھر بدستور قائم رہا۔ نواب احمد علی خاں (۱۷۹۴ء۔ ۱۸۴۰ء) نے انھیں سرگروہ فقرا بنایا تھا۔ ان کے عہد حکومت میں میاں حسن شاہ صاحبؒ کا وصال ہوا۔ بعد ازاں نواب احمد علی خاں کی تدفین بھی میاں حسن شاہؒ کے مزار میں ہوئی۔ موضع نانکار متصل شہر رامپور کا یہ عالیشان مقبرہ جس میں بھول بھلیاں بنی ہوئی ہیں نواب احمد علی خاں نے بنوایا تھا۔

حافظ الملک حافظ رحمت خاں بھی پیر بابا کی اولاد میں میاں معصوم شاہؒ ولد میاں احمد شاہ ترمذی کے مرید تھے۔ حافظ الملک حافظ رحمت خاں نے انھیں قلعہ بریلی میں رہنے کے لیے مکانات دے دیے تھے قلعہ کی فصیل کا تو

نام ونشان بھی باقی نہیں رہا لیکن ان کی اولاد اب بھی انھیں مکانات میں رہتی ہے۔ اور بریلی میں نومحلہ والے سیدوں کے نام سے مشہور ہے۔ نواب فیض اللہ خاں کے عہد میں میاں نعیم شاہؒ کے والد یاغستان سے آئے تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب درویزہ باباؒ سے ملتا ہے۔ نواب فیض اللہ خاں نے آپ کے والد کو تھانہ تجیانی کے پاس مکان دیا تھا۔ پھر بھی آپ ہی کے نام سے مشہور ہے۔ آپ کا مزار اسی محلہ میں اپنے مکان کے سامنے مسجد میں ہے۔ آپ کی پیدائش رامپور میں ہوئی۔ آپ کے والد جنگ دوجوڑہ میں شریک تھے۔

وفات کی تاریخ ۱۱ ربیع الاول ۱۲۷۳ھ تاریخی اسم وفات (بہ بہشت نعیم شاہ امام) ہے۔ ان کے علاوہ مولانا محمد گل صاحب تقریباً اسی سال کی عمر میں رامپور آئے تھے وہ درویزہ باباکے خلیفہ تھے۔ نواب فیض اللہ خاں نے انھیں یہاں راجدوارہ میں ٹیڑھی مسجد سے آراضی دی تھی۔ یہ مسجد ان کی نشست گاہ تھی اور اس کے پاس زنانہ مکان تھا۔ نواب فیض اللہ خاں ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ دیتے تھے اور کبھی کبھی خود بھی ملنے آتے تھے۔ غریب شاہ کے تکیہ میں دفن ہوگئے اب زیر آب ہیں۔

اس خاندان کی تیسری شاخ بھی نواب فیض اللہ خاں کے عہد میں رامپور آگئی تھی۔ ان بزرگ کا نام میاں قطب شاہ تھا۔ ان کے فرزند سید جمال شاہ مظلوم (زخموں والے میاں) ہوئے۔ اسی خاندان میں موجودہ سجادہ نشین میاں محمود شاہ نسیم ہیں۔ میاں حسن شاہ صاحبؒ کی اولاد بھی رامپور میں موجود ہے۔

پیر بابا ترمذیؒ کا سلسلہ روہیلہ پٹھانوں میں عہد ہمایوں بادشاہ سے لے کر آج تک پھلتا پھولتا رہا ہے۔ اخوند درویزہ باباکے تذکرہ میں ان پٹھان قبائل کے نسب پر جو پیر روشن کے معتقد تھے کچھ اعتراضات موجود تھے۔ غالباً وہ مضامین بڑے باباکے تذکرہ میں آگئے ہوں گے کیونکہ انھوں نے اپنے پشتو کے تذکرہ میں مواد اخوند درویزہ بابا سے قبول کیا تھا۔ اس سیاسی مصالح کی بنا پر حافظ الملک حافظ رحمت خاں نے پسند نہیں کیا کیوں کہ اس سے پٹھان قبائل میں اختلاف پیدا ہوسکتا تھا۔ اور فساد بھی پھیل سکتا تھا۔ یہی صورت حال رد الروافض کی بھی تھی۔ اس میں پیر روشن کی بدعتوں کا ذکر تھا۔ ان دونوں رسائل کو نئے سرے سے مرتب کرتے وقت محض قبائل کے نسب پر جو اعتراضات موجود تھے ان کو ہٹا دیا گیا۔ رسالہ رد الروافض کے مضامین کی اصلاح اس طرح ہوئی کہ متنازع نام کے سوا اس میں اور کوئی نزاعی امر باقی نہ رہا۔ اچھا ہوتا کہ یہ نام بھی بدل دیا گیا ہوتا۔ اپنی موجودہ شکل میں یہ رسالہ صرف صحابہ کرام اور ازواج رسول اللہ کی عزت اور تکریم پر زور دیتا ہے۔ پیر روشن کے خلاف کوئی چیز باقی نہیں ہے۔ خلاصۃ الانساب کا ابتدائی حصہ جو حافظ الملک کی معلومات سے لکھا گیا ہے اس کی وجہ تصنیف بتلاتے ہوئے حافظ الملک سے منسوب خلاصۃ الانساب کے ص ۱۶ پر یہ بیان موجود ہے۔

"ہر چند میری اولاد اور دیگر کوٹہ خیل کی اولاد اپنے نسب کی شناخت رکھتی ہے لیکن دور اور قریب کے رشتوں میں فرق کی واقفیت کے لیے جسکی ضرورت صلہ رحمی کے لیے اور اس لیے بھی کہ زمانہ گزرنے کے بعد ان کی اولاد اپنے اخلاف اور نسب کو فراموش نہ کر دے اس لیے یہ انساب تحریر کیا گیا ہے۔"

حیرت کی بات یہ ہے کہ حافظ الملک نے اپنے بیٹوں اور اپنے چچیرے بھائیوں کے بیٹوں کے نام نہیں لکھے۔ اور لڑکیوں کے نام تو سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ حالانکہ صلہ رحمی اور دور و قریب کے رشتہ داروں کی پہچان کے لیے اس کی اشد ضرورت تھی۔ انساب کی تحقیق کے سلسلہ میں حافظ الملک سے منسوب یہ بیان بھی موجود ہے کہ اس میں اپنی معلومات کے علاوہ دیگر پٹھان سرداروں سے بھی معلومات حاصل کی گئی ہیں اس کے علاوہ اخوند درویزہ بابا کے تذکرۃ الابرار والاشرار، تاریخ شیر شاہی، درتاریخ خان جہانی سے بھی مدد لی گئی ہے۔ لیکن کوٹہ بابا کے تذکرہ کا ذکر بالکل نہیں کیا گیا لیکن حافظ الملک کی اولاد کے ذہن میں یقیناً کوٹہ بابا کا رسالہ موجود تھا ورنہ ۱۸۳۱ء میں ایلیٹ بریلی کے کمشنر کی کرسی پر بیٹھ کر اور حافظ الملک کے فرزندوں اور انکی اولادوں سے تعلق رکھ کر ہرگز یہ نہیں لکھتا کہ خلاصۃ الانساب کوٹہ بابا کی تصنیف ہے۔ کوٹہ بابا کا نام غائب ہونے کی بات ۱۸۳۱ء کے بعد کی اور شاید کافی بعد کی بات ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ۱۸۸۱ء میں نقل کے وقت ہی یہ نام غائب ہوا ہو۔

خلاصۃ الانساب کے ابتدائی حصہ میں جس میں کوٹہ بابا کی اولاد کے نام ہیں۔ وہ حصہ حافظ الملک کی دی ہوئی معلومات سے لکھا گیا ہے۔ اس میں کوٹہ بابا سے اوپر کی پشت کا کوئی نام نہیں ہے۔ صرف خیل اور گروہ کے نام ہیں۔ مکمل سلسلہ یہ ہے جو خلاصۃ الانساب کے مختلف مقامات سے جمع کیا گیا ہے۔

۱۔ حافظ الملک حافظ رحمت خاں، ۲۔ شاہ عالم خاں، ۳۔ محمود خاں عرف موتی بابا، ۴۔ شیخ شہاب الدین عرف کوٹہ بابا (اس کے بعد خیل اور گروہ کے نام شروع ہو گئے ہیں۔) ۵۔ کوٹہ خیل، ۶۔ دولت خیل، ۷۔ بدلزئی، ۸۔ داؤد خیل، ۹۔ بڑیچ، ۱۰۔ شرخبوں عرف شیخی، ۱۱۔ سڑبن، ۱۲۔ قیس عبد الرشید۔

قیس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہوا تھا اور مکہ معظمہ کی فتح میں شریک تھا۔ قیس عبد الرشید روایتی طور پر پٹھانوں کا مورث اعلیٰ ہے۔ اگرچہ یہ روایت بھی موجود ہے کہ وہ رسول اللہ کی خدمت میں ۷۰ آدمیوں کے گروہ کے ساتھ شریک ہوا تھا۔ لیکن ان ۷۰ آدمیوں کی اولاد کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے۔ اب پٹھانوں نے اپنے کو قیس عبد الرشید کی اولاد تسلیم کر لیا ہے۔

کوٹہ بابا کے تذکرہ کی فنی تالیف اور ترتیب کس کے ہاتھوں ہوئی اس کا کوئی ذکر خلاصۃ الانساب میں موجود نہیں ہے۔ قیاساً شاید یہ کام بھی پیر معظم شاہ نے کیا ہوگا۔ جن سے حافظ الملک نے تاریخ حافظ رحمت خانی (خان کجوکی تاریخ افاغنہ

جو خواجہ ملی کی تصنیف تھی) کی ترتیب و تدوین اور تلخیص کرائی تھی۔ ملک خواجو نے یہ تصنیف دو سال میں ۱۶۲۴-۱۶۲۳ء میں کی تھی۔ پیر معظم شاہ نے اس کی تلخیص ماہ محرم ۱۱۸۱ھ مطابق جون ۱۷۶۷ء میں مکمل کی۔ خاتمہ کتاب پر پیر معظم شاہ کی نظم میں اس تاریخ کا اندراج موجود ہے۔ لیکن اس کے نیچے جو ترقیمہ لگا ہوا ہے وہ بعد کا ہے۔ اسی ترقیمہ میں معظم شاہ نے اپنے کو سرکار عظیم اللہ خاں ولد نواب دوندے خاں مرحوم کا ملازم بتایا ہے۔ نواب دوندے خاں کا انتقال ۱۷ اپریل ۱۷۷۱ء/۱۱۸۵ھ کو ہوا تھا عظیم اللہ خاں ان کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ان کے دو بھائی فتح اللہ خاں اور محب اللہ خاں اور بھی تھے۔ دو بہنیں ایک نواب نجیب الدولہ کی بیوی اور دوسری نواب سعد اللہ خاں ابن نواب علی محمد خاں کی زوجہ تھیں ۱۷۷۴ء کی جنگ کے بعد یہ الہ آباد کے قلعہ میں اپنے خاندان کے ساتھ قید کر دیے گئے تھے۔ وہاں سے رہا ہو کر عظیم اللہ خاں اور بیگم نواب سعد اللہ خاں نے رامپور کو اپنا مسکن بنالیا عظیم اللہ خاں کا انتقال رامپور میں ۱۸۱۶ء میں ہوا ان کی دختر کی شادی صاحب زادہ اسد اللہ خاں ولد نواب زادہ فتح علی خاں ولد نواب فیض اللہ خاں سے ہوئی تھی ان کے بیٹے صاحب زادہ کرم خاں تھے جس عمارت میں مدرسہ غوثیہ پرانا گنج میں قائم تھا جو مدرسہ عالیہ کا ہی ایک حصہ تھا اس میں قرآن پاک کی تعلیم ہوتی تھی وہ صاحب زادہ کرم خاں کا دیوان خانہ تھا جو ریاست رامپور نے لے لیا تھا۔ صاحب زادہ کرم خاں، نواب فیض اللہ خاں کے پرپوتے اور عظیم اللہ خاں ولد نواب دوندے خاں کے نواسے تھے ان کے نواسے معظم علی خاں مہتمم مدرسہ غوثیہ کی پشت پر مقیم رہے۔ خاص مدرسہ عالیہ اس کے مقابل دوسری عمارت میں تھا وہ عمارت صاحب زادہ کرنل دولہ صاحب کے والد کی تھی۔ اب یہ مدرسہ عالیہ کلب گھر میں منتقل ہو گیا ہے۔ لیکن "مدرسہ غوثیہ" اپنی جگہ پر رہا۔ اب اس کی عمارت کھنڈر ہو گئی ہے۔

عظیم اللہ خاں کے بیٹے بھی تھے۔ لیکن وہ بسولی منتقل ہو گئے تھے۔ ایک روایت کے مطابق عظیم اللہ خاں کی میت بھی بسولی لیجا کر نواب دوندے خاں کے مقبرہ میں دفن کی گئی تھی۔

تاریخ حافظ رحمت خانی کا وہ نسخہ جو اب لندن میں ہے وہ عظیم اللہ خاں کے کتب خانہ میں تو پہنچ گیا تھا اس کے بعد نہ معلوم ان کی بیٹی کے پاس رہا یا ان کے بیٹوں کے پاس بسولی میں تھا۔ بہر حال ۱۸۶۴ء میں اس کی نقل مرزا اسمٰعیل قندھاری نے کی جو انگلستان بھیجی گئی۔ تاریخ حافظ رحمت خانی کے ترقیمہ کے نیچے اسکا ذکر موجود ہے اصل نسخہ کا پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں گیا۔ عظیم اللہ خاں کی اولاد کے حالات مالی اعتبار سے خراب ہو گئے تھے۔ انھوں نے بسولی کی جائیداد صاحبزادہ حیدر علی خاں ولد نواب یوسف علی خاں کے ہاتھ فروخت کر دی تھی جو صاحبزادہ حیدر علی خاں کی اولاد کے پاس خاتمہ زمینداری تک رہی۔

پیر معظم شاہ کے والد کا نام پیر محمد فاضل تھا جو موضع پیر سباک تحصیل نوشہرہ تعلقہ پشاور کے باشندے تھے۔

شاہ حافظ الملک کی شہادت کے بعد عظیم اللہ خاں کی ملازمت میں داخل ہو گئے تھے۔ اور تاریخ حافظ رحمت خانی
عظیم اللہ خاں کے کتب خانہ میں تھی اس کا ذکر تاریخ حافظ رحمت خانی کے ترقیمہ میں موجود ہے۔ اس کی نقل جو لندن
گئی تھی۔ وہاں سے پشتو اکاڈمی پشاور نے منگا کر پہلے پشتو میں اور بعد ازاں اس کا اردو ترجمہ مع حواشی کے شائع
۔ یہ حواشی روشن خاں آف نواکلی کے لکھے ہوئے ہیں اور کافی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔

حافظ الملک حافظ رحمت خاں کو فرصت کے اوقات ۱۷۶۱ء کی جنگ پانی پت کے بعد ملے ہیں۔ اگرچہ
۱۷ء تک وہ شجاع الدولہ اور انگریزوں کی جنگوں میں کسی نہ کسی صورت سے مصروف رہے صرف ۱۷۶۵ء سے
ء تک ان کو اطمینان کے ساتھ حکومت کرنے کا موقعہ ملا۔ اس عرصہ میں انھوں نے تاریخ حافظ رحمت خانی کی تلخیص
ئی اور اس عرصہ میں انھوں نے پیلی بھیت کی شہر پناہ اور جامع مسجد تیار کرائی۔ اور اسی زمانہ میں انھوں نے
ۃ الانساب کی تالیف کرائی ہو گی کیوں کہ خلاصۃ الانساب میں جنگ پانی پت کا ذکر موجود ہے جو ۱۷۶۱ء میں ہوئی
ا اور واقعہ جنگ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ وہ قریب کے زمانہ میں ہوا ہو۔ اور کسی جنگ کا ذکر نہیں ہے۔ اسی لیے
اصۃ الانساب ۱۷۶۱ء کے بعد وجود میں آئی ہے۔ پیر معظم شاہ نے قیاساً پہلے خلاصۃ الانساب کو مرتب کیا اور بعد میں
یخ حافظ رحمت خانی کی تالیف کی۔ خلاصۃ الانساب کے ص نمبر ۲۳ پر لکھا ہے کہ ضمائر اولوالالباب یہ بات پوشیدہ
یں ہے کہ کوٹہ بابا کا نام شیخ شہاب الدین تھا اور وہ پٹھانوں کے ترین قبیلہ کی ذیلی شاخ بدلزئی سے تعلق رکھتے تھے
ن ص ۱۳۱ پر ان کا نام شیخ شہاب الدین سہروردی لکھا ہوا ملتا ہے۔ یہ سہروردی کا اضافہ اگر کاتب کی غلطی نہیں
تو اس کی وضاحت ممکن نہیں۔

نجم الغنی خاں نے اخبار الصنادید میں لکھا ہے کہ کوٹہ بابا کے مزار کو جو چھچھ ہزارہ کے موضع شاہی دیر میں ہے بعض
ماں غلطی سے شیخ شہاب الدین سہروردی کا مزار سمجھتے ہیں یہ علاقہ چھچھ ہزارہ راولپنڈی کے قریب دریائے سندھ
مشرق میں ہے اور پنجاب کے صوبہ میں شامل ہے لیکن اس میں پٹھانوں کے متعدد خاندان آباد ہیں۔ اگرچہ یہ
ے اب پشتو زبان تقریباً بھول گئے ہیں اور پنجابی بولتے ہیں لیکن نسباً پٹھان ہیں۔

خلاصۃ الانساب کے ص ۲۶-۲۷ پر حافظ الملک سے منسوب یہ عبارت بھی ملتی ہے کہ ہندستان کے کچھ
رگ جو حافظ الملک سے شفقت اور محبت رکھتے تھے۔ وہ یہ دریافت کیا کرتے تھے کہ یہ شیخ شہاب الدین
ن بزرگ ہیں جو ہر مشکل کے وقت پر تمہاری امداد کرتے ہیں ہم لوگ تو انھیں شیخ شہاب الدین سہروردی سمجھتے تھے
ن وہ شیخ شہاب الدین سہروردی نہیں بلکہ تمہارے اجداد میں سے ہیں۔ بعض لوگ اس کا نام غلطی سے شیخ کوٹکی

وغیرہ لیتے تھے تب حافظ الملک نے انھیں بتایا کہ وہ شیخ شہاب الدین ان کے پردادا تھے اور ان کا تعلق دگر دہ انھیں سے منسوب ہے جو کوٹہ خیل کہلاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان انساب کو مرتب کرانے کا مقصد ذیلی طور پر گو یوں کی غلط فہمی دور کرانا بھی ہو۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ غلط فہمی کیوں تھی۔ حافظ الملک کے والد اور چچا بقول ہملٹن مصنف روہیلہ افغان ۱۷۷۷ء نسخہ مملوکہ خدا بخش لائبریری مطبوعہ ۱۷۸۷ء اور بقول شیو پرشاد مصنف فیض بخش عرف فرح بخش ۱۷۷۶ء کے ۱۷۲۳ء میں کٹھیر میں آئے تھے۔ خلاصۃ الانساب میں بھی ان کے آنے کا ذکر موجود ہے اگرچہ سال کا اندراج نہیں ہے۔ واپسی کا ذکر ہملٹن نے کیا ہے نہ شیو پرشاد نے کیا اور نہ خلاصۃ الانساب میں موجود ہے۔ لیکن حافظ الملک کے فرزند مستجاب خاں کی گلستان رحمت مصنفہ ۱۷۹۰ء اور اس کی تلخیص گل رحمت مصنفہ سعادت یار خاں ۱۸۳۳ء سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی وقت کم سے کم شاہ عالم خاں ضرور تورڈ شہامت پور واپس چلے گئے تھے کیوں کہ ۱۷۰۰ء سے چند سال قبل جب داؤد خاں یہاں آئے تو اس وقت ان دونوں تاریخوں نے شاہ عالم خاں کی موجودگی تورد شہامت پور میں تحریر کی ہے۔ داؤد خاں کے ساتھ ملک شادی خاں اور پائندہ خاں آئے تھے وہ ابتدا سے ہی ان کے ساتھ رہے تھے۔ اور داؤد خاں کی موت تک ساتھ رہے۔ بعد میں انھوں نے ہی علی محمد خاں کو داؤد خاں کا جانشین بنایا تھا۔ اسی وقت دوندے خاں بھی اس گروہ میں شامل ہو چکے تھے جو داؤد خاں کا تھا۔ اور علی محمد خاں کی جانشینی میں وہ بھی شریک تھے۔ داؤد خاں کا قتل ۱۷۲۹ء میں ہوا۔ اور حافظ الملک ۱۷۳۰ء میں علی محمد خاں کے پاس آنولہ میں آئے۔ منونہ متصل آنولہ میں نواب علی محمد خاں کی جو جنگ خواجہ سرا محمد صالح سے ہوئی جس کو نواب امیر خاں انجام منصب دار بادشاہ دہلی نے اپنی جاگیر کے مواضعات سے علی محمد خاں کو بیدخل کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ اس میں حافظ الملک شریک ہوئے تھے۔ ۱۷۳۲ء تک وہ کٹھیر میں رہے اور پھر واپس شادی کرنے کی غرض سے چلے گئے ۱۷۳۷ء میں جب نواب علی محمد خاں نے جانسٹھ کے نواب سیف الدین خاں پر فتح پائی۔ اور نوابی کا خطاب حاصل کیا اس کے بعد ۱۷۳۸ء میں حافظ الملک دوبارہ کٹھیر (روہیل کھنڈ) میں آئے اور مستقل قیام کر لیا۔

۱۷۶۱ء تک جس کے بعد خلاصۃ الانساب لکھی گئی ہے اس خاندان کا تعلق کٹھیر سے نوے سال پرانا ہو چکا تھا۔ اور اس وقت کوٹہ بابا کی بیشتر اولاد روہیل کھنڈ میں موجود تھی۔ نوابوں اور حکمرانوں کے نسب کی یادداشت کچھ نہ کچھ ہر ایک کو ہوتی ہے۔ ہزاروں آدمی قبائل افغانہ کے روہیل کھنڈ میں موجود تھے۔ کیا ان سے حافظ الملک کا نسب چھپا ہوا تھا۔ آخر وہ کون بزرگان دین تھے۔ پیر علی بابا ترمذی کی اولاد تو ہو نہیں سکتی۔ وہ تو دو علاقہ یوسف زئی سے آئے تھے اور ہر ایک روہیلہ سردار کے نسب سے واقفیت رکھتے تھے۔ تاریخ میں ایک نام شاہ مدن کا ملتا ہے جن کے روہیلوں اور

پیر معظم شاہ حافظ الملک کی شہادت کے بعد عظیم اللہ خاں کی ملازمت میں داخل ہو گئے تھے۔ اور تاریخ حافظ رحمت خانی بھی عظیم اللہ خاں کے کتب خانہ میں تھی اس کا ذکر تاریخ حافظ رحمت خانی کے ترقیمہ میں موجود ہے۔ اس کی نقل جو لندن پہنچ گئی تھی۔ وہاں سے پشتو اکادمی پشاور نے منگا کر پہلے پشتو میں اور بعد ازاں اس کا اردو ترجمہ معہ حواشی کے شائع کیا۔ یہ حواشی روشن خاں آف نواکلی کے لکھے ہوئے ہیں اور کافی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔

حافظ الملک حافظ رحمت خاں کو فرصت کے اوقات ۱۷۶۱ء کی جنگ پانی پت کے بعد ملے ہیں۔ اگرچہ ۱۷۶۵ء تک وہ شجاع الدولہ اور انگریزوں کی جنگوں میں کسی نہ کسی صورت سے مصروف رہے صرف ۱۷۶۵ء سے ۱۷۷۰ء تک ان کو اطمینان کے ساتھ حکومت کرنے کا موقعہ ملا۔ اس عرصہ میں انھوں نے تاریخ حافظ رحمت خانی کی تلخیص کرائی اور اسی عرصہ میں انھوں نے پیلی بھیت کی شہر پناہ اور جامع مسجد تیار کرائی۔ اور اسی زمانہ میں انھوں نے خلاصۃ الانساب کی تالیف کرائی ہوگی کیوں کہ خلاصۃ الانساب میں جنگ پانی پت کا ذکر موجود ہے جو ۱۷۶۱ء میں ہوئی تھی اور واقعہ جنگ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ وہ قریب کے زمانہ میں ہوا ہو۔ اور کسی جنگ کا ذکر نہیں ہے۔ اسی لیے خلاصۃ الانساب ۱۷۶۱ء کے بعد وجود میں آئی ہے۔ پیر معظم شاہ نے قیاساً پہلے خلاصۃ الانساب کو مرتب کیا اور بعد میں تاریخ حافظ رحمت خانی کی تالیف کی۔ خلاصۃ الانساب کے ص نمبر ۲۳ پر لکھا ہے کہ ضمائر اولوالالباب یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ کوٹلہ بابا کا نام شیخ شہاب الدین تھا اور وہ پٹھانوں کے ترین قبیلہ کی ذیلی شاخ بدلزئی سے تعلق رکھتے تھے لیکن ص ۱۳۱ پران کا نام شیخ شہاب الدین سہروردی لکھا ہوا ملتا ہے۔ یہ سہروردی کا اضافہ اگر کاتب کی غلطی نہیں ہے تو اس کی وضاحت ممکن نہیں۔

نجم الغنی خاں نے اخبار الصنادید میں لکھا ہے کہ کوٹلہ بابا کے مزار کو جو چھچھ ہزارہ کے موضع شاہی دیر میں ہے بعض پٹھان غلطی سے شیخ شہاب الدین سہروردی کا مزار سمجھتے ہیں یہ علاقہ چھچھ ہزارہ راولپنڈی کے قریب دریائے سندھ کے مشرق میں ہے اور پنجاب کے صوبہ میں شامل ہے۔ لیکن اس میں پٹھانوں کے متعدد خاندان آباد ہیں۔ اگرچہ یہ لوگ اب پشتو زبان تقریباً بھول گئے ہیں اور پنجابی بولتے ہیں لیکن نسباً پٹھان ہیں۔

خلاصۃ الانساب کے ص ۶-۲۷ پر حافظ الملک سے منسوب یہ عبارت بھی ملتی ہے کہ ہندستان کے کچھ بزرگ جو حافظ الملک سے شفقت اور محبت رکھتے تھے۔ وہ یہ دریافت کیا کرتے تھے کہ یہ شیخ شہاب الدین کون بزرگ ہیں جو ہر مشکل کے وقت پر تمہاری امداد کرتے ہیں ہم لوگ تو انھیں شیخ شہاب الدین سہروردی سمجھتے تھے لیکن وہ شیخ شہاب الدین سہروردی نہیں بلکہ تمہارے اجداد میں سے ہیں۔ بعض لوگ اس کا نام غلطی سے شیخ کوٹلی

وغیرہ لیتے تھے، تب حافظ الملک نے انھیں بتایا کہ وہ شیخ شہاب الدین ان کے پردادا تھے اور ان کا خیل وگروہ انھیں سے منسوب ہے جو کوڑہ خیل کہلاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان انساب کو مرتب کرانے کا مقصد ذیلی طور پر لوگوں کی غلط فہمی دور کرانا بھی ہو۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ غلط فہمی کیوں تھی۔ حافظ الملک کے والد اور چچا بقول ہملٹن مُصنف روہیلہ افغان ۱۷۷۷ء نسخہ ٹلوک خدا بخش لائبریری مطبوعہ ۱۷۸۷ء اور بقول شیو پرشاد مصنف فیض بخش عرف فرح بخش ۱۷۷۶ء کے ۱۷۲۳ء میں کٹھیر میں آئے تھے۔ خلاصۃ الانساب میں بھی ان کے آنے کا ذکر موجود ہے اگرچہ سال کا اندراج نہیں ہے۔ واپسی کا ذکر ہملٹن نے کیا ہے نہ شیو پرشاد نے کیا اور نہ خلاصۃ الانساب میں موجود ہے۔ لیکن حافظ الملک کے فرزند مستجاب خاں کی گلستان رحمت مصنفہ ۱۷۹۵ء اور اس کی تلخیص گل رحمت مصنفہ سعادت یار خاں ۱۸۳۳ء سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی وقت کم سے کم شاہ عالم خاں ضرور تور وشہامت پور واپس چلے گئے تھے کیوں کہ ۱۷۰۷ء سے چند سال قبل جب داؤد خاں یہاں آئے تو اس وقت ان دونوں تاریخوں نے شاہ عالم خاں کی موجودگی تور وشہامت پور میں تحریر کی ہے۔ داؤد خاں کے ساتھ ملک شادی خاں اور پائندہ خاں آئے تھے وہ ابتدا سے ہی ان کے ساتھ رہے تھے۔ اور داؤد خاں کی موت تک ساتھ رہے۔ بعد میں انھوں نے ہی علی محمد خاں کو داؤد خاں کا جانشین بنایا تھا۔ اسی وقت ڈونڈے خاں بھی اس گروہ میں شامل ہو چکے تھے جو داؤد خاں کا تھا۔ اور علی محمد خاں کی جانشینی میں وہ بھی شریک تھے۔ داؤد خاں کا قتل ۱۷۲۹ء میں ہوا۔ اور حافظ الملک ۱۷۳۰ء میں علی محمد خاں کے پاس آنولہ میں آئے۔ منونہ متصل آنولہ میں نواب علی محمد خاں کی جو جنگ خواجہ سراحمد صالح سے ہوئی جس کو نواب امیر خاں انجام منصب دار بادشاہ دہلی نے اپنی جاگیر کے مواضعات سے علی محمد خاں کو بیدخل کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ اس میں حافظ الملک شریک ہوئے تھے۔ ۱۷۳۳ء تک وہ کٹھیر میں رہے اور پھر واپس شادی کرنے کی غرض سے چلے گئے ۱۷۳۷ء میں جب نواب علی محمد خاں نے جانسٹھ کے نواب سیف الدین خاں پر فتح پائی۔ اور نوابی کا خطاب حاصل کیا اس کے بعد ۱۷۳۸ء میں حافظ الملک دوبارہ کٹھیر (روہیل کھنڈ) میں آئے اور مستقل قیام کر لیا۔

۱۷۶۱ء تک جس کے بعد خلاصۃ الانساب لکھی گئی ہے اس خاندان کا تعلق کٹھیر سے نوے سال پرانا ہو چکا تھا۔ اور اس وقت کوڑہ بابا کی بیشتر اولاد روہیل کھنڈ میں موجود تھی۔ نوابوں اور حکمرانوں کے نسب کی یادداشت کچھ نہ کچھ ہر ایک کو ہوتی ہے۔ ہزاروں آدمی قبائل افغانہ کے روہیل کھنڈ میں موجود تھے۔ کیا ان سے حافظ الملک کا نسب چھپا ہوا تھا۔ آخر وہ کون بزرگان دین تھے۔ پیر علی بابا ترمذی کی اولاد تو ہو نہیں سکتی۔ وہ خود علاقہ یوسف زئی سے آئے تھے اور ہر ایک روہیلہ سردار کے نسب سے واقفیت رکھتے تھے۔ تاریخ میں ایک نام شاہ مدن کا ملتا ہے جن کے روہیلوں اور

نوابان اودھ دونوں سے تعلقات تھے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ہوں یا اور کوئی ہو بات صرف معلومات کی ہے یا لفظ کوٹھ بر طنز لطیف ہو۔ یا دربار لکھنؤ کی پھلجھڑی ہو، مگر پھر بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ حافظ الملک ذی علم آدمی تھے، ان کو اپنے پر دادا سے اوپر کی چند پشتوں کا ذکر نام بنام کرنا چاہیے تھا صرف قبیلہ کی ذیلی شاخوں کا ذکر کافی نہ تھا۔ اگر ان کو خیل اور گروہ کے بجائے اشخاص کا نام سمجھا جائے تو ۲۱ پشتوں میں گیارہ سو سال کا عرصہ قیس عبدالرشید تک جو رسول اللہ کے ہاتھ پر ایمان لایا تھا پہنچنا ممکن نہیں ہے۔

کوٹہ بابا کے بارے میں مزید وضاحت ص ۳۶ پر ملتی ہے۔ عنوان میں انھیں شیخ کوٹ لکھا ہے۔ اور اس کے بعد یہ تفصیل دی ہے کہ بڑیچ قبیلہ کی بدل زئی شاخ سے دو ذیلی شاخیں دولت خیل اور ملا خیل نکلیں اور پھر دولت خیل سے کوٹ خیل اور شاہ خیل نکلیں۔ چونکہ کوٹہ بابا کو عنوان میں شیخ کوٹ لکھا ہے۔ اس لیے ان کی پیدائش کوٹ خیل شاخ میں ہوئی جو دولت سے نکلی تھی۔ اور دولت خیل بدل زئی کی شاخ تھی۔ لیکن عام طور پر شیخ شہاب الدین اور ان کے خاندان کو بدل زئی کہا جاتا تھا جو داؤد خیل کے واسطے سے بڑیچ کی شاخ ہے۔ شیخ کا خطاب انھیں عبادت گذاری اور دین داری کی وجہ سے دیا گیا تھا۔ اور وہ شیخ کوٹ خیل کہلاتے تھے۔ یہ قیاس کرنا درست ہے کہ یہی کوٹ کثرت استعمال سے کوٹہ ہو گیا اور وہ شیخ کوٹہ کہلانے لگے کوٹ اردو اور ہندی میں قلعہ یا گڈھی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور پشتو میں بھی اس کا مفہوم یہی ہے۔ لنگر کوٹ جس کا ذکر خلاصۃ الانساب میں آیا ہے پختون علاقہ میں موجود ہیں۔ لیکن کوٹہ کا مفہوم پشتو میں کتا ہے۔ شیخ کوٹ بعد میں کوٹہ بابا میں تبدیل ہوگیا۔ شیخ اور بابا بزرگ کے مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں مطلب دیندار آدمی سے ہے۔ شیخ شہاب الدین کوٹہ بابا کہنے سے برا نہیں مانے اور انھوں نے اپنے کو رسول اللہ کا کتا کہنا شروع کردیا اس سے اظہار عقیدت بھی تھا اور اپنے کو منفعل کرنا بھی تھا تاکہ نفس موٹا نہ ہو۔ جیسا کہ خلاصۃ الانساب میں ہے شیخ شہاب الدین کی اولاد کوٹہ خیل کہلائی۔ لیکن وہ خود بھی کوٹ خیل تھے۔ میرے نکتہ نظر سے یہ کوٹ خیل کوٹہ خیل ہوا ہے۔ اگرچہ خلاصۃ الانساب میں حافظ الملک سے منسوب بیان اس کی وجہ اپنے کو منفعل کرنا بتاتا ہے۔ اب کوٹہ خیل کا کوئی نام نہیں لیتا ہے حافظ الملک کی اولاد حافظ خیل اور کوٹہ بابا کی دوسری اولادیں اپنے کو صرف بڑیچ کہتی ہیں اور اب بڑیچ قبیلہ کی ذیلی شاخوں کا ذکر کوئی نہیں کرتا ہے۔

خلاصۃ الانساب میں روہیل کھنڈ یا کٹھیر کا نام کہیں نہیں آیا ہے۔ صرف ترقیمہ میں کٹھیر کو کٹھر لکھا ہے وہ ترقیمہ حافظ الملک کا لکھا ہوا ہے اور نہ لکھوایا ہوا ہے۔ جس کی تفصیل قبل ازیں دی جا چکی ہے حافظ الملک کی آمد ہندستان میں لکھی ہے۔ اگرچہ ۱۷۲۱ء میں راجہ ہرنند پر فتح یاب ہونے کے بعد نواب علی محمد خاں نے کٹھیر کا نام

رکھ دیا تھا۔ جواب تک مروّج ہے۔ حافظ الملک نے توروشہامت پور اپنے پیدائشی وطن کا ذکر بھی نہیں کیا ہے۔ قدیم کا ذکر آیا تو اس کو ولایت لکھا ہے۔ توروشہامت پور کو اگر پیر معظم شاہ نے اپنی نظم میں جو تاریخ حافظ رحمت خاں کے آخر میں درج ہے حافظ الملک کا وطن نہ بنایا ہوتا تو ان کی توروشہامت پور کی سکونت بھی ایک متنازعہ مسئلہ بن گئی ہوتی۔ حواشی تاریخ حافظ رحمت خانی میں پیر روشن نے لکھا ہے کہ شیخ ملی کے قانون آبادی کے تحت توروشہامت کی آراضی کی بجائے کوٹہ بابا کی اولاد کو تحصیل صوابی میں ڈوڈھیر کا سالم موضع دیا گیا تھا اور آراضی کا اندراج بنام شیخ شہاب الدین قوم بڑیچ پٹھان ۱۸۷۰ء تک کے کاغذات بندوبست میں موجود ہے۔ حیات حافظ رحمت خاں کے جدید اڈیشن سے معلوم ہوتا ہے کہ شہامت پور اور تورو الگ الگ گاؤں ہیں لیکن آبادی ملی ہوئی ہے شہامت ندی کے سیلاب سے کٹتا رہا اور اب صرف اس کی ایک گلی اور مسجد باقی رہ گئی ہے۔ باقی پورا گاؤں ختم ہو چکا ہے آبادی ہجرت کر چکی ہے۔ زیادہ تر نئی بستی قیوم آباد میں آباد ہے لیکن حواشی تاریخ حافظ رحمت خانی کے مطابق حافظ رحمت خاں کا خاندان کافی پہلے منتقل ہو گیا تھا۔ اب بھی کچھ لوگ موضع ڈوڈھیر اور موضع یار حسین میں آباد ہیں۔ لیکن خلاصۃ الانساب میں تحریر ہے کہ کوٹہ خیل تمام کے تمام ہندستان آ گئے تھے اور ایک بھی باقی نہ رہا تھا۔ ہندستان کے کچھ لوگ واپس چلے گئے ہوں۔ خلاصۃ الانساب میں ملک روہ کا ذکر اور اس کا محل وقوع ص ۹۹ پر دیا ہے۔

ملک روہ کے شمال میں قاشقار (کاشغر چینی ترکستان کوہ قراقرم کے دوسری طرف) جنوب میں بکر (بھکر بلوچستان) مشرق میں کشمیر اور مغرب میں دریائے ہلمند (ہلمند افغانستان) بیان کی گئی ہیں۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ ہندستان کے لوگ اس علاقہ کے باشندوں کو روہیلہ کہتے ہیں۔ روہیلہ، پٹھان اور افغان ہم معنی الفاظ ہیں اصلیت یہ ہے کہ یہ پشتو بولنے والے لوگوں کا علاقہ ہے۔ جو اب پختون کہلاتے ہیں۔ اس کا کچھ حصّہ اب پاکستان میں اور کچھ حصّہ افغانستان میں ہے۔ خلاصۃ الانساب کے ص ۱۰۶ پر حافظ الملک سے منسوب یہ بیان ہندستان میں آنے کے بارے میں ملتا ہے۔

"قبلہ گاہی ابوی و اعمام بندہ از راہ قسمت آبخور ہندستان آمدہ ساکن شدہ بودند، بندہ ہم در پسِ ایشاں آمدہ طرح اقامت انداخت"

ترجمہ: "بندہ کے قبلہ گاہی والد اور چچا مقدر آب و دانہ سے ہندستان آئے اور سکونت اختیار کر لی ان بزرگ کے پیچھے بندہ بھی یہاں آگیا اور اقامت اختیار کر لی۔"

اس بیان سے شیو پرشاد اور ہملٹن کی بیان کردہ روایت درست ثابت ہوئی ہے کہ ۱۷۲۶ء میں شاہ عالم خاں (حافظ الملک کے والد) اور حسن خاں (حافظ الملک کے چچا) کٹھیر (روہیل کھنڈ) میں آئے تھے اور اس علاقہ کے

ناہی حاکموں کے یہاں غیر امتیازی قسم کی ملازمتیں کرتے رہے۔ ہملٹن اور شیو پرشاد نے ان کی واپسی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اور خلاصۃ الانساب سے بھی واپسی کا پتہ نہیں چل رہا ہے۔ بلکہ مفہوم کچھ یوں معلوم ہو رہا ہے کہ حافظ رحمت خاں کے والد اور چچا کی زندگی میں ہی یہاں آ گئے تھے۔ جو بالکل غلط ہے۔ یہ ساری غلطیاں ترجمہ کی ہیں یا کتابت میں رد و بدل کیا گیا ہے حالانکہ شاہ عالم خاں جس وقت روہیل کھنڈ میں ۱۷۱۲ء میں قتل ہوئے تھے اس وقت حافظ الملک کی عمر چار سال کی تھی۔ حافظ الملک کی شہادت ۱۱ صفر ۱۱۸۸ھ میں بعمر ۶۷ سال چند ماہ ہوئی اس لیے ان کی پیدائش ۱۱۲۰ھ میں ہوئی جو ۱۷۰۸ء کے مطابق ہے۔ گل رحمت نے ان کی عمر بروقت شہادتِ شاہ عالم خاں تین چار سال تحریر کی ہے۔ اور اخبار حسن مخطوطہ صولت لائبریری رامپور کے مطابق شاہ عالم خاں کی شہادت ۹ ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۱۲ء کو ہوئی تھی۔ یہ تمام بیانات ایک دوسرے کی تصدیق کر رہے ہیں۔ اسی لیے مندرجہ بالا اقتباس کا مفہوم صرف اس قدر قبول کرنا درست ہے کہ حافظ الملک کی روہیل کھنڈ میں آمد اس روایت کی تقلید میں ہوئی تھی جو ان کے والد اور چچا نے اس سرزمین پر قیام کر کے قائم کی تھی۔ اتنا ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ شاہ عالم خاں ایک مدت تک اس علاقہ میں فوجی ملازمت کرتے رہے اور دوران ملازمت ان کی واپسی صرف اس طرح ہوا کرتی تھی جیسے کوئی فوج کا سپاہی آج بھی چھٹیوں میں اپنے وطن کو واپس جاتا ہے۔ لیکن عمر زیادہ ہو جانے پر ملازمت چھوڑ کر وہ تور و شہامت پور میں رہنے لگے تھے۔ جس کی تصدیق گلستان رحمت سے ہوتی ہے۔ ۱۷۰۷ء سے دو تین سال قبل داؤد خاں یہاں آئے جو ۱۷۲۶ء میں قتل ہوئے۔ اس وقت ملک شادی خاں دوندے خاں اور پائندہ خاں جو کوٹہ بابا کی اولاد تھے۔ داؤد خاں کی رفاقت میں روہیل کھنڈ میں موجود تھے جنھوں نے علی محمد خاں کو داؤد خاں کا جانشین بنایا۔ ۱۷۳۰ء سے کچھ قبل ملک شادی خاں کا انتقال ہو گیا۔ تب حافظ الملک ۱۷۳۰ء میں اس علاقہ میں آئے ۱۷۳۴ء میں واپس گئے اور پھر ۱۷۳۸ء میں مستقل قیام کے لیے آ گئے۔

خلاصۃ الانساب کے ص ۱۶ پر حافظ الملک سے منسوب یہ بیان موجود ہے کہ کوٹہ خیل تمام کے تمام روہیل کھنڈ میں آ گئے تھے۔ اور ولایت میں کوئی ایک شخص بھی کوٹہ خیل میں سے باقی نہیں رہا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ حافظ الملک کی شہادت ۱۷۷۴ء میں ہو جانے کے بعد کچھ خیل واپس ولایت چلے گئے ہوں۔ کیوں کہ حافظ الملک کی ریاست ختم ہو گئی تھی اور ان کی اولاد کو بہت معمولی وظائف دیے گئے تھے۔ اور بیٹیاں بالکل ہی محروم کر دی گئی تھیں، تب عزیز و اقارب کو وظائف پانے کا کیا سوال تھا۔ ایسے خراب اور ناموزوں حالات میں اگر کچھ لوگ واپس چلے گئے ہوں تو کیا تعجب ہے۔ روہیل کھنڈ کی تاریخوں میں کوٹہ خیل افراد کے چند نام ہی آئے ہیں۔ اس لیے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ کچھ

لوگ واپس چلے گئے تھے اور اب وہ پیر روشن خاں مصنف حواشی تاریخ حافظ رحمت خاں کے مطابق موضع ڈوڈ
اور موضع یار حسین تحصیل صوابی ضلع مردان میں سکونت رکھتے ہیں۔ اور مالکان دیہہ ہیں۔ پیر روشن خاں کے قول کے
کوٹہ بابا کے بیٹے آدم خاں کے پوتے شیخ علی حسین خاں کی اولاد موضع یار حسین میں آباد ہے۔

کوٹہ بابا کے مختصر حالات خلاصۃ الانساب میں موجود ہیں۔ مثلاً ان کا وطن شوراوک پشین متصل قندھ
لیکن وہاں چند خاندان ہی باقی رہ گئے تھے۔ کیونکہ بیشتر بڑیچ قبائل یوسف زئیوں کے ساتھ افغانستان سے منتقل
وادی سوات باجوڑ سمہ (مردان) چملہ بونیر اٹک لنگر کوٹ اور ہزارہ کے علاقہ میں آباد ہو گئے تھے۔

شیخ شہاب الدین کی آمد قندھار سے اٹک لنگر کوٹ میں ہوئی۔ جہاں کچھ بڑیچ قبائل یوسف زئیوں کی
سکونت رکھتے تھے۔ اغلباً یہ آمد ۱۶۲۲ء میں ہوئی جبکہ شاہ ایران نے قندھار پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور مغل حکومت اس کو واپس لینے
لیے جنگ کر رہی تھی۔ ان حالات میں کوٹہ بابا نے وطن چھوڑنا ہی مناسب سمجھا ہوگا۔

اٹک لنگر کوٹ میں آکر انھوں نے شادی کی پہلی بیوی سے پائی نام کا فرزند پیدا ہوا۔ پھر دوسری شادی کی ا
سے محمد خاں عرف موتی بابا اور آدم دو فرزند پیدا ہوئے محمد خاں عرف موتی بابا کے فرزند شاہ عالم خاں ہوئے جو حافظ الملک کے والد
خلاصۃ الانساب میں کوٹہ بابا کے اٹک لنگر کوٹ سے تورو شہامت پور ضلع مردان جانے کا کوئی ذکر موجود نہا
ہے۔ نہ ان کی اولاد کے تورو شہامت پور جانے کا ذکر ہے لیکن تورو شہامت پور میں ایک آراضی ان کے نام پر لکھی ہو
تھی جو بعد میں موضع ڈوڈھیر میں منتقل ہوئی۔ ڈوڈھیر تحصیل صوابی ضلع مردان میں ہے۔ ۱۸۷۰ء کے کاغذات بندوبست
میں یہ آراضی بنام شیخ شہاب الدین قوم بڑیچ افغان درج ہے اس کا ذکر تاریخ حافظ رحمت خاں کے ص ۴۲ پر موجود
ہے اور اب بھی ان کی اس اولاد کے قبضہ میں ہے جو ڈوڈھیر میں آباد ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد کوٹہ بابا سلسلہ عالیہ قادریہ میں بیعت ہوئے۔ مرشد کے نام کا ذکر خلاصۃ الانساب میں
نہیں ہے۔ قیاساً اخوند درویزہ بابا سے بیعت ہوئے ہوں گے۔ درویزہ بابا کا وصال ۱۶۳۸ء میں بعمر ایکسو آٹھ
سال بحساب سال ہجری ہوا۔ آخری عمر میں مجذوب ہو گئے تھے۔ اس کا اظہار ان کی تصویر سے بھی ہوتا ہے جو حیات
حافظ رحمت خاں میں شائع ہوئی ہے۔ حالت جذب میں وہ جنگل کو نکل جاتے اور مسلسل ریاضتیں کرتے رہتے تھے
مہینوں گھر کو نہیں آتے تھے۔ اسی صحرا نوردی کی حالت میں ان کا انتقال پنج ہزارہ کے موضع شاہی دیر میں ہوا۔ اسی
جگہ مدفین ہوئی۔ یہ علاقہ پاکستان کے صوبہ سرحد سے باہر پنجاب کی حدود میں راولپنڈی کے قریب ہے۔ وفات کے
وقت اولاد میں سے کسی کے ہونے کا امکان دکھائی نہیں دیتا۔ خلاصۃ الانساب میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ محمد خاں عرف موتی با

ابن کوٹہ بابا کے چار بیٹے ہوئے جس میں شاہ عالم خاں حافظ الملک کے والد تھے۔ خلاصۃ الانساب میں کوٹہ بابا کی اولاد کی قرابت اور رشتہ داری کمال زئی سندر خیل میں ہونا تحریر ہے۔ اس لیے حافظ الملک کی دادی یا والدہ یا دونوں کمال زئی قبیلہ کی ہو سکتی ہیں۔ شاہ عالم خاں کی اولاد کے بارے میں مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے۔

"از شاہ عالم ابن موتی بدون فقیر پر تقصیر امیدوار مغفرت حافظ رحمت نام فرزندان سعادتمندان نصیب شدہ، اللہ تعالیٰ ایشاں را از عمر و جوانی خود برخوردار داشتہ بسعادت جاودانی مقرون سازند"

اس عبارت کے پہلے فقرہ کا ترجمہ نجم الغنی خاں نے اخبار الصنادید کے ایڈیشن ۱۹۱۶ء مطبوعہ ۱۹۱۸ء کے ص ۵۷ پر یہ دیا ہے کہ شاہ عالم خاں شہید بن موتی خاں سے بجز میرے (حافظ رحمت خاں) کوئی اور فرزند باقی نہ رہا۔ لیکن اس کے بعد کے ایڈیشن میں یہ اضافہ بھی ملتا ہے کہ "نہ کوئی اس کی اولاد باقی رہی" لیکن یہ انتہائی بے معنی فقرہ ہے۔ جب بیٹا ہی نہ تھا تو اولاد ہونے کا کیا سوال ہے۔ نجم الغنی خاں نے نہ داؤد خاں کو شاہ عالم خاں کا فرزند مانا ہے اور نہ علی محمد خاں کو داؤد خاں کا بیٹا کہا ہے۔ جبکہ ۱۷۷۶ء میں شیو پرشاد نے فیض بخش میں جس کا تاریخی نام فرح بخش بھی ہے اور چارلس ہملٹن نے روہیلا افغان مصنفہ ۱۷۷۶ء کے صفحات ۴۲۔۴۵ نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں صاف صاف تحریر کیا ہے کہ داؤد خاں شاہ عالم کے بیٹے اور علی محمد خاں، داؤد خاں کے بیٹے تھے۔ علی محمد خاں کے سلسلہ میں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ رامپور کے نوابین ۱۸۴۰ء کے لگ بھگ نواب محمد سعید خاں میں اپنا نسب سادات بارہ سے جوڑ چکے تھے۔ جس کی وجہ سے تشیع اختیار کرنا تھی لیکن داؤد خاں کو تو وہ ۱۹۱۱ء تک شاہ عالم خاں کا بیٹا ہی کہتے رہے۔ جیسا کہ امیر مینائی کے تذکرہ انتخاب یادگار کے ص ۱۰ پر لکھا گیا ہے۔ انتخاب یادگار مطبوعہ ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۰ء کی تصنیف ہے۔ ۱۹۱۱ء میں ——— اسٹیٹ گزیٹر رامپور جس کی ٹائپ کی ہوئی نقل رضا لائبریری میں موجود ہے۔ داؤد خاں کو شاہ عالم خاں کا بیٹا لکھا گیا ہے۔ لیکن اس کے تین چار سال بعد نجم الغنی خاں نے اخبار الصنادید میں ان دونوں باتوں سے انکار کر دیا۔ لیکن اخبار الصنادید کے ص ۶۰ ایڈیشن ۱۹۱۶ء مطبوعہ ۱۹۱۸ء میں بزبانی روایت مرتضیٰ خاں نبیرہ ملک شادی خاں لکھا ہے کہ داؤد خاں کوٹہ بابا کے خاندان کے تھے۔ اس روایت میں یہ بھی شامل ہے کہ شاہ عالم خاں کے کئی بیٹے پیدا ہوئے۔ لیکن حافظ الملک کے علاوہ سب مر گئے۔ میرے نکتہ نظر سے مذکورہ بالا اقتباس کا یہ ترجمہ درست ہے۔

"شاہ عالم خاں ابن موتی خاں کو اس امیدوار مغفرت حافظ رحمت کے علاوہ فرزندان سعادتمند نصیب نہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس فرزند کو عمر و جوانی کے ساتھ سعادتمندی بھی عطا کی ہے۔"

اس اقتباس کے پہلے جملہ سے واضح ہوتا ہے کہ شاہ عالم خاں کو حافظ الملک کے علاوہ سعادتمند بیٹے نصیب نہ ہوئے

اس لیے غیر سعادتمندوں کے لیے گنجائش موجود ہے۔ دوسرے جملہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حافظ الملک کے علاوہ اور کسی بیٹے کو علاوہ حافظ الملک کے جوانی اور عمر ضعیفی کے ساتھ سعادتمندی کی دولت نہیں ملی۔

حافظ الملک، شاہ عالم خاں کی تنہا اولاد نہ تھے۔ ان کی دو بہنوں اور ان بہنوں کی اولاد کا ذکر گلستان رحمت اور گل رحمت میں موجود ہے۔ بعض تاریخوں میں یہ بھی درج ہے کہ شاہ عالم کی اولادیں زیادہ تر بچپن میں مر گئیں۔ نجم الغنی خاں نے بھی اخبار الصنادید ایڈیشن ۱۹۱۶ء مطبوعہ ۱۹۱۸ء کے ص ۶۰ پر یہی بات لکھی ہے کہ داؤد خاں جب تورد شہامت پور میں تھے تو شاہ عالم خاں کی اولاد کے ساتھ محبت اور شفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔ یہ حافظ الملک اور ان کی بہنوں کے پیدا ہونے سے قبل کی بات ہے۔

ان سب باتوں کا مطلب صرف اتنا سمجھنا چاہیے کہ شاہ عالم خاں کے بیٹے تو ہوئے لیکن وہ جوانی تک نہیں پہنچے اور جو ایک جوان ہوا اس کو عمر طبعی اور سعادتمندی نصیب نہ ہوئی۔ ۱۷۶۱ء کے بعد جس وقت یہ عبارت لکھی گئی ہے تو واقعی طور پر حافظ الملک کے علاوہ شاہ عالم خاں کا کوئی بیٹا موجود نہ تھا۔ داؤد خاں کا قتل ۱۷۴۶ء میں ہو چکا تھا۔ لیکن اتنا ضرور ماننا پڑے گا کہ حافظ الملک کی والدہ اور داؤد خاں کی والدہ الگ الگ ہستیاں تھیں کیونکہ داؤد خاں اور حافظ الملک کی عمر میں کم سے کم ۳۰ سال کا فرق تھا۔ ۱۱۰۸ھ میں جب حافظ الملک پیدا ہوئے ہیں اس وقت داؤد خاں کو کٹھیر آئے ہوئے کئی سال ہو چکے تھے۔ وہ پٹھانوں کے ایک جتھے کے سردار تھے جس میں ملک شادی خاں، پائندہ خاں، بخشی سردار خاں کمال زئی، صدر خاں کمال زئی شامل تھے۔ اور افغانوں کا یہ جتھہ پورے کٹھیر میں تہلکہ مچائے ہوئے تھا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۰ سال سے کم نہیں مانی جا سکتی ہے۔

اب سوال صرف سعادتمند ہونے کا باقی ہے۔ گلستان رحمت اور گل رحمت تو داؤد خاں کو وفادار غلام بھی کہنے کے لیے تیار نہیں ہیں، سعادتمند بیٹا کہنا تو دور کی بات ہے۔ ان دونوں تاریخوں نے شاہ عالم خاں کے قتل کی ذمہ داری بھی داؤد خاں پر ڈالی ہے۔ لیکن اخبار حسن مصنفہ حسن رضا خاں نبیرہ حافظ الملک کا جو نسخہ صولت لائبریری رامپور میں ہے وہ ان کو قتل کے الزام سے بری کرتا ہے۔

خلاصۃ الانساب میں شاہ عالم خاں کے قتل کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ کسی جگہ شاہ عالم خاں کے نام آگے شہید تک بھی نہیں لکھا ہے۔ اور نہ داؤد خاں کا نام کسی جگہ آیا ہے۔

اس لیے ان کی سعادتمندی پر اگر کوئی حرف آتا ہے تو وہ یہی ہے کہ وہ کٹھیر میں شاہ عالم خاں کی مرضی کے خلاف آئے تھے۔ اور یہاں انھوں نے کچھ ایسے کام کیے جو شاہ عالم خاں جیسے نیک آدمی کو ناپسند تھے۔ داؤد خاں

کا نام بعض تاریخوں میں دیہات پر شبخون مارنے میں بھی آیا ہے۔ جس کو شب خون کہا گیا ہے اس کو آج کی اصطلاح میں ڈاکہ کہا جاتا ہے۔ رہزنی کا واقعہ بھی ان سے منسوب ہے۔ اس وجہ سے ان کی سعادتمندی میں شبہ ہونا لازمی ہے۔ کیوں کہ یہ عمل شاہ عالم خاں کے لیے باعث کبیدگی تھا۔

خلاصۃ الانساب میں علی محمد خاں کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے۔ اگرچہ حافظ الملک ان سے انتہائی عقیدت رکھتے تھے۔ ان کے مرنے کے بعد حافظ الملک نے ایک بڑا عالیشان مقبرہ ان کی قبر پر بنوایا جو آج بھی موجود ہے۔ جب کہ اپنے والد کی صرف قبر کی تعمیر کرائی۔ اس ٹوٹی پھوٹی قبر کی تصویر حیات حافظ رحمت خاں میں موجود ہے۔ اور والدہ کی قبر کی تو کسی کو شناخت بھی نہیں ہو سکی کہ کہاں ہے۔ ان کا انتقال اور تدفین بیلی بھیت میں ہوئی تھی۔ ۱۷۷۴ء کی جنگ میں روانہ ہونے سے پہلے حافظ الملک آنولہ میں نواب علی محمد خاں کی قبر پر پہنچے فاتحہ پڑھ کر وہاں جہاد کا علم کھڑا کیا تھا۔ حافظ الملک اور نواب علی محمد خاں میں جس قدر قریبی تعلق نظر آتا ہے اس کے باوجود خلاصۃ الانساب میں ان کا ذکر کیا نام بھی نہیں آیا۔ میرے خیال میں یہ عبارتیں خلاصۃ الانساب سے فارسی میں ترجمہ کے وقت یا بروقت نقل نکال دی گئیں۔ انساب اپنی اولاد کے لیے لکھا ہے کہ وہ رشتہ داروں کو پہچانے اور رشتہ دار ان کو پہچانیں۔ لیکن اپنی اولاد کے نام تک تحریر نہیں کیے۔ یہ حیرت کی بات ہے۔ اگرچہ جس وقت یہ انساب لکھا گیا ہے اس وقت ان کی تمام اولادیں زندہ و سلامت موجود تھیں۔ اسی طرح اور بھی بہت سی کمیاں اس کے اندر موجود ہیں، حافظ الملک کے وطن تور و شہامت پور کا نام نہیں ہے۔ روہیل کھنڈ اور کٹھیر کا نام نہیں ہے۔ محمود خاں اور موتی بابا کا کوئی حال نہیں لکھا گیا ہے۔ شاہ عالم خاں کی شہادت تک کا ذکر نہیں ہے۔ داؤد خاں، نواب علی محمد خاں اور ان کے بیٹوں کے نام تک نہیں ہے۔ بخشی سردار خاں، صدر خاں، فتح خاں، شیخ کبیر خاں، جیسے سرداروں کا کہیں نام ہے اور نہ نسب کا تذکرہ ہے۔ احمد شاہ ابدالی کے علاوہ نہ بادشاہ دہلی کا نام ہے نہ شجاع الدولہ والی اودھ کا نام ہے نہ نجیب الدولہ والی نجیب آباد کا نام ہے نہ احمد خاں بنگش والی فرخ آباد کا نام ہے۔ کسی جنگ کا ذکر نہیں ہے صرف ۱۷۶۱ء کی جنگ پانی پت کا ذکر ہے۔ کچھ بزرگان دین کے نام ضرور موجود ہیں۔ اُن میں آخری نام آدم بنوریؒ کا ہے جو عہد جہانگیری میں گذرے ہیں۔ باقی ان سے قبل کے بزرگوں کے نام ہیں۔ یہ سب نام اخوند درویزہ بابا کے تذکرہ سے لیے گئے ہوں گے جس کو کوٹہ بابا نے خلاصۃ الانساب میں درج کیا ہوگا۔ جس شخص سے حافظ الملک نے اسی کو مرتب کرایا اس کا نام بھی موجود نہیں ہے۔ قیاساً یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ کام پیر معظم شاہ نے ہی کیا ہوگا۔ جنھوں نے تاریخ حافظ رحمت خانی مرتب کی تھی جو خواجہ ملی کی تصنیف تھی۔ جس طرح وہ نظم آمیز پشتو میں لکھی گئی یہ انساب بھی اسی زبان میں لکھا گیا ہوگا۔ بعد میں اس کا ترجمہ سلیس فارسی میں ہوا جس کا مترجم نامعلوم ہے

تحریر میں پشتو کے اثرات جھلکتے ہیں اور پشتو کے عظیم شاعر خوشحال خان خٹک کے اشعار بھی موجود ہیں۔ لیکن کوئی ترجمہ بھی ہوبہو نہیں ہوتا۔ عبارتوں کے مفہوم میں فرق ضرور پڑجاتا ہے۔ ایسا اس میں بھی ہوا ہے۔ جو کمیاں موجود ہیں وہ یا تو ترجمہ کے وقت ہیں اور یا پھر ۱۸۸۱ء میں نقل کے دوران بیکار سمجھ کر چھوڑ دی گئی ہیں۔ جب تک وہ اصل پشتو نسخہ نہ ملے جو حافظ الملک نے مرتب کرایا تھا اسوقت تک اس فارسی نقل پر ایک حد تک ہی اعتبار کیا جاسکتا ہے جسکی تصدیق دوسرے دستاویزی ذرائع سے ہوتی ہو۔ کیونکہ پہلا مرتب کا نام معلوم ہے نہ مترجم کا نام معلوم ہے کہ اصل نسخہ کس کے پاس تھا۔ نقل کس نے کروائی تھی۔ انتہائی غلطایات یہ ہوئی ہے کہ اصل ترقیمہ بھی ہٹادیا گیا ہے۔ اور جس شخص نے ترقیمہ لگایا ہے اس نے تصنیف کو پڑھا ہی نہ تھا۔ لیکن ان باتوں کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ یہ کل کا کل قابل اعتبار نہیں ہے۔ مختصر بات یہ ہے کہ کوٹہ بابا نے اخوند درویزہ بابا کے تذکرۃ الابرار والاشرار کے مضامین سے افغانوں کے نسب کے بارے میں اور پیر روشن (بایزید انصاری) کی بدعتوں سے محفوظ رہنے کے لیے خلاصۃ الانساب اور رد الروافض نام کے دو رسالے اخذ کر کے مرتب کیے تھے۔ ان دونوں کا مشترکہ نام خلاصۃ الانساب ہی تھا۔ اور یہ پشتو زبان میں لکھے گئے تھے تاکہ فارسی جاننے والے بھی اس سے استفادہ کرسکیں۔ حافظ الملک حافظ رحمت خان کو ۱۷۶۱ء کے بعد قریب اور ۱۷۶۵ء تا ۱۷۷۰ء مکمل فراغت اور اطمینان کے ساتھ حکومت کرنیکا موقع ملا۔ اسی زمانہ میں حافظ الملک نے خان بکوکی بابا اغافنہ کو پیر معظم شاہ ساکن موضع پیر سباک تحصیل نوشہرہ تعلقہ پشاور سے فارسی آمیز پشتو میں تاریخ حافظ رحمت خانی کے نام سے تلخیص کرائی جو ۱۷۶۷ء میں انجام پائی۔ یہ یوسف زئی پٹھانوں کی افغانستان سے نکل کر سوات اور باجوڑ میں آباد ہونے کی تاریخ ہے انکے ساتھ کچھ بڑیچ قبائل بھی آئے تھے جو حافظ الملک کا قبیلہ ہے۔ اسمیں حافظ الملک کا خاندان نہ تھا۔ وہ بعد میں آیا۔ قیاساً حافظ الملک کا ایما سے خلاصۃ الانساب بھی پیر معظم شاہ نے فارسی آمیز پشتو میں مرتب کی انکے پیش نظر کوٹہ بابا کا مسودہ تھا۔ لیکن ترتیب کے دوران انھوں نے اخوند درویزہ بابا کے تذکرہ اور تاریخ شیر شاہی و تاریخ خان جہانی اور خوشحال خان خٹک کے دیوان کو بھی پیش نظر رکھا۔ جہاں سے مضامین کوٹہ بابا نے حاصل کیے تھے۔ کوٹہ بابا کی اولاد کا حال انھوں نے حافظ الملک کی معلومات سے لکھا۔ اور جگہ جگہ حافظ الملک کی زبانی بیانات بھی درج کیے۔ جس کی وجہ سے یہ تصنیف حافظ الملک کی سمجھ لی گئی۔ جبکہ اس کا صرف ابتدائی حصہ جس میں کوٹہ بابا کی اولاد کا ذکر ہے وہ حافظ الملک کا ہے۔ بقیہ حصہ کوٹہ بابا کا ہے۔ جو انھوں نے اخوند درویزہ بابا کے فارسی تذکرہ سے اخذ کیا تھا۔ لیکن مرتب نے اس میں کافی کمی بیشی کی ہے۔ تذکرۃ الابرار والاشرار میں پیر روشن کی بدعتوں اور اس کے حامی قبائل کے انساب پر جو اعتراضات تھے وہ نئی ترتیب میں شامل نہیں کیے گئے۔ پیر معظم شاہ نے یہ کام ۱۷۶۱ء کے بعد اغلباً ۱۷۶۵ء کے آس پاس کیا ہے۔ اور بعد میں تاریخ حافظ رحمت خانی ۱۷۶۷ء میں مکمل کی۔ ۱۷۷۴ء کی جنگ کے بعد پیر معظم شاہ عظیم اللہ خاں ابن نواب دوندے خاں

کی ملازمت میں داخل ہوگئے۔ عظیم اللہ خاں نے سکونت رامپور میں اختیار کرلی تھی۔ ان کی جاگیر بلسی ضلع بدایوں میں تھی۔ ان کی بیٹی کی شادی اسد اللہ خاں نبیرہ نواب فیض اللہ خاں سے ہوئی تھی۔ ان کی بہن بیگم نواب جلال اللہ خاں بھی رامپور آگئی تھیں۔ اور بھتیجی اجان بیگم نواب محمد علی خاں ابن نواب فیض اللہ خاں کی زوجہ تھیں۔ یہ سب رامپور میں تھے۔ عظیم اللہ خاں کا انتقال ۱۸۱۱ء میں رامپور میں ہوا۔ تاریخ حافظ رحمت خانی تو عظیم اللہ خاں کے وارثوں کے پاس رہی لیکن خلاصۃ الانساب کا وہ نسخہ جو حافظ الملک کی ایما سے مرتب ہوا تھا وہ کس کے پاس رہا۔ اس کا پتہ نہیں چلا۔ پھر اس فارسی آمیز پشتو کے نسخہ کا ترجمہ کس نے خالص فارسی میں کیا۔ اس کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ کس کے قبضہ میں تھا اس کا بھی پتہ نہیں چلتا بہر حال ۱۸۸۱ء میں اس کی جو نقل ہوئی وہ بھوپال میں، اور اسکا عکسی نسخہ خدا بخش لائبریری میں موجود ہے جس کو میں نے موضوع بنایا ہے۔

●●

ڈاکٹر محمد طارق
ریڈر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی۔ علیگڑھ

شفیع المعانی
ہندستان کی ایک نایاب فارسی فرہنگ

فارسی زبان وادب کی ترویج میں ہندستان کا اہم حصہ ہے خصوصاً فرہنگ نویسی او تذکرہ نگاری دو ایسے میدان ہیں جنمیں ہندستانی علما و فضلا کو خود ایران پر فضیلت اور برتری حاصل ہے ایرانی اہل علم نے بھی اس برتری کا اعتراف کیا ہے۔

فارسی زبان کا پہلا تذکرہ "لباب الالباب" مصنفہ محمد عوفی التمش کے دور (۶۳۳ھ / ۱۲۳۵ء) میں ہندستان میں لکھا گیا اس کے کچھ عرصہ بعد علاء الدین خلجی م ۷۱۵ھ / ۱۳۱۵ء کے زمانے میں فارسی زبان کی ایک فرہنگ فرہنگ نامۂ قواس' وجود میں آئی۔ یہ فرہنگ ہندستان میں لکھی جانے والی پہلی فارسی فرہنگ ہے اور دنیائے فارسی میں لغت فرس اسدی کے بعد اسی کا نمبر ہے۔ فرہنگ قواس کے بعد ہندستان میں فرہنگ نویسی کا ایک سلسلہ چل پڑا جو جہانگیر کے دور میں فرہنگ جہانگیری کی تصنیف کے وقت اپنے عروج کو پہنچا اور مغلوں کی حکومت کے زوال بلکہ دولت انگلیسیہ کے اوائل تک جاری رہا۔

اگرچہ فارسی فرہنگ نگاری کی تاریخ پر ادھر کچھ دن سے کچھ کام ہوئے ہیں اور کئی لغات جن کے صرف نام باقی تھے طبع ہو کر عوام کے سامنے آچکے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی بہت سے شاید ایسے بھی ہوں جن کے نام سے بھی ہمارے اہل علم واقف نہیں ہیں۔ زیر مطالعہ فارسی لغت "شفیع المعانی" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے

مصنّف : اس کتاب کے مصنّف کے نام یا حالات زندگی کے بارے میں معلومات کا تنہا وسیلہ خود یہ لغت ہے۔ اس کے علاوہ کسی کتاب میں نہ اس مصنف کا کوئی ذکر ہے نہ اس کی تصنیف کا۔ بد قسمتی سے کتاب کا مقدمہ بھی موجود نہیں ہے جس سے مصنّف کے حالات پر کچھ روشنی پڑتی۔ ترقیمہ البتہ موجود ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولفِ فرہنگ کا نام "شفیع الدین" ہے جو رفیع الدین ولد عیوض محمد کے بیٹے ہیں۔ قصبہ آسیون سرکار لکھنؤ کے رہنے والے تھے اسی ترقیمہ سے پتہ چلتا ہے کہ مولف فرہنگ شفیع الدین کے دو لڑکے مظہر الدین اور ظہیر الدین تھے دونوں اہل علم تھے چونکہ دونوں نے مولف کے ساتھ اس فرہنگ کی کتابت میں حصہ لیا تھا ممکن ہے کتاب کی تالیف میں بھی مدد کی ہو۔ مظہر الدین کا ایک بیٹا حسین الدین تھا جس کو مصنف نے یہ کتاب ہبہ کی تھی ظاہر ہے فارسی و عربی زبان وادب سے واقف رہا ہوگا اور ضرورت

پڑی ہوگی تبھی اسکے نام یہ کتاب ہبہ کی گئی ہے۔ ممکن ہے اسی پوتے کی علمی ضرورت یا تقاضے کی وجہ سے دادا نے یہ کتاب تالیف کی ہو۔ گویا مولف فرہنگ کا خاندان ایک علمی خاندان ہے جس میں لکھنے پڑھنے کا ماحول اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ رہا ہے۔

ترقیمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مخطوطہ ۱۲۵۰ ہجری مطابق ۱۸۳۴ فصلی میں مکمل ہوا اور چونکہ خود مولف کا مکتوبہ نسخہ ہے اس لیے یقینی ہے کہ ۱۲۵۰ ہجری میں مولف زندہ تھا اور کم از کم دو بیٹوں کا باپ اور ایک پوتے کا دادا تھا۔ اس کا پوتا حسین الدین ولد مظہر الدین اس وقت اس قابل ہو چکا تھا کہ لغت جیسی علمی کتاب کی اس کو ضرورت پڑے اور وہ اس کا مطالعہ کر سکے۔ اگر ۱۲۵۰ھ میں حسین الدین کی عمر ۲۵۔۲۰ سال سمجھی جائے تو اس کے باپ مظہر الدین کی عمر ۴۵۔۵۰ برس اور اس کے دادا یعنی مولف لغت شفیع الدین کی عمر ستر اسی سال ماننی پڑے گی۔ اس طرح مولف فرہنگ کا زمانہ پیدائش ۱۱۷۰ اور ۱۱۸۰ھ کے درمیان قرار پاتا ہے

<u>علم و فضل</u>: کتاب کے ماخذ میں علم لغت کی تمام اہم کتابیں تو ہیں ہی ان کے علاوہ قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر، تاریخ، جغرافیہ، طب، فلسفہ، معانی، بیان اور نہ معلوم کن کن علوم کی بہت سی کتابیں ہیں جن میں سے بعض کے نام ترجمۂ الفاظ کے ذیل میں ضمناً آ گئے ہیں۔ کتاب کے مطالعہ کے دوران جگہ جگہ مصنف کے کثرت مطالعہ، وسعت نظر اور عمیق علمی ذوق کے ثبوت ملتے ہیں۔ قرآن، حدیث، تفسیر و فقہ کی کتابوں کے حوالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولف مذہبی علما کی صف میں شامل ہیں جن کو عربی اور فارسی دونوں زبانوں پر عبور ہے اور دونوں کے ادب سے واقفیت۔

<u>مسلک و مشرب</u>: فرہنگ "شفیع المعانی" کے مولف شفیع الدین مسلک اہل سنت و الجماعت سے وابستہ ہیں چنانچہ صدیق اور فاروق الفاظ کے ذیل میں جو ترجمہ مولف نے تحریر کیا ہے وہ اس مسلک کا واضح ثبوت ہے۔ مولف لکھتا ہے۔

<u>صدیق</u>: ... دوست و دوستان ... و بکسر و تشدید دال لقب خلیفۂ اول است رضی اللہ عنہ (ورق ۳۱۲)

<u>فاروق</u>: لقب امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ... اسی طرح حضرت حمزہ رض کو سید الشہدا لکھنا بھی اس کے سنی المسلک ہونے پر دال ہے۔

اہل سنت میں مولف فرہنگ حنفی مذہب کا ماننے والا ہے وہ ابو حنیفہ کو نہ صرف امام لکھتا ہے بلکہ امام اعظم مانتا ہے چنانچہ نعمان کے ذیل میں جو ترجمہ دیا گیا ہے وہ ملاحظہ ہو:

<u>نعمان</u>: ... و نیز نام امام اعظم است ابو حنیفہ کوفی ...

جب کہ امام مالک اور امام احمد حنبل کے تحت صرف اس قدر تحریر ہے۔ <u>مالک</u>: ... و نام صاحب مذہب ...

<u>حنبل</u>: ... و نام مردی صاحب مذہب کہ او را احمد حنبلی گویند ...

زمانۂ تالیف: بخط مصنف ہے۔ علاوہ ازیں حاشیہ پر بہت سے اضافے اور اصلاحات بھی اسی خط میں موجود ہیں اس لیے قیاس یہی کہتا ہے کہ یہ نسخہ لغت کی تالیف کے بعد پہلی نقل ہے۔ ممکن ہے اصل مسودہ ہی ہو شروع میں کچھ صفحے مصنف نے خود لکھے ہوں اس کے بعد اپنے بیٹوں کو املا کرائے ہوں۔ یہاں تک کہ ۱۴ جمادی الثانی ۱۲۵۰ھ کو یہ کتاب مکمل ہوئی ہو اگر یہ قیاس صحیح ہے تب تو تاریخ تالیف ۱۴ جمادی الثانی ۱۲۵۰ھ متعین ہو ہی جاتی ہے لیکن اگر ایسا نہیں ہے بلکہ یہ نسخہ اصل مسودہ کی نقل ہے تب بھی مصنف کا مبیضہ ہونے کی وجہ سے قرین قیاس یہی ہے کہ اصل کتاب اس نسخہ سے کچھ ہی پہلے مکمل ہوئی ہوگی گویا اس کتاب کا زمانۂ تالیف ۱۲۵۰ھ یا اس سے کچھ ہی قبل قرار پاتا ہے۔

کتاب کے ماٰخذ: دوران مطالعہ متن و حواشی میں (جو خود متن کا اضافی حصہ ہیں) الفاظ کے ترجمہ کے ضمن میں جن ماٰخذ کے نام نظر آتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

لغات: ۱۔ فرہنگ ابوحفص سعدی، ۲۔ دستور (الافاضل)، ۳۔ شمس فخری (معیار جمالی)، ۴۔ ادات الفضلا، ۵۔ غنیہ (الطالبین)، ۶۔ زفان گویا، ۷۔ شرفنامہ، ۸۔ (فرہنگ) سکندری، ۹۔ موید الفضلا، ۱۰۔ مدار الافاضل، ۱۱۔ کشف اللغات، ۱۲۔ فرہنگ ابراہیمی، ۱۳۔ فرہنگ جہانگیری، ۱۴۔ فرہنگ رشیدی، ۱۵۔ حل اللغات، ۱۶۔ منتخب اللغات، ۱۷۔ سراج اللغات، ۱۸۔ اصطلاحات وارستہ، ۱۹۔ شرح نصاب، ۲۰۔ فرہنگ منظوم، ۲۱۔ برہان قاطع، ۲۲۔ صراح، ۲۳۔ کنز اللغات، ۲۴۔ قاموس، ۲۵۔ تاج (الاسامی)، ۲۶۔ سامی (السامی فی الاسامی)، ۲۷۔ سامانی وغیرہ ہیں۔

لغات کے علاوہ جن کتابوں کے نام بطور حوالہ اس لغت میں آتے ہیں ان میں: قرآن پاک، احادیث نبویہ (بغیر صراحت نام مجموعہ) تفسیر ابدی، شرح مخزن، اشارات شیخ ابوعلی سینا، تاج مآثر، بوستان سعدی، مثنوی مولانا روم وغیرہ ہیں۔

ان ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولف فرہنگ اپنے سے پہلے لکھی جانے والی بیشتر فرہنگوں سے نہ صرف واقف تھے بلکہ انھوں نے ان سے استفادہ بھی کیا تھا۔ البتہ دستور، ادات، زفان، شرفنامہ اور خاص طور سے لغت ابوحفص سعدی کے ناموں سے دھوکہ نہ ہونا چاہیے کہ یہ کتابیں مولف کے پیش نظر تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاید موید الفضلا یا جہانگیری سے استفادہ کے وقت ضمنی طور پر یہ نام بھی آگئے ہیں ورنہ اس دور میں یہ کتابیں نہ صرف میسر عام نہیں تھیں بلکہ ادات، زفان اور دستور تو بالکل ناپید تھیں بہت بعد میں دریافت ہو کر عام ہوئی ہیں فرہنگ ابوحفص آج بھی نایاب ہے شرفنامہ سے البتہ غالب نے استفادہ کیا ہے البتہ بعد میں فرہنگ نظام کے مولف نے ان میں سے بیشتر لغات کو دیکھا ہے جو حیدرآباد کے کتب خانوں میں موجود تھیں۔ فرہنگ ابراہیمی شرفنامہ کو بھی کہتے ہیں اور ایران میں لکھی جانے والی ایک دوسری فرہنگ کا نام بھی ہے۔ جو ہندستان میں عام نہیں رہی البتہ جہانگیری کے ماٰخذ میں سے شاید یہ نام بھی وہیں سے آیا ہوگا فرہنگ منظوم سے کوئی فرہنگ

مراد ہے معلوم نہ ہوسکا کیونکہ اس نام کی کوئی خاص لغت موجود نہیں البتہ مختلف ناموں سے منظوم لغات لکھے گئے ہیں جو موجود بھی ہیں۔

یقیناً یہ لغت اپنے ماخذ کی کثرت کے لحاظ سے آخری دور میں ہندستان میں لکھی جانے والی فارسی لغات میں سب سے اہم قرار پاتی ہے۔

ماخذ کا استعمال: اکثر قدیم فرہنگ نویسوں کا طریقہ بلکہ عیب یہ رہا ہے کہ وہ اپنے ماخذ سے بغیر تحقیق و تنقید کے مواد نقل کر لیتے ہیں۔ بہت کم مولفین لغات نے ماخذ کی اطلاعات کی چھان پھٹک کی کوشش کی ہے۔ شرفنامہ کسی قدر اور جہانگیری، رشیدی اور سراج بڑی حد تک اس کمی کو دور کرتے ہیں۔ ہمارا مولف بھی اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ وہ محض کتابوں کا ناقل نہ رہے بلکہ اپنی قوت نقد کو کام میں لاتے ہوئے ماخذ کی اطلاعات پر نظر ڈالتا جہاں کہیں ماخذ میں اسے غلطی نظر آتی ہے (جس کا موقع بہت کم ملا ہے) تو اپنی رائے کے اظہار کے ساتھ اس کی نشاندہی بھی کر دیتا ہے چنانچہ ذیل کی مثالیں بطور نمونہ پیش کی جاسکتی ہیں۔

آب حرام: شراب و نیز کنایہ از عشق و محبت است لیکن آب حرام از ان گفته که زاہدان از و محروم اند.

کذا فی المؤید و این معنی اخیر ہیچ لطفی ندارد۔

استرنگ: بالکسر مردم گیا... و در قاموس گوید بیخ تفاح دشتی است بصورت انسان ۔

و آنچه گفته اند کشندۂ آں بمیرد خلاف واقع است ۔ و در شرفنامہ گوید کہ بہندی لکھمنان گویند و مکرر آزموده شده آں خاصیت ندارد۔

غالباً بر تقدیر صحت نقل حکمت الٰہی دراں ایں است کہ مردم بدانند کہ ہرگاہ گیاہ بصورت آدم موجب قصاص است کشتن آدم چگونہ موجب قصاص و مستوجب عذاب نباشد۔

آبچین: جامہ کہ بعد از غسل بدن مردہ پاک کنند و چادری کہ از حمام برآمده عرق بدان چینند و سامانی گوید قطنیفہ کہ بدان بدن خشک کنند بعد از غسل و خصوصیت بمیت ندارد چنانچہ جہانگیری گمان برده و توہم اداز خصوصیت مقام ناشی است و آن معتبر نیست۔

تلفظ: فارسی کی ابتدائی فرہنگوں میں تلفظ ضبط کرنے کا کوئی خاص التزام نہ ہوتا تھا شرفنامہ پہلی فارسی فرہنگ ہے جس میں اس سلسلے کی باقاعدہ کوشش نظر آتی ہے اور لفظ کا تلفظ بڑی حد تک متعین ہو جاتا ہے لیکن یہ سلسلہ برابر جاری نہ رہ سکا کچھ عرصہ بعد برہان قاطع اور سراج کے زمانے میں اس طرف باقاعدہ توجہ ہوئی اور الفبائی ترتیب کا رواج ہوا۔

مولف "شفیع المعانی" نے اس طرف اس طرح توجہ نہیں کی جس طرح اس کے بعض پیش رو کر چکے تھے۔ وہ تلفظ کے لیے اکثر مندرجہ ذیل طریقے اختیار کرتا ہے۔

۱۔ صرف پہلے حرف کی حرکت بیان کر کے جیسے: بحر بالفتح دریا ۲۔ پہلے اور دوسرے حرف کی حرکت کے

ساتھ جیسے : بذر بفتح اوّل وسکون ذال نقطہ دار ...، ۳۔ کئی حرفوں کی تفصیل کے ساتھ جیسے : پذیرفتار بابائے فارسی وذال نقطہ دار وفوقانی بالف کشیدہ ...، ۴۔ پہلے اور تیسرے حرف کی حرکت کے ساتھ جیسے : بربر بفتح ہر دو با تازی ... ۵۔ بیشتر ہموزن عام فہم کلمہ تحریر کر کے جیسے : پابر بفتح بار فارسی دیائے تحتانی بوزن دایہ ... پرگار با باوکاف فارسی بروزن سردار ... پرغار بروزن بردار ... وغیرہ۔

ترتیب : الفاظ کی ترتیب کے سلسلے میں بھی قدیم فرہنگوں میں مختلف طریقے استعمال کیے گئے ہیں جو اس وقت کی مجبوریوں اور تقاضوں کے لحاظ سے مناسب بھی تھے اور ضروری بھی۔ "شفیع المعانی" کے مولف نے قدیم الایام سے رائج عام طریقہ اختیار کیا ہے یعنی پہلے حرف کو باب اور آخری حرف کو فصل قرار دیا ہے مثلاً لفظ بار باب الباء فصل را میں ملے گا جسے ہمارا مصنف اس طرح لکھتا ہے باب الباء مع الراء اور کلمہ باری باب الباء مع الیاء میں ہیں۔ گویا موجودہ لغت کی ترتیب الفبائی نہیں ہے اس وجہ سے لفظ کی تلاش میں عام لوگوں کو دشواری ہوتی ہے۔ البتہ پہلے اور آخری حرف کے درمیان جو حروف آتے ہیں ان میں سختی کے ساتھ الفبائی ترتیب کا خیال رکھا گیا ہے جو اس دشواری کو کسی حد تک کم کر دیتا ہے۔

شواہد : اگرچہ عام قدیم لغات کی طرح "شفیع المعانی" میں بھی الفاظ کے تعین کے لیے شعری شواہد نہیں دیے گئے ہیں جن سے کلمے کے تلفظ کے سمجھنے میں بھی بعض اوقات دشواری ہوتی ہے لیکن چونکہ پہلا اور آخری حرف متعلق ہے اور درمیانی حروف میں الفبائی ترتیب پیش نظر رکھی گئی ہے اس لیے تلفظ کے تعین میں غلطی کا امکان کم ہو جاتا ہے البتہ معنی کے تعین میں شواہد سے جو مدد ملتی ہے اس سے اس فرہنگ کا قاری محروم رہتا ہے۔ یوں بھی کچھ طباعت کے عام ہونے کی وجہ سے اور کچھ حجم کی زیادتی اور کلمات کے احاطے میں وسعت کے سبب شعری فرہنگیں عام لغات کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھیں اس لیے "شفیع المعانی" میں شرفنامہ و جہانگیری وغیرہ کے طرز کو ترک کر کے سراج وغیرہ کی پیروی کی گئی ہے۔ اس کے باوجود شعری شواہد بالکل ناپید بھی نہیں ہیں۔ کہیں کہیں یہ شواہد نظر آتے ہیں جیسے اندیک کے ترجمہ کے ذیل بطور شاہد عمارہ مروزی کا شعر دیا گیا ہے۔ اسی طرح تاج مآثر سے ایک شعر اکثر کے شاہد کے طور پر نقل کیا گیا ہے۔ شرح مخزن اور بوستاں کے چند اشعار بھی بطور شاہد استعمال ہوئے ہیں۔ دیگر شعرا میں انوری، مولانا روم، شمالی دہستانی، سعدی وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔

دیگر خصوصیات : کثرت مآخذ تحقیق نظر کے ساتھ اس لغت کی ایک اور خصوصیت وضاحت کے ساتھ معنی کی پیش کش ہے دوران مطالعہ اندازہ ہوتا ہے کہ عام مواقع سے قطع نظر بہت سے الفاظ کے تراجم میں بہت وضاحت اور علمی دقت نظر سے کام لیا گیا ہے اس سلسلے کی مثالیں اس مختصر تعارف کو بہت گراں بار کر دیں گی اس لیے ان الفاظ میں سے چند کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے :

ارغنون، آبچین، ارسلان، استرنگ، اسطخ، زحل، سعد، سکندریہ، مافی، وا، یکدانہ وغیرہ وہ الفاظ ہیں جن کے معنی کافی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں جبکہ بیشتر دوسرے لغات میں ایک دو جملوں بلکہ لفظوں میں بات ختم کردی گئی ہے۔

ہندستانی الفاظ: بعض قدیم فرہنگوں کی طرح "شفیع المعانی" کی ایک اہم خصوصیت فارسی، عربی الفاظ کے ترجمے کے ذیل میں ان کے متبادل ہندستانی الفاظ کا استعمال ہے۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو ان ادوار میں مختلف علاقوں میں استعمال ہوتے تھے۔ قدیم لغات میں ان کا ذکر ان الفاظ کی تاریخ کے سلسلے میں معاون ہوتا ہے تو متاخرین کے یہاں مختلف علاقوں کے لہجوں کے فرق کا پتہ دیتا ہے۔ اردو زبان کی تحقیق میں یہ قیمتی سرمایہ بہت معاون ہوسکتا ہے۔ راقم الحروف نے فارسی لغات میں ہندستانی عناصر کے عنوان ان الفاظ کو بڑی حد تک یکجا کرلیا ہے جو آئندہ کبھی پیش کیا جائیگا۔

"شفیع المعانی" کے مصنف نے بھی سینکڑوں اردو الفاظ فارسی الفاظ کے متبادل کے طور پر ذکر کیے ہیں جو ایک علیحدہ مضمون کے متقاضی ہیں یہاں چند الفاظ بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں:

• آبخور... ہندی گھاٹ (گھاٹ) خوانند • اشخار... ہندسا جی و کھار گویندش • انگشر ہندوی آنکس گویند • ابن عروس... ہند نیول گویند وغیرہ۔

غلطیاں: "شفیع المعانی" میں گوناگوں خوبیوں کے ساتھ کتابت کی بعض غلطیاں نظر آتی ہیں ان میں سے چند کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

سائج: کے ذیل میں سلمان کے بجائے 'سلیمان' شاعر معروف...

شب گاہ: کے تحت شب آنگاہ کنند بجائے شبانگاہ۔

اندود: کے تحت صحیح گلابہ

"شفیع المعانی"، میں عربی فارسی کے بیشتر مروج الفاظ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ترکی کے مستعمل الفاظ بھی ترجمہ کیے گئے ہیں لیکن شرفنامہ یا موید کی طرح ترکی کیلیے علیحدہ فصل قائم نہیں کی گئی ہے۔ اس زمانے میں دساتیر کے جعلی لغات کا جادو ہندستان میں عام تھا برہان اور قاطع برہان دونوں کے مولفین اس جادو کے اسیر رہے ہیں لیکن مولف شفیع المعانی پر یہ جادو چڑھتا نظر نہیں آتا کیونکہ یہ جعلی لغات اس فرہنگ میں نظر نہیں آتے۔ اگرچہ تنقیدی نقطۂ نظر سے یہ لغت رشیدی یا جہانگیری کے مرتبہ کو نہیں پہنچتی لیکن موید اور آنندراج کی طرح محض مآخذ کی نقل بھی نہیں ہے۔ آزادانہ روی اور تنقیدی نظر کی جھلکیاں اس میں جا بجا نظر آتی ہیں ضخامت کے پیش نظر ہی شاید شعری شواہد سے صرف نظر کی گئی ہے ورنہ اس کا حجم جہانگیری اور آنندراج سے کسی طرح کم نہ ہوتا۔ سراج و رشیدی کی طرح بہت سے الفاظ کے معنی دیگر عام لغات سے کہیں زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔

موجودہ نسخہ: یہ نسخہ ۲۰۷ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس کا سائز ۱۳½" × ۹½" ہے۔ ہر صفحہ پر ۲۵ سطریں ہیں۔ الفاظ سُرخ (شنگرفی) روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ ترجمہ سیاہ روشنائی میں ہے۔ کاغذ روئی کا بنا ہوا ہے۔ شروع سے ایک ورق غائب ہے جس کی وجہ سے مقدمہ ضائع ہوگیا ہے نسخہ کا آغاز ورق ۲۔الف سے اس طرح ہوتا ہے۔

باب الالف مع الالف ۱۱ بروزن جا امر آمدن یعنی بیا... الخ: ابتدائی چند صفحات کے آخری حصے گل گئے ہیں یا کرم خوردگی کی وجہ سے ضائع ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے ان صفحات میں ایک ایک دو سطریں کم ہیں باقی پورا نسخہ نہایت اچھی حالت میں ہے ترقیمہ اس طرح ہے:

"تمت تمام شد کتاب ہذا مسمی فرہنگ شفیع المعانی تالیف شفیع الدین ولد رفیع الدین ابن عیوض محمد ساکن قصبہ آسیون لکھنؤ مضاف صوبہ اودھ اختر نگر بخط شفیع الدین و مظہر علی ولد وابن مرقوم ظہیر الدین ولد شفیع الدین مسطور بتاریخ پنجم جمادی الاول ۱۲۵۰ھ مطابق یکم ماہ کاتک ۱۲۴۱[1] فصلی یکپاس روز برآمدہ روز شنبہ بمقام لکھنؤ باختتام رسید۔ چون کتاب ہذا را بہ برخوردار کتاب ہذا را مالک و مختار است فقط"

جیسا کہ ترقیمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ تین لوگوں کے خط میں لکھا ہوا ہے گمان غالب یہ ہے کہ پہلا خط جو ورق ۲ سے ورق ۶۸ تک ہے خود مصنف کا ہے اس کے بعد ورق ۶۹ سے ورق ۲۰۲ تک دوسرا خط ہے ۲۰۲ سے ۲۰۵ تک پھر وہی پہلا خط ہے اس کے بعد کہیں پہلا کہیں دوسرا اور کہیں تیسرا خط نظر آتا ہے تمام صفحات کے حاشیے اضافوں سے بھرے ہوئے ہیں جن میں جگہ جگہ کانٹ چھانٹ کی گئی ہے یہ حاشیے بیشتر پہلے خط میں ہیں یہ حک و اضافے واضح بخط مولف ہیں اور اس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ یہ نسخہ مولف کا مسودہ ہے یا مسودہ کی پہلی نقل۔ پہلا خط نستعلیق پختہ ہے دوسرے خطوط بھی نستعلیق معمولی ہیں

---

[1] جنتری صد سالہ مؤلفہ قطب الدین مطبع نامی شہر لکھنؤ ص ۱۳۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۴ رجمادی الثانی روز شنبہ ۱۲۵۰ھ میں ۱۸ اکتوبر ۱۸۳۴ء تھی۔ "شفیع المعانی" کے مولف نے اس سن ہجری میں ۱۲۴۱ فصلی تحریر فرمائی ہے جو بالکل غلط ہے بلکہ یہ ان کا سہو کتابت ہے اس سن ہجری میں ۱۲۴۲ فصلی ہے نہ کہ ۱۲۴۱ فصلی۔

جناب سیّد نور محمد اکیلوی
دائرۂ مہدویہ
ظہیر آباد (اے۔ پی)

سکّہ شناسی

سِکّوں پر مندرجہ اشعار کے پڑھنے میں جو دشواریاں لاحق ہوتی ہیں اُن کا ذکر کرنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً وہ مشکلات بیان کر دی جائیں جو عام سِکّوں کے پڑھنے میں پیش آتی ہیں۔ یوں تو آج کل سِکّوں کے متعدد کیٹیلاگ دستیاب ہوتے ہیں جن کی مدد سے سِکوں کی شناخت میں سہولت ہوتی ہے لیکن ان سے استفادے کے لیے بھی سِکّوں کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات درکار ہوتی ہیں ورنہ غیر ضروری کیٹیلاگوں کی ورق گردانی میں تضییعِ وقت کا اندیشہ رہتا ہے۔ لہٰذا سِکّے جمع کرنے والوں کو چاہیے کہ سب سے پہلے یہ معلوم کریں کہ جس خاص سکّے کے بارے میں انہیں تفصیلات مطلوب ہیں وہ کس علاقے کا ہے، اس کا عہد کون سا ہے اور اس پر مندرجہ عبارت کی زبان کون سی ہے اور اس کا تعلق کس حکمران خاندان سے ہے۔ یہ باتیں معلوم ہو جانے کے بعد متعلقہ کیٹیلاگ سے بآسانی مدد لی جاسکتی ہے۔

اُنیسویں صدی کے وسط سے سکّوں پر تحقیقی کام بہت تیزی سے ہو رہا ہے۔ غیر منقسم ہندوستان کے سکوں پر بھی کئی کتابیں لکھی گئی ہیں جو مختلف عجائب خانوں میں محفوظ سِکوں نیز خانگی ذخیروں کی فہرستوں پر مشتمل ہیں ان کے علاوہ نیومسمیاٹک سوسائیٹیوں کے جرائد و رسائل میں بھی معلومات افزا مضامین شایع ہوتے رہتے ہیں۔ اس پورے مواد سے خاطر خواہ استفادہ کیا جاسکتا ہے لیکن سکّوں کے شائقین کو بنیادی طور پر ان چند

اُمور کو پیشِ نظر رکھنا بے حد ضروری ہے۔

سکّے کہاں دستیاب ہُوے ۔ سکّوں کا مقامِ دریافت معلوم ہونے سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ وہ سکّے کس علاقے کے ہیں۔ عموماً سکّے جس علاقے کے ہوتے ہیں وہ اُسی علاقے میں بہ کثرت دستیاب ہوتے ہیں۔ دوسرے علاقوں کے سکّے شاذ و نادر ہی مل جاتے ہیں۔ یہ ایک عمومی نقطۂ نظر ہے۔ آج کل سکّوں کی تجارت کافی ترقی کر گئی ہے اور ذرائع آمد و رفت کی سہولت کی وجہ سے ایک علاقے کے تاجر دوسرے علاقے میں جاکر سکّے خریدتے اور بیچتے ہیں مگر یہ صرف سونے کے سکّوں اور کبھی کبھی چاندی کے سکوں کے تعلق سے ہوتا ہے۔ تانبے کے سکّے جس علاقے کے ہوتے ہیں ان کی نکاسی وہیں ہوجاتی ہے۔

مقامِ دریافت کے تعین کے بعد سکّوں کی عبارت کی زبان اور رسم الخط کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ ہندوستان کے ہندو حکمرانوں کے سکّوں پر سنسکرت، کَروشتی، دیوناگری، برہمی اور پالی وغیرہ زبانوں کی عبارتیں ملتی ہیں۔ اور مُسلم حکمرانوں کے سکّوں پر عموماً عربی زبان کی عبارات اور کبھی کبھی فارسی اندراجات بھی پائے جاتے ہیں۔ البتہ مُسلم حکمرانوں کے سکّوں پر درج شدہ اشعار فارسی زبان میں ہیں۔ اِن بادشاہوں کے سِکّوں کے تعلق سے ایک دشواری یہ پیش آتی ہے کہ ایک ہی نام متعدد خاندانوں میں مشترک ملتا ہے۔ مثلاً محمد شاہ کا نام خلجیوں، گجرات کے حکمرانوں کشمیر کے سلاطین، بنگال کے بادشاہوں، بہمنیوں اور عادل شاہیوں میں پایا جاتا ہے۔ ان تمام بادشاہوں کے سِکّوں کی شناخت کے لیے ان کی مخصوص وضع و قطع اور ساخت نیز رسم الخط اور ان کے القاب اور خطابات کو پیشِ نظر رکھنا از بس ضروری ہے۔ بعض صورتوں میں القاب وغیرہ میں مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔ اگر اس پر پوری طرح غور نہ کیا جائے تو ایک خاندان کے حکمران کے سکّے کو دوسرے خاندان کے حکمران سے منسوب کرنے کی غلطی سرزد ہوسکتی ہے۔

متذکرہ صدر اُمور کو پیشِ نظر نہ رکھ کر بعض محققین سے فاش غلطیاں سرزد ہوگئی ہیں۔ ہندوستان کے ایک محقق نے بہمنی خاندان کے دو سِکّوں پر المعتصم باللہ اور الواثق باللہ کے القاب دیکھ کر اُنھیں معتصم باللہ اور واثق باللہ خلفائے بغداد سے منسوب کر دیا۔[1]

---

[1] گنجِ شائگاں مصنفہ محمد رفیع موہانی عالی مطبوعہ مرادآباد ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۴۸

ایران کے ایک محقق نے محمد شاہ والئ گجرات کے سکے[1] کو محض اس بنا پر کہ اس سکے پر بادشاہ کا نام محمد شاہ درج ہے۔ ایران کے قاچار خاندان کے حکمران محمد شاہ کے نام سے شایع کر دیا۔[1]

سکوں کی عبارت کی زبان سے واقفیت نہ ہو تو عبارت کے صحیح مفہوم تک رسائی ممکن نہیں اور مطلب خبط ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی مثال سلاطین مغلیہ کے سکوں پر مندرجہ ایک دعائیہ کلمہ کی انوکھی تعبیر کی صورت میں ملتی ہے۔ ہندوستان کے ماہر مسکوکات قدیمہ سی۔ آر۔ سنگھال نے اسٹیٹ میوزیم لکھنؤ میں محفوظ مغل سلاطین کے سکوں کے کیٹلاگ کی ترتیب کے ضمن میں بادشاہ ہمایوں کے سکوں پر مندرجہ دعائیہ جملہ ——— "خلد اللہ ملکہ دولتہ وسلطانہ" کو اول تو ایک فارسی محاورہ لکھا اور پھر بتلایا کہ اب تک کسی نے جملہ کا صحیح ترجمہ نہیں کیا اور غلط مطلب نکالا۔ نیز یہ کہ (مسکوکات قدیمہ کی تاریخ میں) انھوں نے پہلی بار اس جملہ کو صحیح طور سے پڑھ کر درست مطلب نکالا ہے ان کی تحقیق میں "ملکہ و سلطانہ" سے مراد مَلِکہ اور سُلطانہ یعنی کوئین یا بادشاہ بیگم ہے۔[2] یاللعجب۔ اب انھیں کون سمجھائے کہ مسلم حکمرانوں میں سوائے شہنشاہ جہانگیر کے کسی نے اپنے سکوں پر اشارۃً بھی اپنی ملکہ کا ذکر نہیں کیا چہ جائیکہ اس کے لیے دعائیہ کلمات درج کرے۔ یہ دُعا ملک، دولت اور اقتدار کے استقلال کے لیے ہے اور یہ جُملہ فارسی نہیں بلکہ عربی زبان کا ہے۔

یہ مسئلہ ایلخانی خاندان کی ایک حکمران ساتی بیگ کے سکے سے بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ ملکہٗ و سلطانہٗ کے الفاظ بادشاہ بیگم یا کوئین پر قطعاً دلالت نہیں کرتے کیوں کہ ساتی بیگ نے جو خود ایک عورت اور سلطان سلیمان ایلخانی کی ملکہ تھی اپنے سکے پر خلد اللہ ملکہا استعمال کیا ہے۔[3]

---

[1] کیٹلاگ تبریز میوزیم از آقائے جمال ترابی طباطبائی مطبوعہ ایران جلد سوم صفحہ ۳۴۔
[2] کیٹلاگ آف مغل کوائینس ان دی اسٹیٹ میوزیم لکھنؤ مرتبہ سی۔ آر۔ سنگھال مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۵ء فٹ نوٹس بر صفحات ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔
[3] کیٹلاگ تبریز میوزیم از آقائے جمال ترابی طباطبائی مطبوعہ ایران جلد سوم صفحہ ۵۱۔

انگلستان کے مشہور مورخ اور ماہرِ مسکوکات قدیمہ اسٹینلی لین پول[1] نے ملکہ نور جہاں کا نام مہر النساء کے بجائے مُہر النساء درج کر کے اس کا ترجمہ "نسوانیت پر مُہر" کیا ہے۔ اسی مستشرق نے شاہ جہاں کے لڑکے مراد بخش کے سکوں پر اُس کے لقب "مُروّجُ الدین" کو "مُزوّجُ الدین" پڑھ کر، اس کے معنی ترویج (رواج دینے، پھیلانے) سے نہیں بلکہ تزویج (شادی کرنے، وابستہ ہونے) سے نکال کر خود ہی حیرت کا اظہار کیا ہے کہ یہ عجیب لقب ہے۔

بعض سکوں پر دارالضرب کا نام بھی درج ہوتا ہے چند حکمرانوں نے دارالضرب کے مخصوص لقب بھی وضع کیے تھے مثلاً قبۃ الاسلام، شہر کرم، تخت گاہ، دارالخلافہ، حضرت وغیرہ مغل سلاطین نے اس خصوص میں بڑی جدت دکھائی اور کم و بیش ہر ایک دارالضرب کو ایک علٰحدہ لقب دیا جو دار سے شروع ہوتا ہے۔ جیسے دارالخیر اجمیر، دارالامان ملتان، دارالفتح اُجین، دارالسرور برہان پور اور دارالجہاد حیدرآباد وغیرہ۔ شیر شاہ کے سکوں پر بھی کچھ القاب پائے جاتے ہیں اور کبھی کبھی دارالضرب کے نئے نام کے ساتھ ساتھ اس کا قدیم نام بھی بطور عرف درج کیا گیا ہے مثلاً شیر گڈھ عرف حضرت دہلی۔

شیر شاہ کے کچھ سکے ایسے بھی ملے ہیں جن پر لفظ 'جھاپنناہ' درج ہے۔ ماہرینِ مسکوکات قدیمہ نے اس کو ایک دارالضرب سمجھ لیا۔ چنانچہ انگلستان کے یوجین لیگیٹ نے اپنی مرتبہ فہرست میں اس کا ذکر کیا ہے[2]۔ ایک اور محقق کوڈرنگٹن نے بھی "جھاپنناہ" کو دارالضرب قرار دے کر اس کو دہلی سے منسوب کیا ہے[3]۔ انڈین میوزیم کلکتہ میں محفوظ سکوں کے کیٹیلاگ میں نیلسن رائٹ نے بھی اپنے پیشرووں کی رائے سے اتفاق کر کے "جھاپنناہ" کو دارالضرب بتلایا ہے[4]۔ نیلسن رائٹ نے شیر شاہ کے متعلقہ سکوں کی عبارتیں بھی کیٹیلاگ میں درج کی ہیں۔

---

[1] دی کوائنس آف دی مغل ایمپررز آف ہندوستان اِن دی برٹش میوزیم مرتبہ اسٹینلی لین پول مطبوعہ لندن ۱۸۹۲ء انٹروڈکشن۔

[2] منٹ ٹاونس اینڈ کوائنس آف دی محمڈنس مرتبہ یوجین لیگیٹ مطبوعہ لندن ۱۸۸۵ء صفحہ ۴۰

[3] مینول آف مسلمان نیومیسمیٹکس، ایشیاٹک سوسائٹی مونوگرافس جلد ۷ مرتبہ اُو۔ کوڈرنگٹن مطبوعہ لندن ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۲۹

[4] کیٹیلاگ آف دی کوائنس اِن دی انڈین میوزیم کلکتہ مرتبہ ایچ۔ نیلسن رائٹ مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۰۷ء جلد ۲ صفحہ ۱۰

نیلسن رائٹ نے اپنے محولہ ایک سکّے کی عبارت اس طرح درج کی ہے۔

رُخِ اول		رُخِ ثانی	
دائرے میں	لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ	دائرے میں	شاہ السلطان شیر خلد اللہ ملکہ وسلطانہ ۹۴۹
حاشیہ	السلطان العادل ابابکر عمر عثمان علی	حاشیہ	فرید الدنیا والدین ابوالمظفر جھاپناہ

محقق مذکور نے مندرجہ صدر عبارت کی روشنی میں اس سکّے کو دارالضرب "جھاپناہ" میں مضروب قرار دیا ہے۔ اس استنباط پر سب سے پہلا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ اگر یہاں "جھاپناہ" کو دارالضرب بفرضِ محال مان بھی لیا جائے تو اس کا ماقبل ابوالمظفر بے مصرف ہوجاتا ہے۔ دارالضرب کا جیسا کہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہے لقب تو ہوتا ہے مگر اس کی کُنیت نہیں ہوتی۔ دارالضرب کو ظفر یاب، ظفر قرین اور دارالفتح کے القاب دیئے گئے ہیں مگر کبھی کسی دارالضرب کو ابوالفتح یا ابوالمظفر کا لقب نہیں دیا گیا یہ القاب خود حکمرانوں کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔ جو اشکال پیدا ہورہا ہے اس کو دور کرنے کی آسان صورت یہ نظر آتی ہے کہ سکّے کے رُخِ اول اور رُخِ ثانی پر مندرجہ عبارت کو سلسلہ وار پڑھا جائے ایسا کرنے سے اس کا صحیح مفہوم معلوم ہوسکتا ہے۔

اس سکّے کے رُخِ اول پر کلمہ طیبّہ دائرے میں درج ہے اور حاشیہ پر خلفائے اربعہ کے نام ہیں۔ اسی رُخ پر خلفاء کے ناموں سے پہلے السلطان العادل کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں جن کا کوئی تعلق خلفاء سے نہیں ہوسکتا کیونکہ خلفاء چار ہیں سُلطان بصیغۂ واحد درج کیا گیا ہے اگر خلفاء کو سُلطان کہنا مقصود ہوتا تو سلاطین بصیغۂ جمع استعمال ہوتا۔ پس ثابت ہوا کہ کلمۂ طیبّہ اور خلفائے اربعہ کے اسماء کے اندراج کے بعد دو مذہبی فارمولا

جو سُنّی عقیدے کے حکمران اپنے سکّوں پر درج کرواتے رہے ہیں، مکمل ہو گیا اور اس کے بعد جو الفاظ رُخِ اوّل پر درج ہیں ان کا تعلق رُخِ ثانی پر مندرجہ حکمران کے نام، اس کے القاب اور خطابات سے ہے۔ اس طرح پورے سکّے کی عبارت دو حصوں میں تقسیم کی جا کر بصورت ذیل پڑھی جائے گی۔

لا اله الا الله محمد رسول الله ابا بکر عمر عثمان علی۔ السلطان العادل فرید الدنیا والدین ابوالمظفر جھانپناہ شیرشاہ السلطان خلد اللہ ملکہ وسلطانہ ۹۴۹۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "جھانپناہ" کو شیر شاہ کا لقب سمجھ لیا جائے تو اس سکّے پر دارالضرب کا نام کہاں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سکّوں پر عموماً دارالضرب کا نام درج ہوتا ہے مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ایک سکّے پر دارالضرب کا نام مندرج ہو۔ اُن سکّوں پر جو عام حالات میں شہروں میں مضروب ہوتے ہیں ان پر دارالضرب کا نام پایا جاتا ہے لیکن حکمران جب کبھی مہمات جنگ میں مصروف ہوتے ہیں اور انھیں فوج کے اخراجات کے لیے رقم کی ضرورت ناگہانی طور پر لاحق ہوتی ہے تو وہ برسرِ موقع سکّے مضروب کرواتے ہیں۔ مغل حکمرانوں نے تو فوج کے ساتھ ایک مستقل دارالضرب کا انتظام کر رکھا تھا جس کو انھوں نے اُردو کا نام دیا تھا۔ شیر شاہ نے بھی غالباً زیرِ بحث سکّے اپنی جنگی مہمات کے دوران مضروب کروائے ہوں گے اس لیے ان پر کسی مستقل دارالضرب کا نام پایا نہیں جاتا۔

ہمارے اس استدلال کے بارے میں کہ "جھانپناہ" شیر شاہ کا لقب ہے، ایک دوسرا سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ ایسی صورت میں شیر شاہ کے ان سکّوں پر بھی یہ لقب پایا جانا چاہیے جو کسی مستقل دارالضرب سے جاری ہوئے ہوں۔ اس سوال میں بڑی معقولیت ہے۔ اس سلسلے میں شیر شاہ کے دوسرے سکّوں کی تلاش کے دوران حسنِ اتفاق سے نیلسن رائٹ ہی کے کیٹلاگ میں ایک ایسا سکّہ مل گیا جس پر "جھانپناہ" کا لقب بھی موجود ہے اور دارالضرب کا نام بھی درج ہے۔ اس سکّے کے ہر دو جانب

کی عبارت حسبِ ذیل ہے۔[1]

رُخِ ثانی		رُخِ اول	
شاہ السلطان شیر خلد اللہ ملکہ و سلطانہ	دائرے میں	لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ	دائرے میں
فرید الدنیا والدین ابوالمظفر جہانپناہ	حاشیہ	السلطان العادل ضرب اجین ابابکر عمر عثمان علی	حاشیہ

اس سکے کو دیکھنے کے بعد کوئی گنجایش ہی باقی نہیں رہتی کہ جہانپناہ کو دار الضرب سمجھا جائے۔ اس طرح ایک دیرینہ غلط فہمی کا ازالہ ہوجاتا ہے۔

سکے پڑھنے کے باب میں اس قدر تفصیل میں جانے اور محققین سے جو فروگزاشتیں ہوئی ہیں ان کی نشاندہی کرنے کا مقصد محض یہ بتلانا تھا کہ وہ لوگ جو کیٹلاگ مرتب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ذرا سی بے احتیاطی یا بعض خاص پہلوؤں سے عدم واقفیت کی وجہ سے کیسی شدید غلط فہمیوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔ ایسی صورت میں عام شائقین کے لیے غیر معمولی احتیاط ازبس ضروری ہوجاتی ہے۔ جب عام سکوں کے پڑھنے میں ایسی دشواریاں پیش آتی ہیں تو سکوں پر مندرجہ اشعار کو صحت کے ساتھ پڑھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ مستشرقین نے بھی اس سلسلے میں بہت کام کیا ہے لیکن سکوں پر مندرجہ اشعار کے پڑھنے میں ان سے بھی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں جنھیں آیندہ صفحات میں پیش کیا جائے گا۔

[1] کیٹلاگ آف دی کوائنس اِن دی انڈین میوزیم کلکتہ مرتبہ ایچ۔ نیلسن رائٹ مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۰۷ء جلد ۲ صفحہ ۹۱

پروفیسر سید حکیم محمد کمال الدین ہمدانی
شعبۂ کلیات، اجمل خاں طبیہ کالج
مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

وقائع روزگار

پنڈت دیاناتھ وفاؔ کشمیری کا سفرنامہ

"وقائع روزگارؔ" جناب پنڈت دیاناتھ وفاؔ کشمیری کا مرتبہ ایک سفرنامہ بزبان فارسی ہے جس کی ابتدا چکلہ بریلی سے ہوتی ہے۔ آپ نے سفر کی ابتدا یوم چہارشنبہ ۵ جمادی الاول ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء کو فرمائی جیسا کہ حسب ذیل جملہ سے واضح ہے:

"نیازمند بارادت دیاناتھ پنڈت کہ از اہل کشامرہ بے غل وغش مخلوط است وتخلص باوفا ومقام دلکش چکلہ بریلی بخطاب بخطاب شاہجہاں سوپاریلی است بارادۂ مسافرت وسیر قطائع دور دشت و صد . . . دید صحبت ہائے رنگین مجامع ہر مقامات واستماع مکالمات سحبان لیاقتات واستفادۂ تکلمات از کلام صدق کمالان نیک اوقات در اوائل موسم برسات یکہزار ودوصد بست وپنج ہجری شہر جمادی الاول تاریخ پنجم یوم چہارشنبہ جادۂ پیمائی را بکار آورد وبجست دعوی ارباب کرم روئے اختیار کرد۔"

سفرنامہ کی ابتدا جناب وفاؔ نے حمد سے کی ہے، اور اس کے بعد نعت حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس کے بعد مناقب ائمۂ معصومین علیہم السلام لکھے ہیں۔

نام کتاب و نام تاریخی کتاب آپ کے حسب ذیل جملہ سے واضح ہے:

"پس مصنف ومؤلف ایں نگارنامہ ملقب "وقائع روزگار" ملقب وتسمیہ کرد بصفت مجموعی خرد افروز دانش پرور متصف ساخت از اینکہ در حساب مورخ تاریخ شروعش مقبول خرد (۱۲۲۵) گردیدہ۔"

جناب وفاؔ نے اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر حصہ کو ایک مستقل دیباچہ سے مزین فرمایا ہے۔ دیباچوں

---

[1] وقائع روزگار کا ایک مخطوطہ قدوۃ العارفین "حکیم سید شاہ خیرات علی ہمدانی علیہ الرحمۃ کے کتب خانہ واقع اولاد سید خیرات علی گڑھی، قصبہ جلالی ضلع علی گڑھ میں موجود تھا، اور منتقل آرکائوز آف دہلی کے شعبۂ مخطوطات کو فروخت کردیا گیا۔ حکیم سید شاہ خیرات علی ہمدانی (متوفی ۱۲ رجب ۱۲۲۷ھ/ ۱۸۱۲ء) کا نسبی سلسلہ حضرت حسین اصغر علیہ السلام ابن حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے ہے۔ حضرت میر سید علی ہمدانی علیہ الرحمۃ مبلغ کشمیر بھی آپ کے اجداد میں مبلغ کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ حضرت میر سید علی ہمدانی علیہ الرحمۃ کی نسل سے میر سید کمال الدین ہمدانی بعہد ہمایوں بادشاہ کشمیر سے جلالی وارد ہوئے۔ اور آپ کے خاندان کو جلالی میں عروج حاصل ہوا، اور آپ کی نسل سے حکیم سید شاہ خیرات علی ہمدانی نے فرمانروایان اودھ کے عہد میں بڑا اعزاز حاصل فرمایا۔

کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

دیباچۂ اول :۔ مرصع و مشتمل بوقائع سیاحت عالم

دیباچۂ دوم :۔ ملمع و متضمن از مفاوضات باولاد آدمؑ

دیباچۂ سوم :۔ مکلل و محتوی در تذکرۂ شعرا فی زماننا۔

دیباچۂ سوم کے متعلق پشت ورق ۱۴۱ پر رقمطراز ہیں :

"پس دیباچہ سخن را کہ شیرازۂ جمعیت ۱۲۳۷ نام نہادم"

دیباچۂ اول سفرنامہ سے متعلق ہے جس میں جناب وفاؔ کشمیری نے ان مقامات کا تذکرہ فرمایا ہے کہ جہاں دوران سفر انھوں نے قیام فرمایا اور چونکہ آپ صوفی مشرب تھے، لہٰذا آپ نے عارفین کے مزارات و درگاہوں کا تذکرہ خصوصی طور پر فرمایا ہے۔ مندرجہ ذیل مقامات کا تذکرہ آپ نے سفرنامہ میں فرمایا ہے۔

۱۔ بریلی، ۲۔ آنولہ (ص ۱۵)، ۳۔ بدایوں (ص ۱۶)، ۴۔ اوجھیانی، ۵۔ سوروں (ص ۱۷)، ۶۔ کاس گنج ۷۔ مارہرہ (ص ۲۲)، ۸۔ سکندرہ، (ص ۲۲)، ۹۔ جلیسر (ص ۲۲)، ۱۰۔ آگرہ (ص ۱۹)، ۱۱۔ فتح پور سیکری (ص ۲۷)، ۱۲۔ بھرت پور (ص ۲۹)، ۱۳۔ کہمیر (ص ۲۹)، ۱۴۔ جکنیر (ص ۳۰)، ۱۵۔ بیانہ (ص ۳۱)، ۱۶۔ دھولپور (ص ۳۳)، ۱۷۔ جگنی (ص ۳۳)، ۱۸۔ گوالیار (ص ۳۴)، ۱۹۔ مانجل پور (ص ۳۸)، ۲۰۔ متھرا (ص ۳۹)، ۲۱۔ قرولی (ص ۳۹)، ۲۲۔ قصبہ ہنڈون (ص ۴۶)، موضع برلاوہ پرگنہ ٹونک (ص ۴۷)، ۲۳۔ تودی (ص ۴۸)، ۲۴۔ بگھیرہ (ص ۴۹)، ۲۵۔ کیکری (ص ۴۹)، ۲۶۔ پھولیا (ص ۲۶)، ۲۷۔ شاہ پور (ص ۴۹)، ۲۸۔ نبہرہ (ص ۵۲)، ۲۹۔ اودے پور (ص ۵۳)، ۳۰۔ الور (ص ۵۴)، ۳۱۔ خیر (ص ۵۴)، ۳۲۔ کومل کدہ (ص ۵۴)، ۳۳۔ میواڑ (ص ۵۸)، ۳۴۔ مانڈل و پور مانڈلی (ص ۶۳)، ۳۵۔ مالوہ (ص ۶۸)، ۳۶۔ اوجین (ص ۷۱)، ۳۷۔ جودھپور (ص ۷۴)، ۳۸۔ میرٹھ (ص ۷۸)، ۳۹۔ پالی (ص ۸۰)، ۴۰۔ بیکانیر (ص ۸۴)، ۴۱۔ اجمیر (ص ۸۷)، ۴۲۔ سانبھر (ص ۱۰۳)، ۴۳۔ تاراگڑھ (ص ۱۰۴)، ۴۴۔ چشمہ اناساگر (ص ۱۰۶)، ۴۵۔ احمد نگر گجرات (ص ۱۰۲)، ۴۶۔ کشن گڑھ روپ نگر (ص ۱۰۹)، ۴۷۔ جے پور (ص ۱۱۴)، ۴۸۔ بوندی (ص ۱۱۶)۔

ذکر بوندی کے بعد عبارت نا تمام رہ گئی ہے۔ ورق ۶۲ کے بعد ورق ۶۶ ہے۔ جس سے واضح ہے کہ تین اوراق کی عبارت نقل کرنے سے باقی رہ گئی ہے۔

اس سفرنامہ میں جناب وفاؔ کشمیری نے مذکورہ قصبات اور شہروں کے واقعات نہایت دلچسپ پیرایہ

میں فصاحت کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ خاص خاص تاریخی عمارات، درگاہوں اور مساجد و منادر کا تذکرہ بہ خوبی کے ساتھ کیا ہے، اور مشہور صوفیا و عارفین اور نوابین و راجگان کی مدح بھی فرمائی ہے۔

جناب وفاؔ نے جن مشاہیر کا تذکرہ اس سفرنامہ میں فرمایا ہے ان کی فہرست حسب ذیل ہے:

۱۔ حافظ الملک حافظ رحمت خاں بہادر (ص ۱۴)، ۲۔ شیخ بدیع الدین احمد حکیم ملقب تخویخلص (ص ۱۰)، ۳۔ نواب علی محمد خاں (ص ۱۶)، ۴۔ حضرت بدرالدین عارف (ص ۱۶)، ۵۔ میاں آل احمد ملقب اچھے میاں مارہرا (ص ۲۰)، ۶۔ جلال الدین اکبر بادشاہ گورگانی، ۷۔ شاہجہاں (ص ۲۰)، ۸۔ اورنگ زیب (ص ۲۰)، ۹۔ حضرت میر چشتی قدس اللہ (ص ۲۸، ۱۰۸)، ۱۰۔ تیجے پال جادون بیانہ (ص ۳۱)، ۱۱۔ سید مسعود سالار غازی (ص ۳۱)، ۱۲۔ راجہ رام چندرجی (ص ۳۴)، ۱۳۔ لچھمن (ص ۳۵)، ۱۴۔ میاں محمد غوث (ص ۳۶)، ۱۵۔ شاہ کبیر (ص ۳۶)، ۱۶۔ خواجہ قانون رحمہم اللہ تعالیٰ (ص ۳۶)، ۱۷۔ میاں تان سین (ص ۳۷)، ۱۸۔ راجہ ہزبخش پال خلف راجہ مانک پال (ص ۴۳)، ۱۹۔ عارف باللہ سید عتیق اللہ از آل امیر المومنین امام تقیؑ (ص ۴۴)، ۲۰۔ مولانا ابو المعانی تاج محمد، ۲۱۔ حکمت مآب فرزند علی (ص ۴۴)، ۲۲۔ کنور رستم خاں خلف اللہ ٹھاکر دودمدے خاں (ص ۴۶)، ۲۳۔ محمد شاہ خاں (ص ۴۷)، ۲۴۔ نواب محمد امیر خاں (ص ۴۰)، ۲۵۔ محمد جمشید خاں (ص ۴۸)، ۲۶۔ محمد سعید خاں (ص ۴۸)، ۲۷۔ راجہ امر سنگھ بھوپیا (ص ۵۰)، ۲۸۔ کمانجی راؤ سندھیہ (ص ۵۰)، ۲۹۔ راجہ ہندو سیٹھ (ص ۵۳)، ۳۰۔ رانا بھیم سنگھ (ص ۵۵)، ۳۱۔ خواجہ خواجگان حضرت خواجہ معین الدین چشتی سجزیؒ (ص ۹۲)، ۳۲۔ شاہ تنہا صاحبؒ (ص ۸۳)، ۳۳۔ راجہ مان سنگھ راٹھور (ص ۸۴)، ۳۴۔ حضرت ابو صالح قدس اللہ سرہ (ص ۹۶)، ۳۵۔ حضرت محتشم علی (ص ۹۷)، ۳۶۔ میر عظیم اللہ خادم درگاہ (ص ۹۷)، ۳۷۔ بی بی حافظ جمال (ص ۱۰۰)، ۳۸۔ سید میراں خنگ سوار شہید (ص ۱۰۴)، ۳۹۔ حضرت شاہ شرف بو علی قلندر (ص ۱۰۸)، ۴۰۔ حضرت احمد شہید روح اللہ (ص ۱۰۸)، ۴۱۔ راجہ کلیان سنگھ (ص ۱۰۹)، ۴۲۔ سید غلام علی شاہ ساکن بارہ میراں پور (ص ۱۱۱)، ۴۳۔ مولوی ضیاء اللہ احسن اللہ برکاتہم (ص ۱۱۵)، ۴۴۔ مولوی فخر الدین قدس اللہ سرہ العزیز (ص ۱۱۵)، ۴۵۔ سید قمر علیؒ (ص ۱۹۴)، ۴۶۔ سراج الدین احسن اللہ (ص ۲۲۰)، ۴۷۔ حاجی داؤد احمد (ص ۲۲۴)، ۴۸۔ شیخ فرید گنج شکر (ص ۲۲۰)، ۴۹۔ حکیم محمد اسحاق (ص ۲۳۷)، ۵۰۔ سید عطا حسین (ص ۲۷۵)، ۵۱۔ سید واصل علی ولد سید غلام علیؒ۔

جناب وفاؔ کشمیری ایک انشا پرداز فارسی ادیب تھے۔ آپ کی تحریر میں فسانۂ عجائب کا رنگ نمایاں ہے۔ آپ کی نثر فارسی نہایت مقفیٰ، مسجع اور لفظی و معنوی صنائع و بدائع سے آراستہ ہے۔ نمونہ نثر ملاحظہ ہو۔

اچھے میاں صاحب مارہروی کا ذکر اس طرح فرماتے ہیں :

"در مارہرہ از مدت مدید معمر شدہ بزرگے و بآل احمد موسوم کہ ملقب بہ اچھے میاں مشہور عمر شریف بیش از ہشتاد و کم از نود علم حقیقت چوں دریافت علوم ظاہر والا نثراد عالی گہر مریدان صاحب ارادت زیادت از لکھنو حاضر و غائب مشغول بیاد حق سید السیادت چیست از حسب و نسب بر تحقیق تہی و منکر طبیعت منحرف سر راہ زیارت نمودہ۔ الخ" (ص ۱۲)

سید مسعود سالار غازی کا ذکر اس طرح فرماتے ہیں :

"شاہ قندھار ابوبکر مع فوج بے شمار و عساکر خونخوار بمعیت جناب فیض مآب سید السیادت میر ایران ولایت برگزیدہ گاہ خدائے سید ۔ و سالار غازی فتح این در ہند کردہ درایت دین مصطفوی را با پرچم حیدری مرتضوی اقامت فرمودہ چوں فوج طرفین او باجتماع نہادہ افتادہ جنگ بدے کار افتاد آخر شد الحرب سجال گاہ غالب و گاہ مغلوب می شدند چندانکہ غازیان نصرت مند بعنایت ساقی کوثر جام حیات از آب شیرین ممات لبریز کردہ بانعام و عطایائے مناسب در مدارج شہادت در سلک غازیان شہید اکبر عزیز و سرخرو شدند الخ"

خواجہ اخواجگان حضرت معین الدین چشتی سجزی اجمیری علیہ الرحمۃ کی زیارت کا حال لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں :

"در ماہ رمضان المبارک اشتیاق زیارت سراپا برکت و افادت رہنما گشتہ مشہد طرفہ جائیست کہ حضرت نجرات مجرے بر مقدمات کاشف و قائق خفی و جلی واقف حقائق دینی و دنیوی شہسوار فنائی جبروت گرم او بوادی لاہوت مصدر نشان امامت حیدری منبع زلال شان دادری دانائے علم و حکمت الٰہی آشنا سائے اسرار معرفت آگاہی، خاص الخاص درگاہ جناب مصطفیٰ مخصوص بارگاہ مرتضیٰ۔ خاک درش کحل البصارت اہل بصر گرد آستانہ اش نور دیدہ جن و بشر، نور بصر آفرینش چشم و چراغ بینش حضرت خواجہ خواجگان معین الدین چشتی الحسینی سجزی۔ آفتاب ملک ہند نور اللہ تعالیٰ طین تراب، در تراب مزار ملحق از جانب حسب و نسب تا حضرت امیر المومنین اسد اللہ غالب بمدارج و مراتب مفصلہ ہذا السطور بن حضرت غیاث الدین حسنؒ بن ضیاء الدین حسنؒ بن عماد الملک بن عبد اللہ اعرج بن حسین الاصغر بن امام زین العابدین بن امام ابی عبد اللہ الحسین و بعضے برآیند کہ از حضرت غیاث الدین احمد بن حضرت نجم الدین بن حضرت ابراہیم بن حضرت امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن حضرت امام محمد باقر بن حضرت امام زین العابدین بن حضرت امام سید الشہداء المقتول دشت کربلا حسین ابن علی کرم اللہ وجہہ علیہ الصلوٰۃ والسلام۔ از جاروب معجزات و ولایت خس و خاشاک جہل و بطلان

از کوچہ وسیع وسعت آباد ہندوستان جنت نشان پاک ساختہ قدم ثبات فشردہ جتذلان کوئے ضلالت راہہدایت آوردہ وظلمت زدگان تنگنائے ذلالت را ضیائے اعتقاد بخشیدہ مقبول اہل قبول گردانیدہ و فیض عام از فیوضات خاص وتام از محسنات اخلاص عطا کردہ۔"

نیز حسب ذیل قطعہ سے سال ولادت وفات شریف جناب وقاؔ نے اخذ فرمائی ہے ؎

گونہ بود وجود شریف در عالم شفیع یوم جزا آمد آں زرد آنشد

حسب باآل عباست ہم نسب بہ علی وفات یافت چوں از رب بحق پوشید

شفیع یوم جزا سے سال ولادت اور باآل عبا سے سن مبارک اور بحق پیوست سے تاریخ وفات شریف اخذ کیا ہے۔

سید میراں خنگ سوار شہید اجمیری کا ذکر آپ نے اس طرح فرمایا ہے:

"در بالائے کوہ قلعہ تارا گڑھ کہ استحصال آں بیروں از وہم و قیاس در زمانیکہ سید میراں حسینؒ خنگ سوار شہید کا برا ولیائے آمدہ محرمان راز خلاصہ واقفان اسرار خلوص خاندان نبوت چشم و چراغ دودمان امامت باوصف قرابت قریبہ از حضرت دلی نسبت خصوصیت بیعت بیداشتند با مدیران جہول العافیت مرحوم العافیت جنگ و حرب میان آمد حصر با ہمرہان عاقبت بین و کار اندیش و جوانان صادق الارادت بینائے انجام پیش و حملہ بہ قلعہ کردند کہ بلندی آں سر با سمان میکشید و قلعہ را خالی کردند۔ بعد از چندگاہ خود معہ جمعیت غفیر از زدن شمشیر اعیان بد عاقبت سرشت شہادت چشیدند وہر یکہ بمقام عظمیٰ واصل شد ندکہ گرد و نواح روضہ مرغزار شہدا بطوریکہ خوابیدہ بودند در جواب بقائے فنا رفتند ہشتدہم ماہ رجب المرجب عرس می شود دریں ہنگام بوقت قل عجب حالت رو میدہد کہ از تحریر و تقریر زیادہ تعلق بزیارت است نہ بر گفتار کار بکردار است نہ باظہار و در حین حیات کہ جلال جہاں قلعہ شد بزبان الہام ترجمان گذشتہ بعد کہ از امروز تا حتکہ اشرار اینجا قائم خواہند جنگ ایں قلعہ بیش از شش ماہ بخواہد کشید چنانچہ بوقت رسیدن فوج غنیم و قوام مورچال از جانبین برگاھیکہ وعدہ موعد واقرار موضوع منقضی شد الخ۔" (ص ۱۰۴/۵)

امیر الدولہ نواب محمد امیر خان بہادر کا ذکر موضع بر لادہ ٹونک کے حالات میں اس طرح فرمایا ہے:

"موضع بر لادہ کہ تعلق از پرگنہ ٹونک دارد بہرہ کردہ شامل حال لشکر نواب مستطاب شدند وہم برائے حصول معاملہ امیر الدولہ نواب محمد امیر خان مع جمیع ارکین وانبوہے فوج مورچال قائم کردہ بودند خلائے آں خلال یافتہ وکشائش در توقف ماندتا آنکہ صلح بعد یک نیم سن واقع شد گرفتن دکان از یک دو ماہ زیادہ بکشید

لیکن تغافل فوج بود و مدتیکہ دو وقوع حرب می کردند از ین جہۃ بوقت ظہور گرفت دریں کشاکش قضا یاد مرنیا از اقتضائے منش و تقاضۂ طینت افغانان خصوصاً سرداران جدید الاحوال والا دل محمد جمشید خان و محمد سعید خان بہ بہانہ و حیلہ محمد شاہ خان را گرفتار کردند و فتنۂ خوابیدہ بیدار چوں افسران بلیش خان مذکور مربی خود را مقید دیدہ در انگیختن فساد شدند کار خود دانستہ امیر الدولہ را کہ بباطن دم خرابی می زد و نظام رسانیدہ در روزہ دریں صورت امیر الدولہ صلاحاً و مشورۃً بخیہ بر روئے فساد کردہ و سخنا چرب و نرم خود را و خان مذکور را از دست سپاہ رہانید بجلد ہی تمام در فوج ممدوح آمدہ امان یافتند و بود باش خود مقرر ساختند تا آنکہ بعد یک ہفتہ کہ نفاق باتفاق پیوست و منازعہ و مناقشہ بمصالحہ افتاد و بادئ و غوغا ہر طرف ماند و فتنہ نشست و فساد برخاست از ہم رخصت شدہ۔"

دیباچہ اول بوقائع سیر دلت عالم ایک مستقل تصنیف بصورت سفرنامہ ہے، جس میں روہیلکھنڈ اور راجستھان کے قصبات اور شہروں اور ان میں واقع شدہ درگاہوں، مساجد اور تاریخی عمارات کا تذکرہ جناب وفا نے نہایت دلکش پیرایہ میں بزبان فارسی فرمایا ہے۔ اس میں کہیں کہیں اصلاحات بقلم مؤلف درج ہیں، جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ مخطوطہ بقلم مصنف پنڈت دیا ناتھ وفا کشمیری ہے۔ ابتدائی ورق کے علاوہ ورق ۸ / ۹ بھی نادر د ہیں۔ نیز ورق ۷ ۱۰ کے بعد بھی اوراق نادر د ہیں۔

دیباچہ دوم: ملمع و متضمن از مفاوضات باولاد آدم : (موسومہ بنام تاریخی شیرازۂ جمعیت ۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء)

شیرازۂ جمعیت جناب وفا کی دوسری تصنیف ہے، جو وقائع روزگار کے ساتھ شامل ہے۔ اس کی ابتدا بھی حمد و نعت و منقبت آل اطہار علیہم الصلوٰۃ والسلام سے کی گئی ہے۔

مذکورہ دیباچہ عرفان و تصوف سے متعلق مفاوضات (رقعات) پر مشتمل ہے۔ ان خطوط میں آیات قرآن مجید، احادیث اور اقوال و اشعار صوفیہ کی روشنی میں حقائق و عقائد تصوف بیان فرمائے ہیں۔ مطالب اعلیٰ و ارفع ہیں، اور زبان فارسی نہایت فصیح و بلیغ ہے۔ اس دیباچہ کے مطالعہ سے واضح ہے کہ جناب پنڈت دیا ناتھ وفا کشمیری اپنے عہد کے اعلیٰ پایہ کے صوفی تھے۔ نمونہ تمہید عارفانہ ملاحظہ ہو۔

"ہر گاہ کیہ خلقت لقد کرمنا بنی آدم ساخت و ضدات عناصر را جامع شدہ خواست کہ جود را و نماید و قدرت را ظاہر سازد وجود سراپا جود سرور کائنات فخر موجودات بیت ؎

شَفِیْعٌ مُطَاعٌ نَبِیٌّ کَرِیْمٌ قَسِیْمٌ جَسِیْمٌ نَسِیْمٌ شَمِیْم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم را از کمال نور مسلم و ظہور مجسم خود بر تختۂ ابلگون عزت داد و بر کرسی زبرجدی فرانشاند ملائک تسبیح شکر نعمت خوانند و کشش جہت احسان رحمت شمرانند مہاردن وارشاہ دلدل سوار مالک الرقاب کونین واسطہ شفاعت ثقلین اِنَّمَا یُرِیدُ اللّٰہُ لِیُذْہِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَہْلَ الْبَیْتِ وَیُطَہِّرَکُمْ تَطْہِیْراً اسد اللہ الغالب کل غالب علی ابن ابی طالب سلموا تسلیما را مختار و سزاوار نمود. الخ"

مفاوضات (خطوط) کی فہرست حسب ذیل ہے۔

دیباچہ دوم متضمن از مفاوضات باولاد آدم موسومہ بہ شیرازۂ جمعیت ایک مستقل تصنیف تصوف میں ہے۔ یہ ۲۹ نسطوط پر مشتمل ہے جن میں مسائل تصوف بیان کئے گئے ہیں۔

مخطوطہ کل ۲۸۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ تقطیع ۸″ × ۶″ انچ۔ سطریں فی صفحہ ۱۱، قلم جلی، سرخیاں سرخ روشنائی سے باقی عبارت سیاہ روشنائی سے تحریر کی گئی ہے۔

مخطوطہ کا اختتام حسب ذیل جملہ پر ہے:

"از امداد اعانت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بہ تمم بالخیر رسانیدم واللہ مستعان وھو علی کل شئی قدیر

فیضی غم دل تمام کردیم اتمام برین کلام کردیم

آخری صفحہ پر حسب ذیل حاشیہ درج ہے:

"این کتاب دیا ناتھ پنڈت وفا رضوان اللہ ہنگام روانگی خانہ یعنی در وقت روانہ قسمت برئلی بہ پدر امر بسیدی کول داد اگر کسے دعوی کند باطل و کاذب باشد" خریدہ کتاب ۸۴ روپیہ

کتاب "وقائع روزگار" پنڈت دیا ناتھ وفا کشمیری نے ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں لکھی ہے۔ اس دور میں روہیلکھنڈ اور راجستھان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ ہو چکا تھا۔ روہیلکھنڈ نوابان اودھ کے تحت اور راجستھان راجہ و رانا و نوابین کے تحت تھا۔ لہٰذا جناب وفا نے اس سفرنامہ میں راجگان و نوابین راجستھان اور صوفی بزرگان کے اوصاف بھی بیان فرمائے ہیں۔ اور درگاہوں اور تاریخی عمارات کی شان و شوکت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ غرضیکہ یہ سفرنامہ اس عہد کے تاریخی و تمدنی معاشرہ کا آئینہ دار ہے، اور اس عہد میں تصوف کے اثرات کو واضح کرتا ہے اور ایک فارسی نادر مخطوطہ کی حیثیت سے اس کی اشاعت مع ترجمہ اردو ضروری ہے تاکہ اس سے فارسی داں حضرات کے علاوہ اردو داں حضرات بھی مستفیض ہو سکیں۔

●●

بیانِ ملکیت سہ ماہی خدا بخش لائبریری جرنل اور دیگر تفصیلات

مطابق فارم نمبر ۴، قاعدہ نمبر ۸

۱۔ مقام اشاعت : خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۔۴

۲۔ وقفہ اشاعت : سہ ماہی

۳۔۴ پرنٹر و پبلشر کا نام : مصطفیٰ کمال ہاشمی

قومیت : ہندستانی

پتا : اسسٹنٹ لائبریرین، خدا بخش لائبریری، پٹنہ

۵۔ ایڈیٹر کا نام : عابد رضا بیدار

قومیت : ہندستانی

پتا : ڈائرکٹر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۔۴

۶۔ ملکیت : خدا بخش لائبریری، پٹنہ ۔۴

میں مصطفیٰ کمال ہاشمی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے ساتھ درست ہیں

دستخط پبلشر : مصطفیٰ کمال ہاشمی

یکم فروری ۱۹۹۰ء

پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی (مرحوم)
سابق ڈین، شعبہ دینیات، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی
سابق ایڈیٹر "برہان" دہلی

ذاکر صاحب
چند یادیں

جب ذاکر صاحب، بہار کے گورنر ہو کر پٹنہ آئے۔ میں اس زمانے میں کلکتہ مدرسہ کا پرنسپل تھا۔ اس زمانے میں ذاکر صاحب نے دو باتیں ایسی کیں جو مجھ کو ابتک یاد ہیں اور ان کا میرے اوپر بڑا اثر ہے۔ ایک بار ذاکر صاحب گورنمنٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہاں مس نائیڈو (جو اس زمانے میں مغربی بنگال کی گورنر تھیں) نے ذاکر صاحب سے کہا کہ ہمارے کلکتہ مدرسہ کے پرنسپل اکبرآبادی صاحب مدرسہ چھوڑ کر جا رہے ہیں اور اس کا مجھے بڑا افسوس ہے کیونکہ ان کے بعد ہمارا مدرسہ تباہ ہو جائیگا، لہذا آپ اکبرآبادی صاحب کو روکیے۔ ذاکر صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ گورنر صاحبہ یہ کہتی ہیں کہ آپ کے جانے کے بعد ہمارا انسٹی ٹیوشن تباہ ہو جائے گا لہذا آپ رہ جائیے۔ تو میں نے معذرت کی اور کہا کہ میں تو جانے پر مجبور ہوں، کیونکہ وعدہ کر چکا ہوں۔ انہوں نے کہا، خیر جب آپ کمٹمنٹ کر چکے ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں لیکن اپنی قائم مقامی کے لیے کوئی ایسا آدمی دیکھیے جو آپ کے نزدیک قابل اعتماد ہو۔ تو میں نے ایک صاحب کا نام تجویز کر دیا جسکی باقاعدہ کارروائی ایک سلکشن کمیٹی کے ذریعہ ہوئی۔

میں نے انھیں ایک بار خط لکھا، جب وہ بہار کے گورنر تھے، کہ میں اب علیگڑھ جا رہا ہوں اور مجھ کو افسوس ہے کہ میں علی گڑھ اس وقت جا رہا ہوں جب آپ نہیں ہیں تو اس پر ذاکر صاحب نے ایک پوسٹ کارڈ لکھا کہ مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ علی گڑھ جا رہے ہیں۔ مگر افسوس اس کا ہے کہ اس وقت جا رہے ہیں جب میں نہیں ہوں اور اس پر یہ شعر لکھا:

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

اللہ اکبر! کس قدر شریف آدمی تھے اور باوضع۔

وہ جو مالک رام صاحب نے کتاب چھاپی ہے "نذر ذاکر" اس میں میرا بھی ایک مضمون ہے۔ ذاکر صاحب میں ایک جذبۂ تشکر پیدا ہوا کہ میرے لیے جو کتاب تیار ہوئی ہے اس میں اکبرآبادی صاحب نے بھی حصہ لیا ہے، اور اس کا اندازہ

مجھے بعد میں ہوا جب میں ان سے ملنے راشٹرپتی بھون گیا۔ ہمارے ساتھ پروفیسر خلیق احمد نظامی، اسلوب احمد انصاری اور مالک رام وغیرہ بھی تھے۔ اس ملاقات کے تقریباً ایک سال بعد ذاکر صاحب کا خط آیا۔ انہوں نے لکھا کہ مجھے اظہار تشکر میں تاخیر اسلئے ہوئی کہ میں نے ابتک آپ کا مضمون نہیں پڑھا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا پہلے پڑھ لوں پھر لکھوں۔ ایک صاحب میز پر سے وہ کتاب اٹھالے گئے اور انہوں نے بہت دیر میں واپس کی اور مجھے شرم آتی تقاضا کرتے ہوئے۔ لہذا جب وہ کتاب آگئی تو میں نے پڑھنا شروع کیا۔ میں نے آپ کا مضمون پڑھا اور اب میں انتہائی مسرت کے ساتھ اپنے جذبات تشکر آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ شکر گذار ہوں کہ آپ نے بڑا اچھا مضمون لکھا۔

تقسیم کے بعد، مولانا ابوالکلام آزاد نے ہم کو ایک مرتبہ لنچ پر بلایا۔ میں تو سب کا خورد تھا، عمر میں بھی کم۔ لیکن بہرحال ان لوگوں کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اس لنچ پر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، مولانا کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، ڈاکٹر ذاکر حسین، شفیق الرحمٰن قدوائی، یہ سب لوگ موجود تھے۔ کھانا ہوا۔ کھانے کے بعد کچھ باتیں ہوئیں کہ کیا کیا جائے۔ یہ غالباً ۱۹۴۸ء دسمبر کی بات ہے یعنی پارٹیشن کے بالکل قریب۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ مولانا! اب جبکہ ایک سیکولر گورنمنٹ یہاں قائم ہو گئی ہے تو اب جو تعلیمی اداروں کے ساتھ فرقہ وارانہ نام لگے ہوتے ہیں، یہ چلے گی بات؟ جیسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تو کیا "مسلم" کا لفظ رہے گا؟ بنارس ہندو یونیورسٹی، یہ "ہندو" کا لفظ رہے گا؟ یہ تو نہیں رہنا چاہیے۔ وہ تو سیکولر گورنمنٹ ہوگی۔ ذاکر صاحب کی اس بات پر مولانا آزاد کچھ خاموش سے ہو گئے۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے انہیں خاموش دیکھ کر عرض کیا کہ ڈاکٹر ذاکر صاحب اور شفیق الرحمٰن قدوائی صاحب، یہ دونوں گواہ ہیں اس بات کے کہ جامعہ ملیہ کی جب مالی حالت خراب ہو گئی تو اس پر غور و خوض کرنے کے لیے ڈاکٹر انصاری صاحب کی کوٹھی پر دریا گنج میں ایک اجتماع ہوا۔ مہاتما گاندھی سیٹھ جمنالال بجاج (جو اس زمانے میں کانگریس کے ٹریزرار تھے) ڈاکٹر ذاکر حسین حکیم اجمل خاں اور شفیق الرحمٰن قدوائی یہ سب موجود تھے۔ اور اس پر گفتگو ہو رہی تھی کہ جامعہ کی مالی حالت بڑی خراب ہے۔ اب کیا کریں؟ اسے بند کریں یا جاری رکھیں اس پر سیٹھ جمنالال بجاج نے حکیم اجمل خاں کو خطاب کرتے ہوئے یہ کہا کہ حکیم صاحب! اگر آپ اس سے اسلامیہ کا لفظ نکال دیں تو میں آپ کو ہندوؤں سے لاکھوں روپئے لاکر دے سکتا ہوں، اور جب تک "اسلامیہ" کا لفظ رہے گا، میں ہندوؤں سے روپیہ نہیں لا سکتا۔ اس پر گاندھی جی اٹھ کے بیٹھ گئے اور کہنے لگے، بجاج! تم کیا کہتے ہو؟ جامعہ سے جب اسلامیہ کا نام ہٹا لیا جائے تب تم ہندوؤں سے روپیہ لا سکتے ہو؟ ورنہ نہیں؟ بھئی میں نے تو یہ لفظ خود بڑھوایا ہے اور ایسا میں نے اسلئے کیا کہ اسلام کی تہذیب ایک بہت بڑی تہذیب

ہے اور وہ کلچر ایسا ہے کہ تمام انسانوں کا اس پر حق ہے۔ اس میں ہندوؤں کا بھی حق ہے اور عیسائیوں کا بھی۔ یہ تو دنیا بہت بڑا کنٹری بیوشن ہے۔ لہٰذا اس کے لیے ایک درس گاہ ایسی ہونی چاہیے جس میں اسلامی تہذیب کی تعلیم دی جا پھر انہوں نے یہ بھی کہا کہ فرض کیجیے کہ میرا لڑکا دیدی داس ــــــ میں کہتا ہوں کہ اگر تم ہندو تہذیب کی تعلیم حاصل چاہتے ہو تو بنارس جاؤ، لیکن اگر اسلامی تہذیب کی تعلیمات لینا چاہتے ہو اور لینی چاہیئے۔ تو میں کہاں بھیجوں؟ ــــ میں تو خود ہی اسلامیہ کا لفظ لگوایا ہے بجا بجا ارے حکیم صاحب! آپ اسکی بات نہ مانیے گا۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں اسلامیہ کا لفظ اس میں رہے گا اور میں اسی نام کے ساتھ آپ کو ہندوؤں سے لاکھوں روپئے دلواؤں گا۔ چلیے! ساتھ مدراس۔ چنانچہ مدراس کا دورہ کیا۔ یہ کیا، وہ کیا۔ یہ واقعہ جب میں نے سنا تو میں نے دیکھا کہ مولانا آزاد پر کا بڑا اثر ہوا بات یہ ہے کہ وہ ایسے آدمی تھے کہ ان کے اندرونی جذبہ کا اظہار ان کے چہرے سے فوراً ہو جایا کرتا اور اس کے بعد انہوں نے ذاکر صاحب سے پوچھا، کیا واقعی آپ موجود تھے اس وقت؟ انہوں نے کہا جی ہاں میرے سامنے کی بات ہے۔ پھر شفیق الرحمٰن قدوائی سے پوچھا۔ قدوائی صاحب! آپ بھی موجود تھے اس وقت انہوں نے کہا جی ہاں!

ذاکر صاحب کے بہت لوگوں سے تعلقات تھے قرول باغ میں۔ ان کی سادگی ان کی وضعداری، ان کی مروت اور ان کا لحاظ واقعی وہ ایک اعلیٰ اخلاق کے انسان تھے۔ قرول باغ میں جب ہم لوگوں نے ٹیوشن کا دفتر قائم کیا تو اس وقت یہ جامعہ ملیہ نہیں تھا۔ اور ذاکر صاحب ایک مکان میں رہا کرتے تھے۔ عابد صاحب بھی وہاں پر رہتے تھے اور مجیب صاحب بھی سب سے شاندار مکان مجیب صاحب کا تھا۔ کیونکہ مجیب صاحب گھر کے بڑے مالدار تھے جامعہ سے جو تنخواہ ملتی تھی، وہ تو برائے نام تھی۔ کچھ تر روپئے کا عہد و پیماں کیا تھا ان تینوں لوگوں نے۔ پروفیسر مجیب، ڈاکٹر عابد حسین اور ڈاکٹر ذاکر حسین۔ ان تینوں نے طے کیا تھا کہ صرف ۵۰ روپئے ماہوار تنخواہ لیکر اپنی ساری زندگی DEVOTE کر دیں گے جامعہ ملیہ کی خدمت میں ان میں سب سے زیادہ غریب بیچارے ذاکر صاحب تھے۔ مگر صاحب میں نے اس زمانہ میں دیکھا کہ تنگ دستی کا کوئی اثر نہیں وہی ہشاش بشاش اور بہت خوش۔ زندگی نہایت سادہ تھی۔ چونکہ ہمارے دفتر برھان، کے قریب ہی ان کا مکان تھا۔ تو اکثر ہم لوگ جایا کرتے تھے۔ کبھی شام کو چلے گئے اور کبھی اتوار کو چلے گئے۔ چائے کی پیالی آیا کرتی تھی اس میں بعض پیالیاں صحیح ہوتی تھیں اور بعض پیالیاں ٹوٹی ہوتی تھیں کبھی پرچ ٹوٹی ہوتی تھی۔ فقط چائے۔ بہت ہوا تو اس کے ساتھ بسکٹ وغیرہ دیدیتے۔ کھانا وہ گھر میں ہی پکوا سکتے تھے چونکہ

اہ میں اتنی گنجائش ہی نہیں تھی تو طلبا کے لیے جو مطبخ میں کھانا پکتا تھا اسی کو وہ خرید لیتے تھے اور وہی کھانا چلتا
ا کمرے کے اندر ایک تخت بچھا ہوا تھا اور اس کے اوپر کھدر کی چادر۔ چونکہ صفائی، ستھرائی کا انہیں بہت خیال
تھا مونڈھے تھے وہ بھی ٹوٹے پھوٹے۔ مگر ان کے اوپر کشن وغیرہ رکھا ہوا تھا، وہ بھی کھدر کا۔ صفائی ستھرائی بہت
دہ تھی مگر بیحد سادگی کے ساتھ۔ اس زمانے میں رکشہ۔ رکشہ تو کہیں تھا نہیں، تانگے تھے۔ دیکھا کہ یکے میں بیٹھے ہوئے
جا رہے ہیں ٹرام وے چلتی تھی ہندو راؤ کے باڑے سے لیکر فتح پوری یا جامع مسجد تک۔ تو دیکھا کہ ذاکر صاحب
حہ علیہ سے لیکر ہندو راؤ کے باڑے تک، جہاں سے ٹرام وے چلتی تھی۔ وہاں تک پیدل آتے تھے اور ہندو راؤ
، باڑے آکر ٹرام وے میں بیٹھتے تھے۔ اس زمانے میں شاید ایک آنہ کرایہ تھا اور اس طرح سے وہ جاتے تھے
۔ کوئی اثر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ایک بہت بڑا انسان ہے جس کے سامنے ایک اعلیٰ مقصد ہے اور اس کے لیے وہ
سم کی قربانیاں دے رہا ہے۔ اس طرح میرے اوپر ان کا بڑا اثر ہے۔ ان کے کردار کا۔ اور میرے ساتھ تو ان کے
مت پرانے تعلقات تھے۔ میں اس وقت قرولباغ میں تھا۔ اور پھر جب میں جامع مسجد پر رہنے لگا چونکہ
ہے سب وہیں چلے گئے تھے۔ چوڑی والان کے محلہ میں شمسی کا بچّہ ہوا کرتا تھا، میں اس میں رہا کرتا تھا۔
معین شمسی کے ساتھ۔ معین الدین شمسی صاحب جرمنی میں پڑھے ہوئے تھے ڈاکٹر ذاکر صاحب اور ڈاکٹر عابد صاحب
ے جرمنی کے دوستوں میں تھے۔ یہ میکنکل انجینئرنگ کے لیے گئے ہوئے تھے۔ ان کا کارخانہ SONS & J کے نام سے
نہاں پہ ہے میرے بہت گہرے دوست ہیں جرمنی کے پڑھے ہوئے ہیں اب بھی ہیں دلّی میں۔ آپ کو ان کا ایک
ور پتا بتاؤں۔ یہ جو پاکستان میں اصغر علی خاں ہیں نا۔ ایر مارشل اصغر خاں۔ وہ ان کے داماد ہوتے ہیں سید معین الدین
شمسی کے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی شادی ان کی بھتیجی سے ہوئی ہے شمسی کا بچّہ کا بہت مشہور خاندان ہے ان
کے والد حکیم اجمل خاں کے خاص دوستوں میں تھے۔ حکیم صاحب کی جو مجلس رات کو شروع ہوتی تھی اور بارہ
بلکہ بجے رات تک چلتی تھی اس میں وہ بالالتزام شریک ہوتے تھے۔ سید معین الدین شمسی وہاں کے خاندانی لوگوں
میں ہیں تو ہیں جناب۔ ان کے ساتھ رہا کرتا تھا شمسی کا بچّہ کے اندر۔ ایک تو ہم سے تعلق، پھر معین الدین شمسی
سے جرمنی کا تعلق۔ لہٰذا ذاکر صاحب نے ہم سے وعدہ کیا کہ چوڑی والان کے محلّے کی نہاری بڑی عمدہ ہوتی ہے
وہاں ایک دوکان ہے جو بہت عمدہ نہاری پکاتا ہے۔ لہٰذا پورے سیزن میں، ایک دعوت نہاری کی نہاری
طرف سے ہوگی اور ایک دعوت معین شمسی کی طرف سے۔ تو صاحب! اس طرح وہ دو دعوتیں ہمارے ساتھ کھاتے
تھے۔ اور نہاری بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ اسی میں وہ بیمار ہوئے چونکہ وہ کھانے میں احتیاط نہیں کرتے تھے۔

جناب ضیاء الحسن فاروقی
جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

ذاکر صاحب
چند یادیں، چند باتیں

۱۹۴۶ء کا زمانہ تھا!

ذاکر صاحب علی گڑھ آئے ہوئے تھے، رشید صدیقی صاحب کے یہاں قیام تھا۔ اس کے تین دن یا چار دن قبل علی گڑھ کے دو اولڈ بوائے عبدالرحمٰن صدیقی اور ڈاکٹر سید حسن علی گڑھ آئے تھے یہ دونوں دوست تھے اگرچہ ان کے سیاسی خیالات ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ مشہور تھا کہ عبدالرحمٰن صدیقی ہی جنہیں علی گڑھ کے طالب علموں کی اس روایت پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ بلالحاظ اختلافات سیاسی و فکری علی گڑھ کے تمام اولڈ بوائز کا پورا پورا احترام کرتے ہیں، سید حسن کو بار بار علی گڑھ لاتے تھے۔ لیکن علی گڑھ کے مسلم لیگی طلبا نے جن کی اس وقت یونیورسٹی میں بھاری اکثریت تھی اس وقت اس روایت پر خط تنسیخ کھینچ دیا، عبدالرحمٰن صدیقی کو مایوس کیا اور سید حسن کی نہ صرف یہ کہ تقریر نہیں سنی بلکہ ان کی توہین و بے عزتی کی۔

شرمندگی کا احساس لیے ہم چند طالب علم جن میں ریاض الرحمٰن شیروانی، سعید اختر مرحوم (اور شاید اقبال انصاری) کے نام یاد ہیں (ایک صاحب کا نہیں یاد آرہا ہے) رشید صاحب کے مکان پر ذاکر صاحب سے ملنے گئے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ ذاکر صاحب بڑی خندہ پیشانی سے ملے ڈاکٹر سید حسن مرحوم کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس کی انہیں خبر تھی، ہم میں سے کسی نے اس کا ذکر کیا ہی تھا کہ ذاکر صاحب نے فرمایا "جی ہاں مجھے اس حادثہ کا علم یہاں آکر ہوا، یاد رکھیے اگر علی گڑھ کا یہی حال رہا تو آپ لوگوں کو کوئی اچھا آدمی دیکھنے اور سننے کو نہ ملے گا۔" پھر وہ خاموش ہوگئے۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی، ہم سب سراپا ندامت تھے، ذاکر صاحب کو شاید ہماری حالت پر رحم آیا، گویا ہوئے:

"اوہاں آپ لوگوں نے اپنا اپنا تعارف نہیں کرایا،" ہم میں سے ہر شخص نے تعارف کرایا، اور پھر ہم نے یونیورسٹی میں نیشنلسٹ خیالات اور ان کے عاملین پر جو گذر رہی تھی اس کا مختصراً ذکر کیا، لیکن اس کے بعد یہ محسوس کر کے کہ شاید یہ موضوع بے موقع ہے، ہمارے ایک ساتھی نے جامعہ کے ذکر ساتھ قومی خدمت کا موضوع چھیڑ دیا۔ اس پر ذاکر

صاحب نے ہم میں سے ہر ایک سے پوچھنا شروع کیا کہ "آپ اپنی تعلیم ختم کر کے کیا کریں گے"۔ سب کی زبان پر تھا، "قومی خدمت" سوائے ایک صاحب کے کہ ان کا نمبر آخر میں تھا۔ ذاکر صاحب نے ان کی طرف دیکھ کر کہا، "اور آپ بھی قومی خدمت کریں گے" وہ گھبرا گئے۔ اس کے لیے تیار نہ تھے، سراسیمگی میں جواب دیا، "جی نہیں، میرا ارادہ سرکاری ملازمت ہے" اس پر ذاکر صاحب نے اپنے مخصوص تبسم کے ساتھ فرمایا، "لیکن بھئی، قومی خدمت اب کوئی ایسی بری چیز بھی نہیں کہ آپ اس سے ایسی بیزاری کا اظہار کریں"۔ اس پر ہم سب ہنس پڑے اور پھر ذاکر صاحب نے بڑی نسبت سے ہم سے تھوڑی دیر مختلف موضوعات پر گفتگو کی، اور ہم اس احساس کے ساتھ اجازت لے کر واپس ہوئے کہ آج ہم نے ایک بڑی شخصیت کو دیکھا۔

یہ تھا میرا پہلا تاثر ذاکر صاحب کو دیکھ کر اور ان کی باتیں سن کر۔

غالباً فروری یا مارچ (۱۹۶۹) میں جامعہ سے چند لوگ ان سے ملنے راشٹرپتی بھون گئے تھے۔ عبدالغفار مدھولی صاحب مرحوم بھی تھے، اور میں بھی۔ عبدالغفار مدھولی صاحب مرحوم سے ذاکر صاحب نے جب ان کی خیر و عافیت پوچھی تو یہ بھی پوچھا کہ مدھول میں آپ کا مکان تو اپنی جگہ پہ ہے؟ مدھولی صاحب کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس بات کو سمجھے نہیں۔ ذاکر صاحب نے بھانپ لیا اور کہا، "میں نے یہ بات اس لیے پوچھی کہ آج کل ہمارے ملک میں راتوں رات بستیوں کی بستیاں صاف ہو جاتی ہیں، مکانوں اور دکانوں کو جلا کر راکھ کر دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر ذاکر صاحب تھوڑا سا دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔

۱۹۶۹ - ۱۹۷۰ء میں جامعہ کی گولڈن جوبلی ہونے والی تھی۔ اس موقع پر بعض کاموں اور منصوبوں کے لیے چندہ کی مہم تھی۔ میں مدراس اور جنوبی ہند کے دوسرے شہروں کی طرف مامور تھا۔ مدراس میں، میں سیٹھ جمال کے قائم کردہ جمالیہ، کالج دیکھنے اور ان کے گھر والوں سے ملنے گیا۔ یہ وہی سیٹھ جمال ہیں جنہوں نے ۱۹۲۸ء میں جب جامعہ مالی اعتبار سے بڑے سخت مرحلوں سے گذر رہی تھی اور حکیم اجمل خاں اور ذاکر صاحب مدراس گئے تھے، جامعہ کے لیے چندہ کرنے، ہزاروں روپئے سے مدد کی تھی (یہی کوئی چالیس پچاس ہزار روپئے)، اس وقت کانگریس کے مدراس سیشن کا موقع بھی تھا جس کے صدر ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم تھے۔ میں نے جمالیہ کالج جا کر دیکھا اور اس کے صحن میں وہ بڑا درخت بھی دیکھا جس کے نیچے حکیم صاحب قبلہ اور ذاکر صاحب نے آرام فرمایا تھا۔ پھر سیٹھ جمال کے صاحبزادے سے ملنے گیا جو ممبر پارلیمنٹ رہ چکے تھے اور اس وقت علیل تھے۔ مدراس آنے کا مقصد پوچھا، میں نے بتایا تو رونے لگے اور کہا: "ذاکر صاحب یہاں آئے تھے تو میرے والد سے جو کچھ بن پڑا تھا کیا تھا، اب وہ تو نہیں ہیں، میں بدنصیب زندہ ہوں اور بیمار ہوں، میرا کام خراب ہو گیا ہے اور پریشانیاں ہیں۔ ذاکر صاحب سے کہہ دیجئے گا کہ مجھے بڑی شرمندگی ہے"۔ میری آنکھیں بھی بھر آئیں، اور دعائے خیر کرتا ہوا کمرہ سے باہر آ گیا، دہلی واپسی پر

تھوڑے دن بعد ایک تقریب میں ذاکر صاحب سے ملاقات ہوئی، وہ حسب عادت لوگوں کے پاس جاکر ہاتھ ملا رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے کافی خوش تھے۔ اس گوشے میں بھی تشریف لائے جدھر میں تھا، جب انہوں نے ہاتھ ملا تو میں نے سیٹھ جمال مرحوم کے صاحبزادے کی باتیں دہرادیں، مجھے ذرا ایک طرف کر کے کہ ان کا چہرہ دیوار کی طرف تھا فرمایا "سیٹھ جمال نے ہماری بڑے کڑے وقتوں میں مدد کی تھی، انہوں نے ہمیں رخصت کرتے وقت کہا تھا کہ ذاکر صاحب! یہ جو رقم حاضر ہے، جن لوگوں نے وعدے کیے ہیں، ان کے حصے بھی میں نے اس میں اپنی طرف سے ملا دیتے ہیں، میں یہاں ان سے وصول کر لوں گا۔" پھر ذاکر صاحب نے فرمایا: "کسی نے دیئے تھوڑے ہی ہوں گے، درحقیقت یہ سب بار سیٹھ جمال ہی نے برداشت کیا ہوگا اور خندہ پیشانی سے کیا ہوگا۔" میں نے دیکھا کہ جب یہ باتیں ذاکر صاحب کہہ رہے تھے تو ان کی آنکھیں نم تھیں اور آواز بھرائی ہوئی تھی۔ یہ سب سیٹھ جمال کے لیے اپنے جذبۂ احسان مندی کا اظہار تھا، اور بیتے ہوئے سخت دنوں کی یاد بھی تھی جس کا اپنا الگ ایک مزا تھا۔

ذاکر صاحب نے اپنے محسنوں کو ہمیشہ یاد رکھا اور قوم کے محسنوں کی خدمت میں ہمیشہ خراج عقیدت پیش کیا۔

گورنر مقرر ہونے سے پہلے، قیام جامعہ: ۵۷ - ۱۹۵۶

ذاکر صاحب علی گڑھ سے مستعفی ہو کر آگئے ہیں، جامعہ میں اپنے مکان میں مقیم ہیں جامعہ کے رفقا ان کے پاس بہت جانے لگے۔ طرح طرح کی باتیں ہوتیں، ایسی بھی کہ ذاکر صاحب انہیں پسند نہ کرتے جھوٹی باتیں، دوسروں کی شکایتیں۔ جامعہ کے معاملات؟ مجھ سے جامعہ کے رجسٹرار جناب ارشاد الحق صاحب مرحوم نے بیان فرمایا کہ جب وہ عاجز آگئے اور ایسی باتیں سننا نہیں چاہتے تھے تو ایک دن مجتبیٰ صاحب سے یا سعید صاحب سے (یہ ارشاد صاحب کو یاد نہ تھا) کہا: "آپ کو معلوم نہیں ہے شاید اور جامعہ میں کسی کو معلوم نہ ہوگا کہ میری شیروانی کی جیبوں میں پتھر بھرے ہوتے ہیں، کہہ دیجئے کہ ذاکر دیوانہ ہو گیا ہے، کوئی اس سے ملنے جاتا ہے تو وہ پتھر مارتا ہے۔"

انہیں ارشاد صاحب مرحوم نے یہ بھی فرمایا کہ ذاکر صاحب نے جامعہ کو اپنی شخصیت کی تکمیل کے لیے استعمال کیا۔ اس پر میں نے کہا تھا کہ ارشاد صاحب! اس کو یوں کہئے تو شاید زیادہ مناسب ہو کہ جامعہ کی تعمیر کے ساتھ ذاکر صاحب کی شخصیت کی تعمیر بھی ہو گئی۔

ذاکر صاحب — ذاتی یادیں

ڈاکٹر سید محمد مثنیٰ رضوی
شعبۂ فلسفہ، مرزا غالب کالج
گیا

جب میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ۱۹۴۹ء میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوا تو نہایت افراتفری کا زمانہ تھا۔ مخصوص سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کے باعث سارے ہندستان کے مسلمانوں پر پراگندگی کا عالم طاری تھا۔ ہندستانی مسلمانوں کا اہم ترین تعلیمی اور تہذیبی مرکز ہونے کی حیثیت سے علی گڑھ ایک ایسا آئینہ تھا جس میں ان کی افسردگی، مایوسی، بے حسی اور کلبیت کی تصویر نہایت واضح طور پر جھلک رہی تھی۔ صورت حال بڑی غیر یقینی اور مایوس کن تھی اور اس پر طرہ یہ کہ وائس چانسلر کے عہدہ پر فائز تھے نواب اسمٰعیل خاں جنھیں تقسیم ہند سے پہلے مسلم لیگ ایکشن کمیٹی کے چیرمین ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ غرضیکہ حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ پنڈت نہرو چاہتے تھے کہ بنارس ہندو یونیورسٹی کی وائس چانسلری آچاریہ نریندر دیو اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری ذاکر صاحب قبول کر لیں۔ ذاکر صاحب علیگڑھ کے مخصوص حالات کے پیش نظر اس عہدہ کو قبول کرنے میں خاصی ہچکچاہٹ محسوس کر رہے تھے لیکن جب ان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی کہ اگر انھوں نے یہ ذمہ داری قبول نہیں کی تو حالات میں سدھار ناممکن ہو جائے گا تو یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ انھوں نے اس لمحہ میں یونیورسٹی کی باگ ڈور سنبھالی جس لمحے میں اس کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ یونین ہال میں انکی پہلی تقریر کا نقش ابھی تک ذہن پر قائم ہے۔ اعتماد اور یقین سے بھری ہوئی اس تقریر نے جادو کا کام کیا۔ ہر شخص نے سانس روک کر انکی باتیں سنیں اور ہال سے نکلنے کے بعد سبھی کے چہروں پر اطمینان کی جھلک نمایاں تھی۔ تقریباً چھبیس سال بعد انکو طلبا کو خطاب کرنیکا موقع ملا تھا[1] مگر ان کے لہجہ میں گھلاوٹ ہی گھلاوٹ تھی کڑواہٹ کا شائبہ تک نہیں تھا۔ بعد میں ان کو قریب سے دیکھنے کے مواقع بھی ملے۔ میرے شعبہ (شعبۂ فلسفہ) میں جب بھی آئے تو ہیومر (HUMOUR) اور WIT کی پھلجھڑیاں ہی چھوڑتے آئے اور جاتے جاتے فکر و حکمت کا کوئی نہ کوئی نکتہ سمجھا کر گئے۔

اسوقت ایک واقعہ ذہن میں آ رہا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی (مرحوم) اور پدم بھوشن ڈاکٹر عبید صدیقی علیگڑھ جیل میں بند تھے۔ امتحانات قریب تھے۔ ہم لوگ ان لوگوں کی رہائی کے لیے خاصے فکرمند تھے۔ باقر مہدی اور میں خلیل سے ملنے جیل گئے۔ ملنے کی اجازت نہیں مل رہی تھی اتنے میں ذاکر صاحب جیل کے پھاٹک سے باہر آتے ہوئے دکھائی دیے۔ باقر نے انکی شیروانی کا دامن تھام لیا اور بچوں کی طرح بضد ہو گئے کہ ملنے کی اجازت دلوا دیجیے۔ ذاکر صاحب نے نہایت شیریں اور نرم لہجہ میں ہم لوگوں سے کہا کہ جیل کے کچھ ضابطے اور قاعدے ہوتے ہیں۔ آپ لوگ انسے درخواست کیجیے وہ ملوا دیں گے۔ ہم لوگ ذاکر صاحب کو انکی کار تک چھوڑ کر لوٹے تو کیا دیکھتے ہیں کہ خلیل پھاٹک پر کھڑے ہیں اور ہم لوگوں کو باہر سے بات کرنیکی اجازت مل گئی ہے۔ یہ تھا ذاکر صاحب کا مدد کرنے کا طریقہ۔ پُر وقار اور انصاف پسند۔ ••

---

[1] ذاکر صاحب کے الفاظ یوں ہیں: "آج تقریباً چھبیس برس بعد مجھے آپ لوگوں سے اس ہال میں گفتگو کرنیکا موقع ملا ہے اس درمیان حالات کچھ ایسے رہے کہ مجھے اس سعادت سے محروم رکھا گیا۔"

ڈاکٹر امین اشرف
شعبۂ ادبیاتِ انگریزی
مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

ذاکر صاحب۔ چند یادیں

میں نے ذاکر صاحب کو دیکھا۔ سفید شیروانی، سفید ٹوپی میں بڑے سلیقے سے کھانا کھا رہے ہیں، بڑی اچھی باتیں کر رہے ہیں۔ میں بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اس وقت میں بی۔ اے میں تھا۔ پھر میں نے یونین کے اندر ان کی تقریر سنی اور کئی دفعہ یہاں، وہاں آتے جاتے دیکھا۔ خلیل وغیرہ بیٹھے تھے اور گپ شپ کر رہے تھے۔ تو انہوں نے مجھ سے مذاق میں کہا کبھی تم بھی کچھ لکھو۔ نظمیں کہاں لکھتا ہوں میں۔ اگر ان کی شان میں ایک نظم کہی تھی۔ جب وہ نظم چھپی تو بہت مقبول ہوئی۔ اشفاق صاحب میرے دوست تھے انہوں نے ذاکر صاحب کو بتلایا کہ یہی ہیں وہ صاحب جنہوں نے نظم لکھی ہے اس زمانے میں میں تاریخ میں ایم۔ اے کر رہا تھا۔ ذاکر صاحب نے مجھے گود میں اٹھایا ان کی شان میں بڑی عمدہ نظم تھی۔ آپ بھی سنیے:۔

ہمسر سلسلۂ دیدہ وراں آیا ہے　　زینتِ محفلِ صاحب نظراں آیا ہے
مردِ دانا، ہمہ داں روح رواں آیا ہے　　نازشِ عہد و عزیز از دل و جاں آیا ہے
معدنِ علم و ہنر، جلوہ گہ حکمت و فن　　پائے ارباب ہمم، دستِ جوانانِ وطن
جانِ صد بزم طرب، روحِ غزالانِ ختن　　نکہتِ نسترن و موجِ گل و بوئے سمن
شارحِ درسِ یقیں، حرف زنِ سوزِ دروں　　شمعِ ایثار و وفا، مرہمِ اشکِ پُر خوں
رہرو راہِ عمل، ہمسفرِ شوقِ افزوں　　بیخودِ جامِ خرد، سرخوشِ صہبائے دروں
دل وہی پائی ہے، خارا شکنی پائی ہے　　لبِ اعجاز میں شیریں سخنی پائی ہے
سادگی پائی ہے، گل پیرہنی پائی ہے　　وضعِ کردار میں حب الوطنی پائی ہے
بے خطر ظلمتِ ایام کے گھیروں میں رہا　　صفتِ کرمکِ شب تاب اندھیروں میں رہا
دل کشادہ غم و آلام کے گھیروں میں رہا　　خود سر و سینہ سپر ہند کے شیروں میں رہا
آندھیاں چلتی رہیں، ذوقِ عمل کم نہ ہوا　　سست رَو قافلۂ عظمتِ آدم نہ ہوا
سر خود دار و خود آگاہ کبھی کم نہ ہوا　　سر نگوں جوہرِ ادراک کا پرچم نہ ہوا
سر پُر عزم رہے شوقِ تب و تاب رہے　　زندگی سایۂ برانگن رہے خوشحال رہے
سبز و تر شاخِ تمنا رہے سیراب رہے　　یارب اک نخلِ ثمردار رہے شاداب رہے

اس کے بعد بھی وہ گورنر ہو گئے تھے۔

پروفیسر مُحِب الحسن
سابق صدر شعبہ تاریخ
جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

ذاکر صاحب

میں آر کا نول کمیشن کا ممبر تھا تارا چند صدر۔ اس سلسلے میں پورے ہندوستان کا دورہ رہا۔ بہار آنا ہوا تو ذاکر صاحب نے کھانے پر بلایا علی گڑھ کا حال پوچھا۔ یوسف صاحب اس زمانے میں علی گڑھ میں تھے۔ میں چپ ہو گیا' ہم لوگ تو دوسرے کیمپ کے تھے۔ کہنے لگے۔ کہیے۔ کہیے۔ میں نے کہا، یہ سب ہو رہا ہے۔ بولے ایک وقت جب محمود صاحب وغیرہ تھے، کمیونسٹوں کا زور تھا تقرر وغیرہ انہیں کے ہوتے تھے۔ اب RIGHTISTS کا وقت ہے وہ برسر اقتدار ہیں، وہ دبا رہے ہیں۔ اپنا اپنا وقت ہے۔

اور کسی موقع پر بھی کہی جوش اور ن وغیرہ کی بات تھی' اور مجیب صاحب کی باتیں بھی۔

مجھے اور میری بیوی کو کھانے پر بلایا۔ مجیب صاحب، ان کی بیوی اور زیدی بھی تھے۔ وہ مجیب صاحب سے ناخوش رہتے تھے مگر اظہار نہیں کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے جامعہ EXPAND کرے۔ میں صدر، نائب صدر ہوں، اس وقت کچھ کرا لیجیے۔ مجیب صاحب نہیں چاہتے تھے کیونکہ مسائل پیدا ہونگے۔ ایک دن میرے ساتھ WALK میں انہوں نے کہا اس انجینیر کا APPOINTMENT کیجیے۔ کہنے لگے بہت سے مسائل پیدا ہونگے ــــ اس کھانے پر جو جامعہ میں تھا زیدی صاحب کے یہاں چھا بڑا بھی تھے (ذاکر صاحب کھانے کے بہت شوقین تھے) ضیاء الحسن بھی تھے۔ تو چھابڑا (M. G. C) سے اس کے لیے کافی بات کی۔

ن اور س وغیرہ کی برائی کی کہ ح خ میں کچھ کام کر کے نہیں دیا۔ کہنے لگے میں جب V.C. تھا تو سوچا اچھے لوگوں کو بلایا جائے ع س ن کو اسی خیال سے بلایا کہ کام کریں گے مگر کچھ نہیں کیا بالکیسر میں پڑ گئے۔ ح خ کی عطاء اللہ درّانی نے غالب چیئر قائم کرا دی مگر ــــــ نے ایک لفظ نہیں لکھ

پروفیسر مختار الدین احمد
سابق صدر شعبہ عربی
علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

مثنوی غلام رسول حسرت

پٹنہ کے احوال میں مثنوی "غلام رسول حسرت"، جو خدا بخش لائبریری جرنل کے شمارہ ۲۱-۲۲ میں شائع ہوئی تھی، ڈاکٹر مختار الدین احمد کے مکتوب کی روشنی میں یہ ایک بار پہلے بھی چھپ چکی ہے۔ انھوں نے اس پر ایک مقدمہ بھی، "حسرت مرحوم نے 'عرار بر' تحریر کیا تھا۔ اس اشاعت اول کا سرورق اور مختار الدین صاحب کا مقدمہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

(ادارہ)

نہ رنگینی ہے مضموں کی نہ اپنی خوش بیانی ہے
وطن کا مرثیہ [illegible] پٹنے کی کہانی ہے

مثنوی
خواب حسرت
معروف بہ
پٹنے کی کہانی

۷۸۶

مقدمہ

از

مولانا مختارالدین آرزو رضوی عظیم آبادی

نام و تخلص: غلام رسول نام اور حسرت تخلص ہے۔ آپ کے والد کا نام میاں جان علی خاں ہے۔

تاریخ پیدائش: ۱۰ محرم ۱۳۰۳ھ بروز یکشنبہ شہر عظیم آباد محلہ آغا کا چورا ہا میں پیدا ہوئے۔

شعر و شاعری: آپ کو اوائل عمر ہی سے شعر کہنے کا شوق تھا۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۹۰۲ء میں مستقل طور پر حضرت شاد مرحوم کے تلامذہ میں داخل ہوگئے اور اصلاح کا سلسلہ حضرت شاد مرحوم کی وفات یعنی ۱۹۲۷ء تک رہا۔

تصنیفات: آپ کی تصنیفات نظم میں دو اردو کا دیوان اور چھ مثنویاں ہیں جو اس وقت بالکل مکمل ہیں۔ دیوان میں غزلیں، قطعات، مرثیے، سلام، سہرے غرض کہ سب کچھ ہیں۔

رنگ تغزل: آپ کے تغزل کا رنگ بھی قابلِ تعریف ہے، اور صاحب فن سے داد لیئے بغیر نہیں رہتا۔ کلام میں پختگی ہے الفاظ میں حسن ہے اور بندش میں چستی ہے۔ زبان بھی اچھی ہے۔ ذیل کی چند کیفیتیں ملاحظہ ہوں:

عطا جو ایک بھی جام طہور ہو جاتا — تو ساقیا یہی دل بزم نور ہو جاتا

ہر شے ہر ایک ذرے میں تیرا ظہور ہے — دیکھا اگر نہ تجکو تو اپنا قصور ہے

اس شعر کا مضمون کتنا بلند ہے، غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔

کثافتوں سے جو پاک ہوتے۔ غبار دل سے جو دور ہوتا — ہر ایک ذرے میں پھر تو اپنا قسم خدا کی ظہور ہوتا

نقابِ گل سرخ پہ گر نہ ہوتی کسی کو پھر ہوش میں بھی پاتے — ہر ایک ذرہ بھی اس جہاں کا یقین مانو کہ طور ہوتا

دریا میں مجکو عشق نے پھینکا ہے باندھ کر — تاکید اس پہ یہ ہے کہ دامن بھی تر نہ ہو

ایک آخری شعر سن لیجیے، دوسرے مصرعہ میں اپنے استاد شاد کا رنگ صاف جھلک رہا ہے ؎

عیش و خوشی نشاط کو طینت سے کھو دیا — ہنسنے کو جب کسی نے کہا ہم نے رو دیا

مثنوی خواب حسرت: اوپر کی سطروں میں لکھ چکا ہوں کہ حسرت کی تصنیف سے چھ مثنویاں بھی ہیں۔ "خواب حسرت" "عرف پٹنہ کی کہانی" بھی ان کی ایک مثنوی کا نام ہے، جس میں انھوں نے شہر عظیم آباد کے مشہور شعراء، علماء، حکماء، فضلا، کی یاد تازہ کی ہے۔ عظیم آباد کے مشہور مقامات، مشہور تکیے اور مزارات مشہور محلوں اور مشہور صناعوں کا تذکرہ کیا اور مشہور رئیسوں، مشہور مہاجنوں کا بھی ذکر نہیں چھوڑا ہے۔

مثنوی "خواب حسرت" نہ تو مثنوی مولانا روم کی طرح کوئی تصوف کی مثنوی ہے اور نہ "یوسف زلیخا" کی طرح عشقیہ، نہ "بوستان" کی طرح کوئی اخلاقی رسالہ ہے اور نہ "ہشت بہشت" کی طرح قصہ اور افسانہ کی کوئی کتاب۔ یہ مثنویاں ایک خاص کی مثنوی ہے جیسے تاریخی کہہ سکتے ہیں، اور مثال کے طور پر "فردوسی" کی شاہنامہ پیش کر سکتے ہیں۔

حسرت صاحب کی مثنوی ایک تاریخی مثنوی ہے اس لئے اس میں حسن و عشق کی چاشنی نہیں پائی جاتی تاہم مثنوی دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہے۔ مصنف نے یہ مثنوی لکھ کر صرف شاعری ہی پر نہیں بلکہ تاریخ بہار پر ایک احسان کیا جو بہار کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی شاد مرحوم کی نظر سے نہیں گذری اور کتابت کی غلطیاں بھی دور نہ ہوئیں۔

مثنوی کی زبان بہت صاف اور ستھری ہے۔ بعض اشعار خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں ؎

آل و اصحاب کی جو مدح کروں — زندگی بھر لکھوں تو کچھ نہ لکھوں

رشک جنت تھی ہر گلی اس کی — کیا بتاؤں بہار کیسی تھی

ان کے اخلاق کی مروت کی — مجھ سے توصیف ہو نہیں سکتی

کی تواضع ہر ایک کی زر سے — کوئی خالی پھرا نہیں در سے

تاہم مثنوی میں ربط اور تسلسل کی کمی ضرور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر جگہ روانی نہیں پائی جاتی۔ آخر میں البتہ کافی روانی۔

اب اسی شہر کی یہ حالت ہے — اب اسی شہر کی یہ نوبت ہے

جس طرف کو نگاہ جاتی ہے — ہوکے مغموم لوٹ آتی ہے

کب کسی کو شگفتہ دل دیکھا — جس کو دیکھا تو مضمحل دیکھا

ایسا برباد ایسا ناس نہیں — شہر اتنا کوئی اوداس نہیں

کل جہاں پر تھے محل عالیشان — آج گیدڑ ہیں یا سیار وہاں

خشت کہنہ کا ہے کہیں انبار — یا کہیں پر گری ہوئی دیوار

تھے جہاں پھول سے بھرے تھالے — اب وہاں پر ہیں ڈھیر کوڑے کے

ہے یہ گلیوں میں حال کیچڑ کا — جیسے دیوار کا بنے گارا

تنگ و تاریک ہے گلی کوچا — شہر میں اس طرح کا سناٹا

جا بجا کھیت اب ہیں گوبر کے — یا گدھے لوٹتے ہیں دھوبی کے

بڑھ گئی جاہلوں کی اب تعداد

مل گیا خاک میں عظیم آباد

غرض کہ مثنوی کافی دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہے اور اراکین "بہار بک ڈپو" شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے یہ مثنوی چھاپ کر شائع کی۔ اراکین بہار بک ڈپو نے اپنا کام کر ڈالا' اور اب باری بہار کے شعرا اور ادبا اور علم دوست لوگوں کی ہے۔

ظفر منزل

جہندہ وپٹنہ۔

مختار الدین آرزو

دوشنبہ ۲۸ مارچ ۴۹ء

●●

نسخ خطی زبان پښتو

(در)

کتابخانهٔ خدابخش، پتنه

دکتر زلمی هیوادمل

عضو علمی اکادیمی علوم افغانستان

مرکز زبانها و ادبیات پښتو ټولنه

زلمی هیوادمل (سال تولد ۱۹۵۰ء) در دهکدهٔ علی خیل مرکز نعمان یکی از ایالات شرقی افغانستان) در سال ۱۹۶۸ء در پوهنځی ادبیات و علوم بشری (فاکولتی آف لټریچر اینډ هیومنیټیز) به پوهنتون کابل (کابل یونیورسټی) داخل شد و در سال ۱۹۷۲ء از دیپارتمنت ژورنالیزم آن پوهنځی (فاکولتی) بأخذ ډگری نایل شد۔

در سال ۱۹۷۰ء بحیث مهتمم و در سال ۱۹۷۱ء بحیث معاون (اسسټنټ اډیټر) مجله د ویزمه (نسیم)، نشریهٔ علمی دو ماهه پوهنځی زبان و ادبیات مقرر شد، و در سال ۱۹۷۳ء در اکادیمی پښتو ټولنه داخل خدمت گردید و بحیث عضو علمی شعبهٔ ادبیات و فولکلور به کار گماشته شد۔

در سال ۱۹۷۶ء بحیث اډیټر نشریهٔ هفت روزه بنام زیری (مژده) مقرر گردید و در سال ۱۹۷۸ء دوباره بحیث عضو علمی شعبهٔ ادبیات و فولکلور به اکادیمی افغانستان به کار گماشته شد و تاکنون درین شعبه بحیث عضو کار میکند۔

تالیفاتِ مهم: • فرهنگ زبان و ادبیات پښتو بزبان پارسی در چهار جلد (۱۹۷۷ء افغانستان)، • دیوان قلندر (۱۹۷۷ء افغانستان) • د سرو غزو ګلونه: انتخاب اشعار ناچاپ عبدالرحیم هوتک، جانان هوتک، رحمت داوی، د جان محمد کاکړ (۱۹۷۷ء افغانستان) • فوائد فقیر الله: تالیف میا فقیر الله جلال آبادی (۱۹۷۹ء کابل، افغانستان)، • اسماء الحسنی: تالیف میا فقیر الله جلال آبادی (۱۹۷۹ء کابل، افغانستان)، • د خانګی خلیل خوشرونه (۱۹۸۰ء افغانستان)، • د حاجی جمعه بارکزی دیوان (۱۹۸۱ء، افغانستان)، • د غلام محی الدین افغان افکار و آثار (۱۹۸۱ء کابل، افغانستان)، • حسن و دل از فتاحی نیشاپوری (۱۹۸۲ء افغانستان)، • اولسی سندری: مجموعهٔ چهاربیته های پښتو (۱۹۸۲ء افغانستان)، • د بوعلی سینای بلخی ژوندلیک: ترجمهٔ زندگینامهٔ بوعلی سینای بلخی (۱۹۸۰ء افغانستان)، • د میا فقیر الله پیژندلیک ترجمهٔ شناخت نامه میا فقیر الله (۱۹۸۱ء کابل)، • د امیر کروړ سوری کورنۍ: ترجمهٔ امیر کروړ سوری و دودمان او تالیف پوهاند عبدالحی حبیبی (۱۹۸۲ء افغانستان) • پټه خزانه ذخلکو خبری: ترجمهٔ دیباچه طبع سوم پټه خزانه (۱۹۷۸ء کابل)

علاوه ازین، مقدماتی بر رسالات متفرق نوشته است و نیز مقالات ادبی و تحقیقی او که بیشتر موضوعات را احاطه می کند در مجلات مختلف نشر شده است ●●

کتاب خانهٔ خدابخش نه تنها در کشور هند بل در سائر جهان دانش و در همه منطقهٔ علم و ادب ارزش بس بزرگ و ارجمندی دارد. خصوصاً نسخهای خطی که درین جا یافت میشود، همواره دانشمندان شرق را بخود ش جلب کرده است.

کتاب خانهٔ مزبور فهرست سه جلدی نسخ خطی اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور پٹنه در دو جلد آن تالیف مرحوم خان بهادر مولوی عبدالمقتدر چاپ نموده است[1]. بنده سه جلد آن کتاب را بررسی کردم و جائے خوشی این بود که تلاشم بیهوده نرفت و در جلد اوّل این کتاب بدریافت فرهنگ نایاب زبان پشتو موفق شدم خوش بختانه مادرین باغستان پربهای فرهنگی مشرق زمین گلهای را از زبان خو نیز دریافتیم که اینک آنرا مسلسل به دوستداران علم و ادب و محققین زبان و ادبیات کهن پشتو تقدیم میدارم.

(۱) <u>مخزن الاسلام</u> : مخزن مجموعهٔ از رسائل دینی و مذهبی و فقهی اخوند درویزهٔ ننگرهاری (۹۰۹-۱۰۲۸ھ ق) است[2] که دران بصورت مجموعی رسائل ذیل وجود دارد: ترجمهٔ خلاصه کیدانی، ترجمهٔ قصیدهٔ برده، شرح قصیدهٔ امالی نورنامه، شمائل نامه، مقالهٔ در هجو فرقهٔ روشانیه بزبانهای پشتو و پارسی، رسالهٔ رسم الخط پشتو وغیره مسائل فقهی و دینی جامع این رسائل فرزند اخوند درویزه کریمداد (۱۰۷۳ھ ق شهید) است که در سال ۱۰۱۲ به تدوین و جمع آوری آن همت گماشت و الف نامه[3] خود را نیز بدان افزود،

نسخه برداری هائیکه از مخزن الاسلام جمع کردهٔ اخوند کریمداد شده است، دران نسخ صرف ملحقات کریمداد عبدالحلیم، ملا اصغر و عبدالسلام دیده میشود، اما مخزن الاسلام را مصطفی محمد یکی از احفاد اخوند درویزه نیز برای بار دوم جمع آوری و ترتیب بخشیده است، درین تدوین و ترتیب علاوه از ملحقات کریمداد، عبدالحلیم، و ملا اصغر و عبدالسلام ملحقات مصطفی محمد و دیگر شاگردان اخوند درویزه چون ملا عمر شلمانی وغیرهم نیز بدان افزوده شده و در حقیقت مخزن الاسلام حیثیت گنجینه پربهای شرح مسائل دینی و فقهی را بخود گرفته است.

البته باید یادآور شد که نسخ قدیم مخزن ملحقات دریاسه تن و نسخ بعدی آن ملحقات تا پنج یا شش نویسنده و شاعری را دارا است: از حدود سالهای ۱۱۰۲-۱۱۷۷ھ ق نسخ خطی فراوانی از مخزن الاسلام در دارالامان ملتان دریک

خانواده کاسی[۴] افغان کتابت شده است، شخص اولی این خانواده که باین کار دست یازیده است عبدالغنی کاسی[۵] نام دارد که خودش نیز شاعر و نویسندهٔ زبان پشتو ست. و نسخه برداری مخزن را از وی خانواده اش بارث برده است ابتکار عبدالغنی کاسی در نسخه برداری مخزن اینست که وی علاوه از ملحقاتیکه فرزندان، برادران، نواده ها و کواسه های اخوند درویزه بدان افزوده بودند. دو بخش دیگری را بنام "بیانات افغانی" در تمام نسخ خطی ایکه در خانوادهٔ کاسی ملتانی خطاطی شده بدان افزودند درین دو بخش از رسالات و قصص دینی و تصوفی شعرای سلف آثار زیادی به چشم میخورد شاعران و نویسندگانی چون، اخوند احمد، ملا سلیمان، جان محمد، فاضل، نجابت، بیگ محمد، ادین، مهاداد، شیخ آزاد و همچنان بعضی از نبشته های آثار شعرای پیر طریقه روشانیه.

من تاکنون در حدود سه صد نسخهٔ خطی مخزن الاسلام را دیده ام و یا از ان سراغی دارم، نسخه برداری های زیادی ازین جهت از مخزن الاسلام (با ملحقات) صورت گرفته است که مخزن الاسلام در حلقه های دینی پشتو زبانان تدریس میشود و طالبان علوم دینی ازان استفاده ها می برند.

مخزن الاسلام توسط تاجران کتب پشاور قبل از ۱۳۰۰ هـ ق و بعد ازان سه یا چهار بار بطور مستقل در دهلی و دیگر مطابع هندوستان طبع شده است که در حاشیه یکی از چاپهای آن مفتاح "الدقایق نیز بچشم میخورد. اما چاپ انتخابات مخزن الاسلام در اروپا قدیمتر از چاپ مستقل آن است، انتخاب مخزن الاسلام را بار اول پروفیسور برنادرد ڈورن (۱۸۰۵-۱۸۸۱) خاورشناس روسی در کتاب "پشتو منتخبات" (طبع پتر زبورگ ۱۸۴۷ع) چاپ نموده است[۶] پس ازان مستر اورٹی انگریز در "گلشن روه" (بخش نثر) انتخاباتی از مخزن الاسلام را چاپ کرده است (طبع ۱۸۶۰ع هرتفورد)

همچنان انتخابی از مخزن با انتخاب خیرالبیان بایزید روشان (۹۳۱ - ۹۸۰ هـ ق) یکجا از طرف اکاڈیمی پشتو پشاور طبع شده است.

متن انتقادی مخزن الاسلام از روی چندین نسخهٔ خطی و چاپی توسط پروفیسور تقویم الحق کاکاخیل تهیه شده و با مقدمهٔ تحقیقی آن جناب در سال ۱۹۶۹ع از طرف اکاڈیمی پشتو پشاور طبع شد در مقدمهٔ آن متن مواد زیادی راجع به شرح حال اخوند درویزه[۷] و خانواده اش دریافت میشود.

نسخهٔ خطی مخزن الاسلام خدابخش پبلک لائبریری که در فهرست دست نویس نسخه های زبانهای متفرقه بنام "کتاب پشتو در فقه" یاد شده است، به نمبر ۱۲۵ در راجستر قید بوده تمامی اوراق آن ۱۶۳ و در هر صفحهٔ آن ۱۴ سطر است، تقطیع متن آن: ۱۴×۸ سانتی متر. نسخه از آغاز و انجام ناقص است، اما بخش عمدهٔ آن یا الف نامهٔ کریداد[۸]

ملحقات عبدالحلیم دران با قیست نسخه در بین جداول قرمز به خط نسخ خام نبشته شده است.

(۲) **دستارنامه**: از آثار برجسته منثور شاعر توانا و مقتدر زبان پشتو خوشحال خان ختک (۱۰۲۲-۱۱۰۰ ھ ق) است که آنرا به سال ۱۰۷۶ ھ ق در قلعهٔ رنتهبور ایالت راجستان هندوستان در حالت نفی از وطن در زندان عالمگیر اورنگزیب (۱۰۶۸-۱۱۱۸ ھ ق) نبشته است.

نسخ خطی دستارنامه زیاده تر یافت نمیشود صرف در اکیدیمی پشتوی پشاور و انگلیند دو نسخ خطی دستارنامه موجود است. دستارنامه بار اول در ۱۹۵۲ع از طرف محمد عبدالشکور مهتمم موزهٔ پشاور از آن دیار نشر شده سپس به کوشش اکادیمی پشتوی پشاور در سال ۱۹۵۹ع انتخابی از دستارنامه با ترجمهٔ اردو از پشاور انتشار یافت و بعد به مناسبت سمینار بین المللی خوشحال خان ختک دستارنامه از روی نسخهٔ چاپی پشاور از طرف پوهاند صدیق الله رشتین از کابل (اکیدیمی پشتو) در سال ۱۳۵۵ ھ ش دوباره طبع و نشر گردید. اخیراً در سال ۱۹۸۰ع ترجمهٔ مکمل دوی دستارنامه در پشاور طبع و از آنجا نشر گردید.

نسخهٔ خطی دستارنامه خدابخش پبلک لائبریری در فهرست دست نویس این کتابخانه تحت شمار عدد: ۱۵۶۸ بنام "کتاب نجیبه پشتو" ضبط است. این نسخه اگرچه متاخر است اما مکمل و اهمیت آن درین است که این خطوط نقلیست از مخطوطه ای که در سال ۱۱۱۹ ھ ق بامر و فرمایش افضل خان ختک (وفات ۱۱۶۲ ھ ق) فرزند اشرف خان هجری (۱۰۴۴-۱۱۰۶ ھ ق) نواسهٔ خوشحال خان ختک نبشته شده است.[۷] کاتب نسخهٔ خطی خدابخش پبلک لائبریری مرجع اصلی نقل خود را نشان داده است و از همین جهت ما این نسخه را ولو جدید است[۸] نسخ ارزشمند کتابخانه خدابخش پتنه می شماریم.

(۳) **فواید الشریعت**: فواید الشریعت از آثار اخوند قاسم پاپین خیل شیوازی ننگرهاری است. در مورد سن تالیف آن بار اول مستر راورتی انگریز در مقدمه طبع اول گرامر پشتو بزبان انگلیسی (طبع ۱۸۵۵، کلکته) نبشته بود که اخوند قاسم فواید شریعت را در سال ۱۰۶۹ ھ ق تالیف کرده است، این غلطی نیز تواتر پیدا کرد و جیمز بلومهارت در فهرست نسخ خطی برتش موزیم آنرا برداشت و پس از آن دانشمندان و محققین زبان و ادبیات پشتو نیز این غلط را تکرار کردند. بعدها معلوم شد که اخوند قاسم در زمان تالیف تاریخ مرصع (۱۱۲۲-۱۱۲۶ ھ ق) زنده و در پشاور می زیست و از علما به شمار می رفت که فتوا داده می توانست لذا فواید الشریعت اخوند قاسم پاپین خیل تالیفیست از قرن دوازدهم و این کتاب شامل هشتاد باب است، مسائل مهم دینی، قصص اسلامی و شمایل آنحضرت (ص) را بیان میدارد.

در مسائل فقهی هر فصل احکام را تحت عنوان "فایده" بیان می کند۔

انتخاب فواید الشریعت اخوند قاسم را بار اول سٹر ڈورن در "منتخبات پشتو" (طبع ۱۸۴۷ء پترزبورگ) و بار دوم سٹر راورٹی در "گلشن روہ" (طبع ۱۸۶۰ء) طبع نموده است۔ و این کتاب از سال ۱۲۸۰ ھق به بعد تا سال ۱۹۸۰ء بیش از (۲۰) بار در دہلی، بمبئی، لاہور و پشاور چاپ شده است، نسخ خطی فراوان آن در افغانستان، انگلستان، اتحاد شوروی، پاکستان، ہندستان و سایر نقاط جهان دریافت میشود، نسخ خطی معلوم آن بیش از صد نسخه است۔ این کتاب نیز در حلقه های دینی پشتو زبانان بحیث متن درسی پذیرفته شده است۔

نسخه خدابخش پبلک لائبریری که تحت شماره عدد: ۳۲۳۰ ضبط است، دارای ۲۰۱ ورق بوده خط آن نسخ و تقطیع متن آن ۲۰×۱۲ سانتی متر است۔ نسخه مکمل است هشتاد باب آن کاملاً درج مخطوطه شده است باید گفت که نسخ خطی فواید الشریعت تعداد ابواب کمتر به نظر میاید، نسخه خدابخش لائبریری از نظری که دارا دانیست که آن مخطوطه مربوط کتاب خانه شاہان دہلی بوده مہر شہزاده محمد دارا بخت ولیعهد بهادر شاه بر صفحه الف ورق اول آن به چشم میخورد۔ امانکته قابل تاسف این است که تحت همین مہر در همان صفحه یکی از کتابداران اداره مثل پبلک لائبریری بانکی پور پٹنه آنرا از کتب زبان ترکی قلمداد کرده است، اما در فهرست دست نویس درج فهرست نسخ خطی پشتو ست۔ نیست

در نسخ خطی زبان پشتوی خدابخش پبلک لائبریری یکی از گرانبها ترین نسخ خطی کلیات قاسم علی خان اپریدی فرخ آباد که از رہگذر نوعیت کمی و کیفی خود از منظر ترین نسخه های کلیات قاسم علی به شمار اید۔

یادداشت ها و نبشته های این نسخه نه تنها برای پژوهشگران زبان و ادبیات پشتو در خور اهمیت است، بلکه برای تاریخ ادبیات نورسان و محققین زبانهای ہندی، اردو، پارسی، کشمیری، عربی و انگلیسی نیز نکات مهم و به در خوری را دارا است زیرا قاسم علی خان اپریدی از آن جمله نویسندگان پشتون است علاوه از زبان مادریش پشتو بزبانهای ہندی، اردو، پارسی، کشمیری، عربی و انگلیسی آثار و نبشته های را از خود به یادگار گذاشته است۔

در باره قاسم علی خان اپریدی مستشرق قانی چون راورٹی، جیمز ڈارمسٹر ۱۸۲۹ء - ۱۸۹۰ء یادداشت های دارند سپس تذکره نویسان و تاریخ ادبیات نویسان پشتون بزبانها پشتو، پارسی و اردو در باره شرح حال و زندگانی آن نبشته های کرده اند اما تمام نگارشات مبنی بر بعض یادداشتهای مستشرقین و اشاراتی موجود در دیوان شاعر است و زیاده تر متکی بر حدسیات است۔

در نسخه خدابخش پبلک لائبریری که از مخطوطات خانگی خود قاسم علی خان اپریدی است نکات جالبی

در بارۂ شرح زندگانی شاعر احوال خودش واسمای فرزندان واحفادش بدست می آید. دریں نسخہ یادداشتہای بہ قلم خود مصنف قاسم علی خاں اپریدی جلب نظر می کند من قبل ازینکہ تمام کتب این مجموعہ معرفی دارم نخست شرح حال شاعر را تادم مرگ از روی خود نوشت ہای نویسندہ (قاسم علی خاں) و یادداشت ہای خانوادہ اش در بارہ سال و روز و ماہ وفاتش را دریں جا میاورم واین در لیست جدید در تاریخ ادبیات پشتو کہ ما بہ یاری نسخۂ کلیات اپریدی در خدابخش پبلک لائبریری بہ کشودن آن موفق می شویم:

قاسم علی خاں اپریدی فرزند برہان خان ونوۂ نیک نام خاں اپریدی است کہ سلسلۂ نسب خود را در صفحۂ الف ورق ۲ رسالۂ اپریدی چنان شرح میکند:

"... شرح حق اینکہ منکہ قوم افغان در افغانان قوم کرلا ٹی ودر کرلا ٹی افریدی ودر افریدی آدم خیل ودر آدم خیل ختوٹہ ودر ختوٹہ کمای ودر کمای سید خیل ودر سید خیل سلطان خیل" این شجرۂ نسب با سایر کتب شجرہ ہای قبایل مختلف قوم افاغنہ مطابقت عام وتام دارد واز ان بر می آید کہ در خانوادۂ قاسم علی خاں مسائل شجرۃ النسب ارزش بس مہمی داشت وخودشان شجرۂ نسب را با خود داشتند۔

قاسم علی خاں بتاریخ ۲۰ ماہ رجب روز شنبہ سال ۱۱۸۳ھ ق[۱] در ہندستان تولد گردید، مدتی را در ایام جوانی با مہاراجہ جسونت ہولکر مہاراجہ دولت راو سیندھیا بہادر ونواب امیر خاں سالار زی سپری کردہ وتقریباً سہ سال با نواب امیر خاں وسایر مہاراجہ ہای ہندستان سپہ گری میکرد ودر جنگ اخیری کہ در نواحی روہیلکھنڈ (بین مراد آباد وانولہ) مابین قوای امیر خاں سالار زی وقوای انگلیس بہ مدد شاہان اودھ درگرفت قوای امیر خان (چون دارای تنہا شمشیر وتیر بودند) در مقابل قوای انگلیس بہ ہمکاری شاہان اودھ کہ با عصری ترین سلاحہای آن وقت توپخانہ مجہز بود ہزیمت نمود ودر سلسلۂ شکست لشکر پشتونہای روہیلہ قاسم علی خاں بہ رامپور آمد ودر خانہ یکی از پشتونہای رامپور مدت بیست روز اقامت گزید وبعد رہسپار زادگاہش فرخ آباد گردید وتا آخیر عمر در فرخ آباد بود ومدت چہار ماہ تحصیلداری پرگنۂ شمس آباد را نیز بہ عہدہ داشتہ است[۱]۔

قاسم علی خاں اپریدی در سن ۳۹ سالگی صاحب شش تالیف بود کہ خودش دریں بارہ در صفحۂ الف ورق ۵ رسالۂ افریدی چنین مینگارد:

"درصورتیکہ (قاسم علی خاں) از صحبت آشنایان ودوستان وقت الفراغ می یابد اکثر اوقات شغل کتب ہای فارسی وپشتو وہندی میدارد ونیز در عمر سی ونہ سال شش قطعہ کتاب تصنیف ساختہ یکی دیوان افریدی

دوم خواب نامه بزبان افغانی یعنی پشتو و سیوم دیوان افریدی بزبان هندی رواج ملک هندستان و چهارم افریدی نامه که به پنج زبان مرتب اوّل فارسی دوم پشتو سیوم کشمیری، چهارم فرنگ، پنجم خانه هندی در هر خانه زبان هر یک علیحده معنی هر پنج خانه واحده اند بدون حصول هر یک زبان عبور مشکل است و اگر عاقل غور سازد سهل تر است، باید فهمید که زیر هر ذیل خانه همان زبان مروجهٔ آن ملک خواهد بود جهت آموختن علم هر کسی ازین بلا استاد بهره یافته باشد و پنجم شفاعت نامهٔ افریدی که مامور بقصایدات (قصاید) معهٔ غزلیات به تعداد چهل و یک در راه کار سلسلهٔ قادریه و ششم رسالهٔ افریدی هذا به شمول فضل الهی با ختتام رسید... و تاکه عمر وفا خواهد کرد انشاءالله تعالی به شرط صحت مزاج ... چند کتب دیگر تصنیف خواهد کرد...."

تا حال ما به دریافت همین شش اثر قاسم علی خان اپریدی نایل شده ایم، و تا هنوز کسی از آثار دیگر وی پی نبرده نگفته است، لابد آثار دیگری نیز خواهد داشت زیرا بعد از تکمیل کلیات شاعر تا دیر زمانی زنده بوده و نظر به نوشته خودش در فرخ آباد "از معاش مرفع الحال" زیسته است.

امیدواریم باری آثار دیگر این نویسندهٔ مقتدر چند لسانی پشتون دریابیم

در بارهٔ سن وفات قاسم علی خان اپریدی تاهم اکنون مدرک اصح بدسترس محققین قرار ندارد، و اگر یادداشتی در نسخهٔ کلیات اپریدی خدابخش لائبریری پتنه وجود نمیداشت ما یان از تاریخ وفات این نویسنده توانا ناواقف می ماندیم، در آخیر رسالهٔ افریدی شخصی از خانوادهٔ اش به خط دیگر چنین نوشته است :

"بتاریخ پانزدهم جمادی الاوّل ۱۲۱۰ هـ یوم دوشنبه بوقت نماز صبح قاسم علی خان افریدی مصنف کتاب هذا از جهان فانی بعالم جاودانی رحلت نمودند[12] فقط"

اکنون که شمهٔ از شرح حال شاعر را حضور خوانندگان گرامی تقدیم داشتم می پردازم به معرفی کلیات افریدی.

این کلیات که تحت شمار عدد: ۵۰/۵م ۲۲ در خدابخش پبلک لائبریری محفوظ بوده، دارای شش کتاب قاسم علی خان اپریدی است[13] که دو آن بزبان پارسی یکی آن بزبان هندی و دو دیگر آن بزبان پشتو و یک آن مشترک الالسنین است بین زبانهای پشتو، پارسی، عربی، کشمیری، هندی و انگلیسی[14].

من نخست از کتاب اول کلیات شروع میکنم که نام آنرا مولف "رسالهٔ افریدی" گذاشته است و در این رساله که به سال ۱۲۲۵ هـ تکمیل شده است در ۲۲ باب آن شرح حال خانوادگی قاسم علی خان اپریدی با نسب نامه وقایع هجرت به هندستان و شرح زندگانی هندستانی این فامیل افغان درج است.

اما نکتهٔ قابل تذکر درین جا این است که در مقدمه مولف ابواب این رساله را بیست و پنج نشان داده است و خاتمه نیز کتاب در بیست و پنج باب تکمیل شده است، مولف چهارده سال بعد در سال ۱۲۳۹ھ ق باب دیگری را بنام باب بیست سیوم جهت تکمیل باب بیست و یکم (که در شرح حال افراد خانواده مولف است) بآن اضافه نموده و بخط و قلم خود در اوراق سفید که بعد از تکمیل رساله وجود داشت آنرا نبشته است، درین باب اسمای فرزندان وی نیز با قید تاریخ تولد سنوات هجری و عیسوی درج شده است، خط این فصل با خط تصحیحی که در ابواب مختلف این رساله شده است مطابقت عام و تام نشان میدهد و ازان برمی آید که این اضافات بخط خود مولف است۔

بعد از رساله افریدی شفاعت نامهٔ افریدی درج است که تماماً در ۱۲ ورق نبشته شده است غزلیات و قصاید را حاوی است که شاعر در شرح حال سلسله قادریه سروده است و سن تالیف آن ۱۲۱۰ھ ق است شاعر گوید که آنرا در یک شبانه روز تکمیل کرده است، درین مورد ابیات خود شاعر چنین است:

ازین کتاب مصنف بیک شبانه روز شده به فضل الهی سراعت افریدی

نمود ہاتف غیبی بجست سن هزار و دو صد و ده شد شفاعت افریدی

کتاب سیوم کلیات دیوان هندی قاسم علی خان افریدی است که در ابتدا امر دف تدوین گردیده: اما بعد شکل بیاضی را بخود اختیار کرده است، در حواشی متن خود شاعر و دیگران اضافاتی بدان نموده اند و غزلیات دیگر شاعر را بدان افزوده اند۔ درین دیوان غزلیات متفرق پارسی نیز دیده میشود که غزلی را به اقتفای ناصر علی سرهندی نیز سروده: در درج دیوان هندی است۔ این دیوان ۱۰۸ ورق دارد و در آخر آن چهار بیت هندی نیز آمده است، و قاسم علی خان افریدی کیست که این زمرمهٔ شاعری عوامی پشتو فی با رابشاعری هندی اضافه نموده است تاریخ تکمیل دیوان هندی را ازین دو بیت میتوان استخراج کرد۔

خاتمه دیوان افریدی بدین منوال ہے ہجرت حضرت رسول اللہ کا احوال ہے

ہاتف غیبی سے پوچھا ہیں جو اوس کا سال و ماہ یہ کہا ماہ رجب غیور اوس کا سال ہے ۱۲۵۱

چون در سطور بالا رسائل زبانهای دیگر کلیات افریدی معرفی گردید، درین جا لازمیست که آثار پشتوی وی را باساس نمرات مسلسل نسخ خطی پشتوی خدا بخش پبلک لائبریری بدین شرح معرفی نمایم۔

(۴۰) **افریدی نامه**: این کتاب قاسم علی خان که تصادفاً کتاب چهارم کلیات افریدی است و کتاب چهارم مخطوطات زبان پشتوی خدا بخش پبلک لائبریری درین فهرست نیز میاید دارای ۲۹ ورق هر ورق ۱۳ سطر و هر صفحهٔ آن به شکل دو ستون تهیه شده است و هر ستون آن دارای پنج خانه در جلد اول بوده است یعنی بطور اوسط در هر صفحه

۲۶ لغت ہر زبان وجود دارد تقطیع متن آن ۲۶ × ۱۹ سانتی متر است ۔

در آغاز فرہنگ لغات زبانہای : پارسی، پشتو، کشمیری، انگریزی و ہندی آمدہ است ۔ درستون اول صفحہ الف ورق ۱۷ جای زبان ہندی را عربی میگیرد، ولغات زبان ہای فارسی، پشتو، کشمیری، فرنگی و عربی را میاورد درستون دوہم صفحہ (ب) ورق ۱۹ از زبان کشمیری جالیش را بزبان ہندی میگذارد و فرہنگ بزبان ہای عربی، فارسی، پشتو، فرنگی و ہندی ادامہ می یابد و بدین منوال خاتمہ می پذیرد، باین حساب افریدی نامہ یا باصطلاح محققین افغان پشاوری فرہنگ افریدی فرہنگ شش زبانی است کہ تاہم اکنون در حلقہ ہای علمی این فرہنگ بہ فرہنگ پنج زبانی شہرت داشت و من خود این سہو را مرتکب شدہ ام و در جلد اول فرہنگ زبان و ادبیات پشتو این فرہنگ را پنج زبانی قلمداد کردہ ام[17]

(۵) دیوان افریدی : باز ہم کتاب پنجم کلیات و کتاب پنجم این فہرست باہم متصادف اند و آن این کہ کتاب پنجم کلیات افریدی دیوان پشتوی وی است دیوان پشتوی[17] قاسم علی خان افریدی ۱۱۰ ورق و در ہر صفحہ ۱۹ سطر کہ تقطیع متن آن ۲۵ × ۱۶ سانتی متر بودہ، مجموعہ ای از غزلیات، قصائد، رباعیات و مخمسات قاسم علی خان است کہ قبل از رباعیات دو چہار بیت پشتوی این شاعر نیز دران ضبط می باشد دیوان در سال ۱۲۰۶ ھ ق تکمیل شدہ است وابتدای آن بعد از بسم اللہ الرحمن الرحیم باین ابیات شدہ است ۔

حق مالک د دہ جہان دی رب زما	ہم خبنتن دلامکان دی رب زما
نہ ایجرتہ معین، وطن، ہستوگہ	بیا ظاہر، باطن، عیان دی رب زما

وانجام آن این طور است :

دا دیوان می د عرفان پہ میینی ڈک شو	د غلام محمد ولی دعا اثر دی
قاسم علی افریدی خاتمہ دی خیر شہ	تصنیف کری دی دیوان پہ ملہ ہر ہندوی[18]

(۶) خواب نامہ : کتاب ششم خطی زبان پشتو در خدا بخش پبلک لائبریری خوابنامہ قاسم علی خان افریدیست کہ شامل پنج ورق و ہر صفحہ ۱۹ سطر و تقطیع متن آن ۲۵ × ۱۶ سانتی متر است ۔ خوابنامہ رسالہ آخیر کلیات افریدی است و قاسم علی خان نامش را "خوابنامہ افریدی" گذاشتہ است ۔

باید یادآور شد کہ مخطوطۂ خوابنامہ قاسم علی خان در خدا بخش پبلک لائبریری نسبت بہ دو نسخہ دیگر ازین کتاب کہ من در اسلامیہ کالج پشاور و رضا لائبریری رامپور دیدہ ام در سطح پاینتری قرار دارد بہ اوراق نسخہ آب رسیدہ است کہ این آب رسیدگی ہا بعض جاہای آن را از خواندن و استفادہ خارج نمودہ است ۔ بیت آغاز خوابنامہ این است

تاسی آوری مومنا نو اہل دین　　　　الله بودی لاشریک به ان واین

و بیت انجام آن:

قاسم علی افریدی او س ثره بندګره　　　　بلسبتانه نه نوابنامه باندی تورسند کره[۱۹]

قابل تذکراست که در آغاز و انجام تمام رسائل و کتب کلیات مهر قاسم علی خان افریدی به نظر می اید مهرا بن طور خوانده میشود: "قاسم علی خان افریدی ۱۱۹۱"

۷۱) فرہنگ ارتضائی: از نسخ زیبا و پربهای گنجینه های علی خدابخش پبلک لائبریری فرہنگ زبان پشتو بنام فرہنگ ارتضائی است۔ این کتاب از نایاب ترین آثار زبان پشتوست و اغلباً شاید تا حال یک نسخه دیگری ازین فرہنگ در دست باشد فرہنگ ارتضائی تحت شمار عدد: ۷۸۳

خدا بخش پبلک لائبریری ضبط بوده و دارای ۵۰ ورق هر صفحه ۱۳ سطر تقطیع متن آن ۲۰×۱۱ سانتی متر است۔

این فرہنگ تالیف نواب ارتضا خاں فرزند نواب امان خان عمرخیل افغان است که خود نواب ارتضا خاں از افغانان هندستان زاد شمرده میشود، ولی با وصف دوری از وطن ابایی با عشق و اشتیاق فراوان به تالیف این فرہنگ و قواعد گرامری زبان پشتو در مقدمه و ضمن تشریح لغات دست یازیده است، اصل فرہنگ به زبان پشتوست سپس معنی آنرا بزبانهای پارسی و هندی اورده است، وی درین فرہنگ لغات را چون سایر فرہنگ نویسان باساس ردیف والفبانیاورده است، بلکه آنرا در یک صد و شصت و شش فصل مرتب نموده در هر فصل آن از اعضای بدن انسان و جانوران گرفته تا چرند و پرند و پوشاک و میوه جات وغیره را شرح و معنی نموده است، انتخاب لغات طوری صورت گرفته است که خواننده از آن به قواعد و اصول گرامری و ساختمان زبان پشتو نیز پی برده میتواند که ازین رهگذر نیز این فرہنگ حایز اهمیت فراوان است۔

فرہنگ دارای مقدمه و خاتمه بزبان پارسی است همچنان قطعات تکمیل تاریخ آن بزبان های پشتو، پارسی و هندی از طرف مولف و دیگران سروده شده است فرہنگ ارتضائی در سال ۱۲۲۵ھ ق تکمیل گردیده و تاریخ کتابت نسخه خدابخش پبلک لائبریری نیز ۱۲۲۵ھ ق است و بے حدس قرین به صحت گفته میتوانیم که این نسخه را کاتب از روی مسودات نواب ارتضا خاں برای نواب مذکور تهیه داشته است، و نسخه اولی و قدیمی این کتاب به شمار اید۔

خدابخش پبلک لائبریری را شاید که در نشر این فرہنگ همت گمارد خصوصاً توجه دکتر عابد رضا خان بیدار را به نشر این فرہنگ مبذول میداریم۔

(۸) رسالہ در تحقیق معنی تصور و تصدیق : این رسالہ ایست در شرح مسائل منطقی چنین رسائل در زبان پشتو نهایت زیاد است، بطور مثال علمای جید دین در مسائل مختلف دینی، فقهی و منطقی برای طالبان تقریر میکنند و مسایل مبهم و مغلق و پیچیده را شرح میدهند، طالبان شرح و تقاریر استادان خود را جمع می کنند که آنرا امالی گویند و این رسالہ نیز از یکی از مدرسین مشهور صوبہ سرحد است که طالب العلم خطاط نام آنرا "مولانا صاحب تورورسک" معرفی کرده است رسالہ دو بخش دارد و تمامی صفحات آن (۱۳۱) است تقطیع متن آن : ۲۲×۶ ا سانتی متر - و در خدا بخش پبلک لائبریری تحت شمار علد : ۱۵۷۳ ا درج است. کاتب آن ملا حبیب الرحمن ساکن قریه "تگری سرکز" ایالت ۱۵۷۳ نعمان افغانستان شرقی است. و نسخه را در علاقه صدیخ بابوزی سوات خطاطی کرده است این شرح و سایر شروحی که از طرف علمای دینی بزبان پشتو به طالبان علوم دینی گفته شده است، و شاگردان آنرا بصورت امالی در رسائل جداگانه تهیه کردند، منثور بوده، اما نثر آن نهایت مغلق و پیچیده و از محاوره عامه مردم دور است [۲۲] نثر چنین شروح مکتب جدیدی را در نثر نگاری پشتو ایجاد کرده است که از حیث سلاست و روانی بی مایه بوده والبته کیفیت معنوی در آن نهفته است - این مقاله را به امر برادر به جان برابرم دکتر عابد رضا خان بیدار تهیه داشتم، معلومات تماماً متکی بر حافظه ام است تمیدانم که حافظه درین مورد تا چه حد با من یاری کرده است، اگر در سن ها و تواریخ غلطی رخ داده باشد از دانشمندان امید وار عفو هستم -

حواشی

(۱) رجوع کنید به مراة العلوم ج ۱ ص ۱۱۹ تالیف مرحوم خان بهادر مولوی عبدالمقتدر طبع ۱۹۲۵ء پټنه.

(۲) تالیفات دیگر اخون درویزهٔ ننگرهاری عبارت انداز: تذکرة الابرار والاشرار وارشاد الطالبین.

(۳) الف نامهٔ کریمداد در قالب غزلیات سروده شده وشرحی بدان نیز نوشته شده است که از جمله شروح عبدالله قصوری ...بنام مفتاح الدقائق وشرح حاجی بهادر کوهاتی شهرت ای دارد: شرح عربی نیز بدان نوشته شده است، وشرح اردو آنرا در سال ۱۲۹۱ھ نواب کلب علی خان "المعانی ترجمهٔ زبان افغانی" نام گذاشت، در این کتاب که نویسنده آن مشتاق احمد است لب لباب مخزن الاسلام والف نامهٔ کریمداد ومکتوباتش بزبان اردو ترجمه شده است فلهذا آنرا شرح گفته نمیتوانیم بلکه نویسنده خواسته است که اردو زبان را به نکات صوفیانهٔ مخزن الاسلام والف نامهٔ کریمداد متوجه سازد. "المعانی ترجمهٔ زبان افغانی" در مطبع خورشید هند مراد آباد به سال ۱۲۹۲ھ ق طبع شده است، در الف نامهٔ کریمداد نکات بسیار مهم صوفیانه بزبان پشتو منظوم بیان شده است وازآنرو برگزیدهٔ تصوف زبان پشتو شمرده میشود. پوهاند صدیق الله خان رشتین در یکی از شماره های سال ۱۳۵۲ھ ش مجلهٔ کابل مقاله ای بر شارحان الف نامهٔ کریمداد نوشته است، وشرح حال کریمداد را استاد پروفیسور عبدالحی حبیبی در جلد اول پشتانه شعرا طبع ۱۳۲۰ھ ش کابل درج کرده است، بعد شرح حال مفصل این شخص را قاضی عبدالحلیم اثر در کتاب "تیرهیر شاعرای" طبع ۱۹۶۳ء اکیډیمی پشتو پشاور نیز ضبط نمود.

(۴) کاسی قبیله ای از قوم افغان است که در نواحی کویټه وسایر نقاط افغانستان به شکل متفرق زندگی میکنند وخانواده های ازین قبیله به هندستان نیز آمده اند رسم الخط نام این قبیله در متون کهن ولهجه های مردم افغانستان وپشتو زبانان "کاسی" ضبط است. اما تلفظ آخری این نام در نواحی صوبهٔ سرحد باساس تأثیر زبان های هندی "کانسی" شده است که این شکل بعدی وغیر صحیح این نام است کسانیکه با متون قدیم زبان پشتو اشنایی دارند وبا پشتونها نشست وبرخاست دارند، آنها هیچ گاه در نبشته های خود "کانسی" نمینویسند، بطور مثال مرحوم مولوی عبدالرحیم فهرست لباب المعارف العلیه را بزبان اردو نوشته است ولی او هرگز کاسی را کانسی ضبط ننموده است، بطور مثال وی در ص ۲۴ لباب المعارف مینویسد: "مصطفی خان بن محمد سعید خان افغانوں میں سے ایک قوم کاسیوں کی ہے..." قلندر مومند بر خطاطه پټه خزانه محمد عباس کاسی اعتراض وارد میکند که چرا نام خود را کانسی ننوشته است، حال اینکه ضبط "کانسی" مغایر

نیست دیرینه رسم الخط این نام و همچنان گویش های مردم عامهٔ پشتو زبان است۔

(۵) عبدالغنی کاسی نیز شاعر و نویسنده است بشته های وی و بیانات افغانی (کتابت ۱۱۴۲ھ ق) مخط برادر دانشمندم حبیب الله رفیع موجود است۔

(۶) مولوی غلام سرور لاهوری در خزینة الاصفیا و رحمان علی در تذکرهٔ علمای هند راجع شرح حال اخوند ننگرهاری مواد مبسوطی را ارائه میدارند اما در ضمن آن مولوی غلام سرور خان در مورد سال وفات اخوند درویزه دچار اشتباهی شده است، و تاریخ وفات وی را (۱۰۴۸ھ ق) نبشته است۔ که این غلط تا تدوین متن انتقادی مخزن الاسلام و مقدمه آن تواتر پیدا کرد تمام محققین زبان و ادبیات پشتو حتی خاورشناسان سال وفات اخوند درویزه را (۱۰۴۸ھ ق) میدانستند۔ اما بعد از نشر متن کامل تاریخ مرصع تالیف (۱۱۲۲-۱۱۳۶ھ ق) توسط مرحوم استاد دوست خان کامل مومند (متوفی ۱۹۸۰ع) این سن غلط مشهور تصحیح گردیده و محقق و دانشمند برگزیدهٔ افغانستان استاد فاضل و محترم پوهاند عبدالشکور رشاد باین موضوع ملتفت گردید و یادداشت وقایع دربارهٔ اخوند درویزه مندرجهٔ متن تاریخ مرصع سال وفات اخوند مذکور را به ۱۰۲۸ھ ق تصحیح و شاگردان و محققین تاریخ ادبیات باید بعد ازین تاریخ وفات اخوند درویزه را بجای ۱۰۴۸ھ ق ۱۲۰۸ھ ق صحیح بپذیرند استاد رشاد در مقدمه طبع سوم "گلشن روه" (طبع کابل ۱۹۷۹-۱۳۵۶ھ ش) درین مورد گفتنی های مفیدی دارد۔

لازم به تذکر است که در کتاب خانه های هندستان نیز نسخ خطی فراوان مخزن الاسلام یافت میشود، نسخ این کتاب را که تا حال من در هندستان دیده ام از نگاه سن کتابت قدیم تر نسخه ایست که در سال ۱۱۴۳ھ ق کتابت و تحت شمار عدد: ۴۰۴۳/۲۳/۵۵۰۷۳ موزیم ملی هندستان در دهلی وجود دارد۔

(۷) گوهر خان ختک فرزند خوشحال خان ختک صاحب قلب السیر (تالیف ۱۱۲۰ھ ق) در مقدمه اثر نوشته است که افضل خان ختک کتابت را از نواحی مختلف جمع کرده و کتب جدش خوشحال خان را توسط اتان برنداری میکند و نسخ فراوان از آن برداشته است (مقدمهٔ قلب السیر مخطوطهٔ موزهٔ پشاور) اساس نقل نسخه، دست در خدا بخش لائبریری نیز در همان وقت و باساس همین تجویز نقل برداری و تهیه شده بود۔

(۸) در کتب خانه های هندستان قدیمترین مخطوطهٔ فواید الشریعت از نگاه سن کتابت مخطوطه ایست در رضا رامپور که به سال ۱۱۶۲ھ ق کتابت شده و تحت شمار عدد: ۲۴۳ در فهرست مخطوطات السنه متفرق درج است

(۹) مادهٔ تاریخی وفات برهان خان "قصد نخ" است که با هفدهم جمادی الاولی روز سه شنبه سن ۱۱۹۴ھ ق مطابقت

(۱۰) مادهٔ تاریخی ولادت قاسم علی خان: "تجمّع" است = ۱۱۸۲ھ ق۔

(۱۱) این احوال در اوراق ۴۷-۵۰ رسالهٔ افریدی به تفصیل درج شده است۔

(۱۲) رسالهٔ افریدی ورق ۵۸ ص ب۔

(۱۳) فهرست نسخ خطی فارسی اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور، جلد ۲، ص ۱۵۹

(۱۴) یک نسخهٔ کلیات افریدی که فرهنگ یا افریدی نامه نیز ضم آن است در کتاب خانه های بریتانیا موجود است و دکتر میکنزی که فهرست نسخ خطی پشتوی بریتانیا آنرا معرفی کرده است (طبع ۱۹۶۵ء اکسفورد)، همچنان یک نسخهٔ این کلیات در کتاب خانهٔ اسلامیه کالج پشاور نیز محفوظ است۔ (لباب المعارف العلمیه ص ۳۶۳-۳۶۴، کتاب نمبر ۱۹۱، طبع آگره ۱۹۱۸ء) این نسخه را من دیده ام رسالهٔ افریدی آن که مولوی عبدالرحیم آنرا ننگ افریدی نامیده ناقص است، و شمار کتب آن نیز به شش نمیرسد، یاد داوین، پشتو، هندی فرهنگ، رسالهٔ تاریخ خوابنامه، غزلیات پارسی را دارا است۔

(۱۵) یک نسخهٔ دیگر دیوان هندی قاسم علی خان افریدی مع غزلیات پارسی در کتاب خانهٔ مولانا ابوالکلام آزاد علیگڑھ مسلم یونیورسٹی در سر سلیمان کولکشن تحت شمار عدد: ۷۰۶ ضبط است ۳۵۲ ورق دارد، در آغاز اشعار پارسی بعد اردو و در اخیر آن رباعیات اردو نیز موجود است، بخش هندی (اردو) دیوان قاسم علی خان افریدی از طرف اکیڈمی پشتوی پشاور طبع شده است

(۱۶) فرهنگ زبان و ادبیات پشتو جلد ا ردیف ق، تالیف ملی هیواد مل طبع ۱۳۵۶ ش کابل مطبعهٔ تعلیم و تربیه۔

(۱۷) یک نسخهٔ دیوان پشتوی قاسم علی خان که آثار دیگر آن نیست در آرشیف ملی افغانستان وجود دارد و نسخهٔ دومی دیوان پشتوی آن با ضمیمهٔ خوابنامه در رضا لائبریری رامپور تحت شمار عدد: ۱۴ فهرست السنهٔ مختلف ضبط است، اوراق دیوان ۱۵۶ می باشد۔

(۱۸) اصل: نه تصنیف به کری دیوان په ده میر دی (که غلط و سکته است) وزن آن نیز دچار پریشانی دیده میشود)

(۱۹) اصل: پښتو ته خوبنامه باندی خوسند کړه (وزن آن درست نیست)، باید دانست که دیوان پشتوی افریدی خوابنامهٔ افریدی، فرهنگ افریدی، شفاعت نامهٔ افریدی و رسالهٔ افریدی تا هنوز طبع شده است، صرف نقل خوابنامه را دانشمند محترم حبیب الله رفیع از روی نسخهٔ اسلامیه کالج پشاور جهت طبع گرفته بود ولی تاکنون طبع نه کرده اند۔

(۲۰) پروفیسور محمد نواز خان طاهر در جلد دوم روحی ادب طبع پشاور پشتو اکیڈمی سال ۱۹۷۸ء ذکری و شرحی؛ بارهٔ فرهنگ از نعقانی دارد۔

(۲۱) مرآة العلوم ج ۱ ص ۱۱۹، طبع پٹنه ۱۹۲۵، تالیف مولوی خان بهادر عبدالمقتدر خان صاحب۔

(۲۲) در تاریخ تطور نثر پشتو نثر دینی قرن سیزدهم و چهاردهم خصوصاً چنین شروح از نثر های تفصیلی بی مزه شمرده میشوند ●●

کتابیات سے متعلق اردو اور فارسی زبان میں ۱۹۸۶ سے شائع ہونے والا
تحقیقی مجلہ

کتاب شناسی

زیرادارت
سیّد عارف نوشاہی

- غیر متعارف رسائل کے مکمل متون۔
- کتاب نویسی، کتاب شناسی، اور کتاب داری کے فنی مسائل۔
- نادر مخطوطات اور مطبوعات کی مختصر فہرستیں، یا کسی ایک کتاب کے بارے میں توضیحی و تحقیقی مطالعہ۔
- تازہ علمی مطبوعات پر غیر جانبدارانہ، معیاری اور علمی تبصرے۔

ناشر
ادارہ معارفِ نوشاہیہ
۶۹ - ماڈل ٹاؤن، ہمک، اسلام آباد - پاکستان
ٹیلی فون: ۸۲۷۱۲۲۲(۰۵۱)

Characteristics of the Divan:

a) The Size: The total number of the folios is 293 (586 pages), each 15 x 26 cm. in size. The scribed area is 12 x 18 cm. with varying number of lines between 15 to 17. The Divan is not illuminated and does not have any miniatures. The rubrics are blank. The *ghazels* are put in an alphabetic order.

b) Order of the Divan: The first rubric has the line " فی التوحید الباری تعالی شانہ " which Prof. Suleyman gives as " فی التاخیر الباری تعالی بشانہ ". The first folio has been partially destroyed because of bad repairing (between lines No. 4 - 8).

The first verse is :

The last one is :

Unfortunately, the colophon in the end has fallen away along with some folios. No definite date, therefore, can be given. Main *khat* is *naskh* of the 15th. century and the elegy on Sultan Ibrahim (f.52) is in clear *nasta'liq* written by some other hand.

c) The Content: There are 9 panegyrics (f. 2-51); 3 *terji' bands* (f. 32-50); one *tarkib band* (f. 22-25); an elegy on Ali and one *mustezad* (f. 58-59) with different *khats* Between f. 60 - 574 are the most beautiful 1050 *ghazels* which form the major part of the Divan. Five of the *ghazels* are in Persian & the rest all are in Chagahtay Turkish. The theme of the pomes are, in general, about the eyes, eyebrows, locks, lips of a beauty; lover's cruelty, indifference, pains given by love; wine, goblets, drunkardness, yearning etc. This is the first Chagahtay Divan of the pre-Nevai classical literature.

Towards the end, there are some *qita's* (sections) and *rubai's* (qautrains) a great number of which has been perished. As is usual with the *ghazels*, some exoteric meanings may lead us to mystical ideas and *tasavvuf*. All the poems are original. They are not the translation or even adaptaton of the Great Hafiz's poetry. However, some similarities of the two poets may be noticed which can be taken in a separate article.

---

ncluded in the book of Prof. Suleyman, perhaps due to ome political reasons. His elegy (see f.52) on the eath of Sultan Ibrahim, son of Shahrukh (ruler of hiraz between 1414 - 1435) shows that he was a oet-laureate of the Sultan. We can assume positively hat after staying at his homeland "Khawarezm" he igrated to Shiraz. He had the idea of going to Shiraz r Iraq due to the lack of appreciation of his ountrymen towards him and his poetry. He clearly efers to this in his following lines:

"O, Hafiz set out of Khawarezm and hope to go ither Iraq or Shiraz" (Divan f. 278)

"Hafiz, if the people of Khawarezm do not ppreciate your value then you may decide to go to Iraq nd from there to Shiraz" (Divan f. 395)

He, therefore, stayed at Shiraz until the death of is patron Sultan Ibrahim (d.1435). If the following erses of his *qita'* belong to his later age, then it in be said that he came back to Turkistan:

"O, Hafiz when you turn into dust in the land of irkistan, (May God) spread your words all over"(f.575)

ıy was he ignored and disapproved:

The great Chaghtay poet Ali Shir Nevai does not ention his name in his "Mejalis un-Nefayis" (a ographical work) although his autograph is seen on lio 130 of the Divan. Babur Shah, who probably, owned ie Divan and took it to India with his other Chaghtay oks, does not either give any example of Abdur him's poems in his book on prosody "Mukhtasar". So, iat can be the reason of hiding such a great work ? ie only logical reason is that "Hafiz-i-Khawarezmi" was *Shi'a*. We understand this from his panegyric that he ote in praise of Ali (see f. 9) and particularly from ie word " وصی " = "an executer" (see Divan f. 10). also shows great devotion to *Shi'a* sheykh and poet mattullah Vali (1329 ? - 1431) (see f. 16). Babur ah, a staunch *Sunni*, would not let his Divan come out his library. However it might had been studied by s descndants as we see a *mashq* (drill) of the letter (ق) on the first folio of the Divan. Many other rkish works have similar grammatical drills or ctionaries attached to the main part.

Culture, Language and History, Ankara, to provide the films. After a tiresome correspondence between the Turko-Indian authorities, we received the films towards the end of 1988. It is now that I am able to render a brief introduction of the poet and the manuscripts.

Identity of the poet:

We have little information about his family and life. However, we find some hints about his name in his poems. On folio No. 157 he describes his name as "Abdur Rahim". In his five Persian *ghazels* (lyrics) he uses the short form of his name "Rahim" while in his Turkish poems he uses the pseudonym "Hafiz". He mentions his homeland as "Khawarezm" in his various poems (see for example ff. 278 and 395). As a result his full name will be "Abdur Rahim Hafiz-i-Khawarezmi" and not "Hafiz-i-Turk" as enrolled by the librarian.

Why did he adopt the pseudonym "Hafiz" ?

A great competition between the Turkish and the Persian poets had already started at the time of early Timurid princes. We have these feelings when we read Nevai's book "Muhakamat ul-Lughatayn" (Comparison of the two languages) written after the death of our poet. Under this impulse of rivalry our poet might have adopted the pseudonym "Hafiz" in order to claim that he was as strong as Hafiz-i-Shirazi of Iran. The tone of the following verses gives this feeling:

(i) "At the moment, see this Hafiz in Turkish, although the Hafiz of Shiraz has also passed in Iran" (Divan f. 279) and:

(ii) "If it were proper to be a prophet in the Turkish race, I would have become a prophet and my poems would have been my miracles" (Divan f. 19)

There in no proof that our Hafiz met the Persian Hafiz. So, it cannot be claimed that he adored Hafiz-i-Shirazi and adopted the pseudonym as stated by Prof. Dr.Hamid Suleyman.

The period when he lived:

His first nine panegyrics are very important from the historical point of view. They have not been

Dr. Erkan Turkmen
Associate Professor of
Eastern Languages & Literature
Konya(Turkey)

Divan-i-Hafiz-i-Khawarezmi

Preserved in Salarjung Museum, Hyderabad

In 1984 I had been granted a scholarship for the period of six months to India under the Turko-Indian Cultural Exchange programme. My major interest was to study the influence of Turkish on the Urdu language and literature, because the Central Asian Turks from Mahmud of Ghazna (ruler of India between 1001 - 1027 A.D.) down to the last Timurid king Bahadur Shah Zafar have been patrons of the language. Karakoyunlu (Black Sheep) dynasty of Qutb Shahs in the southern part of India and Babur Shah's descendants took an outstanding role in the developing of Urdu that had begun to become the third lingua franca (besides Persian and Turkish) among the mixing class of Turks and Indians. Babur Shah tried hard to introduce Turkish in India but his son Humayun, who lived in exile for some years in Iran, became reinfluenced by the charm and harmony of the Persian poetry that had already progressed under the patronage of the Turkish poets of Central Asia and India (such as Nizami Ganjevi, Amir Khusrau of Delhi, Maulana Jalal al-Din Rumi and Mirza Bedil).

During my stay in India, I tried to visit the most important libraries to find out what Turkish elements have entered Urdu and its literature. I found several manuscripts of Turkish dictionaries, grammars, drill books and divans etc. At Salar Jung Museum I found works of Babur Shah (his Divans and the Memoirs) and some precious books of Ali Shir Nevai and Fuzuli. Among these manuscripts, I found a huge Divan entitled "Divan-i-Hafiz-i-Turk". The work had already drawn the attention of a Russian Scholar Prof. Hamid Suleyman, who published the Divan in two volumes from Uzbekistan Academy of Sciences in cryillic letters with insufficient introduction.

I requested for the microfilm of the Divan, but he librarian gave me a film of only five folios on the rounds that the personal applications would not be cceptable. Upon my return to Turkey, I asked Mr.Suat han, the president of Ataturk Supreme Council for

arithmetic and illustrates an incident in which the saint outsmarted the professional accountants in calculations in that system.

Apart from a number of Hindi words occurring in the saint's narratives like *Lakhugia, Katori, Chhajja, Khabadya,, Karahra, Battala, Gunakar* and *Bhagakar*, etc. and purely Indian names and sobriquets or surnames like *Bada, Bubu, Kaddu, Khattuwal, Kath, Nawait* etc., the *Mirqat* quotes a number of Persian verses composed by the saint as well as others like Sayyid Mahmud Rukh referred to earlier. The saint also refers to the mystical Persian verses which its composer Maulana Shihabud-Din Ahmad Surkhani had sent to him and which unlike his Tract on Spiritual Path which also was sent with the verses, were proclaimed by the saint to be of a high quality.

The Hindawi *Dohras* mostly composed by the saint as also by others were frequently recited in the assemblies and these have been reproduced in the *Mirqat*. Unfortunately, due to the scribe's unfamiliarity with that language, the correct readings of these cannot be determined unless some good correctly written copy of the *Mirqat* is found. These are quoted below :

ہبہ بجھاہ بدہ جون تہورہ ہتورہ اہ — آگیں ہاتھ نیا نیان بسامرا گواہ

توں جانہ کرتار جی منجہ ساجن بیپرہ — سائیں سریسی سار کردوں تمہاری بلیا

توں جانہ کرتار جی منجہ ساجن بیپرہ — سائیں کی ہے سار پانجر بازجوبن بیسے

رودکہا کا جل جی کردوں توسوکن دکھ دیہ — نہ پیو دیکھن دید منجہ نہ آپ دیکھ سکنیہ

بہولی بوجہوں پندتا ددون کیتی ماس — دیا بجہری ایک تل جانوں برس پچاس

ٹٹی بندہی کنتہری جو دھن اد ٹھیل ہوی — مودکہ در کہی نین دومن کہ رکھی کوی

سوبنتہرا دکہال منجہ جس ہو نیو تلوں — دندا کہیرا نکر بکہیا بانگ جلول

اری منیں مناؤ ماں سر منیں کھیا ہوی — ایتیاں بھیراں منیا سرکہہ نجادہ کوی

دیکھی جی کن دیکھہ دیس کی برس انت نہ باس

اب تجادی ساہری لوکنہ کو بدہ دیکھ

only designated by the term Hindi or Hindawi in the saint's discourses, which was also widely known and spoken by the learned. The saint from his discourses appears to have been at ease in Persian and Hindi and also in Arabic as is clear from the *verbatim* quotations of his conversation in that language with local people at Aden, Jedda, Mecca and Madina. Conversation with or between common man was in the local dialect. The saint's narrative of the meeting at which the *Muqta'* of Nagaur was distributing grain to people at the time of drought, quotes a short phrase in the local dialect used by a local man, which appears to be Rajasthani or Marwadi. Unfortunately, the reading in the manuscripts is too corrupt to admit of satisfactory decipherment; it reads like *Laharjah Jhakanji*[1] the meaning of which given is : 'he is talking non-sense'. A similar phrase, widely current in Khatu, evidently a Rajasthani proverb, which also cannot be satisfactcrily made out reads something like *Kahtu Jhura wa Jahu*[2]. One more phrase in local dialect which is reported from a village near Nagaur is, *Laddu kadhu*[3] that is "from where are there *Laddus*" and *adhu*[4] that is "from there". This is the specimen of a middle 14th century Rajasthani dialect. A similar specimen is provided by a saying current in Khatu region which according tothe saint's own version was quoted by some people when he decided to eave Khatu after Babu Ishaq's death. It is *Kadmul, kadwain hui*[5] meaning "when he died and when he became a grave-splitter" recalling to mind a similar Urdu saying quoted by the Gujarat Sultan almost a century after when Bahadur Khan later Sultan Bahadur Shah left Gujarat after the death of his Pir, namely *Pir mua Murid jogi hua*[6].

The saint conversed with the *Jogis* in the local dialect. With a Hindu resident of Delhi who was taken captive to Semarqand and converted to Islam, the saint says he conversed in Hindi dissuading him from testifying that in Delhi wine was openly sold and acts prohibited by religion were committed in public to provide justification of Timur's invasion of Delhi. The compiler of the *Mirqat* testifies to the saint's expert knowledge of Hindi

---

1 لہرجہ جھکنجی 2 کہتو جہورا وجہو 3 لڈو کدھو 4 ادھو 5 پیر موا مرید جوگی ہوا

6 کد موا کد وین ہوا

newly founded kingdom of the Khanzadas. It was the marketing-centre for the region around, where all types of commodities and fancy goods catering to all tastes were available. Shaikh Ahmad says that Babu Ishaq used to specially order fine shoes, cloth good arrows, etc,, from Nagaur for him,

I now propose to conclude the lecture to the relief of all present here including myself by examining if the saint's *Memoirs* furnish any worthwhile information about an important aspect of religious and cultural life of the medieval society, that is to say about language, literature and general state of learning of the period in Gujarat and Rajasthan. The saint in his talks mentions a large number of such learned men and savants and teachers most of whom he knew or had met as are not known from other sources, like Maulana Majdud-Din *Muhaddith* of Delhi, Maulana Shamsud-Din of Hisar Firuza, Maulana Sayyid Mahmud Rukn of Delhi, the teacher of the compiler of the *Mirqat*, Maulana Nizamud-Din Surkha Maulana Kamalud-Din Samana, Maulana, Qadi Sufyan of Multan, Malik Badh bin Malik Sher of Nagaur, Maulana Ahmad Achh or Uchh (probably Achchhe) spoken of as *Ustad-i-Gujarat*, Maulana Abul-Faraj Radiu'd-Din of Didwana, Maulana Khatirud-Din of Nagaur, a maternal uncle of the compiler, Maulana Kaddu Dihlawi, Maulana Daud Mantiqi, Maulana Ibrahim *Mudarris* of Nahrwala-Patan, Maulana Qasim of Sambhar, who had the entire *Bazdavi* by heart, Maulana Hafiz Husain Shihab of Nahrwala-Patan, Qadi Mansur of Sarkhej, Maulana Mansur Kazeruni, Maulana Kamalud-Din *Muhaqqiq* the learned Imam of Khan Jahan's mosque, Maulana Shaikh, the *Sajjada* of the saint Khidr of Hauzi Khas, Maulana Ahmad, the attendant (*Khadim*) of Shaikh Nasirud-Din Mahmud, and the like. Among others, Maulana Diyaud-Din Sunnami of Delhi ond Maulana Sadrud-Din Bimbani and his son Maulana Siraj Bimbani are mentioned.

As to the languages in vogue, Arabic and Persian were generally understood and also spoken by the comparatively well educated people. Persian was more widely understood. The masses including the trading class, particularly Hindu grocers, seem to have conversed in the local dialects of respective regions

of money and would invest them in trade on their behalf. During his stay with Babu Ishaq at Khatu, the Sarkhej saint had deposited one hundred tankas with a grocer of acquaintance. One of those days, the *moong* prices fell whereupon the grocer sought Shaikh Ahmad's consent to purchase the commodity with the deposited money. Shaikh Ahmad was initiallty hesistant as the money actually belonged to Babu Ishaq, who might ask for it any time. The grocer assuring him that in such a contingency, he would return the money and consider the commodity to be his. The deal was made when somebody carried the tale to the Babu that Shaikh Ahmad had invested money in trade. The Babu asked for the money to verify the matter and Shaikh Ahmad got the money from the grocer as arranged and gave it to the Babu who being satisfied returned it and Shaikh Ahmad also returned it to the grocer. The price of *Moong* rose by one hundred percent and the profit thus made was distributed by Shaikh Ahmad among the needy people. A reference to the presence of the Indian Muslim traders in Aden is also made by Shaikh Ahmad who names a couple of them originally belonging to Nagaur. The saint's discourses also refer to what seems to have been a general practice, also observed today, that people undertaking a journey to any place would carry with them some goods which might have a good market at the place of their arrival for sale, the proceeds of which would come handy as travel expenses or given to the needy in charity. This was also done by people going on *Hajj*. Shaikh Ahmad also carried some such commodity with him in lieu of cash when he went for *Hajj*.

The professional people whose casual mention is met with in the saint's memoirs are oil-presser, butcher, mason (*gilkar*), betel-nut-seller, etc. Transcript of manuscripts was also practised as a profession. One Qadi Raja of Dholka is mentioned by the saint as being a scribe (*katib*) by profession. By the way, Makhdum Jahaniyan Sayyid Husain is also reported to transcribe books for certain length of time every day. Spinning by women-folk as well as by men was also practised.

From the saint's memoirs, it would appear that Nagaur was quite an important town even before it became the capital of the

main non-agricultural product of the province, which was the major source of supply to the rest of the country. The saint mentions caravans of merchants from Gangetic plains coming to Didwana for this merchandise. The region between Sambhar and Didwana was a vast salt-producing area.

Water in this arid desert land was scarce. The saint describes how once when he had come to a village in the course of his travels, he had sent his attendant to the house of a village headman for some water and the headman's wife told him to get her a bundle of fuel-sticks before she gave him water. During days of drought, grain was distributed to people on loan or by way of aid by the state machinary as well as individuals. The saint refers to a grocer of Khatu who had distributed grain on credit to people, on such an occasion.

In the field of trade and commerce, the information gathered from the discourses of the saint, though not much and direct, is nevertheless useful. The salt-trade and caravans of salt-merchents have been just mentioned. No other information is available except through the mention of petty traders like village grocer, usually a non-Muslim. Popa the local grocer at Khatu used to carry on trade in groceries. He supplied commodities of daily use to the saint on credit as has been mentioned. This credit transaction seems to have involved some sort of security also. Shaikh Ahmad in one of his discourses has mentioned that Babu Ishaq had a silver-plate which was pledged with the grocer against the supply of articles or loan of cash. Whenever the saint received money, he would redeem the plate. Shaikh Ahmad says that the plate was named *girvi* (mortgage). At times, the grocer would advance articles to respectable persons like Shaikh Ahmad, the cost to be recovered direct from the state revenue department's grants to saintly establishments. For example, we are told that when Shaikh Ahmad declined to accept the renewed offer of credit by Popa Baqqal who enlisted the support of one of the well-wishers of the saint Sayyid Akram, saying from where he would make payment, the grocer said that he would have it adjusted in the revenue department. The local grocer would also keep deposits

In the matter of dress, the most common item of wear, as gathered from the saint's narratives, appears to have been overalls or cloaks—*lalada* and *barani*– of different materials or cloaks of woolen exterior and broad cloth interior. Some other items were turbans and mini-turbans, caps and handkerchiefs. The turban used to be usually of 20 *gaz* in length. *Khirqa* and *Taqia* caps were normal Sufi apparels. The Shaikh describes himself as having been dressed in a *fota*, *pishwaz* and a cap in Samarqand. The waistband (*kamarband*) had daggers or like weapons tucked in them. The archer's outfit with the quiver was donned by non-military personnel also. As already mentioned, the saint wore it in his advanced age at Sarkhej.

The varieties of textile in vogue as it is known from the *Mirqat* are *Bheram*, or *Bherun*, *Salu*, *Sharbati*, *Bafti*, *Kanbhal* (?), *Saqarlat*, *Firangi*, etc.

From the casual but occasional mention in the discourses of the saint, it would appear that in this part of the country, diseases like gripes or belly-ache, scrofula (glandular swelling in the neck —mumps), Guineaworm, Thread, eye-disease called locally *Gul-dar-chashm* (*phool*) were prevalent. Serpent-bite also was not uncommon. While expert physicians were there, the public at large resorted to homely medicine or quack-treatment. The saint refers to his having dissuaded one of his disciples from giving quack-treatment to his brother who was affected with mumps. The remedy consisted of applying the powder of a human-skull bone to the affected part, which the saint disapproved saying that it was not proper to mutilate a dead man's limbs.

In view of its drought and famine conditions, the agricultural yield of Rajasthan desert lands was limited both in quantity and variety. However, the saint's discourses give us some idea of the grown corn and like items. Lobiya, a kind of bean, is stated by the saint to be the main crop of Khatu and the staple-food item of its people in the saint's time. During the crop-season, its offering was made to saints and cooked Lobiya, with or without *ghee*; was served to visitors including governors. *Moong* pulse also appears to have been grown. Salt was the

item. The *Khichdi* of *Bajra* (millet corn) was also taken. Liberal helping of *ghee* (as was the case not until long ago and is even now) is frequently mentioned. Bread of wheat and mutton-curry was another common dish at least in well-to-do circles. Fish and chicken were also served to guests as also to unscheduled visitors. *Biryani* is another item mentioned in the saint's memoirs. The breakfast course seems to have consisted of butter, buffalo-milk and curds. *Malida* (a dish made out of flour, milk, purified butter i.e. *ghee* and sugar or bread-crusts, *ghee* and sugar) also appears to have been a favourite item of quick-food. The saint also mentions oil-cake—seasame sediment from which oil has been extracted—as having been his only meal on certain occasions for days together. The rice-broth (*Kanji*) and *Khir* (*shir-biranj*) were also taken. Among the vegetables, the only mention is of bitter gourd (*Karela*) and mustard-leaves (*sarson ka-sag*). The saint also mentions some sect or community of *darwishes* who did not take meat. The sweet-dish items usually consisted of sweet-meat balls (*laddu*), sugar-candy and dates. Seasame oil was the medium of cooking and was also used as lamp-oil.

The fruits that find mention in the *Shaikh's* discourses are *Kharbuzas* (of Rajasthan) and pomegranates and mangoes (of Gujarat) and berry (*ber*). One more fruit is mentioned, the name of which cannot be determined, it reads something like *chhartali* or *jahrtali*. The *Kharbuzas* of Rahol, a village near Nagaur which was held in subsistence grant by Burhanud-Din *Qadi* and *Khatib* of Nagaur, were famous in the entire region for their sweetness, as are those of Tonk in our days. The said *Khatib* used to entertain his guests including Shaikh Ahmad at *Kharbuza*-parties in the village. The only item of intoxicating drink we came across in the *Mirqat* is *Bhang*, which was a favourite drink of the *Qalandars*.

In flowers, the white *champa* of Nagaur is stated by the saint to be famous in the entire region for its sweet scent and beauty and basket-full of them used to be offered to prominent personalities as Shaikh Ahmad had once done when he had called on the *Muqta'* of Nagaur.

Pir and extinguish it by rolling it under their feet till it turned into ashes without any harm coming to their feet. Needless to say, the saint and his companions successfully met the challenge.

Mention may also be made here to the fact, more or less established by the saint's memoirs, that a large number of people from Rajasthan came and settled down in Gujarat as much in the wake of the saint's decision to settle down at Sarkhej as to other socio-politico-religious factors. The author of the *Mirqat*, who was one of them, mentions quite a few of his own relatives and fellow townsmen or contemporaries from Rajasthan who had settled in different parts of Gujarat. Having considerable socio-cultural life in common and having no rigid political boundaries between medieval Gujarat and Rajasthan, this migration of people was natural. But with the establishment of the Muslim rule in the Nagaur region by the brother of Muzaffar I of Gujarat, the regions came closer together and people from Marwad—Nagaur region—came to settle down here. The process was accentuated with the uncertain political conditions caused by the Mewar chief, Rao Chonda's seige of Nagaur referred to by the saint in his discourses, as a result of which many people came away to Gujarat. The economic and agricultural prosperity of Gujarat and its inland and foreign trade also must have encouraged migraion of the Rajasthani enterprising community in its quest of economic betterment which waterless sandy area of Marwad denied them. In any case, the saint's narrative mentions a number of persons from Rajasthan who had settled down in Ahmadabad and elsewhere like Sayyid Qasim Nagauri, Sayyid, Rahmatullah Nagauri, Maulana Khatirud-Din, Qadi Muinud-Din and the like. This would explain the sizeable community of Nagauri Hindus and Muslims in various parts of Gujatat and even Nagauri Mohallas in cities like Ahmadabad and elsewhere. There is also a Nagauri-Sarai locality in Ahmadabad, where evidently a caravan sarai of that name originally existed.

From the *Mirqat*, some idea can be gathered about the food and dress habits of the people of these two regions. *Khichdi* and *ghee* appear to have been the most common and favourite

anything for a few days out of shyness—the husband thought she had eaten along with his mother and the latter was under the impression that she ate with her husband. One day while giving water to the plants or birds, out of sheer hunger, she put some grain lying there in her mouth. The moment she did, she was gifted with the power of clairvoyance whereby she saw at a far off distance a group of marauders coming to loot the village and receiving timely warning from her, the people of the village shifted their valuables. The Maulana wrote to the saint that if even a Hindu lady who had no sense of compulsory bath or ablution could develop such power only with a few days starving out of shyness, then "how is it possible for him to say that a religious-minded righteous Muslim Unitarian Faithful *momin-i-muwahhid* who has given up worldly pleasures, who fulfills religious obligations and who undertakes perpetual religious fasts cannot attain union with God" ?

As mentioned a little while ago, there are frequent references in the seint's reminiscences to his meetings with *Jogis* and Brahmins. One of Sultan Muhammad bin Tughluq's high official Malik Muzaffar, whose caste was *Kalal* is reported by the saint to have been a great admirer of *Jogis*. The *Jogis* Shaikh Ahmad met would always confront him with their power of possessing the knowledge of alchemy – turning any metal into gold—and their offer to teach it to him, but the saint always encountered it either by saying that for a *darwish* contentment and lack of worldly desire itself was gold or by demonstrating, as a last resort, similar powers.

The so-called miracle of walking-on-fire was also claimed and practised. The saint relates that once he came to the village of a Hindu *Rai* who received him with respect. Some *darwishes* who had come earlier and were also hospitably received by the *Rai* challenged the Shaikh to say if he knew what the *halwa* of smoke (*halwa-i-dud*) was and would eat it. This phrase was a code word for walk-on-fire. The saint said, it was like this a big raging fire would be lighted and whom ready with bright red embers, the *darwishes* would tread on them reciting the great Names of God (*asma-i-a'zam*) which they had learnt from their

intercession and good offices, a favour the grocer always remembered and tried and even insisted to repay, at least to the extent of being allowed to give grocery items to Shaikh Ahmad's household, after the Babu's death, on credit. He was all excuses and full of entreaties when he found that his minor son had in his absence from the town one day refused this credit facility to the saint's men. He came running to the saint with two *seers* of apricots and one lamp as a present with profuse excuses which the saint refused, ultimately being pursuaded to accept credit as usual.

The Hindus held Muslim saints in high esteem and respect. Shaikh Ahmad relates that when after the Babu's death, he left Khatu for *Hajj*, he was on the way lodged with great affection and hospitality by Hindus, high or low. He also mentions a Hindu lady having given him lodging in the absence of the menfolk of the house. When he once reached a village, its headmen called Rai Mandlik on hearing of his arrival came and invited him to his house where he stayed enjoying lavish treatment and hospitality for three days. At the next halt, he put up with a poor Hindu lady whose house was situated on the bank of the river. Her neighbours started reproaching her for lodging a Muslim in her house and expressed fear of reprisal from the village headmen on that account. The Hindus, particularly the trading community, had their day-to-day dealings with their Muslim fellow-townsmen in normal course. The Shaikh relates that when a certain official who had set apart a calf for Babu Ishaq requested the latter to collect it when it grew into a fat cow, a Hindu *banya* was sent by the saint to collect it. But far more interesting is the story which illustrates how Hindus received due recognition for their piety or righteous conduct even from orthodox Muslim circles. The episode was related in a letter sent by Maulana Abul-Faraj Radiud-Din of Didwana to Shaikh Ahmad, refuting a statement ascribed to him, alleging with reference to Shaikh Ahmad, that no saint could aspire union with God by simply performing ascetic exercises at home and without undertaking tours. The Maulana mentioned the example of a Hindu bride of Ladnun, who in her first visit to the husband's home did not eat

vice versa finds repeated mention in the Shaikh's discourses. The list of items of presentation makes an interesting study. These were in cash or kind and usually both. The cash would comprise coin in gold or silver or copper of different denominations while the kind would comprise such diverse things as *Laddu*, sugar-candy *shir-biranj* (i.e. *Khir*), dates, apricots, flour, *ghee*, mutton and *ghee* cows, cloth of different varities, costly dress, pair of fine knife, fine mat, fine candle-stand, lamp, beggar's bowl (*kachkol*), golden hilted dagger, jewel-studded ring, etc. The coconut also was an item of gift.

It may be of interest to know that the female-slaves were given fancy-names in those days. One such young female servant assigned to the service of the saint was named *Shak i-Zar* literally meaning a branch of gold. In two early-sixteenth century inscriptions from Chanderi in Madhya Pradesh recording the construction of a step-well, the builders, two, *umm-walads* of a saint Qutbul-Aqtab Burhan son of 'Alaul-Haq are named Sabah-Khair and Gul-Bihisht.

The malfuz under reference, like other similar as well as biographical works of Indian Muslim Sufi saints, furnishes refreshing evidence of their precept-and-practice of the tenets of universal brotherhood and love. Shaikh Ahmad in his narratives relates quite a few incidents of Hindu *jogis* and Hindu families with whom he had come into direct contact in different circumstances. He never speaks of them with a dislike, leave alone contempt. He would be drawn into religious discussions with *jogis* or Brahmins and bring them round to his view and even to conversion to Islam. The picture presented by these references is of a society in which the Hindus and Muslims lived in perfect peace and in an atmosphere of brotherliness. Shaikh Ahmad's wrestling bout with a Hindu cobbler's boy shows lack of any feeling of untouchability. The saints Babu Ishaq and Shaikh Ahmad did not differentiate between a Hindu and a Muslim in his time of need. For example, Popa Baqqal, i.e. the Hindu grocer named Popa owed his release from the custody of the officials for non-payment of government dues through Babu Ishaq's

—till that day the village-folk of Khatu had not seen an elephant—which were part of the retinue of the governor going to Delhi from Gujarat.

The saint's memoirs also present vivid pictures—witnessed even today—of village young men of tender age taking bath on a well of the village or how men-folk after taking a bath in the pond or a step-well would sit on a stone or stone-bench in the open to dry their hair at times to the resentment of women going there to fetch water.

Another custom of the feudal days known from the saint's narrative, which has survived more or less in the same form till our days, is that of gathering the students and taking them to accord a welcome to a governor or a ruler whenever he visited or passed through the village. Such students would be paid some money by way of travel expense.

The saint also refers to the custom in vogue in saintly establishments of reciting *takbir* or *fatiha* for the merit of saints and prophets after meals and also to the usual practice of reciting a *fatiha* at the actual commencement of journey. It was also customary, we are told, among the saints that they would have their graves made ready and fill them with wheat or corn, and the quantity of grain thus determined would be given in charity every year. Babu Ishaq, Shaikh Ahmad avers, got his grave made ready, but spurned the suggestion made by the Khatu Qadi to follow this practice.

The *Mirqat* also refers on the authority of the saint to a practice followed in some parts of the Islamic countries—perhaps North Africa—under which whenever an affluent person visited a grave, laid some offerings there. This may be compared with the modern practice of offerings in cash and kind at the graves of saints by all sections of people, rich or poor. The practice of holding music parties or *sama'* at the *Walima* dinners also finds mention more than once in the saint's memoirs.

The customary practice of the visitor taking something by way of present to the person to whom a visit is paid or the offerings of kings, ministers and high dignitaries to saints and

outwitted, Maulana said, "The Makhdum (i e. the saint) was giving me a prayer-carpet and the *mushaf*, but you are depriving me of that even !" The saint says he gave him the *mushaf*.

Another facet of the village life portrayed in the reminiscences of the saint is the village beliefs, superstitions and innocent pastimes and games like strength-testing, making bets, etc. We are told by the saint that there was in Khatu a heavy round stone with a big hole in the centre, like a flour-mill grinding-stone, which the wrestlers and champions of physical strength used to lift for demonstrating their physical prowess. Shaikh Ahmad who was, as already mentioned earlier, a skilled amateur wrestler and strong man, once being callenged by campanions put his head into the hole, lifted the stone and walked with it round his neck taking a few rounds. Likewise, he recalls, how on another occasion, at the dead of one pitch dark night—it must be *Kali Chaudas* or *amavasya* preceding the Diwali when even to-day in rural areas such bets are made—a local grocer's son dared Shaikh Ahmad to go and tie the turban on a certain tree in the forest. Shaikh Ahmad says he went and tied the turban and returned safely.

The village-folk particularly the non-Muslims and perhaps quite a few of the urban population entertained belief in omens and like rituals. The *Mirqat* describes the story related by the saint of the wife of a Muslim village headman who had entertained him when he was passing through her village in the absence of her husband. When he was leaving, she requested him to take a few steps in her field as the good omen of the saint's stepping in the field bring plentiful harvest. This lady, the saint also related, told him that she was the disciple (*murid*) of a *Pir* with a *Shajara* (pedigree-tree) and *Sajjada*. Wanting the saint to meet him, she called him. The *Pir* came with an *ijaza-nama* of Makhdum Jahaniyan Sayyid Jalal Bukhari and, though himself illiterate, tried to overawe the saint but fearing exposure before his disciple soon left on some pretext.

The saint also relates how in his younger days he had like many of his agemates and other people went to see elephants

which was to be hit with an arrow. -The official kinsmen, the Khatu public, the Shiranis and the like tried but none from amongst their groups could hit the mark till noon. By that time, Shaikh Ahmad, then a young skilled archer, reached the spot; the Khatu public claimed him to be one of them and the official group, theirs. The saint says he hit the mark in the first attempt. It may be pointed out that this perhaps one of the earliest references, if not the earliest one, to Shiranis a branch of Pathans and also, this reference to Shiranis of Khatu points to the antiquity of the settlement of the Sheranis at the place called *Shiraniyon ki Dhani*, nearby, to which Professor Hafiz Mahmud Khan Shirani, the great Persian and Urdu scholar, critic and writer and his equally or rather more famed son, but in a different field, namely Urdu poetry, Akhtar Shirani, belonged.

Another interesting and amusing episode related in the *Mirqat*, which is typical of a facet of Indian village life is that of Maulana Faridud-Din whom the saint had appointed as a teacher in a local *madarsa*, probably at Delhi, at one tanka a day. Once he came to see the saint with a high official and entered into discussion on an academic matter. The Maulana who, not able to make his point go home, was getting excited, was restrained by the official making a sign to him to keep quiet. The maulana then demanded his salary dues of 360 tankas which he had not received that year. Shaikh Ahmad had only with him a prayer-carpet and a *mushaf* which he offered to the maulana, promising to make the payment later, to which the latter would not agree. At this, a clerk-accountant (*muharrir*) who had also come to pay his respects obtained the saint's permission to settle the matter. He told the Maulana, "You are paid one tanka per day for taking classes. You sit in *chillas* for 80 days in a year, which should be deducted; then you observe Fridays and Tuesdays as holidays in a week, which makes again 100 tankas less in a year. This leaves only 180 tankas as your legitimate dues. Now in the preceding year you had received 360 tankas, which means that you were overpaid last year by 180 tankas. That means you have already been paid your dues for two years. How can you a deeply religious man, make a demand which is not just ?" Being

came to know that Shaikh Ahmad had proceeded towards the tank, they all hurried to the site to lend a helping hand. Shaikh Ahmad had asked the butcher to slaughter animals for meat, out of which were roasted *sikh* and *Kabab* and the grocer was asked to supply twenty maunds of flour, of which bread was baked. And people were asked to bring pick-axe, shovel, etc. from their homes. People were eating bread and meat and were digging out the sand. As a result, on the first day, two *chhajja* deep sand was removed and the entire tank was cleared within a few days with the help of some hired labour. The head of the labour-team, the memoirs say, over-charged the Saint to the tune of one hundred and forty tankas by manipulating measure, which was pointed out by some one and money taken back and given to the poor.

After this was done, Shaikh Ahmad, presumably with the balance left, excavated another tank. A local grocer, out of rivalry started excavating one more tank. Both got ready. When rains came, and tanks started getting filled the grocer announced a gift of cloth, sweets and coconut for every one who visited his tank. Shaikh Ahmad, then young, shut himself up out of disdain that people would go in large numbers to the grocer's tank while none would care to go to see his tank. Babu Ishaq, having come to know of it, consoled his charge and asked him not to worry. Then it so happened that during the night it rained very heavily filling the tanks to their brim, but the grocer's tank burst and water flew out. People went to see Shaikh Ahmad's tank which was full.

In the *Mirqat*, reference is also made to petty village feuds between the owners of the two adjacent fields over the boundaries of their respective holdings, as for example, the quarrel between Maulana Ibrahim Kaithali's nurse's son and the employees of the *Muqta'* which has been already mentioned earlier.

Apart from this, from the saintly reminiscences, it appears that friendly contests or game-competitions were held on group or class basis, as is being done now on caste, community or regional basis. The saint recalling his younger days physical exploits, says that once the *Muqta'* of Khatu had fixed up a target

mentioned the saint's account of how Shaikh Tajud-Din, whom he had given a fat cow, presented to him by an official, sold it to a butcher when it was given to him for the specific purpose of utilising its milk. The cows, given in *dakshinas* to Brahmins, it is widely known, find way to slaughter-houses in our days too. The saint also reports how an Indian borrowed his brand new shoes in the *haram* premises at Mecca promising him to return it shortly, which is never did. The ship-owners used to charge exorbitantly on out-of-season sailings. For example, when Shaikh Ahmad reached Cambay on his way to Jeddah, the Hajj season had ended and the ships had already left. There was only one ship available, the owner of which, approached by the emissaries of the local official, quoted far more fare. On being told that he should charge less from the "Shaikh" who is a saintly person, the ship-owner characteristically replied, *"agar ishan Shaikh and man murid-i-malam"* (If he is a Shaikh, I am the disciple of money). There is here a pun on the world *malam* which also means the captain of a ship.

There existed local rivalries in different spheres. The saint relates one such incident that took place in the life-time of Babu Ishaq. Once he had gone to Delhi from Khatu and on being presented to the king was granted 2,000 tankas by the latter, which is accepted with great difficulty and that too with the express purpose of getting the Khatu tank desilted of sand. On return to Khatu, when the work of desilting was to be started, the local Qadi went to the tank with his sons and after a trial digging of two-finger depth here and there told his sons that the filling was not much and it could be removed with little effort and in no time and, therefore, they would earn name and fame by accomplishing the task before Shaikh Ahmad got it done. Shaikh Ahmad withdrew on coming to know of it. But, on being told by a well-meaning leading man of the town, Sayyid Akram, that the clearance work was not as easy as he thought and could not be done by a few people, the Qadi seeing the validity of the Sayyid's point, gave up the idea. Sayyid then went to Shaikh Ahmad and persuaded him to take up the clearance work as originally planned. As soon as the people of Khatu

governor and their body-guards from security point of view. Their use for other purposes, if at all, was secondary and later.

The information gleaned from the *Mirqat* on numismatics is likewise not detailed nor specific. But it does name the coins of various denominations current in the saint's time in the fourteenth-fifteenth centuries. The currency mentioned is ; *Alai* gold tanka, gold and silver tankas, *Jital, kani, chaharkani, Panjkani, Shashkani, Dahkani*, and *Bistkani, Fadiya* and *Fadia-I-Firuz Shahi*. One more coin is mentioned but I have not been able to determine its reading. The word is transcribed as *juni*, which Maulana Sayyid Abu Zafar Nadvi takes to be a coin so designated after Prince Juna Khan, later on Sultan Muhammad bin Tughluq Shah. But this is rather far-fetched. The word can be read as *chauni* which one might be tempted to think might stand for *Chawanni*, but it is difficult to say if the usuage of the word *ana* is not so old.

The measures of weight and length that find mention in the *Mirqat* are *seer, man* and *tolcha* and *bigha*. There is also reference to the village-method of measuring depth by lengths of some standard objects. For example, the sand-filling clearance was measured as so many *chhajja*-measures, the exact connotation of which cannot be determined

From the saintly narratives in the *Mirqat*, it would appear that the routine life in a medieval mofussil society was not very different from that of the present day one, at least of until a couple of decades ago. People at large used to live the same hard but leisurely and honest life and their vocations during non-work seasons or leisure hours were not very different. Village houses had as of now thorn-hedged backyards and the doors of the houses at least of the Muslims were covered with straw-curtains—*tattis* as they are also called in the book. Some of the village or town houses had more than one storey. The main item of domestic furniture was the stringed bed as well as stringed chair—*kursi-i-raisman baftah*. Human failings of those days also remind us of those of our days. The butcher selling the meat of stolen animal was not unknown. We have already

tradition even if we give credence to all the four participating Ahmads of which the Sultan was also one as having never missed the *Sunnat*-prayers in their entire life-time. Want of time does not permit me to detail the reasons in support of this doubt but the most forceful argument repudiating this tradition is that even Hulvi Shirazi (wrongly spelt Hulwai by Professor Nazami and others), the extract of whose poetical history describing the foundation of Ahmadabad and its edifices is quoted in full by the author of *Mirat-i-Sikandari* himself, is totally silent on this.

It is rather unfortunate, but understandable, that not much specific data is available in the *Mirqat* on monuments. It does refer to the practice of Babu Ishaq and Shaikh Ahmad himself of visiting places of the resting-places of saints and other places of interest whenever they visited Delhi, Nagaur Didwana and like places. But beyond naming a few of them, no information about the identification, date or description of the building is availtble in the discourses. The only specific information we get is about the construction of the Sarkhej *'Jami'* mosque by the saint. Though important in itself, this information still does not enable us to say for certain if the mosque referred to is the simple but chaste, fine and extremely graceful large mosque situated near his tomb at Sarkhej. The construction of two tanks at Khatu mentioned by him has already been referred to. A reference to the *muluk-khana* portion of the Khan Jahan's mosque may also be noted in this context. Most of the large or even moderate mosques of architectural character of the thirteenth through fifteenth centuries have a cornered off area usually in the upper story in the north-western or northern part of the prayer-hall with a separate entry from the northern wall. The exact purport of this part of the prayer-hall is a matter of difference of opinion among scholars, according to some it was meant for the saintly and like people for their *chilla* vigils, according to others, it was meant for kings and governors, while it is also called ladies' gallery by some. This fifteenth century designation *muluk-khana* should prove beyond doubt that the secluded portion with a separate entry was meant for the ruler or the

we come across frequent mention in the saint's narrative, of tanks and reservoirs in different parts of Rajasthan and Gujarat. For example, the only place of note of Khatu that finds mention in the saint's memoirs is the .tank called Haud-i-Khan. It is difficult to say which of the extant two tanks of Khatu, the tank at the foot of the hill locally called Muluk-Talab or the stepped rectangular tank to the north-west of the town this Khan-tank represents. Also the connotation of the name *Khan*[1] is also not very clear. If the name is correctly spelt in the manuscripts, it might mean the tank carved out or mined out from the hill. The saint's malfuz also refers to the tank of Naraina which is evidently different from the one called Mustafasar excavated on the site of the royal camping ground, in 1437 A.D by Mujahid Khan, the Nagaur ruler and a nephew, of Muzaffar I Other tanks mentioned are the one at Dholka and the one called Nera (even now it is so called) at Cambay, both in Gujarat. A location of cultivable land called Chah-i-Khabadja, the Khabadja-well, near Sarkhej is also mentioned by the saint. It was a wheat-growing land. Other places which find casual mention in the saint's narrative are Vasna and Kochrab, which are now parts of the Ahmadabad city.

A significant, even if negative, evidence of the saint's narrative is in regard to the foundation of Ahmadabad. No direct or indirect reference to it either by the saint or by the compiler is found to the great event, though the founder Sultan's differential relations with the saint are frequently mentioned As is well known, the foundation of the city is believed to have been laid at the suggestion and initiative of Shaikh Ahmad himself with the active participation in the foundation ceremony by four Ahmads who had never missed *Sunnat* prayers in their life. This tradition, widely current in the works of the late sixteenth or early seventeenth century like the *Mirat-i-Sikandari,* is first met with in the *Tuhfatul-Majalis,* the so called other malfuz of the saint, which I have already mentioned. The absence of any mention of the saint's direct or indirect role in the foundation of the capital city, in close proximity to Sarkhej where the saint was already living, creates doubt about the authenticity of this

1 کان

of Firozabad founded by Firoz Tughluq. According to this statement, the newly founded capital extended to north, north-west of Firoz Shah Kotla, the citadel for royal residence, to a distance of a couple of kilometres and must have included the Khan Jahan mosque that is the modern Kalan or Kali Masjid within the Turkman gate of the walled city of old Delhi. Firozabad is also stated in the saint's narrative to be at a distance of five *kroh* from the then Delhi, by which pre-Firozabad Delhi is evidently meant. The narrative of Shaikh Ahmad also refers to the market (*Bazar*) near Khan Jahan's mosque. The saint also mentions the *Kushk-i-Hazar Sutun* which appears to have ceased to be the royal residence and housed members of the public, it was in this once royal palace that Maulana Majdud-Din, the *Muhaddith*, was imparting instruction in the science of Tradition, as mentioned earlier.

Another landmark of Delhi of that period mentioned by the saint is Hauz-i Khas, on the bank of which was a grand mausoleum of pre-1374 A. D. date. It is unfortunate that no further information about this tomb or the year of visit is given. Hauz-i Khas was a place of, in modern parlance, tourist resort as of our days for the saint refers to have been taken there in his young days for recreation and sightseeing. Another important reference to a Delhi locality is Bagh-Jor, or Jor-Bagh, the location and the designation of which have been a matter of speculation until recently. The name is misspelt in Persian historical works as *Bagh-i-Jud*. The saint's memoir spells it as Bagh-Jor and not *Bagh-Jud* or *Bagh-i-Jud*.

Of the buildings of Nagaur mentioned by the saint are the Madrasa of Qadi Hamidud-Din Nagauri founded or named after the savant who flourished more than a century earlier, the caravansarai of Malik Chopan and the Tank. At Didwana were, the saint reports, two tanks one on the east of the town and the other on the west. The fortification or Qala of Didwana was in existence before 1374 A. D. and one of the mosques of the town was called Masjid-i-Burhani in the saint's time. Outside the town, on the west, was the mosque of Malik Daud where Shaikh Ahmad had once stayed when he visited the town. Incidentally

ravines of the Gujarat river Mahi are also mentioned in the saint's narratives. The road to Navsari in south Gujarat is reported to have passed through jungles. Kochrab, now part of the city of Ahmadabad was in the fifteenth century, and apparently till the turn of the century, a village considered to be the first stage towards Nahrwala-Patan from the capital city.

The various means of conveyance that find mention in the saint's narrative are horse, camel, Dola (i. e palanquin), bullock-cart (*gardun*, perhaps for bag and baggage) and special carts called Bahel (Gujarati Vahel) or Bahni (form of Vahan) (for passengers), ships, etc. The routes followed by the saint in his travels as narrated by him are : the route to Gujarat from Delhi passed through Didwana, that from Khatu to Mecca and Madina through Tartav or Tartar, Ladnun, Nagaur, Mahoya *alias* Talwara, Laudara or Laudarwa, Nahrwala-Patan, Cambay or Mahim, Aden, Jeddah, Mecca and Madina. The ships also used to ply between Aden and Thatta in Sind. The saint's return journey was from Aden to Thatta, to Tartav or Tartar and to Khatu. The route from Samarqand to Khatu taken by Shaikh Ahmad, according to his narrative, was Samarqand to Herat, Qandahar, Uchch, Malik Wahan, Jaisalmer and Khatu. The route from Nahrwala-Patan to Khambhat was through Dholka.

More interesting, however, is the information furnished by the saint's discourses about the topography of cities and towns like Delhi, Nagaur, Didwana, Khatu, Cambay, Sarkhej, Ahmadabad, Uchch, etc. The only building of Uchch to which the celebrated saint Makhdum Jahaniyan Jahangasht belonged is the Burj-i-Mamun, where Shaikh Ahmad had stayed at the time of his visit to that town The localities or monuments of Delhi that find mention in the saint's narrative or discussions include the Tomb of Prince Fath Khan (Now in Nabi Karim locality) which is stated to be situated near the Bhilsa gate, and the mosque of Khan Jahan stated to be situated in the Mohalla Jajnagar of Firozabad. This reference to Jajnagar-Mohalla of Firozabad in which the Khan Jahan mosque is stated to have been situated is quite important as it helps to indicate the limits

The officials, among others, tended to avoid payment of state dues or recovery, even if they were in possession of money. Malik Zaina, the *Muqta'* of Hisar Firuza who was imprisoned for non-payment of dues was later found to have buried 80,000 tankas in the earth at some safe place.

The Sarkhej saint's memoir also supplies considerable material for political geography as also topography of towns and regions. The saint had travelled widely undertaking frequent trips from Khatu to Nagaur, Didwana, Ladnun and even Delhi and Hisar Firuza in Rajasthan and adjoining parts, to Gujarat on way to the two holy places, Mecca and Madina, and to Samarqand along with Timur's army, and his narrative covers a number of villages and towns of these regions and also furnishes some idea of the means of communications, routes, halting places, etc. The places from Rajasthan mentioned in his various discourses which were visited by the saint are : Chhoti Khatu, Ajmer, Naraina, Nagaur, Didwana, Ladnun, Kuchera, Kathoti, among well-known or familiar ones and Mahoya also known as Talwara, Laudara or Laudarwa stated to be on the bank of a river, Tartav or Tartar , Satehla or Sathela, Ahwad, Rahol (which may perhaps be what is now called Rohal Sharif), Banathri. Koliwa. Devri, etc., among unfamiliar ones. In the case of some of these, direction and distances from well known places are also given, facilitating the task of their identification. For example, it is mentioned that Kathori was two *kroh* from Khatu, Koliwa was three *kroh* from Didwana, etc. We are also told that the village Ahwad was given in subsistence grant to the Sayyids of Didwana.

Of the Gujarat villages and towns, the familiar and identifiable towns and villages are Birpur, Sanand, Khambhayat that is Cambay, Dholka, Dhandhuka, Bharauch, Navsari, Palanpur, spelt as Palhanpur, Nahrwala, Mahaim (i. e. Mahim, now part of metropolitan Bombay), Baroda, Utelia, Asawal, Rander, Sarkhej, Kapadwanj, etc. We also get the names of places like Godhal, Santij, Choramli, Chara or Chadh, Barli stated to be near Patan, Pandarwara stated to be thirty *kroh* east of Kapadwanj, etc. which can perhaps be identified with some effort. The famous

to the querry by the Sultan on the purpose of his visit, took out the farman of the grant of a village to the attendants of the Tomb of Khwaja Muinud-Din Chishti, which he said he wanted to return to the Diwan as the *Shiq* officials were making undue great demands on the village. Incidentally, this is one of the very few, hardly two three, references to the tomb of the Ajmer saint to be found in a pre-Mughal work.

The personnel appointed to public institutions like mosques, madrasas, etc., leaders-of-prayers, teachers and the like, were maintained by the state or by saintly establishments and in the case of the former, they were required to collect their monthly stipends from the Cashier after proper identification. Payments were made either on cash or in kind or in both. The village *Muqaddim*, an official of the status of the present day Patel or Patil in a village who did not receive a regular salary, would at times take contract of a village as had happened in the case of the saint's village. According to this, he would pay the grantee of the village a certain agreed amount in cash in lieu of the produce of the village. This amount was called *Wajah* and the grantee of the village, *Wajahdar* referred to a little while ago. The crop-share amount in cash of the saint's village Utelia was 2000 tankas in the case of its previous *Wajahdar*, Bubu Badi—Badi Bubu or Badi Bibi of our days. In the alternative the grantee was free to cultivate the village-land through his agents or hired personnel. This posed a number of problems, the foremost being strained relations between different parties and harassment of the *ryot* by local officials, even the Sarkhej saint's men being no exception.

The saintly and like visitors to the court were given 'journey-money.' In some cases when it was ensured that the person concerned actually left the place—for example in the case of one asked to leave having incurred royal displeasure or so—the amount was paid after the party had actually left the first stage on way. Spoils of war or booty obtained in military excursions were shared with people or with some groups of people like pious and saintly ones. Shaikh Ahmad's own version of his share of loot from Malik Chopan has already been mentioned

holder of crop-share of the land owned by him but farmed out to cultivators on crop-share or cash-payment basis, more or less synonymous with the *jagirdar* of the Mughal period is even now used in Gujarat for the non-cultivating agricultural land-owners. A Superintendent of the building of the Khan Jahan mosque of Delhi is also mentioned more than once. While the functions of these officials only come in for indirect or casual mention, we do have some useful bits of information. For example, from an incident narrated of the expedition of the payment of the regular stipend (*muqarrar-dasht*) of two Sayyids of Didwana who had gone to Delhi for presenting their case, it would appear that the duties of a *Jamdar* was not confined only to be incharge of royal wardrobe and keep it fully furnished but he was also the final authority of implementing the royal order of grant of royal dress, robes of honour, etc. to officials and non-officials. It was found that Qadi Nasrullah the Hakim (religious judge) of Delhi, on some pretext or the other, was delaying the sanction of the payment. The intentional delay by the royal *Jamdar*, a disciple of Shaikh Ahmad, in the execution of the royal order bestowing dresses on Qadi Nasrullah expedited the sanction of payment of the stipend of Didwana Sayyids.

The duties of the *Sahib-i-Ard-i-Bandagan* or *Arid*, the Pay Master, it would appear from the Saint's narrative, included physical verification of the mounts of recruits and non-regular soldiers at camps specially arranged for the purpose at different places. For example, a camp for such verification of personnel from the towns of 'Naraina, Khatu and Nagaur was held at Naraina by Malik 'Umar the Pay-Master. The royal farmans received at a place were required to be read out in public from the mosque pulpit by the leader of Friday prayers or by the *Khatib*. A somewhat unusual instance of the voluntary surrender of a farman of land-grant by the donee to the king under protest is also mentioned in the *Mirqat* on the authority of Shaikh Ahmad, who was present at that time. The latter who, then quite young, had gone from Khatu to Delhi, was enlisted among those to be presented to Sultan Firuz Tughluq by the *Sayyidul-Hujjab*. Preceding him was a Shaikh from Ajmer who in reply

said to one another that had they not called him blind, they would have been spared this retort.

The *Mirqat* also helps determine the period of a saint of Cambay, Shaikh Ali al-Jaulaqi locally called Pir Parwaz. According to a note encased in a glass-frame and put up at his tomb situated to the north-east of the town, Shaikh 'Ali al-Jaulaqi flourished in the twelfth century A. D. However, according to the account of Shaikh Ahmad's visit to Cambay, as narrated in the *Mirqat*, the Cambay saint also called therein "Pir Parwaz, whose name was 'Ali had come to see the former and, therefore, being a contemporary, lived in the late 14th-early 15th century. The saint's malfuz thus contains the earliest contemporary reference to saint as well as to his *alias* Pir Parwaz. Incidentally, the Tomb of Pir Parwaz, a modern rectangular hall, situated in what must have been once an extensive graveyard is the repository of more than two dozen epitaphic marble tablets belonging to the graves of persons who lived in the thirteenth and fourteenth centuries, which, lying loose, must have been removed there to save them from disappearance or destruction.

Apart from political personages or events, the malfuz contains material which supplies some information on the administrative machinery of the state. Among the administrative divisions mentioned therein are *Shiq*, Pargana, *Khitta*, Thanas and Qasba. The posts and designations that find mention therein are Diwan or Diwan-i-Shahi for the king or his court, *Naib i-Ghaibat* or King's Deputy-in-absence, a designation for the grovernor of a province currently in use in the 15-16th century Deccan but rarely in the north or the west of the country, *Hajib*, *Sahib-i-Ard-i-Bandagan*, *Muqta'*, *Wajahdar*, *Jamdar*, *Pardadar*, *Dabir*, *Fotedar*, (Cashier), *Muhasib* (Accountant) *Kotwal*, *Sarkhail*, *Muqaddam* *Khot Desai*—perhaps the earliest mention of this word in Pre-Mughal Persian works, though it is known from ancient Indian inscriptions—etc. Of these, the term *Wajahdar* appears to have been in vogue in Gujarat only, where it is found employed in contemporary and later inscriptions. The term meaning the land-holder, the

officials like Alaud-Din Samnani, Amirzada Pir Muhammad, Amir Jan, Sultan Muhammad Bahadur, Amir Saiful-Mulk and Ilyas Khwaja and learned men of Samarqand like the grandson of the author of *Hidaya*, Khwaja Abdul-Awwal, and his nephew Malikul-Ulama Husamud-Din, Shaikh Abu Sa'id Lughavi, etc. This narrative not only provides an Indian saint's experience of social and political life in Central Asia, but also mentions a political event or two that occurred while he was there. For example, we are told that while he was having an audience with Timur, a courtier arrived from Tabriz with the news that Yusuf Qara had attacked and plundered Tabriz putting to death its governor, a son-in-law of Timur.

Incidentally, Shaikh Ahmad's role in the entire affair and his journey to Samarqand does not appear to have been mentioned in pre-Mughal historical works and have not received any serious attention of our historians. As a metter of fact, while Maulana Sayyid Abu Zafar's description of the role in his Urdu introduction to the saint's malfuz-works referred by me earlier was probably completely overlooked, Professor Nizami has only recently brought it to the notice of a wider circle by his article in English. It should be critically examined by students of Central Asian Timurid history both in India and abroad.

From the account of the saint's life in his self-imposed temporary exile in Central Asia, it would appear that his time was mostly spent in meetings with learned men and academic discussions with them. The account is not entirely without its touch of humour. Describing his visit to a *hammam* in Samarqand, the saint says, "Once I went to a *hammam* in Samarqand with an attendant named 'Arif who had 'flower' in one eye. Some ladies also came there. 'Arif had a book of verses in his hand. Seeing this one of the women said to him, "O blind fellow ! What is that book in your hand ?" 'Arif replied, "The Quran". He was asked, "Why Quran here ?" 'Arif said, "You who have come here to take bath will have to declare on oath whether it is a legal bath or otherwise and that is why it is here with me". The ladies were greatly embarassed and

advised by him not to worry and accept the charge which he did. Through the blessings of the saint, we are informed, he enforced order in the thana which greatly prospered. One more nobleman in whose respect the *Mirqat* supplies more details is Malik Uthman Sarkheji whose name figures only once in historical works in connection with the rebellion of some noblemen, he being one, against Sultan Ahmad in A. H. 816 (1413-14 A. D.). He also seems to have been a frequent visitor to the saint's hospice. On one occasion, he made an offering of a jewel-studded ring in lieu of which the saint made a returning gift of matching value. On another occasion, when he presented a costly garment, the saint sent four gold tankas through Qadi Mansur. According to the saint, it was this nobleman who was fetched to summon the saint to Sultan Ahmad I's sick-bed when he had fallen seriously ill in the early years of his reign. The *Mirqat* also reports a meeting in which the said nobleman had discussions with the saint on the nature of Soul.

The historiocity of the saint's narratives has already been indicated by some of the instances referred by me earlier. Before ending this section concerning Gujarat noblemen, I may make mention one more instance. I mentioned Malik Shaikh (son of Malik Fakhr) among the noblemen. While he is not known from any other source, we know from an epigraph that this nobleman had a daughter Bibi Daulat by name who had constructed a mosque at Ahmadabad in A. H. 883 (1478 A. D.) in the reign of Mahmud I of Gujarat. She was married to Malik Adil Khan.

The *Mirqat* also contains references to political history of Central Asia under Timur in a full chapter devoted to the saint's own account of his role during and after Timur's invasion and devastation of Delhi, in retrieving Delhi and its inhabitants from capture, loot and plunder by the Timurid soldiers, as also his travel to Samarqand along with Timur's army and return journey to Khatu via Thatta. The saint in his narrative speaks of the impact, his piety and religiosity had made on all and sundry including Timur, some ladies of his seraglio, his ministers and

horses, a fact brought to the notice of the Khan as implying that he wanted to leave Gujarat and go to Deccan. The Khan immediately ordered inquiry into the matter and ordered the concerned officials to deposit the dues with the saint. He further sent his chamberlain Khwaja Khassa to take 500 tankas from the treasury and offer it to the saint. The Khawaja came to Sarkhej and perhaps exceeding his brief told the saint that he should first give an account of one hundred thousand tankas received in all by him till date from the Khan before he left for Deccan. The saint said he would render account of not one but two thousand tankas, but he would not remain in Khan's territory. Khwaja Khassa told the saint that what he had said was on his own behalf for restraining the saint from leaving Gujarat but he told the saint that the Khan had sent him with the specific object to plead on his behalf in case the saint insisted on his departure that he should not forsake him. At this the saint's anger subsided and Khwaja Khassa presented the money as also the fresh deed of the village-grant made out to the satisfaction of the saint.

A nobleman of first rank who finds detailed mention in the saint's reminiscences is Malik Shaikhan son of Musa. This nobleman does not find mention in historical works like the *Mir'at-i-Sikandari*, but an inscription from Wadhwan in Surendranagar district of Gujarat refers to him as having constructed a mosque there in A.H. 842 (1439 A.D.) during the reign of Ahmad Shah I. From the frequent reference made to him by the saint, he appears to have been a regular visitor to the saintly establishment. The Saint furnishes the information that he was a descendant of the clebrated Hadrat Khalid bin Walid. The saintly reminiscences supplemented by the compiler give a detailed account of Malik Snaikhan's role in Gujarat Sultans, Muhammad Shah II and Ahmad Shah II's battles with Sultans Mahmud Khalji of Malwa as also of his nearness to the kings. The memoir also refers to the appointment of the Malik to a difficult thana, Chadh or Chara by name, which he was hesitating to accept on account of its notoriously mischievous *Muqaddam*. Approaching the saint with his dilemma, he was

'Abbasi, the religious Judges of Cambay, and the like, who find mention in the saint's memoirs in connection, mostly, with incidents relating to him or the affairs of his Sarkhej Khanqah. The names of two princes of the founder of the city of Ahmadabad, Sultan Ahmad I, namely Shadi Khan and Shakar Khan are also only known from the saint's reference to them. This new piece of information furnishes a good circumstantial and fairly corroborative evidence for settling the time of the construction of a mosque called Shakar Khan's mosque in Ahmadabad; it could be assigned to the very early period of the Gujarat Sultanate to which it can be attributed on architectural grounds as well, though competent scholars like James Burgess assign it to the middle of the 16th century—end of Ahmad Shah I's reign.

Coming to the nobles known from other sources to whom the *Mirqat* also refers, mention may be made of Badr son of 'Ala who figures in the history of Gujarat as having been the moving figure behind the rebellion of Maudud against his cousin Sultan Ahmad I in the very first year of his reign. The motive or the *raisond' etre* of Badr's behaviour is as usual not mentioned in historical works, but the *Mirqat* supplies the very useful and significant piece of information that Badr-i-'Ala was the son-in-law of Muzaffar Shah I, that is to say, the husband of the sister of the fathers of both Ahmad Shah I and the arch-rebel Maudud.

The other member of the royal family who is ignored by historical works but is otherwise known from one epigraph found at Patan, then capital of Gujarat, is Khwaja Khassa brother of Muzaffar Shah I. The epigraph designates him as Royal Chamberlain (*Hajib-i-Khas*) and records the construction of a noble edifice by him in A.H. 813 (1410-11 A.D.). Beyond this nothing is known about him or his career. In the *Mirqat* Khwaja Khassa's mission as an emissary of his brother to the saint, during his pre-kingship period, is mentioned at some length : being somewhat dissatisfied with the non-cooperative attitude of the local afficials in the matter of the income of the village granted to him, the saint had sent Khwaja Badh, *Muqaddim* of Sarkhej, to the Khan, but not to much avail. At this the saint purchased two

four hundred tankas to Shaikh Ahmad. The latter narrates the entire episode of his demand of payment, the Malik's initial refusal to own the debt and finally making the payment on being told by Babu Ishaq in a dream. The Malik seems to have later on moved to Nagaur, for we are told by Shaikh Ahmad that when some time after Babu Ishaq's demise, he halted at Nagaur on his way to the holy cities for *Hajj*, in the company of the learned and holy men of Delhi, some of whom he names, Malik Najm was its *Muqta'*. The Malik having come to know from Shaikh's companions who during this brief sojourn had gone to visit him, that Shaikh Ahmad was also their fellow-traveller, called him and tried to dissuade him from undertaking the hazardous journey for which the Malik thought he was not physically fit. The Sarkhej saint always spoke of Malik Qutbud-Din Najm as a very generous person.

This *malfuz* of the saint also furnishes eye-witness accounts of events in the history of Gujarat of the first half of the fifteenth century, the period coinciding with the long years of his stay in Gujarat at Sarkhej. In these narratatives mention is made of a number of officials and nobleman, quite a few of whom are known, from the saint's reference only, though Gujarat is quite rich in historical works. Then, even in the case of those known from historical or other sources, the saint's memoir has as usual more information to give. The officials known for the first time from the *Mirqat* are : Malik Burhanud-Din Tatar Khani, Sikandar Khan, an official of Muzaffar I, Malik Mubarak Butahari of Cambay—incidentally, this is an important piece of information, showing that the Butahari family, some members of which were prominent officials under Ghiyathud-Din Tughluq and his son Muhammad bin Tughluq and one of whom had constructed the *Jami'* mosque of Cambay in 1325 A. D., belonged to Cambay and lived there in official capacity—Malik Fathul Mulk father of Rast Khan, Malik 'Umdatul-Mulk, Malik Shaikh Malik Fakhr, a grandee of Ahmad Shah I, Malik Khidr, Malik Nizam Chhaju and Malik Jalal Shah, officials of the same Sultan, Adharan Tak or Tank, the *Muqta'* of Dholka under Muzaffar I, Ibrahim Muhasib (Accountant), Khwaja Badh, the *Muqaddam* (Chief Revenue Official) of Sarkhej, Qadi Kamalud-Din and Qadi Tajud-Din

Jalor attained martyrdom in the army of the Muslims in A. H. 791' (1389 A. D.). Nothing more was known about him beyond this. Historical works dealing with the Tughluq period, contemporary or later, completely ignore this official of such a high status. But it is again in the memoirs of the saint —and this is the test of authenticity of the memoirs which I just referred to—that we get some more details about his family background, career and personality. The saint while speaking of him on more than one occasion says that he was the son-in-law of Malik Radiul-Mulk, a Tughluqian grandee of Muhammad bin Tughluq Shah and Firuz Tughluq and that he was working as the deputy at Didwana of Radiul-Mulk's son and his own wife's brother Malik Muhammad Haji, that is to say he was the deputy governer of the province during the life time of Babu Ishaq that is before 1374 A. D. The saint while referring to his visit to Didwana in the company of Babu Ishaq, relates how the Malik had misbehaved with or harassed a pious man—*darwish*— from Chanderi who complained about it to the Babu and how the latter, after the Friday prayers were over, refused to shake hands with the Malik whom he scolded calling him a betel-nut-seller's lad. (*SupAri farosh bachcha*) On another occasion, Shaikh Ahmad relates, he had gone to Didwana from Khatu on some errand when Babu requiring his presence urgently at Khatu, sent some one to the Malik with a message to look for him and despatch him immediately to Khatu. Once when Shaikh Ahmad had called on a local savant, Maulana Abul-Faraj Radiud-Din, at the latter's Didwana house, the Malik also chanced to come there. It being a year of drought, the Malik was distributing ten to twenty measures of corn to the Muslims present at the Maulana's house. Shaikh Ahmad not wishing to receive it, left before his turn came, whereupon the Malik who on inquiry found out that he had put up at the house of Sayyid Abu Talib, ordered the latter under threat of dire consequences to bring Shaikh Ahmad to his house. The Shaikh went to spare his host any reprisal on his account. The Malik received him with utmost respect and asked him to take with him one cart-load of corn which he had set apart for Babu Ishaq. The Malik also seems to have owed at one time some

explicit mention of Jai Singh being the first to embrace Islar while Babu Ishaq was alive, that is some years before 1374 A.[As discussed by me in detail in my study of the Ladnun inscrip tion, bardic accounts spin a romantic story round Jai Singh, th Hindu Raja of Ladnun's conversion to Islam. They place the ever some time in the middle of the fifteenth century, while not onl does the epigraph record 1378 A-D. as the date of the mosqu built by him at Ladnun but Shaikh Ahmad reports his entertainin Babu Ishaq which must have been some time before the latter' death in 1374 A.D. From the account of the *Mirqat*, it woul follow that Jai Singh was converted to Islam quite some tim before Ishaq's reported visit. Thus, the conversion of Jai Sing must have taken place around 1370 if not still earlier. In oth words, the conversion of the Mohel branch of the Chauhanas too place not in the middle of the 15th century as is generally believe by Rajasthan's historians of medieval history, but some time i the middle of the 14th century or at least well before the las quarter of that century began. The significance of this event ha not been taken due note of by our political and social historian: It is evidently part of an important but generally overlooke phenomenon in the social history of this part of the country' western sector in the fourteenth century. The second part of thi century is conspicuous in the history of Rajasthan in that witnessed during the rule of Firuz Tughluq at least two conve sions of members of the two ruling families namely the Khanza das of Mewat and the Mohels of Mohelwati, not to mention th Khanzadas of Nagaur and the Sultans of Gujarat who are reporte to have originally belonged to a place adjoining Rajasthan. N attempt has so far been made to determine the reasons or facto other than purely political, if there were any, for this developmen

Yet one more Tughluqian nobleman of governor's ran about whom welcome information is available in the saint personal reminiscences, is Malik Qutbudd-Din Najm. From h epitaph discovered more than a decade ago at Nagaur, it was (course known that this 'magnificent' *malik*, the mine of generosi and magnanimity, lord of the sword and the pen, Mal Qutbud-Din Najm, the deputy in the *shiq* of Nagaur an

Mohel which was somewhat intriguing. The mention of two sets of son-and-father's Muslim and Hindu names was enigmatic—the mention of the father's Muslim name presented the problem since from bardic accounts, it was known that Jai Singh was the first among the descendants of Mohel Chauhan who embraced Islam. It could not be said for certain if his own name was 'Alaud-Din or 'Alaud-Din Mubarak. Also, the epigraph and the barding accounts were at great variance in the matter of his period. While the barding accounts spoke of him as having flourished some time in the middle of the fifteenth century, the epigraph referred to his having built a mosque almost three quarters of a century earlier. This confusion was set at rest by the malfuz of the saint. In his account of one of his visits to Ladnun which he made in the company of Babu Ishaq - obviously before A.H. 776 (1374. A.D.) when the latter died, the saint refers to Malik 'Alaud-Din, a *Nau-Muslim* (Neo-Muslim) the *Muqaddim* of the town and an admirer of the Babu, who received them with honour and made some offering, out of which Babu got *malida* prepared and invited local Muslims to partake of it with him. The *Mirqat* thus helped solve the mystery of the nomenclature. Since the saint call him only 'Alaud-D n. the Islamic name of Jai Singh was only 'Alaud-Din and therefore Mubarak in the epigraphic text was intended to represent the father's name; this would be the only reasonable inference, namely that as the Hindu set of names comprised that of the son followed by the father's, so should be the Islamic nomenclature. It would so appear that 'Alaud-Din had chosen to invest his father also with a Muslim name. Shaikh Ahmad also furnishes an interesting piece of information that this Malik 'Alaud-Din was a disciple of Sayyid Jalalud-Din Husain—by whom evidently the well known saint popularly called Makhdum Jahaniyan Jahangasht is meant. It may be reasonably surmised that Jai Singh who is mentioned in bardic accounts as the local Chauhan chief had embraced Islam at the hands, if not instance, of this famous *Suhrawardi* saint.

The mist that had till now surrounded the age of conversion of the Mohel community of Muslims of Rajasthan concentrated in the Mohelwati region—Ladnun region—is cleared up by this

Malik Chopan is another nobleman also known only from an inscription from Ladnun in Nagaur district of Rajasthan which finds frequent mention in the saint's reminiscences. This epigraph recording the construction of a mosque in A. H. 780 (1378 A. D.) refers to his governorship and tells us nothing further about him beyond, fortunately, mentioning his title *Malik-ush-Sharq* Ikhti-yarud-Din. His name is also absent from the list of leading noblemen and officials of the period given in the *Tarikh-i-Firuz Shahi* of Diyaud-Din Barani or of Shams-i-Siraj-i-Afif; nor does he find mention in other historical works. The Sarkhej saint's malfuz mentions him on more than one occasion. Shaikh Ahmed, a frequent visitor to Nagaur, Didwana and Ladnun during his younger days sojourn in Khatu with Babu Ishaq had personally met Malik Chopan in one of his visits to Nagaur where he had gone for some work during Babu's life-time that is before A. H. 776 (1374 A. D.). Recalling this visit, the saint once said that the Malik had obtained considerable booty in some expedition (*tAkht*)—the time and place of the expedition are unfortunately left out in the narrative—out of which he gave a share comprising four choice cows to Shaikh Ahmad who sold them to one Malik Konan or Gonan at 20 tankas each—it must be silver tankas. This may be reasonably taken to mean that Nagaur was the headquarters of the *iqta'* of Malik Chopan, independent from that of Ajmer of which earlier it formed part for some time. The Malikush-Sharq seems to have built a *sarai* at Nagaur called or known after him as Sarai-i Malik Chopan. The saint refers to it as the place where he had stayed in about A. H. 791 (1388-89 A. D.) when he passed through the town on his way to the two holy cities on pilgrimage.

A third nobleman of substantial rank, who is totally ignored by Persian historians but is known to us from epigraphic as well as bardic sources, is Malik 'Alaud-Din, who constructed a mosque at Ladnun during the governorship of Malik-ush-Sharq Malik Ikhtiyarud-Din Chopan in A. H. 780 (1378 A.D.) according to the epigraph which I have just mentioned. However, the mention of his name in the inscription as also his account in bardic lore were full of confusion. For example, the inscription called him 'Alaud-Din Mubarak *'urf* (*alias*) Jai Singh Bhoja

Haryana, and his father, Malik 'Umar, the *Sahib-i'Ard-iBandagan*, Malik Mughith, the *Hajib*, Chamberlain of the Gujarat governor Darya Khan, Sayyid Radi the *Hajib*, Malik Kamal Gakkar, Malik Ikram, *Jamdar*, Malik Zain Wala, the governor of Didwana, Malik Nasir, son of Ahmad, a *Muqta'* of Khatu, a *Malik* of Nagaur, whose name is spelt in the manuscripts as Konan or Gonan, Shihabud-Din Domak or Dolak, Headman of Khatu, Sher Malik, Malik Muzaffar, the Kalal, Islam Khan, a nobleman, Malik Muhammad son of Haji Daud, the Chaudhary, Amir Nathu or Nanhu, son of Mu'in of Khatu, Malik Ismail, Kala Khwaja and his Agent (*Karkun*), Bhupat, Dev Raj, the Headman of a village in Rajasthan, Qutb Khwajagi, the Superintendent-in-Charge (*Shahna-i-'imarat*) of the Khan Jahan's mosque at Delhi, Qadi Nasrullah, the religious judge (*Hakim*) of Delhi, Qadi Fakhrud-Din, religious judge of Khatu, Qadi Turk, religious judge of Ladnun and the like. But for the *Mirqatul-Wasul*, these noblemen and officials, some of them of quite high rank, their jurisdiction, etc., would have remained unknown to us.

Among the noblemen who find mention in Shaikh Ahmad's reminiscences and are not entirely unknown—only their names and time are known – from some source or the other are Malik Kamal-i Khurram, Malik Chopan, Malik Qutb-i-Najm, all of the ranks of governor and Malik 'Alaud-Din, the Neo-Muslim (*Nau-Msalman*). While they are totally ignored by contemporary or later historians their name is perpetuated by inscriptions which also give their date. Malik Kamalud-Din Ahmad i-Khurram is mentioned in a bilingual record from Sambhar in Rajasthan, dated A. H. 765 (1363 A. D.), in which he is referred to as the governor of that region. The *Mirqat* reference to him is in connection with his routine visit to Khatu which took place well before this date, even before Shaikh Ahmad entered the life of Babu Ishaq sometime in the early 1340's. The saint relates that when the governor came to Khatu, he paid a visit to Babu Ishaq with whom he had earlier acquaintance or relations, and complained to him about his not having paid visit to him in accordance with the Tradition (one who is a new-comer is paid a visit).

was again corroborated by Zafar Khan himself when he referred to his confinement to the saint after his release. This even, seems to have taken place immediately after Nadot expedition for after imprisoning his father and declaring his independence Muhammad Shah himself went to Nadot to bring to book the recalcitrant local chiefs and then proceed to Delhi, when he suddenly died. It may be noted that the saint does not refer to the generally accepted cause of the new Sultan's death through poison administered to him at the instance of his imprisoned father. He merely says that Sultan Muhammad went to Nadot. punished the rebellious chiefs and there laid down his life.

But it is more in the field of local history, particularly of the 14th century—secondhalf- Rajasthan and fifteenth century—first-half Gujarat that the saint's memoir supplies ample material. The saint mentions a number of high and low officials and noblemen posted in provincial or district towns and villages in different situations and contexts to most of which the saint was himself a party. These supply welcome bits of information about their postings and private and official life. We come to know of a vast majority of them, almost all of them, for the first time, through the saint's reminiscences. The historicity of this information has stood the test of authenticity in a number of instances where it has helped identification of certain persons summarily or inadequately mentioned in other sources and supplied more details about their career and manner of government. One such information has helped clear up the uncertainty about the period of the conversion of the Mohil branch of Chauhana Rajputs to Islam, as will be narrated a little later.

Even about officials known from some other sources, the *Mirqat* supplies more information. Among the Tughluqian officials known from the saint's narrative for the first time who held charge of village, district or provincial administration in Rajasthan are Sayyid Kamalud-Din, *Rasul-i-dar*, Malik Haji son of Radiul Mulk, a Firuzian nobleman and governor of Didwana, Malik Ahmad Kath. a Tughluqian grandee, Malik Kamalud-Din, *Muqta'* of Hisar-i-Firuza, i.e. Hisar, now a district headquarters in

book. Zafar Khan, later on Muzaffar I of Gujarat, who had known the saint from the latter's Khan Jahan's mosque days at Delhi, requested his presence in his army in his expedition to quell the rebellion of the chief of Nadot. The saint who had accordingly joined him asked the Sultan why he did not go to the succour of the Delhi Sultan at the time of and after the invasion of Timur despite that much army, resources and elephants. It may be recalled that Sultan Mahmud Tughluq, who had fled Delhi, had come to Nahrwala Patan in A. H. 801 (1398-99 A.D.), then Gujarat's capital, in an unsuccessful bid to muster the Gujarat governor's support. According to the saint's own narrative, Zafar Khan in reply to the saint's query told him that the boy Bijli Khan (Mithe Khan ?—perhaps prince Mithe Khan, one of his sons, is meant) was engaged in battle with Rao Chonda of Mewar, the province of Nagaur was under constant attack, the roads were perilous, the army was occupied with the siege of Mandor—incidentally the printed historical works have Mandu which has misled modern historians to Gujarat's Mandor seige with that of Mandu in totally opposite direction—and the infidels were being properly held at bay, when all of a sudden Bijli Khan (or Prince Mithe Khan) withdrew without even informing him as a result of which he himself was compelled to return to Patan and not leave it lest the province of Gujarat was lost. This information is not given in any historical work of the period. Also, it is only through the saint's narrative that we know that Zafar Khan had personally led the Nadot expedition to suppress the rebellion of its refractory chief.

The saint's reminiscences also support the general belief recorded by the author of the *Mirat-i-Sikandari* that Zafar Khan's son Tatar Khan, who was pressing for declaring independence, had placed his father in confinement when the latter did not agree to the proposal and assumed kingship under the name Muhammad Shah. But while the place of internment of Zafar Khan is generally stated in historical works to be Asawal, on the site of which modern Ahmadabad was founded a few years later, the saint had learnt from the mouth of the new Sultan himself that his father was confined in Bharuch or Broach, a fact which

with the governor's men on the question of the boundary of tilled land—fields. On the contrary, the saint always overlooked the harassment caused every now and then to his men by the local officials. He always restrained his men or would not allow even some of the king's noblemen, *maliks*, who were his disciples and who, coming to know of the matter, would like to take action on their own. He once prevented a *malik* who was sending his men to the saint's village to take to task its headman who never paid the dues in time to the saint and was recalcitrant.

The saint had cordial relations with successive kings as well as with contemporary saints and savants.

The *Mirqat* supplies considerable information on political history of the late *Tughluq* and Gujarat Sultanate periods. A brief reference to this may be made here. Among the political events of which the saint had first-hand information are Rao Chonda's seige of Nagaur, and the migration as a result thereof, of the Muslim population of that region to Gujarat, seige of Mandor, the old capital of Jodhpur Rathod rulers—and not Mandu as has been printed in some historical works and accepted by modern historians—by the Gujarat ruler, the rebellion of the chiefs of Nadot and Idar and the Gujarat Sultan's compaigns to deal with them, two invasions of Malwa king and the battles fought, not very far from Ahmadabad, Sultan Ahmad's Deccan engagement, imprisonment of Zafar Khan later on Muzaffar I of Gujarat by his son and his subsequent release, insurgence of the local chief of a thana the name of which is not clear from the manuscript, but which reads like Chadh of Chara, the menance of the *mala'in*—accursed ones, by which either the Portuguese or the Deccan pirates are meant—on the southern coast of Gujarat, at Mahim, now part of metropolitan Bombay, at the turn of the fifteenth century, etc. Some of these events like those connected with Idar and Malwa affairs have been described in details and a proper appraisal and study of these accounts is likely to throw new light on certain aspects of the history of Gujarat and neighbouring regions. Time does not permit me to attempt this here, but I may also draw attention to one matter mentioned in the

complascent about him, for a man is a man of moods. The saint used to recall this advice whenever some body did something that he did not like.

The Saint's narrative also reveals one more facet of his character and that is his practical approach. Once, he says, Alp Khan, the ruler of Malwa, sent by way of offering 40 gold and 40 silver tankas with a merchant named Bahlul, but the saint declined the offering on the ground, made known to the emissary, that its acceptance might annoy the Gujarat king Sultan Ahmad which he would not like to happen as he was residing in his dominions. Likewise, on another occasion, the Jam of Thatta sent through Sayyid Abu to the saint a certain amount of gold coins in fulfilment of a vow made for the recovery of his wife from an illness and also requested discipleship for his two sons. But while he prayed for the wife and the sons, he declined to accept the money saying that since he was living in the domains of Sultan Ahmad, with three generations of whom he had very cordial relations, it would not behove him to do anything against his wish. Similarly, once when Prince Tatar Khan, later on Muhammad Shah I of Gujarat, sent word to the saint seeking his permission to pay a visit to him, the saint's reply was that he could come only after getting permission from his father Zafar Khan, later on Muzaffar Shah I.

Apart from these, the saint's memoirs depict how cautious and circumspect he was in his dealings with men in authority, particularly at the lower level, like the officials and village headmen of the village Uteliya endowed for his *khanqah* or of those of Sarkhej where he had settled down. He would always maintain that one should not exceed the bounds of righteous behaviour with petty officials of the village or district, on behalf of his own servants, as it was not worth the consequences thereof. He once quoted the instance of Maulana Ibrahim Kaithali, a learned man and a favourite of Sultan Muhammad bin Firuz Tughluq, who ultimately lost his own life in addition to those of his two sons and had his holdings plundered in consequence of the cudgels he took up on behalf of his nurse's son who had picked up quarrel

Not surprisingly, therefore, his discussions would show the saint as a man of great patience and humility. He was always courteous to his visitors and restrained in his behaviour even towards those who would be vehement in their discussion or argument with him on religious or academic matters. He would patiently answer their arguments or at the most would tell them to be reasonable. He would be introspective whenever he tendered advice to anybody; he would address his soul on such occasions and recite a Hindi hemistich, the reading of which cannot be determined but which ran something to this effect that you are doing the same thing but are advising others not to do it.

Despite his greatness as a saint and the respect he commanded of as many as eight Tughluq and Gujarat kings, Shaikh Ahmad was humility itself. Nowhere in his memoirs he appears to have lost his temper even in unfavourable circumstances and adverse conditions. Once a grandson of Maulana Kamalud-Din-Samani, who was serving in the army of the Delhi Sultan Muhammad bin Firuz Shah Tughluq, came to see him and was discussing academic matters. When he was somewhat cornered, he told the saint that he was the grandson of Maulana Kamalud-Din Samani, whereupon the saint told him, "O man of God ! Why did you not tell me before ? There is no use arguing with you—you who are an ocean of learning and whose house is the very fountain-head of learning". On another occasion, when he came across Maulana Thanesari (whose name is not given in the work) who was being taken captive by a Timur's soldier at Samarqand, he not only got him released as he had many more, but when at that time a bowl of broth was brought to him by the men of Amir Pir Muhammad, he asked them to give it to the Maulana saying, "he deserves it more, since in learning he is above me". Despite the influence, he weilded with Sultan Muzzafar of Gujarat, the saint not only did not feel offended by but graciously listened to the advice the king gave to him. When once the king came to see him, the saint interceded on behalf of a personage who was imprisoned by the former. The king spoke of that person's treachery and promised the saint that he would release him on his return in deference to his wish, but he told the saint that he would also like him to listen to a piece of his advice namely that

the crows with it as and when necessary. Once he saw a kite lying wounded, he brought her home, lodged it under a basket and had fed her daily with meat until its wound healed and it was strong enough to fly away. Once a person came to him with a pelican whose wings were pulled out. The saint paid him for it, kept it in the guest-cell and arranged with the fishermen to feed it with its daily quota of fish till it grew its wings and then it was released in the jungle. As and when a huntsman would catch some animal, the saint would pay him for its release. On another occasion when a visiting soldier who had come to Sarkhej with his dog, left him behind as it would not go back with the master. That dog would regularly come and set up a watch at the saint's threshold. When the saint came to know about it, he assigned daily ration for it and asked a woman to cook loaf daily for it The dog would act as an escort to the daily visitors of the *Khanqah*, like Qadi Mansur and the accountant (*muhasib*) Ibrahim when they returned home after *'Isha* prayers. Subsequently, when the accountant was going to the saint's village, he was asked to take it with him there. At the village, it would act as a watch-dog for the herd of animals and cows at home as well as in the grazing-ground. It is also related that once an admirer made an offering of a fat cow to the Shaikh in the month of *Sacrifice* ostensibly for sacrifice. The saint gave it to one Shaikh Tajud-Din to use it for milk and like requirements. Instead, the latter sold it to a butcher from whose custody the cow somehow broke loose and came bellowing to the *Khanqah*. Even while the saint was inquiring about the commotion, the butcher came running after it to take it away. The saint paid the butcher from his pocket and set it loose in the animal herd. Once he saw a dove grazing in the courtyard of the *Jama'at Khana*. He told the attendants to put grain there daily. That dove and other doves would then daily come and eat the grains He was so tender-hearted, the *Mirqat* has it, that he would not slaughter the sacrificial animal with his own hand or see it done, as a result of which he used to discharge this obligatory duty by paying the animal's price in cash, for which he had found some justification. Only in the last three four years of his life, the ceremony of *Id* sacrifice was observed through the compiler of *Mirqat*.

of the village endowed for the expenses of the *Khanqah*, the sizeable *futuh* (unsolicited voluntary donations) from a number of his admirers, which included kings, princes, *maliks* and others, besides meeting the day-to-day expenses of the hospice, were spent to help the poor and the needy in various ways. Not only that everyone who came for help left empty-handed as far as it was within his power to give him something, but he had made it a point to send aid in cash and kind to the deserving families to their homes. Some women would come to the hospice at night after *'Isha* prayers for help. But of such of them who would not come out of their houses and widows and the like, he had asked the local village headman to prepare a list, as per which he would give to him for handing over to them gold and silver, dresses and *doshalas*, etc., presumably for the marriage of their grown-up daughters. Once near Jaisalmer in Rajasthan, he was accosted by an old man in dire need of a meal; not having any cash with him, he tore his turban into two and gave one of it to him to enable him to procure a meal or two by selling it. Once a blind man who had come to him at Sarkhej got four *jitals*. When he left, somebody told the saint that he deserved more, whereupon the saint immediately gave more money to the compiler of the *Mirqat* asking him to find him and give it to him without telling him who had sent it or who he was. At the Sarkhej establishment, every or every alternate month, whatever surplus would be there would be given away to the poor, the needy, the *Sadat*, the *jogis* the wayfarers, the neighbours, the *Kolis*, each of whom received some cash or cloth or like item. The saint, as was wont with others of his fraternity, would as far as possible return the presents or gifts made to him by matching gifts or presents of equal or more value, particularly in case or types of people like officials or *maliks* who had become rich recently—*qaribul-ahd*—neo-rich in modern parlance.

The saint's compassion was not confined to human beings; it extended to birds and animals also. The *Mirqat* has it that sparrows used to come and perch on his head or knees: He had given standing instructions to the servants that they should see that young ones of the sparrows were not harmed by the crows. He himself would keep a rod in front of him and frighten away

The saint praised him. The Sayyid said that he had recited th s quartrain in the assemblies of poets and learned men, but none had pointed this out.

Shaikh Ahmad was fond of music from his very childhood. He liked to hear melodious songs and music and himself possessed a fine voice. Once in his young days, on a summer afternoon he was sitting enjoying the coolness on the bank of the well of a step-well when a woman who came to fetch water sang the *Sohla* (perhaps *Sohaila*, a kind of song which used to be sung while drawing water—it is mentioned in the *Fawaldul-Fuad* of Hazrat Nizamud-Din Auliya also). It moved him so much that falling in a trance, he fell into water whence he was pulled out by that woman. Likewise, whenever at Khatu he heard anyone singing a song or a *ghazal* at the door of Babu Ishaq, he would come out to listen. He describes how when the Babu had once taken him with him to Didwana where they had put up in the Burhan mosque, he was enthralled by the *Samiri*-like voice of a person singing outside the mosque and how, when he praised the singer for his fine voice, the Babu mildly reprimanded him for his exaggerated love for music. It would appear that listening to music—*Sama'* type music—was a popular pastime, since the saint refers to the music sessions held at the marriage and other dinner-parties. Musicians occasionally attended his assemblies. Minstrels accompanied by instruments (*Mazamir*) performed at the gate of his Sarkhej residence, which was, as the saint relates in one of his discourses, one of the two points about whose permissibility, a learned and pious man, *Katib Ibrahim*, a candidate for the saint's discipleship, wanted to be satisfied before enrolment.

The saint emerges from his narratives as a man endowed with a compassionate nature and extremely affable manners. His catholicity of approach, humanitarian behaviour and compassionate nature are reflected in a number of incidents related by him. He was kind and responsive to the need of the poor and the indigent. The income of the saintly establishment out of the produce

he *Dau*, a commentary on *Masabih*, for him. There seem to have been regular inflow of books from abroad, particularly hurasan and Samarqand

Shaikh Ahmad possessed a poetic bent of mind. Like Babu, e had a large number of Persian and Hindi verses at heart, which he would frequently recite or quote on appropriate occasions in the assemblies and meetings with people. His assemblies were attended by poets too, who would present poem composed in his praise which he generally discouraged. He himself used to compose verses in Arabic and Persian as well as Hindi, though he did not like to be called a poet. The *Mirqat* quotes quite a few Arabic and Persian verses and Hindi *dohras* composed by him. An incident of the royal assembly, narrated by the saint, apart from giving a glimpse into the literary pursuits of Sultan Muhammad son of Firuz Shah Tughluq himself, indicates the saint's poetical acumen and insight. Once, we are told, the Sultan had composed a Persian verse which he gave to the court poets to compose *ghazals* by way of *tadmin* thereon. None of the poems submitted by them came up to the Sultan's liking Somebody brought to the saint's notice the couplet as well as the poems of the poets incorporating that couplet, a persual of which made it clear t him that the poets were unable to incorporate the couplet befittingly as they had given preference and priority to the Sultan's couplet in their poems while in fact the couplet should have been brought at the end in a befitting context. The saint himself composed a *ghazal* on this line, which was duly appreciated by the king. Once Sayyid Mahmud son of Rukn Dihlawi, who was the teacher of the compiler and a grandson of Sayyid Kamalud-Din *Rasul-i dar* recited a quatrain

gar jafA kAr az jafA bUd rAndam az shakhs pust
man na bA oo An kunam kIn fi'l-i-man An fi'l-i-oost
man makAfAt-i jafA bA oo kunam chandAn wafA
kU khajil gardad bigUyad kIn nikU kardan nikUst

The saint liked the verses and after thinking over it for a while he said that the height of toleration is only perfectly illustrated if the word *khajil* is not used. Sayyid Rukun immediately changed the hemistich this :

kU bajAn-o-dil bigUyad kIn niko kardan nikUst

At Hisar, he studied under Maulana Shams-ud-Din the famous works *Bazdavi*, *Husami*, *Shashi*, *Mufassal* etc. At Hisar he was told that Maulana Majd-ud-Din, a great *Muhaddith*—the phrase used in the original is *Muhaddith-i-'Azim*—imparted instruction in Hadith (Tradition) in the *Kushk-i-Hazarsutun* at Delhi. Consequently he came to Delhi and would during day-time attend the Maulana's classes and at night study *Bazdavi* without its gloss and learn it by heart. Afterwards he studied *Aqida-i-Hafiziyya* which he committed to memory. He then turned to scholastic philosophy. He is also reported to have learnt three-fourths of the Quran by heart. Incidentally, this gives an idea of the carricula for instruction in religious sciences in vogue in the *maktabs* and *madrasas* of the day. Among other books which the saint mentions as having been under study or discussion during his time are *Dhakhira*, *Hidaya*, *Tawali*, *Masabih* and its gloss *Dau*, *Surah* of Jauhari, *al Muttafaq*, *Kanz*, etc. The last-mentioned seems to have been a popular item in the syllabus and the saint reports that Maulana Sufyan, an extremely learned man of Multan, used to teach it without a *hashiya*—this and other references by the saint show that normally difficult text books were taught or self-taught with the help of glosses Maulana Sufyan also had by heart all the variant readings of *Kanz*. It was after the death of Babu Ishaq in A. H. 776 (1375 A. D.) that Shaikh Ahmad most seriously engaged himself in studies and went from place to place in the pursuit of knowledge.

By the time he started on his pilgrimage to the holy cities, Shaikh Ahmad had become well versed in religious sciences which, as well as the ascetic practices and spiritual exercises which he took under the spiritual guidance and training of Babu Ishaq at Delhi and elsewhere, stood in good in his meetings with saints and savants in India and abroad. The saint had, during his sojourn at Sarkhej, written a religious treatise called *Risala-i-Maghribiy* . The saint also seems to have built up a well-equipped library from which he would send for books to support his views expressed or contentions made from memory. Qadi Badh Abdur Razzaq Walwalji was the librarian-cum-scribe (*Kitabdar-wa-Katib*) of the library of the saint at Sarkhej. Manuscript copies of important works were transcribed for him by disciples or admirers. For

when at Ajmer, he received a spiritual call from Khwaja Muinud-Din Chishti to go and live at Khatu. It was at Didwana that the Delhi boy was living with Najib when the Babu got him to come and stay with him.

Babu Ishaq gave the name Ahmad to him and always addressed him as Baba Ahmad. He brought up the four or odd years old Shaikh Ahmad with greatest possible affection and utmost care. In his very early days, it seems, the boy was not much attracted or devoted to studies but was more fond of manly arts and games like *horsemanship, archery, wrestling, stick-and-ball*, etc. Even as a young man he had gained fame as a wrestler and a skilled archer, and later on he used to often narrate his exploits in these fields. An expert archer of Didwana, Shaikh Ali Qairwani, is reported to have come to Khatu to impart him training in archery and had brought for him a pair of clay-shoe-mould, which he said were put on by trainees. His skill in archery was put to a successful test when a local official, a Malik, had set up a target and invited the people of Khatu, who failed to hit it despite repeated attempts, while the young Shaikh Ahmad arriving on the scene later, hit it in the first attempt. The author of the *Mirqat* has noted that the saint used to wear the archer's outfit at Sarkhej too, that is to say when he was past sixty. The saint also describes his wrestling bout in youth with a Hindu cobbler boy in Khatu, at the latter's persistent challenge. The saint was physically very strong. He recalls how once he rescued a young woman of Khatu who was going to the village-well to fetch water from being molested by an official designated as *Muharrir* i. e. an accountant-clerk.

However, Babu Ishaq wanted him to take to studies in all seriousness. The same advice was given to him by the accountant-clerk whom he had earlier in the day prevented by using physical force from molesting a woman. Babu Ishaq took him to the Madrasa at Nagaur named after Qadi Hamidud-Din Nagauri and asked the teachers there and the learned men of the town who had come to meet him to impart learning to Shaikh Ahmad. The primary books for the beginner's course like *Mizan, Hazar-Alfaz, Masadir, Panj-Ganj*, etc. were procured. Shaikh Ahmad, out of his pocket-money got a copy of *Tafsir-i-Imam Zahid* made for him by Qadi Imam Shah Jalal who charged the cost of paper only.

Samarqand and role in the ceasation of the Delhi plunder and the release of prisoners held by Timur's army, and his fully active advanced life at Sarkhej where he enjoyed utmost consideration of five successful sovereigns. The importance even only in this regard is obvious to all serious students of history who are aware that no biographical accounts of the saints, individually or collectively, are by and large attempted by contemporary or later writers until the Mughal period.

I shall, therefore, begin with the description of the contents of the *Mirqat* and their evaluation with the information contained therein about the life of the saint. The biographical sketch drawn up from the references to his own chequered career by the saint in his discourses from time to time recorded by the compiler of the *Mirqat* is like this : Shaikh Ahmad, whose original name was Nasirud-Din was born in a princely elite family of Delhi in about A. H. 737 (1336-37 A D.) or so, during the reign of Muhammad bin Tughluq Shah. While yet a child, he got separated in unusual but not wholly improbable circumstances. A furious dusty whirlwind overtook him when he was one evening taken out for his usual outing in the garden by his nurse who lost her way and found herself and the lad Nasirud-Din, apparently after the storm had subsided, in the midst of a caravan of merchants from the Gangetic plain who had camped at Delhi on their way to Rajasthan. Both the nurse and the child found refuge with one of the merchants and accompanied him when the caravan left Delhi next morning for Didwana in Nagaur district of Rajasthan on its usual business visit to purchase salt. At Didwana, the child was adopted by a childless weaver Najib by name. Babu Ishaq, a prominent celebrant saint of the Maghribi order, having been told of the boy in a spiritual communion and being in need of a boy-disciple after the untimely death of his young disciple Shaikh Qiwamud-Din, prevailed upon Najib through one of his disciples and a leading citizen of Didwana, Maulana Sadrud Din to part with him and send him to Khatu. Professor Nizami in his account makes Babu Ishaq find the young boy in a village and live with him at Delhi before moving with him to Khatu. But this is not correct In fact, Babu Ishaq, who no doubt originally hailed from and resided at Delhi, had long before the boy came into his life settled at Khatu after his constant travels in the course of which,

ı primary source for an account of the saint's life and achievenents. As a matter of fact, the value of that work in that regard is loubtful. The contents of the *Mirqat* are not more or less the same ıs covered by the other work as claimed by Professor Nizami who probably was led to think so on the basis of Vladamir Ivanow's ıotice of Maulana Muhammad bin Abul Qasim's work in his atalogue of the collection of the Asiatic Society. I for one ertainly wish Professor Nizami had consulted the *Mirqat*, for ad he done so, we would heve had the benefit of a learned xposition of its contents in a more erudite and profitable manner han I shall be able to do. Personally I heve strong reasons to elieve that Shaikh Mahmud's work is not an original work ompiled in the life-time of the saint but perhaps a later one, efinitely later than the *Mirqat*. Time does not permit me to go nto details here, but a comparison of what I am to describe here n regard to the account of the life and various activities of Shaikh hmad on the basis of the *Mirqat* with that gathered by Professor Nizami from the *Tuhfatul Majalis* and detailed in his article suffices o show that t e contents of the account of the seventyfive or so ssemblies of this work has precious little original about them and s nothing but a hash-up of the information taken from Maulana Muhammad's work with a few bits of information then current n Ahmadabad and Sarkhej thrown in between here and there. t may also be pointed out in this connection that not only are he assemblies described without specifying the date and month nd year, but even the date of commencement or the completion of the compilation is not given. Moreover, and this is quite significant the utterances of these assemblies are devoid of a single refeıence by the sa nt to his more colourful life and formative years of his youth passed under the vigilant eyes of Babu shaq whom he never ceased to mention in his utterances.

On the other hand the *Mirqat* is a store-house of information on various matters ranging from political history to everyday minor affairs of contemporary society of medieval Rajasthan and Gujarat It also is by far the main and earliest source that furnish s such varied and useful information about the life and entire career of the saint – from his early childhood, his education, his spiritual training, ascetic exercises, his travels on various counts, his pilgrimage to the holy places, his journey to

saint had also finally settled down at Sarkhej. Maulana Muhammed was well-versed in religious and rational sciences and on his arrival to Sarkhej he joined the Shaikh's establishment as leader-of-prayer (*imam*) before the latter admitted him to the circle of his disciples on the last Thursday of the month of Sha'ban A. H. 819 (22 October 1416 A. D.), For the next three decades that is to say until the saint's death in A. H. 849 (1445 A.D.), he was in constant attendance on the saint, exclusive of the period, unfortunately not specified, of his pre-discipleship association with the saint. It was only twelve years after the death of his master, that is to say in A. H. 861 (1457 A. D.) that after much hesitation he undertook the task to commit to writing the *malfuzat* of the Shaikh at the persistant requests of the military and civil officials of the Gujarat Sultan, though ealier he had successfully resisted the suggestion in the same regard made by a host of people, companion and friends.

Another book purported to be *Malfuz* of the Shaikh is the *Tuhfatul Majalis* referred to more than once earlier. Its compiler is Shaikh Mahmud bin Said Iraji who claims to have put to writing the utterances of the saint which he heard in the saintly assemblies with the easily obtained permission of the saint Once the saint was in an expensive mood and asked him to express any wish to which he replied that he had only one wish and that was to commit to writing and compile the utterances and sayings of the saint. The saint told him to proceed with it if that was what he wanted. Thus whatever he heard in the assemblies from the mouth of the saint he wrote down and compiled it in the form of a book which he named *Tuhfutul Majalis.*

Incidentaly this so-called Malfuz-compilation has got wider currency than the *Mirqat.* Prof. Khaliq Ahmed Nizami describes it as the earliest and by far the most important source of information on account of the value of information it contains about the life of the Shaikh, though he himself considered it to be of an inferior quality as a Malfuz. Professor Nizami was aware of the existence of the Asiatic Society copy of the *Mirqat* but he does not seem to have seen it nor does he seem to be aware ot its Urdu translation, the *Sirat-i-Ahmadiya.* If he had, he would certainly have revised his opinion about the *Tuhufatul Majalis* being

under the general title, perhaps copied from the fly-leaf, *Malfuzat-i-Ahmad Maghribi* and not by its actual name given explicitly in the introductory portion of the work. The Library of the Dargah of Pir Muhammad Shah at Ahmadabad possesses a modern copy made from a manuscript copy transcribed in A. H. 1128 (1715 A. D.), the present whereabouts of which are not known. However, Maulavi Sayyid Abu Zafar Nadvi in the preface of his Urdu translation the *Sirat-i-Ahmadiya* informs that since the time he translated the *Tuhfatul Majalis* and published it in 1939, he was on the look out for the *Mirqat*. At about that time he came to know that a complete copy thereof was in the possession of Sayyid Manzur Hasain Alavi, popularly known as Husaini Pir, a descendent of Shah Wajihud-Din Alavi and father of the famous Urdu critic and writer Professor Varis Hussain Alavi of Ahmadabad, who promised to make it available to him. In the meantime the said Dargah Library obtained an incomplete manuscript-copy of the work through the well known scholar, writer and poet Qadi Mian Ahmad Akhtar of Junagadh. Maulavi Abu Zafar Sahib started perusing it when Pir Husaini gave him a complete pencil-copy with the help of which the former completed the incomplete copy and started his translation from the newly made copy. His translation based on this modern copy was prefaced by a long introduction running into about forty pages which contained an account of the life and work of the author gleaned from the book itself and a detailed life-sketch of the saint from his early childhood to his death compiled from the information mainly from the *Mirqat* and supplemented if necessary by that from the *Tuhfatul Majalis*.

The compiler of the *Mirqat*, Maulana Mohammad bin Abul Qasim was in all probability a fellow-townsman of the saint, that is to say he hailed from Khatu or from Didwana or Nagaur, but he came in contact with the saint much later after the latter's permanent departure from Rajasthan. He was very probably a lad when the saint lived in Rajasthan. In any case, he seems to have come to Gujarat with his maternal grandfather and other relatives in consequence of the unsettled condi ions in Nagaur region due to Rao Chonda of Mewar's depredations there. This was in about A. H. 802 (1399 A.D.), when about that time the

the same problem. Professor Muhammad Aslam of the History Department of the Panjab University, Lahore had also published an article describing the contents of the same Malfuz of Shah Wajih-ud-Din entitled *bahrul Haqaiq*. Another Malfuz-work which has been somewhat extensively used in an article entitled "Shaikh Ahmad Maghribi as a great historical personality of medieval Gujarat" by Professor Khaliq Ahmad Nizami is the *Tuhfatul Majalis*, a collection of assembly-discourses of Shaikh Ahmad Khattu of Sarkhej compiled by Shaikh Mahmud Iraji. The article was published a little more than a decade back, in 197› to be exact. However it was more than four and a half decade back that the late Maulavi Sayyid Abu Zafar Nadvi of Bihar had published a full Urdu translation of the *Tuhfatul Majalis* which failed to attract the attention of historians for so long a period. Maulavi Sayyid Abu Zafar Nadvi, it may come as a news to all here—even in Gujarat, very few people are aware, such is the state of our interest in historial research—had also published in 1945 the Urdu translation, under the title *Sirat-i-Ahmadiya*, of another malfuz of the same saint called *Mirqatul Wusul ilallah-i-war-Rasul* (the Ladder facilitating Union to Allah and the Prophet) compiled in A. H. 861 (1457 A D.) or some 12 years after the saint's death by one of his disciples and leaders-of-prayers (*pish imam*), Maulana Muhammad son of Abul Qasim who was in constant attendance on him for full three decades. Maulavi Sahib had in the exhaustive introductions of these two translated works, written at length about the life and achievements of Shaikh Ahmad on the basis of both the *Tuhfatul Majalis* and the *Mirqat*.

It is this Malfuz the Miqrat, about which I propose to speak at length with partic lar reference to its importance as histor cal source material. The work also, by its very nature, contains matter on theolog'cal and spiritual matters and practices; but not being competent to do justice to that, I have only chosen to deal with its historical aspect only.

Not many manuscripts of this work are known. The only copy the existence of which was known to us from printed catalogues of manuscripts is the one in the collection of the Asiatic Society of Bengal. In the printed catalogue, the work is mentioned

in different regions where the geographical, social, historical and like information contained in the works could be better and properly understood.

Speaking of regions, while the Malfuz-works from Bihar and Deccan have received attention of scholars and historians, they have more or less completely overlooked the copious Malfuz literature of Gujarat, where the Chishti, the Suhrawardi, the Maghribi, the Qadiri and the Shattari orders flourished side by side and played an important role in the various spheres of its life and where a number of treatises and works on mystical subjects and collections of sayings and utterances of saints and accounts of their assemblies are to be found. The Suhrawardi saintly family of Ahmadabad descended from the celebrated saint Sayyid Jalal-ud-Din Husain popularly called Makhdum-i-Jahaniyan Jahangasht whose grandson Sayyid Burhan-ud-Din popularly called Qutb-i-Alam was the first to come to Gujarat and settle there and the Chishti family of the same place claiming descent from Shaikh Nasir-ud-Din Mahmud Chiragh-i-Dihli through his sister's son Khwaja Kamal-ud-Din, very few people outside Gujarat and not many even in Gujarat know, have the distinction perhaps unique in the annals of saintly families of India, of having produced almost successive six-seven generations of spiritual leaders-savants-literateurs-authors, whose contributions to learning and literature are yet to be properly evaluated.

So far, the only field in which a systematic but a very limited use of the Malfuz literature of Gujarat is made, is that of the origin and development of Urdu literature. Baba-i-Urdu Maulavi Abdul Haqq in his *Urdu ke Irtiqa men Sufiyai kiram ka hissa* had utilized one of the seven volumes of the *Jumat-i-Shahiya*, comprising the Friday assembly reminiscences of the celebrated saint Shah Alam, to give example of the proto-Urdu or Gujari language spoken at that period. A few years back Maulana Abdur Rahman Parwaz Islahi who was working on a biography of the sixteenth century famous Gujarat savant and teacher Shah Wajih-ud-Din Alvi of Ahmadabad, which could not be completed due to his sudden and untimely death, had published an article on one of the Shah's Malfuz works mainly with a view, again, to investigate

paid attention to it. The pioneer in this field and in a sense a lone crusader in this task is a well-known and well-respected Professor Sayyid Hasan Askari, who was the first to draw attention, through a number of his articles spread over years to the importance of literature as a valuable source of history. Professor Askari has thrown much light not only on the social, cultural and religious but also political history of medieval eastern India through his in-depth detailed studies of the memoirs of the Sufi saints of eastern India, particularly Bihar. Though a historian by education, training and profession, Professor Askari is among the top historians of India and among the very few of them who can claim profound knowledge of Persian as well as of mysticism. The other medieval Indian historian to highlight the importance and usefulness of this much neglected source is Professor Khaliq Ahmad Nizami who possesses a very good collection, in original as well as copies, of Malfuz works. But regrettably, he has not been able to devote more attention to them though he has at times introduced a few of them to students of Indo-Muslim history.

The fact, it cannot be gainsaid, remains that despite their laudable efforts, these two stalwarts have touched only a few more well know and somewhat easily accessible works and there is still need of utilising fully all known and unknown material not merely pointing out in general terms their importance or significance of some trend, behaviour or thought of the saints having a bearing on the political, intellectual or religious history of their times—this is, I must hasten to add, not less an important contribution to historical investigations—but what is perhaps very necessary is to compile in one place all the revelant extracts from the Malfuz literature of the Indo-Pak-Bangladesh sub-continent having the slightest bearing on any aspect of history and publish them in original as well as in translation on the lines of Elliot and Dowson's or Dr Rizvi's series mentioned earlier. This may on the face of it appear too stupendous a task, but it is nevertheless manageable. It can be undertaken as team-work under a project by some research institution or Centre like the Centre of Advance study in History of Aligarh Muslim University or rather it could be done more practically at research institutes

Hindi or Proto-Urdu. They also mention poets and authors, quoting verses in Arabic, Persian and local dialect—Hindi or Proto-Urdu, names of treatises and works, which one might look for in vain in other sources.

It is true, the importance of such an extremely useful source for the social, cultural religious and literary history has been recognised and also stressed upon from time to time by our historians. At the same time, it is equally true that this vast source-material has not been adequately traced or, if traced, utilised.

A few such not widely known Malfuz may be mentioned here. I shall confine myself to some of the Malfuz-works from Gujarat, Khandesh and Deccan only : *Shamailul Atqiya wa Radhailul Ashqiya* and *Nafaisul Anfas* by Khwaja Rukn-ud-Din son of Imad-ud-Din Kashani (printed, Hyderabad, A. H. 1347), *Husulul Wusul* and *Ahsanul Aqwal* by Khwaja Hammad Kashani, *Gharaibul Karamat* and *Baqiyyatul Gharaib*, both by Khwaja Majd-ud-Din son of Imad-ud-Din Kashani, all being the Malfuz of Khwaja Burhan-ud-Din Gharib, the disciple and Khalifa of Hazrat Nizam-ud-Din Auliya and *Shawamiul Jumal fi-Shumailil Kumal* of Sayyid Muhammad Gesudaraz and *Maqsudul Murad* (Shah Hashim Alvi of Bijapur), all from Deccan. The Malfuz of Burhanpur saints include *Fathul Yaqin* (Shah Nizam-ud-Din Bhikari), *Dalilus Salihin* (Shah Hamid-ud-Din), *Manaqib-i-Sharifi* (Shah Shahbaz), *Futuhul Auliya* (more than one saint) *Khazana-i-Rahmat* (Shaikh Azizullah Mutawakkil and his son Shaikh Rahmatullah by the famous Gujari poet Baha-ud-Din Bajan), *Malfuzat-i-Shah Lashkar Muhammad Arif*, *Kashful Haqaiq* (Shah Isa Jundullah) and *Thamaratul Hayat* and half a dozen more of Shah Burhan Raz-i-Ilahi. The Gujarat malfuz include *Juma'at-i-Shahiya* (based on the contemporary *Kunuz-i-Muhammadi*, now not traceable) of Sayyid Siraj-ud Din Muhammad Shah Alam Bukhari, *Miftahul Qulub* and *Tuhfatul Qari* (Qazi Mahmud Daryai), *Bahrul Haqaiq* (Shah Wajih-ud-Din Alvi), etc.

These works may not be unknown to most of our scholars of Indian mystical studies or of Persian language and literature. But as it happens, few or hardly a couple of our historians of medieval period of Indian history have

household too—in regard to partition of landed property or income of the saint.

The Malfuz works, in short, help us conjure up medieval society in its fulness with the moods, aspirations and varied problems of its members, their customs and manners and likes and dislikes. What strikes us most while going through these Malfuz works is that certain aspects of social life and behaviour of medieval society have undergone, at least until very recent days, but little change in essential parts.

Along with topics dealing with religious, theological and spiritual matters and discourses on ethical themes, interspersed with appropriate anecdotes from the lives of prominent saintly personalities of the past, these works are replete with mention, overt and covert, of manners and usuages, beliefs and creeds, prejudices and predilections, modes of behaviour, food, dress, games, pastimes and the like, generally not met with in historical works and chronicles, some of which have survived, with little modification till our days. These works also refer, however, indirectly, to the educational system and carriculum followed in educational institutions.

Even in the field of political history, the information supplied by them in respect of the imperial government and some department of the state administration is found to be at times quite valuable. But they are a very important source for local history, providing as they do much needed material for the history of outlying regions and mofussil towns and villages which is generally relegated to the background and even overlooked in historical works. Then these works contain topographical data that provide material for students of historical geography and archaeology of a region as also on roads and communications. They are helpful for the topographical study of towns and identification of their sites, gardens and monuments, extant or non-extant, etc.

Another field in which this literature can prove useful—this has also not been systematically tapped I believe—is history of language and literature. Being faithful records of utterances, these memoirs provide important data on the form of lauguage spoken at various periods and in different regions and as such are of substantial help in tracing the history and development of

sharp focus the varied and intensely human qualities of the spiritual mentor.

Contrary to general belief, the saintly persons, who were the cream of the society, as revealed through their recorded utterances and sayings, appear extremely human and simple in their every day life and dealings with their fellow-beings, shorn of the supernatural aura that has been allowed to hallow their normal wordly existence. From the pages of these Malfuz, we get a fairly good idea of the daily routine of the saintly household and the savants and people frequenting them. A perusal of these works shows that the life the saints used to lead was not very different from that of the other members of the society in many respects. Except for the supernatural powers they reportedly possessed not of their own free-will but on behalf of the ultimate master the *Allah* or their undoubted spiritual attainment and pure mind unalloyed with baser instincts of human nature, they lived like any other fellow-member of the community whose spiritual and temporal well-being they sought, not uncommonly doing daily chores like tilling the field, visiting the land they owned or held in subsistence grant, looking after their cows and like herd and seeing that they were properly fed and tended to, participating in social functions of birth, marriage and death, communicating or corresponding with people, transcribing and copying books—*kitabat* was considered in saintly circles as a desirable means of livelihood—going to for a stroll in the garden, or having an outing, going to see a river in spate, etc. They appear to us in these pages behaving for the greater part of the day like normal human beings even having their moments of human weaknesses. They reportedly took part in innocent frolics and pleasure-games like indulging in play with a fellow bather saint in a pond throwing water against each other, one running after the other, taking part at a certain age in pigeon-play or maintaining pigeon-houses in saintly abode or taking part in marriage ceremonies where, permissible at the moment and on the occasion but unprintable, vulgar expressions were exchanged between the bridal and bridegroom parties—as is the practice, I believe, even today in middle-class families of Indian communities. We have even references to dissensions as in an ordinary family in a saintly

properly understood.

The fourteenth century is an important period in religious history. There was an effulgence of mystical activities from Multan in the west to Bengal in the east where Sufi savants and learned mystics and Shaikhs were busy spreading the message of love and universal peace. The first half of the fifteenth century saw the extension of the sphere of sufistic activities to Gujarat and Deccan. The Sufi establishments, their *Khanqahs* and the *Jama'at Khanas* served as hospices for travellers and way-farers and also as training centres for the novices, resounding with lessons and discussions on theology, mysticism, scholastic philosophy, ethics morality, etc, at which the saint was the principal speaker. The utterances of the saint were most covetously taken down by devoted disciples with the express or tacit approval of the saint.

In this way, a considerable number of works came to be compiled in different parts of the country truthfully recording these discourses and proceedings at these meetings or assemblies which were open to all sections of society. This Malfuz literature by its very nature constitutes an important non-political history source material on one hand and one of the most important literary achievements of medieval India, on the other. In no other Islamic country, perhaps, to my knowledge — I am subject to correction of course, — this branch of hagiological compilation has been systematically and methodically cultivated as it has been in our country, specially during the pre-Mughal period in Bihar, Gujarat and the Deccan. Primarily intended to serve as a book of guidance for people at large, in general, and manual of spiritual instruction and code of exemplary conduct to disciples, in particular, the theme of these works revolved round the personality and spiritual achievement of the saint and his place in contemporary society. They thus came to encompass almost every aspect of the life of society at all levels and in all matters, temporal or spiritual. Nowhere else in any branch of medieval literature we come across such a vivid picture of contemporary society portrayed as in these table-talks. They furnish an intimate peep into the life of the laity as well as the elite and bring into

with the abundance of historical literature—a rough idea of which can be had from C. L. Storey's section on History in his *Persian Literature-A Bio-bibliographical Survey* which lists, it may be remembered, only listed or known works. Moreover, apart from historical works or works of history proper by which we mean chronicles or works describing the political history of a ruler, a dynasty or a region, there is a plethora of historical source-material stored in the various libraries and private collections in India and abroad, which has remained by and large untapped. This source-material provides great scope for historical research, containing as it does valuable data on and useful information about various aspects of human activities at different levels of society at different periods in different regions. Albeit, unlike historical works where the information about political events or the achievements of a ruler or his subordinates in the political field or their conquests are described in a single volume or place, which thus provide easy and convenient means of research calling for less arduous task or not very straneous effort on the part of the researcher, the source-material in question exists in the form of manuscripts of works of diverse subjects, archival papers, etc. by a thorough perusal of which only, the requisite information can be had.

This material concerns such diverse subjects as pure literature including works of poets, tales, anecdotes, etc. biographies of eminent people like poets, learned men, ruling elite, saints, etc. hagiological works on religious thoughts and disciplines, saints' table-talks or proceedings of their regular periodic meetings and assemblies and audiences given to disciples and admirers popularly called *malfuz* literature, travelogues and geographical works and the like. Needless to say, for the proper understanding of the human life and behaviour of a region, a country, a community, a nation in its true historical perspective, it is essential to search for, examine, assess, study and utilise this varied, though scattered, material. Unless this is done, unless this multifarious source-material is brought to light and properly utilised, the history of the people, the working of the human mind and spirit, the various factors that weave the multi-faceted fabric of the society, in short, the social, cultural and religious milieu of any specified time and space cannot be

Tarikh-i-Sind of Mir Muhammad Masum Nami, edited by Dr. U. M. Da'udpota, the Baroda University published in 1961, a new critical edition of *Mir'at-i-Sikandari*; a history of Gujarat Sultanate. edited by Dr. S. C. Misra and Prof M. F. Rahman, Professor Dr. A. N. M. Khalidi of Hyderabad published in the 1960's. Nurullah Husain's *Tarikh-i-Ali Shahi*, the Delhi University in recent years too, pulished in 1969, an abridged edition of Shihab Hak m s *Ma'athir-i-Mahmud Shahi* prepared by Dr Nurul Hasan Ansari, ec.t In recent years too. an original text is published once in a while. For example, *Ma'athir-i-Jahangiri* of Khwaja Kamgar Khan edited by Dr. Azra Alavi (nee, Nizami) was published from Aligarh a few years ago.

A major contribution in the field of easy accessibility of original material was made in the early 1950's, under the auspices of the Department of History, Aligarh Muslim University, at the initiative of Prof. Dr. S. Nurul Hasan, then Head of the Department, and with the whole-hearted support of Dr. Zakir Husain, then Vice-Chancellor of the Aligarh Muslim University. A series under the title 'Source Book of Medieval Indian History in Hindi', containing extracts of translations in Hindi original historical works, on the lines of but greater in scope than Elliot and Dowson's *The History of India* was planned under the editorship of Prof. Sayyid Athar Abbas Rizvi—it may be recalled that an Urdu series on Elliot and Dowson's model under the title *Tarikh-i-Hindustan* by Maulavi Zakaullah was published almost a century ago. Unfortunately, the series remained incomplete, though it did cover the history of the period upto Akbar and provincial kingdoms except the Deccan ones. Dr. Rizvi did tap more unpublished material not confined to purely historical works and also utilised a few political works. The last volume in Dr. Rizvi's series was published in 1962 or so.

Apart from the original texts, English translations of a few historical works have also appeared, one of the last. or perhaps the last in the series, being *Shah Nama-i-M unawwar Kalam* of Shiv Das translated into English by our ven.rable friend Prof. Dr. S. H. Askari.

Even so, it will be easily agreed that the work done so far in the field over more than a century past is not commensurate

and a few others, who brought out historical works like, to name only a few, *Babur Nama,* Persian translation of Babur's Turkish memoirs (Bombay, 1890), *Akbar Nama* of Abul-Fadl (more than once 1867, 1881-83, etc.), *A'in-i-Akbari* also by Abul Fadl (1855, 1869, etc.), *Tabaqat-i-Akbari* of Nizam-ud-Din Ahmad (1870, 1875), *Muntakhabu't Tawarikh* of Mulla Abdul Qadir Badayuni (1868), *Gulshan-i-Ibrahimi* or *Tarikh-i-Firishta* of Muhammad Qasim Hindu Shah (more than once, also with Urdu translation, 1864, 1874, 1884, etc.; – very few of us are aware of its fine printed edition in large size in two volumes, edited by Major General J. Briggs and Mir Khairat Ali Khan which was published at Poona, in 1831-2) *Siyarul Muta'akhkhirin* of Nawab Ghulam Husain Khan Tabatabai (1866, 1897), *Imadus Sa'adat* of Ghulam Ali Khan Naqvi (1864, 1897), *Fathiya-i-'Ibriya* of Shihab-ud-Din Ahmad Talish under the title *Tarikh-i-Asham* 1847), etc.

During a couple of decades before and after indepedence, we do find growing awareness of the need of publishing original historical works for the increasing number of researchers, as they or their translations were absolutely necessary for the proper indepth study of the entire second millennuim of the country's past. Some efforts were made to publish original Persian works dealing with the history of the provincial Kingdoms which, with some exceptions like the *Basatinus Salatin,* a history of the Adil Shahis of Bijapur (1891-92) and the *Mir'at-i-Sikandari* (1831, 1890), a history of the Gujarat sultanate, were by and large neglected till then. To name some, the Baroda State in its Gaekwar Oriental Series had published during 1928-30, the celebrated history of Gujarat, the *Mir'at-i-Ahmadi* and its *Khatima,* with the English translation of the *Khatima* or supplement, the Manuscripts Society of Hyderabad published the *Burhan-i-Ma'athir,* a history of the Bahmanis and one of their five successors the Nizam Shahis of Ahmadnagar (1936), the Madras University had published in 1937 the *Futuhus Salatin* a history of India from the Ghaznavid period to the foundation of the independent Deccan Sultanate in 1349-50, a lithograph edition of the same in the following year by Professor Dr. Agha Mahdi Husain who also published its annotated English translation under the title *Futuhus Salatin* or *Shah Nama-i-Hind* (1966 onwards). The Bhandarkar Research Institute Poona had in 1938 published the

It is rather paradoxical that while there has been in the past couple of decades a welcome spurt in historical studies including that of medieval India relating practically to all ruling dynasties and regions, the corresponding exercise of utilizing unpublished sources, leave alone tracing new or unknown ones, one can say without much fear of contradiction, has not kept pace with it. On the contrary, just reverse is the case: the publication of known original sources and search for unknown ones has been greatly on the wane if not totally stopped. One need not tender any apology to say that no serious or concerted efforts have been made to publish either in original or in translation, the vast historical material that lies awaiting the diligent search and extensive research in private collections as well as public libraries, after the efforts made in this direction by Sir H. M. Elliot of the Indian Civil Service, who first published the first volume of his *Bibiliographical Index to the historians of Muhammadan India* and who later on collected and compiled in English, extracts from original Arabic and Persian, mostly Persian of course, historical works covering the history of Muslim India excluding the provincial kingdoms. This monumental work was edited by Professor John Dowson in 8 volumes under the title *The History of India as told by its own historians* from London between 1867 and 1877. Almost simultaneously, the Asiatic Society of Bengal, Culcutta, published about a dozen and a half works and English translation of quite a few of them relating to the history of the Sultanate and the Mughals with the exception of one or two. About this period, the efforts of the British Civilian officers and those of the members of the Asiatic Society seem to have set in motion this process as a result of which we find quite a few historical works published by Indian publishing houses like Munshi Naval Kishore

DR. Z. A. DESAI (Ziyaud-Din Ahmad Desai) Born 1925, Ahmedabad (Gujarat). M. A. (1948), Persian & Urdu, first in Bombay University. D. Litt. (1959) Tehran University. Thesis: Life and works of Faizi with special reference to Nal Daman. Lecturer in Persian, 1947-1953. Epigraphist in Archeological Survey of India, Head of Arabic & Persian Inscription Branch, 1953-1976. Director (Epigraphy) Deptt. of Archeology, Government of India, 1977-1983. President Award (Persian) 1983.

Books: Mosques of India, Indo-Islamic Architecture, Centres of Islamic learning in India, Published Muslim Inscriptions of Rajasthan, Life and works of Faizi, Perso-Arabic Epigraphy of Gujarat, A topographical list of Arabic. Persian and Urdu Inscriptions of South India (In Press) etc. More than 200 articles in English, Urdu, Hindi, Gujarati on epigraphy, architecture calligraphy, history, Indo-Persian literature, etc

Malfuz Literature
As a Source Of Political, Social & Cultural History
of
Gujarat & Rajasthan in 15th Century

by :
Dr. Z. A. Desai

C O N T E N T S

Printer: Liberty Art Press,1528,Pataudi House,New Delhi.
Publisher:Mustafa Kamal Hashmi for Khuda Bakhsh Library,
Patna (Phone : 50109, Telex : 22-430 KBL IN).
Editor : Dr. A. R. Bedar.
Annual Subscription: Rs.100/-(Inland) U$ 20 (Asian Countries), U$ 40 (Other Countries).
Rs.25/- Per Copy.

* * * *

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL

53

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna
1990

خدابخش لائبریری

۵۴-۵۵

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

رجسٹریشن نمبر: ۳۳۴۲۳/۷۷
شمارہ ۵۵: چھپّن۔ پچپن
قیمت: پچاس رُپے

قیمت فی شمارہ: پچیس رُپے
سالانہ: ۱۰۰ رُپے (ہند)
۲۰ ڈالر ایشیا، ۴۰ ڈالر دیگر ممالک

۱۹۹۰ء

فہرست

خدا بخش لائبریری نے پٹنہ لیتھو پریس، رمنا لین، پٹنہ۔۴ اور لبرٹی آرٹ پریس دہلی سے چھپوا کر شائع کیا
ایڈیٹر: عابد رضا بیدار

فرہنگ زفان گویا

تالیف

بدر ابراہیم

تصحیح و تعلیق و ترتیب

پروفسور نذیر احمد
دانش گاہ اسلامی، علیگڑھ

فارسی کی ان قدیم لغات میں جو ہندستان میں لکھی گئیں، زفان گویا کا بڑا درجہ ہے۔ خدا بخش مخطوط کی اس لحاظ سے بڑی اہمیت ہے، جسے ڈاکٹر نذیر احمد نے ہمارے لیے مرتب کیا ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد کا لغت کے میدان میں بہت بڑا یوگ دان رہا ہے۔

زفان گویا کے متن کی فاضلانہ تدوین اور اشاعت، فارسی لغت شناسی میں ایک اہم اضافہ ہوا ہے۔ مثلاً سوویت یونین کے مشہور محقق اکادیمیشین بایفسکی نے لینن گراڈ کے مخطوطہ کو ۱۹۷۲ء میں ایڈٹ کیا تھا اور ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا تھا، مقدمہ روسی زبان میں تھا، جس کا ترجمہ ہمارے لیے ڈاکٹر جاوید اشرف نے کیا ہے۔ جاوید اشرف مشہور مورخ ڈاکٹر محمد اشرف کے صاحبزادہ ہیں اور علم حیاتیات میں وہی درجہ رکھتے ہیں جو ان کے باپ تاریخ میں رکھتے تھے۔

ـــــــ ع رب

فهرست مندرجات

بسمه تعالی

مقدمه

فرهنگ زفان گویا عموماً بهمین نام شهرت دارد، مثلاً در سراسر شرفنامهٔ منیری و موید الفضلا این فرهنگ بهمین نام یاد شده اما در بعضی از فرهنگنامه این لغت بنام زفان گویا و جهان پویا ذکر شده، مثلاً در فرهنگ[1] جهانگیری این فرهنگ در مقدمهٔ کتاب بدینطور ذکر شده:

"فرهنگ زفان گویا[2] و جهان پویا[3] مشهور بهفت بخشی تصنیف بدرالدین"

و خود در فرهنگ نام این کتاب زفان گویان و جهان پویان درجست، مثلاً در مقدمه این عبارت بنظر می آید:

و نام این فرهنگنامه زفان گویان و جهان پویان نهادم

و بر ورق ۱ در نسخهٔ بانکی پور بخط کاتب این عبارت منقول است:

فرهنگنامه تصنیف بدر ابراهیم "اسمه زفان گویان و جهان پویان"

و بر ورق ۱ ب بخط جدیدتری نوشته شده است:

فرهنگ زفان گویان و جهان پویان

و اگرچه در آخر نسخهٔ روسیه که جدیدتر است و غلطها نیز دارد، نام کتاب بصورت زفان گویا و جهان پویا آمده،

---

۱ در مدار الافاضل و شیرخانی نیز بهمین نام یافته می شود.

۲ گویا چند معنی دارد و صفت چند چیز واقع شده، مانند زبان گویا یعنی زبانی که گنگ نیست، و زفان فصیح، فرهنگ معین ۳: ۳۴۸۸

۳ پویا دو معنی دارد: رونده، دونده (ایضاً ۱: ۸۳۴)

"تمام شد کتاب فرہنگ نامہ زفان گویا و جہان پویا" مولف کتاب، نام کتاب خود را "زفان گویان و جہان پویان" قرار دادہ بود.

واژہ ہای گویان و پویان مانند کلمات گویا و پویا معنی دارہستند. در فرہنگ فارسی معین ۳: ۳۴۸۸ این دو کلمہ بدین طور شرح شدہ:

گویان [گفتن] ۱۔ گویندہ: گویان ز پی تو ما دل و دل
جویان ز تو نزد ما زر و زر (عمادی، گنج سخن ۱: ۳۱۲)

۲۔ در حال گفتن: متلہف بود و پویان و مترصد و جویان و برحسب واقعہ گویان
(سعدی، لغت نامۂ دہخدا)

و در ہمین فرہنگ ۱: ۸۴۴ پویان بدینگونہ شرح گردیدہ:

پویان [پوییدن] ۱۔ روان: چنین تا برآمد برین چند گاہ
بدآموز پویان بدرگاہ شاہ (شاہنامہ بخش ۸)،

۲۔ دوان

راجع بہ ہفت بخشی کہ بقول مولف فرہنگ جہانگیری زفان گویا بدین نام شہرت یافتہ، باید علاوہ نمود کہ غیر از جملۂ آخر مقدمۂ زفان گویا کہ شامل فقرۂ ہفت بخشی است، و ذیلاً آوردہ میشود، عبارتی دیدہ نشد کہ دران نام این فرہنگ بعنوان ہفت بخشی آمدہ باشد:

"این از فرہنگ نامہ بر ہفت بخش است"

بہ عبارت اخری در بارۂ شہرت زفان گویا بنام ہفت بخشی ہیچ اطلاعی در دست نیست.

در ہمین فرہنگ جہانگیری در ذیل واژۂ پخس (ج ۱ ص ۸۴۱) فرہنگی بنام پنج بخشی ذکر شدہ:

'در فرہنگ پنج بخشی (پخس) بمعنی عشق[1] نیز مرقوم است.'

فرہنگ قواس تالیف فخرالدین مبارک شاہ غزنوی کہ در عہد علاءالدین خلجی در ہند تالیف گردیدہ شامل پنج بخش است، چنانچہ در مقدمۂ[2] (ص ۳) آمدہ:

---

[1] عشق تصحیف عشوہ است، در نسخۂ زفان کہ پیش بندہ است، عشوہ است نہ عشق: و در فرہنگہای دیگر نیز ہمین کلمۂ عشوہ است نہ عشق، رک: مدار الافاضل ج ۱ ص ۲۹۰، عجب است از صاحب جہانگیری کہ با وصف این کہ مدار الافاضل و فرہنگہای دیگر پیش خود داشتہ اما این تصحیف صریح را تصحیح نہ نمودہ.

[2] این فرہنگ بہ تصحیح و تعلیق و تحشیہ بندہ از طرف بنگاہ ترجمہ و نشر کتاب تہران بسال ۱۹۷۴ میلادی انتشار یافتہ.

"فرہنگ نامہ بر پنج بخش است ، ہر بخشی بر چند گونہ و ہر گونہ در چند بہرہ."
ازین می توان قیاس کرد کہ در عبارت فرہنگ جہانگیری منظور از پنج بخشی فرہنگ قواس باشد اما چون واژهٔ پخس شامل فرہنگ قواس نیست ، بنظرم مراد ہمین فرہنگ زفان گویا باشد ؛ و این قیاس ناشی از این ست کہ در این فرہنگ اخیر کلمۂ پخس آمده و بدینطور شرح شده :

پخس عشوه و گدازش ، بعضی شین معجمہ گویند (گونۂ پ ، بہرۂ س) بہمین علت قیاس بنده این ست کہ منظور صاحب جہانگیری در عبارت فوق زفان گویا ست نہ فرہنگ قواس ، و این سہو است ، و شاید از ہمین سہو است کہ اللہ داد سرہندی در فرہنگ مدار الافاضل کہ در سال ۱۰۰۱ ھ تالیف شد زفان گویا را پنج بخشی گوید . چنانچہ در مقدمۂ کتاب (ص ۳) آمده است :

چنانچہ زفان گویا کہ اورا پنج بخشی نیز گویند

و نیز ذیل واژۂ پاد است :

و در پنج بخشی است کہ بیشتر بذال معجمہ گویند

این ست راجع بنام کتاب ، بنده بنابر شہرت عمومی این فرہنگ نامہ را بجای نام اصیل یعنی فرہنگ نامۂ زفان گویان و جہان پویان بنام زفان گویا بلکہ اختصاراً بعنوان زفان تذکر داده ام .
کلمۂ زُفان کہ در عنوان کتاب واژۂ اول قرار یافتہ در فرہنگ جہانگیری (۱۴۷۷:۲) آمده بدین گونہ شرح شده :

زفان با اول مضموم زبان را گویند ، منوچہری راست :

مرغان زبان گرفتہ یکسر بگشاده زفان رومی و عبری

و با اول مفتوح زبانہ بود ، حکیم سوزنی گفتہ :

نادی از نور دبن رسید و مرا گفت
کرده زفان تیز چون زفانۂ آتش

در حواشی جہانگیری این مثالہا افزوده شده :

و از آن سوراخ از ہزار سال باز یکی مار بیرون آید چندانکہ چشم وردی و زفان وی می بینی .
(تاریخ سیستان ص ۱۴)

و گفتہ اند : از آن گفت کہ در زفان موسی بستگی بود از آن وقت باز کہ آتش بر زبان نہاد .
(قصص قرآن سور آبادی ص ۲۴۸)

با نیکان بدل دوست باشی و بابدان بزبان دوستی نمائی تا دوستی هر دو گروه ترا حاصل گردد. (قابوسنامه ص ۱۴۱)
محمد منصور برکرسی بلرزید و فرونشست و زفان او در بند شد. (مقامات ژنده پیل ص ۴۲) و خود در مقدمهٔ زفان گویا آمده :

'چنانکه از هر زفانی بهره بود، سخنان هر زفانی را جداگانه تر زفانی بود.'

مولف کتاب: دربارهٔ مولف زفان گویا هیچ ماخذی در دست نیست، و خود مصنف کتاب نیز راجع بخود و دربارهٔ تاریخ کتاب هیچ اطلاعی فراهم نه نموده، اما در مقدمهٔ کتاب نام مولف بدر ابراهیم بنظر می آید: پس ز ستایش خدای بی نیاز و ستود محمد کیش نواز چنین گوید بندهٔ خوارترین چون خاک زمین دل پر بیم بدر ابراهیم. وهمین نام یعنی بدر ابراهیم در سرورق نسخهٔ بانکی پور نیز دیده میشود. ظاهراً در ترکیب بدر ابراهیم، اضافت ابنی بکار برده شده یعنی بدر بن ابراهیم، و درصحت این قول می توان حدس زد که نام مولف بدر و پدرش ابراهیم بود وشاید بهمین علت بود که صاحب جهانگیری نامش بدرالدین نوشته. تصادفاً در فرهنگ شرفنامه تالیف ابراهیم بن قوام فاروقی هویت نام مولف همان ست که در خود کتاب است، مثلاً صاحب شرفنامه می نویسد :

'اپاره[۱] بالفتح بارای موقوف نام تفسیر زند که تصنیف[۲] ابراهیم زرتشت است و می گویند تفسیر[۳] نسک است و آن هم کتابی است مغان را، نیز گویند که از صحف منزل است و دو معنی اخیر منقول است از فرهنگ زفان گویا که از مصنفات مولانا بدر ابراهیم برادر جد جامع شرف نامه است'

ازین قول نیز معلوم می شود که ابراهیم بن قوام فاروقی از خانوادهٔ مولف زفان گویا بوده، و ازاین می توان نتیجه گرفت که بدر ابراهیم مانند مولف شرفنامه نسباً فاروقی بوده است. پس نسب نامهٔ بدر ابراهیم باید بدین قرار ترتیب داد :

ابراهیم
(پدر مولف زفان گویا)

ابراهیم بن قوام (جد مولف شرفنامه)	بدر (الدین) (مولف زفان گویا)

ابراهیم بن قوام
|
قوام
|
ابراهیم (مولف شرفنامه)

---
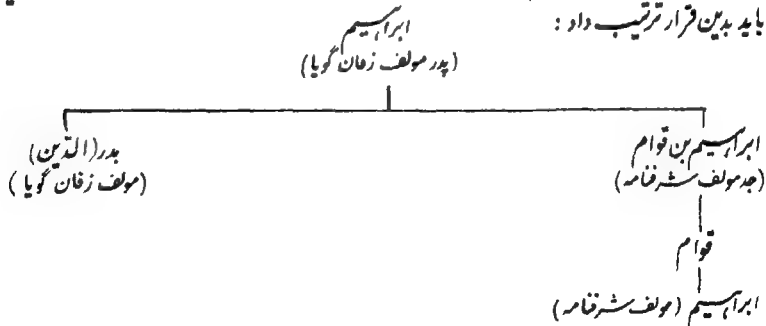
[۱] اپاره شرح و تفسیر اوستاست نه تفسیر زند (معین ۵ : ۲۰۴)

[۲] این قول محل نظر است.

[۳] هر جزو اوستا نسک (بالفتح) می گویند (معین ۶ : ۲۷۲۲)

دانشمند شهیر حافظ محمود شیرانی در تالیف خود : "پنجاب میں اردو" دوبار[1] نام مولف زفان گویا بدینطور آورده :

ملا رشید برادر جد جامع[2] شرفنامه

ملا رشید پدر ابراهیم برادر جد جامع شرفنامه

اگرچه شیرانی ماخذ خود را نه نوشته اما بظاهر او از شرفنامه این اطلاع را بدست آورده، و واضح است که قولش از ماخذش متفاوت است، ملا رشید نام مولف نیست، و اگر در قول دوم کلمهٔ پدر تصحیف بدر نیست، ابراهیم نام پسر مولف زفان گویا بوده نه نام پدر، در هرحال قول شیرانی خالی از اشتباه نیست.

اگرچه بطور قطع و یقین معلوم نیست که بدر ابراهیم مولف زفان گویا کجا سکونت داشته، اما ابراهیم بن قوام فاروقی مولف شرفنامه که نسبت هم خانوادگی به بدر ابراهیم داشته است، در یکی از اشعارش[3] خود را به جوناپور انتساب داده است :

از قدومت هست حقا در همه اقلیم هند

شهر جوناپور ما مانند لؤلؤ در عدن

جوناپور صورت قدیمی قصبه جون پور است، و این شهر بوسیلهٔ شاهان شرقی یکی از مراکز ادبی و فرهنگی قرار گرفته، ممکن است که ابراهیم بن قوام همانجا ولادت و نشو و نما یافته و بعدش عازم بهار[4] و بنگاله شده، فرهنگ خود را درمیان سالهای ۸۶۲ و ۸۷۹ بنام باربک شاه فرمانروای بنگاله ترتیب داده باشد، درصحت این حدس میتوان گفت که این خانواده فرهنگی بجونپور علاقه داشته است، باید علاوه نمود که از واژه‌گی هندی که بدر ابراهیم در زفان گویا و ابراهیم قوام در شرفنامه آورده میتوان قیاس کرد که هردو مصنف نامبرده بخطهٔ شرق هند علاقه داشته اند، مثلاً کلمهٔ اوس که متبادل کلمهٔ فارسی غسک است، بجای کهشل، یا واژهٔ جگنی بجای جگنو متبادل کلمهٔ شب تاب فارسی، یا واژهٔ بنبهنی مترادف کنلچلپرک یا گبروره مترادف خبزدوک یا کلنی مترادف کنه، یا چلنی مترادف پرویزن هنوز در استان اترپردیش شرقی و بعضی خطه های بهار هنوز متداول است.

---

[1] ص ۲۷۳، ۲۸۴

[2] مقالات شیرانی ۱ : ۳۱۷ : شرفنامه احمد منیری

[3] این بیت ذیل واژهٔ 'هند' آمده.

[4] رک : مقدمهٔ شرفنامه

تاریخ تالیف: دربارۂ تاریخ تالیف زفان گویا اطلاعی بهم نرسیده، خوش بختانه درمیان مآخذ بحر الفضائل[1] نام زفان گویا دیده می شود، و تاریخ تالیف بحر الفضائل سنہ ۸۳۷ هجری است چنانکه خود نگارندۂ کتاب می آرد:

"آغاز تاریخ هجرت از غرۂ ماه محرم گرفتند و درین وقت از تاریخ هجرت پیغمبر هشت صد و سی و هفت سال است"

پس محقق شد که زفان گویا پیش از ۸۳۷ هجری نوشته شد؛ استاد سید حسن در یکی از مقالات[2] خود نوشته که "زفان" از ادات الفضلا مقدم است و معلوم است که مؤخر الذکر در ۸۲۲ هجری تالیف شده، پس تاریخ زفان باید از ۸۲۲ هجری پیشتر باشد؛ بنای حدس او بر دو چیز است: اول اینکه نویسندۂ زفان گویا برادر جد نویسندۂ شرف نامه، و شرف نامه درمیان سالهای ۸۶۲ و ۸۷۹ هجری نوشته شده؛ پس اگر درمیان سن های نوه و جدش پنجاه سال تفاوت باشد، تاریخ زفان درمیان ۸۱۲ و ۸۲۹ هجری قرار می یابد، دوم اینکه در موید الفضلا نام زفان قبل از ادات آمده؛ اما این دلیل هیچ محکم نیست زیرا که درهمین موید چندین بار نام زفان از موید موخرتر آمده؛ دربارۂ تفاوت پنجاه سال درمیان سنهای نوه و جد، نباید فراموش کرد که تا معلوم نشود که پدر ابراهیم نویسندۂ زفان گویا برادر بزرگ بود یا خرد، این مدت درست نمی باشد. باید علاوه نمود که در ادات ذکری از زفان گویا نیامده، و بدرالدین دهلوی ثم دهاروالی چندی در جونپور نیز بسر برده، بنابرین قیاس میتوان کرد هر دو یکدیگری را شناخته و دیده باشند. پس اگر زفان گویا در آن موقع نوشته شده باشد، صاحب ادات از آن فرهنگ نیز استفاده نموده باشد، و درچنین صورت نام او حتماً آورده می باشد؛ در هر حال زفان و ادات در یک زمان تالیف یافته و تفاوت در زمان تالیف یکدیگری خیلی کم بوده باشد.

دکتر محمد باقر در مقدمۂ مدار الافاضل[3] تاریخ تالیف زفان گویا بگفتۂ پروفیسر شیرانی ۷۷۳ هجری نوشته، مثلاً:

بنا بقول پرفسور محمود شیرانی مولف این کتاب [زفان گویا] ملا رشید برادر جد ابراهیم قوام فاروقی صاحب شرفنامۂ ابراهیمی است و تاریخ تالیف آن ۷۷۳ هجری (= ۱۳۷۱ میلادی) می باشد.

ظاهراً دکتر محمد باقر از قول[4] پرفسور شیرانی که ذیلاً نقل می شود، استفاده نموده:

"مثلاً فرهنگ نامۂ مولانا مبارک غزنوی قواس که بعهد علاء الدین محمد شاه (۶۹۵-۷۱۵ھ) تعلق داشت

---

[1] رک: مقالات شیرانی ج ۱ ص ۱۰۹

[2] رک: مجلۂ فکر و نظر، علی گڑھ، ج ۳ شمارہ ۳، ژوئیه ۱۹۶۲ میلادی ص ۸۰ بعد

[3] مجلد ۱، لاہور ۱۳۳۷ شمسی، ص ۷ ج

[4] رک: پنجاب میں اردو ص ۲۷۳

... ہمیں دستورالافاضل است کہ مولانا رفیع حاجب خیرات بسال۷۷۳ ہجری تالیف نمود، فرہنگ زفان گویا[1] از ملا رشید برادر جد جامع شرفنامۂ احمد منیری و ادات الفضلا (۸۲۲ھ) از قاضی بدرالدین محمد دہلوی آثار قدیم است، بعلاوہ آن فرہنگہای بسیار است و باید بکتاب پنجاب میں اردو رجوع نمود.[2]"

ازین قول برمی آید کہ ۷۷۳ ہجری بقول شیرانی تاریخ تالیف دستورالافاضل نہ تاریخ زفان گویا چنانکہ دکتر باقر دانستہ است، و باید علاوہ نمود کہ تاریخ دستورالافاضل[3] ۷۴۳ ہجری سال است نہ ۷۷۳ ہجری چنانکہ شیرانی قیاس نمودہ، و این تاریخ خود در آخر کتاب[4] آمدہ:

چو دستورالافاضل شد مرتب | مرا واجب دعا باشد دل شب
خداوندا بحق نیک مردان | بچشم مردمان مقبول گردان
زہجرت بود ہفصد با سہ و چہل | مرتب گشتہ دستور افاضل

مندرجات فرہنگ: از فہرست کاملی کہ از مندرجات فرہنگ در دیباچہ مندرج شدہ ترتیب و تنظیم کتاب را می توان دانست، این فرہنگ شامل یک مقدمہ و ہفت بخش و یک نہایت (خاتمہ) است، ہر بخش در گونہ و ہر گونہ در بہرہ قسمت یافتہ، ہر حرف الفبائی گونہ را تشکیل می دہد و ہر گونہ باعتبار الفبای فارسی در بہرہ تقسیم شدہ بدینقرار:

بخش نخست در سخنان پہلوی و دری کہ جداگانہ[5] است و پیوند سخنی دیگر ندارد و آن بر نہاد حرفہای عجمی بیست و سہ گونہ

گونۂ نخست در سخنانی کہ آغاز آن الف است، بر بیست و دو بہرہ:

بہرۂ نخست در سخنانی کہ پایان آن الف است.

بہرۂ دوم در سخنانی کہ پایان آن ب است. الخ

گونۂ دوم کہ آغاز آن با ست ... تا آخر گونۂ بیست و سوم

بخش دوم در سخنان پہلوی و دری کہ از دو سخن پیوند[6] یافتہ است و از پیوستن ہر دو رازی انجامیدہ،

---

[1] ہمین تاریخ در مقالات شیرانی ج ۱ ص ۳۱۷ یافتہ می شود.

[2] این عبارت بزبان اردو است.

[3] دستورالافاضل بہ تصحیح نگارندہ از طرف بنیاد فرہنگ ایران تہران ۱۳۵۲ شمسی انتشار یافتہ.

[4] رک: مقدمہ ص ۱۵، متن ص ۲۵۶

[5] یعنی مفردات [6] یعنی مرکبات

بر بیست و یک گونه است.

گونهٔ نخست در سخنانی که پایان آن الف است تا آخر گونهٔ بیست و یکم و هر گونه در بهره‌ها قسمت یافته.

بخش سوم در سخنان پهلوی و دری که از آن کردارها بیرون آید بر بیست و سه گونه،
گونهٔ نخست آنکه نخست آن الف است تا آخر گونهٔ بیست و سوم

بخش چهارم در سخنان تازی یعنی عربی بر بیست و هشت گونه شامل حرفهای عربی مانند ث، ح، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع، ق، اکثر گونه به بهره‌ها تقسیم شده بترتیب الفبا

بخش پنجم در سخنان آمیخته از تازی و ترکی و عجمی که در گونه‌ها و بهره‌ها قسمت یافته به ترتیب الفبا.

بخش ششم در لغات رومی و یونانی که در گونه‌ها و بهره‌ها قسمت یافته به ترتیب الفبا.

بخش هفتم در لغات ترکی که در گونه‌ها و بهره‌ها قسمت یافته.

نهایت فرهنگ نامه در لغات متفرقه بدون ترتیب الفبا.

بدر ابراهیم در مقدمهٔ کتاب غرض تالیف را اجمالاً بیان نموده، بگفتهٔ او اکثر فرهنگهای فارسی چنان ترتیب نیافته بودند که غرض خوانندگان بحصول پیوندد، بنابرین اکثر دوستانش اورا وا داشتند که او چنان فرهنگی ترتیب دهد که مطالعه کنندگان را استفاده آسان گردد، همین علت بود که او کتابی را به ترتیب نو پرداخته، و در آن الفاظ مفرد و مرکب و عربی و ترکی و رومی در ابواب جداگانه فراهم آورده شد، و واژه‌هائی که تحت پنج باب آورده نشد، در خاتمه جمع شده. چنانچه بعضی عبارت مقدمه ذیلاً نقل می شود:

فرهنگ نامه بزبان پهلوی و دری و پارسی و جز آن پراگنده و هریکی از آهوی آگنده بوده از بی زیری و زبری، زیر و زبر در پس و پیش بیشتر... سخنان از پارسی و تازی آمیخته و جداگانه در کالبد بربسته و رسته و بربسته چنانکه بایست توسن نیاخته و چنانچه نشایست نساخته تا گروهی از سخن سرایان و دبیران... سخنان بسیار می خوانند و تر زفان آن نمی دانند.... برخی از دوستان یهدل و همراز و همنشین و غم پرداز بودند ... و این غمگین را ... خستو می کردند و بدانچه می رسیدند می پرسیدند چون پاسخ می یافتند رسن می گرفتند که برای آسانی مردمان فرهنگ نامه بپردازید و بهنجار که سودمند گردد بسازید چنانکه از هر زفانی بهری سخنان هر زفانی را جداگانه تر زفانی بود... چون خواهش بسیار افزوده درخواست ایشان را پذیرفتم و خامه برگرفتم و در استوه را بر خود بستم و سخن را در سخن پیوستم...

منابع فرهنگ بدر ابراهیم هیچ جا بیان نه نموده که او از چه منابع فرهنگ خود را ترتیب داده اما درمیان

توضیحات بعضی واژه های نامهای سه چهار فرهنگ برده از آنجمله است لغت فرس اسدی، فرهنگ فردوسی[۱]، فرهنگ فخر قواس، رسالهٔ نصیری اما واضح است که پدر ابراهیم نه فقط در همان مواردی که نامهای فرهنگها آورده، از آنها استفاده نموده بلکه در سراسر کتاب تحت تاثیر آنها بوده است و در بعضی جایها مندرجات آنها را عیناً نقل نموده است، در میان این فرهنگها نویسندهٔ زفان گویا از دو فرهنگ یعنی اسدی و قواس بیشتر استفاده نموده است[۲] مثلاً ذیل واژه های اورمزد، پسیله، خشتچه، رخش، زند، غانه، فسله، کلچ، کبد، کبودر، لک، نورده، ورتاج غلیواز وغیر آنها عبارتهای اسدی و زفان تقریباً یکسانست و ازین جهت تاثیر این کتاب از تاثیر قواس بیشتر نیست؛ اما لغهٔ موخرالذکر از جهات مختلف است، مثلاً اولاً تحت تاثیر قواس پدر ابراهیم فرهنگ خود را در بخش وگونه و بهره قسمت نموده است، ثانیاً نویسندهٔ زفان مقدمهٔ خود را چنان تحت تاثیر قواس قرار داده که اکثر کلمات وفقرات حتی بعضی جملات را از قواس گرفته. ذیلاً بعضی عبارات از مقدمهٔ هر دو کتاب آورده شود تا معلوم شود که پدر ابراهیم از قواس چه قدر استفاده نموده :

(زفان)	(قواس)
برگزین آفریدگار و برگزیدهٔ کردگار دل وروان بریاران ویاوران، ایزد در کار وگفتار او را یار و از آهوگیران و ژبرازان نگاه دارد	برگزین کردگار وبهین مهین آفریدگار هزاران هزار با یاران و یاوران، ایزد تعالی در کار این پی روی از کاهش آهوگیران و ناراثی ژبراز و یار ونگاه دارش باد
پس هوش وگوش بر آن آرزو گماشتند ودل بران کام وبست داشتند وبسوی یکدیگر میدویدند... کسی آن در باز نمی گشاد و داد آن سخنها بسزا نمی داد.	وهوش وگوش بر آن استوار گماشتند... آنچه در دل داشتندهم سوی یکدیگر میدیدند اما کسی آن در باز نمی کرد و داد سخنها بسزا نمی داد
در استوه را برخود بستم وسخن را در سخن پیوستم	در استوه را برخود بستم وسخن را در سخن پیوستم
هرچه در زبان تازی و پارسی و پهلوی و دری ... بود همه را فرو نگریستم ویگان یگان در خانه ... و آن را بخش بخش وگونه گونه و بهر بهر کردم، نهادم برین هنجار ایزد داناتر است برراستی و نادرستی آن، از گمراهی	در زبان تازی و پارسی ترجمان کرده همه را فرونگریستم ویگان یگان در خانهٔ کاغذ نگار آوردم وآنرا بخش بخش وگونه گونه و بهربهر کردم برین هنجار... خدای عزوجل داناترست برراستی و ناراستی آن واز ناآگاهی گمراهی

---

[۱] ببینید: واژه های ایشه، ژرف، بیریان، سنبل، کیفر، کلابه، یزد

[۲] ببینید: واژهای آورد، توز

وبی آگاهی نگاهدارد. | نگاهدارد

واز تحت تاثیر فرهنگ قواس است که مولف زفان گویا در مقدمهٔ خود زبان فارسی سره بکار برده است.

اگرچه صاحب زفان گویا از فرهنگ قواس مستقیماً استفاده کرده اما از مقایسهٔ مندرجات فرهنگ قواس شامل زفان گویا با مندرجات قواس چاپی واضح می شود که نسخهٔ فرهنگ موعزالذکر که ماخذ زفان گویا بود با نسخهٔ چاپی اختلاف داشته و این اختلاف بر دو[1] نوع است :

اوّل : بعضی واژه ها که در زفان گویا بگفتهٔ قواس درج ست از نسخهٔ چاپی که مبنی بر نسخهٔ منحصر بفرد است، خارج است. و این نسخه فعلاً افتادگی دارد، و مندرجات زایده زفان بر نقص نسخهٔ حاضر نیز دلالت می کند.

دوم : در بارهٔ املا و تلفظ بعضی واژه ها نسخهٔ حاضر از فرهنگ قواس قول زفان را مورد تایید قرار نمی دهد.

ذیلاً بعضی واژه ها که شامل زفان گویا و از نسخهٔ چاپی خارج ست، ذیلاً درج می شود:

شال : گلیمی خرد و فخر قواس گوید شال نمدی که زیر برگستوان کنند.

کبشک : سنبه تیز کردن آسیا و بعضی بفتح کاف و کسر با گویند و در فرهنگ نامهٔ فخر قواس کبستک کرده است.

گریان : فدا و این زبان سیستان و بکاف عربی نیز گویند و فخر قواس گوید : گریان فدا

توز : ... و فخر قواس گوید آنچه از کسی بکسی رسیده باشد باز باو رسانیدن. درین چار مورد واضحاً نام قواس آمده اما در بعضی موارد فقط کلمهٔ فرهنگنامه آمده، و ممکن ست منظور صاحب زفان گویا همین فرهنگ قواس باشد.

در موارد[2] ذیل صاحب زفان گویا نام قواس آرد و این واژه ها در نسخهٔ چاپی از قواس به تفاوت درج ست.

توشکان : ایوان حمام یعنی آنجا که آتش سوزند یعنی آتشدان گرمابه و در فرهنگ نامهٔ فخر قواس ترشکان آتشدان گرمابه در نسخهٔ حاضر از قواس این واژه مانند وسکال تصحیف توشکان است، اما در موید ج ۱ ص ۲۶۸ ذیل توشکان آمده : با واو و کاف فارسی و شین موقوف آتشدان گرمابه و در لسان الشعرا مذکور است ایوان حمام یعنی آنجا که آتش سوزند و در فرهنگ فخری بمعنی آتشدان گرمابه، واضح است که صاحب موید فرهنگ فخر قواس را اشتباهاً فرهنگ فخری نوشته.

جفته : طاق که بنا ها کنند و بعضی گویند گونه ای از تخت است و در فرهنگنامهٔ فخر قواس جفته طاق انگور این کلمه در نسخهٔ فخر قواس پس از واژهٔ کت بمعنی تخت بدینقرار آمده : جفته هم نوعی ازو، بنابرین معنی جفته تخت باشد نه طاق انگور

---

[1] رک : فرهنگ قواس مقدمه ص ۳۲ - ۳۳ .

[2] ایضاً ص ۳۳ - ۳۷

کالوخ : گیاهی است و در فرهنگ نامهٔ قواس کاوخ بدون کاف. اما در نسخهٔ چاپی قواس کالوخ است نه کاوخ.

هف : بفتری یعنی کارگاه بافنده و فخر قواس گوید : هف چوبی است که در بافتن بر جامه زنند، و موید الفضلا ج ۲ ص ۲۶۷ نیز همین را مورد تایید قرار می دهد مثلاً در این کتاب آمده : هف بالفتح کارگاه جولاهه که آنرا بفتری گویند و فخر قواس گوید : هف چوبیست که جولاهگان در بافتن بر جامه زنند و معنی اخیر از زفان گویاست. اما در نسخهٔ چاپی از قواس فقط همین قدر است : بفتری هف، و هیچ نشانی از شرحی که در زفان و موید بگفتهٔ قواس درج شده پیدا نیست.

شبان فریوک : شب پرک، و فخر قواس شب فریوک گفته و در محلی است که این جانور را شب فریب نیز گویند. اما نسخهٔ چاپی قواس شبان و فریوک بمعنی شپرک، و همین صورت اخیر در دستور الافاضل وجود دارد؛ اما موید ج ۱ ص ۵۳۴ بگفتهٔ قواس شبان فریوک دارد.

استفادهٔ فرهنگ های بعد از زفان گویا : اکثر فرهنگهای فارسی که پس از زفان نوشته شده، از زفان گویا استفاده نموده اند، از آنجمله است بحر الفضایل تالیف ۸۳۷ هجری، موید الفضلا ۹۲۵ هجری، فرهنگ شیرخانی تالیف ۹۵۰ هجری، مدار الافاضل ۱۰۰۱ هجری، فرهنگ جهانگیری ۱۰۱۷ هجری وغیره، موید الفضلا فرهنگی است که دران مطالب اکثر فرهنگها را با ذکر آن فرهنگ جمع نموده، چنانچه در مقدمه آمده :

> بنابران مولف بتایید موید العباد این نسخه را بنیاد نهاد که این مجموعه جامع جمیع نسخه هاست و همه نسخ و اسامی آن نسخ در حیز لغات مسطور است.

خلاصه اینکه اگر همه جاهای را که در آن موید الفضلا نام زفان گویا آمده، جمع آوری بشود یک نسخهٔ کوچکی از زفان تهیه بشود و معلوم است که فقط یک نسخهٔ کاملی از زفان وجود دارد مندرجات موید الفضلا که بحوالهٔ زفان آمده در تصحیح متن کتاب تاثیر فراوان داشته و در مقایسه و مقابلهٔ عبارات بی نهایت سودمند افتاده، بعضی عبارات از موید ذیلاً نقل شود تا معلوم شود که صاحب موید تا چه اندازه از زفان استفاده نموده است :

> بودیه : با دال موقوف گیاهی است که چون برگهایش شکفته باشند بوی ترنج دارد و آنرا شاهتره نیز گویند کذا فی زفان گویا. (ج ۱ ص ۱۷۷)
>
> بادهرزه : افسونی که دزدان برای خواب صاحبخانه دمند کذا فی زفان گویا. (ایضاً)
>
> بداکه : بداندیش و خشم آلوده و ژاژ که مشله کذا فی زفان گویا (ج ۱ ص ۱۷۹)
>
> بزلیشه : بالضم کنج آرد کرده و قیل حرف یکم فارسی کذا فی الشرفنامه و در زفان گویا بمعنی گنجاره و دراداث است گنبد گرد کرده ای گنجاره (ج ۱ ص ۱۸۱)

بوکه : ... وبمعنی مگر در لسان الشعرا و زفان گویا مگر کلمهٔ استثنات مسطور است.
بیشه : بایاء فارسی دشت و نیستان و جنگل و در زفان گویا مرقوم است که نیز سازی است مثل چنگ و رباب. (ج ۱ ص ۱۸۴)
ابراهیم بن قوام فاروقی زفان گویا را تحت مطالعهٔ دقیق خود در آورده بود، و در بیشتر موارد از ین فرهنگ اخیر استفاده نموده ؛ بعضی مثالها ذیلاً نقل می شود :
اندروا[1] : بالفتح نگون آویخته و بازگونه کرده، اندروای، و دروای و دروا درین لغت است و در فرهنگ زفان گویا بمعنی حاجت نیز آورده
باخور[2] : آن پانزده روز که در سال سخت گرم است و این منقول است از زفان گویا.
بروز[3] : آرایش پوستین که در پای دامن و سر آستین دوزند و پیوند و جامهٔ گستردنی و پوشیدنی با لونی پس از لونی دیگر ... وقیل بروز با رای مهمله در زفان موجود است.
برمو : انتظار و این منقول است از زفان گویا.
خروک : بالفتح همان خرچلوک مرقوم، گویند همان خنجک ... و معنی ثانی از زفان گویا منقول است
دروا : بالفتح نگون آویخته و بازگونه آویخته، اندروای و دروای درین لغت اند و در فرهنگ زفان گویا بمعنی حاجت هم منقول است.
مزایای زفان گویا : مختصات و مزایای این فرهنگ ذیلاً آورده می شود :
۱- زفان گویا از فرهنگهائیکه از آن قدیم تر هستند مانند لغت فرس و فرهنگ قواس و صحاح الفرس و دستور

---

۱ - این واژه از نسخهٔ حاضر از زفان خارج است، اما همین واژه در موید الفضلا بگفتهٔ زفان نیز آمده.
۲ - در بخش پنجم از زفان ذیل واژهٔ باخورا باخور نیز بهمین معنی آمده، ضمناً باید علاوه نمود که باخور بدین معنی تصحیف باحور است و این کلمهٔ اخیر عربی است، باحورا نیز بهمین معنی آمده. در لغتنامهٔ دهخدا این را یونانی قرار داده اند، امّا در فرهنگ معین باحور و باحورا عربی است، اما باخور و باخورا شامل این فرهنگ اخیر نیست، و در لغت نامه واژهٔ باخور بدین طور شرح شده :
نام پدر آزر پدر ابراهیم که جد ابراهیم بود، چنان بنظر میرسد که باخور تصحیف ناحور است و بگفتهٔ طبری ناحور پدر تارخ و تارخ پدر ابراهیم که بنام آزر نیز شهرت دارد. دکتر معین بحوالهٔ قاموس کتاب مقدس نام پدر ابراهیم تارح و ترح نوشته است. (رک: حاشیهٔ برهان قاطع بقلم معین)
۳ - در زفان گویا برور بمعنی پیوند و بروز بهمان معنی آمده که در شرف نامه است، بالفاظ اخری برور و بروز باعتبار معنی اوّل مترادف اند، معین بجای برور و بروز، پرور و پروز آورده، و باعتبار معنی پیوند هر دو مترادف هستند.

الافاضل، ضخیم‌تر و شامل واژه های بیشتر می باشد.

۲۔ این فرهنگ شاید قدیمترین فرهنگی باشد که دران واژه های فارسی و عربی و ترکی و رومی در فصلهای جداگانه نوشته شده و چون اصول دستور زبان عربی مانند جمع و تنوین وغیره. فقط در کلمات عربی که در فارسی متداول است، جائز است نه در واژه های فارسی، تفریق میان واژه های عربی و فارسی لازمۂ زبان شناسی است، ازین حیث زفان گویا خدماتی خوب انجام داده.

۳۔ زفان واژه های مفرد را از مرکب ساخته، این تفریق لازمۂ زبانشناسی و فیلولوژی است.

۴۔ اگرچه در اغلب موارد صاحب زفان گویا از اعراب صرف نظر نموده اما در بعضی جاها التزام آن دیده میشود.

۵۔ ترتیب و تنظیم کلمات باعتبار حرف اول و آخر در تعیین املا و قرأت لفظ کمک می کند.

۶۔ درین لغت بعضی از واژه های هندی که در آن دوره در هند متداول بوده در ضمن توضیح واژه های فارسی شامل نموده، این واژه های هندی که درین فرهنگ "هندوی" گفته شده از لحاظ زبان شناسی سودمند است؛ بوسیلۂ آنها می توان صورتهای اصلی واژه های متداول امروزه را دانست، این همه واژه ها بوسیلۂ بنده جمع آوری شده و مقالۂ مفصل مبنی برآن در مجلۂ "اردو" کراچی در ۱۹۶۷ میلادی چاپ شده، مقالۂ دیگر بعنوان زفان گویا که در مجلۂ "غالب نامه" دلی انتشار یافته، شامل همۂ این کلمات می باشد.

۷۔ صاحب زفان گویا اکثر صورتهای مختلف واژه ها را بیان می کند و این بیان از لحاظ علوم فرهنگ نویسی و فیلولوژی مهم قرار می یابد.

۸۔ زفان گویا شاید قدیم ترین فرهنگی می باشد که واژه ها را که از حرفهای ز (زای عربی) و ژ (زای پارسی) شروع یا برآنها ختم می شود از یکدیگر جدا می کند، همچنین این فرهنگ تنها فرهنگی است که کاف فارسی و کاف عربی را در عنوانهای جداگانه می آورد، و این تفریق لازمۂ علم زبان شناسی است.

۹۔ درین فرهنگ یک بخش جداگانه برای مصادر فارسی مختص شده و این مصادر در تعیین ریشه های الفاظ کمک می کند.

۱۰۔ بعضی واژه ها که در ابواب کتاب شامل نشده در خاتمۂ کتاب جداگانه آمده.

۱۱۔ زفان گویا بنابر بعضی مزایای خود بشمار یکی از متداول ترین فرهنگ می آید و بهمین علت است که مورد استفادۂ فرهنگ نویسان بعد قرار گرفته از آنجمله صاحب موید الفضلا است که ازین کتاب اخیر میتوان یک فرهنگ مختصری از زفان گویا درست نمود.

۱۲۔ اگرچه معلوم نیست که بدر ابراهیم چه زبانهای محلی ایران را می شناخت اما تحت بعضی واژه ها اشاره

به زبانهای محلی می کند از آنجمله است   زبان ماوراءالنهر[1]، زبان شیرازیان[2]، زبان دیلمیان[3]، زبانِ فرغانه[4]، زبان افغانان[5]، و این تعیین خود در جای خویش خیلی مفید و جالب است اما بطور قطع نمیتوان گفت که نویسندهٔ زفان خود این تعیین نموده یا از فرهنگهای قدیم استفاده نموده بهرحال این اطلاع مفید است.

۱۴. اگرچه در زفان گویا از شواهد شعری غالباً صرف نظر شده اما در چند موارد این شواهد وجود دارد، این ست فهرست اشعاری که شامل فرهنگ است، بعضی از اشعار خود از مولف است، اما اشعارش سست و بی کیفیت است. بنابرین پایهٔ بدر ابراهیم بعنوان شاعر فارسی بلند نیست.

رنده :   گردگار[6] امشب رنده ده جهان را خوش تراش
تاکه از قومی که هم ایشان وهم ما تیشه ایم

فروردین :   زفروردین چو بگذشتی مه اردی بهشت آید   همان خرداد و تیر آنگه که مرداد همی آید
پس از شهریور و مهر و آبان آذر و دی دان   چو[7] بر بهمن جز اسفندار مذ ماهی نیغزاید[8]

زفروردین ربیعی دان تا شهریورش وانگه
زمهرش تا باسفندار جمله از خریفش دان

نیمور :   من این نیمور خود را وقف کردم   علی صبیانکم یا[9] ایها النّاس   (سوزنی)

فروردین (بخش ۲)

مصراع :   باد فروردین[10] کش خواند عرب ریح الدبور

---

[1] ذیل واژه های پوشک، چرخشت، فلرز، کنند، دارد
[2] ذیل واژه ها
[3] ذیل واژه گیا
[4] ذیل واژه فغ
[5] ذیل واژه خواره، و ذیل کلمهٔ سیر نام زمین بالادست آمده
[6] بایفسکی مقدمهٔ زفان گویا ص ۱۴ : گردگار امشب رندی کذا از وزن ساقط
[7] بایفسکی بحذف بر
[8] بایفسکی : بیفزاید، مصراع ساقط الوزن
[9] بایفسکی بحذف یا، مصراع ساقط الوزن
[10] بایفسکی باد فروردین ست، مصراع ساقط الوزن

شبستان (بخش ۲)

من نالکنان زغم همه شب　　او خفته بناز در شبستان

تشرین: دو تشرین و دو کانون و پس آنگه　　شباط[۱] آذار نیسان و ایار است
خزیران[۲] و تموز و آب و ایلول　　نگهدارش که از من یادگار است (مولف)

بید: این پنج درخت ست که می نآرد بار　　بید و پد و سرو و سپندان و چنار (مولف)

خنفبر: با فراخی[۳] است ولی سخت همی[۴] تنگ زید　　آنچنان شد که چو هیچ خنفبر نبود (ابوالعباس)

خنیور: به پول خنیور که چون تیغ تیز　　گذار[۵] است هم نام و هم رستخیز (مولف)

زلیفن: از لب[۶] تو مرا[۷] هزار امید　　از سر زلفت[۸] مرا هزار زلیفن (فرخی)

گوش خپه: گرچه صد پا[۹] بیش دارد ای برادر گوش خپه
لیک اندر گوش کس یک پای[۱۰] نتواند نهاد

افشاندن: اگر دستم دهد روزی که انصاف از تو بستانم
قضای عهد ماضی را شبی دستی بر افشانم

یوز: یوز از چشم آهوانهٔ او　　گرگند عاشقی بود آهو (مولف)

گشن: ما هم بجمع خویش یکی گشن لشکریم　　این یک[۱۱] سو پیاده واین یک قدح سوار

انگاره: زان روز که پیش آیدت آنروز پراز هول　　بنشین و تن اندر ده و انگاره به پیش آر (لبیبی)

---

۱ بایفسکی: شباط و آذار و نیسان و ایار مصراع از وزن خارج

۲ این بیت از نسخهٔ دوم (روسیه) افزوده شد، در نسخهٔ اصل افتادگی دارد.

۳ بایفسکی: با فراخی است ولی سخت همی تنگ زید　آنچنان شد که چو هیچ خنفبر نبود (هر دو مصراع از وزن ساقط است)، این شعر از ابوالعباس است، رک: فرس ص ۱۶۹، قواس ص ۱۱۲

۴ فرس و صحاح و سروری و رشیدی: ولیکن به ستم تنگ زید.

۵ بایفسکی: که داد است.

۶ این بیت فرخی در صحاح ص ۲۴۴ و جهانگیری ۲: ۱۶۲۱ نقل شده.

۷ بایفسکی: مرمرا　　۸ بایفسکی: زلف تو

۹ زفان هر دو نسخه: گوش خر

۱۰ زفان هر دو نسخه: پا

۱۱ بایفسکی: یک سو پیاده و یک قدح سو، مصراع معنی ندارد و نیز از وزن ساقط

۱۵۱ - حرف ذال را باب جداگانه نیاورده ، ازین واضح است که دران دوره رواج ذال فارسی کم کم ازبین می رفت ، اما باوصف آن باذ را باذ و انگدان را انگذان نوشته و ذیل سرواد می نویسد: اسدی بذال معجمه گویند. معلوم نیست چرا تخصیص اسدی کرده زیرا در دورهٔ اسدی تفریق میان دال و ذال فارسی برقرار بوده ، ظاهراً این تخصیص برای این ست که لغت اسدی شامل واژه های ماوراءالنهر نیز می باشد و دران خطه بقول شمس قیس رازی در "المعجم فی معائیر اشعار العجم" تفرقه میان دال و ذال فارسی برقرار نبود زیراکه عدم شناسائی نویسندهٔ زفان از روش تفریق میان دال و ذال بعید از قیاس بنظر می آید.

نقایص زفان گویا

۱ - اگرچه نویسندهٔ زفان گویا درعلوم لغت و زبان دستگاهی داشته اما او دربعضی موارد مطالب از فرهنگ های قدیمی بدون تحقیق نقل می کند و بنابرین اورا محقق علم لغت و علم زبان وکتاب اورا کتاب محققانه قرار نمی توان داد ، وشگفت آور است که بدر ابراهیم عیناً همین عبارت را که درفرهنگهای قدیم یافته بدون هیچ تغییر وتبدیل درکتاب خود جاداده واین روش کار تالیف اورا ازمقام ورتبه می کاهد ، بعضی شواهد ذیلاً آورده میشود :

زفان		
ارمان : حسرت ، ارمان خوار حسرت خوار	ارمان : حسرت ، ارمان خور حسرت خوار	(قواس ص ۹۲)
خنج : دیوستنبه وگویند خنج بسکون خا وجیم فارسی آن گرانی بودکه درخواب مردم را الفرو گیرد ، بتازی کابوس گویند	گرانی بودکه در خواب مردم را فرو گیرد ، بعربی آنرا کابوس گویند	(قواس ص ۱۶۳)
دریواس ، چوبی که گرد درنهند برای محکمی	چوبی باشد که پس درنهند بجهت محکمی	(قواس ص ۱۲۱)
زبین : دوغ ستبر مانند پنیر	دوغ ستبر مانند پنیر	(ادات)
دژ : بد و خشم	بد و خشم	(قواس ص ۹۳)
ژوار : خدمت گار بندیان الخ	خدمتگار بندیان باشد	(قواس ص ۹۴)
فدرنگ : چوبی باشد که پس درنهند بجهت محکمی الخ	چوبی باشد که پس درنهند بجهت محکمی	(قواس ص ۱۲۶)
کخ : آنچه کودکان را بدان ترسانند الخ	آنچه کودکان را بدان ترسانند	(قواس ص ۱۱۴)

۲ - این فرهنگ کاملاً از فرهنگها درست شده و در ترتیب این کتاب از متون ومنابع دیگر یکسر صرف نظر شده وبهمین علت است که درشرح وتوضیح لغات اکثر عبارات از فرهنگها عیناً نقل شده است.

۳ - این فرهنگ کاملاً از اسناد وشواهد عاری است ؛ بظاهر درین تخصیص ایجاز واختصار درنظر

است اما اسناد و شواهد نه فقط در توضیح و تشریح واژه ها بلکه در تعیین قرائت و املای لغات تاثیر فراوان دارد.

۴. اگرچه نویسندهٔ این فرهنگ واژه های عربی را در بخش جداگانه آورده اما گاهی در تفریق واژه های عربی از فارسی دوچار اشتباه شده است، چنانچه بعضی از اشتباهات ذیلاً درج می شود:

رشش: مسافت میان دو دوست چون فراز کنند، و سرشک باران خرد قطره و هژدهم روز از ماه. اما رش بمعنی سرشک باران عربی است، در جهانگیری ۲: ۷۶۲ آمده: رشش بتازی با تشدید باران اندک و ریزه راگویند و رساش جمع آنست، در دستور الاخوان ص ۳۰۰: الرّش آب زدن و اندک باریدن و باران اندک و ریزه، الرشاش جماعه

رشاشه: قطرهٔ باران باریک، هندوی پهوں گویند. این کلمه عربی است از مادهٔ رشش بمعنی چکیدن باران اندک و ریز، رک: موید ۱: ۴۴۳، فرهنگ معین ۲: ۱۶۵۶

شرک: جامه دارو و شرک: دام. شرک هردو مفتوح بمعنی دام عربی است، رک: موید ۲: ۵۲۴، دستور الاخوان ص ۳۶۴: الشرک دام، الواحدة شرکة.

زرافه: قج و به تشدید را نیز گویند. اما این واژه عربی است؛ رک: فرهنگ معین ۲: ۱۷۶۹، دستور الاخوان ص ۳۱۷

سبل: علتی است و آن آنست که موی بریده برمی آید، اما این واژه عربی است، رک: فرهنگ معین ۳: ۱۸۲۰، دستور الاخوان ص ۳۳۰

غوغا: آشوب بود و ملخ که پرش برآمده باشد، این واژه عربی است، رک: موید ۲: ۳۴، دستور الاخوان ص ۴۶۲: الغوغاء ملخ که پر برآمده باشد و به شبه الغوغاء من النّاس وهم السفلة.

غبغب: جای زنخ. این واژه عربی است چنانکه در موید الفضلا ج ۲ ص ۳۴ آمده: محمد معین در فرهنگ خود: ۲: ۲۳۸۸ می نویسد: غبغب (عربی) گوشت برجسته که زیر زنخ مردم فربه پدید آید، جمع غباغب، دستور الاخوان ص ۴۵۳: الغبغب والغبب آن پوست که آویخته بود زیر گلو.

غبب: غبغب. این واژه هم عربی است چنانکه از دستور الاخوان، موید الفضلا، فرهنگ معین ۲: ۲۳۷۸ برمی آید.

غیار: جامهٔ زرد جهودان که بر جامهٔ خود می دوزند. غیار عربی است چنانکه از دستور الاخوان (ص ۴۶۲) و موید الفضلا ۲: ۳۷ واضح می شود، در فرهنگ معین ۲: ۲۴۵۵ آمده:

غیار(ع) پاره ای باشد برنگی جز رنگ جامه که جهودان در قدیم برکتف می دوختند. دستورالاخوان: الغیار ... نشان جهودان ونشان اہل ذمه.

کفه: پله وآنچه درو بود، اما این واژه عربی است نه فارسی: دستورالاخوان ص ۵۲۱: الکفة پلهٔ ترازو وحلقهٔ دام؛ فرہنگ معین ۳: ۳۰۱۰ کفه (keffat ، kaffat عربی) پلهٔ ترازو

لبلاب: معزمی که عزیمت خواند وگیاهی است که آنرا عشقه گویند. این واژه عربی است، دستورالاخوان ص ۵۲۳: اللبلاب پیچه، و در فرہنگ موید الفضلا ۲: ۱۵۷ لبلاب در فصل عربی آمده؛ فرہنگ معین ۳: ۳۵۶۰ لبلاب (عربی) عشقه.

مہوز: گیاهی است که آنرا بتازی بزاق القمر گویند. درموید بگفتهٔ زفان گویا مهور است بمعنی بزاق القمر، اما زفان گویا اصلاً مهوز ندارد، برہان قاطع نیز شامل واژهٔ مہور است نه مہوز، واضحاً مہوز و مہور تصحیف مہو بمعنی سنگ قمر است چنانکه البیرونی در الجماہر ص ۱۸۲ آورده: المهو نهو حجر ابیض یعرف ببصاق القمر وبزاقة القمر الخ، فرہنگ نویسان فارسی در لفظ ومعنی تحریف نموده اند، خلاصه اینکه مهو یا مہوز اصلاً عربی است، نباید آنرا در ردیف واژہای فارسی آورد.

مجره: آسمان دره؛ مجره اصلاً عربی است، چنانکه در دستورالاخوان آمده: المجرة راه کاہکشان موید ۲: ۲۰۵ ذیل فصل عربی مجره بمعنی راه کاہکشان نوشته ومعین ۳: ۳۸۷۷ نیز مجره را درہمین معنی دانسته.

مراغه: غلتیدن خر واسب، وماه معروف که سیارهٔ فلک است؛ مراغه بمعنی غلتیدن عربی است، دستورالاخوان ص ۵۷۰ المراغه جای غلتیدن ستور. وہمین است قول صاحب فرہنگ جہانگیری ۱: ۱۱۴۷: بقول محمد معین این کلمه درباب تفعیل (تمریغ) وباب تفعّل (تمرّغ) می آید، ومراغه اسم مکان است یعنی محلّ غلتیدن. خلاصه اینکه مراغه عربی است نه فارسی.

مُرّی: داروئی که آبکامه گویند، برہان مُرّی درعربی باتشدید ثانی آبکامه را گویند وآن خورشی است مشہور خصوصاً درصفاہان، دستورالاخوان ص ۵۷۵ المُرّی آبکامه، نیز رک: منتہی الارب واقرب الموارد وغیره.

نفایه: درم سره؛ اما درین معنی این کلمه عربی است: برہان ۲۱۵۴ نفایه بمعنی تیره رنگ و درعربی سیم قلب نابره. فرہنگ معین ۳: ۴۷۶۷ (عربی نُفایة) ۱. ہرچیزی که بسبب فساد وپستی وبی قیمتی دور انداخته شود. ۲. نبہره، نابره، دکتر معین درحاشیهٔ برہان اضافه کرده: اما این کلمه (نفایه) عربی است، نفاة بالفتح چیز رانده و دور کرده، نفوة بالفتح ونفاء کسحاب ونفایة کسحابة وبالضم ونقاوة چیزی رانده و دور کرده.

اینست بعضی از کلمات که اصلاً عربی است و نباید آنها را در فصل که شامل واژه های فارسی خالص است شامل نمود.

۵. نویسندهٔ زرفان گویا کلمات مرکب را در بخش جداگانه آورده، و آن کلمات مرکب عبارت از واژه ها باشد که از دو چیز ترکیب یافته باشد مانند خرگاه، خرپشته، خرغول، خرزهره، خودخرده، خرجینه، خربواز، خارپشت، خیارچنبر، جوزبوا، ترانگبین، تومند وغیره؛ چنان بنظر می آید که نویسنده از ترکیب بعضی کلمات آشنا نبود و بهمین علت است که بعضی واژه ها که واضحاً از دو جز یا دو کلمه مرکب است مفرد شمرده شده و در بخش اول شامل است. مثلاً

سیکی: شراب مثلث، سیکی مرکب است از سه+یک، شراب ثلثان شده، باده ای که بسبب جوشش دو سوم آن بخار شده و یک سوم باقی مانده (معین ۲: ۱۹۸۰)؛ کشف الاسرار ۳: ۲۲۴ و مطبوخ که دو یک (سه یک) از آن بشود و سیکی (سه یک) بماند، خوردن آن مباح است. سه یک بفارسی یک ثلث مانند ده یک که یک دهم باشد.

ششخانج: گردک گلین گرد و گویند گردک گلین، بعضی بجیم پارسی؛ این کلمه از دو جز مرکب باشد، شش + خانج، خانج از خانه معرب است، ششخانه نیز واژه ای باشد بمعنی خیمهٔ مدور، و سراپرده (معین ۲: ۲۰۴۴)، در فرهنگ معین ششخنج آمده بمعنی گردگاه که بجهت قمار بازی درون آن را خالی کنند الخ، بنابرین باید این واژه را در بخش دوم همراه واژه های خرگوش، خرگاه، خودخرده و غیرآنها آورد، باید علاوه نمود که در زرفان ذکر شده که این کلمه بصورت ششخانچ نیز آمده، اما این درست نباشد بعلت اینکه ششخانج معرب شش خانه است، و در عربی جیم است نه چیم (چ)

کوش خبه: گوشت غوزک. گوش خبه باید با کاف فارسی (گوش خبه) نوشت زیرا که جزء اول گوش است نه کوش، بدین علت این واژه را مانند کهربا، کردگار، کفشیر، مرکب باید شمرد نه مفرد، واضح است درینجا بدرا ابراهیم نویسندهٔ زرفان گویا دوچار اشتباه دوگونه شده، اول اینکه کاف فارسی را کاف عربی قرار داده، دوم اینکه گوش خبه را همراه کلمهٔ مفرد آورده و حال آنکه کلمه از دو جز مرکب است.

دست گاه: مایه را گویند و قوت و قدرت؛ این واژه از دو جز ترکیب یافته دست + گاه، پس این را باید در بخش دوم ذیل واژه های مرکب مانند شبستان، شبگاه، زورگوی، خوالیگر آورد.

نهنبن: سرپوش چیزی؛ این واژه مخفف است از نهنبان، و نهنبان از دو کلمه ترکیب یافته نهن و بان نهن بمعنی نهان است، و این کلمه مشتق است از مصدر نهنبیدن بمعنی پنهان کردن، و از همین مصدر

است سنبیده (اسم مفعول) بمعنی پنهان ساخته بدین بیت شاهد:

برچشمه تحتی و مردی بروی   بمرده، بچادر سنبیده روی

پس این واژه را ذیل واژه های مرکب در بخش دوم باید آورد.

۶. زفان گویا یکی از آن فرهنگهای قدیمی است که درآن بسیاری از کلمات محرف راه یافته است.
بعضی از آنها ذیلاً آورده می شود:

سینا: سوراخ کننده و نام آن کوه که خدای عزّ وجلّ با مهتر موسی علیه السلام برآن کلام کرد. اکثر فرهنگ نویسان را دربارهٔ این واژه اشتباه رو داده است مانند حاجب خیرات صاحب دستور الافاضل، قوام بلخی صاحب بحر الفضایل، شیخ لاد صاحب موید الفضلا، محمد حسین تبریزی صاحب برهان قاطع وغیر آنها، مثلاً در دستور الافاضل ص ۱۶۱ آمده: سینا سوراخ کننده. بحر الفضایل: سینا سوراخ کننده و نام بو علی سینا،

اما واضحاً این اشتباه فاحشی است. دراصل کلمهٔ درست 'سنبا' ست اسم فاعل از مصدر سنبیدن بمعنی سوراخ کردن، محمد معین در حاشیهٔ برهان قاطع می نویسد:

سنبا صفت مشبه از سنبیدن، هویه سنبا یعنی کتف سوراخ کن و پارسیان شاپور را شاپور هویه سنبا خواندندی (مجمل التواریخ والقصص).

فیدافه[1]: (ذیل حرف فا) نام عورتی است. در اکثر فرهنگها این نام با فا آمده، مانند زفان گویا، مثلاً در ادات الفضلا است: فیدافه نام عورتی است که آمرهٔ ولایت سمت مغرب بود با سکندر محاربه کرد الخ، موید ۲: ۶۸: فیدافه نام زنی والیهٔ ولایت بردع.

دراصل نام این زن قیدافه با قاف بوده نه فیدافه با فا، چنانچه در شاهنامه[2] این نام مکرر با قاف درج است:

زنی بود در اندلس شهریار   خردمند با لشکری بیشمار

جهانجوی بخشنده قیدافه نام   ز روی بهم یافته نام و کام

چو قیدافه آن نامهٔ او بخواند   زگفتار او در شگفتی بماند

---

[1] این نام در زفان ذیل حرف ف نقل شده بنابرین دربارهٔ حرف اول هیچ شکی باقی نمی ماند.

[2] رک: شاهنامه چاپ مؤسسه خاور ج ۶ ص ۲۹، ۳۰، ۳۳، ۴۲ وغیر آنها

یکی پور قیدافه داماد او دران شهر قاقاز ازآن شاد بود

دکتر معین[1] نیز نام این زن قیدافه با قاف نوشته.

کلاژه: که بتازی آنرا لهات خوانند. این کلمه درهمین فرهنگ بمعنی عکه یعنی سبزک و با زای عربی غلبه و آن پرنده است، آمده. اما درقواس ص ۶۲ غلبه و کلاژه مترادف اند و خود در زفان غلبه بمعنی سبزک است که بعربی عکه گویند. ازین جهت واضح ست که عکه وغلبه وسبزک مترادف اند و بنابرین درمیان کلاژه و کلازه تفریق نمودن خطا است.

اما کلاژه بمعنی لهات دیده نشد، و معنی کلازه همانست که در زفان اولاً نوشته شده (رک: قواس ص ۶۲، موید ۲: ۱۳۰، جهانگیری ۲: ۱۶۴۰). دراصل کلاژه مصحف ملازه است که به معنی گوشت پاره ای شبیه بزبان کوچک آمده و لهات گوشتی است که بالای حنجره آویخته است، آنرا بگرگان لهات خوانند (ذخیرهٔ خوارزم شاهی)، در دستورالاخوان ص ۵۴۳ ملازه رامترادف لهات نوشته اند.

ورت: برهنه یعنی تهی از پوشش. موید ۲: ۲۴۷، برهان ۴: ۲۲۶۴ ورت برهنه؛ واژهٔ رت نیز بهمین معنی آمده است، رشیدی ج ۱ ص ۷۳۱ می نویسد:

رُت بالضم برهنه، عطار گوید: سرآن کاخها باخاک هموار ﴿ زمینی رت نه درمانده نه دیوار

درجهانگیری ۱: ۶۶۷ است: رت بالفتح برهنه وبا اوّل مضموم تهی دست بود الخ

واضحاً واژهٔ صحیح رت است و واو که واوعطف بوده جزو واژه شده، رشیدی همین طور قیاس کرده. رک: ج ۲ ص ۱۶۵۴، نیز رک: فرس اسدی ص ۳۶ وصحاح ص ۴۵ که لفظ 'رت' دارند نه 'ورت'

وازنیج: معروف آنکه دختر گان ریسمان آویزند و دران بازی کنند الخ

اگرچه درجهانگیری و رشیدی و برهان وغیرآنها وازنیج و بازنیج هردو بهمین معنی آمده، اما این واژه — وازنیج، وازنیج، وازنیج، بازنیج — ظاهراً تصحیف وازبیچ = بازبیچ = بادبیچ است، درصحاح ص ۵۱ بادبیچ بمعنی وازنیج آمده است. نیز رک: هدایة المتعلمین فی الطب فص ۲۸، حاشیهٔ برهان ص ۲۲۴۸، جهانگیری ص ۲۰۶ حاشیه ۱.

---

[1] فرهنگ معین ج ۶ ص ۱۴۸۳

وبردک: لغز.

درمؤید ۲: ۲۵۳ بحوالهٔ زفان گویا "وبردک" بمعنی لغز درج ست. درهمین زفان بردک نیز بهمین معنی آمده، بردک افسانه ولغز که جنسی از معما ... و درفرهنگ نامه است نردک بنون لغز وافسانه. ظاهراً منظور از فرهنگ نامه، فرهنگ قواس می باشد، قواس چاپی ص ۱۸۸ نردک ذیل بمعنی لغز وچیستان. درهرحال بردک اصل است، وبردک مصحف که باضافهٔ واو عاطفه ترکیب یافته است.

وشرک: جامه وارو وبعضی بفتح راگویند.

اگرچه بهمین شکل وبهمین معنی این واژه درمؤید ۲: ۲۵۳، جهانگیری ۲: ۱۴۱۲ وبرهان ص ۲۲۸۵ آمده است وبعلاوهٔ آن دربعضی فرهنگ ها بشکلهای ورشک: ورشتک، وشترک دیده می شود (رک: برهان ص ۲۲۸۳ ح) اما اصل واژه شرک است چنانکه خود در زفان گویا (ذیل حرف شین) وقواس ص ۱۵۷، مدار ۲: ۵۵۸، جهانگیری ۱: ۱۰۴۲ وجود دارد. بنابرین واضح است که وشرک، باضافهٔ واو عاطفه ترکیب یافته.

وگال: انگشت مرده که آهنگران درکوزه اندازند.

درمؤید ۲: ۲۵۴، جهانگیری ۲: ۱۵۷۸، رشیدی ۲: ۱۴۶۵ این واژه بهمین صورت وبهمین معنی آمده است، اما چنانکه صاحب رشیدی حدس زده این کلمه تصحیف زگال است. باید علاوه نمود که در فرهنگ معین زغال، زگال، زکال، ژگال، شگال، شکال بهمین معنی است، اما وگال نیامده.

وخشینه: مرغی است سپید، وقت بهار در باغها نشیند.

این کلمه بهمین شکل درمؤید ۲: ۲۵۷، جهانگیری، برهان قاطع آمده است، اما واضحاً این مصحف واژهٔ خشینه است، واو عطف را جزو کلمه دانسته اند، وظاهراً این اشتباه نتیجهٔ غلط خوانی مندرجات زیر از فرهنگ قواس است:

تزمرغکی بود کوچک وخشینه یعنی سپید، وقت بهار درباغها نشیند، وصاحب فرهنگ رشیدی بدین امر متوجه شده می نویسد:

خشین وخشینه وخش سفید وکوه خشین یعنی سفید از برف. وخشینه ظاهراً واو عطف را اصل کلمه پنداشته. اما نویسندهٔ فرهنگ جهانگیری وخشینه را بدو معنی آورده یعنی نام جانور وچیز سفید؛ وخشین وخشینه بمعنی رنگ سیاه و برای این معنی اخیر از بیت کسائی شاهد آورده:

کوهسار خشینه را به بهار / که فرستد لباس روح العین

صحاح این واژه را بدینطور شرح نموده:

خشینه مرغابی سیاه و رنگش میان سیاه و کبود باشد.

اما شعر کسائی این معنی را تایید نمی کند، و شاید از همین جهت است که صاحب فرهنگ نظام خشینه را فقط رنگی درمیان کبود و سیاه دانسته، نه مرغابی و خود در زفان خشینه بمعنی سپید ضد سیاه و سفید رنگ ناکرده آمده، و موید ا: ۲۷۹ همین معنی را مورد تایید قرار می دهد. از تفصیلات بالا برمی آید که وخشینه مصحف خشینه است. برای آگاهی بیشتر رجوع شوید به مقالهٔ بنده در مجلهٔ علوم اسلامیه، علیگر، دسامبر ۱۹۶۷ میلادی.

شنگل ومنگل: دزد و رهزن

اگرچه درصحاح ص ۲۱۱ منگل بمعنی دزد و رهزن، و در ص ۲۰۸ شنگل بهمین معنی آمده، اما شنگل درهیچ فرهنگ دیگر دیده نشد، بنابرین این را باید تصحیف شنگل یا منگل دانست. این هم ممکن است که از این هردو یکی مصحف باشد.

۷ - بعضی تشریحات درین فرهنگ اگرچه مورد تایید اکثر فرهنگ نویسان قرار می گیرد، اما این خالی از اشتباه نیست، مثلاً

سگزی: نام کوه رستم دستان است، ساکنان ایشان را سگزیان گفتندی.

ادات: سگزی نام کوه رستم دستان که ساکنان آن کوه را سگزیان خوانند، جهانگیری ۲: ۱۵۶۹: سگز نام کوهی است از ولایت زابلستان میان کیچ و مکران، و دریای سند از پهلوی آن گذرد، گویند تولد رستم در آنجا واقع شده لهذا رستم را سگزی گویند.

سگزی یا سگز نام کوه دانستن اشتباه فاحشی است، در اصل سگزی منسوب به سیستان، و این سیستان که نام قدیم آن سگزستان بود سکونت قوم سکه بود. این نام در تورات و کتیبه های آشوری سغز بود و همین سغزستان تدریجاً بنام سگزستان، سگستان، سکستان مشهور شده، و همین سیستان کنونی است، سجستان معرب است، و همچنین سجزی معرب سگزی باشد در چهار مقاله[۱] آمده:

فرخی از سیستان بود پسر جولوغ ... شعر فرخی را شعری دید تر و عذب خوش و استادانه، فرخی را

---

[۱] مقالهٔ دوم حکایت چهارم

سگزی دید بی اندام، جبهٔ پیش و پس چاک پوشیده دستاری بزرگ سگزی وار در سر؛ نیز رک: تاریخ سیستان ص ۱۳، ۱۹۸، ۲۱۲، ۲۴۰ وغیر آنها که درین کتاب هر دو نسبت سگزی و سجزی آمده است، نیز رک: فرهنگ معین ج ۵ ص ۷۷۵.

شوشستر: موضعی است در ترکستان، ششتر نیز گویند و ششتری جامه ایست که آنجا بافند.

درین اقوال قول اول اشتباه فاحشی است، در اصل شوشتر که بنام ششتر و شوش نیز شهرت دارد در استان خوزستان است در جنوب ایران، و این شهر به ترکستان هیچ مناسبت ندارد، و از غایت شهرت احتیاج به هیچگونه شرح و توضیحی نیست.

شاپور: نام پادشاهی شهر جامع مصر.

در اصل شاپور نام سه شاه از شاهان خانوادهٔ ساسانی بود، شاپور اول از سال ۲۴۲ تا ۲۷۳ میلادی، شاپور دوم از سال ۳۰۹ تا ۳۷۹ میلادی و شاپور سوم از سال ۳۸۳ تا ۳۸۹ میلادی حکمرانی نمودند.

۸. بعضی نامهای اشخاص و امکنه که اکثر هیچ شهرت ندارند، درین فرهنگ داخل شده اند

زواغار: نام مغی است، همین است قول فرهنگ نویسان دیگر مانند ادات و موید الفضلا ۱: ۴۵۶، اما در جهانگیری بجای مغی مرغی است، ممکن است درست همین باشد.

سنجه: وزن ... و نام شخصی، همین است قول صاحب ادات، اما در جهانگیری ۲: ۱۸۴۳ اسنجه دیو مازندرانی است.

ساسو: نام مردی، همین اطلاع ناکافی در موید ۱: ۵۰۶، مدار ۲: ۴۱۳ یافته می شود.

شندوس: نام مردی، همین است قول صاحب مدار الافاضل ۲: ۵۸۴، ظاهراً سندوش غلط و درست سیدوش است که یکی از نامهای مذکور در شاهنامه است. اگر این حدس صحیح باشد، این نام معروف است و شمول آن درین فرهنگ بیجا نیست.

شوتن: نام مردی، همین است در ادات، موید ۱: ۵۴۲، مدار ۲: ۵۸۸ و این توضیح ناکافی است.

شیم: نام رودی است، صاحب ادات نیز همین اطلاع داده، اما معلوم نیست که این رود کجاست

یرنان: شهر سمرقند را گویند، موید ۲: ۲۸۵، جهانگیری ۱: ۱۱۸۶، برهان ص ۲۴۳۱ دارای همین اطلاع می باشند اما شهری بدین نام در کتابها دیده نشده.

۹. در زفان گویا مصادر فارسی مخصوصاً در بخش چهارم آمده، بنابرین آوردن افعال صیغه ها

مختلف و نیز بعضی مصادر بار دیگر اساسی ندارد، اینست بعضی مثالها:

شکوخید	ماضی مطلق	از	شکوخیدن
شکرد	ماضی مطلق	از	شکردن
شکرد	مضارع	از	شکردن
شکر	امر واحد حاضر	از	شکردن
انگار	امر واحد حاضر	از	انگاشتن
شمید	ماضی مطلق	از	شمیدن
شخولیده	اسم مفعول	از	شخولیدن
شکوخیده	اسم مفعول	از	شکوخیدن
شمیده	اسم مفعول	از	شمیدن
شخوده	اسم مفعول	از	شخودن
نورد	امر واحد حاضر	از	نوردیدن
نهارید	ماضی مطلق	از	نهاریدن
نشاخت	ماضی مطلق	از	نشاختن
کاخد	مضارع	از	کاخیدن

تکرار مصادر گزردن، خستن، خنیدن و غیرآنها نیز دیده می شود.

۱۰- بعضی واژه ها بصورت جمع درج شده وحال آنکه این بدستور زبان تعلق دارد نه بفرهنگ، مانند فرهنگیان، گوان، لنغان.

۱۱- یکی از نقایص ترتیب کتاب اینست که بعضی واژه ها که دارای دو یا بیشتر معنی دارند جدا جدا درج شده مانند لُر، لک، شغش، شرک، کراز، کریز، کبد و غیرآنها، اما صدها واژه های دیگر که دارای معنی زیاد باشد فقط یکبار آمده و همه معنی ها تحت همین واژه درج شده.

۱۲- یکی از نقایص کتاب اینست که در توضیح و شرح واژه ها اکثر بیان مولف غیرمضبوط و غیرواضح است، مثلاً

زر: پیرکهن ضد برنا، ازین جاست که زال سام را زال زر گویند از بهر موی سپید و ذهب.

درین بیان "از بهر موی سپید" بیجاست، زر را باید اینطور شرح داد:

زر : دومعنی دارد ۱. ذهب ۲. پیرکس که مویش سپید شده باشد، زال سام را زال زر بدین جهت گفتند که او بسیار پیر گشته و مویش سپید شده.

ژاژ : هر سبزه که باشد بی مزه و سخن بیهوده را گویند و رستنی جاوشیش خود روی. صحاح ص ۱۳۷ : ژاژ دومعنی دارد، اوّل گیاهی باشد تلخ که ترهٔ دوغ ازوی سازند، دوم سخن هزیان و یافه بود، شرح صحاح مضبوط و روشن است و هیچ نقصی غیراین ندارد که باید معنی دوم را معنی اوّل قرار داد، اما طرز زفان روشن نیست، و واژهٔ ژاژ را باید بطور شرح باید داد:

ژاژ سخن بیهوده را گویند، و سبزهٔ بی مزه و رستنی جاوشیش خود روی.

سونش ، آهن ریزه و جز آن ، براده هم آنرا گویند.

این را باید اینطور نوشت:

آهن ریزه و جز آن، و هم آنرا براده گویند.

شال : گلیمی خرد و فخر قواس گوید : شال نمدی که زیر برگستوان بکنند یعنی جل نمد که در زیر برگستوان کنند.

در فرهنگ قواس چاپی این واژه شامل نیست، نیز در شرح فوق عبارت یعنی ... کنند هیچ فایده ای ندارد.

سبک و زبان این فرهنگ :

زفان گویا شامل مقدمهٔ مختصری است به نثر، و از روی آن مختصات زبان و دستور فرهنگ ذیلاً درج می شود :

۱. در پیروی فرهنگ قواس زبان فارسی سره بکار برده و از کلمات عربی کاملاً اجتناب نموده، و این موضوع قبلاً مورد بحث قرار یافته.

۲. مولف اکثر سجع را بکار برده، مثلاً نگاه کنید عبارت ذیل:

سپاس هزار افزون از شمار و ستایش بی اندازه و بسیار برون از گردش روزگار.

نیاز بیبین و آفرین پدید آرندهٔ جان و گشایندهٔ دل و روان را که زفانهای همه نیک زفان

بانهاد بی پایان نامش گویان و دلهای همه آفریدگان نشانش جویان

در عبارت اول در واژه های هزار و شمار و بسیار و روزگار سجع است و در عبارت دوم چند تا سجع بکار برده شد:

۱. بیبین ـــ آفرین	۳. گویان ـــ جویان
۲. جان ـــ روان	۴. نیک زفان ـــ بی پایان

۳. محاورات بیشتری بکار برده، مانند:

توسن باختن	چنانکه بایست توسن نباخته
روز بشب آوردن	پندپذیران روز بشب آوردند
به سود پیوستن	لیکن به سودی پیوست
برآرزو گماشتن	پس گوش و هوش برآن آرزو بگماشته
در استوه برخود بستن	در استوه برخود بست
برآن کشیدن	و منش برآن کشید
برچیزی دل داشتن	دل برآن کام و بست داشتم
رسن گرفتن	رسن می گرفتند که برای آسانی مردمان فرهنگنامه بپردازید

۴. اینست فهرست واژه ها و فقره های فارسی سره:

نیاز (حمد)	برگزین (برگزیده)	پس و پیش
آفرین (حمد)	ترکتازگنگ زبان	بستگی
زفان	پرده کن جهانیان	نام گردان
نهاد	سخن کیش	بربسته
نام گویان	فرغیس	بربست
نشان جویان	نهاد دل	جسته (مطلب)
گونه گونه	شب گیتی	هوش و گوش
فره دین	بخشش ریز	بربستها (جمع)
خواست (آرزو)	چیستی	همدل و همراز
ترزفان شناس	چگونگی	همنشین
نجستگی (دل بستگی)	دل پر بیم	هم پرواز
ستود (نعت)	آهوگیر (عیب جو)	بستوه
مهین و بهین	آهو (عیب)	استوه
پیشین سروران	دز براز	هنجار
پسین پیغمبران	بی زیری و زبری	خستو و غیر آنها

۵ ـ بعضی امور دستوری بدین قرار است :

ا ـ حذف را در حالت مفعول صریح

ب ـ صفت مقدم بر موصوف

ج ـ استعمال ضمائر شخص او ، وی برای غیر ذوی العقول

د ـ فعل واحد برای فاعل جمع غیر ذوی العقول

ه ـ استعمال ماضی تمنائی برای ماضی استمرار وغیر آنها

مخطوطات زفان گویا

ازین فرهنگ دو نسخهٔ خطی کشوف شده ، یکی در کتاب خانهٔ خدابخش بانکی پور پتنه ، دیگری در تاشقند که فقط شامل جزء اخیر این فرهنگ می باشد :

نسخهٔ بانکی پور شامل ۱۷۲ ورق است ، از آنجمله سه برگ ۱۶۹ تا ۱۷۱ از کتاب دیگری است ، هر صفحه ۱۷ سطر دارد ، خط نسخ جلی روشن و خوانا ، عناوین با جوهر سرخ ، روی واژه ها که شرح شده خط ریز کشیده اند ، نسخه خوب است اما بعضی جا کرم خورده ، بخش و گونه عنوان دارد ، اما بهره ها عنوان ندارد ، اما چون بهره ها باعتبار الف بآ آمده فقط صورت حرف عنوان بهره را تشکیل می دهد ، کاتب معلوم نیست اما تاریخ کتابت ۹۵۰ هجری است چنانکه از عبارت خاتمه ظاهر می شود :

تمت الکتاب فی یوم الثلثا وقت ظهر الثالث من ذی القعده سنه خمسین تسعمائه (۹۵۰)

تاریخ در لفظ و نیز در هندسه مندرج است . نسخهٔ هذا در ملک شخصی بنام اسماعیل عثمان خطیب مسجد جامع مخدوم شیخ نصیر جمال الدین صدیقی ، واین نام در ابتدا و آخر کتاب دوبار آمده است . خصوصیات املائی نسخه بر قرار زیر است :

۱ ـ التزام ج ـ چ ـ ز ـ ژ ـ ک ـ گ ـ ب ـ پ در سراسر نسخه شده است .

۲ ـ آنچ ، آنک ، بدانچ بحذف های مختفی آمده است .

۳ ـ کلمهٔ چنانچه بحذف الف و های مختفی آمده ؛ مانند چننچ (= چنانچه)

۴ ـ چه ، که با های مختفی نوشته شده

۵ ـ در صورت جمع بستن کلمات مختوم به های مختفی ، بحذف ها آمده ؛ مانند گونها (= گونه ها)

۶ ـ حذف همزهٔ اضافت در کلمه مختوم به های مختفی اکثر بعمل آمده ؛ مثلاً بجای 'جرمهٔ اسب' جرمه اسب ، همچنین در کلمه مختوم به الف یای اضافت حذف شده ؛ مانند بجای 'زای عربی' زاعربی .

۷ ـ یای اضافت پیوست به کلمه نوشته اند مانند باهستگی (= به آهستگی)

۸ ـ حرف نفی 'بی' گاهی پیوست باسم وگاهی جدا نوشته اند، مانند بی غایده، بی باک، بی شوی'
ونیز بیهوشی، همچنین 'می' گاهی جدا از فعل وگاهی پیوست نوشته شده مانند می ماند، میماند'
نمی کند، نمیکند. اما یای زینت بافعل پیوست آمده است.

درین نسخه درحاشیه عبارات اضافی گاهی بخط کاتب نسخهٔ اصل وگاهی بخط بعد دیده می شود، بعضی اضافه ها از روی موید الفضلا شده.

نسخهٔ تاشقند

اوراق ۵۴، هر صفحه دارای ۱۸ سطر، خط نستعلیق، خاتمهٔ کتاب اینست:

"کتاب فرهنگنامهٔ زفان گویا وجهان پویا، بیست ویکم ماه جمادی الثانی سنه ۱۰۴۳
بخط بندهٔ حقیر بی بضاعت عرب نسفی"

ممکن است تاریخ کتابت ۱۰۴۳ هجری باشد، آقای بایفسکی ۱۱۲۳ می نویسد.

نسخه افتادگی های زیاد دارد، ازابتدا تا واژه های حرف 'خ' کاملاً ندارد، از لفظ دارات ذیل حرف دال نسخه شروع می شود، و از 'دغل' افتادگی شروع می شود بدین تفصیل:

۱ـ ا تا خ کاملاً افتادگی دارد
۲ـ دال تا جزوی ازان افتادگی دارد
۳ـ دارات تا دغل موجود است
۴ـ رنگ تا سرپاس موجود است
۵ـ شکر تا آخر نسخه موجود است
۶ـ نهایت فرهنگنامه افتادگی دارد
۷ـ کنایات در دو صفحهٔ آخر که در نسخهٔ بانکی پور افتادگی دارد.

این نسخه در کتابخانهٔ دانشگاه تاشقند، ازبکستان ذیل شماره B09/292 موجود است. نسخه اشتباهات خیلی زیاد دارد و در بعضی جاها غلطهای فاحش دارد، مثلاً هلیو بمعنی سبد، بازو بمعنی فرو مانده وحیران در نسخهٔ تاشقند بدینصورت آمده:

هیلو: سبلهازو، گویا بجای سبد سبل، و بازو که واژهٔ دیگر است آن را جزء معنی هلیو قرار داده، ناگفته نماند که در موید ج ۲ ص ۲۷۳ هلیو بمعنی سبلات، اما در جهانگیری ۲: ۱۶۷۵، برهان ۲۳۶۱،

رشیدی ص ۱۴۹۸ الیلو بمعنی سپید است،

یغما بمعنی غارت و نام شهری، درنسخهٔ تاشقند بمعنی عمارت آمده؛

یاور بمعنی یاری گر و پشتیوان، درنسخهٔ فوق بشکل یلور درج است.

نشتاک بمعنی پیچاک چشم، درنسخهٔ فوق نشتاک بمعنی پیخال چشم درج شده،

خلاصه اینکه نسخهٔ تاشقند یکی از بدترین نسخه های (فرهنگ) فارسی می باشد.

روش تصحیح متن زفان گویا

نسخه های زفان گویا مانند بسیاری از نسخه های آثار ادبی و تاریخی دستخوش تحولات روزگار گشته و ازبین رفته، خوشبختانه دو نسخه ازین کتاب باقی مانده، یکی مقابلهٔ کامل و دیگری ناقص و ناکامل و از طرف کاتب خیلی مغلوط استنساخ یافته، و از روی همین دو نسخه متن حاضر ترتیب یافته امّا در ترتیب و تصحیح متن از فرهنگهای فارسی مانند لغت فرس، فرهنگ قواس، صحاح الفرس، دستورالافاضل، ادات الفضلا، شرفنامه، موید الفضلا، فرهنگ جهانگیری، فرهنگ رشیدی وغیر آنها استفاده نموده شد و درین کار موارد ذیل درنظر گرفته شده است:

۱. اگر در عبارت کلمه ای افتاده است، آن از روی فرهنگها افزوده و بین قلابین [ ] گذاشته شده، مثلاً سیام کوهی است، یا ذیل سمندر [سلامت]

۲. اگر واژه ای صراحةً غلط است آن را از روی فرهنگها تصحیح نموده شد، مثلاً ذیل سح، بجای اکراه گذارده. یا ذیل چلیپا بجای طیب صلیب.

۳. مطالبی که درین فرهنگ بگفتهٔ فرهنگ دیگر نقل شده. از مندرجات فرهنگ ها مقایسه و مقابله شده.

۴. موید الفضلا در حدود صدجا ازین فرهنگ نام برده، همهٔ مندرجات موید را در تصحیح و انتقاد متن زفان بکار برده ام.

۵. از کتب تصوف مانند مقامات ژنده پیل و کتب طب مانند هدایة المتعلمین فی الطب و کتب جغرافی مانند حدود العالم نیز استفاده شده است.

۶. مترادف واژه های عربی از روی فرهنگهای عربی تصحیح شده، ببینید: جرموق

۷. بعضی واژه های غلط که خود نتیجهٔ اشتباه مولف کتاب است درمتن بهمان طور گذاشته شده است و درحاشیه اشاره به الفاظ درست کرده شد. رک: چرویده، چرغله، چغزنده، کیشک، ملاژه.

۸۔ واژه هائیکه نتوانسته‌ام درست بکنم، همانطور در متن گذارده شده، رک: جاگی
۹۔ واژه هاکه بعلت کرم خوردگی ناخوانا مانده از روی فرهنگ تصحیح شده: رک: جزدره، خوار
۱۰۔ واژه های ناخوانا قیاساً درست کرده شد، رک: خشاده
۱۱۔ نسخهٔ تاشقند اشتباهات زیاد دارد و بنابرین همهٔ اختلافات بی معنی را در حاشیه درج نکرده‌ام.
۱۲۔ در نسخهٔ تاشقند عنوان هر بهره در یک عبارت آمده، از آن صرف نظر شده، فقط حرف عنوان بهره قرار داده شده.
۱۳۔ بعضی واژه هاکه در نسخهٔ تاشقند زیاد است آنرا داخل متن کرده‌ام، مثلاً دستور
۱۴۔ عبارات که در حاشیه افزوده آنرا در قوسین گذاشته‌ام؛ مثلاً [درنگ]
۱۵۔ تصحیح واژه های هندی از منابع دیگر شده، و چندی قبل یک مقالهٔ تحقیقی در مجلهٔ اردو ۱۹۶ کراچی شامل همه واژهٔ هندی چاپ نموده‌ام.
۱۶۔ در شرح بعضی واژه ها کلمهٔ 'معروف' بدون اضافهٔ 'است' درج ست، بنده 'است' را افزوده‌ام تا معلوم شود که معروف معنی نیست،

در آخر وظیفهٔ خود می دانم که اقرار کنم که متن حاضر بدون شک از سهو و خطا خالی نیست، بنا براین از خوانندگان محترم استدعا می کنم که هنگام برخورد خطاها بنده را مطلع فرمایند تا از نظرات شان استفاده شود.

در پایان لازم میدانم مراتب امتنان خود را حضور آقای دکتر عابد رضا بیدار، رئیس کتابخانهٔ شرقی خدابخش، بانکی پور پتنه که بنده را برای ترتیب و تصحیح کتاب تشویق نمودند و وسایل برای چاپ و نشر این کتاب فراهم آوردند اظهار دارم. آقای دکتر سید طارق حسن، استادیار قسمت فارسی، دانشگاه اسلامی را که نسخهٔ زفان گویا را برای بنده رونویسی نمودند و در حروف چینی و فهرست سازی کمک نمودند، سپاس گزاری نمایم، همچنین از همسر خود خانم آصفه احمد که برای تهیه و ترتیب کتاب فهرستی پیدا کردند متشکر و سپاسگزارم: از آقای پروفیسر شمیم احمد انصاری که بدقت و احتیاط تمام این نسخه را کتابت نمودند تشکرات صمیمی خود را ابراز نمایم، در آخر از کارکنان چاپخانه که در چاپ کتاب حاضر سعی و اهتمام وافر بکار بردند، تشکرات خود را اظهار می دارم،

پروفسور نذیر احمد
دانشگاه اسلامی علیگره۔ هند

967 — Riva Ridge Dr.
Norcross, Georgia
30093
Atlanta, U.S.A.

۳۱ دسامبر ۱۹۸۵

(ورق ا ب)

فرهنگ[1] زفان گویان
و
جهان پویان

فهرست فرهنگنامه

بدر ابراهیم

مرتب شده بدین ترتیب:

هفت بخش
و در هر بخش چند گونه دارد
و در هر گونه چند بهره بیست ـ معنی ـ
آغز

بحرف تهجی بیایند

بخش نخست (ورق ۴)
درسخنان پهلوی و دری که جداگانه است و پیوند با سخنی دیگر ندارد و آن برنهاد حرفهای عجمی بیست و سه گونه است
گونهٔ نخست درسخنانی که آغاز آن الف است بر بیست و دو بهره، بهرهٔ نخست درسخنان که پایان آن الف است چنانچه آسا مانند

بخش دوم (ورق ۱۰۹)
درسخنان پهلوی و دری که از دو سخن پیوند یافته است و از پیوستن هر دو رازی انجامد بر بیست و یک گونه است،
گونهٔ اول الف چنانچه ادستا

بخش سوم (ورق ۱۲۶)
درسخنان پهلوی و دری که ازان کردارها بیرون آید یعنی مصادر، گونهٔ آن

بخش چهارم (ورق ۱۳۴)
درسخنان تازی یعنی عربی، گونه ۱۱

بخش پنجم (ورق ۱۴۳)
درسخنان آمیخته از تازی و ترکی و عجمی، گونه اول ا

بخش ششم (ورق ۱۴۸)
درلغات رومی و یونانی

بخش هفتم (ورق ۱۶۵)
درلغات ترکی

نهایت فرهنگ نامه بر لغات متفرقه
(ورق ۱۶۷)
ش

---

[1] درخط بعد است.

(۲ ب)

بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم
رب یسّر و تمم بالخیر

مقدمهٔ کتاب

سپاس[1] هزار افزون[2] از شمار و ستایش بی اندازه و بسیار برون از گردش روزگار و نیاز[3] بهین و آفرین[4] پدید آرندهٔ[5] جان و گشایندهٔ دل و [روان[6]] را که [زفانهای] همهٔ نیک زفان[7] با نهاد بی[8] پایان نامش گویان و دلهای همهٔ آفریدگان، نشانش جویان، سخن و آواز گونه گونه و فره[9] دین هر نمونه از توانائی او پیدا و بخواست او هویدا[10]، تا زفان سخن گوی را از سخن او آراستگی و تر زفان شناس را با سخن او دلبستگی و خجستگی، بر زفان مردمان از نام فرخندهٔ او شگفتگی، در سخن[11] روان و سخن در نهاد جان[12] افگندهٔ اوست.

---

[1] این دیباچه تحت تأثیر فرهنگ قواس نوشته شده بنابرین بعضی کلمات و فقرات در هر دو مشترک است.
[2] قواس: بیرون از اندازه و افزون از شمار
[3] قواس: سپاس و ستایش و نیاز و نیایش
[4] قواس: درود و آفرین ستوده
[5] قواس: پدید آرندهٔ گیتی
[6] در مجلهٔ فکر و نظر، ژوئیه ۱۹۶۲ میلادی، این مقدمه بتوسط پروفیسر سید حسن و در کتاب فرهنگ زفان گویا و جهان پویا، ماسکو ۱۹۶۴ میلادی، بتوسط آقای س. ا. بایفسکی کاملاً چاپ شده، امّا هر دو از اشتباه خالی نیست، فکر و نظر و زفان: دل با شاد
[7] فکر و نظر و زفان: نیک زفانان
[8] یک کلمه ناخوانا
[9] کذا است در اصل اما فکر و نظر و زفان ندارد.
[10] فکر و نظر: هویداست.
[11] یک کلمه ناخوانا
[12] کذا است در اصل اما در فکر و نظر و زفان «جان» ندارد.

و درود برترین[1] وستود بهترین برمهین پیام آورآن[2] و بهین مهتران و پیشین سروران، پسین پیغامبران، برگزیترین[3] آفریدگار و برکشیدۀ کردگار[4] که بغز و فرهنگ یکتاست و در سخنوری و زیب[5] و مهتری ناهمتاست، تازی زبان، ترکتاز گنگ نے بانان، [۱۲] گویای جهان، برده کن جهانبانان، جهاندار سخن کیش و جهانگیر بغز و فرعیش[6]، فراوان از نهاد[7] دل و روان، و بر یاران[8] و یاوران و بسیار[9]... او، از آغاز روز آفرینش تا پایان روز رستخیز و از نخستین شب گیتی تا شب بخش ریز[10] پیاپی[11] و دمادم رسان باد.

آغاز فرهنگ نامه در چیستی[12] بربستن و چگونگی آراستن:

پس از ستایش خدای بی نیاز وستود محمد کیش نواز چنین گوید بندۀ خوارترین چون خاک زمین دل پر بیم[13] بدر ابراهیم ایزد در کار و گفتار اورا یار و از آهو[14] گیران و دژ براز[15] آن نگاهدار باد که فرهنگ نامه بزبان پهلوی و دری و پارس و جز آن، پراکنده و هرباکی با آهوی آگنده بود از بی زیری و زبری زیر و زبر و در پس و پیش[16] بیشتر، نه کنی[17] دامنش گشتنی می کشید و نه چندان[18] بربستگی می رسید از آنک

---

[1] قواس: درود و آفرین ستوده و برترین

[2] کذاست در قواس [3] کذاست در قواس

[4] فکر و نظر و زفان: برگزیده؛ قواس: بهین و مهین کردگار

[5] فکر و نظر و زفان: زیب ندار

[6] فکر و نظر و زفان: فرعیش؛ اما فرغیش بمعنی کهنه و فرسوده، رک: فرهنگ معین ۲: ۲۵۲۱

[7] فکر و نظر و زفان: نهاد، ندارد

[8] فکر و نظر و زفان: 'و' ندارد [9] یک واژه ناخوانا

[10] اصلاً بخش زیر، تصحیح متن برقیاس رستخیز در جملۀ قبل

[11] قواس: پی درپی و دم در دم [12] چیستی بمعنی ماهیت (فرهنگ معین ۱: ۱۳۲۷)

[13] فکر و نظر و زفان: بربستم

[14] فکر و نظر و زفان: آهو، قواس: از کاستۀ آهوگیران و ناراشی دژ برازان یار و نگاه دارش باد؛ آهوگیر بمعنی عیب جو جهانگیری (۱: ۸۷۰)، آهو بمعنی عیب و نقص، بیماری و مرض، بد و ناپسند (فرهنگ معین ۱: ۱۰۹)

[15] دژ براز بمعنی زشت خو، عیب جواست (فرهنگ معین ۱: ۱۵۲۳)

[16] فکر و نظر و زفان: و پستی

[17] کذاست در اصل

[18] کذاست در اصل

زفانها همه یکسان و نام گردان بی هیچ نشان بوده، سخن[1] افسر از پارسی و تازی (۲ ب) آمیخته و جداگانه در کالبد برشته[2] و ریخته و در پیوند و بربست[3] چنانک بایست توسن نباخته چنانچ شایست نساخته تا گروهی از جوا[4]ب و سخن سرایان و دبیران و ...[5] و پندپذیران[6] پیشینان و پسینان روز بشب می آرند و شب را چون روز می گذرانند و دران[7] همه سخنان بسیار می خوانند و ترزفان[8] آن نمی دانند و بفرهنگنامه ها می بینند و در برون آوردن آن در می نشینند ولیکن بسود نمی پیوست و جوینده بجسته[9] نمی رسید، و نیز گروهی را خرد بدان رسید و منش بران کشید که آنرا خوانند و هر سخنی را چنانچ اوست بدانند، پس[10] هوش و گوش برآن آرزو بگماشته دل بران کام و بست داشتند و بسوی یکدیگر میدیدند و بربستهای آن می پرسیدند، کسی آن[11] در باز نمی گشاد و داد سخنها بسزا نمی داد، برخی[12] از دوستان همدل و همراز[13] و همنشین و غم پرداز بودند و این غمگین را در پیکار گمان می بردند و خستو[14] می کردند و بدانچ[15] می رسیدند می پرسیدند، چون پاسخ می یافتند

---

۱ گذاشت در اصل

۲ فکر و نظر و زفان: برشته

۳ بست بمعنی ضبط و ربط (فرهنگ معین ۱: ۵۲۸)

۴ گذاشت در اصل ۵ یک کلمه ناخوانا

۶ فکر و نظر و زفان: بند بدیران ۷ فکر و نظر و زفان: درهمه

۸ ترزفان بمعنی ترجمان، ترجمه، گزارش. رک: قواس (تصحیح پروفسر نذیر احمد، چاپ تهران) ص ۲ ستون ۲ سطر ۲

۹ جسته بمعنی تفتیش شده (فرهنگ معین ۲: ۱۲۲۹)

۱۰ قواس: و هوش و گوش برآن گماشتند تا آنچه از پوشیده های آن در دل داشتند بپرسند، هم بسوی یکدیگر می دیدند و بربستهای آن از یکدیگر پرسیدند، اما کسی آن در باز نمی گشاد و داد آن سخنها بسزا نمی داد.

۱۱ فکر و نظر و زفان: از

۱۲ فکر و نظر و زفان: جوخی

۱۳ فکر و نظر: هم آز، زفان: هم ازو، قواس: یاران همدل و هم منش بی هیچ پیغاره و سرزنش (ص ۱-۲)، با بزرگان همنشین و همراز و نامه خوان و غم پرداز (ص ۲ ستون ۲ سطر ۳-۴)

۱۴ خستو بمعنی معترف و مقر (فرهنگ معین ج ۲ ص ۱۴۱۹)

۱۵ قواس: آنچ برسد پاسخ آن بازگوید.

رسن می گرفتند که برای آسانی (ورق ۱۴) مردمان فرهنگنامه بپردازید و برهنجار که سودمند گردد بسازید چنانک از هر زفانی بهری [بود] و سخنان هر زفانی را جداگانه تر زفانی بود و اندیشه بر درستی هر سخنی بگمارید، و بخشها و گونه‌ها پیدا آرید تا جهانیان ازین بهره برند و خوش منشان که زیرک تراند و برهم نشینان بزرگان و همرازان زیردستان، چون پاسخ ناچار و انبوهی بسیار شده و خواهش بسی افزوده درخواست ایشان را پذیرفتم و خامه برگرفتم و در استوه را برخود بستم[1] و سخن‌ها را در سخن پیوستم و منش بران داشتم و آز بدان گماشتم که فرهنگنامه‌ها با هم و سخنان پراگنده‌ها فراهم کنم و هرچه در زبان تازی و پارسی و پهلوی و دری و یونانی و ترکی و جز آن بود همه را فرونگریستم[2] و یگان یگان در خانهٔ نگار آوردم[3] و بدانچ رسید[م] و توانستم و شنیدم و دیدم درست گردانیدم و تر زفانی جداگانه بیاراستم و آزرا بخش بخش[4] و گونه گونه و بهره بهره کردم و هریکی را بدان سوی که سزاوار (۱۴ب) تر است بیاوردم و بکوتاهی کوشیدم نه بدرازی و بسود بگردانیدم نه ببازی، و نام این فرهنگنامه زفان گویان و جهان پویا[ن] نهادم برین هنجار[5]، یزدان[6] داناتر است و بر درستی و نادرستی آن از گمراهی و بی آگاهی نگاه داراد و بر نبشتن توانائی دهاد.

اندازهٔ فرهنگنامه بر هفت بخش[7]،

---

[1] قواس: و دربستوه و استوه را برخود بربستم. استوه بمعنی درمانده، خسته، عاجز، افسرده (فرهنگ معین ۱: ۲۶۲)

[2] قواس: در زبان تازی و پارسی ترجمان کرده همه را فرونگریستم. نکرنظر و زفان: ز فرو نگریستم.

[3] قواس: و یگان یگان در خانهٔ کاغذ نگار آوردم.

[4] رک: قواس ص ۳ ستون ۲ سطر ۱۱

[5] رک: قواس ایضاً

[6] قواس: خدای عزوجل داناترست، بر درستی و نادرستی آن از ناآگاهی و گمراهی نگاه دارد و بر راه درست و راست گذارد

[7] قواس: فرهنگنامه بر پنج بخش است (بحذف اندازه)

بخش نخست

در سخنان پهلوی و دری که جداگانه است و پیوند با سخن دیگر ندارد، و آن بر نهاد حرفهای عجمی بیست و (۲۰) گونه است:

گونهٔ نخست

در سخنانی که آغاز آن الف است، بر بیست (۲۰) دو بهره:

بهرهٔ نخست

در سخنانی که پایان آن الف است.

آسا: مانند، چنانک گویند شیرآسا[1] و حورآسا، و فاژه یعنی آنکه دهن از هم جدا شود یا از کاهلی یا از آمدن خواب، و آسایش[2] چنانک گویند دلاسا[3]، و بعضی فرق[4] کرده اند بدان آسایش و مانند مراد باشد و بغیره فاژه.

آوا: آواز، آخرین حرف ازوی نقصان کرده اند چنانک[5] آرا و ارا[6] و ستا یعنی آراینده و اراینده و ستاینده.

استا: بکسر همزه، ستایش[8] و بفتح همزه[9] [۱۵] کتاب مغان که آنرا تفسیر[10] زند گویند چنانک استا و زند و استازند گویند، اختراع زرتشت است.

---

[1] فرس: مانند بود چنانک گویند شیرآسا و حورآسا، خفاف گوید: بزم خوب تو جنت المأوی ؛ مثل ساقی تو حورآسا
صحاح: شهید بلخی: شود بدخواه تو روباه بدل ؛ چو شیرآسا تو بخرامی بمیدان

[2] کذاست در صحاح؛ موید این را بگفتهٔ شرفنامه نوشته.

[3] این معنی در فرس و صحاح نیامده، اما رک: موید.

[4] موید: دلاسا بالکسر تسکین خاطر و آسایش دل، و در بعضی نسخ دل آسا برین نمط مسطور است یعنی آسایندهٔ دل.

[5] در موید این اضافه بگفتهٔ ادات آمده. [6] در واژه ها آراینده و اراینده و ستاینده فقط یک حرف حذف نشده بلکه علامت 'ینده' افتاده است. [7] نسخهٔ اصل: ازا

[8] کذاست در موید؛ در فرس و صحاح بجای استا ستا بمعنی ستایش و در زفان ذیل حرف س ستا بمعنی ستایش و ستاینده هردو. [9] کذاست در صحاح؛ اما در موید بالضم و بالفتح.

[10] فرس: استا و زند، و ستا و زند صحف ابراهیم است و ابستا تفسیرش بود. صحاح ابستا بفتح همزه و کسر با و سکون سین تفسیر زند و ستاست یعنی صحف ابراهیم. قواس ص ۱۲، زند و پازند کتاب مغان ست و استا نیز گویند ایضاً ص ۱۹۳. زند و استا کتاب مغان ست تصنیف زردشت. زفان ذیل حرف زا: زند کتاب مغان، آن تصنیف زرتشت در آتش پرستی و آنرا زند استا نیز گویند، و اسدی آورده است: زند استا ←

ایلوا[۱]: صبر که بهندوی کنوار گویند و نیز بفتح همزه.

آشنا: ضد بیگانه، و رفتن بروی[۲] آب، بحذف همزه[۳] نیز گویند.

انگزوا[۴]: جای گوسپندان باشد[۵] و نیز گاوان[۶]، و زای فارسی و بفتح کاف نیز گفته اند.

اژدها: مار اژدر، اژدرها همان اژدهاست، بتازی[۷] ثعبان خوانند.

انوشا[۸]: مذهب گبران

← تغیر زنداست و بعضی فرهنگ نامه گویند صحف ابراهیم صلوات الله و سلامه است ... واضح است که تقریباً همه فرهنگ نویسان قدیم فارسی در بارهٔ اوستا و زند و پازند، حتی زرتشت اطلاعات غلط و ناقص داده اند. دراصل اوستا، استا، ابستا، وستا کتاب زرتشت است که بعقیدهٔ زرتشتیان کتاب آسمانی است، نه تصنیف زرتشت، زند گزارش و ترجمهٔ اوستا بزبان پهلوی و پازند هم زنداست بخطّ اوستائی نه بخط پهلوی

لله کذاست دراصل؛ اما رک: همین فرهنگ ذیل حرف زا، واژهٔ زند.

۱ بحرالفضایل: الوا صبرو آن داروی تلخ است، مدار الوا بکسر رستنی است تلخ، عرب آنرا صبر و هند کنوار بضم کاف تازی؛ برهان: الوا بروزن حلوا و همین است درفرهنگ معین با حرف اول مفتوح.

۲ یعنی شنا کردن، درصحاح بیت زیر معزّی شاهد معنی مذکور:

مانند زنگی که برآتش همی تپد زلفش در آب دیده همی کرد آشنا

۳ یعنی شنا، موید: شنا همان آشنا بحذف همزه، شناه نیز بمعنی شنا می آید. صحاح: شناه شنا کردن باشد درآب، در وفائی بیت زیر از منجیک شاهد آمده:

ای بدریای عقل کرده شناه و ز همه نیک و بد شده آگاه

درهمان صحاح آشنا بمعنی شنا کننده نیز آمده، و درفرس آشنا فقط بمعنی شنا کننده درج است، در هردو فرهنگ این بیت از ابوشکور شاهد آمده: کسی کاندرآب است و آب آشناست ٭ از آب ار چو آتش نترسد رواست
وفرس بیت زیر از معزی شاهد دیگری دارد:

درچشمهٔ وزارت و در بحر مملکت ماند به آشنای پدر آشنای تو

درفرهنگ معین آشنا بمعنی شنا و مرد شنا بمعنی شناور آمده؛ ومعین آشنا نیز بمعنی مطلع به امری و عارف از کاری آورده وهمین، قیاس آب آشنا بمعنی شناور درج کرده، درفرهنگ زفان گویا (همین فرهنگ) شناه بمعنی شنا درآمده اما این معنی درهیچیک از فرهنگها دیده نشد؛ معین آشنا، آشناه، اشنا و شنا و شناه بمعنی شنا و شناوری آورده.

۴ فرس وصحاح و قواس ومعین این واژه ندارد؛ موید: انگژو، بفتح یکم وکسر سوم با کاف و زای فارسی جای گوسفندان وقیل کاف فارسی فقط؛ همین است قول صاحب مدار با اضافهٔ مطلب زیر:
وبضم الف وبکاف آمده و درحل لغات است بمعنی خستهٔ میوه و در تحفه زی است آفتاب پرست یعنی حربا الخ

۵ اصل: باشند ۶ اصل: نیزکان ۷ این عبارت درحاشیه افزوده شده.

۸ فرس و قواس وصحاح و فرهنگ معین این واژه ندارد؛ اما رک: موید و مدار

بهرهٔ دوم 'ب'

آشکوب[1] : پوشش خانه ، بغیر مدّ نیز گفته اند.

آگب[2] : بکاف فارسی ، رخساره

آشوب : فتنه و غوغا

آسیب[3] : پرتو[4] و دو تن که برهم سایند وبهم برسند و دوش بدوش بهم کوبند یا پهلویش ، یکدیگر را آزاری وکوفتگی رسد ، وازینجاست که آسیب وسرگشته و مدهوش قریب یکدیگر اند.

---

[1] فرس وصحاح وقواس این واژه ندارد ؛ موید باشین موقوف بمعنی آسمان وسقف ، مدار : اشکوب بفتح وضم کاف و واو پارسی بمعنی آسمانه وسقف وآشکوب نیز درست دانسته. معین : آشکوب ، اشکوب و اشکو هرسه واژه را بهمان معنی نوشته.

[2] موید : اگب بالفتح باکاف فارسی رخساره کذا فی زفان گویا و در ادات الفضلا ، از اسلاف همچنین معلوم می شود که معنی این لفظ فارسی رخساره الخ ، درمدار است : اگب بفتح الف وسکون وفتح کاف پارسی رخساره و درشرفنامه این لفظ را ترکی آورده و بامدّ نیز چنانکه درین بیت است :

روان گشته دایم دو چیز از نهان   ز دو چشم نوری ز آگب لآلی

[3] فرس : آسیب چون دو کس بهم رسند و دوش برهم زنند آنرا آسیب خوانند ، فرخی گفت :

اندوهم از آنست که یکروز مفاجا   آسیبی ازین دل بفتد برجگر آید

صحاح : آسیب دو معنی دارد ، اول پهلو زدن دو کس باشد که بهم رسد ... دوم نکبت باشد.

[4] بحرالفضایل : آسیب پرتو ، موید : آسیب پرتو را گویند کذا فی لسان الشعرا و درقنیه مذکور است : چون دوش بدوش برهم رسانید یا بهم رسید پس یکدیگر را آزاری وکوفتگی رسید ، گویند آسیب رسید یعنی دهکه رسید و در ادات مذکور است که آسیب پرتو که دوش بادوش یا پهلوی به پهلوی بهم کوبند ... بتازیش صدمه ، هند دهکه گویند ، فیه نظر زیراچه ازین معلوم می شود که پرتو صدمه را گویند ، لیس کذالک ، بلکه پرتو عکس چیزی را گویند ، شیخ سعدی راست : ع همه نورها پرتو نور اوست ، و درشرفنامه پرتو روشنائی نوشته ... نوسلم که پرتو همین روشنائی را گویند بازمنافی آنست که پرتو را به دهکه تفسیر کنند و تحقیق آنست که آسیب عام است هم دهکه را گویند وهم پرتو را و آنکه مزاحمت دیو و پری را آسیب می گویند هم بدین می گویند که آن پرتو ایشان است وبعضی این را دهکه نامند باعتبار تعلق ومساس.

مدار : آسیب بمعنی پرتو وصدمه یعنی دهکه وسرگشته و مدهوش وبمعنی نکبت نیز.

معین آسیب را ده معنی نوشته اما معنی پرتو نیاورده.

اندوب[۱]: دردی که پوست آواره کند.

افراسیاب: نام پادشاهی از توران زمین.

بهرهٔ سوم «پ»

ارجاسپ: نام مردی[۲]، نام پادشاه توران که دختران[۳] گشتاسپ را اسیر نموده بود.

ارماپ[۴]: نام گیاهی.

بهرهٔ چهارم «ت»

انفت[۵]: پرده و تنستهٔ عنکبوت.

---

۱ - قواس: انزوب بریون و کواردن؛ سروری، انزوب جرب باشد و آنرا بریون و کواردن نیز گویند، افضل الدین کرمانی گوید: ترا کی ره بود در پیش محبوب ÷ که داری بر همه اندام انزوب
موید: انزوب دردی که پوست را آواره کند کذا فی الادات و در شرفنامه مذکور است دردی که از غلبت خارش الخ؛ و در همین لغت ذیل انزوب نوشته نقل هر تخمی که روغنش بدر آورده باشد... و صاحب زفان گویا نوشته انزوب سلم است الخ اما در زفان ذیل بخش پنجم انزروت است نه انزوب؛ جهانگیری اندوب و اندروب و اندوج هر سه را بهمین معنی آورده و گفته آنرا بتازی قوبا گویند: مدار: انزوب علتی است که پوست آدمی را آواره کند، بهندش داد گویند و در تحفهٔ[؟] است اندوب بوزن محبوب بمعنی مذکور:

ترا کی ره بود در پیش محبوب ÷ که در اندام داری بهق اندوب

و بریون که مترادف انزوب در قواس، در مدار بمعنی دردی که پوست را آواره کند، و در برهان بمعنی داد و قوبا آمده، و در مقدمة الادب زمخشری قوبا و بریون مترادف و در زفان کواردن که پوست را آواره کند.

۲ - موید: ارجاسپ نام پهلوان افراسیاب و نام پادشاه توران زمین که پسر گشتاسپ شاه را در جنگ کشت و آفرین را که دختر گشتاسپ شاه بود اسیر کرد و در دژ روئین محبوس ساخت؛ آخر الامر از دست اسفندیار بن گشتاسپ هزیمت خورد و کشته شد، رک: لغت نامهٔ دهخدا ذیل ارجاسب و ارجاسپ.

۳ - نام دختران آفرین و هما بود که برادرشان اسفندیار ایشان را از روئین دژ آزاد نمود، (برهان)

۴ - این واژه در فرهنگها دیده نشد؛ اما در تحفهٔ حکیم مومن ارما اردشیر دارد، و در لغت نامه ارماث جمع گونه ای از رمث که نام گیاهی است در بادیه.

۵ - قواس و صحاح و سروری و رشیدی بهمین معنی با بیت زیر از خسروی (سروری و رشیدی خسروانی):
عنکبوتی پلاسش بر دل من ÷ گرد برگرد بر تنید انفت، قواس بیت دیگر از خسروی.

آگفت[1]: بلا و رنج.
اپخت[2]: طمع.
آبافت[3]: جامهٔ سفت.
انگشت[4]: پارهٔ [ورق ۵ب] آتش که سیاه شده باشد و گویند زگال آهنگرانست.

بهرهٔ پنجم «ج»

اولنج[5]: سگ انگور، و بعضی بضم همزه گویند[6].
آگنج[7]: با کاف فارسی، عصیب[8] و آن طعامی است که روده ای را به برنج و جگر پر کرده

---

[1] رک: صحاح و قواس و موید و مدار و سروری و جهانگیری و رشیدی؛ در صحاح بیت زیر بدون نام شاعر شاهد:

شاها ادبی کن فلک بدخورا ÷ کآگفت رساند رخ نیکورا

[2] فرس بمعنی امید با بیت شاهد از کسائی:

جهان جای به تلخیست تهی بهر و پردخت ÷ جز این بود مرا طمع و جز این بودم اپخت

صحاح اپخت چشم باز داشتن و طمع بود کسائی:

جز این داشتم امید و جز این داشتم اپخت ÷ ندانستم کزو دور گوازه زندم بخت

موید: اپخت با جیم و خا بوزن انگخت امید کذا فی لسان الشعرا و فی الاداة بالضم و الفتح جیم فارسی طمع و فی شرفنامه بالفتح با سوم فارسی طمع و قیل بالکسر.

[3] موید: آبافت جامه ایست و جامهٔ سفت و سطبر کذا فی الاداة و شرفنامه، و در فرهنگ معین آبفت و آبافت بمعنی جامهٔ سطبر و گنده و هم بمعنی قیمتی آمده.

[4] مدار: انگشت پاره آتش که سیاه شده باشد و در تحفه است: گویند زگال آهنگران.

[5] قواس: اولنج سگ انگور، دستورالافاضل: سگ انگور یعنی لحسوره، نام داروئی است. مدار: اولنج بوزن سوگند، بضم همزه نیز، نام میوه ایست که آن را سگ انگور نیز گویند الخ

[6] در حاشیهٔ اصل این مطالب افزوده: میوه ایست معروف که آن را سگ انگور خوانند و سگ پستان نیز گویند.

[7] فرس و صحاح: امعای گوسفند پر کرده از چیزی (گوشت)، کسائی:

عصیب و گرده برون کن و ز و زونج نورد ÷ جگر بیازن و آگنج را بسامان کن

[8] قواس این مترادف را با بیت کسائی آورده.

در تنور[1] بریان میکنند.

آهنج[2]: انداخته[3]، گویند باهنج یعنی باندازْ[4].

انج[5]: روئی که بیرون کشیده باشد.

---

[1] صاحب مدار بگفتهٔ پنج بخشی مطالب درج متن را نقل نموده، واضحاً از پنج بخشی زفان گویا مراد است وحال آنکه زفان در هفت بخش است اما فرهنگ قواس شامل پنج بخش باشد و موعزالذکر را باید پنج بخشی گفت نه زفان. در فرس آگن را مترادف آگنج دانسته؛ موید: آگنج بوزن آگند امعای گوسپند بگوشتابه پُر کرده، بتازیش عصیب خوانند کذا فی شرفنامه، و درلسان الشعرا که نزد کاتب است نیز هم بدین معنی آورده قال آگنج عصیب که آنرا پارسی جگر آگند گویند، اما درقنیه مذکوراست. کامیراسدی گوید: آگنج قلابی آهنین بود بر سر چوبی محکم کرده و بدان پاره های یخ از یخدان بکشند. و در ادات الفضلا آکنج باکاف تازی بمعنی قلابه است و باکاف فارسی بدین معنی است، هذا هوالصحیح، در اصل در اسدی (لغت فرس) آکج بمعنی قلاب و آگنج بمعنی رودهٔ پرگوشت الخ، درقنیه از قول اسدی آکنج نوشتن تسامح است، همچنین در ادات نیز چنانکه بعداً می آید.

[2] مدار: آهنج بوزن آهنگ انداختن چنانکه گویند باهنج یعنی بانداز نیز بمعنی اندازه، و درلسان الشعرا بمعنی اوّل است، صاحب موید از قنیه بمعنی پوشیده نقل کرده و در قنیه آهنجیدن بمعنی کشیدن گفته الخ

[3] کذاست در اصل؛ اما رک: مدار.

[4] نسخهٔ اصل: باندازه، شاید باندازو اندازه درست باشد؛ املای درست کلمه باندازْ 'بیندازْ' باشد.

[5] موید: انج بوزن رنج بیرون کشیدن کذا فی لسان الشعرا در ادات و شرفنامه. بیرون روی نوشته بجای بیرون رفتن و بیرون کشیدن ... اما معنی آن بیرون روی از کدام قبیل باشد، من نمیدانم؛ شاید این تحریف کاتب باشد، بجای رفتن 'روی' نبشته است وکتابت هردو قریب است، و این گمان ازان شود که درادات الفضلا لغات لسان الشعرا کل آورده است و درین لغت بجای رفتن روی آورده است، پس معلوم شد که خطای کاتب است. درمدار مطالب موید با بیت شاهدی بدون نام شاعر آمده است. اما حق اینست که انج تصحیف لنج است چنانکه در فرس و قواس و صحاح آمده با بیت زیر بعنوان شاهد در اول دو فرهنگ:

گفت من تیز دارم اندر کون ٭ سبلت و ریش و موی لنج ترا

امّا بیشتر فرهنگ نویسان متوجهٔ این نکته نشدند، وحیف است که بعضی انج و لنج هردو را آوردند، چنانچه صاحب زفان گویا ذیل حرف 'ل' لنج را بهمین معنی آورده و، هیچ متوجه نشد که او قبلاً انج را بهمین معنی نقل نموده است، صاحب موید نه فقط همین کار را کرده است، بلکه معنی بیرون روی را تصحیف بیرون رفتن بگفته لسان الشعرا قرار داده؛ از قول فرهنگ نویسان بسیار عجب می آید که ایشان انج را مصدر قرار می دهند وحال آنکه در فارسی علامت مصدر 'دن' یا 'تن' باشد، پس انج را مصدر قرار دادن بر کم آگهی ایشان از اصول و مقررات گواهی می دهد.

آکج[1] : قلابی بود آهنی که برسر چوبی بسته باشد و بدان پاره های یخ از یخدان کشند و در اسدی[3] آنرا کنج کرده است.

الفنج[4] : الفغتن، و امر بالغاختن[5].

اوج : بلندی[6] و هوا.

ارج[7] : اندازه و قدر.

ایرج : نام پسر فریدون.

آرنج[8] : مرفق و آن بندگاه[9] دست بود میان بازو و ساعد.

---

[1] در فرس این واژه دوبار آمده، اول: آکج قلابی آهنین بود که سقایان بدان یخ از یخدان بکنار کشند، عنصری گفت: بجستند تاراج ورستیش را ✤ به آکج گرفتند کشتیش را
بار دیگر، آکج قلابی بود آهنین برسرچوب بسته، عنصری گفت: بجستند تاراج الخ. صحاح همین معانی دبا همین بیت شاهد آورده، بنا برین واضحست که هرچه درموید ذیل واژهٔ آکنج بگفتهٔ اسدی نوشته باطل است.

[2] نسخهٔ اصل: چون

[3] واضحاً این قول غلط است و مبنی است بر اشتباه کاتب که آکج را آکنج نوشته، اسدی آکج دوبا آورده، نه کنج و آکنج چنانکه در زفان ولسان و موید آمده است.

[4] الفنج امر است از مصدر الفنجیدن بمعنی حاصل کردن وجمع آوردن چنانکه درهمین فرهنگ زفان در بخش سوم آمده، و الفنجیدن مترادف الفغتن و الفاختن بمعنی گرد کردن، رک: بخش سوم همین فرهنگ؛ فرس وصحاح: الفنج اندوختن باشد، بوشکور گفت:

میلفنج دشمن که دشمن یکی ✤ فراوان و دوست از هزاران یکی

باید علاوه نمود که در هر دو فرهنگ بالا معنی کلمهٔ الفنج که امر واحد حاضر از الفنجیدن است، اندوختن نوشته و حال آنکه معنی درست اندوز باشد نه اندوختن، درموید است: الفنج بوزن از رنج — الفغتن وجمع کردن وجمع کرده شدن وگردکن، و در لسان الشعرا بمعنی اول و در ادات بمعنی آخر، اول این صیغه مشترک است میان مصدر و فاعل، و امر مشتق است از الفنجیدن.

[5] بظاهر سهو است، الفنج امر است از الفنجیدن نه از الفاختن.

[6] کذاست درموید، اما صحاح: اوج بلندی درجه.

[7] صحاح: الج قدر مردم باشد، موید: ارج قدر و اندازه.

[8] فرس: آرنج بندگاه دست بود که پیوستهٔ ساعد بود زیر بازو الخ.

[9] عیناً همین معنی بدون تغییر الفاظ در صحاح مندرج است.

ارج[1]: پرنده ایست که آنرا[2] شکار کنند.

بهرهٔ ششم، ج،

آماج[3]: آن[4] خاک که نشانهٔ تیر برونهند.

آخشیج[5]: ناهمتا[6].

بهرهٔ هفتم، خ،

اخ[7]: آفرین[8]

آرخ[9]: ثولول که مسا[10] گویند.

---

[1] مدار: ارج بفتحتین بوزن فرج پرنده ایست که بدان شکار کنند.

[2] کذاست در اصل؛ اما بآن باید درست باشد، رک: مدار.

[3] فرس: آماج خاکی باشد تودهٔ گرد کرده که نشانهٔ تیر برونهند، عماره گوید:

سرشک دیده برخسار تو فروگذرد ❊ هر آنگهی که برآماج گاه او گذری

در موید آماج بجیم فارسی مانند زغان بمعنی خاک بلند و نشانه و آلتی برزگران، و مترادف اداماج کذا فی شرفنامه؛ و در مدار اوّلاً آماج گاه بمعنی نشانهٔ تیر نوشته و بعداً آماج بمعنی نشانه و تیر و تودهٔ خاک آلت کشاورزان نوشته و ازین بیت سوزنی تمسک جسته:

برکند روی زمین تیر تو در آماج گاه ❊ برزگر را کنده پنداری بآماج و کلند

[4] نسخهٔ اصل: از

[5] در قواس و دستور آخشیج بمعنی ناهمتا آمده؛ اما در صحاح آخشیج به دو معنی آمده، اوّل ضد و ناهمتا و دوم عناصر اربعه، و در فرس و سروری این بیت از بوشکور شاهد معنی مخالف آمده:

کجا گوهری خیره شد زین چهار ❊ یکی آخشیجش بر آن برگمار

و در صحاح و مدار بیت زیر از نظامی شاهد معنی عناصر آمده:

توئی گوهر آمای چار آخشیج ❊ مسلسل کن گوهران در مزیج

و در قواس این بیت شاهد معنی اول است و این اشتباه است. آخشیج در اکثر فرهنگها با جیم تازی است اما در زفان و شرفنامه با جیم فارسی.

[6] در حاشیهٔ نسخهٔ اصل این عبارت افزوده: آخشیج بیای پارسی ناهمتا و ضد و یک طبع از طبائع اربعه.

[7] موید: اخ در فارسی بمعنی آفرین و تحسین استعمال کرده اند و مکرر آورده اند همچو بخ بخ و اخ اخ.

[8] در حاشیهٔ نسخهٔ اصل افزوده شد: آفرین و ستایش و تحسین آفریننده

[9] در فرس و صحاح از ابیات کسائی و مرادی (صحاح نیز از بیت سوزنی) شاهد آمده. کسائی راست:

از راستی تو خشم آری دایم ❊ بر بام چشم سخت بود آرخ

بحر الفضایل آرخ بمعنی ثولول نوشته.

[10] این کلمه هندی در موید و مدار آمده، بگفتهٔ آن در ادات با زای تازی و در شرفنامه بزای فارسی است.

بهرهٔ هشتم 'د'

ایزد : خدای تعالی و تقدس.
اژند[1] : گل میان دوخشت.
آورد[2] : کارزار، و در رسالهٔ نصیر حمله‌گاه و در فردوسی کوشیدن را گویند، و بعضی گویند جنگ کردن بمبارزت (۱۶) است.
ایمد[3] : بکسر همزه و فتح میم سپار[4] و آن آهن پاره ایست که بدان زمین زراعت پاره کنند که بهندوی پهالی[5] گویند.
افد[6] : شگفت و بعضی افند با تا گویند.

---

[1] بحر الفضائل : اژند گل که میان دوخشت است، موید : آژند بازای فارسی گل میانهٔ آب و گلی که میان دوخشت باشد الخ و در مدار بهر دو معنی آمده، اما تلفظ آن بمد و کسر نوشته : آژندیدن که در زفان موید و مدار وغیره بمعنی گل میان دوخشت کردن از ین کلمه ساخته شد.

[2] فرس و قواس و صحاح بمعنی جنگ نوشته‌اند، اما بیت شاهد در فرس مشعر معنی کوشش و حمله نیز باشد :

زبازور و آورد او در نبرد ٭ رسد تا بگردون گردنده گرد

اما بیتهائیکه در قواس و صحاح نقل شده شاید آوردگاه است نه آورد (فردوسی) مثلاً :

نهادند آوردگاهی بزرگ ٭ دو جنگی بکردار درنده گرگ (صحاح از فردوسی)

موید : آورد کارزار و حمله‌گاه و جنگ بمبارزت و کوشش تمام. و در مدار آمده : کارزار و حمله و کوشش و قیل جنگ و مبارزت و کوشش تمام در پنج بخش (زفان گویا) آرند. واضح است که در نقل معانی بظاهر صاحب مدار دچار اشتباه شده و این هم ممکن است که اشتباه کاتب باشد. بحر الفضائل آورد را بمعنی جنگ و حملهٔ در جنگ نوشته و این معنی شامل همهٔ معانی مذکور در فرهنگها باشد. و دستور الافاضل بمعنی جنگ آورده

[3] دربارهٔ تلفظ این واژه اختلاف است، قواس : ایمل، موید : ایمر، مدار : ایمد و ایمر، و کذا است در سروری و رشیدی و برهان، اما در جهانگیری ایمد است بدین اضافه که در بعضی از نسخ بجای دال لام مرقوم است.

[4] زفان : سپار چرخ انگور مال و گاو و آهن که بدان زمین زرعی پاره کنند و بهندوی پهالی گویند الخ.

[5] در موید ذیل ایمر پهال و به ذیل سپار همین واژهٔ هندوی نقل است و در شرفنامه ایمر بمعنی پهاله، در ادات : ایمد و ایمر هر دو بمعنی پهال.

[6] موید : افند و افد بالفتح شگفت که بتازیش عجب گویند، نیز رک : مدار

این واژه در فرس و صحاح و قواس شامل نیست.

اورند[1]: فر و زیب و خداع و فریب.
افرند[2]: مهتری و فر و نیکوئی.
آفند[3]: خصومت و جنگ.
اند[4]: نیف یعنی شماری مجهول، آنکه از ده تا سه باشد، و سخن به شک گفتن چنانک آن چیز چنانست یا چنین.
ایننده[5]: همان 'اند' است.

---

[1] فرس وصحاح: اورند بمعنی فر و بها و زیبائی آورده — بابیت زیر از فردوسی بطور شاهد:
سیاوش مرا همچو فرزند بود ✽ که با فر و با برز و اورند بود
در موید این واژه بمعنی فریب و دغا و فریب دادن آمده، اما در مدار بمعنی فریب و خداع و فر و زیب است، و این معنی اخیر بگفتهٔ موید نقل نموده حال آنکه در نسخهٔ چاپی موید این معنی وجود ندارد.

[2] این واژه در فرهنگهای قدیم مانند فرس وصحاح و قواس و دستور و غیر آنها شامل نیست؛ موید: افرند همان اورند یعنی فر و زیبائی و مهتری و افزونیها. وهمین لغت اروند بدین طور شرح شده: بالفتح فر و زیبائی و مهتری و نام کوهی الخ، اما اصل اینست که در فرهنگهای قدیم و معتبر اروند بمعنی دجله و الوند آمده، رک: فرس وصحاح اما در فرس اورند و اورنگ، و در صحاح اورند و افرنگ و اورنگ بمعنی فر و زیبائی آمده، بنا برین واضح است که صاحب موید را اروند بمعنی فر و زیبائی نوشتن سهوی دست داده، در مدار بحوالهٔ ابراهیمی اروند و امرند (صح افرند) و افرنگ و اورنگ بمعنی فر و زیبائی آمده، اما واضحاً اروند تصحیف اورند است.

[3] این واژه در فرس وصحاح و قواس شامل نیست؛ و در موید بگفتهٔ لسان الشعرا بمعنی جنگ وخصومت آمده: و در مدار این بیت شاهد منقول است:
آورده پیامی که نباید چو خوری می
مستک شوی و عربده آغازی و آفند

[4] صحاح: اند شماری بود که عدد آن معلوم نباشد، سوزنی:
صد هزار و اند سال اندر جهان باقی بمان
کس ندانست و نداند در جهان تفسیر اند
بنا برین اند را بمعنی عدد مجهولی از ده تا سه قرار دادن بنظر درست نمی آید.
وهمچنین قیاس صاحب قنیه که اند پانصد قرن است درست نیست.
بهر حال معنی اند را که در زفان است از مندرجات ادات و موید و مدار وغیر آنها تایید می شود.

[5] این واژه شامل موید است وبس.

آباد[1]: آفرین، گویند آباد برفلان یعنی برخلاف و ضد یران[2].

اندود[3]: گرفته بچیزی یعنی ملمع.

امرود : میوه ایست.

الوند : نام کوهی بلند.

آزاد : درختی[4] است، گویند درخت نیم.

استاد : ماهر در کاری و آموزنده و مهتر[5].

انگزد[6] : انگوزه.

آراوند[7]: دجله را گویند.

اروند[8]: دجله و نام کوهی[9].

---

[1] موید : آباد، آن ضد ویران و نیز آفرین.

[2] یران صورت قدیمی ویران است.

[3] از مصدر اندودن که درهمین فرهنگ در بخش سوم بمعنی زیر آمده ، اندودن بچیزی گرفتن چنانک گویند زر اندود و گل اندود و اندائیدن که گل کردن و مالیدن گویند، گل اندای یعنی گل مالیده. در مدار آمده: اندود کهگل کرد نیز بمعنی ملمع.

[4] همین معنی در موید بگفتهٔ زفان دیج است ؛ و درخت سرو و سوسن و بکائن را نیز آزاد گفته اند.

[5] این معنی در فرهنگها ندیدم.

[6] موید : انگزد بالفتح و باکاف فارسی مضموم انگوزه که هندش هینگ خوانند ؛ مدار: انگزد انگوزه که هندش هینگ گویند، هفت پیکر :

خواجهٔ چین چو مشک بار کند
مشک را از انگزد حصار کند

[7] موید : اراوند بالفتح نام کوهی کذا فی زفان گویا ، قال فی شرفنامه در پهلوی دجله را گویند که رود مصر است ، مدار : اراوند بزبان پهلوی دجله ، در پنج بخشی است اراوند بمعنی دیده ، و اروند دجله و نام کوهی ، و در ادات اروند به معنی اوّل او راوند دجله الخ ؛ ناگفته نماند که صاحب موید اراوند را بگفتهٔ زفان گویا برای نام کوهی آورده ، و این اشتباه است زیراکه این معنی در نسخهٔ کتاب حاضر وجود ندارد ؛ همچنین صاحب مدار بحوالهٔ زفان اراوند را بمعنی دیده آورده ؛ در اصل دیده تصحیف دجله است که در نسخهٔ زفان موجود است ؛ در فرس و صحاح و قواس واژهٔ اراوند شامل نیست.

[8] در فرس و صحاح ازین بیت استشهاد شده

اگر پهلوانی ندانی زبان ٭ بتازی تو اروند را دجله خوان

اهنود[۱]: اول روز از فوردیان.

اسفندمذ[۲]: سیوم روز از فوردیان.

ارد[۳]: بیست و پنجم روز از ماه.

اشتاد[۴]: بیست و ششم روز از ماه.

اورمزد: ستاره که آنرا مشتری گویند، و اسدی[۵] گوید اورمزد اول روز پارسیان ست یعنی اوّل روز از ماه، و اورا هورمزد و هرمزد و اورمز نیز گویند.

ارجمند: عزیز و گرامی.

---

۹ ← یعنی کوه الوند چنانکه درصحاح است و درین فرهنگ از ابیات عربی استشهاد شده. نیز رک: موید مدار

۱ موید: اهنود بالفتح اوّل روز فروردیان الخ.

۲ موید: اسفندارمذ.

۳ رک: موید و فرهنگ معین ذیل آرد و ارد.

۴ موید و مدار: اشتاد: فرهنگ معین: اشتاد نام فرشته ایست، روز بیست و ششم از هر ماه شمسی که فرشتهٔ مذکور موکّل بر اوست.

۵ درنسخهٔ چاپی پاول هورن ص ۲۰ فقط این معنی آمده: اورمزد و زاوش و برجیس ستارهٔ مشتری باشد، بوشکور گفت الخ، اما درصحاح ص ۷۳ معنی دوم موجود است یعنی اوّل ماهست باصطلاح پارسیان، دقیقی گفت: بهرامی آنگهی که بخشم افتی ÷ برگاه اورمزد درفشانی

در مدار ا: ۱۴۴ آمده: اورمزد ... اوّل روز از ماه و اورا هورمز و هرمزد و ارمزد نیز گویند، چنانچه اسامی سی روز ماه موافق حکیم پارس دفاتر اکبر شاهی درین قطعهٔ مولف مندرج است لمولفه:

اولاً اورمزد و دیگر بهمن و اردی بهشت
بعد ازان شهریور و اسفندمذ خرداد دان
چون امرداد و دگر دیبا ذ آمد در شمار
آذر و آبان و خور آن گاه ماه و تیر خوان
گوش کن دیگر که آمد گوش نام و دی بمهر
هست تا این نصف مه مهر و سروش و بعد ازان
رشن و فروردی همی دان و دگر بهرام و رام
باد دیبا دین و دین و ارد و اشتاد آسمان
بعد ازان زمیاد و مار اسفند انیران یاد گیر
از حکیم پارسی سی روز ماه ای نکته دان

بهرهٔ نهم ' ر '

اختر[1] : منزل ماه و آن بیست هشت است و همه را اختران گویند.

آذر[2] : آتش و آفتاب در قوس که آنرا آذر[3] ماه گویند.

اخگر : انگشت افروخته و سوزان که چون آب زنی زگال شود.

افسر : تاج.

آذر[4] : روز[5] های[6] جشن مغان.

آغار : زمینی[7] که نم بدو فرو رفته باشد و آنچ نیک سرشته بود و حرکت ، گویند بدآغاز یعنی بدحرکت.

---

[1] قواس ص ۱۵ : اختر منزل ماه است ، خاقانی گوید : در طالع مولود تو دیدند زرصدها
اختر شمران رومی و یونانی وطائی ، صحاح ۹۸ : اختر:
فال وستاره ؛ دستور ۶۰ : اختر : فال و منزل ماه ، ص ۷۵ اختر کوکب ، موید ۱ : ۳۳ : اختر فال نیک وستاره و منزلی از منازل ماه الخ.

[2] ظاهراً صاحب زفان گویا در پیروی قواس از معنی های دیگر یعنی فال وستاره وغیره صرف نظر نموده.

[3] در قواس و صحاح ، آذر بمعنی آتش آمده ؛ اما در موید ۱ : ۳۲ فی الادات آذر آتش ، و مدت ماندن آفتاب در برج حوت که فارسیان یک ماه شمرند و آنرا آذر ماه گویند و در شرفنامه مذکور است آتش کده و مدت ماندن آفتاب در برج قوس الخ ونیز نام عم ابراهیم چه پدر ابراهیم تارخ نام داشت؛ معنی اخیر غلط فاحش است که عم ابراهیم آزر نام داشته نه آذر (با ذال)

[4] موید ۱ : ۹۵ آذر ماه نام نهم ماه است از سال شمسی. نیز رک : فرهنگ معین ۱ : ۳۷ ، ۳۸ ، آذر نام روز نهم هر ماه و ماه نهم از سال شمسی.

[5] در موید ۱ : ۹۵ همین معنی بگفتهٔ زفان نقل کرده.

[6] ظاهراً روز درست است زیرا که جشن مغان روز آذر قرار می گردد و این روز نهم است از هر ماه ، آن ماه برای جشن روز نهم از ماه نهم (آذر) قرار می گیرد ، درین روز بزیارت آتشکده ها می روند (فرهنگ معین ۱ : ۳۷)

[7] فرس . آغار نم باشد که بزمین فرو رود ، صحاح ۹۷ : آغار دو معنی دارد اول فرو شدن نم بزیر زمین باشد ، دوم چیزی باشد بهم سرشته و نم گرفته از آب یا از خون ، عنصری گفت :

عقیق رنگ شدست این زمین ز بسکه زخون ✲ بروی دشت و بیابان فرو شدست آغار

قواس ۳۳ : آغار زمینی که نم باو فرو شده باشد ، عنصری عقیق رنگ شدست الخ . در مدار ۱ : ۳۱ قول صاحب زفان گویا بدون ذکر ماخذش نقل شده است ، اما در موید از معنی حرکت صرف نظر شده ؛ باید علاوه نمود که بیت عنصری در فرس و صحاح و سروری و مدار و رشیدی بطور شاهد نقل شده ؛ اما معنی اول یعنی فرو شدن نم که ←

انبر : گلبتان[1] یعنی سنداهی.

آژیر[2] : زیرک وهوشمند و پرهیز[گار] وهوشیارکردن لشکر و بانگ زدن.

افدر : برادر[3] زاده و خواهرزاده.

انبیر : پرکردن[4] وگل تر وخشک ، وگویند چیزی که دربام اندازند ومیان دیوار برآرند.

⟵ در فرس وصحاح وحق درفرهنگ معین درج شده ، درقواس و زفان و موید و مدار وغیره یافته نمی شود.

[1] صحاح ۹۹ : انبر کلبتین باشد ، منجیک گفت الخ ، درموید ا : ۳۶ و مدار ا : ۱۲۸ انبر بمعنی کلبتان یعنی سنداهی آمده ؛ درموید انبر و انبیر را خلط کرده ومعنی دیگرش پرکردن نوشته . باید علاوه نمود که کلبتان وکلبتین هردو بمعنی انبر آمده ، رک : فرهنگ معین ۳ : ۳۰۲۶

[2] درقواس آژیر را دو جا آورده ، درص ۹۴ بمعنی زیرک و هوشمند ، و ازبیت زیر فردوسی استشهاد شده : سپه رانگهدار و آژیرباش ؛ شب و روز باترکش وتیرباش
و درص ۱۶۶ بمعنی هوشیارکردن لشکر و بیت بالای فردوسی شاهد آورده . بظاهر مولف دچار اشتباه شده زیرا بیت مذکورشاهد معنی زیرک و هوشیار است و درفرس ص ۱۴۱ وصحاح ص ۹۷ همین بیت فردوسی شاهد معنی هوشیار آمده ؛ اما در مدار ج ۱ ص ۱۸۲ موافق معنی لشکر و غلبه است این بیت شاهنامه : سپه رابیارا و آژیرباش الخ و درصحاح آژیر بمعنی پرهیزگار نیز آمده و ازین بیت دقیقی استشهاد شده : ترانخوانم جز کافر وستمگر ازانک
به بنودن من کرده کار آژیری
موید ا : ۲۴ آژیر آماده کردن لشکر وهوشیار وغلبهٔ بانگ زدن و هوشمند و زیرک و درادات بمعنی پرهیزگار.

[3] اصل : برادران ، اما رک : فرس ۱۲۹ ، قواس ص ۹۹ ، صحاح ص ۹۹ ، و درفرس وقواس و صحاح و مدار ا : ۹ وسروری ص ۷۱ بیت زیرشاهد آمده :

سلسلهٔ جعدی بنفشه عارضی
کش سیاوش افدر و پرویز جد

[4] همین معنی بدون نقصان در مدار ا : ۱۲۹ درجست ، اما درقواس ص ۱۱۶ انبیر بمعنی آگنش ، و در دستورالافاضل بمعنی کیش و دین و درلسان الشعرا بمعنی آگنش ، در دستور کیش دراصل تصحیف آگنش است ، برای آگاهی بیشتر رجوع کنید بقواس ص ۱۱۶ حاشیه ۷.

آگور[1] : خشت پخته ، چنانک گوید گچ آگور کرده یعنی بالای خشت گچ مالیده.
اوبار : خانه[2] و امر [اوباریدن بمعنی] بیفکندن [و فرو بردن] ، اوبار یعنی بیفکن و فرو بر.
آمار[3] : پت[4] جامه که جولاهان کنند ، هندوی تان[5] گویند و آن چیزی باشد که در جامه مالند تا رنگ و صیقل (ورق ۱۷) دهد.
ایدر[6] : اینجا.
آور : یقین[7] و صاحب چیزی[8] [چنانک] دلاور [و] جنگ آور.

---

[1] موید ۱: ۳۳ آگور با کاف و واو فارسی خشت پخته را گویند چنانک گویند گچ آگور کرده یعنی بالای خشت گچ مالیده کذا فی الادات الخ ، در مدار ۱: ۱۶ آپور و آبور خشت پخته و گویند گچ آپور کرده یعنی بالای خشت گچ کرده و در موید و ابراهیمی و جای دیگر از اسکندری است آگور باین معنی الخ ، در فرهنگ معین ۱: ۷۸ آگور بمعنی خشت پخته ـ آجر آمده ، اما کلمهٔ آپور و آبور درین فرهنگ نیامده ممکنست آبور تصحیف باشد زیراکه در فارسی امروز آجر است ، و درین کلمهٔ 'ج' عربی بجای گاف آمده .

[2] این معنی در صحاح ص ۹۹ و فرهنگ معین ۱: ۳۹۸ نیامده ، اما قواس ص ۱۲۰ : اوبار و کده خانه و گاه جای شب گاه ، آنجا که شب کنند ، نیز رک : موید ۱: ۳۷ و برهان ۱: ۱۸۰ . در مدار آمده : اوبار بفتح خانه و امر اوباریدن ... موید معنی اول است این بیت :

نگه کن کزین گوشت شد کارشان ٭ که یکبار شد جای اوبارشان

[3] رک : قواس ص ۱۸۳ باین بیت شاهد (عنصری) :

سوار بود بر اسبان چو شیر بر سر کوه ٭ پیاده جمله بخون داده جامه را آمار

و همین بیت در صحاح ص ۹۸ بنام عنصری و فرس ص ۴۴ بنام عماره درج است .

[4] این کلمه بپای عربی و فارسی هردو طور آمده : در زفان اینجا پت ، و نیز در گونهٔ 'با' بهره 'ت' آمده : بت آمار جولاهه ؛ و برهان ۱: ۳۲۸ : پت آماری باشد که بر کاغذ و جامه کنند ؛ مقدمة الادب ص ۲۸۵ : بخیرآمار بت کرباس الخ ، در فرهنگ معین بت ۱: ۴۷۱ و پت ۱: ۶۹۷ و موید ۱: ۱۱۵ و ۱: ۱۹۳ هردو آمده ، مدار ۱: ۱۸۳ بت آورده .

[5] کذاست در ادات ؛ اما موید ۱: ۱۱۵ بت بالفتح آمار جولاهه ... که آنرا تا و تان نیز گویند ، معلوم نیست که این واژهٔ کدام زبان است .

[6] رک : قواس ص ۱۹۵ ، صحاح ص ۹۹

[7] کذاست در صحاح ص ۹۸ باین بیت شاهد :

گروه دیگر گفتند کاین بت را ٭ بر آسمان برین بود جایگاه آور

[8] در این معنی بدون ترکیب نمی آید (موید ۱: ۳۳)

انگار[۱] : تصور کن.
استر : بطانه[۲] که زیر صدره و قبا زنند.
آخور : علف گاه ستور و جای بستن وی.
افزار[۳] : آلت چیزی، گویند دست افزار که بواسطهٔ آن دست کار تواند کرد و پای افزا[ر] بخنین[۴] و دیگ[۵] افزار که بدان دیگ خوشبوئی گردد.
آچار : معروف.
اسفندار[۶] : آفتاب در حوت و این را اسفندار مذ ماه گویند و پنجم روز از ماه که آنرا اسفندارمذ روز گویند.
آمار[۷] : حساب.
آوار[۸] : همان حساب که رفت.
اسپندیار : پسر گشتاسپ بن لهراسپ است، اسفندیار نیز گویند.
اردشیر : نام[۹] پادشاهی.

---

۱ امر از انگاشتن و انگاردن است.
۲ برای معنی بطانه رک : فرهنگ معین ۱ : ۵۴۶
۳ ابزار و اوزار و افزار یکی اند (رک : فرهنگ معین ۱ : ۱۲۵)
۴ روشن نیست که این کلمه فی الحقیقت چیست زیرا بخنین چرخ چاه را گویند. و در این جا بخود بنظر می آید در اصل پای افزار آنچه در پای کنند مانند نعلین و کفش، چنانکه در همین فرهنگ زفان گویا در بخش سوم پای افزار بمعنی نعلین و کفش و هرچه در پای کنند آمده.
۵ فرهنگ معین ۱ : ۱۲۵ دیگ ابزار آنچه طعام بدان خوشبو کنند.
۶ رک : مدار ۱ : ۹۰
۷ رک : مؤانس ۱ : ۱۲
۸ رک : موید ۱ : ۳۳ و مدار ۱ : ۳۶ برای شکلهای مختلف مانند آمار، امار و آواره و اواره و آوار و آمار.
۹ نام دو تن از شاهان خانوادهٔ هخامنشی که از ۴۶۶ تا ۴۲۴ ق.م، و ۳۸۴ تا ۳۷۹ ق.م. حکمرانی نمودند، و نیز نام سه تن از شاهان ساسانی که از آنجمله اردشیر بابکان مؤسس این سلسله باشد که از ۲۲۴ تا ۲۴۱ هجری حکمرانی نمود. رک : فرهنگ معین ج ۵ (اعلام) صفحات ۱۱۶ تا ۱۱۷

بهرهٔ دهم ' ز '

ندرز[1] : وصیت

ندوز : حاصل کننده[2] و کرده و چیزی[3] دور کننده ، گویند فلان غم اندوز است یعنی غم دور کننده است.

نباز : شریک.

فروز : روشن و تابان[4] کننده.

آز : حرص.

رز[5] : قیمت.

البرز[6] : نام کوهی است میان هند[7] و ترکستان در غایت بلندی.

آغاز : نخست.

اورمز[8] : مشتری.

---

[1] دستور ۱ : ۶۲ اندرز کتاب و وصیت ، مدار ۱ : ۱۳۲ اندرز وصیت و نصیحت و تنبیه و نیز نام کتابی ، معنی اخیر در اکثر فرهنگها یافته نمی شود ، موید ۱ : ۳۹ آمده ... و در دستور بمعنی کتاب نیز مذکور این معنی مجازیست ، می گویند مواعظ و نصائح در کتب است.

[2] فرهنگ معین ۱ : ۳۷۶ در ترکیب بمعنی اندوزنده آید ، مال اندوز ، و نیز در ترکیب بمعنی اندوخته آید ، ظلمت اندوز.

[3] موید ۱ : ۳۹ آمده : اندوز ... وفی القنیه چیز دور کننده چنانکه گوئی فلان غم اندوز است یعنی غم دور کننده است ، اقول اندوز ماخوذ از اندوختن است و معنی اندوختن دور کردن یافته نشد الخ... و در زفان گویا در بخش سوم اندوختن بمعنی گرد کردن آمده نه دور کردن.

[4] این معنی در ترکیب حاصل آید مانند جهان افروز وغیره.

[5] ارز و ارج هم معنی است ، و بعلاوهٔ معنی بها و ارزش به معنی های قدر و رتبه ، عزت و آبرو ، بهره و فایده ، کام و آرزو می آید فرهنگ معین ۱ : ۱۹۸.

[6] در پهلوی Harborz ، هر بمعنی کوه و برز بمعنی بالا و بلند ، جمعاً کوه بلند و بزرگ فرهنگ معین ۱ : ۱۶۹.

[7] این توضیح درست نیست ، البرز در اصل رشتهٔ کوههای شمالی ایران که سرتاسر شمال ایران از مغرب بمشرق کشیده شده است و مرتفع ترین قلهٔ آن دماوند است (فرهنگ معین ایضاً).

[8] رک ، اورمزد ، فرهنگ معین ۱ : ۲۰۰.

اسپروز[۱]: نام کوهی است.

بہرۂ 'ژ'

آیژ[۲]: سرشک آتش و بوماذران[۳] که نام داروییست.

بہرۂ 'س'

الماس: گوهری است، ہندوی ہیرا گویند.

آبنوس[۴]: چوبی است معروف سیاه وام.

اسپریس[۵]: میدان و اسپریز را ہم گویند، و بفتح ہمزہ نیز گفته اند و بعضی بضم ہمزہ.

۱۔ کوہی میان ری و مازندران، شاہنامہ:

ہمی رفت کاؤس لشکر فروز ❊ بزد گاہ بر پیش کوہ اسپروز

فرہنگ معین ج ۵ ص ۱۳۲، و مدار ا: ۸۳

۲۔ در فرہنگ معین ا: ۱۱۲ آیژ و آیژہ و آیژک یعنی شرارہ و شرر آتش، مدار ا: ۴۳ آیژ سرشک و شرار آتش و نام گیاہی کہ آنرا بوماذران گویند، اما موید ا: ۴۰ اژ نیز، یعنی داروئیکہ آنرا بطم و بضم خوانند ہندوی مجیٹھ، قیل بوی مادران و نیز شرر آتش.

۳۔ ہمین فرہنگ ذیل بخش دوم بو مادران: نام دارو ئی است و بو ماران نیز گویند، ہمین دو صورت در فرہنگ معین ا: ۶۰۶ درج ست؛ اما در مدار ا: ۲۵۶ بعلاوۂ آن بودرمان نیز آمدہ است. اما در توضیح این واژہ گفتۂ موید قول قواس نقل کردہ، اما در موید نام قواس درج نیست و در فرہنگ قواس کلمۂ بومادران دیدہ نشد، برای توضیح کلمۂ بومادران رک: فرہنگ معین ج ا ص ۶۰۶.

۴۔ رک: موید ا: ۴۱ و فرہنگ معین ا: ۲۶

۵۔ لغت فرس ص ۱۹۵، قواس ص ۱۳۳، صحاح ص ۱۴۰، اسپریس یعنی میدان نوشته باین بیت شاہد از شاہنامہ:

نشانہ نہادند بر اسپریس ❊ سیاوش نکرد آنچہ با کس بکیس

مدار ا: ۸۳-۹۴، اسپریش بفتح و ضم ہمزہ و با و با ہر دو پارسی، میدان و قیل بکسر سوم ہم درموید است، از فرہنگ فخر قواس بشین معجمہ از آن کہ در قافیۂ کیش واقع شدہ است چنانکہ درین بیت سکندرنامہ:

نشانہ نہادند بر اسپریش ❊ نکردہ دران کار با کس بکیش

واضحاً در قواس اسپریس است و صاحب مدار را سہو دست دادہ، و او بیت شاہنامہ را از سکندرنامہ دانستہ و نیز قوافی را غلط نقل نمودہ، بعلاوہ ضبط کلمۂ اسپریس در فرس و قواس و صحاح در متن شاہنامہ ص ۶۰۳ اسپریس و قافیہ در مصراع دوم بکیس است نہ بکیش؛ در فرہنگ معین اسپریس و اسپریز و اسپ رس و اسپ ریز ہر چہار صورت نوشتہ و این را ماخوذ از کلمۂ پہلوی asprēs و asprās دانستہ یعنی راہ اسب و میدان تاخت و تاز است، گویا از لحاظ اشتقاق این کلمہ مرکب است و باید در بخش دوم آورد.

آس: آسیا و درخت مورد که بهندوی مور[59] گویند.

بهره شش

اندایش[60]: کاهگل که بمالند.

آغالش[61]: شورش وکسی را برشورانیدن یعنی مردمان را گرم کردن بجنگ.

آگوش: کنار، و آغوش هم گویند.

ارخش[62]: مردمان[63] دنی و عوام.

آگنش[64]: پرکردن دیوار و جز آن.

آرش[65]: نام مردی که تیر او دور تر رفتی و بی خطا بودی.

آذرخش[66]: صاعقه.

---

[58] چون در اسپ ایس جزو اوّل اسپ است، این کلمه بضم همزه درست نخواهد بود. اما رک: مدار ا: ۹۳

[59] برای این کلمه رک: مورد در همین فرهنگ.

[60] رک: قواس ص ۱۳۳، دستور ص ۴۶، موید ا: ۴۴، مدار ا: ۱۳۲. در اصل اسم مصدر است از مصدر اندائیدن بمعنی کهگل کردن و مالیدن، گویند گل اندای یعنی گل مالیده (زفان گویا بخش سوم)

[61] رک: فرس ص ۲۱۵، صحاح ص ۱۴۷، قواس ص ۱۶۶، در اصل اسم مصدر است از مصدر آغالیدن بمعنی تیز کردن، بورغلانیدن، سخت برشورانیدن، گویند هردو آغال کرده اند یعنی یکدیگر بشوریدند و تنگ فراگرفتند، (رک: همین فرهنگ بخش سوم ذیل آغالیدن)

[62] در نسخهٔ اصل ناخوانا؛ موید ا: ۴۳: اربش زیرک و هوشیار کذا فی الدستور.

[63] دارای این معنی، کلمهٔ اوباش (عربی، وجمع) است، موید ا: ۴۳ اوباش مردم عوام وکمینه.

[64] اسم مصدر از آگندن بمعنی پرکردن، در شرفنامه اگنش بالفتح بمعنی برآوردن و پرکردن دیوار آمده؛ اما صاحب موید ا: ۴۴ ایراد نموده وگفته که آگنش بالفتح درست نیست زیراکه در مصدر الف ممدود است. واضحاً آگنش بمعنی عمل پرکردن باشد، غیرازینکه دیوار باشد یا چیزی دیگر، قید دیوار درست نیست. رک: فرهنگ معین ا: ۷۸

[65] آرش پهلوان کماندار بود از لشکر منوچهر پیشدادی، در آخر دورهٔ منوچهر قرار بران شد که دلاوری ایرانی تیری رها کند و هرجا که تیر فرود آید مرز ایران و توران باشد، پهلوان ایرانی از قلعهٔ کوه دماوند بقولی از آمل تیری بیفگند که از بامداد تا نیمروز برفت و بکنار جیحون، بقول مرو، فرود آمد و آنجا مرز شناخته شد، در اوستا ارخش (آرش) سخت کمان تیرشناخته شده است، رک: فرهنگ معین ج ۵ ص ۲۸. توضیح فرهنگ-نامه های فارسی مختلف است مثلاً رک: موید ا: ۴۳ و مدار ا: ۲۴

[66] در نسخهٔ اصل آزرخش غلط املائی است؛ آذر که درپهلوی آتر است بمعنی آتش است؛ صورت املائی دیگر این کلمه آدرخش است، رک: فرهنگ معین ا: ۳۶ - ۳۷

بهرهٔ "غ"

آزغ[1]: آنچ از درخت خرما برند و آزوغ بواو و آژغ نیز گویند، بزای پارسی.

آمیغ[2]: آمیخته.

آمرغ[3]: قدر و قیمت.

آروغ[4]: بادی که باداز پری جانب دهن آید.

انباغ[5]: مزاحم[6] زنی دیگر باشد که آنرا سوکن[7] گویند.

---

[1] در موید ۱: ۴۷ و مدار ۱: ۲۶، آزغ و آزوغ آمده، اما معین صورتهای زیر را بهمین معنی آورده: آزغ و آژغ، آزوغ و آژوغ، ازغ و ازگ، و ریشهٔ پهلوی Azg است.

[2] موید ۱: ۴۷ آمیغ آمیزش و آمیخته و بهمین دو معنی است در مدار ۱: ۰۷. اما در فرهنگ معین بمعنی آمیزش است، و بمعنی آمیخته فقط در مرکبات آید مانند نوشش آمیغ، غم آمیغ، گوهر آمیغ (۱: ۹۴)، اما در صحاح ۱: ۱۶۱ بمعنی آمیخته آمده.

[3] رک: فرس ص ۲۳۲، قواس ص ۱۹۵، صحاح ۱۶۱، و دیگر فرهنگها. و ازین بیت بوشکور در فرس و قواس و جهانگیری ۱: ۸۱ و رشیدی ص ۱۵۲ (و صحاح بنام کسائی) استشهاد شده:

ندانند دل آمرغ پیوند دوست ✤ از آنکه که با دوست کارش نکوست

[4] موید ۱: آرغ و آروغ و اروغ بمعنی بادگلو نوشته، اما بقول صاحب موید اصل لغت آروغ است، مدار ۱: ۲۴، آروغ و آرغ نوشته و باین دو بیت شاهد:

همیشه لب مرد بسیار خوار ✤ در آروغ بد باشد از ناگوار (سکندرنامه)

گیرد چو صبح آروغ از قرص آفتاب ✤ آنرا که تو بخوان کرم میهمان کنی (کمال اسماعیل)

در فرهنگ معین آروغ، آرغ، روغ، ورغ، آروق همهٔ اینها بمعنی بادگلو (۱: ۴۴-۴۵) و در صحاح ۱: ۱۶۱ فقط آروغ آمده و بدین دو بیت تمسک جسته:

اندر حکایت آمده بانگ شتر کند ✤ آروغها کند چو خورد ترب و گندنا (لبیبی)

ز امتلا چو قناعت همی زند آروغ ✤ ز خوان جود وی از بسکه خورده معدهٔ آز (کمال اسماعیل)

[5] بظاهر همریشهٔ انباز یا همباز است، رک: معین ۱: ۳۶۰

[6] بمعنی رنج دهنده، باعث زحمت؛ دستورالاخوان: الضرة بمعنی انباغ و المضرة بمعنی زن با انباغ آورده، ۲: ۸۱۶؛ اما واضح است که مزاحم مترادف انباغ نیست.

[7] سوکن و سوت هردو، رک: مدار ۱: ۲۸۴

آزیغ[1]: سردی که از کسی در دل افتد.
آنجوغ[2]: ترنجش[3] و ترنجیده و کوفته و گرفته روی و شکنج اندام، و انجوخ بمعنی نیز گویند

بهره ٔ ک

اکماک[4]: قی
اک[5]: آبله
آک[6]: آفت
[ورق ۱۸ ا] اشک: آب دیده و نمی که بر[7] زمین و گیاه نشیند.
اسک[8]: بَریدی یعنی قاصدی.
آتشک[9]: کرم شب تاب، و زحمتی است که خردگان را بر لب دمد.

---

[1] موید ا: ۴۷ آزیغ، مدار ا: ۲۶ آزیغ، رشیدی ذیل کلمهٔ زلیغ، آزیغ بازا درست و آریغ بارا غلط قرار داده؛ امامعین ا: ۲۵ کلمهٔ آریغ راکه از پهلوی aravkhā ماخوذ است بمعنی کراهت و نفرت وکینه صحیح دانسته و آزیغ را محرف قرار داده است. مدار: آزیغ بمعنی سردی که از کسی در دل افتد از سخن ناشایسته ، یا از دہشت و بغیر یا نیز.

[2] موید ا: ۴۷: انجوغ شکن اندام، گرفته روی و کوفته و ترنجیده؛ مدار ا: ۱۲۱: انجوغ و انجوخ را بهمین معانی آورده؛ اما صحاح ص ۶۲ انجوخ بمعنی آب دہان و شکن و چین که در روی و تن و پوست افتد، رودکی:

شدم پیر بدینسان و تو خود ہم نه جوانی ❊ مرا سینه پر انجوخ و تو چون چفته کمانی

شرفنامه و رشیدی ا: ۱۵۸ انجوخ و انجوغ ہر دو، معین ا: ۳۶۸ انجوخ و انخ و انجوغ و انجوغه از مصدر انجوخیدن بمعنی درہم کشیدن پوست بدن ... واضح ست که اصل کلمه انجوخ است و انجوغ تغییر صوتی و معنی گرفته روی مجازی است.

[3] اسم مصدر از ترنجیدن بمعنی سخت درہم کشیدن، گرفته شدن، درشت گشتن، چین بہم رسانیدن، رک: معین ا: ۱۰۷۳ و زفان بخش سوم؛ معین ا: ۳۶۸ انجوخیدگی بمعنی چین خوردگی.

[4] کذا است در موید ا: ۵۲، مدار ا: ۱۱۶، سروری ص ۵۸، اما قواس ص ۱۶۱. جہانگیری ۲: ۳، معیار جمالی: اکمال بمعنی قی و استفراغ، برہان ص ۱۵۵ اکماک و اکمال و ہمین است رشیدی ا: ۱۴۱، ۱۵۱.

[5] این کلمه بدین معنی دیده نشد؛ اما در ترکی اک بکسر بمعنی علت، کذا است در زفان بخش ہفتم (لغات ترکی)

[6] رک: قواس ص ۱۶۳ بدین بیت شاہد:

آکی نرسیده بر تو از من ❊ صد بار مرا ز تو رسد آک

[7] موید ا: ۵۲ این معنی بگفتهٔ زفان آورده.

[8] رک: موید ا: ۵۲، مدار ا: ۹۱.

[9] موید ا: ۵۱

اسپرک[1] : گیاہی است معروف کہ بدان جامہ را رنگ کنند

اتابک[2] : پادشاہ پارس را گویند.

اندیک[3] : باشد کہ.

اژدہاک : نام ضحاک[4] ماران.

آژیراک[5] : بانگ ستوران در جنگ ، و گویند بانگ ستوران.

بہرۂ گ

آونگ : رسنی کہ بدان خوشہ ہائی[6] انگور آویزند ، بتازی معلاق[7] گویند یعنی یلگنی.

---

[1] موید ۱ : ۵۲ ، مدار ۱ : ۸۳ : اسپرک را رنگ معروف زرریر دانند ؛ اما اسپرک گیاہی است کہ بعربی اکلیل الملک خوانند (موید ۱ : ۵۲) ؛ شاہسفرم و زرریر مترادف فارسی اکلیل الملک (۱ : ۱۵) بہندوی اسپرک و گھوی خوانند (ایضاً). البیرونی در کتاب الصیدنہ اسپرک را اکلیل الملک داند و اوّل الذکر را بگفتۂ الخشکی ہندی داند ـ عند الہند انہ اسبرک و ایضاً برنک ؛ وُاو اکلیل الملک را مترادف شاہ پسند و شاہ افسرمی داند و زریر و اسپرک را نیز مترادف می نویسد (رک : کتاب الصیدنہ ص ۶۳ ، ۲۰۲ ، ۳۸۸) ؛ ازین تفصیلات واضح است کہ اسبرک ، اسغرک ، اسپرک صورتہای مختلف است ، و این کلمہ در فارسی و ہندی یک شکل مشترک دارد یعنی اسپرک.

[2] اتابک کلمۂ ترکی ماخوذ از اتا = پدر ، بک = بزرگ ، و اتابک و اتابیک لقبی بود کہ از اوائل دورۂ سلجوقی بہ کسانی کہ مامور تربیت شاہزادگان بودند ، دادہ می شد ، و این اتابکان حمایت آن کودکان را برعہدہ می گرفتند و ہمین امر بتدریج موجب دخالت آنان در امور سیاسی می شد ، بعد از عہد ملکشاہ سلجوقی دستہ ای از اتابکان و امرای سلجوقی فرصت یافتند کہ ہریک در قسمتی از ممالک پہناور ترکمانان سلجوقی علم قدرت را بر افراختند و سلسلہ ہای اتابکان در خطہ ہای مختلف تشکیل دادند مانند اتابکان آذربائیجان ، اتابکان فارس ، اتابکان لرستان وغیرہ. رک : تاریخ ادبیات در ایران ۲ : ۲۶ ـ ۲۹.

[3] رک : موید ۱ : ۵۱ ، مدار ۱ : ۱۳۴.

[4] ضحاک معرب اژدہاک ، پادشاہ داستانی کہ پس از جمشید بہ سلطنت ایران پرداخت ، چون بر شانۂ او دو مار پیدا شدند او را ضحاک ماران گفتند

[5] رک : قواس ۱۶۷ ، موید ۱ : ۵۲ ، مدار ۱ : ۲۷

[6] در اکثر فرہنگہا تخصیص خوشہ ہای انگور است ، اما این درست نیست ؛ فرس ص ۲۸۷ : رشتہ ای کہ از و انگور و دیگر میوہ ہا بندند و آویزند ، رودکی :

چو برگ لالہ بودہ ام اکنون ٭ چو سیب پژمریدہ بر آونگم

[7] بگفتۂ موید ۱ : ۵۵ در ادات بدین معنی اورنگ آوردہ و در آخر گفتہ کہ عرب معلاق و ہند لگنی

آذرنگ[1]: بلاکی و رنج.

آهنگ: قصد و آواز.

افرنگ[2]: زیبائی و فرّ.

آژنگ[3]: بازای پارسی، شکنج روی و اندام یعنی چین روی و چین[4] دوگونه، و پیمانهٔ پای باشد، و گویند که این دوم بزای عربی است[5].

آزنگ[6]: میوه ایست.

اورنگ[7]: تخت بلند.

اوشنگ[8]: معلاق و آن آونگ است.

اوژنگ[9]: نام کتاب مانی در نقوش و اشکال.

← نامند، خود در موید کلمهٔ هندی الگنی.

[1] آذرنگ و آدرنگ هردو بمعنی بلاکی و آفت، اصلاً آذرنگ بود، بعداً بتحول زمانی بنابرحذف ذال معجمه آدرنگ شده، قواس ص ۱۶۲ و صحاح ص ۹۲ آذرنگ بمعنی دمار و هلاک و رنج، ابوشکور:

زفسر زند برجان و تنت آذرنگ ❊ تو از مهر او روز و شب چون نهنگ (صحاح)

[2] صحاح ص ۱۹۴: افرنگ زیبائی و نیکوئی، شهید:

ای از رخ تو تافته زیبائی و افرنگ ❊ افروخته از طلعت تو مسند اورنگ

[3] فرس ص ۲۵۹، قواس ص ۸۱، صحاح ص ۱۹۲: آژنگ شکنج روی و چین پیشانی، اما دستور ص ۷، موید ا: ۵۴، مدار ا: ۸۱ اژنگ بالفتح.

[4] موید ا: ۵۴ همین معنی از روی ادات دارد.

[5] شاید منظورش این باشد که برای معنی دوم آزنگ بزای عربی.

[6] موید ا: ۵۴ اژنگ بمعنی میوه بحوالهٔ زفان گویا آمده؛ اما درهمین فرهنگ آژنگ و اژنگ بمعنی شکنج روی نوشته.

[7] کذاست در مدار ا: ۱۴۴، اما اکثر فرهنگها بمعنی تخت و تخت شاهانه.

[8] سروری ص ۶۲ و برهان ص ۱۸۶: اوشنگ و آونگ و ونگ؛ موید ا: ۵۵ ذیل اونگ نوشته: در ادات بدین معنی اورنگ ... که عرب معلاق و هند تلگنی؛ قواس ص ۱۳۵: اوشنگ اورنگ؛ موید ا: ۵۵، مدار ا: ۱۴۶: اوشنگ اورنگ. پس واضح نیست که اورنگ بمعنی آونگ یا اورنگ تصحیف آونگ است.

[9] نام کتاب مانی بصورتهای مختلف مانند ارژنگ، ارتنگ، ارسنگ، ارثنگ، ارجنگ، ارونگ، اژنگ است، رک: فرس ۲۶۱، صحاح ۱۹۲، قواس ص ۱۱، دستور ص ۱۶، موید ا: ۵۵، معین ۵: ۱۱۵ وغیره. اما بصورت ←

استرنگ[۱]: مردم گیا و آن گیاهی است برصورت مردم تمام، در زمین چین روید، هرکه ازآن برکند بمیرد[۲].

بهرۂ ل

اوژول[۳]: شتاب، و بفتح همزه نیز گویند.

آخال[۴]: سقط یعنی افگندنی.

آجل[۵]: اروغ

آغال[۶]: تیز کردن و تضریب[۷] و فر.

اسپغول: معروف است.

آمل: نام شهری.

بهرۂ م

آزرم[۸]: انصاف و جانب حق نگاهداشت و داد و شرم[۹].

← اوزنگ دیده نشد. بظاهر تصحیف و تحریف ارژنگ است.

۱ در حاشیۂ نسخۂ اصل افزوده: استرنگ مردم گیا که آنرا یبروج نیز گویند، هندوی آنرا لکمیا ولکمنا لک دهانا... گویند. فرس ص ۲۶۷، قواس ص ۵۴، صحاح ص ۱۹۳ استرنگ بالفتح بهمین معنی، عسجدی:

هند چون دریای خون شد چنین چو دریا بار او ❊ زین قبل روید بچین برشبه مردم استرنگ

اسدی، گرشاسپ نامه ص ۱۶۹:

همه خاک او نرم چون توتیا ❊ برو مردمی رسته همچون گیا

سرو روی و موی و تن و پا و دست ❊ چو اندام مردم بر اینسان که هست

هم ازآن گیاهای بابوی و رنگ ❊ شناسنده خوانده ورا استرنگ

۲ برای حصول آن گیاه و تاثیر آن، رک: صحاح ص ۱۹۳.

۳ کذا است در موید ۱: ۵۹، اما قواس ص ۱۶۷ بازای عربی.

۴ صحاح ص ۲۰۲: آخال سقط باشد یعنی افگندنی.

۵ معین ۱: ۳۲: آجل بادی که باصدا از گلو برآید، آروغ، آرغ.

۶ در موید ۱: ۵۸ آغال بمعنی تیز کردن و تضریب و فر بحوالۂ زفان. در اکثر فرهنگها معنی آغال تیز کردن برکاری، رک: صحاح ۱: ۲۰۴؛ مدار ۱: ۳۲ برشورانیدن کسی را، و بهمین معنی برای مصدر آغالیدن است (رک: زفان گویا بخش سوم). پس آغال بمعنی آغالش باشد چنانکه معین ۱: ۶۷ دارد اما در زفان آغالش بمعنی شورش و آغال بمعنی تیز کردن الخ ۷ صراح ص ۴۰ چاپ کانپور ۱۲۴۵: تضریب برآغالیدن. ۸ قواس ص ۹۷: آزرم عدل و انصاف. ۹ برای این معنی رک: موید ۱: ۶۳ بحوالۂ زفان.

استیم : ریمی که[1] از جراحت چون فراهم آید درون پر شود ، ستیم[2] نیز گویند.

اوستام[3] : معتمد.

انجام : عاقبت کار

اشتلم[4] : ستم و چیزی بزور ستدنی و بی همزه[5] نیز گویند.

اسپرغم[6] : ریحان و بی همزه[7] نیز آمده است.

آدرم[8] : معروف ، از ان پشم می سازند.

بهرهٔ ن

آئین : رسم.

آبان[9] : آفتاب درعقرب ، آبان ماه گویند ، و یازدهم روز از ماه.

انگدان : بسباس و آن بسباس جابتری است ، والان[10] و انگزد[11] است ، و گویند انگذان[12] بذال معجمه درخت انگدان است ، بتازی انجدان گویند.[13]

---

[1] موید ۱ : ۶۴ معانی مذکور در زفان بحوالهٔ لسان الشعراء نوشته. اما رک : صحاح ص ۲۱۵.

[2] رک : موید ۱ : ۴۹۸. نیز صحاح ایضاً.

[3] رک : موید ۱ : ۶۴ ، مدار ۱ : ۱۴۹ ، و درصحاح ص ۲۱۵ بمعنی معتمد و نیز بمعنی لگام ، آمده

[4] نسخهٔ اصل : اسثم ، رک موید ۱ : ۶۴ و مدار ۱ : ۹۶

[5] رک : مدار ۱ : ۱۴۹ و موید ۱ : ۵۲۸

[6] رک : موید ۱ : ۶۴

[7] رک : ایضاً ۱ : ۴۹۸

[8] در فرهنگ معین ۱ : ۳۶ آدرم وآدرمه ، آذرم وآذرمه بمعنی نمدزین و درفش وشمشیر و تیر و کمان آمده. اما آنچه در زفان گویا آمده از هیچ فرهنگ تایید نمی یابد.

[9] موید ۱ : ۶۷

[10] والان دارویست و آن بر دوگونه می شود. والان بزرگ را بتازی رازیانج و هندوی سونپ (سونف) گویند و والان خرد را بهندوی سوی (سویا) و بتازی شبت نامند (زفان گویا ذیل والان) نیز موید ۲ : ۲۵۵. اما انگدان بدین معنی بهیچ فرهنگها دیده نشد.

[11] انگزد و انگوزه و انگدان هندش هینگ وتازی حلتیت ، رک مدار ۱ : ۱۲۷ ، در فرهنگ معین ۱ : ۳۸۹ ، انگدان بمعنی بسباس یعنی جابتری نیز آید ، رک : ایضاً و دربعض فرهنگها بسباس را نسناس خوانده است و این خنده آور است (رک : موید ۱ : ۸۴)

[12] انگدان وانگذان تفاوت املائی است. درمعنی هیچ تفاوت ندارند.

[13] رک : موید ۱ : ۸۴ و مدار ۱ : ۱۳۰

انجمن : گروهی از خلق.
آهرمن: ممدود[۱] و غیر ممدود، دیو[۲] و نیز گویند دیوی که[۳] بالا رود، و شهاب وی را بزند و بسوزد و گویند دیو مطلق.[۴]
ارمان[۵]: حسرت، گویند ارمانخوار[۶] یعنی حسرت خوار.
ایرمان[۷]: چیزی عاریت.
آهون[۸]: نقب یعنی شقی که در زمین باشد.
ایوان: صفه[۹] و طاق و نشستنگاه و جایگاه بلند، بکسر همزه نیز (ورق ۱۹) گویند.
ایران: نام ولایتی که برین طرف آب آمون است، در بخش ایرج پسر فریدون آمده بود.
آمون:[۱۰] پُر، و نام دریائی[۱۱] است که میان خراسان و ماوراء النهر[۱۲] است، زیر

---

[۱] شکلهای مختلف این واژه: آهرمن، آهرامن، آهریمه، آهریمن، اهریمن، اهرامن، اهرن، آهرن، اهریه است (فرهنگ معین ۱: ۲۰۹)
[۲] در آئین زردشتی اهرمن منشأ بدی، زشتی، پلیدی، تاریکی جهل و ستم و در آئین اسلام وی معادل شیطان و ابلیس است. (فرهنگ معین ۵: ۲۰۳)
[۳] قواس ص ۱۱۴: اهرمن دیو بود که ببالا رود، شهاب ادرا بزند و بسوزد الخ. مؤید ۱: ۷۴، گفتهٔ زفان گویا عیناً نقل کرده است
[۴] صحاح ص ۲۳۰ آهرمن: دیو باشد.
[۵] رک: فرس ص ۳۶۶ و صحاح ۲۳۰؛ قواس ص ۹۲: ارمان خور: حسرت خوار؛ ارمان: حسرت
[۶] گذاشت در مدار ۱: ۷۶، اما قواس و مؤید ۱: ۳۴: ارمان خور.
[۷] قواس ص ۱۳۲: سپنج و ایرمان: خانهٔ عاریت، ص ۶ ایرمانخانه و سرای سپنج: این جهان الخ.
[۸] رک: فرس ص ۳۶۲، صحاح ص ۲۳۰، قواس ص ۹۳.
[۹] سم بمعنی سمج، معین ۲: ۱۹۱۶.
[۱۰] عیناً همین معنی در قواس ص ۱۱۷ یافته می شود.
[۱۱] رک: معین ۱: ۹۳
[۱۲] آمو نام قدیمی رود خانهٔ جیحون است که از کوههای شمال افغانستان (پامیر) سرچشمه گیرد و سابقاً بدریای خزر می ریخته ولی امروز مصب آن دریاچه ارال است، طول آن ۲۶۵۰ متر می باشد. (معین ۵: ۶۱)؛ باید علاوه نمود که آموی و جیحون هر دو نام در سابقاً متداول بوده است. رک: تاریخ بیهقی و زین الاخبار ذیل نامهای آموی و جیحون.
[۱۳] در کتب تاریخ و ادب فارسی نام رودخانه بعلاوهٔ جیحون آمو و آموی و آمویه می آید؛ آمون فقط در بعضی فرهنگهای فارسی آمده، مانند مدار ۱: ۳۶.

ترمذ[1] و خوارزم[2] می رود ، و آمو بغیر نون نیز گویند.

ارغنون : سازی است رومیان[3] را ، وگویند جمع مزامیر[4] را گویند و ارغن[5] هم استعمال کرده اند.

آذین[6] : آرایش ، وگویند قبه[7]ها باشد که در شهر بندند ، بدان شهر و سرایها بیارایند.

ایدون : اکنون و این[8] چنین ، وبعضی بکسر[9] همزه گویند.

آفرین : ستایش وتحسین و آفریننده[10] :

بنام جهانداجان آفرین حکیم سخن در زبان آفرین

اردن[11] یا اورن[12] : یعنی تنگ[13] بیز ، با مد نیز گویند.

انگلیون : نقش[14] و گویند کتاب ترسایان است.

---

1. شهری در ماوراءالنهر در نزدیکی ساحل رود جیحون ، امام ترمذی جامع ترمذی از همین جا بوده ، امروز جزو جمهوری تاجیکستان شوروی است.
2. خوارزم یا خیوه شهری در آسیای مرکزی از بکستان ، پای تخت قدیم حکومتی نیرومند. (معین ۵ : ۴۹۱).
3. همین است در قواس ص ۱۹۰ ، صحاح ارغنون سازیست که مغنیان نوازند ؛ نیز رک : دستور ص ۶۰.
4. جمع مزامیر مثل رباب ، چنگ ، بربط ، طنبور (موید ۱ : ۷۷)
5. رک : موید ۱ : ۷۷ ، مدار ۱ : ۷۴ ؛ معین ۱ : ۳۰۲ ارغن و ارغنن.
6. آذین و آئین از ریشهٔ Advēn و Advēnak (پهلوی) بمعنی زیب و زینت ، رسم و قاعده (معین ۱ : ۳۸) ، و درفرس ص ۳۸۳ ، قواس ص ۱۹۵ بمعنی آرایش و آئین (قواس ایضاً) بمعنی رسم آمده.
7. رک : مدار ۱ : ۲۳.
8. قواس ص ۱۹۵ ؛ همچنین.
9. رک : موید ۱ : ۸۷.
10. رک : موید ۱ : ۷۳
11. این از بوستان سعدی است در حاشیهٔ نسخهٔ اصل بخط کاتب نسخه افزوده شد.
12. این واژه شامل فرهنگهای قدیم مانند فرس و قواس و صحاح و دستور نیست ؛ اما رک : سرمهٔ سلیمانی ص ۸۱ اردن و آردن کفگیر بود و آنرا پالون و پالادن گویند و پالوانه نیز گویند.
13. این صورت در فرهنگها دیده نشد.
14. رک : همین فرهنگ ص ۹۱ ذیل پالاوان.
15. در مدار ۱ : ۱۳۹ این واژه بهردو معنی آمده ، اما در صحاح ص ۲۳۱ بمعنی کتاب ترسایان درج شده و بدین بیت سنائی تمسک جسته شده :

تا دم عیسی چلیپاگر شد اکنون بلبلان ❊ بہر انگلیون سرایدن بترسائی شدند

در موید ۱ : ۸۵ این واژه ، بمعنی های مختلف مانند کتاب نصاری و کتاب مانی نقاش و بوقلمون آمده. فرهنگ معین ۵ : ۱۹۰ انگلیون [شکل مانوی ماخوذ از یونانی euyyelion مژده بشارت ، همریشهٔ انجیل . معرب]

۱. انجیل ۲. نام کتابی از مانویان الخ.

ارغوان: نام[1] گلی است سرخ و گویند گیاهی است لعل.
ارزن: نام غله ایست یعنی چینه[2].
آبشتن[3]: نهفته جای.
اسالیون[4]: تخم کرفش[5]، کوهی است که بتازی فطر[6] گویند.
ایذان[7]: سزاوار و مستحق و خاندان[8].

---

[1] در اکثر فرهنگها این کلمه بمعنی درخت است که گل او سرخ باشد مثلاً رک: صحاح ص ۲۳۰. و فرهنگ معین ۱: ۲۰۲ بمعنی درختی نوشته که برای زینت هم کاشته می شود؛ ارغوانی، برنگ ارغوان، سرخ مایل بنفش الخ. در موید ۱: ۷۷ بمعنی های افسوس وحسرت، چیز عاریتی، نام شهری در ایران، نام گلی، نام گیاهی، اما صحیح درختی است که شاخهای باریک دارد، در بحر الفضائل بمعنی گلی و سازمطرب نوشته؛ بظاهر درین فرهنگ، در ارغوان و ارغنون التباس شده.

[2] این واژهٔ هندوستانی در فرهنگهای دیگر مانند بحر الفضائل و موید درج شده.

[3] موید ۱: ۶۹ آبشتن بمعنی نهفتنی و جای عزمی و نهفته الخ. و آبشتنگاه بمعنی قدم خانه و خلوت خانه و بگفتهٔ ادات بمعنی جای نهفته و قدم جای و محل پنهان شدن آورده؛ و در قواس ص ۱۲۷ و صحاح ص ۲۶۱ آبشتنگاه بمعنی خلوت گاه آمده؛ در فرهنگ معین ۱: ۱۹ آبشتن بمعنی نهفتن و پوشیده داشتن نوشته شده؛ در زفان گویا آبشتنگاه بمعنی خلوت خانه آمده؛ آبشتن مصدر است، اما در زفان این مصدر شامل بخش سوم (مصادر) نیست؛ در هر حال بمعنی آبشتن، نهفتن و پوشیده داشتن است؛ اما نهفته جای فقط در یکدو فرهنگ دیده شد.

[4] کذاست در موید ۱: ۷۹، مدار ۱: ۸۲.

[5] موید و مدار: کرفس؛ اما کرفس و کرفش هر دو صورت صحیح است رک: هدایة المتعلمین ذیل کرفس و کرفش.

[6] موید و مدار: سعتر اما موید ۱: ۸۶ اوداسالیون یونانی کرفس کوهی را گویند و تخم آن را فطراسالیون خوانند؛ رک: هدایة المتعلمین ذیل فطراسالیون.

[7] موید ۱: ۷۵: ایذان بالفتح با ذال معجم خاندان و دودمان و سزاوار و مستحق و خبر دادن؛ این کلمه در فرهنگها غیر از موید دیده نشد؛ اما معنی اخیر که در موید است معنی واژهٔ ایذان عربی است نه فارسی؛ در مدار ۱: ۱۵۱ معنی ایذان عربی آگاهانیدن آمده، و این کاملاً صحیح است.

[8] نسخهٔ اصل خانه دان.

اکسون[۱]: جامه‌ایست ابریشمی.
آدیشن[۲]: گیاهی است که بزلفی ماند، بتازی سعتر گویند.
آرون[۳]: صفتهای خوب.
افسون: کلماتی که معزمان وساحران دپچشکان[۴] درکار بندند در حصول اغراض خویش.
انیران[۵]: نام ولایتی از ترک.
اران[۶]: نام ولایتی است.
ارسن[۷]: نام شهری.
آبسکون[۸]: نام دریائی است.
انبان[۹]: آوندی که دران هرچیزی کنند.

---

[۱] اکسون بمعنی نوعی از دیبای سیاه نیز آمده، و در زفان ازین معنی صرف نظر شده. حال آنکه در فرهنگها این معنی درج است، مثلاً رک: صحاح ص ۲۳۱، موید ۱: ۸۲، درصحاح این بیت شاهد آمده:
برسم خدمتی اندر پی جنیبت تو ٭ فگنده دهر ز روز اطلس وز شب اکسون

[۲] رک: موید ۱: ۷۰، مدار ۱: ۳۹، فرهنگ معین ۱: ۱۰۳.

[۳] رک: موید ۱: ۷۱، ۷۶؛ بظاهر درآنجا اردن و آردن است. [۴] بمعنی پزشک، رک: موید ۱: ۲۰۸

[۵] اگرچه این واژه بدین معنی در فرهنگها دیده نشد اما در فرهنگ معین ۱: ۳۹۶ انیران بمعنی غیرایران وخارج از ایران آمده؛ انیران نام ایزداست در دین زردشتی، و نام روز سی ام است از هرماه شمسی نه نام روز سوم چنانک در مدار ۱: ۱۴۱ هست.

[۶] سرزمینی درشمال غربی ایران ومغرب بحرخزر در قفقاز که اکنون آذربائیجان شوروی است، شهرهای عمدهٔ آن باکو، گنجه، شماخی وغیره است (فرهنگ معین ۵: ۱۱۴)

[۷] این واژه بدین معنی دیده نشد؛ و در فهرست چاپی هم نیامده ممکنست ارمن باشد.

[۸] آبسکون جزیرهٔ برساحل طبرستان که تاگرگان تقریباً ۲۴ فرسنگ فاصله دارد، دریای خزر رابمناسبت نام این جزیره دریای آبسکون گویند، آسکون (فرهنگ معین ۵: ۴)

[۹] بمعنی کیسهٔ بزرگ، همیان، ونیز پوست بزغالهٔ خشک کرده که قلندران درمیان بندند و ذخیره درو نگاه دارند؛ مشهوراست که حضرت ابوهریرهؓ از صحابهٔ پیغمبر صلی الله علیه وسلم انبانی داشت که درآن نان خشک می نهاد و هیچ گاه آنرا از خود دورنمی کرد و آنرا انبان ابوهریرهؓ می گویند. (فرهنگ معین ۵: ۹۶)، سنائی گوید.

بوهریره وار یاری باید اندر اصل وشرع ٭ گاه دل در دین وگه دست اندر انبان داشتن

نیز رک: دیوان سراجی ص ۸۴ و تعلیقات.

آخشیجان[1]: عناصر اربعه اند و امهات سفلی نیز گویند.

آشیان: خانهٔ پرنده.

آذرهمایون[2]: نام ساحرهٔ سپاهان.

افغان: گریه با آواز.

اردوان[3]: نام پادشاهی.

بهرهٔ 'و'

ارغاو[4]: جوی آب

اشتو[5]: انگشت، بعضی بفتح گویند.

انزرو[6]: پازهر.

آمو[7]: پُر.

آهو[8]: عیب (را) گویند، آهوگیران[9] یعنی عیب گیران.

---

[1] رک: موید ۱: ۷۰، دراین فرهنگ این هر دو معنی بگفتهٔ قنیه آورده؛ و نیز رجوع کنید: آخشیج درهمین لغت (زفان گویا).

[2] رک: مدار ۱: ۲۲.

[3] نام پنج تن از پادشاهان اشکانی (رک: فرهنگ معین ۵: ۱۱۹).

[4] نسخهٔ اصل: اوغاو؛ متن تصحیح قیاسی؛ کذاست در قواس ص ۲۶، جهانگیری ۱: ۳۰۳، رشیدی ص ۹۰ اما در دستور الافاضل و بحر الفضائل: ارغا؛ در مدار ۱: ۳۱، ارغا و ارغاف و ارغام و ارغاو بمعنی آب جوی آمده. در فرهنگ معین ۱: ۲۰۲ ارغا و ارغاب و ارغاو آمده و از ارغاف صرف نظر شد و ارغام بمعنی دیگر درج شده.

[5] رک: قواس ص ۸۴، موید ۱: ۸۹، مدار ۱: ۹۶، برهان ۱: ۱۳۸، مجلهٔ تحریر دهلی ص ۴۷ ببعد.

[6] رک: موید ۱: ۸۹، مدار ۱: ۱۳۶.

[7] آمو از مصدر آمودن بمعنی پر کردن.

[8] صحاح ص ۲۹۳ و مدار ۱: ۴۱ آهو بمعنی عیب و فریاد نوشته؛ و در اکثر فرهنگها بمعنی عیب آمده، در جهانگیری ۱: ۸۷ شاهد معنی عیب بیت زیر از خاقانی آمده:

دیدی آن جانور که زاید مشک ÷ نافش آهو و او همه هنر است

[9] قواس ص ۱: ایزد تعالی در کار این پی روی از کاهش آهوگیران الخ. نیز رجوع کنید مقدمهٔ فرهنگ حاضر.

اوسو[۱]: ربایش یعنی ربودن، وبعضی بشین معجمه گویند.

آرزو: کشش خاطر.

انگشتو[۲]: طعامی است، گویند مالیده.

آلو[۳]: میوه ایست.

بهرهٔ (ه)

آمه[۴]: دوات

ایارده: تفسیر زند[۵]، و نیز گویند از صحف[۶] منزل است.

آفسته[۷]: مشنگ[۸] زیرزمین که آنرا بتازی سعد خوانند و بهندوی موتهه، و بعضی بفتح نون گویند.

آسه[۹]: کشت و زراعت.

---

۱ - موید ا: ۹۰ اوسو بالفتح والضم ربوده و ربایش وبعضی بشین معجمه گویند و بمعنی ماتم وعزا و ا: ۸۹ اسو بمعنی ربودن و ربایندگی و ربایش، مدار ا: ۹۴ اسو بفتح وضم همزه ربودن و ربایش ونیل بشین معجمه، در شرفنامه اوسو با واو است. معلوم نشد که اوسو و اسو چطور اسم مصدری واقع شده، در سرمهٔ سلیمانی ص ۲۰ اُوسو بمعنی ربودن است.

۲ - رک: قواس ص ۱۴۴، موید ا: ۸۹، مدار ا: ۱۳۸، برهان ص ۱۷۷.

۳ - رک: موید ا: ۸۸ و مدار ا: ۳۶.

۴ - قواس ص ۹: آمه و خوالستان دوات، نیز رک: دستورالافاضل ص ۶۴.

۵ - قواس ص ۱۲ و صحاح ص ۲۶۳: تفسیر پازند؛ امافرس ص ۴۷۵: ایارده بمعنی پازند است و پازند تفسیر زند و اوستاست.

۶ - رک موید ا: ۱۰۲.

۷ - رک: قواس ص ۱۲، موید ا: ۹۸، مدار ا: ۳۸ در هر دو فرهنگ اخیر همان معانی بامترادف عربی و هندی آمده.

۸ - زفان: مست مشنگ زیرزمین که هندوی موتهه، برای مست رک: قواس ص ۴۲، دستور الافاضل ص ۲۲۹ مشت و البسته؛ مشنگ زیرزمین، زمخشری سعد بمعنی مشنگ زیرزمین نوشته (پیشرو ادب ا: ۲۲۷).

۹ - رک: قواس ص ۵۵، موید ا: ۹۷ آسه کشت راست کرده بجهت زراعت و در ادات بدین معنی آسته آورده و در دستورالافاضل استه، به سرمهٔ سلیمانی آسه و آبسته.

آشتینه[1]: بیضهٔ مرغ.
آگشته[2]: در محکم بسته.
آغشته: [ورق ۱۰ آ] آلوده و ترکرده و زمین بود[3] آب داده.
ایشه[4]: جاسوس کردار، و در فردوسی است ممدود جاسوس [......[5]] ساخته باشد
اسغده[6]: هیزم نیم سوخته و بلغتی ممدود[7] است.
استوه[8]: تنگ آمده و کاهل گرفته و بی همزه[9] نیز گویند.
انیسه[10]: سیاهی و هرچه آبگین بسته شود و بدشواری حل گردد.
آسمانه[11]: سقف.
آسیمه[12]: شیفته و خیره و شوریده گویند، سراسیمه یعنی سرشوریده مغز.

---

[1] دستور ص ۷۷ آستینه بیضهٔ مرغ. موید ۱: ۹۶ آستینه در فارسی بیضهٔ مرغ و قیل باشین معجمه، اما مدار ۱: ۲۹ آستینه، فرهنگ معین ۱: ۵۸ آستینه و آسینه و استینه هر سه بمعنی تخم مرغ.
[2] موید ۱: ۹۷ آگسته، ممدود و مکسور، در محکم بسته؛ مدار ۱: ۲۴ آگشته بمعنی در محکم بسته (و آغشته نیز)؛ اما دکتر معین آگستن و آگستن بمعنی بستن و محکم کردن (بدون قید در) آورده (فرهنگ ۱: ۷۷).
[3] برای این معنی رک: موید ۱: ۹۷
[4] کذا است در اکثر فرهنگها، مانند فرس و دستور ص ۷۲ و ادات و بحر الفضائل؛ اما در قواس ص ۱۰۹ البسته و شرفنامه نیز البسته؛ صحاح ص ۲۶۲ انیشه و ابیشه؛ موید ۱: ۹۹ آیشه بمعنی جاسوس و جاسوس کردار و در شرفنامه بمعنی چاپلوس، ۱: ۱۰۲ ایشه بوزن شیشه جاسوس کردار و چاپلوس کذا فی الادات و الشرفنامه و لسان الشعرا، برای آگاهی بیشتر برای معانی و قرائت مختلف این واژه رک: لغتنامهٔ دهخدا و مجلهٔ تحریر، دهلی، ص ۲۳-۲۸.
[5] اصل ناخوانا.
[6] رک: موید ۱: ۹۶، ۱۰۰.
[7] در موید بهر دو صورت یافته می شود.
[8] رک: موید ۱: ۱۰۰، مدار ۱: ۸۸، استوه و ستوه و استه و سته را مترادف قرار داده.
[9] رک: موید ۱: ۵۱۱؛ زفان گویا ستوه را بمعنی ناخوشی طبع نوشته. و صحاح ص ۲۸۰ استوه بمعنی خسته و عاجز. معین استوه، ستوه، سته سه صورت نوشته (فرهنگ معین ۱: ۲۶۲).
[10] موید ۱: ۱۰۲ انیسه بالفتح مداد و هرچیز بسته که بدشواری حل گردد و آنرا انیشه نیز گویند کذا فی شرفنامه، الخ. صحاح ص ۲۶۲ انبسته چیزی باشد چون مداد و خون که بسته باشد و حل نشود.
[11] کذا است در موید ۱: ۹۶
[12] صحاح ص ۲۰۱: آسیمه متحیر و مدهوش و شیفته؛ مدار ۱: ۳۰ آسیمه متحیر و شوریده سر و دیوانه مزاج.

آگنده : پُرکرده و آخر اسپان.[1]

انچیره[2]: درِ کون را گویند ، بعضی حسّیم[3] عربی گفته اند.

اوسه : ربایش[4] ، وبضم همزه نیز گفته اند.

انبره[5]: اشتر آبکش ، و گویند اشتر آسیاکش[6] وشتر بود که از رنج بارکشیدن موی ریخته بود ، پوستش بی مو شده ، وشکم[7] را انبره گویند و درّهٔ کوه ، وبضم با نیز گویند.

اهیانه[8]: کاسهٔ سر و بعضی کام را گویند ، آنک بهندی آنرا تالو[9] خوانند .

افکانه[10]: بچه ای که از شکم برود از آدمی وچهارپای ، وبغیر همزه وبکسر فا نیز گویند.

آشفته : دیوانه.

انوشه : باهمزهٔ مفتوح و نون مضموم و واو ساکن وشین منقوط ، پادشاه نو وجوان[11]،

---

[1] صحاح ۲۶۱ : آگنده بضم گاف اصطبل و آخور باشد ، ابوالعباس گفت :
روز به آگنده شدم یافتم ❊ آخور چون پاتلهٔ سغلگان
چون آگنده بمعنی پرکرده بافتحهٔ گاف است معنی آن آخور نباشد ، اما در موید ۱ : ۳۵ آگنده وآغنده هردو معنی پرکرده و آخور اسپان ؛ نیز رک : موید ۱ : ۹۷.

[2] رک : فرس ص ۴۵ ، قواس ص ۸۹ ، صحاح ص ۲۶۲ ، موید ۲ : ۱۰۱.

[3] کذاست درفرس و قواس وصحاح و مدار.

[4] مدار ۱ : ۱۴۶ اوسه بفتح وضم ربایش وبضم وباشین معجمه گیاهی است که کمان گران بکار برند؛ موید ۱ : ۱۰۲ اوسه بالفتح والضم ربایش ، اوشه بالضم وباشین گیاهی الخ کذا فی زفان گویا؛ اما در نسخهٔ حاضر این توضیح ندارد.

[5] رک : صحاح ص ۲۶۲ ، قواس ص ۷۴.

[6] موید ۱ : ۱۰۱ ، شرفنامه اشتر آبکش و ادات آسیاکش ، نیز رک : مدار ۱ : ۱۲۸.

[7] رک : موید و مدار .

[8] رک : قواس ص ۷۸ ؛ اما موید ۱ : ۹۸ ؛ مدار ۱ : ۴۲ : آهیانه بمعنی کاسهٔ سر و کام آورده.

[9] این واژهٔ هندی در موید و مدار درج شده.

[10] رک : قواس ص ۶۸ وصحاح ص ۲۶۲ ، اما فرس ص ۴۸۷ : فکانه . در موید ۱ : ۹۷ آفگانه و ۱ : ۱۰۱ افگانه بهمین معنی .

[11] قواس ص ۹۸ پادشاه بودجوان ، اما در دستور ص ۶۴ انوشه پادشاه نو وجوان ، ص ۷۵ انوشه نام عورتی که عزهٔ شاپور در ولایت اصطرخ ؛ و در بحرالفضائل انوشه شامل هردو معنی است . در موید ۱ : ۱۰۲ است که بمعنی اخر واژه انوشه است نه انوشه ، سرمهٔ سلیمانی : پادشاه جوان.

ونیز گویند خوشا او را[۱] یعنی طوبی[۲] له.

ایفده[۳]: بیهوده گوی وسبکسار.

آواره[۴]: دیوان وحساب و دورشدن از جای.

آماره: همان آواره است.

ارزه: کاه‌گل، و نام درختی است که چلغوزه[۶] میوهٔ اوست.

آماده: ساخته و پرداخته.

آموده: آراسته و تمام آمیخته و پرکرده.

اَزده[۷]: رنگ کرده، و آزده ممدود با زای فارسی نیز گویند.

امنه[۸]: پشتوارهٔ هیزم.

اخسمه[۹]: گویند [شرابی که از جو[۱۰] و ارزن سازند.]

---

۱ در موید این معنی عیناً از ادات الفضلا نقل شده.

۲ قرآن سوره الرعد آیه ۲۹: طُوبَىٰ لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ، سرمهٔ سلیمانی: فرخا... طوبی لك.

۳ رک: فرس ص ۴۸۸، قواس ص ۱۰۹، صحاح ص ۲۶۳، موید ۱: ۱۰۲ باید علاوه نمود که در قواس وصحاح وموید و مدار معین کلمات زفان گویا مندرج ست.

۴ رک: موید ۱: ۹۸ و مدار ۱: ۳۸.

۵ رک: موید ۱: ۹۸.

۶ نسخهٔ اصل: چلوارکرده میوه ایست؛ متن بر طبق ادات وموید ۱: ۹۹، مدار ۱: ۷۲.

۷ موید ۱: ۹۶ آزده، ممدود ومقصور، رنگ کرده و نیز بمعنی خلانیدن سوزن و امثال آن آید الخ؛ معین: آزدن، آژدن، آزیدن، آژیدن، آجیدن بمعنی فرو بردن سوزن در چیزی و خلانیدن سوزن و مانند آن آورده؛ اما زفان گویا بخش سوم ازیدن مصدر بمعنی رنگ کردن دارد، بهمین مناسبت ازیده بمعنی رنگ کرده؛ و باید ازدن وآزدن مصدر باشند.

۸ مدار ۱: ۳۷ آمنه و اُمنه بمعنی پشتوارهٔ هیزم موید بدین بیت:

هزار آمنه هیزم زکوه خشک همه

نهاده اند به انبار من چو انبارم

و در صحاح ص ۲۶۲: امنه بمعنی تودهٔ هیزم شگافته آمده.

۹ شکلهای دیگر این واژه آخشمه و اخشمه و آخمه و آخشه و اخسمه است. رک فرهنگ معین ۱: ۳۵

۱۰ دراصل نیامده، اضافهٔ قیاسی، رک: شرفنامه و موید ۱: ۹۵

انچه[۱] : مهر درم.
انگوژنه[۲]: گویک گریبان یعنی ماده جوزگره.
انگله[۳] : جوزگره یعنی از آنک گویک درو کنند در پیراهن [و] فرجی و قبا.
اژینه[۴] : آسیازنه یعنی آلتی که بدان آسیارا دندانه راست کنند، و در فرهنگ[۵] نامه
اژینه منشار آسیا.
انگشبه[۶] : برزگری[۷] پرمایه و صاحب خدمتکاران و بعضی انگشته بتا گفته اند که باسرمایهٔ نیک
بود و رهیان و کارکنان بسی دارد.
آغاذه[۸] : نوعی از ساز[۹] [ورق ۱۱ ا] کفش گران.
آغروده[۱۰]: جامهٔ تنگ و تازه.[۱۱]

---

۱ مدار ۱ : ۶۲ انچه مهر و درم [کذا] که از نقره و زر سازند؛ موید ۱ : ۹۹ انچه مهر زر و نقره کذا فی شرفنامه وفی القنیه مهریست سیمین ؛ فرهنگ معین ۱ : ۱۷۰ ریزهٔ زر ، سکهٔ زر و مهر درم ، مطلق زر و سیم ، روپیه.

۲ قواس ص ۱۵۴ انگوزنه و جوسک : گویک گریبان ؛ زفان جوسک : گویک گریبان ، موید ۱ : ۹۹ انگوژنه همان انگلهٔ مذکور یعنی زه گریبان و گویک گریبان و تکمهٔ کلاه و در ادات جوزگره.

۳ صحاح ص ۲۶۳ انگله بند باشد که بر گریبان پیراهن و فرجی و قبا نهند الخ.

۴ موید ۱ : ۹۶ آژینه منقار آسیا که بدان دندانهٔ آسیا تیز کنند و آنرا آسیازنه نیز نامند.

۵ مراد فرهنگ قواس است ، رک : نسخهٔ چاپی ص ۱۷۹.

۶ موید ۱ : ۱۰۲ انگشبه بالفتح و بالکسر کاف فارسی ، آن مزارع که خدمتگاران بسیار دارد کذا فی الشرفنامه فی الادات ایضاً و قال فی لسان الشعرا انگشته مزارع پرمایه ، اقول در نسخهٔ شرفنامه و ادات بعد شین بای ابجد مرقوم است و در لسان الشعرا تاء قرشت. درمیان فرهنگ نویسان دربارهٔ قرائت این واژه اختلاف رونما شده است. رک : فرهنگ قواس ص ۱۸۰ متن و حاشیه.

۷ نسخهٔ اصل ؛ زرگری

۸ کذا است در قواس ص ۱۸۱ ، موید ۱ : ۹۷ ، مدار ۱ : ۳۲ ، جهانگیری ۱ : ۷۳ ، برهان ۱ : ۴۷ ؛ اما در سروری ص ۹۸ ، رشیدی ص ۱۲۹ : آغاره.

۹ برای همین معنی رک : قواس و موید و مدار و جهانگیری و برهان ؛ اما در سروری و رشیدی بمعنی دوالی که کفشگران میان چرم و روی کفش گذارند.

۱۰ رک قواس ص ۱۵۲ و موید ۱ : ۹۷ و سروری ص ۱۰۷ و مدار ۱ : ۳۲.

۱۱ کذا است در اصل و موید ، و سروری علاوه نموده : در موید الفضلا مسطور است که در فرهنگ فخر قواس بجای تازه پاره آمد [در نسخهٔ چاپی موید این اضافه نیست] در فرهنگ قواس ص ۱۵۲ و مدار ۱ : ۳۲ ←

آهنجه[۱]: پهناکش جامه، آنگه وقت بافتن جولاهگان[۲] در جامه کشند.

انبارده[۳]: پُر و بانعمت.

اساسه[۴]: التفات یعنی واپس نگریستن.

آگاه: [با] خبر و[۵] دانش.

ارغده[۶]: مرد جنگ آور و گویند ارغنده[۷] مرد خشمناک.

افروشه[۸]: نام حلوای و دلیدهٔ گندم.

← 'پاره' وهمین درست بنظر می آید؛ رشیدی ص ۱۲۹ آغزده را مخفف آغارده نوشته بمعنی نرم شده و ترشده؛ در زفان گویا بخش سوم آغاریدن بمعنی فرو شدن نم بزمین و نیک سرشتن و در مدار ۱: ۳۲ آغاریدن و آغاردن بمعنی های در زفان آمده. اما دکتر معین در فرهنگ فارسی ۱: ۶۷ آغزدن و آغشتن و آغاریدن بمعنی خیسیدن وخیساندن، نوشیدن نوشته.

۱ رک: قواس ص ۱۸۳، موید ۱: ۹۸، مدار ۱: ۴۰.

۲ در اصل کرم خورده

۳ رک: سرمهٔ سلیمانی ص ۲۲.

۴ رک: موید ۱: ۱۰۰، مدار ۱: ۸۲؛ اما این واژه در اکثر فرهنگها خصوصاً در فرهنگهای قدیم یافته نشد؛ و در فرهنگ معین هم شامل نیست.

۵ عیناً همین الفاظ در موید ۱: ۹۷ یافته می شود؛ ازین میتوان قیاس کرد که فرهنگیان فارسی در ترتیب فرهنگ اکثر از فرهنگهای قدیم عیناً نقل نموده اند.

۶ موید ۲: ۹۶ آرغده جنگ آور وخشمناک و حریص در چیزها، مدار ۱: ۲۴ معنی اخیر را ندارد؛ اما معین (فرهنگ ۱: ۲۴) هر دو معنی یعنی حریص وغضبناک داده و آرغده و ارغده و آلغده سه صورت نوشته.

۷ قواس ص ۱۶۹: ارغنده بمعنی جنگ آور بدین بیت شاهد آورده:

نهادند آوردگاهی بزرگ ❊ دو جنگی بکردار ارغنده گرگ

مدار ۱: ۷۴ ارغنده بمعنی مردم دلیر وخشمناک با دو بیت شاهد از شاهنامه نوشته. معین (فرهنگ ۱: ۲۰۳) ارغند و آرغنده را بمعنی غضبناک وخشم آلود نوشته، و علاوه نموده که فرهنگها بخطا ارغند را دلیر معنی کرده اند. بنظرم غضبناک وخشم آلود با دلیری مطابقت دارد، ثانیاً ارغنده و ارغده و آرغده ظاهراً هم ریشه اند و از لحاظ معنی مترادف.

۸ رک: موید ۱: ۱۰۰ و مدار ۱: ۱۱۰؛ در فرهنگ معین ۱: ۷۲ آفروشه و افروشه بهمین معنی آمده.

انباشته : پُر کرده.

الفغده[1] : کسب کرده.

انگاره[2] : جریدهٔ شمار، و چون سرگذشتها[3] گویند، گویند : انگاره می کند. [لبیبی گوید][4] :

زان[5] روز که پیش آمدت آنروز پُر از هول
بنشین و تن اندر ده و انگاره پیش آر

آرامیده : آرام گرفته و آرمیده[6] هم گویند.

ایوره[7] : آراسته.

آخته[8] : کشیده و بر آورده.

آگنه[9] : پنبه که درمیان استر و اوره در آرند.

انجبره : انگشت[10] که تخم آن طبیبان بکار می برند.

---

[1] اسم مفعول از مصدر الفغدن بمعنی کسب نمودن، رک : زفان گویا بخش سوم؛ صحاح ص ۲۶۲ ح ۲ : الفغدهٔ اندوخته و کسب کرده بود، موید ۱ : ۱۰۱ و مدار ۱ : ۱۲۰ الفغده و الفخته هر دو معنی آورده؛ زفان گویا بخش سوم الفنجیدن بمعنی جمع آوردن، الفختن و الفاختن بمعنی گرد کردن و الفغدن بمعنی کسب نمودن؛ معین ۱ : ۳۳۹ الفختن، الفاختن، الفغدن، الفنجیدن هر چهار بمعنی اندوختن و گرد آوردن.

[2] صحاح ص ۲۶۲ : انگاره دو معنی دارد، اوّل جریدهٔ محاسبات را گویند، دوم بازگفتن سرگذشتها باشد الخ؛ موید ۱ : ۱۰۰ ازکاره دارد و برای این قرائت توجیه عجیب دارد؛ باز می نویسد ۱ : ۱۰۲ انگارهٔ همان ازکاره یعنی افسانه و سرگذشت. نیز رک : مدار ۱ : ۱۳۶.

[3] نسخهٔ اصل : گذشتها، اما رک : صحاح.

[4] صحاح نیز همین عبارت را دارد.

[5] در اصل ندارد؛ اضافه از روی فرس و صحاح.

[6] این بیت در نسخهٔ اصل بسیار مغلوطست؛ از روی فرس و صحاح تصحیح دست داده.

[7] نسخهٔ اصل : آرامیده؛ اما رک : صحاح ص ۲۶۰ - ۲۶۱.

[8] رک : مدار ۱ : ۱۵۵، موید ۱ : ۱۰۳ ایوزه، و این تصحیف است

[9] مدار ۱ : ۲۰، بیت زیر شاهد :

ای که شمشیر جفا بر سر من آخته‌ای ؛ صلح کردیم که ما را سر پیکار تو نیست (سعدی)؛

مانند مدار در زفان گویا بخش سوم آختن و آهیختن مترادف.

[10] رک : موید ۱ : ۹۷، مدار ۱ : ۳۵.

[11] برای این کلمهٔ هندی رک : موید ۱ : ۱۰۱، مدار ۱ : ۱۳۰.

بتازی فستریش[1] گویند.

اوره[2]: توی بالائین در لبانچه و قبا.

انداوه[3]: مالهٔ[4] که آلت اندایش است.

اشنه[5]: گیاهی است که هندوی چهیلیری[6] گویند.

انبوه: بسیار و بافته[7].

استانه[8]: ستانهٔ[9] در را خوانند.

اره: بدانچ چوب را پاره کنند. بتازی منشار[9] گویند.

اندخسواره[10]: پشتی و آن که پشت درپشت بدو باز گذارند و حصار.

مهرهٔ ی

آبی: میوه ایست که بتازی سفرجل[11] گویند.

النی[12]: چوب بازوی در، وبکسر همزه نیز گویند.

---

[1] رک: مدار ۱: ۱۳۰؛ معین ۱: ۳۶۸ انجره و انجرک مترادف مرزنگوش و آذان الفار آورده، و در مدار ۱: ۶۶ اذن الفار و مرزنگوش مترادف کلمهٔ هندی موساکنی، و در زفان موساکنی ذیل واژه اذن الفار آمده (بخش چهارم)

[2] موید ۱: ۱۰۲ اوره همان آبرهٔ مذکور یعنی توی بالینہ الخ ۱: ۹۲ آبره توی بالائین در لبانچه و قبا کذا فی القنیه الخ.

[3] مشتق است از اندودن.

[4] عیناً این عبارت در موید ۱: ۱۰۱ درج است؛ مدار ۱: ۱۳۲ انداده آلتی که بدان کهگل کنند.

[5] مدار ۱: ۹۹ اشنه گیاهی است خوشبوی، هند چهڑیله خوانند.

[6] ظاهراً واژهٔ هندی که در زفان آمده مترادف چهڑیلی = چهڑیله باشد.

[7] این معنی در فرهنگها دیده نشد.

[8] آستان و استان و آستانه و استانه وستانه هم معنی اند، رک: مدار ۱: ۸۵.

[9] رک: دستور الاخوان ص ۶۱۳.

[10] قواس ص ۱۳۳ و بحر الفضائل و مدار ۱: ۱۳۲، و جهانگیری ۲: ۱۷۵۳، از مصدر اندفسیدن، نیز رک: زفان بخش چهارم. اما موید ۱: ۹۸ اندرخشواره.

[11] رک: دستور ص ۶۰ و موید ۱: ۱۰۶.

[12] قواس ص ۱۲۵، بحر الفضائل، مدار ۱: ۱۲۱، جهانگیری ۲: ۳۱، برهان ۱۵۹.

اسپری[1]: به آخر آمده.

آموی[2]: پرکرده.

آشتی: صلح.

گونهٔ (دوم) که آغاز آن با است،

بهرهٔ 'الف'

بسا: از اضداد است، بسیار[3] و اندک و کم کردن و چیزی زیادتری.

بنا: [بگذار[4]] و گذارنده.

بکیاسا[5]: تملیت، گلیم.

بازاریا[6]: تصغیر بازاری یعنی ماهور[7].

بهرهٔ 'ب'

بوب[8]: بساط و فرش.

بهرهٔ 'ت'

بیدخت[9]: زهره.

---

[1] رک: مدار ۱: ۸۳

[2] موید ۱: ۱۰۶ آموی پرکرد کذا فی القنیه؛ اقول اموی امر آمودن است و بمعنی فاعل هم آید، اما بمعنی ماضی یافته نشد. بنظرم آموی بمعنی آمون است یعنی پر، مملو، لبالب.

[3] در موید ۱: ۱۱۳ بگفتهٔ زفان گویا این معنی که در اکثر فرهنگها یافته نمی شود، آمده. نیز رک: مدار ۱: ۲۱۹ که بگفتهٔ سکندری این معنی آورده است.

[4] در اصل ناخوانا. اما رک: سرمهٔ سلیمانی ص ۲۴.

[5] قواس ص ۱۵۵: بکیاسا تملیت نیز گلیم، موید ۱: ۱۱۳: بکیاسا تملیت ای گلیم؛ مدار ۱: ۲۳۵ بکیاسا نمد گلیم باین بیت استاد شاهد:

نور بر طور دیده چون موسی ٭ ترک زر کرد وطرح بکیاسا

در سروری ص ۱۱۸ آمده: در ادات الفضلا بمعنی تملیت باشد یعنی بار اندک و بمعنی گلیم نیز آمده. و تملیت بمعنی بار اندک باشد رک موید ۱: ۲۳۳.

[6] موید ۱: ۱۱۲ بازار یا تصغیر بازاری کذا فی القنیه؛ مدار ۱: ۱۷۱: بازار یا تصغیر بازاری است الخ.

[7] کذاست در اصل [8] رک: موید ۱: ۱۱۵

[9] رک: موید ۱: ۱۱۸، مدار ۱: ۲۷۰؛ فرهنگ معین ۱: ۶۲۱، ۵: ۳۰۸ بدخت را اصلاً ←

بیخست[1] : محبوس یعنی بندی و چیزی که از بن یکبارگی برکنده باشد، و بفتح خا نیز گویند.

بست : گره[2].

بروت[3] : سبلت یعنی موی لب.

بت : معروف است.

برگست[4] : معاذ الله یعنی مبادا باشد و بعضی با بای فارسی گویند.

بخست[5] : آواز هر چیزی.

بت[6] : آهار جولاهه.

برغست[7] : تره ایست بهاری، ورغست هم گویند.

← بغ دخت یعنی دختر خدا قرار داده.

[1] قواس ۱ : ۹۵ بیخست بندی ؛ موید ۱ : ۱۱۸ بیخست چیزی که آنرا از بیخ کندیده باشند و بندی که بپای محبوس کنند ؛ اما در سروری ص ۱۲۳ بیخشت باشین نقطه دار و برهان ۳۳۲ بیخست و بیخشت بمعنی چیزی که از بیخ برکنده باشند آمده. در برهان بیخسته بمعنی بندی آمده ؛ اما در زفان، موید ۱ : ۱۸۴، مدار ۱ : ۲۶۹، سروری ص ۱۹۵ بیخسته بمعنی درمانده است، و در مدار و سروری این بیت خسروانی شاهد آمده:

دل خسته و محروم و بیخسته و گمراه ❊ گریان به سپیده دم و نالان بسحرگاه

نیز رک : مجلهٔ علوم اسلامیه، علیگڑھ، ۱۹۶۷ ص ۳۹ ببعد

[2] موید ۱ : ۱۱۷، بست بالفتح کوه و این معنی از زفان گویاست. اما اصل اینست که در زفان گره است که کوه خوانده شده و از همین جا که صاحب مدار بست را بمعنی کوه آورده، (مدار ۱ : ۲۲۰) ؛ برای بست بمعنی گره رک : فرهنگ معین ۱ : ۵۲۸.

[3] رک : موید ۱ : ۱۱۷ ؛ در مدار ۱ : ۲۱۳ این بیت انوری شاهد آمده :

فلکش گفت بر بروت مخند ❊ که جهانیت ریشخند کند

[4] رک : موید ۱ : ۱۱۷، و در مدار ۱ : ۲۰۹ بهمین معنی با بیت زیر شاهد آمده :

کسی چون او نبود در ملک هیهات ❊ شهی چون او نبود در دهر برگست

نیز رک : مدار ذیل برگس، و ... سلیمانی ص ۲۲.

[5] رک : موید ۱ : ۱۱۷، ... سلیمانی ص ۲۴ : بخست

[6] رک : مدار ۱ : ۱۹۳، فرهنگ معین ۱ : ۴۷۱ ؛ موید ۱ : ۱۹۳ پت بهمین معنی دارد.

[7] رک بقواس ص ۳۶ ؛ مدار ۱ : ۲۰۷ ؛ موید ۱ : ۱۱۷ برغست بالفتح تره ایست بهاری که چهارپایان خورندش کذا فی الشرفنامه، و در زفان گویا بمعنی بستد که هند پنوالی گویند نیز آمده. اما در نسخهٔ زفان اصلا این معنی نیست ؛ مدار شامل این معنی است اما در آنجا اسمی از زفان گویا برده نشد. ←

بهشت : باغ و گلزار که درو جمیع آرزو مهیا باشد.
بخت : چرم[1] موزه و کفش و پای افزار.
برنجاست[2] : بوی مادران.
بلنجاست : همان [ورق ۱۱۲] برنجاست.

بهرهٔ «ج»

بوغنج[3] : سیاه دانه.
بنانج[4] : انباغ یعنی دو زن یک مردی را باشند، و بیشتر ببای پارسی و بعضی بجیم پارسی.
باج : چیزی که زبردست از زیردست قبول کند و بدهد، بزای[5] فارسی نیز گویند.
بشنج[6] : تاب روی.
بژدج[7] : پیدا کردن.
برخنج[8] : دیوسنبه یعنی سخت[9] بد و گرانی که درخواب بر مردم افتد و این را بتازی کابوس خوانند.

→ در قواس ورغست و بژند مترادف آمده چنانچه در زفان است : بژند گیاهی است خوشبوی بهاری که آنرا ابرغست نیز گویند و بعضی ببای پارسی و زای پارسی مفتوح گفته اند ؛ و درهمین فرهنگ ذیل ورغست آمده : بژند و آن گیاهی است بهاری.

[1] کذاست در مدار ا: ۱۹۰

[2] این واژه به شکلهای زیر آمده : برنجاسب ، برنجاپ ، برنجاست ، بلنجاست ، برنجاسف ؛ رک : مدار ا: ۲۱۱ ، فرهنگ معین ۱۱۳۱/۱۵ فقط برنجاسپ و برنجاسف آورده.

[3] رک : موید ا: ۱۲۰ ، مدار ا: ۲۵۵.

[4] رک : قواس ص ۱۰۱ ؛ موید ا: ۱۲۰ بنانج و بنج هردو را بهمین معنی آورده ؛ مدار ا: ۲۴۶ بنانج و بنج و بناغ و وسنی و بنانج هر پنج را بهمین معنی بیان نموده ، اما در دستور و زفان گویا بنج معنی دیگر دارد چنانکه می آید

[5] رک : موید ا: ۱۴۰ ، مدار ا: ۱۷۲ ؛ چنان بنظر می رسد که املاء قدیمی این کلمه باژ است چنانکه در فرهنگهای قدیم مانند قواس ص ۱۱۰ و صحاح ص ۱۳۶ باژ است نه باج.

[6] رک : قواس ص ۱۶۰ که بهمین کلمه توضیح نموده نیز رک : موید ا: ۱۲۰.

[7] رک : موید ا: ۱۲۰ ، مدار ا: ۲۱۹ ؛ بظاهر اسم مصدر باشد اما مصدر بژدجیدن متداول نیست.

[8] رک : فرس ص ۵۴ و صحاح ۵۱ ، اما در قواس ا: ۱۶۴ اخفج ؛ اما درین هر سه فرهنگ از بیت آغاجی استشهاد نموده شد ؛ در زفان گویا ، مانند موید و برهان و مدار برخفج و خفج هر دو آمده. در مدار ا: ۲۰۱ مترادف های این واژه برخفج و خفج و خفج و دیوسنبه و سکاچه و فرهانج و فرنجک و فرودنجک آمده. [9] برای این معنی رک : مدار ایضاً.

بفنج[1] : خوی که بوقت سخن بیرون افتد.
بلوچ[2] : آن پارهٔ گوشت باشد که برسر عروس رسته بود، آنچه برسرطاق و ایوان و...
آن کنند.
بلنج[3] : قدر چیزی.
بج[4] : اندرون دهان باشد.
برنج[5] : آن باشد که برای تاریکی یا کوری بدست بردن و در آوردن بینند.
بنج[6] : زخ، و بعضی بفنج باگویند.

---

[1] رک بمرزهٔ سلیمانی فرهنگ معین ا : ۵۵۴ ؛ اما در موید ا : ۱۲۰ ، مدار ا : ۲۳۱ بفج بمعنی آب دهن و لب ستبر
قواس ص ۱۸ بفج فقط بمعنی لب ستبر است با بیت زیر فردوسی :
خروشان ززاول همی رفت زال ⁂ فروهشته بفج و برآورده یال
و همین بیت شاهنامه شاهد بفج بمعنی لب ستبر در فرس ص ۶۱ و صحاح ص ۵۹ وجود دارد ؛ خود درشت
ج ا چاپ محمد رمضانی ۱۳۵۴ ش ق بجای بفج قواس با لفج فرس و صحاح لنج آمده اما این غلط چاپی
دکتر معین لفج . لب حیوانات و لب ستبر و گنده و گوشت بی استخوان گفته. شواهد لفج از شاهنامه :
گسسته لگام و نگونسار زین ⁂ فرو برده لفج و برآورده کین
فروهشته لفج و برآورد کفج ⁂ بکردار تیر شبه کفج و لفج
در مدار شاهد بفج بمعنی لعاب دهان :
می ادفند آنرا که سر و رویش توبینید ⁂ زان حلم و زان بفج چکان برسر و برروی
خلاصه اینکه بفج بمعنی لعاب دهن و بفج بمعنی لب ستبر، در قواس بفج تصحیف لفج است و صاحب
صاحب مدار بفج را بمعنی لب ستبر غلط نوشته اند.

[2] رک : موید ا : ۱۲۰ ، مدار ا : ۲۴۳ ؛ در موید دو سه معنی دیگر نوشته ، از آن میان یک معنی
نیز یافته می شود ؛ اما در مدار این واژه با جیم فارسی است.

[3] نسخهٔ اصل : بکنج اما رک موید ا : ۱۲۰ ، مدار ا : ۲۴۲ ، فرهنگ معین ا : ۵۷۱.

[4] رک . موید ا : ۱۱۹ ، مدار ا : ۱۸۶ ، سروری ا : ۱۲۳ ، برهان ا : ۲۲۵ ، فرهنگ معین
اما در قواس ۱۸ بمعنی رخ است

[5] موید ا : ۱۲۰ بگفتهٔ زفان گویا نوشته انچه برای تاریکی و یا کوری بر دیواری یا جای گذ
یابد . مدار ا : ۲۱۱ برنج آن باشد که برای تاریکی یا کوری بدست آوردن و برد
واضحاً صاحب مدار عیناً عبارت زفان را نقل نموده است . این واژه در فر
قدیم شامل نیست ؛ حتی دکتر معین نیز این واژه را در فرهنگ جائی نداده .

[6] در موید ا : ۱۲۰ ، مدار ا : ۱۴۰ بنج و بناخ بمعنی انباغ آمده ؛ و در موید بگفتهٔ زفان

بہرۂ چ

بسیچ[1]: قصد و آہنگ.

برخج[2]: زشت.

بازپیچ[3]: رسنی باشد کہ دو تا[4] بیاویزند و برنشینند، بہندوی پینگھ[5] گویند.

بلنج[6]: زاک سیاہ کہ بدان خضاب کنند.

→ بنج بمعنی رخ نوشتہ و قیاس کردہ این تصحیف زخ بمعنی ثولول است و نیز علاوہ نمود کہ در دستور ہم بدین معنی آمدہ . دستور ص ۸۹ بنج : رخ ؛ بظاہر رخ غلطیست، صحیح زخ است چنانکہ در بحر الفضائل ہم آمدہ . زخ در زفان نیز بمعنی ثولول درج ست .

[1] موید ۱: ۱۲۰، بسیج (بای وجیم ہر دو تازی)، نیز رک : فرہنگ معین ۱: ۵۳۸ ؛ اما معین بسیج و پسیچ و پسیج ہر سہ را درست خیال می کند ایضاً ۱: ۷۹۰ ؛ نظامی گنجوی در بیت زیر با ہیچ قافیہ نمودہ :

درین دم کہ داری بشادی بسیچ ❊ کہ آیندہ و رفتہ ہیچست و ہیچ

[2] رک : موید ۱: ۱۲۱ ؛ در مدار ۱: ۲۰۱ (مدار ۱: ۲۲۲) برخج و فرخج و درخج سہ شکل مندرج است در فرس ۶۰ و صحاح ص ۵۸ فرخج بہمین معنی آمدہ و از بیت لبیبی استشہاد شدہ . و در قواس ۱۰۵، فرخج و درخج ہر دو، برای فرخج بیت لبیبی شاہد آمدہ . درخج در دستور ۲۲۴ و رشیدی ص ۱۲۵۵ بہمین معنی درج ست ؛ زفان درخج نیز بہمین معنی آوردہ اما فرخج بمعنی کفل اسب نوشتہ .

[3] صحاح ص ۵۱ : بادپیچ رسنی باشد کہ کودکان بر درخت بندند و در آنجا نشینند و آیند و روند، با بیت ابو المثل شاہد بادپیچ ؛ موید ۱: ۱۲۰-۲۱ بازپیچ بمعنی رسنی الخ ؛ مدار ۱: ۱۷۲، ۱۷۳، بازپیچ و بازپیچ ہر دو بہمین معنی ، و این ہر دو مصحف بادپیچ ، رک : حواشی برہان .

[4] اصل: تابیا .

[5] رک: موید و مدار .

[6] نسخۂ اصل : بلنج ، اما رک: قواس ص ۱۸۷، موید ۱: ۱۲۱، مدار ۱: ۲۳۸، برہان ص ۲۹۷، فرہنگ معین ۱: ۵۶۶. در اکثر فرہنگہا بلنج و نلنج ہر دو معنی زاک سیاہ آمدہ ، رک: موید ۲: ۱۵۹، برہان ص ۱۸۹۲، و خود زفان گویا ذیل 'ل'. اما در فرس ص ۶۱، صحاح ص ۵۹، جہانگیری ص ۲۸۲، رشیدی ص ۱۲۸۷ فقط نلنج بہمین معنی . باید علاوہ نمود کہ در فرس و صحاح بیتی کہ شاہد نلنج آمدہ، در قواس شاہد بلنج است ؛ و نظر بندہ اینست کہ در "بلنج" بہ حرف اضافہ است ، بیت مذکور اینست :

بینی آن زلفین او چون چنبر بالانجم ❊ گر بلنج اندر زنی ایدون بود چون آبنوس

بهرهٔ 'خ'

بلخ : نام شهری از بلاد خراسان، و آوند[1] شراب چون صراحی و قرابه.

برخ[2]: شبنم

برخ[3]: بهره یعنی بعض از کل.

بهرهٔ 'د'

بزند[4]: گیاهی است خوشبوی بهاری که آنرا برغست نیز گویند، وبعضی ببای پارسی وزای پارسی مفتوح گفته.

بنداد[5]: بنیاد

بیجاد[6]: کهربا، و بیجاده بها نیز گویند.

بند : کمر[7] مردان باشد.

برد[8]: گویند از راه دور شو، و بردابرد همین را گویند.

بدرود[9]: وداع و بکسر با نیز گویند.

بود[10]: خف و آن آنست که آتش از سنگ و آهن درو افتد سوخته گردد، و

---

[1] رک: قواس ص ۱۳۸، موید ۱: ۱۲۲، و مدار ۱: ۲۳۸.

[2] رک: قواس ص ۲۰، موید ۱: ۱۲۲، مدار ۱: ۲۰۱؛ اما دستور ص ۸۴: برخ سرشک آتش
و نیز رک: بحر الفضائل.

[3] رک: موید و مدار که در آنها معنی دیگر برخ بهره وبعض از کل نوشته.

[4] رک: قواس ص ۳۶؛ موید ۱: ۱۲۶، مدار ۱: ۲۱۹ بژند، ۱: ۳۰۵ پژند، فرس و صحاح ص ۷۵
و دستور ص ۸۱ نیز پزند بهمین معنی آورده.

[5] رک: قواس ص ۱۱۵. [6] رک: موید ۱: ۱۲۸.

[7] در فرهنگ معین ۱: ۵۸۲ - ۵۸۳ بند بمعنی کمربند، میان بند.

[8] در اصل نیامده، در حاشیه افزوده، رک: موید ۱: ۱۲۵، مدار ۱: ۲۰۲، سرمهٔ سلیمانی ص ۲۶.

[9] بدرود و پدرود هردو بهمین معنی می آید رک: فرهنگ معین ۱: ۴۸۲.

[10] موید ۱: ۱۲۴: بُد جامهٔ نیم سوخته و بجت کنه و سوداکه در آن آتش زود درگیرد و نیز گیاهی است آبی که زیر چقماق نهند تا آتش زودگیرد الخ. نیز بود ایضاً ص ۱۲۷. فرس ص ۱۰۹ پود بتازی خف باشد یعنی آنکه آتش از سنگ برآید و درو گیرد الخ، قواس ص ۱۷۷ پود بهمین معنی نوشته. فرس و قواس 'پده' مترادف پود قرار داده.

بغیر واو[۱] هم گویند، بعض پوز[۲] بهای پارسی گویند.

بخرد[۳]: مرد دانا و هوشیار.

بلکفد[۴]: رشوت.

بهبود[۵] و برهود: جامه‌ای که از نفش آتش رنگ زرد نماید [گویند برهود].

برازد[۶]: زیبد.

بالاد[۷]: اسب جنیبت.

بید: درختی است، برگ او بمنزلهٔ تیغ باشد و آن هفده[۸] نوعست، و آن درخت بار ندارد

چنانکه قائل: بیت:

این پنج درخت است که می نارد بار ❊ بید و پده[۹] و سرو سپیدار و چنار

باورد[۱۰]: نام شهری است از بلاد خراسان.

---

۱ یعنی بُدْ.
۲ کذاست در فرس و قواس و مدار وغیره.

۳ رک: دستور ص ۸۲، موید ۱: ۱۲۴
۴ بلکفت، بلکفد، بلکفته، بلکفده بمعنی رشوت رک همین: ۵۴۸

۵ صحاح ص ۸۶: برهود یعنی نزدیک شد که بسوزد و چون جامه از تاب آتش زرد رنگ شود گویند برهود.
ص ۸۷ بهبود یعنی برهود، سرمهٔ سلیمانی ص ۲۷: برهود و بهبود،

۶ رک. صحاح ص ۸۶.

۷ مضارع است از مصدر برازیدن، رک: موید ۱: ۱۲۵.

۸ فرس و صحاح ص ۸۷: پالاد جنیبت باشد، مدار ۱: ۱۷۷ بالاد و پالاد هر دو صورت، صحاح و مدار از بیت فرالادی استشهاد شده:

من رهی پیر و سست پای شدم ❊ نتوان رفت راه بی پالاد

قواس ص ۷۲: بالای اسب جنیبت، نیز رک: همین فرهنگ بهرهٔ سی.

۹ ادات و موید ۱: ۱۲۸ بید از هفده نوع قرار داده.

۱۰ زفان: پده درختی است چوب سخت بار ندارد، موید ۱: ۲۲۳ گفته بهای تازی و فارسی هر دو شکل آمده.

۱۱ باورد و ابیورد نام شهری بود، در دشت خاوران در شمال خراسان کنونی نزدیک بدره گز. اکنون ویران است و جزو ترکمانستان شوروی است (معین) بقول یاقوت درمیان سرخس و نساء واقع بود، دانشمندان و شاعران بسیار ازین خطه برخاسته، گویند معروف انوری به ابیورد انتساب دارد. رک لغتنامهٔ دهخدا ذیل ابیورد و ابیوردی. بگفتهٔ گردیزی زین الاخبار ص ۱۱ باورد بنا کردهٔ گیو بود.

زرد[۱]: داروئی است بریز[ه] نیز گویند و بتازی قنّه[۲].

مد : معروف که [ورق ۱۱۳] بشندوی[۳] بنوالی گویند ، بستد بشندیدم آمده است.

یاد : بنا و بیخ و ماده.

شکلید[۴]: یعنی نشان و رخنه و بسر ناخن و انگشت در افگند.

د : معروف ، و بیست و[۵] دوم روز از ماه ، و بیشتر بذال[۶] معجمه گویند.

شد : یعنی برفت.

بوگند[۷]: بیفگند.

بهرهٔ ر

باختر[۸]: مغرب و بعضی برعکس مشرق را گویند.

---

۱ نسخهٔ اصل : بید ، اما رک : مدار ا : ۲۱۵ و معین ص ۶۲۳ ، بیرز بمعنی است مانند مصطکی بدبوی ، شکلهای دیگر این واژه : بیرزه ، بریزه ، بیرزی وغیره ، نیز رک : هدایة المتعلمین.

۲ دستورالاخوان ص ۵۰۷ : القنة بیرزد. ۳ موید ا : ۱۲۶ پنوالی ، مدار ا : ۲۲۰ پنوالی.

۴ ماضی مطلق است از مصدر بشکلیدن بمعنی رخنه درافگندن رک : زفان گویا بخش سوم اصحاح ص ۸۸ بشکلید یعنی نشان و رخنه درافگند بسر ناخن و انگشت ، کسائی :

یاسمن لعل پوش سوسن گوهر فروش ✿ بر رخ پیلغوش نقطه زد و بشکلید

نیز رک : موید ا : ۱۲۶ ، مدار ا : ۲۲۴-۲۲۵.

۵ رک : معین ۵ : ۲۲۶ ، موید ا : ۱۲۳ بجای بیست و دوم 'دوم' غلط چاپی است.

۶ هر دال که پیش آن یکی از حرفهای علت (مصوته) باشد بفارسی بنا بر قواعد تفریق میان دال و ذال فارسی ذال است نه دال ؛ پس این تخصیص فقط به دال با ذ نیست بلکه همه دالها که قبل شان حرف مصوته می آید ذال است نه دال.

۷ مدار ا : ۲۷۶ ح ، ازین بیت استشهاد شده :

چو بچهٔ کبوتر منقار سخت کرد ✿ هموار کرد موی و بوگند موی زرد (بوشکور)

در اصل بوگند شکل قدیمی از بیفگند باشد (رک : خرسن)

۸ باختر بمعنی مشرق و مغرب هر دو ، رک : قواس ص ۱۴۱ ، اما صحاح ص ۹۹ باختر بمعنی مشرق و ازین بیت انوری استشهاد نموده :

خورشید را چون پست شد در جانب خاور علم ✿ پیدا شد اندر باختر بر آستین شب ظلم

و خاور بمعنی مغرب با بیت شاهد زیر (ص ۱۰۳) :

مهر دیدم بامدادان چون بتافت ✿ از خراسان سوی خاور می شتافت

برخور : خداوند برخ[1] و جوانمرد.[2]

بخنور : غرّنده یعنی آنچه بغرد ، ازین رو بعضی بضم باگویند.

ببر : دده ایست معروف

بشتر[3] : فریشتهٔ باران [و نبات[4]] و گویند نام میکائیل[5] علیه السلام.

بالار[6] : فرسب[7] و ستون را گویند که بالا به پهنا نهند.

بهار[8] : فصلی معروف که آفتاب در حمل بود ، و نام بت خانه[9] در ترکستان ، و نام رود[10] باری در هندوستان ، و نام جزیره[11] و گیاهی که آن را گاوچشم[12] گویند.

بادبر : چوبی[13] را گویند که میان دیوار برآرند و بجای پارسی نیز گویند.

بخار : دود عفونت و گرمی که از دهان و از آبهای روان در زمستان برآید.

---

[1] رک : صحاح ص ۱۰۰ ، برخور یعنی بهره ور. [2] رک . رشیدی ص ۲۱۶ برخ بمعنی بهره.

[3] رک : قواس ص ۱۱۱.

[4] کذاست در فرس و صحاح ص ۱۰۱ ، مدار ۱ : ۲۲۳ ، جهانگیری ۲ : ۱۳۴۵ ، رشیدی ص ۲۱۳ ، ۱۱ برهان و آنندراج و ناظم الاطبا : تشتر ؛ معین بشتر را مصحف تشتر قرار می دهد ، بمعنی نام یزدی و سیزدهمین روز هر ماه شمسی بنام ایزد مذکور . صاحب لغت نامه نیز بشتر را تصحیف تشتر می داند.

[5] در اصل ناخوانا ، متن مطابق جهانگیری

[6] کذاست در صحاح و دیگر فرهنگ ها.

[7] رک : فرس ۱۲۹ ، قواس ص ۱۱۷ ، صحاح ص ۱۰۰.

[8] صحاح ص ۱۰۰ : بالار فرسب باشد یعنی چوبی که سقف خانه بدان پوشند. الخ.

[9] رک : موید ۱ : ۱۳۵ و درین فرهنگ مطالب زفان با ذکر نام نقل شده.

[10] بظاهر مراد نوبهار بلخ باشد.

[11] بظاهر این اطلاع غلطست ، خیلی عجیب است که باوجود آنکه نویسندهٔ زفان هندی است او از نام رود بارهای هندوستان اطلاع ندارد.

[12] کذاست در بحر الفضائل اما بهار اسم جزیره مشکوک بنظر می آید ؛ نام استان در شرق یو. پی. در هندوستان ، و نیز نام یکی از جاهای معروف درین استان.

[13] رک : فرهنگ معین ۱ : ۶۰۸.

[14] صحاح ص ۱۰۱ ، سروری سلیمانی ص ۵ ، باد بر چوبی زیر دیوار ، مدار ۱ : ۱۶۱ ؛ موید ۱ : ۱۳۱ بگفتهٔ زفان معنی باد بر فرزه نوشته.

باور[1] : راست گوئی ، راست داشتن.

بدر : بیرون.

برور[2] : پیوند.

بناور[3] : دمل وبضم با نیز گویند.

برآور[4] : برآر.

بشتر[5] : دمیدگی در اندام.

بلغور[6] : عصیب[7] و آن طعامیست معروف یعنی کاچی[8] ، وبعضی گویند بضم با و واو پارسی.

باستار[9] : چنانست کہ گویند فلان و بهمان ، و بستار[10] هم گفته اند.

بر[11] : بالای تن و نزدیک ومیوه و نفع و پهنا[12].

بار[13] : میوه ، کرت درحمل و باریدن وتنگی جامه و جزآن و بزرگ چنانک گویند بارخدایا و برعام پیدا شدن چنانک گویند سلطان بار داد ، و ملاقات و در آمدن برکس ،

---

[1] موید ۱: ۱۲۲ باور بمعنی استوار و راست ونیز استوار داشتن کذا فی زفان گویا ؛ اما این معنی در نسخهٔ زفان یافته نمی شود ؛ مدار ۱: ۱۸۱ استوار و راست.

[2] مدار ۱: ۲۱۳ برور و پرور و بروز و براوز و فراوز بمعنی پیوند جامه نوشته. فرهنگ معین ۱: ۷۶۳ پرور : پیوند ؛ اما درزفان بروز و فراویز و فرویز بمعنی پیوند جامه نوشته. قواس ص ۱۵۷ : وژنگ و بروز و فراویز مترادف قرار داده است. اما صاحب زفان بروز و فراویز وغیره راباهمین معنی آورده ، سرمهٔ سلیمانی ص ۵۱ ، ۱۸۰ پروز سجاف جامه.

[3] رک : قواس ص ۱۶۲ ، موید ۱: ۱۳۵ ، مدار ۱: ۲۴۶ وغیره.

[4] امر از مصدر برآوردن [5] رک : مدار ۱ : ۲۲۳ ، سرمهٔ سلیمانی ص ۲۹.

[6] رک : قواس ص ۱۴۴ ، موید ۱: ۱۳۴ ، مدار ۱: ۲۴۱

[7] نسخهٔ اصل : عصیده اما موید ۲: ۱۶ عصیب ، جگرآگند ، ادات این مترادف عربی را دارد.

[8] رک : قواس وادات وموید و مدار

[9] رک : صحاح ص ۱۰۰ باستار لغتی است مانند فلان و بهمان.

[10] رک : مدار ۱: ۱۷۲ ، سرمهٔ سلیمانی ص ۲۸.

[11] رک : موید ۱: ۱۳۳ ، سرمهٔ سلیمانی ص ۲۹.

[12] شرفنامه : پهنای چیزی

[13] در موید ۱: ۱۲۱ و مدار ۱: ۱۶۸ همهٔ مندرجات را عیناً نقل نموده اند.

چنانک گویند : فلان کس باریافت یعنی درآمد ، پرکردن ، چنانک گویند صنک بارکرد ، و نهتن اشارهٔ مطربه چنانک گویند : بارکنی ، و حاجت چنانک گویند : در بار و عهد وحواله ، و نیز چیزی بود که نویسندگان می نویسند و آنچ می خورند.

بور : تدرو[1] و اسب که رنگ او نزدیک اشقر[2] بود وفش و دنب او سپید نبود ، گویند بور همین اشقر است.

باهار[3] : باژدان[4] و آن آوندی است که بتازی وعاء[5] گویند.

بلغار : نام ولایتی[6] است در ترکستان که آنجا خوبان باشند و آن زمین سرسیر است که

---

[1] کذا است در بحرالفضائل و ادات که هر دو فقط یک معنی دارد ؛ ادات : بور کبک که عرب آنرا اشقر خوانند. ممکن است که درین جا چند لفظ افتاده باشد ، اما رک : موید ۱ : ۱۲۵ و مدار ۱ : ۲۵۲

[2] زفان ذیل بخش چهارم (سخنان تازی) اشقر یعنی اسب سرخ بس که رنگ سرخ بزردی وسیاهی زند وفش و دم او همرنگ بود.

[3] این واژه در اکثر فرهنگها دیده نشد ؛ اما رک : موید ۱ : ۱۳۲ ، مدار ۱ : ۱۸۱ : باهار باردان (کذا) و آن آوندی است که بتازیش وعاء خوانند.

[4] زفان : باژدان آوندی که محصل در وسیم [باج] می اندازند ، نیز رک : مدار ۱ : ۱۸۲ ؛ موید ۱ : ۱۶۳ ، معنی باژدان بحوالهٔ زفان بدینطور می آورد : بازای فارسی موقوف آوندی که درو محصل سیم باج می اندازند ونگاه دارند باج هم باشد کذا فی زفان گویا. بنظرم کلمهٔ باردان صحیح معلوم می شود زیراکه وعاء باژدان نیست بلکه باردان باشد نیز در فرهنگ معین باردان است باژدان نیامده.

[5] دستورالاخوان ص ۶۶۰ : الوعاء باردان ، ای آوند چیزی الوعیه جماعة. برای وعاء رک : قرآن سورهٔ یوسف آیهٔ ۷۶.

[6] بلغار دو بودند ، یکی در شمال بحر خزر و دیگری در غرب بحر سیاه ، یادداشتهای قزوینی ج ۴ ص ۵۱ - ۵۲ ، و مقالهٔ بارتولد در دایرة المعارف اسلامی و فرهنگ معین ۵ : ۲۷۶-۲۷۷. در ادبیات فارسی برای تعیین حد اقصای شرقی و برای زیبائی و برای اجناس مخصوص مانند چرم و تیر و نیزه و باز ، رک : تعلیقات دیوان سراجی بقلم نگارنده ص ۴۱۸ - ۴۲۰. بنابر تفصیلی که در ادات درج است ؛ دراصل بن غار بود بعداً بلغار شد ، بناء آن در دور ذوالقرنین واقع شد. نیز رک : موید ۱ : ۱۲۴. در همین فرهنگ ، بحوالهٔ زفان ، این واژه را ترکی قرار داده ، اما در نسخهٔ حاضر این اطلاع نیست.

طوطی [۱۴۱ ا] نزید و پوستینی[۱] است مخصوص که آنرا نیز بلغار گویند.
بربر: نام[۲] زمین در مغرب، جای خوبان، مردمان آن دیار[۳] سبز رنگ[۴] باشند.

[بهرهٔ ' ز ']

برز: زیبائی[۵]، و ماله که بدان گل کنند و بالای مردم و کشت ورزی.
باز: بازو[۶] و گشاده و بسته و نام شکره است و رجعت و ارش[۷] که بتازی باع گویند و باج که از تاجر ستانند و رشوت و خراج که متغلب[۸] بر عاجز نهد.
بُرز[۹]: بلندی، بالای مردم و تنهٔ درخت و بلندی مجرد، و پارهٔ زمین، بهندوی مینی[۱۰] گویند.
بندرز[۱۱]: جوال دوز و بعضی بضم با گویند.

---

۱ رک: مدار ا: ۲۴۰ ۲ رک: ادات و موید و مدار.

۳ شهری است در سودان واقع در ساحل رود نیل، این شهر در واقع کلید آن کشور بشمار می آید. و نیز بربر قومی باشد که در افریقای شمالی سکونت داشت، مرکز آن لیبا، تونس، الجزائر و مراکش باشد، نیز سابقاً این نام بنواحی افریقای شمالی که در مغرب مصر واقع است، داده می شد. رک فرهنگ معین ج ۵ ص ۲۵۲–۲۵۳؛ اما دستور ص ۹۲ بمعنی ولایت ملک نیمروز.

۴ رک موید ا: ۱۳۳، مدار ا: ۱۹۹

۵ نسخهٔ اصل: سبز رنگ؛ اما رک شرفنامه و مدار.

۶ همین معنی عیناً در مدار ا: ۲۰۴ درج ست.

۷ قواس ص ۸۳: باز بازو و ارش. الخ نیز رک: موید ا: ۱۳۷ و مدار ا: ۱۷۱

۸ موید ا: ۴۳ ارش مسافت دور دست و نیز ا: ۱۳۷ باز نیز مسافت دور دست چون فراز کنی، بتازیش باع خوانند و بفارسی آرش و ارش. دستور ص ۹۰ باز: بازو و دوش و یک بند انگشت.

۹ مدار ا: ۱۷۱، باز... خراج که متغلب نهند.

۱۰ رک: موید ا: ۱۳۸ و مدار ا: ۲۰۴ ذیل 'برز'؛ در سرمهٔ سلیمانی ص ۳۰ بُرز و برز مترادف.

۱۱ این لفظ در فرهنگها دیده نشد.

۱۲ ادات، مدار ا: ۲۴۷، جهانگیری ۲: ۱۰۴، سروری ص ۱۴۷، رشیدی ص ۳۴۵: بندرز جوال دوز؛ اما در سامی فی الاسامی بندوز بواو و بمعنی ریسمانی که بدان جوال دوزند؛ در برهان ص ۳۰۶: بندرز بمعنی جوال دوز، ص ۳۰۷ بندور بروزن پرزور بمعنی ریسمانی باشد که بدان جوال و توبره و امثال آن دوزند. واضحاً بندور تصحیف بندوز است که باید به دو معنی باشد یکی جوال دوز، دوم ریسمانی که بدان جوال دوزند. بندرز بظاهر بندوز باشد، نیز رک: سرمهٔ سلیمانی ص ۳۰.

بگماز : معانی شراب و نبید و غم و اندوه[۱] و این در رسالۂ[۲] نصیراست ، و نیز گویند سیکی[۳] باشد و نیز[۴] گفته اند بگازه بها.

برموز[۵] : علف و بعضی بباسی پارسی گویند.

برواز : زیبا[۶]

بچیز[۷] : کمین

بروز : جامۂ پوشیدنی و یا گستردنی که لونی پس[۸] از لونی بود.

بروز[۹] : پیوندکه در جامه کنند و جامه بهر رنگی که بگرد جامه بدوزند یعنی وصل و پیوند ، و بعضی بباسی[۱۰] پارسی گویند.

بشنیز[۱۱] : بو مادران ، بهندوی[۱۲] بومارا گویند و ملیاز[۱۳] با یا نیز گویند.

بز : گوسپند.

---

[۱] کذاست در ادات ؛ دستور و بحرالفضائل و فرہنگ قواس : معانی شراب . رک: موید ا : ۱۳۹ مدار ا : ۲۳۴ بگماز و بلماز ہر دو صورت آورده.

[۲] این رساله در مآخذ جہانگیری است ، اکنون نسخہ ای از آن موجود نیست.

[۳] بمعنی شراب مثلث ، رک : دستور ، ادات و بحرالفضائل و فرہنگ معین ۲ : ۱۹۸۰

[۴] در اصل پرو ، متن تصحیح قیاسی.

[۵] کذاست در قواس ص ۱۴۳ ، و موید ا : ۱۳۸ با معانی دیگر و برہان ص ۲۶۳ و ۳۸۸.

[۶] این معنی در فرہنگہا دیده نشد ؛ موید ا : ۱۳۸ : برواز نشیمن باز و شاہین... جای قرار و آرام.

[۷] موید ا : ۱۳۸ بچیز کینه ، کمترین و کوچک.

[۸] کذاست در موید ا : ۱۳۸.

[۹] برور و بروز از لحاظ معنی اول مترادف اند.

[۱۰] مدار ا : ۳۰۰ پروز بہمین معنی آورده.

[۱۱] قواس ص ۱۴۰ ، ادات ، موید ا : ۱۳۹ ، مدار ا : ۲۲۶.

[۱۲] موید ا : ۱۳۹ بومادران و بوماران ہر دو نوشته ، و نیز در ہمین فرہنگ (زفان) ذیل مرکبات آمده : بومادران نام داروئی است که بوماران نیز گویند ؛ بنا برین 'بومارا' را ہندوی قرار دادن بظاہر درست نیست.

[۱۳] کذاست در نسخۂ اصل ؛ تصحیح این کلمه دست نداد.

بیواز[۱]: مرغ شب پرک[۲] و اجابت.

بهرهٔ 'ژ'

بژ[۳]: زمین پشتهٔ بلند یعنی دک[۴] بلند و گویند دکی که جوی و لب آب پاره می کند و بیرون می آید وبعضی بیای پارسی گویند.

بهرهٔ 'س'

برجیس: مشتری.

بلکس[۵]: سر دیوار.

بالوس[۶]: کافور مغشوش، و بیای پارسی و شین معجمه نیز گویند.

برجاس[۷]: تیری که بلند برآرند برای نیزه یا چوبی یعنی آماج.

باس[۸]: پای بسته چیزی نه ببند گردن چنانک گوئی فلان پای بسته است یعنی بسببی از حالها از آنجا که نه خوش باشد رفتن و نه بتواند بودن، بکسر میم نیز آمده.

---

۱ شرفنامه، موید ۱: ۱۴۰، مدار ۱: ۲۷۶، جهانگیری ۲: ۲۲۲۳ بیواز یعنی شب پرک؛ رشیدی: بیواز شپرک و اجابت (کذا در متن)، صحاح ص ۱۲۴ بیواز یعنی اجابت.

۲ در اصل کرم خورده و ناخوانا.

۳ در اکثر فرهنگها پژ آمده، چنانکه در همین فرهنگ زفان گویا نیز، مدار ۱: ۲۱۶، فرهنگ معین ۱: ۵۱۹ بز، نیز رک: قواس ص ۳۰، صحاح ص ۱۳۶: پژ سر عقبه بود، خسروانی:

سعز خوش است کسی را که بامراد بود ❊ اگر سراسر کوه و پژ اندر آید پیش

۴ دک زمین سخت که پی دره نگیرد (زفان ذیل دال)

۵ قواس ص ۱۲۴، ادات، موید ۱: ۱۴۲، مدار ۱: ۲۴۱، در موید افزوده که در دستور الافاضل باشین قرشت نوشته، ونسخهٔ حاضر از دستور قول موید را مورد تایید قرار می دهد.

۶ قواس ص ۱۸۶ بالوش، نیز رک: موید ۱: ۱۴۱، برهان ص ۲۴۷.

۷ در نسخهٔ اصل ناخوانا، اما رک: صحاح ص ۱۴۱، موید ۱: ۱۴۰، مدار ۱: ۲۰۰

۸ صحاح ص ۱۴۰: باس پای بسته و بیچاره بود و آمدن و رفتن نتواند، اما موید ۱: ۱۴۱ در پیروی زفان مطالب ساده اش را مبهم نموده. باس بفتح یکم و کسر سوم پای بسته نه بند بلکه زمینی که خوش نباید رفتن از آنجا و نتواند بجای دیگر رفت و در قنیه مذکور است: پای بسته بغیر بند چنانچه گویند فلان پای بستهٔ فلان است الخ.

بخس[1]: پژمرده شدن چیزی است که غژم[2] بودی.
بسباس: داروئی است که بهندوی جابتری گویند.
بوس[3]: بوسانه[4] بردن و فروتنی[5] کردن و بزبان کسی را فرسائیدن و بعضی بیای پارسی نیز گویند.
بلوس[6]: فریب

بهرهٔ شن

بوشش[7]: کر [و] فر را گویند.
بریش[8]: بمعنی پریش، و بیای [ورق ۱۵ ا] پارسی نیز گویند.
بندش[9]: پاغند[10].

---

[1] ادات: بخس پژمردن چیزی که در خوشه بود؛ رک: موید ۱: ۱۴۱؛ بحرالفضائل بخش زیان و چیز ناقص.
[2] غژم و غژب: خوشهٔ انگور. رک: قواس ص ۵۰.
[3] رک: موید ۱: ۱۴۲.
[4] ادات: پوسانه فروتنی گرفتن و بزبان کسی را فریفتن. کلمهٔ لوس بهمین معنی است.
[5] موید این معنی را بحوالهٔ قنیه نقل نموده است.
[6] مدار ۱: ۲۴۳؛ بلوس بفتح فریب، اما غالب آنست که به زاید است، لوس است که بمعنی مذکور است. زفان: لوس فریب دهنده و فروتنی کننده؛ در اصل لوس بمعنی فروتنی کردن و بزبان مردم را فریفتن. و رک، صحاح ص ۱۴۶ و موید ۲: ۱۶۲؛ صاحب زفان دچار اشتباه شده که لوس را که معنی مصدری دارد به معنی فاعلی آورد، و در بلوس بای اضافه را جزو کلمه پنداشته.
[7] ادات: بوش کر و فر، مدار ۱: ۲۵۵ بوشش بمعنی کر و فر، و غوغا و جمعیت بسیار، موید ۱: ۲۰۷ پوش بهمین معنی آورده؛ بحرالفضائل: بوش غوغا و جماعت مردمان و چیزی که پیش شطرنج نهند.
[8] فرس ۲۰۵، قواس ص ۱۰۶، بحرالفضائل: پریش فرونشاندن (و ازهم باشیدن بود)، دستور ص ۹۱ برتش بهمین معنی آورده و موید هم بحوالهٔ دستور این قرأت را نیز درج نموده ۱: ۱۴۴؛ زفان گویا بخش سوم براشیدن بمعنی فرونشاندن، و پریشیدن بمعنی فرونشاندن و باشیدن و بیخود گشتن و به حال گردانیدن، و پریشانیدن بمعنی پریشیدن. صحاح ص ۱۴۸ بریش و بریاش دارد.
[9] رک: موید ۱: ۱۴۴، مدار ۱: ۲۴۷.
[10] پاغند: غلولهٔ پنبه حلاجی کرده، موید ۱: ۱۹۷ پاغند و پاغنده را بهندوی گاله گویند. موید ۱: ۱۴۴ و مدار ۱: ۲۴۷.

بخشش[1]: نرمهٔ بینی و بینی[2].

بزارش[3]، گداز[4]ش.

بریشش: بریدن شکم که بپیچد[5] و برآند.

برخاش: کارزار یعنی جنگ و شور و فریاد، و بعضی بباشی[6] پارسی گویند.

بسش[7]: بند آهنین و یا سیمین و مسین که بر صندوقها نهند و بر درها زنند و به مسمار بدوزند از بهر محکمی.

بسش[8]: موی گردن اسب، و فرومایه و ناقص[9].

---

[1] موید ا: ۱۴۳: بخش نرمهٔ بینی و ستی؛ کذاست در مدار ا: ۱۹۲ در جهانگیری بخس (با سین مهمله) بهمین معنی آمده.

[2] کذاست در اصل؛ اما در موید و مدار و جهانگیری: ستی.

[3] قواس ص ۱۶۰: بزارش گدازش، موید ا: ۱۴۴ بزارش گذارش و در علی بزارش بمعنی زیبائی، مدار ا: ۱۹۸، برازش و برارش بمعنی گذارش و برازیدن بمعنی زیبا نمودن نوشته و نیز ا: ۲۱۷ بزاختن و پزاختن بمعنی گداختن، موید ا: ۱۶۸ بزاختن و بزازیدن (زای معجمه) بنظر بزارش غلط و صحیح کلمه بزازش است که اسم مصدر است از بزاختن و بزازیدن، در زفان نیز بزاختن بمعنی گداختن که در بنیاد بزازیدن بود چنانکه گداختن گدازیدن. ظاهراً در قیاس بزاریدن از بزاختن صاحب زفان دچار اشتباه شده، زیرا برطبق گدازیدن از گداختن بزاختن و بزازیدن بزازش درست بود نه بزارش چنانکه در قواس و زفان وغیره است و بزازش یا برارش که در بعضی لغات یافته می شود.

[4] در اصل: گذارش

[5] رک: قواس ص ۱۶۱

[6] کذاست در مدار ا: ۲۱۷؛ اما موید ا: ۱۴۴ بحوالهٔ زفان بریشش بعضی بریدن شکم که بچه از و بیرون آید؛ واضحاً این عبارت در نسخهٔ حاضر نیست.

[7] بیشتر بهمین صورت متداول است.

[8] فرس ۲۰۷، صحاح ص ۱۴۷، موید ا: ۱۴۴، جهانگیری ۲: ۱۲۲۴، سروری ا: ۱۵۵ البشن بمعنی بند آهنین؛ صحاح ص ۱۴۸ پسش بمعنی بسش نیز دارد. اما قواس ص ۱۷۴، زفان (ذیل حرف پ)، موید ا: ۲۰۷ پسش طرف باشد که بر بند کمر و بر جبین کنند.

[9] صحاح ص ۱۴۷: بسش موی گردن و قفای اسب بود؛ ادات: بسش فرومایه از هر چیز و ناقص طرف که برکمر زنند و موی گردن اسب.

[10] پس ازین در حاشیهٔ نسخهٔ اصل افزوده: برزنوش: سرلشکر، برناش: ولایت ترکستان.

بالش[۱]: مسند و بالشت.

بهرهٔ 'غ'

بناغ[۲]: دبیره ماشورهٔ زنان.
برغ[۳]: رود آب و گویند بند آب.
بزغ[۴]: رنگ آب[۵] و غوک.
بشترغ[۶]: اسپرک[۷] و آن گیاهی است که جامه ها را بدان رنگ نیز کنند، بضم[۸] ها نیز گویند.
بالغ[۹]: قدحی[۱۰] که از سرون گاو و یا از چوب پاک کرده سازند و بدان شراب خورند یعنی شراب[۱۱] مثلث، و گویند شاخ گاو باشد پاک کرده چون پیمانه یا طاسی. بفتح[۱۲] لام نیز گویند و بباء[۱۳] پارسی هم

---

۱ رک: مدار ا: ۱۷۷
۲ درحاشیهٔ نسخهٔ اصل: وزن چراغ؛ دستور ص ۹۲ و بحر الفضائل: بناغ: دبیرا ما در ادات کذا فی المتن، نیز رک: موید ا: ۱۴۷.
۳ قواس ص ۲۴، جهانگیری ا: ۳۰۸، رشیدی ا: ۲۷۰، برهان ا: ۲۵۸ برغ بند رود آب؛ دستور ص ۹۷ بزغ بند رود آب؛ قواس ص ۲۳ ورغ مترادف برغ و در زفان ورغ بمعنی بند آب و رود آب الخ.
۴ کذاست در ادات و بحر الفضائل و موید ا: ۱۴۷؛ اما دستور ص ۸۹ بزغ غوک؛ ص ۹۶ سیمرنگ آب.
۵ رنگ آب چیزی باشد سبز که بر روی آب ایستاده بهم رسد (برهان ص ۱۱۶۸).
۶ درحاشیهٔ نسخهٔ اصل: وزن افشرد؛ ادات: بشترغ درختی است که آنرا اسپرک گویند، و تیل گیاهی که جامه را بدان رنگ کنند.
۷ رک: مدار ا: ۸۳، نیز موید ا: ۱۴۷.
۸ موید بفتح با وضم سوم نوشته و بگفتهٔ دستور بمعنی پاره ای از خوشهٔ انگور آورده و همین معنی در نسخهٔ چاپی دستور ص ۸۸ یافته می شود.
۹ بظاهر بکسر لام آمده، نیز رک: رشیدی ص ۲۰۹ و شرفنامه.
۱۰ صحاح ص ۱۷۱: بالغ بضم لام، سرگاو پاک کرده بود یا کاسهٔ چوبین که بدان شراب خورند.
۱۱ معلوم نیست چرا این را با شراب مثلث مخصوص کرده.
۱۲ شرف نامه بحوالهٔ موابد الفواد با بای فارسی و فتح سوم آورده، نیز رک: رشیدی ص ۲۰۹ که مانند صحاح بضم نیز نوشته.
۱۳ رک: شرفنامه و رشیدی.

گفته اند.
بوارغ[1]: تخت بستن مرز[2] زن را
بالغ[3]: نام[4] ولایتی است در بلاد شمال.

بهرهٔ ک

بک[5]: بی هنری و رعنائی.
بشک[7]: ژاله و برف و عشوه[8]، بمعنی باشد که [می آید[9]] و درخت است معروف[10].

---

[1] کذاست در اصل؛ اما شرفنامه و موید ا: ۱۴۷ و مدار ا: ۲۵۱: بوارغ و همین قرأت در Steingass و Johnson نیز یافته می شود.

[2] کذاست در اصل؛ اما در شرفنامه: مرزراو در موید و مدار: تخت بستن رز را. لغت نامه: بوارغ تخت (شرفنامه)، تختی است که برای زن حامله موقع وضع حمل... (شوری)، تخت آرامش زنان (Steingass). این اختلاف در معنی فقط از تصحیف خوانی لفظ زن و رز پیدا شده؛ بنظر بنده 'رز' درست است و زن تصحیف است. و معنی تخت برای وضع حمل اشتباه است.

[3] شرفنامه لام مفتوح نوشته.

[4] کذاست در شرفنامه؛ رشیدی ص ۲۰۹ نوشته: نام ولایتی از ترکستان که خان بالغ نیز گویند اما قول درست اینست که خان بالغ و خان بالیغ یا خان بالیق اسم قدیمی شهر پکن که پایتخت کشور چین است. رک: فرهنگ معین ج ۵ (آ - ع)

[5] پیش ازین دو کلمه در حاشیه افزوده: بوبک دزن خوبک بدبد؛ بوسک وزن چو بک گربه.

[6] رک: شرف نامه، موید ا: ۱۵۱، مدار ا: ۲۳۳؛ اما در جهانگیری ۲: ۱۵۰۲ بک با اوّل مفتوح بی و خود آرا و همین است در رشیدی ص ۲۳۰-۲۳۱. و لک نیز بهمین معنی آید و خود در زفان تحت لک پک آورده نه بک، و پک از اتباع لک شمرده. صحاح ص ۱۷۴ پک و لک از قبیل توابع بمعنی رعنائی و بهتری (تصحیف بی هنری) و ص ۱۷۵ پک بمعنی رعنائی.

[7] لغت فرس ص ۲۷۵ بشک شبنم، صحاح ص ۱۸۷ بشک بمعنی ژاله، شرفنامه بشک بمعنی ژاله و عشق دل آویز و نام درختی الخ، موید ا: ۱۵۱ بشک بمعنی ژاله و برف و عشوه و غمزه و دل آویز الخ جهانگیری ۲: ۱۳۴۶ بمعنی عشوه و غمزه و شبنم آورده، معنی عشوه را بدین بیت تمسک جسته. نزاری

کرشمهٔ کن و بشکی بزن چه باشد اگر ٭ بگوشهٔ لب همچون شکر فسرو خواندی

و رشیدی ص ۲۱۴ عیناً مطالب جهانگیری را آورده.

[8] کلمه عشق که در شرف نامه و مدار آمده تصحیف عشوه است.

[9] رک: شرفنامه.

[10] در بعض فرهنگ معنی درخت است، اما موکد به شهرت نیست.

بردک[1]: افسانه و لغز که جنسی است از معما، وبعضی بضم با گویند و [در] فرهنگ[2] نامه است:
نردک بنون، لغز و افسانه.
بوک: مگر[3]، کلمهٔ استثنا و غلزاری که جائی[4] پنهان کنند و بر سر خاشاک اندازند.
برندک[5]: پشتهٔ کوه خرد که درمیان دشت بود.
بسک[6]: گیاهی است که آن را اکلیل الملک خوانند.
بشک[7]: جو و گندم درووه.
بشتک[8]: خره و بفتح با نیز گویند.
بلشک[9]: چوب[10] بریان یعنی چوبی که بریان کنند و تنور نهند، بسین مهمله نیز گویند.
بساک[11]: تاجی که از گلها و اسپرگها بافند، بهندوی سهره گویند.
بچسک[12]: طبیب و گیا[13] فروش، و بکسر جیم و با نیز گویند
بلونک[14]: شمشیر چوبین و بضم نیز گویند.

---

[1] فواس ص ۱۸۸: کردک و بردک: افسانه، نردک و چربک: لغز و چیستان، نیز رجوع کنید: فواس حاشیهٔ ص ۱۸۸.
[2] بظاهر مراد فرهنگ فواس است که نردک یعنی لغز و چیستان نوشته.
[3] از لحاظ این معنی بوک مرکب است از بو و که، بودکه، امیدکه، کاشکه، کاش، مگر رک: فرهنگ معین ۱: ۵۹۶ ذیل بو ـ امید، آرزو، آقای دکتر معین کلمهٔ تمنا و استثنا قرار داده، ۱: ۶۰۵.
[4] رک: موید ۱: ۱۵۲، مدار ۱: ۲۵۶.
[5] رک: فواس ص ۳۱.
[6] رک: فواس ص ۶۳.
[7] در بحر الفضائل و شرفنامه و موید ۱: ۱۵۱ بسک با سین مهمله است.
[8] رک: فواس ص ۱۳۷.
[9] بلسک و بلشک بهر دو صورت آمده، رک: موید ۱: ۱۵۱، مدار ۱: ۲۳۹، برہان ص ۲۹۷.
[10] فواس ص ۱۴۰ بلسک: چوب بابزن، اما رک: موید ۱: ۱۵۱ و مدار ۱: ۲۳۹؛ سروری: چوب باشد که بآن بریان در تنور نهند.
[11] رک: موید ۱: ۱۵۱، مدار ۱: ۲۲۰.
[12] کذا است در اصل: اما در موید ۱: ۱۵۰، مدار ۱: ۱۸۷، باشین قرشت، و بای فارسی.
[13] رک: مدار ۱: ۱۸۷.
[14] مدار ۱: ۲۴۳ بلونک و بکونک بهر دو بهمین معنی دارد.

بنجک[1]: پاغند بزرگ از آنِ پنبه یعنی گاله.
باک[2]: التفات یعنی واپس نگریستن.
بنجشک[3]: کنجشک خانگی که بتازی عصفور گویند.
بیلک[4]: تیر نیم شکاری.
بهرک[5]: ریم و گره [که] در تن افتد.
بندک[6]: پاغنده.
بوک[7]: بواو [ورق ۱۶ا] پارسی، پده[8] باشد که بدو آتش زنند وبعضی ببای پارسی فاژه[9] وبعضی ببای پارسی گویند.[10]
بلک[11]: کنجشک طرفه[12]
باسک[13]: بفتح سین فاژه[14] وبعضی ببای پارسی وفتح وضم سین گویند.

---

[1] قواس ص ۱۸۲: پنجک بهندوی گاله را گویند و پارسی پاغنده است؛ رک: ادات الفضلا.
[2] موید ا: ۱۵۰ باک را بمعنی التفات یا بازپس نگریستن بحواله شرفنامه نوشته. نیز رجوع کنید: مدار ا: ۲۸۲ (ذیل پاک).
[3] ادات: بنجشک کنجشک خانگی که عرب آنرا عصفور خوانند؛ نیز رک: صحاح ص ۱۸۶.
[4] کذاست در ادات؛ موید ا: ۱۵۳ بیلک پیکان شکاری... این لغت هندی است مستعمل در فارسی؛ مدار ا: ۲۷۴ بیلک نیزه و نیم شکاری الخ.
[5] رک موید ا: ۱۵۳، مدار ا: ۲۶۲، برهان چرک وریم.
[6] موید ا: ۱۵۲؛ مدار ا: ۲۴۷. نیز رک: زفان بنجک.
[7] ادات بوک گیاهی آبی که نیک نرم بود، در ته چقمق نهند تا زود آتش افتد وخف نیز گویند. کذاست درموید ا: ۱۵۳؛ مدار ا: ۲۵۶.
[8] پده بمعنی درختی که بارش نبود و با ضم گیاهی است نرم وسبک الخ (موید ا: ۲۲۳) اما در زفان پده بمعنی اوّل آمده و در اینجا باید معنی دوم که در موید آمده مراد باشد.
[9] این کلمه دراینجا زاید بنظر می آید. [10] کذاست دراصل.
[11] ادات: کنجشکی طرفه، موید ا: ۱۵۲ بگفته قنیه این معنی آورده، اما جهانگیری ۱۵۹۰، سرمهٔ سلیمانی ۳۴، فرهنگ جعفری ۹۷ بلک نوباده وچیزی نو و تازه.
[12] دستور الاخوان: طرفه چیزی نو.
[13] قواس ص ۱۶۰، باسک وآسا فاژه بود، نیز رک: موید ا: ۱۵۰.
[14] زفان: فاژه آسا بود، دهان دره.

برمک[۱]: نام مردی.

برک[۲]: ستارهٔ سهیل، و ولایتی است که قطب جنوبی آنجا نموده می شود، گویند ستارهٔ برک و آن قطب و کزید[۳] و بعضی سهیل را گویند.

بهرهٔ گاف

برگ: کار و ورق درخت و ساختگی و اسباب و توشه.

بشنگ[۴]: سوراخ کن نجار را گویند یعنی نهانی[۶]، درودگران بدان سوراخ کنند.

باجنگ[۷]: دریچهٔ خرد، بتنک[۸] و پتنگ نیز گویند.

بناسگ[۹]: دریچه.

برنگ[۱۰]: درای یعنی جرس و کلند و ذخیره، و بعضی برنگ که کلند است. بزای معجمه گویند و برنگ که ذخیره است بدو ضمت گویند.

بهرهٔ لام

بشکول[۱۱]: مرد جلد و قوی و سختی کش و حریص برکار.

بشل: درآویزه[۱۲].

---

۱ رک: مدار ۱: ۲۱۰

۲ در موید ۱: ۱۵۰ معنی برک بحوالهٔ زفان نقل شده؛ مدار برک و پرک و پرگ هرسه صورت نوشته (۱: ۲۹۶)، عبید زاکانی (دیوان ص ۱۸۰) (مصراع). غور محیط بستهٔ گرد ستارهٔ پرک.

۳ کذا است در اصل، سرمهٔ سلیمانی ۳۵ برنگ نام ولایتی که قطب جنوبی از آنجا طلوع کند.

۴ در اکثر فرهنگها این معنی دیده نشد؛ رک: موید ۱: ۱۵۴، فرهنگ معین ۱: ۵۰۸.

۵ در اکثر فرهنگها بای فارسی، مثلاً رک: فرس ص ۳۰۰، صحاح ص ۱۹۵، جهانگیری ص ۲۷۶، سروری ص ۲۴۲ وغیره.

۶ ادات 'نهانی' دائرهٔ هندوی گفته.

۷ فرس ص ۱۰۴، صحاح ص ۱۹۴، دستور ص ۹۳، موید ۱: ۲۱۱، و در همه اینها پاچنگ با بای فارسی.

۸ رک: موید ۱: ۲۰۸، ۲۱۱. که پتنک و پتنگ دارد.

۹ رک: قواس ص ۱۲۴، دستور ص ۹۴؛ در اکثر فرهنگها با کاف عربی.

۱۰ قواس ص ۱۷۵، موید ۱: ۱۵۴، مدار ۱: ۲۱۲.

۱۱ قواس ص ۱۶۷.

۱۲ کذا است در موید ۱: ۱۵۷، اما قواس ص ۱۰۷: بشل جدل و درآویزه نیز رک مدار ۱: ۲۲۵.

بجال[1]: انگشت افروخته.

بال : بازوی آدمی وشهپر مرغان.

بشول[2]: دیدن و دانستن.

بشکل : کرک[3] کلیدان.

بیل[4] : آن چوبی که بدان کشتی رانند یا کلوخهای کشت بشکنند ، و آلتی است مانند میتن[5] سرپهن و دستهٔ او راست است ، هیئت[6] بیل کشتی.

بل[7] : بمعنی بہل یعنی بگذار.

بلکل[8] : آب شیرگرم ، وبعضی بلکک[9] بدو کاف گویند.

بهرهٔ ام

بافدم[10]: عاقبت کار.

---

[1] مدار ا : ۱۸۶ ، بجال انگشت افروخته و در ادات ببجال. موید ا : ۱۵۶ : بچال (واژه ازچاپ افتاده) باجیم فارسی وعربی بهمین معنی.

[2] کذاست در موید ا : ۱۵۷ و مدار ا : ۲۲۶ ؛ اما بشول امر است از مصدر بشولیدن ومعنی آن ببین و بدان باشد ، چنانکه در جهانگیری ص ۱۲۵۰ است ، بدین بیت شاهد :
زرد گشت از فراق لقمه بشول ÷ روی سرخ من ای سیاهشه دول : درصحاح ۲۳۲ بشولیدن بمعنی دیدن و دانستن

[3] موید ا : ۱۵۷ ، فرهنگ معین ا : ۵۴۲ : بشکل کجک کلیدان ، مدار ا : ۲۲۴ : کرژک کلیدان

[4] رک : موید ا : ۱۵۷.

[5] زفان : میتن کلند و آن تبری است که بدان چاهها و زمین کنند ، وبیل را نیز میتن گویند.

[6] کذاست دراصل ، ممکنست بیلہ باشد.

[7] رک : موید ا : ۱۵۷ ، مدار ا : ۲۳۶ ؛ بل مخفف بہل است (جعفری) و در بہل بای زینت است کلمۂ اصل از مصدر ہلیدن است ، پس بل را تحت حرف ب آوردن برنقص ترتیب دلالت می کند.

[8] رک : ادات ، موید ا : ۱۵۷ ، مدار ا : ۲۴۲.

[9] نواسس ص ۲۳ ہمین صورت را دارد ، نیزرک : مدار ا : ۲۴۲ ، سروری ص ۱۶۰ ، رشیدی ص ۲۷

[10] صحاح ص ۲۱۲ : بافدم عاقبت کار ، رودکی :
همچنان سرمه که دخت خوبروی ÷ هم بسان گرد بردارد ازوی
گرچه هر روز اندکی برداردش ÷ بافدم روزی بپایان آردش
نیزرک : موید ا : ۱۵۸ ، مدار ا : ۱۷۵.

بادرم[1]: بیهوده وازکار بازمانده[2] باشد.

بهرام[3]: مریخ و روزی از ماه پارسیان، گویند بیستم روز از ماه.

بلخم[4]: کلاخن.

بوم[5]: که شب بیند و روز کور باشد، و زمین نارانده[6] از بنیاد[7].

بزم[8]: مهمانی و مجلس شادی وشراب.

بشترم[9]: دمیدگی اندام.

بخم[10]: نام ولایتی[11] است که آنجا مشک شود.

بشتالم[11]: دمیدگی.

بام[12]: بامداد، و بالای سقف.

بدرام[13]: همیشه.

---

[1] صحاح ص ۲۱۶ بادرم چون بیهوده کار الخ.

[2] نسخهٔ اصل: کارباده؛ متن مطابق موید ا: ۱۵۸، مدار ا: ۱۶۳.

[3] رک: صحاح ص ۲۱۷، موید ا: ۱۶۰، مدار ا: ۲۶۱.

[4] رک: فواسس ص ۳۱، موید ا: ۱۶۰، مدار ا: ۲۳۸؛ سروری ص ۱۷۲، رشیدی ص ۲۴۰ بدین بیت شاهد: گله بانان او نهند از قدر ❊ مهر و مه را چو سنگ در بلخم

[5] دو کلمه در اصل ناخوانا (جاس نشانه؟) [6] رک: فواسس ص ۳۳، مدار ا: ۲۵۷.

[7] این کلمات در فواسس و مدار یافته نمی شود. [8] رک: موید ا: ۱۶۰، مدار ا: ۲۴۹.

[9] موید ا: ۱۶۰، مدار ا: ۲۲۰ بشترم و بسترم هردو.

[10] کذا است در موید ا: ۱۵۸، مدار ا: ۱۹۴، اما واضحاً این ولایت معروف نیست.

[11] رک: فواسس ص ۱۹۱.

[12] رک: موید ا: ۱۵۹، مدار ا: ۱۷۹: بام بامداد و بالای سقف و رودسطبرکه بتازی بم خوانند.

[13] موید ا: ۱۵۹: بدرام آراسته وخرم و باآسایش و جای آرام ... و در زفان گویا بمعنی همیشه مرقوم است، نیز رک: مدار ا: ۱۹۴ بدرام بمعنی بدخوی و بدمهر و بیباری پارسی آراسته و خرم الخ، و خود در زفان ذیل پ پدرام بمعنی آراسته وخرم نوشته. صحاح ص ۲۱۶ بدرام و پدرام هر دو معنی آراسته وخرم آورده، عنصری:

چرا بگرید زار ابر نه غمگنست غمام

گریستنش چه باید که شد جهان بدرام

بم[1]: رود ستبر[2] و بانگ بلند[3].

بهره[4]' ن'

برمایون[5]: نام گاو افریدون و آنرا برمایه هم گویند.

برمگان[6]: موی زهار.

بهمن[7]: آفتاب در دلو که آنرا بهمن ماه گویند، و نام پادشاه که پسر اسفندیار[8] بود، و نام گیا[9] که آنرا بهمن چینی گویند و آن دوگونه است، سپید و لعل، بهندوی اسگند[10] ورق ۲۱۱ گویند، زنان و مردان بجهت قوت و فربهی بخورند. و در اندام مالند، و نیز بهمن دوم[11] روز از ماه را گویند.

بنوان[12]: خرمن بان یعنی نگاهبان خرمن، و بفتح با نیز گویند.

برزن[13]: کوچه یعنی کوچه و محلت و صحرا نیز.

بکهوجتان[14]: خرپشته، و بواو عربی نیز گویند و بعضی بفتح 'با' گویند.

---

[1] موید ا: ۱۵۸، مدار ا: ۲۲۴ بم را عربی دانسته؛ اما صحاح ص ۲۱۶ این کلمه را دارد و حال آنکه این فرهنگ فارسی است.

[2] مدار: رود سطبر رباب، موید رباب ندارد. [3] مدار: همین معنی بحوالهٔ پنج بخشی (زفان) نوشته.

[4] رک: موید ا: ۱۶۷، ۱۸۰، مدار ا: ۲۱۰ [5] رک: موید ایضاً، مدار ایضاً.

[6] رک: موید ا: ۱۷۲، مدار ا: ۲۶۴، صحاح ص ۲۳۴ بمعنی گل و پسر اسفندیار و ماه یازدهم آورده.

[7] نسخهٔ اصل: اسپندیار [8] این کلمهٔ هندی در موید و مدار یافته می شود.

[9] مدار: نهم روز از ماه، و پس ازان علاوه نموده؛ در ابراهیمی دوم روز از ماه و تحقیق همانست چنانکه در قطعهٔ مؤلف زیر اورمزد آمده.

[10] قواس ص ۵۶، دستور ص ۸۸ بنو: خرمن، بنوان: خرمن بان.

[11] در اکثر فرهنگها بمعنی کوچه و محلت آمده، مثلاً رک: قواس ص ۱۲۱، صحاح ص ۲۳۳، اما در موید ا: ۱۶۶ برزن بحوالهٔ رسالهٔ النصیر بمعنی صحرا و در مدار بدون حواله بدین معنی نیز آمده.

[12] دربارهٔ قرائت این واژه اختلاف است: قواس ص ۱۳۳ بکهوجتان چنانکه در متن است، دستور ص ۸۱: بکتوجستان در موید بحوالهٔ این فرهنگ همین صورت درج شده، در ادات الفضلا: بکهوجنان اما در موید بحوالهٔ این فرهنگ بکهوختان، بحر الفضائل: پکهوجتان؛ موید ا: ۱۶۹ بکهوجتان: خرپشته کذا فی شرفنامه، و در لسان الشعرا و ادات الفضلا با خای معجمه و در دستور بکتوجستان الخ؛ مدار ا: ۲۴۴، ۲۴۵: بکتهوجتان و بکهوجتان بمعنی خرپشته.

بابزن: گردنای[1] بریان کرده باشد یعنی سیخ کباب آهنین.
برغان[2]: اژدر یعنی مار بزرگ.
بیژن: نام پسر کیخسرو[3].
بریون[4]: دردکه پوست را آواره کنند، و بعضی ببای پارسی گویند.
باستان: کهن و قدیم.
بخسان[5]: گدازان[6].
بهین[7]: توانگری و یافت.
بتکن[8]: سرباز زدن از خوان از غایت سیری و در فرهنگ[9] نامه آورده است، بتکن نوعی از ساز

---

[1] زفان: گردنا بابزن را گویند یعنی سیخ کباب رک: سرمهٔ سلیمانی ۲۱۴.
[2] این واژه در فرهنگهای قدیم مانند قواس و صحاح و دستور و بحرالفضائل شامل نیست؛ اما در موید ۱: ۱۶۷ و مدار ۱: ۲۰۷ و جهانگیری ۸۵۶ بهمین معنی یافته می شود.
[3] این غلط است؛ بیژن پسر گیو خواهرزادهٔ رستم که عاشق منیژه دختر افراسیاب بود، داستان بیژن و منیژه یکی از مشهور ترین داستانهای شاهنامه است. رک: فرهنگ معین ج ۵ ص ۳۱۰؛ در موید ۱: ۱۷۲ و مدار ۱: ۲۷۲ نیز بیژن پسر گیو قرار داده شده.
[4] در موید ۱: ۱۶۸ و مدار ایضاً بهمین معنی آمده. و بحوالهٔ لسان الشعرا متبادل لغت هندی 'داد' نوشته و در جهانگیری متبادل عربی قوبا و هندی داد درج است (ص ۸۷۰)
[5] رک: مدار ۱: ۲۱۶.
[6] اسم حالیه از بخسیدن بمعنی گداختن و گدازیدن، رک: صحاح ص ۲۴۳ که بدین بیت عنصری تمسک جسته:
ای ترک بحرمت مسلمانی ÷ کم بیش بوعدها بخسانی
رک. موید ۱: ۱۶۶، مدار ۱: ۱۹۱. در زفان گویا بخیدن و بخسانیدن بمعنی گدازیدن آمده است.
[7] در اصل معنی اش: خوب، نیکو، برگزیده، برگزیده ترین است، رک: فرهنگ معین ۱: ۶۱۵؛ اما در موید ۱: ۱۷۲ بمعنی توانگری و یافتن و نیز انتخاب و بهترین، و در مدار ۱: ۲۶۶ بمعنی توانگری و یافت، مهتری آمده.
[8] رک: موید ۱: ۱۶۴، مدار ۱: ۱۸۴؛ در موید 'بتکندن' و 'بتکندیدن' بمعنی سرباز زدن از خوردن بسیار کذا فی زفان گویا و در شرفنامه بدین معنی بتکن مذکور است. و 'بتکن' سرباز زدن از خوردن سخت از بسیاری غایت سیری الخ. در اصل 'بتکن' باید امر باشد از مصدر بتکندن یا بتکندیدن، یا ممکن است اسم مصدر نیز باشد زیرا که زفان معنی مصدری بیان کرده است؛ در زفان بتکندن بمعنی سرباز زدن از خوردن آمده و نیز بتکندیدن.
[9] معلوم نیست کدام فرهنگ است، ظاهراً فرهنگ قواس مراد نیست زیرا درین فرهنگ این واژه شامل نیست. اما در موید ۱: ۱۶۵ ابتکن بهمین معنی آمده، نیز رک: مدار ۱: ۱۸۴.

برزگری است یعنی تخته‌شیار که هندوی بروته گویند، صحیح آنست که بکن ماله است و نیز بکاف پارسی و مکسور گویند.

بوکان[1]: زاهدان.

بلکن[2]: سر دیوار.

بروسان[3]: گروهها[ی] آدمیان.

بومهن[4]: زلزله.

ببربیان[5]: نام قبای رستم دستان است و گویند ببربیان دیبای منقش که هر زمان رنگی دیگر نماید، در روم بافند، و فردوسی گوید خفتان رستم یعنی جوشن رستم که پلنگینه[6] بود.

بزمان[7]: دژم یعنی غمگین و اندوهگین و آرزومند و ببا و زای پارسی هم گویند و بعضی یکی ازین دو عربی و یکی پارسی گویند.

بریزن[8]: غربال.

باژبان[9]: طایفه اند و ایشان را ترکان نیز گویند.

---

[1] نسخهٔ اصل: زهدان اما موید ا: ۱۷۱: بوکان زاهدان یعنی رحم.

[2] رک: موید ا: ۱۶۹، ادات: بلکن با کاف فارسی سر دیوار.

[3] این کلمه بصورتهای مختلف آمده، مانند برسان، بروسان، برروشنان، پرروشنان، بروشیان وغیره؛ اما اصلش کلمهٔ پهلوی "دروشنیک" Warwishnik، جمع Warwishnikan یعنی مومنان، صورت قدیم این کلمه در فارسی بروشنان Berawishnan جمع Berawishn است که در شعر دقیقی آمده:

شفیع باش برشه مرا بدین زلت ❊ چو مصطفی برداراد برروشنان را

کلمهٔ پهلوی بر روی سکه ای که در داراب گرد فارس بنام عبدالله زبیر در سال ۶۵ ضرب شده بود بدینصورت موجود است: 'Apdula Amir Warwishnikan' رک: دکتر معین حاشیهٔ برهان قاطع، و نیز حاشیهٔ مدار: ۳۰۰-۳۰۱؛ این کلمه بصورت جمع در فرهنگها آمده است.

[4] این کلمه بصورت بوم‌هن و بومهین بمعنی آمده؛ رک: صحاح ص ۲۳۴. اما در موید بومهین را خطای کاتب شمرده ا: ۱۷۱؛ این قیاس از اعتبار ساقط است.

[5] رک: موید ا: ۱۶۴

[6] رک: فرهنگ معین ا: ۸۱۰ که پلگینه دارد.

[7] موید ا: ۱۶۸ بزمان مخمور و غمگین، مدار ا: ۳۰۵ پژمان: غمگین و اندوه زده و مخمور و آرزومند؛ قواس ص ۹۵: پژمان و دژم: مخمور بود؛ اما صحاح ص ۲۳۷ پژمان بمعنی غمگین آمده.

[8] رک: موید ا: ۱۶۸؛ اما صورت متداول پرویزن است.

[9] کذا است در شرفنامه و موید ا: ۱۶۳ و مدار ا: ۱۷۲؛ اما این اطلاع ناقص است.

برشجان[1]: نام مقامیست میان ایران و توران.

بجخران[2]: نام ولایتی است.

بارمان[3]: نام مردی از پهلوانان.

بشیون[4]: سمین یعنی فربه.

برین[5]: بزرگ و بالاترین.

بکتوشن[6]: نام مردی.

بی آبان[7]: طایفه ای[8] که اعتبار ندارند.

---

[1] این تصحیف برسخان است و این برسخان یکی از شهرهای خطهٔ ختلغ است. چنانچه در حدود العالم طبع کابل، ص ۳۸۴ آمده:

برسخان شهریست برکران دریا آبادان و بانعمت و دهقان او از خلخ است الخ.

در زین الاخبار گردیزی نیز یادداشت جداگانه دربارهٔ این شهر وجود دارد (ص ۲۶۵-۲۶۶).
بقول معجم البلدان قریه ایست از بخارا بدو فرسنگی از آن. در هر حال توضیحی که دربارهٔ این شهر در فرهنگها مانند موید ۱:۱۶۷، مدار ۱: ۲۰۶ و غیره که بدون تحقیق از یکدیگر نقل کرده، اعتبار رانشاید.

[2] بجخران که در متن است تصحیف بجخوان و این بجخوان تصحیف نخجوان است. نخجوان یکی از جمهوری های قفقازیه در جنوب شرقی مجاور رود ارس، از جنوب به ایران و از شمال غرب به ارمنستان محدود است و اکنون جزئی از آذربایجان شوروی است، پایتخت آن شهر نخجوان و از شهرهای قدیمی قفقازیه است. نخجوان و نخشوان نیز گفته می شود (معین ۶: ۲۱۱۱)، فرهنگ صحاح الفرس که یکی از فرهنگهای قدیم فارسی است و مولف آن محمد بن هندوشاه نخجوانی بوده. رک: موید ۱:۱۶۵؛ مدار ۱: ۱۹۱؛ نام این جای را بجخوان بحوالهٔ زفان نوشته؛ بهمین علت باید بجخران را تصحیف دانست.

[3] رک: موید ۱: ۱۶۳.

[4] موید ۱: ۱۶۹، مدار ۱: ۲۲۷ بشیون بروزن افیون: فربه.

[5] رک: مدار ۱: ۲۱۵.

[6] موید ۱: ۱۶۹ بحوالهٔ زفان بکتوسن و مدار ۱: ۲۳۴ بحوالهٔ پنج بخشی (زفان) بکتوس دارد؛ مدار اصلاً بکتوسان دارد، و همین صورت در سرمهٔ سلیمانی و جعفری وجود دارد.

[7] کذاست در ادات الفضلا؛ اما در نسخهٔ اصل و مدار: بیابان، موید: بیابانان.

[8] همین عبارت عیناً در ادات یافته می شود.

بون : زاهدان[1] که بتازی رحم گویند و گروهی گویند رودهٔ[2] گوسپندان آنک جای[3] سرگین بود.

بان[4]: دارنده و صاحب چیزی در محافظت و غمخوارگی، در آخر کلمه پیوندد و گویند پیلبان دشتبان، و با واو نیز بدل کنند و گویند پیلوان[5]، چنانک بک و [ناک] و زار و سار و ستان ومند و گر و ور، گویند دادبک و رسناک و گلزار و شاخسار و گلستان و خردمند (ورق ۱۱۸) و کمانگر و سرور و دلاور، و همچنین [علامت] فاعل در آخر اسم[6] فعل بیفتد [رنگ ریز] رنگ ریزنده، کفش دوز کفش دوزنده.

بهرهٔ واو

بنو[7]: خرمن، بضم و فتح با.

بتو[8]: قمع و آن روغن ریز است یعنی دبه و گلابدان، بدان گلاب در آوند کنند و آنچه بطریق قبه بر سر چیزی باشد چنانچه بر سر تازیانه و عصا و بر سر بادنجان و آنچه مانند آن باشد و بکسر با نیز گویند.

برمو[9]: انتظار.

بانو[10]: عروس خانه آزا که بزرگی خاتون گویند.

بالو[11]: زخ[12] و بعضی بپای پارسی گویند.

---

[1] مدار ۱: ۲۵۷ بون رودهٔ گوسپند جای سرگین ، نیز رک : موید ۱ : ۱۷۱.

[2] نسخهٔ اصل: رود.

[3] اصل : جای ندارد ، رک مدار.

[4] صحاح ۱: ۲۳۲، موید ۱ : ۱۶۴.

[5] نسخهٔ اصل : پیلبان.

[6] گذاشت در اصل.

[7] گذاشت در قواس ص ۵۹ ، دستور ص ۸۸ ، ادات : بنو و بنوه هر دو بهمین معنی.

[8] رک : موید ۱: ۱۷۵ ، مدار ۱: ۱۸۵ ؛ معین ۱: ۴۷۲ بتو سنگ درازی که بدان داروها سایند ، مقمع ، قیف ، قبه و گوی سر عصا و قمچی. اما قمع بمعنی لولهٔ مخروطی که بدان وسیله مایعات را از ظروف تنگ دهانه داخل کنند (معین ۲ : ۲۷۲۸)، گویا در زفان از سه معنی که معین دارد فقط دو معنی آمده.

[9] موید ۱: ۱۷۵ ، مدار ۱: ۲۱۰.

[10] رک : موید ۱: ۱۷۵ ، مدار ۱: ۱۸۰.

[11] ایضاً

[12] رک : موید ۱: ۴۵۱.

بهرهٔ 'ه'

بروازه[1] : خوردنی باشد که بعد از رفتن قومی برند ، و آتش که پیش عروس افروزند.

برواره[2] : رهی[3] که برای در آمد در خانه بغیر در بود و حجرهٔ بالاترین حجرهٔ دیگر و این را برباره نیز گویند.

بیله : زمین[4] گشاده [میان] دو شاخ آب رود بار و بیای[5] فارسی نیز گویند.

بخنوه[6] : برق و بضم با و نون نیز گویند.

باشامه[7] : سرپوش چون دامنی و چادر.

بلاده[8] : فاسد کار.

بلایه[9] : نابکار و دشنام ده.

بسغده[10] : سازواری و مرد ساخته شده.

---

[1] رک صحاح ۲۶۷، موید ۱۸۱:۱، مدار ۱ : ۲۹۸ (ذیل پروازه)؛ اما در فرهنگ معین ۱ : ۵۱۵ بردازه، ۱ : ۷۵۹ پروازه، سرمهٔ سلیمانی ۵۶ : پرداره.

[2] این واژه بشکلهای مختلف آمده است مانند برباره ، بروار ، برداره ، فروار ، پروار ، پرواره ، پربال ، پرباله ، فربال ، فرباله ، فرداره وغیره رک : فرهنگ معین ۱ : ۷۵۹ . قواس ص ۱۴۲ برباره ، برواره ، فرداز سه صورت دارد. در زفان' ورواره' بمعنی غرفه آمده و آن نیز از همین ریشه.

[3] موید ۱ : ۱۸۱ : بروازه بمعنی باخته یعنی راهی که غیر راه متعارف در آمدن خانه بود کذا فی شرفنامه و در لسان الشعرا مذکور است بمعنی حجرهٔ بالاترین الخ، نیز رک : جهانگیری ص ۸۶۶.

[4] ادات ، موید ۱ : ۱۸۵.

[5] رک : ایضاً ص ۲۲۷.

[6] دربارهٔ تلفظ و معنی این واژه اختلاف بسیار است ، رک : قواس ص ۲۰ متن و حاشیه؛ نیز رک : زفان ذیل بخنور.

[7] رک : موید ۱ : ۱۷۴ [8] موید ۱ : ۱۸۲ ، معین ۱ : ۵۶۴.

[9] صحاح ص ۲۶۶ : بلایه زنی نابکار و دشنام ده : همین عبارت عیناً بعلادهٔ متن در موید ۱ : ۱۸۲ ، مدار ۱ : ۲۳۶ یافته می شود ، و ازین جهت واضح است که اکثر فرهنگ نویسان نقال اند نه محقق. موید و مدار بجای بلایه بلابه دارد ؛ نیز رک : جهانگیری ۲ : ۱۵۸۷ هر دو معنی مع ابیات شاهد آورده است.

[10] فرس ۴۵۸ ، صحاح ۲۶۸ : بسغده ساخته شده ؛ قواس ص ۱۰۸ ، موید ۱ : ۱۸۱ ، مدار ۱ : ۲۲۱ بسغده بهمین معنی.

بیخسته[1] : درمانده.
بنه[2] : اتباع و رخت[3] خانه را گویند چنانکه بنگاه[4] یعنی جای رخت و بندار[5] خانه دار.
بنفشه : رستینه است ، سبز خوشبوی و خم دار[6] ، بر کوع[7] و سجود و گوش و چشم نسبت کنند ، و بدو تاری و کبودی نیز گویند گل [کبود][8] رنگ.
باسره[9] : زمین کشت زار.
بابونه : شکوفه ، هندوی کونپله[10] گویند و بتازی بابونج.
بزغه[11] : آنچه[12] شاخ برو افکند.
باره[13] : اسب و مشهور شده و حجره و حجرهٔ بالا.
بلمه[14] : دراز [ریش].
برمخیده[15] : فرزند عاق.

---

[1] صحاح ص ۲۶۶ : بیخسته درمانده ، نیز رک : موید ۱ : ۱۸۴ ، مدار ۱ : ۲۶۹.
[2] رک : مدار ۱ : ۲۵۰.
[3] کذاست در نسخهٔ اصل ، اما رک : ادات و مدار. ادات بنه بمعنی اتباع و رخت خانه.
[4] موید ۱ : ۱۸۳ بنگاه و بنگه آنجا که رخت نهند.
[5] موید ۱ : ۱۳۵ بندار بضم رخت خانه.
[6] نسخهٔ اصل : خم دار.
[7] رک : موید.
[8] تصحیح قیاسی.
[9] رک : قواس ص ۲۸ ، موید ۱ : ۱۷۸ ؛ مدار ۱ : ۱۷۳ ؛ قواس و مدار بیت زیر عنوان شاهد :
گفتی بدو سه بار مرا باسره کارید ÷ این باسره بازی نه همی زود بکشتی
[10] رک : موید ۱ : ۱۷۷.
[11] نسخهٔ اصل : برغه ، اما رک : قواس ص ۵۳.
[12] عیناً همین عبارت در قواس آمده ؛ نیز رک : دستور ص ۸۸ ، مدار ۱ : ۱۸۱.
[13] رک : دستور ص ۹۲ ، موید ۱ : ۱۷۸.
[14] دستور ص ۹۰ ، مدار ۱ : ۱۸۳ ، سرمهٔ سلیمانی ۴۴.
[15] زفان و بحر الفضائل : مخیده و برمخیده هردو بمعنی فرزند عاق و بی فرمان ؛ حتی در زفان برمخیدن بمعنی بی فرمانی نمودن ، و مخیدن بمعنی خزیدن و صحاح ص ۹۳ مخید بمعنی خسبید. قواس ص ۹۹ مخیده فرزند عاق و بی فرمان و مخنده بمعنی خزنده (ص ۶۹) ؛ رک : قواس ص ۹۹ ح.

باخه[1]: برواره، آنک از[2] غیر راه جای درآمدن بود، ببای[3] پارسی نیز گویند.

[بزیشه][4]: کنجد آرد کرده و گویند گنجاره، ببای پارسی گویند.

بوره: شکربسته[5].

بندیه[6]: گویک گریبان، بندمه[7] نیز گویند.

بسیله[8]: ببای عربی ریم که از خون [پیدا] شود و بعضی ببای[9] پارسی گویند.

بازه[10]: چوب دستی.

بخیده: پنبه[11] و پشم زده و از هم جدا کرده.

بوزمه: گیاهی[12] است خوشبوی

بشنجه[13]: مالهٔ آبار یعنی کوچ، و بفتح شین نیز گویند.

---

[1] قواس ص ۱۲۲ باخه را مترادف برواره و برباره بمعنی حجرهٔ بالا آورده بدین دو بیت شاهد:

یکی بت کده دیده ساده زسنگ ؛ چهل باخه هر یکی بیست رنگ

بهر باخه بر چهل لاد نیز ؛ زجزع و رخام و ز هر گونه چیز

[2] رک: موید ا: ۱۷۷، مدار ا: ۱۵۹. راه غیر در برای آمدن خانه بود.

[3] رک: موید ا: ۲۲۱.

[4] موید: بزیشه بالضم کنجد آرد کرده وقیل حرف یکم فارسی کذا فی الشرفنامه، و در زفان گویا بمعنی گنجاره و در ادات کنجد آرد کرده یعنی گنجاره.

[5] در موید ا: ۱۸۳، این معنی بحوالهٔ لسان الشعرا آمده.

[6] نسخهٔ اصل: بندغه: اما در ادات و موید ا: ۱۸۲، مدار ا: ۲۴۸ بندیه بمعنی گویک گریبان آمد؛ نیز رک: فرهنگ معین ا: ۵۸۹.

[7] رک: موید و مدار، اما در فرهنگ معین و سرمهٔ سلیمانی بندمه، بندیه و بندینه هر سه صورت آمده است.

[8] رک: موید ا: ۱۸۵، مدار ا: ۲۷۴، بیله و پیله.

[9] ادات: پیله بابای فارسی ریم و کرم ابریشم الخ. بیله بابای فارسی زمین کشاده و خشک که درمیان دو شاخ لب آب بود الخ.

[10] موید ا: ۱۷۸.

[11] برای عین همین معنی رک: قواس ص ۱۸۲، موید ا: ۱۷۹.

[12] رک: ادات، و مدار ا: ۲۵۴.

[13] ادات: بشنجه مالهٔ آبار؛ مدار ا: ۳۱۰: پشنجه مالهٔ آبار یعنی کوچ جولاهه بفتح شین معجمه.

ندہ[1]: مرد با آہستگی ، وبفتح با و واو نیز آمده .

رکنہ[2]: ذریره[3] که از خوشبوئی است [ورق ۱۱۹ ا] برعطاران ، و بکاف پارسی نیز آمده است و بکسر با گفته اند .

ره[4]: بچهٔ گوسپند .

دیه[5]: آرزو شد[6] و گویند آرزومندی .

یاره[7]: بلا و فتنه و محنت و چیزی که دشمن دارند .

لوانه[8]: مرغکی است مقدار کنجشک ، سپید و سیاه و کوتاه پای ، بر درخت و دیوار نشیند و اگر بر زمین نشیند بدشواری پرد .

ستہ: حریر[9] منقش ، آنک عطاران مشک درو بندند .

بسوده[10]: دست زده را گویند .

---

[1] مدار ا: ۲۵۸ بوند ، بونده : مرد باآہستگی ، با و واو هردو بفتح ، نیز رک : ادات و موید ا : ۱۸۳ ، جہانگیری ۱۹۳۶ بوند مرد آہسته ، جعفری ۱۱۲ مرد باہستی .

[2] قواس ص ۱۸۶ : برکنه : ذریره ، رک : مدار ا : ۲۹۶ ، موید ا : ۱۸۰ : برکنه بالفتح و الکسر : ذریره (مدوره غلط چاپی) ، آن عطریات است ، وقیل باکاف فارسی ، و ایضاً با باء فارسی ... و این صحیح است کذا فی الشرفنامه و در لسان الشعرا برکنه بوزن سلسله ذریره (دایره غلط چاپی)

[3] نسخهٔ اصل : ذریده ؛ اما رک : فرہنگ معین ۲ : ۱۶۰۹ : ذریره ۱- داروی خشک ، ۲- نوعی بوی خوش ، عطر.

[4] موید ا : ۱۸۱ .

[5] ادات : بویه با واو فارسی آرزومندی ، نیز رک : موید ا : ۱۸۳ ، مدار ا : ۲۵۹ .

[6] این واژه بدین معنی دیده نشد ، فقط بمعنی آرزومندی وطمع آمده است .

[7] فرس ص ۴۳۵ ، پتیاره : بلاباشد و چیزیکه دشمن دارند ؛ صحاح ۲۶۵ بتیاره : بلاباشد و چیزیکه الخ ؛ قواس ص ۱۰۸ : بتیازه ، فتنه و بلا . اما در ادات : بیتاره (یامقدم تا) بہمین معنی .

[8] فرس ص ۴۶۰ ، صحاح ص ۲۴۶ ، بحر الفضائل : بالوانه کذاست درمتن ؛ اما قواس ص ۶۱ : بالوایه ؛ دستور ص ۸۹ ، موید ا : ۱۷۸ : پالوایه ، ا : ۲۲۲ پالوانه و بالونه ، مدار ا : ۱۷۸ ، ۱۸۶ ، سروری ص ۲۶۰ ، بالوانه ، پالوانه ، پالوایه بشکلهای مختلف آورده ؛ موید ا : ۲۲۲ ، پالوانه و پالونه ؛ در ادات است پالوانه با بای فارسی مرغیست سیاه و سفید مقدار کنجشک کوتاه پای الخ .

[9] موید ا : ۱۸۱ ، مدار ا : ۲۳۰

[10] رک : موید ا : ۱۸۲ ، مدار ا : ۲۲۲ ؛ زفان مصدر بسودن را بمعنی دست زدن نوشته .

باشگونه[1]: بازگونه یعنی بازگردانیده، تازیش مقلوب.
بنجره[2]: سوراخی یا دری بود که از خانه یا دکانها سوی کوی و بازار بود.
برزه[3]: شاخ درخت[4]. و در فرهنگنامه[5] بکیله: روغن باکنجشیر آمیخته [بیان] کرده است.
بشمه[6]: پوست خام بی چربو[7] که آنرا سیرم[8] خوانند، و بجای با یای دونقطه در فرد نیز گویند 'یشمه' و در بعضی فرهنگنامه با سین مهمله است.
بشکله[9]: [کژک کلیدان] ببای پارسی و مفتوح گفته است.
براده[10]: سونش.
باغره[11]: نام علتی و زحمتی است و آن چیزی باشد که برگردن برآید و بعضی ببای پارسی[12] گویند
بهنه[13]: گوی بازی.

---

[1] بازگونه و واژگونه بشکلهای مختلف می آید. [2] ادات پنجره با باء فارسی، د موید ا: ۱۸۲. بنجره وپنجره هر دو بهمین معنی دارد، در ادات بمعنی قفس پرندگان هم آمده.
[3] درهمین زفان در بخش دوم برزده نیز بهمین معنی آمده، جعفری ۱۱۰ برزه زراعت و شاخ درخت.
[4] نسخهٔ اصل: بزره، امارک: موید ا: ۱۸۰، مدار ا: ۲۰۵ برزه و برزده بمعنی شاخ درخت.
[5] کذاست در قواس ۱۴۹، اما موید ۱۸۲، مدار ۲۲۳ بکمیکه [6] کذاست در مدار ا: ۲۲۶، اما در فرس ص ۴۹۶، صحاح ص ۲۹۲، قواس ص ۱۴۵: بیشمه و در فرس و قواس بیت منجیک شاهد آمده.
[7] سروری ص ۲۰۲: چربو بمعنی چربی. [8] برهان ص ۱۲۰۴: سیرم تسمه و دوالی باشد سفید که چشمهٔ آنرا کنده باشند بجهت آنکه نرم شود؛ در قواس ص ۱۴۵ در ضمن توضیح لغت چربو و سیرم یافته می شود.
[9] بشکل و بشکله و بسکله و بسکنه و پشکله و پشکنه بشکلهای مختلف آمده، رک: مدار ا: ۲۲۴، ۳۰۹.
[10] موید ا: ۸۰: براده سونش هر چیزی یعنی سریش آهن؛ مدار ا: ۱۹۸: براده سونش آهن یعنی ریزهٔ او و ریزهٔ هر چیزی، زفان: سونش آهن ریزه و جز آن و براده هم آنرا گویند، هندوی لیهن.
[11] رک: قواس ذیل کلن ص ۱۶۲، زفان: کلن باغره و آن زحمتی است، رک: موید ا: ۱۷۸، مدار ا: ۱۷۴.
[12] رک: مدار ا: ۲۸۲.
[13] درهمین فرهنگ ذیل پ آمده: پهنه گوی بازی کردن که بهندوی لتو خوانند؛ قواس ص ۱۸۸: پهنه گوی بازی اما در مدار ا: ۲۶۶ بهنه آمده.

بسه[۱]: نام داروئی است، بتازی اکلیل الملک خوانند.
بریزه[۲]: نام داروئی است.
بُزه[۳]: زمین پشته، و میوه ایست خوشبوی که مزه دارد، و بهندی کهشل[۴] گویند، و خربُزه[۵] از اینجا گویند یعنی بزهٔ کلان.
بادامه[۶]: جامه ایست که پرکالهای خرد خرد میدوزند و خرقه می سازند.
برمه: سوراخ کنِ درودگران[۷].
بخته[۸]: میش، و چیزی پوست بازکرده.
بیشه: دشت[۹] و نیستان و چنگ و سازیست چون چنگ.
بسیجیده[۱۰]: ساخته.
باده[۱۱]: شراب.

---

۱ اصل: بسه اما رک: موید ا: ۱۸۲، مدار ا: ۲۲۲، بسه بشکل بسک نیز آمده.
۲ رک: موید ا: ۱۸۱، مدار ا: ۲۱۵. ۳ رک: موید ا: ۱۸۱، فرهنگ معین ا: ۵۲۴.
۴ قواس ص ۳۶، دستور ص ۱۱۷، موید ا: ۳۶۴ این کلمهٔ هندی مترادف خرچکوک است، چنانچه خود درهمین فرهنگ زفان ذیل خرچکوک این کلمهٔ هندی آمده است، و در موید نیز ذیل خرچکوک این کلمهٔ هندی بحوالهٔ زفان است، نیز رک: مدار ۲: ۱۲۶. ۵ نسخهٔ اصل: خوربزه.
۶ موید ا: ۱۷۷: بادامه آن خرقه که از پرکاله های سه گوشه یا چهار گوشه خرد خرد کرده بدوزند الخ؛ مدار ا: ۱۶۱ بادامه حریر مخطط و جامه است که پرکاله های خرد خرد میدوزند الخ؛ نیز رک: معین ا: ۴۳۸.
۷ درودگر بمعنی نجار.
۸ موید ا: ۱۷۹: بخته بالفتح میش و هر چیزی که پوست بازکرده بود و نیز دنبهٔ فربه و پرورده، نیز رک: مدار ا: ۱۹۱.
۹ موید ا: ۱۸۴: بیشه... و در زفان گویا مرقوم است نیز سازیست مثل چنگ و رباب؛ فرهنگ معین ا: ۶۲۸ سازیست از نی که شبانان می نوازند
۱۰ موید ا: ۱۸۲: بسیجیده سوم و چهارم فارسی، ساخته و قصد کرده؛ نیز رک موید ا: ۲۲۳؛ زفان: بسیجیدن قصد و آهنگ کردن و آراستن.
۱۱ نسخهٔ اصل: بادره؛ این واژه در هیچیک از فرهنگها یافته نشد؛ بظن قوی خطای کاتب است.

باخه[1] : جانوریست آبی ، بهندوی کچهوه[2] گویند.
بنه[3] : فتع.
بنوه[4] : خرمن.

بهرهٔ ہی

برخی[5] : فدا یعنی آنچه بدل جان کسی دهند ، و بعضی بزای[6] هوز و نیز بزای پارسی گویند.
بفتری[7] : هف[8] ، آنک بافندگان را باشد و آن چوبی است که بهنگام بافتن جامه می زنند.
بارگی[9] : اسب را گویند ، بعضی گویند اسب بارگیر ، و قحبگی[10] ، گویند روسپی بارگی یعنی شاهد بازی.
بالای : اسب[11].
بیغ[12] : دفع.

---

[1] رک : موید ا : ۱۷۷ ، مدار ا : ۱۶۰.
[2] موید : کچھ ، مدار : کچھوہ.
[3] کذا است در اصل ؛ اما کلمهٔ درست بته است مترادف بتو ص ۷۱ همین فرهنگ.
[4] کذاست در ادات و موید ا : ۱۸۳.
[5] موید ا : ۱۸۸ ؛ در مدار ا : ۲۰۴ و جهانگیری ۸۴۸ این بیت سعدی نقل است :
همی رفتی و دیدها در پیش ÷ دل دوستان کرده جان برخیش
[6] اصل : بمعجمه ؛ اما رک : موید ا : ۱۸۸.
[7] قواس ص ۱۸۳ : بفتری هف ، رک : موید ا : ۱۸۹ و درین ضمن قول زفان گویا موجود است.
[8] زفان : هف بفتری یعنی کارگاه بافنده و مخترقواس گوید هف چوبی است که در بافتن برجامه زنند. اما این توضیح در نسخهٔ چاپی قواس یافته نمی شود.
[9] موید ا : ۱۸۷ : بارگی بمعنی اسب آمده و بعضی گویند که اسب بارگیر ، و نیز روسپی و قحبگی را گویند و این هر دو معنی اخیر از زفان گویاست.
[10] نسخهٔ اصل : محتگی ؟ واژهٔ بارگی بمعنی قحبگی آمده رک : موید ا : ۲۲۷ ، مدار ا : ۲۸۰ ، فرهنگ معین ا : ۶۵۵.
[11] نسخهٔ اصل : است. متن تصحیح قیاسی ؛ برای بالای بمعنی اسب رک : قواس ص ۷۲.
[12] مدار ا : ۲۷۴ بیغ دفع.

گونهٔ [۲۰ ا] پ

بهرهٔ 'ا'

پروا : پرواز[1] و فراغت و قصد[2] و پرداخت و پرورش ، وبعضی با[3] عربی گویند.

بهرهٔ 'ب'

پتکوب[4] : اچارشی[5] که از شیرو جغزات می سازند و دران جوز مغز نیز اندازند، ترش می باشد، وگویند طعامی است که [از] گوز مغز و سیر و ماست می کنند.

بهرهٔ 'ت'

پلشت[6] : پلید ، وبعضی بفتح لام گویند.

پردخت[7] : فراغ ، گوئی مختصر پرداخت.

پخت[8] : بج را گویند یعنی لگد زدن.

پست : کوتاه ، وچیزی[9] بود بازمین [یلت[10]] کنند.

---

[1] موید ا : ۱۹۱ این معنی بحوالۂ لسان الشعرا نوشته.

[2] در موید این سه معنی اخیر بگفتۂ زفان آورده ، و حال آنکه این فرهنگ شامل پنج واژه است که بعنوان معنی پروا آمده نیز رک : مدار ا : ۲۹۸.

[3] در موید و مدار بباء فارسی است.

[4] قواس ص ۱۴۷ ، صحاح ص ۳۵ ، سروری ص ۱۱۹ ، جهانگیری ص ۱۶۲۰ ، رشیدی ص ۳۴۶ برهان ص ۲۳۴ : بتکوب : مدار ا : ۲۸۹ ، موید ا: ۱۹۳ پتکوب.

[5] کذاست در قواس و موید و مدار : اما در فرس و جهانگیری و رشیدی و برهان : ریچال صحاح : ریچار ، و ریچار طعامی است که از جغزات پزند (موید)

[6] در مدار ا : ۳۱۲ پلشت بمعنی پلید با این بیت شاهد :

با دلِ پاک مرا جامۂ ناپاک رواست ❊ مدبران را که دل و جامہ پلید است پلشت

[7] موید ا : ۱۹۴.

[8] موید ا : ۱۹۳ : پخت بالضم پخش را گویند یعنی لگد زدن کذا فی زفان گویا . ا در نسخۂ حاضر بجای پخش بج است . و بج بمعنی لگد زدن رک : زفان ذیل (جیم عربی)

[9] موید ا : ۱۹۴ ... وچیزی که با زمین برابر بود ونشیب الخ.

[10] در اصل : ناخوانا.

بهرهٔ 'ج'

پازاج[۱]: دایه، و در نسخه ای باجیم پارسی و زای معجمه یعنی **پاژاچ** و این درست تر است.

بهرهٔ 'چ'

پخچ[۲]: **پخش**[۳] یعنی هرچه پهن شود بر زمین چون میوهٔ پخته که پای بر و نهند، گویند: **پخچ** شد.

بهرهٔ 'خ'

پاسخ: جواب.

پیخ[۴]: آبی غلیظ باشد که بر مژهٔ چشم پدید آید، و **پیخال**[۵] نیز گویند.

بهرهٔ 'د'

پازند[۶]: کتاب مغانست و اسدی گوید[۷] صحف ابراهیم علیه السلام، و گویند آن تفسیر زند است.

پژاوند[۸]: با زای پارسی، چوبی که پس در افکنند تا کسی باز کردن نتواند.

---

۱ رک: قواس ص ۸۵ متن/حاشیه؛ در موید ۱: ۱۹۵ ذیل پازاج بر قول زفان انتقاد نموده و دربارهٔ قرائتهای مختلف بحث کرده.

۲ رک: موید ۱: ۱۹۵

۳ در موید این معنی بحوالهٔ لسان الشعراست.

۴ رک: موید ۱: ۱۹۶، مدار ۱: ۳۲۶.

۵ مدار ایضاً

۶ صحاح ۷۴: پازند اصل کتاب صحف ابراهیم علیه السلام است و الستا گزارش آن یعنی تفسیرش.

۷ فرس: پازند اصل کتاب است و الستا گزارش؛ قواس ص ۱۲: زند و پازند کتاب مغان است و استا نیز گویند. مؤرخان و فرهنگ نویسان دربارهٔ زند، پازند، اوستا حتی زردشت اطلاعات ناقصی دارند. اوستا [ابستا، استا] کتاب زردشت است، بزبان مخصوص زبان اوستائی، و زند گزارش و ترجمهٔ آن بزبان پهلوی بخطّ پهلوی با هزوارشها، و پازند همان زند است بخطّ اوستائی که از هزوارشها پاک است، در پازند لغات آرامی بلغات ایرانی تبدیل شده و جای خط پهلوی را خط اوستائی گرفته است:

ای خوانده کتاب زند و پازند ❊ زین خواندن زند تا کی و چند

(ناصرخسرو)

۸ رک: قواس ص ۱۲۷، نیز فرس ص ۸۶، صحاح ص ۷۵: و درین فرهنگ بیت زیر شاهد آمده: بردار دل از دنیا بنشین تو بخانهٔ خویش ❊ بربند در خانه بغلج و به پژاوند

پاد[1]: پاس[2] که نگاهبان گویند، پادشاه[3] یعنی نگاهبان بزرگ و جهانبان، و گویند رمهٔ گاوان[4].
پرند[5]: گوهر شمشیر و حریر ختنی بی‌نقش.
پود[6]: ضد تار و خف[7].
پند[8]: غلیواز[9] و نصیحت.
پسند[10]: پسندیده.
پانید: شکر برگ[11] و آن شکریست که در کهستان برگ شکل راست می‌کنند و شکر قلم همان شکر برگ را گویند و آن حلوائی است از آن قند یعنی عصاره چو منجمد شود پانید از او سازند و بتازی فانید گویند.
پولاد: گوهر آهن.
پژغند[12]: نام درختی است و بعضی بباء و زای عربی گویند.

---

[1] موید ۱: ۱۹۶: پاد بمعنی پاس و پاسبان و نگهبان و پائیدن باشد؛ فرهنگ معین ۱: ۶۳۶ پاد را از پت پهلوی مستفاد می‌داند که بمعنی حامی و نگهبان باشد؛ گویا واژهٔ پاد اسم فاعل است نه اسم مصدری.

[2] پاس از پهلوی pās، بمعنی نگهداری و پاسبان هر دو می‌آید، فرهنگ معین ۱: ۶۵۷.

[3] این توضیح درست نیست زیرا پادشاه از کلمهٔ پهلوی پاتخشاه است که معادل آن در فارسی باستان Patkhashāi (فرمانروا) است، رک: فرهنگ معین ۱: ۶۴۸ و لغت‌نامه حرف پ. و کلمهٔ شاه در پهلوی شاه است که از کلمهٔ اوستائی خشتره و در سانسکرت کشتره و در فارسی باستان khashayaθya است. کلمهٔ کشتری، از همان ریشه آمده.

[4] رک: مدار ۱: ۲۷۸، درین فرهنگ در آخر این واژه آمده: و در پنج بخشی است که بیشتر بذال معجمه گویند؛ اما این اشاره در زفان (= پنج بخشی) در ذیل باد است نه پاد؛ گو حق اینست که قبلاً در باد و پاد امثال این کلمه حرف آخر ذال معجمه بود نه دال مهمله.

[5] رک: موید ۱: ۱۹۷.

[6] رک: بود درهمین فرهنگ و موید ۱: ۱۹۸.

[7] خف رکوی نیم سوخته که زیر چقمق نهندش تا آتش زود گیرد و نیز گیاهی است نرم که زیر چقاق نهند (موید ۱: ۳۶۲)؛ نیز رک زفان گویا ذیل حرف 'خ'.

[8] رک: قرس ص ۹۲، قواس ص ۵۹، صحاح ص ۷۹: پند غلیواز.

[9] زفان: غلیواج و غلیواز یعنی مرغ گوشت ربای.

[10] رک: موید ۱: ۱۹۸.

[11] در موید ۱: ۱۹۷، این توضیح بحوالهٔ قنیه و زفان گویا آمده.

[12] رک: موید ۱: ۱۹۷.

پرهود[۱] : جامه‌ای که از نقش آتش رنگ زرد نماید و هرچه نزدیک سوختن رسد زرد گردد و بعضی بیای عربی گویند.

بهرهٔ 'ر'

پسندر[۲] : پسرزن.
پیکر : صورت
پور : پسر.
پغار[۳] : فانه[۴] یعنی چوبی که میان چوب نهند و باز بر ستونی برای آنک بشکافند و بعضی بکسر با گویند.
پرمر[۵] : انتظار ، و بعضی بزای معجمه گویند
پروار[۶] : پرورش و خانهٔ تابستانی.
[۲۱ ا] پیلور[۷] : طبیب و دارو فروش.
پندار : تکبر ، و امر پنداشتن.
پیور[۸] : ده هزار و بیای عربی نیز گویند ، و این پهلوی[۹] است.
[پرگار[۱۰] : پرگر.]

---

۱ رک : برهود و بیهود در تع‍. فرهنگ ذیل باء تازی.
۲ رک : موید ا : ۲۰۱.
۳ دربارهٔ تلفظ این واژه اختلاف است ؛ فرس ص ۱۶۹ ، قواس ص ۱۱۶ ، صحاح ص ۱۲۳ ، موید ا : ۱۳۹ ، سروری ص ۱۴۷ : بغاز ؛ اما رشیدی ص ۲۲۵ : پغاز ؛ و برهان : بغاز و پغاز (هردو) ؛ اما جهانگیری ص ۴۹۸ : پغار ، و مدار ا : ۲۱۱ بغار.
۴ زفان : فانه چوبی که میان چوب نهند یا زیر ستون بوقت پاره کردن برای آنکه بشکافند الخ.
۵ مدار ا : ۲۱۰ برمو ، ا : ۲۹۷ پرمر و پرمو بمعنی انتظار ، و نیز برمو بزای معجمه نیز ؛ موید ا : ۲۰۱ پرمر و پژمر بمعنی انتظار ، سرمهٔ سلیمانی ۵۰ پرمر.
۶ موید ا : ۲۰۱ ، مدار ا : ۲۹۸.
۷ قواس ص ۱۶۵ : بیلور دارو فروش ؛ موید ا : ۲۰۳ بیلدور.
۸ رک : موید ا : ۲۰۲ ، معین ا : ۶۲۹ بیور ده هزار.
۹ فارسی [illegible] ، پهلوی [illegible] (معین ایضاً).
۱۰ پرکر و پرگر بمعنی پرگار ، موید ا : ۲۰۱.

پرگر : همان پرگا است.
[پیکار:][1] جنگ.
پنیر : شیر بسته
پار : روزهای گذشته، وگویند پارسال.
پیرار[2]: پیش از سال[3] گذشته.
پریر[4]: پیش از دی.
پرندر[5]: شوی مادر.
پاسبار[6]: لگد.
پاسار : همان لگدست.

بهرهٔ ز

پوز[7]: گرد برگرد لب، میان بینی و زنخ. وگویند پوز دهن از بیرون سوی.
پالیز : کشت غربزه و مانند آن.

---

[1] نسخهٔ اصل: پرگار؛ دریجا متن مغلوطست: پرگر همان برگراست، پرگار جنگ.
[2] نسخهٔ اصل: پیوار متن تصحیح قیاسی؛ باید علاوه نمود که در فرهنگهای فارسی مانند برهان و جهانگیری و رشیدی کلمهٔ بیوار (نه پیوار) مترادف بیور و بمعنی ده هزار و در جهانگیری ۲: ۲۲۳۲، و رشیدی ص ۳۷۷ بدین بیت سراجی تمسک جسته:
از همت تو کی رسد آخر که بنده را ⁂ هر سال عشر الف ز بیوار می رسد
اما در دیوان سراجی که بتوسط راقم السطور تصحیح شده در بیت فوق بجای زبیوار دلیوار است، وهمین درست بنظر می آید، و از همین جهت است بنظرم وجود کلمهٔ بیوار در فارسی سابقه ندارد.
رک: مقالهٔ بنده ناموارهٔ دکتر افشار ۲: ۷۹۵.
[3] در اصل کرم خورده و ناخوانا، تصحیح قیاسی.
[4] رک: مؤید ۱: ۲۰۱.
[5] رک: مدار ۱: ۲۹۰.
[6] رک: مؤید ۱: ۱۹۹، مدار ۱: ۲۸۱.
[7] قواس ص ۸۱، دستور ص ۹۰: پوز گرد لب، در فرس ص ۱۹۶، صحاح ص ۱۲۵ بازای تازی و باز در فرس ص ۱۸۰ بازای پارسی بمعنی میان لب یا بینی، و در صحاح ص ۱۳۶ بازای فارسی پیرامون دهن.

شیز[1] : یک مایه[1] دانگ یعنی پیسه[1] و بتازی فلس و بجای درم رود.

روز[2] : مبارک و فره[2] کننده و مظفر.

فوز[3] : کله و گرداگرد دهان و آن مرغان رامنقار بود و مردم و جانوران دیگررا بیرون
از دهان و بباء عربی نیز گویند.

واز[4] : جای آرام، و آن آنست که از چوب برای کبوتر و باز راست کنند و آنرا اڈّه
خوانند وبعضی بباء عربی گویند.

رواز[5] : همان پتواز است.

رواز[6] : پرورش و پریدن و جای آرام.

ربوز[7] : گرداگرد دهن.

بهرهٔ "ژ"

پایژ[8] : آفتاب درسرطان، پایژ ماه را گویند یعنی تیرماه وبعضی بباء عربی گویند.

پژ[9] : کنده و نرم[10] وسرکوه و زمین پست و بلند وسرعقبه[11] و گویند نیز یعنی نرم بباء[12] عربی.

---

[1] مدار ا: ۱۱۳ ربع دانگ، پشیز و پشیزه (هردو) عه گذاشت در اصل، اما در دستورالاخوان ص ۲۷۸ فلس یعنی پیسه، و پیسه در فرهنگها بدین معنی دیده نشد.

[2] موید ا: ۲۰۵ فیروزی کننده، ادات: فره کننده یعنی مظفر.

[3] قواس ص ۸۲: بتفوز گرداگرد دهان و روی. موید ا: ۱۳۸ بتفوز، ا: ۲۰۳ پتفوز گرداگرد کلاه و گرد برگرد دهان، وقیل مرغان را منقار الخ؛ دستور ص ۵۳ ۲: ینفوز (اشتباه وتحریف وتصحیف مصنف) رک: مقدمهٔ دستورالافاضل چاپ تهران ص ۳۲.

[4] رک: موید ا: ۲۰۳ که درآنجا بلفظهٔ زفان آورده، جعفری ۹۰ بتواز نشیمنهٔ باز.

[5] رک: موید ا: ۲۰۳، مدار ا: ۱۹۶، سرمهٔ سلیمانی ۳۰: بدواز، بتواز، برواز.

[6] مدار ا: ۲۹۸: پرواز پرورش و جای آرام.

[7] گذاشت درموید ا: ۲۰۳؛ اما قواس ص ۸۱، دستور ص ۹۰: برپوز گرداگرد دهن؛ دراصل بتفوز، برپوز، پرلوز، بدپوز وغیره همریشه است.

[8] مدار ا: ۲۹۸: پاییژ و پایژ آفتاب در برج سرطان، پایز ماه نیز گویند، با وزاء پارسی، نیز رک: موید ا: ۲۰۵؛ فرهنگ معین ا: ۶۹۶ پاییز (زای عربی)؛ فصل سوم سال، ماندن آفتاب در بروج میزان وعقرب و قوس، خزان. [9] صحاح ص ۱۴۶: پژ سرعقبه باشد؛ قواس ص ۳۰: پژ پشتهٔ بلند بود. نیز رک: فرس ص ۱۷۸ و درفرس وصحاح این بیت شاهد آمده:

سفرخوش است کسی راکه بامراد بود ÷ اگر سراسرکوه و پژ آید اندرپیش

←

بهرهٔ 'س'

پلس[11] : مجذوم.

پخس[12] : عشوه و [گدازش، بعضی شین] معجمه[13] گویند پخش.

پرواس[14] : بسودن[15] و پرداختن و بسای[16].

پلاس : پشمینه، و بت[17] که از شنی سازند.

بهرهٔ 'ش'

پش : طرف[18] که بر بند کمر گه سخت کنند و بلغتی بای عربی است.

پش : بضم با، جغد[19] را گویند.

پاداش : جزا.

---

[8] ← برای این همه معانی رک: شرفنامه و موید ا: ۲۰۵، مدار ا: ۲۱۶.

[9] نسخهٔ اصل: سرحقه، متن تصحیح قیاسی.

[10] رک: شرفنامه، مدار ا: ۲۱۶ بابای و زای عربی. صحاح ص ۱۳۲: پژ سرعقبه، قواس ص ۲۲: پژ پشتهٔ بلند؛ در فرس ص ۱۷۸ و صحاح بیت فسروانی شاهد آمده.

[11] رک: موید ا: ۳۰۶

[12] صحاح ص ۱۷۱ پخس پژمرده بود از مستی یا از غم. شرفنامه: پخس فرو پژمردن، عشوه و گداز و رنج الخ، نیز رک: معین ا: ۷۰۴ که پخس و پخسان و پخسانیدن و پخسیدن و پخسیده به معانی مذکور در فرهنگها دارد.

[13] صحاح ص ۱۴۸ پخش بمعنی پژمرده دست، نیز رک: موید ا: ۳۰۶، در جهانگیری ا: ۱۴۱۷ با عشق بجای عشوه بحوالهٔ زفان، واضحاً این صورت مبنی است بر اشتباه کاتب در نسخهٔ زفان.

[14] رک موید ا: ۲۰۶، مدار ا: ۲۹۹، سرمهٔ سلیمانی ۵۱.

[15] در موید این معنی بحوالهٔ لسان الشعرا آمده.

[16] زفان و موید و مدار: بسیار، و این اشتباه کاتب نسخهٔ زفان است که پیش صاحب موید و مدار بوده.

[17] موید ا: ۱۹۶، آباری باشد. ا: ۲۰۶ پلاس در زفان گویا مکر و حیله و طرز و روش... و بت را گویند یعنی آباری الخ؛ واضح است که صاحب موید در اینجا دچار اشتباه شده. بت بمعنی گلیم.

[18] قواس ص ۱۷۴ البش طرف باشد که بر بند کمر و بر جبین کنند، رک: صحاح ۱۴۷-۱۴۸ البش و پش هردو را بمعنی بند آهنین و سیمین آورده. اما طرف بمعنی بند نقره و آهن که بر کمر بندند (موید ۲: ۲۰۷)

[19] موید ا: ۲۰۷ چغد؛ اما رک: مدار ا: ۳۰۷، معین ا: ۷۹۰.

پوزش : عذر یعنی بهانه و معذرت گویند که حجت[1] است.
پژوهش : نصیحت و بازجست[2].
پریش[3] : زهر و خرمای[4] ابوجهل.
پخشش : ریخ[5] کدو.
پیغلوش[6] : گلی است از جنس سوسن که آسمانگون نیز خوانند و بر کنارهٔ او نقطهٔ سیاه[7] و بر کنارهٔ رخنهٔ کوچک ، و آنرا پیلغوسش نیز گویند.

بهرهٔ (غ)

پزداغ[8] : مصقله یعنی بدانچه زنگ بزدایند و بعضی با هم گویند.

بهرهٔ (ک)

پیوک[9] : عروس.
پکوک[10] : چچه و بعضی پکول [ورق ۲۲ ا] گفته اند بلام آخر و واو پارسی ،

---

[1] رک : موید ا : ۲۰۷.
[2] نسخهٔ اصل : حسب ؛ رک : موید ایضاً.
[3] کذاست در اصل ؛ موید ا : ۲۰۷ پیش و پیس بهمین معنی آمده ، نیز رک : مدار ا : ۳۲۸-۳۲۹ ؛ قواس ص ۵۳ ، دستور ص ۸۸ پیش آنچه از خرما رسن سازند ؛ ادات پیس : سپید و ابروص و خرمای ابوجهل که از پوست رسن سازند ، و زهر. پریش بمعنی پریشان ، سرمهٔ سلیمانی ص ۵۲.
[4] سروری ص ۲۳۳ : پیس خرمای ابوجهل باشد که از پوستش رسن سازند.
[5] ربخ و ریخ هردو خوانده می شود ؛ اما این معنی در فرهنگها دیده نشد ؛ ریخ بمعنی فضلهٔ حیوان باشد.
[6] پیلغوسش اصل و پیلوسش مقلوب ، و در فرس ص ۲۱۰ و صحاح ۱۴۸ همین صورت درج است ، قواس ص ۴۵ ، دستور ص ۸۷ پیغلوسش مانند متن ؛ موید ا : ۲۰۷-۲۰۸ پیغلوشش ، پیلغوشش ، پیلگوشش و نیز در مدار ا : ۳۳۵ و برهان ص ۱۴۴ هر سه صورت ؛ اما در ادات پیلغوسش گلی از جنس سوسن و پیلگوسش نیلوفر.
[7] رک : ادات ؛ موید این خاصیت بحوالهٔ ادات آورده.
[8] قواس ص ۱۷۹ ، سروری ص ۱۵۶ ، رشیدی ص ۳۰۰ ، جهانگیری ا : ۱۱۹۱ بزداغ مصقله.
[9] این کلمه بصورت پیوک ، بیوک ، بیوگ ، پیوگ آمده ؛ رک : فرس ص ۲۷۸ ، ۵۲۸ ، صحاح ص ۱۷۵ ، ۱۹۴ وغیره.
[10] کذاست در دستور و بحر الفضائل و رشیدی ص ۳۳۱ ، اما قواس ص ۱۲۴ : بکول ، ادات ، موید ا : ۲۱۰-۲۱۲ ، مدار ا : ۳۱۱-۳۱۳ پکول و پلوک هردو.

چمچه و خایسک[۱].

پلنک[۲]: مرکبان.

پشک[۳]: سرگین گوسپند و شتر و بز.

پاوچک[۴]: ولیکن واو درمیان زیاد است یعنی آنچ از سرگین زنند.

پتک[۵]: کدین آهنگران.

پلک[۷]: بزرگ.

پلالک[۸]: جنسی از پولاد گوهردار و بلغتی پلارک بارا گویند و مشهور همین است.

پک[۹]: بند انگشت، و نیز گویند پاشنه پای، و بعضی بکسر[۱۰] با گویند.

پوپک[۱۱]: هدهد، و با دوم پارسی نیز گویند.

پوشک[۱۲]: گربه، بلغت ماوراء النهر[۱۳].

---

۱ شرفنامه، جهانگیری ۲: ۱۵۹۸، پلوک و پکوک یعنی عزقه و خایسک (پتک آهنگران)

۲ کذاست در اصل، واژه و معنیش هر دو مشکوک.

۳ رک: ادات و بحر الفضائل و موید ا: ۲۲۵، مدار ا: ۳۰۹.

۴ کذاست در قواس ص ۱۴۱ و ادات؛ سروری ص ۲۴۱ پاچک و پاوچک هردو؛ جهانگیری ا: ۲۲۳ پاچک سرگین گاو را گویند که خشک شده باشد، یا بدست آنرا پهن ساخته خشک کرده باشند... هندوی آنرا اوپلی نامند... مدار پاچک و پاوچک هردو.

۵ مترادف این کلمه در فرهنگ معین ص ۶۹۸ اینست: آهن کوب، کوبن، کوبیازه، مرزبه، گزینه پکوک، پک، مطرقه، کدین، خایسک.

۶ رک: جهانگیری ص ۸۰۹ - ۸۱۰ با بیت شاهد از حکیم نزاری

۷ کذاست در اصل، و ظاهراً این اشتباه است.

۸ صحاح ص ۱۷۵: پلارک و پلالک جنسی از فولاد گوهر دار؛ اما موید ا: ۲۰۹، مدار ا: ۳۱۲ بمعنی تیغ تیز.

۹ برای این دو معنی رک: مدار ا: ۲۳۲.

۱۰ معین ص ۸۰۳ پک بالکسر یعنی بند انگشت دست و پای آورده.

۱۱ رک: موید ا: ۲۱۰، مدار ا: ۲۵۱، جهانگیری ۲: ۱۹۳۷

۱۲ رک: موید ا: ۲۰۹، جهانگیری ۲: ۱۹۴۲

۱۳ این تخصیص دیده نشد؛ پوشک در فارسی متداول است. ممکن است اصلش ماوراء النهری باشد.

پچواک[1]: ترجمان یعنی بیان کننده.

پیازک: گیاہی که از آن بوریا بافند، هندوی گوندگویند.

پیک: قاصد.

پشلنگ[3]: پس افتاده.

پلک: سرپوشش چشم.

بہرۂ گ

پاہنگ[4]: خوشۂ انگور، و خیاری که بجہت تخم بزرگ کنند.

پاشنگ[5]: خوشۂ خرد انگور نارسیده و خیار بزرگ که از بہر تخم بارگیرند.

پالنگ[6]: پای افزار چرمین.

پگ[7]: غوک.

پلنگ[8]: زرافه و شیر[9] است و پرنده است.

---

[1] رک: موید ا: ۲۰۹، جہانگیری ا: ۷۳۴.

[2] موید ا: ۲۱۰ ہمین معنی بگفتۂ زفان گویا نوشته؛ اما کاہی بجای گیاہی؛ نیز رک: مدار ا: ۲۲۵.

[3] شرفنامه، مدار ا: ۳۰۹ پشلنگ (کاف فارسی) پس افتاده، موید ا: ۲۱۱ پشتلنگ بمعنی پس افتاده و ناقص و معیوب، جہانگیری ۲: ۱۳۵۳، ۱۳۵۵ پشتلنگ و پشلنگ را بمعنی ناقص و معیوب و ہرزه و بی معنی، نیز رک: رشیدی ص ۳۱۹.

[4] رک: شرفنامه، موید ا: ۲۱۰، مدار ا: ۲۸۵.

[5] رک: صحاح ص ۱۹۴ برای ہردو معنی، و برای ہردو شاہدی آورده.

[6] ادات، موید: ۲۱۰، مدار ا: ۲۸۳: پالنگ بمعنی پای افزار چرمین و دریچۂ خرد، اما قواس ص ۱۵۵: پالنگ بمعنی پا افزار چرمین. در بارۂ املاء این واژه اختلاف است؛ فرس ص ۲۷۷، سروری ص ۲۳۸: پالیک، صحاح ص ۱۷۴ بالیک، برہان ۳۵۸-۳۵۹ پالنگ و پالیک. جہانگیری پالنگ بمعنی پا افزار چرمین و پالیک بمعنی پاتابه آورده، در فرس وصحاح و سروری بیت زیر از رودگی شاہد آمده و ہمین بیت، در رشیدی شاہد پالنگ است؛ صاحب لغتنامه پالنگ را تصحیف پالیک می داند:

از خسرو پالیک آنجای رسیدم که ہمی ✿ موزۂ چینی میخواہم و اسب تازی

[7] فرس ص ۲۵۴: پک، قواس ص ۶۸، صحاح ص ۱۷۳: بک، مدار: بک، پک، پگ ہر سه ہمین معنی ا: ۳۱۱.

[8] رک: موید ا: ۲۱۱.

[9] ادات و موید: دشمن شیر.

پاچنگ: پائی[1] افزار چرمین، و دریچهٔ خرد.
پالهنگ[2]: قودکش[3] یعنی دوال[4].

بهرهٔ ل

پرغول[5]: گندم نیم نیم کرده یعنی دلیده[6]، و حلوائی است آنرا افروشه[7] گویند. و به نخجوان[8] فرقوت گویند و اگرچه جو باشد و بباءِ عربی نیز گویند.
پلپل: معروف.

بهرهٔ م

پدرام[9]: آراسته و خرم و نیکو چون باغ و مجلس و خانه آراستن و در فرهنگ نامه[10] است: پدرام بفتح اول جای آرام و این را بدواز[11] نیز گویند.
پیام: پیغام گویند، پیام آوران یعنی پیغامبران.
پرچم: معروف.

---

[1] در موید ۱ : ۳۱۰، مدار ۱ : ۲۸۳ پالنگ و پاچنگ مترادف است؛ اما در فرس ص ۲۶۴، قواس ص ۱۲۴، صحاح ۱۹۴ پاچنگ فقط بمعنی دریچه یا سوراخ دریچه آورده. جعفری ۶۲ پاچنگ و پاهنگ و پاژنگ دریچه کوچک و کفش.
[2] قواس ص ۱۷۶ پالهنگ قودکش.
[3] زفان و موید ۱ : ۳۱۲ چنبور: قودکش، برهان ص ۶۲ : چنبور پالهنگ.
[4] نسخهٔ اصل: از دوال؛ اما رک: موید ۱ : ۲۱۱.
[5] فرس ص ۳۲۱ : برغول گندم نیم کرده بود.
[6] قواس ص ۱۴۵ : برغول دلیدهٔ گندم و افروشه.
[7] قواس ص ۱۴۴ : آفروشه نوعی از حلوا بود.
[8] مدار ۱ : ۲۹۵ : پرغول که عرب آنرا فرقوط گویند و فرقوط در موید ۲ : ۵۶ بدینطور شرح شده: فرقوط بالفتح دلیده و گندم کوفته و دو نیم کرده و حلوائی که آنرا افروشه نیز گویند، کذا فی القنیه.
[9] صحاح ص ۲۱۶ بدرام و پدرام جای خرم و آراسته و نیکو.
[10] معلوم نیست که این کدام فرهنگنامه است.
[11] قواس ص ۱۲۷ : بدواز جای آرام باشد، زفان بدواز و پتواز جای آرام و آن آنست که از چوب برای کبوتر و باز راست کنند الخ.

بهرهٔ (ن)

پرن[1] : پروین.

پیشن[2] : آنچه از خرما رسن سازند یعنی کباک پیشن نیز گویند.

پوزن[3] : زمین پاک کرده ، و زای پارسی نیز گویند.

پرچین : خاربست گردگشت[4] و باغ و دژ[5] و بارگاه.

پایندان[6] : میانجی یعنی ضمان کردن.

پرویزن : غربال و آن آلت بیختن آرد است که بهندوی چلنی گویند.

پریزن[7] : همان پرویزن است ، و ببای عربی نیز گویند ، و بیزنده را پریزبان[8] گویند.

[ورق ۲۲۳ ا] پرنیان : حریر منقش.

پریون[9] : دیبای تنک ، وبعضی ببای عربی و زای پارسی گویند.

---

[1] قواس ص ۱۴ : پرن پروین را گویند ، فرخی گوید :

تا چو خورشید نتابد ناهید ⁂ تا دو پیکر نبود همچو پرن

[2] کذا است در موید ا : ۲۲۰ ، اما مدار ا : ۱۳۳ پیشن و پیسن و پژن ، جعفری ۲۸۱ کباک ریسمانی از لیف خرما.

[3] قواس : پوزن ؛ اما رک : موید ا : ۲۱۹ ، مدار ا : ۳۲۱ ، سروری ص ۲۴۹ ، ا : ۲۱۶. برهان[7]

[4] قواس ۵۶ ، دستور ص ۸۸ خاربست گردگشت ، اما در موید بحوالهٔ همین لغت یعنی زفان آمده : د زفان گویا مذکورست پرچین باجیم فارسی ماری که بر بند کمر سخت کنند.

[5] این معنی محل نظر است.

[6] مدار ا : ۲۷۷ پاپندان ؛ اما در اکثر فرهنگ پایندان مثلاً رک : موید ا : ۲۱۵ ، جانگیری ص ۱۲۱ ، سروری ص ۲۵۰ ، برهان ص ۳۶۵ ؛ ا در رشیدی ذیل پابندان آمده : صاحب جانگیری این لفظ را تصحیف خوانده بجمیع معانی ، و صحیح بای موحده است بدل یای مثناة تحتیه ، و سامانی گوید ضامن را ازان پابندان گویند که کفالهٔ پابند ضامن ومضمون عنه هردو باشد ... اما در نسخهٔ معتبرهٔ مثنوی مولوی پایندان (بیا) دیده شد. دستور ص ۹۱ بجای پایندان پابیزان دارد.

[7] رک : موید ا : ۲۱۷ ، فرهنگ معین ا : ۷۷۲.

[8] کذا است در اصل.

[9] دربارهٔ تلفظ این کلمه اختلاف است. دراکثر فرهنگها پرنون مثلاً رک : موید ا : ۱۶۷ : برا مدار ا : ۳۰۳ : پریون و پرنون ؛ فرهنگ معین ا : ۷۵۸ ولغتنامهٔ دهخدا پرنون ، دیوان منوچهری ، دبیرسیاقی ص ۱۸۲ : پرنون ؛ اما دیوان سراجی ص ۱۳۰ ، ۵۲ بزیون.

پیغون[1]: برزه و پیمان و [عهد][2] و شرط.

پالاوان[3]: آنک بدان چیزی پالایند یعنی تنک[4] بیز که بهندوی آنرا پانک[5] گویند.

پیمان: عهد و سوگند.

پرپهن[6]: همان گیاهی است، تخم اورا کلکنگ[7] گویند.

پایان: آخر کار.

پروین: ستاره[8] از منازل که اورا ثور گویند بتازی[9] و آن شش ستاره است.

پلندین[10]: پیرامون در، و بعضی ببای[11] عربی و مضموم گفته اند.

پارگین[12]: حوض و ناودان و گرمابه که غساله[13] دران جمع شوند.

پیکان: معروف [است].

پوشنگان[14]: نام مقامی است نزدیک نیشاپور.

---

[1] درموید ا: ۲۲۰، همین معنی بحوالهٔ شرفنامه نقل شده.

[2] دراصل کرم خورده.

[3] درموید ا: ۲۱۴ این معنی را بحوالهٔ همین فرهنگ (زفان) نقل نموده؛ اما مدار ا: ۲۸۳: پالاون.

[4] رک: همین فرهنگ ذیل اردن ص ۳۲. [5] موید: پانک، مدار: پونه.

[6] موید ا: ۲۱۶ پرپهن ... همان گیاه است که تخم اورا کلنک گویند.

[7] زفان: کلکنگ تخم خفرج یعنی لونک، و درهمین فرهنگ (زفان) ذیل خفرج آمده: گیاهی است که بتازی بقلة الحمقاء گویند یعنی لونک.

[8] رک: موید ا: ۲۱۷ ذیل 'پرن'. [9] نسخهٔ اصل: بتازی خوانند.

[10] ادات: پلندین بابای فارسی پیرامن در؛ اما درموید ا: ۲۱۸ بگفتهٔ ادات پلندی نوشته.

[11] فرس ص ۳۶۳، صحاح ص ۲۳۴، قواس ص ۱۲۴: بلندین (ببای عربی).

[12] رک: موید ا: ۲۱۴، مدار ا: ۲۸۰. [13] موید: غساله در آن گرد آید

[14] چنانکه معلوم است فرهنگ نویسان نامهای جغرافیائی را بدون هیچ تحقیق در فرهنگ خود داخل می کنند، و این نیز یکی از آنهاست؛ پوشنگان یا پوشگان نام هیچیک از شهرهای ایران نیست؛ اما بوژگان و پوشنگ دو شهر است در خراسان، و پوشنگ که بنام فوشنگ و فوشنج نیز شهرت دارد از هرات ده فرسخ راه دارد (معجم البلدان)، نیز رک: حدود العالم چاپ کابل ص ۳۸۸، پوشنگ یکی از شهرهای معروف خراسان بود مانند طبسین و آمل و نسا و باورد و هرات و پوشنگ، رک: زین الاخبار ص ۷، ۱۲۶، ۱۲۸، ۱۳۱، و بوزگان از نواح نیشاپور، معرب آن بوزجان است نه بوژکان. رک: مراصد ص ۲۲۹، زین الاخبار ص ۱۷۵ ـ امیر نصر از نیشاپور به بوزگان آمد ـ نیز رک: حدود العالم ص ۳۸۸ ←

پاپون[1]: پیرایه.
پرهون[2]: آرایش و نیز[3] [دایره[4] گرد ماه و آفتاب]
پژبان[5]: آرزو و بعضی بباء[6] و زای عربی گویند.

بهرهٔ (و)

پوپو[7]: هدهد، و بواو پارسی نیز گویند.
پینو[8]: جغرات چکیده، و بعضی گفته اند جغراتی که چک[9] زده باشند و مسکه ازو نکشیده باشند.
پهلو: نام مرد[10] درشت و بزرگ و ضابط و خانهٔ شاه[11].
پرنو[12]: جامهٔ باریک.

بهرهٔ (ه)

پاره[13]: رشوت، و در اسدی طوسی[14] است که شهر[15] است و قلعه و حصار[16] و مانند آن.

← خلاصهٔ کلام: معلوم نیست که منظور نویسنده بوزگان است یا پوشنگ.

[1] رک: موید ا: ۲۱۵؛ مدار ا: ۲۸۸. [2] رک: موید ا: ۱۶۹ (برهون) ا: ۲۱۷، پرهون
فرهنگ معین نیز برهون و پرهون هر دو بهمین معنی نوشته. رک: ا: ۵۱۷، ۷۶۸.

[3] نسخهٔ اصل: بژ، متن تصحیح قیاسی.

[4] اضافه از روی موید الفضلا.

[5] رک: موید ا: ۲۱۷، مدار ا: ۳۰۶.

[6] موید ا: ۱۶۸، مدار ا: ۲۱۹ بژبان (بای عربی و زای فارسی).

[7] موید ا: ۲۲۱ پوپو و پوپک: هدهد، مرغ سلیمانی ۱۲ بوبو.

[8] موید ا: ۲۲۱ (پیو غلط چاپی)، مدار ا: ۳۳۶.

[9] مدار: جغراتی که چک کرده باشند مسکه کشیده باشند.

[10] رک: ادات، موید ا: ۲۲۱، مدار ا: ۳۲۳.

[11] این معنی در مدار درج شده.

[12] در موید ا: ۲۲۱: پرنو جامهٔ باریک کذا فی زفان گویا و در ادات الفضلا با باء تازی بمعنی دیبای
منقش در نهایت نزاکت و لطافت. رک: پریون درهمین فرهنگ.

[13] رک: صحاح ص ۲۶۶، موید ا: ۲۲۲، و درین لغت اخیر این معنی بحوالهٔ شرفنامه و گفتهٔ زفان معنی دیگر نوشته.

[14] فرس و صحاح ص ۲۶۴ باره باروی شهر و قلعه.

[15] یعنی معنی کلمه شهر است، نه نام شهر.

[16] این معانی واژهٔ باره است، نه پاره، رک: قواس ص ۱۲۸، صحاح ص ۲۶۴

پنجه[1]: طرهٔ موی[2] که عورات بر کله مانند دپیشانی، وگیاهی است که آنرا نویچ[3] گویند.
پذیره[4]: رفتن در پیش و باز آمدن.
پورهٔ[5]: تنهٔ درخت، بعضی ببای عربی[6] گویند.
پیلسته[7]: ببای عربی[8] نیز گویند، رخساره.
پیغاره[9]: طعنه و سرزنش و بهتان.
پالکانه[10]: دریچه و آن در کوچک باشد، در و دیوار که از و پنهان می[11] نگرند، و بود که مشبک[12]

---

[1] بظاهر واژهٔ درست باید پیچه باشد زیرا در همین فرهنگ مترادف نویچ پیچه است نه پنجه؛ اما برای پیچه بمعنی طرهٔ موی وگیاه رک: موید ۱: ۲۲۶، مدار ۱: ۳۲۵، در موید بحوالهٔ زفان ترجمه کونین نوشته، اما نسخهٔ حاضر این قول را مورد تایید قرار می دهد.

[2] معین ۱: ۸۲۰ پنجه بمعنی ۱. پیشانی ۲. موئی که از سر زلف ببرند و آنرا پیچ و خم داده بر پیشانی گذارند، و در همین فرهنگ ۱: ۸۷۶ پیچه بمعنی ۱. قسمی روی بند. ۲. عصابه که زنان بر پیشانی بندند. ۳. پیرایهٔ مرصع که بر سر عروس بندند. ۴. زیبی که زنان و پسران بر روی گذارند. ۵. گیس عاریه. ۶. طرهٔ زلف و کاکل که بپیچند و بر یکدیگر گره زنند. ۷. پیشانی الخ؛ از تفصیلات بالا روشن است که پنجه و پیچه هر دو صورت در فارسی سابقه دارد.

[3] زفان: نویچ لبلاب و آن گیاهی است که بر درخت بپیچد ... و آنرا پیچه نیز گویند. الخ.

[4] رک: موید ۱: ۲۲۳، مدار ۱: ۲۹۱، سرمهٔ سلیمانی ۵۷ پذیره استقبال و قبول کردن.

[5] کذاست در ادات، موید ۱: ۲۲۵، رشیدی؛ اما دستور و بحر الفضائل و مدار ۱: ۳۲۱ پوزه و بوزه بهمین معنی. ادات بوز نیز بهمین معنی دارد، جهانگیری ۱۹۴۱، پوره تنهٔ درخت.

[6] نسخهٔ اصل: بای پارسی.

[7] قواس ص ۸۰، ادات، موید ۱: ۲۳۴، برهان ص ۴۴۷، سروری ص ۲۷۳ پیلسته (کذاست در متن) اما بیلسته ببای عربی معنی دیگر دارد،
رک: قواس ص ۸۰ ح.

[8] نسخهٔ اصل: فارسی، متن تصحیح قیاسی.

[9] صحاح ص ۲۶۹: پیغاره طعنه و سرزنش و ملامت، موید ۱: ۲۲۶ سرزنش کذا فی القنیه و در ادات و زفان گویا بمعنی بهتان نیز هست؛ نسخهٔ ادات که پیش بنده است فقط سرزنش و طعنه. مدار کذا فی المتن.

[10] کذاست در مدار ۱: ۲۸۳؛ اما صحاح ص ۲۶۴ بایگانه بهمین معنی، سرمهٔ سلیمانی ۴۲ بالکانه و پالکانه.

[11] نسخهٔ اصل: گرند. [12] صحاح: شاید که مشبک نیز باشد.

است وگویند پالانه[۱] چجه یعنی بام بلند.

پیغوله[۲]: گوشهٔ خانه و دیده ، و در بنیاد همان گوشه است که بتازی زاویه و بیای پارسی کنج گویند.

پیواسته[۳]: برج فصیل حصار.

پدرزه[۴]: چیزی که در جامه و ازار بندند.

پیرزه[۵]: همان پدرزه است.

پده[۶]: رکوی یعنی پارهٔ جامهٔ سوخته[۷] که آنرا خف[۸] گویند و بباء[۹] [ورق ۱۲۴ ا] عربی مفتوح گفته اند.

پرگنه[۱۰]: بکاف فارسی معامل[۱۱] یعنی تختی زمین.

پاغنده[۱۲]: پنبه زده یعنی ندف کرده وغلوله ساخته.

پهنه[۱۳]: گوی بازی کردن که بهندوی لثو[۱۴] خوانند ، وگویند که کفچه باشد که بر دگوی بازی کنند خردگان

---

[۱] مدار قیل پالانه چجه ، موید ا : ۲۲۱ پالگانه بام بلند کذا فی الزفان گویا ؛ قواس ص ۱۲۴ ، موید ا: ۱۷۷ بادگانه دریچه (موید : هندی دریچه).

[۲] فرس ص ۴۵۷ ، دستور ص ۱۲۸ ، صحاح ص ۲۶۹ پیغوله گوشهٔ خانه ، اما در ادات و موید ا : ۲۲۷ ، مدار ا : ۳۳۲ پیغوله یعنی گوشهٔ خانه وگوشهٔ چشم.

[۳] رک : قواس ص ۱۲۸.

[۴] صحاح ۲۶۵ : پدرزه خوردنی را گویند که در ازار یا در رکو بندند ، نیز رک بموید ا : ۲۲۳ ، مدار ا : ۲۹۰.

[۵] ادات : پیرزه بابای فارسی ، آن چیز که درجامه یا در ازار بندگره بندند ، نیز رک : مدار ا : ۳۲۷.

[۶] فرس ص ۴۲۶ : پده رکوئی بود سوخته و پود پده حراق بود.

[۷] قواس ص ۱۷۷ : سوخته خف را گویند.

[۸] قواس ایضاً پده هم خف باشد.

[۹] صحاح ص ۲۶۵.

[۱۰] ادات : پرگنه باکاف فارسی پارهٔ زمین که ازان باج وخراج یک ساله بگیرند ؛ نیز رک ؛ موید ا : ۲۲۳–۲۲۴ ، مدار ا : ۲۹۶.

[۱۱] کذا است در اصل.

[۱۲] رک : صحاح ص ۲۶۱ ، ۲۶۷ ، موید ا : ۲۲۲.

[۱۳] رک : موید ا : ۲۲۶ ، مدار ا : ۲۶۶ ، ۳۲۵

[۱۴] این کلمه در موید موجود است.

و غازیان ، و این را بتازی طبطاب[1] گویند.

پدمر[2] : بهره

پیله[3] : اصل افریشم و اسدی نبشته[4] است پیله آن باد[ا]نچه[5] باشد که تخم ابریشم اندر و باشد و پیله بیای عربی گیاه دارو و ریم که از خون[6] شود.

پیاله : قدح[6] می.

پاره[7] : شکسته.

پیسه[8] : بیای پارسی ، ابلق یعنی سپید و سیاه پوشیده شده و آماسیده.

پژوه[9] : بازجست[10] تفحص و بازپرس و جمیع[11] پیرایهٔ آرایش.

پروانه : آن که درمیان آید برای نفاذ حکم ، و کرمی که بر چراغ افتد.

پالونه[12] : پالاون[13] ، و گویند پالونه کف گیر[14] حلوایان ، آنچه بدان شکر صاف کنند.

---

[1] تختهٔ گوی بازی است ، فرخی :
زهیبت تو دل دشمن تو اندر بر ⁂ چنان طپد که طپد گوی گرد بر طبطاب

[2] رک : موید ا : ۲۲۳ ، سرمهٔ سلیمانی ۵۸. [3] رک : قواس ص ۱۸۵ ، صحاح ص ۲۶۹ موید ا : ۲۲۷ ، در ادات است : بابای فارسی ریم و کرم افریشم که تخم افریشم است.

[4] فرس چاپ مجتبائی ص ۲۱۶ پیله آن باد[ا]نچه که تخم افریشم دروه باشد الخ.

[5] اصل : بادیچه ، تصحیح از روی فرس اسدی. [6] همین است در شرفنامه ، رک : موید ا : ۲۲۷.

[6] رک : ادات ، موید ا : ۲۲۶.

[7] در موید بحوالهٔ زفان گویا بمعنی زاده نوشته ، پاره درهمین لغت بمعنی رشوت است که گذشت

[8] رک : ادات و موید ا : ۲۲۶ ، مدار ا : ۳۲۹.

[9] صحاح ۲۶۸ پژوه بازجستن بود و عرب تفحص ، جهانگیری ۱۲۳۰ بازجست و تفحص بمعنی پژوهش نوشته ، معین ۷۷۸ پژوه بمعنی پرسش و بازخواست.

[10] نسخهٔ اصل : بازجسته ؛ متن تصحیح قیاسی.

[11] این معنی بنظر نیامده . بظاهر معلوم می شود که واژه‌ٔ که معنیش پیرایهٔ آرایش باشد درینجا افتاده.

[12] معین ا : ۶۸۰ پالونه ، پالاوان بالاون ، پالونه آلتی که بدان چیزها را صافی کنند ، جا[مع] ا : ۲۳۹ پالونه ، پالاون ، پالوانه دارد.

[13] نسخهٔ اصل : پالان.

[14] موید ا : ۲۱۴ ذیل پالاوان :
اما در زفان پالاوان آنکه بدان چیزی پالایند.

پاده : گوبان[1] ونگاهبان ، وگویند رمهٔ[2] گاوان ، وانیجاست که گوبان را پادبان[3] گویند.

پژوهنده[4] : متفحص.

پراشیده[5] : از هم جدا کرده.

پریشیده[6] : پریشان و پرافشانده را گویند.

پالوایه[7] : فراشتک ، بعضی بباشی[8] عربی گویند.

پهنانه : بوزنه ، وبعضی باشی[9] عربی گویند.

پلمه[10] : اتهام و دروغ [گفتن ومتهم] کردن.

پاینده : همیشه.

---

[1] موید ۱ : ۲۲۲ عیناً همین مطالب را بگفتهٔ قنیه آورده.

[2] مدار الافاضل ۱ : ۲۷۹ بهمین معنی درج نموده ، فرهنگ معین ۱ : ۶۵۰ پاده بمعنی گله وچرگان و چوبدستی ، و پاده بان را بمعنی گله بان و چوپان نوشته.

[3] کذاست در موید ؛ اما در فرهنگ معین پاده بان.

[4] صحاح ص ۲۶۸ : و دانشمند را بسبب آنکه دانش می جوید "پژوده" خوانند. ظاهراً بجای پژده پژوهنده درست باشد.

[5] موید ۱ : ۲۲۳ : پراشیده از هم جدا شده و پریشان شده وبیخود گردیده و برباد داده.

[6] اسم مفعول از مصدر پریشیدن بمعنی فرو نشاندن و پاشیدن وبیخود گشتن و بدحال گردانیدن (زفان گویا) ؛ فرهنگ معین پاشیدن ، پراشیدن ، پریشیدن ، پاچیدن ، مترادف اند (رک : ۱ : ۶۶۵ ، ۷۱۴).

[7] این واژه بشکل بالوانه و پالوانه و بالوایه و پالوایه و پالونه و نیز بالواه به فرهنگ آمده است ، رک : موید ۱ : ۱۷۸ ، ۲۲۲ (پالونه اشتباه چاپی ، اصلاً پالوایه)

[8] خود همسم درین فرهنگ ذیل بالوانه آمده : مرغکی است مقدار گنجشک سپید وسیاه الخ ، در ادات پالوانه بهمین معنی آمده ، اما در شرفنامه پالوایه مذکور است (موید ۱ : ۱۷۸) ؛ واضحاً فراشتک همان مرغکی است که ذیل پالوایه مشروح است چنانچه خود صاحب زفان گویا ذیل فراشتک نوشته.

[9] رک : موید ۱ : ۲۲۵ ، ۱۸۴ ، قواس ص ۷۶.

[10] رک : موید ۱ : ۲۲۵. درجهانگیری ۲ : ۱۵۹۶ ، پلمه بمعنی تخته ولوح نیز نوشته و از همین بیت عمید لویکی تمسک جسته :

نخست چون پدرم پلمه در کنار نهاد ؛ چو علمها که نخواندم از آن بغیر زبان

پغنه[1]: پایهٔ نردبان.
پیروزه[2]: سنگی است سبز که بر انگشترین نهند.
پژولیده[3]: بسوده و پژمرده.
پاشنه: عقب پای.
پرونده[4]: بستهٔ[5] قماش یعنی بسل و گویند بقچهٔ جامه وبعضی برونده[6] وبعضی پرونده گویند.
پیواره: غریب[7] و تنها، وبعضی بیای[8] عربی گویند و این درست تراست وبیوه[9] نیز ازین است.
پده[10]: درختی است چوب سخت، بار ندارد.
پروازه[11]: آنک اورا چرانیده و فربه کرده باشند، بتازی مسمّن[12] گویند.

---

[1] موید ا: ۲۲۴: پغنه پایهٔ زینه و نردبان؛ جهانگیری ۱۴۲۲ بدین بیت شهاب مهره تمسک جسته:
پغنهٔ بام دولتت باشد ❊ این چهار آخشیج وهفت فلک

[2] یعنی فیروزه. [3] اسم مفعول از مصدر پژولیدن که درهمین فرهنگ (زفان گویا) بمعنی بسودن و پژمرده شدن آمده؛ و درجهانگیری ا: ۱۲۲۰ بمعنی درهم شدن و پریشان گردیدن. [4] موید ا: ۲۲۴ پرونده: بستهٔ قماش و بقچهٔ جامه کذا فی الشرفنامه و در زفان گویا بدین معنی بر وزن غلطیده. اما در نسخهٔ حاضر پرونده است، نه پرویده. واضحاً نسخهٔ که پیش صاحب موید بوده، اشتباه کاتب داشته بود.

[5] نسخهٔ اصل: بسکه، اما رک: موید. [6] درجهانگیری بیای فارسی است اما در فرس ص ۴۲۷ برونده است وبیت آغاجی شاهد آمده.

[7] در موید ا: ۲۲۷ همین توضیحات بحوالهٔ ادات آمده.

[8] درجهانگیری ص ۲۲۲۲ بیواره نوشته وبیتهای شاه داعی شیرازی وحکیم اسدی شاهد آورده؛ در حاشیهٔ جهانگیری ص ۲۲۲۳ بیتهای اسدی (گرشاسپ نامه) وسنائی افزوده شده.

[9] رک: موید ا: ۲۲۷، مدار ا: ۲۷۵ بیوه زنی.

[10] رک: موید ا: ۲۲۳، نیز رک: توضیحات ذیل 'بده'.

[11] کذاست در اصل؛ اما اصل کلمه پرواره است چنانک ازین شواهد بوضوح پیوندد:
نبرد شیر مست بلغاری ❊ ماهی تازه مرغ پرواری (هفت پیکر ۲۵۶)
اسب لاغر میان بکار آید ❊ روز میدان نه گاو پرواری (سعدی، گلستان)
سودای تو از برای قربان ❊ بشتت زمانه را بپروار (سروری ص ۲۲۴)
کس مرغ را که داشت بپروار ندهد آب ❊ من مرغ غم وار آب بپروار می زدم (خاقانی، دیوان ۸۹۸)
درجهانگیری ۸۹۲-۸۹۳ ذیل پروار و پرواری آمده: جانوری که در خانهٔ خنک بندید که فربه شود بدین جهت پرواری خوانند و مردم بغلط خیال نموده اند که پرواری بمعنی پرورش داده است وحال آنکه ←

پاتله: یعنی کراهی[۱۲].

پاخره: بندوی اوشه[۱] گویند، برای نشستن راست می کنند برستانهٔ[۲] در.

پشیزه[۳]: که درکارد وجزو آن بیخت می کنند.

پژه[۴]: استر، ضد اوره[۵].

پره[۶]: دایرهٔ که بگرد چیزی کنند، وچیزاست که ازساز درودگران و دندانهٔ کلید[۷]ان باشد.

پنجره: قفص.

پرستنده: خدمت کار.

پیراه[۸]: آرایش [۱۲۵] و زیب ونکوئی.

پیمانه: قفیز[۹] وکیل که بدان هرچیزی پیمایند.

پشه: موشه[۱۰] گویند، بتازی بعوض[۱۱].

← پرورش داده پرورده است نه پرواری الخ، و درهمین فرهنگ ذیل پرورده آمده: جانوری راگویند که درپروار بسته فربه گرده باشند. الخ. ۱۲ مویدا: ۲۲۴ همین معنی بحوالهٔ قنیه نوشته.

۱ رک: مویدا: ۲۲۱. ۲ رک: مویدا: ۲۲۱؛ مدار ا: ۲۷۸ ادت

۳ مویدا: ۲۲۴: پشیزه چیزیکه در دامن خیمه دوزند وریسمانی که دروی کشند وچیزی که میان تیغ ودستهٔ کارد وصل کنند.

۴ مویدا: ۲۲۴: پژه استر قبا وجز آن.

۵ یعنی ابره.

۶ نسخهٔ اصل: پژه اما رک: مویدا: ۲۲۴: پره دایرهٔ لشکر ... وپرهٔ کلید وبرگ کاه ... کذا فی القنیه، ودر زفان گویا بمعنی ترنجیده آورده است؛ واضح ست که نسخهٔ ای از زفان که نزد صاحب موید بوده ازنسخهٔ حاضر متفاوت بوده.

۷ رک: جهانگیری ص ۸۹۹ که درآن فرهنگ پره بمعنی های حلقه زدن لشکر، دامن وکناره، جزوی ازقفل، برگ کاه آمده بابیتهای شاهد. برای معنی جزوی ازقفل این بیت سیف اسفرنگی شاهد است:

ناطقه بی اختیار مدح توسازد ٭ پرهٔ قفل سخن کلید زبان را

۸ مویدا: ۲۲۶: پیرایه وپیراه آنچه بدان زینت افزایند وزیب ونکوئی.

۹ درمویدا: ۲۲۷ بهمین معنی بگفتهٔ زفان نقل نموده. ۱۰ زفان: موسه زنبور وبضم میم تیز گویند، نیز رک: سرمهٔ سلیمانی ص ۲۳۵. ۱۱ دستور الاخوان ص ۱۰۹: البعوض پشه.

پالوده[1]: بر زدود[ه] یعنی مروق کرده و نام حلوائی[2].

پله: کفهٔ ترازوی.

پرزه[3]: ابریشم پاره[4] باشد که از جامهٔ دیبای فرسوده بردارند.

پوشنه[5]: سرپوش هر چیزی چون چادر و جز آن.

بهرهٔ «ی»

پی[6]: پیش و نشان پای و پای پس و قصد[7].

پالای[8]: اسب جنیبت.

پیوستگی[9]: وسیلت.

پیروزی[10]: ظفر، روائی[11] حاجت.

پیوی[12]: عروس.

---

۱ اسم مفعول از مصدر پالودن؛ خلاصهٔ چیزی کردن و صاف کردن.

۲ یعنی فالوده.

۳ موید ا: ۲۲۳: پرزه پارهٔ ابریشم که از جامهٔ دیبای کهنه و نو بردارند.

۴ نسخهٔ اصل: ابریشم کار، متن تصحیح قیاسی.

۵ نسخهٔ اصل: پوشته؛ اما رک: مدار ا: ۳۲۲، جهانگیری ۲: ۱۹۴۳؛ موید ا: ۲۲۵ پوشینه بهمین معنی، نیز رک: سرمهٔ سلیمانی ص ۵۸.

۶ در موید ا: ۲۲۸ پی بمعنی سینه و قدم و نشان پا و قصد آمده؛ اما در جهانگیری ص ۲۲۴۶ پی را بهشت معنی آورده از آنجمله است پای و نشان پای و دنبال و تعاقب، بهره برای بار و مرتبه.

۷ بظاهر در پی کسی بودن در نظر است؛ اما سعدی درین بیت بمعنی دنبال نوشته:
سگ اصحاب کهف روزی چند ❊ پی نیکان گرفت و مردم شد

۸ در موید بالای و پالای، ا: ۱۸۷، ۲۲۷ بمعنی اسپ جنیبت. اما در جهانگیری ص ۲۲۶ 'پالا' ست نه 'پالای' حکیم اسدی گوید:
ز دروازه تا درگه شه دو میل ❊ در رویه سپه بود پالا و پیل

۹ موید ا: ۲۲۹: پیوستگی وسیلتی کذا فی القنیه منقول از زفان گویا.

۱۰ رک: موید ا: ۲۲۹؛ معین ا: ۸۹۸: پیروزی = فیروزی، ظفر و غلبه، کامیابی و روائی حاجت.

۱۱ در اصل کرم خورده، اما رک: مدار ا: ۳۳۷ ذیل پیوزی، معین ا: ۸۹۸ معنی دوم.

۱۲ موید ا: ۲۲۹ بهمین معنی بگفتهٔ زفان نوشته رک: مدار ا: ۳۳۰

پیوگانی[۱]: عروسی است.
پیزری[۲]: رخت و اسباب پیزری فروشان.
پری: معروف (است).
پایندانی[۳]: میانجی گری.
پزوی[۴]: کین و فرومایه از مرمان که بتازی ارذل گویند.

گونهٔ 'ت'

بهرهٔ 'الف'

ترا[۵]: دیوار، و گویند دیوار باشد که در وی گلابه سخت کرده باشند.
تیلا[۶]: خبزدوک[۷] منقش.
توتیا[۸]: سنگی است که سرمه[۹] سازند و گویند سنگ بصری[۱۰] آب انگور آتش کرده.

---

۱. رک: موید ا: ۲۲۹، مدار ا: ۳۳۸، موید ا: ۱۹۰ بیوگانی بهمین معنی دارد اما صاحب مدار این را غلط قرار می دهد.
۲. نسخهٔ اصل: پیروزی، موید ا: ۲۲۸: پیزری بهمین معنی؛ مدار پیزری و پیورزی ا: ۳۲۷، ۳۳۷ بمعنی رخت و اسباب که می فروشند، اما این همه اشتباه است، معین ا: ۹۰۱ پیزر (Pīzor) نوعی جگن که در آب روید؛ پیزری (Pīzorī) منسوب به پیزر، آنکه پیزر فروشد.
۳. رک: موید ا: ۲۲۷، معین ا: ۶۹۵، و پایندان درهمین فرهنگ (زفان)
۴. موید ا: ۲۲۸ پژوی، جهانگیری ا: ۲۳۰: پژوی، معین پزوی و پژوی ا: ۷۷۵، ۷۷۸ بهمین معنی؛ مدار ا: ۳۰۶ پژوهی؛ بظاهر اشتباه.
۵. معین ۱۰۵۸: ترا... دیواری که با کاهگل و گلابه استوار کنند.
۶. موید ا: ۲۳۱: تیلا چنبرسن و خبزدوک منقش، جهانگیری ۲: ۲۲۶۲ بمعنی اول.
۷. زفان: خبزدوک کرمی است منقش که آنرا سرگین غلطانک گویند، وبعضی هزارپایه، نیز رک: موید ا: ۳۶۴، جهانگیری ا: ۵۸۱.
۸. موید ا: ۲۳۰ ذیل عربی آمده.
۹. در موید بگفتهٔ شرفنامه و زفان گویا آمده.
۱۰. مدار ا: ۴۰۲... قیل بصری را به شیرهٔ انگور است می سازند.

بهرهٔ 'ب'

تاب: فروغ یعنی تابش و تفش یعنی گرمی آتش و آفتاب و تابه نیز گویند، و طاقت و رنگ[1] و آنچه در رشته و رسن و جز آن از تافتن افتد، چنانکه زلف نیکوان یعنی پیچ که درین چیزها افتد آن را تاب گویند، و جوق را هم گویند یعنی قوج[2]، و ونخ[3] نیز باشد.

ترب[4]: حیلت و مکر.

تیب[5]: شیب[6] و سرگشته یعنی مدهوش.

تراب[6]: رفتن آب بود به بالا اندک اندک و روغن نیز که از آوند بالا شدن گیرد و گویند از آن روی نخل می ترابد[7].

توب[8]: دیده.

بهرهٔ 'ت'

تبست[9]: چیزی از کار افتاده یعنی تباه شده.

تبت: نام موضعی است که آنجا مشک خیزد در بلاد ترکستان و گویند شهر ختن[10].

ترت[11] **و مرت**: بزیان[12] [آمده] را گویند.

---

[1] جهانگیری ۱: ۲۵۵ طاقت و توانائی.

[2] نسخهٔ اصل: رنوج، اما در موید ۱: ۲۳۲ بگفتهٔ زفان فوج، نیز رک: مدار.

[3] رک: مدار ص ۳۳۹ ذیل تاب.

[4] رک: سرمهٔ سلیمانی ص ۶۰.

[5] موید ۱: ۲۳۳: تیب بوزن و معنی سیب، و بیقرار و سرگشته و مدهوش، اما جهانگیری ۲: ۲۲۵۳ معنی اول ندارد؛ نیز رک: مدار ۱: ۴۰۹.

[6] در اصل سیب؛ اما سرمهٔ سلیمانی شیب، و شیب بمعنی مدهوش، جهانگیری ۲: ۲۳۱۶.

[6] موید ۱: ۲۳۲، مدار ۱: ۳۶۰، جهانگیری ۱: ۹۰۳.

[7] از مصدر ترابیدن و تراویدن. رک: زفان بخش سوم.

[8] رک: موید ۱: ۲۳۲ که بهمین معنی بگفتهٔ زفان درج شده، نیز رک: مدار ۱: ۴۰۱.

[9] در اصل افتاده؛ اما رک: صحاح ۱: ۴۳ با شاهد بیت سوزنی:

اگر نه عدل شهستی و نیک رائی او ✤ یقین شدستی کار جهان تباه و تبست

موید ۱: ۲۳۳: تبست.

[10] تبت از بلاد چین باشد و از ختن هیچ علاقه ندارد. اما در ادبیات فارسی مانند ختن مشک تبت شهرت دارد.

[11] نسخهٔ اصل: ترت لفظ و مرت؛ بظاهر صورت درست ترت (لفظ) و مرت (تابع).

[12] رک: صحاح ۱: ۴۳ که بزیان آورده دارد؛ جهانگیری ۱: ۹۰۷ تاخت و تاراج، زیر و زبر.

تملیت[۱]: بارکه برپشت ستور می بندند، تنبلیت[۲] نیز گویند.

بهرهٔ ج

تلاج[۳]: بانگ و مشغله یعنی غلبه.
تنج[۴]: افشردن و فراهم نشاندن، گویند تنج یعنی فراهم نشان.
ترنج[۵]: فراهم افشردن.
ترفنج[۶]: راه باریک و دشوار باشد.
تارج: غارت و از یکدیگر[۷] جدا جدا کردن.

بهرهٔ چ

تیماج: چرمی است رنگین و خوشبوی، آن شب که طلوع سهیل شود برنگ[۸] [۱۲۶] بوی حاصل[۹] شود چنانک[۱۰]

بهرهٔ خ

تشلیخ[۱۱]: مصلا یعنی سجاده.
تاخ[۱۲]: درختی است که هیزم او زود بسوزد.

---

۱ درموید ایضاً تخصیص اندک باری است، و هم چنین است در جهانگیری ۶۸۲ ا تلیت بار اندکی را گویند که بربار بزرگ بندند. ۲ جعفری ۱۹۹ تنبلیت بارکم باشد.
۳ موید ا: ۲۳۴ تلاج و تلانج هردو یعنی بانگ و مشغله، فرس ۵۴ تلاج بدین بیت شاهد:

شب بیامد بر درم دربان باج ٭ در بجنبانید با بانگ و تلاج

۴ رک: ادات: موید ا: ۲۳۶ و مدار: ۳۹۴، عیناً عبارت متن آمده: از مصدر تنجیدن؛ اما این مصدر در زفان و موید نیامده.
۵ از مصدر ترنجیدن یعنی گرفته شدن و درشت گشتن رک: زفان؛ و نیز رک: سرمهٔ سلیمانی ۶۱.
۶ رک: قواس ص ۳۴، صحاح ص ۵۱، موید ا: ۲۳۶.
۷ در موید ایضاً این معنی بگفتهٔ همین فرهنگ (زفان) درج شده.
۸ ادات: تیماج چرمی ... که سهیل طلوع شود آن چرم را رنگی و بوئی حاصل شود. ۱۰ کذاست در اصل.
۱۱ موید ا: ۲۳۹: تسلیخ، اما رک: جهانگیری ص ۱۲۶۰، و قواس ص ۱۵۸.
۱۲ جهانگیری ص ۲۵۷: تاخ نام درختی است که چوب آنرا هیزم سازند، آتش آن از هیزمهای دیگر بیشتر ماند و آنرا تاغ نیز گویند. و در حاشیهٔ جهانگیری بیت

ترخ[۱]: نام گیاهی است.

بهرهٔ 'د'

ترفند[۲]: بعین نیز گویند.
ترکند[۳]: همان ترفند است یعنی مکر و حیله و تزویر.
تکند[۳]: خانهٔ مرغ و بعضی بکسر تا گویند.
تند: توانا[۴] و فربه و جنبان.
تربد: نام[۵] داروئی است چون نی میانه خالی، تربد نایژه[۶] [را] گویند.

بهرهٔ 'ر'

تیر[۷]: عطارد و نام ماه که آفتاب در برج سرطان باشد و آنرا تیرماه گویند و آنچه در سقف بود و تیر و کمان و نام[۸] مرغی است و فصل خزان و نصیب و تیرکشتی و سیزدهم[۹] روز از ماه.

← سوزنی درج است که موید معنی مذکور در جهانگیری است:
سوال من بتو گیرا تر است میدانم
از آنکه آتش افروخته بهیزم تاخ

نیز رک: فرهنگ نظام ۱/۱۷۷.

۱ـه موید ۱: ۲۳۹: ترخ بالفتح نام گیاهی است و قیل ترنج.
۲ـه موید ۱: ۲۴۰: ترفند و ترکند و ترونه بمعنی مکر و حیله، اما صحاح ۷۶، قواس ۱۶۰: ترفند؛ جهانگیری ص ۹۱۲ ترفت و ترفنده دارد. عـه ادات وجعفری ۱۲۱ ترفند و ترکند.
۳ـه رک: قواس ص ۱۳۳، موید ۱: ۲۴۱، جهانگیری ۲: ۱۵۰۶.
۴ـه موید ۱: ۲۴۱ تند بحوالهٔ شرفنامه بمعنی جنبان و جنبنده و بحوالهٔ زفان گویا توانا و فربه نوشته.
۵ـه موید ۱: ۲۴۰ بهمین معنی بحوالهٔ ادات و زفان درج نموده.
۶ـه زفان: نایژه ساز جولاهان، جهانگیری ۱: ۵۳۱ نایژه نی میانه تهی باشد چنانکه جولاهگان دارند.
۷ـه موید ۱: ۲۴۴؛ در جهانگیری ۲: ۲۲۵۴ - ۵۷ بیست و چهار معنی این کلمه درج شده.
۸ـه کذاست در موید و مدار ۱: ۴۰۹؛ و جهانگیری ۲: ۲۲۵۷ تیر: جنسی از مرغ بود.
۹ـه تیرماه ... روز سیزدهم آن روز تیر است و عیدی است تیرگان، جهانگیری ح.

تندر[1]: بلبل و رعد غرنده ، بعضی بزای معجمه گویند.

تبر[2]: نام مرغکی است.

تار: تاریکی و تار رشته یعنی ضد پود ، و تارک[3] سر را گویند.

توار: رسنی بود که چون بار بر چهارپای نهند[4] بدان بندند.

تیمار: غمخوارگی و نگاهداشت.

تندیور[5]: برجستن.

تتار: نام زمینی است از ترکستان که آنجا مشک خیزد.

تنکار[6]: سهاگا.

تور: نام ولایتی است که توران زمین گویند ، و نام مردی[7] و نام گیاهی است که ترمس[8] گویند.

ترمشیر[9]: نباتی است که ازو زر[10] حاصل شود.

تباشیر: دارویی است سپید و روشنیِ[11] اوّلِ صبح.

---

[1] جهانگیری ص ۱۷۸۲ تندر و تندور بمعنی رعد نوشته اما در موید ا : ۲۴۴ این هر دو کلمه را بمعنی رعد نوشته و بعداً بحوالۀ زفان گویا بمعنی بلبل نیز آورده ، و مدار ص ۳۹۷ تندر بمعنی بلبل و رعد غرنده. نیز رک : ادات و جعفری ۱۲۳.

[2] این صورت در هیچ فرهنگ دیده نشد.

[3] رک : موید ا : ۲۴۳ و جهانگیری ص ۵۷۱ بکسر ر نیست.

[4] رک : موید ا : ۲۴۲.

[5] موید ا : ۲۴۴ عیناً همین معنی بحوالۀ لسان الشعرا نوشته ؛ و در زفان و دیگر فرهنگها مانند صحاح و ادات نوار همین معنی دارد ، و همین درست است ، توار تصحیف نوار است

[6] رک : ادات و موید ا : ۲۴۴ ؛ اما مدار ا : ۳۹۴ و جهانگیری ۲ : ۱۷۸۲ تندیور بهمین معنی.

[7] در موید ایضاً ، این کلمۀ "هندی" آمده ؛ نیز رک : مدار ا : ۳۹۶ ذیل تنگار و جهانگیری ۲ : ۱۷۸۶.

[8] ظاهراً مراد یکی از سه پسر فریدون است.

[9] موید ایضاً : ترمش ، جهانگیری ۲ : ۱۹۵۰ : ترمه ؛ مدار ا : ۴۰۳ ترمس ؛ نیز رک : ایضاً ص ۳۶۸ کلمه ترمس و ترمش.

[10] جهانگیری ص ۹۱۶ : ترمشیر گویند دارویی است از اجزای اکسیر.

[11] رک : موید ا : ۲۴۳ که تریاک دارد ، نیز رک : مدار ا : ۳۶۸.

[12] یعنی در مرکبات مانند تباشیر صبح بطور اضافت تشبیهی.

بهرهٔ 'ز'

تز[1]: مرغکی است سپید و کوچک، وقت بهار در باغها نشیند و آواز خوش دارد و بلون خشینه[2] بود و برجهد و نیک تواند پرید.

توز[3]: آنچ در کمانها پیچند.

توز[4]: بواو پارسی حاصل کننده، و گویند کین توز است و فخر قواس[5] گوید آنچه از کسی بکسی رسیده باشد بدو باز رسانیدن و در رسالهٔ نصیر نبشته است: کشیدن و دوختن[6] را گویند.

بهرهٔ 'ژ'

تژ[7]: اول برگ[8] گیاه در بر آمدن.

تکژ[9]: دانهٔ انگور و درست تر آنست تا بکاف پارسی گویند.

بهرهٔ 'س'

تکس[10]: دانهٔ انگور آنک در میان غژم[11] [بود].

ترس[12]: زمین سخت.

---

[1] رک: قواس ص ۶۳ متن؛ حاشیه. در موید ا: ۲۴۳ تز بمعنی مندرجهٔ متن؛ در ص ۲۴۷ تز بمعنی صعوه.

[2] زفان: خشینه سپید ضد سیاه گویند سپید رنگ الخ [3] موید ا: ۲۴۷ توز چیزی که بر کمانها پیچند.

[4] امر از مصدر توختن و توزیدن بمعنی کشیدن و حاصل کردن و اندوختن و جمع نمودن (رک: موید ا: ۲۶۸)

[5] در نسخهٔ قواس چاپی نیامده؛ اما خود در زفان گویا و موید ا: ۲۶۸ توختن بمعنی چیزی که از کس رسیده باشد باز بدو رسانیدن.

[6] نیز رک: موید ایضاً. [7] موید ا: ۲۴۷؛ جهانگیری ص ۱۲۲۱: تژ دو معنی دارد: اول برگ گیاه نو برآمده دوم: مرغکی باشد کوچک جثه. در اصل در زفان 'تز' بمعنی دوم آمده. [8] نسخهٔ اصل: بررگ.

[9] رک: قواس ص ۵۰، ۵۵.

[10] رک: تکژ؛ نیز قواس ص ۵۰.

[11] غژم خوشهٔ انگور... و بعضی گویند صرهٔ انگور بود که شیره و تکس اندر میان وی باشد (زفان).

[12] رک: قواس ص ۲۹، موید ا: ۲۶۸، مدار ص ۳۶۴.

بهرهٔ «ش»

تش[1] : تیشهٔ بزرگ دروگران که درخت[2] بدان بشکافند و بشکنند.

تاشش[3] : یار و خانه، گویند خواجه تاشش[4] یعنی خواجهٔ خانه است.

توشش : بواو پارسی، توانائی و قوت[5].

توخشش[6] : کشیدن.

تراشش : تراشیده[7] و گرفتن و ستدن.

بهرهٔ «غ»

توغ[8] : هیزم سخت یعنی هیزم که آتش [ورق ۱۲۷] او تیز باشد.

تیغ : شعاع[9] دادن شمشیر و ماهتاب و آفتاب و آنچه بدان ماند و همان شمشیر که دم شیر[10] دارد و سر کوه و راه، نیز سوی[11] کارد و شمشیر.

تارغ[12] : درختی است که آنرا بتازی غضا[13] گویند.

---

[1] رک: قواس ص ۱۱۵، صحاح ص ۱۴۹.

[2] صحاح: درختها را بدان بشکافند و بشکنند.

[3] موید ا: ۲۴۹ : تاشش خواجه و خداوندگار و خانه الخ.

[4] موید ا: ۲۶۰ خواجه تاشش یعنی خداوند خانه و نیز غلامان و چاکران یک خواجه الخ.

[5] رک: صحاح ص ۱۴۹، در موید ا: ۲۵۰ این معنی بحوالهٔ شرفنامه آمده.

[6] در موید ایضاً این معنی بحوالهٔ زفان آمده.

[7] در ادات بمعنی براده و گرفتن و ستدن.

[8] رک: صحاح ص ۱۶۲؛ جهانگیری ص ۱۹۵۴ : توغ هیزمی است که آتش آن دیر بماند و آنرا تاغ و تاخ نیز خوانند.

[9] صحاح ص ۱۶۲ : تیغ شعاع ماه و آفتاب.

[10] رک: مدار ا: ۱۴۱۲، همان شمشیر که دم شیر ماند.

[11] کذاست در اصل.

[12] تاخ و تارغ و توغ بمعنی هیزم سخت و بدین اعتبار، مترادف، صاحب زفان بدین متوجه نشده، هر سه را جدا جدا معنی نوشته.

[13] نسخهٔ اصل: غضا؛ اما در صحاح غضا مترادف تاغ؛ و معین ۲ : ۲۴۱۹ تاغ مترادف غضا.

بهرهٔ «ف»

تف: گرمی و عفونت[1].

ترف[2]: پنیر دگویند که ترشی است، دوغ را چندآن[3] می جوشانند که بسته شود و خشک می کنند، وقتی که در آب حل شود ترشی خوب می شود.

بهرهٔ «ک»

تبوک[4]: طبقی مثل دف، بقالان [را] باشد که آنچه [اجناس[5]] بود بدان اندازند.

تابوک: برون[6] داشت در عمارتها.

تهک[7]: تهی باشد و برهنه، گویند تهی و تهک اتباع[8] اند چنانک اسم[9] و رسم.

ترک، خود[10] یعنی مغفر و کلاه.

تنبوک[11]: جناغ زین و دریچهٔ زین مرکبان باشد.

تنبک[12]: همان تنبوک است.

تاک: درخت انگور.

تکوک[13]: صراحی سفالین و یا زرین و یا سیمین بر صورت آوند چینی یعنی بر صورت چیزی از جانوران سازند چون شیر [و] گاو و ماهی، و شراب بدان خورند.

---

[1] کذاست در ادات.

[2] رک: صحاح ص ۱۶۸، موید ا: ۲۵۶، جهانگیری ص ۹۱۱.

[3] همین ترتیب در مدار ا: ۳۶۶، اما در صحاح نوشته که چیزی مانند کشک است که آنرا خرد بسایند الخ.

[4] رک: موید ا: ۲۵۸، مدار ا: ۳۵۱؛ تبوراک نیز بمعنی دف می آید. رک: صحاح ص ۱۷۶: تو بتوراکی بدست دمن یکی بربط چنگ؛ معین ا: ۱۰۲۵ فقط بتوراک دارد، و بمعنی پهن که بقالان دارند الخ مانند متن.

[5] در اصل کرم خورده؛ اما رک: معین؛ نیز رک: مدار ا: ۳۵۱ که از روی آن خوراکی باشد.

[6] رک: موید ا: ۲۵۸، مدار ا: ۳۳۹؛ جهانگیری ا: ۲۵۸ تابوک مخارج عمارت.

[7] رک: صحاح ص ۱۷۷.

[8] صحاح: بطریق اتباع.

[9] در اصل «اسم» افتادگی دارد.

[10] رک: موید ا: ۲۵۹، مدار ا: ۳۶۷.

[11] جهانگیری با بیت حمید لوبکی شاهد معنی اش (ص ۱۷۸۱):
بر کمان چرخ پیش پیلک مریخ را ❊ هم کمان تنبوک زیر شیر ساطور آمده ←

تموک[۱]: نشان
تلک: ادرک[۲]، و در فرهنگنامهٔ فردوسی است: تلک دانهٔ[۳] باشد که بتازی[۴] آنرا جلبان گویند.
ترندک: صعوه یعنی سرپچه[۵]، و در فرهنگ نامه رای مهمله است و بعضی بدو کسر گویند[۶].
ترتک[۷]: تدرو و تورنگ[۸] نیز گویند.
تردک[۹]: کرم گندم و در فرهنگنامه زای[۱۰] معجمه است.
ترباک: پا زهر و هر آنچه مضرت دفع کند.
تبوراک[۱۱]: آوندی که بتازی کربال[۱۲] گویند، و گویند تبوراک بدانچه آرد بیزند.
ترشک[۱۳]: پرنده ایست سبز دام.
تارک: فرق سر و خود.[۱۴] تباک[۱۵]: نام مردی.

→ اما امیر خسرو تبول نظم نموده و قافیه اشس کول آورده، رک: ایضاً.
[۲] رک: موید ا: ۲۶۰، مدار ا: ۲۹۳. [۳] رک: قواس ص ۱۲۸، صحاح ص ۱۷۷.
[۱] رک: صحاح ۱۷۷، ادات، مدار ا: ۲۹۲ تموک نشانهٔ تیر.
[۲] رک: موید ا: ۲۶۰، جهانگیری ص ۱۰۶۱، مدار ا: ۲۸۹.
[۳] ادات تلک لوبیا که عرب آنرا جلبان خوانند و قیل ادرک؛ دستور الاخوان ۱۹۸ جلبان لوبیا.
[۴] پرنده ایست سیاه دم دراز نول و آنرا ترندک و بتازیش صعوه و هند ممولہ نامند (موید ا : ۵۱۲).
[۵] اصل: گویند ترندک.
[۶] رک: موید ا: ۲۵۹، سرمۂ سلیمانی ۶۵، ادات ترترک و تورنگ.
[۷] رک: موید ا: ۲۶۲، جعفری ۱۲۷.
[۸] رک: موید ا: ۲۵۹، جهانگیری ص ۹۱۰.
[۹] رک: ایضاً.
[۱۰] رک: موید ا: ۲۵۸، جهانگیری ص ۵۷۶-۵۷۷؛ بتوراک سه معنی دارد: طبلک یادف، غربال، طبقی پهن
[۱۱] دستور الاخوان ۵۱۷ الکربال تبوراک؛ ادات تبوراک آوندیست و قیل آنچه بدان آرد بیزند، نیز رک: مدار ا: ۳۵۱.
[۱۲] موید ا: ۲۵۹: ترسک، اما رک: مدار ا: ۳۶۵.
[۱۳] در موید ا: ۲۵۸ این معنی بحوالهٔ زفان گویا درج شده.
[۱۴] در موید ایضاً این واژه بهمین معنی بحوالهٔ قنیه آمده و مدار ا: ۳۴۸ بمعنی نام مردی.

تاژیک[1]: نام ولایتی وطایفه.
تمنک[2]: رستینه است سبزوام اترش طعم.

بهرهٔ گ

تگرگ: ژاله.
تگ[3]: بفتح وکسر، بن حوض وقعر دریا یعنی ته آب.
تورنگ[4]: تدرو، وبعضی بضم تا و واو پارسی گویند وبعضی بواو عربی.
ترنگ[5]: تارک سر وعزقاب.
تلنگ[6]: بضمتین وسکون نون، حاجت، وگویند بضم تا وفتح لام.
تنگ[7]: ضد فراخ وآنچ اسب رابمیان دو زین بندند و جوال وخروار چیزی و درهٔ کوه و مایهٔ گردآورد چنانک [ورق ۲۲۸] گویند تنگ[8] یعنی مهر.
ترنگ[9]: آواز کمان وزخم.
تونگ[10]: گنجینه، وبعضی توبک بباو کاف[11] عربی گویند.

---

[1] از اغلب فرهنگها تایید این معنی نمی شود؛ فقط در مدار ا: ۲۴۳ تاژیک نام ولایتی.
[2] جهانگیری ص ۱۶۸۲: تمیک نوعی از رستنی که طعم آن ترش بود، ودر بعضی از فرهنگها بجای یای تحتانی نون مرقوم است، مدار ا: ۲۹۲ تمنگ، تحفة السعاده تمنک وتمیک، شرفنامه تمیک (رک: مدار حاشیه)
[3] رک: موید ا: ۲۵۹ تک و فرهنگ قواس ۲۴: تک بن حوض
[4] رک: قواس ص ۶۹؛ نیز رک: ترنک درهمین فرهنگ.
[5] رک: موید ا: ۲۶۱، درین فرهنگ این معانی بگفتهٔ ادات درج شده؛ نیز رک: جهانگیری ص ۹۱۸.
[6] رک: قواس ص ۹۲، موید ا: ۲۶۱ [7] رک: موید ا: ۲۶۱، سرمهٔ سلیمانی ۶۵.
[8] جعفری ۱۶۱ تنگه مقداری از درم مس.
[9] رک: صحاح ص ۱۹۵؛ موید ا: ۲۶۱، ترنگ بمعنی آواز کمان وزخم بحوالهٔ ادات وآواز کمان بوقت تیر انداختن بگفتهٔ لسان الشعرا؛ جهانگیری ص ۹۱۸ - ۹۱۹ بمعنی تارک سر، آواز کمان، انگیز وجست وخیز، عزقاب نوشته
[10] رک: موید ا: ۲۶۰، ۲۶۲.
[11] جهانگیری ۲: ۱۹۴۶: توبک گنجینه راگویند، واادات الفضلا بجای با تای فوقانی و در شرفنامه بنون آمده.

بہرۂ ل

تزوال[1]: برگ گیاه.

تاپال[2]: بپای پارسی، تنۂ درخت، تاپان[3] نیز گویند.

تگل[4]: باکاف پارسی، دنبۂ سرزن که بتازی کبش گویند، وگویند تنگل[5] جوانی که هنوز خطش تمام ندمیده بود، بعضی گویند این بکاف عربی است.

تادل[6]: خر و گاوِ جوان.

تویل[7]: پیشانی از فراز سر.

تنبل[8]: فریب و حرکت و سخره، وگویند فریبنده.

بہرۂ م

تیم[9]: وزن سیم، سرای وخانه و کاروانسرای.

تهم[10]: بی همتا ببزرگی و قامت.

تتم[11]: تتری[12] و آن ترشاده[13] است معروف.

---

[1] موید ا: ۲۶۳: ترادل و ترداول برگ گیاه و در زفان گویا بازای تازیست، تراول بوزن هلاہل برگ گیاه کذا فی لسان الشعرا و در دستور بازای فارسی است. جہانگیری ص ۹۲۰ تروال آورده و گفتۂ زفان تزوال نوشته. [2] رک: موید ا: ۲۶۳، جہانگیری ص ۲۵۶

[3] در موید ا: ۲۶۶ این واژه بہمین معنی بگفتۂ زفان آمده

[4] در موید ایضاً بگفتۂ زفان ہر دو معنی نوشته. [5] قواس ص ۸۲ وصحاح ص ۲۰۶ و شرفنامه فقط ہمیں معنی آمده؛ و در جہانگیری ۵۶۲ تنگل با اول و ثانی مفتوح بمعنی غوچ جنگی و با اول مفتوح و ثانی مکسور بمعنی نوخاسته و با اول مکسور و ثانی مفتوح پارچۂ بود. [6] موید ا: ۲۵۸ تادک، ا: ۲۶۳ تادل، ہر دو معنی خر و گاو جوانه و جہانگیری ص ۲۱۷ تادک و تادل ہر دو بہمان معنی.

[7] موید ا: ۲۶۳ تویل بوزن جمیل پیشانی و فرق و سر و تارک سر الخ، مدار تویل پیشانی از فراز سر الخ.

[8] موید ایضاً تنبل مرد ہیچکاره و سخره، و نیز مکر و حیله، جہانگیری ۱۷۱۰ ہر دو معنی آورده با شواہد شعری برای مکر و حیله.

[9] رک: موید ا: ۲۶۵؛ صحاح ص ۲۱۸؛ تیم کاروانسرا. [10] رک: صحاح ص ۲۱۷.

[11] موید ا: ۲۶۴ تتم بہ ضمتین ترشاده است که آنرا سماق نیز گویند و در فرہنگ علی است که این لغت ترکی است در جہانگیری ص ۶۶۴ تتم سماق باشد.

[12] مدار ا: ۲۷۷ تتری بالفتح ترشاده است معروف که در دیگ اندازند، صحاح ص ۲۰۰ و جہانگیری ص ۶۶۳ تتری سماق باشد.

[13] نسخۂ اصل: ترشاره.

بهرهٔ 'ن'

ترین[1]: زمین سخت.

ترن[2]: گل نسرین.

تان[3]: دهن از درون سوی، و گویند تان یعنی شما[4].

ترشکان[5]: ایوان حمام یعنی آنجاکه آتش سوزند یعنی آتشدان گرمابه، و در فرهنگ نامهٔ فرقواس[6] ترشکان آتشدان گرمابه.

تریان[7]: نوعی از سبد بید بافته باشد.

ترنیان[8]: طبقی که آنرا همان تریان گویند و گویند نوعی از سبد است.

توبان[9]: ازار کوتاه کشتی گیران یعنی شلوار تنگ و چابک، و تنبان[10] بضم و فتح نیز گویند.

ترزفان[11]: ترجمان.

توران: نام[12] ولایتی است که بدان طرف آب آموست[13] و این آمو آبی است که در زیر خوارزم[14] میرود.

---

[1] رک: مدار ا: ۳۶۳، جعفری ۱۳۲ اما رک: ترس درهمین لغت؛ بظاهر تصحیف ترس.

[2] رک: قواس ص ۴۴، و موید ا: ۲۶۷ [3] رک: موید ا: ۲۶۶.

[4] نسخهٔ اصل: شمار. [5] در اصل حرف دوم واضح نیست، متن تصحیح قیاسی؛ مدار ا: ۵۰۴ توشکان و ترشکان هردو. [6] قواس ص ۱۳۱ توشکان دارد نه ترشکان؛ واضح است که نسخهٔ قواس که پیش صاحب زفان بوده از نسخهٔ چاپی تفاوت داشته.

[7] قواس ص ۱۳۴، موید ا: ۲۶۸. اما ادات توشکان بهمین معنی.

[8] قواس ص ۱۳۴، تریان و ترنیان سبدی که از بید بافند.

[9] رک: فرس ص ۳۶۷، صحاح ص ۲۳۸، قواس ص ۱۵۴، ادات، موید ا: ۲۶۸، سروری ص ۱۲۱۷، برهان ص ۵۲۷. [10] در موید و برهان تنبان بهمین معنی آمده.

[11] رک: موید ا: ۲۶۷ و مدار ا: ۳۶۴ و جهانگیری ا: ۹۱۰ که ترزفان را بمعنی مترجم دارند؛ اما در مقدمهٔ قواس ص ۲، ترزفان بمعنی ترجمه آورده: ترزفان نویسی - ص ۳: در زبان تازی و فارسی ترجمان کرده.

[12] یعنی ماوراءالنهر.

[13] رک: آمو درهمین لغت؛ آمو، آموی، آمویه یکی است: رک: فرهنگ معین ۵: ۶۰ - ۶۲.

[14] رک: فرهنگ معین: ۵: ۴۸۷.

توسن[1]: کرهٔ نارانده و نارام.

ترکمان[2]: طایفه ای از ترکان است.

تهمتن[3]: نام مردی[4]، و گویند رستم[5] است وبعضی گویند آن بهمن[6] است.

تاوان[7]: غرم[8]

بهرهٔ «و»

تگو[8]: باکاف پارسی، جعد زنگیانه و موی زنگیانه.

تیو[9]: طاقت.

ترتو[10]: لاغ وسخره، وبعضی بدو فتحت وسکون واو پارسی.

تبنگو[11]: زنبیل وتغار وسبد، وحجام[12] را نیز گویند.

تینگو[13]: بفتح وضم همان حجام.

---

[1] موید ا: ۲۶۸: توسن ... و درقنیه بقلم میان قاضی شه از زفان گویا بمعنی آب دهنده نیز مرقوم است، اقول شاید از باب سهو کاتب باشد که بجای اسب آب مرقوم نشده.

[2] رک: فرهنگ معین ۵: ۳۸۷. [3] این واژه مرکب است از تهم بمعنی بزرگ وعظیم وبی همتا + تن یعنی عظیم الجثه، چون رستم در دلاوری بی همتا بود، او را ازین لقب ملقب نمودند (رک: جهانگیری ۲: ۲۱۶۳).

[4] مدار ا: ۴۰۸ تهمتن نام مردی که آنرا رستم نیز گویند. [5] در موید ا: ۲۶۹ تهمتن ... در زفان گویا بمعنی فرمان کردن است. اما نسخهٔ حاضر زفان از این مندرجات هیچ ندارد؛ مدار ا: ۴۰۸ بمعنی فرمان برداری کردن. [6] نسخهٔ اصل: تهمتن تصحیف بهمن، رک: موید ا: ۲۶۹، مدار ا: ۴۰۸.

[7] نسخهٔ اصل: تاران. اما تاوان بمعنی غرم، غرامت، رک: سرمهٔ سلیمانی ص ۶۷.

[8] دستور الاخوان ص ۴۵۵ الغرم: تاوان، معین ۲۴۰۴ غرم بمعنی تاوان، غرامت.

[8] موید ا: ۲۷۰، مدار ا: ۳۸۶.

[9] تیو وتنو بمعنی طاقت، رک: موید ا: ۲۷۰، در فرهنگ جهانگیری ص ۲۲۶۳ تیو بمعنی تاب وطاقت آمده وبیت زیر شاهد درج است:

فتادند برخاک بی هوش و تیو ⁂ همی داشتند از غم دل غریو (اسدی)

[10] رک: قواس ص ۱۱۳، فرس ۴۱۲.

[11] رک: قواس ص ۱۳۵، فرس ۴۱۲، صحاح ۲۹۴، ۲۹۹ تبنکو باکاف عربی.

[12] در اصل واو عطف بعد از سبد اشتباه مؤلف است، سبد حجام درست است، رک: مدار ا: ۳۵۱.

[13] این کلمه در فرهنگها دیده نشد، اماله تانگو باشد. ممکنست تصحیف تبنگو باشد.

تیهو : جانوریست بزرگتر[1] از چغنک[2].

تنو[3] : طاقت.

تدرو : دراج ، وگویند[4] جانوری است سرخ وام خوش رفتار وبعضی بذال معجمه گویند[5]

تگاو : زمین که درو [ورق ۲۲۹] آب زود کم شود و جا بجا[6] ماند

تسو : چهار[7] جو ، بتازی طسوج گویند.

تربو[8] : جامهٔ باریک وسفت ، وبعضی بضم تا گویند.

تانگو[9] : حجام.

بهرهٔ 'ه'

تواره[10] : خانه ای که سرگین و روفته[11] درو بود ، و پرچین[12] یعنی بارهٔ خاربست ونشستن گاه را نیز گویند تواره.

---

[1] موید ا : ۲۷۰ خردتر از کنجشک.

[2] زفان : چغنک کاردانک ، پرنده ایست معروف . موید ا : ۲۹۵ چغنک جانوریست خرد تر از تیهو که آنرا کنجشک نیز گویند وکاردانک کذا فی زفان گویا. [3] رک : تیو.

[4] در موید ا : ۲۷۰ ، این معنی بگفتهٔ زفان آمده.

[5] طبق دستور تفریق میان دال و ذال فارسی "تذرو" درست تر وصحیح تر صورت است.

[6] در موید ا : ۲۷۰ عیناً بهمین معنی درج شده ؛ جهانگیری ص ۱۵۶۱ تگاب و تگاو بهمین معنی آمده.

[7] کذاست در موید ا : ۲۷۰ ؛ اما در جهانگیری ص ۱۲۷۸ تسو حصه را گویند از بیست و چهار حصهٔ گز و سیر و روز وشب وغیره الخ کمال اسماعیل

گرچه مرا هست بحر وار فضل ؛ نیست ز دانگانه مرا یک تسو

نیز رک : دستور الاخوان ۴۰۹ طسوج چهار جو.

[8] رک : قواس ص ۱۵۳ ، موید ا : ۲۷۰ ، جهانگیری ص ۹۷۰.

[9] رک : قواس ص ۱۸۵ ، موید ا : ۲۶۹ ، ۲۷۰ ، جهانگیری ۲۶۹ : تانگو و تونگو را بدین معنی آورده. و ادات فقط 'تونگو' دارد.

[10] صحاح ص ۲۷۱ : تواره خانه باشد که دران جز سرگین و پلیدی دکاه هیچ نبود.

[11] مدار ا : ۰۴ سرگین روفته. موید ا : ۲۷۵ روضه وهمین است در ادات ولسان الشعراء ، در اول الذکر هر سه معنی و در لسان اول دو معنی آمده.

[12] جهانگیری ۲ : ۱۹۴۵ خانه و دیواری که از کاه وعلف سازند.

تفنه[1]: طعنه زدن، و بعضی به سین[2] مهمله گویند.

تنوره[3]: پوششی است همچو جوشن ولکن جیبهای دراز دارد.

ترغده[4]: بفتحتین، گرفته رو و ترنجیده، و عضوی که از درد حرکت نتواند کرد، گویند ترغده شده است، و بعضی بفتح تا و سکون را گویند.

تروه[5]: جفت ضد طاق، و در فرهنگ‌نامه است تردّه[6]: طاق.

تبیره[7]: طبل و دمامه.

تریوه[8]: راه پشته.

تنده[9]: غنچه‌ای که برگ بیرون زند.

تلوسه[10]: غلاف کارد، و بفتح تا نیز گویند، و در فرهنگنامه است: تلوسه غلاف کارد و آن[11] باز عزمای تر است.

توره[12]: شکال و آن جانوریست که بشب بانگ کند، بهندوی گدر[13] گویند.

تله[14]: دام، فخ[15].

---

1. رک صحاح ص ۲۷۰. 2. رک: موید ۱: ۲۷۴.
3. رک: موید ۱: ۲۷۵، مدار ۱: ۳۹۹، جهانگیری ۲: ۱۷۹۱ در آخر دو فرهنگ بیت نظامی گنجوی شاهد آمده.
4. رک: موید ۱: ۲۷۳؛ در جهانگیری ۱: ۹۱۱ بیت زیر منجیک شاهد است:

زبس کوب از زمانه یافت دشمن ⁂ همه اعضای او گشته ترغده

5. رک: موید ۱: ۲۷۳، جهانگیری ۱: ۹۲۰. 6. رک: موید ایضاً، جعفری ۱۳۷ تردده.
7. موید ۱: ۲۷۲ عیناً بهمین معنی دارد؛ تبیر نیز بهمین معنی می آید، رک: صحاح ص ۱۰۲.
8. صحاح ۲۷۰ و جهانگیری ۹۲۴. تریوه راه پشته پشته؛ با بیت شاهد از شهید.
9. رک: موید ۱: ۲۷۴، جهانگیری ۲: ۱۷۸۵.
10. قواس ص ۵۲؛ موید ۱: ۲۷۴ تلوسه بوزن سبوسه غلاف کارد و تیغ ... و در ادات هست: غلاف دانهٔ عزما و در دستور الافاضل غلاف کارد یعنی شکوفه.
11. ادات: غلاف دانهٔ عزما نیز.
12. رک: مدار ۱: ۴۰۳، جهانگیری ۲: ۱۹۵۱.
13. یعنی گیدڑ.
14. رک: قواس ص ۷۷.
15. مدار ۱: ۳۹۰ تله دام عرب آنرا فخ خوانند.

فخ غلطست فخ واژهٔ صحیح می باشد، دستور الاخوان ۲۶۸ الفخ دام.

رک: نصاب الصبیان ص ۴۳: منقبت مشترک چه بود دام فخ تله.

تندیسه[1] : صورت.

تخمه : اصل و نام زحمتی است که در اسب[2] باشد.

تماخره[3] : سخره.

تژه[4] : بزای پارسی، دندانهٔ کلیدان و غنچهٔ درخت.

تابه[5] : بدانچ بریان کنند، بتازی مقلاة[e] گویند.

تفته[6] : خانهٔ عنکبوت یعنی پردهٔ او.

توانچه[7] : طراق و تمانچه نیز گویند.

تشه[8] : پیمانهٔ روغن.

تلنه[9] : حاجت یعنی نیاز.

تفشیله[10] : گوشت و گندم و گندنا و جوز مغز و بیضه یکجا بدیگ کرده و پخته یعنی ازین همه خوردنی پزند آنرا تفشیله گویند.

تجله[11] : نعلین و عصا و بلغتی خا نیز آمده است.

تفسه[12] : کلفه.

---

[1] قواس ص ۸۴ : تندیسه و پیکر صورت باشد. [2] قید اسب درست نیست بلکه این مرض آدمی و حیوانات دیگر را بهم رسد، نوعی از هیضه است : رک : موید ۱ : ۲۷۲ و جهانگیری ۱ : ۷۴۳.

[3] جهانگیری ۲ : ۱۶۸۱ تماخره : هزل و مزاح و ظرافت و سخر.

[4] جهانگیری ص ۱۲۲۱ تژه بمعنی غنچهٔ گل و موید ۱ : ۲۷۳ تژده (صح تژه) بمعنی دندان کلید و غنچه نوشته؛ فرس ۴۴۲، صحاح ۲۷۰ تزه زای عربی، قواس ۱۲۵، برهان ۴۹۵ تژه زای فارسی، سروری ص ۳۲۴ تره بمعنی دندانهٔ کلید.

[5] رک : موید ۱ : ۲۷۱ تابه آنچه بران نان پزند و تاوه نیز گویندش. [e] دستور ۶۰۲ المقلاة تابه.

[6] موید ۱ : ۲۷۴ و جهانگیری ص ۱۳۶۸، صحاح ۲۷۰، بیت شاهد :

عشق او عنکبوت را ماند ٭ بتنیده است و تفته گرد دلم

[7] موید ۱ : ۲۷۲، ۲۷۵، توانچه و تپانچه بتازیش لطم. [8] رک : قواس ص ۱۳۶ متن و حاشیه.

[9] رک : موید ۱ : ۲۷۴، مدار ۱ : ۳۸۹ نیز ببینید : تلنگ و تلنگی درهمین فرهنگ.

[10] رک : موید ایضاً. جهانگیری ۱۴۶۷ تفشیل و تفشیده هردو آورده؛ نیز رک : فرس ص ۴۶۴ صحاح ۲۷۰.

[11] کذا است دراصل؛ اما درهمهٔ فرهنگها بخا آمده است. رک : فرس ۴۲۸، قواس ۱۵۶، صحاح ۲۷۰، سروری ۳۲۶.

[12] جهانگیری ۱۴۶۷ : تفه سیاهی بود که بر بشره پدید آید ... بتازی کلف و بهندی چهائی.

تاسه[1] : سیاهی روی و بی قراری .

تالواسه[2] و تلواسه : اندوه و بیقراری .

ترده[3] : مرد آسیا و اجرت آسیا راست کردن .

ترنجیده[4] : گرفته و درشت را گویند .

توبکه[5] : گنجینه .

ترفیده[6] : هرزه[7] و بفرهنگ [[8]]

تفسیله[9] : نام جامه است .

ترانه : گونه ای از سرود و نواخت است .

---

[1] رک : موید ۱ : ۲۷۱ ؛ اما در جهانگیری ص ۲۶۴ تاسه و تاسا و آسه بمعنی بی قراری .

[2] موید ۱ : ۲۷۲ تالواسه ... در ادات بمعنی بیقراری است و عوام آنرا تلواسه نیز گویند ؛ و حال آنکه جهانگیری ۲ : ۱۶۰۳ تلواسه و تلوسه بمعنی اضطراب نوشته و برای هر دو شاهد آورده :

زبس تلواسه کاندر جان من بود ❊ تو گفتی مردنم درمان من بود (اشهری)

در تلوسه ای چنین جگر سوز ❊ می دید عقوبتی دو سه روز (امیر خسرو)

و تالواسه شامل این فرهنگ نیست ؛ ازین توضیحات روشن می شود که تلواسه بگفتگوی عوام نیست چنانکه در موید آمده . موید ۱ : ۲۷۴ تلواسه و تلوسه هر دو را بمعنی بیقراری آورده .

[3] موید ۱ : ۲۷۳ و جهانگیری ص ۹۱۰ ترده بمعنی اوّل نوشته ؛ و در مدار ۱ : ۳۶۴ ترده اجرت آسیا راست کردن ، بزای معجمه نیز .

[4] موید ۱ : ۲۷۳ : ترنجیده 'زفان درشت شده' ... زفان : ترنجیدن گرفته شدن و درشت گشتن (ذیل بخش سوم) ، سرمهٔ سلیمانی ۶۹ ترنجیده سخت تنگ درهم آمده .

[5] اصل - توبله ؛ اما در اکثر فرهنگها توبک یا توبگ بهمین معنی آمده ؛ مدار ۱ : ۴۰۱ توبک ... در ابراهیمی ست . توبک گنجینه و بلغتی بجای با نون ؛ در سکندری در باب لام بمعنی پیشانی الخ ؛ جهانگیری ۲ : ۱۹۴۶ : توبگ گنجینه را گویند و در ادات الفضلا با تاء فوقانی و در زفان با نون ، سلیمانی ۷۰ تونکه گنجینه .

[6] لذا ست در اصل ؛ ترفنده درست است ؛ جهانگیری ۱ : ۹۱۲ ترفند و ترفنده بمعنی تزویر و دروغ و مکر . اکثر فرهنگها ترفند دارند نه ترفنده یا ترفیده . رک : قواس ص ۱۶۰ ، صحاح ص ۶۰ ، و نیز همین فرهنگ .

[7] مدار ۱ : ۳۶۷ : ترفنده و ترقنده هرزه و دروغ و محال .

[8] در اصل کرم خورده ، ممکن است ترفنده بانون باشد .

[9] ادات تفسیله نوعی از جامه ها که برای زمستان بافت ؛ نیز رک : جهانگیری ۲ : ۱۶۶۷ .

تریته[۱]: طعامی است که بتازی [ورق ۱۳۰ ا] عویشه[۲] گویند.

تروشه[۳]: میوه ایست.

تازیانه: چابک.

تازه[۴]: جدید و پالاینده.

تغاره[۵]: آوند بزرگ روگشاده.

تواهچه[۶]: گوشت نرم پخته، و تباهچه[۷] و تماهچه نیز گویند.

تاه[۸]: توی[۹] باشد یعنی پرده، گویند دو تاه یعنی دو توی، و نیز کنایت[۱۰] از اعداد، گویند تاهی[۱۱] چند.

تمیشه[۱۲]: نام شهری که فریدون[۱۳] در آن بود.

تارچه[۱۴]: تیری است که بر پرندگان اندازند.

---

۱ رک: ادات و موید ا: ۲۷۳، جهانگیری ۹۲۳؛ قواس ۱۴۳ بمعنی کنجد آرد کرده.

۲ دستور ۲۴۸ العویشه تریته؛ معین ۲۴۵۲ غوشه نوعی از طعام که آنرا تریته سازند؛ نیز رک: همین فرهنگ ص ۱۰۷۶؛ زمخشری، مقدمة الادب ص ۳۴۶ عویشه، تریته، ترغینه، ترخانه آب کشک.

۳ رک: ادات و موید ا: ۲۷۳.

۴ موید ا: ۲۷۱ این معنی بگفتهٔ زفان نوشته.

۵ موید ا: ۲۷۵

۶ رک: موید ا: ۲۷۵، مدار ا: ۱۰۴.

۷ برای صورتهای کلمه: تباهچه، تماهچه، تباهیه رک: مدار ا: ۸ ۳۴، موید ا: ۲۷۲ تباهچه، تماهچه، تباهه، تواهه چهار صورت دیگر نوشته.

۸ رک: موید ا: ۲۷۲.

۹ جهانگیری ۲: ۱۹۵۶ توی بمعنی توه و تاه ولای نوشته.

۱۰ موید این معنی بگفتهٔ زفان آورده؛ نیز رک: مدار ا: ۳۴۷.

۱۱ مدار: تائی چند.

۱۲ نسخهٔ اصل: تمشیته: موید ا: ۲۷۴ تبیشه، تمیشه و تیشه دارد، جهانگیری ۲: ۱۶۸۲ تمیشه. حدود العالم ص ۱۴۵: تمیشه شهریست (از طبرستان) خرد، گردوی باره و نعمت بسیار و اندر کوه و دریا نهاده است و حصاری دارد استوار و اندروی پشه بسیار باشد اندر همهٔ شهر مگر بمزگت (= مسجد) جامع که پشه اندروی نرود.

۱۳ این طور بیان افسانه ایست و اهمیت کتاب می کاهد؛ موید ا: ۲۷۵ تمیشه نام شهری که فریدون دران بود کذا فی الادات.

۱۴ رک: موید ا: ۲۷۲.

توباره[1]: بز نر باشد.

تبخاله: تبشی باشد که بر روی برآید.

توده: انبار.

بهرهٔ ی

تشی[2]: روباه ترکی، روباه خار انداز، و این جانوریست از خزندگان.

تلی[3]: دست افزار حجام یعنی دست افزار دان و این درست تراست.

تلنگی[4]: حاجت مند.

توالی[5]: طمانچه.

تهی: خالی.

ترپی[6]: ترشاوه[7] است که در دیگ اندازند.

[.....][8] ... است چنانکه مدور و ملمع و معرج.

تودری[9]: نام گیاهی است، دوگونه باشد، لعل و سپید.

تالکی[10]: کشنیز دشتی.

گونهٔ جیم.

بهرهٔ ب

جلب[11]: ناستور.

---

[1] رک: موید ا: ۲۷۵، مدار ا: ۴۰۰؛ اما ادات توپاره با واو فارسی: بز نر.

[2] در اصل کرم خورده، اما رک: موید ا: ۲۷۷ و در این فرہنگ بگفتهٔ زفان معنیش بیان شده.

[3] تواسس ص ۱۸۵: تلی دست افزار کارگران؛ در موید معنی کلمہ بگفتهٔ زفان بیان شده.

[4] رک: تواسس ص ۹۲، ادات، و موید ا: ۲۷۸؛ رک: تلنگ و تلنہ در ہمین فرہنگ.

[5] رک: مدار ا: ۴۰۱، در موید معنی کلمہ بگفتهٔ زفان نوشته شده.

[6] رک: موید ا: ۲۷۳، مدار ا: ۳۵۲، زفان گویا ذیل 'تتم'.

[7] رک: ادات و زفان ذیل 'تتم'.

[8] اصل واژه و جزئی از معنی اش در نسخهٔ اصل کرم خورده و ناخوانا.

[9] رک: موید ا: ۲۷۸، مدار ا: ۴۰۲؛ در موید اسمی از زفان برده شد.

[10] رک: موید ا: ۲۷۷، مدار ا: ۲۴۵. [11] صحاح ص ۳۸: جلب ناستور.

بهرهٔ 'ت'

جغبوت[۱]: حشو آگنده یعنی پنبه آگنده، و بضم[۲] جیم و سکون غین لغتی است، و بعضی فرهنگها[۳] جیم پارسی مفتوح و غین ساکن است.
جمست[۴]: جوهری است فرومایه، کبودی که بسرخی زند.
جرست[۵]: آواز برهم سودن چیزی.
جفت[۶]: نوعی از انگور.

بهرهٔ 'ج'

جوج[۷]: آن پارهٔ گوشت باشد بر سر خروس و بر سر ترکها کنند و بر سر طاق ایوان و مانند آن.

بهرهٔ 'خ'

جوخ[۸]: گران[۹] و فوج.

بهرهٔ 'د'

جلوند[۱۰]: چراغ.
جاورد[۱۱]: خار سپید[۱۲]، بعضی بزای معجمه گویند.

---

۱ رک: قواس ص ۱۵۱، موید ۱: ۲۸۵.
۲ در موید بفتحتین.
۳ رک: فرس ص ۱۴، صحاح ص ۴۴. ۴ رک: قواس ص ۱۵۹، صحاح ۴۳ که مندرجات عیناً برطبق متن است
۵ جهانگیری ۱: ۹۲۶ جرست آواز برهم زدن دندان. کشف الاسرار ۶: ۴۱۰ جمله طاعات و عبادات و اعمال و اقوال اولاد آدم در مقابل کمال و جمال الٰهی جرست دوک پیرزنان نیست (حاشیهٔ جهانگیری).
۶ رک: مدار ۲: ۱۹، مدار ۲: ۱۹.
۷ موید ۱: ۲۸۵ ذیل فصل عربی، مدار ۲: ۳۳.
۸ موید ۱: ۲۸۶ ذیل فصل عربی، و در زفان گویا جوخ بالفتح فوج گران، اما جهانگیری ۲: ۱۹۵۸: جوخ بمعنی گروه، معرب آن جوق.
۹ مدار ۲: ۳۳ جوخ گران و فوج الخ. ۱۰ رک: موید ۱: ۲۸۷، مدار ۲: ۲۴.
۱۱ رک: موید ۱: ۲۸۷، مدار ۲: ۷، جهانگیری ۱: ۳۷۹.
۱۲ نسخهٔ اصل: سپید خار، اما رک: مدار و جهانگیری.

جمشید[1]: نام پادشاه[2].

بهرهٔ «ر»

جذار[3]: شتر چهار ساله و نیز استر چهار ساله را هم گویند.

جبروز[4]: خارپشت.

جمزپور[5]: اسپی[6] که روی شکم و دست و پای رو سپید باشد، و اگر شکم او سپید نبود جمزپور نگویند.

بهرهٔ «ز»

جلویز[7]: غماز[8] و شرطه یعنی جبار[9].

---

[1] رک: مدار ۲: ۲۶، جهانگیری ۲: ۱۶۸۲

[2] بعدش دو کلمه افتادگی دارد مانند حکیم پیشه کذا فی المدار.

[3] موید ۱: ۲۸۸ ذیل فصل عربی، معنی اوّل (کذا است در متن) بگفتهٔ زفان گویا، نیز رک: مدار ۲: ۱۲.

[4] رک: مدار ۲: ۸، اما موید ۱: ۲۸۹ جرور یعنی خارپشت بحوالهٔ زفان نوشته؛ جهانگیری ۵۷۸، سرمهٔ سلیمانی ۷۵، جعفری ۱۶۳ جبروز (جپروز) خارپشت. [5] موید ۱: ۲۸۹ جمزبور، مدار ۲: جمزپور، سرمهٔ سلیمانی ۷۴ جمزپور.

[6] نسخهٔ اصل: اسپی که بود که («بود که» بعدش افزوده شده).

[7] معنی این کلمه از روی فرهنگ ها واضح نمی شود، مثلاً:

درفرس ص ۱۷۳ بدینطور آمده: جلویز مفسد، طاهر فضل

روانه بود بزندان و بند بسته تنم ٭ اگر نه زلف مشکین تو بدی جلویز

قواس ص ۱۱۱ جلویز شرطه بود یعنی جبار این کس، طاهر فضل گفته الخ.

صحاح الفرس ص ۱۲۵ جلویز یعنی غماز، طاهر فضل گفته الخ.

دستور ص ۱۰۹ جلویز مطرلون (صح عوان) یعنی چنانک اینکس.

ادات الفضلا جلویز عوان و شرطه یعنی خیار این کش.

بحر الفضائل جلویز مردم گزیده و اختیار.

معیار جمالی ص ۱۶۶ جلویز مفسد و غماز باشد:

بعهد او نبود قدر ظالم و مفسد ٭ بدور او نبود کام جابر و جلویز

موید الفضلا ۲: ۲۹۰ جلویر (صح جلویز) دو معنی دارد اوّل کمند بتازی مقود، دوم غماز و مفسد و برگزیده.

مدار الافاضل ۲: ۲۴ جلویز شرط کردن بنخیار این کس و یعنی سرهنگ و ظالم و پیاده قاضی، استاد روانبود بزندان الخ.

جهانگیری ۲: ۱۶۰۶ جلویز دو معنی دارد اوّل کمند و آنرا جلبیز نیز خوانند و بتازی مقود ←

جواز[۱۰] : پادن چوبین که بدان غله کوبند.

→ طاهر فضل گفته روا نبود بزندان الخ. دوم مفسد و غماز باشد، شمس فخری:

بعهد او نبود کام ظالم و جابر ❊ بدور او نبود قدر مفسد جلویز

رشیدی ص ۱۳۱ ۵ بر شاهد اول جهانگیری ایراد نموده و گفته در آن تامل است چه معنی اول (یعنی غماز) نیز راست می آید اما دکتر معین در برهان ص ۵۸۳ (ح) بیت طاهر را برای معنی کمند اصح دانسته است. برهان: جلویز بمعنی کمند باشد که بعربی معقود خوانند و بمعنی مفسد و غماز هم آمده است، و برگزیده و انتخاب کرده را نیز گویند. آنندراج: جلویز و جلبیز بمعنی غماز و مفسد و در قاموس جلواز بالکسر پیادهٔ کوتوال و جاسوس که مردم را غمازی کند آمده.

فرهنگ معین ۲: ۱۲۳۹ جلویز (= جلبیز = جلیز) ۱ کمند، معقود ۲- مفسد، غماز ۳- برگزیده، منتخب. اما جلبیز و جلیز فقط بمعنی اول و دوم.

بنظرم معنی کمند از بیت طاهر فضل استفاده نموده شده و حال آنکه معنی مفسد بر او نیز راست آید؛ ممکنست معنی شرطه نیز از آن گرفته شده زیراکه یکی از خواص شرطه و عوان سخت گیری باشد که منتج به فساد شود؛ و شاید بهمین مناسبت است که صاحب قاموس اضافه نموده که جاسوس که مردم را گیرند و غمازی کنند. و معنی گزیده و منتخب که در فرهنگها نقل نموده شد بظاهر از معنی شرطه گرفته شده، در مقدمة الادب زمخشری ج ۱ ص ۲۴۸ حاشیه: الشرط خیرة الجند الواحد شرطه و الشرطی صاحبهم، و درهمین فرهنگ در متن آمده:

شرطه شرطی بمعنی سرهنگ بازار، سردار بازار یا لشکر، سردار گزیدهٔ سپاه. چون شرطه بمعنی سردار گزیده نوشته بعد ٔ معنی شرطه و بهمین واسطه معنی جلویز گزیده نوشته شده.

واجع به قرائت جبار در قواس و چنانک در دستور الافاضل یافته می شود باید گفت که شاید این مصحف خیار باشد و خیار جمع خیر است که معنی آن برگزیده و منتخب است و این کس یا این کس شاید تصحیف لشکر است. یعنی سردار گزیدهٔ سپاه چنانکه در مقدمة الادب آمده.

بنظرم غماز مصحف عوان است، و این کلمه نه مترادف مفسد است که در فرس است و نه مترادف شرطه چنانکه در صحاح آمده، و چنانکه معلوم است صاحب لغت فرس کلمهٔ غماز نیاورده، صاحب صحاح این کلمه را مترادف شرطه قرار داده و چار اشتباه شدیدی شده، غماز مترادف شرطه نیست بلکه عوان است چنانکه در ادات و زفان آمده، بنا برین معنی کلمهٔ جلویز بمعنی مفسد است و عوان و شرطه است، نه غماز.

[۸] نسخهٔ اصل: عغزان، عغوان، شاید مصحف غماز.

[۹] این واژه در نسخهٔ اصل کرم خورده.

[۱۰] در اصل کرم خورده و ناخوانا، رک: مویدا: ۲۹۰، جهانگیری ۲: ۱۹۵۷.

بہرۂ ش

جخش[1]: غرعہ[ع] کہ در حلق بود، بیشتر بگردن مردم جیلان[2] [ورق ۱۳۱ ا] و فرغانہ وآن دیار، چون بادنجان بزرگ از تن مردم بروید و بریدن[3] مخاطرہ بود.

جماش[4]: جادو وست.

جاش[5]: تودہ و انبار غلۂ پاک کردہ[6] در خرمن وبعضی بجسیم[7] پارسی نیز گویند.

بہرۂ غ

جغ[8]: چوبی کہ بدان برگردن ستورجفتی وگردنہ کش بندند یعنی یوغ[9].

جناغ[10]: زین رکاب.

بہرۂ ف

جاف[11]: قحبہ بدکارہ و زنی است کہ بریک شوی آرام نگیرد، زود زود از آن بدین همی بود وبعضی فرہنگنامہ جاف[12] مرکب گویند.

جلف[13]: سخرہ و بی باک وسفیہ وتہی.

بہرۂ ک

جوشک[14]: بلبلہ[15] یعنی کوزۂ بانول، وبعضی بفتح جیم گویند.

جوسک[16]: گویک گریبان[17] یعنی مادہ جوز گرہ.

---

[1] رک: قواسس ص ۱۶۵، صحاح ص ۱۴۹؛ جہانگیری ۱: ۷۴۴ جخش و ججخ هردو.

[ع] نسخۂ اصل: عرکہ؛ رک: ادات. غر علتی در اعضا کہ مانند گلولہ در زیر گلو بہم رسد (فرہنگ معین ۲۳۹۴).

[2] صحاح: اہالی ختلان و فرغانہ؛ معیار جمالی ص ۲۱۰: گیلان و فرغانہ. [3] کذاست در صحاح.

[4] موید ۱: ۲۹۱ جماش بمعنی دلیر و مست و جادو ذیل فصل عربی، نیز رک: جہانگیری ۲: ۱۶۸۴، مدار ۲: ۲۵.

[5] رک: موید ۱: ۲۹۱. [6] موید: از. [7] موید ایضاً.

[8] رک: موید ۱: ۲۹۳، جہانگیری ۲: ۱۴۲۴؛ مدار ۲: ۵۵ جغ و چغ هر دو صورت

[9] رک: جہانگیری ۲: ۲۱۴۱، فرس ۲۲۹. [10] رک: موید ۱: ۲۹۳، جہانگیری ۲: ۱۷۹۵ جناغ دامن زین، سلیمانی ص ۷۵. [11] رک: موید ۱: ۲۹۴.

[12] یعنی جاف جاف: رک: قواسس ص ۱۰۶، جہانگیری ۱: ۲۷۲. [13] مدار ۲: ۲۳ جلف ع بکسر سخرہ و بیباک وکمینہ الخ. [14] رک: قواس ص ۱۳۷؛ جوشک: بلبلہ یعنی کوزۂ بانول، نیز رک: موید ۱: ۱۸۲. [15] دستور الفضائل ص ۱۵: بلبلہ کوزۂ بانول.

[16] قواسس ص ۱۵۴ انگوژنہ و جوسک: گویک گریبان، نیز رک: ادات و جہانگیری ۲: ۱۹۶۰.

[17] جہانگیری ۲: ۲۰۶۲ گویک تکمہ؛ زفان گویک مادہ جوز گرہ.

جلانک[1] : کوزه گردانک که دو کوزه یکی بر سری بگردانند و دوم برشته و در فرهنگ[2] نامه است جلانک[3] گوی گردانک[4].

جلک[5] : سخت شدن چیزی بچیزی یعنی از دب[6].

جنگلوک[7] : کسی که دست و سر فرود[8] از تو نهد و بنشیند.

بهرهٔ ل

جوال : تنگی[9] که از شنی سازند.

بهرهٔ م

جم[10] : نام بادشاه است که نگین داشت و آن هم جمشید را گویند و هم سلیمان[11] را علیه السلام.

جام : پیاله

---

[1] مدار ۱ : ۱۱ ، موید ۱ : ۲۹۵ : جدانک کوزه گردانک که دو کوزه یکی الخ جهانگیری ۱ : ۷۸۹ : جدارک با اوّل مضموم نام بازی است که آنرا کوزه گردان نیز گویند ؛ و در همین فرهنگ ص ۱۶۰۷ : چلانک با اوّل مضموم ، دو معنی دارد ، اوّل بازی است که آنرا کوزه گردان نیز گویند ، دوم سرگین گردانک . اما در موید ۱ : ۳۱۷ چلانک بمعنی سرگین گردانک.

[2] کذا است در موید ۱ : ۲۹۵

[3] موید : جدانک.

[4] جهانگیری ص ۲۰۹۳ : گوی گردان و گوی گردانک : گوکار ، ایضاً ص ۲۰۸۶ گوگار و گوگال و گوگردانک : جانوری است که سرگین را گلوله کرده بگرداند ، خبزدوک.

[5] جهانگیری ص ۵۷۶ ، موید ۱ : ۳۱۶ چلک ناشایسته آلوده و پلید و در زفان گویا پلید و ناپاک ؛ واضحاً صاحب موید را اشتباه دست داده.

[6] کذا است در اصل ؛ در جهانگیری نیامده.

[7] موید ۱ : ۲۹۵ : جنگلوک آنکه سر و دست برکسی نهد و بنشیند ؛ اما در جهانگیری ص ۱۸۰۲ جنگلوک آدمی یا حیوانی که دست و پای او کژ و ناراست باشد.

[8] مدار ۲ : ۶۶ : سر و دست فراز نهد.

[9] صحاح ص ۱۹۵ تنگ : تنگ شکر باشد و تنگ هر باری را نیز گویند.

[10] رک : جهانگیری ۱۶۸۲ - ۱۶۸۳.

[11] عمید لویکی گوید : یعقوب را نشاط ز یوسف فزوده اند . داود را بشارتی از جم نموده اند.

بهرهٔ ن

جیلان[1]: کنجد و گویند گردگانی بود، و بعضی فرهنگیان بجیم پارسی گویند.

جوشن: نوعی از پوشش سلاحی.

جینین[2]: انباچهٔ مزیّن را گویند.

جدتین: همان جینین، و جدیتین نیز گویند.

بهرهٔ و

جهملو[3]: مشتک و لتک[4].

جو: جو غلهایست، بتازی شعیر گویند، و عیار[5] زر را نیز جو گویند.

جوجو: و این آن باشد که جزو جز[6] و ذره ذره، و جوجو[7] نیز گویند.

بهرهٔ ه

جشینه[9]: آنک خنگ[10] رنگ بود.

---

[1] در موید ا: ۳۰۰، جیلان بمعنی کنجد و عناب، و در جهانگیری ۲۲۶۶: جیلان بمعنی عناب آمده.

[2] رک: موید ا: ۳۰۰، جینین: انباچهٔ مزیّن و ص ۲۹۹ جدتین و جدیتین کذا فی الدستور. و در جهانگیری ص ۷۸۹: جدتین با اوّل مفتوح انباچه باشد که آنرا مزیّن ساخته باشند؛ ادات جدتین و جینین هر دو بمعنی انباچهٔ مزیّن. [3] قواس ص ۱۸۹: جهملو مشتک و کتک (نوعی از بازی)، در اکثر فرهنگها جهملو بمعنی جنسی از غله آمده: مثلاً در جهانگیری ۲: ۱۶۸۵، و در برهان ص ۵۸۸: جهملو جنسی از غله که آنرا مشنگ خوانند و بهندی کلاو و بعضی مشتک خوانده اند و گفته اند جهملو از بازی است، نیز رک: موید ا: ۳۰۰، مدار ۲: ۲۸؛ برای آگاهی بیشتر دربارهٔ معنی این کلمه رک: مقالهٔ بنده در مجله علوم اسلامیه، علیگر، دسامبر ۱۹۶۷ م ص ۷۹.

[4] کذاست دراصل؛ اما رک: قواس ص ۱۸۹ و موید ا: ۳۰۰: کتک.

[5] موید ا: ۳۰۰ جو... نود و ششم مرتبه از گوهر و زر که بتازیش عیار خوانند. [6] دراصل کرم خورده، باید بدینطور تشریح کرد: جزو جزو و ذره ذره باشد. [7] جهانگیری ۲: ۱۹۵۸: جوجو دو معنی دارد، اوّل نام شهری باشد از ملک خطا که در آنجا جامه های ابریشمی و مشک و کافور بسیار خوب می شود... عمید لویکی:

در شمامهٔ حزرهٔ کافور جوجو بار شد ؛ عنبرتر کاروان بر کاروان آمد پدید

دوم ریزه ریزه و پاره پاره. [8] رک: ایضاً در شواهد شعری.

[9] رک: مدار ا: ۱۸؛ موید ا: ۳۲۵ چشیشه، جهانگیری ا: ۱۳۶۳ جشیشه و چشینه رنگی باشد مخصوص اسب و استر را، و آنرا خنگ خوانند از این تفصیل واضح است که جشینه رنگی مخصوص است نه که اسب یا استر که دارای رنگ باشد چنانکه در زفان گویاست. [10] ادات و مدار ۲: ۱۸ خرما رنگ.

جامه[1]: مانند کوزه باشد و شراب در وی کنند و آنچ بنوشند.

جفاله[2]: گلهٔ مرغ.

جوشه[3]: کوشک، و آنچ بیرون[4] بدارند.

جشه[5]: پیمانهٔ روغن.

جهودانه[6]: چرب روده و گویند چربهٔ رودهٔ بریان کرده، و نام درختی است که بار می
آرد و کلک[7] خوردنی [ورق ۱۳۲ا] صمغ اوست.

جزوره[8]: آنچ از دنبه و پیه گداخته بماند، وبعضی زای[9] پارسی گویند جژدره.

جغرسته[10]: ماشوره، وبلغتی جیم پارسی است.

جیوه: سیماب

جبیوه[11]: جمع شدن گروهی.

جله[12]: سمارغ و آوند خرما.

جنبنده[13]: جانور.

---

[1] رک: صحاح ص ۲۷۱، موید ۱: ۳۰۲، مدار ۲: ۵.

[2] رک: فرس ص ۴۳۰. صحاح ص ۲۷۰؛ اما قواس ص ۶۵: جفاله گلهٔ مرغان. نیز رک: دستور ص ۱۰۹، ادات، موید ۱: ۳۰۳ (جفاله با فا).

[3] کذاست در اصل؛ اما قواس ص ۱۲۱، مدار ۲: ۳۵ جوسه کوشک.

[4] شاید بالاخانه مراد باشد، رک: معین ص ۱۲۵۳ ذیل جوسه.

[5] رک: قواس ص ۱۳۶، مدار ۲: ۱۵؛ اما دستور ص ۲۴۴ وجسر تصحیف است.

[6] رک مدار ۲: ۳۹.

[7] نسخهٔ اصل: کلکب؟؛ جهانگیری ۲: ۲۱۶۵ صمغ اورا کلک وکوژده گویند؛ مدار: علک.

[8] رک: موید ۱: ۳۰۲، مدار ۲: ۱۶.

[9] مدار جیم و زا هردو پارسی.

[10] موید ۱: ۳۲۶ چغرسته، جهانگیری ۲: ۱۴۲۷، ۱۴۷۲ چغرسته وچغزسته بمعنی ماشوره.

[11] کذاست دراصل وادات؛ اما رک: موید ۱: ۳۰۲: جبیره وچبیره، جهانگیری ۱: ۵۸۰ چبیره:

بعزمودشان تا چبیره شوند ٭ هژبر زیان را پذیره شوند (فردوسی)

[12] صحاح ص ۲۷۲ جله: سمارغ بود، موید ۱: ۳۰۳ جله: آوندشراب وسمارغ؛ و در ادات و مدار ۲: ۲۴ جله: سمارغ و آوندشراب وجز آن.

[13] در موید (ایضاً) این واژه بحوالهٔ زفان آمده.

چکاشه[1] : خارپشت.
جچمه[2] : کفش[3] جاگی.
جرمه[4] : اسب خنگ.
جره[5] : بازمهین[6].
جبجله[7] : یعنی آنکه یخ برای جوی بسته می شود وبعضی مردمان می دوند، از خشکی دران جوی افتند وهیچ حرکت نمی کنند وپایهای ایشان لخشان می رود.
جوزینه[8] : شوربای جوز.
جفته : طاق که در بنا[9] کنند، وبعضی گویند گونه[10] ای از تخت است و در فرهنگنامهٔ فخر قواس[11] جفته طاق انگور.
جرده[12] : اسب خصی که بتازی آنرا هجین[13] گویند.

---

[1] ادات : چکاسه خارپشت ؛ اما رک : موید ۱ : ۳۰۳.
[2] کذا است در مدار ۲ : ۲۵-۲۶ ؛ اما در موید ۱ : ۳۰۴ جنبو نوعی ازکفش و پای افزار کذا فی زفان گویا؛ واضح است که جنبو تصحیف کاتب است. قواس ص ۱۵۶ ؛ ادات و مدار و موید ۱ : ۲۹۸ جمچم بمعنی کفش جاگی که درویشان سازند. [3] نسخهٔ اصل : پاگی.
[4] رک : موید ۱ : ۳۰۲ ؛ مدار ۲ : ۱۹ جرمه سبزرنگ و اسب خنگ : شاهنامه :
برازخشم وازکینه سالارنو ⁂ نشست ازبرجرمهٔ تیزرو
[5] دستور ص ۱۱۰ : جره زین ، ادات : بازسپید ؛ جهانگیری ص ۹۲۷ جره نرباز ، فرهنگ معین ۱ : ۱۲۲۶ جره باز نر. [6] نسخهٔ اصل : بازهین (متن تصحیح قیاسی)
[7] در موید ۱ : ۳۰۲ معنی جبجله بیان شده ، ونیز ۱ : ۳۲۵ چبچله ؛ در مدار ۲ : ۴۵ چبچپه اما در معنی بجای یخ تخت نقل شده ، وآنرا تصحیف باید دانست ، نیز رک : سرمهٔ سلیمانی ص ۸۰ چبچله.
[8] رک : مدار ۲ : ۳۵ ؛ اما در ادات : جوزینه لوزینه ، موید ۱ : ۳۰۳ جوزینه و لوزینه ؛ در زفان گویا بمعنی شوربای جوز.
[9] در موید (ایضاً) این معنی بحوالهٔ قنیه نقل است.
[10] رک : قواس ص ۱۳۲.
[11] در قواس جفته دو بار آمده. دفعهٔ اول بمعنی شاخ انگور ذیل بر رسته (متاسفانه ازنسخهٔ چاپی افتاده) و دفعهٔ دوم ص (۱۳۲) بمعنی تخت. دستور ص ۱۱۰ جفته شاخ درخت.
[12] رک : موید ۱ : ۳۰۲ ، معین ۱ : ۱۲۲۴ جرده (بالفتح) اسب زرد رنگ ، زرده و جرده (بالضم) اسب خصی. [13] دستور الاخوان ص ۶۶۸ هجین اسب بدنژاد آنکه مادرش بنده باشد ←

جوینه[۱] (صح جوبینه) : مرغی است بزرگ وسپیده، باگردن دراز، بتازی آنرا کروان[۲] گویند.
جلغوزه : نام میوه ایست معروف مانند پسته.
جبه[۳] : داروئی است که بهندی چوکه گویند.
جوانه[۴] : جوانی دیده.
جفته[۵] : لگد.

← و پدرش آزاد. بنابرین واضح است که همچنین مترادف جرده نمی باشد. جرده و زرده در یک معنی مترادف اند چنانکه در فرهنگ معین ۱: ۱۲۲۴ آمده. و زرده در فرهنگ زفان گویا بمعنی اسپ زرد رنگ، و آنک میان کیت و بور بود و گویند برنگ اوبس ماند و بیشتر بزردی گراید. جهانگیری ۱: ۹۹۸ زرده اسپی را گویند که رنگ آن زرد باشد:

زرده شام و نقره خنگ سحر ❊ چرخ را زیر ران نیابستی

چون زرده بمعنی اسپ زرد رنگ است، و همچنین بمعنی اسپ بدنژاد، پس هردو را مترادف قرار دادن بظاهر اشتباه است.

۱ـ موید ۱: ۳۰۴ جوینه مرغی است بزرگ وسپید باگردن دراز که بتازی آنرا کروان گویند کذافی زفان گویا. ازین پیداست که خود صاحب زفان جوینه نوشته؛ اما قرائت درست این واژه جوبینه است چنانکه درفرهنگها آمده، بعلاوهٔ آن خود درهمین فرهنگ زفان ذیل حرف چ چوبینه بمعنی کاروانک و آن پرنده ایست بزرگ وسپید باگردن دراز. جهانگیری ۲: ۱۹۶۵ چوبینه نام پرنده ایست که آن را کاروانک نیز خوانند، و در موید ۲: ۱۱۰ کاروانک بمعنی پرندهٔ آبی درازگردن سپید آمده.

۲ـ زفان گویا کروان مرغی است که ببط ماند شبهانخسپد. فرهنگ معین ۲: ۲۹۵۸ کروان کبک، پرنده ایست از راستهٔ پابلندان که در حدود ۱۲ گونهٔ آن در سراسر کرهٔ زمین می زیند، رنگ پرهای زرد مخلوط باخرمائی وخاکستری است. ازین تفصیل واضح است که جوبینه یاچوبینه با مترادف کروان نیست.

۳ـ رک: موید ۱: ۳۰۲، مدار ۲: ۹ جبه: نام داروئی است ترشش هندس چوک نامند.

۴ـ کذاست در موید ۱: ۳۰۲؛ و در پلاٹس: Rumex Vesicarius, چوک Cuk Sorrel or R. Montanus

۵ـ موید ۱: ۳۰۲ جوانه: همان جوان به زیادتی ها چنانکه در کلام نظامی آمده:
ع زن پیراز نفسهای جوانه. بیرم خان بمعنی بچه کبوتر نظم نموده:

جوانه ها که به گرد او همی گردند ❊ به از هزار جوان است هرجوانهٔ او

و محمد حسین: فرهنگ ۱: ۱۲۵۰ جوانه بمعنی جوانی و مرد جوان آورده. ←

جدکاره[1] : راههای[2] مختلف .

بهرهٔ «ی»

جادوی[3] : چیزیکه دران مردم حال بگردانند[4] .

جامگی[5] : رزق و سربرد[6] .

جالی[7] : درخت پیلوکه بتازی اراک گویند .

گونهٔ «چ»

بهرهٔ «الف»

چلیپا : صلیب[8] که براهمه[9] و نصاری در زنار[10] اندازند یعنی کستی[11] .

← عه مويد ۱ : ۳۰۲ جفته بالضم هردو لگد اسب و سرین مردم وغیر آن و ادات : جفته هردو سرین مردم وغیر آن و هردو لگد اسب . [1] کذا است در فرس ص ۵۱۳ ، صحاح ص ۲۷۱ ، دستور ص ۱۰۸ ، ادات ، مدار ۲ : ۱۲ ، سروری ص ۳۶۳ ؛ اما در جهانگیری ۱ : ۲۸۹ ، رشیدی ۱ : ۴۹۵ ، برهان ۲ : ۵۶۶ جدگاره . [2] کذا است در قواس ص ۱۰ و دستور ص ۱۰۸ ، ادات ، شرفنامه ، جهانگیری ، رشیدی وغیر آنها ، اما در فرس و صحاح و مدار و سروری رایهای مختلف . و در قواس بیت زیر برای شاهد معنی راههای مختلف و در صحاح بمعنی رایهای مختلف آمده :

جهانیان را دیدم بسی ز هر مذهب ❊ بسی بدیدم از گونه گونه جدکاره

[3] کذا است در مويد ۱ : ۳۰۴ و ادات ؛ این جادوی بمعنی جادوئی است که سحر و ساحری باشد و جادو - ساحر ، رک : فرهنگ معین ۱ : ۱۲۰۱-۱۲۰۲ . [4] ادات و مويد : چیزیکه بدان حال مردم بگردانند ؛ واضح است که معنی عیناً از یک فرهنگ قدیمی نقل شده است بتکرار .

[5] مدار ۲ : ۴۳ جامگی : علوفه و وجه جامه و ماهیانه و سالیانهٔ چاکران الخ . [6] کذا است در اصل .

[7] ادات : جالی درختی که عرب آنرا اراک و اهل هند پیلو گویند .

[8] نسخهٔ اصل : طیب . صلیب معرب چلیپاست . [9] چلیپا چوب چهار پره نشانه دار عیسی است که مسیحیان برگردن آویزند یا در کلیساها و نقاط دیگر برپا کنند ، صلیب مخصوص است به مسیحیان ، به براهمه و زردشتیها هیچ رابطه ندارد . [10] رشته ای که مسیحیان متصل صلیب در گردن آویزند ؛ و زنار نصاری و زردشتیها و هندوان هر سه گروه می بندند . اما چلیپا مخصوص است به مسیحیان .

[11] کستی زنار یا کمربندیست زردشتیان را و آن از ۷۲ نخ از ابریشم سفید گوسفند تهیه می گردد و بدست زن موبدی بافته می شود ، فرهنگ معین ۳ : ۲۹۷۱ . بنا برین واضح است که توضیح صاحب زفان درست نیست .

چوخا[1]: جامهٔ پشمین و گویند جامه است کوته که ترسایان می پوشند و آن دکله[2] ترسایانست.

چاروا: اسپ و جز آن، هرچه از مواشی باشد.

بهرهٔ ت،

چرخشت[3]: چرخ انگور مال و آن بزبان ماوراء[4] النهر است و بتازی معصر[5] گویند و بعضی بجیم عربی گویند.

چست[6]: چالاک و تنک و استوار.

بهرهٔ ج،

چلوج[7]: سنبه تیز کردن آسیا و بعضی بجیم پارسی گویند.

چج[8]: بدانچه غله افشانند.

بهرهٔ چ،

چاچ[9]: نام شهریست از بلاد فرغانه.

بهرهٔ خ،

چخماخ[10]: چقمق یعنی آتش زنه[11] و چخماخ[12] نیز گویند.

---

[1] ادات: چوخا جامه ایست پشمین و نوعی از پوشش ترسایان که کوتاه است و در هند جوگیان پوشند و اهل هند آنرا کنتها خوانند.

[2] دکله نوعی از جامه ایست.

[3] کذاست در قواس ص ۱۴۰، صحاح ص ۱۴۴؛ اما موید ا: ۲۸۵ چرخست (سعنی بگفتهٔ زفان) و ا: ۳۰۸ چرخست و چرخشت (هردو).

[4] این تخصیص در فرهنگها که مورد احتیاج بنده است دیده نشد.

[5] رک: دستور الاخوان ص ۵۹۴ المعصر چرخشت.

[6] نسخهٔ اصل: چشت.

[7] کذاست در قواس ص ۱۷۹، برهان ص ۴۵۶؛ اما موید ا: ۳۰۸، سروری ص ۲۷۳، رشیدی ص ۵۲۹، نیز برهان ۶۵۲: چکوج افزاری برای سنبه تیز کردن آسیا؛ ادات: چکوج آن سنبه که بدان آسیا تیز کنند.

[8] رک: موید ا: ۳۰۸، مدار ۲: ۴۶.

[9] شهری است از ماوراء النهر در کنار سیحون که اکنون تاشکند نامیده می شود و مرکز جمهوری ازبکستان است.

[10] رک: ادات و تیز مدار ۲: ۴۷.

[11] موید ا: ۹۵ آتش زنهٔ ترکیش چقاق گویند.

[12] این شکل در فرهنگهای مورد استفادهٔ بنده دیده نشد.

چرخ : فلک و [آنچه] [ورق ۱۳۳] از آن آب کشند و دایرهٔ[1] جامه و آنرا زنان چرخه کنند و بدانچه[2] شیره و روغن بیرون آرند یعنی روغنگران و نیشکر که بهندوی کولهو گویند و هرچه مدور گرد آن نیز چرخ است. چون چرخ اثیر و چرخ زمهریر.

بهرهٔ 'د'

چکاد[3] : میانهٔ تارک سر گویند پیشانی است و نیز سر کوه را چکاد گویند.

چغد[4] : جانوری شوم گیرند، و گویند که آن مادهٔ[5] بوم است و کنگرهٔ حصار.

چرغند[6] : چراغ و گویند چراغدان.

چند[7] : شماری که کم از ده باشد و گویند غیر معین.

بهرهٔ 'ر'

چور[8] : تدرو، و بعضی گفته اند، چور مرکب است.

چنار : نام درختی است، برگهای آن مثل پنجهٔ دست بنابرین به پنجه[9] نسبت کنند

---

[1] بمعنی گریبان رک : صحاح ص ۶۴. [2] نسخهٔ اصل : از آن.

[3] موید ا : ۳۱۰، مدار ۲ : ۵۹ چکاد بهر سه معنی مذکور در متن : اما در صحاح ص ۸۸ چکاد بمعنی میانهٔ سر و قلعه آمده و در جهانگیری ۲ : ۱۵۱۰ چکاد و چکاده بمعنی تارک سر و سر کوه.

[4] رک : ادات و موید ا : ۳۱۰ و مدار ۲ : ۵۶، و جهانگیری ۲ : ۱۴۲۷.

[5] بحر الفضائل چغد بمعنی بوم نر نوشته. [6] قواس ص ۱۴۰ : چرغند چراغ است، سوزنی :

آورد پیای برمن تا تو برفتی ❊ در خانهٔ من هیش نه دود است نه چرغند

ادات : چرغند با جیم فارسی چراغ و چراغدان و جگر آگنده که آنرا عصیب خوانند، نیز رک : مدار ۲ : ۵۱، رشیدی ص ۵۰۴، موید ا : ۲۸۷ جرغند، (بحوالهٔ لسان الشعرا) چراغ الخ.

[7] رک : موید ا : ۳۱۰، اما ادات : چند نام شهری، شمار غیر معین و شمار کم از ده، و شمار اندک.

[8] قواس ص ۶۲ : چوربور : تدرو اما ادات : چوربور پرنده ایست کوهی تیز پر خوب رفتار آتش خوار گروهی آنرا کبک نیز گویند، همان معنی در مدار ۲ : ۳۴ درجست؛ نیز در مدار ۲ : ۶۸ چور و چورپور بهمین معنی؛ اما موید ا : ۳۱۲ : چور و چورپور تدرو و بعضی گفته اند چورپور مرکب بمعنی تدرو، و در زفان گویا در جیم فارسی و رای مهمله آورده، اما در شرفنامه در باب جیم تازی (و فصل رای مهمله مرکب) جور بوزن نور تدرو.

[9] عنصری دیوان ص ۹۹ : چنار کرد دعا تا گر بود مجلس ❊ از آن چو پنجهٔ مردم شده است برگ چنار

منوچهری دیوان ص ۳۰ : برداشت تا جای همه تارک سمن ❊ برداشت پنجه های همه ساعد چنار

نیز رک : دیوان انوری ص ۲۷، سنائی ص ۱۰۹، فرخی ص ۱۷۵، مسعود سعد سلمان ص ۲۲۲، رشید وطواط ص ۱۰۶، خاقانی ص ۱۸۵ وغیره.

چغز[1]: التفات.

چنبر[2]: حلقه.

چهار[3]: طاق خیمه است.

چنگار[4]: پنج پایه یعنی سرطان و بعضی بجیم عربی گویند.

چلندر: میوه[5] ایست که آنرا می خورند بعد پختن، و چقندر[6] و چغندر نیز گویند، بهندوی تند[7]ششش[8] گویند.

چنبور[9]: قودکش[10].

چیر[11]: توانا و دلیر[12]، و بیای پارسی[13] و عربی نیز گویند.

چغز[14]: غوک و گویند آنکه در آب بانگ کند و درست[15] تر آنست چغز بسکون غین آواز[16] غوک است.

---

[1] ادات: چغز التفات نمودن و ترسیدن نیز آرد: موید ۱: ۳۰۲. [2] رک: موید ایضاً، مدار ۲: ۶۴.

[3] صاحب زفان در اینجا 'چار' اشتباه شد؛ اصل واژه چارطاق است یعنی نوعی از خیمه؛ بنا برین این را باید در ذیل مرکب نوشت؛ برای چهارطاق رک: موید ۱: ۳۱۵، مدار ۲: ۷۰-۷۱.

[4] چنگار جیم و کاف هردو فارسی جانوری است آبی ... عرب آنرا سرطان و فارسیان پنج پایک و اهل هند کیکره خوانند؛ موید: جنگارا: ۲۸۹ و چنگارا: ۳۱۲ بهمین معنی آورده. [5] کذا است در موید ۱: ۲۸۹، اما در ادات: پنج پایک. [6] واضحاً چلندر سبزی است نه میوه چنانکه در ادات و موید و دیگر فرهنگها آمده. [7] رک: موید ۱: ۳۱۲؛ بعلاوهٔ این هر سه چندر هم بدین معنی آمده، رک: موید ایضاً و جهانگیری ۲: ۱۷۹۹.

[8] موید ۱: ۳۱۲ بحوالهٔ زفان ڈیڈس و ڈھینڈس نوشته، رک: رسالهٔ اردو، کراچی، ۱۹۶۷، مقالهٔ راقم این سطور. در ادات کلمهٔ هندی کونگلو دوبار آمده. [9] رک: ادات و موید ۱: ۳۱۲.

[10] یعنی پالنگ و مقصود است که بهندوی باگ ڈور خوانند، رک: آنندراج.

[11] موید ۱: ۳۱۲ چیر و چیره هردو بهمین معنی آورده. [12] نسخهٔ اصل: داثر.

[13] در موید و مدار ۲: ۷۴ بای فارسی نوشته. و صاحب مدار همین قطعهٔ خود شاهد نقل نموده:

فیضیا صلح کن بخصم قوی ❊ جنگ ناخوش بود بدشمن چیر
نزند هیچ عاقلی هرگز ❊ پنجه با شیر و دست با شمشیر

[14] در قرأت این کلمه اختلاف است، در قواس ص ۶۸ و دستور ص ۱۰۹ و بحر الفضائل جغز یا چغز چنانکه در متن است اما در فرس و صحاح ص ۱۲۵ چغز و درین هردو فرهنگ باشاهد بیت زیر:

هرچند که درویش پسر فغ زاید ❊ در چشم توانگران — چغز آید

←

بهرهٔ "ز"

چوز[۱] : پرنده ایست از شکره.

بهرهٔ "س"

چاپلوس : فریبنده و فروتن.

چرس[۲] : چرخ است که بدان انگور بمالند.

بهرهٔ "ش"

چخش[۳] : علت.

چالش[۴] : خرامش و بناز رفتن.

چاوشش : نقیب.

بهرهٔ "غ"

چغ[۵] : آنچ بدان جغرات زنند و دوغ گویند و این را شیرزنه[۶] نیز گویند.

چپاغ[۷] : نوعی از ماهی.

چرغ[۸] : شکره است.

← [وہمین قرائت اخیر در ادات و مدار و دیگر فرہنگہا آمده].

[۱۵] در موید ۱ : ۳۱۳ ذیل چغز قول صاحب زفان درجست.

[۱۶] رک : موید ایضاً.

[۱] در موید ۱ : ۳۱۳ و مدار ۲ : ۶۸ چوز و چور بمعنی تذرو یا کبک آمده، اما در جهانگیری ۲ : ۱۹۹۶ چور بمعنی تذرو و چوز بمعنی جانور شکاری که سالی برو نگذشته و گریز نخورده باشد.

[۲] اصل : چوس ؛ اما در موید ۱ : ۳۱۴ : چرس بالفتح حوضی است که دران انگور مالند، کذا فی زفان گویا، جهانگیری ۷ ۹۲ چرس حوضی باشد که دران انگور مالند.

[۳] رک : ادات، موید ۱ : ۳۱۴ ، مدار ۲ : ۴۷، نیز رک : جخش درہمین فرہنگ ص ۱۲۲.

[۴] ادات : چالش با جیم فارسی رفتار با ناز و بناز رفتن ؛ رک : موید ۱ : ۳۰۴ و مدار ۲ : ۴۲.

[۵] رک : ادات ، موید ۱ : ۳۱۵ ، مدار ۲ : ۵۵.

[۶] زفان و مدار ۲ : ۵۹۷ : شیرزنه آنچه جغرات بدان دوغ کنند و شیرزنه نیز گویند.

[۷] ادات : چپاغ جیم و با هر دو فارسی نوعی از ماهی ها ، رک : موید ۱ : ۳۱۵.

[۸] رک : ادات و موید ۱ : ۳۱۵.

بهرهٔ «ک»

چکاوک[1]: سرخاب و آن نوعی است گله دار، و نام[2] سازیست از آن مطربان.

چلوک[3]: گیاه، و نیز سرخاب[4] را گویند، و بعضی بواو پارسی گویند.

چغنک[5]: کاروانک[6]، پرنده ایست معروف، و بعضی بجیم[7] عربی و مفتوح[8]، خغنک[9] بخای معجمه نیز گویند.

چنوک[10]: قبره[11] یعنی مانورک[12] و بهندوی آنرا مترہ[13] گویند، و بواو پارسی [ورق ۱۲۴ا] نیز گویند.

---

[1] رک: قواس ص ۵۸، صحاح ص ۱۷۸، در اول بمعنی سرخاب و در دوم بمعنی چکاو آمده. قواس این بیت[؟] هم دارد:
صفیر بلبل و لحن چکاوک و قمری ÷ نفیر فاخته و نغمهٔ هزار آوا

[2] برای این معنی رک: موید ۱: ۳۱۷ و مدار ۲: ۶۰، در موخرالذکر با این بیت شاهد:
تو اگر نوای چکاوک بود ÷ چو دشمن زند تیر ناوک بود

[3] قواس ص ۳۵: چلوک: گیاه؛ ادات و موید ۱: ۳۱۷: چلوک گیاه و سرخاب.

[4] در صحاح ص ۱۷۸ چلوک بمعنی سرخاب بدین بیت شاهد:
چون ماهی شیم کی بود غوطهٔ غوک ÷ کی دارد جغد خیره سر لحن چلوک

[5] رک: قواس ص ۶۰، ادات، موید ۱: ۳۱۷، مدار ۲: ۵۸.

[6] رک: برهان ج ۳ ص ۱۵۶۱. [7] رک: مدار ۲: ۵۸

[8] رک: موید و مدار؛ ادات مانند زفان مفتوح و مضموم هر دو صورت دارد.

[9] کذا است در مدار.

[10] قواس ص ۶۰: چنوک و مانورک: قبره؛ ادات: چنوک جیم و واو هر دو فارسی، پرنده ایست که عرب آنرا قبره و اهل هند مترہ گویند، نیز رک: موید ۱: ۳۱۷. اما جهانگیری ۲: ۱۴۲۸-۱۴۲۹ چنوک و چغنک بمعنی کنجشک با بیت شاهد:
ز زعفران و عصفور و مغز چلغوزه ÷ بمشک و عنبر مغز چنوک آمیزد
نیز رک: حاشیه جهانگیری ص ۱۴۲۹، و معین چلک، چلوک، چنوک، چنک، چنو بمعنی کنجشک آورده رک: فرهنگ ۱: ۱۲۹۶-۱۲۹۷. [11] دستورالاخوان ص ۴۸۸ و فرهنگ معین ۲: ۲۶۳۴: قبره چکاوک. [12] زفان: مانورک قبره و آن پرنده ایست معروف، مانوک نیز گویند و جهانگیری ۱: ۵۰۲ مانورک چکاوک بود. چکاوک و چکوک و چکاوه و چکاو در جهانگیری ۲: ۱۵۱۱ مترادف بمعنی پرنده از کنجشک اندر بزرگتر بود و آنرا اجل نیز گویند و بتازی قبره و ابوالملیح الخ؛ اما در زفان گویا ابوالملیح را چکاوک یعنی قبره نوشته و در موید ۱: ۲۱ نیز آمده که ابوالملیح را سرخاب نیز گویند. خلاصهٔ کلام اینست که درباره معنی چنوک و چکوک و مانورک و قبره درمیان فرهنگ نویسان اختلاف وجود دارد.

[13] کذا است در ادات الفضلا. اما در مدار ۲: ۵۸ چرا تصحیف «مترا» است.

چرک[1]**: خارپشت و آن خزنده ایست معروف.**

چرک[2]**: ریم اندام.**

چالاک[3]**: جلد و [نیک**[4]**] جنبان.**

چابک: چالاک و زیبا[5] **و تیز و قوی و تازیانه.**

چربک[6]**: لغز و معما و این را چیستان گویند و طنز.**[7]

چچک[8]**: گل که [در] بستان**[9] **باشد، و بعضی بدو کسر گویند و نیز بضم جیم نخستین گفته اند.**

چنگ[10]**: منقار مرغ.**

چک[11]**: منشور**[12] **و قباله و آواز زخم تیغ و آواز چیزی خاستن و چکاچک و چکاچاک ازین است، و نام سلاحی بهندوی**[13] **جکر گویند.**

چکاک: منشور نویس[14] **و مهره سای.**

چلوک[15]**: رسنی که بر گردن آسیا بود.**

چرک: نانی که فرداد پاتیچه نهند.[16]

---

[1] رک: قواس ص ۷۰ و دستور ص ۱۰۹، ادات و موید ۱: ۳۱۶؛ در موید ۱: ۲۹۵ جرک بهمین معنی ذیل فصل ترکی آمده.

[2] رک: ادات و موید ایضاً.

[3] قواس ص ۹۸: چالاک چابک و جلد بود، ادات: چالاک نیک جنبان و بمعنی کش و جلد، نیز رک: موید ۱: ۳۱۶، مدار ۲: ۱۴۳.

[4] اضافه از روی ادات و موید.

[5] این معنی در فرهنگها دیده نشد.

[6] رک: قواس ص ۱۸۸ و ادات.

[7] در اصل بدون نقط؛ اما در موید ۱: ۳۱۶ چربک و در زفان گویا بمعنی طنز است.

[8] ادات: چچک رخساره و خال و گل که آنرا ورد خوانند، موید ۱: ۳۱۶ چچک بفتحتین خال رخساره و در زفان گویا بمعنی گل که در بستان باشد و بعضی بکسرتین گویند و نیز بضم اول در شرفنامه بمعنی گل در ترکی آورده است.

[9] نسخهٔ اصل تابستان.

[10] جهانگیری ۲: ۱۸۰۰ چنگ با اول مکسور منقار جانوران و نوک سنان و پیکان. در فرهنگ معین ۱: ۱۳۱۶ چنگ بکسر و ضم بهمین معنی، نیز رک: سلیمانی ۸۳.

[11] موید ۱: ۳۱۷: چک بالفتح قباله و بیعنامه و در قنیه منشور و آواز زخم تیر و آواز چیزی خاستن.

[12] نسخهٔ اصل: منشور نویس.

[13] در موید ۱: ۳۱۷، همین کلمهٔ هندی بحوالهٔ زفان گویا آمده

[14] در موید ایضاً، این معنی بحوالهٔ زفان درج شده.

[15] ادات و موید ۱: ۳۱۷.

[16] بعینه همین معنی در ادات مذکور است، اما در متن و در ادات یک کلمه ناخوانا. جهانگیری ۱: ۹۴۱ چروک، در بعضی فرهنگها نوشته اند که نان باشد، و در بعضی چنان مرقوم است که نانی است که طباخان آنرا ←

چاک : پاره وشگاف.

چلک[1] : مرغکی است خرد وبعضی چلک گویند.

چلونک[2] : درخت خربزه وبعضی بجیم عربی گویند.

چرژک[3] : پرنده ایست که سینهٔ بلند دارد.

چلک : بدو ضمت ، دوال[4] ابریشم وکفچهٔ دیگ زن[5]، وبعضی بسکون لام کفچهٔ دیگ زن[6] گویند وبعضی آنرا بکسر جیم گویند.

بهرهٔ گ

چمشاگ[7] : کفش وبلغتی جیم عربی وکاف، نیز گویند.

چنگ : ساز معروف وچنگال درندگان ودست[8].

چمشگ : همان چمشاگ است وچمنک گویند.

بهرهٔ ل

چال[9] : مرغکی است بقدر زاغ وگوشتش چون گوشت بط ، وحرام[10] وکوهی[11]، پارسی هندوی شده

← تربیت کنند وفرد وکله پاچه بگذارند ودر تنور نهند تانیک پخته شود.

[1] در ادات : چلک وچلک هردو بمعنی مرغی است خرد آمده. [2] رک : دستور ص ۱۰۸ ؛ ادات و موید ا : ۳۱۷. [3] رک : موید ا : ۲۹۵.

[4] چرژک بمعنی خارپشت قبلاً آمده ؛ واین واژه بمعنی پرنده دیده نشد.

[5] قواس ص ۱۸۴ : چلک دوک افریشم ، موید ا : ۳۱۷ چلک دوال ابریشم ودر لسان الشعرا با دوم مضموم دوک ابریشم. [6] رک : قواس ص ۱۴۱ ، موید ا : ۳۱۷ ، سروری ص ۳۸۹ ، برهان ص ۲۵۵.

[7] اصل : زان. [8] ادات : چمشاک وچمشک بمعنی کفش ؛ موید ا : ۲۹۵ چمشاک ، ا : ۳۱۷ چمشاک وچمتک بمعنی پای افزار ؛ جهانگیری ۲ : ۱۶۸۸ - ۱۶۹۰ چمشاک ، چمشک ، چمتاک ، چمتک ، چمناک ، چمنک بمعنی کفش . مدار ۲ : ۶۳ چمشک وچمشاک وچمناک بمعنی کفش دوز ؛ درموید ا : ۳۱۷ چشمک وچشماک بهمین معنی بگفتهٔ زفان گویا نوشته وحال آنکه در زفان بکاف فارسی است نه کاف عربی. درهیچیک از فرهنگها که تحت مطالعهٔ نگارنده است بکاف فارسی چنانکه در زفان است دیده نشد.

[9] برای این معنی رک : ادات ؛ اما درموید ا : ۳۱۸ پنجه وانگشتان مردم ودرهمین لغت بحوالهٔ فرهنگ علمی چنگ بمعنی دست مردم است. [10] در ادات وبحر الفضائل : پرنده ایست همچو زاغ و گوشتش چون گوشت بط است وحرام است. واضح است که این معنی ازیکدیگر نقل شده است ؛ درصحاح ص ۲۰۶ : چال مرغی باشد چند زاغی وگوشتش بطعم گوشت بط باشد ، نیز رک : موید ا : ۳۱۸.

[11] این معنی درموید ا : ۳۱۸ بحوالهٔ قنیه ونیز زفان آورده . اما خود صاحب موید بحوالهٔ شیخ خف ←

و نوعی[۱] از رنگ اسب و اسب گلگون و عنابی.

چنگال: میانه[۲] باریک و ناخن درنده.

چگل[۳]: نام شهریست در ترکستان که آنجا خوبان باشند.

بهرهٔ م

چم[۴]: خرام.

چمجم[۵]: پای افزار جاگی یعنی کفش جاگی که درویشان می سازند، و جیم عربی نیز لغتی است و چمچمه[۶] نیز گویند.

بهرهٔ ن

چیستان: لغز یعنی مرموزاتی که بپرسند و چربک[۷].

→ نوشته که چال مخصوص است به بازی. در جهانگیری بمعنی آن گرو قمار نوشته (۱: ۲۸۶) به استشهاد این دو بیت:

هیچ می دانی که اینجا با حریف مهره دزد ❊ جان همی بازی بخصلی تو بهر چال قمار

فلک تختهٔ نرد و سیاره مهره ❊ زمین جملہ چال قمار است گوئی

۱ک گذاشت دنسخهٔ اصل؛ بظاهر گوی دربست باشد. مثلاً جهانگیری ۱: ۲۸۶ چال گودال.

شد دل خستهٔ من بسته به چال زنخت ❊ زانکه انباشته شد تالب آن چال بمشک

۱ک رک: جهانگیری ایضاً. چال دو موئی را گویند عموماً و اسبی را که موی آن سرخ و سفید درهم باشد خصوصاً

اثیر اخسیکتی: درسر گرفته بانقط کلک اصفرت ❊ گلگون آسمان هوس چال وابرشی

نیز رک: موید ۱: ۳۱۸.

۲ک این معنی در هیچیک از فرهنگها دیده نشد؛ اما موید ۱: ۳۱۹ در زفان گویا معنی جنگال باریک میان آمده.

۳ک چگل ناحیتی است و اصل او از خلخ است ولکن ناحیتی است بسیار مردم و مشرق او و جنوب او حدود خلخ است، مغرب وی حدود تخس است و شمال وی ناحیت خرخیز است (حدود العالم ص ۵۲).

۴ک درجهانگیری بمعنی خرام و امر از خرامیدن (۲: ۱۶۸۵). و در ادات چم بمعنی رفتار باناز آمده.

۵ک رک: جمجمه در همین لغت؛ تواس ص ۵۶ اجمجم کفش جاگی که درویشان سازند. جهانگیری ۲: ۱۶۸۸-۸۹ چمچم نوعی از پای افزار که از جامهٔ کهنه بسازند و آنرا گیوه نیز خوانند. در حاشیهٔ فرهنگ ہٰذا افزوده شده: دیگر روز چم چم در پای کردم در خانقاه بوزجان می گشتم، شیخ الاسلام را چشم بر آن افتاد (مقامات ژنده پیل ص ۸۲). ۶ک نسخهٔ اصل: چمچه اما این واژه بصورت جمجمه درست، چمچه بمعنی دیگر آید. رک: جهانگیری ۲: ۱۶۸۹. ۷ک چربک در همین فرهنگ ص ۱۳۴.

چمن[1]: صحن باغ بارستنیها وگل، وگویند راه میان باغ وبستان و درختان چنانکه از هر دو طرف درختان باشد.

چندن: صندل.

چرغون[2]: زبان بره.

چین: شکنج یعنی گوگهای پیشانی که در روی ترسش کردن پیدا شود، و نام ولایتی [ورق ۲۵ا] ترکستان است که چین[3] ماچین گویند.

چندان[4]: سرموزه[5] که بتازی جرموق[6] گویند. چوپان: شبان.

چوبلین[7]: آنچه بدان دانهٔ پنبه کشند وبعضی بجیم عربی گویند

---

۱ رک: ادات وموید ا: ۳۲۲. ۲ ادات وموید ا: ۳۱۸، ۳۲۱: چرغول وچرغون بمعنی زبان بره؛ نیز رک: فرهنگ معین ا: ۱۲۸۱ که بهمین دو صورت دارد بمعنی لسان الحمل و زبان بره. اما در دستور ص ۱۰۸، وبحر الفضائل: جیرغول بمعنی زبان بره. وهمین است در جهانگیری ا: ۹۲۹. اما چنان بنظری رسد که چرغول وچرغون هر دو مصحف واژهٔ خرغول است. وخرغول در ادات و زفان گویا بمعنی زبان بره آمد. ونیز در موید ا: ۳۶۷ خرغول گیاهی که اطلاق شکم باز دارد. وذیل زبان بره (ا: ۴۶۴) آمده: گیاهی که اطلاق شکم باز دارد، و در زفان گویاست که آنرا اسپغول گویند و بتازی لسان الحمل؛ در نسخهٔ حاضر از زفان گویا زبان بره مترادف اسپغول ولسان الحمل قرار داده شده چنانکه در موید آمده. اما در جهانگیری ا: ۶۱۹ خرغول وخرغوله مترادف بارتنگ ولسان الحمل بیان شده که در پاکیزه ساختن جراحت بسیار سودمند است. و در تحفهٔ مومن نیز خرغول را لسان الحمل و بارتنگ قرار داده شده. یوسفی طبیب خرغوله را نظم نموده و در ضعف معده مفید قرار داده (رک: جهانگیری ا: ۶۱۹) اگرچه در تحفهٔ مومن لسان الحمل با بارتنگ مترادف قرار داده شده، اما در زفان گویا لسان الحمل و زبان بره را اسپغول نوشته واین درست است زیراکه ابوبکر اخوینی در اواخر قرن چهارم در هدایة المتعلمین لسان الحمل را اسپغول بخاری قرار داده است، رک: هدایه چاپ مشهد ۱۳۴۴: ص ۲۳۷، ۴۰۷، ۵۲۷ وغیره.

۳ چین ماچین یک کلمه نیست، چین و ماچین درست است؛ غرض قدما از چین فقط بلاد مجاور کاشغر وختن بود (رک: فرهنگ معین ج ۶ ص ۱۸۶۱) و ماچین چین بزرگ، چین خاص باشد. (ایضاً) در ادات الفضلا چین نام شهر قرار داده شده. ۴ کذا است در نسخهٔ اصل؛ امامدار ۲: ۷۴ چیدان.

۵ درموید ا: ۳۲۱ همین بحوالهٔ قنیه درج شده. ۶ دستور الاخوان ص ۱۹۳: الجرموق سرموزه

۷ موید ا: ۳۲۳ چوبکین وچوبلین هر دو بهمین معنی آورده، ومحمد قزوینی جوبکین را اصل وچوبلین را تصحیف قرار دهد: حاشیهٔ برهان قاطع تصحیح دکتر معین.

بهرهٔ 'و'

چیزو[1]: خارپشت وچیزو[2] نیز گویند.

بهرهٔ 'ہ'

چامه[3]: شعر ونظم بزبان[4] پهلوی و باجیم[5] عربی نیز آمده.

چوبینه[6]: کاروانک[7] و آن پرنده ایست بزرگ و سپید باگردن دراز.

چلباشه[8]: کرفش[9]، دبپای پارسی نیز گویند.

چغانه[10]: سازیست معروف مثل کمانچه[11].

چفته[12]: خمیده وکژ و دوتاگشته.

چوزه: بچهٔ مرغ که بتازی فرخ[13] گویند.

چمانه[14]: کدوی[15] خالی خشک برای شراب خوردن وسیکی داشتن.

چرویده[16]: چاره جسته[17] و دونده[18].

---

۱ دستور ص ۱۰۹؛ چزک وچیزو، موید ۱: ۳۰۰، ۳۲۴؛ جیزو وچیزو، جزک (ترکی)، ادات: جزک وچیزو بمعنی خارپشت. اما قواس ص ۷۰: ریکاسه وجزک وجزع بهمین معنی.

۲ رک: مدار ۲: ۷۴؛ در موید ۱: ۳۲۴ چترو اشتباه چاپی است.

۳ رک: فرس ص ۴۴۵، قواس ص ۱۰، صحاح ص ۲۷۲، ادات، موید ۱: ۳۲۵.

۴ چون در فارسی چامه متداول است، این تخصیص بی‌خود است، و در هیچیک از فرهنگها مورد استفادهٔ بنده یافته نشود.

۵ کذا است در موید ۱: ۳۲۵؛ اما در هیچیک از فرهنگها دیده نشد.

۶ رک: جوبینه در همین فرهنگ ص ۱۲۷.

۷ رک: فرهنگ جهانگیری ۲: ۱۹۶۵.

۸ قواس و ادات و موید ۱: ۳۲۶: چلپاسه؛ دستور ص ۱۰۹، بحر الفضائل: جلبایه بهمین معنی

۹ برهان ۳: ۱۶۲۱: کرفش چلپاسه؛ نیز رک: ۱: ۶۵۵.

۱۰ رک: صحاح ص ۲۷۳. ۱۱ رک: مدار ۲: ۵۶.

۱۲ صحاح ص ۲۷۳ چفت خمیده. رک: موید ۱: ۳۲۴ که عیناً همین معنی دارد.

۱۳ دستور ۴۷۱ الفرخ چوزه، رک: مدار ۲: ۶۸. ۱۴ رک: صحاح ص ۲۷۳، ادات: چمانه کدوی خالی خشک کرده که بدان سیکی خورده، پیاله. ۱۵ نسخهٔ اصل: کدر.

۱۶ اسم مفعول از مصدر چرویدن بمعنی چاره جستن، دویدن؛ رک: همین فرهنگ بخش سوم؛ موید ۱: ۳۲۰.

۱۷ اصل: چاره جستن. ۱۸ اصل: دوند.

چیره[1]: دلیر[2] و قوی و زبردست.

چرغله[3]: کرم شب تاب.

چغزنده[4]: ترسنده[5].

چاره[6]: حیله و لابد.

چغزواره[7]: چیزیست که آنرا بهندی سوال گویند، درمیان آب باشد.

چهره: صورت تراشیده[8].

چچرغه[9]: گره تازیانه.

بهرهٔ ی

چاپاتی[10]: نانی که آنرا بتازی رغیف[11] گویند.

چربوی[12]: چربی.

چاشنی[13]: دلیل و نمودار و صفت و مزه.

چکی[14]: چیزیدانچه آسیا گرد یعنی غرآسیاگرد[15]، از اینجاست که حد[16] خانه را [چک] گویند.

---

[1] رک: چیر درهمین فرهنگ ص ۱۳۱. [2] رک: موید ۱: ۳۲۱.

[3] کذاست دراصل اما دستور ص ۱۰۹، ادات، موید ۱: ۳۲۵: چراغله، مدار ۲: ۴۸ چراغله و چراغک.

[4] اسم فاعل از مصدر چغزیدن بمعنی ترسیدن و التفات نمودن، رک: بخش سوم درهمین فرهنگ.

[5] اصل: ترسیده، متن تصحیح قیاسی.

[6] صحاح ص ۲۷۲: چاره تدبیر و حیلت، یک باره.

[7] کذاست درجهانگیری ۲: ۱۴۲۸، اما در ادات و موید: چغزواره، موید چغزپاره نیز، مدار ۲: ۵۷: چغزوازه.

[8] نسخهٔ اصل: دشیت. متن مطابق موید ۱: ۳۲۷، مدار ۲: ۷۳.

[9] ادات: چچرغه رشته و تازیانه، موید ۱: ۳۲۶ جنسی از تازیانهٔ معروف، نیز رک سلیمانی ۸۶.

[10] رک: مدار ۲: ۴۱، جهانگیری ۱: ۲۸۰.

[11] موید ۲: ۳۲۳ زغیف نان گرده و نازک. [12] رک: موید ۱: ۳۲۴: چربو (ذیل حرف واو)، مدار ۲: ۴۹: چربو و چربوی هردو بهمین معنی.

[13] موید ۱: ۳۲۷، مدار ۲: ۴۳ همین چهار لفظ بهمین ترتیب بصورت معنی واژهٔ چاشنی، بنابرین واضحست که فرهنگ نویسان از یکدیگر بدون تحقیق نقل نموده اند.

[14] رک: موید ۱: ۳۲۷، مدار ۲: ۶۱. [15] کذاست در اصل.

[16] مدار: حد را نیز چک گویند.

گونۂ 'خ'

بہرۂ 'الف'

غنیا: سرود و طرب.
خارا[1]: جامۂ ابریشمین[2] کہ آنرا صاحبی[3] می گویند، و گفتہ اند خارای عتابی جامۂ مخطط و خارای ششتری ہمان عتابی است، و سنگ سخت، گویند سنگ خارا یعنی [سنگ] سخت و درشت.
خولیا[4]: آنچہ ہمہ تصرف کنند.
خوا[5]: بضم و کسر نیز، مزۂ طعام و لذت.

بہرۂ 'ب'

خنب[6]: صفہ.

بہرۂ 'ت'

خشت[7]: ژوپین و گل راشت زدہ.
خوست[8]: راہ مالیدہ و کوفتہ، جزیرہ[10].

---

1. خارا و خارہ بمعنی جامۂ ابریشمی و سنگ سخت آمدہ، و در اشعار شعرای فارسی بتکرار آمدہ؛ رک: لغتنامۂ دہخدا 'خ' خانہ ذیل خارا. 2. در موید ۱: ۳۴۵ قول زفان گویا عیناً نقل شدہ.
3. موید ۱: ۳۷۷: صاحب و عتاب نام مردی کہ واضع آنست. نیز رک: مدار ج ۲ ص ۱۰۱، و فرہنگ معین.
4. در موید ۱: ۳۴۶، مدار ۲: ۱۹۰، سلیمانی ۸۹: خولیا؛ اما جہانگیری ۲: ۱۶۱۴: خولیا با اوّل و ثانی مضموم و واو مجہول دو معنی دارد، اوّل بی شرم و بی باک و دیوانہ مزاج، و دوم چیزی بود کہ ہرکس کہ خواہد آنرا متصرف شود و مانع نداشتہ باشد. جعفری ۱۷۱ خولیا.
5. قواس ص ۱۴۳: خوا لذت، مدار ۲: ۱۷۶: خوا بضم آنچہ بدان روز بگذرانند و مزہ و بمعنی لذت بکسر نیز، در ادات است: بضم بمعنی اوّل و بکسر بمعنی ثانی، و در موید بکسر و ضم بمعنی ثانی و بضم معنی اوّل. در جہانگیری ۲: ۱۹۷۰ خوا بضم بمعنی قوت و بکسر بمعنی لذت و مزہ، ہمین است در برہان.
6. رک: موید ۱: ۳۴۷.
7. کذاست در موید ۱: ۳۴۸ و مدار ۲: ۱۴۴، در موخر الذکر با بیت شاہد زیر:
   سنان بر سر خشت عنان شکاف ❊ برون رفت از خلقۂ پشت ناف
8. یعنی خشت کہ در ساختمانہا بکار بردہ می شود.
9. رک: موید ۱: ۳۴۸، مدار ۲: ۱۸۷
10. نسخۂ اصل: خربزہ؛ متن تصحیح قیاسی بر طبق موید و مدار، نیز آخوست بمعنی جزیرہ، رک: مدار ۱: ۱۱، معین ۱: ۱۲. و فرہنگ معین و لغت نامہ دہخدا ہمین را مورد تایید ←

بهرهٔ ج

خفرج[1]: گیاهی است که بتازی بقلة الحمقاء[2] گویند یعنی لونک

خفنج[3]: دیوستنه[4] وگویند[5] خفیج بسکون فا و جیم پارسی و آن گرانی بود که در خواب[6] مردم را فرو گیرد، بتازی کابوس[7] گویند.

خنج[8]: نفع و ناز [ورق ۱۳۶] وطرب.

خلنج[9]: ابلق یعنی دو رنگ.

بهرهٔ چ

خروچ[10]: خروس.

← را می‌گیرند، و در مدار بیت زیر و در لغت‌نامه همین بیت از جملهٔ دیگر ابیات بطور شاهد درج است:

تنی چند از موج دریا بجست ❊ رسیدند نزدیک این آبجوست (عنصری)

[1] رک: موید ۱: ۳۴۹، مدار ۲: ۱۵۸، جهانگیری ۲: ۱۴۷۶.

[2] همین کلمه بی و بت ی در مدار و کلمهٔ بی فقط در موید یافته می شود. زفان بقلة الحمقاء بمعنی خرفه آورده وکلمهٔ متبادل هندی لونک است که ذیل خفرج در زفان موجود است. واضحست که این لونک از لونگ (قرنفل) جداست، کلمهٔ متبادل هندی در موید "لونیا" ست و بظاهر لونک و لونیا هم معنی اند. بمعنی خفرج در جهانگیری خرفه آمده.

[3] رک: برخفج در همین فرهنگ، برای خنج رک: قواس ص ۱۶۴، موید ۱: ۳۴۹، مدار ۲: ۱۵۶، جهانگیری ۲: ۱۴۷۵. فرس ص ۵۴، صحاح ص ۵۱ برخفج بهمین معنی با بیت شاهد، و عجب است که بیت آغاجی که در فرس و صحاح شاهد برخفج است، در قواس و مدار شاهد خفنج نقل است. اما در موید و مدار و جهانگیری ۱: ۸۴۷ به علاوه خفج برخفج نیز آمده. جهانگیری ۱: ۹۱۰ فرنجک نیز بهمین معنی دارد بدین بیت شاهد:

فرنجک دار شان بگرفته آن دیو ❊ که سریانیش نامش خورنجیون

[4] در زفان همین واژه ذیل برخفج نیز یافته شود. [5] کذاست در قواس ص ۱۶۴.

[6] اصل: جواب.

[7] مقدمة الادب ص ۱۶۵: کابوس سکاچه، آنچ مردم را در شب فرو گیرد. و در دستور الاخوان ص ۵۱۱ کابوس مترادف فرنجک قرار داده شده.

[8] در موید ۱: ۳۴۹ همین سه لفظ و در صحاح ص ۵۲ فقط ناز و نفع بطور معنی واژهٔ خنج درجست. [9] رک: موید ۱: ۳۴۹، مدار ۲: ۱۶۴.

[10] رک: جهانگیری ۱: ۹۶۷؛ موید ۱: ۳۴۹ این واژه را ذیل ترکی نقل نموده.

خوچ[1] : تاج خروس[2].
خلچ[3] : گروهی از ترکسان.
خچچ[4] : جانوری.

بهرهٔ 'خ'

خلخ[5] : ولایتی است در ترکستان، مشک[6] و خوبان خیزند.

بهرهٔ 'د'

خرداد[7] : آفتاب در جوزا که آنرا خرداد ماه گویند، و هفتم[8] روز از ماه.
خرد[9] : گل که بتازی[10] طین گویند یعنی خره گل[11] باشد و آن[12] توده است.

---

[1] رک : فرس ص ۶۵، صحاح ص ۵۶، قواس ص ۶۴.

[2] جهانگیری ۲ : ۱۹۷۶ تاج خروس بمعنی گوشت پارهٔ سرخ بر سر خروس و نیز بمعنی گل بستان افروز آورده و برای هر دو معنی بیت شاهد دارد.

[3] موید ۱ : ۳۴۹ خلچ نام ولایتی از ترکستان و نیز اصلی است ترکان را، مدار ۲ : ۱۶۲ خلچ (بفتح) : اصلی از ترکان، (بضم) گروهی از عرب الخ.

[4] دراصل : خچخ و خچچ هر دو خوانده می شود؛ اما در موید ۱ : ۳۴۹ و مدار ۲ : ۱۱۸ خچچ و در هر دو بحوالهٔ زفان گویا بمعنی جانور درج است.

[5] خلخ : ناحیتی است در ترکستان، مشرق وی بعضی از حدود تبت و حدود یغما و حدود تغزغز و جنوب وی بعضی از حدود یغما و ناحیت ماوراء النهر و مغرب وی حدود غور و شمال وی حدود تخس و چگل و تغزغز، و این ناحیتی است آبادان و با نعمت ترین ناحیت است از نواحی ترک (رک : حدود العالم چاپ کابل ص ۲۸۳).

[6] صحاح ص ۶۴ خلخ شهریست که خوبان بسیار از آن خیزند، اما رک : موید ۱ : ۱۴۹-۱۵۰.

[7] رک : موید ۱ : ۳۵۱، مدار ۲ : ۱۲۷.

[8] در موید این معنی بحوالهٔ زفان بیان شده.

[9] رک : فرس ص ۹۶، قواس ص ۳۳، صحاح ص ۷۷.

[10] کذاست در موید ۱ : ۳۵۱ بحوالهٔ شرف نامه؛ نیز رک : مدار ۲ : ۱۲۷. و اما نسخهٔ اصل طیره

[11] رک : خره ذیل 'ه' درهمین فرهنگ.

[12] در موید این معنی بحوالهٔ زفان و در مدار بدون حواله بهمین معنی آمده.

خاد[1] : غلیواز و در فرہنگ نامۂ اسدی[2] طوسی بذال معجمہ زغن یعنی کویل ، و خراد نیز گویند بزیادت رای مہملہ .

خرند : گیاہی[3] است مانند اشنان .

خود : ترک[4] ، بتازی مغفر گویند ، آنکہ بوقت جنگ برسر نہند و آن از چرم خام و آہن نیز باشد .

خرد : عقل .

خجند[5] : نام شہریست در بلاد فرغانہ .

---

[1] قواس ص ۵۹ : خاد غلیواز .

[2] لغت فرس اسدی چاپ پال ہورن ص ۳۳ : خاذ مرغ گوشت ربای باشد ، و چاپ عباس اقبال ص ۱۰۴ خاد : زغن باشد یعنی مرغ گوشت ربای ، و بعینہ ہمین است در صحاح ص ۸۹ . دراصل حسب قاعدۂ تفریق میان دال و ذال فارسی خاد باید خاذ باشد . اما زغن را مترادف کویل قرار دادن ازین حیث درست بنظر نمی آید کہ در فرہنگ قواس ص ۵۸ : زغن و غلیواز مترادف است و در زفان گویا غلیواج و غلیواز بمعنی مرغ گوشت ربا آمدہ ، و در فرس و صحاح زغن مرغ گوشت ربا نوشتہ شدہ . بنا برین خاد و زغن و غلیواز و مرغ گوشت ربا مترادف اند . موید ا : ۳۵۱ خاد : آنرا غلیواز نیز گویند کذا فی شرف نامہ ، و در فرہنگ مولانا فخرالدین کانگر مذکور است کہ باز را گویند و در فرہنگ اسدی طوسی است : خاذ بذال معجمہ زغن یعنی کویل و آنرا خراد نیز گویند بزیادت راء مہملہ ، اقول فیہ نظر زیرا چہ تفسیر زغن بکویل یافتہ نشد . باید علاوہ نمود کہ صاحب موید نہ فرہنگ قواس دیدہ و نہ فرہنگ طوسی ! قواس خاد بمعنی غلیواز نوشتہ و ہرچہ بہ اسدی انتساب دادہ آنرا از زفان گویا گرفتہ ، در فرہنگ اسدی خاذ بمعنی زغن یعنی مرغ گوشت ربا فقط ، اضافۂ کویل و صورت دیگر اصل واژہ بزیادت را یعنی خراد در زفان است نہ در اسدی . مصحح مدار الافاضل دکتر محمد باقر در حاشیۂ ج ۲ ص ۱۰۰ متوجہ این نکتہ شدہ اما چون او زفان گویا را ندیدہ بود ، فقط ہمین قدر نوشتہ کہ "اسدی طوسی زغن بمعنی کویل ننوشتہ و مولف موید اشتباہ کردہ است ."

[3] عیناً ہمین عبارت در قواس ص ۱۳۰ ، موید ا : ۳۵۱ ، مدار ا : ۱۳۵ و غیرہ یافتہ می شود ، و ازین جہت پیداست کہ ہمۂ اینہا از قواس نقل نمودہ اند و قواس بجای خود از اسدی طوسی گرفتہ و ہمین اسدی ماخذ صحاح ہم بودہ است . فرہنگ نویسان قدیم ہمہ ناقل بودہ اند و ہیچ تحقیق ننمودہ .

[4] فرہنگ معین ا : ۱۰۷۰ ترک : کلاہ خود ، مغفر .

[5] خجند از شہرہای معروف ماوراءالنہر است کہ در ساحل چپ رودخانۂ سیحون و در سوی رودخانۂ خواجہ بکارغان و یکصد و چہل ہزار گزی جنوب شرقی تاشکند (رک : قاموس الاعلام ترکی) بقول یاقوت در معجم البلدان خجند از سمرقند دہ روزہ راہ است .

خرسند: خوشی و قناعت[1].

خرند[2]: بمعنی تند است، گویند خوند و ترت و مرت و تار و مار این همه بیک معنی است.

خوید[3]: کشتزار باشد.

خورند[4]: دوازدهم روز از ماه است.

بهرهٔ ’ر‘

خور: آفتاب، و خورنده، و امر از خوردن، و سزاوار و درین کلمه ’د‘ اوّل را ضم کنند چنانکه گویند درخور.

خاور: مشرق[5] و برعکس مغرب[6] نیز گویند، و اصح اوّل است. در باختر همچنین بحث است.

خشیشار[7]: مرغی است تیره گون، آبی سر سپید و بزرگ و بعض خشنسار بجای یا نون گویند.

خنیور[8]: قیامت. قائل گوید:

---

[1] موید ا: ۳۵۱.

[2] مدار ۲: ۱۳۴-۱۳۵ خرند و خوند: ہر دو بضم بمعنی تند... و در تبختری است خوند بفتحتین تند و در سکندری و پنج بخشی (ازفان) است: خرند و ترت و مرت و تار و مار مترادف.

[3] خوید بروزن رسید است، در صحاح ص ۸۹ معنی آن کشتزار جو نوشته و ہمین است در شرف نامه. اما در موید ا: ۳۵۲ خوید بمعنی درختان خام جو است و ہمین معنی در برہان وغیره درج است اما تایید معنی کشت زار از اشعار می شود، مثلاً عماره گوید:

روییش میان حائسبز اندرون پدید ؛ چون لاله برگ تازه شگفته میان خوید (صحاح ص ۸۹)

نیز رک. لغتنامه شمارهٔ مسلسل ۱۷۰ (شمارهٔ حرف خ ۱۰) ص ۹۵۵.

[4] رک بلغتنامه شمارهٔ مسلسل ۱۶۹ (شمارهٔ حرف خ ۹) ص ۸۸۲.

[5] رک: قواس ص ۱۶: خاور مشرق، مستشهد بابیت شمس طبسی.

[6] رک: صحاح ص ۱۰۳: خاور مغرب، مستشهد بابیت رودکی.

[7] کذا است در قواس ص ۶۳، دستور ص ۱۱۹، بحر الفضائل، اما فرس ص ۱۲۴: خشنسار مرغ آبی سر سپید و خشن سپید، صحاح ص ۱۰۳ نیز خشنسار. اما در موید ا: ۳۵۵، مدار ۲: ۱۴۶، سروری ص ۴۳۲ ہر دو شکل دارد؛ سروری نیز علاوه نموده در ترجمهٔ صیدنهٔ ابی ریحان بیرونی خشنسار بنظر رسیده و برین قول اعتماد بیشتر است. اما در صیدنه (نه در متن عربی و نه در ترجمهٔ پارسی) خشنسار اندراج جداگانه ندارد. ممکن است در ضمن بحث در بارهٔ خواص اشیا آمده باشد.

[8] کذا است در فرس و صحاح ۱۰۶ و در اکثر فرہنگها، اما این لغت در اصل چینود چینوت ←

بپول خنبور کہ چون تیغ تیز ÷ گذار است ہم نام ہم رستخیز

یعنی پل خنبور و آن صراط قیامت است کہ بروی دوزخ است.

خنبر[1]: کسی کہ بتوانگری لاف زند و مفلس بود، چنانکہ گوید[2]:

بافراخی است ولی[3] سخت می تنگ زید

آنچنان[4] شد کہ چنو هیچ خنبر نشود

خنور[5]: کند و گویند رخت و کالا و آوندهای مطبخ چون خنبر و آنچہ ماند از کاسۂ سفالین و آبگینہ، و تازیان ہمہ آوندہا خنور بتشدید نون گویند.

خوار[6]: آنچہ بخورند[7]، و مزه[8]، [ورق ۳۷ ا] و نام[9] خطہ نزدیک ری، و در فرهنگنامہ[10] است: خواربار آنچہ بخورانند و گندم نیز، و نام کوشک[11] بہرام گور کہ نعمان منذر ساختہ بود.

→ بوده (رک: بمقالہ "چینودپل" در مقدمۂ چاپ جدید "گاتھا" گزارش استاد پورداود. نشریۂ انجمن زرتشتیان بمبئی ۱۹۵۲ صفحہ بیت - یح -) این کلمہ بعدا بتصحیف چنبود، چنور، جنیور، خنپور، خنبور، خینور وغیره ضبط شده (رک: مقدمۂ برہان قاطع ص ۴۶).

۹ه اگرچہ این معنی در بعضی فرہنگہا یافتہ می شود مانند قواس ص ۷: اما معنی اصلی کلمہ پل صراط است نہ قیامت. رک. قواس ص ۷ ح ۱۳، ۱۴.

۱ه رک: قواس ص ۱۱۲، دستہ ص ۱۲۰ وغیره.

۲ه این بیت از ابوالعباس [illegible] است و در فرس ص ۱۴۹، قواس ص ۱۱۲، صحاح ص ۱۲۰، معیار ص ۲۰۳ و رشیدی ص ۶۹ [illegible] شاهد آمده.

۳ه فرس، صحاح، سروری و رشیدی [illegible] زفان: ولی بی تنگ همی [illegible] (فرہنگ [illegible] زفان).

۴ه قواس، زفان: آنچنان گشت کہ

۵ه [illegible] : خنور کند، گویند رخت، کالا و آوندهای طبخ، [illegible] / تازیان / همہ آوندہا را خنور گویند. عنصری:

همای لطف تو [illegible] کسی [illegible] فلک ÷ [illegible] نقره کشش زمانہ خنور

۶ه رک: قواس ص ۱۴۲، موید ۱/۳۵۶، [illegible] ۱۷۸۰.

۷ه موید: خورنده.

۸ه رک: قواس ص ۱۴۲: خوا و خوار مزه.

۹ه خوار بخشی است در جنوب شرقی تہران بر سر راه خراسان [illegible] ص ۴۸۷

۱۰ه مراد از فرہنگنامہ قواس، رک ص ۱۴۲. ۱۱ه صاحب موید ۱/۳۵۶ و [illegible] در نام کوشک بہرام نوشتہ.

خنچیر[۱]: بوی و دود چربی و گوشت بوقت سیخ [کردن] کباب.

خنجر: دشنه.

خشار[۲]: پاک کردن باغ و کشت از گیاه های خود رو.

خز[۳]: گل تر یعنی طین، و خزه[۴] بهما نیز.

خستر[۵]: خزنده.

خواستار[۶]: خواهنده.

خر[۷]: کلان و لاشه.

خوار: خورنده[۸]، و ضد عزیز.

خزر: نام[۹] ولایتی است از آن ترکان که مردمان سپید پوست باشند، و دران زمین قندز می شود، و خزران[۱۰] نیز گویند.

خسر: پدر زن و پدر شوی.

---

۱ رک: فرس ص ۱۴۰ و قواس ص ۱۴۶.

۲ در مدار ۲: ۱۴۳-۱۴۴، خشار و خشاره و خشاده هر سه بهمین معنی آمده؛ و در زفان خشاره بمعنی پاک کردن باغ الخ آمده؛ اما در قواس ص ۱۸۱ و صحاح ص ۲۷۹ خشاده آمده نه خشاره مؤکد با بیت ابوالعباس:

که خود نشانم و خود پرورم خود آب دهم ÷ ز خود خشاده کنم شان بنوک دو سره داس

۳ رک: فرس ص ۳۷، قواس ص ۳۲، صحاح ص ۱۰۳، مدار ۲: ۱۲۱.

۴ مؤید ایضاً.

۵ رک: قواس ص ۶۹، دستور ص ۱۲۰، مدار ۲: ۱۴۰، و در مدار و مؤید ۱: ۲۷۵ خستو بهمین معنی آمده؛ اما در صحاح ص ۲۹۵ خستو بمعنی معترف است.

۶ رک: مؤید ۱: ۳۵۶.

۷ مؤید ۱: ۳۵۴ همین معنی را بحوالهٔ زفان آورده.

۸ نسخهٔ اصل: خوانده؛ اما رک. مؤید ۱: ۳۵۶.

۹ بعینه بهمین تفصیل در مؤید ۱: ۳۵۵ یافته می شود؛ در فرهنگ معین ۶: ۴۷۸: خزر قومی که سابقاً در حاشیهٔ بحر خزر و شمال جبال قفقاز سکونت داشتند، گروهی از آنان بطرف قسمت جنوب غربی قفقازیه و شبه جزیره قرم (کریمه) شمال بحر اسود روی آوردند و تا قرن چهارم هجری قدرتی داشتند. پای تخت آنان در اوائل اسلام و عصر فتوحات مسلمانان بلنجر بود.

۱۰ رک: فرهنگ معین ایضاً.

بهرهٔ «ز»

خاز[۱]: ریم اندام.
خوز[۲]: نام ولایتی که خوزستان گویند.

بهرهٔ «س»

خس: خاشاک و مرد کوهی[۳] و [.... بش[۴]] را خس گویند.
خدیش[۵]: کدبانوی خانه، و بعضی شعرا در استعمال بمعنی خداوند آورده اند.

بهرهٔ «ش»

خلالوش[۶]: غلغل و غلبه و شغله.
خراش[۷]: نابکار و انداختنی[۸] یعنی سقط و خراشیدن.

۱؎ رک: موید ۱: ۳۵۷ ۲؎ خوز در اصل نام قوم، و خوزستان محل این قوم بود، ایالتی است در جنوب غربی ایران استان ششم و مرکز استان اهواز است.

۳؎ رک: مدار ۲: ۱۴۰، جهانگیری ۱: ۱۲۸۲ خس بهندی قومی است از کفار که در کوهها ... ساکن اند.

۴؎ اصل کرم خورده، خس بمعنی مردم فرومایه و دنی و رذیل نوشته اند.

۵؎ رک: مدار ۲: ۲۱؛ موید ۱: ۵۹ ۳ بمعنی اوّل یعنی کدبانوی خانه بحوالهٔ زفان نوشته و خدیش نیز بهمین معنی آورده است. موید و مدار ایضاً، نیز فرهنگ معین ۱: ۱۴۰۲ که خدیش بمعنی کدخانه، بانوی خانه، پادشاه آورده. جهانگیری ۱: ۹۳ ۷ بمعنی کدبانو، با این بیت شاهد:

دارد هر کسی بتا باندازهٔ خویش ؛ در خانه خود بنده و آزاد خدیش

رودکی: چه خوش گفت آن مرد با آن خدیش ؛ مکن بد بکس گر نخواهی خدیش (ایضا)

اما همین بیت صاحب صحاح ص ۱۵۰ بنام حکیم سوزنی نقل کرده بتوضیح خدیش بمعنی کدبانو، دستور ص ۱۲۰ نیز خدیش دارد.

۶؎ در فرس ص ۲۱۰ و صحاح ص ۱۵۰ خلالوش آشوب و غلغله و شغله و آواز بود. اما در موید ۱: ۳۷۰ خلاکوش و مدار ۲: ۱۶۱ خلاکوش، خلالوش برده: در فرهنگ قواس در نسخهٔ اصل خلاکوش (رک: ص ۱۰۶).

۷؎ صحاح ص ۱۵۰: خراش دو معنی دارد، اوّل خراشیدن، دوم سقط و نابکار،
رودکی گوید:

بت اگرچه لطیف دارد نقش
نزد رخسارهٔ تو هست خراش

۸؎ رک. موید ۱: ۳۶۰؛ اما نسخهٔ اصل: انداختی.

خوش: بضم خویش[1]، و خشو[2] یعنی مادر زن و خشک[3].

غلیش[4]: خلاب.

خروش: فریاد. و در فردوسی است بانگ مردم دون.

غیش[5]: جامهٔ پنبه آگنده بافته.

بهرهٔ «ف»

خف[6]: رکوی[7] سوخته یعنی پارهٔ جامهٔ سوخته.

بهرهٔ «ک»

خدوک[8]: طیره شدن یعنی خجل شدن و کسی که طیره شده باشد یعنی خجل شده گویندش خدوک است.

خیک[9]: فشردن گلو.

خنجک[10]: بفتح و کسر خا، خار خسک، و دانهٔ او را بتازی حبة الخضراء و بلطم[11] و خرنوب[12]

---

[1] کذا است در اصل: اما جهانگیری ۲: ۱۹۹۲ خوسش یعنی خویش همراه این بیت شاهد:

خاموش شو خاموش شو و عشق او مدهوش شو
از حال خود بی هوش شو تو مار آ ز ذکر ماضی

[2] جهانگیری ایضا خوسش مادر شوی و مادر زن. صحاح ص ۱۵۱ خوش خسر باشد یعنی مادر زن و پدر زن؛ مؤید ا: ۳۶۰ خوسش مادر شوهر ... ۱۴۰۱ خشو مادر شوهر و ... زن: مدار ا: ۱۷۱ خوشش مادر شوی و زن.

[3] صحاح ص ۱۵۱ خشک ... خوشیدن ... سعدی:

خوشیده ... های قدیم ... ماند آب جز آب چشم یتیم

[4] رک: قواس ص ۲۱، دستور ص ۱۰۳

[5] مؤید ا: ... تاریخ بیهقی ص ۱۴۱ ... خوب ... آنرا ... محمد ... آن بخند

[6] صحاح ص ۱۶۸ خف رکوی سوخته. [7] زفان رکوی پارهٔ جامه.

[8] مؤید ا: ۲۷۴ یعنی ... قواس ص ... دستور ص ۱۲۰، بحر العجائب: خدوک خجل ... قواس ص ۵۵ ... خدوک شده. صحاح ص ۱۸۹ خدوک ... خجل و طیره. [9] رک مؤید ... ۱۳۳۲ ... مدار ۲: ۳۰۲

[10] صحاح ص ۱۸۰ خنجک بفتح خا، خار خسک ... است ... و آنرا کمسان ... و حب الخضراء ... مؤید ۲: ۱۸۰۲ خنجک بفتح ... حبة الخضراء ...

گویند، و بعضی گویند که خنجک غلہ ایست که آنرا بهندوی کلتھی[۱] گویند.

خلشک[۲]: گل ناپخته.

خروک[۳]: گیاهی است که آنرا خرجوک[۴] نیز گویند. و خروک همان خنجک[۵] است.

خشوک[۶]: حرام[۷] زاده.

خپاک[۸]: شبگاه گوسپندان یعنی جای گوسپندان و چهار[۹] دیواری که سرگشاده باشد، و بمای عربی نیز آمده است.

خلشک[۱۰]: کوزهٔ گلین رنگ کرده.

خورمک[۱۱]: مهرهٔ [ورق ۱۳۸ ا] که برای دفع چشم زخم برگردن کودکان بندند.

→ ۱۱ صحاح و جهانگیری جة الخضراء: خارخسک جدامی دانند. برای جة الخضراء، رک: هدایة المتعلمین فی الطب ص ۱۵۷، ۵۲۱.

۱۲ دنسخهٔ اصل: بطسم بمعین ۱: ۵۴۸ بطم صمغ درخت بنه، ایضاً ص ۵۹۵، بنه، صمغ بنه مترادف بطم و جة الخضراء است. ۱۳ معین ۱: ۱۴۱۵ خرنوب درختی است شبیه بدرخت گردو، واضحاً از جة الخضراء جداست: خرنوب یکی از دواهای سودمند است، رک: هدایة المتعلمین ص ۳۱۴، ۳۹۴، ۵۹۹ وغیره.

۱ رک: موید ۱: ۳۶۵، مدار ۲: ۱۵۱.

۲ بدین معنی فقط در موید ۱: ۳۶۵، مدار ۲: ۱۶۳، و در همهٔ فرهنگها بمعنی کوزهٔ گلین رنگ کرده آمده. چنانکه ذیل همین کلمه (بعد از سه واژه در همین فرهنگ) می آید.

۳ رک: مدار ۲: ۱۴۶ که بهمین تفصیل دارد. ۴ مدار: خرچلوک، موید ۱: ۳۶۴ خرچلوک گیاهی که بزنان کم شیر دهند. و در زفان گویا مذکور است: داروئی است که آنرا حبتسل و کچری نامند و بنابر لغت جهانگیری ۱: ۹۶۷ و موید خروک گیاهی است که زنان کم شیر را دهند، ازین جهت واضح است که خروک و خرچلوک (در مدار همین است و همین است در زفان ذیل بخش مرکبات) مترادف است.

۵ خنجک خارخسک و جة الخضراء است، پس جدا از خروک باشد، رک: خنجک در همین فرهنگ.

۶ رک: فرس ص ۲۵۱، قواس ص ۱۰۲، صحاح ص ۱۶۰. ۷ پیش ازین درنسخهٔ اصل افزوده: هم آمده است.

۸ فرس ص ۲۵۲، قواس ص ۱۲۵، صحاح ص ۱۷۹: خباک؛ موید ۲: ۳۶۴ کذا در اصل؛ مدار ۲: ۱۱۶ خباک و خپاک هر دو.

۹ مدار: با چهار دیواری سرگشاده

۱۰ رک: فرس ۲۹۳، قواس ص ۱۲۶.

۱۱ کذا است در موید ۱: ۳۶۵، اما در ص ۲۱۵، قواس ص ۱۵۹، صحاح ص ۱۷۹: خرتمک بهمین معنی.

خنک[۱]: سرد نفس زدن و خوشی یاد گرفتن، بتازی طوبی لک[۳] گویند.
خایسک[۴]: مطرقهٔ[۵] آهنگران و جز آن که بهندوی هتوره[۶].
خپک[۷]: نان بزرگ.
خاشاک: نابکار[۸]، و ریزه های[۹] خشک از چوب و کاه و خاک بهم آمیخته و آنچه بدین ماند.
خسوک[۱۰]: کوهان.
خمک[۱۱]: آواز بانگ.
خراک[۱۲]: بانگ خفته.
خرک[۱۳]: هر آنچ دیواری را سوراخ کنند، و چوبکی که بدان جنایت کننده را دره زنند، و چوبکی بربط که ته تار نهند.
بهرهٔ گ
خنگ[۱۴]: بد نفسی.

---

۱ عیناً همین معنی در موید ۱: ۳۶۵ و مدار ۲: ۱۷۳ یافته می شود.
۲ کذاست در موید و مدار، صحاح ص ۱۸۰: خنک یعنی خوشا و عرب طوبی گوید.
۳ طوبی لک: خنکی باد ترا، رک: دستور الاخوان ص ۴۱۳. قرآن ۱۳: ۲۹ طُوبىٰ لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ (برای ایشان خوش حالی و نیک انجامی است.)
۴ صحاح ص ۱۷۹: خایسک مطرقه.
۵ دستور الاخوان ص ۵۹۰: مطرقه غنج و خایسک.
۶ رک: مدار ۲: ۱۱۲.
۷ رک موید ۱: ۳۶۴، جهانگیری ۱: ۶۲۹، عبید لوکی:
از جگر تنور شرق امر تو می برآورد ❊ قرصهٔ زر مغربی از پس سیمگون خپک
(رک: دیوان ص ۱۸۰)
۸ در اینجا بقدر یک کلمه کرم خورده؛ این معنی در فرهنگها دیده نشد.
۹ رک: موید ۱: ۳۶۳ و مدار ۲: ۱۰۴.
۱۰ این واژه بدین معنی دیده نشد.
۱۱ موید ۱: ۳۶۵، مدار ۲: ۱۶۸، جهانگیری ۲: ۱۶۹۲.
۱۲ رک: موید ۱: ۳۶۴، مدار ۲: ۱۶۸، نیز رک: جهانگیری ۱: ۹۴۷.
۱۳ رک: موید ۱: ۳۶۴ و مدار ۲: ۱۳۳؛ جهانگیری ۱: ۹۶۲ معنی اوّل ندارد و برای معنی سوم بیت زیر شاهد دارد:
کاسس رباب را چه نقص گر گسلد بزخم در ❊ تار بریشمی بروی برآیدش خرک
(دیوان عبید لوکی ص ۱۸۶)
۱۴ رک: مدار ۲: ۱۷۴، و برهان: خنگ بفتح اوّل بد ذاتی و بد نفسی.

خیگ[۱]: مشک بزرگ که بهندوی پکهال[۲] گویند.
خدنگ[۳]: چوبی است هموار که خار و گره ندارد، ازوی تیر سازند در ترکستان.
خنگ[۴]: اسب سپید و آن بر چند گونه است، سبز خنگ و سرخنگ[۵] و مگس خنگ و خنگ ریو و خنگ بور و خنگ ذبابی.

بهرهٔ ل

خول: دراج[۶] سپید که آنرا کبک انجیر[۷] گویند، و خول بضم[۸] خا و سکون واو نیز گویند و در محلی است که خول مانند عصفور[۹] است، بتازی جنجو[۱۰] گویند.
خوهل[۱۱]: کژ، یعنی ضد راست و گویند کژپائی[۱۲] باشد.

---

۱ رک: موید ۱: ۳۶۶، مدار ۲: ۱۹۹.
۲ کذاست در اصل، اما موید: بکهال و مدار پکهال.
۳ مدار ۲: ۱۲۰: خدنگ چوب درختی از وحصای زین و ترکش و تیر سازند، و از خدنگ تیر مطلق اراده کرده اند الخ.
۴ رک: موید ۱: ۳۶۶.
۵ موید: سرخ خنگ. اما در برهان است: خنگ چون سرخی مائل باشد سرخ خنگ گویند، یک خا را حذف کنند سرخنگ خوانند.
۶ قواس ص ۶۲، دستور ص ۱۱۹: خول کبک انجیر، موید ۱: ۳۶۷ و مدار ۲: ۱۸۹ خول دراج سپید که آنرا کبک انجیر خوانند الخ.
۷ زفان: کبک انجیر دراج سپید.
۸ درین معنی تلفظ خول بتحتین آمده. رک: موید و مدار؛ اما در جهانگیری ۲: ۱۹۸۴ با اول مضموم و بواو پارسی درج است. نیز رک: جعفری ص ۱۸۵: خول بوزن غول چکاوک ... و دراج الخ
۹ مثلاً دسکندری (رک: موید ۱: ۳۶۷) مانند کنجشک است.
۱۰ اصل: صعفور، متن مطابق مدار ۲: ۱۹۰، اما معین ۱: ۱۲۹۷ جنجو بمعنی کنجشک دارد. برای 'خول' رک: دیوان منوچهری ۱۸۷:

خول طنبوره تو گوئی زند ولاسکوی
از درختی بدرختی شود و گوید آه

۱۱ در فرس ص ۲۱۲، صحاح ص ۲۰۷ خوهل بمعنی کژ با این بیت شاهد:

پس از تراژ و خوهل آوری پیش من ⁂ همت خوهل بپاسخ دهد پیرزن

۱۲ کذاست در مدار ۲: ۱۹۱، موید ۱: ۳۶۷

بهرۀ م

خیم : خوی[1] و طبع و جراحت[2] [و ریزش[3] رودگانی و شکنبه ، و در فرهنگ[4] نامه است خیم جراحت].

خام : ضد پخته و کمند[5] و پوست[6] را نیز گویند.

خیم[7] : ریم چشم و جز آن.

خورّم[8] : خوش.

خرام[9] : رفتن بناز.

خلم[10] : آب بینی ستبر.

بهرۀ ن

خوالستان[11] : دوات و خوالسته[12] نیز گویند.

---

[1] در جهانگیری ۲: ۲۲۷۱ بدین بیت سنائی استشهاد شده :

مرد شهوت پرست را در خیم ❊ بدتر از بت پرست خواند حکیم

نیز رک : صحاح ص ۲۱۹ .

[2] در فرس ص ۳۴۲ و صحاح ص ۲۲۰ بدین معنی و با بیت زیر :

بسی خیمها کرده بود او درست ❊ وز آن خیم های ورا چاره جست

اما صاحب جهانگیری خیم را بدین معنی درست نمی داند و آنرا تصحیف 'خم' قرار دهد (۲ : ۲۲۷۱).

[3] در اکثر فرهنگها همین کلمهٔ ریزش آمده ؛ رک : موید ۱ : ۳۶۸ ، مدار ۲ : ۲۰۰ ، اما واژهٔ صحیح ریدنش کذا است در فرس و صحاح ص ۲۲۰ و شمس فخری ص ۳۲۱ (متن ، حاشیه ، ریزش).

[4] از ریزش تا آخر جمله حاشیه افزوده شده ، بقول انجوی شیرازی در عربی نیز بمعنی خوی و طبیعت است.

[5] نسخهٔ اصل ، بلند ؛ اما رک : جهانگیری ۱ : ۲۹۹ بدین بیت شاهد :

گر این جست لین و گر آن جست نام ❊ گر این تیغ برکف گر آن خم خام

[6] برای معنی چرم دباغت نکرده مع بیت شاهد رک : صحاح ص ۲۱۹ ، جهانگیری ۱ : ۲۹۸ .

[7] نسخهٔ اصل : خم ؛ اما رک : صحاح ص ۲۱۹ - ۲۲۰ : خیم رمص باشد ، منجیک :

دو جوی رواں در دهانش زخم ❊ دو خرمن زده بر دو چشمش زخیم

معین ص ۱۷۷۴ رمص چرک خشک کنج چشم.

[8] بواو معدوله ، اما املای جدید خرّم. [9] رک : موید ۱ : ۳۶۸ .

[10] رک : صحاح ص ۲۱۹ ، موید ۱ : ۳۶۸ . [11] رک : قواس ص ۹ ، دستور ص ۱۲۲ .

[12] موید ۱ : ۳۸۰ : خوالسته .

خزان[1]: هشتم روز شهریور که آفتاب در سنبله بود، روز جشن پارسیان است، و در فرهنگنامه است که خزان سوم روز شهریور است و درست تر آنست که خزان هژدهم روز از شهریور ماه باشد.

خان[2]: خانه و کاروانسرای[3] و پادشاه ملک سمرقند و در ترکستان پادشاهی که فروترین مرتبه[4] بود و نام ولایتی[5] است در ترکستان.

خرمن[6]: انبار غلهٔ نامالیده یعنی تودهٔ گندم و جو و جز آن که از میان کاه پاک نکرده باشد و برباد نداده بود.

خستن[7]: خزیدن[8].

[۱۴۶ا] خشنان[9]: بسه فتحت، مبارک و بعضی فرهنگیان[10] بکسر خا و سکون نون گویند.

خندستان[11]: سخر و فسوس. خنیدن[12]: بر جستن.

---

[1] قواس ص ۱۷: خزان هشتم روز از ماه شهریور (روز جشن پارسیان)؛ در مدار ۲: ۱۳۷ همین قول زفان بدون ذکر ماخذ عیناً شامل شده.

[2] رک: موید ۱: ۳۶۸: خان (فصل عربی)، مدار ۲: ۱۰۹ خان (ع) کاروان سرای و در پارسی القاب پادشاهان الخ.

[3] مکاتیب سنائی ص ۷۸: آن بازرگان که در خان سرخس در بند خانه داشت الخ.

[4] در موید بگفتهٔ زفان آمده: پادشاه ملک سمرقند، و در زفان گویاست که در ترکستان پادشاهی که فروترین مرتبه بود اورا خان گویند و پادشاهی که بزرگترین مرتبه بود اورا خاقان نامند و نیز نام ولایتی است در زمین ترکستان.

[5] رک: لغت نامهٔ دهخدا - جزء خ - خانه. [6] رک: موید ۱: ۳۷۱.

[7] رک: موید ایضاً، مدار ۲: ۱۶۱: خستن مجروح کردن و خریدن (صح خزیدن). کذا است در زفان گویا (ذیل مصادر)؛ ناگفته نماند که دراین فرهنگ مصادر در بخش جداگانه آمده؛ پس دراینجا این مصدر بی محل بنظر می آید. [8] نسخهٔ اصل: خزیده یا خزنده.

[9] رک: موید ۲: ۱۷۳، جهانگیری ۲: ۱۸۰۷ خشنا و خشنان با اول مضموم مبارک. رودکی:

باد بر تو مبارک و خشنان ٭ جشن نوروز گوسپندکشان

[10] رک: موید ۱: ۳۷۳ و جعفری ص ۱۸۹؛ مدار ۲: ۱۷۳ و قیل بضم و کسر نون.

[11] موید ۱: ۳۷۲ خندستان بمعنی سخر و فسوس و سخره اما مدار ۲: ۱۷۲ بمعنی سخر خانه و جای بازی، و در جهانگیری ۲: ۱۸۰۷ بمعنی مجلس مسخرگان آمده. اما در جملهٔ زیر خندستانی بمعنی سخر آمده:

"موسی می آمد لابنی در بر، کلاهی بر سر، چوبی در دست هارون نهاده، و در قفای وی خلق خندستانی می کردند" (قصص قرآن سورآبادی بحوالهٔ جهانگیری ۲: ۱۸۰۷ حاشیه ۲.)

[12] رک: موید ۱: ۳۷۲، مدار ۲: ۱۷۰.

خرغون[۱] : شہریست.

خدایگان : خداوند.

خماہن[۲] : مہرۂ سنگی است سیاہ و پارۂ سرخی زند و گویند مہرۂ یمانی و او کبود است و گویند کہ سیاہ و سپید، و بہ لغتی[۳] خا مضموم است.

خفتان : قبای سلاحی است و خفدان[۴] نیز گویند.

خیزران[۵] : نام درختی است از نی کہ ازان گلدان راست کنند و تازیانہ و آن شرخ[۶] است یعنی بیت[۷].

ختن[۸] : نام ولایتی است در ترکستان کہ مردمان آن بہ سپیدی[۹] منسوب اند، و مشک خوب آنجا شود.

خنبان[۱۰] : جنبان.

ختلان[۱۱] : نام ولایتی است در ترکستان کہ آنجا اسب خوب خیزد، ختل[۱۲] نیز گویند.

---

۱ کذاست در موید ۱ : ۳۷۱، مدار ۲ : ۱۳۱. ۲ رک : مدار ۲ : ۱۶۷. عہ جعفری ۱۸۸.

۳ رک : موید ۱ : ۳۷۲، مدار ۲ : ۱۵۵. ۴ برہان : خیزران نوعی از چوب و نی باشد کہ بخم شدن نشکند و از آن تازیانہ سازند، غیاث : خیزران درخت بید کہ بہندی بیت خوانند.

۵ کذاست در اصل. ۶ رک : موید ۱ : ۳۶۹، اما از فرہنگ معین ۱ : ۱۴۶۹ واضح است کہ خیزران از بید جداست. در اکثر فرہنگہا این واژہ را عربی قرار دادہ اند اما در شرفنامہ فارسی دانستہ شدہ.

۷ در حدود العالم است : ختن میان دو رود است، اندر حدود وی مردمانی است وحشی ... و بر حدی است کہ میان چین و تبت است ... و از ین شہر ہفتاد ہزار مرد جنگی بیرون آید و سنگ یشم از رودہای ختن خیزد (چاپ کابل ص ۳۷۵). ۸ مانند چگل برای خوبرویان شہرت دارد، فرخی :

گروہی ماہرویان ابخدمت برہمن خواند ؛ نگاری از چگل خواند نگاری از ختن خواند

۹ موید ۱ : ۳۷۲ این کلمہ را بحوالۂ قنیہ آوردہ. واضحاً این کلمہ اسم حالیہ از مصدر خنبیدن بمعنی جنبیدن است.

۱۰ در حدود العالم ص ۳۹۸ آمدہ : 'ختلان ناحیتی اندر میان کوہ ہای بزرگ نہادہ... و از ین ناحیت اسپان نیک خیزد بسیار' مولف لغت نامہ ختلان را ولایتی بماوراء النہر نزدیک بدخشان ذکر می کند، میان آن و چغانیان سی فرسنگ راہ است الخ.

۱۱ رک : لغت نامۂ دہخدا شمارہ ۹۱ ص ۲۷۶ - ۲۷۷.

بهرهٔ 'و'

خسرو : پادشاه و نام پرویز.

خدیو[1] : خداوند و قوی[2].

خو : گیاهی[3] است که از کشت برکنند و دور اندازند.

خستو[4] : مقر یعنی اقرار آرنده.

خدو[5] : اثر چیزی از مزه.

ختو[6] : شاخ افعی یا ماهی که او را وال گویند.

خیرو[7] : گیاهی است که بهندوی پت سن[8] گویند، گلی بزرگ دارد.

خرگاو[9] : نام زمینی است.

بهرهٔ 'ه'

خجسته : مبارک.

خشتجه[9] : خشتک ازار[10]، و اسدی گوید: خشتجه[11] زیرکش جامهٔ پوشیدنی بود و آن را خشتک گویند و مردم عامه سوزه و کوزه گویند.

خله[12] : هرزه و گم شده، و چوبی[13] که بدان سفینه را زنند، و دردی که ناگهان خیزد.

---

۱ درمؤید ۱ : ۳۷۵ خدیو بمعنی وزیر بگفتهٔ زفان آمده. ۲ مدار ۲ : ۱۲۱ خدیو بمعنی بادشاه قوی نیز آورده.

۳ مؤید ۱ : ۳۷۵ عیناً این معنی بحوالهٔ لسان الشعرا نوشته.

۴ رک : فرس ص ۴۰۶، صحاح ص ۲۹۵، جهانگیری ۱ : ۱۲۹۴.

۵ رک : مدار ۲ : ۱۲۰؛ درجهانگیری ۱ : ۷۹۲ خدو بمعنی آب دهن، خیو و تفو آمده.

۶ برای ختو رک : الصیدنهٔ بیرونی چاپ کراچی، ص ۱۷۴ و الجماهر ص ۲۰۸ - ۲۰۹.

۷ رک : مدار ۲ : ۱۹۵، و درمؤید ۱ : ۳۷۵ همین معنی بحوالهٔ زفان گویا آمده.

۸ مدار الافاضل ۲ : ۱۳۲، ۱۵۹ خرگاو و خنگاو بهمین معنی نقل شده.

۹ صحاح ص ۲۷۴ : خشتجه : زیر بغل جامه و به بعضی از زبانها خشتک نیز گویند. عماره گفت دیبای خشتجه گر شست نا نه بردوزی الخ؛ مؤید ۱ : ۳۷۹ : خشتجه : زیرکش جامهٔ پوشیدنی کذا فی الشرفنامه و در قنیه خشتک ازار و مردم عام سوزه گویند، نیز رک : مدار ۲ : ۱۴۴.

۱۰ مدار ایضاً خشتک پارهٔ جامه که در بغل برند. نیز رک : صحاح ص ۲۷۴. ۱۱ فرس ص ۲۱ چاپ : پال هورن : خشتچه زیر بغل بود از جامه؛ واضح است که نسخهٔ لغت فرس اسدی که پیش صاحب زفان بود از نسخهٔ پال هورن اختلاف داشته. ۱۲ برای این سه معنی رک : مؤید ۱ : ۳۷۹؛ صحاح ص ۲۷۵ : خله بفتح خا و لام محقق و هرزه گفتن. ۱۳ در صحاح بدین معنی خله بضم خا و لام مفتوح مخفف.

خله[1] : خلم که از بینی بیرون آید.
خستوانه[2] : پشمینه و پاره های کرباس و برد[3]، و پشمینه که درویشان و پلاوریان[4] پوشند، مویهای آویخته باشد.
خشته[5] : مفلس و بی باک.
خامه : قلم.
خبه[7] : فشردن گلو و تاسه[8] و تلواسه.
خازه[9] : گل سرشته.
خرده[10] : تفسیر زند که آنرا پازند نیز گویند.
خاره[11] : سنگ سخت و نوعی از پشمینه و خارا بمعنی جامهٔ ابریشمین که صاحبی[12] گویند.

---

1. صحاح ص ۲۷۵ : خله بضم خاء و لام مشدد بمعنی خلم بینی یعنی آب سطبر از بینی برآید.
2. فرس ص ۲۴۸ : خستوانه پشمینه ای باشد پیله وریان دارند و موی ازو آویخته باشد، معروف.
نگر زسنگ چه مایه بهست کوه سیخ ❊ ز خستوانه چه مایه بهست شوشته ی
نیز رک : قواس ص ۱۵۵ و صحاح ص ۲۷۴، موید ۱ : ۳۷۹.
3. برد نوعی از جامه های پوشش زمستان (موید ایضا) ۴. اصل : پلادریان، اما رک : فرس و قواس.
5. رک : موید ۱ : ۳۷۹ و مدار ۲ : ۱۴۴. ۶. موید و مدار : بی برگ.
7. خبه و خفه مترادف است. رک : آنندراج، و نیز موید ۱ : ۳۷۸، ۳۷۹، مدار ۲ : ۱۱۵.
8. تاسه و تلواسه بمعنی بی قراری است رک : موید ۱ : ۲۷۱ - ۲۷۲.
9. موید ۱ : ۳۷۷ : خازه گل سرشته که بتالیش طین گوین.
10. صحاح ص ۲۷۴ : خرده تفسیر اجزای پازند است، دقیقی گفته است :
ببینم آخر روزی بکام دل خود را ❊ گهی ایارده خوانم گهی خرده
نیز رک : موید ۱ : ۳۷۸ ؛ اما خرده بدین معنی درست نیست ؛ در اصل کلمهٔ خرده اوستا و آنهم بخش پنجم است از اوستا، نه تفسیر زند ؛ خرده اوستا بزبان اوستائی است و با پازند هیچ علاقه ای ندارد.
11. خاره و خارا به هر دو معنی مشترک است ؛ رک : جهانگیری ۱ : ۲۹۳ - ۲۹۴، و موید ۱ : ۳۴۵، ۳۷۷.
صحاح ص ۲۳ : خارا بمعنی سنگ سخت و جامهٔ حریر نوشته متمسک بدین بیت منجک چند ابیات دیگر :
دفع یاجوج ستم را در بسیط مملکت ❊ عدل تو سدی چنین چون کوه خارا ساخته
- - -
بجای صدرهٔ خارا چو بطریق ❊ پلاسی پوشم اندر سنگ خارا
برای شاهد خاره بدین دو معنی رک . جهانگیری ۱ : ۲۹۴ متن و حاشیه. ←

خرّه[1]: گل [۱۴۰] یعنی طین.
خاشه[2]: ریزه های سرگین و کاه و مثل آنکه خاشاک گویند.
خرفه[3]: پرپهن که بقلة الحمقا گویند یعنی لونک.
خشاره[4]: پاک کردن پالیز[5] از سبزه و پاک کردن[6] باغ و پالیز و کشت زار بود از گیاه خودروی.
[خشاوه[7]]: پالیز خشاوه کردن.
خروه[8]: خروس که بعربی دیک گویند و خره نیز گویند.
غنب[9]: طاق و صفه.
خشینه[10]: سپید ضد سیاه، و گویند سپید رنگ ناکرده.
خوچه: تاج[11] [خروس]

→ [12] در مؤید ا: ۳۴۵ همین معنی بحوالهٔ زفان نوشته، رک: خارا در همین فرهنگ.

[1] مؤید ا: ۳۷۹: خره بالفتح والتشدید گل ترکه بتازیش طین خوانند و نیز تودهٔ گل؛ صحاح ص ۲۷۴ خره بمعنی گل تر و سیاه.
[2] رک: صحاح ص ۲۷۴؛ در مؤید ا: ۳۷۷ بهمین معنی بحوالهٔ زفان گویا بیان شده، نیز رک: مدار ۲: ۱۰۴.

[3] در مؤید ا: ۲۱۶ پرپهن را خرفه نوشته؛ اما در همین فرهنگ پرپهن را گیاه قرار داده که تخمش کلکلک باشد. اما صاحب زفان خفرج را بقلة الحمقاء و لونک، و بقلة الحمقا را مترادف خرفه و لونک قرار داده.

[4] در قواس ص ۱۸۱، صحاح ص ۲۷۴ و معیار جمالی: خشاوه بهمین معنی آمده، و در اول دو بدین بیت شاهد:

که خودنشانم و خود پرورم خود آب دهم ٭ ز خود خشاوه کنم شان بنوک دو سره داس

اما در مدار ۲: ۱۴۳-۱۴۴ خشار، خشاره، خشاوه مترادف قرار داده شده. در برهان اصلاً خشاوه آمد، و اشاره به خشاره هم شده. مؤید ا: ۳۷۸ خشاره را بحوالهٔ شرفنامه ذیل فصل عربی بیان نموده.

[5] نسخهٔ اصل: پاکیز.
[6] نسخهٔ اصل: پاک کردن و زردکشت بود الخ.
[7] نسخهٔ اصل کرم خورده.
[8] رک: صحاح ص ۲۷۴، مدار ۲: ۱۳۶.
[9] نسخهٔ اصل: غینه، اما رک: مدار ۲: ۱۷۰؛ صحاح ص ۲۷۵: غنبه چهار دیواری که غله در آن کنند.
[10] مؤید ا: ۳۷۹: خشینه سپید و قیل سپید خود رنگ، صحاح ص ۲۷۵: خشینه مرغابی سیاه و رنگش میان سیاه و کبود باشد.
[11] رک: مدار ۲: ۱۸۱، و نیز خوچ در همین فرهنگ.

خره[۱] : یعنی خروس.
خسته[۲] : خزنده[۳].
خاتوله[۴] : دغا بازنده و مکر و دونی یعنی مرد دونی و دغائی.
خروهه[۵] : مرغکی است که بردام بندند تا مرغان بروجمع آیند یعنی کنجشکی که صیاد برکنار دام آنرا بندد، بتازی آنرا ملواح خوانند.
خبیره[۶] : جمع حساب و تودهٔ ریگ.
خاده[۷] : چوبی که بدو جاروب بندند و بدان سقف وخانه و دیوار پاک کنند.
خفه[۸] : سرفه و فشردن[۹] گلو.
خیزیده[۱۰] : نام بازی است که می بازند و این را دو[۱۱] داله و دو دله و خاک[۱۲] نمک و

---

۱. رک : خزوه.
۲. موید ۱ : ۳۷۹، مدار ۲ : ۱۴۱ : خسته خزنده که بتازیش هامه گویند.
۳. در اصل : خزندگان.
۴. قواس ص ۱۱۰، صحاح ص ۲۷۳، دستور ص ۱۲۲ خاتوله بمعنی دونی و دغائی ؛ ادات : دو روئی و دغا و مکر و دغاباز ؛ بحرالفضائل : دغاباز ؛ مدار ۲ : ۱۰۰ خاتوله : دغاباز و مکر و دغابازی و دوئی کننده. در جهانگیری ۱ : ۲۹۱ بمعنی مکر و حیله با این بیت شاهد :

گر تو خاتوله خواهی آوردن ٭ این چه مکراست و تنبل و دستان

و در صحاح و قواس و سروری ص ۴۷۳ و رشیدی ص ۵۰۶ بیت از ابوالعباس شاهد بمعنی مکر و دونی آمده.
۵. رک : قواس ص ۷۷، جهانگیری ۱ : ۳۴۰، سروری ص ۴۹۴.
۶. رک : موید ۱ : ۳۷۷، مدار ۲ : ۱۱۵، خبیره و خبیوه هر دو بهمین معنی.
۷. رک : قواس ص ۱۳۰ و موید ۱ : ۳۷۷، در جهانگیری ۱ : ۲۹۲ خاده بمعنی چوبی بلند و چوبی بدان دارسازند نیز آمده. ناگفته نماند که معنی که در قواس آمده عیناً در زفان درج شده.
۸. بعینه همین معنی در موید ۱ : ۳۷۹ یافته می شود. قواس ص ۱۶۱ خفه : سرفه.
۹. از لحاظ این معنی خفه و خبه مترادف است، رک : خبه درهمین فرهنگ.
۱۰. مدار ۲ : ۱۹۷ خیزیده نام بازی که اورا دو دله و خاک نمک و کوه با موی نیز گویند، نیز بجای یا نون نیز ؛ رک : قواس ص ۱۸۷.
۱۱. اصل : دو دلکه، اما درهمین فرهنگ دو داله بازی است و آن گرد برگشتن است در بازی و این را دو دله نیز گویند، نیز رک : قواس ص ۱۸۷.
۱۲. زفان : خاک نمک نام بازی است که آنرا خیزگیره و کوبان موی و دو داله و خیزیده و مژیده گویند، نیز رک : قواس ایضاً.

کوهای[۱] موی نیز گویند و بعضی بجای[۲] یا نون گویند.

خیزنده: خاک نمک.

خنبیده[۳]: دانا در سرود و خوب گوی یعنی بسرود ستوده و مرد مشهور و معروف و دانا.[۴]

خبوه[۵]: محکم یعنی استوار و خبوک[۶] نیز گویند و بعضی خبیوه[۷] بکسر خا و دا نیز ذکر کرده است بمعنی استوار.

خجاره[۸]: اندک، و بضم خا نیز گویند.

خدره[۹]: پاره پارهٔ آتش که میان دخان رود یعنی شراره.

خنبره[۱۰]: خره را گویند.

خواره[۱۱]: کله

---

[۱] قواس ص ۱۸۷: مزیده: خیزگیر، خیزیده، خاک نمک، کوههای موی، دو واله (نام بازیها)

[۲] رک: موید ۱: ۳۸۰، مدار ۲: ۱۹۷. [۳] موید ۱: ۳۷۹ خنبیده بالضم مرد مشهور و دانا بکار سرود و بسرود ستوده. این واژه مشتق است از خنبیدن بمعنی برجستن و برهم زدن دست باصول، خنبک نیز بهمین معنی آید، رک: جهانگیری ۲: ۱۸۰۵. [۴] این کلمه در اصل درست خوانده نمی شود؛ اما واژهٔ خنیده بمعنی مشهور و شهرت یافته است نه خنبیده، رک: جهانگیری ۲: ۱۸۱۰، مدار ۲: ۱۵۹ (شاید خنبیده تصحیف خنیده باشد)؛ وچنانکه صاحب زفان خنبیده را بمعنی مشهور نوشتن دچار اشتباه شده، صاحب مدار و دیگران خنیده را بمعنی دانا بکار سرود نوشتن اشتباه نموده اند. خُنبیده بمعنی بکار سرود شهرت یافته و خنیده بمعنی مجرد شهرت یافته، رک: صحاح ص ۲۷۵

[۵] جهانگیری ۱: ۵۸۲ خبوک و خبوه محکم و استوار و آنرا خبره نیز گویند؛ نیز رک: موید ۱: ۳۷۷، مدار ۲: ۱۱۴.

[۶] موید ۱: ۳۶۴ بمعنی خبوک بگفتهٔ قواس نوشته. [۷] موید ۱: ۳۷۷، مدار ۲: ۱۱۵ خبیره و خبیوه را مترادف نوشته اند، و همین است قول جهانگیری ۱: ۵۸۲. [۸] کذا است در موید ۱: ۳۷۷ و مدار ۲: ۱۱۵؛ جهانگیری ۱: ۷۰۸ خجاره بمعنی اندک، مختاری:

بنگر بزی وسپاه دشمن ❊ کان هست فراوان واین خجاره

نیز رک: تاریخ سیستان ص ۳۸۹. [۹] موید ۱: ۳۷۷ معنی خدره بحوالهٔ زفان آمده:

در جهانگیری ۱: ۷۹۱ خدره بمعنی ریزهٔ هرچیز با بیت زیر سنائی شاهد:

نه دران معده خدرهٔ میده ❊ نه دران دیده قطرهٔ پانی

فرهنگ معین ۱: ۱۴۰۲ خدره بمعنی ریزه و شرارهٔ آتش آمده.

[۱۰] رک: موید ۱: ۳۷۹.

[۱۱] خواره بدین معنی در موید ۱: ۳۸۰ و مدار ۲: ۱۷۸ بحوالهٔ تحفه آمده:

اما معنی دیگر خواره نان باشد،

چنانکه در منشآت خاقانی آمده، ص ۱۱۷، ۶

خفده[1]: کژ شده.

خواسته: مال.

خسته: مجروح.

خرده[2]: نکته را گویند، و نکتهٔ باریک علم را گویند، خرده[3] نیز عیب را گویند، خرده[2] مگیر یعنی عیب مگیر: مصراع: خرده[3] از خود دان [و] مسکین درگذار

خیره[4]: شوخ و بی باک و سرکش[5] [را] گویند، خیره سری یعنی سرکشی، و تاریک و ریم و آشکارا کردن چیزی و سست شدن و درخواب[6] شدن [ورق ۱۴۱] اعضا.

خرزه[7]: آلت لاشه و مرد.

خیازنه[8]: خواهر زن.

خرخشه[9]: خصومت و مجادله.

خروسه[10]: پوست بالای سر ذکر که دور کنند، بتازی بظر[11] گویند.

خواجه: دستور و صاحب و حاکم.

---

[1] موید ۱: ۳۷۹، مدار ۲: ۱۵۸ عیناً همین معنی دارد؛ اما در آنندراج خمیده و خم شده.

[2] فرهنگ معین ۱: ۱۴۰۹.

[3] در اصل: خورده متن تصحیح قیاسی.

[4] مدار ۲: ۱۹۶ خیره شگفت بسیار و بیهوده، ضعیف و شوخ و بی باک و سرکش چنانکه گویند خیره سری یعنی سرکشی، خیره کُشی یعنی ضعیف کشی و تاریک و غبالت و ریم و آشکارا کردن و سست شدن و درخواب شدن اعضا.

[5] در موید ۱: ۳۸۰ این معنی بحوالهٔ زفان آمده.

[6] نسخهٔ اصل: دخراب شدن.

[7] نسخهٔ اصل: خزیزه؛ تصحیح از روی موید ۱: ۳۷۸، مدار ۲: ۱۲۸، فرهنگ معین ۱: ۱۴۱۰.

[8] رک: موید ۱: ۳۸۰.

[9] ایضاً ص ۳۷۸.

[10] موید ۱: ۳۷۸ معنی کلمه را بحوالهٔ زفان نیز آورده؛ جهانگیری ۱: ۹۶۷: خروسه و خروسک. گوشت پارهٔ بلند بود که برلب فرج زنان باشد و آنرا بتازی بظر گویند و زن بزرگ خروسه را بظراء خوانند.

[11] دستور الاخوان ص ۱۰۸: البظر، خروسهٔ زن، البظراء زن بزرگ خروسه.

خوره[1]: علتی که بدان موی میسر ریزد.

خواره[2]: طعام است بزبان افغانان[3].

خوابانیده: خسپانیده.

بهرهٔ ی

خانی[4]: حوض آب و گویند حوض خرد.

خوی[5]: خود آهنین که بر سر نهند در وقت کارزار.

خوالی[6]: رودبار یعنی رود آب و مطبخ و بعضی فرهنگنامه گویند دود آتش.

خوی: سرشت و خاصیت و خصلت و طبیعت.

خوی: عرق که از اندام چکد.

خسروانی[7]: سرود است.

خدای[8]: صاحب و دارندهٔ چیزی و فرمانفرمای و سرو پادشاه، و این لفظ تنها استعمال نکنند مگر باری عزّ و جلّ را و در مخلوق که خدای گویند یعنی خواجهٔ خانه و خدای کشور و خداوند و خدایگان گویند.

خیری[9]: گل است، و گویند خیرو[10] است و آنرا هندوی مورون گویند.

خشی[11]: سپید.

---

[1] رک: مدار ۲: ۱۸۶، موید ا: ۳۸۰ (خوزه اشتباه چاپی) [2] رک: موید ا: ۳۸۰ و مدار ۲: ۱۷۸.

[3] در اشعار خاقانی و خشالتش خواره بمعنی نان آمده، بنابرین واضح است که این کلمه در فارسی نیز مستعمل بوده، رک: جهانگیری ۲: ۱۹۷۲ متن و حاشیه. [4] رک: موید ا: ۳۸۱، مدار ۲: ۱۱۲، جهانگیری ۳۰۲، این بیت در جهانگیری شاهد آمده:

زشرم آب آن رخشنده خانی ❊ شده در ظلمت آب زندگانی

[5] رک: صحاح ص ۳۰۰ خوی عادت و طبیعت، دوم خود بود اعنی ترک که بر سر نهند، دقیقی:

سیاوش است پنداری میان شهر و کوی اندر ❊ فریدون است پنداری میان درع و خوی اندر

[6] موید ا: ۳۸۲ همین معنی بحوالهٔ قنیه نقل کرده. [7] رک: موید ایضاً، مدار ۲: ۱۴۲.

[8] موید ا: ۳۸۱ معنی مندرج متن بحوالهٔ قنیه درج نموده. [9] رک: موید ایضاً و مدار ۲: ۱۹۶.

[10] رک: مدار ایضاً: اما جهانگیری خیرو و خیری را دو گل جداگانه قرار می دهد، رک: ۲: ۲۲۶۸.

[11] کذا است در موید ایضاً؛ معین ا: ۱۴۲۵ اخشی بمعنی کبود رنگ و سیاه رنگ، و خشین بهمین معنی آورده، جهانگیری ۲: ۱۳۷۰: خشین و خشینه رنگ سیاه، صحاح ص ۲۳۹ خشین بمعنی سپید، و دوباره رنگ باز نه سپید نه سبز نه سرخ. اما قواس ص ۶۳: تز مرغکی بود کوچک و خشینه یعنی سپید، نیز رک: قواس همان صفحه حاشیه نمره ۱

گونۀ د

بهرۀ 'الف'

دارا : دارندۀ[1] همه و نام پادشاهی.
دروا : حاجت[2] و نگون یعنی باژگونه[3] آویخته و درباء[4] و دلوا نیز گویند.
دغا[5] : ناراست و فریب و بازی.
دندا[6] : مکر و فریب.

بهرۀ 'ب'

داب[7] : خصلت و شان و روش و جباری[8] و پیدا کردن[9] کر و فر.

بهرۀ 'ت'[10]

دارات[11] : داب کردن.

---

[1] گذاشت در ادات، حواس ص ۵ : دارا دارنده باشد. نظامی :
دارای زمین و آسمان اوست ÷ دارندۀ انس و جان اوست

[2] در موید ا : ۳۸۳ این معنی را بحوالۀ زفان نوشته، نیز رک : مدار ۲ : ۲۳۰. جهانگیری ا : ۹۸۶ :
دروا چیزی ضروری باشد، اسدی :
ز دروای ما هرچه بایست نیز ÷ نوشتست بر بارۀ گنج و چیز
در حاشیۀ جهانگیری : ولکن همه اجزای جهان از من خبری دارند از تغییر و تبدیل و دروای هر جزوی از خنکا و گرما. معارف بهاء ولد ۴ : ۹۵. [3] خاقانی گوید :
چه سنگر ماند از آن آتش که وقتی ÷ خلیل الله دران افتاد دروا

[4] رک : جهانگیری ایضاً درباء و بایست و دروایست نیز گویند، اما بمعنی ضرورت و حاجت.

[5] ادات و موید ا : ۳۸۳ : دغا ناراستی و ناراست و فریب.

[6] رک : موید ا : ۳۸۴.

[7] در موید ا : ۳۸۴ معنی اول این کلمه بحوالۀ زفان ذیل فصل عربی نوشته.

[8] مدار ۲ : ۲۰۲ : روش جباری.

[9] گذاشت در ادات که فقط یک معنی دارد. اما جهانگیری ا : ۳۰۵ داب بمعنی کر و فر، با این بیت مظهر شاید :
گر ببینی آن همه دارات و داب و دار و گیر ÷ که با مرشاه و رسم باستان آورده اند

[10] نسخۀ تاشقند (ل) از این جا شروع می شود.

[11] ادات : دارات پیدا کردن کر و فر.

دخت[1]: دختر.

دوست: یار.

درست: چیزی استوار.

دشت: زمین بیابان و نام ولایتی[2] در ترکستان.

دست[3]: چهار بالش و بنا برین وزیر را دستور گویند.

بهرهٔ ج[4]

داج[5]: تاریکی و سیاهی شب.

دوج[6]: گیاهی است.

درج[7]: آنچه دران پیرایهٔ عروس باشد. درج[8]: خط نقش آمیز.

بهرهٔ خ[9]

دوخ: آنچه که بچگان شب برات سوزند و آن گیاهی[10] است نرم که در مسجدها افکنند و ازو بوریا و فرشها بافند، بهندوی پتیره[11] گویند، بواو عربی و بغیر واو[12] نیز گویند.

---

[1] این واژه در نسخهٔ بانکیپور افتادگی دارد.

[2] در ایران چند جایها بدین نام اشتهار دارد، رک: لغتنامه شماره ۱۸۱ دشت - دل، ص ۵۰۴ و در جهانگیری ۲: ۱۳۷۱ دشت را دشت بیاض قرار داده که در خراسان است.

[3] موید ۱: ۳۸۶: دست: و در قنیه یعنی چارباش یعنی مسند و وزیر را که دستور می گویند هم بدین معنی که او صاحب مسند است. جهانگیری ۱: ۹۱-۱۲۹۰ دست صدر و مسند ملوک و صدور و اکابر و وزرا را گویند و آنرا چاربالش نیز خوانند. حکیم انوری:

زهی دست وزارت از تو دستور ❊ چنان کز پای موسی پایهٔ طور

[4] ل: بهرهٔ چهارم در آنکه جیم است.

[5] ادات: داج سیاهی شب و تاریکی آن؛ نیز رک موید ۱: ۳۸۷ و مدار ۲: ۲۰۲.

[6] رک: موید ایضاً.

[7] رک: ادات؛ اما در موید ۱: ۳۸۷ درج بالضم بهمین معنی عربی است؛ دستور الاخوان ص ۲۶۹: اُلدُّر عطردان زنان.

[8] رک: ادات؛ اما در مدار ۲: ۲۲۲ بدین معنی دانسته؛ دستور ص ۲۶۹ اَلدَّرج طومار و پیچ نامه.

[9] ل: بهرهٔ پنجم در آنکه خاست.

[10] برای این معنی رک: ادات و مدار.

[11] فرس ص ۸۰: دوخ: گیاهی بود نرم در مسجد افکنند و ازو بوریا و فرشها بافند.

[12] کذا است در ادات و شرفنامه ذیل دخ

[13] رک: فرس و مدار ۲: ۲۱۷.

درواخ[1]: آنکه از بیماری [۱۶۲ ا] به[2] شده باشد و برخاسته و به درستی[3] رسیده.

دوزخ[4]: جای بند و عذاب و سختی و درشتی و گرفت و رنج.

بهرهٔ د[5]

وند[6]: ابله و بی باک و خود کامه[7]، و نام[8] گیاهی است.

داشاد[9]: عطار[10].

دیوند[11]: نام داروئی است.

دُرد[12]: [شراب] تیره[13].

---

[1] رک: فرس ص ۷۸، صحاح ص ۶۴، قواس ص ۶۴۱: آنکه از بیماری برشده باشد و برخاسته (قواس)، ... که از نالندگی و بیماری بدر آمده باشد و بدرستی رسیده (فرس).

[2] نسخهٔ اصل ناخوانا، نسخهٔ ل: بر؛ متن تصحیح قیاسی.

[3] نسخهٔ اصل: بدرشتی.

[4] رک: موید ا: ۳۹۸.

[5] بهر ششم در آنکه دالست.

[6] ادات: دند مردم بی باک و خود کامه و ابله و نام گیاهی است؛ نیز رک: موید ا: ۳۹۰؛ در جهانگیری ۲: ۱۸۱۲ دند به نه معنی آورده از آنجمله همین دو است که در متن آمده.

[7] ل و جهانگیری: خودکام.

[8] نسخهٔ اصل: وگیاهی است.

[9] نسخهٔ اصل: درشاد، نسخهٔ ل: داناد.

[10] نسخهٔ اصل: عطارد، ل: عطارد. موید ا: ۳۸۸ داشاد خوشبوی فروش بتازیش عطار؛ برهان: داشاد و خوشبوی فروش و عطار نیز گویند اما در صحاح الفرس ص ۸۹، ادات، معیار جمالی، جهانگیری ا: ۶۱۳ بمعنی عطا و بخشش. و در جهانگیری بیت زیر از منوچهری شاهد:

زتیغ و زکینت حزین شد عدو ✤ ز داشاد تو شاد گردد ولی

و در صحاح بیت زیر از عنصری شاهد:

خواستم با نثار و داشادش ✤ پدر اینجا بمن فرستادش

ناگفته نماند که بیت منوچهری که در جهانگیری شاهد داشاد بمعنی عطا آمده، در مجمع الفرس سروری شاهد داشاب بمعنی دشمن درج شده بدینطور:

زکین تو غمناک گردد عدو ✤ ز داشاب تو شاد گردد ولی

بظاهر چنان بنظر می رسد که لفظ عطار تصحیف عطاست، سرمهٔ سلیمانی د ۱۰، و جعفری ۲۰۲ داشاد دهش.

[11] رک: ادات و موید ا: ۳۹۰. [12] ل: دود. [13] ل: تیره و نسخهٔ اصل: ←

درند : شکل[1] و سان[2]

دماوند[3]: کوهی است بلند که چاه هاروت[4] و ماروت آنجاست.

داد : عدل و راستی.

بهرهٔ ر[5]

داور : آنکه[6] میان نیک و بد یکسو کند یعنی حاکم و داوری[7] حکومت است.

دادار[8]: دهنده و این نام خدای تعالیٰ [است].

دسمر[9] : نوعی است از غله و گویند که آن شاغل[10] است که بهندی ارهر[11] گویند.

دادر[12] : برادر و دوست بزبان ماوراءالنهر.

دستور[13]: بفتح دال وزیر و اعتماد جائی[14]، و بضم در عربی استعمال کنند.

→ تیر ؛ متن تصحیح از روی ادات و مدار ۲: ۲۲۳.

[1] ادات و مدار ۲: ۲۲۹ : شکل وسان، نسخهٔ ل: دشنگل و برادر.

[2] مدار : در پنج بخشی (زفان) است : شکل و برادر.

[3] کوهی است که در شمال تهران است

[4] همین است در ادات و در موید ۱: ۳۹۰ دماوند ... نام کوهی بحدود ری که چاه بابل در آنست.

[5] ل: بهر هفتم در آنکه راست.

[6] قواس ص ۵، ادات عیناً همین معنی دارد، چنان بنظر می آید که یکی از دیگری بدون تحقیق نقل کرده.

[7] ادات و موید ۱: ۴۱۶ داوری میان نیک و بد یکسو کردن عرب آنرا حکومت خوانند، اما در قواس ص ۹۷، صحاح ص ۲۰۱، جهانگیری ۱: ۳۲۳ داوری بمعنی جنگ و خصومت موکد به اشعار:

زهر شما دخش ما چون همه حکم داور است ❊ داورتان خدای باد این همه چیست داوری (خاقانی)

تا بود در کارگاه عالم کون و فساد ❊ چار ارکان را بجسم گه صلح و گاهی داوری (انوری)

آب و آتش را اگر در مجلسش حاضر کند ❊ از میان هردو بردارد شکوهش داوری (انوری)

[8] قواس ص ۵: دادار دهنده، ادات : دادار اسم باری تعالیٰ است بمعنی دهنده.

[9] رک : قواس ص ۶۵ و ادات و موید ۱: ۳۹۲.

[10] رک: قواس و ادات و موید.

[11] برای این کلمهٔ هندی رک: موید و مدار ۲: ۲۴۸.

[12] این واژه با همین معنی عیناً در موید ۱: ۳۹۱ آمده.

[13] این واژه از نسخهٔ اصل افتاده ؛ اضافه از روی ل. [14] مدار ۲: ۲۴۷ دستور جای اعتماد ؛ اما دستور کسی باشد که برو اعتماد کنند رک ؛ ادات و موید ۱: ۳۹۲ ؛ برای اعراب کلمه رک : موید و مدار.

دستیار[۱] : یاری دهندهٔ ترسایان.

دبیر : نویسنده و منشی.

دیر : معبد و کلیسا.

دنبر[۲] : نام مقامی است.

دیمر[۳] : رخساره.

دختندر[۴] : دختر زن.

بهرهٔ ز[۵]

دز[۶] : حصار.

دباز[۷] : بفتح و کسر، بانگ و فریاد، و در فردوسی گوید : دباز غار و دره.

دمساز : یار موافق را گویند.

---

۱ ادات و موید ۱ : ۳۹۲ : دستیار یاری در پیشه وری، مدار ۲ : ۲۴۸ دستیار یاری ده ترسایان و یاری دهنده در پیشه الخ.

۲ رک : ادات، مدار ۲ : ۲۵۹ : دنبر نام مقامی است از هندوستان زمین، جهانگیری ۲ : ۱۱۱۲ دنبر نام شهری است از هندوستان و بعضی برانند که اسم گریوه ای بود در راه کشمیر. فردوسی، شاهنامه ۱/۱۴۴ :

همه کابل و دنبر و ناي هند ÷ ز دریای چین تا بدریای سند

۳ رک : ادات و موید ۱ : ۳۹۴.

۴ صحاح ص ۱۰۴ : دختندر دختر پدر باشد از زن دیگر، ادات و مدار ۲ : ۲۱۹ : دختندر دختر زن و دختر شوهر، نیز رک : موید ۱ : ۳۹۲.

۵ ل : بهر هشتم در آنکه زا است.

۶ ادات و موید ۱ : ۳۹۴ : دژ ؛ جهانگیری ۱ : ۱۲۰۱ دز یا اول مکسور قلعه باشد و بعضی بزای عجمی نیز خوانند، نیز رک : مدار ۲ : ۲۳۵.

۷ قواس ص ۱۹۲ دباز بمعنی اول آمده با بیت زیر از فرخی :

فرخی بندهٔ تو بر در تو ÷ از نشاط تو برکشیده دباز

در مدار ۲ : ۲۷۶ دباز به زای تازی و فارسی و رای مهمله بهر دو معنی مذکور در متن ؛ اما صحاح ص ۱۲۶ دباز بمعنی نعره با بیت فرخی، و ص ۱۰۶ دبار بمعنی غار و دره، همین است در حل لغات (مدار ۲ : ۲۷۶). اما ادات و رشیدی ص ۷۰۰ و ناصری ۳۹۶ فقط بزای عجمه و این کاملاً درست نیست زیراکه در منظومهٔ فرخی [illegible]

بهرهٔ ژ[1]

دژ[2]: بد و خشم ، و در اسدی[3] است: خشم بد.

بهرهٔ س[4]

دریواس[5]: چوبی که گرد در نهند برای محکمی یعنی آلتی که از چوب بود و در دیوار استوار کرده بود، و فردوسی[6] نوشته: گرد بر گرد خانه را دریواس گویند.

داس[7]: دهرهٔ[8] و آن آلتی است معروف ، بهندوی درانتی گویند.

دیس[9]: مانند و همتا و شکل و سان[10].

بهرهٔ ش[11]

درخش: برق و صاعقه ، بهندوی بجلی[12] گویند.

درفش: علم که برکنند.

درفش[13]: آنچه بدان چرم را سوراخ کنند برای دوختن.

داش[14]: تنور خشت پخته و کاسه.

---

[1] ل: بهرنهم در آنکه "ژ" است.

[2] رک: فواس ص ۹۳، صحاح ص ۱۳۶، ادات، موید ا: ۳۹۵، مدار ۲: ۲۳۵.

[3] در لغت فرس اسدی ص ۴۶۵: دژ آگاه یعنی بدآگاه و بخشم آمده.

[4] بهردهم در آنکه سین است.

[5] فواس ۱۲۶ دریواس بمعنی اول آورده، موید ا: ۳۹۶ و صحاح ص ۱۴۳: دریواس بهردومعنی.

[6] مدار ۲: ۲۲۴ از قول فردوسی همین معنی نوشته

[7] رک: صحاح ص ۱۴۳، انوری:

گاو گردون هرگز اندر خرمن عمرت مباد ÷ تا نه نوکشت زار آسمان را هست داس

[8] صحاح ص ۲۷۷: دهره داس کوچک باشد. [9] رک: فواس ص ۱۱۸، صحاح ص ۱۴۳.

[10] موید ا: ۳۹۶، مدار ۲: ۲۸۴: ساز و آن اشتباه است.

[11] ل: بهر یازدهم در آنکه شین است.

[12] موید ا: ۳۹۶ این کلمهٔ هندی دارد.

[13] ل: دردش. اما درفش دو معنی دارد، اول علم رایت درفشان دوم آنچه کفشگران و دوزان دارند، رک: صحاح ص ۱۵۱، ادات، موید ا: ۳۹۶ و غیر آنها.

[14] فواس ص ۱۳۱: داش تنور، اما ادات کذا در متن.

دروش[1] : کلک که حجام زند.

دخش[2] : آغاز کار.

دوش : کتف وشب گذشته.

درویش : فقیر یعنی مفلس حال و اصل معنیش درجوئی[3] است.

بهرهٔ غ[4]

داغ : نشان وآنکه داغ کنند.

دغ[5] : آنجا که موی نباشد ورق ۱۴۳ ا بعض لغ[6]، گویند دغسر[7] یعنی لغسر.

دریغ[8] : اندوه و دشوار، و این کلمه را در محل تاسف[9] استعمال کنند.

بهرهٔ ف

درخف[10] : زنبور سیاه.

بهرهٔ ک

دسوک[11] : هیزم باریک وبعضی بواو پارسی گویند و فتح دال.

دروک[12] : همان دسوک است وبعضی بضم دال گویند.

---

[1] رک : فواس ص ۱۸۵، ادات، مدار ۲: ۲۳۱؛ موید ۱: ۳۹۷ دروش وزن سروش بمعنی نشان و داغ.

[2] رک : ادات و موید ۱ : ۳۹۶، مدار ۲ : ۲۱۸ وخش و دخش هردو؛ شمس فخری بدین بیت استشهاد نموده :

بنام شهنشاه اعظم کنند ∴ سعود کواکب بهر کار دخش

[3] درویش از پهلوی driyosh ماخوذ است؛ اما ادات : درویش بمعنی جوینده از درها و موید ۱ : ۳۹۷ : درویش خواهنده از درها کذا فی القنیه.

[4] ل : بهر دوازدهم درانک غین است.

[5] رک : موید ۱ : ۳۹۹، مدار ۲ : ۲۵۱، جهانگیری ۲ : ۱۴۲۰.

[6] فواس ص ۸۹ : لغ بمعنی بی موی. [7] درنسخهٔ ل ندارد؛ مدار ۲ : ۲۵۱ دغسر سر بی موی؛ برهان : دغسر کسیکه سرش کچل و بی موی باشد.

[8] رک : موید ۱ : ۳۹۹. [9] نسخهٔ اصل ناخوانا، متن مطابق نسخهٔ ل.

[10] رک : ادات و مدار ۲ : ۲۲۴؛ موید ۱ : ۳۹۹ درجف اشتباه چاپی.

[11] رک : موید ۱ : ۴۰۰.

[12] رک : موید ۱ : ۴۰۰ و مدار ۲ : ۲۳۱.

دک[1] : زمین سخت که بران[2] پیدا نشود و از سختی پی[3] نگیرد.
دیلک[4] : خبزدوک[5] منقش.
دشک[6] : رشتهٔ درزی که برای جامه دوختن سازند وبعضی سین مهمله گویند.
دژک[7] : گره که در رشته افتد.
دوک[8] : بدانچه ریسمان تابند.
دیوک[9] : دیوچه که از زمین خیزد.

بهرهٔ گ

دنگ[10] : نقطه ونشان ، وگویند که دنگ دیوانگی وبیهوشی.
دشنگ[11] : بندآب ، وآنچه شاخ خرما برد[12] باشد.

---

[1] رک : قواس ص ۲۹ ، دستور ، ادات ، بحرالفضائل ، موید ۱ : ۴۰۰ (ذیل فصل عربی) ، مدار ۲ : ۲۵۳ (نیز عربی).
[2] نسخهٔ اصل : بدان (یک کلمه افتادگی دارد).
[3] قواس وموید : پی ؛ نسخهٔ اصل : کی.
[4] رک : قواس ص ۶۶ ، موید ۲ : ۱۵۷.
[5] برای خبزدوک رک : زفان : خبزدوک کرمی است منقش که آنرا سرگین غلطانک گویند وبعضی ہزارپا را گویند ، ادات : دیلک جانوریست خزنده وگروہی آنرا سرگین غلطانک گویند وعرب آنرا جعل خوانند.
[6] در قواس ص ۱۷۸ ، موید ۱ : ۴۰۰ و ادات : دسک بمعنی رشتهٔ دوختن. اما مدار ۲ : ۲۴۹ دشک باسین مهمله نیز.
[7] رک : قواس ص ۱۷۸ ، ادات ، موید ۱ : ۴۰۰ ، جہانگیری ۱ : ۴۳۴ ، رشیدی ص ۶۶۷ اما مدار ۲ : ۲۳۷ دژک و دشک را مترادف نوشته.
[8] مدار ۲ : ۲۷۳ : دوک آلت آہنین ریسیدن.
[9] رک مدار ۲ : ۲۸۹ ؛ اما ادات : دیوک کرم چوب خوراک که از زمین خیزد. و دیوچه درہمین فرہنگ (ادات) چوب اندام خارک که آنرا چوبک خوانند وجانوریست که بدان خون زایده بکشانند و اہل ہند آنرا جوک خوانند.
[10] رک : موید ۱ : ۴۰۱ دنگ برای ہردو معنی.
[11] در ادات دشنگ ، بہردو معنی مذکور در متن آمده ؛ در موید ۱ : ۴۰۱ دشنگ و دلنگ بعلاوه ہردو بمعانی دیگر آمده.

[درنگ[1]: آهستگی.
دلنگ[2]: بند آب و آن شاخ که خرما برو باشد[3] و گویند دلنگ میتین یعنی سبل.

بهرهٔ ل

داهل[4]: علامتهائی است که بر زمین اندازند و از بالای آن دام اندازند و بگسترند تا نخچیر از داهل نترسد و آهنگ دام کند و بدام افتد، و در تاجمین داهول[5] وزن معمول نبشته اند.
دنگل[6]: ابله و نادان[7].
دلال[8]: ناز و حسن.
دمل[9]: غلولهٔ بیماری یعنی رسولی.
دغل[10]: آنچه بیامیزند باچیزی، و گویند که دغل جنگل است یعنی درختان انبوه.
دغل[11]: دولاب و مردسفله.

---

[1] ادات: درنگ آهستگی و توقف.
[2] ادات: دلنگ باکاف پارسی بند آب و آن شاخ که خرما برو باشد و آن آلت آهنی دراز که سنگ شکنان دارند، گروهی آن را میتین و گروهی سبل خوانند. زفان: میتین کلند و آن تبری است که بدان چاهها و زمین کنند و کلند خوانند و سبل را نیز میتین گویند. نیز رک: مدار ۲: ۲۵۵.
[3] از درنگ تا اینجا در اصل افتاده و در حاشیه افزوده شده.
[4] رک: ادات و موید ۱: ۴۰۲ و مدار ۲: ۲۱۳ و جهانگیری: ۳۲۴.
[5] در موید و مدار، جهانگیری داهل و داهول هر دو صورت آمده.
[6] نسخهٔ اصل: داهول نترسد.
[7] ادات: دنگل ابله و بی اندام و نادان.
[8] ادات و مدار ۲: ۲۵۴.
[9] در اکثر فرهنگها این واژه عربی قرار داده شده، رک: موید ۱: ۴۰۲، مدار ۲: ۲۵۸، فرهنگ معین ۲: ۱۵۶۱.
[10] در ادات فقط معنی اوّل آمده؛ برای معنی دوم رک: مدار ۲: ۲۵۱، اما درین فرهنگ اخیر این واژه را عربی نوشته اند.
[11] دغل بمعنی مزوّر و حیله گر آمده است: رک: فرهنگ معین ۲: ۱۵۴، جهانگیری ۲: ۱۴۳۰. دغل مکر و حیله و ناراستی بود، و کسی را که دغلی کند نیز دغل گویند.
[12] کلمهٔ درست باید دول باشد، رک: جهانگیری ۲۰۰۰، مدار ۲: ۲۷۴، سرمهٔ سلیمانی ص ۱۱۰.

بهرهٔ «م»

دیهیم[1]: چتر پادشاه و در فرهنگنامه است و در اسدی است دیهیم: تاج و افسر.

داهیم[2]: کله مرصع بجواهر.

دژم[3]: اندوهگین و سرحسرت[4] فرود افکنده، اندیشه‌مند و مخمور را گویند.

درم[5]: نقش، گویند نقش سکه.

دام[6]: نخچیر، و گویند جانوری نادرنده چون شگال و روبه و بدانچه جانوری بند ند.

دیلم[7]: نام زمینی است که مردمان آنرا موی درهم باشد و پیچان چون برگ بنفشه.

درغم[8]: نام مقامی است.

بهرهٔ «ن»

دالان: دهلیز، و دالانه[9] بهانیز گویند.

---

[1] قواس ص ۱۵۰: دیهیم چتر پادشاهان، صحاح ص ۲۲۰: دیهیم تاج باشد الخ، دستور ص ۱۲۴: دیهیم تخت و کرسی، ادات: دیهیم چتر و تاج. ع۵ چاپ مجتبائی ۱۳۶۵ این کلمه نیست.

[2] موید ا: ۴۰۴: داهیم کلاه مرصع بجواهر که آنرا دیهیم نیز گویند الخ، فرس: داهیم کله بجواهر مرصع.

[3] قواس ص ۹۵: پژمان و دژم: مخمور بود، صحاح ص ۲۲۰: دژم غمگین و آشفته و پژمان باشد. ادات مخمور و غمگین.

[4] موید ا: ۴۰۴: سرپست و فرود افگنده.

[5] ادات: درم آنچه نقش سکهٔ شاهی برو بود.

[6] صحاح ص ۲۲۰: دام گستردهٔ صیادان باشد جهت صید و پارسیان نخچیر خوانند و عرب شبکه. ادات: دام آنچه صیادان بدان مرغان را صید کنند و جانور نادرنده چون شگال و روباه و آهو و امثال آن. نیز رک: دستور ص ۱۲۵، موید ا: ۴۰۳.

[7] ادات: دیلم نام ولایتی است که ساکنان آن ولایت موهای سرپیچیده دارند؛ بقول صاحب جهانگیری (رک: جهانگیری ۲: ۲۲۸۱) اکثر و اغلب حربهٔ آنها تیر و زوبین بود. در قرن چهارم تمام گیلان و ولایات کوهستانی که در مشرق گیلان و در سواحل دریای خزر قرار داشت یعنی طبرستان و جرجان و قومس جزء ایالت دیلم بود (جغرافیای تاریخی ص ۱۸۶). دیلم و دیلمان و دیلمستان مترادف اند، برای تفصیل رک: فرهنگ معین ۵: ۵۵۰ - ۵۵۱.

[8] درغم یکی از روستای سمرقند که انگور و شراب آن معروف بوده ایضاً ص ۵۲۳، خسروانی گفته:

فتاده در میان لاله‌زار بوستان ژاله ❊ چنان کز ساغر صافی شفق گون بادهٔ درغم

مدار ۲: ۲۲۶ - ۲۲۷. [9] رک: جعفری ۲۱۶.

دستان[۱]: مکر و حیلت یعنی شیوه و فن، و نام پدر رستم، و سرود.
دودمان[۲]: خاندان و اصل.
درزن[۳]: سوزن گویند، و درزنِ[۴] ترسا یعنی سوزن ترسا.
درغان: شهریست نزدیک سمرقند[۵] ازین سوی.
داستان[۶]: حکایت و فسانه و مثل.
درفشان[۷]: روشن و تابان.
دوستگان[۸] [۱۴۴ ا]: معشوق و محبوب که بر خط[۹] و جان خویش، وی را بگزیند.
دمان[۱۰]: تند و سخت حمله است.
دین[۱۱]: بیست و چهارم روز از ماه.

---

۱ ادات: دستان سرود و مکر و حیله و نام پدر رستم.
۲ رک: ادات و موید ۱: ۴۰۹.
۳ رک: قواس ص ۱۷۹، ۱۷۱، ادات، موید ۱: ۴۰۷، مدار ۲: ۲۲۵، جهانگیری ۱: ۹۷۸.
۴ خاقانی گوید:
چون موی خوک درزن ترسا بود چرا ٭ تار ردای روح بدرزن در آورم
دیوان ص ۲۱، همین بیت در قواس و جهانگیری و رشیدی ص ۶۵۵ شاهد درزن آمده.
۵ همین جای وقوع در اسدی و موید ۱: ۴۰۷ بیان گردیده؛ درغان شهری بود برکنار آمو که اول حدود خوارزم شمرده می شد (مراصد ص ۵۲۳). بگفتهٔ جغرافیای تاریخی ص ۴۸۰ و مسالک و ممالک ص ۲۳۵: در یک منزلی شمال طاهریه نزدیک تنگ رود جیحون شهر درغان است که بقول مقدسی باندازهٔ جرجانیه است، نیز رک: معجم البلدان که مولفش در سال ۶۱۶ھ آن شهر را دیده بود.
۶ موید ۱: ۴۰۶: داستان حکایت و مثل و شهرت و افسانه.
۷ درفشان و درخشان هم معنی اند، موید ۱: ۴۰۷ معنی درخشان بگفتهٔ زفان نقل نموده.
۸ نسخهٔ اصل: دوستان. دوستکام و دوستگان بمعنی محبوب و معشوق است. رک: فرهنگ معین ۲: ۱۵۷۷-۷۸، نیز ادات، موید ۱: ۴۰۵، ۴۰۹، مدار ۲: ۲۷۰، اما جهانگیری ۲: ۱۹۹۶ دوستکام دوستکامی، دوستگان، دوستگانی بمعنی شرابی نوشته. دوستان با دوستان یا بیاد دوستان بنوشند.
۹ کذا است در اصل: اما ادات: دوستگان آن که او را از جان و تن عزیز دارند و مرادات او برمرادات خویش بگزینند.
۱۰ موید ۱: ۴۰۸: دمان تند و تیز رفتن و سخت حمله کردن. و استعمالش اکثر مرکب است چنانکه پیل دمان. مدار ۲: ۲۵۶: دمان تند و سخت حمله و مست و این لفظ به ترکیب مستعمل است چنانکه پیل دمان الخ.
۱۱ در مدار ۲: ۲۸۶ معنی ۲۱، ۱۰ و ... [illegible]

بهرهٔ 'و'

واو[1] : دشنام و دیلوار و نوبت نردبازی.

بهرهٔ 'ه'

داه[2] : ده یعنی عشره، و دایه وکنیزک.
دستینه[3] : توقیع ومثال وگویند مثال اوتیغی[4]، و دستوانه[5] نیز باشد.
دوله[6] : گردباد و پیمانهٔ شراب.
دسته : بضم[7] دال، سنگ و بفتح قبضهٔ شمشیر است.
دمه[8] : برف ونمی که از غایت سرما بریزد.
دوسنده[9] : بضم دال وبلغتی دال مفتوح، زمین چرب ولغشان.
دوژه[10] : گیاهی است که بجامه آویزد و سلک[11] نیز گویند.
دیوچه : چوب اندام[12] خارک یعنی دیوچک[13] وآنکه بدان خون کشانند، وکرمی است که در آب باشد و کرمی است که در گل میگردد.

---

[1] رک : ادات و موید ا : ۴۱۰، مدار ۲ : ۲۱۳.
[2] ادات : داه دایه وکنیزک وعدد ده که عرب آنرا عشر خوانند.
[3] موید ا : ۴۱۳ : دستینه یاره که آنرا دست برنجن نیز گویند و توقیع ومثال.
[4] یک کلمه در اصل ناخوانا. ممکنست دستهٔ تیغ باشد، رک : جهانگیری ۱۳۰۳.
[5] جهانگیری ا : ۱۲۰۰ : دستوانه دست برنجن بود و آنرا دستیانه و دستینه نیز گویند؛ بنابرین واضح است که از لحاظ معنی دست برنجن دستوانه و دستینه مترادف اند، نه از لحاظ فرمان و مثال؛ واضحاً معنی دست برنجن از نسخهٔ اصل زفان افتاده است.
[6] ادات : دوله پیمانهٔ شراب وگردباد، نیز رک : موید ا : ۴۱۵.
[7] رک : ادات و موید ا : ۴۱۳ و جهانگیری ا : ۱۳۰۲.
[8] رک : قواس ص ۲۱، موید ا : ۴۱۴، مدار ۲ : ۲۵۹.
[9] قواس ص ۴۱۵ : دوسنده زمین چرب وچفسان، موید ا : ۴۱۵ : دوسنده زمین چرب ولغشان وچفسان وچفسیده. اما ادات : دوسیده بهمین معنی.
[10] رک : ادات، موید ا : ۴۱۵
[11] رک : موید ا : ۴۹۴.
[12] نسخهٔ اصل خوب اندام، امارک قواس ص ۴۹ و ادات و موید ا : ۴۱۵.
[13] در ادات و موید : چوبک.

دوشیزه : بکر یعنی دختری شوی ناپیوسته.

دخمه[1] : گورخانه و مدفن گبران ، و گویند گنبد که برسر گور بود و گویند دخمه جایگاهی بود چهارگوشه[2] کاویده ، زبر او پوشش کرده ، و نردبانی و دری درو نهاده ، هر آدمی که بمیرد در تابوت کنند و دران نهند ، و این را سردابه[ع] نیز گویند .

دوره[3] : پیمانهٔ شراب .

دله[4] : مشدّد و غیر مشدّد ، دلق و آن جامه است ، و نیز گربهٔ دشتی[5] ، بتازی دلق[6] .

دژبیه[7] : غدود و بعضی دژبیه .

درونه[8] : کمان نداف .

دنه[9] : نعمت گویند ، دنه پسند[10] یعنی نعمت پسند .

---

[1] رک : ادات و موید ا : ۴۱۲ و مدار ۲ : ۲۱۸ . [2] مدار محل چهارگوشه . [ع] رک : مدار .

[3] رک : قواس ص ۱۳۷ و ادات و موید ا : ۴۱۴ و مدار ۲ : ۲۶۹ .

[4] قواس ص ۱۵۴ : کول و دله و جامهٔ گدا الخ .

[5] رک : ادات و موید ا : ۴۱۴ س ۲ . [6] فرهنگ معین ۲ : ۱۵۵۲-۵۳ دلق بفتح لام ، (Dalaq) معرب دله بمعنی گربهٔ صحرائی و بمعنی جامهٔ دلق بسکون لام است .

[7] قواس ص ۱۶۲ : دژبیه ، ادات : دژنیه ، موید ا : ۴۱۳ : دژنیه و دژنیه نیز رک : رشیدی ص ۶۴۴ .

[8] رک : فرس ص ۴۴۶ ، قواس ص ۱۸۲ ، صحاح ص ۲۷۷ ، موید ا : ۴۱۳ وغیره .

[9] ادات : دنه بفتح دال نعمت و بضم نغمه ، سرمهٔ سلیمانی ۱۱۳ دنه نعمت و شادی .

[10] بگفتهٔ موید همین مثال در ادات است ، اما نسخهٔ حاضر این را مورد تایید قرار نمی دهد ، نیز رک : مدار ۲ : ۲۶۲ دنه بمعنی نغمه ، دنه پسند بمعنی نغمه پسند . بظاهر چنان بنظر می آید که در ضبط معنی دنه فرهنگ نویسان دچار اشتباه شده اند ، در اصل نعمت تصحیف نغمه است ، دنه پسند بمعنی نعمت پسند یعنی چه ؛ جهانگیری ۲ : ۱۸۱۶ دنه بمعنی صدا و ندا و زمزمه از غایت خوشی و نشاط و بیت منوچهری :

تا توانی شهریار را روز امروزی مکن ❊ جز بگرد خشم غرامش جز بگرد دن دنه

و بیت کمال اسماعیل شاهد آورده :

حاش لله گر کند پیوند با طبع تو غم ❊ طبع غم را از نشاط آن پدید آید دنه

نیز رک : دیوان منوچهری تعلیقات ص ۸۷ ، ۸۸ . دکتر معین فرهنگ ج ۲ ص ۱۵۶۶ دنه بمعنی خوشحالی ، شادی ، زمزمه از خوشحالی ، آهنگ مخصوص آورده و اسم مصدر از مصدر دنیدن بمعنی دویدن از نشاط و خوشحالی نوشته .

دغدغه[1]: غلغج یعنی گدگدی.

دوژنه[2]: نیش پشه و کنه[3].

دره[4]: دهان و شکنبه، و تنگنای میان دو کوه.

دوده: خاندان و فرزند مهین پسر[5].

دبیله[6]: غلوله و آن جمعی است، و بعضی دبیله بفتح دال و کسر با گویند.

دسته[7]: گستاخی کردن و گستاخ گردانیدن مردم.

دبیره[8]: طنبور و آن سازیست که می زنند.

درسه[9]: عفو.

دستگاه[10]: مایه را گویند و قوت و قدرت، مصراع: زمانه بخش و کان دستگاه و بحر نوال

درغاله[11]: راه کوه.

دریوزه[12]: جستن از درها (ورق ۱۴۵) یعنی گدائی.

درمنه[13]: گیاهی است در خراسان که اسبان می خورند و گویند که مرده[14] است بتازی آنرا شیحه گویند[15].

---

۱ عیناً همین معنی همراه مترادف هندی در ادات آمده، نیز رک: موید ۱: ۴۱۲، مدار ۲: ۲۵۱: اگر غلغلیج و غلغلیج، غلیج درست نوشته اند (رک: جهانگیری ۲: ۱۴۳۱) اما در فرس ۶۲ و صحاح ۵۸ غلغلیج بابیت شاهد آمده.

۲ رک: قواس ص ۶۷، دستور ص ۲۳، ادات، موید ۱: ۴۴۱. ۳ نسخهٔ اصل: کنه؛ اما کنه بمعنی نارد یعنی کلنی، رک: قواس ص ۶۷، دستور ص ۴۰، نیز زفان ذیل ن. ۴ قواس ص ۹۶، ادات، موید ۱: ۴۱۳. ۵ ادات و موید ۱: ۴۱۴، مدار ۲: ۲۶۷؛ قواس ص ۹۸: دوده پسر.

۶ رک: قواس ص ۱۶۲، ادات، موید ۱: ۴۱۳، ابن سینا در قانون 'دبیلة الکبد' آورده، بنا برین این را عربی باید دانست. رک: قواس ص ۱۶۲ ح ۶. ۷ رک: موید ۱: ۴۱۳.

۸ رک: موید ۱: ۴۱۴ و مدار ۲: ۲۶۰. اما تبیره بمعنی دهل است، منوچهری گوید:

تبیره زن بزد طبل نخستین ❊ شتربانان همی بندند محمل

۹ رک: ادات و موید ۱: ۴۱۲. ۱۰ رک: ادات و موید ۱: ۴۱۳.

۱۱ رک: ادات و موید ۱: ۴۱۲ و مدار ۲: ۲۲۶.

۱۲ ادات: دریوزه جستن از درها ای گدائی کردن الخ.

۱۳ ادات: درمنه بفتح و کسر دال گیاهی است که اسپان را چرانند.

۱۴ موید ۱: ۴۱۲ همین معنی را بحوالهٔ ادات نوشته اما در نسخهٔ ادات که مورد مطالعهٔ بنده است، یک کمی فرق دارد.

۱۵ موید: شیح و شیحه و در دستور الاخوان ص ۳۷۶: الشیح درمنه، اما نسخهٔ اصل: سیحه.

دوله[1] : آنکه خود را چیزی داند و مکر ورزد.

درخشنده[2] : تابان.

دبدبه : آوازهٔ[3] بزرگی و زدن طبول و سازها برای اظهار بزرگی.

دربه[4] : پیوند.

دهره[5] : دشنه و تیغ سرپهن.

دوشه[6] : آوندی که دران گاو و گوسپند بدوشند.

دودله[7] : بازی است که بتازی قله[8] گویند و این را دوداله و دادواله[ع] و دادله نیز گویند.

دیزه[9] : اسب[10] که نزدیک سبز اندام بود.

دسیجه[11] : مرغی است.

---

[1] رک : ادات ، موید ا : ۴۱۵ ، مدار ۲ : ۲۷۴. [2] رک : موید ا : ۴۱۲.

[3] در موید ا : ۴۱۲ همین معانی عیناً بحوالهٔ شرف نامه درج شده.

[4] جهانگیری ا : ۹۷۵ دربه پارچهٔ پیوند ، موید ا : ۴۱۲ : دربه پیوند و بارهٔ درخت.

[5] نسخهٔ اصل : دبره ؛ اما رک : مدار ۲ : ۲۷۷ ؛ در موید ا : ۴۱۵ دهره بمعنی داس بحوالهٔ زفان گویا آمده : اما از نسخهٔ حاضر تایید این معنی نمی شود.

[6] رک : موید ا : ۴۱۵.

[7] رک : قواس ص ۸۷ ؛ همین زفان در بخش دوم دوداله را بمعنی بازی و آن برگشتن است در بازی و این را دودله نیز گویند ، و در همین بخش دوم خاک نمک را مترادف دوداله نوشته موید ا : ۴۱۴. دوداله و دوواله و دودله سه صورت نوشته.

[8] در برهان نوشته که درین بازی دو چوب بکار می برند ، چوب کوچک را بعربی قله و چوب بزرگ را مقلاه خوانند ، دستور ۵۰۲ القله دودله. [ع] کذا است در اصل.

[9] موید ا : ۴۱۵ دیژه با زای فارسی ؛ اما مدار ۲ : ۲۶۴ : دیزه رنگ اسب که نزدیک به سبزی بود. جهانگیری ۲ : ۲۲۷۸ دیز بمعنی رنگ و لون ، رنگ سیاه ، رنگ خاکستری بسیاهی مائل که مخصوص بود به اسب داشت و خر. اما در فرهنگ معین ۲ : ۱۵۹۳ دیزه بمعنی اسبی که قوایم اسش سیاه باشد.

[10] نسخهٔ اصل : است.

[11] موید ا : ۴۱۴ دسیجه بجیم فارسی . اما جهانگیری ۲ : ۱۶۹۹ دسیجه پرنده ایست که بعربی صعوه خوانند حکیم خاقانی :

چو موسیچه سر بر سر هوا کش ⁂ چو دسیچه دم بر زمین زن

بهرهٔ 'ی'

دی[۱] : زمستان و آفتاب در جدی که آنرا دی ماه گویند ، ونهم روز از ماه.

دژخی : بفتح دال و بلغتی مکسور دال ، گرفته[۲] روی و درفرهنگنامه است بندیان[۳].

درای : جرس یعنی آنکه درگردن[۴] شتر بندند ، هندوی گهانٹی ، وبفتح دال[۵] نیز گویند

دورای[۶] : نای و گویند نوعی از ساز طرب است.

دشنگی[۷] : بدوفتحت ، روزگار وبعضی بفتح دال وسکون شین گویند.

دولی[۸] : دغاباز.

داوری[۹] : حکومت گری.

دیلمی : قومی اند ترک ، مویهای ایشان ایستاده و پرخم باشد چون موی حبشیان وایشان[۱۰] بسرداری نسبت کنند.

گونهٔ 'ر'

بهرهٔ 'الف'

رخشا[۱۱] : رخشان بحذف نون.

روهینا[۱۲] : پولاد.

رعنا[۱۳] : ست وگل زرد.

۱ە رک : موید ا : ۴۱۹.

۲ە برای همین معنی رک : مؤاس ص ۹۵ ، ادات ، موید ا : ۴۱۷ ، مدار ۲ : ۲۳۶.

۳ە این معنی درفرهنگهاکه مورد استفادهٔ بنده است دیده نشد. فقط درموید این معنی بحوالهٔ زفان در ج ش ۵.

۴ە موید ا : ۴۱۷ همین معنی بحوالهٔ شرفنامه وبگفتهٔ زفان فقط جرس نوشته. نیز رک : ادات.

۵ە ادات : قیل بکسر دال.

۶ە رک : ادات ، اما موید ا : ۴۱۸ و مدار ۲ : ۲۶۹ دوزای و دورای هر دو را بهمین معنی آورده.

۷ە رک : مؤاسس ص ۶۱ ، دستور ص ۱۲۹ ، ادات ، موید ا : ۴۱۷ ، مدار ۲ : ۲۵۰.

۸ە موید ا : ۴۱۹ : دولی یعنی دغابازی ؛ مدار ۲ : ۲۶۷ : دودلی بمعنی دغابازی نوشته.

۹ە داوری بمعنی جنگ وخصومت است ، رک : مؤاسس ص ۹۷.

۱۰ە موید ا : ۴۱۹ همین معنی را کاملاً بدون حواله نوشته.

۱۱ە رک : موید ا : ۴۲۳ ، مدار ۲ : ۳۱۳. ۱۲ە روهینا - روهینا نوعی از پولاد برّان وقیمتی

۱۳ە ادات : رعنا زنی ست وگلیست زرد ، معیں رعنا (عربی) زن احمق ، ست ، زیبا.

بهرهٔ «ب»

رباب[1] : نام مردی که عاشق دعد[2] بود، و نام سازیست معروف.

بهرهٔ «ت»

رشت[3] : گرد و خاک.

رست[4] : رسته یعنی صف، و رهاشده.

رخت[5] : اسباب و بنه و ساز.

رماست[6] : گونه ای از علک رومی[7]. [رعونت[8] : رعنائی[9] و سرکشی و نادانی کردن و خودی[10]].

بهرهٔ «ج»

رونج[11] : عصیب، و در بعضی فرهنگنامه ها است رونج[12] بفتح را و کسر واو و سکون با، عصیب و روده.

ریواج[13] : گیاهی است که بتازی ریباس گویند [۱۴۶ ا] و بهندوی چکری.

بهرهٔ «خ»

رخ[14] : نام جانوری که رخ شطرنج بدان وضع کرده اند، و عنان اسب، و جانب روی که رخساره گویند.

رخ[15] : معروف.

---

[1] رک : ادات و مدار ۲ : ۳۰۷. واضحاً این عربی است.

[2] اگرچه شعرای فارسی رباب و دعد را عاشق معشوق قرار داده مانند مجنون و لیلی، اما اصلاً دعد و رباب نام دو زن بود، رک : تعلیقات دیوان سراجی ص ۵۴۵ - ۵۴۷.

[3] رک: ادات و موید ا : ۴۲۵.

[4] موید ا : ۴۲۵ : رست بالفتح خلاص یافت و رسته ای صف و رهاشده الخ.

[5] رک : موید ا : ۴۲۵، مدار ۲ : ۳۱۲.   [6] موید ا : ۴۲۵ : رماست نوعی از علک رومی.

[7] زفان : علک کندر، مدار: نوعی از علک رومی کندر.   [8] ازین جا تا آخر در حاشیه افزوده.

[9] برای این معنی رک : فرهنگ معین ۲ : ۱۶۶۲.   [10] خودبینی، خودپسندی درست است.

[11] ادات : رونج جگر آگنده که عرب آنرا عصیب خوانند، موید ا : ۴۲۶ : رونج به فتحتین امعاء گوسپند بگوشتابه پرکرده کذا فی شرفنامه و در بعضی فرهنگنامه ها است رونج الخ.

[12] مدار ۲ : ۳۳۹ رونج قیل بکسر واو و بجای نون یا.

[13] رک : ادات و موید ا : ۴۲۶ : مدار ۲ : ۳۴۸ : ریواج.

[14] کذاست در موید و مدار   [15] رک : موید ا : ۴۲۷.

بهرهٔ 'د'

اودد[1] : بفتح واو و بضم لغتی است ، جائی که آنجا پشته‌ها بود ، و فراز و نشیب بسیار باشد و تیرگی آب روان و سبزه ها که بدان رسته بود.

ر د[2] : دانا و خردمند و حکیم و بخرد و پهلوان[3] نیز.

راد : سخی یعنی جوانمرد.

رود : جوی و تارهای ساز.

ریوند : داروئی است ، سردی[4] آرد.

رند[5] : منکر باشد.

رشنواد[6] : نام مردی.

بهرهٔ 'ر'

رامر[7] : نام شهریست که ابریق را بدان نسبت کنند ؛ گویند ابریق رامری.

روار[8] : آنرا گویند که کسی که بندی یا زندانی باشد ، اورا خدمت کند.

---

1. قواس ص ۳۰ : رادود جائی باشد پشته پشته با سبزه و آب عسجدی گوید :
الا تا زمین از کوه پدید است وره ازسد ❊ یکوه اندر زراست و بره بر شخ و رادود
و درصحاح افزوده : در بعضی از نسخه‌ها زاود بزای عجم نویسند ، مدار ۲ : ۳۰۴ راود و رادود و زاود و زواد هرچهار آورده ، درصحاح این بیت شاهد درج است :
فسیله به رادود همی داشتی ❊ شب و روز بردشت بگذاشتی
2. قواس ص ۸۸ : رد یعنی دانا و حکیم و خردمند.
3. مویدا : ۴۲۷ و بمعنی پهلوان نیز آمده.
4. مویدا : ۴۲۸ در بعضی کتب طب است که سردی آرد.
5. ادات : رند منکری که انکار او از زیرکی و کیاست بود نه از جهل و حماقت ...
6. جهانگیری ۲ : ۱۳۷۹ : رشنواد نام یکی از اسپهبدان همای بنت بهمن است ... فردوسی :
یکی مرد بُد نام او رشنواد ❊ سپهبد بد و هم سپهبد نژاد الخ
7. ادات : رامر نام شهریست که ابریق‌ها را بدو نسبت کنند و گویند ابریق رامری.
8. کذاست در ادات ، اما مویدا : ۴۲۹ : روار خدمتگار بندیان و قیل با زاء معجمه. در اصل این واژه بازای تازی است ، چنانچه خود درهمین فرهنگ زفان ذیل گونه "ز" آمده : زوار خدمتگار بندیان و زنده ضد مرده الخ ؛ و در فرس ص ۱۳۰ و صحاح ص ۱۰۶ و قواس ص ۹۴ و مدار ۲ : ۳۹۳ نیز زوار بمعنی خدمتگار بندیان با بیت شاهد.

بهرهٔ ز

راویز[1]: شترغار[2] و این نام گیاهی است که شتران خورند و از بیخ اچار کنند.

رز : انگور.

رستخیز: قیامت و رستاخیز نیز گویند.

ریاز[3]: جامه.

راز : سخن نهان، وگل گر[4] که بتازی طیان[5] گویند.

ریز[6]: مراد و هوا و کام.

بهرهٔ س

رس[7]: گلوبند زنان.

روس : ولایتی در ترکستان.

بهرهٔ ش

رخش : نام اسب رستم پهلوان، مثل گویند: رستم را هم رخش رستم کشد.

رخش : قوس الله آنکه او را خلق از جاهلی کمان رستم گویند و قوس مطلق[8] را نیز رخش گویند و دراسدی[9] است رخش عکس[9] باشد.

---

۱ قواس ص ۴۲ ؛ راویز شترغار، دستور ص ۱۴۰ : راویز ورادیج شترغار، ادات : راویز گیاهی است ... و این غذای شتران است واشترغار نیز گویند.

۲ کذاست در قواس و دستور و ادات وغیره، اما درهمین فرهنگ زفان واژهٔ مخصوص اشترغاز وشترغاز است نه شترغار که دراینجا آمده، از برهان واضح می شود که اشترخار و شترخار واشترغار وشترغار یکی است، رک : فرهنگ قواس ص ۴۲ ح ۱. ۳ رک : ادات و موید ۱ : ۴۳۱، مدار ۲ : ۳۴۷. ۴ موید ۱ : ۴۳۰ این معنی بحوالهٔ زفان نوشته.

۵ دستور ۲۱۴ طیان بگل گر. ۵ رک : ادات و مدار ۲ : ۳۴۴.

۶ رک : ادات و موید ۱ : ۴۳۱ و ۲ : ۳۱۶. ۷ برای این معنی رک: مدار ۲ : ۳۱۳، سکندری : قوس الله که جبلا او را قوس الله گویند. ۸ لغت فرس نسخهٔ پاول هورن ص ۱۵ رخش بمعنی قوس قزح، چاپ مجتبائی کذا در متن. ۹ معین ۲ : ۱۶۴۴ رخش بمعنی عکس نیز، رک: مدار ۲ : ۳۱۳ بگفتهٔ معین واضح است که رخش از مصدر رخشیدن بمعنی درخشیدن مشتق است؛ صحاح ص ۱۵۲ رخش بضم را بمعنی عکس و شعاع با بیت عنصری بطور شاهد، نیز فرس:

زخون دشمن او شد بحر مغرب جوش ÷ فکند تیغ بمانیش رخش در عمان

ﺑﺶ : مسافت[۱] میان دو دست چون فراز کنی و آنرا بتازی باع[۲] گویند یعنی آغوش فراز کرده و سرشک[۳] باران خرد قطره و هیژدهم[۴] روز از ماه .

اشش[۵] : انبار غله .

اشش : سرور[۶] و شادی و طرب .

بهرۀ ‹غ›

اغ[۷] : دامن کوه بجانب صحـــراکہ فرود رود و درفرهنگنامه است : صحرا گویند ، و در فردوسی[۸] است : بنِ کوه و گویند زمین کشت .

بهرۀ ‹ف›

اف[۹] : جابتری .

---

۱ معنی اول عیناً در ادات و موید ا : ۴۳۲ درج است .

۲ معین ا : ۴۶۱ : باع طول از سرانگشت دست راست تا سرانگشت دست چپ .

۳ کذا است در ادات و بحرالفضائل ، و درین معنی این کلمہ عربی است ، رک : جہانگیری ۲ : ۱۳۷۶ ، ماده رس بمعنی تراویدن . سراشک بمعنی قطرہای باریک از باران (مدار ۲ : ۴۵۸) .

۴ رک : جہانگیری ۲ : ۱۲۷۵ ، عنصری :

درآمد دران خانۂ چون بہشت ❊ بروز رشس از ماه اردی بہشت

۵ کذا است در ادات و موید ا : ۴۳۲ و جہانگیری ا : ۳۲۹ ؛ در موید افزوده کہ عوام الناس راش گویند ، (در استان اترپردیش بعضی جاہا انبار غلہ کہ در خرمن باشد راس گفتہ می شود) . در حاشیۂ جہانگیری بیت زیر از سنائی شاهد درج است .

خاک را تشنگی دہی گہ راشش ❊ از یکی صد ہمی دہی پاداش

بگفتۂ جہانگیری راشش و راژ هر دو مترادف اند و در فرس ص ۱۸۰ و صحاح ص ۱۳۸ راژ بمعنی تودۂ غلہ و بیت لبیبی شاهد آمده . و درین فرهنگ از راشش صرف نظر شده چنانکہ از "راژ" در ادات و زفان و غیر آنها .

۶ ادات ، موید ا : ۴۳۲ ، مدار ۲ : ۳۰۳ همین سہ لفظ را آورده ، بدینجہت واضح است کہ فرهنگ نگاران از یک دیگر نقل نموده اند .

۷ ادات : راغ دامن کوه بجانب صحرا و صحرا و بن کوه و کشت ، و در موید ا : ۴۳۳ 'بجانب صحرا کہ فرو رود' بر ادات اضافہ دارد .

۸ این لغت کہ در مآخذ جہانگیری آمده ، الآن پیدا نیست .

۹ موید ا : ۴۳۵ : راف جابتری کہ آنرا لبساس گویند .

رف[۱]: آنچه در دیوارها برون داشت جای نشست[۲] [ورق ۱۴۷ ا] و این در عمارتهای خراسان است.

بهرهٔ ک

رک[۳]: کسی که با خود از تندی و خشم آلودگی نرم نرم سخن گوید، گویند فلان می رکد.

راک[۴]: دنبهٔ سر زن، و کاسه[۵] که بتازی جفنه[۶] گویند.

رمژک[۷]: بفتح زای پارسی و ضم است، شخیدن یعنی گناه کردن و لغزیدن.

رشک[۸]: بکسر را، ریم و ژولیدگی.

رشک: بفتح را، غیرت و حسد و کرمیست که بتازی صواب.

ریدک[۹]: کودک و نام مردی.

ریک[۱۰]: سخنی است که بجای دیحک باشد.

بهرهٔ گ

رنگ[۱۱]: بزکوهی و گوزن و آهو و آنچه در دشت باشد و حیله و مکر و گونه و شکل و در فرهنگنامه

---

۱ ادات و موید ا: ۴۳۴ : رف آنچه در دیوار عمارت برون داشت برای نشست مردم کنند و این نوع عمارت در ملک بالا بود. ۲ نسخهٔ اصل: نشیب.

۳ معنی این کلمه عیناً در ادات و موید ا: ۴۳۵ و مدار ۳۲۶ یافته می شود.

۴ نواسس ص ۷۵، دستور ص ۱۴۱، ادات، مدار ۲: ۳۰۳. راک: دنبهٔ سر زن.

۵ نسخهٔ اصل: کامه.

۶ مدار ۲: ۲۰: جفنه کاسهٔ بزرگ نیز دستور الاخوان ۱۹۷.

۷ نواسس ص ۱۸۹: رمژک: شخیدن، و در زفان شخیدن بمعنی لغزیدن و از جای فرو خریدن و گناه کردن الخ. ادات: رمژک با زای فارسی از جای فرو خزیدن و لغزیدن و گناه کردن. ۸ موید ا: ۴۳۵: رشک بالفتح غیرت و بالکسر ریم و ژولیدگی کذا فی شرفنامه و در قنیه رشک بالکسر کرمی بتازی صوابه خوانند و نیز غیرت و دبرین معنی بفتح راست، و در ادات رشک آن چیز... عرب آنرا غیرت خوانند و کرمی است بتازی صواب گویند. مدار بکسرمیم بمعنی ریم و ژولیده و کرمی نوشته و معنی اخیر محل نظر است.

۹ صحاح ص ۱۸۱: ریدک غلام و کنیزک و کودک. جهانگیری ۲: ۲۲۸۹: ریدک بمعنی پسران امرد. اما موید ا: ۴۳۶ و مدار ۲: ۳۴۴ ریدک بمعنی کودک و نام مردی کذا است در متن.

۱۰ رک: موید ا: ۴۳۶، و در مدار بعلاوهٔ معنی نیک بخت بحوالهٔ پنج بخشی معنی درج متن است.

۱۱ رک: موید ا: ۴۳۶، مدار ۲: ۳۳۱؛ در جهانگیری ۲: ۱۸۱۹ رنگ به سی و یک معنی آمده.

است : جلاجل وبعضی بزای معجمه گویند.

رچگ[۱] : آروغ

بهرهٔ ل

رسیل[۲] : پیرو.

بهرهٔ م

رزم[۳] : نبرد جای یعنی جنگ جای.

رام : فرمان بر[۴] و نرم گردن و نام هادی[۵] است از زمین هند، وبیست[۶] ویکم روز از ماه.

بهرهٔ ن

روان : جان وبعضی بفتح را گفته اند.

رمین[۷] : سرکش و زین استوار.

رخبین[۸] : با یای پارسی، دوغ ستبر مانند پنیر.

---

۱ رک : موید ۱ : ۴۳۶.

۲ مدار ۲ : ۳۱۹ : رسیل (عربی) همراه وهمرو در تیراندازی وپیغام فرستاده وقیل پی رو؛ نیز رک: معین ۲: ۱۶۵۵ درین فرهنگ این کلمه عربی قرارداده شده.

۳ کذاست در ادات اما در اکثر فرهنگها رزم بمعنی جنگ ونبرد است، در موید ۱ : ۴۳۷ آمده : رزم بالفتح جنگ کذافی شرفنامه و در ادات وزفان گویا بمعنی جنگ وجدال و در لسان الشعرا بمعنی جای جنگ و نبرد، اما در ادات و زفان بمعنی جنگ جای آمده نه جنگ وجدال

۴ دومعنی اوّل در ادات آمده.

۵ کذاست در موید ۱ : ۴۲۷؛ مدار ۲ : نام وادیٔ.

۶ رک : موید ۱ : ۴۳۶

۷ فرس ص ۳۷۸، صحاح ص ۲۴۳ : رمین بمعنی مکار وکینه ور، ودر جهانگیری بیتهای سنائیٔ واسدی شاهد این معنی درج شده، بیت سنائیٔ :

ای بطریق باطل پویان توروز و شب ❊ داده عنان خویش بشیطان رمینی

وبیت خاقانی که در قواس ص ۶۹ شاهد معنی سرکش آمده، شاهد بمعنی دغاباز و مکار است :

ازین رمین آید کرم، نی شاید ❊ ز ریم آهن اقلیمیائی نیابی

رمین بمعنی اسب سرکش نوشته واین نیز غلط و اشتباه است، دستور ۲۴ مانند قواس رمین سرکش.

۸ در ادات و موید چون معنی متن عیناً درج شده بنا برین واضح است که مآخذ همان فرهنگها یکی بوده است. اما در صحاح ص ۲۴۳ که در ایران نوشته شده عبارت مختلف است :

رخبین چیز باشد که از کشک ترش و دوغ کنند.

ربون[1]: آن سیم که پیش از اجر[2] مزدور را دهند و امروز ربون بیعانه را گویند.

روین: روی[3] ناس و آن گیاهی[4] است که بدان جامه را رنگ لعل کنند، بهندی منجیٹھہ گویند.

رخشان: روشن.

رهبان[5]: زاهد ترسایان.

راسن[6]: گیاهی است، وگویند سبزه که در پیاز وسیر می کارند آنرا راسن گویند.

رشن[7]: گزیدن وگزیدگی.

ران[8]: درخت انگزد و انگزد را نیز ران و راو[9] ماده گویند.

بهرهٔ ه

رومه[10]: موی زهار.

ریکاسه[11]: خارپشت و آن خزنده است، وبعضی به شین معجمه گویند.

رکوه[12]: پارهٔ جامه.

رزه[13]: رشته که بر و هر چیزی اندازند، و بزای معجمه نیز گویند.

---

[1] اداتـ: ربون آن سیم که پیش از مزد بمزدوران دهند وبیعانه: صحاح ص ۲۴۳: ربون آن باشد که پیش از مزد مزدوران دهند چیزی، فرخی:

بردہ دل من بدست عشق زبونست ❊ سخت زبونی که جان و دلش ربون است

معین ۲: ۱۶۳۷ مترادف ربون اربون، اربان، ارمون ومعرب عربون.

[2] اصل: ربون آن سیم که از اجر مزد دهند. [3] صحاح ص ۲۴۳ روین: روییناس.

[4] ادات همین معنی همراه کلمهٔ هندی دارد. نیز رک: موید ا: ۴۴۱. [5] این کلمه عربی است مشتق از رهب بمعنی ترسیدن. [6] رک: موید ا: ۴۳۹؛ دراین فرهنگ مطالب زفان درج شده.

[7] رک: موید ا: ۴۴۰ و مدار ۲: ۳۲۰؛ موید هر دو معنی را بگفتهٔ شرفنامه درج نموده است. رشن در اصل یکی از ایزدان آئین مزدیسنی است، نیز روز هیجدهم هر ماه شمسی و در عربی بمعنی ناخوانده مهمان گردیدن وسر بردن سگ در کاسه، رک: جهانگیری ۲: ۱۳۷۹، معین ۲: ۱۶۵۸.

[8] رک: ادات و موید ا: ۴۲۹ و مدار ۲: ۳۰۴. [9] اصل: راو ماره: امارک: ادات و موید ا: ۴۴۳ و مدار ۲: ۳۰۴؛ قواس ۴۲: راو ماده انگزد، جهانگیری ا: ۳۳۷، نیز ۲: ۱۷۵۸ انگزد، انگزه، انگوزه حلتیت.

[10] رک: قواس ص ۸۹، ادات و موید ا: ۴۴۵ و مدار ۲: ۳۲۸، دستور ص ۱۴۱ رومه بمعنی موی نوشته.

[11] کذا است در قواس ص ۷۰، دستور ص ۱۴۱ این کلمه با شین معجمه و مهمله و ما حذف یا نیز آمده، رک: مدار ۲: ۳۴۴، صحاح ۲۷۸ و موید ا: ۴۴۵ با سین و شین بهر دو صورت، و فرس ص ۴۲۳ با شین معجمه فقط، در زفان گویا نیز بهمین معنی آمده. [12] رک قواس ص ۱۵۸. [13] رک: قواس ص ۱۸۳.

ربوخه[1]: خوشی و ذوق جماع تا هرکه بر وقت جماع بخوشی [ورق ۱۴۸] رسد، گویند ربوخه شده است[2].

ریشیده[3]: ریشهٔ دستار که چشمه چشمه کنند یعنی کبود و سبز و سفید [سازند].

رافه[4]: گیاهی است کوهی، همچو سیر بریان کنند و بخورند.

ریده[5]: با ذال معجمه کودک.

رفوشه[6]: بفتح را، برچیدن پی و گیاه و سخن.

رنبه[7]: موی زهار، و بزبان[8] هندی آهن را گویند که از برای زمین کافتن کنند.

رده[9]: صف و برج.

رنده[10]: گیاهی است بهاری، و آلتی که بدان چوب را بتراشند، مشت[11] زنده یعنی رنده[12]، بیت:

کردگارا مشت[13] رنده[14] ده جهان را خوش تراش
تا که از قومی که هم ایشان و هم ما تیشه ایم

روده: آنجا که طعام در شکم باشد.

رشاشه[15]: قطرهٔ باران باریک، هندوی پھوئی گویند.

روه[16]: سیرت و پارسائی وگرایش به نیکی، و از اینجاست که زاهد ترسایان را رهبان[17] گویند.

۱- رک: فرس ص ۴۳۳، قواس ص ۱۱۳، صحاح ص ۲۷۸ و غیر آنها. ۲- در موید ۱: ۴۴۳ این معنی بحوالهٔ زفان گویا درج است. ۳- صحاح ص ۲۷۸، مدار ۲: ۳۴۵: ریشیده ریشهٔ دستار هر رنگ. ادات: ریشیده ریشهٔ دستار که چشمه چشمه کنند ای کبود و سبز و سپید سازند. ۴- رک: موید ۱: ۴۴۳، مدار ۲: ۳۴۳.

۵- در اکثر فرهنگها ریدک بجای ریده بهمین معنی آمده. ۶- ادات: رفوشه پی برچیدن و گیاه و قیل بفتح الراء سخن، موید ۱: ۴۴۴: رفوشه برچیدن و گناه کذا فی لسان الشعرا و در ادات رفوشه پی برچیدن و گناه قیل بفتح الراء سخن و در شرفنامه هر سه معنی بفتح. مدار ۲: ۳۲۴ رفوشه برچیدن پی و گناه و سخن، و همین سه معنی بحوالهٔ ادات درج است، بعداً بحوالهٔ موید نوشته که در فخری سخن تصحیف سخراست. اما نه در موید این قول آمده و نه فخری درین باره هیچ اطلاعی داشته. ۷- برای معنی اول رک: صحاح ص ۲۷۸، ادات، فخری ص ۴۰۵-۴۰۶، موید ۱: ۴۴۴.

۸- این معنی در فرهنگها دیده نشد. ۹- در صحاح ص ۲۷۸، فخری ۴۲۴ رده بمعنی صف. جهانگیری ۱: ۷۹۵ رده بمعنی رسته و صف، و چوبی که برگردن گاو بندند. موید ۱: ۴۴۴ بمعنی برج و رسته که بتازی صف خوانند. و همین است در مدار ۲: ۳۱۴، ادات: رده رسته بتازی صف. ۱۰- ادات و موید ۱: ۴۴۴ رنده نوعی است از دست افزار درودگران که بدان چوب تراشیده را هموار کنند و این را مشت رنده نیز گویند و گیاهی است بهاری.

۱۱- نسخهٔ اصل: کومشت. ۱۲- نسخهٔ اصل بزنده. ۱۳- این بیت در هیچیک از فرهنگها که پیش بنده است دیده نشد، ظاهراً خود از صاحب زفان گویا باشد. ۱۴- نسخهٔ اصل: رندی، متن تصحیح قیاسی. ۱۵- ادات: رشاشه و رشه و رشیشه قطرهٔ باران خرد که نیک باریک بود و اهل هند آنرا پھوئی گویند. واضحاً این کلمه عربی است. رک: ←

رخنه : سوراخ و دریچه[1]

رخساره : معروف [است].

رودابه : نام مادر رستم.

رزمه[2] : تنگی[3].

بهرهٔ «ی»

روی[4] : مس با قلعی آمیخته که هندوی بهنکار گویند.

روسپی : تحبگی[5] را گویند یعنی زنی که قحبه بود.

رهی[6] : بنده و ناله.

رکوی[7] : پارهٔ جامه.

روسی : نسبت به روس و جامه[8] ایست سرخ.

راهوی[9] : نام پرده[10]، چنانک حجاز و عراق و سپاهان و نهاوند[11] و خراسان[12].

← مویدا : ۴۴۳ و فرهنگ معین ۲ : ۱۶۵۶ ، مادهٔ کلمه رشّ بمعنی چکیدن باران اندک.

[16] مویدا : ۴۴۵ روه باواو فارسی سیرت و پارسائی وگرایش نیکی و نیز نام مقامی الخ ، مدار ۲ : ۳۳۹ : روه سیرت و در تبختری است : پارسای ترسایان وگرایش و نیکی الخ. [17] این توجیه غلط است زیراکه کلمهٔ رهبان عربی است و از رهب بمعنی ترسیدن و ترس مشتق است ، رک : معین ۲ : ۱۶۹۸ ؛ نیز مویدا : ۴۲۱.

[1] د مویدا : ۴۴۴ این معنی بحوالهٔ زفان آورده ؛ معین ۲ : ۱۶۴۵ این معنی دارد.

[2] این واژه عربی است ، بمعنی پشتوارهٔ جامه ، در شرفنامه بمعنی تنگی و بقچه آمده. [3] بمعنی جوال.

[4] ادات : روی با واو فارسی چیزیست که اہل هند آنرا تنکار خوانند ، نیز رک : مویدا : ۴۴۷ و مدار ۲ : ۳۴۰.

[5] قحبه درست است نه تحبگی ، رک : مدار ۲ : ۳۳۶. [6] ادات : رهی بنده ؛ مویدا : ۴۴۷ : رهی بالکسر بنده و ناکس کذا فی زفان گویا و در ادات بمعنی بنده و چاکر ، (واضحاً نسخهٔ زفان و ادات که در پیش صاحب موید بود از نسخهٔ من اختلاف داشته). [7] ادات : رگوی کاف و واو هردو فارسی پارهٔ جامهٔ کهنه و ریزیده و چادر یک تخته. [8] مویدا : ۴۴۶ و مدار ۲ : ۳۳۶ روسی بمعنی نام جامه نیز آمده.

[9] در مدار ۲ : ۳۰۶ بدین بیت انوری استشهاد شده :

من غزلهای خود همی خوانم ❊ در نهاوند و راه ری و عراق

نیز قس : رهاوی. [10] دربارهٔ نام دوازده مقام موسیقی اختلاف است مثلاً مقاصد الالحان ص ۵۶ این نام نوشته : عشاق ، نوی ، بوسلیک ، راست ، حسینی ، حجازی ، راهوی ، رنگوله ، عراق ، اصفهان ، زیرافگند بزرگ ؛ معین ۲ : ۱۵۶۸ : راست ، صفاهان ، بوسلیک ، عشاق ، زیر بزرگ ، زیرکوچک ، حجاز ، عراق ، زنگله ، حسینی ، رهاوی ، نوا. [11] رک : جهانگیری ۲ : ۲۲۰۶. [12] مدار ۲ : ۱۲۲ ، روسی و راهوی در نسخهٔ روسیه افتادگی دارد.

روشنی[1] : آہن گوہردار.

رستی[2] : حلوا و نیز نان را گویند.

گونۂ 'ز'

بہرۂ 'الف'

زیبا[3] : نیکو و آراستہ.

بہرۂ 'ب'

زیب : نیکوئی و زینت.

زکاب[4] : سیاہی کہ بدان بنویسند و بعضی بضم زا گویند.

زہاب[5] : چشمہ و قعر و عمق آب و نیز آبی باشد کہ از سنگی یا از زمینی و جائی می آید اندک و بسیار.

بہرۂ 'ت'

زفت[6][7] : بخیل و گرفتہ روی، و زفتی بخیلی است و قیر[8] را نیز گویند.

---

[1] در موید ۱ : ۴۴۷ روشنی با واو فارسی روشنائی و آہن گوہردار و معنی اخیر از زفان گویاست.

[2] نسخۂ روسیہ : رسی. مدار ۲ : ۲۱۸ رستی بمعنی نان و حلوا نوشتہ بدین بیت شاہد :

رستی خوردم بخوانچۂ زرین آسمان ❊ آوازۂ صلا بہ مسیحا در آورم

[3] ادات : زیبا بای فارسی ہرچہ خوب با ملاحت بود و نیکو و آراستہ. [4] رک : فرس ص ۲۴ صحاح ص ۴۸ قواس ص ۹. [5] فرس : زہاب جائی بود کہ آب زاید، صحاح ص ۳۸ : زہاب آبی باشد کہ از سنگ یا از زمین برآید اندک و بسیار الخ. جہانگیری ۲ : ۲۱۷۷ زہاب بمعنی تراویدن آب آوردہ، برہان بمعنی تراویدن آب و موضع چشمہ و چشمہ و آبیکہ قعرش پیدا نباشد نوشتہ. معین ۲ : ۱۷۶۳ زہاب بمعنی آب کہ تراوش کند، موضع چشمہ، آبیکہ قعرش پیدا نباشد، چشمہ آوردہ. موید ۱ : ۴۴۹ زہاب ہر دو معنی مذکور در متن نوشتہ.

[6] مدار ۲ : ۳۹۶ این معنی بحوالۂ زفان گویا نوشتہ. [7] قواس ص ۹۵، رفت : بخیل، صحاح ۴۵ : زفت بفتح زا بخیل. عنصری :

صعب چون بیم و تلخ چون غم جفت ❊ تیرہ چون گور و تنگ چون دل زفت

ادات : زفت بضم بخیل و گرفتہ روی، و ہمین قرأت است، در موید ۱ : ۴۴۹ ذیل فصل عربی، و در مدار ۲ : ۳۷۷ : زفت (عربی) بضم گرفتہ روی و بخیل.

[8] در موید ایضاً و مدار ایضاً : زفت بالفتح بہمین معنی. اما در جہانگیری ۲ : ۱۴۷۸-۷۹ زفت بضم بمعنی بخیل و ممسک و داروئی چسبندہ کہ از صنوبر حاصل شود. اما در معین ۲ : ۱۷۴۲ زفت بالکسر بمعنی قیر و صمغ نوشتہ.

وہمیں قرأت در آنندراج است.

زفت[۱]: فربه یعنی ستبر و پر و تناور و زفتی فربهی است.
زهشت[۲]: نفس یعنی دم، بکسر ها نیز گویند.
زمخت[۳]: چیزی درشت و سخت [ورق ۱۴۹ ا] و گره بسته.
زردست[۴]: نام مردی ساحر که دین مغی پیدا کرد و زردشت و زرادشت و زراتشت نیز گویند و آنکه گویند زردست ابراهیم علیه السلام است مخطی و زندیق باشد.

بهرهٔ ج

زاج[۶]: زاک یعنی پهشکری و اجناس آن.
زمنج[۷]: زمچک و آن پرنده ایست که در هوا پرد.

بهرهٔ چ

زاچ[۸]: زچه.
زچ[۹]: بلور که بهندوی پهشکری گویند.
زمچ[۱۰]: شکره ایست معروف که برکبوتر افتد.

---

۱. رک: ادات و موید و مدار و جهانگیری ۲: ۱۷۴۸ زفت گنده و ستبر و پر و مالامال.

۲. رک: ادات و مدار ۲: ۲۹۷. ۳. برای اعراب رک: موید و مدار و جهانگیری ۲: ۲۱۷۸.

۴. رک: ادات، موید ۱: ۴۵۰، مدار ۲: ۳۸۴، جهانگیری ۲: ۱۷۰۶ زمخت طعمی و گرهی سخت. و اینکه در موید بحوالهٔ قواس زمخت بمعنی پهشکر نوشته، اما در قواس این واژه شامل نیست.

۵. اگرچه زردشت با سین مهمله آمده جمهٔ معانی را در ذیل زردشت نوشتن خالی اشتباه نیست.

۶. معرب زاگ یا زاک است، رک: موید ۲: ۲۵۵، معین ۲: ۱۷۱۲؛ موید ۱: ۴۵۰، ذیل فصل عربی زاج ـ در زفان گویاست: زاج همان زاک یعنی پهشکری و اجناس آن.

۷. قواس ص ۵۹: زمنج و زمچک: استخوان ربا، دستور ص ۱۴۸: زمنج زمچک، جهانگیری ۲: ۱۷۰۷ زمنج نام جانوریست شکاری... بتازی زمج، بحر الفضائل: زمنج و زمیج و زمچک پرندهٔ درنده ایست از علیوا از کلان تر. ۸. رک: قواس ص ۸۵.

۹. موید ۱: ۴۵۱ زچ (زنج اشتباه چاپی) و در زفان گویاست زچ بالفتح بلور بهندوی پهشکری، نیز رک: جهانگیری ۲: ۱۷۰۶ و معین ۲: ۱۷۴۶.

۱۰. موید ۱: ۴۵۱ ذیل زمچ بگفتهٔ صاحب زفان آورده: و بالکسر شکره ایست معروف که برکبوتر افتد. اما در جهانگیری ۲: ۱۷۰۶ زمچ بمعنی پهشکری نه شکره. بمعنی شکره زمج است! موید ۲: ۳۸۳ ـ ۳۸۴ زمج را عربی نوشته و مترادف زمچ فارسی بمعنی پهشکری و شکره. اما در موید ۱: ۴۵۰ بجای زمچ، زنج، زنچ آمده.

زیچ[1]: لاغر و سخرو راه نفس و رشتۀ بنّا و آنک برای تقویم می سازند یعنی رصد که ازآن استخراج تقویم کنند.

بهرهٔ خ

زخ[2]: ثؤلول و آن معروف است و آواز حزین.

زخ[3]: معروف [است] و بی نفع.

بهرهٔ د

زند[4]: کتاب مغان و آن تصنیف زرتشت در آتش پرستی و آن را زنداستا نیز گویند[5] و اسدی آورده است: زنداستا تفسیر زند است و بعضی فرهنگنامه گویند صحف ابراهیم صلوات الله علیه و سلامه است، و آتش زنه[6] آنرا چقمق گویند.

زوهمند[7]: کشت بالیده[8] و افزوده، و بعضی واو پارسی گویند.

زغند[9]: بانگ سخت و برجستن.

---

[1] برای این معنی رک: قواس ص ۱۱۳، دستور ص ۱۴۵: زیچ سخرو لاغ و کتابی است در حکمت. موید ۱: ۴۵۱ زیچ بالکسر آن کتاب که ازو تقویم استخراج کنند و نیز مرد لاغر و راه نفس و نیز رشتهٔ بنّا که بآن اندازهٔ طرح عمارت کنند.

[2] رک: صحاح ص ۶۶، موید ۱: ۴۵۱ و مدار ۲: ۳۶۳، قواس ص ۱۹۰ شرخ آواز حزین.

[3] رک: موید ۱: ۴۵۱، مدار ۲: ۳۸۹.

[4] رک: قواس ص ۱۲، ۱۹۳، دستور ص ۱۴۵، ادات.

[5] لغت فرس چاپ پال هورن ص ۲۹: زند تفسیر پازند و استا و ابستا بود — پازند اصل کتاب است و ابستا گزارش. همه فرهنگ نویسان فارسی دربارهٔ اوستا و زند و پازند اطلاعات غلط و ناقص دارند. اوستا کتاب زرتشت و زند گزارش و ترجمهٔ آن بزبان پهلوی و پازند همان زند است بخط اوستائی رک: قواس ص ۱۲ ح ۷.

[6] برای آتش زنه و چقاق زَند است نه زند، رک: معین ۲: ۱۷۷۷.

[7] نسخهٔ اصل: آتش زن. [7] قواس ص ۵۵، دستور ص ۱۴۸: زوهمند کشت بالیده؛ اما ادات، بحرالفضائل، موید ۱: ۴۵۲، جهانگیری ۲: ۲۰۲، رهان ۲: ۱۰۴۶ گفتهٔ زفان را مورد تائید قرار دهند.

[8] اصل: پالیده.

[9] ادات: زغند بانگ تند و برجستن، در بحرالفضائل بجای برجستن چمیدن دارد.

زرنباد[1] : داروئی است که بتازی رجل[2] الجراد گویند ، بهندوی کچور[3].
زباد[4] : خوی[5] گربهٔ مشکین.
زامیاد[6] : بیست هشتم روز از ماه.

بهرهٔ ر

زر[7] : پیرکهن ، ضد[8] برنا ، ازین جاست که زالِ سام را زال زر گویند از بهرموی سپید؛ و ذهب.
زفر[9] : کلهٔ دهن[10].
زوار[11] : خدمتگار بندیان ، و زنده ضد مرده ، و بعضی بضم زا گویند ، و در فردوسی است : زوار بیمار[12].

---

[1] رک : ادات و بحر الفضائل و موید ا : ۴۵۲.

[2] همین کلمهٔ عربی در ادات مذکور است ، و در زفان گویا بخش چهارم واژه های عربی ، مترادف رجل الجراد زرنباد مندرج نیست ؛ اما در کتاب الصیدنهٔ بیرونی اسم هندی کچور موجود است و درین کتاب عربی رجل الجراد درج نشده ؛ اینکه اسم زرنباد ، متداول بوده نه رجل الجراد ، از بدایة المستعلین نیز ثابت می شود.

[3] نسخهٔ ل : کچور گویند ؛ این کلمهٔ هندی غیراز ادات و بحر الفضائل در صیدنهٔ بیرونی نیز آمده (رک : کتاب الصیدنه چاپ کراچی ص ۲۰۰).

[4] ادات : زباد نوعی از خوشبوییهای خوب و آن از گربه پیدا آید ، بحر الفضائل عطری است بغایت خوشبو از گربهٔ مشکین خیزد. معین ۱۷۱۸/۱۹ — زباد مادهٔ معطری که از غدهٔ مشک جانوری (نر) استخراج می شود ، این حیوان باندازهٔ یک گربه است و بنام گربهٔ زباد و قط الزباد و ستور الزباد ذکر شده. معین این را عربی قرار داده.

[5] کذا است در موید ا : ۴۵۲ ؛ ل : خایه.

[6] رک : ادات و موید ا : ۴۵۲.

[7] رک : لغت فرس ص ۱۳۰ ، صحاح ص ۱۰۵ ، موید ا : ۴۵۴ ، جهانگیری ا : ۹۹۵.

[8] رک : بیت دقیقی :

همی نوبهار آید و تیر ماه ∴ جهان گاه برنا شود گاه زر

[9] رک : موید ا : ۴۵۴ ، مدار ۲ : ۳۷۷.

[10] ل : دهان.

[11] لغت فرس چاپ اول هورن ص ۳۶ : زوار خدمتگر و یاری ده ، قواس ص ۹۴ و بحر الفضائل خدمتگار بندیان ؛ صحاح ص ۱۰۶ زوار بمعنی زندانیان و خدمتگار زندانیان ، اما تائید معنی اول نه از بیت شاهد و نه از قول لغت نویسان می شود. بعلاوهٔ آن زوار کلمهٔ واحد است و زندانیان معنی اش جمع چگونه جائز باشد.

زغار[۱] : نعره و فریاد .

زنبر : زنبل[۲] یعنی آنچه بدان گل کشند و بتازی[۳] منقل گویند ، و نیز زنبر انگشت دان را گویند ، مربعی است با دو بازو .

زاور[۴] : زنده و نیز زهره[۵] را گویند و سیاه .

زریر[۶] : مایهٔ صفرا یعنی یرقان[۷] ، و اسپرک که بدان رنگ کنند ، و آن سبز و کبود است و بعضی گویند زریر زعفران[۸] نیز باشد و گویند بضم[۹] است .

← درادات زوار بمعنی خدمتگار بندیان و زنده آمده . موید ۱ : ۴۵۴ بهر سه معنی مذکور در متن آمده ، نیز رک : مدار ۲ : ۳۹۳ ، جهانگیری ۲ : ۲۰۱۶ — ۱۷ .

۱۲ نسخهٔ اصل : خدمتگاران بندیان . ۱۳ این معنی در موید درج است .

۱ ادات : زغار نعره و فریاد و قیل بازای فارسی نعرهٔ سهناک و همین است در بحر الفضائل ، در مدار ۲ : ۳۷۵ زغار بمعنی نعره و فریاد و ژغار بمعنی سهمناک و سختی ، جهانگیری ۲ : ۱۴۲۲ زغار بمعنی سختی دارد .

۲ درنسخهٔ اصل افتاده ، اضافه از روی نسخهٔ «ل» برای همین مترادف رک : قواس ص ۱۷۵ .

۳ اگرچه در هر دو نسخه بهمین طور آمده ؛ اما واضحاً در این عبارت پس و پیش شده ؛ باید این طور باشد ، و نیز زنبر انگشت دان که بتازی منقل گویند ، نیز آلتی مربعی است با دو بازو ، رک : مدار ۲ : ۳۸۷ .

۴ صحاح ص ۲۰۵ : زاور زهره باشد از آن هر چیز ، دوم سیاه بود ، ادات : زاور زنده ، موید ۱ : ۴۵۳ : زاور معنی زنده و سیارهٔ زهره و سیاه ، معنی اخیر بگفتهٔ زفان ؛ اما نسخهٔ حاضر از زفان همه معنی را دارد . مدار ۲ : ۳۵۶ زاور بمعنی ستارهٔ زهره و در بعضی فرهنگها زهره و یارا ، در ادات بمعنی زنده و در پنج بخشی (زفان) بمعنی سیاه . جهانگیری ۱ : ۳۴۸ : زاور هفت معنی دارد ، خادم ، ستارهٔ زهره ، قدرت و یارا ، راحله ، زنده ، رنگ سیاه یا علتی که آب سیاه آورده باشد ، زفت و بخیل . معین ۲ : ۱۷۱۴ : زاور بمعنی خدمتگار ، زور و قوت ، بارکش و راحله ، علت آب سیاه ، ستارهٔ زهره .

۵ اصل : اهره .

۶ ادات : زریر مایهٔ صفرا ، و سبز و کبود ، و نام گیاهی که بدان جامه با رنگ کنند و آن گیاه را اسپرک نیز خوانند ، و گیاهی است زرد و گروهی زرچوبه را گویند و زعفران .

۷ رک : مدار ۲ : ۳۷۴ ؛ واضح است که مایهٔ صفرا و یرقان مترادف نیست بلکه زیادتی صفرا موجب یرقان است .

۸ ل : زریر زرچوبه است . زرنگ نیز بمعنی زرچوبه آمده (زفان)

۹ موید ۱ : ۴۵۴ ، مدار ۲ : ۳۷۴ بضم و کسرتین نام برادر گشتاسپ . اما در جهانگیری نام برادر گشتاسپ بالفتح است ۱ : ۳۰۰۳ — ۱۰۰۴ .

زنجیر[1]: تخته سپاری[2].

زاغر[3]: حوصلهٔ مرغ که بهندوی دانه پوته[4] گویند وبعضی گفته اند زاغر سنگ[5] [۱۵۰] دانه است و در اصطلاح[6] غین مضموم گویند وبعضی زای پارسی[7] گویند.

زینهار[8]: امان وعهد.

زاستر[9]: جدا و دورتر دیگو.

زار: جای[10] چیزی که چیز از آنجا خیزد، ونالش[11] و زاری.

زغیر[12]: تخم کتان و این تازی است، بهندوی السی گویند.

زیر: تاریست[13] درساز یعنی رود باریک و ناله[14] باریک.

زیور[15]: پیرایه.

زیگر[16]: آنک کسی باد اندر دهن افکند از هر سوی، دیگر سر انگشتان برای جای بادش زند تا باد [بیرون[17] رود].

---

[1] ادات: زنجیر تخته سپار... واہل ہند آنرا بروتہ گویند، نیز رک: موید ا: ۴۵۴ و مدار ۲: ۳۸۸. (درہردو: تختۂ اشیار) [2] در ادات و زفان مترادف ہندی سپار پھال آمدہ. ادات: سپار آن آہن که بدان زراعت پارہ کنند وگاوآہن نیز گویند واہل ہند پھال خوانند وہمین مطلب در حاشیۂ زفان افزودہ. [3] ادات، موید ا: ۴۵۳، مدار ۲: ۳۵۵: زاغر چینه دان مرغ که آن را حوصله خوانند. [4] مدار: پوٹہ.

[5] در زفان سنگدانہ بمعنی حوصلۂ مرغ آمدہ؛ پس اضافۂ کلمات 'وبعضی گفته اند' بی خود است.

[6] رک: موید ا: ۴۵۳. [7] ادات با زای پارسی و در موید نیز با زای عربی وپارسی.

[8] رک: ادات، موید ا: ۴۵۴. [9] رک: ادات وموید ا: ۴۵۳، سلیمانی ۱۲۶ زاستر، زانستر.

[10] برای این معنی رک: مدار ۲: ۳۵۳.

[11] رک: ادات اما در مدار ا: ۳۵۳ بمعنی عجز و اندوه آمده.

[12] رک: ادات، موید ا: ۴۵۴، مدار ۲: ۳۷۶، جعفری ۲۵۰.

[13] ل: نام تاریست در رباب وناله باریک.

[14] رک: مدار ۲: ۳۹۹.

[15] رک: موید ا: ۴۵۵.

[16] ادات: زیگر باکاف فارسی، کسی که باد اندر دہان افگند، دیگری سر انگشتان بر ہر دو کله آورند تا باد بآواز صعب از دہن او بیرون رود. نیز رک: سرمۂ سلیمانی ۱۲۶.

[17] این دو دراصل افتاده.

زبار[1] : عانه[2] یعنی شرمگاه.
زمر[3] : بادی عظیم.
زکور[4] : زفت.
زواغار[5] : نام مغی است.

بهرهٔ 'ش'

زاوش[6] : مشتری وبعضی بسین[7] مهمله گویند.
زوشش[8] : تند[9] وگرفته روی و ترنجیده[10] و زود خشم و سخت طبع.

بهرهٔ 'غ'

زلیغ[11] : بوریای لخ[12] وبلغتی یا عربی است.
زاغ : معروف [است].

بهرهٔ 'ک'

زاک[13] : زاج ، و نام گیاهی[14] است.
زمجک[15] : وآن پرنده ایست در هوا پرد.

---

[1] رک : موید ا : ۴۵۵ : زبار بالکسر شرمگاه. [2] فرہنگ معین ۲ : ۲۲۷۱ : عانه موی زبار ، پست زبار ؛ نسخهٔ 'ل' این کلمه وسه کلمهٔ بعدرا ندارد. [3] این کلمه بدین معنی دیده نشد. در نسخهٔ ل این واژه شامل نیست. [4] زکور بمعنی گرفته وبخیل و دزد ، رک : ادات ذیل همین فرہنگ ذیل ژکور.

[5] رک : ادات و موید ا : ۴۵۴ ، اما در جهانگیری ۲ : ۲۰۱۷ : زواغار نام مرغی است.

[6] رک : فرس ص ۲۱۴ ، قواس ص ۱۳ ؛ دستور الافاضل ص ۱۴۱ : راوس برای مهمله و برهان زاوش و راوش هردو بدین معنی نقل نموده. [7] رک : مدار ۲ : ۳۵۷. [8] ل این واژه ندارد.

[9] رک : فرس ص ۲۱۰ ، قواس ص ۱۰۵ ، صحاح ص ۱۵۲.

[10] قواس : رنجیده ، اما رک : ادات الفضلا.

[11] فرس ص ۲۳۱ ، صحاح ص ۱۶۳ ، قواس ص ۱۹۳ : زلیغ بوریا که از دوخ بافند الخ.

[12] زفان : لخ کاه بوریا الخ . دوخ و دخ گیاهی است و ازو بوریا بافند ، رک : فرس ۲۳۱ ، قواس ص ۱۹۲ ، صحاح ص ۶۵ ؛ قواس ص ۵۷ دوخ بمعنی لخ نوشته.

[13] رک : صحاح ۱۸۱ ، موید ا : ۴۵۷.

[14] موید ا : ۴۵۷ بحوالهٔ طب حقائق الاشیاء زاک بمعنی تج نوشته.

[15] قواس ص ۵۹ : زمچک.

بهرهٔ 'گ'

زرنگ[1] : زرچوبه وگلهٔ اسب و درختی است کوهی، بار نیاورد و هیزم راشاید و عجب سخت چوب باشد که آتش او دیر ماند تا گویند اگر وی را بسوزند، و در خاکستر بدارند آتش او پانزده روز بماند و بعضی بفتح را گویند.

زرنگ[2] : خردل که بهندوی[3] رائی گویند.

زنگ[4] : زنگار که در آهن و جز آن گیرد، و ولایتی که زنگبار گویند و پیخال چشم که از بخار چشم خیزد، و روشنی ماهتاب، وگویند آنچه چون[5] زنگ جلاجل است.

زغنگ[6] : فواق یعنی هکک، وبعضی[7] گویند زغنگ بکاف عربی.

زراغنگ[8] : زمین ریگناک، و زراغن[9] بغیر کاف نیز گویند.

بهرهٔ 'ل'

زگال[10] : انگشت سوخته که بتازی فحم[11] گویند، وگفته اند که لفظ زگال زبان[12] ازمنی است، و بزای[13] پارسی نیز گویند.

---

[1] قواس ص ۱۴۰، دستور ص ۱۴۸ : درختی است سخت چوب الخ، نیز رک : فرس ص ۲۶۲، صحاح ص ۱۹۷.

[2] رک قواس ص ۱۴۱ (بدون متبادل هندی). [3] این دائرهٔ هندی در ادات و مؤید ۱ : ۴۵۸ موجود است.

[4] ادات : زنگ پیخال چشم که از بخار چشم خیزد، و روشنی ماه و زنگار که بر آهن و آب و امثال آن بنشیند. و ولایت زنگیان، و جلاجل که اهل هند آن را گهونگهرو و عرب آن را جلجل و جلاجل خوانند. و سراب.

[5] نسخهٔ 'ل' : آبی چون زنگ و جلاجل یعنی زنگله وبعضی گویند زنگ بازای پارسی جلاجل.

[6] در نسخهٔ اصل افتادگی دارد.

[7] جهانگیری ۲ : ۱۴۳۲-۱۴۳۳ زغنگ جستن گلو باشد و آنرا کلیچه و هکک نیز گویند و بتازی فواق و هند ی هچکی گویند.

[8] ادات : زراغنگ زمین ریگناک.

[9] رک : ادات ذیل زراغن.

[10] رک : ادات.

[11] دستور الاخوان ص ۴۰۸ : الفحم انگشت مرده، همین عربی مترادف در معین ذیل زگال یافته می شود.

[12] معلوم نشد که این اطلاع بر چه ماخذی مبنی است.

[13] رک : مدار ۲ : ۳۷۸.

زاویل[1] : راز[2] یعنی برآرندهٔ عمارت.
زال[3] : پیرکهن و نام پدر رستم.
زاول[4] : نام شهری است.
زنبل[5] : آلت جنگ، و آن مربع است با دو بازو گلیمی[6] و یا مشکی[7] از دو سر چوب در دبسته و بدان گل کشند، دو تن یکی در پیش و یکی در پس، و آن [ورق ۱۵۱] زنبر[8] است.
زاغل[9] : درخت آک.

بهرهٔ م

زم[10] : بخ[11] بود، چنانک گوشت دهان از درون بیرون رود.

بهرهٔ ن

زنیان[12] : نانخواه یعنی جوانین[13] و بعضی زینان[14] بتقدیم یا گویند.

---

[1] رک : قواسی ص ۱۱۵. [2] رک : فرس ص ۱۷۷ : زفان : راز گلکار که بتازی طیّان گویند. [3] در نسخهٔ اصل در حاشیه عبارتی مفصل راجع به زال افزوده و این بدینطور شروع می شود : زال پیر فرتوت و پدر رستم، چون زال با موی سرآویز و مژهٔ سپید زاده شد، پدر او فرمود تا اورا در کوهی دوردست اندازند، همچنان کردند، سیمرغ اورا دریافت و پرورد، بعد هفت سال در خواب دید : کسی اورا بگوید پسر تو درفلان محل زنده است، طلب کرد، سیمرغ زال را باز داد و پدر او زال را دستان نام کرد و زال لقب نهاد و خلق اورا زال زر گفتندی. [4] زاول نام شهری است در افغانستان، رستم را بدانجا منسوب می کنند، فردوسی محمود غزنوی را نیز زاولی می نویسد :
خجسته درگه محمود زاولی دریاست. [5] رک : ادات و موید ۲ : ۳۸۷ که تقریباً همین تفصیل ذیل زنبردارد.
[6] سرمهٔ سلیمانی ۱۲۶ زنبر گلیمی. [7] معین ۲ : ۱۷۴۹ زنبر = زنبل بمعنی مشکی نوشته که بر دو سرآن دو چوب تعبیه کنند و آب کشند. [8] نسخهٔ اصل : زن بیر. [9] رک : ادات و موید ۱ : ۲۵۸.
[10] ادات : زم بخ آنکه گوشت اندرون دهان او بوقت سخن گفتن بیرون برود. جهانگیری ۲ : ۱۷۰۴-۵، زم طفلی باشد که درهنگام سخن کردن آب از دهنش بیرون افتد (بدون مثال).
[11] زفان و موید ۱ : ۱۱۹ بخ اندرون دهن.
[12] رک : قواسی ص ۱۴۱.
[13] کذاست در دستور ص ۱۴۳ و ادات ؛ اما در موید ۱ : ۱۴۶۱ و مدار ۲ : ۳۹۳ : اجوائن، نسخهٔ اصل : جوانی.
[14] کذاست در ادات. ناگفته نماند که در فارسی نام نانخواه که مترادف زنیان است بیشتر متداول است. رک : البیرونی کتاب الصیدنه ص ۳۵۹ و درین کتاب مترادف نانخواه در سندی "جوان" است. برای نانخواه نیز رک : هدایة المتعلمین ص ۸۶۰ (فرست)

زغن[1] : غلیواز ، وگویند گنجشکی سیاه است .

زیبن[2] : آنکه پشت پای زنند .

زلیفن[3] : تهدید ، و به لغتی یا عربی است ، وبعضی بفتح زا گویند . بیت[4]

ازلب تو مرا هزار امید است ❊ وز سر زلفت[5] مرا هزار زلیفن

زکان[6] : از خویش[7] رمیده ، و در فردوسی است : زکان کشی[8] که در خود رمد .

زیبان[9] : زیبا ، گوئی در زیبا نون زیادت کرده اند .

زوپین[10] : نیزه ، بهندوی آنرا سبّل[11] گویند .

زبون[12] : شترلگدزن مردوشنده راست ، و راغب و خریدار وگرفتار و اسیر وجفت[13] و زیردست وبیچاره .

---

[1] ادات : زغن غلیواز ، اما در موید ۱ : ۴۶۰ معنی زغن عیناً طبق مندرجات متن بحوالهٔ زفان .

[2] کذاست در ادات و موید ۱ : ۴۶۱ ؛ اما در مدار ۲ : ۲۹۹ زیبن بمعنی پشت پای زدن ، برہان بمعنی شخصی نوشته که عالم را پشت پا زده .

[3] ادات : زلیفن با یاء فارسی ترسانیدن وقیل بفتح زا صحاح ص ۲۴۴ : زلیفن تهدید کردن وسهم دادن باشد ، نیز رک : جهانگیری ۲ : ۱۶۲۱ ، زلیف ترس وبیم باشد و زلیفن ترسانیدن .

[4] این بیت از فرخی است و در صحاح وجهانگیری بطور شاهد نقل شده .

[5] نسخهٔ اصل : زکف تو .

[6] رک : ادات و موید ۱ : ۴۶۱ .

[7] ل : خود .

[8] ل : بودکه درخود همی رمد .

[9] رک : صحاح ص ۲۴۴ ، ادات وموید ۱ : ۴۶۱ ؛ در فرس ص ۲۶۵ بیت زیر از معروفی شاهد آمده ،

آن نگار پری رخ زیبان ❊ خوب گفتار و مهتر خوبان

[10] در مدار ۲ : ۴۰۵ : ژوپین .

[11] در موید ۱ : ۴۶۱ : سبیل وجهانگیری ۲ : ۲۰۱۸ کذا در متن ؛ ادات و مدار : سیلره . و در ادات متبادل عربی "سُل" و در جهانگیری "سَل" نوشته اما ننوشته که عربی است یا فارسی .

[12] ادات : زبون گرفتار و راغب و خریدار . و در موید ۱ : ۴۵۹ زبون عربی قرار داده شده .

[13] برای این معنی رک : موید .

[14] ل : مفت ؛ این معنی در فرهنگها دیده نشد .

زرفین[1] : آهنی باشد که بر درها زنند و حلقه در او افکنند ، زرافین همان زرفین است .

بهرهٔ «و»

زنجرو[2] : انزروت[3] ، و آن گیاهی است مشهور ، و بعضی بفتح جیم گویند .

زرو[4] : دیوچهٔ[5] آبی .

زمو[6] : گل تر و خشک ، بلغتی واو عربی است .

زیلو[7] : شطرنجی ، و زیلوی بیا نیز گویند .

بهرهٔ «ه»

زبوده[8] : گندنا ، و آن سیر است که میان پیاز[9] می کارند .

زله[10] : کرمی است که در گرمابه باشد و فریاد کند .

زکاسه[11] : روباه ترکی که خار اندازد ، و بلغتی زا و شین[12] معجمه است ، و آن[13] را سکرنه[14] و سغرنه[15] و

---

[1] نسخهٔ اصل : زوفین اما صحاح ص ۲۴۴ و ادات و موید ۱ : ۴۶۰ و مدار ۲ : ۳۷۲ .

[2] قواس ص ۲۳ : کنجده و زنجرو : انزروت ، [3] البیرونی در کتاب الصیدنه می گوید : انزروت را عنزروت گویند بسبب قرب مخرج ، او ابلغت سریانی عزرو ؛ ازروی و زروی و انزروتا هم گویند و بزبان هندی جنجر گویند و بسجزی زنجرود و بپارسی کنجده و کونزده الخ ، رک : متن عربی ص ۷۰ و ترجمهٔ فارسی .

[4] رک : قواس ص ۶۹ ، دستور ص ۱۴۸ . [5] قواس ص ۴۹ و همین فرهنگ .

[6] رک : قواس ص ۱۱۶ ، نیز رک : مقالهٔ بنده در مجلهٔ علوم اسلامیه ، دسامبر ۱۹۶۷ ، ص ۶۶ ، اندو ایرانیکا ج ۲۰ ، دسامبر ۱۹۶۷ ص ۳۹ - ۴۰ .

[7] رک : قواس ص ۱۵۶ ، موید ۱ : ۴۶۲ و ۴۶۶ .

[8] رک : قواس ص ۴۰ ، موید ۱ : ۴۶۳ ، مدار ۲ : ۳۶۱ .

[9] موید : پیاز و ترب .

[10] رک : فرس ص ۴۹۲ و صحاح ص ۲۷۹ و ادات . در ادات متبادل هندی جهینگر درج است .

[11] در بعضی فرهنگها بازای فارسی و شین معجمه مثلاً در موید ۱ : ۴۶۴ ، زکاسه و ژکاشه هردو ، و همین است در رشیدی ۱ : ۷۸۹ ؛ برهان ۲ : ۱۰۲۵ زکاسه ، زکاشه و ژکاشه .

[12] ادات سین مهمله دارد .

[13] این مطالب از قواس ص ۶۹ گرفته شده بحذف کلمهٔ سکرنه .

[14] رک : جهانگیری ۱ : ۵۰۳ ، ۲ : ۱۴۳۷ ، برهان ۲ : ۱۱۴۲ .

[15] زمان : سغر جانوری که بر پشت او تیرها باشد ، و سغرنه روباه ترکی که خار اندازد .

سیخول[1] وتشی[2] نیز گویند، و بتازی قنفذ[3] گویند و بهندوی سیه گویند، و این جانور از خزندگان ست که خار دارد چون دوک تیز و رنگین، چون خود را بیفشاند آدمی را بدان خسته کند و خارپشت نیز گویند.

زموده: نگار[4] ونقش[5].

زغاره[6]: نان گاورسین[7]، در نسخه ای زای[8] معجمه است.

زغنه[9]: ماشوره[10].

زکاره[11]: گران ولجوج یعنی ستیهنده، و بعضی فرهنگیان ژکاره بزای[12] پارسی و مضموم گویند.

زاولانه[13]: تخت بند و آن پارهٔ [ورق ۵۲ ا] آهنین است [که] برگردن و پای زندانیان زنند، زالانه[14] نیز گویند.

زنگله[15]: بغیر ها نیز آمده است، جرس خرد که بچگان بندند.

زاره[16]: زاری کردن.

زرافه[17]: قج، و به تشدید را نیز گویند.

زواله[18]: طعامی است، بتازی مرزوقه گویند.

---

۱ زفان: سیخول روباه ترکی که خار اندازد. ۲ زفان: تشی روباه ترکی الخ.

۳ برای عربی و هندی متبادل رک: ادات ذیل سغر و مدار ۲: ۴۷۵.

۴ برای عیناً همین معنی رک: قواس ص ۱۳۶. ۵ رک: قواس ص ۱۶۵.

۶ نسخهٔ اصل: کادرسین بحذف نان. ۷ کذاست در ادات.

۸ قواس ص ۱۸۲ و ادات. ۹ رک: ادات؛ اما جهانگیری ۱: ۴۹۷ ماشوره نی میان تهی که بر و ریسمان پیچند، و زغونه گروههٔ ریسمان خام که بر دوک پیچند (جهانگیری ۲: ۱۴۲۳) بنابرین زغونه و ماشوره یکی نیستند. ۱۰ صحاح ص ۲۷۹: ژکاره لجوج وگران وستیهنده. ۱۱ صحاح: ژکاره، ادات: زکاره و ژکاره هردو. ۱۲ رک: صحاح ص ۲۷۹. ۱۳ کذاست در نسخهٔ اصل؛ ل: زلانه؛ بظاهر زولانه درست است، رک: معین ۲: ۱۷۱۴.

۱۴ در ادات زنگل و زنگله و زنگوله سه صورت است.

۱۵ رک: جهانگیری ۱: ۲۴۴، مؤید ۱: ۴۶۳.

۱۶ مؤید ۱: ۴۶۲ زرافه بمعنی قج بحوالهٔ زفان ذیل عربی آمده. این کلمه در اصل عربی است رک: دستور الاخوان ص ۳۱۷، مدار ۲: ۳۶۷، معین ۲: ۱۷۲۹.

۱۷ مؤید ۱: ۴۶۵ مدار ۲، ۳۹۶ همین معنی همراه عربی متبادل بحوالهٔ پنج بخشی (زفان) آمده. ۱۸ ل: دروجه.

زرده[1] : اسب زرده گویند آنکه میان کیت[2] و بور بود[3] و گویند آنکه برنگ ادیس[4] ماند و بیشتر به زردی گراید.

زهره[5] : تلخه.

زه[6] : بچه و گویند آنجا که بچه باشد یعنی آبستنه[7] که زهدان بود و آن رحم است.

زخاره[8] : شاخ درخت باشد.

زچه[9] : نفاس[10].

زواره[11] : نام مردی.

بهرهٔ ی

زی : ... و نزدیک، و امر بزیستن یعنی زندگانی کن[12].

گونهٔ ژ

بهرهٔ خ

ژخ[13] : آواز جرس، و گویند آواز حزین و بانگ زار.

---

[1] جهانگیری ۱: ۹۹۸ زرده اسبی را گویند که رنگ آن زرد بود ؛ نسخهٔ ل: زرده رنگ اسب و گویند الخ.

[2] موید ۲: ۹۴ : کیت چیزی که به سیاهی ماند.

[3] جهانگیری ۲: ۱۹۳۱ : بور اسب سرخ رنگ.

[4] کذا است در اصل ؛ ممکن ست ادکن باشد.

[5] رک : موید ۱: ۴۶۵.

[6] رک : ادات و موید ۱ : ۴۶۵ و مدار ۲ : ۳۹۵-۳۹۶.

[7] رک : موید ۱ : ۹۴ ، معین ۱ : ۱۸.

[8] موید ۱ : ۴۶۳ ، مدار ۲ : ۳۶۳ ، نیز رک : زخناره ، مدار ۲ : ۳۶۵.

[9] جهانگیری ۱ : ۷۲۵ : زچه عورت نو زائیده را گویند تا چهل روز.

[10] دستور الاخوان ص ۱۴۱ ۶ النفاس : زاج شدن و زاجی ؛ زاج زنی که تازه زائیده.

[11] زواره برادر رستم بود ، رک : جهانگیری ۲ : ۲۰۱۷.

[12] نسخهٔ اصل 'کن' ندارد ؛ اما رک : معین ۲ : ۱۷۶۶ ؛ ناگفته نگذریم که جهانگیری ۲ : ۲۲۹۴ زی با اول مفتوح بمعنی جان و زندگانی.

بهمنجه است خیز و می آر ای چراغ زی ⁂ تا بر چنین گوهر شادی نگنج می

[13] فرس ص ۷۹ ، صحاح ص ۶۶ : ژخ بانگ زار و حزین باشد ، نیز رک : قواس ص ۱۹۰. در ادات و کنز الفضائل و موید ۱ : ۶۶۶ : ژخ بالفتح پاره گوشت که بر تن مردم برآید ، ثؤلول ، هندوی مسا. و برای معنی آواز حزین ژغ است.

بهرهٔ 'د'

ژرد[1]: بسیار خوردن.

ژند[2]: چیزی عظیم و منکر بود، هم ازین پیل را ژنده[3] پیل گویند و پاره[4] نیز گویند.

ژندژند[5]: پاره پاره.

ژکور[6]: زفت[7] یعنی بخیل و پیچیده[8] و دزد باشد، بعضی بزای[9] عربی گویند.

ژغار[10]: بانگ سهناک.

بهرهٔ 'ژ'

ژاژ[11]: هر سبزه که باشد بی مزه، و [سخن] بیهوده[12] را گویند، و رستنی[13] خاردار و حشیش خود روی.

بهرهٔ 'ف'

ژرف[14]: قعر و عمق و غور، در فردوسی[15]: عظیم و دور اندر بود چون مغاکی و چاهی، و معنی باریک.

بهرهٔ 'ن'

ژیان: تیز[16] تند و خشم آلوده، و بیشتر با شیر و اژدها و پیل و دده و مانند آن استعمال کنند.

---

[1] رک: ادات، موید ا: ۴۶۷: ژرد پُرخوری.

[2] ادات: ژند بازای فارسی چیزی عظیم و منکر و چیزی نیکو کهن شده.

[3] ژنده نیز بمعنی عظیم و بزرگ است، پس ژنده پیل بمعنی پیل عظیم و بزرگ بود، و این لقب شیخ احمد جام است.

[4] رک: مدار ۲: ۴۰۵. [5] رک: ایضاً.

[6] رک: فرس ص ۱۳۹، قواس ص ۹۵، صحاح ص ۱۰۶.

[7] رک: قواس ص ۹۵. [8] ادات: گرفته، مدار ۲: ۴۰۴: پیچیده روی.

[9] رک: موید ا: ۴۶۶.

[10] ادات: زغار نعره و فریاد و قیل بازای فارسی بانگ سهناک. نیز رک: ژغاره در قواس ص ۱۶۹.

[11] صحاح ص ۱۳۷: ژاژ دو معنی دارد، اول گیاهی باشد تلخ که ترهٔ دوغ از وی سازند، دوم سخن هذیان و یافه بود.

[12] در موید ا: ۴۶۷ این معنی بحوالهٔ قنیه آمده.

[13] این عبارت در نسخهٔ 'ل' یافته نمی شود.

[14] ادات و موید ا: ۴۶۷: ژرف بن چاه که عرب آنرا غور خوانند و مغاک که دور اندر بود و عرب آنرا عمیق خوانند و بمعنی باریک.

[15] مراد فرهنگ فردوسی که نایاب است.

[16] گذاشت در نسخهٔ اصل اما رک: صحاح ص ۲۴۴ و ادات و موید ا: ۴۶۸.

بهرهٔ 'ه'

ژاله[1]: سنگ باران یعنی تگرگ، و قطرهٔ باشد که بامداد[2] از خنکی بر چیزها نشیند و مُشک باد دمیده که در وقت آشنا کردن در آب بر خود گیرند و آنرا سناهی[3] خوانند.

ژنده[4]: کهنه گشته و ستبر.

ژولیده[5]: یکدیگر آمیخته و گرد آلوده[6].

بهرهٔ 'ی'

ژی[7]: آبگیر و آب دان.

گونهٔ 'س'

بهرهٔ 'الف'

سرواش[8]: حدیث.

سینا: سوراخ[9] کننده. و نام آن[10] کوه که خدای عزوجل با مهتر موسی علیه السلام بران کلام کرد.

سا[11]: خراج و گزید[12].

---

[1] رک: صحاح ص ۲۷۹، ادات، مویدا: ۴۶۸. [2] از باشد تا مشک در نسخهٔ اصل افتادگی دارد.

[3] گذاشت در ادات، موید و مدار ۲: ۴۰۴. [4] صحاح ص ۲۷۹: ژنده جامهٔ دریده و کهن گشته.

[5] ادات: ژولیده یکدیگر آمیخته و بدست مالیده شده، جهانگیری ۲: ۲۰۲۱: ژولیدن بمعنی پریشان شدن و درهم رفتن. [6] رک: مدار ۲: ۴۰۵.

[7] رک: فرس ص ۵۱۷، قواس ص ۳۵، صحاح ص ۳۰۳.

[8] رک: فرس ص ۷، صحاح ص ۳۵، قواس ص ۱۹۳.

[9] سینا بمعنی سوراخ کننده در دستور ص ۱۶۱، ادات، بحرالفضائل، مویدالفضلا ۱: ۴۷۰ ذیل عربی، برهان وغیره یافته می شود؛ اما این اشتباه است، این کلمه باید سنبا باشد اسم مصدر از مصدر سنبیدن بمعنی سوراخ کردن، رک: حاشیهٔ برهان نوشتهٔ محمد معین، نیز مقدمهٔ دستور الافاضل بقلم نگارندهٔ این سطور ص ۳۴. [10] یعنی 'طور سینا' و این کلمهٔ عربی است نه فارسی با سین مفتوح.

[11] صحاح ص ۲۴: سا خراج باشد، عسجدی:

تا هند ز روم لاجرم شاها ÷ گیتی همه زیر باج و سا کردی

سا و سای نیز بهمین معنی آمده.

[12] گزید و گزیت بمعنی خراج و جزیه است:

گر دهن از لقمه نخواهد مزید ÷ معده ز دندان نستاند گزید

رک: جهانگیری ۱: ۱۲۱۴.

ستا[1]یش: ستایش

سودا: اندیشه و خیال.

سکبا[2]: نان خورش که گوشت با سرکه می کنند.

سمیرا[3]: آلت گرای[4].

سارا[5]: خالص، گویند [ورق ۵۳ ا] عنبر سارا یعنی خالص و سپید.

بهرهٔ 'ب'

سداب[6]: و آن گیاهی است مثل پودنه که دایگان عورت حامله را از بهر اسقاط دهند، و نیز آنرا آش می کنند و بالای نانخورش می اندازند.

سیب[7]: معروف (است).

بهرهٔ 'ت'

سرشت[8]: مایهٔ طبع یعنی آفرینش.

سپست[9]: سبزه که تنه ندارد، و بتازی رطب[10] گویند و بعضی گویند بکسر بای پارسی.

سموت[11]: فتراک زین.

سویت[12]: غفلت.

سوغات[13]: ره آورد[14]. سفت[15]: کتف یعنی دوش.

---

[1] رک: ادات و جهانگیری ۱: ۶۶۹. [2] رک: ادات و مدار ۲: ۴۸۲.

[3] رک: ادات و موید ۱: ۴۷۱ و مدار ۲: ۴۹۶: سمیرا آلت حمام.

[4] نسخهٔ اصل: گرد، اما قواس ص ۱۸۵: گرای و تاگو و تونگو یعنی حجام.

[5] ادات: سارا نام حرم ابراهیم علیه السلام و نوعی از عنبر خالص، نیز رک: موید ۱: ۴۷۱.

[6] رک: موید ۱: ۴۷۰ ذیل عربی؛ جهانگیری ۱: ۷۹۹ سداب را عربی و فارسی هر دو نوشته.

[7] ل: ستب. [8] رک: قواس ص ۱۸، دستور ص ۱۵۰.

[9] رک: ادات و موید ۱: ۴۷۴ و جهانگیری ۱: ۶۳۸.

[10] کذا است در ادات و موید؛ اما جهانگیری: رطبه. — و از زمین ... بدین باران و سپست رویانیدم و زیتون رویانیدم، تفسیر کمبریج، حاشیهٔ جهانگیری.

[11] رک: ادات و موید ۱: ۴۷۵. [12] رک: ادات و موید ۱: ۴۷۵ و جهانگیری ۲: ۲۰۲۳.

[13] کلمهٔ ترکی است. رک: موید ۱: ۴۷۶. [14] همین معنی در رشیدی درج شده.

[15] ادات، موید ۱: ۴۷۵، مدار ۲: ۴۷۳.

ساخت[1]: دوال رکاب.

بهرهٔ 'ج'

سارج[2]: شارک[3].

سارچ[4]: مرغکی است ضعیف و کوچک.

ساج[5]: مرغ کنجد خوارک.

سج[6]: رخ و رخساره.

سنج[7]: سرین.

سنج[8]: تنگی نفس، و بفتح سین نیز گویند و بعضی بجیم[9] پارسی نیز گویند.

سغج[10]: خربزهٔ خرد نارسیده که آنرا بشکنند و دران شراب خورند و سیکی[11]، و بعضی بجیم پارسی گویند.

سپنج[12]: چیزی عاریت، و گویند سپنجی یعنی عاریتی.

---

[1] کذاست در موید ۱: ۴۷۴، اما جهانگیری ۱: ۳۵۵: ساخت بند و بار زین.

[2] ادات: سارج جانوریست پرنده، اہل ہند آنرا شارک خوانند الخ، ازین شاید قیاس کرد که شارک کلمهٔ ہندی است.

[3] رک: جهانگیری ۱: ۳۸۹، شارک نام جانوری که آنرا شار نیز گویند؛ ۱: ۳۸۸: شار جانوریست مانند طوطی و در دیار ہندوستان بسیار است و آنرا شارک و شارو نیز گویند، ۱: ۵۳۹: سارج جانوریست خوش آواز و آن را سار نیز خوانند، ۱: ۳۵۷ سار جانوری است خوش آواز الخ. ازین توضیحات واضح می شود که سار و سارج و شار و شارک و شارو مترادف اند.

[4] جهانگیری ۱: ۳۶۰: سارج مرغیست کوچک و ضعیف و سیاه رنگ که در آذربائی جان سوران گویند.

[5] جهانگیری ۱: ۳۵۴: ساج ماده مرغ کنجد خواره. [6] رک: ادات و مدار ۲: ۶۴۰ و جهانگیری ۱: ۷۱۱.

[7] کذاست در ادات و موید ۱: ۴۷۶؛ مدار ۲: ۴۹۹ ایرادی دارد بر صاحب موید. جهانگیری بمعین 'سنج' را بدین معنی نیاورده، اما رک: سرمهٔ سلیمانی ص ۱۳۶.

[8] رک: قواس ص ۱۶۱، موید ۱: ۴۷۶، جهانگیری ۲: ۱۸۶۴.

[9] رک: جهانگیری.

[10] صحاح ص ۵۷: سغج خربزهٔ نارسیده باشد و در ماوراءالنهر آنرا بشکنند و از آن شراب خورند، نیز رک: سغچه: در زفان سغچه را بدین طور شرح کرده: سغچه خربزهٔ خام یعنی خربزهٔ نارسیده باشد که بدان شراب خورند و سغج نیز گویند، در بعضی فرہنگها سغنج و سغنجه مرقوم است، رک: مدار ۲: ۴۷۴ و موید ۱: ۴۷۶.

[11] سیکی یعنی شراب مثلث.

[12] رک: قواس ص ۱۳۲، صحاح ص ۵۳.

بهرهٔ "چ"

سیچ[1] : نقب[2] یعنی حفره کردن و سیچه حفره زده، بزیر زمین آگنده و چون خانه نیز باشد.

بهرهٔ "خ"

ستیخ[3] : راست ایستاده یعنی چیزی راست بقد چون ستون و قد و قامت و مانند آن.

ستاخ[4] : راست.

بهرهٔ "د"

سرواد[5] : شعر و نظم بزبان عجم[6]، و اسدی بذال[7] معجمه گوید، سرود[8] نیز گویند[9].

سرند[10] : گیاهی دراز است میان آب که در پای آویزد و ریسمانی[11] که در بازیها بپای اندازند و بفتح را نیز گویند و بعضی سرید[12] بیا گویند.

سفرود[13] : سنگ خوارک و آن مرغی است.

سابود[14] : طوق ماه یعنی خرمن ماه.

سند[15] : حرام زاده که از کوی برگیرند.

سپهبد[16] : سپه سالار.

سجد[17] : سرمای سخت تا اگر کسی را سرما زند گویند سجیده شده و بسجید و گویند روزی سجاید یعنی نیک سرد میشود، و بعضی بشین معجمه گویند.

---

۱ فرس ص ۶۲، قواس ص ۱۲۱، صحاح ص ۵۳ بجیم عربی و موید ۱ : ۴۷۷ با جیم فارسی. نیز رک: مدار ۲: ۴۹۴.

۲ نسخهٔ اصل نقب ندارد. ۳ رک: صحاح ص ۶۶، ادات، موید ۱ : ۴۷۷.

۴ کذا در نسخهٔ اصل : اما در نسخهٔ "ل" نیامده، نیز این کلمه در مراجع بنده دیده نشد. جهانگیری ۲۷۰ شاخ درخت نوچه.

۵ رک: فرس ص ۱۰۷، قواس ص ۱۰، صحاح ص ۹۰، دستور ص ۱۵۸. ۶ قواس و دستور: بزبان پارسی.

۷ چون در سرواد ماقبل دال، الف است، بقاعده تفریق میان دال و ذال در اینجا ذال باشد نه دال.

۸ صحاح ص ۹۰: سرود سماع و شعر. ۹ نسخهٔ اصل ندارد. ۱۰ رک: قواس ص ۵۷، دستور ص ۱۶۰.

۱۱ برای این معنی رک: ادات و موید ۱ : ۴۷۹ - ۴۸۰. ۱۲ رک: موید ۱ : ۴۸۰.

۱۳ قواس ص ۶۰، دستور ص ۱۶۰ : سفرود سنگخواره.

۱۴ رک: ادات، موید ۱ : ۴۷۸، جهانگیری ۱ : ۳۵۳ - ۳۵۴. در هر سه فرهنگ باعتبار معنی رسنی که اطفال بدان بازی کنند، مترادف سرند است، نیز رک: جهانگیری ۱ : ۱۰۳۰، جعفری سابود هالهٔ ماه.

۱۵ رک: قواس ص ۹۳ ۱۶ رک: صحاح ص ۹۰.

۱۷ ادات، و در موید ۱ : ۴۷۹، همهٔ مندرجات بحوالهٔ زفان گویا آمده.

ستاوند[1] : صفهٔ بلند .
سنجد[2] : میوه است ، تازی [۱۵۴] عناب گویند ، طریق[3] کنار باشد ، گرد و خرد و سرخ چون انگشت خرد و آنرا سنجد جیلان[4] و سنجد میلان گویند .
ستود : ستایش[5] و درود .
سپرد[6] : تحمل و گوشه [نشینی[7]] و فروتنی .
سمند : اسب[8] که رنگ او بسیاهی و زردی[9] زند . و گویند آنکه رنگ و موی او بزردی زند و فش[10] و ذنب[11] او سیاه باشد .
سبید[12] : سازی است بر شکل نای و نام حصاری در ایران زمین .
ساد[13] : ساده .

بهره «ر»

سپهر : آسمان .
سکار[14] : انگشت افروخته ، و در فرهنگنامه است : سکار[15] طعامیست ، گویند مالیده .
ستار[16] : زمینی که آب او تنک بود و بگل نزدیک و کشتی را بگیرد و بایستد .

---

[1] رک : ادات و موید ۱ : ۴۷۹ . [2] رک : ادات و موید ۱ : ۴۸۰ .
[3] ادات : مثل کنار ، موید : مانند کُنار ، وکنار بالضم والتشدید میوهٔ در غایت شهرت (موید ۲ : ۱۰۳) .
[4] مدار ۲ : ۵۰۰ : سنجد یلان (صح جیلان) و سنجد میلان بمعنی عناب ، موید ۲ : ۱۶ : عنّاب بالضم والتشدید سنجدِ جیلان و آن میوه ایست مانند کنار ، گرد و لعل بود ، به انگشتان خوبان او را تشبیه کنند .
[5] موید ۱ : ۴۷۹ بهمین معانی بحوالهٔ زفان آمده .
[6] ادات : سپرد بابای فارسی گوشه نشینی و قناعت و تحمل و فروتنی و راه سلوک .
[7] در اصل نیامده . [8] نسخهٔ ل : رنگ اسب که بسیاهی و زردی زند و فش و دم او سیاه باشد .
[9] رک : مدار ۲ : ۴۹۵ . [10] فش بالفتح دم است و بالضم موی گردن اسب (موید ۲ : ۵۶)
[11] ذنب بمعنی دم ایضاً .
[12] مدار ۲ : ۴۲۸ : سبند سازی است بشکل نای و نام حصاری در ایران زمین ، جعفری سپید نام قلعه و کوس الخ .
[13] رک : مدار ۲ : ۴۰۹ . [14] رک : قواس ص ۱۸ .
[15] در بعضی فرهنگها مانند ادات و شرفنامه و مدار و سروری و برهان وغیره سکار و سکاره مترادف قرار داده شده و حال آنکه سکار بمعنی انگشت افروخته و سکاره بمعنی مالیده باشد . رک : مقالهٔ بنده ، تصحیفات و لغات فارسی مجلهٔ علوم اسلامیه ۱۹۶۷ م ص ۶۶ . [16] رک : فرس ص ۱۲۶ ، قواس ص ۲۲ ، صحاح ص ۱۰۸ .

سا‌سر[۱]: کلک یعنی خامه.

سا‌سر[۲]: شارک.

سر[۳]: کفشی که از پشمینه[۴] و موی و ریسمان سازند.

سار[۵]: مانند[۶]، و جای[۷] [و] سارک[۸] را نیز گویند[۹].

سمر[۱۰]: مالهٔ خرد آبار.

سنگور[۱۱]: بادریسهٔ[۱۲] دوک و در اسدی[۱۳] است که مرغی است.

سمندر: مرغی یا جانوری که در آتش باشد و نسوزد، و گویند[۱۴] موش آتشکده و از پوست او رومال می سازند، ریم و چرکش دور می کنند و چون ریگین مگردد در آتش اندازند، ریم او بسوزد و او [سلامت] باند، و بلغتی سمندر[۱۵] و سمندور نیز گویند.

سبار[۱۶]: چرخ انگور مال وکاو آهن که بدان زمین زرعی پاره کنند، بهندوی پهالی[۱۷] گویند، و بعضی فرهنگیان بکسر سین گویند.

---

۱ رک: قواس ص ۵۷، ادات، موید ۱: ۴۸۲.

۲ موید ۱: ۴۸۲ و مدار ۲: ۴۱۳: ساسر بمعنی سایج ؛ و سارج بمعنی شارک، رک: زفان.

۳ موید ۱: ۴۸۴ سر بالضم بمعنی مذکور در متن آمده. ۴ نسخهٔ اصل: آن.

۵ رک: ادات. ۶ قواس ص ۸۵: سان و سار و آسا شکل را گویند الخ. مانند نگون سار.

۷ مثل در کلمهٔ کوهسار و مانند آن.

۸ قواس ص ۶۳: سایج و سار: شارک. صحاح ص ۱۸۲: شاک و سارک پرنده.

۹ 'را نیز گویند' از روی نسخهٔ ل افزوده شده.

۱۰ موید ۱: ۴۸۵: سمر بالفتح ثانی و مشدد مفتوح مالهٔ آبار. ادات: مالهٔ ابار که ملوک و اکابر و صدور پوشند. اما ماله دست افزار جولاهه و آبار مانند[ه]ی است.

۱۱ قواس ص ۱۸۴: سنگرک و سنگور بادریسه، مدار ۲: ۵۰۵ سنگور بادریسهٔ دوک، هندش پهرکی نامند و آن را شنگرف، سنگرک، شوکلک نیز گویند.

۱۲ زفان: بادریسه آنچ ریسمان بر دوک کنند... و آنرا بتازی فلکه گویند ؛ مقدمة الادب ص ۳۲۵: فلکه بادریسه.

۱۳ در نسخهٔ لغت فرس اسدی این لفظ شامل نیست.

۱۴ رک: ادات.

۱۵ کذا است در ادات. ۱۶ رک: ادات، نیز جعفری ص ۲۷۱.

۱۷ نسخهٔ اصل: سبالی ؛ ادات: پهال.

سریر[1]: قوس الله که نادانان کمان رستم گویند، و سریر بتازی تخت و کرسی است.

سغز[2]: جانوریست که برپشت او تیرها باشد، و بتازی سغر خانه گذاشتن و بجای رفتن.

سیر: شش نیم درم[3] سنگ.

سیر: ضد گرسنه و وزنی است معین و آن شش نیم درم سنگ است. در زمین بالا[4] دست و در بلاد ما هفتاد و دو درم سنگ است.

سیسنبر[5]: گلی که بگوش[6] ماند و گویند گیاهی است خوشبو که زهر کژدم فرود آرد.

سوفار[7]: معروف که در تیر باشد.

سپیدار: درخت [ورق ۱۵۵] است بار ندارد.

ستور[8]: اسب.

سالار[9]: بزرگ و سر[10] قوم و صاحب.

ساغر: پیاله.

سغر[11]: جانوریست چون سگی میانه باشد، خارها برتن او رسته بود چو کمان، آنرا بیندازد و همچو تیر بر هر که قصد گرفتن او کند.

بهرهٔ ز[12]

سپرز: عضوی از اعضای درونی، آنکه بسندوی تلی گویند.

سپز[13]: بیای پارسی، تیر که از کمان[14] بالا بفرستند، و بعضی بیای عربی گویند.

---

[1] ادات: سریر قوس الله که جهلای عرب قوس قزح و فارسیان کمان رستم خوانند.

[2] در ادات و زفان سغر و سغز هردو بهمین معنی، اما واضح است که یکی آنها تصحیف است. رک: موید ۲: ۴۷۵.

[3] رک: مدار ۲: ۵۲۲. [4] رک: موید ۱: ۴۸۶، مدار: در خراسان چهل سیر یک من.

[5] نسخهٔ اصل: سیسره اما رک: ادات و موید ۲: ۵۲۴. [6] نسخهٔ اصل: بگوشه.

[7] ادات: سوفار دهان تیر. [8] موید ۱: ۴۸۳: ستور اسب و چار وای دیگر.

[9] ادات: سالار بزرگ و سرقوم و سرگروه بعضی لشکر. [10] نسخهٔ اصل: سرقوم بحذف قوم آمده.

[11] صحاح ص ۱۰۸: سغر جانوریست از سگ کوچکتر و خارهای چون تیر دارد، نیز رک: سغر در همین فرهنگ.

[12] رک: ادات و مدار ۲: ۴۲۱.

[13] دربارهٔ قرأت کلمه اختلاف است، قواس ص ۱۷۲، موید ۱: ۴۸۷، برهان ص ۱۲۰۵ سپز (با بای) بمعنی تیز. نیز همین است در ادات، و بظاهر درست همین است.

[14] از روی 'ل' افزوده شد، اما معنی کلمهٔ سپز تیز است، رک: برهان، رسیدی وغیره.

ستیز[۱]: ستیزه بحذف ها، و آن ستیهش[۲] است.
سرز[۳]: ماله.

بهرهٔ 'س'

سویس[۴]: ببای پارسی، غفلت، و سویست[۵] بتا نیز گویند.
سالوس[۶]: فریبنده و مزوّر.
سدکیس[۷]: بیای پارسی، قوس الله تعالی.
سیبوس[۸]: اسبغول.
سپاس: منّت و در استعمال بضم[۹] سین می آید.
سادیس[۱۰]: چیزی که در و پنبه نهند و بدان جنگ کنند.
سپس: پس و پستر.
سندروس[۱۱]: مهره[۱۲] ایست معروف و از آن روغن نیز سازند.
سوس[۱۳]: درختی است.
سرپاس[۱۴]: لخت[۱۵] باشد و آن عمودی است که آلت جنگ است[۱۶].

---

۱ این واژه و واژه بعد از نسخهٔ 'ل' افزوده شد. ۲ اصل: ستاهش؛ اما رک: موید ۱: ۴۸۷، معین ستیهیدن بمعنی ستیزیدن آورده (۲: ۱۸۳۸). ۳ جهانگیری ۱: ۱۰۲۲: سرز ماله را گویند که بنّایان به آن گچ و آهک و کهگل بر دیوار مالند، نیز رک: مدار ۲: ۵۷. ۴ رک: موید ۱: ۴۸۸.

۵ رک: موید ۱: ۴۷۵. ۶ رک: موید ۱: ۴۸۸. ۷ ادات: سدکیس مانند کمان ملون که در ایام بشگال بر آسمان برآید و عرب آنرا قوس الله و قوس قزح و پارسیان کمان رستم خوانند.

۸ کذاست در ادات الفضلا و موید ۱: ۴۸۸، و در موید بگفتهٔ زفان سیپوس نوشته.

۹ کذاست در ادات الفضلا. ۱۰ ادات: سادیس و آن پنبه آگنده که از آن سلاح سازند در جنگ.

۱۱ ادات: سندروس چوبی که روغن ازو کشند. ۱۲ برای این معنی رک: موید ۱: ۴۸۸.

۱۳ رک: ادات، در موید ذیل عربی (۱: ۴۸۷) آمده: سوس در شرفنامه بمعنی درختی و در زفان گویاست بمعنی سوسمار و گیاهی که بهندوی ملتهی گویند. واضحاً نسخهٔ زفان که نزد صاحب موید بود، از نسخهٔ حاضر متفاوت بوده است.

۱۴ نسخهٔ اصل: سرماس؛ قواس ص ۱۷۰، سرپاش، موید ۱: ۸۸-۴۸۹ و برهان ص ۱۱۱۶ سرپاس و سرپاش هر دو بمعنی آلت جنگ نوشته. اما در فرس ص ۱۹۱، ادات، جهانگیری ۱: ۳۵۷، رشیدی ص ۸۴۸ فقط سرپاس (بسین مهمله). ۱۵ قواس ص ۱۷۰: لخت عمودی باشد که بدان جنگ کنند، درین فرهنگ سرپاس را از لخت جدا بیان نموده، نیز رک: ادات. ۱۶ ازین پس نسخهٔ 'ل' افتادگی دارد.

بهرهٔ 'ش'

سروش[1]: فریشته، و در بعضی فرهنگنامه‌هاست: مهتر[2] جبرئیل علیه السلام، و سروشه[3] بها نیز گویند، و سروش[4] هفدهم از ماه است.

سیرش[5]: دامنی زنان و بعضی نسخ بای[6] موحدت پارسی یعنی سپرش.

سونش[7]: آهن ریزه و جز آن، و براده هم آنرا گویند، هندوی 'لیچن[8]'.

سریش[9]: معروف [است].

ستایش[10]: دعای نیکو و آفرین.

بهرهٔ 'غ'

سماروغ[11]: رستنیه است که تخم ندارد و از جایگاه عفن و شوره و نمناک روید چون مزبله‌ها، و پهلوی جویها و چاهها و دیوار گرمابه و شورستانها و جز آن، سپید مانند چتر، خلق آنرا چترمار[12] خوانند، و گروهی کهیره[13] نیز خوانندش هندوی سانپکاچتر[14]، و زماروغ[15] بزا نیز گویند.

سپرغ[16]: ببای پارسی، خوشه‌های انگور پربار، و بفتح سین[17] و سکون بای پارسی نیز گویند.

ستاغ[18]: کرهٔ اسب شیرخواره زین ناکرده[19]، و گویند ستاغ[20] شتر شیرآور[21] [ورق ۱۵۶ا] و جز آن است و سرون[22] را نیز گویند.

---

۱ رک: قواس ص ۶. ۲ ادات و موید ۱: ۴۸۹ سروش فرشته و جبرئیل علیه السلام؛ صحاح ص ۱۵۳: سروش نام جبرئیل است علیه السلام خصوصاً و نام فرشته عموماً. ۳ رک: موید ۱: ۵۱۲.

۴ رک: مدار ۲: ۴۶۵ و معین ۵: ۷۵۲. ۵ کذا است در موید ۱: ۴۸۹.

۶ همین است در ادات. ۷ رک: ادات و موید ۱: ۴۸۹. ۸ رک: ادات.

۹ رک: موید ایضاً. ۱۰ رک: ایضاً. ۱۱ رک: ادات.

۱۲ کذا است در ادات و موید ۱: ۴۹۰. ۱۳ موید: کهوه.

۱۴ تصحیح این کلمه میسر نشد. ۱۵ رک: مدار ۲: ۳۸۳، جهانگیری ۲: ۱۷۰۵، ۱۷۰۹.

۱۶ رک: فرس، و قواس ص ۴۹ و صحاح ص ۱۶۳ و ادات وغیره.

۱۷ این تلفظ در جای دیگر بنظر نیامده.

۱۸ رک: فرس ص ۲۳۷، صحاح ص ۱۶۳، قواس ص ۷۳، موید ۱: ۴۹، مدار ۲: ۲۳۷.

۱۹ نسخهٔ اصل: تازین کرده.

۲۰ رک: قواس ص ۷۴، دستور ص ۱۶۱، ادات

۲۱ بحرالفضائل: شیردلادر؛ بظاهر این تصحیف شیرآور باشد.

۲۲ موید ۱: ۴۹۰ این معنی را بحوالهٔ ادات نوشته اما در نسخهٔ ادات که نزد بنده است این معنی یافته نمی شود.

سغ[1]: پوشش گنبد وسقف بی تیر و گداره[2] چون گنبد وسرون گاو، وبعضی اوّل بکسر[3] گویند وبعضی بفتح.
ستیغ[4]: راست ایستادن[5] بقدچون ستون و مانند آن وآسمان رانیز گویند.

بهرهٔ ف

سرف[6]: دردگلو که از سرفه بود و اصح بضم سین است.

بهرهٔ ک

سنگک: تصغیر سنگ، ژاله[7] باشد آنکه تگرگ گویند.
سیک[8]: زردی کشت.
سولک[9]: نیز، زردی کشت.
سارخک[10]: پشه[11].
سترک[12]: بزرگ وستیهنده ولجوج وتند و بزرگ جثه گویند وخشناک، وبعضی بکاف پارسی گویند.
سوناتک[13]: نفس بینی، بعضی سونانک گویند.
سچک[14]: کنج شیر، وبفتح سین نیز گویند و درین لغت معنی دوم هلک[15] است.
سنگرک[16]: بادریسهٔ دوک وسنکوک[17] نیز گویند.   **سپیتاک**[18]: سپیده، وبفتح سین نیز گویند.

---

[1] رک: قواس ص ۱۲۲، ادات، مويد ۱: ۴۹۰، مدار ۲: ۴۷۱. [2] جعفری تختهٔ پوشش بام، مويد، مدار: گذاره.
[3] كذاست مويد بحوالهٔ ادات. [4] رک: ستیغ درهمین فرهنگ. [5] رک: ادات ومويد ۱: ۴۹۰.
[6] رک: مويد ۱: ۴۹۱.
[7] كذاست در ادات، اما قواس ص ۵۵ ودرمويد ۱: ۴۹۴ سنگک بمعنی مشنگ یعنی کلاد نیز آمده.
[8] رک: قواس ص ۵۵، مويد ۱: ۴۹۴.
[9] رک: ایضاً، ودرقواس ص ۵۵ سیلک بمعنی زردی کشت آمده.
[10] رک: قواس ص ۶۷. [11] نسخهٔ اصل: پشته.
[12] رک: مدار ۲: ۴۳۸، سترگ وسترک هردو.
[13] قواس ص ۱۶۱: سوناک؛ ادات، مويد ۱: ۴۹۴، سروری ص ۷۶۶، جهانگیری ۲: ۲۰۴۲، رشیدی ص ۸۹۲، برهان ص ۱۱۹۳: سونانک نفسی کازبینی برآید. اما سوناتک مورد تائید قرار نمی گیرد.
[14] ادات ومويد ۱: ۴۹۳: سچک فتح جیم فارسی هلک که عرب آنرا فواق خوانند وآن شیر که بردوغ دوشند.
[15] قواس ص ۱۶۱: سچک: هلک. زفان هلک ذم بالا، هلک تصحیف هکک است.
[16] قواس ص ۱۸۴: سنگرک وسنگور: بادریسه.
[17] درمويد ۱: ۴۹۴ سنکوک بحوالهٔ ادات آمده اما رک: سرمهٔ سلیمانی ص ۱۴۳.
[18] رک: قواس ص ۱۸۶، ادات ومويد ۱: ۴۹۳.

سرک[1] : سپیده و سرخی.

سرک[2] : بضم سین، حصبه است.

ستاک[3] : شاخ نو که از بن ریاحین و درخت روید.

سروتک[4] : شورش، و در فرهنگنامه[5] سروتک افتاده است و بعضی سرموتک[6] گویند.

سرشک[7] : آزاد درختی است که گلهاش سپید بود و لطیف و کوچک، بسرخی گراید و مثل قطرهاش باریک
از باران و آب چشم که بچیزی رسد، گویند سرشک آب.

سلگ[8] : ناودان یعنی موری، و بعضی سلک گویند.

سپاروک[9] : بواو پارسی، کبوتر و بعضی بضم سین و بیائی عربی گویند.

سیلک[10] : کرم گندم خوار و بعضی این کرم را سیسک[11] خوانند.

سنلک[12] : مشنگ و آن نام غله ایست که بهندوی بتوره خوانند و بعضی بکسر سین و بعضی ستلک[13] گویند
و در نسخهٔ سنگل[14] کرده است.

سیسک : کرم گندم.

سیامک[15] : نام پسر کیومرث.

---

[1] قواس ص ۱۸۶ : سرک سرخی و سپیده. [2] قواس ص ۱۶۳ : سرک حصبه.

[3] رک : ادات و موید ۱ : ۴۹۳ و مدار ۲ : ۴۳۷.

[4] رک : ادات و موید ۱ : ۴۹۳، مدار ۲ : ۳۶۵، موید : سرونک و سلیمانی ص ۱۴۲، سرونک و سروتک و سرموتک.

[5] شاید فرهنگ قواس مراد باشد [6] مدار : سروک، موید : سرمونک.

[7] رک : ادات و موید ۱ : ۴۹۳. صحاح ص ۱۸۱ : سرشک چند معنی دارد، اوّل اشک، دوم درختی
است در نواحی بلخ برگش چون ارغوان باشد و گاه بلون بنفشه ماند و گاه سفید باشد، سوم گلی
باشد سرخ، چهارم قطرهٔ باران.

[8] رک : موید ۱ : ۴۹۴. [9] رک : ادات و موید ۱ : ۴۹۳ (سماروک غلط چاپی)، عه رک : سلیمانی ص ۱۴۳.

[10] ادات : سیلک کرم گندم خوارک که اهل هند آنرا گهن خوانند.

[11] قواس ص ۶۴ : سیسک کرم گندم خوار.

[12] قواس ص ۵۵ : سنگک مشنگ، ادات سیسک کرم گندم خوار و نام غله ایست که آنرا مشنگ خوانند
و اهل هند کلاو و بتوره گویند، رک : موید ۱ : ۴۹۴، مدار ۲ : ۵۰۴، بظاهر کلمهٔ درست سنگک است.

[13]، [14] در فرهنگهای که مراجعهٔ بنده اند، این دو صورت دیده نشد.

[15] سیامک نام پسر کیومرث که بردست دیو کشته شد، نام پهلوان تورانی، نام کوهی (معین ۵ : ۸۳۶).

سمک[۱] : رعنائی و بهتری.
سوسک[۲] : تیهو.

بهرهٔ گ

سنرنگ[۳] : پوستینی است سخت لعل.
سوگ[۴] : مصیبت و تعزیت.

بهرهٔ ل

سیخول[۵] : روباه ترکی که خار اندازد.
سندل[۶] : کفش.
سفال[۷] : معروف [ورق ۱۵۷ا] که از گل پخته بود، و استخوان جوز یعنی خستهٔ جوز و فندق و پسته و مانند آن.
سگال : اندیشه و حیل[۸]، و کرد[۹] و گفت است، گویند : بدسگال بدگوی[۱۰] و بداندیش.
سبل[۱۱] : علتی است و آن آنست که موی بردیده برمی آید.
سنبل[۱۲] : گیاهی است خوشبوی بخط نسبت کنند، و در فردوسی است[۱۳] : سنبل ریحان گویند، بهندوی آنرا چهر[۱۴] گویند.
سل[۱۵] : داغ. سکل[۱۶] : گیاهی است که در جامه آویزد و بعضی سکک[۱۷] گویند.

---

۱ رک : ادات و موید ا : ۴۹۲ (ذیل عربی) ۲ رک : ادات و موید ا : ۴۹۴.
۳ گذاست در اصل ؛ اما ادات : سنرنگ پوستینی است سخت لعل.
۴ ادات واو و کاف هردو را فارسی نوشته. ۵ رک : ادات و موید ا : ۴۹۷.
۶ رک : قواس ص ۱۵۵. ۷ رک : ادات و موید ا : ۴۹۶.
۸ برای این معنی رک : مدار ۲ : ۴۸۶. ۹ گذاست در اصل ؛ بظاهر این درست نیست زیرا سگال امر است.
۱۰ در زفان سگالیدن بمعنی اندیشیدن و خواستن است، پس بدسگال بمعنی بداندیش و بدخواه درست باشد.
۱۱ رک : موید ا : ۴۹۵ (ذیل عربی) ؛ این کلمه عربی است اگرچه در ادات شامل است، رک : دستور الاخوان ص ۳۳.
۱۲ رک : ادات و موید ا : ۴۹۶ (ذیل عربی).
۱۳ موید نیز بگفتهٔ فردوسی نقل نموده. ۱۴ گذاست در ادات، اما در موید : بال چهر.
۱۵ در مدار ۲ : ۴۸۷ سل بمعنی داغ بحوالهٔ سکندری درج شده.
۱۶ رک : موید ا : ۴۹۶.
۱۷ رک : ادات : بعضی سسک نوشته اند، رک : مدار ا : ۴۸۳.

بهرهٔ 'م'

سیام[1]: [کوهی است] در ماوراء النهر [که] ابن مقنع بدروغ از آن ماه برآورده بود و آن ماه را ماه سیام و ماه کاشغر و ماه نخشب و ماه مقنع و ماه کش نیز گویند که چهار شهر را روشن کردی.

ستیم[2]: ریش که برو سرما زند و بیاساماند، و فخر قواس[3] گفته است: ستیم سرما که بر ریش زند و بیاسام و در اسدی[4] آمده است: آن ریم که بر جراحت گاه فراهم آید و خون درو پر گردد، استیم نیز گویند.

ستام[5]: ساخت اسبان و استران که از سیم یا از زر بود.

سوتام[6]: اندک و بعضی بواو پارسی گویند.

سم[7]: خانه که زیر زمین کنده و راست کرده باشند.

سنگم[8]: کرمیست که می پرو.

سیم[9]: نوعی از ساز برزگری[10] است که بشکن گویند.

سرسام: علتی است یعنی خلل دماغ.

سهم[11]: بیم و ترس و هیبت.

سلم[12]: نام پسر فریدون.

بهرهٔ 'ن'

سان[13]: مانند و رسم[14] و سنگی که بدان کارد و جز آن تیز کنند.

---

[1] در ادات بهمان تفصیل است که در متن آمده؛ اما این از قول مؤرخان متفاوت است. رک: مجمل التواریخ والقصص ص ۲۳۵، تاریخ بخارا ص ۷۷، نیز جهانگیری ذیل نخشب و سیام.

[2] رک: ادات. [3] رک: قواس ص ۱۶۴.

[4] در نسخهٔ پاول هورن ص ۹۴ آمده: ستیم آن آب بود که در ریش جراحت بود، اول خون بود پس ریم گردد، ستیم خوانندش.

[5] رک: ادات و قواس ص ۱۷۵

[6] صحاح ص ۲۲۲: سوتام بزبان طوسی اندک و کوچک باشد، فرخی:

آنچه کردست و آنچه خواهد کرد ❊ سخت اندک نماید و سوتام

[7] رک: صحاح ص ۲۲۱. [8] رک: موید ۱: ۴۹۸.

[9] رک: ایضاً. [10] نسخهٔ اصل: بزاگری.

[11] رک: معین ۲: ۱۹۶۳. [12] رک: معین ۵: ۷۹۰.

[13] رک: ادات و موید ۱: ۵۰۰. [14] نسخهٔ اصل: ریم.

ستروَن[1] : نازاینده و آن زنی است که از زادن باز ماند یعنی عقیمه و استروَن[2] بکسر همزه نیز گویند .

ستودان[3] : خانه ای باشد که گبران گورستان خود کنند و مردگان را آنجا نهند .

سقفین[4] : نام ولایتی که آنجا مشک و خوبان باشند .

سوزیان[5] : سرمایه و غمخوار .

سمان[6] : بیست و هفتم روز از ماه .

سوین[7] : آبدان سگ یعنی اونهٔ[8] سگ .

ساوین[9] : سبدی که درو پنبه کنند .

سرشکوان[10] : پردهٔ عروس و جز آن [ورق ۱۵۸ا] یعنی حجله ، وبضم کاف نیز گویند ، و سرشکون هم آمده است .

ساربان : شتربان ، ساروان[11] نیز گویند .

---

[1] رک : ادات و موید ۱ : ۵۰۱ .

[2] کذا است در ادات .

[3] رک : فرس ص ۳۵۶ ، قواس ص ۱۳۰ .

[4] رک : ادات و موید ۱ : ۵۰۳ و مدار ۲ : ۴۷۴ . اما خطه ای بدین نام در ترکستان دیده نشد . در حدود العالم این نام مطلقاً نیست اما در مقدمهٔ بارتولد ص ۳۱ ، شهری بنام سقسین آمده : کلمهٔ شار غشن شکل اصلی سقسین است ، جغرافیانویسان دورهٔ مغول آنرا شهری می گفتند در کنار رود بزرگ و معمولاً آن را با ولگا بلغار یکجا می آوردند . نیز رک : حاشیه ص ۳۱۰ . در موید الفضلا سقسین را از سقفین جدا قرار داده .

[5] نسخهٔ اصل : سوزبان اما ادات و موید ۱ : ۵۰۴ ؛ جهانگیری ۲ : ۲۰۲۷ سوزیان بمعنی نفع و سود ، زر و سرمایه ، سخن راز ، سرکشی ، غمخوار ، ارمغان آورده .

[6] رک : ادات و موید ۱ : ۵۰۴ .

[7] قواس ص ۱۳۹ ، موید ۱ : ۵۰۴ ، مدار ۲ : ۵۱۵ : سوین آبدان (آبدستان) سنگ ؛ اما ادات و رشیدی ص ۸۹۳ ، برهان ص ۱۱۹۳ سوین آبدان سگ . جهانگیری ۲ : ۲۰۳۳ سوین بمعنی دیگ وطبق و کاسه آمده ، مترادف آوند دانا .

[8] کذا است در اصل ؛ ممکن ست آوند . آوند بمعنی ظرف است ، رک : جهانگیری ۱ : ۱۶۲ . آبدستان که در قواس است بمعنی آفتابه .

[9] رک : قواس ص ۱۳۴ .

[10] رک : قواس ص ۱۵۷ و جهانگیری ۱ : ۱۰۳۴ .

[11] رک : موید ۱ : ۵۰۰ .

سامان[1]: اندازه و حد و درخورد و قرار و پذیرفت .

سرغین[2]: بکسر وضم سین ، نای ترکی است .

سرون[3]: آنچه از بالای رانها باشد یعنی سرین وبضم نیز گویند ، و درین[4] لغت شاخ نیز باشد .

سوهان[5]: بدانچه آهن براده کنند.

سالیون[6]: تخم کرفش کوهی .

سمنگان : نام شهری در توران[7] زمین .

ساسان[8]: نام مردی [ ] که ملوک عجم از تخمهٔ او [بودند] .

ساتکین[9]: پیاله و خمره .

سندان[10]: بدانچه آهن کوبند .

بهرهٔ 'و'

ساو[11]: باج که از سوداگران ستانند وخراج و مرسوم ، و خالص و سونش زر وجزآن و زر خلاصه .

---

[1] رک : ادات و موید ۱ : ۵۰۰ ، موید ۲ : ۴۱۸ ؛ اما در جهانگیری ۱ : ۳۶۸ - ۳۶۹ : سامان بمعنی اندازهٔ کار ، میسر ، قرار و آرام ، قصبه وشهر ، عفت وعصمت ، قوت وقدرت ، نشان گاه مرز .

[2] نسخهٔ اصل ؛ سرگین ؛ اما رک : قواس ص ۱۷۵ ، ادات ، مدار ۲ : ۴۶۰ ، جهانگیری ۱ : ۱۰۲۵ ، در آنجا الذکر دو بیت از فردوسی شاهد آمده .

[3] رک : صحاح ص ۲۴۵ ، موید ۱ : ۵۰۳ ، مدار ۲ : ۴۶۶ .

[4] معلوم نیست کدام لغت است . اما برای معنی شاخ رک : موید و مدار .

[5] ادات : سوهان آن آهن درازوش که بدان خشونت از آهن دیگر برند وپیکان و امثال آن تیزکنند.

[6] رک : ادات ، موید ۱ : ۵۰۰ ، مدار ۲ : ۴۱۷ .

[7] کذاست در ادات و مدار ۲ : ۴۹۵ ، جهانگیری ۲ : ۱۷۱۲ . سمنگان شهری است در افغانستان میان خلم و مزارشریف وبلخ . همین شهر است که بروایت شاهنامه رستم تهمینه دختر سمنگان را بزنی گرفت و سهراب ازین پیوند متولد شد .

[8] ساسان از نجبای فارس بود ، بابک پسر اوست ، و خاندان ساسانی بدو منسوب است ، رک : معین ۵ : ۷۰۰ .

[9] سانکین وساتکینی هردو قدحی باشد که بدان شراب خورند ، جهانگیری ۱ : ۳۵۴ .

[10] ادات : سندان آنچه بر وآهن و زر ومس و امثال آن کوبند .

[11] قواس ص ۱۱۰ ساو بمعنی باژ و خراج نوشته و ص ۱۷۹ بمعنی سونش آورده . ادات ساو را بمعانی مذکور در متن بجز خالص نوشته .

سکالیو[۱]: بآتش پخته نان وجز آن ، وبعضی بفتح سین گویند.

سکارو[۲]: انگشتو[۳] وآن طعامی است چنانکه انگشت[۴] وبعضی بکسر سین گویند ، وسمنو[۵] نیز گویند.

سکو[۶]: بدانچه غله افشانند که بتازی آنرا مدری[۷] گویند.

ساشو[۸]: نام مردی.

سرو[۹]: درختی است هموار وبلند ، وآن چند گونه است چون پیاده وساده وسهی وسرو جویبار.

سغدو[۱۰]: طعامی است.

بهرهٔ ’ه‘

سامه[۱۱]: سوگند وعهد.

سده[۱۲]: دهم روز از بهمن ماه ، وآن جشن مغان است.

سنگچه[۱۳]: ژاله.

سرویسه[۱۴]: قوس الله[۱۵] که آنرا نادانان کمان رستم[۱۶] گویند.

سمه[۱۷]: مالهٔ خرد که بدان آهار کنند.

سغرنه[۱۸]: بفتح وضم غین ، روباه ترکی که خار اندازد.

---

۱ رک: قواس ص ۱۴۳ ، ادات وموید ۱: ۵۰۷.

۲ قواس ص ۱۴۴: سکارو ، انگشتو ، چنگال خوست مالیده. ۳ برهان ص ۱۷۷: انگشتو چنگالی و مالیده.

۴ انگشت عروس بحوالهٔ شرفنامه درموید ۱: ۵۰۷ آمده.

۵ کذاست دراصل ؛ اما سمنو در ادات وموید ۱: ۵۰۷ طعام آشامیدنی است ، نیز رک: مدار ۲: ۴۹۶.

۶ رک: موید ۱: ۵۰۷ ، مدار ۲: ۴۸۴ ، جهانگیری ۲: ۱۵۲۶.

۷ نسخهٔ اصل: مذری ، رک: موید و جهانگیری. ۸ رک: موید ۱: ۵۰۶ ، مدار ۲: ۴۱۳.

۹ مدار ۲: ۴۶۴ سرو را سه نوع بیان کرده سروآزاد ، سروناز ، سروسهی ، نیز رک: سلیمانی ۱۴۸ ، جعفری ۲۸۷.

۱۰ رک: موید ۱: ۵۰۷ ، مدار ۲: ۴۷۲ ؛ برهان یعنی سختو نوشته چرب روده باگوشت ومصالح پرکرده باشند.

۱۱ رک: ادات وموید ۱: ۵۱۰. ۱۲ رک: ادات.

۱۳ ادات: سنگچه ، کاف وجیم هردو فارسی ژاله.

۱۴ قواس ص ۲۲: سرویسه کمان ؛ اما ادات: سرویسه کمان رستم یعنی قوس قزح ، نیز رک: موید ۱: ۵۱۲ ، مدار ۲: ۴۹۶ ، جهانگیری ۱: ۳۶۵ وغیره.

۱۵ رک: ادات وزفان (ذیل سریر) ۱۶ ایضاً.

۱۷ رک: قواس ص ۱۸۳.

۱۸ رک: ادات ، موید ۱: ۵۱۲ اشتباهاً سغرنه ، نیز رک: 'سغر' در زفان و ادات.

سمانچه[۱]: سینه بند زنان، و بضم سین نیز گویند.
سفچه[۲]: خربزهٔ خام یعنی خربزهٔ نارسیده باشد که بدان شراب خورند و سفچ بغیرها نیز گویند، و در فرهنگنامه آمده که آنرا سبز کالک[۳] نیز گویند.
سفته[۴]: سوراخ کرده مروارید و بسد و جز آن.
سپاسه[۵]: منت [ورق ۱۵۹ ا] نهادن برکس.
سکیله[۶]: فواق یعنی هلک[۷]، بکسر سین نیز گویند.
سوخته[۸]: خف[۹] یعنی جامهٔ پاره[۱۰] سوخته، و هرچه وی[۱۱] را سوختگی و درد رسیده باشد.
سنبه[۱۲]: آلت تیز کردن آسیا برای آس کردن[۱۳] و در بعضی فرهنگنامه است: سنبه میتین[۱۴] آنکه آسیا برد و آنرا گرد[۱۳] بر آسیا زنه[۱۵] نیز گویند.
سنیره[۱۶]: نی که بدان تنسته بافند یعنی دران تنسته درکشند.
سنده[۱۷]: بچهٔ حرامزاده و آنکه از کوی برگیرند.
سرخده[۱۸]: حصبه، علت دمیدگی که بچگان [را] برون آید، و در فرهنگنامه[۱۹] است [...[۲۰]] افتاده است.

---

۱. رک: قواس ص ۱۵۰، ادات، موید ا: ۵۱۳
۲. رک: قواس ص ۴۹، ادات، موید ا: ۵۱۳. ۳. کالک خربزه نارسیده، جعفری ۳۸۱.
۴. موید ا: ۵۱۳ سفته بالضم حلقهٔ زرین وسیمین و آهنین و امثال آن که درگوش کنند، و هرچه سوراخ کرده بود از مروارید و بسد و جز آن الخ.
۵. رک: ادات و موید ا: ۵۱۰. ۶. رک: قواس ص ۱۶۱.
۷. رک: قواس ذیل هلک و هلک. ۸. رک: قواس ص ۱۷۷.
۹. زفان: خف رکوی سوخته یعنی پارهٔ جامهٔ سوخته.
۱۰. در موید ا: ۵۱۴، این معنی بحوالهٔ زفان آورده شده.
۱۱. رک: ادات و موید ایضاً ۱۲. رک: ادات و موید ا: ۵۱۳.
۱۳. زفان: میتین کلند و آن تبری است که بدان چاهها و زمین کنند و کلند خوانند، و سبل رانیز میتین گویند. ۱۴. ادات و موید: سنبه گرد برخیام.
۱۵. آلتی آهنین یا فولادین که سنگ آسیا را بدان تیز کنند.
۱۶. رک: ادات و موید ا: ۵۱۴. ۱۷. رک: ادات و موید ا: ۵۱۳؛ نیز رک: سند در همین فرهنگ.
۱۸. قواس ص ۱۶۳ سرخزه. اما رک: ادات؛ موید ا: ۵۱۲، سرخچه، جهانگیری ا: ۱۰۱۹: سرخده، سرخچه، سرخزه، سرخزه بهمین معنی. ۱۹. معلوم نشد که کدام فرهنگ مراد است. بظن غالب سرخوه که در اصل است تصحیف است. ۲۰. یک کلمه افتادگی دارد.

ستنبه[1] : بجوج وستیهنده وگویند ستنبه دیوی است که در خواب مردم را فرود گیرد.

سغده[2] : آماده.

سیله[3] : گلهٔ اسبان.

ساوه[4] : سونش زر یعنی ریزهٔ زر، و نام قصبه.

ساره[5] : چادر که هنود پوشند.

سنه[6] : لعنت، و بعضی بشین معجمه گویند.

سبوسه[7] : سبوس گندم.

سراینده : سرود گوی.

سخره : بیکاری ولاغ.

سرپوشه[8] : سرپوش چون دامنی و جز آن.

سکیزنده[9] : اسب و ستور برجهنده

سباده[10] : سنگی که بدان تیز کنند سلاح را، گویند سنگ[11] سباده

سرواله[12] : کاهی است که نوک دارد.

سکرفنده[13] : اسپ[14] در سرآینده وسکرفیده نیز گویند.

---

[1] ادات و موید ا: ۵۱۱ : ستنبه ستیهنده، و آن دیوی که در خواب الخ. نیز رک : جهانگیری ا: ۶۸۱، اما صحاح ص ۲۸۰ ستنبه بمعنی مرد قوی بازو آمده. [2] رک : ادات و موید ا : ۵۱۲.

[3] رک : ادات و موید ا : ۵۱۵ (قول صاحب موید که در ادات باکاف است درست نیست).

[4] رک : ادات و موید ا : ۵۱۰ و مدار ۲ : ۴۲۰. [5] رک : ادات و موید ا : ۵۱۰.

[6] موید ا : ۵۱۴ : سنه بالفتح لعنت، وقیل باشین قرشت و بالضم زن پسر. [7] رک : موید ا : ۵۱۱، مدار ا : ۴۲۹. [8] رک : قواس ص ۱۵۰، ادات، موید ا : ۵۱۲

[9] رک : قواس و موید ا : ۵۱۳، اسم فاعل از مصدر سکیزیدن بمعنی برجستن ستور.

[10] رک : ادات، و موید این معنی بحوالهٔ زفان نوشته.

[11] رک : مدار ۲ : ۴۲۳.

[12] رک : موید ا : ۵۱۲.

[13] موید : سکرفنده و سکرفیده اسب سرآینده کذا فی زفان گویا.

[14] اصل : است.

ستوه[1]: ناخوشی طبع، گویند بستوه[2] آمده است یعنی تنگ آورده، و استوه نیز گویند.

سوکه[3]: سوراخ آلت.

سپاه[4]: لشکر، و اسپاه[5] بکسر همزه است و در اصطلاح سپاه، بضم سین گویند.

سوده[6]: کهنه و مالیده.

سره[7]: پاکیزه و راست وبی عیب.

سکاچه[8]: آنکه تازی آنرا کابوس گویند.

سکنه[9]: کرد بر[10]، بتازی بیرم[11] گویند.

سنجه[12]: وزن چون درم و مثقال وسیر، و نام شخص[13].

ستاره[14]: قبه ایست که برای خفتن زنند، و نام سازی از جنس رباب، و درفشنده آسمان و آستانه[15].

سغبه[16]: [...] وچیزی فریفته.

سریچه: کنجشک خرد که بتازی[17] احمر الراس گویند.

---

[1] رک: ادات، در موید ۱: ۵۱۱ ستوه بکسر یکم وفتح دوم بمعنی رنجور بحوالهٔ زفان نوشته، حالانکه در بوستان بر وزن کوه آمده.

[2] ستوه آمدن نیز محاوره است چنانکه در بیت زیر از بوستان:

زمین از تب لرزه آمد ستوه ٭ فرو کوفت بر دامنش میخ کوه

[3] ادات سوکه سوراخ بن و سوراخ آلت. [4] رک: ادات.

[5] رک: مدار ۲: ۴۳۰. [6] موید ۱: ۵۱۴: سوده نیک کهنه و زده و مالیده شده.

[7] موید ۱: ۵۱۲: سره بفتحتین شقهٔ حریر سپید کذا فی زفان گویا و قنیه و در ادات وغیره بمعنی راست وبی عیب و پاکیزه؛ واضحاً صاحب موید در بردن نام زفان اشتباه کرده.

[8] سکاچه بمعنی ستنبه است، موید ۱: ۵۱۳. و در آخر الذکر ستنبه و کابوس (عربی) مترادف (۱: ۵۱۱)

[9] رک: ادات و موید ۱: ۵۱۳.

[10] نسخهٔ اصل: گره بر؛ موید: کرد بر نجار، کرد بر اشکنه یا برمای درودگری، موید ۲: ۱۰۲.

[11] دستور الاخوان ص ۱۱۹: البیرم: سکنه.

[12] ادات: سنجه آن سنگ که بدان وزن کنند چون درم و مثقال و نام شخصی

[13] جهانگیری ۲: ۱۸۴۳: سنجه نام دیو مازندرانی. [14] ادات و موید ۱: ۵۱۱

[15] سرمهٔ سلیمانی ۱۵۰ آستان در.

[16] در اصل کرم خورده و ناخوانا. رک: مدار ۲: ۴۷۲، جهانگیری ۲: ۱۴۳۶: سغبه فریفته و چیزی خوب.

[17] موید ۱: ۵۱۲: سریچه پرنده است سیاه دم دراز نول، تازیش صعوه، رک: مدار.

ستاه: نام پرده[1] ایست در سرود.

سبوسه: پوست گندم که در بیختن بردن می آید و بفا علتی که[2] در (ورق ۲۶۰) سر می شود.

سته: رنجور[3].

ستوده: مدح کرده.

سفته[4]: کسی را چیزی بجائی بدهند و جایگاه دیگر باز ستانند، بهندوی آنرا هنـد[5]ی گویند.

سمانه[6]: پرنده ایست.

سارچه[7]: شارک.

سمه[8]: رنگ آب.

بهرهٔ 'ی'

ساسی[9]: گدای.

ساری[10]: کشتی آب.

سای: ساینده و [امراز] سودن.

سپری[11]: تمام شده یعنی بسر رسیده، و نیز جنسی [از تیری] معروف بی پیکان آهنی.

سوری[12]: نام گلیست.

سبزگی[13]: سختی و رنج و درد.

سیکی: شراب مثلث.

---

[1] همین معنی در موید ا: ۵۱۱ بحوالهٔ زفان درج شده.

[2] جهانگیری ص ۵۹۲ سبوسه مردم هندوستان بفا گویند، رک مدار ۲: ۴۲۹ علتی که در سر باشد.

[3] در موید ا: ۵۱۱ سته (چاپی محذوف) یعنی رنجور بحوالهٔ زفان نوشته شده.

[4] رک: ادات و موید ا: ۵۱۳ (سفه غلط چاپی)

[5] گذاشت در موید. [6] رک: موید ا: ۵۱۳. [7] موید ا: ۵۱۰.

[8] رک: موید ا: ۵۱۳.

[9] رک: قواس ص ۹۴، دستور ص ۱۶۱. [10] رک: قواس ص ۱۷۸، ادات، موید ا: ۵۱۸.

[11] رک: ادات و موید ا: ۵۱۶.

[12] ادات: سوری نام گلی است که به پیکان تشبیه کنند.

[13] رک: ادات و موید ا: ۵۱۸: سیزگی. این واژه بشکل سپرگی، سپزگی، سیزگی، سبزگی آمده، دکتر معین سپزگی را درست می دانند، برای تفصیل رک: حاشیهٔ برهان و جعفری ص ۲۹۳ متن و حاشیه و ص ۲۹۴.

سایری[۱]: جامه ایست تنگ.
سگزی[۲]: نام کوه رستم دستان است، ایشان را سگزیان گفتندی.
سرنای[۳]: نای ترکی.
سپوزی[۴]: روغن کنجد.

گونهٔ ش

بهرهٔ الف

شغا[۵]: تیردان و ترکش، وبعضی فرهنگیان بفتح شین گویند.
شکیبا: صبوری.
شیدا[۶]: دیوانه و واله.
شوا[۷]: ریم اندام وسوختگی دست و پا.

بهرهٔ ب

شوب[۸]: دستار.

---

۱ کذا است در اصل؛ اما موید ا: ۵۱۵: سابری؛ در ادات حرف سوم واضح نیست؛ مدار ۲: ۴۰۷: ساتری.

۲ ادات: سگزی نام کوه رستم دستان که ساکنان آن کوه را سگزیان خوانند. همین معنی است در موید ا: ۵۱۸، مدار ۲: ۴۸۶. جهانگیری ۲: ۱۵۶۹: سگز نام کوهی است از ولایت زابلستان میان کیج و مکران، و دریای سند از پهلوی آن گذرد، گویند تولد رستم درآنجا واقع شده، لهذا رستم را سگزی گویند. نسبت سگزی به کوه سگز محض افسانه ایست؛ سگزی منسوب به سگزستان که سکونت قوم سکه بود که در تورات وکتیبه های آشوری سغز نام داشتند. همین سغزستان بنام مختلف مانند سگزستان، سگتان، سکستان، سگستان، سگقان یاد شده، واکنون سیستان نام دارد، سجستان معرب است. (رک: فرهنگ معین ۵: ۷۷۵).

۳ رک: ادات و موید ا: ۵۱۷. ۴ رک: مدار ۲: ۵۳۳.

۵ قواس ص ۱۷۳: شغا ترکش.

۶ ادات: شیدا دیوانه، موید ا: ۵۲۰: شیدا دیوانه و واله.

۷ قواس ص ۸۴: شوا: سوختگی دست و پا، ادات: شوا: ریم اندام و سوختگی دست و پا از کثرت کار ستبر وسخت گردد، اهل هند آنرا گره خوانند.

۸ قواس ص ۱۴۹ و ادات: شوب دستار.

ثیب[1] : تازیانه ، وفرود چیزی است ، و دراسدی[2] است ثیب بثای عربی و بیای پارسی چنانک[3] تازیانه یعنی رشتهٔ تازیانه باشد.

ثیب وتیب[4] : از اتباع[5] اند یعنی فراز[6] ونشیب ، یک معنی است .

شاذاب : بذال[7] معجمه ، سیراب .

شترب[8] : پلنگ .

شکیب : صبر وشکیبائی ، نیز صبوری[9] است .

شرب[10] : جامه ایست ازشعرهای افریشمی .

بهرهٔ ت

شنفت[11] : پوشش خانه یعنی سقف وبلندی ، وبفتح شین نیز گویند وبعضی شفت[12] هم گویند .

شویست[13] : همان شبت[14] .

---

[1] قواس ص ۱۷۶ : شیب : تازیانه ، صحاح ص ۳۹ و ادات : رشتهٔ تازیانه ، جهانگیری ۲ : ۲۳۱۴ : شیب دنبالهٔ تازیانه. [2] فرس نسخهٔ پاول هورن ص ۸ : شیب رشتهٔ تازیانه بود ، معزی گوید الخ .

[3] فرس این کلمه را ندارد ؛ کذاست در نسخهٔ زفان .

[4] فرس ص ۹ ، صحاح ص ۳۹ : شیب وتیب سرگشته و مدهوش بود ، رودکی :

شیب تو با فراز و فراز تو با نشیب ٭ فرزند آدمی تو اندر شیب وتیب

[5] صحاح : از قبیل توابع اند . [6] کذاست در اصل ؛ بظاهر مانند فراز ونشیب . [7] صاحب زفان فقط چند کلمه را بذال معجمه نوشته وحال آنکه بنا بر قاعدهٔ تفریق میان دال و ذال هزارها کلمات ذال معجمه داشته اند

[8] رک : موید ۱ : ۵۲۰ ، مدار ۲ : ۵۵۰ . [9] نسخهٔ اصل : صبر . اما رک : مدار ۲ : ۵۷۵ .

[10] رک : بحر الفضائل ، موید ۱ : ۵۲۰ ، مدار ۲ : ۵۵۶ ، شعر حافظ شاهد :

دامن کشان همی شد در شرب زرکشیده ٭ صد ماه نوز غشقش جیب قصب دریده

[11] کذاست در دستور ص ۱۷۰ ع ، اما قواس ص ۱۳۱ ، ادات ، بحر الفضائل ، موید ۱ : ۵۲۱ ، جهانگیری ۱ : ۲۶۷ ، برهان ۱۲۵۴ : شنفت . [12] رک : مدار ۲ : ۵۶۶ ، اما بیت شاهد که درین فرهنگ آمده ، در قواس شاهد شنفت است . [13] ادات و بحر الفضائل : شویست فسون وعلاج ، پراگندگی ، اما در موید ۱ : ۵۲۱ آمده شوبست بوزن شوخست فسون وعلاج ، وشویست پراگندگی و در لسان الشعرا بیک معنی هر دو نمط تصحیح کرده است ، فاما در ادات بدین طریق تمیز کرده است الخ ، مدار ۲ : ۵۹۲ : شویت بوزن شوخست فسون وعلاج و بفتح یکم وکسر سوم پراگندگی ، و در تجنیس شویست بوزن شوخست همان شملیت مذکور الخ ، جهانگیری ۲ : ۲۰۳۴ : شوبست افسون وعلاج ، ۲ : ۳۰۶۱ : شویست پراگندگی : بنظر بنده کلمهٔ اصل شویت است .

[14] شوی وشویت وشبت وشوید هم معنی اند ، یعنی والان خرد .

شبت[1] : والان خرد.
شست[2] : گرفتن سوفار تیز بر زه کمان ، و عددی که بتازی ستین گویند ، و دام ماهی یعنی آهن ماهی گیران و نشتر رگ زنان.

بهرهٔ ج

ششخانج[3] : گردک گلین گرد و گویند گردک گلین ، و بعضی بجیم[4] پارسی.
شکنج[5] : علتی است بهندوی بدّه[6] گویند.
شکنج[7] : چین که بهندوی جهرّی گویند.

بهرهٔ خ

شخ[8] : زمین سخت برکوه وجز آن ، و بینی و پارهٔ[9] کوه.
شکوخ[10] : با واو [ورق ۱۰۱] پارسی کی پایش بچیزی اندر آید و از کوچکی[11] بسر اندر افتد.
شوخ[12] : ریم اندام و هر ریمی که باشد در تن و جامه ، و بغیر واو[13] نیز گویند شخ ، بواو نیز دزد و بی شرم و

---

[1] رک : ادات و بحرالفضائل و موید ۱ : ۵۲۰ (ذیل عربی) شبت رستنی که بهندی سویا گویند و در لسان الشعرا شبت دهلیز خرد و کوچک ، مدار ۲ : ۵۴۵ : شبت والان خرد و رستنی هنش سویا . ع ه اکثر فرهنگها : دالان.

[2] رک : ادات و موید ۱ : ۵۲۱ . [3] رک : ادات ، موید ۱ : ۵۲۲ : ششخانج گردک گلین که بتازیش خدر نامند ، این در زفان گویاست . اما این قول صاحب زفان نیست بلکه صاحب ادات است . جهانگیری ۲ : ۱۳۸۱ : ششخان و ششخانه خیمه گرد را گویند و آنرا گنبد نیز نامند ، و معرب آن ششخانج باشد.

[4] رک : موید ۱ : ۵۲۲ [5] رک : ادات و موید ایضاً.

[6] این کلمه هندی در ادات و موید یافته می شود.

[7] رک : ادات و موید ایضاً.

[8] فرس ص ۷۸ ، قواس ص ۳۰ ، صحاح ص ۶۷ : شخ زمین سخت برکوه ، ادات : زمین سخت که پی برنگیرد و چرک اندام و جامه . و در ادات و موید ۱ : ۵۲۲ سنج بهمین معنی آورده شد.

[9] در نسخهٔ اصل ناخوانا ، ادات : ساده کوه (ذیل سنج) ، بحرالفضائل : پارهٔ کوه ، موید : سی ستارهٔ کوه ؛ معین ۲ : ۲۰۳۱ : بینی کوه ، سرکوه . اما جهانگیری ۱ : ۷۶۱ شخ بمعنی کوه با اشعار شاهد آورده.

[10] اصل : شلوخ ، صحاح ص ۶۷ : شکوخ آن باشد که پای بچیزی در افتد و مردم بسر درآیند ، گویند فلان کس بشکوخید ؛ ادات : شکوخ لغزش و افتادگی و بسرآمدگی اسب ؛ شکوخ مشتق است از مصدر شکوخیدن بمعنی بسر درآمدن و هیبت زدن ، (زفان).

[11] کذاست در اصل . [12] شوخ برای معنی اوّل رک : فرس ص ۸۰ ، قواس ص ۱۵۸ . [13] رک : مدار ص ۵۵۴ شخ بمعنی چرک اندام . [14] رک صحاح ص ۶۸.

رندست.

شامخ[1]: نام غله ایست خرد دانه چون کال.

بهرهٔ 'د'

شید[2]: روشنی و آفتاب که مقصود[3] ازوی روشنی است، و در فردوسی است: شید چشمهٔ آفتاب[4].

شکوخید[5]: لغزید و افتاد.

شکرد[6]: شکست، گویند شکرَد یعنی شکند، شکر یعنی بشکن و شکن.

شخود[7]: چیزی که بدان[8] ناخن بُرند.

شمید[9]: بی هوش [شد].

شابورد[10]: خرمن ماه و آفتاب، یعنی آنک از ابر و بخار گرد ماه و آفتاب برآمده باشد.

شادورد[11]: همان شابورد است.

شند[12]: منقار مرغ.

شمشاد[13]: سین[14] مهمله هم آمده. درختی است که قد را بدان تشبیه کنند.

شاکند: نمد[15] بزرگ که ازوی برگستوان سازند.

---

[1] موید ۱: ۵۲۳: شامخ غله ایست که دانه های خرد دارد چون کاکن، هندش سانوه خوانند.

[2] رک: قواس ص ۱۳-۱۴.   [3] اصل بقصور؛ برای همین نقره رک: ایضاً.

[4] همین معنی است در صحاح ص ۹۱. موید ۱: ۵۲۵ این معنی را بحوالهٔ زفان نوشته.

[5] ماضی مطلق از شکوخیدن.   [6] ماضی مطلق از شکردن بمعنی شکستن (زفان).

[7] کذا در اصل، شخود ماضی مطلق از شخودن بمعنی بناخن کندن، رک: ادات و جهانگیری ۱: ۷۶۳.

[8] ازین برمی آید که اسم نکره است، اما ماضی مطلق هم چنانچه در ادات الفضلا شخود بمعنی بناخن برید، وآنچه بناخن برید، هردو است.   [9] ماضی مطلق از شمیدن بیهوش شدن؛ قواس ص ۱۱۰ شمیده بیم رسیده و بیهوش شده.   [10] کذاست در قواس ص ۲۲، اما در فرس ص ۸۷، صحاح ص ۸۰، موید ۱: ۵۲۴ وغیره، شابورد. نیز رک: ادات و دستور ص ۱۷۲.

[11] رک: قواس، ادات، دستور وغیره.   [12] رک: فرس ص ۹۱، قواس ص ۴۴، صحاح ص ۸۰.

[13] رک: قواس ص ۴۷.

[14] موید ۱: ۵۲۹ بحوالهٔ زفان نوشته که سین دوم مهمله باشد؛ اما در شرف نامه این را غلط قرار داده.

[15] در موید ۱: ۵۲۴ همین معنی بحوالهٔ زفان نقل شده.

شنبلید[1]: معروف و شنبلیت[2] بتا نیز گویند، و آنرا بهندوی میتهی گویند.
شملید[3]: همان شنبلید است.
شکند[4]: جانوریست از خزندگان.
شکاد[5]: نام برادر رستم، شغاد نیز گویند.

بهرهٔ 'ر'

شاکار[6]: بیگار که مجرک[7] خوانندش و بلغتی[8] با حالت شین است هم بوزن بیگار.
شنار[9]: آشنا [در آب] کردن و جائی بود که آنجا کسی بایستد[10].
شبگیر[11]: صبح و نیز شبگیر آخر شب را گویند.
شهریور[12]: آفتاب در سنبله که شهریور ماه و چهارم روز از ماه که شهریور روز گویند.
شمشار[13]: درختی است سخت چوب میانه بالا سخت بلند[14] نیست، پیشه وران ازو آلاتها سازند و بلغتی[15] شین مفتوح است.
شکر[16]: شکن یعنی شکننده، گویند دل شکر است یعنی دل شکننده[17] است، و ازینجاست که پرندهٔ درند را شکره گویند و صید را شکار.

---

[1] ادات: شنبلید تخم معروف که اهل هند آنرا میتهی گویند. [2] رک: موید ۱: ۵۲۱، صورتهای دیگر شنبلید و شنبلیت و شملید است. [3] رک: موید ۱: ۵۲۵. [4] رک: ادات و موید ۱: ۵۲۴ و جهانگیری ۲: ۱۵۲۷، با این بیت شاهد:

درکوی این رباط زعقبی نشان مجوی ❊ هرگز بود مزاج سقنقور در شکند

[5] ادات: شکاذ و شغاد هر دو صورت دارد، اما معین ۵: ۹۰۵، نام برادر رستم فقط شغاد نویسد.

[6] صحاح ص ۱۰۹: شاکار و بروایتی شاه کار بیگار باشد و مجرک نیز خوانند الخ. [7] قواس ص ۱۰۲، زفان' و موید ۲: ۱۹۲: مجرک سخره بیگار. [8] رک: مدار ۲: ۵۳۷. [9] برای معنی اول رک: صحاح ص ۱۱۰، اما جهانگیری ۲: ۱۸۵۲ اشنار بمعنی شنا در نوشته. [10] اما رک: ادات و موید ۱: ۵۲۹، مدار ۲: ۵۸۳. [11] ادات: شبگیر صبح و پیش از صبح، متاخران بمعنی رفتن استعمال کنند، رک: جهانگیری ۱: ۱۰۸۱.

[12] رک: مدار ۲: ۵۹۳.

[13] رک: ادات و موید ۱: ۵۲۸ که مندرجات هر دو عیناً برطبق متن باشد.

[14] در ادات و موید نیست. [15] تا این جا در نسخهٔ 'ل' افتادگی دارد.

[16] امر از مصدر شکردن بمعنی شکستن.

[17] موید ۱: ۵۲۸ بحوالهٔ زفان این معنی افزوده: شکر بمعنی مرکش و شکننده و شکارکن نیز آمده کذا فی زفان گویا.

شغر[1]: گره که در اندام بسبب بسیار کار کردن افتد.

شیار[2]: زمین پاره کردن بگاو آهن و شکافتن [ورق ۶۲ا] گویند، فلان دشت و فلان کوه شیار زده است.

شاوغر[3]: ولایتی است برکنار ماوراءالنهر و از آن سوی[4] کافر است و درو جولاهان[5] بسیار اند.

شمر[6]: حوض خرد یعنی از آن آب که آنرا آبگیر و آبدان خوانند.

شدیار[7]: زمین زراعت پاره کرده یعنی زمین پاره کرده و رانده بهر زراعت که بهندوی هلوتی گویند.

شبهر[8]: نول[9] صقر.

شبانور[10]: شب پره.

شیپور[11]: نوعی است از بوق و شپبور[12] نیز گویند.

شار[13]: بنای بلند و خوب و نامور.

شلوار: ازار.

شوشت[14]: موضعی است در ترکستان[15]، ششتر نیز گویند، و ششتری[16] جامه ایست که آنجا بافند.

شخار[17]: قلی[18] باشد که گازر و رنگ[19] ریز نگاه دارد، و آن چیزی است که بهندوی سجی[20] و کهار[21]

---

[1] رک: ادات و موید ۱: ۵۲۸. [2] رک: صحاح ص ۱۱۱، موید ۱: ۵۲۹: شیاریدن در زمین جفت راندن (زفان). [3] رک: صحاح ص ۱۰۹، ادات، موید ۱: ۵۲۷.

[4] کذا است در ادات و موید. [5] کذا است در صحاح و ادات و موید.

[6] رک: قواس ص ۲۴ و ادات.

[7] رک: قواس ص ۳۰: فرس ص ۲۵. صحاح ص ۱۱۱ ش کار آورده. مدار ۲: ۵۵۰ شدیار و شدکار هردو دارد. زفان: شدیاریدن یعنی زمین پاره کردن. [8] رک: موید ۱: ۵۲۷، مدار ۲: ۵۴۸.

[9] نول یعنی منقار. صقر یعنی چرغ.

[10] رک: موید ۱: ۵۲۷، مدار ۲: ۵۴۴، جهانگیری ۱: ۵۹۴.

[11] کذا است در موید ۱: ۵۲۹، معین ۲: ۲۱۰۱. [12] ادات و موید ۱: ۵۲۷: شبور.

[13] رک: ادات: اما در صحاح ص ۱۰۹ شار یعنی نام جبش و بنای بلند و اسم بادشاه غرجستان و فراخ آمده، نیز رک: موید ۱: ۵۲۶. [14] در اصل شوسته، وشسته، وششتری.

[15] این اشتباه است: شوشتر در خوزستان است، شوشش نیز گویند.

[16] رک: ادات، مدار ۲: ۵۶۰. [17] موید ۲: ۸۹: قلی شخار که هندش سجی نامند؛ نسخهٔ ل: گلی. [18] نسخهٔ ل: صابونگر. اما ادات، موید ۱: ۵۲۷، مدار ۲: ۵۵۴ ←

گویند، و این را اشخار[1] نیز گویند.

شور : آشوب و غوغا.

شاپور: نام[2] پادشاهی شهر مصر جامع.

بهرهٔ ز

شومیز[3]: مزارع[4]، و گویند شومیز زمین پاک کرده و رانده یعنی شدیار.

شوریز: همان شومیز است و نام[5] داروئی است.

شنگویز[6]: داروئی است که بهندوی سندھی[7] گویند، و بیای عربی نیز گویند.

شیراز[8]: شیر که بروغ می دوشند، بهندوی کوچه[9] می گویند، و نام شهری است در پارس.

→ [1] ادات، موید، مدار: ساجی، اما در موید ۲: ۸۹ مترادف قلی (شخار) سجی نوشته، و در ۱: ۳۵ ذیل اشخار ساجی دارد. [2] نسخهٔ اصل: کلهار، برای این کلمهٔ هندی رک: موید ۱: ۳۵ ذیل اشخار.

[1] رک: موید ۱: ۳۵. [2] کذاست در اصل، در اصل سلسلهٔ ساسانی سه تن بدین نام پادشاهی کردند شاپور اول دومین پادشاه ساسانی (۲۴۲–۲۷۲م)، شاپور دوم دهمین پادشاه ساسانی (۳۰۹–۳۷۹م)، شاپور سوم پسر شاپور دوم (۳۸۳–۳۸۹م)، ساسانیان در ایران از ۲۲۴م تا ۶۵۲م سلطنت کردند، کانون خاندان ساسانی ایالت فارس بود و پای تخت ایشان تیسفون (مدائن) بود، ساسانیان حکومتی ملی تاسیس کردند که متکی بدین زردشتی و تمدنی بود که شاید از جنبهٔ ایرانیت در سراسر تاریخ ایران نظیر نداشته است. (رک: معین د، ذیل ساسان و شاپور)

[3] صحاح ص ۱۱۱: شومیز (مختوم به را) بمعنی زمین شکافتن، اما اصل کلمه شومیز (بازا) است. "بجایگاهی افتاد شومیز کرده ... اسپ از آن شومیز نتوانست آمدن" سمک عیار. رک: صحاح ص ۱۱۱ حاشیه ۱. قواس ص ۵۶: شومیز بمعنی شدیار و ادات: شومیز بمعنی زمین که از بهر کشت پاره کرده باشند. جهانگیری ۲: ۲۰۴۱ شومز، شومیز، شمیر هر سه بمعنی زمینی که بجهت زراعت آراسته باشند، شومیزیدن بمعنی زراعت کردن. رک: زفان.

[4] ادات و موید ۲: ۵۳۰ و جهانگیری ۲: ۲۰۳۷ شوریز بمعنی مزارع است. [5] موید ۲: ۵۳۰ این معنی بگفتهٔ زفان آورده، اما رک: مدار ۲: ۵۸۹. اما شونیز نام داروئی معروف است. رک: هدایة المتعلمین ص ۲۵۹، ۲۶۴ وغیره. [6] بگفتهٔ رشیدی ص ۹۵۷ شنگویز و شنگبیز و شنگویل و شنگبیل بوزن و معنی زنجبیل که معرب آنست. [7] در نسخهٔ اصل افتاده؛ رک: ادات و موید ۱: ۵۳۰، مدار ۲: ۵۸۶. اما در جهانگیری ۲: ۱۸۵۷: شنگبیز و شنگویز بمعنی شراب خرما نوشته که بهندی سندھی گویند، و معنی دیگر زنجبیل. البیرونی کتاب الصیدنه ص ۲۰۶ می آرد: زنجبیل رطب، بالهندیه ادرک، زنجبیل یابس: سنٹھ، بالفارسیه: شنگویر و ایضاً زنگبیر و شنگلیل؛ و بالسریانیة: زنگبیل، بالطخاریه: سنگریه. اما در ترجمهٔ فارسی بجای شنگویر شنگویز؛ اما از صورتهای دیگر مانند زنگبیر و شنگلیل و زنگبیل می توان قیاس کرد که شنگویر نیز اصلی دارد. [8] رک: ادات. ←

بهرهٔ 'س'

شندوس[1] : نام مردی.

بهرهٔ 'ش'

شفش[2] : نی نداف که بدان پنبه گرد کنند.
شفش[3] : شاخسار هر درختی که باشد، شُفش بضم شین وسکون فا نیز گفته، شفشه بها[4] نیز آمده است که شاخ درخت را گویند.
شخش[5] : فرد غزیده[6] بود یعنی لغزیده، و پوستین و جامهٔ کهنه.
شش[7] : پستان هست و نام عضوی معروف از شکنبه.

بهرهٔ 'غ'

شغ[8] : سرو[9]ن گاو که بدان جنگ کنند، و بلغتی شین[10] مفتوح است، و شغه بها[11] نیز گویند.
شغ[12] : آن[13] پوست که برتن سخت شده باشد از کار کردن.

بهرهٔ 'ف'

شنگرف[14] : کرم کشت خوار، [ورق ۱۶۳] و رنگی معروف است که بتازی زنجرف و شنجرف گویند.
شف[15] : شب، گوئی با بفا[16] بدل کرده اند.

→ ۹ ادات : کوجا.

۱ رک : مدار ۲ : ۵۸۴.

۲ رک : موید ا : ۵۳۱ ، مدار ۲ : ۵۶۶. ادات : ششش ؛ موید و مدار "شش" را بهمین معنی نوشته ؛ اما جهانگیری ۲ : ۱۴۸۷ شفش و ششش را مترادف نوشته.

۳ رک : قواس ص ۴۷. ۴ رک : موید ا : ۵۴۸ ، مدار ۲ : ۵۶۷.

۵ رک : ادات و موید ا : ۵۳۱. ۶ زفان : شخیدن لغزیدن و از جای فرو غزیدن الخ.

۷ رک : ادات و موید ا : ۵۳۱. ۸ این کلمه در نسخهٔ اصل افتاده.

۹ رک : قواس ص ۱۷۳ ، ادات ، بحرالفضائل ، موید ا : ۵۳۲ ، اما در فرس ص ۲۳۵ ، صحاح ص ۱۶۴ : سروی گاو.

۱۰ مدار ۲ : ۵۶۴ سغ. ۱۱ رک : موید ا : ۵۴۸ ۱۲ ل : شوغ.

۱۳ در اکثر فرهنگها مانند فرس ص ۴۹۲ ، قواس ص ۸۴ ، ادات شغه بهمین معنی آمده نه شغ.

۱۴ رک : قواس ص ۵۵ ، دستور ص ۱۷۴ و ادات و موید ا : ۵۳۳ برای معنی اوّل فقط.

۱۵ در نسخهٔ اصل افتاده ، رک : موید ا : ۵۳۲. ۱۶ صاحب موید این قول را بحوالهٔ زفان نقل کرده.

شگرف[۱] : بزرگ و با حشمت و لطافت ، و هرچیزی بود خواهی کار بود خواهی مردم ، و شگفت[۲] و زیبا [را] نیز گویند.

شندف[۳] : دهل و طبل.

شکاف : رخنه و شکافته.

بهرهٔ 'ک'

شلک[۴] : گل سیاه وام ، و خلاب که از وی پای بدشواری توان کشید.

شفک[۵] : نابکار و جلف یعنی تهی[۶] و نادان را نیز گویند.

شبک[۷] : دوک و در فرهنگنامه[۸] شبک بفتح با [بیان] کرده است [بمعنی] دوک.

شولک[۹] : گردهٔ دوک.

شتک[۱۰] : آنکه ببازی لگد بر سینه زنند.

شوشک[۱۱] : رباب چهار تاره ، و مرغکی که آنرا تیهو گویند.

شاشک[۱۲] : همان شوشک.

شکانک[۱۳] : سنگدان مرغ ، و بعضی بکسر شین گویند.

شاک[۱۴] : بُزِ نر.

---

۱. رک : فرس ص ۲۴۵ ، قواس ص ۹۸ ، ادات ، موید ا : ۵۳۳.

۲. رک : موید و مدار ۲ : ۵۷۵. ۳. رک : فرس ص ۲۴۲ ، قواس ص ۱۷۴ ، صحاح ص ۱۶۹.

۴. رک : قواس ص ۲۶. ۵. کذاست در فرس : اما قواس ص ۱۰۳ و صحاح ص ۱۸۲ : شنک؛ موید ا : ۵۳۵ ، برهان ص ۱۲۷۰ شغک و شفک هردو. ۶. رک : مدار ۲ : ۵۶۷.

۷. ل : شنک. ادات : شبک : دوک و گردهٔ دوک.

۸. رک : قواس ص ۱۸۳ : مشبک : دوک.

۹. رک : قواس ص ۱۸۴ ، موید ا : ۵۳۵ ؛ سروری شولک : بادریسهٔ دوک.

۱۰. رک : ادات ، موید ا : ۵۳۴ ، مدار ۲ : ۵۴۵.

۱۱. صحاح ص ۱۸۳ ؛ شوشک چهار رود یا چهار تار ؛ قواس ص ۶۱ : شوشک و شیشک تیهو. ادات و موید ا : ۵۳۴-۵۳۴. شوشک و شاشک بمعنی رباب چهار تاره و تیهو هردو. اما قواس ص ۱۹۰: شارشک و شاشک رباب چهار تار. نیز رک : قواس ص ۱۹۰ حاشیه.

۱۲. رک : ادات و موید ا : ۵۳۴. ۱۳. رک : قواس ص ۶۴ و ادات.

۱۴. رک : قواس ص ۷۵.

شلکلک[1] : ناودان، وبعضی فرهنگیان گویند : شلک بدو کاف در آخر : ناودان، هندی موری[2] گویند.

شاماک[3] : سینه بند.

شجک[4] : هکَ[5] یعنی هلک، شجک بکسر شین نیز گویند.

شرک[6] : حصبه که آنرا بهندوی سیپل[7] گویند، وبعضی بفتح شین گویند.

شیشک[8] : بسبزک[9] یعنی عکه[10] و در فرهنگنامه[11] است : شیشک تیهو است.

شرک[12] : جامه دارو، و شرک[13] دام.

شنلک[14] : خوشه.

شتاک[15] : شاخ نوکه از ریاحین و درخت برآید و نازک و تازه بود و خوردستان[16] نیز گویند.

شوالک[17] : پرنده ایست سرخ، و گویند که مرغی است که هر زمان رنگ بگرداند و بتازی آن را ابوبراقش[18] گویند.

شرفاک : آواز دم[19] شتر و اسب[20] و جز آن در رفتن.

---

[1] نسخهٔ اصل : شک، ل : شلکلک ؛ اما رک : ادات و موید ۱ : ۵۳۵. [2] همین کلمه در جهانگیری ۲ : ۱۶۲۶ یافته می شود. [3] شاماک و شاک و شاماخچه و شاماکچه بمعنی سینه بند زنان، رک : جهانگیری ۱ : ۳۹۱.

[4] رک : ادات و موید ۱ : ۵۳۵ و مدار ۲ : ۵۵۲، قواس ص ۱۴۸ اشجک بمعنی کنج، اما در زفان سجک بمعنی کنج است نه شجک. [5] رک : موید ۱ : ۲۶۷. [6] رک : ادات، موید ۱ : ۵۳۵.

[7] نسخهٔ اصل : پیل، ل : سیک ؛ ادات : بوری ؛ موید : بوری و سپل. [8] رک : موید ۱ : ۵۳۵.

[9] رک : ایضاً ص ۴۹۳. [10] زفان : عکه جانوریست که بتازیش عقعق گویند، سلیمانی ۱۶۳ ابزک عکه.

[11] رک : قواس ص ۶۱. [12] رک : جهانگیری ۱ : ۱۰۴۲ شرک باول مفتوح بثانی زده بمعنی جامه دارد.

[13] شرک هردو مفتوح بمعنی دام عربی است نه فارسی، رک : دستور الاخوان ص ۳۶۴.

[14] رک : موید ۱ : ۵۳۵. [15] رک : ادات و موید ۱ : ۵۳۴. [16] مدار ۲ : ۱۸۴ خوردستان شاخ نو و نازک ؛ ادات خوردستان، موید : خورد دوستان. [17] رک : موید ۱ : ۵۳۵، مدار ۲ : ۵۸۸.

[18] سلیمانی ۱۵۸ ابوبراق، مدار : بوبراقش. [19] فرس ص ۲۹۶، صحاح ص ۱۸۲ : سرفاک آواز پای مردم. جهانگیری ۱ : ۱۰۴۱ اشرفاک بمعنی هرآواز عموماً و آواز پای را خصوصاً گویند. فرس و صحاح بدین بیت تمسک جسته :

توانگر بنزدیک زن خفته بود ✤ زن از خواب شرفاک مردم شنود

و در جهانگیری ازین بیت :

تا مهرهٔ دل گرفت تاپاک ✤ در طاس فلک فتاد شرفاک

بنابرین معنی شرفاک که در زفان و موید و مدار درج است محل نظر است.

[20] نسخهٔ اصل : آب.

شارک[1] : مرغی معروف .

بهرهٔ گ،

شرنگ[2] : زهر، و گویند گیاه[3] و خربزه[4] تلخک ، بفتح شین لغتی است .

شنگ : درخت[5] سرو ، وشوخ[6] و دزد راهزن و مکابره گر و خوب .

شتالنگ[7] : پاشنه[8] پای ، بتازی کعب خوانند .

شهلنگ[9] : رسن تاب .

شالنگ[10] : گردگان[11] .

بهرهٔ ل، [ورق ۱۶۴]

شنگل[12] : دزد و راهزن ، و بضم کاف[13] نیز گویند .

شاغل[14] : نوعی از غله که بهندوی اَرہر[15] گویند ، و بعضی بضم غا گفته اند .

شمل[16] : پای افسزار چرمین .

شکول[17] : جلدی .

شال[18] : گلیمی خرد ، و فخر قواس[19] گوید : شال نمدی که زیر برگستوان[20] بکنند یعنی جل نمد که در زیر برگستوان کنند .

---

[1] درنسخهٔ اصل افتادگی دارد ؛ از نسخهٔ 'ل' افزوده ، ادات و سرمهٔ سلیمانی ۱۵۸ مرغی کوچک خوش آواز .

[2] قواس ص ۱۶۰ ، ادات شرنگ بمعنی زہر نوشته . [3] رک : مدار ۲ : ۵۵۹ . [4] مؤید ۱ : ۵۳۶ : خربزهٔ تلخ ، مدار : خربزهٔ تلخک . [5] قواس ص ۱۶۷ : شغک وشنگ شاخ درخت سرو ؛ اما ادات ، بحرالفضائل ، مؤید ۱ : ۵۳۶ کذاست درمتن . اصل : شالنگ . [6] رک : ادات و مؤید و مدا ۲ : ۵۸۵ . [7] رک : ادات و مؤید ۱ : ۵۳۶ . [8] صحاح ص ۱۹۸ : کعب پای .

[9] رک : مؤید ۱ : ۵۳۶ . [10] در 'ل' افتادگی دارد . رک : ادات و مؤید ۱ : ۵۳۶ ، (شاهنگ اشتباه چاپی) جهانگیری ۱ : ۳۹۲ : شالنگ چهار معنی دارد ، اول : گرو ، گردگان ، دوم : ستم و اشتلم ، سوم : مکر و حیله ، چهارم : سرکش . [11] گردگان با اول مکسور مرہون باشد : یک برادر شمعون باز گرفت گردگان تا ایشان باز آید و آن برادر کمتر را بیارند ، تاریخ بلعمی ص ۳۰۵ . [12] صحاح ص ۲۰۸ : شنگل دزد .

[13] رک : مؤید ۱ : ۵۳۷ . [14] رک : قواس ص ۵۶ ، دستور ص ۱۷۳ ، ادات ، مؤید ۱ : ۵۳۷ . در قواس و زفان کشاغل بهمین معنی است . [15] رک : زفان ذیل کشاغل ، نیز این کلمهٔ هندی در ادات و مؤید و جهانگیری ۱ : ۳۸۰ یافته می شود . [16] رک : قواس ص ۱۵۵ .

[17] رک : قواس ص ۱۶۸ . [18] رک : صحاح ص ۲۰۸ . [19] در قواس این واژه افتادگی دارد . ←

بهرهٔ م

شم[1]: پای افزار چرمین، و رمیده[2] یعنی دم خوارنده، و در فرهنگنامه[3] است: شُم بضم پای افزار مسافران آذربیجان است.

شجام[4]: آفت که از سرما رسد بمیوه و جز آن، و سرمای سخت.

شیم[5]: ماهی است سیمگون یعنی نقره گون، و نام[6] رودی است، و بعضی سین[7] مهمله گویند.

شلغم: گیاهی[8] است معروف، بتازی آنرا لفت[9] گویند، بهندوی کونگلو[10] گویند.

بهرهٔ ن

شران[11]: باران تند، و رای مشدّد[12] نیز آمده است.

شان[13]: زنبورخانه.

شایگان[14]: مال بسیار و گنج فراوان، آنگاه علم گشت گنج[15] خسرو پرویز را، و از معائب اشعار آنکه جمع آوردن[16] برای قافیه مفرد چنانکه در قافیه آسمان و زمان و مردگان[17].

← [20] موید ۱: ۵۳۷: شال گلیم خرد و نمدی که زیر برگستوان بود.

[1] برای معنی اوّل رک: فرس ص ۳۴۰، قواس ص ۱۵۶، صحاح ص ۲۲۲.

[2] نسخهٔ اصل: پای افزار خورمیده یعنی دم خوانده؛ صحاح ص ۲۲۲: شم بفتح رمیدن بود چنانکه گویند مشم یعنی مرم الخ، جهانگیری ۲: ۱۷۱۴: شم اوّل مفتوح بمعنی رم و آشفته و پریشان، از مصدر شمیدن بمعنی رمیدن. [3] معلوم نیست که کدام فرهنگنامه است، اما در صحاح آمده: شُم بضم شین پای افزار مسافران بود، روستای آذربایجان نیز دارند و آنرا چارخ گویند. جهانگیری است: بترکی چارق.

[4] فرس ص ۳۴۵، صحاح ص ۲۲۳: شجام بمعنی سرمای سخت، موید ۱: ۵۳۸ و مدار ۲: ۵۵۲ شجام بهردو معنی.

[5] فرس ص ۳۴۸، قواس ص ۶۸، صحاح ص ۲۲۳ بمعنی اوّل.

[6] ادات: شیم نام رودی است و ماهی سیمگون.

[7] رک: موید ۱: ۵۳۸. [8] یعنی بیخ گیاهی است خوردنی. [9] رک: دستورالاخوان ۵۲۹.

[10] ادات و مدار ۲: ۵۷۶، موید ۱: ۵۳۸: کنگلو.

[11] رک: قواس ص ۱۹، دستور ص ۱۷۲. [12] رک: موید ۱: ۵۴۰.

[13] رک: قواس ص ۲۰. [14] گنج بزرگی که لایق شاهان بود (جهانگیری ۱: ۴۰۵)

[15] رک: ایضاً.

[16] نسخهٔ اصل: آرد؛ این شایگان جلی است و شایگان خفی الف و نونی بود که در آخر کلمات بمعنی فاعل آید چون گردان و خندان یا زبان و کمان قافیه کردن، رک: ایضاً.

[17] اصل: مرده.

شن[۱] : شنی[۲] که از او پت[۳] سازند.

شیون : ماتم و زاری.

شمن : بت پرست.

شاهین[۴] : جانوری معروف که صید گیرد ، و دستهٔ ترازو.

شیان[۵] : جزا و مکافات.

شگون[۶] : جانوری از جنس شگالان است ، و بعضی بفتح شین گویند.

شروان : نام ولایتی.

شکن : پیچ یعنی خم در هرچه افتد.

شوتن[۷] : نام مردی.

شابران[۸] : نام ولایتی.

شادروان[۹] : بساط[۱۰] و پرده که بزرگ باشد.

بهرهٔ 'و'

شیشو[۱۱] : تیهو.

شاشو[۱۲] گیاهی است ، تخم او بدارو کار آید.

---

۱ رک : ادات و موید ۱ : ۵۴۲ ، مدار ۲ : ۵۸۳.

۲ موید بهندی سنئی نوشته . اما از ادات واضح می شود که سنی فارسی است . مدار ششنی کذا در متن.

۳ ادات و موید : ریسمان سازند.

۴ صحاح ص ۲۴۸ : شاهین بمعنی دستهٔ ترازو و جانور شکاری ؛ اما در موید ۱ : ۵۳۸ و مدار ۲ : ۵۴۲ عربی دانسته شده.

۵ رک : صحاح ص ۲۴۷.

۶ قواس ص ۷۶ : ششگون جانوریست . ادات : ششگون نوعی از سگالان ، نیز رک : موید ۱ : ۵۴۱ و مدار ۲ : ۵۷۴.

۷ رک : ادات ، موید ۱ : ۵۴۲ ، مدار ۲ : ۵۸۸. ممکنست پشوتن پسر گشتاسب باشد.

۸ ادات و موید ۱ : ۵۳۹ : شابران نام ولایتی است و نام شهری . نیز رک : لغت نامهٔ دهخدا ذیل شابران.

۹ رک : قواس ص ۱۵۷.

۱۰ موید ۱ : ۵۳۸ این معنی بحوالهٔ قنیه نوشته . بظاهر قنیه عیناً از زفان نقل نموده.

۱۱ رک : ادات و مدار ۲ : ۵۹۹—۶۰۰.

۱۲ رک : ادات و موید ۱ : ۵۳۳.

بہرۂ '۵'

شکافه[1] : زخمه که بدان رود زنند.
شغانه[2] : مرغی است مقدار[3] غلیواز، چهار[4] رنگ دارد.
شخولیده[5] : پژمرده.
شکوه[6] : حشمت یعنی بزرگی بسیار، هیکل[7] و زیب و قوت و مهابت.
شکوه[8] : محلت خرد را گویند، وبعضی شکوه دیه نشیب[9] را گویند چنانکه کلات دیه بلند را گویند.
شوره[10] [ورق ۱۶۵ ا] : خجل وبعضی بفتح شین گویند.
شیشله[11] : سُست.
شنوشه[12] : عطسه، وبلغتی سین دوم مهمله آمده است.
شخکاسه[13] : ژاله.
شته[14] : انگور، وشینه را نیز شته گویند، بسین مهمله نیز آمده است.
شیدانه[15] : عناب و آن میوه است، فندق نیز گویند.
شکوخیده[16] : اسبی که درسرآید وجز آن از چهار پایان، وشکوخنده[17] نیز گویند و درست تر گویند.

---

[1] رک : ادات و موید ا : ۵۴۸. [2] رک : ادات و موید ا : ۵۴۸ و مدار ۲ : ۵۶۶.

[3] در ادات و موید و مدار : بزرگتر از غلیواز. [4] ادات و مدار : سراو چهار رنگ دارد.

[5] رک : ادات و موید ا : ۵۴۷ و جعفری، شخولیده اسم مفعول است از شخولیدن که در ادات و زفان بمعنی صفیرزدن و چیزی بناخن کندن است. پس معنی آن باید صفیرزده و بناخن کنده باشد.

[6] رک : قواس ص ۸۵، ادات، موید ا : ۵۴۸، مدار ۲ : ۵۷۴.

[7] ادات و موید : هیکل بامهابت و قوت. [8] رک : ادات، موید و مدار.

[9] رک : مدار ۲ : ۵۷۴. [10] رک : ادات و موید ا : ۵۴۹. [11] رک : ادات و موید ا : ۵۵۰.

[12] رک : فرس ص ۴۹۰، صحاح ص ۲۸۲. اما در قواس ص ۱۶۶ : شنوسه.

[13] رک : قواس ص ۲۱، ادات، موید ا : ۵۴۷.

[14] برای معنی اول رک : قواس ص ۱۴۹، و برای هردو معنی رک : ادات و موید ا : ۵۴۷ و مدار ۲ : ۵۵۲.

[15] رک : قواس ص ۵۲، ادات و موید ا : ۵۴۹.

[16] قواس ص ۷۳ و ادات و برهان ص ۱۲۸۲ : شکوخنده. اما موید ا : ۵۴۸ شکوخیده مانند متن دارد. ادات شکوخیده بمعنی اسبی بسرآمده نوشته.

[17] نسخهٔ اصل : شوخنده.

شنه[1] : آواز اسب و اشنه[2] نیز گویند.

شیه[3]: آواز اسب و اشیه بهمزه نیز.

شغه[4] : گره[5] که در پای افتد.

شمغنده[6] : بوی ناک یعنی بوئی که از اندام مردم آید و بفتح[7] شین نیز گویند.

شاهیده[8]: صالح.

شمیده[9] : بیم زده و بیهوش شده .

شلّه[10]: جامهٔ عورت یعنی جامه ای که در شرمگاه عورت باشد، و سرگین[11] دان و جای خاک و پلیدی بود در کویها.

شیفته[12]: دیوانه مزاج .

شانه[13]: کاشانهٔ کوهی، کاف حذف کرده اند، و شانه خانهٔ زنبوران شهد را گویند، و آلت چوبین معروف که موی را بدان از یکدیگر جدا کنند .

شمّه[14] : چربی[15] سر شیر که بهندوی ملائی[16] خوانند و بتخفیف نیز خوانده اند .

---

۱ رک : فرس ص ۴۷ ، قواس ص ۷۳ ، صحاح ص ۲۸۲ . ۲ در نسخهٔ اصل نیست ، از نسخهٔ 'ل' افزوده شد .

۳ رک : قواس ۷۳ ، ادات ، موید ا : ۵۵۰ ، مدار ۲ : ۶۰۲ .

۴ رک : قواس ص ۸۴ ، نیز رک : همین فرهنگ زفان ذیل شغ و شغر .

۵ اصل : کردهٔ . ۶ رک : ادات و موید ا : ۵۴۹ . ۷ در نسخهٔ اصل نیامده ؛ اضافه از روی نسخهٔ 'ل' .

۸ ادات و مدار ۲ : ۵۴۲ : شابنده و شاهیده نیکوکار ، اما موید ا : ۵۴۶ : شاهنده نیکوکار و صالح .

۹ ادات : شمیده بیم زده و بیهوش ؛ اما موید ا : ۵۴۹ شمنده بهمین معنی آمده .

۱۰ فرس ص ۴۲۹ و قواس ص ۸۹ و ادات : شلّه بمعنی شرمگاه زنان آورده .

۱۱ برای معنی دوم رک : صحاح ص ۲۸۲ و ادات . اما در موید ا : ۵۴۹ بجای شلّه شنگه آمده و معنیاش بگفتهٔ زفان نوشته .

۱۲ رک : قواس و صحاح ص ۲۸۲ .

۱۳ مدار ۲ : ۵۳۸ شانه بمعنی کاشانه و خانهٔ زنبوران نوشته ، و موید ا : ۵۴۸ بگفتهٔ زفان معنی این واژه آورده . قواس ص ۱۲۰ ، شانه و شان بمعنی خانه و زنبورخانه هردو .

۱۴ در موید ا : ۵۴۹ شمه بکسر یکم و فتح دوم مشدّد و بتخفیف نیز آمده ؛ اما در جهانگیری ۲ : ۷۱۹ : با اوّل و ثانی مفتوح و مشدّد عربی است و به فارسی به تخفیف ، و کذا است در مدار ۲ : ۵۸۲ و برهان .

۱۵ قواس ص ۱۴۸ : چربی شیر .

۱۶ این کلمهٔ متبادل در ادات و موید و جهانگیری موجود است .

شنگله[1]: ریشهٔ دامنی و خوشه و شنگله تکژ[2] را گویند یعنی دانهٔ انگور.
شاره[3]: جامهٔ لعل و تنک [که] گرد شمع کشند تا باد نکُشد.
شکاه[4]: تیردان.
شناه[5]: مرد آشناکننده.
شوشه[6]: سونش و ریزه.
شرزه[7]: جنسی از دوگان است، و گویند شرزه شرزه شیری را گویند که در دُم او مار باشد[8]
شکافه[9]: کافه.
شکاونه[10]: کاونده یعنی نباشش[11]، و اورا گور شکاونه نیز گویند.

---

[1] قواس ص ۱۵۰: شنگله ریشه، ادات: شنگله با کاف فارسی دانهٔ انگور و ریشهٔ دامنی؛ موید ا: ۵۴۹ شنگله بمعنی ریشهٔ دامنی، مدار ۲: ۵۸۶: شنگله ریشه و ریشه بمعنی ریشهٔ دستار، جهانگیری ص ۱۸۵۸ شنگله به معنی ریشهٔ دستار و خوشه؛ و برای معنی خوشه بیت ناصرخسرو آورده:
درخت خرما صد خشک خار دارد زشت ٭ اگر دو شنگله خرمای خوب تر دارد.

[2] تکژ و تکس دانهٔ انگور باشد. رک: قواس ص ۵۰.

[3] رک: قواس ص ۱۵۲-۱۵۳، در موید ا: ۵۴۶ علاوه نموده: شاره جامه ایست لعل رنگ مخصوص پوشش اہل ہند. در زفان و مداز ۲: ۴۱۲، ۵۳۵ برای پوشش ہند ساره آمده نه شاره. اما در صحاح ص ۲۸۱ شاره بمعنی دستار و چادری مخصوص به اہل ہند آمده و از بیت منجیک تمسک جسته، و در جهانگیری ا: ۳۸۹ - ۳۹۰ شاره اوّل بمعنی دستار اہل ہند و دوم چادر رنگین که زنان ازان لباس سازند سوم به بمعنی کرتهٔ فانوس و برای معنی اوّل دو بیت فردوسی شاہد آمده. نیز رک: بیهقی ص ۴۱۷: "صد غلام ہندو و صد کنیزک ہندو بغایت نیکو رو و شارہای قیمتی پوشیده".

[4] رک: ادات و موید ا: ۵۴۸. [5] ادات: شناه آشناگر در آب. اما در صحاح ص ۲۸۲ شناه بمعنی شناکردن در آب و آشناه بمعنی شناکردن و شناکننده ہردو دارد، و در موید آشنا و شناه و آشناه ہر سه بمعنی شناکردن آمده.

[6] رک: ادات و موید ا: ۵۴۹.

[7] ادات و موید ا: ۵۴۷: شرزه درنده ایست غالب تر از شیر؛ صحاح ص ۲۸۱: شرزه شیر برهنه دندان و خشناک بود. اما در جهانگیری ا: ۱۰۲۱ شرزه بمعنی خشمگین و پر قوت و بسیار نیرو نوشته.

[8] این معنی در فرہنگها دیده نشد.

[9] موید ا: ۵۴۸: شکافه بالفتح کافه کذا فی القنیه اما معنی مشهور شق شده است.

[10] ادات: شکاونه کاونده و ہم بدین معنی کفن دزد را گور شکاونه خوانند.

[11] نباشش بمعنی گور شکاف و کفن دزد باشد رک، فرہنگ معین ص ۴۶۶۱-۶۲.

شکوفه : شکفته[1] نیز گویند ، غنچه ، بهندوی کونپلی[2] خوانند .

شمسه[3] : قرص که در مساجد و طاق و غیر آن می کنند .

شبه[4] : مهرهٔ یمانی و این سیاه است ، بتازی سبج[5] و بهندوی شوه[6] گویند .

شاه[7] : بزرگ و آشکارا[8] ، و ازینجاست[9] که جاندار و جهانبان را پادشاه گویند و مهرهٔ[10] مهین شطرنج را شاه گویند و راه گشاده [را] که بسیار راهها ازو گشاید و عامهٔ خلق دران بگذرند شاه راه گویند ، و داماد ازانکه وی را عزیز و بزرگ [ورق ۶۶ ا] دارند شاه گویند ، و نیز شاه نام جامه[11] است که از هندوستان آرند .

شخوده[12] : بناخن کندیده و خلیده .

شکرنده[13] : اسب که در سر آید .

---

[1] موید ۱ : ۵۴۸ شکفته برگ و گل دهان بسته که از شاخ بر زند ، ادات همین معنی برای شکوفه آورده .

[2] این کلمه در موید آمده . [3] ادات : شمسه آن قرص که در مساجد بر سر محراب و بزیر پای طاق راست کنند ؛ نیز رک : موید ۱ : ۵۴۹ ، مدار ۲ : ۵۸۰ .

[4] موید ۱ : ۵۴۷ : شبه مهره ایست سیاه که بر سر سلک مروارید نظم میدهند ، و در فرهنگ مولانا فخر قواس است که هندش ریعتی نامند و در ادات مذکور است که آن مهرهٔ یمانی ست بتازیش شبج (صح سبج) و هندش پوته نامند . اما در ادات فقط بمعنی اوّل آمده نه معنی سوم ؛ و در فرهنگ قواس این کلمه نیامده . مدار ۲ : ۵۴۸ شبه مهرهٔ سیاه یمانی ... و در اصطلاح مهرهٔ سیاه باریک که هندش پوت خوانند الخ .

[5] سبج معرب شبه است ، رک : فرهنگ معین ۲ : ۱۸۱۵ ، مدار ۲ : ۴۲۳ متن و حاشیه .

[6] نسخهٔ اصل : شتوه ؛ شبه و شوه هردو فارسی است ، رک : فرهنگ معین ذیل شبه و جهانگیری ا : ۵۹۹ ذیل شبرنگ . واضحاً صاحب زفان دچار اشتباه شده . متبادل کلمهٔ هندوی پوته یا پوت است .

[7] موید ۲ : ۵۴۶ ، معانی شاه بحوالهٔ ادات و زفان نقل نموده ؛ اما در نسخهٔ چاپی هردو عبارت مخلوط شده . [8] این معنی در فرهنگها دیده نشد .

[9] بظاهر این توجیه درست نیست ؛ این کلمه بدین معنی ریشهٔ مخصوص دارد که در پهلوی بشکل شاه است .

[10] صحاح ص ۲۸۱ : شاه چار معنی دارد ، پادشاه ، شاه شطرنج ، شاهراه ، داماد .

[11] رک : موید ۲ : ۵۴۶ ، مدار ۲ : ۵۳۹ .

[12] گذاست در ادات ، اما در صحاح ص ۲۸۱ : شخوده کاویده باشد (بدون قید ناخن) .

[13] ادات : شکرفنده اسبی بسر آینده

شیرینه[1] : نوعی از علت[2] که بتازی شعفه[3] گویند.

شیرازه : معروف.

شمنده[4] : شرمنده و بیهوش[5].

شادیه[6] : داروئی است.

شاماکچه[7] : سینه بند [زنان] و شاماخچه[8] نیز گویند.

بهرهٔ «ی»

شوی[9] : والان خرد که بهندوی سوئی گویند.

شبی[10] : نوعی از پوستینهاست و گویند گونهٔ از جامه و پوستین است و بفتح شین نیز گویند.

شکپوی[11] : شک شک پای رونده.

شخلی[12] : خارگیاه[13] و بیخ گیاه.

شیروی[14] : نام مردی.

---

[1] نسخهٔ اصل : شرینه ؛ اما شیرینه و شیرونه هر دو بهمین معنی آمده ، رک : موید ا : ۵۵۰ و مدار ۲ : ۵۹۹ و در فرهنگ معین و آنندراج شیرونک نیز. [2] نسخهٔ اصل : غله ، در اکثر فرهنگها بیماری سرقرار داده شده. اما در فرهنگ معین ۲ : ۲۱۱۰ - ۱۱ ، شیرینه و شیرینک زرد زخم ، و زرد زخم بیماری جلدی که در پوست دانه های زرد رنگ و ریز آبدار پدید آید.

[3] نسخهٔ اصل : شعفه؛ دستور الاخوان ۳۴۷ السعفة شیرینه ، فرهنگ معین ۲ : ۱۸۸۵ اسعفه : ناخوشی جلدی مانند کچلی الخ.

[4] ادات : شمیده بیم زده و بیهوش ، موید ا : ۵۴۹ شمنده و شمیده هر دو بهمین معنی دارد. مدار ۲ : ۵۸۳ شمیده دارد همراه بیت زیر از فردوسی : شمیده دلش موج برزد به جوش الخ ، و نیز بعلاوه نمود که در پنج بخشی (زفان گویا) شمنده بمعنی بیهوش و شرمنده آمده.

[5] در نسخهٔ اصل : بیهوشی ، تصحیح از روی فرهنگها.

[6] کذا ست در اصل اما در موید ا : ۵۴۶ و فرهنگ معین ۲ : ۱۹۹۵ همین درست است زیرا که شادنج معرب آنست اما جعفری ۳۳۱ شادنه و شادیه هر دو ، نیز رک : موید و فرهنگ معین ؛ جهانگیری ا : ۳۸۶ شاذنه با ذال نوشته. [7] رک : فرهنگ جعفری ۳۱۲ ، سرمهٔ سلیمانی ۱۶۵.

[8] نسخهٔ اصل : شامانچه ؛ اما ادات شاماکچه و شاماخچه و جهانگیری بعلاوهٔ آنها شاماکجه دارد ، رک : ۲ : ۳۹۲. [9] رک : ادات و موید ا : ۵۵۱ و مدار ۲ : ۵۹۱.

[10] ادات : شبی نوعی از جامه و پوستین ؛ نیز رک : مدار ۲ : ۵۴۸.

[11] رک : ادات و موید ا : ۵۵۱ و مدار ۲ : ۵۷۱. [12] نسخهٔ «ل» : شخکی.

[13] رک : ادات و موید ا : ۵۵۱. [14] رک : موید ا : ۵۵۱ و مدار ۲ : ۵۹۸ ، سرمهٔ سلیمانی ۱۶۶.

گونهٔ غ

بهرهٔ 'الف'

غوغا[۱]: آشوب بود و ملخ که پرش برآمده باشد.

بهرهٔ 'ب'

غزب[۲]: خوشهٔ انگور و گویند انگور است، و بیشتر فرهنگیان بزای پارسی گویند.

غاب[۳]: حدیث بیهوده و آنچه از کار بازمانده باشد و آنرا بتازی سقط گویند، و بیشه[۴] چنانکه گویند شیران غاب.

غبغب[۵]: جای زنخ[۶].

غبب: غبغب.

بهرهٔ 'ت'

غوشت[۷]: برهنه مادرزاد.

غلت[۸]: غلتیدن و بفتح لام[۹] نیز گویند.

غرشت[۱۰]: آواز اسب.

---

۱ این کلمه عربی است، رک: دستورالاخوان ص ۴۶۲، فرهنگ معین ۲: ۲۴۵۳ و موید ۲: ۳۴.

۲ فرس ص ۲۷، صحاح ص ۳۹: غزب دانهٔ انگور، قواس ص ۵۰: غژب: خوشهٔ انگور، موید ۲: ۳۵: غژب انگور و دانهٔ انگور، ادات: غژب خوشهٔ انگور، دانهٔ انگور.

۳ ادات: غاب سخن یاوه وبیهوده وچیزی از کار باز مانده که عرب آنرا سقط خوانند و بیشه. جهانگیری ۱: ۶۰۸ غاب سه معنی دارد، بقیهٔ خوردنی، بیهوده و هرزه، چیزی از کار مانده، و برای هردو معنی اوّل مثال آورده، برای معنی سوم بیت شاهد در حاشیه افزوده شده.

۴ از روی این معنی 'غاب' عربی است، رک: دستورالاخوان ص ۴۵۱، جهانگیری ۱: ۶۰۸.

۵ غبغب وغبب هردو عربی است، رک: دستور ص ۴۵۳، موید ۲: ۳۴، معین ۲: ۲۳۸۷-۸۸، اما جهانگیری 'غبب' را فارسی دانسته بمعنی گوشت زیر زنخ مترادف عربی غبغب (۱: ۶۰۵).

۶ موید ۲: ۳۴ این معنی را بگفتهٔ صاحب زفان نقل نموده.

۷ رک: فرس ص ۴۰، قواس ص ۱۰۵، صحاح ص ۴۶، ادات، موید ۲: ۳۵.

۸ رک: ادات و موید ۲: ۳۵.

۹ تخصیص اعراب در فرهنگها دیده نشد.

۱۰ رک: ادات و موید ۲: ۳۵.

بهرهٔ ج

: سندان ، جیم پارسی هم آمده است ،

: قنج یعنی کرشمه و سرین مردم و جز آن از چارپای ، و گویند آنگه که مراد کرشمه دارند
بضم غین گویند .

: کرشمه و ناز کردن .

ج : شرابی که بوقت بامداد خورند و بتازی صبوح گویند .

لیج : آنکه پهلوی یا زیر بغل کسی بسر انگشت بگیرند و بدان بخندانند ، بهندوی آنرا گدگدی
گویند و بعضی هر دو غین راکسرت دهند و بعضی غین دوم را به میم بدل کنند و گویند غلملیچ ،
و در بعضی فرهنگنامه ها جیم پارسی است .

غج : غلاب و غلیش .

، رک : قواسں ص ۱۷۸ ، ادات : خنج سندان .

، کذاست در ادات ، موید ۲ : ۳۶ با جیم تازی و فارسی هر دو صورت دارد .

، ادات : غنج بضم غین سرین مردم و غیر آن ، غنج بفتح غین کرشمه .

، رک : موید ۲ : ۷۰ . ۵ نسخهٔ 'ل' : و .

، نسخهٔ اصل : گویند که مراد کرشمه دارند الخ ؛ متن بر طبق نسخهٔ 'ل'

، دستور ص ۱۴۶۱ ذیل الغنج (عربی) نوشته : الغنج نازکردن و کرشمه و خرامش ، موید ۲ : ۳۶ این
کلمه را عربی دانسته .

، از نسخهٔ 'ل' افزوده شده . ازینجا تا بتازی در نسخهٔ اصل افتاده .

، از روی نسخهٔ 'ل' اضافه شده . ۱۰ رک : فرس ص ۶۶ ، قواس ص ۱۴۶ ، صحاح ص ۵۷ ، ادات ،
موید ۲ : ۳۶ . ۱۱ کذاست در موید ۲ : ۳۶ ؛ اما ادات غلغلیچ و غلملیچ (با جیم فارسی) بهمین معنی ، صحاح
ص ۵۸ : غلغلیچ دغدغه باشد که کسی را پهلو یا زیر بغل بخارند و بخندد ، لبیبی : چنان بدانم من
جای غلغلیچگهش الخ .

ل : کسی را . ۱۳ یعنی غلملیچ

ل : در فرهنگنامه .

از روی نسخهٔ 'ل' افزوده شد . در نسخهٔ اصل این واژه بعد از غلیواج آمده ، و بدینطور شرح
شده : گرهش که آسان نگشاید و بعضی جیم عربی گویند . واضح است که واژهٔ غلیج از قلم افتاده
و معنی اش تحت کلمهٔ غریفج نقل شده .

، رک : ادات و جهانگیری ۱ : ۱۰۵۱ ؛ جهانگیری غریفج نیز دارد ؛ نیز رک : موید ۲ : ۳۶ .

غلیواج[1] : غلیواز[2] یعنی مرغ گوشت ربای.

بهرهٔ 'چ'

غلیج[3] : گرهی که آسان نگشاید و بعضی بجیم عربی گویند.

بهرهٔ 'د'

غوشاد[4] : درختی است بلند و جایگاه کاروان و گاوان و گوسپندان.

غربد[5] : زنی که بشرط بکارت بخواهند [ورق ۱۶۷] و نباشد و در فرهنگنامه[6] غرید زنی که دوشیزه عروس کنند و نباشد.

غُند[7] : چیزی باهم شده ، و گرد[8] باز هم آمده.

غرو[9] : خانهٔ تابستانی[10].

بهرهٔ 'ر'

غر[11] : آنکه درگلوی مردم برآید کدو[12] واری ، بیشتر درحلق مردم فرغانه[13] بود.

---

[1] صحاح ص ۵۴ : غلیواج زغن باشد یعنی مرغ گوشت ربای و موش گیر ، موید ۲ : ۳۶ غلیواج با یای فارسی جانوریست معروف سالی ماده و سالی نر بود ، انوری در بیت زیر زغن را بهمین صفت بیان کرده : چون زغن تا چند سالی ماده و سالی نری. [2] رک : ادات. [3] رک : موید ۲ : ۳۶ ؛ نسخهٔ اصل : غریغج گرهش آسان نگشاید و بعضی جیم عربی گویند. [4] موید ۲ : ۳۷ بمعنی درخت بلند و جایگاه دیوان و جای کاروان و گوسپندان نوشته ، و بهمین معانی در ادات نیز درج شده. اما در فرس ص ۱۱۷ و صحاح ص ۹۱ غوشاد بمعنی جایگاه گاوان و گوسپندان آمده و در قواس ص ۱۲۹ غوشاد جایگاه کاروان همراه بیت زیر بعنوان شاهد : سبوح و مزکت بمان گرفت و دیزه فلان ÷ و ما چو گاوان گرد آمده بغوشادی واضح است که کاروان و دیوان تصحیف گاوان است. رک : حاشیهٔ قواس ص ۱۲۹ و مجلهٔ علوم اسلامیه : تصحیفات و لغات فارسی ، دسامبر ۶۷م ص ۴۹ بعد.

[5] درمیان فرهنگ نویسان دربارهٔ قرأت این کلمه اختلاف است ، فرس ص ۹۶ ، معین ۲ : ۲۴۰۵ غرند ، صحاح ص ۸۰ : عزبد ، قواس ص ۱۰۰ ، ادات : عزید. در اکثر فرهنگها بیت شاهد یکی است. رک : قواس حاشیه ص ۱۰۰

[6] از اینجا تا آخر در 'ل' ندارد. [7] ادات و موید ۲ : ۳۷ غند بالضم چیزی باهم شده ؛ جهانگیری ۲ : ۱۸۶۲ غند با اوّل مضموم گرد شده و جمع آمده را گویند (با بیت شاهد). [8] نسخهٔ اصل : گره باز

[9] رک : قواس ص ۱۱۹ ، ادات و موید ۲ : ۳۶. [10] نسخهٔ اصل : بلستانی.

[11] رک : ادات و موید ۲ : ۳۷ و جهانگیری ۱ : ۱۰۴۴ - ۴۵. [12] نسخهٔ 'ل' ندارد ؛ اما ادات : مثل کدو.

[13] این تخصیص در همین فرهنگ موجود است ، در هندوستان بالخصوص در ناحیهٔ مشرق هند این علت معمول است ، پس معلوم نیست صاحب زفان چرا فقط مردم فرغانه را ذکر نموده.

غنجار[1]: سرخی که زنان مالند در روی و آنرا گلگونه نیز گویند.
غز[2]: دبۀ خایه.
غیار[3]: جامۀ زرد که جهودان بر جامۀ خود می دوزند.
غار: کایان[4].

بهرۀ «ز»

غز[5]: قومی از ترکان ظالم که بر خراسان دست یافته بودند و بزور گرفته.

بهرۀ «س»

عرس[6]: خشم و عزاشیده[7] خشم آلوده[8] و بشین معجمه هم گفته اند.

بهرۀ «ش»

غراش[9]: خشم.
غاش[10]: فتنه و پلید[11] طبع و کسی که کس را دوست دارد، گویند عاشقی غاش است.
غوش[12]: چوبی است سخت که مطربان از آن زخمه سازند و سلاحدان تیر[13] سازند.
غاوش[14]: خیاری بود که برای تخم بدارند تا بزرگ شود.

---

[1] رک: فرس ص ۱۲۴ و قواس ص ۱۸۶. [2] رک: ادات و جانگیری ۱: ۱۰۴۴.
[3] این کلمه عربی است چنانکه از موید ۲: ۳۷ و جانگیری ۱: ۱۱۲۸، ۲: ۲۲۱۰ واضح است؛ در جانگیری کلمۀ متبادل فارسی یهودانه و گرده است.
[4] کذا است در نسخۀ اصل؛ «ل»: کابل؛ و معین بمعنی پیمانۀ نوشته که معادل صد قفیز الخ (۲: ۲۳۷۲)
[5] رک: فرهنگ معین ج ۶ ص ۱۲۴۸-۵۰. [6] ادات: غراس و غرس: خشم و خراش.
[7] در اصل: غراشیده: اما غراشیده با غین درست است. چنانکه قواس ص ۱۰۲: غراشیده بمعنی خشم آلود، باید علاوه نمود که درینجا غراسیده باسین مناسب بنظر می آید.
[8] در نسخۀ اصل «واو» پیش از خشم آلوده، چنان بنظر می آید که در اصل کتاب همین طور بود، بنابرین غراشیده و خشم آلوده شامل معنی غرس بود، رک: موید ۲: ۳۹.
[9] رک: قواس ص ۱۰۲.
[10] رک: ادات؛ موید ۲: ۳۹.
[11] ل: بلند طبع.
[12] رک: ادات؛ موید ۲: ۳۹. [13] تبر نیز خوانده شود.
[14] رک: ادات و موید ۲: ۳۹.

غیش[1] : بدحال[2] وبیشه و ده و اندوه بسیار.

بهرهٔ ک

غالوک[3] : گروهه یعنی مهرهٔ کمان گروهه باشد، و در بعضی فرهنگیان غالوک : کمان گروهه[4].

غرنک[5] : بانگ نرم درگلو وقت گریه.

غساک[6] : گیاه عشقه که بر درخت پیچد و پژمرده گرداند.

غسک[7] : کرمی است که در خوابگاه باشد یعنی اودس[8].

غدرک[9] : سلاحی که غازیان پوشند و کدرا و کدرنگ نیز خوانند.

بهرهٔ گ

غنگ[10] : چوب بزرگ عصاران که از چوبی و سنگی درآویزند تاگران گردد و روغن ازان بیرون آید که آنرا بهندوی لٹه[11] گویند.

غدنگ[12] : بی اندام و ابله.

غرنگ[13] : ناله و فریاد، و گویند بمعنی غرنک است یعنی آواز نرم باشد بگریه درگلو. بعضی بدو فتحت گویند.

---

۱ ادات : غیش بایای فارسی بدحال وبیشه و غم و اندوه بسیار و انبوه، نیزرک : موید ۲ : ۳۹.

۲ جهانگیری : بدحال فراوان (۲ : ۲۲۲۳). جهانگیری : هرچیز انبوه راگویند مانند بیشه و غیرآن. و درحاشیه این بیت اسدی افزوده : جزیری پر از بیشه ها بود و غیش الخ.

۳ فرس ص ۲۷۱، ۵۰۳، صحاح ص ۱۸۳ : غالوک : مهرهٔ کمان گروهه. قواس ص ۱۷۲ : غالوک گروههٔ کمان، موید ۲ : ۴۰ غابوک و غالوک هردو دارد.

۴ کذاست در ادات و موید.

۵ فرس ص ۲۶۰ : غرنگ بانگ نرم بود درگلو ازگریه، صحاح ص ۱۹۹ : غرنگ اول آواز نرم بود که ازگلو برآید دوم گریه و زاری باشد، قواس ص ۱۰۳ غرنگ آواز نرم بود. واضح است که کاف عربی خالی از اشتباه نیست.

۶ رک : ادات، سرمهٔ سلیمانی ۱۷۴. ۷ رک : ادات، سرمهٔ سلیمانی ایضاً.

۸ کذاست در ادات. همین کلمهٔ (اوڈس) در بعضی جایها در اضلاع شرقی و استان بهار، بجای کھٹمل بکار برند. ۹ ادات : غدرک نوعی اسلوٴ پوشیدنی که اہل ہند آنرا گدر خوانند، رک : موید ۲ : ۴۰. ۱۰ ادات : غنگ چوب بزرگ عصاران، وغن نیز گویند.

۱۱ ادات و موید ۲ : ۴۱ : لاته. ۱۲ رک : ادات و موید ۲ : ۴۱.

۱۳ رک : حاشیه ذیل غرنک.

بهرهٔ ل

غول[1]: دیو بیابانی و نشستگاه گوسپندان در دشت.

بهرهٔ م

غرشم[2]: خوشهٔ انگور و بخشم آمدن، و بعضی گویند صُرّهٔ انگور بود که شیره و تکش[3] اندر میان وی باشد.

غرم[4]: میش دشتی و گوسپند کوهی و گوسپندی که کودکان برو سوار شوند[5]، [ورق ۱۶۸] هندوی ارکه[6] گویند.

بهرهٔ ن

غلبکن[7]: دری چون پنجره و یا جعفری، درو هرکه باشد بنماید، و در اسدی[8] است: دری باشد از چوب بافته بود چون پنجرهٔ مشبک که درو نگاه کنند هرکه در سرای در آید و در سرای دهقانان[9] و باغها بسیار بود، و در فرهنگ نامه کاف پارسی است و مکسور و غین مضموم کرده است.

غرویزن[10]: غربال و خلاب، و غریزن[11] بفتح و کسر غین نیز گویند و در فرهنگنامه است: غریزن بزای پارسی غلیش[12] سیاه [که] بگندد.

غن[13]: چوب بزرگ عصاران یعنی غنگ عصاران.

---

[1] از لحاظ معنی اوّل عربی است، رک: موید ۲: ۴۱، معین ۲: ۲۴۵۴، اما از لحاظ معنی دوم فارسی است، رک: ایضاً. [2] رک: ادات و موید ۲: ۴۲.

[3] برای تکش و تکژ رک: قواس ص ۵۰. قواس بجای تکش تخس دارد.

[4] رک: قواس ص ۷۵، ادات و موید ۲: ۴۱.

[5] ادات و موید: سواری آموزند. [6] ادات: ادکه، ایرکه، تصحیح کلمه میسر نشد.

[7] رک: فرس ص ۳۶۴، صحاح ص ۲۴۷، قواس ص ۱۷۵.

[8] در اسدی نسخهٔ پال هورن ورق ۶۶: غلبکین دری باشد که از چوب بافته باشند پنجره کردار که از بیرون همه چیزی از خانه ببینند و در سرای روستائیان و در رزها بیشتر چنان باشد.

[9] در نسخهٔ 'ل': و در دهقانان.. بود افتاده.

[10] ادات: غریزن و غرویزن ... غربال، خلاب سیاه که بگندد.

[11] در نسخهٔ 'ل': و غریزن ... گویند افتاده.

[12] غلیش بمعنی خلاب، رک: قواس ص ۲۷، دستور الافاضل ص ۱۲۳، زفان گویا و غیر آن.

[13] رک: ادات و موید ۲: ۴۳. [14] نسخهٔ اصل: تنک عصاران، اما رک: غنگ.

غلیون[۱] : گِل سیاه که در زیر آب بود.

بهرۀ 'و'

غرو[۲] : خالی و نی یعنی قصب[۳] آنکه میان تهی باشد و آنرا[۴] بزنند.
غریو[۵] : فریاد و گریه بآواز.
غو[۶] : غلبه.
غیو[۷] : بیای پارسی، غلبه.
غالو[۸] : گروهۀ کمان و گویند[۹] کمان گروهه.

بهرۀ 'ه'

غمنده[۱۰] : غمگین.
غیشه[۱۱] : گیاهی است که بتابند و ازان جوال بافند، و گویند[۱۲] همانند کبال[۱۳] وحصیراست و جوال کاهکشان[۱۴] وبعضی بسین مهمله گویند.
غوشنه[۱۵] : گیاهی است که بتری[۱۶] بخورند و بخشکی اشنان[۱۷] سازند یعنی دست شوئی، و گویند غوشنه نوعی از سمارغ[۱۸] است.

---

۱ رک : ادات و موید ۲ : ۴۳. ۲ قواس ص ۳۹ : غرونی را گویند که میان تهی باشد.
۳ دستور الاخوان ص ۴۹۸ : قصب کلک و نی.
۴ نسخۀ 'ل' ندارد. در حاشیه نسخۀ اصل بخط کاتب نسخه افزوده : عزه و زن سرد که بتازی یراعه خوانند، یراع جمع، ولغت یراعه قصب و مگس که بشب بپرد چنانستی آتش است و مرد بد دل.
۵ ادات : غریو بیای فارسی فریاد باگریۀ کثیر الخ. نیز رک : موید ۲ : ۴۴.
۶، ۷ رک : ادات و موید ۲ : ۴۴. ۸ موید ۲ : ۴۳ غالو را ذیل عربی درج نموده وقول زفان گویا رانقل نموده ؛ نیز رک : غالوک.
۹ نسخۀ 'ل' : گویند کمان (بحذف گروهه) ۱۰ رک : ادات و موید ۲ : ۴۶.
۱۱ ادات : غیشه گیاهی است مانند حصیر و آن را بتابند و جوال بافند و ستوران نیز خورند، رک : قواس ص ۳۸.
۱۲ ازینجا تا آخر در نسخۀ 'ل' نیامده. ۱۳ رسنی را گویند از لیف خرما سازند (جهانگیری ۱ : ۶۰۶)
۱۴ موید ۲ : ۴۶ جوال کاهکشان را بحوالۀ قنیه نوشته ۱۵ رک : قواس ص ۳۸.
۱۶ نسخۀ 'ل' : آنرا بهتری ؛ متن مطابق نسخۀ اصل و قواس است. ۱۷ درختچه ایست خاص نواحی گرم و کویری (فرهنگ معین ۱ : ۲۸۸). ۱۸ رستنیه است که تخم ندارد (رک : زفان).

غلبه[1] : سنگ که آنرا بتازی عکه[2] و عقعق نیز گویند و آنرا شوم[3] گیرند.

غنده[4] : عنکبوت بزرگ و پاغنده[5] یعنی گاله[6].

غوزه[7] : بار پنبه[8].

غمزه[9] : مژه و چشم برهم زدن بناز یعنی چشم بریکدیگر زدن بود و آن چشمک است ، و اصل بستن و گشادن چشم را گویند.

غتفره[10] : پلید طبع یعنی ابله و عجمی[11] را گویند.

غراشیده[12] : خشم آلوده.

غداره[13] : پیکان بزرگ ، و این را غراده[14] و غزاره هم گویند ، و گویند دبهٔ برنجین[15] ، و در فرهنگنامهٔ فخر قواس[16] است : غزاره بزای معجمه شریط.

---

[1] رک : قواس ص ۶۲ ، ادات ، موید ۲ : ۴۶.

[2] زفان (ذیل بخش چهارم) : عکه جانوریست که بتازی عقعق گویند و گفته اند که آن زاغ دشتی است.

[3] نسخهٔ 'ل' ندارد.

[4] رک : قواس ص ۷۱.

[5] زفان : پاغنده پنبه زده یعنی ندف کرده و غلول ساخته.

[6] رک : ادات ذیل غنده و موید ۲ : ۴۶.

[7] ادات : غوژه با زای فارسی بهمین معنی.

[8] جهانگیری ۲ : ۲۰۴۲ غوزه پنبه ناشکفته بود که در غلاف باشد.

[9] صحاح ص ۲۸۳ : غمزه دو معنی دارد : اول مژه بود ، دوم چشم برهم زدن معشوق و عرب نیز این را غمزه گویند ، نیز رک : قواس ص ۷۹ و ادات.

[10] ادات : غتفره ابله و پلید طبع و زبون گیر الخ.

[11] نسخهٔ 'ل' : عجمه ؛ عجمی بمعنی غافل و بیخبر ، رک : فرهنگ معین ۲ : ۲۲۷۹.

[12] رک : ادات و موید ۲ : ۴۶.

[13] قواس ص ۱۳۷ : غداره پیکان ؛ اما رک : حاشیهٔ صفحهٔ مذکور. ادات : غزاره پیکان بزرگ و دبهٔ برنجین و چیزی مانند شریطه ، جهانگیری ۱ : ۸۰۲ : غداره پیکان بزرگ

[14] رک : موید ۲ : ۴۶ ذیل غراره بمعنی نوعی از سلاح جنگ پوشیدگی و غراده بمعنی خود آهنین ؛ اما در این صورت غزاره و غزاده مترادف غداره نیست.

[15] نسخهٔ 'ل' : دبهٔ روغن.

[16] نسخهٔ فرهنگ قواس چاپی این را مورد تائید قرار می دهد.

غبازه[1]: چوبی که بدان خررا رانند و آن باریک بود یعنی چوب دستی باریک و این را [۱۶۹] گوازه[2] نیز گویند ، و بعضی بضم غین نیز گویند .

غازه : گلگونه بود که زنان در روی مالند یعنی سپیدی و سرخی زنان .

غنچه : گل ناشکفته .

غوره[3]: انگور خام یعنی ترش و ناپخته .

غزنبه[4]: بانگ به تشنیع و بخشم زدن .

غرواشه[5]: گیاهی است[6] که آنرا کفشگران و جولاهان در لیف[7] مالند .

غوته[8]: سر آب فرو بردن باشد ، بتازی غوطه و غوصه[9] گویند .

غناوه[10]: سازیست ، و نام بازی است که بتازی ارجوجه گویند .

غرچه[11]: نادان .

غنوده[12]: خفته .

غیبه[13]: میانهٔ خلقه .

---

[1] کذاست در ادات و موید ۲ : ۴۶ و سروری ص ۹۳۹ . اما این اشتباه است زیراکه در فرس ص ۴۷۸ ، قواس ص ۱۷۰ غبازه است ؛ در مدار ۲ : ۱۴۳-۱۴۴ بازه را مختصر غبازه نوشته ؛ بازه بمعنی چوب دستی است . رک : قواس ص ۱۷۰ ، جهانگیری ۱ : ۶۰۵ : غباز بمعنی چوب دستی با بیت ناصرخسرو آورده . [2] جهانگیری ۲ : ۲۰۷۶ : گواز و گوازه چوب دستی باشد که بدان خر و گاو و سائر ستوران برانند و آنرا غرگواز نیز گویند .

[3] موید ۲ : ۴۶ : غوره انگور نارسیده که هنوز ترش بود .

[4] رک : ادات ، و صحاح ص ۲۸۳ ، در جهانگیری غزنبه بانگ و مشغله بود و آنرا غزیو نیز گویند (۱ : ۱۰۴۹) از مصدر غزنبیدن ، اسدی لغت فرس ص ۴۴۹ : دو چیز برکن و دو بشکن بیندیش ز غلغل و غزنبه .

[5] صحاح ص ۲۸۳ : غرواشه گیاهی باشد که جولاهان دسته بندند و بر جامه مالند.

[6] نسخهٔ 'ل' : 'است که آنرا' ندارد . [7] نسخهٔ 'ل' : کیف ، برای لیف رک : صحاح ص ۱۷۰.

[8] رک : ادات موید ۲ : ۴۶ غوشه ، سرمهٔ سلیمانی ۱۷۶ غوته غوطه است .

[9] غوص به آب فرو بردن.

[10] رک : ادات و موید ۲ : ۴۶ [11] ادات و موید ۲ : ۴۶ : غرچه مخنث و نادان

[12] ادات و موید ۲ : ۴۶.

[13] رک : ادات و موید ۲ : ۴۵ ، فرهنگ معین ۲ : ۲۴۵۷ : غیبه دایره های در سپر.

بهرهٔ «ی»

غوشای[1] : سرگین ستوران که در دشت خشک گردد و آنرا پاچک[2] دشتی گویند.

غاوجی[3] : صبوحی ، و در بعضی فرهنگ نامه هاست : غارجی برای مهمله ، صبوحی.

غرنیجی[4] : سرمارا گویند در عراق.

گونهٔ «ف»

بهرهٔ «الف»

فاوا[5] : خجل.

فراغا[6] : فراخی و کشادگی.

فنجا[7] : دمه و آن زحمت است.

فرا[8] : بالا و پیش ، گویند فراتر یعنی بالاتر و بیشتر ، و میانه ، گویند آن را فرا آب ده یعنی درمیان آب بینداز ، و گنج ، گویند فراخانه یعنی گنج خانه ، و بمعنی بر و در نیز باشد چنانکه گویند فراهم آر یعنی درهم آر و برهم آر ، و مختصر فراخ باش ، گویند فراکن یعنی فراخ کن بحذف خا ، و نیز می افتد ، گویند فراپوشنده یعنی پوشنده ، و تمام ، گویند فراپوش یعنی تمام پوشنده ، و گویند این کلمه بمعنی بر و در و نزدیک و دور آمده است.

بهرهٔ «ب»

فرسب[9] : جامه ای باشد که بدان بام را پوشند ، و بعضی بباء[10] پارسی گویند.

---

[1] رک : قواس ص ۱۴۱ و موید ۲ : ۴۷. [2] رک : جهانگیری ۱ : ۲۲۳. [3] درهمین فرهنگ نامه بمعنی صبوح آمده ، پس غارجی درست است نه غاوجی ، موید از قول زفان غاوجی نیز آورده (۲ : ۴۷)، قواس ص ۱۴۶ غاریج : صبوح ، غارجی : صبوحی. [4] ادات و موید ۲ : ۴۷ : غرنیجی سرمارا گویند در عراق.

[5] ادات : فاوا شرمنده. [6] ادات : فراخی و کشادگی. [7] ادات : فنجا بکسر فا دمه.

[8] ادات : فرا بالا و پیش چنانکه گوئی فراتر شو یعنی بالاتر شو و بیشتر رو ، و بمعنی میان آید ، و بمعنی کنج نیز آید و بمعنی بر و در استعمال کرده و بمعنی نزدیک و دور استعمال کرده اند ، در موید ۲ : ۴۸ معانی فرا بگفتهٔ خود از زفان نقل نموده ، اما مندرجات آن یک کمی فرق دارد.

[9] موید ۲ : ۴۸ : فرسب بفتحتین جامهٔ که بدان بام را پوشند و در شرفنامه بدین معنی بابای فارسی و در زفان گویا هر دو لغت است.

[10] موید ایضاً : فرسپ همان فرسب مذکور و آن چوبی ستبر که بدان سقف کنند و بمعنی نزدیک و دور نیز آمده ، ادات فقط معنی اول دارد ؛ صحاح ص ۳۹ : فرسپ چوبی است که بام را بدان پوشند.

بهرهٔ 'ت'

فرهست[1] : جادوئی.

فرتوت : پیر سال خورده یعنی سخت پیر.

فرت[2] : تار که مناسب پود باشد، بعضی بضم فا نیز گویند.

فخت[3] : ماهتاب.

بهرهٔ 'ج'

فرنج[4] : پیرامون دهان یعنی گرداگرد، و در بعضی فرهنگنامه هاست فرنج بدو فتحت و جیم پارسی،

پیرامون دهان.

فنج[5] : دبهٔ خایه و زشت یعنی قبیح.

فلج[6] : کلیدان در یعنی غلق[7] در.

فنج[8] : فروهشته لب.

فرنج[9] : دیوستنبه[10]

بهرهٔ 'چ' [ورق ۱۷۰]

فرهانج[11] : شاخ بزرگ که در و شاخ دیگر دهد.

---

[1] صحاح ص ۴۶ و ادات : فرهست : جادوئی.

[2] ادات : فرت تار که ضد پود است. نسخهٔ 'ل' : فرتاب بجای فرت.

[3] کذا است در نسخهٔ اصل؛ اما نسخهٔ 'ل' : فحت؛ و در موید ۲ : ۴۸ فخت بمعنی ماهتاب ذیل فصل عربی نقل شده، ادات فخت ماهتاب.

[4] رک : فرس ص ۵۸، قواس ص ۸۱، صحاح ص ۵۴، ادات وغیره.

[5] ادات : فنج دبهٔ خایه و زشت، قواس ص ۸۹ : فنج دبهٔ خایه.

[6] رک : فرس ص ۵۵، صحاح ص ۵۴، قواس ص ۱۲۶.

[7] صحاح ص ۵۴ : فلج غلق در باشد یعنی کلیدان. [8] رک : ادات و موید ۲ : ۴۹، جهانگیری ۱ : ۷۱۲. [9] رک : ادات : فرنج پیرامون دهن و دیوستنبه که مردم را در خواب فروگیرد، موید ۲ : ۴۹ : فرنج پیرامون دهان و در زفان گویا فرنج بفتحتین دیوستنبه (در نسخهٔ حاضر اعراب مذکور نیست).

[10] جهانگیری ۱ : ۶۷۹ ستنبه در بعضی فرهنگ ها نوشته اند که دیوی باشد که در خواب مردمان را فرو گیرد.

[11] نسخهٔ اصل : فرخانج، 'ل' : فرهانج، قواس ص ۵۳ : فرهانج شاخ بزرگی که پی کنند تا شاخ دیگر دهد.

فرنج[1]: کفل اسب .

فرغانج[2]: مادہ گاو خرد فربہ .

بہرۂ 'خ'

فخ[3]: دام .

فرخ : مبارک بنیاد ، فرنخ[4] بود زیبا رخ .

فکامخ[5]: شیری کہ بر خوردنی ریزند .

بہرۂ 'د'

فرزد[6]: سبزہ کہ درمیان آب باشد و ہمہ وقت تازہ بود .

فرغند[7]: گیاہ عشقہ ، و آن گیاہی است و گندیدگی[8] یعنی آنکہ بوی ناخوش دہد ، و چون بر درخت پیچد درخت را زرد و خشک گرداند ، وی را تعند نیز گویند .

فسرد[9]: باسین مہملہ شکاری و بعضی بشین معجمہ گویند .

فرکند[10]: جای گذر آب چہ [بر] دیوار و چہ بر زمین .

---

[1] ادات : فرنج زشت و کفل اسب ؛ ادات ۲ : ۵۰ : فرنج کفل اسب و رشوت ، اما قواس ص ۱۰۵ و صحاح ص ۵۴ : فرنج بمعنی زشت و پلید . جہانگیری ۱ : ۱۰۱۳ : فرنج اوّل کفل اسب و دیگر چارپایان — پرخش و فرخش نیز ، دوم بمعنی زشت و نازیبا ، سوم رشوت .

[2] ادات : فرغانج : مادہ گاو و خرد کہ نیک فربہ شدہ باشد ، موید ۲ : ۵۰ فرغانج (ذیل ترکی) مادہ گاو کہ نیک فربہ باشد .

[3] رک : ادات ؛ در موید ۲ : ۵۰ : فخ بمعنی دام ذیل عربی بحوالۂ قنیہ نوشتہ .

[4] موید ۲ : ۵۰ ہمین اصل بحوالۂ قنیہ نوشتہ .

[5] رک : ادات و موید ۲ : ۵۰ (نکامخ اشتباہ چاپی است) .

[6] رک : قواس ص ۳۸ ، صحاح ص ۸۱ ، ادات ، موید ۲ : ۵۱ .

[7] رک : فرس ص ۹۷ ، قواس ص ۵۴ .

[8] کذاست در اصل ؛ صحاح ص ۸۱ : فرغند گندیدہ باشد ، موید ۲ : ۵۱ فرغند نیز بمعنی گندیدگی آید کہ بوی گندہ دہند .

[9] ادات و موید ۲ : ۵۱ : فسرد شکاری و ماضی از فسردن ؛ اما قواس ص ۷۶ : فشرد شکاری ، فسردہ نیز بمعنی شکاری آید ، رک : زفان ، موید ۲ : ۶۷ ، جہانگیری ۱ : ۱۴۶۱ ، رشیدی ۲ : ۱۰۴۸ ، برہان ۲ : ۱۴۸۸ .

[10] رک : قواس ص ۱۲۵ ، ادات ، موید ۲ : ۵۱ .

فلغند[1] : پرچین یعنی خاربست گرد[2] باغ و گرد گلزار باشد، وبعضی بفتح غین گویند.

فغند[3] : بدو فتحت وبلغتی بدو کسرت، زغند[4] زدن یعنی برجستن.

فنود[5] : فریفته و غره شده.

فلخود[6] : پنبه دانه [از پنبه کشیده] .

فلخید[7] : [پنبه دانه از] پنبه کشیده.

فترد[8] : دریدن ، درید[9] و دریده.

فراوند[10] : چوبی که از پس در نهند.

فرسود : سخت سوده و کهنه شده.

فرود : زیر.

فرهمند[11] : دانا و خردمند.

فروپژمرید[12] : فرونشست و تیزیش رفت.

بهرۂ 'ر'

فر[13] : زیب و زیبائی وشکوه و وقتی 'را'[14] را تشدید دهند چون زرّ و کرّ و فرّ.

---

[1] رک : فرس ص ۴ ، صحاح ص ۲۷ ، قواس ص ۱۲۹. [2] نسخۂ اصل : گرد برگرد. [3] رک : صحاح ص ۸۱.

[4] بعینه همین معنی در ادات آمده اما در موید ۲ : ۵۲ آمده : در زفان گویا فغند بمعنی فرغند است یعنی عشقه. واضح است که نسخۂ از زفان که نزد صاحب موید بود، اشتباه داشته.

[5] صحاح ص ۹۲ فنود چند معنی دارد، اوّل فریفته و غره شده باشد چون کسی فریفته شود گویند بغنود یعنی فریفته و غره شد.

[6] سرمۂ سلیمانی ۱۷۹ فلخود بمعنی فخمید، وفخمید پنبه دانه از پنبه دور کردن.

[7] فلخود و فلخید هردو هم معنی است، رک : صحاح ص ۹۲ ، و از مصدر فلخودن و فلخیدن بمعنی پنبه دانه از پنبه بیرون کشیدن، رک : زفان بخش سوم بمصدر، و ادات ؛ در آخر الذکر و موید ۲ : ۵۲ : فلخود و فلخید بمعنی پنبه دانه نوشت و این اشتباه است.

[8] موید ۲ : ۵۱ : فترد بالفتح درید و دریده و دریدن ؛ اما صحاح ص ۸۱ : فترد چیزی باشد که از هم بدرند، خسروی : خود طرازید باز خود بفترد الخ.
از این بیت واضح است که بفترد، فترد فعل ماضی است.

[9] از 'ل' افزوده. [10] ادات و موید ۲ : ۵۱ و جهانگیری ۱ : ۱۰۵۸.

[11] ادات : فرهمند دانا و خردمند. [12] نسخۂ اصل : فروبرمرید یعنی فرنش و تیرنش رفت ، امارک : موید ۲ : ۵۲. [13] ادات : فرزیبائی وشکوه. [14] نسخۂ اصل : وقتی را گویند تشدید دهند (بحذف چون)

فرغر[1]: زمین تنگاو[2] باشد یعنی زمینی باشد که درو آب رود و آب او کم شود و جای بجای آب بماند.

فرغار[3]: چیزی راکه بآب ترکرده و نیک تر شده و سرشته گشته.

فرخار[4]: آراسته و نام بت و بت خانه و نام شهری که درو خوبان بسیارند.

فیاوار[5]: شغل، و بعضی بکسر فا گویند.

فروار[6]: خانهٔ تابستانی که بر بالا باشد.

فریز[7]: گیاهی است خوشبوی، فریر و بعضی 'رای' اوّل[8] معجمه گویند و آن را گزره[9] و سر ریزه[10] و بوزمه[11] گویند.

فیر[12]: فسوس و سخر.

فریور[13]: آنکه راه راست دارد اندر[14] دین، و گویند فریوری و فریورکیش و فریوردین.

فرفور[15]: پیشوا.

فور[16]: لقب پادشاه هند.

فغفور: لقب پادشاه چین.

---

۱ رک: قواسں ص ۳۲. ۲ زفان: تنگاو زمینی که درو آب رود الخ.

۳ رک: قواس ص ۱۹۴، ادات، موید ۲: ۵۳. فرغار از مصدر فرغاریدن بمعنی چیزی بآب نیک ترکردن.

۴ رک: قواس ص ۱۹۴، ادات، موید ۲: ۵۳ که بمعنی شهر و بت خانه و آراسته آورده‌اند، و از بت صرف نظر نمود.

۵ رک: موید ۲: ۵۴ و جهانگیری ۲: ۲۳۲۴. ۶ رک: ادات و موید ۲: ۵۳.

۷ ادات، موید ۲: ۵۳: فریر: گیاهی است خوشبوی.

۸ ادات و موید ۲: ۵۴: فریز دارند بمعنی کباب قدید و گیاهی است خوشبوی. اما قواس ص ۳۶: گزره، سرریزه، فریز، بورمه بمعنی گیاه خوشبوی آورده، و در ص ۱۴۴ فریز بمعنی قدید نوشته.

۹ زفان: گزره گیاهی خوشبوی، نیز رک: دستورالافاضل ص ۲۰۳ گزره سرریزه.

۱۰ زفان: سرریزه گیاهی است خوشبوی (ذیل بخش دوم).

۱۱ کذا است در مدار ۱: ۲۵۴، سروری ۱: ۱۹۷، برہان ۱: ۳۱۶؛ اما قواس ص ۳۶: بورمه.

۱۲ رک: موید ۲: ۵۴. ۱۳ ادات و موید ۲: ۵۳: فریور آنکه راه راست دارد در دین.

۱۴ نسخهٔ 'ل': در. ۱۵ رک: ادات. ۱۶ در اصل معرّب یا معرب پورس است که نام پادشاه هند معاصر سکندر رومی بود، از شاهنامه واضح شود که نام رای قنوج بود:

زمیلاد چون بادلشکر براند ❊ بقنوج شد گنجش آنجا بماند

چو آورد لشکر بنزدیک فور ❊ یکی نامه فرمود پر جنگ و شور

فرفر[1]: گله[ع] دروان.

بهرهٔ "ز"

فغیاز[2]: [ورق ۱۷۱] مژدگانی و شاگردانه و عطای شعر یعنی ازین چیزها که بکسی دهند،
آنرا نودارانی[3] نیز گویند، و بعضی برای مهمله.

فرواز[4]: گدارهٔ چهارپهلو و بعضی به رای مهمله.

فریز[5]: وزن تریز، گوشت قدید، و در بعضی فرهنگنامه ها بفتح فا و یای پارسی است، و در
نسخه ای زای معجمه و پارسی است.

فراویز[6]: پیوند جامه و جز آن و آرایش پوستین که بر دامن و سر آستین و گریبان و درزهای دیگر
دوزند، و فرویز نیز گویند.

فراز[7]: بلند و نشیب و بستن و گشادن و گستردن و بالای چیزی و نزدیک.

فلرز[8]: چیزی خوردنی که در جامهٔ یا ازاربند یا در رکوی گره بندند و در کستان این را بدره و سرزه
گویند و در ماوراءالنهر فریز و فلرزنگ[9] گویند.

فریبرز: نام عورتی[10] است و نام مردی[11].

→ رک: جهانگیری ۲: ۲۰۴۸ و فرهنگ معین ۶: ۱۳۸۳.

[1] ادات: فرفر بادزنه، جهانگیری ۱: ۱۰۷۴ فرفر زدد زود، سخنی به تعجیل گفتن، چرم مدور. اما موید ۲: ۵۳، ذیل فرفر قول زفان گویا نقل نموده. [ع] ل: گلهٔ روان.

[2] فرس ص ۱۷۶ ا ح، صحاح ص ۱۲۹ و جهانگیری ۲: ۱۴۴۲: نغیاز و بغیاز، قواس ص ۱۱۱: فغیاز، ادات و موید ۲: ۵۳-۵۴: فغیار و فغیاز بهمین معنی آورده.

[3] رک: فرس وصحاح و جهانگیری ۲: ۲۱۱۵. نودانی بمعنی زری باشد که بشعراد کسی که مژده و خبر خوش آرد بدهند.

[4] رک: ادات و موید ۲: ۵۴ فروار بالفتح گدارهٔ چهارپهلو و خانهٔ تابستانی. اما ادات: فرواز گدارهٔ چهارپهلو.

[5] رک: قواس ص ۱۴۴، موید ۲: ۵۴، مدار ۳: ۲۱۱، برهان ۱۴۸۳.

[6] رک: قواس ص ۱۵۷، ادات، موید ۲: ۵۴. در قواس مترادفها دیگر دژنگ و پروز درج است.

[7] رک: ادات و موید ۲: ۵۴.

[8] رک: ادات و موید ۲: ۵۴ و جهانگیری ۲: ۱۶۳۶.

[9] نسخهٔ اصل: فرزنگ، اما رک: ادات و جهانگیری ۲: ۱۶۳۶. سرمهٔ سلیمانی ۱۸۰.

[10] کذا است در ادات و موید ۲: ۵۴، نیز رک: جهانگیری ۱: ۱۰۶۰.

[11] نام پسر کیکاوس، رک: فرهنگ معین ۶: ۱۳۵۹، نیز جهانگیری ایضاً.

بهرهٔ ژ

رژ[1] : گیاهی است تلخ که درد شکم ببرد.

بهرهٔ س

سوس[2] : سخن و حسرت ، و بهرهٔ مفتوح نیز گویند افسوس.

رناس[3] : نیم خواب باشد و مرد غافل و نادان طبع.

بهرهٔ ش

رغیش[4] : موئی که از دامن پوستین بیرون آید.

ریش[5] : بریان.

اش[6] : پراگنده و مشهور شده.

ش[8] : پوزاسب[9] و خزان و مانند و دنبالهٔ دستار.

ش : دم ، آنکه اورا بتازی ذنب خوانند و بعضی گویند موی گردن است ، ببای پارسی آمده است گویند پش[10].

رویش[11] : کاهلی و ملتوی شدن کاری.

رنگیش[12] : نام عورتی.

بهرهٔ غ

فغ[13] : دوست و معشوق و بت تراشیده و در فردوسی است : بت رنگین فغ گویند و گویند دوست

---

[1] ادات : فرژ بازای فارسی گیاهی است تلخ دافع درد شکم.

[2] رک : ادات و موید ۲ : ۵۵ ، و جهانگیری ۱ : ۱۳۱۵. [3] رک : ادات و موید ۲ : ۵۵.

[4] رک : صحاح ص ۱۵۴ ، ادات ، موید ۲ : ۵۵. [5] رک : ادات.

[6] موید ۲ : ۵۶ این معنی بحوالهٔ قنیه درج نموده. [7] ادات . فاش پراگنده و آشکارا و گشاده.

[8] این واژه از نسخهٔ 'ل' افزوده شد ؛ رک : صحاح ص ۱۵۴ ، ادات و موید ۲ : ۵۶.

[9] فرهنگ جعفری ۲۳۵ فش شبیه و مانند و طرهٔ دستار و پوز اسب. [10] رک : جهانگیری ۲ : ۱۲۸۲.

[11] رک : ادات و موید ۲ : ۵۵. [12] اصلاً فرنگیس است که دختر افراسیاب که در حبالهٔ سیاوش بن کیکاوس بود رک : موید ۲ : ۵۵ و فرهنگ معین ۶ : ۱۳۴۶.

[13] رک : قواس ص ۱۰۷ ، صحاح ص ۱۶۲ : فغ دوست و معشوق بود ، بزبان فرغانه صنم و بت را گویند ، ادات : آن دوست که اورا بجای معشوق دارند و صورت تراشیده و بزبان فرغانه بت . نیز رک : جهانگیری ۲ : ۱۴۴۱.

که بجای معشوق دارند فغ گویند و بزبان فنه غانه صنم و بت باشد.

فراغ[1]: باد سرد و مهتر[2] و فرصت[3].

فروغ[4]: تاب یعنی روشنائی و درخشانی که بهندوی جهلک گویند.

بهرهٔ ک

فغاک[5]: ابله و حرامزاده بود.

فرنجک[6]: دیو ستنبه است و فرنجک بدو ضمت نیز گفته و بغیر کاف هم گویند: فرنج دیوستنب.

فدرنجک: بفتح و کسر فا دیوخانه.

فراشتک[7]: مرغکی است [ورق ۱۷۲] سیاه و سپید، به خانه ها خانه کند و بنگ و بچه درمیان مردم کند، بتازی آنرا خطاف و بهندوی چچرک[8] گویند.

فرخواک[9]: گوشتابه.

فتراک[10]: معروف یعنی سموت زین.

فراشتوک[11]: فراشتک است، گوئی در فراشتک واو زیادت کرده اند.

---

[1] ادات: فراغ باد سرد و خوشدلی و فرصت. صحاح ص ۱۶۴: فراغ: باد سرد.

[2] رک: موید ۲: ۵۷ فراغ (ذیل عربی)

[3] از نسخهٔ 'ل' افزوده. و در نسخهٔ اصل بجای فرصت: بهندوی جهلک گویند، واضح است که درین نسخه از کلمهٔ فرصت ... درخشانی افتادگی دارد.

[4] صحاح ص ۱۶۴ - ۶۵: فروغ شعاع آتش و آفتاب و امثال این یعنی روشنی و درخشندگی.

[5] رک: ادات و موید ۲: ۵۹.

[6] نسخهٔ 'ل': فرنجک دیوخانه بفتح جیم نیز گفته اند و در فرهنگنامه فرنجک دیوستنبه است، قواس ص ۱۱۴: فرنجک و فدرنجک دیوخانه، صحاح ص ۱۸۳: فرنجک کابوس یعنی گران شدن مردم در خواب، ادات: فرنجک و فدرنجک دیوستنبه که مردم را در خواب فرو گیرد، نیز رک: جهانگیری ۱: ۱۰۷۹، ۸۰۴، رشیدی ۱۳۰۶.

[7] رک: ادات و موید ۲: ۵۹.

[8] موید ۲: ۵۹ چرک و این متبادل کلمهٔ هندی را بحوالهٔ ادات نوشته، نسخهٔ ادات که پیش بنده است این کلمه ندارد. [9] رک: ادات و موید ۲: ۵۹. در موید علاوه شده: و در زفان گویا با قاف آورده. اما نسخهٔ ما این را مورد تائید قرار نمی دهد.

[10] ادات: دوالهای زین که بچپ و راست و درپس کوهه آویخته باشد.

[11] رک: جهانگیری ۲: ۱۷۱۴، جعفری ۲۶۵ سموت فتراک. [12] رک: ادات.

فدرونک[1] : مترس آنکه درحصار گیرپیا می کنند و در وقت جنگ می اندازند.

فیلک[2] : تیر بدخشانی دو شاخه.

فرموک[3] : گردانک، بزبان هندوی لٹو گویند.

فلنجک[4] : قرنفل بستانی بهندوی سلسی گویند.

فرانک[5] : نام مادر افریدون.

بهرهٔ 'گ'

فرسنگ[6] : کروه که بهندوی کوس گویند، و درست تر آنست که فرسنگ سه کروه زمین است.

فدرنگ[7] : چوبی باشد که پس در نهند بجهت محکمی و دستور[8] را نیز گویند و بفتح فا نیز آمده است.

فرهنگ : ادب و دانش، گویند فرهنگیان[9] یعنی ادیبان و مودبان.

فلرزنگ[10] : آنکه درجامه یا ازاربند گره بندند.

بهرهٔ 'ل'

فرخال[11] : موی راست فروهشته.

فرغول[12] : تاخیر خلاف تقویم، یعنی خلاف درکار وتن زدن.

---

[1] ادات فدرونک آن سنگ که بر سرکنگرهٔ حصار برای دفع غلبهٔ خصم نهند و عرب آنرا مترس خوانند.

[2] رک : قواس ص ۱۷۳ وصحاح ص ۱۸۴. [3] رک : ادات و موید ۲ : ۵۹.

[4] درنسخهٔ اصل افتادگی دارد ؛ کذاست درنسخهٔ 'ل' ؛ موید ۲ : ۵۹ : فرنجمشک : رستنی است که بوی خوش دارد و آنرا پلنگ موش نیز گویند، هندش سکسی نامند.

[5] رک : ادات، موید ۲ : ۵۹، جهانگیری ۱ : ۱۰۵۸، شاهنامهٔ فردوسی ۱ : ۶۱ (حاشیهٔ جهانگیری) اما درمجمل التواریخ والقصص ص ۲۷ : فری رنگ. فرهنگ معین ۶ : ۱۳۲۷ : فرانک نام دختر برزین و زن بهرام گور.

[6] نسخهٔ اصل : فراسنگ ؛ اما رک : نسخهٔ 'ل' ؛ ادات : فرسنگ سه کروه.

[7] رک : فرس ص ۲۸۲، قواس ص ۲۶، صحاح ص ۱۹۹، فدرنگ برای معنی اول.

[8] رک : ادات و موید ۲ : ۵۹. [9] نسخهٔ اصل : فرهنگنامه.

[10] رک : ادات و جهانگیری ۲ : ۱۶۲۶، ببینید 'فلرز' درهمین لغت.

[11] ادات و موید ۲ : ۶۰ : فرخال موی فروهشته، در لسان الشعرا موی راست. (رک : موید : ایضاً).

[12] موید ۲ : فرغول و فرغوک : تاخیر درکار وتن زدن ؛ جهانگیری ۱ : ۱۰۷۴ : فرغول درنگ و غفلت وتاخیر.

فتال[1] : زره فتال و مردم فتال ، از هم باز گسستن و بر دریدن و از هم شکستن چیزی بود.

فل[2] : چوب درخت آبی است ، بعضی بیخ نیلوفر را گویند.

بهرۂ 'م'

فرم[3] : دل تنگی و فرو ماندگی است و گویند[4] فلان فرم[5] شده .

فام[6] : مانند و رنگ.

فرجام[7] : عاقبت کار.

فنخم[8] : چادری که بازیگران در هوا بگیرند تا نثار دران افتد.

بهرۂ 'ن'

فروردین : نام ماهیست ، آنکه آفتاب در حمل باشد فروردین ماه گویند و جمع ماههای فارسیان درین[9] نظم است :

زفروردین چو بگذشتی مه اردی[1] بهشت آید
همان خرداد[2] و تیر[3] آنگه که مرداد[4] ت همی آید
پس از شهریور[5] و مهر[6] و آبان[7] آذر[8] و دی[9] دان
چو بر بهمن[10] جز اسفند[11] ارمذ[12] ماهی نیفزاید

بیت[10]

زفروردین ربیعی دان تا شهریورش و آنگه
ز مهرش تا باسفندار جمله از خریفش دان

---

[1] فرهنگ معین ۲ : ۲۴۸۳ : فتال از هم گسستن ، جدا کردن ، بریدن ، شکستن ، در ترکیب بمعنی فتالنده (مصدر فتالیدن) بمعانی ذیل زره فتال ، گرفتال ، مغز فتال (قس مردم فتال).

[2] ادات و موید ۲ : ۶۰ فل چوب درخت آبی و نیلوفر.

[3] رک : ادات و موید ۲ : ۶۰ و جهانگیری ۱ : ۱۰۷۶.

[4] در نسخۂ 'ل' افتادگی دارد. [5] نسخۂ اصل : فرکن. [6] رک : ادات.

[7] رک : موید ۲ : ۶۰. [8] رک : موید ۲ : ۶۰ و جهانگیری ۱ : ۷۶۵.

[9] معلوم نیست که قائل این نظم خود صاحب زفان است یا خیر.

[10] ازین بیت واضح است که شاعر دوازده ماه در دو فصل ربیع و خریف قسمت نموده است ؛ اما در ایران چهار فصل بشمار می آید ، بهار ، تابستان ، پائیز خزان ، زمستان و هر یک شامل سه ماه باشد.

فوردیان[1] : پنج روزاست آخرین از آبان ماه یعنی آفتاب درعقرب و آن روزها جشن مغانست که بتعریب فوردجان[2] گویند ، و آن ایام[3] مسترقه است ایشانرا که از دوازدهم ماه بشمرند .

فسان : سنگی که بدان کارد و تیغ و امثال آن تیز کنند .

فرکن[4] : جوی .

فرزان[5] : حکمت .

فغان : نفیر و بانگ و نعره و فریاد .

فلاخن[6] : معروف ، و آن آلت شبانان است ، آنکه بدان سنگ اندازند ، هندوی گوپهن[7] گویند .

فراکن[8] : بلند .

فرهنگیان[9] : ادیبان .

فشان[10] : ریزان .

فوردین : همان فروردین[11] است و نوزدهم[12] روز از ماه .

فراشیون[13] : گیاهی است که اوراگندنائی[14] کوهی نیز گویند و بتازی صدف[15] الارض خوانند ، و بعضی گویند علقم[16] است .

---

[1] رک : قواس ص ۱۷ ، متن و حاشیه ، موید ۲ : ۶۴ ؛ جهانگیری ۱ : ۱۰۸۳ . [2] رک . فرهنگ معین ۲ : ۲۵۸۴ .

[3] فوردگان = فروردگان ، پنج روز آخر سال خمسهٔ مسترقه (فرهنگ معین ۲ : ۲۵۳۲) .

[4] صحاح ص ۲۴۸ : فرکن و فرغن جوی بود .

[5] رک : صحاح ص ۲۴۸ .

[6] رک : ادات و موید ۲ : ۶۳ .

[7] این کلمهٔ هندی در ادات و موید درج است .

[8] رک : ادات و موید ۲ : ۶۱ .

[9] این کلمه جمع فرهنگی است و صورت جمع را بطور لغت جداگانه داخل فرهنگ نمودن درست بنظر نمی آید و عجب است که همین صورت در ادات و موید ۲ : ۶۲ یافته می شود .

[10] ادات و موید ۲ : ۶۳ : فشان ریز و ریزنده و ریزان .

[11] رک : موید ۲ : ۶۴ .

[12] فرهنگ معین ۲ : ۲۵۳۳ فروردین نام روز نوزدهم از ماه شمسی .

[13] رک : ادات و موید ۲ : ۶۱ (در آخرالذکر فراسیون اشتباه است) .

[14] نسخهٔ اصل : گندناگوهر ، نسخهٔ ' ل ' : گندناوگوبر ؛ متن مطابق موید ۲ : ۶۱ .

[15] کذاست در ادات و موید . [16] نسخهٔ ' ل ' : عقمه ؛ علقم : زیتون تلخ (معین ۲ : ۲۳۴۰)

فرفیون[1] : صمغ مازریون[2] که بهندوی انجروت[3] گویند.

فراوان : افزون و بسیار.

فرزین[4] : مهره[5] در شطرنج که وزیر گویند.

فریدون : نام پادشاهی.

فغستان[6] : بتخانه.

فزون : زیادت و بسیار.

فاشرستین[7] : سپندان.

فریغون[8] : نام مردی.

بهرهٔ 'و'

فراشتو[9] : فراشتک.

بهرهٔ 'ه'

فرسته[10] : پیغامبر یعنی فرستاده و رسول.

---

[1] رک : ادات : موید ۲ : ۶۲ زفان گویا می گوید که نام داروئی است ، هدایة المتعلمین فربیون ص ۲۲۹، ۲۲۴، ۲۳۰. [2] کذا است در اصل اما در هدایة المتعلمین ۶۵۸،۶۵۷ مازریون. [3] رک : ادات.

[4] رک : موید ۲ : ۶۲. [5] نسخهٔ 'ل' : که در شطرنج است.

[6] نسخهٔ اصل : فغسان ، اما رک : فغ درهمین لغت ، نیز موید ۲ : ۶۳.

[7] نسخهٔ 'ل' : فاشرستین ، نسخهٔ اصل : فازرستین . اما در ادات و جهانگیری ۱ : ۱۶۱۵ ، فرهنگ معین ۲ : ۲۴۶۵ فاترسین . در موید ۲ : ۶۱ فاشرستین ، فارشرستین و در جهانگیری بعلاوهٔ فاترسین ، فاشرسنی و فاشش رسنی آمده.

[8] فریغون شخصی بود که در خوارزم حکومت یافت و آل فریغون بدو نسبت دارند ، و ایشان عبارت اند از احمد بن فریغون و محمد بن فریغون ، ابوالحارث احمد بن محمد . حکومت این سلسله ۲۷۹ھ تا ۴۰۱ھ ادامه داشت (فرهنگ معین ۶ : ۱۳۶۲) . نیز رک : مقدمهٔ حدود العالم که مؤلفش باین خانواده انتساب داشته.

[9] موید ۲ : ۶۴ فراشتو بمعنی فراشتک و فرستو بمعنی مرغکی است سیاه . اما در شرفنامه فرستو بمعنی فراشتک . ادات : فرستو مرغی است که آن را فراشتک گویند.

[10] موید ۲ : ۶۶ : فرسته پیغامبر کذا فی لسان الشعرا و در شرفنامه فرستاده و پیغمبر و رسول ، فرشته روحانی علوی ، فریشته نیز گویند . رک : معین ۲ : ۲۵۱۸ که هر سه صورت یعنی فرسته و فرشته و فریشته دارد.

فسیله[1] : گلهٔ اسب دستور.

فرهخته[2] : نیکوروئی و مودت ، فراهخته نیز گویند.

فرزانه : حکیم و دانا.

فرژه[3] : بازای پارسی زشت و پلید[4].

فلاده[5] : بیهوده یعنی بی فائده و بلغتی بضم فاست.

فرزوره[6] : چوبی که پس در نهند تا باز نتوان کرد و در فرهنگنامه برای مهمله است و آن اصح است.

فرواره[7] : گدارهٔ[8] چهار پهلو که در عمارت نهند و گنجینه[9].

فرخشه[10] : قطایف[11] ، نانهائی است[12] آنکه از نشاشته بجهت لوزینه بر سنگ می پزند.

فلاته[13] : حلوای شیر و بفتح فا نیز گویند.

فه[14] : بیل[15] چوبین آنکه در کشتیها باید و بعضی فرهنگیان بفتح فا گویند.

فریه[16] : لعنت و نفرین.

---

[1] رک : موید ۲ : ۶۷. [2] رک : موید ایضاً.

[3] رک : موید ایضاً.

[4] نسخهٔ اصل : پلیب یعنی عندلیب ، نسخهٔ 'ل' : بلبل یعنی عندلیب . دراصل معنی فرژه : زشت وپلید است ، و بلبل تصحیف خوانی است ، رک : صحاح ص ۲۸۴ : فرژه پلید ، پلشت . رودکی :

این فرژه پیر زبهر تو مرا خوار گرفت ؛ برهاناد ازو ایزد جبار مرا

[5] رک : صحاح ص ۲۸۴.

[6] رک : قواس ص ۱۲۷ که فردره بهمین معنی دارد ؛ موید ۲ : ۶۶ ذیل فردره قول زفان را نقل کرده.

[7] ادات : فرواره گنجینه و گدارهٔ چهار پهلو و خانهٔ تابستانی. [8] جهانگیری ۱ : ۸۱۷ : گداره بالاخانهٔ تابستانی باشد و آنرا پروار و پرواره و فروار و فرواره نیز گویند.

[9] قواس ص ۱۳۳ : فرواره : گنجینه. [10] رک : فرس ص ۴۳۷ ، قواس ص ۱۴۵ ، صحاح ص ۲۸۴.

[11] مقدمة الادب زمخشری ص ۳۶۹ قطائف نان گردکان و کلوچهٔ شکر باش.

[12] نسخهٔ 'ل' : و آنرا بزبان ماوراءالنهر قطائف گویند.

[13] رک : قواس ص ۱۴۸.

[14] رک : ادات ، جهانگیری ۲ : ۲۱۸۷ : فه چوب سرپهنی باشد که بدان کشتی را برانند.

[15] جهانگیری ۲ : ۲۲۲۹ : بیل تخته ای باشد برهیئت بیل که بر سر چوب نصب کنند و کشتی و غراب و امثال آنرا برانند.

[16] رک : صحاح ص ۲۸۴ ، این واژه در نسخهٔ اصل نیامده.

فرخنده : مبارک .

فره[۱] : بلند وپلشت و غالب شدن و زیادت .

فله[۲] : بضم فا ، ماستی یعنی جغراتی که زود بندد و داروئی که بهندوی بهگلی گویند، و بتازی لباء، بعضی بفتح فا گویند .

فرفره[۳] : آنکه بچگان بازند و آن چوبکی بود در رشته درمیان کرده و بهندوی پهرکی گویند .

فانه[۴] : [ورق ۷۴ب] چوبی که میان چوب نهند و زیرستونی بوقت پاره کردن برای آنکه بشکافند و در فرهنگنامه فانه آنست که چوبی در درهای خلانند تاکس در را به تعجیل نتواند شکست ، و اسدی گوید : فانه بغار[۶] است یعنی چوبکی نوک درشکاف چوبی شکافته نهند تامحکم کند[۷] .

فکانه[۵] : بچه ای که ازشکم برود از آدمی یا از دواب .

فرسوده[۸] : کهنه وخلل پذیرفته .

فراسوده[۹] : فرسوده .

فرومایه : نادار[۱۰] باشد و از دل فروبسته[ع] .

فاژه[۱۱] : آسا[۱۲] بود آنکه دهان دره گویند .

---

۱ فره : بمعنی زیادت وسبقت وافزون وبسیار ، رک : صحاح ص ۲۸۴ ، موید ۲ : ۶۷ ، جهانگیری ۱: ۱۰۸۶ اما معنی ها که درمتن آمده مورد تائید از هیچیک از فرهنگها قرار نمی گیرد ، در اصل کلمهٔ اصل فرّه است که بالا گذشت .

۲ این واژه شامل حاشیهٔ نسخهٔ اصل است وصحاح ص ۲۸۵ : فله ماستی بود که بساعتی کنند ، نیز رک : ادات و موید ۲ : ۶۷ .

۳ در موید بحوالهٔ قنیه آمده . ۴ رک : ادات و موید ۲ : ۶۶ .

۵ رک : صحاح ص ۲۸۴ ؛ موید ۲ : ۶۶ .

۶ نسخهٔ اصل : بغان است ، رک : قواس ص ۱۱۶ متن وحاشیه نمره ۱۱ .

۷ نسخهٔ اصل : کنند .

۸ رک : صحاح ص ۲۸۵ و موید ۲ : ۶۷ . ۹ برای فرسوده و فراسوده رک : موید ۲ : ۶۶ .

۱۰ نسخهٔ اصل : نادان ؛ اما ادات و موید ۲ : ۶۷ : فرومایه بی هنر وفقیر وآنکه کارهای دنی کند . ع کذا است در اصل .

۱۱ ادات : فاژه آنکه دهن ازهم بازشود از کاهلی و ازآمدن خواب ، صحاح ص ۱۳۷ : فاژ آسا بود یعنی آنکه دهان بازشود ازغلبهٔ خواب یا ازکاهلی .

۱۲ فرس ص ۳ : آسا دهان دره باشد آنکه دهان بازشود . الخ .

فشرده[1] : بسته .
فسله[2] : شکاری ، و در اسدی[3] است : اسب و گویند گلهٔ اسب و ستور .
فرشته : روحانی علوی ، فریشته نیز گویند .
فسرده[4] : شکاری .
فلخوده[5] : پنبه دانه[6] .
فاغره[7] : نوعی از عطرات و آن دانه است مقدار نخود ، پوست شکافته و سخت .
فاغیه[8] : گویند گل حنا ، یعنی گویند حنا چون خوشه ها بیرون آرد گلها بشکفد فاغیه گویند .
فیدافه[9] : نام عورتی است .

بهرهٔ 'ی'

فیروزی : روائی حاجت .
فرومانی : یعنی متحیر شوی و درمانی و بسته گردی .

---

[1] ادات : فشرده بر بسته ای منجمد شده (بحوالهٔ موید ۲ : ۶۷) . رک : فشرد و فسرد .

[2] رک : موید ۲ : ۶۷ ، فسله و فسیله مترادف ، و فسیله بمعنی گلهٔ اسبان و شکاری ، رک : ادات و موید ایضاً . اما درہمین فرہنگ زفان گویا فسیله بمعنی گلهٔ ستور آمده .

[3] رک : فرس ص ۴۴۵ . و نیز لغواسں ص ۷۳ و صحاح ص ۲۸۵ .

[4] ہمین معنی در موید ۲ : ۶۶ درج است . [5] رک : موید ۲ : ۶۷ ، نیز رک : فشرد و فسرد .

[6] رک : ادات و موید ۲ : ۶۷ که فلخوده و فلخیده ہر دو بہمین معنی آورده ، نیز رک : فلخود و فلخید درہمین فرہنگ زفان .

[7] ادات و موید افزوده : از پنبه جدا کرده . [8] رک : ادات .

[9] ادات : فاغیه گل حنا و حنا گل کرده و شکوفه . اما در موید ۲ : ۶۶ فاغیه بحوالهٔ ادات بمعنی گل چنپا نوشته و جهانگیری ۱ : ۱۶۴۶ : فاغیه و فاغر ہر دو بمعنی گل رای چنپا آورده . فرہنگ معین ۲ : ۲۴۷۵ : فاغیه بمعنی شکوفهٔ حنا نوشته . بنابرین واضح است که چنپا تصحیف حناست .

[10] نسخهٔ اصل : فیدانه ، ادات : فیدافه نام عورتی است که آمرهٔ ولایت سمت مغرب بود الخ ؛ موید ۲ : ۶۸ فیداف (فیلافه اشتباه چاپی) نام زنی والیهٔ ولایت بردع . اما اصل نام قیدافه است نه فیداف ، این قیدافه معاصر اسکندر بود ، رک : شاهنامهٔ فردوسی چاپ موسسهٔ خاور ج ۴ ص ۳۰ ، ۳۲ ، ۴۳ ، نیز رک : فرہنگ معین ۶ : ۱۴۸۳ .

گونهٔ 'ک'

بهرهٔ 'الف'

کندا[1] : حکیم و منجم یعنی ستاره شمر و کاهن[2] که اخترگوی باشد و فیلسوف یعنی دانا و آگاه[3] باشد.

کربا[4] : ببای پارسی، گیاهی است که آنرا هلندوز[5] نیز گویند و بعضی گویند ببای عربی است.

کیا[6] : نوعی از علکهاست رومی و کیلیز[7] گویند.

کانا[8] : پارهٔ خوشهٔ انگور و خرما، و درست تر آنست که کانا چوب بن خوشهٔ خرماست، و ابله و نادان[9].

کلیسا[10] : پرستش جای گبران یعنی معبد مغان.

کمرا[11] : جای گوسپندان و طاق دیوار.

کبیتا[12] : ناطف[13] و آن نانی بود که از کنجد و شکر پزند و آن شیرینی است.

---

۱ رک : قواس ص ۹۱.

۲ نسخهٔ 'ل'. کاهن که اختری از خویشتن گویند، صحاح ص ۲۷ : کندا کاهن بود اعنی آنکه چیزی از خود گوید و فیلسوف و دانا.

۳ نسخهٔ 'ل' : آگاهنده، نسخهٔ اصل : آگاش. ۴ رک : قواس ص ۳۷.

۵ این را هلندور نیز گویند، فرس متن ص ۱۱، موید ۲ : ۹۱ : هلندوز ؛ فرس حاشیه، قواس ص ۳۷ : هلندور ؛ برهان ص ۱۳۵۹ : هلندوز گیاهی است که آنرا در دواها بکار برند بارای بی‌نقط بنظر آمده ؛ زفان ذیل 'را' می آورد : هلندور کربا و آن داروئی است.

۶ موید ۲ : ۹۲ کیا را بحوالهٔ زفان آورده.

۷ زفان : گیاهی است و در فرهنگنامه است کیلیز بدو کاف مکسوره و یای اوّل پارسی : رستینه است زیبا. نیز رک : قواس ص ۳۸.

۸ در لغت فرس و صحاح و معیار جمالی و جهانگیری و رشیدی : کانا معنی احمق و نادان است که در بعضی فرهنگها بصورت کاناى آمده. اما کلمه ای که بمعنی چوب بن خرما آمده کاناز است نه کانا. اما در قواس و زفان : کانا بمعنی چوب بن خرما و ابله و نادان هر دو آمده و کاناز فقط بمعنی چوب بن خرما، برای آگاهی بیشتر رک : قواس ص ۵۲ ح ۲.

۹ برای این معنی در قواس ص ۵۲ واژهٔ بیتک است.

۱۰ ادات : کلیسا پرستش جای گبران و ترسایان.

۱۱ قواس ص ۱۳۹، صحاح ص ۲۷ : کمرا جای گوسپندان ؛ اما ادات : کمرا جای گوسپندان و طاق دیوار.

۱۲ قواس ص ۱۶۳، صحاح ص ۲۷ : گبیتا ناطف بود. ۱۳ نسخهٔ اصل : ناطق. دستوا ناطف حلوای معروف

کنخا[1] : جامهٔ منقش و ساده و جز بیک رنگ نقش بسته .

کفا[2] : سختی و رنج باشد که بکسی رسد.

کردنا[3] : مرغ و یا چیزی که بر آتش بریان کنند و بگردانند و بلغتی کاف پارسی است ، بعضی بکسر کاف و دال گویند.

کیانا[4] : طبائع اربعه بزبان فلاسفه .

کما[5] : راف[6] یعنی ترشی و گویند جابتری

کبدا[7] : لحام[8] را گویند که بدان کفشیر[9] کشند .

کیمیا[10] : [ورق ۱۷۵] حیلت را گویند.

کرا[11] : حجام ، و بعضی بکاف پارسی گویند و این درست است ، و بعضی گویند[12] بکاف عربی حجام است و بکاف پارسی غلام هندوی یعنی کمه[13] .

---

[1] رک : قواس ص ۱۵۳ . [2] رک : فرس ص ۱۳ ، قواس ص ۱۹۴ ، صحاح ص ۲۶ .

[3] صحاح ص ۲۷ : گردنا بمعنی مذکور ، و ادات : کردنا و گردنا هردو ، رک : موید ۲ : ۹۱ . [4] رک : صحاح ص ۲۷ ، ادات ، موید ۲ : ۹۲ . [5] ادات : کما راف ای ترشی است جابتری . درهمین ادات: کانا بمعنی آستین رفیده ، و برای آستین رفیده ، رک : جهانگیری ۲ : ۱۷۲۱ ذیل کما.

[6] زفان راف بمعنی جابتری ، جهانگیری ۱ : ۳۳۰ راف بزباز ، بسباسه .

[7] ادات : کبدا لحام که آنرا کفشیر خوانند ، نیز رک : جهانگیری ۱ : ۶۰۷ . در اصل این واژه 'کبد' است نه 'کبدا' الف اضافی است که در قدیم در کلمه ها اضافه شده مانند 'رودا' درین مصراع : آهوی کوهی در دشت چگونه رودا . کبد بمعنی کفشیر است که بدان چیزی پیوندند ، رودکی : مرا بکار نیاید سریشم و کبدا ، برای آگاهی بیشتر رک : قواس متن و حاشیه ص ۱۹۲ . فرس ص ۸۵ ، صحاح ص ۹۲ .

[8] لحام آنچه که بوسیلهٔ آن چیزی را لحیم کنند ، آنچه که بدان سیم و زر وغیره را پیوند دهند. (فرهنگ معین ۳ : ۳۵۷۰)

[9] آنچه که بدان شکستگی ظروف مسین و برنجین را لحم کنند (ایضاً ۳ : ۳۰۰۷).

[10] صحاح ص ۲۷ : کیمیا دو معنی دارد اوّل حیلت باشد ، و دوم ترکیب ادویه ، نیز رک : موید ۲ : ۹۲ .

[11] ادات : کرای بمعنی حجام ، و اکثر فرهنگها مانند قواس ص ۱۸۵ ، صحاح ص ۲۷ ، جهانگیری ۱ : ۱۱۱۵ گرا یا گرای دارند و موید ۲ : ۹۱ کرا و ۲ : ۱۳۵ گرا بهمان یک معنی .

[12] موید ۲ : ۳۵ این معنی بحوالهٔ زفان نوشته .

[13] کذاست در اصل و موید.

کیبا[1] : بزبان شیرازیان عصیب[2] را گویند.

کیا[3] : بکسر کاف و یای پارسی خوط.

کنا[4] : مرز یعنی زمین.

کوادا[5] : چوب زیر در.

کسیلا[6] : داروئی است که بهندوی کمیلا گویند.

کونیا[7] : سازی است از آن درودگران.

بهرۀ ب

کنب[8] : شتّی[9] که ازو ریسمان[10] سازند، و بلغتی ببای پارسی است.

کب[11] : اندرون رخ، و بلغتی ببای پارسی است.

کمخواب[12] : جامهٔ ایست معروف و آن کمخاست.

کلب[13] : منقار مرغ، و بلغتی ببائی[14] پارسی.

بهرۀ ت

کنشت : پرستش جای جهودان و گبران[15]، و جای بستن[16] خوکان[17].

---

۱ رک : ادات. اما در موید ۲ : ۱۳۶ گیپا طعامی است. ۲ دستورالاخوان ۲۳۷ جگر آکن.

۳ موید ۲ : ۹۰ کیا بمعنی خواجهٔ ده و مقدم ده. ۴ ادات : کنا زمین، اما موید ۲ : ۹۱ معنی مندرج متن بحوالهٔ زفان آورده. در فرس ص ۲۰۶، قواس ص ۸۸، صحاح ص ۲۰۰ : کنا رنگ بمعنی مرزبان وصحاح کنا بمعنی مرز نیز نوشته. ۵ جعفری ۴۰۰ کوادا بهمین معنی.

۶ رک : ادات. ۷ این کلمهٔ هندی در ادات یافته می شود.

۷ رک : موید ۲ : ۹۲، اما در جهانگیری ۲ : ۲۰۹۱ : گونیاست.

۸ رک : ادات و موید ۲ : ۹۳. ۹ نسخهٔ اصل : شتئی.

۱۰ ادات و موید : که از لیف آن رسن سازند.

۱۱ ادات : کب اندرون رخ و قیل بابای پارسی، رک : موید ۲ : ۹۳.

۱۲ رک : موید ۲ : ۹۳ که بحوالهٔ زفان معنی اش را نوشته.

۱۳ از روی نسخهٔ 'ل' افزوده شده.

۱۴ دستور ۲۰۷ کلب، ادات و موید ۲ : ۴۹ کلپ دارند نه کلب.

۱۵ در اکثر فرهنگها مانند فرس ص ۵۱، قواس ص ۱۱، ادات : جای جهودان. اما در قواس کنیه پرستش جای گبران قرار داده شده.

۱۶ این معنی فقط در ادات است، و در موید ۲ : ۹۵ بحوالهٔ زفان آورده. ۱۷ نسخهٔ اصل : خوکا.

کبست[1] : پوست نیشکر و خربزهٔ تلخک یعنی حنظل ، و در فردوسی حنظل را کبست[2] افتاده است.
کدست[3] : یک بدست[4] یعنی بلشت که بتازی آنرا شبر گویند ، و بکسر دال نیز گویند.
کویست[5] : کوفتگی ، و بعضی بکاف پارسی گویند.
کبت[6] : نحل انگبین یعنی مگس ، و بعضی فرهنگیان بدو کسر گویند.
کلات[7] : دیهی باشد بالای بلندی و کوهی اگرچه ویران شود ، و بعضی گفته اند کلات دیههای کوچک است.
کفیت[8] : از هم باز شده.
کاشت[9] : گردانیدن.
کافت[10] : شکافت.
کوت[11] : سرین.
کت[12] : تاج[13] و تخت ، و در فرهنگنامهٔ فخر قواس است : کت تخت هندوان باشد میان بافته ، گوئی تفریس کٹ[14] است.
کاست[15] : کم شده و کمی پذیرفته.
کیخت[16] : پوستینی است ترنجیده و گویند دانهٔ اورا کیمخت گویند یعنی پوست پیراسته.

---

[1] قواس ص ۳۷ ، صحاح ۴۷ ، دستور ص ۲۰۳ ، ادات : کبست بمعنی حنظل نوشته ؛ اما موید ۲ : ۹۵ هردو معنی دارد. [2] نسخهٔ اصل : کبشت افتاده الخ.

[3] قواس ص ۸۴ ، دستور ص ۲۱۴ : کدست بدست. رشیدی ۲ : ۱۱۱۰ : کدست بدست که بعربی شبر گویند.

[4] برهان ۱ : ۲۴۴ : بدست وجب را گویند و عربی شبر.

[5] کذا است در موید ۲ : ۹۵ ؛ اما در ادات گویست کاف و یا هردو فارسی.

[6] رک : ادات و موید ۲ : ۹۵ (کیت اشتباه چاپی).

[7] رک : فرس ص ۳۶ ، قواس ص ۱۳۳ ، دستور ص ۲۱۰.

[8] از مصدر کفیتن بمعنی کفیدن : از هم باز شدن.

[9] رک : موید ۲ : ۹۴ کاشت ماضی از کاشتن ، روی برگردانیدن.

[10] رک : موید ۲ : ۹۵. [11] موید ۲ : ۹۵ : کوت سرین مردم.

[12] رک. قواس ص ۱۳۲ : کت تخت هندوان باشد میان بافته

[13] بظاهر تاج از کت هیچ علاقه ندارد. [14] نسخهٔ اصل : کمن.

[15] رک : ادات و موید ۲ : ۹۴.

[16] در موید ۲ : ۹۵ همین معنی بحوالهٔ زفان آمده است.

بهرهٔ 'ج'

کوبج[1]: سیاه دانه.
کلوج[2]: نان ریزه.
کنج[3]: بیرون کشیدن[4] و احمق و خودستائی[5] و بعضی فرهنگیان بکاف وجیم پارسی، احمق و خودستا را گویند.
کولنج[6]: قولنج و آن نام علتی است از باد.
کولانج[7]: حلوائی است که آنرا سایر و لابرلا و لابرن[8] نیز گویند.
کلج[9]: سبد گرمابه بانان را گویند سبد کناس[10]، و بعضی بکسر کاف وفتح لام گویند [ورق ۱۷۶] و در اسدی بجیم پارسی گفته.
کج[11]: قلاب آهنین بر سر چوب کرده که بدان یخ کشند و مانند یخ.
کنج: پیغوله[12] یعنی گوشه ای از جائی بود.
کلاج[13]: همان حلواست که آنرا لابرلا گویند، و بکاف وجیم نیز پارسی گویند.

---

۱. قواس ص ۹۰: کوبج و بوغنج: سیاه دانه؛ نیز رک: ادات.
۲. رک: قواس ص ۱۴۹.
۳. این کلمه بصورت های ذیل یافته می شود، کنج و گنج و کیچ و کنج و گنج، رک: فرس، قواس، دستور، صحاح، موید، برهان قاطع. دکتر معین در برهان ص ۱۸۳۷ گنج را صورت صحیح و دیگر صورتها را مصحف قرار می دهد.
۴. موید ۲: ۹۶ کنج: بیرون کشیده. ادات: گنج بالفتح احمق و خودستا و کنج بمعنی بیرون کشیده نوشته.
۵. نسخهٔ اصل: خودستائی. ۶. رک: جهانگیری ۲: ۲۰۷۰، فرهنگ معین ۳: ۳۱۳۱.
۷. ادات: گولانج کاف و واو و جیم هرسه فارسی حلوائی است که اهل هند آن را لابر خوانند، موید ۲: ۹۶ کولانج را بدین معنی می نویسد، با مترادف هندی لابر.
۸. کذا است در اصل. اما این همه بظاهر اشتباه است، و صحیح لابرلا ست چنانکه در فرهنگ معین ۱: ۳۱۳۱ درج است نیز معین ذیل لابرلا (فرهنگ ۳: ۳۵۱۷) می نویسد: لابرلا (۱) توبرتو (۲) نوعی نان شیرین، تنک و توبرتو، توبرته، کلاج.
۹. رک: فرس ص ۶۱، قواس ص ۱۳۴، صحاح ص ۵۹.
۱۰. موید ۲: ۹۶ ۱۱. رک: موید ایضاً.
۱۲. قواس ص ۱۲۸: پیغوله گوشهٔ بود از خانه. ۱۳. رک: فرهنگ معین ۱: ۳۱۳۱.

کرنج[1] : زہر و خرمای ابوجہل.

کرج[2] : زخمهٔ گریبان وبضم کاف نیز گویند.

کبج[3] : خر دم بریده و چارپائی که زیر دهانش بیاماسد آنگاه گویند کبج[4] شده است از ستور وخر، وبعضی بجیم پارسی گویند.

بهرهٔ 'چ'

کاچ[5] : کاچک یعنی تارک وسیلی که پس قفا زنند.

کیچ[6] : پراگنده و جامه بود.

کوچ وبلوچ : یعنی کوچ و بلوچ مرکب و در هردو واو پارسی، دزدان را گویند، ومجرد کوچ[7] اعوال باشد وچند[8] وپیاده[9] و دزدو زند. وبعضی بجیم عربی گویند.

کالوچ[10] : خرد، وگویند انگشت خرد پای یعنی کهین انگشت پای.

---

[1] رک : ادات ؛ موید ۲ : ۹۶ کرنج اشتباه چاپی است.

[2] ادات : کرچ باجیم فارسی زخمهٔ گریبان.

[3] رک : فرس ص ۵۱. صحاح ص ۵۴، ادات ؛ موید ۲ : ۹۶.

[4] ادات، موید، فرہنگ معین ۳ : ۲۸۸۵ : گویند کبچه شده است - کبج، کبچ، کبجه - ہمین معنی دارد.

[5] رک : صحاح ص ۵۸.

[6] رک : ادات و موید ۲ : ۵۷، این فرہنگ اخیر بگفتهٔ زفان معنی درج نموده. فرہنگ معین ۳ : ۳۱۴۹ کیچ بمعنی پراگنده، اندک، خرد نوشته.

[7] کذا است در ادات ؛ اما کوچ وبلوچ بگفتهٔ صحاح ص ۵۹ موضعی است میان کرمان واصفهان. وبگفتهٔ جهانگیری ۲ : ۲۰۵۵ کوچ وبلوچ نام طایفه ایست از صحرانشین که در اطراف و نواحی کرمان متوطن اند وکار و حرفهٔ آنها جنگ و خونریزی و دزدی و راهزنی باشد الخ. و مسالک و ممالک ص ۱۴۱ : این دو قوم را کوچ وبلوچ خوانند و کوچ از کس نترسد الا بلوچ و مردمانی صحرانشین باشند الخ - حکیم قطران نظم نموده :

ہستند اہل پارس ہراسان زکارمن ؛ زان سان که اہل کرمان ترسان ز دزد کوچ

نیز رک : فرس ص ۶۳.

[8] رک : ادات، جهانگیری ۲ : ۲۰۵۵. [9] رک : ادات.

[10] این معنی را موید ۲ : ۹۶ بحوالهٔ زفان آورده.

[11] ادات و موید ۲ : ۹۷ : کالوچ کبوتر و انگشت کهین پای. اما در فرس ص ۶۴، قواس ص ۸۴، صحاح ص ۵۸ : کالیچ بمعنی انگشت کهین پای. در ادات کالیچ وکالوچ ہر دو آمده.

کلنج : ریم اندام یعنی شوخ و چرکیک بر دست و اندام باشد و در فرهنگنامه است : کلنج احمق و معجب و خویشتن ستا!
کوچ : رحلت یعنی روان شدن از منزل و خرامیدن ، و کوف[3] یعنی چغد شوم .
کرتج[4] : خانهٔ کوچک و خانهٔ خرمن بان که در خرمن سازد و گوشهٔ خانه .
کلوچ[5] : کلوج : نان ریزه ، کلوچ [با جیم فارسی] بدل کرده .
کلیواچ[6] : پشه[7] باشد .

بهرهٔ خ

کستخ[8] : ترش شیر مثل پنیر کر جغرات را باشه می کنند و گویند کشک[9] یعنی پنیر .
کالوخ[10] : گیاهی است و در فرهنگنامهٔ فخر قواس کاکوخ بدو کاف است .
کیرخ[11] : تختهٔ چوب باشد و دفتر و کتاب بر آن نهند ، بتازیش رحل خوانند .
کخ[12] : آنچه کودکان را بدان بترسانند یعنی چیزی باشد صورت زشت درش بنگارند و کودکان را که طفل باشند بترسانند یعنی کهوکهر[13] ، و کخ زنده[14] دیوار را گویند
کاخ[15] : کوشک و خانه و روزن ، و بعضی گویند : کاخ خانهٔ با روزن است .
کوخ[16] : خانهٔ بی روزن .
کولخ[17] : آتش دان .
کلوخ[18] : پارهٔ گل خشک کرده .

---

۱ رک : قواس ص ۸۹ ، صحاح ص ۵۹ .
۲ ادات هر دو معنی دارد ، و نسخهٔ 'ل' از زفان فقط معنی دوم دارد . اما در صحاح ص ۵۸ کیج و در زفان کنج و جهانگیری ۲ : ۱۶۵۶ کلیج دارای همین معنی است . ۳ رک : صحاح ص ۵۹ .
۴ رک : ادات . ۵ رک : ادات . ۶ جهانگیری ۲ : ۱۶۵۸ : کلیواج غلیواج ، نیز رک : فرهنگ معین : کلیواج غلیواژ ، زغن (۳ : ۳۰۵۲) . ۷ کذا است در اصل ، نسخهٔ 'ل' : پس ' ادات : کلیواج پس عربی خشن ، مدار ۱ : ۳۰۷ پشه مختصر پشه کلیواج ، موید ۲ : ۷ ۹ بگفتهٔ زفان بشن نوشته . ۸ رک : قواس ص ۱۴۷ . ۹ رک : فرهنگ معین ۳ : ۲۹۸۸ .
۱۰ رک : قواس ص ۳۸ که کالوخ دارد نه کاکوخ . ۱۱ رک : قواس ص ۱۲ . ۱۲ رک : قواس ص ۱۱۴ .
۱۳ کذا است در اصل . ۱۴ رک : فرهنگ معین ۳ : ۲۹۱۹ .
۱۵ رک : ادات . ۱۶ رک : ادات .
۱۷ در ادات و موید ۲ : ۹۶ کوکنج : اما در لسان الشعرا بگفتهٔ موید : کولخ کذا در متن (زفان) .
۱۸ ادات : کلوخ : پارهٔ گل خشک شده الخ .

بهرهٔ 'د'

کبد[1]: مرد کوه نشین از زهاد و رهبانان، و در [ورق ۱۷۷] اسدی و فردوسی است: کبد دهقان.
کبد[2]: درم گزین[3] پادشاه باشد یعنی ناقد که سیم و زر سلطان بدو سپارند و او بخزانه سپارد.
کراد[4]: جامهٔ کهنه و پاره پاره نیز گویند.
کبد[5]: گوشت آور یعنی فربه.
کلوند[6]: مرسله باشد از گوز و انجیر[7] و آنچه بدین ماند.
کرمند[8]: شتاب.
کافد[9]: شکافد.
کفند[10]: بیلی باشد سر اندر جفته، برزگران را بود، در ماوراءالنهر بیشتر بود.
کمند[11]: طناب[12].
کرد[13]: کشت شالی و ترکاریها و نام قومی.
کرود[14]: چاهی که آب ازو بدشواری کشند.
کلند[15]: میتین[16] یعنی سبل[17].

---

[1] رک: قواس ص ۸۷؛ ادات: کبد کوه نشین از زهاد و عباد و قیل دهقان.
[2] کبد را بدین معنی نیز بالضم نوشته اند (رک: جهانگیری ۲: ۲۱۸۹). اما تحقیق دکتر معین اینست که اصلاً این گاه بد = گهبد است، و معرب آن جهبذ، رک: فرهنگ معین ۳: ۳۱۴۱، ۳۲۶۹۲.
[3] رک: قواس ص ۸۷. [4] رک: ادات و موید ۲: ۹۹. [5] رک: ادات و موید ۲: ۹۹.
[6] ادات و موید ۲: ۱۰۰ کلوند نام کوهی است و مرسله (موید: گلوبند) که از گوز و انجیر بکنند، قیل باکاف پارسی. در موید باکاف فارسی و عربی بهر دو طور؛ اما چون مرسله با گلو علاقه دارد بنا بر این کلمه باید گلوند باشد نه کلوند. [7] رک: ادات و موید. نسخهٔ اصل: گور و انجیر و گور.
[8] صحاح ص ۸۲: کرمند شتاب در کارها باشد، نیز رک: ادات و موید ۲: ۹۹ (کردمند غلط، کرمند درست)
[9] موید ۲: ۹۹: کافد شکافد و شکافته شود.
[10] کفند و کلند مترادف اند. رک: جهانگیری ۲: ۱۶۵۰.
[11] رک: ادات و موید ۲: ۱۰۰. [12] ادات: طناب که ازان آلت جنگ سازند. [13] رک: ادات.
[14] رک: جهانگیری ۱: ۱۱۰۹. [15] رک: جهانگیری ۲: ۱۶۵۰؛ موید ۲: ۹۹.
[16] رک: ادات، درین فرهنگ میتین و کلند مترادف اند، نیز رک: مدار ۲: ۲۰۳، جهانگیری ۲: ۲۳۴۲، صحاح ص ۲۵۳. زفان میتین را مترادف کلند و سبل نوشته.
[17] ادات و موید: سبال (هندی)؛ زفان سبل (ذیل میتین).

بهرهٔ «ر»

کر[1] : توان و مراد.

کبودر[2]: کرمی خرداست، درشب[3] باشد، و گویند کرمی خرداست که ماهی خورد، و در اسدی است : کرمی باشد که بخود اندر آب رود.

کوار[4] : سبدی که بدان خاک و میوه وجزآن بردارند.

کزار[5] : بازای پارسی، حوصله.

کدیور[6]: کشاورز و دهقان راگویند، مزارع نیزگویند.

کویر[7]: زمین سراب یعنی کوراب[8] و آن زمین[9] شوره است و بیابان که بی آب و نبات باشد و بعضی فرهنگیان[10] گویند کویر بکاف و یای پارسی.

کیفر[11]: پشیمانی و سنگ سرکنگره و مزک[12] دروغ، و گویند آلتی[13] بود دوغبانرا که اندرو دروغ وماست کنند، مانند تغاری باشد لیکن دیوارش ازآن برتر باشد و نایژه[14] دارد چون نایزهٔ بلبله، وبعضی این رابکاف پارسی گویند، و در فردوسی است : کیفر حیف باشد.

کدیور[15]: برزگر و دهقان و باغبان وخانه[16] دار.

کشور[17]: اقلیم یعنی رکنی وبخشی از زمین وآن هفت است باقسام هفت سیاره، پس کشور هفتم حصهٔ زمین باشد از ربع مسکون.

---

[1] ادات ومؤید ۲ : ۱۰۲ : کر توان و مراد، صحاح ص ۱۱۲ : کر توان باشد، وکام وکر: مراد و تولی وپشت و پناه.

[2] صحاح ص ۱۱۲ : کبودر کرمکی باشد خرد درآب و ماهی آنرا خورد.

[3] رک : ادات ومؤید ۲ : ۱۰۲. [4] رک : مؤید ۲ : ۲۰۳.

[5] رک : صحاح ص ۱۱۳. [6] رک : صحاح ص ۱۱۲.

[7] رک : قواس ص ۲۸ ، صحاح ص ۱۱۵. [8] قواس ایضاً.

[9] درنسخهٔ اصل : از زمین ... بعضی افتادگی دارد.

[10] صاحب ادات ، باکاف و یای پارسی آورده.

[11] رک : فرس ص ۱۳۱ ، قواس ص ۳۱ و ۱۳۶ ، صحاح ص ۱۱۵.

[12] رک : قواس ص ۱۳۶. [13] رک : ادات. [14] نعل آوند (مؤید ۲ : ۲۴۲)

[15] در هردو نسخهٔ زفان این واژه دوباره آمده. [16] رک : صحاح ص ۱۱۲.

[17] رک : ادات.

کوکنار[1] : خشخاش.

کستر[2] : خارسیاه، وبعضی بکاف پارسی گویند.

کراکر[3] : کلاغ، وبعضی بضمت هردو کاف.

کنگار[4] : مارپوست افگنده. وبلغتی[5] کاف مفتوح است.

کیار[6] : کاهلی وگیاهی باشد.

کریر[7] : پای کاریعنی پیشکار.

کنور[8] : کندوی غله وآن چیزی است همچو خم وکانور[9] نیز گویند، وبلغتی کاف مفتوح است.

کنار[10] : موز که میوه است.

کلاور[11] : غوک.

کاشغر[12] : نام شهری است در ترکستان وکاژ[غر] نیز گویند.

کندر[13] : نام درخت است که بدرخت پسته ماند، واورا میوه وتخم نباشد. [ورق ۱۷۸ ا]
بتازی لبان[14] گویند.

---

[1] صحاح ص ۱۱۵ : کوکنار خشخاش بود باپوست رسته، اما ادات ، کوکنار خشخاش.

[2] ادات : گستر باکاف فارسی خارسیاه وگسترنده.

[3] رک : قواس ص ۵۸. [4] رک : قواس ص ۷۱.

[5] ازین جا تا کنور در نسخهٔ اصل افتادگی دارد.

[6] این واژه و واژهٔ بعد در نسخهٔ اصل افتادگی دارد. صحاح ص ۱۱۵ : کیار کاهلی ؛ اما ادات ومؤید ۲ : ۱۰۳ : کیار کاهلی وگیاه.

[7] جهانگیری ۱ : ۱۱۲ : کریر با اوّل مضموم وثانی مکسور و یای معروف پایکار وپیشکار.

[8] نسخهٔ اصل : کانور.

[9] رک : قواس ص ۱۶۱ ؛ صحاح ص ۱۱۴ : کندور وکنور ظرفی باشد بزرگ مانند خم که غله را دران ریزد وکندوله وکنو خوانند. کندو بمعنی ظرف بزرگ گلین که هندوی کوٹھی گویند. (جهانگیری و رشیدی)

[10] کذا است در نسخهٔ 'ل' ؛ اما این صورت در فرهنگها دیده نشد.

[11] رک : ادات ومؤید ۲ : ۱۰۳. [12] رک : ادات ومؤید ایضاً.

[13] کاشغر که بشکل های دیگر مانند کاجغر، کاچغر، کاژغر آمده، شهر مرکزی ترکستان شرقی واقع در ۷۰ کیلومتری شمال غربی یارکند (فرهنگ معین ۶ : ۱۵۲۴) ؛ نیز رک : جهانگیری ۱ : ۴۲۵.

[14] رک : ادات ومؤید ۲ : ۱۰۳ و فرهنگ معین ۳ : ۳۰۹۱.

[15] رک : فرهنگ معین ایضاً.

کرگسار[1] : نام ولایتی است .
کاخر[2] : یرقان .
کردر[3] : دشت و کوه ، و گویند درّهٔ کوه .

بهرهٔ ز

کاریز[4] : جوی سرپوشیده و سربسته یعنی آنکه بطریق سمج[5] کاوند ، و در اسدی[6] است : آبی باشد زیر زمین که از جایها بجایها برند .
کاز[7] : صومعه[8] برسر کوه و صحیح گویند کاف پارسی است .
کریز[9] : گوشهٔ خانه .
کراز[10] : کوزهٔ سرتنگ و تب[11] ولیکن تبی که زنان را وقت ولادت بیشتر باشد .
کیز[12] : نم .
کشاورز : مزارع .
کروز[13] : طرب و نشاط ، و بواو[14] پارسی نیز گویند .

---

[1] نسخهٔ اصل : کرگنار ، اما رک : جهانگیری ۱ : ۱۱۰۵ نیز حاشیه : شاهنامه :

سوی کرگسار و سوی باختر ٭ درفش خجسته برافراخت سر

درچاپ دیگر : سوی کرگساران سوی باختر ، و در مجمل التواریخ و القصص ص ۲۴ بصورت کرگساران آمده .

[2] رک : جهانگیری ۱ : ۶۲۶ . [3] ادات : کردر دشت و کوه و درّهٔ کوه و زمین سخت ؛ نیز رک : قواس ص ۳۱ . [4] رک : قواس ص ۲۵ .

[5] کذاست در قواس ، زفان : سمج یعنی حفره کردن و سمچه حفرکرده الخ .

[6] فرس چاپ پاول هورن ص ۳۹ : کاریز آبی باشد در زمین بجائی بردن برند الخ . اما در صحاح ص ۱۲۹ : کاریز آب روان باشد زیر زمین که بجایها برند .

[7] کذاست در صحاح ص ۱۲۹ ، اما قواس ص ۱۲۳ : کاژ .

[8] کذاست در قواس ؛ اما صحاح : موضعی باشد که درکوه و بیابان برکنند الخ .

[9] در هر دو نسخه : کویز ؛ و شاید بهمین جهت است که در موید ۲ : ۱۰۵ این واژه بهمین شکل آمده ، واضح است که این تصحیف است . اما در قواس ص ۱۲۸ ، صحاح ص ۱۳۰ ، ادات ، دستور ص ۲۱۰ ، موید ۲ : ۱۰۴ ، جهانگیری ۱ : ۱۱۱۲ کریز بمعنی خانهٔ کوچکی یا گوشهٔ خانه آمده .

[10] قواس ص ۱۳۹ ، صحاح ص ۱۳۰ : کراز کوزهٔ سرتنگ . [11] رک : ادات و موید ۲ : ۱۰۴ .

[12] رک : موید ۲ : ۱۰۵ . [13] رک : صحاح ص ۱۳۰ ، موید ۲ : ۱۰۴ .

[14] موید : با زای پارسی .

کاناز[1]: بن خوشهٔ رطب.
کناز[2]: همان کاناز.
کیلیز[3]: گیاهی است، و در فرهنگنامه[4] است: کیکیز بدو کاف مکسوره و یای اوّل پارسی، رستنیه است زیبا.
کریز[5]: پر ریختن باز و مثل او، و فریضه[6] بمعنی[7] فریصه باصاد مهمله آنست که دستهارا زیر پایها بندند یا دست و پا بندند.
کوز[8]: دوتا یعنی کنک و چفته[9].
کنیز: پرستار.
کراز[10]: بیلی باشد بدو رشته بسته و دوکس می کشند و زمین راست می کنند.

بهرهٔ ژ

کژ: بیخ درخت[11] هر چیزی.
کاژ[12]: کلیک[13] بود یعنی احول.
کژ: خوهل[14] یعنی ضد راست.

---

[1] رک: صحاح ص ۱۳۰، موید ۲: ۱۰۴، و نیز قواس ص ۵۲ ذیل کانا، و حاشیه نمره ۲.
[2] رک: سرمهٔ سلیمانی ۱۹۷. [3] فرهنگ جهانگیری: کیکیز، نیز رک: فرس ص ۲۰۲.
[4] کذا است در قواس ص ۳۸، موید ۲: ۱۰۵ قول زفان را عیناً نقل نموده.
[5] رک: ادات و موید ۲: ۱۰۵.
[6] کذا است در ادات و موید ایضاً و سرمهٔ سلیمانی ۱۹۷.
[7] همین معنی عیناً در موید بگفتهٔ ادات درج نموده؛ اما نسخهٔ ادات که پیش بنده است یک کمی فرق دارد، در دستور الاخوان فریصه بدینطور شرح شده:
گوشت بازو و میان شانه و پهلو که از بیم بلرزد.
[8] صحاح ص ۱۳۰ و ادات و موید ۲: ۱۰۵: کوز چفته و دوتا شده.
[9] نسخهٔ اصل: خفته.
[10] موید ۲: ۱۰۴: گراز و صحاح ص ۱۳۱: گراز بدین معنی نوشته.
[11] برای این معنی رک: ادات و موید ۲: ۱۰۵. [12] رک: صحاح ص ۱۳۷.
[13] کلیک بمعنی احول، رک: صحاح ص ۱۸۵.
[14] خوهل بمعنی کژ ضد راست، رک: صحاح ص ۲۰۶.

بهرهٔ س

کرس[1] : موی پیچیده و ریم تن[2] و جامه ، وبعضی کاف مضموم گویند وبلغتی کاف پارسی است .

کالوس[3] : مردم خربط[4] یعنی مسخره ، مشهور[5] و مستهتک[6] .

کوس[7] : طبل ، آنکه بلشکرها و مرکبها دارند ومعروف است ، ویرا بزنند ازجهت حشمت بزرگان و ملکان را بود ، و زبان و مانند ، گویند این بران کوس می زند یعنی بدان می ماند ، وآنکه دوتن برهم رسند یعنی[8] فراهم رسند وپهلو و دوش سخت دریکدیگر کوبند .

کابوس[9] : دیوستنبه

کماس[10] : کوزهای پهن برمثال کشف چه ازچوب و چه از سفال ، چنانکه خواهند از زیربغل در آویزند .

کیوس[11] : کژ .

کسیس[12] : گیاهی است[13] که بدان گوهر پولاد پیدا[14] آید .

کرگس[15] : پرندهٔ مردار خوار .

کُس : فرج عورت .

---

[1] قواس ص۷۸ ، دستور ص ۲۱۳ : کرس وکورس : موی پیچیده ، و موید ۲ : ۱۰۶ : ریم اندام . ادات کرس بالفتح ریم اندام ، وگرس موی پیچیده . زفان : کورس همان کرس یعنی موی پیچه و ریم اندام جهانگیری ۱ : ۱۱۰۲ ، کرس ، کرسه ، کورس بمعنی چرک و ریم و موی مجعد .

[2] رک : قواس ص ۱۵۸ ، صحاح ص ۱۴۵ .

[3] قواس ص ۱۱۲ : کالوس مردم خربطه . صحاح ص ۱۴۵ : کالوس : مردم خربط و ابله .

[4] خربط بمعنی مسخرگی وخربطه بمعنی مسخره ، رک : مدار ۲ : ۱۲۴ .

[5] کذاست درنسخهٔ اصل و ادات ، امانسخهٔ ل : مشهور ، موید ۲ : ۱۰۶ : مقهور .

[6] کذاست درنسخهٔ اصل و ادات ، ونسخهٔ ل : مستهیکه و موید : غمناک .

[7] ادات : کوس طبل و دمامه و زبان و مانند .

[8] رک : موید ۲ : ۱۰۶ ، درین فرهنگ این معنی بگفتهٔ ادات نوشته ؛ امانسخهٔ ادات این را ندارد

[9] رک : ادات .

[10] رک : صحاح ص ۱۴۵ و ادات .

[11] رک : صحاح ایضاً .

[12] رک : ادات .

[13] ادات : چیزی است .

[14] ادات : بیارایند

[15] ادات : کرگس پرنده ایست درنده ... وعرب آنرا نسر خوانند .

س[۱] : همان کرس است یعنی موی پیچیده و ریم اندام.

بهرهٔ شین

ش[۲] : دین و مذهب [ورق ۱۷۹ ا] و آنچه دران تیر اندازند مثل قربان یعنی ترکش، موی[۳] و زلف را نیز کیش گویند.

ش[۴] : صفت و کاف مضموم لغتی است و بعضی بکاف پارسی گویند.

ش[۵] : آوند دوغ، و بعضی بکاف پارسی گویند، و کاویش نیز گویند.

دش[۶] : بضم و فتح دال پاغنده[۷]، و بعضی بکسر دال گفته اند و بعضی بفتح کاف نیز گویند.

زش[۸] : تظلم، و بعضی کاف پارسی گویند.

یش[۹] : جانوریست چون مار کوتاه ولیکن دست و پای دارد و سبک رود و بیشتر به ویرانه ها باشد، هرکه راگزد دندان او در زخم گاه ماند.

باش[۱۰] : کرفش.

اوش[۱۱] : چرخ روغن گران یعنی کهنی[۱۲]، آنچه بدان روغن می کشند.

ش[۱۳] : چهاردهم روز از ماه.

---

۱ رک : کرس. ۲ رک : صحاح ص ۱۵۵، ادات و موید ۲ : ۱۰۸. ۳ این معنی در فرهنگها دیده نشد.

۴ قواس ص ۱۶۰ : کواش و گون دوام : صفت، ادات : گواش؛ جهانگیری ۲ : ۱ د ۲۰۵ : کواس و کواسه بمعنی صفت و گونه و در بعضی از فرهنگها باشین منقوط.

۵ ادات : کویش آوند دوغ و قیل باسین مهمله، رک : موید ۲ : ۱۰۸.

۶ رک : ادات و موید ۲ : ۱۰۸. ۷ زفان : پاغنده پنبه زده.

۸ نسخهٔ اصل : کورش. اما رک : نسخهٔ 'ل' و موید ۲ : ۱۰۷ (کزرش اشتباه چاپی) ادات : گرزش.

۹ رک : ادات، در موید کرش اشتباه چاپی، ۲ : ۱۰۷.

۱۰ رک : ادات و موید ۲ : ۱۰۷.

۱۱ رک : ادات، موید ۲ : ۱۰۷ : کاودش و این اشتباه است.

۱۲ کذا است در اصل. ازینجا تا آخر در نسخهٔ 'ل' افتادگی دارد.

۱۳ موید ۲ : ۱۰۸ کوش چهارم روز از ماه کذا فی شرفنامه. اما در اکثر منابع این گوش است. فرهنگ معین ۳ : ۳۶۵۲ : گوش روز چهاردهم از هرماه شمسی :

به روز گوش اسفندارمذ ماه ❊ بگاه یزدجرد آخر شهنشاه

بقول بیرونی در گوش روز از دی ماه جشنی بوده است موسوم به "سیر سور" الخ. نیز رک : مدار ۱ : ۱۶۶ د قطعه ای که نام سی روز از ماه درج نموده است.

بهرهٔ 'غ'

کیغ[1] : پیخال[2] چشم یعنی آب و بخار چشم که پیخال بندد.

کناغ[3] : بضم کاف، تار ابریشم[4]، و بعضی گویند اصل ابریشم یعنی پیلهٔ[5] و گویند کناغ یعنی تار ریسمان، و بعضی بفتح کاف گویند.

کزغ[6] : اوشه[7]، و این گیاهی است که کمنگران[8] بر بازوی فرود آمده بندند، بتازی اشق گویند.

کلاغ[9] : زاغ سیاه دشتی.

کاغ : آوازی که در کله[10] جنبانیدن گاو بر آید که بهندوی آنرا جگال گویند.

بهرهٔ 'ف'

کوف[11] : جنسی است از مرغان، و اصح آنکه پغد شوم است.

کشف[12] : باخه[13].

کزف[14] : سیم سوخته و بعضی بکاف پارسی گویند.

کاف[15] : شکاف.

بهرهٔ 'ک'

کاواک[16] : میان تهی یعنی خالی، و بعضی بکاف[17] پارسی گویند.

کاک[18] : مرد، بلغت ماوراءالنهر[19]، و قرص[20] و مردم چشم[21].

---

[1] قواس ص ۷۹. [2] رک : سروری ۱ : ۲۴۴. [3] رک : قواس ص ۱۸۵.

[4] از اینجا تا گویند کناغ درنسخهٔ اصل افتادگی دارد. [5] رک : قواس ص ۱۸۵.

[6] قواس ص ۴۳، دستور ص ۲۰۴ : کزغ اوشه.

[7] موید ۱ : ۱۰۲ : اوشه گیاهی است که کمانگران بر بازوی فرود آمده بندند.

[8] رک : ادات و موید ۲ : ۱۰۹. [9] رک : موید ایضاً.

[10] رک : موید ۲ : ۱۰۹. [11] رک : ایضاً ص ۱۱۰.

[12] رک : قواس ص ۶۷. [13] رک : موید ۱ : ۱۷۷.

[14] رک : قواس ص ۱۹۱. برای شکلهای دیگر این کلمه رک : قواس ص ۱۹۱ ح. فرس وصحاح : کرف دارند و دکتر معین همین را درست قرار می دهد : حاشیهٔ برهان ص ۱۶۳۶.

[15] ادات : کاف شکاف و بکاف فارسی نیز. [16] رک : موید ۲ : ۱۱۰. [17] ایضاً.

[18] رک : صحاح ص ۱۸۴، جهانگیری ۱ : ۱۴۴۰-۱۴۴۱. [19] رک : صحاح ایضاً.

[20] جهانگیری ایضاً نانی بود. [21] رک : قواس ص ۸۰، صحاح ص ۱۸۴

کابک[1]: خانهٔ کبوتر و مرغ خانگی و چیزی مانند زنبیل که آدمیان در خانه آویزند تا کبوتر اندر وی بچه کند.
کابوک[2]: همان کابک است.
کلیک[3]: کاژ چشم یعنی احول.
کوک[4]: با واو پارسی، تره است، از خوردن آن[5] خواب آید و طبعش سرد تراست چنانکه از خوردن خشخاش، بتازی آنرا خس[6] و بهندوی بهسل[7] گویند.
کوک[8]: بواو عربی، کمان، و بعضی کاف پارسی گویند.
کلیک[9]: کریچ[10]، خرمن دان یعنی جای نگاهبان، خرمن دان خانه [ورق ۱۸۰ ا] ایست که درخرمن گاه اندازند.
کلنک[11]: تخم خفرج[12] یعنی لونک[13].
کراک[14]: جانوری است از مرغان سیاه و سپید دراز دم، برکرانه[15] آب نشیند و دم بگرداند[16]، مقدار[17] فراشتک است، کرک[18] نیز گویند.

---

[1] رک: صحاح ۱۸۴. [2] ایضاً. [3] رک: صحاح ص ۱۸۵ و دستور ص ۲۰۴.
[4] صحاح ص ۱۸۵: کوک کاهو باشد که بعضی تره خوانند، طبعش سرد و تراست.
[5] قواس ص ۳۸: کوک تره ایست و کوکنار خشخاش، خورندهٔ هر دو را خواب آید. سنائی:
پاس خود خود دار زیرا پاسبانان ترا ٭ ترهٔ شان کوک هست و میوهٔ شان کوکنار
[6] رک: جهانگیری ۲: ۲۰۶۶ و فرهنگ معین ۱: ۱۴۰۹. [7] نسخهٔ 'ل': بهل.
[8] رک: قواس ص ۱۷۲.
[9] قواس ص ۵۶: کلیک و کریج: خرمن بان. دستور ص ۲۰۶ کلنبک: کریج خرمن بان، ادات: کلیک خرمن بان که خرمن برو اندازند.
[10] زفان: کریچ خانهٔ کوچک و خانهٔ خرمن بان که درخرمن سازند و گوشهٔ خانه.
[11] رک: قواس ص ۱۴۰ و ادات، موید ۲: ۱۱۲، (خفرج غلط چاپی)، اما دستور ص ۲۰۴: کلنک تخم حفرج.
[12] زفان: خفرج گیاهی است که بتازی بقلة الحمقا گویند یعنی لونک، درهمین فرهنگ بقلة الحمقا بدینطور شرح کرده: خرفه و اورا بقلهٔ مبارکه و بقلهٔ زهرا نیز گویند، بهندوی لونک گویند.
[13] این کلمهٔ هندی بعلاوه زفان در موید ۲: ۱۱۲ نیز یافته می شود.
[14] رک: فرس ص ۲۵۲، قواس ص ۵۹. [15] نسخهٔ 'ل': کنار.
[16] نسخهٔ 'ل'، ادات: بلرزاند. [17] در دیگر فرهنگها دیده نشد.
[18] موید ۲: ۱۱۱ برای این معنی کردک دارد، و نیز کرک.

کریشک[۱] : چوزهٔ[۲] هرچیزی ، و در فرهنگنامه[۳] نبشته[۴] : کریشک مرد جنگی و پهلوان .

کشنک[۵] : بشین معجمه خیزدوک[۶] منقش .

کرک[۷] : محلوق یعنی سرکل[۸] ، و بعضی بفتح کاف گویند : مردم چشم[۹] .

کملک[۱۰] : بغل یعنی ابط[۱۱] و کاف مضموم ، علتی[۱۲] است .

کوچک : بواو پارسی و عربی نیز گویند ، خرد .

کندک[۱۳] : نان ریزه ، و بفتح دال .

کیشک[۱۴] : سنبه[۱۵] تیزکردن آسیا ، و بعضی بفتح کاف و کسر با و در فرهنگنامهٔ فخر قواس[۱۶] کبیتک کرده است .

کورک[۱۷] : بواو پارسی ، سنگ گازر .

کردک[۱۸] : افسانه و گویند لغز .

کبک : پرنده ایست چون فاخته سپید باشد و رنگها خوب دارد ، انگشت[۱۹] می خورد ، رفتار خوب دارد ، گویند کبک دری در درهٔ کوهها باشد .

کلک[۲۰] : بی موی و نیشتر یعنی زخم نیشتر و دندان .

---

۱ ادات و جهانگیری ۱ : ۱۱۱۳ . ۲ رک : قواس

۳ معلوم نیست منظور مؤلف کدام فرهنگ است .

۴ در نسخهٔ اصل این جا تا پهلوان افتادگی دارد .

۵ رک : قواس ص ۶۶ ، ادات ، مدار ۳ : ۸۵ اما در هر دو نسخه : کشتک .

۶ در اصل افتادگی دارد . ۷ رک : قواس ص ۷۹ ، برهان ۲ : ۱۶۶۵ .

۸ زفان : کل سر بی موی . ۹ رک : موید ۲ : ۱۱۱ که بحوالهٔ زفان این معنی نقل شده .

۱۰ رک : قواس ص ۸۳ ، جهانگیری ۲ : ۱۶۴۶ .

۱۱ اَلْاِبط بالسکون و بالکسر : بغل ، رک : دستورالاخوان ص ۷ .

۱۲ کذاست در نسخهٔ 'ل' ؛ نسخهٔ اصل : لغتی . ۱۳ قواس ص ۱۴۹ : کلوج و کندک : نان ریزه .

۱۴ نسخهٔ 'ل' : کتینک .

۱۵ ادات : کبتک ، موید ۲ : ۱۱۰ : کبیک . اما در جهانگیری ۱ : ۶۱۰ ، و فرهنگ معین ۳ : ۲۸۹۴ : کبیتک آلتی که آسیا را بدان تیزکنند ، زفان : سنبه آلت تیزکردن آسیا .

۱۶ در فرهنگ قواس چاپی ص ۱۷۹ این کلمه افتادگی دارد و بجای آن جلوج بمعنی سنبه تیزکردن آسیا .

۱۷ رک : قواس ص ۱۸۴ و ادات .

۱۸ قواس ص ۱۸۸ : کردک و بردک افسانه ، تردک و چربک لغز و چیستان . ۱۹ رک : ادات و موید ۲ : ۱۰۱ . ۲۰ رک : فرهنگ معین ۳ : ۳۰۳۲ کلک معنی شماره ۱ و ۴ .

[1]: کژ چشم یعنی کاژ .

[2]: نی یعنی قلم.　　　کنک[3] : شنی که آنرا بتابند.

[4]: مشک در، جانوریست آبی که مشک درّد .

لک[5] : کشک شیر که با جغرات می کنند و بعضی شین معجمه گویند .

[6]: جانوریست خرد از جنس کرم که می خورد ، بهندوی پیهو[7] گویند .

ل[8] : آنچه از خرما رسن سازند ، و بعضی آخرین حرف[9] لام گویند .

ل : خدمتگار[10] و بنده و پسر که به بلاغت نرسیده باشد و آزاد بود ، بر سبیل ترحم وی را کودک گویند

رانک[11] : استخوانی است ، بتازی آنرا غضروف گویند .

ل[12] : قلاب .

نک[13] : پشمینه است معروف .

لک[14] : کارد خرد که نوک او کژ باشد .

رنجک[15] : خیار بادرنگ بود که سبز نبود هنوز .

۱　رک : صحاح ص ۱۸۵ الکل یعنی احول .　۲ رک : ایضاً .　۳ رک : موید ۲ : ۱۱۲ .

۴　رک : موید ۲ : ۱۱۱ ، ادات : کچل .

۵　کذاست در هردو نسخه . اما فرهنگ معین ۳ : ۲۹۸۸ : کشک نوعی از لبنیات که عبارت است از دردی ماست یا دوغ که پس از جوشانیدن خشک کنند الخ .

۶　رک : ادات .　　۷　در ادات این واژهٔ هندی موجود است

۸　رک : موید ۲ : ۱۱۰ .

۹　جهانگیری ۱ : ۶۰۶ : کبال رسنی را گویند که از لیف خرما سازند و در بعضی از فرهنگها بجای لام کاف مرقوم است .

۱۰　موید ۲ : ۱۱۲ بعینه همین شرح بدون ضبط نام فرهنگ آمده .

۱۱　رک : جهانگیری ۲ : ۱۰۹۹ ، ۱۱۰۵ : کرکرانک وکرکری با هردو کاف مفتوح بمعنی کرجن است ، کرجن استخوان نرمی را گویند که توان خائید مانند استخوان گوشت و سر استخوان شانه و سر استخوان پهلو و امثال آن و آن را کرکرانک وکرکری نیز گویند و بتازی غضروف و غرضوف خوانند .

۱۲　رک : جهانگیری ۱ : ۱۲۴۳ .　　۱۳　کذاست در نسخهٔ ’ل‘ ، نسخهٔ اصل : کپنک .

۱۴　رک : موید ۲ : ۱۱۱ .　　۱۵　کذاست در هردو نسخه اما رک : صحاح ص ۱۸۵ ، جهانگیری ۱ : ۱۴۵۶ که کاونجک دارند .

کلونک[۱] : کدینهٔ گازر.
کناک[۲] : پیچاک شکم.
کوژانوک[۳] : با زای پارسی، پرهٔ کلیدان.

بهرهٔ گ

کلنگ[۴] : کلند یعنی میتین، و بعضی بکاف عربی گویند.
کدنگ[۵] : کارد و بعضی کرنگ [ورق ۱۸۱] برای مهمله گویند.
کوهنگ[۷] : برجستن و برجست، و بلغتی بکاف مضموم آمده.
کدنگ[۸] : چوب گازر که بدان جامه می کوبند.
کنارنگ[۹] : مرزبان و شحنهٔ ولایت.

بهرهٔ ل

کول[۱۰] : خزینهٔ آب و چند یعنی بوم و دوش یعنی کتف، و کول[۱۱] بکاف و واو پارسی نیز گویند
کشاخل[۱۲] : نوعی از غلها و گویند که آن همان شاخل است و بعضی خارا نیز ضمت دهند.
کاکل[۱۳] : کلها که درمیان آب روید، بهندوی کانس گویند، و بلغتی کاف دوم مضموم است.
کلال[۱۴] : میانهٔ تارک سر از بالای پیشانی، و در بعضی فرهنگ نامه‌ها آخرین[۱۵] حرف کاف است، ای کلاک

---

۱ رک : ادات، موید ۲ : ۱۱۳.
۲ ادات : کرینه؛ اما رک : موید ۲ : ۳۵۹، قواس ص ۱۸۴ : کدنگ کدینهٔ گازر.
۳ جهانگیری ۲ : ۱۸۶۸ : کناک بپیچش شکم بعربی زحیر. ۲ : ۲۰۶۱ کوژ نوک بهمین معنی.
۴ گذاشت در ادات و موید ۲ : ۱۱۲، اما جهانگیری
۵ رک : موید ۲ : ۱۱۳ و جهانگیری ۲ : ۱۶۵۱.
۶ این واژه بدین معنی در فرهنگها دیده نشد. کوهنگ بمعنی برجستن است.
۷ ادات و موید ۲ : ۱۱۳ و جهانگیری ۲۰۷۱ :
۸ رک : قواس ص ۱۸۴ متن و حاشیه.
۹ رک : قواس ص ۸۸، صحاح ص ۲۰۰.
۱۰ رک : ادات و جهانگیری ۲ : ۲۰۶۹.
۱۱ نسخهٔ اصل : و گویند کول بکاف و فتح واو و واو پارسی نیز بوم گویند؛ نسخهٔ ل : کوف بکاف و فتح واو و واو پارسی نیز گویند.
۱۲ کشاخل و کشاخول هر دو بهمین معنی آید، رک : جهانگیری ۲ : ۱۲۸۶.
۱۳ رک : ادات و موید ۲ : ۱۱۴ و جهانگیری ۱ : ۱۶۴۳.
۱۴ رک : فرس ص ۳۱۸، قواس ص ۷۸، صحاح ص ۲۰۹، ادات، موید ۲ : ۱۱۵.
۱۵ در فرهنگهای مورد استفادهٔ بنده این صورت را ندارند.

کاجال[۱]: متاع یعنی آلات خانه از هر لونی ، وبعضی بجیم پارسی گویند.
کول[۲]: دلق ، وبعضی کاف پارسی گویند.
کیل[۳]: آرزو ومیل.
کنجال[۴]: ثقل هر مغزی که روغنش بیرون آید و آنرا کنجاره نیز گویند وبعضی[۵] بجیم پارسی گویند.
کل[۶]: سر سترده و بی موی.
کابل: نام ولایتی.
کوپل[۷]: شکوفه.

بهرهٔ دوم

کرم[۸]: اندوه وغم و دل کوفتگی و زخم[۹] و رنج و سبزه که بر سر[۱۰] جوی روید.
کرم[۱۱]: زحمت و رنج و کمان[۱۲] رستم که آن قوس الله است ، وبعضی بکاف پارسی هم گویند.
کام: مراد ، گویند کامران یعنی مراد راندن ، و چاره ، گویند ناکام ای[۱۳] ناچار ، و آنچه درون دهن نزدیک حلق است یعنی تالو[۱۴].
کنام[۱۵]: بیشهٔ سباع و وحوش وطیور.
کژم[۱۶]: درخت.

---

۱ فرس ص ۳۱۹ ، قواس ص ۱۳۹ کاچال دارند.   ۲ رک: قواس ص ۱۵۴.
۳ رک: ادات ، موید ۲ : ۱۱۵ : کیل آرزومند.   ۴ رک: صحاح ص ۲۰۹ ، ادات.
۵ این اضافه از روی نسخهٔ 'ل' شده.   ۶ رک: موید ۲ : ۱۱۵.
۷ جهانگیری ۲ : ۲۰۵۳ ، صاحب مدار کوپل را هندی دانسته که اصلش کونپل است (۲ : ۱۱۵).
۸ در موید ۲ : ۱۱۶ ، ۱۴۶ کرم باکاف فارسی وعربی ؛ اما در قواس ص ۱۶۳ ، صحاح ص ۲۲۵ ، ادات جهانگیری ۱ : ۱۱۳۶ ، گرم باکاف فارسی است.
۹ کذاست در موید ، اما این تصحیف زحمت است ، سلیمانی ۲۰۲ زخمه ، سروری زخم و زحمت ، برهان زخم
۱۰ ادات برای این معنی کرم بالفتح دارد. و برای زحمت و دلتنگی گرم بالضم چنانکه در جهانگیری است.
۱۱ در هر دو نسخه بتکرار ؛ اما این همان کرم است بتکرار.
۱۲ اگرچه در موید ۲ : ۱۴۸ گرم شامل این معنی است ، اما بنظرم این خود واژهٔ جداگانه است وبرای این واژه رک: موید ۲ : ۱۱۶.
۱۳ موید ۲ : ۱۱۶ این تفصیل بحوالهٔ قنیه نوشته.   ۱۴ نسخهٔ 'ل' : که بهندوی تالو.
۱۵ رک: قواس ص ۳۲.   ۱۶ موید ۲ : ۱۴۶ : کژم درختی ؛ اما جهانگیری ۱ : ۱۲۱۳ ←

کمکم[1]: آواز کاویدن.

کمکام[2]: داروئی است که بتازی ضرع[3] گویند و بعضی افواه الطیب خوانندش.

بهرهٔ ن

کیوان: زحل که آن بر فلک هفتم است.

کنودان[4]: شاه دانه، و بفتح نون نیز گویند.

کرکن[5]: غله درّل[6] که بهندوی اوهی[7] گویند و کاف دوم مضموم و مکسور نیز آمده، و بلغتی هر دو کاف پارسی و بعضی کوکن[8] گویند.

کلان: بزرگ و بلند[9] و افزون.

کشخان[10]: قلتبان.

کرازان[11]: خرامان.

کیان[12]: خیمهٔ عرب و کرد، و کرد طائفه اند.

کون[13]: مخنث.

[ورق ۱۸۲ا] کرستون[14]: ترازوی[15] حکمت یعنی کپان.

→ گزم درخت گز؛ بزای عربی درست بنظر می آید.

[1] موید ۲: ۱۱۶: کم کم آواز کافتن نقب الخ. نیز رک: جهانگیری ۲: ۱۷۲۷.

[2] فرهنگ جهانگیری ۲: ۱۷۲۷: کم کام با اوّل مفتوح داروئی است که آنرا بتازی ضرو و افواه الطیب خوانند.

[3] کذا ست در نسخهٔ اصل و در بعضی از نسخ جهانگیری، اما برای ضرو رک: تحفهٔ حکیم مومن و مخزن الادویه (جهانگیری ۲: ۱۷۲۷ حاشیه)

[4] رک: قواس ص ۱۴۰. [5] رک: قواس ص ۵۵، دستور ص ۲۰۶.

[6] برهان ص ۸۴۱: درل، دلمل غله خوب نرسیده که آنرا بریان کنند و بخورند.

[7] برای این کلمهٔ هندی رک: موید ۲: ۱۲۰.

[8] رک: موید ایضاً که بگفتهٔ لسان الشعرا این صورت را ذکر کرده.

[9] رک: موید ۲: ۱۲۱.

[10] رک: ادات و موید ۲: ۱۲۰، قواس ص ۱۹۷: کشخان قرتبان. [11] رک: ادات.

[12] رک: قواس ص ۱۳۰، صحاح ص ۲۵۰. [13] رک: جهانگیری ۲: ۲۰۷۱، فرهنگ معین ۳: ۳۱۳۴.

[14] رک: فرس ص ۳۶۳، قواس ص ۱۴۲. [15] نسخهٔ اصل ندارد، متن مطابق نسخهٔ ل.

کرزن[1] : نیم تاج از دیبا بافته و جواهر نشانده . و گویند تاجی گران بار بود ، وگویند که پیرایهٔ[2] فرق است که بهندی مانگ گویند ، و در بعضی نسخ به کاف پارسی .

کشکین[3] : طعامی است و آن آنست[4] که از باقلی و نخود و گندم و جو از هرگونی یکی[5] کرده بپزند .

کلن[6] : بفتح وضم لام ، باغره[7] و آن زحمت است .

کوارون[8] : درد که پوست را آواره کند ، وبعضی[9] بزای معجمه گویند .

کدین[10] : چوب گازر که بران جامه کوبند[11] .

کوکان[12] : ساز گازرست ، و بواو پارسی هم گفته اند .

کیاخن[13] : استوار ومحکم ، وگویند که آهستگی و نرمی درکار و استوارکاری ، وبعضی بکاف پارسی و خا[14] مضموم گویند .

کانون[15] : آتش دان روئین یا آهنین ، ومردی که مردمانش[16] گران دارند وقت حدیث[17] و ماه دی[18] .

---

۱ درفرس ص ۳۵۸ ، قواس ص ۱۵۰ ، ادات ، جهانگیری ۱ : ۱۱۳۰ : گرزن (باکاف فارسی) ؛ اما صحاح ص ۲۴۹ ، موید ۲ : ۱۱۹ ، ۱۴۸ کرزن وگرزن بهر دوصورت .

۲ این معنی در موید یافته شود .

۳ رک : موید ۲ : ۱۲۱ ، درصحاح ص ۲۸۷ کشکینه و در جهانگیری ۲ : ۱۲۹۲-۹۳ : کشکنه ، کشکین وکشکینه هرسه بهمین معنی .

۴ نسخهٔ 'ل' : طعامی است که از الخ .   ۵ نسخهٔ 'ل' : یکجا کرده .

۶ رک : ادات . ۷ موید ۲ : ۱۲۱ این معنی بحوالهٔ زفان نوشته . برای باغره رک : زفان (ذیل باغره) .

۸ موید ۲ : ۱۲۲ : کوارون علت دردکه پوست را آواره کند و در ادات باکاف فارسی مصحح است وبعضی بزای معجمه . جهانگیری ۲ : ۲۰۷۵ گوارون دارد .

۹ نسخهٔ 'ل' : بکاف پارسی وزای معجمه .

۱۰ رک : ادات و موید ۲ : ۱۱۹ . کدینه بهمین معنی ، رک : قواس ص ۱۸۴ ذیل کدنگ وحاشیه نمره ۸ .

۱۱ نسخهٔ اصل : کوبه .

۱۲ رک : ادات و موید ۲ : ۱۲۳ : جهانگیری ۲ : ۲۰۶۷ : کوکان دست افزاری باشد مرگازران را .

۱۳ رک : ادات و موید ۲ : ۱۲۳ .   ۱۴ نسخهٔ 'ل' : بضم خا .

۱۵ ادات : کانون آتش دان و ماهی از ماههای رومیان ... وشغل .

۱۶ این معنی در فرهنگهای مورد استفاده دیده نشد .

۱۷ ایضاً .

۱۸ شاید منظور مؤلف یکی از ماههای رومی باشد . درهرحال این معنی درست بنظر نمی آید .

کوبین[1] : پنجه .

کورابین[2] : همان پنجه است .

کلتان[3] : بازوی در .

کابین[4] : مهر زنان و اجر دست[5] پیمان .

کودن[6] : اسپ کند رو و پلید طبع و پالانی .

کپان[7] : ترازوی بزرگ که دران بارها سنجند ، و به تشدید با نیز آمده ، و به تازی آنرا قسطاس گویند

کوبین[8] : از آلت روغنگران ست که بتازی[9] معدل[10] گویند ، وآن چیزیست چون کفهٔ ترازو از خوص[11] بافته و برزک[12] آس کرده درو کنند و در تنگ تیر[13] عصار آن نهند تا روغن ازو بیاید .

کوبن[14] : همان کوبین است .

کتابون[15] : نام عورتی[16] ونام مردی .

---

[1] این واژه بدین معنی دیده نشد ، و درهمین فرهنگ بعد از چند واژه "کوبین" بمعنی معروف درج شده .

[2] موید ۲ : ۱۲۳ کورابین بمعنی کوبین است .

[3] نسخهٔ اصل : کلسان ، جهانگیری ۲ : ۱۶۴۴ کلتان از جمله چهار چوب در .

[4] رک : صحاح ص ۲۴۹ . ادات ، موید ۲ : ۱۱۸ .

[5] نسخهٔ اصل : بیان ، 'ل' : همان ، اما دست پیان : آنچه از نقد وجنس و زیور آلات که داماد پیش از عروسی بخانهٔ عروس فرستد (فرهنگ معین ۲ : ۱۵۳۰) .

[6] ادات : کودن اسب کند رو ؛ موید ۲ : ۱۲۲ کودن کند وکمینه وکور ؛ جهانگیری ۲ : ۲۰۵۷ کودن اسب پالانی کم راه راگویند و مردم کند فهم را باین اعتبار کودن خوانند .

[7] جهانگیری ۱ : ۵۰۶ : کپان ترازوی بود بزرگ که یک پله داشته باشد و برجانب دیگر سنگ ازشاهین بیاویزند . در حاشیهٔ آن افزوده : "نیز گفته اند کپان عدل وقسطاس ، بزبان رومی کپان باشد و آنرا بزبان تازی آورده اند" بحوالهٔ تفسیر کمبریج ۱/۲۳۱ .

[8] رک : ادات و موید ۲ : ۱۲۲ و فرهنگ معین ۳ : ۳۱۰۹ .

[9] درنسخهٔ 'ل' بعضی از عبارات اینجا ذیل کپان آمده . [10] نسخهٔ اصل : کندل اما رک : فرهنگ معین .

[11] الخوص برگ خرما باشد (دستورالاخوان ص ۲۶۰) ــ فرهنگ معین : کوبین را از برگ خرما یا ازنی سازند .

[12] بزرک ، برزک : دانهٔ گیاه کتان که از آن روغن گیرند ، ایضاً ــ ۱ : ۵۲۱ .

[13] تیر : شکنجهٔ عصاری فرهنگ معین ۳ : ۳۱۰۹ . [14] رک : ادات .

[15] جهانگیری ۱ : ۶۹۵ : کتابون زن گشتاسپ که دختر قیصر روم بود ، نیز رک : مجمل التواریخ والقصص ص ۲۰ .

[16] کذاست در اصل ؛ و نیز درموید ۲ : ۱۱۹ بحوالهٔ زفان آمده .

کران : کناره و حد.

کتران[1] : روغن درختی است مانند عرعر، بعضی گویند از درخت صنوبر متولد شود و بتازی قطران گویند و آن داروئی[2] است قاطع رحم.

کرگدن[3] : جانوریست[4] و گویند پیل آبی[5].

کزمازون[6] : نام داروئی است.

کونیان[7] : خواب باشد.

کوهان : پشته که بالای دم شتر باشد.

کیمن[8] : نام مردی.

کیکن : تاریکی[9] شب.

کرن[10] : روستائی است که در روز عاشور آنجا خلق بسیار جمع آید.

کپکن[11] : بپای پارسی، میل.

کینان[12] : ایشان.

بهرهٔ 'و'

کیکو[13] : خزینهٔ [ورق ۱۸۳] آب.

---

[1] رک : موید ۲ : ۱۱۹. [2] نسخهٔ 'ل' : داروی سیاه است براندم شتر بجهت گرمی مالند و آن قاطع رحم است. [3] ادات : کرگدن (کاف دوم فارسی) پرنده ایست بزرگتر از سیمرغ که پیل را هلاک می کند. [4] نسخهٔ 'ل' : معروف و

[5] همین معنی بحوالهٔ زفان، در موید ۲ : ۱۱۹- ۱۲۰ یافته می شود. [6] موید ۲ : ۱۲۰ : گزمازون را بهمین معنی بحوالهٔ زفان آورده ؛ اما در هدایة المتعلمین فی الطب ص ۸۵ : کزمازه (بغیر نون).

[7] همین معنی در موید ۲ : ۱۲۳ درج است، اما اصلش معلوم نیست.

[8] این واژه بدین شکل در فرهنگها دیده نشد. نسخهٔ 'ل' : کمسن.

[9] رک : موید ۲ : ۱۲۳ نسخهٔ اصل : تاریک.

[10] ادات و موید ۲ : ۱۱۹ : کدن.

[11] رک : موید ۲ : ۱۲۳ ؛ این واژه و واژهٔ بعد در نسخهٔ 'ل' افتادگی دارد.

[12] کذاست در اصل.

[13] کذاست در ادات و لسان الشعرا، اما در قواس ص ۲۳، موید ۲ : ۱۲۴ : کیلو ؛ در جهانگیری ۲ : ۲۲۳۱ : کیلو نام میوه.

کنو[۱]: شنی که ازو ریسمان بافند یعنی از پوست تنهٔ او رشته سازند.[۲]
کنشو[۳]: انگور خام و در فرهنگنامه کنسو[۴] است بسکون نون و ضم سین بغیر تا.
کتو[۵]: با دو ضمت، سنگ خوارک[۶] و آن مرغکی است معروف، و بفتح کاف نیز گویند.
کشتو[۷]: باخه، و شنی که[۸] از آن ریسمان بافند.
کلاد[۹]: غوک.
کربشو[۱۰]: کرفش.
کرباشو[۱۱]: همان کرفش[۱۲].
کیتو[۱۳]: دینارسر، مرغکی است که در هوا پرد.
کندو[۱۴]: غول بیابانی.
کاهو[۱۵]: جنازهٔ مغان[۱۶] و کوک یعنی گیاه خواب آرنده.
کاردو[۱۷]: گیاهی است که می خورند و گویند بار خرمای تر است، و بعضی بکاف پارسی گویند.

---

۱. رک: ادات، فرهنگ معین ۳: ۳۱۰۳ ذیل کنو و کنف.
۲. رک: قواس ص ۴۹، ادات. ۳. نسخهٔ 'ل': کنشو.
۴. معلوم نیست که منظور مؤلف کدام فرهنگ است، اما برای کنشو رک: جهانگیری ۲: ۱۸۷۹ و برهان ۳: ۱۷۰۹. در قواس بیت شاهدی نقل است و آنهم کنشتو دارد نه کنشو.
۵. رک: قواس ص ۶۰، جهانگیری ۱: ۶۹۷، فرهنگ معین ۳: ۲۹۰۷؛ ادات: کیتو، موید ۲: ۱۲۴: کتو و کیتو.
۶. قواس: سنگوارہ، معین: سنگ خوارہ و سنگ خوارک. ۷. رک: قواس ص ۶۷.
۸. رک: موید ۱: ۱۷۷، موید ۲: ۱۲۴ کنشتو گیاهی که از پوست او رسن سازند الخ. اما در همین فرهنگ 'کنو' بهمین معنی آمده؛ شاید کشتو تصحیف باشد.
۹. رک: ادات و موید ۲: ۱۲۴. اما قواس ص ۶۸ کلاده بمعنی غوک، سلیمانی ۲۰۶ کلاد، کلادو.
۱۰،۱۱. رک: موید ۲: ۱۲۴، در جهانگیری ۱: ۱۰۹۷: کرباسو و کرباسه و کربابیس و کربس و کربسه و کربه با سین منقوطه نیز بهمین معنی، صحاح ص ۲۸۶: کرباسه، ص ۱۵۵: کربشش دارد.
۱۲. رک: فرهنگ معین ۳: ۲۹۶۶، نیز رک: هدایة المتعلمین ص ۸۵ که کرفس و کرفش هر دو دارد.
۱۳. رک: ادات و موید ۲: ۱۲۴.
۱۴. رک: موید ۲: ۱۲۴؛ اما در ادات و موید ۲: ۱۳۱ کنده بدین معنی نیز آمده.
۱۵. رک: ادات و موید ۲: ۱۲۴. ۱۶. ادات و موید: گبران.
۱۷. فرهنگ معین ۳: ۲۸۰۶: کاردو گیا آنچه از خرما بن برآید... شکوفهٔ نخستین خرما - کاردوی آن نازکست و نرم الخ.

کندرو[1] : مصطکی و آن بیخ است که آنرا می خایند ، بتازی علک[2] گویند .
کشکو[3] : کشکاو[4] و آن طعامی[5] است معروف .

بهرۀ ه

کاخه[6] : باران و یرقان .
کوکله[7] : هدهد .
کوپله[8] : با واو پارسی ، شکوفه .
کویله[9] : سوارگان آب و موی کله[10] ، و گویند این[11] دوم کویله است .
کمانه[12] : کاریزکن ، و بفتح کاف نیز گویند .
کنغاله[13] : نام کوهی است بخراسان[14] ، و قحبگی یعنی زنجگی[15] و شاهد بازی که آنرا روسپی[16] بارگی هم گویند ، و بفتح کاف نیز آمده است .
کارتنه[17] : شنبلید[18] یعنی شملیت[19] ، و بعضی را ساکن و تا مفتوح گویند .
کاژیره[20][21] : دانۀ معصفر .

---

[1] رک : قواس ص ۱۸۶ و ادات . [2] زفان علک را مترادف کندرو نوشته (ذیل علک) .
[3] رک : موید ۲ : ۱۲۴ ؛ جهانگیری ۲ : ۱۲۹۱ - ۹۳ کشکو ، کشکاو ، کشکاب .
[4] نسخۀ 'ل' : کژکاو . [5] جهانگیری : آش جو .
[6] دستور ص ۲۱۴ ، ادات : کاخه باران ، اما رک : موید ۲ : ۱۲۶ .
[7] رک : ادات و موید ۲ : ۱۳۲ . [8] ادات : کوپله واو و با هردو فارسی : شکوفه و قفل و سوارگان آب . رک : کوپل درهمین فرهنگ (زفان) .
[9] ادات و موید ۲ : ۱۳۱ : کوپله . [10] نسخۀ اصل : موی (بحذف کله) .
[11] کویله بمعنی کاکل یعنی موی سر است ، رک : جهانگیری ۲ : ۲۰۷۳ .
[12] رک : قواس ص ۲۵ ، موید ۲ : ۱۳۰ . [13] درنسخۀ 'ل' این محذوف است .
[14] رک : قواس ص ۳۲ و موید ۲ : ۱۳۱ . [15] نسخۀ 'ل' : درخراسان .
[16] جعفری ۲۵۹ زنچه زن فاحشه .
[17] فرهنگ معین ۳ : ۳۰۹۸ ، ادات : روسپی بارگی (قس غلام بارگی) ؛ در قواس و موید روسپی و بارگی بظاهر اشتباه است .
[18] قواس ص ۱۶۰ ، دستور ص ۲۰۲ ، موید ۱ : ۱۲۶ کارتنه : شنبلیت .
[19] جهانگیری ۲ : ۱۸۵۴ : شنبلید و شنبلیت (مترادف) .
[20] رک : فرهنگ معین ۲ : ۲۰۸۱ . [21] رک : قواس ص ۱۴۱ .

کنجده[1] : بضم وفتح جیم ، عنزروت ، وآن داروئی است ، و در فرهنگنامه[2] است : کنجده بکسر جیم یا زهر ، وگویندکه آن انزروت[3] است .

کاکره[4] : عاقرقرحا .

کفه[5] : آنچه درو دانه بود .

کوالیده[6] : وبعضی بکاف مفتوح گویند ، غلۀ مالیده وبعضی گویند : کوالیده کشت مالیده .

کویسه[7] : غلۀ کوفته و بیای پارسی نیز گویند .

کوژه[8] : بزای فارسی گویند . پنبۀ نرم وبعضی کاف پارسی و واو پارسی گویند .

کرته[9] : اشترخار یعنی جانواسه وگیاه جاروب[10] .

کرته[11] : قرطه و آن پیراهنی است .

کرایه[12] : مرغی است سیاه .

کلاژه[13] : بازای پارسی ، عکه[14] یعنی سبزک و بازای[15] عربی غلبه و آن نیز پرنده ایست ، وگویندکه غلبه همان عکه است وبعضی بضم کاف گویند .

۱ـ قواس ص ۴۳ : کنجده انزروت . انزروت وعنزروت بهردوصورت آید ، رک : هدایة المتعلمین ص ۸۱۹ ، ۸۴۶ .

۲ـ موید ۲ : ۱۳۱ : کنجده درفرهنگ فخرقواس پا زهررا گویند : اما فرهنگ قواس چاپی این را مورد تائید قرار نمی دهد .

۳ـ کذاست درقواس ؛ امانسخۀ 'ل' : عنزروت . ۴ـ ادات و موید ۲ : ۱۲۶ .

۵ـ فرهنگ معین ۳ : ۳۰۱۰ : کفه خوشۀ گندم و جوی که بهنگام خرمن کوفتن آنها کوفته نشده باشند ـ مرترا از ایشان جداکرد چنانکه کفه را ازگندم جداکنند ـ تفسیر کیمبریج .

۶ـ قواس ص ۵۵ : گوالیده ، موید ۲ : ۱۳۱ : کوالیده غلۀ مالیده وکشت مالیده .

۷ـ نسخۀ 'ل' : کوسه ؛ رک : ادات وموید الفضلا ۲ : ۱۳۲ .

۸ـ ادات : گوژه کاف و واو و زا هرسه فارسی یعنی تار پنبه که عرب آنرا جوزق گویند ؛ جهانگیری ۲ : ۲۰۸۴ : گوزه غنچۀ پنبه وکوکنار وپیلۀ ابریشم و امثال آن وآنرا غوزه وکوزه نیز نامند .

۹ـ رک : فرس ص ۴۶۴ ، قواس ص ۵۷ . ۱۰ـ رک : ادات .

۱۱ـ رک : ایضاً . ۱۲ـ ایضاً .

۱۳ـ رک : ایضاً . ۱۴ـ رک : قواس ص ۶۲ .

۱۵ـ زفان : غلبه سبزک که آنرا بتازی عکه گویند .

۱۶ـ قواس ص ۶۲ : کلاژه دارد و غلبه را مترادف نویسد .

کاغنه[1]: عروسک[2] و آن کرمی است سرخ، و بانقشهای سپید و سیاه پرنده[3] ایست.
گوش خبه[4] [ورق ۱۸۴ ا]: گوش[5] خزک.
کربشه[6]: کرفش.
کرباشه: همان کرفش، وبعضی هردو سین مهمله گویند.
کلته[7]: حیوان دم بریده، و[8] در [اسدی] حیوان[9] پیر[10] از چهار پای.
کلوته[11]: حلقهٔ دام و دامک که در جامه‌ها باشد، وبعضی بکاف پارسی گویند.
کالیده[12]: موی و موی درهم شده.
کلندره[13]: بفتح وضم لام، مرد درشت.
کالیوه[14]: احمق و دیوانه و آسیمه[15] وسرگشته وبتازی اورا ارعن[16] تانیث او رعناء.
کچیده[17]: بفتح جیم پارسی، پیشوا، وبعضی بکسر جیم و یای پارسی گویند.

---

[1] رک: قواس ص ۶۶، دستور ص ۲۰۷. [2] رک، موید ۲: ۲۵: عروسک کرکی است که بشب چون آتش نماید...، و نیز پرنده ایست که بشب بانگ کند. [3] رک: ادات.
[4] کذا است دراصل؛ اما در جهانگیری ۲: ۲۰۸۸ گوش خبه میلکی باشد که بدان گوش را بخارند و دوم نام جانوری است و آنرا گوش خزک و هزارپا نیز گویند. [5] جهانگیری ایضاً: گوش خز و گوش خزک: هزارپا و گوش خبه، بنابرین واضح است که گوش خبه را باید ذیل گاف آورد، واین سهو است.
[6] رک: جهانگیری ۱: ۱۰۹۷. و نیز همین فرهنگ ذیل کرباشو و کربشو.
[7] رک: فرس ص ۴۰۶، قواس ص ۷۴، صحاح ص ۲۸۷.
[8] در نسخهٔ 'ل' ازینجا تا آخر افتادگی دارد.
[9] در نسخهٔ اصل ناخواناست؛ صحاح: کلته چها[ر] پای پیر باشد و گویند چهار پای دم بریده نیز باشد و دد و دام از کار مانده.
[10] ادات: کلته حیوان دم بریده و پیر از دد و دام چهارپای.
[11] رک: قواس ص ۷۷ و ۱۵۰؛ ادات: کلوته حلقهٔ دام. و دامک یعنی سرپوش دختران نارسیده.
[12] رک: قواس ص ۷۹.
[13] رک: صحاح ص ۲۸۵؛ قواس ص ۹۰: کلندره مردم درشت خلقت و قوی. ادات: کلندره مرد درشت اندام.
[14] رک: قواس ص ۹۱ و صحاح ص ۲۸۶.
[15] نسخهٔ 'ل': سراسیمه؛ نسخهٔ اصل: آسیمو، اما برای آسیمه رک: صحاح ص ۲۸۶.
[16] دستور الاخوان ص ۲۶: الارعن کالیوه، والانثی رعناء.
[17] رک: قواس ص ۱۰۰، و ادات.

کبله[۱]: نادان مزاج و احمق.
کاتوره[۲]: سرگردانی[۳] و سرگشتگی.
کواژه[۴]: بازای پارسی، مرد مزاح وطیب کننده[۵] وطعنه زن، وطعام نیم پخته[۶]. بلغتی کاف پارسی است.
کله[۷]: بضم وفتح کاف، کس باشد که باکسی بسر نبرد و با دیگری شود.
کوباره[۸]: گلهٔ گاو و خر یعنی رمه.
کبچه[۹]: خروستور که زیر دنبالش بیاماسد[۱۰]، گویند کبچه شده است، وبعضی گویند خردستور دم بریده بود وکنج.
کنده[۱۱]: پارهٔ چوب وغول بیابانی و امرد[۱۲] قوی.
کده[۱۳]: خانه وکلیدان.
کاشانه: خانهٔ[۱۴] زمستان وگویند خانهٔ[۱۵] [مرغ].

---

۱ رک: فرس ص ۴۵۶، قواس ص ۱۰۸.
۲ قواس ص ۱۰۸: کاتوره سردان؛ اما رک: فرس ص ۴۵۱، صحاح ص ۲۸۵.
۳ دستور ص ۲۰۹: سرگردانی کذاست درمتن، رک: قواس ص ۱۰۸ حاشیه نمره ۱۹.
۴ این واژه کواژه وگواژه بهردو صورت آمده، رک: قواس ص ۱۰۹، گواژه، صحاح ص ۲۸۸: کواژه، ادات: گواژه، موید ۲: ۱۳۰، ۱۵۳، کوازه و گوازه.
۵ درمعنیٔ این واژه هم اختلاف وجود دارد. قواس وصحاح بمعنی طعنه زدن آورده، و ادات و موید بمعنی طعنه زدن وطعنه زن هردو دارد. ۶ این معنی درموید ۲: ۱۵۳ بگفتهٔ لسان الشعرا درجست.
۷ رک: ادات وموید ۲: ۱۳۰.
۸ رک: ادات؛ موید ۲: ۱۳۰ گوپاوه غلط چاپی است. جهانگیری ۲: ۲۰۷۴ گواره و ۲: ۲۰۷۸ گوباره بمعنی گلهٔ گاو وگاومیش و امثال آن.
۹ رک: ادات وموید ۲: ۱۲۷ کبچه بمعنی خردم بریده و چارپائی که زیر دمانش آماسیده باشد.
۱۰ نسخهٔ 'ل': بیاساسیده. ۱۱ رک: صحاح ص ۲۸۷ و ادات و موید ۲: ۱۳۱.
۱۲ رک: صحاح و ادات: امرد.
۱۳ رک: ادات و موید ۲: ۱۲۷.
۱۴ رک: صحاح ص ۲۸۵ و ادات.
۱۵ موید ۲: ۱۲۶ این معنی بحوالهٔ زفان نوشته؛ جهانگیری ۱: ۶۳۶ کاشانه بمعنی خانهٔ محقر وخانهٔ مرغ آورده.

کوپله[1]: قفل.

کنده[2]: خندق.

کره[3]: دندان کلیدان یعنی چوبک که بکلیدان فرود افتد تا در نتوان گشاد، وبعضی برای مهمله گویند کره، دندانهٔ کلیدان دگویند این درست تراست، وبعضی گویند[4] کره کلیدان.

کریه[5]: دوکان وبعضی بفتح کاف گویند.

کلاته[6]: دیه خرد و[7] محلت را نیز گویند، و به نسخه ای[8] بلند وپست.

کهسته[9]: کوزهٔ پرآب یعنی تالب پر وبعضی[10] باسین معجمه وبضم کاف و فتح ها گویند.

کبیده[11]: دلیده و درشته وبعضی بضم کاف و فتح با گویند.

کلاژه[12]: که بتازی آنرا لهات[13] گویند.

کماسه[14]: کوزهٔ شبانان، یک سوگرد[15] ویک سوپهن، وبعضی کاف بضم خوانند.

کندوله[16]: کندو یعنی غله دان.

کلنبه[17]: لڈو.[18]

---

[1] رک: قواس ص ۱۲۵ و موید ۲: ۱۳۱. [2] رک: صحاح ص ۲۸۷.

[3] رک: ادات. و در موید ۲: ۱۲۹ بگفتهٔ زفان معنی اش نوشته شده.

[4] در نسخهٔ 'ل' ازینجا تا آخر افتادگی دارد. و نسخهٔ اصل: کره دندانهٔ کلید؛ تصحیح از روی موید.

[5] ادات: کریه ساق است که میخورند و دوکان.

[6] قواس ص ۱۳۳: کلاته برکوه دیه بلند وپست.

[7] همین معنی در موید ۲: ۱۲۹ درج است. [8] رک: قواس ص ۱۳۳.

[9] رک: موید ۲: ۱۳۲؛ اما در ادات کهشته وکسته بهر دوصورت.

[10] در نسخهٔ اصل سین معجمه ندارد. [11] رک: موید ۲: ۱۲۷.

[12] اصل: ملاژه، دریجا مؤلف دچار اشتباه شدیدی شده، در اصل ملاژه بمعنی بن زبان است که بعربی لهاة خوانند، چنانچه در دستور الاخوان ص ۵۴۳ ملاژه را مترادف لهاة نوشته. چون این کلمه بامیم است این را ذیل 'م' آورد نه ذیل 'ک'؛ ظاهرا مؤلف ملاژه را کلاژه پنداشته، و اینجا آورده وحال آنکه در نسخهٔ اصل ملاژه است نه کلاژه. وهم چنین است در فرهنگ معین ۳: ۴۳۶۰ وهمین است در فرهنگ هذا. [13] نسخهٔ اصل: کهاه اما 'ل': لهاة، رک: دستور ص ۵۴۳.

[14] رک: قواس ص ۱۳۹. [15] رک: ادات. [16] رک: جهانگیری ۲: ۱۸۷۶؛ کندو، کندوک، کندوج، کندوله بمعنی ظرفی مانند خم بزرگ برای غله، هندی کوٹھی.

[17] رک: قواس ص ۱۴۸. [18] این واژهٔ هندی در قواس آمده.

کواشمه[1] : دامنی ، وبعضی کاف پارسی گویند بکسر وسکون شین.

کسه[2] : آسانی ، وبعضی مشدّد گویند وبعضی بفتح کاف .

کشه[3] : [ورق ۱۸۵ا] مشدّد ، فلکندهٔ پالان[4] ، وبکسر کاف نیز آمده است وبتخفیف نیز گویند.

کوفشانه[5] : جولاهه .

کیسنه[6] : ماشوره[7] یعنی ریسمان که بر دوک[8] ریسیده باشد و مانند بیضه کرده ، هندوی کُکڑی[9] گویند.

کپه[10] : شیشهٔ حجام یعنی محجمه .

کنبوره[11] : فریبنده یعنی فریب دهنده .

کراشیده[12] : کار تباه و پریشان شده .

کامه[13] : خواست ، ونیز کامه طعامیست[14] که بتازی کامخ[15] گویند.

کرشمه : غنج[16].

کفیده[17] : ازهم باز شده .

کفه[18] : ترقیده .

---

[1] قواس ص ۱۵۰ : گواشمه بمعنی دامنی . و دامنی مقنعهٔ زنان است (برہان ص ۸۱۸).

[2] رک : قواس ص ۱۶۱ . [3] کشه چار معنی دارد : ۱۔ خط ۲۔ خط بطلان ۳۔ نواری که بر زین و پالان دوزند ، تنگ چاروا ۴۔ گدائی . فرہنگ معین ۳ : ۲۹۹۳-۹۴ ، نیز رک : صحاح ص ۲۸۶ ، ادات ، موید ۲ : ۱۲۹ ، در آخر دو سه معنی نوار پالان ، خط و آسانی .

[4] نسخهٔ اصل : باران . [5] رک : صحاح ص ۲۸۸ ، وموید ۲ : ۱۳۲ .

[6] رک : قواس ص ۱۸۲ کیسنه ، ادات وموید ۲ : ۱۳۲ .

[7] صحاح ص ۲۸۹ : ماسوره : اما رک . قواس ص ۱۸۲ . [8] رک : قواس ص ۱۸۳ .

[9] برای این واژه رک : ادات و موید ایضاً .

[10] رک : فرس ص ۴۵۷ ، قواس ص ۱۸۵ ، صحاح ص ۲۸۶ .

[11] رک : قواس ص ۱۹۶ . [12] رک : صحاح ص ۲۸۶ ، موید ۲ : ۱۲۸ .

[13] رک : ادات وموید ۲ : ۱۲۶ و جهانگیری ۱ : ۴۴۹-۵۰ .

[14] صحاح ص ۲۸۷ ریچاری ، جهانگیری : نانخورش که زنان پزند .

[15] معرب کامه ، رک : فرہنگ معین ۳ : ۲۸۶۹ . [16] نسخهٔ اصل : عنج . موید ۲ : ۱۳۶ : غنج کرشمه .

[17] رک : صحاح ص ۲۸۷ . از مصدر کفیدن بمعنی ترقیدن = ترکیدن = ازهم باز شدن رک : بخش مصادر (زفان).

[18] بمعنی ترقیده یعنی ازهم باز شده . رک : صحاح ص ۲۸۷ ، ادات ، موید ۲ : ۱۲۹ .

کودره[1] : بضم و فتح ، مرغی است که در آب تیز نشیند[2].

کوره[3] : بواو پارسی ، سیلاب کنده بود و زمین گوشده و گل درو مانده ، و نیز آنجا که آهنگران آتش کنند.

کابیله[4] : باون.

کاینه[5] : امر کردن بدانچه از و[6] چشم مگردان.

کویه[6] : گیاهی است شیرین ، می خورند.

کواره[7] : بضم و فتح کاف ، سبد که بدان خاک و میوه و جز آن برند[8] ، و خانهٔ زنبور.

کشه[9] : و بعضی مشدّد گویند ، خط.

کاونه[10] : عروسک ، کرمی پرنده که کاغنه گویند.

کونسته[11] : دو گونه[12] آدمی.

کویشه[13] : آوند دوغ.

کواشه[14] : گونه[15] یعنی صفت.

کدنگه[16] : چوبی که بدان جامه را کوبند.

---

[1] رک : ادات و موید ۲ : ۱۳۱ و صحاح ص ۲۸۸. [2] نسخهٔ اصل : مرشید.

[3] رک : ادات و موید ۲ : ۱۳۱ [4] رک : صحاح ص ۲۸۵.

[5] رک : ادات و موید ۲ : ۱۲۷ که عیناً هر دو همین معنی دارند ، اما صحاح ص ۲۸۷ کاینه دارد بمعنی چشم. فرهنگ معین ۳ : ۲۷۷۸ کابه دارد. [6] ادات : برانکه ازمن.

[6] کذاست در اصل ، اما ادات : کریه نباتی است که می خورند ، و دوکان ، باید علاوه نمود که در همین فرهنگ زفان معنی کریه دوکان نوشته ؛ بنابرین واضح است که ازین دو فرهنگ نویسان یکی درینجا اشتباه نموده است ، سلیمانی ۲۱۲ کویه بمعنی گیاهی.

[7] رک : صحاح ص ۲۸۸. [8] نسخهٔ 'ل' : بردارند.

[9] رک : ایضاً ص ۲۸۶.

[10] رک : موید ۲ : ۱۲۷ ، اما قواس ص ۶۶ کاغنه دارد.

[11] نسخهٔ اصل : کوفسته ، اما رک : قواس ص ۸۶ ، موید ۲ : ۱۳۲.

[12] رک : برهان ص ۱۷۳۸ : گونه کفل و سرین آدمی.

[13] رک : قواس ص ۱۳۶ [14] کذاست در نسخهٔ اصل ؛ اما نسخهٔ 'ل' و موید ۲ : ۱۳۱ : کواسه گونه یعنی صفت. [15] نسخهٔ اصل : گویند.

[16] موید ۲ : ۱۲۷ کدنگه و معنی اش بگفتهٔ زفان نوشته. اما قواس ص ۱۸۴ : کدنگ : کدینهٔ گازر.

گواده[1] : چوب زیر در.

کنیسه[2]: پرستش جای گبران.

کلبه[3]: خانه د گوشه

کژاوه[4] : محل، کجابه[5] نیز گویند.

کشته[6] : تشنه.

کالمه[7] : زنی باشد که یک شوی کرده.

کوهه[8] : پیش آهنگ زین و پس آهنگ.

کنانه[9] : یعنی کهنه.

کنانه[10]: کیش یعنی تیردان، ترکش نیز گویند.

کفه[11] : پله[12] و آنچه[13] دانه درو بود.

کنه[14] : جانوری باشد که در[15] چهار پای افتد[16].

کلابه[17]: گلولهٔ ریسمان، و فردوسی گوید[18]: چرخهٔ جولاهان[19] بود، ریسمان برو زنند تا ازو بکار برند.

کراسه[20]: مصحف جامع.

---

[1] رک: موید ۲: ۱۳۱. [2] فرهنگ معین ۲: ۳۱۰۵: کنیسه معبد یهود و نصاری.

[3] رک: موید ۲: ۱۳۰. [4] یعنی کجاوه. [5] رک: جهانگیری ۱: ۷۱۴.

[6] موید ۲: ۱۲۹ کشته را بدین معنی بحوالهٔ زفان نوشته.

[7] نسخهٔ اصل: کامله، متن مطابق نسخهٔ 'ل'، نیز رک: صحاح ص ۲۲۴: کالم زنی که یک شوی کرده باشد' و جهانگیری ۱: ۶۴۶: کالم و کالمه: زنی که شوهر مرده باشد. [8] رک: جهانگیری ۲: ۲۰۷۲.

[9] ادات: کنانه کهنه و کاریزکن. برای معنی اوّل نگاه کنید بفرهنگ معین ۳: ۳۰۸۳ و جعفری ۱۴۰۰.

[10] رک: ادات.

[11] کذاست در ادات؛ اما از لحاظ این معنی واژهٔ کفّه (مشدد) عربی است، رک: جهانگیری ۲: ۱۴۹۲؛ نیز رک: فرهنگ معین ۳: ۳۰۱۰.

[12] رک: ادات، و فرهنگ معین ایضاً؛ در ادات کفه بدون تشدید، بمعنی آنچه دانه درو بود واژهٔ جداگانه قرار داده شده.

[13] رک: صحاح ص ۲۸۷، ادات، موید ۲: ۱۳۱. [14] کذاست در صحاح و ادات.

[15] نسخهٔ 'ل': که در گوش سگ چسپد، بهندوی کلنی گویند. و این کلمهٔ هندی در ادات و موید یافته می شود.

[16] در موید ۲: ۱۲۹ معنی کلابه بحوالهٔ زفان گویا درج شده.

[17] این قول در موید محذوف است. [18] موید: چرخ جولاهگان. [19] ادات: ←

کشنه[۱] : داروئی است که بتازی کشنیج[۲] گویند، وبعضی گویند : نوعی از سماروغ[۳] است .

کره[۴] : بچهٔ اسب وگوی[۵] .

کشته[۶] : میوه ایست .

کدواره[۷] : بنیاد .

کلپتره[۸] : چیزی نادر و بوبکر ربابی[۹] را نیز گویند .

← کراسه مصحف ، صحاح ص ۲۸۶ : کراسه به تخفیف را دفتر بود ، و عرب کرّاسه گویند به تشدید .

۱ رک : جهانگیری ۲ : ۱۲۹۴ . ۲ نسخهٔ اصل : کیشنج .

رک : مدار ۲ : ۱۲۹ ، جهانگیری و هدایة المتعلمین ص ۱۵۷ .

۳ سرمهٔ سلیمانی ۲۱۰ کشنه گیاهی بود به سماروغ مانند ، یا داروئی است ، وگفته اند نوعی از سماروغ .

۴ کره بضم وتشدید را بمعنی بچهٔ اسب است ، رک : ادات و فرهنگ معین ۳ : ۲۹۶۰ .

۵ کره بالضم وتخفیف رای مفتوح بمعنی گوی عربی است ، رک : فرهنگ معین ایضاً و دستور الاخوان ص ۵۱۸ .

۶ رک : فرهنگ معین ۳ : ۲۹۸۱ . ۷ جهانگیری ۱ : ۸۰۸ : کدواره : بنای خانه وعمارت نسخهٔ اصل : کدو[؟]

۸ برای هردو معنی مندرجهٔ متن رک : ادات و مؤید ۲ : ۱۳۰ ، اما در جهانگیری ۲ : ۱۶۴۳ و فرهنگ معین ۳ : ۳۰۲۷ ، کلپتره بمعنی سخن بیهوده با بیتی شاهد از انوری .

۹ نسخهٔ اصل : ربانی ! اگرچه در ادات و مؤید اسم این شخص آمده معلوم نیست که منظور مؤلفان کیست ، بهرحال در دیوان منوچهری ص ۱۴۰ ذکری از ابوبکر ربابی شده :

روزگاری کان حکیمان وسخنگویان بُدند ؛ بود هریک را به شعر لغز گفتن اشتهی
اندرین ایام ما بازار هزلست وفسوس ؛ کار بوبکر ربابی دارد وطنز جحی

و در حواشی این دیوان اضافه شده :

ازین بوبکر ربابی در رسالهٔ دلگشای عبید زاکانی (ص ۱۲۷ و ۱۷۶) دو حکایت آمده است وادیب صابر در اشارت بدو گوید :

چو شعر نیک بیابی نظر نباید کرد ؛ به هزلهای ربابی وطنزهای جحی

ومولوی نیز در همهٔ قصهٔ حاسدان بر غلام سلطان گوید :

شاه از اسرارشان واقف شده ؛ همچو بوبکر ربابی تن زده

و در حاشیهٔ مثنوی آمده : ابوبکر ربابی یکی از مشایخ وصاحب جذبه بوده است ... اما آنچه از شعر منوچهری وادیب صابر و دو حکایت مذکور در رسالهٔ دلگشا برمی آید آنست که ابوبکر ربابی مردی بذله گوی وهزّال بوده است همچنان که جحی وظاهراً نیز در عصر غزنویان میزیسته است (دیوان منوچهری تصحیح سیاقی ص ۲۹۹-۳۰۰) اما دربارهٔ رشتهٔ کلپتره با ابوبکر ربابی غیراز بعضی فرهنگنامه ها منابع دیگر بدست نیامده .

کیه[1]: گونه ای از علکهای رومی است یعنی مصطکی.

کمانه[2]: آلت سوراخ کن.

کندواله[3]: گنگ و فربه[4].

[ورق ۱۸۶] کاسکینه[5]: مرغیست سبز که آنرا سبزک گویند، و بعضی بشین معجمه گویند.

کشکینه[6]: نانی باشد از جو و گندم و باقلی دلیده کرده.

کوبیاره[7]: میخ کوب.

کرزه[8]: مار اژدر.

کاله[9]: کدوی سیکی.

کلیچه: قرص[10] و آفتاب[11].

کمینه[12]: کمتر.

کمین[13]: کمتر.

کالفته[14]: آشفته.

کانه[15]: آنکه کسی باکسی سری و بلندی کند و بایکدیگر کوشد، گویند کانه همی کند.

کنگره[16]: شرف دیوار و منظرها و کوشکها و برجهای حصار

---

[1] رک : موید ۲ : ۱۳۳، جهانگیری ۲ : ۲۳۳۵. [2] رک : موید ۲ : ۱۳۰ و جهانگیری ۲ : ۱۷۲۵ (معنی سوم). [3] ادات : کندواله وکنداواله : کندو فربه. موید ۲ : ۱۳۱ گنگ و فربه، فرهنگ معین ۳ : ۳۰۹۳ کندواله وکنداواله قوی هیکل و بلند و بالا.

[4] گذاست در نسخهٔ اصل و موید؛ نسخهٔ 'ل' : کبک. اما گنده درست باشد بمعنی درشت و ستبر رک : معین.

[5] رک : ادات و موید ۲ : ۱۲۶.

[6] رک : ادات و موید ۲ : ۱۲۹، نیز رک : کشکین در همین فرهنگ. نسخهٔ اصل : کشلینه.

[7] رک : موید ۲ : ۱۳۱. سرمهٔ سلیمانی ۲۱۰، جعفری ۴۰۱ کوبیازه مطرقهٔ آهنگران.

[8] در جهانگیری ۱ : ۱۱۳۰ و فرهنگ معین ۳ : ۳۲۵۸ : گرزه (باکاف فارسی) بمعنی مار بزرگ. اما در موید ۲ : ۱۲۸ کرزه 'مادرزاد' اشتباه چاپی است.

[9] رک : صحاح ص ۲۸۶ : جهانگیری ۱ : ۴۴۸ : کاله کدو را گویند عموماً و کدوی را که در آن شراب خورند خصوصاً.

[10] رک : فرهنگ معین ۳ : ۳۰۴۸ برای هر دو معنی. [11] جهانگیری ۲ : ۱۶۵۶ کلیچه بمعنی چراغ نوشته.

[12] رک : فرهنگ معین ص ۳۱۳۶. [13] ایضاً کمینه وکمین بمعنی کمتر و کمترین.

[14] رک : صحاح ص ۲۸۶. [15] رک : ادات و موید ۲ : ۱۲۶.

[16] موید ۲ : ۱۳۱ کنگره آن محراب شکلی که بر روزن و دیوار و منظرها و کوشکها و برجهای حصار راست کنند کذا فی زفان گویا.

بهرهٔ «ی»

کستی[1]: زنار و آن[2] ریسمان است که کشتی گیران خراسان در کمر بندند آنرا زنار گویند در عرف و نیز آنکه ترسایان دارند.

کرای[3]: حجام، بکاف پارسی نیز گویند.

کافوری[4]: اقحوان یعنی گل لعل.

کی[5]: پادشاه جبار را گویند که از همهٔ پادشاهان او بزرگ بود[6]، ستانندهٔ خراج هفت کشور.

کرنای[7]: بوق که بهندوی بهیر گویند.

کپی[8]: بوزنهٔ روسیه[9].

کیانی: جبارتی[10] و کیانی نسبت بدوست.

کشنی[11]: جنگل[12] یعنی درخت انبوه.

کاکوتی[13]: گیاهی است که بتازی سعتر گویند.

کوزگانی[14]: بزای معجمه، سختیان[15] و بلغتی کاف و واو پارسی ست و رای مهمله.

---

[1] نسخهٔ اصل: کسی، اما ادات: کستی زنار. [2] رک: موید ۲: ۱۳۴.

[3] موید ۲: ۱۳۳ کرای و قواس ص ۱۸۵ اگرای یعنی حجام. [4] رک: قواس ص ۱۴۵، موید ۲: ۱۳۲.

[5] رک: قواس ص ۹۸. [6] نسخهٔ «ل»: باشد.

[7] رک: ادات، متبادل عربی و هندی هر دو درین فرهنگ یافته می شود.

[8] رک: قواس ص ۷۶.

[9] نسخهٔ «ل»: بوزنه و گویند روسیاه. موید ۲: ۱۳۴: کپی بوزنهٔ سیاه (زفان گویا).

[10] همین معنی در موید ۲: ۱۳۵ بحوالهٔ زفان درج است. اما بنظرم کیانی نسبت به کیان است، درست باشد.

[11] موید ۲: ۱۳۴-۳۵: کشنی جنگل یعنی درخت انبوه کذا فی زفان گویا؛ این واژه بکاف فارسی یعنی گشنی درست باشد و گشنی بمعنی انبوهی، فراوانی، بسیار (معین ۳: ۳۳۳۱) ماخوذ از گشن بمعنی انبوه لشکر و شاخهٔ درخت وغیره (ایضاً ص ۳۳۲۹).

[12] نسخهٔ اصل: جنگ.

[13] رک: موید ۲: ۱۳۴ (کاکوفی اشتباه چاپی)، جهانگیری ۲: ۲۴۴۳، معین ۳: ۲۸۵۷.

[14] این واژه کوزگانی و گوزگانی هر دو شکل آمده، و آن منسوب است به گوزگانان، برای آگاهی بیشتر رک: قواس ص ۱۸۱ متن و حاشیه.

[15] سختیان پوست بز دباغت یافته (رک: آنندراج).

گونهٔ 'گ'

بهرهٔ 'الف'

گردا[1]: چرخ گردان[2]، گوئی نون حذف کرده اند، چرخ گردا گویند.
گردنا[3]: گردانگ.
گیا[4]: دهقان و خوط[5] را گویند و بزبان دیلمیان پهلوان باشد[6] و در پارسی گیاه[7] را گویند.
گیپیا[8]: ریماز[9]، پارسی جامه باشد.
گردنا[10]: بابزن[11] را گویند یعنی سیخ کباب.
گندنا[12]: سبزه ایست چون سیر و پیاز، و گویند سیر که در پیاز کارند.

بهرهٔ 'ب'

گوداب[13]: طعامی است.
گورب[14]: موزهٔ نمدین.

بهرهٔ 'ت'

گست[15]: رای و زشتی و بمعنی دیدن باشد.

---

[1] رک: صحاح ص ۲۷. [2] نسخهٔ 'ل': گران.
[3] رک: موید ۲: ۱۲۵ و معین ۳: ۳۲۲۵ (معنی سوم)، در موید اضافه شده: در زفان گویا بکسر کاف و دال است؛ اما از نسخهٔ حاضر تائید این امر نمی شود. سرمهٔ سلیمانی گردانگ رباب.
[4] این واژه باعتبار معنی اول و دوم در بعضی فرهنگ بکاف تازی است، رک: قواس ص ۹۷، موید ۲: ۹۲، برهان ۳: ۱۷۴۹ اما در ادات بکاف فارسی چنانکه در متن است.
[5] رک: دستور ص ۲۰۸ و ادات و بحر الفضائل. [6] نسخهٔ 'ل': باشد محذوف است.
[7] نسخهٔ اصل: گیاه ندارد، رک: صحاح ص ۲۹.
[8] گذاشت در اصل؛ اما در موید ۲: ۱۳۶ و جهانگیری ۲: ۲۲۹۲ و ۲۳۳۸: گیپیا بمعنی ریماز که نوعی از جامه است. در موید ۲: ۱۳۵ گیپیا بکسر یکم و سوم ریماز که نوعی از جامه است و پارچهٔ لطیف است گذاشت فی زفان گویا، اما در نسخهٔ حاضر موید این معنی و این املا نیست.
[9] نسخهٔ اصل: ریمان. [10] رک: ادات و موید ۲: ۱۳۵.
[11] نسخهٔ اصل: باب زده. [12] رک: ادات. [13] رک: اولت و موید ۲: ۱۳۶. اما کلمهٔ صحیح گوزاب است، رک: سلیمانی ۲۱۴. [14] رک: ادات و موید ۲: ۱۳۶، عرب آنرا جورب گویند.
[15] در صحاح ص ۴۷ و جهانگیری ۱: ۱۳۲۱ گست بمعنی زشت نوشته با شواهد اشعار. اما در ادات بمعنی رای و زشتی و در موید ۲: ۱۳۷ هر سه معنی و معنی اخیر بگفتهٔ زفان.

گورست[۱] : دمبین چوب ، واین نام بازی است و در بیشتر فرهنگ نامه گورشت بکاف عربی وشین معجمه وکسر را افتاده است .

گشت[۲] : خربزه .

بهرهٔ ج

گرنج[۳] : برنج یعنی ارز[۴]، وگویند گرنج بشیر یعنی شیر برنج .

بهرهٔ چ

گیج[۵] : احمق و خودستا .

بهرهٔ خ

گستاخ [ورق ۱۸۷] : دلیر[۶] و تند و شوخ .

بهرهٔ د

گلوند[۷] : گلوبندی که زنان از انجیر و جوز بسازند .

گرد[۸] : پهلوان .

گزید[۹] : چیزی که از رعیت بستانند ، وبعضی خراج و جزیه و رشوت و هدیه[۱۰] گویند .

گزند : آفت .

گولاد[۱۱] : نام مردی .

---

۱ جهانگیری ۲ : ۲۰۵۹ کورشت دو چوب باشد یکی دراز بمقدار یک گز و دیگری کوتاه مقدار یک وجب که بدان کودکان بازی کنند و آنرا جالیک و دسته چلک وغوک چوب و دمبین چوب و لاوه و پل و جفته نیز گویند .

۲ درمؤید ۲ : ۱۳۷ همین معنی بحوالهٔ زفان نوشته

۳ رک : مؤید ۲ : ۱۳۷ ، جهانگیری ۱ : ۱۱۳۸

۴ دستورالاخوان ۲۵ الأرز برنج .

۵ درقواس ص ۱۰۶ و دستور ص ۲۰۸ : کنج ، فرس : گیج و صحاح : کیج ، نیز رک : مؤید برهان ، ادات : گیج بمعنی پراگنده و احمق و خودستا ؛ نیز رک : مؤید ۲ : ۱۳۷ و جهانگیری ۲۳۳۶ .

۶ درمؤید ۲ : ۱۳۹ این معنی بحوالهٔ زفان نوشته . ۷ رک : مؤید ایضاً .

۸ رک : قواس ص ۹۶ . ۹ رک : ادات و مؤید ۲ : ۱۳۹ .

۱۰ رک : مؤید ایضاً . ۱۱ نام یکی از پهلوان ایرانی ، رک : جهانگیری ۲ : ۲۰۸۹ .

بهرهٔ ‹ر›

گبر[1]: خود و خفتان و آنچه[2] بدان ماند از آهن ، و نام گیاهی[3] است در خراسان و آن چیزیست مانند زنجبیل که از زمین بیرون می آرند و برای سردی می خورند ، وبعضی بسکون با گویند وبعضی بکاف عربی گفته اند .

گبر : مغ بددین ، وخفتان[4] را نیز گویند .

گرگر[5]: نام خدای عزوجل یعنی صانع الصنائع[6] ای جبّار و جهاندار ، وبزبان چینیان گرگتاج[7] را گویند ، و گردگر[8] نیز گویند .

گستر[9]: خار سیاه ، بعضی بضم کاف نیز گویند ، نیشترک[10] زدن ، و بکاف عربی نیز گویند .

گردیر[11]: سنبه یعنی آنچه بدان نایزه[12] و یکچوبی[13] وجز آن سوراخ کنند .

گنجور : خازن .

گزیر : چاره .

گوهر : اصل و نژاد وحسب[13] .

گوبر[14]: پایکار یعنی پیشکار .

گرگر[15]: باقلی ، وبعضی کاف[16] عربی گویند .

---

[1] رک : ادات . [2] رک : موید ۲ : ۱۴۰ .

[3] ہمین تفصیل بحوالۂ زفان در موید ۲ : ۱۴۰ درج شده .

[4] نسخۂ اصل : وبعضی خفتان را نیز گویند تکرار این معنی بیہوده است .

[5] رک : ادات ، موید ۲ : ۱۴۰ ، جهانگیری ۱ : ۱۱۳۵ .

[6] این واژه در ادات و موید و جهانگیری یافته می شود .

[7] موید : باج بحوالۂ شرفنامه نوشته [8] رک : جهانگیری ۱ : ۱۱۳۹ .

[9] گذاشت در ادات و دستور ۲ : ۱۴۱ ؛ اما در دستور ص ۲۰۴ گستر با کاف تازی و در قواس ص ۵۶ و بحرالفضائل : گستره ہمین معنی .

[10] این معنی در فرہنگها دیده نشد .

[11] رک : ادات . [12] نسخۂ اصل : بایزه .

[13] نسخۂ 'ل' افزوده : یعنی کریدگی . [14] رک : ادات و موید ۲ : ۱۴۲ .

[15] ادات : گرگر ہر دو کاف فارسی مکسور ، باقلی .

[16] رک : موید ۲ : ۱۴۰ .

گور: با واو پارسی، قبر و خر دشتی که آنرا[1] گورخر گویند ولقب[2] پادشاه ساسانی که بهرام گور گویند.

گر[3]: سازنده[4] چیزی.

گیگیر[5]: تره تیزک، بتازی جرجیر گویند

بهرهٔ 'ز'

گراز[6]: خوک نر، و در اصطلاح مرد دلاور و بیلی از چوب که بدو رشته بسته باشد و دو کس بکشند و زمین[7] راست کنند، و کوزهٔ آب سرتنگ وگویند جز در خوک[8] کاف عربی است و آن برین گونه : گراز[9] بکسر کاف، بیل است که آلت برزگری است وگراز بفتح کاف کوزهٔ سرتنگ، وگراز بضم کاف، تبشی[10] بود سخت در تن که زنان را وقت ولادت بیشتر [باشد][11].

گریز[12]: کنج وگوشهٔ خانه.

گربز[13]: مرد دلیر و زیرک و مکاره[14] و بکاف عربی[15] نیز گویند.

---

۱ نسخهٔ 'ل': آنرا ندارد. ۲ نسخهٔ 'ل': از ینجا تا آخر ندارد. ۳ این علامت پسوند فاعلی است و در آخر کلمه آید مانند زرگر، کاسه گر، آهن گر، رک: جهانگیری ۱ : ۱۱۱۴.

۴ جهانگیری: سازنده وکننده.

۵ موید ۲ : ۱۴۲ : گیگیر تره میرکه (صح تره تیزک) بتازی جرجیر گویند، وقیل باکاف تازی و رای مهمله و زای معجمه (زای عربی). چنان معلوم می شود که کیکیز وگیگیر مترادف هستند بلکه یکی از دیگری مستفاد می باشد. جهانگیری ۲ : ۲۳۴۲ کیکیز و تره تیزک را مترادف نوشته وهمچنین در همین لغت ۲ : ۱۹۱۲ وندہ را بمعنی تره تیزک نوشته و مترادف عربی آن جرجیر قرار داده شده؛ بدین جهت واضح است که کیکیز بمعنی جرجیر و شاید آن معرب گیگیز باشد؛ درحاشیهٔ جهانگیری ۲ : ۱۹۱۲ بحوالهٔ تحفهٔ مومن جرجیر را مترادف تیره تیزک قرار داده است. ۶ گراز درهمین فرهنگ (زفان) بمعنی کوزهٔ سرتنگ وتب آمده. ۷ عیناً همین معنی در ادات است، نیز رک: صحاح ص ۱۳۱.

۸ نسخهٔ اصل: جز در خوک نیز کاف است. ۹ دراصل این توضیح است واژهٔ جداگانه نیست.

۱۰ صحاح ص ۱۳۱ : گراز چند معنی دارد، اوّل خوک نر...، دوم بیلی باشد و رشته برآن بسته وکشاورزان زمین را بدان راست می کنند، سوم تبشی باشد سخت که در تن مردم افتد، وبیشتر زنان را بوقت زادن.

۱۱ اضافه قیاسی.

۱۲ در موید ۲ : ۱۴۲ : این معنی بحوالهٔ شرفنامه نوشته. سرمهٔ سلیمانی ۱۹۷ گریز بهمین معنی.

۱۳ رک : ادات و موید ۲ : ۱۴۲.

۱۴ رک : جهانگیری ۱ : ۱۱۱۸، موید این معنی را بحوالهٔ زفان نوشته.

۱۵ رک : موید : ایضاً.

گوز[1] : جوز، و بدینجاست که گویند با نغزان نغزی و با گوزان گوزی. و بعضی بضم کاف و واو پارسی گویند و بدین لغت نیز بادی[3] مراد است که از دُبر رها [ورق ۱۸۸] میشود.
گاز : نیش[4] دندان و موی[5] چینه.
گواز[6] : چوبدستی بود که بدان غزان را برانند و گاو و چهار پای را.
گشنیز : گیاهی است خوشبوی، بهندوی دهنیه گویند.
گرز : چقمار[7] و عمود[8].
گز : درختی است که بهندوی جهاؤ گویند.
گودرز[9] : نام مردی.

بهرهٔ "س"

گاورس[10] : کال و گویند ارزان یعنی چینه[11] که بتازی آنرا جاورس گویند.

بهرهٔ "ش"

گش[12] : رفتار با ناز و کبر و شادمانی[13].
گش : بلغم[14]، و بعضی کاف عربی گویند.
گریش[15] : جانوری است کوتاه ولیکن دست و پای دارد.

---

۱ رک : فرهنگ معین ۳ : ۳۴۴۱. ۲ موید ۲ : ۱۴۳. ۳ ایضاً و نیز فرهنگ معین ۳ : ۳۴۴۲.
۴ رک : فرهنگ معین ۳ : ۳۱۶۵ : دندان نیش، ناب (معنی سوم)
۵ ایضاً معنی چهارم (ج) گاز موچین موچینه، ناخن پیرای. ۶ رک : صحاح ص
۷ چقار و چوقر (ترکی) گرز، موید ۱ : ۳۱۲.
۸ رک : جهانگیری ۲ : ۱۵۱۵ چکیده بمعنی گرز تازی عمود.
۹ نام دو بادشاه از ملوک اشکانی، و دو پهلوان ایرانی، یکی پسر قارن بن کاوهٔ آهنگر و دوم پسر کشواد، رک : جهانگیری ۲ : ۲۰۷۹ — ۸۰.
۱۰ رک : قواس ص ۵۶. دستور ص ۲۰۲.
۱۱ موید ۲ : ۱۴۳ این را بحوالهٔ زفان آورده ؛ اما غلط مذکوره بحوالهٔ قواس نوشته ؛ اما نسخهٔ چاپی از فرهنگ قواس قول موید را مورد تائید قرار نمی دهد.
۱۲ صحاح ص ۱۵۶ : کش نازان و شادمانی. ۱۳ نسخهٔ اصل : شادی و بغل.
۱۴ رک : قواس ص ۱۶۱ ؛ اما رک : فرهنگ معین ۳ : ۳۳۲۱ ؛ موید ۲ : ۱۴۴ این معنی بحوالهٔ زفان نوشته. ۱۵ رک : ادات و موید ۲ : ۱۴۴.

گزایش[1]: پیچش[2] و درخورد، و بضم نیز گویند و بلغتی کاف عربی است.

بهرۂ 'غ'

گریغ[3]: گریز.

بهرۂ 'ف'

گزاف[4]: بیهوده و دروغ و غیر[5] معلوم.

گزف[6]: قیر[7] و سیم سوخت آنکه بالای کارد[8] بدوانند.

بهرۂ 'ک'

گنجشک: مرغکی کوچک[9]، بتازی عصفور خوانندش.

گلیک[10]: کریج[11] خرمن بان[12].

گویک[13]: بواو پارسی، ماده جوزگره.

گلشاک[14]: بازوی در.

بهرۂ 'گ'

گنگ[15]: نام شهریست، گویند بیت المقدس است شرفها اللہ تعالیٰ بذا، و نام رودی[16] است

---

[1] نسخۂ 'ل': گرایش. [2] ادات و موید ۲: ۱۴۴: گزایش بالفتح درخورد و پیچش وقیل بالضم. فرہنگ جعفری ۳۵۲ گزایش پیچش و میل. معین گرایش بمعنی میل و توجه و روپیچی کردن (۳: ۳۲۲۵).

[3] رک: موید ۲: ۱۴۴، دستور ص ۲۱۱، بحرالفضائل: گریغ جستن و گریختن.

[4] ادات: گزاف بیهوده گوئی و مقال دروغ. [5] کذاست دراصل.

[6] در ادات کاف و زا ہر دو فارسی؛ نیز رک: موید ۲: ۱۴۴. [7] نسخۂ 'ل': 'قیر' محذوف.

[8] ہمین است در موید عیناً (کار غلط چاپی). [9] نسخۂ 'ل': است.

[10] نسخۂ 'ل': کلنگ؛ اما قواس ص ۵۶، دستور نسخۂ خطی ص ۳۵، موید ۲: ۱۱: کلیک (کاف عربی)؛ نیز در زفان نیز کلیک (کاف عربی) تقریباً بہمین معنی.

[11] نسخۂ 'ل': کریجہ؛ اما قواس، دستور، ادات، موید: کریج، در زفان ذیل کلیک: کرتج؛ جہانگیری ۱: ۱۱۱۲ کریج و کریجہ و کریز و کریزہ خانۂ کوچکی کہ دہقانان درکنارۂ زراعت خود سازند از نی و علف. [12] زفان: خرمن دان (رک: ذیل کلیک).

[13] رک: موید ۲: ۱۴۵، ادات: گویک جوزگره و مادۂ جوزگره.

[14] رک: ادات و موید ۲: ۱۴۵.

[15] رک: قواس ص ۱۱۷، صحاح ص ۲۰۰، ادات، موید ۲: ۱۴۵.

[16] نسخۂ اصل: رودی و لب آبی.

در هند و نام بهار خانهٔ[1] ترکستان و کوشکی است که کیکاوس[2] ساخته و بعضی بتخانه را نیز گویند و شهریست[3] بهندوستان و دیگر جزیره ایست و چیزیست[4] که پست بر آید.

گنگ: لال بود که زبان ندارد.

گریشنگ[4]: مغاک یعنی گو.

بهرهٔ ل

گوپال[5]: گرز، و اسدی[7] و فردوسی[8] گویند تخت[6] آهنین و چوبین[9] باشد.

گسیل[10]: دفع، گویند گسیل کرد یعنی دفع کرد، گسل یعنی دفع کن.

گول[11]: احمق.

گال[12]: غله ایست که بهندوی آنرا کنکنی[13] گویند.

بهرهٔ م

گوم[14]: گیاهی است مثل کهبل[15]، خوشبوی است، و گویند آن گیاهی تنک است در شدیارکاوند[16] ونیش هیچو[17] بن نی باشد، بواو پارسی نیز گویند، بلغتی کوم آمده است.

---

[1] فقط در موید آمده. [2] ازینجا تا آخر در نسخهٔ 'ل' افتادگی دارد. [3] موید: نام هرچه که پست بداند.

[4] این واژه بشکل گریسنگ، گریشک نیز آمده. مثلاً قواس ص ۱۳۳؛ دستور ص ۲۱۰: گریشک؛ ادات: گرسنگ؛ موید ۲: ۱۴۵: گریشگ، نیز رک: فرهنگ معین ۳: ۳۲۹۶.

[5] رک: ادات، موید ۲: ۱۴۶ معنی گوپال بحوالهٔ زفان نوشته (هندی و فارسی غلط چاپی).

[6] فرس چاپ پاول هورن ص ۷۹: گوپال لخت آهنین بود تا زیش عمود الخ. [7] نسخهٔ 'ل': اسدی و فردوسی باواو پارسی گرز را گویند دغیر این تخت آهنین و چوبین الخ. [8] این غلط فاحش است، اصل لفظ لخت باشد چنانکه خود در زفان درگونهٔ 'ل' موجود است. [9] چوبین نیز درین محل بیجود است.

[10] رک: ادات و موید ۲: ۱۴۶. [11] دستور ص ۲۰۷، ادات و موید ۲: ۱۴۶: گول بمعنی بوم یعنی شب پره است؛ اما فرهنگ معین ۳: ۳۴۷۰ گول بمعنی احمق و ابله.

[12] رک: ادات، موید ۲: ۱۴۶؛ جهانگیری ۱: ۴۵۹. [13] نسخهٔ 'ل': کیکنی.

[14] فرس ص ۳۴۵، صحاح ص ۲۲۵، موید ۲: ۱۱۶، جهانگیری ۲: ۲۲۳: کوم بکاف تازی، قواس ص ۳۶، دستور ص ۲۰۳، بحر الفضائل: کووم؛ ادات کوم و کووام.

[15] برای این کلمه رک: قواس، دستور، بحر الفضائل، ادات؛ موید ۲: ۱۴۷ کیله، و آن تصحیف کهبل یا کهیل است (کذاست در نسخهٔ زفان).

[16] رک: رشیدی ص ۱۲۳۸.

[17] این اطلاع در فرهنگها نیافتم.

گزم[1]: درختی است که بتازی عیش[2] گویند.

بهرهٔ 'ن'

گیهان[3]: این جهان.

گرزمان[4]: عرش، و این پارسیان گویند و نزدیک شعرا آسمان.

گردگان: جوز.

گون[5]: صفت و مثل.

گریان[6] [ورق ۱۸۹]: فدا، و این زبان[7] سیستان است، و بکاف[8] عربی نیز گویند، فخر قواس[9] گوید: گریان فدا.

گزردن[9]: چاره شدن.

گوزن: شکاری است، شاخ بسیار دارد و دراز، ہندوی جھنکیال گویند و در فردوسی است گاد کوہی[10].

گوان[11]: مبارزان.

گردون: چرخ.

گشن[12]: بسیار و انبوه[13]، بیت[14]:

باهم بجمع خویش یکی گشن لشکریم ❊ اینک سبو پیاده و اینک قدح سوار

---

۱ رک: گزم در ہمین فرہنگ. ۲ جہانگیری شجرة البق. ۳ قواس ص ۱۶۰: گیہان: جہان.

۴ رک: قواس ص ۱۳. ۵ قواس ص ۱۶۰ گواش و گون و وام رابمعنی صفت نوشته.

۶ رک: موید ۲: ۱۴۸.

۷ موید نیز بحوالۂ زفان نوشته است. ۷ رک: ادات.

۸ موید بحوالۂ شرفنامه قول قواس را آورده؛ اما نسخۂ چاپی گریان ندارد.

۹ موید ۲: ۱۴۸ گزاردن آورده؛ اما رک: زفان بخش مصادر.

۱۰ ادات و موید ۲: ۱۵۰ گاو دشتی.

۱۱ جمع گو است؛ و گو بمعنی پہلو؛ موید ۲: ۱۵۰: گوان بمعنی پہلوانی با ہیبت و شکوه نوشته اما این را واحد قرار دادن محل نظر است.

۱۲ کذاست در نسخۂ 'ل' اما در نسخۂ اصل یک لفظ قبل ازان ناخوانا.

۱۳ رک: موید ۲: ۱۴۹، سلیمانی ۲۲ انبوه، انبه، گشن مردم بسیار.

۱۴ این بیت در نسخۂ 'ل' آمده.

گلخن[۱]: رنون[۲] باشد آنجا که در حمام نجاست سوزند.

بهرهٔ 'و'

گو[۳]: مغاک و پهلوان و مبارز.

گلو[۴]: بزرگ بزبان شیرازیان است.

گیو[۵]: پهلوان و نام مردی[۶] پسر گودرز[۷] داماد رستم، و بعضی شوهر خواهر رستم گفته اند.

گیسو: موی تافته.

بهرهٔ 'ہ'

گریوه[۸]: دک بلند را گویند و گویند دکی که جوی و آب[۹] باران را پاره می کند و بیرون می آید.

گازه[۱۰]: بزای عربی و پارسی، آنچه صیاد از شاخهای درخت و کاه سازد و پس آن نشیند و دام اندازد، و غرض آن دارد که مرغان او را نبینند، و گویند گازه نوعی از دام صیاد است و گویند آفتاب خانهٔ صیاد؛ کاشه[۱۱] صیاد هم گویند آنرا که در پس او صیاد پنهان شده کنجشکی صید کند، و نیز گویند گازه جای و صومعه[۱۲] بر سر کوه و نشستگاه چوبین باشد، و بعضی بکاف عربی گویند و بعضی فرهنگیان گویند گازه بزای پارسی جائی باشد، باقی بزای عربی است.

گاه[۱۳]: جای و وقت و تخت آراسته و کرسی زرین.

گرته[۱۴]: گیاهی است.

---

[۱] فرهنگ معین ۳: ۳۲۶۵ - ۶۶ گلخن ۱- نوعی از آتش دان که دران غله را بریگ گرم بریان کنند ۲- اجاق حمام ۳- مزبلهٔ اجاق حمام ۴- جائی که خس و خاشاک دران ریزند.

[۲] کذاست در نسخهٔ اصل؛ نسخهٔ 'ل': الون.

[۳] ادات: گو مغاک و پهلوان و مرد جنگی.

[۴] گلو بدین معنی در فرهنگها ندیدم، حتی در جهانگیری که مولف خود شیرازی بود این کلمه را بیان نه نموده است. در موید ۲: ۱۵۰ اهمین معنی بحوالهٔ زفان نقل نموده است.

[۵] رک: فرهنگ معین ۶: ۱۷۶۰. [۶] نسخهٔ اصل: مردی پهلوان.

[۷] اضافه از روی نسخهٔ 'ل'. [۸] قواس ص ۳۰: گریوه دک بلند را گویند که جوی و آب باران را پاره می کند و بیرون می آید. [۹] اسان باران. [۱۰] رک: ادات و موید ۲: ۱۵۱.

[۱۱] نسخهٔ 'ل': کانه اما رک: ادات. [۱۲] رک: ادات، برهان ۱۷۶۳.

[۱۳] رک: ادات و موید ۲: ۱۵۱.

[۱۴] رک: کرته در همین فرهنگ. گربه نیز گیاهی است، رک: ادات و موید ۲: ۱۵۲.

گداره[1] : یعنی آن که برگ باتخت[2] در سقف نهند.

گله[3] : موی.

گلاله[4] : هم موی باشد.

گهواره : مهد که آنجا بچگان خرد را بغلطانند.

گروهه[5] : غلولهٔ گل و جز آن.

گله : رمه.

گزاره[6] : سرریزه[7] ، گیاهی است خوشبوی.

گوله[8] : غلولهٔ[9] بزرگ سنگین که بران منجنیق سازند.

گوزه[10] : دوتابه[11].

گاله : غلولهٔ پنبه.

گوزینه[12] : طعام است.

گرده[13] : نان ستبر و قرص.

گومه[14] : آن که از بهر باران و سایه از کاه بندند یعنی ٹٹی[15] ، و خرپشته که از جهت پناه[16] سازند.

---

[1] نسخهٔ اصل : گراره ؛ امارک : ادات و موید ۲ : ۱۵۱ و جهانگیری ۱ : ۸۱۱.

[2] ادات و موید : گداره بکاف فارسی برگ که باتخت در سقف نهند.

[3] رک : ادات ۲ : ۱۵۳ ، نیز رک : کله (ذیل کاف).

[4] رک : کلاله باکاف عربی ، موید ۲/۱ : ۱۳۰. [5] رک : موید ۲ : ۱۵۲ (ذیل گرهه).

[6] ادات و موید ۲ : ۱۵۲ : گزره.

[7] رک : زفان گویا بخش دوم گونهٔ س : سرریزه گیاهی است خوشبوی.

[8] رک : فرهنگ معین ۳ : ۳۴۷۲. [9] موید ۲ : ۱۵۴ این مطالب بحوالهٔ زفان نوشته.

[10] نسخهٔ 'ل' : گوره ؛ ادات : گوژه ، جهانگیری ۲ : ۲۰۸۴ و موید ۲ : ۱۵۳ : کوزه بمعنی غلاف پنبه ، پیلهٔ ابریشم (فرهنگ معین ، جهانگیری) ، تارپنبه (موید) گذاشت در نسخهٔ اصل ؛ اما نسخهٔ 'ل' : دوتانانه و

[11] همین معنی اخیر در موید بحوالهٔ زفان آمده. جعفری ۳۶۰ گوزه غوزهٔ پنبه.

[12] حلوائی که از مغز گردگان بپزند ، جهانگیری ۲ : ۲۰۸۴.

[13] ادات و موید ۲ : ۱۵۲ : گرده کلیچه و نان. [14] رک : موید ایضاً.

[15] این واژهٔ هندی در موید موجود است. [16] موید 'تباه' اشتباه چاپی.

گاوه[1]: نام آهنگری که در سپاهان بود، بر ضحاک [ورق ۱۹۰] ماران خروج کرد.
گوبه[2]: جانوری است معروف و نیز گیاهی باشد که بخورند.
گوساله: گاو بچه.

بهرهٔ «ی»

گیتی: روزگار[3] و جهان.
گشتی[4]: رفتار با ناز یعنی خرامش و بناز رفتن.
گزنی[5]: گل تر و خشک و بعضی بکاف عربی و کسر نون گویند.
گرامی: عزیز و محبوب و بزرگ.
گیلی: نام طایفه از ترکانست[6] نسبت بگیل.
گسنی[7]: گیاهیست معروف که کشنیج[8] گویند و بتازی هندبا[9] که برای تب[10] دهند.
گیروی[11]: نام گردی یعنی پهلوان.

گونهٔ «ل»

بهرهٔ «الف»

لخا[12]: کفش و گویند سر موزه.

---

1. اگرچه در موید ۲: ۱۵۱ گاوه بکاف فارسی آمده؛ اما صورت صحیح این کاوه است، رک: فرهنگ معین ۶: ۱۵۴۲–۴۳.
2. برای معنی دوم رک: ادات.
3. برای هر دو معنی رک: موید ۲: ۱۵۶.
4. ادات: گشتی باکاف فارسی بناز رفتن و رفتار با ناز؛ نیز گشن باکاف فارسی نازان و رفتار با ناز و شادمانی.
5. رک: قواس ص ۱۱۶؛ دستور ص ۲۰۹: گزنی: تر و خشک (بحذف گل).
6. کذا است در موید ۲: ۱۵۶–۱۵۷
گیلی منسوب است بگیل و گیل گیلان را گویند، ناحیه ایست در ایران در جنوب غربی بحر خزر، رک: فرهنگ معین ۶: ۱۷۵۵.
7. نسخهٔ «ل»: کستی؛ اما گسنی درست بنظر می آید، و گسنی و کاسنی گیاهی است معروف، رک: گسنی-کاسنی در هدایة المتعلمین ص ۲۷۲، ۴۰۵، ۴۴۲ح، ۴۴۴ح. جهانگیری ۱: ۱۳۲۱ گسنی را حلقیت گوید.
8. کذا است در اصل؛ بظاهر کسنیج درست است.
9. هدایة المتعلمین کسنی را از هندبا جداگانه قرار می دهد، رک: ص ۳۸۶، ۴۷۳، ۴۷۷.
10. در هدایه هندبا در مرض فواق و طحال مفید دانسته شده.
11. نسخهٔ «ل»: گروسی؛ گیروی نام پهلوان ایرانی، جهانگیری ۲: ۲۳۳۷، در فرهنگ معین گیرد و گیروی پهلوان ایرانی بود، و گروی پهلوان دیگری، ۶: ۱۶۹۹، ۱۷۵۳.
12. رک: قواس ص ۱۵۶، موید ۲: ۱۵۷، جهانگیری ۱: ۲۸۲.

لکا[1]: سختیان سیاه ولک[2] سرخ.
لالا: دانه[3] است مانند کنجد.

بهرهٔ 'ب'

لبلاب[4]: معزمی[5] که عزیمت خواند، و گیاهی است که عشقه[6] گویند.

بهرهٔ 'پ'

لهراسپ[7]: نام پادشاهی، پدر گشتاسپ[8].

بهرهٔ 'ت'

لیرت[9]: غداره[10]، از جنس اداتیست.
لخت[11]: عمودی که بدان حرب[12] کنند، و چرم[13] موزه و کفش.
لت[14]: قطع کتان و پاره، گویند لت[15] لت یعنی پاره پاره و سرگز[16] گویند و لخت[17] [زدن] یعنی عمود زدن.
لفت[18]: لعبت[19]، دختران که صورتها از جامه کنند.
لوت[20]: نان و طعام.

بهرهٔ 'ج'

لنج[21]: بیرون روی چون بینی و رخ و زنخ، و مرد[22] دست بیکار.

---

[1] رک: قواس ص ۱۸۱ و ادات. [2] رک: ادات و موید ۲: ۱۶۴. [3] این معنی در موید ۲: ۱۵۷ (ذیل فصل عربی) بحوالهٔ زفان درج است. [4] این کلمهٔ عربی بمعنی عشقه آمده، رک: دستورالاخوان ص ۵۳۳، فرهنگ معین ۳: ۳۵۶۰، و نیز موید ۲: ۱۵۷ بمعنی عشقه و عزیمت خوان. [5] نسخهٔ 'ل': معظم و عظمت.
[6] نسخهٔ اصل: عشیقه، معین لبلاب را نیلوفر قرار دارد و عشقه و پیچه را درست نمی داند.
[7] نسخهٔ اصل: لهراست (ذیل ت). [8] نسخهٔ 'ل': کراسپ نیز گویند. [9] رک: ادات و موید ۲: ۱۵۸، جهانگیری ۲: ۲۳۴۰ لیرت: خود و نوعی از سلاح غزاره. [10] جهانگیری و فرهنگ معین ۲۶۶۵ غزاره؛ اما غداره درست تر است. [11] قواس ص ۱۷۰: لخت عمودی باشد که بدان جنگ کنند.
[12] از ینجا تا آخر در نسخهٔ اصل نیامده. [13] برای این معنی رک: صحاح ص ۴۸ و ادات.
[14] این واژه در نسخهٔ اصل نیامده، رک: ادات و موید ۲: ۱۵۸. [15] رک: صحاح ص ۴۸.
[16] موید: سرکر بمعنی گرز. [17] رک صحاح ص ۴۸. [18] قواس ص ۱۹۱: لفتان دارد.
[19] ناصری لفت را مصحف لعبت می داند، رک: برهان ص ۱۹۱۸ - ۱۹ متن و حاشیه.
[20] رک: موید ۲: ۱۵۸ که در آن معنی اش بحوالهٔ زفان آمده.
[21] برای معنی اول رک: قواس ص ۸۱، و در جهانگیری ۲: ۱۸۹۹. باول مفتوح بمعنی بیرون روی.
[22] رک: جهانگیری ۲: ۱۸۹۹ لنج بالضم بمعنی شل.

لنبج[1] : بضم و فتح لام ، ساز گازر و چیزیست به ساز گازران تعلق دارد .
لج[2] : لگد باشد که بزنند و آنچه[3] بیرون کشند .
لفج[4] : بسکون فا ، فروهشته لب و ستبرلب ، و کسی که بخشم باشد ، و بعضی بدو فتحت گویند و بلغتی جیم پارسی .
لخج[5] : بسکون خا ، زاک سیاه که رنگ رزان دارند ، و بعضی[6] بدو فتحت گویند ، و بلغتی[7] جیم پارسی .

بهرهٔ ' چ '

لوچ[8] : احوال یعنی کاژ[9] .
لچ[10] : رخ و گویند زخ[11] .

بهرهٔ ' خ '

لاخ[12] : جای ، گویند دیولاخ یعنی جای دیو ، و سخت و سیاه ، گویند سنگ لاخ زمین سنگستان .
لخ[13] : کاه بوریا که بهندوی بتیره[14] و گوند[15] گویند .

---

[1] قواس ص ۱۸۴ : لبنج حجام ؛ درین فرهنگ پیش ازین دو کلمه دیگر یعنی کدنگ بمعنی کدینهٔ گازر و کورک بمعنی سنگ گازر و بعد ازین گرای ، تانگو . تونگو ' نیز بمعنی حجام ' ـ بنابرین واضح است که معنی کلمه حجام درست بنظر می رسد ، و سازگار و سازگار و سنگ کارد وغیره غلط و بعضی از نتیجهٔ تصحیف خوانی است ، رک : مجلهٔ علوم اسلامیه ، دسامبر ۱۹۶۷م ص ۵۵ بعد و قواس ص ۱۸۴ حاشیهٔ نمره ۱۱۰ .
[2] رک : فرس ص ۶۵ ، صحاح ص ۵۹ (لچ) ادات ، موید ۲ : ۱۵۹ .
[3] این معنی در فرهنگها بنظر نیامده . [4] موید ۲ : ۱۵۹ بحوالهٔ زفان لفچ آورده .
[5] رک : صحاح ص ۵۹ ، ادات ، موید ۲ : ۱۵۹ .
[6] در موید بفتحتین ، اما جهانگیری ۱ : ۷۷۰ باوّل مفتوح بثانی زده .
[7] صحاح ، ادات ، جهانگیری باجیم فارسی و موید باجیم عربی و فارسی بهردو طور .
[8] رک : صحاح ص ۶۰ . [9] کاژ بمعنی احول ، رک : صحاح ص ۱۳۷ .
[10] ادات : بالضم لام وجیم فارسی ، رخ .
[11] کذاست در نسخهٔ اصل ؛ اما در نسخهٔ ' ل ' این نیامده ، نیز در موید ۲ : ۱۵۹ لچ بالضم بمعنی رخ است (زفان) بعلاوهٔ این کتاب در هیچ فرهنگ این معنی دیده نشد .
[12] در موید ۲ : ۱۶۰ معنی لاخ بحوالهٔ زفان نوشته ؛ ادات : لاخ زمین سنگستان و جای بیابان ، جهانگیری ۱ : ۱۷۶۴ لاخ بمعنی جا نوشته و علاوه نموده که بدون ترکیب استعمال نمی شود ، و فقط در سه کلمه یعنی سنگلاخ و دیولاخ و رودلاخ (یکبار) دیده شد. [13] رک : ادات و موید ۲ : ۱۶۰ .
[14] ادات و موید : بتیرا. [15] این کلمهٔ هندی در بعضی جایها متداول است

بہرۂ 'د'

لاد[1]: دیبای تنگ و بنای[2] دیوار و گویند دیواری که از گل برہم نہادہ بود یعنی توئی[3] از دیوار لادی باشد.

لوند[4]: پسرو بطفیل.[5]

لوید[6]: بفتح لام وکسر، دیگ مسین بزرگ.

لاجورد[7]: سنگی[8] معروف [ورق ۱۹۱] که از آن رنگ سازند، ہندوی رتی.[9]

لاژورد: ہمان لاجورد است.

بہرۂ 'ر'

لر[10][11]: برۂ گوسپند ومیش دشتی ونیز برۂ کوہی را گویند، ونام شہریست[12]، و در فرہنگنامه است:

لر توان[13] وکام باشد، و از سیلاب زمین[14] گو شده باشد.

لور[15]: ہم بمعنی لر است، وچکیده[16] یعنی آنچه از جغرات بعد چکیدن بماند ونام زمینی وزمین نشیب.

لتنبر[18]: مرد بسیار خوار وکاہل.

---

[1] ادات و موید ۲: ۱۶۰ لاد بمعنی دیبای تنگ وبنای دیوار، اما جہانگیری ۱: ۴۷۲-۷۳ لاد بمعنی بنای دیوار، رده از دیوار گل پخته و دیبای تنگ وغیره آورده.

[2] رک: جہانگیری. [3] نسخۂ اصل: بومی؛ توی بمعنی توه، تاه ولای، جہانگیری ۲: ۱۹۵۶.

[4] صحاح ص ۸۳: لوند مردم کاہل وتنبل و ہرجائی باشد.

[5] ادات و موید: اہل خرابات را مہمان طفیلی، برہان ۱۹۱۶ پسر بدکاره ومہمان طفیلی الخ.

[6] رک: قواس ص ۱۳۶ و ادات. [7] رک: موید ۲: ۱۶۰.

[8] نسخۂ 'ل': رنگی معروف که از سنگ سازند؛ موید ۲: ۱۶۰ لاجورد ولاژورد: رنگی است که از سنگ مخصوص کشند. [9] نسخۂ 'ل': راوت گویند. [10] رک: ادات و موید ۲: ۱۶۱ و جہانگیری ۱: ۱۱۲۵.

[11] ادات و موید: بره. [12] از تاریخ گزیده معلوم می شود موضعی بنام لر است، و از تاریخ وصاف واضح می شود که دو خط بودند، یکی لر بزرگ و دوم لر کوچک، جہانگیری ص ۱۱۲۵ حاشیه ۱، و در ادات و موید و جہانگیری: نام طائفۂ صحرانشین.

[13] کذا است در ادات و موید. [14] رک: جہانگیری. اما بدین معنی بالفتح است.

[15] در جہانگیری لر بالفتح بمعنی زمین گو شده آمده، و لور بمعنی زمین سیلاب کند بالضم نوشته ۲: ۲۰۹۶.

[16] فقط از لحاظ دو معنی یعنی زمین سیلاب کند، و نام طائفه.

[17] رک: ادات و موید ۲: ۱۶۱.

[18] رک: قواس ص ۱۱۲.

لوراور[1]: دبهٔ برنجین بزرگ.
لزیر[2]: زیرک و پرهیزگار.
لر[3]: زمین نشیب و جوی خرد.
لنگر[4]: بدانچه کشتی بدارند، و مدار[5] هرچیزی. بنابرین خانقاه[6] را نیز لنگر گویند.

بهرهٔ 'ز'

لغز: فرو[7] خزیدن باشد.
لیز[8]: آمیخته و دست افزار کشیدن[9] چیزی.

بهرهٔ 'س'

لوس[10]: فریب دهنده و فروتنی کننده.
لاس[11]: ابریشم.

بهرهٔ 'ش'

لوش[12]: خلیش و گویند زمین خلاب، (و) کژ دهان[13] و بعضی بواو عربی گویند.
لاش: کم عرض[14] و بی اعتبار.

---

[1] مواسس ص ۱۳۶: لوراور دبهٔ روغن، اما موید ۲: ۱۶۱ لوراور بمعنی دبهٔ برنجین بزرگ و دبهٔ روغن.
[2] رک: موید ۲: ۱۶۱. [3] تکرار این واژه بیخود است.
[4] در موید ۲: ۱۶۱ مطالب مندرج متن را بحوالهٔ زفان آورده.
[5] این معنی و توجیه در هیچیک از فرهنگهای مورد استفاده دیده نشد.
[6] فرهنگ معین ۳: ۳۶۳۲ - ۳۳ ازجمله معنی های دیگر این سه معنی آورده ۱ـ لنگر کشتی. ۲ـ جای که همه روزه بفقیران طعام دهند. ۳ـ خانقاه.
[7] رک: موید ۲: ۱۶۱ که همین معنی بگفتهٔ زفان نوشته؛ اما ادات: لغزیدن دارد نه لغز.
[8] در موید ۲: ۱۶۱ همین دو معنی بحوالهٔ زفان آمده؛ اما جهانگیری ۲: ۲۲۴۰ لیزه بمعنی آمیخت، دست افزار نوشته، از مصدر لیزیدن بمعنی آمیختن.
[9] برهان ۱۹۲۰ دست افزار کشیدن بر چیزی.
[10] در اکثر فرهنگها لوس بمعنی فریب دادن و فروتنی کردن است، اما برای این معنی رک: فرهنگ معین ۳: ۳۶۵۰. [11] صحاح ص ۱۴۵. [12] رک: ادات و موید ۲: ۱۶۲.
[13] رک: صحاح ص ۱۵۶: لوش کج دهان. [14] رک: موید ۲: ۱۶۲.

بهرهٔ 'غ'

لغ[1]: بی موی، گویند لغ سر یعنی سرگل[2].

لوغ[3]: بواو پارسی؛ دوشیدن و آشامیدن و دوشنده[4] و آشامنده.

بهرهٔ 'ف'

لاف[5]: کلام فضول و عبارت گشاده و خویشتن[6] ستائی. بتازی صلف[7] گویند.

بهرهٔ 'ک'

لک: مرد[8] احمق و خام[9] درای و یاوه گوی، و صد هزار، و پک بپای پارسی از اتباع، و بعضی[10] هر چیزی قلیل، گویند: لک و پک آورده است، و بی هنری و تنگاپوی[11].

لشک[12]: کنج شتر.

لک[13]: غلوله، و آنکه کسی فریب خورده زودتر در چیزی افتد، و نیز لک شئ معروف است و آن سرخی است که بدان هر چیز را رنگ کنند و گویند رنگ لکی است، و در اسدی[14] است لک: بن لاک و لکا باشد که آن پس مانده[15] باشد و در بن دستهٔ[16] کارد و مانند آن نشانند تا آهن را سخت گیرد.

---

1. رک: قواس ص ۷۹. ۲. کل: سر بی موی، رک: زفان.
3. صحاح ص ۱۶۵ نوع بزبان ماوراءالنهر نوشیدن و آشامیدن بود، نیز رک: ادات.
4. این معنی در موید ۲: ۱۶۳ یافته می شود و نیز رک: برهان ۱۹۱۴.
5. در موید ۲: ۱۶۳ معانی مذکور در متن بحوالهٔ زفان نوشته.
6. صحاح ص ۱۷۰: لاف بتازی صلف و بپارسی خویشتن ستائی.
7. نسخهٔ اصل: صلق، موید ۱: ۱۵۵: صلف لاف.
8. رک: قواس ص ۱۰۸، دستور ص ۲۲۰، فرس و جهانگیری ۲: ۱۵۴۲ لک هذیان و هرزه بود. صحاح ص ۱۸۶ لک: مرد رعنا و احمق و هذیان گو بود.
9. درای سراینده سخن، برهان ۲: ۸۳۱.
10. ادات و موید ۲: ۱۶۴ لک و پک بابای فارسی بی هنر و بضاعت مزجات چنانکه گویند لک و پک آورده است.
11. رک: فرس نسخهٔ پاول هورن ص ۶۶. ۱۲. رک: موید ۲: ۱۶۴، فرهنگ معین ۳: ۳۶۲۵.
13. رک: ادات و موید ایضاً.
14. رک: فرس نسخهٔ پاول هورن ص ۶۷ لک بن لک باشد و لکا باشد الخ.
15. نسخهٔ اصل: بسر مانده. ۱۶. فرس ایضاً: در دستهای کارد بکار برند.

لورک[1] : کمان نداف ، و بواو عربی نیز گویند و تیر[2] نیز مراد باشد و این[3] بعضی مراد داشته اند .
لاک[4] : همان لک که بدان هر چیزی رنگ کنند [ورق ۱۹۲ ا] و کاسه[5] .
لشک : پاره پاره .
لیتک[6] : ضعیف .
لنبک[7] : نام مردی که سقا بود .

بهرهٔ 'گ'

لگ[8] : بند و زنخ ولت .
لکلگ[9] : پرنده ایست معروف .

بهرهٔ 'ل'

لکل[10] : امرود[11] ، بتازی مرود[12] گویند .

بهرهٔ 'ن'

لیان[13] : تابش و فروغ دهنده بود[14] که از پس یکدیگر همی درفشد[15] .
لگن[16] : مثل طبقی بزرگ راست می کنند دیوارش بلند از سیم و یا از زر و جز آن ، و طشت[17] و شمع از هرچه باشد .

---

۱ رک : قواس ص ۱۸۱ .   ۲ نسخهٔ 'ل' : سره ، موید ۲ : ۱۶۴ : شتبیر ، فرهنگ معین ۳ : ۳۶۳۷ : لورک کمان حلاجی و نوعی از تیر پیکان دار .
۳ نسخهٔ 'ل' : این را ندارد .
۴ رک : قواس ص ۱۸۷ (فقط معنی اوّل) ؛ موید ۲ : ۱۶۳ ، هر دو معنی بحوالهٔ زفان نوشته .
۵ رک : موید ۲ : ۱۶۴ و جهانگیری ۲ : ۱۴۰۱ .
۶ جهانگیری ۲ : ۲۳۳۹ و فرهنگ معین ۳ : ۳۶۶۴ : لیتک بی سروپا و مفلس و بی چیز .
۷ جهانگیری ۲ : ۱۸۹۷ : لنبک نام سقائی است کریم که در زمان بهرام گور بود و مهمانی بهرام کرده ، رک : شاهنامه ۷ : ۲۱۲۲ (حاشیهٔ جهانگیری) .   ۸ رک : موید ۲ : ۱۶۴ .
۹ ادات : لکلگ (هر دو کاف فارسی) و موید ۲ : ۱۶۴ کاف اوّل عربی .
۱۰ موید ۲ : ۱۶۶ لکل امرود و بتازیش مرود .   ۱۱ نسخهٔ اصل : مرود .
۱۲ رک : فرهنگ معین ۳ : ۴۰۶۹ .   ۱۳ رک : ادات و موید ۲ : ۱۶۷ .
۱۴ 'بود که' در نسخهٔ اصل نیامده .   ۱۵ موید : درخشد .
۱۶ رک : ادات و موید ۲ : ۱۶۷ .   ۱۷ کذاست در اصل ؛ موید : و آنرا طشت شمع نیز نامند .

لادن[1] : جنسی است از معجونات عطریات[2] مانند دوشاب سیاه[3] و خوشبوی و گویند آن عنبر اصلی[4] است که جنسی از عنبر است و گویند لادن مشکی است.

لشن[5] : لخشان[6].

لعفتان[7] : لعبتان[8] دختر گان.

لوهنین[9] : آنچه بدان دانهٔ پنبه کشند.

لان[10] : گوی باشد در زمین و در هر چه افتد.

لمغان[11] : نام شهری است نزدیک غزنین.

بهرهٔ 'ه'

لنبه[12] : مردم فربه.

لویشه[13] : غلهٔ کوفته.

لکانه[14] : عصیب و زدیج[15].

لوره[16] : سیلاب کند و زمین گو شده.

لتره[17] : دریده و پاره پاره و کیسه[18].

لامه[19] : چیزی که از بالای سر تا دم بپیچند[20] و این پوشش را لامک نیز گویند.

---

[1] موید ۲ : ۱۶۶ امعنی لادن بگفتهٔ زفان آورده. [2] موید : عطر.

[3] نسخهٔ اصل : وسیاه و خوشبوی از معجونات. [4] موید : نعلی ، برهان عسلی.

[5] فرهنگ معین ۳ : ۳۵۸۸ لشن نرم ولغزنده. [6] لخشان بمعنی لغزان (ایضاً ۳۵۷۵)

[7] رک : لعفت درہمین فرہنگ. [8] نسخهٔ 'ل' : لعبت.

[9] رک : موید ۲ : ۱۶۷. [10] ایضاً ۱۶۶.

[11] ایضاً ، وحدود العالم ص ۲۸ و چہار مقاله ، مقالهٔ اوّل. [12] رک : صحاح ص ۲۸۹.

[13] رک : ادات و موید ۲ : ۱۶۹ ؛ اما برہان ۱۹۰۹ ، سرمهٔ سلیمانی ۲۲۵ ، فرہنگ جعفری ۲۱۴ لوبشه درین معنی. [14] صحاح ص ۲۸۹ ، ادات : لکانه بمعنی عصیب وجگر آگنده . جہانگیری ۲ : ۱۵۴۷ لکامه و لکانه ہر دو بمعنی عصیب و آلهٔ تناسل ، اما ابیات توضیح لکانه دارند نه لکامه.

[15] کذاست در اصل . درہمین فرہنگ روتج و رودیج بہمین معنی ؛ سلیمانی ۱۲۵ زدیج.

[16] رک : صحاح ص ۲۸۹ ، درموید ۲ : ۱۶۹ بگفتهٔ زفان معنیش آورده.

[17] رک : صحاح ایضاً و موید ایضاً. [18] نسخهٔ اصل : رسکینه.

[19] نسخهٔ اصل : لامنه اما جہانگیری ۱ : ۴۸۴ لامه و لامک چارگزی را گویند که بربالای دستار به پیچند. [20] اصل بپیچد.

لابه[1]: بازی[2] کردن و چاپلوسی و خوشی و چیزی است که از[3] بالای سر تا دم بپیچند یعنی لامه.

لانه[4]: کاہل و بیکار.

لخشه[5]: شعلهٔ آتش و سرشک آن.

لوشانه[6]: چرب و شیرین و فریبش[7] و فروتنی و فروتنی کردن، و بعضی بواو پارسی گویند و بلغتی بسین مهمله است.

لاله: گلی است درکسار باشد چون سرخ[8].

لغونه[9]: آرایش.

لادنه[10]: گیاهی است که بهندوی رانتی[11] گویند.

لاغیه[12]: درختی است که آب او بالای آن بتدریج فرود آید و جمع شود.

لوزینه[13]: طعامی است معروف.

لبیسه[14]: دهانه که اسب را کنند.

بهرهٔ ی

لای[15]: خلاب و خلیش و آب باران که در کوچه ها روان شود، و جامهٔ چینی از ابریشم تنک و رنگین.

---

[1] رک: صحاح ص ۲۸۹، و ادات و موید ۲: ۱۶۸. [2] برای این معنی رک: جهانگیری ۱: ۴۷۰.

[3] همین است در موید. و نیز رک: صحاح ص ۲۸۹ لابه بمعنی دستار بالای دستار. ممکن است این معنی بر بنای غلط خوانی لامه باشد. [4] رک: صحاح ایضاً.

[5] رک: موید ۲: ۱۶۹.

[6] فرس ص ۴۹۶، قواس ص ۱۴۶، صحاح ص ۲۸۹: لوسانه بمعنی چاپلوسی کردن، موید ۲: ۱۶۹: لوشابه، برهان ص ۱۹۱۳ لوشابه و لوسانه را مترادف نوشته. اما اصل کلمه لوسانه است که از لوس ساخته شده و لوس بمعنی فروتنی و چرب زبانی و فریفتن و لانه کردن است، رک: صحاح ص ۱۹۶.

[7] کذا است در اصل؛ ظاہراً فریفتن درست است. [8] کذا است در نسخهٔ اصل و 'ل': چوشه سرخ.

[9] رک: قواس ص ۱۸۶، موید ۲: ۱۶۹.

[10] در موید ۲: ۱۶۸ معنی لادنه بحوالهٔ زفان آورده؛ جهانگیری ۱: ۴۷۵ لادنه گیاهی است که از پوست ساق آن ریسمان سازند، در هندوستان سن گویند.

[11] کذا است در موید. [12] رک: فرهنگ معین ۳: ۳۵۳۰، لاغیه مترادف لبانه رک: ۳: ۳۵۵۶.

[13] رک: موید ۲: ۱۶۹.

[14] موید ایضاً لبیشه و لبیسه هر دو دارد.

[15] رک: قواس ص ۲۶ و ۱۵۳، اما موید ۲: ۱۶۹ لای را ذیل فصل عربی آورده.

لاینی[1] : جامهٔ سوزنی که درویشان و صوفیان را باشد.

لوری[2] : پیسی یعنی [ورق ۱۹۳] جذام، و بواو پارسی نیز گویند

لولی[3] : مطرب و کوچه گرد.

لوئی[4] : گردون بازی.

گونهٔ 'م'

بهرهٔ 'الف'

مروا[5] : فال نیک زدن.

مرغوا[6] : فال بد زدن.

مانا[7] : پنداری و مگر.

مینا[8] : شیشه.

بهرهٔ 'ب'

مکیب[9] : باز داشتن[10]، از راه کژ کردن یعنی از راه کژ بردن، چنانکه گویند از راستی بکژی یا بجای دیگر فلان را مکیب یعنی مکش.

بهرهٔ 'ت'

ماست[11] : یعنی جغرات، دگویند آنچه جغرات بد و بسته شود، نیز علک رومی[12] را ماست گویند.

---

[1] نسخهٔ اصل : لائی، رک : موید ۲ : ۱۶۹، جهانگیری ۱ : ۲۸۸ ؛ درحاشیهٔ جهانگیری مثالها از قصص قرآن، سورآبادی ص ۲۵۳ وکشف الاسرار ۱ : ۷۶۱ آورده. [2] رک : قواس ص ۱۶۴، موید ۲ : ۱۷۰.

[3] رک : موید ۲ : ۱۷۰. [4] درقواس ص ۱۸۸ و زفان (گونهٔ 'ه') هیلوی : گردون بازی.

[5] رک : قواس ص ۱۹۳، ادات، موید ۲ : ۱۷۱. [6] ایضاً. برای این دو واژه بیت زیر از معزی شاهد آمده : آری چو پیش آید قضا مروا شود چون مرغوا ؛ جای شجر گیرد گیا جای طرب گیرد شجن

[7] برهان ص ۱۹۴۹ : مانا گوئی و پنداری (و مانند).

[8] درجهانگیری ۲ : ۲۳۴۶ - ۴۷، برهان ۲۰۸۲ مینا بمعنی آبگینه و آبگینهٔ الوان و کیمیا ؛ اما ادات بمعنی سبز آورده ؛ موید ۲ : ۱۷۱ مینا را ذیل عربی بمعنی شیشه بحوالهٔ قنیه آورده.

[9] ادات : مکیب بابای فارسی یعنی از راستی بکژی مبر و بکژی مکش و از راه بی راه مبر و بی راه مرو، نیز رک : موید ۲ : ۱۷۳. [10] نسخهٔ اصل : باز داشتن است.

[11] رک : ادات و برهان ص ۱۹۴۱. درموید ۲ : ۱۷۴ معنیش بحوالهٔ زفان نوشته.

[12] رک : موید و برهان.

مست[1] : مشنگ زیر زمین که هندوی موتهه[2]، گویند کچور[3] است ، و بعضی بشین[4] معجمه گویند.

مفت[5] : اسیر و زیردست.

بهرهٔ ج

مشنج[6] : مگسی که برگوشت نشیند و تباه کند، و بضم میم نیز گویند.

منج[7] : نحل[8] انگبین و گویند زنبور[9] و ریوند و آن داروئی است.

مج[10] : راوی یعنی آنکه روایت کند و نام راوئی[11].

بهرهٔ چ

ملچ[12] : ریوند[13] و آن گیاهی است ، مستی آرد.

مغلاچ[14] : گوبازی و گویند گوی که درو جوز بازند یعنی خطف[15] ، ولغتی جیم[16] عربی است.

بهرهٔ خ

مخ[17] : زنبور و لگامی که برسر اسب سرکش بنهند تا نرم شود و گویند لگامی است سنگین که اسبان و شتران بی فرمان راکنند.

ماخ[18] : مرد احمق و منافق و سیم نبهره[19].

---

[1] رک : ادات و موید ۲ : ۱۷۴ و جهانگیری ۱ : ۱۳۲۴.

[2] رک : ادات و جهانگیری ؛ موید : موتهه ، و این اشتباه است.

[3] کذاست در نسخهٔ اصل ؛ اما در نسخهٔ 'ل' نیامده. [4] رک : موید و جهانگیری.

[5] رک : موید ۲ : ۱۷۴. [6] ادات و موید ۲ : ۱۷۵.

[7] نسخهٔ اصل : مسنج ؛ اما رک : فرس ص ۵۸ ، قواس ص ۶۶ ، صحاح ص ۴۷ ، ادات ، موید ۲ : ۱۷۵ ، برهان ص ۲۰۳۸.

[8] نسخهٔ 'ل' : کل. [9] برهان و جهانگیری منج بالضم بمعنی زنبور و بالفتح بمعنی ریوند.

[10] رک : موید ۲ : ۱۷۵ و برهان ص ۱۹۶۶-۶۷. [11] نام راوی شعر رودکی ، رک : جهانگیری ، برهان ، سلیمانی وغ.

[12] رک : ادات و موید ۲ : ۱۷۵ ، برهان ص ۲۰۳۱. [13] این مترادف فقط در ادات است.

[14] رک : قواس ص ۱۸۸ ، ادات ، موید ۲ : ۱۷۵ ، جهانگیری ۲ : ۱۴۲۴. [15] نسخهٔ 'ل' : حطن.

[16] قواس و جهانگیری و برهان : مغلاچ و مغلاغ ، ادات : مغلاچ ، موید مغلاج و مغلاچ هردو.

[17] برای معنی دوم رک : قواس ص ۱۷۶ ؛ اما برای هردو معنی رک : ادات ، جهانگیری ۱ : ۷۷۱ ، موید ۲ : ۱۷۶ ، برهان ص ۱۹۷۲.

[18] رک : صحاح ص ۶۹ ، ادات ، موید ۲ : ۱۷۶ ، جهانگیری ۱ : ۴۸۹.

[19] نبهره بمعنی ناسره ، رک : فرهنگ معین ۴ : ۴۶۶۸. نسخهٔ 'ل' : بی بهره.

ملخ[1]: سنگ فلاخن.

بہرهٔ 'د'

مرداد: آفتاب[2] در اسد و ہشتم[3] روز از ماه.
مند[4]: خداوند چیزی که با او مرکب شود چنانچه دولتمند و حاجتمند.
موبد: دانشمند[5] و دیردار و حاکم مغان.
میزد: مجلس[6] خانه و عشرتگاه و مهمانی، و در فردوسی[7] است: مهمان خانه.
مستمند: حاجتمند و غمگین.
مانید[8]: بمعنی ماند.
مورد[9]: درختی است که بهندوی مورنو[10] گویند.
مد[11]: ششم روز از ماه.

بہرهٔ 'ر'

مهر[12]: آفتاب و آفتاب در میزان، و آن را مهرماه گویند، و شفقت و عشق، و سنگ[13] سرخ، و شانزدهم[14] روز از ماه.
مر[15]: حساب، و گویند که حساب گذشته را گویند.

---

[1] کذاست در موید ۲: ۱۷۶؛ اما جهانگیری ۲: ۱۶۶۹، برہان ص ۲۰۳۱: بلخ سنگ فلاخن.
[2] جہانگیری ۱: ۱۱۴۹ ستون اوّل سطر سوم.
[3] در زفان گویا ہمین است چنانکه از موید ۲: ۱۷۸ برمی آید، اما این غلط است، رک: جہانگیری ۱: ۱۱۴۹، ترجمهٔ آثار الباقیه ص ۲۵۰، مرداد ہفتم روز از ماه ہست.
[4] این فقط در مرکبات بطور پسوند آید، لفظ جداگانه نیست.
[5] موید ۲: ۱۷۹ ہمین معنی بحوالهٔ زفان نوشته، رک: قواس ص ۸۷.
[6] برای این دو معنی رک: قواس ص ۱۲۷. [7] رک: موید ۲: ۱۷۹.
[8] رک: موید ۲: ۱۷۸.
[9] رک: جہانگیری ۲: ۲۱۰۲، برہان ص ۲۰۴۹ - ۵۰.
[10] این نام در فرہنگہا ندیدم. [11] رک: برہان ص ۱۹۷۵.
[12] رک: ادات، موید ۲: ۱۸۴، برہان ص ۲۰۶۱ - ۶۲. [13] رک: موید و برہان.
[14] ایضاً.
[15] فرہنگ معین ۴: ۳۹۷۶ مر شماره و حساب، ادات: عدد و شمار، نیز رک: موید ۲: ۱۸۱، جہانگیری ۱: ۱۱۴۶.

مندور[1] : [ورق ۱۹۴] غمگین[2].

مناور[3] : شهریست نزدیک ختن[4].

مرغزار : آنجاکه سبزه رسته باشد.

مهار[5]: چوبی که در بینی شتر کنند و برو ریسمان بربندند یعنی بینی بند شتر.

ماخور[6]: خرابات.

مستار[7] : داروئی است و آن را مروه[8] نیز گویند.

مایندر[9] : زن پدر.

بهرهٔ 'ز'

مرز : زمین رانده[10] وکشت[11] و آبادان[12].

مُرز[13]: مخرج آدمی وجز آن یعنی کون.

ماز[14]: شکاف که در وی چیزی افتد از چوب، در دیوار و مانند آن.

مهاز[15]: سیخ آهن بود که درون جناغ[16] محکم کنند[17] تا چون رکاب زنند اسب برون جهد و روان شود و این را مهمیز[18] نیز گویند.

میز[19]: اسباب مهمانی، گویند[20] میزبان یعنی مهمانی[21] دارنده.

---

[1] موید ۲ : ۱۸۴ ، جهانگیری ۲ : ۱۹۰۴-۵ : مندور مغلوک ، بی دولت و سیاه بخت. [2] صحاح ص ۱۱۶ : مندور غمگین. [3] رک : فرس ص ۱۳۷ ، ادات ، موید ۲ : ۱۸ ، جهانگیری ۲ : ۱۹۰۱ ، برهان ص ۲۰۳۷. [4] فرس: چین. [5] رک : برهان ص ۲۰۵۹.

[6] رک : موید ۲ : ۱۸۲ ، برهان ص ۱۹۳۳. [7] رک : جهانگیری ۱ : ۱۳۲۵ ، برهان ص ۲۰۰۷.

[8] کذا است در اصل و جهانگیری اما موید ۲ : ۱۸۳ : مرد. [9] برهان ص ۱۹۳۴ : مادندر بدین معنی.

[10] رک : قواس ص ۳۳. [11] ایضاً ص ۵۴.

[12] رک : موید ۲ : ۱۸۵ ، اما صحاح ص ۱۳۲ : مرز سرحد. [13] قواس ص ۸۶.

[14] صحاح ص ۱۳۲ : ماز اوّل شکاف باشد در دیوار دوم شکنج باشد که در چوب افتد و مانند آن.

[15] رک : برهان ص ۲۰۶۹. [16] جناغ : دامن زین ، جهانگیری ۲ : ۱۷۹۵ ، زفان : زیر رکاب.

[17] نسخهٔ 'ل' : کنند. [18] رک : برهان ایضاً.

[19] رک : موید ۲ : ۱۸۵ ، برهان ص ۲۰۷۶. واژهٔ 'میزد' بهمین معنی است ، رک : ادات و برهان.

[20] نسخهٔ 'ل' : گویند ندارد. برهان 'میز' بمعنی میزبان نیز آورده ، رک : ایضاً.

[21] نسخهٔ 'ل' : مهمان.

موز : میوه ایست که بتازی طلع و بهندوی کیله گویند.

مهوز[1] : گیاهیست که آنرا[2] بتازی بزاق القمر[3] گویند.

بهرهٔ 'ژ'

مژ[4] : ابرو تاریخ را گویند یعنی آنکه هوا را تاریک کند، و مژهٔ[5] چشم، و از اتباع کژ[6] است، گویند کژ و مژ[7] آنکه هر بار کژ گردد.

مژمژ[8] : خرمگس.

بهرهٔ 'س'

مس[9] : پای بند بچیزی که از آن جای بسبب آن[10] نتوان رفت.

مهراس[11] : هاون.

مرس[12] : نام مغنی است.

مترس[13] : چیزی است که در حصارها می بندند در وقت جنگ.

بهرهٔ 'ش'

منش[14] : طبع و همت.

منیوش[15] : مشنو.

---

[1] کذا است در اصل ؛ اما در موید ۲ : ۱۸۵ : مهوز ، برهان ص ۲۰۷۰ : مهور ، دکتر معین این را تصحیف مهو (عربی) می داند چنانچه بیرونی در جماهیر آورده (حاشیهٔ برهان). در موید ذیل 'ر' (فصل فارسی) آمده بدین شرح : مهور گیاهی است که وقتی ماه در نقصان باشد آنرا بگیرند و آن در زمین عرب بود بتازیش بزاق القمر و بساق القمر و زبد القمر نامند کذا فی زفان گویا ، در نسخهٔ موجود این فرهنگ کلمهٔ مهور شامل نیست.

[2] نسخهٔ 'ل' آنرا ندارد. [3] بیرونی : بصاق القمر و زبد القمر ، زفان ذیل بصاق القمر بزاق القمر و بساق القمر و زبد القمر آورد ، فارسی مهوز . برهان : بساق القمر ، بصاق القمر ، بزاق القمر ؛ بیرونی آنرا حجر ابیض گوید. [4] رک : موید ۲ : ۱۸۵ و برهان ص ۲۰۰۳. [5] ایضاً.

[6] نسخهٔ 'ل' : گذشت. [7] برهان : کژ و مژ کج و مج نقیض راست.

[8] رک : قواس ص ۶۷ ، موید ۲ : ۱۸۵. [9] رک : قواس ص ۱۰۱ ، زفان مس و بامس هر دو دارد نیز رک : قواس ص ۱۰۱ ، ح ۱۴. [10] نسخهٔ اصل : 'آن' ندارد.

[11] رک : ادات و جهانگیری ۲ : ۲۱۹۸. [12] رک : قواس ص ۲۰۰ ، ادات ، موید ۲ : ۱۸۶.

[13] رک : موید ایضاً و برهان ص ۱۹۶۶. [14] رک : موید ۲ : ۱۸۷ ، برهان ص ۲۰۴۲.

[15] فعل نهی از مصدر نیوشیدن یعنی شنیدن ، رک : موید ایضاً ، برهان ص ۲۰۴۷.

بہرۂ غ

میغ : ابر.
مارغ[1] : مرغی است سیاه وام بیشتر در آب نشیند.
مغ[2] : طایفۂ آتش پرست و[3] محرم خواه و شراب[4] فروش.
مرغ[5] : سبزه و رستینه، گویند مرغزار یعنی سبزه زار.
مغ[6] : گو و ژرف.

بہرۂ ک

مشلک[7] : بیخ گیاهی است که موتھ[8] گویند.
مینک[9] : گیاه جاروب.
مانورک[10] : قبره[11] و آن پرنده ایست معروف، مانوک[12] نیز گویند.
مشکنک[13] : جانوریست همچو[14] کبک، و در فرهنگ نامه است : مشکنک بکسر جانوریست[15] خرد که کرمی[16] می برد.
مک[17] : زوبین و گویند گونۂ از زوبین است و [امراز[18]] مکیدن یعنی [ورق ۱۹۵] مزیدن.
مغاک : گو زمین و در هرچه[19] گو افتد چنانکه سینه و جز آن که مغاکچه[20] گویند.
میزک[21] : بول بود.

---

[1] رک : ادات و موید ۲ : ۱۸۹، سلیمانی ۱۴۴ نوعی از مرغابی. [2] رک : صحاح ص ۱۶۵، ادات، موید ۲ : ۱۹۰.
[3] رک : موید، در فرهنگهای دیگر این معنی نیافتم. [4] رک : ادات و موید.
[5] رک : موید ایضاً. [6] رک : موید ایضاً، جهانگیری ۲ : ۱۴۴۳، برہان ص ۲۰۲۰.
[7] رک : ادات. [8] رک : ادات ؛ همین کلمه زیر واژۂ 'مست' در همین فرهنگ آمده. نسخۂ 'ل' : موتھ ندارد
[9] رک : قواس ص ۵۷.
[10] قواس ص ۶۰ : چنوک و مانورک : قبره، رک : چنوک در همین فرهنگ.
[11] نسخۂ 'ل' : فره. [12] رک : موید ۲ : ۱۹۲، برہان ۱۹۵۱.
[13] نسخۂ 'ل' : مسکنک. رک : ادات و برہان ص ۲۰۱۵. [14] در نسخۂ اصل همچو کبک نیامده.
[15] نسخۂ 'ل' : در فرهنگنامه جانوری خرد مانند کبک. [16] نسخۂ اصل : کرمی است که.
[17] رک : ادات و موید ۲ : ۱۹۳. [18] 'امراز' نسخۂ اصل ندارد.
[19] برہان ص ۲۰۲۱ : مغاک بمعنی گودال است خواه در زمین خواه غیر زمین. [20] نسخۂ 'ل' : معالچه
رک : دستور ۱۸۰ الشتره مغاکچه اسینه. [21] رک : موید ۲ : ۱۹۳، برہان ص ۲۰۷۷.

بهرهٔ 'گ'

مانگ[1]: ماه یعنی ماهتاب.

منگ[2]: اندام شکستن و فاژه، و قمار[3] و دزد و راه‌زن و منگل[4] و منگه بهانیز گویند فاژه اندام.

منجک[5]: آن بود که بازیگران چون قلم از دوات و سنگ از طاس[6] بدو برجانند.

مجگ[7]: بیگار بود و سخره[8] یعنی بیغاره و سخره باشد، چه بقهر چه بخوشی.

مدنگ[9]: پرهٔ قفل یعنی دندانهٔ[10] کلیدان.

مشتنگ[11]: دزد و راه[12]زن و بضم میم نیز گویند.

مشنگ[13]: غله ایست، بهندوی کلاو[14] گویند.

مستنگ[15]: قمار و گویند قمارباز باشد، و گویند دزد و راهزن و رند.

بهرهٔ 'ل'

مل: شراب و نبید.

منگل[16]: دزد و راهزن.

مشنگل[17]: دزد و راهزن.

مالول[18]: غلام بزرگ بمرتبه یعنی گلوبند [ه].

---

[1] رک: قواس ص ۱۴.   [2] قواس ص ۱۶۰: منگ فاژه واندام شکستن.

[3] برای این دو معنی رک: موید ۲: ۱۹۳.   [4] نسخهٔ اصل: وشکل و منکه، منگل بمعنی دزد.

[5] رک: ادات و موید ۲: ۱۹۲ و برهان ص ۲۰۳۹.   [6] نسخهٔ 'ل': طاووس.

[7] رک: فرس ص ۲۷۸؛ قواس ص ۱۰۲ و صحاح ص ۲۰۱: مجگ بیگار و سخره بود چه بقهر و چه بخوشی.

[8] نسخهٔ اصل: سخن.   [9] رک: قواس ص ۱۲۶؛ نسخهٔ 'ل': قفل تا آخر محذوف.

[10] برهان ۱۹۷۶ دندانهٔ کلید و پرهٔ قفل.

[11] رک: ادات و موید ۲: ۱۹۳.   [12] در نسخهٔ اصل هرجا دزد راهزن بدون واو.

[13] رک: ادات و موید ۲: ۱۹۳ در اکثر فرهنگها بمعنی دزد و راهزن نیز آمده، رک: صحاح ص ۲۰۲، ادات، برهان ص ۲۰۱۷. در نسخهٔ دیگر صحاح 'درد و محن' نتیجهٔ غلط خوانی است، رک: حاشیهٔ برهان و حاشیهٔ صحاح.

[14] رک: موید ۲: ۱۹۳ (گاو غلط چاپی).   [15] کذاست در اصل؛ گویا ذیل مستنگ معنی های منگ و مشتنگ جمع شده.

[16] رک: ادات و صحاح ص ۲۱۱.   [17] رک: رشیدی، بظاهر مشنگل مصحف شنگل باشد، (شنگل بمعنی درد، صحاح ص ۲۱۱). برهان ص ۲۰۱۷: مشنگک بمعنی دزد و راهزن.   [18] این واژه بشکل مالول و ماکول هر دو آمده؛ مثلاً موید ۲: ۸۹۵ و جهانگیری ۱: ۵۰۰ و رشیدی: مالول کذاست در متن؛ اما فرس ص ۳۱۶، صحاح ص ←

مندل[1] : خط که معزمان کشند یعنی خط عزیمت .

مرغول[2] : زلف پیچیده و نشاط .

منبل[3] : بد اعتقاد ، و گویند من اورا منبلم[4] یعنی معتقد نیستم .

بهرهٔ م

ملغم[5] : مرهم .

مرهم[6] : خسته بند یعنی پتّی[7] که بر شکسته بندند .

مریشم[8] : چیزیست که بتازی اورا غراء[9] گویند .

بهرهٔ ن

مهرگان[10] : شانزدهم روز مهرماه یعنی آفتاب در میزان ، و آن روز جشن مغان است ، بتعریب مهرجان[11] گویند .

مرزبان[12] : زمین دار و شهردار که شهریار گویند .

موژان[13] : چشمی خوب و نیکو که بلطافت اندک متحرک بود و خواب آلوده باشد .

میهن[14] : پسر و خانمان و جای زاد بود و خوش خبر[15] و مسکه آن که ازان روغن شود ، و در فرهنگنامه بشر[16]

← ۲۱۰ ، ادات : ماکول ، برهان ماکول و مالول هردو ؛ همچنین در معنی هم اختلاف است ، بعلاوه غلام بزرگ مرتبه ، بمعنی رسن و بسیار خوار آورده اند ، و این هم تصحیف خوانی الفاظ است ؛ مثلاً گلوبند که بمعنی غلام بزرگ مرتبه (گلو بمعنی بزرگ) است به گلوبند تبدیل کرده اند . رک : برهان قاطع ۱۹۲۵ حاشیه ۲ .

[1] ادات : مندل خط مدور که اصحاب عزیمت کشند. [2] ادات فقط معنی اوّل دارد . موید ۲ : ۱۹۶ معنی دوم بحوالهٔ زفان آورده ؛ جهانگیری ۱ : ۱۱۵۹ برای معنی دوم این بیت شاهد آورده :

آن دمی کو سخن سکرهٔ مرغول کند ✣ از خجالت زتن سکره بگشاید خوی

[3] رک : موید ۲ : ۱۹۶ ، برهان ص ۲۰۳۷ . [4] همین مثال در هردو فرهنگ آمده . [5] رک : قواس ص ۱۸۵

[6] رک : موید ۲ : ۱۹۶ . [7] در نسخهٔ اصل از یعنی تا آخر افتادگی دارد ؛ اما رک : موید (ذیل عربی) .

[8] جهانگیری ۱ : ۱۱۶۱ : مریشم خسته بند را گویند و آن چیزی باشد که بر جراحت بندند .

[9] نسخهٔ 'ل' : غراو ؛ دستورالاخوان ۴۵۴ الغراو سریشم ؛ رک : قواس ص ۱۷ . برهان ص ۲۰۶۵ - ۶۷ .

[10] جهانگیری ۲۱۹۹ مهرگان مهر روز از مهرماه باشد و آن روز شانزدهم است .

[11] برهان : مهرجان . [12] رک : قواس ص ۳۳ . [13] رک : ایضاً ص ۸۰ .

[14] قواس ص ۹۸ : میهن پسر بود . [15] نسخهٔ اصل : خوش خبر ؛ اما در موید ۲ : ۲۰۳ : خوش خوی .

[16] موید این معنی را بحوالهٔ زفان آورده ، بظاهر تصحیف پسر باشد .

میتین[1] : کلند و آن تبریست که بدان جاہا و زمینہا کنند و کلنگ[2] خوانند ، و بسل را نیز میتین گویند.

ماکیان : مرغ خانگی.

من : انبار[3] چیزی یعنی توده و کنایه از خود.

مازون[4] : چیزیست که بهندوی[5] مائین گویند و آن میوه[6] درخت گز است.

مازریون[7] : گیاہی است [ورق ۱۹۶] که اطبا کار بندند و آن بعضی مور[8] ذ زرد را گویند و بعضی سپید دام را گویند.

مایون[9] : نام علتی[10] است.

مان[11] : مارا بگذار یعنی امر از گذاشتن ، و اسباب درخت و توابع[12] ، و درین معنی این کلمه را با خان استعمال کنند ، خان و مان.

بهرهٔ و

ماشو[13] : تنک[14] بیز و گلیم[15].

مازو[16] : چوبکی که درمیان پشت بود و چوبکی که بدان کشت[17] ماله دهند ، و نام داروئی[18] که بدان جامه رنگ کنند.

مینو : بهشت.

---

[1] رک : کلند و کلنگ ہمین فرہنگ ص ۲۷۰ ، ۲۸۱. [2] نسخهٔ اصل : کلند.

[3] رک : موید ۲ : ۲۰۲.

[4] رک : موید ۲ : ۲۰۰ ، جہانگیری ۱ : ۴۹۶ ، برہان ص ۱۹۴۱ مازون و مازو را دریک معنی مترادف دانند.

[5] موید بحوالهٔ زفان آورده اما این واژه افتادگی دارد . نسخهٔ 'ل' : من انبار چیزی که بهندوی مائین گویند الخ.

[6] نسخهٔ اصل 'میوه' ندارد.

[7] رک : موید ۲ : ۲۰۰ ؛ چنانچه در موید آمده ، از ہدایة المتعلمین نیز برمی آید که مازریون در مرض استسقا مفید است ، رک : ص ۴۵۷ ، ۴۵۸ وغیره.

[8] رک : موید ایضاً . و نیز ہدایة المتعلمین ص ۸۵۸ .

[9] در ہمهٔ فرہنگها مانند ادات و موید ۲ : ۲۰۰ و جہانگیری ۱ : ۵۱۰ ، و برہان ص ۱۹۶۴ : مایون نام گاو فریدون.

[10] کذاست در اصل ؛ و این اشتباه است ، علتی تصحیف گاوی.

[11] رک : موید ۲ : ۲۰۰ و جہانگیری ۱ : ۵۰۱ مان بمعنی بگذار و خانه و اسباب خانه آورده .

[12] رک : موید ایضاً.

[13] رک : ادات و موید ۲ : ۲۰۳. [14] جہانگیری ۱ : ۴۹۷ : ماشو غربال باشد و تنک بیز نیز گویند.

[15] رک : سرمهٔ سلیمانی ۲۲۴. [16] رک : قواس ص ۸۴ مازو : چوبک پشت .

[17] رک : جہانگیری ۱ : ۴۹۱ ، موید ۲ : ۲۰۳ ، نیز رک : فرہنگ معین ۳ : ۳۷۰۷. [18] رک : موید ایضاً.

ماکو[1] : از ساز جلاهگان[2] است که بتازی آنرا قلهم[3] گویند.

مرو[4] : گل کبود است بر سر شاخ نبات و آن دو بسته شکوفه است.

بهرهٔ 'ه'

موسه[5] : زنبور، و بضم میم نیز گویند.

مخنده[6] : خزنده یعنی حشرات زمین.

ملاژه[7] : بازای پارسی، گوشت اندرون حلق آویخته یعنی کام دهان و گویند که بن زبان[8] باشد، و بعضی بکسر میم گویند.

میره[9] : خواجه، و میر نیز گویند.

مزره[10] : چراغدان و بعضی مرزه[11] رای دوم معجمه گویند.

مسته[12] : طعمه شکره یعنی خورش شکره.

میلاوه[13] : شاگردانه[14] و مژدگانی و نودارانی[15].

میانه[16] : جوهر بزرگ که آنرا بتازی واسطة العقد گویند.

مرسله[17] : گلوبند.

ماشه[18][19] : انبر آهنگران و زرگران که بدان انگشت بردارند، هندوی سنداسی گویند[20].

---

[1] جهانگیری ۱ : ۱۴۹۹، برهان ص ۱۹۲۵ : ماکو دست افزار جولاهگان برای جامه بافی.

[2] هر دو نسخه : جاهگان، اما این غلط است، متن برطبق جهانگیری و برهان و فرهنگ معین.

[3] نسخهٔ اصل : قلهم، 'ل' : ملهم ؛ متن برطبق دستور الاخوان ص ۲۷۹ که قلهم مترادف ماکو نوشته.

[4] برهان ص ۱۹۹۶ : مرو گیاهی باشد خوشبوی که آنرا مرو خوش گویند.

[5] رک : قواس ص ۶۶، دستور ص ۲۲۵.

[6] رک : قواس ص ۶۵.

[7] رک : قواس ص ۸۳.

[8] رک : موید ۲ : ۲۱۰.

[9] رک : ادات و موید ۲ : ۲۱۱.

[10] رک : قواس ص ۱۴۰ و موید ۲ : ۲۱۰.

[11] رک : موید ایضاً، برهان ۱۹۸۸.

[12] رک : قواس ص ۱۴۵.

[13] رک : صحاح ص ۲۹۰، ادات، موید ۲ : ۲۱۱.

[14] نسخهٔ 'ل' : 'جوهر بزرگ' افزوده و آن معنی داژه بعد است.

[15] نسخهٔ اصل : نودرانی ؛ ادات : نودارانی مژدگانی و عطا. وصحاح ص ۱۲۹۱ : نودارانه بمعنی شاگردانه و میلاوه.

[16] رک : ادات و موید ۲ : ۲۱۱.

[17] نسخهٔ اصل : موسله، اما رک : ادات.

[18] رک : قواس ص ۱۷۸.

[19] زفان : انبر کلستان یعنی سنداسی.

[20] نسخهٔ 'ل' : 'گویند' محذوف

اشوره[1]: ریسمان که بر دوک رسیده باشد و مانند بیضه گردد، هندوی گلگری[2] گویند، ونام بازئی[3] دیگر هرچیزی که بهم[4] درآمیخته بود.

زیده[5]: نام بازی که آنرا خیزگیر[6] وخیزه گیر وخاک نمک[7] نیز گویند وگیرنده[8] نیز باشد.

رخشه[9]: نحس یعنی شوم.

وسیجه[10]: مرغی است سپید[11] شبیه قمری.

شخنه[12]: حلوائی باشد صافی درشت[13] بتازی آنرا مشاش[14] گویند.

غنده[15]: چیزی بود که براندام درگوشت چو دنبلی[16] برآید.

شغله[17]: فریاد وفتنه وفغان.

ہمہ[18]: برمهٔ درود[19]گران.

راغه[20]: غلتیدن خر و اسب.

ه: معروف که سیارهٔ[21] فلک است.

---

۱ موید ۲: ۲۰۸ که معنی مندرجهٔ متن بحوالهٔ شرفنامه نوشته. اما صحاح ص ۲۸۹ ماشوره و جهانگیری ۱: ۴۹۷ ماشوره بمعنی نی که جولاهگان دارند. ۲ این کلمه در موید آمده.

۳ رک: برهان ص ۱۹۴۳. ۴ رک: ایضاً، ماسور و ماشور نیز بدین معنی آمده.

۵ رک: قواس ص ۱۸۷. ۶ رک: زفان (ذیل خ). ۷ رک: زفان: خاک نمک (ذیل خ).

۸ کذاست در هردو نسخه؛ اما کلمهٔ درست خیزیده است، رک: زفان. ۹ رک: صحاح ص ۲۹۰.

۱۰ نسخهٔ اصل: موشیجه؛ اما صحاح ص ۲۹۰ موسیچه مرغی است سپیدگون مانند قمری.

۱۱ نسخهٔ 'ل': سپید تا آخر افتاده.

۱۲ نسخهٔ 'ل': مشخشه؛ اما صحاح ص ۲۹۰ مشخنه حلوای صابونی که بتازی مشاش خوانند، چنین درچین. نیز رک: فرس ص ۲۷۵، ادات و موید ۲: ۲۱۰، جهانگیری ۲: ۱۴۰۴؛ برهان ص ۲۰۱۳: مشخنه ومشخته هردو.

۱۳ نسخهٔ 'ل': 'درشت ندارد؛ صحاح: نسخهٔ اصل صافی است، رک: حاشیه.

۱۴ نسخهٔ 'ل': مشابه. ۱۵ رک: صحاح ص ۲۹۰، جهانگیری ۲: ۱۴۴۴، برهان ص ۲۰۲۲.

۱۶ کذاست در برهان اما صحاح: دملی. ۱۷ رک: ادات.

۱۸ رک: قواس ص ۱۷۹. ۱۹ موید ۲: ۲۰۱ بحوالهٔ قواس مسته نوشته وآن درست نیست.

۲۰ رک: صحاح ص ۲۹۰، ادات، موید ۲: ۲۰۹، برهان ص ۱۹۸۰ مراغه بمعنی غلطیدن نوشته اند. جهانگیری ۱: ۱۱۴۷ مراغه را عربی دانسته وآن درست است، رک: دستورالاخوان ۵۷۰ المراغه جای غلطیدن ستور، نیز رک: فرهنگ معین ۳: ۳۹۸۳. ۲۱ نسخهٔ 'ل': ستاره.

مازه[1] : چوبک پشت که آنرا پشت مازه[2] گویند یعنی صلب.

مژه : [ورق ۱۹۷] موی[3] پلک ، جمع مژگان آید.

مزه : لذت.

مویه : نوحه و زاری ، گویند مویه گر یعنی نوحه گر.

مژده : بشارت و خبر[4] خوش.

منیژه : نام دختر افراسیاب ، عشیقهٔ بیژن پسر کیخسرو[5].

مجره[6] : آسمان دره.

مته[7] : همان ماهه[8] است.

ماریره[9] : دایه و مادر خوانده.

مازیاره[10] : چیزی است خوردنی.

مسکه : خلاصهٔ شیر که بتازی زبده گویند.

مهینه[11] : بهتر.

ماله[12] : سمهٔ[13] جولاهان باشد که تار جامه را بدان آهار[14] کنند و در مالند از لیف کرده[15].

مایه : ماده[16] و بنیاد چیزی و سرمایه و دستگاه.

منحیده[17] : فرزند عاق و بی فرمان.

---

[1] رک : موید ۲ : ۲۰۸ و جهانگیری ۱ : ۴۹۶ ، مازو ، مازون ، مازن هر سه بدین معنی.

[2] برهان ۲۰۸ پشت مازه و پشت مزه سلک استخوانهای میان پشت عربی صلب.

[3] نسخهٔ اصل : یعنی ؛ اما موید ۲ : ۲۱۰ : موی پلک. [4] نسخهٔ اصل : خوش خبر ؛ اما رک : موید ۲ : ۲۱۰.

[5] این غلط است ، بیژن پسر گیو بود. [6] این عربی است ، رک : فرهنگ معین ۳ : ۳۸۷۵.

[7] رک : ادات ، موید ۲ : ۲۰۹. [8] نسخهٔ اصل : ماه ؛ اما ماهه برمه را گویند.

[9] رک : موید ۲ : ۲۰۸ ، جهانگیری ۱ : ۴۹۵ ، برهان ص ۱۹۳۹.

[10] رک : برهان ۱۹۴۱ ؛ جهانگیری ۴۹۷ مارد یاره.

[11] ادات : مهینه گرانمایه و بزرگترین.

[12] رک : قواس ص ۱۸۳ و ادات. [13] رک : قواس ایضاً.

[14] ایضاً. [15] نسخهٔ اصل : کتف کرده و نسخهٔ ا ل : لیف کرده کرده.

[16] موید ۲ : ۲۰۹ همین معانی بحوالهٔ زفان آورده.

[17] رک : قواس ص ۹۹.

بهرهٔ می

مشکوی[1] : بتخانه و نام قصر شیرین، و گویند کوشک مطلق است، و در رسالهٔ[2] نبشته است: حرم پادشاهان.

مانی : بیای پارسی، نام نقاش[3] که در روم استاد بود، نسبت بدو مانوی آید، گویند ارتنگ مانوی، و آن کتاب نقش است که مانی[4] ساخته است.

مژدگانی[5] : آنکه در شراب[6] نوبت خویش بدوستی[7] ایثار کند و خبر[8] خوش و بشارت که بر کسی رسانند و ازو چیزی[9] بخواهد، آنرا مژدگانی گویند.

میشائی[10] : گیاهی است که بتازی آنرا حی العالم[11] گویند.

موری[12] : ناودان[13].

ماخچی[14] : اسب گذارنده[15] که بتازی برذون[16] گویند، و آن اسب پارسی است، و گویند ترکی ختلی و بعضی گویند: اسب هندوی که پاکوب باشد.

مومیائی[17] : داروئی است نافع و دافع[18] زیادت خون یعنی خون چین.

---

[1] قواس ص ۱۱۸ : کوشک یعنی بتخانه و کوشک شیرین. [2] ادات : حرم پادشاه.

[3] نسخهٔ 'ل' : نقاش چین. [4] نسخهٔ اصل : مانی است که مانی الخ. [5] مژدگانی یعنی اوّل نظر نیامده. درمؤید ۲ : ۲۱۴ این معنی بحوالهٔ زفان آمده. [6] نسخهٔ 'ل' : 'در' ندارد.

[7] ازینجا تا آخر معنی کلمه در نسخهٔ اصل نیامده. [8] در اکثر فرهنگها یعنی انعامی که شنونده به آورندهٔ خبر خوش دهد.

[10] درمؤید ۲ : ۲۱۶ معنی این واژه بحوالهٔ زفان درج است ؛ اما رک : برهان ص ۲۰۷۸ که میشا و میش بهار را نیز بهمین معنی آورده. [11] رک : برهان ایضاً.

[12] رک : صحاح ص ۳۰۸ ؛ مؤید ۲ : ۲۱۵ معنی موری بحوالهٔ زفان نوشته.

[13] نسخهٔ اصل : نانودان. [14] رک : ادات و مؤید ۲ : ۲۱۳ ، جهانگیری ا : ۱۶۹۰ ، برهان ص ۱۹۳۳.

[15] مؤید معنی کلمه اش عیناً همان آورده که در متن است. اما ادات : ماخچی آن اسب از جائی تازی و از جائی ترکی ؛ نیز رک : جهانگیری ص ۱۶۹۰ و برهان ص ۱۹۳۳.

[16] کذ هست در مؤید.

[17] برای این کلمه رک : برهان ، نیز دستور الاخوان ص ۱۰۲ : برذون اسب ماخچی ای ترکی.

[18] مومیائی بدین معنی در هیچیک از کتب مورد استفادهٔ بنده دیده نشد، مومیا و مومیائی داروئی است که در شکسته بندی بکار برده شود یا داروئی که بدان مرده را حنوط کنند. رک : صحاح ص ۳۸ ، مؤید ۲ : ۲۱۵ ؛ برهان ص ۲۰۵۵ ؛ نیز هدایة المتعلمین فی الطب ص ۶۲۸.

[19] نسخهٔ اصل : نافع خون.

مری[1]: داروئی است که آبکامه[2] گویند.

گونهٔ 'ن'

بهرهٔ 'الف'

نیا[3]: خال[4] وجد یعنی پدر پدر و پدر مادر و بزرگ و قدر[5] چیزی.

ناشتا[6]: ناہار، آنکه هنوز چیزی[7] نخورده باشد.

نغوشا[8]: مذهب گبران.

نوا[9]: نام پرده و سرود و نواختن یعنی نوای خنیاگران و بسیار یعنی اسباب و سپاه، و نام مغل، و آنکه کسی را در بر کسی بگرو بگذارند، گویند فلان نواست یعنی نوای آنست.

ناخدا: که بتازی آنرا نوبتی[10] گویند.

بهرهٔ 'ب'

ناب[11]: چیزی خالص یعنی صافی و صرف بی غش و بی عیب، گویند مشک ناب و زهر ناب و نوش ناب[12]، [ورق ۱۹۸] و گوکه[13] در پشت اسپ از فربهی افتد، و بتازی ناب پیشک[14] را گویند یعنی دندان پیش[15] که بهندوی کوچلی[16] گویند.

---

[1] موید ۲: ۲۱۴ معنی مری بحوالهٔ زفان آورده؛ و برهان ص ۱۹۹۹: مُرّی درعربی با تشدید ثانی آبکامه را گویند و آن خورشی است مشهور خصوصاً در صفاهان؛ دستور الاخوان ص ۵۷۵ المُرّی: آبکامه.

[2] زفان و موید ۱: ۹۴ آبکامه آشامی است و نیز داروئی (که بهندوی کانجی گویند). در هدایة المتعلمین این دوا بتکرار بکار برده شده، رک: ص ۲۰۹، ۲۲۴، ۲۵۶، ۲۵۸ وغیره.

[3] صحاح ص ۳۱: نیا جد باشد یعنی پدر پدر و پدر مادر.

[4] برهان ص ۲۲۲۱ نیا بمعنی برادر مادر (خالو) و برادر بزرگ هم بنظر آمده.

[5] موید ۲: ۲۱۷. [6] رک: موید ۲: ۲۱۶.

[7] نسخهٔ اصل: هیچ. [8] رک: صحاح ص ۳۰ و موید ۲: ۲۱۷.

[9] رک: صحاح ص ۳۰، موید ص ۲۱۷، برهان ص ۲۱۷۴–۲۱۷۷. [10] رک: برهان ۲۱۷۴، جهانگیری ۲۰۰۲.

[10] دستور الاخوان ص ۶۴۳: اُلنوبتی کشتی بان؛ در ادات 'ربّان' و 'رُبان' بمعنی ناخدا، رک: دستور ص ۲۹۴.

[11] ادات: ناب هرچه بی آمیزش و خالص باشد، و یکی از چهار دندان پیشتر که آنرا پیشک خوانند، و آن گو که بر فرنج اسب از فربهی افتد. اما قواس ص ۱۹۳، صحاح ص ۴۰ ناب بمعنی اوّل، یعنی خالص و بی عیب نوشته.

[12] در بیت انوری یاقوت ناب، رک: صحاح ص ۴۰. [13] رک: برهان ص ۲۰۸۶ متن و حاشیه ۷.

[14] قواس ص ۸۲: پیشک چهار دندان پیش باشد، نیز رک: حاشیه نمرهٔ ۲، و نیز مجلهٔ علوم اسلامیه، دسامبر ۶۷، ص ۵۷–۵۸. [15] برهان: نیش. [16] این واژه در فرهنگها بنظر نرسیده.

نهیب : ترس و هیبت و گرانی.
نشست : پست و فرو[1] خزیده.

بهرهٔ 'ت'

نشاخت[2] : نشاند یعنی اجلاس کرد.
نشیت[3] : خوشی.
ناخوست[4] : آن باشد که بپای کوفته باشد.

بهرهٔ 'ج'

نشکنج[5] : نیلک بود که بانگشت گیرند تا بدو ناخن گیرند و گویند نیلک زدن بود و فراز گرفتن بناخن، و بعضی بکسر نون گویند.

بهرهٔ 'چ'

نیچ[6] : نم یعنی تری.
نویچ[7] : لبلاب و آن گیاهی است که بر درخت بپیچد، چون چیزی ازو ببرند شیر روان شود، و خاصیتش آنست که چون چیزی ازوی بر درخت اندر بپیچد درخت [را[8]] خشک کند، آبش بخورد و طراوت و نازکی ببرد، برگهاش زرد کند[9] و آنرا پیچه نیز گویند و بتازی عشقه ←

---

[1] موید ۲ : ۲۱۸ این معنی را بحوالهٔ زفان نوشته، نیز رک : برهان ص ۲۱۴۷.
[2] نسخهٔ 'ل' : نساخت؛ اما رک : موید ۲ : ۲۱۹، نشاخت فعل ماضی مطلق از مصدر نشاختن، رک : برهان ص ۲۱۴۲.
[3] نسخهٔ اصل : نشست، کذاست در موید ۲ : ۲۱۹ بحوالهٔ زفان؛ متن مطابق جهانگیری ۲ : ۱۴۰۹ و برهان ص ۲۱۴۵. و درین فرهنگها نشت بمعنی خوش و نشتی بمعنی خوشی (بدون شاهد).
[4] ادات و موید ۲ : ۲۱۹ : ناخواست بمعنی بپای کوفته؛ اما برهان ص ۲۰۹۱ ناخواست و ناخوست هردو بدین معنی آورده.
[5] رک : فرس ص ۵۶، صحاح ص ۵۵، قواس ص ۱۰۷، دستور ص ۲۳۷.
[6] رک : قواس ص ۲۶، صحاح ص ۶۰.
[7] نسخهٔ 'ل' : نوعج؛ موید ۲ : ۲۲۰ : نویج؛ اما ادات : نویچ باجیم فارسی گیاهی است که بر هر درخت درپیچید آنرا خشک گرداند، عرب آنرا البلاب و عشقه خوانند.
[8] نسخهٔ اصل 'را' ندارد [9] نسخهٔ 'ل' : لیک

← ولبلاب گویند، و بلغتی نون مکسور و یا پارسی است.

نسیج[1]: حریر زربافته.

بهرهٔ خ

نخ[2]: شطرنجی و ابریشم و نهالچه و گویند نخ جامه[3] است، و در اسدی[4] است: تار ریسمان را نخ[5] گویند
و نیز زیلو[6] باشد.

ناچخ[7]: نام سلاحی است.

بهرهٔ د

ناهید: زهره که از سیارات[8] است در فلک.

نرد[9]: تنهٔ درخت و نام بازی معروف.

نارد[10]: کنه[11] که پشت[12] سگ گیرد.

ناورد[13]: کارزار، و نورد[14] نیز گویند.

نوند[15]: اسپ و پیک خبر برنده و خبرگیر، و نام مقامی[16].

نبرد: جنگ یعنی کارزار.

نژند[17]: زای پارسی، فرود افگنده یعنی خوار، وبعضی بکسر نون گویند[18]، غمگین، و ضد بلند یعنی نشیب[19].

نهاد: رسم و بنیاد و تن[20].

---

[1] موید ۲: ۲۲۰ بحوالهٔ زفان گویا نسیج (جیم تازی) آورده. برهان ص ۲۱۴۱ نسیچ (جیم فارسی) دارد.

[2] رک: فرس ص ۷۹-۸۰، صحاح ص ۶۹، ادات، موید ۲: ۲۲۱، برهان ص ۲۱۲۰.

[3] ادات: نوعی از جامه های گرانمایه. [4] رک: فرس ص ۷۹-۸۰. [5] نسخهٔ اصل 'را' ندارد.

[6] این معنی در نسخهٔ 'ل' یافته نمی شود؛ برای زیلو رک: فرس و صحاح.

[7] رک: موید ۲: ۲۲۱. [8] نسخهٔ 'ل': از سیارات فلک است.

[9] رک: موید ۲: ۲۲۲. [10] رک: قواس ص ۶۷، دستور ص ۲۳۷. [11] رک: قواس.

[12] نسخهٔ 'ل': درگوش. [13] رک: قواس ص ۱۶۶ ناورد و آورد جنگ بود.

[14] رک: موید ۲: ۲۲۲. [15] قواس ص ۹۳: نوند اسب و پیک.

[16] موید ۲: ۲۲۲ نام مقامی که آتشکدهٔ برزین آنجا بود.

[17] رک: موید ۲: ۲۲۲ که معنی اش بحوالهٔ زفان آورده.

[18] نسخهٔ 'ل': نژند به زای پارسی غمگین. [19] رک: برهان ص ۲۱۳۵.

[20] موید ۲: ۲۲۳ این معنی بحوالهٔ زفان نقل نموده.

نورد[1] : درخورنده[2] وپسندنده[3] و نوشتن[4] وپیچیدن[5] .

نواند[6] : بفتح نون ، نالنده[7] .

نهارید[8] : بترسید و نیز بزای[9] معجمه .

نوید : آگاهی دادن و وعده[10] عظیم وبیکران ، و نوان[11] گشته باشد .

نوشاد[12] : نام شهریست .

نژاد : اصل[13] وتخم ونسب .

نشید[14] : با یای پارسی سرود .

---

[1] صحاح ص ۸۴ : نورد اوّل درخور وپسندنده ، دوم چوبیست که جولاهان جامه بران پیچیند. ادات : نورد درخورد وپسندیده وپیچ هرچیزی .

[2] نسخۂ 'ل' : درخرنده . [3] ل : پسندیده . [4] برهان نوشتن بمعنی درنوردیدن .

[5] باید بمعنی پیچ باشد نه پیچیدن که معنی کلمه نوردیدن است .

[6] موید ۲ : ۲۲۲ : نواند نالنده و آگاهی کذا فی زفان گویا. باید علاوه نمود که درنسخۂ بانکی پور نواند بمعنی نالیدۂ و آگاهی درج است اما از مقابلۂ نسخۂ 'ل' واضح می شود که درمیان نالنده و آگاهی دو لغت افتاده است یعنی نهارید ونوید ؛ و آگاهی معنی کلمۂ نوید است نه نواند . بظاهرچنان بنظرمی رسد که صاحب موید از نسخۂ بانکی پور استفاده نموده بود .

[7] دراصل نوان بمعنی نالنده است ، رک : برهان ص ۲۱۸۰ . [8] ازینجا تا نوید درنسخۂ بانکی پور افتاده ؛ نهارید ماضی مطلق ازمصدر نهاریدن بمعنی خوف کردن ، رک : زفان ذیل مصادر .

[9] آقای دکترمعین نهاریدن رامصحف نهازیدن قرارداده ، رک : حاشیه ۷ برهان ص ۲۱۲۲ . ادات : نهاز ترس .

[10] برهان ص ۲۲۰۹ وعده کردن بخدمات دیوانی وکارهای بزرگ ، نیزرک : موید ۲ : ۲۲۲ - ۲۳ که معنی مذکور در برهان بحوالۂ زفان نوشته (نسخۂ چاپ بغداد غلط چاپی) .

[11] نوید بروزن گوید بمعنی بلرزد و بنالد برهان ص ۲۲۰۹ ، نوان بمعنی لرزنده .

[12] نوشاد که درادبیات فارسی بنام شهری حسن خیز ذکرشده و نیز بهار نوشاد و بت نوشاد شهرت داشته ، نزدیک بلخ بوده که داود بن عباس والی بلخ دربنای آن بیست سال مشغول بوده . چنان گویند که درسال ۲۵۶ھ چون یعقوب لیث بلخ راگرفت نوشاد را ویران کرد ؛ بقول آقای حبیبی نوشاد در قدیم نوشال بود که درکتبۂ بغلان حدود سال ۱۶۰ میلادی آمده ، رک : فضائل بلخ ص ۲۰ متن وحاشیه .

[13] موید ۲ : ۲۲۲ این معانی بگفتۂ زفان نقل نموده .

[14] رک : موید ایضاً .

بہرۂ 'ر'

نسر[1]: سایه گاه وبعضی بدو فتحت[2] گویند و [بعضی فرهنگیان] نسار[3] را گویند.

نهار[4]: بسیار و بی اندازه و عجب و عظیم کاری باشد.

ناگوار[5]: تخمه.

ناهار[6]: [ورق ۱۹۹ ا] ناشتا[7] بی اندازه[8] یعنی گرسنه از آغاز روز.

نهار[9]: کاهش وگداختن وگدازش و ناشتا[10] نیز گویند.

نگار: نقش.

نخچیر[11]: شکاری وشکارکننده وشکارگاه.

نوبر[12]: نو برآمده.

نیلوفر[13]: گیاهی است در آب بود و آفتاب پرست نیز گویند، هندوی کنول گویند.

نیمور[14]: ذکر مردم یعنی کیر چنانکه سوزنی[15] گوید: بیت

من این نیمور خود را وقف کردم ❊ علی صبیانکم یا ایها الناس

نوار[16]: رسنی که چون بار[17] برچهار پای نهند، بدان بندند.

نشتر[18]: بدانچه رگ گشایند.

---

[1] رک: صحاح ص ۱۱۷ و ادات: اما موید ۲: ۲۲۳: نسر بمعنی سایۂ کلاه بحوالۂ قواس نوشته؛ لاکن در قواس ص ۱۲۳ نسر بمعنی سائبان آمده. [2] نسخۂ 'ل': بدو دفعت.

[3] رک: برہان ص ۲۱۳۸؛ نسار بمعنی سائبان، ونیز برہان ص ۲۱۳۷.

[4] رک: صحاح ص ۱۱۷ و موید ۲: ۲۲۶.

[5] صحاح ص ۱۱۶: ناگوار تخمه باشد یعنی امتلاء، نیز رک: ادات.

[6] ادات و موید ۲: ۲۲۵: ناہار بمعنی گرسنه وگداختن وکاہش؛ نیز رک: برہان ص ۲۱۱۲.

[7] رک: برہان ص ۲۰۹۹. [8] نسخۂ 'ل' ندارد.

[9] صحاح ص ۱۱۷ نہار کاہش. [10] از روی این معنی مترادف 'ناہار' است: رک: ادات و موید.

[11] رک: موید ۲: ۲۲۵ و برہان ص ۲۱۲۲. [12] رک: موید ۲: ۲۲۶.

[13] در موید ۲: ۲۲۶ معانی کلمه بگفتۂ زفان آمده. [14] رک: صحاح ص ۱۱۷.

[15] رک: دیوان چاپی ص ۳۹۴؛ این بیت در قواس ص ۸۷ وصحاح ص ۱۱۷ بطور شاہد آمده.

[16] رک: صحاح ص ۱۱۷ و ادات. [17] در ہر دو نسخه افتاده، اضافۂ قیاسی.

[18] ازینجا تا آخر در نسخۂ 'ل' افتاده.

نوکر[1]: چاکر، و نام مردی[2] از پادشاهان.

بهرهٔ «ز»

نهاز[3]: گوسپند که پیشرو گله[4] بود و گویند گوسپند نر که بهندوی بوگ[5] گویند، و مقتدا یعنی باستعاره این نام بر[6] پیش روان نهند و بعضی بکسر نون گویند.

نخیز[7]: باخای معجمه کمین[8].

نماز[9]: پرستش و خدمتگاری و نواز[10] بود.

نیاز: حاجت و احتیاج و دوست[11] و قحط[12]، و این را نوازن[13] نیز گویند.

نغز: خوب و پاکیزه[14] و چابک و نیکو و بدیع.

ناز[15]: کشش[16].

نواز: نواختن[17].

بهرهٔ «ژ»

ناژ[18]: نام درختی است معروف[19]، و گویند که آن صنوبر است، و بلغتی زای عربی.

---

۱ این واژهٔ مغولی است، رک: فرهنگ معین ۴: ۴۸۵۶ و برهان قاطع ص ۲۲۰۵ حاشیه ۲.

۲ کذا است در موید ۲: ۲۲۶؛ اما رک: رشیدی و برهان ص ۲۲۰۵ حاشیه ۱. ۳ برای معنی اول رک: فرس ص ۶۷، قواس ص ۷۶، صحاح ص ۱۳۳. ۴ نسخهٔ 'ل': رمه.

۵ ادات: نهاز گوسپند نر که بر پیشروان قوم اطلاق کنند، نیز رک: موید ۲: ۲۲۷. ۶ نسخهٔ 'ل': بوک.

۷ نسخهٔ 'ل' 'بر' ندارد. ۸ ادات: نخیز کمین، اما موید ۲: ۲۲۵: نخیر و نخجز بمعنی کمین و بحوالهٔ ادات: کمین اگرچه در نسخهٔ ادات که پیش بنده است بجای کمین کمین است. اما رک: برهان ص ۲۱۲۴ متن و حاشیه ۹. دراصل کلمه نخیز است، رک: فرس ص ۱۷۰ و صحاح ص ۱۳۲.

۹ در برهان ۲۱۲۴ نخیز و نخیز هر دو صورت و معنی اش مردم فرومایه و کمین (کمین گاه).

۱۰ رک: موید ۲: ۲۲۷ که معانی نماز بحوالهٔ زفان آورده.

۱۱ نسخهٔ 'ل': نوار. ۱۲ کذا است فی لغت فرس ص ۱۸۶؛ اما صحاح ص ۱۳۳: درست، در بعضی نسخهای این فرهنگ 'درشت'. نیز رک: برهان ص ۲۲۲۲.

۱۳ رک: صحاح ایضاً و موید ۲: ۲۲۷. ۱۴ نسخهٔ اصل: نوازل: اما رک: نسخهٔ 'ل' و موید ۲: ۲۲۷.

۱۵ نسخهٔ 'ل': چیزی پاکیزه.

۱۶ موید ۲: ۲۲۷: ناز کشش معشوق از عاشق. ۱۷ نسخهٔ 'ل': کش.

۱۸ نسخهٔ اصل: نواخت. ۱۹ موید ۲: ۲۲۷: ناژ درخت صنوبر.

۲۰ نسخهٔ 'ل' معروف ندارد.

نوژ[1]: درختی است معروف و آن درخت بر شبیه سدره است و بار او چون ترنجکی[2] باشد و چون غیبه[3] جوشن، و بلغتی زای عربی است و بعضی واو پارسی گویند[4] و نیز نوز بزای عربی و واو پارسی[5] هنوز را گویند، پس بنیاد هنوز همان نوز است و های زائده است.

بهرهٔ 'س'

نس[6]: گرد دهان[7] یعنی بوز که بیرون و درون دهان است.

نسناس[8]: دیو، و گویند دیو ستنبه، هندوی اتهاره و اچهاره[9] گویند.

نکس[10]: سر دیوار.

نرگس: گلی است سپید میانه زرد[11]، خرد و گرد، و این را بچشم نسبت کنند.

ناوس[12]: عبادت جای مغان.

نتاس[13]: خوشی، گویند عمر[14] نتاسان گذاشتم[15] یعنی بخوشی[16] گذرانیدم.

بهرهٔ 'ش'

نش[17]: سایهٔ [ورق ۱۰۰ الف] کلاه.

نیایش: زاری کردن یعنی دعا[18] و آفرین کردن.

---

[1] رک: موید ۲: ۲۲۷. [2] اضافه از روی نسخهٔ 'ل' و موید.

[3] نسخهٔ 'ل': عیبی. [4] نسخهٔ 'ل': هنوز گویند پس بنیاد الخ.

[5] رک: ادات و موید. [6] رک: موید ۲: ۲۲۸. [7] نسخهٔ اصل: دهقان.

[8] ادات: نسناس دیو مردم، نیز رک: موید ۲: ۲۲۸ و برهان ص ۲۱۴۰ متن و حاشیه.

[9] این هر دو کلمهٔ هندی در فرهنگها دیده نشد. موید ۱: ۱۲۰، برنجِ دیو ستنبه هندش اچهامه، همین کلمهٔ اچهامه تحت ستنبه نیز در موید ۱: ۵۱۱ آمده.

[10] نسخهٔ 'ل': نکلس؛ این کلمه بصورت بلکس در اکثر فرهنگها آمده است، رک: قواس ص ۱۲۴ ادات؛ اما زفان و موید ۲: ۲۲۸ و برهان ص ۲۱۶۶ هر دو صورت دارد.

[11] رک: ادات و موید ۲: ۲۲۸. [12] نسخهٔ 'ل': ناابس، موید ایضاً: ناودس. رک جها[ngiri]

[13] در اکثر فرهنگها نتاس بمعنی خوش و خرم، رک: موید ۲: ۲۲۸، جهانگیری ص ۷۰۳، برهان ص [۲۱]۸ در موخرالذکر از مصدر نتاسیدن؛ فرهنگ نظام: نتاشن.

[14] همین مثال در موید آمده. [15] نسخهٔ 'ل' ندارد. [16] نسخهٔ اصل ندارد.

[17] ادات و موید ۲: ۲۲۹؛ اما برهان ص ۲۱۴۲ سایه گاه و سایهٔ کلاه.

[18] موید ۲: ۲۲۹ همین معنی بحوالهٔ زفان نوشته.

نانمش[1] : از جهان[2] چیزی ندیده .
نوش[3] : تریاک یعنی پازهر و آب حیات و شیرین و لذیذ
نیوش : بکسر و ضم نون ، گوش کردن[4] سخن .
نکوهش : سرزنش

بهرهٔ غ

نفاغ[5] : پیمانهٔ بزرگ یعنی محفی که بدان شراب خورند یعنی قدح .
نغنغ[6] : قفیز یعنی پیمانهٔ غله

بهرهٔ ف

نوف[7] : بانگ صدا که بکوه افتد یعنی [صدائی] که از کوه باز پس آید .
نکاف[8] : موزهٔ دست یعنی دستوانه که شکره داران بر دست می پوشند .
ناف : میانهٔ چیزی .

بهرهٔ ک

نسک[9] : جزوی است از کتاب اخبار گبران و گویند که کتابی[10] است ایشان را و آن را سورت سورت و جز جز خوانند ، و غله ایست معروف که بتازی عدس خوانند . بعضی[11] بضم نون[12] گویند .
نغوشاک[13] : از کیش بکیش شونده و شدن و گویند[14] که از مذهب گبران مذهبی است .

---

[1] نسخهٔ 'ل' : نایمش ؛ موید ۲ : ۲۲۸ : نایمش بیراهی کردن . [2] نسخهٔ 'ل' : چیزی بریده . [3] رک : موید ۲ : ۲۲۹ و برهان ص ۲۱۹۶ . [4] این معنی مصدر نیوشیدن است و نیوش فعل امر است ، نه اسم مصدر ، رک : موید ایضاً و برهان ص ۲۲۳۸ .

[5] کذاست در فرس ص ۲۳۴ ، جهانگیری ص ۵۱۵ ، رشیدی ص ۱۴۱۰ ؛ اما در صحاح ص ۱۶۲ ، قواس ص ۱۳۸ ، مدار ۱ : ۳۸۰ ، سروری ۱ : ۳۰۲ : تفاغ ، برهان ص ۵۰۰ : تفاغ ، ص ۲۱۵۴ : نفاغ .

[6] این واژه به سه شکل آمده ؛ نغنغ (فرس ص ۲۳۷ ، قواس ص ۲۳۷ ، برهان ص ۲۱۵۱) ؛ تغنغ (جهانگیری ص ۱۴۹۹ ، سروری ص ۳۰۲ ، رشیدی ص ۱۴۳۴) ؛ تفتغ (صحاح ص ۱۶۲) ؛ موید نفنغ بهمین معنی ذیل فصل عربی آورده . [7] رک : صحاح ص ۱۷۰ و موید ۲ : ۲۳۰ . [8] موید ایضاً معنی کلمه بحوالهٔ زفان نوشته .

[9] رک : قواس ص ۹ ، صحاح ص ۱۸۸ . [10] نسخهٔ اصل : آن نام کتابی الخ . [11] نسخهٔ اصل : بعضی اوّل .

[12] صحاح بهر دو معنی مفتوح دارد . [13] فرس ص ۶ ، صحاح ص ۳۰ نغوشا و نغوشاک بمعنی دوم ، اما در قواس ص ۱۰ ، دستور ص ۲۳۶ ، موید ۲ : ۲۳۱ ، جهانگیری ص ۵۰۴ ، رشیدی ص ۱۴۰۹ ، برهان ص ۲۱۵۲ بمعنی اوّل . برای آگاهی بیشتر رک : برهان ص ۲۱۵۲ حاشیه و مزدیسنا و تاثیر آن در ادبیات فارسی ←

نشک[۱] : درخت نار[۲] که دراز همچو سرو بود، و در فرهنگنامه[۳] است : نشک بضم نون درختی است معروف.

نتک[۴] : چیزی سرخ مانند مرجان یعنی بسد.

نستاک[۵] : پیچاک[۶] شکم.

نلشک[۷] : قرص دارو و در بعضی فرهنگها است : نکیشک[۸] قرص دارو و بعضی بسین مهمله گویند.

نیلک[۹] : آنکه بدو انگشت و بدو ناخن بگیرند، بهندوی جهنتی[۱۰] گویند.

نموسک[۱۱] : نام مرغی است، بعضی بشین[۱۲] معجمه گویند.

ناک[۱۳] : مشک یا کافور مغشوش و گویند که آن مشک[۱۴] مغشوش کند بحکم[۱۵] سوخته، و صاحب چیزی که[۱۶] لفظ ناک در آخر او آید چنانک خشم ناک و غمناک.

نلک[۱۷] : اورک و دانهٔ حلبه یعنی شملیت.

نمشک[۱۸] : کتنخ شیر.

→ ص ۳۲۱، و قواس ص ۱۰ حاشیه ۵. ۲۴ درنسخهٔ 'ل' ندارد.

۱ رک : فرس ص ۱۴۷ و ۲۶۴، قواس ص ۴۸، صحاح ص ۱۸۸ (درنسخهٔ چاپی نار غلط چاپی است).

۲ نسخهٔ اصل : درخت نار. ۳ معلوم نیست منظور مولف کدام فرهنگ است، قواس : ناژ و نوژ و نشک درختان معروف اند. ۴ بظاهر معنی کلمه از قواس ص ۱۵۹ اگرفته شده.

۵ نسخهٔ اصل : نشتاک، اما درهمهٔ فرهنگها مانند متن، رک : قواس ص ۱۶۱، موید ۲ : ۲۳۱.

۶ نسخهٔ 'ل' : پیچال چشم. ۷ رک : قواس، ادات : نلشک و نیشک قرصدار، بهمین معنی در موید و جهانگیری و سروری و برهان نیز دیده می شود : قرصدار تصحیف قرص دارو است.

۸ رشیدی : ناشنک و نشنک نیز دارد؛ درنسخهٔ اصل ناخوانا. ۹ این واژه درنسخهٔ اصل نیامده؛ رک : موید ۲ : ۲۳۲، جهانگیری ص ۲۳۵۴، برهان ص ۲۲۳۱.

۱۰ این کلمهٔ هندی در فرهنگها دیده نشد. ۱۱ نسخهٔ 'ل' : نموشک؛ قواس ص ۱۶، دستور ص ۲۳۶ نوسک؛ ادات نموشک یعنی تیهو؛ موید ۲ : ۲۳۲ نموسک و نموشک هردو.

۱۲ نسخهٔ 'ل' : بسین مهمله. ۱۳ رک : قواس ص ۱۸۶ و ادات و موید ۲ : ۲۳۱.

۱۴ نسخهٔ 'ل' آن را ندارد. ۱۵ نسخهٔ 'ل' بدون نقطه، ادات : حسک بدون نقطه، موید ۲ : ۲۳۱ : جگر.

۱۶ نسخهٔ اصل 'که' ندارد.

۱۷ رک : صحاح ص ۱۸۸، موید ۲ : ۲۳۱، هدایة المتعلمین ص ۴۳۷ ح.

۱۸ رک : ادات و موید ۲ : ۲۳۱.

ناوک[1] : آنکه درو تیر خرد بفرستند .

نوک[2] : سر قلم و تیغ و سنان و تیر و همه سلاحها .

نغاک[3] : ابله بود ، و گروهی حرامزاده را گویند .

بهرهٔ گ

نیرنگ : جادوئی و طلسم و سحر و افسون گری ، و [ورق ۱۰۱ ا] در تعریب کاف[4] پارسی را بجیم عربی بدل کنند و در کافیه سپنج نیرنج آرند ، نیرنجات جمع اوست .

نارنگ : میوه ایست ، نارنج گویند .

بهرهٔ ل

نال[5] : نی میانه تهی ، و نام پرنده[6] ، بعضی آنرا توتی[7] گویند .

نشل[8] : دو چیز باشد که بریکدیگر بگیرند یعنی در آویزند .

نجل[9] : نیلک که بانگشت گیرند یعنی نشکنج[10] که بتازی قرص[11] گویند .

نغول[12] : پوشش نردبان و نغوله[13] بها نیز گویند .

نشپیل[14] : ببای پارسی و یای عربی گویند ، شست ماهی گیر و نیز ببای پارسی گویند .

نول[15] : منقار مرغان ، و سوراخ[16] آوند .

---

[1] صحاح ص ۱۸۸ : ناوک تیری کوچک که آنرا در غلاف چوبین یا آهنین که مانند نادی باریک باشد کنند و بعد ازان در کمان نهند الخ ، موید ۲ : ۲۳۱ : ناوک آلت چوبین خالی که میان آن تیر ناوک داشته اند الخ .

[2] رک : صحاح ص ۱۸۹ ، موید ۲ : ۲۳۲ . [3] رک : ادات و موید ۲ : ۲۳۱ .

[4] رک : برهان ۲۲۲۴ .

[5] صحاح ص ۲۱۱ : نال نی میان آگنده : موید ۲ : ۲۳۳ نال نی که درون خالی باشد ؛ برهان ص ۲۱۰۴ نال نای میان خالی و میان پر .

[6] رک : ادات و موید . [7] گذاشت در ادات ؛ موید : نولی (غلط چاپی) .

[8] رک : ادات و برهان ص ۲۱۴۶ ؛ موید ۲ : ۲۳۴ نشبل اشتباه چاپی .

[9] رک : فرس ص ۳۱۴ ، قواس ص ۱۰۷ ، صحاح ص ۲۱۱ ، دستور ص ۲۳۷ [10] رک : فرس ، قواس ، صحاح ، دستور . [11] رک : صحاح ص ۲۱۱ . [12] رک : قواس ص ۱۲۲ ، دستور ص ۲۳۷ ، ادات .

[13] برهان ص ۲۱۵۳ : نغوله بمعنی زلف آورده و در رشیدی بیت نظامی شاهد آمده . نغوله در معنی متن یافته نشد .

[14] گذاشت در فرس ص ۳۱۵ ، قواس ص ۱۷۷ ، اما صحاح ص ۲۱۱ نشبیل .

[15] قواس ص ۶۴ ، دستور ص ۲۳۶ : نول منقار مرغ . [16] رک : موید ۲ : ۲۳۴ ، برهان ص ۲۲۰۶ .

نهال : درخت نونشانده.

بهرهٔ م

نژم[1] : مژه[2] که هوا تاریک کند و آن بخار[3] است ، چون ابر بود پدید آید و به زمین نزدیک باشد و آنرا تارمیغ[4] نیز گویند .

نغام[5] : تیره گون و زشت .

نسیرم[6] : بضم و فتح را ، جائی که آفتاب نیفتد .

نیرم[7] : نریمان راگویند و آن پدر سام است جد زال پدر رستم .

بهرهٔ ن

نسترن[8] : گلی است سپید و بعضی گل نسرین راگویند و بعضی فرهنگیان گلنار[9] را و بعضی باغ را نسترن گویند .

نسترون : همان نسترن است .

نرگان[10] : بتشدید را و[11] فتحت ، گدایان شوخ .

نشیمن[12] : نشستنگاه و مقامی که کسی مدام باشد ، و آشیان مرغ را نیز گویند .

نفرین : لعنت .

نون[13] : درحال و تنهٔ درخت .

---

۱ فرس ص ۳۴۳ ، قواس ص ۱۹ ، صحاح ص ۲۲۵ : نزم : دستور ص ۲۳۶ : نژم ، برهان : نزم و نژم و نزم و نژم هر چهار صورت آورده ، نیز رک : رشیدی .

۲ نسخهٔ 'ل' : مژه . ۳ نسخهٔ 'ل' : بخاری است که . ۴ نسخهٔ اصل : تارمیغ گویند ندارد .

۵ کذا است در لغت فرس ص ۳۳۷ ؛ صحاح : نغام . و اما در فرس و صحاح در هر دو از بیت دقیقی استشهاد شده . موید ۲ : ۲۳۵ : نغام زشت و تیره گون ، و در لسان الشعراء و فرهنگ فخر قواس نغام با فاء مرقوم است اما ادات مصحح با غین است . باید علاوه نمود که فرهنگ قواس شامل این کلمه نیست . برای آگاهی بیشتر رک : برهان ص ۲۱۵۴ حاشیه ۲ .

۶ رک : قواس ص ۱۲۴ و موید ۲ : ۲۳۵ . ۷ رک : موید ۲ : ۲۳۵ و برهان ص ۲۲۲۴ .

۸ رک : قواس ص ۴۴ و صحاح ص ۲۵۴ . این واژه بشکلهای زیر آمده : نستر ، نسترن ، نسترون (برهان) ، ترن (قواس) . ۹ نسخهٔ 'ل' : بعضی گویند گل نسرین را که نسترن است .

۱۰ رک : ادات و برهان ص ۲۱۳۷ . ۱۱ رک : فرس ص ۳۵۵ ، قواس ص ۱۰۳ ، صحاح ص ۲۵۴ .

۱۲ نسخهٔ اصل : فتحت . ۱۳ قواس ص ۱۲۷ : نشیمن نشستنگاه ، صحاح ص ۲۵۵ : نشیمن جای و مقامی باشد .

۱۴ برهان ص ۲۲۰۶ : نون درحال و تنهٔ درخت .

نوان[1] : نالیدن وجنبیدن برخود مانند جهودان روز شنبه[2] وگویند نوان : میلان[3] ولرزان[4] وخان وآگاهی باشد.

نارون[5] : درختی است بلند و راست ، واین بقد نسبت کنند ، چوب[6] سخت باشد ، پیشه وران از ا افزار سازند.

نهنبن[7] : سرپوش چیزی.

نیاکان[8] : جدان ومهتران.

نیستان[9] : بیشه.

نخچوان[10] : نام ولایتی.

نسرین[11] : گلی است معروف.

ناردین[12] : سنبل رومی است زرد.

نگون : خمیده و فرود افگنده که نگونسار گویند.

بهرهٔ 'و'

نوی[13] : خرمای [ورق ۱۰۲ ا] تر یعنی تر[14] خرما و نوو[15] نیز گویند.

نیرو : قوت یعنی توانائی و زور ، گویند نیرومند یعنی مرد بازور.

نیو[16] : پهلوان و دلیر.

۱ـ رک : صحاح ص ۲۵۵ : نوان جنبیدن برخویشتن ... روز شنبه ، ضعیف ولاغر. ادات : نالیدن و جنبیدن ... روز شنبه وآگاهی و دو تو و کوژ و نگون شده و خمیده.

۲ـ نسخهٔ اصل : سه شنبه. ۳ـ کذا است در اصل ؛ نسخهٔ 'ل' : میدان.

۴ـ رک : برهان ص ۲۱۸۰ و واژهٔ 'نواند' درهمین فرهنگ زفان. ۵ـ رک : موید ۲ : ۲۳۶.

۶ـ ازینجا تا آخر در نسخهٔ 'ل' افتاده.

۷ـ رک : صحاح ص ۲۵۵ ؛ موید ۲ : ۲۳۹ معنی واژه بحوالهٔ زفان آورده.

۸ـ موید ایضاً معنی کلمه بگفتهٔ زفان نوشته. ۹ـ ادات : نیستان بیشه که عرب آنرا غاب و اہل ہند جنگل خوانند.

۱۰ـ شهری است در ایران در شمال رود ارس ، فرہنگ صحاح الفرس که یکی از منابع پر ارزش بنده است تالیف محمد بن ہندوشاه نخچوانی است.

۱۱ـ این کلمه معرب است از نسترن فارسی ، رک : فرہنگ معین. ۱۲ـ رک : موید ۲ : ۲۳۶.

۱۳ـ رک : قواس ص ۵۲ و دستور ص ۲۳۶. ۱۴ـ نسخهٔ 'ل' 'یعنی تر خرما' ندارد.

۱۵ـ نسخهٔ 'ل' : نو. ۱۶ـ قواس ص ۹۶.

نشتو[1]: نام مردی.
نشو[2]: لشن و نخشان یعنی آنکه بر و هرچه نهند بیفتد و برو نماند، و بعضی بواو پارسی گویند، و بعضی بکسر نون و سین مهمله گویند.
نیسو[3]: نشتر حجام که بدان رگ زنند.

بهره "ه"

نوسه[4]: قوس الله عز وجل که نادانان کمان رستم گویند، و بعضی بواو عربی گویند.
ناوه[5]: چوبکی که در پشت[6] اسب و آدمی بود و آن چیزکه در آن خمیر کنند یعنی تغار و نام مقامی و چادر سرکهنه بزبان[7] نیشاپوریان و برنج[8].
نبیره و نبیسه: یعنی فرزند فرزند، و در اصطلاح نبیره از جانب دختر[9] بود و نبیسه از طرف پسر.
نوده[10]: فرزند عزیز.
نژاده[11]: اصیل[12] یعنی صرف[13] و خالص.

---

[1] رک: برہان ص ۲۱۴۴، جہانگیری ۲: ۱۴۰۹. در نسخهٔ اصل معنی کلمهٔ نشتو و واژهٔ "نشو" افتاده، و معنی نشو بمعنی نشتو قرار گرفته. [2] برہان ص ۲۱۴۶: نشو ہموار و صاف و ساده و نرم و لغزنده الخ.

[3] کذا است در صحاح ص ۲۹۵، موید ۲: ۲۴۰، اما فرس ص ۴۱۶ و قواس ص ۱۸۵: نیشو.

[4] رک: قواس ص ۲۲، صحاح ص ۲۹۱، ادات. [5] رک: ادات و موید ۲: ۲۴۱-۴۲ و برہان ۲۱۱۲.

[6] ناو نیز بدین معنی آید، برہان ص ۲۱۱۰. [7] این تخصیص در فرہنگہا دیده نشد.

[8] این معنی در موید و برہان و ادات نیامده؛ موید ۲: ۲۴۲ نام مقامی و چادر کہنه را ہم گفته اند و نیز گویند که قالب روح باشد، ہر دو معنی اخیر از زفان گویاست. واضحاً این غلط است. معنی قالب روح در زفان نیست، اما در برہان ہست و آقای معین آن را برساختهٔ فرقهٔ آذرکیوان داند، برہان ص ۲۱۱۲ ح ۷. درین صورت این معنی در موید الحاقی می باشد.

[9] موید ۲: ۲۴۲ نبیسه پسر دختر، اما در ہند نبیسه پسر پسر را گویند و نبیره پسر دختر را؛ اما بظاہر این درست نیست زیرا که نبیسه و نواسه از یک ریشه است و نواسه پسر دختر باشد. ادات نبیره را ہر دو معنی آورده اما صحاح ص ۲۹۰، جہانگیری ۱: ۶۱۹ نبیره پسرزاده است. نیز رک: برہان ص ۲۱۱۷.

[10] رک: قواس ص ۹۹، صحاح ص ۲۹۱، موید ۲: ۲۴۳، برہان ص ۲۱۸۵ نوده بمعنی فرزندزاده و فرزند عزیز آمده.

[11] رک: قواس ص ۹۹.

[12] نسخهٔ اصل: اصل، و ہمانست در ادات، نیز رک: برہان ص ۲۱۳۴.

[13] رک: کلمهٔ ناب در ہمین فرہنگ ص ۳۳۱.

نیوه[1]: نالش و نوحه[2] و خروش.
نژه[3]: تیر سقف.
نواسته[4]: خشت چفته زده یعنی کژ و خمیده، و بعضی بفتح نون گویند و بشین معجمه نیز گویند آنرا.
نبروه[5]: مرد مبارز و مردانه.
نیوشه[6]: گوش داشتن بود بسخن و گریستن بگلو، و در فرهنگنامه است: نیوشه فریاد و گریه بگلو باشد.
نیسته[7]: نیست[8] را گویند، بزیادت های سکته[9].
نره[10]: سخت و درشت و گردنکش و گدای شوخ، و نرّه بتشدید هم گویند، جمع نرّگان[11] آید.
نکژده[12]: بازای معجمه، کوزه و شرابه، و بعضی کاف پارسی نیز گویند.
نارهٔ[13]: زبانهٔ کمان.
نورده[14]: تنهٔ پیراهن و در اسدی است، نورده: قباله.
نهاله[15]: کازهٔ[16] صیاد یعنی کمین گاه بود، صیادان[17] از بهر نخچیر اندر پنهان باشند.
نسیله[18]: گلهٔ اسب و ستور[19]، و بضم و فتح نون[20] نیز گویند.
نمونه[21]: نابکار و باژگونه و مانند[22].
نخکله[23]: گوز سخت[24]، آنکه مغز او را جوز مغز گویند.

---

[1] رک: قواس که همان سه لفظ در تفسیر این کلمه دارد. [2] نسخهٔ 'ل' واو ندارد.
[3] رک: موید ۲: ۲۴۲. [4] قواس ص ۱۳۹ و موید ۲: ۲۴۳: نواشته. اما در موخرالذکر نواسته باسین مهمله
[5] رک: موید ۲: ۲۴۲. [6] رک: ادات و موید ۲: ۲۴۴؛ صحاح ص ۲۹۱ فقط معنی اوّل آورده.
[7] نسخهٔ اصل: نوشته، نسخهٔ 'ل': نوسه. [8] رک: ادات و موید ۲: ۲۴۴.
[9] نسخهٔ 'ل': نیس. [10] نسخهٔ 'ل': شکسته، موید (چاپی): شکنه.
[11] رک: موید ۲: ۲۴۲. [12] رک: قواس ص ۱۰۳.
[13] رک: قواس ص ۱۳۷. [14] رک: ایضاً ص ۱۴۲.
[15] قواس ص ۱۵۴ و ادات: نورده بمعنی تنهٔ پیراهن؛ جهانگیری ص ۲۱۱۸ نورده بمعنی پیراهن و قباله
[16] رک: صحاح ص ۲۹۱، موید ۲: ۲۴۳.
[17] کذاست در موید. [18] رک: موید ۲: ۲۴۲ و برهان ص ۲۱۴۲ نسیل مصحف فسیله.
[19] نسخهٔ اصل: ستوران. [20] نسخهٔ 'ل' نون ندارد.
[21] موید ۲: ۲۴۳ معنی کلمه بحوالهٔ زفان نوشته. [22] نسخهٔ 'ل' مانند ندارد.
[23] رک: موید ۲: ۲۴۲. [24] نسخهٔ اصل: سخت سخت.

جبه[1]: سیلاب.

امه: کتاب و نبشته.

شتوه[2]: جنگ آور و ستیهنده و زشت[3] رو، و بعضی بسین مهمله گویند.

شکرده[4]: [ورق ۱۰۳ الف] آنکه بتازی شغره[5] و مخرا[6] گویند.

غایه[7]: درم ناسره.

شره[8]: نقش که[9] سرخ و زرد کنند.

نرگسه[10]: آنکه گل در سقف و دیوار منقش سازند.

نایژه[11]: از ساز جولاهان است.

نواجسته[12]: باغ نو نشانده.

نغوشه[13]: دل یکی هم شکستن و گویند دل یکی[14] تسکین دادن.

نرموره[15]: لک گلین که گرد و پهن باشد یعنی گردک[16] و فندق بزرگ

بهرهٔ 'ی'

نوی: تازگی.

---

[1] رک: صحاح ص ۲۷۱؛ این کلمه بشکل توجبه نیز آمده. رک: فرهنگ قواس ص ۲۵، برهان ص ۲۱۸۴ حاشیه ۱.

[2] رک: موید ۲: ۲۴۲ که فشتوه و نستوه هردو آمده. اما فرس ص ۴۵۰، قواس ص ۱۶۹، صحاح ص ۲۹۱: نستوه.

[3] برهان ص ۲۱۳۸ زشت. [4] رک: فرس ص ۵۰۷، موید ۲: ۲۴۲، جهانگیری ۲: ۱۴۱۰.

[5] این مترادف در برهان ص ۱۲۴۶ وجود دارد، الشفرة کارد بزرگ، رک: دستور الاخوان ص ۳۶۹.

[6] نسخهٔ 'ل' بدون نقطه؛ تصحیح این کلمه میسر نشد. جهانگیری و برهان مترادف عربی از میل است؛ که در دستور الاخوان بمعنی نشکرده آمده (ص ۲۸).

[7] نسخهٔ اصل: نغایسه، اما نغایه بمعنی درم ناسره عربی است، رک: جهانگیری ۲: ۱۴۹۶، برهان ص ۲۱۵۵.

[8] رک: برهان ص ۲۱۴۵. [9] نسخهٔ 'ل' 'که' ندارد.

[10] رک: جهانگیری ۲: ۱۶۹ و برهان ص ۲۱۲۹. [11] رک: جهانگیری ص ۵۳۱.

[12] رک: صحاح ص ۲۹۱. [13] ادات معنی اوّل دارد و موید ۲: ۲۴۳ معنی اوّل و دوم.

[14] نسخهٔ اصل: یک.

[15] صحاح ص ۲۹۱: نرموره بادپیچ، و بادپیچ رسنی باشد که کودکان بر درخت بندند و در آنجا نشینند (صحاح ص ۵۱). اما جهانگیری ۱: ۱۱۶۵ بمعنی چیزک وگنده. برهان ص ۲۱۳۱: نرموره بمعنی گردکان و فندق بزرگ نوشته. [16] فرهنگ معین ص ۳۲۴۱ گردک بمعنی گرد و مدور، حجلهٔ عروس، نانی پر از مغز بادام وغیره.

نپی[1] : ببای پارسی و بدو کسرت ، قرآن ، و نوی نیز گویند .

نارای[2] : منکر و ناشایسته .

نامی : نامدار و نامور[3] .

نامی : ساز معروف و حلقوم .

نرسی[4] : ببای پارسی ، نام پادشاهی .

گونهٔ 'و'

بهرهٔ 'الف'

والا : زبردست[5] و بزرگ بجاه و بلندی یعنی بقدر و مرتبه ، و جامه ایست ابریشمی که آنرا والا گویند .

ویدا[6] : نقصان یعنی کم باشد .

ورا : اورا ، گوئی همزه حذف کرده اند و واو مفتوح .

وستا[7] : ستایش خدای عز و جل .

بهرهٔ 'ب'

وریب[8] : کژ[ی] یعنی برخوهلی[9] .

بهرهٔ 'ت'

ورت[10] : برهنه یعنی تهی از پوشش .

---

[1] برای نبی و نوی رک : فرهنگ قواس ص ۷ ، جهانگیری ص ۶۵۴ وغیره . [2] ادات و موید ۲ : ۲۴۴ ، جهانگیری ص ۵۱۷ ، برهان ص ۲۰۹۲ : نارای منکر . [3] نسخهٔ 'ل' : نام آور .

[4] پسر گودرز از ملوک اشکانیان ، رک : جهانگیری ص ۱۱۶۴ متن و حاشیه . [5] برای معنی اوّل رک : قواس ص ۹۸ ، دستور ص ۲۶۰ ؛ اما ادات و جهانگیری ۱ : ۵۴۰ هر دو معنی دارد . [6] صحاح ص ۳۲ : ویدا کم باشد بفتح کاف . اگرچه در بعضی فرهنگها ویدا بمعنی گم شده آمده ؛ اما صحیح لفظ کم (کاف تازی) بفتح است . رک : صحاح ص ۳۲ حاشیه و برهان ص ۲۲۹۷ حاشیه . [7] وستا بمعنی اوستاست ؛ اما در بعضی فرهنگها بمعنی ستایش خدا آمده ، رک موید ۲ : ۲۴۷ (وسطا اشتباه چاپی) برهان ص ۲۲۸۱ : و این معنی بر اساسی نیست رک : برهان ایضاً حاشیه ۴ . [8] فرس ص ۲۶ ، صحاح ص ۴۰ : وریب کجی و ناراسی (برخولی) ادات : کژ و برخوهلی ، موید ۲ : ۲۴۷ و برهان ص ۲۲۷۸ : وریب کژ . [9] برخولی بمعنی کجی است ، رک : برهان ص ۲۲۷۸ حاشیه ۱ . باید علاوه نمود که برخولی اسم کیفیت است و کژ صفت . بنابرین در متن کژی اصلاح شده .

[10] کذا است در موید ۲ : ۲۴۷ و برهان ص ۲۲۶۴ ، اما این تصحیف رت است ، رک : فرس ص ۱۴۹ ، صحاح ص ۴۵ ، جهانگیری ۱ : ۶۶۷ .

خست[1] : بژند و آن گیاهی بهاری است .
شت[2] : چهارم روز از فوردیان .

بهرهٔ 'ج'

تاج[3] : نیلوفر ، وگویند ورتاج گیاهی است هم درآب روید ؛ اسدی می گوید : پنبرک[4] را گویند ، وآن گیاهی است سبز ، برگ[5] او گردو این برگ هرجانبی که آفتاب گردد آن سوی[6] روی کند .
ادیج[7] : چیزی که براو انگور می اندازند ، جائی که انگور رسته باشد وگویند جای انگور آویختن و بعضی بجیم پارسی گویند .
یرج[8] : داروئی است که بهندوی آنرا تج گویند .
رتیج[9] : پرنده از دراج[10] خردتر یعنی ولج ، وگویند جز[11] دیج است ، بتازی سمانی[12] گویند .

بهرهٔ 'چ'

وازیچ[13] : معروف ، آنکه دختران ریسمان آویزند و دران بازی کنند ، و اسدی[14] بیا گوید .

---

[1] رک : فرس ص ۳۶ ، صحاح ص ۴۲ ، قواس ص ۳۶ . [2] دراصل کلمهٔ صحیح وهشت (وزن نشست) بجای وخشت بمعنی روز پنجم است از خمسهٔ مسترقهٔ قدیم ، رک : برهان قاطع حاشیهٔ ص ۲۲۶۰ ، ۲۲۹۵ ، و فرهنگ معین ۴ : ۵۰۶۳ . [3] رک : فرس ص ۵۴ ، صحاح ص ۵۶ ، قواس ص ۳۸ .
[4] نسخهٔ اصل : سبزک امارک فرس وصحاح . [5] رک : صحاح . [6] نسخهٔ 'ل' : ازان سوی روی جانب آفتاب کند . [7] فرس ص ۶۰ : وادیج رشتهٔ انگور ؛ قواس ص ۵۱ ، دستور ص ۲۴۳ : وادیج چیزیست که انگور برو اندازند ؛ صحاح ص ۵۵ : وازج جای انگور رسته باشد .
[8] رک : سوید ۲ : ۲۴۸ ، برهان ص ۲۲۹۹ .
[9] فرس ص ۶۷ ، صحاح ص ۵۶ : درتیج سمانه ؛ قواس ص ۶۰ ، صحاح ص ۵۶ ، دستور ص ۲۴۴ درتیج دیج .
[10] بعضی تیهو نوشته اند ، رک : جهانگیری ۱ : ۱۱۶۸ و برهان ص ۲۲۶۵ .
[11] از فرهنگهای مورد استفاده این قول مورد تائید قرار نمی گیرد .
[12] نسخهٔ اصل : سیمانی ، اما ادات و جهانگیری : سلوی ، نیز رک : جهانگیری حاشیه ۱ ؛ برهان : سلوی و سمانی . درلسان التنزیل ص ۱۳۹ السلوی را مترادف درتیج ، و در دستورالاخوان ص ۳۲۵ السلوی مترادف دیج ، ص ۳۲۶ السمانی مترادف درتیج .
[13] کذاست در ادات ؛ اما در جهانگیری ص ۵۲۸ : وازنیج ، و ص ۲۰۴ : بادنیج درهمین معنی . اما این لفظ مصحف بادپیچ است ، رک : صحاح ص ۵۱ ، ص ۲۹۱ ذیل نرموره ؛ نیز جهانگیری ص ۲۰۴ حاشیه ۱ ، و هدایة المتعلمین ص ۲۸۹ .
[14] نسخهٔ 'ل' ندارد ؛ بیا یعنی بازیچ . رک : فرس چاپ مجتبائی ۱۵ متن و حاشیه .

ورنج[1]: زشت.

ویخ[2]: پرندهٔ معروف، خردکه بهندوی بٹیر ولاوه[3] گویند و بتازی سمانی و سلوی.

بهرهٔ 'د' [ورق ۱۱۰۶]

والاد: دار[4] گل یعنی عمارت گل.

ورستاد[5]: وظیفه، وراستاد[6] نیز گویند.

وید[7]: پیدا و بزرگ و بسیار[8]، و هویدا ازین گرفته اند، گویند: ویدا و هویدا.

وستاد[9]: بسیار، و بعضی بفتح واو گویند.

ورد[10]: لشکر و رخت[11].

بهرهٔ 'ر'

وانگر[12]: پوستین دوز.

وخشور[13]: پیغامبر خدای[14] تعالی.

وزیر[15]: زرچوبه، و بتازی دستور را گویند یعنی آنکه بار ملک و مملکت کشد.

وار[16]: مانند وصفت.

بهرهٔ 'ز'

ورز[17]: ورزنده[18] ولب آب ماوراءالنهر.

---

[1] رک: قواس ص ۱۰۵. [2] رک: ورتیج. [3] کذاست در نسخهٔ اصل؛ نسخهٔ 'ل' ندارد. [4] نسخهٔ اصل: اما رک: قواس ص ۱۱۶ و ادات. [5] رک: ادات و موید ۲: ۲۴۹ و برہان ص ۲۲۷۲.

[6] رک: موید ایضاً، برہان ص ۲۲۷۳ ورشاد نیز دارد. [7] موید ۲: ۲۴۹، برہان ص ۲۲۹۷: وید بمعنی کم چیز، غصص، چاره و علاج. [8] این معانی کلمهٔ ویدا است. [9] این معنی نیز در فرہنگها یافته نشد.

[10] رک: ادات و موید ۲: ۲۴۹. [11] ورد بمعنی گروهی از لشکر عربی است، رک: فرہنگ معین ۴: ۵۰۰۱ برہان ص ۲۲۶۷ ح ۵. و در برہان ورد بمعنی شاگرد و مرید درج است.

[12] این معنی در هیچ یکی از ماخذ بنده دیده نشد. [13] رک: صحاح ص ۱۱۹، ادات، موید ۲: ۲۴۹.

[14] رک: فرس ص ۶۴-۶۵، قواس ص ۷، صحاح ص ۱۱۹. [15] نسخهٔ 'ل': عزّ و جلّ.

[16] رک: ادات (برای معنی اوّل)، برہان ص ۲۲۷۹؛ آقای معین وزیر را مصحف زریری دانند، رک: ایضاً حاشیه

[17] موید ۲: ۲۴۹، برہان ص ۲۲۴۵: وار مانند و نظیر، و خداوند. [18] رک: ادات (برای معنی دوم)، موید ۲: ۰: اما برہان ص ۲۲۶۸ بمعنی رود ماوراءالنهر و خود ماوراءالنهر آورده، جهانگیری ص ۱۱۶۶ ورا رود، وراز رود، و ورود را ماوراءالنهر دانسته، نیز رک: ص ۱۱۷۱. برای آگاهی بیشتر دربارهٔ اختلاف قرأت و معانی این کلمه

بهرهٔ س

ورس[1]: بند و رشتهٔ ریسمان، وبعضی بدو فتحت گویند.
ویس[2]: همانا[3] و پرنده ایست[4].

بهرهٔ ش

وغیش[5]: بسیار و انبوه، و بلغتی واو مفتوح و یای پارسی، وبعضی بیای عربی گویند، و این لفظ بر مال و بیشه و غم[6] و چیزها که بی جنبش بود، توان گفت، و بر جانوران استعمال کردن نشاید.
وش[8]: مانند و دنبالهٔ دستار.

بهرهٔ غ

ورغ[9]: بند آب و رود[10] آب، و در فرهنگ نامه است: ورغ کشت[11].
دروغ[12]: آروغ[13]، وبعضی بفتح واو گویند.

← رک: برهان ص ۲۲۶۳ حاشیه ۳. [19] نسخهٔ 'ل': وزنده.

[1] فرس ص ۲۰۴ ورس چوبی که در بینی اشتر کنند؛ قواس ص ۱۷۸: ورسس بند و رشته. رشیدی ص ۱۴۵۶ ورس ریسمان و چوبی که در بینی اشتر کنند. برهان ص ۲۲۷۱ ورس در هر دو معنی. ادات برای بند و ریسمان 'ورسن' وارد نه ورس، نیز رک: برهان ص ۲۲۷۲؛ شاید مصحف رسن باشد، رک: ایضاً ح

[2] ادات: ویس پنداری؛ موید ۲: ۲۵۰: ویس در شرفنامه پنداری و در قنیه است همانا یعنی که پرنده ایست معنی اخیر از زفان گویاست. باید علاوه نمود که ویس مصحف دیس است که بمعنی همانا و مانند است، رک: صحاح ص ۱۴۳؛ نیز قواس ص ۱۱۸. فرس ص ۱۰-۱۱، صحاح ص ۳۱ همانا: پنداری بود.

[3] نسخهٔ 'ل': همان پرنده.

[4] ویس بمعنی پرنده از هیچیک از فرهنگهای مورد استفاده مورد تائید قرار نمی گیرد.

[5] رک: فرس ص ۲۱۲ و قواس ص ۱۰۶ و صحاح ص ۱۵۸.

[6] صحاح و برهان: عمر، اما ادات و موید کذا در متن (۲ : ۲۵۱). [7] نسخهٔ 'ل' واو ندارد.

[8] صحاح ص ۱۵۸: وش بمعنی فش یعنی مانند، جهانگیری ص ۱۴۶۲: فش بمعنی شبه و مانند، و شملهٔ دستار و آنرا فش نیز خوانند. صحاح ص ۱۵۶: فش مانند، بضم بش چارپای، جهانگیری ص ۱۳۸۳ فش بمعنی کاکل اسب (بش)، شبیه و مانند، سر دستار.

[9] قواس ص ۲۴، صحاح ص ۱۶۱، ۱۶۶: ورغ بند آب.

[10] در هیچیک از فرهنگها این معنی دیده نشد، بظاهر "بند رود آب" عبارت صحیح می باشد چنانکه در دستور ص ۲۶۳ هست. [11] کذا است در ادات، در اصل ورغ بمعنی کشت است، رک: قواس ص ۵۴، دستور ص ۲۶۴

[12] رک: ادات و برهان ص ۲۲۷۷. [13] آروغ بمعنی بادی که از گلو بر آید ص ۱۶۱.

وراغ[1] : شعلهٔ آتش.
وارغ[2] : بدانچه زرباف[3] بندند.

بهرهٔ ف

واف[4] : هزار دستان.

بهرهٔ ک

ورکاک[5] : شیرکنجشک[6].
وردوک[7] : چپّر، و بعضی دال و بعد وی واو هردو مفتوح گویند.
وشرک[8] : جامه دارو[9]، و بعضی بفتح را گویند.
ویندانک[10] : ناغه، و بلغتی ویدانک[11] آمده است.
ویک[12] : این سخن در خطابها گویند یعنی نیک بخت چنانکه بتازی ویحک.

---

۱ رک : جهانگیری ص ۱۱۶۷، برهان ص ۲۲۶۳-۶۴ ؛ موید ۲ : ۲۵۲ واغ اشتباه چاپی.
۲ نسخهٔ 'ل' : ولاغ ، موید ۲ : ۲۵۲ وازغ بدین معنی آمده ، و در جهانگیری و برهان وارغ بمعنی دروغ است.
۳ در هردو نسخه ناخوانا ؛ متن تصحیح قیاسی ؛ رک : موید ایضاً ، زرباف بمعنی زربفت است. نیز رک : برهان.
۴ رک : موید ایضاً و جهانگیری ۱ : ۵۳۹ .
۵ رک : فرس ص ۲۶۹ ، قواس ص ۶۰ ، اما صحاح ص ۱۸۹ مرغی بزرگتر از باز.
۶ شیرکنجشک پرندهٔ درنده ، مردار خوار ، رک : موید ۲ : ۲۵۳ و صحاح ذیل دزکاک.
۷ قواس ص ۱۳۳ : وردک بمعنی چپّر ، اما موید ۲ : ۲۵ وردوک بمعنی مذکور آمده ؛ و رشیدی ص ۱۴۵۵ وردوک و ورود بمعنی چپّر آورده.
۸ رک : موید ۲ : ۲۵۳، جهانگیری ۲ : ۱۴۱۳، برهان ص ۲۲۸۵ ، ۲۲۷۳ وشرک و ورشک هردو بهمین معنی آورده ؛ اما در بعضی فرهنگها ورشنک و وشترک آمده ، رک : برهان ص ۲۲۸۵ ، ۲۲۷۳ حاشیه ۴ . بباید علاوه نمود که در قواس ص ۱۵۷ و مدار ۲ : ۵۵۸ وغود در زفان شرک بمعنی جامه دارو نوشته اند
۹ برهان ص ۱۲۶۴ : جامه دارو جامه‌ای باشد که در آن دارو بندند .
۱۰ نسخهٔ اصل : ونیدانک ، رک : موید ۲ : ۲۵۳ ، جهانگیری ص ۲۳۶۴ : ویندانک بمعنی مشک نافه ، و برهان ص ۲۳۰۲ ویندانک بمعنی نافه و ناغه هردو ، ناغه را مصحف نافه قرار دهند .
(رک : برهان ایضاً ح ۷) .
۱۱ رک : ادات و موید ۲ : ۲۵۳ .
۱۲ رک : صحاح ص ۱۸۹ ، ادات ، موید ۲ : ۲۵۳ ، جهانگیری ص ۲۳۶۲ .

وبردک[1] : لغز .
وشمک[2] : پای افزار چرمین .
ویجک[3] : رنگ .

بہرۂ گ

ونگ[4] : آنچه برو خوشه های انگور اندازند .
ونگ[5] : گدا و درویش .
وژنگ[6] : بازای[7] پارسی وضم وفتح آن ، پیوند[8] جامه و در فرهنگنامه : وژنگ[9] آرایش[10] پوستین که در دامن وسر آستین وگریبان و درزهای دیگر دوزند از قندز وسمور وجز آن .

بہرۂ ل

وال[11] : ماهی درم دار .
ویل[12] : فرصت یافتن بکاری بامراد وظفر .
وژول[13] : بازای پارسی ، شور وبضم واو نیز گویند .
وشکول[14] [ورق ۱۰۵ ا] : جلدی درکار نمودن ، وبضم واو نیز آمده است ، وبعضی واو دوم پارسی گویند

---

[1] رک : موید ۲ : ۲۵۳ که این واژه را بحوالۂ زفان آورده ؛ اما این مصحف بردک است که درہمین فرہنگ (زفان) ذیل گونۂ ب آمده . دراصل واو را جزکلمه پنداشته ، رک : قواس ص ۱۸۸ متن وحاشیه .

[2] رک : ادات و موید ۲ : ۲۵۳ وجہانگیری ۲ : ۱۴۱۴ و برہان ص ۲۲۸۶ . در قواس ص ۱۵۵ وہمین فرہنگ (زفان) شمل بمعنی پای افزار چرمین آمده ؛ ممکن است وشمک مصحف باشد .

[3] این کلمه در فرہنگها دیده نشد ، موید ۲ : ۲۵۳ می آرد : " ویجک بالفتح باجیم فارسی رنگ کذا فی زفان گویا "

[4] سرمۂ سلیمانی ص ۲۵۱ ونگ چوب خوشۂ انگور است که خوشه ازو آب خورد و معنی سرتاک بریده آمده وریسمانی که انگور ازو آویزند و آنرا آونگ گویند ، نیز رک : قواس ص ۵۱ متن و حاشیه .

[5] رک : قواس ص ۱۹۴ ، رشیدی ص ۱۴۶۷ .

[6] رک : قواس ص ۱۵۷ ، ادات ، موید ۲ : ۲۵۳ . [7] درنسخۂ اصل ازینجا تا وژنگ افتاده .

[8] نسخۂ 'ل' : ہم پیوند جامه . [9] نسخۂ 'ل' : ورنگ . متن تصحیح قیاسی .

[10] ادات و موید ۲ : ۲۵۳ ہردو معنی را داده اند ؛ و در موخرالذکر بگفتۂ زفان آمده .

[11] رک : قواس ص ۶۸ ، ادات ، موید ۲ : ۲۵۴ .

[12] رک : فرس ص ۳۱۳ ، صحاح ص ۲۱۲ ، قواس ص ۱۰۳ . [13] رک : قواس ص ۱۶۷ .

[14] رک : موید ۲ : ۶۴ ، برہان ص ۲۲۸۶ ، قواس ص ۱۶۷ و زفان (ہمین فرہنگ) : بشکول مرد جلد وقوی وسخت کش (و حریص برکار) .

دکال[1]: انگشت مردہ کہ آہنگران در کورہ اندازند.

بہرۂ 'م'

وشم[2]: بخار.

وام[3]: مانند و دَین وصفت و رنگ.

ورم: آماس.

بہرۂ 'ن'

ورسنان[4]: بدو فتحت، است.

وارن[5]: آرنج و بند دست، آنکہ میان دست و بازو است.

وَرّفان[6]: بہ سہ فتحت و رای مشدّد، شفیع.

واردن[7]: بدخوی و نحس یعنی بدبخت و شوم و باژگونہ[8] و واژگونہ ہمانیز گویند.

والان[9]: داروئی است، دوگونہ: والان بزرگ[10] کہ بتازی آنرا رازیانج[11] و ہندی سونپ[12] گویند و دیگر آنکہ[13] خرد است، بہندی آنرا سوئی[14] و بتازی شبت گویند.

وادیان[15]: گیاہی است بوستانی و گویند آن والان است.

---

[1] رک: موید ۲: ۲۵۴ و جہانگیری ۲: ۱۵۷۸. بظاہر تصحیف زگال یا زغال است کہ بمعنی انگشت سوختہ آمدہ. فرہنگ معین دغال مطلقاً ندارد و بجای آن زغال، زگال، ژگال، شگال، شگار دارد، ۲: ۱۷۴۰.

[2] رک: موید ۲: ۲۵۴ و جہانگیری ۲: ۱۴۱۳. [3] رک: ادات و موید ایضاً.

[4] گذاشت در ادات؛ اما برای این کلمہ صورتہای مختلف آمدہ، مانند ورشتان، ورستان، ورشنان، ورسنان، بربروشان، بروسنان، بروشیان وغیرہ اما بقول دکتر معین در حاشیۂ برہان ص ۲۴۴۹ ہمہ را تصحیف برروشنان قرار می دہد و ہمین صورت در فرس ص ۳۵۸ نقل شدہ. برای آگاہی بیشتر رک: قواس ص ۸ ح ۵. [5] رک: فرس ص ۳۷۷، قواس ص ۸۳، صحاح ص ۲۵۷.

[6] رک: فرس ص ۳۵۴، قواس ص ۱۰۳. [7] برای معنی اوّل رک: فرس ص ۳۶۶، قواس ص ۸۷.

[8] رک: برہان ص ۲۲۴۶. [9] موید ۲: ۲۵۵ معنی این کلمہ بحوالۂ زفان آوردہ.

[10] نسخۂ اصل ندارد.

[11] اصل ناخوانا و نسخۂ 'ل': واریانج؛ رازیانج معرب رازیانہ است کہ مترادف والانست، رک: جہانگیری ۱: ۵۴۱؛ برای رازیانہ رک: ہدایۃ المتعلمین ص ۳۶۳، ۳۶۷، ۳۸۲ وغیرہ.

[12] نسخۂ 'ل': سونپی، موید: سونف. [13] از اینجا تا آخر در نسخۂ 'ل' افتادہ. [14] موید: سویا.

[15] جہانگیری ۱: ۵۳۵ وادیان بادیان باشد، و والان بمعنی بادیانست؛ دستورالاخوان وادیان را مترادف الشبت نوشتہ (رک: ص ۳۵۹).

ورخین[1] : جانوریست آبی که چشم ندارد، گردن دراز و باریک، و دندان دارد، در آب تیره و شور قرار گیرد، بهندوی[2] بوبو گویند

بهرهٔ 'ه'

وشکله[3] : دانهٔ انگور.

ولانه[4] : ریش یعنی جراحت، و بعضی بفتح واو گویند.

ورپوشنه[5] : سرپوش چون دامنی و چادر.

وشنگه[6] : عورت مرد یعنی کیر.

وشکرده[7] : بفتح واو، چست و ساخته.

وشکرده[8] : بکسر واو، چیزی با جد و کوشش، و گویند با توش[9] و پوش یعنی کرّ و فرّ و توانائی.

وسینه[10] : جوشن و آن گونه است از پوشش سلاحی.

ولغونه[11] : سرخی و سپیدهٔ زنان.

والغونه[12] : همان ولغونه است.

ویژه[13] : بیای پارسی، خالص و خاص را گویند، بعضی بیای عربی گویند.

ویده[14] : چاره جستن.

ورده[15] : برج [کبوتر].

وله : بعضی بتشدید لام، خشم

---

[1] موید ۲ : ۲۵۵ معنی واژه بحوالهٔ زفان نوشته، برهان ۲۲۶۲ ودخین. [2] کذا است در برهان ۲۲۶۲.

[3] رک : موید ۲ : ۲۵۸ و جهانگیری ۲ : ۱۴۱۳. [4] رک : قواس ص ۸۳، موید ۲ : ۲۵۸، جهانگیری ۲ : ۱۶۷۱. [5] نسخهٔ اصل : وکاله ؛ رک : موید ۲ : ۲۵۷، برهان ۲۲۶۴.

[6] نسخهٔ اصل : وسنکه. رک : برهان ص ۲۲۸۷. اما در موید ۲ : ۲۵۸ وشکنه بحوالهٔ زفان، و دشگنه بحوالهٔ ادات؛ جهانگیری ۲ : ۱۴۱۳-۱۴ وشگنه و وشنگه هردو بمعنی آلت تناسل آورده. سلیمانی ۲۵۳ وشگنه عورت مرد.

[7] رک : ادات و موید ۲ : ۲۵۷. [8] رک : ادات و برهان ص ۲۲۸۵.

[9] نسخهٔ 'ل' : مالوپوشش ولوش. [10] ادات : وسینه جوشن ؛ در موید ۲ : ۲۵۷ بجای این کلمه، وسه بمعنی جو بدستی بحوالهٔ زفان نوشته. برهان ۲۲۸۷، سرمهٔ سلیمانی ۲۵۳ وشینه جوشن.

[11] رک : موید ۲ : ۲۵۸، برهان ص ۲۲۹۱. [12] برهان ایضاً. [13] رک : موید ۲ : ۲۵۸.

[14] رک : ایضاً؛ اما برهان بمعنی 'چاره جسته' از مصدر ویدیدن (ص ۲۲۹۸).

[15] رک : فرس ص ۴۷۴، صحاح ص ۲۹۲. [16] رک : برهان ص ۲۲۹۱.

ویره[1] : درخت خربزه.

ورواره[2] : غرفه یعنی چهجّه.

وخشینه[3] : مرغی است سپید، وقت بهار در باغها نشیند.

ولوله[4] : آشوب.

وسمه[5] : سنگی است[6] سبز که ترکان ابرو بدان کشند.

وسه[7] : عارض خانه.

وایه[8] : مایحتاج یعنی بایسته.

بهرهٔ 'ی'

وسنی[9] : انباغ[10]، وبعضی بفتح واو گویند وبفتح وکسر سین [ورق ۱۰۶ ا] نیز گویند.

گونهٔ 'ه'

بهرهٔ 'الف'

هرّا[11] : ساخت زین، و آواز[12] ددگان را نیز هرا گویند.

هویدا[13] : آشکارا و روشن بغایت.

هجا[14] : علامت.

همانا[15] : پنداری و مانند.

---

[1] رک : موید ۲ : ۲۵۸، برهان ۲۲۹۹ درختی که ساق نداشته باشد و بر زمین پهن شود الخ.

[2] رک : جهانگیری ۱ : ۱۱۷۵ و برهان ص ۲۲۷۷ متن و حاشیه ؛ صحاح ص ۲۹۲ : وروازه، و این اشتباه است.

[3] رک : موید ۲ : ۲۵۷، برهان ص ۲۲۶۱. در اصل این واژه مصحف خشینه است. رک : برهان ایضاً حاشیه ؛ صحاح ص ۲۷۵ : خشینه مرغابی سیاه و رنگش میان سیاه و کبود.

[4] موید ۲ : ۲۵۸ : ولوله شور و غوغا. [5] رک : ادات و موید ۲ : ۲۵۶.

[6] نسخهٔ 'ل' : رنگی سبز که در بناگوش، برهان ۲۲۸۱ سنگی است که بآب آسایند و بر ابرو می مالند الخ.

[7] کذا است در نسخهٔ 'ل' ؛ اما معنی وسه در بعضی فرهنگها چوبدستی است، نسخهٔ اصل وده.

[8] رک : موید ۲ : ۲۵۷ و برهان ص ۲۲۵۶. [9] رک : فرس ص ۵۲۳، قواس ص ۱۰۱.

[10] زفان : زن دیگر باشد که آنرا سوکن گویند. [11] رک : قواس ص ۱۷۶، ادات (معنی اوّل).

[12] رک : جهانگیری ۱ : ۱۱۷۸ هرّا باوّل مضموم آواز مهیب مانند آواز سباع و وحوش.

[13] رک : قواس ص ۱۹۳. [14] رک : ادات و برهان ۲۲۶۷.

[15] رک : فرس ص ۱۰-۱۱، صحاح ص ۳۱، برهان ص ۲۲۶۴.

بهرهٔ «ت»

هنگفت[1] : جامهٔ سفت ، وبعضی بفتح ها گویند .

هلخت[2] : پای افزار .

هرات : نام شهری از خراسان که آنرا هری[3] و هریو[4] نیز گویند .

بهرهٔ «چ»

هج[5] : بضم وفتح ها ، راست بازکردن چنانچه علم ونیزه ، وبعضی نصب نیزه وعلم ومانند آن گویند یعنی هج کرد ، واگر چیزی بزمین افگنی راست و برزمین راست بایستد گویند هج کرد .

بهرهٔ «خ»

هیدخ[6] : اسب نیک خنگی[7] که تند بود .

بهرهٔ «د»

هرمزد[8] : مشتری ، سیارهٔ فلک .

هورمزد[9] : همان هرمزد است .

هنکارد[10] : تندی .

هیربد[11] : خادم آتشکده و قاضی گبران .

هید[12] : ماله که بدان کشت راهموار کنند وبعضی بذال[13] معجمه وبعضی بیای پارسی گویند .

---

[1] رک : قواس ص ۱۵۳ ، ادات ، موید ۲ : ۲۶۲ .

[2] رک : فرس ص ۳۸ ، قواس ص ۱۵۶ ، صحاح ص ۴۸ ، ادات وغیره .

[3] رک : برهان ص ۲۳۲۹ . [4] ایضاً ۲۳۳۰ ، هراو هریوه نیز گویند ، رک : ایضاً .

[5] رک : ادات و موید ۲ : ۲۶۱ ؛ فرس ص ۶۷ ، قواس ص ۱۷۴ ، صحاح ص ۵۵ : هج بمعنی راست کردن علم بود .

[6] رک : فرس ص ۷۶ ، صحاح ص ۷۰ ، نیز ادات ، موید ۲ : ۲۶۱ ؛ ادات : هیدج و موید هیدج وهیدخ هر دو دارد .

[7] فرس وصحاح : خصلتی ، سلیمانی ، جعفری : جنگی . [8] رک : صحاح ص ۸۵ و ادات .

[9] رک : ادات [10] رک : ادات و موید ۲ : ۲۶۲ . [11] رک : موید ۲ : ۲۶۲ ، برهان ص ۲۴۰۵ ؛ برای آگاهی بیشتر دربارهٔ این کلمه رک : برهان ایضاً حاشیه و فرهنگ معین ۵۲۳۱-۳۲ .

[12] رک : موید ۲ : ۲۶۲ ، برهان ص ۲۴۰۴ . [13] چون ماقبل دال «ی» است بنا برقاعدهٔ تفریق میان دال و ذال اصل کلمه هیذ است نه هید . مولف زفان گویا این را بیان نموده است .

هرند[1]: نام[2] لب آبی بگرگان .

بهرهٔ 'ر'

هور[3]: آفتاب .

هیر[4]: آتش

هلندور[5]: کربا ، و آن داروئی است .

هژیر[6]: بازای پارسی ، نیکو و فرخ[7] .

هودر[8]: زشت یعنی قبیح ، بفتح ها نیز گویند و بلغتی ذال معجمه و واو پارسی .

هیکر[9]: اسب سیاه بود[10] که بسرخی زند .

هجیر[11]: نام مردی .

هنجار[12]: راه ، و گویند کسی باشد که راه نگذارد[13] و برابر آن راه همی رود .

بهرهٔ 'ز'

هرمز[14]: مشتری[15] فلک .

هیز[16]: مخنث .

هنیز[17]: اکنون و زیادت .

---

[1] این واژه در نسخهٔ 'ل' افتادگی دارد . [2] رک : جهانگیری ۱ : ۱۱۸۲ ، برهان ص ۲۳۲۷ . در جهانگیری هرند نام قصبهٔ از نواحی اصفهان نیز ؛ در حدود العالم است که هرند رودی است بحدود خراسان ، از طوس برود بحدود آستو و جرمکان برود و میانهٔ گرگان ببرد و بشهر آبسکون رود و بدریای خزران افتد (ص ۳۲) .

[3] قواس ص ۱۴ . [4] رک : ادات و موید ۲ : ۲۶۴ . [5] فرس ص ۱۱ : کرباگیاهی است که آنرا هلندوز خوانند ، ادات و جهانگیری ۲ : ۱۶۷۴ هلندوز (بازای عربی) ؛ اما در موید ۲ : ۲۶۴ ، ۶۵ هلندور و هلندوز هردو ، همین است در برهان ص ۲۳۵۹ . [6] رک : فرس ص ۱۰۶ ، قواس ص ۹۴ ، صحاح ص ۱۱۸ .

[7] نسخهٔ اصل : فرج . [8] رک : ادات و موید ۲ : ۲۶۴ ، برهان ص ۲۳۸۹ ؛ رشیدی هوذر باذال فارسی .

[9] رک : موید ۲ : ۲۶۴ ، جهانگیری ص ۲۳۶۷ ، برهان ص ۲۴۰۷ . [10] نسخهٔ 'ل' : سیاه بود ندارد .

[11] جهانگیری ۱ : ۷۲۰ : هجیر پسر گودرز برادر گیو است ، سهراب اورا زنده گرفت .

[12] رک : فرس ص ۱۴۶ ، صحاح ص ۱۱۸ ، ادات . [13] فرس و صحاح : راه بگذارد و برابر راه همی رود .

[14] رک : صحاح ص ۱۳۴ . [15] نسخهٔ 'ل' : نام مشتری .

[16] صحاح ص ۱۳۴ : هیز حیز بود یعنی مخنث .

[17] موید ۲ : ۲۶۵ : هنیز اکنون و زیادت ؛ برهان ص ۲۳۸۴ بمعنی هنوز است ؛ فرهنگ معین ص ۵۲۱۱ ، هنیز و هنوز مترادف اند ، برای شاهد رک : هدایة المتعلمین ص ۱۶۹ ، ۱۷۴ ، المعجم چاپ مدرس ص ۲۳۱-۳۲ .

بهرهٔ 'ژ'

باژ[1] : حیران و فرمانده و درمانده .

بهرهٔ 'س'

هراس : بیم و ترس .

بهرهٔ 'ش'

هراش[2] : قی .

هوش[3] : هلاک ، و این پهلوی است ، و خرد یعنی عقل و زیرکی ، گویند هوشمند یعنی بخرد و هُش 'بغیر واو هم گویند .

هشتویش[4] : پنجم روز از فوردیان[5] .

بهرهٔ 'ف'

هف[6] : بفتری یعنی کارگاه بافنده ، و فخر قواس گوید : هف چوبی است که در بافتن بر جامه زنند .

بهرهٔ 'ک'

هباک[7] : تارک سر ، و بعضی بیای پارسی گویند .

هزاک[8] : ابله و نادان که آسان فریفته شود .

هولک[9] : گردون بازی و آن[10] بازی خراسان است .

---

[1] رک : قواس ص ۱۱۲ ، صحاح ص ۱۳۸ .　[2] قواس ص ۱۶۱ ، صحاح ص ۱۵۷ .

[3] رک : فرس ص ۲۱۱ ، قواس ص ۱۶۳ ، صحاح ص ۱۵۷ .

[4] جهانگیری ۲ : ۱۶۱۶ و برهان ص ۲۳۳۹ : هشتویش نام روز پنجم است از خمسهٔ مسترقه ، نیز رک : خرده اوستا ص ۲۱۱ و کلمهٔ وهشت (وخشت) .

[5] نسخهٔ 'ل' : فروردین ، موید ۲ : ۲۶۶ هشتویش (هشوشس اشتباه چاپی) بمعنی مندرجهٔ متن بحوالهٔ زفان . درنسخهٔ اصل بعد این کلمه جزوی کرم خورده .

[6] رک : موید ۲ : ۲۶۷ هف بالفتح کارگاه جولاهه که آنرا بفتری گویند و فخر قواس گوید الخ ، این معنی اخیر از زفان گویاست ، مقدمة الادب زمخشری ص ۳۸۷ : هف بفتری بافنده الخ ؛ فخر قواس این واژه را ندارد، رک : فهرست کتاب چاپی . اما بفتری بمعنی هف آورده (ص ۱۸۳) .

[7] رک : فرس ص ۲۵۳ ، قواس ص ۷۷ ، صحاح ص ۱۸۹ .

[8] قواس ص ۱۰۴ عیناً معنی مندرج در متن دارد .

[9] رک : قواس ص ۱۸۸ .　[10] قواس این تخصیص ندارد .

هسک[1] : بدو فتحت ، غله افشان که آنرا ببندی [ورق ۱۰۷ آ] چهج[2] گویند ، و بعضی بکسر ها گویند ، و بسکون سین نیز آمده است .
هیرک[3] : شتربچه چنانک بره : گوسپند بچه .
هلک[4] : دم بالا .

بهرهٔ گ

هنگ[5] : زیرکی و زکا[6] و قوم و سپاه .
هوشنگ[7] : نام پادشاهی است از باستانیان .

بهرهٔ ل

هال[8] : آرام و قرار .
همال[9] : انباز و همتا .
هیکل[10] : جثه یعنی پیکر[11] چیزی و بتخانهٔ ترسایان و بهار خانه .

بهرهٔ م

هردم[12] : نام شهری .
هنگام : وقت .
هرتوم[13] : تخم اسپغول ، و بضم ها نیز گویند .

---

[1] قواس ص ۱۴۰ : هسک غله افشان . [2] ادات و موید ۲ : ۲۶۷ : چهاج .
[3] رک : موید ۲ : ۲۶۸ ، برهان ص ۲۴۰۶ . [4] رک : موید ۲ : ۲۶۷ ، برهان ص ۲۳۵۶ . [5] رک : موید ۲ : ۲۶۸ ، برهان ص ۲۳۸۱-۸۲ . [6] موید این معنی که بحوالهٔ زفان نوشته مورد تائید قرار نمی گیرد .
[7] هوشنگ پسر سیامک بود ، جدش کیومرث نام داشته ، رک : برهان ص ۲۳۹۵ . [8] رک : فرس ص ۳۱۷ ، قواس ص ۱۰۳ ، صحاح ص ۲۱۲ . [9] رک : صحاح ص ۲۱۲ . [10] ادات : هیکل بهار خانه و جثهٔ بزرگ و بتخانهٔ ترسایان ، صحاح ص ۲۱۲ : هیکل بهار خانه باشد به پهلوی یعنی بت خانه . اما این کلمه عربی است ، رک : دستور الاخوان ص ۶۷۲ ، موید ۲ : ۲۶۹ . [11] نسخهٔ اصل : بیک .
[12] جهانگیری ۱ : ۱۱۸۳ : هردم نام شهر زنان است ، فردوسی :

همی رفت با نامداران روم ÷ بدان شارسانان که خوانی هروم
که آن شهر یکسر زنان داشتند ÷ کسی بر در شهر نگذاشتند

[13] کذا است در دستور الافاضل (ص ۲۵۰ حاشیه ۶) ؛ اما این اشتباه است ، در اصل کلمهٔ صحیح هردتوم است ، رک : قواس ص ۴۰ ، ادات ، بحر الفضائل ، موید ۲ : ۲۷۰ ، جهانگیری ۱ : ۱۱۸۳ وغیره .

بهرهٔ «ن»

هامون[1]: دشت و زمین هموار، و گویند زمین[2] سخت که باران قبول نه کند.

هیون[3]: اسب[4] و اشتر، و گویند شتر جمازه یعنی تند که[5] بسیار رود، هندوئی[6] سانڈه گویند.

هارون: نقیب[7] و قاصد.

هون[8]: بدو فتحت، زمین کشت با کلوخ، و بسکون واو نیز گویند.

همایون: مبارک.

هاون[9]: جواز و آنچه درآن دارو ها کوبند.

هین[10]: بشتاب و سیلاب و بگذار.

هزمان[11]: هر زمان، گوئی را را حذف کرده اند.

همیدون[12]: وقتی از اوقات چنانک گویند درین میان، ناگاه، و همدون[13] هم اکنون است.

هان[14]: هوشدار[15].

هرین[16]: آواز.

هومان[17]: نام مردی از پهلوانان ترکان[18] که برادر پیران بود.

بهرهٔ «و»

هو[19]: ریم و زرد آب.

---

[1] رک: قواس ص ۲۸، صحاح ص ۲۵۵، ادات. (معنی اول). [2] در موید ۲: ۲۷۰ این معنی بحوالهٔ زفان نوشته.

[3] رک: قواس ص ۷۴، صحاح ص ۲۵۶، ادات. [4] نسخهٔ اصل: شتربچه.

[5] موید ۲: ۲۷۳ این معنی بحوالهٔ زفان نوشته. [6] موید: سانڈ.

[7] رک: ادات و موید ۲: ۲۷۰. [8] رک: ادات و موید ۲: ۲۷۳. [9] رک: ادات و برهان ص ۲۳۱۲.

[10] رک: ادات و موید ۲: ۲۷۳. [11] رک: صحاح ص ۲۵۶. [12] موید ۲: ۲۷۲ معنی کلمه بحوالهٔ زفان نوشته، صحاح ص ۲۵۶: همیدون، همچنین، برهان ص ۲۳۷۴: همیدون بمعنی همین دم، همین ساعت، همین جا، این زمان، اینچنین، همچنین، بیک ناگاه.

[13] در نسخهٔ اصل افتادگی دارد. [14] رک: برهان ص ۲۳۱۲.

[15] در اصل: هوشدار و اکنون؛ واضح است که اکنون معنی کلمهٔ سابق است.

[16] در نسخهٔ اصل کرم خورده، موید ۲: ۲۷۱، جهانگیری ۱: ۱۱۸۴: هرین آواز مهیب، هرّا نیز خوانند.

[17] جهانگیری ۲: ۲۱۳۸: هومان برادر پیران ویسه. [18] ازینجا تا آخر در نسخهٔ اصل افتاده.

[19] رک: جهانگیری ۲: ۲۱۳۱.

هلیو[1]: سبد.
هازو[2]: فرومانده و حیران.
هستو[3]: مقر.
هرو: مرد دلیر[4].

بهرهٔ «ه»

هویه[5]: کتف یعنی دوش و حمایت، و بعضی بضم ها گویند.
هده[6]: حق و نفع و فایده، بواو نیز گویند، بیهوده یعنی باطل و ناحق ولاینفع.
هروانه[7]: بیمارستان.
هرکاره: دیگ آهنی[8] که در و حلوا کنند[9]، بتازی طنجیر[10] و بهندوی تتر[11] و کراهی[12] گویند.
هیمه[13]: هیزم و بعضی بیای پارسی، بلغتی هاء مفتوح است.
هزینه[14]: نفقه یعنی آنچه بدان روز گذارند و روزگار بگذرانند.
هماره[15]: همیشه یعنی همواره.
هاینه[16]: ناچار[17] جستن.

---

[1] رک: رشیدی ص ۱۴۹۸، جهانگیری ۲: ۱۶۷۵، برهان ص ۲۳۶۱؛ اما موید ۲: ۲۷۳: هلیو سبل، و نسخهٔ ل: سبلهازو، یعنی کلمهٔ هلیو را با واژهٔ هازو جمع کرده؛ یکی از مثالهای بهترین غلط خوانی است.
[2] جهانگیری ۱: ۵۴۴، برهان ص ۲۳۰۷: هازو و هاژ (هاژه) بمعنی حیران و فرومانده، نیز رک: هاژ درهمین فرهنگ (زفان).
[3] رک: جهانگیری ۱: ۱۳۳۵ و برهان ص ۲۳۳۶. خستو نیز بهمین معنی آمده، رک: فرس ص ۴۰۶، صحاح ص ۲۶۵، جهانگیری ۱: ۱۲۸۴.
[4] نسخهٔ اصل: دیر. رک: جهانگیری ۱: ۱۱۸۲، برهان ص ۲۳۲۸.
[5] رک: قواس ص ۸۴؛ اما موید ۲: ۲۷۵ هو به نوشته.
[6] رک: جهانگیری ۱: ۸۱۵.
[7] رک: فرس ص ۴۶۴، قواس ص ۱۲۸، صحاح ص ۲۹۲، جهانگیری ۱: ۱۱۸۲.
[8] جهانگیری ۱: ۱۱۸۰: هرکاره: دیگ سنگی، برهان ص ۲۳۲۳: هرکاره دیگ سنگی و آهنی؛ نسخهٔ ل: دیگ آهنین.
[9] برهان: پزند.
[10] دستورالاخوان ص ۴۱۲: الطنجیر هرکاره.
[11] قواس ص ۱۳۷: هرکاره: تتر.
[12] این کلمه در نسخهٔ ل افزوده شده.
[13] رک: قواس ص ۱۴۱.
[14] قواس ص ۱۴۳: هزینه آنچه روز بروز بگذرانند.
[15] مخفف همواره، رک: جهانگیری ۲: ۱۷۳۵.
[16] جهانگیری ۱: ۵۴۹: هاینه و هاینه مخفف هرآینه و هرآینه باشد.
[17] موید ۲: ۲۷۴ این معنی بحوالهٔ شرفنامه نوشته.

هاله[1]: خرمن[2] ماه و آفتاب یعنی دورکه بگرد آن باشد[3].

هرزه[4]: بی فایده و بیهوده و روان گفتن، گویند هرزه مدرائی[5] یعنی بیهوده مگوی.

هراسه[6]: آلت ترسانیدن [ورق ۱۰۸ ا] یعنی بدانچه[7] کسی را بترسانند و برمانند و آنرا در کشتها نصب کنند. بتازی مخذار[8] گویند.

هیاسه[9]: بدانچه تنگ زین کشند.

هریوه[10]: شبینه که تعین کنند برای زنجه[11] را.

هنگامه[12]: جای جمع شدن خلق.

هرآینه[13]: قطع و بیشک[14] یعنی آنکه گوئی ناچار چنین بود.

بهرهٔ "ی"

هکری[15]: کشتی که از باران آب خورد.

هیلوی[16]: گردون[17] بازی که بازی خراسان[18] است، بعضی بیا[19] و واو پارسی[20] و بلغتی با مفتوح است.

هلوی[21]: حیران.

۱

۲ رک: جهانگیری ۱: ۵۴۶. در موید ۲: ۲۷۳ و در دستورالاخوان ص ۶۶۷ هاله را عربی قرار داده شده و در اکثر فرهنگها معنی هاله خرمن ماه است فقط؛ اما در ادات مانند متن.

۳ نسخهٔ اصل ندارد. ۴ نسخهٔ اصل: هریزه، رک: صحاح ص ۲۹۲.

۵ گذاشت در موید ۲: ۲۷۴. ۶ نسخهٔ 'ل': ملای، واین هم درست است، رک: برهان ص ۲۳۲۱.

۷ رک: جهانگیری ۱: ۱۱۷۹. ۸ نسخهٔ اصل: آنچه کسی را بترسانیدن.

۹ رک: برهان ص ۲۳۱۹. ۱۰ رک: موید ۲: ۷۵، برهان ص ۲۴۰۲.

۱۱ گذاشت در موید ۲: ۲۷۴؛ در نسخهٔ 'ل' این واژه بدون نقطه. ۱۲ گذاشت در اصل.

۱۳ رک: موید ایضاً و برهان ص ۲۳۸۲. ۱۴ رک: موید ۲: ۲۷۴ و برهان ص ۲۳۲۰.

۱۵ نسخهٔ اصل: بیشکی.

۱۶ رک: قواس ص ۵۵، دستورالافاضل ص ۲۴۹، موید ۲: ۲۷۶، درین هر سه فرهنگ عیناً معنی مندرجهٔ متن درج است.

۱۷ رک: قواس ص ۱۸۸؛ اما در موید ۲: ۲۷۶ هلوی بدین معنی آمده. ۱۸ نسخهٔ 'ل': گردان.

۱۹ این تخصیص در فرهنگها دیده نشد. ۲۰ نسخهٔ 'ل': بیای پارسی.

۲۱ گذاشت در اصل؛ اما کلا درست 'هکوی' است، رک: ادات و موید ۲: ۲۷۶ و جهانگیری ۲: ۱۵۵۴ و برهان ص ۲۳۵۷.

هواری[1]: بارگاه.
همای[2]: نام عورتی است و نام جانوری که مبارک گرفته

گونهٔ «ی»

بهرهٔ «الف»

یغما: غارت[3]، و نام شهری که مشک آنجا[4] خیزد در ولایت ترکستان.
یکتا[5]: یکتو.
یارا: زهره و قوت.

بهرهٔ «ب»

یب[6]: پیر[7] باشد.

بهرهٔ «ج»

یغنغج[8]: ماریست زرد که در باغها بود و نگزد و زهر ندارد، و یفتنج نیز گویند.
یوج[9]: جانوریست از خزندگان.
یج[10]: لفظی است که [چون[11] شتررا] بر زانو آرند[12] گویند یج یج، و گروهی گویند[13] که سخنی باشد که نهان گویند [چنانکه[14] کسی معلوم نکند که چه می گویند] مردم عام یج یج می کنند.

---

[1] رک: موید ۲: ۲۷۶، جهانگیری ۲: ۲۱۳۲ و برهان ص ۲۳۸۵.
[2] همای دختر بهمن بود، رک: جهانگیری ۲: ۱۷۲۷، برهان ص ۲۳۶۵ متن و حاشیه.
[3] نسخهٔ «ل»: عمارت. [4] این عبارت در نسخهٔ «ل» افتادگی دارد: این معنی در فرهنگها دیده نشد؛ معنی کلمه اینست: خوبان از آنجا خیزند، رک: صحاح ص ۳۳، موید ۲: ۲۷۷.
[5] ادات: یکتا یکتوی از جامه. [6] موید ۲: ۲۷۸ بحوالهٔ زفان یب بمعنی پیر نوشته.
[7] کذا است در اصل؛ نسخهٔ «ل» پیر بدون نقطه ها؛ فرس ص ۲۹: یب تیر بود بزبان سمرقندی، با بیت شاهد از منجیک، نیز رک: جهانگیری ۱: ۶۲۱، برهان ص ۲۳۲۴.
[8] این کلمه بشکلهای مختلف در فرهنگها ضبط شده مانند یفقیج (برهان، قواس)، بغنج (ادات)، یفج (معیار جمالی، مدار، سروری، برهان ۱: ۲۹۱)، یفتنج (سروری، موید، زفان، برهان)، یغتنج (موید، زفان، برهان).
[9] رک: موید که بحوالهٔ همین زفان معنی کلمه نوشته، نیز برهان ص ۲۴۵۶.
[10] رک: ادات، و در موید ۲: ۲۷۹ ذیل فصل عربی. [11] از روی ادات تصحیح شده.
[12] ادات: نشانند. [13] کذا است در نسخهٔ «ل».
[14] تصحیح از روی ادات و موید.

بهرهٔ 'چ'

یفج[1] : لعاب دهن.
یاسچ[2] : تیر، وبعضی بضم[3] سین گویند.

بهرهٔ 'خ'

یخ : اشک زمستان.

بهرهٔ 'د'

یارد[4] : یعنی تواند.
یاکند : یاقوت[5]، وبعضی بفتح کاف گویند.

بهرهٔ 'ر'

یاور[6] : یاری گر و[7] پشتیوان باشد.
یادر[8] : دهم روز از ماه.

بهرهٔ 'ز'

یوز : دده است معروف، وآن جانور شکار کننده[9] است که هندوی چیته گویند[10]، وجستن[11] چنانکه گویند راه یوز و چاه یوز و جنگ یوز و رزم یوز، و دربسی ولایت پارسی گویان سگِ خرد را گویند

---

[1] رک : ادات ؛ این کلمه بصورت بفج درهمین فرهنگ ذیل گونهٔ 'ب' آمده ؛ و نیز در فرس ص ۶۳، مدار ۱ : ۲۳۱، جهانگیری ۱ : ۵۰۶، سروری ص ۱۲۳، رشیدی ۱ : ۳۲۷ : بفج ؛ و در قواس ص ۸۳، دستور ص ۲۵۳ : یفج ؛ اما در برهان بفج و یفج و در موید بفج و یفج هردو. [2] سه صورت این کلمه در فرهنگ ها دیده شد، یاسچ در ادات و زفان، یاسج و یاسیج جهانگیری ۱ : ۵۵۵، یاسج برهان ص ۲۴۱۸.

[3] در ادات باضم وکسر. [4] در نسخهٔ اصل این دو کلمه افتاده.

[5] رک : موید ۲ : ۲۷۹. [6] نسخهٔ 'ل' : یلور. [7] جهانگیری ۲ : ۵۵۸ : یادر یاری ده و مددگار.

[8] جهانگیری ۱ : ۵۵۱، برهان ص ۲۴۱۳ : یادر دوازدهم تیرماه باشد و آنروز جشن است ؛ برهان ذیل یادر نوشته : نام روز دهم است از هرماه. اما بظاهر این درست نیست زیرا نام روز دهم هرماه آبان نام بود، رک : مدار ۱ : ۱۴۴، نیز رک : حاشیهٔ برهان نمره ۳۰ - ص ۲۴۱۳.

[9] این جمله درنسخهٔ 'ل' افتادگی دارد.

[10] در موید ۲ : ۲۸۱ معنی کلمه تا این جا بحوالهٔ زفان گویا آمده.

[11] نسخهٔ 'ل' بجای چنانکه ... رزم یوز، آمده است : یعنی گریختن چنانک بزرگی گوید، بیت :

یوز از چشم آهوانهٔ او ❊ گرکند عاشقی بود آهو

که چون کبک در سوراخ شود اندر فرستند تا کبک را از سوراخ بدر آرد ، آنرا یوزک گویند[1]
در فرهنگنامه لفظ[2] یوز برای گریختن هم آمده است .

یاز[3] : قصد[4] .

یغز[5] : رنگ است معروف .

بهرهٔ غ

یوغ[6] : آن چوب که برگردن گاو در جفت وگردون بندند ، و هندوی آنرا جوه[7] گویند .

بهرهٔ ک

یشک[8] : چهار دندان تیز یعنی دندان پیشتر ، وآن دندان بزرگ ترین بود[9] که پیش باشد[10] از آن مار و
دده و دام[11] و مانند آن از جانوران .

یوک[12] : آنچه بر و نان نهند و در تنور زنند[13] .

یوزک[14] : سگ بچه ای که در آن کبک[15] در آید ، در رود وبکشد .

یزک[16] : [ورق ۱۰۹ ا] چند سوار که بجهت خبر آوردن از لشکر بروند .

یلک[17] : کلاه پادشاه ، وآن کلاهی است باجعد وگوش .

---

[1] در موید تا آخر معنی کلمه از زفان گرفته شده اما نام فرهنگ درج نیست . در نسخهٔ 'ل' بجای این جمله عبارت زیر است یعنی گریختن چنانک بزرگی گوید :

یوز ازچشم آهوانه' او الخ.

[2] نسخهٔ 'ل' : نام لفظ . [3] امر واحد حاضر از مصدر یازیدن بمعنی قصد کردن ، و نیز اسم فاعل مرخم یعنی یازنده. موید ۲ : ۲۸۰ یاز بمعنی قصد و قصد کن نوشته . برای یاز رک : برهان ص ۲۴۱۶ و برای یازیدن ، بخش مصادر و جهانگیری ۱ : ۵۵۴ و برهان ص ۲۴۱۷.

[4] کذاست در ادات و موید . [5] موید ایضاً : یغز یک نوع رنگ اسب .

[6] رک : فرس ص ۲۲۹ ، صحاح ص ۱۶۶ ، موید ۲ : ۲۸۲ . اما قواس ص ۱۸۱ یوغ بمعنی تخته سپار و برزماله نوشته.

[7] نسخهٔ اصل : جوهره ؛ 'ل' و ادات : جوا. [8] رک : فرس ص ۲۶۵ ، قواس ص ۸۲ ، صحاح ص ۱۹۰ ، دستور ص ۲۵۴ .

[9] نسخهٔ 'ل' : بوتد . [10] نسخهٔ 'ل' : باشند . [11] نسخهٔ 'ل' 'و دام' ندارد.

[12] معنی این کلمه در قواس ص ۱۴۹ عیناً مانند متن است . [13] نسخهٔ 'ل' ندارد .

[14] رک : موید ۲ : ۲۸۳ ، برهان ص ۲۴۵۷. [15] نسخهٔ اصل : سوراخ کبک .

[16] رک : موید ۲ : ۲۸۳ . [17] رک : موید ایضاً که معنی مندرج در متن را بحوالهٔ زفان نقل نموده ، نیز رک : برهان ص ۲۴۴۸ متن و حاشیه .

بهرهٔ گ

ینگ[1] : شکل .

بهرهٔ ل

یال[2] : گردن اسب ، وگویند گردن[3] هر که باشد و نیز سر[4] اسب را گویند .

یل : پهلوان و مبارز وشیر[5].

بهرهٔ م

یشم[6] : سنگی است سبزوام ، از او انگشتری[7] کنند دفع برق را .

یجکم[8] : خانهٔ تابستانی و نام ترکستان بترکی ، وگروهی جعفری گویند .

بهرهٔ ن

یزدان : خدای جلّ جلاله[9] وعمّ نواله .

یون[10] : نمد زین .

یاسمین : نام گلی است

یونان : نام مقامی است که درو مردمان[11] حکمتناک وصاحب عقل باشند وخیزند .

یکران[12] : اسب که هیچو اشقر[13] بود ، اما ذنب وفش او سپید بود واگر سپید نبود بور بود .

یرنان[14] : شهر سمرقند را گویند .

---

[1] رک : قواس ص ۱۹۵ ؛ ادات : ینگ شکل و مانند ، رک : موید ۲ : ۲۸۳ ؛ جهانگیری ۲ : ۱۹۱۸ : ینگ آئین روش. [2] دستور ص ۲۵۳ ، ادات ، جهانگیری ۱ : ۵۵۷ : یال موی گردن اسب .

[3] رک : قواس ص ۸۳ ، صحاح ص ۲۱۳ ، جهانگیری ۱ : ۵۵۷ ، برهان ص ۲۴۲۰ . [4] کذاست نسخهٔ 'ل' نسخهٔ اصل : ست . [5] برای این معنی رک : ادات و موید ۲ : ۲۸۳ . [6] رک : ادات و موید ۲ : ۲۸۴ یسم اشتباه چاپی ، برهان ص ۲۴۳۵ ؛ نسخهٔ 'ل' : یشم سنگی است معروف دافع برق .

[7] نسخهٔ اصل : انگشترین . [8] این واژه در اکثر فرهنگها شامل نیست ؛ ادات یجکم از نامهای ترکستان است خانهٔ تابستانی با دیوارهای مشبک وگروهی آنرا جعفری گویند ؛ موید ۲ : ۲۸۴ این کلمه را ذیل فصل ترکی با معنی درج آورده . [9] نسخهٔ 'ل' : عزّ وجلّ . [10] رک صحاح ص ۲۵۸ ، و ادات و موید ۲ : ۲۸۵ .

[11] نسخهٔ 'ل' مردمان ندارد . [12] رک : صحاح ص ۲۵۷ .

[13] موید ۲ : ۲۸۵ معنی مندرج متن را بدون ذکر ماخذ نوشته . [14] رک : موید و برهان ص ۲۴۴۲ .

[15] کذاست در نسخهٔ اصل ، نسخهٔ 'ل' بدون نقطه ها ؛ موید ۲ : ۲۸۵ ، جهانگیری ۱ : ۱۱۸۶ ، برهان ص ۲۱ اما شهری بدین نام در کتابها دیده نشد .

بهرهٔ 'ه'

یخچه[1] : ژاله.

یاوه[2] : سردرگم[3] و گم گشته و بیهوده و نخش.

یشمه[4] : چرم خام و بی چربی چون سیرم[5].

یلمه[6] : قبا.

یوبه[7] : آرزو

یله[8] : رها شده و گم کرده و هرزه.

یافه[9] : هرزه و هذیان یعنی بیهوده.

یاره[10] : دست ورنجن یعنی دستوانه و طوق.

یاخته[11] : حجره و خمره.

یمرده[12] : گیاهی است که آنرا سایه برگ[13] نیز گویند، و بتازی یبروح[14] خوانند.

بهرهٔ 'ی'

یارگی[15] : توانائی.

یاوری[16] : یاری.

---

[1] رک : موید۲: ۲۸۵. [2] رک : جهانگیری۱: ۵۵۹، ۵۵۶، برهان ص۲۴۲۳. [3] نسخهٔ اصل : سرگم؛ اما رک : جهانگیری۱: ۵۵۶ ذیل یافه. [4] رک : قواس ص۱۴۵. [5] نسخهٔ اصل : سیوم.

[6] رک : قواس ص۱۵۰؛ یلمق معربست، رک : مقدمة الادب ص۳۵۹. [7] رک : فرس ص ۴۵۶، صحاح ص۲۹۲، موید۲: ۲۸۶؛ برای آگاهی بیشتر دربارهٔ املا و قرائت واژه رک : برهان حاشیه ص۲۴۵۳-۵۵.

[8] رک : صحاح ص ۲۹۲، ادات، جهانگیری۲: ۱۶۷۶. [9] رک : جهانگیری۱: ۵۵۶؛ درین فرهنگ و در برهان یافه و یاوه مترادف قرار داده شده. [10] صحاح ص ۲۹۲ : یاره دست آورنجن، موید۲: ۲۸۵ یاره دست برنجن. [11] نسخهٔ 'ل' بدون نقطه؛ رک : موید۲ : ۲۸۵، جهانگیری۱ : ۵۵۱ (یاخت بجای یاخته)، برهان ص۲۴۱۲. [12] رک : موید۲: ۲۸۶، جهانگیری ۲ : ۱۷۴۱، برهان ص۲۴۵۰.

[13] جهانگیری و برهان : مردم گیا. [14] نسخهٔ اصل : یبروج، برهان : یبروج الصنم. اما جهانگیری : یبروح الصنم.

[15] رک : موید ۲ : ۲۸۶، برهان ص۲۴۱۵؛ یارگی از یاره بمعنی یارا و توانائی، برهان حاشیه.

[16] ادات و موید ۲ : ۲۸۶ : یاوری یاری گری؛ اما در صحاح ص۱۱۹ یاور بمعنی یاری دهنده.

فہرستہا

فهرست واژه های الفبائی

ج

و

ه

ی

فهرست نامهای اشخاص و اماکن، سیارگان و بروج وغیره

فهرست نامهای کتب وزبانها

ڈاکٹر شریف حسین قاسمی
شعبہ فارسی
دہلی یونیورسٹی، دہلی

بھگوان داس ہندی۔ احوال و آثار

بھگوان داس ہندی فارسی شعراء کے اپنے تذکرے 'سفینۂ ہندی'[1] کی وجہ سے فارسی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اس کے احوال زندگی جو اب تک شائع ہو سکے ہیں وہ سفینۂ ہندی میں اس کی خود نوشت سوانح اور 'انیس الاحبا'[2] میں منقول اس کے احوال پر مبنی ہیں۔ ان دو ماخذ کے علاوہ اس کی زندگی کے حالات کسی دوسرے ذریعے سے دستیاب بھی نہیں ہوتے تھے۔ خود بھگوان داس کے بقول اس نے اپنے مفصل حالات زندگی اپنی تصنیف 'حدیقۂ ہندی' میں 'طرب نامۂ نسب'[3] کے عنوان سے نظم کیے ہیں۔ حدیقۂ ہندی[4] کا غالباً اب تک سراغ نہیں ملا تھا اور اسے بھی 'سفینۂ ہندی' کے سوا بھگوان داس کی دیگر تصانیف کی طرح مفقود الاثر سمجھا گیا۔ خوش قسمتی سے راقم حروف کو 'حدیقۂ ہندی' کا ایک قلمی اور غالباً واحد دستیاب نسخہ ملا ہے جس میں ۸۹ ابیات پر مشتمل 'طرب نامۂ نسب' شامل ہے۔ بھگوان داس نے یہ منظوم سوانح اپنی عمر کے چونتیس برس گذرنے کے بعد یعنی ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء[5] میں مرتب کی تھی۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ 'سفینۂ ہندی' اور 'انیس الاحبا' میں ہمارے اس مصنف کے جو احوال زندگی درج ہیں وہ مکمل نہیں۔ اسی وجہ سے 'حدیقۂ ہندی' میں منقول 'طرب نامۂ نسب'[6] 'سفینۂ ہندی' میں مصنف کی بیان کردہ خود اپنی سوانح اور انیس الاحبا میں

---

1. اس کا واحد قلمی نسخہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، بہار میں محفوظ ہے۔ اسے سید شاہ محمد عطاء الرحمن عطا کاکوی صاحب نے ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ سے ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء میں شائع کیا ہے۔
2. موہن لال انیس کا یہ تذکرہ بھگوان داس ہندی کے حالات کے لیے اس وجہ سے اہم ہے کہ انیس بھگوان داس کے معاصر ہیں۔ خود بھی کایستھ ہیں۔ بھگوان داس ہندی کی طرح فاخر مکین کے شاگرد ہیں اس لیے بعید نہیں کہ ہندی سے ملے ہوں اور ان سے دریافت کرنے کے بعد ہی ان کے حالات اپنے تذکرے میں لکھے ہوں۔ 'انیس الاحبا' ۱۱۹۷ھ میں مکمل ہوا یعنی طرب نامۂ نسب کے آس پاس زمانے میں۔
3. مطبوعہ سفینۂ ہندی میں درج ہے کہ: "تمام این حالات مشروحاً در قصیدہ نامۂ نسب بنظم در آوردہ" قصیدہ نامۂ نسب غالباً اشتباہ ہے اسے طرب نامۂ نسب ہونا چاہیے جیسا کہ اس منظومے کا عنوان حدیقۂ ہندی میں آیا ہے: خواستم نام این قصیدہ ز عقل بطرب نامۂ نسب گفتا
4. اس کا ایک قلمی نسخہ راقم حروف کے شخصی کتاب خانے میں موجود ہے اور جو آئندہ نزدیک میں ترتیب و تحشیہ کے بعد قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔
5. بھگوان داس ہندی چونکہ ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۰ء میں پیدا ہوا اس لیے ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء میں وہ چونتیس سال کا ہوتا ہے۔
6. طرب نامۂ نسب کے پہلے یہ عبارت ہے: "مخفی نماند کہ جامع این مجموعۂ لطیفہ و مؤلف این حدیقۂ بالطائف نوچہ خاکپای اکابر بیچ میرز امیداند لہٰذا نام خود را با نام ہر یک در این مقام می نگارد عالم مستوجب شکر و شناست و احوالم از این قصیدہ پیداست۔"

مذکور اس کے حالات کی بنیاد پر فارسی کے اس معروف ادیب و شاعر کی زندگی کو بہتر اور مفصل طور پر اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

بھگوان داس ہندی سری واستو کائستھ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد اور والدہ دونوں سری واستو تھے[1]۔ ان کے اجداد کا اصلی وطن کابلی[2] تھا جہاں سے ان کے ایک جد اعلیٰ لال من سوندھا منتقل ہو گئے:

لال من جد ششمیں منست کو از انجا رسیده در سهوندا[3]

لال من نے سوندھا میں دلکش باغ لگوایا اور اپنے لیے ایک خوبصورت عمارت تعمیر کرائی۔ ان کی عمر عیش و عشرت میں گذری۔ ان کا ایک خوبرو لڑکا تھا چندر سین جو اپنے والد کی موت سے اتنا زیادہ متاثر ہوا کہ عام زندگی کی گہما گہمی سے دل برداشتہ ہو کر اس نے صحرا نوردی اختیار کی۔ اس نے جنگل ہی میں زندگی بسر کرنی شروع کر دی۔ صبح پہاڑوں کی طرف نکل جاتا اور شام کو واپس ہوتا یہاں تک کہ ایک روز وہ انہی پہاڑوں میں گم ہو گیا اور اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ چندر سین کا ایک لڑکا کرپال داس صاحب عقل و فہم و ذکا تھا۔ اس نے اپنے والد کے گم ہو جانے کے بعد دہلی کا رخ کیا، جہاں شاہجہاں (۱۰۳۷-۱۰۶۹/ ۱۶۲۸-۱۶۵۹) سریر آرائے سلطنت تھا۔ کرپال داس شاہ جہاں کے دربار میں حاضر ہوا اور بادشاہ نے منصب لائق اور خلعتوں سے سرفراز کیا۔

شاه عالم پناه شاهجهان سایه کرد کار جل و علا
شاه اورا بمنصب لائق کرد ممتاز و داد خلعتها

کرپال داس کے انتقال کے بعد ان کا لڑکا بدلیداس اپنے والد کی جانشینی حاصل کرنے کے لیے دربار میں حاضر نہیں ہوا۔ اس سلسلے میں اس نے کوئی کوشش بھی نہیں کی۔ اس نے اپنے مستقبل کو خدا کے سپرد کر دیا کہ دیکھیں پردۂ غیب سے کیا نمودار ہوتا ہے۔ اسی اثنا میں بادشاہ نے اُسے بلا بھیجا۔ بدلیداس جب دربار میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے اسے خلعت اور رائے کے خطاب سے نوازا۔ اسے جاگیر بھی عطا کی گئی۔ دستیاب اطلاعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بھگوان داس ہندی کے خاندان میں بدلیداس پہلا شخص ہے جسے دربار وقت سے رائے کا خطاب عطا ہوا۔

بدلیداس کے چار لڑکے تھے۔ پہلا سہز مل "صاحب علم و فضل و حلم و حیا" تھا۔ سہز مل کے تین لڑکے تھے۔ ان میں سے ہر ایک فن انشا سے واقف تھا۔ ان میں سے پہلے کا نام کیسری سنگھ دوسرے کا دیوان سنگھ اور تیسرے کا سہا سنگھ تھا۔ دیوان سنگھ "خوش قد و رعنا" جوان تھا۔ سہا سنگھ افغانوں کے ساتھ جنگ میں مارا گیا۔ سہا سنگھ کا ایک لڑکا تھا لالا اودھی لال جو بقول مصنف:

اکنون یادگار رحم منست یاالهی همیشه خوش بادا

---

[1] سفینۂ ہندی میں بھگوان داس لکھتا ہے: سری باستم دوسرا یہاں 'دوسرا' سے غالباً یہی مراد ہے کہ اس کے والد اور والدہ دونوں سری واستو تھے۔ [2] حدیقۂ ہندی اور سفینۂ ہندی کی اسکی تصدیق ہوتی ہے لیکن انیس الاحبا میں آیا ہے کہ: وطن بزرگان ایشان سکرو (؟) کالنجر مضاف صوبۂ مالوہ است۔ [3] سفینۂ ہندی: سوندھا۔

ان کے چچا کے ایک لڑکے کا نام بلاقی داس تھا جو نہایت ' زیرک و دانا شخص تھا۔ یہ برہان الملک سعادت خاں کے دورِ نظامت (۱۱۳۶/۲۲-۱۷۲۳-۵۱/۱۱۳۸ء) میں مشرفی عرف سپاہ[1] کے عہدے پر فائز تھا۔ یہ نواب برہان الملک بہادر کے دور سے نواب آصف الدولہ بہادر کے دور تک (۱۱۸۹ھ-۱۲۱۲ھ/۱۷۷۵ء-۱۷۹۷ء) امتیازی حیثیت میں حکومت سے وابستہ رہا۔ ہمیشہ یادِ الٰہی میں مشغول رہتا۔ برج بھاشا میں اس نے حمد باری تعالیٰ میں شعر بھی کہے ہیں۔ کنیز حلال سے ان کا ایک لڑکا سدانند تھا جس کے لڑکے کا نام لکھن سنگھ تھا جو عالم جوانی ہی میں فوت ہو گیا۔

بھگوان داس کے دادا کا نام ہربنس داس تھا۔ یہ جود و سخا میں مشہور تھے۔ یہ اپنے بھائی بلاقی داس کی دعوت پر اپنے لڑکے دلپت داس (بھگوان داس ہندی کے والد) کے ہمراہ نواب برہان الملک بہادر (سعادت خاں) کے دورِ نظامت میں لکھنؤ آگئے اور اپنے ایک دوسرے بھائی لالا موتی لعل کو بھی لکھنؤ لا لیا۔ اس طرح:

قصہ کوتاہ جملہ می بودند اندریں شہر لکھنؤ یکجا

کچھ عرصے کے بعد یہ سب راہی ملک عدم ہوئے۔

بھگوان داس کے دادا کے چار لڑکے تھے۔ ان میں سے ہر ایک ہوش و خرد میں یکتائے روزگار تھا۔ لالا لیکھراج اور سبھاہت ' بھگوان داس ہندی کے صاحب تقویٰ چچا تھے۔ یہ دونوں ہی فوت ہو گئے۔ ہندی کے تایا کا نام موہن لعل تھا جو صاحب زہد تھے۔ ہندی کے والد دلپت داس دنیوی مال و متاع سے بے زار رہے۔ حالانکہ یہ بھی آصف الدولہ (متوفی: ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء) کے دربار سے وابستہ تھے لیکن انھیں سوا یادِ الٰہی کے اور کسی چیز سے لگاؤ نہ تھا۔ جب بھگوان داس کے تولد کا وقت قریب آیا تو ہندستانی رسم کے مطابق ان کی والدہ کو ان کے والد کے گھر بھیج دیا گیا۔ ان کا نام لالہ رام غلام تھا جو صدر پور موضع سیلک کے قانون گو تھے۔ بھگوان داس ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۰ء میں اپنے نانا کے گھر صدر پور میں پیدا ہوئے: "صبی جوان بخت" سے یہ سال برآمد ہوتا ہے۔ نواسے کی پیدائش پر نانا پھولے نہ سماتے تھے۔

پدر مادرم ازیں شادی می نگنجید درمیان قبا

نانا نے منجموں سے نواسے کا نام دریافت کیا اور ان کی تجویز پر بھگوان داس منتخب ہوا۔ بھگوان داس دو برس تک اپنے نانا کے گھر رہے۔ اس کے بعد وہ اپنے والد کے پاس لکھنؤ آگئے۔ کچھ عرصے بعد ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ان کے والد نے نہایت شفقت و محبت سے ان کی پرورش کی۔

پدر مشفقم ہمی پرورد در بر و دوش ہر صبح و مسا

---

1. سفینۂ ہندی: مشرفی تصحیح شمالی سپاہ

بھگوان داس جب نو برس کے ہوئے تو والد نے انھیں ایک فاضل و کامل استاد کے سپرد کر دیا جن کا نام مولوی یوسف سہارنپوری تھا اور جو بھگوان داس کے بقول 'افضل الفضلا' تھے:

کامل استاد مولوی یوسف   آنکہ او بود افضل فضلا

بھگوان داس نے ان کی خدمت میں چار سال تحصیل علم کیا اور فن فارسی میں یکتا ہو گئے:

بندہ در چار سال از فیضش   در فن فارسی شدم یکتا

صنائع اخلاق، صرف و نحو انھیں استاد سے پڑھے۔ جب بھگوان داس ہر فن میں ماہر ہو گئے تو ان کے استاد نے سفر آخرت باندھا۔ بھگوان داس کی قسمت نے یاوری کی اور وہ اپنے استاد مولوی یوسف کی وفات کے بعد فاخر مکین (متوفی ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء) کی خدمت میں کسب فیض کے لیے پہنچے۔ ہندی اپنے استاد فاخر مکین کی تعریف میں رطب اللسان ہیں کہ:

باعث فخر آسمان و زمین   عارف کامل اکمل شعرا

وصف او در دہان نمی گنجد   می نگنجد بکوزہ ای دریا

بھگوان داس نے فن تاریخ میں بھی مہارت بہم پہنچائی اور اس فن پر تقریباً سو کتابوں کا مطالعہ کیا:

فن تاریخ تا کہ خواہش کردم   خواندہ ام صد کتاب این فن را

بھگوان داس پہلے بسمل تخلص کرتے تھے لیکن ان کے استاد فاخر مکین نے ان کے لیے ہندی تخلص تجویز کیا جس کی برکت سے ان کی طبیعت میں گویائی پیدا ہوئی:

تا کہ ہندی تخلصم فرمود   طبع من گشت در سخن گویا

اپنے ہندی تخلص کے بارے میں بھگوان داس کے یہ دو اشعار قابل توجہ ہیں:

درمیان سخنوران انام   نظم من مختصر خردمند یست

ہندوام، ہندوزادہ بوم ہست   زین دو باعث تخلصم ہندیست

بھگوان داس نے 'طرب نامہ نسب' میں اپنی شخصی زندگی کے بارے میں زیادہ اشارے نہیں کیے ہیں لیکن یہ کمی سفینۂ ہندی سے پوری ہو جاتی ہے جہاں وہ اپنے بارے میں لکھتا ہے کہ آغاز جوانی میں نواب مختار الدولہ بہادر کی طرف سے اسے تمام صوبۂ الہ آباد کا 'میر بحری' بنایا گیا۔ اس کے بعد وہ نواب آصف الدولہ بہادر کی سرکار سے وابستہ ہو کر میرزا راجا دھی سنگھ بہادر کا دیوان مقرر ہوا۔ راجا دھی سنگھ صاحب نوبت و جاگیر اور سرکار خیرآباد و سیلک کے مالک خدمات تھے یہاں بھگوان داس صاحب دستخط ہوا اور پانچ سو سوار اس کے دستخط سے ملازم سرکار رہے۔ راجا صاحب کے

نقال کے بعد بھگوان داس راجا پرچند بہادر کے مصاحب ہوگئے۔ یہ راجا حضور پرنور نواب مرحوم (آصف الدولہ) کے
لک سپاہ وکارخانجات اور خانساماں تھے۔ راجا کے سورگ باش ہونے کے بعد بھگوان داس کو آصف الدولہ کے
یوان ونائب معتمد الدولہ مشیر الملک مہاراج ادھیراج مہاراجہ ٹکیت رائے نراندر بہادر صلابت جنگ (متوفی: ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء)
ا مصاحبی کا شرف حاصل ہوا۔ اسکے بعد راجا جے سنگھ رائے نے ان پر نظر کرم کی اور ان کی قدر و منزلت میں اضافہ کیا۔ اس
کے علاوہ لکھنؤ کے امراء و وزراء نے بھی ان پر شفقت و عنایت کی بارش کی۔

جب بھگوان داس ہندی کا ایک قصیدہ (معروف بہ آفتاب) حضرت آسمان جاہ خلد اللہ ملکہ و ابقاہ کی نظر سے گزرا
تو اسے دربار میں طلب کیا گیا اور رائے کے خطاب اور پانصد ذات و پنجاہ سوار کے منصب سے سرفراز کیا گیا۔
س قصیدے کے یہ دو بیت سفینۂ ہندی میں نقل ہوئے ہیں:

یک صبحدم جمال تو بیند گر آفتاب　　　از جیب صبح سر نکشد دیگر آفتاب
تا خطبۂ ثنای جمالت بیان کند　　　ہر صبح می رود بسر منبر آفتاب

بھگوان داس کا ایک لڑکا مادھو رام سات سال کی عمر میں داغ مفارقت دے گیا۔ اپنے اسی لڑکے کی وفات کا ذکر کرنے
کے بعد بھگوان داس نے "طرب نامۂ نسب" میں غزل کے عنوان سے درج ذیل مرثیہ لکھا ہے:

ایں ہمہ داستان چو بشنیدی　　　گوش کن تا نہ ایں غزل حالا
چند سازی مرا ز خویش جدا　　　از رہ لطف زود خیز و بیا
در گلستان ز رشک رنگ رخت　　　میکند گل ہمیشہ چاک قبا
چند میرم بشوق دیدارت　　　پردہ بردار و روی خود بنما
رفت از سر ہوای خوبانش　　　دیدہ ہر کس کہ آں قد و بالا
دم مرگ از سرم شان مرود　　　تا کنم جان و دل فدای شما
تا تو ای دوست از برم رفتی　　　من چگویم چہ رفت بر سرما
در فراق تو داد حبان ہندی　　　وای فریاد حسرتا دردا

مادھو رام کے انتقال کے بعد خدا نے بھگوان داس کو ایک دوسرا لڑکا عطا کیا۔ اس کا نام کشن پرشاد رکھا گیا۔ بھگوان داس نے
"طرب نامۂ نسب" جس کی بنیاد پر اس کے درج بالا احوال زندگی بیان کیے ہیں، چونتیس برس کی عمر میں نظم کیا تھا:

سال عمرم گذشت چون سی و چہار　　　گفتم ایں داستان بصدق و صفا

مصحفی نے اپنے تذکرے عقد ثریا میں ایک راجا بھگوان داس کا ذکر کیا ہے، وہ غالباً یہی بھگوان داس ہندی ہیں جنھیں رائے کا خطاب عطا ہوا تھا راجا کا نہیں۔ مصحفی کے بقول یہ کشمیر کے صوبے دار تھے[1] یہ اطلاع خود بھگوان داس نے بہم نہیں پہنچائی ہے۔

انیس الاحبا کا مؤلف بھگوان داس کا معاصر ہے۔ وہ ان کی عادات و اطوار کے بارے میں لکھتا ہے کہ ستودہ صفات، نیکو خصال ہیں۔ باعزت و وقار، میرزا وضع، پاکیزہ گفتار ہیں۔ مزاج درد کے آشنا اور طبع رسا کے مالک ہیں۔ جو کچھ آج کل نظم کرتے ہیں، اسے اپنے دیوان ذوقیہ میں شامل کرتے ہیں۔ فصحا و بلغا کی روش سخن کے پیرو ہیں ان کے کلام میں شستگی اور روانی ہے۔ بھگوان داس کا سال وفات کسی ذریعے سے معلوم نہیں ہو سکا۔ بھگوان داس نے حدیقۂ ہندی اور سفینۂ ہندی میں اپنی درج ذیل ادبی کاوشوں کا ذکر کیا ہے:

(۱) **دو دیوان:** (الف) شوقیہ (ب) ذوقیہ

بھگوان داس نے قصاید، ترجیع بند اور دوسری اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔

(۲) **تین مثنویاں:** (الف) نور الدین عبدالرحمٰن جامی (متوفی: ۸۹۸ھ) کی سلسلۃ الذھب کے وزن پر سلسلۃ المحبت، تقریباً ایک ہزار ابیات پر مشتمل اس مثنوی میں چت گیت (جسے اہل فارس عطارد کہتے ہیں) کے احوال بیان کیے ہیں۔ اس کے اکثر ابیات میں شاعر نے گوہر معانی پروئے ہیں[2] (ب) نظامی گنجوی کی مخزن الاسرار کے وزن پر مظہر الانوار (ج) یوسف و زلیخا کے وزن پر بھاگوت مسمی بہ مہر ضیاء۔

(۳) **حدیقۂ ہندی:** ہندستان میں مسلمانوں کی آمد سے اس کی تالیف کے سال ۱۲۰۰ھ تک ان فارسی شعرا کا تذکرہ جو ہندستان میں پیدا ہوئے یا جنھوں نے اس سرزمین پر نشو و نما پائی۔ بقول مصنف یہ تذکرہ بھی ہے اور تاریخ بھی۔

(۴) **رسالۂ سوانح النبوۃ:** پیغمبر اسلام کی حیات طیبہ اور دوازدہ ائمہ کی سوانح پر مشتمل یہ رسالہ سید خیرات علی کی فرمائش پر لکھا گیا[3]

(۵) **سفینۂ ہندی:** شاہ عالم کے عہد (۱۱۷۳/۱۷۵۹) سے اس تذکرے کے سال تصنیف ۱۲۱۹ھ/ تک ہندستان میں نشو و نما پانے والے فارسی شعرا کا تذکرہ ہے[4]

درج بالا تصانیف میں سے فی الحال بھگوان داس کی صرف دو تصانیف کے وجود کا علم ہو سکا ہے — ایک سفینۂ ہندی جو شائع ہو چکا ہے، اور دوسرا حدیقۂ ہندی جو زیر طبع ہے۔

---

[1] سفینۂ ہندی، ضمیمہ، مطبوعہ پٹنہ، ص ۲۷۷ [2] انیس الاحبا، بحوالہ مقدمہ مرتب سفینۂ ہندی [3] اس کا ذکر عبداللہ نے اپنی ادبیات فارسی میں [illegible]
[illegible] [4] [illegible] سفینۂ ہندی، مقدمہ [illegible]

ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن

اسسٹنٹ لائبریرین خدابخش لائبریری
پٹنہ - ۴

خدابخش لائبریری میں مشاہیر کے آٹوگراف

خدابخش لائبریری پٹنہ دنیا کی اہم ترین شرقی کتابخانوں میں شمار ہوتی ہے۔ کیونکہ یہاں نادر قلمی نسخوں اور نایاب مصوّر مخطوطات کے علاوہ اسلامی دنیا کے نامور مصنفین اور حکمرانوں کی خود نوشت تحریریں (AUTOGRAPHS) بھی محفوظ ہیں۔

درج ذیل سطور میں فارسی کے کچھ معروف مصنفین اور حکمرانوں کی خود نوشت تحریروں کی تفصیلات پیش کی جاتی ہیں تاکہ قارئین کو اندازہ ہو کہ یہاں کیسے کیسے نادر اور اہم قلمی نسخے موجود ہیں:

شیخ حسین معز بلخی

شیخ حسین معز بلخی (م ۸۴۴ھ/۱۴۴۱ء) نویں صدی ہجری کے مشہور بزرگ ہیں۔ یہ دراصل حضرت مخدوم بہاری کے ارشد خلیفہ حضرت مظفر شمس بلخی (م ۸۰۳ھ/۱۴۰۰ء) کے بھتیجے ہیں۔ جن سے انھوں نے دینی و روحانی تعلیم و تربیت حاصل کی اور پھر خلافت سے سرفراز ہوئے۔ انھوں نے اپنی دینی خدمات اور روحانی کمالات کی وجہ سے صوفیائے بہار میں بڑا نام پیدا کیا۔

مکتوبات صدی حضرت مخدوم بہاری کے خطوط کا ایک اہم مجموعہ ہے جس میں رشد و ہدایت، تزکیۂ نفس اور اصلاح باطن کی باتیں بتائی گئی ہیں۔ اس کا ایک نسخہ خدابخش لائبریری میں محفوظ ہے۔ جو نویں صدی ہجری کا مکتوبہ ہے اور پروفیسر سید حسن عسکری کی تحقیق کے مطابق شیخ حسین معز بلخی کا خود نوشت ہے۔ اس میں جا بجا مفید حواشی اور نوٹس ملتے ہیں جو حضرت مظفر شمس بلخی کی ہدایت پر تحریر کیے گئے ہیں اور یہ بھی انھیں کے قلم سے ہیں[1]۔

اس میں ۳۴۳ اوراق ہیں۔ کتابت خط نسخ میں ہے ایکسیشن نمبر ۲۱۷ ہے۔

(اصل تحریر کے لیے دیکھیے عکس نمبر ۱)

ملا عبدالرحمٰن جامی

ملا عبدالرحمٰن جامی (م ۸۹۸ھ/۱۴۹۲ء) کی شخصیت علمی دنیا میں انتہائی مشہور و معروف ہے۔ یہ نویں صدی ہجری کے ہیں۔ ان کی ایک منظوم تصنیف سلسلۃ الذہب کے نام سے ہے جس کا ایک قدیم نسخہ یہاں محفوظ ہے جو ۸۶۵ھ کا مکتوبہ ہے اور ملا عبدالرحمٰن جامی کا خود نوشت ہے اس میں اس کے صرف دفتر اوّل اور دیوان جامی کے اشعار ہیں۔ اس کے ۲۴۶ اوراق ہیں۔ ہینڈ لسٹ نمبر ۴۹۴ اور کیٹلاگ نمبر ۱۸۵ ہے۔

---

۱ [illegible] Collected works of S.H.Askari p.3-18

اس نسخہ کے شروع صفحہ پر ملا عبدالرحمٰن جامی کی مزید ایک خود نوشت تحریر ملتی ہے۔ جو دراصل ان کے لڑکے ضیاءالدین یوسف کی تاریخ ولادت کے سلسلے میں ہے۔ انکی ولادت ۹ شوال ۸۸۲ھ کو بروز بدھ بوقت آخر شب ہوئی تھی تحریر ملاحظہ کیجیے:

"ولادت فرزند ارجمند ضیاءالدین یوسف ابقاہ اللہ تعالیٰ نباتا حسنا فی الاخیر من لیلۃ الاربعاء التاسع من شہر شوال سنۃ اثنین وثمانین وثمانمایۃ۔ والکاتب ابوہ الفقیر عبدالرحمٰن بن احمد الجامی عفی عنہ"

(اصل تحریر کے لیے دیکھیے عکس نمبر ۳)

اس کے علاوہ ملا عبدالرحمٰن جامی کی ایک اور تصنیف منتخب انیس الطالبین وعدۃ السالکین کے نام سے ملتی ہے جو ان کی آٹو گراف کاپی ہے۔ یہ دراصل انیس الطالبین وعدۃ السالکین کی تلخیص ہے۔ کتابت ۸۵۶ھ کی ہے۔ اس میں ۵۵ اوراق ہیں۔ خط نسخ میں تحریر کردہ ہے۔ ہینڈ لسٹ نمبر ۱۳۴۰ اور کیٹلاگ نمبر ۱۳۷۷ ہے۔

اس کے آخری صفحہ پر مندرجہ ذیل ترقیمہ کی عبارت ملتی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ اسکی کتابت خود مصنف نے ۸۵۶ھ میں کی ہے۔

"تم بعون اللہ تعالیٰ فی شہر جمادی الاول سنۃ ست وخمسین وثمانمایۃ علی ید العبد الفقیر عبدالرحمٰن الجامی تاب اللہ علیہ"۔

(اصل تحریر کے لیے دیکھیے عکس نمبر ۴)

ہمایوں ہمایوں (۹۳۷ھ-۹۶۳ھ) ہندستان کا مشہور مغل بادشاہ ہے۔ جو ایک حکمراں ہونیکے علاوہ بڑا علم دوست اور نیک مزاج آدمی تھا۔ خدا بخش لائبریری میں اس کی مندرجہ ذیل خود نوشت تحریریں موجود ہیں۔

۱- اس کی پہلی تحریر اس وقت کی ہے جب وہ ۹۴۵ھ میں بنگال کی سرزمین پر فتح پانے کے لیے کوشاں تھا۔ اس وقت اس نے دیوان حافظ کے ایک نسخے سے فال نکالا۔ یہ وہی نسخہ ہے جو خوش قسمتی سے خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے۔ اور جس پر ہمایوں کے علاوہ جہانگیر بادشاہ کی بھی تحریریں ملتی ہیں۔ یہ نسخہ ۲۰۱ اوراق پر مشتمل ہے۔ ہینڈ لسٹ نمبر ۲۱۸ اور کیٹلاگ نمبر ۱۵۱ ہے۔ ۹ ویں صدی ہجری کا مکتوبہ ہے۔

ہمایوں نے فال نکالنے کے بعد مندرجہ ذیل نوٹ اپنے قلم سے لکھا ہے۔ جو مذکورہ نسخہ کے ورق ۱۳۵ الف پر موجود ہے اور وہ اس طرح ہے:

"روز سہ شنبہ دولت سرا محرم انتخاب بریں بیت کہ تا جہاں باشد بہ نیکی در جہانت کام باد۔ صورت (رت) یافت والسلام در موضع منگر"

(اصل تحریر کے لیے دیکھیے عکس نمبر ۵)

۲- ہمایوں کی دوسری تحریر اس وقت کی ہے جب اس کو اپنے بھائیوں (مرزا کامران، مرزا عسکری، مرزا ہندال) کی باغیانہ چال کی وجہ سے ہندستان چھوڑ کر بھاگ جانا پڑا۔ اور پھر اسے ۹۶۲ ہجری میں انتہائی جدوجہد کے بعد دہلی پر دوبارہ

ہوا جس سے اس کی کامیابی قریب نظر آرہی تھی۔ شعر

عزیز مصر برغم برادران غیور — ز قعر چاہ بر آمد باوج ماہ رسید

اس کے بعد اس نے یہ لکھا:

"ایں غزل خاصہ ایں بیت تفال ہمایوں شد چند بار" یہ تحریر ورق ۳۸ الف پر ملتی ہے۔

(اصل تحریر کے لیے دیکھیے عکس نمبر ۶)

۳۔ ہمایوں ۹۶۲ھ میں جب دہلی پر دوبارہ قابض ہوگیا تو کچھ دنوں بعد پھر بنگال پر چڑھائی کرنے کا منصوبہ بنانے لگا۔ اس منصوبہ بندی کے زمانے میں اس نے مذکورہ دیوان حافظ سے فال نکالا اور فال کے بعد مندرجہ ذیل نوٹ تحریر کیا جو ورق ۶۷ ب پر درج ہے اور یہ اس کی تیسری تحریر ہے:

"از فال مصحف کہ ربک برآمد از دیوان حافظ ایں شاہ بیت آمد و چند یں بار ابیات مناسب آمدہ کہ اگر شرح آنہا شود کتابی شود ان شاء اللہ تعالیٰ۔ چوں فتح ولایات شرقی و مبارزان ایں دیار بامر کردگار شود نذر خوبی بخواجہ لسان الغیب فرستادہ شود۔ وجمع آں تفالات نیز رقم کردہ شود بمنہ و توفیقہ شب دوشنبہ ہجدہم ذی حجہ سنہ ۹۶۲ در شہر دیں پناہ تحریر یافت والسلام۔ (اصل تحریر کے لیے دیکھیے عکس نمبر ۷)

جہانگیر نور الدین جہانگیر (۱۰۱۴–۱۰۳۷ھ) اپنے عدل و انصاف اور حکمرانی و علم دوستی کی وجہ سے مغل بادشاہوں میں خاص اہمیت کا حامل ہے یہ بھی دیوان حافظ سے فال نکالتا اور اس کو صحیح سمجھتا تھا۔ اس نے دیوان حافظ کے مذکورہ نسخہ سے مختلف بار فال نکالا ہے۔ اور پھر اپنے قلم سے اس پر جابجا نوٹ لکھا ہے۔ اس طرح اس کی مندرجہ ذیل خود نوشت تحریریں بھی اس نسخہ پر ملتی ہیں۔

۱۔ ۱۰۱۲ھ میں جہانگیر الہ آباد میں مقیم تھا۔ اسے خبر ملی کہ اس کی خبر گیری کی غرض سے اکبر بادشاہ وہاں آنے والا ہے لیکن کسی مجبوری کی بنا پر نہ آسکا۔ جہانگیر یہ خبر سنتے ہی اپنے والد سے ملنے کے لیے بے چین ہوگیا۔ اور پھر الہ آباد سے آگرہ کے لیے روانہ ہوگیا۔ درمیان سفر اس نے مذکورہ دیوان حافظ سے فال نکالا اور اس کے بعد اپنے قلم سے یہ عبارت لکھی:

"وقتی کہ از الہ باس بقصد ملازمت حضرت والد بزرگوار خواہش منداً آگرہ بودم۔ در اثنای راہ بخاطر رسید کہ تفال بدیوان حافظ باید نمود۔ ایں غزل برآمد وہم سعادت خدمت و رضا جوئی و حاضر بودن در واقعہ ناگزیر دست داد وہم دولت موروثی روزی گشت کہ لعینہ مضمون ایں غزل بود۔ در جمید الثانی کشودہ شد۔ احمد نور الدین جہانگیر بن اکبر بادشاہ غازی

(اصل تحریر کے لیے دیکھیے عکس نمبر ۸)

یہ عبارت ورق ۱۱۵ الف پر ملتی ہے۔

۲۔ جہاں گیر کو کچھ معتبر ذرائع سے ایک روز معلوم ہوا کہ حکیم فتح اللہ' نورالدین' شریف اور کچھ دوسرے لوگ خسرو کو جیل سے نکال کر جہانگیر کی جگہ بیٹھانا چاہتے ہیں اور جہانگیر کو اس کی بادشاہت سے ہٹا دینے کی سازش کر رہے ہیں۔ جہانگیر کو یہ بات نہایت ناگوار معلوم ہوئی۔ اور اس بنا پر اس نے انھیں گرفتار کرا کے قتل کر دینے کا حکم دیا۔ اسی دوران اس نے فتح اللہ کے سلسلے میں مذکورہ دیوان سے فال نکالا — جب اس کی معافی کے لیے فال نکلا تو اس نے اس کو معاف کر دیا فال کی عبارت ملاحظہ ہو:

"بجہت خلاص فتح اللہ پسر حکیم ابوالفتح برآمد۔ گناہ اورا بخشیدیم۔ ۱۰۱۸ھ" (اصل تحریر کے لیے دیکھیے عکس نمبر۹)

۳۔ ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۳ء میں جہانگیر اجمیر گیا تاکہ وہاں کے حالات کا بخوبی جائزہ لے سکے اور رانا کی سیاسی نقل و حرکت کی دیکھ بھال کر سکے۔ اس زمانے میں وہ ایک روز شکار کرنے کی غرض سے نکلا کہ جنگل میں ایک نہایت قیمتی تعویذ گم ہو گیا وہ اس سے نہایت رنجیدہ ہوا۔ اس نے اپنی رنجیدگی دور کرنے اور تعویذ تلاش کرنے کے مقصد سے دیوان حافظ کا سہارا لیا اور اس سے فال نکالا۔ فال نکالنے کے بعد اس نے مندرجہ ذیل عبارت اپنے قلم سے لکھی جو ورق ۶۷ ب پر درج ہے۔ اور وہ ہمایوں کی تحریر کے نیچے ہے۔

"در اجمیر بر سر رانا رفتہ بودم۔ در شکار تعویذ الماس تراشیدہ از سر من افتاد۔ شگون این را خوب ندانستہ تفال بدیوان خواجہ نمودم۔ این غزل برآمد و روز دیگر تعویذ پیدا شد۔ حررہ نورالدین جہانگیر بن اکبر بادشاہ غازی فی محرم سن ۱۰۲۴ھ"

(اصل تحریر کے لیے دیکھیے عکس نمبر۷)

۴۔ اسی ورق (۶۷ ب) پر جہانگیر کی ایک دوسری تحریر ملتی ہے۔ جو اس تعویذ کے واقعۂ گم شدگی سے متعلق ہے وہ یہ ہے:

"فال کہ بجہت الماس کشودہ بودم" (اصل تحریر کے لیے دیکھیے عکس نمبر۷)

۵۔ اسی مہینے (محرم ۱۰۲۴ھ) میں جہانگیر نے خرم کو اجمیر بھیجا کہ وہ رانا کے خلاف محاذ آرائی کر کے اودے پور پر قبضہ کرے۔ خرم نے اپنی فوج کی مدد سے اودے پور کا محاصرہ کر لیا۔ یہاں تک کہ رانا نے مجبور ہو کر اس کے سامنے SURRENDER کر دیا اور اس طرح وہ جہانگیر کا محکوم ہو گیا۔ اسی زمانے میں جہانگیر نے مذکورہ دیوان حافظ سے فال نکالا اور اس کے بعد یہ عبارت لکھی جو ورق ۷۲' الف پر درج ہے۔

"فرزند خرم را بر سر رانا تعین نمودہ خود در اجمیر نزول اجلال داشتیم۔ چون کار بر او تنگ شد اختیار بندگی نمود۔ ہنوز خبر دیدن او نرسیدہ بود کہ تفال بہ لسان الغیب حافظ نمودم۔ این غزل برآمد و بعد از دو روز خبر رسید کہ رانا خرم را ملازمت کرد۔ در محرم ۱۰۲۴ھ حررہ نورالدین جہانگیر"

(اصل تحریر کے لیے دیکھیے عکس نمبر۸)

۶۔ عثمان افغان بنگال کا سردار تھا۔ اور مغل بادشاہ کا سخت دشمن بھی۔ اس وقت مغل بادشاہ کی طرف سے اسلام خاں بنگال کا گورنر تھا۔ اس نے اپنی فوج کو شجاعت خاں کی قیادت میں عثمان افغان کے مقابلے کے لیے بھیجا۔ چنانچہ ان دونوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی اور عثمان افغان بری طرح زخمی ہوا اور پھر انتقال کر گیا۔ اس کے بعد اس کے لڑکوں بھائیوں اور دوسرے رشتہ داروں نے شجاعت خاں کے سامنے SURRENDER کر لیا اور انھیں معاف کر دیا گیا۔

جب جہانگیر کو عثمان افغان کے انتقال کی افواہ سننے میں آئی تو اس نے مذکورہ دیوانِ حافظ سے فال نکال کر اس کی تصدیق کی۔ پھر چند روز بعد اسکو مصدقہ طور پر معلوم ہوا کہ عثمان افغان انتقال کر گیا۔ فال میں یہ شعر نکلا ؎

خوردہ ام تیر نظر بادہ بدہ تا سرمست   عقدہ در بند کمر ترکش جوزا فگنم

اس کے بعد اس نے یہ جملہ تحریر کیا جو ورق ۱۲۱ الف پر پایا جاتا ہے:

"بجہت کشتہ شدن عثمان از حافظ تفال نمودم این بیت بر آمد و چند روز بعد ازاں خبر قتل آں مقہور رسید حررہ نور الدین جہانگیر بن اکبر بادشاہ"۔

(اصل تحریر کے لیے دیکھیے عکس نمبر ۱۱)

۷ ــ جہانگیر کی ایک تحریر اس وقت کی ملتی ہے جب اس نے اپنے ایک قریبی دوست خاں عالم کے ملازم حافظ حسن کی آمد کے سلسلے میں دیوان حافظ سے فال نکالا اور پھر اپنا نوٹ لکھا جو ورق ۸۱ ب پر اس طرح موجود ہے:

"بجہت کس خاں عالم کہ حافظ حسن نام داشت کشادہ بودیم خاں عالم را پیش دارای ایران بایلچی گری فرستادہ بودیم"

(اصل تحریر کے لیے دیکھیے عکس نمبر ۱۲)

۸ ــ جہانگیر نے اپنے ۱۱ ویں سال جلوس (۱۰۲۵ھ) میں سلطان خرم کو شاہ خرم کا خطاب دے کر دکن پر چڑھائی کرنے کا حکم دیا۔ اس موقع پر اس نے مذکورہ دیوان حافظ سے فال نکالنے کے بعد اپنے ہاتھ سے یہ عبارت لکھی:

"برای نور چشمی شاہ خرم کشادیم۔ امید کہ از تفرقہ امان آید" یہ عبارت ورق ۲۴ ب پر موجود ہے۔

(اصل تحریر کے لیے دیکھیے عکس نمبر ۱۳)

شاہ جہاں بادشاہ شاہ جہاں (۱۰۳۷ھ — ۱۰۶۸ھ) ہندوستان کا مشہور و معروف مغل بادشاہ ہے۔ اسکی ایک خودنوشت تحریر تاریخ خاندان تیموریہ کے شروع صفحہ پر ملتی ہے جو خدا بخش لائبریری کا اہم ترین مصور قلمی نسخہ ہے اور اکبر بادشاہ کے ۲۲ سال جلوس میں اس کے دربار میں لکھا گیا ہے۔ یہ نسخہ ۳۳۸ اوراق پر مشتمل ہے۔ ہینڈ لسٹ نمبر ۱۰۷ اور کیٹلاگ نمبر ۵۱۰ ہے۔ اب شاہ جہاں کی تحریر ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتا ہے:

"در ایں تاریخ کہ مشتمل است بر مجمل احوال حضرت صاحبقران گیتی ستاں و اولاد امجاد آنحضرت و سوانح ایام حضرت عرش آشیانی انار اللہ برہانہ تا سال بست و دوم در عہد دولت شاہ بابا تصنیف شدہ۔ حررہ شاہ جہاں"۔

(اصل تحریر کے لیے دیکھیے عکس نمبر ۱۴)

محمد سلطان

محمد سلطان (متوفی ۱۰۸۷ھ/۱۶۷۶ء) اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ اس کی ایک خود نوشت تحریر جہانگیر نامہ کے شروع صفحہ پر ملتی ہے جو لائبریری کا ایک اہم نسخہ ہے اور ۱۰۴۰ھ کا مکتوبہ ہے۔ یہ نسخہ ۱۱۹ اوراق پر مشتمل ہے ہینڈ لسٹ نمبر ۱۱۱۳ اور کیٹلاگ نمبر ۵۰۷ ہے، اس نے لکھا ہے کہ یہ نسخہ اس نے قطب الملک حیدرآباد کے یہاں سے حاصل کیا اس کی عبارت یوں ہے۔

"ایں کتاب جہانگیر نامہ کہ حضرت جنت مکانی خود تصنیف نمودہ اند۔ در دار الفتح حیدر آباد از کتاب خانہ قطب الملک گرفتہ شد۔ حررہ محمد سلطان" محمد سلطان کی مہر کے علاوہ اس صفحہ پر دو قطب شاہی مہریں (سلطان محمد قطب شاہ اور عبد اللہ قطب شاہ) بھی موجود ہیں۔ (اصل تحریر کے لیے دیکھیے عکس نمبر ۱۵)

ظفر خاں قدسی

مرزا احسن اللہ (متوفی ۱۰۷۳ھ/۱۶۷۰ء) کا تخلص احسن تھا۔ عہد جہانگیری کے ۱۹ ویں سال (۱۰۳۲ھ/۱۶۲۳ء) میں کابل کے گورنر مقرر ہوئے اور ظفر خاں قدسی کا خطاب حاصل کیا۔ پھر شاہ جہانی عہد کے ۵ ویں سال (۱۰۴۱ھ/۱۶۳۱ء) میں کشمیر کے گورنر بنائے گئے اور کافی عرصہ تک اسی عہدے پر مامور رہے۔

یہ ایک اچھے شاعر تھے کشمیر میں طالب کلیم، طالب آملی اور محمد جان قدسی کے ساتھ ان کی صحبت رہتی تھی۔

ان کا ایک مجموعۂ اشعار کلیات احسن کے نام سے خدا بخش لائبریری میں موجود ہے جو ۲۳۰ اوراق پر مشتمل ہے اور جس کی کتابت ۱۰۵۳ھ کی ہے۔ ہینڈ لسٹ نمبر ۶۶۴ اور کیٹلاگ نمبر ۳۲۹ ہے۔ مندرجہ ذیل ترقیمہ کی عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ یہ نسخہ مرزا احسن اللہ احسن کا خود نوشت ہے۔

"راقم احسن اللہ بن ابو الحسن المخاطب بظفر خاں" (اصل تحریر کے لیے دیکھیے عکس نمبر ۱۶)

مرزا عبد القادر بیدل

مرزا عبد القادر بیدل (متوفی ۱۱۳۳ھ) فارسی زبان کے مشہور صوفی شاعر ہیں۔ ان کا ایک مجموعۂ رباعیات یہاں محفوظ ہے جو ۱۶۱ اوراق پر مشتمل ہے۔ ہینڈ لسٹ نمبر ۶۴۵ اور کیٹلاگ نمبر ۲۸۶ ہے۔ یہ مرزا بیدل کا خود نوشت نسخہ ہے۔ کیونکہ اس کی کتابت ۱۱۱۵ھ میں ہوئی ہے۔ جو ان کی وفات سے اٹھارہ سال قبل ہوتا ہے۔ اور اس کے علاوہ اس کے شروع صفحہ پر مندرجہ ذیل تحریر قدیم خط میں ملتی ہے جس سے تصدیق ہوتی ہے کہ یہ نسخہ مرزا بیدل کے خط میں ہے۔ تحریر یہ ہے۔

"بخط مرزا بیدل مرحوم" (اصل تحریر کے لیے دیکھیے عکس ۱۷)

تقی الدین محمد کاشی

ابن شرف الدین علی تقی الدین محمد الکاشی (متوفی ۱۰۱۶ھ) فارسی زبان کے مشہور فاضل اور تذکرہ نگار

ہیں۔ ان کی ایک مایہ ناز تصنیف خلاصۃ الاشعار و زبدۃ الافکار ہے۔ جس میں فارسی شعرا کے حالات تحریر کیے گئے ہیں۔

اس کا ایک نسخہ یہاں موجود ہے جس میں ۳۹۵ اوراق ہیں۔ ہینڈ لسٹ نمبر ۲۱۸ اور کیٹلاگ نمبر ۶۸۴ ہے۔ اس نسخہ پر مصنف نے خود ہی نظر ثانی کی ہے اور جا بجا اپنے قلم سے حواشی اور ضروری نوٹس لکھے ہیں۔

ورق ۳۱۸ ب کے حاشیہ پر مصنف نے کاتی الدولہ ہبۃ اللہ ابراہیم الشہیر بکافی ظفر پر اضافہ خود اپنے قلم سے کیا ہے اور اپنا تعارف خود ہی اس طرح کرایا ہے:

"اما دریں ایام اشعار وی مہجور و نایاب است و دیوان اشعار او در میان نیست و تفصیل حالاتش نیز در کتاب تذکرہ و تاریخی مذکور نہ لاجرم جامع ایں خلاصہ اعنی تقی الدین الحسینی ایں قصیدہ را با اندکے از اشعار وی کہ در سفاین و مصنفات دیگراں بنظر رسیدہ بود در ایں نسخہ خیر مآل در آخر مجلد و چہارم در تلو شعرا کہ ہمہ شعرا از ایشاں نوشتہ شدہ مسطور ساخت۔۔۔

(اصل تحریر کے لیے دیکھیے عکس نمبر ۱۸)

اندرامن اندرامن لالہ ٹیک چند بہار کے خاص شاگرد ہیں انھوں نے لالہ ٹیک چند بہار کی تصنیف بہار عجم کا انتخاب کیا جس کا ایک نسخہ یہاں موجود ہے۔ جو ۴۲۰ اوراق پر مشتمل ہے۔ ہینڈ لسٹ نمبر ۱۷۷ اور کیٹلاگ نمبر ۸۱۴ ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل ترقیمہ سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ نسخہ خود اندرامن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

"الحمد للہ والمنۃ کہ باتمام رسید منتخب کتاب بہار عجم تالیف استادی مخدومی ٹیک چند بخط فقیر حقیر۔۔۔ اندرامن اول روز پنج شنبہ شہر شوال سنہ دوازدہ از جلوس شاہ عالم بہادر بادشاہ غازی موافق سال ہزار یک صد ہشتاد و چہار"

(اصل تحریر کے لیے دیکھیے عکس نمبر ۱۹)

آزاد بلگرامی غلام علی آزاد بلگرامی (متوفی ۱۲۰۰ھ) علوم دینیہ کے مشہور عالم اور فارسی کے معروف ادیب اور تذکرہ نگار ہیں۔ ان کی ایک اہم تصنیف ید بیضا ہے۔ جو فارسی شعرا کا تذکرہ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ یہاں موجود ہے جو ۲۳۰ اوراق پر مشتمل ہے۔ ہینڈ لسٹ نمبر ۲۴۳ اور کیٹلاگ نمبر ۶۹۱ ہے۔ اس میں ورق ۱۹۰ — ۲۲۲ نیم شکستہ رسم الخط میں ہیں اور آزاد بلگرامی کے خود نوشتہ ہیں۔ بقیہ اوراق کسی دوسرے کاتب کے لکھے ہوئے ہیں۔

اس نسخہ کے شروع صفحہ پر ایک مستشرق J.H.BLOCKMAN کی مندرجہ ذیل تحریر ملتی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس نسخہ کا مذکورہ حصہ (ورق ۱۹۰ - ۲۲۲) خود آزاد بلگرامی کا مکتوبہ ہے بلاک مین نے یہ ۱۸۷۵ء میں لکھا تھا۔

"THE BOOK IS CHIEFLY IN THE HANDWRITING OF THE AUTHOR,

WHO LIVED IN BILGRAM (BOUGHT IN BILGRAM). GHULAM ALI AZAD'S HANDWRITING IS THE SMALL CLOSE HANDWRITING TOWARDS THE END OF THE BOOK, FROM میر عبد الجلیل. THIS I INVESTIGATED IN BILGRAM ITSELF.-J.H.B.

اس تحریر سے دو بات واضح ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ J.H.BLOCKMAN نے ۱۸۷۵ء میں یہ نسخہ خود بلگرام میں خریدا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہاں کے اہل علم نے خود اس بات کی تصدیق کی کہ اس نسخہ کے مخصوص اوراق آزاد بلگرامی کے خود نوشت ہیں۔ (اصل تحریر کے لیے دیکھیے عکس نمبر ۲۰)

شیخ محمد علی حزیں شیخ محمد علی حزیں اصفہانی (م ۱۱۸۰ھ/۱۷۶۹ء) فارسی کے اہم شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا ایک دیوان یہاں موجود ہے۔ جس کے پہلے صفحہ پر ان کی ایک تحریر ملتی ہے جس میں ۲۹۶ اوراق ہیں۔ کتابت ۱۲ویں صدی ہجری کی ہے۔ کاتب کا نام عبد الصمد ہے۔ خط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے۔ ہینڈ لسٹ نمبر ۱۹۰۰ اور کیٹلاگ نمبر ۱۹۲۵۔ (اصل تحریر کے لیے دیکھیے عکس نمبر ۲۱)

اس کے علاوہ یہاں مرزا محمد تبریزی متخلص بہ مجذوب کا ایک مجموعۂ کلام دیوان مجذوب کے نام سے ہے جس کے شروع اور آخری صفحہ پر شیخ علی حزیں کا دستخط موجود ہے۔ مخطوطہ ۱۴۴ اوراق پر مشتمل ہے۔ کتابت ۱۲ویں ہجری کی ہے۔ نستعلیق خط میں لکھا ہوا ہے۔ ہینڈ لسٹ نمبر ۱۹۱۸ اور کیٹلاگ نمبر ۱۹۰۹ ہے۔ اس دیوان میں مجذوب کے قصائد، غزلیات، مخمسات، مثنویات اور ترجیعات وغیرہ درج ہیں۔ (اصل تحریر کے لیے دیکھیے عکس نمبر ۲۲)

غلام حسین طباطبائی غلام حسین طباطبائی ۱۳ویں صدی ہجری کے مشہور فاضل اور مورخ ہیں۔ ان کی ایک مشہور کتاب "سیر المتاخرین" کے نام سے ہے۔ اس کا ایک نسخہ ۱۲۳۰ھ کا لکھا ہوا خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے۔ جو خود ان کا لکھا ہوا ہے۔ یہ ۴۱۰ اوراق پر مشتمل ہے۔ ہینڈ لسٹ نمبر ۱۱۲۵ اور کیٹلاگ نمبر ۵۸۲ ہے۔ اس کے شروع صفحہ پر مندرجہ ذیل تحریر ملتی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ مصنف کا خود نوشت نسخہ ہے۔

"کتاب ہذا بتاریخ بستم شہر ربیع الثانی سنہ یک ہزار و دو صد و سی ہجری با تمام رسید۔ نوشتہ خاص سید غلام حسین خاں مغفور است"

اس کے علاوہ ایک اور تحریر ملتی ہے جو اس طرح ہے:

"نسخہ ہذا بتلاش بسیار بقیمت یک صد و پنجاہ روپیہ چونکہ دست خاص نواب صاحب مرحوم بود بنا بر خیال قیمت نکردم۔"

"ان دونوں تحریروں کی روشنی میں یقینی طور سے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مصنف کا خود نوشت نسخہ ہے

لیکن جب تک اس کے مقابلے میں کوئی دوسری تحریر سامنے نہیں آجاتی تب تک یقین کے ساتھ اس کو رد بھی نہیں کیا جا سکتا۔ (اصل تحریر کے لیے دیکھیے عکس نمبر ۲۳)

مظفر حسین | مظفر حسین المخاطب بہ مہارت خاں ابن حکیم غلام محمد خاں ۱۲ ویں صدی ہجری کی قابل ذکر ہستیوں میں ہیں۔ ان کی ایک اہم تصنیف جام جہاں نما ہے جو دراصل ایک انسائیکلوپیڈیا ہے اور تاریخ، جغرافیہ اور تذکرہ وغیرہ پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ یہاں محفوظ ہے جو مظفر حسین کا خود نوشت ہے۔ یہ دو جلدوں میں ہے۔ اس میں جا بجا مفید حواشی اور نوٹس تحریر کیے گئے ہیں جو کہ مصنف کے قلم سے ہیں۔ اس کی پہلی جلد میں ۲۲۹ اور دوسری جلد میں ۲۰۸ اوراق ہیں۔ کتابت ۱۱۸۰ھ کی ہے۔ خط نستعلیق میں ہے۔ ہینڈ لسٹ نمبر ۴۳ اور کیٹلاگ نمبر ۵۲۷ ہے۔

کتاب کے آخری صفحہ پر ترقیمہ کی مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے جو کسی دوسرے شخص کی ہے اور جس سے تصدیق ہوتی ہے کہ یہ پوری کتاب مظفر حسین کی کتابت کی ہوئی ہے:

"تمام شد کتاب مسمی بجام جہاں نما من تصنیف افضل المتاخرین محمد مظفر حسین الطبیب المخاطب بمہارت خاں متخلص بصوفی در سنہ یکہزار و یکصد و ہشتاد من السنۃ النبویہ بفضل الوہاب در بلدہ فاخرہ محمد آباد بنارس بید المولف تحریر"

(اصل تحریر کے لیے دیکھیے عکس نمبر ۲۴)

خاقان محمد مرزا خاں | یہ حکیم محمد یوسف خاں کے لڑکے اور ۱۳ ویں صدی ہجری کے مشہور حکیم ہیں۔ انھوں نے طب پر کئی کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں ان کی ایک اہم تصنیف قرابادین کافی ہے۔ اس کا ایک نسخہ خدا بخش لائبریری میں موجود ہے جو مصنف کا خود نوشت ہے۔

یہ ۵۴۴ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس کا ہینڈ لسٹ نمبر ۹۹۹ اور کیٹلاگ نمبر ۱۱۷ ہے۔ ۱۲۲۴ھ کا کتابت شدہ ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل ترقیمہ کی عبارت سے واضح ہوتا ہے۔

"تکمیل ایں کتاب مستطاب بعون الملک الوہاب رسید باختتام در ۱۲۲۴ھ یکہزار و دو صد و بست و چہار ہجری آخر ماہ ذی الحجۃ الحرام التماس از ناظران عطا پاش و خطا پوش آنکہ چوں سہوی و خطائی یابند در اصلاح آنکہ کوشند واگر نتوانند انگشت طعن برآں ننہادند ...

و دعای خیری فقیر مؤلف را یاد آرند والسلام علی من اتبع الہدی

(اصل تحریر کے لیے دیکھیے عکس نمبر ۲۵)

(شیخ حسین معز بلخی کی تحریر)

باشید که خدا و ند خود را به بیند اشکال العلماء اند هر که بدید
برسید از محل فنا در گذشت و از مقام بقا برگذشت در سبحات
وجه محبوب سوخته کند و قد جاء الحق و زهق الباطل
هر که درین مقام از وی عبارت کند گویند ضال من الضلال
و هر که درین حال بوی اشارت کند گویند اعمی من العمیان

عزیزی گفته است — مثنوی

بس محبی که را نه مطلق گفت زان جنید گو انا الحق گفت
در کشتی محرمست کرو زنی تن را بلا بود و دل را صفا بود جان را
ولا بود و سر را لقا بود چون دل صفا یافت و جان ولا یافت
و سر لقا یافت بجز زبان اگر تن بلا یابد هم ازین معنی اشارت
حضرت رسالت است علیہ السلام حاکیا عن اللہ تعالی کل
عمل ابن آدم یضاعف لی سبعین الا الصوم فانہ لی
و انا اجزی بہ هر عملی که فرزند آدم کند او را چون مضاعف
بودنا از یکی بهفتاد برسد مگر روزه که مرحق راست چنانچه
بوده گفته اند الا الصوم فانہ لی و انا اجزی بہ یعنی
الصائم لی که در عرب صفت ترک کنند و موصوف خواهند اگر
او را گفتندی که کسل این دری دولت را جای نبودی تکلیف

نمونہ نمبر ۱

(ہمایوں کی تحریر)

زینهار ای دل مکن انکار صاحب دولتان ۔ کاندرین سودای کج بوجهل گردد بوالحکم

شرح احوال تو بر حق بر دهرست ۔ بنده یارب کی تواند کرد شکر این نعم

با بسم مهر ربود آز اپستان در گذشت ۔ در وجودش درد بود دیدیم و درمان ندم

با شما اخلاص هر کس حاجت تقریر نیست ۔ عالم آصف دیده باشد حال ما در خاطرم

با جهان باشد به نیکی در جهانت با کام ۔ وین دعا بر انس و جان پست از دل و جان قدم

روز سه شنبه دولت ۱۲ محرم
ایجاب ... کرتا جهان
به نیکی در جهات کام باد همیشه
بانت والسلام والاکرام

ساقی اگرت هوای ما هی ۔ جز باده میار پیش ما هی

سجاده و خرقه در خرابات ۔ بفروش و بیار پیاله آی

از زنده دلی شغب چو مستان ۔ در گنبد جان صدای یا حی

اسرار دلست درره عشق ۔ بهتر ز هزار حاتم طی

سلطان صفت آن بت پری وش ۔ می آمد و خلق شهر در پی

مردم نگران بروی خوبش ۔ وز شرم گرفته عارضش خوی

حافظ ز غمت چو چند نالد ۔ آخر من دل شکسته تا کی

بنشینم و با غمت بسازم
جان در سر کار عشق بازم

نمونہ نمبر۵

(ہمایوں کی تحریر)

۷۷

شعر حافظ در زمان آدم اندر باغ خلد | دفتر نسرین و گل را زینت اوراق بود

وله نور الله مرقده

بیا که رایت منصور پادشاه رسید | نوید فتح و بشارت بمهر و ماه رسید
جمال بخت ز روی ظفر نقاب انداخت | کمال عدل بفریاد دادخواه رسید
ز قاطعان طریق این زمان شوند ایمن | قوافل دل و دانش که مرد راه رسید
عزیز مصر برغم برادران غیور | ز قعر چاه برامد باوج ماه رسید
سپهر دور خوش اکنون کند که ماه آمد | جهان بکام دل اکنون رسد که شاه رسید
کجاست صوفی دجال فعل ملحد کیش | بگو بسوز که مهدی دین پناه رسید
صبا بگو که چها بر سرم ازین غم عشق | ز آتش دل سوزان و دود آه رسید
ز شوق روی تو شاها بدین اسیر فراق | همان رسید کز آتش بروی کاه رسید
مرو بخواب که حافظ ببارگاه قبول | ز ورد نیم شب و درس صبحگاه رسید

بعد ازین دست من و دامن آن سرو بلند | که ببالای چمان از بن و بیخم برکند
حاجت مطرب و می نیست تو برقع بگشا | که برقص آورد م آتش رویت چو سپند
هیچ روئی نشود آینه حجله بخت | مگر آن روی که مالند بر آن سم سمند

این غزل حافظ را بطلب تفأل همایون شده بود.

نمونہ نمبر ۶

(ہمایوں کی تحریر)

نمونہ نمبر ۷

(جہانگیر کی تحریر)

غم غریبی و محنت چو بر نمی تابم | بشهر خود روم و شهریار خود باشم
چو کار عمر نه پیداست باری آن اولی | که روز واقعه پیش نگار خود باشم
ز محرمان سراپرده وصال شوم | ز بندگان خداوندگار خود باشم
ز دست بخت گران خواب و کار بی سامان | اگر کنم گله راز دار خود باشم
همیشه پیشهٔ من عاشقی و رندی بود | دگر بکوشم و مشغول کار خود باشم
بود که لطف ازل رهنمون شود حافظ | وگرنه تا بابد شرمسار خود باشم

چل سال رفت بیش که من لاف می زنم | کز چاکران پیر مغان کمترین منم
هرگز بیمن عاطفت پیر میفروش | ساغر تهی نشد ز می صاف روشنم
از جاه عشق و دولت رندان پاکباز | پیوسته صدر مصطبه ها بود مسکنم
در شان من بدرد کشی ظن بد مبر | کالوده گشت خرقه ولی پاکدامنم
شهباز دست پادشهم یا رب از چه رو | از یاد برده اند هوای نشیمنم
حیفست بلبلی چو من اکنون درین چمن | با این لسان عذب که خامش چو سوسنم
آب و هوای فارس عجب سفله پرورست | کو همرهی که خیمه ازین خاک برکنم
حافظ بزیر خرقه قدح تا بکی کشی | در بزم خواجه پرده ز کارت برافکنم

نمونہ نمبر ۸

(جہانگیر کی تحریر)

ای دوست دست حافظ تعویذ چشم زخم است ۔ یا رب که بینم آن را در گردنت حمایل

حرف المیم

[illegible]

اگر برخیزد از دستم که با دلدار بنشینم ۔ ز جام وصل می نوشم ز باغ خلد گل چینم

شراب تلخ صوفی سوز بنیادم بخواهد برد ۔ لبم بر لب نه ای ساقی و بستان جان شیرینم

مگر دیوانه خواهم شد کز عشقت شب تا روز ۔ سخن با ماه میگویم پری در خواب می بینم

شب رحلت هم از بستر روم در قصر حور العین ۔ اگر در وقت جان دادن تو باشی شمع بالینم

چو هر خاکی که باد آورد فیضی برد از انعامت ۔ ز حال بنده یاد آور که خدمتگار دیرینم

نه هر کو نقش نظمی زد کلامش دلپذیر آمد ۔ تذرو طرفه بگیرم که چالاکست شاهینم

اگر باور نمیداری رو از صورتگر چین پرس ۔ که مانی نسخه میخواهد ز نوک کلک مشکینم

رموز عشق و سرمستی ز من بشنو نه از واعظ ۔ که با جام و قدح هر شب حریف ماه و پروینم

وفاداری و حق گویی نه کار هر کسی باشد ۔ غلام آصف دوران جلال الحق و الدینم

[illegible]

اگر چه پامال جفا کرد چو خاک راهم ۔ خاک می بوسم و عذر قدمش میخواهم

من نه آنم که بجور از تو بنالم حاشا ۔ بنده معتقد و چاکر دولتخواهم

ذره خاکم و در کوی توام وقت خوش است ۔ ترسم ای دوست که بادی ببرد ناگاهم

هو
[illegible]
[illegible]
[illegible]
۱۰۱۸

نمونہ نمبر ۹

(جہانگیر کی تحریر)

باغ گل و مل خوش است لیکن | بی صحبت یار خوش نباشد
نرگس که درست صنع بندد | در چشم نگار خوش نباشد
جان نقد محقرست حافظ | از بهر نثار خوش نباشد

کسی که حسن و خط دوست در نظر دارد | محقق است که او حاصل بصر دارد
چو خامه در ره فرمان او سر طاعت | نهاده‌ایم مگر او به تیغ بردارد
کسی به وصل تو چون شمع یافت پروانه | که زیر تیغ تو هر دم سری دگر دارد
ز زهد خشک ملولم کجاست باده ناب | که بوی باده مدامم دماغ تر دارد
ز باده هیچت اگر نیست این نه بس که ترا | دمی ز وسوسه عقل بی‌خبر دارد
کسی که از ره تقوی قدم برون ننهاد | به عزم میکده اکنون ره سفر دارد
به پای بوس تو دست کسی رسید که او | چو آستانه بدین در همیشه سر دارد
دل شکسته حافظ به خاک خواهد برد | چو لاله داغ هوایی که بر جگر دارد

کنون که در چمن آمد گل از عدم به وجود | بنفشه در قدم او نهاد سر به سجود
بنوش جام صبوحی به ناله دف و چنگ | ببوس غبغب ساقی به نغمه نی و عود

فرزند خرم را ... [illegible]
... [illegible]
... نورالدین جهانگیر

نمونہ نمبر ۱۰

(جہانگیر کی تحریر)

هو
[illegible]
نورالدین جهانگیر [illegible] اکبر [illegible]

خورده‌ام تیر فلک باده بده تا سرمست	عقده در بند کمر ترکش جوزا فکنم
جرعهٔ جام بر این تخت روان افشانم	غلغل چنگ در این گنبد مینا فکنم
مایهٔ خوشدلی آنجاست که دلدار آنجاست	می‌کنم سعی که خود را مگر آنجا فکنم
بگشا بند قبا ای مه خورشید کلاه	تا چو زلفت سر سودازده در پا فکنم
حافظا تکیه بر ایام چو سهو است و خطا	من چرا عشرت امروز به فردا فکنم

روز عید است و من امروز در آن تدبیرم	که دهم حاصل سی روزه و ساغر گیرم
چند روز است که دورم ز می و ساغر و جام	بس خجالت که پدید آمد از این تقصیرم
من به خلوت ننشینم پس از این ور بنشینم	زاهد صومعه بر پای نهد زنجیرم
پند پیرانه دهد واعظ شهرم لیکن	من نه آنم که دگر پند کسی بپذیرم
می کشم باده و سجادهٔ تقوی بر دوش	وای اگر خلق شود واقف از این تزویرم
خلق گویند که حافظ سخن ناموس	نشنوم زانکه بود بادهٔ صافی پیرم

روزگاری شد که در میخانه خدمت میکنم	در لباس فقر کار اهل دولت میکنم
تا کی اندر دام وصل آرم تذروی خوش‌خرام	در کمینم و انتظار وقت فرصت میکنم

نمونہ نمبر ۱۱

(جہانگیر کی تحریر)

۱۶۴

مطربا مجلس انس است غزل خوان و سرود — چند گویی که چنین رفت و چنان خواهد شد

ماه شعبان منه از دست قدح کین خورشید — از نظر تا شب عید رمضان خواهد شد

حافظا از پی تو آید سوی اقلیم وجود — قدمی نه بوداعش که روان خواهد شد

نقد صوفی نه همه صافی و بی غش باشد — ای بسا خرقه که شایسته آتش باشد

صوفی ما که ز ورد سحری مست شدی — شامگاهش نگران باش که سرخوش باشد

خوش بود گر محک تجربه آید بمیان — تا سیه روی شود هر که درو غش باشد

ناز پرورد تنعم نبرد راه بدوست — عاشقی شیوه رندان بلاکش باشد

غم دنیای دنی چند خوری باده بخور — حیف باشد دل دانا که مشوش باشد

خط ساقی گر ازین گونه زند نقش بر آب — ای بسا رخ که بخونابه منقش باشد

دلق و سجاده حافظ ببرد باده فروش — گر شراب از لب ساقی مهوش باشد

واعظان کین جلوه در محراب و منبر میکنند — چون بخلوت میروند آن کار دیگر میکنند

مشکلی دارم ز دانشمند مجلس بازپرس — توبه فرمایان چرا خود توبه کمتر میکنند

گوییا باور نمیدارند روز داوری — کین همه قلب و دغل در کار داور میکنند

نمونہ نمبر ۱۲

(جہانگیر کی تحریر)

۵۰

هو
ای نور چشم شاه
دیدم امید که از تو تو
امان آید

چشم بد دور کز آن تفرقه خوش باز آورد	طالع نامور و دولت مادرزادت
شادی مجلسیان در قدم و مقدم توست	جای غم باد مر آن دل که نخواهد شادت
ما خلاص از بدن من صحبت آن کشتی نوح	ورنه طوفان حوادث ببرد بنیادت

شربتی از لب لعلش نچشیدیم و برفت	روی مه پیکر او سیر ندیدیم و برفت
گویی از صحبت ما نیک به تنگ آمده بود	بار بربست و بگردش نرسیدیم و برفت
بس که ما فاتحه و حرز یمانی خواندیم	وز پیش سوره اخلاص دمیدیم و برفت
گفت کز خود ببرد هر که وصالم طلبد	ما به امید وی از خود ببریدیم و برفت
شد چمان در چمن حسن و لطافت لیکن	در گلستان وصالش نچمیدیم و برفت
عشوه میداد که از کوی ارادت نروم	دیدی آخر که چنان عشوه خریدیم و برفت
همچو حافظ همه شب ناله و زاری کردیم	کای دریغا به وصالش نرسیدیم و برفت

شکفته شد گل حمرا و گشت بلبل مست	صلای سرخوشی ای صوفیان باده پرست
اساس توبه که در محکمی چو سنگ نمود	ببین که جام زجاجی چگونه اش بشکست
بیار باده که در بارگاه استغنا	چه پاسبان و چه سلطان چه هوشیار و چه مست

نمونہ نمبر ۱۳ ازن

(شاہ جہاں کی تحریر)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

این تاریخ کہ مشتملیست بر مجمل احوال حضرت صاحبقران
گیتی ستان و اولاد امجاد آنحضرت و سوانح ایام
حضرت عرش آشیانی انار اللہ برہانہ تا پنجاہ سال
بلبیست و دوم در عہد دولت شاہ بابا تصنیف شدہ
حررہ شاہجہان بادشاہ بن جہانگیر بادشاہ بن اکبر بادشاہ

نمونہ نمبر ۱۴

(محمد سلطان بن اورنگ زیب عالمگیر کی تحریر)

نمونہ نمبر ۱۵

(ظفر خاں احسن کی تحریر)

آراسته شده و بافزونی بلندیست آفتاب جهانتاب مسخر نمود

درجه ارتفاع رسیده و بزیادتی تا هفت بیت دیگر مانده که کسب

در مدرس جهات مشهور و معروف گشته میخانه را که جام

ارباب نیاز است به بسیاری قدرت ید اللهی قرابه باده عنبر را

بطاق بلند پایه نهاده و سه بیت گذاشته امید که از گزند

سیب گیران مصئون مانده آسیب عین الکمال نه بیند

راقمه حسن الله بن ابو الحسن الملقب بظفر خان

(مرزا عبدالقادر بیدل کی تحریر)

نمونہ نمبر ۱۲

(تقی الدین محمد کاشی کی تحریر)

نمونہ نمبر ۱۸

نمونہ نمبر ۲۳

(خاقان محمد مرزا خان کی تحریر)

ها ماند دور کنند پس آن موم صاف شده را چنین خواهند که سفید کرده باشند در شبهای ماه
در کاسه انداخته بدستور در آب کشیده پوست کنند و قدری قدری در آب شوره قطره بر آن نهاده باشند و دور آن
شوره نصف شب یا نیم روز اثار موم کیفیت که در روشنی ماهتاب گیری یکجا بر دارند و بر آورده
تمام شب در روشنی ماه بگذارند و بدستور چند شب دیگر عمل کنند و آب شوره دیگر بار تحلیل نمایند
هر گاه آب سرد شود و موم بالا بسته شده را بر میدارند سفید کافوری میگردد و این عمل از عجایب
و کار دیگران پنهان میدارند بنا بر افاده معصب تعلیم آمده [illegible] نوشته شد تکمیل این کتاب مستطاب
معدن الملک الوهاب رسید باختتام در سنه ۱۲۲۴ یکهزار و دوصد و بیست و چهار هجری آخر ماه ذی الحجه الحرام
التماس از ناظران عطا پوش و خطا پوش آنکه هر جا سهو و خطا یابند در اصلاح آن کوشند و اگر
نتوانند انگشت طعن بر آن ننهاده بحکم الانسان مرکب من الخطاء و النسیان چشم عنایت در پوشند
و شایقان این فن شریف هر گاه فایده از این جریده لطیفه بر دارند موجب هل جزاء الاحسان
الا الاحسان بدعای خیر مؤلف یاد آرند والسلام علی من اتبع الهدی ۵۵۵۵۵۵

نمونہ نمبر ۲۵

خدا بخش لائبریری کی چند اہم مطبوعات

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
ہندوستانی مسلمان عصری دستاویزات کے آئینہ میں (علی گڑھ تحریک ۱۵ - ۱۹۸۰ء)		۷۵/ رُپے
ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل	جناب سید حامد	۳۰/ رُپے
مغربی تعلیم کا تصور اور اس کا نفاذ علی گڑھ میں	پروفیسر رشید احمد صدیقی، مرتبہ مہر الٰہی	۲۰/ رُپے
رقعاتِ رشید صدیقی	" " مرتبہ پروفیسر مسعود حسین خاں	۳۰/ رُپے
کانٹے (کشمیری انشائیے)	ڈاکٹر محمد زماں آزردہ	۱۵/ رُپے
اورنگ زیب (ایک نیا زاویۂ نظر)	ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد	۱۵/ رُپے
قومی یکجہتی کی روایت	مسٹر بی۔ این۔ پانڈے	۱۵/ رُپے
مقدمہ طلسم ہوشربا	———	۴۰/ رُپے
طلسم ہوشربا (نو جلدیں)	———	۸۰۰/ رُپے
نوبت رائے نظر کے ماہنامہ "ادیب" الٰہ آباد (۱۳-۱۹۱۰) کے مضامین کا انتخاب، اشاریہ کے ساتھ		۵۰/ رُپے
پیارے لال شاکر کے ماہنامہ "العصر" لکھنؤ (۱۷-۱۹۱۲ء) کے مضامین کا انتخاب، اشاریہ کے ساتھ		۴۵/ رُپے
برج نرائن چکبست کے ماہنامہ "صبح امید" لکھنؤ (۲۱-۱۹۱۸ء) کے مضامین کا انتخاب		۵۰/ رُپے
قاضی عبدالودود کے ماہنامہ "معیار" کی مکمل ری پرنٹ، اشاریہ کے ساتھ۔		۵۰/ رُپے
مولانا ابوالکلام آزاد کے ہفت روزہ "پیغام" کی مکمل ری پرنٹ، اشاریہ کے ساتھ۔		۷۵/ رُپے
خوشتر منگر ولی کے ماہنامہ "زبان" (۲۹-۱۹۲۸ء) کی مکمل ری پرنٹ، اشاریہ کے ساتھ		۵۰/ رُپے
تجدید غزل گو نیاز فتحپوری کے ۱۹۴۰ء کے نگار کی ری پرنٹ، آٹوگراف اور تصاویر کے اضافہ کے ساتھ۔		۱۲۵/ رُپے
داستاں میری (سوانح اور اہم معاصرین کا تذکرہ)	ڈاکٹر اقبال حسین	۱۲۰/ رپے
تذکرۂ کاملانِ رامپور	مولفہ حافظ احمد علی خاں شوقؔ، تصحیح و اضافہ شائر اللہ خاں و حکیم محمد حسین خاں شفاؔ۔	۱۵۰/ رپے

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

جناب ادیب سہیل
انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی

شادی خانہ آبادی

"شادی خانہ آبادی" آٹھ صفحات پر مشتمل ایک کتاب ہے۔ یہ مطبع فیض عام میں منشی سورج مل کے زیر اہتمام پانچ سو تعداد میں ۱۵ اکتوبر ۱۸۷۲ء میں چھپی۔ اس کی قیمت ایک آنہ رکھی گئی۔ کتاب کے آخر میں اس کی تکمیل کی جو تاریخ درج ہے وہ ماہ جنوری ۱۸۷۲ء ہے۔ ڈاکٹر مظفر اقبال اپنی کتاب "بہار میں اردو نثر کا ارتقا" میں "شادی خانہ آبادی" کے مصنف کی پیدائش کا سال اکتوبر ۱۸۵۲ء بتاتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس کتاب کی اشاعت کے وقت مصنف کی عمر ۲۱ برس کے قریب ہوگی۔ مصنف نے کتاب میں اپنا نام منشی حسن علی لکھتے ہوئے اس کی لاحقے میں، "باشندہ بھاگلپور" لکھا ہے۔ بھاگلپور بہار کا ایک قدیم شہر ہے اور اپنا ایک علمی و تہذیبی پس منظر بھی رکھتا ہے۔ یہیں کے ایک بزرگ شیخ رضی الدین، فاضل مؤلفین "فتاویٰ عالمگیری" میں شامل تھے۔ شیخ متبحر عالم کے ساتھ ساتھ فن سپہ گری میں بھی کامل تھے۔ (مآثر عالمگیری ص۵۲۱) اسی دیار کے نامور بزرگ مولوی محمد عالم علی، جن کا شمار اردو کے اولین نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔ اُن کی اردو نثری تصنیف "دہ مجلس" ۱۲۶۱ھ ۱۸۴۴ء میں منظر عام پر آئی تھی۔

"شادی خانہ آبادی" کی تصنیف کے پس پردہ جو محرکات و جذبات کارفرما رہے ہیں، ان کے متعلق منشی حسن علی لکھتے ہیں:

> "جاننا چاہیئے کہ آج کل ہمارے بہترے ملکی بھائی شادی کے اصل مطلب کو نہیں جانتے ہیں، اور لڑکپن کی شادی کی بُرائیوں کو نہیں پہچانتے ہیں۔ عورتوں کی جہالت باعث کتنی بُرائی کی ہے اس سے بھی بہت کم واقف ہیں۔ اس خاکسار کا ارادہ ہے کہ یہ کتاب ایسی لکھیے کہ جس سے ہر عوام الناس فائدہ پائیں اور بُرائیوں کو پہچان جائیں۔"

مصنف کے ان تعارفی کلمات کے بعد یہ جاننے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ اس کتاب کا موضوع و مطمح نظر کیا

ہے ؟ پھر بھی یہ اعادہ ضروری ہے کہ اس کا بنیادی موضوع عورتوں کی کم سنی کی شادی ہے جس سے ازدواجی زندگی میں دوسری بہت سی خرابیاں پیدا ہونے کے علاوہ بائیولوجیکلی اس کا اثر آئندہ نسل پر بُرا پڑتا ہے۔ اس کتاب کا یہی رخ اسے دوسری ہمعصر کتابوں سے ممیّز کرتا ہے، ورنہ عام حالت میں اس کا موضوع وہی اصلاح نسواں ہے جو "مرآۃ العروس" کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولوی نذیر احمد دہلوی نے "مرآۃ العروس" کے ذریعے اس موضوع کو ایک تحریک کی صورت دے دی تھی۔ چنانچہ بہت دیر اور بہت دور تک بعد کے اہلِ قلم اس کی پیروی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

"مرآۃ العروس" کا سنہ تصنیف ۱۸۶۹ء ہے۔ اس کے چار سال بعد ۱۸۷۳ء میں "شادی خانہ آبادی" زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ اگر اسے کوئی بڑا کام تصوّر نہ بھی کیا جائے تو بھی جس دور میں یہ کتاب شائع ہوئی اُس وقت عورتوں کی اصلاح احوال کے نقطۂ نظر سے اس کا منظرِ عام پر آنا وقت کا ایک اہم تقاضا پورا کرتا تھا۔ اس وقت یہ موضوع بڑا محبوب اور مَن بھاتا کہا جاتا تھا۔

"شادی خانہ آبادی" کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ دو دوست عالم اور جاہل روز کی طرح صبح سویرے سیر کے لیے نکلتے ہیں، راستے میں وقت گزاری کے لیے آج بھی ایک موضوع ہاتھ آجاتا ہے۔ ناگاہ انھیں اپنے ایک جاننے والے صاحب غافل کی کم سنی کی شادی کا خیال آجاتا ہے۔ چنانچہ عالم اور جاہل قدم بھی بڑھاتے جاتے ہیں اور غافل کے حوالے سے کم سنی کی شادی اور عورتوں میں حصولِ علم کی کمی کے نفع و نقصان پر مکالمے بھی کرتے جاتے ہیں، اور جب ان کے درمیان ہونے والا مکالمہ مختلف موڑ کاٹتا ہوا ایک خاص منزل پر پہنچ جاتا ہے تو جاہل، عالم سے کہتا ہے:

"بھائی تمہاری باتوں سے میری آنکھیں کھل گئیں۔ اب میرے دل سے سب واہیات خیال جاتی رہیں۔ اب اپنے دوستوں سے ان بُرائیوں کو کہوں گا اور حتی المقدور کوشش کروں گا کہ یہ بُرائی ہمارے ملک سے جاتی رہے۔"

مکالمے کا اختتام ان جملوں پر ہوتا ہے:

"کچھ دن نکل آیا تھا۔ دونوں دوستوں کی رائے ہوگئی کہ لوٹ چلیں . . ."

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ منشی حسن علی کی اس کتاب کو "فسانہ مکالمت" کہا جا سکتا ہے یا نہیں، جس کا آغاز مکالمے سے ہوتا ہے اور مکالمے پر اختتام بھی ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے سنہ اشاعت ۱۸۷۳ء

و پیش نظر رکھکر اس کتاب میں مختصر کہانی کی تکنیک تلاش کی جائے تو یہ کتاب ابتدائی اور خام صورت میں
ہی سہی، مختصر کہانی کی اولیت کی دعوےدار کہی جا سکتی ہے۔ ایسے زمانے میں جب بھی اردو میں مختصر افسانے کا دور
دور تک سراغ نہیں ملتا تھا، اور پریم چند کو اس منظر میں داخل ہونے کے لیے تقریباً ربع صدی سے
زیادہ کا عرصہ باقی تھا۔ کسی شخص کا اس طرف رجوع ہونا یقیناً نئے تجربے کی خواہش کا غماز
کہا جا سکتا ہے۔

یہاں پھر ذہن میں ایک کرید پیدا ہوتی ہے کہ منشی حسن علی کو "فسانۂ مکالمات" کے طرز
میں "شادی خانہ آبادی" لکھنے کی تحریک کہاں سے ملی ہوگی۔ تو اس کا سیدھا جواب یہ ہو سکتا ہے
کہ کلکتے سے۔ کلکتہ ہی ان دنوں بہار، بنگال کا مرکز تھا۔ بنگلہ ادب میں فکشن کا رواج بہت پہلے ہو چکا
تھا۔ ۱۸۰۱ء کے آس پاس خود اردو میں مختلف موضوع پر فورٹ ولیم سے کتابیں چھپنے لگی تھیں۔

پروفیسر سید حسن اپنی تصنیف "بہار کا اردو اسٹیج اور ڈرامہ" میں یہ اطلاع بہم پہنچاتے ہیں
"بہار کے ایک شخص پنڈت بال کرشن بھٹ (۱۸۷۲ء میں) کلکتے اور بعد ازاں پٹنے سے ایک ہندی
اخبار "بہار بندھو" نکالا کرتے تھے۔ اس وقت اُن کے معاون کار کی حیثیت سے منشی حسن علی کا نام بھی
آتا تھا۔ کتاب مذکور کے صفحہ ۵۶ کی ایک عبارت سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ منشی حسن علی "بہار بندھو"
بہار کے قائم مقام ایڈیٹر کے فرائض بھی انجام دیتے رہے تھے۔ گویا اردو کے ساتھ انھیں ہندی پر بھی
اچھی دسترس تھی کہ جس کی بنا پر وہ کسی ہندی اخبار کی ادارت سنبھال سکیں۔ عین ممکن ہے کہ انھوں نے
اتفاقی ضرورت کے تحت بنگلہ زبان بھی سیکھی ہو، اور کلکتہ کے قیام ہی میں فکشن کی طرف رجوع ہوئے
ہوں، فکشن کی طرف رجوع ہونے کا ایک ثبوت ان کا ناول "نقش طاؤس" ہے جو ۱۸۸۱ء میں چھپا تھا۔

"نقش طاؤس" کا ذکر آگیا ہے تو یہاں قاضی عبدالودود کے مضمون مطبوعہ "معاصر" جنوری
۱۹۷۰ء کا اقتباس نقل کر دینا دلچسپی سے خالی نہیں، جو شادی خانہ آبادی" کے مصنف کے بارے
میں مزید معلومات کی فراہمی کا موجب بنا

"نقش طاؤس" ایک پرانا ناول ہے جس کی اشاعت ۱۸۸۱ء میں ہوئی ہے۔ اس کے
سرورق پر نام کے بعد یہ عبارت مرقوم ہے:

"جنگلہ نگری" بنگلہ زبان کا ناول ہے نئے اور خوبصورت لباس میں منشی حسن علی

صاحب اور منشی محمد اعظم صاحب کی کوشش سے ناظرین کی خدمت میں ہدیہ ہے۔"
منشی حسن علی وہی بزرگ ہیں جنھوں نے ۱۸۸۰ء میں جون فورسٹر کی کتاب "ڈسیشن آف کیرکٹر Decision of Character (کذا) کا ترجمہ "قوت فیصلہ کے نام سے کیا تھا اور اُس زمانے میں گورنمنٹ ایڈڈ اپر کلاس انگلیش اسکول شہر پٹنہ میں معلّم تھے، منشی محمد اعظم وہ بزرگ ہیں جو صورت الخیال" کے اصل مصنف ہونے کے مدعّی تھے۔ "نقشِ طاؤس" لکھنے میں کس کا حصّہ تھا۔ اس کی خبر نہیں نقش طاؤس چھوٹی تقطیع کی ۴ + ۶۲ صفحوں پر مطبع احسن المطابع کرۂ شائستہ خاں شہر عظیم آباد میں طبع ہوا تھا۔ "جنگلا نگری" کا مصنف کون ہے؟ اس کا سال اشاعت کیا ہے، اس کا مجھے علم نہیں قیاس ہے کہ انیسویں صدی کے عشرۂ ہشتم سے قبل کی نہ ہوں۔ میرا خیال ہے کہ "جنگلا نگری" سے صرف کہانی لی گئی ہے، اور اس میں تصرف بھی ہوا ہے۔ ناول کی ابتدا میں ایک دیباچہ ہے۔ غالباً یہ حسن علی اور محمد اعظم یا اِن دونوں میں سے کسی ایک کا لکھا ہوا ہے۔ "جنگلا نگری" کے مصنف کو اس سے سروکار نہیں۔ یہ اس زمانے کی تحریر ہے جب "داستان امیر حمزہ" اور "بوستان خیال" وغیرہ کا زور کم ہو چلا تھا اور اردو خوانوں میں ایسی کہانیوں کی مانگ پیدا ہو چلی تھی جس میں انوکھا پن ہو لیکن روزمرّہ کی زندگی سے زیادہ دوری نہ ہو . . . "

قاضی عبدالودود صاحب کے اس اقتباس سے یہ اطلاع فراہم ہوتی ہے کہ منشی حسن علی نے جون فورسٹر کی کتاب "ڈسیشن آف کیرکٹر" کا ترجمہ "قوت فیصلہ" کے نام سے کیا تھا۔ ڈاکٹر مظفر اقبال نے اپنی کتاب "بہار میں اردو نثر کا ارتقا" میں منشی حسن علی کے ایک اور ترجمے کا ذکر کیا ہے۔ یہ ترجمہ مشہور انگریزی مصنف مسٹر "اسماعیل" (سموئیل) کی کتاب "سیلف ہیلپ" Self help کا ہے جو "تحریک" کے عنوان سے کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر اقبال نے اپنی مذکورہ کتاب میں منشی حسن علی کی کتاب "نقشِ طاؤس" کے سلسلے میں مزید معلومات فراہم کی ہیں، قاضی عبدالودود صاحب "جنگلا نگری" کے اصل مصنف کا نام معلوم نہ کر سکے تھے۔ ڈاکٹر مظفر نے اس گتھی کو سلجھا دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

" . . . اس کا مصنف بنگلہ زبان کا مشہور ناول نگار بنکم چٹرجی ہے۔ اور کتاب کا صحیح نام "جگلا نگریو" ہے جس کے معنی بنگلہ زبان میں "انگوٹھی کا ایک جوڑ" ہے۔"

ڈاکٹر صاحب کی اس صراحت سے مجھے اردو ڈراموں "سجاد سنبل" (۱۸۹۴ء) "شمشاد سوسن" اور "اندھوں کو آنکھ" (۱۸۸۰ء) کے مصنف پنڈت کیشو رام بھٹ یاد آئے جاتے ہیں۔ پنڈت جی اپنے بڑے بھائی بال کرشن بھٹ کے ساتھ "بہار بندھو" میں کام کرتے تھے اور منشی حسن علی بھی اس اخبار میں معاون کار و مدیر کی حیثیت سے منسلک تھے۔ پنڈت جی کے ڈرامے "اندھوں کو آنکھ" کے سرورق پر اُن کی دیگر تصانیف میں "ایک جوڑا انگوٹھی" کا بھی ذکر ہے، جو بہ زبان ہندی ہے۔ عین ممکن ہے کہ "جگلا نگریلو" کو ہندی اور اردو میں منتقل کرنے کا ارادہ پنڈت کیشو رام بھٹ اور منشی حسن علی نے ایک ساتھ کیا ہو، اس لیے کہ دونوں ایک ہی اخبار "بہار بندھو" سے وابستہ تھے۔

دورانِ مطالعہ یہ تقابل بھی سامنے آیا ہے کہ دہلی اور لکھنؤ میں لکھے جانے والے بالکل ابتدائی اردو ناولوں پر انگریزی ناولوں کا اثر ہے۔ مثال کے طور پر ڈپٹی نذیر احمد کے ناول "بنات النعش" پر ٹامس ڈے کے ناول The History of Standford and Method اور "توبۃ النصوح" پر ڈیفو کے فیملی انسٹرکٹر حصہ اول Family Instructor, Part کے اور سرشار کے "فسانۂ آزاد" پر سروانٹیز کے "ڈون کوئیزوٹ" کے اثرات ہیں۔ اس کے برعکس بہار کے ابتدائی ناول نگاروں کے پیشِ نظر بنگلا ناول رہے ہیں۔ مثال کے طور پر شاد عظیم آبادی کے ناول "صورۃ الخیال معروف بہ ولایتی کی آپ بیتی" (۱۸۷۶ء) پر بنگال کے مشہور ناول نگار بنکم چٹرجی "اندرا" اور منشی حسن علی کے ناول "نقشِ طاؤس" پر اُسی مصنف کے ناول "جگلا نگریلو" کے اثرات ہیں۔

لیکن منشی حسن علی کی کتاب "شادی خانہ آبادی" طبع زاد ہے۔ البتہ عورتوں کی اصلاح کے لیے ڈپٹی نذیر احمد کے توسط سے ناول "مراۃ العروس" کی صورت میں جو لہر چلی تھی اُس سے "شادی خانہ آبادی" متاثر ہے۔ "بہار میں اردو نثر کا ارتقا" میں منشی حسن علی کی اور کئی کتابوں مثلاً "معراج المومنین" (۱۸۸۶ء) "سراج الکتب" اور "تائیدِ حق" (۱۸۹۹ء) وغیرہ کے حوالے ملتے ہیں، لیکن "شادی خانہ آبادی" کا ذکر نہیں ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر مظفر اقبال کی نظر سے یہ کتاب نہیں گزری۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب پردہ خفا میں ہے۔ اِسے رکارڈ میں آنا چاہیے۔

"شادی خانہ آبادی" کی فوٹو اسٹیٹ کاپی قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش ہے۔

●●

شادی خانہ آبادی

جسکو

منشی حسن علی باشندہ ضلع بھاگل پور نے

ہر خاص و عام کے فائدے کے لیئے تصنیف کیا

۱۵۔ اکتوبر سنہ ۱۸۷۳ء

مطبع فیض عام میں اہتمام سی منشی سوجبل صاحب کے چھپا

پہلی بار ۵۰۰ جلد

قیمت فی جلد ۱ر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جاننا چاہیے کہ آجکل ہمارے بہتیرے ملکی بہائی شادی کے اصل مطلب کو نہین جانتے ہین + اور لڑکپن کی شادی کی برائیون کو نہین پہچانتے ہین - عورتون کی جہالت باعث کتنی بُرائی کی ہے اس سے بہی بہت کم واقف ہین + اِس خاکسار کا یہہ ارادہ ہے کہ یہہ کتاب ایسی لکہے کہ جس سے ہر عوام الناس فایدہ پائین اور برائیون کو پہچان جائین

آغاز بیان

کسی شہر مین دو دوست رہتے تہے + ایک کا نام عالم دوسرے کا جاہل تہا + یہہ دونون دوست اکثر صبح کے وقت سیر کے لیئے

شہوت باہر نکل جایا کرتے تھے + ایک دن کا ذکر ہے کہ یہہ دونون دوست حسب
دستور سیر کے لیے چلے جاتے تھے کہ اتفاقاً راستہ مین یہہ بات نکل آئی یعنی جاہل
کہنے لگا کہ بھائی محمد غافل کی جب سے شادی ہوئی ہے تب سے اونہیں ہمیشہ غم و الم مین
مبتلا دیکھتا ہون + اس مصیبت کا سبب آپ کیا سمجھتے ہین عالم نے کہا کہ میری سمجھ مین
یہہ آتی ہے کہ اونہون نے جسے شادی کہتے ہین نہین کی ہوگی یعنی شادی کی مراد کو
سمجھکر شادی نہ کی ہوگی + شادی کی تین مرادین ہوسکتی ہین ایک یہہ کہ انسان دوست کا
محتاج ہے دوسرے اوسکو لڑکے کی محبت طبعی ہے تیسرے جتنے اعضا خدا نے ہمکو دیے ہین
کو دئی ہین سبھون سے یہہ غرض ہے کہ اونہون کا درست استعمال کیا جای اور جو شخص ان
اعضاؤن کا درست استعمال نہین کرتا ہے وہ اوسکی عدو لحکمی کرتا ہے + اور یے اعضائے
علامت مرد اور عورت کس مصرف کے ہین ضرور ہے کہ انہون کا درست استعمال کیا جاے
بھائی آجکل بہت کم ہین جو شادی بخیال فرض ادا کرنے کے کرتے ہون + محمد غافل نے
بھی شاید ایسا ہی کیا ہوگا + دوسرے انکی عورت کم سن ہوگی یعنی عمر اسکی سولہ برس سے
نیچے ہوگی اسلیے دونون کو موقع مین مطلب شادی کی معلوم کرنیکا نہ ملا ہوگا + اور اسمین
تو شک ہی نہین کہ شادی حسب دستور ماں باپ کی مرضی پر ہوئی ہوگی + اسلیے محمد غافل کو یہہ موقع
نہ ملا ہوگا کہ اپنے عورت کو خاطر خواہ چن سکے تیسرے انکی عورت جاہل ہوگی یعنی دین دنیا
دونون سے بے خبر + بھائی محمد غافل کا غمگین ہونا غلط نہین ہے + جب
عورت جسکے ساتھ ساری عمر کاٹنی ہوتی ہے جاہل ہوتی ہے یعنی جب
عورت مراۃ العروس کی اکبری خانم کی طرح ہوتی ہے تو گھر دوزخ کا سا

معلوم ہوتا ہے + جیسا شاعر نے کہا ہے + خانہ دوزخ سے ہوتا ہے بدتر + گھر مین الغرض جب عورت ہوتی ہے + بہائی اگر کسی دن موقع ملا تو بالکل برائیونکو جو عورت کے جاہل رہنے سے ہوتی ہین تشریح وار کہین گے *

عاقل نے کہا کہ مین تم سے یہہ پوچھتا ہون کہ اگر عورت پڑہی لکھی ہوشیار اور دیندار نہ ملے تو کیا شادی نہین کرنی چاہئے اور کیا گناہ کے دریا مین بلا خوف تیرنا چاہئے + عاقل نے کہا کہ اوس سونے کو پھینکئے جو پہلے توڑے کان + اجی صاحب شادی کس کام آئیگی جس سے ہمیشہ تکلیف اوٹھانا ہو اور مذہبی کامون مین خلل ہو + گناہ کا آپ نے کیا نام لیا + شاید آپ سمجھتے ہونگے کہ شادی کرنے سے آدمی گناہون سے بچتا ہے + یہ بھی آپ کے سمجھ کی خطا ہے + اجی مینے بچشم خود دیکھا ہے کہ بہتر سے لڑکے نہایت نیک تھے شادی ہوتے دیر نہین کہ واہیاتون مین مشہور ہوگئے + تمنے کیا یہہ مثل نہین سُنی آدمی گھر ہی مین سیکھتا ہے زیادہ کیا کہین شرم کی بات ہے حیا مانع ہوتی ہے - کیا آپ نے اُن فقیرونکو نہین دیکھا جو عمر کاٹ دیتے ہین اور عورتون کا منہہ تک نہین دیکھتے کیا ان لوگون کو یہہ واہیات خواہش نہین ستاتی - جاہل نے کہا کہ آپ کا کہنا درست ہے پر اگر ماباپ کی مرضی ایسی ہی ہو تو کیا کرنا چاہئے + عاقل نے کہا کہ مین آپ کے سوال کا ایک دوسرے سوال سے جواب دیتا ہون + یعنی آپ یہہ تو خوب جانتے ہین کہ ملکہ دکٹوریا ہملوگون کی

ملکہ ہے ہملوگ کو انکا حکم ماننا بہت ضرور ہے + اور لارڈ صاحب بہادر
اسکے وزیر ہین + اور ہملوگ کہہ سکتے ہین کہ گورنر جنرل صاحب درجہ مین
ایک طرح سے اسکے برابر ہین لیکن اگر گورنر موصوف ہملوگون کو کوئی کام
ایسا کرنے کہین جو برخلاف رائے ملکۂ زمان کے ہو تو ہملوگ کو کس کا
حکم مقدم رکھنا واجب ہے + ہم سمجھتے ہین کہ آپ کہینگے کہ وکٹوریا کا
حکم مقدم ہے + تو وہی حال درمیان حکم خدا اور ماباپ کے سمجھنا لازم
ہے اگر ماباپ ایسی بات کہین جس سے خدا کے حکم ادا کرنے مین خلل آتا ہو
تو صرف اُسی حکم کیواسطے خدا کا حکم مقدم جاننا لازم ہے + لیکن لڑکے
ایک حالت مین لاچار ہین یعنی جب والدین بسبب جہالت کے لڑکون کی
شادی کمسنی مین کرتے ہین + بھائی جبتک یہہ برائی ہندوستان سے
دفع نہوگی امن و صلح نظر نہ آئیگی + یہہ سنکر جاہل نے کہا کہ ہماری نسبت
مین کم سن مین شادی ہونا بہتر ہے کیونکہ جب عورت جوان ہوتی ہے
تو اسکو غرور رہتا ہے + اور سمجھتی ہے کہ مجھے بھی خدا نے عقل دی ہے
اسلیئے شوہر کی تابعداری قبول نہین کرتی لیکن کم سن عورت تو سمجھانا
لڑکپنی سے جو سکھلایا جاتا ہے سیکھتی ہے اپنے شوہر کو اپنا مالک اور
برتر سمجھتی ہے اور ہمیشہ تابعدار بنی رہتی ہے + اور بقول آپ کے بہت
دنون شامل رہنے کا موقع ملتا ہے اسلیئے محبت بھی ازحد ہوتی ہے +
عالم نے جواب دیا کہ جوان لڑکی کو غرور ہوتا ہے + تو ہم پوچھتے ہین

کہ کم سن عورت کیا جوان نہین ہوتی خواہ جوان ہوئی سسرال مین یا نہیر
مین غرور ہونا دونون حالتون مین ہوسکتا ہے ہان جب انسان کو علم ہوتا ہے
تو غرور زایل ہوتی ہے پر دیکھئے جب کم سنی مین شادی ہوئی تو والدین
کو علم دینے کا موقع بہت کم ملا اور سسرال مین بہ سبب شرم حیا کے
علم سے محروم رہتی ہے + یہہ تو آپ خوب جانتے ہین کہ علم نہونے سے
انسان غرور کیا بہت طرح کی برائیون مین مبتلا ہوتا ہے - اور یہہ جو آپ
کہتے ہین کہ کم سن مین شادی ہونے سے عورت فرمان بردار ہوتی ہے
یہہ کہنا بھی غلطی سے خالی نہین + ہان اگر مان لیا جائے کہ فرمان بردار ہوئی
تو یہہ فرمان برداری بہ سبب خوف کے ہوگی نہ بسبب علم کے اور جو
فرمان برداری خوف سے ہوتی ہے وہ قایم نہین رہتی + دیکھئے جب
انسان جاہل رہتا ہے تو بہوت سی نیکی بہ سبب جہالت کے تابعداری کرتا ہے
اور جب یہ سمجھنے لگتا ہے کہ ان سے ڈرنا بیفائدہ ہے تو اوسیوقت
فرمان برداری سے ہاتھہ اوٹھاتا ہے + اور آپ جو کہتے ہین کہ کم سن
عورت کو جو سکھلایا جاتا ہے سیکھتی ہے + ہم کہتے ہین کہ بہ سبب شرم
و حیا کے بہت کم سیکھتی ہے اور بہت باتون کے سیکھنے سے محروم
رہتی ہے - اب ہم آپ کو اون برائیون کو جو کم سنی کے شادی سے
ہوتی ہین سناتے ہین +

برائیان جو کم سن مین شادی کرنے سے ہوتی ہین

(۱) اگر صرف عورت کم سن ہوئی یا صرف مرد کم سن ہوا تو حکمت کی رو سے دونون کی تندرستی مین خلل آتا ہے یعنی کم زوری ظہور مین آتی ہے اولاد بھی کم زور اور کم عقل ہوتے ہین اور یہہ کم زوری نسلاً بعد نسلاً چلی جاتی ہے + یہہ تو آپ اکثر سنتے ہونگے کہ جو عمر اگلے زمانے مین آدمیون کی ہوتی تھی اب نہین ہوتی اسکا سبب بھی یہی برا رسم ہے۔ دیکھیے بھاگلپور کے محلہ خنجرپور مین ایک نو برس کی لڑکی کو لڑکا ہوا ہے خیال کرنا چاہیے کہ اگر یہہ لڑکا جیتا رہا تو اسکا پوتا بالشتی سے کیا کم ہوگا اس طرح کے لڑکے اکثر بہت جلد مر جاتے ہین اسکا سبب یہہ ہے کہ یہہ مثل تو مشہور ہے دبلے کو مارین شاہ مدار بہ سبب کم زوری کے ہزار طرح کی بیماریان اسکو گھیر لیتی ہین آخر بیچارہ کسی نہ کسی کا شکار ہوا

(۲) مان لو کہ لڑکا آٹھہ برس کا ہوا اور لڑکی پانچ برس کی تو بعد دس برس کے لڑکا اٹھارہ برس کا ہوگا اور لڑکی پندرہ برس کی اور یہہ تو خوب معلوم ہے کہ پندرہ برس مین آجکل لڑکی اچھی طرح جوان ہو جاتی ہے اور جوان لڑکی کو چھوٹا شوہر برا معلوم ہوتا ہے اور بیچارہ لڑکا شیر کے آگے بلی بنا رہتا ہے + ایسا اکثر دیکھنے مین آتا ہے کہ عورت غیر مرد سے آشنائی کر لیتی ہے اسمین اکثر خوف جان کا ہوتا ہے اور ناحق کی بدنامی چھپرا تم پور مین جو بھاگلپور کے قریب ہے ایک لڑکے نے جسکی عورت جوان تھی اس ارادہ سے کہ اگر عورت مر جائیگی تو دوسری شادی کرنے

موقع ملتا اپنی عورت کو مار ڈالا آخرش پکڑا گیا تھوڑا دن ہوا کہ دایم الحبس ہوا
کیون اس طرح کی بہلائیان کم سن مین شادی کرنے سے ظہور مین آتی ہین +

(۳) اگر گہر مین دو بہائی ہوے ایک بہائی تو نوکر ہے اور دوسرا
پڑہتا ہے اور عورت جوان ہے تو اسکی عورت کو اپنی گوتنی سے عداوت
اور حسد ہوتی ہے نتیجہ اسکا ہمیشہ کا جھگڑا + دیکھئے برسون کا ذکر ہے
کہ امیر علی اور وزیر علی کی عورتون مین جھگڑا تھا ایک دوسرے کا جھونٹا
پکڑ کر مارتی تہی آئی اوئی ہو رہی تہی + سارے ہمسایہ کی عورتین جمع ہو گئی
تہین - ایک کہتی تہی کہ تیرے بڑے کو کہا جاؤن دوسری کہتی کہ اے
کتیا مردار کیا بہونکتی ہے غرض عجب کہرام مچ رہا تہا ایسا ہی اکثر دیکھنے
مین آتا ہے کہ عورت اپنے میان کو کہہ سنا کر چولہا الگ کرا دیتی ہے
اور یہہ تو آپ کو خوب معلوم ہے کہ جدا ہونے سے انسان کس کس
طرح کی برائیون مین مبتلا ہوتا ہے ہ

(۴) ایک برائی کم سن کی شادی سے یہہ ہے کہ عورت مرد مین
ادب لحاظ نہین رہتا اور جب ادب نہین تو باتون مین اثر نہین اسلیئے
جو جو فائدے ادب اور باتون کے اثر کے ہین اون سے انسان
محروم رہتا ہے + غرض بہائی جاہل کم سن کے شادی کی برائیون
کو کوئی کہان تک بیان کرے اگر یہہ برائی ہماری ہندوستان مین نہ ہوتی
تو ہم لوگون کی یہہ حالت نہوتی + جاہل عالم کی ساری باتون کو سنکر کہنے لگا

کہ بہائی تمہاری باتون سے میری انکہین کہل گئین اب میرے دل سے
سب واہیات خیال جاتی رہین + اب مین اپنے دوستون سے ان
برائیون کو کہونگا اور حتی المقدور کوشش کرونگا کہ یہہ برائی ہمارے
ملک سے جاتی رہے + کچہہ دن نکل آیا تہا دونون دوستون کی رائے
ہوئی کہ لوٹ چلین غرض دونون اپنے اپنے گہر پہر آئے فقط

فدوی خاکسار حسن علی باشندہ
ضلع بہاگلپور

تحریر ہفتم تاریخ
ماہ جنوری ۱۸۷۳ء

تمام شد

حکیم صیانت اللہ
قاضی زادہ ۔ امروہہ

عہد شاہجہانی کا فرس نامہ
اور
عہد عالمگیر کا باز نامہ

ابھی دو تین قبل "فرس نامہ" سے موسوم عہد شاہ جہانی کا ایک قدیم مخطوطہ سامنے آیا ہے۔ جو یہاں ایک صاحب کی ملکیت ہے اور ان کے مورث اعلیٰ کی یادگار، ترقیمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مورث اعلیٰ "سید عبد اللہ المخاطب عبد اللہ خاں بہادر فیروز جنگ دور شاہ جہاں میں ایک کوہستانی ریاست میں جنگی مہم پر گئے ہوئے تھے۔ جہاں فتح کے بعد انھیں کتابوں کا ایک بکس ملا جن میں سالوتری علم سے متعلق بھی "سنسکرت" ایک کتاب ملی جس کا موصوف نے فارسی میں ترجمہ کرایا ہے فارسی ترجمہ کا نام فن سے متعلق "فرس نامہ" رکھا۔

طبی اعتبار سے یہ خصوصیت بھی ہے کہ اس میں جتنی دوائیں لکھی ہیں وہ بھی ہندستانی ہیں۔ اصل نسخہ غالباً آیور ویدک نظریات پر مشتمل ہوگا جسے فارسی میں یونانی طب سے قریب تر کیا گیا ہے۔ اصل نسخہ سے ترقیمہ کے علاوہ مترجم میں کچھ اضافات بھی ہیں مثلاً غزنوی عہد کے کسی فرس نامہ کی بعض فصلیں بھی اس میں شامل کی گئی ہیں۔ تتمہ کے کچھ اوراق غائب ہیں اس لیے سنہ کتابت وغیرہ کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا پھر بھی کاغذ، کتابت، روشنائی وغیرہ سے مخطوطہ قدیم معلوم ہوتا ہے۔

اپنے ذخیرۂ کتب میں بھی عہد عالمگیر کا "باز نامہ" سے موسوم ایک مخطوطہ ملا ہے جو طیور وحوش کے شکار ان کی بیماریاں اور علاج، ان کی حرمت وحلت شکار کے آلات، ان کا طریقہ استعمال، اور دیگر جانوروں کے خواص پر مشتمل ہے۔ بندوق کی ایجاد کا سلسلہ حضرت داؤد علیہ السلام سے قائم کیا گیا ہے جو عہد بعہد احمد استاد تک پہنچا ہے۔ بندوق وبارود سازی، ان کی انواع اسی کا تفصیلی ذکر ہے۔

ترقیمہ تو اسی دور کا معلوم ہوتا ہے مگر بعد میں خطوط و قلم بدلے ہیں اور متعدد جگہ مختلف ہیں۔ تتمہ پر ۱۲۰۳ فصلی درج ہے۔ جو بظاہر محل نظر ہے۔

رسول خدا نور حق آفتاب فلک کتاب صاحب تاج و
منبر و محراب حاکم اوکردمایر و رقیام بر سر نوشن مالک
شهسواری که مرکب بخشش پرده از ته فلک بیرون
رخش کرده چون فرم زاده بکر النفس لامکان شد
مکان جولانش دوستان خدا رحیل و شد
دینی و آخرت بطفیل و شد ازخدا بر صد درود و سلام
بروی و آل و بر صحابه تمام باب اول در ارباب
عقل و اصحاب دانش پوشیده نماند که کتاب در معرفت اسپان
و علامات محمود و مذموم و دانستن علل و امراض که اسپ را
پیدا میکند و معالجه آن را حکمای هند بزبان سنسکرت شالیهوتر
صفر را سلوک در زمان سابق تصنیف کرده اند و ان لغت
هندوان دانا کسی نمیدانستند بنابران فواید ان مستور مانده
بود در ایام خلافت سلطان حضرت فلک رفعت
ملک خصلت مشتری صاحب کیوان سطوت پادشاه جم جاه
آفاق پناه مروج دین محمدی شاهنشاه عادل الخاقان

ز السلطان بن سلطان بن سلطان ابوالمظفر شهاب
الدین محمد صاحبقران ثانی شاهجهان بادشاه غازی خلد الله
ملکه و سلطانه بندگان که در علم و دانش سپهریست دانا بود
جمع ساخته کتاب سالوتر را که در فرسنامه هندی باشد
در هنگامی که این بنده فدوی درگاه خلایق پناه سپهسالار
المخاطب بعبد الله خان بهادر فیروز جنگ بعزات تلکار
ماجلمور که دران زمان رانا امرسنگ ولد رانا پرتاب سنگ
این رانا و دیگر سرکشان بزرگ زمینداران آن کوهستان
سرکوب میزد و از برکت توجهات ظاهری و باطنی بادشاه
دین پناه فتوحات مسعوده نصیب روزگار این جانب شد
درگاه خادم خلق الله گردیده چند صندوق کتاب هندی
از رانا امرسنگ بدست غازیان لشکر بادشاه اسلام افتاد
از آنجمله یکی سالوتر اسپان بود که عبارت از فرسنامه باشد
آن را بزبان فارسی ترجمه نموده اگرچه در زمان سابق فرسنامها
در نظم و نثر نوشته اند اکثر موافق باین کتاب است

وچون توجه شریف پادشاه اسلام واسلامیان بمقتضای
آیت کریمه الذین هاجروا وجاهدوا فی سبیل الله باموالهم و
انفسهم اعظم درجة عند الله واولئک هم الفائزون
جد و جهد در جهاد کفار و دشمنان دین بسیار از حد
و عدد بیرون است و باین سبب میل بخرید تمام اسپان تیزگام
خوش خرام دارند با وجود آنکه اسپان بسیار بیرون از الوف
[illegible] در پایگاه خاصه وطویله های معموره از اسپان
عربی و رومی و عراقی و ترکی و کچهی از هر قسم قریب برو ازده
هزار اسب موجود و حاضر میباشند همه تازی نژاد
ترکی نژاد پرورش یافته بشیر و نبات هر یکی بشکوه رخش
ساوران بآن کوه در شکوه فزون بآن موزه بر شدی
و بری بگردد باد پا رسانید خبرها از نه لعل عنان گردش نژاد
ز دو تیت بسته بر دو ماه بهمه کس بورد عالم گیر در جهان
نشان کس نمیدهد بر خداوندان نقل قدر استاد و نشید
جنت کرا ... ساخته ازین قابل و لایق باو کیاید

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
مارواڑی کالج، بھاگلپور (بہار)

ایسپس فیبلس کا نسخۂ خدا بخش

ایسپس فیبلس کے تین نسخوں کا پتہ چلتا ہے۔ پہلے نسخہ کی نشاندہی اقبال کرشن کے یکم نومبر ۱۹۹۷ء کے ہفتہ وار "ہماری زبان" علی گڑھ میں شائع شدہ ایک مراسلہ سے ہوتی ہے۔ اقبال کرشن تحریر کرتے ہیں:

"یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے۔ کل صفحات ۱۱۴ ہیں۔ اس میں ایسوپ کے پورے ایک سو قصے ہیں۔ اصل انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔ نہ سرورق کا پتہ ہے، نہ پشت ورق کا۔ لہٰذا میں آپ کو بتانے سے قاصر ہوں کہ کس نے چھاپی، کب چھاپی۔ اب اس لئے میں خود ہی پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ کتاب کب چھپی کہاں چھپی، کس نے ترجمہ کیا تھا؟ واضح رہے کہ اردو چھپائی، قدیم اردو ٹائپ میں ہے اور ترجمے کی زبان بھی قدامت کا پتہ دیتی ہے۔"

آخری ورق موجود نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ ناقص الآخر ہے۔

دوسرے نسخہ کی نشاندہی یکم دسمبر ۱۹۹۷ء کے "ہماری زبان" میں ہی سلیم تمنائی کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس کتاب میں ایسوپ کے پورے ایک سو قصے ہیں۔ لیکن صفحات ۱۴۲ ہیں، جسے رام نرائن لال نے الہ آباد سے شائع کیا تھا تاکہ ان لوگوں کو فائدہ ہو جو اردو کی مدد سے انگریزی اور انگریزی کے ذریعہ سے اردو سیکھنا چاہتے ہیں۔ رمضان علی شاہ نے نیشنل پریس الہ آباد میں اسے چھاپا تھا۔ سرورق با تصویر ہے۔ کتاب پر تاریخ طباعت نہیں۔" یہ بہت بعد کی طباعت معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے فی الحال اس نسخے کو زیر بحث لانا ضروری نہیں۔

تیسرا اگر ان دونوں نسخے سے قدیم اور ضخیم نسخہ خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس نسخہ کا پہلا اور دوسرا صفحہ غائب ہونے کے باوجود صفحہ ۳ سے آخری صفحے تک دیکھنے سے ساری ضروری معلومات حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کتاب میں اصل انگریزی کا ہی اردو ترجمہ دیا گیا ہے۔

اقبال کرشن نے تعداد اوراق ۱۱۱۴ اور سلیم تمنائی نے ۲۴۲ صفحات لکھا ہے۔ نیز قصے کی تعداد ایک سو بتائی ہے۔ لیکن خدا بخش لائبریری میں محفوظ کتاب میں ضخامت ۱۸۴ صفحات اور چھوٹی چھوٹی ۱۹۶ کہانیاں ہیں۔ اتنی کہانیاں ہی انگریزی حصے میں ہیں۔

صفحہ ۱۸۴ پر درج ہے :

" الحمد للہ والمنۃ کہ یہ کتاب مفید و آسان کہ ہر ایک اس کو پڑھ کر فائدہ پاوے، تمام ہوئی۔ مترجم منشی نظام الدین ہندوستانی۔"

تاریخ گیارہویں ماہ جمادی الاوّل ۱۲۶۶ ہجریہ مقدسہ مطابق چھبیسویں مارچ ۱۸۵۰ء عیسویہ چھاپ خانے میں فضل الدین صاحب لکھ کر کے چھاپی گئی۔ م م م"

اس کے بعد ۴ صفحات میں غلط نامہ (صفحہ، سطر، غلط، صحیح) ہے۔ غلط نامہ کے آخری صفحہ پر "تمام شد" درج ہے اور تمام شد کے نیچے " منشی فضل الدین کے چھاپ خانے میں چھاپی گئی اور ابراہیم صاحب بن محمد فتح نے چھاپی"۔ انگریزی حصہ ۸۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں سبھی کہانیوں میں عنوان رکھا گیا ہے۔ جبکہ اردو میں صرف " نقل نمبر" فلاں کر کے درج ہے۔

انگریزی حصہ کے سرورق پر درج ہے :

ENGLISH AND HINDOOSTANEE
AESOP'S FABLES
TRANSLATED FROM THE ENGLISH
INTO HINDOOSTANEE
BY
MOONSHEE NIZAM-UD-DEEN
TRANSLATOR OF THE
HINDOOSTANEE AESOP'S FABLES
THE NEW ARTICLES OF WAR
AND THE INSHA-I-HINDEE
THIS WORK WAS REVISED AND APPROVED
BY THE LATE MAJOR GENERAL VANS KENNEDY
ORIENTAL TRANSLATOR TO GOVERNMENT

BOMBAY
PRINTED AT THE DUPTUR ASHKARA PRESS
FOR IBRAHIM FUTTA MOHAMMAD AND
SOLD BY HIM AT MEADOW STREET
BELOW MR.CANONN'S LIBRARY
AND BY MOONSHEE NIZAM-UD-DIN
AT POONA A.D. 1850 HIJRIA 1266

انگریزی حصّے کے پہلے صفحہ پر اورینٹل ٹرانسلیٹر وینس کنیڈی کی ایک سرٹیفکیٹ ہے:

CERTIFICATE

BOMBAY 4th Nov. 1846.

I DO HEREBY CERTIFY THAT I HAVE EXAMINED THIS TRANSLATION FROM ENGLISH INTO HINDOOSTANEE OF AESOP'S FABLES MADE BY MUNSHI NIZAM-UD-DIN AND THAT IT APPEARS TO ME THAT IT HAS BEEN EXECUTED CORRECTLY AND IN SUCH AN EARLY STYLE AS WILL FACILITATE THE LEARNING OF THE LANGUAGE.

(SIGNED) VANS KENNEDY
ORIENTAL TRANSLATOR
TO GOVENMENT

اس کے بعد منشی نظام الدین کا ۱۹ صفحات کا انگریزی میں دیباچہ درج ہے، جس میں انھوں نے ایسپس فیبلس کی اشاعت پر تاریخی روشنی ڈالی ہے۔ پھر صفحہ ۲۰ سے ۵۸۲ تک انگریزی کی ۱۹۶ کہانیاں ہیں، اور پھر اردو ترجمہ۔

••

ڈاکٹر ایرکن ترکمان
شعبۂ اُردو سلجوق یونیورسٹی
قونیہ، ترکی

ہندستان کے کتب خانوں میں ترکی مخطوطات

ہندستان میں علی گڑھ، دہلی، حیدر آباد اور پٹنہ کے کتب خانوں میں محفوظ ترکی مخطوطات کے مطالعے کے دوران جو اہم ترکی مخطوطات میری نظر سے گزرے انھیں موضوع کے اعتبار سے ذیل میں پیش کیا جاتا ہے: ۱۔ منظوم و منثور لغت ۲۔ ادبی رسائل، ۳۔ تراجم۔

منظوم و منثور لغت

(۱) نصاب ترکی، ورق ۱۳۹، از خواجہ صاحب خواجہ محمد شاہ نقشبندی، لاہور محرم ۱۲۵۶ھ/مارچ ۱۸۴۰ء (۲) رسالہ در لغت ترکی، بچوں کے لیے ایک رسالہ ہے، ورق ۱۹، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد لائبریری نمبر ۱۲۷۲۔ (۳) لبیب اللغات ترکی۔ فارسی ترکی کی ایک منظوم لغت، ورق ۶۳ خدا بخش لائبریری، پٹنہ (۴) رسالہ لغت ترکی: فارسی کی منظوم لغت، ورق ۹، سالار جنگ میوزیم حیدر آباد ۱۸۱۷ھ/۱۴۱۴ء۔ (۵) انشا منظوم فارسی: ترکی لغت از محمد رضا بخشی ۱۶۷۵، اورینٹل مینو سکرپٹ لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ترناکہ، حیدر آباد (۶) نصاب ترکی: بہت اہم فارسی۔ ترکی کی منظوم لغت ہے۔ ورق ۳۳، اورینٹل مینو سکرپٹ لائبریری حیدر آباد (۷) ترکی مصادر: بعض ترکی مصادر اور فارسی میں ان کے متبادل، سالار جنگ میوزیم حیدر آباد۔ (۸) ترکی مصادر: ورق ۴۲ سالار جنگ میوزیم حیدر آباد (۹) ترکی لغت: منظوم لغت از حاجی شہاب الدین ورق ۸۷، ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۵ء سالار جنگ میوزیم حیدر آباد (۱۰) نصاب ترکی: گوپال لعل، ورق ۵۹ (۱۱) صرف و نحو: ورق ۶۲، اورینٹل مینو سکرپٹ لائبریری حیدر آباد۔ (۱۲) فرہنگ اسکندری: در عہد سلطان اسکندر بن بہلول شاہ، اورینٹل مینو سکرپٹ لائبریری، حیدر آباد (۱۳) فرہنگ ترکی: جو ۱۱۴۰ھ/۱۷۲۷ء میں محمد شاہ بادشاہ کی عہد میں ابو المعصوم بیگ بن قوام الدین بیگ نے مرتب کیا اوراق ۱۱۸۳، اورینٹل مینو سکرپٹ لائبریری۔

ادبی کتابیں

(۱۴) علی شیر نوائی کا دیوان: ورق ۱۵۳، خدا بخش لائبریری، پٹنہ (۱۵) دیوان علی شیر نوائی: ورق ۲۳۶

کاتب محمودی کابلی ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۳ء۔ (۱۶) دیوان علی شیر نوائی: ورق ۲۱۰، ترقیمہ: بندۂ درگاہ شاہ محمد بیگ نیر الملک ۱۲۵۶ھ (۱۷) یوسف زلیخائی نوائی: ورق ۸۷، سالار جنگ میوزیم حیدرآباد۔ (۱۸) دیوان علی شیر نوائی: اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری حیدرآباد۔ (۱۹) دیوان علی شیر نوائی: ورق ۴۴۴ (۲۰) کلیات نوائی: اس میں ۲۸ ورق کی ایک کتاب "تاریخ سلاطین عجم" بھی شامل ہے۔ اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری حیدرآباد (۲۱) منطق الطیر (لسان الطیر): ورق ۱۱۸ ۱ا عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد۔ (۲۲) دیوان فضولی: از محمد حسین بن پہلوان طرقندان ورق ۶۲، سالار جنگ میوزیم۔ (۲۳) دیوان فضولی: ورق ۱۳۰ عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد (۲۴) دیوان فضولی: اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری حیدرآباد (۲۵) حدیقۃ السعداء: ورق ۲۱۹ (۲۶) دیوان بابر شاہ: ورق ۵۱، اس میں ۱۴۰ غزلیں ہیں۔ سالار جنگ میوزیم۔ (۲۷) دیوان بابر شاہ: ورق ۷۵ سالار جنگ میوزیم (۲۸) روضۃ الاشعار: ۳۱۰ اشعار کا انتخاب ہے۔ اس میں نسیمی، سلطان سلیمان، سلطان مراد، یونس، فضولی، حافظ ترکی، سلیمی، حالی وغیرہ کے اشعار شامل ہیں ۱۱۲۸ھ/۱۷۱۶ء اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری حیدرآباد۔ (۲۹) دیوان حافظ خوارزمی: سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں ان کا ایک ۵۸۶ ورق کا مجموعہ کلام موجود ہے (۳۰) دیوان راشد آفندی: محمد راشد آفندی کا دیوان، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد۔ (۳۱) چہل حدیث: ۴۰ منظوم احادیث از علی شیر نوائی (۳۲) مجموعۃ الاشعار: ورق ۲۷ مولانا آزاد لائبریری، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی (۳۳) بیاض اشعار، ورق ۴۶ خدا بخش لائبریری پٹنہ۔

تراجم: بعض تاریخی و دینی کتابوں کا ترکی ترجمہ

(۳۴) عجائب المخلوقات از زکریا ابن محمد بن محمود القزوینی، ورق ۷۵ خدا بخش لائبریری، پٹنہ (۳۵) عقد الجمان فی تاریخ اہل زمن از ابو محمد ابو الثنا محمود بن موسیٰ بن احمد بن حسین بن یوسف بدر الدین العینی العنفی ج ۱، ورق ۳۳۶، ج ۲، ورق ۴۱۷، ج ۳، ورق ۴۳۲، خدا بخش لائبریری، پٹنہ (۳۶) تقویم البلدان از ابو الفدا اسمٰعیل بن علی بن محمود بن محمد بن عمر بن شہنشاہ بن ایوب عماد الدین الایوبی (۳۷) ترجمہ رشحات عین الحیات: ورق ۴۱۸ از محمد عارف بن محمد شریف عباسی، خدا بخش لائبریری، پٹنہ (۳۸) بادی الاسلوب از سلطان عثمان خان۔

جناب شبیر احمد خاں غوری
علیگڑھ

خیام کا ایک عظیم ہندسی شاہکار

شرح ما اشکل من مصادرات اقلیدس

خیام ایک رباعی گو شاعر کی حیثیت سے مشہور ہے۔ مگر اس شہرت نے حقیقی "خیام" کو نظروں سے چھپا لیا ہے۔ شاعری کی دنیا میں اس کا کوئی مقام ہو یا نہ ہو، عالمی ریاضی و ہیئت کی تاریخ میں اُسے ایک ممتاز مقام ضرور حاصل ہے۔ وہ رصدگاہ ملک شاہی کا سربراہ تھا۔ کارڈان (Cardan) سے کہیں پہلے اس نے "فصول مخروطی (Conic sections) کی مدد سے تیسرے درجہ کی مساواتوں (Cubic Equations) کو منظم طور پر حل کیا تھا اور "اُصول اُقلیدس" کے "خطوط متوازی کے مصادرہ" (Parallel Postulate) کو ثابت کرنے کی جو مسلسل کوشش بطلیوس (Ptolemy) (زمانہ ۱۵۰ء کے قریب) کے وقت سے آج تک ہوتی رہی ہے، اس کے اندر وہ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُس نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب بعنوان "شرح ما اشکل من مصادرات اُقلیدس" بھی لکھی تھی، جس کا واحد نسخہ لیڈن کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ یہ کتاب طبع بھی ہوئی تھی، مگر مطبوعہ نسخے کمیاب ہیں۔ سطور ذیل میں اسی کتاب کا ابتدائی تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔ مگر اس سے پیشتر اس کے موضوع کی وضاحت مستحسن معلوم ہوتی ہے۔ اس ضمن میں دو باتوں پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

۱۔ مصادرہ کی حقیقت و ماہیت۔

۲۔ "اُصول اقلیدس" کے "خطوط متوازی کے مصادرہ" کے ساتھ اعتنا کا اجمالی جائزہ۔

۱۔ مصادرہ مفہوم: "مصادرہ" جسے انگریزی میں (Postulate) کہتے ہیں منطق اصطلاح ہے، اگرچہ اس کا استعمال زیادہ تر علم ہندسہ (Geometry) میں ہوتا ہے۔ اس اصطلاح کا بانی مشہور یونانی حکیم و فلسفی ارسطاطالیس تھا جو علم منطق کا بھی واضع و بانی ہے۔ مصادرہ کی توضیح اس نے اپنی منطقی تصنیف "انالوطیقائے ثانی" (Analyticae Posterior) میں کی تھی۔ عہد حاضر میں اس کے ترجمے یورپی زبانوں (بشمول انگریزی زبان کے) میں ہوئے۔ میرے پیش نظر (Jonathan Barnes) کا ترجمہ ہے جو ۱۹۷۵ء

میں کلیرنڈن پریس آکسفورڈ سے Aristotle Posterior Analytics (Translated by Jan-
athen Barnes, Charendon Press, Oxford, 1975) کے نام سے
شائع ہوا تھا۔

اس کتاب کے صفحہ ۱ پر ارسطو "مصادرہ" (Postulate) کی تعریف بدیں طور کرتا ہے:۔

"مصادرہ" وہ (دعویٰ یا مقدمہ) ہے جو متعلم کی رائے کی ضد ہو، اور ہر چند کہ وہ ثبوت طلب ہو، اُسے ثابت کئے بغیر ہی مان لیا جائے اور استعمال کیا جائے۔

اس تعریف کی مزید توضیح ارسطو "مفروضہ" (یا "اُصول موضوعہ") (Supposition) اور "مصادرہ" میں امتیاز کر کے کرتا ہے:

"جو بات کوئی شخص بغیر خود اس کو ثابت کئے ہوئے فرض کر لیتا ہے، حالانکہ وہ ثبوت طلب ہوتی ہے (اس کی دو شکلیں ہیں۔) اگر وہ ایسے دعویٰ کو فرض کرتا ہے جو متعلم کے نزدیک بھی صحیح ہے تو وہ اسے (Suppose) کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ اس بات کو اس حالت میں مان لیتا ہے کہ یا تو اس کے بارے میں اس کی کوئی رائے ہی نہیں ہوتی، یا اگر ہوتی تو ہے، مگر وہ (دعویٰ کے اصل مدعی کے موقف کے) خلاف ہوتی ہے تو وہ اُسے بطور "مصادرہ" کے پیش کرتا ہے، اور یہی وہ امتیازی فرق ہے جس کی بنا پر "مفروضہ" (یا "اُصول موضوعہ") اور "مصادرہ" ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، کیونکہ "مصادرہ" وہ دعویٰ ہے جو متعلم کی رائے کی ضد ہو اور ہر چند کہ ثبوت طلب ہو، اُسے ثابت کئے بغیر ہی مان لیا جائے اور استعمال کیا جائے۔"

ہر چند کہ "مصادرہ" منطقی اصطلاح ہے، مگر اس کا استعمال زیادہ تر اقلیدسی ہندسہ کے ماہرین نے کیا ہے۔ ان میں سے ایک اہم شخصیت پرقلس (Proches) کی ہے۔ وہ اس (مصادرہ) کی تعریف میں کہتا ہے:

"اگر کوئی دعویٰ غیر واضح بالذات ہونے کے ساتھ متعلم کی رضامندی کے بغیر تسلیم کیا گیا ہو، تو وہ "مصادرہ" کہلاتا ہے۔"

ارسطو کی تصانیف عہد اسلام میں پہلے عربی میں ترجمہ کی گئیں اور پھر حکمائے اسلام نے ان کی مدد سے مستقل کتابیں لکھیں۔ ان حکما میں اہم ترین شخصیت شیخ بو علی سینا کی ہے اور اس کی تصانیف میں تین کتابیں خصوصی اہمیت رکھتی ہیں: "شفا، نجاۃ، اور اشارات۔"

"کتاب الشفا" کا پہلا حصہ منطق پر ہے جو نو "فنون" پر مشتمل ہے۔ پانچواں فن ارسطو کی "انالوطیقائے ثانی کا چربہ ہے۔ اس کے پہلے مقالہ میں بارہ فصلیں ہیں۔ آخری فصل میں اُس نے "مصادرہ" اور اُس کی اخوات "علوم متعارفہ" (Axiom) اور "اصول موضوعہ" (Supposition) یا (Hypothesis) کی حقیقت و ماہیت کی توضیح کی ہے :

' اُصول موضوعہ' وہ مقدمات ہیں جو اپنی ذات میں غیر واضح بالذات ہوتے ہیں مگر کسی دوسرے علم میں ان کی وضاحت کی جاتی ہے، اور متعلم انھیں اس بنا پر کہ اُسے اپنے استاد کے ساتھ حسن ظن ہے اور اس بات پر اعتقاد ہے کہ معلّم کی رائے اس باب میں صحیح ہے، تسلیم کر لیتا ہے۔ "مصادرہ" بھی ایسا ہی (غیر واضح بالذات) مقدمہ ہوتا ہے۔ لیکن یا تو اس باب میں متعلم کی رائے وہ نہیں ہوتی، جو معلّم کی رائے ہے، یا پھر سرے سے کوئی رائے نہیں ہوتی۔"

اور اس (مصادرہ) کی بہترین مثال وہ " اقلیدس کے خطوط متوازی کے مصادرہ" کو بتاتا ہے کہ :

" اقلیدس کی کتاب میں جو بیان ہوا ہے کہ اگر ایک خط مستقیم دو دوسرے خطوط مستقیم کو قطع کرے اور خط قاطع کے ایک جانب کے دو داخلہ زاویے مل کر دو قائمہ زاویوں سے کم ہوں تو اس جانب دونوں خط بڑھائے جانے سے آپس میں مل جائیں گے، ایک "مصادرہ" ہے۔"

مصادرہ کی اسی طرح توضیح ابن سینا نے اپنی دوسری کتابوں "کتاب النجاۃ" اور "کتاب الاشارات والتنبیہات" میں کی ہے، مگر اس کی تفصیل موجب تطویل ہوگی۔

ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی مسیحی) میں کاتبی قزوینی نے "شمسیہ" کے نام سے منطق کا ایک عمدہ متین لکھا جس پر بعد میں قطب الدین رازی نے شرح لکھی، جو ان کے نام پر "قطبی" کہلاتی ہے۔ اس کے آخر میں انھوں نے "مصادرہ" کی جو توضیح کی ہے، وہ بڑی صاف اور واضح ہے۔ فرماتے ہیں :

" ہر علم کے تین حصے ہوتے ہیں۔ موضوع، مبادی اور مسائل . . . مبادی یا تصورات ہوتے ہیں یا تصدیقات . . . (تصدیقات کی تین شکلیں ہیں) ۔

(۱) یا تو وہ اپنی ذات میں (per se) واضح بالذات (Self-evident) ہوتی ہیں (وہ "علوم متعارفہ" (Axiom) کہلاتی ہیں یا غیر واضح بالذات ہوتی ہیں۔ (اُس حالت میں ان کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔)

یہ مگر شاگرد استاد کے ساتھ حُسنِ ظن کی بنا پر انھیں صحیح تسلیم کرتا ہے تو وہ " اُصول موضوعہ" (Hypothesis) کہلاتی ہے، لیکن

(۳) اگر شاگرد ان کے تئیں انکار اور شک کے ساتھ پیش آئے نہیں تو "مصادرہ" کا نام دیا جاتا ہے۔"

آخری زمانہ میں ملّا محب اللہ بہاریؒ (المتوفی ۱۱۹۱ھ/۱۷۰۸ء) نے "سلّم العلوم" لکھی جس کے ذریعہ نہ صرف ہندوستان، بلکہ عالم اسلام کی منطق عبقریت اپنے نقطۂ کمال کو پہنچی۔ بعد میں مختلف علماء نے اس پر شروح لکھیں۔ ان شروح میں اہم ترین شرح مولانا عبدالعلی بحرالعلوم کی ہے۔ اس میں وہ فرماتے ہیں: "مبادی (First principles) ان امور کو کہتے ہیں جن سے دلیل مرکب ہوتی ہے . . . اگر یہ امور تصورات کے قبیل سے ہوں تو انھیں حدود (یا تعریفات) کا نام دیا جاتا ہے، اور اگر از قسم قضایا ہوں تو:

"اگر وہ ضروری ہوں اور بیان و توضیح سے مستغنی، تو "علوم متعارفہ" (Axioms) کہلاتے ہیں۔ اور اگر نظری ہوں . . . اور اس انداز کے ہوں کہ متعلم ان کی صحت کو اس وجہ سے تسلیم کرے کہ اسے ان کی صحت کا ظن غالب ہے، یا اس وجہ سے تسلیم کرے کہ اُسے اپنے اُستاد (کی اصابت رائے) کے ساتھ حسن ظن ہے۔ تو انھیں "اصول موضوعہ" (Hypothesis) کہا جاتا ہے۔

لیکن اگر وہ امور اس انداز کے ہوں کہ شاگرد انھیں تسلیم تو کرے مگر دل میں ان کی صحت کا منکر ہو تو انھیں "مصادرات" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اس تفصیل سے "مصادرہ" کی حقیقت و ماہیت متحقق ہو گئی ہو گی جو مغرب میں ارسطو کے زمانہ سے پچھلی صدی تک اور مشرق میں آج کے دن تک عام اندازِ فکر کا ماحصل ہے، ایک ہی رہی ہے اور جس کی رو سے "مصادرہ" سے مراد وہ دعاوی یا مقدمات ہوتے ہیں جو:

(الف) نہ تو لازماً بدیہی (واضح بالذات Self-evident) ہوں کہ ثبوت ہی سے مستغنی ہوں، اور (ب) نہ ہی انھیں مخاطب (یا متعلم اگر وہ استاد کا مخاطب ہے) ہی بطیب خاطر تسلیم کر لیتے ہوں بلکہ اُستاد (یا دعوے کے مدعی) کی جلالت قدر سے مرعوب ہو کر وقتی طور پر انھیں تسلیم کر لیتا ہے (حالانکہ اس باب میں اُس کی رائے اکثر استاد کی رائے کے مخالف ہوتی ہے)۔

۲- اُصول اُقلیدس کا خطوط متوازی کا مصادرہ: مصادرہ کی بہترین مثال اُقلیدس

کا مخطوط متوازی کا مصادرہ" ہے۔ مگر اس کی تفصیل سے پہلے خود "اصول اُقلیدس" کا اجمالی تعارف ضروری ہے۔

"اصول اقلیدس" ہندسہ یا جیومیٹری کی مشہور کتاب ہے۔ "جیومیٹری" کی ابتدا جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے پیمائش زمین کے سلسلے میں مصر قدیم میں ہوئی۔ بعد میں پروہت طبقہ نے اس پیمائش کے بہت سے قاعدے دریافت کئے اور اس طرح "جیومیٹری" کے علم کا آغاز ہوا۔

پھر یونانی حکماء جیسے تالیس (Thalse) اور فیثاغورث وغیرہ مصر پہنچے اور وہاں سے دوسرے علوم کے ساتھ ہندسہ یا جیومیٹری کا علم بھی سیکھ کر آئے۔ خود انھوں نے بھی اپنی دریافتوں سے اس علم کی ثروت میں اضافہ کیا اور اس طرح ان کی سعی پیہم سے اس علم کا وافر ذخیرہ جمع ہو گیا۔

اس وافر ذخیرہ میں سے بنیادی حیثیت کی اشکال کو منتخب کر کے "اصول ہندسہ" کا نام دیا گیا۔ اس قسم کا سب سے پہلا انتخاب بقراط کیوسی (Hippocrates of Chios) نے مرتب کیا۔ پھر اور لوگوں نے بھی اسی انداز کی کتابیں مرتب کیں۔ آخری کوشش اقلیدس (زمانہ ۳۰۰ ق م کے قریب) نے کی۔ اُس کی "اصول ہندسہ" (Elements of Geometry) کے سامنے اس موضوع کی سابق تصانیف گوشہ گمنامی میں جا پڑیں۔

بعثت اسلام کے بعد جب یونانی علم و حکمت کی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں تو سب سے پہلے اقلیدس کی "اصول الہندسہ" ہی کا ترجمہ ہوا۔ مگر اس کا باقاعدہ ترجمہ حجاج بن یوسف بن مطر نے ہارون الرشید کے عہد (۱۷۰ھ — ۱۹۳ھ) میں کیا۔ حجاج ہی نے اس کا دوسری مرتبہ ترجمہ ہارون کے بیٹے مامون کے زمانہ (۱۹۸ھ–۲۱۸ھ) میں کیا۔ بعد میں اور لوگوں نے بھی ترجمے کئے جن میں سب سے مشہور اسحاق بن حنین کا ترجمہ تھا، جس پر ثابت بن قرہ نے اصلاح دی۔

تیرہویں صدی مسیحی کے وسط میں خواجہ نصیر الدین طوسی نے حجاج اور ثابت کے ترجموں کو سامنے رکھ کر "تحریر اُصول اُقلیدس" کے نام سے اصول اقلیدس کا ایک نیا ایڈیشن مرتب کیا اور پھر اسی ایڈیشن کو قبول عام نصیب ہوا۔ بعد کے علمائے تدریس ہو یا تصنیف دونوں ہی میں اسی کے ساتھ اعتنا کیا۔

اُقلیدس کی "اُصول الہندسہ" کی سب سے بڑی خوبی اُس کی منطقی ترتیب ہے۔ ہر شکل پچھلی اشکال کی مدد سے ثابت ہوتی ہے اور وہ اپنے سے پہلے کی اشکال سے۔ آخری اساسی شکلوں کی صحت کچھ تمہیدی مقدمات اور چند مصطلحات (حدود یا تعریفات) پر موقوف ہوتی ہے جنھیں "مبادی" (First Principles)

کہتے ہیں، محقق طوسی کے یہاں انھیں "صدد" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ پچھلی فصل میں مذکور ہوا، ان تمہیدی مقدمات کی تین قسمیں ہیں: "علوم متعارفہ، اصول موضوعہ اور مصادرات۔ محقق طوسی کی "تحریر اصول اقلیدس" میں پہلی قسم کو تو "العلوم المتعارفہ" کا عنوان دیا گیا ہے۔ لیکن باقی دو قسموں کو ان کے مصطلح عنوانات کے تحت بیان نہیں کیا گیا، بلکہ ایک ہی جماعت میں "اوضاع" (أن یُوضَعَ) کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ انھیں میں حسب ذیل مقدمہ ہے:

" کل خطین مستقیمین وقع علیهما خط مستقیم، وکانت الزاویتان الداخلتان فی احد الجهتین اصغر من قائمتین، فانهما یلتقیان فی تلک الجهة ان اخرجا۔"

[اگر دو خطوط مستقیم کو تیسرا (خط مستقیم کاٹے اور (خط قاطع) کی ایک جانب کے دونوں داخلہ زاویے دو قائمہ زاویوں (rt.angles) سے کم ہوں تو وہ دونوں خط اگر بڑھائے جائیں تو اسی جانب میں (کہیں نہ کہیں جاکر) مل جائیں گے۔]

یہی اقلیدس کا "خطوط متوازیہ کا مصادرہ" ہے جو علم ہندسہ کی تاریخ میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ ہندسی دنیا کی ہنگامہ آرائیاں اسی مصادرہ کے محور پر گردش کرتی رہی ہیں اور اسی کے ثابت کرنے کی کوشش غیر اقلیدسی جیومیٹری (Non-Euclodean Geometry) کے وجود میں آنے پر منتج ہوئی۔ مگر اس کی تفصیل موضوع زیر بحث سے دور لے جائے گی۔ اس اہمیت سے قطع نظر یہی "مصادرہ" اقلیدس کا عظیم ترین کارنامہ ہے، کیونکہ اسی کے ذریعہ اُس نے خطوط متوازی کے مسئلہ کو پائدار اور مستحکم بنیادوں پر استوار کیا۔

لیکن واقعات کی ستم ظریفی بھی قابل غور ہے کہ اقلیدس کا یہی عظیم کارنامہ کوئی دو ہزار سال سے ہدف تنقید بنا ہوا ہے، کیونکہ اقلیدس کے بعد آنے والے ماہرین علم ہندسہ نے اکثر اسے "مصادرہ" ماننے سے انکار کیا اور اس بات پر اصرار کیا کہ یہ صرف ایک "مسئلہ اثباتی" (Theorem) ہے، جسے زیادہ بسیط شکلوں کی مدد سے ثابت کیا جانا چاہئے۔ قدیم ترین ریاضی داں جس نے اسے ثابت کرنے کی کوشش کی بطلیموس تھا۔ بعد کے ریاضی دانوں میں برعکس (Proclus) اس حیثیت سے مشہور ہے کہ وہ اس "مصادرہ" کی مصادراتی حیثیت کا بڑی شدت سے منکر تھا اور کہتا تھا کہ اس کو مصادرات کی فہرست ہی سے ساقط کر دینا چاہئے، کیونکہ یہ ایک مسئلہ اثباتی (Theorem) ہے۔ جسے بطلیموس نے اپنی کتاب میں اور خود اقلیدس

نے اس کے "عکس" (Converse) کو عملاً مسئلہ اثباتی کی طرح ثابت کیا ہے۔ ہرقلس کا شاگرد (Simplicius) کہتا ہے کہ بطلیموس اور ہرقلس کے علاوہ اور ریاضی دانوں نے بھی اسے ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔

بہرحال جب "اصول اقلیدس" عربی میں ترجمہ ہوئی تو پھر مسلمان فضلاء نے اس پر شروح لکھیں اور اس کے مشاکل و غوامض کو حل کرنے کی کوشش کی۔ ان مشاکل و غوامض میں سب سے اہم "خطوط متوازی کا مصادرہ" ہے۔ محقق طوسی نے "الرسالہ الشافیہ" میں ان میں سے تین فاضلوں کی کوشش کا تفصیلی طور پر ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس علم کے (یونانی) متبحرین کے بعد متاخرین (فضلائے اسلام) کا زمانہ آیا۔ انھوں نے جب دیدۂ انصاف سے دیکھا تو صورت حال ان پر واضح ہو گئی اور انھوں نے اس (مصادرہ) کی دلیل و حجت تلاش کرنا شروع کی . . . کسی نے تو اس مصادرہ کا بدل پیش کیا جو وضوح و غموض میں اقلیدس کے بیان کردہ مصادرہ (کی مشکلات) کے قریب ہے اور وہ ابو علی ابن الہیثم ہے جو فنون ریاضیات میں تبحر رکھتا تھا۔ اور کسی نے اس مصادرہ کا ثبوت ایسے مقدمہ کے ذریعہ دیا جو اقلیدس کے مصادرہ سے زیادہ واضح نہیں ہے اور وہ حکیم عالم ابوالفتح عمر خیام ہے۔ اور کسی نے اس کی دلیل ایک مغالطہ آمیز مقدمہ پر قائم کی اور وہ فاضل عباس بن سعید الجوہری ہے۔"

ان فضلاء میں سب سے پہلے عباس بن سعید الجوہری نے "اصول اقلیدس" کے باقاعدہ ترجمہ کے کوئی تیس سال بعد اس مسئلہ کے ساتھ تعرض کیا۔ اس نے اقلیدس کی کتاب کی اصلاح لکھی اور اس کی اشکال میں تقریباً پچاس شکلوں کا اضافہ کیا۔ ان میں سے چھ شکلیں خطوط متوازی کے مصادرہ کے اثبات میں ہیں، مگر بقول محقق طوسی ان کی اساس ایک ایسے مقدمہ پر ہے جو مغالطہ آمیز ("مغالطیہ" (Fallacious)) ہے۔

چوتھی صدی کے خاتمہ پر ابن الہیثم نے اقلیدس کے خطوط متوازی کے مصادرہ کا بدل دریافت کیا کہ "ایک دوسرے کو قطع کرنے والے دو خط مستقیم (بیک وقت) ایک ہی خط مستقیم کے متوازی نہیں ہو سکتے" یا "Two intersecting St. lines can not be parallel to one and tne same St. line."

ابن الہیثم نے یہ بدل اپنی کتاب "شرح مصادرات اقلیدس" میں پیش کیا تھا، مگر محقق طوسی کو یہ کتاب نہیں

مل سکی۔ خوش قسمتی سے آج دنیا میں اُس کے تین نسخے محفوظ ہیں۔ ابن الہیثم نے اس کا حوالہ اپنی ایک اور کتاب "حل شکوک کتاب اُقلیدس" میں دیا تھا جو محقق طوسی کو مل گئی تھی۔ فرماتے ہیں:

" اور رہا ابن الہیثم تو اس نے اپنی کتاب مسمّٰی بہ "حل شکوک کتاب اقلیدس" میں اس مقدمہ (خطوط متوازی کے مصادرہ) کے بجائے ایک دوسرا مقدمہ بیان کیا ہے اور اُس کا گمان ہے کہ یہ اقلیدس کے مصادرہ کے مقابلہ میں زیادہ واضح اور ذہن میں جلد راسخ ہو جانے والا ہے۔ اُس نے اس مصادرے اور اس جیسے دوسرے مصادرات کے ثبوت کے لئے اپنی ایک اور کتاب کا حوالہ دیا ہے۔ جس کا نام اُس نے "شرح المصادرات" بتایا ہے (مگر) مجھے اس کا نسخہ نہیں ملا"

محقق طوسی ابن الہیثم کے مجوزہ بدل کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

" اما المقدمة التی زعم انها ابین عند الحس واوقع فی النفس من هذه المصادرة و استعملها فی المواضع التی تحتاج فیها الی تلک المصادرة بدلاً عنها فهی ان الخطین مستقیمین المتقاطعین لایمکن ان یوازیا خطاً واحداً مستقیماً۔"

[اور وہ مقدمہ جس کے لئے اس (ابن الہیثم) کا گمان ہے کہ وہ (اُقلیدس کے) اس مصادرے کے مقابلہ میں زیادہ واضح اور ذہن میں زیادہ راسخ ہو جانے والا ہے اور جسے اس نے ان مقامات پر جہاں اس کی ضرورت پڑتی ہے، اُقلیدس کے "مصادرہ" کے بجائے استعمال کیا ہے حسب ذیل ہے: "ایک دوسرے کو قطع کرنے والے دو خطوط مستقیم کے لئے ناممکن ہے کہ وہ ایک ہی خط مستقیم کے متوازی ہوں۔"]

اور یہ وہی چیز ہے جسے ابن الہیثم کے کوئی آٹھ سو سال بعد برطانوی ریاضی دان پلے فیر نے اپنا لیا۔ چنانچہ اس نے ۱۷۹۵ء میں "اصول اقلیدس" کا جو ایڈیشن شائع کیا۔ اُس کے دیباچہ میں لکھتا ہے:

"A new axiom is introduced in the room of the 12th for the purpose of demonstrating more easily some of the prope-rties of parallel lines."

[اقلیدس کے بارہویں علوم متعارفہ (خطوط متوازی کے مصادرہ) کے بجائے ایک نیا علوم متعارفہ داخل کیا جا رہا ہے، جس کا مقصد خطوط متوازی کے کچھ خواص کو زیادہ آسان طریقہ سے ثابت کرنا ہے]

اور یہ نیا علوم متعارفہ (Axiom) پلے فیر کے لفظوں میں حسب ذیل ہے:

"Two St. lines which intersect one another cannot be parallel to the same St. line."

[دو خطوط مستقیم جو ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں، ایک ہی خط مستقیم کے متوازی نہیں ہو سکتے]

علم و حکمت کی تاریخ میں علمی اور سائنسی قزاقی اور ڈاکہ زنی کی اس سے زیادہ شرمناک مثال شاید ہی مل سکے۔ ع چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد۔

اور پھر برطانوی ریاضی داں کیلے (Calay) نے اس سائنسی قزاقی پر مہر توثیق ثبت کر دی، چنانچہ موخرالذکر نے ۱۸۷۲ء میں سائنس دانوں کے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"My own view is that Euclid's Twelfth axiom in playfairs form of it does not need demonstration, but is part of our notion of space, of physical space of our experience, which is the representation lying at the bottom of all external experience."

یہ ہے "مغرب" کی انصاف پروری کہ مشرق کے گنجہائے زر و سیم تو در کنار، اس کے فرزندوں نے جن علمی اور سائنسی اکتشافات کیلیے خون جگر بہایا تھا، وہ بھی ان کی دستبرد سے نہ بچ سکے۔ والی اللہ المشتکی۔

ابن الہیثم کے بعد "خیام" (وفات ۵۲۳ھ/۱۱۲۹ء) کا زمانہ آتا ہے۔ اس نے اس خطوط متوازی کے مصادرہ کو اپنی کتاب "شرح ما اشکل من مصادرات اقلیدس" میں ثابت کیا ہے۔ اس کی تفصیل اگلی فصل میں آرہی ہے۔

محقق طوسی کو صرف انھیں تین فاضلوں (عباس بن سعید الجوہری، ابن الہیثم اور خیام) کے نام ملے مصادرہ کے سلسلے میں کوشش کی کہیں زیادہ ہے۔ یوں تو ہر فاضل جس نے "اصول اقلیدس" کی شرح لکھی (اور ان شارحین کی تعداد خاصی طویل ہے)، خطوط متوازی کے مصادرہ پر کچھ نہ کچھ گفتگو ضرور کی ہے (مثال کے طور پر احمد بن عمر الکرابیسی نے اپنی شرح اقلیدس میں، جس کا واحد مخطوطہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے) مگر ابن الندیم نے کچھ اور لوگوں کے تذکرہ میں اس موضوع پر ان کی تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ یہ ثابت بن قرہ اور یوحنا القس ہیں جن کی تصانیف تیرھویں صدی عیسوی تک موجود تھیں، کیونکہ علم الدین قیصر نے محقق طوسی کے "الرسالۃ الشافیہ" پر جو تبصرہ لکھ کر انھیں بھیجا تھا، اس میں ان تصانیف کا ذکر کیا ہے۔

اگلی تیرھویں صدی مسیحی میں جبکہ محقق طوسی نے "الرسالۃ الشافیہ" لکھا پہلے اثیرالدین البہری نے "خطوط متوازی کے مصادرہ" کو ثابت کیا۔ اس کی تفصیل قاضی زادہ رومی نے جو الغ بیگ کے استاد اور اُس کی رصدگاہ سمرقند کے پہلے متولی تھے، "شرح اشکال التاسیس" میں دی ہے۔ اثیرالدین البہری کے بعد محقق طوسی نے اس مصادرہ کو ثابت کرنے کی کوشش کی، چنانچہ انھوں نے "الرسالۃ الشافیہ" میں پچھلے ماہرین علم ہندسہ (الجوہری، ابن الهیثم اور خیام) کی کوششوں کے ذکر کے بعد اپنی کوشش کی تفصیل دی ہے کہ میں نے اسے سات شکلوں کی مدد سے ثابت کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

" واما الطریقۃ التی اتضحت لی بعد مطالعۃ کلام ھؤلاء الافاضل فھی ھذہ التی ترتیب فی سبعۃ اشکال"

[بہرحال وہ طریقہ جو سابق فاضلوں کے کلام کے مطالعہ کے بعد میرے خیال میں واضح ہوا ہے، وہ حسب ذیل ہے اور جسے میں نے سات شکلوں میں مرتب کیا ہے۔]

اس کے بعد انھوں نے ان اشکال ہفتگانہ کو ثابت کیا ہے، جس کا اعادہ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ صرف اتنا بتادینا ضروری ہے کہ محقق طوسی کی ان اشکال ہفتگانہ میں سے دوسری اور چوتھی شکل بعینہ وہی ہے جو خیام نے اپنے تجویز کردہ ثبوت میں دی ہیں۔ ان کی تفصیل آگے آئے گی۔

محقق طوسی نے انھیں اشکال ہفتگانہ کی مدد سے اپنی "تحریر اُصول اُقلیدس" میں اس مصادرہ کو ثابت کیا ہے۔ چنانچہ پہلے تو کتاب (تحریر اقلیدس) کے دیباچہ میں اس مصادرہ کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ "قضیہ" (مصادرہ) نہ تو علوم متعارفہ میں داخل ہے اور نہ علم ہندسہ کے علاوہ کسی اور علم میں اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔ یہ ایک قابل توضیح و ثبوت مسئلہ ہے جسے مبادی کے بجائے "مسائل فن" میں بیان کیا جانا چاہیئے۔ لہٰذا میں اسے مناسب موقعہ پر بیان کروں گا۔ پھر اٹھائیسویں شکل ثابت کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

" ھذا موضع بیان القضیۃ التی صادر بھا اقلیدس ووعدتہ بیانھا فی صدر الکتاب وقد بینتھا بسبعۃ اشکال۔"

[یہ اس قضیہ (مصادرہ) کی توضیح کے لیے (مناسب) مقام ہے، جو اُقلیدس نے بطور مبادی لکھے تھے۔ اور جس کی توضیح کا میں نے دیباچہ میں وعدہ کیا تھا۔ میں نے اس مصادرہ (خطوط متوازی کے مصادرہ) کو

مات شکلوں کی مدد سے ثابت کیا ہے۔]

یہ ہے ایک اجمالی جائزہ افاضل ریاضی دانان اسلام کی کوششوں کا جو انھوں نے خطوط متوازی کے مصادرہ کو ثابت کرنے کے سلسلے میں کی ہیں۔ اسی جائزے میں ایک ممتاز مقام خیام کا ہے، جس نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی تھی۔ اسی کا مختصر تعارف آئندہ فصل میں پیش کیا جارہا ہے۔

۳۔ مختصر تعارف شرح ما اشکل من مصادرات اُقلیدس: خیام کے احوال و آثار کا اہم قدیم ترین ماخذ نظامی عروضی سمرقندی کا "چہار مقالہ" ہے۔ اسی زمانہ میں بیہقی نے "تتمہ صوان الحکمۃ" لکھی، جس میں خیام کے تفصیلی حالات ملتے ہیں۔ مگر دونوں میں خیام کی کسی تصنیف کا ذکر نہیں ملتا۔ "الجبر و المقابلہ" کے علاوہ اُس کی اہم ترین ریاضیاتی تصنیف "شرح ما اشکل من مصادرات اُقلیدس" ہے جس کا تعارف اس مقالہ کا مقصد ہے۔ خیام کی اس کتاب کا قدیم ترین حوالہ خواجہ نصیر الدین محقق طوسی نے اپنے "الرسالۃ الشافیہ عن الشک فی الخطوط المتوازیہ" میں دیا ہے۔ نیز اس کا ایک طویل اقتباس لفظ بلفظ نقل کر دیا ہے۔ خوش قسمتی سے یہ اقتباس ہماری اس پیش کش پر مشتمل ہے۔ ویسے خیام کی "شرح ما اشکل من مصادرات اُقلیدس" ہنوز موجود ہے، مخطوطہ بھی اور مطبوعہ بھی۔ اس کا واحد مخطوطہ لیڈن (ہالینڈ) کے کتب خانہ مشرقی میں ہے، جس کی فہرست سے براکلمن نے اپنی کتاب "تاریخ علوم عرب" میں اس کا حوالہ نقل کیا ہے۔ براکلمن کے حوالے سے محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے "حواشی چہار مقالہ" میں اس کا ذکر کیا ہے۔ قزوینی ہی کے حوالے سے سید سلیمان ندوی نے اپنی مایہ ناز تصنیف "خیام" میں اسے خیام کی تصانیف میں بیان کیا ہے۔

اس صدی کے وسط میں "شرح ما اشکل من مصادرات اقلیدس" کو ایک فاضل نے لیڈن کے مخطوطہ نیز محقق طوسی کے "رسالہ شافیہ" میں مذکور اس کتاب کے متعلقہ اقتباس کی مدد سے اکٹھا کر کے شائع کیا۔ مطبوعہ کتاب کا غالباً ایک نسخہ ایرانی تاجر کتب خانم کے یہاں بھی آیا جسے ہم نے منگالیا تھا لیکن آج یہ نسخہ میری دسترس میں نہیں ہے۔

مگر غالباً کسی نے بھی مخطوطہ کے مطالعہ کی زحمت نہیں کی۔ اس عاجز نے بھی مطبوعہ نسخہ کا مطالعہ نہیں کیا، اس لئے میں نہیں بتا سکتا کہ کس فاضل نے اسے کب اور کہاں سے اکٹھا کیا اور اس کے اندر "خطوط متوازی کے مصادرہ" کے علاوہ جس کی تصدیق محقق طوسی کے "الرسالۃ الشافیہ" سے ہوتی ہے "اُصول اقلیدس" کے اور کس کس مصادرہ کے اشکالات کی شرح و توضیح کی گئی ہے۔

●●

ڈاکٹر محمد مجیب الرحمٰن
راجشاہی یونیورسٹی، بنگلہ دیش

بنگلہ دیش میں اسلام

ماضی بعید میں سرزمین بنگال پر جو شخصیت حکمرانی کرتی تھی اس کا نام تھا لچھمن سین۔ گھمسان کا رن اور سخت ترین مذبھیڑ بلکہ محض نعرۂ تکبیر کے ذریعہ جس شخص نے اس کا تختہ الٹ دیا تھا اس کا پورا نام تھا اختیار الدین بن بختیار خلجی۔ بنگال کے معروف شاعر عبداللہ الندوی نے کیا خوب کہا:

لما فتح البختیار بنغالة ... تزلزلت البلاد ومسّهٗ الرعب
هندٌ وسندٌ وملاد الشام والعرب ... الصين والافغان والیابان والغرب
فنحن من مسلم تلک البلاد لنا ... اوصافنا البطش والاقدام والغلب

یعنی (۱) بختیار خلجی نے جب فتح و ظفر مندی کا پرچم لہرایا تو پوری سرزمین تھر تھر کانپ اٹھی اور (لچھمن سین پر) رعب و داب یوں طاری ہو گیا (کہ وہ گھر کے پچھواڑے سے دُم دبا کر بھاگا) (۲) (صرف بنگال ہی نہیں بلکہ) سرزمین ہند و سندھ، مملکت عرب و شام، چین و افغانستان اور مغربی ممالک کے حصّے بھی ان کے قبضۂ قدرت میں آگئے تھے کیونکہ ان دنوں ان کے کرداروں کی خاصیت تھی آگے بڑھ کر غلبہ حاصل کرنا (نہ کہ پیچھے ہٹ کر شکست کھانا)۔

بنگال کی سرزمین، اس کی گلی کوچے اور چپے چپے میں عام طور پر بنگلہ زبان رائج تھی مگر صد افسوس کہ یہ صرف مسلمان اور ہندوؤں کے نچلے طبقوں کی زبان تھی۔ ہندوؤں کے اونچے طبقے کے گھرانوں میں سنسکرت زبان بولی جاتی تھی اور وہ بنگلہ کو پرندوں و چرندوں کی زبان سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ مزید برآں وہ یہ بھی کہتے تھے کہ انسان ہو کر جو بنگلہ زبان بولتے ہوں گے وہ اس دوزخ کے ایندھن بنیں گے جسے اور ہنگ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سنسکرت زبان کا یہ شعر مشہور و معروف ہے:

پستودس پردنی ... روبنگ دوزخنگ ...

عین اسی دوران بنگال کا باا ثر حکمران حسین شاہ نے ببانگ دہل یہ اعلان کر دیا کہ عوام کی زبان ہی دراصل حقیقی

بان ہے۔ چنانچہ یہی زبان ہر جگہ بولی جائے اور ہر سمت و چپے چپے میں اسے رواج دیا جائے۔ اسی شاہی فرمان کے اجرا
یہ لازمی نتیجہ تھا کہ اسی زمانہ میں بنگلہ زبان کا عظیم شاعر علاول، سید سلطان، عبدالحکیم، شاہ غریب اللہ وغیرہ نے بنگلہ شاعری کی زبان
ں ایسی ایسی انمول و عظیم تصنیفات شائع فرمائیں کہ ان شاہکاروں کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔

ماضی بعید کے انھیں ادبا و مصنفین کے عظیم شاہکاروں کی سلیس زبان کا جہاں تک تعلق ہے تو اس میں بنگلہ کی بہ نسبت
ردو، عربی، فارسی کی بھر مار ہوا کرتی تھی۔

انھیں بنگالی ادبا و شعراء کے نقش قدم پر گامزن ہو کر آنے والی نسل نے بھی اپنے اسلاف کی روایات کو برقرار
رکھتے ہوئے قرآن و حدیث کی روشنی میں کافی کتابیں لکھ ڈالیں اور اس قدر زیادہ لکھ ڈالیں کہ مسلمان تو مسلمان
ہندوؤں نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر دلچسپیاں لینا شروع کر دیں۔ گریس چندر سین، کرن گوپال سنہا، امیرالدین باسونیا وغیرہ
کا نام نامی اسم گرامی اس سلسلہ میں خاص طور پر قابل ذکر بلکہ سر فہرست ہے۔ اس سلسلہ میں چاٹگام کے مولانا ذوالفقار صاحب
رحوم کا ذکر بھی لازمی و حتمی ہے جنھوں نے بنگلہ زبان کو عربی حروف میں تحریر کرتے ہوئے قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔

ادھر مسلمان مصنفین نے قرآن و حدیث اور دیگر دینی کتابوں کو بنگلہ کا جامہ پہنانے میں کچھ گریز کی راہیں اختیار کیں۔
لیونکہ اس زمانہ میں کورٹ و عدالت کی زبان فارسی تھی اور اس زبان میں قرآن و حدیث کے ترجمے کی بہتات
بھی تھی اور فراوانی بھی۔ اور تقریباً مسلم قوم کے ہر فرد و بشر کو فارسی و اردو زبان سے کچھ نہ کچھ شد بد اور واقفیت
ہوا کرتی تھی، بلکہ شریف گھرانوں میں تو اردو ہی عام طور پر بولی جاتی تھی۔ مثال کے طور پر اس ضمن میں شیر بنگلہ فضل الحق،
خواجہ ناظم الدین، نواب عبدالغنی، نواب سلیم اللہ وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ بنگلہ زبان
ں ترجمہ کی چنداں ضرورت نہیں۔

کرشمۂ قدرت و گردش ہائے زمانہ کو دیکھیے کہ یہ وہی بنگلہ زبان ہے جسے مسلمانوں نے فروغ دیا پروان چڑھایا
ور بڑھتی ہوئی روز افزوں ترقیوں کے زینے پر اسے گامزن کیا اور اپنے خون جگر سے اس کی آبیاری بھی کی رفتہ
رفتہ وہ خود ہی پیچھے ہٹتے گئے حتیٰ کہ وہ پسپائی کے آخری سرے اور انتہائی مرحلے کو پہنچ گئے۔ اس کے برعکس ہندوؤں
نے بنگلہ زبان سے نفرت و ناک بھوں چڑھانے کے بجائے اب اس کی پوری آؤ بھگت کرنا شروع کر دی بلکہ اس کی
ڈور بھی اپنے ہاتھوں میں سنبھال لی اور اسے یوں اپنایا کہ اپنے گھر کی لونڈی سمجھنے لگ گئے۔

کسی قوم کا عروج و زوال اس کی تہذیب و تمدن کی بلندی کا انحصار زیادہ تر اس کی زبان پر ہوا کرتا ہے۔ یہ کرشمۂ قدرت
ہی تو ہے کہ قومی تمدن و تہذیب اسی طرح ایک قوم سے منتقل ہو کر دوسری قوم تک جا پہنچتی ہے۔ جس طرح کہ ماضی بعید

سلمانوں کی تہذیب، تمدن بلکہ ان کے علمی کارنامے، میراث و ایجادات کو پوری طرح یورپ والوں نے اپنا کر دن دو نی
اچوگنی ترقیوں کے زینے پر جا پہنچے۔ اب ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ بنگلہ زبان کی باگ ڈور جب مسلمانوں کے ہاتھوں رہی تو
بے حد الفاظ اردو عربی و فارسی لیے۔ اب جوں ہی ہندوؤں نے اسے اپنایا تو اس میں وہ سنسکرت کو گھسیڑنے
لگے حتیٰ کہ مسلمان بھی اس کی پیروی کیے بغیر نہیں رہ سکے۔

۱۹۴۷ء میں اس برصغیر کے بٹ جانے کے بعد بنگال کی پوری سرزمین دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ مشرقی اور
ربی بنگال۔ مشرقی بنگال کی زبان میں جس طرح اردو، عربی و فارسی کی بہتات و فراوانی شروع ہوئی عین اسی طرح مغربی
ال میں ہندی و سنسکرت کے عناصر یوں غالب ہے کہ گویا اس کی ہر شاخ اور گوشے گوشے میں ہندی و سنسکرت
بھرمار شروع ہو گئی۔ لیکن جب آزاد بنگلہ دیش وجود میں آیا تو پھر مشرقی و مغربی بنگال آپس میں گھل مل گئے۔ پھر
ں جوں وقت گذرتا گیا اس سرزمین میں نئی نئی تحریکیں و انقلابات سر اٹھاتے رہے ان میں سے قدیم ترین تحریک تو بنگال
کے عظیم مرد مجاہد حاجی شریعت اللہ اور ان کے فرزند ارجمند دودو میاں کی فرائضی تحریک تھی۔

اس تحریک کے بانی مبانی حاجی شریعت اللہ نے ۱۷۸۰ء میں فریدپور کے ایک شریف گھرانے میں آنکھیں
کھولیں اور تعلیم ہگلی میں پائی۔ ۱۷۹۸ء میں جبکہ وہ ۱۸ سالہ جوان تھے حج کو جا کر وہاں کے بزرگوار عالم و شہرہ آفاق استاذ
شیخ طاہر المکی کے روبرو زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اسی دوران تقریباً ۲۰ سال تک حج کے موقع پر بنگال سے گئے ہوئے حاجیوں
کو مذہبی و سماجی اصلاح پر بہت زور دیا۔ پھر انمول کتابوں سمیت وطن مالوف واپس لوٹنے لگے تو اثنائے طریق میں
ڈاکوؤں کے ہاتھوں سب کچھ لٹ گیا۔ اب حاجی صاحب نے فقیر کا فقیر بن کر تہ دست گھر لوٹنا بے سود سمجھ کر
ڈاکوؤں کی صحبت و معیت اختیار کر لی۔ بعد ازاں قلیل سی مدت بھی نہیں گذرنے پائی کہ آپ کے انتہائی زہد و تقویٰ سے
غیر متوقع طور پر متاثر ہو کر لٹیروں کی پوری جماعت ایک پارسا و خدا ترس ٹولی میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔

آپ پہلے انسان تھے جنھوں نے بنگالی مسلمانوں کو انگریزی سامراج میں فرائضی تحریک چلا کر اپنے پیروں پر کھڑے
ہونے کا موقع دیا۔ پورے معاشرے کے ماحول میں پائے جانے والے رسوم بد اور شرک و بدعات کی قلع قمع کیلیے
مہم شروع کی۔ ساتھ ہی ساتھ سماج کے پس ماندہ لوگوں کی معاشی زبوں حالی کو سدھارنے کی بھی کوشش کی۔ آپ کا
واحد مقصد تمام فرائضیوں کی اصلاح اور خالص اسلامی تعلیم و تہذیب پر عمل پیرا و کاربند ہونا تھا۔ توہم پرستی اور غلط
رسم و رواج کو بیخ و بن سے اکھاڑنا بھی اس تحریک کا فرض اولین تھا۔ حاجی صاحب نے اس تحریک کے لیے چند

اصول وضوابط بھی مرتب کیے۔

آپ نے کسان مزدور جیسے ادنیٰ طبقے اور پسماندہ مسلمانوں کے درمیان رہ کر ان میں اصلاحی کام شروع کیا اور انھیں اسلامی طرز معاشرت کی دعوت دی۔ غریب کاشتکار آپ کی بے لوث دعوت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ آپ کی تعمیل ارشاد کو اپنے لیے وہ باعث صد افتخار سمجھتے تھے فرائضیوں میں آپس کی مواخات، بھائی چارہ اور اتفاق و اتحاد کو دیکھ کر انگریز اور ہندو زمیندار طبقے میں کھلبلی سی مچ گئی۔ چنانچہ ابتدا ہی میں انھوں نے اس تحریک کا گلا گھونٹنا چاہا۔ ۱۸۳۱ء میں فرائضیوں کو ان دونوں سے نبرد آزمائی بھی کرنی پڑی۔

تاہم اس تحریک کا غلغلہ اتنا زیادہ ہوا کہ بنگالی مسلمانوں کی آبادی کا چھٹا حصہ آپ کے پرچم تلے جمع ہوگیا اس طرح سید احمد شہید کے لیے بھی بنگال میں راستہ کھل گیا۔ حاجی صاحب نے ہندو زمینداروں کے ہاتھوں ستائے ہوئے لوگوں کی ایک زبردست ٹیم تیار کرلی تھی۔ آپ کا واحد مقصد غریب مسلمانوں کو ہندو مہاجنوں اور زمینداروں کے پنجۂ استبداد سے نجات دلانا تھا۔ اس جماعت کو یحییٰ علی صادق پوری نے اپنی جماعتِ مجاہدین میں مدغم کرلیا۔ یہ سب کے سب جذبۂ جہاد سے سرشار ہوکر سرحد پار کی گھاٹیوں میں گھات لگا کر بیٹھے ہوتے تھے۔ سردھڑ کی بازی لگانے میں انھیں کوئی ہچکچاہٹ نہیں تھی۔

ادھر ہندو زمینداروں نے حاجی صاحب اور ان کے متبعین و رفقائے کار کے خلاف کئی قسم کے جھوٹے مقدمات دائر کردیے جو ۱۸۳۱ء میں ڈھاکہ مجسٹریٹ کورٹ میں چلتے رہے لیکن گواہوں کے نہ ملنے پر بالآخر وہ خارج کردیے گئے۔

فرائضی تحریک دراصل محمد بن عبدالوہاب نجدی کی "محمدی تحریک" اور سید احمد شہید کی "تحریک المجاہدین" کا ایک حصہ تھی۔ انیسویں صدی کے اوائل میں بنگالی مسلمان کے بدترین حالات کو سدھارنے کی غرض سے یہ تحریک وجود میں آئی۔ اسی زبوں حالی پر روشنی ڈالتے ہوئے سر ولیم ہنٹر اپنی کتاب "OUR INDIAN MUSALMAN" میں یوں رقمطراز ہیں "لگ بھگ پونے دو سو سال قبل ایک بنگالی مسلمان کا قلاّش ہونا ہی ایک ناممکن سی بات تھی مگر ان دنوں اپنے آپ کو خوش حال رکھنا ہی ناممکن ہے۔"

فرائضی حضرات اپنی اصلاح کے ساتھ معاشرتی اور معاشی الجھنوں سے بھی مسلمانوں کو نجات دلانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تحریک کو AGRARIAN MOVEMENT سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اگرچہ فرائضی تحریک قدیم ترین ہے تاہم بعد میں چلکر یہ "تحریک المجاہدین" میں جذب ہوکر رہ گئی۔ ڈاکٹر ایس بی چودھری اس تحریک کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے "وہابی فرائضی حضرات سماجی و اقتصادی اعتبار سے مجبور کاشتکاروں کے طرفدار تھے جن کو وہ اونچے

ہندوؤں کے مظالم سے بچانا چاہتے تھے۔"

حاجی شریعت اللہ نے برطانوی بنگال میں چاروں طرف سے مخالفت کے باوجود اصلاحی و تعمیری کام برابر جاری رکھا۔ عوام الناس اور غریبوں پر آپ کا اثر و رسوخ بہت زیادہ تھا۔ کیونکہ پسماندہ کسانوں اور عوام غریبوں کو متحد کرتے ہوئے انھیں خوابِ غفلت سے بیدار کیا اور احساس و شعور کے مادے کو کوٹ کوٹ کر ان کے دلوں میں سمو دیا اور جائز مطالبات کو مانگنے کی ہمت پیدا کر دی۔

چونکہ عوام الناس پر آپ کا اثر و رسوخ بہت زیادہ تھا اس لیے آپ کے اصلاحی پروگراموں میں بڑی کامرانی ہوئی۔ آپ کے ہمعصر مورخ ڈاکٹر جیمس وائز نے بھی اپنی کتاب "MOHAMMADANS OF EASTERN BENGAL" میں اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے یوں لکھا ہے:

"آپ ہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے مشرکانہ رسم و رواج اور توہم پرستی کے خلاف برملا مہم شروع کی۔ چونکہ آپ راست باز و رحمدل انسان تھے اس لیے آپ کے کریمانہ اخلاق اور نیک سلوک کا اثر غریب کسانوں پر بہت زیادہ پڑا۔ علاوہ ازیں آپ کی بے لوث اور مثالی زندگی نے فلاکت زدہ ہموطنوں پر جادو کا سا اثر پیدا کر دیا۔ کیوں کہ آپ کی حیثیت ایک شفیق باپ جیسی تھی جو کڑے وقت پر ہمیشہ کام آئے۔"

آپ کی ہمہ گیر مقبولیت، ہر دل عزیزی اور فرائضی تحریک کی وسعت و پھیلاؤ کو دیکھ کر ایک دوسرے ہمعصر مورخ جیمس ٹیلر نے بھی "TOPOGRAPHY AND STATISTICS OF DACCA" میں بھی یوں تسلیم کیا ہے:

"گذشتہ دس سال میں ملکِ بنگال کا ایک مسلم طبقہ ابھرا اور غیر معمولی طور پر پورے بنگال کے طول و عرض میں بڑی تیزی سے چھا گیا۔ اس تحریک کے بانی مبانی ہیں حاجی شریعت اللہ جو فرید پور ضلع کے "شمائل" گاؤں کے باشندہ ہیں۔"

۵۹ کی عمر میں ۱۸۴۰ء بماہ جنوری شمائل میں ہی آپ کی آخری خوابگاہ بنی۔ پھر آپ کا سچا جانشین اور لائق و فائق فرزند محسن الدین احمد معروف بہ دودو میاں نے اپنی قیادت میں اس تحریک کو اور بھی منظم مستحکم اور نمایاں کر دیا۔ سیاسیات میں ان کا حصہ نمایاں رہا۔ ان کے پوتے پیر بادشاہ میاں نے "خلافت تحریک" اور "عدم تعاون تحریک" کے وقت فرائضی تحریک کو فعال و متحرک رکھ کر انگریزی سامراج کے خلاف ایک مستحکم قوت بنا ڈالی تھی۔ غرضیکہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ حاجی شریعت اللہ کا نامِ نامی و اسمِ گرامی برصغیر کی تحریکِ آزادی میں ایک روشن ستارہ کی طرح چمکتا رہے گا۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ بعد میں آنے والی تحریک مجاہدین کے بہت سے بنیادی اجزا تحریک فرائضی میں موجود تھے۔

اس کی تبلیغ واشاعت نے بنگال میں اپنی راہ ہموار کر دی۔ نیز یہ واقعہ بھی قابل غور اور معنی خیز ہے کہ باداسٹیٹ کے خروج اور بنگال میں عنایت علی صادق پوری کے پہلے تبلیغی دورے کا زمانہ ایک ہی ہے۔ ان تحریکوں کا انقلابی پہلو بڑا نمایاں ہے۔ ساری تحریکیں دراصل وجود میں آئی تھیں ہندوستان کو حکومت برطانیہ کی غلامی کی بیڑیوں سے نجات دلانے کے لیے۔ "سرگذشت مجاہدین" "کالاپانی" "تذکرۂ علمائے صادقپور" وغیرہ کتابوں میں ان تحریکوں پر اچھی خاصی روشنی ڈالی گئی ہے۔ بنگلہ زبان میں بھی اس موضوع پر کافی سے زائد کتابیں قلمبند کی گئی ہیں۔ حتیٰ کہ اس موضوع کو سامنے رکھ کر ناول نگاری بھی وجود میں آئی۔ زبان کی سلاست، روانی اور ادبی پہلو کا یہ عالم ہے کہ قارئین پر عموماً محویت طاری ہو جایا کرتی ہے۔

بنگلہ دیش کی سرزمین میں یوں تو سیاسی جتھے اور فرقوں کی کوئی کمی نہیں بلکہ بہتات اور فراوانی ہے۔ فی الجملہ ان پارٹیوں کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو اسلام کے حامی و شیدائی۔ دوسرے اسلام سے بیری عداوت و بغاوت کے علمبردار۔ اوّل الذکر کے گروپ میں سے جماعت اسلامی، جماعت تبلیغ، نظام اسلام پارٹی، مسلم لیگ وغیرہ کے نام سر فہرست ہے۔ مؤخر الذکر میں عوامی لیگ، بی این پی، بکسال وغیرہ کے علاوہ خدا جانے اور بھی کتنی پارٹیاں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دھڑے بندی، تفرقہ بازی اور پُر آشوب دور میں اسلام کا نام لیوا اگر کوئی ہے نیز اسلام اگر زندہ ہے تو اوّل الذکر پارٹیاں اور ان کے حامی و قائدین کے دم قدم سے ہے۔

●●

ایک علمی استفسار

اس وقیع مجلہ کی وساطت سے محققین و ماہرین لسانیات سے استفسار کیا جاتا ہے کہ ہندستان میں تصنیف ہونے والی قدیم ترین نثری اردو فارسی لغت (فرہنگ) کون سی ہے؟ (منظوم نصاب ناموں کے بارے میں سوال نہیں ہے)۔ مجھے حال ہی میں ایک فرہنگ موسوم بہ کمال عترت مولفہ محمدی بن میر عبداللہ شاہ نعمت اللہی متخلص بہ عترت کا مخطوطہ دستیاب ہوا ہے۔ یہ ۸۹-۱۱۹۰ھ میں تالیف ہوئی ہے اور نواب آصف الدولہ (۱۱۸۸ھ/۱۲۱۲ھ) کے نام معنون ہے۔

۱: مصنف کے حالات (بعلاوہ "روز روشن") کہاں سے دستیاب ہیں؟

۲: کیا اس فرہنگ کے دیگر مخطوطات بھی دستیاب ہیں؟ جواب ارسال فرما کر یا اسی مجلہ میں چھپوا کر ممنون فرمائیں۔

عارف نوشاہی
۶۹ - ماڈل ٹاؤن، ہمک
اسلام آباد، پاکستان

جناب ضیاءالدین ڈیسائی

۱۲ : خورشید پارک
سرکھیج روڈ، احمد آباد ۔ ۳۸۰۰۵۵

کچھ سکّوں کے بارے میں

جو چیز ایک عرصہ دراز سے لکھنا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ میں جرنل کے مندرجات کی نوعیت اور ان کے انتخاب اور فراہمی میں جو IMAGINATION اور محنت کارفرما ہیں ان کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا، میں عموماً رسماً اس قسم کے تعریفی جملے نہیں لکھتا کہ ایک تو کچھ آپ حضرات کی صحبت یا دیکھا دیکھی کہیے، کچھ دشوار پسند طبیعت پائی ہے اور اپنا مسلک صائب کے اس شعر کو بنایا ہے کہ :

صائب دو چیز میشکند قدر شعر را   تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس

اس لیے بھی میرا فرض ہو جاتا ہے کہ طبعی میلان کے خلاف بھی دو ایک جملے آپ کے جرنل کی خوبی اور اس کے پیچھے سب جانتے ہیں جن کی محنت اور جن کا DYNAMISM ہے، اس کے بارے میں لکھے جائیں، بہرحال یہ جرنل اپنی نوعیت کا منفرد رسالہ بلکہ مجلہ ہے جیسا کہ اپنی نوعیت کا تحریر تھا، اس کے مضامین کے تنوع کے ساتھ THEMATIC ہونا بہت ہی بڑی بات ہے، بلکہ اکثر و بیشتر مضامین تو ARCHIVES میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

البتہ شمارہ نمبر ۵۳ میں "سکّوں" پر جو مضمون ہے اس کو پڑھ کر یہ خیال ہوا کہ آپ اس کو اور اس قسم کے دیگر مضامین کو کسی ماہر سکوکات کو بھیج دیتے تاکہ وہ اپنی رائے دے جس کی روشنی میں اگر ضروری ہو تو مضمون میں اصلاح یا اضافہ کیا جائے، مجھے مضمون نگار موصوف کی "جہاں پناہ" لفظ کی تعبیر کچھ محل نظر معلوم ہوئی۔ لیکن سردست چونکہ وقت نہیں ہے۔ کچھ عرض نہیں کر سکتا، ہاں یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ موصوف نے بڑی محنت سے یہ مضمون لکھا ہے اور بہت ہی اچھا مضمون ہے۔

●●

ڈاکٹر کلیم سہسرامی

ڈاکٹر افتخار مدنی۔ اور ڈاکٹر اقبال حسین کے بارے میں

آپ سے وعدہ تھا اور اس کا پاس بھی، اس لیے ڈھاکے دوبارہ سفر کرنا پڑا، آپ کو خوشی ہوگی کہ آخر میں "تاریخ شجاعی" لے آیا۔ اس میں آپ کے نسخے کے علاوہ لندن کے دو نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہے، اور پوری کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔ مع ترجمہ تقریباً ۶۵۰ صفحے کی ضخیم مجلد کتاب ہے آپ کے ہائی کمیشن کے ذریعہ بھیجدی جائے یا پھر کسی سیمینار کا بہانہ ہو تو میں خود لے کر بہ نفس نفیس آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں۔ میری یونیورسٹی ۸ اپریل سے ۱۲ مئی تک بند رہے گی۔ لیکن ڈھاکے کے سفر میں ایک اہم چیز کھو دی یعنی "خدا بخش جرنل" کا نمبر ۵، پروفیسر عسکری صاحب کا مضمون بہار پر پڑھا جا رہا تھا۔ اسے قیمتاً یا تحفتاً جس طرح بھی آپ مناسب سمجھیں بھیجدیجیے تاکہ میری فائل مکمل ہو جائے اور علم بھی۔

مقالے کی تکمیل کی داستان اور مقالہ نگار کا شناسنامہ اشاعت کتاب کے وقت بھیجدوں گا۔

اب ملاحظہ کیجیے چند معروضات خدا بخش جرنل نمبر ۵۱۔۵۲ کے سلسلے میں: (الف) مقالہ جس زبان میں ہو اسی زبان میں مقالہ نگار کا نام اور عہدہ بھی مذکور ہو تو بہتر ہے۔ "میر الٰہی ہمدانی" کے مقالہ نگار کے نام اور عہدے میں یہ مناسبت بہتر ہوتی۔ (ب) "خدا بخش فہرست مخطوطات فارسی کے مسامحات" کے عنوان کے تحت ڈاکٹر افتخار احمد مدنی صاحب مقالہ (ص ۵۸۲۔ ص ۵۹۸) خود ہی مسامحات کتابت سے بھرا ہوا ہے۔

اس میں کم از کم ۲۸ بار سن کتابت کے بجائے سال کتابت درج ہوا ہے۔ آپ کے جرنل کی ہر سطر سے تحقیق کا مظاہرہ اور صحت کا مشاہدہ ہونا چاہیے۔

پروفیسر سید اقبال حسین صاحب کی خود نوشت اپنے عہد کی سماجی، سیاسی، تاریخی اور تعلیمی دستاویز ہے، اس پیری میں حافظہ اتنا قوی کہ رشک آتا ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم سہسرام میں ہوئی، اس لیے اب ان کی خدمت میں حاضری کا شوق ہے۔

مخلص: کلیم سہسرامی

جناب تحسین فراقی
استاد شعبۂ اردو
یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

نواب شروانی اور مثنوی

شمارہ ۵۰۔۵۱ میرے پیشِ نظر ہے۔ میری ذاتی ترجیحات میں چونکہ مثنوی کو اولیت حاصل ہے اس لیے فطری طور پر نظر سب سے پہلے نواب رحمت اللہ خاں شروانی کے مقالے "مثنوی مولانا روم۔ منتخب و زبان زد اشعار صحیح قرأت کے ساتھ" پر پڑی۔ مضمون اہم ہے اور میں نے اس سے استفادہ کیا۔ اس مضمون میں ایک مقام پر وہ لکھتے ہیں: "افسوس کہ علامہ اقبال کی رسائی نکلسن کے مرتبہ نسخہ مثنوی شریف تک نہ ہو سکی۔ اس نسخہ نے ان غلطیوں کو بھی بے نقاب کر دیا ہے جو علامہ سے مثنوی شریف کے اشعار نقل کرنے میں ہوئیں۔" ص۴۹

معلوم نہیں صاحبِ مضمون کا اس ارشاد کا کہ علامہ اقبال کی رسائی نسخہ نکلسن تک نہ ہو سکی، ماخذ کیا ہے ورنہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ آپ کو علم ہو گا کہ اقبال میوزیم میں موجود علامہ مرحوم کے مسودات و کتب حتیٰ کہ اشیائے متعلقہ کی تفصیل تک بھی کتابی صورت میں Relics Allama Iqbal Catalogue کے نام سے شائع ہو گئی ہے اس میں کتب مملوکہ اقبال کے ذیل میں مثنوی کے نسخہ نکلسن کی تمام جلدوں کا اندراج ہے ملاحظہ ہو ص۳۳ ظاہر بات ہے کہ علامہ کے ذاتی کتب خانے میں مثنوی معنوی کے نسخہ نکلسن کی موجودگی سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ علامہ کے زیرِ مطالعہ بھی رہی ہو گی کیونکہ علامہ کے مطالعے سے ایسی اہم کتاب چوک نہیں سکتی

رہا مثنوی کے بعض اشعار کا علامہ کے ہاں "متغیر" یا "محرّف" متن کا مسئلہ تو اس کے تین اسباب ہو سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ علامہ نے جس زمانے میں مثنوی کا مطالعہ شروع کیا اس وقت نولکشوری ایڈیشن ہی دستیاب تھا اس لیے اشعار کی وہی صورت حافظے میں نقش ہو گئی جو متذکرہ نسخے میں موجود تھی۔ دوم یہ کہ اوائل عمر میں مثنوی کے اشعار اپنے بزرگوں مثلاً مولوی میر حسن یا اپنے والد مکرم سے جس طرح سنے اسی طرح حافظے کا حصہ بن گئے۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ بعض اوقات زبانی روایت میں نقلِ متن میں لاشعوری طور پر تحریف ہو جایا کرتی ہے۔ تیسری اور اہم تر صورت یہ ہو سکتی ہے کہ علامہ چونکہ ایک غیر معمولی تخلیقی ذہن رکھتے تھے اس لیے غیر شعوری طور پر ان کے یہاں بعض شعر اپنی مسلمہ صورت سے کسی قدر منقلب ہو گئے ہوں۔ یہ بات تو عام مشاہدے میں آئی ہے کہ موزوں طبع افراد بعض اوقات بعض اشعار کو اصل متنی صورت سے کسی قدر متغیر پیرہن عطا کر دیتے ہیں۔ ایسا متغیر پیرہن جو بعض اوقات اصل پیرہن سے الگ مگر جاذب تر ہوتا ہے بہر حال یہ مسئلہ گہری نفسیاتی تفتیش کا متقاضی ہے۔

●●

Recent Publications of
Khuda Bakhsh Library

1. Collected Works of Prof.S.H.Askari (1979-85) p. 104, 1985 — Rs. 10.00

2. Amir Khusrau: As a Historian (Second Volume of Prof.S.H.Askari's collected works). — Rs. 25.00

3. Islam & Muslims in Medieval Bihar (Third Volume of Prof.S.H.Askari's collected works) p. 135, 1989. — Rs. 25.00

4. Medieval Bihar - Sultanate and Mughal Period (Fourth Volume of Prof.S.H.Askari's Collected works) p. 208, 1990. — Rs. 25.00

5. An Overview of Sufi Literature in the Sultanate Period (1206-1526 A.D.) p.76, 1977 by Dr.Bruce Lawrence. — Rs. 10.00

6. Maktub and Malfuz Literature as a source of Socio-Political History by Prof. S.H.Askari, p. 64, 1981. — Rs. 10.00

7. Reflections on the Completion of the 1400 years of the Hijri Calender: The Hindu Muslim Syndrome; Islam & the Modern World (Problems & Prospects); by Badr-ud-Din Tayabji, p.54,1981. — Rs. 10.00

8. Islamic Studies by Dr. Md.Zubayr Siddiqi 1986. — Rs. 10.00

9. Muslim Thought in a changing world: Islam & Modern Challenges; Islam: Problems and prospects by Prof. S.Vahiduddin, p.41, 1982. — Rs. 10.00

10. The Middle East: (Middle Eastern Studies, North Africa; the Middle East) by Prof. Asaf Ali Asghar Fyzee, p. 66, 1986. — Rs. 10.00

11. Interfaith Dialogue: As Historical Challenge & As Religious Experience, by Dr. A. Roset Crollius S.J., p. 14, 1985. — Rs. 10.00

12. Islam and Indian Culture (The confluence of Islam & Hinduism, Distortion of Medieval Indian History & the Legacy of Islam: A panorama of Composite Culture) by Mr.B.N.Pande p. 80, 1987. — Rs. 15.00

******

It is rather demonstratively interesting that this type of work was put under the term Farhang, that initially indicate: educativeness, intellectuality, scientific, culture, scholasticism. This old term is used, as is well known, not only for dictionaries of new Persian language. By this very word, in the form of Farhang, are named such lexicographic compositions, as Avesta-medieval-Persian glossories 'Farhang-e-Oim (69) and medieval Persian dictionary of idioms, 'Farhang-e-Pehlavi. (70)

Early Persian dictionaries are not only a type of reading material for poetic texts, but also a type of text books of literary mastery. They have been also a type of reference books: dictionaries of onomastics (dictionary of nouns), encyclopaedic literature.

Earlier dictionaries undoubtedly played a significant role in the foundation and development of the literary language. They strengthened proper terminology and orthography, fixed the new metaphorical usage of words in literature and by this very act helped the perfection of polysemantic and phraseological possibilities of the Persian language.

The dictionaries were a type of text book of culture during the medieval period. Lexicography was included as one of the diciplines in the complex of sciences, expressed by the term 'Ulum-e-Adabi', that was an absolute necessity for any cultured person, including poets.

The dictionary Zufangoya wa Jahanpoya, like it predecessor Persian dictionaries, also complexly combines in itself different aspects of a text book of medieval cultured training, though undoubtedly, significantly large amount of attention is given to linguistic aspect of the Lexicography.

All this gives us the ground to state that Zufangoya wa Jahanpoya constituted in its time a new stage in the development of the dictionary tradition, completing in a definite manner the initial period of Persian Lexicography.

Phototype publication of the text of the dictionary is supplimented by listing of the words in the dictionary, introduction of the author of the dictionary, decipherment of the text of the two Bakhsh that are specially highlighted because it represents a new trend in the early Persian Lexicography: Bakhsh-III Persian infinitives, and Bakhsh-VII Turkish words. Text of the Bakhsh-VI, Rumi words (Facsimile, text decepherment, translation) has been published separately. (71)

We have published the introduction of the author to the dictionary Zufangoya "On a few Persian words that have different meanings".

Besides, we have given the list of words according to the Indian manuscripts from Bakhsh-I, that fill the lacuna in the Tashkent manuscript.

---

in earlier dictionaries the dialectical Lexicon. In the text of the dictionary is mentioned the dialects of Bukhara, Shiraz, Nishapur, Farghana, Maveran-Nehar, Jilan, Azarbaijan. Sometimes the author cites these words from dialects as example of words (vocables), though in bulk of the cases these are mentioned in the text as equivalents. Here are some examples:

f.10b نغ: دست دهقوق دبت تراشیده ود (در) فردوسی راست ابیت انگین نغ گویند و بزبان فرغانه صنم و بت باشد

f.11b زخشه: نانبانی (است) آن که از تشاشته بجهت لوزینه برسنگ می پزند و آنرا بزبان ماوراء النهر تطالفت گویند

f.14b ساک: بلغت ماوراالنهر (...) مقرمی دمردم چشم

f.49b ؟: جوش بزرنگ دبزبان بخارا مردی باتیو

f.12b گیا: بزبان شیرازیان عصیب را گویند

f.19a گلو: بزرگ بزبان شیرازیان

f.17b گیا: دهقان و خوط را گویند و بزبان دیلمیان پهلوان (باشد)

Lexicography constituted one of the important areas of rich Persian culture of the medieval period. Earlier Persian Lexicographical Traditional Culture, that has come to us, as monuments of the beginning of 11th century, has its roots still earlier in time.

Dictionaries played an important role in the cultural life of the Persian speaking people. Significant part of the Lexicographical compositions, composed in century after century, by itself indicates wide demand and circulation of this type of scientific literature. Science of today has evidence that medieval Persian dictionaries were more than two hundred in numbers. Thus annotated chronological list of Persian dictionaries, those that have come to us as well as those that are known to us only through their references, that has been compiled by academician K.G.Zalemann in 1887, counted more than 160 names. List of dictionaries that have been published by Saeed Nafasi in 1951 contains more than 202 names; by this time this number may have increased further.

By itself the fact that to us have come relatively large number of manuscripts of Persian dictionaries speaks of big demand for this type of manuscript books and their wide circulation. In big manuscript collections of the world we normally can see whole collection of Persian dictionaries.

Comparative study of Persian dictionaries of 11th-14th centuries (Lughat-e-Furs, Farhang-e-Fakhr-e-Qavvas, Sihah-al-Furs, Maiar-e-Jamali, Dastur-al-Afazil) permits us to discern a few general and common features, Characterising the early stage of the Persian Lexicography. Early Farhangs, that are normally qualified as dictionaries, in reality represent a type of scientific literature, that complexly combine with different aspects: linguistics, literature studies, encyclopaedism.

alphabet 'ta' (Turki), in front of Persian dictionaries, sometimes but not always, separated Arabic and Turkish words, and put them in a separate section at the end of the section or chapter, as may be seen in the example of above mentioned Farhang-e-Ibrahimi and Muaied al-Fuzala.

The data available to us at the moment permits us to conclude that Zufangoya wa Jahanpoya was first in history of Persian Lexicography that deviated from the established tradition of using the last alphabet for classification and took to the first alphabet of the word for the same purpose. In the time to come this structural principle was used as more easy to use and was widely used in compilation of dictionaries. Such well known and big medieval dictionaries as Farhang-e-Ibrahimi, Tuhfat-as-Saadat, Muaied al-Fuzala, Tuhfat al-Ahbab, Madar al-Afazil, Majma al-Furs and others are structure on the basis of the first alphabet.

Wide coverage of words according to languages, marking out of words of foreign languages Arabic, Turkish, Rumi and their placement into separate dictionaries for convenience of utilisation and placement of words according to the first alphabet, inclusion of literal words as well as words used in conversational language all this Jahanpoya us to say that the author of the dictionary Zufangoya wa Jahanpoya fundamentally differs from earlier basic need, i.e. usage of dicitionary as a help to the study of poetry, an object that was put before themselves by the earlier authors of Persian dictionaries, who primarily compiled dictionaries of rythm. The author of Zufangoya has put before himself different, more wide tasks that of preparing his dictionary, partly as a direct contact with foreign neighbours.

In this connection, as one may suggest, the author introduces a novility into Persian dictionaries-giving of pronounciational indicators of some words, sometimes even noting their various variations. e.g.

f.27b — خسیدن بفتح وکسر خا خائیدن

f.44b — بلس بضم با ولام عدس

f.47a — طرخون بضم با درختی است

f.48a — تقنس بضم قاف ونون وبعضی بقاف وواو ققنوس گویند وبه لغتی ققنس است به فتح قاف جانوری است

f.45b — ذب بفتح ذال نگاه داشت

The dictionary Zufangoya wa Jahanpoya may also be credited with identification of a number of words (vowels) according to their origin and their pronounciation, which was not met within earlier dictionaries. The author notes the 'Maaruf' and 'Majhul' vowel words while giving them his own names: 'Wao-e-Arabi' and 'Ya-e-Arabi', 'Wao-e-Farsi' and 'Ya-e-Farsi'.

In the dictionary Zufangoya is reflected more widely than

world" (65), meaning thereby Arabic, Persian and Turkish.

Organic interaction of these three languages may be see in almost any Persian dictionary beginning with 14th century in which, alongwith the Persian words, a large number o Arabic and Turkish words are explained. Historically by thi time the lexicographic traditions of the three languages ha developed considerably.

By including Turkish Lexicon in his dictionary, dedicat ing to it one of the seven Bakhsh, the author of 'Zufangoya w Jahanpoya' seems to have responded to a lively contact wit the neighbouring Turkish environment that were specially noti ceable in areas of northern and central India, an area t which the place of compilation of this dictionary belongs.

This part of the dictionary Zufangoya, which the autho calls 'Dar Sukhanan-i-Turki', is specially interesting and ma be looked upon as the earliest experiment in compiling a Turk ish-Persian dictionary. If we may say so about the well devel oped traditions of 14th century, tradition of compilin Arabic-Persian dictionary, tradition that takes its origi from 9th century (e.g. Well known dictionary of Zauezani Masadir; also As-Sami fi-l Asami etc.) (68) the practice o compiling Turkish-Persian dictionary may be traced only fro 15th-16th centuries when we find a number of dictionarie using the work of Alisher Novai, that are writing in old Uzbe language (e.g. one of the earliest among them, Badai-al Lughat, composed in 15th century) (67).

One should note that compiler of Zufangoya often give examples of Indian equivalants for this or that word with th comment 'in Hindvi language'; apparently these words are fro Urdu, for example;

f.21b ...وزہ میوہ معروف بتازی طلح و بہ ہندوی کیلہ

f.24a ...لوفر گیاہیست در آب و آفتاب پرست نیز گویند۔ بہ ہندوی کنول۔

f.46a ...ذب زاک سپید کہ بہ ہندوی پھٹکری گویند

Over all Zufangoya includes more than hundred India words (in the Indian manuscript, according to the count o Sayed Hasan 133 words (68). These Indian words may be of inte rest to indologists and could form an area of specia analysis.

The dictionary Zufangoya wa Jahanpoya appears before u yet in one important quality for Persian Lexicography as th first experiment of the compilation of a multi-lingual dictio nary. This type of multi-lingual dictionary did not find furt her development in Persian dictionaries a large number o Arabic as well as Turkish words, but gave them, as a rule, i general list of words that were listed according to alphabe of Persian language. They put in front of Arabic words th alphabet 'Ain' (Arabic), and in front of Turkish words th

rest. In the author collected Persian expressions and word combinations, having derivative meanings. Separation of phraseological elements of Persian language in a separate section was not taken up, as one can judge from the monument that has reached us, in the preceding lexicographs, but it did find its place in the works of Lexicographers of later period.

Bakhsh-IV and partly V, author presents words from Arabic that had been used in Persian language. Arabic words in some cases, usually insignificant in volume, had been used in earlier Persian Farhangs also, but only in general context of alphabet and without any distinction whatsoever.

It was new for the times and in the history of Persian Lexicography and may be seen as innovation in Persian dictionaries to have a special section in the dictionary for words from 'Rumi' Lexicon. Inclusion of separate Greek words was also to be found in earlier dictionaries of 11 century, like Lughat-e-Furs. However, the author of Zufangoya significantly widened the circle of such Lexicon and created first of its type 'Rumi-Persian' dictionary.

Cultural contacts between Iran and Greek had been existing, as is well known, since ancient times; even during the epoch of Achmenides the Greek Culture, Art, Language had penetrated the East. Significant section of lexical exchange, that had taken place with Persian language and the West-Greek, Latin etc. had penetrated Persian language after the Arab conquest-through the agency of the Arabic language and partly in their Arabicised form. Exchanges with aramaic and syriac languages had taken place directly.

Meaning under the term 'Rumi' the Bazentine empire, the author of Zufangoya, under the name 'Rumi', brings together, as can be seen from the text of Bakhsh-VI, words that had entered the early Persian literature from the West. The author himself seems to be interested, as is manifested by his inclusion of words in the dictionary, in these words as indicators of the origin of a certain group of terms in christian religion, that were frequently used in Persian literature as in prose, so in poetry. One may postulate that significant part of the material for this section of the dictionary the author found from the work of the well known poet Khaqaani (514 A.H./ 1120 A.D. - 595 A.H./ 1198-99 A.D.), who often uses motifs and terms from Christianity.

In earlier Persian monumental dictionaries many of these words do not find entry.

The dictionary Zufangoya in its Bakhsh-VII, appears to be the first experiment to explain Turkish words in the Persian dictionary. Earlier Persian dictionaries we are unable to notice cases of inclusion of Turkish words for explanation alongwith Persian words. In later dictionaries we find explanation of Turkish words in Persian dictionaries. Academician V.V.Bertold has pointed out that "as early as 13th century we meet explaination in three literary languages of the Muslim

small section on Persian infinitives under direct influence of Zufangoya.

The material of Zufangoya wa Jahanpoya undoubtedly entered, as can be seen in textological analysis, in the composition of most authoritative and most complete among the dictionaries, Burhan-e-Qatai which was composed in India in 1062 A.H./1625 A.D. by Mohammad Tabrizi. It should be noted that in his short list of sources the author does not mention Zufangoya.

Latest critical edition of the dictionary is prepared under the guidence of Professor M.Moin. This edition includes a substantial preface describing the different characteristics of the dictionary. (63)

Use by Lexicographers of Zufangoya as source can be fully traced to the end of 17th century. For example, the big Persian Turkish dictionary, Farhang-e-Shuuri, compiled in 1075 A.H./1665 A.D. in Turky by Hasan Shuuri, mentions Farhang-e-Zufangoya among the list of early Persian Farhangs, used in the compilation of the given dictionary. (64)

Zufangoya wa Jahanpoya as a Land Mark

The dictionary Zufangoya wa Jahanpoya, as is shown by the investigation, constituted in its time a definite stage in the development of Persian Lexicography.

Wide coverage of Lexicon alongwith the division of the dictionary presents substantial interest and provides the basis to consider this dictionary as one of the first in history of Persian Lexicography experiments in dividing the Lexicon to sharply bring out the words, as in Persian, so in Arabic, Turkish, Greek that were used in the then Persian language. It is not worthy that Persian Lexicon itself is also classified by the author into three sections. On the basis of type of word formation, the author brings out words that have a common root (Bakhsh-I) in Persian; words with two roots (Bakhsh-II); in a special section (Bakhsh-III) he puts Persian infinitives.

One should note that in the work of Lexicographers preceding him verbs, as a rule existed their individual form (for example, Maikuhad, Miravad etc.); infinitives were met with very rarely. There was no attempt at separating the infinitives as of special attention, as a special case. Similarly it was not paid attention to in the the dictionaries of later period. Infinitives in Zufangoya are primarily old ones and are usually given in two of three forms, basic and derivative, with special attention, with special attention to the basic form (See p.14 Supra).

Preface to the dictionary undoubtedly is of special inte-

It is not accidental that just like Zufangoya, Muaiad al-Fuzala also provides Indian equivalents for a number of listed words. Just like the author of Zufangoya, the compiler of Muaied al-Fuzala also pays attention to metaphorical usage of words and idioms.

The manuscript of Muaied al-Fuzala is to be found in a number of world collections. It was published in 1899 A.D. (59)

The Persian poet and Lexicographer Muhammad Qasim Sururi Kashani, while compiling the well known dictionary Majma al-Furs (First copy was completed in Isfahan in 1008 A.H./1599-1600 A.D., second in India in 1028 A.H./1619 A.D.) used Zufangoya as one of the sixteen sources. The dictionary of Sururi lists a wide range of words from Persian, in the main as these are used in literature, including words that are not widely used during his time and those redundant by his times. It is possible to discern a few common features between the dictionary of Sururi and Zufangoya, e.g. placement of lexicographic material according to the first alphabet of lexicographic material according to the first alphabet of the word; indication of the pronounciation of individual word, specially those belonging to different dialects; separate entry of idiomatic expressions alongwith their meanings and explanations.

The dictionary of Sururi was, it seems, widely used. It has come to us in may copies and has been published.(60)

One of the most well known medieval dictionaries of Persian language, Farhang-e-Jahangiri, completed in India in 1017 A.H./ 1608-09 A.D., and according to its author Fakhruddin Hasan Shirazi, he used 43 authors as basic sources for the compilation of this dictionary, has a large number of direct citations of Zufangoya. As an appendix to the dictioanry, the separate listing of idioms and metaphoric usage of words and compounds (though these are not many in the dictionary Jahangiri) with their Persian equivalants Turkish, Greek alonwith marks to indicate proper pronouncement of the sounds, all these characteristcs of structure of the dictionary and characteristics of presentation of the lexicographic material brings the dictionary Farhang-i-Jahangiri to the dictioanary Zufangoya wa Jahanpoya.

Farhang-i-Jahangiri, that was very popular during the medieval period, has preserved a substantial number of words that are common with a number of other dictionaries in their manuscript from that are to be found in world collections. It has been published only in lithographic technique. (61)

Persian dictionary of the first half of 17th century, Faraid al-Fawaid, is known to us through a single manuscript in the collection of the Institute of Oriental Studies, Academy of Sciences of the USSR, Moscow. This dictionary also mentions Zufangoya as one of its sources (62). In the text of Faraid al-Fawaid there are many references to Zufangoya. It also directly cites from Zufangoya. It is possible to suggest that the author of Faraid al-Fawaid included in his work a

Zufangoya in the Works of later Lexicographers

Farhang 'Zufangoya wa Jahanpoya' probably was one of the more authoriative Lexicographic compositions containing valuable dictionary material, easy to use due to its strict structure. Recognition of its authority is confirmed by the fact that Zufangoya was used repeatedly used by the successor Lexicographists as one of their basic sources.

First dictionary in time to use Zufangoya was the Persian dictionary Bahr-al-Fazail, composed in 837 A.H./1433-34 (55), by Mohammad Ibn Qawwas Balkhi. He had also composed earlier in 837 A.H./ 1392-93 A.D. a literary commentary (Sharah) to the poem of Nizami titled Makhzan al-Asrar. The dictionary Bahr-al-Fazail has come to us in a number of its copies (56). It has been published so far.

Later on Zufangoya was included as source by Ibrahim Qawamuddin Farrukhi when he compiled the dictionary Farhang-e-Ibrahimi who's composition is dated as 878 A.H./1473-74 A.D. This dictionary, compiled in India, covers wide circle of Lexicon. Selected basically from earlier work of Persian poets. Turkish (old Uzbek) woids are separated in the dictionary and are specially placed at the end of each section (Fasl); it is possible to postulate that this separation of Turkish words was taken up by the author on the basis of the example from Zufangoya.

Farhang-e-Ibrahimi has come to us in many manuscript copies but has not been published so far.(57)

Next in time the dictionary for which Zufangoya is a source is the big dictionary Tuhfat-as-Saadat of Iskandari. This dictionary was composed in 916 A.H./ 1510-11 A.D. in India by Maulana Mohammad Ibn Shaikh Ziauddin Mohammad.

Tuhfat-as-Saadat takes up the construction of a number of Persian words mainly through its usage in poetry; very rarely Arabic and Turkish words are mentioned.

Influence of Zufangoya may be traced in the succession of the classification of words into singles (Mafaradat) and in terms and compound words (Istilahat wa Murakkabat). Maunscripts of Tuhfat-as-Saadat, that have not been published so far, are rather rare.(58)

The dictionary Muaied-al-Fuzala, completed in 925 A.H./ 1519 A.D. in India by Shaikh Mohammad Ibn Lad Ibn Abd-al-Wahab ad-Dehlavi is next in chronological order.

Tne compiler of Muaied-al-Fuzala included in the text of his compositions a number of citations to Zufangoya as compared with other authors. One can notice a general similarity between Zufangoya and Muaid-al Fuzala in the sequence of listing of words. In both the dictionaries Persian, Arabic and Turkish words are given separately, in three special sections.

composed). Its author Naseer Qaziuddin Gunbazi. This dictiona ry has been fixed in the well known bibliographical work o 16th century by Khwaja Khalfi under the name of Risalat-an Nasiriya fi Lughat-al-Furs. (47)

More complete information about this early Lexicographi work is not known to science today.

Reference to Risala-e-Naseer-e-Ahmed in the text o Zufangoya is given on f.23a. The dictionary Risala-e-Naseer lost for science, was used by still later authors, may be no in oriental but through its use and reference in Zufangoya, a it is indicated by material cited above.

Fourth reference to source is given, as a rule, in th form of 'Dar Firdausi' (See ff.3a, 4b, 10b, 12b, 13a, 17a 18b, 19a, 21b, 30a, 33a, 34b, 36a) character of these citat ions (comparing here that on ff.5b, 9a, 12a, 13a, 13b, 14a 20b, etc. citing the dictionary Lughat-e-Furs in the same forn as 'Dar Asadi ast), gives the basis to assume that the autho of Zufangoya is citing material from some dictionary, tha gives this or that word.

Sayed Hasan in his paper concerning the Indian manuscrip of Zufangoya calls this source without any reservation a Farhang-e-Firdausi. (48)

In scientific literature one does not find reference i Lexicographical works to Farhang-e-Firdausi. No dictionary b the name is referred to earlier in chronological desription of Persian dictionaries compiled by K.G.Zelemann (49) nor i the introduction of Saeed Nafisi to the publication of th dictionary Burhan-e-Qate that contains a long list of Persia dictionaries.(50)

Besides, it is well known that Shah-Nama of Firdausi had special dictionaries built round it from very early times in Persian Lexicography. About the existance of some of such dictionaries, that have not come to us, we know only through their reference in one or the other early dictionary. For example, such an early dictionary of Shah Nama, like Fawaid-i-Burhani wa Firdausi, composed in 822 A.H./1419 A.D. (quoted as source in Adat-al-Fuzala) (51). Among later dictionaries of this class one can mention Lughat-e-Shah Nama of Muhammad Tusi Alavi, composed in 950 A.H./1543-44 A.D. (52)

Among the Persian dictionaries published by Sayed Nafasi, citation of various dictionaries is given without the date of compilation or the name of the authors. (53)

It is worthwhile to note the fact that in some of the old manuscripts of the poems of Firdausi one meets a few pages of glossary giving redundant words used in Shah Nama. (54)

In the text of the dictionary 'Zafangoyan' itself there are many references to four Persian dictionaries Lughat-e-Furs, Asadi Tusi, Farhang-Name-e-Fakhr-e-Kavvas, Risala-e-Naseer-e-Ahmed and Farhang-e-Firdusi.

We now give basic information about these sources.

Lughat-e-Furs was compiled by well known poet Asadi Tusi in the second half of 11th century; It is the earliest as has been mentioned earlier, among the Persian dictionaries that have come to us. This dictionary has been used by a majority of the succeeding Persian Lexicographers. Lughat-e-Furs has three complete sections mentioned above; the dictionary has been discussed in detail by V.A.Kapranov in his special studies, who analyses the lexicol content of the dictionary.

In the text of 'Zufangoya wa Jahanpoya' there is reference to Lughat-e-furs on the following folios: 3a, 5b, 9a, 13a, 13b, 14a, 18b, 20b, 23d, 25b & 33a.

Farhang-e-Fakhr-e-Kavvas has come to us in its unique manuscript, now in India, in the library of the Asiatic Society in Calcutta. (45) The dictionary was compiled in 701 A.H./ 1301 A.D. in India by the well known poet Maulana Fakhruddin Mubarak Gaznavi Kavvasi, who by profession was a Kamangar. This dictionary is the oldest after Lughat-e-Furs, among the dictionaries of Persian that have come to us. Farhang-e-Fakhr-e-Kavvas is also known as 'Panjab Bakhshi' (of five parts) and is divided into five big parts (Bakhsh) that are further subdivided on thematic basis: Bakhsh-I includes Lexicon, related to heavens, Bakhsh-II explains understanding related to earth, Bakhsh-III is dedicated to flora, Bakhsh-IV to Fauna, Bakhsh-V to man. The parts (Bakhsh) are further divided into chapters (Gune), also according to thematical principle, so also are sections (Bahr).

The dictionary contains many citations from earlier poets of Persian group of languages: Rudaki, Daqiqi, Asadi, Tusi, Firdausi, Unsuri, Farrukhi, Suzani, Nizami, Khaqani etc. (46)

In the text of 'Zufangoya wa Jahanpoya' citations to Farhang-e-Fakhr-e-Kavvas are located on the following folios: 2a, 5a, 6b, 7a, 8a, 9a, 10b, 13a, 14a, 14b, 15a, 16a, 16b, 19a, 22a, 24b, 27a, 32b, 34a, 45a, 45b, 48a. Sometimes the citations give a secondary derivative. Name of 'Farhang-e-Fakhr-e-Kavvas' Farhang Name.

Third source of 'Zufangoya' Risala-e-Naseer-e-Ahmed' as it is referred to by the author of 'Zufangoya' has not come to us. It is known only through its reference in later dictionaries, e.g. Adat al-Fuzala (XVth), Kashf al-Lughat (XVIth), Majma al-Furs (XVIth), Sururi (XVIth), Farhang-e-Jahangiri (XVIIth).

Risala-e-Naseer-e-Ahmed was composed not later than 822 A.H./1491 A.D. (i.e. the year in which Adat al-Fuzali was

tion and putting into order (words)' : "Thus says the humble dust of the land, Badr Ibraheem".

God will help in his work and in his difficulties an save him from mistakes and loosing the way. There are man dictionaries of the Pahlavi, Dari, Persian and other languages, and each of them is full of mistakes because in the majority of them there is absence of marks on the words that indicate pronounciation. They are chaotic and without order and d not attain reqiured structure because words from differen languages are all given together and the rules are not explained and Persian and Arabic authors are all mixed up together, (explanation of words) are not arranged in required structure, as it should be.

Many authors, as it was earlier, so it is today spen days and night, and spend their nights and days, but fail t attain clearity. They try to look into dictionaries but fail.

One group got the desire to read and understand ever word as it is. They directed all their souls to this end. Others ran in a different direction and asked each other bu no one could open the door for them and shouts for help i understanding turned out to be of no use.

Group of friends near and dear to me did not encourage m in the beginning, thinking that I may not be able to be of an help to them. But (by chance) they came to me and asked. Whe they got the answer they decided 'To help people and compile a dictionary'. And construct it in a way that it is of help: that from each language was put in a section and for words from each of them there emerges a separate dictionary. Think deeply for the meaning of each word. Parts (Bakhsh) and sections (Gune) should be separate so that any one could get advantage from them: and it should be strong in thinking, and near to the great ones and their friends, as many dictionaries try to gather words and their meanings-words that are nesessory and widely used.

Their request I accepted for fulfilment. I took the pen and without fear got down to collecting word after word. I had a strong desire to collect all dictionaries and words that were dispersed all over. And all that is there in such languages as Arabic, Persian, Dari, Pehlavi, Greek, Turkish and others, all this I collected separately and analysed them to put them under one cover. All that I could attain and could find, all that I heard and saw, I put into order; each dictionary I compiled separately, dividing the dictionary into Bakhsh, Gune and Bahr. I tried to find most suitable place for each of the collected word. I tried to be brief and not superfluous, trying to explain their use and not be bombastic.

I gave this dictionary the name 'Zafan-e-Guyan-e-Jahanpuyan' (Spoken language all over the world).

God knows best and saves us from mistakes, from loosing the way and gives strength to complete it".(44)

attention to.

Five confirmatory citations, mentioned above under numbers 1,2,4,6 and 7, i.e. belonging to the words Randa, Farvardin, Naimur, Bad Farvardin, and Shabistan, fully coincide in both the manuscripts; In the Indian manuscript these are located respectively on ff.48a, 72b. 99a, 111b, & 121b.

Citation number 10, Rubai to the word Tashrin, is given in the Indian manuscript only partly (f.159a). It gives only the first Bait of the Rubai.

Four citations from our lists (Nos.3,5,8 & 9) for the words Kashan, Iuz, Gushkhaba, Afshandan respectively, are absent from the Indian manuscript.

In the Indian manuscript, alongwith the 5 citations refered to above, there are some absent from the Tashkent Mss.

With the word Bid

(f.12b) این نخج در خفست کرمی ناردیار بیرو بده و سرو سپیدان و چنار

With the word Khatanber

(f.36b) با فراخی ست ولے تنگ ہمی زید آنجاست کہ چنو ہیچ ختنبر

With the word Khinabar

(f.36b) بعول جنونر کہ چو تیغ تیز گردانست ہم ہام درہم ز خنبر

With the word Dastgah

(f.44b) زمانہ بخشش دکان دستگاه و بحر نوال

With the word Zalifan

(f.51a) از لب تو حو مرا ہزار امید است واز گرہ زلف تو مرا ہزار زلیفن

Source for the Dictionary

On the basis of the preface to the dictionary, as far as it is possible to decide on the basis of the text published in the paper of Sayed Hasan, the author of 'Zufangoya' does not list the sources used by him. However, he makes definite judgements in his preface, and definitions, accumulated till his times and uses the values and experiences that had become standard till his days. Author of Zufangoya points to the defficiencies in the dictionaries popular in his times, that he generally calls as 'some dictionaries' or 'compositions of some of the Lexicographers'.

He tells the following in connection with the task of his dictionary and its links with the existing dictionaries. This he mentions in the section titled, 'On the (rules) of compila-

(نیمور)-i-Zakr-i-Mardum,..., This is how Suzani says

من این نیمور خود را وقف کردم   علی صبیانکم ایها الناس

5. Bakhsh-I, f.28a, for the word Iuz (   ) a well known carnivourous animal, that in Hindustani is called Hata. (   ) The word also means to jump and to run. This is how some one is cited; Bait,

یوز از جسم آهوانه او   گر کند عاشق بود آهو

6. Bakhsh-II, f.29b, citation is given for the word 'Bad Farvardin' (بادفروردین) this is how the western wind is called. The poet says, Misra: (36)

باد فروردین است کش خوانند عرب ریح الدبور

7. Bakhsh-II, f.34a, citation is given for the word 'Shabistan' (شبستان) place where night is spent; also the bed room or bed. Bait: The Bait is given without citation of the name of the author (37).

من نازکان زخم همه شب   او خفتا نیارد در شبستان

8. Bakhsh-II, f.35a, under the word Gushkhaba (گوشخنه) it is an animal with 40 legs (centiped). Poet says, Bait (38):

گرچه صد پایش وارد ای برادر گوش خر   لیک اندر گوش کس یک پانه تواند نهاد

9. Bakhsh-III, f.36b, citation is given for the word Afshandan, (افشاندن) throw, for example legs or feet. When Hamza is shortened, it is shortened, it is pronounced as Fa. Bait:

اگر دستم دهد روزی که انصاف از تو بستانم   قضای عهد ماضی را شبی دستی برافشانم

Citation is without the name of the poet (39).

10. Bakhsh-V, f.50a, for the word Tashrin (تشرین) name of a month. There are two Tashrin:

تشرین الاول: and   تشرین الآخر

However, in the dictionary the meaning related to month was included Rubai:

دو تشرین و دو کانون و پس آنگه   شباط و آذار و نیسان و ایار است

حزیران و تموز و آب و ایلول   نگهدارش که از من یادگار است

The Rubai is given without the name of the author (40).

Characterising the Indian manuscript of the dictionary 'Zufangoya', Sayed Hasan focuses attention on the citations in his paper. In the Indian manuscript there are 11 citations in total. Comparison of confirmatory citations in Tashkent and Indian manuscripts shows some differences that should be paid

that has come to us. Among such big poets of the past whom we know only partially one can name Shahid Balkhi, Rudaki, Unsuri, Amaq etc.

The method of confirmational citation of Persian poetry is quite important also from the point of view of the knowledge of language. Presentation of confirmatory citation, that document this or that way of using a word, gives the possibility of investigating rather in detail the meaning of the word and its nuances and shades of a given word in its literary usage, especially in its rare usage that is not always very obvious, as metaphorical and other senses.

Author of the dictionary 'Zufangoya' gives a number of poetical citations, though in this case their number is small. In the given manuscript, in which part of the first Bakhsh, there are ten poetic citations; in the first, second, third and fifth Bakhsh, i.e. mainly in that part of the dictionary that deals with Persian words.

Below we give the poetic citations.

1. Bakhsh-I, f.2a. In the dictionary part dealing with the word Randa (رنده)-Spring grass; instrument that peels wood. Mushtranda is the same as Randa, Bait:

کردگارا و شب رنده‌ای ده جهان را خوش تراش   تا که از قوی کرده ایشان و هم ما تیشه ایم

The Bait is cited without the name of the author (31).

2. Bakhsh-I, f.11a. In the dictionary there is citation to the word 'Farvardin' (فروردین) - name of the month, Wjen the Sun is in the zodical sign of Hamal. Citation.

ز فروردین چو بگذشتی مه اردی بهشت آید   جهان خرداد و تیر آنگه که مرداد همی آید

پس از شهریور و مهر و آبان آذر و دی دان   چو بهمن جز اسفندارمذ ماهی نیفزاید

ز فروردین ربیعی دان تا شهریورش آنگه   ز مهر تا با اسفندیار جمله از خریفش دار

Citation is given without the name of the author (32).

3. Bakhsh-I, f.19a. In the dictionary the citation is given for the word Kashan (کشن) - Many, Many in numbers Bait.

ما هم به جمع خویش یکی کشن لشکریم   یک سو پیاده و یک فوج سوار

Bait is cited without name of the author (33).

4. Bakhsh-I, f.24a, citation occurs for the word Naimur-

The last folios of the dictionary (ff. 53b-54a) contain mall appendix explaining the title "Some Persian words having ietaphoric significance". The same title is to be found in the :ndian manuscript. In this appendix the author analyses the iignificance of some Persian words and word combinations hav-.ng double meanings. Idioms are listed in alphabetical order »ased on the first alphabet.

Some examples

ساده‌دل نادان و کم دان (f.54a)

یک چشم ظاهر بین و کم بین و منافق (f.54a)

سیماب شدن ناپدید شدن و دویدن است (f.54a)

Some Poetic Citations in Support

Early Persian dictionaries were compiled primarily as lictionaries of rare and difficult words that were met with in »oetic texts. These dictionaries were compiled as adjuncts to .he reading of Persian poetry, and in reality were dictionar-.es of rare words giving rythm and rhym. These dictionaries :ould be used by poets as some sort of text books for master-ng the poetic art.

It is not without interest to note that early Persian lictionaries were composed in the main by poets. It is well .nown that such famous poets like Rudako, Farrukhi, Qatran 'ere authors of dictionaries, that unfortunately have not ;urvived and their works that have come to us, it is possible .o name a number of poets: Asadi Tusi, Shams-i-Fakhri, Lexico-|raphers of 16th century; Mohammad bin Shaikh Ziauddin author »f a big dictionary called Tuhafat-as-Saadat, Hafiz Ubihi - ıuthor of the dictionary Tuhafat al-Ahbab, Mirza Ibraheem - :omposer of the dictionary Farhang-i-Mirza Ibraheem, Ilahdad--Faizi, author of the dictionary Madar al-Afazil etc.

Introduction of poetic citations in the preface of the lictionaries became a strong tradition in Persian Lexicography 'rom the very early period of its development. For already .here is a large volume of poetic citations. This tradition ılmost does not know exceptions in Persian Lexicography .hrough out its entire history.

Inclusion of poetic examples with citation of the name of .he poet, and rarely with citation of the composition, gives ıxclusive value to the Persian Lexicographical compositions, ;pecially the early ones, specially because these dictionaries ıs has been shown by investigations, in those early days were .he only source, conserving fragments from lost literary comp-»sitions in the early days in the development of poetry in the .ew Persian language. Researchers in literature (P.Horn, E.A. »ertels) successfully used Persian dictionaries while collect-ng and restoring the literary inheritance of the days gone by

صنبه دوم روز ایام عجوز (f.46b)

وامق نام مردی عاشق عذرا (f.49b)

عجازه شتر یا قوت که بر آن قاصدی کنند (f.45a)

نظرون بوسه بر خست بعضی گویند نمک دریاست (f.49a)

Bakhsh-VI. (ff. 50a-51a). Title-Words of Roman. The same :itle in the Indian manuscript. Contains 16 Gune. The Bakhsh :epresents a short dictionary of Greek, Latin and Syrian ıords. Here are listed the titles of Church hierarchy, names ›f scientists, and of big Christian Church dignitaries, recol-.ection of well known Churches and monastaries, objects of :hristian cult, names of months in Syrian calander, as well as ıames of plants, animals and birds, some understanding of the ·eals that have relation with ancient Greece and Bazentin. e.g.

اسطقسات ارکان یعنی طبایع اربعه (f.50a)

افلاطون نام حکیمی یونانی (f.50a)

جاثلیق عالم و عابد ترسایان (f.50a)

سکوبا نام مردی از رومیان که دیر او معروفست (f.50a)

شباط ماه رومیان و آن آخرین ماه زمستانست (f.50b)

Bakhsh-VII (ff.51a-53b). Title Turkish words. The same in :he Indian manuscript. It contains 17 Gune. The dictionary ınterprests a number of simple Turkish words; the words are ›ld Uzbek language. These are basically terms of relation-ships, number-words, names of domestic objects, names of birds ınd animals, division verbs. As one may notice, these words ıre predominantly of non-literary nature but are used in Living conversational language. e.g.

آتا پدر (f.51a)   تورت چهار (f.52a)   بشماق کفش (f.51b)   بوری گرگ (f.52a)

آنا مادر (f.51a)   توق چهل (f.53a)   تاغ کوه (f.52a)   ستمق فروختن (f.52b)

آغا برادر بزرگ (f.51a)   یتمش هفتاد (f.53a)   تل زبان (f.52b)   کلدی آمد (f.53a)

اینی برادر کهتر (f.51b)   توز نمک (f.52a)   التونچی زرگر (f.51b)

ntal (Bunyad or Asl). Some examples:

اندوختن الفختن وگرد کردن در اصل اندوزیدن بود (f.36b)

انگاشتن داشتن وگمان بردن بنیاد انگاریدن (f.37a)

In the dictionary are given quite a number of different onetical and orthographic variations for the given infinive, e.g.

افزولیدن واو تزولیدن نیز گویند (f.38b)

افراشتن بمعنی افراختن است در بنیاد افرازیدن بود و نیز همزه از هردو حذف کنند و فا را کسره دهند (f.36b)

Sometimes the author of the dictionary considers it rthwhile to cite in the text examples of the verb used in e personal form. e.g.

شخیدن لغزیدن واز جای فروخزیدن وگناه کردن گویند فلان شخید یعنی از خویش فروخزید و بلغزید (f.38a)

نیوشیدن سخن در گوش کردن یعنی شنیدن که بنیوش یعنی بشنو و شنایدن و بکسر نون نیز گویند (f.39a)

Bakhsh-IV (ff.39b-43b). Title (the same as in the Indian nuscript) Tazi Words, i.e. Arabic words. It has 27 Gune. The ctionary gives explaination of Arabic words that were used the Persian language. These are basically words used in riculture geographical names and names of heavenly bodies d some of the war terms and words of domestic appliances e.g.

ترجمان بیان کننده سخنی بزبانی دیگر (f.40a) تخمین گمان (f.40a) منشور فرمان پادشاه (f.42b)

نسیم باد نرم و خوش که از آخر شب تا طلوع آفتاب بوزد (f.43a) عراق ولایتی معروف و آن ایران زمین است و عراق العرب که از آن سوی

دجله است یعنی دجله بغداد و عراق عجم که از این سوی است یعنی شیر (f.41b)

Bakhsh-V (ff.43b-50a). Title "Miscellaneous Words: abic, Nabatic and Dari". In the Indian manuscript the same rds are given, though the word 'Nabatic' is replaced by the rd 'Turkish', apparently by mistake (30).

The Bakhsh contains 29 Gune. In this part the author plains basically words of Arabic that had entered the rsian language as well as some Nabatic (Aramic) words, that e used for the formation of reals and names of appliances of mestic use, dress, decorationals, musical instruments etc. ctionary explains a few words denoting ethnic terms, names diseases and medicaments, names of animals and birds, of ants, fruits, minerals, names of historical and literature rsonalities, geographical names, terms of war and armaments. g.

اصطخر نام شهریست در بلاد پارس (f.43b)

طون در روم بافند و این دیبا منقش است که هر زمان رنگ دیگر نماید (f.43b)

ترقین خطی که محرران میان دو خط دراز میکشند و این بزبان نبطی است (f.44b)

Indian manuscript provides more title "Pehlavi words and Dari words that consist of two words and the meaning of which is found by joining these two words" (28).

It contains 21 Gune. It includes words with two roots, from Persian, that are very frequently used in literature. Just as in Bakhsh-I, these words are most widely used: names of armaments, names of work implements, domestic utensils, diseases, medicines, names of counteries and regions, names of plants and animals, names of minerals, names of authors etc.

آهون برکسی کو گویند که در دیوار و بازین نقب زنند یعنی نقب زن (f.29a) آهن ربا سنگی است معروف بتازی مقناطیس هندوی

کاسک گویند (f.29a) تنگنای میان دو کوه گلی دره کوه (f.30b) دستار خوان سفره که بدان طعام خورند (f.32b)

شب بوی گل است زرد (f.34a) شاه بوی عنبر (f.34a) نیمروز ولایتی است درمیان خراسان و فارس (f.35b)

راه کهکشان راهی است که در آسمان شب نماید آن را عرب مجره خوانند و پارسیان آسمان دره و ره روسالک گویند (f.32b)

دوستگانی پیاله شراب که دوست از دوست خورد و بدست یار کند (f.32b) هفت خوان راهی است که هفت منزل میان ایران زمین و توران

زمین در آنراه بود و کس نرفته آنرا مگر رستم دوم اسفندیار (f.36a)

گاو دوشه اوندی که در او شیر دوشند (f.35a)

Bakhsh-III (ff. 36a-39b). Title-Words of Pehlavi and Dari that form and give rise to words of action, i.e. those that are like Masdar. Indian manuscript gives a bit shortened Title-Words of Pehlavi and Dari, from which words of action are formed, i.e. Masdar (29).

This Bakhsh contains 23 Gune. Exclusively infinites are explained, predominantly archaical words and only simple ones. Division of Bahr is absent, as all words are of the same infinitive ending.

Some more typical examples from this Bakhsh are.

افراختن برآوردن و برکشیدن و بالاتر بردن که در بنیاها افزایدن بود (f.36b) پرداختن انگیختن و ترک دادن و آراستن و ساختن و

دور کردن (f.37a) گرویدن پذیرفتن و سرنهادن و بدل گره بستن و استوار داشتن (f.39a)

As one can see from the cited examples, explanations given in this Bakhsh are constructed in a way that semantic of the major verb, taken as vocables, is opened up from various sides with the help of a number of infinitives, forming its own group of verbal synonyms.

Vocable-infinitives in this Bakhsh are given, as a rule are in two forms-basic and derivatives, formed from the basis of present tense and infinitive form-with corresponding funda-

terms that deal with relationships, objects of domestic use, parts of the body, names of the months, measures and weights etc. Alongwith these, it explains the proper names of the rulers and of literary personages, geographical names, ethic concepts and war terms.

Here are explained many rare, redundant words, in the main from 'Shah Nama' that were already not well known and well understood even during the time of Firdausi, trying to replace them by then becoming well known Arabic words by archaical Persian words.

Text of the first Bakhsh begins in our manuscript with Gune Dal, which according to count turns out to be 8th, with 3rd Bahr. First word - دارات حاب کردن

Here are some of the most characteristic words and their explanations:

خارج شرابی که به وقت بامداد خورند و بتازی صبوح گویند (f.8a) فروردین نام ماهی که آفتاب در حمل بود (f.11a)

مرزبان زمین دار و شهردار که شهریار گویند (f.22a) منیژه نام دختر افراسیاب معشوقه بیژن (f.23a)

هرات نام شهری از خراسان که آنرا هری و هریو گویند (f.27a) هامون دشت و زمین هموار گویند زمین سخت که باران قبول نکند (f.27b),

رستی حلوا و نیز نان را گویند (f.2b) درفش آنچه بدان چرم سوراخ کنند برای دوختن (f.1b)

زوار خدمتکاران جندیان (f.1b)

زرافنگ زمین ریگ و زرافن بلغت کات نیز گویند (f.3b)

Alongwith explanations for early rare and antique words e.g.
زکان از خود رمیده (f.3b) کهبد مرد کوه نشین (f.13a) میزد مجلس خانه و عشرتگاه و مهمانی (f.21b)

The dictionary gives frequent & very simple words with short explaination, e.g.
نام کتاب و نبشته (f.25b) دوست یار (f.1a)
گوساله گاو بچه (f.19b) ناهار ناشتا یعنی گرسنه از آغاز روز (f.24a)

These examples may be seen as conscious attempt of the compiler of the dictionary to pay attention to synonyms and give practical help to poets. Some times the author builds up an interpretation on the basis of antonyms, e.g.
زنده ضد مرده و بعضی بلغم را گویند (f.3a)
سیر ضد گرسنه (f.5b)

Bakhsh-II (ff. 28b-36a). It is titled "Dari Words". The

Besides, one observes differences in the citation of confirmatory poetical citations (see below).

Volume of the dictionary and its Construction

The dictionary 'Zufangoya wa Jahanpoya' was apparently, one of the first in the Persian language Lexicopraphical experiment of producing dictionaries with wide range of Lexicon. It includes, considering the data from both the known manuscripts of our times, approximately 5170 vocables. For comparison one may give the data from other early Persian dictionaries: 'Lughat-i-Fars' contains 1700 vocables, Sahih al-Furs' 2300, Maar-i-Jamali' about 1600.

The dictionary 'Zufangoya' comes out among the early Persian dictionaries for its originality of its internal structure. Early Persian dictionaries presented the entire Persian lexical material, as a rule, in the, in the content of one general dictionary with division in sections (Bab) according to the last syllable of the word; sections were organised according to the order of the Arabic-Persian alphabets. Arabic, Turkish and Greek lexics, represented in insignificant quantity, it was part of the general presentation of the Persain words.

The dictionary 'Zufangoya wa Jahanpoya' is divided in seven general sections (Bakhsh); each one of the Bakhsh represents in substance a distinct dictionary and as such headed by the author. In their turn Bakhshs are divided into Gune. These in their turn are further sub-divided according to the first letter of the word, i.e. each Gune contains its own words each beginning with its own respective alphabet. Gune are divided according to the order of Arabic-Persian alphabets. Gune is divided into Bahr. These are in their turn divided according to the alphabet at which the word ends.

Apparently the compiler of the dictionary 'Zufangoya wa Jahanpoya' was interested in terminology indicating sections, parts and chapters which seems to have been based on the dictionary 'Farhang-i-Fakhr-i-Kavvas' that preceeded him, and was compiled in India in 701 A.H./1301 A.D. However, 'Farhang-i-Fakhr-i-Kavvas' included only words of Persian Lexicon; at the root of its sub-divisioning etc. lie Persian Lexicon. It was based on thematic principles.

Characteristics of Lexical Composition

Bakhsh-I (ff. 1a-28b). Title of the Bakhsh, as it is restored in the Indian manuscript "Words of Pehlavi and Dari, Simples and unrelated to other words"(27). First Bakhsh is the most voluminous in Lexicon and includes words of Persian origin. It lists words according to similarity of roots and deals mostly with commonly and frequently used words, mostly

gives a comparative account:

	QUANTITY OF VOCABULS		QUANTITY OF GUNE (CHAPTERS)	
BAKHSH (Part)	IN INDIAN TEXT	TASHKENT TEXT	IN INDIAN TEXT	IN TASHKE TEXT
I	2947	1614	23	23 (2
II	484	505	21 (26)	21
III	269	248	23	23
IV	332	408	28	28
V	410	464	29	29
VI	51	54	16	16
VII	572	486	17	14

Comparison of the Tashkent text with some small gap with the Indian text, as published in the paper of Sayed Has and also with the photocopy of the Indian text shows coincid ntiality of the larger part of the text. One observes on insignificant editorial differences expressed in a differe order of the words in the given sentence, this or that gramm tic formulation e.g.

Tashkent text, f.5a: سارنج زغیست ضعیف وکوچک
Indian text, f.53a: سارنج زغکی است ضعیف وکوچک

Tashkent text shows very rarely complexity of text, e. in the Tashkent text on f.4b:

ینگ باران یعنی تگرگ و قطره باشد که بامداد از خشکی بر چیزها نشیند و مشک باد و دیده که در وقت آشنا کردن در آب بر خود گیرند و آنها سا مخوانند

Corresponding Indian text on f.52b:

لینگ باران یعنی تگرگ و قطره و باد دمیده که در وقت آشنا کردن در آب برخود گیرند و آنرا شامخوانند

In the Tashkent text one may observe a few vocabl absent in the Indian text, e.g. f.1a:

در برادر و دوست بزبان ماوراءالنهر دستور بفتح دال وزیر و اعتماد جالی و بضم در عربی استعمال کنند و سیار یاری دهنده

Corresponding Indian text f.42a;

ر برادر و دوست بزبان ماوراءالنهر دستیار یاری دهنده

There are sequential differences observable in the desi nation of Gune and Bahr of the dictionary. In the Tashke text factually every Gune and Bahr has its own separate titl while in the Indian text Gune and Bahr are indicated by the corresponding letters; e.g. In Tashkent text: f.4a.

ز یازدهم که در آن نامآنها پارگاه است بهر نخست در آهنگ نماست

In the Indian text corresponding part on f.52a: گونه ز غ

Indian manuscript contains 189 leaves of the size 22x12 cm. Text is written in 17-19 lines per page of large thick Naskh script of non-calligraphic type with some elements of Nastaliq. Words are underlined. Pagination is of the European type. Folio 1b-2a is occupied by Fahrist, giving the name of the seven Bakhsh and their sequence in the text alongwith the number of leaves they occupy respectively; for every Bakhsh, the number of Gune is given.

Comparison of the two manuscripts of the dictionary 'Zufangoya' on the basis of their photocopy shows the following:

Indian manuscript compliments the gaps, observed in the Tashkent text as a result of the loss of the starting folios. It contains (ff. 2b-4b) the authors preface to the dictionary, that is absent in Tashkent text. Text of this introduction, unfortunately can not be read completely due to the damage done to the manuscript by the book worms. In his introduction author of the dictionary calls himself as Badruddin Ibrahim (f.3a); name of the dictionary is given as 'Zafanguyan-i-Jahanpuyan' (f.4a).

BAKHSH-I, represented in the Tashkent manuscript only in part, from the 3rd Bahr, of the eighth Gune, i.e. from the word beginning with Dal and ending on Ta (first words in Tashkent text is Darat), in Indian manuscript are given fully, with the exception of a few, even with large number of defects caused by the worms. Beginning of the Bakhsh-I according to the Indian manuscript is (f.4b).

Bakhsh-II begins in the Indian text on f.109b.

Bakhsh-III on f.126b, Bakhsh-IV on f.134a.

Bakhsh-V on f.143a, Bakhsh-VI on f.158b.

Bakhsh-VII on f.161a.

Beginning of the Tashkent manuscript corresponds with f.41b of the Indian text, line seventh from above. Indian text fills yet other two lacunae in the text of the first Bakhsh in the Tashkent manuscript: text of ff.43b-47a of the Indian text fills the lacunae in the Tashkent text after f.1b; text of the ff.55b-61b of the Indian text fills the lacuna in Tashkent manuscript on f.5b.

First Bakhsh in Indian text includes 2947 vocables. In Tashkent text, in the preserved part of the 1st Bakhsh there are 1614 words.

Some divergences are also noticeable in the number of words in the remaining six Bakhsh of the dictionary, represented in the full text in the two manuscripts. Following table

there is the inventary number 127366. On f.1a and 239b th
is imprint of an oval seal of the Fundamental Library of
Central Asian State University with inventory number 2140
In the margin on f.1a are written the names in the Ara
script, "Mulla Mohammad Lateef, Mulla Mohammad Shareef, Mu
Baba Raheem" etc.; On the inside of the binding in Ara
script is written the name of either the owner or readers.
f.1a there is a date seal 49 with print 'entered'.

Date of copying, given on f.54a, in the colophon is gi
as 21st Jamadi-II, 123, i.e. one of the four digits is l
out. On the basis of paeleographic characteristics it is po
ible to suggest that the manuscript can be dated as 1123 A.
i.e. August 6th, 1711 (20) the copyist calls himself "A
Nasafi from Khatai (21). The Nisba of Nasafi shows that
copyist belonged to the central Asian city of Nasef,
Karshi of today.

Manuscript Discovered in India

In 1962, in the Indian journal Fikr-o-Nazar (22) publi
ed from Aligarh University, there was published a paper
Urdu language authored by Professor Sayed Hasan, titled, "O
est Persian Dictionary 'Zufangoya'.(23)

Author of the paper is head of the research centre in
field of Arabic and Persian languages in Patna. He annonu
that in the Oriental Library of Bankipur, Under No.3570 th
is a unique, according to him, manuscript of the diction
'Zufangoya-o-Jahanpoya' and he gave a short description of

Indian text of the dictionary has no date of copyi
but, basing on paeleographical characteristic of the te
Sayed Hasan takes it to 9th A.H., i.e. 15th A.D.

Sayed Hasan's paper made it possible to judge the compl
teness of the text of the dictionary in case of the Ind
manuscript, quality of its words according to the Bakhsh(
The paper gave full text of the author's preface to the dict
onary and large part of the poetic citation, and also suffic
ent formal description of the Indian copy.

In May, 1971 I got the possibility to get acquainted wi
the photocopy of the Indian text (24). This made it possib
for me to have a more complete and concrete concept of t
fulness of the Indian manuscript and of some of its characte
istics.

Indian manuscript is extremly defective, eaten up rig
through by the book worms. Insects have destroyed many lin
of the text completely, e.g. on ff.41-46, 56-70, 88-91, 10
109, 124-146. Significant damage has been done to the text
ff. 1-3, 7, 9-19, 22-31, 37-40, 77-85, 119-129, 155-166. En
ing pages of the text have been lost.

Names of the sections and other headings of the sections in the dictionary 'Zafagoya wa Jahanpoya' (Gune, Bahr) are written in Jali hand. Sometimes these are not written at all. (e.g. f.42b). Words, though not every where, are underlined by a wavy line. The words are also written Jali. So are Nazm, Bait, Misra. Size of the written area is 19x11, 5 cm. Paper is oriental, fibrous, weak, glazed, slightly darkened with age, with a size of 25x19 cm.

On the borders of some folios there are corrections and comments of some readers related to the text. Diacriticals are often absent, often these are not fully put; there is one dot in place of two or three. In the text one meets distortion of prono-unciation as it is described by alphabets. It seems these words were not understood by the copier. There are rare orthographic mistakes. Obvious writing mistakes are seen on ff.48b, 49b, 51a. On f.45a the word is written but its meaning is not. On f.47a the word is missing; so are the meanings, number in serial, Gune. On f.41a the whole title is missing (Gune-17). On f.12a the heading of Gune-16 it is mentioned that this Gune contains 20 Bahr. However, in the following text there are 22; in the heading of the Bakhsh (part) 7 (on f.51a) is mentioned 14 Gune, but the text has 17.

As a characteristic of writing style (graphic) one may note differences in the writing of Kaf and Gaf(18), when these alphabet are used to designate Bahr.

The manuscript is defective, beginning is missing which normally contains author's preface and the beginning of the first Bakhsh (part), i.e. first seven Gune are lost fully, also first and second Bahr of the eighth Gune. Remaining text of the dictionary, beginning with third Bahr of eighth Gune of the first Bakhsh, is complete with the exception of the foll-owing lacuna, formed as a result of the loss of the folios in the middle of the text: after f.1b the beginning of the Gune-9 is lost (Bahr 1-14 to till Bahr 15-Gaf); after f.5b, the end of Gune-12, i.e. Bahr-II-22, and the beginning of Gune-13, i.e. Bahr 1-7 and beginning of Bahr 8-Ra.

The manuscript has suffered from humidity. The folios have markings and tearings. Due to age text has fallen and dimmed at many places. The writing has been partly restored. During restoration the text has been damaged at some places. Upper part of f.44a is pasted over during restoration of the margins. Corners of the paper are torn, cut or rubbed off e.g. ff.2-5, 19-20, 23, 34, 35, 44.

Binding is oriental, 24.5 x 18 cm. thick, of card board, covered by thin skin; board thickness used in binding is 6mm. Side binding is dark and granular, gummed, in all probablity during the restoration. Binding is glazed and leathered in the three-fourth upper part and inside. Upper cover in part has been eaten up by insects.

On the f. 1a there is print of a small rectangular seal: 'Uzbek State University (Samarqand)' (19); Inside the seal

the dictionary 'Farhang-i-Ibrahimi' composed in 878/1473. It should be noted that some Lexicographers, citing works of their predecessors, cite, as a rule, examples from Zufangoya before any other like 'Adat-al-Fuzala' (composed in 822/1419) or 'Muaiyad-al-Fuzala' (14).

Study of the manuscript of the now published dictionary showed that 'Farhang-i-Zufangoya wa Jahanpoya' could not have been composed before 701/1301, as it contains reference to the Persian dictionary called 'Farhang-i-Fakhr-i-Kavvas' finished in 701/1301. (Mss.ff-2a,5a,6b etc.).

Description of the Manuscript

During the IVth All Union Scientific Conference on Iranian Philology, held in Tashkent during September 1964, I got introduced to the fund of Persian manuscripts in the main library of the Tashkent State University. My attention was drawn to one of the manuscripts, that was listed in the inventory as follows: "General Manuscript; Farhang Name: As-Surah Min As-Sihah, Inv. No.214014 Shifr V-09/292".

'As-Surah min as-Sihah' is the name of a well known Arabic-Persian dictionary of 13th century, manuscripts of which are quite well known. So far as the name of the first part of the Farhang Name is concerned, that is bound in this volume, it was obviously one of the tentative names for some unknown dictionary. On the colophon of the Farhang Name the following was written: "The dictionary book 'Zafanguya wa Jahanpoya' was completed on the 21st of Jamadi II, year 123 by the hand of the mean and lowly slave Arab Nasafi of Khatai'(15

From the contents of the colophon and from the text it became clear that the unknown Farhang is one of the early Persian dictionary 'Zufangoya wa Jahanpoya' about which science till now had known next to nothing except its name and an incomplete name of the compiler (16).

Text of the dictionary 'Zufangoya wa Jahanpoya' occupies ff.1a-54a(17) collected in the manuscript volume, included in the 239 pages. Beginning is lost; consequently the consequent pagination on the present leaves, ff.1 is indicated as 12. As a result one can conclude that eleven folios have been lost, i.e. one sixth of the total numbers have survived only on some folios.

Text of the dictionary is written in black ink with 18 words per line in calligraphic hand in Nastaliq writing (size of the alphabets 5 mm., Alif reaches 7 mm.) with some elements of Shikast. Other composition is the dictionary As-Surah min as-Sihah, which is written in a different hand-writing, in smaller alphabets, in Naskh style with 29 words per line; obviously the two have been mechanically put together in binding.

showing that other earlier dictionaries did exist that were used in their times on the basis of their popularity. One of such dictionaries that was supposed to have been lost during the later times, was 'Zufangoya wa Jahanpoya', that is the object of the present work(5).

This dictionary is often referred to in Lexicographical compositions of 15th-16th centuries and later period, e.g. 'Farhang-i-Ibrahimi (878 A.H,/1473 A.D.), 'Tuhfat-as-Saadat' (916/ 1510), 'Madar-al-Afazil' (1001 A.H./1593 A.D.), 'Muaid-al-Fuzala' (925/1519), 'Majma-al-Furs' (1008 A.H./1599-1600 A.D.), 'Farhang-i-Jahangiri' (1017/ 1608-09), 'Sharh-i-Gulis-tan' (1073 A.H./1662 A.D.), 'Fraid-al-Favaid' (not earlier than 984/1576 and not later than 1088 A.H./1677 A.D.).

Refering to the dictionary 'Zufangoya' as one of the sources, eastern Lexicographers summarily characterise it as follows: "among the older sources" or "...one of the authoritative compositions". For example the author of 'Madar-al-Afazil' wrotes, "In the dictionary 'Zufangoya', which is one of the the authoritative Persian sources, is mentioned as ..." (6). Mentioning their sources, author of 'Madar-al-Afazil' puts 'Zufangoya' under the heading 'Kutub-al-Mutaqaddemin' (Earlier sources) and puts it among the well know dictionaries like 'Adat-al-Fuzala (composed in 822/1419) and 'Farhang-i-Ibrahimi' (composed in 878/1473-74). This heading or category of Earlier Sources, author counter poes with the category 'Kutub-al-Mutakherin' (compositions of later period), where he puts such dictionaries as 'Tuhafat-as-Saadat (916/1510) and 'Muaid-al-Fuzala' (925/1519).

Most comprehensive reference to this dictionary, is given in 'Farahang-i-Jahangiri' in these words, "The dictionary Zufangoya wa Jahanpoya, also known as Of Seven Parts, composed by Badruddhin (8). Till the discovery of the manuscript of the dictionary 'Zufangoya', this information was the only one surviving evidence giving the name of the author of 'Zufan-goya'.

Reference to this dictionary in the European literature is limited to short notices in the work of H.Blochmann (9) and in the work of C.Salemann(10) who mention the name of the dictionary 'Zufangoya' on the basis of its mention in 'Farhang-i-Jahangiri'. However, Salemann proposed that the dictionary 'Zufangoya' was composed before 822/1419 and Bloch-mann was inclined to put this date to still earlier period.

Indian Philologist, Professor of Aligarh University, Dr.Nazeer Ahmad in his paper dealing with early Persian dicti-onaries like Farhang-i-Fakhr-i-Kavvas(11) and 'Dastur-al-Afazil'(12) notes that 'Zufangoya wa Jahanpoya was composed before 837/1433, basing himself on the fact that 'Zufangoya wa Jahanpoya' was used as one of the sources for the Persian dictionary 'Bahr-al-Fazail', whose date of composition accord-ing to Nazeer Ahmed is 837/1433(13).

The dictionary 'Zufangoya' is mentioned as a source in

C.K.Bayafski

Translated by Dr.Javed Ashraf
Jawaharlal Nehru University
New Delhi.

Zufan i-guya wa Jahan i-puya

Date and Composition

Early Persian Lexicographical literature (11th-14th centuries) is represented in our times by isolated monuments. First Persian language dictionary, that has come to us, is the well known 'Lughat-i-Fars' of Asadi Tusi, composed roughly in about 457 A.H./1065 A.D.(1). Out of the Persian dictionaries of 12th-13th centuries, unfortunately none has been preserved (2). From 14th century only a few dictionaries have come to us, that too as a rule, in rare copies. Out of these, two are composed by Shams-i-Fakhri Isphani in 744 A.H./1343-44 A.D.(3) and 'Sihah-al-Fars' by Mohammad Ibn Hindushah Nakhchivani (date of compilation 728 A.H./1328 A.D.)(4). Out of dictionaries known only through their reference in manuscripts one can mention 'Farhang-i-Furs-i-Kavvas (701/1301) and 'Dastur-al-Afazali' (743 A.H./1343 A.D.).

Alongwith this, on the basis of references given in the monuments belonging to later period we may find references

During the entire medieval period, social gradation cut across the distinction between Hindu and Muslim. Poor Muslims were in the employment of rich or affluent Hindus, and vice versa. Muslim rulers and feudal lords ruled over and commanded the genuine loyalty and admiration of their subjects, Muslim and Hindu alike, and vice versa. Muslim rulers had enemies or rivals among the Hindus, and vice versa. Friends and foes did not belong to any religton or caste, nor did creditors and debtors. There were business and industrial partnerships between Hindus and Muslims who took the same risks and shared the same gains or losses. The common man, be he a Hindu or Muslim, had the same grievances against the Patwari. the Kotwal, the Sahukar' the 'Qazi', the aristocrat, the burglar, the artisan, the prostitute, who could be either Hindu or Muslim. And so on.

The best commentary on the tolerance and functional secularism of medieval India is provided by the growth of a common or composite culture reflected in the regional languages, architecture, painting, music, dress, entertainments, amusements, proverbs, folklore and folk-religions of India.

expanding group was played by the Arabs, Turks, Mongols. In the modern era the role was taken over by the Europeans.

It is also worth mentioning that the social paradigm of "Muslim aggressor' and 'Hindu victim' (even if it were to be accepted, to begin with) breaks down after the first few episodes, since the aggressors and their victims no longer beloged to different religious groups. To give only a few examples of how the struggle for power and wealth cut across religious or racial distinctions, Babar fought against the combined forces of Ibrahim Lodi and Rana Sanga, Humayun struggled against Sher Shah, and both these contenders for supremacy had allies or supporters from both Hindus and Muslims. The power of the great Mughals flowed from a firm alliance between them and the Rajputs. The victims of Mughal imperialism or expansion were Muslim kingdoms no less than Hindu. The Hindu rulers of south India continually fought against each other even as the Rajas in the northern region before the advent of the Muslims. The entire artillery of Sivaji was manned by Muslims. The victims of Sivaji's lootings of the prosperous port of Surat were Hindus no less than Muslims, even as were the victims of the invasions by Nadir Shah and Abdali.

According to the Hindu Dharmshastras, every king or ruler was duty-bound to enlarge his dominions and fighting was the highest duty of the warrior caste. Territorial expansion was not evil so long as the ruler could win in battle and rule justly over his subjects in accordance with the Shastras. The Rajas fought, won or lost, but the Praja," unmindful of the race or religion of the contenders for power, pursued their own peacefull vocations of life the 'purusharthas'. This social ethic was also applied to the Muslim rulers when they came on the scene. The Hindu populace, in general, did not grudge Muslim rule, provided the ruler did not interfere in his Dharma. The legitimacy of the ruler was not determined by or dependent upon his religion or race, but flowed from his victory in battle or the struggle for power. Such has been the basic social and political ethic of Bharat from times immemorial. Communalism, in the modern Indian sense of the term, was unknown earlier and emerged during British rule.

Coming to later times, exactly the same remarks apply to the shifting alliances and endemic warfare between the decadent Mughals, rising Marhattas, Rajputs, Pathans, Jats, Sikhs, Rohillas and others, all of whom got sucked into the vortex of the power struggle following the sudden collapse of the great Mughal empire soon after the death of Aurangzeb.

In the southern region, Tipu Sultan (d. 1799) emerged as the hero, alike of Muslims and Hindus, of Mysore (present Karnataka). The Nizam of Hyderabad emerged as the ruler over a mixed poulation whose loyalty never wavered till the very end of the British period. However, the Muslim rulers of Mysore and Hyderabad ever remained on opposite sides in the drama of the Indian struggle against British sumpremacy.

Coming to our own times, the semi-independent princely states, Gwalior, Indore, Baroda, Jaipur, Patiala, Kapurthala, etc., all ruled by Hindu or Sikh rulers, gave liberal patronage to Muslims of ability and integrity who rose to highest positions of power and trust in the state.

In conclusion, a few comments on the proper interpretation of medieval Indian history would be in order. As is well know, Mahmud Ghaznavi (d. 1030) attacked India several times in the 10th century, Muhammed Ghori invaded and conquered North India in the 12th century. Babar in the 16th century, and Nadir Shah and Ahmad Shah Abdali again invaded the country in the 18th century, and all these attackers or conquerers were Muslim. But it would be a totally perverse view to hold that the above historical processes were instances of Islamic agression against Hinduism. All the above events flcwed, essentially, from the struggle for ascendancy by rising and expanding groups at the expense of older and defensive groups, more or less on the decline, in terms of general human creativity and vigour. This has been the perennial rhythm of world history. In the ancient period, the creative and expanding groups were the Aryans, the Iranians, Greeks, Romans and Chinese, while in the medieval period the role of the creative

non-Muslims. While Aurangzeb did demolish a few temples, he endowed many more in different parts of the country. The plain truth is that both actions were motivated by political and administrative rather than religious considerations. The same remarks apply to the Emperor's dealings with the Sikhs and the Marhattas. It is significant that Aurangzeb did not hesitate to demolish a mosque at Golkunda for the same reasons.

The history of the several independent regional Muslim kingdoms in the medieval period, prior to their incorporation into the Mughal empire, also points to the tolerant character of the Sultans and of the functionally secular motivation of their policies and conduct of public affairs. Zaynul Abidin (d.1470) of Kashmīr, the most illustrious ruler of the region, was admired and loved by all Kashmiris, irrespective of their religion. He was the patron of Sanskrit no less than of Persian, of the Sant no less than of the Sufi. Husayn Shah (d. 1519) of Bengal played a similar role in the eastern region. His example was later on followed by the great Sher Shah (d. 1545) whose enlightened religious liberalism and administrative reforms are still remembered by all Indians, Hindus and Muslims alike.

In the southern region, the Bahmani Sultan, Tajuddin Feroze (d. 1472) gave preference to Dakhnis in state employment, irrespective of religion. His confict with the neighbouring Hindu Raja of Vijaynagar was purely political. Mahmud Gawan (d. 1481), the illustrious Prime Minister of the Bahmani Kingdom followed the same policy. The Sultans of Golkunda and Bijapur and the rajas of Vijaynagar entered into pacts or fought among themselves in their own respective political interests, as they saw them, quite irrespective of their religious affiliations. Ibrahim Qutb Shah (d. 1580) of Golkunda greatly patronised Telegu culture, endowed Hindu temples and even discontinued the 'jizya'. Vijaynagar thought it fit, in its own political interests, to play one Muslim kingdom against, the other. This game went on until Vijaynagar's eventual defeat in 1565. During this protracted period of shifting alliances, the Muslim ruler of Bijapur sought the help of the Raja of Vijaynagar against the Muslim kingdom of Ahmadnagar. In short. political, rather than religious considerations, were the *leitmotif* of the actors concerned.

persecution of Hindus and Sikhs. Incontrovertible historical evidence is increasingly piling up with the passage of years, thanks to objective and rigorous methods of research by Indian and western scholars. to expose the fallacy of the above exteme views.

It is clear that Akbar's chosen self-identity was Islamic and he was also regarded by his subjects (both Muslim and non-Muslim) as a Muslim ruler, It is also clear that Aurangzeb continued to enjoy the unquestioned loyalty and active support of a sizeable section of the Rajputs till the very end of his long reign. Aurangz eb's declared policy and practice were to employ efficient and honest persons, irrespective of religion or caste. The perce ntage of non-Muslims amoung high ranking mansabdars, no less than among lower or middle rank revenue officers, was higher in the time of Aurangzeb as compared to Akbar. Aurangzeb's Deccan and Marhatta policies were not dictated by religious, but rather by economic and political considerations, even as his fight againsr his father and brothers was not an exercise in Islamic piety but rather a vigorous search for power. His brothers also sought power, but they lost, while Aurangzeb won. This is not to say that differences in outlook did not exist. But they were not the crucial factor in the motivation of the contenders for power of their respective supporters from among the classes and the masses. If Dara was poetic and speculative Aurangzeb was puritanical and legalistic; if Dara came under the spell of the Upanisads, Aurangzeb remained in the grip of the *shariat*; if Dara stood for the essential unity of all religions and the universality of salvation, on the basis of good deeds, Aurangzeb stood for Islamic ethnocentricity. But the point is that religious bigotry was not the crucial factor in the motivation of Aurangzeb who was far from being an evil tyrant and temple-destroyer. His failure lay in the field of political insight and religious vision, rather than in religious persecution or hatred of non-Muslims. The reimposition of the 'Jizya', discriminatory tax structure for excise and customs duty, discouragement of music and other art forms and continuing wars of expansion were misconceived and harmful policies, not acts of hostility against

The policy of 'functional secularism' reached its ful fruition and was sought to be transformed into a basic political principle, as it were, in the time of Akbar. Going beyond mere practical prudence, Akbar sought to bring about complete equality of status and of opportunity between his subjects, and also emotionally integrate Hindus, Muslims and others into one larger Indian family. Akbar's abolition of the 'Jizya' in 1564 (eight years after his accession to the throne) was the most significant reform or innovation, both psychologically and doctrinally, to bring about the desired emotional integration. However, from the purely fiscal or economic angle, the abolition of this discriminatory tax on non-Muslims did not amount to much. 'Jizya' was in lieu of the obligatory wealth-tax (*zakat*) which was a religious duty imposed on all Muslims having surplus wealth at the end of the year. Now whatever the theory of 'jizya' may have been, in practice, it was an exclusive tax on the non-Muslims, while the '*zakat*' was an exclusive tax on the Muslims, and the latter tax could far exceed the quantum of 'Jizya' paid by non-Muslims. Moreover, several categories of non-Muslims were exempt from the said tax. The discrimination involved was thus more formal rather than economic. Nevertheless, the discriminative nomenclature must have bred psychological distance between the two categories of tax assesses. And Akbar's administrative intuition and political insight led him to bring all his subjects on par, legally, administratively and fiscally. Unfortunately, Akbar's well-intentioned and farregchicg vision was misinterpreted by many of his Muslim contemporaries as a repudiation of Islamic *shariat*, or as a sinister move to impose a new religion in place of Islam. The coining of the term 'Din-e-Ilahi' and the over-enthusiasm of some of the Emperor's courtiers (for reasons more politically selfish than spiritual) conspired to give a semblance of truth to the above mentioned misinterpretation of Akbar's religious liberalism as the downright repudiation of Islam or as sheer political opportunism. This misinterpretation still persists, especially among those who glorify the achievements of Aurangzeb, and hold that he saved Islam from being totally destroyed by the follies of Akbar and Dara Shukoh. Numerous non-Muslims, on the other hand, condemn Aurangzeb for his supposedly religious fanaticism and

composition from the Muslim side. The upper class families of Turkish, Pathan, Turanian and Iranian descent looked upon themselves and were also looked upon by the rulers as the natural claimants or incumbents for higher positions of prestige and power,and even the Muslims of pure Indian origin had to struggle against stiff competition from nobles originating from the Islamic heartland, as it were.

The Hindu princes and chieftains who accepted the suzerainty of the central power were accorded high honour, retained their thrones and exercised vast powers, military and civil, in their own extensive territories under the feudal system. There was a common civil law of the land, apart from personal laws which were not interfered with. The law of the land was heavily influenced by the *shariat,* but the sovereigns claimed and exercised discretionary powers in all worldly matters. The sovereigns, firmly and consistently repudiated the claim of the Islamic jurists that the jurisdiction of the *shariat* was all embracing.

The sultans and emperors, with the sole exception of Akbar, did not presume to reinterpret Islam, but merely followed the policy of 'functional secularism'. This, in effect, amounted to a pragmatic separation between the jurisdication of the state and of religion without formally raising technical religious or doctrinal issues, such as the status of India as 'dar ul Islam', or the de jure authority of the *khalifa* over India, and so on.

Many theologians and jurists dirapproved of the above mentioned pragmatic approach of the sultans who, however, persisted in their de facto functional secular approach. The rulers got moral support from sufi saints who were, in general, inclined to religious liberalism and humanism and were also more in touch with the populace, Muslim as well as Hindu. Indeed, there was a measure of tension (which persists till today) between the humanism of the sufi and the legalism of the jurist or the theologian. The best Urdu and Persian poets in India and elsewhere express this tension and exalt the spiritual ecstasy of the sufi while decrying the empty legalism of the *mulla.*

As prudent statemen, the sultans and emperors adopted a policy of non-discrimination against their Hindu subjects who constituted the overwhelming majority. This fact rather than sheer force or the supposed degradation of the Hindus helped sustain Muslim rule in medieval India for successive centuries. The overwelming majority of the Hindus did not look upon Muslim sovereigns as foreign tyrants, or the Muslim nobility and the military as agents of exploitation of the tyrant concerned. The king or the ruler, no matter what his race or religion, was given all love and loyalty, so long as he was victorius in the battlefield. The Hindu populace, no matter what it might have thought at the time of the very first confrontation with the Turk or the Pathan invaders, soon came to look upon the Muslims as a warrior caste, one among the serveral castes forming the rich mosaic of Indian society. There is no doubt that when the Muslims settled down in the land of their conquest, they became in their own eyes no less than in that of the Hindus, an integral part of the already much mixed population. True, intermarriage between the Muslims and the Hindus was an unthinkable proposition. But so was intercaste marriage within the Hindu fold as such. The significant point is that the vast majority of the Indian Muslims were ethnically of Hindu stock. The weaker and socially handicapped segments of an extremely hierarchial Hindu society, bedevilled by caste taboos, had found new hopes of vertical mobility under the umbrella of Islamic social egalitarianism. In addition, Islam being the creed of the ruling class, it offered extra avenues of political power.

The sovereigns (with just one or two exceptions) treated Hindus and Muslims with paternalistic impartiality. The Hindu populace enjoyed full freedom of belief and of conscience, and were free to carry on their individual and social life just as they chose. There was absolutely no state interference in matters religious, cultural, and social. Agriculture, industry, the bulk of the trade and administration (at the lower and intermediate levels) remained in the hands of the Hindus who, however, also had access to assignments at the highest level. But at this level their proportion was considerably less because of intense

scholars to wrong conclusions regarding the actual state of affairs in medieval India. These scholars tend to ignore the fact that the Sufi approach to the problem of tolerance was quite different.

Sufis, in general, are known for their ethics of tolerance and universal love and the doctrine of the essential unity of all religions and the oneness of the human family, notwithstanding diversity of symbols and forms. Some of the Sufi utterances, really, cut so deeply into the traditional fabric of religious belief as to invite the charge of misunderstanding or blasphemy. Though the great Sufis did attract people to Islam through their elevated moral and spiritual status, their emphasis was upon inner purification of the soul rather than upon conversion to Islam. It is highly significant that Muslim soverigns were attracted more to the Sufis than to the theologians.

The point at issue has a great relevance to our own times. It is well known that several Hindu quarters are openly hostile to the non-Hindu segment of the Indian people. Now the spoken and written words emanating from such quarters should not make the impartial observer of the Indian scene today infer that the government of the day actually practice what the Hindu communalists desire or recommend, The declared wishes or inner attitudes of a particular section of the people should not be equated with the actual policy and practice of the government of the day. Unfortunately, this is, precisely, what some scholars, politicians and religious leaders do when they bemoan the plight of Hindu society under Muslim rule in the medieval period.

No matter what some custodians of the *shariat* may have thought, the Muslim rulers of medieval India refused to mix religion and politics and followed a policy which may aptly be called 'functional secularism'. Like rulers, in general, Muslim rulers were more interested in saving their own thrones rather than in saving the souls of others. When things do not go their way, rulers often turn to spiritual help or support from religious sources and symbols. But then this is merely a recipe in times of adversity, not the staple food, for rulers.

the eternity of the Quran. Mamun, reputed for his great contrbution to culture and learning, sought to impose his own *Mutazalite* view upon the *Asharite* theology of the great jurist. Ironically, Muqtadir reversed the position and persecuted the *Muatazalites*, expelling them from public office. Self-appointed censors invaded homes and burnt objectionable literature. Under Mustanjid, the writings of Ibn Sina were burnt in 1150. In 1192 Abdus Salam, the noted scholar of Baghdad, was accused of atheism and his library was burnt. The persecution of the great mystic, Mansur Hallaj (d. 922) is well known.

Notwithstanging the above, the Muslims in history have shown far greater tolerance than the Christians or Jews in the same period. All impartial historians, including reputed non-Muslim scholars concede the atrocious behaviour of the Christian crusaders towards the Muslims and Jews in the territories the crusaders had temporarily conquered from the Arabs and which remained under Christian rule for an interrugnum of approx. 80 years. The defenders of the Cross unleashed a reign of terror and incredible brutality, not only against the non-Christians of Palestine, but against the local fellow Christians themselves who were far happier under Islamic rule than under the Cross.

THE PRACTICE OF TOLERANCE IN MEDIEVAL INDIA

Let us now review the practice of tolerance in medieval India. We should avoid drawing hasty and sweeping conclusicns from selective views and attitudes and take the totaliy of facts into account. We would be guilty of 'simplism' if we were to give undue significance to the views of a section of the *ulama* who bemoaned the friendly relations between Muslims and non-Muslims and the power and position of Hindu nobles and top administrators, on the ground that the *shariat* (as interpreted by them) prohibited friendly intercourse between Muslims and the polytheists. Some theologians were not even averse to the permissibility of coercion for saving the souls of heathens, even as a doctor may forcibly administer a bitter medicine for the patient's own good. The expression of such ideas in the writings of some Muslim divines has led some historians and

Abbasid Caliphs appointed Christians as Viziers (Prime Ministers), Ibn Sa'id Yaqut being the most famous. The Caliph Muttaqi (d.944) had a Christian Vizier. Caliph Mutazid (d.902) appointed a Christian as the head of the war office, and a Jew, Muhammad bin Ubaidullah, as the Vizier. The Fatmide Caliph, Aziz (d.996) appointed a Jew, Yaqub bin Killis, as the Vizier. Eventually, Yaqub became a Muslim. Aziz later appointed Isa bin Nestorius, a Christian, as a Vizier. The head of the Babylonian Jews in Baghdad was greatly venerated by the Muslims who viewed him as the direct descendant of David.

Abdur Rahman I (d. 788) of Muslim Spain continued the liberal tradition of the Damascus Caliphate. Hakam I (d.822), was opposed to the mixing of religion with politics. and stood for restricting the *shariat* to purely religious matters, Abdur Rahman II (d.852) showed the utmost tolerance to Christians who wielded great power in society. Abdur Rahman III (d.961). the greatest of all the Caliphs of Muslim Spain and one of the greatest rulers of the world, continued the liberal tradition at Cordova. Spain produced a gallaxy of poets, thinkers scientists, historians, artists. architects, manufacturers who came from among the Jews and the Christians, no less than Muslims, and made a permanent contribution to the sum total of human civilisation and culture. The Ottomon Caliphs of Turkey also practised the same liberal tradition, throughout their very extensive multi-racial and muli-religious empire. The Jews and Christians (both Catholics and protestants) were given the highest posts in the realm and even dominated the industrial and commercial life of the state. Even the personal body guard of the Caliphs called the Jannisaries were Christians.

Coming to the dark side of the picture, several Caliphs (no matter what their other qualities and good points) deviated, in varying degrees, from the Islamic doctrine of tolerance, and discriminated against non-Muslims and some even persecuted doctrinal dissent within the fold of Islam itself. The most striking case of persecution of doctrinal dissent within Islam is Mamun's prolonged presecution of the great jurist, Imam Ibn Hanbal, concerning the theological doctrine of

rawn out affair extending to almost two centuries in Syria, Iraq, 'an, Egypt and other places. The Zoroastrians of Iran who ıigrated to India (and who came to be known as 'Parsis') on the lleged ground of persecution were only a tiny fragment of the 'anian population, the majority of which stayed behind, radually taking to Islam. In a slow and prolonged process of ultural inter-action between the ancient and rich culture of the ranians, and the Quranic and semitic concepts represented by he Arabs, several elements of Iranian thought and culture ıecame an integral part of the growing Islamic tradition. The ame process was repeated later on in India, and subsequently, ı Malaysia and Indonesia, with respect to their pre-Islamic anskrit cultures.

The Prophet himself had set the tradition of tolerance nd of inter-religious dialogue from the very beginning. On being orced to migrate to Medina, the Prophet's agreement with the ocal residents stipulated mutual friendship and aid for all citizens, respective of their religion. Political expediency and breach of olemn promises by the Jews impaired the inter-religious olidarity, friendship and harmony visualised by the Prophet. ndeed, the burden of the Prophet's Islamic message lay in contiuity of the great Semitic tradition of the Jews as well as the hristians. The friendly relations between the Prophet and the mperor of Ethiopia are well known.

Caliph Umar refused to pray inside the Christian Church t Jerusalem (despite requests by the Christians) lest this rovide an excuse, later on, for its conversion into a mosque. mar also had the sagacity and the moral courage to prohibit ıe Arab conquerers of Egypt from displacing the local farmers om their fertile lands in the Nile valley.

Coming to the Ummayad period we come across numeıus instances of harmonious relations and friendship between luslims and non-Muslims. The wife of Caliph Muawiyah 1. 680) was a Christian, as also his secretary of finance. Alasri, governor of Iraq, under Caliph Hisham (d. 743) built a hurch at Kufa to please his mother who was a Christian. isham also appointed Zoroastrians to public office. The

movement, we would, in either case, be reductively simplifying a complex historical phenomenon.

The expansion of Arab power was the result of successful aggression against neighbouring states. In this sense, therefore, the Arabs were not tolerant. But once the power of the Caliph was established, on the basis of victory in battle or through voluntary submission, in the face of superior military might, the Arab Muslims immediately put the Islamic doctrine of tolerance into practice. The people in the conquered territory were invited to accept Islam and become partners, enjoying equal rights, in the task of world-Islamisation. Failing this, they could live and carry on their normal activities as *'dhimmis'*, protected non-Muslims living in an Islamic state. Though the *'dhimmis'* had a lower status, it was certainly not a lowly status or a mere euphemism for slavery. In any case, there was no recourse to forced conversion of the conquered people. It is, precisely, in the treatment meted out to the *'dhimmis'* that Islamic tolerance came into full play. It may be held that Islamic tolerance falls short of the modern idea of tolerance implying complete equality of status, irrespective of religion, Yet, both in theory and practice, the Arab conquerers committed to Islam were ahead of the times in regard to humane rules of war, treatment of prisoners and of subjugated people who were unwilling to embrace Islam. Historians of repute, including eminent non-Muslim scholars, testify to the above.

The *'dhimmis'* had an honourable place in every sphere of life. Short of becoming the head of state, they rose to positions of eminence in the service of the state, business. industry, commerce, banking, medicine and the pursuit of learning. In the course of time, the majority of *'dhimmis'* got converted to Islam. But this was certainly not the result of force but of social psychological, political and ideological factors. The great achievement of the early Muslims and Islamic creativity in almost every field of human endeavour genuinely moved millions of Christians, Jews and others to embrace the new faith, as had happened earlier in the case of Christianity and Buddhism.

The process of formal conversion to Islam was a long

religion does so. The Islamic tradition permits marriage between Muslim men and non-Muslim women belonging to the 'people of the book' (*ahl-e kitab*). Muslim women are, however, not permitted to marry non-Muslim men. The 'people of the book' meant, in practice, only the Jews and the Christians, to begin with. Later on the Zoroastrians were also included, but not other religious groups.

ISLAMIC TOLERANCE IN PRACTICE :

The Islamic doctrine of tolerance found the fullest expression in the practice of the Prophet and the pious Caliphs, The Ummayad and Abbasid Caliphs also practised tolerance in the vast regions which gradually became a part of the Islamic Commonwealth, The term 'practice' should, however, be taken to mean 'usual behaviour' rather than 'invariable behaviour'.

The Prophet had brought about the political unification of the Arab tribes shorly before his death, This great achievement represented the combined victory of Arab nationalism over centrifugal tribalism, as also of Islam as the revised version of ancient Judaism and Christianity. The hitherto camel-drivers, petty traders and free-booters of the desert, emerged from the back-waters of history, on the world-stage of history. The almost unbroken chain of military victories against the then super-powers inevitably fostered a new self-image of the Arab emerging elite. In this self-image were inextricably mixed Arab nationalism and faith in Islam, as the final world religion—the completion of God's favours and blessings on mankind. Gushing springs of self-assertion and valour, born from the fusion of Arab pride and Islamic commitment, burst forth from the arid deserts of Arabia, taking the world by storm, as it were. The incredible momentum of the Arab-Islamic revolution of the 7th. century has, historically speaking, not yet been surpassed in the annals of world history. Arab expansion was the result of neither pure racial imperialism, nor of pure Islamic missionary zeal, but rather an inextricable combination of both. If we look upon the Arab expansion as nothing but territorial aggrandisement, or as nothing but a spiritual or missionary

doctrines are much later developments and have no place in the Quran or in the practice of the Prophet and the pious Caliphs.

DAR-UL-ISLAM & DAR-UL-HARB (LANDS OF ISLAM & LANDS OF WAR) :

The Islamic doctrine of tolerance presupposes the division of the world into the land of Islam and of non-Islam, and the desirability or duty of the entire world becoming the land of Islam, under the Fatherhood of God and the prophethood of Muhammad, and finally the duty of the Muslims to work for the consummation of the above ideal. The traditional Islamic doctrine affirms a state of continuing conflict between Islam and non-Islam. However, there is room, on a temporary basis, for a transitory truce, no-war pacts, or treaties of mutual aid. The sanctity of contracts and promises is greatly stressed by Islam as is the duty to be just and fair to all human beings, irrespective of their religion. Islamic jurists were the first to frame a code of conduct for Muslim participants in war and also for Muslims living in the land of non-Islam.

RESPECT FOR PLACES OF WORSHIP :

The Islamic doctrine of tolerance categorically prohibits desecrating any place of worship, or forcibly using it for Islamic worship, However, the Prophet did remove the idols from the *Ka'ba* at Mecca on the ground that the *Ka'ba* was, originally, a mosque built by Abraham. The Prophet viewed the 'cleansing' of the *Ka'ba* from idols as the restoration of a monotheistic place of worship to its original status. This is a solitary instance of a house of worship having been 'cleansed' in the life of the Prophet or the pious Caliphs. Syria was conquered during the caliphate of Abu Bakr, Iraq, Iran and Egypt during the caliphate of 'Omar, and Khurasan during that of 'Usman. No expansion took place during the caliphate of 'Ali. The combined period of the pious Caliphate amounts to approximately 30 years. and during this entire period no place of worship was desecrated, nor any icon destroyed or any encouragement given to iconoclasm.

PERMISSIBILITY OF INTER-RELIGIOUS MARRIAGE :

A unique feature of the Islamic doctrine of tolerance is that Islam permits inter-religious marriage, when no other

territory became part of 'the land of Islam' (*dar ul Islam*) those inhabitants who were not willing to embrace Islam, though willing to give up fighting (open as well as concealed) were entitled to full protection of life and property and to freedom of belief and of practice of their religion, and the carrying on of their normal means of livelihood, provided they paid *'jizya'*, a special discriminatory tax on an annual per capita basis. Women, children, the aged and the infirm were exempted.

The concept of the *'jizya'* was patterned after the ancient practice in Iran and fully harmonised with the spirit of the times. The logic of *'jizya'* was that it was a substitute tax in lieu of *'zakat'* which was obligatory upon Muslims alone. Moreover, defence of the state against external attack was also obligatory upon the Muslims but optional for the *'dhimmis'*. *Dhimmis* who opted for military or defence purposes got exemption from the *'jizya'*, just like the Muslim citizens. It is significant that without the *'jizya'* the economic liability of the Muslims would have exceeded that of the *'dhimmis'*. In fact the *'jizya* kept both categories on par, in economic terms. Moreover, the Islamic establishment actually protected the *'dhimmis'* against the land hunger of the Muslims themselves. In short, in actual practice, the *'jizya'* was not a penal tax. but merely a more or less functional substitute tax for a class of people, the non-Muslim citizens, who, by definition, could not attract all the rights and obligations associated with Islam. but wished to live in the land of Islam.

The *'dhimmis'* were not subject to any humiliating dis-abilities, either in theory, or in practice, mentioned in the so called'Compact of 'Omar'. This document is attributed to the great Caliph 'Omar'. Modern research (thanks to the labours of reputed Western scholars, no less than Muslims themselves) has exploded the myth of the so called compact. 'Omar II (d. 702), the Ummayad Caliph, who came on the scene more than half a century after the pious Caliph 'Omar, did put some restri-ctions upon the *'dhimmis'*. and, subsequently, some jurists did adopt a discriminatory approach against non-Muslims. But even 'Omar II did not issue any Compact at all, and he should not be held respingly for some subsiful juristic excesses. These

will never pardon them, nor will He guide them unto a way. (an-Nisa, 4: 137)

O ye who believe ! whoso of you becometh a renegade from his religion, (know that in his stead) Allah will bring a people whom He loveth and who love Him, humble toward believers, stern toward disbelievers, striving in the way of Allah, and fearing not the blame of any blamer. Such is the grace of Allah which He giveth unto whom He will. Allah is a All-Embracing, All-Knowing. (al-Maidah. 5:54)

The above verses certainly do not lend themselves to the traditional Islamic sanction of death to the apostate.

APOSTASY :

Apostasy became a major issue after the death of the Prophet when some Arab chieftains who had earlier accepted the Prophet's call to Islam decided to repudiate Islam or the authority of the successor to the Prophet. It seems that two logically distinct issues, namely, repudiation of the Islamic creed proclaimed by the Prophet, and repudiation of the political authority or supremacy of the successor, to the Prophet were intertwined in the historical developments after the passing away of the Prophet. In other words, the ideas of apostasy and of rebellion were compresent in the response of the Arab chiefs concerned. The Islamic establishment deemed rebellion to be punishable by death without going into a depth analysis of the total situation. Had this been done at that early stage, the founding fathers of the Islamic jurisprudence may well have arrived at a distinction (valid and essential for the modern mind) between the repudiation of a religious commitment and the repudiation of political supremacy. Perhaps, it was extremely difficult for the persons concerned to make this distinction between apostasy and rebellion. In any case, the two were (most probably) mixed motivationally and functionally. And the law provided a common penalty for two human responses which, in the ultimate analysis. are qualitatively quite different from each other.

THE STATUS OF DHIMMIS :

The Islamic doctrine of tolerance prohibited force as an instrument of conversion. The doctrine held that once a

Allah forbiddeth you only those who warred against you on account of religion and have driven you out from your homes *and helped to drive you out, that ye make friends with them* (All) such are wrong-doers. (al-Mumtahanah, 60:7-9)

O ye who believe ! The idolaters only are unclean. So let them not come near the Inviolable Place of Worship after this their year. If ye fear poverty (from the loss of their merchandise), Allah shall preserve you of His bounty if He will. Lo ! Allah is knower, Wise. (al-Bara'at. 9:28)

He it is who hath sent His messenger with the guidance, and the Religion of Truth, that He may cause it to prevail over *all religion, however much the idolaters may be averse.* (al-Taubah, 9:33)

And whoso seeketh as religion other than the Surrender (to Allah), it will not be accepted from him, and he will be a loser in the Hereafter. (Al-i-Imran, 3:85)

A person who has an open mind and who reads the above two sets of Quranic verses, in their proper context, would, most probably, *say that the Quran preaches tolerance in the modern sense of the term. However, the traditional Islamic* interpretation, is different. According to the traditional interpretation, the clear and categorical Quranic text 'there is no compulsion in religion', and several other verses mentioned above, imply *merely* the prohibition of conversion by force. But this prohibition does not rule out the death penalty for apostasy, according to the *Shariat*. In other words, while use of force for conversion to Islam is prohibited, use of force is not deemed to be *evil and abhorrent for preventing a Muslim from going* over to another faith. Thus, Islamic jurists of all schools declare that once a person accepts Islam, he forfeits the freedom to repudiate his allegiance to Islam. Should he do so, he attracts the death penalty. But there appears to be absolutely no warrant for this extreme view in the relevant verses of the Quran. The Quranic verses are as follows :

Lo ! those who believe, then disbelieve and then (again) believe, then disbelieve, and then increase in disbelief, Allah

O ye who believe ! Choose not disbelievers for (your) friends in place of believers. Would ye give Allah a clear warrant against you ? (an-Nisa, 4 : 144)

O ye who believe ! Take not the Jews and Christians for friends. They are friends one to another. He among you who taketh them for friends is (one) of them. Lo ! Allah guideth not wrong-doing folk. (al-Maidah, 5 : 51)

O ye who believe ! choose not for friends such of those who received the Scripture before you, and of the disbelievers, as make a jest and sport of your religion. But keep your duty to Allah if ye are true believers. (al-Maidah, 5:57)

O ye who believe ! choose not your fathers nor your brothern for friends if they take pleasure in disbelief rather than faith. Whoso of you taketh them for friends, such are wrong-doers. (al-Bara'at, 9:23)

Then, when the sacred months have passed, slay the idolaters wherever ye find them, and take them (captive), and besiege them, and prepare for them each ambush. But if they repent and establish worship and pay the poor-due, then leave their way free. Lo ! Allah is Forgiving, Merciful. (al-Bara'at, 9:5)

It may be that Allah will ordain love between you and those of them with whom ye are at enmity. Allah is Mighty, and Allah is Forgiving, Merciful.

Allah forbiddeth you not those who warred not against you on account of religion and drove you not out from your homes, that ye should show them kindness and deal justly with them Lo ! Allah loveth the just dealers.

When they listen to that which hath been revealed unto the messenger, thou seest their eyes overflow with tears, because of their recognition of the Truth. They say : Our Lord, we believe. Inscribe us as among the witnesses. (al-Ma'da, 5 : 83)

Those unto whom we gave the Scripture before it, they believe in it.

And when it is recited unto them, they say : we believe it. Lo ! it is the Truth from our Lord. Lo ! even before it we were of those who surrender (unto Him). (al-Qasas, 28 : 52-53)

- Here are those Quranic verses which, prima facie, contradict the spirit of humanisn, but which do not really negate tolerance (as explained earlier) when their historical context is understood :

Let not the believers take disbelievers for their friends in preference to believers. Who so doeth that hath no connection with Allah, unless (it be) that ye but guard yourselves against them, taking (as it were) security. Allah biddeth you beware (only) of Himself. Unto Allah is the journeying.

(al-i-'Imran, 3 : 28)

O ye who believe ! Take not for intimates other than your own folk, who would spare no pains to ruin you; they love to hamper you. Hatred is revealed by (the utterance of) their mouths, but that which their breasts hide is greater. We have made, plain for you the revelations if ye will understand.

(al-i-'Imran, 3 : 118)

Those who choose disbelievers for their friends instead of believers, do they look for power at their hands ? Lo ! all power appertaineth to Allah. (an-Nisa, 4 : 139)

They long that ye should disbelieve even as they disbelieve, that ye may be upon a level (with them). So choose not friends from them till they forsake their homes in the way of Allah; if they turn back (to enmity) then take them and kill them wherever ye find them, and choose no friend nor helper among them. (an-Nisa, 4 : 89)

And for every nation have we appointed a ritual, that they may mention the name of Allah over the beast or cattle that He hath given them for food; and your God is one God, therefore surrender unto Him. And give good tidings (O Muhammad) to the humble. (al-Hajj 22 : 34)

Unto each nation have we given sacred rites which they are to perform; so let them not dispute with thee of the matter, but summon thou unto thy Lord. Lo ! thou indeed followest right guidance. (al-Hajj 22 : 67)

Say : O people of the Scripture ! Ye have naught (of guidance) till ye observe the Torath and the Gospel and that which was revealed unto you from your Lord. That which is revealed unto thee (Muhammad) from thy Lord is certain to increase the contumacy and disbelief of many of them. But grieve not for the disbelieving folk. (al-Mai dah, 5 : 68)

Let the People of the Gospel judge by that which Allah hath revealed therein. Whoso judgeth not by that which Allah hath revealed, such are evil-livers. (al-Ma'idah, 5 : 47)

Naught is said unto thee (Muhammad) save what was said unto the messengers before thee. Lo : thy Lord is owner of forgiveness, and owner (also) of dire punishment.

(Ha-M m, 41 : 43)

Whoso bringeth a good deed will receive tenfold the like thereof, while whose bringeth an ill deed will be awarded but the like thereof, and they will not be wronged.

(al-An'am, 6 : 161)

And Lo ! of the People of the Scripture there are some who believe in Allah and that which is revealed unto you and that which was revealed unto them, humbling themselves before Allah. They purchase not a trifling gain at the price of the revelations of Allah. Verily their reward is with their Lord, and lo Allah is swift to take account. (al-i-'Imrah, 3 199)

Lo : this your religion, is one religion, and I am your Lord, so worship me.

And they have broken their religion (into fragments) among them, (yet) all are returning unto Us.

Then whoso doth good works and is a believer, there will be no rejection of his effort. Lo ! we record (it) for him.

(al-Anbiya, 21 : 94)

Say : Obey Allah and obey the messenger. But if ye turn away, then (it is) for him (to do) only that wherewith he hath been charged, and for you (to do) only that wherewith ye have been charged. If ye obey him, ye will go aright. But the messenger hath no other charge than to convey (the message) plainly. (an-Nur, 24 : 54)

Remind them, for thou art but a remembrancer, Thou art not at all a warder over them. (al-Ghashiyah, 88 : 21, 22)

And they say : None entereth Paradise unless he be a Jew or Christian. These are their own desires. Say : Bring your proof (of what ye state) if ye are truthful. Nay, but whosoever surrendereth his purpose to Allah while doing good, his reward is with his Lord : and there shall no fear come upon them neither shall they grieve. (al-Baqarah, 2 : 111. 112)

And the Jews say the Christians follow nothing (true), and the Christians say the Jews follow nothing (true); yet both are readers of the Scripture. Even thus speak those who know not. Allah will judge between them on the Day of Resurrection concerning that wherein they differ. (al-Baqarah. 2 : 113)

The Jews and Christians say : We are sons of Allah and loved ones. Say : why then doth He chastise you for your sins ? Nay, ye are but mortals of his creating. He forgiveth whom He will, and chastiseth whom He will. Allah's is the Sovereignty of the heavens and the earth and all that is between them, and unto Him is the journeying. (al-Maidah 5 : 18)

Lo : those who believe and those who are Jews, and Sabaeans, and Christians — whosoever believeth in Allah and the Last Day, doth right — there shall no fear come upon them neither shall they grieve. (al-Ma'ioa, 5 : 69)

And unto thee have We revealed the Scripture with the truth, confirming whatever Scripture was before it and a watcher over it. So judge between them by that which Allah hath revealed and follow not their desires away from the truth which hath come unto thee. For each We have appointed a divine law and a traced-out way. Had Allah willed, He could have made you one community. But that He may try you by that which He hath given you (He hath made you as ye are). So vie one with another in good works. Unto Allah ye will all return, and He will then inform you of that wherein ye differ. (al-Ma'idah. 5 : 48)

Had Allah willed, they had not been Idolatrous. We have not set thee as a keeper over them, nor art thou responsible for them.

Revile, not those unto whom they pray beside Allah lest they wrongfully revile Allah through ignorance. Thus unto every nation have We made their deed seem fair. Then unto their Lord is their return, and He will tell them what they used to do.

(al-An'am, 6 : 107, 108)

And if thy Lord willed, all who are in the earth would have believed together. Wouldst thou (Muhammad) compel men until they are believers ?

It is not for any soul to believe save by the permission of Allah. He hath set uncleanness upon those who have no sense. (Jonah, 10 : 99,100)

Say : O mankind : Now hath the Truth from your Lord come unto you. So whosoever is guided, is guided only for (the good of) his soul, and whosoever erreth erreth only against it. And I am not a warder over you. (Jonah, 10 : 108)

Say (O Muslims) : We believe in Allah and that which is revealed unto us and that which was revealed unto Abraham and Ishmael and Isaac, and Jacob, and the tribes, and that which Moses and Jesus received, and that which the Prophets received from their Lord. We make no distinction between any of them, and unto Him we have surrendered. (al-Baqarah, 2:136)

Lo : those who disbelieve in Allah and His messengers, and seek to make distinction between Allah and his messengers, and say : We believe in some and disbelieve in others, and seek to choose a way in between : Such are disbelievers in truth; and for disbelievers We prepare a shameful doom

But those who believe in Allah and His messengers and make no distinction between any of them, unto them, Allah will give their wages; and Allah was ever Forgiving, Merciful (an-Nisa, 4 : 150-152)

The Messenger believeth in that which hath been revealed unto Him from his Lord and (so do) the believers. Each one believeth in Allah and His angels and His scriptures and His messengers—we make no distinction between any of His messengers—and they say . we hear, and we obey. (Grant us) Thy forgiveness, our Lord ! Unto thee is the Journeying.

(al-Baqara,h 2 : 285)

Verily We sent messengers before thee, among them those of whom we have told thee, and some of whom We have not told thee; and it was not given to any messenger that he should bring a portent save by Allah's leave, but when Allah's commandment cometh, (the cause) is judged aright, and the followers of vanity will then be lost. (al-Mumin, 40 : 78)

Lo : those who believe (in that which is revealed unto thee, Muhammad), and those who are Jews, and Christians, and Sabaeans — whoever believeth in Allah and the Last Day and doth right — surely their reward is with their Lord, and there shall no fear come upon them neither shall they grieve. (al-Baqarah, 2:62)

concept of tolerance, at its best. But this fact should not depress the Muslim believer or surprise the historian of ideas.

The Quran also contains several injunctions which *Prima-facie*, negate the spirit of humanistic love and tolerance. But contextual enquiry and textual scrutiny of the relevant verses, scattered in different parts of the Quran, show, beyond any doubt, that these injunctions were temporary regulations during the state of war or belligerency rather than basic maxims of conduct. A comparative study of the Quranic texts, in the light of the situational context of the revelation, confirms the view that humanistic love and tolerance are the fundamental directive principles of the Quran, while mistrust of non-Muslims, social exclusiveness and harshness towards non-believers were merely temporary rules or security measures during the state of belligerency.

I shall now cite some Quranic texts which suggest and prescribe tolerance, inter-religious harmony, the essential oneness of all religions and the continuity of the Divine message to the human family as a whole, the equal importance of good deeds (together with faith) as the basis of salvation, a permissive approach to the diversity of religious faiths, and lastly, but not less importantly, verses which affirm that moral goodness cuts across groupings made on the basis of religion.

Says the Quran :

There is no compulsion in religion. The right direction is henceforth distinct from error. (Al-Baqarah, 2.256)

Unto you your religion, and unto me my religion.

(al-Kafirun, 109:6)

Say (O Muhammad) : We believe in Allah and that which is revealed unto us and that which was revealed unto Abraham and Ishmael and Isaac and Jacob and the tribes, and that which was vouchsafed unto Moses and Jesus and the Prophets from their Lord. We make no distinction between any of them, and unto Him we have surrendered. (al-i-'Imran, 3:84)

as such, in such a subtle and unobtrusive manner that the distinction between the text and its interpretation virtually disappeared. This led, in the course of time, to a situation where the inevitable imperfections of falliable individuals and the limitations of the spirit of the age in which they lived came to be projected on the 'Word of God' or the 'Book' as such. The fall of the titular Abbasid Caliphate (1258) at the hands of the Mongol hordes put the last nail in the coffin of the Islamic creativity of the earlier days. The tradition lost, for centuries to come, its inner dynamism and creativity in an ever-changing human situation.

It is, therefore, imperative to make a clear distinction between the Quranic texts, as such, dealing with tolerance (or any other concept or belief for that matter) and the traditional understanding or interpretation thereof. According to the orthodox view, the traditional understanding is based upon the precepts and practice of the Prophet, the pious Caliphs and authoritative jurists. We must, however, realise that, firstly, all natural languages (including Quranic Arabic) are inevitably open to diverse interpretations, specially in the case of metaphysical, metaphorical, evaluative and directive uses of language. Secondly, whenever we act on the basis of a general statement or command, diverse interpretations of the 'real' meaning become unavoidable. In other words, the principle of plural interpretations is an in-built feature of the Quran no less than of other scriptures or of language in general. while the traditional interpretation of the Quranic texts is certainly worthy of respect by Muslims belonging to the tradition concerned, no individual, school or system can rightly claim absoluteness or finality in an ever changing human situation. The inevitable growth or movement of thought will inevitably and rightly suggest fresh interpretations of the scripture of Islam as of other religions.

Coming to the subject of tolerance, the Quran abounds in verses which suggest, rather prescribe, tolerance of a high order. It is quite another matter that the traditional interpretation of the texts concerned is not in full harmony with the modern

THE ISLAMIC DOCTRINE OF TOLERANCE :

The concept of tolerance in Islam is derived from the Quran and the practice of the Prophet. The core ideas set forth in the 'Book and the example' (of the Prophet) were developed by the great Islamic jurists and theologians who shaped the Islamic tradition between the 8th and the 10th centuries. The scattered Quranic verses revealed intermittently, over a period of 23 years, were collected and compiled, within a few years after the passing away of the Prophet, by Caliph Abu Bakr (according to one version), and by Caliph Osman (according to another version), If not by the Prophet himself. The reported sayings and doings of the Prophet were, however, put into writing, sorted and classified a little less than 200 years after the Prophet's passing away. Meanwhile, the four great jurists of Sunni Islam, and Imam Ja'far, (representing the Shi'ite school of law) had already produced full-fledged systems of Islamic piety and polity (*shari'at*) covering every aspect of life on the basis of their own reflective understanding of the Quran and the example of the Prophet and his pious companions. The different schools of law founded by Abu Hanifa (d. 767), Malik (d. 795), Shafi'i (d. 820), Hanbal (d. 855), and Ja'far Sadiq (d. 765) crystallised after the *Umayyid* Caliphate had been displaced by the Abbasid wing of the Prophet's family. The *Ummayyid* Caliphs who were more self-reliant or independent in their judgment on public matters had adopted a more or less eclectic and pragmatic approach to Islamic polity, under the influence of Iranian and Roman ideas, which were adopted to promote the social dominance and economic interests of the Arab ruling class. During this period Islamic piety was focussed, more on the five pillars of the religion, rather than on the social aspect of the *shari'at*.

The flowering of thought and culture that took place in the middle Abbasid period, on the basis of the spade work earlier done under the Ummayyid Caliphate, led to the full growth of the *shari'at* whose authority became almost indistinguishable from the 'Book' as such. The interpretations of the 'Word of God' came to be super-imposed upon the Quranic text,

to resort to a civil marriage. The Jews still have their problems of emotional distance or prejudice. In America the Catholics would not readily give full marks to the overwhelming Protestant majority on the issue of who should occupy the White House and other such issues. However, the movements of Unification Theology and Inter-religious dialogues, Human Rights and so on are all contributing to the desired goals.

The communications revolution of the late 20th century bears the promise of ushering in a multi-cultural global society. Almost every nation or linguistic and religious group, hitherto steeped into an ethno-centric outlook, has been exposed to multi-cultural stimuli and to the knowledge explosion. The tribals of a remote village in India mingle with the folk dancers from USSR, or listen to the music at St. Peter's; a Puritanical *mulla* of a mosque in the interior of Pakistan or Afghanistan watches the temple-dancers of India or Indonesia, and so on. The sheer force of technology has shattered the cultural insularity of the past. Great diversity and disparity certainly characterise the human situation, and there is, as yet, no common language, no common religion, political authority or economic system. Yet, the awareness of cultural plurality is steadily steering the human family in the direction of permissiveness and tolerance in all cultural matters including religious belief or faith. The phenomena of religious fundamentalism, violence and terrorism do raise fears of an impending catastrophe round the corner. However, in my thinking, though the fundamentalists or terrorists may win the battles, here and there, the humanists are going to win the war.

Secular Humanism, when not equated with atheism, does not destroy genuine religious feeling and spirituality, it merely rejects that form of religion which seeks to regulate the total behaviour of the believer and which, furthermore, divides humanity into 'we-they camps' with respect to every sphere of human activity. Religious tolerance, when not equated with indifference, is not the axe which destroys the tree of faith, but rather the fruit which grows upon it.

established in 1649, also ensured complete toleration, though the state had retained the traditional principle of 'jurisdiction' i.e , the jurisdiction of Christianity over the state.

The first large modern state, founded on the principle of separation of church and state, is the United States of America The principle of separation was applied here even earlier than in the case of the French Republic after the Revolution. The secular constitution of the USA was, however, not the work of atheists, agnostics or materialists, but of committed Christians who sincerely and passionately had veered round to the belief that religion was essentially a personal matter which should be kept separate from the affairs of state and public issues, and the state, as a public corporation, should have no official religion. This philosophy of the nascent American Republic was the fruit of the sad and the bitter experience of the wars of religion, fanaticism and intolerance prevailing in the countries of the old world. The founding fathers of the American constitution held that the principle of jurisdiction enabled and encouraged one particular religion or sect to use the power and machinery of the state for promoting its own cause at the expense of the non-official sects or denominations. The constitution, therefore, declared the state to be nuetral and equi-distant from all religions, and every citizen, irrespective of his religion or lack of religion, was guaranteed equal status, as an American citizen. The constituent states of the Federal Union were, however, granted the right to follow the principle of separation or of jurisdiction with respect to their internal matters. The principled separation of the state and the church by the founding fathers of the American constitution reflected the religious maturity of enlightened and sincere Christians who had certainly not repudiated spiritual or moral values, or even institutional religion, provided it did not over-step its proper sphere.

Mankind, however, is still far from the practice of tolerence, at its best, whether it be USA, Europe or other countries of the world. Tolerance, in the sphere of marriage between Catholics and Protestants, still does not come naturally or readily in the western world, and many sincere Christians are compelled

English sovereign proclaimed the principle of tolerence in his realm. The British Parliament passed the Act of Toleration in 1689. The philosopher, John Locke of Oxford, published in the same year his first Letter Concerning Toleration, Locke had great influence over the thinking of the period. The great philosopher was in favour of the principle of separation between church and state, but this separation, in the strict formal sense, never came about in his own country, even though it came to be implemented in the New World, as we shall shortly see. Interestingly, rather paradoxically, Locke did not extend the principle of tolerance to atheists.

Earlier the great English poet, Milton, had strongly championed the liberty of conscience. Milton declared in 1644, 'Give me the liberty to know, to utter, and to argue freely according to conscience, above all other liberties'.

The Act of Toleration of 1689, however, did not bring about complete tolerance in the modern sense of the term. It was only the first beginning of a long process of social and legal changes that eventually culminated in the establishment of full and unqualified tolerance and equality of status in the modern sense. Legal discrimination against the Jews and the Unitarian Christians continued. It is significant that the great physicist and philosopher of Cambridge, Newton (d. 1727) who was drawn to Unitarianism dared not air his views and conduct, in the open, his scholarly researches into Christianity. These disabilities were not removed until mid-19th century. Disraeli could not have become Prime Minister of England, had he been born a quarter of a century earlier.

I now turn to America which has given the greatest importance to complete religious tolerance and where the principle of separation between church and state was first applied in the history of mankind. This was done in the city state of Providence on the eastern coast of the USA. The city was founded by Roger Williams in the 17th century with a view to securing complete equality and dignity to all its citizens, irrespective of their religion. The Roman Catholic colony of Maryland,

principle of jurisdiction, thereby restoring the authority of the Pope over the French constitution. Napoleon thought that 'using the Pope as an instrument he could control the consciences of men and more easily carry out his plans of empire'. The Concordat lasted till 1905 when the principle of 'separation' (first applied in 1795) was restored in France.

The story of the birth of religious tolerance in Germany is far more consistent than the French experience, until the advent of Hitler's ideology implying racial as well as religious intolerance of the worst kind in human history. Germany, however, had to go into an incredibly prolonged and tragic baptism of fire and blood in the form of the Thirty Year's war which was occasioned and fed by religious intolerance. The famous Treaty of Westphalia of 1648, which ended the infamous war, stipulated religious tolerance and equality of status to Catholics and Lutherans though not to the Jews and others. Frederick, the Great, after his accession in 1740. extended full tolerance to all, including the Jews, though the principle of 'jurisdiction' was retained and Lutheran Christianity remained the religion of the State. The great emperor, who befriended Voltaire and who had a cosmopolitan outlook, even toyed with the idea of inviting Muslim settlers in his dominion and extending them equal rights. Frederick held that 'every one should be allowed to get to heaven in his own way.' The outstanding German thinkers, poets and scholars who ushered in the German Enlightenment of the 18th and 19th centuries—Kant, Schiller, Goethe, Hegel, Dilthey *et al* were all great champions of religious tolerance.

Coming to England, the turning point in the history of religious tolerance in the country is the Glorious Revolution of 1688 when Queen Anne and Prince Williams were raised to the English throne after the long period of instability, strife and uncertainty which followed the beheading of King Charles I in 1649. The horrors of the Thirty Year's war brought home to Englishmen, no less than to Germans and others, the utter futility of intolerance, thereby generating a sort of moral revulsion against bigotry. It is significant that the Treaty of Westphalia was signed in 1648, and exactly forty years afterwards, the new

Trinity, but held Jesus to be the perfect man and the exemplar for all times. Though Sozzini did not affirm the separation of church and state, he stood for complete tolerance of all views within and without the Church.

It was natural for the Catholic church to fight back the different reforms and liberal Christian movements from Luther to Sozzini. Pope Paul III severely punished free enquiry in religion and science. The most tragic episode was the burning of the great scientist and thinker, Bruno of Italy, in 1600 The massacre of French Protestants had earlier taken place on St. Eartholomew's Day, 1572. At least 7000 innocents lost their lives in cold blood. The conscience of France was shocked, and, to make amends, the Edict of Nantes, 1598, ensured bare tolerance to the Protestant minority of France for almost the next hundred years. However, in 1676 persecution of Protestant recommenced and this continued until the French Revolution of 1789.

Voltaire's contribution to freedom of conscience and tolerance is well known. Though far from demanding the separation of the church and the state, he championed free enquiry and complete tolerance, though not complete equality of all citizens in the modern sense. His great contemporary Rousseau (d. 1778) had no place for atheists in public office. The French Revolution despite retaining Catholic Christianity as the 'dominant religion' of the Republic, gave the right of public office to all French citizens with the exception of Jews. Absolute or unqualified equality of status of all French citizens was established, in theory and practice, only in 1795 when the modern principle of 'separation' between the church and the state was substituted in the French Constitution in place of the earlier principle of 'jurisdiction'. According to the constitution of 1795 'Theophilanthrophy', i. e., Divine Love of Man was the new official philosophv or secular religion of the state. This 'Love of Man' was claimed to be 'the religion of Socrates, Marcus Aurelius and Cicero', a religion which cut across all religions in the conventional sense. Ironically, Napoleon who claimed to be an atheist and humanist entered into a pact with the Pope in 1801 (the Concordat) and re-established the

with the full range of Greek thought and culture, their attention being focussed on translated versions of some selected writings of Aristotle and others derived from Arabic sources. The western mind now, for the first time, came in contact with the Greek classics in the original. This triggered the great cultural revolution known as the Renaissance.

The independent states of southern Italy became the cradle of the new movement which, in the course of time, radiated to the whole of Europe and transformed the intellectual, cultural, religious, political and economic climate of the entire western world. The Renaissance was soon followed by movements of religious reform in several Christian communities by Wycliffe (d. 1384), Hus (d. 1415) and Martin Luther (d. 1546). Luther's Reformation proved to be the most effective and durable, but Luther was far from being a consistent champion of freedom of conscience. Having succeeded in repudiating papal authority, in the name of liberty of conscience, Luther tried to impose his own conscience on others with the help of force. He declared Anabaptist Christians as heretics who should be put to the sword. Likewise, Calvin (d. 1564) of Switzerland, the other outstanding Protestant reformer of the age, substituted his own brand of religious and political authoritarianism in place of the Pope. Calvin stood for the organic unity of the church and the state and of spiritual and worldly power in the manner of Islamic fundamentalism today. He is generally accused of the execution of the great Spanish religious liberal, Servetus, in 1553.

The real protagonists of Christian liberalism and religious tolerance were the Italian pioneers of the Unitarian version of Christianity—Sozzini (known as Socinus in English speaking countries), Castellio and others in the second half of the 16th century. These honest and brave souls were hunted out of Rome and fled to Switzerland, Transylvania and Poland to escape the wrath of Calvin. Eventually, they took refuge in Germany, Holland, England, and finally, in the New England state of the America. The Unitarians rejected the dogma of

France. Pope Inncent III set the precedent that the Pope had the right to coerce a Christian ruler in matters, both temporal and religious, on the principle of the supremacy of the spiritual over temporal power. Shortly afterwards Pope Gregory IX initiated the idea of the Inquisition, which idea was put into practice by Pope Innocent IV in 1252. Going far beyond the punishment of heretics, the objective of the Inquisition was to pry into the inmost depths of the human soul to punish the minutest doubt or deviation from the dogmas of the Church.

The work of the Inquisition was supervised directly by the Pope over the head of the Bishops who had no say in the secret workings of a super investigative net-work throughout the Western Christiandom. The most ruthless agency of this Papal tyranny was the Spanish Inquisition which concerned itself not merely with Christian heretics but also with the persecution of Spanish Muslims.

In 1556 Philip II decreed that Muslims should abandon 'at once' their language, worship, institutions and manner of life. The final order of expulsion was given by Philip III in 1609, and more than three million Muslims were executed or banished from Spain.

Not less tragic than the persecution of heretics was the persecution of women dubbed as witches in medieval Christian-dom. As late as 1484 Pope Innocent VIII said in a Bull that plague and storms were the work of witches.

THE IDEA AND PRACTICE OF TOLERANCE IN THE MODERN AGE :

The capture of Constantinople by the Turks in the mid-15th century and the final collapse of the Eastern wing of the Roman Empire .(Byzantium) is another turning point in world history. Christian scholars who were exclusive custodians of the Greek classics in the original, migrated to the Italian mainland which was the seat of the Pope and an integral part of western Europe. Till that time Western Church fathers, scholastic thinkers and writers were not acquainted

point of the sword as, indeed, political expansions do in history. But Islam, as a religious faith, was certainly not forced down upon the throats of Jews, Christians and others concerned at the point of the sword. The latter view is a totally false and perverse interpretation of facts. The truth is that the political hegemony of Islam, on the basis of an almost unceasing chain of military victories against the then super powers, had created the social psychological space for the eventual peaceful conversion of the non-Muslim subjects of the Islamic commonwealth due to a combination of social, psychological, cultural, and political factors.

Islam ushered in a plural society based upon tolerance, though the tolerance was not perfect and fell short of the modern concept of tolerance. Inter-religious co-existence and tolerance prevailed for four centuries in the territories of Islam until they were attacked by the Christian crusaders at the fag end of the 11th century. These crusades continued, with interruptions, for almost the next three centuries. Impartial western scholars of repute have pointed out that the defenders of the Cross unleashed a reign of terror, not only against the Muslims and Jews, but also the local Christians of the areas 'liberated' by the crusaders and ruled by them for approx. 80 years.Eventually the crusaders were thrown back by the legendary heroism and inspiring leadership of Sultan Salahuddin (Saladin the Great) in the early 13th century. Immediately afterwards, or almost at the same time, the Islamic world had to face the terrible fury of the Mongol hordes leading to the almost total destruction of Baghdad in 1258. Though Iran recovered after approx. 200 years, under the great Safavids, who ushered in the golden age of Persian culture and Islamic humanism, the Arabs could not recover. In fact, they regressed into a state of utter political, economic and cultural decline, lasting until the beginning of the present century.

Turning to the story of Christian militancy in the struggle for political power, Pope Innocent III, at the end of the 12th century, embarked upon the policy of penalising Christian kings adjudged to be heterodox. The most tragic victims of this policy were the Count of Toulouse and the Albigeios community in

under the reigns of Decius (d.251) and Valerian (d. 260). Numerous Christians became martyrs, though, according to modern historical res earch, the tales of savage persecution of the martyrs are m yths. At last, better sense came to prevail, and Emperor Constantine (d. 337) inaugurated the era of religious toleration vide the Edicts of Milan of 311 and 313. Soon after wards (approx. 321) Constantine himself embraced Christianity which became the state religion of the now Holy Roman Empire. *This was indeed a turning point in world historv.*

The Christian subjects of the Roman Empire had been eulogising the virtues of tolerance for the past 200 years. But no sooner did Christianity become the official religion of the empire, the Christians started to eulogise the necessity of saving the souls of non-Christians, even by force, if necessary. The belief in exclusive salvation and the view that heretics and apostates merit death in order to be spared the everlasting punishment in hell, soon became a part of the Christian dogma. Even the great Christian father, St. Augustine, (d. 430) interpreted the saying of Jesus 'Compel them to come in', as reported in the gospel, as a permission for the use of force for the noble purpose of saving the soul of heathens or heretics.

The emperor Julian the Apostate (d. 363) stopped the persecution of heretics and pagans at the hands of the Christians who now ran the Roman empire. But it was a still-born move. Emperor Theodosius I (d. 395) resumed the policy of persecuting pagans and heretics. This state of affairs continued until the end of the 6th century.

A new era dawned in world history with the advent of Prophet Muhmmad's mission in the early 7th century. Islam, though a continuation of the Semitic tradition of Monotheism, rejected the dogma of exclusive salvation (so far as the teachings of the Quran are taken into account) and welcomed Jews, Christians and all others into its rapidly expanding territories.

The political expansion of the Arab-Islamic state in the regions adjoining Arabia proper certainly took place at the

India was vitiated by the presence of intolerance in the shape of caste taboos of the worst type in human history. There was no concept of the dignity and equality of the individual, irrespective of caste, in the theory and practice of the ancient Indian tradition.

The freedom of thought and tolerance prevailing in ancient Greece and Rome was free from caste discrimination, though there were rigid class distinctions and a strongly entrenched system of slavery. The populace were ever attracted to myth and ritual, connected with religious beliefs, while philosophers to abstract reasoning. Neither the conflict between myth and reason nor the wide variety of myths and philosophical theories led to any rancour or intolerance of dissent, in the pre-Christian era. It appears that the rise of Semitic Monotheism and the denunciation of idol worship in Palestine (then under Roman occupation) created a new psychology or attitude, both among the monotheists themselves and the pagans or the worshippers of tribal deities. The Jewish prophets had phrophesied the destruction of Roman glory and political supremacy because the rulers and the people did not worship the one true Lord of the whole universe. The Jewish prophets held that all those who did not worship the one Lord and who did not live up to the one right way of life, as revealed by the Lord, were wicked people and deserved to be punished by the all powerful God of Abraham and Moses. Obviously, this approach or attitude was not at all to the liking of imperial Rome. However, the Jews were treated as too insignificant a minority to be taken seriously by the mighty Romans.

The emergence of Christianity in the same region of Palestine also did not pose any serious threat to the Romans, to begin with. The emperor Domitian (d. 96), however, thought that the other-worldly concern and the repudiation of Roman gods was a potential danger to Roman solidarity; but he was not intolerant to the Christians. Emperor Trajan (d. 117) was the first to ban the propagation of the new religion, totally opposed to the Roman creed. The Christians were also subjected to mild suppression which, however, became intensified

(d) awareness of the distinction between objective certainty and existential certainty,

(e) awareness of man's essential historicity,

(f) capacity for empathy,

(g) unconditional respect for the individual on humanistic grounds.

Awarenes of plural truth-claims and of man's historicity and a measure of existential perplexity are the essential conditions of tolerance Empathy and respect for the individual who may hold different views from one's own lead to an intensification of one's existential perplexity and also of genuine humility, particularly, in the face irresolvable differences between oneself and those whom one respects or loves. Differences in sensory taste do not lead up to inner perplexity, but irresolvable differences over moral or religious issues do lead to spiritual anxiety or perplexity.

Awareness of the plastic power of the milieu and of the essential non-demonstrability of religious convictions should convince the honest truth-seeker that religious truth-claims can never be settled by logical arguments or scientific investigation. Consequently, tolerance of diverse views is the only proper response to the essential mystery of the universe,

THE IDEA AND PRACTICE OF TOLERANCE IN ANCIENT & MEDIEVAL PERIODS :

The idea of religious tolerance was understood and practised in China, India, Greece and Rome in the ancient period. The religious and philosophical approach of the ancients was that there were many roads to salvation and the individual should be free to take any road he likes.

The Emperor Asoka (d. app, B, C 235) stood for tolerance, not merely in the sense of tolerating religious dissent, but in the higher sense of respecting plural convictions or faiths other than his own. The classical Hindu concept of *'isht devata'* (choice of deity) also reflected the same basic approach. Unfortunately, the concept of tolerance in the Sanatana Dharma of

not be the only factor. The realisation that one's cherished beliefs and convictions would have been very different, had one been born in a family professing a different faith, shows up the essentially contingent character or complexion of one's beliefs system. This realisation ought to fill one with humility as well as empathy for other traditions.

What social factors promote or retard the prospects of tolerance ? It seems heterogenity within a large autonomous group, with regard to race, language, culture or religion, plays the dual role of generating tension and conflict within the group, and at the same time, facilitating the eventual growth of tolerance. The greater the area of inner differentiation within a large and complex society, the greater the chance of conflict, as also the greater the need of mutual understanding and accomodation to prevent the disintegration of the society into smaller warring sub-groups. If the internal unity of the society, as a whole, be a crucial survival value for most members composing the large group, the will to preserve its unity will generate tolerance and mutual accomodation of diverse points of view. Since, however, the needs and interests of individuals and of sub-groups often clash with each other, and also with the society, as a whole, they may adopt strategies calculated to promote their own limited interests at the cost of the long term interest of the society as a whole.

The appeal of tolerance is relatively greater for those individuals and sections which enjoy high status or power and possess material means enough for sustaining their dominance. A few highly evolved and sensitive souls may, however, reach the level of pure morality transcending individual or group interests.

INTELLECTUAL ROOTS OF TOLERANCE :

The accaptance or awareness of the following truth promotes tolerance :

(a) awareness of plural truth-claims,
(b) existential perplexity,
(c) spiritual autonomy,

profound humility in the face of the inscrutable mystery of reality, and of genuine respect for different perspectives and views.

SOCIAL ROOTS OF TOLERANCE :

The individual, as a child, is obviously, culturally conditioned in respect of language, morals, religious convictions, artistic as well as sensory taste, gestures and so on. Thus, he speaks not language, in general, but a particular language; he follows not religion and morality, in general, but a particular religion and moral code. Now the crucial feature of the conditioning process is that the individual is, on principle, screened from exposure to other languages, morals, religious convictions and art forms, as if, they were aberration to be concealed from the tender and innocent mind of the child. In other words, the inbuilt cultural plurality of the human situation is prevented from making its natural impact upon the individual. To a considerable extent this is a pedagogic necessity since too many cultural stimuli would, obviously, confuse and destabilise the growth of the child. But the way in which the child is more or less indoctrinated by his parents and teachers almost inevitably leads to the fallacy of cultural reification the indentification of symbols with what is symbolised. Thus, the child, as well as the adult, begins to equate particular language forms with the structure of the world itself, particular moral codes with absolute morality itself, particular perspectives of reality with reality itself. In other words, the individual is made to feel, as if, his cultural world alone accurately mirrors or reflects reality, while all other cultural worlds are, more or less, miserable caricatures. Thus what is, really, a model of reality is reified as the reality as such.

The simple truth (which is difficult to learn because of our cultural conditioning) is that while reality is one, its symbols are many; that the same experience or response can be expressed in a variety of forms or ways. The crucial reason why a particular conceptual model or form appeals to me has a lot to do with my own cultural conditioning, even if this may

or atheism, but merely the principled separation of religion and politics. This must, however, not be misconstrued as the separation of morality from politics.

A tolerant person need not be apathetic to persuading others to the acceptance of his own views or values. Apathy is the true index of unconcern rather than of tolerance. However, the concern of a tolerant person for the welfare of others is tempered by humility and the passion for authentic sharing of 'the rhythm of the spirit' instead of a conceited desire to dominate others and impose one's own ideas or values, conceived as the absolute truth.

A tolerant person need not remain a silent spectator in the face of conflicting truth-claims. Tolerance is not the fear of giving offence, just as it is not the fear ef commitment to a particular viewpoint. Tolerance does not conflict at all with spontaneous self-expression and active communication or dialogue, provided mutual goodwill and respect be present. Dialogue helps to promote greater harmony even though it may also bring unbridged differences into sharper focus.

A tolerant person need not appease those who disagree with him. Tolerance is an intrinsic value like love of truth or devotion to duty, while appeasement is a strategy for 'buying' agreement or peace on an ad hoc basis. A tolerant person may be extremely firm and unbending in doing his duty or in resisting evil. Tolerance may result in self-sacrifice of a martyr, while appeasement seeks the easy way out.

The birth of tolerance, however, does not signify the death of genuine faith in one's own cherished tradition. Tolerance merely signifies the willing acceptance of the view that other beliefs or convictions may also ennoble and inspire goodness and beauty in the depths of the human soul, even as one feels ennobled by one's own tradition. This approach is quite different from merely tolerating dissenting views which are deemed to be essentially evil or, at least, devoid of any real value. In other words, tolerance, at its best, is not reluctant acceptance of error, beyond our power of correction, but rather

philosopher, John Locke, who was the father of the movement of religious tolerance in 17th century England, was not prepared to tolerate atheists. Madan Mohan Malviya, a great Indian nationalist, freedom fighter, and colleague of Gandhiji, could not tolerate non-Brahmans at his dining table.

In view of the above fact that tolerance has both different dimensions and degrees, no individual or society should be judged to be tolerant or intolerant on an either-or basis. The application of a simple two dimensional either-or logic would mislead us and would fail to capture the complexity of different situations. The proper course, therefore, is to identify the different elements and degrees of tolerance or intolerance and to grade individuals or societies accordingly.

Let us now distinguish the concept of tolerance from some related or cognate concepts with which it is liable to be confused.

A person who is tolerant in religious matters need no, be indifferent to religion, or be a sceptic or atheist. Indeedt tolerence is perfectly compatible with the most passionate and profound religious faith and commitment to moral values. Even, if a tolerant person himself be indifferent to religion or a sceptic, he would respect those who are genuinely religious. If a person be both tolerant and courageous, he would say after Voltaire and Mill— 'I do not agree with a word of what you say, but I shall give my life to defend your right to say so'.

A tolerant person need not accept a secular approach to politics, even though a secular approach to politics helps promote religious tolerance. Tolerance may co-exist with religious fundamentalism, provided the latter is of a form which does not involve any discrimination against others on grounds of faith. Since, however, the fundamentalist versions of all religions have some in-built elements of inter-group or inter-group discrimination (in some form or other) the practice of complete tolerance does require a secular approach to politics. However, secularism, as such, is neutral with regard to theism or atheism. Commitment to secularism does not imply any corollary of theism, agnosticism

supplemented by a conceptual analysis of the core use of the word in a particular context. This core use should then be distinguished from cognate or related concepts to avoid confusion.

Contextual analysis means translating the analysandum into expressions which are simpler, clearer and conform to natural or ordinary usage rather than to the specialised usage or language of philosophers or scientists.

Let us now attempt a contextual analysis of the statement, 'Ahmad is a tolerant person'. Most of us would agree on the following contextual analyses which are illustrative rather than exhaustive :

(a) Ahmad tries to understand the other's point of view with sympathy.

(b) Ahmad does not believe that those who differ from him are dishonest, ill-motivated or perverse, unless there be clear evidence for this.

(c) Ahmad realises that beliefs, attitudes or approaches other than his own could possibly be right or justifiable.

(d) Ahmad realises that value judgments can never be proved conclusively, so that disagreement among different persons is unavoidable.

(e) Ahmad does not allow his differences with others to cloud his judgment concerning their good points, or to make him hostile to them.

(f) Ahmad actually befriends or is ever willing to befriend those who honestly differ from him but are decent persons.

(g) Ahmad believes that the inherent dignity of a human being should be respected irrespective of caste, colour, creed or sex.

It may be added that tolerance has several dimensions and degrees. Thus a person may be tolerant in one sense, or with regard to a particular dimension, but not with regard to others. Again, he may be tolerant up to a particular degree but not beyond that. To give two striking examples, the British

INTRODUCTION :

Analysing the concept of tolerance is the job of the philosopher, while describing the rule of tolerance in the history of Islam is the task of the historian. The historical question itself comprises two distinct issues, (a) what are the ideals or teachings concerning tolerance in the scriptures and the writings of theologians, jurists and saints, and (b) how far have these ideals and teachings been practised at different points of time ? To confuse the above two issues, (as is not uncommon even in highly educated quarters), leads to futile controversy.

In the following pages I wish to (a) give a philosophical analysis of the concept of tolerance, as understood in the modern sense of the term, (b) give a historical review of the idea and practice of tolerance in history, (c) give a critical analysis of tolerance, as understood in classical Islamic thought derived from the Quran, and finally (d) describe how tolerance was actually practised by Muslims in the Islamic world with special reference to medieval India.

THE CONCEPT OF TOLERANCE :

The original use of the word 'tolerance' referred to tolerance of metals, of gold and silver coins, of bridges to bear stress, and of the capacity of a person to bear pain or suffering, physical and mental, i. e., the capacity for endurance. These uses of the word were gradually extended, perhaps, in the 17th and 18th centuries, to the use which concerns us here. A standard English dictionary defines tolerance as 'the disposition to tolerate or allow the existence of beliefs, practices or habits differing from one's own, now often freedom from bigotry, sympathetic understanding of others' beliefs etc., without acceptance of them...'

The diverse uses or meanings of any word shows the futility of picking upon 'the' meaning or essence of a concept. Instead, we must make a contextual analysis of the different uses of a word or expression. This analysis may well be

Khuda Bakhsh Extension Lectures, 1988

Tolerance and Islam

by

Prof. Jamal Khwaja

C O N T E N T S

* * * * *

Printer : Liberty Art Press,1528, Pataudi House, New Delhi.
Publisher : Mustafa Kamal Hashmi for Khuda Bakhsh Library, Patna (Phone : 50109, Telex : 22-430 KBL IN)
Editor : Dr. A. R. Bedar.
Annual Subscription :Rs.100/-(Inland) U$ 20 (Asian Countries), U$ 40 (Other Countries). Rs.25/- Per Copy
Price (this issue) Rs.50/-.

Khuda Bakhsh Library
JOURNAL
54-55
Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna

خدا بخش لائبریری
سہ ماہی
جرنل
پٹنہ
۵۶
خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

خدابخش لائبریری

پٹنہ

رجسٹریشن نمبر : ۳۳۴۲۴/۷۷
شمارہ : ۵۶
قیمت : پچیس رُپے

۱۹۹۰ء

قیمت فی شمارہ : پچیس رُپے
سالانہ : ۱۰۰ رُپے (ہند)
۲۰ ڈالر ایشیا، ۴۰ ڈالر دیگر ممالک

فہرست

مصطفیٰ کمال ہاشمی نے لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) دہلی میں چھپوا کر خدابخش لائبریری سے شائع کیا

ایک نادر روزنامچہ

اٹھارہ سو سٹھ سے انیس سو گیارہ تک

مصنفہ

مولوی سید مظہر علی سندیلوی

(م- ۱۹۱۱ء)

مرتبہ

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی

مولوی سیّد مظہر علی سندیلوی (م - ۱۹۱۱ء)

مصنف "روزنامچہ"

فہرست

نورالحسن ہاشمی ——— (سوانحی خاکہ)

• نام: سید نورالحسن ہاشمی ولد سید مجتبیٰ علی • وطن: سندیلہ ضلع ہردوئی (یوپی)
• ساکن: محلہ قطب پور، ڈالی گنج، لکھنؤ ۲۰ • تاریخ ولادت: یکم جولائی ۱۹۱۳ء (مطابق ہائی اسکول سارٹیفکٹ)
• تعلیمی استعداد: ایم۔ اے (انگریزی) لکھنؤ یونیورسٹی ۱۹۳۵ء۔ ایم۔ اے (اردو) علیگڑھ یونیورسٹی ۱۹۳۹ء۔ ایم۔ اے (فارسی) لکھنؤ یونیورسٹی ۱۹۵۰ء۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ (اردو) علی گڑھ یونیورسٹی • موضوع: دلی کا دبستان شاعری۔ ڈی لٹ (اردو) لکھنؤ یونیورسٹی • موضوع: تدوین۔ کلیات ولی۔
• معلمی کا تجربہ: لیکچرر (بحیثیت ریسرچ اسکالر) شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ ۴۳-۱۹۴۲ء / لیکچرر شعبہ اردو، دلی کالج ۴۵-۱۹۴۴ء / لیکچرر، ریڈر، پروفیسر و صدر شعبہ اردو و فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی ۱۹۷۴-۱۹۴۵ء۔ آپ کی نگرانی میں دس پی ایچ۔ ڈی کے طلبا نے اردو میں ڈگریاں حاصل کیں اور دو نے فارسی میں، اسی طرح دو نے ڈی لٹ کی ڈگری فارسی میں اور چار نے اردو میں حاصل کیں۔
• مطبوعات: • دلی کا دبستان شاعری۔ ۵ ایڈیشن • تدوین کلیات ولی۔ ۴ ایڈیشن • تدوین: نوطرز مرصع۔ دو ایڈیشن • تلخیص و تدوین روزنامچہ مولوی سید مظہر علی سندیلوی بعنوان: ایک نادر روزنامچہ • تدوین کلیات حسرت دہلوی کا نرم لکھنؤی • تدوین: بکٹ کہانی (بہ شرکت ڈاکٹر مسعود حسین خاں) ۳ ایڈیشن • تدوین مثنوی طوطی نامہ از حسرت دہلوی • تدوین مثنوی سراپا سوز از محمد صادق خاں اختر • ادب کیا ہے؟ (تنقیدی مضامین) ۴ ایڈیشن • ادب کا مقصد (تنقیدی مضامین۔ ۴ ایڈیشن) • ناول کیا ہے؟ ۱۶ ایڈیشن بہ شرکت ڈاکٹر محمد احسن فاروقی • ترجمہ کینڈڈا از جارج برنارڈ شا • سیاسی نظریے (ترجمہ) دو ایڈیشن • مزید القاعدہ (منظوم۔ بچوں کے لیے) • ریختہ ولی (انتخاب) ۶ ایڈیشن • تذکرہ مشاہیر سندیلہ • انتخاب سب رس • اندر ونم (منظومات) • ساز اودھ میں نغمۂ غالب (منظوم اردو میں غالب کے یک صد اشعار کا ترجمہ) • ولی (انگریزی) مطبوعہ ساہتیہ اکاڈمی • ولی (اردو) مطبوعہ ساہتیہ اکادمی نئی دہلی • مرتب: لکھنؤ اور جنگ آزادی • مرتب: فسانۂ عجائب کا پہلا مستند ایڈیشن ۱۹۷۳ء۔
• دیگر: • ایڈیٹر رسالہ جامعہ (جامعہ ملیہ) نئی دہلی ۴۳-۱۹۳۶ء • سکریٹری اردو اکادمی جامعہ ملیہ نئی دہلی ۴۰-۱۹۳۹ء • ایڈیٹر رسالہ فروغ اردو لکھنؤ ۶۸-۱۹۵۴ء • ممبر یوپی سرکار ہائی پاور کمیٹی (کتابوں پر انعامات دینے کے لیے نیز مستحق اور نادار اردو ادیبوں کو وظائف دینے کے لیے) ۷۲-۱۹۶۲ء • ممبر جنرل کونسل انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی ۸۱-۱۹۷۶ء • ممبر مجلس انتظامیہ رضا لائبریری رام پور ۸۰-۱۹۷۵ء • ممبر کونسل و مجلس عاملہ یوپی اردو اکادمی لکھنؤ ۷۵-۱۹۷۲ء • وائس پریسیڈنٹ یوپی اردو اکادمی لکھنؤ ۷۷-۱۹۷۵ء، پریسیڈنٹ اردو اکادمی لکھنؤ ۷۹-۱۹۷۷ء • فی الحال اردو اکادمی لکھنؤ اور فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کی مجلس عاملہ کونسل کے ممبر ہیں۔
• انعامات: • فارسی میں سند اعزاز از طرف صدر جمہوریہ ہند • غالب ایوارڈ از طرف غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی • سند افتخار میر از طرف میر اکادمی، لکھنؤ۔

مقدمہ

اردو میں روزنامچے بہت کم لکھے گئے ہیں۔ اب تک جتنے دستیاب ہوئے ہیں یا جن کے نام معلوم ہوئے ہیں ان میں مولوی سید مظہر علی سندیلوی کا روزنامچہ جو قلمی صورت میں موجود ہے اولیت رکھتا ہے۔ یہ ۲۱ جنوری ۱۸۶۷ء سے ۲۴ دسمبر ۱۹۱۱ء تک (مولوی صاحب کے یوم وفات) یعنی تقریباً پینتالیس سال تک بلاناغہ لکھا گیا۔ قصبہ سندیلہ ضلع ہردوئی (یوپی) کا ایک بہت پرانا قصبہ ہے جو لکھنؤ سے تقریباً اکتیس میل (۵۰ کلو میٹر) کے فاصلہ پر ہردوئی و مراد آباد جانے والی ریلوے لائن پر واقع ہے۔

روزنامچہ دراصل مولوی صاحب نے ۱۸۶۷ء میں پہلے فارسی میں لکھنا شروع کیا تھا لیکن ۱۸۸۷ء میں انھوں نے محسوس کیا کہ فارسی کی وقعت اب کم ہوتی جاتی ہے اس لیے اس وقت تک جو کچھ لکھا تھا اس کا اردو میں ترجمہ کر ڈالا اور اس کے بعد برابر اردو میں لکھتے رہے۔ روزنامچہ عموماً رات کو جب سب کاموں سے فراغت ہو جاتی تب لکھا کرتے تھے۔ ایک ہفتہ یا دس دن بعد ایک خوش نویس سید محمد ذکی (ساکن محلہ درگاہ سندیلہ) سے صاف کروا لیا کرتے تھے کیوں کہ مولوی صاحب کا خود اپنا خط بہت شکستہ تھا۔ تمام روزنامچہ اٹھارہ فل اسکیپ سائز کی جلدوں پر مشتمل ہے ہر صفحہ سولہ سطری ہے۔ تمام جلدوں کی مجموعی تعداد صفحات ہزار آٹھ سو صفحات کے قریب ہے۔ تمام روزنامچہ میں التزام سن عیسوی، ہجری، فصلی اور دنوں کا رکھا گیا ہے۔ حاشیہ پر الفاظ ولادت، وفات، شادی، عقیقہ وغیرہ مختلف رنگوں سے لکھے ہوئے ہیں تاکہ اس قسم کی یادداشت ڈھونڈنے میں آسانی ہو۔

روزنامچہ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ سندیلہ میں اس وقت دو راجہ اور تین تعلقہ دار رہتے تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے چھوٹے بڑے زمیندار تھے اور جن میں آپس کی پھوٹ وجہ سے مقدمہ بازیاں ہوا کرتی تھیں۔ مولوی مظہر علی ان میں سے ایک تعلقہ دار سید فضل حسین کے سگے خالہ زاد بھائی تھے اور انھیں کے پڑوس میں ایک مشترکہ مکان میں بد قسمتی تمام اپنی گزر کیا کرتے تھے۔ ۱۰ ستمبر ۱۸۳۹ء کو پیدا ہوئے تھے۔ قصبہ میں ان کا خاندان مولویوں کا کہلاتا تھا اس لیے کہ ان کے خاندان میں فارسی کی معلمی کا پیشہ عرصے سے چلا آرہا تھا۔ خود ان کے والد مولوی سید مظہر علی

صاحب ام - ۱۸۶۸ء) مدرسہ ریاست بجواپور میں صدر معلم تھے۔ لیکن تنخواہ قلیل تھی اور وہ بھی کئی کئی مہینے کے بعد ملا کرتی تھی اس لیے عسرت سے بسر ہوتی تھی لیکن مظہر علی کی قسمت یاور تھی۔ ان کے خالہ زاد بھائی سید فضل حسین کو ان کے باپ سید فضل رسول نے جو اس وقت تعلقہ دار تھے سیتاپور انگریزی پڑھنے کے لیے بھیجا اور اپنے بیٹے کی تنہائی کے خیال سے مولوی مظہر علی کو بھی ساتھ کر دیا اور ان کا نام بھی اسی اسکول میں لکھوا دیا گیا۔ اس زمانے میں کمشنری سیتاپور ہی میں تھی (اب لکھنؤ میں ہے) اس لیے اودھ کے تمام تعلقہ داروں اور راجاؤں کے لڑکے وہیں پڑھنے کے لیے جاتے تھے۔ لیکن راجاؤں اور تعلقہ داروں کے لڑکے پڑھتے ہی کب ہیں اس لیے مولوی صاحب ان سب لڑکوں میں اوّل رہتے تھے۔ لیکن مڈل پاس کرنے کی نوبت ہنوز نہیں آئی تھی کہ فضل حسین کو ان کے باپ نے واپس بلا لیا اور انہی کے ساتھ ان کو بھی واپس آنا پڑا۔ سندیلہ آکر یہاں کے مقامی اردو اسکول میں سکنڈ ماسٹر ہو گئے۔ (۱۸۶۵ء) چار سال معلمی کے بعد ان کو محکمہ ریلوے میں بہ عہدہ خزانچی ایک سو پچھتر روپے ماہوار مشاہرہ پر ملازمت مل گئی۔ اسی زمانہ میں ان کو حصول ریاست کا شوق پیدا ہو گیا اور معاملات رہن و بیع کرنا شروع کیے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد جب ان کے ضلع میں ریلوے لائن پڑ گئی تو انھوں نے ملازمت چھوڑ دی اور اپنی مکسوبہ زمینداری پر بسر اوقات کرنا شروع کی۔ لیکن اسی عرصہ میں فضل حسین اپنے والد سید فضل رسول کے مرنے کے بعد تعلقہ دار ہو گئے تھے (۱۸۷۹ء)۔ انھوں نے مظہر علی کو اپنا نائب سو روپے ماہوار پر مقرر کر لیا۔ اسی کے ساتھ چونکہ مولوی صاحب نے امتحان وکالت الہ آباد سے پاس کر لیا تھا اس لیے آنریری مجسٹریٹی پہلے درجہ سوم پھر درجہ دوم کی بھی مل گئی۔ ۱۸۸۴ء میں سندیلہ میں میونسپلٹی قائم ہوئی اس کے آنریری سکریٹری بھی مقرر ہو گئے۔ اس کے بعد کا زمانہ مولوی صاحب کے عروج کا زمانہ رہا۔ چنانچہ اپنے پرانے گھر کے قریب ایک بڑی کوٹھی اپنی رہائش کے لیے تعمیر کرائی۔ اپنے چار بیٹوں میں سے دو کو بیرسٹر کروا دیا۔ بہت سے باغات لگوائے اور بہت سی دوکانیں بھی تعمیر کروائیں۔ بعد میں سید فضل حسین کے انتقال (۱۹۰۱ء) کے کچھ عرصہ بعد ان کے تعلقہ کی منیجری سے بھی مستعفی ہو گئے تھے۔ اپنی جائداد کی آمدنی کافی تھی اس لیے آخر عمر تک بافراغت زندگی بسر کی۔

مولوی صاحب کا یہ روزنامچہ کسی ادیب کا روزنامچہ نہیں ہے بلکہ ایک نہایت مصروف آدمی کی ڈائری ہے جو بیک وقت میونسپل سکریٹری بھی تھا، بینچ مجسٹریٹ بھی، ایک تعلقہ کا منیجر بھی اور زمیندار پیشہ بھی۔ چونکہ مولوی صاحب کی عربی، فارسی و انگریزی میں لیاقت اچھی خاصی تھی اس لیے کہیں کہیں ان کی تحریر میں ادبیت آجاتی ہے ورنہ روزنامچہ عموماً صاف اور واضح زبان میں لکھا گیا ہے۔ اس روزنامچے کی اہمیت اس لیے

ہے کہ ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کی دنیا کا کوئی ایسا اہم واقعہ نہیں ہے جو ان کے زمانہ میں ہوا ہو اور اس
میں مندرج نہ ہو۔ مولوی صاحب نے ۱۹۴۴ء میں اپنی ایک ضخیم سوانح عمری بھی شائع کرائی تھی جس میں خصوصیت
سے غدر کا حال اور اپنے اس سفر کا حال بہت دلچسپ لکھا تھا جو انھوں نے گیارہ سال کی عمر میں جودھپور
کا اپنے خالو کے ہمراہ کیا تھا۔ اس سوانح عمری کی ایک تیسری جلد ۱۹۴۰ء میں تیار کر لی تھی لیکن اس کے چھپنے کی نوبت
نہ آسکی۔ اب اس روزنامچے کا دیباچہ ملاحظہ ہو۔ بعد بسم اللہ لکھتے ہیں:

"بعد حمد خدا و نعت سرور کائنات محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم، احقر العباد سید مظہر علی ابن سید مظفر علی صاحب
مرحوم ساکن سندیلہ محلہ اشراف ٹولہ عرض کرتا ہے کہ اس ہیچ میرز کو عرصے سے اس امر کا خیال ملحوظ خاطر تھا کہ ایک روزنامچہ
بقید تواریخ مروجہ زمانہ حال لکھنا شروع کروں اور اس میں کل حالات صحیح بالمرہ لکھتا رہوں اور ایسا اہتمام
کروں کہ کسی حالت میں اس کو ناغہ نہ کر سکوں تاکہ عامہ خلائق کو بوقت ضرورت اس سے فائدہ و نفع پہنچے چنانچہ
کئی سال کے خیال و فکر کے بعد میں نے اس کام اہم کو اپنے ذمہ ہمت پر قبول کیا اور ۲۱ جنوری ۱۸۶۷ء سے اس کتاب
روزنامچہ کا زبان فارسی میں آغاز ہوا۔ اس میں حالات جدید صحیح عام اس سے کہ اس کا تعلق کسی شہر و قصبہ و ملک
سے ہو بالمرہ درج ہوتے رہے اور ایسا التزام کیا کہ کسی سفر و حضر میں اس کا ترک جائز نہیں رکھا۔ نومبر ۱۸۸۴ء
میں دفعتاً یہ خیال پیدا ہوا کہ زبان فارسی کی وقعت اب گھٹتی جاتی ہے اور چند ہی روز میں طلبا سے
اسکول بباعث کم علمی کتب فارسیہ کو دفتر پارینہ سمجھ کر بالکل نظر انداز کر دیں گے اور اس حالت میں میری اس
قلم فرسائی کی (جس کو بہ کمال دقت میں نے مرتب کیا ہے اور حالات نوبہ نو اس کے عام پسند مفید اور خالی از تجربہ
نہیں ہیں) کوئی قدر نہ ہوگی۔ پس بہ نظر مصلحت وقت روز بہ روز میرے خیالات کو استحکام ہوتا گیا۔ آخرش
دسمبر ۱۸۸۷ء میں، میں نے سید محمد ذکی ولد سید احمد بخش صاحب مخدوم زادہ محلہ درگاہ سے اس کا ترجمہ اردو
میں لکھانا شروع کیا اور شکر خدا کا کہ اپریل ۱۸۸۸ء میں روزانہ محنت شاقہ سے اس کا تکملہ حسب مراد ہوا۔ چونکہ
دریافت شادی و مرگ و ولادت وغیرہ تقریبات کی انسان کو ضرورت زائد دائمی ہوتی ہے اس وجہ سے برنگ سرخ
شادی ختنہ و عقیقہ و سیاہی سے وفات اور سبز سے ولادت حواشی کتاب پر درج کیے۔ یہ ذریعہ واسطے تلاش
ایسی ضروریات کے آسان و کار آمد ہے اور ہر متلاشی کو اس سے بہت مدد مل سکتی ہے۔ لہٰذا مجھے امید ہے کہ ناظرین
کتاب اگر کسی موقع پر کوئی مضمون اپنے خلاف ملاحظہ فرمائیں تو اس پر اظہار ناراضگی کا نہ کریں کہ راقم نے کوئی
حال غلط اور نفسانیت سے درج کتاب ہٰذا نہیں کیا ہے۔"

اس مختصر دیباچہ سے اس روزنامچہ کا مقصد ظاہر ہو گیا کہ فائدہ عوام الناس مقصود تھا خصوصاً سندیلہ کی پبلک کے لیے۔ چنانچہ مولوی صاحب کی وفات کے بعد کئی ایسے نزاعی معاملات سندیلہ میں درپیش ہوئے جن میں مولوی صاحب کا روزنامچہ بطور صحیح دستاویز کے پیش کیا گیا لیکن اس روزنامچہ کا انجام دینا واقعی ایک بہت مشکل اور وقت طلب کام تھا اور انھیں اس کا پورا احساس تھا۔ چنانچہ اس بات کا اعادہ کئی مقامات پر کیا ہے۔ نمونہ کے طور پر صرف دو اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

"۲۸ ستمبر ۱۸۸۸ء: شکر ہے کہ آج کتاب روزنامچہ اتمام لکھنے اور ترتیب بنانے نشانات شادی و غمی وغیرہ برنگہائے مختلف سے بہ شدہ مرتب ہو گئی جس کا آغاز ۱۱ر جنوری ۱۸۸۷ء سے و اختتام ۳۱ دسمبر ۱۸۸۷ء تک ہے۔ یہ تین کتابوں میں مجلد ہے اور چوتھی کتاب ۱ جنوری ۱۸۸۸ء سے بالمرو لکھی جاتی ہے۔ میں اس کو نگر بہت مشکل جانتا تھا اور اپنے علم و لیاقت میں اس کو غیر ممکن تصور کرتا تھا۔ بہرحال شکر ہے اس خدا کا کہ جس نے اس مشکل مہم کو آسانی کے ساتھ پورا کرا دیا ورنہ جب اس کی ضخامت و طوالت پر نگاہ کرتا تھا تو بظاہر ہمت اس کام کا انجام کا لحاظ نہیں پہنچتی تھی۔"

"۱۹ دسمبر ۱۸۹۳ء: اگرچہ میں ۸ بجے صبح سے ۵ بجے شام تک اپنا روزنامچہ محمودی کی دو کام سے اپنے بالاخانہ پر جس جگہ دوسرے شخص کے جانے کو بہ نظر حرج کام مجاز نہیں ہے صاف کراتا ہوں لیکن ہنوز چند مہینے لکھنے کو باقی ہیں۔ اگرچہ مجھے کھانے روزنامچہ میں تمام روز کی محنت سخت تکلیف دہ ہے۔ لیکن مجبوری ہے کہ بدون میرے ان حالات کو بہ ترمیم مناسب کوئی لکھ نہیں سکتا۔ اور چونکہ سوائے ہوا خوری و ضروری اور تناول طعام کے یک لخت بیٹھا رہنا پڑتا ہے اور چلنے پھرنے کا اتفاق نہیں ہوتا ہے لہٰذا میں نے بعد دوپہر کے جب محمودی کی روٹی کھانے جاتے ہیں بہ غرض جذب رطوبت معدہ و تحلیل ہونے غذا کے یہ تدبیر نکالی ہے کہ بعد پڑھنے نماز ظہر کے اپنے بالاخانہ سے وظیفہ پڑھتا ہوا چند بار نیچے سے اوپر کو چڑھتا اترتا رہتا ہوں تاکہ ورزش بدن میرے تمام دن بیٹھے رہنے کا ہو اور کوئی ستم مری تحلیل غذا میں نہ پیدا ہو۔"

جیسا کہ خود مولوی مصنف نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اس روزنامچہ میں حالات اس سے کہ ان کا تعلق کسی شہر قصبہ دیہ وغیرہ سے ہو بالعموم درج ہوتے رہے ہیں سندیلہ کے حالات تو انھیں میونسپلٹی کے سکریٹری ہونے کی وجہ سے براہ راست معلوم ہوتے رہتے تھے۔ ہندوستان اور بیرون ہندوستان کی خبریں انھیں "اودھ اخبار اور پائنیر" وغیرہ سے معلوم ہوتی تھیں جنھیں وہ کھانا کھانے کے بعد دوپہر کو پڑھا کرتے تھے۔ یوں تو مولوی صاحب کا روزنامچہ ہر قسم کے واقعات سے پر ہے۔ لیکن وہ حالات زیادہ اہم اور معلوماتی ہیں جو واقعات ہند یا بیرون ہند یا معاشرت زمانہ پر روشنی ڈالتے

ہیں اور بعض وہ نجی حالات و تجربات بھی جو عام دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔

راقم الحروف نے اسی لیے ان تمام واقعات کے انتخاب کو پانچ مختلف ابواب میں تقسیم کر دیا ہے یعنی واقعات ہند، ریاستیں اور تعلقے، واقعات بیرون ہند، مقامی حالات اور ذاتی حالات۔ ساتھ ہی ذیلی سرخیاں قائم کر دی ہیں تاکہ ناظرین کو واقعات کی تلاش میں آسانی ہو ورنہ اصل روزنامچہ میں نہ ابواب کی تقسیم ہے نہ ذیلی سرخیاں۔ روزنامچہ کی ابتدائی جلدوں میں اندراجات زیادہ ترنجی ہیں اور بہت مختصر عموماً ایک دن کا حال دو چار سطروں میں ختم ہو گیا ہے۔ لیکن جیسے جیسے مولوی صاحب کی زندگی سنورتی گئی، حالات زمانہ موافق ہوتے گئے، خود اعتمادی کا احساس بڑھا، اپنی کچھ اہمیت محسوس ہوئی، ان کا روزنامچہ طویل تر ہوتا گیا۔ واقعات زیادہ لکھے جانے لگے۔ بسا اوقات تو ایک دن کا حال کئی کئی صفحات پر مشتمل ہونے لگا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے مولوی صاحب کے دو بیٹے سید مصطفےٰ علی و سید مرتضیٰ علی شروع بیسویں صدی میں بیرسٹر ہونے کے لیے لندن بھیجے گئے تھے۔ وہاں سے ان بیٹوں نے جو خطوط مولوی صاحب کو لکھے (اور یہ تمام خطوط فائل کی شکل میں مولوی صاحب کے خاندان میں اب بھی موجود ہیں) ان میں انگریزی معاشرت اور لندن کے بعض دلچسپ واقعات اور اپنے تاثرات بھی لکھے ہیں۔ مولوی صاحب نے اپنے روزنامچہ میں بھی ان میں سے کئی خطوط کے اقتباسات جگہ جگہ دیدیے ہیں۔

مولوی صاحب کا یہ روزنامچہ کئی حیثیتوں سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کے جس دور پر یہ محیط ہے (۱۸۶۷ء-۱۹۱۱ء) وہ ہندوستانی تمدن و تہذیب و معاشرت وغیرہ کے لیے ایک عبوری دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ انگریزی حکومت اور انگریزی تعلیم کی بدولت انگریزوں کے تمدن و معاشرت کا بڑھتا ہوا اثر، علوم و فنون کا احیا، وطنیت اور سیاسی بیداری کا پیدا ہونا، اردو نثر کا نشو و نما پانا اور ترقی کرنا، اردو نظم کا نئے سانچوں میں ڈھلنا، ذہن و اعتقادات و خیالات پر مغربی اثرات کا پڑنا، پرانی ایشیائی تہذیب و ہندی تمدن کا مغرب زدہ ہو جانا، غرض کہ تاریخی، سیاسی، تمدنی، معاشرتی اور ادبی ہر حیثیت سے یہ زمانہ بہت اہم ہے۔ مولوی صاحب موصوف کا بظاہر ہرگز یہ ارادہ نہیں تھا کہ وہ ایک معاشرتی تاریخ لکھیں۔ لیکن غیر ارادی طور پر یہ روزنامچہ اپنے عہد کا اور جاگیرداری دور کا ایک بہت اچھا معاشرتی نقشہ بن گیا ہے۔ پرانے رسوم و رواج، قدیم طریقۂ فکر، خیالات و اعتقادات اور پھر ان میں تغیرات کا پیدا ہونا اور رفتہ رفتہ لوگوں کی ذہنیتوں کے بدلنے کا حال نہایت واضح طور پر پیش نظر ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی وبائی امراض (چیچک، طاعون، ہیضہ

اور دق کس وسیع پیمانہ پر ہلاکت پھیلاتے تھے، قحط کہاں کہاں اور کتنے لاکھ آدمی بھوکوں مرجاتے تھے اور اس زمانہ میں بازاروں میں غلہ اور اشیاء خوردنی کا کیا نرخ ہوجاتا تھا یہ سب واقعات آپ کو اس روزنامچہ میں بالتفصیل مندرج ملیں گے۔ وغیرہ وغیرہ

تاریخی اور تمدنی حیثیت سے قطع نظر یہ ایک مکمل سوانح عمری بھی ہے۔ مولوی صاحب کی زندگی کے تمام پہلو مثلاً تعلیم دستی روزگار، ترقی کی کوشش، زمانہ کی سازگاریاں اور ناسازگاریاں اپنا کیرکٹر اور خیالات و اعتقادات اپنی خوبیاں اور خامیاں غرضکہ ان کی زندگی کا ہر گوشہ اجاگر ہے۔ اپنے دوستوں کی محبت، اپنے قریبی عزیزوں سے رنجشیں (خصوصاً اپنے خالہ زاد بھائی سے جو ایک تعلقہ دار تھے) اپنی بیماریاں اور ان کا معالجہ اپنی اولاد کی خوبیاں اور خامیاں، ان کے روزگار کے لیے سر توڑ کوششیں کرنا، اپنے روز مرہ کے تجربے ہر بات بہت صاف صاف مندرج ہے۔ آخر میں ان کی بیوی کی وفات (۱۹۰۴ء) کا اثر ان پر کسی حد تک نمایاں ہے۔ اسی آخری زمانے میں وہ اپنی چند مبہم آرزوؤں کی کشمکش میں مبتلا ہو گئے تھے جن کا بیان دلچسپی سے خالی نہیں اور روزنامچہ میں ایک طرح کی افسانویت پیدا کر دیتا ہے۔ ان مبہم آرزوؤں کی وجہ سے بڑی بے قراری اور بے چارگی کا سا عالم نظر آتا ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ شاید وہ اپنے بعض دوستوں کے مشورہ پر عقد ثانی کرنا چاہتے تھے مگر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کے ساتھ کریں جو اس عمر میں ان کی صحیح رفیقہ حیات بن سکے اور ان کی خانہ داری کا اچھا انتظام کر سکے۔ ساتھ ہی غالباً وہ کوئی سرکاری خطاب یا صلہ عزت چاہتے تھے. اور ان دونوں باتوں کے تکملہ کے لیے خواب کثرت سے دیکھا کرتے تھے۔ یہ زمانہ ذہنی طور پر ان کی بڑی پریشانی کا زمانہ ہے (۱۹۰۶ - ۱۹۱۰ء) جس پر ترس آنے لگتا ہے۔ ۱۹۱۱ء میں وہ زیادہ تر بیمار رہے۔ لیکن پھر بھی روز مرہ کے دیگر واقعات بھی قلم بند کراتے رہے۔ ان کا دماغ آخری دن تک صحیح طور پر کام کرتا رہا۔

مولوی صاحب پہلے خوابوں، فالوں اور نجوم پر بڑا اعتقاد رکھتے تھے اور علم نجوم سے تو بخوبی واقف بھی تھے۔ اپنے خوابوں کی فال دیوان حافظ، سکندر نامہ وغیرہ سے نکالا کرتے تھے اور اپنے حالات پر بعض نجومی پنڈتوں سے مشورہ کرتے اور خود اس پر تبصرہ بھی کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان دل خوش کن چیزوں سے انھیں ناامیدی اور مایوسی ہوتی گئی اور آخر میں صرف خدا کی مرضی پر تکیہ اور بھروسہ رہ گیا تھا۔ روزنامچہ ان کے دلچسپ خوابوں سے بھی بھرا پڑا ہے جن کی تعداد ڈیڑھ سو دو ہزار سے کم نہ ہوگی۔ یہ خواب کسی ماہر نفسیات کے لیے دلچسپ مواد کا کام دے سکتے ہیں۔ ہر فصلی سال اور کبھی عیسوی سال کے آخر میں مولوی صاحب اپنی زندگی کے پچھلے سال کا

محاسبہ بھی کیا کرتے تھے اور کبھی کبھی دنیا کے حالات پر تبصرہ بھی۔ یہ محاسبے اور تبصرے بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

مولوی صاحب موصوف کے اس روزنامچے کو اگر تمام و کمال پڑھا جائے (اور یہ کام آسان نہیں ہے) تو اس میں ایک ناول کا سا لطف آنے لگتا ہے ایک ایسا ناول جس میں بغیر کسی تمہید یا اشارے کے ایک مخصوص مگر غیر متعارف زمان و مکان میں ہم اپنے آپ کو ایک تماشائی پاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ کردار، زمان و مکان ہم پر [illegible] ہونے لگتے ہیں اور ہم ان سے مانوس ہوتے جاتے ہیں اور ان کے انجام کا شدت، دلچسپی اور ہمدردی سے انتظار کرنے لگتے ہیں۔ اس روزنامچے کا اختتام ہم کو محض ایک شخص واحد کی زندگی کا خاتمہ محسوس نہیں کراتا بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے ایک دور کا باب تھا جو بند ہو گیا۔ مختصر یہ کہ مولوی سید مظہر علی سندیلوی کا یہ روزنامچہ بیک وقت ایک تاریخ بھی ہے ایک سوانح عمری بھی اور زندگی کی ایک صحیح داستان بھی۔

مولوی صاحب کے لکھنے کا انداز اور اسلوب بالکل سیدھا اور صاف ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ مولوی صاحب کوئی ادیب نہ تھے بقدر ضرورت عربی، فارسی اور انگریزی ضرور جانتے تھے۔ ان کی تحریر میں ادبیات فارسی کی گنجلک تو کہیں نہیں ہے فارسی الفاظ البتہ کہیں کہیں بکثرت سے استعمال کیے ہیں لیکن ان سے تعقید کہیں بھی نہیں آنے پائی ہے۔ مجسٹریٹی کا کام چونکہ انھوں نے عمر بھر کیا تھا اس لیے یہ تو ضرور ہوا کہ کہیں کہیں جملوں کی ترکیب عدالتی زبان معلوم ہوتی ہے ورنہ عموماً وہی زبان لکھتے تھے جو عام طور پر بولی جاتی ہے اس کے علاوہ ایک بہت مصروف آدمی کو اتنی فرصت ہی کہاں کہ وہ طرز ادا پر توجہ مرکوز کرے۔ اس کے لیے یہی کیا کم ہے کہ وہ روزمرہ کے سیدھے سیدھے واقعات لکھ دے۔ یہی وجہ ہے کہ مولوی صاحب کا اسلوب سادہ اور صاف ہے بلکہ کہیں کہیں تو دیہاتی الفاظ بھی استعمال کر گئے ہیں۔ مثلاً بچپن کے لیے لڑکیاں، دھبوں کی فارسی جمع دھبہا اسی طرح پان خوری، سلوکات، خوابیں (مونث) کسی وقت کی بجائے کوئی وقت، سیتا، دل بہلاوا، بدرجی، پونڈہ خوری وغیرہ۔ ہندی اور فارسی الفاظ کے درمیان یا دو ہندی الفاظ کے درمیان واو عطف اکثر استعمال کیا ہے۔ یہی حال فارسی اضافت کا ہے جو ہندی الفاظ کے ساتھ استعمال ہوئی ہے۔ بعض جگہ جملوں کی ترکیبیں بھی بھدی معلوم ہوں گی۔ مثلاً "بوجہ علاوہ رک جانے حرکت قلب کے وفات پائی" یا "باوصف اس قدر سن آنے کے میں نے کوئی لیاقت نہیں حاصل کی" وغیرہ۔ اس قسم کے الفاظ اور ترکیبیں اس زمانہ کی تحریروں خصوصاً سرکاری اخبارات میں اکثر ملیں گی۔ اس لیے انھیں نقائص میں نہ شمار کرنا چاہیے۔

آخر میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اردو میں بالخصوص نثری صنف روزنامچے کی بہت بڑی کمی تھی۔ مولوی صاحب

کے اس روزنامچے نے اس کمی کو بڑی حد تک پورا کر دیا ہے۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ اس التزام، اس ترتیب اور اس طریقہ کا مربوط و منظم روزنامچہ شاید ہی کسی زبان میں لکھا جا سکے۔ بیالیس سال تک ناغہ نہ ہونے دینا، ذاتی مقامی ملکی اور غیر ملکی تمام واقعات کا بڑی پابندی سے اندراج کرتے رہنا ہی ایسا کارنامہ ہے جو نہایت قابل قدر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ روزنامچہ نویسی کے معاملہ میں اردو زبان اس روزنامچے کی بدولت دوسری زبانوں کی صف میں سربلندی حاصل کر سکے گی۔

○

نوٹ: روزنامچہ کی کتابت کے متعلق پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مولوی صاحب اسے پہلے اپنے خط شکست میں لکھتے تھے پھر اسے بولتے جاتے تھے اور سید محمود ذکی درگاہی صاحب (محرر اکٹرائی میونسپلٹی سندیلہ) اسے خوشخط لکھتے جاتے تھے۔ لیکن یہ روزنامچہ صرف ۳۱ اگست ۱۹۰۹ء تک سید محمود ذکی صاحب کا صاف کیا ہوا ہے۔ اس کے بعد چونکہ مولوی صاحب سکریٹری میونسپل بورڈ نہیں رہے تھے غالباً سید محمود ذکی صاحب کو اپنے دفتری کام سے فرصت یا رخصت نہ مل سکی اس لیے مولوی صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا یکم ستمبر ۱۹۰۹ء سے ۱۲، مارچ ۱۹۱۱ء تک کا روزنامچہ صاف نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے بعد مولوی صاحب نے ۱۳، مارچ ۱۹۱۱ء سے یوم وفات خود (۲۴ دسمبر ۱۹۱۱ء) تک دوسروں کو بول کر لکھوایا کیوں کہ وہ خود بوجہ علالت نہیں لکھ سکتے تھے۔ ۱۹۶۰ء میں، میں نے یہ ناصاف حصہ پہلے خود الگ کاغذات پر صاف کیا (کیونکہ مولوی صاحب کا شکستہ خط کوئی کاتب پڑھ نہیں سکتا تھا اور خود مجھے اس کو صحیح پڑھنے میں پسینے آ گئے تھے) اور پھر ایک دوسرے خوش نویس منشی عبدالحلیم صاحب ساکن سبہا، ضلع بارہ بنکی سے لکھنؤ میں خوشخط لکھوا کر جلد بندی کرا دی۔

سید محمود ذکی صاحب مرحوم کا خط تو نہایت پاکیزہ صاف اور روشن ہے۔ لیکن انھوں نے اپنے زمانہ کی رسم کتابت کو ملحوظ رکھا ہے۔ بجائے پیش لگانے کے انھوں نے واؤ معروف سے کام لیا ہے یعنی الفاظ اُس، اُن، اُردو وغیرہ کو اوس، اون، اوردو لکھا ہے۔ کل کو کلہ۔ کان پور کو کانہ پور وغیرہ۔ لیکن تعجب معلوم ہوتا ہے کہ باوجود خاصے پڑھے لکھے ہونے کے انھوں نے بعض جگہ املے کی غلطیاں کر دی ہیں مثلاً ہذیان کو حزیان، ارب کو عرب، سحر کو سہر، ترکاری کو ترقاری، مجتبیٰ کو مجتبہ، معدہ کو میدہ لکھ گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب سید محمود ذکی صاحب پر اعتبار کرتے ہوئے ان کی تحریر پر نظر نہیں ڈالتے تھے۔ صرف پڑھوا کر سن لیتے ہوں گے۔

اشاریہ

جغرافیہ قصبہ سندیلہ: قصبہ سندیلہ (ضلع ہردوئی) میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تر مخدوم سید علاء الدین (۶۴۲ھ-۷۹۰ھ) خلیفہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے ورود سے ہوئی۔ قصبہ سندیلہ اسٹیشن سندیلہ کے شمال میں واقع ہے۔ آبادی اسٹیشن ہی سے شروع ہو گئی ہے۔ وسط قصبہ میں صدر بازار کی سڑک ہے جو قصبہ کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ سڑک کے پچھم میں اشراف محلہ آباد ہے جسے مخدوم صاحب مذکور کے خاندان کے ایک بزرگ شیخ المشائخ سید حسن میاں (۹۹۱ھ-۹۲۲ھ) نے ۹۸۲ھ میں آباد کیا تھا۔ اور وہیں اپنی بنوائی ہوئی مسجد سے متصل محو خواب ابدی ہیں۔ مولوی سید مظہر علی اسی محلہ میں اپنے خالو سید فضل رسول کے مکان کے بالکل پڑوس میں رہتے تھے۔ اشراف محلہ میں آباد مخدوم علاء الدین صاحب کی نسل مخدوم زادگان اشرف ٹولہ کے لقب سے موسوم رہی ہے۔

اشراف محلہ کا شمالی حصہ محلہ ملکانہ کہلاتا ہے۔ جنوبی حصہ میں کسانوں کا محلہ پاکسانی ٹولہ ہے۔ مغربی حد پر "شیر حوض" (دراصل شیریں حوض) کا میدان، "عیدگاہ"، "دیبی یا دبین کا تالاب" اور "تالاب کربلا" ہے۔ صدر بازار کی سڑک کے پورب میں محلہ جات "منڈی"، "مہتوانہ"، "موسلی پور" اور "درگاہ" ہیں ان محلوں میں مسلمان چودھریوں اور کائستھوں یا کھتریوں کے خاندان آباد ہیں۔ راجہ درگا پرشاد اور راجہ نریندر بہادر اور راجہ وزیر چند بھی اسی محلہ مہتوانہ میں رہتے تھے۔ مخدوم صاحب مذکور کا مزار اسی جانب ہے اور انھیں کے عہد کی بنی ہوئی مسجد بھی۔ یہ دونوں عمارتیں فیروز شاہ تغلق کی بنوائی ہوئی ہیں۔ ریلوے اسٹیشن کے متصل دکھن کی طرف تحصیل سندیلہ کا دفتر ہے اور اسٹیشن کے قریب ہی سید فضل رسول صاحب تعلقہ دار مرحوم (مولوی مظہر علی صاحب کے) خالو اور ان کے بیٹے سید فضل حسین کا مقبرہ ہے اور ساتھ میں ایک کوٹھی مع باغ اسی خاندان کی ملکیت ہے۔ جو "عمر ہرہ" یا "امر ہرہ" کہلاتا ہے اور اسی باغ کے ایک گوشہ میں خاندانی قبرستان ہے جہاں مولوی مظہر علی کے خاندان کے لوگ بھی دفن ہوتے رہے ... دکھن کی طرف اسی باغ کے کنارے اب لکھنؤ اور ہردوئی جانے والی شاہراہ ہے اور اب وہاں ایک بڑا بس کا اڈا بن گیا ہے جس کی وجہ سے وہاں دوکانوں اور مکانوں کی کثرت ہو گئی ہے۔ اس شاہراہ سے کچھ ہی دور دکھن کی طرف مولوی مظہر علی کا باغ ہے جہاں ان کی قبر بنی ہوئی ہے اور اسی باغ کے کچھ آگے دکھن کی طرف مواضعات مخدوم پورہ، "ملیاں"، "گدوری" وغیرہ ہیں جن کا ذکر روزنامچہ میں متعدد بار آیا ہے۔ پس اکّا کے جانب دکھن اور مولوی صاحب کے باغ کے کنارے

سے گزرتی ہوئی اب ایک عمدہ پختہ سڑک بن گئی ہے جو ضلع اناؤ کی طرف جاتی ہے۔ ریلوے اسٹیشن سے قریب جانب شمال قصبہ کا تھانہ اور ڈاک خانہ ہے۔

خود مولوی صاحب کی زمینداری کے مواضعات "کمال پور" اور "گھوگیرہ" سندیلہ سے کوئی آٹھ دس میل کے فاصلہ پر جانب مغرب تھے۔ ضلع ہردوئی کی دیگر تحصیلیں علاوہ سندیلہ کے شاہ آباد، بلگرام اور تحصیل ہردوئی ہیں تحصیل سندیلہ ضلع کے جنوب میں ہے۔ اس لیے اس کی سرحد ضلع اناؤ اور ضلع سیتاپور سے ملتی ہے۔ ضلع اناؤ کے مواضعات "گنج مراد آباد" اور "بانگر مئو" اور تحصیل بلگرام کے ایک موضع "ملاّ ناواں" کا ذکر روزنامچہ ہذا میں آیا ہے۔ قصبہ دیوہ یا دیوا ضلع بارہ بنکی میں ہے لکھنؤ سے ۲۴ میل پورب میں جہاں حاجی وارث علی شاہ صاحب کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔

مولوی مظہر علی صاحب کے اکابر

منشی سید فضل رسول صاحب: (۱۸۰۷-۱۸۷۹ء)۔ مولوی مظہر علی صاحب کے حقیقی خالو، مخدوم زادہ، جوانی میں نائب میر منشی ایجنٹ جودھ پور و اجمیر رہے۔ ۱۸۵۳ء میں ملازمت ترک کر کے اپنے وطن سندیلہ میں مستقل قیام اختیار کیا اور سرمایہ موجودہ سے متعدد مواضعات خرید کیے۔ منجملہ ان کے ایک موضع متوسلہ تحصیل ہردوئی میں آباد کیا جہاں کا مشہور آم ثمر بہشت آپ ہی کا ایجاد کیا ہوا ہے۔ زمانہ غدر میں انگریزوں کی مدد کی تھی اس کے صلہ میں بھی کئی مواضعات ملے اور تعلقدار "جلال پور" نامزد ہوئے۔ گورنمنٹ سے اختیارات فوجداری درجہ دوم و اختیارات مال و دیوانی بھی اپنے علاقہ کے حاصل تھے۔ علوم متداولہ عربی و فارسی و نجوم و حکمت میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ اپنی فہم و فراست سے سرکار انگریزی میں بڑا رسوخ حاصل کیا تھا۔ آدمی بہت منتظم تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۱ء میں انھوں نے کرنل سلیمن (جنھوں نے الحاق اودھ کے لیے جال بچھایا تھا) کے سامنے ایک اسکیم رکھی تھی جس سے اودھ کی حکومت کا انتظام بہت بہتر ہو سکتا تھا لیکن کرنل سلیمن نے اسے نامنظور کرتے ہوئے کہا تھا کہ تم اس معاملہ میں نہ پڑو اور اپنے کام پر واپس جاؤ۔ فضل رسول صاحب کو شعر و شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ اردو میں ان کے دو دیوان شائع ہوئے تھے۔ ایک ان کی زندگی میں دوسرا وفات کے بعد۔ فن شاعری میں اپنے ہم عمر اور بچپن کے دوست (دونوں اپنے ننھیال قصبہ امیٹھی ضلع لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے) مظفر علی اسیر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ آپ کی عمارت مقبرہ سندیلہ میں آپ کی یادگار ہے۔

منشی فہیم الزماں صاحب: دیوان محمد علی صاحب "باندہ" کے نواسے جو سندیلہ میں اقامت پذیر ہو گئے تھے محلہ ملکانہ میں رہتے تھے۔ مولوی صاحب کی شادی آپ ہی کی بھانجی مساۃ شمس النساء سے ہوئی تھی۔ اپنے زمانہ

کے مشہور رئیس تھے۔ علم تواریخ سے بے حد شغف تھا۔ ۱۸۹۰ء میں بہ عمر ۶۳ سال وفات پائی۔ آپ کے اخلاف اب لکھنؤ میں اقامت پذیر ہیں۔

حافظ کرامت احمد صاحب: ایک نہایت متبرک خصائل صوفی منش اور متوکل بزرگ تھے۔ مولوی صاحب کے گھر کے بہت قریب آپ کا مکان تھا۔ پہلے ضلع جالون و ساگر (صوبہ متوسط) وغیرہ میں بہ عہدۂ سررشتہ داری ملازم رہے۔ بعد ملازمت پنشن لے کر خانہ نشین ہو گئے تھے۔ آپ کے صدہا مرید سندیلہ و نواح سندیلہ میں تھے۔ مولوی مظہر علی صاحب نے کئی کتب درسیہ آپ سے پڑھی تھیں۔ ۱۸۸۰ء میں بہ عمر ۷۵ سال وفات پائی۔ مولوی صاحب کے چھوٹے بھائی سید اظہر علی اور منجھلے بیٹے سید مجتبیٰ علی دونوں آپ کے مرید تھے اور بعد وفات حافظ صاحب انکے خلیفہ یکے بعد دیگرے ہوئے اور عرصہ دراز تک حافظ صاحب کا عرس ان دونوں خلفا کی حیات تک ہوتا رہا۔

قاضی وجیہ الدین صاحب: مولوی صاحب کے عزیز قریب تھے۔ شیخ فریدالدین گنج شکر کی نسل کا ایک خاندان سندیلہ میں عرصہ دراز سے آباد ہے۔ قاضی صاحب اسی خاندان کے ایک فرد تھے۔ عہد شاہی میں سندیلہ کا محکمہ قضا اسی خاندان کو تفویض ہوا تھا۔ قاضی صاحب سلسلہ چشتیہ میں مرید تھے۔ سماع کا بے حد شوق تھا۔ اپنے پیر حافظ امام علی صاحب کا سالانہ عرس بڑی دھوم دھام سے کرتے تھے۔ ۱۸۷۹ء میں بعمر ۷۲ سال وفات پائی۔

حافظ شوکت علی صاحب: خلف چودھری اسد علی صاحب محلہ مہتوانہ کے ایک مقتدر رئیس باوضع اور خلق مجسم بزرگ تھے۔ پیروں سے معذور تھے۔ لیکن علوم دینی میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ ایک مدرسہ شوکت الاسلام جاری کیا تھا جہاں بڑی دور دور سے طلبہ علوم دین حاصل کرنے آتے تھے۔ مولوی مظہر علی صاحب نے بھی حافظ صاحب مرحوم سے کچھ عربی پڑھی تھی۔ ۱۹۰۲ء میں بعمر ۸۶ سال وفات پائی۔

منشی عزیز الدین: مولوی صاحب کے گھر کے قریب رہتے تھے۔ صوبہ متوسط میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدہ تک ترقی کی تھی۔ زمانہ غدر میں انگریزوں کی مدد کی تھی اس کے صلہ میں ایک بڑا موضع "اٹوا" نامی تحصیل بلگرام میں ملا تھا۔ بعد حصول پنشن خانہ نشین ہو گئے تھے۔ آدمی راست گو، لائق اور تجربہ کار تھے۔ مئی ۱۸۸۲ء میں بعارضہ فالج بہ عمر ۶۶ سال وفات پائی۔

منشی سید شمس الدین: سید فضل رسول کے چھوٹے بھائی تھے۔ پہلے میر منشی ایجنٹ جودھ پور رہے۔ پھر یو۔ پی میں تحصیلدار۔ بعد پنشن کچھ عرصہ ریاست بلرام پور (اودھ) میں نائب ریاست رہے۔ ۱۸۸۶ء میں وہاں سے ترک تعلق کر کے خانہ نشین ہو گئے تھے (وفات ۱۸۹۲ء بہ عمر ۵۷ سال) "ترانہ دلکش" کے نام سے اپنا مجموعہ

کلام شائع کرایا تھا جس میں ہندوستانی راگ اور راگنیوں پر مبنی غزلیں اور گیت تھے دوسری کتاب قیامت [illegible] کے نام سے بھی طبع ہوئی تھی۔

مولوی صاحب کی اولاد

مولوی سید مصطفیٰ علی: (۱۸۶۳-۱۹۴۳ء) مولوی مظہر علی صاحب کے سب سے بڑے بیٹے۔ ۱۹۰۲ء میں بیرسٹری پاس کی لیکن اس پیشہ کو بہ وجہ کمزوری صحت نباہ نہ سکے۔ کچھ دنوں ہردوئی میں پریکٹس کی پھر سی۔ پی میں۔ اس کے بعد گھر آ گئے۔ کچھ دنوں اپنے والد کی وفات کے بعد مجسٹریٹی کی لیکن اسے بھی چھوڑ دیا اور اپنی زمینداری کی آمدنی پر گزارہ کرنے لگے۔ حصول علم کا بے حد شوق تھا۔ سارا وقت کتب بینی میں صرف ہوتا تھا۔ ان سے نوٹس بھی تیار کرتے رہتے تھے۔ ہر علم کی کتاب ان کی لائبریری میں موجود تھی۔ پہلے دو نوجوان اولادیں نہیں رہیں پھر بیوی بھی نہ رہیں اس لیے دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ محض کتب بینی سے وقت کاٹتے تھے۔ بڑے پابند اوقات بزرگ تھے۔ اردو زبان، فلسفہ اور سائنس سے زیادہ شغف تھا۔

مولوی سید مجتبیٰ علی: (۱۸۶۷-۱۹۴۲ء) مولوی مظہر علی کے دوسرے بیٹے۔ نہایت متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ مذہب اور تصوف سے بے حد ذوق تھا۔ امتحان قانون گوئی پاس کیا تھا مگر اس سے کوئی دنیوی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ حافظ کرم احمد صاحب کے مرید نوجوانی ہی میں ہو گئے تھے۔ بعد ان کے خلیفہ قرار دیے گئے تھے۔ ساری عمر عبادت و وظائف و دینداری میں گزری۔ ذریعہ معاش موروثی زمینداری تھا۔ دو بیٹے یادگار چھوڑے تھے ایک سید مزمل حسین جو بھوپال خاص میں تحصیلدار تھے (وفات ۱۹۶۲ء) دوسرا یہ راقم الحروف نور الحسن ہاشمی۔

مولوی سید ارتضیٰ علی: (۱۸۷۱-۱۹۴۶ء) مولوی مظہر علی کے تیسرے بیٹے۔ ایف۔ اے تک انگریزی پڑھی تھی۔ کچھ دنوں سندیلہ میونسپلٹی کے سکریٹری رہے۔ لیکن عمر کا زیادہ حصہ سیر و سیاحت میں گزرا — آخر میں خانہ نشین ہو گئے تھے۔ زوجہ ثانیہ سے دو بیٹے یادگار چھوڑے سید التجا حسین اور سید اقتدار حسین۔ یہ دونوں سندیلہ ہی میں رہتے ہیں۔ التجا حسین صاحب اولاد ہیں دوسرے نے شادی نہیں کی۔

مولوی سید مرتضیٰ علی: (۱۸۷۲-۱۹۲۹ء) مولوی صاحب کے سب سے چھوٹے بیٹے۔ ۹۰۲ میں بیرسٹری پاس کرنے کے بعد پہلے کچھ دنوں الہ آباد میں بعدہ شاہجہاں پور میں پریکٹس شروع کی۔ پھر ریاست بھوپال میں پہلے منصفی ملی پھر ترقی کر کے آخر میں بھوپال ہائی کورٹ کے جج ہو گئے تھے۔ ایک دن حسب معمول ورزش کر رہے تھے کہ دفعتاً دماغ کی رگ پھٹ گئی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم اس زمانہ میں وہیں تھے۔ انھوں نے بہ[illegible] تدبیریں کیں لیکن ان کی جان بری نہ ہو سکی (۱۹۲۹ء)۔ مرحوم بڑے روشن دماغ، خوش تدبیر، ذہین اور کنبہ[illegible]

سے تھے۔ایک بیٹی اور دو بیٹے سید سلطان علی و سید سلیمان بھی یادگار چھوڑے تھے جو بھوپال ہی میں اقامت پذیر ہو گئے تھے۔اب صرف سید سلطان علی حیات ہیں۔

افضلاً: (۱۹۴۴-۱۸۷۰ء) مولوی صاحب کی سب سے بڑی بیٹی۔قریبی عزیزوں میں سعید الدین ساگر (مدھیہ پردیش) کو بیاہی تھیں ان کے دو بیٹے اندور میں مقیم ہو گئے تھے۔ایک بیٹی ساتھ رہتی تھیں۔ بیٹوں اور بیٹی کی اولادیں پاکستان میں بس گئی ہیں۔ان کی بڑی بیٹی انجمن النسا (۱۹۶۱-۱۸۸۷ء) کم سنی ہی بیوہ ہو گئی تھیں۔مولوی صاحب نے ان کا عقد ثانی خلاف رسم زمانہ کرایا تھا۔روزنامچہ ہذا میں اس کا ذکر موجود ہے۔

النساءاً: (۱۹۰۵-۱۸۷۷ء) ان کی شادی مولوی صاحب نے اپنے حقیقی بھتیجے سید اصغر علی ولد سید مظہر علی سے کی تھی۔ایک لڑکی یادگار چھوڑی تھی اس کی اولاد پاکستان چلی گئی۔

جمیلاً: (۱۹۰۱-۱۸۸۲ء) خیرآباد کے ایک رئیس سید اعجاز الحسن کے ساتھ ان کا عقد ہوا تھا۔لاولد فوت ہوئیں۔

مقیماً: (....-۱۸۸۴ء) خیرآباد کے ایک عزیز دار محمد ابراہیم کو بیاہی گئی تھیں جو ریاست "جوبٹ" مدھیہ پردیش) میں ملازم تھے۔ان کی اولاد نرینہ (۲ بیٹے) پاکستان میں ہیں۔ایک بیٹی تھیں جن کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہندوستان میں ہے اور ایک بیٹا اور ایک بیٹی کراچی میں۔

سید اصغر علی: (....-۱۸۷۴ء) پہلے بھوپال میں ملازم تھے۔آنکھوں میں خرابی ہو جانے کے باعث قبل از وقت پنشن لے کر سندیلہ چلے آئے تھے۔پہلی شادی مسماۃ النساءاً سے ہوئی تھی۔وہ نہ رہیں تب دوسری شادی عزیزوں میں کی۔ان سے ایک بیٹا مسمی سید انور علی پیدا ہوا جس کا انتقال ہندوستان ہی میں جوانی میں ہوا۔فوج کے اکاؤنٹ آفس میں ملازم تھے سید انور علی کے بال بچے (دو بیٹے تین بیٹیاں) اب کراچی میں ہیں۔

مولوی خلیل الدین: مولوی صاحب کے حقیقی بھانجے (۱۹۲۷-۱۸۵۹ء) بڑے عالم فاضل شخص تھے۔حاجی، حافظ اور حکیم۔مدتوں ریاست جھالاواڑ میں مدرس عربی و فارسی رہے۔وہاں کا راجہ ان کو بہت مانتا تھا اور اپنے خرچ پر انھیں شام و عراق و عرب کے تمام متبرک مقامات کی زیارت پر بھیجا تھا۔ان کے ایک بیٹے ڈاکٹر جمیل الدین تھے جو سندیلہ ہی میں پریکٹس کرتے تھے اور ایک بیٹی تھی۔دونوں کا ابھی دو تین سال کے اندر انتقال ہو چکا ہے۔ڈاکٹر جمیل الدین کی شادی مقیماً کی بیٹی سے ہوئی تھی جن کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔

منتظم حسین: ابن سید مصطفیٰ علی۔مولوی صاحب کے سب سے بڑے پوتے (۱۹۰۷-۱۸۸۵ء) جوانی ہی میں بعارضۂ دق وفات پائی۔اسی طرح ان کی چھوٹی بہن مسماۃ زینب (۱۹۰۹-۱۸۹۲ء) نے بھی جوانی

میں ادق میں تعضا کی اور اس طرح سید مصطفیٰ علی کی گیارہ اولادوں میں سے کوئی باقی نہ رہا۔

مولوی صاحب کے دیگر اعزہ و احباب

منشی سید فضل حسین : (۱۹۰۱-۱۸۴۹) سید فضل رسول صاحب کے بیٹے جو اپنے والد کی وفات کے بعد تعلقدار "جلال پور" ہوئے۔ یہ مولوی صاحب کے خالہ زاد بھائی تھے۔ انھیں کے زمانہ میں مولوی صاحب ان کے تعلقہ کے دو مرتبہ منیجر مقرر ہوئے۔ پہلے ۱۸۸۰ء - ۱۸۸۷ء پھر ۱۸۹۷ء تا حیات فضل حسین صاحب۔ روزنامچہ میں ان کا اور ان کے متعلقین کا ذکر کثرت سے آیا ہے۔

سید التفات رسول (۱۹۲۱-۱۸۸۳ء) اپنے والد سید فضل حسین کے بعد تعلقدار ہوئے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ سالانہ مشاعرے بڑے پیمانہ پر کیا کرتے تھے جن میں مشاہیر شعرائے اردو شرکت کرتے تھے۔ آرزو لکھنوی سب سے پہلے آپ ہی کے زمرۂ مصاحبین میں ملازم ہوئے تھے۔ ہاشمی تخلص تھا اور آرزو کے شاگرد تھے۔ آپ ہی کی بہو بیگم اعزاز رسول آجکل اقلیتی کمیشن (یو پی سرکار) کی صدر ہیں۔

سید الطاف رسول : (۱۹۰۴-۱۸۶۹ء) سید فضل حسین صاحب کے بڑے بیٹے تھے۔ لیکن بوجہ ضعف دماغی تعلقداری انھیں نہ ملی بلکہ ان کے چھوٹے بھائی التفات رسول کو دی گئی تھی۔ الطاف رسول مرحوم کے بیٹے سید افضال رسول صاحب (ولادت ۱۹۰۰ء) مع قبائل خود کراچی میں مقیم ہو گئے ہیں۔

سید معراج رسول : سید فضل حسین صاحب کی دوسری زوجہ سے تھے۔ ان کا بھی کراچی میں انتقال ہو چکا ہے۔ ان کی اولاد وہیں پاکستان میں ہے۔

سید امیر حسن : سید فضل رسول کے ایک بیٹے ایک کنیز کے بطن سے (ولادت ۱۸۶۵ء) ــ التفات رسول صاحب کے زمانہ میں یہاں کی ریاست کے منیجر ہو گئے تھے۔ ان کے تین بیٹے تھے۔ جن میں سے ایک ابھی حیات ہیں (دبیر حسن صاحب) اور لکھنؤ میں قیام پذیر۔

منشی سید عنایت حسین : وفات ۱۹۰۵ء۔ مولوی صاحب کے لڑکپن کے دوست تھے اور عزیز دار۔ پہلے یو۔پی کے اضلاع میں ملازم رہے پھر بھوپال میں صدر المہام ہو گئے تھے۔ پہلی شادی منشی شمس الدین صاحب کی بیٹی سے ہوئی جن سے دو بیٹے ہوئے۔ نجم الدین اور قمر الدین۔ دوسری شادی بھوپال میں کی اور وہیں اقامت اختیار کر لی تھی ــ وہیں ۱۹۰۵ء میں وفات پائی۔ زوجۂ ثانی سے جو اولاد ہوئی ان میں سید آفاق حسین نے ناموری حاصل کی۔ اب آفاق حسین صاحب کی اولاد بھوپال ہی میں اقامت گزیں ہے۔

سید حافظ علی: مولوی صاحب کے عزیز اور پڑوسی۔ ایف اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ انگریزوں کو اردو پڑھاتے تھے۔ والی کالج اندور میں فارسی کے استاد تھے۔ ایک انگریزی ناول کا بہت اچھا ترجمہ مونس غمگسار کے نام سے ۱۸۸۹ء میں شائع کروایا تھا (وفات ۱۹۱۷ء)

چودھری عبد الباقی: اشراف محلہ کے ایک نامور رئیس اور بزرگ شخصیت۔ علوم متعارفہ میں ماہر۔ حافظ چودھری شوکت علی کے شاگرد خاص مولوی صاحب کو بہ حیثیت ایک سینئر طالب علم کے آپ نے بھی کچھ پڑھایا تھا۔ مولوی صاحب سے بڑے مراسم اتحاد تھے (وفات ۱۸۹۷ء بہ عمر ۵۵ سال)

سید کرامت حسین: سید عنایت حسین کے چھوٹے بھائی تھے۔ محکمہ بندوبست و علاقہ جات کورٹ آف وارڈس میں منصرم اور سربراہ کار رہ کر پھر تحصیلدار اور ڈپٹی کلکٹر ہو کر ریٹائر ہونے عرصۂ دراز تک پنشن پائی (وفات غالباً ۱۹۲۹ء)

محمد عربی: ابن شیخ حامد حسن صاحب اشراف ٹولہ (ولادت ۱۸۷۳ء) ذہین تیز طبع اور خوش پوشاک فیشن ایبل نوجوانوں میں تھے۔ بیرسٹری پاس کر کے کچھ دنوں پریکٹس کی تھی مگر زیادہ عمر نہ پائی۔ آپ کے بیٹے انس عربی و احمد عربی تھے۔ موخر الذکر سیتاپور کے بہت کامیاب وکیلوں میں تھے۔ انس عربی تو لاولد فوت ہوئے۔ احمد عربی نے ۱۹۷۳ء میں وفات پائی۔ ان کی اولاد سیتاپور میں ہے۔

منشی قبول احمد: وفات ۱۹۴۴ء خلف منشی عزیز الدین صاحب۔ بہت ذی ہوش وجیہہ اور حکام رس آدمی تھے۔ مولوی صاحب کے زمانہ میں بڑے زیرک نوجوانوں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔

چودھری خصلت حسین: (وفات ۱۸۸۲ء) محلہ مہتوانہ میں ایک بہت بڑے تعلقدار تھے اور بڑے خوش انتظام۔ اودھ میں انجمن تعلقداران بمقام لکھنؤ قائم تھی اس کے سکریٹری بھی عرصہ تک رہے۔ آخر میں خطاب راجگی بھی مل گیا تھا۔

چودھری محمد عظیم: چودھری خصلت حسین کے بڑے بیٹے۔ آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔ پورے ضلع ہردوئی میں آپ کا تعلقہ بہ لحاظ آمدنی دوسرے نمبر پر تھا۔ ۱۹۰۲ء میں دفعتاً انتقال کیا۔ مولوی صاحب سے مراسم خصوصی تھے۔

چودھری محمد خاں: خلف چودھری محمد عظیم صاحب (وفات ۱۹۱۸ء)

چودھری نصرت علی: ولد چودھری عظمت علی۔ محلہ مہتوانہ کے بڑے رئیسوں میں تھے۔ انجمن تعلقداران اودھ (لکھنؤ) کے عرصہ تک سکریٹری رہے۔ بڑے وسیع الاخلاق اور ذکی الطبع لوگوں میں تھے۔

خطاب خاں بہادری بھی ملا تھا۔ تعلقداران اودھ میں آپ کا طوطی بولتا تھا لیکن بدقسمتی کہ ایک خاص مقدمہ میں ماخوذ ہو جانے کی وجہ سے آپ کا عہدہ اور خطاب دونوں جاتے رہے تھے (وفات ۱۳۲۹ھ)

چودھری جاوید علی: چودھری خصلت حسین کے بڑے بھائی تھے۔ ابتدائے عمر میں بہت خوشحال اور صاحب حشمت و جاہ رہے۔ سندیلہ کی چکلہ داری بھی کی اور بہت مرفہ حال رہے۔ لیکن ان کو اپنی زندگی میں تین بڑے صدمے نصیب ہوئے۔ اول نابینا ہو جانا اپنے اکلوتے فرزند احمد عظیم کا دوسرے محرومی از مسند تعلقداری، تیسرے انتقال ان کی بہو کا جو خانہ داری میں نہایت لیاقت مند تھیں (وفات بعارضہ ذیابیطس سال ۱۸۹۳ء)

سید نجم الدین و سید قمر الدین: پسران سید عنایت حسین۔ مولوی صاحب کے عزیزوں میں دو خوش لیاقت جوان حضرات۔ دونوں کو شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ خصوصاً سید قمر الدین قمر خوش گو شاعر تھے۔ امیر مینائی کے شاگرد۔ عرصہ تک ایک رسالہ "قمر" نکالتے رہے اور کئی نظمیں چھپوائیں۔ ان کا غیر مطبوعہ کلام مشتمل بر دیوان غزلیات دیوان قصائد و دو تین مثنویات وغیرہ اب بھی ان کی نواسی قمر افضل کے پاس لکھنؤ میں موجود ہے۔

مولوی سید علی احمد صاحب: (۱۸۴۴-۱۹۱۵) - جبل پور میں وکالت کرتے تھے جہاں بڑا نام پیدا کیا۔ سر سید احمد خاں سے بہت متاثر تھے۔ چنانچہ جبل پور میں انجمن اسلامیہ قائم کی جس کے تحت وہاں ایک اسکول مسلمان لڑکوں کے لیے اور ایک مسلمان لڑکیوں کے لیے قائم کیا تھا جو ابھی تک قائم ہیں۔ جبل پور کے میونسپل سکریٹری بھی ہو گئے تھے۔ خطاب خان بہادری حاصل کیا تھا۔ آخر عمر میں بہت خاموش رہنے لگے تھے۔ سندیلہ ہی میں وفات پائی۔

راجہ درگا پرشاد: (۱۸۴۶-۱۹۲۰ء) خلف راجہ دھنپت رائے۔ سندیلہ کے پشتینی راجاؤں میں تھے۔ سنسکرت، فارسی، اردو، ہندی میں مہارت تام۔ شاعری فارسی اور اردو میں کرتے تھے۔ بڑے فیاض، بامروت اور علم دوست رئیس تھے۔ تاحیات سندیلہ میونسپلٹی کے چیرمین رہے اور آنریری مجسٹریٹ بھی اور انگریزی اسکول کے چیرمین بھی۔ ایک سرائے بنام کوشن سرائے اسٹیشن سندیلہ کے قریب بنوائی تھی جو ابھی تک قائم ہے۔ تصنیف و تالیف کا بہت شوق تھا اور ایک اچھی لائبریری بھی ان کے پاس تھی۔ ایک ذاتی مطبع بھی قائم کیا تھا جس میں ان کی اپنی اور دوسروں کی کتابیں شائع ہوتی تھیں مشہور تصانیف یہ ہیں:

فارسی: گلستاں ہند، تاریخ ہند با تصویر، تذکرہ حدیقہ عشرت، پند دل پسند، مخزن اخلاق، بوستان اودھ۔ (تاریخ اودھ با تصویر)

اردو: مثنوی مہر تاباں، گلشن ہدایت، تاریخ اجودھیا با تصویر، تاریخ سندیلہ، ترجمہ مہابھارت (سات مختلف پرچے) شائع ہو سکے تھے۔ مہابھارت کا یہ ترجمہ اصل سنسکرت ماخذ اور فیضی کے فارسی ترجمہ کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا ہے اور بہت خوب ہے۔ مولوی صاحب چونکہ عرصہ دراز تک میونسپل سکریٹری رہے اور دونوں بنچ مجسٹریٹ بھی تھے اس لیے دونوں میں یکجائی کے باعث بڑی دوستی تھی۔

کنور منوہر بہادر: بنچ مجسٹریٹ تھے۔ راجہ درگا پرشاد صاحب کے عزیز قریب۔ مولوی صاحب سے مراسم اتحاد تھے۔ فارسی اور انگریزی میں اچھی لیاقت رکھتے تھے۔ وفات ۱۹۰۵ء بہ عمر ۴۵ سال۔

چودھری محمد رؤف: چودھری خصلت حسین کے چھوٹے بھائی تھے۔ رئیس قصبہ، بنچ مجسٹریٹ ہونے کی وجہ سے مولوی مظہر علی صاحب سے بہت دوستانہ تعلقات تھے۔ تاریخ پیدائش و وفات معلوم نہ ہو سکی۔ ان کے ایک پوتے عشرت علی صدیقی صاحب اخبار "قومی آواز" کے مشہور اڈیٹر ہیں۔

سید وصی علی شاہ: درگاہ مخدوم علاؤالدین کے سجادہ نشین تھے۔ بہت خلیق، خوش اوقات اور مہمان نواز۔ آپ کے صدہا لوگ مرید تھے۔ (وفات ۱۸۹۸ء بہ عمر ۶۱ سال) راجہ جنگ بہادر خاں نانپارہ نے آپ کا مزار سنگ مرمر کا بنوا دیا تھا۔

لالہ لالتا پرشاد: تعلقہ جلال پور میں سیاہہ نویس تھے۔ بڑے سمجھدار اور فرض شناس۔

لچھمن پرشاد: سندیلہ کے مشہور مہاجن تھے پہلے بزازی کرتے تھے۔ بعد میں نمایاں ترقیاں کیں اور کچھ زمینداری بھی پیدا کر لی تھی۔ مولوی صاحب سے کافی مراسم تھے۔

حکیم ظہور الحسن: سندیلہ میونسپلٹی کے طبیب تھے اور بحیثیت طبیب کے بڑا نام پیدا کیا تھا۔ ۱۹۱۷ء میں بعارضہ طاعون وفات پائی۔ مولوی صاحب کے خاندان میں زیادہ تر آپ ہی کا علاج ہوتا تھا۔ مولوی صاحب نے ایک موقع پر ایک باغ بطور انعام آپ کو دیا تھا۔

نور الحسن ہاشمی

باب اوّل

واقعاتِ ہند

○

سفر کی مدت: ۲۹ فروری ۱۸۶۸ء آج اہل خانہ حافظ کرم احمد صاحب و والدہ سید عابد علی وغیرہ اکیس دن سفر کے بعد ساگر سے سندیلہ پہنچے۔

شہر بمبئی: ۳ مارچ ۱۸۶۸ء منشی فہیم الزماں صاحب لکھنؤ سے تشریف لائے۔ کیفیت شہر بمبئی کی ان کی زبانی مفصل معلوم ہوئی واقعی شہر مذکور قابل سیر ہے۔

پہلے پہل ریل کا سفر: ۱۲ مئی ۱۸۶۸ء۔ چونکہ میں اس وقت تک ریل پر سوار نہیں ہوا تھا۔ شوقیہ ریل پر سوار ہو کر کانپور گیا، چوک میں شیخ امجد علی فرخ آبادی جو تا فروش کی دوکان پر ٹھہرا۔ باوصف نہ ہونے ملاقات کے بہت خلق سے وہ پیش آئے اور بوقت معاودت محمد یٰسین ان کے بیٹے کو میں نے آٹھ آنے واسطے شیرینی کے دیے۔

وفات لارڈ میو: ۱۷ فروری ۱۸۷۲ء۔ اس خبر کی تصدیق ہوئی کہ ۸ فروری ۱۸۷۲ء کو جناب نواب میو صاحب گورنر جنرل بہادر بہ تقریب دورہ جزیرۂ انڈمان میں بطرف جیل خانہ سیر کناں تشریف لے گئے۔ دفعتاً شیر علی خاں قیدی دائم الحبس نے ایک چھرا صاحب ممدوح کو ایسا کاری مارا کہ جاں بر نہ ہوئے اور انتقال فرمایا یہ شخص خیبر کا رہنے والا تھا۔

سرخ بخار: ۲۲ ستمبر ۱۸۷۲ء۔ آج کل بخار فصلی جس کو سرخ بخار کہتے ہیں اس گرد و نواح میں خصوصاً اور تمام ہندوستان میں عموماً اس کثرت سے پھیلا ہے کہ کمتر لوگ اس سے محفوظ ہیں۔ تین دن تک شدت زیادہ رہتی ہے بعد اس کے کم ہو جاتا ہے اکثر شخصوں کے بدن پر دانے سرخ بھی پڑ جاتے ہیں جو خارش ہو کر زائل ہو جاتے ہیں۔

غلام امام شہید: ۲ اکتوبر ۱۸۷۲ء۔ مولوی غلام امام صاحب متخلص شہید متوطن الٰہ آباد آج تشریف لائے منشی فضل رسول صاحب ان کے بھانجے ہیں۔ شہید صاحب مولود بہت خوب پڑھتے ہیں اور وقت پڑھنے کے عشق آں حضرت میں بے چین ہو جاتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ آواز اچھی نہیں۔ بالفعل ان کی عمر ستر برس

کا ہے قرناۃ لگا کر سنتے ہیں۔

انگریزوں کی تعلیم: ۱۶ دسمبر ۱۸۷۰ء بوقت ملاقات کنیڈی صاحب اسسٹنٹ انجینئر کانپور نے دو کتابیں اردو کی ایک نو طرز مرقع 'دوسری' حلوائے بے دود مجھ سے لیں اور فرمایا کہ کل کوئی وقت اپنے پڑھنے کا مقرر کر دوں گا۔ ۱۰ جنوری ۱۸۷۲ء۔ بوقت ملاقات کنیڈی صاحب اسسٹنٹ انجینئر کانپور کو دو کتابیں 'مفید المبتدی' اور 'معلم المبتدی' پیش کیں۔ بعد ملاحظہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ مجھے بوقت فرصت ان کو پڑھا دیا کرو بلکہ چند باتیں متعلقہ کتاب مجھ سے دریافت کیں میں نے ان کا بہت مراحت سے جواب دیا کہ جس سے بہت خوش ہوئے۔

مشاعرہ: ۱۴ ستمبر ۱۸۷۳ء۔ بمقام لکھنؤ آج منشی مظفر علی اسیر کے مکان پر مشاعرہ تھا میں بھی بہمراہی منشی فضل رسول صاحب شریک ہوا' شام تک یہ صحبت رہی چودھری عبد الباقی سندیلہ نے بھی اپنی غزل فارسی کی پڑھی مجمع شاعروں کا بکثرت تھا' لطف خوب ہوا لیکن سہ پہر کو بارش نے بے لطفی کر دی۔

ادب: ۶ مارچ ۱۸۷۴ء۔ آج میں نے کتاب سرورش سخن' مصنفہ شیخ فخر الدین حسن صاحب دہلوی کو معائنہ کیا۔ واقعی یہ کتاب فسانہ عجائب کے مقابلہ میں خوب تیار ہوئی ہے اور بہت خوب ہے۔

مشاعرہ: ۲۶ فروری ۱۸۷۶ء۔ آج شب کو میرے مکان پر مشاعرہ ہوا۔ سید فضل حسین و چودھری عبد الباقی و دیگر شاعر شریک جلسہ تھے حضرت شاعرہ کی ریختہ گوئی سے حاضرین کو کمال حظ حاصل ہوا۔ بعد بارہ بجے رات کے صحبت برخاست ہوئی

دربار دہلی: ۵ دسمبر ۱۸۷۶ء۔ چونکہ یکم جنوری کو دہلی میں دربار ہونے والا ہے اور ملکہ وکٹوریہ شہنشاہی خطاب حاصل کریں گی اس وجہ سے جملہ راجہ و رؤسا کمال تزک و احتشام سے شرکت دربار کے واسطے جاتے ہیں۔ یہ دربار بھی قابل یادگار ہوگا۔ ریلوے کمپنی کو آج کل بہت فائدہ ہو رہا ہے۔

یکم جنوری ۱۸۷۷ء۔ آج ملکہ وکٹوریہ نے شہر دہلی میں خطاب شاہنشاہی قیصرۂ ہند کا حاصل کیا جلسہ عظیم ہوا ہندوستان کے سب بڑے بڑے راجہ شریک دربار تھے' اکثروں کو خطاب بھی حاصل ہوئے۔ ۲۲ لاکھ آدمیوں کا مجمع تھا۔ اور تاریخ امروز میں ہردوئی خاص میں بھی بڑا جلسہ ہوا جس میں تعلقداران ضلع و دیگر معزز اشخاص شریک تھے۔

قحط: ۲۷ اگست ۱۸۷۷ء لوگ مشہور کرتے ہیں کہ لارڈ لٹن صاحب گورنر جنرل ہندوستان اور کوپر صاحب لفٹیننٹ گورنر اضلاع مغربی و شمالی و اودھ کی نیت اچھی نہیں ہے' یہ ہی امر باعث خشک سالی ہے' یہ دونوں صاحب ان عہدوں پر جدید مقرر ہوئے ہیں۔

۵ ستمبر ۱۸۷۷ء غلہ روز بروز گراں ہوتا جاتا ہے۔ آج نرخ گندم کا ۱۴ سیر نمبری اور چنے و جو ۱۵ سیر

نمبری تھا۔ بارش مطلقاً نہ ہوتی خلق اللہ کو ہراس و نا امیدی بہ درجۂ غایت ہے۔

۱۶ ستمبر ۱۸۷۷ء۔ ہوا گرم مثل جیسا کہ جیٹھ کے چلتی ہے۔ اخیر شب کو سردی ہوتی ہے۔ پانی کے آثار بالکل معلوم نہیں ہوتے۔ نرخ غلہ کا بالمرہ گھٹتا جاتا ہے۔ خلائق از حد پریشان اور کاشتکار اپنے مویشی اُتر لیے جاتے ہیں۔ ۲۳ ستمبر ۱۸۷۷ء خشک سالی کی شکایت ترقی پذیر ہے۔ آثار قحط بہ درجہ پیدا ہیں۔ صدہا آدمیوں نے گداگری اختیار کی۔ خدا اپنا فضل فرمائے۔

۲۷ نومبر ۱۸۷۷ء جب کہ بباعث خشک سالی اسامی فاقہ کر رہے ہوں تو وصول ہونا مال گزاری کا سخت دشوار ہے لیکن افسوس ہے کہ سرکار کوئی عذر سماعت نہیں کرتی۔

۳۰ دسمبر ۱۸۷۷ء۔ آج کل اکثر لوگ ساکنان سندیلہ بوجہ عدم پیداوار فصل خریف و گرانی غلہ کے سخت پریشان ہیں اور دو دو روز تک ان کو کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ خداوند کریم اس حالت نازک کو جلد دور فرمائے۔

۳۱ دسمبر ۱۸۷۷ء۔ اگرچہ کچھ بارش ہوئی ہے لیکن چونکہ ہنوز غلہ تیار نہیں ہے اس وجہ سے شکایت گرانی بدستور سابق ہے۔ خدا سے امید ہے کہ ایک وہ بھی دن ہوگا کہ یہ شکایت رفع ہوگی بر دروازہ پر آج کل اس قدر محتاج آتے ہیں کہ ان کو تھوڑی تھوڑی بھی بھیک دی جاتی ہے تو اس کی ایک مقدار کثیر ہو جاتی ہے۔

۱۲ فروری ۱۸۷۸ء کچھ عرصے سے نرخ غلہ حسب ذیل ہے جس سے لوگوں کو از حد تکلیف ہے۔ روز دو چار آدمی تلف ہوتے ہیں۔

"گندم ۱۰ سیر، جوار خورد ۱۲ سیر، برنج ۸ سیر، دال ارہر ۱۱½ سیر، جو ۱۳ سیر، جوار کلاں ۱۲ سیر، روغن زرد ۲ سیر، مٹری عظیم آبادی ۱۱ سیر، ماش ۸ سیر، قند سیاہ ۷½ سیر، مسور ۱۲ سیر، باجرہ ۱۱½ سیر، کاکن ۱۱ سیر، نخود ۱۲ سیر، مونگ ۱۰ سیر، روغن سیاہ ۴ سیر۔

علی گڑھ کالج: ۲۹ دسمبر ۱۸۷۸ء۔ منظور ہے کہ برخوردار مصطفٰے علی کو واسطے تحصیل علم مدرسۃ العلوم علی گڑھ کو روانہ کروں۔۔۔ کہ وہاں کی تعلیم اچھی ہوتی ہے۔ اس میری رائے سے منشی فضل رسول و منشی فہیم الزماں نے بھی اتفاق رائے کیا ہے۔ منظور ہے کہ جنوری آئندہ سے ان کی تعلیم کا بندوبست مدرسۂ مذکور میں کیا جائے۔

۱۵ جنوری ۱۸۷۹ء۔ صبح کے دس بجے مدرسہ علی گڑھ میں پہنچا مولوی محمد اکبر صاحب منیجر مدرسۂ مذکور سے ملاقات کر کے برخوردار مصطفٰے علی و امیر حسن کو داخل بورڈنگ ہوس کے کیا اور مبلغ ۵ اروپیہ ۲ آنے بابت فیس مدرسہ و کرایہ مکان و صرف طعام ابتدائے جنوری ۱۸۷۹ء لغایت مارچ مولوی صاحب منیجر کو حوالہ کیے۔۔۔۔

۱۸ جنوری ۱۸۷۹ء مقام علی گڑھ۔ واسطے خرید اسباب ضروری میز وکرسی وغیرہ متعلقہ برخوردار مصطفیٰ علی بازار علی گڑھ کو گیا۔ اوّل مولوی فریدالدین احمد صاحب صدر اعلیٰ سے ملاقات کی یہ رئیس کڑا مانک پور کے ہیں اور مبلغ ۰۰ روپے ماہوار تنخواہ پاتے ہیں۔ اس کے بعد مولوی محمد اسمٰعیل صاحب سے ملاقات کی یہ نہایت ذی علم شخص ہیں.... بعدہٗ مولوی لطف اللہ صاحب مدرس جامع مسجد سے ملاقات کی یہ مولوی صاحب فاضل زبردست ہیں اور بہت سے منتہی طالب علم ان کے پاس پڑھتے ہیں.... مولوی صاحب کی عمر ساٹھ برس سے زیادہ ہے، مجھ سے بہ کمال تپاک پیش آئے۔ جامع مسجد میں میں نے نماز ظہر کی ادا کی یہ مسجد نہایت مضبوط پتھر کی بنی ہوئی ہے، شب کو میں بورڈنگ ہوس مدرسۃ العلوم میں لوٹ آیا اور مولوی اکبر صاحب منیجر کو چھ آنے پیسے دے کر بورڈنگ ہوس میں کھانا کھایا۔

۲۲ جنوری ۱۸۷۹ء۔ مقام سندیلہ حسب تحریک آج چودھری خصلت حسین صاحب سے ملاقات کی اور حالات تعلیم مدرسۃ العلوم بیان کیے جس سے نہایت درجہ خوش ہوئے ان کا ارادہ ہے کہ اپنے پوتوں میں سے کسی کو واسطے تعلیم کے علی گڑھ کو بھیجیں۔ یہ مدرسہ سید احمد خاں صاحب نے قائم کیا ہے، بہت وسیع اس کا رقبہ ہے اور حکمت عملی یہ کی ہے کہ جو شخص ۲۰ روپے سید صاحب کو دیوے تو اس کا نام احاطہ دیوار کے ایک جز میں کندہ کر دیا جاتا ہے اور جو شخص مقدار زائد دیوے اس کے نام کا پھاٹک بنا دیا جاتا ہے اور اس کا نام کندہ کر دیا جاتا ہے۔ اس کارروائی سے اکثر لوگ بہ غرض ابقائے نام روپیہ دیتے ہیں اور دیواروں اور پھاٹکوں پر ان کے نام کندہ ہیں۔ اسی طور سے جو کالج زیر تعمیر ہے اس کی کارروائی بھی ہوئی ہے اور صدہا آدمی اس چندہ میں شریک ہیں اور ہوتے جاتے ہیں۔

۱۰ مارچ ۱۸۷۹ء۔ تحریر مرسلہ محمد اکبر صاحب منیجر مدرسۃ العلوم علی گڑھ سے واضح ہوا کہ برخوردار مصطفیٰ علی لکھنے پڑھنے میں محنت کرتے ہیں ان کے استاد ان سے خوش ہیں۔ یہ کیفیت پانزدہ روزہ آیا کرتی ہے۔

تپ ولرزہ: ۲ اکتوبر ۱۸۷۹ء بمعائنہ اخبارات واضح ہوتا ہے کہ بیماری تپ ولرزہ عالم گیر ہے۔ کوئی شہر و قصبہ و دہ اس سے محفوظ نہیں ہے۔

۳ اکتوبر ۱۸۷۹ء۔ آج کل سندیلہ خاص اور دیہات نواحی میں تپ ولرزہ کی از بس شکایت ہے۔ کوئی گھر نہیں ہے کہ جس میں چار پانچ بیمار نہ ہوں بلکہ کثرت اس قدر ہے کہ اس علالت سے کوئی آدمی گھر میں محفوظ نہیں ہے۔ میرے مکان میں بھی چار آدمی مبتلائے تپ ولرزہ ہیں۔

وفات غلام امام شہید: ۲؍اکتوبر ۱۸۷۹ء مولوی غلام امام شہید نے جو رشتہ میں منشی فضل
رسول کے ماموں ہوتے تھے اور مولود شریف تصنیف کردہ خود بہت اچھا پڑھتے تھے، بعمر ۷۵ سال الٰہ آباد میں
انتقال کیا۔ یہ بزرگ بڑے نامور شخص تھے اور ریاست ہائے حیدر آباد و رام پور سے کچھ روپے ماہواری
ان کے صرف کے لیے مقرر تھے۔ صاحب تصنیف بھی تھے اور بباعث ثقل سماعت کان میں قرنائی لگا کر باتیں
سنتے تھے، مولوی صاحب لاولد فوت ہوئے۔

ہیضہ: ۳۰ جولائی ۱۸۸۰ء اس سال دیہات نواحی میں بھی ہیضہ شروع ہو گیا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا
موضع ہو کہ جس میں اس کی شکایت نہ ہو[1]۔

۱۲؍اگست ۱۸۸۰ء بباعث ایام گرما شب کو اتفاق خواب کا سقف بالاخانہ پر ہوتا ہے اور متوفیان
کے ورثا کی گریہ و زاری سے رات کو نیند نہیں پڑتی اور ایک نوع کا ہول پیدا رہتا ہے۔

مردم شماری: ۱۷؍فروری ۱۸۸۱ء آج مردم شماری بہ وقت ۹ بجے شب کے تمام ہندوستان
میں شروع ہوئی۔ اور ۳ بجے صبح کے ختم ہوئی۔ بعد چندے شمار ان کا معلوم ہوگا۔

ستارۂ دنبالہ دار: ۲۷؍جون ۱۸۸۱ء دو روز سے ستارہ دنبالہ دار گوشۂ شمال و مغرب
میں برآمد ہوتا ہے۔ لوگ اس کے آثار اچھے نہیں بتلاتے ہیں۔

وفات اسیر لکھنوی: ۷؍فروری ۱۸۸۲ء آج دوپہر کو منشی مظفر علی اسیر شاعر نامی لکھنؤ نے
بمقام لکھنو بعمر ۸۰ سال انتقال کیا۔ یہ منشی فضل رسول صاحب واسطی مرحوم کے شاعری میں استاد تھے اور
ہزار ہا آدمی مرحوم کے شاعری میں شاگرد ہیں۔ عہد واجد علی شاہ میں مرحوم نے بہت بڑا اعزاز حاصل کیا
تھا بلکہ بادشاہ بھی ان کے شاگرد تھے۔

مشاعرہ: ۶؍اگست ۱۸۸۲ء۔ مکان منشی فضل حسین صاحب پر شام کو تقریب مشاعرہ ہوئی۔
شیخ ظہور الحسن صاحب شاعر لکھنؤ و راجہ غلام حسین خان بہرائچ بھی شریک صحبت تھے۔ دیر تک اس کی گرم بازاری رہی

۲۴؍ستمبر ۱۸۸۲ء۔ آج منشی فضل حسین نے صحبت مشاعرہ اپنے مکان پر منعقد کی جس میں شعرائے
لکھنؤ و سندیلہ شریک تھے۔ بی بی عصمت شاعرۂ لکھنؤ کی غزل گوئی سے لوگ بہت محظوظ ہوئے۔ میں شریک صحبت
نہ ہو سکا۔ ۱۹؍اکتوبر ۱۸۸۲ء۔ آج پھر مشاعرہ منشی فضل رسول حسین کے مکان پر ہوا لیکن یہ امر میرے خلاف ہے۔

۱۔ روزنامچہ جولائی اور اگست میں ہیضہ سے موت پانے والوں کے نام سے پُر ہے۔ (ن)

کیونکہ اس کا زیادہ چرچا اچھا نہیں ہے اور تجربے سے اس کا انجام بخیر ہوتے نہیں دیکھا۔

۱۱ر جنوری ۱۸۸۲ء۔ آج شب کو پھر صحبت مشاعرہ منشی فضل حسین صاحب نے منعقد کی دو بجے صبح کو فراغت ہوئی۔ چوں کہ یہ امر میرے خلاف ہے اس وجہ سے شریک نہ ہو سکا۔

آتش زدگی وچیچک: ۸ر مئی ۱۸۸۲ء۔ اب کی سال ہندوستان میں آتش زنی بہ کثرت ہوئی، بڑے بڑے کارخانے جل کر خاکستر ہو گئے۔ اور تمام ہندوستان میں شکایت چیچک بھی بہت ہوئی۔ ہزارہا اس عارضہ میں فوت ہوئے۔

اندر سبھا: ۱۸ر نومبر ۱۸۸۲ء۔ شب کو رقص اندر سبھا کا منشی فضل حسین کے مکان پر ہوا۔ شریک جلسہ تھا۔

گورنر جنرل: ۲۳ر دسمبر ۱۸۸۲ء۔ ۱۹ر دسمبر کو لارڈ رپن صاحب گورنر جنرل ہند کلکتہ سے ولایت نہ ہوئے اور لارڈ ڈفرن صاحب نے چارج گورنر جنرل کا لیا۔ صاحب اول الذکر نے ہندوستانیوں کے رضامندی کا اچھا برتاؤ کیا۔

مشاعرہ: ۲۹ر جنوری ۱۸۸۵ء۔ منشی فضل حسین صاحب کے مکان پر صحبت مشاعرہ قرار پائی۔ کلام ہوالحسن شاعر لکھنوی بہ مقابلہ منشی محمد حسن نامی شاعر باندہ بہت خوب تھا، کوئی شعر خالی استعارے سے واقعی خوب غزل کہتے ہیں۔

ستارے: ۲۸ر نومبر ۱۸۸۵ء۔ شب کو آٹھ بجے سے بارہ بجے تک ہزاروں ستارے آسمان تے نظر آئے۔ یہ کیفیت تمامی ہندوستان میں پیدا ہوئی، لوگوں نے بہ نظر حیرت اسکو مشاہدہ کیا۔ بائے کہ اس کا کیا انجام ہو۔

برھما: ۲۹ر نومبر ۱۸۸۵ء۔ آج سرکار انگلشیہ نے شہر مانڈلے دارالسلطنت ملک برہما پر فتح حاصل کی اہ ہیبا نے اطاعت اختیار کی اور اپنی جان و مال کو انگریزوں کے سپرد کیا۔ شاہ موصوف بہ جانب بہ ذریعہ جہاز بھیجے گئے۔ شاید ہندوستان کے کسی ٹاپو میں اب ان کا قیام ہو۔

فوج کی زیادتیاں: ۶ر فروری ۱۸۸۶ء۔ رسالہ سواران انگریزی سیتاپور سے وارد سندیلہ ہوا چونکہ سواروں کے مزاج میں زیادتی و بدعت زیادہ ہوتی ہے اس وجہ سے مولوی عبدالقادر صاحب تحصیلدار بلحاظ حفظ اپنی آبرو کے روپوش ہو گئے۔ لیکن سامان رسد وغیرہ کا بذریعہ چپراسیان تحصیل مہیا کرادیا لیکن سوار

لوگ ہر گلی و کوچہ میں تحصیلدار کی تلاش کرتے تھے ۔۔۔۔ رسالہ تو بعد ایک روزہ قیام کے کانپور روانہ ہو گیا لیکن سواروں کے کرنیل نے رپورٹ شکایت مولوی عبدالقادر صاحب تحصیلدار کی صاحب ضلع اور صاحب کمشنر سیتاپور کو کر دی۔

دربار جوبلی: ۱۶ فروری ۱۸۸۷ء۔ مقام ہردوئی آج گیارہ بجے دن کے شریک دربار جشن جوبلی ہوا۔ میری کرسی بزمرۂ آنریری مجسٹریٹاں دوسری تھی۔ نمبر اول حاجی محمد حسین خان شاہ آباد کا تھا۔ ہارس فورڈ صاحب ڈپٹی کمشنر ضلع ہردوئی بہ لباس شاہانہ ہاتھی پر سوار ہو کر ۱۲ بجے تشریف لائے اور کرسی نقرئی جو بالائے تخت بچھی ہوئی تھی متمکن ہوئے۔ اول چودھری محمد عظیم نے بزبان اردو اڈریس پڑھا۔ اس کے بعد قصیدہ منشی فضل حسین صاحب کا پیش ہوا مگر پڑھا نہیں گیا۔ پھر منشی نظر حسن صاحب وکیل کاکوروی نے چند اشعار مدح میں پڑھے اس کے بعد پنڈت تربھون ناتھ بی اے منصف بلگرام نے منجانب انسٹی ٹیوٹ بلگرام اسپیچ انگریزی میں دی۔ اس کے بعد صاحب بہادر نے بزبان اردو جواب اڈریس دیا۔ بعد تقسیم عطر و پان جلسہ برخاست ہوا۔ سہ بجے گھوڑ دوڑ، کشتی و شب کو روشنی و آتشبازی و ناچ طوائفوں کا ہوا اور اظہار مسرت میں ۱۱۸ قیدی فوجداری اور دیوانی کہ جن کی میعاد ۲۰ جون ۱۸۸۷ء تک ختم ہونے والی تھی، جیل خانہ ہردوئی سے رہا ہوئے۔

رہائی قیدیاں: ۸ مارچ ۱۸۸۷ء۔ بمعائنہ گزٹ اردو محررہ ۵ مارچ ۱۸۸۷ء واضح ہو کہ بتقریب جشن جوبلی حضرت ملکہ معظمہ قیصرہ ہند تمامی عملداری انگریزی میں قیدیان فوجداری حسب ذیل رہا ہوئے۔

مرد ۸۳۸، ۱۱، عورتیں ۱۴۶۷۔ کل ۳۰۵، ۱۳۔

وفات واجد علی شاہ: ۲۲ ستمبر ۱۸۸۷ء۔ کل واجد علی شاہ سابق بادشاہ اودھ نے بمقام مٹیا برج کلکتہ بہ عمر ۷۰ سال قضا کی۔ مرحوم کے ۱۹ لڑکے اور ۲۸ لڑکیاں ہیں۔

نول کشور: ۵ جنوری ۱۸۸۸ء۔ چودھری نصرت علی صاحب رئیس سندیلہ و اسسٹنٹ سکریٹری انجمن ہند لکھنؤ کو خطاب خان بہادر گورنمنٹ انگلشیہ سے یکم جنوری ۱۸۸۸ء کو حاصل ہوا جس کا میں نے خط مبارکباد چودھری صاحب کو لکھا۔ منشی نول کشور مالک مطبع اودھ اخبار کو بھی خطاب سی۔ آئی۔ ای کا گورنمنٹ سے حاصل ہوا۔ ان کو بھی میں نے خط مبارکبادی بھیجا ہے۔

کاشت خربوزہ: ۱۱ جولائی ۸۸ء ـــ اودھ اخبار محررہ ۱۱ جولائی ۱۸۸ نمبری ۱۸۹۶ء کے کالم اول میں درج ہے کہ اگر تخم خربزہ دودھ اور شہد میں تر کر کے بوئے جائیں تو پھل نہایت شیریں ہوگا اور اگر اس کے تخم کو گلاب میں رکھے اور پھر اس کو بوئے تو خربزہ میں گلاب کی خوشبو ہوگی اور جس کھیت میں خربزہ میں کیڑے

پیدا ہو گئے ہوں تو ان کیڑوں کو جمع کر کے پانی میں جوش دے اور اس کو دوسرے کھیت کے خربزوں میں ڈال دے تو اس کھیت میں کیڑے پیدا نہ ہوں گے۔

کانگریس: ۱۶ جولائی ۱۸۸۸ء۔ آج نو بجے صبح کے کانگریس اور بنگالیوں کے خلاف ایک جلسہ چودھری محمد عظیم صاحب کے مکان پر منعقد ہوا جس میں صاحبان ذیل شریک تھے اور بعد فراغت جلسہ تین تار مخالفت کانگریس بہ پریسیڈنٹ چودھری محمد عظیم صاحب بنام مہتمم پانیر و اکسپریس لکھنؤ، و منشی امتیاز علی صاحب وکیل لکھنؤ کو بھیجے گئے اور پانچ اسپیچیں ارباب ذیل کی طرف سے منظور کی گئیں اور بعد پاس ہونے رزولیشن پاس شدہ مطبع آزاد لکھنؤ کے کسی پرچہ آئندہ میں طبع کیا جائے گا۔ تفصیل حاضرین جلسہ چودھری محمد عظیم صاحب، چودھری جاوید علی صاحب، راجہ درگا پرشاد صاحب، کنور نریندر بہادر صاحب، شیخ احمد علی صاحب اشوق مالک مطبع آزاد لکھنؤ، سید نجم الدین و قمر الدین، لچھمن پرشاد بزاز، لالتا پرشاد بزاز، مہاراج شیو سہائے، راقم تحریر ہذا۔ صراحت ان اشخاص کی جن کی اسپیچیں منظور ہوئیں۔ چودھری محمد عظیم صاحب، چودھری نصرت علی صاحب، راجہ درگا پرشاد صاحب، کنور نریندر بہادر صاحب، راقم الحروف۔

تعداد فوج: ۲۲ ستمبر ۱۸۸۸ء بمعائنہ پرچہ جریدہ روزگار مدراس مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۸۸۸ء واضح ہوا کہ ہندوستان میں کل فوج انگریزی بقید گورہ و ہندوستانی حسب ذیل ہے۔ فوج گورہ ۷۹، ۱۲۷، فوج ہندوستانی ۱۲۴۴۷، کل ۲۰۰،۵۸۵۰۔ سرکار انگریزی ایسی منتظم ہے کہ اس قلیل فوج سے کل ہندوستان اور بنادر کا خوش اسلوبی کے ساتھ بندوبست کر رہی ہے عہد شاہی میں قریب دو لاکھ کے فوج لکھنؤ میں رہتی تھی۔ لیکن اس سے صرف اودھ کا انتظام قابل اطمینان نہیں ہو سکتا تھا۔

سرحد و تبت: ۳ نومبر ۱۸۸۸ء۔ بالفعل جو جنگ مابین فوج برٹش و حسن زئی وغیرہ فرقہ ہزارا سے ہو رہی ہے اس میں متواتر فتح فوج انگریزی کو ہوئی۔ اگرچہ کپتان بیلی صاحب و دیگر افسران فوج ضائع ہوئے۔ لیکن انگریزوں نے اکثر دیہات ان کے اجاڑ دیے اور قلعے منہدم کر دیے، اہل فرقہ بحالت مجبوری اطاعت قبول کرتے جاتے ہیں اور جرمانہ مجوزہ برٹش ادا کرتے جاتے ہیں غالباً قریب زمانے میں فوج انگریزی بعد عہد و مواثیق مزوری مظفر و منصور واپس ہو۔ صاحب اقبال سے مقابلہ جن کا ستارہ ترقی اوج پر ہے نہایت مشکل و دشوار ہے۔ انگریزوں نے مقامات سکم و تبت والوں کو بھی شکست فاش دی اور ان کی فوج مفرور ہو گئی۔

کانگریس: ۱۲ نومبر ۱۸۸۸ء آج میرے نام ایک خط مرسلہ کنور پرنام سنگھ صاحب بہادر سی۔ آئی۔

ای آنریری سکریٹری انجمن ہند تعلقہ داران اودھ محررہ ۸ نومبر ۱۸۸۸ء بدیں مضمون موصول ہوا کہ حسب تجویز کمیٹی انجمن ہند مورخہ ۵ نومبر ۱۸۸۸ء یہ امر قرار پایا ہے کہ ۲۲ نومبر کو ایک جلسہ عام اہل اسلام و اہل ہنود و دیگر مذاہب و اقوام خیر خواہان ملک و نیز خواہان انگلش گورنمنٹ کا واسطے تصفیہ چند مقاصد مفید ملک و گورنمنٹ کے شہر لکھنؤ مقام بارہ دری قیصر باغ میں کیا جاوے۔ اسی جلسے میں ترتیب دستور العمل انڈین یونائیٹڈ پیٹریاٹک کمیٹی کی بھی عمل میں آئے اور تقسیم کارہائے ضروری متعلقہ اینٹی کانگریس بھی ہو جائے ....

میرا خیال ہے کہ بشرط امکان اس جلسے میں شریک ہوں کیوں کہ یہ جلسہ خلاف کانگریس منعقد ہوگا۔ اور مجھے اس سے مخالفت ہے بلکہ قبل اس کے میرا ایک بیان متعلقہ اینٹی کانگریس انگریزی میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکا ہے .....

<u>اینٹی کانگریس</u>: ۲۲ نومبر ۱۸۸۸ء۔ آج دو بجے شام کو جلسہ اینٹی کانگریس میں بارہ دری قیصر باغ میں شریک ہوا۔ قریب ایک ہزار آدمیوں کا مجمع تھا۔ منجملہ ان کے چند مشاہیر کا نام درج ذیل ہے۔

راجہ شیو پرشاد صاحب "بنارس"، سر سید احمد خاں صاحب بہادر (علی گڑھ) اودے نرائن سنگھ صاحب تعلقدار (مہدونہ) راجہ پرتاپ نرائن سنگھ صاحب تعلقدار (بھنگا) راجہ تصدق رسول صاحب تعلقدار (جہانگیر آباد) چودھری محمد عظیم صاحب تعلقدار (اکبرلی) وغیرہ وغیرہ اولاً منشی امتیاز علی صاحب وکیل نے منجانب انجمن شکریہ تکلیف فرمائی شرکائے کمیٹی کا ادا کیا۔ بعدہٗ منشی اطہر علی صاحب وکیل نے اس چٹھی کا ترجمہ پڑھا جو سر آکلینڈ کالون صاحب لفٹیننٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی و اودھ نے مسٹر ہیوم صاحب بانی کانگریس کے جواب میں تحریر فرمایا تھا جس سے جناب ممدوح کی مخالفت بانیان قومی کانگریس سے صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ زاں بعد اس کمیٹی کا نام انجمن خیر خواہان ملک ہند رکھا گیا جس کے پریسیڈنٹ اودے صاحب تعلقدار مہدونہ باتفاق رائے تجویز ہوئے اور سر سید احمد خاں صاحب اور راجہ صاحب (بھنگا) سکتری قرار پائے اور ممبران انجمن میں راقم کا نام حسب تحریک چودھری نصرت علی صاحب درج ہوا۔ شام کو جلسہ برخاست ہوا اور راقم اپنے مکان مشک گنج میں مقیم ہوا۔

مفصل دریافت ہوا کہ دعوت لفٹیننٹ گورنر بہادر میں جو ۱۷ نومبر ۱۸۸۸ء بمقام محمود آباد قرار پائی تھی راجہ امیر حسن خاں صاحب والی ریاست کا ایک لاکھ پچیس ہزار روپیہ صرف ہوا۔ انواع اقسام کے کھانے پخت ہوئے تھے۔ سامان رقص و رنگ و روشنی و آتش بازی وغیرہ قابل دید تھا۔ قبل اس کے راجہ

صاحب موصوف نے مبلغ پچپن ہزار روپیہ دعوت لارڈ ڈفرن صاحب گورنر جنرل کشور ہند میں بمقام شملہ صرف کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان سب مصارف کا مقصد حصول خطاب سے ہو۔

لینس ڈاؤن ولارڈ ڈفرن: ۴ دسمبر ۱۸۸۸ء۔ کو مارکوئس لینس ڈاؤن صاحب بہادر جدید گورنر جنرل کشور ہند داخل بمبئی ہوئے اور ۶ ماہ حال کو کلکتہ جا کر ۱۰ دسمبر کو چارج وائسرائے لارڈ ڈفرن صاحب سے حاصل کریں گے۔ لارڈ صاحب جدید کی عمر ۴۴ سال کی ہے قبل اس کے ملک کناڈا کے گورنر جنرل تھے۔ آدمی ذی علم لائق اور صاحب تجربہ ہیں دیکھنا چاہیے کہ رعایا کے حق میں کیا سلوک کرتے ہیں۔ لارڈ ڈفرن صاحب اگرچہ بہت بڑے مدبر زیرک، ہوشمند و تجربہ کار تھے اور ان کے عہد میں برہما فتح ہوا سکم اور ہزارا میں کامیابی کے ساتھ جنگ ہوئی لیکن رعایا کو ان کی وجہ سے نفع نہیں ہوا بلکہ قانون ٹیکس انھوں نے جاری کیا جس سے عموماً ہر پیشہ ور ملازم وغیرہ کو پریشانی لاحق ہے لارڈ ڈفرن صاحب کی عمر ۶۰ سال کی ہے۔ ایکٹ لگان اودھ یعنی ایکٹ نمبر ۲۲، ۸۶ء حضرت ہی کے وقت میں پاس ہوا جس سے زمینداروں کی بالکل بے اختیاری ہو گئی۔ باب بے دخلی کاشتکاران مطلقاً مسدود ہوا۔

جدید وائسرائے: ۱۲ دسمبر ۸۸ء معائنہ اودھ اخبار" محررہ امروزہ سے معلوم ہوا کہ لارڈ لینس ڈاؤن صاحب جدید وائسرائے ۹ دسمبر ۸۸ء کو داخل کلکتہ ہوئے اور ۱۰ دسمبر کو چارج وائسرائے کا لے کر انتظام سلطنت میں مصروف ہوئے۔ اور لارڈ ڈفرن صاحب سابق گورنر جنرل ہند بعد دینے چارج کے اسی وقت صبح کے ۱۰ بجے بعزم ولایت روانہ بمبئی ہوئے۔

وائسرائے اور گورنروں کی تنخواہ: ۲۴ فروری ۱۸۸۹ء پرچہ جریدہ روزگار مدراس محررہ ۹ فروری ۱۸۸۹ء بحوالہ گائڈ اخبار واضح ہوا کہ گورنر جنرل ہند و گورنر لوکل گورنمنٹوں کی تنخواہ حسب ذیل ہے۔
نام گورنمنٹ: وائسرائے ہند تنخواہ سالانہ دو لاکھ پچاس ہزار آٹھ سو' نام گورنمنٹ: گورنر بمبئی تنخواہ سالانہ ایک لاکھ بیس ہزار' نام گورنمنٹ: لفٹیننٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی تنخواہ سالانہ اٹھتر ہزار نام گورنمنٹ: گورنر مدراس تنخواہ سالانہ ایک لاکھ بیس ہزار' نام گورنمنٹ لفٹیننٹ گورنر بنگالہ تنخواہ سالانہ بانوے ہزار نام گورنمنٹ: لفٹیننٹ گورنر پنجاب تنخواہ سالانہ چھہتر ہزار۔

لینس ڈاؤن: ۱۸ اپریل ۱۸۸۹ء۔ آج ۶ بجے شام کے خاص ریل گاڑی میں لارڈ اور لیڈی لینس ڈاؤن صاحب مع مصاحبین وغیرہ لکھنؤ سے براہ سندیلہ روانہ شملہ ہوئے۔ چوکیدار و کانسٹبل ایک ایک میل کے

فاصلہ پر واسطے حفاظت ریل گاڑی کے مامور تھے یہ گورنر جنرل نہایت سلیم الطبع اور لائق شخص ہیں۔

شہزادہ وکٹر: ۱۲ نومبر ۱۸۸۹ء۔ ۹ نومبر کو شہزادہ وکٹر خلف پرنس آف ویلس ولی عہد انگلستان بطور سیر و سیاحت داخل شہر بمبئی ہوئے ہندوستان کے کل نامی شہروں کو ملاحظہ فرمائیں گے۔

۱۸ جنوری ۱۸۹۰ء۔ آج صبح شہزادہ البرٹ وکٹر نبیرۂ ملکہ وکٹوریہ قیصرۂ ہند رونق افروز لکھنؤ ہوئے کل تعلقہ داران سندیلہ واسطے جائنہ جلسہ دعوت و روشنی و آتش بازی جو منجانب انجمن ہند لکھنؤ آج رات کو ہوئی ۷ بجے روانہ لکھنؤ ہوئے راقم نہیں گیا کہ صرف بے جا تھا۔

زکام و بخار: یکم اپریل ۱۸۹۰ء۔ قصبہ سندیلہ اور اس کے نواح و نیز تمام ہندوستان میں آج کل بیماری زکام و بخار کی بشدت تمام ہے کوئی گھر ایسا نہیں ہے کہ جس میں اس کی شکایت نہ ہو لیکن محل شکر ہے کہ اس بیماری سے ابتک کوئی ضائع نہیں ہوا۔

انفلوئنزا: بخار انفلوئنزا انگلستان سے یہاں آیا ہے وہاں یہ بڑا مہلک تھا۔ یہ سرد ملک کا عارضہ ہے جس کو جوشاندہ سے فائدہ ہوتا ہے سرد چیزیں مضر ہیں۔ فاقہ و علاج نہ کرنا اس کی عمدہ دوا ہے ہندوستان کے سرد ملکوں میں یہ مہلک قرار پایا ہے۔ سنا گیا ہے کہ جبل پور میں نو سو آدمی ہلاک ہوئے۔

بارش: ۱۰ اگست ۱۸۹۰ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار وغیرہ واضح ہوتا ہے کہ امسال تمامی ہندوستان میں اس قدر بہ کثرت بارش ہوئی جس سے مکانات خام و پختہ و سڑک ریلوے و فصل خریف وغیرہ کو از حد نقصان ہوا۔ اشخاص مسن کا بیان ہے کہ ایسی بارش ان کی عمر میں شاید کبھی ہوئی ہو۔ سڑک ریل کانپور اناؤ کو ایسا صدمہ پہنچا کہ تین ہفتہ تک وہ جاری نہیں ہو سکتی اور یہی کیفیت بریلی ریل کی رام گنگا نے کر رکھی ہے۔ آمد و شد مطلقاً بند ہے۔ مغل سرائے بنارس ہو کر ڈاک کانپور الہ آباد اور لکھنؤ کو آتی ہے۔ تحقیق سے سنا گیا ہے کہ جس مقام پر ریل کانپور کی بگڑی ہے اس مقام پر تیس فٹ اونچا پانی سڑک پر آ گیا ہے۔

ایجوکیشن کانگریس علیگڑھ: ۱۲ نومبر ۱۸۹۰ء آج شب کو چودھری محمد عظیم صاحب تعلقہ دار ککرالی و رئیس اعظم سندیلہ و چودھری نصرت علی خلف چودھری عظمت علی صاحب مرحوم سکریٹری انجمن ہند لکھنؤ و رئیس سندیلہ و چودھری محمد رؤف صاحب خلف چودھری حشمت علی صاحب تعلقہ دار مرحوم و مولوی فریدالدین صاحب رئیس کٹرہ حال سب جج پنشن یافتہ میری عیادت کو تشریف لائے۔ مولوی صاحب نے استدعا کی کہ ایجوکیشن کانگریس علی گڑھ کے جس کے سرپرست مولوی سید احمد خاں صاحب ہیں آپ ممبر تجویز

ہوئے اور آپ سے ممبری کی فیس پانچ روپیہ چاہیے پس آپ زر مذکورہ داخل کریں۔ چنانچہ راقم نے بپاس خاطر
مولوی صاحب بلا لحاظ طمع ممبری اسی وقت مبلغ مطلوبہ پیش کیے۔

۱۲ر دسمبر ۱۸۹۰ء۔ آج ایک خط سر سید احمد خاں صاحب سکریٹری محمڈن ایجوکیشن کانگریس الہ آباد
بدیں مضمون بنام راقم موصول ہوا کہ من ابتدائے ۲۸ر دسمبر ۱۸۹۰ء لغایتہ ۳۰ ماہ مذکور اس اجلاس کانگریس بمقام الہ آباد
قرار پایا ہے، چونکہ آپ اس جلسہ کے ممبر ہیں اگر شرکت کریں تو پیشتر سے مطلع فرمائیں کہ ریلوے اسٹیشن پر سواری
بھیجی جائے اور انتظام مکان و قیام اور سامان مہمان داری ہر قسم کا بغرض آسائش و آرام آپکے مہیا کیا جاوے۔

دو شاہزادوں کا سفر ہند: ۲۷ر دسمبر ۱۸۹۰ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار محررہ امروز سے واضح
ہوا کہ شہنشاہ زادہ سلطنت روس و شہزادہ جارج ملک یونان ۲۳ر دسمبر ۱۸۹۰ء کو بطور سیر و سیاحت ہندوستان
داخل بمبئی ہوئے جن کا بہت جلوس کے ساتھ منجانب انگلش گورنمنٹ اعزاز ہوا، یہ نامی مقامات ہندوستان
کی سیر کریں گے اور مقامات سرحدی بھی ملاحظہ کریں گے۔

طریقہ تعلیم: ۱۶ر فروری ۱۸۹۱ء۔ چونکہ طریقہ تعلیم مبتدی اب نہایت خراب حالت میں ہے
معلم مکتبی اسی پرانے ڈھنگ سے تعلیم کرتے ہیں جس سے چند سال تک مبتدی کو کوئی لیاقت استعداد پیدا نہیں ہوتی
اور مثل طوطے کے بلا فہمید الفاظ فارسی و عربی کے رٹا کرتا ہے لہذا بعد غور میں نے تجویز کیا کہ بقاعدہ مدارس
گورنمنٹ نور دیدہ منتظم حسین کی تعلیم کراؤں۔

مردم شماری: ۲۶ فروری ۱۸۹۱ء۔ آج نو بجے رات کو کل ہندوستان و تمامی جزائر و ممالک
محروسہ گورنمنٹ انگریزی کی مردم شماری ہوئی۔

مسٹر کوینٹن: ۲۸ر مارچ ۱۸۹۱ء کی رات کو مسٹر کوینٹن صاحب چیف کمشنر آسام کو منی پوریوں نے قتل کیا۔

ایک لغت انگریزی: ۳۱ر جولائی ۱۸۹۱ء۔ آج ایک کتاب انگریزی ڈکشنری (کتاب لغت)
جس میں انگریزی سے اردو اور اردو سے انگریزی معنی باسانی نکلتے ہیں اور ایسی کتاب اس وقت تک
جامع و مانع تالیف نہیں ہوئی ہے اور عموماً بیس روپیہ اس کی قیمت ہے آج مجھے میر علی حسین ہیڈ ماسٹر انگریزی
سندیلہ کے ذریعہ علی احمد خاں ولد امیر خاں سابق نیٹو ڈاکٹر شفاخانہ سندیلہ سے بہ قیمت مبلغ پانچ روپیہ حاصل ہوئی۔

طریقہ تعلیم: ۱۵ر ستمبر ۱۸۹۱ء۔ میرا تجربہ ہے کہ ملا مکتبی اپنے طریقہ قدیمہ کی تعلیم سے لڑکوں کو
کودن کر دیتے ہیں، میں نے بچشم خود مشاہدہ کیا کہ سات برس کے تعلیم یافتہ لڑکے کو اس قدر مادہ حاصل و متواصل

نہ تھا کہ وہ خط وکتابت بلا تکلف کر سکتا۔ لہٰذا اس تعلیم سے مجھے تنفر کامل ہو گیا ہے .....

انگریزوں کی طمع: ۱۹ر ستمبر ۱۸۹۱ء۔ اب انگریزوں کو بھی طمع زیادہ ہو گئی ہے اور بمقابلہ اپنے فائدہ کے تحریراً و تقریراً غلط بیان کرنے میں ان کو کوئی تکلف نہیں ہوتا۔ سچ یہ ہے کہ روپیہ دنیا میں عجب چیز ہے جس سے سب تمنائیں بہ آسانی پوری ہو سکتی ہیں۔

وفات البرٹ: ۱۵ر جنوری ۱۸۹۲ء۔ کل واقعہ ۱۴ر جنوری کو شاہزادہ البرٹ وکٹر خلف اوّل پرنس آف ویلز نے بہ مقام لندن بہ عمر ۲۸ سال عارضہ بخار میں رحلت کی۔ ان کی شادی عنقریب ہونے والی تھی۔ سال پیوستہ میں ہندوستان کو تفریحاً تشریف لائے تھے۔ اگر زندہ رہتے تو بعد اپنے باپ کے وہ شہنشاہ انگلستان وغیرہ کے ہوتے۔ یہ ملکہ وکٹوریہ کے پوتے تھے۔

وفات حکیم محمود علی خاں: ۳۰ر جنوری ۱۸۹۲ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار محررہ امروزہ سے واضح ہوا کہ حکیم محمود خاں طبیب دہلی نے واقعہ ۲۴ر جنوری بہ عمر ۷۰ سال عارضہ فالج میں قضا کی۔ یہ بڑے نامور اور حاذق حکیم تھے۔ دور دور ملکوں میں ان کا نام تھا اور مریض معالجہ کو آتے تھے۔ مرحوم کا اکثر کشتہ جات پر عمل تھا اور نہایت دولت مند طبیب تھے مگر اپنا جانشین بھی بہت لائق چھوڑا جو ان کا پورا یادگار رہے گا۔

ہیضہ: ۲۶ر مئی ۱۸۹۲ء۔ گرمی بہ شدت ہوتی ہے خلائق کو از حد انتشار ہے، خدا رحم کرے ہندوستان کے اکثر حصص میں شکایت ہیضہ وبائی پیدا ہے۔ کابل میں ۱۹ر اپریل سے ۲۹ر اپریل تک ۱۵ آدمی ہیضہ سے ضائع ہوئے۔

۱۰ر جون ۱۸۹۲ء۔ بمعائنہ اخبارات سے واضح ہوتا ہے کہ جب سے ۹۲ء شروع ہوا ہے صدہا جلیل القدر معزز اشخاص یورپئین اور بیسیوں راجہ و مہاراجہ و نواب ہندوستانی بہ عوارض مختلف رہ گرائے عالم بقا ہوئے اور شکایت بیماری ہیضہ وغیرہ ہر مقام پر بہ کثرت ہے جس سے اوسط و ادنیٰ درجہ کے اشخاص ہزارہا ضائع ہوئے ہیں اور ہنوز موسم بارش کا آغاز نہیں ہوا ہے، جس میں انواع اقسام کی بیماری کا خروج ہوتا ہے اور واقعات طرح طرح کے پیش آتے ہیں، دیکھا چاہیے کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے میری یاد میں ایسا سال ناقہ وقوع پذیر ہوا۔ خدا اپنا رحم فرمائے۔

۲۸ر جون ۱۸۹۲ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار (جو اس زمانے میں اعلیٰ درجہ کا روزانہ اخبار ہے اور منشی نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے) واضح ہوا کہ کسی شہر و قصبہ وغیرہ میں ہنوز کما حقہ بارش نہیں ہوا

سخت پریشانی پیدا ہو رہی ہے دیکھا چاہیے کہ انجام اس کا کیا ہو جس کا آغاز ایسی حالت سے ہو رہا ہے۔

دادابھائی نوروجی: ۲۳ راگست ۱۸۹۲ء مسٹر دادا نوروجی قوم پارسی اوّل ہندوستانی ہیں جو پارلیمنٹ انگلستان کے ممبر مقرر ہوئے جس کی تصدیق اخبارات انگریزی سے ہوتی ہے۔ یہ ساکن بمبئی ہیں۔

مردم شماری: ۶ راگست ۱۸۹۲ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار مطبوعہ امروزہ بحوالہ کانپور گزٹ مورخہ ۲۲ جولائی کے واضح ہوا کہ جو مردم شماری واقعہ ۲۶ فروری ۱۸۹۱ء کو ہوئی تھی اس کی رو سے حسب ذیل تعداد مختلف مذاہب کے پیروؤں کی ہے۔

ہندو ۲۰ کروڑ ۱/۴، لاکھ، مسلمان ۵ کروڑ ۱/۴، لاکھ، بودھ ، لاکھ، عیسائی ۲۵ لاکھ آبادی جنگلات ۹ لاکھ، پارسی نواسی ہزار نوسو نواسی ___ یہودی ۱۷ ہزار ایک سو اٹھاسی، ملحد ۲ سو نواسی، برہمو ۴ ہزار چار سو ایک، آریا ۴۰ ہزار چھ سو، مذہب نامعلوم .... انتالیس ہزار سات سو چھپن۔ تعداد ہندو سب قوموں میں زائد ہے۔

کثرت بارش: ۲۱ راگست ۱۸۹۲ء۔ دیکھنے اخبارات سے واضح ہوتا ہے کہ تمامی ہندوستان میں بارش کی کثرت ہے۔ پانی کی طغیانی سے اکثر دریاؤں کے پل شکست ہو گئے اور سڑک ہائے ریلوے بہہ گئیں جس کی وجہ سے اکثر حادثات ہوئے۔ ایسی بارش کی شدت سابقاً کم ہوئی ہے جیسی سال گزشتہ و حال میں ہوئی۔

لفٹیننٹ گورنر: یکم دسمبر ۱۸۹۲ء۔ بہ معائنہ انتخاب گزٹ سرکاری مطبوعہ ۲۸ ماہ حال سے واضح ہوا کہ بحکم ۳۱ اکتوبر ۱۸۹۲ء نمبری ۵۳۸ نواب گورنر جنرل صاحب بہادر آف انڈیا کے سر آکلینڈ کالون صاحب بہادر لفٹیننٹ و چیف کمشنر اودھ نے اپنا چارج لفٹیننٹی واقع ۲۸ نومبر مسند الیہ کو وقت ایک بجے دن کے بمقام الٰہ آباد سر چارلس کراس ویٹ صاحب بہادر جدید لفٹیننٹ گورنر کو حوالہ کیا اور اب تین بج کے چالیس منٹ پر الٰہ آباد سے روانہ ولایت لندن ہوئے۔ صاحب ممدوح کے زمانہ حکومت میں اکثر پانی کے کام و چند جدید اسپتال بمقامات مختلف میں بہ نام لیڈی ڈفرن کھولے گئے۔

سردی: ۲۱ فروری ۱۸۹۳ء۔ بمعائنہ اخبارات واضح ہوتا ہے کہ امسال کی ایسی سردی چند سال گزشتہ میں نہیں ہوئی جس کی تصدیق مسن لوگوں سے ہوتی ہے کشمیر میں پیالوں کی چائے جم جاتی ہے اور بیضہ مرغ اگر زمین پر پھینکے جاتے ہیں تو مثل لکڑی کے ان میں آواز آتی ہے۔ ٹوٹنے پھوٹنے کا کچھ خیال ہی نہیں گزرتا۔ کل سے ابر باد گھٹ گیا ہے جس سے فی الجملہ زوالِ زردگی سے اطمینان پیدا ہوا، اگر پھر اعادہ نہ کرے۔

رؤساء ہند کی آمدنی: ۲۵ مارچ ۱۸۹۳ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار مطبوعہ امروزہ سے واضح ہوا کہ آمدنی سالانہ رؤسائے ہندوستانی حسب ذیل ہے۔

ریاست حیدرآباد دکھن ۲ کروڑ گوالیار سوا کروڑ، گیکوار بروده ایک کروڑ ۲۰ لاکھ میسور ایک کروڑ سے کچھ زیادہ، کشمیر ۸۵ لاکھ، اودے پور ۶۴ لاکھ، ٹراونکور ۶۰ لاکھ، اندور ۵۰ لاکھ، پٹیالہ ۴۴ لاکھ بھرتپور ۲۸ لاکھ، بھوپال ۲۶ لاکھ، جودھ پور ۲۵ لاکھ، ریواں ۲۵ لاکھ، الور ۳۰ لاکھ، بھاول پور ۱۹ لاکھ، کپور تھلہ ۱۷ لاکھ، راؤ صاحب کچھ ۱۳ لاکھ۔

یہ بھی اس اخبار سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے شہروں میں بلحاظ آبادی سب سے اول شہر کلکتہ پھر بمبئی، پھر مدراس پھر حیدرآباد و لکھنؤ ازاں بعد بنارس ہے۔

موسم: ۸ مئی ۱۸۹۳ء۔ اگرچہ مہینہ جیٹھ کا رواں ہے۔ لیکن فصل میں کچھ ایسا غیر معمولی انقلاب ہے کہ شب و روز بہ شدت ہوا شرقی چلتی ہے اور شب کو سردی ہوتی ہے چنانچہ آج جب میں بوقت شب زیر سائبان سو رہا تھا تو مجھے لحاف اوڑھنے کی ضرورت داعی ہوئی اور یہی غیر معمولی کیفیت تمامی ہندوستان میں دیکھنے اخبارات سے ظاہر ہوتی ہے میرے ہوش میں ایسا حال کبھی دیکھنے میں نہ آیا۔

ٹیکہ ہیضہ: ۱۴ مئی ۱۸۹۳ء ڈاکٹر ایم ہیفکن شہر پیرس ملک فرانس کے رہنے والے ہیں اور حسب اجازت وزیر اعظم سلطنت لندن وارد ہندوستان ہو کر کلکتہ میں تشریف لائے ان کا تجربہ ہے کہ جیسے ٹیکہ لگانے سے چیچک نہیں نکلتی اسی طور سے عارضہ ہیضہ ٹیکہ دینے سے نہیں عارض ہوتا۔ زخم ٹیکہ کے ذریعہ سے جسم میں پہنچاتے ہیں ایک مرکب عرق کو جو ہر رگ وپے میں اتر کر جاتا ہے اور رہتا ہے ٹیکہ بیمار کا ہیضہ سے محفوظ رہتا ہے۔ ٹیکہ دینے سے اور استعمال دوا سے چنداں تکلیف نہیں ہوتی چنانچہ بالفعل آگرہ، علیگڑھ اور جھانسی وغیرہ میں فوجی لوگوں کو ٹیکہ دے رہے ہیں۔ دیکھا چاہئے کہ موسم ہیضہ میں اس کا کیا اثر ظاہر ہوتا ہے۔

آم: ۹ جولائی ۱۸۹۳ء فصل آم کی امسال ایسی افراط ہے کہ ایک سو آم ۲ پائی کو ملتا ہے ایسی ارزانی کبھی دیکھی اور سنی نہیں گئی۔ غربا نے روٹی کھانا موقوف کر دیا ہے جب کہ ڈیڑھ پائی میں ان کو سیری ہو جاتی ہے۔

ہندو و مسلم فساد: ۱۸ اگست ۱۸۹۳ء۔ آج کل جہاں تک میں خیال کرتا ہوں

کوئی اہل دنیا خالی از فکر اور تردد نہیں۔ کسی نہ کسی رنج میں ضرور مبتلا ہے۔ چنانچہ بمعائنہ اودھ اخبار مطبوعہ امروزہ سے واضح ہوا کہ بوجہ نزاعت اہلِ اسلام و ہنود ریاست جونا گڑھ کاٹھیاوار و نیز شہر بمبئی میں جو ایک نہایت مہذب شہر ہے واقعہ ۱۱ اگست سن رواں کو درمیان ہندو اور مسلمانوں کے سخت لڑائی ہوئی۔ ۴ قتل اور ۵۰ زخمی ہوئے اور مسٹر وینینٹ کمشنر پولیس بروقت انسداد حملہ زخمی ہوئے۔ مقام غور ہے کہ ایسا تسلط اور اس میں ایسے مناقشات کا پیش آنا نہایت تعجب خیز ہے علی الخصوص بمبئی میں جو نہایت مہذب شہر ہے اور جہاں سو برس سے زائد عمل داری سرکار کو گزر چکے ہیں۔

۱۸ اگست ۱۸۹۳ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار محررہ امروزہ کے معلوم ہوا کہ ۱۲ اگست یوم دوشنبہ کو بھی بمقام بمبئی مابین اہل اسلام و ہنود کے بلوہ قائم رہا اور ۵۱ آدمی قتل اور ۶۰ زخمی ہوئے اور واسطے انفصال مقدمات مجرموں کے تیرہ خاص مجسٹریٹ مقرر ہوئے ہیں۔ انجام اس کا بخیر نہیں۔

<u>نرخ غلہ</u> : ۱۹ ستمبر ۱۸۹۳ء۔ امسال غلہ کی ایسی ارزانی ہے کہ شاید قبل اس کے کہ جب سے ریل جاری ہوئی کبھی نہیں ہوئی اور حالات فصل خریف بھی اس وقت تک بہت عمدہ ہے اوسط درجہ نرخ غلہ آج کل فی روپیہ حسب ذیل بازار میں فروخت ہوتا ہے۔

گندم ۱۸ سیر، گوجئی ۲۵ سیر، بجھرا ۳۵ سیر، نخود ۳۶ سیر، ماش ۱۸ سیر، ارہر ۳۶ سیر، مونگ ۱۵ سیر، دھان ۴۰ سیر، جوار کلاں ۳۶ سیر۔

<u>مردم شماری</u> : ۲۱ ستمبر ۱۸۹۳ء۔ مردم شماری ۹۱ء سے واضح ہوا کہ تمامی ہندوستان میں ۲۸ کروڑ ۷۴ لاکھ ۳۲ ہزار آبادی ہے۔ کل فرقے کے آدمیوں سے حسب ذیل اذکار رفتہ ہیں بیوقوف و خراب دماغ کے آدمی ۷۴ ہزار ۲ سو ۸۹ بہرے اور گونگے ایک لاکھ ۹۶ ہزار ۴ سو اکسٹھ اندھے ۴۵۸۸۶۸۔

<u>زلزلہ</u> : ۴ جنوری ۱۸۹۴ء ۔۔۔۔ آج بوقت ساڑھے پانچ بجے شام کے زلزلہ محسوس ہوا چونکہ فی الجملہ شدید تھا اور تمام کوٹھی میری جنبش کرنے لگی تھی لہٰذا میں اندیشناک ہو کے باہر صحن کے چلا گیا تھا اور قیام اس کا تقریباً دو منٹ تک رہا اور چار منٹ کے بعد پھر محسوس ہوا جو نصف منٹ سے زائد نہیں رہا۔

<u>کرنل ہارس فورڈ</u> : ۹ فروری ۱۸۹۴ء بمعائنہ اخبار انگریزی 'مارننگ پوسٹ'، الہ آباد مطبوعہ ۹ فروری کے معلوم ہوا کہ کرنل ہارس فورڈ صاحب سابق ڈپٹی کمشنر ہردوئی حال چیف کمشنر جزیرہ انڈمان کو ایک جنم قیدی مسمی بھیلارام برہمن نے جو میرٹھ کے باغیوں سے اکیس سالہ عمر کا دائم الحبس ہوا

تھا چھریوں سے سر و شانہ کو شدید زخم پہنچائے اور دو انگلیاں بھی کٹ کر جدا ہو گئیں۔ اول لیڈی صاحبہ اور مس فورڈ نے جرات کر کے اسے پکڑا۔ بعدہٗ اور لوگوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ چونکہ صاحب بہادر کے مزاج میں سختی و دشنام دہی زائد تھی عجب نہیں کہ اسی وجہ سے ایسی نوبت کو پہنچے ہوں۔ چونکہ مرد دست از جاں بشوید ہر چہ در دل آید، بگوید۔

انفلوئنزا: ۲۲ مارچ ۱۸۹۴ء۔ آج میں بعد دوپہر بخار و کھانسی میں مبتلا ہو گیا۔ اعضا شکنی اور درد سر کی شکایت بڑھی۔ شب کو غذا نہیں کی اور بے خوابی کے ساتھ نیند آئی نفخ نے اور بھی تکلیف دی۔ یہ ایک انگریزی بخار انفلوئنزا ہے جس کی آج کل عام شکایت ہے۔

گرہن: ۶ اپریل ۱۸۹۴ء۔ مجھے اپنے ہوش میں ایسے مشاہدہ کا اتفاق ہوا کہ چندر گرہن اور سورج گرہن ایسے زمانہ قریب میں پڑے ہوں جیسا کہ ۱۸۹۴ء میں۔ چندر گرہن ۲۱ مارچ ساڑھے چھ بجے شام کو اور سورج گرہن آج صبح کے ساڑھے چھ بجے پڑے تھے۔ ۱۷ دن میں دونوں قسم کے گرہن پڑے۔ دیکھا چاہیے کہ اس کا پھل کیا ہو۔ ہندو لوگ تو نقص بتلاتے ہیں۔ انگریزی قاعدہ سے جب زمین درمیان چاند و سورج کے آجاتی ہے اس وقت چندر گرہن ہوتا ہے اور جب چاند درمیان سورج و زمین کے آجاتا ہے اس وقت سورج گرہن ہوتا ہے' واللہ اعلم بالصواب

غدر کا گمان: ۱۴ جون ۱۸۹۴ء۔ صوبہ بہار بنگالہ اور اضلاع گورکھپور بلیا و اعظم گڑھ وغیرہ میں آم کے درختوں میں مٹی کے چھوپے لگائے جا رہے ہیں جس کا حال باوصف تحقیقات پولیس ہنوز کچھ منکشف نہیں ہوا بعض حکام گمان کرتے ہیں کہ اس کی حالت ۱۸۵۷ء کی ٹکیاں کے موافق ہے جس کا حال ابتدائً کچھ ظاہر نہیں ہوا اور آخر کو غدر ہو گیا۔ گورنمنٹ آف انڈیا کو اس حال سے از بس پریشانی ہے۔ اکثر یورپین کا ظن غالب ہے کہ عید قرباں میں کچھ نہ کچھ نزاع مذہبی ضرور برپا ہوگی خدا امن رکھے۔

ہیضہ: ۱۷ جولائی ۱۸۹۴ء .... مجھے چند سال کے تجربہ سے یہ بات تحقیق ہوئی کہ زمانہ بیماری ہیضہ میں جس روز بارش زیادہ ہوتی ہے اس روز بہت سے آدمی بیمار اور ضائع ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ رطوبت فضلیہ باعث مرض دیا کرتی ہے۔

۱۸ جولائی ۱۸۹۴ء .... میر نظیر حسین خلف حسین علی اشراف ٹولہ نے آج دوپہر کو ہیضہ میں قضا کی جو کل گیارہ بجے رات کو مبتلا ہوئے تھے۔ متوفی خوش تقریر اور کارندہ گری میں بہت ہوشیار فارسی داں لائق شخص تھے.... ان کی ایک کہاوت ضرور قابلِ یادداشت ہے کہ متوفی ہیضہ میں مبتلا ہونے

کے تین گھنٹے قبل حکیم ظہور الحسن صاحب طبیب میونسپل سے براہ تعلّی بیان کرتے تھے کہ ہیضہ میں وہی لوگ مبتلا ہوا کرتے ہیں جو غذا ثقیل اور دیر ہضم کھاتے ہیں اور کثرت سے پانی پیتے ہیں اور ہم ایسے لوگوں کے پاس بیماری ہیضہ ہرگز نہیں آتی جو مرغن گوشت اور سپید دھلی ہوئی دال ماش کی کھاتے ہیں۔ لیکن یہ بیان ان کا برعکس ثابت ہوا اور تین گھنٹے کے بعد وہ مبتلائے ہیضہ ہوئے اور رحلت کر گئے۔ سچ یہ ہے کہ جب قضا آتی ہے تو اس کے وہی سامان پیدا ہو جاتے ہیں۔ سریع الہضم اور دیر ہضم غذا ہرگز اسے روک نہیں سکتی۔ میرے خیال میں جب اس قسم کی بیماری کا خروج ہو تو جن لوگوں کے مزاج میں خفقانیت کا دخل ہو ان کو ایسے ہولناک اخبار نہ سنانا چاہیے کیوں کہ بعض اوقات ایسا دیکھا گیا ہے کہ خوف کے باعث بھی دست آنے لگتے ہیں۔ ۲۳ر جولائی ۱۸۹۴ء۔ شب گزشتہ کو دختر خورد لالہ دیا شنکر متوفی نے ہیضہ سے قضا کی۔ جو لوگ لاش دیا شنکر متوفی کی گنگا لے گئے تھے ہنوز واپس نہیں آئے کہ یہ دوسرا واقعہ پیش آیا۔ گھر میں سوائے بیوہ اور سالگ رام برادر خورد متوفی کے دوسرا نہیں ہے ہر چند کوشش کی گئی کہ کوئی ایک شخص از قوم ہنود اجرت دے کر واسطے تجہیز و تکفین متوفیہ کے بھیجا جائے لیکن یہ وقت ایسا ہولناک ہے کہ کوئی شخص اس طرف کا رخ نہیں کرتا۔ ایں الم بالائے الم است۔

۲۴ر جولائی ۱۸۹۴ء۔ آج ۱۰ بجے کی ریل گاڑی میں راجہ درگاہ پرشاد صاحب کا کُل خاندان لکھنؤ چلا گیا۔ راجہ صاحب تو چار دن پیشتر جا چکے تھے۔ اب رؤسا کی دیکھا دیکھی غربا بھی جہاں جس کا سُوبیتا ہے بیرونجات کو جا رہے ہیں۔ اشراف محلّہ میں میری نقل و حرکت کے رکھنے سے بہت لوگوں کو دلاسا پیدا ہے اور وہ یہاں میرے ہونے کو غنیمت خیال کر کے اپنی تشفی کیے رہتے ہیں اس وجہ سے اشراف محلّہ کی رونق بمقابلہ دوسرے محلّوں کے بخوف ہیضہ کم نہیں ہوئی۔ میں اپنے خدا پر پورا بھروسہ کیے ہوئے اور اپنے اعزا کو طمانیت دیتے ہوئے بیٹھا ہوں اور سمجھ لیا ہے کہ اگر قضا اسی حیلہ سے لکھی ہے تو اس سے گریز نہیں ہو سکتا اور اگر یہاں موت کبھی آوے گی تو چار بھائی مل کر تجہیز و تکفین بہت خوش عنوانی کے ساتھ کر دیں گے اور اگر باہر جانے پر یہ واقعہ پیش آیا تو مشکل ہے کوئی شرکت بھی نہ کرے گا۔ کیوں کہ عموماً لوگ اس مرض اور اس کے مریض اور جو اس میں فوت ہوا ہو اس سے بہت خوف کرتے ہیں۔ پس میں نے اسی پر قناعت کی کہ سندیلہ نہ چھوڑوں۔ آج اٹھارہ آدمی قصبہ ہذا میں ضائع ہوئے۔

۲۵ر جولائی ۱۸۹۴ء۔ آج تو ہیضہ میرے مکان کے ہر چہار طرف گشت لگا رہا ہے جس میں پڑوسی

لوگ مبتلا ہیں پورب۔ منیر حجام و مرتضیٰ خاں چپراسی تحصیل سندیلہ پچھم۔ اہل خانہ حکیم امجد علی۔ اتر۔ محمد شعیب، دکھن۔ نتھا نداف، خداوند کریم سب کو بچاوے اور اطمینان بخشے، ہر ایک کی جان سوکھ رہی ہے، بے نمازی نمازی ہو گئے، توبہ واستغفار ورد زبان ہے۔

۹ر اگست ۱۸۹۴ء..... اب کی سال کوئی مقام ایسا نہیں چھوٹا جہاں حضرت ہیضہ صاحب کا دورہ نہ ہوا ہو، سچ یہ ہے کہ جہاں یہ ہولناک بیماری ہوتی ہے، چاہے جیسا مستقل مزاج آدمی ہو لیکن اس کا قلب اس کے خطروں سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اللہ اس کو دور کرے آمین۔ ہیضہ عجب ہولناک مرض ہے کہ کوئی شخص مریض کی بخواہش دل قربت پسند نہیں کرتا اگرچہ مرتبہ عزیز القلوبی اسے حاصل کیوں نہ ہو۔ میں نے تجربہ کیا ہے کہ احباب و اعزا خاص اس سے دوری چاہتے ہیں اور ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ شاید مریض سے دور رہنے میں میری جان بچ جاوے۔ حشر میں نفسی نفسی کی خبر کلام شریف میں تھی لیکن میں نے اس مرض کے خروج پر وہ کیفیت بچشم خود مشاہدہ کر لی اللھم احفظنا من بلاء الدنیا و عذاب الآخرہ۔

کلکتہ: ۲۴ر اگست ۱۸۹۴ء۔ آج کی تاریخ میں دو سو چار برس پورے ہوئے جب انگریزوں نے بنیاد کلکتہ قائم کی تھی۔

ہندو مسلم فساد: ۱۶ر ستمبر ۱۸۹۴ء۔ اودھ اخبار لکھنؤ سے معلوم ہوا کہ ۱۳ر ستمبر کو مابین ہندو اور مسلمانوں کے شہر پونا میں سخت لڑائی ہوئی کہ ہندو باجا بجاتے ہوئے مسجد کے دروازے سے نکلے جب کہ مسلمان قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔

تبت: ۹ر جنوری ۱۸۹۵ء۔ تمام دنیا میں مقام ہنسلے (کذا) واقع تبت سب سے بلند جگہ ہے جس کی بلندی سولہ ہزار فٹ ہے اور یہاں ایک بودھ کا مندر ہے جس میں اکیس پجاری رہتے ہیں۔

وفات منشی نول کشور: ۱۹ر فروری ۱۸۹۵ء۔ آج چار بجے صبح کو منشی نولکشور صاحب مالک مطبع اودھ اخبار نے دفعتاً بمقام لکھنؤ قضا کی۔ بڑے مشہور لائق و دانش مند شخص تھے۔ اپنی ذاتی لیاقت و قابلیت سے ایک بہت بڑا مطبع لکھنؤ حضرت گنج میں قائم کیا جس میں ہزارہا آدمی کاربرداز ہیں۔ مرحوم نے کار خیر میں بلااظہار اپنی لیاقت و خوش رکھنے حکام وقت صرف زر کو جائز رکھا جس سے گورنمنٹ میں بہت بڑا رسوخ پیدا ہوا اور خطاب سی۔ آئی۔ ای گورنمنٹ نے عطا کیا اور متعدد دیہات زمینداری پیدا کرنے سے تعلقہ دار بھی ہوئے جس کی سند انجمن ہند لکھنؤ سے حاصل ہوئی اور لکھنؤ بنچ کے آنریری مجسٹریٹ

بھی تھے غرض کہ دنیوی امور میں ہر قسم کی ترقی نمایاں کی۔ متوفی نے کوئی اولاد ذکور نہیں چھوڑی۔ عمر متوفی ۶۴ سال تھی۔

سرحد: ۱۱ اپریل ۱۸۹۵ء۔ جو فوج برٹش گورنمنٹ بہ تعداد ۱۴ ہزار بغرض اعانت چترال واسطے مقابلہ عمراخاں والی باجور کے بھیجی گئی تھی اس کا مقابلہ سواتی لوگوں سے بمقام شاہ کوٹ ۴ اپریل کو ہوا۔ پانچ گھنٹے تک سخت لڑائی رہی۔ اگرچہ سرکاری فوج زیادہ کام آئی لیکن مقام مذکور فتح ہوگیا۔ اس بیان کی تصدیق اودھ اخبار مطبوعہ ۱۰ اپریل ترجمہ اخبار "پانیر" انگریزی الہ آباد مورخہ ۶ اپریل سے ہوئی۔ اول لڑائی گھاٹی مالاکنڈ میں ۳ اپریل کو ہوئی تھی....

۷ مئی ۱۸۹۵ء۔ دیکھنے اخبارات سے واضح ہوا کہ عمراخاں باجوری تاب مقابلہ انگلش گورنمنٹ نہ لاکر مفرور ہوئے اور شیر افضل خاں اور ان کے ہمراہیوں کو جو قلعہ چترال کا محاصرہ کیے ہوئے تھے محمد شریف خاں خان دیر نے گرفتار کرکے سپرد فوج انگریزی کیا۔ اب فوج اعانت چترال سے کوئی مقابلہ کرنے والا باقی نہیں رہا۔ سچ ہے کہ انگریزی قواعد داں فوج کا گروہ افغانی کیا مقابلہ کر سکتے ہیں جن کے پاس ہتھیار تک نہیں۔

وفات مولوی فضل رحمان صاحب: ۱۲ ستمبر ۱۸۹۵ء۔ آج آٹھ بجے شام کو بمقام گنج مراد آباد جناب مولوی فضل الرحمان صاحب نے بہ عارضہ پیرانہ سالی قضا کی۔ آپ کے فیض و برکت کا اس قدر شہرہ تھا کہ تمام ہندوستان کے لوگ جوق در جوق آپ کی زیارت و شرف حصول بیعت کو تشریف لاتے تھے۔ حتیٰ کہ سر چارلس کراسویٹ صاحب بہادر لفٹیننٹ گورنر اضلاع مغربی و شمالی و اودھ جب ۳۰ دسمبر ۱۸۹۵ء کو بہ تقریب دورہ وارد ملانواں ہوئے تو مراد آباد جا کر آپ کی ملازمت سے شرف اندوز ہوئے۔ سندیلہ کے گاڑی بانوں کی یہ بھی ایک روزی تھی کہ جو لوگ منازل دور دراز سے آکر بغرض جانے مراد آباد کے یہاں ریل سے اترتے تھے ان کو اپنی گاڑیوں میں حضرت صاحب کی خدمت میں پہنچاتے تھے۔ کوئی شک نہیں کہ آپ نہایت خجستہ خصال بزرگ تھے ــــــ آپ کو آفتاب ہند سے تشبیہ دی جائے تو بجا ہے۔ آپ کی عمر سو برس سے تجاوز کر گئی تھی۔ مولوی صاحب مرحوم شاہ آفاق صاحب کے مرید تھے جو دہلی میں نہایت بزرگ شخص گزرے ہیں۔ آپ خاندان نقشبندیہ میں مرید تھے۔ گانا وغیرہ کچھ نہیں سنتے تھے۔

قحط: ۷ فروری ۱۸۹۷ء۔ آج کل بباعث ثقامت فصل از حد گرانی ہے، لوگ مصیبت سخت میں مبتلا ہیں۔ دو دو تین تین روز تک دانہ میسر نہیں آتا حتیٰ کہ اکثر بے دین ہو گئے۔ دوسروں کی غلامی اختیار کی۔ بعض نے اپنی اولاد کچھ لے کر جدا کر ڈالی۔ چنانچہ چند لڑکیاں مختلف قوم کی جو اسی نہج سے حاصل ہوئیں میرے گھر میں موجود ہیں (جن کے نام اب بید رکھے گئے ہیں۔ گل رنگ، موتی، سندر، شربتی، سُہلی وغیرہ) یہی کیفیت تمام ہندوستان کی ہے جس کی تصدیق اخباروں سے ہوتی ہے۔ میرے خیال میں یہ حالت خشک سالی ۱۸۷۷ء سے بڑھ کر ہے جو

صرف ایک فصل خریف کی عدم پیداوار سے رونما ہوئی تھی اور حالت موجودہ میں تین سال زیادتی بارش دسال حال کی کمی بارش سے پیدا ہو رہی ہے۔ یہ حالت سخت نازک ہے۔ خدا آبرو رکھے۔ آج کل نرخ غلہ بازار امانی گنج (سندیلہ کے غلہ کے بازار کا نام۔ ہاشمی) سندیلہ حسب ذیل ہے۔

" گندم۔ ۱۱½ سیر، بجھرا۔ ۱۵½ سیر، نخود۔ ۱۵ سیر، باجرہ۔ ۱۴ سیر، جوار کلاں۔ ۱۶ سیر، جوار خورد ۱۵½ سیر دھان۔ ۲۲ سیر، چاول ۱۴ سیر، ماش ۱۲ سیر، مونگ۔ ۱۱½ سیر"

۲۲ مئی ۱۸۹۶ء۔ اب کے سال غلہ کی کمی پیداوار سے سخت گرانی ہے۔ اس وقت فصل میں نرخ گیہوں کا ۱۲ سیر ہے۔ لیکن اس کی شان رزاقی کو دیکھنا چاہیے کہ امسال خربزہ و تربوز کی فصل اس قدر افراط سے ہے کہ ایک پیسہ کی پنج سیری بھر خربزے ملتے ہیں جس سے انسان کو دوپہر کے لیے ایک پیسہ میں سیری ہو جاتی ہے اور فصل انبہ بھی افراط سے ہے۔ اس سے بھی آئندہ بہت مدد ملے گی۔

۶ اگست ۱۸۹۶ء۔ تین ہفتہ سے بارش نہیں ہوئی جس سے جوار کلاں بالکل خشک ہو گئی اور رقم دھان نصف رہ گئی۔ ہنوز کپاس اور جوار خورد کی حالت اچھی ہے۔ اگر دو چار روز میں بارش ہو گئی۔ کاشتکاران دیہات کی حالت قابل بیان نہیں جو فاقہ پر فاقہ کر رہے ہیں اور خرابی فصل کو دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر روتے ہیں۔ جو سڑک سندیلہ۔ بانگر مئو بغرض رفاہ عام درست ہو رہی ہے اس پر سات سو آدمی کام کرتے ہیں... حسب ذیل اجرت مرمت سڑک کی ملتی ہے۔ مرد۔ ۵ پیسہ، عورت۔ ۴ پیسہ، لڑکا ۳ پیسہ اور جو لوگ بوجہ شدت ضعف جسمانی بوجہ فاقہ کشی کے کام نہیں کر سکتے ہیں ان سب کو کھانا دیا جاتا ہے جن کی تعداد قریب ۱۳۲ کے ہوگی۔ پکی ہوئی روٹی و دال فی کس ۳ پاؤ کے حساب سے ان کو مفت ملتی ہے اور لڑکوں کو پاؤ سیر سے آدھا سیر تک۔ ان لوگوں کی حالت ایسی تباہ ہے کہ چند قدم نہیں چل سکتے۔ ان کی صورتیں خوفناک معلوم ہوتی ہیں۔ صرف ہڈی چمڑا جسم میں باقی ہے۔ امید ہے کہ گورنمنٹ کی بدولت ان کی زندگی ہو جائے۔

۱۱ اگست ۱۸۹۶ء۔ آج کمیٹی خاص میونسپل بصدارت منشی رحمت اللہ تحصیلدار سندیلہ کے ہوئی۔ جس میں یہ طے ہوا کہ ممبران میونسپل بورڈ من جانب گورنمنٹ باری باری ایک روز اپنے اہتمام و نگرانی میں کھانا محتاجوں کو تقسیم کرادیں۔ چنانچہ بیہ امر ۱۲ اگست کو قائم ہوا اور کل ۱۴ اگست کو راجہ درگا پرشاد صاحب کے اہتمام میں تقسیم ہوگا

۲۴ ستمبر ۱۸۹۶ء... یہ عجیب وقت ہے کہ آج کل تمامی ہندوستان میں بہ باعث امساک باراں و عدم پیداوار فصل سخت گرانی و نوبت قحط کی پہنچ گئی ہے کہ صدہا آدمی فاقہ سے مر رہے ہیں۔ فقیروں کی یہ کثرت ہے

تمام دن اور گیارہ بجے رات تک ان کے سوالوں سے نجات نہیں ملتی۔ حالانکہ میں نے اپنے گھر کا بند و
ہے کہ کچھ غلہ اپنی نگاہ کے سامنے رکھوا لیا ہے اور ملازموں پر تاکید ہے کہ جو سائل آوے وہ خالی نہ پھیرا
لیکن کہاں تک دیا جاوے۔ بعض وقت تو کر بھی تنگ آکر جواب دینا جائز رکھتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ ا
عہد میں تین قسم کی صعوبتیں نازل ہوئی تھیں۔ اول حاکم ظالم دوسرے ہیضہ وبائی کی شدت تیسرے قحط کی صع
ے خلق اللہ کو سخت پریشانیوں کا سامنا ہوا تھا۔ آج کل میں جہاں تک خیال کرتا ہوں تو وہی کیفیت تمامی ہند
کی ہو رہی ہے اور جا بجا لوٹ مار، ڈاکہ زنی شروع ہو گئی ہے آج کی تاریخ میں نرخ بازار سندیلہ کا حسب ذیل

"گندم ۸ ½ سیر، نخود ۱۱ ½ سیر، بجھرا ۱۰ ¾ سیر، جو ۱۱ سیر، مکائی ۲ ¾ سیر، کاکن ۱۴ سیر، منڈوا
۱۳ سیر، دھان یک من یعنی ۱۶ سیر، ماش ۱۰ ½ سیر۔ گرانی ۱۸۷۷ء سے بھی بڑھ کر ہے جب گیہوں کا نرخ ۱۰ سیر کا

۲ اکتوبر ۱۸۹۶ء۔ کیفیت امساک باراں بدستور ہے۔ آسمان بالکل صاف ہے بظاہر کوئی آثار
نظر نہیں آتے۔ رقم خریف و کنوار دا گہن جاتی رہی۔ اب اگر خدانخواستہ ہفتہ عشرہ میں پانی نہ ہوا تو کاشت
غیر ممکن ہو جاوے گی اور سخت قحط کا سامنا ہو گا جو ناقابل برداشت متصور ہے۔ ابھی سے لوٹ مار شروع ہو
شہر آگرہ کی غلہ کی منڈی کنگلوں نے لوٹ لی اور انتظام پولیس کچھ کارگر نہ ہوا۔ جب لوگ بھوکوں مر
تو جو کچھ کر نہ گزریں تعجب ہے۔ بقول مشہور مرتا کیا نہ کرتا۔ ہیضہ بھی بہت سے مقاموں پر تیزی کے ساتھ
جس سے ہزاروں بندۂ خدا ضائع ہو رہے ہیں۔ اس زمانہ سخت قحط سالی میں لارڈ ایلگن وائسرائے ہند
سر اینٹنی میکڈانلڈ صاحب ہمارے صوبہ کے لفٹیننٹ گورنر اور مسٹر سوئل صاحب و مسٹر مکنتاش صاحب
ڈپٹی کمشنر ہردوئی و لکھنؤ ہیں اور ہماری تحصیل کے تحصیلدار شیخ رحمت اللہ ساکن شہر الہ آباد ہیں۔ مشہور عام
سے ادنیٰ تک جملہ حکام خوش نیت نہیں بلکہ جابر و بدنیت ہیں۔ ایسی حالت میں اللہ رحم کرے۔

۱۶ اکتوبر ۱۸۹۶ء۔ تفصیل قحط جو ہندوستان میں پڑے۔

۱۔ ۱۷۷۰ء ایسٹ انڈیا کمپنی: یہ قحط صوبہ بنگالہ میں پڑا تھا۔ کاشتکاروں نے اپنے بیل بیچ ڈالے تھے
کرتے تھے اور مقدار قلیل غلہ کے عوض اپنی اولاد فروخت کرتے تھے۔ زندہ مُردوں کو کھاتے تھے ا
کی سخت بیماری وبائی پیدا تھی جس سے ایک ملت نذر ہو گئی۔

۲۔ ۱۷۸۳ء وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل: اضلاع مغربی و شمالی و اودھ میں یہ قحط پڑا تھا اودھ میں جو
کا بکتا تھا حالانکہ معمولی نرخ غلہ وہاں ہمیشہ فی روپیہ ڈیڑھ من پختہ تھا۔ بیماری وبا بھی ساتھ ساتھ تھی

۳-۱۸۳۷ء ایسٹ انڈیا کمپنی: یہ قحط کل ہندوستان میں ایسا ہیبت ناک تھا کہ اس کی رو سے لوگ اپنی عمر کا اس وقت حساب لگاتے تھے۔

۴-۱۸۶۶ء ملکہ وکٹوریہ: یہ قحط مساوی قحط ۱۸۷۷ء کے تھا لیکن گورنمنٹ نے بہت سے کام رفاہ عام نہر و پل جاری کیے جس سے اس کا کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔

۵-۱۸۷۳-۷۴ء سر جارج کیمبل لفٹیننٹ گورنر بنگالہ: یہ قحط بہار و بنگالہ میں پڑا تھا جس سے زراعت خشک ہوگئی تھی۔

۶-۱۸۷۷ء لارڈ لٹن صاحب گورنر جنرل: جاری ہونے کام رفاہ عام بہت بڑی مدد ملی۔ ۱۰ سیر کا گندم اس وقت میں فروخت ہوتا تھا۔ اگرچہ یہ قحط عام تھا لیکن صرف فصل خریف بوجہ نہ ہونے پانی کے بوئی نہیں گئی تھی لیکن ربیع بہت عمدہ ہوئی کہ عین وقت بونے و پکنے غلہ کے دو پانی ہوگئے تھے۔

۷-۱۸۹۶ء لارڈ الجن صاحب گورنر جنرل: یہ قحط تمامی ہندوستان میں ہے جس سے ایک عام پریشانی پیدا ہے۔ خریف جس قدر بوئی گئی تھی وہ بوجہ امساک باراں بہت کم ہوئی اور کاشت ربیع کی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ یہ بہت طویل قحط ہے۔ لوگ اناج و مدد کو چیخ رہے ہیں بازار موت گرم ہے۔ اگرچہ گورنمنٹ اجرائے کام رفاہ عام میں بڑی فیاضی کر رہی ہے۔

۱۴/ نومبر ۱۸۹۶ء: تمامی ہندوستان میں سخت گرانی و قحط ہے۔ گرانی اسے کہتے ہیں جب نرخ معمولی سے غلہ کمی کے ساتھ فروخت ہوا اور قحط اسے کہتے ہیں کہ جب اس مقام کے باشندوں کے استعمال کے لیے غلہ کافی موجود نہ ہو۔ چنانچہ شولہ پور احاطہ بمبئی میں نرخ جوار فی روپیہ ساڑھے تین سیر کا ہے جس کی وجہ سے لوٹ مار ہو رہی ہے۔ اکثر مقاموں پر ڈاکوؤں کا مقابلہ ہوا اور بلوائی مارے گئے۔ اگر اس عرصہ میں بارش نہ ہوئی تو سخت مصیبت کا سامنا ہوگا اور لوگوں کو اپنی حفاظت دشوار ہو جائے گی۔ دیکھنے اخبارات سے واضح ہوتا ہے کہ بوجہ خشک سالی موسم گرما کی جو چیزیں گرمی میں پیدا ہوتی تھیں وہ اس موسم میں پیدا ہونے لگیں۔ ضلع رائے بریلی میں مہوہ ٹپک رہا ہے اور بازاروں میں بکنے آتا ہے اور آم پختہ برابر فروخت ہوتے ہیں۔ اور نمکوہی تو سندیلہ میں پھلیں اور ٹپکیں جن کو میں نے خود دیکھا ایسا وقت میری نگاہ سے نہیں گزرا اور مسن لوگ یہ کیفیت دیکھ کر متعجب ہیں۔

ایک وبائی مرض: ۳/ جنوری ۱۸۹۷ء آج کل شہر بمبئی اور اس کے حوالی شہروں سورت۔ پونا کراچی میں وبائے بد مشابہ طاعون کے ہے بہت پھیلی ہوئی ہے صدہا آدمی بالمرہ مبتلا و ضائع ہوتے ہیں۔

خاص شہر بمبئی کے دس ہزار آدمی اس وقت تک ضائع ہو چکے ہیں۔ تکلیف اس کی یہ ہے کہ بُن ران یا گرد
دفعتاً ورم پیدا ہو کر شدت سے بخار آتا ہے اور ایک دو روز میں مریض مر جاتا ہے۔ ڈاکٹر علاج
عاجز ہیں اور ہزار ہا باشندے دوسرے شہروں میں چلے گئے اور جا رہے ہیں۔ کچہریاں بند اور د
نے اپنی دوکانوں پر نوٹس لگا دیا ہے کہ ہم نے وبا کے باعث دوکانیں بند کر دی ہیں اور باہر جاتے ہیں

زلزلہ: ۱۲ جون ۱۸۹۷ء۔ آج ۴ ½ بجے زلزلہ شدید آیا جس کا قیام قریباً ایک منٹ رہا۔ میں ا
میں بیٹھا ہوا آمدنی آکٹرائی کی جانچ کر رہا تھا۔ میرے پاس چند آدمی اور بھی بیٹھے تھے جو یہ کیفیت دیکھ کر بھا

۱۶ جون ۱۸۹۷ء۔۔۔۔ جو زلزلہ ۱۲ جون کو آیا تھا اسی سے کلکتہ اور آسام میں بہت کچھ ض
صدہا جانیں ضائع ہوئیں اور بڑے بڑے مکانات گر گئے۔ اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ کلکتہ کو
ضرر نہیں پہنچا تھا جو اس مرتبہ زلزلہ سے کیفیت ویرانی پیدا ہے۔ مکانوں کے گرنے سے علاوہ خ
کے اکثر لوگ ہندوستانی اور یوروپین ضائع ہوئے۔

قحط: ۷ جون ۱۸۹۷ء۔ ہفتہ مختتمہ ۱۹ مئی میں حسب ذیل آدمی کا رہائے رفع تکلیف ہندوستان میں
مدراس ۸۶۱۰۴۰، بمبئی ۳۵۰۰۲، بنگال ۸۳۳۴۴۷، ممالک مغربی شمالی واودھ ۳۳۳۲۵
پنجاب ۶۶۳۶۹، ممالک متوسط ۴۵۸۷۶۹، برہما ۷۷۱۸۲، برار ۲۷۴۳، حیدر آباد ۷
وسط ہند ۳۵۴۸۴۱۲، راجپوتانہ ۵۰۶۲۰، کل ۲۹ ۴۱۶۱،۲۴۹۔

نرخ غلہ: ۲۴ جولائی ۱۸۹۷ء۔ بمطالعہ اخبار انجمن ہند ہفتہ گزشتہ کے واضح ہوا کہ جب ہر
کا جشن تخت نشینی واقعہ ۲۱ جون ۱۸۳۷ء ہوا تھا اور جب جشن جوبلی ۲۲ جون ۱۸۹۷ء کو ہوا تو نرخ غلہ دونوں زمانہ کا ہند
میں حسب ذیل تھا۔

نام جنس	نرخ بروقت جلوس ملکہ معظمہ ۲۱ جون ۱۸۳۷ء	نرخ غلہ بروقت جشن جوبلی واقعہ ۲۲ جون ۱۸۹۷ء	نام جنس	نرخ بروقت جلوس ملکہ معظمہ ۲۱ جون ۱۸۳۷ء	نرخ غلہ بروقت جشن جوبلی واقعہ ۲۲ جون
گندم	یک من ۵ سیر بحساب نمبری	۹ ¾ سیر بحساب نمبری	باجرہ	یک من ۵ سیر بحساب نمبری	۸ ½ سیر بحساب
نخود	یک من ۵ سیر "	۱۰ سیر "	ماش	یک من ۱۰ سیر "	"
بجھڑا	یک من ۲۰ سیر "	۱۱ سیر "	مونگ	یک من ۱۵ سیر "	۶ ¾ سیر
جو	یک من ۲۰ سیر "	۱۱ ¾ سیر "	ارہر	یک من "	۱۰ ¾ سیر
			جوار	یک من ۱۰ سیر "	۱۰ ¾ سیر

نام جنس	نرخ بروقت جلوس ملکہ معظمہ ۲۱ جون ۱۸۳۷ء	نرخ غلہ بروقت جشن جوبلی واقعہ ۲۲ جون ۱۸۹۷ء
چاول	۲۰ سیر بحساب نمبری	۸¼ سیر بحساب نمبری
گڑ	۱۳ سیر "	۸¾ سیر "
گھی	۴¼ سیر بحساب نمبری	۱½ سیر بحساب نمبری
تیل	۱۴ سیر "	۳¼ سیر "

<u>سرحد</u> : ۲۵ اگست ۱۸۹۷ء۔ آج کل سرحد ملاکنڈ و ٹوچی پر انگریزوں سے سخت لڑائی ہو رہی
اور ہندوستانی فوج بغرض مقابلہ برابر جا رہی ہے۔ اگرچہ امید نہیں تھی کہ مجاہدین لوگ ظفریاب ہوں گے جن کے
ملا ہڈا ہیں۔ لیکن یہ بات اخباروں سے ضرور معلوم ہوتی ہے کہ سرکاری فوج کو بہت نقصان پہنچا۔

۲۸ نومبر ۱۸۹۷ء۔ سرحدی لڑائی آفریدیوں اور برٹش گورنمنٹ سے ابتدا جنوری ۱۸۹۷ء میں شر
ہوئی تھی وہ اب تک بدستور قائم ہے اور ۶۵ ہزار فوج سرکاری مقامات سرحد پر موجود ہے۔ سرکاری فوج ا
اس کے افسر بہت سے مارے گئے۔ بالفعل یہ مقابلہ تیراہ میں ہو رہا ہے اور اب برف پڑنا شروع ہو گ
ہے۔ اس وجہ سے سرکاری فوج کا اب زیادہ قیام وہاں مشکل نظر آتا ہے۔

۷ دسمبر ۱۸۹۷ء۔ ۱۹ نومبر کو مہاراجہ پرتاپ سنگھ وزیر اعظم جودھ پور جنگ سرحدی میں زخمی ہو
ہاتھ میں گولی لگی۔ یہ جنگ انگریزوں اور آفریدیوں سے ہو رہی ہے اور مہاراجہ صاحب انگریزوں کی کمک پر گئے تھے

۱۲ دسمبر ۱۸۹۷ء۔ یکم دسمبر کے پرچۂ ہندوستانی اخبار لکھنؤ سے واضح ہوا کہ ۱۹ جون سے ۱۰ نو
جنگ سرحدی آفریدیوں میں حسب تفصیل ذیل برٹش آفیسر اور سپاہی مقتول و مجروح ہوئے۔

ملٹری سررشتہ اسٹاف کے افسر ۲ ہلاک ۶ مجروح، رجمنٹ کے افسر ۲۷ ہلاک ۶۰ مجروح برٹش عہدہ د
سپاہی ۵۹ ہلاک ۲۴۰ مجروح، دیسی افسر ۶ ہلاک ۲۲ مجروح، دیسی عہدہ دار و سپاہی ۲۳۶ ہلاک ۶۵۵ مجرو
شاگرد پیشہ ۹ ہلاک ۲۲ مجروح۔ کل ۳۳۹ ہلاک ۱۰۰۸ مجروح۔

اگرچہ قتل و مجروح بہت سے لوگ ہوئے لیکن یہ لڑائی کا اصول ہے کہ تعداد کم کر کے لکھائی جاتی ہے۔

<u>سورج گرہن</u> : ۲۲ جنوری ۱۸۹۸ء۔ آج سورج گرہن بعد ۱۲ بجے کے پڑنا شروع ہوا اور ۳ بجے خ
ہو گیا۔ قصبہ ہذا میں میرے خیال میں ۲ ربع سے زائد نہیں پڑا جس کی بات لوگ اندیشہ کرتے تھے کہ کل پڑے گا
تاریکی ہو جائے گی اور ستارے نمایاں ہوں گے اور چڑیاں اپنے گھونسلوں میں چلی جائیں گی۔ لیکن یہ کوئی بات نہیں ہوئی

<u>وفات سرسید</u> : ۳۰ مارچ ۱۸۹۸ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ۲۷ مارچ کو

۱اپ۱ بجے رات کو سرسید احمد خاں صاحب بانی علی گڑھ کالج نے بعمر اکیاسی سال رحلت کی۔ ۴م اکتوبر ۱۸۱
ہوئے تھے۔ اور مسلمانوں میں اس قدر ذی وقعت شخص زمانہ حال میں کم گزرے ہیں۔ آپ کے کالج
کیلئے اکثر لفٹینٹ گورنر و وائسرائے کشور ہند تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے محل نہ ہوگا کہ مرحوم مسلمانوں میں آفتا
شادی دختر وائسرائے: ۲۷ ستمبر ۱۸۹۸ء۔ لارڈ ایلگن نائب السلطنت کشور ہند کی بیٹی
بروس کی شادی مسٹر ٹیننگ پرائیویٹ سکریٹری گورنر جنرل سے ہوئی۔
لارڈ کرزن: ۴م جنوری ۱۸۹۹ء۔ ۳۰ دسمبر کو لارڈ کرزن صاحب نائب السلطنت
بمبئی ہوئے جہاں سے ۶ جنوری کو کلکتہ پہنچ کر چارج وائسرائے کشور ہند لارڈ ایلگن صاحب سے حا
صاحب ممدوح تجربہ کار شخص ہیں اور کئی مرتبہ بطور سیاحت ہندوستان تشریف لا چکے ہیں۔
۶ جنوری ۱۸۹۹ء۔ آج لارڈ و لیڈی کرزن صاحب وائسرائے کشور ہند نے چارج باضا
صاحب کنارہ کش وائسرائے ہندوستان کا لیا اور صاحب آخر الذکر اسی وقت کلکتہ سے جہا
روانگی ولایت کے سوار ہوئے اور ریکار روانی ۹ بجے صبح کو عمل میں آئی۔
بمبئی میں طاعون: ۱۹ فروری ۱۸۹۹ء۔ تین برس ہو چکے ہیں مگر اس وقت تک عارضہ
بمبئی سے دور نہیں ہوا بلکہ وہ مختلف شہروں مدراس کراچی لاہور وغیرہ میں پھیلتا جاتا ہے اور کوئی تا
کے دفع ہونے کی موثر نہیں ہوتی باوجودیکہ جرمن فرانس لندن اور بہت سے یورپین سلطنتوں کے تج
بمبئی میں آئے اور ہر قسم کی جانچ کی لیکن کوئی دوا مفید ثابت نہیں ہوئی اور وہ بدستور بمبئی میں اپنی شورش کا
وفات عبدالحق خیرآبادی: ۱۱ مارچ ۱۸۹۹ء۔۔۔۔ ۶ مارچ کو مولوی عبدالحق صاحب
نے بعوارض چند در چند رحلت کی۔ مرحوم بہت بڑے عالم متقی تھے اور دو سو روپیہ ماہوار ر
رام پور سے وظیفہ پاتے تھے۔ مولوی صاحب کی شہرت تمام ہندوستان میں تھی۔
ملکہ معظمہ: ۲۴ مئی ۱۸۹۹ء۔ آج کی تاریخ میں ملکہ قیصرہ ہند پورے اسی برس کی
سچ یہ ہے کہ یہ ملکہ نہایت خوش اقبال بادشاہزادی ہیں جن کے عہد میں صدہا ممالک مفتوح ہو کر قبضہ
امساک باراں: ۹ ستمبر ۱۸۹۹ء۔ امساک باراں کی عام شکایت ہے۔ احمد آباد د گجرات
سخت قحط پڑا ہوا ہے کہ وہاں کے لوگ ترس ترس مرنے کے عوض اپنی ہلاکت کو پسند کرتے ؛
ایک شخص نے اپنا گلا کاٹ کر اپنے کو ہلاک کیا۔

قحط: ۱۲ستمبر ۱۸۹۹ء - کئی روز سے ابر محیط آسمان ہے لیکن پانی نہیں برستا۔ رقم دھان خشک ہوئی جاتی ہے.... آثار قحط پیدا ہیں۔ یہ حالت تو اودھ کی ہے لیکن اور حصہ ہندوستان میں کام قحط شروع ہو گیا ہے۔ میں نے ایسا جلد قحط تو تاریخ ہندوستان میں کہیں نہیں دیکھا۔ ایک کو ابھی دو سال نہیں گزرے تھے کہ دوسرا نمودار ہو گیا۔ پروردگار عالم اپنی خلقت پر رحم کرے۔

مردم شماری: ۲۸ستمبر ۱۸۹۹ء - ۲۶ فروری ۱۸۹۱ء کو تمام ہندوستان کی مردم شماری ہوئی تھی۔ ۲۸ کروڑ دس لاکھ مرد و عورت ہیں۔ منجملہ ان کے انگریزی عملداری میں ۲۲ کروڑ پانچ لاکھ اور ریاستوں میں ۶ کروڑ پانچ لاکھ آباد ہیں۔ جو مردم شماری ۱۸۸۱ء میں ہوئی تھی۔ اسکے مطابق ۲ کروڑ نو لاکھ آدمی ملکی ترقی ہوئی۔

بارش و قحط: ۷ اکتوبر ۱۸۹۹ء - دیکھنے اخبارات سے واضح ہوتا ہے کہ دارجلنگ متصلہ کلکتہ میں اس قدر شدید بارش ہوئی کہ پہاڑ کو جنبش ہو گئی جس سے چار سو جانیں تلف ہو گئیں اور صدہا مکانات گر گئے اور اس کے رہنے والے اسی کے اندر دفن ہو گئے۔ راستہ آمد شد ہنوز بند ہے۔ عجب حال دنیا کا ہے کہ کہیں تو اس قدر بارش ہو رہی ہے کہ لوگ اس سے اماں مانگ رہے ہیں اور کہیں اس قدر کمی ہے کہ عدم پیداوار غلہ دکھاس سے بغرض رفاہ عام کام قحط کا جاری ہے۔ عجب کارخانہ ایزدی ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

۱۲ اکتوبر ۱۸۹۹ء - چونکہ ریاست ہائے راجپوتانہ میں اور نیز بعض حصص ممالک مغربی شمالی میں کمی بارش سے قحط پیدا ہے لہذا اکثر ڈاکہ زنیاں بوجہ گرانی غلہ ہو رہی ہیں۔ ڈاکوؤں نے جس موضع کو تاکا فوراً وہاں رات کو پہنچ گئے اور جو پایا لوٹ لے گئے۔

۱۹ اکتوبر ۱۸۹۹ء - چونکہ جودھ پور وغیرہ راجپوتانہ میں قحط پڑا ہوا ہے لہذا بہت سے مارواڑی اپنا وطن چھوڑ کر اس ضلع میں آ گئے ہیں اور شب و روز بھیک مانگ کر اپنی گزر کرتے ہیں۔ نرخ وہاں کا حسب ذیل ہے۔

گندم - ۴ ۱/۲ سیر، نخود ۵ ۱/۲ سیر، جو ۵ ۱/۲ سیر، مکائی ۵ ۱/۲ سیر، جوار ۵ ۱/۲ سیر، باجرہ ۴ سیر، روغن زرد ۱/۲ سیر، عمدہ صاف پانی فی روپیہ ۲۵ گھڑے۔ میلا و گندہ پانی فی روپیہ ۵۰ گھڑے۔

کانگریس: ۴ جنوری ۱۹۰۰ء.... مسٹر کاکس صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر ہردوئی حسب منشا گورنمنٹ بذریعہ پولیس سندیلہ اس بات کی تفتیش کرا رہے ہیں کہ رؤسائے سندیلہ سے کون کون لوگ شریک جلسہ کانگریس ہوتے جو میدان شاہ مینا صاحبؒ (لکھنؤ) میں ۲۷ دسمبر تک تین روز منعقد رہا اور جس کے پریسیڈنٹ مسٹر دت بنگالی تھے جو اس کام کے لیے ولایت لندن سے آئے تھے جہاں وہ کسی مدرسے کے پروفیسر ہیں۔

ان کی اپیچ آج اودھ کل کے اودھ اخبار میں میں نے دیکھی جو نہایت پُرمضمون تھی۔

طاعون کانپور میں: ۱۲ اپریل ۱۹۰۰ء آج کل طاعون نے کانپور میں خروج کیا ہے اور بوجہ کارروائی انسدادی کہ اشخاص مبتلا شدہ شہر کے باہر جھونپڑیوں میں رکھے جاویں وہاں کے متمول لوگوں کو خلاف ہوا اور ہندو و مسلمانوں نے باہم اتفاق کر کے چند پولیس مین اور ایک ہیڈ کانسٹبل کو جو محافظ جھونپڑوں کے تھے مار ڈالا اور ان کو اسی جھونپڑوں میں آگ لگا کر جلا دیا جس سے ایک عام بلوہ ہو گیا اور ہزاروں آدمی متفق ہو گئے کہ ہم ایکٹ نمبر ۳ ۱۸۹۷ء قانون کی شرائط کو قبول نہیں کر سکتے کہ ہماری اولاد اور عورتیں بحالت بیماری شہر کے باہر رکھی جائیں اور کیفیت غدر کی پیدا ہو گئی۔ بظہور اس امر کے فوراً لفٹیننٹ گورنر بذریعہ خاص ٹرین نینی تال سے کانپور تشریف لائے۔ کارروائی دفعیہ غدر میں معروف ہوئے اور قواعد طاعون کے ترمیم فرمائے جس کا یہ منشا ہے کہ جو لوگ مبتلائے طاعون ہوں وہ اپنے مکان کے کسی علیحدہ حصہ میں رکھے جاویں اور جن لوگوں سے ان کا عقیدہ ہو علاج کریں اور اگر اس مکان میں گنجائش ایسی نہ ہوئی کہ مریض علیحدہ رکھا جا سکے تو کسی اور علیحدہ مکان میں وہ رکھا جاوے اور اگر ایسا مکان بہم نہ پہنچے تو جنرل اسپتال میں قیام کرے اور اپنی مرضی کے موافق جس شخص کا چاہے علاج کرے۔ پولیس و ڈاکٹر کوئی مزاحمت نہ کریں گے۔

۱۴ مئی ۱۹۰۰ء۔ آج کل تین آفتیں ہندوستان میں پیدا ہیں۔ اول طاعون جو پانچ سال سے ابتداً بمبئی میں تھا بعدہٗ ہندوستان کے اور شہروں میں پھیل گیا۔ اب قریب ہندوستان کے کل اضلاع میں ہے۔ حتیٰ کہ اضلاع مغربی و شمالی و اودھ میں بھی آ گیا ہے اور ضرر پہنچا رہا ہے جس کے انسداد کی تدبیریں گورنمنٹ تشدد کے ساتھ کر رہی ہے۔ ڈاکٹروں اور پولیس پر دارومدار ہے کہ جہاں کسی ڈاکٹر نے کسی کو دبلا پتلا دیکھا یا اس کو معمولی بخار میں مبتلا پایا فوراً ریل سے اُتار لیا اور پولیس کے حوالہ کر دیا اور پولیس نے اس کو جھونپڑوں میں بھیج دیا جو بیرون شہر بنائے گئے ہیں۔ یا کسی شخص کو پولیس نے بیمار دیکھا فوراً اس کو طاعون کے جھونپڑوں میں داخل کر دیا۔ اگر احیاناً اس نے پولیس کو کچھ دیدیا تو مخلصی پائی ورنہ دس دن تک انھیں جھونپڑیوں میں مبتلائے صعوبت رہا جس کی وجہ سے جابجا بلوے ہو گئے اور ہو رہے ہیں۔ دوسرے قحط جو باستثنائے اودھ چند اضلاع مغربی و شمالی کے کل ہندوستان میں مسلط ہے کہ لوگ فاقوں سے مر رہے ہیں۔ تیسرے اب ہیضہ نے خروج کیا ہے ہزاروں آدمی مر گئے اور رصد ہا مبتلا ہو کر بالمرہ مرتے ہیں۔ چوتھا امر اگرچہ ہندوستان سے متعلق نہیں ہے وہ جنگ ٹرانسوال افریقہ ہے جہاں گورنمنٹ کا بہت نقصان ہوا۔ اب بموجب اخبار کے تیس ہزار فوج اس وقت تک ضائع

ہو چکی ہے اور ہنوز لڑائی ختم نہیں ہے اور علاوہ ضائع ہونے جانوں کے کروڑہا روپیہ صرف ہو گیا اور ہوتا جاتا ہے۔ یہ ایسے آثار بد ہیں کہ جن کا انجام بخیر نظر نہیں آتا۔

ناگری: ۱۶ مئی ۱۹۰۰ء۔ گورنمنٹ نے جو رزولیوشن اپنے گزٹ مورخہ ۱۸ اپریل میں نسبت رواج حروف ناگری کے جاری کیا ہے اس کی وجہ سے کل بڑے بڑے شہروں میں کمیٹیاں ہو رہی ہیں اور لفٹیننٹ گورنر و گورنمنٹ ہند کو میموریل بھیجے جا رہے ہیں کہ ناگری کا دفاتر سرکاری میں جاری ہونا مناسب نہیں ہے جس کی وجہ سے تکلیف زائد ہوگی۔

ہندوستان کے قحط: جس قدر قحط ہندوستان میں ہوئے ہیں منجملہ ان کے گزشتہ ۱۳۱ سال کے قحطوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ موجودہ قحط کیا چیز ہے:

نمبر شمار	سنہ	قحط زدہ علاقہ	قحط زدہ رقبہ
۱	۱۷۷۰ء	بنگال	ایک لاکھ مربع میل
۲	۱۷۹۱ء	مشرقی، مدراس، حیدر آباد، گجرات، مارواڑ، جنوبی بہار شتر	دو لاکھ〃
۳	۱۸۰۳ء	دکھن حیدر آباد	۱½ لاکھ〃
۴	۱۸۰۴ء	ممالک مغربی و شمالی، وسط ہند و راجپوتانہ	ایک لاکھ〃
۵	۱۸۲۴ء	شمالی مدراس	۸۰ ہزار〃
۶	۱۸۲۵ء	بمبئی، گجرات و شمالی دکن	۸۰ ہزار〃
۷	۱۸۳۷ء	ممالک مغربی و شمالی، مشرقی ریاست ہائے راجپوتانہ، مشرقی پنجاب	۸۰ ہزار〃
۸	۱۸۳۸ء	دوآبہ، ممالک مغربی و شمالی، دہلی و حصار ڈویژن	۸۰ ہزار〃
۹	۱۸۴۰ء	گجرات، کچھ و کاٹھیاوار	۵۰ ہزار〃
۱۰	۱۸۶۱ء	دوآبہ، ممالک مغربی و شمالی، دہلی، حصار و ایک حصہ راجپوتانہ	۵۰ ہزار〃
۱۱	۱۸۶۵ء	اضلاع گنجام، بلاری، اڑیسہ، بہار، میسور، حیدر آباد، بمبئی، وسط ہند و بنگال	دو لاکھ〃
۱۲	۱۸۷۲ء	راجپوتانہ، پنجاب و مابین جمنا و سندھ و شمالی و مشرقی اضلاع، ممالک متوسط	دو لاکھ〃
۱۳	۱۸۷۳ء	مغربی راجپوتانہ، اضلاع الہ آباد، دہلی، حصار، گجرات، کچھ، چند اضلاع ممالک متوسط	
۱۴	۱۸۷۴ء	بہار، یو۔ پی	۵۵ ہزار〃
۱۵	۱۸۷۶ء	مدراس، دکھن، میسور، حیدر آباد	۵۵ ہزار〃

نمبر شمار	سنہ	قحط زدہ علاقہ	قحط زدہ رقبہ
۱۶۔	۱۸۷۷ء	مدراس، میسور، بمبئی، حیدرآباد	۲½ لاکھ مربع میل
۱۷۔	۱۸۷۸ء	ممالک مغربی و شمالی، کشمیر، پنجاب	۱½ لاکھ ״
۱۸۔	۱۸۹۶ء	ممالک مغربی و شمالی و ممالک متوسط	
۱۹۔	۱۸۹۷ء	ممالک مغربی و شمالی و سی پی	۳ لاکھ سے ۴ لاکھ ״
۲۰۔	۱۸۹۹ء	جنوبی پنجاب، راجپوتانہ، سی پی، برار، وسط ہند، حیدرآباد، بمبئی، چھوٹا ناگپور، مدراس	
۲۱۔	۱۹۰۰ء	جنوبی پنجاب، مشرقی سندھ، راجپوتانہ، وسط ہند، برار، سی پی، بمبئی، کاٹھیاوار، گجرات	۶ لاکھ سے ۷ لاکھ ״

اردو : ۱۹ اگست ۱۹۰۰ء کل بوقت ۷ بجے صبح کے ایک جلسہ اردو ڈیفنس بصدارت نواب مہدی علی صاحب محسن الملک بارہ دری قیصر باغ لکھنؤ میں منعقد ہوا جس کا یہ منشا تھا کہ جو رزولیوشن مسٹر میکڈانلڈ صاحب لفٹیننٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی و اودھ نے ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کو درباره شائع اور رائج کرنے دیوناگری کے نافذ کیا ہے وہ منسوخ کیا جاوے۔ جس کی نسبت نواب صاحب نے ایک نہایت عمدہ و دلچسپ اسپیچ فرمائی جس کا اثر کل حاضرین پر بخوبی پڑا اور اس جلسہ میں قریب آٹھ نو ہزار آدمیوں کی شرکت تھی جو بطور قائم مقامان ہندوستان کے ہر ایک حصہ ملک سے آئے ہوئے تھے اور یہ جلسہ نہایت خیر و خوبی کے ساتھ ختم ہوا اور رزولیوشن پاس ہوئے وہ بحضور گورنمنٹ بھیجے گئے کہ اہالی جلسہ کا یہ منشا ہے کہ اگر نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر نے اس عرضداشت کی کچھ سماعت نہ فرمائی تو اسکی اپیل وائسرائے ہند و وزیر اعظم ہندوستان کے حضور میں پیش کی جاوے گی۔

وفات امیر مینائیؒ : ۱۹ اکتوبر ۱۹۰۰ء منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی نے ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو حیدرآباد میں قضا کی۔ مرحوم اردو زبان کے ایک مسلم الثبوت اور بے بدل شاعر تھے۔ ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے تھے اور بہ عمر ۷۲ سال قضا کی اور پانچ بیٹے یادگار چھوڑے۔

ملکہ معظمہ کا سوگ : ۱۲ فروری ۱۹۰۱ء۔ اشتہار لارڈ کرزن صاحب گورنر جنرل کشور ہند مشتہر ہیں مضمون شائع ہوا کہ کل رعایا ہندوستان سے امید ہے کہ جناب ملکہ معظمہ کی وفات کا ۲۰ مارچ تک پورا اور ۷ اپریل تک نصف ماتم کریں اور ملازمین سول فوج و بحری وغیرہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۱ء تک بائیں بازو پر سیاہ کپڑا باندھے رہیں۔

اسٹیشن بمبئی : ۱۱ مارچ ۱۹۰۱ء ... دنیا میں سب سے بڑا خوبصورت اور قیمتی اسٹیشن بمبئی کا وکٹوریہ ٹرمنس ہے۔

علی گڑھ کالج : ۱۵ جون ۱۹۰۱ء۔ علی گڑھ کالج سرسید احمد خاں مرحوم میں ایک انجمن قائم ہوئی ہے جس کا

نام "انجمن الغرض" ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ چندہ ہر شہر و دیار سے وصول کر کے محتاج طلبا کے خورد و نوش کی کفالت میں صرف کیا جائے۔ چنانچہ کالج مذکورہ کے چار طالب علم سید ابو محمد اور واجد حسین وغیرہ کل وارد سندیلہ ہوئے اور آج انھوں نے ایک جلسہ کمیٹی میونسپل ہال میں منعقد کیا جس میں بہت سے رؤسا شریک جلسہ ہوئے انھوں نے اسی قسم کی اسپیچیں کیں جن کا منشا میں اوپر ظاہر کر چکا ہوں۔ لیکچر ختم ہوتے ان اسپیچوں کے فہرست چندہ کھولی گئی۔

وفات حکیم عبد المجید دھلوی: ۱۴ر جولائی ۱۹۰۱ء۔ تاریخ ۱۱ر جولائی کو حکیم عبد المجید خاں مشہور طبیب دہلی نے عارضہ مرض میں انتقال کیا۔ چونکہ حکیم حاذق تھے اس وجہ سے رؤسائے اعظم ان سے علاج کرانے کو دہلی جایا کرتے تھے اور اگر وہ حسب طلب کسی راجہ مہاراجہ کے باہر جاتے تھے تو بڑی فیس یومیہ لیتے تھے۔ مرحوم حکیم محمود خاں صاحب نامی طبیب دہلی کے فرزند تھے۔ افسوس کہ ایسے نامی طبیب کی وفات سے دہلی خالی ہو گئی۔ حکیم صاحب بہت متمول آدمی تھے۔

بیواؤں کی مردم شماری: ۲۱ر جنوری ۱۹۰۲ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ۱۸۹۱ء کی مردم شماری کی رو سے بیوہ عورتوں کی تعداد دو کروڑ چھبیس لاکھ ستاون ہزار چار سو چھبیس ہے جس میں ہندو بیواؤں کی تعداد مع جینی مت کے ایک کروڑ چورانوے لاکھ ترپن ہزار پانچ سو چھیاسی ہے اور مسلمان و عیسائی وغیرہ بیواؤں کی تعداد بتیس لاکھ تین ہزار آٹھ سو چھیالیس ہے۔ اس ملک کی مردم شماری قریب تیس کروڑ کے ہے۔ اگر نصف مرد نصف عورتیں ہوں تو گویا دس کروڑ عورتوں میں قریب دو کروڑ کے بیوہ ہیں یعنی پانچ عورتوں میں ایک بیوہ۔ چونکہ تعداد بیواؤں کی بہت زائد ہے لہٰذا اگر اصلاح دہندگان قوم ان کے عقد ثانی کی جانب متوجہ ہو جائیں تو ایک سخت مشکل آسان ہو سکتی ہے۔

مردم شماری: ۷ر مارچ ۱۹۰۲ء۔ جو مردم شماری یکم مارچ ۱۹۰۱ء کو تمامی ہندوستان کی ہوئی تھی اس کی رو سے اخبار پانیر میں جو نقشہ جات شائع ہوئے ہیں اس کی تعداد حسب ذیل ہے،

مرد۔ چودہ کروڑ ننانوے لاکھ ترپن ہزار سات سو اکسٹھ۔ عورتیں۔ چودہ کروڑ چوالیس لاکھ آٹھ ہزار ۹ سو گیارہ۔ کل آبادی۔ ۲۹ کروڑ تینتالیس لاکھ باسٹھ ہزار چھ سو بہتر آدمی ہیں۔ اس حساب سے پچپن لاکھ چوالیس ہزار ۸۵۰ آدمی بمقابلہ عورتوں کے زیادہ قرار پاتے ہیں۔

یو۔ پی: ۲۹۔ مارچ ۱۹۰۲ء۔ بموجب اشتہار گورنمنٹ مکوخہ ۲۴ر مارچ ۱۹۰۲ء بحوالہ اشتہار ہوم ڈیپارٹمنٹ کلکتہ مورخہ ۲۲ر مارچ اضلاع مغربی و شمالی و اودھ کا نام بدل کر اضلاع متحدہ آگرہ و اودھ رکھا گیا اور یہ تبدیلی

بہ زمانہ لارڈ کرزن صاحب بہادر و لفٹیننٹ گورنری سرالگوش صاحب وقوع میں آئی جو قابل یا
ہو گی۔ اب اضلاع مغربی وشمالی پشاور کے اضلاع قرار دیے گئے۔

طاعون: ۲۷ راپریل ۱۹۰۲ء۔ اب شکایت بیماری طاعون برابر ترقی کرتی جاتی ہے۔ بڑے بڑے
شہروں میں کئی عرصہ سے اس کی شکایت پیدا ہے لیکن اب بہت سے اور مقامات میں اس بیماری کی مداخا
پیدا ہوتی جاتی ہے۔ جو شہر یا قصبہ کنارے دریا کے واقع ہے وہاں اس کا قیام مدت تک رہتا ہے اور جب
کسی قصبہ یا شہر میں اس بیماری کا خروج ہوتا ہے تو سب سے پہلے مرے ہوئے چوہے نظر پڑتے ہیں۔ ایسا ہوا
ہے کہ اگر مکان فوراً خالی نہ کر دیا گیا اور ایک آدمی بھی اس گھر کا مرا تو اس گھر والوں میں کسی کی خیریت نہیں۔

لارڈ کچنر: ۲ر دسمبر ۱۹۰۲ء۔ ۲۸ر نومبر ۱۹۰۲ء کو لارڈ کچنر صاحب لندن سے داخل بمبئی ہوئے اور
چارج پاور صاحب سے کمانڈران چیف ہندوستان سے چارج لیا۔ لارڈ صاحب کی عمر ۵۲ سال کی ہے
اور بڑے نامی گرامی اور مشہور شخص ہیں۔ انھوں نے ملک مصر میں سوڈان فتح کیا تھا اور مہدی سوڈانی کا قبر
کھود واکر پھینک دیا تھا اور جنوبی افریقہ کی جنگ ٹرانسوال میں یہی باعث صلح نامہ بوئیر لوگوں سے ہوئے
یورپ میں یہ شخص بہت مشہور ہے۔ دیکھا چاہیے کہ وہ ہندوستان میں کتنی ناموری حاصل کرتے ہیں۔

جشن تاج پوشی: یکم جنوری ۱۹۰۳ء۔ آج دہلی میں دربار بہت شان وشوکت سے ہوا اور
یہی کیفیت ہر ضلع میں ہوئی یعنی فرمان شاہی پڑھا گیا اور لوگوں کو اعزاز حاصل ہوا۔

۱۰۔ جنوری ۱۹۰۳ء۔ جناب لارڈ کرزن صاحب گورنر جنرل کشور ہند ۲۹ر دسمبر ۱۹۰۲ء کو بہ کمال
تزک و احتشام والیان ملک کے جلوس کے ساتھ دہلی کو تشریف لائے تھے اور آج ۱۰ جنوری ۱۹۰۳ء کو بعد
فراغت دربار وغیرہ بارادہ کلکتہ دہلی سے روانہ ہوئے۔ لارڈ صاحب بمقابلہ اور وائسرایوں کے کم عمر ہیں
غالباً ۴۵ سال کے اندر عمر ہو گی۔۔۔۔ آج کل اسپشل ٹرینیں بوجہ واپسی روسائو والیان ملک برابر سندیلہ
اسٹیشن سے گزر رہی ہیں کہ وے لوگ دہلی سے اپنے وطن کو جا رہے ہیں۔

محصول نمک: ۱۹ مارچ ۱۹۰۲ء۔۔۔۔ آج کے اخبار پانیر سے معلوم ہوا کہ کرزن صاحب وائسرائے
کشور ہند کی کونسل کی رائے ہے کہ نمک پر ڈھائی روپیہ فی من سے محصول گھٹا کر دو روپے فی من کر دیا جائے
اور انکم ٹیکس جو پانچ سو سالانہ کے منافع پر لیا جاتا ہے اب ہزار روپیہ کے منافع پر لیا جائے گا اور جن لوگوں
کا منافع پانچ سو روپیہ ہے وہ بری کیے جاویں گے۔ غالباً مارچ ۱۹۰۳ء کی کیفیت سے اس کی بابت حکم صادر ہو جائے۔

سرخی شفق: ۶ اپریل ۱۹۰۳ء میں دیکھتا ہوں کہ تھوڑے زمانے سے بوقت طلوع و غروب آفتاب جو سرخی شفق عموماً ہوا کرتی ہے اس کا قیام ڈیڑھ دو گھنٹہ سے کم نہیں ہوتا حالانکہ اس قسم کی سرخی وقت طلوع غروب آفتاب کے پندرہ یا بیس منٹ میں فرو ہو جاتی تھی۔ کتاب مہابھارت میں لکھا ہے کہ کورو اور پانڈو کی لڑائی کے قبل بھی ایسی ہی سرخی وقت طلوع و غروب آفتاب کے نمودار ہوا کرتی تھی جس کا انجام یہ ہوا کہ دونوں میں سخت لڑائی ہوئی اور لاکھوں آدمی کا کشت و خون ہوا کہ دریا خون کے بہے۔ لہٰذا میں خیال کرتا ہوں کہ جب سے اس سرخی کو ترقی ہوئی بیماری طاعون سے کئی لاکھ آدمی ضائع ہو گئے اور جو ہفتہ ۲۸ مارچ کو ختم ہوا ہے اس میں تمامی ہندوستان میں تعداد کشتگان ۳۰۰۷۸ آدمیوں کی فی ہفتہ ہے۔ پس مقام غور ہے کہ آغاز طاعون سے کہ جس نے ۱۸۹۶ء سے بمبئی میں خروج کیا ہے اس وقت تک کس قدر لوگ ضائع ہوئے ہونگے لیکن اب دو چار روز سے وقت طلوع و غروب آفتاب قیام سرخی کا کم رہتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ بیماری مذکور گھٹ جاوے۔ خدا ایسا ہی کرے۔

طاعون: ۶ مئی ۱۹۰۳ء ۔۔۔۔ اودھ اخبار مورخہ امروزہ سے بحوالہ اخبار ٹیلی گراف انگریزی محررہ ۲ اپریل ۱۹۰۳ء واضح ہوا کہ جب سے طاعون ہندوستان میں شروع ہوئی ہے اس کی سالانہ اموات حسب ذیل تمامی ہندوستان میں وقوع پذیر ہوئیں۔

"۱۸۹۷ء - ۵۶ ہزار، ۱۸۹۸ء - ایک لاکھ ۱۸ ہزار، ۱۸۹۹ء - ایک لاکھ ۳۳ ہزار - ۱۹۰۰ء ایک لاکھ ۹۲ ہزار، ۱۹۰۱ء - دو لاکھ ۷۴ ہزار، ۱۹۰۲ء - پانچ لاکھ ۷۳ ہزار۔ کل ۱۲ لاکھ ۷۳ ہزار۔

وفات سید محمود: ۱۳ مئی ۱۹۰۳ء ۔۔۔۔ ۸ مئی کو مسٹر سید محمود بیرسٹر ایٹ لا کا بمقام سیتاپور انتقال ہو گیا۔ متوفی سر سید احمد خاں صاحب بانی کالج علی گڈھ کے بیٹے تھے اور امتحان بیرسٹری لندن میں پاس کر کے ہندوستان میں وکالت شروع کی تھی۔ چند سال تک وہ جج ہائی کورٹ بھی رہے تھے جنھوں نے بڑے بڑے پیچیدہ مسائل قانونی اپنی قابلیت اور عالی دماغی سے حل کیے۔ بعدہٗ عہدہ ججی سے بہ حصول پنشن چھ سو روپیہ ماہوار کنارہ کش ہو کر پھر اپنا کام بیرسٹری شروع کیا مگر افسوس کہ وہ شراب بکثرت پینے لگے جس سے ان کا دماغ خراب ہو گیا۔ آخرش انتقال ہوا۔ متوفی ۲۲ مئی ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ایک لڑکا خورد سال جس کی عمر ۱۶ سال ہو گی یادگار چھوڑا۔ مسٹر محمود کی لاش علی گڈھ بھیجی گئی جہاں اپنے باپ کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

قواعد ڈاکخانہ: ۲۷ مئی ۱۹۰۳ء۔ جدید قانون ڈاک خانہ: اکہرے و جوابی پرائیویٹ پوسٹ ٹکٹ چسپاں ڈاک کے ذریعہ سے معمولی پوسٹ کارڈ کے طور پر بھیجے جا سکتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ۵½ انچ طویل اور

۴ ۱/۲ انچ عریض سے زیادہ اور ۴ ۳/۴ انچ لانبے اور ۳ انچ چوڑے سے کم نہ ہوں اور ان کا کاغذ ویساہی دبیز ہو جیسے کہ پوسٹ کارڈ کا ہوتا ہے۔ چھ سو روپیہ تک کا ایک منی آرڈر بذریعہ ڈاکخانہ جا سکتا ہے مگر اس میں آنہ نہ ہوں۔

<u>کشمیر میں سیلاب</u>: ۴ راگست ۱۹۰۳ء۔ یہاں پانی کی کمی ہے اور کشمیر میں ۲۹ جولائی کو اتنا پانی برسا کر سیلاب آگیا جو ۱۸۹۳ء کے سیلاب سے دو فٹ بلند تھا۔ وہاں کے باشندے پہاڑوں پر چڑھ گئے اور کشتیوں پر جا کر پناہ لی۔ ریذیڈنسی و ہوٹل اور ہوٹلوں کے مکانات میں چھت تک پانی بھر گیا۔ خیریت ہوئی کہ سیلاب دن کو آیا۔ اگر رات کو آتا تو بہت سی جانیں تلف ہو جاتیں۔ آبادی میں دس سے پندرہ فٹ تک پانی تھا ایسا سیلاب وہاں کبھی نہ آیا تھا۔

۷ ستمبر ۱۹۰۳ء۔ جو سیلاب جولائی میں کشمیر میں آیا تھا اس سے سات ہزار مکان شہر کے منہدم ہو گئے اور تیس ہزار آدمی بے خانماں ہوئے۔

<u>لارڈ کچنر</u>: ۲۱ نومبر ۱۹۰۳ء۔ لارڈ کچنر صاحب کمانڈر ان چیف افواج ہند ۱۶ نومبر سنہ الیہ کو متصل سنجولی بازار کے گھوڑے سے گر پڑے اور گھٹنے کے اوپر دو مقام سے ٹانگ ٹوٹ گئی۔ شملہ میں علاج ہو رہا ہے۔

<u>طاعون</u>: ۲۶ مارچ ۱۹۰۴ء۔ معائنہ پانیر اخبار محررہ امروزہ سے معلوم ہوا کہ ہفتہ مختتمہ ۱۹ مارچ ۱۹۰۴ء میں کل ہندوستان میں ۴۷۵۲ آدمی طاعون سے فوت ہوئے جس میں بڑا حصہ اموات بمقابلہ دیگر صوبہ جات کے پنجاب کا ہے۔ اللہ اکبر یہ کس قدر کثرت ہے۔ اس بیماری سے اب کیسے دنیا قائم رہے گی۔

<u>سلسلہ ریل کا</u>: ۲۹ مارچ ۱۹۰۴ء۔ سب سے پیشتر ۲۷ ستمبر ۱۸۲۵ء کو سلسلہ ریل کا انگلینڈ میں جاری ہوا اور ہندوستان میں ۱۸ اپریل ۱۸۵۳ء کو اس کے بعد بتدریج قریباً کل ہندوستان میں اس کا سلسلہ قائم ہو گیا اور یکم فروری ۱۸۷۲ء کو سندیلہ میں ریل جاری ہوئی۔

<u>نیا وائسرائے</u>: ۲ مئی ۱۹۰۴ء۔ ۳۰ اپریل ۱۹۰۴ء کو آنریبل اسمٹ ہل گورنر پریسیڈنسی مدراس نے وائسرائے کشور ہند کا عہدہ قبول کیا اور لارڈ کرزن صاحب بمبئی سے جہاز پر سوار ہو کر روانہ ولایت ہوئے۔

<u>تھرمامیٹر</u>: ۲۷ جون ۱۹۰۴ء۔ آج ایک آلہ دریافت گرمی و سردی کمنٹ اینڈ کو بمبئی کے کارخانہ سے منگایا بہ قیمت چار روپے۔ محصول وغیرہ نو آنے۔ کل ۴ روپے ۹ آنے۔ اس آلہ سے اگر وہ بغل میں دبایا جائے تو یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کس قدر گرمی و سردی دبانے والے کے مزاج میں ہے۔ جس کی تصریح یہ ہے کہ اگر آلہ کا پارہ بغل میں دبانے پر ۹۷ یا ۹۸ درجہ تک رہے تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ شخص بحالت تندرست ہے۔ اگر اس تعداد سے گھٹ جاوے تو اس کو ضعف ہے اور اگر بڑھ جاوے تو دلیل حرارت و بخار کی قیاس کی جاوے۔

کمہن: ۱۰ر دسمبر ۱۹۰۴ء ۹ر دسمبر ۱۹۰۴ء کو لارڈ کرزن صاحب وائسرائے انگلستان سے داخل بمبئی ہوئے۔ یہ ان کا دوبارہ انتخاب ہے اور جس قدر وائسرائے اب تک ہندوستان کو آئے ہیں سب سے کم سن ۴۵ برس کے ہیں۔

علی گڑھ کالج: ۲۲ر دسمبر ۱۹۰۴ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واقع ہوا کہ اہل تشیع شاہزادگان و نوابزادگان لکھنؤ نے ایک جلسہ خلاف کانفرنس علی گڑھ کے امام باڑہ آصف الدولہ میں ۱۸ر دسمبر کو منعقد کیا تھا جس میں علمائے فرنگی محل اہل تسنن مجتہدان شیعہ کے فتوے مشعر بدیں خلاصہ پیش ہوئے کہ کالج علی گڑھ کے لوگوں کے عقائد خلاف دین اسلام ہیں کہ وہ عربی میں نماز پڑھنا لازمی نہیں سمجھتے ہیں اور نہ پانچ وقت کی نماز کی پابندی اور نہ عید الاضحیٰ کی قربانی اور نہ روزہ رکھنا وغیرہ وغیرہ۔ تو ایسی حالت میں اطلاق کفر کا ان پر لازم آتا ہے۔ ان کی اطاعت کسی نہج سے نہیں کرنا چاہیے۔ اس پر بہت سی تقریریں ہوئیں۔ اس جلسے میں اہل سنت جماعت کے معزز شریک نہیں ہوئے تھے چونکہ علی گڑھ کالج نے طریقہ تعلیم کا ایک عمدہ نوعیت کا جاری کیا ہے اب اسکی مخالفت ہو رہی ہے۔

۲۷ر دسمبر ۱۹۰۴ء آج کی تاریخ سے جلسہ کانفرنس علی گڑھ کالج بمقام لکھنؤ کیننگ کالج شروع ہوا جو ۲۹ر دسمبر تک قائم رہے گا۔ بہت سے معززین قصبہ ہذا واسطے شرکت کے لکھنؤ گئے ہیں۔ میں بھی اس کا ممبر تھا لیکن بوجہ اسکے کہ طبیعت کو اب کوئی لطف باقی نہیں اور بحالت تنہائی و خاموشی ایام زندگی بسر کرنا پسندیدہ معلوم ہوتے ہیں۔ لہٰذا فسخ عزیمت کی۔ ۳۰ر دسمبر ۱۹۰۴ء۔ آج معلوم ہوا کہ سید التفات رسول تعلقہ دار جلال پور سندیلہ نے چندہ کانفرنس علی گڑھ منعقدہ ۲۷ لغایت ۳۰ر دسمبر ۱۹۰۴ء کیننگ کالج لکھنؤ مبلغ پانچ ہزار روپیہ بنا بر تعمیر کمرہ علم سائنس کالج علی گڑھ کو دینا تجویز کیا جس سے کمرہ کا نام ان کے والد (فضل حسین) کے نام پر رکھا جاوے گا۔

۵ر جنوری ۱۹۰۵ء۔ جو جلسہ کانفرنس علی گڑھ کیننگ کالج لکھنؤ میں ۲۷ر لغایت ۳۰ر دسمبر ۱۹۰۴ء منعقد ہوا تھا وہ نہایت کامیابی کے ساتھ ختم ہوا اور ایک لاکھ چار ہزار کا چندہ ہوا اور مسٹر شاہد حسین تعلقہ دار و بیرسٹر ایٹ لا کو بجلدوے حسن کوشش ایک طلائی تمغہ منجانب کانفرنس عطا ہوا۔

طاعون: ۱۸ر فروری ۱۹۰۵ء ہفتہ مختتمہ ۴ر فروری ۱۹۰۵ء نقشہ حالت طاعون سے واضح ہوا کہ ہندوستان میں مرض مذکور سے ۳۶,۱۲۷ آدمی ضائع ہوئے اور اس کے قبل کے ہفتہ میں ۳۳,۰۸۷ آدمی فوت ہوئے تھے۔ ممالک متحدہ ہفتہ ۴ر فروری میں ۱۵,۳۶۷ اور ہفتہ ماسبق میں ۱۴,۷۰۴۔

پانچ سال کے ہفتہ مختتمہ ۲۱ر جنوری کی تعداد اموات طاعون ذیل میں درج کی جاتی ہے جس سے معلوم ہوگا کہ پانچ سال سے طاعون میں اموات کی سال بہ سال کیسی کثرت ہوتی جاتی ہے۔ ۱۹۰۱ء ۱۲۱۵۔ ۱۹۰۲ء ۔

۱۲۱۹۲، ۱۹۰۳ء-۲۲۳۵۶-۱۹۰۴ء-۲۳۴۰۳، ۱۹۰۵ء-۳۲۰۸۷

زلزلہ: ۱۲/اپریل ۱۹۰۵ء- آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ۴/اپریل ۱۹۰۵ء کے زلزلے سے شملہ میں اکثر مکانات شق و منہدم ہو گئے۔ لیڈی کرزن مع اپنے بچوں کے وائسرائے لاج چھوڑنے پر مجبور ہوئیں اور کرزن ہاؤس میں جا کر قیام کیا۔ ۴و۵/اپریل کی رات کو پھر پانچ مرتبہ زلزلہ آیا اور ۶/اپریل کو ایسا شدید تھا کہ یورپین اپنے مکانوں کو چھوڑ کر میدانوں میں کمل اوڑھ کر سوئے۔ دھرم شالہ کا زلزلہ بہت شدید تھا۔ ایک ہزار ہندوستانی و چار سو گورکھا سپاہی اور کئی یورپین افسر مرے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اسی فی صدی جانوں کا نقصان زلزلہ سے ہوا۔ لاہور میں بہت سے مکانات کو ضرر پہنچا۔ ایک سو جانیں ضائع ہوئیں۔ زلزلہ کا مرکزی قیام شملہ و لاہور کے مابین تھا اور وہاں اس کا قیام کئی منٹ تک رہا۔

۱۳/اپریل ۱۹۰۵ء- آج کل کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ۴/اپریل کے زلزلہ سے شہر کانگڑہ بالکل تباہ ہو گیا۔ منجملہ ۴۷۴۴ آدمیوں کے صرف ۵۰۰ بچے اور یہ مردم شماری اس کی مارچ ۱۹۰۱ء میں ہوئی تھی اور دھرم شالہ کے گرد و نواح کے مواضعات بالکل تباہ ہو گئے۔ چوں کہ جا بجا پہاڑ شق ہو گئے ہیں اور کئی مقاموں میں پہاڑ کھسکنے سے بڑے بڑے غار پڑ گئے ہیں اس وجہ سے دھرم شالہ کے نواحی لوگ نہایت خطرناک حالت میں ہیں غلہ خورد و نوش باقی نہیں رہا اور روپے خچروں کے ذریعے سے بھیجا جا رہا ہے۔ بمبئی میں زلزلہ کا احساس بالکل نہیں ہوا۔

۸/مئی ۱۹۰۵ء- آج کے اودھ اخبار سے واضح ہے کہ جس رقبہ میں شدید زلزلہ آیا اور اس سے جان و مال دونوں کا نقصان ہوا وہ سات سو مربع میل ہے جس میں اس وقت تک اتلاف جانوں کا تخمینہ پندرہ ہزار معلوم ہوا۔ ممکن ہے کہ اس تعداد سے اور بھی زیادہ ملبوں سے فوت شدہ اشخاص کی لاشیں برآمد ہوں۔

کرزن: ۹/مئی ۱۹۰۵ء... لارڈ کرزن صاحب وائسرائے ہند کے عہد حکومت میں مصائب ذیل باشندگان ہندوستان کے حق میں وقوع پذیر ہوئے۔ اول تو طاعون کی شدت سے بہت سے آدمی ضائع ہوئے دوسرے پالہ زدگی سے فصل ربیع ۱۳۱۲ فصلی کو بہت ضرر پہنچا۔ تیسرے زلزلہ جوالا مکھی سے ہزاروں جانیں اور املاک ضائع ہوئیں۔ چوتھے ان کی اسپیچ کلکتہ متعلقہ تعلیم سے عوام اور تعلیم یافتہ کو سخت ناراضگی پیدا ہوئی کہ انھوں نے ہندوستانیوں کو برے نام سے یاد کیا اور تعلیم کو سخت کر دیا۔

گردش زمانہ: ۹/جولائی ۱۹۰۵ء- اس سال مفصلہ ذیل آفتیں و مصیبتیں ہندوستان میں نازل ہوئیں:

۱- طاعون کی شدت سے لاکھوں آدمی مرے، ۲- سردی بے حد ہوئی، ۳- گرمی سخت پڑی اور آندھیاں بکثرت

آگئیں جس سے صدہا عظیم الشان درخت جڑ سے اکھڑ گئے ۔ ۵- آتش زدگی سے لاکھوں روپیہ کا مال تلف ہو گیا۔
۶- زلزلہ شدید سات سو مربع میل کے رقبہ میں کانگڑہ وغیرہ میں آیا جس سے تیس ہزار آدمی ضائع ہوئے اور ہزاروں مکان مسمار ہو گئے ۔ ۷- پالہ زدگی سے فصل ربیع بالکل جاتی رہی ۸- علاوہ اس کے جنگ روس وجاپان میں دس لاکھ سے زائد آدمی فریقین کے مقتول ہوئے- اور یہ بات بھی عجیب دیکھ رہا ہوں کہ ہر قصبہ گاؤں میں بلاوجہ باہم نزاعات وفسادات پیدا ہیں چنانچہ ہمارا قصبہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے اور بلاوجہ نزاعیں پیدا ہیں۔ معلوم نہیں کہ ایسے سال گردش ستاروں کی کس نہج پر ہو رہی ہے کہ کسی شخص کو چین نہیں اور ہر شخص انواع واقسام کے افکار میں مبتلا ہے۔

ایک ایجاد: ۱۳ر اگست ۱۹۰۵ء- آج راجہ درگا پرشاد صاحب نے مجھے تحفۃً ایک سفید سی پیالی بھیجی ہے جس میں ایک قسم کا اسفنج رکھا ہوا ہے جس کی بیتا تیر ہے کہ اگر انگلی سے اسے چھو کر لفافہ بند کریں تو اس کے لمس سے لفافہ وغیرہ بند ہو جائے گا اور گوند وغیرہ کی کوئی ضرورت نہ ہو گی یہ ایک نئی ایجاد یورپ کی ہے ایسی ہی ایجادوں سے ہندوستان کا روپیہ یورپ کو چلا جاتا ہے کیونکہ روساء لوگ ایک نئی اور عمدہ چیز کو دیکھ کر شوق سے اس کی خریداری کے گرویدہ ہو جاتے ہیں

تقسیم بنگالہ: ۱۵ر اگست ۱۹۰۵ء- ۷ر اگست کو ایک جلسہ ٹاؤن ہال کلکتہ میں اس غرض سے منعقد ہوا کہ تقسیم بنگالہ کی جو کارروائی گورنمنٹ سے تجویز ہوئی ہے اس کی عذرداری کی جاوے۔ اس کمیٹی میں بارہ ہزار آدمی از اعلا تا ادنیٰ شریک تھے اور پانچ ہزار طالب علم ماتمی لباس پہنے ہوئے ایک ممبر کونسل کے ہمراہ شہر میں گشت لگاتے پھرتے تھے تاکہ عوام کو اپنا ہمدرد بنا دیں اور یہ رزولیوشن بہ اتفاق رائے منظور ہوا اور عہد کیا گیا کہ جب تک تقسیم بنگال کا فیصلہ رعایا کے حق میں حسب اطمینان نہ ہو گا ولایت کی بنی ہوئی چیزیں استعمال نہ کریں گے دیکھنا چاہیے کہ اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔

کرزن: ۲۳ر اگست ۱۹۰۵ء- لارڈ کرزن صاحب وائسرائے ہند نے ایک فوجی تنازعہ کی وجہ سے ۱۲ر اگست سنہ الیہ کو اپنے عہدہ سے استعفا دے دیا۔ یہ جھگڑا ان کے اور لارڈ کچنر صاحب کمانڈر ان چیف کے مابین تھا اور ان کی جگہ پر لارڈ منٹو وائسرائے ہند مقرر ہوئے۔

تقسیم بنگالہ: ۲۸ر ستمبر ۱۹۰۵ء- چونکہ اشتہار نمبر ۲۸۳۲ مورخہ یکم ستمبر ۱۹۰۵ء کے بموجب گورنر جنرل ہند نے بمنظوری ملک معظم وشاہنشاہ ہندوستان تقسیم بنگال کی کارروائی عمل میں آئی اور صوبہ آسام قائم ہوا۔ لہذا اب اس کی تعمیل ہو رہی ہے۔

پرنس آف ویلز: ۲۰ر اکتوبر ۱۹۰۵ء- پرنس آف ویلز اور ان کی بیگم ۹ر نومبر ۱۹۰۵ء کو وارد بمبئی ہوں گے

اور ہندوستان کے نامی شہروں کی سیر فرمادیں گے و نذر و تحائف قبول کریں گے۔ دیکھا چاہیے کہ بحق رعایا کیا
سلوک فرماتے ہیں۔ شاہنشاہ روس نے تو اپنے بیٹے کی ولادت میں بہت کچھ سلوکات بحق رعایا فرمائے تھے۔

تقسیم بنگالہ: ۲۲ر اکتوبر ۱۹۰۵ء۔ ۱۶ر اکتوبر کو مقاسمہ بنگال کا نفاذ ہوا جس سے بنگالیوں کو
سخت رنج و غم ہوا۔ اور انھوں نے زرد راکھیاں باندھیں اور جس قدر دوکانیں ان کے امکان میں تھیں
وہ بند کرا دیں اور یہ دن وہ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

سودیشی تحریک: ۷ر اکتوبر ۱۹۰۵ء۔ اہل بنگالہ نے جو سودیشی تحریک شروع کی ہے یعنی اپنے ہی
ملک ہندوستان کی اشیا استعمال کریں اور یورپ کی ساختہ اشیا کو ترک کریں اس کے جلسے ہندوستان کے تمام
شہروں میں ہو رہے ہیں اور کوشش ہے کہ ہندوستان کی بنی ہوئی چیزیں کام میں لائی جائیں۔ چونکہ عموماً
ہر مقام پر کوشش ہو رہی ہے عجب نہیں کہ یہ کارروائی تکمیل کو پہنچ جاوے۔

کمشنان: ۲۲۔ نومبر ۱۹۰۵ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ۱۸ر نومبر کو لارڈ منٹو داخل بمبئی ہوئے۔
یہ پچیسویں گورنر جنرل ہند کے ہیں اور ۱۸ر نومبر کو لارڈ کرزن کنارہ کش ہو کر واپس براہ بمبئی روانہ ولایت ہوئے۔
آخر الذکر کا انتظام ہند تو بہت اچھا تھا لیکن بعض بعض باتیں ان سے ایسی ظہور میں آئیں جس سے زیادہ حصہ عوام ہندوستان
کا کبیدہ خاطر ہوا اور ان کے زمانہ وائسرائے میں چند قسم کے مصائب مفصلہ ذیل ہندوستان پر نازل ہوئے۔
طاعون کی شدت رہی جس سے لاکھوں آدمی ضائع ہوئے۔ آتش زنی سے بہت نقصان ہوا۔ زلزلہ کانگڑہ سے
بیس ہزار جانیں تلف ہوئیں۔ پالہ زدگی فصل ربیع ۱۳۱۲ف کو سخت نقصان پہنچا کہ زمیندار اور کاشتکار تباہ
ہو گئے۔ فصل خریف ۱۳۱۳ف کی بارش سے بہت ہی کم ہوئی اور ربیع آئندہ کی بھی حالت بہت خراب ہے
اور ہزاروں بیگہ اراضی کاشت ہونے سے رہ گئی شاید بمشکل تمام زر مال گزاری وصول ہو سکے۔

شاہزادہ ویلز: ۲۳ر دسمبر ۱۹۰۵ء۔ شاہزادہ ویلز نے ۱۸ر دسمبر ۱۹۰۵ء کو اپنی دادی ملکہ وکٹوریہ
کی شبیہ برنجی کا افتتاح کیا جو آگرہ کے میکڈانلڈ پارک میں نصب ہوئی۔ اس کی تیاری میں ایک لاکھ چالیس ہزار روپیہ
صرف ہوا۔ یہ برنجی شبیہ ملک المالیہ کی بالوترس کمپنی نے تیار کی ہے۔

کمبھ میلہ: ۳ر جنوری ۱۹۰۶ء۔ میلہ کمبھ الٰہ آباد میں جو ابھی ختم ہوا ہے بیس لاکھ آدمیوں کا مجمع تھا۔
۲ر جنوری ۱۹۰۶ء کو کثرت ازدحام سے دس آدمی ہلاک ہوئے اور اٹھارہ سخت مجروح ہوئے۔

جوبلی برٹش حکومت: ۱۹ر فروری ۱۹۰۶ء۔ اودھ میں ۱۴ر فروری ۱۹۰۶ء کو برٹش حکومت کا پچاسواں

ل پورا ہو گیا کہ ۱۳ ر فروری ۱۸۵۶ء کو اس کے انتزاع کا اعلان ہوا تھا۔

شہزادہ ویلز: ۲۳ ر مارچ ۱۹۰۶ء-۱۹ ر مارچ ۱۹۰۶ء کو شاہزادہ ویلز اور ان کی بیگم صاحبہ شہر
چی سے بذریعہ بیرنا ون (کذا) جہاز روانہ ولایت ہوئے جو ۹ نومبر ۱۹۰۵ء کو بنا بر سیر و سیاحت داخل بمبئی ہوئے تھے۔

۲ ر مئی ۱۹۰۶ء۔ شاہزادہ ویلز کے دورۂ ہندوستان میں جو ۶-۱۹۰۵ء میں ہوا گورنمنٹ ہند کا ۱۶ لاکھ
پیہ صرف ہوا دیکھنا چاہیے کہ جب شاہزادہ موصوف بادشاہ ہوتے ہیں تو رعایا ہندوستان کو کیا نفع پہنچاتے ہیں۔

وفات لیڈی کرزن: ۲۵ ر اگست ۱۹۰۶ء۔ لیڈی کرزن متوفیہ زوجہ لارڈ کرزن صاحب سابق وائسرائے
ر نہایت حسین و خوش پوشاک تھیں۔ ۲۷ ر مئی ۱۸۷۰ء کو پیدا ہوئی تھیں اور ۱۸ ر جولائی ۱۹۰۱ء کو قضا کی جس حساب
ان کی عمر ۳۶ سال ایک مہینہ ۲۱ دن کی ہوئی۔ اور ۲۳ ر جولائی سنہ الیہ کو قبرستان گڈ فسٹون میں دفن ہوئیں۔

کانگریس: ۵ ر ستمبر ۱۹۰۶ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ سر اندر ناتھ بنرجی مشرقی و مغربی دونوں
الوں کے شاہ کی حیثیت سے انھیں تاج پہنایا گیا اور انھوں نے غیر ملک کی ساخت کی چیزوں پر سخت
تراض کیا اور ملک کی کارروائی جائز رکھنے کے لیے مذہبی مدد حاصل کی اور انگریزی کپڑے پر اسی وجہ سے
راض کیا کہ وہ سور کی چربی سے گھونٹا جاتا ہے۔ لہٰذا ہندو اور مسلمانوں دونوں کو ناگوار ہے۔ اس جلسہ میں ہزاروں
نگالیوں کا مجمع تھا۔ میری رائے میں بظاہر ان کارروائیوں کا انجام بخیر نظر نہیں آتا۔

اخبارات: ۱۱ ر ستمبر ۱۹۰۶ء۔ آج کل ہندوستان میں ۱۲۱۷ اخبار نکلتے ہیں۔ تعداد کے لحاظ سے بمبئی
درجہ اوّل اور پنجاب کو درجہ دوم حاصل ہے۔

وفد مسلمانوں کا: ۹ ر اکتوبر ۱۹۰۶ء۔ مسلمانوں کے ایک ڈپوٹیشن نے بہ سرغنائی آغا سلطان
شاہ آغا خاں صاحب جی سی آئی ای بمبئی جن کے ساتھ سر برآوردہ معزز اہل اسلام ہندوستان شریک
تھے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء بمقام شملہ حضور میں لارڈ منٹو صاحب بہادر وائسرائے ہند حاضر ہو کر ایڈریس پیش کیا کہ
انتظامات نسبت تقرر ججان ہائی کورٹ وغیرہ آئندہ ہونے والے ہیں اس میں مسلمانان ہند کے حقوق کا بھی لحاظ
ما جاوے جس کا جواب وائسرائے نے قابل اطمینان دیا۔ اس کی کیفیت مفصل اودھ اخبار مورخہ ۱۸ اکتوبر میں درج ہے۔

۷ ر جنوری ۱۹۰۷ء۔ جو ڈپوٹیشن اہل اسلام یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو حضور میں لارڈ منٹو صاحب وائسرائے ہند
مقام شملہ گیا تھا اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ مسٹر شاہ دین بیرسٹر و مسٹر شرف الدین بیرسٹر ایٹ لا چیف کورٹ پنجاب و ہائی کورٹ
کلکتہ کے جج مقرر ہوئے جس کے معنی یہ ہیں کہ گورنمنٹ نے استدعا مسلمانان ہند پذیرا فرمائی اور ان کو عہدہ ہائے جلیلہ عطا فرمائے۔

فیٹ (FETE) ۲ر فروری ۱۹۰۷ء - امیر کابل نے ۲ر فروری کو بحالت قیام کلکتہ لیڈی منٹو کے فیٹ میں بہت کچھ فیاضی ظاہر کی جو بنا بر مصارف تعلیم دایہ اسپتالوں کو دیا جائے گا - اسی غرض سے یہ مینا بازار قائم ہوا - لیڈی منٹو لارڈ منٹو وائسرائے گورنر جنرل کی بی بی ہیں جنھوں نے محض رفاہ عام کے لیے یہ فیٹ بمقام کلکتہ قائم کیا -

امیر کابل : ۵ر فروری ۱۹۰۷ء - امیر حبیب اللہ خاں والی کابل نے بہ فراہمی اہل ہنود و مسلمان دہلی میں دربار کیا تو ان لوگوں کو نصیحت کی کہ رسم گاؤکشی موقوف کر دی جائے جو باعث دل دکھنے ہنود کا ہے - میں نے کابل میں اس طریقہ کو مسدود کر دیا ہے اور قرآن شریف میں حکم گاؤکشی کا کہیں نہیں ہے لہٰذا آپ لوگ بھی اس رسم کو ترک کریں - اس امیر کی نصیحت کو تمامی مولوی اماموں اور روسائے دہلی نے منظور و قبول کیا کہ ہم آئندہ ایسا ہرگز نہیں کریں گے - یہ نصیحت امیر صاحب نے ۲۵ر جنوری کو کی تھی -

طاعون : ۵ر مارچ ۱۹۰۷ء بمعائنہ گزٹ سرکاری و اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ امسال طاعون بمقابلہ سال گزشتہ کے بہت ترقی پر ہے اور بکثرت لوگ مر رہے ہیں یعنی اگر گزشتہ سال میں پانچ ہزار مرے تو سال رواں میں پندرہ ہزار ہمارے ضلع ہردوئی میں بھی اسکی زیادتی ہے - گونی گونڈہ میں تو کئی مہینہ سے تھا اب ہمارے ضلع گھوگرہ کے قریب آگیا ہے -

امیر کابل : ۸ر مارچ ۱۹۰۷ء نے جمعہ گزشتہ کو جب مسجد لاہور میں نماز جمعہ ادا کی تھی تو ستر ہزار آدمیوں کا مجمع تھا اور جس طرف آپ گزرتے تھے تو پھولوں کی برابر بوچھار ہوتی تھی - آپ نے پیش امام مسجد کو خلعت قیمتی دیا اور موذن کو ایک دوشالہ عطا کیا - امیر صاحب میں مثل انگریزوں کے پابندی اوقات کی تو نہ تھی ورنہ اور باتوں کے اعتبار سے وہ بہت ممتاز رہے - ۳ر مارچ کو امیر کابل نے مسلمانوں کے لیے لاہور میں کالج کی تعمیر کے لیے بیس ہزار روپے دیے اور ترقی تعلیم کالج کے لیے چھ ہزار سے اضافہ کر کے بارہ ہزار سالانہ منظور فرمائے جس کی تصریح ۶ر مارچ ۱۹۰۷ء کے اودھ اخبار میں درج ہے -

طاعون : ۱۰ر مارچ ۱۹۰۷ء بمعائنہ پانیر مورخہ ۹ مارچ ۱۹۰۷ء سے واضح ہوا کہ تمامی ہندوستان میں ہفتہ مختتمہ ۲ر مارچ میں ۳۲,۹۰۹ آدمی طاعون سے ضائع ہوئے اور اس کے ماقبل ہفتہ میں ۲۴,۳۰۰ مرے تھے -

امیر کابل : ۱۲ر مارچ ۱۹۰۷ء - امیر حبیب اللہ خاں والی کابل ۷ر مارچ سنہ الیہ کو بمقام جمرود اپنے افغانستان میں داخل ہوئے - وہاں سے بذریعہ تار اخبار والوں کو اطلاع دی کہ میں ۶۴ روز ہندوستان کی سیر کر کے اپنے ملک کی حد میں پہنچا اور زمانہ دورہ میں لارڈ منٹو وائسرائے ہند اور تمامی حکام نے میرے ساتھ دوستانہ برتاؤ کیا - اگر میں اس سفر کو گوارا نہ کرتا تو ہندوستان کے حالات سے ہنوز (کذا) بے خبر رہتا - کلکتہ میں امیر صاحب فری میسن بھی ہوئے -

طاعون: ۲۹ اپریل ۱۹۰۷ء۔ بحوالہ "پائنیر" اخبار مورخہ ۲۷ اپریل سے واضح ہوا کہ ہفتہ مختتمہ ۲۰ اپریل سنہ الیہ میں تمام ہندوستان میں ۷۶,۵۱۰ آدمی طاعون سے مرے اور اس کے قبل کے ہفتہ میں ۷۵,۴۴۲ ضائع ہوئے تھے۔ آج چار آدمی اشراف محلہ کے طاعون سے مرے۔

۱۱ مئی ۱۹۰۷ء۔ راولپنڈی میں بعض وکلاء و بیرسٹر نے خلاف گورنمنٹ مجمع عام میں اسپیچیں کیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجسٹریٹ ضلع نے ان پانچوں وکلاء و بیرسٹروں کو گرفتار کرا کے حوالات بھیج دیا اور ضمانت قبول نہیں کی۔ اب کسی تاریخ آئندہ میں اس کی تحقیقات ہوگی۔ ان لوگوں نے اس قسم کی اسپیچیں کی تھیں کہ سرکار نے بندوبست دیہات کا سخت کر دیا ہے اور طاعون سے ہزاروں آدمی مر رہے ہیں لہٰذا ہم لوگوں کے واسطے یہی مناسب ہے کہ گورنمنٹ سے جھگڑا کر کے اپنی جان دیدیں کیونکہ اگر طاعون سے بچے تو گورنمنٹ کی سنگینی جمع سے تکلیف اٹھا اٹھا کر مرنا ہوگا۔

لاجپت رائے: ۱۵ مئی ۱۹۰۷ء۔ بحوالہ اودھ اخبار مورخہ امروزہ سے واضح ہوا کہ لالہ لاجپت رائے ایک نامور وکیل لاہور بموجب حکم گورنمنٹ محکومہ ۹ مئی سنہ الیہ گرفتار کر کے بذریعہ اسپیشل ٹرین ملک برہما کو بھیج دیے گئے کہ انھوں نے مفسدانہ اسپیچیں کی تھیں جو گورنمنٹ کی حکومت کے محض خلاف تھیں اور اجیت سنگھ ان کے نائب کو بھی گرفتاری کی تجویز ہو رہی ہے جو جا بجا اسپیچیں کہتا پھرتا تھا اور جو بالفعل لاپتہ ہے۔

۲۱ مئی ۱۹۰۷ء۔۔۔ لالہ لاجپت رائے ایک نامور متمول وکیل لاہور قلعہ "مانڈلے" واقع ملک برہما میں بطور سلطانی قیدی مقید ہیں۔

۷ جون ۱۹۰۷ء۔ آج کے اخبارات سے واضح ہوا کہ اجیت سنگھ پنجابی نائب لالہ لاجپت رائے امرتسر میں گرفتار ہوا جو عنقریب کسی مقام پر جلا وطن کیا جائے گا۔ اجیت سنگھ گورنمنٹ کے خلاف اسپیچیں لاہور میں دیا کرتا تھا جس کی وجہ سے اس پر وارنٹ گرفتاری بعد تا پانچ سو روپیہ انعام کے جاری تھا۔

۱۹ جون ۱۹۰۷ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ لالہ لاجپت رائے ملک برہما میں قلعہ "مانڈلے" کے ایک آراستہ بنگلہ میں مقیم ہیں جو لب سڑک واقع ہے۔ ان کے واسطے کتابیں مہیا کی گئی ہیں اور بگھی اور ایک جوڑی گھوڑے کی ان کی سواری کے واسطے ہے۔ دو افسروں کے ہمراہ باہر نکل سکتے ہیں۔ جو ہندوستانی ان کو دیکھنا چاہتے ہیں وہ دیکھ سکتے ہیں۔ ان کے صرفہ سالانہ کے واسطے گورنمنٹ نے ۴۸ ہزار روپیہ منظور کیا ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ ان کو ۴۰ روپیہ یومیہ ملتا ہے۔ بہر حال ان دونوں میں سے ایک رقم ان کو ملتی ہے۔ غالباً اخیر رقم صحیح ہے جس کی تعداد ماہواری ۱۲۰۰ ہے۔

<u>اِکنی</u> : یکم اگست ۱۹۰۷ء۔ آج یکم اگست ۱۹۰۷ء سے ایک آنہ کا نکل کا سکہ جاری ہوا ہے۔ اس سکہ کا کنارہ پہلودار ہے۔ جس سے یہ غرض ہے کہ اس پر چونی کا دھوکا نہ ہو۔ اگرچہ چونی سے کسی قدر بڑا اور موٹا ہے مگر چونی سے کچھ مشابہ ہے۔ پہلودار بنانے سے دنیا کے سکوں میں یہ نرالا سکہ ہے کیونکہ اس وقت تک کسی ملک میں ایسا سکہ مسکوک نہیں ہوا ہے۔ اس کے سامنے کے رُخ پر بادشاہ کا تاجدار چہرہ ہے۔

<u>دُمدار ستارہ</u> : ۱۶ اگست ۱۹۰۷ء۔ آج کل تین بجے آخر رات کو ایک دمدار ستارہ نکلتا ہے جو پورب میں کہکشاں کے قریب اتر کو دکھلائی دیتا ہے۔ یہ ستارہ زمانہ غدر بعدہٗ ۱۸۷۷ء و زمانہ خشک سالی میں نکلا تھا اب پھر نکلا ہے، دیکھنا چاہیے کہ اسکا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ بارش کی کمی اور خریف کا نقصان تو ظاہر ہو رہا ہے۔

<u>وفات نواب محسن الملک</u> : ۲۰ اکتوبر ۱۹۰۷ء۔ نواب محسن الملک سکریٹری مدرسۃ العلوم علی گڑھ نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء بمقام شملہ قضا کی۔ مرحوم لائق و قابل شخص تھے۔ ان کی اسپیچ میں ایسی سحر بیانی تھی کہ حاضرین جلسہ ان کے منشا سے فوراً متاثر ہو جاتے تھے اور ان کے مقاصد کی پوری تعمیل ہوتی تھی۔ محسن الملک ۹ دسمبر ۱۸۳۷ء کو پیدا ہوئے اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء یوم چہارشنبہ کو فوت ہوئے اور ۱۹ اکتوبر یوم شنبہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ متصل قبر سرسید احمد خاں کے مسجد میں مدفون ہوئے۔ حساباً ان کی عمر ۶۹ سال ۹ ماہ تینتیس روز کی ہوئی۔

<u>قحط اور چوہے</u> : ۲۰ اکتوبر ۱۹۰۷ء۔ چونکہ آج کل زمانہ قحط سالی کا ہے پروردگار عالم نے عوام کے رزق پہنچانے کا یہ سامان کر دیا کہ حسب منشائے گورنمنٹ واسطے انسداد بیماری طاعون کے ہلاکت چوہوں کا کام جاری ہو گیا چنانچہ قصبہ ہذا میں چوہوں کی ہلاکت کا کام جاری ہے اور ان کو لانے والوں کو دو پیسہ فی چوہا عام اس سے کہ وہ زندہ ہوں یا مردہ انعام تقسیم کیا جاتا ہے جس کی تعداد یومیہ باون روپے تک پہنچ گئی ہے جس سے بہت سی جانیں پرورش پا رہی ہیں۔

<u>ہڑتال</u> : ۲۷ نومبر ۱۹۰۷ء۔ ملازمان یوروپین و ہندوستانی ایسٹ انڈیا ریلوے نے ہڑتال کر دی کہ یہ زمانہ قحط سالی کا ہے اگر ہماری تنخواہوں میں اضافہ نہ ہوگا تو ہم ریل نہیں چلائیں گے۔ چنانچہ ۱۸ نومبر سے کلکتہ سے کالکا تک ریل بند ہے اور مسافروں اور مال کی آمد و شد رکی ہوئی ہے۔

<u>علی گڑھ</u> : ۱۰ دسمبر ۱۹۰۷ء۔ آج کی کمیٹی علی گڑھ سے وقار الامرا سکریٹری علی گڑھ کالج بجائے محسن الملک نواب مہدی علی خاں متوفی سکریٹری مقرر ہوئے۔

<u>تعداد فوج</u> : ۱۱ اپریل ۱۹۰۸ء۔ تعداد سرکاری فوج گورے و ہندوستانی ہندوستان میں بہ تعداد ذیل ہے

فوج گورا - ۸-۱۹۰۷ء-۷۶۰۱۹ ہندوستانی ۱۵۶۴۱۱ - کل - ۲۳۲۴۳۰ - اس میں فوج کنٹنجنٹ بھی شامل ہے۔ صرف اسی قدر فوج سے حفاظت ہندوستان ہوتی ہے

حادثہ ریل: ۱۴ر مئی ۱۹۰۸ء کل کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ جو دو ٹرینیں متصل غازی آباد کے لڑای تھیں اور اس کا زمانہ ایک ہفتہ ہوا۔ اس کے صدمہ سے دو تین سو مسافر ضائع ہوئے اور بہت سے مجروح اور مجروحین میں سے لوگ ہلاک ہو رہے ہیں اور کئی ریل گاڑیاں جل کر خاکستر ہو گئیں اور ایک بارات ریل میں جا رہی تھی ان باراتیوں میں سے ایک آدمی بچا اور کل بارات ہلاک ہو گئی۔ یہ بہت بڑا واقعہ تھا۔

وفات غلام احمد قادیانی: یکم جون ۱۹۰۸ء - ۲۶ر مئی ۱۹۰۸ء کو غلام احمد قادیانی جنھوں نے ایک جدید اسلامی فرقہ قائم کیا تھا بعارضہ ہیضہ لاہور میں قضا کی۔

رعایا پروری: ۷ر جولائی ۱۹۰۸ء۔ غلہ روز بروز گراں ہوتا جاتا ہے لیکن فصل انبہ بکثرت ہونے سے غربا کی اس سے بہت پرورش ہوتی ہے ورنہ سخت پریشانی کا سامنا ہوتا۔ دوسرے گورنمنٹ اور چندہ کے روپیہ سے جو قریباً تین سو ماہوار خاص محتاجان قصبہ ہذا میں تقسیم ہوتا ہے اس سے بہت بڑی امداد مستورات پردہ نشین و غربا کی ہو رہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ گورنمنٹ اپنی رعایا کی پرورش میں بہت سرگرم ہے ورنہ بہت سے لوگ فاقہ کشی سے مر جاتے۔ اور اسی طور پر تمامی ہندوستان میں لکھوکھا روپیہ محتاجوں کو تقسیم ہو رہا ہے۔ میرے خیال میں جیسی پرورش رعایا برٹش گورنمنٹ کے عہد سلطنت میں ہو رہی ہے ایسی کسی راجہ ہند یا کسی بادشاہ مسلمان کے زمانِ حکومت میں نہیں ہوئی ہوگی۔ علاوہ اسی کے سرکار لاکھوں روپیہ رعایا کو خریداری ترگانوان و بہسارہ میں بانٹ رہی ہے جس کی کمال شکر گزاری ادا ہو رہی ہے اور یہ سلسلہ تقسیم خیرات کا تا وقتیکہ فصل خریف آئندہ تیار نہ ہو برابر جاری رہیگا۔

مسٹر تلک: ۲۵ر جولائی ۱۹۰۸ء... مسٹر تلک مرہٹہ رئیس پونا کو بمبئی کے جج صاحب نے چھ سال قید سخت کی سزا دی اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کیا۔ مسٹر تلک اپنی قوم میں نہایت معزز اور پر اثر شخص تھے۔ قیدی نے اپنے اخبار مرہٹی زبان میں تین دفعہ گورنمنٹ کی کچھ شکایت اور توہین چھاپی تھی اس وجہ سے ان کو حسب منشا دفعہ ۱۲۴ حرف الف و دفعہ ۱۵۳ الف تعزیرات ہند سزا ہوئی۔ مسٹر تلک عدن میں جلاوطن کیے گئے اور جس وقت وہ جہاز پر لیے جا رہے تھے تو ان کے ہمدرد لوگوں نے بہت کچھ یورش کی اور گارڈ کے سپاہیوں کو اینٹ اور پتھر مارے۔ کئی افسر زخمی ہوئے اور ادھر سے فوج نے گولیاں چلائیں چار آدمی ہلاک ہوئے اور ۳۲ آدمی زخمی ہوئے۔ کیفیت غدر کی اس وقت پیدا تھی۔

پھانسی: ۱۵ اگست ۱۹۰۸ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ "کھودے رام بوس" کو بتاریخ ۱۱ اگست ۱۹۰۸ء پھانسی دے دی گئی۔ ملزم پر یہ الزام تھا کہ اس نے مظفر پور میں بم کے گولے سے دو یورپین لیڈیوں کو ہلاک کیا تھا۔

سرکاری گواہ: ۵ ستمبر ۱۹۰۸ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ نرندر ناتھ گوسائیں سرکاری گواہ کو جس نے مخبری کر کے بہت سے اپنے ہم قوم لوگوں کو کلکتہ میں گرفتار کرایا تھا اس کو کنھئی لال دت اور سریندر ناتھ بوس دو قیدیوں نے علی پور کے جیل خانہ کے اندر ریوالور اور طپنچہ کی گولیوں سے ۳۱ اگست ۱۹۰۸ء کو ہلاک کر ڈالا اور دو دیوریپین قیدی جو اس کو بچانے کے واسطے آئے تھے ان کو بھی زخمی کیا۔ وہ طپنچے شاید کھانے میں رکھ کر اس کے دوستوں نے قیدیوں کے پاس بھیجے تھے۔ یہ دونوں قیدی جنھوں نے گوسائیں کو ہلاک کیا محض گوسائیں کی مخبری پر زیر حوالات تھے جب دونوں قیدیوں کی تلاشی لی گئی تو پانچ ریوالور اور طپنچے ان کے پاس برآمد ہوئے۔

مسٹر تلک: ۲۸ ستمبر ۱۹۰۸ء۔ مسٹر تلک مرہٹا پونا جن کو سزا چھ سال بہ عبور دریائے شور بہ علت شائع کرنے مضامین فتنہ پردازی ہوئی تھی وہ بحکم گورنر بمبئی قید محض رہے گی اور اب وہ شہر منڈالے مواقع برہما کو بھیجے گئے۔

جشن جوبلی: ۲۸ نومبر ۱۹۰۸ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ جشن قیصری جوبلی ۲ نومبر ۱۹۰۸ء کو تمامی ہندوستان میں ہوا تھا۔ اس کا یہ منشا تھا کہ برٹش سلطنت نے براہ راست قدیم ایسٹ انڈیا کمپنی سے حکومت ہندوستان کی زمام اپنے ہاتھ میں لی تھی جس کو زمانہ پچاس سال کا ہوا جو زمانہ امن و امان سے ختم ہوا۔

حقہ کی ایجاد: ۱۳ نومبر ۱۹۰۸ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ اکبر بادشاہ کے حکم سے حکیم ابو الفتح گیلانی نے حقہ کی ایجاد کی جس کو اکبر بادشاہ نے بہت پسند کیا تھا۔

بنگال میں حادثہ: ۱۴ نومبر ۱۹۰۸ء ... آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ایک جلسہ کلکتہ میں سر انڈر و فریزر صاحب لفٹیننٹ گورنر کی پریسیڈنسی میں ۷ نومبر کو بوقت شام منعقد ہوا تھا، جو نندر ناتھ چودھری نے ایک ریوالور و طپنچہ سے گورنر پر دو مرتبہ فیر کرنا چاہا لیکن طپنچہ نے خطا کی اور چودھری مذکور گرفتار کر لیا گیا جس کی تحقیقات ہو رہی ہے۔ اسی اخبار سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نند لال بنرجی انسپکٹر تحقیقات فوجداری کو کسی نے ۱۰ نومبر کو طپنچہ کے دو فیروں سے قتل کیا۔ قاتلوں کی تفتیش ہو رہی ہے۔ ہنوز کوئی سراغ نہیں لگا۔

۲۸ نومبر ۱۹۰۸ء آج کے اخبار سے واضح ہوا کہ جو نندر ناتھ چودھری جس نے سر انڈر و فریزر لفٹیننٹ گورنر بنگال کو ہلاک کرنا چاہا تھا اس کو دس سال قید سخت کی سزا ملی۔ اگر مہاراجہ بردوان لفٹیننٹ گورنر اور قاتل کے درمیان میں نہ آجاتے تو ضرور طپنچہ سر ہونے سے ہز آنر ہلاک ہو جاتے۔

بیرسٹر منجانب انگلستان، پیروی مقدمہ کرتے تھے۔

مدن لال قاتل: ۱۰ر جولائی ۱۹۰۹ء۔ یکم جولائی ۱۹۰۹ء کو کرنیل کرزن ویلی اور ڈاکٹر لال کا کا کو مسمی مدن لال طالب علم ساکنہ امرتسر نے بمقام لندن تپنچہ کی گولیوں سے قتل کر ڈالا جس کی وجہ سے مدن لال قاتل نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ غالباً اس کو سزا پھانسی کی ہوگی۔ مقدمہ کی تحقیقات لندن کورٹ میں ہو رہی ہے۔ مدن لال نے اپنی بریت کے لیے کوئی بیان نہیں دیا بلکہ جو اس نے پولیس میں بیان کیا تھا وہی کافی سمجھا گیا۔

۲۷ر جولائی ۱۹۰۹ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ لارڈ الورسٹون نے مدن لال قاتل سر کرزن ویلی کو پھانسی کی سزا دیتے ہوئے کہا کہ میں جو بات کہوں گا اس کا ملزم پر کچھ اثر نہ پڑے گا۔ جب مدن لال حکم سزا سن چکا تو اس نے فوجی سلام کیا اور کہا کہ مائی لارڈ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں خوش ہوں کہ مجھے میرے وطن کے لیے مرنے کا یعنی شہید ہونے کا فخر نصیب ہوا۔

۲۰ر اگست ۱۹۰۹ء۔ ۱۷ر اگست کو مسمی مدن لال دینگرا ساکن امرتسر کو بجرم قتل سر کرزن ویلی صاحب بمقام لندن پھانسی ہوئی۔

لارڈ کچنر: ۱۶ر ستمبر ۱۹۰۹ء۔ ۱۰ر ستمبر کو لارڈ کچنر کمانڈر ان چیف افواج ہندوستان، ہندوستان سے روانہ ہوئے جنھوں نے سات سال اس عہدہ کا کام نہایت عمدگی سے انجام دیا اور جنرل سر او لیور کریک جدید کمانڈر ان چیف کو چارج دیا جو اسی تاریخ داخل بمبئی ہوئے تھے۔

جنتریوں میں فرق: ۱۳ر جنوری ۱۹۱۰ء۔ جنتری ہائے مفصلۂ ذیل میں محرم کے چاند میں اختلاف ہے:
جنتری نولکشور۔ ۲۹ر جنتری رعد کانپور۔ ۲۹ر علمی جنتری۔ ۲۹ر مشہور عالم، ۳۰ر پترہائے منجان۔ ۳۰ مگر کل شام کو بہت غور سے چاند دیکھا گیا لیکن نظر نہیں آیا۔ اس وجہ سے آج چاند رات قرار دی گئی۔ مستورات اور بعض جہلا کا عقیدہ ہے کہ مہینہ محرم کی چاند رات اور پنج شنبہ اچھے نہیں ہوتے۔ چونکہ آج پنج شنبہ کی رات ہوگی اب تجربہ کرنا ہے کہ یہ سال کیسا گزرتا ہے۔

پھانسی: ۴ر فروری ۱۹۱۰ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ نرندر ناتھ سین کو ہائی کورٹ کلکتہ نے حکم پھانسی کا صادر کیا جس نے ۲۵ جنوری ۱۹۱۰ء کو شمس العالم ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو تپنچہ کی گولی سے ہلاک کیا تھا۔

علی گڑھ کالج: ۸ر فروری ۱۹۱۰ء ... معلوم ہوا کہ سر آغا خاں، خوجوں کے پیر، بذریعہ اسپیشل ٹرین ۵ر فروری بوقت ۱۱ بجے دن لکھنؤ تشریف لائے۔ اہالی لکھنؤ نے ان کی نہایت قدر و منزلت کی اور گھوڑے کھول کر خود اسٹیشن سے قیصر باغ تک لے گئے۔ اسٹیشن سے قیصر باغ تک جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ ان کی

دارالعلوم ندوہ : ۲/ دسمبر ۱۹۰۸ء - ۲۸/ نومبر ۱۹۰۸ء کو سر ہیوٹ صاحب بہادر لفٹیننٹ گورنر متحدہ اضلاع آگرہ و اودھ نے سنگ بنیاد دارالعلوم ندوۃ العلما کا بمقام لکھنؤ رکھا۔

گاڑیوں کا تصادم : ۱۰/ دسمبر ۱۹۰۸ء - آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ۳/ دسمبر ۱۹۰۸ء کو قصبہ مصطفےٰ آباد متصلہ لاہور میں دو ریل گاڑیاں لڑ گئیں جس سے ۱۸/ آدمی ہلاک و ۲۵/ مجروح ہوئے۔

صرفہ تار : ۱۳/ فروری ۱۹۰۹ء ... یکم جنوری ۱۹۰۹ء سے ٹیلی گرام بھیجنے کا حسب ذیل انتظام ہوا معمولی تار جو ایک روپیہ میں جاتا تھا وہ اب چھ آنے میں جائے گا لیکن شرط یہ ہے کہ مع نام و پتہ مکتوب الیہ و مکتوب الیہ بارہ لفظوں سے زائد نہ ہوں اور اگر زائد الفاظ ہوں گے تو فی لفظ ایک پائی مزید دینا ہوں گی اور جو تار ضروری دو روپیہ میں جاتا تھا وہ ایک روپیہ میں جاوے گا مگر اس میں بھی یہ شرط ہے کہ مع نام کاتب و مکتوب الیہ وغیرہ کے بارہ لفظوں سے زاید نہ ہوں۔ اگر ہوں گے تو فی لفظ ایک آنہ مزید دینا ہوگا۔

آگرہ : ۲۲/ فروری ۱۹۰۹ء ... آگرہ کے تاج محل میں ایک لمپ عطیہ لارڈ کرزن صاحب سابق وائسرائے ہند ۲۱/ فروری ۱۹۰۹ء وقت سوا سات بجے رات کے سر ہیوٹ صاحب بہادر لفٹیننٹ گورنر اضلاع متحدہ آگرہ و اودھ نے آویزاں کیا۔ یہ نہایت عمدہ لمپ ہے۔ مصر کے مدروس مدبر نے دو سال میں اس لمپ کو تیار کیا ہے۔ یہ لمپ کسی تقریب ضروری میں روشن کیا جائے گا۔

ممبر کونسل وائسرائے : یکم اپریل ۱۹۰۹ء - اخباروں سے واضح ہوا کہ مسٹر سنیہ (کذا) قوم بنگالی بیرسٹر ایٹ لا و ایڈوکیٹ جنرل بنگال کونسل وائسرائے کے ممبر مقرر ہوئے جن کی تنخواہ چھ ہزار چھ سو سٹھ روپیہ ماہوار مقرر ہوئی ہے یہ پہلی مرتبہ ہے کہ ایک ہندوستانی گورنمنٹ کے معزز عہدہ پر مقرر ہوا حالانکہ ان کی وکالت کی آمدنی تیس ہزار روپیہ ماہوار تھی مگر بوجہ از دیاد عزت و مرتبہ کے انھوں نے یہ عہدہ قبول کیا۔ بالصفات نہایت قابل قانون داں شخص ہیں۔

جوڈیشل کمشنر : ۱۲/ مئی ۱۹۰۹ء - آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ پنڈت سندر لال صاحب وکیل عدالت ہائی کورٹ الہ آباد جوڈیشل کمشنر مقرر ہوئے۔ یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ ایک ہندوستانی ایسے معزز عہدہ پر ممتاز فرمایا گیا۔ پنڈت صاحب کی آمدنی وکالت ان کے اس عہدہ کی تنخواہ سے کہیں زائد تھی۔

مقدمہ لاجپت رائے : ۹/ جولائی ۱۹۰۹ء - جو مقدمہ لالہ لاجپت رائے لاہور نے بنام اخبار "انگلش مین" کلکتہ میں بابت اپنے ازالہ حیثیت عرفی کے کلکتہ ہائی کورٹ میں دائر کیا تھا اس میں جج فلیچر کلکتہ نے ۷/ جولائی کو پندرہ ہزار کی ڈگری دی اور خرچہ مقدمہ دلوایا۔ دعویٰ پانچ ہزار کا تھا۔ مسٹر نارٹن اعلیٰ درجہ کے

تشریف آوری کا یہ سبب ہے کہ علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی قرار دینا چاہتے ہیں۔ جس کا تخمینہ تیس لاکھ روپے ہے۔ منجملہ اس کے بیس لاکھ روپیہ وصول ہو چکا ہے اب صرف دس لاکھ چندہ ہونے کی ضرورت ہے۔ غالباً لکھنؤ میں فہرست چندہ کھولی جائے اور متمول لوگ حسب حیثیت چندہ دیں جس کی تعداد میں آئندہ کسی تاریخ میں درج روزنامچہ ہذا کروں گا۔

وفات ایڈورڈ ہفتم: ۸ مئی ۱۹۱۰ء۔ آج کے "پانیر" سے واضح ہوا کہ ایڈورڈ ہفتم بادشاہ انگلستان اور ہمارے شہنشاہ معظم نے ۶ مئی ۱۹۱۰ء کا دن گزر کے رات کو ۱۱ بج کے ۴۵ منٹ پر بعارضہ انفلوئنزا انتقال کیا۔ عمر ۶۹ سال تھی۔ اعلیٰ حضرت کے زمانہ میں قحط و زلزلہ و طاعون اور ہر قسم کی پریشانیاں زیادہ لاحق رہیں۔

دمدار ستارہ: ۹ مئی ۱۹۱۰ء دمدار ستارہ صبح کے ۴ بجے پورب جانب اُتر کو ہٹتا ہوا نکلتا ہے جس کا قیام ۵ بجے تک رہتا ہے۔ تواریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا نکلنا اچھا نہیں ہے۔ جنگ و قحط سالی وغیرہ کا سامنا اور بادشاہ اور رؤسائے وقت کو باعث نقصان کا متصور ہے۔ چنانچہ ہمارے ایڈورڈ ہفتم کا انتقال ہو گیا۔

ماتم ایڈورڈ ہفتم: ۱۵ مئی ۱۹۱۰ء۔ بوجہ وفات بادشاہ ایڈورڈ ہفتم حسب منشائے گورنمنٹ بہ اظہار ماتم غم و الم کل حکام و رؤسا وغیرہ اپنے بائیں بازو پر ایک سیاہ کپڑا بالائے پوشاک باندھے رہتے ہیں۔ لہٰذا جب میں باہر نکلتا ہوں تو اپنے بائیں بازو پر پارچہ سیاہ لپیٹا کرتا ہوں کہ باعث اعتراض کا نہ ہو۔

۱۸ مئی ۱۹۱۰ء آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ملک معظم کی تدفین میں تیس فرماں روایان ملک شریک ہوں گے۔ غیر ملکی حکمرانوں نے نہایت بیش قیمت ہار بھیجے ہیں جن میں بعض کی قیمت ڈیڑھ سو گنی ہے۔ آغا خاں نے بھی نہایت بیش قیمت پھولوں کا ہار بھیجا ہے اس میں علاوہ گلاب کے ایک ہزار پھول چنبیلی کے ہیں۔

۲۴ مئی ۱۹۱۰ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ۱۹ مئی ۱۹۱۰ء کو اعلیٰ حضرت ملک معظم کی لاش بنظر دیدار ویسٹ منسٹر میں رکھی گئی تھی اور دیکھنے والے مجمع کی لمبائی تین میل تک تھی۔ گمان ہے کہ چار لاکھ آدمی تابوت کے قریب سے گزر چکے تھے اور ۲۰ مئی کو وہیں کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

سید علی امام: ۱۳ ستمبر ۱۹۱۰ء۔ آج کے تار برقی مندرجہ اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ سید علی امام بجائے مسٹر سنہا کونسل وائسرے میں مقرر ہوئے۔

لارڈ ہارڈنگ: ۲۵ نومبر ۱۹۱۰ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ لارڈ ہارڈنگ جدید وائسرے ۱۸ نومبر ۱۹۱۰ء کو داخل کلکتہ ہوئے۔ دیکھنا چاہیے کہ جدید لارڈ انتظام سلطنت کیسا کرتے ہیں۔ لارڈ منٹو کی خوش

انتظامی سے باشندگان ہندوستان بہت خوش رہے اور انھوں نے ہندوستانیوں کو معزز عہدے عطا کیے اور نیک نامی کیساتھ رخصت وطن ہوئے۔

<u>ولی عہد جرمنی</u>: یکم جنوری ۱۹۱۱ء۔ آج کل ولی عہد جرمنی ہندوستان کے مشہور شہروں کی سیاحت فرما رہے ہیں اور ہماری گورنمنٹ ان کا ہر قسم کا اعزاز و دعوت و تواضع فرما رہی ہے کہ وہ وکٹوریہ آنجہانی کے نواسے ہیں۔

<u>آغا خاں اور علی گڑھ</u>: ۵ مارچ ۱۹۱۱ء۔۔۔ اودھ اخبار مورخہ ۴ مارچ ۱۹۱۱ء سے واضح ہوا کہ سر آغا خاں بہادر قوم خوجہ آج کل تمامی ہندوستان سے بنا پر قائم کرنے یونیورسٹی علی گڑھ مسلمانوں سے چندہ وصول کر رہے ہیں اور بیس لاکھ سے زائد وصول کر چکے ہیں اور بالفعل لاہور (پنجاب) میں ہیں۔ وہ ۱۱ نومبر ۱۸۷۷ء کو بمقام کراچی پیدا ہوئے۔ اس حساب سے ان کی عمر ۳۳ سال کی ہے آدمی نہایت لائق خطاب یافتہ فرقہ خوجہ کے امام ہیں اور ہزاروں روپیہ ان کی آمدنی ہے۔ یقین ہے کہ ان کی کوشش موجودہ سے تیس لاکھ سے زائد چندہ وصول ہو جائے یہ پہلے شخص ہیں جو بعد سر سید احمد خاں بانی علی گڑھ کالج اپنی قوم کیلیے یونیورسٹی قائم کرنے کیلیے اس قدر کوشش کر رہے ہیں۔

<u>جشن تاج پوشی</u>: ۲۸ مارچ ۱۹۱۱ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ہمارے ملک معظم کا دربار تاج پوشی ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو بمقام دہلی ہوگا۔

<u>وفات حسین علی بلگرامی</u>: ۳ مئی ۱۹۱۱ء۔۔۔ شب گذشتہ کو سید علی بلگرامی مقیم ہردوئی نے بعارضہ رکنے حرکت قلب کے قضا کی۔ عمر ۶۵ سال تھی یہ بڑے نامی گرامی بلگرامی کے رؤسا میں تھے اور باہر ملازمت حیدرآباد دکن میں انھوں نے بہت کچھ کمایا۔ سنا جاتا ہے کہ پچاس ساٹھ لاکھ روپیہ ان کا بینک میں جمع ہے اور اسی ہزار روپیہ کا کتب خانہ حیدرآباد میں ہے۔ شراب خوار اکثر رکنے سے حرکت قلب کے مر جاتے ہیں۔ چونکہ متوفی بھی شراب خوار تھے لہٰذا دفعتاً اسی عارضہ میں فوت ہوئے۔ کئی لڑکے اور لڑکیاں اور ایک بیوی یادگار چھوڑیں۔ متوفی علاوہ زبان انگریزی، فارسی، عربی اور سنسکرت کے فرانسیسی اور جرمنی زبان کے بھی ماہر تھے۔ کوئی شک نہیں کہ ان کو بہت بڑی قابلیت حاصل تھی اور جلیل القدر حکام ان کو نگاہ وقعت سے دیکھتے تھے۔

<u>جشن تاج پوشی</u>: ۲۳ جون ۱۹۱۱ء۔ آج جارج پنجم ملک معظم انگلستان و ہندوستان کا جشن تاج پوشی بمقام لندن ہوا۔ اس وجہ سے ہندوستان کے ہر ایک شہر اور قصبہ میں جشن خوشی منایا گیا۔

<u>برقی پنکھا</u>: ۲۳ اگست ۱۹۱۱ء۔ شب گزشتہ کو برقی پنکھا مرسلہ سید التفات رسول صاحب تعلقدار ۸ بجے شب سے آج ۶ بجے صبح تک میری کوٹھی میں متصل میرے پلنگ کے چلتا رہا۔ ہوا کافی ملتی ہے۔ شب میں اسی ہوا میں سویا اور نہایت غرق نیند آئی اور ڈیڑھ آنے کا تمام رات میں روغن مٹی جلا۔ یہ

برقی پنکھا بہت عمدہ ہے جس کی قیمت چھیانوے روپے ہے۔ میرا قصد تھا کہ میں بھی ایک پنکھا لکھنؤ سے منگواؤں گا لیکن چونکہ اب سردی پڑنے کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں لہٰذا امسال اس کا منگانا ملتوی رکھا۔ انشاءاللہ تعالیٰ سال آئندہ بشرط حیات منگاؤں گا۔

جشن تاج پوشی جارج پنجم: ۲۴ نومبر ۱۹۱۱ء ... آج کل دہلی میں بڑے بڑے انتظامات ہو رہے ہیں۔ ۲۵ مربع میل میں خیمے وغیرہ نصب ہیں کہ ہمارے شہنشاہ جارج پنجم و ملکہ میری ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو رسم تاج پوشی بمقام دہلی ادا فرمائیں گے اور بہت سے والیان ملک شریک دربار رسم تاج پوشی ہوں گے۔ ہمارے ضلع ہردوئی سے راجہ صاحب کٹیاری و نواب عبدالکریم خاں صاحب تعلقہ دار شاہ آباد مطلوبہ گورنمنٹ شریک دربار ہوں گے یہ بہت بڑا جشن دہلی میں ہوگا کہ لاکھوں آدمی شریک ہوں گے۔ شاید کبھی ایسا ہوا ہو۔

۳ دسمبر ۱۹۱۱ء۔ "کل ۲ دسمبر کو ہمارے ملک معظم جارج پنجم مع ملکہ میری جہاز مدینہ پر داخل بمبئی ہوئے اور اور شاید کسی تاریخ آئندہ پر روانہ دہلی ہوں گے۔

۸ دسمبر ۱۹۱۱ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ جو خیمہ عالی شان دربار دہلی کی کیٹیوں کے واسطے نصب ہوا تھا۔ ۵ دسمبر کو آگ لگ جانے کی وجہ سے بالکل سوختہ ہو گیا ہے۔ ہزاروں روپیوں کی تیاری کا تھا۔ اگرچہ خیمہ مذکور اس قلیل مدت میں تیار ہو سکتا ہے لیکن جو چیزیں طلائی اور نقرئی یا اور آلات جو اس کی زیبائش کے لیے آراستہ کیے گئے تھے ان کا بہم پہنچنا مشکل ہے اور قبل اس کے چیف کمشنر صاحب لاہور کا بھی خیمہ مع اس کے کل شاگرد پیشوں کے آگ لگ جانے سے سوختہ ہو گیا تھا۔ اگرچہ یہ علامتیں اچھی نہیں ہیں مگر خدا مدد فرمائے کہ یہ جشن تاجپوشی جو ۱۲ دسمبر کو ہونے والا ہے بادشاہ و کل رعایائے برٹش کو مبارک ہو۔

۱۵ دسمبر ۱۹۱۱ء۔ ۱۲ دسمبر کو جب ملک معظم نے تخت نشینی بمقام دہلی اختیار فرمائی تو لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل نے حسب ذیل اسپیچ فرمائی۔

۱۔ دہلی بجائے کلکتہ کے دارالسلطنت قرار پائے۔ ۲۔ یہ عہد لارڈ کرزن صاحب جو تقسیم بنگالہ کی ہوئی تھی اور جس کی وجہ سے بنگالیوں میں ایک شورش پیدا تھی وہ منسوخ کی جاتی ہے۔ ۳۔ ۵۰ لاکھ روپیہ واسطے تعلیم کے دیا گیا ہے۔ ۴۔ ملازمان سول و فوجی جن کی تنخواہ پچاس روپے ماہوار ہے ان کی تنخواہ ۱۵ دن کی مضاعف کی جائے۔ آج کی تاریخ میں اعزاز تقسیم ہوئے جس میں تعداد کثیر انگریزوں اور والیان ملک وغیرہ کی ہے۔

باب دوم

ہندوستان کی ریاستیں اور تعلقے

لشکر کپورتھلہ: یکم نومبر ۱۸۶۷ء۔ لشکر کپورتھلہ آج سندیلہ ہوکر گزرا۔ چونکہ راجہ صاحب بذریعہ ریل واسطے ملاقات گورنر جنرل بہادر کے لکھنؤ تشریف لے گئے ہیں لہذا لشکر براہ خشکی پیدل منزل بہ منزل جاتا ہے۔

وفات والی جودھپور: ۱۲ فروری ۱۸۷۳ء۔ تحریر منشی باسط علی خسر پور منشی شمس الدین صاحب سے معلوم ہوا کہ ۱۲ ماہ حال کو راجہ تخت سنگھ والی جودھپور بعارضہ ورم جگر فوت ہوئے۔

وفات مہاراجہ بلرامپور: ۲۸ مئی ۱۸۸۲ء۔ ۲۷ مئی کو مہاراجہ دگبجے سنگھ والی ریاست بلرامپور و تلکشی پور بعارضہ استسقا بمقام الہ آباد فوت ہوئے۔ عمر ۵۹ سال تھی۔ مہاراجہ کو سرکار انگلشیہ سے بہت بڑا اعزاز ملا تھا اور گیارہ ضرب توپیں سلامی کی ان کی آمد و شد میں سر ہوتی تھیں۔ سنا گیا کہ ایک لاکھ روپے قبل وفات پجاریان الہ آباد وغیرہ کو دیا گیا۔

دستور پان۔ حیدرآباد: ۱۴ نومبر ۱۸۸۲ء۔ مولوی ضامن حسین صاحب حال سٹی مجسٹریٹ حیدرآباد میری ملاقات کو تشریف لائے اور عند التذکرہ بیان کیا کہ حیدرآباد میں یہ دستور ہے کہ جب کوئی کسی کی ملاقات کو آتا ہے تو جس وقت دوسرا پان صاحب خانہ ملاقاتی کو دیتا ہے تو اس سے رخصتی مفہوم ہوتی ہے اور اہل ملاقات پان کھا کر رخصت ہو جاتا ہے۔

۸ فروری ۱۸۸۳ء۔ سر سالار جنگ مختار الملک وزیر اعظم دکن حیدرآباد نے بعارضہ ہیضہ وبائی آج انتقال کیا۔ یہ بہت بڑے مدبر فرزانۂ روزگار تھے اور ان کے عہد وزارت میں ریاست حیدرآباد نے بہت ترقی حاصل کی۔

۶ فروری ۱۸۸۳ء۔ کل (میر محبوب علی خاں) نظام حیدرآباد گدی نشین ہوئے۔ لارڈ رپن صاحب گورنر جنرل ہند نے گدی نشین کیا۔

مولوی صدیق حسن۔ بھوپال: ۲ نومبر ۱۸۸۵ء۔ بملاحظہ اودھ اخبار ۱۸۸۵ء معلوم ہوا کہ ماہ حال کو بحکم گورنمنٹ مولوی صدیق حسن خاں صاحب شوہر رئیسہ بھوپال سے خطاب نوابی واپس لیا گیا اور کار ریاست سے بے تعلق ہوئے اور ۱۷ ضرب توپ سلامی کی موقوف ہوئی جس کا سبب یہ معلوم ہوا کہ مولوی صاحب

موصوف رعایا پر ظلم و جور بہت کرتے تھے جسکی شکایت سر لیپل گریفن صاحب ایجنٹ راجپوتانہ نے گورنمنٹ سے کی تھی۔

نزاع۔ بلرام پور: ۷ مارچ ۱۸۸۶ء۔ آج اجلاس جوڈیشل کمشنر لکھنؤ سے بابت نزاع ریاست بلرام پور یہ فیصلہ ہوا کہ مہارانی خورد و کلاں بعد منہائی مصارف انتظامی وغیرہ نصف نصف منافع تقسیم کرلیا کریں۔ چونکہ یہ حکم خلاف مہارانی کلاں کے ہے لہٰذا اس کا اپیل ولایت میں ہوگا۔ بالفعل منشی شمس الدین صاحب نائب ریاست بلرام پور میں اور اس مقدمہ کی پیروی کر رہے ہیں۔

وفات مہاراجہ اندور: ۱۷ جون ۱۸۸۶ء۔ آج مہاراجہ ہلکر نے ۱۱ بجے دن کو انتقال کیا۔

وفات مہاراجہ گوالیار: ۲۲ جون ۱۸۸۶ء۔ ۲۰ جون شام کو مہاراجہ جیاجی راؤ گوالیار نے بعمر ۵۵ سال قضا کی۔

وفات نواب رام پور: ۲۶ مارچ ۱۸۸۷ء۔ نواب کلب علی خاں صاحب والی ریاست رام پور بعوارض چند در چند ۲۳ مارچ یوم چہارشنبہ کو فوت ہوئے۔ نواب صاحب مرحوم نے ایک لاکھ روپیہ واسطے مرمت جامع مسجد دہلی کے عطا کیا تھا۔

ایک شادی۔ حیدرآباد: ۲ نومبر ۱۸۸۸ء۔ معائنہ اودھ اخبار لکھنؤ سے واضح ہوا کہ سر سالار جنگ مرحوم وزیر اعظم حیدرآباد دکن کی پوتی کی شادی ایک امیر زادہ سے ہوئی۔ عمر دولہا تین سال اور دلھن کی ایک ماہ ستائیس دن کی ہے۔ ایسی شادی نادر الوقوع ہے جو قبل اس کے کبھی سماعت میں نہیں آئی اور اسی وجہ سے اس مقام پر اس کا اندراج ہوا۔

ملازمت بھوپال: ۱۲ دسمبر ۱۸۸۸ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار محررہ امروزہ کے واضح ہوا کہ حسب تحریک رئیسہ بھوپال بہ منظوری گورنمنٹ آف انڈیا منشی امتیاز علی صاحب وکیل لکھنؤ منصب وزارت ریاست مذکور کے واسطے منتخب ہوئے۔ یقین ہے ان کی ذات سے بہت سے لوگ فائز المرام ہوں۔

نیوتہ بھوپال: ۲۹ فروری ۱۸۸۹ء۔ آج چودھری نصرت علی صاحب اسسٹنٹ سکریٹری انجمن تعلقداران اودھ و آنریری مجسٹریٹ لکھنؤ سے ملاقات ہوئی۔ کمال تپاک سے پیش آئے اور مجھے وہ تحریریں معائنہ کرائیں جو ان کے نام شاہجہاں بیگم صاحبہ والی ریاست بھوپال اور نواب صدیق حسن خاں صاحب شوہر رئیسہ نے بجواب شقہ طلب شادی چودھری عزت علی خلف چودھری صاحب موصوف بھیجی ہیں اور رئیسہ نے ایک ہزار روپیہ کا کرنسی نوٹ بطریق نیوتہ و ساری جوڑے کے بمعیت اپنے معتمد خاص کے بھیجا ہے۔ تحریروں سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ ہر دو صاحبان کی نظر الطاف چودھری صاحب پر زائد ہے اور ان کو امیدوار ملازمت بعہدہ نائب وزارت مال کے کیا ہے جس کا اشارہ تحریر نواب صاحب میں درج تھا۔ تعداد مشاہرہ بالفعل چار سو پچاس قرار پائی ہے اور آئندہ کو امید ترقی کی ہے لیکن

منشا چودھری صاحب بباعث غیر استقلالی و تلوّن ریاست کے معلوم نہیں ہوتا۔

وفات نواب رام پور: یکم مارچ ۱۸۸۹ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار مطبوعہ امروزہ سے معلوم ہوا کہ نواب صاحب مشتاق علی خاں صاحب والی ریاست رام پور نے بعارضہ سرسام بعمر ۳۴ سال واقعہ ۲۵ فروری سن حال روز دوشنبہ ۲ بجے دن کے انتقال کیا دو لڑکے خورد سال چھوڑے۔ حامد علی خاں ولی عہد کی عمر ۱۴ سال کی ہے۔ صاحب ایجنٹ روہیلکھنڈ نے ولی عہد صاحب کو بتاریخ ۲۷ فروری مسند نشین ریاست کا کیا اور اختیارات ریاست اس وقت عطا ہوں گے جب وہ علوم متعارفہ کو حاصل کر کے لیاقت پیدا کریں گے اس وقت تک امور انتظامی بذریعہ کونسل تصفیہ پاتے رہیں گے جس کے وائس پریسیڈنٹ جنرل اعظم الدین خاں صاحب ہمرمال ہیں و جوڈیشل نواب اکرام اللہ خاں صاحب یار جنگ و منشی علی حسن خاں صاحب ہمرمال ہیں۔ نواب مشتاق علی خاں صاحب مرحوم ابتدائے عمر سے بعارضہ فالج مبتلا تھے۔

وفات راجہ بوندی: ۵ اپریل ۱۸۸۹ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار ۵ اپریل سے معلوم ہوا کہ ۲۸ مارچ سن رواں کو مہاراو راجہ رام سنگھ والی ریاست بوندی بعمر ۸۷ سال فوت ہوئے۔ ان کی رعایا ان سے بہت رضامند تھی۔ بجائے راجہ صاحب متوفی ان کے بیٹے رگھوبر سنگھ گدی نشین ہوئے۔

وفات مہاراجہ بنارس: ۱۷ جون ۱۸۸۹ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار محررہ امروزہ سے واضح ہوا کہ بتاریخ ۱۲ جون سنہ الیہ مہاراجہ سر ایشری پرشاد نرائن سنگھ بہادر جی سی ایس آئی بنارس نے بعمر ۷۰ سال بعارضہ اسہال قضا کی۔ یہ ہر دل عزیز مہاراجہ تھے۔

وفات معتمد حیدرآباد: ۲۸ جنوری ۱۸۸۹ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار محررہ امروزہ سے معلوم ہوا کہ واقعہ ۲۶ جنوری سنہ الیہ کو نواب سعادت علی خاں صاحب نیّر الملک (کذا) معتمد ریاست حیدرآباد دکن خلف اصغر نواب سر سالار جنگ اوّل مرحوم بعوارض چند در چند رہ گزارے عالم بقا ہوئے۔ عمر ۴۴ سال تھی۔ ایک لڑکی پنج سالہ یادگار چھوڑی۔

وفات نواب صدیق حسن خاں بھوپال: ۲۶ فروری ۱۸۸۹ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار محررہ امروزہ سے معلوم ہوا کہ نواب صدیق حسن خاں صاحب شوہر شاہجہاں بیگم رئیسہ بھوپال واقعہ ۱۹ فروری سن رواں بعارضہ استسقا فوت ہوئے اور ۲۰ کو دفن ہوئے۔ نواب صاحب ساکن قنوج ادنیٰ درجے کے آدمی تھے لیکن اقبال نے کچھ ایسی ترقی کی کہ دفعتاً شوہر رئیسہ ہو کر مرتبۂ اعلیٰ پر پہنچے اور خطاب نوابی گورنمنٹ انگلشیہ سے حاصل ہوا اور

گیارہ ضرب توپ سلامی کے مقرر ہوئے لیکن تھوڑے عرصہ میں یہ ثبوت مخالفت گورنمنٹ نے خطاب وغیرہ واپس لے لیا اور عہدۂ مدار المہامی ریاست سے معزول کیا جس کا سخت صدمہ نواب صاحب کو ہوا اور کوئی کوشش حصول اعزاز کارگر نہ ہوئی۔ بالآخر اسی کوفت میں انتقال کیا۔ اگرچہ ذی علم تھے لیکن مادہ انتظامی دماغ میں نہ تھا تلوّن کی شکایت تھی اور مخبری پر دار و مدار جس سے سارے اہل کاران ریاست ہمیشہ اندیشہ ناک رہتے تھے۔ نواب صاحب کی ذات سے زینیہ کی بیٹی اور داماد کے درمیان عداوت قلبی تھی یقین ہے کہ اس حادثہ سے اہل کاران ریاست کم ملول ہوں۔

وفات سالارجنگ ثانی۔ حیدرآباد: ۱۲ر جولائی ۱۸۸۹ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار محررہ ۱۱ جولائی سنہ الیہ واضح ہوا کہ لائق علی خاں سر سالارجنگ ثانی سابق وزیر اعظم حیدرآباد دکن نے بعمر ۲۶ سال واقع ۷ر جولائی ۱۸۸۹ء کو بعارضہ فالج انتقال کیا۔ ایک بیٹا چند مہینہ کا یادگار چھوڑا۔

قتل جنرل رامپور: ۱۳ر اپریل ۱۸۹۱ء۔ آج دس بجے رات کو جنرل عظیم الدین خاں پریسیڈنٹ کونسل ریاست رامپور کو جب وہ بگھی پر جا رہے تھے کسی نے بندوق مار کر ہلاک کیا۔ سنا گیا کہ جنرل صاحب ظالم مزاج و سخت گیر تھے اور ان کا برتاؤ اہالی رام پور علی الخصوص متوسلین ریاست سے اچھا نہ تھا اور عموماً لوگ ان کے دشمن تھے۔

موسم کشمیر: ۲۵ر جولائی ۱۸۹۲ء۔ آج پنڈت منوہر ناتھ خلف پنڈت بشمبر ناتھ سابق سب جج اضلاع اودھ بہ ہمراہی راجہ کنور نریندر بہادر صاحب تعلقدار میری ملاقات کو تشریف لائے اور اپنی مہذبانہ بات چیت سے مجھے خوش کیا۔ بالفعل پنڈت صاحب سٹی مجسٹریٹ شہر سری نگر کشمیر کے ہیں اور تین سو ماہوار تنخواہ پاتے ہیں۔ میری ان کی اس وقت سے ملاقات ہے جب کہ ان کے والدین ابتدائے ۱۸۷۳ء لغایت ۱۸۷۶ء تحصیلدار سندیلہ تھے۔ پنڈت صاحب کا بیان ہے کہ اس موسم میں جب کہ یہاں زمانہ بارش کا ہوتا ہے تو کشمیر کا موسم نہایت خوشگوار و پسندیدہ ہوتا ہے اور دور دور کے لوگ وہاں تفریحاً اسی زمانہ میں جاتے ہیں۔

نظام دکن۔ حیدرآباد: ۲۴ر اکتوبر ۱۸۹۲ء۔ نواب میر محبوب علی خاں صاحب بہادر جی سی ایس آئی نظام دکن ۱۸۶۷ء کو پیدا ہوئے تھے جن کی عمر ۲۸ر اکتوبر کو ۲۶ سال کی ہوگی اور بعد انتقال افضل الدولہ اپنے والد ماجد کے ۲۷ر فروری ۱۸۶۹ء کو قائم مقام ہوئے تھے اور ۵ر فروری ۱۸۸۴ء کو لارڈ رپن صاحب گورنر جنرل بہادر کشور ہند نے ان کو تخت نشین کیا تھا لہٰذا اب ۲۴ سال سے حکومت کر رہے ہیں۔

مقدمہ توہین۔ حیدرآباد: ۲۶ر مارچ ۱۸۹۳ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار مطبوعہ امروزہ سے معلوم ہوا کہ جو مقدمہ توہین کا نواب صاحب مہدی حسن فتح نواز جنگ سابق ہوم سکریٹری ریاست حیدرآباد دکن ساکن

ضلع نواب گنج اودھ نے دربارۂ اشاعت پمفلٹ فضیحتی نسبت بدچلنی وبداطواری مسماۃ گرٹرڈ انڈلے زوجہ مہدی حسن) کے مسٹر متر ابنگالی پر دائر کیا تھا اور جس کی تحقیقات مسٹر ویس کو بیمڈ اسسٹنٹ رزیڈنٹ حیدرآباد مدت ایک سال سے کر رہے تھے اسے ختم کر کے ۱۹ را پریل ۹۳ء کو اپنی تجویز مجمع عام میں سنائی کہ متر ملزم اس بنیاد پر بری ہوا کہ اثبات جرم کے یہ ثابت کرنے میں ناکامی ہوئی کہ متر انے پمفلٹ شائع کیا تھا اور واجبیت کے بابت مجسٹریٹ صاحب نے فیصلہ قلمبند کرنے سے انکار کیا ہر چند کہ فریقین کی استدعا تھی ۔

مقدمہ ہذا میں بہت بڑی طوالت و فضیحتی ہوئی جو ہندوستان کی تواریخ میں قابل یادگار ہوگی۔ آغا مرزا ملقب بہ سرور جنگ برادرزادہ مرزا عباس بیگ صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ اضلاع سیتاپور وہردوئی ساکن دہلی حال سکریٹری صیغہ متفرقات ریاست نظام بانی مقدمہ ہذا تھے اور انھیں کی مدد سے یہ مقدمہ اس قدر زمانہ تک چلا جس میں لاکھوں روپیہ صرف ہوا۔ ان کے معین سر خورشید جاہ یکے از دولت مندا خوان ریاست ہیں اور مہدی حسن کے مددگار سر آسماں جاہ وزیر ریاست۔ پس انھیں دو صاحبوں کا روپیہ صرف ہوا ورنہ سرور جنگ و فتح نواز جنگ کچھ بالذات ایسی مقدرت نہ رکھتے تھے کہ چند ہزار روپیہ بھی اپنی جیب خاص سے صرف کر سکتے۔ آج کل سرور جنگ کا بڑا زمانہ ہے ملنظام حیدرآباد دکن کی ناک کے بال ہو رہے ہیں اور مابین نظام و صاحب رزیڈنٹ کے متوسط ہیں۔

<u>اعزاز مہارانی بلرام پور:</u> ۳ر مئی ۱۸۹۳ء۔ مہارانی کلاں ریاست بلرام پور بیوہ مہاراجہ سرڈگ بجے سنگھ کو نوضرب توپ سلامی کا اعزاز حاصل ہوا جس کا نفاذ ۱۳ر اپریل سنہ الیہ کو ہوا۔

<u>محسن الملک: حیدرآباد:</u> یکم اگست ۱۸۹۳ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار مطبوعہ امروزہ کے واضح ہوا کہ مولوی مہدی علی خاں صاحب۔ ملقب بہ نواب محسن الملک جو ہوم ڈیپارٹمنٹ ریاست حیدرآباد کے نامور وزیر تھے اور جن کی لیاقت و عالی دماغی کی بہت تعریف تھی اور ریاست موصوفہ کے سچے خیر خواہ تھے مسٹر پلوڈن صاحب ریذیڈنٹ حیدرآباد کی پولیٹکل کارروائیوں سے علٰحدہ ہوئے اور یکم محرم ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۰ر جولائی سنہ الیہ کو ریاست موصوفہ سے اپنے وطن مالوفہ شہر اٹاوہ کو روانہ ہوئے جن کی مفارقت میں ہزارہا پارسی دکھنی و ہندوستانی بوقت رخصت اسٹیشن ریلوے پر چشم پرنم وگریہ کناں تھے سچ یہ ہے کہ یہ زمانہ خیر خواہ لوگوں کا دشمن ہے یہ مسلم امر ہے کہ جب کسی ریاست میں زوال آنے والا ہوتا ہے تو وہاں کے خیر طلب لوگ اول اسی طور سے علٰحدہ ہو جاتے ہیں۔

<u>خان قلات:</u> ۴ر اگست ۱۸۹۳ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار کے واضح ہوا کہ خداداد خاں خان قلات (بلوچستان) بباعث قتل کرنے اپنے وزیر و وزیرزادہ کے معزول ہوئے اور بجائے ان کے محمود خاں ان کے

بڑے بیٹے حسب منظوری گورنمنٹ ہند والی قلات مشتہر ہوئے۔

رامپور: ۳ مئی ۱۸۹۳ء۔ معائنہ اودھ اخبار امروزہ سے واضح ہوا کہ سعد اللہ خاں و مصطفیٰ خاں ولدان عبد اللہ خاں قاتلان جنرل اعظم الدین خاں ممبر اعلا ریاست رامپور کو بہ ثبوت جرم حکم سزا پھانسی و سزا دوام بہ عبور دریائے شور اجلاس سشن ریاست موصوفہ سے صادر ہوا جس کی تعمیل عنقریب ہوگی مصطفےٰ خاں عرصہ تک تحصیل داری ضلع کان پور میں مامور رہے تھے۔

مسند نشینی: ۴ اپریل ۱۸۹۴ء۔ آج صبح کو سر چارلس کراس ویٹ صاحب بہادر لفٹیننٹ گورنر اضلاع مغربی و شمالی و چیف کمشنر اودھ نے نواب حامد علی خاں صاحب والی ریاست رام پور کو حسب ضابطہ مسند نشین کیا اور ایک ہزار اشرفی نواب صاحب نے بطور نذر کے پیش کی۔

گدی نشینی: گوالیار: ۱۵ دسمبر ۱۸۹۴ء۔ آج ۵ بجے شام کو مہاراجہ گوالیار گدی نشین ریاست ہوئے اور بہت جشن تمامی ریاست میں ہوا۔

جلاوطنی مہاراجہ جھالراوار: ۳ اپریل ۱۸۹۶ء۔ آج معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ ۱۷ مارچ کو مہاراجہ ظالم سنگھ والی ریاست جھالراوار بحکم گورنمنٹ آف انڈیا اجلاسی ایلگن صاحب وائسرائے، شہر بنارس کو جلاوطن کیے گئے الزام یہ قرار پایا کہ اپنی رعایا کے ساتھ حسن انتظام کی قابلیت نہیں رکھتے ہیں۔

وفات وزیر اعظم بھوپال: ۱۷ نومبر ۱۸۹۶ء۔ آج بذریعہ تار بھوپال سے واضح ہوا کہ کل ۱ بجے شام بروز دوشنبہ منشی امتیاز علی صاحب ساکن کاکوری وزیر اعظم بھوپال نے بعارضہ ضعف و استسقا قضا کی اور آج دس بجے دن کو وہیں بھوپال میں متصل مقبرہ نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم دفن ہوئے۔ عمر ۶۵ سال کی تھی۔ منشی صاحب نہایت خوش تقدیر آدمی تھے۔ اول پیشہ وکالت لکھنؤ سے بہت کچھ شہرت پیدا کی۔ بعدۂ وزیر اعظم بھوپال بمشاہرہ ساڑھے تین ہزار ماہوار مقرر ہوئے اور بہت بڑا اعزاز و ناموری حاصل کی۔ ہماری اہل برادری سے ایسا کوئی شخص ممتاز نہیں ہوا۔ ایک کل برف کی بصرف ایک لاکھ روپیہ لکھنؤ میں جاری کی اور تین لاکھ روپیہ کا علاقہ ضلع اعظم گڑھ میں خرید کیا۔ آدمی نہایت لائق و مخیر تھے۔ بہت سے اہل کاکوری اس وقت ریاست موصوفہ میں بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز ہیں۔ چھ لڑکیاں اور ایک لڑکا یادگار چھوڑا۔

۱۸ نومبر ۱۸۹۶ء۔ آج کل نواب اسحاق خاں صاحب وزیر رام پور و چودھری نصرت علی صاحب رئیس سندیلہ و اسسٹنٹ سکریٹری انجمن ہند لکھنؤ بغرض حصول وزارت ریاست بھوپال کوشش کر رہے ہیں دیکھا چاہیے کہ کون کامیاب ہوتا ہے۔

برطرفی سرور جنگ حیدرآباد: ۹ر فروری ۱۸۹۷ء ۲ فروری سنہ الیہ کو آغا مرزا بہ لقب نواب سرور جنگ پیشی سکریٹری نظام حیدرآباد اپنے عہدہ سے علیحدہ کیے گئے اور بلدہ سے خارج۔ چار سال تک ان کا زمانہ بہت موافق رہا اور لاکھوں روپیہ کمایا اور سرآسماں جاہ وزیر اعظم و نواب محسن الملک مہدی علی خاں و نواب مہدی حسن انھیں کی کارروائیوں سے موقوف ہوئے تھے۔

وفات شاہ جہاں بیگم: جھوپال: ۱۹ر جون ۱۹۰۱ء خط برخوردار مجتبیٰ علی مطابق ۲۹ر صفر موصولہ بھوپال سے واضح ہوا کہ تاریخ ۱۶ر جون ۱۹۰۱ء یوم یکشنبہ ساڑھے ۱۱ بجے دن کے سرکار عالیہ شاہ جہاں بیگم صاحبہ والی ریاست بھوپال نے بعمر ۶۵ سال مرض آکلہ میں رحلت کی جس کی شکایت میں وہ ایک سال سے مبتلا تھیں۔ رئیسہ کے مزاج میں خیر خیرات بہت تھی اور پکی مسلمان تھیں۔ انھوں نے اپنا عقد ثانی مولوی صدیق حسن قنوجی سے کیا تھا جو شوہر ہونے کے بعد خطاب نواب سے ممتاز ہوئے جو گورنمنٹ نے دیا تھا۔ دس بارہ سال کا زمانہ ہوا کہ مولوی صاحب موصوف نے رحلت کی۔ مرحومہ بعد نماز مغرب باغ نشاط افزا میں دفن ہوئیں پچیس ہزار سے زائد لوگ شریک نماز تھے۔ بعد وفات رئیسہ مرحومہ ان کی ولی عہد بیٹی سلطان جہاں بیگم صاحبہ داخل تاج محل ہوئیں۔ چونکہ رئیسہ مرحومہ سولہ سال سے ان سے ناراض تھیں اس وجہ سے صرف ایک مرتبہ بیٹی صاحبہ چند منٹ کے لیے اپنی والدہ کی عیادت کو آئی تھیں اور اب بعد وفات آئیں۔

سلطان جہاں بیگم: ۲۸ر جون ۱۹۰۱ء۔ آج برخوردار مجتبیٰ علی مع ہمشیرہ منجھلی نو دوارد سندیلہ ہوئے جن کی زبانی معلوم ہوا کہ ۳ر جولائی مطابق ۷ر ربیع الاول سن رواں کو جناب سلطان جہاں بیگم رئیسہ بھوپال تخت نشیں ہوں گی لیکن انھوں نے انتظام ریاست ابھی سے شروع کر دیا ہے اور ہر ایک کارخانہ میں تخفیف کا لگاؤ لگا دیا ہے چنانچہ تعمیرات میں ۲۵ ہزار روپیہ ماہوار کا صرفہ تھا جو گھٹا کر صرف دو ہزار روپیہ کر دیا گیا اور جس قدر بیگمات لکھنؤ وغیرہ کی محل سرا میں تھیں ان سب کو نکال دیا اور منشی احتشام علی خلف امتیاز علی صاحب مرحوم سابق وزیر اعظم کو جو تنخواہ پانچ سو روپیہ ماہوار ملتی تھی وہ موقوف کر دی گئی۔ غرض کہ ریاست میں ہر قسم کا عزل و نصب ہو رہا ہے اور سلطان جہاں بیگم اپنے شوہر احمد علی خاں بہ لقب سلطان دولھا کی رائے پر کام کرتی ہیں۔

حالات شاہ جہاں بیگم: ۲۸ر جون ۱۹۰۱ء۔ حالات مختصر جناب نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ مرحومہ رئیسہ بھوپال۔ آپ ۶ جمادی الاول ۱۲۵۴ھ میں قلعہ اسلام نگر میں پیدا ہوئیں اور ۲۸ر ذیقعدہ ۱۲۶۰ھ کو بیگم صاحبہ کے والد جہانگیر محمد خاں صاحب نے بعارضہ ضعف معدہ انتقال کیا۔ اور ۱۲ ذیقعدہ ۱۲۷۰ھ کو بخشی باقی

محمد خاں بہ لقب امراؤ دولھا صاحب سے آپ کی شادی ہوئی اور ۲۰ ذیقعدہ ۱۲۷۴ھ کو نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ پیدا ہوئیں۔ ۲۱ صفر ۱۲۸۴ھ کو امراؤ دولھا صاحب شوہر بیگم صاحبہ نے انتقال کیا اور ۳۰ رجب ۱۲۸۵ھ کو نواب سکندر بیگم صاحبہ والدہ ماجدہ نواب بیگم صاحبہ نے انتقال کیا۔ نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ یکم شعبان ۱۲۸۵ھ کو مسند نشین ہوئیں۔ اور موصوف الیہا نے ۱۲۸۸ھ میں مولوی صدیق حسن صاحب قنوجی سے عقد ثانی کیا۔ شاہ جہاں آباد (ایک محلّہ کا نام۔ ہاشمی) کی آبادی میں قریباً ایک لاکھ روپیہ صرف کیا جس کو آپ نے خود آباد کیا اور ۱۶ جون ۱۹۰۱ء مطابق ۲۹ صفر ۱۳۱۵ھ یوم یکشنبہ کو انتقال کیا اور ۳ جولائی ۱۹۰۱ء مطابق ۱۷ ربیع الاوّل ۱۳۱۹ھ یوم پنج شنبہ کو نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ دختر بلند اختر شاہ جہاں بیگم صاحبہ مرحومہ نے تخت شاہی پر جلوس فرمایا اور ان کے خلف اکبر نصر اللہ خاں صاحب ولی عہد ریاست مقرر ہوئے۔ اس وقت عمر رئیسہ حال کی ۴۵ سال ہے اور ان کے دو فرزند اور ایک شوہر نواب سلطان دولھا اس وقت موجود ہیں اور انہی کی رائے پر کام ریاست چل رہا ہے۔

حالات جودھپور: ۲۹ جون ۱۹۰۱ء۔ آج خط عزیز از جان سید اعجاز الحسن مورخہ ۱۴ جون سن رواں کے جو جودھپور سے موصول ہوا وہ لکھتے ہیں کہ اس ریاست کے سکرٹری پنڈت دینا ناتھ جی صاحب ہیں جن کی تنخواہ پانچ سو روپے ماہوار اور پانچ ہزار کی ان کی جاگیر ہے۔ پنڈت سکھا دیو پرشاد صاحب منجھلے بھائی سکرٹری صاحب جوڈیشل سکرٹری ہیں اور انگریزی میں بی اے پاس ہیں اور خطاب راؤ بہادر گورنمنٹ کی طرف سے ان کو ملا ہے۔ تنخواہ ان کی بارہ سو روپیہ ماہوار ہے اور پنڈت شیو پرشاد صاحب سکرٹری کے چھوٹے بھائی کی تنخواہ دو سو روپیہ ماہوار ہے اور سر مہاراجہ پرتاب سنگھ وزیر اعظم اور مہاراجہ سری دربار کی مشورت سے کام ریاست جودھپور کا سرانجام پاتا ہے۔ اب چونکہ دونوں صاحب ریاست میں تشریف نہیں رکھتے ہیں اس وجہ سے سکرٹری صاحب بہ استصواب رائے جناب صاحب ریذیڈنٹ بہادر امورات اہم ریاست کے انجام دیتے ہیں اور عدالتی کارروائی کونسل سے ہوتی ہے اور انتظامی مصارف بھی صاحب موصوف کے حکم سے ہوتے ہیں مگر سب امور سکرٹری صاحب ہی کی رائے سے طے ہوتے ہیں۔

وفات مہاراجہ دھول پور: ۲۵ جولائی ۱۹۰۱ء۔ مہاراجہ نہال چند والی ریاست دھول پور نے بمقام شملہ ۲۰ جولائی ۱۹۰۱ء کو انتقال کیا جن کی عمر ۴۰ سال کی تھی اور ان کی محبتی (کذا) مہارانی نے بھی اسی وقت اسی مقام پر رحلت کی اور دونوں کی لاشیں ایک ساتھ واسطے جلانے کے بھیجی گئیں۔ مہاراجہ ۱۸۷۳ء

میں بعمر ۱۱ سال گدی نشین ہوئے تھے۔

وفات نواب احمد علی خاں، بھوپال: ۶ر جنوری ۱۹۰۲ء۔ بمعائنہ اخبار انگریزی پائنیر "الہ آباد کے معلوم ہوا کہ نواب احمد علی خاں صاحب شوہر نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ رئیسہ بھوپال نے بتاریخ ۴ر جنوری ۱۹۰۲ء یوم شنبہ ۳ بجے صبح کے دفعتاً انتقال کیا۔ ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ قلب پر فالج گرا۔ نواب صاحب مرحوم کی عمر ۴۴ سال کے اندر تھی۔ اپنے صاحبزادگان نصر اللہ خاں و عبید اللہ خاں کی تقریب شادی میں مصروف تھے جو ۷ر شوال آئندہ کو ہونے والی تھی۔ سنا جاتا ہے کہ مرحوم سخت منتظم تھے۔ انھوں نے ہزارہا آدمی ڈیوڑھی خاص سرکار عالیہ شاہجہاں بیگم صاحبہ مرحومہ کو موقوف کر دیا اور اب تخفیف عمال کے کاغذات پیشی میں تھے جن کے واسطے عنقریب حکم تخفیف کا صادر ہونے والا تھا لیکن قبل اس کے کہ کاغذات ملاحظہ ہو کر کوئی حکم اس پر صادر ہو دفعتاً پیک اجل نے اپنے پنجے میں ایسا لیا کہ پھر دم زدن کا موقع نہ ملا اور عموماً کل باشندگان اور خصوصاً ملازمت پیشہ کو مرحوم کے انتقال سے نہایت درجہ خوشی ہوئی۔ البتہ نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ کو سخت صدمہ ہوا جو اپنے شوہر کی نہایت درجہ مطیع و فرماں بردار تھیں۔

وفات راجہ نان پارہ: ۳ر مئی ۱۹۰۲ء یکم مئی ۱۹۰۲ء کو سر راجہ جنگ بہادر تعلقہ دار نانپارہ نے بعوارض چند در چند بمقام بہرائچ قضا کی۔ عمر ساٹھ سال تھی۔ آدمی نہایت مخیر اور متمول تھے اور نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ گیارھویں شریف حضرت پیران پیر چار روز انجام دیتے تھے اور جو لوگ بغرض شرکت وہاں جاتے تھے انکو حسب حیثیت زر نقد دیا کرتے تھے مزاج میں انکسار بہت تھا اور مثل ادنی آدمیوں کے اپنا طرز عمل رکھتے تھے۔

گدی نشینی مہاراجہ میسور: ۱۶ر اگست ۱۹۰۲ء۔ ۸ر اگست ۱۹۰۲ء لارڈ کرزن صاحب بہادر وائسرائے ہند نے مہاراجہ میسور کو گدی نشین کیا جن کا نام مہاراجہ کرشنا دوریا بہادر ہے جن کی عمر ۱۸ سال کی ہے۔

مہاراجہ کشن پرشاد۔ حیدرآباد: ۲۲ر نومبر ۱۹۰۲ء۔ ۱۶ر شعبان ۱۳۲۰ھ کو مہاراجہ کشن پرشاد صاحب مستقل وزیر اعظم ریاست حیدرآباد دکن مقرر ہوئے۔

معزولی مہاراجہ ریاست پنا: ۵ر دسمبر ۱۹۰۲ء۔ مہاراجہ مادھو سنگھ معزول از ریاست پنا جنھوں نے اپنے چچا کو زہر دلوا کر ہلاک کیا تھا ریاست مذکور سے جلا وطن کیے گئے اور شہر بلاری متعلقہ احاطہ مدراس میں ان کا قیام کرایا گیا اور ایک ہزار دو سو ماہوار ان کی تنخواہ تجویز کر دی گئی۔

مہاراجہ کشن پرشاد حیدرآباد: ۶ر دسمبر ۱۹۰۲ء۔ نظام حیدرآباد نے ۹ر نومبر کو ایک دربار منعقد

کیا جس میں صاحب ریذیڈنٹ بہادر بھی شریک تھے اور مہاراجہ کشن پرشاد صاحب کو خلعت وزارت عطا فرمایا جو قیمتاً ایک لاکھ روپیہ کا تھا۔

صوبہ برار: ۱۸ر دسمبر ۱۹۰۲ء۔ گورنمنٹ انگریزی نے نظام حیدر آباد کو مجبور کرکے اقرار نامہ پر دستخط کرالیے جس کا منشا یہ ہے کہ ۲۵ لاکھ روپیہ سالانہ بعوض صوبہ برار دواماً نظام حیدر آباد کو دیتی رہے گی۔ سنا جاتا ہے کہ فی الحال صوبہ مذکور کی آمدنی ایک کروڑ روپیہ سال کی ہے۔ سنا گیا کہ نظام کو اس قدر موقع نہیں ملا کہ اس بارۂ خاص میں اپنے وزراء سے پورے طور پر صلاح کریں۔

مہاراجہ ہلکر اندور: یکم فروری ۱۹۰۳ء۔ کل مہاراجہ ہلکر نے تخت سے کنارہ کشی کی۔ شاید لارڈ کرزن وائسرائے سے کچھ ناچاقی ہو گئی تھی۔ مہاراجہ موصوف ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۸۸۶ء میں ریاست کی گدی پر متمکن ہوئے تھے۔ بعد کنارہ کشی اپنے اکلوتے بیٹے بالا صاحب کو تخت نشین کیا جس کی اب عمر بارہ برس کی ہے اور مہاراجہ صاحب کو منجانب ریاست چار لاکھ سالانہ کا گزارہ تجویز ہوا اور انھوں نے اپنی ریاست کا ایک مقام "بروہار" واسطے سکونت کے تجویز کیا جو دریائے نربدا کے کنارے واقع ہے اور اسی وقت اندور سے روانہ ہو گئے۔

غوثیہ بیگم حیدر آباد: ۸ر اپریل ۱۹۰۲ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ مہاراجہ سر کشن پرشاد صاحب وزیر اعظم حیدر آباد پر نواب سید سراج الحسن امیر یار جنگ بہادر نے بذریعہ قاضی کبیر الدین بیرسٹر ایٹ لا بمبئی و ہیرا جی وکیل حسب منشا دفعہ ۳۶۱، ۳۶۳، ۴۹۲، ۴۹۶، ۱۰۹ تعزیرات ہند باجلاس کنٹونمنٹ مجسٹریٹ مقدمہ دائر کیا ہے کہ ان کی پوتی مسماۃ غوثیہ بیگم نابالغہ دختر سید نور الدین متوفی کو بلا اجازت نالشی عقد کرکے اپنے محل میں داخل کر لیا ہے۔ چونکہ یہ جرم انگریزی عملداری میں وقوع پذیر ہوا ہے لہذا مدعا علیہ پر سمن جاری ہونا چاہیے اور یہ نالش سکندر آباد کے مجسٹریٹ کے اجلاس میں رجوع ہوئی ہے اور بیرسٹر نے یہ بھی بیان کیا کہ حسب دفعہ ۱۸۱ ضمن ۴ ضابطہ فوجداری سے عدالت میں یہ مقدمہ دائر ہونا چاہیے۔

۹ر مئی ۱۹۰۳ء۔ مسماۃ فیض النسا بیگم زوجہ مسٹر سید نور الدین متوفی نے اخبار "مشیر دکن" کو چٹھی بھیجی کہ عدالت کنٹونمنٹ مجسٹریٹ سکندر آباد میں سید سراج الحسن نے مہاراجہ کشن پرشاد صاحب وزیر اعظم پر جو نالش دائر کی تھی وہ خارج ہوئی اور بوجہ پردہ نشینی اس کی اطلاع مجھے دیر کو ہوئی لہذا اب میں سچے واقعات ظاہر کرتی ہوں کہ میری دختر غوثیہ بیگم پر جو الزام عداوتاً لگائے گئے ہیں ان کی تردید کروں۔ غوثیہ بیگم مسٹر سید نور الدین کی اور میری دختر ہے جو صغر سنی سے اپنے والد متوفی اور میری نگرانی و حفاظت میں پرورش پاتی رہی۔ اب اس کی عمر ۱۷ برس کی ہے۔ اس کے بلوغ کو پانچ برس کا عرصہ ہوا۔ گو مسٹر سراج الحسن غوثیہ بیگم کے دادا

ہیں لیکن کبھی وہ ان کی حفاظت و نگرانی میں نہیں رہی۔ میں نے مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کے ساتھ اپنی خوشی اور اپنے لڑکے یعنی اس کے بھائی سید معین الدین کی رضامندی سے غوثیہ بیگم کی نسبت کردی۔ یہ گفتگو ایک سال سے ہورہی تھی جس سے سراج الحسن اور اور تمام اہل خاندان واقف تھے اور جن باتوں کا انھوں نے ذکر کیا وہ محض بے بنیاد ہیں۔ نہ میرے بیٹے سکندرآباد کو گئے اور نہ کسی عورت نے اسے بہکایا اور نہ کسی وقت مہاراجہ کشن پرشاد نے اپنے مذہب کے بارے میں مجھ سے غلط بیانی کی۔ تمام باتیں میری رضامندی سے ہوئیں۔

۲۴ مئی ۱۹۰۳ء۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے خاندان میں برابر یہ دستور چلا آتا ہے کہ منجملہ اور بیبیوں کے ایک مسلمان بیوی بھی تصرف میں آیا کرتی ہے چنانچہ مہاراجہ چندولال جو مہاراجہ حال کے پرداد تھے ان کی بھی ایک مسلمان بیوی تھی۔ علی ہذا ان کے بعد جو جو راجہ وزیر مقرر ہوئے ان کے بھی ایک زوجہ مسلمان ہوتی آئی۔ چنانچہ مہاراجہ صاحب حال کے بھی مسلمان زوجہ سابق میں تھی جو فوت ہوگئی۔ اب مسماۃ غوثیہ بیگم بنت فیض النسا بیگم زوجۂ ثانیہ ہوئی ہیں۔

وفات راجہ محمود آباد: ۲۱ مئی ۱۹۰۳ء۔ راجہ محمد امیر حسن خاں صاحب تعلقہ دار محمود آباد تاریخ ۳۰ مئی ۱۹۰۳ء کو بوقت آٹھ بجے صبح کے بعوارض چند در چند فوت ہوئے۔ مرحوم نہایت لائق و فائق تعلقہ دار تھے۔ ۱۸۶۲ء میں میں اور وہ ایک ساتھ مدرسہ سیتاپور میں انگریزی پڑھتے تھے۔ مزاج میں نہایت خلق و مروت تھی۔ مرحوم ۱۶ جون ۱۸۴۹ء کو پیدا ہوئے تھے اس حساب سے انکا سن تقریباً ۵۴ سال کے تھا۔ اولاد لائق چھوڑ گئے۔

صوبہ برار: ۱۵ اکتوبر ۱۹۰۲ء۔ یکم اکتوبر ۱۹۰۲ء سے ملک برار متعلقہ حیدرآباد دکھن، اضلاع متوسطہ عملداری برٹش انڈیا میں شریک کیا گیا۔

سلطان جہاں بیگم بھوپال: ۲۰ اکتوبر ۱۹۰۳ء۔ اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ سلطان جہاں بیگم بھوپال معہ اپنے دو بیٹوں اور تقریباً تین سو ہمراہیوں کے ۲۰ اکتوبر ۱۹۰۳ء کو جہاز اکبر پر بمبئی سے مکہ معظمہ روانہ ہوں گی اور صرف ان کے بڑے بیٹے جو ولی عہد ہیں اپنی والدہ کی غیبت میں کام ریاست کا انجام دیں گے۔

نواب رام پور: ۹ فروری ۱۹۰۴ء۔ آج منشی بیکولال صاحب شاعر لکھنؤ تخلص عشرت عزیز راجہ درگاپرشاد صاحب موضع کھیونہ سے میری ملاقات کو آئے اور کہا کہ میں اخیر ہفتہ دسمبر ۱۹۰۳ء میں مہمان راجہ کشن کمار صاحب رئیس سہس پور ضلع مرادآباد کا تھا جہاں ایک جلسہ بدیں غرض منعقد ہوا تھا کہ نواب حامد علی خاں صاحب والی ریاست رام پور قلعہ زیر تعمیر برج جنوبی کا بنیادی پتھر تاریخ ۲۴ دسمبر ۱۹۰۳ء وقت دس بجے دن کے رکھیں۔ چنانچہ نواب صاحب نے کنی نقرئی سے بنیاد رکھی اور جلسہ رقص و سرود منعقد ہوا۔

اولاً ایک طوائف منیٰ نامی نے جو علی گڑھ سے دو سو روپیہ یومیہ پر آئی تھی رقص شروع کیا۔ ہنوز اس نے کچھ گایا نہیں تھا کہ حضرت نواب صاحب نے جو جلسہ کے محاذ ایک کمرہ میں معہ اپنے مصاحبین کے قیام فرما تھے طوائف مذکور کو طلب کیا اور سر مجلس اُس سے مذاق شروع کر دیا جو ایک گھنٹہ تک کرتے رہے اس کے بعد طوائف مذکورہ کو اپنے ہمراہ لیے چلے گئے۔ یہ امر خلاف تہذیب سب حاضرین کو ناپسند ہوا یہی وجہ ہے کہ برٹش گورنمنٹ اکثر والیان ملک و رؤسا کو نگاہ وقعت سے نہیں دیکھتی ہے کہ طرز معاشرت ان کا نہایت خراب و خلاف تہذیب ہے۔

سلطان جہاں بیگم بھوپال: یکم اپریل ۱۹۰۴ء۔ سلطان جہاں بیگم صاحبہ بھوپال جو معہ اپنے بیٹوں عبیداللہ خاں و حمید اللہ خاں و بیگم شاہ برنگا (کذا) صاحبہ معہ ۲۵۷ ہمراہیوں کے ۳۰ اکتوبر ۱۹۰۳ء کو جہاز "اکبر" پر بمبئی سے حج مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کو تشریف لے گئی تھیں ۳۵ مارچ ۱۹۰۴ء کو اسی جہاز پر واپس تشریف لائیں اور بعد عشرۂ محرم بذریعہ اسپیشل ٹرین اپنے دولت کدہ کو تشریف لے جاویں گی (اودھ اخبار مورخہ)

مہاراجہ کشمیر: ۲ نومبر ۱۹۰۵ء۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو لارڈ کرزن صاحب وائسرائے ہند نے مہاراجہ صاحب کشمیر کو اختیارات ریاست عطا فرمائے اور کونسل برخاست ہوئی۔

مہاراجہ اجودھیا: ۲۹ دسمبر ۱۹۰۵ء یادداشت: ۱۲ جولائی ۱۸۹۱ء کو گورنمنٹ نے مہاراجہ سر پرتاب نرائن سنگھ صاحب کو مہاراجہ اجودھیا کا خطاب بطور ذاتی اعزاز کے عطا فرمایا تھا اور ۱۸۹۵ء میں کے۔ سی۔ آئی۔ ای کا خطاب دیا۔

۹ نومبر ۱۹۰۶ء۔ آج مہاراجہ سر پرتاب نرائن سنگھ مہاراجہ اجودھیا پریسیڈنٹ کمیٹی انجمن ہند لکھنؤ نے بعارضہ استسقا قضا کی عمر ۴۱ سال تھی۔ متوفی خاں بہادر چودھری نصرت علی (سندیلوی) کے بہت بڑے مربی تھے اور ان کو ایک موضع بھی دیا تھا۔

مہاراجہ بلرام پور: ۳ دسمبر ۱۹۰۶ء آج مہاراجہ بھگوتی پرشاد صاحب والی ریاست بلرامپور بجائے مہاراجہ سر پرتاب سنگھ صاحب متوفی پریسیڈنٹ میں جیاتی انجمن تعلقہ داران اودھ باتفاق رائے جملہ تعلقہ داران منتخب ہوئے۔

نواب بہاول پور: ۱۷ فروری ۱۹۰۷ء۔ محمد بہاول خاں نواب بہاول پور متعلقہ صوبہ لاہور جو بارادۂ زیارت مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کو تشریف لے گئے تھے وقت واپسی جب عدن سے روانہ ہوئے تو ۱۶ فروری سنہ الیہ کو بعارضہ نمونیہ جہاز "شاہ نجف" پر قضا کی۔ لہذا ... کو واپس آیا اور ان کی لاش حنوط کی گئی۔ نواب صاحب کی عمر ۲۴ سال تھی اور نہایت روشن دماغ تھے اور قبل روانگی حج اپنی رعایا کو اشتہار دیا تھا کہ جو شخص ہمارے ساتھ حج

ہو جائے گا تو ہم اس کو زاد راہ سے مدد کریں گے۔ چنانچہ بہت سے لوگ ان کی رعایا سے ہمراہ گئے تھے۔
مرحوم نے ایک دو سال کا لڑکا اپنی یادگار چھوڑا۔

وفات راجہ نان پارہ: آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ محمد صدیق خاں راجہ نان پارہ، واقع اودھ نے مکہ معظمہ میں بعارضہ ہیضہ انتقال کیا۔ مرحوم حواس باختہ اور بے عقل آدمی تھے اور ان کے فتور عقل سے ان کا علاقہ کورٹ آف وارڈس ہوا۔

سیلاب حیدر آباد: ۱۳ر اکتوبر ۱۹۰۸ء۔ ۲۶ر ستمبر ۱۹۰۸ء سے ۲۸ر ستمبر تک علی الاتصال حیدر آباد دکن میں ۱۵ انچ بارش ہوئی جس سے شہر مذکور میں سیلاب آگیا اور صدہا مکانات ڈوب گئے اودھ اخبار سے واضح ہوتا ہے کہ دس ہزار آدمی ضائع ہوئے اور پل وغیرہ بہہ گئے اور دس میل کے رقبہ میں سڑی ہوئی لاشیں ڈھیر لگی ہوئی ہیں۔ یہ طوفان بہت شدید تھا جس سے ہزارہا مکان غرقاب ہو گئے۔

۱۹ر اکتوبر ۱۹۰۸ء آج کے اودھ اخبار سے معلوم ہوا کہ ۲۷ر ستمبر ۱۹۰۸ء کو شدت کی بارش حیدر آباد میں ہوئی اور سیلاب آئے۔ تالاب "جھد متلا" کا بندھ ٹوٹ جانے سے مفصلہ ذیل محلے تباہ و برباد ہو گئے۔ ریذیڈنسی بازار، شیری، مہاراج گنج، افضل گنج۔ یہ محلے تو بالکل تباہ ہو گئے اور ریذیڈنسی کے مغربی جانب جو مکانات کی قطار واقع تھی، وہ بالکل مسمار ہو گئی۔ چادر گھاٹ، ہلارٹ یہ دونوں گاؤں بہہ گئے، پل انگورا اور کوٹھی جوڑا اور ڈاک خانہ بالکل منہدم ہو گئے۔ افضل گنج کے کنارے کنارے جو مکانات تھے ان میں کوئی باقی نہیں رہا۔ عابد کمپنی کا کارخانہ واقع چادر گھاٹ سے لے کر سرکاری باغات کی سڑک تک نوبت خانہ بازار کا ایک حصہ منہدم ہو گیا۔ جان بازار، مہراج گنج، ٹھنڈی بازار اور ریگم بازار بالکل مسمار و منہدم ہو گئے ہیں۔ شمالی جانب ایک پل سے دوسرے پل تک جس قدر گاؤں اور بستیاں دریا کے کنارے واقع تھیں سب بہہ گئیں۔ شہر میں بارہ دری پوسٹ آفس بازار، ستر گوج، امین باغ، نیزہ گلی تک بہہ گئی۔ افضل گنج کا اسپتال جس کی تیاری میں دس بارہ لاکھ روپیہ صرف ہوا ہو گا اس کا ایک بڑا حصہ مسمار ہو گیا۔ زنانہ اسپتال، امین باغ جس کا بنیادی پتھر شہزادہ ویلس نے رکھا تھا اور جس کی تیاری میں چار لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا اس کا بڑا حصہ گر گیا۔ نظام حیدر آباد کو اس واقعہ سے سخت صدمہ ہوا۔ لکھا ہے کہ ایک چہارم حیدر آباد تباہ و برباد ہو گیا۔ دریائے موسیٰ ان پہاڑوں سے نکلا ہے جو شہر سے ۵۰ میل پر واقع ہیں اور گرمی کے موسم میں یہ بالکل ہی بے حقیقت نالہ معلوم ہوتا ہے۔ برسات میں بھی اس دریا سے لوگ پایاب عبور کرتے ہیں۔ اس دریا میں طغیانی اکثر آتی ہے جس سے نقصان پہنچا ہے خاص کر

۲۸، ۲۷، ۱۶ اور ۱۷، ۸ اور ۹ اکتوبر ۱۹۰۳ء میں جو سیلاب اس دریا میں آئے اُن سے بہت نقصان ہوئے اور بے شمار لوگ غرق ہوئے اور بہت سے مکانات مسمار ہو گئے۔

۱۰ اکتوبر ۱۹۰۸ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ سیلاب آنے سے جو تباہی و بربادی شہر حیدرآباد کی ہوئی اس کے واسطے اس وقت تک حسب ذیل چندہ ہوا ہے۔

لارڈ منٹو وائسرائے ہند: ۱۵۰ پونڈ، لیڈی منٹو: ۷۵ پونڈ، نظام حیدرآباد اپنی جیب خاص سے: ۴ لاکھ پچاس ہزار، گورنمنٹ حیدرآباد: دو لاکھ، گورنر بمبئی: ۲۵۰ روپے، کریم بھائی ابراہیم، دوارکا داس، غیرہ اور سر سوتی بورڈ وغیرہ۔ من جانب ریاست حیدرآباد تیس ہزار آدمیوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ ایک لاکھ آدمی بے خانماں ہو گئے۔

۲۴ نومبر ۱۹۰۸ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ حیدرآباد کے سیلاب سے ۵۲ وارڈ ویران ہو گئے اور ڈیڑھ کروڑ کی جائداد وغیرہ منقولہ اور ایک کروڑ کی منقولہ جائداد کا نقصان ہوا۔ ایک لاکھ انتیس ہزار روپیہ مصیبت زدوں کی امداد کے لیے چندہ ہوا ہے اور یہ چندہ ۱۶ نومبر ۱۹۰۸ء تک ہے۔ جو چندہ ابکے ہوا ہے اس کی تعداد آئندہ تحریر ہوگی۔ قریب ستر ہزار جانیں تلف ہوئیں یہ امر حیدرآباد کے جلسہ عام میں طے ہوا جس میں اعلیٰ و ادنیٰ ہر قسم کے لوگ شریک جلسہ تھے۔

بلرام پور۔ خطاب مہاراجہ: ۲۳ جنوری ۱۹۰۹ء۔ آج کے اودھ اخبار سے معلوم ہوا کہ مہاراجہ سر بھگوتی پرشاد سنگھ صاحب والی بلرام پور کو ۱۸ جنوری ۱۹۰۹ء کے دربار لکھنؤ میں خطاب مہاراجہ نسلاً بعد نسلاً سر ہیوٹ صاحب نواب لفٹیننٹ گورنر صاحب بہادر ممالک متحدہ آگرہ و اودھ نے عطا فرمایا۔

شادی راجہ محمود آباد: ۲ جولائی ۱۹۰۹ء۔ آج کے اودھ اخبار سے معلوم ہوا کہ راجہ علی محمد خاں صاحب تعلقہ دار محمود آباد کی شادی بمقام لکھنؤ بہت بڑی دھوم سے ہوئی۔

کشمیر، وزیر مال: ۲۵ نومبر ۱۹۰۹ء۔ آج شیخ مقبول حسین صاحب تعلقہ دار "گدیا" وزیر مال ریاست کشمیر مقرر ہو کر سندیلہ سے گزرے۔ ان کی تنخواہ ڈیڑھ ہزار روپے ماہوار مقرر ہوئی ہے۔

راجہ پوایاں: ۴ مارچ ۱۹۱۰ء ... چودھری (محمد رؤف) صاحب و راجہ درگا پرشاد صاحب سکنڈ کلاس میں سوار تھے جس میں کنور اندر بکرم سنگھ خلف راجہ "پوایاں" ضلع شاہجہاں پور بھی سوار تھے۔ راجہ صاحب "پوایاں" کا علاقہ ضلع شاہجہاں پور میں واقع ہے جس کی مال گزاری ۸۵ ہزار سالانہ کی ہے اور چند معافی سرکار سے ہیں جو بہ صلہ خیر خواہی زمانہ غدر میں اس کے رئیس کو گورنمنٹ سے حاصل ہوئی۔ خیر خواہی راجہ صاحب

بقی کہ انھوں نے احمد اللہ شاہ اور دو ایک نواب و راجہ کو زمانۂ غدر میں قتل کیا تھا۔

مہاراجہ پٹیالہ، گدی نشینی: ۸ر نومبر ۱۹۱۰ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ۳ر نومبر ۱۹۱۰ء کو لارڈ منٹو وائسرائے ہند نے مہاراجہ پٹیالہ کو گدی نشین کیا اور اختیارات ریاست ان کو عطا کیے۔

وفات مہاراجہ جودھ پور: ۲۸ر مارچ ۱۹۱۱ء۔ آج کے اودھ اخبار سے معلوم ہوا کہ مہاراجہ سردار سنگھ والی ریاست جودھ پور نے ۲۰ر مارچ ۱۹۱۱ء کو لعارضہ نمونیہ مبتلا ہو کر قضا کی۔ متوفی مہاراجہ ۱۱ر فروری ۱۸۸۰ء کو پیدا ہوئے تھے اور ۱۱ر اکتوبر ۱۹۰۵ء کو تخت نشین ریاست ہوئے۔ متوفی نے اپنے سفر انگلستان وغیرہ سے بہت تجربہ حاصل کیا تھا۔ آپ کی دو شادیاں ہوئیں۔ ایک راجہ بوندی کی ہمشیرہ دوسری مہاراجہ اودے پور کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ آپ تین بیٹے اور دو بیٹیاں یادگار چھوڑ گئے۔ ان کی سلامی سترہ ضرب توپ کی تھی۔

وفات نظام حیدرآباد: یکم ستمبر ۱۹۱۱ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ نواب میر محبوب علی خاں بہادر نظام حیدرآباد دکن مورخہ ۱۴ر اگست ۱۸۶۶ء کو پیدا ہوئے تھے اور ۲۹ر اگست ۱۹۱۱ء کو عارضۂ فالج میں وفات پائی۔ عمر ۴۵ سال تھی۔ مرحوم تعلیم یافتہ اور شکار دوست تھے۔ متوفی کے بجائے ان کے بیٹے میر عثمان علی خاں مسند نشین ہوئے جن کی عمر اس وقت پچیس سال کی ہے۔

۱۲ر ستمبر ۱۹۱۱ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار امروزہ واضح ہوا کہ ہز ہائی نس نواب میر عثمان علی خاں جدید نظام دکن حیدرآباد تاریخ ۲۹ر جمادی الثانی ۱۳۰۳ھ یوم سہ شنبہ وقت ۹ بجے رات کو پیدا ہوئے تھے۔

باب سوم

واقعات بیرون ہند

جنگ روس و روم: ۲۹ مارچ ۱۸۷۸ء۔ جو لڑائی سلطان روم و روسیوں سے ہو رہی تھی اس میں سلطان کو شکست ہوئی اور بحالت مجبوری صلح کرنے کو مجبور ہوئے۔ شرائط صلح ابھی دریافت نہیں ہوئی ہیں مگر اس بات کا خوف و اندیشہ ہے کہ روسی ایک نہ ایک روز ضرور قسطنطنیہ دار الخلافہ روم کو اپنے قبضہ میں لے آویں گے کیوں کہ سلطان جنگ روسیوں کا بمقابلہ سلطان کے بکثرت ہے اور سلطنت روم کو روز بروز زوال نظر آتا ہے۔

۸ مئی ۱۸۷۸ء درمیان گورنمنٹ انگلستان و روس بباعث مزاحمت نہر باسفورس فی الجملہ صورت رنجش کی پیدا ہے۔ اسی وجہ سے فوج انگریزی ہندوستان سے براہ بمبئی بجانب مالٹا بھیجی گئی ہے۔ عجب نہیں کہ جنگ ہو۔

کابل: ۲۵ اکتوبر ۱۸۷۸ء۔ منجانب انگلش گورنمنٹ بہ افسری چمبرلین صاحب کابل کو سفارت جاتی تھی بمقام علی مسجد فیض محمد خاں گورنر علی مسجد نے حسب اشارت امیر شیر علی خاں والی کابل سفارت کو آگے جانے سے روکا لہذا سرکار نے حکم فراہمی فوج بندھے لام کا بمقام پشاور دیا ہے۔ غالباً تھوڑے زمانے میں لڑائی ہو۔

۵ نومبر ۱۸۷۸ء۔ پشاور میں فوج انگریزی بہت مجتمع ہو گئی ہے۔ غالباً عنقریب واسطے جنگ کے روانہ کابل ہو۔

۲۳ نومبر ۱۸۷۸ء۔ سرکار اور امیر شیر علی والی کابل سے لڑائی شروع ہو گئی ہے۔ ۲۱ نومبر ۱۸۷۸ کو اس کا آغاز ہوا تھا۔ ۲۲ ماہ حال کو قلعہ علی مسجد فتح ہو گیا اور سرکار انگریزی کے قبضہ میں آیا۔

۴ دسمبر ۱۸۷۸ء۔ فوج انگریزی نے مقام پیوار کو شیر علی خاں والی کابل سے خالی کرا لیا اور فوج آگے کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔

۲۵ مارچ ۱۸۷۹ء۔ جنگ کابل ابھی تک ختم نہیں ہوئی ہے۔ ایک فوج کابلی مع سامان کثیر واسطے مقابلہ انگریزوں کے کابل سے جلال آباد کو گئی۔

۹ ستمبر ۱۸۷۹ء معائنہ اودھ اخبار سے دریافت ہوا کہ میجر کوگنارل صاحب ریذیڈنٹ و دیگر حکام انگلش بمقام کابل بالاحصار قتل ہوئے۔ کوئی شخص فوج انگریزی کا باقی نہیں رہا جس کا سبب یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ فوج کابلی امیر صاحب غدر کر کے باعث اس قتل عام کی ہوئی ہے اور امیر یعقوب خاں بھی بحالت محصوری ہیں لہذا فوج انگریزی قندھار سے واسطے تادیب فوج باغی کے کابل بھیجی گئی ہے۔

۱۲ اکتوبر ۱۸۷۹ء سرکار انگلشیہ نے بسرکردگی جنرل رابٹ کابل کو فتح کیا۔

روس و کابل: ۱۳ اپریل ۱۸۸۵ء۔ ۳۰ مارچ سنہ الیہ کو بمقام پنجدہ متعلقہ کابل افغانان اور رو
سے لڑائی ہوئی۔ پانچ سو فوجی امیر کابل کے قتل ہوئے۔ جنرل کمروف فوج روسیہ کا افسر تھا۔

کابل: ۱۴ اپریل ۱۸۸۵ء۔ ۱۱ اپریل کو امیر عبدالرحمٰن خاں کابل کو واپس گئے۔ منجانب سرکا
ہزار ہا روپیہ مہمان داری میں صرف ہوا۔

شہنشاہ جرمنی: ۱۴ مارچ ۱۸۸۸ء۔ معائنہ اودھ اخبار امروزہ سے معلوم ہوا کہ شہنشاہ ول
جرمن نے بتاریخ ۹ مارچ سن الیہ کو ۸½ بجے صبح کو بعمر ۹۱ سال قضا کی۔ شہنشاہ نے ۳۱ سال سلطنت کی۔ یہ بڑے خوش نصیب بادشاہ

آبادی ممالک: یکم جون ۱۸۸۸ء۔ معائنہ پرچہ جریدۂ روزگار، مدراس نمبری ۲۱۵ محررہ مئی ۸۸
سے واضح ہوا کہ ممالک ذیل کی آبادی حسب صراحت تحت ہے:
چین۔ ۴۰ کروڑ، سلطنت برطانیہ۔ ۳۶ کروڑ، روس۔ ۱۰ کروڑ، فرانس۔ ۷ کروڑ، ممالک متحدہ امریکہ ۶ کروڑ، جرمنی ۵ ک

شہنشاہ جرمنی: ۱۹ جون ۱۸۸۸ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار محررہ امروزہ کے واضح ہوا کہ ۱۵ جو
۱۸۸۸ء کو یوم جمعہ ساڑھے بارہ بجے دن کے شہنشاہ فریڈرک جرمن نے تین مہینے چھ یوم سلطنت کے بعد بعم
سال عارضہ خناق میں قضا کی۔ یہ متوفی ملکہ وکٹوریہ انگلینڈ کے بڑے داماد تھے۔

مردم شماری دار السلطنت ممالک: ۳۰ جون ۱۸۸۸ء۔ معائنہ اودھ اخبار مورخہ ۲۷ جو ۸۸
نمبری ۱۴۸ سے واضح ہوا کہ مردم شماری سلطنت ہائے ذیل میں حسب مندرجہ تحت ہے:

لندن	دارالسلطنت	انگلستان	۳۶۵۵۸۱۹	کلکتہ	دارالسلطنت	ہندوستان	۶۶۲۹۸
پیرس	〃	فرانس	۲۲۶۹۰۲۳	وائنا	〃	آسٹریا	۲۰۱۰۵
برلن	〃	پروشیا	۱۱۲۲۳۳۰	قسطنطنیہ	〃	ٹرکی	...۰۰۰۰
سینٹ پیٹرس برگ	〃	روس	۷۶۶۶۶۴	میڈرڈ	〃	اسپین	۱۰۰۹۰۰

مردم شماری ناخواندگی: ۴ اپریل ۱۸۸۹ء۔ ممالک یورپ مندرجہ ذیل میں اشخاص ناخواندہ یع
جاہل حسب ذیل ہیں جس کی شہادت اخبار سررشتہ تعلیم اودھ، یکم اپریل ۱۸۸۹ء سے کما حقہ ہوتی ہے:

نام ملک	تعداد فی صدی	نام ملک	تعداد فی صدی	نام ملک	تعداد فی صدی	نام ملک	تعداد فی صدی
روس سرویہ و رومانیہ	۸۰	فرانس و بلجیم	۱۵	اسپین	۶۳	انگلستان	۱۲
				اٹلی	۴۸	اضلاع امریکہ	۸

نام ملک	تعداد فی صدی	نام ملک	تعداد فی صدی	نام ملک	تعداد فی صدی
ہنگری	۴۱	اسکاٹلینڈ	۷	سوئٹزرلینڈ	۲۵	ڈنمارک بویریا	۰
آسٹریا	۲۹	جرمنی	۱	آئرلینڈ	۲۱	ہندوستان	۸۳

یعنی ہندوستان میں سو میں صرف ۷، آدمی لکھے پڑھے ہوتے ہیں۔ مقام غور ہے کہ ہندوستان کے باشندے روسیوں سے بھی جو جاہل قوم مشہور ہے تہذیب و شائستگی میں پیچھے رہ گئے۔

افواج یورپ: ۲۲ر اگست ۱۸۸۹ء بمعائنہ اودھ اخبار امروزہ ۲۵۱۷ بحوالہ اخبار پانیر انگریزی مورخہ ۴ر اگست ۱۸۸۹ء سے واضح ہوا کہ لڑائی اور امن کے دوران افواج سلاطین یورپ حسب ذیل مہیا و موجود ہیں۔ تفصیل افواج:

جنگ: جرمن۔ تیس لاکھ پچاس ہزار۔ آسٹریا۔ گیارہ لاکھ ۸۱ ہزار، اٹلی۔ اکیس لاکھ ۱۹ ہزار دو سو پچاس۔ فرانس سینتیس لاکھ ۵۳ ہزار، روس ۵۵ لاکھ۔

امن: جرمن۔ چار لاکھ ۹۲ ہزار، آسٹریا۔ تین لاکھ ۸۱ ہزار، اٹلی۔ دو لاکھ ۵۳ ہزار، فرانس۔ چار لاکھ ۹۹ ہزار، روس ست لاکھ۔

تعداد اخبارات: ۲۶ر ستمبر ۱۸۹۰ء۔ سچ ہے دنیا میں تہذیب و شائستگی کی روز افزوں ترقی ہے۔ علی الخصوص یورپ کو اگر مخزن تہذیب کہیں تو گنجائش ہے۔ ایک ادنیٰ سی بات یہ ہے کہ اودھ اخبار محررہ امروزہ ترجمہ انگریزی ٹائمس سے معلوم ہوا کہ بالفعل تخمیناً اکتالیس ہزار اخبار دنیا میں شائع ہوتے ہیں ان میں چوبیس ہزار یورپ میں ہیں حسب ذیل:

جرمنی - ۵۵۰۳ فرانس - ۱۴۰۰ انگلستان - ۳۰۰۰ آسٹریا ہنگری ۲۵۰۰ اٹلی - ۲۴۰۰
اسپین - ۸۵۰ روس - ۸۰۰ سوئٹزرلینڈ ۴۵۰ ہالینڈ ۳۰۰ امریکہ ۱۲۵۰۰
کینیڈا ۷۰۰ آسٹریلیا ۷۰۰ ایشیا ۳۰۰ جاپان ۲۰۰ افریقہ ۲۰۰
جزائر سنڈوچ (کنڈا) ۸۰۔ میزان کل ۳۶۴۵۲۔

مکہ میں ہیضہ: ۴ر ستمبر ۱۸۹۱ء: بمعائنہ اودھ اخبار امروزہ بحوالہ ملٹری گزٹ ۲۸ر اگست سنہ الیہ سے واضح ہوا کہ مکہ معظمہ میں حفظان صحت کا عمدہ بندوبست نہیں ہے اس وجہ سے ہر سال شکایت ہیضہ وبائی بکثرت ہوتی ہے اور ایک ایک تاریخ میں چار چار پانچ پانچ سو آدمی مبتلائے عارضہ مہلکہ ہو کر ضائع ہوتے ہیں۔ نقشہ سرکاری چھ سال گزشتہ سے واضح ہوتا ہے کہ جس قدر حاجی بمبئی سے گئے ان میں سے دو ثلث سے زیادہ ہندوستان واپس نہیں آئے۔

حاجیوں کا شمار

	روانگی	مراجعت	ضائع
۱۸۸۵ء	۸۴۳۶	۵۰۴۵	۳۳۹۱
۱۸۸۶ء	۸۶۰۶	۶۱۵۰	۲۴۵۶
۱۸۸۷ء	۹۴۶۶	۵۷۲۶	۳۷۴۰
۱۸۸۸ء	۱۴۹۷۰	۶۵۰۵	۷۴۶۵
۱۸۸۹ء	۱۲۴۹۵	۱۱۱۰۱	۱۳۹۴
۱۸۹۰ء	۱۱۶۶۵	۸۶۶۲	۳۰۰۳
میزان	۶۴۶۳۸	۴۳۱۸۹	۲۱۴۴۹

وزیر اعظم انگلستان: ۲۱ اگست ۱۸۹۲ء۔ معائنہ اخبارات سے واضح ہوتا ہے کہ مسٹر گلیڈاسٹون وزیر اعظم انگلستان بجائے لارڈ سالسبری مقرر ہوئے اور یہ تیسرا انتخاب ان کے وزیر اعظم ہونے کا ہے۔ قبل اس کے بہ اوقات مختلف دو مرتبہ اس عہدہ پر ممتاز ہو چکے ہیں۔ یہ انتخاب پانچ سال کے واسطے ہوا ہے۔

تعداد ممبران پارلیمنٹ: ۱۹ ستمبر ۱۸۹۲ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار مطبوعہ امروزہ سے واضح ہوا کہ تعداد ممبران پارلیمنٹ انگلستان کی حسب ذیل ہے:

انگلستان ۔ ۴۶۵ ، صوبہ ویلز ۔ ۳۰ ، اسکاٹ لینڈ ۷۲ ، آئرلینڈ ۱۰۳ ۔ کل ۶۷۰

چند اقوال: ۳۰ نومبر ۱۸۹۲ء۔ چند اقوال تجربہ کار عاقلوں کے درج ذیل کرتا ہوں جو قابل یاد رکھنے کے ہیں۔

ملٹن : سچ کی کسی برائی سے قدر کم نہیں ہو سکتی جیسے کہ سورج کی کرنوں کو کوئی ہاتھ لگا کر میلا نہیں کر سکتا۔

شکسپیر : ایک منٹ کی خوشی کے لیے ایک ہفتہ کا رنج کوئی ہرگز اختیار نہ کرے گا۔

کوپر : خالی بیٹھے رہنا آرام نہیں ہے۔ جو دل کسی شغل سے خالی ہے وہ غم سے بھرا ہوا ہے۔

سوتھ : جو کسی کی برائی کرتا ہے اسی کے خود خیالات اسے رنج و دکھ میں رکھتے ہیں۔

سعدی : دو شخصوں کے درمیان ایسی بات کہنا چاہیے کہ اگر وہ دوست ہو جاویں تو ان سے شرمندہ ہونا نہ پڑے۔

" : جو کوئی شخص بُروں میں بیٹھے اگرچہ ان کی عادات اس میں اثر نہ کریں لیکن برے کسی فعل کی تہمت اس پر بھی لگے گی۔

سعدی: بیوقوف کے لیے خاموشی سے بہتر کوئی بات نہیں ہے لیکن اگر وہ اس مصلحت کو جانتا تو بیوقوف نہ ہوتا۔
": جو اپنی امیری کی حالت میں بھلائی نہیں کرتا وہ غریبی کی حالت میں تکلیف اٹھاتا ہے۔

متفرق معلومات: ۳ر جولائی ۱۸۹۳ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار لکھنؤ مطبوعہ دی روزہ سے معلوم ہوا کہ
۱۔ تمام روئے زمین پر اہل اسلام کی آبادی ساڑھے سترہ کروڑ ہے۔ ۲۔ شہر لندن کی ۷۰۰ مربع میل میں آبادی ہے۔ ۳۔ تمام دنیا میں ایک ارب ۳۷ کروڑ پچاس لاکھ من گیہوں پیدا ہوتا ہے۔ واقعی اس زمانہ میں شہر لندن سے کوئی دوسرا بڑا شہر بلحاظ طول و آبادی روئے زمین پر نہیں ہے۔

کابل: ۱۳ر ستمبر ۱۸۹۳ء۔ مسٹر ڈیورنڈ کا کمیشن بغرض صلاح و مشورہ عبدالرحمان خان امیر کابل ۱۵ ستمبر سنہ الیہ کو پشاور سے روانہ 'جمرود' ہوا۔ یہ کمیشن لارڈ لینس ڈاؤن صاحب گورنر جنرل کشور ہند کی ہدایت سے بدیں غرض بھیجا گیا ہے کہ مراتب ضروریہ سرحدی کے بعد یہ بھی امیر سے طے کرے کہ وہ قندھار تک ریل بنانے کی اجازت عطا کریں۔

وزیر اعظموں کا وزن: ۸ر نومبر ۱۸۹۳ء۔ لارڈ سالسبری سابق وزیر اعظم انگلستان کا وزن جسمانی ۳ من ۹ سیر اور حال کے وزیر اعظم مسٹر گلیڈ اسٹون کا دو من ۴ سیر ہے۔ ایک ڈاکٹر کا قول ہے کہ سر ٹھنڈا رکھو اور پاؤں گرم اور عادات باقاعدہ پھر تم کو طبیب اور ڈاکٹر کی ضرورت نہ ہوگی۔

کابل: ۲۳ر نومبر ۱۸۹۳ء۔ سفارت مسٹر ڈیورنڈ کامیابی کے ساتھ کابل سے واپس ہوئی۔ امیر عبدالرحمان خاں صاحب نے ہر طرح سے اس کی خاطرداری کی اور جملہ عہد و مواثیق مابین گورنمنٹ اور امیر کابل بسہولت طے ہوگئے اور برٹش گورنمنٹ نے بعوض بارہ لاکھ روپیہ سالانہ اب اٹھارہ لاکھ روپیہ سالانہ کا گزارہ امیر کابل کا مقرر کر دیا یعنی ڈیڑھ لاکھ روپیہ ماہوار ان کو ملا کریں گے اور جس قسم کے آلات حرب وغیرہ امیر کابل چاہیں انگلستان سے منگالیں۔

پریسیڈنٹ فرانس: ۶ر جولائی ۱۸۹۴ء۔ معائنہ اخبارات سے واضح ہوا کہ اہم گارنٹ پریسیڈنٹ فرانس کو آخر ہفتہ جون میں مسمی ساٹھو باشندہ اٹلی نے تلوار سے مار ڈالا جب کہ وہ ایک جلسہ میں بغرض شرکت بگھی پر جا رہے تھے۔ یکم جولائی کو ان کی تجہیز و تکفین بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ مرحوم نہایت لائق و منتظم شخص تھے۔ عمر ۵۶ سال تھی اور بیس ہزار پونڈ سالانہ تنخواہ پاتے تھے۔

گلیڈسٹن: ۹ر مارچ ۱۸۹۴ء۔ ۳ مارچ سن رواں کو مسٹر گلیڈسٹن وزیر اعظم انگلستان نے اپنی ملازمت سے بحضور ملکہ معظمہ استعفا داخل کیا اور لارڈ روزمیری کو یہ اعزاز بخشا گیا۔ مسٹر گلیڈسٹن نے بوجہ ضعف بصارت و نہ منظور ہوتے قانون ہوم رول آئرلینڈ کے استعفا داخل کیا۔ اب ان کی عمر ۸۴ سال ہے۔

زار روس: ۵ نومبر ۱۸۹۴ء۔ معائنہ اخبار 'پانیر' انگریزی الہ آباد مطبوعہ ۶ نومبر سے واضح ہوا کہ زار روس الگزنڈر سوم شہنشاہ روس نے پھیپھڑے کے عارضہ میں بمقام 'لیوادیا' تاریخ یکم نومبر پنج شنبہ سوا دو بجے شام کو انتقال کیا۔ یہ بادشاہ بہت صلح پسند تھا۔

تعداد فوج: ۹ جنوری ۱۸۹۵ء۔ بمعائنہ ملٹری گزٹ لاہور مطبوعہ یکم دسمبر سے واضح ہوا کہ سلطنت ہائے ذیل میں مفصلہ تحت فوج بحالت صلح و جنگ پائی جاتی ہے:

نام سلطنت	تعداد ایام صلح	تعداد ایام جنگ	توپوں کی تعداد
روس	۱۰،۲۰،۰۰۰	۴۵۰۰۰۰۰	۲۳۴۶۰
جرمنی	۵،۵۷۰۰۰	۴۳۰۰۰۰۰	۲۹۹۴
فرانس	۵۷۲۰۰۰	۴۰۰۰۰۰۰	۲۸۸۰
اٹلی	۲۲۰۰۰۰	۲۹۸۰۰۰۰	۱۶۲۰

نام سلطنت	تعداد ایام صلح	تعداد ایام جنگ	توپوں کی تعداد
آسٹریا	۲۹۰۰۰۰	۱۴،۳۷۰۰۰	۱۹۱۲
ٹرکی	۱۷۰،۰۰۰	۱۱۰۰۰۰۰	۲۵۰۰
اسپین	۱۰۰۰۰۰	۷۰۰۰۰۰	۸۰۰
برطانیہ اعظم	۲،۱۱،۰۰۰	۶۲۴۰۰۰	۶۰۰

طویل قد آدمی: ۲۵ فروری ۱۸۹۵ء۔ دنیا میں سب سے بڑا بلند قد آدمی حسن علی مصری ہے جس کی عمر اس وقت ۱۶ برس اور قد سات فٹ نو انچ ہے اور ہنوز نشو و نما جاری ہے اور صرف اپنی طویل القدی کی بدولت نمائش گاہ برلن دار السلطنت جرمن میں پیش ہوا۔

انجن: ۶ مارچ ۱۸۹۵ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار امروزہ سے واضح ہوا کہ مسٹر جارج ساکن 'نیوکاسل' متعلقہ نیو انگلینڈ نے انجن کا بنانا ۱۸۱۲ء میں شروع کیا اور ۲۵ جولائی ۱۸۱۴ء کو چلایا اور ۲۸ ستمبر ۱۸۲۲ء کو بارہ میل کی سڑک ریلوے کھولی جس سے آمد و شد مال تجارت اور آدمیوں کی قائم ہوئی۔ جارج ایک مزدور پیشہ آدمی تھا لیکن اس نے اپنی ذہانت سے ایسی ایجاد کی۔

شہزادہ کابل: ۲۰ جولائی ۱۸۹۵ء۔ سردار نصر اللہ خاں خلف دوئم امیر عبد الرحمان خاں امیر کابل جو حسب خواہش گورنمنٹ ملکہ وکٹوریہ آج کل انگلستان کے شہروں کی سیر کر رہے ہیں کل صرفہ ان کی سیاحت کا گورنمنٹ موصوفہ برداشت کر رہی ہے۔ چنانچہ ملک معظم نے حکم دیا ہے کہ تمام شاہزادگان انگلستان پر سوا شہزادہ ویلس بہادر اور ڈیوک آف کوبرگ کے ان کو سبقت دی جاوے۔ یہ بہت بڑا اعزاز خلف دوئم امیر کابل کا ہوا۔ اس کی تصدیق انگریزی اخبارات سے ہوئی۔

ڈاک فیلو: ۱۸ اکتوبر ۱۸۹۵ء۔ بمعائنہ اخبار ایوننگ حیدر آباد مطبوعہ ۲۵ ستمبر سن الیہ سے واضح

ہوا کہ جان ڈی راک فیلر امریکہ میں سب سے زیادہ دولت مند ہیں۔ ان کے پاس ۱۴ کروڑ ۵ لاکھ ڈالر ہیں اور ایک ڈالر دو روپے پانچ آنہ کا ہوتا ہے۔ سال ختم ہونے کے قبل ان کی دولت ۱۵ کروڑ ہو جائے گی۔ بیان ہے کہ ان کی دولت ایک کروڑ پانچ لاکھ ڈالر سالانہ کے حساب سے بڑھتی ہے۔

موجد منی آرڈر: ۱۲ نومبر ۱۸۹۵ء۔ بذریعہ منی آرڈر و نیز تار کے روپیہ بھیجنے کا موجد مسٹر فاسٹ نابینا شخص ہے جو سابق پوسٹ ماسٹر جنرل انگلستان کا تھا جس کی دونوں آنکھیں ایک شکار میں جاتی رہیں۔ وہ بدستور اپنے منصبی کام کو انجام دیتا رہا۔

قسطنطنیہ: ۱۰ جنوری ۱۸۹۶ء۔ آج کل قسطنطنیہ کی حالت نازک ہو رہی ہے۔ کل سلاطین یورپ آرمینیا کے حسن انتظام کے سلطان عبدالحمید سے خواہاں ہیں اور وہ بوجوہ لیت و لعل کر رہے ہیں۔ لہٰذا روس، فرانس، انگلینڈ، اٹلی اور امریکہ کے جنگی جہازات آبنائے ڈارڈینیلز میں داخل ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ خوف دلا کر کارروائی کریں اور قسطنطنیہ کو سلطان سے انتزاع کر کے باہم تقسیم کر لیں جس سے سلطان ازبس پریشان ہیں۔ دیکھنا چاہیے کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ آج کل اخباروں میں بجز اس حال کے اور باتوں کا کمتر تذکرہ ہوتا ہے۔ یہ پیچیدگیاں چند ماہ گذشتہ سے برابر قائم چلی آتی ہیں۔

۵ر فروری ۱۸۹۶ء۔ چونکہ بہ سازش انگلستان پانچ دیگر سلطنت ہائے یورپ نے اپنے جنگی جہازات بحیرہ ڈارڈینیلز متعلقہ ٹرکی میں قائم کیے تھے کہ سلطان عبدالحمید سے بہ زور حسن انتظام صوبہ آرمینیا کرا دیں لیکن بتدریج وہ جہاز تو واپس گئے اور یکم فروری کے تار برقی اودھ اخبار مطبوعہ ۵ر فروری میں لارڈ سالسبری وزیر اعظم انگلستان کی اسپیچ کا یہ مضمون ہے کہ انگلستان ٹرکی سے آرمینیا کے لوگوں کی طرف سے جنگ نہیں کر سکتا اور مہلت دینا چاہیے تاکہ عمدہ انتظام عمل میں لایا جائے۔ میں یقین نہیں کرتا کہ سلطان نے اس جور و ظلم کا حکم دیا ہے جو آرمینیا میں ہوئے گو ان کی گورنمنٹ کمزور و نالائق ہے اور کچھ نہیں کر سکتی۔ سلاطین یورپ عمدہ انتظام کے نگراں رہیں گے لیکن آگے بڑھ کر کوئی کارروائی نہ کریں گے۔ یہ نتیجہ اس وجہ سے پیدا ہوا کہ انگلستان کو چند سخت جھگڑے امریکہ و جرمنی وغیرہ سے پیش ہو گئے۔ سچ یہ ہے کہ مشیت ایزدی میں ابھی قسطنطنیہ کا خاتمہ مقدر نہیں ہے ورنہ یورپین سلطنتوں کی تو یہ خواہش ہے کہ اسکے حصے بانٹ کر لیویں جیسا کہ اخباروں سے معلوم ہو رہا ہے۔

قتل شاہ ایران: ۵ر مئی ۱۸۹۶ء۔ یکم مئی کو مرزا محمد رضا ایک مذہبی متعصب نے ناصر الدین شاہ بادشاہ فارس کے دل میں گولی مار دی جب کہ وہ ایک زیارت متصل طہران کے اندر جا رہے تھے۔ اس کے صدمہ سے چار بجے شام کو شاہ نے قضا کی اور بجائے متوفی ان کے دوسرے بیٹے جو اصلی بیگم کے بطن سے تھے تیسری مئی کو بمقام تبریز تخت نشین ہوئے۔ اس خبر کی تصدیق پانیر الہ آباد مطبوعہ ۳ر مئی سے ہوئی۔ عمر شاہ متوفی ۶۷ سال

تھی۔ ۱۸۲۹ء میں پیدا ہوئے تھے اور بڑی طویل بادشاہت کی مزاج میں تعصب نہ تھا۔

جشن شہنشاہ روس: ۳۰ مئی ۱۸۹۶ء معائنہ اخبارات سے واضح ہوا کہ شہنشاہ روس کا جشن تاج پوشی ۲۶ مئی کو ختم ہوا اور شہنشاہ نے بروقت تاج پوشی ایک فرمان جاری کیا جس کی رو سے تمام باقیات ٹیکس معاف کر دیے اور دس برس کے لیے محصول اراضی نصف کر دیا اور خفیف مجرموں کے جرائم معاف کیے اور دیگر سزاؤں میں تخفیف کر دی اور پولٹیکل جلاوطنوں کی نسبت حکم دیا کہ جہاں کہیں مناسب سمجھیں تخفیف سزا کر دیں۔ مگر یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ جب لوگ کھانا کھانے اور انعام لینے چلے تو کثرت آدمی کے ازدہام کے باعث ۲۷۰۰ آدمی کچل کر مر گئے۔ یہ ایسے موقع پر افسوس ناک ہے۔ یہ یادگار کبھی فراموش نہیں ہو سکتی۔

شہزادہ کابل: ۹ جولائی ۱۸۹۶ء۔ معائنہ اخبار انگریزی سے معلوم ہوا کہ شاہزادہ نصر اللہ خاں خلف دوم امیر عبدالرحمان خاں والی کابل کی سیاحت انگلستان میں ۲۵،۸۰۸ پونڈ خرچ ہوئے جو چند روز کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ یہ روپیہ خزانہ ہندوستان سے خرچ میں پڑے گا۔

ملکہ وکٹوریہ: ۲۸ ستمبر ۱۸۹۶ء۔ دیکھئے اخبارات سے واضح ہوتا ہے کہ جناب ملکہ معظمہ وکٹوریہ شہنشاہ ہندوستان و انگلستان ۲۴ مئی ۱۸۱۹ء کو پیدا ہوئی تھیں اور ۲۰ جون ۱۸۳۸ء کو بیسویں سال تاج شاہی زیب سر کیا اس حساب سے ۲۰ ستمبر ۱۸۹۶ء تک جناب ممدوح نے اپنے دادا جارج سوم کے مساوی ۵۹ سال ۹۶ یوم زمانہ حکمرانی ختم کیا اور ۲۳ ستمبر سنہ الیہ سے آپ کو اپنے دادا کی سلطنت سے سبقت شروع ہوئی۔ اس قدر مدت تک سلطنت کسی بادشاہ انگلینڈ نے سلف سے اس وقت تک نہیں کی۔

سلطان عبدالحمید خاں: ۲ نومبر ۱۸۹۶ء۔ سلطان عبدالحمید خاں قسطنطنیہ میں ۲۴ ستمبر ۱۸۴۲ء کو پیدا ہوئے۔ اس حساب سے اب ان کی عمر ۵۲ سال کی ہے۔

بیرونی کتب خانے: ۲۴ نومبر ۱۸۹۶ء۔ اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ کتب خانہ شاہی فرانس میں چار کروڑ ایک لاکھ کتابیں ہیں۔ انگلستان کے کتب خانہ میں دو کروڑ دو لاکھ ساٹھ اور روس کے کتب خانہ میں دو کروڑ ہیں۔

جنگ روم و یونان: ۸ مئی ۱۸۹۷ء۔ جو جنگ مابین سلطان روم اور یونانیوں کے ہوتی تھی اس میں سلطان کو کامل کامیابی حاصل ہوئی اور یونانیوں کو ہزیمت حاصل ہوئی اور شہر تھیسلی پر سلطان کا قبضہ ہو گیا۔ اس فوج ترکی کے کمان پر اور افسر اعلیٰ ادھم پاشا تھے جن کی عموماً تعریف ہو رہی ہے۔ سلطان کی اس کامیابی سے تمام یورپ حیرت میں آ گیا اور جو خیالات فاسد و حقارت آمیز جنگی کارروائی ترکوں کی نسبت دول یورپ کو تھے وہ اس ظفر یابی

سے بالکل بدل گئے اور سمجھنے لگے کہ یہ بھی ایک معتد بہ سلطنت یورپ میں ہے ۔

وفات گلیڈسٹن: ۲۲ مئی ۱۸۹۸ء۔ ۱۹ مئی کو گلیڈسٹن سابق وزیر اعظم نے بعمر ۸۹ سال قضا کی۔ وہ ۲۹ دسمبر ۱۸۰۹ء کو پیدا ہوئے تھے۔ یہ بہت بڑا لائق شخص تھا اور جب اسپیچ کہنے کھڑا ہوتا تھا تو ایسا خوش بیان تھا کہ گھنٹوں میں ایک بحث ختم ہوتی تھی۔ سخت متعصب شخص تھا ترکوں سے اسے عداوت قلبی تھی ۔

اسپین و امریکہ: ۲۶ اگست ۱۸۹۸ء۔ بابت جزیرہ کیوبا مابین اسپین و امریکہ اس عرصہ میں سخت لڑائیاں ہوئیں اور امریکہ کو کامیابی حاصل ہوئی سلاطین یورپ نے باہم صلح کرادی اور جزیرہ کیوبا اور فلی پائن کو اسپین سے امریکہ کو دلوا دیا۔

ملکوں میں شادیاں: ۱۵ ستمبر ۱۸۹۸ء۔ آج بمعائنہ اودھ اخبار بحوالہ انگریزی ایکسپریس معلوم ہوا کہ ممالک ذیل میں شادی لڑکوں اور لڑکیوں کی کس عمر میں ہوتی ہے ۔

نام ملک	عمر لڑکا	عمر لڑکی	نام ملک	نام لڑکا	نام لڑکی
آسٹریا	۱۴ سال	۱۴ سال	جرمنی	۱۸ سال	۱۸ سال
فرانس و بلجیم	۱۶ سال	۱۵ سال	اسپین	۱۴ سال	۱۲ سال
روس و سیکسنی	۱۴ سال	۱۶ سال	یونان	۱۴ سال	۱۲ سال
سوئزرلینڈ	۱۴ سال	۱۲ سال			

قسطنطنیہ میں شادیاں اس وقت ہی ہو جاتی ہیں جب لڑکے لڑکیاں چل پھر سکتے ہیں اور ضروری مذہبی احکام تمام کو سمجھ سکتے ہیں۔

جنگ افریقہ: ۲۴ اکتوبر ۱۸۹۹ء۔ آج کل مابین ڈچ کاشتکاران ٹرانسوال واقع افریقہ و انگریزوں کے جنگ ہو رہی ہے اور بمقام گلنکو بہت بڑی جنگ ہوئی جس میں ۲۲ افسر انگریزوں کے مع جنرل سمنز قتل ہوئے۔

۲۰ دسمبر ۱۸۹۹ء۔ دیکھنے اخبارات سے واضح ہوتا ہے کہ جو لڑائی افریقہ میں مابین ڈچ کاشتکاران ٹرانسوال اور انگریزوں کے ہو رہی ہے وہ بہت سخت مقابلہ ہے۔ ہر لڑائی میں بہت سی فوج انگریزوں کی مقتول و مجروح ہوتی ہے۔ ڈچ ایسے نشانہ باز ہیں کہ افسروں کو چن چن کر مارتے ہیں اور سامان حرب بمقابلہ انگریزوں کے ان کا بہت عمدہ ہے۔ پانچ ہزار گز کے فاصلہ پر ان کی توپوں کے گولے بہت عمدہ کام کرتے ہیں اور انگریزوں کی توپیں دو ہزار گز کے فاصلہ کی ہیں۔ جناب ملکہ معظمہ قیصرہ ہند کو اپنی فوج کے ضائع ہونے کا سخت ملال ہے۔ حتیٰ کہ ان کا قصد تھا کہ بعد بڑے دن کے لندن کے دوسرے مقامات کو جاویں لیکن دفور رنج و غم سے انھوں نے فسخ عزیمت کی۔

۲۸ جنوری ۱۹۰۰ء۔ ۱۱ اکتوبر ۱۸۹۹ء سے جنگ ٹرانسوال واقع افریقہ مابین بوئر و برٹش گورنمنٹ کے شروع ہے۔ سرکار کے بہت سے افسر و فوجی لوگ ضائع ہوئے۔ ڈفرن کے خلف اکبر اور لارڈ رابنس کے اکلوتے بیٹے

اور لفٹیننٹ گورنر وہاں کے صاحبزادے اور بڑے بڑے باقی افسر قتل ہوئے۔

١٩ر مارچ ١٩٠٠ء۔ بلوم فانیٹن دارالخلافت آرنج فری اسٹیٹ واقع جنوبی افریقہ کو لارڈ رالبسن نے فتح کرلیا جس کے پریسیڈنٹ مسٹر اسٹمن تھے اور جنرل کرانجی فوج ملک آزاد کو گرفتار کرکے جزیرۂ سینٹ ہلینا بھیج دیا۔

٣١ر مئی ١٩٠٠ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار واضح ہوا کہ ... ٣٠ر مئی سے دارالخلافت بلوم فانیٹن جنوبی افریقہ کیپ ٹاؤن میں شامل کیا گیا اور اس کی رو سے 'آرنج فری اسٹیٹ' کا نام آئندہ 'آرنج ریور کالونی' ہوگا گویا کہ وہ اب مستقل طور پر انگریزوں کے قبضہ میں آگیا ہے۔ اب جہاں تک اخبارات دیکھے جاتے انگریزوں کی برابر فتح معلوم ہوتی جاتی ہے اور بوئر لوگ پسپا ہو رہے ہیں وہ جوہانس برگ میں پہنچ گئے ہیں۔

ملک چین: ۵ر اگست ١٩٠٠ء۔ آج کل ملک چین پر پانچ سلطنتیں چڑھائی کر رہی ہیں جن کی فوجیں برابر بذریعہ جہازات اپنے اپنے دارالسلطنتوں سے بھیجی جارہی ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ جرمن، فرانس، روس، اٹلی، جاپان اور خصوصی برٹش گورنمنٹ۔ سبب اس لڑائی کا اخباروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قوم بکسر باشندگان چین کی پیشوا ہے انھوں نے جب یہ دیکھا کہ غیر ملک کے لوگ چینیوں کو عیسائی کیے ڈالتے ہیں تو انھوں نے غدر کر دیا اور جس قدر عیسائی لوگ بہم پہنچے ان کو قتل کر ڈالا۔ چوں کہ ان کی جماعت کثیر ہے اور اہل چین بھی ان کو اپنا پیشوا مانتے ہیں اسی وجہ سے وہ لوگ بھی بکسروں کے شریک ہوگئے اور چینی فوج بھی ان کی معاون ہے اسی وجہ سے ان کی بہت بڑی جمعیت ہوگئی ہے اور ان سلطنتوں سے مقابلہ کے لیے وہ تیار ہیں۔ دیکھا چاہیے کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ بظاہر سخت کشت و خون ہوتا نظر آتا ہے اور عجب نہیں بعد ظفر پانے سلطنت ملک چین کو باہم تقسیم کرلیں یہ سلطنت بہت پرانی ہے اور کسی نے اس وقت تک اس پر دست درازی نہیں کی تھی لیکن اب انجام بخیر نظر نہیں آتا۔

جنگ افریقہ: ١٢ر جنوری ١٩٠١ء۔ اگرچہ جنرل رابٹس صاحب ٹرانسوال سے لندن کو واپس گئے لیکن ابھی بوئر برابر لڑ رہے ہیں اور جنگ ختم نہیں ہوئی۔ مسٹر کلوگر کے قائم مقام برابر لڑ رہے ہیں۔

وفات ملکہ وکٹوریہ: ٢٤ر جنوری ١٩٠١ء۔ آج کے اردو اخبار میں یہ خبر غمگین مندرج دیکھی گئی کہ جناب ملکہ معظمہ وکٹوریہ قیصر ہند نے اس جہان فانی سے بمقام لندن رحلت کی۔ وقت ٦ بجے ٣٠ منٹ شام کا تھا اور تاریخ ٢٢ر جنوری ١٩٠١ء۔ کوئی شک نہیں کہ قیصرۂ ہند نہایت ہی خوش اقبال تھیں اور جس تاریخ سے وہ تخت انگلستان پر بیٹھیں برابر فتوحات بے پایاں حاصل ہوتے رہے اور اولاد کی جانب سے بھی وہ نہایت خوش نصیب تھیں کہ جن کے نواسے قیصر ولیم شہنشاہ جرمن ہیں۔ اس وقت ملکہ معظمہ کے قبضہ میں کل دنیا کا

ایک چہارم حصہ ہے اور کبھی آفتاب ان کی عملداری میں غروب نہیں ہوتا۔ اب ذیل میں ان کی مختصر سوانح عمری حوالۂ قلم کرتا ہوں جس سے ان کی عمر و تخت نشینی کا حال مفصل معلوم ہوگا۔

جناب ملکہ معظمہ قیصرۂ ہند ۲۴ر جنوری ۱۸۱۹ء کو پیدا ہوئی تھیں۔ ۲۰ر جون ۱۸۳۸ء کو تخت نشین ہوئیں اور ۲۲ر جنوری کو رحلت کی۔ اس وقت ان کی عمر ۸۲ سال تھی۔ دو مرتبہ مرحومہ کی پنجاہ سالہ و شصت سالہ جوبلی ہوئی اور ایسی خوش اقبال تھیں کہ ایک چہارم دنیا ان کے قبضہ میں تھی۔

تدفین ملکہ و جلوس ایڈورڈ ہفتم۔ ۲ر فروری ۱۹۰۱ء۔ چونکہ آج جناب ملکہ معظمہ قیصرۂ ہند دفن ہوں گی لہٰذا آج قصبہ سندیلہ کی کل دوکانیں بند ہوگئیں اور دفاتر میں تعطیل ہے۔

"پرنس آف ویلز جو تخت سلطنت انگلستیہ پر جلوس فرما ہوئے ان کا لقب ایڈورڈ ہفتم رکھا گیا اور چھ ایڈورڈ اس سے قبل تخت انگلستیہ پر نشست فرما چکے ہیں جن کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے:"

نام	سن جلوس	سن کنارہ کشی یا وفات
ایڈورڈ اول	۱۲۷۲ء	۱۳۰۷ء
ایڈورڈ دویم	۱۳۰۷ء	۱۳۲۷ء
ایڈورڈ سویم	۱۳۲۷ء	۱۳۷۷ء
ایڈورڈ چہارم	۱۴۶۱ء	۱۴۸۳ء
ایڈورڈ پنجم	جنوری ۱۴۸۳ء (کذا)	
ایڈورڈ ششم	۱۵۴۷ء	۱۵۵۳ء
ایڈورڈ ہفتم	۲۲ر جنوری ۱۹۰۱ء	

جنگ افریقہ: ۲۹ر جولائی ۱۹۰۱ء۔ جنگ ٹرانسوال واقع جنوبی افریقہ ہنوز ختم نہیں ہوئی ہے اور بوئر اور انگریزوں سے برابر لڑائی جاری ہے۔ بالفعل انگریزی فوج بہ تعداد دو لاکھ ۵۳ ہزار جنگ گاہ میں موجود ہے یہ لڑائی ۱۱ر اکتوبر ۱۸۹۹ء کو شروع ہوئی تھی۔ انگریزی فوج کے سپہ سالار لارڈ کچنر ہیں۔

دختر کلاں ملکہ وکٹوریہ: ۱۵ر اگست ۱۹۰۱ء۔ شاہنشاہ بیگم فریڈرک جرمنی یعنی دختر کلاں ملکہ وکٹوریہ بعوارض چند در چند بعمر ۶۰ سال بتاریخ ۵ر اگست ۱۹۰۱ء فوت ہوئیں جن کے ماتم کے واسطے چھ ہفتہ کا اعلان ہوا ہے۔

صدر امریکہ: ۱۶ر ستمبر ۱۹۰۱ء۔ مسٹر میکنلے پریسیڈنٹ امریکہ کو بتاریخ ۱۴ر ستمبر ۱۹۰۱ء جبکہ وہ بفلو نمائش گاہ کی سیر کر رہے تھے مسمی نزول بوروئے نے دو گولیاں ماریں جس سے انھوں نے انتقال کیا اور روزولٹ ان کی جگہ پر پریسیڈنٹ مقرر ہوئے۔

امیر کابل: ۱۹ر اکتوبر ۱۹۰۱ء۔ امیر عبدالرحمٰن خاں امیر کابل نے ۱۳ر اکتوبر سن الیہ کو انتقال کیا اور بجائے ان کے حبیب اللہ خاں تخت کابل پر جانشین ہوئے اور انھیں کی بابت خاں مرحوم جانشینی تجویز کرتے تھے۔ حبیب اللہ خلف اکبر ہوش مند آدمی معلوم ہوتے ہیں جن کی جانشینی گورنمنٹ آف انڈیا نے بھی منظور کی۔ عبدالرحمٰن مرحوم نہایت

لائق و دانشمند شخص تھے جنھوں نے افاغنہ پر بہت رعب و ہیبت کے ساتھ سلطنت کی اور جن کو انگریزی گورنمنٹ بھی مانتی تھی اور دو لاکھ روپیہ ماہوار ان کو گزارہ دیتی تھی اس غرض سے کہ روسی گورنمنٹ سے وہ کہیں مل نہ جائیں جو عرصہ سے براہ کابل ہندوستان کا قصد رکھتے ہیں۔ امیر صاحب نے اپنی فوج بھی قواعد داں تیار کی تھی۔

جنگ افریقہ: ۱۳؍ اکتوبر ۱۹۰۱ء۔ جنگ ٹرانسوال جنوبی افریقہ اب تک مابین برٹش گورنمنٹ اور بوئروں کے قائم ہے جس کا آغاز ۱۱؍ اکتوبر ۱۸۹۹ء کو ہوا تھا۔ اگرچہ بوئر بوجہ کمی فوج برابر دو تین روز تک جنگ نہیں کر سکتے ہیں تاہم سرکار کی ایک بڑی فوج سے جس کی تعداد دو لاکھ ترپن ہزار ہے برابر مقابلہ کرتے رہتے ہیں۔

آبادی لندن: یکم فروری ۱۹۰۲ء۔ لندن کی مردم شماری انتالیس لاکھ ۳۶ ہزار ۵۴۱ ہے جس کی تصدیق اودھ اخبار مورخہ امروزہ سے ہوئی۔ دس سال گزشتہ میں تین لاکھ کا اضافہ ہوا۔

وفات لارڈ ڈفرن: ۱۴؍ فروری ۱۹۰۲ء۔ لارڈ ڈفرن صاحب سابق گورنر جنرل نے ۱۲؍ فروری ۱۹۰۲ء کو بمقام لندن رحلت کی۔

جنگ افریقہ: ۲۹؍ مارچ ۱۹۰۲ء۔ جنوبی افریقہ میں ٹرانسوال کے بوئرز نے جو برٹش گورنمنٹ سے ۱۱؍ اکتوبر ۱۸۹۹ء کو لڑائی شروع کی تھی وہ ابھی تک بدستور جاری ہے۔ سچ یہ ہے کہ وہ لوگ نہایت جری ہیں۔ باوجودیکہ ان کی فوج بہت قلیل ہے اور انگریزوں کی ڈھائی لاکھ سے زیادہ ہے لیکن وہ برابر مقابلہ کر رہے ہیں اور اکثر مقاموں پر انگریزوں کو فاش زک دی۔ اگرچہ ایک روز یہ شدنی ہے کہ وہ مغلوب ہو کر اطاعت قبول کر لیں گے مگر ابھی تک ان کے دم خم وہی ہیں۔

۳؍ جون ۱۹۰۲ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ جو لڑائی برٹش گورنمنٹ اور جنوبی افریقہ کے بوئر کے درمیان ۱۱؍ اکتوبر ۱۸۹۹ء سے ہو رہی تھی اور فریقین کے بڑے بڑے نامی افسر مقتول و مجروح ہوئے تھے اب دونوں میں تاریخ ۳۱؍ مئی ۱۹۰۲ء کو حسب شرائط ذیل صلح ہو گئی۔ کوئی شک نہیں کہ بوئر لوگ نہایت جری جفاکش اور بہادر ہیں جنھوں نے اپنی تھوڑی فوج سے ایک بہت بڑی سلطنت ذی مقدور سے جس کی کئی لاکھ فوج ان کے مقابل تھی دو سال سات مہینے تک برابر لڑتے رہے اور بہت کچھ نقصان اسے پہنچایا اور جس کا کروڑوں روپیہ اس جنگ میں صرف ہو گیا۔ شرائط صلح حسب ذیل ہیں: (شرائط بوجہ طویل عبارت ہونے کے ترک کیے گئے۔ ہاشمی)

۷؍ جون ۱۹۰۲ء۔ آج کے اودھ اخبار سے معلوم ہوا کہ جنگ جنوبی افریقہ میں جو بوئر لوگوں کے ساتھ سرکار انگریزی سے ۱۱؍ اکتوبر ۱۸۸۹ء شروع ہوئی تھی اور ۳۱؍ مئی ۱۹۰۲ء کو بذریعہ صلح ختم ہوئی اس میں سرکار انگریزی کا ۱۴۰ ملین پونڈ جو مساوی ۳۴۰ ملین روپے کے ہے صرف ہوا۔ اس صرف میں معمولی فوجی صرفہ جو بالفعل بہت زیادہ ہو گیا ہے داخل نہیں ہے اور نہ وہ معاوضہ شامل ہے جو گورنمنٹ کو اختتام جنگ کے بعد صرف کرنا ہوگا جس کی تعداد دس ملین پونڈ ہوگی۔ شرائط صلح میں جو مابین فریقین کے قرار داد

ور گورنمنٹ انگریزی ہوئی ہے اس کی شرط پنجم یہ ہے کہ ڈچ کاشتکار اپنی حفاظت جان و مال کے خیال سے اپنی رائفل و
ندوقیں اپنے پاس رکھیں گے اور چھٹی شرط یہ ہے کہ مصارف جنگ کے متعلق جنوبی افریقہ کے ٹرانسوال والوں سے کچھ نہیں لیا جائیگا۔

جشن تاج پوشی: ۷ر جون ۱۹۰۲ء۔ جشن تاج پوشی شہنشاہ انگلینڈ و ہندوستان جو ۲۶ر جون ۱۹۰۲ء
بمقام لندن ہوگا اس میں بہت سے ہندوستانی والیان ملک جیسے مہاراجہ گوالیار، مہاراجہ جے پور، مہاراجہ اندور،
مہاراجگان سنگھ بیکانیر اور بہت سے رؤسائے اعظم ہندوستان سے جارہے ہیں مگر مہاراجہ جے پور نے یہ قابل یادگار
بات کی ہے کہ اپنے کرم ودھرم کو قائم رکھنے کے لیے اپنے دیوتا بھی ولایت کو ساتھ لے گئے ہیں حتی کہ ہاتھ پاک
کرنے کی مٹی بھی جہاز پر رکھ لی گئی ہے۔ بمقابلہ اور والیان ملک کے مہاراجہ نے نہایت پابندی مذہب کے ساتھ لندن
کا سفر اختیار کیا۔ اودھ سے راجہ پرتاب بہادر سنگھ پرتاب گڑھ بھی گئے ہیں غرض کہ اضلاع کلکتہ، بمبئی، مدراس اور لاہور
وغیرہ سے خاص خاص روسا شرکت جشن تاج پوشی کے لیے جارہے ہیں اور بہت بڑا صرف اپنے اوپر گوارا کیا
ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ بہ تقریب تاج پوشی ان کے واسطے کیا سلوک ہوتا ہے۔

جنگ افریقہ: ۹ر جون ۱۹۰۲ء۔ لارڈ کچنر صاحب سپاہ سالار جنوبی افریقہ کو بہ بدلہ دوے ان کے حسن
خدمات کے کہ انھوں نے بوئر لوگوں سے ۳۱ر مئی کو صلح کرادی پچاس ہزار پونڈ انعام دیا گیا اور خطاب وائی کاؤنٹ
کا شہنشاہ انگلینڈ نے مرحمت فرمایا اور قبل اس کے لارڈ رابرٹس کو بخدمات و کارگزاری جنوبی افریقہ کے ایک لاکھ
پونڈ انعام میں ملا تھا۔ اس صلح سے جو ٹرانسوال میں بوئر لوگوں سے ہوئی تمامی ہندوستانی عموماً اور
اہل انگلینڈ خصوصاً خوشیاں منارہے ہیں۔

۱۰ر جون ۱۹۰۲ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار امروزہ سے واضح ہوا کہ بحوالہ بیان محکمہ جنگ جنوبی افریقہ کی لڑائی
میں ایک ہزار چھتر افسر اور پینتیس ہزار آٹھ سو بہتر سپاہی ہلاک ہوئے اور تین ہزار ایک سو سولہ افسر اور چھتر ہزار
تین سو چودہ سپاہی معزول الخدمت قرار پاکر انگلینڈ کو واپس بھیجے گئے۔

وزیر اعظم انگلستان: ۱۶ر جولائی ۱۹۰۲ء۔ ۱۲ر جولائی ۱۹۰۲ء کو لارڈ سالسبری وزیر اعظم انگلستان نے
اپنی ملازمت سے استعفا دے دیا جس کو شاہ انگلینڈ و ہندوستان نے منظور فرمایا بجائے ان کے مسٹر بالفورڈ وزیر اعظم مقرر ہوئے۔

ایک عورت: ۱۳ر دسمبر ۱۹۰۲ء۔ آج کے اودھ اخبار میں درج ہے کہ ایک عورت متصل شہر نیپلز علاقہ
ملک اٹلی میں رہتی تھی اس کی شادی کو ۱۹ر سال ہوئے ہیں اس مدت میں اس کے ۶۲ بچے پیدا ہوئے۔ ۵۹ لڑکے
اور تین لڑکیاں۔ ۹ برس کے عرصہ میں گیارہ توام لڑکے پیدا ہوئے اور پانچ مرتبہ چار چار اور تین مرتبہ تین تین اور

ایک مرتبہ چار بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئی اور کچھ زمانے میں صرف ایک ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اب اس کی عمر ۵۷ برس کی ہے اور ضعیف و ناتواں ہو گئی ہے کچھ کام اس سے نہیں ہوتا لہٰذا اٹلی کے بادشاہ کو ایک عرضداشت بھیجی گئی ہے کہ اسکا کچھ گذارہ مقرر کر دیں۔

آبادی چین: ۱۴ر اپریل ۱۹۰۲ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ جدید مردم شماری ملک چین بیالیس کروڑ ۴ لاکھ ۴۷ ہزار ہے۔

شاہ سرویہ: ۱۹ر جون ۱۹۰۲ء۔ ۳ر جون ۱۹۰۲ء کے تار برقی میں درج ہے کہ الیکزنڈر شاہ سرویہ مع ملکہ ڈریگا کے اپنے ایوان میں قتل کر دیئے گئے اور ان کے ساتھ میں وزیر اعظم سرویہ اور ایک جنرل فوج بھی مقتول ہوئے۔ خود ان کی فوج نے انھیں قتل کیا۔ وجہ قتل یہ معلوم ہوئی کہ کل رعایا شاہ سے ناراض تھی۔ ۱۴ر اگست ۱۸۷۹ء کو شاہ سرویہ پیدا ہوئے۔ ۱۳ر اپریل ۱۸۹۳ء کو تخت نشین ہوئے تھے اور ۲۱ر جولائی ۱۹۰۰ء کو شاہ سرویہ نے اپنی نسبت میڈم ڈریگا سے کی اور ۵ر اگست ۱۹۰۰ء کو شادی ہو گئی۔ ڈریگا والدہ کی پیش خدمت تھی جس کی عمر اس وقت ۳۴ سال کی تھی یعنی بادشاہ سے عمر میں بڑی تھی۔ اس کا شوہر مر چکا تھا مگر بوجہ حسین ہونے کے بادشاہ نے اس کے ساتھ عقد کر لیا تھا۔

وفات پوپ: ۲۳ر جولائی ۱۹۰۳ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ پوپ روم اٹلی جو یورپ میں واقع ہے۔ ۲۰ر جولائی ۱۹۰۳ء کو وقت ۴ بجے دن کے فوت ہوئے۔ عمر ۹۴ سال تھی اور ۱۸۱۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ پیشوا مذہب رومن کیتھولک کے تھے۔

وفات سالسبری: ۲۶ر اگست ۱۹۰۳ء۔ ۲۲ر اگست سن الیہ کو لارڈ سالسبری سابق وزیر اعظم انگلستان نے بمقام لندن قضا کی۔

بلغاریہ: ۱۴ر اگست ۱۹۰۳ء۔ سرحد بلغاریہ پر پہلی بغاوت ہوئی لہذا فوج سلطان ٹرکی واسطے تادیب کے بھیجی گئی اور سلونیکا کے قریب کل جماعت باغیوں کی گولہ اندازی افواج ٹرکی سے مقتول ہوئی۔

ترکی: ۱۶ر ستمبر ۱۹۰۳ء۔ ممالک مقدونیا و بلغاریہ و سلونیکا کی بغاوت سے آج کل بڑی بے نظمی سلطان ٹرکی کی عملداری میں ہے اور افواج ٹرکی باغیوں کو گوشمالی واجب دے رہی ہے۔ ہزاروں آدمیوں کا کشت و خون ہو رہا ہے سلاطین یورپ سلطان کو الگ دھمکی دے رہے ہیں کہ بدنظمی جلد دور کی جائے۔

۷ر ستمبر ۱۹۰۳ء۔ آج کل یورپ میں باہم سلاطین میں انواع و اقسام کے نزاعات پیدا ہیں اور عموماً سلطان ٹرکی کو دبا رہے ہیں اور کوئی شک نہیں کہ وہ بتیس دانتوں میں ایک زبان ہے۔

جنگ روس و جاپان: ۱۳ر فروری ۱۹۰۴ء۔ ۱۲ر فروری سن الیہ کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ۹ر فروری ۱۹۰۴ء کو بوقت ۱۰ بجے دن مابین روس و جاپان لڑائی شروع ہو گئی اور جاپانی تارپیڈو کشتیوں نے

بمقام پورٹ آرتھر روسی جہازوں پر حملہ کیا یہ لڑائی دو بڑی سلطنتوں میں شروع ہوئی ہے۔ دیکھیے کیا انجام ہوتا ہے۔

سب سے زیادہ معمر شخص: ۴ مارچ ۱۹۰۴ء۔ دنیا بھر میں سب سے زیادہ سن دراز و معمر شخص شہر ماسکو (روس) کا "ذاذاز" دوست ہے۔ اس کی عمر ۱۳۱ برس کی ہے اور اس کی بصارت علی حال بھی قائم ہے۔ اس کا باپ ۱۲۰ برس کا ہو کر فوت ہوا تھا۔

آبادی امریکہ: ۱۲ اپریل ۱۹۰۴ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ یونائیٹڈ اسٹیٹ آف امریکہ کی مردم شماری جو ۱۹۰۳ء میں ہوئی تھی اس کی تعداد ۷ کروڑ ۹۹ لاکھ ہے۔

جنگ روس و جاپان: ۲۰ اپریل ۱۹۰۴ء۔ آج کے اخبار میں میں نے پڑھا کہ جاپان کے مرد و عورت دونوں اپنی بہبودی ملک کے عاشق ہیں جس کی تصدیق مضامین ذیل سے ہوتی ہے:

۱۔ ایک سپاہی لڑائی پر جاتا تھا۔ اس نے اپنے ایک دوست سے جو اسے پہنچانے آیا تھا بیان کیا مجھے ایک روز مرنا ہے پس بہتر ہے کہ ہم اپنے ملک کے لیے مریں۔ اگر میں بستر مرگ پر مروں گا تو کیا خاک میری ماں کو تسلی ہوگی۔

۲۔ ایک عورت نے اپنے بیٹے سے جب وہ لڑائی پر جاتا تھا کہا کہ تم لڑائی پر جاتے ہو پھر گھر کو واپس نہ آنا۔ اگر تم واپس ہوئے تو میں معاف نہ کروں گی۔

۳۔ قصبہ ذکاس کی ایک عورت کو جب معلوم ہوا کہ اس کا بیٹا اس بنا پر جنگی خدمت سے معاف کر دیا گیا کہ وہ اکیلا اپنی ماں کا پرورش کرنے والا تھا تو اس نے فوراً خودکشی کر لی اور اس نے ایک خط میں بیان کیا کہ میں نے اس وجہ سے خودکشی کی کہ میرا بیٹا اپنے ملک کے لیے روسیوں سے آزادی کے ساتھ لڑ سکے۔ دم توڑنے کے وقت اس نے وہ خنجر جس سے خودکشی کی تھی اپنے بیٹے کو دے دیا کہ وہ اس کو دشمن کے خلاف کام میں لائے لڑکے نے خنجر کمر سے باندھ لیا اور فوراً جنگ میں شریک ہونے کی درخواست پیش کر دی۔ واہ رے ملک کی ہمدردی! جبکہ ایسی اہم قومی و ملک کی ہمدردی ہو تو کیوں نہ اس ملک کے بادشاہ کو پوری کامیابی حاصل ہو سکے۔

یکم جون ۱۹۰۴ء۔ مابین جاپان اور روسیوں کے ہنوز جنگ جاری ہے۔ دو مقاموں پر سخت لڑائیاں ہوئیں۔ ایک دریائے "یالو" پر ۶ مئی کو دوسری "نان شان" پر ۱۵ مئی کو اور ان دونوں جنگوں میں جاپانیوں کو کامیابی حاصل ہوئی نیز پورٹ آرتھر میں "نان شان" کی جنگ میں جاپانیوں کو ۷۳ توپیں کلدار باقی میدانی اور بندوقیں و گولے بارود حاصل ہوئے اور بہت سے روسی گرفتار ہوئے۔

دنیا کی قومیں: ۲۹ جون ۱۹۰۴ء۔ فرانس کے ایک پروفیسر کے پاس کل روئے زمین کی اقوام کے

آدمیوں کے سر موجود ہیں۔ ان کی تعداد ۲۰۴ ہے۔ اس سے صفا ہویدا ہے کہ تمام دنیا میں ۹۲۰ قومیں آباد ہیں۔

جنگ روس وجاپان: یکم جولائی ۱۹۰۴ء۔ اب تک جس قدر لڑائیاں مابین جاپان و روس ہوئیں ان سب میں جاپانی فتح یاب ہوئے اور ۲۸ر جون کی جنگ میں انھوں نے کئی مقامات منچوریا کے روسیوں کے مقابلے میں فتح کر لیے۔
۱ر ستمبر ۱۹۰۴ء۔ آج کل خوب گھمسان لڑائی مابین جاپان اور روسیوں کے بمقام 'لیونگ' متعلقہ منچوریا (چین) ہو رہی ہے۔ ڈھائی ڈھائی لاکھ فوج و تیرہ سو توپیں دونوں جانب ہیں اور ہزاروں آدمی دونوں طرف مقتول و مجروح ہو رہے ہیں۔ ۲۴ و ۲۸ر اگست سن الیہ کے مابین سخت لڑائیاں ہوئیں اور تیسری ستمبر سن الیہ بوقت ۹ بجے صبح کے جاپانیوں نے روسیوں سے 'لیونگ' چھین لیا اور اپنا قبضہ و دخل کیا۔ جنرل کروپٹکین روسیوں کی طرف افسر اعلیٰ ہیں اور جنرل کردکے اور جنرل اوکو جاپانیوں کی جانب سے۔

اصطباغ ولی عہد روس: ۱۰ر ستمبر ۱۹۰۴ء۔ اودھ اخبار محررہ امروزہ سے واضح ہوا کہ شہنشاہ روس نے بعد اصطباغ اپنے بیٹے شہنشاہ زادہ کی پیدائش کی یادگار میں اپنے دست مبارک کا لکھا ہوا حکم مشعر باین خلاصہ نافذ کیا کہ:
۱۔ فوج بحری و بری کو جو بکرار ارتکاب جرم پر سزائے جسمانی دی جاتی تھی وہ نہ دی جاوے گی۔ ۲۔ بقایا مال گزاری ٹیکس و محصول معاف کیا گیا۔ ۳۔ پیداوار زمانہ قحط کی تقاوی کاشتکاروں کو معاف ہوئی۔ ۴۔ بہت سے جرمانے معاف ہوئے۔ ۵۔ قیدیوں کی سزائیں جو پولٹیکل قیدی اپنے زمانۂ قید میں نیک کردار رہے ان کی سزا ختم ہونے پر انھیں سِول اختیارات دیے جائیں۔ ۶۔ جن لوگوں نے قبل پندرہ سال پولٹیکل جرائم کیے ہیں اور ان کا پتہ نہیں ہے اب ان پر جرم عائد نہ ہوگا۔ ۷۔ جو پولٹیکل مجرم روس سے بیرونجات کو بھاگ گئے ہیں اگر وہ پھر اعادہ چاہیں تو وزیر داخلہ سے درخواست کریں۔ ۸۔ فن لینڈ کی باقیات مال گزاری و ٹیکس بابت ۱۹۰۴ء جو شہنشاہ زادہ کی پیدائش تک ادا نہیں کیے گئے وہ سب معاف کیے گئے اور وہاں کے کاشتکاروں کو جو نقد روپیہ یا غلہ دیا گیا اس میں سے ایک چوتھائی معاف ہوگا۔ ۹۔ موضعوں اور قصبوں پر اپنی طرف سے لوگ منتخب نہ کرنے کی علت میں جو جرمانہ کیا گیا تھا وہ بھی معاف کر دیا گیا۔ ۱۰۔ جو لوگ بغیر منظوری فن لینڈ سے چلے گئے تھے ان کو ایک سال کے اندر واپس آنے کی اجازت دی گئی۔ ۱۱۔ ان میں سے جو لوگ ملازم فوج تھے وہ فوراً واپس آ کر حکام فوجی کو رپورٹ کریں۔ ان کو سزا نہ دی جائے گی۔ ۱۲۔ فوجی کاموں سے گریز کرنے کے جرم میں خاندان یہود پر جو جرمانہ ہوا تھا۔ ان کو سزا نہ دی جائے گی۔

معاہدہ تبت و برٹش: ۱۲ر ستمبر ۱۹۰۴ء۔ برٹش گورنمنٹ اور تبت کے مابین حسب ذیل عہد نامہ ہوا۔

۱۔تبت پابند ہوگا کہ مقامات جنگ، گیانٹسی اور گرٹوک میں بازار قائم کرے۔ ۲۔ تبت نصف ملین اسٹرلنگ تاوان جنگ ادا کرے۔ اس کی سالانہ تین اقساط ہوں گی۔ ۳۔ برٹش فوج وادی چمبی پر اس وقت تک رہے گی جب تک کہ تاوان جنگ ادا نہ ہو۔ ۴۔ برٹش گورنمنٹ کی رضامندی کے بغیر کوئی غیر سلطنت تبت کے کسی علاقہ پر قبضہ نہ کرے گی، نہ کسی سلطنت کو اس کا پٹہ دیا جائے گا۔ ۵۔ کوئی غیر سلطنت معاملات تبت میں دست اندازی نہ کرے گی۔ نہ کوئی سڑک یا ریلوے یا تار برقی قائم کرے گی اور نہ کوئی کان کھدوائے گی۔

گھڑی کی ایجاد: ۱۱ اکتوبر ۱۹۰۴ء۔ پٹر ہیم نے ۱۵۴۰ء میں گھڑی کی ایجاد کی تھی جس کی یادگار مقام نورم برگ میں قائم ہونے والی ہے۔

سلطنت روس: ۲۷ نومبر ۱۹۰۴ء۔ نکولس دوم شہنشاہ حال روس کے زیر حکومت براعظم یورپ کا نصف مشرقی حصہ اور براعظم ایشیا میں نصف سے کچھ کم شمالی حصہ ہے۔ اس وسیع سلطنت کی لمبائی شرقاً غرباً تخمیناً پانچ ہزار میل ہے اور عرض شمالاً جنوباً قریباً ایک ہزار تین سو بیس میل کے ہے۔ کل سلطنت کا رقبہ ۸۶ لاکھ مربع میل ہے یعنی کل روئے زمین کا ایک ششم حصہ زیر حکومت شاہنشاہ روس ہے۔ آبادی اس عظیم الشان سلطنت کی ۱۳ کروڑ ہے۔ بحالت جنگ بری فوج کی تعداد ۵۲ لاکھ اور سواروں کی تعداد ۲۵ لاکھ ۷۰ ہزار ہے۔ روسی عموماً بلند قامت مضبوط جری ہوتے ہیں۔

شہزادہ کابل: ۲۵ دسمبر ۱۹۰۴ء۔ سردار عنایت اللہ خاں خلف اکبر امیر حبیب اللہ خاں والی کابل براہ لاہور، الہ آباد روانہ کلکتہ ہوئے جہاں لارڈ کرزن صاحب وائسرائے ہند سے ۲۷ دسمبر کو ملاقات کریں گے۔ سردار صاحب کی عمر ۱۶ سال ہے، اور پانچ سو افغان ان کے ساتھ ہیں اور کل خرچہ ان کی آمد و شد کا گورنمنٹ برداشت کرے گی۔

۵ جنوری ۱۹۰۵ء۔ سردار عنایت اللہ خاں خلف اکبر امیر حبیب اللہ خاں والی کابل ہندوستان سے واپس گئے اور لارڈ کرزن صاحب وائسرائے ہند نے بمقام کلکتہ ان کی بہت خاطر مدارت کی اور گورنمنٹ نے کل صرفہ ان کی آمد و شد ہندوستان کا اپنے ذمہ برداشت کیا۔

راتھس چائلڈ: یکم جنوری ۱۹۰۵ء۔ راتھس چائلڈ انگلستان میں ایک مشہور مہاجن ہے۔ اس کے تمول کو بعض سلطنتیں بھی نہیں پہنچ سکتیں۔ اس کی منٹوں کی آمدنی لاکھوں شمار کی گئی ہے۔ جو نصائح اس نے اپنے خاندان کو کیے ہیں وہ غور کے قابل ہیں۔ ۱۔ اپنے کاروبار کے ہر جزو پر نہایت احتیاط کے ساتھ غور کرو۔ ۲۔ ہر کام کو بہ مستعدی انجام دو۔ ۳۔ ہر ایک معاملہ کا بعد غور کامل فیصلہ ناطق کرو۔ ۴۔ اس قسم کی کوشش کرتے رہو جو باعث ترقی ہوں۔ ۵۔ جو مصائب و تکالیف پیش آویں ان کو صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کرو۔ ۶۔ راست بازی کو مقدم سمجھو۔ ۷۔ تا قیام زندگی ہر کام میں

کوشش وسعی بلیغ کرتے رہو۔ ۸۔ کاروباری معاملہ میں ہرگز جھوٹ نہ بولو۔ ۹۔ لوگوں سے فضول ملاقات نہ کرو۔ ۱۰۔ اپنا فرض بہ مستعدی ادا کرو۔ ۱۱۔ اپنے اوقات عمدہ کاموں میں صرف کرو۔ ۱۲۔ جو امور اتفاقی پیش آئیں ان کا زیادہ مت خیال کرو۔ ۱۳۔ اپنے متعلقہ کاموں کو نہایت محنت و مستعدی کے ساتھ انجام دو۔

جنگ روس وجاپان: ۱۸ فروری ۱۹۰۵ء۔ جاپانی روس کو منچوریا میں برابر شکست پر شکست دے رہے ہیں۔ 'پورٹ آرتھر' ان سے چھین لیا اور 'مکڈن' میں بھی شکستیں دے رہے ہیں۔ ادھر سے 'سینٹ پیٹرس برگ'، دارالخلافت روس 'وارسا' 'طفلس' وغیرہ میں لاکھوں آدمی بلوہ کر رہے ہیں۔ حضرت شہنشاہ روس محل میں چھپے ہیں۔ فوجیں بلوائیوں کا مقابلہ کر رہی ہیں جس کی وجہ سے زائد فوجیں واسطے مقابلہ جاپان کے منچوریا نہیں جا سکتی ہیں۔

۸۔ فروری ۱۹۰۴ء کو جنگ شروع ہوئی تھی اور ہنوز برابر قائم ہے۔ جنرل اسٹوسل پورٹ آرتھر سے اس شرط کے ساتھ رہا ہوئے کہ وہ آئندہ کسی جنگ میں جاپانیوں کے مقابلہ میں نہ آئیں گے اور جنرل کروپٹکن 'مکڈن' میں شکستیں کھا رہے ہیں جو گورنمنٹ روس سے وعدہ کر کے آئے تھے کہ جاپانیوں کو سمندر میں ڈبو دوں گا۔

۱۶ر مارچ ۱۹۰۵ء جاپانیوں نے 'مکڈن' واقع منچوریا کو روسیوں سے چھین لیا۔ اس لڑائی میں دو لاکھ روسی فوج قتل ہوئی اور چار ہزار مقید اور پانچ سو توپیں علاوہ بہت سے سامان رسد وغیرہ کے جاپانیوں کے ہاتھ آئیں۔ جنرل کروپٹکن جو جاپانیوں کو شکست دینے کے واسطے روس سے آئے تھے انھوں نے شہنشاہ روس کو درخواست دی ہے کہ ان کی جگہ پر کوئی دوسرا جنرل بھیجا جاوے۔ اب ان کے آرام کرنے کے دن ہیں۔

صلح کابل: ۲۷ر مئی ۱۹۰۵ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ سفارت مسٹر ڈین صاحب کابل کو گئی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شرائط صلح تمام بدستور وہی قائم رہے جو امیر عبدالرحمان خاں مرحوم والی کابل کے عہد میں طے ہوئے تھے اور امیر حبیب اللہ خاں والی کابل کو گورنمنٹ ہند نے خطاب عطا کیے: ہز مجسٹی خود مختار دولت افغانستان۔

ایک عورت: ۲۱ر جولائی ۱۹۰۵ء۔ شہر کیوبا (امریکہ) میں ایک عورت جس کی عمر ۳۰ سال اور قد ۲۶ انچ کا ہے اس کا نام 'جیکوبا' ہے۔ حالت نوعمری میں اس کے سونے کے لیے معمولی ڈبے کے برابر پلنگ کافی ہوتا تھا۔ اس عمر میں بھی اس کے پیر آٹھ مہینے کے اوسط قد کے بچے کے برابر ہیں۔ اگرچہ بہت پستہ قد ہے۔ مگر بدن کے کل عضو سڈول ہیں۔ اس کو گانے بجانے کا بہت شوق ہے۔ بائیسکل پر خوب سواری کرتی ہے۔

جہاز پر متلی: ۲۱ر جولائی ۱۹۰۵ء۔ جہاز کی سواری میں اکثر آدمیوں کو متلی ہوتی ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ ایک آنکھ میں پٹی باندھ لی جاوے تو جلد آرام ہو جاتا ہے (از اودھ اخبار)

صلح روس وجاپان: ۸ر ستمبر ۱۹۰۵ء۔ پورٹسماؤتھ واقع امریکہ میں ۵ ستمبر ۱۹۰۵ء کو روسی اور جاپانیوں کے مابین صلح نامہ پر دستخط ہوگئے اور لڑائی ختم ہوگئی ۔ شرائط صلح نامہ ۲۸ر ستمبر کی تاریخ میں درج ہیں جو بوجہ طوالت نظر انداز کیے گئے ہیں (ہاشمی)

جاپان میں اخبارات: ۲۸ر ستمبر ۱۹۰۵ء۔ ابتداءً جاپانی اخبار ۱۸۶۲ء میں جاری ہوا تھا جس کو ۴۴ سال کا زمانہ ہوا اور اب جاپان میں ایک ہزار پانچ سو اخبار اور رسالے روزانہ نکلتے ہیں۔

متفرقات معلومات: ۴ر اکتوبر ۱۹۰۵ء۔ آلپین بنانے کا سب سے بڑا کارخانہ 'برمنگھم' واقع انگلستان میں ہے جہاں ہر روز تعطیل وغیرہ کا زمانہ چھوڑ کر ۳ کروڑ ۷۰ لاکھ آلپینیں تیار کی جاتی ہیں۔ نیوزی لینڈ کے جنوب میں جزائر کا ایک مجمع جو سات بہنیں کہلاتا ہے اس میں ہمیشہ بارش ہوا کرتی ہے۔ سمندر کا پانی نہایت ہی مقوی جگر، معدہ وگردہ ہوتا ہے۔

روس میں بغاوت: ۱۸ر دسمبر ۱۹۰۵ء۔ روسی سلطنت کے ہر صوبہ میں غدر وفساد تو ہو ہی رہا تھا۔ اب فوج بحری و بری نے بھی بغاوت شروع کر دی ہے۔ چنانچہ اخبارات سے واضح ہوتا ہے کہ روسی فوج 'ہاربن' نے بھی غدر کر دیا اور شہر مذکور کو لوٹ وجلا کر خاکستر کر دیا۔ یہ بد اقبالی نکولس دوئم شہنشاہ روس کی ہے۔

آبادی جرمنی: ۲۲ر مارچ ۱۹۰۶ء سلطنت جرمنی کی آبادی مردم شماری کے لحاظ سے ۶ کروڑ ۶۰ لاکھ ۸۳ ہزار ہے۔

اسپین: ۵ر جون ۱۹۰۶ء۔ ۳۱ر مئی ۱۹۰۶ء کو شاہ الفانسو اسپین کی شاہزادی 'اینا' (انگلستان) سے شادی ہوئی۔ جب جلوس گرجا گھر سے ایوان خاص کو چلا تو کسی بدمعاش نے ایک گول چمکدار فولاد کا پھینکا جو شاہ کے گھوڑوں کے نیچے گر کر پھٹا۔ گاڑی شاہی کے پہیوں کو سخت نقصان پہنچا۔ گھوڑے ہلاک ہو گئے۔ تین افسر سات سپاہی اور پانچ تماشائی ہلاک ہوئے اور ایک سو آدمی سخت مجروح ہوئے۔ تحقیقات ہو رہی ہے۔ شاہ اور ان کی بیگم محفوظ رہیں۔

شہد کی مکھیوں کے چھتے: ۶ر نومبر ۱۹۰۶ء۔ اسپین میں شہد کی مکھیوں کے چھتے سولہ لاکھ نوے ہزار رہیا۔ ان میں سے ۱۹ ہزار من شہد نکلتا ہے۔ (از اودھ اخبار مورخہ امروزہ)

امیر کابل: ۶ر جنوری ۱۹۰۷ء۔ امیر حبیب اللہ خاں والی کابل بعزم سیاحت ہندوستان ۲ر جنوری ۱۹۰۷ء 'لنڈی کوتل' سرحد ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ان کے ہمراہ گیارہ سو آدمی سوار وپیدل ہیں۔ امیر کی بہت خاطر مدارات ہو رہی ہے اور جب وہ ۲ر جنوری سن الیہ کو داخل پشاور ہوئے تو ان کے قدموں کے پاس اکیس ہزار کی تھیلیاں منجانب گورنمنٹ بطور نذرانہ رکھی گئیں۔ امیر نے قبول کیا۔

وفات شاہ ایران: ۱۱ر جنوری ۱۹۰۷ء ۸ر جنوری ۱۹۰۷ء کو وقت ۱۱ بجے رات کو مظفر الدین شاہ بادشاہ ایران نے قضا کی

امیر کابل: ۱۳ر جنوری ۱۹۰۷ء-امیر حبیب اللہ خاں والی کابل اب بادشاہ قرار دیے گئے ہیں اور ہمارے شہنشاہ نے ان کو خطاب 'ہز میجسٹی' کا عطا کیا ہے جس کے معنی بادشاہ کے ہیں اور اسی مضمون کا انھوں نے تار بھی بمقام 'لنڈی کوتل' دیا تھا جس میں لقب 'ہز مجسٹی' درج تھا- امیر کابل قبل تشریف آوری آگرہ کے اول ۸ر جنوری کو بمقام 'سرہند' علاقہ پٹیالہ کو اس غرض سے تشریف لے گئے کہ حضرت امام ربانی یعنی مجدد الف ثانی کے مزار پر فاتحہ پڑھیں جو مقام 'سرہند' سے دو میل فاصلہ پر واقع ہے- یہ ایک کابلی بزرگ ہیں جو شہنشاہ اکبر کے عہد سلطنت میں ہندوستان تشریف لائے تھے- اولاً ان کی شہنشاہ نے بہت قدر و منزلت کی لیکن وہ مذہب شاہ پر معترض ہوئے تو ان کی وقعت فی الجملہ گھٹ گئی- بعد انتقال شہنشاہ اکبر جہانگیر شاہ کا زمانہ آیا تو اراکین سلطنت کی شکایتوں پر پیر صاحب قلعہ گوالیار میں چند سال کے واسطے قید کر دیے گئے- تھوڑے عرصہ کے بعد جب سلطنت میں کچھ بے قراری پیدا ہو گئی تو جہانگیر نے نہایت اعزاز کے ساتھ حضرت کو قید سے رہائی دے کر اپنے پاس بلا لیا اور خود بھی مرید ہو گئے اور تقریباً تیرہ ہزار آدمی اراکین سلطنت میں سے جو مخالف تھے وہ سب کے سب پیر صاحب کے مرید ہو گئے اور ہر ایک حکم ان کا بطیب خاطر بجا لایا گیا- حضرت مجدد الف ثانی نے اسی زمانہ میں پیشین گوئی کی تھی کہ آئندہ ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ جب درانی قوم کے افغان تخت کابل پر مسلط ہوں گے- چونکہ امیر حبیب اللہ خاں درانی نسل سے ہیں لہٰذا جب وہ ہندوستان کو تشریف لائے تو انھوں نے حضرت صاحب کے مزار پر جا کر نہایت عقیدت کے ساتھ فاتحہ خوانی فرمائی-

۱۰ر جنوری ۱۹۰۷ء- اخباروں سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر حبیب اللہ خاں امیر کابل جو ہندوستان تشریف لائے ہیں منجانب برٹش گورنمنٹ ان کی بہت بڑی خاطر داری اور اعزاز ہو رہا ہے جیسا کہ کسی اور نے کسی دوران کے ماسبق کا نہیں کیا- بمقام آگرہ لفٹیننٹ گورنر اضلاع متحدہ آگرہ و اودھ و لارڈ منٹو گورنر جنرل وائسرائے ہند نے بڑی بڑی دعوتیں کیں جس سے امیر بہت خوش ہوئے اور ایک موٹر کار گاڑی قیمتی تین ہزار ان کی نذر کی گئی اور لارڈ منٹو نے امیر کو معزز تمغہ پہنایا-

۱۹ر جنوری ۱۹۰۷ء- امیر حبیب اللہ خاں کا یادگار حکم: چونکہ نماز عید الاضحیٰ امیر صاحب جامع مسجد دہلی میں پڑھیں گے لہٰذا دہلی کے مسلمانوں نے چاہا کہ ایک سو گائیں قربانی کریں- جب امیر صاحب کو یہ کیفیت معلوم ہوئی تو انھوں نے حکم دیا کہ ہم ہندوستان کو بنا بر سیر و تفریح آئے ہیں نہ کسی فریق کے دل دکھانے کو ہم یہ نئی بات جس سے اہل اسلام و اہل ہنود کے اکثر جھگڑے ہوتے ہیں ناپسند کرتے ہیں اور بجائے اس کے اگر مسلمان بکرے

ذبح کریں گے تو باعث ہماری خوشی کا ہوگا۔ چنانچہ اب یہی ہونے والا ہے۔ اہل ہنود اس بات سے بہت خوش ہوئے اور جا بجا کو میٹیاں کر کے اظہار خوشی کے تار امیر صاحب کی خدمت میں بھیج رہے ہیں۔

۲۲ر جنوری ۷ ۱۹۰ء - ۱۶ر جنوری کو امیر حبیب اللہ خاں امیر کابل علی گڑھ میں تشریف لائے اور کالج علیگڑھ کو غور و خوض کے ساتھ دیکھ کر نسبت تعلیم مذہبی کے واقفیت حاصل کی اور خوش ہوئے اور مبلغ بیس ہزار روپے بنا بر اعانت کالج مرحمت فرمائے اور چھ ہزار روپیہ سالانہ دینے کا وعدہ کیا۔

۱۹ر جنوری ۷ ۱۹۰ء - ۲۵ر جنوری کو امیر حبیب اللہ خاں نے نماز عید الاضحیٰ مسجد عیدگاہ دہلی میں پڑھی اور نماز جمعہ جامع مسجد میں۔ ۵۰ ہزار آدمی شریک نماز تھے۔

شاہ ایران: ۲۰ر فروری ۷ ۱۹۰ء شاہ مظفر الدین متوفی ایران کے بجائے محمد علی مرزا تخت نشین ہوئے۔

امیر کابل: ۱۹ر مارچ ۷ ۱۹۰ء - امیر حبیب اللہ خاں امیر کابل کے ہندوستان میں تشریف لانے سے افغانستان کے متعصب فرقے بہت ناراض ہوئے ہیں اور جن خاص امور پر اعتراض ہے وہ یہ ہیں کہ امیر نے انگریزی افسروں کے ساتھ کھانا کھایا۔ ان سے بہت اظہار دوستی کا کیا۔ یوروپین لباس اختیار کیا اور بہت انگریزی چیزیں مول لیں۔ ایک ہوٹل کا تمام سامان خرید کیا۔ کلکتہ میں امیر فراموشن ہو گئے۔ جلال آباد کے قریب ضلع لاغمان میں ملاؤں کا ایک بہت بڑا جلسہ ہوا اور اشتعال طبع دلانے والی تقریریں کی گئیں اور یہ الزام لگایا گیا کہ امیر نے فراموشن ہو کر اپنا مذہب بدل دیا۔ بعض غالی ملاؤں نے یہ بھی کہا کہ اب وہ ہم پر قابل حکمرانی نہیں۔ اس جلسہ کو سردار عنایت اللہ خاں خلف اکبر امیر حبیب اللہ خاں نے منتشر کر دیا۔

شاہ ایران: ۲۰ر مارچ ۷ ۱۹۰ء - محمد علی شاہ بادشاہ ایران مظفر الدین شاہ مرحوم کے خلف اکبر ہیں جن کی عمر ۳۴ سال ہے۔ ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کی شادی ملکہ جہاں خاتون وزیر جنگ کی بیٹی سے ہوئی۔

شاہ پرتگال: ۷ر فروری ۱۹۰۷ء - آج کے روزانہ اخبار سے معلوم ہوا کہ شاہ کارلوس پرتگیز اور ان کے بیٹے ولی عہد اور ملکہ پرتگیز گاڑی پر سوار جا رہے تھے اور ان کا چھوٹا بیٹا مینول گاڑی پر سوار تھا تو تین شخصوں نے گاڑی پر چڑھ کر ریوالور طپنچے سے شاہ اور ولی عہد کو گولیوں سے مار ڈالا۔ البتہ ملکہ اور ان کا چھوٹا بیٹا محفوظ رہا۔ قاتل گرفتار ہو کر قتل کیے گئے۔

وزیر اعظم انگلستان: ۱۱ر اپریل ۱۹۰۸ء - ۸ر اپریل ۱۹۰۸ء کو مسٹر کیمبل بنرمن نے بوجہ علالت خود عہدہ وزیر اعظم لندن میں استعفا داخل کر دیا اور بجائے ان کے مسٹر اسکوئیتھ وزیر اعظم مقرر ہوئے۔

افغانستان: ۶ر جون ۱۹۰۸ء - مہمندوں کو برٹش گورنمنٹ کی فوج نے گوشمالی واجب دی جس سے

انھوں نے اطاعت قبول کی اور جرمانہ بھی ادا کیا جنرل الکاکس فوج کے اعلا افسر تھے جن کی ہدایت سے فوج لڑی اور بہت بڑی کامیابی ہوئی۔

سلطان روم: ۲۶ اگست ۱۹۰۸ء سلطان عبدالحمید خاں نے قسطنطنیہ میں اپنی گورنمنٹ قائم کی اگرچہ بعض وزرار اس کے خلاف تھے لیکن سلطان نے اس کی کوئی پروا نہیں کی اور ان کو موقوف کر کے جدید وزرار مقرر کیے لیکن عموماً سلطان کی مکمل رعایا نے اظہار خوشی کا کیا اور یوروپین بادشاہ بھی پارلیمنٹ قائم ہونے سے بظاہر رضامند و خوش ہیں۔

عرب میں ریل: یکم ستمبر ۱۹۰۸ء۔ آج کی تاریخ سے مقام دمشق تا مدینہ منورہ ریل جاری ہوگئی۔ اب حجاج کو وہاں جانے میں بہت آسانی ہوگی۔ اور اس ریل کے جاری ہونے سے عموماً کل باشندگان ہندوستان وغیرہ جہاں مسلمان رہتے ہیں بڑی خوشی اور جشن منائے گئے۔

ایران میں غدر: ۲۰ ستمبر ۱۹۰۸ء۔ اخباروں سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت ایران میں غدر ہو رہا ہے۔ بادشاہ ایران آئینی حکومت کو پسند نہیں کرتے اور رعایا اسی کی خواستگار ہے۔ لہذا رعایا اور بادشاہ میں بمقام تبریز سخت لڑائی ہوئی اور برابر خوں ریزی ہو رہی ہے۔ دیکھا چاہیے کہ اس کا کیا انجام ہوتا ہے۔

ترکی میں آئینی حکومت: ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۸ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۸ء کو ترکی میں آئینی حکومت قائم ہوئی اور پارلیمنٹ کا انعقاد ہوا اور باقاعدہ گورنمنٹ قرار دی گئی۔

وفات شاہ چین: ۱۷ نومبر ۱۹۰۸ء۔ آج کے اودھ اخبار سے معلوم ہوا کہ ۱۴ نومبر کو شاہنشاہ چین نے اور ۱۵ نومبر کو بیوہ شاہنشاہ چین نے انتقال کیا۔

۲۰ نومبر ۱۹۰۸ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ۱۶ نومبر ۱۹۰۸ء کو پونے دو سالہ فرزند پرنس چین شاہنشاہ پرنس جن ریجنٹ سلطنت چین مشتہر ہوئے کیونکہ شاہنشاہ اور بیوہ شاہنشاہ بیگم نے ۱۴، ۱۵ نومبر سن الیہ کو انتقال کیا تین ہزار برس پہلے جو جو رسوم و اعمال کیے جاتے تھے وہی شاہنشاہ اور بیگم شاہنشاہ کے وقت عمل میں آئے۔

ترکی: ۱۳ دسمبر ۱۹۰۸ء۔ سلطان ترکی نے ۱۷ دسمبر ۱۹۰۸ء کو پارلیمنٹ کا افتتاح کیا اور دستوری انتظام کے آغاز سے اپنی مسرت ظاہر کی۔

انگلستان میں برف باری: ۴ جنوری ۱۹۰۹ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ برطانیہ عظمیٰ میں طوفان برف کا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ ۱۹ ڈگری تک برف بستہ ہیں۔

ترکی: یکم مئی ۱۹۰۹ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ۲۷ اپریل ۱۹۰۹ء کو عبدالحمید خاں سلطانِ روم

حسب فتوائے شیخ الاسلام تخت سے اتار دیے گئے کہ انھوں نے احکام شرع شریف کے خلاف کیا اور بے گناہوں کا خون بہایا اور رشید آفندی ان کے چھوٹے بھائی کو جن کی عمر ۶۵ سال کی ہے بلقب محمد پنجم تخت نشین کیا۔ سلطان عبدالحمید کی عمر ۶۸ سال کی ہے۔ انھوں نے ۳۳ برس حکومت کی۔ ان کا منشا یہ تھا کہ پارلیمنٹ بھی قائم ہو اور میرا بھی اختیار رہے۔ اس وجہ سے بڑا کشت و خون ہوا۔ سلطان عبدالحمید خاں مع گیارہ بیگمات و دو چھوٹے بیٹوں کے سلونیکا کو منتقل ہوئے اور بہ حالت جلاوطنی وہیں سکونت گزین ہوں گے۔ ۲۹ اپریل کو سلونیکا بھیجے گئے۔

یکم جون ۱۹۰۹ء۔ ۲۰ جون ۱۹۰۹ء سلطان عبدالحمید کی ذاتی دولت پانچ کروڑ پونڈ ہے جو معرض ضبطی میں آوے گی اور مصارف سلطنت میں صرف ہوگی۔

ایران: ۲۱ جولائی ۱۹۰۹ء۔ ۱۷ جولائی ۱۹۰۹ء کو شاہزادہ ولی عہد سلطان احمد مرزا فرزند دوم شاہ ایران مشتہر ہوئے اور فرقہ نیشنلسٹ کے خوف سے جسکے سرگروہ اسی خاں ہیں محمد علی شاہ ایران نے روسی سفارت خانہ میں پناہ لی۔

ترکی: ۲۹ جولائی ۱۹۰۹ء سلطنت قسطنطنیہ کی پارلیمنٹ نے چودہ ہزار تین سو چھہتر روپیہ مشاہرہ سلطان معزول عبدالحمید خاں کا مقرر کیا۔

باورچی خانہ شاہ روس: ۱۹ اگست ۱۹۰۹ء شاہنشاہ روس کے باورچی خانہ میں ۴۴ عدد نقرئی کڑاھیاں ہیں جن کی ہر ایک کی قیمت ۴۰ پونڈ ہے۔ شاہنشاہ روس کا میر سامان ایک فرانسیسی شخص ہے جس کے ساتھ مثل ایک شریف آدمی کے برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اس کو تلوار باندھنے کا اختیار ہے۔ اس کی تنخواہ چھ ہزار چار سو پونڈ سالانہ ہے۔ اس کی ماتحتی میں چھ اور آدمی کام کرتے ہیں جن کی تنخواہیں تین ہزار پونڈ سے بارہ ہزار پونڈ سالانہ تک ہے۔

شاہ ایران: ۲۴ نومبر ۱۹۰۹ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ محمد علی شاہ معزول بادشاہ ایران ۶ ستمبر ۱۹۰۹ء کو خارج البلد ہوئے۔

وفات ایڈورڈ ہفتم: ۸ مئی ۱۹۱۰ء۔ آج کے پانیر سے واضح ہوا کہ ایڈورڈ ہفتم بادشاہ انگلستان اور ہمارے شہنشاہ معظم نے ۶ مئی ۱۹۱۰ء کا دن گزار کے رات کو گیارہ بج کے ۴۵ منٹ پر بعارضہ انفلوئنزا انتقال کیا۔ عمر ۷۰ سال تھی۔ اعلیٰ حضرت کے زمانہ میں قحط و زلزلہ و طاعون اور ہر قسم کی پریشانیاں زیادہ لاحق رہیں۔

مصارف تدفین شاہان: ۹ اگست ۱۹۱۰ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم وغیرہ کی لاش دفن کرنے میں حسب ذیل خرچ ہوا۔

شہنشاہ ایڈورڈ۔ ۴۰ ہزار پونڈ، ملکہ وکٹوریہ۔ ۲۵ ہزار پونڈ۔ قیصر جرمنی ولیم۔ ۵۶ ہزار پونڈ منجانب

اہل جرمنی وگورنمنٹ جرمنی کی جانب سے ایک لاکھ اسی ہزار پونڈ، ڈیوک آف ولنگٹن۔ ایک لاکھ پونڈ، نیلس کی لاش اٹھانے میں ۸۵ ہزار پونڈ۔

آبادی نیویارک: ۱۸ستمبر ۱۹۱۰ء۔ حال میں جو مردم شماری نیویارک میں ہوئی اس کی تعداد ۴۵ لاکھ ۲۶ ہزار آٹھ سو تیراسی ہے۔ دس برس میں ۱۳ لاکھ ۲۹ ہزار ۲۹۱ آدمیوں کا اضافہ ہوا۔

جاپان میں طوفان: ۷ ستمبر ۱۹۱۰ء۔ آج کے اودھ اخبار سے معلوم ہوا کہ ٹوکیو اور اس کے گرد و نواح میں جو فی الحال سیلاب آیا تھا اس کے نقصانات جان و مال کا اندازہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ ایک ہزار ایک سو آدمی مفقود الخبر ہیں ۲۔ ایک لاکھ اکیاون ہزار چھ سو پینتیس مکان سیلاب میں ڈوب گئے ۳۔ پینتیس ہزار نو سو تریسٹھ مکان بہہ گئے ۴۔ چار سو ننانوے پل دریاؤں کے کچھ مسمار ہوئے اور چار سو اٹھارہ پل بہہ گئے ۵۔ ایک سو پندرہ مکانات کی زمین شق ہو گئی۔

ایران: ۲۲ ستمبر ۱۹۱۰ء سلطان احمد مرزا خلف محمد علی شاہ ایران نے وفات پائی۔

پرتگال: ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۰ء۔ پرتگال میں جمہوری سلطنت قائم ہو گئی اور شاہ ... الفانسو جہاز پر سوار ہو کر لندن وغیرہ کی طرف جان بچانے کو چلے گئے۔

تاج کی قیمت: ۲۸ نومبر ۱۹۱۰ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ شاہ پرتگال کے تاج کی قیمت ۳ کروڑ روپیہ کہی جاتی ہے اور شہنشاہ روس کے تاج کی قیمت ۲½ کروڑ روپیہ ہے۔ شہنشاہ جارج پنجم کے تاج میں چھوٹے بڑے ۱۳۶۰ سفید ہیرے ہیں اور ۲۷۳ رنگین الماس جڑے ہوئے ہیں۔ چار بڑے موتی ایک لعل اور ایک بڑا نیلم لگا ہوا ہے۔ ۱۶ چھوٹے نیلم ۲۶۵ چھوٹے موتی ۱۸ بڑے مروارید اور چار پنے بھی اس میں لگے ہیں۔ ... کے تاج کی قیمت کا اندازہ ۲ کروڑ روپیہ کیا جاتا ہے جس میں کوہ نور کی قیمت کا حساب نہیں لگایا گیا ہے۔

ولی عہد جرمنی: یکم جنوری ۱۹۱۱ء۔ آج کل ولی عہد جرمنی ہندوستان کے مشہور شہروں کی سیاحت فرما رہے ہیں اور ہماری گورنمنٹ انکا ہر قسم کا اعزاز دعوت و تواضع فرما رہی ہے کہ وہ وکٹوریہ آنجہانی کے نواسے ہیں۔

آبادی جرمنی: ۲۷ فروری ۱۹۱۱ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ دسمبر ۱۹۱۰ء میں مردم شماری ملک جرمنی کی ہوئی تھی اس کی تعداد چھ کروڑ اڑتالیس لاکھ چھیانوے ہزار ہے۔ ۱۹۰۵ء میں مردم شماری ملک مذکور کی چھ کروڑ اکتالیس لاکھ تھی۔ اس چار پانچ سال کے عرصہ میں بیالیس لاکھ پچپن ہزار کی زیادتی ہوئی۔

باب چہارم

مُقامی حالات لکھنؤ، ہردوئی وغیرہ کے

وبائی ہیضہ: ۲۵ر جولائی ۱۸۶۷ء۔ آج ریڈ صاحب ڈپٹی کمشنر ہردوئی وارد سندیلہ ہوئے اور انھوں نے حکم قطعی صادر کیا کہ ایک محلہ کا آدمی دوسرے محلہ میں نہ جاوے بلکہ جابجا راستوں میں پہرے تلنگوں کے مقرر کر دیے اور کیفیت یہ ہے کہ چھ سات آدمی روزمرہ مرتے ہیں۔ انگریزی ڈاکٹر ہردوئی سے آیا وہ ہر مریض کو دیکھنے جاتا ہے اور علاج کرتا ہے۔

۳۰ر جولائی ۱۸۶۷ء۔ خلائق سندیلہ شدت وبا سے ازحد پریشان ہے بعض لوگ بیرونجات کو چلے گئے تقریباً ۲۵ر آدمی روز ہیضہ سے مرتے ہیں۔

۲۰ر اگست ۱۸۶۷ء۔ سندیلہ سے اب ہیضہ بالکل دفع ہو گیا اور لغایتہ ۱۷ر اگست قریب چھ سو آدمیوں کے باشندگان سندیلہ سے نذر ہیضہ ہوئے اکثر ان میں قابل یادگار ہیں۔ بابو جوالا پرشاد صاحب ہیڈ ماسٹر (بسواں) کی تحریر سے معلوم ہوا کہ قصبہ خیرآباد میں اس مرتبہ ہیضہ سے ایک ہزار آدمی فوت ہوئے۔

۲۷ر اگست ۱۸۶۷ء۔ آج جناب قاضی وجیہہ الدین صاحب نے اعلان کیا کہ عنقریب بلائے آسمانی ہیضہ سے سخت تر آنے والی ہے سب لوگوں کو چاہیے کہ استغفار و توبہ کریں اور خیرات دیویں۔ (یہ بلا نہیں آئی۔ ہاشمی)

رہس: ۲۴ر مئی ۱۸۶۸ء۔ آج شب کو احاطہ تقی میاں میں منشی فضل رسول صاحب نے ناچ رہس کا کرایا۔ یہ رہس لکھنؤ سے آیا تھا۔ اخیر شب کے جوگن نے بہت لطف دیا۔ مجمع کثیر تھا۔ ایسا ناچ پہلی مرتبہ میرے ہوش میں ہوا۔

۲۵ر مئی ۱۸۶۸ء۔ اس بات سے مجھے سخت ملال ہوا کہ والد کے سیوم کے روز منشی فضل رسول صاحب کے یہاں ناچ کرایا گیا۔ اگرچہ اس محلہ میں تین دن سے زیادہ ماں دان نہیں ہے لیکن قرابت قریبہ ہرگز مقتضی ایسے جلسہ کی نہ تھی۔

مردم شماری: ۴ر اکتوبر ۱۸۶۸ء۔ تمام ہندوستان میں مردم شماری ہونے والی ہے۔ سندیلہ کے ایک محلہ کا کام مردم شماری محمد کریم خاں تحصیلدار نے مجھے تفویض کیا۔

۱۶ر اکتوبر ۱۸۶۸ء۔ آج نمبر خانہ شماری قصبہ سندیلہ میں دینا شروع ہوئے اکثر رئیس سندیلہ اس کام کو انجام دے رہے ہیں۔

رہس: ۱۹ر دسمبر ۱۸۶۸ء۔ آج شادی میر ابوالحسن فرزند ڈپٹی محمد حسن 'منڈی' کی تھی جس میں رہس لکھنؤ رہس

جتنا ہر طوائف سندیلہ سے ناچ وغیرہ میں مقابلہ ہوا۔ رئیس سندیلہ کو ترجیح رہی۔

عملیات: ۱۹ راگست ۱۸۶۹ء۔ آج ہری ہر شاہ فقیر اندرائن (سندیلہ) نے حامد حسین کو طلب کیا اور شاہ 'اندراش' کی قبر کے سامنے انھیں کھڑا کیا۔ کھڑے ہونے کے ساتھ ہی حامد حسین نے غل شور مچایا کہ حسن علی شاہ گوپامئو کا ہوں۔ حامد حسین کے بالوں پر عاشق ہو کر سترہ دن سے ان کے ساتھ رہتا ہوں لیکن اب چھوڑتا ہوں ہرگز نہ آؤں گا۔ غرض کہ ہری ہر شاہ نے حامد حسین کے چہرہ پر کچھ پڑھ کر پھونک ڈالی اور حسن علی شاہ چلے گئے اور حامد حسین صحیح و سالم ہو گئے۔ یہ کیفیت میری چشم دید ہے۔ معلوم نہیں کہ کیا اسرار تھا۔

شکار: ۲۲ فروری ۱۸۷۰ء۔ آج سید فضل حسین (ابن سید فضل رسول) لکھنؤ سے آئے ان سے دریافت ہوا کہ شاہزادہ ایڈنبرا واسطے شکار کے جنگل نیپال کو تشریف لائے۔

وفات علی نقی خاں: ۲۰ نومبر ۱۸۷۱ء۔ نواب علی نقی خاں سابق وزیر اعظم لکھنؤ نے بعارضہ ہیضہ نواب محسن الدولہ لکھنؤ کے مکان پر قضا کی اور لاش ان کی کربلا بھیجی گئی۔

سندیلہ میں ریل: ۱۵ جنوری ۱۸۷۲ء۔ اب انجن ریل مع گاڑیوں مملو کارخانہ سڑک ریل کا برابر آمد و شد رکھتا ہے اور کام تعمیر اسٹیشن سندیلہ بعجلت ہو رہا ہے۔ ظن غالب ہے کہ ماہ آئندہ سے ریل سندیلہ سے لکھنؤ تک جاری ہو جائے۔

۲۵ جنوری ۱۸۷۲ء۔ اب ریل گاڑی 'سیت' (سندیلہ اور ہردوئی کے درمیان ایک اسٹیشن ہاشمی) تک جاتی ہے۔ آج تفریحاً برخوردار مصطفےٰ علی ہمراہ جان علی خدمتگار سیت تک گئے اور شام کو واپس آئے۔

۲۹ جنوری ۱۸۷۲ء۔ آج بابو ایشر داس اسٹیشن ماسٹر سندیلہ مقرر ہو کر آئے۔ ستر روپے تنخواہ مقرر ہوئی اور اشتہار دیا کہ یکم فروری سے سندیلہ سے لکھنؤ تک ریل جاری ہوگی اور پانچ آنہ کرایہ دینا پڑے گا۔ ٹھیکہ تعمیر اسٹیشن سندیلہ متعلق حسن علی قصاب کانپور کے ہے۔

یکم فروری ۱۸۷۲ء۔ آج سات بجے صبح سواریاں بذریعہ ریل لکھنؤ روانہ ہوئیں۔ دوسری ریل لکھنؤ سے چار بجے آوے گی۔ پانچ آنہ فی کس کرایہ ہے۔

۲ فروری ۱۸۷۲ء۔ آج شیخ فہیم الزماں صاحب وعزیزی بشیر الزماں تفریحاً بہ سواری ریل لکھنؤ گئے۔

۴ فروری ۱۸۷۲ء۔ آج منشی امتیاز الزماں خویش چودھری سرفراز احمد تعلقہ دار 'سمجہ' (ضلع بارہ بنکی) مع اپنے چھوٹے بھائی محمد زماں کے تفریحاً بہ سواری ریل سندیلہ کو آئے اور دس روپے برخوردار مصطفےٰ علی کو بطور شیرینی دیے۔

۱۵ جولائی ۱۸۷۲ء۔ آج سندیلہ سے ہردوئی تک ریل جاری ہوئی۔ پانچ آنہ تین پائی محصول مقرر ہوا۔

ہ ریل پر برخوردار مصطفٰی علی میرے پاس 'چونسہ' آئے[1]

ایک لڑکا: ۱۹ اگست ۱۸۷۲ء۔ شیو چرن عرف بین فرزند اکلوتا بابو بودھن پال ڈاکٹر شفاخانہ سندیلہ آج
ہیضہ وبائی میں مبتلا ہوا اور ۱۰ بجے وفات پائی۔ یہ لڑکا نیک بخت تھا۔ عربی، فارسی انگریزی میں اچھی لیاقت
رکھتا تھا۔ سب لوگوں کو اسکے انتقال کا افسوس ہوا۔ ڈاکٹر بودھن پال نے اس کی قبر اپنے بلغ منصوبہ میں پختہ بنوائی ۔

اولاد میر قاسم علی: ۲ اکتوبر ۱۸۷۲ء۔ آج میر قاسم علی سوداگر نے بعارضہ پیرانہ سالی انتقال کیا۔ مرحوم
اولاد کی طرف سے خوش نصیب تھے اور جب ان کے اولاد ہوئی تو دو لڑکے ایک ساتھ پیدا ہوئے کبھی لڑکا
لڑکی۔ اور کبھی دونوں لڑکے۔ ایسا آدمی نگاہ سے کم گزرا ہے۔ اخیر عمر میں منشی فضل رسول صاحب کے وہاں چار روپیہ
ماہواری کے نوکر تھے۔ حساب کھنڈسار و دیہات کا لکھا کرتے تھے ۔

ایک بنگالی: ۱۲ دسمبر ۱۸۷۲ء۔ آج بضرورت کام ریل 'کانپور گیا۔ بابو کیلاش چندر مکرجی سے ملاقات ہوئی
ان کا قیام کانپور میں رہتا ہے۔ آدمی طویل القامت و فربہ اندام خلیق ہیں اور تنخواہ ۱۵۰ روپے پاتے ہیں۔
ایسا موٹا تازہ آدمی بنگال میں نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا ہے۔

عرس محمد علی شاہ: ۴ جنوری ۱۸۷۳ء۔ آج شب کو عرس محمد علی شاہ کا حسین آباد لکھنؤ میں
تھا۔ کرم خاں ملازم حسین آباد کی تحریک سے میں بھی شریک ہوا اور پھاٹک حسین آباد پر بیٹھ کر خوب تماشا دیکھا۔
کیفیت روشنی و آتش بازی نہایت درجہ قابل تعریف ہے۔ میں نے جو سامان اس امام باڑہ میں آرایش دیکھا
اس کی کوئی تعریف نہیں ہو سکتی۔ واقعی محمد علی شاہ نہایت عقیل و تجربہ کار وانجام بیں بادشاہ تھے
ان کی یادگار کسی حالت میں مٹ نہیں سکتی[2]

شطرنج: ۱۶ جنوری ۱۸۷۳ء۔ آج بابو امر ناتھ سے دو بازی شطرنج کی میں نے جیتیں۔ آٹھ سال
کے بعد آج شطرنج کھیلنے کا اتفاق ہوا۔ باوصف کامیابی میں اپنے نفس پر لعنت کرتا تھا کہ کیوں میں مرتکب
ایسے فعل لہو ولعب کا ہوا جو میرے خلاف عادت تھا۔

کینڈی صاحب: یکم فروری ۱۸۷۳ء۔ کینڈی صاحب نے چہار عدد کتب اردو جو میں نے واسطے

---

[1] چونسہ: تحصیل سندیلہ میں ایک بڑا گاؤں ہے جو ریلوے اسٹیشن مسیت (سندیلہ ہردوئی لائن) سے تین میل پر واقع ہے اور مولوی مظہر علی صاحب کے خالو منشی سید فضل رسول صاحب کی ملکیت میں تھا۔ مولوی صاحب اس زمانے میں مسیت میں بعہدہ خزانچی ریلوے تعینات تھے لیکن رات کو 'چونسہ' میں جا کر رہتے تھے۔ اسی گاؤں کے نام سے آم کی مشہور قسم 'چونسہ' مشہور ہے۔ جسے منشی فضل رسول صاحب نے بطور قلم لگایا تھا۔ ہاشمی۔ ۲۔ آتش بازی اور روشنی ہر سال محرم میں اب بھی ہوتی ہے لیکن اسے عرس نہیں کہا جاتا۔ مولوی صاحب کو غلط فہمی ہوئی۔ یہ محمد علی شاہ نہیں محمد علی بادشاہ اودھ تھے۔ ہاشمی

پڑھنے کے دی تھیں بذریعہ چٹھی مجھ کو واپس کیں۔ لکھا کہ مجھ کو کمال افسوس ہے کہ ان کتابوں کے پڑھنے کا مجھے موقع نہیں ملا اور بہت شکر گزاری ادا کی۔ سچ یہ ہے کہ کینڈی صاحب کو مجھ سے الفت زیادہ تھی۔ کبھی میرے حالات کا استفسار نہیں ہوتا تھا۔ مجھے ہر نوع کی آزادی حاصل تھی اور میرے ساتھ ایسی خوش اخلاقی سے پیش آتا تھا کہ دوسرے انگریز سے ایسی امید نہیں ہو سکتی۔ مجھے کمال افسوس ہے کہ ایسے حاکم مہربان سے علٰحدہ ہوتا ہوں۔

ریل شاہ جہاں پور تک: یکم مارچ ۱۸۷۳ء۔ آج لکھنؤ سے شاہ جہاں پور تک ریل جاری ہو گئی ہے۔ منشی نہیم الزماں صاحب واسطے سیر شاہ جہاں پور کی آج دو بجے کی ریل پر تشریف لے گئے۔

تعزیے: ۹ مارچ ۱۸۷۳ء (۹ محرم ۱۲۹۰ھ)۔ آج ... کچھ تعزیے دیکھ کر سودھا، شکر و ملازم قاضی وجیہہ الدین سے دریافت ہوا کہ اب کے سال ۵۷۳ تعزیے قصبہ ہذا میں رکھے گئے۔

ملازمت ریل: ۳ اپریل ۱۸۷۳ء۔ اس مرتبہ جب ریل میں ملازم ہوا ہوں مجھے بالترہ کی دوا دوش رہتی ہے مگر سواری ریل کی اور بالترہ نئے نئے لوگوں کی ملاقات ہونے کا موقع نہ ملتا تو شاید یہ نوکری مجھ سے نہ چل سکتی۔

گنگا کا پل: ۱۱ اپریل ۱۸۷۳ء۔ آج میں کانپور گیا اور گھاٹ دریائے گنگ پر قیام کیا۔ کام تیاری پل گنگا کا بہت مستعدی سے ہو رہا ہے۔ نیوٹن صاحب انجینیر اس کے مہتمم ہیں۔ بہت سی کوٹھیاں گل چکی ہیں اور متصل جزیل گنج تعمیر اسٹیشن کی تیاری ہو رہی ہے۔

شاہ تقی علی کاکوروی: ۱۷ جون ۱۸۷۳ء۔ میں آج شب کو شریک عرس شاہ تراب علی صاحب کاکوروی ہوا۔ 'منڈولی' سے دو کوس کا فاصلہ تکیہ کاکوروی کا ہے۔ میں نے دو روپے شاہ تقی علی صاحب و مولوی محمد اکبر صاحب کو نذر دیے اور بارہ بجے رات کو 'منڈولی' واپس آیا۔ شاہ تقی علی صاحب خلیق و مہذب، ذی علم اور زاہد ہیں اور اشغال شبانہ روزی نہایت عمدہ ہیں۔ ایسا بزرگ فی الحال اس نواح میں نہیں ہے۔

باون سبھا: ۲۳ اگست ۱۸۷۳ء۔ آج 'منڈولی' میں جلسہ بابو لوگوں نے قرار دیا۔ شب اول میں سور داس نابینا ساکن لکھنؤ نے بہت خوب چکارہ بجایا۔ اس کے بعد ناچ باون سبھا کا ہوا جس سے تمام شب جگنے کا اتفاق ہوا۔ جلسہ عموماً اچھا تھا۔ دو روپیہ چندہ کے میں نے بھی دیے۔

وفات شاہ تقی علی کاکوروی: ۱۳ ستمبر ۱۸۷۳ء۔ پرسوں شاہ تقی علی صاحب بزرگ کاکوروی نے ایک بجے دن کو رحلت فرمائی۔ یہ بہت بزرگ شخص تھے۔ اس نواح میں ان کے مانند دوسرا نہیں تھا۔ ذی علم، خوش بیان، حالات خاندانی سے واقفیت تام رکھتے تھے۔ بہت بڑے بڑے لوگ کاکوری لکھنؤ و سندیلہ

کے ان کے مرید تھے۔ وفور اخلاق سے لوگوں کے دلوں کو اپنی جانب جذب کر لیتے تھے۔ سن شریف قریب اسّی سال کے ہو گا۔

راجہ فتح چند: ۴ر اکتوبر ۱۸۷۳ء۔ آج راجہ فتح چند صاحب تعلقہ دار سرون بڑا گاؤں ضلع ہردوئی نے بعمر ۷۰ سال انتقال کیا۔ راجہ صاحب بڑے منتظم تھے۔ مالگزاری سرکار اور تنخواہ ملازمین بوقت واجب ادا کر دیتے تھے۔ لیکن چونکہ مزاج میں خساست تھی لہٰذا عموماً ان کے جاننے والے علی الصباح ان کا نام نہیں لیتے تھے۔ خزانہ انھوں نے بہت فراہم کیا تھا آخر وقت میں مفلوج و نابینا ہو گئے تھے۔

شب دیگ: ۲۸ر دسمبر ۱۸۷۳ء۔ آج منشی فہیم الزماں صاحب نے سرفراز علی رکاب دار لکھنؤ سے شب دیگ تیار کرا کے بعض مشاہیر اشراف محولہ کو لطف حویلانہ کو طلب کر کے دعوت کی۔ واقعی شب دیگ نہایت نفیس تیار ہوئی تھی اور یہ امر منشی صاحب کی عالی حوصلگی پر دال ہے کہ بلا کسی خاص وجہ کے ایسا صرف گوارہ کر کے ہم لوگوں کو طعام لذیذ سے متلذذ فرماتے ہیں۔

اکرام اللہ خاں: ۱۲ر فروری ۱۸۷۴ء۔ منشی اکرام اللہ خاں صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ضلع ہردوئی بحصول رخصت دو ماہ بہمراہی تین میاں صاحب رئیس بلگرام وارد حیدر آباد دکن ہوئے سنا گیا ہے کہ وہاں کسی عہدہ پر معزز ملازم ہو چکے۔

راجہ گوالیار کی طوائف: ۹ر مئی ۱۸۷۴ء۔ دریافت ہوا کہ راجہ گوالیار اپنی طوائف چندر بھاگا کے لینے کے واسطے لکھنؤ آئے تھے جس نے منشی محمد حسین وکیل سے عقد کر لیا ہے۔ رات کے وقت وکیل کے مکان پر چڑھ دوڑے۔ وکیل صاحب تو بھاگ گئے تھے مگر چندر بھاگا کو گوشمالی معقول دی۔

حاجی وارث علی شاہ: ۲۰ر جون ۱۸۷۴ء۔ حاجی وارث علی صاحب سے اسٹیشن لکھنؤ پر ملاقات ہوئی۔ ان شاہ صاحب کے بہت لوگ مرید ہیں بلکہ مستورات زیادہ ہیں۔ چودھری امتیاز الزماں صاحب کو عقیدت کمال ہے اور ہر مرید کو میں زیادہ ارادت مند پاتا ہوں۔

ایک انگریز انجینیر: ۳۱ر اگست ۱۸۷۴ء۔ کینلس صاحب انجینیر کا کوروی اکثر کانپور بہ جلسۂ نازنیناں رہا کرتے ہیں۔ شاید عنقریب کسی مس کو پسند کر کے شادی کریں گے۔ جس کی وجہ سے اکثر کاغذات بلا دستخط رہتے ہیں اور کوئی کام اجرا نہیں ہوتا۔

ستی: ۷ر اپریل ۱۸۷۵ء۔ کل ایک برہمنی موضع رسول پور میں اپنی خاوند کی لاش کے ساتھ ستی ہو گئی۔ بدریافت اس حال کے اہلکار فوجداری و تحصیلدار سندیلہ موقع پر پہنچے اور بعد تحقیقات تیس آدمیوں کو گرفتار کر کے لائے۔

ایک تکیہ کلام: ۹ر نومبر ۱۸۷۵ء۔ یعقوب خاں سابق کیدان عہد شاہی رئیس 'مرزا گنج' نے قضا کی۔ ان کا عہد شاہی میں بہت دور دورہ تھا۔ "میاں کے سر کی قسم" ان کا تکیہ کلام تھا۔ جاہل محض تھے لیکن آدمی خوش نصیب تھے۔ بعمر ۶۵ سال قضا کی۔

جلوس شاہزادہ ویلس: ۶ر جنوری ۱۸۷۶ء۔ آج میں لکھنؤ گیا۔ قیصر باغ میں مقیم ہوا۔ شام کو سواری شاہزادہ ویلس بہادر ولی عہد ملکہ وکٹوریہ معائنہ کی۔ شاہزادہ صاحب بگھی چواسپہ پر سوار تھے۔ ہزارہا خلقت تماشائی تھی۔ عمر تخمیناً ۳۵ سال ہو گی۔

۷۔ جنوری ۱۸۷۶ء۔ آج شاہزادہ ویلس قیصر باغ میں ۹ بجے رات کو تشریف لائے۔ منجانب تعلقہ داران اودھ دعوت بارہ دری قیصر باغ میں ہوئی۔ روشنی و آتش بازی عمدہ تھی۔ ایک تاج مرصع و بکس نقدی وغیرہ قیمتی تیس ہزار روپیہ منجانب تعلقہ داران پیش ہوا جس کو شاہزادہ صاحب نے منظور و قبول فرمایا۔

مسماۃ علیما: ۲۰ فروری ۱۸۷۶ء۔ میر معصوم علی تھانہ دار سندیلہ نے حسب الحکم رائے شیو سہائے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ضلع ہردوئی کے مسماۃ علیما زوجہ محمد اجمل سے دربارۂ تکلیف دہی شوہر دختر کے دریافت کیا۔ مسماۃ مجیب ہوئی کہ میں اصالتاً ڈپٹی صاحب کے اجلاس میں مقدمہ متدائرہ کی پیروی و جواب دہی کروں گی۔ اس حال سے تمام شرفائے سندیلہ کو تاسف ہوا کہ عورت پردہ نشین کو ایسی جرات ہے کہ جس سے بدنامی و ناموسی متصور ہے۔ خدا غارت کرے۔

۲۷ر فروری ۱۸۷۶ء۔ آج کل ہر گلی و کوچہ میں تذکرہ مقدمہ مسماۃ علیما النسا و محمد اجمل کا ہوتا ہے اور کمال درجہ فضیحتی ہو رہی ہے۔ یہ مقام کمال عبرت کا ہے جس شخص کا باپ عہدۂ صدر اعلیٰ پر بمشاہرہ ۶۰۰ روپیہ ماہواری پر ممتاز ہو اس کی لڑکی بمقابلہ اپنے شوہر کے علانیہ میں روبکاری کرتی پھرے۔

۶ر مارچ ۱۸۷۶ء۔ آج مسماۃ علیما النسا کا مقدمہ ہردوئی میں پیش ہوا۔ بیانات قاضی وجیہ الدین صاحب و قاضی عابد علی و مولوی کریم الزماں تحریر ہوئے۔ حکم تاریخ آئندہ پر سنایا جائے گا۔

۹ر مارچ ۱۸۷۶ء۔ مسماۃ علیما النسا کے مقدمہ میں اجلاس رائے شیو سہائے صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ضلع ہردوئی سے حکم مچلکہ لینے پانچ سو روپیہ کا بہ میعاد ایک سال محمد اجمل شوہر مدعیہ سے نافذ ہوا۔ اگر مابین سال کے محمد اجمل پھر اپنی زوجہ کو تکلیف دیں گے تو پانچ سو روپیہ تاوان ان کو دینا پڑے گا۔

ریل گاڑی لڑی: ۲۰ر ستمبر ۱۸۷۶ء۔ آج شب کو عجب اتفاق ہوا کہ غفلت رام دین کلید بردار اسٹیشن

سندیلہ سے سڑک آہنی قینچ مال گاڑی کی کھلی رہ گئی اور مسافر گاڑی بباعث کھلی ہونے قفل قینچ کے اسی سڑک آہنی پر جس پر مال گاڑی کھڑی تھی چلی آئی اور ایک ضرب شدید مال گاڑی کو دی کہ کل گاڑیاں اس کی اسٹیشن چبوترہ پر چڑھ آئیں اور چند گاڑیاں پٹری سڑک کے نیچے اتر گئیں۔ اس صدمہ سے اکثر مسافر مجروح ہوئے۔ کلید بردار مفرور ہوگیا۔ صبح کو بمشکل تمام مسافر گاڑی لکھنؤ کی شاہجہاں پور کو روانہ ہوئی۔ دیکھا چاہیے کہ اس جرم میں کتنے آدمی سزایاب ہوں۔

به سلسلۂ خطاب ملکہ: ۴ر جنوری ۱۸۷۷ء۔ آج منجانب سرکار پنڈت لشمبر ناتھ تحصیلدار سندیلہ نے لمرضائی و کمل محتاجوں کو تقسیم کیے اور شب کو مدرسہ سرکاری میں طوائفوں کا ناچ ہوا۔ آتش بازی چھوٹی۔ مبلغ پانچ سو روپیہ بہ سلسلہ خطاب ملکہ معظمہ قیصر ہند تحصیل سندیلہ میں صرف ہوئے۔

ایک نابینا: ۸ر فروری ۱۸۷۷ء۔ ایک حافظ نابینا ساکن شہر دہلی وارد مکان منشی عزیزالدین صاحب ہوئے۔ غزل و قصیدہ اساتذہ سلف کے بہت یاد ہیں اور ان کے گلے میں کچھ ایسی تاثیر پیدا ہے کہ دوسرے شخص کی آواز میں اپنی آواز ملا دیتے ہیں۔

چیچک: ۲۲ر فروری ۱۸۷۷ء۔ سندیلہ میں آجکل چیچک کی شدت ہے اکثر لڑکے اس عارضہ میں فوت ہوئے اور ہوتے جاتے ہیں۔

انجام آشنائی: ۲۰ر اپریل ۱۸۷۷ء۔ میر تصدق حسین برادر عابد علی نمبردار جمکورہ اور مسماۃ تلشیا خاکروبن زوجہ کالکا خاکروب سندیلہ سے آشنائی تھی۔ آج میر مذکور ریحانہ کالکا خاکروب تلشیا سے ملتفت تھے۔ یہ حالت دیکھ کر خاکروب مذکور کو سخت اشتعال طبع ہوا۔ نامبردہ نے تصدق حسین کو بانکہ سے مجروح کیا۔ چند زخم چہرہ پر لگے اور اپنی زوجہ تلشیا اور رمنیا خوشدامن کو جو محرم راز اس واقعہ کی تھی چند زخم کاری لگائے۔ مقدمہ زیر تحقیقات پولیس ہے۔

قلت بارش: ۲ر اگست ۱۸۷۷ء۔ جس مقام پر طوائفان سندیلہ علم لے کر کربلا میں مقیم ہوتی تھیں اور دعا باران رحمت کی کرتی تھیں شب کو کسی شخص نے بھیٹ[1] کربلا میں آگ لگا دی اور چند بھیلیں جو ایک دوسرے سے پیوستہ تھیں سوخت ہو گئیں۔ بے چاری طوائفیں بباعث خوف بحالت سراسیمگی بھاگ کر اپنے اپنے گھر آئیں اور امیدواری بارش میں یہ سوختگی نصیب ہوئی۔

---

[1] بھیٹ اس اونچے ٹیلے کو کہتے ہیں جہاں پان کی کاشت ہوتی ہے یہ ٹیلے عموماً کسی چھوٹے یا بڑے تالاب کے کنارے منتخب کیے جاتے ہیں۔ کربلا سندیلہ میں ایک تالاب اس نام سے موسوم ہے جس کے کنارے عشرۂ محرم کو تعزیے دفن کیے جاتے ہیں (ہاشمی)

۸ر اگست ۱۸۷۷ء- اگرچہ آج چودہ تاریخ ساون کی ہے لیکن بارش اب تک نہیں ہوئی ہے- دا
ہوا گرم چلتی ہے اور رات کو ایسی گرمی ہوتی ہے کہ جس کی برداشت نہیں ہو سکتی ہے-

۱۱ر اگست ۱۸۷۷ء- اب تک مطلقاً بارش نہیں ہوئی- روز بروز نرخ غلّہ کا گراں ہوتا جاتا
جو خریف کاشتکار ولانے بوئی تھی وہ خشک ہو گئی- بظاہر آثار خشک سالی پیدا ہیں- خدا اپنا فضل کرے-

۱۲ر اگست ۱۸۷۷ء- آج کل ایسی گرم ہوا دوپہر کو چلتی ہے جیسے مہینہ بیساکھ یا جیٹھ کا ہو- فصل
وا گہن باستثنا اس کے جو کنوئیں پر ہے اور سینچی گئی ہے بالکل نیست و نابود ہو گئی ہے-

یکم اکتوبر ۱۸۷۷ء- ہوا گرم دس بجے صبح سے ایسی تیز چلتی ہے کہ باہر مکان کے نکلنا سخت ناگوار ہوتا
رات کو مثل چیت و بیساکھ کے سردی ہوتی ہے- اس سے اور بھی بارش کی نسبت مایوسی ہے-

عرس فضل میاں: ۲۲ر اکتوبر ۱۸۷۷ء- اس مرتبہ حافظ کرم احمد صاحب کے مکان پر عرس جنا
فضل میاں[1] مرحوم و مغفور کا بہت بڑے مجمع کے ساتھ ہوا- قوالان خیرآباد و لکھنؤ و سندیلہ حاضر جلسہ تھے
گانا بھی بہت اچھا ہوا- حافظ صاحب جس قدر نذریں اپنے مریدوں سے پاتے ہیں سب قوالوں کو دید
ہیں اور خرچہ عرس کا اپنی جیب خاص سے کرتے ہیں- واقعی ذات حافظ صاحب نہایت مغتنم ہے-

قحط: ۱۰ر فروری ۱۸۷۸ء- بفضل یزداں فصل ربیع بہت خوب ہے اگر کوئی آفت ارضی و سما
نازل نہ ہوئی تو فصل کنوار و اگہن کی حالت سقیم بخوبی دفع ہو جائے گی لیکن فی الحال لوگ بھوکوں کے ما
مرے جاتے ہیں- اگرچہ رئیساں قصبہ ہذا نے کچھ روپیہ بطریق چندہ واسطے تقسیم محتاجوں کے فراہم کیا ہے
نو پائی یومیہ ہر ایک کو تقسیم ہوتی ہے اور چودھری خصلت حسین و تحصیلدار صاحب سندیلہ اس کے مہتمم
لیکن یہ مقدار بباعث گرانی غلّہ ان کے واسطے ہرگز کافی نہیں ہے-

۱۳ر فروری ۱۸۷۸ء- بباعث گرانی غلّہ اعلیٰ و ادنیٰ سب کو پریشانی ہے- اکثر آدمی بوجہ فاقہ کش
پہچانے نہیں جاتے- بباعث ہجوم محتاجین مجھے اپنی نشست گاہ میں بیٹھنا دشوار ہے-

حافظ شوکت علی: ۱۶ر فروری ۱۸۷۸ء- آج حافظ شوکت علی صاحب[2] میرے مکان پر تشریف
لائے اور ایک قطعہ دستاویز ہبہ نامہ مورخہ یکم فروری ۱۸۷۸ء بابت موضع اکگرالی میرے سامنے واسطے
کے پیش کیا میں نے تعمیل حکم کی کی- یہ ہبہ نامہ حافظ صاحب نے اپنی اہل خانہ مسماۃ اماّ کو باستثنائے باغات کے تحریر کیا ہے

---

[1] حافظ کرم احمد صاحب کے ایک جدی بزرگ جو بڑے خدا رسیدہ تھے (ہاشمی) [2] حافظ شوکت علی صاحب رئیس سندیلہ مولوی مظہر علی
استاد رہ چکے تھے- (ہاشمی)

سید شریف: ۲۹ اگست ۱۸۷۸ء- آج سید شریف بیٹے سجادہ نشین درگاہ حضرت معین الدین چشتی قدس اللہ سرہٗ اجمیری وارد سندیلہ ہوئے اور درگاہ مخدوم صاحب میں قیام کیا اور میرے واسطے ایک تسبیح، ایک شانہ صندل و قدرے خرما و خاک درگاہ مبارک معرفت اپنے خادم کے بھیجی جس کو میں نے متبرک سمجھ کر لے لیا اور ایک روپیہ ان کی نذر کو دے دیا۔

ٹڈیری: ۱۴ اکتوبر ۱۸۷۸ء- کل سہ پہر کو ٹڈیری بکثرت پورب سے پچھم کو گئی۔ شب کو جہاں بسیرا کریگی غالباً فصل کنوار میست و نابود ہو جائے۔

علاقہ فضل رسول: ۲۳ اکتوبر ۱۸۷۸ء- اگرچہ منشی فضل رسول صاحب کا علاقہ کورٹ سے واگزار ہوا ہے لیکن اس کا انتظام کچھ اچھا نہیں ہے۔ قواعد مرتب ہوئے ہیں لیکن ان پر عمل نہیں ہوتا ہے بلکہ ان کے خلاف کارروائی ہوتی ہے۔ مخبری کو زیادہ زور قوت ہے۔

ٹیکس: ۱۳ فروری ۱۸۷۹ء- آج کل ڈپٹی سید محمد اکبر صاحب ہردوئی سے وارد سندیلہ ہیں اور تجویز ٹیکس اہل حرفہ پر حلقہ بندی پٹواریوں کی کر رہے ہیں۔ ان کے خوف سے تمام رعایا اندیشہ ناک ہے کہ تجویز ٹیکس سخت کرتے ہیں۔

شکار: ۱۲ فروری ۱۸۷۹ء- نواب غنی بہادر داماد برادر خورد نواب علی نقی خاں بہادر وزیر اعظم واجد علی شاہ لکھنؤ و محمد خاں داروغہ بہ تقریب شکار وارد سندیلہ ہوئے اور میرے مکان پر شب کو قیام کیا اور صبح کو واسطے کھیلنے شکار کے روانہ گھوگیرہ ہوئے۔ میں نے انکے کھانے پینے کا وہاں انتظام کرا دیا۔ پانچ چھ آدمی ان کے ہمراہ ہیں۔

۲۳ فروری ۱۸۷۹ء- نواب غنی بہادر و محمد خاں داروغہ گھوگیرہ سے واپس آئے۔ چند چڑیاں ان کو شکار میں ملیں۔

منشی فہیم الزماں: ۲۷ مارچ ۱۸۷۹ء- منشی فہیم الزماں نے اپنے بیٹے بشیر الزماں کی رفاقت گوارا نہ کرکے ان کو مدرسہ علی گڑھ سے طلب کیا ہے اور مشیر الزماں (داماد) چونکہ بحالت تنہائی وہاں قیام نہیں کر سکتے ہیں اس وجہ سے وہ بھی آدیں گے اور لکھنؤ میں تحصیل علم کریں گے۔

یکم مئی ۱۸۷۹ء- کل بشیر الزماں و مشیر الزماں علی گڑھ سے سندیلہ لوٹ آئے اور پڑھنا انگریزی کا چھوڑ دیا۔

اخبار نور الانوار: ۹ جون ۱۸۷۹ء- بمعائنہ اخبار نور الانوار کانپور مورخہ ۲ جون ۱۸۷۹ء سے معلوم ہوا کہ سال رواں سالہائے گزشتہ سے زیادہ خراب ہے۔ ۲۰ جون کو اتصال مریخ کا زحل کے ساتھ ہوگا جس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ لغایت ۱۲۸۵ فصلی بیماری ہیضہ و وبائی بخار و چیچک عالمگیر ہوگی۔ انسان اور حیوان بکثرت تلف ہوں گے۔

اور ۳۰ر جون کو ایک نیا ستارہ نمایاں ہوگا جو وقت ولادت حضرت عیسیٰ المسیح علیہ السلام کے ظاہر ہوا تھا۔ روشنی اس کی ستارہ زہرہ سے زیادہ منور ہوگی۔ یہ پیشین گوئی کارسپانڈنٹ 'نورالانوار' نے بحوالہ صاحب اخبار ریاست پٹیالہ مورخہ ۱۴ر مئی ۱۸۷۹ء کے کی ہے۔ دیکھا چاہیے کہ اس کا کیا ظہور ہو۔ منشی فضل رسول صاحب کو اس پیشین گوئی کے دیکھنے سے تحیر ہوا اور ایک نقل اس کی اپنے پاس رکھ لی ہے۔

کثرت انبہ: ۱۵ر جون ۱۸۷۹ء۔ اب کے سال انبہ ایسی کثرت سے پیدا ہوا ہے کہ قبل اس کے کسی سال میں اتنا زیادہ اور ارزاں فروخت نہ ہوا تھا۔ بالفعل اس کی قیمت ایک پیسہ سیکڑہ ہے۔

وفات قاضی وجیہ الدین: ۱۱ر اکتوبر ۱۸۷۹ء۔ آج قاضی وجیہ الدین صاحب نے عارضہ تپ ولرزہ میں بعمر ۶۰ سال قضا کی۔ یہ بہت بزرگ شخص تھے اور عرس سالانہ حافظ امام علی صاحب اپنے مرشد کا کیا کرتے تھے اور چار پانچ دن تک شب و روز جلسہ رہتا تھا اور اکثر کتھک کے لڑکوں کا ناچ ہوتا تھا اور سندیلہ کے بہت لوگ ان کے مرید تھے۔ ہر جمعہ کو بوقت سہ پہر قوالوں کا گانا ہوا کرتا تھا۔ قاضی عابد علی صاحب اپنے داماد و بھانجے سے اخیر وقت تک ان کو ملال رہا۔

میونسپلٹی کے ممبر: ۸ر نومبر ۱۸۷۹ء۔ بموجب حکم محررہ ۲۲ر اکتوبر ۱۸۷۹ء جناب چیف کمشنر صاحب بہادر اودھ راقم بشمول دیگر ارباب سندیلہ ممبر میونسپل سندیلہ کا مقرر ہوا۔ اسم نویسی درج ذیل ہے۔

"راجہ وزیر چند تعلقہ دار۔ سید فضل حسین تعلقہ دار۔ چودھری خصلت حسین تعلقہ دار۔ منشی مظہر علی۔ لالہ گنگا سہائے لچھمن پرساد بزاز۔ لالتا پرساد بزاز۔ منشی عزیز الدین اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر پنشن یافتہ شیخ اعظم علی چودھری عبدالباقی۔"

تابوت کا قضیہ: ۲۲ر دسمبر ۱۸۷۹ء۔ سید محمد تقی منصف نے کہ شیعہ مذہب ہیں قصد کیا کہ تابوت محلہ اشراف ٹولہ درگاہ حضرت عباس میں لے جائیں جس کو میر مشرف علی نے منگل بازار میں تعمیر کیا ہے۔ یہاں پر سید ابوالقاسم و سید فضل حسین و چودھری عبدالباقی و شیخ اعظم علی و حامد حسن و سید محمد تقی وغیرہ اور بہت سے جولاہے کھتی ٹولہ کے آمادۂ فوجداری ہوئے اور رپورٹ تھانہ میں لکھوائی کہ منصف صاحب خلاف عملدرآمد قدیم کے ہمارے محلہ میں تابوت لے جانا چاہتے ہیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو سخت فوجداری ہوگی۔ تب حسب فہمائش مولوی عبدالقادر صاحب تحصیلدار سندیلہ و حافظ رحیم بخش تھانہ دار کے منصف صاحب تابوت کو اشراف محلہ میں نہیں لائے اور درگاہ مخدوم صاحب کے راستہ سے امام باڑہ چودھری تفضل حسین میں لے گئے۔

وفات والدہ امجد خاں: ۱۷ر اپریل ۱۸۸۰ء۔ شب کو ۱۱ بجے مردم خانہ محمد علی خاں سابق چکلہ دار

نوابی بعارضہ پیرانہ سالی بعمر ۹۵ سال قضا کی۔ ان کو اپنی حیات میں صدمات پیہم لاحق حال ہوئے علی الخصوص علی امجد خاں ان کے اکلوتے بیٹے کے زمانہ غدر میں مقتول ہونے سے سخت صدمہ پہنچا[1]

ایک لطیفہ: ۱۲ مئی ۱۸۸۰ء۔ احمد رضا خاں صاحب تھانہ دار ہوشنگ آباد ساکن رام پور واسطے ملاقات مولوی فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی خائز سندیلہ ہوئے اور مکان منشی فضل حسین پر قیام کیا اور مزاحاً یہ بات کہی کہ اگر مکان منشی صاحب کو بہشت قرار دوں تو ہو سکتا ہے کیونکہ مثل بہشت کے اس مکان میں پاخانہ نہیں ہے۔

عرس فضل رسول: ۳ و ۴ جولائی ۱۸۸۰ء۔ آج عرس منشی فضل رسول صاحب مرحوم قبرستان 'عمر ہرہ' پر قرار پایا۔ اکثر قوال بیرونجات سے آئے تھے۔ اور سید فضل حسین نے بادشاہ پسند کشمیری کو بقرار داد بیس روپے یومیہ علاوہ کرایہ ریل و خرچ خوراک کے لکھنؤ سے بلایا۔ رات کو اس کا جلسہ خوب ہوا۔ مولوی واجد علی کاکوری سے اور منشی مظفر علی اسیر لکھنؤ سے تشریف لائے تھے۔ چار سو روپیہ کا صرف ہوا۔ کل اہتمام میرے متعلق تھا۔

جائداد اسیر لکھنوی: ۱۳ ستمبر ۱۸۸۰ء۔ منشی غضنفر علی و افضل علی صاحبزادگان منشی مظفر علی اسیر واسطے تصفیہ چک الیس پور تحصیل ہردوئی میں ایک اراضی فضل رسول صاحب اور ان کے دوست اسیر لکھنوی نے مشترکہ طور پر خریدی تھی انتظام اس کا فضل رسول صاحب تعلقہ دار کے سپرد تھا (ہاشمی) لکھنؤ سے تشریف لائے۔ تمام دن گفتگو ہوتی رہی لیکن کوئی تصفیہ نہیں ہوا۔

۴ اکتوبر ۱۸۸۰ء۔ حسب طلب منشی سید فضل حسین صاحب لکھنؤ جاکر منشی مظفر علی اسیر سے اس بات کا فیصلہ کر لیا کہ چک الیس پور بالفعل ان کے قبضے میں رہے اور جب اراضی بنجر کا فردد ہو جائے تو اس وقت اس کی بابت کوئی فیصلہ ہو اور ان کو نالش سے باز رکھا۔

نینی تال: ۲۳ ستمبر ۱۸۸۰ء۔ ۱۸ ستمبر سن رواں کو نینی تال پہاڑ پر ایسا سیلاب آیا کہ ایک ٹکڑا پہاڑی کا پھٹ کر گرا جس سے بہت انگریز ہلاک ہوئے اور نینی تال والوں کو بہت بڑی مصیبت کا سامنا ہوا۔

پارسی تھیٹر: ۵ اکتوبر ۱۸۸۰ء۔ شب کو بارہ دری قیصر باغ (لکھنؤ) میں پارسیوں کا تھیٹر ہمراہ سید فضل حسین صاحب کے معائنہ کیا۔ ٹکٹ درجہ دوم ایک روپیہ کا تھا۔ صبح کو سندیلہ لوٹ آیا۔

---

[1] بعض لوگوں نے ان کا نام امجد علی خاں لکھا ہے۔ یہ بڑے با اثر اور جری شخص تھے اور بہرائچ کے چکلہ دار بھی تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء میں انگریزوں سے لڑتے ہوئے لکھنؤ میں بمقام عالم باغ مارے گئے۔ رجب علی بیگ سرور نے ان ہی کے وہاں قیام کر کے "شگوفۂ محبت" لکھی تھی۔ (ہاشمی)

طوائفوں کے تعزیے : ۷،۸،۹ دسمبر ۱۸۸۰ء۔ مساۃ اچھی طوائف سندیلہ نے کہ بالفعل مرزا محمد علی بیگ تعلقدار اورنگ آباد (تحصیل سندیلہ) سے علاقہ رکھتی ہے اپنا تعزیہ کمال تزک و احتشام سے اٹھایا۔ مرزا صاحب کی جانب سے جلوس بہت عمدہ تھے۔ چوبدار، جھنڈی بردار وغیرہ اورنگ آباد سے آئے تھے۔ مرزا صاحب نے پانچ سو روپیہ اس کام کے واسطے اچھی طوائف بنت گوہر طوائف اشراف ٹولہ کو دیے ہیں۔

اب کی سال بھی محرم سندیلہ میں کمی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اکثر طوائفوں نے بباعث غربت و افلاس کے تعزیہ داری چھوڑ دی ہے۔ لاڈو طوائف جس کا تعزیہ ہر سال دھوم سے اٹھتا تھا اب کی سال اس نے تعزیہ نہیں رکھا۔ صرف محفل عزا پر قناعت کی۔

تعزیہ بسنت : ۲ر فروری ۱۸۸۱ء۔ دو سال گزشتہ سے وصی علی شاہ صاحب درگاہ بسنت اٹھاتے ہیں جو فیض بخش نجارہ ان کے مرید کے مکان سے اٹھتا ہے جس میں چند گلدستہ ہائے رنگارنگ کے ایک ظرف میں لگے رکھے ہوتے ہیں اور گاتے بجاتے گشت کرتے ہوئے درگاہ مخدوم صاحب میں لے جاتے ہیں اور کل مریدین کی پوشاک بسنتی ہوتی ہے۔ جب بسنت اندر درگاہ کے پہنچتا ہے تو شاہ صاحب کے مریدوں پر کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس وقت گانا خوب ہوتا ہے۔ بہت سے اہلِ مذاق شریک ہوتے ہیں۔ مجھے تو کبھی اتفاق جانے کا نہیں ہوا مگر منشی فضل حسین اس مرتبہ شریک ہوئے تھے۔

آتش بازی : ۱۰ر مارچ ۱۸۸۱ء ... شام کو دریائے گومتی کے دونوں طرف اور کشتیوں پر نہایت عمدہ روشنی کی گئی اور آتش بازی چھوٹی۔ یہ دونوں چیزیں قابل دید تھیں جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ اہتمام اس کا چودھری خصلت حسین صاحب تعلقدار سندیلہ و سکریٹری انجمن ہند سے متعلق تھا اور چودھری نصرت علی صاحب اسسٹنٹ سکریٹری کو بہ حسن کارگزاری کام متعلقہ نمائش اجناس گورنمنٹ سے حسب ذیل خلعت عطا ہوا۔

دوشالہ ایک، رومال شالی ایک، دوپٹہ بنارسی ایک، چوغہ پشمینہ ایک، جملہ ۵ عدد۔ اور یقین ہے کہ ان کی تنخواہ میں بھی اضافہ ہو۔

نواب نور الحسن خاں : ۱۴ر اپریل ۱۸۸۱ء۔ شیخ نور الحسن ولد مولوی نواب صدیق حسن خاں صاحب شوہر رئیسہ بھوپال واسطے بیعت مولوی فضل الرحمٰن صاحب (گنج مراد آباد) معہ مولوی قدرت اللہ سندیلوی وارد مکان منشی سید فضل حسین ہوئے۔

۱۵ر اپریل ۱۸۸۱ء۔ نواب نور الحسن خاں صاحب کہ بطن دختر مدار المہام صاحب بھوپال سے ہیں

معہ برادرم سید عنایت حسین روانہ مراد آباد ہوئے اور مولوی فضل الرحمن صاحب کی بیعت کی اور بھائی عنایت حسین صاحب بھی مرید ہوگئے۔ واقعی ذات مولوی صاحب اس زمانہ میں بہت غنیمت ہے۔

۱۷ اپریل نواب نورالحسن بعد بیعت مراد آباد سے واپس آئے۔ عمران کی قریب ۷۰ برس کے ہوگی۔ چونکہ عقد نواب صاحب کا قصبہ فتح پور ہسوہ میں قرار پایا تھا وہاں سے مولوی فضل رحمن صاحب کی بیعت کو چلے آئے۔

۱۸ اپریل۔ برادرم سید عنایت حسین صاحب و نواب نورالحسن خاں صاحب و مولوی قدرت اللہ روانہ بھوپال ہوئے۔

شادیوں کی کثرت: ۱۸ جون ۱۸۸۱ء۔ آج کل سندیلہ میں شادیوں کی کثرت ہے۔ رات ہوئی باراتیں نکلنے لگیں۔ شاید اب کی سال سال پیوستہ کے مانند زیادہ شادیاں ہوں گی۔

عرس فضل رسول: ۲۰ جون ۱۸۸۱ء شب کو روشنی شب عرس منشی فضل رسول صاحب کے مزار پر ہوئی۔ قوال بیرونجات سے آئے ہیں۔ محفل حال وقال نصف شب تک گرم رہی۔ ضامن علی شاہ لکھنوی کو کیفیت بہت زور وشور سے آئی جس سے لوگ محظوظ ہوئے۔

بارش میں روزہ: ۳۰ جولائی ۱۸۸۱ء۔ چار دن سے برابر بارش ہوتی ہے اور دن بھر ابر محیط بہ آسمان رہتا ہے۔ اس وجہ سے روزہ داروں کو چنداں روزہ معلوم نہیں ہوتا ہے۔ یہ بھی فضل یزدانی کے باعث ہے۔

تیتر کی چوری: ۲۰ اگست ۱۸۸۱ء۔ آج کل ایک مقدمہ چوری تیتر کا اجلاس منشی فضل حسین صاحب میں چالانی پولیس دائر ہے کہ جس میں مسمی سرفراز علی رئیس زادہ شاہ آباد بھی ماخوذ ہیں۔ اور اکثر رئیس قصبہ مذکور مقدمہ مسطورہ کی پیروی کر رہے ہیں۔

پیپر مل لکھنؤ: ۲۷ ستمبر ۱۸۸۱ء۔ بہمراہی سید فضل حسین کارخانہ کاغذسازی جو متصل دریائے گومتی لکھنؤ کے ہے آج جا کر معائنہ کیا۔ واقعی بہت بڑا کارخانہ ہے۔ جس میں صدہا آدمی ملازم ہیں اور دو انگریز بھی نوکر ہیں۔ بالفعل چھوٹی کل سے کاغذ بنتا ہے اور بڑی کل مرتب ہو رہی ہے۔

مقدمہ جائداد اسیر لکھنؤ: ۱۷ نومبر ۱۸۸۱ء۔ سید افضل علی ولد منشی مظفر علی اسیر لکھنوی نے بابت مداخلت منیجر اراضی افضل پور واقع گرنٹ الیس آباد (تحصیل ہردوئی) بمقابلہ منشی سید فضل حسین تعلقہ دار نالش حسب دفعہ ۲۰۱ ایکٹ لگان تحصیل ہردوئی میں دائر کی اور مولوی ابوالحسن تحصیلدار ہردوئی نے ان کو ڈگری عطا فرمائی۔ اب نگر ثانی عدالت جوڈیشلی میں ہے، جس کی منشی کالی پرشاد صاحب سے رائے لی جائے گی۔

تعزیہ داری: ۲۸ نومبر ۱۸۸۱ء - ۵ محرم ۱۲۹۹ھ۔ آج نصیباً طوائف کا تعزیہ بڑی دھوم دھام سے

اٹھا۔ چودھری خصلت حسین صاحب رئیس اعظم قصبہ ہذا اور دیگر رؤسا تعزیہ کے ساتھ تھے۔

۲۹ر نومبر۔ آج شب کو حسب معمول قدیم امام باڑہ ہدا شاہ اور میر قاسم علی میں جاکر شریک ہوا۔ اور گزشتہ شب کو چودھری صاحب کے یہاں گیا تھا۔

۳ر دسمبر۔ تسکر خدمت گار قاضی عابد علی صاحب سے معلوم ہوا کہ اب کے سال ۱۰۳ تعزیے سندیلہ خاص میں رکھے گئے۔ یہ شخص رات بھر تعزیوں کی زیارت کرتا ہے اور کوئی تعزیہ اس کے شمار سے نہیں چھوٹتا ہے اور صبح کو مجھے تعداد سے مطلع کرتا ہے۔

کمیٹی تعلقہ داران اودھ: ۳۰ر دسمبر ۱۸۸۱ء۔ کو کمیٹی تعلقہ داران آج بارہ دری قیصر باغ میں شریک ہوا۔ مرزا محمد علی بیگ تعلقہ دار اورنگ آباد (سندیلہ) و رگھوبر دیال سیٹھ تعلقہ دار معز الدین پور بسواں سے ملاقات ہوئی یہ دونوں شخص بہت اشفاق سے پیش آئے۔ ۱۸۶۳ء میں یہ دونوں صاحب میرے مدرسہ سیتاپور میں ہم سبق تھے۔

۳۱ر دسمبر۔ آج روشنی و آتش بازی بارہ دری قیصر باغ قابل دید تھی اور ایسی چیزیں نمائش گاہ میں دیکھنے میں آئیں جو کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا عزیزی بشیر الزماں (خلف فہیم الزماں) میرے کمرہ قیصر باغ میں مقیم ہیں

مرض دق: ۵ر جنوری ۱۸۸۲ء۔ قاضی صمصام علی (مظہر علی صاحب کے ایک خالہ زاد بھائی ہاشم) کو باوجودیکہ شیر عورت و شیر خر دکھنی سرطان یعنی کیکڑے کی استعمال کرائی گئی لیکن حرارت لاحقہ میں کوئی افاقہ نہیں ہے۔ بیس بائیس بہت سے کیکڑے دریائے گومتی سے منگا دیے تھے (یہ اشیا پرانے زمانہ میں مرض دق سے بچنے کے لیے مفید سمجھی جاتی تھیں۔ ہاشمی)۔

مولوی ضامن حسین: ۱۵ر جنوری ۱۸۸۲ء۔ آج مولوی ضامن حسین صاحب سٹی مجسٹریٹ دکھن حیدر آباد سے ملاقات ہوئی۔ پانچ سو روپے ماہواری کے نوکر ہیں اور آدمی خلیق و لئیق ہیں۔ باوجودیکہ میں نے ان سے عربی پڑھی ہے اور ان کا شاگرد ہوں لیکن نہایت تعظیم و تکریم سے بوقت ملاقات پیش آتے ہیں۔

وفات منشی عزیز الدین: ۲۱ر مئی ۱۸۸۲ء۔ صبح کے چار بجے منشی عزیز الدین صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر پنشن یافتہ نے بعارضہ فالج عمر ۶۳ سال میں قضا کی۔ مرحوم اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ باپ شیخ جمیل الدین تھے جو قبل ولادت بیٹے کے مفقود الخبر ہو گئے تھے۔ لہٰذا مولوی فضل صاحب ماموں حقیقی کے سایہ عاطفت میں پرورش و تعلیم پائی اور رفتہ رفتہ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری پر فائز ہوئے۔ زمانہ غدر کی خیر خواہی سے موضع ڈالوا تحصیل بلگرام میں ملا اور بعد حصول پنشن مبلغ دو سو چون روپے کے خانہ نشین ہوئے

قبل وفات آمدنی جناب مرحوم کی باشمول پنشن چھ سو ماہواری تھی۔ زوجہ اولیٰ کی اولاد قائم نہ رہنے سے عقد ثانی قصبہ مسولی ضلع نواب گنج بارہ بنکی میں کیا جن سے تین فرزند نرینہ اور دو لڑکیاں موجود ہیں۔ آدمی نہایت راست گو، لائق و تجربہ کار تھے۔ اپنی حیات میں کمال عزت و توقیر گورنمنٹ انگلشیہ سے حاصل کی۔

ظہور لکھنوی: ۲۲ر اگست ۱۸۸۲ء۔ منشی ظہور الحسن شاعر لکھنؤ کو منشی فضل حسین نے بمشاہرہ مبلغ دس روپیہ ماہواری نوکر رکھا ہے اور شاعر ماہ۔ ان کے واسطے دیوان مرتب کر رہے ہیں۔ کلام اچھا ہوتا ہے۔

مولوی عبد القادر صاحب[1]: ۵ر ستمبر ۱۸۸۲ء۔ جلسہ کومیٹی میونسپل مدرسہ سندیلہ میں منعقد ہوا۔ راجہ درگا پرشاد صاحب تعلقہ دار و مولوی عبد القادر صاحب تحصیلدار سندیلہ در بارۂ سڑک دہن بہت بے لطفی سے گفتگو ہوئی۔ راجہ صاحب نے سخت کلمہ تحصیلدار صاحب کی نسبت کہا اور طیش کھا کر جلسہ کومیٹی سے اٹھ جانے کا قصد کیا لیکن چودھری محمد عظیم صاحب نے ان کو فہمائش کرکے روکا مگر تحصیلدار صاحب نے زبان درازی نہیں کی اور سکوت کیا۔ راجہ درگا پرشاد صاحب نے بہ کمال معذرت اور متعدد اشخاص کو درمیان میں ڈال کر عبد القادر صاحب سے صفائی حاصل کی۔ راجہ صاحب مغلوب الغضب مشہور ہیں۔

دنگل: یکم نومبر ۱۸۸۲ء۔ آج سہ پہر کو دنگل کشتی پہلوانوں کا غلہ کے گودام میں ہوا۔ چار آنہ ایک آنہ اور چھ پائی کا ٹکٹ تھا۔ چراغ علی پہلوان اورنگ آباد (تحصیل سندیلہ) متاقصاب پنجابی کی کشتی ہوئی۔ آخرش چراغ زیر ہوا۔

دربار لکھنؤ: ۲۸ر نومبر ۱۸۸۲ء۔ شام کی ریل میں واسطے شرکت دربار کے میں لکھنؤ گیا۔ مولوی عبد القادر صاحب تحصیلدار سندیلہ بھی ساتھ ریل میں تھے میں منشی فضل حسین کے پاس قیصر باغ میں ٹھہرا۔

۲۹ر نومبر آج گورنر جنرل صاحب (لارڈ رپن) نے صبح کے گیارہ بجے دربار فرمایا۔ تعلقہ دار و دیگر رؤسائے عظام مشرف بہ زیارت ہوئے۔ اور یہ دربار بارہ دری قیصر باغ میں ہوا۔

۳۰ر نومبر۔ شب کو تمام قیصر باغ میں روشنی ہوئی اور جب دس بجے گورنر جنرل صاحب تشریف لائے تو نہایت عمدہ قسم کی آتش بازی چھوٹی۔ میں بھی تعلقہ داروں کے ساتھ اندر بارہ دری کے یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا صبح کی ریل میں میں سندیلہ لوٹ آیا اور کار و بار تعلقہ جلال آباد میں معروف ہوا۔

شیخ حامد حسن: ۲ر جنوری ۱۸۸۳ء۔ شیخ حامد حسن (سید فضل حسین تعلقہ دار کے بہنوئی) نے بخانہ حسین باندی طوائف روزمرہ کا قیام اختیار کیا ہے۔ اس سے منشی فضل حسین صاحب و دیگر اعزا سسرالی ناراض ہیں۔

---

[1] عبد الماجد دریابادی صاحب کے والد جو عرصہ تک سندیلہ کے تحصیلدار رہے۔ ہاشمی

فہرست ووٹ دھندگان: ۲۴ مارچ ۱۸۸۳ء ۔ بہ استعانت چودھری عبدالباقی فہرست اسم نویسی رائے دہندگان ہر چہار محلہ قصبہ سندیلہ کی مرتب کر کے بخدمت مانک چند قائم مقام تحصیلدار سندیلہ کے پیش کی جس سے وہ بہت رضامند اور خوش ہوئے۔

شادی الطاف رسول: ۱۹ اکتوبر ۱۸۸۳ء - آج صبح کو تقریب مانجہ برخوردار الطاف رسول (ولد سید فضل حسین) قرار پائی۔ مجمع بہت کثیر تھا اور بتاشے نہایت خوش انتظامی کے ساتھ تقسیم ہوئے۔ کوئی محروم نہیں گیا۔ بیرونجات کے لوگ متعدد مکانوں میں فرد کش تھے جن کے واسطے ہر قسم کا سامان ضروری مہیا کیا گیا۔ ہر مہمان کی خبر گیری کے واسطے علیحدہ علیحدہ آدمی مقرر تھے . . .

۲۰ اکتوبر۔ ہزار ہا مردمان بیرونجات طوائفان گرد و نواح شادی الطاف رسول میں آئی تھیں اور سب کو وقت معین پر کھانا اور دیگر اشیائے ضروری پہونچتی تھیں۔ مجھے شب و روز دو گھنٹے سے زاید آرام کی مہلت حاصل نہ تھی۔ دو کشمیری مسمیان کھلونا و نعمل حسین و ایک انگریزی باجا جس میں ۲۲ آدمی تھے اور دو ڈیرہ طوائف مسماۃ نظیر جان و چھوٹی صاحب لکھنؤ سے آئے تھے اور ایک ڈیرہ کشمیری قصبہ سانڈی کا بھی تھا۔ برادری تاشہ نوازان شمار میں آٹھ عدد تھی۔ چھ ہزار بخش مسلمانوں کو علاوہ خوراک ہائے ہنود کے روزمرہ تقسیم ہوتے تھے۔ اشخاص معززین کی اسم نویسی جو شریک شادی تھی درج ذیل کی جاتی ہے۔ اگرچہ ان کے علاوہ بہت سے زمیندار وغیرہ بھی شریک تھے جس کی صراحت اس مقام پر لکھنا طوالت سے خالی نہیں (اس کے بعد اکیس تعلقہ دار رؤسا اور وکلاء کی فہرست ہے جو یہاں حذف کی جاتی ہے۔ ہاشمی)

۲۲ اکتوبر۔ بارات سید الطاف رسول بہ کمال احتشام دو بجے رات کو روانہ ہوئی۔ سامان آرائش بہت خوب تھا لیکن انور خاں وغیرہ مالی کی غفلت بلکہ نمک حرامی سے ہمراہ بارات کے سامان روشنی کا کم تھا۔ ان لوگوں نے بخیال اس کے کہ اس ہجوم میں کون باز پرس کرے گا مزدوران بہت کم فراہم کیے اور ان کی اجرت خود چکھ گئے۔ اس ان کی نالائقی سے کمال رنج و باعث بے لطفی کا تھا . . . چار بجے صبح کو بارات منشی شمس الدین کے دروازے پہنچی تو نوشاہ ہاتھی پر سوار اور ان کے ہر چہار جانب ہاتھیوں کا حلقہ تھا آتش بازی علی حسین و محمد حسین و فرزند علی آتش بازان لکھنؤ قابل تعریف تھی جس سے عموماً سب لوگ بہت خوش ہوئے۔

۲۳ اکتوبر۔ صبح کو ایک گھڑی دن چڑھے عقد برخوردار الطاف رسول خلف منشی سید فضل حسین تعلقہ دار جلال پور، مسماۃ شفیق النساء دختر منشی سید عنایت حسین سے بعوض مہر پچیس ہزار کے ہوا۔ منشی شمس الدین صاحب

نانا دولھن کفیل مصارف شادی تھے اور دولھن کے باپ نے کچھ زیور اور سید کرامت حسین چچا نے ایک گھڑا مع زیور نقرئی اور کچھ ظروف مسی جہیز میں دیے۔ دس بجے دن کے بارات رخصت ہوئی۔ شام کی ریل میں اکثر مہمان رخصت ہوئے۔

۴ تا ۷ اکتوبر شادی الطاف رسول میں عموماً انتظام اچھا تھا اور انعام بھی اچھا دیا گیا جس سے سندیلہ اور اس کے نواح میں اس شادی کی بہت شہرت و ناموری ہوئی...

منشی شمس الدین صاحب نے میرے انتظام شادی الطاف رسول کی بہت تعریف کی اور نہایت درجہ میرا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ مجھے تمہارے انتظام کی نسبت ایسی امید ہرگز نہیں تھی...

خدا کا شکر ہے کہ شادی الطاف رسول میں میرے انتظام کی بہت شہرت ہوئی اور ہر شخص میرا نام نیکی سے لیتا ہے اور جو اندیشہ مجھے حالی خاطر تھا اس کا انجام بفضل یزداں نیک ہوا۔ منشی شمس الدین صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بعد فراغت شادی اپنی نواسی کے روانہ نواب گنج (بارہ بنکی) ہوئے۔

راجہ درگا پرشاد: ۱۱ر فروری ۱۸۸۴ء۔ چونکہ راجہ درگا پرشاد صاحب کے ساتھ اتفاق نشست یکجائی اجلاس بنچ میں روزمرہ ہوتا ہے اس وجہ سے ان کی لیاقت کا حال بخوبی منکشف ہوا۔ آدمی نہایت لائق و فہیدہ ہیں۔ علم فارسی میں دستگاہ کامل ہے۔ نہایت خوش خط و زود نویس ہیں۔ قانون دانی البتہ کم ہے۔

۲۵ر فروری۔ آج راجہ درگا پرشاد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ چند امور میں مجھ سے مشورت کی اور فرمایا کہ ہماری اور آپ کی کمیٹی میونسپل سندیلہ میں ہمیشہ اتفاق رائے ہونا چاہیے۔ جو آپ کو منظور ہوا کرے وہ آپ پہلے سے کہہ دیں۔ میں اس سے اتفاق کروں گا۔

تیترا لڑکا: ۱۲ر مارچ ۱۸۸۴ء۔ کل بخانہ ملک مصطفےٰ حسین کے دو پہر کو فرزند نرینہ پیدا ہوا۔ چونکہ لڑکا بعد تین لڑکیوں کے پیدا ہوا ہے اس وجہ سے عورتیں اس کو تیترا نا مزد کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ایسا لڑکا ناقص ہوتا ہے باپ اس کو نہ دیکھے۔ اس وجہ سے ملک صاحب سخت متردد ہیں اور اپنے گھر نہیں جاتے۔

منشی شمس الدین[1]: ۱۳ر اپریل ۱۸۸۴ء۔ شب کو منشی شمس الدین صاحب بحصول پنشن از عہدہ اکسٹرا اسسٹنٹی نواب گنج سے تشریف لائے۔ بانوے روپے ماہوار پنشن مقرر ہوئی۔ بوقت ملاقات کمال عنایت بزرگانہ سے پیش آئے اور میری تعظیم کی اور فرمایا کہ حسب سفارش فوربس صاحب کمشنر فیض آباد میں ریاست بلرامپور میں بہ عہدہ وزیر خزانہ بہ مشاہرہ تین سو روپیہ ماہواری مقرر ہوا ہوں۔

---

[1] منشی فضل حسین کے چچا۔

بنارسی باغ لکھنؤ: ۱۹ر اپریل ۱۸۸۴ء۔ بمقام لکھنؤ۔ شام کو بنارسی باغ کی میں نے سیر کی۔ نہایت خوش کیفیت ہے اور سبزہ وگل بوٹے اس کے تازگی بخش ہیں۔ اتفاق سے اس وقت کچھ گوری پلٹن گھنگرا والی (رکذا) کی آئی اور انگریزی باجا نہایت عمدہ گت کے ساتھ بجایا جس سے طبیعت نہایت محظوظ ہوئی۔ شام کو سندیلہ لوٹ آیا۔

ایک امام باڑہ: ۱۳ر مئی ۱۸۸۴ء۔ مرزا محمد علی بیگ تعلقہ دار اورنگ آباد (تحصیل سندیلہ) کو مساۃ اچھی طوائف سندیلہ سے اتحاد ہے لہٰذا حسب خواہش اس کی مرزا صاحب بصرف زر کثیر ایک امام باڑہ طوائف مذکور کے واسطے تعمیر کرا رہے ہیں جس کے مہتمم مولوی محمد امیر موالی حسین رئیس منڈئی کے ہیں۔ چونکہ اس کی تیاری کا جشن ہوگا۔ اس وجہ سے مرزا صاحب تشریف لائے ہیں۔

سندیلہ میونسپلٹی: ۹ر اکتوبر ۱۸۸۴ء۔ آج کو میٹی لوکل سلف گورنمنٹ کچہری پنج میں ہوئی۔ بمشورت یک دیگر منظوری عہدہ ہائے ذیل کے استحکام کے طور پر تجویز ہوئی جس کی رپورٹ صاحب ضلع کو بھیج دی گئی اور جس کے مستقل ہونے میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہا۔ مولوی عبدالقادر صاحب تحصیلدار (میر مجلس) چودھری محمد عظیم صاحب (نائب میر مجلس) راجہ درگا پرشاد صاحب (نائب میر مجلس) راقم (سکریٹری میونسپل)۔ حکم گورنمنٹ مورخہ ۶ر اکتوبر ۱۸۸۴ء بدیں مضمون موصول ہوا کہ بیس ممبر واسطے کو میٹی میونسپل کے قائم ہوئی۔ منجملہ ان کے پندرہ شخص مجوزہ رعایا اور پانچ شخص مقرر کردہ سرکار ہیں اور وہ پانچوں آنریری مجسٹریٹ سندیلہ کے جن کا تقرر ہمیشہ گورنمنٹ کرتی رہیگی۔ چودھری محمد عظیم منشی فضل حسین، کنور درگا پرشاد، کنور وزیر چند، مولوی سید مظہر علی۔

تعزیے: ۲۹ر اکتوبر ۱۸۸۴ء۔ آج چند مشہور تعزیے میں نے جا کر دیکھے جو اپنی ساخت میں قابل تعریف ہیں۔ خیراتی و بدل منہیار، میر ناظم علی سوداگر، امامی نوربانٗ، سما دھان بھرجی، لال خاں، میر قاسم علی سوداگر، واحد علی نے ایک تعزیہ ٹین کا تیار کیا جیسا کہ قبل اس کے کبھی نہیں بنا تھا۔

۳۰ر اکتوبر۔ تسکر وملازم قاضی عابد علی نے بیان کیا کہ اب کے سال ۳۲۳ تعزیے سندیلہ میں رکھے گئے۔ مرزا محمد علی بیگ تعلقہ دار اورنگ آباد (تحصیل سندیلہ) نے ایک تعزیہ قصبہ (بسواں) سے بہ قیمت پچیس روپے اچھی طوائف کو منگوا دیا جو نہایت عمدہ تھا۔

مولوی خلیل الدین[1]: ۴ر نومبر ۱۸۸۴ء۔ کل مولوی خلیل الدین خلف شیخ امین الدین حقانی مکہ شریف سے واپس آئے۔ بہ عمر ۲۵ر سال وہ عالم و حافظ و حاجی و طبیب ہوئے۔ ایسا لائق آدمی اب اس محلہ میں نہیں ہے۔

ایک شادی: ۱۲ر دسمبر ۱۸۸۴ء بشب کو نو بجے عقد سید نبی احمد خلف مولوی علی احمد وکیل جبل پور مسماۃ سیدہ دختر شیخ حامد حسن سے بعوض ۴۰ مثقال نقرہ کہ مساوی ایک سو چھپن روپے آٹھ آنے کے ہوتا ہے

---

[1] مولوی مظہر علی کے بھانجے۔ (ہاشمی)

مسجد مولوی فضل علی صاحب میں ہوا۔ مولوی مہدی حسن صاحب کی ممانعت سے اندر و باہر نہ تو ڈھول بجی نہ کسی قسم کا گانا ہوا۔ مولوی علی احمد صاحب وکیل نے کھانا اہل برادری کو اچھا تقسیم کیا تھا۔ نان بہت بڑی تھی جہیز عمدہ ملا۔ منشی فضل حسین نے ایک گھوڑا مع زیور نقرئی جہیز میں دیا۔

مولوی عبدالقادر: ۱۲ مارچ ۱۸۸۵ء۔ مولوی عبدالقادر تحصیلدار سندیلہ کی تنخواہ میں پچیس روپے سرکار سے اور اضافہ ہوئے ایک سو پچھتر روپے ماہواری تنخواہ پائیں گے۔

بسمل خیرآبادی: ۱۹ ستمبر ۱۸۸۵ء۔ محمد حسین خاں بسمل بعد ملاقات حافظ کرم احمد صاحب خیرآباد تشریف لے گئے۔ یہ وہی بسمل ہیں جو حافظ صاحب کے قدموں سے جدا نہیں ہوتے تھے اور ہر وقت لباس گیروا پہنے رہتے تھے اور خیرآباد سے سندیلہ پاپیادہ آتے تھے۔ اب جب سے ریاست ٹونک میں اپنے باپ کی جگہ وکیل ریاست ہو گئے ہیں حافظ صاحب سے کچھ علاقہ ہی نہیں رہا اور خیرآباد میں آئے تو کبھی سندیلہ نہیں آتے اور جب حافظ صاحب خیرآباد جاتے ہیں تو سوائے معمولی دعوت کے نہ وہ خدمت ہے اور نہ وہ اطاعت اور نہ وہ مریدی ہے جس کا ابتداً شور و شغب زیادہ تھا۔

لفٹیننٹ گورنر کی آمد: ۱۹ نومبر ۱۸۸۵ء۔ آج گبسن صاحب ڈپٹی کمشنر ہردوئی واسطے انتظام جلوس وغیرہ تشریف آوری لفٹیننٹ گورنر بہادر، ہردوئی سے سندیلہ وارد ہوئے اور بہ کمال مستعدی ہر ایک کام کی دیکھ بھال کی اور مجھ سے بوقت شام کچہری پنچ میں دریافت کیا کہ کس قدر مقدمات ۱۸۸۴ء میں دائر و فیصل ہوئے۔ میں نے بیان کیا کہ دو سو پینتیس ۲۳۵ مقدمے دائر ہوئے۔ ۱۹ میں مجرموں کو سزا ہوئی اور ۵۴ مقدمے بذریعہ راضی نامہ و عدم ثبوت جرم کے خارج ہوئے اور کسی کا اپیل نہیں ہوا۔ اس بات سے بہت خوش ہوئے اور کپتان صاحب سے میری تعریف کی۔

۲۰ نومبر ۱۸۸۵ء۔ صبح کے ۸½ بجے بذریعہ اسپیشل ٹرین جناب نواب الفرڈ لائل صاحب لفٹیننٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی (یعنی یو پی۔ ہاشمی) و چیف کمشنر اودھ لکھنؤ سے تشریف لائے۔ اسٹشن سندیلہ پر فرش باناتی بچھا تھا، میں بھی شریک پیشوائی تھا۔ اوّل اپنی قیام گاہ پر تشریف لے گئے۔ بعدہٗ ۱۱½ بجے اسکول میں تشریف لائے۔ منجانب میونسپل راجہ درگا پرشاد صاحب نے ایڈرس پڑھا۔ جواب میں کلمات خوش فرمائے اور پنچ مجسٹریٹوں کی تعریف کی۔ مدرسہ سرکاری بھی فرش بانات وغیرہ سے آراستہ و پیراستہ تھا۔ چودھری محمد عظیم صاحب نے بہت چاہا کہ لفٹیننٹ گورنر صاحب بہادر ان کے مکان پر تشریف لے جاویں جس کے واسطے مکان

اپنا بہت آراستہ کیا تھا مگر صاحب ممدوح تشریف نہیں لے گئے اور دو بجے کی ریل میں مراجعت فرمائی۔ بازار بہت خوب آراستہ تھا اور ہر ایک دوکان سفیدی سے پتی ہوئی تھی۔

ڈائرکٹر تجارت و زراعت: ۳ مارچ ۱۸۸۶ء۔ آج مسٹر بچر صاحب اسسٹنٹ ڈائرکٹر تجارت و زراعت سے کہ بہ تقریب دورہ سندیلہ تشریف لائے ہیں میں نے ملاقات کی اور حسب فرمائش ان کی، چوڑی لاکھ سا سندیلہ، قلمدان و پلنگ پوش سندیلہ کے بنے ہوئے اور آرسی گوپا مئو کی بنی ہوئی ملاحظہ کرائی اور تھوڑے سے لڈو ٹھکری حلوائی کے ان کو بھیجے جس سے نہایت درجہ خوش ہوئے اور ایک یادداشت مجھ کو لکھ کر بھیج دی کہ جس کے مطابق میکو جولاہے سے میں پلنگ پوش تیار کرا کے عجائب خانہ لکھنؤ کو بھیجوں۔

منشی غضنفر علی: ۳۰ مارچ ۱۸۸۶ء۔ منشی سید غضنفر علی صاحب خلف منشی مظفر علی صاحب اسیر سے ان کے مکان پر جا کر ملاقات کی اور مقدمہ گرنٹ ہردوئی دیر تک بات چیت رہی اور بوقت رخصت ہونے کے منشی صاحب نے اپنے دروازے تک مشایعت کی۔

ہیضہ: ۳ اگست ۱۸۸۶ء۔ سندیلہ علی الخصوص اشرف محلہ میں نہایت ہیضہ بڑھتی جاتی ہے، لہٰذا ہر روز دو چار آدمی ضائع ہوتے ہیں۔

۷ اگست۔ کل شام سے دو شیشہ گلاب اور ایک سیر آلو بخارا خرید کر کے الٰہی بخش خدمت گار کو تفویض بدیں ہدایت کر دیے ہیں کہ جو شخص عارضہ میں مبتلا ہو کر طالب گلاب یا شیرہ وغیرہ کا ہو تو فوراً اس کو دیا جاوے۔ چنانچہ اس وقت تک چند آدمی لے جا چکے ہیں۔

(اس کے بعد کئی تاریخوں میں ہیضہ سے مرنے والوں کے نام درج کیے ہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ بیماری سندیلہ اور اس کے نواح میں بھی پھیل گئی تھی۔ مولوی صاحب کا نواسہ رشید الدین بھی اسی ہیضہ میں ضائع ہوا۔ اور اہل خانہ موصوف اور بڑی بیٹی افضلاً بھی مبتلائے مرض ہوئی تھیں لیکن بچ گئیں۔ ہاشمی)

۱۵ ستمبر۔ شب کو والدہ منشی فضل حسین اور دختر شیخ حامد حسن لکھنؤ سے وارد سندیلہ ہوئیں۔ اب بیماری ہیضہ سندیلہ سے دفع ہوئی۔ اب نہ کوئی بیمار ہوتا ہے نہ ضائع ہوتا ہے۔

بسمل خیرآبادی: ۲۹ نومبر ۱۸۸۶ء۔ سچ ہے کہ حافظ کرم احمد صاحب کو اپنے پیر معشوق علی شاہ صاحب کے عرس میں صرف کرنے سے کوئی آسودگی نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی قرض و دام سے روپیہ لے کر عرس شاہ صاحب کیلئے کل خیرآباد کو تشریف لے گئے۔ افسوس ہے کہ محمد حسین بسمل خیرآبادی (مضطر خیرآبادی کے بڑے بھائی۔ ہاشمی) باوجود عمدہ روزگار ہونے کے کوئی استعانت اس صرف میں نہیں کرتے ہیں۔ میں نے اس وجہ سے یہ بات لکھی کہ بسمل صاحب معشوق علی شاہ کے پوتے اور حافظ کرم احمد صاحب کے مرید ہیں۔

برہما میں ملازمت: ۱۸؍ فروری ۱۸۸۷ء۔ آج میرے پاس کئی اشتہار ہردوئی سے آئے کہ جس شخص کو ملازمت پولیس برہما کی منظور ہو وہ ہردوئی جائے۔ اس کی تنخواہ چون روپے ماہواری سے پچھتر روپے تک ہوگی۔ اور جو شخص زبان برہمی سیکھ لے گا اس کی تنخواہ اس سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے اشتہارات جا بجا چسپاں کرا دیے۔ جس کو خواہش ہوگی وہ ہردوئی جا کر نوکری حاصل کرے گا۔

حکیم عبدالعزیز دریابادی: ۷؍ اپریل ۱۸۸۷ء حکیم عبدالعزیز صاحب برادر چچا زاد مولوی عبدالقادر صاحب تحصیلدار سندیلہ حسب طلب والدہ منشی فضل حسین واسطے معالجہ کے لکھنؤ سے تشریف لائے اور بعد معائنہ نبض وقارورہ جناب مقدسہ کے ایک اشرفی نذر میں پیش کی گئی لیکن حکیم صاحب نے میری رشتہ داری کی وجہ سے قبول نہیں کی۔ اور میری کوٹھی دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ اب کوئی مکان قصبہ سندیلہ میں ایسا نہ ہوگا۔

ریل سیتاپور۔ لکھیم پور: ۲۷؍ اپریل ۱۸۸۷ء۔ ۱۵؍ اپریل سے ریل سیتاپور سے لکھیم پور تک جاری ہوئی جس کا محصول درجہ ادنیٰ کس سوا پانچ آنے قرار پائے گا۔

شادی پوتی اسیر لکھنوی: ۲۰؍ مئی ۱۸۸۷ء۔ الطاف رسول (دلپسر منشی فضل حسین تعلقدار) واسطے شرکت تقریب شادی دختر منشی غضنفر علی صاحب حکیم شاعر لکھنوی کے صبح کی ریل سے روانہ لکھنؤ ہوئے اور مبلغ دس روپے نیوتہ کے منجانب منشی فضل حسین بغرض حوالگی شاعر صاحب ان کو دیے گئے۔

حاجی وارث علی: ۲۲؍ جولائی ۱۸۸۷ء۔ کل حاجی وارث علی شاہ صاحب سندیلہ میں تشریف لائے۔ نانی صاحب برخوردار مصطفےٰ علی ان کی مرید ہیں۔ میری کیفیت بے کاری شاہ صاحب سے عرض کی۔ فرمایا خدا اس کا مالک ہے۔

ہیضہ وبائی: یکم اکتوبر ۱۸۸۷ء۔ بالفعل ہیضہ وبائی سندیلہ میں پھر شائع ہوا ہے۔ اکثر علیل اور بعد ایک آدمی ضائع بھی ہوئے ہیں (اس کے بعد متعدد تاریخوں میں مرنے والوں کے نام درج ہیں۔ ہاشمی)

لفٹیننٹ گورنر: ۷؍ نومبر ۱۸۸۷ء۔ سر الفرڈ لایل صاحب لفٹیننٹ گورنر اضلاع مغربی و شمالی و اودھ نے چارج لفٹیننٹی کا سر آکلینڈ کالون صاحب کو بمقام الہ آباد دیا اور ۲۱؍ ماہ حال کو روانہ ولایت ہوں گے۔

حکیم بندہ حسن: ۱۵؍ دسمبر ۱۸۸۷ء۔ کل حکیم بندہ حسن صاحب جو ملازم موروثی چودھری محمد عظیم کے تھے اور بہ ضرورت ادائے ایک شہادت کے کانپور گئے تھے وہاں درد قولنج اور ضیق النفس میں مبتلا ہو کر بمقام کانپور بہ عمر ستر سال وفات پائی۔ جس کے سننے سے نہایت درجہ افسوس ہوا کیونکہ حکیم صاحب کی ذات سندیلہ میں نہایت غنیمت تھی۔ مزاج میں خلق و مروت زیادہ تھی۔ اہالی قصبہ کو ان کی ذات سے بہت فیض تھا اور جو

شخص بلاتا تھا بلاتکلف وخیال غریب وامیر کے تشریف لے جاتے تھے۔ افسوس کہ اب سندیلہ طبیب سے خالی ہوگیا۔ تیس روپے ماہواری علاوہ کھانے کے چودھری صاحب ان کو دیتے تھے اور حکیم صاحب انکے چھتیس برس کے ملازم تھے اور اہلِ قصبہ بھی بوقت معالجہ ان کی خدمت کیا کرتے تھے۔

کانگریس واہلِ اسلام: ۲۱ر دسمبر ۱۸۸۷ء محمد باقر خاں صاحب اسسٹنٹ کمشنر ہردوئی نے بمقدمہ کانگریس اہلِ اسلام جو ۲۷، ۲۸ و ۲۹ دسمبر سن الیہ کو بمقام لکھنؤ مکان منشی امتیاز علی صاحب وکیل پر منعقد ہوگا۔ مجھ سے سوالات چند متعلقہ طرز وروش اہلِ اسلام سندیلہ دریافت کیے تھے جس کا جواب میں نے بہ استعانت محمد ذکی (درگاہ) کے لکھ بھیجا۔

نیا گورنر: ۲۲ر جنوری ۱۸۸۸ء۔ آج بارہ بجے دن کے سر آکلینڈ کالون صاحب لفٹیننٹ گورنر ممالک مغربی وشمالی و چیف کمشنر اودھ کے دربار میں بمقام کیننگ کالج شریک ہوا۔ ڈپٹی کمشنران اضلاع نے اپنے اپنے ضلع کے لوگوں کو پیش کیا۔ مجھے ہارس فورڈ ڈپٹی کمشنر ضلع ہردوئی نے اس اعلان کے ساتھ پیش کیا کہ یہ آنریری مجسٹریٹ وسکریٹری میونسپل بورڈ سندیلہ کا ہے۔ ایک اشرفی میں نے نذر دکھلائی۔ ایک بجے لفٹیننٹ گورنر صاحب نے اسپیچ دی اور عطر و پان کے بعد دربار برخاست ہوا۔

تماشا تھیٹر: ۲۹ر جنوری ۱۸۸۸ء۔ آج شب کو دائم علی کے تماشے تھیٹر میں ۹½ بجے سے دو بجے تک مدرسہ سندیلہ میں شریک رہا۔ ٹکٹ نمبر ایک دو روپے کا لیا تھا اور محمد ذکی کو جو میرے ہمراہ گئے تھے آٹھ آنہ کا ٹکٹ لے دیا تھا۔ اور اپنے تین خدمتگاروں کو چھ آنے کے ٹکٹ خرید دیے تھے مگر تماشا اچھا نہ تھا کچھ لطف حاصل نہیں ہوا۔

منشی شمس الدین: ۳ر فروری ۱۸۸۸ء۔ منشی شمس الدین صاحب چالیس سال ہوئے جب وہ ریاست گوالیار میں بہ عہد ملازمت ایک مہاجن کے بارہ سو کے مقروض تھے۔ مہاجن مر گیا تھا۔ اس کے لڑکے کو بلا کر کل قرضہ اس کا ادا کر دیا۔ ایسا کام کسی دوسرے سے نہیں ہو سکتا ہے۔

گِل صاحب: ۶ر فروری ۱۸۸۸ء۔ آج گل صاحب اسسٹنٹ کمشنر ہردوئی سے ملاقات ہوئی۔ آدمی بہت خلیق اور نیک مزاج ہیں اور مقدمات فوجداری میں بہت کم سزا دیتے ہیں۔ ایسا انگریز میری یاد میں کبھی ضلع میں نہیں آیا۔ اگر گِل کو بضم میم گُل سے تشبیہ دیں تو ہو سکتا ہے۔

عبدالقادر صاحب[1]: ۲۵ر مارچ ۱۸۸۸ء۔ آج پروانہ تبادلہ مولوی عبدالقادر صاحب تحصیلدار سندیلہ

---

[1] عبدالماجد دریابادی صاحب کے والد۔ ہاشمی

از اجلاس صاحب ڈپٹی کمشنر ہردوئی اس مضمون سے موصول ہوا کہ مولوی عبد القادر صاحب بلگرام کو اور منشی مقبول احمد صاحب تحصیلدار بلگرام سے سندیلہ کو تبدیل ہوئے یہ خبر سن کر مجھے اور کل اشخاص سندیلہ کو لغایت درجہ ملال ہوا مولوی صاحب نہایت نیک مزاج فہمیدہ اور عقیل تھے تحصیل سندیلہ میں کوئی ان سے ناراض نہیں تھا۔۔۔

تحصیلدار صاحب نے علاوہ نو مہینے قائم مقامی کرنے کے جس کے بعد ہردوئی اپنے عہدۂ سرشتہ داری پر واپس گئے تھے۔ ۲۹ر جون ۱۸۸۱ء کو پھر چارج تحصیلداری کا سید محمد صاحب تحصیلدار سے حاصل کیا اور بعد چند روز کے مستقل ہوگئے اور اس وقت تک اسی عہدہ پر ممتاز رہے۔ اس حساب سے چھ سال نو مہینے انھوں نے تحصیلداری سندیلہ کی کمال نیک نیتی اور تدین کے ساتھ انجام دی اور مجھے ان کی ذات سے ہر طرح کی اعانت ملی اور ملنے کی امید تھی۔ دیکھا چاہیے کہ اب منشی مقبول احمد صاحب سے کس طرح برتاؤ ہوتا ہے۔

۲ر اپریل۔ آج مولوی عبد القادر صاحب تحصیلدار بہ چشم گریاں روانہ بلگرام ہوئے۔ وقت رخصتی اسٹیشن پر ہر قسم کے لوگ مشایعت کو گئے تھے۔ یہ ان کی محض وسعت اخلاق کا نتیجہ تھا۔۔۔

۲۲ر و ۲۴ر اپریل۔ مولوی عبد القادر صاحب تحصیلدار بلگرام ایک ہفتہ کی رخصت لے کر اس غرض سے وارد سندیلہ ہوئے کہ اپنے قبائل کو دریاباد پہنچا دیں۔

مولوی عبد القادر صاحب مع اپنے اہل خاندان کے روانہ قصبہ دریاباد ہوئے۔ ریلوے اسٹیشن پر مجمع رخصتی کثیر تھا۔ افسوس ہے کہ اب ان کا سر دست سندیلہ آنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

وکٹوریہ ہال ہردوئی: ۱۶ر اپریل ۱۸۸۸ء۔ خط ہارس فورڈ صاحب ڈپٹی کمشنر ہردوئی اس مضمون سے موصول ہوا کہ ۲۳ر اپریل سنہ الیہ کو بنیاد وکٹوریہ ہال ہردوئی کی مسٹر ایڈورڈ برن صاحب چیف سکریٹری لفٹیننٹ گورنر ڈالیں گے۔ تم بھی اس جلسہ میں شرکت کرو۔

غم مفارقت: ۲۸ر مئی ۱۸۸۸ء شب کو دختر لالہ دولت رام جس نے اپنے شوہر منسا رام کے غم مفارقت دائمی میں کھانا پینا ترک کر دیا تھا اور یاد شوہر میں کیفیت جنون کی پیدا ہوگئی تھی ۱۱ بجے رات کو بعمر ۱۷ سال فوت ہوئی۔ واقعی اس کو عشق حقیقی تھا اور زمانہ سابق میں ایسی ہی عورتیں ستی ہو جاتی تھیں۔

کثرت بارش: ۳۰ر اگست ۱۸۸۸ء۔ کل آدھی رات سے بارش بہ شدت ہوئی۔ ایسی اس طرف کم تر ہوئی تھی۔ زراعت خریف کو بہت نقصان پہنچا۔ یہ قاعدہ مستمرہ ہے کہ ساون میں ہوا مغربی و بھادوں میں ہوا مشرقی سے بارش ہوتی ہے لیکن اس سال اس کے برعکس محض ہوا بالظاہر آثار اچھے نہیں ہیں۔ صدہا مکان خام گر گئے۔۔۔

۱۳ر اگست آج بھی تمام روز بارش رہی۔ مکانات خام و پختہ برابر گر رہے ہیں۔ شاید سندیلہ میں کوئی مکان ایسا نہ ہوگا جو ٹپکنے سے محفوظ رہا ہو۔ اور ہنوز کوئی آثار آسمان کھلنے کے نہیں معلوم ہوتے۔ میرے دیہات مکال پور وغیرہ میں فصل خریف کو بہت نقصان پہنچا کہ یہ مواضع فی الجملہ نشیب میں واقع ہیں۔

۲ر ستمبر۔ آج بھی چند مکانات پختہ و خام گر گئے۔ واقعی اس بارش سے تمامی خلائق کو بہت نقصان پہنچا یہ ایک قہر کی آفت ہے جو ہمارے افعال قبیحہ کا نتیجہ ہے۔ پروردگار عالم فضل کرے۔ آثار سال کے بہت خراب ہیں۔

۲۰ر ستمبر۔ اس سال اضلاع مغربی و شمالی و اودھ و کلکتہ وغیرہ میں ایسی بارش ہوئی کہ سیلاب آگیا۔ اور حیدرآباد میں نماز استسقا بہ جمعیت دو دو ہزار کے پڑھی جاتی ہے۔ یہ بھی ایک شان خدا ہے کہ کہیں ایسی بارش ہو کہ سیلاب آجائے اور پیداوار مفقود ہو جائے اور کہیں ایسی کمی ہو کہ خشک سالی سے آثار قحط نمایاں ہوں۔

انفلوئنزا: یکم اکتوبر ۱۸۸۸ء آج کل شکایت تپ دلرزہ کی سندیلہ اور اس کے نواح میں زائد ہے اب آدمی بھی ضائع ہونے لگے ہیں۔ (اس کے بعد کی تاریخوں میں متعدد اموات کی خبریں درج کی گئی ہیں۔ ہاشمی۔)

خط جہنم: ۱۵ر اکتوبر ۱۸۸۸ء۔ آج کل عجب نیرنگیاں سندیلہ میں وقوع پذیر ہیں کہ جن کا اظہار اس موقع پر بے محل نہ ہوگا۔ منشی ... کی عادت ہے کہ بلا وجہ لوگوں کو ستانے و دق کرنے کو اکثر خطوط گمنام ان کے نام بھیجا کرتے ہیں بلکہ اکثر اپنے دست و قلم سے لکھا کرتے ہیں جس کا جواب اسی طریقہ سے ان کو وصول ہوا کرتا ہے بقول شخصے چاہ کندہ را چاہ در پیش۔ چنانچہ کئی روز ہوئے کہ ایک خط منجانب جناب منشی (ان کے والد صاحب مرحوم از مقام جہنم بنام (اپنے بیٹے) صاحب اس مضمون کا موصول ہوا کہ "اتو خاں میرے پاس داخل جہنم ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تم لوگوں سے خوش برتاؤ نہیں کرتے اور کل اہل قصبہ کو اپنا دشمن کر لیا ہے جس سے ایں جانب کو سخت ملال و تاسف ہے۔ قصد تھا کہ قبر توڑ کر نکل آؤں اور تم کو گوشمالی مناسب دوں لیکن یہ قانون قدرت کے خلاف ہے اس وجہ سے مجبور رہا۔ اگر تم اپنے طریق و عمل و طرز معاشرت درست نہ کرو گے تو دوسرے نہج سے تمہاری تنبیہ و سرکوبی ہوگی" یہ خط بدل ان تحریرات کا ہے جو وہ دوسروں کے دل دکھانے کے واسطے بھیجتے ہیں ورنہ اور رئیس بھی سندیلہ میں ہیں ان کے نام کیوں نہیں ایسے خطوط آتے۔ افسوس ہے کہ منشی موصوف نے اپنے وقار اور حرمت کو ایسا بگاڑ لیا ہے کہ ادنیٰ درجہ کے لوگوں کو ان کے نام تحریرات ہزل و تمسخر بھیجنے کی جرأت ہوتی ہے۔ خدا ان کو رائے صائب عطا کرے۔

راجہ محمود آباد: ۶ر نومبر ۱۸۸۸ء آج ۱۱ بجے دن کے میں قیصر باغ (لکھنؤ) مع برخوردار مصطفیٰ کے گیا۔ اول چودھری نصرت علی صاحب اسسٹنٹ سکریٹری انجمن ہند سے ملاقات کی۔ بہت خلق سے پیش آئے

اور میری خواہش پر آمادہ ہوئے کہ راجہ امیر حسن خاں صاحب سے دلوانے چھٹی میں سعی ضرور کروں گا۔ چنانچہ ۳ بجے راجہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بہ لطف پیش آئے اور میری درخواست پر جناب ممدوح نے وعدہ کیا کہ میں کسی حاکم کو چھٹی ضرور لکھ دوں گا۔ چونکہ دماغ راجہ صاحب کا باعث لاحق ہو جانے عارضہ جنون کے ہنوز جیساکہ چاہئے صحیح نہیں ہے اس وجہ سے ان کے حرکات وافعال متغیرانہ حالت میں ہیں جس کا ثمرہ یہ ہے کہ صبح کے تین بجے بعد تناول طعام آرام کرتے ہیں اور بارہ بجے دن کو بیدار ہوتے ہیں۔ اسکے بعد نماز و وظیفہ میں مصروف ہو جاتے ہیں کہ کسی کو نوبت کلمہ وکلام تین بجے شام تک نہیں پہنچتی ہے۔ کوئی کام خود نہیں دیکھتے۔ ہاں ہوں میں شبانہ روز گزرتا ہے۔ آخرش آج ان کے کثرت اوراد سے کوئی موقع مجھے لکھوانے چھٹی مطلوب کا نہیں ملا۔

۷ نومبر۔ بوقت ایک بجے دن کے میں پھر واسطے ملاقات راجہ امیر حسن خاں صاحب بہادر قیصر باغ گیا اور بہ حسن کوشش چودھری نصرت علی صاحب راجہ صاحب نے واسطے سفارش برخوردار مصطفےٰ علی کے ایک چھٹی انگریزی از دست خود بنام بٹس صاحب ڈپٹی کمشنر سیتاپور کے لکھ دی جس کا یہ مضمون تھا کہ سید مصطفےٰ علی نوجوان آدمی میرے ایک دوست کا بیٹا ہے۔ ان کے باپ میرے ساتھ مدرسہ سیتاپور میں انگریزی پڑھتے تھے مصطفےٰ علی نے امتحان انٹرنس کلکتہ یونیورسٹی کا پاس کیا ہے اور اب درجہ ایف۔ اے میں پڑھتے ہیں۔ یہ شخص تعلقدار سندیلہ کا عزیز ہے بہ عہد شاہی و نیز بوقت تسلط عملداری سرکار انگریزی ان کے مورث اعلا اعلا عہدوں پر ممتاز رہے اور بہت ذی عزت ہیں اس وجہ سے میں سفارش کرتا ہوں کہ آپ براہ عنایت مصطفےٰ علی کو کوئی عہدہ ان کی عزت کے موافق عطا کریں گے جس کا میں مشکور ہوں گا۔

بعد واپسی مکان قیام میں نے کل بندوبست جانے برخوردار مذکور کا کر دیا اور مولوی عبدالغنی صاحب وکیل سیتاپور کے نام خط لکھ دیا کہ اپنے مکان میں برخوردار کا قیام کرا دیں اور صاحب ضلع سے ملاقات کرا دیں۔

۱۳ نومبر۔ آج چار بجے شام کو برخوردار مصطفےٰ علی ضلع سیتاپور سے واپس آئے۔ معلوم ہوا کہ بٹس صاحب ڈپٹی کمشنر سیتاپور سے بمقام اسد ہولی ملاقات ہوئی۔ راجہ امیر حسن خاں صاحب کی چھٹی ملاحظہ کر کے فرمایا کہ بالفعل کوئی جگہ خالی نہیں ہے لیکن تمہارا نام امیدواروں میں لکھ لیا گیا۔ بروقت موقع پرورش کی جائے گی چونکہ صاحب بہادر وعدہ کے پکے ہیں عجب نہیں کہ کسی موقع پر یاد کریں بلکہ برخوردار موصوف سے کہہ دیا ہے کہ کبھی کبھی ملاقات کر جایا کرو۔

انجمن اسلامیہ سندیلہ۔ ۱۸ نومبر ۱۸۸۸ء۔ ۱۳ ربیع الاول ۱۳۰۶ھ۔ آج جلسہ انجمن اسلامیہ اشراف محلہ سندیلہ بوقت ۹ بجے صبح مدرسہ سرکاری میں قرار پایا۔ ایک سو سے زائد باشندگان سندیلہ کا مجمع تھا۔ منشی

نفضل حسین صدر نشیں کیے گئے۔ سید محمود رضا (ولد سید محسن رضا صاحب) امیر حسن، کرامت علی (ولد شیخ سلامت علی صاحب مرحوم) و مولوی حفیظ اللہ مدرس دویم ساکن ساندی، و مولوی فیاض علی مدرس اول محلہ منڈی نے مناسب وقت ہمدردی و ترقی دین اسلام کے اسپیچیں کیں۔ یہ جلسہ ۳ گھنٹے تک قائم رہا۔ انجمن مذکور ۱۳۰۱ھ میں قائم ہوئی ہے۔ خدا برکت دے کہ یہ قائم رہے اور کوئی نفاق باہمی پیدا نہ ہو جائے۔ اس انجمن کی دیکھا دیکھی واجد خاں صاحب نے محلہ ملکانہ میں اور ریاض الدین پٹواری مخدوم پورہ نے محلہ منڈی میں ایک ایک انجمن چندہ سے قائم کی ہے۔ اگر ان میں نفاق نہ ہوا تو خیر ورنہ انجام بخیر نہ ہوگا۔

<u>حافظ کرام احمد</u> : ۱۹ نومبر ۱۸۸۸ء۔ افسوس ہے کہ آج ایک بج کر ۴ منٹ دن کے جناب حافظ کرم احمد صاحب نے بہ عمر ۷۰ سال اس دار ناپائدار سے رحلت فرمائی۔ ان کی مفارقت دائمی سے باشندگان سندیلہ کو عموماً اور ان کے اعزا و مریدین کو خصوصاً از بس صدمہ ہوا۔ جناب مرحوم شیخ صدیقی حافظ محمد حسین صاحب کے بیٹے تھے۔ کتب درس تصوف میں دستگاہ کامل تھی۔ ابتداً بعد تحصیل علم ضروری اضلاع للت پور وغیرہ میں بہ عہدہ ہائے مختلف ملازم سرکار رہے۔ ۱۸۵۵ء و ۱۸۵۶ء میں ضلع اورئی ملک متوسط میں سررشتہ دار و موضع سراون میں تھانہ دار رہے۔ زمانہ غدر ۱۸۵۷ء میں سندیلہ تشریف لائے اور بعد رفع غدر و تسلط عملداری برٹش گورنمنٹ ضلع ساگر میں سررشتہ دار بندوبست و پیش کاری وغیرہ عہدہ ہائے مختلف پر ممتاز رہے۔ بعد تکمیل ملازمت ۱۸۷۲ء میں بحصول پنشن تیرہ روپے چار آنے خانہ نشین ہوئے۔ حضرت معشوق علی صاحب خیرآبادی کے مرید تھے اور راہ طریقت میں معلومات کامل تھی۔ آپ کے صدہا مرد و زن سندیلہ و خیرآباد، گوپامئو، لکھنؤ، ساگر، بھوپال، ٹونک وغیرہ میں مرید ہیں۔ باوصف قلت مداخلت و حالت توکل اپنے دادا پیر حضرت فضل میاں صاحب قدس اللہ سرہٗ کا عرس ۱۲ شوال کو بمقام سندیلہ بہت دھوم دھام سے فرماتے تھے اور ہر سال خیرآباد تشریف لے جا کر ۷ ربیع الاول کو اپنے مرشد کا عرس بڑی فیاضی و کشادہ دلی و خوش اعتقادی سے سرانجام دیتے تھے۔ اس مرتبہ علالت در د صدر مانع عزیمت خیرآباد ہوئی اور عرس آخری سندیلہ میں کیا۔ آپ کو کاشتکاری کا بہت شوق تھا۔ اگرچہ اس سے نفع قلیل حاصل ہوتا۔ بباعث وسعت اخلاق و فطری فیاضی و تعلیم علم فقر کے لوگوں کا ہجوم رہتا۔ دوسروں کا نفع اپنے نقصان پر مقدم جانتے۔ کسی سائل کو بے نیل مرام واپس نہیں کرتے اور اس کے فائدے کو بدل معروف ہو جاتے۔ کنبہ پروری میں یکتا تھے۔ دوسروں کے انجام مرام میں کسی نہج سے دریغ نہیں فرماتے اور ان کی راحت کو اپنی تکلیف پر ترجیح دیتے۔ ان کی ذات خیر و برکت سے رونق محلہ تھی اور کل اہل سندیلہ ان کا اعزاز کرتے

تھے۔ سخت تاسف ہے کہ آج جناب ممدوح نے باتیں کرتے ہوئے دردِ صدر میں انتقال فرمایا جو کم و بیش دو ہفتہ سے لاحق تھا اور چھ بجے شام کو اپنے احاطہ نشست گاہ میں مدفون ہوئے۔ چار پانچ سو آدمی تجہیز و تکفین میں شریک تھا جناب مرحوم کے کوئی اولاد ذکور نہ تھی صرف ایک لڑکی یادگار چھوڑی جو قبل اس کے لاولد بیوہ ہو چکی ہے۔ افسوس صد افسوس کہ آج کے روز سے ان کا نام ونشان بالکل معدوم ہو گیا۔

۲۰ نومبر۔ آج طعام دُوجا بہ خانہ جناب حافظ کرم احمد صاحب مرحوم بھیجا۔ چونکہ برخوردار مجتبیٰ علی حافظ صاحب مرحوم کے بہ کمال عقیدت مندی مرید تھے لہٰذا رحلت فرمائی حافظ صاحب سے ان کو نہایت صدمہ ہوا اور چند گھنٹے اوقات عزیز کے گریہ وزاری میں صرف کیے۔

ایک عقد شرعی: ۷ر دسمبر ۱۸۸۸ء۔ آج ۹ بجے رات کو عقد شرعی دختران وصی علی شاہ صاحب درگاہ کا فرزندان حامد علی و مشرف علی سے ہوا۔ میں بھی شریک رہا۔ محمد ادریس خلف حامد علی کا عقد مسماۃ کنیز فاطمہ اور نبی محمد عرف مسیح اللہ خلف مشرف علی کا مسماۃ اللہ بخشی سے ہوا۔ ایک ایک ہزار اور ایک ایک روپیہ مہر قرار پایا۔ دس بجے رات کو فراغت ہوئی۔ بعد نکاح شاہ صاحب اپنے سر پر چکی کے پل رکھ کر اور لڑکیوں کو پاپیادہ لے کر ان کی سسرال پہنچا آئے۔ لڑکیاں سات سات پیوند کی چادریں اوڑھے تھیں اور پیجاموں میں بھی پیوند لگے تھے۔ ایسے شرعی طریقے سے عقد سندیلہ میں کبھی نہیں ہوا۔ بروقت رخصتی دولھن ایک کہرام عظیم تھا۔ کل حاضرین کو رقت تھی۔

اطبائے سندیلہ: ۱۶ر دسمبر ۱۸۸۸ء۔ افسوس کہ سندیلہ طبیبوں سے خالی ہو گیا۔ بعد انتقال حکیم بندہ حسن صاحب اب کوئی ایسا نظر نہیں آتا کہ اس سے رجوع کیا جائے اور پھر بعد تشخیص کامل علاج ہو۔ گرچہ حکیم جاوید علی مہتوانہ شاگرد رشید حکیم صاحب مرحوم علاج بتوجہ کرتے ہیں اور بجانب غربا ان کی نظر زیادہ ہے لیکن جو علمیت اور لیاقت حکیم صاحب کو حاصل تھی وہ کہاں۔ میرے خیال میں اب طب یونانی روز بروز معدوم اور علاج انگریزی کو ترقی ہے۔ غالباً اب عموماً علاج انگریزی ہوا کرے گا۔ اور یونانی مطلقاً مفقود ہو جائے گا۔

منشی امتیاز علی و اکرام اللہ خاں: ۲۴ر دسمبر ۱۸۸۸ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار امروزہ سے واضح ہوا کہ منشی امتیاز علی صاحب رئیس کاکوری وکیل عدالت ہائے لکھنؤ ۱۲ر ماہ حال کو عازم بھوپال ہوئے اور ۲۲ر خواہ ۲۳ر دسمبر کو چارج منصب وزارت ریاست مذکور مسٹر وارڈ صاحب مہتمم ریاست سے حاصل کریں گے۔ شکر ہے کہ ہمارے ہم وطن بھائی کو ایسا اعزاز حاصل ہوا جس سے ہر آئینہ موجب فخر قومی متصور ہے۔ اور اسی پرچے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ محمد اکرام اللہ خاں صاحب بہادر نواب یار جنگ صوبہ دار گلبرگہ دکن ممبر کونسل ریاست رام پور

مقرر ہوئے اور شاید یکم جنوری ۱۸۸۹ء کو ریاست مذکور میں فائز ہو کر کنور لطف علی خاں صاحب سے
چارج حاصل کریں۔ سنا گیا کہ منشی امتیاز علی صاحب کی دو ہزار پانچ سو روپیہ اور ڈپٹی اکرام اللہ خاں صاحب کی
بارہ سو روپیہ تنخواہ ہوئی۔ صاحب آخرالذکر علاوہ اس تنخواہ کے پانچ سو روپیہ پنشن ماہواری ریاست
حیدرآباد سے اور تین سو بیس روپیہ گورنمنٹ انگریزی سے پاتے رہیں گے۔

برادر خورد: ۲۹ دسمبر ۱۸۸۸ء۔ آج شب کو حسب ہدایت سابقہ جناب حافظ کرم احمد صاحب مرحوم
شیخ شجاعت حسین و حیدر حسن وغیرہ ساکنان گوپامؤ مریدین حافظ صاحب مرحوم و مغفور نے عزیزی سید اظہر علی کو
خلیفہ جناب مرحوم کا قبول کیا اور بعد بندش عمامہ خلافت تو الان نے مبارک بادگائی اور مریدین نے نذریں
پیش کیں۔ چونکہ اس کارروائی میں عجلت بہت ہوئی اس وجہ سے میں شریک نہ ہو سکا۔ واقعی حافظ صاحب
عزیز موصوف سے بباعث ان کی سلیم الطبعی و شائستگی کے ازحد خوش تھے اور علم فقر کی تعلیم بوجہ ان کی حاضر باشی
بطرز مناسب فرمائی تھی۔ خدا کرے کہ سرانجام اس خلافت کا خوش اسلوبی سے ظہور پذیر ہو۔

انجمن اسلامیہ: ۳۰ دسمبر ۱۸۸۸ء۔ آج ایک بجے دن کے جلسہ انجمن اسلامیہ مدرسہ سندیلہ میں
قرار پایا۔ منشی فضل حسین پریسیڈنٹ کمیٹی تجویز ہوئے اور مولوی علی احمد صاحب نے در بارۂ ترقی تعلیم اہل اسلام
کے پرجوش اسپیچ بیان کی جس سے حاضرین کو ایک نوع کا اثر ہوا۔ بعدہٗ مولوی مقیم الدین صاحب عالم پنجابی نے
چند آیات قرآنی کا ترجمہ بطور وعظ کے فرمایا اور جلسہ برخاست ہوا۔

گورنر کا دربار: ۵ فروری ۱۸۸۸ء صبح کی ریل میں جناب سر آکلینڈ کالون صاحب بہادر
لفٹیننٹ گورنر اضلاع مغربی و شمالی و چیف کمشنر اودھ وارد ہردوئی ہوئے۔ چار بجے شام کو بمقام وکٹوریہ ہال
دربار ہوا۔ چودھری محمد عظیم صاحب نے از جانب وکٹوریہ ہال اور راجہ درگا پرشاد نے منجانب تعلقداران ایڈریس
پڑھا اور راقم نے منجانب ڈسٹرکٹ بورڈ و حاجی محمد حسین خان شاہ آباد نے از جانب میونسپلٹی و سید تقی صاحب
(عرف بھیتن میاں) نے از طرف بلگرام انسٹی ٹیوٹ ایڈریس و شیخ نظیر حسین وکیل ہردوئی نے قصیدہ یکے بادیگرے
پیش کیا جو قبول و منظور ہوا۔ بعدہٗ الائچی و پان تقسیم ہو کر دربار برخاست ہوا۔ شام کو آتش بازی و روشنی و رقص
جدن و بگن وغیرہ طوائفان لکھنؤ و فضل حسین کشمیری کا ہوا۔

کتب خانہ وکٹوریہ ہال: ۲۲ فروری ۱۸۸۹ء۔ آج صبح کی ریل میں واسطے شرکت کمیٹی چندہ
کتب خانہ کالون صاحب وکٹوریہ ہال ہردوئی کو گیا۔ بارہ بجے کمیٹی ہوئی۔ مبلغ چار ہزار چھ سو روپے کی تعداد کتب خانہ

یخ ہذا تک قرار پائی۔ منشی نولکشور صاحب مالک مطبع اودھ اخبار نے اسپیچ پڑھی اور دو ہزار پانچ سو جلد کتاب کی
ب فہرست پیش کی جو کتب خانہ کالون میں داخل کریں گے اور دو سو روپے نقد واسطے خرید ایک کتاب جامع علوم
نون کی دینا منظور کیے جو کتاب لندن سے خرید ہو کر آوے گی۔ اوّل ہارس فورڈ صاحب ڈپٹی کمشنر بعدہٗ علی بہادر
صاحب ڈپٹی انسپکٹر مدارس و منشی نظیر حسن صاحب نے اسپیچیں پڑھیں جن کا تعلق فائدہ عام کتب خانہ کالون سے
تھا۔ پانچ بجے شام کو فراغت ہوئی اور اسی وقت شام کی ریل میں سندیلہ واپس آیا۔

شادی عزت علی: ۸ مارچ ۱۸۸۹ء۔ شب کو جلسہ رقص شادی عزت علی (خلف چودھری نصرت علی
صاحب) میں شریک ہوا۔ حسب ذیل تعلقداران اودھ نے بباعث اسسٹنٹ سکریٹری ہونے چودھری صاحب
کے شرکت کی۔ علاوہ تعلقداروں کے اور بھی معزز لوگ شریک ہوئے تھے۔ تفصیل تعلقدار: راماشنکر بخش صاحب
تعلقدار کھجور گاؤں ضلع رائے بریلی۔ راجہ تصدق رسول صاحب تعلقدار جہانگیر آباد ضلع بارہ بنکی۔ خان بہادر احمد حسن خاں
صاحب تعلقدار گدیا ضلع بارہ بنکی، مرزا محمد علی بیگ تعلقدار اورنگ آباد ضلع سیتاپور محمد علی خاں صاحب تعلقدار اسلا مئو
ضلع لکھنؤ، داروغہ نظیر حسن تعلقدار ضلع لکھنؤ، وصی حیدر عرف جنی میاں صاحب تعلقدار بلگرام ضلع ہردوئی، ٹھاکر جنگ
بہادر صاحب تعلقدار سرورہ ضلع سیتاپور، وصی الزماں تعلقدار النا ؤ راقم جلسہ میں چند منٹ ٹھہرا اا ور دو روپے چودھری
نصرت علی صاحب اور دو روپے چودھری محمد عظیم صاحب کو نیوتہ دے کر مکان پر واپس آیا۔

۹ مارچ۔ صبح کو نکاح چودھری عزت علی خلف چودھری نصرت علی صاحب کا مسماۃ مینا دختر چودھری محمد عظیم
صاحب سے بعوض مہر پچھتر ہزار کے ہوا۔ حافظ شوکت علی صاحب نے نکاح پڑھا۔ سامان آرائش و آتش بازی بہت خوب
تھا۔ چند ڈیرے طوائف کے لکھنؤ سے بھی آئے تھے۔ چودھری محمد عظیم صاحب نے حسب معمول کندوری عام طور سے
تقسیم کیا اور جہیز بھی اچھا دیا۔ تفصیل مختصر درج ذیل ہے۔

ظروف نقرہ۔ ۵۱، ظروف مسی ۱۵۱، زنجیر فیل یک، اسپ یک، شتر یک۔ زیور کل طلائی تھا۔ صرف چھپیاں گوکھرو نقرئی
تھے (کذا) یہاں تک کہ زیور پیر کا بھی مثل کڑے وچھڑے کے طلائی دیا گیا۔ ظروف و زیور مضبوط و وزنی تھا الغافیہ نہ تھا۔
چھ ہزار بخش کندوری میں صرف ہوئے۔ گیارہ بجے رات کو بارات رخصت ہوئی۔ جب بارات بخانہ دولہا پہنچی تو ایک طشت و
ایک لوٹا نقرئی و ایک پات طلائی قیمتی ۳۲ روپیہ چوری گیا جس کی تفتیش ہو رہی ہے۔

چیچک: ۴ اپریل ۱۸۸۹ء۔ آج کل سندیلہ خاص اور اس کے نواح میں اس قدر شکایت چیچک ہے کہ
صدہا لڑکے اس عارضہ میں ضائع ہو گئے اور ہوتے جاتے ہیں مگر ہاں جن لڑکوں کو ٹیکا دیا گیا ہے وہ البتہ اس شکایت

سے محفوظ ہیں۔ یہ عجب موذی عارضہ ہے کہ صدہا اشخاص کو داغ مفارقت اولاد دے رہا ہے۔

حکیم ظہور الحسن: یکم مئی ۱۸۸۹ء۔ آج میں نے بوقت ملاقات منشی مقبول احمد صاحب تحصیلدار سندیلہ سے حکیم ظہور الحسن نبیرہ میر کرم صفی کی سفارش کی کہ سندیلہ میں حکیم کے نہ ہونے سے عموماً تکلیف سخت ہے۔ اگر ان کا تقرر صیغہ میونسپل سے کیا جائے تو باعث بڑے رفاہ عام کا ہے۔ چنانچہ تحصیلدار صاحب نے سفارش منظور کی اور کومیٹی آئندہ پر اُن کا تقرر و تنخواہ وغیرہ کی بحث کو موقوف رکھا۔

مدرسہ انگریزی: ۲۷ جون ۱۸۸۹ء۔ آج کومیٹی واسطے قائم ہونے مدرسہ انگریزی کے باستعانت ارباب سندیلہ قائم ہوئی۔ کثرت رائے سے طے پایا کہ یکم جولائی سن الیہ کو دیوان خانہ چودھری دھوکن میں جو تین روپیہ ماہواری کرایہ پر لیا گیا ہے مستقر ہو۔ بالفعل تین مدرس دو انگریزی اور ایک فارسی داں واسطے تعلیم کے تجویز ہوئے واسطے امور انتظامی کے منشی علی بہادر صاحب تحصیلدار سندیلہ پریسیڈنٹ و کنور درگا پرشاد صاحب و کنور نرندر بہادر صاحبان وایس پریسیڈنٹ اور راقم الحروف سکریٹری تجویز ہوا اور پروانہ جات تقرری بنام مدرسین جاری ہوئے۔ پنڈت آسارام نقل نویس سب ججی ہردوئی مدرس اوّل تنخواہ بیس روپے، اکبر خاں سندیلہ مدرس دوئم دس روپے، لالہ جواہر لال سندیلہ معلم فارسی سات روپے، بھگوان دین چپراسی سندیلہ تین روپے۔ کُل چالیس روپے ماہواری۔ پنڈت آسارام کے نام پروانہ تقرری بھیجا گیا ہے اگر وہ قبول نہ کریں گے تو کوئی دوسرا شخص تجویز ہوگا۔

یکم جولائی۔ آج مدرسہ انگریزی بہ دیوان خانہ چودھری دھوکن مرحوم راقم و کنور درگا پرشاد و کنور نرندر بہادر صاحبان نے کھولا۔ بالفعل اکبر خاں و جواہر لال نے کام شروع کیا۔ ہیڈ ماسٹر ابھی نہیں آئے۔

۹ جولائی۔ آج میں نے ایک فہرست مرتب کی اور اس کو شائع کیا کہ روسائے قصبہ ہذا و ممبران میونسپل بروقت تشریف آوری کرنل پچر صاحب جو ۱۱ جولائی کو وارد سندیلہ ہوں گے کھولنے مدرسہ انگریزی میں شرکت کریں۔

۱۱ جولائی۔ آج بارہ بجے دن کی ریل میں کرنل پچر صاحب ڈپٹی کمشنر ہردوئی و ڈاکٹر مکریڈی صاحب و پرل صاحب کپتان پولیس واسطے کھولنے مدرسہ انگریزی سندیلہ کے رونق بخش سندیلہ ہوئے اور دیوان خانہ چودھری دھوکن میں تشریف لے جا کر جہاں بالفعل مدرسہ تجویز ہوا ہے مدرسہ کو کھولا۔ راجہ درگا پرشاد صاحب تعلقہ دار سرون بڑاگاؤں نے اسپیچ پڑھی جس کے جواب میں صاحب ضلع نے اپنے ایڈریس میں وعدہ کیا کہ ہم اس مدرسہ کے واسطے سرکاری مدد بھی دیں گے اور میونسپل سندیلہ سے بھی بحالت گنجائش مدد کی تحریک کریں گے راقم و جملہ تعلقداران و روسا قصبہ ہذا موجود جلسہ افتتاح تھے۔

۱۹ر جولائی۔ میر علی حسن ساکن پہانی ہیڈ ماسٹر مدرسہ انگریزی سندیلہ مقرر ہو کر آئے اور چارج اپنے عہدہ کا لیا۔
۲۱ر جولائی۔ آج کل بہ منصب سکریٹری مدرسہ انگریزی سندیلہ مجھے کچھ کام زیادہ بڑھ گیا ہے لیکن اس سے مجھے کچھ مجبوری نہیں ہے اور نہایت خوشی سے میں اس کام کو انجام دیتا ہوں جسکی علت غائی صرف رفاہ خلائق و حصول اعزاز ہے۔
۳۱ر جولائی۔ آج بغرض ہوادار کرنے دیوان خانہ چودھری دھوکن مرحوم (جس میں بالفعل مدرسہ انگریزی قائم ہوا ہے) ایک دروازہ پشت برلب سڑک توڑ دیا تاکہ معلمین و متعلمین کو احتباس ہوا سے تکلیف نہ ہو۔

<u>ایک میت</u> : یکم ستمبر ۱۸۸۹ء۔ آج مساۃ شفیق النساء دختر منشی سید عنایت حسین صاحب یعنی اہل خانہ سید الطاف رسول خلف منشی فضل حسین نے بعارضہ تپ دق بوقت ۵ بجے شام کے اس دنیا سے رحلت کی۔ عمر ۱۷ رسال تھی مرحومہ کے تا بمرگ حواس خمسہ درست رہے اور باتیں کرتی رہیں اور کلمۂ شہادت پڑھتی رہیں۔ ۲۲ر اکتوبر ۱۸۸۲ء کو بہ صرف مبلغ پندرہ ہزار روپیہ شادی ہوئی تھی لیکن بباعث نااتفاقی مورثان فریقین ایک روز بھی آسائش نصیب نہ ہوئی۔۔۔ دو باتیں مرحومہ کے انتقال میں جدید ہوئیں جو رواج سندیلہ کے خلاف تھیں۔ اوّل جب لاش مکان سے لے چلے تو بباعث خفیف ترشح ایک سائبان مختصر بغرض حفاظت لاش چار آدمی تانے لے چلے۔ دوسرے یہ کہ نماز جنازہ مسجد مہرہ کے اندر ہوئی جس کی نسبت علما میں اختلاف ہے۔

<u>مدرسہ انگریزی و حکیم ظہور الحسن</u> : ۱۹ر ستمبر ۱۸۸۹ء۔ آج میونسپل کمیٹی ماہواری قرار پائی۔ بکثرت رائے مبلغ پندرہ روپے ماہوار واسطے امداد مدرسہ انگریزی کے تجویز ہوئے۔ حکیم ظہور الحسن نبیرہ میر کرم صفی، چوپار ٹولہ، سندیلہ از جانب میونسپل کمیٹی طبیب تجویز ہوئے اور دس روپے ماہوار ان کو کمیٹی میونسپل سندیلہ سے ملیں گے بشرطیکہ حکام بالا اس تجویز کو منظور کریں اور بائیس روپے ان کو چندہ سے ملیں گے جس کو روسائے سندیلہ نے منظور کیا ہے اور ایک روپیہ میں نے بھی اس مد میں دینا جائز رکھا۔ ظہور الحسن حکیم نوجوان خوش تشخیص ہیں اور علاج اچھا کرتے ہیں۔

<u>اچھی طوائف</u> : ۱۶ر اکتوبر ۱۸۸۹ء۔ مساۃ اچھی طوائف کل بعد حج کعبہ سے داخل سندیلہ ہوئی۔ اس نے گناہوں سے توبہ کی اور اب اس کا قصد اپنے پیشہ کا نہیں ہے۔ عجب نہیں کسی سے عقد کر لیوے۔

<u>ٹیکا چیچک</u> : ۲۲ر اکتوبر ۱۸۸۹ء۔ آج کمیٹی خاص میونسپل میں یہ طے ہوا کہ کام لگانے ٹیکا ہر ایک ممبر کو تفویض کیا جائے اور وے لوگ ہفتہ وار اپنے اہتمام خاص سے کام ٹیکا کا انجام کراویں جس کی بابت ہدایت خاص گورنمنٹ موصول ہوئی ہے چنانچہ میرے متعلق ہفتہ اوّل دسمبر ۱۸۸۹ء کا مقرر ہوا ہے۔

<u>مذابح</u> : ۳۰ر اکتوبر ۱۸۸۹ء۔ آج بہ ہمراہی سید علی بہادر تحصیلدار سندیلہ دو گھنٹہ کامل گشت قصبہ ہذا کا کیا

اور مقامات ذبیحہ کے تجویز کیے ۔ آخرش متصل تالاب شراحوض ایک موقع واسطے ذبیحہ کے قرار پایا ۔ لبد تعمیر اس مکان میں گائے بیل وغیرہ ذبح ہوا کریں گے اور جو مقام تالاب شاہ دیوان عالم تجویز ہوا ہے ۔ اس میں بکری وبھیڑی وغیرہ ذبح ہوا کریں گی ۔ یہ مکانات عنقریب میونسپل سے تعمیر کرائے جائیں گے ۔

مرمت نہر: ۲۸ر نومبر ۱۸۸۹ء آج کل مرمت نہر تالاب 'بچکوہرہ' جو ندی 'بیتا' میں منتہی ہوتی ہے میرے اہتمام میں ہوتی ہے ۔ ضامن علی سابق خدمت گار راقم بحیثیت میٹ سولہ نفر مزدوروں سے کام لیتا ہے ۔ آج میں نے کام معائنہ کیا ۔ آج چند جریب تیار ہوا ہے اور اچھا ہوا ہے ۔ اب یقیناً زمانہ بارش میں پانی تالاب 'بچکوہرہ' و 'بھٹریلا' کا جو محلہ مہتوانہ کے گرد پھیل جاتا تھا بلا تکلف 'بیتا' میں بہتا چلا جائے گا ۔

قیمت گوشت: ۸ر دسمبر ۱۸۸۹ء ۔ آج میونسپل کمیٹی اکتوبر و نومبر سن الیہ کی ایک ساتھ ہوئی ۔ ایک امر متعلقہ نامنظوری افزونی قیمت گوشت کے میری رائے کو غلبہ رہا اور منجملہ بارہ ممبران موجودہ کے دس کو مجھ سے اور ایک کو چودھری محمد عظیم سے اتفاق رائے ہوا ۔ ان کی رائے تھی کہ قیمت گوشت کی دو آنے سے ڈھائی آنے سیر کردی جائے ۔ آخرش بہ کثرت رائے فیصلہ ہوا اور دو آنہ سیر قیمت قائم رہی ۔

فضل حسین و احمد علی شوق: ۲۲ر فروری ۱۸۹۰ء ۔ غلط بیانی سے بروقت افشائے راز ہمیشہ ندامت ہوتی ہے لیکن کچھ لوگ اس کے ایسے عادی ہو رہے ہیں کہ باوصف زک پر زک اٹھانے کے باز نہیں رہتے ۔ چنانچہ آج کل ایک مقدمہ مابین منشی فضل حسین تعلقہ دار و سید علی بہادر صاحب تحصیلدار سندیلہ کے زیر بحث ہے بایں تفصیل کہ منشی صاحب نے ایک فٹن گاڑی لکھنؤ سے بقیمت نوسو پچاس روپے بذریعہ احمد علی شوق (جن کا اخبار موسومہ 'آزاد' لکھنؤ سے نکلتا ہے) خرید کرا کے سندیلہ منگائی اور خرچ اس کا درج روشن باقی تعلقہ ہوا ۔ اور قبل آنے گاڑی کے منشی صاحب نے راجہ کنور بہادر صاحب تعلقدار خریداری گاڑی اور اس کی قیمت کا اظہار کیا اور محمد یحییٰ مختار عام نے بھی اس کی تصدیق میر الطاف حسین سپرنٹنڈنٹ آکٹرائی سے کی ۔ جب سپرنٹنڈنٹ نے محصول طلب کیا تو منشی ساڑھے چار سو قیمت گاڑی قرار دے کر چودہ روپے ایک آنہ محصول بھیج دیا ۔ چونکہ سپرنٹنڈنٹ کو اصل قیمت سے اطلاع تھی لہٰذا انھوں نے سید علی بہادر صاحب پریسیڈنٹ میونسپل کو اس صورت حال سے اطلاع دی جس پر تحصیلدار نے بعد استفسار از شوق (جو حسن اتفاق سے بہ تقریب شادی رفیع الزماں ہمراہ بارات آئے تھے) کل کیفیت درج کر کے منشی صاحب سے جواب طلب کیا ہے دیکھیے کہ کیا جواب دیتے ہیں ۔

۲۴ر فروری ۔ جب منشی فضل حسین کو معلوم ہوا کہ احمد علی 'شوق' مالک اخبار 'آزاد' لکھنؤ نے سید علی بہادر

تحصیلدار سے تصدیق کی ہے کہ گھوڑی بذریعہ ان کے نوسو پچاس کو خرید ہوئی ہے تب تو منشی صاحب سخت پریشان ہوئے اور ڈرے کہ ایسا نہ ہو کہ مقدمہ بجرم اخفاے محصول قائم کیا جائے لہذا فوراً مبلغ تینتیس روپے بابت قیمت گھوڑی نوسو پچاس کے محصول بھیج دیا لیکن تحصیلدار صاحب نے اس وقت تک لینے سے انکار کیا جب تک منشی صاحب نے تحریری اقبال خرید گاڑی کا بہ قیمت نوسو پچاس روپے کے نہیں کیا۔ سچ ہے کہ جھوٹ بولنے کا ایسا ہی نتیجہ ہوتا ہے جیسا کہ منشی صاحب نے حاصل کیا ہے جس سے تمام سندیلہ میں مطعونی ہو رہی ہے۔

کالون انسٹی ٹیوٹ: ۱۰ر مارچ ۱۸۹۰ء۔ آج ایک ٹکٹ شرکت جلسہ کالون انسٹی ٹیوٹ جس کی بنیاد بادشاہ باغ لکھنؤ میں ۱۱ر مارچ ۱۸۹۰ء وقت ۵ بجے شام کے قائم ہوگی مرسلہ چودھری نصرت علی صاحب اسسٹنٹ سکریٹری انجمن ہند لکھنؤ موصول ہوا۔ چونکہ کل مقدمات چند فوجداری میری پیشی میں ہیں اس لیے شکریہ کے ساتھ عذر عدم شرکت کا لکھ بھیجا[1]۔

شادی میں فضول خرچی: ۱۹ر مارچ ۱۸۹۰ء۔ چونکہ دختر مرزا محمد علی بیگ تعلقدار اورنگ آباد ضلع سیتاپور کی تقریب رخصتی بہت دھوم دھام سے قرار پائی ہے.... سنا گیا ہے کہ بہت بڑا مجمع ہوگا۔ کئی لاکھ روپے کا صرف جائز رکھا گیا ہے۔ ہمارے ہندوستانی بھائی ایسی ہی فضول خرچی سے مقروض و پریشان ہیں۔

قانون ٹیکا: ۳ر اپریل ۱۸۹۰ء۔ آج شام کمیٹی میونسپل منعقد ہوئی۔ سید علی بہادر صاحب پریذیڈنٹ کمیٹی نے تجویز کیا کہ قانون ٹیکا قصبہ ہذا میں جاری کیا جاوے جس کی تائید بالاتفاق ہوئی اور اس بارے میں ایک روداد خاص بخدمت صاحب ضلع واسطے منظوری گورنمنٹ کے بھیجی گئی۔

مرزا محمد علی بیگ: ۱۵ر جون ۱۸۹۰ء۔ مرزا محمد علی بیگ صاحب ولد آغا جان تعلقہ دار اورنگ آباد (ضلع سیتاپور) سے آج شام کو ملاقات ہوئی۔ بہت تپاک سے پیش آئے اور میرے بعض خیالات کو (جیسے بدنیتی سے احتراز اور مظلوموں پر نگاہ کرم) اپنے سے مطابق پاکر بہت خوش ہوئے اور اگلے زمانے کا پورا خیال ان کے قلب پر حاوی ہے جب کہ میں اور وہ ۱۸۶۲ء میں مدرسہ سیتاپور میں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ بالفعل عشق اچھی جان بنت گوہر طوائف سندیلہ میں مرزا صاحب سخت مبتلا ہیں، اور اس کو ایک عالیشان پختہ بصرف مبلغ چھ ہزار روپیہ سندیلہ میں تعمیر کروا دیا ہے

کثرت انبہ: ۳ر جولائی ۱۸۹۰ء۔ آج کل آم کی بہت افراط ہے۔ ہر سڑک و گلی میں اس کی خریداری ہوتی ہے۔ حتی کہ دو پیسہ سیکڑہ فروخت ہوتے ہیں۔ بمقابلہ ہر سال کثرت ہے۔

---

[1] کالون کالج کے نام سے یہ ادارہ اب بھی موجود ہے۔ ا۔ ن

نماز بقرعید: ۲۸ جولائی ۱۸۹۰ء۔ مولوی مقیم الدین صاحب ساکن ڈیرہ اسماعیل خاں صاحب کی کوشش موفورہ سے آج نماز بقرعید عیدگاہ میں ہوئی۔ دو ہزار سے زائد آدمی شریک تھے۔ کل رؤسا قصبہ مثلاً چودھری محمد عظیم صاحب و حافظ شوکت علی صاحب و منشی فضل حسین صاحب وغیرہ باوصف ترشح بارش شریک نماز ہوئے۔ ایسا مجمع شاید عہد شاہی میں ہوا ہو لیکن اس میں اس قدر رؤسا کا اجتماع محلات سے ہوگا۔ یہ نتیجہ محض مولوی صاحب کی محنت شاقہ کا ہے۔ مولوی صاحب ایک غریب الوطن شخص ہیں (جن) کا سر دست قیام سندیلہ بباعث تعلیم چودھری حسن جان متبنیٰ چودھری امیر روف صاحب کے ہے۔ جہاں سے چالیس روپے ماہوار علاوہ کھانے کے مقرر ہے) مگر محض حمیت و جوش اسلام سے اس بار عظیم کو اپنے سر لیا جس کا بفضل خدا انجام بخیر ہوا۔ اس مجمع سے ایک شوکت اسلام ظاہر ہوتی تھی۔ خدا ہم لوگوں کو ہدایت کرے کہ ہمیشہ نماز عیدین عیدگاہ میں ادا کریں جس کا چبوترہ چندہ سے وسیع کر دیا گیا ہے۔

تین درخت: ۸ اگست ۱۸۹۰ء۔ بالفعل اندرون آبادی قصبہ سندیلہ تین درخت حسب ذیل ایسے بلند ہیں جو قصبہ سے تین تین کوس کے فاصلہ پر نمودار ہوتے ہیں اور ایسا بلند کوئی درخت کسی محلہ میں نہیں ہے۔ اس وجہ سے وہ ضرور اس زمانہ میں قابلِ یادگار ہیں۔ درخت کھجور منصوبہ نظام میاں واقع اشراف ٹولہ دو عدد، درخت املی بخانہ دیا نور باف مملوکہ میر شرف علی وغیرہ برواری محلہ ایک عدد۔

ایک کتاب خواں: ۸ اگست ۱۸۹۰ء میر ہادی کتاب خواں ساکن ملیح آباد نے قضا کی۔ عمر ۶۵ سال تھی۔ یہ شخص بروز چاندرات محرم ہر سال سندیلہ میں آجاتا تھا اور مقامات معروف میں کتاب خوانی مجلس عزا میں کرتا تھا اس سوز و گداز و خوش الحانی سے کتاب پڑھتا کہ حاضرین کو نہایت لطف ملتا تھا اور مقامات غم میں سخت رقت ہوتی تھی۔ اکثر حضرات محض بغرض سماعت کتاب شریک مجلس عزا ہوتے تھے۔ اب ان کے انتقال سے لطف کتاب خوانی جاتا رہا اور محرم سندیلہ کا نصف رہ گیا۔ سنا گیا کہ یہ واقعہ کل بمقام ملیح آباد ہوا۔

ظہور لکھنوی: ۳۱ اگست ۱۸۹۰ء۔ آج گیارہ بجے دن کے منشی ظہور الحسن شاعر ساکن لکھنؤ بعارضۂ تپ مزمن مکان منشی فضل حسین صاحب تعلقہ دار بعمر ۶۵ سال فوت ہوئے۔ متوفی اگرچہ قوم کے باورچی تھے لیکن خواندہ فارسی تھے۔ شاعری میں تحقیقات اچھی تھی۔ منشی مظفر علی اسیر لکھنوی کے شاگرد رشید تھے۔ مزاج میں از بس انکساری تھی بظاہر وہی ان کی باعث فروغ ہوئی۔ ظہور تخلص تھا۔ منشی فضل حسین تعلقہ دار انھیں کے باعث شاعر مشہور ہوئے۔ دو دیوان اپنی فکر رسا سے ان کے نام سے لکھ دیے ورنہ بذاتہٖ تعلقہ دار صاحب کو ایک مصرعہ موزوں کرنے کی لیاقت نہ تھی۔ چونکہ شاعر متوفی کو تمنا تھی کہ سندیلہ کے قبرستان اُمرہرہ میں دفن ہوں پس جب زائد علیل ہوئے تو لکھنؤ سے سندیلہ چلے

آئے۔ منشی فضل حسین مجلد دے شعر گوئی پندرہ روپے ماہوار متوفی کو دیتے تھے۔ میں اس امر کو بھی فروگذاشت نہیں کرنا چاہتا کہ متوفی کی عقل صائب اور تجربہ کار شخص تھے اور اپنی منکسر مزاجی سے ہر ایک کو راضی رکھا۔

لاڈو طوائف: ۱۶ نومبر ۱۸۹۰ء۔ آج مسماۃ لاڈو طوائف دختر نمو لاطوائف جس نے ایک مسجد بازار بزازہ امانی گنج میں تعمیر کی ہے میری عیادت کو آئی۔ اس کا عہد شاہی میں بہت بڑا دور دورہ تھا۔ بوجہ مصاحبت نواب علی نقی خاں وزیر اعظم گل چکلہ دار اس کے مطیع تھے۔ یہ ایک نقل مشہور ہے کہ اس نے اپنی تقریب شادی میں ... سے گھونیاں چھلوائی تھیں۔ اب بھی وہ خوش حال ہے۔ اس کے پاس ایک موضع موسومہ لاڈو کھیڑا ضلع اناؤ میں معافی ہے جس کی نکاسی حال ...۵۰ روپیہ سالانہ سے کم نہیں ہے۔

وفات منشی فہیم الزماں: ۷ دسمبر ۱۸۹۰ء۔ کل ۱۱½ بجے رات کو منشی فہیم الزماں صاحب خلف شیخ ممتاز الزماں صاحب نواسہ دیوان محمد علی صاحب مرحوم نے بعوارض مختلف بہ عمر ۶۴ سال قضا کی۔ مرحوم نے پرسوں بدرستی و حواس جب میں ان کی ملاقات کو گیا تھا اپنے خلف اکبر شیخ بشیر الزماں سے کہا کہ میرا قیام بمقام سندیلہ بباعث مولوی مظہر علی (راقم) کے ہوا۔ تم کو چاہیے کہ ہمیشہ ان سے صلاح لیتے رہو اور ان کے افعال کی تقلید کرو جو باعث تمہاری بہبودی کا ہوگا۔ میں واقعی لکھتا ہوں کہ مرحوم نہایت خوش تقریر، تواریخ داں، حافظ قوی کے آدمی تھے۔ علوم متعارفہ میں واقفیت تام تھی۔ خوش نیت، خوش خوراک، خوش پوشاک تھے۔ دنیاوی جھگڑوں سے بباعث لائق کارندوں کے بے فکر تھے۔ راقم کے نہایت درجہ خیر طلب اور بہ وفور محبت دعائے خیر سے یاد کرتے تھے۔ اکثر عمدہ عمدہ کھانے رکابدار لکھنؤ سے پکواتے، خود کھاتے اور اپنے احباب کو کھلواتے تھے۔ سندیلہ میں ان کے مقابل دوسرا خوش خوراک کم دیکھا گیا۔ اولاد کی طرف سے بھی خوش نصیب تھے کہ دو فرزند سعادت مند بشیر الزماں و نعیم الزماں اور تین لڑکیاں یادگار چھوڑیں جن کے فرائض سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ آج ایک بجے دن کے اپنی مادر مرحومہ کے پہلو احاطہ زیر مجلس اپنی مدفون ہوئے۔ ان کی مفارقت دائمی کا مجھے صدمہ سخت ہوا۔ پانچ سو بخشش کھانے کے جس میں قورمہ قلیہ اور پلاؤ شامل تھا برسم تعزیت میں نے بھیجے ... ایک روز قبل از انتقال جناب مرحوم نے بشیر الزماں کو بلا کر وصیت کی کہ تم دونوں بھائی میری کل جائداد کے بلا تفریق مالک ہو میرے بعد کوئی فساد نہ ہونا چاہیے۔

چودھری نصرت علی: ۲۶ دسمبر ۱۸۹۰ء۔ آج چودھری نصرت علی صاحب سابق اسسٹنٹ سکریٹری انجمن ہند لکھنؤ۔ حال اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ضلع بریلی میری ملاقات کو تشریف لائے اور گھنٹہ بھر سے زائد قیام کرکے نہایت لطف و تپاک سے باتیں کرتے رہے۔ یہ خاندان چودھری حشمت علی صاحب مرحوم میں لائق و خوش فکر

آدمی ہیں اور انھوں نے اپنے ہم چشموں میں کامل ترقی واعزاز حاصل کیا۔

فضل حسین: ۲۶ر جنوری ۱۸۹۱ء۔ آج منشی سید فضل حسین صاحب نے اپنے شیشہ آلات سے میری کوٹھی کو بعنوان شائستہ آراستہ کرادیا کہ تقریب مانجہ نور چشم مجتبیٰ علی اسی مکان میں ہوگی اور ایک لیمپ جو آندھی سے بھی گل نہیں ہوسکتا اور ایک فلٹر سنگ جس سے بہ آسانی پانی صاف ہوجاتا ہے بہ اصرار مجھے دیا اور تہ دل سے اپنی محبت کا میری جانب اظہار کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ضرور صاف دل آدمی ہیں لیکن افسوس کہ باعث قلت جوہر عقل ان کے مصاحبوں کا ان کے قلب پر بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ اگر صحبت نیک ہوتی تو ان کے مقابل دوسرا آدمی سندیلہ میں نہ ہوتا۔

فوج گورا پلٹن: ۱۳ر فروری ۱۸۹۱ء۔ کل ایک فوج گورا بہ تعداد ۲۰۰ بہ قصد جانے گنگا پار کے لکھنؤ سے وارد سندیلہ ہوئی۔ سید علی بہادر صاحب تحصیلدار (ساکن بلگرام) کی کوشش سے انتظام رسد نہایت عمدہ تھا۔ گوروں نے بلا کسی جبر و تعدی کے اشیاء ضروری خریدیں اور قیمت کامل ادا کی۔

میلہ دھنک جگ: ۱۸ر مارچ ۱۸۹۱ء۔ معلوم ہوا کہ میلہ دھنک جگ حسب اشارہ کرنل ہارس فورڈ صاحب ڈپٹی کمشنر ہردوئی بہ کوشش مالا یطاق مولوی سید علی بہادر صاحب تحصیلدار سندیلہ میدان شیرہ حوض (سندیلہ) میں بڑی دھوم دھام سے ہوا جو تاریخ یکم مارچ سے تاریخ امروزہ تک قائم رہا۔ سوائے رؤسائے قصبہ جات کے بہت سے لوگ شریک ہوئے اور بہ توجہ تحصیلدار تاجروں کی بکری بھی ہوئی۔ ہاتھی، گھوڑے اونٹ بیل بھی بکثرت آئے۔ سنا گیا ہے کہ بیل کی بکری زائد ہوئی۔

عقد مرزا محمد علی بیگ: ۲۵ر مارچ ۱۸۹۱ء۔ تحریر لالہ دیاشنکر سندیلہ سے معلوم ہوا کہ پرسوں واقعہ ۲۳ر مارچ ۱۸۹۱ء روز دوشنبہ بوقت ۱۲ بجے دن کے بمقام سندیلہ عقد مرزا محمد علی بیگ تعلقہ دار اورنگ آباد ضلع سیتاپور خلف آغا جان صاحب، مسماۃ اچھی بنت گوہر طوائف اشراف ٹولہ سندیلہ سے ہوا اور پانچ ہزار مہر قرار پایا۔ مرزا صاحب بہت روز سے اس کی تمنا رکھتے تھے اور اسی امید پر علاوہ تیاری زیورات قیمتی سات ہزار خرچ کرکے اس کا امام باڑہ پختہ تعمیر کروادیا جیسا کہ اس محلہ میں دوسرا نہیں ہے۔

قافلہ برائے حج: ۱۴ر مئی ۱۸۹۱ء۔ آج ایک قافلہ قصبہ ہذا کے محلہ اشراف ٹولہ سے بغرض طواف کعبہ و زیارت مدینہ منورہ نو بجے صبح کی ریل میں روانہ بمبئی ہوا جس میں اکثر میرے اعزا و بزرگ شامل ہیں جن کے اسمائے گرامی درج ذیل کیے جاتے ہیں (۱۴ نام مردوں اور عورتوں کے درج ہیں جو یہاں حذف کیے گئے۔ ہاشمی) مشتاق احمد کو منشی فضل حسین صاحب نے اپنی والدہ ماجدہ کی طرف سے خرچ دے کر روانہ کیا ہے باقی لوگ اپنے صرف یا باستعانت

دوسروں کے جاتے ہیں۔ مسماۃ فاطمہ (اہل خانہ حافظ کرم احمد صاحب مرحوم) کو زیارت مدینہ منورہ کے لیے عرض حاصل ہے۔ میں نے بروقت روانگی مبلغ پانچ روپے ان کے نذر کیے۔ خدا سب کی تمنائیں پوری کرے اور بخیر و عافیت معاودت وطن کرے۔ منشی سید فضل حسین صاحب نے اپنے چچا منشی سید شمس الدین احمد صاحب کو مبلغ ایک ہزار پانچ صد روپیہ بغرض سفر بیت اللہ قرضاً دیا جس کی ادائی باقسط ہوگی۔

چودھری نصرت علی: ۱۸ مئی ۱۸۹۱ء۔ واقع ۱۶ مئی سن حال کو چودھری نصرت علی صاحب رئیس سندیلہ و اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ضلع بریلی نے اپنی ملازمت چار سو روپے ماہوار سے مستعفی ہو کر پھر اپنی نوکری سابقہ اسسٹنٹ سکریٹری انجمن ہند لکھنؤ کو واپس آگئے۔ اگرچہ اس عہدہ کی تنخواہ تین سو روپے ماہوار ہے لیکن اختیارات کی وسعت، اپنی ذات کو آزادی اور ہر طرح سے صورت انتفاع پیدا ہے اور زیادہ تر فائدہ کی بات یہ ہے کہ جب چاہا سندیلہ چلے آئے اور اپنے ذاتی معاملات ریاست کی پورے اطمینان کے ساتھ نگرانی کر لی اور عجب نہیں کہ بباعث عنایت افسران انجمن یہاں بھی کچھ اضافہ تنخواہ کا ہو جاوے۔ آدمی خوش نصیب ہیں۔

راجہ درگا پرشاد: ۱۱ر جولائی ۱۸۹۱ء۔ کل شب کو راجہ درگا پرشاد صاحب نے بڑا جشن واگزاری علاقہ کا کیا جس کو قرقی نے کر کورٹ (آف وارڈس) سے چھڑایا ہے۔ بہت سے لوگ اہل کاران ہردوئی سے شریک ہوئے تھے اور علی جان کشمیری اور ایک طائفہ زنانہ علاوہ سندیلے کے لکھنؤ سے آیا تھا تمام رات بڑی مسرت کا جلسہ رہا۔ چونکہ راجہ صاحب میرے دوست ہیں لہٰذا خدا سے دعا کرتا ہوں کہ خدا ان کو ہدایت کرے کہ ایسی فضولیات سے وہ اپنے کو بچاویں تاکہ علاقہ قائم رہے ورنہ سوا لاکھ روپے کی قرض داری جس کا سود دس آنے فی صدی ہے علاقہ کو اپنے خاندان میں قائم نہیں رکھ سکتے۔ یہ بحث عقلی دلیل سے کی گئی ہے اگر کوئی غیبی تائید ہو جاوے تو اس کا علم نہیں۔

مستی نظیر جان: ۲۵ر جولائی ۱۸۹۱ء۔ کل سے بہ تقریب مستی مسماۃ نظیر جان طوائف بڑی دھوم دھام ہو رہی ہے۔ کل شام کو پانچ ریل گاڑیوں میں وہ نامور مردانہ و زنانہ طائفے لکھنؤ سے آئے جو بلا اخذ اجرت معقول شہر سے نقل و حرکت نہیں کرتے ہیں لیکن مسماۃ مذکور کے ہم پیشہ ہونے کی وجہ سے بلا لیئے کسی اُجرت کے شریک جلسہ ہوئے بلکہ ایک جانب ریل کا کرایہ اپنی جیب خاص سے ادا کیا۔ مسمیان بنیادین و کالا کشمیری جو آج کل لکھنؤ میں گانے و بتانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے و مسماۃ نذیر جان چودھری طوائفان لکھنؤ و مسماۃ بگن و جدّن جو اپنی خود آپ ہی نظیر ہیں شریک جلسہ ہوئیں اور بڑے بڑے نامی قوال و ستار یے وغیرہ نے بھی شرکت جلسہ مذکورہ کے کی۔ مسماۃ نظیر جان سندیلہ نے بڑی عالی حوصلگی کے ساتھ اس جلسہ کو انجام دیا اور آج صبح سے تمام دن رات اور کل صبح تک قیام جلسہ رہے گا۔

میرے خیال میں شاید کبھی ایسی تقریب اس دھوم دھام سے قصبہ ہذا میں ہوئی ہو اور ایسے لوگ جو اپنے فن میں معروف و کامل ہیں شریک ہوئے ہوں۔ مسماۃ نظیر جان سندیلہ نے کھانا بھی اعلیٰ درجہ کا پخت کراکے تمامی مہمانوں کو کھلایا اور روسلے قصبہ ہذا کو تقسیم کیا۔ آج کے دن بڑی دھوم دھام ہو رہی ہے جو قابل دید ہے اور یہ جلسہ مرزا محمد علی بیگ صاحب تعلقدار اورنگ آباد کے گنج میں متصل ریلوے اسٹیشن ہے قرار پایا۔ اکثر رؤسا سندیلہ شریک جلسہ ہوئے۔

۲۶ر جولائی۔ آج جلسہ رقص مسیٰ نظیر جان طوائف سندیلہ کا ختم ہوا۔ شب کو جلوس کے ساتھ بہ کمال تزک و احتشام بارات نکلی تھی۔ آرائش کثی اور آتش بازی چھٹی اور شام کی ریل میں مہمان رخصت ہو کر روانہ لکھنؤ ہوئے۔ جس قدر طائفے مردانہ و زنانہ لکھنؤ سے آئے تھے انھوں نے کسی قسم کی تکلیف نظیر جان سندیلہ کو نہیں دی۔ مجھے مُسن لوگ کہتے ہیں کہ ایسی مسیٰ عہد شاہی سے اس وقت تک کسی طوائف کی ایسی دھوم دھام سے نہیں ہوئی۔

کثرت بارش: ۱۶ر اگست ۱۸۹۱ء۔ ۱۰ر محرم ۱۳۰۹ھ۔ ۲۶ر ساون ۱۲۹۸ فصلی۔ شب گزشتہ کو ۱۲ بجے رات سے بشدت بارش ہوئی اور تمام دن اسی حالت سے ہوتی رہی۔ یا تو امساک باراں کی شکایت تھی یا اس کا نزول اس افراط سے ہوا کہ لوگ گھبرا گئے اور کمتر مکانات پختہ ایسے ہوں گے جو ٹپکنے محفوظ رہے ہوں۔ کچے مکانوں کا تو کوئی ذکر ہی نہیں۔ بہت سے سرنگوں بھی ہو گئے۔ اکثروں کی دیواریں گر گئیں البعضوں کی چھتیں ..... اس شدت کی بارش کسی سال شاید ہی ہوئی ہو کہ جملہ تالاب گرد و نواح قصبہ الٹے بہہ رہے ہیں۔ اگر نہر 'بردنی' ذکر بلا' نہ نکلی ہوتی تو نصف قصبہ ڈوب جاتا۔ پیمائش آلہ بارش سے واضح ہوا کہ کل ۸ بجے دن سے ۶ بجے شام تک ایک انچہ و ۲۹ خط اور کل ۷ بجے شام سے آج ۸ بجے صبح تک ۶ر انچہ ۵۲ خط اور ۸ر بجے سے ۵ بجے شام تک ۳ر انچہ ۱۶ر خط۔ جملہ ۱۱ر انچہ ۹۷ خط بارش ہوئی۔ ضلع ہذا میں ۳۳ر انچہ اوسط بارش کا ہے اور یہ بارش بہ لحاظ اوسط سالانہ ۱۱ انچہ یعنی ایک ثلث ۲۴ گھنٹے میں ہوئی۔ دیکھا چاہیے کہ مہینہ بھادوں کیسا اپنا اثر دکھلاتا ہے۔ ہمارے اشراف محولہ کے تعزیہ داروں کو شاباشی دینا چاہیے کہ ایسی بارش و ہوا میں وہ اپنے تعزیوں کو مرثیہ پڑھتے ہوئے اسی طریقہ سے کربلا لے گئے جیسے ہمیشہ لے جاتے تھے۔ تعزیوں کا صرف ٹھاٹھ تو رہ گیا تھا اور ابرک و کاغذ کا کوئی نشان نہ تھا جو وقت معمول ساڑھے پانچ بجے "کربلا میراں معز الدین" قدس اللہ سرہٗ العزیز میں دفن ہوئے۔ امسال پورے طور سے شمار تعزیوں میں بارش مانع ہوئی اس وجہ سے صحیح تعداد ان کی میں نہیں لکھ سکتا۔

حج کے مسافر: ۲۰ر اگست ۱۸۹۱ء۔ آج رات کی ریل میں مسماۃ فاطمہ النساء و مسماۃ عزیزا ازاہل خانہ دختر حافظ کرم احمد صاحب (مرحوم) بعد حج کعبۃ اللہ براہ 'ساگر' وارد سندیلہ ہوئیں۔ موصوفین ۵ر شوال ۱۳۰۸ھ کو ہمراہ

قافلہ اشراف ٹولہ سندیلہ سے روانہ ہوئی تھیں۔ چونکہ خرچ کافی نہ تھا اور ان کے بھتیجے حافظ نذیر الدین وکیل ساگر نے کچھ استمداد ان کی نہیں کی تھی اس وجہ سے مدینہ منورہ نہ جاسکیں جس کی ان کو بے حد تمنا تھی۔

۲۵ ستمبر۔ آج منشی شمس الدین صاحب مع اہل خانہ و اعزہ و قافلہ اشراف ٹولہ کے (جس کی صراحت ۵ شوال ۱۳۰۸ھ کو درج روزنامچہ ہو چکی ہے) حج کعبۃ اللہ سے وارد سندیلہ ہوئے۔ سوائے مسماۃ ننھی اہلیہ منشی عزیز الدین صاحب مرحوم کہ ان کا انتقال بعد حج و طواف کعبہ مکہ معظمہ میں ہو گیا تھا منشی صاحب بباعث علالت خود مدینہ منورہ نہ جاسکے۔

تعزیے پر جھگڑا ۲۵ ستمبر ۱۸۹۱ء۔ آج تعزیہ میر قاسم علی سوداگر ملکانہ کا اٹھا اور گشت کرتے ہوئے جب مدرسہ مولوی حیدر علی صاحب مرحوم کے آگے پہنچا تو کسی ہندو نے سنکھ بجایا جس سے تعزیے رکھ دیے گئے اور ایک کیفیت بلوہ کی پیدا ہو گئی۔ مسلمانوں نے فوراً تار ڈپٹی کمشنر بہادر ضلع ہردوئی کو دیا کہ سنکھ کے بے محل بجنے کی باعث رانی صاحبہ اہلیہ کنور وزیر چند صاحب تعلقہ دار "رودن بڑاگاؤں" کی ہیں کہ انھوں نے پرسوں بھی جب تعزیہ وزیر ولد شہابو کمانگر و دیگر شرکائے چندہ اشراف ٹولہ کا "گدڑی" میں پہنچا تھا تو رانی صاحبہ نے اس وقت اپنی کوٹھی پر سے سنکھ و گھنٹہ بجوایا تھا۔ اگرچہ شام کو تحصیلدار و تھانہ دار سندیلہ نے مسلمانوں کو سمجھا بجھا کر مسلمانوں کے تعزیے ان کے مکانوں پر واپس کرا دیے لیکن ان کی رائے ہے کہ جب تک صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر موقع پر تشریف لا کر بعد تحقیقات تدارک مناسب نہ کریں گے اس وقت تک ہم تعزیوں کو دفن نہ کریں گے۔ اس مرتبہ مابین اہل اسلام و ہنود ایک نزاع جدید پیدا ہوئی ورنہ اب تک کبھی ایسا واقعہ قصبہ ہذا میں نہ ہوا تھا اس جھگڑے میں ملکانہ و منڈوئی و بعض اصحاب ہتوانہ کے علی الخصوص اہل تشیع شریک ہیں۔

بارش کی کثرت: ۲۷ ستمبر ۱۸۹۱ء۔ تین دن سے برابر بارش ہو رہی ہے اور ہر وقت ابر و باد محیط آسماں رہتا ہے۔ آج کل کی راتیں کیفیت ساون بھادوں کی دکھلا رہی ہیں۔ مہینہ کنوار میں میں نے ایسی کیفیت اپنے ہوش میں کبھی نہیں دیکھی۔ خلق زیادتی بارش سے عاجز ہے۔ نقشہ ذیل سے کیفیت زیادتی بارش جس کا اندراج گزٹ انگریزی سرکاری الہ آباد مطبوعہ ۲۶ ستمبر سن الیہ میں ہوا ہے ضلع ہردوئی کی ہر ایک تحصیل کی واضح ہو سکتی ہے۔

نام تحصیل	اوسط بارش سالانہ	یکم جون تا ۲۶ ستمبر	بیشی
ہردوئی	۳۴ر۷۰	۴۴ر۲۲	۹ر۹۲
شاہ آباد	۳۶ر۴۷	۴۶ر۵۰	۱۰ر۵۳
سندیلہ	۳۳ر۷۹	۳۸ر۳۱	۴ر۵۲
بلگرام	۲۶ر۹۷	۳۴ر۴۴	۷ر۷۷

مولوی خلیل الدین: ۸ اکتوبر ۱۸۹۱ء۔ آج برخوردار مولوی خلیل الدین ولد شیخ امین الدین حقانی

(عرف ہنگامیاں) جو میرے حقیقی بھانجے ہیں لبعد سیاحت بغداد، کاظمین، نجف اشرف و کربلائے معلی وغیرہ براہ بندر کراچی، لاہور، امرتسر وغیرہ ہوتے ہوئے صبح کی ریل سے وارد سندیلہ ہوئے۔ عزیز موصوف نے ۲۷ سال کی عمر میں کلام شریف حفظ کیا، عالم ہوئے، فن طبابت میں دستگاہ کامل حاصل کی اور زیارت کعبہ سے مشرف ہوئے۔ اس لیاقت کا آدمی اب قصبہ ہذا میں کوئی نہیں ہے۔ بالفعل موصوف ریاست جھالر واڑمیں بمشاہرہ مبلغ بلیس روپے ماہوار سررشتہ دار جنگی ہیں لیکن افسوس کہ علم مروجہ زمانہ حال انگریزی قانون سے ناواقف ہیں جو باعث فلاح و بہبودی امور دنیوی متصور ہے۔

ہیضہ: ۱۲ نومبر ۱۸۹۱ء۔ اگرچہ سردی پڑنے لگی ہے لیکن ہنوز آب و ہوا قصبہ ہذا کی خراب حالت میں ہے۔ آج بھی دو آدمی بلائے درماں میں ضائع ہوئے بلکہ جہاں تک اخباروں میں دیکھا جاتا ہے تو عموماً کل ہندوستان میں اسی بیماری ہیضہ کی ازحد شکایت ہے۔ شہر لکھنؤ بہت پرخطر ہو رہا ہے۔

درخت پیپل: ۲۲ نومبر ۱۸۹۱ء۔ آج شام کو کرنیل کوتن صاحب ڈپٹی کمشنر ہردوئی نے شاخ ہائے پیپل بلکہ نصف درخت متنازعہ (جس کی وجہ سے تعزیہ ہائے سوداگران ملکانہ جو چہلم کو دفن ہوتے تھے ہنوز بدستور ان کے گھروں پر رکھے ہیں اور وے لوگ رجوع نالش پر آمادہ ہیں) کٹوا ڈالا۔ یہ پیپل متصل مکان شیخ نثار علی مہتوانہ لب چاہ پختہ واقع ہے اور اس کی شاخیں سڑک پختہ کو گھیرے ہوئے تھیں۔

نئے و پرانے تحصیلدار: ۲۹ نومبر ۱۸۹۱ء۔ آج بابو نوروز علی (نئے تحصیلدار سندیلہ، سابق ہیڈ کلرک ضلع پرتاب گڑھ) میری ملاقات کو تشریف لائے اور تا دیر میرے مکان پر نشست رکھی۔۔۔۔ میں نے بوقت شب ان کی دعوت کی اور ہر قسم کا کھانا پکوا کر کھلایا۔ بظاہر آدمی صاف گو سچے و مستعد معلوم ہوتے ہیں۔

آج ڈھائی بجے ریل میں سید علی بہادر صاحب سابق تحصیلدار اپنے وطن بلگرام کو تشریف لے گئے، جہاں سے اپنی ملاقات جدید منیجری علاقہ جات کورٹ آف وارڈس، سیتاپور کو جائیں گے۔ بروقت روانگی اسٹیشن پر مجمع زائد تھا۔ سید صاحب آدمی مدبر، تیز مزاج و صاحب جرأت تھے۔ قلم پر بہت زور تھا اور حکام کو فوراً راضی کر لیتے تھے اور وہی باعث ان کی اس قدر جلد ترقی کا ہوا۔ اگرچہ خاص لوگ قصبہ کے ان سے رضامند تھے لیکن عوام کچھ شاکی تھے۔ میرے حال پر ان کی عنایت خاص تھی۔ ان کے عہد میں میونسپل سندیلہ کو بہت رونق ہوئی۔ متعدد سڑکیں جدید پختہ تیار ہوئیں۔ بم پولس پختہ بنے۔ لالٹینیں روشنی کی بڑھیں۔ مدرسہ انگریزی چندہ سے مقرر ہوا۔ حکیم ظہور الحسن بصرف میونسپل و نیز چندہ سے مقرر ہوتے۔ نہر بیرونی کربلا کھودی گئی جس سے قصبہ کو بڑا فائدہ ہوا ورنہ امسال کی

بارش میں زیادہ حصہ اس کا غرق ہو جاتا۔ غرض کہ بہت سے کام رفاہ عام کے اُن کے عہد میں ہوئے۔ انھوں نے دماغ ایسا عالی پایا ہے کہ جو تجویز کرتے تھے وہ مقبول حکام وقت ہوتے تھے۔

<u>ایک ڈپٹی کمشنر</u>: ۲۵ر دسمبر ۱۸۹۱ء۔ آج کل بہ تقریب یوم کلاں (کرسمس۔ بڑا دن۔ ہاشمی) ہمارے کرنل کوتن صاحب ڈپٹی کمشنر ہردوئی مقیم موضع 'بروا' ہیں جہاں سب سامان عیش مسماۃ دلیل کنور ٹھکرائن 'بروا' زوجہ چندر سکا پرشاد تعلقدار نے مہیا کیا ہے۔ 'دکھونہ' سے 'بروا' تک ایک سڑک مرتب ہوئی۔ تعلقداروں کی بگھیاں وغیرہ ہر دو جانب سے واسطے لانے و لے جانے احباب صاحب ضلع کے تیار رہتی ہیں۔ سامانِ روشنی کافی ہوا تعلقہ دار رؤسا، حکام و اہل کار ضلع حسب حیثیت خود ہا عمدہ عمدہ ڈالیاں پیش کر رہے ہیں اور صاحب ممدوح مع اپنے دیگر یوروپین احباب کے نہایت مسرت کے ساتھ جشن میں معروف ہیں۔ جہاں تک خیال کیا جاتا ہے ایسا یوروپین حاکم عیش دوست کامل و طامع اس ضلع میں کبھی نہیں آیا ہے جس سے کل رعایا بباعث عدم دستیابی قیمت کاملہ سخت پریشان ہیں اور نگاہ حیرت سے دیکھ رہے ہیں کہ ایسے لوگ یورپ میں بھی ہوتے ہیں جن کے افعال ظاہری قابل نفرت ہیں۔ سچ یہ ہے کہ جب سے ضلع قائم ہوا ہے ایسا صاحب ضلع کبھی نہیں آیا۔

۲۶ر دسمبر۔ بحکم کرنل کوتن صاحب ڈپٹی کمشنر کل شکاری بہیڑوں کے قصبہ ہذا سے موضع 'بروا' کو طلب ہوگئے تاکہ شکار کھیل کر ممدوح الیہ کو تازہ بٹیریں پہنچا دیں اور نام قیمت صفر۔ جو تعلقہ دار بہ جشن یوم کلاں اعلیٰ درجہ کی ڈالی خود لے جا کر پیش کرتے ہیں تو قبول ہوتی ہے ورنہ واپس۔ چنانچہ راجہ درگا پرشاد صاحب و کنور نرندر بہادر صاحب تعلقداران کی ڈالیاں اسی وجہ سے نامقبول ہوئیں کہ وہ خود نہ گئے تھے۔ لہٰذا بفور سماعت اس حال کے موصوف الیہم افتاں و خیزاں آج 'بروا' تشریف لے گئے اور ڈالیاں پیش کر کے شام کو واپس آئے کہ مقدم خوشنودی حاکم ہے۔ دیکھا چاہیے کہ یہ ظالم حاکم کب تک ضلع میں رونق بخش رہیں گے۔

<u>مردم شماری ضلع</u>: ۴ر فروری ۱۸۹۲ء۔ جو مردم شماری ۱۸۹۱ء کو تمامی ممالک محروسہ عملداری انگریزی کی ہوئی تھی تو اس کی رو سے ضلع ہردوئی میں جہاں کا میں باشندہ ہوں حسب ذیل مرد و زن شمار میں آئے۔

نام مقام	مرد	زن	میزان
میونسپل ہردوئی	۶۷۴۴	۴۴۱۹	۱۱۱۵۲
تحصیل ہردوئی	۱۵۸۸۳۱	۱۳۶۰۸۸	۲۹۴۹۱۹
میونسپل سنڈیلہ	۸۴۷۸	۸۴۶۵	۱۶۹۴۳
تحصیل سنڈیلہ	۱۳۸۴۴۰	۱۲۲۴۰۶	۲۶۰۵۴۶
تحصیل بلگرام	۱۴۵۸۸۶	۱۲۶۲۱۹	۲۷۲۱۰۵
میونسپل سانڈی تحصیل بلگرام	۴۹۱۴	۴۷۲۵	۹۶۳۹
میونسپل شاہ آباد	۱۰۲۹۲	۹۸۶۱	۲۰۱۵۳
میونسپل پیہانی (تحصیل شاہ آباد)	۴۰۶۶	۳۹۲۷	۷۹۹۳
میزان کل ضلع ہردوئی	۵۹۹۴۸۵	۵۱۱۷۰۹	۱۱۱۲۱۹۴

رام لیلا: ۲۱ فروری ۱۸۹۲ء۔ آج ۶ بجے شام کو بہ سواری بگھی معہ عزیزی بشیر الزماں بغرض معائنہ میلا رام لیلا کے گیا۔ جماؤ اچھا ہے۔ کچھ دوکاندار بیرونجات کے بھی آئے ہیں۔ بیل گائے کی کثرت ہے۔ پانچ چھ ہاتھی اور بہت سے گھوڑے سوداگری کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ بیلوں کی بکری زیادہ ہو رہی ہے۔ اس میلہ کا نام رام لیلا اس وجہ سے رکھا گیا کہ یہاں کے ہنود بمقابلہ اہل اسلام زیادہ متمول ہیں جن سے حسب حیثیت چندہ کافی وصول ہو کر امور انتظامیہ میلا میں صرف ہوتا ہے اور اصل غایت مد سرکاری یہ ہے کہ چشمہ تجارت قصبہ ہذا میں جاری ہو اور ہر چیز بہ آسانی و بہ کفایت مل سکے جس سے فروغ و رونق قصبہ منصور ہے۔

۲۴ فروری۔ امسال میلہ رام لیلا میں اکثر مسلمان بھی جاتے ہیں۔ آج چودھری محمد عظیم صاحب رئیس اعظم سندیلہ بھی تشریف لے گئے تھے۔ اب کے سال چنداں رکاوٹ مسلمانوں کو نہیں ہے ورنہ پر سال مولوی ہدایت رسول وغیرہ واعظوں نے بہت جھگڑے پیدا کر دیے تھے۔ یہ زمانہ نازک ہے انسان کو چاہیے کہ حالت وقت کی دیکھ کر کام کرے۔

تحصیلدار سندیلہ: ۱۴ مارچ ۱۸۹۲ء۔ افسوس کہ بابو نوروز علی تحصیلدار سندیلہ عیش دوست ثابت ہوئے جن کو مساۃ مقصود طوائف بازار سندیلہ سے تعشق پیدا ہو گیا ہے۔ اب میں یقین نہیں کر سکتا کہ ان کی داب حکومت پورے طور سے قائم رہے جب کہ رؤسائے قصبہ سے بھی میل نہیں ہے۔

۲۹ مارچ۔ بابو نوروز علی صاحب تحصیلدار سندیلہ کی مخالفت اہل قصبہ سے روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ تحصیلدار صاحب علانیہ طور پر لوگوں کو برا بھلا کہا کرتے ہیں اور بدنامی سے نام پیدا کرنے کو مستعد ہیں۔ طریق عمل ظاہری ضرور مقتضی اس کا ہے کہ شاید سندیلہ ان کو جلد چھوڑنا پڑے۔ یہ امر بخوبی پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ شریف القوم نہیں ہیں.......

۱۳ اپریل۔ میں نے اس قسم کا آدمی چھوٹے قد کا نہیں دیکھا کہ وہ اپنے راز کو (یعنی کہ وہ لے پالک ہیں) علانیہ افشا کرے۔ یہ حضرت ایسے عقل مند ہیں کہ ہر وقت سر دربار ہر ایک کو برا بھلا کہا کرتے ہیں حتیٰ کہ چودھری محمد عظیم صاحب تعلقہ دار سندیلہ کی نسبت کوئی دقیقہ برائی کا اٹھا نہیں رہتا۔ بالمرہ صدہا صلواتیں سناتے ہیں.... یہ سچ ہے کہ غلام لے پالک کسی کا دوست نہیں ہوتا اور نہ اس سے کوئی امید ہو سکتی ہے اور لطف یہ ہے کہ باوجود حکومت سخت حضرت تماش بینی کے بھی شائق ہیں۔ مساۃ مقصود طوائف بازار والی بوقت شب ہم بستر رہتی ہے۔

وفات مولوی سرفراز علی: ۸ مئی ۱۸۹۲ء۔ آج ۹ بجے شام کو مولوی سرفراز علی ملکانہ اپنے فرزند علی اصغر کی بارات شرعی دروازہ حافظ محمد اسحاق خلف میر وارث علی مرحوم کے لائے۔ مہر کی کمی و بیشی کی نسبت کچھ خفیف بحث

فریقین میں ہوئی۔ مولوی صاحب کو غصہ آگیا۔ بدن کنپنے لگا۔ بسم اللہ کہہ کر سر جھکالیا۔ دفعتاً انتقال ہوگیا۔ اس وقت مصلحتاً یہ راز مخفی کیا گیا۔ اول عقد علی اصغر مسماۃ خلیقاً دختر حافظ اسحاق سے بعوض مہر پانچ ہزار کے کردیا گیا۔ اس کے بعد وفات مولوی صاحب مشتہر کی گئی۔ ایسی واردات کم گوش گذار ہوئی اور کبھی دیکھا نہیں گیا کہ خوشی کے ساتھ شادی کرنے کو آئے تھے اور بعوض رخصتی دولھن خود کی لاش گئی۔ رخصتی کی بابت بوقت استفسار میں نے کہا کہ لاش لے جاکر دفن کرنا چاہیے اور بعد سیوم یا جب مناسب ہو رخصتی دولھن کی کرلی جائے جو باتفاق منظور ہوا۔ مولوی سرفراز علی صاحب اس وقت میں نہایت بزرگ و نیک مزاج تھے۔ ابتداً اضلاع متوسط میں ملازم گورنمنٹ رہے اور بتدریج ترقی کرکے سپرنٹنڈنٹ بندوبست مقرر ہوئے جہاں سے مبلغ اڑتیس روپے بارہ آنہ ماہوار پنشن حاصل کرکے سندیلہ آئے بچیس سال سے خانہ نشین تھے اور کچھ اراضی خرید لی تھی۔

بارش: ۲۱ر جولائی ۱۸۹۲ء۔ جمعہ گزشتہ ۱۵ر جولائی سے جو بارش شروع ہوئی اس کا سلسلہ آج تک برابر قائم ہے۔ زمین خشک بخوبی تر ہوگئی۔ اب کاشتکاروں کی خواہش ہے کہ تھوڑے روزوں کے واسطے کھلا ہو جاوے تو کھیت لگائے جائیں۔ ۲۴ر جولائی۔ جیسا کہ ایک ہفتہ ہوا خلائق نہ ہونے بارش سے منتشر تھی ویسے ہی اب اس کی زیادتی سے پریشان ہے کہ نشیبی کھیت ڈوبے جاتے ہیں اور موقع نکوئی نہیں ملتا۔

محرم کے تعزیے: ۳۱ر جولائی ۱۸۹۲ء مطابق ۶ر محرم ۱۳۱۰ھ۔ محلہ اشراف ٹولہ کی رونق تعزیہ داری صرف طوائفوں کی ذات سے ہے۔ بالمرہ ان کے تعزیے ۶ محرم تک بہت دھوم دھام بڑے مجمع کے ساتھ اٹھتے ہیں اور بہ استثنائے بعض رؤسائے معزز کل قصبہ کے لوگ ساتھ ہوتے ہیں جس کی رونق زیادہ تر سڑک پختہ پر مقابل شفاخانہ و مدرسہ سرکاری کے ہوتی ہے اگر ان کے تعزیے نہ اٹھتے ہوتے تو شاید سوائے سات اور دس محرم کے اور کسی دن مجمع نہ ہوتا۔

وصی علی شاہ: ۲۲ر اگست ۱۸۹۲ء۔ آج بوقت شب میں نے وصی علی شاہ صاحب سجادہ نشین درگاہ مخدوم صاحب سید علاء الدین صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی عیادت کی جو چند روز سے اندرون ناک دنبل نکلنے کے باعث علیل ہیں۔ بہت خاطر سے پیش آئے۔ چونکہ آدمی خلیق ہیں جو ان کی ملاقات کو جاتا ہے ان کی محبت کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ فقرا کے واسطے انکساری ایک پہلا حسن ہے جو ان میں موجود ہے۔ مولوی سید علی اختر صاحب خلف سید غلام حسین صاحب مرحوم مخدوم زادہ سندیلہ اور بہت سے دیگر حضرات ان کے مرید ہیں۔

ہیضہ: ۲۹ر ستمبر ۱۸۹۲ء۔ ہنوز ہیضہ کی چھیڑ چھاڑ قصبہ میں چلی جاتی ہے۔ دو تین آدمی بالمرہ ضائع ہوتے ہیں۔ محلہ مہتوانہ کا کل خاندان چودھری اور محلہ منڈی کے اعلیٰ رئیس سندیلہ چھوڑ کر لکھنؤ وغیرہ مقامات کو چلے گئے۔

نا اتفاقی رؤسا: ۴؍اکتوبر ۱۸۹۲ء۔ افسوس کہ ہمارے قصبہ میں باہم رؤسا کے اتفاق نہیں ہے۔ حالانکہ یہ دونوں (راجہ درگا پرشاد و کنور نرندر بہادر) ہنود تعلقہ دار جن کی باہم قرابت ہے اور ایک دادا کی اولاد ہیں باہم رنجش چلی جاتی ہے۔ اگر کاش تعلقہ تقسیم نہ ہوا ہوتا تو نائرۂ فساد کبھی نہ بجھتی۔ وائے بر حال ان تعلقہ داران کے جن کے سلسلہ باہم رشتہ داری قائم نہیں ہے۔ میں نہایت افسوس کے ساتھ لکھتا ہوں کہ ہمارے قصبہ میں مطلقاً اتفاق کی جڑ قائم نہیں۔ باہم ایک دوسرے کے ہمیشہ فسادات برپا رہتے ہیں اور اسی پھوٹ کے باعث ہر ایک حاکم تحصیل کو پورا موقع ان پر حکومت کا حاصل ہوتا ہے۔

ایک عقیدہ: ۱۵؍اکتوبر ۱۸۹۲ء۔ یہ ایک مشہور نقل تھی کہ اس زمانہ میں ہیضہ نہیں رہتا اور اگر ہوتا ہے تو دفع ہو جاتا ہے جب کہ سیار و گدھے بولنے لگتے ہیں اور ابابیلوں کا جھنڈ چہچہاتا ہوا ہوا میں اڑتا ہے۔ لیکن جب اس مرتبہ تجربہ کر کے دیکھا گیا تو بالکل خلاف اس کے وقوع میں آیا۔ یہ سب جانور بولتے رہے لیکن بیماری نہ گھٹی۔ سچ یہ ہے کہ مشیت ایزدی میں کسی کو دخل نہیں۔

ہیضہ: ۱۶؍اکتوبر ۱۸۹۲ء۔ ۲۶؍اگست سن الیہ سے شکایت ہیضہ قصبہ ہذا میں شروع ہوئی جس کی شکایت کچھ نہ کچھ آج تک چلی جاتی ہے۔ بموضع 'کدوری' میں چالیس سال کے بعد امسال ہیضہ نے خروج کیا۔ پچاس آدمی ضائع ہوئے۔ زمینداران خوش حال گاؤں چھوڑ کر دوسرے مواضعات کو چلے گئے۔

منشی شمس الدین: ۱۹؍اکتوبر ۱۸۹۲ء۔ منشی شمس الدین احمد صاحب خلف حکیم سید عبدالشکور صاحب مرحوم صرف ہمارے بزرگوں میں بقید حیات ہیں اور بظاہر تجربہ کار ممکن تھا کہ ان کا دباؤ اور ہمارے خوردوں پر ہوتا اور اُن کی ذات سے مدد ملتی لیکن افسوس کہ وہ ایسے اپنی بی بی (ہماری ممانی صاحبہ) کے قابو میں ہیں کہ بدون ان کی مشورت کے کام نہیں کر سکتے اور عورتوں کی کج عقلی مشہور ہے... (ان کی) زن مریدی تمام محلہ میں مشہور ہے۔ پس مقام غور ہے کہ ایسی حالت میں کس سے رائے لی جائے۔

گورنر کا دربار ہردوئی: ۲۹؍اکتوبر ۱۸۹۲ء۔ آج ۳ بجے شام کو سر آکلینڈ کالون صاحب بہادر لفٹیننٹ گورنر اضلاع مغربی و شمالی و چیف کمشنر اودھ کا دربار ہوا۔ مسٹر ولیم صاحب قائم مقام کمشنر اضلاع لکھنؤ وغیرہ ہمراہ تھے۔ میری کرسی کا نمبر ۲۲ تھا۔ درباریوں میں جملہ تعلقہ داران ورؤسا و معزز ممبران میونسپل و ڈسٹرکٹ بورڈ شریک تھے۔ منجانب باشندگان ضلع ہردوئی چودھری محمد عظیم صاحب تعلقہ دار و رئیس سندیلہ نے ایڈریس اردو میں پڑھا جس کا جواب لارڈ صاحب نے اسی زبان میں دیا۔ جملہ درباری حسب ہدایت کرنل کوئن صاحب ڈپٹی کمشنر ہردوئی علامہ

باندھے تھے۔ سوائے چند درباریوں کے جنھوں نے پرانے طریقہ کو قائم رکھنے کا عذر کیا تھا۔

کیمیا سازی: ۱۵ر نومبر ۱۸۹۲ء۔ آج قریب نصف شب بوقت ایک بجے مولوی لطف علی صاحب برادر کوچک شیخ مومن علی صدر اعلیٰ کا انتقال ہوا۔ آپ کو کیمیا کا بے حد شوق تھا۔ بعد ترک روزگار اسی عارضہ میں تا بہ زلیست مبتلا رہے لیکن کبھی کامیاب نہ ہوسکے۔ حتیٰ کہ دھونکتے اور پھونکتے بصارت بھی جاتی رہی۔ اب بہ عمر ۶۰ سال فوت ہوئے۔ ایک بیٹا محمد اجمل یادگار چھوڑا جو ریاست بھوپال میں تھانہ دار ہے۔

وصی علی شاہ: ۴ر دسمبر ۱۸۹۲ء۔ آج وصی علی شاہ صاحب سجادہ نشین درگاہ حضرت مخدوم سید علاءالدین صاحب قدس اللہ سرہ العزیز میری ملاقات کو تشریف لائے۔ میں نے معمولاً ایک روپیہ نذر دیا اور ایک حقہ چرمی پنجابی جو ہر چہار جانب پترہائے پیتل سے آراستہ تھا اور وہی اس وقت ان کے واسطے بھر کر آیا تھا اور مزے میں نہایت خوشگوار تھا پس ان کی پسند پر میں نے بہمہ وجوہ مرتب کرا کے ان کے ساتھ کر دیا۔ شاہ صاحب بہت خلیق و نیک صفات ہیں اور اس زمانے میں انکی ذات اہالی درگاہ میں غنیمت ہے۔ عمر ۵۵ سال کی ہے۔

مکان چودھری نصرت علی: ۲۲ر دسمبر ۱۸۹۲ء۔ آج میں نے مکان نو تعمیر چودھری نصرت علی صاحب (ولد چودھری عظمت علی صاحب مرحوم) کا دیکھا جو اپنی پھلواری کے میل میں بنایا ہے اور تالاب گیونڈی سے متصل ہے۔ یہ ایک عظیم الشان عمارت ہے .... بعد تکملہ یہ عمارت بلحاظ وسعت اور باموقع ہونے میں لاثانی ہو گی اور میرے خیال میں تیس ہزار سے زائد اس کی تیاری میں صرف ہوگا۔

نیا بند و بست اراضی: ۳ر جنوری ۱۸۹۳ء۔ آج چار بجے شام کی ریل میں مسٹر ریڈ صاحب صدر بورڈ واسطے ملاحظہ وجانچ کے وارد سندیلہ ہوئے۔ غالباً مواضعات پیمائش شدہ کی پڑتال کریں گے۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بند و بست سخت ہو گا۔ اس کا نتیجہ یہ نظر آتا ہے کہ کسی خاندان میں کوئی حقیت (زمینداری) باقی نہ رہے گی۔ شاید فی صدی پانچ زمیندار ہوں گے۔ جنھوں نے اپنے مصارف کو حالت اعتدال پر رکھا ہو اور کچھ خزانہ جمع کر لیا ہو ورنہ عموماً بچا توے مالگزاروں کے مصارف بڑھے ہوئے ہیں جن کا صرفہ آمدنی موجودہ سے بمشکل چلتا ہے اور جب نصف منافع ان کا اس بند و بست میں سرکار لے لیگی تو بجز اس کے کہ اپنے علاقہ موروثی سے ان کو دست بردار ی لازم آوے اور کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔

تعداد ممبران میونسپلٹی: ۲۳ر جنوری ۱۸۹۳ء۔ حسب ہدایت بابو نوروز علی تحصیلدار سندیلہ راقم نے کمیٹی کر کے بہ مشاورت چودھری عبدالباقی صاحب وغیرہ ممبران کمیٹی (کی) فہرست رائے دہندگان و امیدواران

ممبری کی ترمیم کرکے مرتب کی جس کی تعداد گھٹ کر اب مفصلۂ ذیل ہوئی۔

فہرست رائے دہندگان بقید محلہ		فہرست امیدواران بقید محلہ		فہرست رائے دہندگان بقید محلہ		فہرست امیدواران بقید محلہ	
اشراف ٹولہ	۸۷	اشراف ٹولہ	۳۰	منڈی	۲۹	منڈی	۴
مہتوانہ	۵۶	مہتوانہ	۲۰	ملکانہ	۲۹	ملکانہ	۶

شرکت دربار لکھنؤ: ۶ مارچ ۱۸۹۳ء۔ آج ٹھیک گیارہ بجے بہمراہی منشی فضل حسین صاحب بسواری بگھی کوٹھی کیننگ کالج (لکھنؤ) میں واسطے شرکت دربار کے حاضر ہوا۔ بارہ بجے جناب سر چارلس صاحب بہادر لفٹیننٹ گورنر تشریف لائے۔ کرنل کوئن صاحب ڈپٹی کمشنر ہردوئی نے جناب محتشم الیہ سے معرفی کرایا۔ ایک شرفی پیش کی جو مس کرکے واپس ہوئی۔ شرکت دربار کے واسطے شرط تھی کہ عمامہ سر پر، دوپٹہ کمر میں اور بوٹ وارنش پیر میں ہو، جس کی پوری تعمیل ہوئی۔ چونکہ مجھے روشنی و آتش بازی سے جو کل رات کو ہوگی چنداں شوق نہیں ہے لہذا آج آٹھ بجے رات کی گاڑی میں سندیلہ لوٹ آیا۔

تھیٹر بکاولی: ۱۴ مارچ ۱۸۹۳ء۔ آج شب کو حسب اصرار کنور نرندر بہادر صاحب تعلقہ دار میں ان کے مکان پر تماشائے تھیٹر میں شریک ہوا جو آجکل لکھنؤ سے وارد سندیلہ ہے۔ بکاولی کا تھیٹر ہوا۔ میں رات کے ایک بجے تک شریک تماشا رہا۔ اگرچہ نقالوں کی پوشاک وغیرہ عمدہ تھیں لیکن خوش آواز نہ تھے۔

تحصیلدار نوروز علی: ۴ اپریل ۱۸۹۳ء میں نے ایسا تحصیلدار قبل اس کے کوئی نہیں دیکھا جس کی مختصر تعریف یہ ہے کہ جس شخص کے خلاف مقدمہ لگان یا فوجداری فیصل کرنا چاہتے ہیں تو اول ہی سے علانیہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ فلاں کو ڈگری یا سزا دوں گا اور جب مسل کی ترتیب شروع کرتے ہیں تو اپنی مرضی کے موافق اس کا تکملہ کر دیتے ہیں تاکہ اس کے زور سے ڈگری یا سزا میں ایسی قوت پیدا ہو جائے کہ اپیل سے کوئی سقم مقدمہ کی اصلیت میں عائد نہ ہو اور تماش بینی کا یہ حال ہے کہ کوٹھے پر مقصوداً طوائف بازاری کو لیے پڑے رہتے ہیں اور نیچے کے مکان میں حضرت کی بی بی صاحبہ ہمشیرہ کلاں اور لڑکے بالے رہتے ہیں لیکن اسکا مطلقاً خیال نہیں رہتا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔

۱۷ اپریل۔ آج بابو نوروز علی تحصیلدار سندیلہ نے بضرب ڈھول منادی کرائی کہ ہر ایک دوکاندار پندرہ روز کے اندر اپنی دوکانوں کے آگے چھپر آہنی ڈالیں اور جس کا چھپر پھوس کا بعد پندرہ دن کے قائم رہے گا وہ مستوجب سزا متصور ہوگا۔ اس حکم سے اکثر دوکاندار پریشان ہیں کہ جن کو استطاعت اس صرفہ کی نہیں ہے کہ جس میں پچیس تیس روپے سے کم خرچ نہ ہوں گے۔ لہذا ضرور ہے کہ وہ پھوس کا چھپر اتار کر دھوپ میں تپا کریں اور ذکر خیر سے تحصیلدار کی

ا بھجن گا دیں۔ یہ نیا حکم نہ تو خلاف ورزی قواعد میونسپل میں ہے اور نہ اس کے واسطے کوئی منظوری
اسے ہوئی ہے اور نہ گورنمنٹ نے اپنے گزٹ میں اس کا اعلان کیا ہے پس یہ کیسے واجب التعمیل ہو سکتا ہے
چونکہ ہمارے روساے قصبہ میں اتفاق نہیں ہے اور سب نفسی نفسی کا دم بھر رہے ہیں اس وجہ سے ہر ایک حکم تحصیلدار
رو ناچار واجب التعمیل ہو جاتا ہے۔ یہ زمانہ عرصہ تک لوگوں کو یادگار رہے گا۔

چودھری محمد عظیم: ۱۹ اپریل ۱۸۹۳ء۔ آج بھی اکثر لوگ عید ملنے آئے اور میں بھی اپنے اعزہ
ملنے گیا۔ شام تک اکثر حصہ وقت کا ملاقات احباب میں صرف ہوا۔ چودھری محمد عظیم صاحب تعلقہ دار و رئیس اعظم
بہ وفات اپنے اہل خانہ سے سخت مغموم ہیں کہ ان کا لطف زندگانی بالکل جاتا رہا بلکہ کل عید کو کپڑے بھی نہیں بدلے
بہ عید گاہ میں نماز پڑھنے گئے۔ مسجد مخدوم صاحب میں معہ فرزندان خود نماز ادا کی۔ دوسرے بابو نوروز علی
یلدار کی دشمنی اور مقدمۂ زیادہ ستانی رقم بٹائی بینی گنج، جو ہنوز عدالت سے فیصل نہیں ہوا ہے اور بھی ہر وقت
ن روح ہو رہا ہے۔ گو چودھری صاحب مالا مال ہیں لیکن افسوس کہ ان کی جان کو راحت و چین نہیں اور سخت
انی میں زندگی گذار رہے ہیں اور ان کا طریق عمل ایسا غیر مستحسن ہے کہ کسی اہل قصبہ سے لطف نہیں ہے حتی کہ چودھری نصرت علی صاحب
ہ قریب اور اپنے خاص فرزندوں سے بھی نہیں۔ اسی وجہ سے کوئی انکو مسرت حاصل نہیں۔ کل بوقت ملاقات اپنا حال زار دیر تک بیان کرتے رہے۔

میلہ صحبت: ۲ مئی ۱۸۹۳ء۔ آج بہ تقریب میلہ صحبت (صحبتیا باغ کے نام پر اس میلہ کا نام
صحبت پڑ گیا تھا۔ ہاشمی) میں نے مبلغ دس روپے اپنے لڑکوں کو دیے۔ اس میلہ میں سید سالار (مسعود غازی)
بہت سامان دان ہے۔ لڑکوں میں اس کی بہت قدر ہوتی ہے۔ انواع و اقسام کی چیزیں خرید و فروخت
تی ہیں جس سے اطفال کی نہایت دلچسپی متصور ہے۔

نتیجہ امتحان الہ آباد یونیورسٹی: ۳ مئی ۱۸۹۳ء۔ اب کے سال نتیجہ امتحان یونیورسٹی
آباد حسب ذیل ہے جس کی تصدیق ۲۹ اپریل ۹۳ء کے گزٹ سرکاری سے ہوتی ہے۔ ایم اے (۲۰) بی اے (۱۹۱)
اے (۳۰۴) انٹرنس (۸۲۹) ایم اے میں کیننگ کالج کا ایک لڑکا اول آیا۔ (پہلے یوپی میں تمام امتحانات انٹرنس
یم اے الہ آباد یونیورسٹی ہی کے تحت ہوتے تھے۔ ہاشمی)

موسم: ۸ مئی ۱۸۹۳ء۔ اگرچہ مہینہ جیٹھ کا رواں ہے لیکن فصل میں کچھ ایسا غیر معمولی انقلاب ہے کہ
ب و روز بہ شدت ہوا شرقی چلتی ہے اور شب کو سردی ہوتی ہے چنانچہ آج جب میں بوقت شب زیر سائبان سو
ہا تھا تو مجھے لحاف اوڑھنے کی ضرورت داعی ہوئی اور یہی کیفیت تمامی ہندوستان میں دیکھنے اخبارات

سے ظاہر ہوتی ہے۔ میرے ہوش میں ایسا حال کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔

سفر حج: ۳ر جون ۱۸۹۳ء عزیزی حامد حسن ولد مولوی فضل علی مرحوم موسماۃ باندی طوائف تو مجھول رخصت از ریاست بھوپال جہاں وہ انسپکٹر پولیس بمشاہرہ یک صد روپے ماہوار ہیں واسطے شرف زیارت کعبہ معظمہ و مدینہ منورہ براہ جبل پور روانہ ہو کر جہاز 'حیوا' پر عازم بیت اللہ ہوئے۔ اس جہاز میں بہت سے حجاج سوار تھے۔ جب چند منازل طے ہوئیں تو دفعتاً جہاز میں آگ لگ گئی جس سے اکثر جانیں تلف اور کل اسباب حاجیوں کا سوخت ہو گیا۔ ان میں سے بعض تن تنہا کشتیوں کے مل جانے سے ایک جزیرہ کے کنارے پہنچے اور اپنی جان بچائی اور مال اسباب سے ہاتھ دھوئے۔ منجملہ ان کے عزیز موصوف بھی معہ اپنی اہلیہ کے اس آفت و مصیبت سخت سے محفوظ رہے۔ صرف اسباب کے ساتھ گئی اور اب اس جزیرہ سے مکہ پہنچنے تک وقت حج کا گزر جائے گا لہذا وارد بمبئی ہوئے ہیں۔

کثرت انبہ: ۳ر جولائی ۱۸۹۳ء۔ آم کی امسال بہت کثرت ہے۔ بعض روز شام کو ایک پیسہ سیکڑا فروخت ہوتے ہیں۔

مسخرگی: ۲۵ر جولائی ۱۸۹۳ء۔ ۱۱ر محرم ۱۳۱۱ھ .... میں حسب تحریک تحصیلدار کے ایک بجے (دن) سے چھ بجے شام تک ان کے ساتھ گذری" سے کربلا میراں معز الدین تک (جہاں قصبہ کے تعزیے دفن ہوتے ہیں۔ ہاشمی) رہا۔ اگرچہ ماندگی محسوس ہوئی... کربلا میں لالہ ہزاری لال ولد لکشمی دیال ساکن "منڈلی"، اور بابو نوروز علی تحصیلدار و پنڈت شیورام تھانہ دار سندیلہ سے بہت کچھ مسخراپن ہوا۔ حتیٰ کہ تھانیدار نے ہزاری لال کو بہ حالت مسخرگی ایک گڈھے میں ڈھکیل دیا جس میں پانی بھرا ہوا تھا جس سے کل کپڑے اس کے بھیگ گئے اور وہ تحصیلدار و تھانیدار کے پیچھے جبلا لیے ہوئے مارتا پھرتا تھا اور یہ دونوں شخص اسی مجمع میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے جس پر بڑے قہقہے ہوتے رہے اور علاوہ محرم کے ایک یہ تماشا جداگانہ تھا جس کو صاحب تہذیب نگاہ حیرت سے دیکھتے تھے اور معزز حکام کی جانب نگاہ کم وقعتی سے نظر کرتے تھے۔ افسوس کہ آجکل زمانہ کچھ عجیب رنگ کا ہو رہا ہے کہ جن باتوں کو دیکھ کر کمال تعجب ہوتا ہے۔

نفاق باہمی: ۷ر اگست ۱۸۹۳ء۔ آج کل حالت سندیلہ نہایت پرآشوب ہے۔ ایک رئیس دوسرے کا دشمن ہو رہا ہے۔ بلکہ باہم خاندانوں میں لطف نہیں ہے۔ جہاں جاؤ سوائے اس تذکرہ کا دوسرا ذکر نہیں ہوتا۔ یہ حالت میری یاد میں شاید کبھی نہ تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس کے باعث بابو نوروز علی تحصیلدار ہیں جو باہم رؤسا میں چڑھاؤ اُتار کر کے ملال پیدا کر رہے ہیں اور ان کی یہ باتیں اس وجہ سے جلد پر اثر ہو جاتی ہیں کہ صاحب ضلع کے مزاج میں ان

و رسوخ کامل حاصل ہے۔ میں ذیل میں تفصیل ان رؤسا کی حوالہ قلم کرتا ہوں جن میں بالفعل مخالفت ہے (یہ فہرست یہاں نظر انداز کی گئی۔ ہاشمی)۔ تحصیلدار صاحب کل روسا کے کم و بیش چٹکی لیتے ہیں۔ چودھری محمد عظیم صاحب اور ان کے بیٹوں سے مخالفانہ عداوت ہے۔ منشی فضل حسین صاحب کو نگاہ تیز سے دیکھتے ہیں۔ راجہ درگا پرشاد و کنور نرند بہادر صاحبان چونکہ حاضر باش رہتے ہیں اس وجہ سے بظاہر میل ہے لیکن باطناً ضرور چٹکی لینے کو تیار ہیں جب موقع پا جاویں بے داغ نہ چھوڑیں گے۔ پروردگار عالم ایسے شخص کے سابقہ سے اپنے حفظ میں رکھے۔

خلاف دستور قدیم: ۱۶ر اگست ۱۸۹۳ء۔ ہمارے خاندان میں یہ دستور کبھی نہ تھا کہ مستورات پردہ نشین قبرستان میں جاتیں یا سیر باغات کرتیں لیکن اب منشی سید فضل حسین صاحب نے اپنی اہلیہ ثانی (کاکوری) کے واسطے ایسا جائز رکھا ہے کہ وہ اکثر قبرستان 'مرہرہ' میں جایا کرتی ہیں اور چمن ہائے باغ میں جہاں ہزار ہا مردے دفن ہیں گل گشت کرتی رہتی ہیں اور اکثر کوٹھی 'مرہرہ' میں قیام بھی رہتا ہے۔ آج انھوں نے 'بڑے باغ' کی سیر کی جو طرف ہتوانہ میں متصل ریلوے اسٹیشن ہے۔ یہ امور ضرور ہمارے خاندانی اصول کے خلاف ہیں۔

امرود کی کثرت: ۲۸ر اگست ۱۸۹۳ء۔ آج کل سندیلہ اور اس کے نواح میں امرود کی اس قدر کثرت ہے کہ شاید قبل اس کے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ جو عام طور پر دو ڈیڑھ پیسہ پنج سیری فروخت ہوتے ہیں اور غریب لوگوں کے باعث شکم پُری ہوتے ہیں۔ نرخ غلہ فصل ربیع سے ارزاں ہے۔ تین پیسے پنج سیری کے حساب سے بجھڑا فروخت ہوتا ہے جس سے ایک آدمی ڈیڑھ پیسے میں بہت آسودگی کے ساتھ شکم پُری کر سکتا ہے۔

میلاد شریف: ۲۲ر ستمبر ۱۸۹۳ء۔ آج ۸ بجے رات کو پنڈت شیورام تھانہ دار پولیس نے محفل میلاد تھانہ میں منعقد کی۔ اکثر روسائے قصبہ شریک تھے۔ راقم بھی حسب اصرار شریک ہوا۔ محفل پُر رونق تھی۔ جلیبی بکثرت تقسیم ہوئیں۔ تھانیدار صاحب کا یہ فعل مصلحت سے خالی نہیں۔

۹ر اکتوبر۔ کل شب کو چودھری محمد عظیم صاحب تعلقدار نے محفل میلاد بڑی دھوم سے کی۔ مجمع کثیر تھا اور ایک ایک رکابی نصف سیر پلاؤ اور ایک ایک ہانڈی بورانی کی ہر ایک کو تقسیم کی۔ اس قسم کی محفل آج تک قصبہ سندیلہ میں میری یاد میں کسی خاندان میں نہیں ہوئی کہ پلاؤ اور بورانی تقسیم ہوئی ہو۔

بنیاد سرائے و شفاخانہ: یکم نومبر ۱۸۹۳ء۔ آج سرائے 'کوئن' کا بنیادی پتھر مسٹر جے اینڈرسن علی صاحب کمشنر قسمت لکھنؤ نے آٹھ بج کر پچیس منٹ صبح کو اپنے ہاتھ سے رکھا۔ کنی نقرئی جس پر نام صاحب بہادر بقید تاریخ وغیرہ کندہ تھا۔ قیمتی بتیس روپے کی تھی۔ اول راجہ درگا پرساد صاحب تعلقہ دار 'بڑا گاؤں' بانی سرائے نے

ایڈریس بزبان اردو پڑھا جس کے جواب میں صاحب کمشنر نے ارشاد کیا کہ اس کام خیرات سے تجار و مسافر و
بڑا نفع ہوگا اور راجہ درگا پرشاد و کرنل کوئن صاحب ڈپٹی کمشنر ہردوئی کا نام ہمیشہ یادگار رہے گا۔ دربار
رؤسا تقریباً ڈیڑھ سو کے کرسی نشین تھے اور میری نشست زمرہ آنریری مجسٹریٹوں میں تھی۔

بوقت ساڑھے چار بجے شام کے کمشنر صاحب ممدوح نے پتھر بنیادی شفاخانہ کا اراضی قدیم
محمد عظیم میں رکھا۔ یہ کتنی بھی قیمتی بتیس روپے کی تھی اور بہ جواب ایڈریس کے جو راجہ صاحب نے منجا
بورڈ پڑھا تھا صاحب ممدوح نے بابت اراضی سرائے (یہاں پہلے بھٹیاری سرائے تھی۔ ہاشمی) ۔
محمد عظیم صاحب کا اور بابت اعانت چندہ کے رؤسائے قصبہ علی الخصوص خان بہادر چودھری نصرت علی
کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے پانچ سو اس تعمیر میں دینا منظور کیے ہیں۔ یہ دربار صبح کے دربار سے پر
حکام میں کرنل کوئن صاحب ڈپٹی کمشنر مسٹر ہیوم صاحب اسسٹنٹ کمشنر اور شاہزادہ ہمایوں قد
شریک تھے۔ صاحب ضلع اور اسسٹنٹ صاحب کی کرسی بالائے تخت صاحب کمشنر کے داہنے دبا

پیزایہ: ۲۵ نومبر ۱۸۹۲ء۔ آج صبح کو بہ سواری اسپ مادیہ خود 'تالاب کھتری' واقع م
ایک موقع تیاری پزایہ کا دیکھا جو انگریزی ساخت کا جمنی دار بنایا جائے گا۔

شفاخانہ ہردوئی: ۲۳ دسمبر ۱۸۹۲ء۔ آج ۳ بجے شام کے بعد سر چارلس کراس ویٹ لف
بہادر کا شفاخانہ جدید (ہردوئی) کے صحن میں دربار ہوا۔ اول راجہ درگا پرشاد صاحب تعلقہ دار سندیلہ
تصنیف کیا ہوا قصیدہ فارسی زبان کا پڑھا۔ بعدہٗ منشی نظیر حسن صاحب نے منجانب رؤسائے ضلع ایڈریس
پڑھ کر سنایا۔ اس کے جواب میں محتشم الیہ نے انگریزی میں جواب پڑھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ رؤسا
اعانت سے شفاخانہ مردانہ اور ٹھاکر صورت سنگھ صاحب کی استعانت سے شفاخانہ زنانہ تعمیر
میں نے آج نہایت خوشی کے ساتھ کھولا۔ وہ ایک نہایت وسیع عمارت ہے۔ جناب لفٹیننٹ گورنر
ایک کمپنی فوج جنگی اور بائیس سوار رسالہ کے تھے۔ یہ محض خوبی اقبال ہے کہ چار صوبہ کا مالک ایک
جمعیت کے ساتھ ایسے وسیع ملک کا دورہ کر رہا ہے جس کا حکم ہے کہ کوئی شے ہرگز بلا قیمت نہ لی جاوے لیکن
کہ وہ قیمت کون حاصل کرے گا جب کہ رسد زمینداروں سے لے کر فراہم ہو چکی ہے۔

بڑے دن کی ڈالیاں: ۲۵ دسمبر ۱۸۹۲ء۔ میں نے بمقام ہردوئی دیکھا کہ اکثر تعلقداروں کے
اہالکار واسطے پیش کرنے ڈالی جناب نواب لفٹیننٹ گورنر صاحب بہادر اور ان کے سکریٹریوں کو بہ تقریب

دلی کے وارد ہوئے اور قیمتی ڈالیاں پیش کیں۔ ان میں سے بعض کے نام درج ذیل کرتا ہوں :

۱۔ لالہ بھگوان دیال صاحب نائب ریاست مہاراجہ پرتاپ نرائن سنگھ صاحب تعلقہ دار اجودھیا۔ ۲۔ نابت اللہ صاحب نائب راجہ امیر حسن خاں صاحب محمود آباد۔ ۳۔ خلف الصدق راجہ جنگ بہادر صاحب نانپارہ۔

تبادلہ تحصیلدار: یکم جنوری ۱۸۹۴ء۔ آج نقل حکم صاحب کلکٹر اعظم گڑھ مشعر بدیں مضمون مرسلہ دفتر ئی بنام بابو نور وز علی تحصیلدار سندیلہ کو موصول ہوئی کہ تم ضلع اعظم گڑھ کو تبدیل ہوئے اور بجائے تمہارے بد الرحمان صاحب ضلع مذکور سندیلہ کو آویں گے۔ بابو صاحب کو ۸ جنوری تک ضلع مذکور میں پہنچ کر چارج تحصیلداری ہیے۔ ہمارے کرنل کوئن صاحب ڈپٹی کمشنر کو غالباً اس تبادلے سے بہت افسوس ہوا ہوگا۔ پنڈت شیورام کھاندار بیسری دیال اسٹیشن ماسٹر ریلوے اور بعض دیگر اشخاص کو بہت ہی افسوس ہوگا کہ ان کی حکومت جاتی رہی۔

مولوی فضل رحمان صاحب: ۲۰ جنوری ۱۸۹۴ء۔ سچ یہ ہے کہ اس زمانہ میں جناب مولوی الرحمان صاحب ساکن گنج مراد آباد نہایت مقدس بزرگ ہیں جن کے حصول زیارت کی غرض سے دل مرد وزن ہر فرقہ کے منازل دور دراز بلکہ تمامی ہندوستان سے چلے آتے ہیں۔ کوئی دن نہیں جاتا چار آدمی آپ کا شرف زیارت حاصل نہ کرتے ہوں۔ حتیٰ کہ یوروپین بھی آتے ہیں چنانچہ جب ۲ دسمبر ۱ء کو جناب سر چارلس کراس ویٹ صاحب بہادر لفٹیننٹ گورنر اضلاع مغربی و شمالی و چیف کمشنر بہ تقریب دورہ ملانواں سے بانگرمؤ تشریف لے گئے تو آپ کا ذکر خیر سن کر متمنی ملازمت ہوکر مع سکریٹری مراہیاں خود مراد آباد تشریف لے گئے اور آپ سے مصافحہ کیا۔ آپ نے صرف اس قدر صاحب محتشم الیہ یا کہ ظلم زیادہ ہوتا ہے اس کا انسداد کرو۔ فی الواقع آپ کی ذات شریف بسا غنیمت ہے۔ مشہور ہے کہ اس آپ کا سن شریف ایک سو چھ سال کا ہے اور بخوبی چلتے پھرتے ہیں اور لکھنے پڑھنے وغیرہ میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔

بابو نور وز علی: ۱۲ فروری ۱۸۹۴ء۔ آج دو بجے کی ریل میں مرزا یعقوب حسن تحصیلدار وارد سندیلہ ے اور بابو نور وز علی تحصیلدار سندیلہ سے چارج تحصیلداری سندیلہ کا لیا۔ بابو صاحب سندیلہ چھوڑنے ہت افسردہ خاطر ہیں جہاں دو سال دو ماہ سولہ یوم بوجہ ناتفاقی رؤسا بہت تیزی سے تحصیلداری راج میں عجلت، تلون، ناعاقبت اندیشی، ارذل کا درخور اعتبار پر عمل، تماش بینی کا بد تہذیبی کے ساتھ شوق بازاریوں کے جھگڑ لانا، عزت و آبرو کسی کی نہ سمجھنا، قبل از وقت بات کہنا، ظلم کو جائز رکھنا، کسی مشرب کا نہ ہونا، ہندوؤں کو مسلمانوں پر ترجیح دینا۔ البتہ صاف دل و صاف معاملہ تھے۔

راجہ درگا پرشاد: ۱۸ر فروری ۱۸۹۴ء - آج بحالت تخلیہ مجھ سے اور راجہ درگا پرشاد صاحب تعلقہ دار سے نہایت صفائی کے ساتھ ہر قسم کی بات چیت ہوئی اور گذشتہ حالات بابو نور وز علی تحصیلدار بیان ہوتے رہے جو ان کے اور میرے ساتھ غیبتاً مخالفانہ طریقے سے برتے جاتے تھے اور باہم ہمارے اور راجہ صاحب کے یہ معاہدہ ہوا کہ ہم دونوں سچے دوست ہو جاویں حتّٰی کہ جو میرا دوست وہ انکا اور جو میرا دشمن وہ ان کا اور اسی پر زور دے کر قول قرار ہوا اور باہم ہاتھ ملایا گیا اور ایک چھڑی ناخ کی قیمتی پندرہ روپے میں نے بہ یادگار داستحکام اس معاہدہ کے بذریعہ تحریر امروزہ خدمت میں راجہ صاحب ممدوح کے ارسال کی جو تحریری شکرگزاری کے ساتھ قبول ہوئی اور جواب میں یہ بھی کہا کہ انشاءاللہ تعالیٰ میں بھی کسی موقع پر ایسے معاہدہ کی یادگار میں ایسی چیز پیش کروں گا کہ ہر وقت پیش نظر رہے اور میری یاد ہر وقت آپ کو دلاتی رہے۔

مسہل اور ناچ گانا: ۲۵ر اپریل ۱۸۹۴ء - آج کل مسماۃ کندن کا کوروی اہل خانہ ثانی منشی فضل حسین صاحب تعلقہ دار نے مسہل لیا ہے اس وجہ سے مسماۃ رانا میراثن ملیح آباد و لکھنؤ کا گانا شب و روز شنہ کرتی ہیں۔ یہ میراثن مثل طوائفوں کے ناچتی گاتی ہے۔ کیا عجب ہے کہ اہل محلہ خوش ہوں کہ ان کو مفت بلا ... گانا سننے کو ملتا ہے جو بالاخانہ زنانہ پر ہوا کرتا ہے۔ یہ سب باتیں زیادتی روپیہ سے حاصل ہوتی ہیں۔

خطاب خان بہادر: ۳۱ر مئی ۱۸۹۴ء - معائنہ اودھ اخبار مطبوعہ امروزہ سے واضح ہو کہ حسب اندراج گزٹ آف انڈیا محکومہ ۲۶ر مئی مولوی سید علی احمد صاحب خلف مولوی سید غلام حسین صاحب مرحوم اشراف ٹولہ سندیلہ حال وکیل جبل پور کو بہ تقریب جشن سالگرہ ملکہ وکٹوریہ انگلستان کی خطاب خان بہادر، بطور زیادہ اعزاز کے عطا ہوا۔ ۲۴ر مئی سن الیہ کو ملکہ کی عمر پورے پچھتر سال کی ہوئی۔

جلوس مہندی: ۱۰ر جولائی ۱۸۹۴ء - ۶ر محرم ۱۳۱۲ھ - آج دس بجے رات کو واجد حسین سا... محلہ اشراف ٹولہ نے مہندی نکالی سامان روشنی و آرائش بہت خوب تھا مومن علی (صدر اعلیٰ) کے مکان طرف سے چودھری عبدالباقی کے دروازے ہوتی ہوئی پیارے شہیدوں میں اور وہاں سے بازار منگل ہو میری کوٹھی کے نیچے نکلی اور پھر چوراہا سڑک پختہ پر ہو کر اس کے امام باڑہ میں پانچ بجے صبح کو پہنچی۔ مرثیہ قدم قدم پر ہوتا جاتا تھا اور مجمع بھی زائد تھا۔ میرے خیال میں یہ پہلا موقع اس کے نکلنے کا اس قصبہ میں ہے

ناک کٹی: ۲۰ر ستمبر ۱۸۹۴ء آج کلو ولد فہیم اللہ نے کلو خلف روح الدین کی ناک دانت سے کاٹ لی جو علحدہ ہو گئی یہ دونوں اشراف محلہ میں رہتے ہیں کچھ معاملہ عاشق معشوقی کا تھا۔ کلو کچھ ایسا حسین خوبصورت لڑکا نہ تھا لیکن طبیعت۔

خاندان چودھری حشمت علی: ۴ر دسمبر ۱۸۹۴ء۔ چودھری حشمت علی صاحب تعلقدار مرحوم کے خاندان میں بالفعل تین شخص محمد عظیم صاحب تعلقہ دار، خان بہادر چودھری نصرت علی صاحب اسسٹنٹ سکریٹری انجمن ہند تعلقہ داران لکھنؤ و چودھری محمد رؤف صاحب گزارہ دار تعلقہ اگرا ئی، سربرآوردہ و حکام رس ہیں اور باہم ان تینوں میں قرابت قریبہ ہے اور بظاہر یہ جلسہ یکجائی مثل شیر و شکر پیوستہ رہتے ہیں لیکن دل میں ایسا نفاق پیدا ہے کہ ایک دوسرے کا سخت دشمن ہے اور پیش گاہ حکام ایک دوسرے کی توہین و تذلیل میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔ یہ کیفیت میں نے اسی خاندان میں دیکھی۔ یہ محض نفسانیت ہے جو باعث تخریب ہو رہی ہے۔ اگر باہم ان میں اتفاق ہوتا تو کل قصبہ ان کا مطیع و منقاد رہتا اور کوئی دم مخالفت نہ مار سکتا۔ یہ علامت ادبار ہے جو عموماً مسلمانوں پر مسلط ہو رہی ہے۔

فاقے کے مارے: ۲۶ دسمبر ۱۸۹۴ء۔ آج میں ایک واقعہ افسوس ناک حوالہ قلم کرتا ہوں جو باعث عبرت ناظرین ہوگا۔ مجھے آج صبح اسسٹنٹ سرجن سندیلہ نے ایک خط بھیج کر اپنے شفاخانہ میں طلب کیا کہ میں ایک ملزم کا بہ حیثیت مجسٹریٹ بیان لکھوں جو جاں بلب ہے۔ اور شفاخانہ میں زیر علاج۔ مسماۃ پاربتی زوجہ خوشحال چمار "جند پور" مزرعہ "بھر بیرہ" تھانہ سندیلہ نے بوقت استفسار بیان کیا کہ وہ بیوہ ہے اور اس کے چار خورد سال لڑکے تھے۔ پانچ روز سے کچھ کھانے کو میسر نہیں آیا اور بھوک سے تڑپتے تھے۔ تب وہ اپنے لڑکوں کی ایسی حالت برداشت نہ کر سکی اور مرنے کو زندگی پر ترجیح دی۔ سب سے اول اس نے چاروں لڑکوں کا گلا استرے سے کاٹا اور پھر اپنے گلے پر استرا پھیرا جس سے نیم جان بچی۔ سانس پیٹ کی کچھ ذریعہ زخم کچھ منہ سے نکلتی ہے۔ چند ساعت کے بعد لڑکا تو مر گیا تینوں لڑکیاں زندہ ہیں جن کی عمر و غیرہ درج ذیل ہے۔ مسماۃ مہرنیا۔ عمر دس سال۔ مسماۃ کموتی عمر ۱۱ سال۔ مسماۃ دلارہ عمر تین سال۔ مسمی گھانسی پسر متوفی ۵ سال تینوں لڑکیاں غالباً بچ جاویں مگر ماں کی خیریت نہیں جس کی عمر ۴۰ سال ہے۔ یہ فعل محض مجبوری سے ہوا ورنہ اولاد سے دلاری دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے۔

افتتاح کوٹھی سرائے: ۴ر جنوری ۱۸۹۵ء۔ بہ تقریب کھولنے سرائے سندیلہ کے دور دور سے مہمان راجہ درگا پرشاد صاحب تعلقہ دار کے آرہے ہیں اور سرائے کی بہت آرائش ہو رہی ہے۔ واقعی یہ کام راجہ نے نہایت حوصلہ مندی کے ساتھ باوصف مقروض ہونے علاقہ کے انجام دیا ہے جس کی تیاری آراستگی اور اور مہمان داری کا خرچہ بیس ہزار سے کم نہیں ہو سکتا۔ میں نے حسب خواہش جناب موصوف ایک تاریخ سنگ مرمر

پرکندہ کرکے بطور یادگار و استحکام روابط و اتحاد کے وسط پھاٹک سرائے زیر تعمیر میں نصب کروائی ہے۔

۲۳ جنوری ۱۸۹۵ء۔ آج تقریب افتتاح سرائے کو عمل میں آئی۔ ضلع کے جملہ حکام تعلقہ داران و رؤسا وغیرہ علی قدر مراتب کرسی نشین ہوئے۔ کرنل کوئن صاحب ڈپٹی کمشنر ہردوئی جن کے نام نامی پر یہ سرائے موسوم ہوئی ٹھیک تین بجے شام کو تشریف لائے۔ اول راجہ درگا پرشاد صاحب تعلقہ دار بانی سرائے نے ایڈریس پڑھا۔ بعدہ کرنل صاحب نے بہ زبان انگریزی اس کا جواب دیا۔ پھر اس کا ترجمہ شاہزادہ مرزا ہمایوں قدر صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر نے پڑھ کر سنایا۔ ایڈریس پارچہ ریشمی سرخ پر تحریر تھا جو کشتی نقرئی میں لگا کر پیش کیا گیا اور کنجی نقرئی سے صاحب بہادر نے قفل افتتاح کا کھولا۔ صاحب بہادر نے اپنے جواب میں راجہ صاحب کو ہدایت کی کہ کچھ جائداد واسطے مرمت ضروری سرائے کی علیحدہ کر دی جاوے تاکہ وہ ہمیشہ قائم و برقرار رہے شب کو جلسہ چند طائفہ زنانہ سندیلہ و علیجان کشمیری کا ہوا۔ یہ کام راجہ صاحب نے واقعی نہایت حوصلہ کے ساتھ کیا ہے اور اپنے ہمسروں میں سبقت لے گئے۔ میری نشست بائیں جانب صف اول میں آنریری مجسٹریٹوں میں تھی۔

حال و قال: ۱۸ جنوری ۱۸۹۵ء۔ آج رات سے منشی فضل رسول صاحب کا عرس شروع ہوا اور مشائخ لکھنؤ واسطے زینت محفل کے آ رہے ہیں۔ کاش منشی صاحب (یعنی منشی فضل حسین صاحب جو اپنے والد منشی فضل رسول کا عرس کرتے تھے۔ ہاشمی) اس مصنوعی حال و قال کی مجلس موقوف کر کے دو چار ہزار جنس کھانے محتاجوں کو تقسیم کراتے تو شاید روح جناب مغفور کو زیادہ ثواب پہنچتا۔ اس مجلس کا یہی نتیجہ نکلا کرتا ہے کہ شہر کے لوگ حالیوں کا تماشا دیکھ کر قہقہہ لگاتے ہیں اور ان کی شورش سے لطف گانے کا بھی مفقود ہو جاتا ہے اور کچھ عجب نہیں کہ ایسے افعال اور حرکات سے مرحوم کی روح کو صدمہ ہوتا ہو۔

افعال قبیحہ: ۱۸ فروری ۱۸۹۵ء۔ آج عزیز از جان بشیر الزماں خلف منشی نعیم الزماں صاحب سے معلوم ہوا کہ آج کل کے تعلیم یافتہ لڑکے اکثر عارضہ زلق میں مبتلا ہیں۔ بعضوں کو شکایت کم اور بعض کو زیادہ ہے۔ جن کی شادیاں ہو گئیں وہ دوا کی تلاش میں سرگرداں اور بے شادی والے ہنوز اس سے غفلت میں پڑے ہیں۔ ان دنوں طریقہ تہذیب تحفظ بدنامی صحبت مستورات یہی قرار پایا ہے۔ تفصیل ابتلائے نوجوانان مخلوق جس کی تصدیق اب تک ہوئی ہے یہ ہیں۔ (یہاں مصنف روزنامچہ نے آٹھ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے نام درج کیے تھے جن میں ان کا ایک بیٹا بھی شامل ہے۔ ہاشمی) افسوس اگر ابتدائے عمر میں شادی کی جاتی ہے تو اولاد کم زور پیدا ہوتی ہے۔ تعلیم کی طرف چنداں توجہ نہیں رہتی اور اگر اس میں توقف ہو،

ہے تو ایسے افعال قبیحہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ کُل لڑکے تعلیم یافتہ ہیں۔

مالگذاری میں اضافہ: ۱۳ مارچ ۱۸۹۵ء۔ آج میں نے راجہ درگا پرشاد صاحب کی جمع ثانی معائنہ کی جس کی وہ نقل لائے ہیں تو جمع مالگذاری سابق کے دوچند ہے۔ اس حالت میں کیسے امید ہو سکتی ہے کہ ان کا یا کسی کا علاقہ بحالت موجودہ قائم رہ سکتا ہے چہ جائے کہ راجہ صاحب پر اس وقت قریب ۹ لاکھ کے قرضہ ہے۔ جس وقت سے میں نے یہ کیفیت دیکھی ہے اور سنی ہے میرے ہوش جاتے رہے کہ میں اپنی کثیر عیال داری کے ساتھ کیونکر بسر کرسکوں گا جب کہ جمع سابق سے دوچند تجویز ہو رہی ہے اور کوئی دوسرا ذریعہ معاش کا بجز اس کے میرا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ عزت و آبرو سے رکھے۔ بجز اس کے افضال کے اب کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔

ندوۃ العلما لکھنؤ: ۱۰ اپریل ۱۸۹۵ء۔ بارہ دری قیصر باغ (لکھنؤ) میں جلسہ ندوۃ العلما منعقد ہوا ہے جس میں مشہور و نامی علما تمامی ہندوستان کے شریک ہیں۔ مقاصد جلسہ یہ ہیں کہ اہل اسلام کو ترقی دینی و دنیوی میں توجہ و ترغیب ہو جو اور قوموں سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ دونوں وقت صبح و شام وعظ ہوتا ہے اور اس تمامی خرچ کے کفیل حضرت وکیل صاحب ہیں۔ خدا ان کو اپنی کوشش میں کامیاب کرے۔

ہنگامہ محرم میں: ۲ جولائی ۱۸۹۵ء۔ نویں محرم کو تعزیہ چودھری کلو کا معہ دیگر تعزیوں کے گڈری میں زیر محل راجہ صاحب کے پہنچا تو ایک مرتبہ غل ہوا کہ رانی چندر کنور زوجہ راجہ وزیر چند صاحب کے محل سے اینٹ آئی اور کل تعزیے وہیں رکھ دیے گئے اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ تحصیلدار و تھانیدار و مرزا ہمایوں قدر صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر موقع پر پہنچ کر تحقیقات کرنے لگے حالانکہ اینٹ آنے کی کوئی اصلیت نہ تھی۔ صرف یہ کارروائی واجد خاں بلوچ کی تھی جنھوں نے صمد ولد علی رضا مہتوانہ والی وغیرہ چند اپنے ملازم افترا پرداز کو اشارہ کر دیا تھا کہ جب تعزیے گڈری میں پہنچیں تو چند پارہ سفالی تعزیوں پر اچھال دیں اور جب رانی کی طرف بدگمانی ہو کر ہنگامہ برپا ہو جاوے اور تعزیے والے پولس و حکام کا کہنا نہ مانیں تو آپ کو درمیان میں ڈال کر انھیں راضی کریں تاکہ اس کے باعث سے پیش گاہ حکام رسوخ و وقعت پیدا ہو اور پولس ہر ایک فعل ناجائز کے ارتکاب کو مانع نہ ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب تعزیہ والوں نے پولس وغیرہ کا کہنا نہ کیا تو حضرت نے اپنی سانباز متخیلہ کے مطابق سب کو رام کر کے تعزیوں کو آگے بڑھایا اور ایک نوع کی ظاہری نمود حاصل کی ورنہ دراصل یہ کوئی بات نہ تھی مگر افسوس یہ فطرت ان کی کھل گئی اور پولس کو بھی معلوم ہو گیا۔ عجب نہیں کہ یہ راز حکام کو بھی منکشف ہو جاوے اور ان کی فطرتی کارروائی کا ثمرہ بدلے۔ عجب بے ڈھب لوگ ہیں کہ

حکام وقت سے ان کو مطلقاً خوف نہیں اور ایسے فعل کا ارتکاب کرتے ہیں کہ جس سے نیک رئیسوں کے جسم میں رعشہ
پیدا ہوتا ہے۔ خدا ایسے لوگوں کی نزدیکی سے اپنی حفاظت میں رکھے۔

حصہ میلاد: ۱۲ ستمبر ۱۸۹۵ء۔ آج صبح کو چودھری نصرت علی صاحب خاں بہادر رئیس "مہتوارہ" کے
مکان پر محفل میلاد شریف منعقد تھی۔ اول پانچ پانچ لڈو جو اسی غرض سے تیار ہوئے تھے تقسیم ہوئے اور جب وہ
باعث مجمع کثیر کافی نہ ہوسکے تو مٹھائی بازار سے منگا کر تقسیم ہوئی اور جب وہ بھی غیر کافی ٹھہری تو سو روپے کے
پیسے فی کس دو آنے کے حساب سے بانٹے گئے اور جب وہ بھی حساب نہ چل سکا تو ایک آنہ، بعدہٗ چھ پائی فی کر
دیے گئے۔ سنا گیا کہ ۱۵۰ روپے اس تقریب میں صرف ہوئے۔ اب سندیلہ میں مجلس کرنا بہت مشکل ہو گیا۔
نیکی تو در کنار بُرائی پیش قدمی کو تیار۔ اس وجہ سے متوسط لوگوں نے ایسا کرنا موقوف کر دیا ہے۔ گردن صد عیب و نہ کردن یک عیب

تحفہ راجہ صاحب: ۲۶ ستمبر ۱۸۹۵ء۔ راجہ درگا پرشاد صاحب تعلقہ دار "سرون بڑا گاؤں" نینی تا
سے آج واپس آئے اور براہ ازدیاد محبت و مراسم دوستانہ ایک قلمدان برنجی ساخت انگریزی وارنش شدہ لائے او
بطور تحفہ کے مجھے لطف فرمایا۔ سچ یہ ہے کہ ایسے طریق عمل سے بنائے محبت و دوستی کو صورت استحکام کی پیدا ہے۔

لکھنؤ کی قفلیاں: ۱۷ اکتوبر ۱۸۹۵ء۔ مسمی ڈھونڈھے لکھنؤ کی بالائی کی قفلیاں نہایت اعلیٰ د
کی ہوتی ہیں جو پاؤ بھر سے کم نہیں ہوتیں اور دو آنہ سے تین آنہ تک بلحاظ کمی و بیشی بالائی کے فی قفلی فروخت ہو
ہے۔ آج وہ بذریعہ برخوردار مرتضیٰ علی لکھنؤ سے منگائی تھیں اور استعمال میں آئیں جو نہایت پسندیدہ ثا
ہوئیں اور بدرجہ غایت قابل تعریف۔ مرتضیٰ علی ایک سال درجہ ایف اے کا امتحان دیں گے۔ خدا کامیاب کرے

دربار لفٹیننٹ گورنر: ۳ فروری ۱۸۹۶ء۔ آج ۸½ بجے صبح کی ڈاک گاڑی میں بغرض شرک
دربار لکھنؤ گیا۔ قیصر باغ میں ٹھہر کر اپنے ساتھ کا کھانا بمعیت منشی سید فضل حسین صاحب تعلقہ دار کے کھایا ا
انھیں کی بگھی پر ۱۱½ بجے کیننگ کالج موقع دربار میں بذریعہ ٹکٹ درباری داخل ہوا۔ ٹھیک بارہ بجے جناب
سر انٹنی میکڈانل صاحب لفٹیننٹ گورنر اضلاع مغربی و شمالی و چیف کمشنر اودھ تشریف لائے۔ اول فرم
شاہی و تمغہ عطائے خطاب (نائٹ کمانڈر) مہاراجہ پرتاب نرائن سنگھ اجودھیا کو مرحمت ہوا اور فرم
پڑھ کر سنایا گیا پھر ہر ایک درباری کو ضلع کے صاحب ڈپٹی کمشنروں نے ٹکٹ کے ذریعہ سے نام پکار کر پیش
اور لفٹیننٹ گورنر بہادر نے ایک اشرفی نذر پیش شدہ مس کی۔ بعدہٗ درباری جو بساط قالین اونی داہنی کنا
سے پیش ہوا تھا وہ بائیں کنارہ قالین مذکور ہو کر اپنی جلسے نشست پر جا بیٹھا۔ اس کے بعد جناب مختتم ا

انگریزی میں اسپیچ دی جس کا ترجمہ اردو محمد رفیق صاحب ایڈیشنل جج لکھنؤ نے پڑھ کر سنایا جس کا خلاصہ نسبت تعلقہ داران اودھ یہ تھا کہ اپنی اولاد کو تعلیم دلائیں اور مصارف شادی وغمی میں تخفیف کریں اور بادشاہ وقت کی خیرخواہی میں معروف رہیں۔ تاں بعد صلح کے ڈپٹی کمشنر نے درباریوں کو عطر پان دیا اور ٹھیک ۱۱ بجے کے دربار برخواست ہوا اور سہ پہر بمعیت منشی صاحب موصوف قیصر باغ میں واپس ہوکر بعد ادائے نماز ظہر ریلوے اسٹیشن کو گیا اور ۴ بجے شام کی ڈاک گاڑی میں اپنے مکان سندیلہ کو واپس آیا۔

یوپی کی میونسپلٹیاں: ۷ر مئی ۱۸۹۶ء۔ رپورٹ سال تمام گورنمنٹ اضلاع مغربی وشمالی واودھ میغہ میونسپل ۱۸۹۶ء سے واضح ہوتا ہے کہ انعقاد میونسپل کمیٹی بلقید مردم شماری ۱۸۹۱ء ضلع ہردوئی حسب ذیل ہے۔

نام قصبہ	کب میونسپلٹی قائم ہوئی	مردم شماری اندر حدود میونسپل
سندیلہ	۱۴ر جولائی ۱۸۶۸ء	۱۶۸۱۳
ہردوئی خاص	یکم جنوری ۱۸۷۱ء	۱۱۱۵۲
شاہ آباد	یکم نومبر ۱۸۷۲ء	۲۰۱۵۳
ساندی	یکم اپریل ۱۸۷۷ء	۹۶۲۹
پہسانی	یکم اپریل ۱۸۷۷ء	۷۹۹۳

قیام میونسپل ومردم شماری شہرہائے نامی اضلاع مختلف مغربی وشمالی واودھ

نام قصبہ وشہر	کب میونسپلٹی قائم ہوئی	مردم شماری اندر حدود میونسپل
لکھنؤ	یکم جنوری ۱۸۶۲ء	۲,۶۷,۹۱۰
بنارس	یکم جون ۱۸۶۸ء	۲,۱۳,۱۶۱
آگرہ	۷ر اکتوبر ۱۸۶۳ء	۱,۶۹,۵۰۹
کانپور	۲۲ر نومبر ۱۸۶۱ء	۱,۶۳,۷۷۹
الہ آباد	یکم مارچ ۱۸۶۳ء	۱,۶۲,۸۹۵
میرٹھ	یکم جولائی ۱۸۶۴ء	۱,۱۹,۳۹۰
بریلی	۲۳ر جون ۱۸۵۸ء	۱,۰۰,۷۸۵
فیض آباد	۱۹ر اگست ۱۸۶۵ء	۷۲,۶۸۴
باندہ	یکم نومبر ۱۸۶۵ء	۶۳,۰۷۱

بسمل خیرآبادی: ۸ر جون ۱۸۹۶ء۔ آج محمد حسین بسمل خیرآبادی اپنے مرشد حافظ کرم احمد صاحب مرحوم کی قبر پر واسطے فاتحہ خوانی کے آئے جو ۲۲ سال گزشتہ سے منحرف تھے۔ ابتدا میں ان کو ایسی عقیدت تھی کہ حضرت مرشد کی قدم بوسی کو خیرآباد سے پاپیادہ آتے تھے اور بحالت قیام سندیلہ چارپائی پر نہیں لیٹتے تھے۔ اس وقت ان کی شادی نہیں ہوئی تھی اور نہ کوئی معمدہ روزگار ملا تھا لیکن جب شادی ہوئی اور ریاست ٹونک میں ریکس کے میر منشی مقرر ہوئے تو سندیلہ کا کبھی رخ بھی نہیں کیا۔ جب بی بی لاولد فوت ہوئیں اور روزگار سے پنشن پائی ولولہ سابقہ پھر جوش میں آیا اور حسرت بھری آرزوں سے کشاں کشاں سندیلہ آئے اور فاتحہ مزار مرشد کے بعد

قوالی گانا سنا۔ اگر کاش حیات آں رشد میں اپنی عقیدت سابقہ پر قائم رہ کر آمد و رفت در رکھتے تو بمقابلہ اوروں کے ان کو خلیفہ ہونے کا فخر اور ترجیح ہوتی۔

لفٹیننٹ گورنر: ۲۴ جولائی ۱۸۹۶ء۔ سر انیٹنی میکڈانل صاحب لفٹیننٹ گورنر نہایت بیدار مغز و منصف حاکم ہیں۔ حکام ماتحت علی الخصوص یوروپین ان سے بہت ڈرتے ہیں۔ ان کی رائے عدل و انصاف سے مملو ہے۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے کہ ان کے ماتحت رعایا پر کوئی ظلم و تعدی جائز رکھیں۔ اس وجہ سے ہر شخص کو عام حکم ہے کہ جو کچھ ان پر جبر ہوا ہو جو ان کو کہنا سننا ہو اپنی زبان سے بیان کریں تاکہ اس پر غور مناسب کیا جاوے۔ عمر صاحب محتشم الیہ قریب پچاس سال کے ہو گی۔ پستہ قد جسیم آدمی ہیں۔

ایک تعلقہ دار کی فریاد: ۹ اگست ۱۸۹۶ء۔ آج منشی رحمت اللہ تحصیلدار سندیلہ نے بوقت ملاقات مجھ سے بیان کیا کہ . . . تعلقہ دار کی وجہ ناراضگی میرے ساتھ یہ ہے کہ انھوں نے دو شکایتیں مجھ سے کیں کہ میں ان کا انسداد کرا دوں لیکن وہ ایسے امور تھے کہ میں ان کی تعمیل میں قاصر رہا۔ اول یہ کہ چودھری علی جان خلف دویم چودھری محمد عظیم صاحب تعلقہ دار جہاں کہیں ملتے ہیں تو مجھے انگوٹھا دکھلاتے ہیں اور قیں کر دیتے ہیں اور جب میں بازار میں نکلتا ہوں تو بازاری لڑکے مجھے منہ چڑھاتے ہیں اور انگوٹھا دکھلاتے ہیں۔ آپ ان کو گوشمالی واجب دیں۔ دوسرے میری آشنا شیرن (طوائف) کے یہاں رات کو ڈھیلے آتے ہیں اور نصف جلے ہوئے کنڈے اور میری کوٹھی و محل سرا میں اینٹیں آتی ہیں تو میری بی بی کو اس موسم گرما میں صحن میں لیٹنا دشوار ہو گیا ہے۔ اس کا انسداد کر دیں۔ میں نے کہا کہ دونوں باتیں مجھ سے نہیں ہو سکتی ہیں۔ آپ خود اس کا بہ حیثیت تعلقہ دار اپنی دولت مندی کے باعث بندوبست کر سکتے ہیں۔

انتظام بے روزگاری: ۱۴ اگست ۱۸۹۶ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار ہی روزہ کے معلوم ہوا کہ یکم اگست ۱۸۹۶ء کے گزٹ انتظام عامہ امیدواران ملازمت کے لیے گورنمنٹ نے بذریعہ ریزولیشن ۸۴/۹۴۲ ج محکمہ ۲۴ جولائی سن الیہ کے مشتہر کیا ہے کہ جو شخص انگریزی یا اردو کا مڈل پاس ہو گا اس کو ۲۵ روپے ماہوار تک ملازمت مل سکتی ہے اور جو انٹرنس پاس ہو گا اس کو ۲۵ روپے ماہوار سے زائد تنخواہ تک نوکری مل سکے گی۔

اسپتال سندیلہ: ۶ ستمبر ۱۸۹۶ء۔ آج شفاخانہ جدید سندیلہ کا کھولا گیا اور بابو سوشی بھوشن بنرجی اسسٹنٹ سرجن سندیلہ نے اس میں بیٹھ کر معالجہ شروع کیا۔

ایک رسم: ۲ اکتوبر ۱۸۹۶ء۔ چونکہ بخانہ الطاف رسول خلف الصدق منشی سید فضل حسین صاحب امید ولادت فرزند اولین ہے اور اب ساتواں مہینہ ختم ہو رہا ہے لہذا حسب رواج خاندانی آج تقریب ستوائی

دوپٹہ ڈالنے کی یہ فرائض مستورات برادری گاتے بجاتے کے ساتھ ادا ہورہی ہے۔ خدا کرے فرزند صاحب اقبال پیدا ہو۔

حکیم عبدالعزیز دریابادی: ۳۰ ر نومبر ۱۸۹۶ء۔ آج تحریر دریاباد سے واضح ہوا کہ ۲۷ ر نومبر سن الیہ جمعہ کو بوقت ۱۲ ½ بجے حکیم عبدالعزیز خلف مولوی نور کریم صاحب نے بعارضہ سل قضا کی۔ عمر ۵۶ سال تھی۔ مرحوم مدرس عربی کیننگ کالج لکھنؤ کے تھے اور پچھتر روپے تنخواہ پاتے تھے۔ علم طب میں بھی اچھی مداخلت تھی اور روز بہ روز ان کی شہرت اور فیس یومیہ بڑھتی جاتی تھی۔ اب پندرہ روپیہ تک یومیہ تھا۔ اپنے سب بھائیوں میں لیئق تھے اور سب لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔ صرف دو لڑکیاں یادگار چھوڑیں اور کل جائداد منقولہ وغیر منقولہ اپنی بیوی کے نام وصیت کر گئے۔

ایک تحصیلدار: ۱۹ ر دسمبر ۱۸۹۶ء۔ منشی رحمت اللہ تحصیلدار سندیلہ سخت جابر اور رشوت خور ہیں اور ادنیٰ ادنیٰ چیزوں کو بھی نہیں چھوڑتے۔ یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ جب وہ دورہ پر تشریف لے جاتے ہیں تو اپنے گھوڑے کے واسطے چھ سیر دانہ زمینداروں سے لیتے ہیں، چار سیر گھوڑے کو دے کر باقی سندیلہ میں لاکر چند روز تک اسی حساب سے اپنے گھوڑے کو کھلاتے ہیں ان کو خریدنا نہیں ہوتا اور نہ ان کو کوئی اثر قحط سالی کا پہنچا۔ یہ ایک ادنیٰ بات ہے اور باتوں کی نسبت اسی نہج کا خیال کر لیا جاوے اور طرہ یہ ہے کہ یہ سب جلب منفعت عزت بہ تلا کر کی جاتی ہے۔ عموماً لوگوں کا خیال ہے کہ اس قماش کا کوئی تحصیلدار سندیلہ میں نہیں آیا۔

امداد محتاجین: ۲۵ ر دسمبر ۱۸۹۶ء۔ آج مسٹر لاٹوش صاحب صدر بورڈ اضلاع مغربی و شمالی و اودھ سندیلہ آئے اور ایک قطعہ نوٹ پچاس روپے کا منشی رحمت اللہ تحصیلدار سندیلہ کو دیا کہ محتاجوں کو سرمائی بنوا دیں چنانچہ حسب تحریک تحصیلدار میں نے چالیس رضائی اور تیس عدد لہنگے بنوا دیے جن کی تیاری میں جملہ چوّن روپے آٹھ آنے صرف ہوئے۔

۵ ر جنوری ۱۸۹۷ء۔ آج ۸۰ رضائی حسب ہدایت تحصیلدار سندیلہ تیار کرا کے محتاجین کو بھیجیں جس کی حاصل تیاری میں مبلغ چھیاسٹھ روپے آٹھ آنہ نو پائی خرچ ہوئے۔ یہ امداد منجانب گورنمنٹ ہے۔ آج بہ شکل تمام فہرست مستورات پردہ نشیں قصبہ ہذا حسب ہدایت ڈپٹی انبا سہائے صاحب میں نے مرتب کی جس کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔ علاوہ اس کے ابھی اور بھی مستورات باقی ہیں جن کا اندراج عجلت میں نہ ہو سکا اشراف ٹولہ۔ ۱۳۲، مہتوانہ۔ ۹۱، ملکانہ۔ ۲۸، منڈی۔ ۲۵ = کل ۲۷۷

۱۵ ر جنوری ۱۸۹۷ء۔ آج محلہ چوپار ٹولہ (ملکانہ) میں بوقت سہ پہر ہمراہ ڈپٹی انبا سہائے صاحب

رہا اور گزارہ مستورات پردہ نشین وغیرہ کو شام تک تقسیم کرتا رہا اور اس کے بعد گیارہ بجے رات تک عورات اشراف طول کی تقسیم ہوتی رہی۔ اگرچہ اس کام سے مجھے سخت تکلیف ہوتی ہے کہ کھانے و سونے کا وقت ہو جاتا ہے لیکن محض بغرض رفع تکلیف مردمان پریشان حال جن کو دو دو تین تین وقت کھانا میسر نہیں آتا ہے میں اس تکلیف کو تکلیف نہیں تصور کرتا ہوں بلکہ عین موجب راحت جانتا ہوں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ نکوئی بہ شراکت تام ڈپٹی صاحب میری ایک مدت دراز تک رہے گی۔

تماشا کرناٹکی: ۲۶ جنوری ۱۸۹۷ء۔ آج ۴ بجے شام کو مسٹر ہوٹبل صاحب اسسٹنٹ کمشنر ہردوئی نے اپنے لشکر "باغ پڑاؤ" میں کرناٹک حیدرآباد دکن کا تماشا کرایا اور حسب طلب منشی رحمت اللہ تحصیلدار قائم راجہ درگا پرشاد و کنور نرندر بہادر شریک جلسہ تھے۔ میں نے ایک روپیہ تماشا کرنے والوں کو دیا۔ اور لوگوں نے بھی بقدر اپنی حیثیت مراتب کے دیا۔ تماشا اچھا تھا۔

ڈپٹی کمشنر ہردوئی: ۴ مارچ ۱۸۹۷ء۔ کل دوپہر کرنل کوئن صاحب ڈپٹی کمشنر ہردوئی نے مسٹر ہاپکنس صاحب سابق جج ہردوئی کو اپنے عہدہ کا چارج دے دیا اور آج نو بجے کی ڈاک گاڑی میں روانہ ولایت لندن ہوئے میں نے بھی اسٹیشن پر سلام رخصتی کیا۔ بعض روسائے قصبہ ہذا صدرہ (ہردوئی) کو بھی واسطے ملاقات کے گئے تھے۔ اور لکھنؤ تک بھی ہمراہ گئے۔ صاحب بہادر جبر پسند تھے۔ ہر ایک چیز مفت چاہتے تھے۔ ان کی پنج سالہ ڈپٹی کمشنری میں لوگوں کو کوئی نفع نہیں ہوا بجز رحمت اللہ کے جن کو پیش کاری ضلع اُناؤ سے تحصیلداری سندیلہ مقرر کرادیا۔ باوجودیکہ راجہ درگا پرشاد صاحب تعلقدار نے اپنی ٹمبر کوئن سراے سے اپنے کو زیر بار قرضہ کر دیا لیکن کوئی رعایت ان کے ساتھ بھی نہیں ہوئی۔ اور چلتے چلاتے یہ دو باتیں ان کے عہد کی یادگار رہیں گی کہ اپنی روانگی کے دو ہفتہ قبل انھوں نے کل روسائے ضلع ہذا کی قرقی کرا کے پورا مطالبہ چھ آنے خریف کا باوجود قحط سالی کے وصول کر لیا حالانکہ منشائے گورنمنٹ فی صدی چالیس لینے کا تھا جس کا اشتہار گورنمنٹ گزٹ مورخہ ۱۲ جنوری میں درج ہے۔ . . . . دوسرے یہ کہ بہت سی پردہ نشین محتاج اور غیر پردہ دار کے نام خارج کر دیے جن کو گورنمنٹ سے گزارہ ملتا تھا منجملہ ان کے بہت سے ہلاک ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ عجب نہیں کہ وہ اپنے جانشین مسٹر ہاپکنس صاحب کو بھی ایسی تعلیم دے گئے ہوں۔

تاریخ شادی: ۲۴ ستمبر ۱۸۹۷ء.... نور چشم مرتضیٰ علی کی بارات لکھنؤ جاوے گی اور عقد شرعی ہوگا اور ۲۷ ربیع الثانی کو رخصتی ہوگی اور ۲۸ کو دونوں اپنے دو بیٹوں ارتضیٰ علی و مرتضیٰ علی کی شادیاں

مولوی مظہر علی نے ایک ہی تاریخ کو کی تھیں۔ ہاشمی) کی سندیلہ سے واپسی ہوگی کیوں کہ ۲۶ر کو بعد شام کے ۲۷ر تاریخ لگ جاوے گی جو طاق ہوگی اور اس قسم کی تاریخ میں رواجاً عقد نہیں ہوتا ہے۔

نواب یار جنگ: ۲۸ر فروری ۱۸۹۸ء۔ آج منشی اکرام اللہ خاں صاحب نواب یار جنگ واسطے عیادت منشی فضل حسین صاحب کاکوری سے تشریف لائے۔ ان کو اب گورنمنٹ انگریزی اور ریاست حیدرآباد سے بارہ سو پنشن ملتی ہے۔ میں نے اسٹیشن ریل تک پیشوائی کی اور بوقت سہ پہر بسواری بگھی مقامات مشہور کی سیر کرائی۔ مجھ سے بہ اخلاق پیش آئے۔ میری ان سے ملاقات سابق کی بھی تھی جب کہ وہ بندوبست میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ضلع ہردوئی میں تھے۔

رسم نیوتہ: ۱۲ر مئی ۱۸۹۸ء۔ برخوردار سید حافظ علی ولد سید ماجد علی مرحوم نے اپنی بیٹی کا عقد محمد عزیز کے ساتھ کیا۔ اس میں کسی کا نیوتہ نہیں لیا اور نہ کوئی رسم ادا ہونے دی حتیٰ کہ کسی قسم کا کھانا بھی کہیں نہیں بھیجا۔ صرف کچھ زیور معمولی اور ایک جوڑا لڑکی کو دے کر رخصت کر دیا جب انھوں نے نیوتہ نہیں لیا ہے تو آئندہ کسی کو نہیں دیویں گے۔ یہ طریقہ انھوں نے جدید اختراع کیا جس کا رواج اس محلہ و قصبہ میں نہیں ہے۔

ممولا و مکڑی: ۱۷ر ستمبر ۱۸۹۸ء۔ تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ کھڑ بچہ (کذا) عرف ممولا پرند اور جالا مکڑی برسات کے شروع ہونے پر ناپید ہو جاتا ہے یعنی پرند پہاڑوں پر چلا جاتا ہے اور مکڑی جالا لگانا موقوف کر دیتی ہے اور بارش کے خاتمے پر پرند کو پھر نمایاں ہو جاتا ہے اور مکڑی جالا لگانا شروع کر دیتی ہے اور یہ دلیل اس بات کی ہے کہ اب اور بارش نہ ہوگی۔ چنانچہ آج کل اس قسم کے آثار نظر آرہے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب بارش اور زیادہ نہ ہوگی کہ جھلے پالے اور کانس بھی پھولنے لگی ہے۔

گراموفون: ۲۹ر مارچ ۱۸۹۹ء۔۔۔۔ اس کے بعد میں کنور نرندر بہادر صاحب سے ملا۔ مجھے اپنی کوٹھی جدید کا معائنہ کرایا اور بہت لطف و محبت سے پیش آئے اور ایک گھنٹہ تک مجھے مسٹر ایڈیسن صاحب امریکہ کا ایجاد کیا ہوا باجہ سنایا جو جدید ایجاد ہوا ہے اور جس میں ہر ایک شخص کی آواز کا فوٹو اتر جاتا ہے جس قسم کی وہ بات چیت کرے اور گانا گاوے فوراً اس کی آواز پیالہ میں اتر جاتی ہے اور جس وقت اس کو ٹھوکیے فوراً اسی قسم کا گانا جیسا گویّے نے گایا تھا اسی تال سُر سے ہونے لگتا ہے۔ کنور صاحب نے اس باجے کو بقیمت مبلغ تین سو روپے خرید کیا ہے۔

چوہے: ۴ر اپریل ۱۸۹۹ء۔ مدھا نامراؤ ساکن سہنگوان نے اپنے کھیتوں کے ڈھائی ہزار چوہے مارے جس سے ایک کھیت اس کا چوہوں کی ضرر رسانی سے محفوظ رہا اور جانڈا خوب پیدا ہوئی اور وہ

ترکیب یہ کرتا تھا کہ جس قدر گڑھے اس کے کھیت میں تھے ان میں پانی بھر دیتا تھا اور جب چوہے گڈھوں سے نکلتے تھے تو اس کے بیٹے اور بھائی جو تعداد میں پانچ چھ تھے سب مل کر ان کو مار ڈالتے تھے جس سے افزائش چوہوں کی اب کے سال نہ ہو سکی۔ یہ ترکیب میں نے اپنے ہوش میں کبھی دیکھی نہ تھی۔

تھیٹر: ۸ر اپریل ۱۸۹۹ء۔ آج شب کو ایک تھیٹر لکھنؤ کا جلسہ احاطہ تقی میاں مرحوم میں شروع ہوا۔ ٹکٹ ۳ روپے سے لے کر بارہ روپے تک تھا۔

شادیوں کی کثرت: ۵ر مئی ۱۸۹۹ء۔ آج کل ایک مہینہ سے اس قدر کثرت شادی بیاہوں کی قصبہ ہذا میں ہے کہ اوسط روزانہ بارہ سے پندرہ تک کا ہے۔ اور یہی کیفیت دیہات میں ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے غدر کے بعد ۱۸۵۸ء کی کیفیت یاد آجاتی ہے کہ اس زمانے میں بھی کثرت تھی۔

نیا شوالہ: ۲۲ر جولائی ۱۸۹۹ء۔ آج استھاپنا مہادیو کا شوالہ سنگ مرمر میں ہوا۔ شب کو چند طوائفوں کا ناچ ہوا تھا اور سرائے و دھرم شالہ میں روشنی ہوئی تھی۔ راجہ درگا پرشاد صاحب نے اس کام کو بہت دھوم دھام سے انجام دیا۔ یہ فعل دھرم کا راجہ صاحب نے ایسا کیا جو ان کے باپ دادا سے نہ ہو سکا جو عہد شاہی میں بڑے معزز چکلہ دار تھے۔

ایک ڈھاڑی کا ناچ: ۲۱ر دسمبر ۱۸۹۹ء۔ آج شام کو گومتی کر ج ولد مرج ڈھاڑی گوالیار کا منشی سید فضل حسین صاحب کے مکان پر ناچ ہوا اور بہ اصرار منشی صاحب میں شریک جلسہ ہوا۔ وہ اول تلواروں کی باڑھ پر بلا تکلف پیروں کی تھپکی دے کر ناچا اور کوئی اثر تلوار کی باڑھ کا اس کے پیروں اور تلووں پر نہیں پہنچا۔ دوسرے وہ چھوٹے بتاشوں کو بچھا کر ناچا اور ایک بھی بتاشا نہیں ٹوٹا۔ تیسرے وہ گھونگرو پیروں میں نہیں باندھے تھا لیکن وہ منہ سے ایسے صاف گھونگرو بجاتا تھا گویا وہ پیروں کی تھپکی دے کر بجاتا ہے۔ بظاہر اس کی عمر ۳۵ سال کے اندر ہے منشی صاحب نے مبلغ دس روپیہ اس کو انعام دیا۔

چندہ مقتولین جنگ: ۲۴ر دسمبر ۱۸۹۹ء۔ آج کو میٹنگ امداد ورثا مقتولین و مجروحین جنگ ٹرانسوال میونسپل ہال میں منعقد ہوئی کہ جو انگریزی فوج بمقابلہ ڈچ کاشتکاران ٹرانسوال کے قتل ہوئی ہے انکی بیواؤں اور خورد سال لڑکوں کی چندہ سے اعانت کریں۔

حاجی وارث علی شاہ: ۲۵ر مارچ ۱۹۰۰ء۔ چونکہ حاجی وارث علی شاہ صاحب رئیس دیوا (ضلع بارہ بنکی) آج چار یوم سے وارد سندیلہ ہیں اور بر مکان چودھری وقار محمد صاحب مرحوم مقیم ہیں مقامات مختلف سے

جوق جوق لوگ آپ کی زیارت کے واسطے چلے آتے ہیں۔ سہ روشن چوکی ہر وقت بجتی رہتی ہے اور چندہ مریدین سے لنگرخانہ جاری ہے جہاں سے مہمانوں کو کھانا ملتا ہے۔ دن میں تین تین چار چار مرتبہ نہ بند بجتے ہوئے اٹھتے ہیں (حاجی صاحب کا واحد لباس ایک تہ بند ہوتا تھا جس کو بطور احرام باندھے رہتے تھے۔ ہاشمی) جو شاہ صاحب کو نہلائے جاتے ہیں۔ میرے خیال میں آپ کے ہزاروں مرد و زن مرید ہیں اور آج کل آپ جس مکان میں فروکش ہیں وہاں ایک میلہ سا لگا رہتا ہے اور صدہا آدمی مرید ہوتے جاتے ہیں۔ واقعی آپ کی ذات اس وقت میں بہت غنیمت ہے۔
آج میں نے بھی حضرت سے ملاقات کی۔ اٹھ کر مجھ سے نہایت تپاک سے ملے اور میری لیاقت وغیرہ کی بہت تعریف کی۔

<u>محمد فرنگی محلی</u>: ۲۱؍اگست ۱۹۰۰ء۔ کل شب کو مولوی محمد نعیم صاحب فرنگی محلی لکھنؤ نے بعارضہ ہیضہ وبائی رحلت کی۔ عمر ۷۶ سال تھی۔ آپ نہایت بزرگ شخص تھے اور آپ کی تجہیز و تکفین میں ہزاروں آدمی شریک تھے۔

<u>مقبرہ وصی علی شاہ</u>: ۲۴؍اگست ۱۹۰۰ء۔ آج مسمیاں بندو و فیض الدین و عبدالرزاق سنگ تراشان آگرہ مقبرہ وصی علی شاہ بہمہ وجوہ مرتب کرکے روانہ آگرہ ہوئے۔ اس مقبرہ کی تیاری کے واسطے ایک ہزار پانچسو پچیس روپے راجہ جنگ بہادر صاحب 'تانپارہ' نے عطا کیے اور باقی روپیہ کی شاہ صاحب کے مریدین نے امداد کی۔ جملہ دو ہزار خرید سنگ سفید، تیاری مقبرہ و بارہ دری وغیرہ میں صرف ہوئے۔ چونکہ شاہ صاحب مرحوم نہایت خلیق و شہرت گرفتہ شخص تھے ویسی ہی عمدہ آپ کی یادگار قائم ہوئی جو مدت دراز تک قائم و برقرار رہے گی۔

<u>مضطر خیرآبادی</u>: ۱۹؍نومبر ۱۹۰۰ء۔ آج ۲ بجے دن کو عقد عزیزی مقصود علی خلف منشی نیاز علی صاحب مرحوم گھنڈن طوائف 'ہاڑی' سے بعوض مہر مبلغ پانچ ہزار روپیہ کے ہوا۔ برخوردار مجتبیٰ علی نے عقد پڑھا۔ اس طوائف کا عقد اولاً افتخار حسین مضطر خیرآبادی سے ہوا تھا لیکن جب ان کی شادی اہل برادری میں ہوئی تو انھوں نے اسکو طلاق دیدی عمر تخمیناً ۲۱ سال کی۔

<u>سوگ وفات ملکہ وکٹوریہ</u>: ۲؍فروری ۱۹۰۱ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار امروزہ واضح ہوا کہ اصحاب ذیل نے واقعہ ۲؍فروری ۱۹۰۱ء کو بیوم تجہیز و تکفین جناب ملکہ معظمہ قیصر ہند انگریزی گرجا گھر لکھنؤ میں جاکر نماز پڑھی۔ راجہ تصدق رسول صاحب تعلقہ دار جہانگیر آباد وائس پریسیڈنٹ انجمن ہند لکھنؤ نے ازجانب تعلقہ داران اودھ اور حاجی سید شعبان علی خاں صاحب تعلقہ دار ازجانب اہل شیعہ و خان بہادر چودھری نصرت علی صاحب سندیلوی منجانب اہل تسنن۔ مسلمانوں کو مسجد میں دعائے مغفرت مانگنی چاہیے تھی۔

۲۲؍فروری ۱۹۰۱ء۔ آج صبح کی ڈاک گاڑی میں لکھنؤ گیا اور گیارہ بجے سفید بارہ دری قیصر باغ میں شریک جلسہ تعزیت وفات ملکہ معظمہ قیصرۂ ہند ہوا۔ اضلاع مغربی و شمالی و اودھ کے تمام معزز اشخاص جمع تھے۔

حتیٰ کہ نواب حامد علی خاں صاحب رام پور بھی تشریف لائے تھے۔ ٹھیک بارہ بجے دن کو سر میکڈانلڈ صاحب لفٹیننٹ گورنر اصلاع مغربی وشمالی رونق بخش ہوئے اور بصدارت خود اوّل اسپیچ اندوہناک پڑھی۔ اس کے بعد تجویز فرمایا کہ کوئی قومی یادگار جناب قیصر ہند کی تجویز کی جائے اور اس کے واسطے چندہ ہونے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اسی وقت صرف چار آدمیوں نے یہ تجویز چندہ ظاہر کی۔

نواب صاحب رامپور۔ ایک لاکھ، مہاراجہ بھگوتی سنگھ صاحب بلرام پور۔ پچاس ہزار، مہاراجہ بنارس پچیس ہزار راجہ صاحب نانپارہ دس ہزار، جملہ ایک لاکھ پچاسی ہزار۔ اسی وقت چندہ ہوا اور مابقیہ چندہ ضلع وار فراہم ہوگا۔ بعد اس کارروائی کے جلسہ برخاست ہوا اور شام کی ریل میں سندیلہ لوٹ آیا۔

پھوٹ (پھل) : ۲۳ر ستمبر ۱۹۰۱ء۔ امسال پھوٹوں کی ایسی کثرت ہے کہ ایک پیسہ و ڈیڑھ پیسہ کو ایک ٹکڑہ ملتا ہے جس میں تعداد پندرہ بیس پھوٹوں سے کم نہیں ہوتی۔ لوگوں کو اس سے نفرت ہو چلی ہے۔ ستر اسی برس کی عمر والے لوگ کہتے ہیں کہ ہماری یاد میں کبھی ایسی افراط نہیں ہوئی۔ میں نے جہاں تک اس کی افراط کی بابت خیال کیا تو اسکا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ پورا مہینہ بھادوں کا بہ حالت خشکی رہا یعنی پانی بالکل نہیں برسا جس کی وجہ سے اسکی کثرت ہوئی۔

فاتحہ چہلم : ۱۱ر اکتوبر ۱۹۰۱ء۔ آج فاتحہ چہلم نور چشمی جمیلاً کا ہوا۔ جس میں ہر قسم کا کھانا زردہ پلاؤ وغیرہ پخت ہوا اور جس میں مبلغ ۲۳ روپے خرچ ہوئے۔ ہم لوگوں میں عجیب رسم ہے کہ اوّل تو آدمی مرجائے دوسرا اوپر خرچ مزید ہو جس سے سخت رنج و زیر باری متصور ہے۔ مگر کیا کیا جاوے رسم سے چارہ نہیں۔

اصلاح رسوم : ۴ر جنوری ۱۹۰۲ء۔ آج بعد ختم فاتحہ سوم ہمشیرہ منشی کرامت حسین صاحب حسب تجویز مولوی احمد علی صاحب امور ذیل بہ اتفاق یک دگر طے قرار پائے۔

۱۔ کسی شخص کی وفات پر گھر والے ونیز اہل برادری جو شریک غم ہوں وہ منہ ڈھانک کر نہ روئیں اور نہ متوفی کے حالات بیان کریں۔ ۲۔ بجز رشتہ داروں کے اور کوئی اہل برادری متوفی کے گھر میں اقل درجہ تین روز سے زائد قیام نہ کرے۔ ۳۔ قریب تر رشتہ دار طعام تقریب بہ خانۂ متوفی بھیجیں لیکن اس کی مقدار اسی قدر ہو جو متوفی کے گھر والوں اور اقرب رشتہ داران مقیم کے واسطے کافی ہو۔ ۴۔ طعام مندرجہ ذیل بھیجا جائے: کھچڑی مونگ ہی وگھی۔ دال و چاول۔ قلیہ و روٹی۔ ۵۔ جب کسی کے گھر واقعہ وفات وقوع میں آئے تو اس کے افسر خاندان کو لازم ہے کہ اطلاع وفات اپنے اعزہ و خاص احباب کو بذریعہ حجام کرادیوے تاکہ کسی شخص کو عدم اطلاع کا عذر نہ ہو۔

پردہ : ۵ر مارچ ۱۹۰۲ء۔ محمد عربی بیرسٹر نے بالاعلان اس بات کو ظاہر کیا کہ اپنی بیوی کو بے پردہ رکھنا

نامناسب نہیں سمجھتا ہوں چنانچہ میں اکثر کھلی گاڑی میں اپنے ساتھ ان کو بغرض تفریح لے جاتا ہوں اور جب ۲ مارچ کو
میں اپنی بیوی کو لکھنؤ سے سندیلہ سکنڈ کلاس میں لا رہا تھا تو اس درجہ میں ایک انگریز بھی بیٹھا تھا لیکن میں نے
کوئی پروا نہیں کی ۔۔۔ اور اپنی بیوی کو لے کر اسی درجہ میں بیٹھ گیا اور جب سندیلہ اسٹیشن پہنچا ہوں بلا انتظار اس
کے کہ کوئی پردہ واسطے اترنے کے کیا جاوے وہ فوراً اتر کر پالکی پر سوار ہو گئیں اور میں اپنے ملازمان ذکور سے بھی
چنداں پردہ کرانا پسند نہیں کرتا ہوں ۔ ابھی کچھ خفیف حجاب سا ہے بعد چندے وہ ترک کرا دوں گا ۔ میں اس پردہ کو
بالکل ناپسند کرتا ہوں ۔ نوکر چاکر مثل جنگلی درختوں کے ہیں ان سے پردہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے ۔

نیا فیشن: ۲۵ مارچ ۱۹۰۲ء ۔ مسٹر محمد عربی بیرسٹر ڈاڑھی تو منڈواتے ہی تھے اب انھوں نے مونچھیں
بھی منڈوا ڈالیں ان کی صورت بدنما معلوم ہوتی ہے ۔ یہ ایک نئی وضع ایجاد ہوئی ہے ۔

اپنی وفات کا کھانا: ۱۲ اپریل ۱۹۰۲ء ۔ مساۃ عباد النساء زوجہ غلام حسین ولد منشی فصیح اللہ درگاہ
اپنی وفات کا کھانا اپنی حیات میں آج کل قصبہ ہذا میں تقسیم کر رہی ہیں ۔ چونکہ لاولد ہیں اس وجہ سے اپنے بعد اس انتظام
کا کوئی کرنے والا نہیں دیکھا ایسا ایک نئی بات قصبہ ہذا میں ہوئی ۔ مساۃ موصوفہ نے ثواب حج بھی حاصل کر لیا ہے ۔

جشن تاج پوشی: ۲۶ جون ۱۹۰۲ء چونکہ شاہنشاہ انگلستان بعارضہ ذات الجنب سخت علیل ہو گئے
اس وجہ سے جشن تاج پوشی بموجب ہدایت گورنمنٹ سب مقاموں پر ملتوی ہو گیا اور آج شام کو ہم بعض معزز مسلمانوں
نے مسجد امر ہیرہ پر واسطے درازی عمر شاہنشاہ معظم کے دعائے خیر کی اور ہندوؤں نے دھرم شالہ راجہ درگا پرشاد
صاحب میں شاہنشاہ وقت کے واسطے دعائے خیر مانگی ۔

۹ اگست ۱۹۰۲ء آج انتظام جشن تاج پوشی شاہنشاہ ہندوستان ہمارے قصبہ سندیلہ میں ہوا ۔ روشنی ہوئی آتش بازی
چھوٹی، تکلفات حاضرین نے نوش کیے اور جلسہ طوائفان سندیلہ مدرسہ اردو سندیلہ میں شب بھر ہوا ۔ میں نے ایک روپیہ
کا غلہ محتاجوں کو تقسیم کیا ۔ اور ہر طرح کا اظہار مسرت کیا گیا حتیٰ کہ پانچ بجے شام کو کرناٹک والوں کا بھی تماشا ہوا ۔
جنھوں نے عمدہ عمدہ کرتب دکھائے اور یہ تماشا شفاخانہ کے صحن میں ہوا ۔

حرص جائداد: ۲۴ اگست ۱۹۰۲ء ۔ سر لاٹوش صاحب گورنر اضلاع متحدہ آگرہ و اودھ نے ۱۳ اگست ۱۹۰۲ء
کے جلسہ میں یہ طے کر دیا کہ چودھری محمد جان تعلقہ دار ککرالی کو اس وجہ سے اجازت شرکت کی نہیں دی کہ ان کی
نسبت چودھری محمد عظیم اپنے باپ کو زہر دینے کی بدگمانی ہے اور راجہ جنگ بہادر صاحب مرحوم نانپارہ کے بیٹے بدیں
وجہ شرکت دربار سے ممنوع کیے گئے کہ ان کی نسبت لفٹیننٹ گورنر کو خبر ہوئی کہ انھوں نے اپنے باپ کو جوتوں

سے مارا کہ جس کے رنج سے وہ بیمار ہو گئے۔ آخرش مقام بہرائچ میں انھوں نے قضا کی۔ اب کے سال یہ واردائیں ایسی ہو گئیں کہ ہلاکت خود اپنے بیٹوں کے ہاتھ سے مسموع ہو رہی ہے۔ سچ یہ ہے کہ جائداد دنیا میں ایسی شے ہو رہی ہے جس کی وجہ سے بھائی بھائی کی جان کا دشمن ہو جاتا ہے اور بیٹا باپ کو نگاہ دشمنی سے دیکھتا رہتا ہے۔

خورشید طوائف: ۹ ستمبر ۱۹۰۲ء - ۳ بجے صبح کو خورشید طوائف نے درد شکم میں قضا کی۔ عمر ۲۰ سال تھی۔ گانے و ناچنے میں مشہور تھی۔ منشی فضل حسین صاحب تعلقہ دار نے بندہ علی خاں و پیغمبر بخش قوالان بدایوں کو بہ مشاہرہ ۲۰ روپیہ ماہوار نوکر رکھ کر چند سال تک تعلیم کرائی تھی۔ متوفیہ کا چوک لکھنؤ میں قیام رہتا تھا اور اس کی آمدنی ۳۰۰ ماہوار تک پہنچ گئی تھی۔ افسوس اس کے کل اعزا کی امیدوں کا خون ہو گیا اور اس کی ہمشیر شیریں جان طوائف منشی صاحب مرحوم اپنی بہن کی وفات سے سڑن سی ہو گئی اور عجب نہیں کہ چند مہینہ میں فور رنج و غم سے فوت نہ ہو جاوے۔

کانپور میں طاعون: ۲۷ اکتوبر ۱۹۰۲ء - ہفتہ مختتمہ ۱۸ اکتوبر میں شہر کانپور میں ۹۸۶ آدمی بعارضہ طاعون فوت ہوئے۔ یہ تعداد بہت زیادہ ہے۔ اہل کانپور اپنے اپنے گھر چھوڑ کر بیرون تجارت کو چلے گئے اور کاروبار تجارت میں بہت کمی ہو گئی بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ کام بند ہے۔ خدا اس بلائے بے درماں کو جلد دفع فرمائے۔ سخت اندیشہ ہے کہ کہیں لکھنؤ میں اس کا خروج نہ ہو۔

گورنمنٹ ہاؤس میں میلاد: ۲۸ اکتوبر ۱۹۰۲ء ... دریں ولا ایک میلاد شریف نینی تال گورنمنٹ ہاؤس میں منعقد ہوئی اور سر لاٹوش صاحب لفٹیننٹ گورنر اضلاع مغربی و شمالی و اودھ نے معہ اپنے مصاحبوں کے اس میں شرکت کی اور بیس منٹ تک شریک جلسہ میلاد رہے۔ یہ ایک نئی بات لاٹ صاحب نے کی۔

جشن تاج پوشی: یکم جنوری ۱۹۰۳ء - آج دلی میں دربار بہت شان و شوکت سے ہوا اور یہی کیفیت ہر ضلع میں تھی یعنی فرمان پڑھا گیا اور لوگوں کو اعزاز حاصل ہوا۔ آج میں نے نماز عید مسجد امیرہ پر پڑھی اور اسی جانب سے ۱۱ بجے کی ریل میں بنابر شرکت جشن تاج پوشی شاہنشاہ معظم ہندوستان روانہ ہردوئی ہوا جہاں قریب ۲ بجے کے پہنچا اور سیدھا وکٹوریہ ہال کو جہاں دربار منعقد تھا چلا گیا۔ ٹھیک ۳ بجے دن کو مسٹر ہوپ صاحب ڈپٹی کمشنر و مسٹر سبالڈیر صاحب جج و مسٹر کاکسی صاحب مہتمم بندوبست تشریف لائے۔ ڈپٹی کمشنر نے فرمان شاہی پڑھا۔ اس کے جواب میں من جانب تعلقہ داران و رؤسائے ضلع ہردوئی ایڈریس پڑھا گیا۔ اس کے بعد سندیں تقسیم ہوئیں جو من جانب وائسرائے گورنر جنرل ہند دربار دہلی سے دستخطی سر لاٹوش صاحب بہادر لفٹیننٹ گورنر ضلع متحدہ آگرہ و اودھ سربمہر آئی تھیں۔ منجملہ ان کے ایک ٹھاکر مہاراج سنگھ تعلقہ دار بھتودہ بجلدوے قائم کرنے ایک

...رسے کے عطا ہوئی اور دوسری راقم کو بوجہ انجام دیے کام آنریری مجسٹریٹی و سکریٹری میونسپلٹی سندیلہ کے صاحب ضلع سے عطا ہوئی جس کا مضمون یہ ہے «بموجب ہدایت ہز اکسیلنسی گورنر جنرل کشور ہندیہ سند بکمال عنایت و مہربانی ایڈورڈ ہفتم شاہنشاہ ہندوستان منشی مظہر علی سندیلہ ضلع ہردوئی کو بہ اعتبار ان کی خدمات آنریری مجسٹریٹی و سکریٹری میونسپل بورڈ سندیلہ عطا کی گئی۔ یکم جنوری ۱۹۰۳ء» .....

طاعون: ۲۰ر فروری ۱۹۰۳ء۔ آج بمعائنہ اودھ اخبار معلوم ہوا جس نے سرکاری گزٹ اضلاع طاعون زدہ کا حوالہ دیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ تمام ہندوستان میں شکایت طاعون پھیلی ہوئی ہے جس کی ترقی اضلاع پنجاب و بنگالہ میں زیادہ ہے خصوصاً ضلع سارن واقع بنگالہ میں ایک ہزار ۲۱۶ر آدمیوں نے ایک ہفتہ میں قضا کی۔ اضلاع ناگپور و جبل پور میں غضب ناک طاعون پھیلا ہوا ہے جو ملک متوسط میں واقع ہیں۔ جبل پور میں ایک ہفتہ میں ۳۹۵ آدمی فوت ہوئے اور ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے ۱۲ر اضلاع میں طاعون پایا جاتا ہے جس میں الہ آباد کانپور وغیرہ شامل ہیں۔ اب شہر لکھنؤ میں بھی اس کی شدت ہو چلی ہے اور بالفعل مفصلہ ذیل محلوں میں ہے۔ مقبول گنج، فتح گنج، امین آباد، برازہ، گنیش گنج، ٹیڑھی بازار، مولوی گنج، باٹ ناتھ بھوا، حضرت گنج (باوجودیکہ اس محلہ میں صفائی بہت زیادہ ہے)۔ اناؤ کے عموماً کل باشندے بیرونجات کو اپنے شبیتے کے مقامات کو چلے گئے۔ چنانچہ خاندان مولوی صفی اللہ و عطاء اللہ، حافظ کرم احمد صاحب مرحوم چودھری عبدالباقی صاحب مرحوم کے مکان پر سندیلہ آکر قیام گزین ہیں۔ یہ عارضہ طاعون ہیضہ سے بہت بڑھا چڑھا ہوا ہے۔ اس کا قیام دو تین ہفتہ سے زیادہ نہیں ہوتا لیکن طاعون کا قیام جس شہر میں وہ آتا ہے مہینوں رہتا ہے بلکہ ایک دفعہ جانے کے بعد پھر دوسرے سال بھی زور کرتا ہے۔ اللّٰھم احفظنا من البلاء الدنیا و عذاب الآخرۃ

عبدالوہاب فرنگی محلی: ۳ر اپریل ۱۹۰۳ء۔ معائنہ اودھ اخبار سے معلوم ہوا کہ یکم اپریل ۱۹۰۳ء کو مولوی عبدالوہاب فرنگی محلی لکھنؤ نے قریب عصر کے مرض طاعون سے انتقال فرمایا۔ جناب مرحوم اپنے علم و فضل و جمیع حیثیات کے اعتبار سے ایک ممتاز عالم باعمل تھے۔ خدا مغفرت کرے۔

طوطے: ۲۲ر مئی ۱۹۰۳ء۔ آج میلہ صحبت[1] کا ہوا۔ بمقابلہ اور چیزوں کے برف زیادہ بکا۔ ایک شخص باہر سے چند طوطے تعلیم یافتہ لایا تھا جو ایک پیسہ فیس کا ہر شخص سے لے کر ان کا تماشا دکھاتا تھا۔ تماشا یہ تھا کہ طوطے مگدر و بنیٹھی ہلاتے، توپ داغتے اور چند ٹکڑے کاغذوں میں سے جس کو پوشیدہ طور پر چھوڑ...

---

[1] صحبتیا باغ سندیلہ میں یہ میلہ ماہ مئی یا جون میں سید الافغانہ کی یاد میں لگتا تھا۔ اسی لیے یہ نام پڑا۔ اس میں ہندو مسلمان دونوں شریک ہوتے تھے۔ انتخی

وہی اٹھا لاتے۔ غرض کہ انواع اقسام کے تماشے کرتے تھے۔

فاؤنٹن پین: ۲۶ راگست ۱۹۰۳ء۔ آج ایک قلم انگریزی اعلیٰ درجہ کا جس کے اندر روشنائی بھر کر ایک شخص گھنٹوں لکھ سکتا ہے اور برخوردار مصطفےٰ علی بقیمت تین روپیہ ولایت لندن سے لائے تھے اور التفات رسول کو دینا تجویز ہوا تھا آج میں نے ان کو بھیج دیا۔ بہت خوش ہوئے۔

شادی کا شوق: ۱۸ راکتوبر ۱۹۰۳ء۔ آج سید حسین احمد اشرف ٹولہ سے واضح ہوا کہ مہینہ ستمبر گزشتہ میں سید کرامت علی پنشنر ڈپٹی کلکٹر نے اپنا عقد چہارم اپنی منجھلی سالی سے کیا۔ یہ تین بہنیں تھیں۔ بڑی کا عقد آبرا میں ہوا اور چھوٹی کا ڈپٹی صاحب سے جو کہ فروری ۱۹۰۲ء کو فوت ہوئیں اور منجھلی سے چوتھا عقد کیا۔ عمر ڈپٹی صاحب اکسٹھ سال ہے۔ چہرے پر جھریاں پڑ گئی ہیں۔ بازوؤں کی کھال لٹکتی ہے۔ کمر خمیدہ ہے۔ غذا بہت قلیل ہوتی ہے۔ دبلے وضعیف از حد ہیں۔ تند ہوا کے جھونکے سے اڑ جا سکتے ہیں۔ حرارت غریزی کم پائی جاتی ہے۔ بظاہر یہ عقد ایام زندگی گھٹانے والا گویا پیغام اجل ہے۔ خدا مبارک کرے۔

محمد احمد خاں صاحب: ۲۳ راکتوبر ۱۹۰۳ء۔ محمد احمد خاں صاحب تعلقہ دار کسمنڈی خورد (ملیح آباد) ولد فقیر محمد خاں صاحب مرزا گنج تحصیل ملیح آباد نے ۱۵ ستمبر یوم سہ شنبہ کو قضا کی۔ عمر ۲۷ سال تھی۔ مرحوم نے ۴ عقد کیے اور قریب ایک سو کے اولاد ہوئیں۔ منجملہ ان کے اب حسب ذیل بیبیاں اور لڑکے لڑکیاں موجود ہیں ازواج۔ ۱ عدد، فرزندان نرینہ۔ ۱۵ عدد، دختران۔ ۲۲ عدد علاوہ اس کے پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں بکثرت ہیں اور خاں صاحب ایسے پر قوت تھے کہ سال گزشتہ تک انھوں نے عقد کیے ہیں۔

طاعون: ۸ ردسمبر ۱۹۰۳ء۔ بوقت ۳ بجے شام کے بصدارت مسٹر گرے صاحب کمشنر لکھنؤ تحصیل سندیلہ میں کمیٹی طاعون قرار پائی اور ایک گھنٹہ تک صاحب بہادر نے اسپیچ دی کہ بیماری طاعون لاعلاج ہے لیکن اس کا انسداد حسب ذیل صورتوں سے ہو سکتا ہے۔

۱۔ ایسے مکان میں قیام کیا جائے جو ہوادار ہو اور جس میں دھوپ آتی ہو۔ ۲۔ نیب کی پتی، کوئلہ اور گندھک مکان میں سلگانا چاہیے۔ ۳۔ جب آدمی طاعون میں مر جائے تو اس کے کپڑے و چارپائی جلوا دے۔ ۴۔ مکان بالکل چھوڑ دیا جائے اور دوسرے مقام پر قیام کرے۔ ۵۔ صفائی مکان باضابطہ کرائی جائے۔ ۶۔ اول بیماری چوہوں سے پیدا ہوتی ہے لہٰذا جس گھر میں وہ مریں اس گھر کی بخوبی صفائی کرائی جاوے۔ ۷۔ کوٹھے کا قیام بہ نسبت نیچے کے اچھا ہوتا ہے۔ ۸۔ جس مکان میں اینٹوں کا فرش ہو وہ خام فرش سے بہتر ہے۔

۹ جنوری ۱۹۰۴ء۔ کل مسمی گنیش ولد منشی لکھوار موضع مہسونہ طاعون سے فوت ہوا۔ وہاں کے باشندوں نے اس کی لاش متوفی کے مکان پر بھیج دی۔ لاش پہنچنے پر اس کے چچا متوفی نے ممانعت کی کہ گھر کے اندر نہ ڈالی جائے جو تمام شب چبوترے پر پڑی رہی۔ جب آج صبح کو مولوی ضامن علی محرر رجسٹری و دیگر ہمسایہ مسلمانوں کو اطلاع ہوئی تو وہ لوگ موقع پر گئے اور مالک مکان سے استدعا کی کہ اگر وہ اجازت دیوے تو وہ لوگ قبر کھدوا کر لاش کو دفن کرائیں۔ بوجہ اس کے کہ متوفی کے اعزہ و اقارب کوئی شریک تجہیز و تکفین نہیں ہوئے تھے۔ آخرش بحالت مجبوری تین چار (دو جوشی اور ایک اہیر) لاش اٹھانے کو بہم پہنچے۔ تب مادر متوفی نے چوتھا پایہ خود اٹھایا اور جو قبر مسلمانوں نے کھدوائی تھی اس میں جا کر دفن کر دیا۔ یہ مقام عبرت کا ہے کہ عزیز شریک نہ ہوں اور ماں اپنے بیٹے متوفی کی لاش خود لے جا کر دفن کرے اور جلوانے کا کوئی سو بیتا نہ ہو سکے۔ اس بیماری کی نسبت جہاں تک غور کیا گیا نوجوان، خواہ مرد ہو یا عورت، و لڑکے لڑکیاں زائد مرے اور مرتے ہیں۔

۱۱ جنوری ۱۹۰۴ء۔ آج آٹھ بجے صبح کو ہمارے محلّہ کے چاروں طرف سورہ یٰسین اس طور پر گشت کر کے پڑھی گئی کہ چوراہے ٹاؤن ہال سے لوگوں نے پڑھنا شروع کیا اور جہاں پر "مبین" آیا وہاں سات نمازیوں نے سات سات اذانیں کہیں۔ اور اس طور پر سات روز تک گشت ہوگا۔ خدا کرے اس سورہ یٰسین کی برکت سے طاعون سارے قصبہ ہذا سے دفع ہو جائے۔

۱۶ جنوری ۱۹۰۴ء۔ مکا بری (پان فروش) کی لاش بذریعہ میونسپل گڑھوا دی گئی۔ اس کے اعزا نے متوفی کی مدد نہیں کی جو طاعون میں مرا تھا۔ یہ زمانہ ایسا ہے کہ عزیز قریب بھی طاعون کے ڈر سے لاش کے قریب آنا پسند نہیں کرتے۔

<u>وقف حسین آباد لکھنؤ</u>: ۱۸ فروری ۱۹۰۴ء۔ وقف امام باڑہ حسین آباد کی ابتدا اس عطیہ سے ہوئی جو محمد علی شاہ سابق شاہ اودھ نے ۱۸۳۹ء سے ۱۸۴۱ء تک کیا تھا اس کی کل مقدار چھتیس لاکھ ۲۷ ہزار تھی یہ بیا رقم کاغذ زر سرکاری کی حیثیت سے جمع تھی جس کی ایک لاکھ ۱۸ ہزار آمدنی ہے اور دکانوں وغیرہ کے کرایہ کی بھی آمدنی ہے۔ پس اس امانت کی کل آمدنی ایک لاکھ ۳۰ ہزار سالانہ ہے۔ اس روپیہ میں سے نصف روپیہ خاص کام یعنی ان وظائف میں صرف ہوتا ہے جو شاہ کے نام پر (۵ اشخاص کو پنشنوں میں اور زائرین کربلا معلّٰی کو دی جاتی ہیں۔ ۳۰ ہزار) اور امام باڑہ نواب آصف الدولہ کے عملہ کے مصارف اور اخراجات مذہبی ہوتے ہیں۔ آمدنی کا دوسرا نصف حصہ ضروری مرمت و عمارتوں کے قائم رکھنے اور مفید عام اور خیرات میں صرف ہوتا ہے۔ مفید عام صیغوں میں متولیوں نے جامع مسجد کی مرمت کرائی اور شہر سے امام باڑہ تک وکٹوریہ باغ لگایا۔ یہ چمن بندی

مسٹر مول صاحب کمشنر لکھنؤ کی تجویز سے ہوئی تھی اس سے امانت کی عمارتیں خوشنما معلوم ہوتی ہیں اور اہل شہر کی تندرستی اور تفریح کا باعث ہے جو اس مقام کے سبزہ کے خوشنما میدانوں کی بڑی قدر کرتے ہیں۔

آندھی: ۱۲ رجون ۱۹۰۴ء۔ آج ۲½ بجے دن کو ایک ایسی گرد آلودہ آندھی آئی کہ دو منٹ تک ایسا اندھیرا رہا کہ میں اپنا ہاتھ دو فٹ کے فاصلہ پر نہیں دیکھ سکتا تھا میری یاد میں ایسی کوئی آندھی قبل اس کے نہیں آئی۔

نرخ آم: ۲۰ رجون ۱۹۰۴ء۔ اب کے سال انب بھی دو پیسہ سیکڑہ فروخت ہوئے جس کی ازحد افراط تھی۔

بکریا پیر: ۱۹ ستمبر ۱۹۰۴ء۔ بکریا پیر اراضی جو قلعہ پر مشہور ہے وہ ایک صیغہ دار بھکو میاں چودھری کے عزیز تھے جن کو کسی عامل نوابی نے بعلت بقایا مالگزاری زندہ دفن کرادیا تھا جن کا نام طہٰ تھا۔ اس امر کی تصدیق دولہ مہدی حسن صاحب ولد مولوی فضل علی صاحب سے آج ہوئی لیکن صیغہ دار متوفی اب بکریا پیر مشہور ہیں اور بعض جاہل لوگ محلے کے ان پر چڑھاوا چڑھاتے ہیں[1]

عجیب الخلقت لڑکا: ۸ اکتوبر ۱۹۰۴ء۔ شب گزشتہ کو ایک لڑکا محلہ کسان ٹولہ[2] میں عجیب الخلقت بخانہ نجو ولد رحمن کسان پیدا ہوا جس کا منہ لانبا تھوتھنی نکلی ہوئی۔ بجائے آنکھ کان کے گتھی لگی ہوئی ہے۔ ٹھوڑی ناک نہیں۔ ہاتھ پیروں کی انگلیاں ندارد، پاؤں کے گٹوں میں ناخن نکلے ہیں اور چار دانت اوپر کے نمایاں ہیں۔ زبان نکلی ہوئی ہے۔ بدن مثل مچھلی کے سفنوں کے چپٹا ہوا ہے۔ جسم موٹا ہے جس کے مقابلے میں ہاتھ پیر پتلے ہیں۔ بکری کا دودھ اس کو پلایا جاتا ہے۔ تمام دن وہ زندہ رہا اور آٹھ بجے رات کو مر گیا۔

سید سالار مسعود غازی: ۲۷ اکتوبر ۱۹۰۴ء۔ سید مسعود غازیؒ ۷ ارشعبان ۴۲۳ھ مطابق ۱۰۳۲ء کو بہرائچ میں داخل ہوئے اور ۱۸ ررجب ۴۲۴ھ مطابق ۱۰۳۳ء کو سہیر دیو نے ان کو معہ ان کی تمامی فوج کے قتل کیا اور سید سالار بہرائچ کے تالاب کے قریب جس پر سورج کا مندر تھا اور جس کو سالار اپنی آرام گاہ کیلیے بہت پسند کرتے تھے مدفون ہوئے۔ سید سالار ساہو کے بیٹے اور سلطان محمود کے بھانجے تھے[3]

---

[1] مولوی مظہر علی صاحب کے مکان سے کچھ دور ایک مرتفع میدان ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ یہاں بہت پہلے ایک قلعہ تھا۔ اس لیے یہ میدان ابھی تک قلعہ کہلاتا ہے۔ اس کے مغربی جنوبی کنارے پر ایک برج لکھوری اینٹوں کا بنا ہوا تھا جس پر ایک بکریا کا پرانا پیڑ لگا تھا۔ یہ بھی مشہور تھا کہ اس میں کوئی شہید مدفون ہیں اسلیے وہ بکریا پیر کے نام سے موسوم ہوگئے تھے۔ ۱۹۵۰ء تک یہ برج خستہ حالت میں موجود تھا۔ اب وہاں کچھ نہیں ہے اور قلعہ کی زمین پر مکانات بن رہے ہیں۔ ہاشمی

[2] اب یہ محلہ کسان ٹولہ کہلاتا ہے۔ [3] نیول نے اپنی اودھ ڈسٹرکٹ گزیٹیر (انگریزی) میں سالار مسعود غازی کی شہادت کی تاریخ ۱۵ رجون ۱۰۳۳ء مطابق ۱۴ ررجب ۴۲۴ھ لکھی ہے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے کوئی ساتھی اور ساری فوج یہیں شہید ہوئے تھے۔ اور یہ کہ ان کی عمر اس وقت صرف ۱۹ رسال کی تھی۔ ہاشمی

سخت سردی: ۴ فروری ۱۹۰۵ء - آج کل برف بہت گر رہی ہے اور ہوا بہت تند چلتی ہے جس سے بے حد سردی ہے اور کثرت برف سے مٹر، چنا، ارہر اور آلو جاتا رہا۔ جو ظروف پانی سے بھرے رکھے تھے ان میں بھی برف جم گیا اور گڑھا تالاب 'مخدوم پورہ' کا ایک حصہ اس سے منجمد ہو گیا۔ آج کل نہایت شدت کی سردی ہے۔ میری کوٹھی کے اندر انگلیاں ٹھٹھری جاتی ہیں اور صبح شام دونوں وقت اپنی کوٹھی میں انگیٹھی روشن کرایا کرتا ہوں تب چین پڑتی ہے۔

۵ فروری ۱۹۰۵ء چار روز برابر برف گرنے سے حسب ذیل پیداوار فصلی کو سخت نقصان پہنچا جس کا تخمینہ صحیح طور پر بعد ایک ہفتہ کے تحریر کروں گا۔

"نخود، مٹر، گندم، پوستہ، تمباکو، جو، آلو، ارہر، درختاں میوہ دار، درختاں انبہ خورد سال مہوہ و جامن، کچھیا نہ"۔

میرے قلمی باغ اشرف ٹولہ کو جو چند سال سے پھلتا تھا بہت ضرر پہنچا۔ برف بہت دیر گرا حتیٰ کہ تالاب اجمیر و آگرہ منجمد ہو گئے۔ خیال ہوتا ہے کہ تمامی ہندوستان میں یہ بلا نازل ہوئی کیوں کہ تحریرات باندا، الہ آباد اور دیوا ضلع بارہ بنکی سے اس کی تصدیق ہوئی ہے۔ میں جہاں تک خیال کرتا ہوں تو میرے ہوش میں نہ ایسا پالا پڑا اور نہ ایسی سردی ہوئی۔ (شاید برف گرنے، سے مراد مولوی صاحب کی مراد پالا پڑنے سے ہے۔ کیونکہ یو پی کی وادی میں برف گرنے کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ سخت پالا پڑنے سے پانی منجمد ہو گیا ہو ورنہ انجلا آب بھی میری یاد میں کبھی نہیں ہوا تھی)

رویت ہلال: ۱۵ فروری ۱۹۰۵ء - آج لکھنؤ کے علمائے سنت و جماعت نے نماز بقرعید پڑھی لیکن شیعہ مذہب والوں نے نہیں۔ اور اضلاع میں بھی آج بقرعید ہوئی۔ سندیلہ میں نہیں ہوئی۔ اگر رویت ہلال کی قبل سے تحقیقات کر لی جاتی تو یہ اختلاف ہرگز نہ ہوتا۔

میر جلید کا مرثیہ: ۶ مارچ ۱۹۰۵ء - آج شب کو میر جلید پوتے میر انیس لکھنوی نے چودھری محمد جان صاحب تعلقدار کے امام باڑہ میں مرثیہ تصنیف خود پڑھا جن کا یومیہ ایک رات ٹھیرنے کا پچاس روپے قرار پائے تھے۔ باوصف طلب میں شریک مجلس نہیں ہوا کہ اب مجھے خوشی دنیاوی کا کوئی لطف باقی نہیں رہا اور بحالت افسردگی ایام زندگی بسر کیے جا رہا ہوں۔ برخورداران مصطفےٰ علی و مجتبیٰ علی شریک ہوئے تھے سنا گیا کہ کچھ اچھا نہیں پڑھا۔

وفات حاجی وارث علی: ۱۰ اپریل ۱۹۰۵ء - آج خط برخوردار سید مجتبیٰ علی مورخہ ۸ اپریل ۱۹۰۵ء قصبہ دیوا سے واضح ہوا کہ جناب حاجی وارث علی شاہ نے بتاریخ ۶ اپریل سن الیہ یوم جمعہ کو علی الصباح بمقام دیوا

رحلت فرمائی اور بوقت ۴ بجے شام کے اپنے سہ درہ نشست گاہ میں مدفون ہوئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ اور بعد سیوم سید ابراہیم شاہ صاحب نواسہ حاجی صاحب مرحوم سجادہ نشین قرار دیے گیے اور بعد ہٗ ممدوح شاہ صاحب مرحوم حاجی صاحب نے سید صاحب کو پہنایا۔ سید صاحب کے سامنے نذریں برسم جانشینی گزریں اور اکثر لوگ مرید ہوئے اور بعض ہنود مسلمان ہو کر مرید ہوئے۔ جناب مرحوم کے لاکھوں مرد و زن دُور دُور کے مرید تھے اور سن شریف ۹۲ سال تھا۔ آپ کی ذات اس زمانہ میں بسا غنیمت تھی۔

میڈیکل کالج لکھنؤ: ۲۱ نومبر ۱۹۰۵ء آج ۹ بجے صبح کی ریل میں واسطے شرکت کمیٹی چندہ ڈاکٹری کالج لکھنؤ کے ہردوئی گیا۔ وقت ۲ بجے دن کے بصدارت مسٹر ٹرنر صاحب ڈپٹی کمشنر ہردوئی کمیٹی منعقد ہوگی۔ چونکہ میرا نام اعزاز کے ساتھ لیا گیا لہٰذا میں نے بہ نظر مناسب ۲۵ روپے چندہ دینا منظور کیا اور منشی قبول احمد نے ایک سو۔ غرضکہ اسی طور پر ہر ایک شخص کی مقدار چندہ بڑھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُس وقت تقریباً ۲۲ ہزار کا چندہ ہوا۔ بعض تعلقداران تحصیل سندیلہ کی مقدار ذیل میں درج کرتا ہوں۔

راجہ درگا پرشاد صاحب، ایک ہزار، چودھری محمد جان صاحب۔ ایک ہزار، رانی چندر کنور صاحبہ زوجہ راجہ وزیر چند صاحب۔ ایک ہزار، سید التفات رسول صاحب۔ ایک ہزار، اہلیہ کنور نرندر بہادر صاحب مرحوم۔ ۵ سو، مادھو سنگھ صاحب بھرواں، ایک ہزار، ٹھاکر مہاراج سنگھ صاحب بھورہ، دو ہزار، ٹھاکر سرب جیت سنگھ صاحب پوایاں، ٹھاکر سرب جیت سنگھ صاحب پوایاں بعد فراغت میں ۶ بجے شام کی ریل میں سندیلہ واپس آیا۔

۲۰ دسمبر ۱۹۰۵ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ نو لاکھ تینتیس ہزار پانچ سو ستر کا چندہ واسطے تیاری ڈاکٹری کالج لکھنؤ ہو چکا ہے اور ابھی اور ہوگا اور شاخ تعلیم نسواں کے لیے ۶۲ ہزار ۵۲۳ روپیہ چندہ ہوا ہے۔ ان دونوں کی مجموعی تعداد ۹ لاکھ ۸۷ ہزار ایک سو تین روپے ہے۔

۲۲ دسمبر ۱۹۰۵ء آج ۹ بجے صبح کی ریل میں شہزادہ و شہزادی پرنس و پرنسس آف ویلز داخل لکھنؤ ہوئے اور وقت ۳ بجے دن کے موصوف الیہ نے سنگ بنیادی ڈاکٹری کالج میدان شاہ مینا میں رکھا اور ۱۰ بجے شب کو بارہ دری قیصر باغ میں تشریف لائے۔ روشنی و آتش بازی کو ملاحظہ کیا اور سنا گیا کہ حضرت گنج میں بہت عمدہ روشنی تھی علی الخصوص بابو پراگ نرائن مالک اودھ اخبار نے بہت اعلیٰ درجہ کی روشنی کرائی تھی جس کی تعریف عموماً ہو رہی ہے۔

طاعون اور چوہے: ۱۲ جنوری ۱۹۰۶ء حکم ٹرنر صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر ہردوئی مشعر بدیں خلاصہ موصول ہوا کہ بنام ممبران میونسپل یادداشت بھیجی جاوے کہ وہ اپنے اپنے حلقہ میں باشندگان کو ترغیب دیں کہ جو

مُردہ چوہے وہ پیش کریں گے ان کو فی چوہا ایک پیسہ اور جو زندہ لاویں گے ان کو فی چوہا دو پیسہ انعام دیا جاوے گا۔ چنانچہ بموجب اس حکم کے اسی وقت بنام ممبران یادداشتیں جاری کی گئیں اور اس کی اطلاع صاحب ضلع کو کردی گئی اور یہ بھی اطلاع دی گئی کہ ۱۵ر جنوری ۱۹۰۶ء تک حسب ذیل چوہے ہلاک کیے گئے۔

"من ابتدا سے ۱۲ر نومبر ۱۹۰۵ء لغایتہ ۱۵ر جنوری ۱۹۰۶ء بذریعہ چوہے دان میونسپل ۵۷۰۱ من ابتدائے ۱۳ر جنوری سن الیہ لغایتہ ۱۵ر ماہ مذکور بہ ادائے انعام ۲۳۴۶ "(یہ سلسلہ تقریباً پورے سال تک چلتا رہا جس کا اندراج وقتاً فوقتاً روزنامچہ میں ہوتا رہا۔ ہاشمی)

<u>کنبھ کا میلہ</u>: ۲۶ر جنوری ۱۹۰۶ء۔ میلہ کنبھ الہ آباد میں جو ابھی ختم ہوا ہے بیس لاکھ آدمیوں کا مجمع تھا۔ ۲۴ر جنوری ۱۹۰۶ء کو کثرت ازدہام سے دس آدمی ہلاک ہوئے اور اٹھارہ سخت مجروح ہوئے۔

<u>عقد ثانی بیوہ</u>: ۱۰ر مارچ ۱۹۰۶ء۔ چونکہ نور دیدہ انجمن (نواسی) دختر برخوردار سعید الدین کم عمری یعنی ۱۹ سال میں بیوہ ہوگئی لہٰذا برخلاف رسم قدیمہ یہ تجویز کیا ہے کہ اس کا عقد ثانی کرا دیا جاوے۔

<u>شیعہ سُنّی جھگڑا</u>: ۱۸ر مارچ ۱۹۰۶ء۔ آج کے اودھ اخبار سے معلوم ہوا کہ لکھنؤ کے شیعوں نے سنیوں اور ہندوؤں سے یہ کہا کہ وہ برہنہ سر و پا بغیر پان کھائے کربلا تال کٹورہ میں آئیں اور اپنے اپنے تعزیے دفن کریں لیکن یہ بات دونوں فرقوں نے منظور نہیں کی اور اپنے تعزیے اجنوں کی مسجد کے قریب ایک میدان میں دفن کیے جہاں اہل تعزیہ و تماشائیوں کا ہجوم تھا اور دوکانداروں وغیرہ کو بھی کوئی ممانعت نہیں تھی اور جا بجا شربت کی سبیلیں رکھی ہوئی تھیں۔ لنگر جاری تھے اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی تھی کہ جو مولوی مقبول احمد شیعہ پر بہ علت کہنے تبرا کے ایک ہزار روپیہ جرمانہ اور تین ہزار روپیہ کی ضمانت نیک چلنی حبیب اللہ سُنّی کے استغاثہ پر عدالت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ضلع فیض آباد کے اجلاس سے حال میں ہوئی ہے اسی وجہ سے لکھنؤ کے شیعوں نے سُنّیوں کی نسبت شرائط قائم کیے۔ جہاں تک خیال جاتا ہے تو سُنّیوں کی جابیہ کربلا کو بہت جلد نمایاں ترقی اس وجہ سے ہو جائیگی کہ ان کی میں کسی قسم کی قید یا شرط وقت داخلہ کربلا کے نہیں ہے جس کا آغاز عمدہ نظر آرہا ہے۔

<u>مدرسۂ نسواں</u>: ۱۲ر مارچ ۱۹۰۶ء۔ آج میں نے کمیٹی خاص میونسپل سے مدرسہ نسواں اشراف ٹولہ کا نفاذ کرا دیا اور مولوی عبد الرزاق صاحب مہتوانہ کا تقرر بمشاہرہ پندرہ روپے ماہوار منظور ہوا جو کل ۱۳ر مارچ سن الیہ سے مکان صدر اعلا میں جاری ہوگا۔

<u>حافظ انور علی قلندر</u>: ۱۷ر مارچ ۱۹۰۶ء۔ آج معلوم ہوا کہ شام کو حافظ علی انور صاحب سجادہ نشین

تکیہ شاہ تراب علی صاحب کاکوری نے قضا کی۔ عمر تقریباً ساٹھ سال تھی۔ مرحوم نہایت ذی علم باوضع و مقدس بزرگ تھے اور بہت سے مردوزن علی الخصوص مستورات کاکوری مرید تھیں اور آپ ہفتہ میں ایک مرتبہ ہر ایک اپنے مرید کے گھر جاتے تھے اور وہیں کھانا کھاتے تھے۔

۱۹ر مارچ ۱۹۰۶ء۔ آج حافظ علی انور صاحب مرحوم کاکوری کا سیوم تھا اور ان کے بیٹے بعد تقریب سیوم اپنے باپ کے سجادہ نشین منتخب ہوئے۔

شیعہ سُنّی تعزیہ داری: ۱۷ر اپریل ۱۹۰۶ء۔ لکھنؤ کے جہلم کی خبر جو ۱۵ر اپریل ۱۹۰۶ء کو معلوم ہوئی کہ سُنّیوں اور ہندوؤں کے تعزیے زیادہ دھوم دھام سے اٹھے اور گشت کیا۔ منشی احتشام والد منشی امتیاز علی مرحوم کی آراضی میں دفن ہوئے جو اب 'پھول کٹورہ' کے نام سے موسوم ہوئی ہے۔ راستہ شربت و پانی کی سبیلیں قائم تھیں۔ مجمع ہمراہ تعزیوں کے اس قدر تھا کہ ایسا 'تال کٹورہ' میں شاید کبھی نہ کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ سے سوا لاکھ تک آدمیوں کا مجمع تھا۔ اثنائے راہ کربلا میں جان محمد نے ایک قائم کیا تھا جہاں ہر شخص کو کھانا مفت تقسیم ہوتا تھا۔ گھوسیوں نے چھ سو من دودھ کا بندوبست جو شربت میں ملایا گیا تھا۔ منشی احتشام علی نے کربلا پھول کٹورہ میں تقسیم طعام کا بندوبست کیا تھا جو کو دیا جاتا تھا۔ 'گول دروازہ' لکھنؤ سے پھول کٹورہ کربلا تک تین کوس کا فاصلہ ہے اثنائے راہ میں سبیلیں ہر قسم کی تھیں جس میں برف پڑا ہوا تھا۔ کربلا میں ہر قسم کے فرقے و طبقے کے لوگ اور رؤسا تعزیہ تھے۔ برخلاف اس کے 'تال کٹورہ' شیعوں کی کربلا میں سناٹا تھا حتی کہ غلام حسین عرف مُٹّن صاحب کا تعزیہ بارہ بجے نہایت مجمع کے ساتھ اٹھتا تھا وہ چار بجے شام تک بوجہ نہ ملنے مزدوروں کے نہیں اٹھ سکا لکھ اہل تشیع سے یہ بڑی غلطی ہوئی جو انھوں نے قید لگائی تھی کہ سُنّی و ہندو جو اپنے تعزیے تال کٹورہ کی کربلا میں جائیں وہ ننگے سر برہنہ پیر ہوں۔ ایسی حماقت کا انکو شکست فاش ملی کہ سُنّی و ہندو متفق ہوگئے اور انھوں نے بالاتفاق یہ کارروائی کی

کنکوا بازی: ۱۵ر اکتوبر ۱۹۰۶ء۔ آج اجودھیا ولد گوردیا کلوار ساکن 'گڈری' و محمود علی خاں خلف واجد علی خاں بلوچ میں صبح سے کنکوا بازی شروع ہوئی اور نماز مغرب تک برابر ہوتی رہی۔ اجودھیا چھ اصطبل سید النفات رسول تعلقہ دار پر تھا اور محمود علی خاں قلعہ پر۔ ۲۶ پیچ لڑے۔ محمود علی خاں پانچ رہے اور پالا ان کے ہاتھ رہا اور پانچ روپیہ اجودھیا کلوار سے جیتے کہ ایک روپیہ بازی تھی۔ محمود علی خاں اپنی دلی خوشی اس نہج سے منائی کہ موجود لوگوں کو بتاشے تقسیم کیے اور گاتے بجاتے چلے اور اجودھیا کی د

کی طرف سے ہو کر چادر درگاہ مخدوم صاحب میں لے جا کر چڑھائی۔ راستہ میں آتش بازی چھوٹتی جاتی تھی۔ کنکیے دیکھیے (کذا) ساتھ تھے۔ محمود علی خاں کی طرف قلعہ پر کرسیوں اور فرش پر نشست تھی۔ پانی پان اور حقہ کا اور انبد وبست تھا

نینی تال میں محفل میلاد: ۱۸ اکتوبر ۱۹۰۶ء۔ آج کے اودھ اخبار سے معلوم ہوا کہ ۴ اکتوبر ۱۹۰۶ء وقت شب کو ہز آنر سر لاٹوش صاحب لفٹیننٹ گورنر اضلاع متحدہ آگرہ و اودھ کی جانب سے بمقام نینی تال ان کی کوٹھی کے سامنے محفل میلاد شریف منعقد ہوئی اور اس جلسہ کا اہتمام صاحب بہادر کے حکم اور ان کے اہتمام سے ہوا تھا۔ محفل کی آراستگی و شیشہ آلات کی روشنی اور آدمیوں کا ہجوم قابل دید تھا۔ مولانا حاجی حافظ ولایت حسین صاحب جوالہ آباد سے بلوائے گئے تھے جب آپ جلسہ میں تشریف لائے تو لاٹ صاحب نے اٹھ کر ہاتھ ملایا اور تخت پر بیٹھنے کی اجازت دی اور سب اہل مجلس کو تاکید فرمائی کہ کوئی ہماری تعظیم کو نہ اٹھے۔ مولوی صاحب نے تین گھنٹہ کے قریب مولود پڑھا۔ لاٹ صاحب نے ایک گھنٹہ سے کچھ زائد بہت دلچسپی سے بیان سنا۔ اس کے بعد اٹھ کر مولوی صاحب سے ہاتھ ملایا اور یہ کلمات فرمائے کہ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے اس جلسہ میں شریک کیا۔

لفٹیننٹ گورنر: یکم جنوری ۱۹۰۷ء۔ آج گیارہ بجے دن کو ہز آنر سر ڈگس لاٹوش صاحب بہادر نے اپنا چارج گورنری اضلاع متحدہ آگرہ و اودھ جے پی ہیوٹ صاحب جدید لفٹیننٹ گورنر کو دے کر روانہ ولایت لندن ہوئے۔ جو نہایت نیک مزاج حاکم تھے۔ اب دیکھنا ہے کہ ہز آنر ہیوٹ صاحب بہادر کیسا کام کرتے ہیں۔

قیصر باغ: ۹ مارچ ۱۹۰۷ء۔ قیصر باغ (لکھنؤ) کی تعمیر ۱۸۴۸ء میں شروع ہوئی اور ۱۸۵۰ء میں ختم ہو گئی۔ اس کی تیاری میں اسی لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ کم سے کم چار میل کے دور میں تھا۔ بادشاہ منزل، روشن الدولہ کی کوٹھی، مقبرہ سعادت علی خاں، گھسیاری منڈی، اور دلی بازار، چولکھی، حضرت گنج یہ سب مقامات اس باغ میں داخل تھے۔ اس کے اندر قلعہ در قلعہ تھا۔

نواب منجھو صاحب: ۱۹ مارچ ۱۹۰۷ء۔ آج نواب منجھو صاحب لکھنؤ سے ملاقات ہوئی جو بوجہ شدت طاعون لکھنؤ چھوڑ کر سندیلہ کو تشریف لائے ہیں اور راجہ درگا پرشاد کے گوشہ محل سرا بالائے پھاٹک میں مقیم ہیں۔ عمر نواب صاحب ۵۴ سال ہو گی۔ ان کی کیفیت اس طور پر ہے کہ جب والٹن صاحب لندن سے آئے تو ان کے ہمراہ ایک فرزند (پدر نواب صاحب) اور ان کی ایک بیٹی بھی موصوف الیہ کے ساتھ آئیں۔ مس صاحبہ منظور نظر نصیر الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ ہوئیں اور ان کا عقد مسلمان ہونے پر بادشاہ کے

ساتھ ہوگیا اور ولایتی بیگم کے نام سے موسوم ہوئیں۔ اس وقت ان کا پورا خاندان مسلمان ہوگیا۔ نواب صاحب کے باپ بڑے امیر کبیر تھے اب منجھو صاحب بھی خوش حال ہیں اور ان کا گزر وثیقہ وغیرہ سے ہوتا ہے۔

طاعون: ۲۰ مارچ ۱۹۰۷ء۔ آج دو آدمی محلّہ اشراف ٹولہ کے طاعون میں فوت ہوئے۔ لکھنؤ میں طاعون کی بہت زیادہ شکایت ہے۔ حضرت گنج جو اپنی صفائی میں بوجہ سول لائن ہونے کے مشہور ہے وہ بھی اس شکایت سے بری نہیں۔ دو قسم کا طاعون سخت مہلک ہے اوّل جن کے بخار یا گلٹی نکل آنے کے ساتھ دست آنے لگتے ہیں دوسرے نمونیہ کی نوعیت کا طاعون یعنی جب پسلی میں درد بحالت طاعون ہوتا ہے۔ ان دونوں میں مریض جاں بر نہیں ہوتا۔

محمد ابراہیم شاہ: ۹ جون ۱۹۰۷ء۔ آج ۶ بجے شام کو محمد ابراہیم شاہ صاحب نواسہ و جانشین جناب حاجی وارث علی شاہ صاحب مرحوم قصبۂ دیوا، جو آج صبح کی ریل میں وارد سندیلہ ہوئے تھے حسب خواہش اہل خانہ برخوردار مصطفےٰ علی میرے مکان پر تشریف لائے اور مجھ سے مصافحہ اور معانقہ فرمایا اور کمال عنایت و اخلاق سے پیش آکر چند مرتبہ مزاج پرسی فرمائی اور بعد نماز مغرب اندر تشریف لے گئے اور نور دیدہ منتظم حسین پر جو شکایت دق میں مبتلا ہیں پھونک ڈالی اور دعا حصول صحت فرمائی۔ چونکہ ان کی والدہ جناب حاجی صاحب مرحوم کی مرید تھیں لہٰذا وہ اور ان کی دونوں ہمشیر منجھلی و چھوٹی شاہ صاحب کے سامنے آئیں جس کی اجازت مجھ سے حاصل کر لی تھی۔ مبلغ بیس روپے میرے گھر میں عورتوں نے بطور نذر پیش کیے۔

۱۰ جون ۱۹۰۷ء۔ آج ۷ بجے صبح کی ڈاک گاڑی میں محمد ابراہیم شاہ صاحب روانہ قصبۂ دیوا ہوئے اسٹیشن پر بہت بڑا مجمع تھا۔ چودھری محمد جان صاحب راجہ درگا پرشاد صاحب بنا بر رخصتی تشریف لے گئے تھے۔ اور بہت سے اہل قصبہ اور ان کے مریدین کا اسٹیشن پر مجمع تھا۔

نرخ غلّہ: ۹ ستمبر ۱۹۰۷ء۔ نرخ غلّہ آج کی تاریخ میں حسب ذیل ہے۔

گندم قسم اوّل ۹ سیر، گندم قسم دوم ۹½ سیر، آرد گندم ۸ سیر، نخود ۱۲ سیر، دانہ نخود ۱۱½ سیر، ماش ۱۰ سیر دال ماش ۹ سیر، مونگ ۱۰ سیر، دال مونگ ۹ سیر، ارہر ۱۱¾ سیر، دال ارہر ۱۱ سیر، چاول باریک ۶ سیر، چاول موٹے ۷ سیر دھان ۱۰ سیر، شکر چینی ۲¾ سیر، شکر قسم اوّل ۲½ سیر، شکر قسم دوم ۴ سیر، نمک سانبھر ۲۰ سیر، روغن زرد ۱۵ چھٹانک روغن ارنڈی ۲½ سیر، لکڑی ۴ من، روئی ۲¾ سیر، قند سیاہ ۷ سیر، سرسوں ۶½ سیر، روغن سرسوں ۲½ سیر، چوکر ۶ سیر۔

رفاہ عام: ۱۲ نومبر ۱۹۰۷ء۔ آج میرے مکان پر کمیٹی خاص میونسپل بورڈ منعقد ہوئی جس میں پنڈت گرجا دت تحصیلدار و راجہ درگا پرشاد صاحب و ممبران شریک تھے اور بکثرت رائے مبلغ ڈھائی ہزار روپے میونسپل

کھدائی تالاب بیرونی، وغیرہ کام رفاہ عام میں تجویز ہوئے اور کمیٹی مقامی قحط سے یہ بھی طے ہوا کہ آبادی سندیلہ ستر حلقوں میں تقسیم کی جائے اور ذی اثر اشخاص کے نام نوٹس دیا جائے کہ وے اپنے حلقوں میں ان اشخاص کو امداد ملنے کی سفارش کریں جو شرم و عزت و ضعیفی و علالت و پردہ نشینی اور اسی قسم کی وجہ سے کوئی کام کرنے کے قابل نہ ہوں اور ان کو کسی اپنے عزیز وغیرہ سے امداد نہ ملتی ہو۔

<u>گوشت ۲ پیسے سیر</u>: ۲۱ر نومبر ۱۹۰۷ء۔ چونکہ زمانہ قحط سالی ہے جس سے ہر ایک شے گراں کمیاب ہے اور سب سے بڑی کمیابی گھاس کی ہے جو بالکل میسر نہیں آتی اور مویشی مرے جاتے ہیں لہذا ہندو مسلمان دونوں اپنے مویشی قصائیوں کے ہاتھ فروخت کر رہے ہیں اور گوشت کا نرخ آج کل سستا یعنی دو پیسے سیر فروخت ہوتا ہے اور ان کا چرسہ معمول سے زیادہ قیمت پر بکتا ہے۔ آج کل قصائیوں کی اس قدر تعداد بڑھ گئی ہے کہ ہر ایک ادنی اقسم کے مسلمان نے یہ پیشہ اختیار کر لیا ہے۔ آج کل مویشیوں کی وبا ہے۔

<u>تالاب بیرونی</u>: ۱۸ر دسمبر ۱۹۰۷ء۔ آج ۳ بجے دن کو میں نے تالاب بیرونی کو دیکھا میرے ساتھ سید حسن احمد مخدوم زادہ اور قاضی نقی حسن محرر میونسپل ساکن شاہ آباد تھے۔ تالاب میں ۲۰ نفر میٹ کام کرتے ہیں جن کو فی کس ۳ر یومیہ ملتا ہے اور عبدالرحیم ٹائم کیپر کو دس روپے ماہوار اور مزدوران وغیرہ کو حسب تفصیل ذیل اجرت دی جاتی ہے جس کی بابت حکم تحریری ڈپٹی کمشنر بہادر میں نے حاصل کر لیا ہے۔
بیل دار جو پھاوڑہ چلاتے ہیں ۲ آنہ یومیہ، مزدور ڈلیا ڈھونے والے ۱ ۱/۲ آنہ یومیہ، عورت مٹی ڈھونے والی ۱ ۱/۴ آنہ یومیہ، لڑکی دس سال کی عمر سے زائد ایک آنہ یومیہ: افسوس ہے کہ یہ کام عنقریب بند ہونے والا ہے اور ۵۰۴ آدمی جو میرے ذریعے سے ما زقہ پا رہے ہیں وہ عنقریب بند ہو جائے گا۔

<u>نرخ غلہ بازار سندیلہ</u>: ۲۶ر دسمبر ۱۹۰۷ء۔ آج نرخ غلہ بازار سندیلہ میں حسب ذیل ہے:
گندم ۷ سیر، دانہ نخود ۸ ۱/۲ سیر، مونگ ۷ ۱/۴ سیر، دال ارہر ۶ ۱/۴ سیر، آرد باجرہ ۷ ۱/۴ سیر، آرد گندم ۶ ۱/۴ سیر، ماش ۵ سیر، دال مونگ ۶ ۱/۴ سیر، جوار ۹ سیر، چاول ۶ سیر، نخود ۸ سیر، دال ماش ۴ ۱/۴ سیر، ارہر ۹ سیر، باجرہ ۸ ۱/۴ سیر، جو ۹ سیر، آرد جو ۸ سیر، مکائی ۱۰ سیر، دھان ۱۱ سیر، نمک ۱۹ سیر، قند سیاہ ۶ سیر، گھی ۱ سیر ۳ چھٹانک، سرسوں ۵ ۱/۴ سیر، روئی ۲ ۱/۴ سیر، روغن سیاہ ۲ سیر ۲ چھٹانک۔

<u>محتاج خانہ</u>: ۸ر جنوری ۱۹۰۸ء۔ آج کل محتاج خانہ میں مع مرد و عورت و لڑکوں کے ۹۹ نفر ہیں۔ یہ کمی و بیشی روزانہ ہوا کرتی ہے۔ آج کئی نفر بحکم ڈپٹی کمشنر صاحب سندیلہ میونسپل کو بھیجے گئے کہ وہ قصبہ ہذا کے کمانے والے

کے ساتھ خیرات پایا کریں اور ان کا نام درج بموجب محتاجان سندیلہ کیا جائے۔ بظاہر صاحب بہادر کا یہ منشا معلوم ہوتا ہے کہ محتاج خانہ کے لوگ شامل محتاج سندیلہ کیے جاویں کہ ان کی تقسیم خیرات کے روپے سے ہوئی۔ (یہ لوگ قحط امداد دیے کا کام سال بھر چلتا رہا۔ تالاب و کنوئیں بھی بغرض رفاہ عام کھدوائے گئے تھے۔ ہاشمی۔)

۲۶ فروری ۱۹۰۸ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ تمامی ہندوستان میں منجانب سرکار نولاکھ دو ہزار آٹھ سو پچیس آدمیوں کی رفع تکلیف ہوتی ہے۔ واقعی گورنمنٹ رعایا کی ایسے زمانہ قحط میں بہت مدد کر رہی ہے۔

مدح صحابہ و تبرا: ۱۳ فروری ۱۹۰۸ء۔ سنا گیا کہ چوک لکھنؤ میں شیعہ و سنی میں سخت مقابلہ ہو گیا۔ سنت جماعت لوگ حسب الحکم ڈپٹی کمشنر لکھنؤ چار یاری مرثیہ پڑھتے جاتے تھے اور خلاف اجازت شیعہ لوگوں نے تبرا کہنا شروع کر دیا۔ پولس نے مزاحمت کی۔ باہم پولس اور شیعوں کے لڑائی شروع ہو گئی۔ سنت جماعت نے موقع پا کر شیعوں کو خوب مار حتی کہ ان کا ایک آدمی مر گیا اور پولس کے لوگ شیعوں کے حملے مجروح ہوئے۔ حکام وقت فوراً موقع پر پہنچ گئے۔ ایک سو سے زائد شیعہ گرفتار ہو کر زیر حراست پولس ہوئے۔ اب تحقیقات ہو رہی ہے۔ دیکھا چاہیے کہ کیا نتیجہ ہوتا ہے۔

شبیہ ملکہ: ۹ اپریل ۱۹۰۸ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ شبیہ ملکہ وکٹوریہ ۲ اپریل ۱۹۰۸ء کو لکھنؤ میں متصل مقبرہ سعادت علی خاں بادشاہ بوقت ۵ بجے شام کو قائم ہوئی ہے اس کو سرجان ہیوٹ صاحب لفٹیننٹ گورنر نے کھولا جس کی تیاری میں حسب ذیل روپیہ خرچ ہوا۔

تیاری چھتری۔ ۸۸ ہزار سات سو پچیس روپے ۱۲ آنہ ۹ پائی / تیاری شبیہ۔ ۴۱ ہزار پانچ سو روپے ۸ آنہ ۶ پائی = میزان کل ایک لاکھ ۳۰ ہزار ۲۲۸ روپے ۶ آنہ۔

مسٹر ٹرنر صاحب: ۷ ستمبر ۱۹۰۸ء۔ آج صبح کی ڈاک گاڑی میں مسٹر ٹرنر صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر ہردوئی سے تشریف لائے اور مدرسہ اردو سندیلہ میں کمیٹی کر کے جناب لفٹیننٹ گورنر بہادر کی اسپیچ پڑھانے کی تجویز کی جو صاحب ممتشم الیہ نے لکھنؤ میں فرمائی تھی جس کا ترجمہ راجہ درگا پرشاد صاحب نے اہالی کمیٹی کو پڑھ کر سنایا جو اخبار میں شائع ہوا تھا اس کا مضمون یہ تھا کہ اضلاع متحدہ آگرہ و اودھ کے لوگ بنگالیوں کے مفسدہ پردازی نہ کریں جس کا کوئی فائدہ بجز نقصان کے نہیں ہے۔

.... ازاں بعد ڈاک بنگلہ میں یکے بعد دیگرے روسائے قصبہ ہذا کی ملاقات کی اور سید التفات رسول صاحب سے وقت ملاقات فرمایا کہ تم مولوی مظہر علی سے کہہ دینا کہ ہم ان کے کام آنیریری سکریٹری سندیلہ سے

ہت خوش ہیں جو انھوں نے ایک مدت دراز تک اپنے متعلقہ کام کو نیک نیتی سے انجام دیا۔ چونکہ اب وہ ضعیف ہوگئے ہیں اس وجہ سے ہم نے ہیڈ سکریٹری مقرر ہونا تجویز کیا اور مولوی صاحب ہمیشہ منجانب گورنمنٹ ممبر میونسپل مقرر ہوتے رہیں گے۔ جب میں نے صاحب بہادر کی ملاقات کی تو مجھ سے فرمایا کہ آپ کتنی مدت سے سکریٹری میونسپل ہے ہیں۔ میں نے کہا کہ قریباً ۲۶ سال تک میں سکریٹری میونسپل کا رہا ہوں۔ فرمایا کہ ہم تمہارے واسطے بنابر حصول اعزاز گورنمنٹ کو لکھیں گے۔ آپ ضرور اس کے مستحق ہیں اور اس کے متعلق ایک یادداشت لکھ لی۔

تپ ولرزہ: ۲ر اکتوبر ۱۹۰۸ء۔ آج کل سندیلہ کا کوئی گھر خالی نہیں جس میں دو چار آدمی شکایت تپ ولرزہ بن مبتلا نہ ہوں۔ میرے تجربے میں یہ سال مطابق ۱۸۷۹ء کے ہے جس سال نہایت سخت تپ ولرزہ کی تھی اور ہزارہا آدمی اسمیں ضائع ہوا تھا۔

تراویح: ۲۴ر اکتوبر ۱۹۰۸ء۔ کل رات کو مسجد چوراہا ٹاؤن پولس میں شبینہ ہوا اور ایک قرآن شریف حافظ تجو (تاج الدین) جولاہے نے پڑھا تھا۔ ایک رکعت میں ۱۸ سی پارے حافظ نے پڑھے۔ صرف نیفو (مقیم چاہ بچہ) کھڑے رہے باقی کل مقتدی بیٹھ اور لیٹ گئے۔

لرزہ بخار: یکم نومبر ۱۹۰۸ء۔ روزنامچہ میونسپل سے واضح ہوا کہ مہینہ اکتوبر ۱۹۰۸ء میں ۱۹۸ نفر تپ ولرزہ وغیرہ سے قصبہ ہذا میں ضائع ہوئے۔ یہ تعداد بہت زیادہ ہے اور دیہات میں بہ لحاظ مردم شماری اس سے زیادہ تعداد میں لوگ مر رہے ہیں۔ سندیلہ کی مردم شماری ۱۸۸۴۹ آدمیوں کی ہے۔

دیوان حافظ: ۱۱ر نومبر ۱۹۰۸ء.... راجہ صاحب (راجہ درگا پرشاد سندیلوی۔ ہاشمی) نے مجھے ایک کتاب دیوان حافظ مطلا مع تصویر بادشاہان سابق دکھلائی جو ایک سو برس کی لکھی ہوئی ہے۔ نواب بنگش فرخ آباد کے کتب خانہ کی ہے جس کو موصوف الیہ نے بہ قیمت ایک سو تیس روپے خرید کیا ہے۔

مالیخولیا: ۱۱ر نومبر ۱۹۰۸ء۔ آج ساڑھے چھ بجے صبح کو مسماۃ محمودن اہلیہ بابو معز الدین اشراف ٹولہ نے بعوارض چند بعمر ۵۰ سال قضا کی۔ متوفیہ کے مزاج میں جھنک اور مالیخولیا پیدا تھی۔ ایک روز متوفیہ مجھ سے کہنے لگیں کہ دنیا میں ڈیڑھ عقل ہے۔ ایک مجھ میں ہے اور نصف تم میں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ ذی ہوش عورت تھیں اور معاملہ کی بہت صاف۔

وائسرائے لارڈ منٹو: ۷ر نومبر ۱۹۰۸ء۔ آج صبح کو لارڈ منٹو وائسرائے ہند بذریعہ اسپیشل ٹرین لکھنؤ جاتے ہوئے اسٹیشن سندیلہ سے گزرے۔ پولس کی ایسی سخت نگرانی تھی کہ کوئی شخص ڈاک خانہ تک جو اسٹیشن سے تھوڑی دور ہے۔ ہاشمی نہیں جانے پاتا تھا۔ اسٹیشن پر جانا تو ہرگز ممکن نہ تھا۔ چونکہ بنگالیوں نے بعض بم

کو لفٹیننٹ گورنر بنگال پر تمنچہ سر کرنا چاہا تھا اور مہاراجہ بردوان درمیان قاتل اور لفٹیننٹ گورنر آگئے تھے اور قاتل کو ہٹا بھی دیا تھا اس وجہ سے اب سخت دیکھ بھال اور نگرانی ہو رہی ہے۔

۲۳ نومبر ۱۹۰۸ء۔ آج لارڈ منٹو صاحب وائسرائے کشور ہند ایک نہایت عمدہ رام بھج ہاتھی بلرام پور سوار ہوکر لکھنؤ مچھی بھون کی راہ سے گزرے۔ ہاتھی مذکور کو ہر ایک قسم کا طلائی و نقرئی زیور پہنایا گیا حتی کہ اس کے پیروں میں چاندی کی پازیب بھی تھی اور اس کے عقب میں ۶۰ تعلقہ دار ہاتھیوں پر سوار تھے ہر ایک ہاتھی خوب سجا ہوا تھا۔ یہ اسی قسم کا جلسہ تھا جب کہ یکم جنوری ۱۹۰۳ء کو وائسرائے لارڈ کرزن صاحب سابق گورنر جنرل کے عہد میں بمقام دہلی ہوا تھا اور بہت بڑے بڑے والیان ملک بموجب درجہ وم تبہ کے وائسرائے کے ہاتھی کے عقب میں تھے۔ اگرچہ اس جلوس میں بڑے بڑے نامی گرامی والیان ملک شریک تھے لیکن یہ ۲۳ نومبر ۱۹۰۸ء کا جلوس بھی قابل دید ضرور تھا۔

راجہ درگا پرشاد: ۱۳ جنوری ۱۹۰۹ء۔ آج سہ پہر کو راجہ درگا پرشاد صاحب نے یہ اظہار خوشی جیتنے مقدمہ استقرار حق کے درگاہ مخدوم صاحب میں چادر چڑھائی۔ ہاتھی پر چودھری مقبول حسن صاحب وکیل سوار تھے جس کا ہودج گنگا جمنی اور عمدہ پوشش سے آراستہ تھا اور اس کے پیچھے بگھیوں کا سلسلہ تھا جس پر راجہ صاحب کے صاحبزادگان و منشی عبدالودود صاحب و جمیل الدین کارندہ چودھری علی جان صاحب سوار تھے۔ وکیل صاحب کو ایک جُغہ چامہ وار قیمتی دوسو روپے عطا ہوا اور محمد حسین مختار عام کو بھی ایک دوشالہ ملا۔ لیکن افسوس پانی برسنے کی وجہ سے کچھ زیادہ لطف تماشائیوں کو حاصل نہیں ہوا۔

شبیہ مہاراجہ بلرام پور: ۲۵ جنوری ۱۹۰۹ء۔ آج کے اودھ اخبار سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سر ہیوٹ صاحب لفٹیننٹ گورنر اضلاع متحدہ آگرہ و اودھ نے سر دگبجے سنگھ صاحب مہاراجہ بلرام پور پریسیڈنٹ انجمن تعلقہ داران کی شبیہ کا افتتاح فرمایا جو بارہ دری قیصر باغ میں رکھی گئی ہے۔ اس شبیہ کی تیاری میں چوبیس ہزار روپیہ خرچ ہوا جس کو مسٹر کاسکوب جان نے بنایا اور اس کی بیٹھک کی تیاری میں چار ہزار روپے صرف ہوئے جس کو بابو درگا پرشاد سنگ تراش لکھنؤ نے تیار کی۔

مدح صحابہ: ۲۰ جنوری ۱۹۰۹ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ گورنمنٹ نے مخالفت کی ہے کہ چار یاری مرثیہ سنی لوگ راستہ وغیرہ میں نہ پڑھیں اور اگر پڑھیں گے تو قابل تدارک ہوں گے۔

مقامی مسلم لیگ: ۳ فروری ۱۹۰۹ء۔ آج چار بجے دن کو ایک کمیٹی مسلم لیگ مکان منشی قبول احمد

منعقد ہوئی جو کمیٹی آل انڈیا علی گڑھ کی امداد میں تھی کہ مسلمانوں کے حقوق کا گورنمنٹ خیال رکھے۔ اس کمیٹی کے پریسیڈنٹ منشی التفات رسول اور وائس پریسیڈنٹ چودھری علی جان اشار، سکریٹری مقبول احمد اور جوائنٹ سکریٹری بدالودود تجویز ہوئے۔ قصبہ ہذا کے بہت سے لوگ شریک تھے۔ منجملہ ان کے ایک میں بھی تھا۔

مدح صحابہ: ۱۳ مارچ ۱۹۰۹ء آج لکھنؤ میں تعزیہ چہلم عیش باغ سے اٹھا جس کے آگے مرثیہ چار یاری پڑھا جاتا تھا جس کی گورنمنٹ نے قبل آغاز مہینہ محرم ممانعت کر دی تھی کہ تعزیہ کے سامنے چار یاری مرثیہ نہ پڑھا جاوے مگر برخلاف اس کے جب سنی لوگ چار یاری مرثیہ پڑھتے ہوئے چوک لکھنؤ سے گزرے تو پولس کے لوگوں نے گول دروازہ کے پاس سب کو گرفتار کر کے کوتوالی میں کر دیا اور جس شخص نے دس روپے کی ضمانت پیش کی اسے چھوڑ دیا گیا۔ باقی لوگ حوالات بھیج دیے گئے۔ پولس کے ساتھ مجسٹریٹ ڈپٹی کمشنر لکھنؤ اور بابو سری رام آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس کارروائی میں کسی بڑے شخص کی تحریک ہے ورنہ ادنیٰ کم بضاعت لوگوں کو ایسی جرأت نہ ہوتی جو حکم گورنمنٹ کے خلاف کارروائی کرتے۔ مجمع کی تعداد سات آٹھ سو سنی جاتی ہے۔ میرے خیال میں یہ فعل سنیوں کا بالکل جاہلانہ ہے۔ ان کو خلاف ورزی و سرتابی گورنمنٹ کے حکم سے ہرگز نہ کرنا چاہیے۔

یکم اپریل ۱۹۰۹ء۔ جو سنیان لکھنؤ نے حکم گورنمنٹ کی خلاف ورزی کی اور چہلم کے روز تعزیہ کے ساتھ چار یاری مرثیہ پڑھتے ہوئے چوک سے گزرے ان کو مسٹر جابلنگ صاحب سٹی مجسٹریٹ لکھنؤ نے تین تین مہینہ قید سخت کی سزا دی۔ ۲۹ مارچ سن الیہ کو ان لوگوں کے خلاف حکم سنایا گیا۔

۸ اپریل ۱۹۰۹ء۔ آج کے اودھ اخبار سے معلوم ہوا کہ ۵ اپریل کو مسٹر وارٹن صاحب سیشن جج لکھنؤ نے اپیل سنیوں کا جو متعلق چار یاری مرثیہ پڑھا تھا خارج کر دیا اور تین ماہ کی سزا مجوزہ سٹی مجسٹریٹ صاحب لکھنؤ بحال رکھی۔

کیننگ کالج لکھنؤ: ۴ اپریل ۱۹۰۹ء۔ ۳۱ مارچ ۱۹۰۹ء وقت ۵ بجے شام کے سر ہیوٹ لفٹیننٹ گورنر اضلاع متحدہ آگرہ و اودھ نے کیننگ کالج واقع بادشاہ باغ لکھنؤ کا بنیادی پتھر نصب کیا[1]۔ اس تعمیر کے لیے سر بھگوتی پرشاد والی بلرامپور نے تین لاکھ روپیہ عنایت کیا اور اگر احتیاج اس میں کچھ کمی پڑے گی تو غالباً کچھ اور بھی امداد کریں۔

مقامی مسلم لیگ: ۲۵ اپریل ۱۹۰۹ء۔ آج ۴ بجے دن کو جلسہ مسلم لیگ کوٹھی امیر پرہ سید التفات رسول صاحب پر منعقد ہوا۔ سندیلہ، ہردوئی، شاہ آباد اور بلگرام کے معززین شریک تھے اور بہ کثرت آرا سید التفات رسول

---

[1] پہلے یہ کیننگ کالج قیصر باغ لکھنؤ کی ایک عمارت میں قائم تھا جہاں اب محکمہ آثار قدیمہ قائم کر دیا گیا ہے۔ ہاشمی۔

صاحب پریسیڈنٹ کمیٹی منتخب ہوئے۔ انھوں نے ایسی تقریر کی جو الجھی ہوئی تھی اور بہت آہستہ آہستہ کہ سامعین ان کے مطالب سے فیض یاب نہ ہو سکے۔ اشخاص ذیل نے رزولیوشن تجویز کیے: نواب عبدالکریم خاں صاحب تعلقہ دار شاہ آباد۔ سید امجد علی بلگرامی وکیل ہردوئی۔ محمد علی خاں طبیب ہردوئی۔ منشی حامد حسین صاحب بلگرامی ڈپٹی انسپکٹر مدارس پنشن یافتہ۔ حکیم خادم حسین صاحب شاہ آباد۔ منشی مقبول احمد صاحب سندیلہ۔ منشی نور الحسن صاحب کاکوروی وکیل ہردوئی۔ آخر الذکر کی تقریر نہایت شستہ تھی۔ دوران جلسہ میں آندھی کے ساتھ بارش ہوئی اور دیر تک مثل برسات پانی برستا رہا۔

<u>ایک چودھری</u>: ۱۱ر جولائی ۱۹۰۹ء۔ معتبر ذریعے سے دریافت ہوا کہ چودھری . . . . خلف . . . . صاحب مرحوم نے اپنے مکان بیرونی کے بر دے میں کتھا، ڈلی، ہلدی مرچ وغیرہ کی دوکان رکھی ہے۔ چونکہ خود نابینا ہیں اس وجہ سے بڑا بیٹا تول ناپ اشیا کرتا ہے اور خریداروں کے ہاتھ فروخت کرتا ہے . . . . چودھری . . . . مرحوم سندیلہ کے چکلہ دار تھے اور ان کی سخت حکومت زمینداروں پر تھی اور ایک بہت بڑا لشکر سوار و پیادوں کا ان کے ہمراہ رہا کرتا تھا۔ آج ایک وہ دن ہے کہ چودھری صاحب مرحوم کے بیٹے اپنے بر دے میں نمک مرچ فروخت کر رہے ہیں۔

<u>آبادی شیعہ</u>: ۸ر نومبر ۱۹۰۹ء۔ اڈیٹر روزگار آگرہ نے اضلاع متحدہ آگرہ اودھ کا دورہ کر کے کل شیعہ آبادی کی مردم شماری کی۔ اسکا قیاس ہے کہ کل شیعہ آبادی تین لاکھ بانوے ہزار ہے جس میں شہر لکھنؤ میں انتیس ہزار دس ہیں۔ اسکی تصدیق آج کے اودھ اخبار سے ہوئی۔

<u>ایک تقریب ختنہ</u>: ۱۹ر دسمبر ۱۹۰۹ء۔ آج اعزاز رسول و افضال رسول (پسر و بھتیجا سید التفات رسول تعلقہ دار) کا مانجا پہننے کا بلاوا تھا۔ ۱۱ بجے لڑکوں نے مانجا پہنا۔ انتظامی حالت مجلس کی ٹھیک نہیں تھی . . . ۳ بجے دن کو دونوں لڑکے مخدوم علاؤالدین صاحب کی درگاہ میں واسطے سلام کے گئے۔ انگریزی و ہندوستانی باجہ آگے آگے بجتا تھا۔ جھنڈیاں بھی تھیں۔ علی محمد خاں تعلقہ دار محمود آباد بھی لکھنؤ سے آکر شریک جلسہ ہوئے۔ ختنہ افضال رسول و اعزاز رسول کا بوقت ۳ بجے شام کو ہوا۔ مبلغ پانچ روپے میں نے نیوتہ دیا۔

۲۰ر دسمبر ۱۹۰۹ء . . . دریافت ہوا کہ ایک کشمیری (طائفہ) لکھنؤ کے علاوہ حسب ذیل طوائف زنانہ کا ناچ ہوا۔ مسماۃ زہرہ طوائف پٹنہ۔ جانکی بائی عرف چھپن چھری طوائف کلکتہ۔ مسماۃ مجھری طوائف لکھنؤ۔ منجملہ ان کے زہرہ طوائف کا گانا بہت تعریف کے ساتھ سنا گیا۔ سندیلہ کے بھی چند ڈیرے تھے . . . . واقعی یہ ہے کہ یہ تقریب بہت بڑے پیمانہ پر کی گئی۔ بہت زیادہ مہمانان شریک تقریب تھے جیسی قبل اسکے کوئی نہیں ہوئی تھی۔ طلبیدہ تعلقہ داروں کے اسما ذیل میں درج ہیں۔ "علی محمد خاں تعلقہ دار محمود آباد۔ راجہ شعبان علی خاں تعلقہ دار بارہ بنکی۔ شیخ شاہد حسین تعلقہ دار گدیا، ٹھاکر شنکر بخش سنگھ تعلقہ دار کچھوا، ضلع ہردوئی۔ محمد (؟) تعلقہ دار بلگرام"۔ علاوہ ان کے بہت سے وکلا و بیرسٹر تشریف لائے تھے لیکن انتظامی حالت اچھی نہیں تھی (بد انتظامی کی تفصیل حذف کی گئی۔ ہاشمی)

۲۱ر دسمبر ۱۹۰۹ء.... چونکہ منتظم نوجوان لوگ زہرہ طوائف پٹنہ کے گانے میں معروف رہے
لہٰذا کسی اہل محفل کی حقہ پان و پانی کی خبرداری نہیں کی گئی۔ سنا ہے کئی لوگوں کو کھانا نہ ملنے کی شکایت رہی۔
۲۲ر دسمبر ۱۹۰۹ء.... مسماۃ زہرہ طوائف پٹنہ جو بہت اچھا گاتی ہے اس کا یومیہ تین سو روپیہ
تھا وہ کل دو ہزار بائیس روپیہ انعام پاکر رخصت ہوئی۔

محمد نسیم صاحب وکیل: ۲۴ر دسمبر ۱۹۰۹ء۔ آج خط مولوی عبدالقادر پنشنر ڈپٹی کلکٹر و حال سکریٹری
میونسپل سیتاپور موصول ہوا۔ لکھتے ہیں کہ انتخاب پراونشل کونسل ہز آنر لفٹیننٹ گورنر میں حسب ذیل امیدواران انتخاب کے آئے:
محمد نسیم صاحب وکیل لکھنؤ ۱۳۸، مسٹر نبی اللہ بیرسٹر ۸۹، منشی احتشام علی کاکوروی ۸۱، راجہ نوشاد علی ۲۲، محمد یوسف
بیرسٹر ۱۲۔ چونکہ کثرت رائے ممبروں کی محمد نسیم کی نسبت آئی لہٰذا وہ ممبر کونسل منتخب ہوئے۔ میں نے انھیں کی نسبت رائے دی تھی۔

راجہ درگا پرشاد: ۷ جنوری ۱۹۱۰ء۔ آج صبح میں نے راجہ درگا پرشاد صاحب سے ملاقات کی
بہت اخلاق سے پیش آئے اور اپنے کچھ اشعار سنائے۔ جہاں تک میں غور کرتا ہوں راجہ صاحب موصوف
تمام تر خدائے پاک کی ذات پر بھروسا رکھتے ہیں اور اسی کی درگاہ میں اپنے حوائج رفع کرنے میں دست بدعا رہتے
ہیں اور اسی کی شان میں مناجات وغیرہ بالمرہ تصنیف کر کے پڑھا کرتے ہیں۔ میں نے اہل ہنود کو کم تر ایسا عقیدت مند پایا۔

چیرمینی میونسپلٹی: ۱۴ر جنوری ۱۹۱۰ء۔ آج دو بجے دن کو منشی علی ضامن صاحب تحصیلدار سندیلہ
بغرض مشورت بعض امور ضروری میرے مکان پر تشریف لائے اور فرمایا کہ بروئے اسکیم جدید گورنمنٹ کا منشا ہے کہ میونسپل کے پریسیڈنٹ و
وائس پریسیڈنٹ گورنمنٹ کے حکام نہ رہیں بلکہ غیر ملازم سرکار کام میونسپل انجام دیں۔ چنانچہ میری نسبت صاحب ڈپٹی
کمشنر بہادر کا آج حکم صادر ہوا ہے کہ میں وائس پریسیڈنٹی میونسپل سندیلہ سے استعفا دیدوں۔ لہٰذا میں کل سے استعفا
کمیٹی میں پیش کردوں گا اور صاحب ڈپٹی کمشنر بھی چیرمین نہیں رہیں گے اور انھوں نے مجھ پر اپنا منشا ظاہر کیا کہ راجہ درگا پرشاد
صاحب تعلقہ دار چیرمین تجویز ہوں اور سید التفات رسول وائس چیرمین۔ لہٰذا آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟
میں نے جواب میں کہا کہ اگر ایسا انتظام ہوا تو کام میونسپل ابتر حالت میں ہو جاوے گا۔ ایسے کام کے واسطے نہایت
محنتی و مستعد اشخاص ہونے کی ضرورت ہے۔ لیکن خیر، بالفعل یہی بہتر ہے کہ حکم کے مطابق عملدرآمد کیا جاوے۔
چنانچہ تحصیلدار صاحب اولاً التفات رسول کے پاس گئے اور ان سے تذکرہ کیا۔ انھوں نے صاف الفاظ میں فرمایا
کہ میں وائس پریسیڈنٹ ہونا ایسی حالت میں نہیں چاہتا ہوں جب کہ راجہ صاحب چیرمین ہوں گے۔ پھر تحصیلدار صاحب
مجھے اپنے ہمراہ راجہ درگا پرشاد صاحب کے یہاں لے گئے اور ان سے چیرمین ہونے کا ذکر کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ میرے

نام بھی ایک چٹھی صاحب ضلع کی آئی ہے جس میں بھی چیرمین ہونے کی بابت لکھا ہے جس کا جواب میں نے شکریہ کے ساتھ آج ہی بھیج دیا کہ مجھے چیرمین ہونا تحصیل کا منظور ہے اور تحصیلدار صاحب کے سوال پر انھوں نے کہا کہ اگر ڈپٹی کمشنر چیرمین رہیں گے تو میں وائس چیرمین بننا منظور کر لوں گا۔ اب یہ امر غور طلب ہے کہ اس نفسانفسی کا انجام کیا ہوگا جب کہ ابھی سے مخاصمت پیدا ہے۔ سچ یہ ہے کہ بدون اعانت کسی سرکاری افسر کے کام میونسپل کا ہرگز نہیں چل سکتا ہے جس کا نتیجہ بدنامی ہوگا۔

۲۱ر جنوری ۱۹۱۰ء۔ آج کمیٹی خاص سے عہدہ چیرمین میونسپل بورڈ سے استعفا مسٹر دے صاحب ڈپٹی کمشنر ہردوئی وچیرمین میونسپل سندیلہ کا منظور ہوا اور بجائے ان کے راجہ درگا پرشاد صاحب چیرمین میونسپل مقرر ہوئے۔ اس کے بعد راجہ صاحب میرے مکان پر تشریف لائے اور مجھے اپنے ساتھ بگھی پر لے جا کر چوکی اکھاڑا عیدگاہ کا معائنہ کیا اس کے بعد میں اور وہ ایک ساتھ تالاب دیبن گئے۔

<u>عطیات</u>: ۷ر فروری ۱۹۱۰ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ منشی التفات رسول تعلقہ دار جلالپور رئیس سندیلہ نے بہ تقریب خوشی ختنہ اپنے فرزند اعزاز رسول و بھتیجے افضال رسول میں جو ۱۹ر دسمبر ۱۹۰۹ء کو منعقد ہوئی تھی عطیات ذیل مدرسہ علی گڑھ وغیرہ کو دیے۔

علی گڑھ۔ پانچ سو روپیہ انجمن حمایت اسلام لاہور۔ یک صد روپیہ ندوہ لکھنؤ۔ یک صد روپیہ انجمن اسلامیہ سندیلہ۔ یک صد روپیہ مدرسہ اسلامیہ اٹاوہ۔ دو صد روپیہ = جملہ ایک ہزار روپیہ۔

<u>سوگ ایڈورڈ ہفتم</u>: ۱۱ر مئی ۱۹۱۰ء۔ آج ۸ بجے صبح کو مدرسہ اردو سندیلہ میں بصدارت راجہ درگا پرشاد صاحب جلسہ اظہار غم و الم وفات ملک معظم بادشاہ ایڈورڈ ہفتم قرار پایا۔ بعض لوگوں نے تاریخ ہائے وفات تصنیف کردہ پڑھیں لیکن جو مضمون اندوہگین قصیدہ راجہ درگا پرشاد نے پڑھا وہ نہایت اعلیٰ درجے کا تھا اور جو فقرے پنڈت گیا پرشاد نے سنسکرت کے پڑھے وہ مقبول ہوئے۔ ایک تار منٹو وائسرائے ہند دوسرا لفٹیننٹ گورنر اضلاع متحدہ آگرہ و اودھ کو بھیجا گیا۔ تیسرا اخبار پائنیر انگریزی کو بنا بر اطلاع۔ وقت نو بجے جلسہ برخاست ہوا۔ ۲۰ر مئی چونکہ آج ایڈورڈ ہفتم شہنشاہ ہندوستان دفن ہوں گے لہٰذا آج عام تعطیل ہو گئی۔ قصبہ ہٰذا کی بھی دوکانیں بند کرا دی گئیں۔ گانا بجانا رقص و رنگ وغیرہ موقوف کرا دیا گیا جو آجکل قصبہ ہٰذا میں بہت سے ہو رہے ہیں۔ ان میں صرف ضروری مراسم ادا ہوئے۔ باجن وغیرہ نہیں بجے۔

<u>عقد ثالث</u>: ۲۴ر جولائی ۱۹۱۰ء۔ بعد نماز مغرب عقد مساۃ وراثت فاطمہ عزیزی سید حافظ علی سے

بہ قرارداد مہر ۳۵ ہزار روپے بمقام کلیم پور ہوا۔ لڑکی محمد عسکری دسیم یعنی ریاض احمد ریاض شاعر خیرآباد کے بھائی کی ہے (اس کے شوہر اول نے طلاق دیدی تھی۔ باوجودیکہ عزیز موصوف بہت ضعیف اور گران گوش ہیں۔ بصارت میں بھی کمی ہے۔ بال بالکل سفید ہوگئے ہیں۔ عمر ۶۲ سال ہے لیکن ان کا اعتقاد عورت کی نسبت اتنا زبردست ہے کہ تیسرا عقد ان کا آسانی کے ساتھ ہوگیا۔

سلیمان قدر: ۵ر اگست ۱۹۱۰ء۔ یکم اگست کو صاحب عالم پرنس مرزا سلیمان قدر خلف العرق واجد علی شاہ اودھ نے انتقال کیا۔

۹ر اگست ۱۹۱۰ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ۲۷ر صفر ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے اور ۷ر فروری ۱۸۵۶ء کو سلطنت اودھ کا انتزاع عمل میں آیا۔ پرنس سلیمان قدر ۱۰ دسمبر ۱۸۳۹ء کو پیدا ہوئے تھے اور یکم اگست ۱۹۱۰ء کو فوت ہوئے۔ اس حساب سے ان کی عمر ۷۱ سال ۷ مہینے کی ہوئی۔

ایک کاریگر: ۳ر اکتوبر ۱۹۱۰ء۔ آج ۷ بجے شام کو میکو جولاہا نواسہ حافظ حسن اشرف ٹولہ میں بعارضہ بخار وغیرہ قضا کی۔ عمر ۵۰ سال تھی۔ متوفی اپنے پیشہ میں بہت ہوشیار تھا اور پلنگ پوش اور فرش بنانے اس کے دُور دُور جاتے تھے اور اس نے اپنے پلنگ پوشوں کی بدولت نمائش گاہوں سے اکثر انعامات پائے تھے بلکہ میں نے اس کے بنے ہوئے پلنگ پوش بہ کثرت عجائب خانہ لکھنؤ کو بھیجے تھے۔

کمیٹی چندہ: ۱۷ر اکتوبر ۱۹۱۰ء۔ آج کمیٹی چندہ یادگار بادشاہ ایڈورڈ ہفتم بصدارت منشی علی ضامن صاحب تحصیلدار مدرسہ اردو میں منعقد ہوئی کہ ان کی تصویر دہلی میں قائم ہوگی اور ایک شفاخانہ عارضہ دق کا الموڑہ پہاڑ پر قائم ہوگا۔ میں نے پندرہ روپیہ چندہ دینا منظور کیا۔

طاعون: ۱۰ر نومبر ۱۹۱۰ء۔ چونکہ بیماری طاعون ترقی پر ہے اس وجہ سے ہمارے بھائی بند اشراف ٹولہ سے باہر دیہات کو بہ خوف طاعون چلے جارہے ہیں۔ میں صرف اس وقت تک ثابت قدم ہوں۔ خدا میرے استقلال کو قائم رکھے اور اس کا انجام بخیر ہو (اس کے بعد کئی صفحات پر طاعونی ہلاکتوں کا ذکر ہے۔ ہاشمی)

۳ر دسمبر ۱۹۱۰ء۔ آج میں نے مدرسہ انگریزی سندیلہ ایک ہفتہ کے واسطے بند کر دیا کہ کل ۲ر دسمبر ۱۹۱۰ء کو ۱۳ آدمی طاعون سے ضائع ہوئے تھے۔ چونکہ سردی ترقی کرتی جاتی ہے اس وجہ سے طاعون کو بھی ترقی ہے۔ اب تو محلہ منڈئی میں بھی بیماری کی ترقی ہوتی جاتی ہے اور اس وجہ سے لوگ مقامات بیرون کو جارہے ہیں۔ صرف میں مع اپنے خاندان کے حق تعالیٰ شانہ پر بھروسا کیے پڑا ہوں۔

۱۴ر دسمبر ۱۹۱۰ء - آج کل کثرت اموات طاعون ہے اور گورکن نہیں ملتے ہیں لہذا اشخاص ذیل نے کام گورکنی کا اختیار کر رکھا ہے جن کو بمقابلہ ان کے اپنے پیشہ کے زیادہ فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔ دیانت جو پیشہ کہاری یعنی ڈولی ڈھونے کا کرتا تھا۔ جان علی و بدھو مکا ہے۔ مکا بہشتی۔ یہ چاروں آدمی اشرف ٹولہ میں رہتے ہیں۔

۱۵ر جنوری ۱۹۱۱ء - جدید لوگ برابر بیمار ہو رہے ہیں جب تک یہ سلسلہ قائم رہے گا۔ بیماری طاعون قصبہ ہذا سے دفع نہیں ہو سکتی۔ دیکھنا چاہیے کہ کب تک وہ قصبہ کو چھوڑتی ہے۔ مستقل مزاج والے اس کی طوالت سے بہ حالت پریشانی میں ہیں۔ سچ ہے کہ یہ مرض لادوا ہے۔ اگر مریض کی زندگی ہے تو وہ اچھا ہو جاتا ہے ورنہ کوئی بیمار ہو کر اچھا نہیں ہوتا۔ گزٹ مورخہ ۱۴ر جنوری سے واضح ہوا کہ ہفتہ مختتمہ ۷ر جنوری میں ضلع ہردوئی میں بیماری طاعون سے ۵۵ ۳ مبتلا ہوئے اور ۳۰۴ مرے اور اضلاع متحدہ کی سب سے بڑی تعداد ضلع اعظم گڑھ کی ہے جس میں ۶۴۹ مبتلا ہوئے اور ۵۰۴ فوت ہوئے۔ سندیلہ میں آج صرف دو آدمی ملکانہ واشرف ٹولہ میں طاعون سے فوت ہوئے۔ (اموات کا یہ سلسلہ بعد کی کئی تاریخوں میں مندرج ہے۔ ہاشمی)

۲۴ر فروری ۱۹۱۱ء - ہمارے موضع گھوگیرہ میں چوہے بہ کثرت مر رہے ہیں لہذا گاؤں والوں نے اپنے مکانات خالی کر کے اسکے باہر باغ میں جھگیاں لگا کر سکونت پذیر ہیں اور گاؤں کے اندر کوئی نہیں جاتا۔ اب کے سال اضلاع متحدہ آگرہ و اودھ میں بیماری طاعون کا اس قدر زور ہے کہ بظاہر کوئی گاؤں قریہ باقی نہیں بچا جس میں اس نے خروج نہ کیا ہو۔

جوالا پرشاد برق: ۲۱ر مارچ ۱۹۱۱ء - ۲۶ر مارچ ۱۹۱۱ء یوم یکشنبہ کو منشی جوالا پرشاد جج عدالت خفیفہ لکھنؤ جن کا تخلص برق تھا عارضہ طاعون میں مبتلا ہو کر فوت ہوئے۔ ایک ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ انھوں نے دو لڑکے یادگار چھوڑے۔ ایک امتحان بی اے پاس کر چکا اور دوسرا ابھی نیچے کے درجوں میں پڑھتا ہے۔

برائے یونیورسٹی علی گڑھ: ۲ر اپریل ۱۹۱۱ء - کل ایک جلسہ بنا بر قیام محمڈن یونیورسٹی علی گڑھ بمکان چودھری سرفراز علی ہوا۔ اگرچہ مجمع کم تھا تاہم سنا گیا کہ ایک ہزار ایک روپیہ کے چندہ کا وعدہ ہوا۔

خاتمہ طاعون: ۲۸ر مئی ۱۹۱۱ء - معائنہ گزٹ دی روزہ سے واضح ہوا کہ تعداد اموات اضلاع متحدہ کی بہت گھٹ رہی ہے۔ میں نے ضرورت نہیں سمجھی کہ اس کی تفصیل درج روزنامچہ ہذا کروں۔

جشن تاج پوشی: ۲۲ر جون ۱۹۱۱ء - آج جارج پنجم ملک معظم انگلستان و ہندوستان کا جشن تاج پوشی بمقام لندن ہوا اس وجہ سے ہندوستان کے ہر ایک شہر اور قصبہ میں جشن خوشی منایا گیا۔ چنانچہ ہمارے قصبہ سندیلہ

میں عیسائیوں نے بمقام شفاخانہ سرکاری نمازیں بوقت ۷ بجے صبح طول عمری ملک معظم کی پڑھیں اور منشی سید التفات رسول صاحب نے اپنی مسجد "امرہرہ" و راجہ درگا پرشاد صاحب نے اپنے شوالہ میں دعاے خیر بدرگاہ لم یزل واسطے درازی عمر ملک معظم کی بوقت ۹ بجے دن کے مانگی اور من جانب ممبران میونسپل بورڈ و رؤسائے قصبہ ہذا میونسپل ہال جدید میں امورات ذیل بہ آسانی تمام ذریعہ رقم چندہ طے ہوئے یعنی چار بجے سے پانچ بجے تک محتاجوں کو خیرات تقسیم ہوئی اور آتش بازی چھوٹی اور نوبت بجی اور ایک منادی کے ذریعہ سے جو میونسپلٹی کی طرف سے ہوئی کہا گیا کہ ہر شخص شام سے اپنے اپنے مکان پر بارہ بجے رات تک چراغ جلائے۔ اس کی بھی تعمیل کی گئی۔ آج جو اودھ اخبار آیا وہ بھی طلائی اور سرخ کاغذ پر تحریر تھا جس میں ملک معظم کی تاج پوشی لندن کے حالات درج تھے۔

مشاعرہ مسند میلہ: ۱۹؍جولائی ۱۹۱۱ء۔ آج صحبت مشاعرہ مقبرہ منشی سید فضل رسول صاحب پر بوقت گیارہ بجے دن منعقد ہوئی اور رات تک شعرا اپنا کلام پڑھتے رہے۔ لکھنؤ، سیتاپور، ہردوئی، شاہجہانپور وغیرہ سے شاعر لوگ آئے ہوئے ہیں اور اپنا کلام آبدار سنا رہے ہیں۔ چونکہ بعض شاعروں نے سید التفات رسول تعلقہ دار کو اپنے ڈھنگ پر لگا لیا ہے اس وجہ سے یہ مشاعرہ ایام عرس میں بڑی دھوم دھام سے ہوتا ہے اور بعض شاعروں کو خرچ آمد و شد بھی دیا جاتا ہے۔ ایک شاعر لکھنوی[1] مستقل طور پر ملازم تعلقہ جلال پور ہیں جو پندرہ روپیہ ماہوار علاوہ کھانے کے تنخواہ پاتے ہیں۔ وہ تعلقہ دار صاحب کی جانب سے غزلیں تصنیف کر دیا کرتے ہیں اور وہ غزلیں مشاعرہ میں پڑھی جاتی ہیں.... جہاں تک مجھے علم ہوا ہے جو شعرا بیرونجات سے آئے ہوئے ہیں وہ قصبہ ہذا میں مختلف مکانات میں ٹھہرا دیے گئے ہیں اور باورچی خانہ باغ امرہرہ میں ہے تو وہاں سے اوقات مقررہ پر کھانے کا پہنچانا خالی از دشواری نہیں اور عجب نہیں کہ ان کو موقع شکایات کا ملے۔

۲۲؍رجب کی رسم: ۱۹؍جولائی ۱۹۱۱ء۔ آج مجھے ایک نئی رسم دریافت ہوئی جو میرے اور دوسرے گھروں میں رائج ہوئی جو پہلے میری سماعت میں نہیں آئی تھی۔ وہ یہ ہے کہ ۲۱؍رجب کو بوقت شب میدہ شکر گھی اور دودھ ملا کر ٹکیاں پکائی جاتی ہیں اور اس پر حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کا فاتحہ ہوتا ہے اور ۲۲؍رجب کی صبح کو وہ عزیز و اقارب کو بلا کر کھلائی جاتی ہیں اس طرح سے ہر ایک گھر میں بلا کر کھلائی جاتی ہیں ٹکیاں باہر نکلنے نہیں پاتی ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہوا ہے اس کا عام رواج ہر ایک مقام پر ہے۔ میری یاد میں کبھی اس کا تذکرہ بھی سماعت میں نہیں آیا اور یہ فاتحہ ہر ایک گھر میں نہایت عقیدت کے ساتھ ہوا کرتا ہے اور یہ رسم برابر بڑھتی جاتی ہے۔

---

[1] آرزو لکھنوی (ہاشمی)

الیکشن میونسپلٹی: ۲۲ راگست ۱۹۱۱ء - آج کل قصبہ ہذا کے ہندو مسلمانوں میں سخت تعصب پھیلا ہوا ہے۔ مسلمان لوگ چاہتے ہیں کہ چودھری محمد جان بجائے منا لال مستعفی کے ممبر میونسپل بورڈ سندیلہ منتخب ہوں اور راجہ درگا پرشاد صاحب کی یہ خواہش ہے کہ شیو شنکر لال کھتری ممبر ہو جس کا شمار ہماری جماعت میں ہے۔ لہذا باہم بڑی کوشش ہو رہی ہے اور کیٹیاں ہو ہو کر رائے دہندوں کو فہمائش ہوتی ہے کہ وہ ہماری خواہش کے مطابق رائے دیں جس کے واسطے ۱۶ ستمبر مقرر ہے۔ میرے خیال میں ہندو مسلمان کے درمیان اب تعصب بڑھتا جاتا ہے جس کا انجام بخیر نظر نہیں آتا۔ چونکہ میرے راجہ درگا پرشاد صاحب دوست ہیں میں نے بوجوہ مصلحت وقت ان کو آج یہ شعر ملا نظامی کا لکھ بھیجا تاکہ ان کے دل میں میری طرف سے گنجائش رہے۔

ع سرے کز تو گردد بلندی گرائے بیفگند نیفتد زجائے

یہ شعر پڑھ کر راجہ صاحب بہت خوش ہوئے اور اس کے جواب میں ایک شعر اسی وقت تصنیف کر کے مجھے لکھ بھیجا اور آزردہ خط سے کہلا بھیجا کہ میرا جی آپ کی ملاقات کو بہت چاہتا ہے لیکن اس زمانہ پورش میں مناسب نہیں کہ میں آپ کے پاس آؤں۔

برقی پنکھا: ۲۳ راگست ۱۹۱۱ء - شب گزشتہ کو برقی پنکھا سید التفات حسین صاحب تعلقہ دار کا ۷ بجے شب سے آج ۶ بجے صبح تک میری کوٹھی میں متصل میرے پلنگ کے چلتا رہا۔ ہوا کافی ملتی ہے۔ شب میں اسی کی ہوا میں سویا اور نہایت غرق نیند آئی اور ڈیڑھ آنے کا تمام رات میں روغن مٹی کا جلا۔ یہ جدید برقی پنکھا بہت عمدہ ہے جس کی قیمت چھیانوے روپیہ ہے۔ میرا قصد تھا کہ میں بھی ایک پنکھا لکھنؤ سے منگاؤں لیکن چونکہ اب سردی پڑنے کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں لہذا امسال اس کا منگانا ملتوی رکھا۔ انشاء اللہ تعالیٰ سال آئندہ بشرط حیات منگاؤں گا۔

ایک واقعہ: ۲۵ راگست ۱۹۱۱ء - منڈئی اور مہتوانہ میں ابھی تک شکایت ہیضہ وبائی پیدا ہے۔ چنانچہ دو تین روز کا عرصہ ہوا کہ ضامن علی خلف میر محمد حسن منڈئی ہردوئی سے ہیضہ میں بیمار ہو کر سندیلہ آئے تھے۔ کل شب کو ان کو سرسام ہو گیا اور چارپائی سے اٹھ کر بھاگتے تھے۔ ایک مرتبہ جب وہ چارپائی سے اٹھ کر بھاگنے لگے تو ان کی مادر مہربان 'ہائے ہائے میرے لڑکے' کہہ کر ضامن علی کے پیچھے دوڑی اور بہ وفور محبت سے دوڑ کی حالت میں زمین پر گر پڑی اور دم نکل گیا۔ ایسا واقعہ بھی کمتر ظہور میں آیا ہوگا۔ آج صبح کو اس کی تجہیز و تکفین ہوئی اور ضامن علی کی حالت بھی اچھی نہیں ہے۔ شاید وہ جانبر نہ ہو سکے۔

الیکشن میونسپلٹی: ۱۶ ستمبر ۱۹۱۱ء - آج ۷ بجے صبح کو کارروائی انتخاب بجائے منا لال مستعفی ممبر میونسپل صدر چوکی میں شروع ہوئی۔ سید ضامن علی تحصیلدار اور بابو شیام لال مہتمم سب انسپکٹر سندیلہ موقع پر

موجود تھے اور تجویز قرار پائی تھی کہ چھ چھ آدمی اندر ہال کے جا کر پرچہ انتخاب کا لکھ کر گولک میں ڈالیں اور کل معززین قصبہ ہذا و رؤسائے عظام صدر چوکی کے گرد و پیش جمع تھے اور ۹½ بجے تک اسی نہج سے پرچے پڑتے رہے اور بہت سے مسلمان اور ہندوؤں نے چودھری محمد جان کے حق میں پرچے ڈالے اور شیو شنکر کے نام کم پرچے پڑے۔ جب راجہ درگا پرشاد صاحب نے یہ دیکھا کہ چودھری صاحب کامیاب ہوتے نظر آتے ہیں اور شیو شنکر کے نام کم پرچے پڑتے ہیں تو انھوں نے مہتمان کے پاس صدر ہال میں جا کر اطلاع دی کہ کارروائی بے ضابطہ ہو رہی ہے لہٰذا انتخاب ملتوی کیا جاوے۔ یہ کہہ کر باہر نکلے اور ریلوے اسٹیشن پر جا کر صاحب ڈپٹی کمشنر ہردوئی کو تار دیا کہ میں نے کارروائی انتخاب اس وجہ سے بند کر دی کہ بے ضابطگی ہو رہی تھی اور جب التفات رسول کو یہ معلوم ہوا وہ فوراً اسٹیشن ریلوے پر گئے اور علاوہ چودھری محمد جان اور جو لوگ نامزد ہوئے تھے ان کی طرف سے ایک ایک تار صاحب ڈپٹی کمشنر ہردوئی کو بھیجے اور ایک تار کمشنر صاحب لکھنؤ کو روانہ کیا اور ایک لفٹیننٹ گورنر کو بھی جس کا مفہوم یہ تھا کہ بلا وجہ راجہ درگا پرشاد چیرمین میونسپل نے کارروائی انتخاب روک دی۔ اس کا تدارک ہونا چاہیے اور جس قدر پرچے گولک میں پڑے وہ گولک سربمہر کرا کے اور مہتمان انتخاب چودھری عبد الباسط، منشی عبد الودود، لالتا پرشاد کے دستخط کرانے کے بعد محفوظ کر دیے گئے۔ عجب بات ہے کہ اکثر ہندوؤں نے چودھری محمد جان کے حق میں پرچے ڈالے اور راجہ صاحب کی کوئی فہمائش کارگر نہیں ہوئی اور مسلمان اور ہندو دونوں راجہ صاحب کو برے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ... اور کیفیت مزاجی یہ ہے کہ کسی معزز شخص قصبہ ہذا کو نگاہ وقعت سے نہیں دیکھتے ہیں بلکہ انھوں نے اہل درگاہ مخدوم صاحب کو کہلا بھیجا کہ اگر تم میری رائے کے مطابق شیو شنکر کھتری کے نام پرچہ نہ ڈالو گے تو میں مخدوم صاحب کے مزار پر چادریں چڑھانا بند کر دوں گا۔ یہ کیسے غضب کی بات ہے کہ مخدوم صاحب کی نسبت ایسا جملہ استعمال کیا جائے جو بدرجہ اتم ثقیل و نازجام ہو۔

۱۰/ ستمبر ۱۹۱۱ء کل محمد جان تعلقہ دار نے بذریعہ محمد عربی بیرسٹر ڈپٹی کمشنر ہردوئی کو درخواست پیش کی ہے کہ انتخاب ممبری میونسپل میں بہت بڑی بے ضابطگی ہوئی کہ راجہ درگا پرشاد صاحب چیرمین نے کارروائی پرچہ اندازی رائے دہندگان قبل از وقت ۶/ ستمبر ۱۹۱۱ء کو روک دی۔ اس کی تاریخ پیشی صاحب ڈپٹی کمشنر نے ۱۲/ ستمبر یوم شنبہ مقرر فرمائی ہے جس کی پیروی تاریخ مقررہ پر ہو گی۔ یہ مقدمہ بہ اجلاس چودھری مہاراج سنگھ رائے بہادر ڈپٹی کمشنر ہردوئی دائر ہوا ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

۱۳/ ستمبر ۱۹۱۱ء۔ جو درخواست من جانب چودھری محمد جان صاحب محمد عربی بیرسٹر نے باجلاس چودھری

مہاراج سنگھ صاحب ڈپٹی کمشنر ہردوئی پیش کی تھی اس کی کارروائی کل ہوئی۔ صاحب بہادر نے یہ حکم صادر فرمایا
کہ از سرِ نو جلد انتخاب ممبر کا کیا جاوے لیکن جو قواعد حال میں جاری ہوئے ہیں اس کے مطابق کارروائی ہونا چاہیے۔

حکیم عبدالعزیز لکھنوی: ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۱ء۔ ۱۲ اکتوبر یوم پنجشنبہ کو حکیم عبدالعزیز صاحب لکھنؤ کے
مشہور طبیب نے انتقال کیا۔ عمر ۶۵ سال تھی۔ ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ وہ حج کر کے واپس آئے تھے۔

ایک قوال: ۹ نومبر ۱۹۱۱ء شب گزشتہ کو اور آج عرس برادر عزیز سید اظہر علی مرحوم بہت اچھی طرح پر ہوا۔
قدرن قوال کو اس کے گانے پر نقدی و کپڑا بہت کچھ ملا۔ قدرت اللہ عرف قدرن قوال خیرآباد جو کاکوری میں بوجہ سسرال
خود رہا کرتا ہے اور جس نے جناب حافظ کرم احمد صاحب مرحوم کی مسہری مزار شریف بصرف مبلغ تین سو چودہ روپے دو سال ہوئے
تیار کرائی ہے اس کا گانا قوالی نہایت عمدہ قابل تعریف ہے اور محض تنہا گاتا ہے۔ چونکہ میں بوجہ علالت خود شریک فاتحہ سالانہ نہ ہو سکا لہذا
آج میں نے ۷ بجے رات کو قدرت اللہ کو اپنے مکان پر بلوا کر اس کا گانا سنا تھا۔ مولوی حیدر حسین صاحب و دیگر اعزا شریک جلسہ تھے۔
واقعی اس کا گانا نہایت عمدہ اور صاف اور بخوبی ہر ایک جملہ اس کا سمجھ میں آتا ہے اور ہندی کی چیزیں بھی بہت عمدہ گاتا ہے اس کے گانے
سے حاضرین جلسہ سب خوش ہوئے اور میں نے مبلغ دو روپیہ اس کو انعام دیے۔

ویدک اور طب: ۱۳ نومبر ۱۹۱۱ء حکیم عبدالولی لکھنوی اور حکیم محمد اجمل دہلوی یہ چاہتے ہیں کہ ویدک اور طب یونانی
کی شرکت ہو اور حافظ عبدالرشید خلف حکیم عبدالعزیز صاحب لکھنوی کا یہ منشا ہے کہ دونوں کی شرکت نہ ہو۔ اسی وجہ سے جلسے بارہ دری قیصر باغ
لکھنؤ میں ہو رہے ہیں شرکت کے متعلق بہت تکرار ہے۔ اب دیکھنا چاہیے اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔

جشن تاج پوشی: ۱۱ نومبر ۱۹۱۱ء۔ ۱۱ نومبر ۱۹۱۱ء کو اعلیٰ حضرت جارج پنجم مع ملکہ معظمہ جہاز مدینہ پر لندن سے روانہ
ہندوستان ہوئے تاکہ ۱۲ دسمبر کو بمقام دہلی رسم تاج پوشی ادا کریں جس کا سامان سال گزشتہ سے برابر دہلی میں ہو رہا ہے اور ۲۵ میل کے
رقبہ میں ہر قسم کے کاروبار ہو رہے ہیں۔ امید ہے کہ اکثروں کو خطابات عطا ہوں گے جو قابلیت اس کی رکھتے ہیں۔

۳ دسمبر ۱۹۱۱ء .... ہمارے قصبہ سے سید التفات رسول صاحب تعلقہ دار بطور سیر تفریح آج چھ بجے شام کی ریل میں مع اپنے ہمراہیوں
کے روانہ دہلی ہوئے۔ سنا ہے کہ شہر میں کوئی مکان کرایہ پر لیا ہے اور ۵۹۰ روپے پر ایک گاڑی فٹن کرایہ پر لی ہے
جو تا قیام دہلی ہر وقت ان کے دروازہ پر حاضر رہے گی۔

۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء آج سندیلہ و دیگر مقامات قصبہ و دیہات میں رسم تاج پوشی ملک معظم روشنی ہوئی اور طلبا کے مدرسہ کو انعام و تحفہ جات
و کتب وغیرہ تقسیم ہوئیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں بوجہ علالت نہ صدر ہردوئی میں تقریب مراسم تاج پوشی میں شریک ہو سکا اور نہ میونسپل ہال
جدید سندیلہ کی کسی رسم مسرت و خوشی میں جا سکا اور طبیعت میری آج بوجہ کھانسی کے ایسی بے لطف ہے کہ ایک حالت سے نہ تو بیٹھا

جاتا ہے اور نہ لیٹا جاتا ہے۔ لہٰذا بحالت مجبوری اپنا دل بہلانے کیلئے گراموفون باجا سنا کرتا ہوں یا دو دہ اخبار پڑھ کر اس سے دلچسپی حاصل کرتا ہوں۔

۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کل ۱۲ دسمبر کو دربار بصدارت صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر ہر دوئی میں منعقد ہوا۔ اکثر رؤسا قصبہ سندیلہ حسب الطلب شریک ہوئے۔ اسمیں ذیل کو خطابات و سارٹیفکٹ بجلدوے ان کی کارروائیوں کے عطا ہوئے۔

منشی قبول احمد اشراف مولہ کو بہ سفارش فری مینٹل صاحب رجسٹرار کہ انھوں نے دیہی بینک سندیلہ کو بہت ترقی دی' خاں صاحب کا خطاب عطا ہوا لیکن یہ خطاب ان کو پسند نہ آیا کہ وہ خان بہادر کا خطاب چاہتے تھے اور یہ ان کی ناپسندیدگی حق بجانب ہے کہ اس زمانہ میں گل پٹھان اور ان کے چیلے چاپڑ اور عوام پٹھان بھی خاں صاحب کے لقب سے پکارے جاتے ہیں۔ حتی کہ قوال لوگ بھی (گو کسی اکثر ملقب بخاں صاحب ہیں) ایک سارٹیفکٹ سید التفات رسول صاحب تعلقہ دار کو اور ایک رائی صاحب بھاون کو ملا کہ انھوں نے ایک شاخ ارین بینک سندیلہ و جاتو میں قائم کی اور ایک سارٹیفکٹ بجے شنکر وکیل وچیرمین میونسپل ہردوئی کو عطا ہوا۔

۱۷ دسمبر ۱۹۱۱ء۔ آج صبح کو برخوردار مولوی خلیل الدین سے ملاقات ہوئی جو شب گذشتہ کو دربار دہلی سے واپس آئے ہیں۔ جہاں تک دریافت سے معلوم ہوا کہ ان سے بڑھ کر کسی تعلقہ دار و رئیس نے بھی سیر و تفریح نہ کی ہوگی۔ ان کا بیان ہے کہ میں ایک فتوہی فلالین پہنتا تھا اس کے اوپر ایک موٹا کرتا فلالین کا اس کے اوپر ایک کمل کی اچکن اور سر پر ایک دوپٹا اور کمر میں ایک رضائی دبا کر چھ بجے صبح سے آٹھ بجے رات تک دربار وغیرہ کی اور ہر مقام دلچسپ کی سیاحت کرتا تھا۔ میری آٹھ دس گھنٹے یومیہ پیادہ پائی سے کم نہ ہوتی تھی۔ جس وقت احتیاج پاخانہ کی ہوتی تھی تو کسی بم پولس میں جاکر ایک پیسہ دیتا اور فراغت کر لیتا اور جب خواہش غذا کی ہوتی تو ہر مقام پر باورچیوں کی دوکانیں قائم تھیں۔ وہاں ہر مقام پر قورمہ' قلیہ' پلاؤ و زردہ فروخت ہوا کرتا تھا اور جس چیز کی مجھے رغبت ہوتی تو فوراً کھا لیتا تھا۔ اگرچہ ظاہری طور پر میرا قیام سید التفات رسول کے مکان پر تھا لیکن کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ میں نے ان کے یہاں کھانا کھایا ہو اور جب آٹھ بجے رات کو بعد سیر و تفریح واپس آتا تھا تو چارپائی پر اوڑھ کر سو رہتا تھا اور صبح کو اسی نہج سے پھر سیر و تفریح کرتا جیسا کہ اوپر ذکر کر چکا ہوں اور خوب میں نے دربار کی کیفیت دیکھی جیسا کہ ایک بڑا آدمی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اگر رات کو ایسا اتفاق ہوا کہ درگاہ حضرت نظام الدین اولیا میں پہنچ گیا تو وہیں سو رہا۔ غرض کہ میں جہاں تک غور کرتا ہوں تو متوسط الحال امرا نے بھی باوجود مصارف کثیر کے ایسا لطف مراسم تاج پوشی حاصل نہ کیا ہوگا جیسا میں نے اپنی پیادہ پائی کی روش سے حاصل کیا۔ یہ حالات ان سے دریافت کر کے بہت جی خوش ہوا۔

باب پنجم

ذاتی حالات و واقعات

<u>ٹوپی کی قطع</u> : ۱۹ر نومبر ۱۸۶۷ء۔ آج میں نے ٹوپی گول مخملی اودی خدا بخش خیاط سے تیار کرائی جو نہایت خوشنما اور قابل محفل ہے۔

<u>الطاف برادرانہ</u> : ۲۳ر ستمبر ۱۸۶۸ء۔ بزبانی اکبر علی معلوم ہوا کہ کرامت حسین آج کل مجھ سے ناخوش ہیں۔ بظاہر کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی، شاید الطاف برادرانہ ہو۔

<u>احساس کم لیاقتی</u> : ۷ر نومبر ۱۸۶۸ء۔ مجھے آج کمال افسوس رہا کہ باوصف اس قدر سن آنے کے میں نے اب تک کوئی لیاقت حاصل نہیں کی لہذا کمال عاجزی سے درگاہ خدا میں دعا کرتا ہوں کہ مجھے لیاقت عطا فرمائے تاکہ میں اپنے ہم چشموں سے شرمسار نہ ہوں۔

<u>طمانچہ</u> : ۷ر فروری ۱۸۶۹ء۔ غلام علی کاشتکار موضع مخدوم پور نے بلاوجہ مجھ سے گستاخی کی لہذا ایک طمانچہ اس کے مارا لیکن تھوڑی دیر کے بعد اپنے اس فعل سے نادم ہوا کہ خلاف تہذیب میں نے ایسا کیا۔

<u>صفات حمیدہ</u> : ۲۵ر دسمبر ۱۸۶۹ء۔ آج میں حسب تحریک منشی فضل رسول صاحب بوقت شام لکھنؤ پہنچا۔ وقت ملاقات کے منشی صاحب نے فرمایا کہ میں تم کو بمقابلہ عنایت حسین کرامت حسین و فضل حسین و حامد حسین کے چند وجہوں سے اچھا جانتا ہوں۔ اوّل تم جھوٹ نہیں بولتے ہو۔ دوسرے مزاج میں جہالت نہیں، تیسرے مغلوب الغیض نہیں ہو، چوتھے معاملہ فہم ہو، اس وجہ سے میں چاہتا ہوں کہ اپنے علاقہ کا جو کورٹ ہونے والا ہے تم کو سربراہ کار مقرر کراؤں اور اس میری خواہش کو ضرور حکام منظور کریں گے۔

<u>محکمہ ریل میں ملازمت</u> : ۶ر مئی ۱۸۷۰ء۔ آج کل محکمہ ریل میں کام کی کثرت ہے اس وجہ سے آٹھ بجے رات کو مجھے مہلت ملتی ہے۔ ۱۰ بجے سے رات تک کام کرتے کرتے طبیعت مضمحل ہو جاتی ہے۔

<u>تقریب میں اسراف</u> : یکم جولائی ۱۸۷۰ء۔ تقریب ختنہ میں میں نے عمدہ ہندوستانی کھانا پکوا کر دونوں وقت مارٹن صاحب کو بھیجا جس کو تناول فرما کر بہت خوش ہوئے، مجھ سے کہا کہ اس تقریب میں کتنا

روپیہ صرف ہوا، میں نے ایک ہزار روپیہ اندروئے حساب بتلایا۔ بہت تاسف کیا کہ تم نے ایک سال کی تنخواہ ایک چھوٹی سی تقریب میں خرچ کر ڈالی یہ طریقہ ناپسندیدہ ہے۔

نجوم: ۱۰ر ستمبر ۱۸۷۰ء آج میں نے پنڈت گوردیال کو پانچ روپے دیے کہ جو قمر نحس زائچے میں بیٹھا ہے اس کی نحوست کے انسداد کے لیے کچھ جپ کریں۔

ہردل عزیزی: ۱۱ر دسمبر ۱۸۷۰ء آدمی ہر دل عزیز اسی حالت میں ہو سکتا ہے جب خود غرضی اس کی ظاہر نہ ہو اور ہر ایک کے ساتھ بخلق پیش آئے اور ان کے لغراض کے پورا ہونے میں ساعی رہے۔

فال: ۱۱ر جون ۱۸۷۲ء۔ خبر برخاستگی دفتر ریل دریافت کر کے مجھے کمال تشویش لاحق ہوئی۔ نہیں معلوم کہ اب آب ودانہ کہاں لے جائے گا اور اس حالت پریشانی میں خواجہ معین الدین چشتی قدس اللہ سرہ کے دیوان میں فال دیکھی۔ اشعار ذیل برآمد ہوئے۔ جس سے ہر گونہ آئندہ امید کامیابی کی پائی جاتی ہے۔

گرچہ از جلوۂ بروں است ولیکن بخدا　　کہ شب و روز درونِ دل ما جا دارد

عاقبت چہرۂ دلدار عیاں خواہد بود　　ہر کہ آئینہ زنگار مصفا دارد

حسن آں ماہ چو خورشید ہویداست معین　　محرم آں است کہ او دیدۂ بینا دارد

ہردوئی تک ریل: ۱۵ر جولائی ۱۸۷۲ء۔ آج سندیلہ سے ہردوئی تک ریل جاری ہوئی۔ پانچ آنہ تین پائی محصول مقرر ہوا۔ اس ریل پر برخوردار مصطفی علی میرے پاس چونسہ آئے۔

ٹکیٹ رائے کی مسجد: ۲۶ر جولائی ۱۸۷۲ء آج بمعیت احباب منڈولی مسجد ٹکیٹ رائے واقع کاکوری سے سیر کناں گیا۔ یہ مقام پر فضا ہے۔

رشوت: ۲۳ر جون ۱۸۷۳ء۔ آج جان صاحب ٹھیکے دار اینٹ نے شہر کانپور میں دو ہزار روپے دیے۔ بعد لینے روپے کے صاحب موصوف نے کمرے کے کواڑ بند کر لیے۔ جہاں سوائے میرے اور ان کے دوسرا شخص نہ تھا۔ مبلغ دس روپے بطور نذر کے پیش کیے اور اس کے قبول کرنے میں از حد اصرار کیا۔ میں نے کہا یہ امر میری عادت کے خلاف ہے اور میں ایسے نذرانے کسی حالت میں جائز نہیں رکھتا۔ لیکن اس نے نہ مانا جبر یہ زر مذکور دیکر بہت شائستگی کے ساتھ رخصت کیا۔ میں صرف اس خیال سے کہ بحالت سخت انکار ناراض ہو کر کوئی شکایت حاکم سے کر دے تو اسکا کوئی ثبوت میرے پاس نہیں ہے۔ چار و ناچار قبول کر کے ایک ربع اسکا محتاجوں کو تقسیم کر دیا۔

حکم حاکم: ۱۳ر اگست ۱۸۷۳ء۔ بول صاحب نے ایک یہ حکم جاری کیا ہے کہ ملازمان سرکاری پنکھا رکھنے

اپنے پھاٹک کے ہر دو جانب پانچ پانچ جریب گھاس چھیلا کریں۔ چونکہ ان نوکروں میں اکثر شریف لوگ بھی ملازم ہیں بعضوں نے نوکری چھوڑ دی اور جو لوگ کام کر رہے ہیں اگر وہ پورا کام ختم نہیں کرتے تو ان کو تنخواہ نہیں دیتے ہیں۔

حکم برخاستگی: یکم ستمبر ۱۸۷۳ء۔ آج منڈولی آیا۔ مرجن چپراسی دفتر ریل سے معلوم ہوا کہ بوک صاحب نے چپراسیان محافظ خزانہ متعلقہ راقم کو حکم برخاستگی کا دیا ہے۔ بدریافت اس حال کے ایک طرح کا ملال ہوا کہ یہ بچارے کہاں تلاش معاش میں سرگرداں پھریں گے۔

علی حسین خان: ۹ ستمبر ۱۸۷۳ء۔ آج ریل پر سیف الدولہ علی حسین خاں صاحب بہادر نائب مدار المہام ریاست بھوپال رئیس ساڈی سے ملاقات ہوئی۔ یہ بہ حصول رخصت وطن کو جاتے ہیں آدمی خلیق ہیں روزہ نماز کے پابند معلوم ہوتے ہیں۔ پانچ سو روپے کی تنخواہ ہے۔

سرنارتھ بروک: ۲ دسمبر ۱۸۷۳ء۔ دریافت ہوا کہ سرنارتھ بروک صاحب نواب گورنر جنرل بہادر کشور ہند لکھنؤ میں تشریف لانے والے ہیں اس وجہ سے ہر مقام پر صفائی ہو رہی ہے۔ جلسہ قابل دید ہوگا۔

۷ دسمبر ۱۸۷۳ء۔ پانچویں دسمبر کو نارتھ بروک صاحب گورنر جنرل ہندوستان نے لکھنؤ میں بڑے کرّوفر کے ساتھ دربار کیا۔

۸ دسمبر ۱۸۷۳ء۔ جو خاص گاڑی گورنر جنرل صاحب کو کانپور پہنچا کر لوٹی آتی تھی جب قریب شام کے اسٹیشن ہردوئی کو پہنچی تو اس کے ۲۰ منٹ قبل سواری گاڑی ہردوئی سے لکھنؤ کو روانہ ہوئی تھی۔ چونکہ خاص گاڑی میں حکام ریل سوار تھے اسٹیشن ماسٹر ہردوئی نے پاس روانگی خاص گاڑی کا دے دیا۔ جب خاص گاڑی متصل اسٹیشن لکھنؤ پہنچی تو سواری گاڑی سے لڑ گئی جس سے پانچ چھ گاڑیاں سواری کی ٹوٹ گئیں اور بہت سے مسافر مجروح ہوئے۔ ایک فوت ہوا۔ یہ واقعہ ساڑھے سات بجے شام کو ہوا۔ تحقیقات غفلت پیش ہے۔ دیکھیے کون کون سزایاب ہوتا ہے۔

زنجیر طلائی: ۱۴ دسمبر ۱۸۷۳ء۔ آج ایک زنجیر طلائی اپنی گھڑی کی سیکھا رام سونار (رساڈی) سے تیار کرائی جس میں ۴۹ روپے ۱۲ آنے حسب ذیل خرچ ہوئے۔

طلا: ۳ تولہ ۴ رتی۔ فی تولہ ۱۷ روپے آٹھ آنے۔ اجرت ۲ روپے۔ اور زنجیر مذکور کو بتاریخ امروزہ زیب گلو کیا۔ یہ زنجیر نہایت خوشنما بنی ہوئی ہے۔ انگریز بھی اس کو پسند کرتے ہیں اور جب سندیلہ کی ساخت سنتے ہیں تب ان کو نہایت تعجب ہوتا ہے۔

شب دیگ : ۲۸ر دسمبر ۱۸۷۳ء - آج منشی فہیم الزماں صاحب نے سرفراز علی رکابدار لکھنؤ سے شب دیگ تیار کرا کے بعض مشاہیر اشراف محلہ و مہتوانہ کو طلب کر کے دعوت کی۔ واقعی شب دیگ نہایت نفیس تیار ہوئی تھی اور یہ امر منشی صاحب کی عالی حوصلگی پر دال ہے کہ بلا کسی خاص وجہ کے ایسا صرف گوارا کر کے ہم لوگوں کو طعام لذیذ سے متلذذ فرماتے ہیں۔

ساییل : ۵ر جنوری ۱۸۷۴ء - کل بنارس سے شاہ گنج تک ریل جاری ہوئی۔ میں والی صاحب کے ساتھ ٹالی (ٹرالی) میں سندیلہ سے کاکوری کو آیا۔

الف لیلہ : ۱۸ر جون ۱۸۷۴ء - چونکہ قیام دفتر منڈولی میں محض بے شغلی رہتی ہے اور یہاں جنگل میں کوئی ایسا آدمی نہیں کہ جس سے گھڑی دو گھڑی دل بہلے لہٰذا بالفعل واسطے رفع پریشانی کتاب الف لیلا انگریزی اور اردو کی مطالعہ کیا کرتا ہوں۔

حدائق الانظار : ۲۴ر اگست ۱۸۷۴ء - آج کل میرے مطالعہ میں کتاب 'حدائق الانظار' مؤلفہ خواجہ بدر الدین دہلوی رہتی ہے۔ اس سے دلچسپی ہے۔

بدر الآثار : ۹ر نومبر ۱۸۷۴ء - مکان قیصر باغ (لکھنؤ) میں مطالعہ کتاب 'بدر الآثار' کا اتفاق رہتا ہے۔ قصہ دلچسپ ہے اس سے طبیعت بہلی رہتی ہے۔

بنیاد مکان ذاتی : ۱۹ر نومبر ۱۸۷۴ء - آج منشی فضل رسول صاحب و قاضی وجیہ الدین صاحب نے بموجودگی جملہ احباب برادری یکے بادیگرے بنیاد میرے مکان کی رکھی۔ پنڈت بشمبھر ناتھ تحصیلدار سندیلہ اس وقت شریک تھے۔ مجمع کثیر ہونے سے ۱۲ روپے آٹھ آنے کی مٹھائی تقسیم ہوئی۔ خداوند کریم اس کا تکملہ بخیر و خوبی کرائے۔ آج گیارہ معمار و ۲۲ مزدور کام کرتے ہیں۔ زائچہ مکان جس ساعت پر بنیاد قائم ہوئی تھی حسب ذیل ہے (زائچہ نقل نہیں کیا جا رہا ہے۔ ہاشمی)

۲۰ر نومبر ۱۸۷۴ء ہر ایک معمار سے ایک گز مکسر کام لیا جاتا ہے (کام لکھوری اینٹ سے لیا جاتا تھا۔ ہاشمی) اور میں خود نگراں تعمیر کا ہوں۔ لالہ مہانند کو واسطے تحریر حساب مد مکان بہ مشاہرہ دو روپیہ و مرزا حسین بیگ کو بکار نگرانی مکان تین روپیہ ماہواری کا نوکر رکھا۔

۲۴ر نومبر ۱۸۷۴ء - آج کل اکیس معمار و تینتیس نفر مزدور زیر مکان میں کام کرتے ہیں بشرح حسب ذیل ہے۔
رام دین معمار سوا تین آنے یومیہ۔ رام پرشاد مستری تین آنے۔ ہدایت معمار تین آنے۔ درگا معمار،

،باقی اور معمار ایک اور دو آنے یومیہ پاتے ہیں۔ اور جوان مزدور کو ڈیڑھ آنہ یومیہ سے زاید نہیں
ہے اور لڑکے کو تین پیسے ساڑھے بارہ دام یومیہ ملتے ہیں۔
۲۷ر نومبر ـــ اینٹ کا نرخ بالفعل ستائیس روپے لاکھ کا ہے (لکھوری اینٹ۔ ہاشمی کا دراسی
سے کمی لاکھ میں نے خرید کیں اور جو اینٹ موٹی ولانبی ہے اس کا نرخ بتیس روپے لاکھ کا ہے۔ کڑیاں
امن پیچ گزی ایک روپے کی دو خرید کیں اور انبہ کی کڑیاں تیر گزی ایک روپے کی ڈھائی ملتی ہیں۔
فسانہ معقول: ۱۶ر جنوری ۱۸۷۵ء۔ آج اتفاق قیام مکان قیصر باغ (لکھنؤ) کا ہوا۔ کتاب
معقول" من تصنیف غلام حیدر خاں صاحب میرے مطالعہ میں ہے۔ واقعی یہ کتاب خوب دلچسپ صاحب نے لکھی ہے۔
فال: ۸ر مارچ ۱۸۷۵ء۔ آج بہ حالت کمال پریشانی میں نے دیوان حافظ میں فال دیکھا اشعار
مد ہوئے جن سے امید کامیابی متصور ہے۔

کلکِ تبارک اللہ بر ملک دل کشادہ   صد چشمہ آب حیواں از قطرۂ سیاہے
غافل مکن شکایت گر وصل دوست خواہی   زیں بیشتر نیاید بر ہجرت احتمالے

۰ر اپریل ۱۸۷۵ء۔ کل ایک برہمنی موضع رسول پور میں اپنے خاوند کی لاش کے ساتھ ستی ہو گئی۔ بدریافت
ہ کے اہل کار فوجداری و تحصیل از سندیلہ موقع پر پہنچے اور بعد تحقیقات ۳۰ آدمیوں کو گرفتار کر کے لائے
اجازت حقہ نوشی: ۸ر اپریل ۱۸۷۵ء۔ آج شب کو منشی فضل رسول صاحب نے مجھے و سید
ین و ابوالقاسم و سید فضل حسین کو اپنے سامنے اجازت حقہ پینے کی دی پہلے مجھے پلایا بعدہٗ دوسروں کو۔
بدر الآثار: ۱۱ر مئی ۱۸۷۵ء۔ آج صبح کی ریل میں لکھنؤ گیا۔ کتاب "بدر الآثار" میرے مطالعہ
ں ہے۔ واقعی یہ کتاب بہت دل بہلاتی ہے۔
مکان ذاتی: ۱۰ر جولائی ۱۸۷۵ء۔ چونکہ میرا مکان زنانہ بہ ہمہ وجوہ مرتب ہو گیا ہے لہذا اکثر
ان و روٴسائے سندیلہ واسطے معائنہ کے آتے ہیں۔ اور دیکھ کر کمال اظہار مسرت کا کرتے ہیں کہ ایسا
لع مکان اب تک سندیلہ میں تعمیر نہیں ہوا ہے۔ اس مکان میں چند باتیں نئی ہیں۔ اوّل چھت بلند دوسرے
انہ بنایا گیا تیسرے باورچی خانہ کو الگ دار ہے۔
چند مشاہدات: ۱۴ر جولائی ۱۸۷۵ء۔ یہ مجھے بخوبی تجربہ ہے کہ قبل از وقت معینہ کوئی کام
تا اور تمامی کوششیں فضول ہوتی ہیں پس انسان کو لازم ہے کہ اس وقت کے انتظار کے لیے صبر کرے

در وقت مقررہ کے لیے انتظار ۔

آج کل مداخل سے مخارج زیادہ ہیں اور یہ علامت خوش نہیں ہے۔ انسان جب تک بقید حیات رہے کچھ نہ تدبیرات از دیاد بہبودی و فلاحیت کی سوچتا رہے ۔

شمس الانوار: ۲۸ جولائی ۱۸۷۵ء آج کل شیخ سلامت علی صاحب و شیخ فیضو وغیرہ میرے مکان پر دونوں وقت آتے ہیں کتاب شمس الانوار پڑھی جاتی ہے اس کو بکمال اشتیاق سنتے ہیں۔ واقعی یہ کتاب بلحاظ نرخ کم ہے۔

تعمیر کوٹھی ذاتی: ۱۸ اگست ۱۸۷۵ء منشی مظفر علی صاحب اسیر لکھنوی و آفتاب الدولہ رئیس لکھنوی نے محل سرا نو تعمیر کا ملاحظہ کیا اور ہر ایک چیز کو بغور دیکھا اور پسند فرمایا یہ دونوں صاحب منشی فضل حق صاحب کے ان دنوں مہمان ہیں ۔

ایک مذاق: ۲۲ ستمبر ۱۸۷۵ء ۔ آج سید فضل حسین نے میرے مکان پر مہل لیا۔ چونکہ یہ مکان ہوادار ہے اس وجہ سے تفریح زیادہ ہوئی۔ اتفاقاً براہ ہنسی سید فضل حسین و قاضی واجد علی نے سید عبد الرحمٰن کی داڑھی میں ایک جانب وسمہ لگا دیا اور دوسری جانب داڑھی کو اسی حالت پر رکھا جس کی وجہ سید صاحب مجھ سے زیادہ ناخوش ہوئے اور کہا کہ اس مکان میں آنے سے میری بہ گت ہوئی۔ اب کبھی اس مکان میں نہ آؤں گا ۔

اہل خانہ کا ورود: ۲۵ نومبر ۱۸۷۵ء ۔ آج والدہ مصطفیٰ علی حویلی نو تعمیر میں آئیں۔ لیکن قبل آنے کے اولاً مسجد قدیم بھی گئیں اور درگاہ بندگی شیخ حسن میاں صاحب میں واسطے حصول برکت کے دعا مانگی۔ اس کے بعد مکان میں آئیں۔ زائچہ آنے مکان کا درج ہے سر زائچہ نہیں دیا جا رہا ہے۔ ہاشمی)

ایک رسوائی: ۲۰ فروری ۱۸۷۶ء ۔ میر معصوم علی تھانہ دار سندیلہ نے حسب الحکم رائے شیو سہائے صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ضلع ہردوئی کے مسماۃ علیما زوجہ محمد اجمل دربارۂ تکلیف دہی شوہر و خسر کے دریافت کیا۔ مسماۃ مجیب ہوئی کہ میں اصالتاً ڈپٹی صاحب کے اجلاس میں مقدمہ متدائرہ کی پیروی و جواب دہی کروں گی۔ اس حال سے تمام شرفائے سندیلہ کو تاسف ہوا کہ عورت پردہ نشین کو ایسی جرأت ہے کہ جس سے بدنامی و ناموسی متصور ہے۔ خدا غارت کرے ۔

۲۷ فروری ۱۸۷۶ء ۔ آج کل ہر گلی و کوچہ میں تذکرہ مقدمہ مسماۃ علیما النساء و محمد اجمل کا ہوتا ہے اور کمال درجہ فضیحتی ہو رہی ہے یہ مقام کمال عبرت کا ہے کہ جس شخص کا باپ عہدہ صدر اعلیٰ پر بہ مشاہرہ ۶۰۰ روپیہ ماہواری ممتاز ہو اس کی لڑکی بمقابلہ اپنے شوہر کے عدالت میں روبکاری کرتی پھرے ۔

۶؍مارچ ۱۸۷۶ء - آج مسماۃ علیمؑ النسا کا مقدمہ ہردوئی میں پیش ہوا۔ بیانات قاضی وجیہ الدین صاحب، قاضی عابد علی و مولوی کریم الزماں تحریر ہوئے۔ حکم تاریخ آئندہ سنایا جائے گا۔

۹؍مارچ ۱۸۷۶ء۔ مسماۃ علیم النسا کے مقدمہ میں اجلاس رائے شیو سہائے صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ ضلع ہردوئی سے حکم مچلکہ لینے پانچ سو روپے کا بہ میعاد ایک سال محمد اجمل شوہر مدعیہ سے نافذ ہوا۔ اگر مابین سال کے محمد اجمل پھر اپنی زوجہ کو تکلیف دیں گے تو پانچ سو روپیہ تاوان کا ان کو دینا پڑے گا۔

رہس: ۲۴؍اپریل ۱۸۷۶ء - آج شب کو رہس جواہر طوائف کا چندہ سے ہوا۔ جس میں اشخاص ذیل شریک تھے اور یہ جلسہ تقی میاں صاحب کے مکان پر قرار پایا۔ چودھری اعظم علی، محمد تقی صاحب، سید فضل حسین، شیخ حامد حسن، سید ابوالقاسم، حافظ سراج الدین، منشی رضی الدین اسیونی، حسن علی خاں کاکوری۔

حاجی وارث علی: ۲۲؍ستمبر ۱۸۷۶ء - آج والدہ مصطفیٰ علی (اہل خانہ مولوی مظہر علی راقم روزنامچہ ہاشمی) نے بیعت حاجی وارث علی شاہ صاحب حاصل کی۔

ریل گاڑی لڑی: ۳۰؍ستمبر ۱۸۷۶ء - آج شب کو عجب اتفاق ہوا کہ غفلت رام دین کلید بردار اسٹیشن سندیلہ سے سڑک آہنی قینچ مال گاڑی کی کھلی رہ گئی اور مسافر گاڑی بباعث کھلی ہونے قفل قینچ کے اسی سڑک آہنی پر جس پر مال گاڑی کھڑی تھی چلی آئی اور ایک ضرب شدید مال گاڑی کو دی کہ کل گاڑیاں اس کی اسٹیشن کے چبوترہ پر چڑھ آئیں اور چند گاڑیاں پٹری سڑک کے نیچے اتر گئیں۔ اس صدمہ سے اکثر مسافر مجروح ہوتے۔ کلید بردار مفرور ہوگیا صبح کو بہ مشکل تمام مسافر گاڑی لکھنؤ کی شاہ جہاں پور کو روانہ ہوئی۔ دیکھا چاہیے کہ اس جرم میں کتنے آدمی سزایاب ہوں۔

چیچک گھر میں: ۲۲؍فروری ۱۸۷۷ء - سندیلہ میں آج کل چیچک کی شدت ہے۔ اکثر لڑکے اس عارضہ میں فوت ہوئے اور ہوتے جاتے ہیں۔

۲۸؍فروری۔ برخوردار مقتدیٰ علی (بیٹا) کے تین دن سے چیچک نکلی ہے۔ ہر وقت رویا کرتا ہے۔ حالت اچھی نہیں معلوم ہوتی ہے۔

۴؍مارچ برخوردار مقتدیٰ علی کو چیچک سے از حد تکلیف ہے۔ شب و روز گریہ و زاری سے بسر کرتا ہے۔

۹۔ مارچ برخوردار مقتدیٰ علی کی طبیعت روز بروز مضمحل ہوتی جاتی ہے اور رونا کسی وقت بند نہیں ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دانے بیٹھ گئے۔

۱۴؍مارچ۔ برخوردار مقتدیٰ علی کا اطباے یونانی و ڈاکٹر کا بہت علاج ہوا لیکن کوئی نفع نہیں ہوا۔ ۱۱ بجے

۱۸۷۵ء یوم چہارشنبہ کو پیدا ہوا تھا اور آج دم صبح عارضہ چیچک میں ۷ دن کی علالت کے بعد فوت ہوا۔ چونکہ یہ لڑکا باوجود صغر سنی اپنے بھائیوں سے ذی ہوش معلوم ہوتا تھا اس وجہ سے اس کی مفارقت کا کمال صدمہ ہوا۔

۱۵ مارچ برخورداران ارتضیٰ علی و مرتضیٰ علی و اصغر علی کو ڈاکٹر سندیلہ سے ٹیکہ لگوا دیا۔

۱۷ مارچ برخوردار مقتدیٰ علی کی قبر پختہ بنوا دی۔ بیماری چیچک کی سندیلہ میں بہت شدت سے ہے اور صدہا اطفال اس عارضہ میں فوت ہوئے۔

۱۹ مارچ۔ برخوردار مرتضیٰ علی کے بھی چیچک برآمد ہوئی۔ چونکہ مقتدیٰ علی کا انتقال ہو گیا ہے اس وجہ مرتضیٰ علی کی علالت سے زیادہ تشویش ہے اس محلہ میں چیچک کی شدت ہے کہ کوئی گھر اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

۵ اپریل عارضہ چیچک میں اب کمی ہو چلی ہے مگر اس مرتبہ صدہا لڑکے سندیلہ کے اس عارضہ میں ضائع ہوئے۔

دو بیٹے: ۲۴ اکتوبر ۱۸۷۷ء۔ برخوردار مصطفےٰ علی کو شوق تحصیل علم انگریزی زیادہ معلوم ہوتا ہے اور محنت بھی خوب کرتے ہیں غالباً اس علم میں لیاقت مناسب حاصل کریں۔ برخوردار مجتبیٰ علی اگرچہ ہنوز خورد سال ہیں لیکن مزاج میں صلاحیت معلوم ہوتی ہے۔ خود رائی بالکل نہیں ہے اور مزاج میں محبت لوگوں سے بدرجہ غایت ہے اور ہر ایک کی تعمیل حکم میں ان کو دریغ نہیں ہوتا اس وجہ سے ہر ایک کا میلان طبیعت براہ محبت ان کی جانب ہے

امتحان وکالت: ۳ نومبر ۱۸۷۷ء۔ جو درخواست میں نے شرکت امتحان وکالت کی عدالت ہائی کورٹ الہ آباد میں بھیجی تھی اسکینی صاحب رجسٹرار الہ آباد نے منظور کر کے مجھے مطلع کیا کہ شریک امتحان ہو۔

۱۶ جنوری ۱۸۷۸ء۔ پانچ بجے صبح کو میں بغرض دینے امتحان وکالت ریل سندیلہ پر سوار ہوا۔ لکھنؤ پہنچ کر تمام دن وہاں قیام کیا اور شام کی ریل میں الہ آباد روانہ ہوا۔ صبح کو الہ آباد پہنچ کر سرائے گڑھی میں قیام کیا۔ علی محمد خاں ضلع دار میرے ہمراہ تھے۔

۱۷ جنوری ۱۸۷۸ء۔ منشی حسن رضا منصرم محکمہ بندوبست نے براہ عنایت مولوی وہاج الدین صاحب کا ایک مکان خالی کرا دیا جس میں میں نے قیام اختیار کیا اور میرے ساتھ میر تفضل حسین فیض آبادی بھی مقیم ہوئے۔ مولوی وہاج الدین حیدر صاحب عزیزی قاضی ابوالحسن کے خسر ہیں اور محلہ شاہ گنج میں رہتے ہیں۔ مولوی وہاج الدین صاحب نے فرش مکان کے واسطے بھیج دیا۔ یہ مکان مختصر میری گزر کے موافق کافی ہے۔

۱۸ جنوری۔ آج چودھری محمد عظیم صاحب و چودھری نصرت علی صاحب و سید ابوالقاسم و شیخ نیاز علی و شیخ محفوظ علی و شیخ حافظ علی خلف مولوی باقر علی و میر محمود علی سوداگر ملکانہ بھی واسطے دینے امتحان کے

ندیلہ سے) وارد الہ آباد ہوئے اور شاہ گنج کی ایک سرائے میں مقیم ہوئے۔

۲۶ر جنوری۔ اس پنج روزہ امتحان وکالت میں سوائے دو تین وقتوں کے اکثر اوقات میرے اور
بدالقادر صاحب کی یکجائی رہی اور مدد مناسب ملی مگر افسوس ہے کہ میر تفضل حسین فیض آبادی کا ساتھ میری
یت میں نہ ہوسکا کیونکہ اوّل روز جب امتحان دیوانی کا ہوتا تھا اسی روز ایک محافظ نے میرے پاس
سے ان کو اٹھا دیا اور میں ضابطہ دیوانی میں ان کو مدد نہ دے سکا جس سے وہ ناراض ہوگئے۔ محمود علی سوداگر
ے چالاک نکلے کہ اوّل روز جب کہ ضابطہ دیوانی میں امتحان ہوتا تھا میرے اکثر پرچہ سوالات کے
ٹھاکر نقلیں کرلیں جس سے اسوقت نہایت خوف طاری تھا کہ مبادا کوئی نگراں یہ حالت دیکھ کر مجھے اور انھیں بدرنہ کر دے۔

۲۷ر جنوری۔ کل میں بارش کی وجہ سے نیز بہ خیال اس کے کہ میں قلعہ الہ آباد کی سیر کروں عازم وطن نہ
ہوا۔ آج صبح کو الہ آباد سے روانہ ہوکر صبح ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچا اور قیصر باغ میں قیام کیا۔
لکھنؤ تک کا کرایہ ریل گاڑی فی کس دو روپے چھ آنہ ہے۔

<u>ایک سرود نواز</u>: ۸ر مارچ ۱۸۷۸ء۔ الہ آباد۔ میرا قصد آج واپسی وطن کا تھا لیکن غلام علی خاں
سرودیا جو گوالیار میں بمشاہرہ تین سو روپے ماہوار نوکر ہیں اور میرے مکان کے قریب سرائے گڑھی میں اترے
یں بوقت ملاقات مجھے سرود سنانے کا وعدہ کیا اور رو کا اور شب کو سرود بجایا کہ جس کی تعریف نہیں ہوسکتی اور
ن کا بیٹا ننھے خاں کہ جس کی عمر ۱۲ سال ہے سرود نوازی میں اچھی مہارت رکھتا ہے۔

<u>نتیجہ امتحان وکالت</u>: ۲۳ر جولائی ۱۸۷۸ء۔ تحریر مولوی عبدالقادر صاحب سررشتہ دار ہردوئی
سے معلوم ہوا کہ گزٹ مطبوعہ ۲۰ر جولائی ۱۸۷۸ء میں درج ہے کہ اشخاص ذیل امتحان وکالت منصفی میں پاس ہوئے۔
"مظفر کریم سکنہ دریاباد، مولوی عبدالقادر سکنہ دریاباد، سید مظہر علی ساکن سندیلہ، شیخ نثار علی (سندیلہ)
ہودھری محمد عظیم (سندیلہ) منشی نظیر حسن ساکن کاکوری، چودھری نصرت علی مختاری میں پاس ہوئے اور مولوی
بدالقادر صاحب علاوہ امتحان وکالت درجہ دویم اسی میں بھی پاس ہوئے"۔

۲۴ر جولائی۔ بمعائنہ اودھ اخبار امروزہ تصدیق میری کامیابی امتحان وکالت کی ہوئی اور منجملہ
یک ہزار پانچ سو امیدواران امتحان کے حسب تفصیل ذیل لوگ کامیاب ہوئے۔

عدالتی ججی۔ ۵۴، منصفی۔ ۲۱۰، مختاری۔ ۱۴۹، ریونیو ایجنٹ۔ ۵ = جملہ ۴۰۹

مجھے اپنی کامیابی امتحان کے باعث نہایت درجہ خوشی حاصل ہوئی اور منشی فضل رسول صاحب نے خوش ہوکر

بہم اظہار اپنی خوشنودی کا کیا۔ سید ابوالقاسم کو امتحان میں کامیابی نہیں ہوئی۔

شکایت پسینہ: ۱۵ اکتوبر ۱۸۷۸ء۔ بعد نماز صبح بالمرہ بطور تفریح اپنی پھلواڑی واقع بچولی جاتا ہوں اور ۷ بجے واپس آکر بعد حصول ملازمت منشی فضل رسول صاحب اپنے مکان پر آتا ہوں لیکن چونکہ میرے اعضاے جسم میں پسینہ نکلنے کی شکایت زیادہ ہے اس وجہ سے نہایت درجہ مضمحل ہوتا جاتا ہوں اور جو شخص اس وقت میری صورت دیکھتا ہے مجھے چھ مہینے کا بیمار بتاتا ہے۔

مولوی ضامن علی: ۱۹ نومبر ۱۸۷۸ء۔ مولوی ضامن حسین صاحب کی مجسٹریٹ ریاست حیدرآباد وارد سندیلہ ہوئے۔ مولوی صاحب کی تنخواہ چار سو روپے ہے۔ چونکہ میرے استاد ہیں اور شرح جامی میں ان سے پڑھتا تھا ان کی ملاقات کو گیا۔ کمال عنایت سے پیش آئے۔

علی گڑھ سے واپسی: ۶ جولائی ۱۸۷۹ء۔ چونکہ امیر حسن کو منشی فضل رسول صاحب نے علی گڑھ جانے سے روکا ہے اور صرف تنہا برخوردار مصطفےٰ علی وہاں رہ نہیں سکتے اور نہ ان کی تنہائی طبیعت کو گوارا ہے لہٰذا ان کو لکھا گیا کہ اپنا نام مدرسۃ العلوم سے خارج کرا کے سندیلہ چلے آؤ۔ چنانچہ برخوردار مسطور معہ قاضی صمصام علی علی گڑھ سے آج وارد سندیلہ ہوئے۔

وفات فضل رسول: ۱۴ جولائی ۱۸۷۹ء۔ آج شب کو بوقت ایک بجے جناب منشی سید فضل رسول صاحب نے عارضہ بخار و سرسام میں انتقال فرمایا جس سے نہایت درجہ ملال و رنج ہوا۔ ایسا شخص عالی مرتبہ مخدوم زادوں میں کوئی نہیں ہوا تھا۔ اپنی لیاقت ذاتی سے جناب مرحوم نے بہت کچھ پیدا کیا کہ تعلقدار ہو گئے اور بہت بڑا اعزاز گورنمنٹ انگریزی میں حاصل کیا۔ ان کے ہمسر خاندانی تعلقدار حسد کرتے تھے۔ جناب مرحوم نے جنگل 'چونسہ' کی آبادی سرانجام دیگر اہم امور میں ایسی ناموری حاصل کی کہ چند پشتوں تک ایسا شخص پیدا ہوتا نظر نہیں آتا۔ جناب مرحوم اعزہ و اکابر سے بوقت ضرورت مسلوک ہوتے اور ان کی احتیاجوں کو پورا کرتے تھے اور اپنے اخلاق وسیع سے ہر ایک کو مطیع کر لیا تھا۔ اختیارات فوجداری درجہ دویم و اختیارات دیوانی وہ قصبہ سندیلہ اور اپنے علاقہ کے ان کو حاصل تھے اور امورات پولٹیکل میں اچھی لیاقت رکھتے تھے اور جس امر کو کرنا چاہتے تھے اس کو پیشتر سے غور کر لیتے تھے۔ علوم فارسی، عربی، نجوم و حکمت میں بہت اچھی لیاقت حاصل تھی۔ فن شاعری میں صاحب دیوان تھے اور منشی مظفر علی آسیر لکھنوی کے شاگرد رشید تھے۔ ان کی تعریف خارج از امکان ہے اور اس کے واسطے ایک کتاب مطول چاہیے۔ عمر شریف ۶۷ سال دو ماہ پانچ دن کی ہوئی۔

۱۹ر جمادی الاول ۱۲۲۸ھ روز جمعہ پیدا ہوئے تھے اور آج ۲۳ر رجب ۱۲۹۶ھ میں انتقال کیا۔ خدا غریق رحمت کرے۔

۱۷ر جولائی ۱۸۷۹ء۔ شام کو قبر منشی فضل رسول پر گانا ہوا۔ قوالوں نے مرحوم کی غزلیں گائیں جس سے ہر ایک کو کمال رقت ہوئی۔ منشی مظفر علی صاحب اسیر لکھنوی استاد مرحوم بھی شریک جلسہ تھے۔ بعد گانے کے شیرینی تقسیم ہوئی۔

ایک نصیحت: ۴ر ستمبر ۱۸۷۹ء آج یہ نصیحت "سوچ سمجھ کر بات کر کہ پشیمان نہ ہو" مصطفےٰ حسین سے لکھا کر شیشہ کے چوکھٹے میں رکھ کر اپنے کمرہ نشست گاہ میں آویزاں کی تاکہ ہر وقت کے دیکھنے سے مجھے اور دوسروں کو نصیحت نیک حاصل ہو۔

تعین تاریخ شادی: ۱۲ر جنوری ۱۸۸۰ء۔ عزیزی سید اظہر علی و قاضی صمصام علی کو خدمت میں منشی فہیم الزماں واسطے تعین تاریخ عقد نور چشم سید مصطفےٰ علی کے بھیجا۔ بعد معائنہ جنتری کے منشی صاحب نے تاریخ شادی ۲۵ر ربیع الاول ۱۲۹۷ھ ہجری مطابق ۸ مارچ ۱۸۸۰ء روز دوشنبہ قرار دی ہے (لیکن یہ تاریخ بڑھا کر ۱۷ مارچ کر دی گئی تھی۔ ہاشمی)

شادی پسر: ۱۷ر مارچ ۱۸۸۰ء۔ روبرو حافظ کرم احمد صاحب و مولوی عبد القادر صاحب اور دیگر ارباب برادری پارچہ شادی اور اپنے نوکروں و چوکیداران و بسر اران دیہات کو بہ تعداد ۳۵ جوڑے کی تقسیم کی اور ۴۰ جوڑے گھر میں مستورات کو جملہ ۷۵ جوڑے شادی میں صرف ہوئے۔ تیسرے پہر کو دو ہزار آدمی تقریباً مانجہ میں اہل برادری وغیرہ سے شریک تھے۔ تقسیم بتاشوں کی خوب اچھی ہوئی۔ کوئی متنفس باقی نہیں رہا جس سے عوام میں بہت تعریف ہوئی۔ مساۃ بوٹا و منا جان طوائف، جونسہ و حسین باندی طوائف سندیلہ کا رقص ہوا۔ انگریزی باجہ بھی لکھنؤ سے منگوایا تھا۔ برات کے جانے کے وقت تک بہت بڑا مجمع رہا اور کل ارباب برادری اعلیٰ و ادنیٰ شریک ہوئے۔ تین بجے بہ جمعیت کثیر بارات در دروازہ منشی فہیم الزماں صاحب کے گئی۔ برخوردار مصطفےٰ علی تامجان پر سوار تھے۔ گھوڑے کی شوخی سے اس پر سوار نہ ہو سکے۔ چھ بجے صبح کو بہ مہر ۸۵ ہزار کے قاضی عابد علی صاحب نے نکاح برخوردار موصوف کا مساۃ نفیساً دختر منشی فہیم الزماں صاحب کے پڑھا۔ مولوی عبد القادر صاحب و دیگر ارباب سندیلہ نے میرے انتظام و وسعت ہمت کی تعریف کی۔ بہ تقریب سلامی ایک سو اکیس روپیہ حاصل ہوا

تقرری منیجری: ۲ر اپریل ۱۸۸۰ء۔ آج پھر برادرم سید فضل حسین نے مجھے بلایا اور باصرار اسی گفتگو کا اعادہ کیا جو انھوں نے کل کی تھی۔ جواب میں میں نے کہا کہ آپ کو مدد دینے میں مجھے کوئی محل عذر کا نہیں ہے لیکن باعث توقف کا یہ ہے کہ میری خیر خواہانہ کارروائی سے عموماً لوگ ناراض ہوں گے اور آپ سے وقتاً فوقتاً شکایت کریں گے جس سے میرے اور آپ کے درمیان میں ناحق سبب ملال و رنجش کا ہوگا۔ چنانچہ اسکے جواب میں کہا کہ کل تعلقہ کا انتظام تمہارے تفویض کرتا ہوں اور جو تم نیک و بد کرو گے اس میں کبھی کسی کی شکایت نہ سنوں گا او

اس قول کی تائید میں اقرار نامہ تحریری اسٹامپ پر لکھے دیتا ہوں کہ کسی حالت میں اس سے منحرف نہ ہوں گا۔ چنانچہ اُسی وقت کاغذ اسٹام قیمتی پانچ روپے کا منگا کر کل اختیارات مثل ذات خاص خود اس پر تحریر کر دیے اور ایک روبکار کل اپنے کارندکان و ضلع داران و مختاران اضلاع ہردوئی و لکھنؤ و اناؤ و لکھیم پور و سیتاپور کے نام جاری کیا کہ میں نے اپنا نائب سید مظہر علی کو مقرر کیا ہے۔ کل تحریرات ان کے نام بھیجی جائیں اور جو وہ جواب لکھیں اس کی تعمیل پوری پوری کی جائے۔ اگرچہ اس کام کو میں نے اپنے ذمہ لیا ہے لیکن مجھ کو نہایت دشوار معلوم ہوتا ہے کہ کیونکر میں اس کو انجام دے سکوں گا خدا سے دعا ہے کہ جب تک اس تعلقہ میں رہوں نیک نامی اور سرخ روئی حاصل ہو۔

برکھ پھل: ۱۰ ستمبر ۱۸۸۰ء۔ آج برکھ سن ۱۲۸۷ فصلی ختم ہوا۔ کیفیت مختصر اس کی درج کی جاتی ہے:
اوّل جو فرزند گھر میں پیدا ہوا تھا وہ ایک ہفتہ کے اندر فوت ہوا۔ مقدمہ جاجمو (ایک گاؤں کا نام ہے ہاشمی) میں کامیابی حاصل ہوئی۔ کل زر رہن وصول ہو گیا۔ اکثر مقدمات میں کامیابی حاصل ہوئی جس سے قصبہ ہذا میں میری شہرت ہوئی۔ برخوردار مصطفےٰ اعلیٰ کی شادی خوشی سے کی جس سے ناموری ہوئی۔ یکم اپریل سے تعلقہ جلال پور میں نوکر ہوا۔ اکثر بڑے بڑے لوگ میری ملاقات کے واسطے مکان پر آئے اور میرے ہاتھ سے ان کی بہبودی ہوئی۔ تعلقہ جلال پور میں اکثر مقدمات پیچیدہ بہ آسانی طے ہوئے۔ اب دیکھیے برکھ پھل ۱۲۸۸ فصلی کا کیا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے جو آج سے شروع ہوا۔

بیٹی کی شادی: ۱۶ ستمبر ۱۸۸۱ء۔ بارات برخوردار سعید الدین خلف حافظ نذیر الدین ایک بجے رات کو میرے دروازے آئی۔ آتش بازی و آرائش اچھی تھی۔ ۳ بجے رات کو عقد سعید الدین مسماۃ افضلاً میری لڑکی کلاں سے بعوض ۸۵ ہزار مہر کے ہوا۔ منشی فہیم الزماں صاحب مولوی عبدالقادر صاحب تحصیلدار تمام رات میرے مکان پر رہے اور ہر ایک امر میں مجھے صلاح مناسب دیتے رہے۔ کھلونا و فضل کشمیریوں کا ناچ ہوتا تھا۔ حافظ نذیر الدین صاحب کشمیریوں کو ہر ایک ان کی نقل اور گانے پر دو دو روپیہ انعام دیتے رہے۔ میرے خیال میں ساٹھ روپیہ سے زائد میرے مکان پر انعام دیا گیا۔ اس وجہ سے کشمیری لوگ نقل بہت اچھی کرتے تھے اور خوب جی توڑ کر گا ناگاتے تھے جس سے اہل جلسہ بہت محظوظ و خوش تھے۔

۱۷ ستمبر ۱۸۸۱ء گیارہ بجے صبح کے بارات سعید الدین کی رخصت ہوئی میں نے حسب ذیل جہیز دیا:
زیور طلائی مرصع کار۔ ۲۳ عدد، زیور نقرئی۔ ۲۸ عدد، پارچہ جوڑہ۔ ۴۱ عدد، ظروف مسی و آہنی۔ ۴۵ عدد، پینس وصندوق رنگین وغیرہ۔ ۵ عدد، جملہ۔ ۱۵۸ تفصیل زر نقد یہ ہے:

منگنی - ۲۰ روپے سلامی - ۵۱ روپے، چوتھی - ۲۵ روپے، رو نمائی - ۵ روپے
۲۸ ستمبر ۱۸۸۱ء۔ شادی نور چشمی افضلاً میں مبلغ دو ہزار سہ صد روپے ایک آنہ نو پائی صرف ہوا اور جن جن لوگوں کا یا فتنی تھا دے دیا گیا۔ اب کسی کا مجھ سے یافتنی نہیں ہے۔

ماء الجبن: یکم نومبر ۱۸۸۱ء۔ استعمال ماء الجبن سے اگرچہ عارضہ پسینہ (جسم کے بائیں جانب پسینہ کثیر نکلنے کی شکایت ہو گئی تھی۔ ہاشمی) میں ابھی فائدہ نہیں ہے لیکن قوت جسمانی بڑھتی جاتی ہے اور طبیعت کو اضمحلال کم ہے اور طبیعت بہت خوش رہتی ہے۔ اس لیے یقین ہے کہ چند روز میں اصل عارضہ کو بھی فائدہ ہوگا۔
۲ نومبر۔ ماء الجبن کے استعمال سے ایک یہ فائدہ معلوم ہوتا ہے کہ چہرہ صاف ہوتا جاتا ہے۔ جو شخص آج کل مجھے دیکھتا ہے وہ بلا تکلف کہہ اٹھتا ہے کہ تمہارے چہرے کی پژمردگی بالکل جاتی رہی اور ایک نئی کی رونق آتی جاتی ہے۔

ملازمت تعلقہ جلال پور: ۸ مارچ ۱۸۸۲ء۔ چونکہ میں تعلقہ جلال پور سے سوائے تنخواہ کے نذر تک نہیں لیتا ہوں اور کوئی چیز فصلی باغات و دیہات کی اپنے مکان پر آنے نہیں دیتا ہوں اس وجہ سے میری طبیعت کو کسی وقت کسی قسم کی پژمردگی و تردد لاحق نہیں رہتا اور نہایت بے خوفی اور مستقل مزاجی سے کام تعلقہ جلال پور انجام دیتا ہوں۔

مجسٹریٹی: ۱۱ جولائی ۱۸۸۳ء۔ بموجب ڈاکٹ نمبری ۱۷۱۱ مورخہ ۲ جولائی ۱۸۸۳ء مرسلہ صاحب لفٹیننٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی و اودھ مجھے اختیارات مجسٹریٹی درجہ سوئم اندر حدود میونسپل قصبہ سندیلہ حاصل ہوئے اور میرے ساتھ میں کنور وزیر چند صاحب و کنور درگا پرشاد صاحب تعلقہ دار سرن بڑا گاؤں کو بھی اختیارات مثل میرے گورنمنٹ سے حاصل ہوئے ہیں بلکہ ایک ہی ڈاکٹ میں ہم تینوں آدمیوں کے نام درج ہیں بالفعل لائل صاحب لفٹیننٹ گورنر ہیں۔

نظام اوقات خود: ۷ فروری ۱۸۸۴ء۔ میری کارروائی روزمرہ حسب ذیل ہے:
علی الصباح بیدار ہو کر نماز صبح و انفراغ حوائج ضروری ماء الجبن استعمال کرتا ہوں اور پندرہ سو قدم چہل قدمی کے بعد بخدمت جناب خالہ صاحبہ (والدۂ فضل حسین) بوقت ۷ ½ بجے حاضر ہو کر تسلیم بجا لاتا ہوں اور پھر منشی فضل حسین صاحب کے پاس جا کر ایک گھنٹہ تک امور ضروریہ متعلق علاقہ جلال پور کے تذکرہ و استفسار کرتا ہوں اور پھر وہاں سے قریب ۸ ½ بجے بنچ میں جا کر مقدمات فوجداری دس بجے تک فیصل کرتا ہوں اور پھر مکان پر آکر بعد تناول طعام کچہری علاقہ جلال پور میں جا کر کام تعلقہ اپنا پانچ بجے تک انجام دیتا ہوں بعدہٗ مکان پر آکر اکثر احباب وغیرہ سے ملاقات رہتی ہے اور بعد نماز مغرب محل سرا میں جا کر کھانا کھاتا ہوں

اور بعد پینے وکھانے حقّہ پانی کے نماز عشاکی پڑھ کے جاڑوں میں ۹ ½ بجے اور گرمیوں میں ۱۰ بجے سو رہتا ہوں اور اگر احیاناً کسی روز کوئی اہم مقدمہ تعلقہ کا پیش ہوگیا تو گیارہ دبارہ بجے تک اس کے سوچنے اور غور کرنے میں نیند نہیں آتی ہے اور اس وقت تک طبیعت کو بے چینی رہتی ہے جب تک کوئی رائے مناسب نسبت مقدمہ پیش پا کی تجویز نہیں کر لیتا ہوں۔

منشی فضل حسین: ۲۹ر مارچ ۱۸۸۴ء منشی فضل حسین کی نافہمی سے ہر وقت طبیعت کو ملال رہتا ہے کام کرنے کو جی نہیں چاہتا اور دل بھی کام میں کم لگتا ہے کیونکہ صحبت ان کی روز بہ روز ناقص ہوتی جاتی ہے اور مزاج میں ایسی ضد آ گئی ہے کہ جو بات خیال میں آئے چاہے اس کا انجام بد ہو لیکن اس کے کرنے سے باز نہیں رہتے اور کوئی فہمائش کارگر نہیں ہوتی۔ پس میرا خیال اور ارادہ ہے کہ اس تعلقہ سے علیحدگی اختیار کروں کیونکہ ایک روز نتیجہ اس کا بدنامی ہوگا۔

رقص: ۲۵ر اپریل ۱۸۸۴ء۔ شب کو جلسہ فضل حسین کشمیری (لکھنؤ) کا منشی فضل حسین کے مکان پر ہوا یہ اچھا ناچتا ہے۔ میں بھی ۱۲ بجے تک شریک جلسہ رہا۔

راجہ درگا پرشاد: ۱۸ر نومبر ۱۸۸۴ء۔ راجہ درگا پرشاد صاحب تعلقہ دار سرون بڑا گاؤں میرے مکان پر آج پہلی مرتبہ تشریف لائے اور ان کی مدارات ضروری کی گئی۔

متفرق ذمہ داریاں: ۳۰ر اپریل ۱۸۸۵ء۔ آج کل تین قسم کے کام میں انجام دیتا ہوں۔ کار محرری متعلقہ سندیلہ، خاص انتظام تعلقداری جلال پور کا، کارروائی میونسپل سندیلہ۔ اس وجہ سے مجھے بہت کم فرصت رہتی ہے تاہم کام سے میں گھبراتا نہیں ہوں اور کمال مستقل مزاجی سے ان کو انجام دیتا ہوں۔

فوٹو: ۵ر اگست ۱۸۸۵ء۔ آج راجہ وزیر چند کے مکان پر امیر علی فوٹوگرافر لکھنؤ سے تصویر کھنچائی۔ میں اور راجہ وزیر چند صاحب اور راجہ درگا پرشاد صاحب اور میر عاشق حسین محرر پنج و لالہ امبکا پرشاد محرر میونسپل و ممبر و چپراسی اور ایک ایک خدمت گار ہم لوگوں کا اس مجمع میں شریک تھا۔ تصویریں بہت عمدہ منعکس ہوئی ہیں۔

خواب خوش: ۵ر اکتوبر ۱۸۸۵ء۔ آج کل خواب خوش میرے معائنہ میں آتے ہیں۔ خدا ظہور نیک فرمائے کیونکہ میرا تجربہ ہے کہ جب میں اچھے خواب دیکھتا ہوں تو اس کا ظہور اچھا ہوتا ہے اور جب برے دیکھتا ہوں تو برا۔

ممبری ڈسٹرکٹ بورڈ: ۷ر جنوری ۱۸۸۶ء۔ ڈپٹی عنایت اللہ خاں صاحب واسطے انتخاب ممبران ڈسٹرکٹ بورڈ ہردوئی سندیلہ تشریف اور کثرت رائے سے میرا اور منشی فضل حسین کا انتخاب ہوا۔ اکیس رائیں

میری جانب اکتیس اور دس بجانب منشی فضل حسین اور باقی لوگوں کی نسبت اس سے کم کتھیں یعنی میں نے منشی فضل حسین
کے انتخاب کی نسبت بڑی کوشش کی ورنہ کسی رائے دہندہ کو ان کی نسبت منظور نہ تھا کہ منتخب ہوں۔

زمانہ تعمیرات: ۱۴ رمئی ۱۸۸۶ء۔ مجھے اس بات کا تجربہ حاصل ہو گیا ہے کہ فصل ربیع میں
کوئی تعمیر شروع نہ کراوے۔ اوّل تو زمانہ بارش قریب ہوتا ہے دوسرے کاریگر وغیرہ کم دستیاب ہوتے ہیں کیونکہ
اس فصل میں بباعث تیار ہونے فصل ربیع و قریب بارش کے ہر متنفس کو ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اوّل تو کاریگر
و مزدور بمشکل ملتے ہیں دوسرے مزدوری زیادہ دینا ہوتی ہے۔ ہر صاحب عمارت کو چاہیے کہ بعد ختم بارش
مہینہ کنوار میں کام تعمیر کا شروع کراوے۔

اپنی کوٹھی: ۱۴ رمارچ ۱۸۸۷ء۔ جب سے میری کوٹھی تیار ہوئی ہے جو شخص اجنبی ادھر سے گزرتا
ہے تو اسکے ارتفاع اور نمائش ظاہر کو بنظر تحیر دیکھتا ہے اور بعد دریافت نام مالک کے آگے بڑھتا ہے۔ واقعی طرز تعمیر اسکی اسی قابل ہے

منشی فضل حسین اور ان کی ملازمت: ۲۵ رمئی ۱۸۸۷ء۔ بمعائنہ روبکار مسٹر ہارس فورڈ صاحب
ڈپٹی کمشنر ہردوئی محررہ ۱۹ رمئی ۱۸۸۷ء سے واضح ہوا کہ صاحب ضلع نے تھانہ سندیلہ 'بگھولی' میں حکم بھیج دیا ہے کہ
کسی مقدمہ کا چالان منشی فضل حسین کے اجلاس میں ہرگز نہ بھیجا جائے۔ کل چالان ہردوئی جاویں وہاں سے
صاحب ممدوح جیسا مناسب سمجھیں گے وہ منشی فضل حسین کے اجلاس میں بھیج دیں گے۔ اس حال کے دریافت کرنے
سے تردد ہوا کہ یہ امر باعث توہین کا ہم چشموں میں متصور ہے جس کی منسوخی کے واسطے شاید بہت کوشش کرنا پڑے۔

۲۷ رمئی ۱۸۸۷ء۔ آج صبح کو ہارڈ فورڈ صاحب ڈپٹی کمشنر سے ملاقات کی اور منشی فضل حسین کی نسبت استصوابا
دریافت کیا۔ صاحب نے فرمایا کہ سرشتہ دار فضل حسین کا رشوت لیتا ہے اور فضل حسین بباعث اپنی کم فہمی کے اس کا
تدارک نہیں کرتا ہے اور جو کچھ وہ لکھ دیتا ہے اس پر فضل حسین دستخط کر دیتا ہے۔ اس سے انصاف میں بڑا خلل آتا ہے
اور فضل حسین نے ہم کو لکھا کہ انور خاں اور حسین خاں ہمارا نوکر نہیں ہے۔ یہ اس کی غلط بیانی ہے۔ ضرور وہ
لوگ اس کے نوکر ہیں۔ ہم اس کے اس جھوٹ بولنے پر نہایت ناخوش ہیں۔

۳ رجون ۱۸۸۷ء۔ آج کل حسین خاں و انور خاں اور ملک مصطفےٰ حسین کی مصاحبت منشی فضل حسین میں
گرم بازاری ہے حضور حضور کر کے جو بات یہ لوگ کہتے ہیں وہ پذیرا ہوتی ہے۔ اس وجہ سے میں بحالت
سکوت ہوں اور کوئی امر مفید یا مضر کسی کی نسبت نہیں کہتا ہوں۔ بظاہر حالات خوش معلوم نہیں ہوتے ہیں۔

۲۷ رجون ۱۸۸۷ء۔ آج استعفا لکھ کر بوقت صبح میں منشی فضل حسین کے پاس گیا لیکن وہ پاخانہ کو جانے

کے حیلے سے اٹھ کر دالدہ الطاف رسول کے پاس دوسرے کمرے میں چلے گئے اور میں دیر تک بیٹھا رہا لیکن نہ آئے۔ تب مجبور ہو کر اپنے مکان پر آگیا اور بعد تناول طعام وقت معمول پر کچہری جلال پور میں گیا اور دن بھر کام متعلقہ انجام دیا لیکن نہایت ملال وتکدر کے ساتھ کہ جس کا تحریر کرنا اس موقع پر ممکن نہیں اور جب شام کو بعد فراغت کار میں مکان پر آیا تو اس وقت ملک مصطفےٰ حسین کے مسودے کے مطابق منشی فضل حسین نے یادداشت میری موقوفی کی صاف کی جو میرے پاس ۵ بجے آئی جس کا مفہوم یہ تھا کہ تعلقہ جلال پور کی آمدنی قلیل اور مصارف کثیر ہیں اور وہ ہرگز متحمل سو روپیہ ماہواری نائب کی تنخواہ کا نہیں ہو سکتا۔ لہذا عہدۂ نائب تخفیف کیا جاتا ہے اور میں اپنی ذات خاص سے کام تعلقہ کا انجام دوں گا جس وقت یہ یادداشت میرے پاس آئی تو میں نہایت خوش ہوا اور بالکل مجھ کو ملال نہیں ہوا اور تین مہینہ کی پریشانی وکشاکش سے نجات ہوئی کہ شخص ناقدرداں کی صحبت سے ہر آئینہ علاحدگی اولیٰ ہے کیوں کہ دوست ناداں سے ہمیشہ احتمالات ضرر متصور ہیں۔

۲۸ جون ۱۸۸۷ء۔ سات برس دو مہینے ۲۷ یوم میں نے کام تعلقہ جلال پور کا کمال عزت وحرمت کے ساتھ انجام دیا اور جملہ ملازمین تعلقہ کو اپنی حکمت عملی سے راضی وخوش رکھا اور اپنی مستعدی وخیر خواہی سے بہت جدید علاقہ پیدا کر دیا کیوں کہ جب میں نے اپریل ۱۸۸۰ء میں تعلقہ جلال پور کا انتظام شروع کیا تھا تو اس کی سال کی نکاسی خام اڑتالیس ہزار کی تھی اور بابت ۱۲۹۴ فصلی (۱۸۸۷ء) اس کی نکاسی اٹھتر ہزار کی ہے تو اپنی سات برس کی کارکردگی سے تیس ہزار سالانہ کا منافع بڑھا۔ (اس کے بعد تفصیل کارکردگی دی گئی ہے جو یہاں حذف کی گئی۔ ہاشمی)

آج صبح میں منشی فضل حسین کے پاس بموجودگی منشی ظہور الحسن وغیرہ کے گیا۔ مجھے دیکھ کر متعجب ہوئے۔ میں نے کہا کہ کوئی محل استعجاب نہیں ہے۔ میں صرف اس غرض سے آیا ہوں کہ چند باتیں مصلحت وقت کہوں۔ اوّل میں اپنی برخاستگی سے ناراض نہیں ہوں بلکہ شکر گزار ہوں کہ آپ نے عہد ملازمت میں وہی میرا اعزاز اور وقار قائم رکھا جس کا حق مجھ کو آپ سے حاصل تھا۔ دوسرے میری علیحدگی کے بعد اکثر آپ کے ملازم میرے اور آپ کے درمیان میں پیچیدگیاں پیدا کریں گے تو اس سے ناحق موجب ملال کا پیدا ہوگا۔ اس وجہ سے میرے نزدیک یہ مناسب ہے کہ جب کوئی نئی بات آپ میری جانب سے سنیں تو اولاً آپ مجھے بلا کر اس کی کیفیت دریافت کر لیں اور اگر جواب شافی دیا جائے تو اس پر اطمینان حاصل کیا جائے ورنہ جو تدارک مناسب وقت ہو اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ تیسرے اگر کوئی مقدمہ نازک تعلقہ میں پیش ہو اور اس کی صلاح ومشورت کی بابت کوئی ضرورت داعی ہو اور میرے امکان میں اس کا سلجھانا ممکن ہو تو مجھے آپ فوراً طلب کر کے کیفیت واقعی

بیان کریں تو میں حتی الامکان اس پیچیدگی کو سلجھانے میں اسی طور سے کوشش کروں گا جیسا کہ بحالت ملازمت کرتا تھا۔ بہرحال مجھ کو اپنا خیر طلب مثل سابق کے تصور کرنا چاہیے۔ میں کوئی دقیقہ آپ کی بہبودی کا حتی الامکان کسی حالت میں فروگذاشت نہ کروں گا۔

اہل خانہ منشی فضل حسین: ۹ راگست ۱۸۸۷ء۔ والدۂ الطاف رسول (اہل خانہ منشی فضل حسین) بوجہ باعث ضعف و افراط اٹھنا بیٹھنا محال ہے اور بدون امداد دوسرے کے چوکی پر بھی نہیں بیٹھ سکتی ہیں۔ شاید زمانہ ان کی مفارقت دائمی کا قریب ہے۔ مجھے کمال افسوس ہے .... مریضہ نے جب میری علاحدگی کا حال کسی دن کے بعد سنا تو افسوس کے بعد کہا کہ جہاں اور بھی برائی کے پیدا ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ اور اگر احیاناً میں کوئی دن واسطے عیادت کے نہیں جاتا ہوں تو بہ شکایت معمول کے یہ کہتی ہیں کہ تم کو میں اپنے بھائی حقیقی سے کم نہیں جانتی ہوں اور جب تک تم نہیں آتے ہو تو میں منتظر رہتی ہوں اور جس وقت جاتا ہوں تو کل سرگزشت اپنی شب و روز کی مجھ سے بیان کر دیتی ہیں اور کسی تیماردار سے بات بھی نہیں کرتیں۔

۲۰ راگست ۱۸۸۷ء۔ آج ایک بجے دن کو مسماۃ نجیباً اہل خانہ منشی فضل حسین نے عارضہ دق میں بہ عمر ۳۵ سال انتقال کیا۔ بوقت انتقال شدت سے بارش ہوئی تھی اور بمشکل لاش مکان بیرونی سے گھر میں آئی۔ شام کو تجہیز و تکفین سے فراغت ہوئی۔ مرحومہ نے تین لڑکے یادگار چھوڑے۔ ان میں سے الطاف رسول کی شادی ہو گئی ہے۔ میں نے طعام تقریب بھیجنا چاہا۔ ملک مصطفےٰ حسن حارج ہوئے۔ لیکن منشی فضل حسین و منشی شمس الدین صاحب نے منظور کیا۔ رات کو بھی بھیجی جس میں پندرہ روپے صرف ہوئے۔ مرحومہ کے مزاج میں متانت زیادہ تھی اور اپنے شوہر کی متحمل مزاج تھیں۔

۲۲ راگست ۱۸۸۷ء۔ اس وجہ سے اہل قصبہ ہذا کو انتہا شکایت ہے کہ جب اہل خانہ منشی فضل حسین کی لاش واسطے دفن قبرستان عمر پرہ کو جاتی تھی سب لوگ تو پیادہ پا گئے۔ لیکن منشی صاحب بگھی پر سوار ہو کر واسطے دفن کے تشریف لے گئے جس سے سب لوگ خندہ زنی کرتے تھے۔ دوسرے آج جب لوگ بہ تقریب سیوم مرحومہ کے آئے تو حضرت شریک سیوم نہ تھے۔ دوسرے کمرہ میں حلقہ طوائفان میں بیٹھے تھے۔ جو اشخاص معزز واسطے ادائے تعزیت اعلیٰ حضرت کے پاس گئے تو ایسے جلسہ کی شرکت سے ان کو کمال ندامت و تاسف ہوا۔

والدۂ فضل حسین: ۱۸ ستمبر ۱۸۸۷ء۔ جس تاریخ سے اہل خانہ منشی فضل حسین نے انتقال کیا میں جناب خالہ صاحبہ (والدہ فضل حسین) کے پاس واسطے سلام کے نہیں گیا۔ آج ایک مہینہ کے بعد باصرار انھوں نے طلب فرمایا اور کمال لطف سے پیش آئیں۔ وہ مثل اپنے فرزند کے مجھ سے محبت رکھتی ہیں۔ جس وقت میں گیا۔

بہت روئیں اور فرمایا کہ میری حیات میں اپنی آمد و شد ترک نہ کرو جس کو بخوشی میں نے منظور کیا۔

ایک افیونی: ۱۸ ردسمبر ۱۸۸۷ء۔ محمد حسین عرف چھوٹن ساکن درگاہ بعمر ۷ سال فوت ہوئے اور کل جائداد منقولہ وغیر منقولہ اپنی مع خانہ سکونت بیچ کھائی۔ افیون کا استعمال زیادہ تھا۔ ایک مرتبہ عطاری کی دکان کی تھی اور کل اشیائے شیریں بجائے بیچنے کے خود ہی چکھ گئے تھے۔

کچھ اپنا حال: ۳۱ ردسمبر ۱۸۸۷ء۔ ابتداءً میری جائداد آبائی و موروثی کچھ نہ تھی حتیٰ کہ مکان سکونت بھی مشترک تھا جس میں چند اعزا کے گھروں سے کھڑکیاں تھیں۔ اس سے مکان غیر محفوظ اور موجب تکلیف کا متصور تھا۔ ابتداءً میری ملازمت مدرسہ سندیلہ میں ہوئی اور اسی وقت سے مجھے شوق حصول ریاست کا پیدا ہوا اور میں نے معاملات رہن و بیع کرنا شروع کیے۔ اولاً ۱۲ رمارچ ۱۸۶۷ء کو ایک قطعہ الاضی زرعی موسومہ کسہا تعدادی ۵ بیگھہ واقع موضع مخدوم پورہ مملوکہ میر احمد بخش صاحب مرحوم مخدوم زادہ درگاہ مبلغ ۱۵ روپے پر رہن رکھا جس کا حاصلات مبلغ چار روپیہ سالانہ تھا۔ اس کے بعد جوں جوں میری تنخواہ میں ترقی ہوتی گئی میں ریاست پیدا کرتا گیا اور اس کے حصول میں بباعث کمی زر کے اپنے اوپر بہت تکلیف گوارا کی لیکن شوق کو کسی نہج سے کم نہیں کیا اور اس بات کا ہمیشہ خیال ملحوظ خاطر رکھا کہ اس قدر جائداد غیر منقولہ پیدا کرلینا چاہیے کہ بوقت بیکاری معین اپنے مصارف روزینہ کی ہوسکے اور قیام سندیلہ بحالت بیکاری مجبوراً ترک نہ کرنا پڑے۔ ہزار ہزار شکر پروردگار عالم کا کہ اس نے اپنے فضل سے میرے ان خیالات کو پورا کیا اور بقدر میرے صرف کے جائداد غیر منقولہ مجھے حاصل ہوئی جس سے ایام بیکاری بہ آسانی بسر ہو رہے ہیں۔ میں نہایت مناسب تصور کرتا ہوں کہ جس قدر جائداد غیر منقولہ علاوہ زر نقد اور زیور جو اس وقت میرے قبضہ میں ہے حوالہ رقم کروں اور جس قدر تمتع منافع زر تمسکی سے حاصل ہوتا ہے اس کو بھی لکھوں تاکہ میرے جانشینان کو معلوم ہو کہ ہمارے مورث نے اکیس سال کی مدت میں کس قدر ترقی کی جس سے اکثر رؤسائے قصبہ ہذا و غیر خوش روزگار کو باعث حسد متصور ہے۔ دس پندرہ برس قبل جائداد غیر منقولہ کی اتنی قدر نہ تھی جیسی کہ اس وقت ہے اسی وجہ سے اس زمانہ میں بہت کم قیمت پر حاصل ہوئی۔ اگر وہ زمانہ حال بہ نرخ بازار فروخت کی جائے تو محل شک کا نہیں ہوسکتا کہ دو چند قیمت اس کی ملے۔ میزان جملہ جائداد منقولہ غیر منقولہ۔ چوالیس ہزار پانچ سو ترسٹھ روپے سات آنہ چار پائی۔ (اس کے بعد اس آمدنی کی تشریح دو صفحوں میں لکھی ہے۔ ہاشمی)

نولکشور کو خط: ۲۵ رجنوری ۱۸۸۸ء۔ میں نے جو خط مبارک باد حصول خطاب منشی نولکشور مالکِ مطبع

وہ اخبار، محررہ ۱۳ر جنوری ۱۸۸۸ء کو بھیجا تھا وہ اودھ اخبار ۲۴ر جنوری ۱۸۸۸ء نمبر ۱۳۹ میں طبع ہوا ہے۔

متعلق چاہات و باغ: ۲ر فروری ۱۸۸۸ء۔ کو کل یکم فروری کے اودھ اخبار میں بعنوان 'ہمدردی' بڑے کنویں بنانے اور باغ لگانے موضع 'پرکاپور' کا نہایت عمدہ مضمون جو مولوی حفیظ اللہ خاں صاحب مدرس سندیلہ نے شائع کرایا ہے وہ قابل تعریف ہے۔

۱۲ر فروری ۱۸۸۸ء۔ اخبار 'خیر خواہ عالم' دہلی محررہ ۸ر فروری ۱۸۸۸ء اور اخبار 'دبدبہ سکندری' رام پور محررہ ۶ر فروری ۱۸۸۸ء میں میرے باغ و کنواں واقع موضع پرکاپور کی بہت تعریف لکھی ہے میں نے یہ دونوں چیزیں محض واسطے رفاہ عام کے بنوائی ہیں۔

فال: ۱۷ر فروری ۱۸۸۸ء۔ آج میں نے فال اپنی بہبودی کی کتاب سکندر نامہ میں دیکھی جس کا جواب نکلا۔ شعر

مبارک بود فال بر رخ زدن　　نہ بر رُخ زدن بلکہ شہ رُخ زدن

خواب خوش: ۱۵ر مارچ ۱۸۸۸ء۔ صبح کے وقت خواب دیکھا کہ نازنین اہل فرنگ نازک اندام کہ نفیس میں بہ التفات مجھ سے پیش آئیں اور اپنے دونوں رخساروں پر بخوشی بوسے دیے۔ یہ خواب ایسا ہے کہ کبھی مجھے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن حصول کامرانی اور دولت اس کی تعبیر ہے۔

شبرات کی آتش بازی: ۲۷ر اپریل ۱۸۸۸ء۔ چونکہ برخورداران ارتضیٰ علی و مرتضیٰ علی اس مرتبہ ہردوئی سے نہیں آئے (جہاں وہ زیر تعلیم تھے۔ ہاشمی) لہٰذا میرے یہاں تقریب شبرات میں سناٹا رہا۔ تھوڑی آتش بازی میں نے نور دیدہ منتظم حسین (پوتا) کو منگادی تھی جو محل سرا میں چھوڑی گئی ورنہ چند روپوں کی آتش بازی چھوڑی جاتی تھی۔

شادی جنگ بہادر: یکم مئی ۱۸۸۸ء۔ آج شب کو جلسہ شادی کنور جنگ بہادر خلف راجہ درگا پرشاد صاحب تعلقہ دار سَروَن بڑاگاؤں، میں شریک ہوا۔ افضل حسین کشمیری لکھنؤ کے ناچ میں جو چیالیس روپیہ یومیہ علاوہ خرچ خوراک و کرایہ ریل آمد و شد کے لکھنؤ سے آیا تھا میں چند گھنٹے تک بوفور عنایت راجہ صاحب شریک رہا اور مبلغ دو روپے نیوتہ دے کر نصف شب کو مکان پر واپس آیا۔ راجہ صاحب نہایت صاحب حوصلہ ہیں۔ اگرچہ علاقہ کورٹ ہونے سے حسب خواہش خود اس تقریب میں صرف نہ کر سکے لیکن تاہم قرض و دام سے بہت کچھ عالی ہمتی کو دخل دیا۔

'مونس غم گسار': ۲۷ر مئی ۱۸۸۸ء۔ کل سے میں کتاب "مونس غم گسار" مرسلہ برخوردار سید حافظ علی معائنہ کرتا ہوں۔ واقعی انھوں نے اس کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں اچھا کیا ہے، قصہ دلچسپ ہے جسکو شاید برخوردار

موصوف عنقریب طبع کرادیں گے ۔ یہ کتاب ۱۸۸۹ء میں لکھنؤ میں طبع ہوئی ۔ میرے پاس موجود ہے ۔ ہا[...]

دوا نبہ: ۷ر جولائی ۱۸۸۸ء ۔ مسماۃ .... منکوحہ چودھری محمد رؤف نے ایک دوا[...]
بھیجا جس کے معاوضے میں میں نے ۲۰ ، انبہ تخمی اور ۳ عدد قلمی بھیجے جسکو شاد'' الیہا بکمال مسرت قبول کیے

شیخ رعایت حسین: ۷ر جولائی ۱۸۸۸ء ۔ اس حالت انقلاب میں جبکہ زمانہ میر[...]
ہے شیخ رعایت حسین وکیل ہردوئی کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے برخورداران ارتضی علی و مر[...]
کے ہمراہیوں کو بباعث نہ ملنے مکان کے ۱ر جولائی سے آج تک اپنے مکان پر رکھا اور ان
کا بار اپنے ذمہ لیا اور ہر طرح سے تلاش مکان میں مدد کافی دی ۔ واقعی میں وکیل صاح[...]
میں بے نظیر ہیں اور میرے ساتھ ان کا برتاؤ ۲۲ سال سے بحالت مساوی چلا آتا ہے ۔

۸ر جولائی ۱۸۸۸ء مکان پختہ رام سرن مستری ہردوئی بغرض قیام برخورداران ا[...]
تین روپیہ کرایہ ماہواری پر لیا گیا اور اس پر چھپر وغیرہ ڈلوا کر آج وزیر علی داروغہ شام کی ریل میں
واپس آیا قیام لڑکوں کا آج سے اس میں ہوا ۔ دو مہینہ کا کرایہ پیشگی ادا کیا گیا اور چھ سات روپے
صرف ہوئے وہ اس کے علاوہ ہیں ۔ مگر شکر ہے کہ لڑکوں کو بغرض قیام مکان تو مل گیا ۔[1]

توقیر ذاتی: ۱۹ر جولائی ۱۸۸۸ء ۔ آج کل چودھری محمد عظیم صاحب و چودھری نصرت علی [...]
کمال کرتے ہیں اور بہت محبت و تپاک سے آتے ہیں اور جو تحریر میرے نام بھیجتے ہیں وہ ایسی
کی ہوتی ہے جس سے دوسروں کو تحیر ہوتا ہے ۔ میں بہر حال شکر پروردگار ادا کرتا ہوں کہ خدا
میری عزت اور آبرو ایسی ہی قائم رکھے اور ترقی مدارج فرمائے ۔

ایک تجربہ: ۲۴ر اگست ۱۸۸۸ء ۔ تجربے سے ظاہر ہوا کہ دھبہ ہائے ذیل اشیاء
سے اگر دھوئے جائیں تو معدوم ہو جاتے ہیں ۔ اگر گھی کا دھبہ پڑ جائے تو سجی سے جاتا رہتا ہے
سے، روشنائی کا دہی سے اور پان کی پیک کا شکر سے ۔

خالہ خود: ۲۵ر ستمبر ۱۸۸۸ء ۔ اگرچہ ماں کو اپنے فرزند سے جس قدر محبت ہوتی ہے اس
سے چاہیے جیسا کہ وہ عزیز قریب ہو ممکن نہیں ہے لیکن جناب خالہ صاحبہ والدۂ سید فضل حسین کی

---

[1] مولوی صاحب کے یہ دونوں بیٹے ہردوئی میں پڑھتے تھے ۔ پہلے فضل حسین تعلقہ دار کے ایک مکان میں رہتے تھے لیکن مظہر[...]
باعث اب انھوں نے اپنا مکان لڑکوں سے خالی کرا لیا تھا ۔ ہاشمی

شکریہ ادا نہیں کر سکتا ہوں کہ وہ مجھے اپنے فرزند سے کسی حال میں کم نہیں چاہتیں اور یہ اُلفت ان کی انتہا درجہ کی ہے کہ جب سید فضل حسین نے بلا وجہ مجھ پر ضلع 'کھیری' میں دعوا دائر کیا تو جناب مقدسہ کو اس سے از بس رنج و ملال ہوا اور اسی حالت میں انھوں نے درگاہ ایزدی میں دعا مانگی کہ جس وقت مقدمہ میں مظہری علی کو کامیابی ہوگی تو مسجد میں نیاز کروں گی۔ چنانچہ جب خبر میری کامیابی کی جناب مقدسہ نے سنی تو مسجد میں طاق بھرا اور حافظ کرم احمد صاحب کے تعزیہ پر شربت وغیرہ محرم کی رات کو چڑھایا۔ یہ نظیر ایسی صاف ہے کہ اس سے ان کی محبت اور جوشِ مادری کا ثبوت کامل ہوتا ہے اور چونکہ جناب مقدسہ ہمیشہ میری نیک روشی چال چلن اور اطاعت سے خوش تھیں اور ہیں اس وجہ سے وہ تمام تر اپنے فرزند کو میرے مقابلہ میں ملزم اور خطاوار جانتی ہیں اور کسی قسم کا کوئی شک میری نسبت ان کو نہیں ہے۔ بحمد اللہ کہ ایسی پاک طینت اور منصف مزاج عورتیں بھی دنیا میں ہیں۔ ایسی حالت میں جس قدر شکریہ جناب مقدسہ کا ادا کیا جائے کم ہے جن کو اپنے فرزند اکلوتے کے مقابلہ میں مجھ سے کہیں زیادہ محبت ہے۔ یہ محض تائید ایزدی ہے ورنہ اس قسم کی محبت اور ہمدردی اس زمانہ میں نایاب ہے۔

بیٹوں کی تعلیم: ۳۰ ستمبر ۱۸۸۸ء۔ آج برخوردار ان مجتبیٰ علی و ارتضیٰ علی و مرتضیٰ علی کو گیارہ بجے دن کی ریل میں لکھنؤ بھیجا کہ مدرسہ جوبلی میں انگریزی پڑھیں اور مکان مشک گنج مملوکہ مشیر الزماں میں جو مدرسہ سے قریب ہے قیام رکھیں اور علاوہ مصارف پارچہ و جوتا و خرید کتب وغیرہ مبلغ ۴۵ روپے ماہواری ان کے صرف خور و نوش کے واسطے بشمول صرفہ برخوردار مصطفےٰ علی (جو کیننگ کالج میں لا لیکچر سنتے ہیں) مقرر کر دیے۔ چونکہ چاروں بھائی ایک ہی مقام پر رہیں گے غالباً خرچ میں کفایت ہو۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ حصول علم سے ان کو فیض یاب کرے۔ اگرچہ میں ایک سال زائد سے بیکار ہوں لیکن تعلیم اطفال کے واسطے مجھے صرف کرنے میں ہرگز کوئی دریغ نہیں۔ آئندہ ان کا مقدر۔ برخوردار مصطفےٰ علی کی ترک ملازمت اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ ضلع ہردوئی سے مجھے اب تک تاسف ہے کیونکہ جو شخص ان کی جگہ مقرر ہوا ہے وہ اس نوکری پر مستقل ہو گیا اور چالیس روپے ماہواری پاتا ہے۔ معلوم نہیں کہ اب ان کا مقدر کب یاوری کرتا ہے۔ تجربہ ہے کہ از خود روزگار چھوڑنے سے بمشکل روزی ملتی ہے۔

کھنکھجورا: ۷ اکتوبر ۱۸۸۸ء۔ دو بجے رات میں سو رہا تھا ایک کنکھجورے نے میری بائیں ہنسلی میں ایسا کاٹا کہ خواب مفقود اور سوزش سے پریشان ہو گیا۔ وہ موذی اسی وقت مارا گیا جو رضائی میں لپٹا تھا۔ یہ پہلا مرتبہ ہے کہ مجھے اس سے ضرر پہنچا۔ اس کی سوزش مساوی نیش بھڑ کی ہوتی ہے۔ مقام ماؤف پر استعمال عرقِ پیاز سے افاقہ ہوا جو اس کا مجرب علاج ہے۔

ہر دل عزیزی: ۱۰ اکتوبر ۱۸۸۸ء - آج کل منشی فضل حسین کسی کو نوکر رکھتے ہیں تو اولاً اس سے اقرار لیتے ہیں کہ مظہر علی (یعنی راقم) کے مکان پر نہ جانا اور نہ اس سے کوئی تعلق رکھنا یا ملاقات کرنا - ان کا یہ ظن غالب ہے کہ ان کے ملازمین موقوف شدہ اعلانیہ اور اکثر خفیہ مجھ سے رسم رکھتے ہیں اور میرے خیر خواہ ہیں اور عموماً کل باشندگان سندیلہ کی نسبت انھیں خیال میری ہمدردی کا ہے اور تعجب کرتے ہیں کہ یہ مرتبہ باوصف تعلقہ دار ہونے کے مجھے کیوں حاصل نہیں ہے - یہ خیالات منشی صاحب بجائے خود درست نہیں ہیں - یہ بات صرف تعلقہ دار یا صاحب دولت ہونے سے حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ یہ رنگ ہی دوسرا ہے جو ہر شخص کو سرسری طور سے نصیب نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اپنے نفس پر اس قدر قابو نہ ہو کہ لوگوں سے بہ لحاظ ان کی منزلت و مرتبہ حال کے پیش آنا - ان کے مقاصد متوجہ ہو کر سننا اور انجاح مرام میں دریغ نہ کرنا - اس کے حق میں بوقت موقع کلمۂ خیر بولنا - بوقت استفسار ان کو صلاح نیک دینا کسی حاجت مند کو بہ ترش روئی جواب نہ دینا اور خاص خاص حالتوں میں ان کی دردمندی کرنا - اکثر موقع پر ضبط و تحمل کو روا رکھنا - دشمن کے ساتھ حتی الامکان دوستی کا برتاؤ کرنا اور جب عاجز و معذور ہو تو انتقام نہ لینا - بعض محل پر مصلحتاً اپنا نقصان جائز رکھنا - ہر ایک سے بلا کسی قید کے بہ اخلاق و محبت پیش آنا - نیک نیتی و خوش چلنی اختیار کرنا - ایفائے وعدہ میں کوشش کرنا - غلط بیانی سے احتراز کرنا - امور معاملاتی میں لغویت کو راہ نہ دینا - سوچ سمجھ کر بات کہنا - بلاوجہ کسی کی غیبت یا ہجو نہ کرنا - دشمنوں کے گھٹانے میں توجہ بلیغ رکھنا - اپنے اختیار و اقتدار پر مغرور نہ ہونا - مسلک صلح کل اختیار کرنا - جب یہ باتیں اختیار کی جائیں تو اس وقت مرتبۂ ہر دل عزیزی حاصل ہو سکتا ہے - اگرچہ ان سب پر میں ہنوز قادر نہیں ہوں لیکن کوشش کرتا ہوں کہ اپنے نفس کو اس جانب راغب کر سکوں -

مفید العدالت: یکم نومبر ۱۸۸۸ء - آج ایک کتاب قانون فوجداری موسومہ 'مفید العدالت' مولفہ منشی غلام حیدر خاں صاحب جائسی، سب جج ضلع سلطان پور جس میں علاوہ نظائر مجموعہ تعزیرات ہند و ضابطہ فوجداری وغیرہ بھی شامل ہیں اور کارروائی عدالتی کو اس سے بہت مدد مل سکتی ہے مطبع نولکشور لکھنؤ سے منگائی (قیمت دو روپے خرچہ آٹھ آنے) - جہاں تک بادی النظر میں دیکھا گیا یہ کتاب کارروائی عدالت کے لیے بہت مفید ہے جس کی روزمرہ احتیاج رہتی ہے - علاوہ حوض کے ضروری قانون حاشیہ پر درج ہیں -

مجتبیٰ علی: ۲۸ نومبر ۱۸۸۸ء طبیعت برخوردار مجتبیٰ علی کو ہنوز عارضہ لاحقہ بول فی الفراش سے افاقہ نہیں ہے - ہر چند معالجہ میں زر کثیر صرف کیا گیا اور ہو رہا ہے لیکن ہنوز روز اوّل ہے - اب حکیم حیدر علی

صاحب لکھنؤ نے تجویز کیا ہے کہ اگر پندرہ روپے نقد دیے جائیں تو ایک چہارم نسخہ کا دضماد کا تیار کرا دیا جاوے تو اس کے استعمال سے بالضرور فائدہ ہوگا اور یہ نسخہ مجرب ہے جس کے استعمال سے ایک شاہزادے کو نفع معتد بہ حاصل ہوا تھا۔ چنانچہ میں نے برخوردار موصوف کو پندرہ روپے دیے اور ہدایت کی کہ لکھنؤ جا کر نسخہ تیار کرا دیں اور استعمال کریں شافی مطلق اس نسخہ سے شفا کامل عطا کرے۔ چونکہ لڑکا نہایت سعید نیک بخت مطیع و ہر دل عزیز ہے اس وجہ سے میری طبیعت کو اس سے زیادہ اُنس ہے اور عموماً کل اہل محلّہ اس سے از بس محبت رکھتے ہیں۔

ایک رمال: ۱۲ر دسمبر ۱۸۸۸ء۔ آج گلاب شاہ رمال ساکن پاک پٹن وجاروب کش درگاہ حضرت شیخ فرید شکر گنج قدس اللہ سرہٗ ملک پنجاب میری ملاقات کو آئے اور بعد بنانے زائچہ کے مجھ سے کہا کہ تمہارا مقصد یاور ہے۔ تا بہ زیست خوش حالی سے بسر کروگے اور مدت دو مہینہ میں تمہاری بہبودی حسب خواہش ہوگی اور تمہارا چھوٹا لڑکا مرتضیٰ علی بہت بڑا خوش نصیب ہوگا اور تمہارے اعزاز و ثروت سے اس کا مرتبہ بلند ہوگا[1]۔ لہٰذا یہ مضمون بطور آزمائش حوالہ قلم کرتا ہوں کہ ان احکام کا کہاں تک ظہور ہوتا ہے لیکن جو حالات گزشتہ رمال صاحب نے میری اور دوسروں کی نسبت بیان کیے وہ سب صحیح معلوم ہوتے ہیں۔

خواب خوش: ۲۰ر جنوری ۱۸۸۹ء۔ آج کئی روز سے بہ شب خواب ہائے خوش نظر آتے ہیں۔ دو روز سے تو اپنے کو بمقام بلند اور گھوڑے پر سوار دیکھا اور آج صبح ہاتھی عماری دار پر سوار اور ہمراہی میں بہت سا مجمع اور جلوس نظر آیا۔ دیکھیے کہ اس کا ظہور کب ہوتا ہے۔ میں اپنی عقیدت سے لکھتا ہوں کہ میرے خوابوں کا ظہور کبھی دیر کبھی جلد ضرور ہوتا ہے جس کے امتحانات اور تجربے متواتر ہو چکے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں لیکن ابھی تک یہ امر امتحان طلب ہے کہ کس موسم و تاریخ و دن کا خواب سریع الظہور اور بطئی الظہور ہوتا ہے۔

انتزاع: ۱۸ر مارچ ۱۸۸۹ء۔ جو عرضی بندگان خدا کی طرف سے بہ شکایت منشی مقبول احمد تحصیلدار سندیلہ بذریعہ صاحب کمشنر بحضور صاحب ضلع ہردوئی پیش ہوئی اس کی نسبت صاحب ضلع کو فضل حسین اور ان کے مختار محمد یحییٰ پر شک ہوا۔ لہٰذا صاحب بہادر نے بعد اظہار ناراضگی محمد یحییٰ کو عرائض نویسی تحصیل سندیلہ سے برخاست کر دیا۔ یہ عجیب کارروائی ہوئی کہ بندہ خدا کی عرضی اور معزولی محمد یحییٰ۔ میں جہاں تک خیال کرتا ہوں تو یہ نتیجہ محمد یحییٰ کے اس ظلم کا ہے جو انھوں نے حافظ باسط علی واجب الرحم کو ۱۰ر مارچ سن الیہ کو صدمہ پہنچایا اور اس ظلم و ستم رسیدہ نے آہ سرد کھینچ کر اور سنگ شکیبائی اپنے سینہ بے کینہ پر خواہاں دادرسی اپنے منتقم

---

[1] یہ بات بعد میں صحیح ثابت ہوئی۔ مرتضیٰ علی صاحب ریاست بھوپال میں جج ہائی کورٹ ہو گئے تھے۔ ہاشمی

حقیقی سے ہوا جو استدعا فوراً مستجاب ہوئی جس کی تصدیق اس شعر سے ہوتی ہے ؎

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن — اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید

وصیت نامہ: ۵ مئی ۱۸۸۹ء - آج میں نے ایک وصیت نامہ بنام اپنے جانشین کے تحریر کیا کہ بعد میرے اسی کے بموجب عمل درآمد ہونا چاہیے اور جو وصیت نامہ میں نے ۱۷ جولائی ۱۸۷۹ء کو تحریر کیا وہ قابل نفاذ نہیں رہا۔ وصیت نامہ بنام میری اہل خانہ مسماۃ شمس النساء ہے جو بعد میرے مالک جائداد ہوں گی۔

شجرۂ خود: ۱۴ مئی ۱۸۸۹ء - شجرہ مندرجہ ذیل سے راقم کی سولھویں پشت مخدوم سید علاء الدین قدس اللہ سرہٗ العزیز سے ہے۔ آپ ہی کے صرف ذاتی کے لیے موضع مخدوم پورہ معاف ہوا تھا جب سے اسی حالت میں چلا آتا ہے۔ پشت نامہ:

" سید مظہر علی بن سید مظفر علی بن مولوی سید الٰہی بخش (عرف میر جیون) بن سید محمد بخش بن سید محمد اکرم بن سید محبوب عالم بن مولوی سید موسیٰ بن سید ابوالمعالی بن سید عبدالحی بن سید بندگی شیخ حسن بن سید احمد بن سید لاڈ بن سید مصطفیٰ بن سید بجن بن سید مجیرالدین بن مولوی سید علاء الدین قدس اللہ سرہٗ العزیز۔"

مجتبیٰ علی پسر خود: ۲۹ مئی ۱۸۸۹ء - آج برخوردار مجتبیٰ علی نے اپنے ہم سنوں کو روزہ کھلوایا۔ افطاری بہت تیار ہوئی تھی۔ اس لڑکے کے مزاج میں صلاحیت اخلاق عامہ ہے۔ کل ہمسن اس سے محبت رکھتے ہیں اور سلسلہ آمد و شد جاری رہتا ہے اور ان کے وسعت اخلاق سے کوئی ناخوش نہیں جاتا۔ علاوہ بریں اہل محلہ کے تمام مرد و زن ان کی روش و چلن کا اعتبار کرتے ہیں اور بدرجہ غایت رضامند ہیں۔ خدا نصیب و رکرے۔ یہ مرتبہ ہر دل عزیزی کا برخوردار مصطفےٰ علی کو حاصل نہیں ہے۔

مجسٹریٹی درجہ دوم: ۱۴ جون ۱۸۸۹ء - آج ڈاکٹ سکریٹری گورنمنٹ محکومہ ۸ جون ۱۸۸۹ء نمبری ۱۲۶۱ بدیں مضمون موصول ہوا کہ راقم اور راجہ درگا پرشاد صاحب تعلقہ دار کو اختیارات مجسٹریٹی درجہ دویم اندر حدود میونسپل سندیلہ عطا ہوئے۔ بدریافت اس حال کے شکر خدا بجالایا کہ اس نے اپنے حبیب کے طفیل سے مجھ ناقابل کو ایسے اختیارات جس کی بڑے بڑے لوگ تمنا رکھتے ہیں عطا فرمائے اور میرے ہم چشموں میں مجھے تفاخر بخشا۔ یہ نتیجہ کرنیل بیچر صاحب ڈپٹی کمشنر ہردوئی کی عنایت کا ہے۔ آج حاسدوں کو میرے اس حصول اعزاز سے نہایت درجہ قلق اور ملال ہوا۔

چند کتب: ۳ جولائی ۱۸۸۹ء - آج کتاب "مطلع العلوم و مجمع الفنون" مسٹر کلارات صاحب جو ڈیشیل

ن ابتدائے ۱۸۶۲ء لغایت ۱۸۷۱ء و نظائر قانون فوجداری بابت ۱۸۷۸ء مطبع نولکشور لکھنؤ و نظائر ہند
ہ آباد سے جن کی قیمت حسب ذیل ادا کی گئی، منگائے۔ 'مطلع العلوم و مجمع الفنون' ایک جلد ڈھائی روپے
کلرات سوا روپے۔ نظائر سوا روپے محصول وغیرہ بارہ آنے۔ جملہ پانچ روپے بارہ آنے۔

عید الضحیٰ: ۸ راگست مطابق ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۰۶ھ - آج بہ تقریب عید الضحیٰ میرے مکان پر باشندگان
نریلہ کا مجمع کثیر رہا اور مجھے اپنے عنایات واشفاق سے مشکور کیا۔ مبلغ گیارہ روپے سوا تیرہ آنے انعام وغیرہ
یں صرف ہوئے اور میں اس بات کا نہایت شکر گزار ہوں کہ باوجودیکہ میں نہایت ناچیز و کم سرمایہ آدمی ہوں
یکن روسائے قصبہ ہذا مجھے نہایت نگاہ وقعت سے دیکھتے ہیں اور میرا اعزاز کرتے ہیں۔ پروردگار عالم تا حیات میری عزت اور وقعت برقرار و قائم رکھے!

اودھ اخبار: ۱۰ راگست ۱۸۸۹ء - اودھ اخبار منشی نولکشور کی خریداری کے لیے بعوض مبلغ بیس روپے
سالانہ میونسپل کمیٹی سے منظور ہو گئے۔ لہٰذا آج زرِ مذکورہ بذریعہ منی آرڈر بخدمت صاحب مطبع لکھنؤ
بھیجا گیا کہ ۱۲ راگست سن الیہ سے روزانہ پرچہ بھیجا کریں جو میرے نام سے آیا کرے گا۔

گھڑیاں: ۱۳ راگست ۱۸۸۹ء - آج چھ گھڑیاں دوکان فیور لو با کمپنی بمبئی سے اپنے
ور اپنے احباب کے واسطے بہ قیمت ترانوے روپے منگائیں جس پر خرچہ حسب ذیل واجب ہوا۔
یمت گھڑی ۹۳ روپے، محصول ڈاک و فیس منی آرڈر دو روپے، محصول اگڑائی ایک روپیہ دو آنہ
ٹھ پائی۔ تفصیل خریداران گھڑی۔ راقم، راجہ درگا پرشاد کنور رنرنار بہادر صاحب تعلقہ دار (دو گھڑیاں)
ودھری جاوید علی صاحب، مولوی عبد القادر صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر نواب گنج۔

۱۰ محرم ۱۳۰۷ھ: ۷ ستمبر ۱۸۸۹ء بخلاف معمول آج میں واسطے زیارت و دفن تعزیوں کے
کربلا نہیں گیا۔ اوّل تو گرمی تھی دوسرے طبیعت بالکل متوجہ نہ ہوئی۔ تنکر و خدمتگار قاضی عابد علی صاحب سے معلوم
ہوا کہ امسال قصبہ ہذا میں ۶۹ تعزیے رکھے گئے۔

تلفظ زبان انگریزی: ۸ راکتوبر ۱۸۸۹ء - میں کثرت کام میونسپل سے بہت عدیم الفرصت
ہوں۔ حتیٰ کہ اگر تھوڑا سا وقت ضائع ہوتا ہے تو کمال افسوس معلوم ہوتا ہے۔ اور جس وقت کام سے
فرصت ملی تو فوراً نوشت و خواند انگریزی میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ شب کو میر حسین علی ماسٹر انگریزی
واسطے تعلیم انگریزی زبان کے بالمرّہ آتے ہیں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ تلفظ انگریزی میں ایک مہینہ کی محنت
سے بہت کچھ ترقی حاصل ہوئی۔ اگر چندے یہی شغل رہا تو مجھے انگریزوں سے زبان انگریزی میں گفتگو کرنا

دشوار نہ ہوگا۔ خدا میری خواہش کی تکمیل کرے۔

<u>قاضی ابوالحسن</u>: ۶ر نومبر ۱۸۸۹ء۔ آج قاضی ابوالحسن ولد قاضی اقتدار علی رحومیرے حقیقی خالہ زاد بھائی ہیں اور میں ان کا ہر حالت میں ان کا دوست اور بہی خواہ رہا) میری عیادت کو آئے اور بہ رسم ظاہری خیریت دریافت کی۔ جب سے مفسدوں نے میرے اور منشی فضل حسین کے درمیان میں ملال پیدا کرا دیا اور میں تعلقہ جلال پور سے علٰحدہ ہوا تو قاضی صاحب نے بھی میرے یہاں کی آمد و رفت و شرکت شادی و غمی ترک کردی تھی۔ آج نہیں معلوم کہ کیا دنیا گزرتے دیکھی جو انھوں نے ایسا ارادہ کیا۔

<u>نقشہ ہندوستان</u>: ۴ر جنوری ۱۸۹۰ء۔ آج ایک نقشہ جس میں انگریزی فارسی ہندی میں نام شہر و قصبہ وغیرہ درج ہیں بہ قیمت ڈھائی روپے و بہ صرف تین آنہ تین پائی خرچہ محصول وغیرہ مطبع الٰہ آباد سے منگایا۔ یہ نقشہ عمدہ ہے، رنگ و روغن سے آراستہ و مرتب اور جس قدر ریلیں اس وقت تک جاری ہوئی ہیں ان سب کا سلسلہ اس میں موجود ہے اور اسی قسم کا ایک نقشہ راجہ کنور نرندر بہادر صاحب اور ایک منشی فہیم الزماں صاحب کو منگا دیا۔

<u>گھوڑا کمیت</u>: ۱۰ر جنوری ۱۸۹۰ء۔ آج راقم اپنے گھوڑے کمیت پر اوّل مرتبہ سوار ہوا اگرچہ چال درست نہیں ہے لیکن بہت شائستہ چالاک مادہ قدم بازی اس میں موجود ہے۔ شاہ گام بہت تیزی سے چلتا ہے۔ سائیس وغیرہ دوڑے بغیر اسکے ساتھ نہیں پہنچ سکتے۔ اگرچہ کوئی چابک سوار اسے درست کریگا تو بہت خوش رفتار ہوگا۔

<u>رشتہ پسر خود</u>: ۲۱ر جنوری ۱۸۹۰ء۔ آج خط مولوی نصیر الدین تعلقہ دار میہ پور ضلع بارہ بنکی بجواب تحریر راقم مورخہ ۲ر جنوری سن الیہ مقام لکھنؤ محلہ نیا گاؤں سے بدیں مضمون موصول ہوا کہ بوجہ قرابت قدیم نسبت برخوردار سید مجتبیٰ علی اپنی لڑکی سے بدل منظور ہے اور بمقابلہ رشتہ داری جدید کے رشتہ قدیم کو ترجیح ہے۔ چونکہ میرا قیام لکھنؤ میں رہتا ہے اس وجہ سے آپ ایک روز آکر مجھ سے ملاقات کریں جس کی اطلاع پیشتر سے دیں۔ چنانچہ بوصول تحریر ہذا کمال ہی اطمینان ہوا اور آج شام کی ریل میں منشی وزیر علی اپنے داروغہ خاص کو معہ تھوڑی شیرینی کے بغرض استدراک خیریت تعلقہ دار صاحب لکھنؤ روانہ کیا۔

<u>توصیفی سند</u>: ۲۰ر اپریل ۱۸۹۰ء۔ سید علی بہادر صاحب تحصیلدار سندیلہ و پریسیڈنٹ میونسپل سندیلہ نے وقت تحریر رپورٹ سال تمام میونسپل کے میری نسبت یہ لکھا کہ سید مظہر علی سکتری میونسپل کام سکتری کا تنخواہ دار ملازم سے زیادہ مستعدی سے کرتا ہے۔ ایسا ایمان دار و معتبر شخص ممالک متحدہ میں کوئی نہ ہوگا۔ حکام ضلع کو ان کی کارروائیوں کی قدر کرنا چاہیے۔

حاجی وارث علی شاہ: ۵ مئی ۱۸۹۰ء۔ آج صبح کو حاجی وارث علی شاہ صاحب رئیس دیوا نے بطیب خاطر خود مجھے یاد کیا۔ میں فوراً مکان عبدالعلی موسیٰ پور میں جا کر قدم بوس ہوا۔ شاہ صاحب نے خلاف عادت خود سر و قد میری تعظیم کی اور نہایت تپاک سے اپنے قریب مجھے بٹھلایا اور بعد دریافت خیریت و امور معمولی کے رخصت کیا۔ وجہ طلب میری سمجھ میں نہیں آئی۔ شاہ صاحب نہایت مکرم و محترم بزرگ ہیں۔ ہزارہا مرد و زن دیہہ بدیہہ، شہر بہ شہر آپ کے مرید ہیں۔ آپ سوائے مریدوں کے اور کسی سے ملاقات کم کرتے ہیں۔ یہ محض آپ کی توجہ و عنایت خاص ہے جو اس صورت سے راقم کو اعزاز بخشا۔

ٹھاکر کھڑگ سنگھ: ۷ مئی ۱۸۹۰ء۔ آج صبح کو ٹھاکر کھڑگ سنگھ ولد بھوپ سنگھ زمیندار موضع ہیا بعارضہ حبش شفاخانہ سندیلہ میں فوت ہوئے۔ عمر ۵۲ سال تھی۔ ابھی بہت تندرست و توانا تھے۔ راقم سے از بس ربط تھا۔ جب کبھی سندیلہ آتے تو بدون میری ملاقات کے واپس نہیں جاتے تھے اور ان کو بھی مجھ سے از بس تقویت تھی۔ جب کل گاؤں سے سندیلہ آئے تھے تو میں نے ٹٹی خس و دیگر سامان ضروری ان کی آسائش کے واسطے بھیج دیا تھا۔ افسوس کہ دنیا کو مطلق ثبات نہیں۔ دم زدن میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔

تعلقہ دار بھراون: ۲۰ مئی ۱۸۹۰ء۔ آج صبح کو راجہ مادھو سنگھ تعلقہ دار بھراون (تحصیل سندیلہ) میری ملاقات کو تشریف لائے اور قریباً دو گھنٹہ نشست رکھ کر ہر ایک امر متعلق ریاست مجھ سے مشورت کرتے رہے ..... راجہ صاحب میری ملاقات سے بہت اظہار مسرت کرتے رہے اور بوقت ضرورت نیک صلاح دینے کا اقرار لیا۔ شب کو میں نے بھی باغ پڑاؤ ملاقات باز دید کی۔

ایک حادثہ: ۲۷ مئی ۱۸۹۰ء۔ آج بوقت شام راقم واسطے معائنہ نہر جدید کے گیا۔ جس وقت نہر مذکور کو موقوعہ باغ نثار علی وکیل عقب مسجد کفر توڑ معائنہ کر رہا تھا دفعتاً میرا گھوڑا پچھلے پیروں سے نہر میں پھسل پڑا اور اس کے ساتھ میں نہر میں گرا جو سطح زمین سے پانچ چھ فٹ گہری تھی لیکن شکر ہے کہ میں بالکل ضرر جسمانی سے محفوظ رہا اور گھوڑے کو بھی کوئی آسیب نہیں پہنچا اور پھر اسی وقت سوار ہو کر اور ہر ایک کام متعلقہ کو دیکھتا ہوا قریب آٹھ بجے مکان پر آیا۔ جب تک یہ غلغلہ تمام قصبہ میں پھیل گیا اور ہر ایک احباب و اعزہ کی جانب سے پیغام استدراک خیریت گیارہ بجے رات تک آئے۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔

انگریزی الف لیلہ: ۳۰ مئی ۱۸۹۰ء۔ آج کل دو ہفتہ سے انگریزی الف لیلہ میرے مطالعہ میں ہے بعد تناول طعام دوپہر کو اس کے دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ منظور ہے کہ ایسی کتب کی مزاولت سے اس قدر استعداد ہو

پہنچاؤں کہ بلا توقف حکام وقت سے کلم (خط و کتابت) کر سکوں۔ ہر ناکی لیاقت کا موقوف ہے کہ حکام وقت کی زبان سے واقف رکھے۔

تیاری نہر و پل: ۲ر جون ۱۸۹۰ء۔ آج کل مجھے کام تیاری نہر و پلوں سے سخت تکلیف ہے۔ باوصف شدت گرمی ایک دو میل واسطے معائنہ کام کے جاتا ہوں اور بہ مستعدی کامل حساب و کتاب اس کا جانچتا ہوں۔ خدا تکملہ ان کا بخیر کرے۔ میری ذات کو اس مشقت سے بجز اس کے اور کوئی فائدہ نہیں کہ پندرہ بیس شریف آدمی بہ زمرۂ میٹان کام میں متعلق رہتے ہیں اور مجھے دعائے خیر سے یاد کرتے ہیں۔

ملازمت میونسپلٹی: ۱۴ر جون ۱۸۹۰ء۔ اگرچہ سلسلہ ملازمت میونسپل سندیلہ مجھے حاصل نہیں ہے لیکن اس کام کو اس قدر مشقت و دیانت سے سرانجام کرتا ہوں کہ شاید کوئی ملازم بھی نہ کرتا اور کام کی کثرت بوجہ تیاری نہر کربلا دربرونی کے اس قدر رہے کہ کوئی وقت فرصت نہیں ملتی۔ اکثر میرے اعزہ و باشندگان قصبہ معترض ہیں کہ یہ مفت زحمت اپنے سر کر لی گئی جس کا بظاہر کوئی نفع نہیں۔ لیکن میرے خیالات ان کے بالکل مخالف ہیں۔ اگرچہ یہ مسلم ہے کہ اس کام کو کر لینے سے میرا سردست کوئی ذاتی فائدہ نہیں لیکن یہ بہت بڑا نفع خیال کرنے معلوم ہو سکتا ہے کہ اسی کام کی بدولت رؤسائے قصبہ ہذا خصوصاً و تمامی باشندگان سندیلہ عموماً مجھے نگاہ عزت سے دیکھتے ہیں اور اکثر ان کے مقاصد میری توجہ سے طے ہوتے ہیں۔ بہت سے اشخاص میرے ذریعہ سے متفرق کاموں پر مقرر ہیں جن کا تمام خاندان میرے حق میں دعائے خیر کرتا ہے اور میری ان پر حکومت کامل ہے۔ قصبہ ہذا میں عام طور پر و نیز ملازمان میونسپل و پولس پر میری حکومت ہے جو رتبہ کسی رئیس اعظم کو بھی حاصل نہیں۔ یہ کام بہت بڑا ذریعہ ملاقات حکام وقت ہے جس سے توسط کی کوئی ضرورت نہیں اور جب کام بلا عذر کیا جاتا ہے تو ہر خواہش کا تکملہ بمقابلہ دیگر رؤسائے قصبہ بہ آسانی ہو سکتا ہے۔ جو ضرورتیں بہ زمانہ قریب میں پیش آمدنی ہیں اگر میری رائے غلطی پر نہ ہو تو ایسے کار سرکاری کا انصرام بوجوہ مفصلہ صدر میں اپنے ذمہ فرض تصور کرتا ہوں۔

وزن: ۲۰ر جولائی ۱۸۹۰ء۔ آج اسٹیشن سندیلہ پر تفریحاً ہم لوگوں نے اپنے اجسام کو تنک (کذا) میں وزن کرایا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

چودھری محمد رؤف صاحب ولد چودھری حشمت علی تعلقدار۔ دو من ۲۶ سیر، شیخ اعظم علی ولد کریم کریم صاحب مرحوم۔ دو من ۲۷ سیر، راجہ درگا پرشاد صاحب تعلقدار سرون بڑا گاؤں۔ دو من ۳ سیر، منشی فضل حسین صاحب تعلقدار جلال پور۔ دو من، شیخ رعایت حسین صاحب وکیل ہردوئی۔ ایک من ۳۴ سیر، کنور جوالا پرشاد صاحب ولد راجہ دھنپت رائے صاحب تعلقدار حال پیشکار سندیلہ ایک من ۱۸ سیر، راقم روزنامچہ ہذا۔ ایک من ۱۲ سیر۔

متعلقین خود: ۵ر اگست ۱۸۹۰ء - بالفعل ۲۵ مرد و عورت کا دو وقتہ صرف کھانے و پینے کا میرے متعلق ہے اور ملازمین جو خشک تنخواہ پاتے ہیں ان سے کوئی علاقہ نہیں۔ اس قدر صرف کبیر عہد ملازمت میں بھی نہیں تھا۔ گھٹانے کی کوئی فکر نہیں ہوسکتی۔ اگر کی جائے تو بدنامی ہے۔ انسان کو لازم ہے کہ ایسا صرف جس کے آئندہ گھٹانے میں نتیجہ برا پیدا ہونے والا ہو اس کا انسداد اول ہی سے ملحوظ رکھے ورنہ سخت دشواری ہوگی۔ بقول سعدی ؎ مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست۔

راجہ درگاہ پرشاد: ۹ر ستمبر ۱۸۹۰ء - آج صبح کو راجہ درگا پرشاد صاحب تعلقہ دار سردن (پرتاب گڈھ) کی میں نے ملاقات کی۔ بڑی محبت سے پیش آئے۔ راجہ صاحب کے مزاج میں از بس تہذیب ہے اور اپنے وقار موروثی کا بدرجہ غایت لحاظ۔ جب میں ملاقات کو جاتا ہوں تو بوقت رخصتی اپنے دیوان خانہ سے تا لب چبوترہ بیرونی میری مشایعت کرتے ہیں۔

شکایت ضعف معدہ: ۱۳ر اکتوبر ۱۸۹۰ء - علاوہ شکایت ضعف معدہ اب دو روز سے مجھے حرارت بھی محسوس ہوتی ہے۔ چونکہ علاج ڈاکٹری کرتے کرتے تنگ آ گیا لہذا رائے جمہور خاندان راقم یہ قرار پائی کہ کچھ علاج بغرض استعانت طبع کرنا ضروری ہے لہذا حکیم ظہور الحسن طبیب میونسپل کا آج علاج یونانی شروع کیا۔ بوجہ پیدا ہونے گرمی کے معدہ میں خواہش بھوک بالکل مفقود ہوگئی۔ کسی چیز کی رغبت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی لقمہ مونہہ میں رکھا گیا تو اس کا حلق سے اترنا دشوار ہو جاتا ہے۔

۳ر نومبر ۱۸۹۰ء - آج سید علی بہادر تحصیلدار سندیلہ و کنور جوالا پرشاد پیشکار و جملہ اہلکاران تحصیل و مہاجنان وغیرہ و راجہ درگا پرشاد و چودھری محمد رؤف صاحب میری عیادت کو تشریف لائے اور ممنون کیا۔

۷ر نومبر ۱۸۹۰ء - آج ۱۱ بجے دن کے منشی سید فضل حسین صاحب تعلقہ دار میری عیادت کو آئے اور قریب دو گھنٹے کے نشست کی اور نہایت تپاک و محبت سے پیش آئے گویا کبھی کوئی ملال ہی نہ تھا۔ یہ رسم مکمل منشی صاحب سے بعد تین سال چار ماہ دس دن کے قائم ہوئی۔ بمشکل قائم رہ سکے کیونکہ ملک مصطفی حسین مالکانہ دار میر حسن پسر خوش رنگ کو (جو بالفعل مصاحب خاص ہیں) سخت ناگوار ہوگا اور بہ جدے کوشش کریں گے کہ بار دیگر ملال کرا دیں اور حسین علی قلتبان مصاحب خاص دار روغہ کا قریباً یہی حال ہوگا۔ دیکھنا چاہیے کہ اس میل کا کیا نتیجہ نکلے۔ چونکہ منشی فضل حسین کو اپنی طبیعت پر قابو نہیں ہے اور دوسروں کی رائے کے محتاج ہیں اس وجہ سے ان کے خیالات پر بھروسا نہیں ہوسکتا۔

۱۳ر نومبر ۱۸۹۰ء۔ میرا مزاج صفراوی ہے اور گرمی مزاج میں رہتی ہے اور علاج ڈاکٹری عموماً گرم ہوتا ہے اسی وجہ سے باوصف توجہ خاص بابو سالک رام اسسٹنٹ سرجن سندیلہ مجھے افاقہ نہیں ہوا اور مادہ ناقص معدہ وغیرہ میں محتبس ہو کر باعث لحوق اشتہا ہوا جس سے حرارت و تپش پیدا ہو گئی۔ اب بالآخر علاج یونانی مجوزہ حکیم ظہور الحسن طبیب میونسپل سندیلہ سے افاقہ ہوا اور رب العنایت و بفضل یزداں شکایت ضعف معدہ بھی دور ہوتی جاتی ہے۔

مصاحبین فضل حسین: ۲۶ر نومبر ۱۸۹۰ء۔ جب سے منشی فضل حسین صاحب تعلقہ دار نے مجھ سے میل کیا ہے ان کے مصاحبین کو از حد ملال ہے علی الخصوص ملک مصطفےٰ حسین ملکانہ وامیر حسن پسر خوش رنگ کنیز و حسین خان قلقبان کے دلوں میں ہول پیدا ہو گیا ہے۔ کوئی وقت چین نہیں آتا مصطفےٰ حسین تو ہر وقت دعا تعویذ کراتا پھرتا ہے اور دعا طلبوں کی تلاش میں سرگرداں ہے کہ کوئی ایسا عمل کرا دے کہ مجھے ضرر پہنچے اور منشی صاحب کا رجحان میری جانب نہ ہو۔ مجھے تو پورا بھروسا اپنے خالق پر ہے کہ بدون اس حکم کے کوئی ذرہ حرکت نہیں کر سکتا۔ جو کچھ وہ چاہتا ہے کرتا ہے اور جو چاہے گا وہ ہوگا۔

خالہ خود: ۲ر دسمبر ۱۸۹۰ء۔ آج جناب خالہ صاحبہ والدہ منشی سید فضل حسین صاحب تعلقہ دار نے مجھے معتبر ذریعہ سے کہلا بھیجا کہ شادی الطاف رسول خلف منشی صاحب کی بارات میں جو ۱ر جمادی الاول ۱۳۰۸ھ (مطابق ۱۱ دسمبر ۱۸۹۰ء) کو خیرآباد جائے گی تو اس میں ضرور شرکت کرنا۔ سب سامان تمہارے آرام کا مہیا کر دیا جائے گا۔ میری زندگی کی اب امید قلیل ہے میری تمنا ہے کہ تمہاری اور برخوردار فضل حسین کی مصالحت کامل ہو جائے تاکہ وہ ملال جو تمہارے اور اس کے درمیان بدکرداروں نے ڈال رکھا ہے اپنے ساتھ قبر میں نہ لے جاؤں۔ سچ یہ ہے کہ جناب ممدوحہ کو میرا خیال از حد اور بدرجہ غایت مجھ سے الفت ہے۔ ایسے لوگ دنیا میں بہت کم ہیں۔

توصیف سرکاری: ۱۰ر دسمبر ۱۸۹۰ء۔ ایک قطعہ ڈاکٹ محکمہ جات سرکاری اضلاع مغربی و شمالی و اودھ نمبری ۱۱۷ محکومہ ۱۱ر نومبر سنہ الیہ مقام الہ آباد بدیں مضمون بنام راقم موصول ہوا کہ منشی سید مظہر علی نے بصرف مبلغ ۳ ہزار روپیہ باغ و کنواں بغرض رفاہ عام تعمیر کرایا اس وجہ سے حسب ہدایت جناب لفٹیننٹ گورنر بہادر ان کا نام دفتر سرکاری میں درج کیا گیا یہ وہ باغات و کنوئیں ہیں جو میں نے 'پرکاپور' ڈاک خانہ لشکر اور موضع 'بیگم گنج' میں تعمیر کیے ہیں۔ یہ ڈاکٹ آج موصول ہوا۔

علالت: ۱۴ر دسمبر ۱۸۹۰ء۔ آج مجھے چھ دست آئے۔ جس سے جس قدر طاقت ہفتہ گزشتہ میں آئی تھی سب زائل ہو گئی ضعف بے حد ہو گیا۔ یہ عارضہ ضعف معدہ کا مجھے ایسا لاحق ہو گیا ہے کہ غذا قلیل بھی ہضم

نہیں ہوتی۔ اب بظاہر اس عارضہ کا دفع ہونا دشوار معلوم ہے۔ ایسی طویل بیماری ابتدائے ہوش سے مجھے کم لاحق ہوئی۔ بہر حال رضی خدا پر راضی ہوں۔ جو منظور ہوگا وہی پیش آئے گا۔ اس بارہ میں کوئی محل تردد و کاوش کا نہیں ہے۔

بنچ مجسٹریٹی: ۳۰ دسمبر ۱۸۹۰ء۔ میں بہ باعث علالت و ضعف مزاج خود عدالت بنچ فوجداری سندیلہ میں شرکت نہیں کرتا اس وجہ سے میرے ساتھی ممبران بنچ انفصال مقدمات میں بباعث عدم واقفیت قانون کے نہایت تامل کرتے ہیں اور اگر احیاناً ایسا ہوا بھی تو بدون میرے استصواب کے کوئی حکم نہیں دیتے اور بالفعل شرکائے بنچ مجسٹریٹی راجہ درگا پرشاد صاحب و راجہ کنور زندر بہادر صاحب تعلقہ داران سروان بڑا گاؤں، و چودھری محمد رؤف صاحب خلف چودھری حشمت علی صاحب مرحوم ہیں۔

بہ تقریب شادی: ۱۰ جنوری ۱۸۹۱ء۔ میں بہ تقریب شادی نور چشم سید مجتبیٰ علی اپنے کل لڑکوں عزیزی سید اطہر علی (برادر خورد) و نور چشم اصغر علی (بھتیجا) و برخوردار سعید الدین (داماد) کے انگرکھا اطلس گرنٹ پھول دار ریشمی کے تیار کرائے جس کی قیمت فی درعہ ایک روپیہ ہے اور ہر ایک انگرکھے میں سات سات درعہ صرف ہوا اور ٹوپی گول مخمل اودی کامدار قیمتی چار چار روپیہ خرید کیں۔ علی ہذا پائجامہ مشروع چار روپیہ تھان والے کا نصف۔ اور کل اپنے ملازمین کے انگرکھے چکن پائجامہ مشروع حسب ان کی حیثیت کے بنواتے۔

۱۴ جنوری ۱۸۹۱ء۔ آج حسب تحریر حکیم عبد العزیز صاحب ولد مولوی نور کریم صاحب مرحوم دریابادی حال مدرس کیننگ کالج لکھنؤ کو لکھا گیا کہ آپ سواری ذیل کا بمقام نواب گنج (اسٹیشن بارہ بنکی) ۹ فروری سن الیہ کو بر وقت پہنچنے بارات کے بندوبست کر رکھیں جس کا کرایہ انعام دیا جائے گا۔

تسکرم ۴ عدد، ایکہ ۳ عدد، بہل ۴ عدد، اونٹ گاڑی ۳، ہاتھی ۳، گھوڑے ۴، اونٹ ۴، چھکڑہ ایک

علالت خود: ۲۵ جنوری ۱۸۹۱ء۔ چونکہ غذا کے دیکھنے سے بھوک بھاگتی ہے اور جو بہ مقدار قلیل ہوتی ہے وہ بھی ہضم نہیں ہوتی اور حرقت بول سے سخت تکلیف ہے لہذا حسب تجویز حکیم ظہور الحسن صاحب آج عمل لیا اور بباعث ابر و باد ہوا کا انسداد لٹکانے پردوں وغیرہ سے کیا گیا اور تین چار انگیٹھیاں روشن ہوئیں تاکہ سردی سے کوئی ضرر نہ پہنچے۔ دو بجے تیسرے عمل کے بعد بوجہ استیلائے گرمی و حبس ہوا کے غشی طاری ہوئی اور دو گھنٹہ تک کسی طرح سے آنکھ نہیں کھولی۔ ہذیان بکنے کا اتفاق ہوا۔ تمام اہل محلہ براہ ہمدردی جمع ہو گئے۔ جب پردے کھولے گئے اور آگ فرو کی گئی اور رشافیں لگائی گئیں تو حواس درست ہوئے۔ میری اس کیفیت سے ایک تلاطم پیدا ہو گیا تھا۔ نو بار اجابت ہوئی جس سے بہت سا مواد خارج ہوا اور بہ استثنائے حرقت بول اور سب

شکایتیں اسی روز دفع ہو گئیں۔ ایسی صورت میں خیال ہوتا ہے کہ اگر مسہل لیے جاویں تو ضرور فائدہ معتد بہ حاصل ہو سکتا ہے۔

۲۶ جنوری ۱۸۹۱ء۔ میری طبیعت کو آج افاقہ ہے۔ بظاہر کوئی شکایت معلوم نہیں ہوتی۔ اگر اسی طور سے افاقہ قائم رہا تو خدا سے امید ہے کہ ۶ فروری کو میں قابل جانے بارات نور چشم مجتبیٰ علی کے ہو جاؤں گا۔ اگرچہ فی الجملہ ضعف مسہل سے پیدا ہوا لیکن فائدہ کی امید زیادہ پائی گئی۔

تقریب شادی: ۲ فروری ۱۸۹۱ء۔ آج تقریب بسر دکذا) نور چشم مجتبیٰ علی بہ فراہمی اعزا کے خاص محلّہ قرار پائی۔ صرف رنگ قلیل نوشاہ پر بطور شگون ڈالا گیا اور رنگ کھیلنے کی رسم بباعث موسم سرد کے جائز نہیں رکھی گئی۔ آج نوید شرکت تقریب حسب معمول قدیم اور بہانے جوڑا ہائے مکلف کے بذریعہ نائن دھانٹن اہل برادری کو بھیجی گئی۔

۵ فروری ۱۸۹۱ء۔ آج شام کو اول بہ تقریب مکتب نور دیدہ منتظم حسین (پوتا) ولد برخوردار مصطفےٰ علی قرار پائی اور مولوی مہدی حسن صاحب ولد مولوی فضل حسین مرحوم نے مسجد قدیم میں بسم اللہ پڑھائی۔ بعدہٗ برخوردار مجتبیٰ علی کو کوٹھی راقم نو تعمیر میں مانجہ بٹھایا گیا جس تقریب کو منشی فضل حسین صاحب تعلقہ دار نے ادا کیا۔ تقسیم بتاشا بہت عنوان بایستہ سے ہوئی و با وصف مجمع کثیر کوئی متنفس حصہ پانے سے محروم نہیں گیا۔ صبح کو حسب ذیل جوڑے تقسیم ہوئے تھے (۷ اعداد تفصیل حذف کی گئی۔ ہاشمی) شب کو جلسہ رقص احاطہ راقم میں ہوا جس میں دو شامیانہ کلاں استادہ تھے اور تمامی روسائے قصبہ مسلمان و ہنود کا مجمع کثیر تھا۔ اکثر زمیندار وغیرہ دیہات سے بھی آئے تھے۔ طائفہ ذیل کا ناچ ہوا۔

فضل حسین کشمیری لکھنؤ بیس روپیہ یومیہ بسماۃ مقصود طوائف سندیلہ۔ سات روپیہ یومیہ مسماۃ احمدی جان طوائف سندیلہ۔ سات روپے یومیہ۔ جلسہ بہت اچھا ہوا جس سے حاضرین مسرور ہوئے اور اہل برادری کو طعام اعلیٰ درجے کا کھلایا گیا۔

۶ فروری ۱۸۹۱ء۔ یوم جمعہ علی الصباح عمدہ قسم کا کھانا بطور ناشتہ اصحاب ہمراہی بارات کو تقسیم کیا۔ گیارہ بجے دن کو بذریعہ ریل بہ جمعیت ڈھائی سو ہمراہیوں کے بارات روانہ ہوئی اور تین بجے شام کو اسٹیشن نواب گنج (بارہ بنکی) پہنچی۔ براتیوں میں منشی سید فضل حسین صاحب تعلقہ دار و دیگر اشخاص معزز قصبہ بڑی نجات کے تھے جس سے ایک نوع کا وقار راقم منظور تھا۔ نواب گنج سے بذریعہ تسکرم ایکہ و اونٹ گاڑی و چہار زنجیر فیل و اسپ ہائے متعدد بہ جمعیت تین سو آدمیوں کے بوقت شام بارات قصبہ دیوا پہنچی۔ بعد پہنچنے بارات کے بطور ناشتہ اصحاب بارات کو میں نے کھانا کھلوایا جس کا انتظام قبل سے کر رکھا تھا۔ اس کارروائی

ری بہت ناموری ہوئی ڈھائی بجے شب کو بارات بہ دروازۂ دولھن برمکان مولوی نصیر الدین احمد
ب تعلقہ دار پہنچی۔ آتش بازی و آرائش عمدہ تھی۔ ۳ بجے رات کو نور چشم سید مجتبیٰ علی کا مساۃ ظہیرؔ دختر مولوی
وصفو سے بعوض ایک لاکھ زرِ سرخ عقد ہوا اور قاضی صاحب دیوا کو مبلغ دس روپے نکاحانہ دیا گیا جن کا نام محمد بشیر ہے۔

۷ر فروری ۱۸۹۱ء۔ بوقت صبح مولوی نصیر الدین صاحب نے طعام کنڈوری براتیوں کو دیا جس کی تقسیم بہت
ن بالیت سے ہمارے منتظم سید محمد زکی صاحب نے کی۔ طعام اچھا و بھاری تھا۔ شب گزشتہ کو وزیر صبح لکھنو کو
حسین کشمیری و مساۃ بیگن طوائف لکھنؤ اور ایک طائفہ نواب گنج نے رقص کیا۔ فضل حسین و بیگن کا بیس بیس روپیہ
ہ اور نواب گنج والی کو چودہ روپے دیے گئے۔ انگریزی باجا لکھنؤ سے اور تاشہ نواز و روشن
والے نواب گنج سے شریک ہوئے تھے۔ جہیز حسب تفصیل ذیل ملا:

"زیور طلا خورد و کلاں۔ ۱۴ عدد، زیور نقرہ۔ ۱۰ عدد ظروف نقرہ خورد و کلاں۔ ۲۶ عدد، ظروف مسی خورد و کلاں ب
عدد، ظروف آہنی۔ ۶ عدد، ملمع معہ اسپ و ساز۔ ایک عدد، قرآن مجید۔ ایک عدد جوڑا زنانہ و مردانہ ۳۲ عدد،
دق و پٹارہ و بینس۔ ۵ عدد۔ دری و قالین و چاندنی۔ ۳ عدد، رخصتی ۱۵ روپے۔"

۳ بجے شام کو بارات دیوا سے رخصت ہوئی۔ تعداد مردمان تین سو تھی۔ دو گھنٹہ میں نواب گنج پہنچے
بجے رات کی ریل میں وہاں سے روانہ ہو کر ۱۲ بجے رات کو داخل سندیلہ ہوئے۔ انتظام بارات قابل تحسین
منتظموں نے بہت دل سوزی ظاہر کی مگر میں اپنی علالت سے بہت پریشان رہا۔ غذا کا بہت ہی قلیل
اق ہوا...... اس تقریب میں میرا صرف زائد ہوا جو شادی نور چشم مصطفےٰ علی اور دختر کلاں میں
یں ہوا تھا جس کی صراحت کسی تاریخ آئندہ میں درج ہوگی۔

علالت خود: ۲۵ر فروری ۱۸۹۱ء۔ (بمقام لکھنؤ) آج بہ عطائے فیس دو روپیہ حکیم سید عابد علی
حب خلف حکیم حیدر علی صاحب چوک جدید (لکھنؤ) کو بذریعہ مولوی نصیر الدین احمد صاحب وکیل طلب کر کے
کیفیت علالت کی بیان کی اور نسخہ مجوزہ ان کا استعمال کیا۔ ان کی یہ رائے ہے کہ مادہ یرقانیت سے حرارت جگر
سا پیدا ہو گئی ہے جس کی وجہ سے شکایت ضعف ہضم و کمی اشتہا و سوزش بول وغیرہ کی ہے۔ سنا گیا کہ
یم صاحب سمجھ دار آدمی ہیں اور علاج اچھا کرتے ہیں۔

۱۳ر مارچ ۱۸۹۱ء (بمقام لکھنؤ) آج رات کو جلسہ اطبا مکان حافظ عبد العلی صاحب پر نسبت تشخیص مرض
م فراہم ہوا جس میں حافظ صاحب و حکیم عبد العزیز صاحب جھوائی ٹولہ و مولوی عبد العزیز صاحب دریابادی

شریک تھے۔ باہم بحث ہوئی اور کیفیت مزاج بست سالہ مرتبہ راقم پیش ہوئی جس کو نور چشم سید مصطفےٰ علی نے بہ توضیح تمام پڑھا۔ اور اس پر غور کامل ہوا۔ آخرش بالاتفاق یہ طے ہوا کہ راقم کو تپ نہیں ہے۔ عارضہ لاحقہ ہیں شرکت گرمی و سردی کی ہے اور اس وجہ سے علاج اجزائے معتدلہ سے ہونا چاہیے۔ حکیم عبدالعزیز صاحب دریابادی نے اپنی رائے میری نسبت یہ ظاہر کی کہ حافظ عبدالعلی صاحب پرانے حکیم ہیں اور ان کا تجربہ بمقابلہ حکیم عبدالعزیز صاحب جھوائی ٹولہ بڑھا ہوا ہے اور اس شہر لکھنؤ میں بہت نامور ہیں ان کا علاج شروع کیا جاوے۔ لہٰذا قصد ہے کہ کل بعد معائنہ نبض و قارورہ ان کا علاج شروع کروں۔ بعد کو بہ حالت عدم حصول صحت حکیم عبدالعزیز صاحب کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

۲۲ مارچ ۱۸۹۱ء۔ آج لالہ لالتا پرشاد ولد مول رام (محلہ بردنی) و جگن ناتھ پرشاد ولد گیا پرشاد (سرائے کالیستھ) و کیدار ناتھ ولد مہاراج شیو سہاے (مہتوانہ) واسطے عیادت راقم کے سندیلے سے آئے اور اپنی تکلیف دہی سے مجھے ممنون کیا۔ میں نہایت خوش نصیبی کے ساتھ شکریہ اس خدائے عالم یزل کا ادا کرتا ہوں کہ ہندو و مسلمان ہر دو فریق میری ہمدردی کرتے ہیں۔

۲۳ مارچ ۱۸۹۱ء۔ میں نے بمقام لکھنؤ (بوجہ علالت خود) محلہ پنجابی ٹولہ مکان برکت علی صاحب میں قیام جائز رکھا اس لیے کہ اس مکان میں برخورداران ارتضیٰ علی و مرتضیٰ علی بباعث تعلیم انگریزی مقیم ہیں اور ڈھائی روپیہ کرایہ مکان دیا جاتا ہے۔ اگرچہ پہلے سندیلہ سے ایک روز کی علیحدگی طبیعت کے خلاف معلوم ہوئی تھی لیکن یہاں آج ۲۸ روز سے مقیم ہوں اور علاج حکیم عبدالعلی صاحب جھوائی ٹولہ کر رہا ہوں لیکن طبیعت کو دلچسپی ہے اور کوئی گھبراہٹ نہیں معلوم ہوتی اور آج آٹھ روز سے طبیعت کو بھی افاقہ نظر آتا ہے اگر دورہ مرض بار دیگر اعادہ نہ کرے۔

مولوی شیخ نصیر الدین وکیل درجہ اوّل و کارندہ شیخ فہیم الزماں صاحب سندیلہ متعلقہ امور ذرہ دیکھ بھال ادویہ تیاری نسخہ جات وغیرہ میں بہت مدد دیتے ہیں اور بالالتزام تشریف لاتے ہیں جس کا میں ممنون ہو رہا ہوں۔

سید مرتضیٰ علی: ۲۴ مارچ ۱۸۹۱ء۔ بباعث علالت بہ حالت قیام لکھنؤ مجھے برخوردار سید مرتضیٰ علی فرزند اصغر سے برابر یکجائی رہی اور میں نے ان کے عادات و خصائل کو جو بہ نظر غور دیکھا تو فہم و فراست، ذہن و عقل و ہوش اُس کے نہایت درجہ اعلیٰ کے ہیں اور طبیعت لکھنے پڑھنے و مادہ انتظامی خانہ داری میں ایسی مناسبت ہے کہ جس کا حصہ ان کے برادران اعظم میں نظر نہیں آتا۔ مزاج میں سہولت کے

تیزی اور ہر ایک کام میں دلچسپی و مادہ ہر دل عزیزی حاصل ہے۔ میں جہاں تک غور کرتا ہوں تو میرے حواس
عمر میں ایسے صحیح نہ تھے۔ یہ لڑکا ضرور ہونہار ہے اور ترقی کامل کرے گا اور بعد میرے یہ میرے خاندان اور
دین میں جو ناموری و افتخار پیدا کرے گا وہ دوسرے سے امید نہیں ہو سکتی اور اپنے ہم چشموں میں میں جو گوئے
بنے لے جائے گا وہ یہی لڑکا ہوگا اور زائچہ ولادت بقاعدۂ نجوم بھی اس کا اس کے ذی اقبال ہونے پر دلالت
ہے۔ خدا میرے خیالات راست لا دے اور اس کی عمر میں برکت دے۔ میں اس سے از بس خوش ہوں۔

کتبۂ قبر: ۱۰ اپریل ۱۸۹۱ء۔ آج شیخ عبدالوہاب مہر کن لکھنؤ حسب خواہش میری سنگ مرمر پر قطعۂ ذیل
باجرت دو روپے کندہ کرکے لایا جو بعد انتقال راقم میری قبر پر نصب ہوگا۔ قطعہ

چو کردۂ بہ سرِ تربتم قدم رنجہ — عنایت از من بیدست و پا دریغ مدار
ولے کہ کار نباید بجز دعائے خیر — دعائے خیر برائے خدا دریغ مدار

متعلق حالات خود: ۲۰ اپریل ۱۸۹۱ء۔ آج منشی سید فضل حسین صاحب تعلقہ دار سندیلہ میرے
زاد بھائی نے براہ کمال محبت اپنی تحریر ڈاک مورخہ ۱۹ اپریل میں مجھے لکھا کہ آپ کو مکان پنجابی ٹولہ میں
باعث گرمی تکلیف ہوتی ہوگی۔ میرے مکان قیصر باغ میں آپ اٹھ آویں۔ وہاں سامان ٹٹی خس و پنکھا
موجود ہے اور میں واسطے تفریح طبع کے اپنا گھوڑا گاڑی لکھنؤ بھیج دوں گا۔ اس کا صرفہ میرے متعلق رہے گا۔
آپ اس پر سوار ہو کر بالمرہ تفریح کیا کریں جس سے طبیعت کو نہایت فرحت حاصل ہوتی رہے گی۔ اس میں کوئی تکلف نہ ہونا چاہیے۔

آج تین دن ہوئے مجھے شب کو اتفاق غذا کا نہیں ہوتا۔ شام کو نہ اجابت ہوتی ہے نہ اشتہا۔
بھوک کی زیادتی ہوتی ہے اور جب کھانے پر بیٹھتا ہوں تو ابکائی شروع ہو جاتی ہے۔ عجب حالت میں مبتلا
ہوں۔ نہیں معلوم منظور خدا کیا ہے۔۔۔۔ لہذا آج سے حسب اتفاق رائے حکیم عبدالعزیز صاحب دریابادی
حافظ حکیم عبدالولی صاحب جھوائی ٹولہ کا معالجہ موقوف کر دیا۔۔۔۔ اب قصد ہے کہ ڈاکٹر عبدالرحیم صاحب
اسسٹنٹ سرجن وکٹوریہ اسپتال لکھنؤ خواہ حکیم عبدالعزیز صاحب جھوائی ٹولہ کا علاج کروں۔

۲۱ اپریل ۱۸۹۱ء۔ آج سے معالجہ عبدالعزیز صاحب ولد حکیم اسمٰعیل صاحب جھوائی ٹولہ چوک
لکھنؤ شروع کیا۔ جنھوں نے کمال توجہ کے ساتھ سب حال سنا اور نسخہ لکھا جس کا استعمال شروع کیا۔

آج راجہ درگا پرشاد صاحب تعلقہ دار سندیلہ بادیگر میری عیادت کو تشریف لائے جو میرے لیے
باعث فخر کا متصور ہے۔ چودھری محمد امیر و محمد عزیز حافظ علی و عوض علی صاحب سندیلہ سے میری عیادت کو آئے

جو باعث کمال خوشی کا ہوا اور میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ لوگ مجھے بنظر وقار دیکھتے ہیں اور عزت کرتے ہیں۔

۲ رمئی ۱۸۹۱ء۔ میں خدا کی عنایتوں کا شکر گزار ہوں کہ اس نے اپنے حبیب کے صدقے میری تکلیف بیماری ضعف معدہ و جگر میں تخفیف عطا کی کہ آج سات یوم گذشتہ سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی اور اجابت بستہ ہوتی ہے اور فی الجملہ قوت آچلی ہے۔ اگر ایک ہفتہ تک ایسی ہی طبیعت رہی تو مجھے اس دار الشفا سے امید ہے کہ توانائی قابل امتیاز آجائے۔

۷ رمئی ۱۸۹۱ء۔ حکیم عبدالعزیز جھوائی ٹولہ نے میرے واسطے ایک چٹکی ادویہ کی تیار کروا دی تھی مجھ کو اوّل دن ہی سے مضر پڑی اور اجابت پتلی ہوئی جس کی شکایت کی گئی لیکن سماعت نہ ہوئی اور پھر نوش کرنے کی تاکید ہوئی۔ دوسرے دن پھر نوش کی اس سے زیادہ ضرر ہوا مگر عذر سود مند نہ ہوا اور تیسرے دن بہ صراحت حکیم صاحب سے عذر کیا گیا لیکن کچھ موثر نہ ہوا اور کل بوقت شب پھر وہ چٹکی نوش کرنے کو مجبور ہوا جس سے اس قدر گرمی مزاج میں پیدا ہو گئی کہ کل رات سے آج نو بجے صبح تک نو دست آئے اور ضعف سخت پیدا ہو گیا نشست و برخاست و تکلم دشوار ہو گیا۔ تمام اعضا سے آنچیں نکلتی تلووں میں بے چینی کے ساتھ سوزش بول و براز میں حرقت، تحریک کی شدت، متلی کی شکایت پیدا ہوئی اور جب یہ کیفیت حکیم صاحب کو مفصلاً تحریر کی تو جواب ملا کہ طبیب کی رائے پر علاج ہونا چاہیے مریض کو محل مداخلت نہیں اور جب مریض طبیب کی مخالفت کرے تو اس کا علاج نہ کرے۔ جب یہ فقرات حکیم صاحب کے دست و قلم سے لکھے ہوئے میں نے دیکھے تو ان کے علاج سے مجھے سخت تنفر پیدا ہوا۔ یہ حکیم سخت طامع ہیں حالانکہ ان کی فیس معمولی جب میں ان کے مکان پر جاتا تھا تب بھی دیتا تھا لیکن ان کی طمع غلبہ مانع اس امر کی نہ ہوئی کہ حصول صحت کامل تک اپنی حرص کو مریض کی ایذا رسانی سے روکیں۔ پس میں نے ایسی حالت میں بہ صلاح اپنے احباب یہ ہی مناسب سمجھا کہ معالجہ ان کا ترک کیا جائے ورنہ اگر ایک روز اور اجزاے مرکبہ ادویہ چٹکی استعمال کیا جائے گا تو جان بری دشوار ہوگی۔ پس بنظر مناسب یہ خیال میں آیا کہ اب گرمی لکھنؤ سے تکلیف ہے اور اب یہاں کسی کا علاج کرنا منظور نہیں پس قیام لکھنؤ بھی فضول اور بیکار ہے۔ لہٰذا دس بجے رات کی گاڑی میں اپنی صحت سے بے نیل مرام سندیلہ کو واپس آیا۔ دو مہینے بارہ دن مجھے اتفاق قیام لکھنؤ کا ہوا۔ مصارف بہت پڑے۔ احباب وغیرہ کی گرم جوشی ظاہر ہوئی لیکن مجھ علیل کو کچھ نفع نہ حاصل ہوا اور جس حسرت کے ساتھ اپنی تمناؤں کو مشت بند کیے ہوئے میں وطن کو

خدا کسی آرزومند کو وہ حالت نصیب نہ کرے۔

۹ مئی ۱۸۹۱ء۔ آج سید علی بہادر صاحب تحصیلدار و جوالا پرشاد صاحب پیشکار و راجہ درگا پرشاد
و راجہ کنور نرندر بہادر صاحب تعلقہ داران اور بہت سے معزز اشخاص قصبہ ہذا میری عیادت کو آئے
حالت دیکھ کر بہت افسوس ظاہر کیا اور تہِ دل سے میرے حصول تندرستی کی خدائے لم یزل سے
۔ میں اپنے احباب و اکابر و اعزا وغیرہ کا نہایت شکر گزار ہوں کہ مجھے نگاہ وقعت سے دیکھتے
میری تندرستی کے خواہاں ہیں۔ آج سے میں نے علاج ظہور الحسن طبیب میونسپل کا شروع کیا۔ نسخہ
چھا نظر آتا ہے۔ شاید ملین اجابت کو کچھ اس سے نفع ہو۔

۱۰ مئی ۱۸۹۱ء۔ جس تاریخ سے میں سندیلہ آیا ہوں جملہ اہلِ قصبہ مجھ سے ایسا برتاؤ ہمدردی کر رہے ہیں کہ
ایک کثیر مجمع میری چارپائی کے گرد بیٹھا رہتا ہے جس میں اعلیٰ و ادنیٰ سب قسم کے لوگ شامل ہیں
از دیاد ضعف سے آنکھیں بند کیے پڑا رہتا ہوں اور کسی طرح سے ان کی ہمدردی کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔
ی طویل علالت سے بخوبی ثابت ہو گیا کہ اہلِ قصبہ مجھے نگاہ محبت سے دیکھتے ہیں۔ اگرچہ بہ بفضلِ
جھے گرمی موسمی وغیرہ سے ظاہری کوئی تکلیف نہیں ہے۔ پردے ٹٹی دبنکھا آراستہ شدہ کوٹھی میں مہیا
سے تمام دن راحت سے گزرتا ہے اور شب کو بھی چھت کے وسیع صحن سے راحت ملتی ہے مگر
جسمانی تکلیف نے مجھے ایسا پریشان کر رکھا ہے کہ ان نعمت ہائے موجودہ کا کوئی لطف و حظ حاصل نہیں ہے۔

۱۵ مئی ۱۸۹۱ء۔ ۱۲ مئی سے میری طبیعت کو سکون ہے۔ اجابت بستہ اوقات معمولی پر ہوتی ہے دونوں
ی قدر غذا بھی ہونے لگی ہے جس کی مقدار شاید آدھ پاؤ سے زائد نہ ہو۔ اگر اسی طور سے طبیعت
ہی تو یقیناً کچھ ضعف گھٹے اور قوت اعادہ کرے۔ حکیم ظہور الحسن صاحب جوارش آنولہ جس میں بہت سے اجزا مقوی
یں چار رتی مروارید محلول کے ساتھ استعمال کرواتے ہیں جس سے ایک نوع کی شکل فائدہ متصور ہے۔

۱۰ جون ۱۸۹۱ء۔ آج کل میرے مصارف بباعث بیماری بہت بڑھے ہوئے ہیں کہ جس کی کوئی حد
... خیر خدا فضل فرمائے تو یہ صرف بھی بیجا نہیں ہے۔ اپنی صحت جسمانی کے لیے آدمی کیا کچھ نہیں خرچ
ہے۔ مگر میں ایک ایسا مریض ہوں کہ جس کا نسانہ مرض کسی نہج سے ختم نہیں ہوتا۔ دسواں مہینہ میری
کو ہے۔ اگر اپنی حالت پر غور کرتا ہوں تو یوماً فیوماً بہتر نظر آتی ہے۔ قوت جسمانی ایسی گھٹ گئی ہے کہ
ت و برخاست تکلیف سے ہوتا ہے اور جو تکلیف کہ مرض سے میں برداشت کر رہا ہوں اس کا تحمل

اب نہیں ہوسکتا۔ اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو شاید ایسی تکلیف سے میں اسے گوارا کرتا اور بہ آرام اپنی قبر میں سوتا لیکن افسوس ہے کہ یہ فعل میرا بعد میرے حق پر دلالت کرے گا اور شرعاً ایسا کرنا حرام مطلق ہے بہ خیال اس کے میں اپنی نیت و ارادہ سے باز رہتا ہوں اور اپنے خدا سے دست بدعا ہوں کہ وہ جملہ مصیبت پر لحاظ فرماکر یا تو مرض سے مجھے نجات بخشے یا میرا انجام بخیر فرمائے۔

۱۴ر جون ۱۸۹۱ء۔ سنیچر پیوستہ سے کل تک مستورات پردہ نشین و مردمان خاندان شریف کو دست سوال کسی کے آگے پھیلانا مکروہ سمجھتے ہیں مختلف قسم کے کھانے بہ تعداد ۲۵ر بخش بالمرہ تقسیم کیے.... شاید خدا انھیں کی دعا سے میری مشکلات کو حل فرمائے یہ مسئلہ مسلم ہے کہ خیرات باعث رد بلا ہوتی ہے۔

۱۹ر جون ۱۸۹۱ء۔ آج ۲ بجے رات سے ۹ بجے صبح تک چھ گھنٹے کامل میرے پیٹ میں بائیں طرف اس قدر شدت سے درد ہوا کہ روح کو سخت صدمہ تھا.... بالآخر جب ماش کی روٹی پیٹ پر باندھی گئی تو اس سے معاً افاقہ ہوا۔ میری کوٹھی تمامی اہل محلہ سے بھری ہوئی تھی جو براہ ہمدردی عیادت کو تشریف لائے تھے اور میرے حال پر متاسف تھے۔ مساۃ امت النسا درگاہ گنج مرادآباد سے واپس آئیں۔ مولوی فضل رحمان صاحب نے (جو آج کل بزرگی و فضیلت و مقبول بارگاہ لم یزل ہونے میں مشہور آفاق ہیں اور تمامی ہندوستان کے لوگ ان کے حصول بیعت کو دور دور سے آتے ہیں) مجھے الائچیاں و لوبان پڑھ کر بھیجا اور ایک گنڈہ گلے میں پہننے کے واسطے بنا دیا اور فرمایا کہ جلد صحت ہو جائے گی۔ دو آدمی ان کی مخالفت میں کچھ پڑھتے ہیں لیکن ان کا عمل کچھ موثر نہ ہوگا اور میں پنجگانہ نماز میں ان کی صحت کی دعا مانگتا رہوں گا۔

۲۶ر جون ۱۸۹۱ء..... سچ ہے کہ حکیم ظہور الحسن میرے معالج ۲۵ سال کے آدمی ہیں مگر خدا نے ایسی فہم رسا اور ذکاوت ان کو عطا کی ہے کہ میرے مرض صعب ضعف و حرارت جگر و تولید ریاح کا علاج بہت سوچ سمجھ کر کر رہے ہیں جس سے مجھے افاقہ متعد بہ پیدا ہے اور میں اپنے خیال میں کہہ سکتا ہوں کہ لکھنؤ کے نامور اطبا کے برابر ان کی تشخیص ہے بلکہ میں اپنے علاج کی نسبت یہ کہہ سکتا ہوں کہ حکیم عبدالعلی و حکیم عبدالعزیز مشہور و معروف اطبا چوک جھوائی ٹولہ سے بڑھ کر میرا علاج حکیم ظہور الحسن کر رہے ہیں۔ مجھے خدا کے افضال سے امید پڑتی ہے کہ عجب نہیں کہ حکیم صاحب کے علاج سے نفع کامل حاصل ہو....

۱۱ر جولائی ۱۸۹۱ء۔ چونکہ معالجہ حکیم ظہور الحسن و لد تفضل حسین سے جن کی ملازمت میں نے میونسپل سندیلہ سے مستقل کرا دی ہے میرے عارضہ ضعف و حرارت جگر میں ایسا فائدہ حاصل ہوا اور استعمال

م و بیضۂ مرغ سے اس قدر توانائی حاصل ہوئی کہ میں آج علی الصباح واسطے سیر باغات ملکانہ کے گیا۔ پھر مکان
ن فہیم الزماں صاحب مرحوم پر عزیزی البشیر الزماں سے ملاقی ہوا اور نصف گھنٹہ نشست کے بعد اپنے
ان کو لوٹ آیا۔ یہ تمامی مسافت دو گھنٹہ میں بہ سواری تامجان طے ہوئی اور خدا کے فضل و کرم سے کوئی تھکاوٹ
ان محسوس نہیں ہوئی بلکہ اس سیر سے طبیعت کو فرحت حاصل ہوئی۔

برکھ پھل: ۲۹ر جولائی ۱۸۹۱ء۔ جو مضمون واقعہ ۱۵ر فروری و ۲۹ر جولائی ۱۸۹۱ء کو متعلق برکھ پھل
۱۱ ستمبر سن الیہ کو شروع ہوگا بموجب رائے پنڈت گوری شنکر ولد گور دیال (سندیلہ) حوالہ قلم کیا ہے اس کو جہاں تک
مانے غور کیا تو میری رائے ان کی رائے کے محض خلاف ہے جس کے وجوہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) سورج میرے جنم لگن کا صاحب طالع ہے اور وہ اپنے گھر میں بخانہ ہشتم برکھ پھل ۱۱ ستمبر میں بیٹھا ہے
ر سنیچر لگن برکھ پھل کا صاحب طالع ہو کر تحت الشعاع آفتاب میں آ گیا ہے اور اس کی قوت زائل ہو گئی
ر یہ زوال قوت بحق صاحب طالع چنداں مضر نہیں ہو سکتا کیوں کہ بلحاظ قواعد نجوم اصل مالک طالع کا آفتاب
ہے تو کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی ذات سے ضرر پہنچا وے۔ (۲) دوسرے یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ اگر ستارہ
قص برج ناقص میں اپنے گھر کا مالک ہو کر یا اپنے شرف میں ہو کر پڑے تو اس سے کوئی امید ضرر کی نہ
کھنا چاہیے اور وہ ہرگز مضرت رساں نہ ہوگا۔ برخلاف اس کے اگر وہ کسی دوسرے برج میں پڑتا۔
۳) تیسرے اگرچہ سال مذکور الصدر کا صاحب طالع سنیچر ہے اور بخانہ ہشتم بیٹھا ہے لیکن اس سال کا رکھیس
یعنی سال کا مالک آفتاب ہے جو کسی طرح اپنی ذات کو نقصان نہیں پہونچا سکتا۔ (۴) چوتھے جہاں تک غور
کیا گیا تو ۱۱ ستمبر کے برکھ پھل میں اقبال جوگ پڑا ہے اور بقاعدۂ نجوم اقبال جوگ سولہ جوگوں میں نمبر اول
ہے جس برکھ میں پڑ جاوے اس کے صاحب طالع کو اس سال کے اندر پورے طور سے حصول مقاصد
میں کامیاب کرے تو ایسی حالت میں جو تقاضات سنیچر و منگل و زہرہ کے بخانہ ہشتم بیٹھنے سے تا ۲۹ر جولائی
کو درج ہوئے ہیں ان کا کوئی اثر بمقابلہ اقبال جوگ موثر نہیں ہو سکتا آئندہ جو کچھ منظور خدا ہو جس کا نتیجہ شروع
ہونے سال کے ایک مہینہ بعد معلوم ہوگا اور درج کتاب ہذا کیا جائے گا۔

محرم میں ایک رسم: ۱۰ر اگست ۱۸۹۱ء۔ آج ۵۴ عدد بتاشے جن میں گوکھرو و گوٹہ و بعض
میں لچک وغیرہ لگا تھا شیخ رفیع الدین ولد مولوی نصیر الدین رئیس دیوائی نے من جانب ہمشیرہ خود یعنی اہلیہ برخوردار
سید مجتبیٰ علی معہ قدرے مسالہ بمقدار چار سیر بدست کلو حجام کے بھیجے۔ ایسے مراسم جب کہ پہلا محرم بعد شادی کے

پڑتا ہے تو فریقین کی جانب سے ادا ہوا کرتے ہیں۔ گھنڈیاں نقرئی کسی بٹوہ میں نہیں تھیں۔

۱۳/ اگست ۱۸۹۱ء۔ آج پچاس عدد بٹوے جو کم خواب زر بفت اطلس وغیرہ سے مرتب ہوئے تھے اور ان میں گوٹہ لچکا پٹھا لگا ہوا تھا بدست کلو حجام مولوی نصیر الدین صاحب واسطے اہلیہ برخوردار قصبہ دیوا کو بھیجے بٹوہ کم خواب وغیرہ ۷ عدد جن میں لچھے دار گھنڈیاں نقرئی لگی تھیں۔ بٹوہ گوٹہ دلچکہ جن میں گھنڈیاں نقرہ تھیں دیگر بٹوے اطلس وغیرہ کے جن میں گوکھرو دلچکہ وغیرہ لگا تھا۔ جملہ ۵۰ عدد۔ مسالہ پنج رنگا محمولہ سینی کلاں دس سیر نمبری۔

انڈوں کا استعمال: ۲۲/ اگست ۱۸۹۱ء۔ مجھے اس وقت کا زمانہ کبھی فراموش نہ ہوگا کہ میرے مزاج میں ایسی برودت آگئی ہے کہ اندک سرد چیز کا استعمال میرے حق میں مضر ہے اور اس سے اس قدر ریاح کی تولید ہوتی ہے کہ خارج ہونا دشوار ہو جاتا ہے اور زردی بیضہ مرغ نیم برشت سے جو دس گیارہ سے کم استعمال نہیں ہوتے کسی نوع کی گرمی محسوس نہیں ہوتی اور چونکہ یہ غذا لطیف اور زود ہضم ہے اس وجہ سے اس کا استعمال میں اپنے حق میں بہت مفید اور ضروری تصور کرتا ہوں۔

وفات خالہ خود: ۳/ اکتوبر ۱۸۹۱ء۔ آج ۶ بجے صبح کو مسماۃ شرفاً والدہ منشی فضل حسین تعلقہ دار نے بعارضہ تخمہ جو منجر بہ ہیضہ ہو گیا تھا اس دنیا سے رحلت فرمائی۔ دس بجے تجہیز و تکفین سے فراغت ہوئی اور منشی سید فضل رسول صاحب مرحوم اپنے شوہر کے پہلو میں پچھم جانب مدفون ہوئیں۔ عمر چھیاسی سال تھی۔ یہ بی بی نہایت نیک سیرت کنبہ پرور سخی المزاج تھیں۔ اکثر اپنے اعزا کی پرورش و پرداخت ملحوظ رکھتیں۔ غریبوں کی پوشیدہ اعانت کرتی تھیں اور ایسی خوش نصیب تھیں کہ جب سے ان کا بیاہ ہوا اس گھر میں دولت برسنے لگی۔ آخر عمر میں ان کو اپنے اکلوتے بیٹے کی بے اعتنائی و بے اعتدالیوں کا البتہ ملال رہا کرتا تھا۔ میرے ساتھ ان کو ایک محبت خاص تھی اور مثل اپنے بیٹے کے بلکہ بعض موقعوں پر ان سے زیادہ مجھے عزیز رکھتی تھیں ....
مجھے انکی مفارقت دائمی کا افسوس سخت ہے لیکن محض مجبوری کہ مشیت ایزدی میں کوئی چارہ نہیں خدا غریق رحمت کرے۔ آمین۔

۵/ اکتوبر ۱۸۹۱ء۔ آج صبح کو سیوم والدہ منشی سید فضل حسین صاحب تعلقہ دار کا ہوا۔ مجمع عوام زائد تھا۔ بارہ سو بخش طعام واسطے تقسیم برادری و محتاجین کے پخت ہوا جس میں قلیہ و قورمہ پلاؤ تھا۔ بباعث بدانتظامی تقسیم اچھی نہیں ہوئی۔ اکثر فقرا دعاے بد دیتے ہوئے محروم گئے۔ پہلے روز پانچ سو بخش کھانا برادرم سید کرامت حسین بھانجے مرحومہ کے دوسرے دن چار سو بخش منشی شمس الدین صاحب دیورا اور دو سو بخش سید محمود رضا دلد محسن رضا بھانجے اور پانچ بخش من جانب مولوی علی احمد صاحب (وکیل حال جبل پور) سمدھی

کے بھیجے گئے تھے۔ منشی شمس الدین صاحب کے یہاں کا پلاؤ نا کافی تھا۔ محمود رضا کے یہاں پلاؤ نہ تھا مولوی صاحب کے گھر کھانا اچھا تھا۔ مرحومہ کی نواسی سید نبی احمد خلف مولوی صاحب کو بیاہی ہے۔ دوسرے منشی حسین مولوی صاحب کے دیہات کے منتظم و مختار عام ہیں۔

انڈوں کی قیمت: ۸ ۲ر اکتوبر ۱۸۹۱ء۔ دو روز علاوہ غذا معمولی بارہ عدد زردی بیضۂ مرغ نیم برشت استعمال کرتا ہوں جو بہ عنایت الٰہی بخوبی ہضم ہو جاتے ہیں اور چار پیسے کے پانچ انڈے بالفعل خرید ہو کر آتے ہیں۔

درد شانہ: ۱۱ر جنوری ۱۸۹۲ء۔ میں اپنی بدقسمتی کا کیا ذکر کروں کہ مجھے ایک درد (درد شکم) سے کامل نہیں ہوا تھا کہ درد شانہ وگلو نے مجھے گھیر لیا اور فوراً ورم آگیا اور اعضائے متصلہ پر ایسا اثر پہنچا کہ گردن وغیرہ ماؤف ہو گئیں۔ غرض کہ اس درد نے مجھے ایسی تکلیف دی اور دے رہا ہے کہ ایک کروٹ دوسری کروٹ لینا دشوار ہے۔ باوجود اس قدر تکلیف کے میں اس صعوبت کو نہایت صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کر رہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ جب زمانہ رفع تکلیف کا آوے گا تو یہ شکایت دفع ہو جاوے گی۔ گریہ و زاری بیکار محض ہے۔

۱۴ر جنوری ۱۸۹۲ء۔ درد شانہ کی تکلیف بدستور ہے۔ ہنسلی کی ہڈی قریباً ایک انچ ابھر آئی ہے۔ ضعف کا یہ حال ہے کہ ایک انچ سرکنے میں دس منٹ صرف ہوتے ہیں اور قوت حاصلہ دو ثلث زائل ہو گئی۔

۱۳ر جنوری ۱۸۹۲ء۔ آج میں نے ایک روغن مجربہ برادرم سید حافظ علی ولد رحم رحمان خاں صاحب نے درد شانہ میں ملا۔ اس سے اس قدر تخفیف ہوئی کہ میں اپنا دست چپ بلا تکلف سر تک بلند کر سکتا ہوں۔ نسخہ واسطے استفادہ ناظرین کتاب ہذا درج ذیل کیا جاتا ہے۔

نسخہ روغن دافع درد ریاحی: لہسن، ایک تولہ، فرفیون۔ ۲ ماشہ، برگ سداب تازہ۔ ۱ تولہ، عقرقرحا۔ ۴ ماشہ، پیپل۔ ۳ ماشہ، روغن کنجد یا زیتون۔ پاؤ بھر کل چیزوں کو کوٹ چھان کر روغن تلی میں جلاوے اور جب ایک ثلث رہ جائے اس کو چھان کر مقام ماؤف پر مالش کرے۔

پچیسی: ۱۴ر فروری ۱۸۹۲ء۔ میرا تجربہ ہے کہ پچیسی ایک منحوس کھیل ہے۔ علاوہ تضییع اوقات اس کے کھیلنے سے نحوست بڑھتی ہے۔ آج کل یہ کھیل .... مشغلہ منشی فضل حسین صاحب تعلقدار ہے جو بالمرہ کم سے کم پانچ چھ گھنٹے اس میں صرف کرتے ہیں اور اس حالت میں انھیں کسی معاملہ کی بات سننا سخت ناگوار ہوتی ہے۔ اس کھیل کا انجام بخیر نظر نہیں آتا۔ میں اس کھیل کا کبھی عادی نہ تھا بلکہ ستائیس سال ہوئے میں نے گنجفہ و شطرنج

مطلقاً ترک کردیا جس میں مجھے دستگاہ کامل تھی۔

نسخہ ضعف معدہ ۲۱؍مارچ ۱۸۹۲ء۔ ضعف معدہ کے واسطے اجزائے ذیل بہت مفید ہیں۔ راقم کو بھی ان کے استعمال سے فائدہ ہوا:

"کنوچہ، الائچی خورد، زیرہ سفید، زیرہ سیاہ۔ ان چاروں اجزا کو ہم وزن لے کر کوٹ چھان کر تین تین ماشہ کی پڑیاں بنالے اور بعد غذا ایک پڑیا نوش کرے۔ امید کہ شافی مطلق شفائے عاجل عطا کرے۔

وجوہ مالیخولیا وغیرہ ۲۴؍مارچ ۱۸۹۲ء۔ مالیخولیا، خبط و بے خوابی وغیرہ کے کئی سبب ہیں ان میں خاص خاص وجہ یہ ہیں: طبیعت پر زیادہ زور دینا، دوسرے ورزش نہ کرنا اور جسم سے کم کام لینا، تیسرے مزاج میں استقلال و عزم کا نہ ہونا، چوتھے خطرناک طریقوں سے کام کرنا، پانچویں دن رات خیال کرنے اور سوچنے کی بیہودہ عادت پر چلنا۔

نسخہ ہضم آم: ۲۴؍جون ۱۸۹۲ء۔ تجربہ سے لکھا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص سونٹھ صاف چھنی ہوئی بقدر ایک ماشہ و نمک سیاہ ایک ماشہ باہم مخلوط کرکے بعد کھانے آم کے استعمال کرے تو ان کی تحلیل میں کوئی توقف نہ ہوگا کسی ضرر کے بغیر ہضم ہو جائیں گے۔

تحصیلدار نوروز علی: ۶؍جولائی ۱۸۹۲ء۔ آج چودھری محمد عظیم صاحب و چودھری نصرت علی صاحب سکریٹری انجمن ہند لکھنؤ و چودھری محمد روف صاحب روسائے محلہ مہتوانہ عید ملنے کی تقریب میں میرے مکان پر تشریف لائے۔ چودھری محمد عظیم صاحب نے بحالت تخلیہ مجھ سے بیان کیا کہ نوروز علی تحصیلدار سندیلہ نے تمہاری کچھ شکایت کرنل کوین صاحب ڈپٹی کمشنر ہردوئی سے کی ہے جس کی نسبت صاحب بہادر چودھری صاحب سے دریافت کرتے تھے کہ مظہر علی کچھ کام میونسپل میں غفلت کرتا تھا جس کی وجہ سے تحصیلدار سندیلہ نے کار میونسپل اپنے تعلق کرلیا ہے اور کوشش تحصیلدار سے آمدنی میں اضافہ ہوا۔ بجواب اس کے چودھری صاحب نے میری لیاقت و تدین کی بہت تعریف کی کہ مظہر علی نے جیسا کام میونسپل کا کیا ہے ویسی لیاقت و مستعدی سے شاید دوسرا نہ کرسکے۔ جواب الجواب میں صاحب بہادر نے فرمایا کہ ہم ضرور مظہر علی کو اچھا جانتے ہیں وہ کام سکرٹری سے علیحدہ نہیں ہوا ہے —— افسوس کہ میری لیاقت و کارگزاری تحصیلدار کے ناگوار طبع ہے۔ ع اے روشنیِ طبع تو برمن بلا شدی

ھدایت نفس خود: ۱۴؍اگست ۱۸۹۲ء۔ بغرض تعلیم و ہدایت خود میں نے نصیحت ذیل چودھری

عبدالباقی صاحب نمبردار سے بہ خط جلی لکھوا کر اور واحد علی سازسے شیشہ و چمن سے مرتب و آراستہ کرا کے اپنی نشست گاہ کی دیوار کے محاذ میں آویزاں کی تاکہ وہ مجھے ناصح رہے کہ کوئی بات غیر مہذب زبان سے نہ نکالوں۔

"سوچ سمجھ کر بات کرو کہ پشیماں نہ ہو"

<u>پوتے کا نام</u>: ۲۸ر اگست ۱۸۹۲ء۔ آج زائچہ مولود نورچشم سید مجتبیٰ علی بقاعدۂ نجوم میں نے مرتب کیا۔ نشست ستاروں کی بہت اچھی ہے۔ دو شرف میں ایک اپنے گھر کا اور ایک خانہ مسرت میں ہے۔ خدا اس کو زندہ رکھے۔ وہ ایک ہونہار لڑکا ہوگا۔ بعد غور کامل اس کا نام میں نے سرتاج حسین رکھا۔ اس نام کا کوئی آدمی قصبہ ہذا میں نہیں ہے۔

<u>ایک طبی مشورہ</u>: ۱۴ر ستمبر ۱۸۹۲ء۔ اگر انسان اپنی صحت چاہے تو نصف مہینہ بھادوں سے شروع کاتک تک بلا بھوک ہرگز غذا نہ کرے ورنہ بالضرور کوئی نہ کوئی تغیر پیدا ہوگا۔ یوں تو ہمیشہ احتیاط لازمی ہے۔ یہ نصیحت بڑے تجربہ کے بعد درج ہوئی۔

<u>شناخت ہیرا</u>: ۲۳ر ستمبر ۱۸۹۲ء۔ ۱۔ کارڈ یا اس قسم کا کوئی دبیز کاغذ کا ٹکڑا لے کر سوئی سے اس میں ایک سوراخ کرو اور ہیرے کو آنکھوں کے سامنے لاکر اسی کی راہ سے سوراخ کو دیکھو۔ اگر ہیرا جھوٹا ہے تو دو سوراخ اور اگر سچا ہے تو ایک سوراخ دکھائی دے گا ۲۔ انگلی پر ہیرا رکھ کر اس کے ذریعہ سے انگلی کے مسامات پر نگاہ کرو۔ اگر ہیرا سچا ہے تو جلد کے مسامات کچھ کچھ ممیز ہوں گے۔ صاف نہیں دکھلائی دیں گے اور اگر ہیرا نقلی ہوگا تو بہت صاف اور شفاف دکھلائی دیں گے ۳۔ ہیرے کا نگ انگوٹھی پر جڑا ہو تو اس طرح پر شناخت ہوسکتی ہے کہ اگر نگینہ اصلی ہیرے کا ہے تو ڈانک کبھی نہیں دکھلائی دے گی اور اگر نقلی ہیرا ہے تو صاف دکھلائی دے گی۔

<u>تجربہ کاری</u>: ۹ر نومبر ۱۸۹۲ء۔ تجربہ کار کا لفظ اسی شخص کی نسبت استعمال ہونا چاہیے جس نے اولاً ہر چیز کو بہ نظر غور دیکھا ہو اور بطور خود اس کی نسبت پوری فکر کی ہو، دوئم کتابوں کی سیر بہ نظر تعمق کرچکا ہو، سوئم ہم عصر لوگوں کی تحریرات کو جو کسی امر خاص کی بابت ہوں غور کیا ہو۔ تجربہ کاری کچھ اس بات سے متعلق نہیں ہے کہ اس کی عمر زیادہ ہوگئی ہو اور وہ ان فضائل سے بے بہرہ ہو۔ اگر جوان آدمی میں ایسے فضائل حاصل ہوں تو وہ بھی تجربہ کار کے شمار میں آسکتا ہے۔ جو شخص بلا واقف کاری بلا اطلاع و مشورت کے کوئی کام کرے گا وہ ہمیشہ غلطی میں پڑے گا۔

<u>سوانح عمری خود</u>: ۱۲ر نومبر ۱۸۹۲ء۔ آج میں نے اپنی سوانح عمری لکھنا شروع کی جس کو چودہ فصلوں میں منقسم کیا ہے اور ایک فصل میں اپنے حالات مفصل لکھنا چاہتا ہوں۔ خدا سے امید ہے کہ اس کی

تکمیل بوجہِ احسن فرمائے (یہ سوانح عمری ۱۸۹۴ء میں کوئن پریس سندیلہ سے شائع ہوئی تھی۔ ہاشمی)

یکم دسمبر ۱۸۹۲ء۔ آج صبح کو کنور درگا پرشاد صاحب تعلقہ دار میری ملاقات کو تشریف لائے اور مجھے اپنی سوانح عمری لکھتے ہوئے دیکھ کر فرمایا کہ آپ ایک نہایت عمدہ و قابل یادگار کام کر رہے ہیں جواب اور آئندہ بدرجہ غایت کار آمد ہوگا کیوں کہ تصنیفات سے بڑھ کر کوئی اعلیٰ درجہ کی یادگار دنیا میں نہیں ہو سکتی اور جب اس کام کو انجام دے چکیں تو نہایت بہتر ہوگا اس کو طبع کرا دیں جو باعث آپ کی کمال یادگار کے ہوگی اور چونکہ میں اپنا ذاتی مطبع سندیلہ میں جاری کرنے والا ہوں۔ پس اس میں یہ کتاب بہت آسانی سے طبع ہو جائیگی۔ میں نے راجہ صاحب کا شکریہ ادا کیا کہ آپ نے مجھے نہایت نیک صلاح دی۔

معاشی تردد: ۲۰ دسمبر ۱۸۹۲ء۔ میرے مصارف کو روز بروز ترقی ہے حتیٰ کہ سال گزشتہ میں تین سو سینتالیس روپے کا صرف کپڑا خرید ہوا۔ اور دیگر مصارف لابدی علاوہ براں۔ اگرچہ میں فکر مند ہوتا ہوں لیکن اس کا کیا اثر ہو سکتا ہے جب تک کہ فضل ایزدی شامل حال نہ ہو۔ پس اس کی درگاہ میں دست بدعا ہوں کہ جیسی میری حیثیت و عزت بڑھائی ہے اپنے حبیب کے صدقہ سے تا حیات میری ویسی ہی آبرو و منزلت برقرار و قائم رکھے۔ آمین ثم آمین۔

ڈالیاں: ۲۱ دسمبر ۱۸۹۲ء۔ چونکہ کرنل کوئن صاحب ڈپٹی کمشنر ہردوئی بڑا دن بمقام 'جھرویہ' مزرعہ بینی گنج علاقہ چودھری محمد عظیم صاحب میں منائیں گے اور اسی روز عموماً کل رؤسا وغیرہ ڈالیاں حسب حیثیت خود داپیش کریں گے۔ لہٰذا مجھے بھی واجب ہوا کہ جس طور سے ممکن ہو ڈالی لے کر ۲۵ دسمبر کو جھرویہ پہنچوں۔ پس برادرم منشی سید فضل حسین صاحب سے یہ طے ہوا کہ ہم دونوں ۲۴ دسمبر کی شام کو سندیلہ سے بذریعہ ریل جونسہ پہنچیں اور بعد قیام شب صبح کو بہ سواری پالکی جا کر بعد ملاقات صاحب ضلع ڈالیاں پیش کریں جس کا سامان لکھنؤ سے میں نے منگایا ہے۔

سال نو: یکم جنوری ۱۸۹۳ء۔ آج سے ۱۸۹۳ء کا آغاز ہوا۔ ۱۸۹۲ء عموماً بہت سخت گزرا۔ سو میں شاید پانچ ہی شخص خوش حال و بے فکر رہے ہوں۔ انواع اقسام کے حادثات پیش آئے۔ نامور انگلستان و ہندوستان وغیرہ کے اس جہاں سے گزر گئے۔ میں بھی علالت جان فرسا' درد قولنج وغیرہ میں سخت مبتلا رہا اور ترددات انواع و اقسام کے علاوہ براں تھے۔ دیکھا چاہیے کہ یہ ۱۸۹۳ء کیسا گزرتا ہے۔

محلے کے کل لڑکوں میں بلکہ شاید سندیلہ میں کرامت علی خلف شیخ سلامت علی صاحب مرحوم کا سب سے

بڑا ہے اور آدمی بھی خوش فہم تیز طبع وسعید ہیں۔ عجب نہیں کہ یہ صفات ایک روز ان کو مرتبہ اعلیٰ پر پہنچا دیں اور مثل بھی ہندی مشہور ہے کہ سر بڑا سردار کا۔

موروثی خاصہ: ۱۳ مارچ ۱۸۹۲ء۔ میرے خاندان کا یہ موروثی خاصہ ہے کہ ابتدائً تعلیم و تعلم کا ضرور شغل رہتا ہے۔ بعدہٗ وہ چاہے جیسا معزز عہدہ حاصل کرے۔ چنانچہ میں اپنے چشم دید تین پشتوں کا ذکر کرتا ہوں کہ میرے جدامجد مولوی سید الٰہ بخش صاحب مرحوم نے مدت تک پیشہ معلمی کا کیا اور میرے والد ماجد مولوی سید مظفر علی صاحب مرحوم ایک عرصہ تک مدرس اول مدرسہ ریاست جودھپور رہے۔ بعدہٗ سندیلہ میں بھی بعد غدر اس شغل کو جائز رکھا۔ ابتدائً راقم بھی مدرس مدرسہ سندیلہ مقرر ہوا جس کو ساڑھے چار سال تک انجام دیا۔ اس کے بعد نوکری ریلوے وغیرہ کی حاصل کی۔ برخوردار مصطفےٰ علی آج کل مدرس اوّل مدرسہ انگریزی میں جس خدمت کو اپریل ۱۸۹۱ء سے انجام دے رہے ہیں۔ دیکھا چاہیے کہ ان کا مقدر کب یاوری کرتا ہے کہ کوئی بڑا عہدہ مستقل طور پر حاصل کریں۔

کھٹمل و مچھر: ۶ اپریل ۱۸۹۲ء۔ آج میں چار بجے شام کی ریل میں ہردوئی گیا..... شیخ رعایت حسین صاحب وکیل کے مکان پر ٹھہرا لیکن جو چارپائی نواڑ کی میرے واسطے بچھائی گئی تھی اس میں اس قدر کھٹمل تھے کہ تمام رات مجھے ان کے چننے اور گھنٹے شمار کرنے میں گزری اور کوئی وقت پلک خواب راحت سے آشنا نہیں ہوئی اور اس پر طرہ یہ تھا کہ مچھروں کی فوج نے ایسے پیہم دھاوے کرنا شروع کیے کہ اگر کوئی منٹ کھٹمل کی نیش زنی سے نجات بھی ملتی تو ان کی سوزش سے چین نہیں ملتا تھا حتیٰ کہ تمام بدن میں ددورے پڑ گئے۔ غرض خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور میں نماز کو اُٹھا۔ یہ رات میرے حق میں سخت تکلیف کی تھی جو شاید کبھی فراموش نہ ہو۔

کل شیٔ ..... اصلہ: ۱۰ اپریل ۱۸۹۲ء۔ کل شیٔ یرجع الی اصلہ۔ اس مسئلہ کا جہاں تک تجربہ و امتحان ہوا تو بہت درست و صحیح قرار پایا۔ ہر شے کو ضرور اصل کی طرف رجحان ہوتا ہے..... اگر انسان پر قیاس کیا جاوے تو اس کی بھی بلا کم و کاست وہی حالت دیکھی گئی جس سے اس کی اصلیت کا پتہ چلتا ہے۔ اگر کوئی شخص قوم رذیل سے تعلیم دیا جاوے تو گو تحصیل علوم سے اس کی عقل و دماغ میں روشن ضمیری ضرور پیدا ہو جاوے گی لیکن اس کی عادات میں کچھ شمہ اس کی اصلیت کا بلا توقف ضرور پایا جائے گا۔ اسی طرح سے اگر کسی خادمہ کے فرزند کو تعلیم دے کر لیاقت حاصل کرائی جاوے اور اگرچہ وہ کسی شریف کے نطفہ سے بھی

ہو تو بھی اس کی خو بو میں کچھ نہ کچھ اس کی ماں کا اثر پیدا ہوگا اور بوے وفاداری مفقود ہوگی۔ یہ شعر استاذ فردوسی
کا ایسے محل پر نہایت درجہ صادق آتا ہے ع پرستار زادہ نہ آید بکار اگرچہ بود زادۂ شہریار
پس اسی طور سے میں جہاں تک خیال کرتا ہوں تو......

اشعار حافظ: ۱۴ر اپریل ۱۸۹۲ء..... جب تحصیلدار نے دیکھا کہ میں کارروائی میونسپل میں نہایت
صاف و پاک ہوں اور جو کام میرے عہد میں ہوئے وہ نہایت نیک نیتی کے ساتھ ہوئے اور کسی قسم کا
تغلب کوئی شخص نہ کرنے پایا اور ملازمین میونسپل پر میرا کامل دباؤ تھا لہذا جس نہج سے انھوں نے کنجی ہائے
گولک (اکٹرائی) بموجب تحریر ۱۸ر مارچ ۱۸۹۲ء کے مجھ سے منگالی تھیں۔ اسی طور سے آج مجھے بھیج دیں کہ میں
کام متعلقہ سابقہ کو بحیثیت سکریٹری میونسپل کے انجام دوں۔ اس مقام پر مجھے بعض اشعار حافظ شیراز علیہ الرحمہ کی کامل
تصدیق ہوتی ہے جو سال گزشتہ میں بحالتِ تردد بوقت معائنہ فال کے برآمد ہوئے تھے۔ شعر

بداں مثل کہ شب آبستن آمدہ است بہ روز ستارہ می شمرم تا کہ شب چہ زاید باز
ز لوح بادیہ دل بد مکن بہ بند احرام کہ مرد راہ نیاندیشد از نشیب و فراز
بیا کہ بلبل مطبوع خاطرم حافظ بہ بوے گلشن وصل تو می سراید باز

دانتوں کی حفاظت: ۱۵ر اپریل ۱۸۹۲ء۔ جس شخص کو اپنے دانت مدت تک قائم رکھنا مقصود ہو اسے
پان خوری کا استعمال کم اور خلال کی عادت نہ کرے ورنہ میرا تجربہ ہے کہ چونا مسوڑھوں کو کاٹ دیتا ہے اور
خلال کرتے کرتے دانتوں کے درمیان فرق پیدا ہو جاتا ہے جس سے چند روز میں انھیں جنبش ہونے
لگتی ہے اور بالآخر گر جاتے ہیں اور انسان روٹی و دیگر لذائذ دنیوی سے محروم ہو جاتا ہے۔

قسم کھانا: ۲۴ر جون ۱۸۹۲ء۔ جب میں کم سن تھا مجھے خوب یاد ہے کہ ۱۸۵۶ء سے قسم کھانا
جیسا اس کا آج کل ضرورت بلا ضرورت عام رواج ہے مطلقاً ترک کر دیا تھا اور کبھی سہواً اس کا اتفاق
نہیں ہوتا ہے اور میں بہت برا جانتا ہوں کہ لوگ معمولی بات چیت میں بلا ضرورت اس کے عادی ہیں جس
سے ان کی بے اعتباری متصور ہے اور جب کبھی کسی عدالت میں اتفاق اداے شہادت کا ہوتا ہے تو وہاں
بھی انھیں الفاظ کا استعمال کرتا ہوں کہ اپنے علم و یقین سے سچ کہوں گا جھوٹ نہ کہوں گا۔

دعوت احبہ: ۴ر جولائی ۱۸۹۲ء۔ آج میں نے اپنے اعزا خاص کو طلب کر کے عموماً قلمی و تخمی آم نوش
کرائے جن کے نام ذیل میں ہیں۔

عزیز سید اظہر علی، عزیزی سید حافظ علی ولد ماجد علی صاحب، مولوی خلیل الدین ولد مینگا میاں،
ر علی، قاضی ابوالحسن ولد قاضی اقتدار علی، عوض علی خلف سید حسین علی مرحوم، برخورداران سید مصطفیٰ
دار منتظم حسین، محمد زبیر و محمد شعیب و محمد ضمیر محمد صعیب فرزندان برادرم سید نذر علی۔
جی وارث علی: ۲۵ جولائی ۱۸۹۳ء۔ آج بہ تقریب آمد ایلفنسٹن صاحب کمشنر لکھنؤ میں بوقت
شن ریلوے پر گیا۔ صاحب تو تشریف نہیں لائے لیکن حاجی وارث علی شاہ صاحب ساکن دیوائے
ملازمت حاصل ہوئی۔ بعد مصافحہ بہت مہربانی سے پیش آئے۔ کہا کہ ان کی ذات ستودہ میں بہت
اپنے اور شیخ فہیم الزماں کے خاندان میں یہ بہت عمدہ آدمی ہیں اور ہم سے ان کا تولا
ہ کر میری پیٹھ پر دست شفقت پھیرا اور بخوشی رخصت کیا۔ مجھے یہ شگون نیک حاصل ہونے سے
ئی اور اپنے خدائے پاک سے امید کرتا ہوں کہ میرا ملال بعنوان نیک مبدل بہ راحت ہو۔ آمین۔
ب باغ و کنواں: ۱۱ ستمبر ۱۸۹۳ء۔ جو باغ و کنواں میں نے لب سڑک ہتیا ہرن کی سرحد شمالی
کے بنوایا ہے اس راستہ سے ہزاروں جاتری کی ہر چہار جانب آمد و شد رہتی ہے۔ چونکہ کل اتوار
نے بذریعہ چھتا سنگھ نمبردار موضع مذکور کے کنوئیں پر ایک برہمن مقرر کرادیا اور اس کو ایک لوٹا
یا تاکہ راہ گیروں کو پانی پلاوے۔ چنانچہ اس کارروائی سے کل کنوئیں پر بڑا مجمع رہا اور برہمن نے
کے ساتھ سب کو پانی پلایا۔ اس وجہ سے میری نیک نامی کی بڑی شہرت ہوئی۔۔۔ چونکہ ایک
اُردو وہندی کنوئیں پر لگی ہے کہ "یہاں تشریف لائیے آب شیریں و عمدہ موجود ہے" یہ تحریر
ں کو بہت کشش کرتی ہے۔ اگر چند سال تک ایسی ہی کوشش رہی تو میں امید کرتا ہوں کہ
ی وہاں ٹھہرنے لگے کیوں کہ وہاں سے دو کوس کے فاصلہ تک کہیں عمدہ پانی نہیں ملتا ہے۔
جرت فی اتوار تین آنہ قرار پائی۔
رق کیلہ: ۳ اکتوبر ۱۸۹۳ء۔ آج میں صبح کے آٹھ بجے دفعتاً عارضہ ہچکی میں مبتلا ہوگیا۔
حارش ہوگئی جس کی تکلیف سے بخار آگیا اور غذا نہار نہ کرسکا۔ عرق کیلہ کے استعمال سے افاقہ
عارضہ کے واسطے نہایت مفید ثابت ہوا۔
ملاقات کمشنر وغیرہ: ۲ نومبر ۱۸۹۳ء۔ آج آٹھ بجے صبح کو مسٹر جے ایڈمس صاحب کمشنر
ملاقات کی۔ حالات خاندانی استفسار فرمائے۔ میں نے کہا کہ مخدوم سید علاء الدین قدس اللہ سرہٗ

کی اولاد میں ہوں جو سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں شہر واسط سے ہندوستان تشریف لائے تھے۔ اور جن کے نام کا "مخدوم پورہ" ہنوز بہ حیثیت معافی دوامی عہد شاہی کے ہم لوگوں کے قبضہ میں چلا آتا ہے۔

کرنل کوتن صاحب ڈپٹی کمشنر ہردوئی سے آج بار دیگر ملاقات کی اور جو باتیں کمشنر صاحب سے ہوئی تھیں ان کا اعادہ کیا میں نے یہ بھی کہا کہ مجھے کام میونسپل و آنریری مجسٹریٹی سے فرصت قلیل رہتی ہے لہذا میں چاہتا ہوں کہ عدالت سیشن کی حاضری سے بحیثیت اسیسر کے معاف کیا جاؤں۔ فرمایا کہ درخواست دو ہم حسب خواہش کارروائی کردیں گے۔ مجھ سے فرمائش کی کہ ایک جوڑا گولڈ فنچ جس کو اردو میں سہرا کہتے ہیں اور ایک مادہ گو برلا وا لکھنؤ وغیرہ سے تلاش کر کے منگوادو کہ سرد موسم میں یہ چڑیاں ملتی ہیں اور مجھ کو پرندوں کا شوق بہت ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میں ضرور کوشش کر کے ان کو منگواؤں گا۔

خریداری کتب: ۱۰ر نومبر ۱۸۹۲ء۔ آج میں نے مطبع منشی نولکشور لکھنؤ سے حسب ذیل کتابیں منگائیں۔ اکسیر ہدایت ترجمہ کیمیائے سعادت دو روپے چار آنہ، دیوان حافظ محشی بارہ آنہ، محصول ڈاک فیس منی آرڈر دس آنہ = جملہ ۳ روپے دس آنے۔

گھر بھر بیمار: ۱۳ر نومبر ۱۸۹۲ء۔ آج کل علاوہ خلجان مقدمات متدائرہ کے میں تشویشات بیماری میں بھی سخت غلطاں و پیچاں رہتا ہوں۔ کوئی وقت ان سے جدائی نہیں ہوتی۔ اول تو مجھے تیرہ روز گزشتہ سے برابر دورہ اجابت طلیق کا ہوتا ہے جس سے بحد سے ضعیف ہوگیا ہوں اور ہنوز کوئی افاقہ نہیں۔ دوسرے نور چشم مصطفےٰ علی خلف اکبر پھوڑہ ہائے زیر بغل میں مبتلا ہیں جس سے حرارت لاحق رہتی ہے اور استعمال منضج کا ہو رہا ہے۔ تیسرے نور چشم مجتبیٰ علی خلف دوئم کی تحریر ۱۱ر نومبر سے بمقام کانپور سے واضح ہوا کہ وہ خارشت سخت میں مبتلا ہیں اور چند پھوڑے ایسے برآمد ہوئے کہ مدرسہ تک جانا دشوار ہے۔ چوتھے نور چشم مرتضیٰ علی زکام و بخار میں بمقام لکھنؤ مبتلا ہیں کہ کالج تک نہیں جا سکتے۔ پانچواں برخوردار مرتضیٰ علی حرارت و دردسر میں بمقام لکھنؤ اور چھٹا نور چشم التفاتاً بعد وفات فرزند کے بخار شدید میں مبتلا ہیں بلکہ اس وقت کیفیت بے ہوشی کی پیدا ہے۔ ساتواں اہلخانہ برخوردار مصطفےٰ علی ضیق النفس میں۔ نور دیدہ منتظم حسین حرارت و اسہال میں نور العین مرزا حسین عارضہ خارشت و استفراغ میں۔ غرض ان دنوں میں سخت پریشانی میں مبتلا ہوں۔ خدا رحم کرے۔ آمین

استعمال چائے: ۱۸ر دسمبر ۱۸۹۲ء۔ چونکہ استعمال چائے کا تحلیل ریاح کے واسطے مفید معلوم

ہوتا ہے لہٰذا زمانہ بارش سے میں بالمرۃ علی الصباح اس کا استعمال کرتا ہوں جس میں تین عدد بادام گھسے ہوئے اور ایک تولہ بالائی اور ایک ماشہ بادیان خطائی پڑتا ہے۔

منشی شمس الدین: یکم جنوری ۱۸۹۴ء۔ آج منشی عبدالصمد واصل باقی نویس تحصیل سندیلہ سے جو نہایت درجہ معتمد دستیر بابو نوروز علی تحصیلدار کے ہیں معلوم ہوا بلکہ انھوں نے حلفیہ بیان کیا کہ تحصیلدار سے آپ کی رنجش کے باعث جناب منشی شمس الدین احمد صاحب مرحوم تھے کہ جنھوں نے بحالت تخلیہ تحصیلدار سے بیان کیا تھا کہ "مظہر علی اچھے آدمی نہیں ہیں۔ ان سے بہت ہوشیار رہنا چاہیے اور ان کو اختیارات امیونسپل میں خودسری کے بند دینا چاہیے بلکہ ہمیشہ اپنے زیر حکومت رکھنا چاہیے ورنہ تم کو ضرر پہنچے گا" اسی وجہ سے تحصیلدار مجھ سے بہت کشیدہ رہا کرتے تھے اور میرے ہر فعل کو نگاہ حقارت سے دیکھتے تھے بلکہ اسی زمانے میں میرے خلاف رپورٹ اخفاے لگان کی صدر کو بھیجی تھی جس کی وجہ سے آج تک پریشانی میں مبتلا ہوں۔ چونکہ ہمارے بزرگوار (شمس الدین صاحب) اور تحصیلدار سے ضلع کچہری کے روابط تھے اور تحصیلدار ان کو بہت نیک صفات اور مقدس سمجھتے تھے اس وجہ سے ان کی شکایت کا پورا اثر میری نسبت ہوا حالانکہ بعد تجربہ کامل اب تحصیلدار کے دل سے ویسے خیالات میری نسبت باقی نہیں رہے تھے اور مجھے اچھا سمجھنے لگے تھے۔ افسوس کہ ایک مقدس بزرگ سے بعوض بھلائی و بہبودی کے یہ ثمرہ حاصل ہوا۔

حاجی وارث علی شاہ: ۲۴ فروری ۱۸۹۴ء۔ آج ۷ بجے صبح میں نے شرف ملازمت جناب حاجی وارث علی شاہ صاحب کی حاصل کی۔ بہت مہربانی سے پیش آئے اور سرو قد تعظیم دے کر مجھ سے معانقہ کیا اور ضروری بات چیت فرمائی۔ کل چونکہ بعد دریافت خیریت مجھے سلام کہلا بھیجا تھا اس وجہ سے مجھے فرض ہوا کہ حصول زیارت سے شرف ہوں۔

عید الفطر: ۹ اپریل ۱۸۹۴ء۔ ۳۰ شوال ۱۳۱۱ھ۔ آج چودھری حسن جان خلف چودھری محمد عظیم صاحب تعلقہ دار و فتح علی ولد چودھری نصرت علی خاں بہادر و چودھری محمد عظیم صاحب و میر محمد عوض صاحب رؤسائے مہونہ و نواب جد علی خاں بلوچ اشراف ٹولہ مجھ سے عید ملنے آئے۔ چودھری صاحب آخرالذکر مجھ سے دیر تک ہر قسم کی بات چیت کرتے رہے اور چونکہ میں نے ان کی بہ عہد بابو نوروز علی تحصیلدار سندیلہ ہر قسم کی مدد کی تھی اس وجہ سے اکثر باتوں میں ان کی رضامندی میری نسبت ظاہر ہوئی۔

قانونی کتب: ۱۷ اپریل ۱۸۹۴ء۔ چونکہ اس زمانے میں بدون واقفیت قانون کوئی شخص لائق تصور نہیں کیا جاتا ہے اس وجہ سے میں نے ایک سو برس کے قوانین غیر منسوخ اپنے کتب خانہ میں فراہم کر لیے

ہیں اور ہر سال ایک جلد خلاصہ نظائر فوجداری ہائی کورٹ الہ آباد، مدراس، کلکتہ، بمبئی کے سرکاری چھاپہ خانوں سے منگاتا رہتا ہوں کہ بروقت ضرورت مجھے کہیں سے مستعار منگانے کی حاجت نہ پڑے اور لوگ اپنی رفع ضرورت کے مجھ سے خواہش مند ہوں۔ مجھے اپنی اولاد نیک اطوار سے امید ہے کہ اس رسالہ کو بحفاظت رکھیں گے اور وقتاً فوقتاً قوانین جدید اپنے کتب خانہ میں اکٹھا کرتے رہیں گے۔

راجہ درگا پرشاد: ۲۴ر اپریل ۱۸۹۴ء۔ آج راجہ درگا پرشاد صاحب رئیس سندیلہ میری ملاقات کو تشریف لائے اور میری کتاب سوانح عمری کو دیکھ کر فرمایا کہ آپ نے عبارت بہت لطیف سلیس و رواں لکھی ہے جو چودھری حافظ شوکت علی صاحب کی عبارت سوانح عمری سے بہت عمدہ ہے۔

قول سعدی: ۱۱ر مئی ۱۸۹۴ء۔ کس نیا موخت علم تیر از من :: کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

یہ قول حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کا بہت صحیح و درست ہے اور جہاں تک میں نے تجربہ کیا یہ مثل میرے حق میں بہت صادق آتی ہے۔ میں اپنے تجربہ سے لکھتا ہوں کہ جس شخص کے ساتھ میں نے سلوکات کیے اور اس کی بہبودی کا باعث ہوا بالآخر اس سے ضرر میری ذات و مال کو ضرر پہنچا جس کی چند مثالیں حوالہ قلم کرتا ہوں....

تحسین: ۲۴ر مئی ۱۸۹۴ء۔ آج مرزا یعقوب حسین صاحب تحصیلدار کے مکان پر منشی سید یوسف زماں صاحب حاکم بندوبست تحصیل سندیلہ سے ملاقات ہوئی۔ تحصیلدار صاحب نے میرا ڈپٹی صاحب سے تعارف کرایا کہ یہ صاحب رئیس سندیلہ نہایت لائق اور وقت کے فلاسفر ہیں۔ کوئی وقت ان کا فضول و رائیگاں صرف نہیں ہوتا سرکاری کاموں کی طرف بہت دلچسپی ہے۔ آنریری مجسٹریٹی کا کام مثل تنخواہ دار مجسٹریٹ کے بہت استعدادی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔

مصطفیٰ علی: ۱۰ر ستمبر ۱۸۹۴ء۔ آج ایک پوسٹ کارڈ محررہ ۸ ستمبر سن الیہ مرسلہ عبدالاحد صاحب فرنگی محلی لکھنوٴ مہتمم مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور بجواب خط راقم مشعر بدیں مضمون موصول ہوا کہ برخوردارم سید مصطفیٰ علی مدرسہ مذکورہ میں علم عربی حاصل کر رہے ہیں۔ دو کتابیں ختم کر چکے ہیں۔ ان کا قصد ہے کہ بذریعہ اس کے علم طب کا تکملہ کریں اور ایک عہدہ ماسٹری بھی ان کو مل گیا ہے۔ جو کفیل ان کے مصارف کا ہے۔ بالفعل وہ مولوی حافظ محمد علی صاحب وکیل کے مکان پر رہتے ہیں۔ یہ خبر معلوم کر کے بدرجہ غایت خوشی ہوئی جوان کی مفقودی سے ایک مہینہ بیس یوم کے بعد سماعت میں آئی۔ میں نے اپنے اعزہ و احباب کو فوراً خطوط روانہ کیے جو اس کے منتظر تھے اور میں نے مولوی صاحب کو شکریہ لکھ بھیجا۔ برخوردار مصطفیٰ علی کو لکھا کہ تمہاری

یت معلوم کر کے جی خوش ہوا۔ تم کو حسب خواہش خود تحصیل علم کا اختیار ہے میں مانع نہیں ہوں۔ اگر ضرورت
پ کی ہو تو میں بھیج دوں۔ تم اپنی خیریت سے مطلع کرو کہ مجھے اور دوسروں کو طمانیت حاصل ہو۔

۲۱ ر اکتوبر ۱۸۹۴ء۔ جو خطوط برخوردار مصطفیٰ محررہ ۱۳، و ۱۵ ر اکتوبر کو بھجوائے گئے تھے ان کا
دش نتیجہ نکلا کہ شب گزشتہ کو برخوردار موصوف بعد مفقود الخبری بخیریت تمام باز پس سندیلہ آئے اور ان
والدہ نے بالطہار مسرت آج برادری جمع کی اور مولود شریف پڑھوایا۔ اس چھوٹی سی تقریب میں ۱۵ ر روپے صرف ہوئے۔

ابازی و چالاکی: ۱۶ ر دسمبر ۱۸۹۴ء۔ آج کل گردش زمانہ کچھ چالاک کاذب و دغاباز آدمیوں کے موافق
رہی ہے۔ میں تجربہ سے لکھتا ہوں کہ لوگ جھوٹ و دغابازی سے براہ چالاکی کوئی فعل کرتے ہیں تو ان کو ہر طرح
کامیابی ہوتی ہے۔ بالفعل یہ امر میرے مشاہدہ میں آچکا ہے کہ ایک شخص اپنے آقا کی حضوری میں اس قدر تعریف
تا ہے گویا بادشاہ وقت وہی ہیں لیکن جب علیحدگی ہوتی ہے تو کوئی دقیقہ مذمت حضرت آقا کا اٹھا نہیں
کھتا۔ وہ بہ خوش حالی کر رہا ہے اور جو لوگ نہایت راست بازی ایمانداری اور نیک نیتی سے چل رہے
باعث تکلیف و پریشانی میں مبتلا ہیں۔ یہ محض زمانہ کی خوبی ہے ورنہ میں ہمیشہ نیک روشی کا انجام خوش دیکھتا
ا ہوں اور میں یہ کہنے کو تیار ہوں کہ ایمانداری و نیک نیتی ضرور اپنا ثمرہ نیک دکھا دے گی اور بد روشی
یشہ ذلت و خواری میں مبتلا رہیں گے۔

سوانح عمری خود: ۱ ر مارچ ۱۸۹۵ء۔ چونکہ کتاب سوانح عمری راقم بشمول تقریظ و شجرہ وغیرہ
بیس جزوں میں چھپی لہٰذا کل اجرت مطبع کوثن پریس سندیلہ ایک سو بہتر روپے چودہ آنہ نو پائی قرار پائی اور
بعد مجرائی وصول سابقہ میں نے رقم بقیہ اڑتیس روپے بارہ آنہ نو پائی مطبع کوثن کو آج بھیج دی۔ اب کچھ باقی نہیں رہا۔

انبہ: ۱۳ ر جون ۱۸۹۵ء۔ تجربہ سے مجھے استعمال انبہ بہت مفید ثابت ہوا اور اس کے ہضم کے واسطے
ماشہ سونٹھ اور اسی قدر نمک سیاہ بہت فائدہ بخش ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ انبہ کے استعمال سے میری
انائی کو ترقی ہوتی جاتی ہے علی الخصوص پتلے رس کا تخمی شیریں آم زیادہ تر مفید ہے۔

آم کی شاخیں: ۱۰ ر جولائی ۱۸۹۵ء۔ اگر تم چاہو تو تمہارے انبہ کے درخت ہر سال بارآور
ہوں تو ہر سال بور آنے کے پہلے کم زور شاخوں کے پتے توڑ کر پھینک دو کہ بجائے بور آنے کے
ن میں نئے نئے کلے نکلیں۔ نئی شاخیں دوسرے برس پھولتی اور پھل لاتی ہیں۔

متعلق سوانح عمری: ۲۷ ر اگست ۱۸۹۵ء۔ آج پوسٹ کارڈ مورخہ ۲۶ ر اگست مرسلہ حکیم محمد علی خان طبیب

میونسپل ہردوئی مشعر یہ مضمون موصول ہوا کہ شیخ ولایت علی ولد لائق علی اشراف گولہ سندیلہ ایک مضمون متعلقہ تردید بعض صفحات سوانح عمری آپ کی میرے مطبع میں طبع کرانا چاہتے ہیں چونکہ میں آپ کا نیازمند ہوں اس لیے میرا فرض ہے کہ میں آپ سے اس کے چھاپنے کی اجازت حاصل کروں۔ بجواب اس کے میں نے لکھ بھیجا کہ اپنی کتاب سوانح عمری میں کل واقعات میں نے سچے لکھے ہیں۔ اگر شیخ ولایت علی کوئی ایسی تردید چھپوائیں گے جس کا مضمون میرے خلاف ہوگا یا اس سے کسی قسم کی اہانت متصور ہوئی تو شاید میں اس کی طوالت میں ہرگز در طبع نہ کروں گا اور بلا ارجاع نالش باز نہ رہوں گا۔ اگر آپ ایک نقل اس کی قبل طبع مجھے لطف فرمادیں تو باعث مشکوری ہوگا۔ یہ بھی شان خدا ہے کہ جس کو میں نے اپنا موقع موئی دے کر صاحب ریاست کردیا اور عزت پیدا کرانے کا باعث ہوا اور کل مطالبہ اپنا اس وقت تک وصول نہیں کیا وہ اپنی اصلاح کو چھوڑ کر مخالفت پر کمربستہ ہیں۔ سچ یہ ہے کہ کم ظرفوں کے ساتھ چاہے جس قدر سلوک کیا جائے لیکن وہ اپنی اصلیت کی جانب بدون رجوع کیے باز نہیں رہتے۔ مثل مشہور ہے کل شئی یرجع الی اصلہ۔

صبح کی ورزش: ۲۷ر ستمبر ۱۸۹۵ء۔ صبح کی ورزش و پا پیادہ تفریح سے میری تندرستی کو بہت فائدہ پہنچ رہا ہے۔ طبیعت بشاش چست و چالاک رہتی ہے۔ غذا بخواہش ہوتی ہے اور کسی کام سے جی نہیں گھبراتا۔ یہ تفریح بیرون قصبہ کم از کم ایک گھنٹہ ہوتی ہے۔

محنت: ۲۸ر ستمبر ۱۸۹۵ء۔۔۔۔ میں خود ہی اپنی ذات سے تمام اوقات مصروف رہتا ہوں۔ حتیٰ کہ سوائے رات کے نصف تک چارپائی پر نہیں لیٹتا اور زیادتی محنت سے بوقت شب دماغ تپکنے لگتا ہے لیکن باوصف ان سب باتوں کے میں کل کام اپنے آرام پر مقدم تصور کرتا ہوں۔ غدا میری اولاد کو بھی ہدایت کرے۔

۶ر نومبر ۱۸۹۵ء۔ ملک ہسپانیہ میں ایک مثل ہے کہ خدا سے دعا مانگو اور ہتوڑے کو بھی لوہے پر مارتے رہو ورنہ صرف دعا مانگنے سے لوہا کبھی نرم نہیں ہوسکتا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ مطابق اس مثل کے میرا ہمیشہ طریق عمل رہا جس سے کسی کام میں مجھے بہت کم ناکامی ہوئی اور میرے اس بیان کی تصدیق میری کتاب سوانح عمری سے بطرز احسن ہوسکتی ہے۔ بہرحال انسان کو اپنی کوشش و پیروی سے ہرگز باز نہ رہنا چاہیے جس کی بدولت کل کام بن سکتے ہیں۔

الجھن: ۲۸ر نومبر ۱۸۹۵ء۔ کل سے میں بعض امور مستقبل کا خیال کرکے ازبس پریشان تھا کہ اب میرا صرف برخورداران ارتضیٰ علی و مرتضیٰ علی کی شادیوں سے اور بڑھے گا اور سلسلہ آمدنی دیہات بوجہ سقیم سالی

چار سال گزشتہ بہت گھٹ گیا اور اب تجویز جمع بندوبست ثانی سے اور بھی گھٹے گا جو نومبر ۱۸۹۶ء سے کی جاوے گی لہٰذا میں کیونکر با عزت و آبرو اپنے مصارف خانہ داری کو چلا سکوں گا پس میں نے اسی حالت انتشار میں بہ نظر استدراک حالات پیش کتاب دیوان حافظ اور سکندر نامہ نظامی میں بوقت ۳ بجے شام کے فال دیکھی اور استدعا کی کہ میں صاف طور سے مطلع کیا جاؤں کہ میرے حق میں کیا شدنی ہے۔ اتفاق سے دونوں کتابوں میں صفحہ نمبر ۱۶۲ فال نکلی جن کے اشعار حسب ذیل درج کیے جاتے ہیں۔ کتاب دیوان حافظ کتاب خانہ راقم صفحہ ۱۶۲ کا شعر یہ ہے:

اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقان ریزد ۔۔۔ من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

کتاب سکندر نامہ مصطفائی۔ صفحہ ۱۶۲

شنیدم رسن بستی سوئے داد ۔۔۔ برو تازگی وقت خون بہار (کذا)

بمعائنہ اشعار مفصلہ صدر کے صاف مترشح ہوتا ہے کہ میرا رنج و غم ضرور برطرف ہو جائے گا اور میں آئندہ بہ کامیابی تمام بسر کروں گا جس سے مجھے نہایت درجہ طمانیت حاصل ہوئی اور اسی وقت سے میرے افکار لاحقہ میں خفت ہوئی بہرحال الٰہی یہی امید ہے کہ وہ کامیابی کی زمانِ آئندہ میں دکھاتا ہوں اور بہرحال اسکے فضل و کرم کا امیدوار ہوں۔

اعتدال: ۸ فروری ۱۸۹۶ء۔ انسان کو لازم ہے کہ وہ انحطاط عمر و قویٰ میں اپنی طبیعت کو کھانے پینے و سونے و جاگنے و رفع ضروریات میں بہت سنبھل کر بحالت اعتدال رکھے اور بہ پابندی اوقات ہر ایک کام انجام دیتا رہے ورنہ اسکی تندرستی کبھی قائم نہیں رہ سکتی اور بقیہ ایام زندگانی بہ لطف بسر نہیں لے جا سکتا۔

پابندی نماز و وظائف: ۴ مئی ۱۸۹۶ء۔ ۴۲ سال کا زمانہ ہوا جب میں نے نماز کی پابندی کی۔ اسی وقت سے درود شریف ہر نماز کے بعد ایک صد بار و سبحان اللہ بحمدہ ۲۵ بار سورہ مزمل ایک بار برابر پڑھتا رہا ہوں..... اور ۳۶ سال سے یا مظہر العجائب بالخیر بعد نماز عشا کے ۳۶۰ بار ورد میں ہے جس کے اول و آخر سات سات مرتبہ درود شریف پڑھتا ہوں اور ۳۰ سال گزشتہ سے چہل کاف بعد نماز صبح و مغرب ایک بار پڑھا کرتا ہوں۔ ان اوراد کی برکت ورد سے مجھے بہت بڑا نفع دنیاوی حاصل ہوا اور ہو رہا ہے۔

چند آم: ۲۶ جون ۱۸۹۶ء۔ راجہ درگا پرشاد تعلقہ دار نے چند انبہ حیدرآباد دکن کے آج بھیجے جوان کو راجہ مرلی منوہر صاحب جاگیردار دس لاکھ ریاست موصوف نے بھیجے تھے۔ آم بڑے تھے اور خوشبو امرود کی تھی۔

ایک شاہ صاحب: ۲۲ اگست ۱۸۹۶ء۔ کل شام کو ایک بزرگ دارا شاہ ساکن مہاراج گنج ضلع جون پور کا میرے مکان پر گزر ہوا۔ ان کے پاس چند اسناد تحریری تھے جن کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ

آدمی بے طمع و متوکل ہیں۔ شب کو میرے مکان پر ٹھہرے۔ بہت آسودگی کے ساتھ کھانا نوش کیا اور حقہ پیا۔ ہر قسم کی ان کی خاطر داری ہوئی جس سے بہت رضامند ہوئے۔ اور آج صبح کو بوقت رخصت مجھ سے کہا کہ جو حاجت ہو بیان کرو کہ اس کے پورا کرنے کی کوشش کروں۔ بجواب اس کے میں نے کہا کہ دعائے خیر۔ کہا کچھ اور مانگو۔ میں نے کہا کہ جو کچھ مانگنا ہوتا ہے وہ میں اپنے رب العالمین سے مانگا کرتا ہوں اور میں اس کی ذات پر پورا بھروسہ رکھتا ہوں اور شاکر ہوں۔ شاہ صاحب میری اس گفتگو سے بہت متعجب ہوئے۔

معلومات عامہ: ۲۹ ستمبر ۱۸۹۶ء (۱) ۱۸۵۴ء کے نصف آخر میں ہندوستان میں ریل جاری ہوئی (۲) صبح کو ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی کر ٹہلنا واسطے رفع قبض کے بہت مفید ہے (۳) بالائی اور مرچ سیاہ درد شقیقہ پر ملنا بہت مفید ثابت ہوا ہے۔

خواب خوش: ۱۲ نومبر ۱۸۹۶ء۔ علی الصبح بوقت نماز میں نے خواب دیکھا کہ ایک دولت مند کی محل سرا میں داخل ہوا اور مالک مکان نے (جو ابھی زندہ ہیں) میرے داخلہ محل سرا کو بہ نظر مسرت و عزت دیکھا اور ایک معشوقہ دل نواز کو جو مجھ سے پردہ کرتی ہے اجازت دی کہ بالاخانہ پر چلی جائے جس کی اوٹ اس نے خود کی لیکن بوجہ غیر کافی ہونے پردہ کے اس کا نصف جسم اسفل صاف نظر آتا تھا جو اطلس کا کلی دار پاجامہ جس کی ہر کلی میں گوٹا و پانچوں میں لچکا لگا تھا پہنے تھی اور اس کے کڑوں اور چھڑوں نقرئی کی آواز میرے کانوں تک آتی تھی۔ بعدہٗ میری آنکھ کھل گئی۔ میں حیرت میں ہوں کہ کس قسم کی خوابیں ہیں جن کو میں چار سال برابر دیکھ رہا ہوں اور جس کا قبل از خواب کوئی وہم و گمان نہیں ہوتا۔ دیکھنا چاہیے کہ اس کا کیا ظہور ہوتا ہے۔

قحط زدہ لوگ: ۱۵ نومبر ۱۸۹۶ء۔ آج پھر میں نے انتظام تقسیم طعام محتاجوں کا کیا۔ محتاج خانہ موقوعہ پشت مقبرہ منشی فضل رسول صاحب مرحوم میں حسب ذیل آدمی ہیں:

مرد ۶۰، عورتیں ۲۰، لڑکے ۱۶، کل = ۹۶۔ فی روٹی گیہوں کی ½ سیر تھی۔ تین تین مردوں کو، دو دو عورتوں کو اور ایک ایک لڑکوں کو تقسیم ہوئیں اور ایک ایک سفید کمبل مردوں کو اور پتلی مارکین کی چادریں عورتوں کو دی گئیں۔ کل صرفہ منجانب گورنمنٹ ہو رہا ہے۔

سال کا آخری دن: ۳۱ دسمبر ۱۸۹۶ء۔ آج سال ۱۸۹۶ء ختم ہوا۔ بوجہ کمی بارش از حد گرانی و قحط سالی سے خلق اللہ کو بہت تکلیف پہنچی۔ ہزارہا آدمی فاقہ کشی سے مر گئے اور اپنی اولاد آٹھ آٹھ آنے پر فروخت کر دی۔ مجھے بھی اس سال تفکرات زائد رہے۔ کوئی کامیابی نہیں ہوئی اور نہ میری اولاد کو دیکھنا چاہیے کہ

۱۸۹۷ء کیسا گزرتا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ باعزت و آبرو رکھے اور ہر طرح سے کامیابی عطا فرماوے۔

کرتا ٹوپی: ۸ر جنوری ۱۸۹۷ء۔ آج غسل آخر ولادت دختر اہل خانہ الطاف رسول نے کیا۔ اگرچہ کرتہ ٹوپی بھیجنے کی ہر ایک عزیز نے رسم ادا کی۔ میں نے بھی بھیجا۔ اور لگانے صندل پر ایک روپیہ زوجہ صفی حجام کو دیا لیکن جس دھوم دھام سے مسماۃ حسنا بنت الٰہی جان و مسماۃ شیریں بنت کوکا طوائف نے با دیگر جماعت کثیر اپنی ہم قوم کے کرتہ ٹوپی لے گئیں وہ کیفیت قابل دید تھی۔ آگے ڈفلی اس کے پیچھے تاشا و شہنائی بجتی تھی اور اس کے بعد رنڈیوں کا غول گاتا بجاتا جاتا تھا جس کے ساتھ صدہا تماشائی تھے۔ چونکہ اس گھر میں ان لوگوں کا بہت مان دان ہے لہٰذا ایسی کارروائیوں سے خوب حاصلات کر رہے ہیں اور انتظام ریاست میں بھی مشیر ہیں۔

فضل حسین: ۴ر مارچ ۱۸۹۷ء.... بوقت شب بذریعہ رقعہ منشی سید فضل حسین نے مجھے طلب کر کے باصرار کہا کہ میں فی الجملہ علیل ہوں اور بجز آپ کے دوسرے شخص پر مجھے اعتبار نہیں ہے کہ اس قدر روپیہ اس کی معرفت منگایا جاوے لہٰذا آپ لکھنؤ جا کر بیس ہزار روپیہ بینک بنگال سے مجھے لا دیں اور اس میں سے مبلغ چار ہزار بابت فک رہن حصہ موضع 'سر پرھی' آپ لے لیجیے جو آپ کو یافتنی ہے۔ لہٰذا حسب اصرار ان کے میں نے شب کو کل انتظام اپنے لکھنؤ جانے کا کر لیا۔ آج کل منشی صاحب میری جانب بہت متوجہ ہیں بلکہ منولال ان کے خزانچی مجھ سے کہتے تھے کہ بجز آپ کے ان کی نگاہ دوسری طرف نہیں پڑتی ہے اور ان کا ارادہ ہے کہ انتظام تعلقہ جلال پور پھر آپ کے سپرد کریں اور جملہ دوسر سے نجات پاویں۔ سچ یہ ہے کہ بدون آپ کی مداخلت کے اب یہ علاقہ ہرگز چل نہیں سکتا ہے

انجام قحط: ۹ر جون ۱۸۹۷ء۔ آج مجھے دریافت سے معلوم ہوا کہ میرے یہاں گیارہ لڑکیاں واسطہ پرورش خدمت کے اس قحط سالی میں حاصل کی گئیں جن کی تفصیل بقید اسم درج ذیل ہے (نام حذف کیے گئے۔ ہاشمی) اور ان سب کی پرورش میری ذات خاص سے متعلق ہے اور ہر ایک واسطے خدمت گزاری کے میری اولاد میں تقسیم ہے۔ چونکہ میں گھر میں چھ چھ مہینہ تک نہیں جاتا ہوں اس وجہ ان کے حالات سے محض غیر مطلع تھا۔

دوبارہ منیجری علاقہ: ۲۳ر جون ۱۸۹۷ء۔ (مقام ہردوئی)۔ آج صبح کو منشی فضل حسین صاحب تعلقہ دار شیخ رعایت حسین صاحب وکیل کے مکان پر تشریف لائے جہاں میر امجد علی صاحب وکیل بھی موجود تھے اور ان دونوں صاحبوں کو مجبور کیا کہ مجھے واسطے انتظام علاقہ جلال پور کے رضامند کریں۔ چنانچہ انھوں نے بہت زور دے کر مجھے مجبور کیا کہ میں تعلقہ مذکور کا کام اپنے ہاتھ میں لوں اور ان دونوں صاحبوں اور بعد کا بہ ارشاد

صاحب (جو اس وقت وہاں موجود تھے۔ہاشمی) اس بات کا اقرار کیا کہ اگر آئندہ کوئی امر خلاف مزاج آپ کے منجانب منشی صاحب وقوع پذیر ہوگا جو باعث آپ کے ملال کا ہو تو ہم لوگ اسے رفع کرا دیں گے۔ چنانچہ بہ تائید اس بیان کے ایک یادداشت میر امجد علی صاحب وکیل نے مرتب کی جس میں کل اختیارات نظم و نسق علاقہ مجھے تفویض ہوئے اور ایک سو روپیہ ماہوار تنخواہ بدستور سابق اس میں درج ہوئی اور تینوں صاحبوں کا اس میں حوالہ درج یادداشت مذکور کیا گیا اور منشی صاحب موصوف نے بعد ثبت دستخط خود یادداشت مذکور میرے حوالہ کی اور اپنے ساتھ آج دوپہر کی ریل میں سندیلہ مجھے لائے .... آج یہ بہت بڑا بار میرے سر پر رکھا گیا جس کے واسطے میں دعا کرتا ہوں کہ خداوند کریم انجام اس کا بخیر فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

شادی پسران خود: ۲۳ ستمبر ۱۸۹۷ء۔ میں نے ریل کی دو گاڑیاں لکھنؤ سے منگائیں۔ فی درجہ آٹھ آدمیوں کی نشست تھی۔ چونکہ ہر گاڑی میں چھ درجے ہوتے ہیں لہٰذا چھیانوے آدمی اس میں بیٹھے۔ ماباقی براتیوں کے ٹکٹ خرید ہوئے۔ کل براتیوں کی تعداد تقریباً دو سو کے تھی جو سندیلہ سے روانہ ہوئے تھے لیکن لکھنؤ میں پہنچ کر بشمول باجوں والے اور طائفہ زنانہ و مردانہ کے ۴۲۴ تک تعداد بڑھ گئی۔ جب بارات اسٹیشن لکھنؤ پر پہنچی تو منشی لطف حسن ساکن سندیلہ نائب حال تحصیلدار لکھنؤ مع ۲۳ عدد فٹن اور مع انگریزی و ہندوستانی باجوں کے مستعد تھے۔ سب براتی گاڑیوں پر سوار ہوئے اور باجا بجتی ہوئی بارات روانہ ہوئی۔ وقت مغرب دروازہ دولھن کے محلہ مشک گنج میں بارات پہنچی جو مکان میر مونس مرثیہ خواں پر ٹھہری۔ نو بجے رات کے شیخ یوسف الزماں صاحب نے براتیوں کو کھانا دیا جس میں نان، شیر برنج، قلیہ، قورمہ، پلاؤ، زردہ و شیرمال تھی۔ بعد تناول طعام اول مسماۃ خورشید طوائف سندیلہ کا رقص ہوا۔ زاں بعد مسماۃ جدن ایک نامور طوائف لکھنؤ کا رقص ہوا جس سے حاضرین کو ایک نوع کا حظ حاصل ہوا۔ بعدہٗ بسنتی طوائف لکھنؤ کا رقص ہوا۔ جس وقت یہ ناچ ہو رہا تھا اور وقت ۴ بجے رات کا تھا کہ دفعتاً کسی شقی القلب نے ایک ایسی اینٹ جلسہ میں پھینکی جو نور چشم مرتضیٰ علی کی داہنی بھوں پر لگی اور خون جاری ہو گیا۔ جلسہ میں بے لطفی پیدا ہو گئی۔ بڑی خیریت ہوئی کہ آنکھ بچ گئی۔ انتظام جلسہ متعلق منشی لطف حسن صاحب تحصیلدار کے تھا ... انتظام بارات کا برخوردار مجتبیٰ علی و شیخ مقبول احمد (خلف دوئم منشی عزیز الدین احمد صاحب مرحوم) و چودھری عبدالباسط صاحب (خلف دوئم چودھری عبدالباقی صاحب) کے متعلق تھا جنھوں نے بہت مستعدی کے ساتھ اپنے کار متعلقہ کو انجام دیا۔ افسوس کہ برخوردار مصطفیٰ علی بوجہ علالت خود شریک بارات نہ ہو سکے۔

طائفے جو رقص کناں تھے ان کو اجرت علاوہ انعام کے حسب ذیل دی گئی۔ خورشید طوائف ۱۵ روپے۔
ن طوائف ۔ ۱۷ روپے، بسنتی طوائف ۱۴ روپے

۲۴ ستمبر ۱۸۹۷ء۔ چھ بجے صبح کو برخوردار ارتضیٰ علی کا مسماۃ شاکرہ دختر شیخ یوسف الزماں صاحب
بعوض مہر ۸۵ ہزار عقد ہوا۔ بعدہٗ برخوردار مرتضیٰ علی کا مسماۃ انیس دختر مولوی محمد کریم صاحب دریابادی
عقد قرار پایا مہر وہی ۸۵ ہزار تھا۔ مولوی محمد نعیم صاحب فرنگی محلی نے نکاح پڑھا۔ سہ پہر کو من جانب
وی محمد کریم صاحب براتیوں کو کھانا دیا گیا۔ قریب ۶ بجے شام کے رخصتی بارات کی ہوئی۔ صندل دونوں
ں کی مانگوں میں میں نے بھرا۔ شیخ یوسف الزماں صاحب ایک سو ایک روپیہ اور مولوی محمد کریم صاحب
اکیاون روپیہ سلامی دیا۔ جہیز حسب ذیل دیا گیا۔ (حذف کیا گیا۔ ہاشمی) سات بجے بارات اسٹیشن لکھنؤ
ی اور پونے دس بجے وہاں سے رات کی ریل میں روانہ ہو کر ۱۱ بجے داخل سندیلہ ہوئے ... میں نے برسم
ارکائی اپنی لڑکیوں کو ایک باغ دیا ... میں نے اس تقریب میں ۳، ۴ روز تک قریباً ایک ربع غذا کی
جہاں تک میں حساب لگاتا ہوں تو قریباً تین ہزار روپے میرا ان دونوں تقریبوں میں صرف ہوا۔ ہاں
قدر لکھنا بھول گیا کہ اس تقریب میں آرائش و آتش بازی بھی تھی۔ چونکہ آج جو ہتھیار نہیں آئے
وجہ سے رخصتی عروسان نہیں ہوئی۔ قریباً تین سو روپیہ نیوتہ اندر و باہر میرے یہاں آیا۔

<u>محاسبہ سالانہ</u>: ۳۱ دسمبر آج سال ۱۸۹۷ء ختم ہوا۔ میں مختصراً اپنے حالات ذیل میں درج کرتا ہوں:

۱۔ مہینہ جون میں انتظام تعلقہ جلال پور اپنے ہاتھ میں لیا مبلغ سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی —
برخورداران ارتضیٰ علی و مرتضیٰ علی کی شادی میں تقریباً تین ہزار روپے خرچ ہوا ۲۔ قحط سالی سے اکثر مہاجون
دیوالہ نکل گیا اور مقروض ہو گئے ۳ لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں وہ ایام عزت و آبرو سے بسر لے گیا۔ اس قحط سالی
بہت سے لوگ ضائع ہوئے اگرچہ گورنمنٹ نے ان کی جان بچانے میں بہت کچھ روپیہ صرف کیا۔ میں نے انجام
کار قحط میں بہت مستعدی حکام وقت کے ساتھ ظاہر کی اگر مجھے تکالیف سخت کا سامنا رہا ۴۔ جائداد قلیل
نے اس سال حاصل کی اگرچہ معاملات پیچیدہ چند سال گزشتہ کے بہت سلجھ کر صاف ہوئے ۵۔ برخوردار مصطفیٰ
دو ہفتہ تک مفقود الخبر ہو گئے۔ آخرش پٹنہ عظیم آباد سے خط خیریت کا بھیجا اور واپس آئے ۔ ۶۔ شکر ہے کہ
قصبہ ہٰذا میں بہ نگاہ وقعت دیکھا گیا اور عموماً اہل قصبہ مجھ سے راضی و خوش رہے ۷۔ مبلغ چار
ہزار روپیہ بابت فک رہن حقیت مہر موضع سرہری، منشی فضل حسین صاحب سے مجھے وصول ہوا۔

جس سے بہت سے معاملات تصفیہ طلب طے ہوگئے اور اسی روپیہ سے میں نے لڑکوں کی شادی بھی کی۔

علالت فضل حسین: ۶ مارچ ۱۸۹۸ء۔ آج الٰہی بخش جراح محلہ وکٹوریہ گنج لکھنؤ سے آیا اور اس نے علاج دنبل منشی فضل حسین صاحب تعلقہ دار کا شروع کیا اور کہتا ہے کہ ایک ہفتہ میں بلا چاک کیے اچھا کر دوں گا۔ الٰہی بخش قوم کا حجام ہے جس کی عمر پچاس کی ہو گی۔

۲۴ مارچ ۱۸۹۸ء۔ آج ریڑھ کی دوسری جانب کا پھوڑا منشی فضل حسین صاحب الٰہی بخش جراح لکھنؤ نے چاک کیا لیکن وہ ناکافی ہوا۔ اگر تھوڑا نشتر اور بڑھ جاتا تو یقین تھا کہ اس کا کل ریم نکل جاتا۔ تاہم بہت سا خون ریم نکلا۔

۳ اپریل ۱۸۹۸ء۔ شام کو منشی فضل صاحب سے ملاقات ہوئی ان کا ارادہ غسل صحت کا ۱۴ ذی الحجہ یعنی ۳ مئی کو ہے۔ جوڑے وغیرہ بہت سے لوگوں کو تقسیم ہوں گے اور رقص و رنگ کی مجالس گرم ہوں گی۔

۶ مئی ۱۸۹۸ء۔ آج ۸ بجے صبح کو منشی فضل حسین صاحب نے غسل صحت کا کیا اور جو جوڑا کاکوری (ان کی سسرال) سے بھتا ہوا ان کی سالیوں کے لایا گیا تھا اس کو زیب بدن کیا۔ جوڑا سرخ رنگ کا تھا جب نہا کر بیٹھے ہیں تو طوائفان سندیلہ و قوالان وغیرہ نے مبارک باد گایا اور نذریں و نچھاور پیش ہونے لگے اور مبلغ ایک سو گیارہ روپے ان دونوں مدوں میں آیا۔ منشی صاحب نے کچھ جوڑے اپنے نوکروں کو تقسیم کیے اور شب کو طوائفان سندیلہ کا رقص ہوا اور صبح و شام بارہ سو بخش پخت ہو کر جس میں قلیہ قورمہ پلاؤ شامل تھا تقسیم ہوئے۔

۲۳ مئی ۱۸۹۸ء۔ آج الٰہی بخش جراح کو منشی فضل حسین صاحب نے رخصت کیا جس نے ان کا پھوڑا اچھا کیا ہے۔ نام بردہ لکھنؤ محلہ وکٹوریہ گنج میں رہتا ہے اور وہاں اپنے فن جراحی میں ایک مشہور آدمی ہے۔ اس کو منشی صاحب اور ان کی اہلیہ نے ایک سو روپیہ نقد اور ایک دوشالہ قیمتی پندرہ روپے انعام میں دیا اور پانچ روپے بیان نے دیے اور نیز منشی صاحب نے بخط خود عرہ امروزہ بدیں مضمون لکھ دیا کہ پانچ روپے ماہوار میں اس کو تاحیات اس کی دیہات ہوں گا اور دو مرتبہ ضرورت یا طلب ضرورت ہر مہینہ سندیلہ آیا کرے جس کا کرایہ آمد و شد دیا جائے گا۔

انگلیوں میں تکلیف: ۱ جون ۱۸۹۸ء۔ ہنوز میری انگلیوں میں ایسی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی کہ میں ایک حالت سے لکھ سکوں اور بعض وقت تو حروف بہت اچھے بنتے ہیں اور وقت بالکل خراب جس کی وجہ بجز اس کے اور کوئی خیال میں نہیں آتی کہ اس کا باعث شاید کم ربطی ہو اور یہ ہی کیفیت میری انگریزی اور اردو دونوں قسم کی تحریر میں ہے۔

وفات وصی علی شاہ: ۲۳ جون ۱۸۹۸ء۔ آج بارہ بجے دن کو وصی علی شاہ صاحب والد چھیدا میاں

سجادہ نشین درگاہ مخدوم سید علاء الدین نے بعمر ۷۱ سال قضا کی۔ چند ماہ گزشتہ سے بخار وغیرہ میں علیل تھے۔ بوقت ۵ بجے شام کے بعد غسل و تکفین لاش شاہ صاحب کی گاتے بجاتے بڑے اژدہام کے ساتھ درگاہ سے اٹھی جس کے اوپر دوشالہ پڑا ہوا تھا اور شبنمی سبز بذریعہ چار چوبوں کے مریدین لوگ لاش پر تانے ہوئے تھے۔ کچہری چاہنج سے مشعلیں روشن ہوئیں۔ آگے آگے چودھری محمد عظیم صاحب وغیرہ روسائے قصبہ آہستہ آہستہ رواں تھے۔ اس کے پیچھے چند اشخاص از مریدین وغیرہ گریاں کناں جا رہے تھے۔ زاں بعد گھوڑے وغیرہ مجرائی غزلیں گاتے تھے۔ اس کے پیچھے ایک گروہ از اعزا کلمۂ طیبہ پڑھتا تھا۔ اول لاش چوراہے مخدوم صاحب سے سڑک پختہ پر آئی۔ اور میونسپل ہال کے سامنے ہو کر نعیماً طوائف کے پھاٹک سے مڑ کر مدرسہ قدیم کی جانب سے سڑک پختہ پر آئی اور زیر مسجد چودھری صاحب سے ہو کر لادو شہید کے پاس سے درگاہ کی جانب پھری۔ ایک نماز پہلے وقت اٹھنے لاش کے ہوئی تھی اور دوسری اس وقت ہوئی جب جنازہ گشت کر کے ۱۱ بجے رات کو درگاہ میں پہنچا۔ ٹھیک بارہ بجے رات کو روضہ مخدوم صاحب کے دکھن جانب قبر میں لاش دفن ہوئی۔ شاہ صاحب بدرجہ نہایت خلیق تھے جو شخص آپ کے پاس جاتا تھا خوش ہو کر آتا تھا۔ آپ محمدی شاہ صاحب الہ آبادی کے مرید تھے اور صدہا مرد و زن قصبہ و بیرونجات خصوصاً مولوی علی احمد صاحب وکیل جبل پور و دیگر معزز لوگ مرید تھے۔ درگاہ میں آپ کی وجہ سے بہت رونق تھی۔ میرے ساتھ آپ کو ایک خاص لطف تھا اور کبھی کبھی میرے مکان پر تشریف لاتے تھے حالانکہ وہ کسی اور رئیس کے یہاں شاید شاذ و نادر تشریف لے گئے ہوں اور میرا دستور تھا کہ بوقت ان کی تشریف آوری کے میں ایک روپیہ ان کو نذر دیتا تھا بہت تھوڑا زمانہ ہوا میں نے حسب خواہش آپ کے ایک وصیت نامہ مرتب کر دیا تھا جس کی رو سے آپ نے اپنی کل جائداد اپنی بیبیاں کے نام لکھ دی تھی جن کے بعد آپ کی دونوں لڑکیاں مالک ہوں گی حسب وصیت آپ قبر بغلی میں مدفون ہوئے۔

<u>مراقم روزنامچہ کو اندیشہ</u>: ۲۲ ستمبر ۱۸۹۸ء۔ آجکل ایک گروہ جس میں شبرن طوائف و بندہ علی قوال بدایونی اور امیر حسن پسر خوش رنگ شامل ہیں منشی فضل حسین صاحب کی مصاحبت میں ہر وقت رہتا ہے جو وقتاً فوقتاً قوت حاصل کرتا جاتا ہے اور شب و روز ہم جلیس رہتے ہیں۔ منشی صاحب کو ایسا اپنے قابو میں کر لیا ہے کہ جس طرف چاہتے ہیں ان کے خیالات بدل دیتے ہیں۔ بظاہر اس کا نتیجہ خوش نظر نہیں آتا شاید عنقریب کوئی اس کا گل کھلے۔ لہٰذا خدا سے دعا ہے کہ اس صحبت کا انجام بخیر ہو۔

<u>فال دیوان حافظ</u>: ۸ اکتوبر ۱۸۹۸ء۔ میں نے اپنے ایک حصول مرام کے لیے مراتب چند اوقات

مخالف اپنے منتخب دیوان حافظ میں فال دیکھی جو حسب ذیل برآمد ہوئی جس سے امید ہوتی ہے کہ میں ضرور اپنی مراد میں کامیابی حاصل کروں گا۔

صفحہ ۳۶	ساقی بیا کہ یار ز رخ پردہ برگرفت	کار چراغ خلوتیاں باز درگرفت
ص ۶۴	اے دل صبور باش و مخور غم کہ عاقبت	ایں شام صبح گردد و ایں شب سحر شود
ص ۱۲۴	عید است و موسم گل و یاراں در انتظار	ساقی بروی شاہ ببیں ماہ و مے بیار
ص ۱۲۶	یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور	کلبۂ احزاں شود روزی گلستاں غم مخور
ص ۱۵۰	فراق و ہجر کہ آورد در جہاں یارب	کہ روز ہجر سیہ باد و خانماں فراق
ص ۱۵۲	ہزار دشمنم ار می کنند قصد ہلاک	گرم تو دوستی از دشمناں ندارم باک
ص ۱۵۴	خوش خبر باش اے نسیم شمال	کہ بہ ما می رسد زمان وصال
ص ۱۶۴	اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقاں ریزد	من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم
ص ۱۷۱	سایہ بر دل ریشم فگن اے گنج مراد	کہ من ایں خانہ بسودای تو ویراں کردم
ص ۱۹۰	خالی مباد کاخ جلالت ز سروراں	وز ساقیان سرو قد و گل عذار ہم
ص ۱۹۶	ز در در آ و شبستان ما منور کن	دماغ مجلس روحانیاں معطر کن
ص ۲۰۴	اے قبای پادشاہی راست بر بالای تو	زینت تاج و نگین از گوہر والای تو
ص ۲۱۴	سرحالیست از بیگانہ شے نوش	کہ نبود جز تو اے مرد یگانہ

اشعار مفصلہ صدر سے ضرور امید کامیابی ہے۔ آئندہ العلم عند اللہ

باک بٹ: ۲ر جنوری ۱۸۹۹ء۔ جو حقیقت موضع ازانن پور دھولی میرے پاس رہن تھی اور میں نے اس کو برخوردار مصطفیٰ علی کو اس غرض سے دیدی تھی کہ اس کا زر رہن وصول کر کے قصد ولایت لندن کا کریں۔ منجملہ حقیقت مرہونہ کے لالتا سنگھ زمیندار نرائن پور نے قریب پانچ سو روپیہ اپنا زر رہن دے کر اپنے حصہ ایک آنہ مرہونہ کو فک الرہن کرلیا تھا جس کا روپیہ موصوف کے پاس مجتمع ہے.... اگرچہ یہ جائداد اس قابل نہ تھی کہ میں اس کو بخوشی جدا کرتا مگر باک بٹ سے مجبور ہوگیا اور بجز رنج و ملال کے کوئی صورت مفر کی نہ دیکھی۔

منشی فضل حسین: ۱۲ر جنوری ۱۸۹۹ء۔ منشی سید فضل حسین دائمی مریض ہیں جس کی وجہ سے کہ شب و روز بیٹھے رہتے ہیں اور بالکل نقل و حرکت نہیں کرتے حتیٰ کہ پچاس قدم بھی ان کو چلنا مشکل معلوم ہوتا ہے اور کوئی دن ناغہ نہیں جاتا کہ دواؤں انگریزی و یونانی کا استعمال نہ کرتے ہوں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تندرستی میں بہت بڑا فرق

گیا اور شب و روز ۲۴ گھنٹوں میں ایک گھنٹہ بھی ان کی صحت کا نظر نہیں آتا اور مزاج میں ایسی کیفیت پیدا ہوگئی ہے کہ مثل اطفال خورد سال گھڑیوں میں طبیعت کا رنگ بدلتا رہتا ہے۔

داماد سعید الدین: ۲۰ فروری ۱۸۹۹ء۔ تحریر برخوردار سعید الدین مورخہ ۱ جنوری ۱۸۹۹ء سے مرسلہ لندن سے واضح ہوا کہ وہ امتحان بیرسٹری میں صرف دو چیزوں میں فیل ہوگئے جس کی نسبت ان کو پوری امید کامیابی کی تھی۔ اب مارچ آئندہ میں پھر امتحان دینے والے ہیں دیکھا چاہیے کہ ان کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ میرے نزدیک ان کو یہ ناکامی اس وجہ سے ہوئی کہ ان کو بڑا زعم اس آخری امتحان میں پاس ہونے کا تھا اور اپنی یاد پر کامل بھروسہ رکھتے تھے اور انھوں نے زور دے کر لکھا تھا کہ میں ضرور پاس ہوں گا۔ چونکہ خدا کلمۂ تکبر ناپسند کرتا ہے لہذا کوئی یاد ان کو کام نہ دے سکی اور وہ فیل ہوگئے۔

۲۵ فروری ۱۸۹۹ء۔ تحریر برخوردار سعید الدین موصولہ لندن سے واضح ہوا کہ محمد عربی خلف علی حسن جو واسطے پاس کرنے بیرسٹری کے (سندیلہ سے) لندن گئے ہیں وہاں ایک انگریز کو پڑھاتے ہیں اور اس نے ان کو ڈیڑھ ہزار روپیہ واسطے شریک ہونے ٹرم بیرسٹری کے نومبر ۱۸۹۸ء میں قرض دیا تھا جس کا وعدہ ادائی آخر مارچ سن الیہ کا ہے۔ محمد عربی نے ایک مختار نامہ خاص بنام منشی قبول احمد اشراف ٹولہ سندیلہ بھیجا ہے کہ سات بسوہ موضع ملہ پور کو جو ان کا مقبوضہ مملوکہ ہے رہن خواہ بیع کر کے واسطے ادائے زر قرضہ کے لندن بھیجیں۔

ہولی: ۲۸ مارچ ۱۸۹۹ء۔ کل اور آج اکثر از قوم ہنود علی الخصوص کنور نرندر بہادر صاحب مجھ سے ہولی ملنے آئے اور میں نے ان کی عطر و الائچی سے مدارات کی۔ میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ہر قوم سے بلا قید مذہب ملتا رہتا ہوں جس سے ہر شخص مجھ سے رضامند ہے۔

دو تار: ۲۴ جون ۱۸۹۹ء۔ آج دو تار مرسلہ برخوردار ممتاز علی خلف الصدق سید نذر علی مرحوم چھاؤنی مئو سے بنام میرے و منشی فضل حسین کے موصول ہوئے جس کا مضمون یہ ہے کہ کل ۹ بجے رات کو برخوردار محمد عزیز نے قضا کی۔ اس بات کے دریافت کرنے سے سخت رنج و ملال ہوا کہ ان کے گھر میں بجز ان کے کوئی از قسم ذکور نہیں ہے اور بہت بڑی امیدیں ان کی ذات سے متعلق تھیں۔ سال گزشتہ مہینہ مئی میں ان کی شادی عزیز از جان سید حافظ علی کی بیٹی مسماۃ نظیر النساء سے ہوئی تھی۔ ابھی ان کی عمر ۲۴ سال کی تھی افسوس ہے کہ انھوں نے بہت تھوڑی عمر میں دنیا کو خیرباد کہا اور تین بیواؤں کو اپنے رنج مفارقت دائمی میں تا حیات بحالت گریاں چھوڑا۔ مرحوم کے کوئی اولاد بھی اس وقت تک

نہیں ہوئی تھی۔ چونکہ برخوردار موصوف حافظ منیرالدین بیرسٹر ایٹ لا کے مکان پر مقیم تھے اس وجہ سے گمان ہوتا ہے کہ انھوں نے کیوں نہیں تار دیا اور ممتاز علی نے کیوں دیا اور دو تار دینے کی کیا ضرورت تھی جب کہ ایک تار سے مطلب پورا حاصل ہو سکتا تھا کیونکہ میں اور منشی صاحب ایک ہی مقام پر رہتے ہیں۔ لہٰذا اس شک نے مجھے مجبور کیا کہ قبل مشتہر کرنے تار منجانب خود حافظ منیرالدین کو بھیجوں اور واقعی حال دریافت کروں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور اب تک خبر تار موصولہ کا ان کے گھر میں کوئی اعلان نہیں کیا۔ خدا کرے یہ خبر غلط ہو ورنہ سخت سانحہ ہے۔ ان کے والد حافظ فیاض علی نے بھی تقریباً اسی عمر میں بمقام 'مئو' رحلت کی تھی اور دو یادگاریں اپنی چھوڑ گئے تھے ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ چنانچہ لڑکی نے سال گزشتہ میں انتقال کیا اور ایک خورد سال لڑکی چھوڑی اور یہ لاولد فوت ہوئے! ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مُرد۔ اس مصرع کی اس مقام پر پوری تصدیق ہوتی ہے۔

۶ رجون ۱۸۹۹ء۔ آج آٹھ بجے رات کو خبر تار مرسلہ برخوردار سید حافظ علی 'اندور' سے واضح ہوا کہ ۵ رجون کو محمد عزیز بخیریت تمام بھوپال کو روانہ ہوئے جس سے نہایت خوشی ہوئی اور میرے خیالات کی تصدیق کہ جو دو تار ۴ رجون کو چھاؤنی 'مئو' سے آئے تھے وہ غلط ہیں۔۔۔۔ مجھے یہ ظن غالب ہوتا ہے کہ خود محمد عزیز نے اپنے انتقال کے تار دیے تھے۔

۸ رجون ۱۸۹۹ء۔ آج خط محمد عزیز کا مورخہ ۶ رجون بھوپال سے صبح کی ڈاک میں موصول ہوا اور دس بجے دن کی ریل میں وہ خود وارد سندیلہ ہوئے آوازہ مبارکی و سلامی کا گرم ہوا اور میری نسبت جن لوگوں کے خیالات ناقص تھے کہ میں نے خبر تار کو مخفی کیا اور متعلقین تار کو اطلاع نہیں دی وے لوگ اب اظہار مسرت کا کر رہے ہیں اور میری رائے کی نسبت خیالات نیک ظاہر کرتے ہیں۔

عرس وصی علی شاہ: ۱۱ رجون ۱۸۹۹ء۔ آج عرس وصی علی شاہ صاحب مرحوم میں شریک ہوا اور راجہ جنگ بہادر صاحب 'نانپارہ' سے مکان نو تعمیر منشی لطف حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر میں ملاقات کی۔ بوقت گیارہ بجے دن کے شمس الحق فرزند چہار سالہ نبی محمد یعنی نواسہ وصی علی شاہ صاحب مرحوم سجادہ نشین درگاہ مخدوم صاحب ہوا اور رات کو شاہ صاحب کا قل ہوا۔ راجہ صاحب موصوف الصدر نے مبلغ چالیس روپے کی شیرینی منجانب خود تقسیم کی اور ایک سو روپے واسطے صرفہ عرس کے نقد دیا۔ راجہ صاحب گانے بجانے کے شوقین اور خوش عقیدہ آدمی ہیں۔

سید حافظ علی: ۱۲ رجون ۱۸۹۹ء۔ آج برخوردار سید حافظ علی خسر محمد عزیز 'اندور' سے وارد سندیلہ

؛ جہاں وہ مدرس فارسی ڈالی کالج کے ہیں اور مبلغ ساٹھ روپے تنخواہ پاتے ہیں۔ ان سے دریافت ہوا کہ خود محمد عزیز
تار اپنی وفات کے چھاونی 'مئو' سے ۴ جون کو بھیجے تھے جس کی تنقیح تار گھر میں جا کر خود حافظ علی و حافظ
ین نے کی۔ محمد عزیز نے ایسے فضول تار بھیجنے سے اپنے اعزا خاص کو بلاوجہ رنجور کیا اور وفور غم والے
اہلیہ کے قلب کو ایسا سخت صدمہ پہنچا کہ وہ شب و روز میں ایک دو مرتبہ بے ہوش ہو جاتی ہیں اور
حرکت یک قلم موقوف ہو جاتی ہے۔ اور اپنے آنے کی خوشی میں پندرہ بیس روپے گانے بجانے
رب میں صرف کر ڈالے۔ یہ فعل ان کا تمام تر ان کی حماقت پر دال ہے۔

مصطفٰے علی: ۹ ستمبر ۱۸۹۹ء۔ آج صبح کی ڈاک گاڑی میں برخوردار مصطفٰے علی بغرض پاس کرنے امتحان
ں کے براہ کلکتہ روانہ لندن ہوئے۔ خدا کامیاب معاودت کرائے اور ان کے پیشہ میں برکت دیوے۔
ں تاریخ میں ان کی عمر ۳۵ سال ۸ مہینہ ۲۷ یوم کی ہے اور جو جہاز کلکتہ سے لندن کو جائے گا اس کا
ہ ان کو تین سو پچھتر روپیہ دینا پڑا۔

۳۰ اکتوبر ۱۸۹۹ء۔ آج خط برخوردار مصطفٰے علی مورخہ ۱۳ اکتوبر بمقام لندن سے موصول ہوا جہاں
اکتوبر کو بوقت پانچ بجے شام کے براہ ریلوے فرانس پہنچے اور بموجب ان کے تار کے جو انھوں نے برخوردار
لدین کو دیا تھا برخوردار موصوف اسٹیشن لندن پر آ گئے تھے اور ان کے ہمراہ جا کر عزیز از جان محمد عربی
مکان پر قیام کیا۔ جو دو کمرے محمد عربی کے پاس کرایہ پر ہیں معہ صرفہ خورد و نوش سولہ روپیہ فی ہفتہ دینا
ہے۔ اب برخوردار موصوف بھی انھیں کی قربت میں مکان لینے والے ہیں۔۔۔

نجوم: ۲۳ نومبر ۱۸۹۹ء۔ ۱۲ نومبر سے سات ستارے برج برچھک میں فراہم ہو گئے ہیں جو ۲۵ نومبر
اسی برج میں رہیں گے دیکھنا چاہیے کہ اس کا کیا انجام ہوتا ہے۔ نجومیوں کا مقولہ ہے کہ جب سابق میں اسی
پر سات ستارے ایک برج میں جمع ہوئے تھے تو کوروکشیتر کے میدان میں کوروں پانڈوں کے درمیان
ن لڑائی ہوئی تھی جس میں لاکھوں آدمیوں کا قتل ہوا تھا۔ جو ستارے بالفعل برج عقرب میں موجود ہیں ان
سم درج ذیل ہیں: آفتاب، مشتری، زحل، مریخ، زہرہ، عطارد، راہ۔ منجملہ ان کے تین ستارے تحت الشعاع آفتا
غرق ہیں یعنی ان کی قوت بالکل زائل ہو گئی۔ وہ یہ ہیں: مشتری، مریخ، زحل۔

لندن کا کیچڑ: ۱۸ فروری ۱۹۰۰ء" رجب علی بیگ سرور نے 'فسانۂ عجائب' میں کانپور کے
کی بہت ہجو کی ہے اور سید اسمٰعیل حسین منیر نے اپنی کلیات میں الہ آباد کے کیچڑ کی۔ میرے خیال میں لندن کا

کیچڑ بھی کچھ ان جگہوں سے کم نہیں ہے۔ یہاں سے ایک میل پر ایک مقام ہے جس کا نام ڈیلچ ہے۔ پختہ سڑک کا نشان تک نہیں۔ تمام سڑکیں کچی ہیں۔ کیچڑ اس غضب کا ہوتا ہے کہ پھونک پھونک کر قدم رکھا جائے تب بھی ٹخنے دھنس جاتے ہیں۔ مگر ہندوستان میں کسی انگریز کے منہ سے اس کی برائی نہ سنیے گا۔ ساری برائیاں و خرابیاں گویا ہندوستان ہی میں ہیں۔" (از خط مصطفیٰ علی۔ لندن)

مرتضیٰ علی: ۲۴ فروری ۱۹۰۰ء۔ آج خط برخوردار مرتضیٰ علی مورخہ ۲۱ فروری بھوپال سے موصول ہوا۔ وہ ۲۰ فروری کو معہ احمد کریم خسر پورہ خود شام کی ۴ بجے کی ریل میں للت پور سے روانہ ہو کر ۹ بجے رات کو بھوپال پہنچے اور ۲۱ فروری کو ۹ بجے رات کی ڈاک گاڑی میں بعزم ولایت روانہ بمبئی ہوں گے انھوں نے دن کو کھانا نور چشم اصغر علی کے یہاں کھایا اور رات کو برخوردار مجتبیٰ علی کے ساتھ (یہ دونوں آجکل بھوپال میں ہیں) خدا مع الخیر ان کو پہنچا دے اور بحصول کامیابی معاودت وطن کریں۔

انگریز قوم: ۱۹ مارچ ۱۹۰۰ء "جو میمین بخدا ہمارے یہاں پیشاب کا برتن صاف کرتی ہیں وہی ہندوستان پہنچ کر ہم کو کتے سے بدتر سمجھنے لگتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے کہ کیا انقلاب ہے۔ سوائے ہندوستانیوں کی خوبی قسمت کے اور کیا کہا جائے۔ ہندوستان آ کر یہ برتاؤ کیوں کر برداشت ہوگا" از خط مصطفیٰ علی۔ لندن)

لندن کے موسم: ۲۶ مارچ ۱۹۰۰ء۔ یہاں سال میں صرف دو موسم ہوتے ہیں گرمی اور جاڑا۔ رہی برسات وہ جاڑے کے ساتھ ہے۔ پانی برسنے کی کوئی تعداد و شمار نہیں۔ دن کو دس مرتبہ برسا اور رات کو بیس مرتبہ۔ جنوبی سمندر سے بادل اٹھے برس پڑے۔ شمالی سمندر سے بخارات دوچار ہاتھ اونچے ہو کر پھٹ پڑے۔ مشرقی چینل نے کچھ کمک بھیج دی کبھی مغربی بحر ذخار نے بدلیوں کے مشکیزوں سے چھڑکاؤ کر دیا۔ رات دن یہی ہوا کرتا ہے (از خط مصطفیٰ علی۔ لندن مورخہ ۹ مارچ ۱۹۰۰ء)

لندن کی زندگی: ۳ اپریل ۱۹۰۰ء۔ دوشنبہ کو بوقت ۷ بجے صبح تاریخ ۱۲ مارچ کو مرتضیٰ علی معہ احمد کریم داخل لندن ہوئے۔ بفضلہ اب تک بخیریت ہیں۔ مرتضیٰ علی کا ارادہ ہے کہ 'لنکن ان' میں داخل ہوں۔ مجھ کو ایک مکان 'برکسٹن' میں مل گیا۔ مرتضیٰ علی کے مکان سے اور 'ٹمپل' سے بھی قریب ہے۔ چنانچہ آج میں اٹھ بھی آیا۔

دو دن سے محلہ مذکور میں جاچر کا سوانگ بنتا ہے اور افریقہ کی لڑائی کا پورا نقشہ اتارا ہے۔ جو روپیہ اس آمد سے وصول ہوگا وہ مقتولین و مجروحین افریقہ کی بیوہ یتیموں کو دیا جائیگا۔ خیال فرمائیے لوگ کس قدر قومی ہمدردی کرتے ہیں۔

لندن عجیب مقام ہے۔ یہاں بندر بندریا کا بھی ناچ ہوتا ہے۔ یہ بڑا نقص ہے کہ عورتیں مردوں سے

ہی بے تکلفی سے ملتی ہیں جیسی مرد مرد سے۔ لڑکے اور لڑکیاں حد سے زیادہ آزاد ہیں۔ دن کو کوئی مرد گھر میں نہیں رہتا چاہیے کام کو جائے سیر و تماشے کو۔ (از خط مصطفیٰ علی لندن۔ مورخہ ۱۵ر مارچ ۱۹۰۰ء)

لندن میں شطرنج: ۱۷ر اپریل ۱۹۰۰ء۔ ..... بہت سے انگریز جو 'مڈل ٹمپل' یا 'لنکن ان' میں شریک ہیں ان کا فرض ہے کہ صبح سویرے 'ٹمپل' یا 'ان' آکر شطرنج کھیلیں اور جب تک رات نہ ہو جائے اس وقت تک اس کا پیچھا نہ چھوڑیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو دنیا میں سوائے شطرنج کھیلنے کے اور کوئی کام نہیں ہے۔ یہاں عورتوں کے خیالات ویسے ہی ہیں جیسے ہندوستان کی عورتوں کے ہیں۔ دولت البتہ یہاں زیادہ ہے۔ (از خط مرتضیٰ علی لندن)

ہندوستان کی ترقی: ۲۹ر جون ۱۹۰۰ء۔ ..... میرا خیال ہے کہ جب تک بقول پروفیسر ہکسلے نیچرل نالج کی ترقی نہ ہوگی ہندوستان کی ترقی نہ ہوگی۔ اس قول کی قوی دلیل چند یورپ کی سلطنتیں ہیں اور ایک ایشیا کی یعنی جاپان کی۔ اہل ہند جب تک سائنس کے ایک ایک مسئلہ کو سونے کی اینٹوں سے زیادہ گراں بہا تول اور مول میں نہ سمجھیں گے حالت نہ سنبھلے گی۔ (از خط مرتضیٰ علی۔ لندن)

نواب مرشد آباد: ۲۲ر جولائی ۱۹۰۰ء۔ نواب مرشد آباد سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ جب وہ یہاں تشریف لائے تو ملکہ معظمہ سے ہاتھ ملایا اور فوراً جا کر ہاتھ دھو ڈالا جس سے ملکہ معظمہ کی توہین ہوئی۔ ان سے سبب اس کا پوچھا گیا تو کہا کہ ہمارے مذہب میں ہے کہ جب کسی دوسرے مذہب والے سے ہاتھ ملائے تو فوراً اسے دھو ڈالے۔ چنانچہ اس کی تفتیش کی گئی۔ عرب، ترکی، فارس وغیرہ کے مولویوں سے دریافت کیا گیا۔ خیر یہ بات تو رفع دفع ہو گئی۔ نواب صاحب ایک میم پر عاشق ہوئے جو ایک ہوٹل کی خادمہ تھی ..... میں متحیر ہوا کہ کہاں وہ نفرت اور ذلت کہ ملکہ معظمہ سے ہاتھ ملا کر دھو ڈالا اور کہاں یہ کہ خادمہ ہوٹل کے ساتھ شادی کر لی۔ (از خط مرتضیٰ علی۔ لندن)

پیرس کی نمائش: ۳۰ر جولائی ۱۹۰۰ء ..... اسی طور سے پیرس کی نمائش گاہ میں ہزاروں کھیل تماشے اور تھیٹر وغیرہ آئے ہیں۔ نواب شیش محل لکھنؤ کے لڑکے گئے تھے ان سے معلوم ہوا کہ ہندوستانی بھائیوں نے بھی ایک تھیٹر وغیرہ قائم کیا اور لے آئے ہیں جس میں دو تین طوائفیں لکھنؤ کی ہیں۔ ایک گھنٹہ ان کے ناچ کا مقرر ہے مگر ہمیشہ یہی ہوا کہ ان کے ساتھی ساز درست کیا کیے اور گھنٹہ ختم ہو گیا یا کبھی دو چار بول گانے پائیں۔ اگرچہ ان کے مالک لاکھ سر پٹکتے ہیں کہ تم لوگ اپنا پہلے سے ساز کیوں نہیں درست کر لیتے تو کہتے ہیں کہ صاحب شاہی سے ایسا ہوتا آیا ہے۔ غرض کہ پیرس میں بھی ہندوستانی ذلیل ہو رہے ہیں۔ نواب صاحب کے لڑکے کہتے تھے کہ اور تماشا گاہوں میں جائیے تو تل رکھنے کو جگہ نہیں ملتی مگر یہاں دو چار لوگ کرسی پر بیٹھے

اور باقی تھوڑے کھڑے بے ہودگیاں دیکھ کر ہنستے رہتے ہیں۔ (از خط مرتضیٰ علی۔ لندن)

لندن میں دھوپ: ۱۷ستمبر۱۹۰۰ء..... آج بھی دن اچھا ہے۔ آفتاب کی کرنیں زمین میں لوٹ رہی ہیں جس سے ہم ہندوستانی بہت خوش ہیں اگرچہ بعض وقت پریشان کرنے والے ابر کے پہاڑ اپنے دامنوں میں کرنوں کو اٹھا لیتے ہیں اور ہم لوگ للچائی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگتے ہیں۔

یہاں بھینس اور بکری نہیں ہوتی۔ گائے اور بھیڑ بکثرت۔ گائے دودھ کے واسطے اور بیل و بچھڑے کھانے کے لیے کیونکہ بیل سے یہاں کوئی کام نہیں لیا جاتا۔ گھوڑے سے سب کام لیتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے کام گدھے سے مثلاً گھاس کے کاٹنے کے آلہ میں گدھا جوت دیا یا چھوٹی سی گاڑی میں جوت دیا اور چیزیں بیچتے پھرتے ہیں اور اسی گاڑی پر خود بھی سوار ہیں۔ سمندر والے کنارے مقاموں پر گدھوں پر چار جامے کھنچے جاتے ہیں جس پر لوگ نہایت خوشی سے سوار ہوتے ہیں۔ ٹانگیں زمین میں لگی ہوئی اور بھاگتے چلے جاتے ہیں۔ (از خط مرتضیٰ علی۔ لندن)

ملکہ کا جنازہ: ۱۰ فروری ۱۹۰۱ء۔ جس دن ملکہ معظمہ کا جنازہ اٹھا ہر گرجا گھر میں دعائیں مانگی گئیں جن کا مفہوم تھا:

اے مسافر تو ہم سے جدا ہو گیا اب ہماری آنکھیں تجھ کو کبھی نہ دیکھیں گی۔ راہ نہایت دشوار ہے مگر تو نے خوب طے کر لی۔

ملک عدم میں نہ رنج ہے نہ غم۔ نہ ہنستے ہوئے آنسو، نہ روتی صورتیں۔

اب تجھ کو مردم آزار آزار نہ پہنچا سکیں گے۔ دنیا بھر کے جھگڑوں سے تجھے نجات ہو گئی۔

گناہوں کے دھبے تیرے دامن پر نہ پڑیں گے نہ وہم و شک عقائد مذہبی میں رخنہ انداز ہوں گے۔

عذاب دوزخ تیری راحت میں مخل نہ ہو گا کیونکہ حضرت مسیح حافظ و ناصر ہیں۔

اے خدا تیری مقدس حفاظت میں تیرے سوتے ہوئے بندہ کو چھوڑتے ہیں۔

بے خبر سونے والا حشر تک یوں ہی سوتا رہے گا۔ بعدہ تیرے حکم سے جاگے گا اور اٹھے گا۔

افسوس تھوڑے عرصہ میں جسم زار کا پتہ بھی نہ لگے گا۔ مٹی میں مٹی اور خاک میں خاک مل جائے گی۔

(از خط مصطفیٰ علی۔ لندن)

ملکہ کی وفات: ۱۲ مارچ ۱۹۰۱ء۔ یہاں ملکہ معظمہ کی وفات پر اظہار غم یوں ہوا: "ملکہ معظمہ مر گئیں۔ غریب پرانی روح تھی" بس ختم ہو گیا۔ دکانیں صرف آدھے دن بند رہیں۔ (از خط مرتضیٰ علی۔ لندن)

اپریل فول: ۲۲ اپریل ۱۹۰۱ء..... دوشنبہ گزشتہ کو دن بے وقوفی یعنی یکم اپریل تھی۔ ایک شخص نے ۲۷ وکیلوں کو بے وقوف بنایا۔ ہر ایک کو خط اس مضمون کا لکھا کہ مجھ پر ایک مقدمہ پڑ گیا ہے۔ آپ مہربانی کر کے

فلاں وقت کی گاڑی فلاں اسٹیشن پر ملیے اور میرے ساتھ 'دلوا' چلیے۔ جو کچھ فیس آپ کی ہو گی آپ کو اسٹیشن پر دی جائے گی۔ چنانچہ وقت مقررہ پر کل وکیل اسٹیشن پر موجود ہوئے۔ اتفاق سے ایک وکیل نے دوسرے وکیل سے پوچھا کہ آپ فلاں شخص ہیں جنھوں نے مجھے خط بھیجا ہے۔ دوسرے نے کہا کہ میں خود ہی اس شخص کی تلاش میں ہوں۔ اسی طور پر کل وکیل ملے اور جو خط ہر ایک نے کھولا اور مضمون ملایا تو ایک تھا۔ دن کا جو خیال کیا تو وہ دن یکم اپریل تھا۔ سب شرمندہ ہوئے اور اپنے اپنے مکان پر واپس گئے۔ خط بھیجنے والے نے اپنا فرضی نام اور فرضی پتہ لکھ دیا تھا۔ (از خط مرتضیٰ علی۔ لندن)

مچھروں سے حفاظت: ۲ مئی ۱۹۰۱ء۔ تجربہ: ارنڈ کے پتے اگر اپنی نشست گاہ کے گرد و پیش رکھ لیے جاویں یا چارپائی پر سوتے وقت رکھے جاویں تو مچھروں سے حفاظت ہوتی ہے اور وہ مضرت نہیں پہنچاتے۔

وفات فضل حسین صاحب: ۲۸ اگست ۱۹۰۱ء۔ آج صبح سے طبیعت منشی فضل حسین صاحب بگڑنا شروع ہوئی اور ٹھیک ۸ بجے رات کو انتقال کیا اور ۲ بجے رات کو مقبرہ منشی فضل رسول مرحوم اپنے والد ماجد کے مدفون ہوئے عمر ۵۶ سال ایک ماہ ۲۵ یوم کی ہوئی۔ ۳۰ جولائی ۱۸۴۵ء یوم بدھ کو پیدا ہوئے تھے۔ آدمی نہایت نیک اور منکسر المزاج تھے اور ان کی وفات سے عموماً اہل قصبہ بہت متاسف ہوئے اور مجھے ان کی مفارقت دائمی کا سخت ملال ہوا۔ خدا غریق رحمت کرے۔ ان کی ذات سے بہت سے لوگوں کی پرورش ہوتی تھی۔ اگرچہ مزاج میں بعض وقت غصہ آجاتا تھا لیکن جب دو ایک روز کی حاضرباشی کی گئی اور عذرات پیش کیے گئے تو اس کا قصور معاف کردیتے تھے اور یہ بات ان کے مزاج میں ضرور تھی کہ لوگوں کے کہنے سننے کا بہت اثر پڑتا تھا اور کچھ زیادہ عاقبت اندیشی مزاج میں نہ تھی مگر خوش قسمت ضرور تھے کہ انکے عہد میں بہت سی ریاست پیدا ہوئی۔

۲۹ اگست ۱۹۰۱ء ... آج میں نے مجمع عام میں کہہ دیا کہ التفات رسول کا بہی خواہ ہوں اور اپنے امکان میں کوئی دقیقہ ان کی بہی خواہی کا اٹھا نہ رکھوں گا لیکن تعلقہ جلال پور کا کام میں ہرگز نہیں کروں گا میری جگہ پر کوئی دوسرا شخص تجویز کیا جاوے۔ اس میرے کہنے پر راجہ درگا پرشاد اور ڈپٹی کرامت حسین صاحب اور محمد عربی نے بالاتفاق یہ کہا کہ بغیر آپ کی توجہ کے یہ کام ہرگز نہیں چل سکتا اور انتظام بالکل ابتر ہو جائے گا اگرچہ التفات رسول نے اس بارے میں کچھ نہیں کہا لیکن اور لوگوں کے ذریعہ سے مجھے کہلا بھیجا کہ میں خود مکان پر حاضر ہو کر عذر کروں گا اور جو باتیں وہ فرمائیں گے ان کی تعمیل مثل خوردوں کے کروں گا اور ہرگز ان سے سرتابی نہ ہوگی اور آپ میرے مربی ہیں۔ بدون آپ کی امداد کے یہ دشوار گزار مرحلہ ہرگز طے نہیں ہو سکتا۔

عقد التفات رسول: ۷ر اکتوبر ۱۹۰۱ء۔ آج نو بجے رات کو عقد برخوردار سید التفات رسول خلف دویم منشی سید فضل حسین صاحب مرحوم مساۃ آمنہ دختر سید نبی احمد یعنی بھانجی محمد عربی سے بقرار داد مہر ۵ ہزار روپیہ کے ہوا۔ نکاح مولوی مقیم الدین صاحب عالم ساکن ڈیرہ اسمٰعیل خاں نے پڑھا۔ یہ عقد چھواروں اور شکر پر ہوا۔ منجانب دولھن ڈپٹی کرامت حسین وکیل اور سید نجم الدین و برخوردار سید ارتضیٰ علی گواہ تھے ـــ (رخصتی بعد میں ہوگی) اس عقد سے مساۃ کندن زوجہ ثانیہ منشی فضل حسین صاحب مرحوم کو سخت رنج و صدمہ ہوا جو اپنی خالہ زاد بہن دختر مولوی رفیع الدین سے کرنا چاہتی تھیں اور منشایہ تھا کہ اگر بہن کے ساتھ جانشین علاقہ کا عقد ہو جائیگا تو میری حکومت اور رعب و ادب اسی حالت سے قائم رہے گا جیسا کہ گزشتہ میں تھا لیکن مشیت ایزدی خلاف اس کے تھی کہ دفعتاً منشی صاحب مرحوم کا انتقال ہو گیا۔

والدہ مصطفیٰ علی: ۱۶ر نومبر ۱۹۰۱ء والدۂ برخوردار مصطفیٰ علی کو ابھی درد لاحقہ عرق النساء سے کامل افاقہ حاصل نہیں اور بائیں آنکھ میں ناخنہ کی شکایت پیدا ہو گئی۔ آنکھ ورم کیے ہوئے ہے جس سے تکلیف از حد ہے اور وہ گوشت جانب دیدۂ سیاہ بڑھتا جاتا ہے۔

۱۰ر دسمبر ۱۹۰۱ء۔ آج اہل خانہ مولوی علی احمد صاحب اشراف ٹولہ نے حسب تحریک میری بذریعہ منشی سید کرامت حسین کا کہلا بھیجا کہ وہ رخصتی اپنی پوتی دختر سید نبی احمد کی بعد ۱۰ ذی الحجہ کے قرار دیں گی جس کے واسطے جو تاریخ طے کی جاوے۔ یہ وہ لڑکی ہے جس کا عقد ۷ر اکتوبر کو ہو چکا ہے۔ فریقین اپنے اپنے یہاں سامان کر رہے ہیں۔

وفات چودھری محمد عظیم: ۲۴ر جنوری ۱۹۰۲ء۔ چودھری محمد عظیم صاحب تعلقہ دار ڈگرائی رئیس اعظم سندیلہ نے دفعتاً بوقت ایک بجے رات گزشتہ اپنے مکان واقع قیصر باغ لکھنؤ میں قضا کی۔ مرحوم ٹھیک گیارہ بجے شب کو کھانا کھا کر سوئے تھے۔ ایک بجے کچھ شکایت درد قلب کی پیدا ہوئی اور معاً روح پرواز کر گئی۔ ۱۲ بجے دن کی اسپیشل ٹرین میں ان کی لاش لکھنؤ سے آئی اور ٹھیک چار بجے شام کو اپنے نبی باغ میں دفن ہوئے ... مرحوم میرے ساتھ بوجوہ بہت اخلاق سے پیش آتے تھے۔ ان کی عمر ۵۳ سال تھی۔

شادی التفات رسول: ۱۵ر مارچ ۱۹۰۲ء۔ آج سے جلسہ شادی برخوردار سید التفات رسول شروع ہوا لیکن موصوف الیہ نے نہ تو جامہ پہنا اور نہ آتش بازی و آرائش کو جائز رکھا اور نہ کسی قسم کے باجن وغیرہ بجنے کی اجازت دی صرف ناچ طوائفان سندیلہ و چار طائفہ زنانہ لکھنؤ اور ایک طائفہ کشمیری مسمی مورث حسین خلف کھلونہ لکھنؤ کا ہوا ... کل طائفان لکھنؤ میں حیدری طوائف لکھنؤ کا ناچ و گانا عموماً سب کو پسند ہوا۔

۱۸ر مارچ ۱۹۰۲ء۔ بوقت ۳ بجے صبح کے برّی اور ۶ بجے صبح بارات برخوردار سید النفات رسول بخانہ مولوی
لی احمد صاحب گئی اور منشی عزیز الدین احمد صاحب کے مکان میں ٹھہری۔ نوشاہ تامدان پر سوار تھے اور کوئی آرائش
نیز ہمراہ نہ تھی۔ بلکہ سوائے نوکروں کے اہل برادری میں سے بھی کوئی ہمراہ بارات نہ تھا۔ صرف چند عزیز ضرور تھے۔ ۹½ بجے
ان کو رخصتی ہوئی۔ دلہائی سو روپے نوشاہ کو سلامی میں ملے اور ایک گھوڑا مع زیور نقرئی۔ علاوہ اس کے جہیز میں چند
ظروف نقرئی اور باقی مسی کے تھے جن کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی۔ محمد عربی بیرسٹر نے میز کرسی ظروف چینی مسہری الماری
ڈھکی۔ سنگ مرمر کی دی اور میں نے بھی چار جوڑے دو بجانب دولہا اور دو بجانب دولہن بھیجے۔ اور دونوں طرف
کے مراسم نیوتہ وغیرہ ادا کرنے میں میرا مجموعی صرفہ سترہ روپے ساڑھے تین آنہ ہوا۔ ایک پالکی بھی جہیز میں ملی اور یہاں
ایک پلنگ و پیڑھی بھی نقرئی تھی۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ جہیز معمولی تھا۔

<u>زندہ دل لوگ:</u> ۱۴ر اپریل ۱۹۰۲ء۔ رہنا یہاں چاہیے جو کچھ ہو دل ہمیشہ زندہ ہوتا ہے۔ کوئی کھیل
کوئی دل بستگی کا سامان یہاں ایسا نہیں جس میں بچے بوڑھے سب شریک نہ ہوتے ہوں۔ اپنے کو یہاں کے لوگ
ہمیشہ بچہ سمجھتے ہیں۔ عجب زندہ دل لوگ ہیں۔ ایک خاندان کو میں جانتا ہوں جن کے ۱۳ یا ۱۴ لڑکے ہیں۔ ایک
روز لڑکوں کی ماں سے باتیں ہوئیں جن کا سن قریب پچاس برس کے ہے۔ کہا میں بوڑھی نہیں ہوں۔ میرے پاس سوائے
اس کے کوئی جواب نہ تھا کہ بیشک تم کہیں سے بوڑھی نہیں معلوم ہوتی ہو۔ اصل تو یہ ہے کہ تم اپنے لڑکوں کی ایک بہن
معلوم ہوتی ہو۔ کہا تم سچ کہتے ہو۔ اکثروں نے ایسا ہی خیال ظاہر کیا ہے۔ بڑے لڑکے کا سن ۲۰ برس کا ہے۔ (از خط مرتضیٰ علی۔ لندن)

<u>لندن میں تاج پوشی:</u> ۱۳ر مئی ۱۹۰۲ء۔ موسم اچھا ہے۔ تاج پوشی کا زمانہ قریب آگیا۔ مہمانوں کی آمد
ہو رہی ہے۔ ان کے ٹھہرنے کے لیے مکانات منتخب ہو چکے ہیں۔ یہ جلسہ قابلِ دید ہوگا۔ دیکھا چاہیے کہ دیکھنے
میں آتا ہے یا نہیں۔ ایک شخص معمولی مقام سے اگر دیکھنا چاہے تو ایک گنی کم از کم پڑے۔ مجمع سے دیکھنا نہایت
مشکل اور سخت مشکل سے خالی نہیں۔ علی الصباح اگر جائے اور دن بھر بھوکا پیاسا کھڑا رہے تو شاید دیکھنے کو مل سکے (از خط مصطفیٰ علی لندن)

<u>بیرسٹر کی آمدنی:</u> ۲۲ر جون ۱۹۰۲ء۔ یہاں ایک بیرسٹر کی آمدنی فی گھنٹہ چھ سو روپے ہے۔ اس قدر
روپیہ خدا جانے کس کس کے گھر میں رکھتے ہوں گے۔ چاروں طرف تخت نشینی کی دھوم دھام ہے لوگ سودائی
ہو رہے ہیں۔ ایسے تماشائی شاید کہیں ہوں۔ (از خط مصطفیٰ علی۔ لندن)

<u>علالت والدہ مصطفیٰ علی:</u> ۲۸ر جولائی ۱۹۰۲ء۔ آج بابو گنگا سہائے ڈاکٹر سدیلہ نے پانچویں مرتبہ
والدہ مصطفیٰ علی کی رگ عرق النساء میں بذریعہ پچکاری دوا پہنچائی۔ میں نے ان کو چار روپے فیس کے دیے

ڈاکٹر صاحب اگرچہ توجہ سے علاج کر رہے ہیں لیکن ہنوز وہ بالکل دفع نہیں ہوا ہے۔ پچکاری دینے سے تین روز تک بہت تخفیف ہو جاتی ہے۔ بعدہٗ جھنجھناہٹ ہو کر پھر شروع ہو جاتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ بالکل دفع ہو جائے۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۰۲ء۔ ہنوز والدہ مصطفےٰ علی کو درد عرق النساء سے کامل آرام نہیں ہے اور حسب تجویز حکیم ظہور الحسن صاحب آج کل پھر ان کے مسہل ہو رہے ہیں۔ خدا شفائے کامل عطا فرمائے۔ ان کی بائیں آنکھ کی بصارت بالکل جاتی رہی۔

دربار تاج پوشی ہردوئی: ۲ جنوری ۱۹۰۳ء۔ کل کے دربار جشن تاج پوشی ہردوئی میں میری کرسی صف اول میں تھی اور آنریری مجسٹریٹوں کے سلسلے میں پہلی تھی اور میری کرسی کے پیچھے وکلا اور اہلکار وغیرہ کی کرسی تھی جس کا ہر آئینہ مجھے فخر ہے کہ ایسا اعزاز اپنے ہم رتبہ اور ہم چشموں میں مجھے حاصل ہوا۔

سید علی بلگرامی: ۱۹ جنوری ۱۹۰۳ء۔ سید علی بلگرامی کو انڈیا آفس میں ایک جگہ مل گئی ہے مترجم کا خدمات عربی و فارسی ہیں اور تین سو پونڈ تنخواہ سالانہ ہے۔ (از خط مصطفےٰ علی۔ لندن)

تاریخ اعزاز: ۲۸ فروری ۱۹۰۳ء۔ جو سند گورنمنٹ نے بجلدوے میری خدمات آنریری مجسٹریٹی و سکریٹری میونسپل سندیلہ کے عطا فرمائی ہے اس کی بابت ایک تاریخ مصنفہ منشی مکولال صاحب عشرت دبیر پرتیمی لکھنوی آج کے اودھ اخبار میں طبع ہوئی جو جہاں درج کی جاتی ہے: قطعہ تاریخ عطائے سند انتظام میونسپلٹی از جانب گورنمنٹ بجناب مولوی سید مظہر علی رئیس و آنریری مجسٹریٹ و سکریٹری میونسپل بورڈ سندیلہ ضلع ہردوئی

مظہر علی نامور و مولوی لقب | در نامیانِ قصبۂ سندیلہ نیک نام
میونسپل کمشنر و سکریٹری بورڈ | ہر دل عزیز و لائق و ممدوحِ خاص و عام
عمدہ رئیس و مقتدا مثلِ خود شریف | جوئندۂ رفاہِ رعایائے مستہام
شد جشنِ تاج پوشیِ ایڈورڈ ہفتمی | ہر مستحق رسید با اعزاز و احترام
ایں ہم ز والیسرائے سند تازہ یافتند | گردید کار کردگی اعلانِ اہتمام
بسیار شاد گشت دل و جانِ دوستاں | ور دِ لب است باد مبارک علی الدوام
عشرت نوشت مصرعِ سالش بہ معمہ | آمد چہ مستند سند حسن انتظام

لاثانی استانی: ۴ مارچ ۱۹۰۳ء۔ آج میں نے ایک کتاب "لاثانی استانی" علی گڑھ سے بقیمت ایک روپیہ علاوہ محصول وغیرہ ڈاک کے منگائی جو نہایت دلچسپ اور تعلیم نسواں کے لیے بہت مفید نظر آتی ہے۔ ہر قسم کے مضامین اس میں درج ہیں جس کی وجہ سے گھر میں بیٹھے ہوئے چار دانگ عالم کے حالات بخوبی معلوم ہو سکتے ہیں

مراجعت: ۲۴ر مارچ ۱۹۰۳ء۔ خطوط برخورداران مصطفےٰ علی و مرتضیٰ علی مورخہ ۶ر مارچ ولایت لندن
ے موصول ہوئے۔ مصطفےٰ علی نے لکھا کہ جہاز واسطے روانگی وطن کے ٹھیک ہوگیا۔ ۱۵ر مارچ کو مارسیلز
(لس) سے روانہ ہوں گا اور بشرط زندگی ۳۱ر ماہ مذکور کو بمبئی داخل ہوں گا۔ آپ اطمینان رکھیں۔
ے میرے نام کوئی نوازش نامہ نہ ارسال فرمادیں۔

مصارف بیرسٹری: ۲۸ر مارچ ۱۹۰۲ء جس قدر روپیہ میں نے برخورداران مصطفےٰ علی و مرتضیٰ علی
بغرض تعلیم بیرسٹری لندن کو بھیجا ہے اس کی تفصیل لغایت ۱۸ر اکتوبر ۱۹۰۲ء درج روزنامچہ ہذا کردی ہے
ں کی مقدار سات ہزار نوسو بیس (۷۹۲۰) روپیہ ہے اور تاریخ مذکورہ کے بعد جس قدر روپیہ میں نے
ردار مصطفےٰ علی کو اور ۳ر فروری ۱۹۰۲ء تک بھیجا ہے ... اس کی میزان ایک ہزار دوسو نوے روپے
۔ میزان کل لغایت ۳ر فروری ۹۲۹۰ روپے۔

اگرچہ مولوی محمد کریم صاحب تحصیلدار برخوردار مرتضیٰ علی (اپنے داماد) کے صرف لندن کے کفیل ہیں لیکن
ف آٹھ سو بائیس روپے دو آنے میں نے بھی اپنی جیب خاص سے انھیں بھیجے ہیں۔ خدا سے دعا ہے ان کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو۔

واپسی مصطفےٰ علی: یکم اپریل ۱۹۰۳ء: آج تمام روز برخوردار مصطفےٰ علی کی آمد کا لندن سے انتظار رہا
غالباً ۳۱ر مارچ کو حسب تحریر خود بمبئی آگئے ہوں گے۔ اگر وہ کاش اپنے آنے کا اطلاعی تار بھیج دیتے
ان کی پیشوائی عزت کے ساتھ کی جاتی۔

۲ر اپریل ۱۹۰۳ء۔ آج ۱۱½ بجے رات کی ریل میں برخوردار مصطفےٰ علی بلا اطلاع دہی ما قبل بعد امتحان
ٹری وارد سندیلہ ہوئے اور میں ان کے آنے پر جگایا گیا اور ان سے ملا اور بہ وفور مسرت مجھے دو تین گھنٹہ
ے نیند نہیں آئی۔ افسوس کہ انھوں نے اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی ورنہ اسٹیشن سندیلہ پر ان کی پیشوائی کا بہت بڑا مجمع ہوتا۔

۳ر اپریل ۱۹۰۳ء آج میرے بہت سے اعزا و احباب برخوردار مصطفےٰ علی سے ملنے آئے اور ان کی
ں اخلاقی سے خوش گئے اور راجہ درگا پرشاد میر۔ منجھے حبیب نے ان کو طلائی گوٹے کا ہار پہنایا اور بہت
ہ عزت سے دیکھا۔ خدا سے دعا ہے کہ ان کے کام میں برکت نصیب ہو۔

چہل قدمی: ۲۴ر اپریل ۱۹۰۴ء میں اس مقام پر پھر حوالہ قلم کرتا ہوں کہ تندرستی و اسطے قیام تندرستی کے نہایت عمدہ علاج
خصوصاً صبح و شام کی تفریح نوجوانوں اور بڈھوں اور ہر عمر کے آدمیوں کو لازم ہے کہ اس کی مزاولت کریں اگر چاہتے
ہ کہ ان کی تندرستی قائم رہے۔ ہزاروں دواؤں سے یہ نسخہ عمدہ اور حکم اکسیر کا رکھتا ہے۔

مرتضیٰ علی و ملازمت خود: ۲۹ر اپریل ۱۹۰۴ء بجواب خط مورخہ ۹ ر اپریل ۱۹۰۳ء برخوردار مرتضیٰ علی کو یہ تحریر کیا کہ میں کوشش کروں گا کہ تمہارے واسطے ایک ہزار ایک سو روپیہ کا بندوبست کر کے لندن روانہ کروں تاکہ تم سند بیرسٹری حاصل کرو۔ میں نے ۲۸ر اپریل سن الیہ سے بوجہ خلاف برتاؤ سید التفات رسول تعلقہ جلال پور کی ملازمت سے علیحدگی اختیار کی لیکن اس کا کوئی اثر تم پر نہ پڑنا چاہیے حتی الامکان میں تمہارے واسطے رقم مذکور الصدر کوشش کر کے ضرور روانہ کروں گا لیکن اب تم بعد پاس کرنے امتحان کے وطن چلے آؤ اور جو کچھ خامی قانون دانی میں تم کو ہوگی اس کا تکملہ یہاں ہو سکتا ہے۔

واپسی مرتضیٰ علی: ۹ر نومبر ۱۹۰۳ء ..... میں ۲۰ر اکتوبر کو یہاں سے جہاز پر سوار ہونے والا تھا لیکن اس پر جگہ نہیں ملی۔ اتفاق سے جہاز پرشیا پر جگہ ملی جو ۱۲ر نومبر سن الیہ کو یہاں سے روانہ ہوگا اور میں ۱۳ر نومبر کو مارسیلز سے اس پر روانہ ہوں گا اور ۲۸ر نومبر کو بمبئی پہنچ جاؤں گا..... اب آپ کوئی خط مجھے نہ بھیجیں۔ (خط مرتضیٰ علی۔ لندن)

دفع طاعون کے جھنڈے: ۲۸ر نومبر ۱۹۰۳ء آج کل ہمارے محلہ اشراف ٹولہ کے عزیزوں کے مکانات کی بالائی سقف پر جھنڈے نصب ہیں جس کے کپڑے پر آیات قرآنی واسطے دفعیہ بیماری طاعون کے مرقوم ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا اثر چالیس گھروں تک پہنچتا ہے اور اس کے باشندے برکت دعا سے بیماری سے محفوظ رہتے ہیں۔ چونکہ میرے مکان کے قریب منشی مقبول احمد و منشی عزیز الدین صاحب مرحوم و سید التفات رسول تعلقہ دار نے ایک ایک جھنڈا نصب کیا ہے جس کا اثر میرے مکان تک بخوبی پہنچ سکتا ہے لہٰذا میں نے اپنے مکان میں اس کا قائم کرنا مناسب نہیں جانا۔

ورود مرتضیٰ علی: یکم دسمبر ۱۹۰۳ء آج تار مرسلہ مولوی محمد کریم صاحب تحصیلدار "کل پہاڑ" سے معلوم ہوا کہ نور چشم مرتضیٰ علی ۳۰ر نومبر ۱۹۰۳ء کو ولایت لندن سے مقام "کل پہاڑ" پہنچ گئے اور بخیر و عافیت ہیں۔

۱۳ر دسمبر ۱۹۰۳ء آج خط برخوردار مرتضیٰ علی مورخہ ۱۱ر دسمبر تحصیل 'کل پہاڑ' سے آیا کہ اب اگر وبائی طاعون نے قصبہ کو چھوڑ دیا ہو تو میں قصد وطن کا کروں۔ میں نے لکھ دیا کہ ہنوز وبا دفع نہیں ہوئی۔ بالمرہ دو تین آدمی لگاتار متواتر روزانہ دمنڈی میں مبتلا ہو کر ضائع ہوتے ہیں۔

طاعون سے فرار: ۲۲ر جنوری ۱۹۰۴ء چونکہ بوجہ علالت طاعون مسماۃ بستی خادمہ گھر میں وحشت و پریشانی پیدا ہو گئی اس لیے میں نے آج اہلیہ برخوردار مجتبیٰ علی و مجھلی دختر و لڑکیوں و نانی صاحبہ مصطفیٰ علی کو بہ سواری بیل گاڑی میانوں کے موضع 'گھوگیرہ' کو بھیج دیا اور برخوردار مجتبیٰ علی اور نور دیدہ متنظم حسین کو سواریوں کے ساتھ کر دیا۔

۲۵ر جنوری ۱۹۰۴ء آج کل میں 'گھوگیرہ' میں ہوں اور میرے ساتھ والدہ و نانی برخوردار مصطفیٰ علی

ران کی منجھلی و چھوٹی بہنیں و برخوردار مجتبیٰ علی معہ اہل خانہ خود معہ نوردیدگان مزمل حسین و توکل حسین ہمراہ ہیں اور
بنج سخاوت علی ضلع وارڈ گھوگیرہ' دکال پوڑی کی خدمات اس وقت تک پسندیدہ ثابت ہو رہی ہیں اور کسی قسم کی ضروری کا
بیا بہم پہنچنے میں کوئی تکلیف نہیں۔ زمینداران و کاشتکاران گھوگیرہ نذریں پیش کر رہے ہیں۔ پانی یہاں کا عموماً
لم و شیریں ہے خصوصاً اس کنوئیں کا جو میرے مکان سے متصل ہے۔

۱۳ فروری ۱۹۰۴ء۔ آج حکیم ظہور الحسن بعد وفات تمامی خاندان خود جو تین ہفتہ کے اندر بعارضہ طاعون
تم ہو گیا براہ بہندر کلاں' وارد گھوگیرہ ہوئے اور والدہ برخوردار مصطفیٰ علی کے لیے دو نسخے واسطے دفعیہ درد
رق النسا کے لکھ دیے جو آج کل درد شدید میں مبتلا ہیں اور نقل و حرکت سے معذور۔

۱۷ فروری ۱۹۰۴ء۔ ۱۸ نومبر ۱۹۰۳ء کو سندیلہ میں طاعون نے خروج کیا تھا اور ابھی تک اس کا وہی حال
ہے اگرچہ میں کل مزرعہ جات دیکھ چکا ہوں لیکن تاہم چار بجے شام کے بغرض تفریح نکلتا ہوں اور ہر ایک
ر کی پیداوار کو دیکھتا ہوں اور کبھی کسی مزرعہ کو چلا جاتا ہوں۔ جو یہ مشی تین چار میل کی ہوتی ہے اس سے
یری تندرستی کو نفع پہنچ رہا ہے۔ برخوردار مصطفیٰ علی اکثر میرے ساتھ ہوتے ہیں۔ والدہ برخوردار مصطفیٰ علی
و درد عرق النسا سے از حد تکلیف ہے۔ حکیم ظہور الحسن کے روغن مجوزہ سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ لہٰذا آج دوا
ہومیوپیتھک معرفت نور دیدہ متوسل حسین لکھنؤ سے منگائی ہے۔ شاید اس سے کوئی نفع ہو۔ چونکہ سندیلہ
بں ہنوز سلسلہ بیماری طاعون کا جاری ہے اس وجہ سے میں ان کو وہاں بھی نہیں لے جا سکتا ورنہ شاید
ڈاکٹری معالجہ سے نفع ہوتا۔ ان کو تین سال سے سخت تکلیف و پریشانی ہے۔ چند مہینہ کچھ آرام ہو گیا تھا۔
چلنے پھرنے لگی تھیں لیکن اب پھر اس کی شدت ہے۔ اللہ شفا دیوے۔

۶ مارچ ۱۹۰۴ء۔ آج نو بجے صبح کو راجہ درگاہ پرشاد صاحب تعلقدار تیسری مرتبہ میری ملاقات
کو قریب کے موضع کھجوہنہ سے جہاں وہ مقیم ہیں تشریف لائے۔ ان کے ہمراہ کنور جنگ بہادر و لال بہادر
اوّل و دوئم فرزندان بھی تھے اور ایک گھنٹہ کامل علم نجوم وغیرہ کے متعلق بات چیت کرتے رہے اور بر[illegible]
باغ انبہ قلمی و تخمی متصلہ مکان کو ملاحظہ کر کے بہت خوش ہوئے۔ زاں بعد بہندر کلاں کو تشریف لے گئے۔ میرے
لیے باعث کمال عزت کا ہے کہ ایسے معتبر شخص مجھے نگاہ وقعت سے دیکھتے ہیں۔

۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء۔ آج میں نے والدہ برخوردار مصطفیٰ کو بحالت مجبوری ان کے سخت اصرار پر گھوگیرہ
سے روانہ سندیلہ کیا۔ حالانکہ وہاں ہنوز سلسلہ بیماری طاعون کا قائم ہے۔ ۲۲ جنوری کو وہ گھوگیرہ آئی تھیں

اور ایک مہینہ ۱۰ یوم کے قیام کے بعد نوبت واپسی آئی۔ سچ یہ ہے کہ اس زمانہ قیام میں ان کو درد بڑا
سے سخت تکلیف کا سامنا رہا اور کوئی دن چین نہیں ملا اور باوصف معالجہ ہومیوپیتھک و یونانی
ترقی ہوتی رہی اور بحالت مجبوری آج روانگی سندیلہ عمل میں آئی۔ راقم معہ منجھلی بہو و پسران و د
نواسے وغیرہ انشاء اللہ تعالیٰ کل روانہ سندیلہ ہوں گا۔ پروردگار عالم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

واپسی مرتضیٰ علی: ۷ اپریل ۱۹۰۴ء۔ آج ۸ بجے ڈاک گاڑی میں برخوردار سید مرتضیٰ علی
دمیجا، ضلع الہ آباد سے وارد سندیلہ ہوئے۔ انھوں نے امتحان بیرسٹری ۱۰ جون ۱۹۰۳ء کو بمقام لندن
پاس کر لیا تھا اور ۲۰ نومبر کو اپنے خسر کے وہاں تحصیل کل چھار، آگئے تھے۔ لیکن محض بیماری طاعون
کی وجہ سے انھیں سندیلہ نہیں بلایا تھا۔ آج بعد چار سال ایک ماہ ۲۳ یوم کے ان کے دیدار نصیب
خدا سے دعا ہے کہ ان کو اپنے کام بیرسٹری میں کامیابی حاصل ہو جن کی تعلیم میں ایک مقدار کثیر صرف ہوئی!
ابھی صرف ہونے کو ہے کہ ہائی کورٹ سے پانچ سو روپیہ دے کر سند حاصل کریں گے دیگر مصارف کتب وغیرہ

سوانح عمری حصہ دوم: ۳۰ مئی ۱۹۰۴ء۔ میں اپنی کتاب سوانح عمری (حصہ دوم)
لکھنے میں برابر مصروف رہتا ہوں جو مِن ابتدائے جون ۱۸۹۴ء لغایۃ جون ۱۹۰۴ء قریب ختم ہے
خدا کرے یہ کتاب میری حیات میں طبع ہو جائے اور اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے کیوں کہ اس میں
ہر ایک کے مذاق کے موافق تذکرہ لکھا گیا ہے۔ شاید میں اپنی یادگار قائم کر جاؤں۔

وفات اہلیہ: ۲۵ جولائی ۱۹۰۴ء۔ افسوس صد افسوس کہ آج چار بجے صبح میری مونس غم گسار
مسماۃ شمس النساء بنت شیخ کریم بخش امیٹھوی حرم خانہ راقم نے قضا کی اور مجھے مبتلائے رنج و الم
دائمی کیا جو تا حیات فراموش نہیں ہو سکتا اور کبھی ایسا صدمہ مجھے نہیں پہنچا۔ مرحومہ ۳ ذی حجہ ۱۲۶۲ھ مطابق ۲۲ نومبر
۱۸۴۶ء روز دوشنبہ بوقت ۱۰ بج کے ۳۵ منٹ پر پیدا ہوئی تھیں۔۔۔ مرحومہ سے میرا عقد ۱۷ جنوری ۱۸۶۳
بوقت ۷ بجے صبح یوم سنیچر کو ہوا تھا۔ بلحاظ سن عیسوی اکتالیس سال چھ مہینے ایک دن ہوئے۔ مرحومہ شکل و صورت
میں حسین اور سابقے میں نہایت خوش سلیقہ صاحب عصمت حلیم و فیاض ثابت ہوئیں اور بدرجہ غایت
میری فرماں بردار تھیں۔ اہل برادری ان کے خلق و ملنساری سے رضامند و ثناخواں تھے۔ وہ ہمیشہ کل تقریبات
شادی و غمی برادری میں شریک ہوا کرتی تھیں اور بوجہ اپنی وجاہت ظاہری کل مستورات میں ممتاز نظر
آتیں اور ان کی حلیم الاخلاقی سے کل عورتیں بہ نگاہ وقعت دیکھتیں اور ان کو رضامند رکھنے میں تمام تر

خاطرداری عمل میں لائیں۔ مرحومہ کے پندرہ لڑکے اور لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ منجملہ ان کے چار فرزند اور تین لڑکیاں وقت وفات حی القائم ہیں اور ان کے خدمت گزاری و تجہیز و تکفین سے افتخار کونین حاصل کیا۔ مرحومہ نے حسب ذیل اپنی اولاد چھوڑی: چار بیٹے، تین لڑکیاں، تین پوتے، دو پوتیاں، دو نواسے، دو نواسیاں۔ کل سولہ۔

. . . . جون ۱۹۰۱ء سے درد عرق النسا و بائیں آنکھ کے گوشت بڑھنے میں مبتلا ہو گئیں جو نہایت تادم مرگ قائم رہی اور اخیر چھ مہینے زندگی کے بہت تکلیف و پریشانی سے گزرے کہ سیدھی یک لخت پڑی رہتی تھیں اور کسی جانب کو بوجہ تکلیف و شدت درد کے جنبش نہ تھی اور ہر وقت استدعا خودکشی کی رہتی کہ کوئی ایسی شے کھلا دی جائے کہ جس سے روح فنا ہو کر تکلیف شدید سے نجات ملے۔ ہر چند یونانی ڈاکٹری ہومیوپیتھک کا علاج ہوا افسوس کہ کوئی فائدہ بخش نہ ثابت ہوا۔ بقولے کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی . . . مجھے ان کی مفارقت دائمی سے سخت صدمہ پہنچا کہ انتظام خانہ داری بگڑ گیا اور میری آرام و آسائش مفقود ہو گئی اور بقیہ ایام زندگانی تلخ۔ خدا کسی دشمن کو بھی ایسا صدمہ نہ دیوے۔ واللہ ما یشاء و یحکم ما یرید۔

۴ ستمبر ۱۹۰۴ء جس تاریخ سے اہلیہ مرحومہ کا انتقال ہوا ہے میری طبیعت کچھ ایسی الجھ سی گئی ہے اور سخت پست ہو گئی ہے اور دل سے تقویت و اطمینان ایسا جاتا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کام میں جی نہیں لگتا اور نہ کہیں جانے کو جی چاہتا ہے اور نہ کسی کی ملاقات سے خوشی اور نہ کسی رشد و بہبود کی خواہش۔ جو کچھ ملا کھا لیا اور کپڑے خدمت گار نے نکال دیے پہن لیے۔ بالکل قلب ماہیت کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ بحالت وفور انتشار قصد ہوتا ہے کہ کہیں باہر جا کر سیاحی کروں اور اپنے دل کو بہلاؤں مگر جب مصائب سفر اور تکالیف غربت کا خیال کرتا ہوں تو اس کا متحمل ہونا غیر ممکن نظر آتا ہے اور ایسی حالت میں جس وقت اندک خیال اہلیہ مرحومہ کا آ جاتا ہے تو اس وقت نہایت ناقابل برداشت صدمہ ہوتا ہے جس کا اظہار نہیں ہو سکتا۔ سچ یہ ہے کہ زوجہ صاحب عصمت و فرماں بردار نہیں مل سکتی اور اس سے بڑھ کر شوہر کے لیے کوئی ہمدرد نہیں ہو سکتا۔

۲۳ اکتوبر ۱۹۰۴ء۔ افسوس دنیا عجب ناپائیدار مقام ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ ایک دن وہ تھا جب مرحومہ دوسرے کے عرفہ میں شرکت کو جایا کرتی تھیں اور آج وہ دن ہے کہ مستورات برادری مرحومہ کے فاتحہ عرفہ میں شریک ہو رہی ہیں۔ یہ کیسا عبرت انگیز منظر ہے۔

۴ دسمبر ۱۹۰۴ء۔ سچ یہ ہے کہ عورت نیک خصلت اور خوش اطوار سے بڑھ کر شوہر کے واسطے دنیا میں کوئی نعمت نہیں ہے جو اپنی خاص ذات سے صحت و تندرستی اپنے شوہر کی خیر خواہ اور ہمدرد ہوتی ہے جس نعمت سے افسوس ہے کہ میں محروم ہو گیا۔

۲۰ مارچ ۱۹۰۵ء - ۲۰ ماہ جون ۱۹۰۴ء جب سے اہلیہ مرحومہ کی حالت غیر شروع ہوئی اور اس کے بعد ۲۵ جولائی ۱۹۰۴ء کو ان کا انتقال ہو گیا اسی روز سے میرا دلی صدمہ کسی وقت زائل نہیں ہوتا۔ چین و آرام بالکل جاتا رہا۔ اگرچہ بظاہر میں ذاتی صفاتی و سرکاری کاروبار انجام دیتا رہتا ہوں لیکن دلی شگفتگی مفقود ہے۔

دوست کا مشورہ: ۱۱ جون ۱۹۰۵ء - آج میں واسطے ملاقات راجہ درگا پرشاد صاحب تعلقہ دار کے گیا۔ جناب موصوف چونکہ میرے دلی خیر طلب ہیں مجھ سے فرمایا کہ آپ سے میں چند مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ آپ عقد ثانی کر لیویں لیکن آپ کچھ خیال نہیں کرتے ہیں یہ امر آپ کی صحت و تندرستی کے لیے سخت مضر ہے۔ بدون عورت کے انسان کی دلچسپی نہیں ہو سکتی انسان کو چاہیے جیسا کوئی رنج و ملال و افکار دامن گیر ہوں لیکن جس وقت عورت سے سامنا و بات چیت ہوئی فوراً کل رنج و غم غلط ہو جاتا ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ جب میری دوسری زوجہ نے انتقال کیا تو مجھے سخت پریشانی کا سامنا تھا اور میں اکثر اوقات و فور رنج و الم سے رویا کرتا تھا حتیٰ کہ خیال بیماری دق کا پیدا ہو گیا تھا لیکن جب میں نے تیسری شادی کر لی تو وہ کل شکایت و رنج دفع ہو گیا اور اب میں نہایت اچھی حالت میں زندگی بسر کر رہا ہوں اور اگر کسی تردد وغیرہ کے وقت گھر میں جاتا ہوں تو وہاں پہنچتے ہی سب فکریں جاتی رہتی ہیں اور ہمیشہ ان کی صحت و سلامتی کیلیے پاٹ کرایا کرتا ہوں جس کے واسطے ایک خاص پنڈت مقرر ہے۔ لہذا میں آپ کو براہ محبت و اتحاد کے مجبور کرتا ہوں کہ اگر آپ اپنی بقیہ حیات خوشی سے بسر کرنا جائز رکھتے ہوں تو آپ جلد عقد ثانی کا کفو یا غیر کفو میں بندوبست کریں۔ اپنی راحت مقدم ہے۔ لڑکے لڑکیاں سب اپنے مطلب کے ہوتے ہیں۔ دنیا میں اگر کوئی دلی خیر خواہ ہے تو وہ صرف اپنی عورت ہی ہے۔ اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو چند روز میں آپ کی حالت رنج و غم میں بالکل تباہ و ابتر ہو جائے گی۔ اس میرے کہنے پر آپ ضرور عمل کریں۔ میں نے جواب میں کہا کہ اس بارے میں کسی روز آپ سے ملاقات کر کے عرض کروں گا۔ فرمایا کہ میں خود کسی روز واسطے تصفیہ اس امر کے آپ کے مکان پر آؤں گا۔

جہاز کی متلی: ۲۱ جولائی ۱۹۰۵ء - جہاز کی سواری میں اکثر آدمیوں کو متلی ہوتی ہے اس کا علاج یہ ہے کہ ایک آنکھ پر پٹی باندھ لی جاوے تو جلد آرام ہو جاتا ہے۔ (اردو اخبار)

نیرنگی زمانہ: ۱۷ دسمبر ۱۹۰۵ء - زمانہ کی نیرنگیاں دیکھ رہا ہوں جو عجیب و غریب حالت سے چل رہا ہے۔ کبھی دوست بہ شکل دشمن نظر آتے ہیں اور کبھی دشمن دوستی کا اظہار کرتے ہیں۔ اعزا و

بڑے بالوں کی نظریں کبھی موافق کبھی مخالف پڑتی ہیں۔ غرض دنیا کا عجیب رنگ ہے اور کوئی ذاتی خیرخواہ دکھلائی نہیں پڑتا۔ خوش نصیب وہی شخص ہے جو باعزت و آبرو اس دنیا کو خیرباد کہے۔ لہٰذا میری یہی دعا ہے کہ اس دنیا سے نکوئی کے ساتھ اٹھ جاؤں کہ اب کوئی حوصلہ باقی نہیں ہے۔

شادی نور چشمی: ۳۱ جنوری ۱۹۰۶ء۔ چونکہ تاریخ شادی نورچشمی مقیماً محمد ابراہیم خلف محمد صدیق خیرآبادی سے ۱۴ فروری ۱۹۰۶ء مطابق ۱۹ ذی حجہ ۱۳۲۳ھ کو قرار پائی ہے۔ لہٰذا آج میرے یہاں بعد مدت دراز کے ڈھول بجی ورنہ بوجہ صدمات چند در چند میرا گھر ماتم کدہ ہو رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ یہ تقریب بہ حسن و خوبی انجام کو پہنچاوے اور سب طرح سے مبارک ہو۔ چونکہ والدہ نورچشمی بقید حیات نہیں ہیں جس کا بہت افسوس ہے لیکن میں نے طے کر لیا ہے کہ یہ شادی بھی میں ویسی ہی کروں جیسی میں نے اور لڑکیوں کی ہے تاکہ اس کو کسی وقت یہ خیال پیدا نہ ہو کہ میری ماں کے نہ ہونے سے کمی کی گئی۔

۱۴ فروری ۱۹۰۶ء۔ آج شام کو مانجہ محمد ابراہیم ولد محمد صدیق خیرآبادی کا ہوا... وقت ۳ بجے صبح کو میرے یہاں بارات بھی آئی اور ۵ ½ بجے نورچشمی مقیماً کا عقد ابراہیم سے ہوا۔ مہر ۸۵ ہزار دینار سرخ قرار پایا... حالانکہ میں نے مولوی احمد رضا صاحب سے ۸۵ ہزار روپے کہے تھے لیکن عورتوں کے کہنے سننے سے میری لاعلمی میں اس قدر مہر تجویز ہو گیا (جو ۱۸ لاکھ ۷۰ ہزار روپے کے برابر ہے) جو میرے مزاج کے خلاف ہوا۔ مولوی احمد رضا مہتوانہ نے عقد پڑھا۔ آتش بازی اور آرائش ہمراہ بارات تھی۔ خدا تقریب کو مبارک کرے اور دونوں خوش حالی کے ساتھ بسر کریں... محمد ابراہیم انٹرنس پاس ہیں اور چالیس روپے ماہوار کے ریاست 'دھار' میں ملازم ہیں۔ یہ ریاست چھاؤنی مئو سے ۱۸ کوس ہے۔

بیرسٹران: ۲۰ فروری ۱۹۰۶ء۔ برخورداران مصطفیٰ علی و مرتضیٰ علی کو حسب اصرار ان کے میں نے ولایت بھیجا اور جس طور سے ممکن ہوا ان کا کل خرچہ برداشت کیا۔ یہاں تک بیرسٹر ہو کر واپس آئے۔ خیال تھا کہ ان کی آمدنی میں ایسی برکت ہوگی کہ جو جائداد مرہونہ فک رہن ہو کر میرے قبضہ سے نکل گئی ہے اور اس کا زر رہن بنا بر خرچہ بیرسٹران ولایت بھیجا گیا ہے اس سے دوسری جائداد حاصل کی جاوے گی جس سے خانہ پُری منافع کمی شدہ کی بخوبی ہو سکے گی اور مصارف خانہ داری میں بھی اس سے کافی امداد ملے گی اور میں اپنا اخیر زمانہ زندگانی یاد الٰہی میں بہ اطمینان گزاروں گا مگر افسوس کہ یہ میرا خیال بالکل غلط نکلا کہ ان کو تین دو دو سال کا زمانہ ہندوستان آئے ہو چکا ہے ہنوز مطلقاً آمدنی نہیں ہوئی بلکہ دونوں کے مصارف

بیرسٹری ماہوار میں برداشت کر رہا ہوں ... کل اسی تردد و پریشانی میں مبتلا رہا اور خدا سے دعا کرتا رہا کہ ایسی حالت میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ آج ۵½ بجے صبح کو خواب دیکھا کہ میں ایک بڑے ہال میں میز لگائے کرسی پر بیٹھا ہوں اور ایک معزز رئیس میری داہنی جانب بیٹھے ہیں اور جو میں نے اپنی رائے نسبت مقدمہ پیش شدہ کے قائم کی ہے اس سے ان کو بھی اتفاق ہے یہ خواب فی الجملہ تسکین دہ ضرور ہے دیکھنا چاہیے کہ اس کا کیا انجام ہوتا ہے ان شاءاللہ وہ بحکم ما یرید۔

پیسہ اخبار: ۱۷ اپریل ۱۹۰۶ء۔ آج کی تاریخ سے میں نے خریداری پیسہ اخبار ہفتہ وار لاہور کی شروع کی جس کی قیمت سالانہ ڈھائی روپیہ ہے اور آج پہلا پرچہ اخبار مذکور کا میرے نام لاہور سے آیا۔

نیک عورت: ۲۳ فروری ۱۹۰۶ء۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے جس عورت میں چار خصلتیں ہوں اس سے شادی کرنا چاہیے۔ ایک تو اس کی دولت دوسرے اس کی شرافت نسل تیسری اس کا حسن چوتھے اس کے اوصاف جمیلہ۔ دنیا اور اس کی تمام چیزیں قیمتی ہیں لیکن دنیا بھر میں سب سے زیادہ قیمتی شے نیک عورت ہے۔

نصائح حضرت علی: ۱۸ مئی ۱۹۰۶ء۔ نصائح حضرت امیر: ۱۔ جو شخص مسکینی کا برقع اوڑھے ہو اس کے عیوب نہیں کھلتے ۲۔ کسی کو دو چیزوں یعنی صحت اور دولت پر بھروسا نہ کرنا چاہیے۔ صحیح تندرست شخص کی تندرستی دفعتاً جاتی رہتی ہے اور متموں کی دولت آناً فاناً مٹ جاتی ہے۔ ۳۔ جو شخص ذرا ذرا سی بات کا شاکی ہو گا اسے بہت بڑی مصیبت ہو گی۔ ۴۔ جو شخص کامیابی کے ساتھ اپنے دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتا وہ غیبت اختیار کرتا ہے۔ ۵۔ جو شخص کاہلی کا فرماں بردار ہے وہ کسی شے کا مستحق نہیں۔ ۶۔ جو شخص غمازوں کی سنتا ہے وہ اپنے عام دوستوں کو اپنے ہاتھ سے کھوتا ہے۔ ۷۔ خود بینی ترقی کی دشمن ہے۔

اولاد کی خامیاں: ۳۰ جولائی ۱۹۰۶ء۔ جہاں تک میں نے غور کیا تو مجھ میں اور میری اولاد میں یہ بہت بڑا فرق ہے کہ وہ ضروری کام کو بھی چنداں ضروری خیال نہیں کرتے اور میں ضروری اور غیر ضروری باتوں کو ضروری سمجھتا ہوں اور حتی الامکان اسے دوسرے وقت پر ملتوی کبھی نہیں کرتا اور اسی وقت کر ڈالنے سے اطمینان حاصل کرتا ہوں بجائیکہ وہ مجھے ہی کرنا پڑے۔

نیا ہنر: ۲۴ ستمبر ۱۹۰۶ء۔ اس زمانے کے نوجوان وعدہ خلافی اور دھوکہ دہی اور جھوٹ بولنے کو اپنا ہنر سمجھتے ہیں اور جو لوگ پرانی وضع کی پابندی کرتے ہیں ان کے نزدیک ان لوگوں کا شمار بیوقوفوں میں ہے۔ اس رنگ زمانہ کو میں دیکھ رہا ہوں اور بجائے خود ساکت و خاموش ہوں اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے ایسے نوجوانوں کی صحبت سے میں حذر کرتا ہوں۔

خوابوں کی حقیقت: ۳۰ نومبر ۱۹۰۶ء۔ اگست ۱۹۰۳ء سے آج تک میں اپنے حصول مقاصد کے
بے درگاہ لم یزل میں نہایت عاجزی کے ساتھ دست بستہ دعا کرتا رہتا ہوں جن کی بشارتیں خواب میں ہمیشہ
سب دل خواہ ہوتی رہیں اور فالیں دیوان حافظ و سکندر نامہ میں مشاہدہ کیں۔ ان کے جوابات بھی
ر موافق آئے لیکن مجھے کمال افسوس ہے کہ اس وقت تک ان کا کوئی ظہور نہیں۔ لہذا اب میں جہاں تک
ر کرتا ہوں وہ خوابیں وغیرہ محض میرے دلاسا و طمانیت کے واسطے تھیں اور ہیں تاکہ میں منتشر ہو کر کوئی
لائق بات نہ کروں اور اب ناامیدی اس وجہ خاص سے ہے کہ جس قدر زمانہ گزرتا جاتا ہے اور میری قوت
گھٹتی جاتی ہے اسی قدر خواہش دل پر اوس پڑتا جاتا ہے اور حوصلہ پست ہوتا جاتا ہے اور ہنوز کسی قسم کے
ثار میرے حصول تمنائے قلبی کے نظر نہیں آتے۔ لہذا مرتبہ یقین کا حاصل ہو گیا کہ وہ سب خوابیں اور فالیں
ض میری طمانیت کے واسطے تھیں۔ اللہ یفعل مایشاء و یحکم مایرید

عقد ثانی بیوہ: ۲۵ جنوری ۱۹۰۷ء۔۔۔ چونکہ یہ رسم (عقد ثانی نواسی خود مسماۃ انجمن) خلاف رواج
مطابق سنت نبوی رسول پاک کے اختیار کی اس وجہ سے کل اکابر و ہمسر و نوجوانان قصبہ ہذا بہت خوش ہوئے
در میرے حق میں دعائے خیر کی کہ میں نے رسم قبیحہ کو دور کر کے سنت نبوی کو تازہ کیا اور اکثروں نے دعا خیر
کی کہ مجھے خدا ہر قسم کی برکت دے۔ چونکہ یہ کارنمایاں مجھ سے وقوع میں آیا جس کا رواج مطلقاً قصبہ ہذا
میں نہیں لہذا مجھے امید ہے کہ اب اہل قصبہ میری تقلید کریں گے۔

نئی پود: ۹ فروری ۱۹۰۷ء۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے اس زمانے کے نوجوان لڑکے اپنی تیز مزاجی
کی وجہ سے کہتے بہت کچھ ہیں لیکن کرتے کچھ بھی نہیں۔ دوسرے غیر مہذب ہیں کہ اپنے اکابر کو نگاہ حقارت سے
دیکھتے ہیں اور ان کو بے وقوف سمجھتے ہیں۔ حالانکہ خود کچھ کرنے کا ارادہ نہیں کرتے اور ان ہی کی جائداد پر چاہے
وہ تھوڑی کیوں نہ ہو تکیہ کرنا پسند کرتے ہیں اور باتیں اس قسم کی کرتے ہیں کہ ان سے بڑھ کر دوسرا عقل مند نہیں۔
مجھے تو خوب یاد ہے کہ میں اپنی نوجوانی کے زمانہ میں اپنے بزرگوں کے علاوہ غیر اشخاص کو بھی جو مجھ سے سن میں
بڑے ہوتے تھے سبقت سلام میں کیا کرتا تھا اور ان کو نگاہ بزرگی سے دیکھتا تھا اور اس وقت کے نوجوان عموماً
پیرینہ لوگوں سے منتظر سلام رہتے ہیں۔ میرے خیال میں یہی ان کی علامت بدبختی کی ہے بقول شخصے کہ باادب بانصیب بے ادب بے نصیب!

شکایت ضیق النفس: ۱۱ مئی ۱۹۰۷ء۔ شب گزشتہ کو مجھے ہپّی سے سخت تکلیف ہوئی کہ کسی کروٹ
چین نہیں تھا اور چونکہ ابتدائے شب سے تکلیف شروع ہو گئی تھی لہذا گھنٹہ شماری میں تمام رات آخر ہوئی۔ رات کی

تکلیف خصوصاً جب کہ عالم تنہائی ہو نہایت مکلف ہے۔ مجھے بعض وقت سخت حسرت ہوتی ہے کہ رات کی ٹھنڈک میں تمام عالم سہانی نیند سو رہا ہے اور ایک میں ہوں کہ چارپائی پر بیٹھا یا لیٹا ہوا موٹے موٹے سانس لے رہا ہوں۔ اے اللہ مجھے اس تکلیف سے جلد نجات دے!

ساون میں خاک اڑنا: ۴؍ اگست ۱۹۰۷ء۔ یہ میں اکثر سنا کرتا تھا کہ ساون میں خاک اُڑتی ہے وہ آج میں نے اپنی آنکھوں مشاہدہ کی کہ آج ۳ بجے دن کے ابر غلیظ محیط آسمان تھا اور دیر تک خوب گرجتا رہا۔ اس عرصہ میں ایسی ہوا تند چلی کہ ابر وغیرہ سب غائب ہو گیا اور دھول مثل جیٹھ بیساکھ کے اڑی اور ایسی بلند ہوئی کہ مکانوں کے اوپر سے گزر گئی اور خاک اڑتے ساون کی مثل صادق آئی۔

شب برات: ۵؍ ستمبر ۱۹۰۷ء۔ عموماً اطفال اہل دول شب برات آنے کے ایک ہفتہ قبل اور متوسط درجے کے لڑکے شب برات کے دو تین روز پہلے سے آتش بازی چھوڑ کے اپنے دل بہلاتے ہیں لیکن ہمارے پڑوسی منشی قبول احمد کے یہاں رجب کے مہینہ سے آتش بازی چھوٹنا شروع ہو جاتی ہے اور مہینہ شوال تک اس کا سلسلہ برابر قائم رہتا ہے۔ واقعی لڑکوں کے لیے بہت دلار کی بات ہے لیکن ان کی ایسی عادت پڑ جانے سے وہ عادی اسراف کے ہو جاتے ہیں جو مشکل سے چھوٹتی ہے۔

شکایت ھیتی: ۲؍ اکتوبر ۱۹۰۷ء۔ شب گزشتہ کو شدت کھانسی سے مجھے تمام رات نیند نہیں آئی اور بے چینی کے ساتھ گھنٹہ شماری میں رات آخر ہوئی۔ اگرچہ حکیم ظہور الحسن دوا میں ردوبدل کرتے رہتے ہیں لیکن ہنوز کوئی صورت نفع کی پیدا نہیں ہے اور نہ غذا بجز چند چمچ دلیا کے ہوتی ہے جس کا بخار مانع ہے۔ حکیم صاحب دونوں وقت مجھے دیکھنے کو آتے ہیں جس کا مشکور رہوں۔

بیوی کی یاد: یکم جنوری ۱۹۰۸ء۔ اگرچہ مسماۃ شمس النساء میری زوجہ کی وفات کو تین برس پانچ ماہ گزر چکے ہیں لیکن جب ان کے افعال و حرکات شائستہ یاد آتے ہیں تو طبیعت کو سخت ملال ہوتا ہے مگر مجبوری ہے کہ مشیت ایزدی میں کوئی دخل نہیں۔ جہاں ۴۴ سال عیش و عشرت میں گزرے وہاں اب پریشانی کا سامنا پیش آ رہا ہے اور یہ رنج و غم تاحیات فراموش نہیں ہو سکتا۔

افسانۂ خواب: ۴؍ فروری ۱۹۰۸ء۔ میں چند سال سے خواب ہائے خوش شمولہ بہبودی خود دیکھا کرتا ہوں جس کی تعداد آج تک ۷۹۱ ہے لیکن افسوس کہ اس وقت تک کسی ایک کا بھی ظہور نہیں ہوا وغیرہ میرا خواب اکثر سچا ہوا کرتا تھا اس وجہ سے اس پر میرا اعتبار تھا اور میں اسے بعد بیداری اپنے روزنامچہ میں

بند کر لیا کرتا تھا اور اب بجز اس کے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ جہاں میری عیش و آرام و زمانہ فلاحیت کا گزر گیا
ں خواب بھی راستہ نہیں آتے اور رات دن مجھے پانچ منٹ کی بھی خوشی نصیب نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ اس حال پر رحم کرے!

تعزیت کا طریقہ: ۱۴ر اگست ۱۹۰۸ء ... چونکہ عموماً رواج یہ ہے کہ جب کوئی شخص بہ رسم تعزیت
سی غم زدہ کے پاس جاتا ہے تو متوفی کے اوصاف حمیدہ ظاہر کر کے اس کے غم کو تازہ اور اس کے زخموں پر
ک چھڑکتا ہے جس سے وہ بہت متاثر ہو کر پریشان ہو جاتا ہے لیکن میں اس کے بالکل خلاف ہوں اور
زدہ کو زیادہ ملول کرنا ہرگز پسند نہیں کرتا بلکہ اس کے پاس جا کر ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہتا ہوں تاکہ اس
خیالات جو غم آلود ہیں وہ بالکل دفع ہو جائیں۔

استعفا: ۱۲ر ستمبر ۱۹۰۸ء۔ آج میں نے چارج آنریری سکریٹری میونسپل سندیلہ کا بابو ستیش چندر
رجی تنخواہ دار سکریٹری کو دیا۔ اب میں سرکاری ممبر کی حیثیت سے میونسپل کا کام انجام دوں گا ....
ی کی (چٹرجی صاحب کی) یہ کیفیت ہے کہ ہر کام میونسپل کا مجھ سے دریافت کر کے کرتے ہیں۔

انتظام خانہ داری: ۲۴ر ستمبر ۱۹۰۸ء۔ چونکہ میری چار بہوئیں منجملہ ان کے بڑی بہو اہل خانہ
مصطفیٰ علی آج کل اپنے شوہر کے ساتھ سیونی چھپارہ (اضلاع متوسط) میں ہیں باقی تین یہاں موجود ہیں
لہٰذا میں نے بہ نظر مصلحت انتظام خانہ داری اس نہج پر تینوں کو تقسیم کر دیا ہے کہ ان میں سے کسی کو کوئی
ی شکایت کا نہ ہو اور حالت انتظام عمدہ طریقہ پر چلے جاوے۔

خدمات کا اعتراف: ۲۱ر اکتوبر ۱۹۰۸ء۔ آج کے اودھ اخبار میں ترجمہ چٹھی مورخہ ۹ ستمبر ۱۹۰۸ء
ٹرنر صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر ہردوئی و چیرمین میونسپل بورڈ سندیلہ طبع ہوا جس میں میری خدمات آنریری سکریٹری
میونسپل بورڈ کی نسبت اظہار خوشنودی مزاج کا ہے۔ (ترجمہ چٹھی ٹرنر صاحب: چونکہ مولوی سید مظہر علی صاحب
نے اپنے عہدہ آنریری سکریٹری سے بوجہ زیادتی کام کے استعفا دے دیا ہے اور بجائے ان کے تنخواہ دار سکریٹری
کی تجویز ہوئی ہے لہٰذا میں اپنی رائے ان کی عمدہ خدمات کی نسبت جس میں کہ انھوں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ
صرف کیا ہے ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔ قریب تیس سال کے وہ آپ لوگوں کے سکریٹری رہے اور اپنی اعلیٰ خدمات
کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ اس طریقہ پر انھوں نے باشندگان قصبہ کو اپنا قیمتی وقت کا بہت بڑا حصہ
صرف کر کے بہت خوش و رضامند رکھا۔ میں اس بات سے خوش ہوں گا کہ مولوی سید مظہر علی صاحب اپنے
عہدہ سکریٹری سے سبکدوش ہونے پر میونسپل کے کاموں میں بہ حیثیت ایک ممبر کے اسی طور پر مدد دیتے رہیں گے

جیسا کہ وہ اپنے عہدہ سکریٹری کے زمانہ میں دیا کرتے تھے۔)

حقیقت نجوم: ۲۸ر دسمبر ۱۹۰۸ء۔ اس مہینہ دسمبر میں اگرچہ میرے زائچہ میں سب ستارے عمدہ حالت و خوشی میں بیٹھے ہوئے ہیں اور چار خراب مقام پر بیٹھے ہیں اور زہرہ و مشتری کا اتصال ہے لیکن کوئی نفع میری ذات کو نہیں پہنچا بلکہ اکثر تردوات لاحق رہے۔ اس سے بخوبی ہویدا ہوتا ہے کہ جو مشیت ایزدی ہے وہی ہوتا ہے نشست ستاروں کی کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اکثر تجربہ ہوا ہے کہ نشست ستاروں کی خراب ہے اور بہبودی حاصل ہوئی۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ انسان مشیت الہٰی پر بھروسا رکھے جو اس کا منشا ہے وہی ہوتا ہے۔ واللہ یفعل مایشاء۔ علم نجوم دل بہلانے کے واسطے اچھا ہے ورنہ ہیچ۔

انتظام خانہ داری: ۴ر فروری ۱۹۰۹ء۔ اگرچہ میری چار بہوئیں ہیں لیکن ان میں کوئی ایسی خوش لیاقت نہیں کہ انتظام خانہ داری خوش اسلوبی سے انجام دے سکے اور اگر شاید ان میں سے کسی کو مادہ انتظامی ہو بھی لیکن بوجہ اختلاف رائے کوئی کچھ نہیں کرتا..... بحالت حیات اہلیہ مرحومہ ہمیشہ سب انتظام خانہ داری ان کے متعلق رہتا تھا اور میں مہینہ انگریزی کی پہلی تاریخ کو تنخواہ بنابر مصارف روزمرہ ان کے پاس بھیج دیا کرتا تھا اور وہ حسب رائے خود جزوی وکلی انتظام خانہ داری کرتی رہتی تھیں..... اور مجھے کوئی تعلق اس سے نہیں رہتا تھا۔ سب سے ادنیٰ بدنظمی یہ ہے کہ مجھے تو کھانا بارہ بجے دن تک مل جاتا ہے لیکن جو عورتیں اہل محلہ کبھی کسی ضرورت سے آجاتی ہیں تو دو بجے تک ان کو کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ میں نے یہ بھی چاہا تھا کہ ہر ایک بہو کے واسطے بقدر انکی ضرورت کے تنخواہ مناسب مقرر کر دوں جس سے وہ علیحدہ علیحدہ اپنے خورد و نوش کا انتظام کریں اور اپنے اپنے جداگانہ چولھے روشن کروا دیں لیکن یہ بھی اس وجہ سے مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ میری موجودگی سندیلہ میں چار جداجدا چولھے روشن ہوں جو باعث کمال بدنامی کا ہے۔

نمائش ہردوئی: ۲۰ر فروری ۱۹۰۹ء۔ آج میں ۱۱ بجے دن کو دربار نمائش پھل پھول ہردوئی میں شریک ہوا۔ جناب راجہ درگا پرشاد نے بہت اچھا قصیدہ پڑھا اور بعض شاعروں نے بھی قصیدہ خوانی کی لیکن راجہ صاحب کا قصیدہ سب سے اوّل درجہ کا تھا۔ مجھے دربار میں مسٹر ٹرنر صاحب ڈپٹی کمشنر ہردوئی نے بابت کام قحط سارٹیفکٹ عنایت کیا۔ بعد فراغت دربار تین بجے دن کی ریل میں واپس آیا۔ آمد و شد میں میرا در راجہ صاحب اور چودھری محمد رؤف صاحب کا ریل میں ساتھ رہا۔ راستہ میں ہر قسم کی بات چیت ہوتی رہی۔ اگرچہ سہ پہر کو نمائش اور شب کو روشنی و ناچ تھا لیکن میں نے اس میں شرکت نہیں کی۔

تجویز عقد ثانی: ۱۲ر مئی ۱۹۰۹ء چونکہ راجہ درگا پرشاد صاحب تعلقہ دار میرے سچے اور خیر خواہ دوست ہیں
ہے انھوں نے کئی مرتبہ فرمایا کہ تم عقد ثانی کرلو کہ سوائے عورت کے دنیا میں اپنا کوئی خیر خواہ نہیں ہوتا ہے۔ لڑکے
یاں اور بہوئیں سب اپنے مطلب کے ہیں اور یہ چاہا کرتے ہیں کہ کسی طرح سے باپ نہ رہیں تو ان کی جائداد اپنے
ہ تصرف میں لاویں۔ جس کے واسطے وہ ہر وقت دست بہ دعا رہتے ہیں لیکن اپنی عورت برخلاف اس کے
شوہر کی بہی خواہ اور اس کی درازی عمر کی دعاگو رہتی ہے۔۔۔ چنانچہ آج صبح کو راجہ درگاہ پرشاد صاحب نے مجھے ایک
ھیجا کہ آج بوقت ۹ بجے صبح کے میں اور وہ ایک ساتھ چودھری محمد رؤف صاحب کے مکان پر جاکر باہم صلاح و
سورہ کریں تاکہ اس کے متعلق کوئی امر طے ہو۔ چنانچہ موصوف الیہ آج اپنی بگھی پر مجھے چودھری صاحب کے مکان پر
گئے، جہاں وہ موصوف الیہ سے دیر تک بات چیت کرتے رہے۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ چودھری صاحب لکھنؤ
ر کوئی حسین عورت میرے واسطے تجویز کریں جو سیرت و صورت میں اچھی اور مطیع ہو۔ چنانچہ چودھری صاحب
وعدہ کیا کہ میں ایک ہفتہ کے اندر جملہ امور کا تصفیہ کرلوں گا۔ لیکن مجھے ان دونوں صاحبوں کی رائے سے
راں اتفاق نہیں ہے اور میں اس کو ہرگز پسند نہیں کرتا ہوں اور پروردگار عالم کے فضل و کرم پر صابر و شاکر ہوں۔ جو کچھ اس کی
بت ہوگی اس کی پابندی کرنا پڑے گی۔ اور بدون مشاہدہ و واقف کاری بلا سمجھے بوجھے کوئی فعل کرنا انسانی مصلحت کے خلاف ہے۔

۲۵ر مئی ۱۹۰۹ء۔۔۔۔ لیکن مجھے لکھنؤ کی عورت سے عقد ہرگز منظور نہیں مگر راجہ صاحب کے اصرار
وجہ سے ہوں ہاں کردیا کرتا ہوں۔۔۔ لیکن آج کل اس کا تذکرہ اکثر رہتا ہے۔

امید و بیم: ۸ر جولائی ۱۹۰۹ء۔ منجملہ اپنی تین خواہشوں کے (د) (ح) (ش)[1] کس خواہش میں میں کامیاب
دگا جس کا مشاہدہ مجھے خواب میں ہو۔ یہ خیال کر کے سویا۔ شب آخر کو میں نے خواب میں دیکھا کہ میں (د) کی قربت
کامیاب ہو رہا ہوں جس کو میں نے بخوبی تمام مشاہدہ کیا۔ خدا کرے یہ خواب راست آئے اور اس کا مشاہدہ بوجوہ احسن ہو۔ آمین ثم آمین

۳ر اگست ۱۹۰۹ء۔ باوجود بیہم ظہور ناامیدیوں کے میں اکثر اپنی خیالی امیدوں سے باز نہیں آتا اگرچہ
وبی جانتا ہوں کہ اب میرا زمانہ خوشی و مسرت کا نہیں آسکتا۔ لیکن یہ میری محض نافہمی ہے جو موہوم باتوں میں
ستغرق رہتا ہوں لہٰذا میں درگاہ رب میں ملتجی ہوں کہ جو امر اس کی مشیت میں بحق مجھ گنہگار شدنی نہیں ہے

---

[1] ۱۹۰۹ء مولوی صاحب کے خاندان میں کئی خوش سلیقہ اور متمول بیوائیں موجود تھیں۔ ان میں سے تین کے نام ان حروف سے
شروع ہوتے تھے اور مولوی صاحب ان میں سے کسی ایک سے عقد ثانی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس قسم کی تحریک کوئی خود انھوں نے
یں کی ممکن ہے کہ اس قسم کی تحریک کا اشارہ پہلے دوسری جانب سے چاہتے ہوں۔ مگر دوسری شادی ان کی ہر حال نہیں ہوئی۔ ہاشمی

اس کے خیالات میرے دل پر حاوی ہونا باعث کمال رنج و ملال کا ہوتا ہے خدا ان کو میرے دل سے دفع فرمائے ورنہ امر کی حالت سخت پریشان کن ہے۔ اے خدا میرے حال پر رحم فرما اور خیالات فاسد دل خوش کن میرے دل سے دور کر جو غیر ممکن الوقوع ہو

۱۰/ اگست ۱۹۰۹ء۔ باوجودیکہ میں یہ بخوبی جانتا ہوں کہ بے اذن الٰہی ذرہ نہیں ہل سکتا اور قبل از کوئی امر ظاہر نہیں ہو سکتا اور نہ مقدر سے کم و بیش ہو سکتا ہے جیسا کہ مساۃ زیب النسا بنت شہنشاہ عالمگیر نے

قضا قضا نہ شود اے عزیز من ہرگز　　تو خواہ فال ببیں خواہ استخارہ کن

مگر اس پر ثابت قدمی خیلے دشوار ہے۔ اللہ ہی میری مدد کرے

۳۱/ اگست ۱۹۰۹ء۔ میرا معاملہ متعلقہ ذات خاص کچھ ایسا دشوار ہے کہ اس کا انجام کچھ خوش نظر نہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی نہج سے طے نہ ہو سکے گا اور کیونکر ہو جب کہ اس کا کوئی سامان بظاہر نظر نہ آتا۔ بعض وقت یہ شعر حافظ شیرازی کچھ تسکین دہ ضرور ہوتا ہے ؎

گرچہ منزل بس خطرناک است و مقصد ناپدید　　ہیچ راہے نیست کو را نیست پایاں غم مخور

مگر دوسرے وقت اس کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا اور بہ لحاظ حالت موجودہ آثار توقع مطلقاً نسیاً منسیاً ہو جاتے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ مثل میرے کوئی شخص توہمات غیر متوقع میں مبتلا ہو جس کا کوئی انجام ہی نہیں۔ مشیت ایزدی یہ ہی ہے کہ میں انھیں خیالات میں مستغرق رہ کر ایک روز شاید اس دار ناپائیدار کو خیرباد کہوں۔

<u>برکھ پھل</u>: ۱۲/ ستمبر ۱۹۰۹ء۔ میرا برکھ پھل جو ۱۲ ستمبر ۱۹۰۸ء کو شروع ہوا تھا اس کے حالات مختصر حسب ذیل ہیں۔ عہدہ سکریٹری میونسپل سے بوجہ کثرت کام استعفا دے دیا اور بعد دس مہینے کے برخوردار مرتضیٰ علی کو حسب سفارش مسٹر وے صاحب ڈپٹی کمشنر ہردوئی نے بہ مشاہرہ پچپن روپے ماہوار ہیڈ سکریٹری میونسپل سندیلہ تقرر کر دیا۔ پشت دوکانات صدر میں نے رعایا آباد کی جس سے دوکانات خدشہ نقب زنی سے محفوظ ہو گئیں۔ میں اپنے مقاصد دلی میں کامیاب نہیں ہوا۔ نور دیدہ فریعنؒ دختر برخوردار مصطفےٰ علی کا انتقال ہو گیا جو باعث کمال ملال کا ہوا۔ ان اب یہی ایک اولاد زیح رہی تھی۔ بجانہ برخوردار مجتبیٰ علی و مرتضیٰ فرزندان نرینہ پیدا ہوئے۔ کوئی جائداد فک رہن نہیں ہوئی۔ مقدمات عدالتی میں کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ ایک دو معاملے پیچیدہ بآسانی طے ہو گئے۔ حکام وقت رضامند و خوش رہے اور بنگاہ وقعت سے دیکھتے رہے۔ بھائی بندوں سے میل جول رہا۔ بمقابلہ آمدنی مصارف کثیر رہے۔ بعض احباب سے فائدہ رہا۔ ایک دو معاملے طے نہیں ہوئے۔ برخوردار مصطفےٰ علی اکثر علیل رہے۔ میری تندرستی اچھی رہی اور مرتضیٰ علی کی تقرری سے میری ناموری پوری

...ہذا میں نیز ہر دوئی بھر میں ہوئی۔ برخوردار مرتضیٰ علی کی آمدنی بیرسٹری اچھی رہی۔

خواب خوش: ۲۶ نومبر ۱۹۰۹ء۔ شب گزشتہ کو سوتے وقت اول میں نے درگاہ یزدان پاک ...پھر جناب فضل میاں صاحب مرحوم کی جناب میں التجا کی کہ سوائے میں ان کا پرپوتا ہوں اور آج کل ...لر رہتا ہوں میرے حق میں دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ میری پریشانی دور فرمائے اور مجھے راحت و چین ...اور جس صورت سے میرا تعلق ہو مجھے خواب میں مشاہدہ ہو جائے کہ (و) سے عقد ہو گا یا (ح) ...شب آخر کو میں نے خواب دیکھا کہ ایک عورت ۳۰ سالہ جس کا قد و چہرہ لانبا ہے اور ناک میں نتھ نہیں ...ہے میرے سامنے کھڑی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے ملتجی ہے۔ اس عرصہ میں میری آنکھ کھل گئی۔

محاسبہ سال: ۳۱ دسمبر ۱۹۰۹ء۔ ذاتی حالات راقم جو ۱۹۰۹ء میں گزرے: ترددات اکثر بے ...بعنوان شائستہ دفع ہوئے۔ آرزوے دلی پوری نہیں ہوئی۔ ایک پوتی جوان و ایک پوتا و ایک نواسی و ...پر نواسی نومولود ضائع ہو گئی۔ پشت دوکانات پختہ کے رعایا آباد ہو گئی اس سے کرایہ ماہوار دوکانات میں ...فہ ہوا۔ مقدمات عدالتی میں عموماً کامیابی ہوئی اور اعداء زیر ہوئے۔ بخانہ مرتضیٰ علی فرزند نرینہ پیدا ہوا جس کا ...سلیمان حسین رکھا گیا۔ برخوردار مصطفیٰ علی چھ مہینہ تک سخت علیل رہے۔ مصارف زائد ہوئے لیکن ...نی بھی بہ مقابلہ سال گزشتہ اچھی ہوئی۔ حکام وقت رضامند رہے۔ اکثر اشیا جدید خریدی گئیں۔ بھائی بندوں ...لطف رہا اور نگاہ قدر سے دیکھا گیا۔ سفر کم پیش آیا جو محدود لکھنؤ و ہردوئی رہا۔ سارٹیفکٹ خوشنودی ...ے بابت کام خود عطا ہوا۔ خواب ہائے خوش اکثر مشاہدے ہوئے لیکن کوئی خاص ظہور ان کا نہیں ہوا۔

الہ آباد یونیورسٹی: ۱۳ جنوری ۱۹۱۰ء۔ آج میرے نام ایک کارڈ ... فیلو یونیورسٹی الہ آباد کا آیا کہ ...۷ جنوری ۱۹۱۰ء کو قائم ہوئے بنیاد یونیورسٹی میں بوقت ۲ بجے شرکت کروں لیکن اب میں سفر کرنا پسند نہیں کرتا ہوں۔

...ارتضیٰ علی: ۲۵ مارچ ۱۹۱۰ء۔ برخوردار ارتضیٰ علی تحت ملازمت سکریٹری میونسپل نے بیلے سے گھبرا نا... ...ع ہو گئے ہیں اور اب ملازمت ترک کرنا چاہتے ہیں یہ ان کی سخت بدبختی ہے کہ وہ پچپن روپے ماہوار کی گھر کی نوکری ...سا دی ایک سو ماہوار کے ہے چھوڑنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ جو تنخواہ وہ پاتے ہیں وہ تمام اپنے صرف میں لاتے ہیں۔ ...و نوش ان کی اور ان کی اہلیہ کا میں کفیل ہوں۔ اپنے شہر کی حکومت کی نوکری چھوڑنا سخت نادانی ہے ...بور ہی کہ کوئی علاج اس کا میرے پاس نہیں ہے اور نہ کوئی فہمائش ان کو کارگر ہوتی ہے۔

انتظام خانہ داری: ۸ جون ۱۹۱۰ء۔ آج واسطے انتظام خانگی تو د نہایت پریشانی لاحق رہی اور

مجھے چند مرتبہ اہلیہ مرحومہ یاد آئیں کہ ان کے وقت میں کیسا عمدہ میرے گھر کا انتظام تھا۔ مجھے کسی امر میں مداخلت کرنے کی نوبت نہیں آتی تھی اب آج کل حسب رائے برخوردار مصطفیٰ علی مسماۃ علیمنّ خالہ معشوق حسین (پڑوسی) منتظم ہیں جو ایمانداری سے کام نہیں کرتی ہیں اور مجھے پریشانیاں لاحق رہتی ہیں اور کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی کہ سوائے بڑی بہو کے اور کوئی بہو اس وقت گھر میں موجود نہیں اور ہر ایک اپنے میکہ میں ہے۔ خدا میرے حال پر رحم کرے اور میرے ترددات دور کرے۔

بڑی بہو: ۵ جولائی ۱۹۱۰ء۔ ہماری بڑی بہو مسماۃ نسیمؔا کی طبیعت میں کچھ اس قسم کا فسادی مادہ ہے کہ اپنے کو بطور خود بہت سمجھ دار سمجھتی ہیں اور دوسروں کو ناقابل۔ بلکہ ہر ایک کو نہایت درجہ حقیر جانتی ہیں کہ میری عام حکومت گھر میں ہو اور سب مجھ سے زیر رہیں لیکن چونکہ ہر ایک کو درجہ مساوی حاصل ہے اس وجہ سے وہ ہرگز زیر نہیں ہو سکتیں اور انھوں نے برخوردار مصطفیٰ علی کو اس کے ولایت جانے سے قبل اس کی والدہ سے لڑوا دیا تھا اور خود نسیمؔا کی ذات سے ان کے بھائیوں بشیر الزماں و نعیم الزماں میں سخت الجھن و ملال پیدا ہو گیا اور مصطفیٰ علی کچھ ایسے ان کے قبضہ میں ہیں کہ جو کچھ وہ ان سے کہتی ہیں اس کے کرنے کو آمادہ ہو جاتے ہیں چاہے وہ فعل قابل نفرت کیوں نہ ہو۔

خواب خوش: ۷ اگست ۱۹۱۰ء۔ قبل اس کے جو خواب اچھا یا برا میں دیکھتا تھا اس کا ظہور جلد یا دیر سے ضرور ہوتا تھا جس کا میں پورے طور پر قائل تھا لیکن چند سال سے عجب کیفیت ہو گئی ہے کہ جو خواب برا دیکھتا ہوں اس کا ظہور کسی قدر ضرور ہوتا ہے۔ لیکن میں نے یکم اگست ۱۹۰۴ء سے ۵ اگست ۱۹۱۰ء تک ۱۰۱۶ خوابیں بہت عمدہ مشاہدہ کیں اور ان میں سے اکثر صبح صادق کے وقت دیکھی تھیں لیکن نہایت افسوس ہے کہ ان میں سے ایک کا بھی ظہور اس وقت نہیں ہوا۔ معلوم نہیں مجھ سے درگاہ ایزدی میں کیا قصور ہوا ہے کہ جس کا نتیجہ یہ مل رہا ہے کہ میرے خوابوں کا کوئی نتیجہ ظاہر نہیں ہوتا۔

ملاقات احباب: ۱۵ اگست ۱۹۱۰ء۔ آج ۹ بجے صبح کو راجہ درگا پرشاد صاحب و چودھری محمد رؤف صاحب میری ملاقات کو تشریف لائے۔ اول الذکر آج کل تاریخ سندیلہ لکھ رہے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے میرے حالات بنا بر کارگزاری آنریری مجسٹریٹی و سکریٹری میونسپل سندیلہ کے لے گئے ہیں تاکہ تاریخ مذکورہ میں بطور میری یادگار کے درج کریں جو ہمیشہ میری یادگار رہے جس کا میں مشکور ہوا اور چودھری محمد رؤف نے مجھے ایک عینک قیمتی بائیس روپے دی جو میری آنکھ میں خوب لگتی ہے اور میں اس سے بخوبی لکھ پڑھ سکتا ہوں۔ میں نے ان کا

ادا کیا۔ ۱۱ بجے تک یہ نشست رہی اور باہم بہت لطف آمیز باتیں ہوتی رہیں۔

خیالات خوش: ۲۴ر اگست ۱۹۱۰ء۔ جب میں خیالات خوشی کے اپنے دل میں چند منٹ کے واسطے
بگہ دیتا ہوں تو مجھے معاً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی پاداش میں کسی رنج و ملال کا مجرم نہ قرار پاؤں لہذا
رح ممکن ہوتا ہے میں ان خیالات خوش کن اور فاسد کو اپنے دل سے دور کرتا ہوں۔ خدا نہ کرے کہ کسی رنج و
لال کا مجھے سامنا ہو اس وجہ سے کہ زمانہ آج کل میرے خلاف گردش کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ میرے حال پر رحم فرمائے۔

بصارت خورد: ۱۰ر دسمبر ۱۹۱۰ء۔ اب میری آنکھوں کی بصارت ایسی گھٹ گئی ہے کہ نہ تو میں اخبار پڑھ سکتا ہوں
خط کسی کا پڑھا جاتا ہے بلکہ وہ اپنے عزیز صمصام علی سے پڑھوا لیا ہوں اور وہی جوابات میرے بتلانے پر لکھتے
لہذا اب میں پریشان رہتا ہوں اور کل کام دستخط وغیرہ کا مجھے بالکل سے کرنا ہوتا ہے اور قریب کا آدمی بھی
پہچان سکتا ہوں۔ دیکھنا چاہیے کہ اب میری بصارت پھر عود کرتی ہے یا میں اپنا زمانہ زندگی اسی
سے بسر لے جاؤں گا۔ اللہ مالک ہے۔

اوور کوٹ: ۵ر جنوری ۱۹۱۱ء۔ آج جناب راجہ درگا پرشاد صاحب نے ایک قیمتی اوور کوٹ اپنے
ی سے تیار کرا کے بھیجا جو نہایت عمدہ جامہ وار ہے اور اس کا استر اور وہ بہمہ وجوہ مکمل ہے۔ جس
نے پہنا وہ میرے بدن پر درست آیا میں نے ؟ اور اس کے پیر کار دوست علی خیاط کو ایک روپیہ انعام دلوا دیا۔

شکایت کھانسی: ۱۳ر جنوری ۱۹۱۱ء۔ چونکہ مجھے کھانسی دو ہفتے سے سخت تکلیف ہے لہذا آج میں نے
سٹنٹ سرجن سندیلہ کو واسطے اپنے علاج کے طلب کیا اور پانچ روپیہ ان کی فیس ادا کی اور علاج ان کا شروع کیا۔

ماہ لقا: ۲۵ر جنوری ۱۹۱۱ء۔ مسماۃ ماہ لقا ساکن رام پور جو ایک انجینیر ریاست کی بیٹی ہیں اور ان کے
و جمال کی بڑی تعریف ہے اور اکثر وہ شملہ کشمیر لکھنؤ وغیرہ میں آزادی کے ساتھ سیاحت کرتی رہتی ہیں
اپنے گھر سے نہایت متمول لیڈی ہیں۔ جب وہ کسی مجلس اناث میں شریک ہوتی ہیں تو اس جلسہ کی
نوں کو اپنے اخلاق سے گرویدہ کر لیتی ہیں۔ چنانچہ جو تقریب محمد یوسف ولد منشی یعقوب علی جگوری [illegible]
سندیلہ میں قرار پائی تھی اس میں حسب طلب شریک ہوئیں اور کل بوجہ اس کے کہ شیخ یوسف الزماں کی
بتانیہ سے قرابت قریبہ ہے میرے مکان پر تشریف لائیں۔ جیسا کہ خداوند کریم نے ان کو حسن و جمال عطا
ہے ویسے ہی وہ لائق بھی ہیں۔ عمر غالباً ۳۰ سال ہوگی۔ دو بیٹے ان کے جو شاید ہنوز خورد سال ہیں علی گڑھ میں
لیم پاتے ہیں اور لڑکی خورد سال جس کا نام ماہ پارہ ہے ان کے ہمراہ آئی تھی۔

شکایت تنفس: ۳۰ مارچ ۱۹۱۱ء۔ شب گزشتہ کو حسب تجویز بنگالی ڈاکٹر شفاخانہ میں نے عرق فلوس
بقدر نصف چمچہ جس میں نصف چھٹانک پانی تھا بعد غذا کے استعمال کیا۔ چونکہ میرے تجربہ میں عرق مذکورہ فی الجملہ
ملین ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر حصہ رات مجھے کھانسی آتی اور اخراج کف نہیں ہوا اور جب میں صبح کو جگا
وں تو تنفس کی ترقی تھی کہ میں اچھے طور سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ غرض کسی نہ کسی طرح میں نے حقہ پی کر بلغم سینہ
سے خارج کیا تب کسی قدر سکون ہوا۔ آج ڈاکٹر صاحب موصوف نے بعد معائنہ سینہ وغیرہ تجویز کیا کہ
بس آج کوئی ایسی دوا بڑھاتا ہوں جو ہیچی کو مفید ثابت ہوگی۔

۷ مئی ۱۹۱۱ء۔ کل مجھے ڈاکٹر مکرجی اسسٹنٹ سرجن سندیلہ نے وہی دوا نوش کرائی جو میں نے
یسوں پی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شام سے ہیچی کی ترقی ہوگئی۔۔۔ اور رات سخت بے چینی سے گزری۔ آخر شب
ب اوّل اذان مسجد میں شروع ہوئی میں فوراً اٹھ بیٹھا۔ بعد وضو نماز صبح پڑھی۔۔۔ لہٰذا آج میں نے
دئے دوا انگریزی کا استعمال نہیں کیا اور قصد ہے کہ وقت خواب شب ایک تولہ حلوہ چھوٹے لال بازار منگل
استعمال کر لوں اور غور کروں کہ اس سے کیا نفع یا نقصان پیدا ہوتا ہے کیونکہ تین سال کا زمانہ ہوا جب
ن حلوے کے استعمال سے شکایت کھانسی و ہیچی بالکل دفع ہوگئی تھی۔

مرمت کنواں: ۲۶ مئی ۱۹۱۱ء۔ جو رقم منشی عظیم الدین صاحب منصف ہمیرپور نے بابت مہر
نیرہ دختر برخوردار سعید الدین کو دی تھی اس سے ایک بہت اچھا کام رفاہ عام کا کھولا گیا ہے یعنی جو کنواں
مجور والا" (قریب مکان راقم) ایک عرصہ دراز سے بوجہ گر جانے کے بند پڑا ہوا تھا جس سے تمام محلہ آبنوشی
رتا تھا اس کی صفائی کا کام آج بہ اہتمام شیخ علی رضا کیا گیا۔ خدا کرے یہ کام بوجہ احسن پورا ہو اور اہل محلہ اس کے پانی سے سیراب ہوا کریں۔

مرض تنفس: ۱۳ جون ۱۹۱۱ء۔ چونکہ میرے مرض کھانسی و ہیچی میں ہنوز کوئی تخفیف پیدا نہیں
ہے لہٰذا بہ اتفاق رائے اپنے بیٹوں مصطفیٰ علی وغیرہ کے لکھنؤ جا کر عہدہ دار مشہور ڈاکٹر کا علاج کروں اور ایسا ارادہ بہت جلد کیا جائے گا۔

انبہ خوری: ۲۵ جون ۱۹۱۱ء۔ آج دوپہر کو برخورداران مصطفیٰ علی و مجتبیٰ علی و ارتضیٰ علی و مرتضیٰ علی
اصغر علی و نور دیدگان فرل حسین و توکل حسین نے میری کوٹھی میں بیٹھ کر آم کھائے۔ یہ مجمع مجھ کو نہایت پسندیدہ نظر آیا۔

راجہ درگا پرشاد: ۲۷ جون ۱۹۱۱ء۔ آج گیارہ بجے راجہ درگا پرشاد صاحب میری عیادت کو
تشریف لائے اور دیر تک مجھ سے ہمدردی کی باتیں کرتے رہے اور کہا کہ میں آپ کی صحت و سلامتی کی ہر وقت دعا
کیا کرتا ہوں اور اس وقت بھی میں دیوتا (ایک مندر۔ ہاشمی) اور شاہ اندر آئن کے مزار پر فاتحہ پڑھنے جاتا ہوں

ر دونوں مقاموں پر آپ کے واسطے دعائے خیر کروں گا کہ آپ کو جلد صحت کامل حاصل ہو۔

شکایت تنفس: ۲۸ جولائی ۱۹۱۱ء- آج مجھ کو تمام دن شکایت ہچکی پیدا رہی اور رات تک اس کی ترقی ہوتی گئی
ر کوئی دوا مجوزہ حکیم ظہور الحسن مفید ثابت نہیں ہوئی اور سخت پریشانی کا سامنا پیدا ہے کہ رات کس تکلیف و پریشانی سے بسر ہوگی۔

ملازمت ارتضیٰ: ۲ اگست ۱۹۱۱ء ۔۔۔۔ چنانچہ آج ۸ بجے صبح صدر چوکی میں بحاضری ممبران مفصلہ
یل کمیٹی ہوئی۔ محمد عوض پنشنر تحصیلدار اور لچھمن پرشاد و لالتا پرشاد اور گوالے بند کر کے کمیٹی ہوئی اور کاغذات
روری پیش ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ارتضیٰ علی عہدہ سکریٹری سے موقوف کیے گئے اور ان کو بہ اجرائے
دداشت حکم ہوا کہ آج ہی چارج اپنا کامتا پرشاد محرر پنشنی راجہ صاحب کو دے دیں۔ چنانچہ انھوں نے چارج
ے کر سبک دوشی حاصل کی۔ مجھے افسوس ہے کہ پچپن روپیہ ماہوار کی نوکری قصبہ ہذا کی مفت انھوں نے
موئی جہاں علاوہ تنخواہ کے قصبہ ہذا پر رعب بھی تھا۔ چونکہ میری فہمائش کے مطابق ارتضیٰ علی نے راجہ صاحب
سے برتاؤ نہیں کیا اور ان سے مخالفت پیدا کر لی اور اُس پارٹی میں شریک ہوئے جو بلحاظ تعداد کمی ممبران کے
زور ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ان کی موقوفی عمل میں آئی اور کوئی میری فہمائش کارگر نہ ہوئی۔

شکایت تنفس: ۲۶ اگست ۱۹۱۱ء ۔۔۔۔ میرا دل و دماغ ایسا ضعیف ہو گیا ہے کہ اندک گرم و سرد
ہوا کا فوراً احساس ہوتا ہے۔ مگر پھر میں کہنے سے باز نہیں رہوں گا کہ ہچکی کے واسطے سگرٹ (دمہ کے)
ا استعمال بہت مفید ہے اور فوراً نفع معلوم ہوتا ہے۔

تجربہ سے یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ قبض باعث ترقی ہچکی کا ہوتا ہے ۔۔۔۔ جس روز قبض ہوتا ہے تو
ر بھی شکایت اس کی بڑھ جاتی ہے لہذا ضرورت ہے کہ میں ایسی تدبیر کروں کہ قبض نہ رہنے پائے تو سخت ضرر رساں ہے۔

نور الحسن: ۲۰ ستمبر ۱۹۱۱ء- آج چھلہ کلاں اہلیہ برخوردار مجتبیٰ علی کا ہوا اور خدا کا شکر ہے کہ برخوردار
ور الحسن خیریت سے ہے اور مبلغ (۰۰۰) روپے اس تقریب میں صرف ہوئے۔ آج صبح کو میں نے نور چشم
ور الحسن ولد برخوردار مجتبیٰ علی کو دیکھا اس کی شکل و صورت مشابہ برخوردار توکل حسین ہے۔ آج کی تاریخ میں اس
ی عمر ایک مہینہ کی ہوئی۔ ۱۷ اگست کو پیدا ہوا تھا۔ خدا اس کی عمر دراز کرے۔

علالت خود: ۲۸ اکتوبر ۱۹۱۱ء- بوجہ شکایت ہچکی و کمزوری خود سات بجے شام سے ۹ بجے تک
و گھنٹہ رات گزارنا نہایت دقت معلوم ہوتی تھی یا تو نیند اپنا غلبہ کرتی تھی یا خیالات پریشانی افزا حاوی خاطر
ہوا کرتے تھے لہذا بہ نظر مناسب میں تین روز سے قصہ حاتم طائی ۷ بجے سے ۸½ بجے تک سنا کرتا ہوں

جو جان علی خدمت گار پڑھتا ہے جس سے طبیعت کو فی الجملہ دل بستگی ہے۔

عطیہ مناجات: یکم نومبر ۱۹۱۱ء آج راجہ درگا پرشاد صاحب نے ایک مناجات بہ حصول شفا تصنیف کر کے میرے پاس بھیجی تاکہ میں اس کو اپنے ورد میں رکھوں۔ خدا مجھ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ وہ مناجات حسب ذیل ہے:

مناجات مصنفہ راجہ درگا پرشاد صاحب تعلقدار سندیلہ

شافیِ مطلق شفایم دہ شفا — خلعتِ صحت ز شفقت کن عطا
بندۂ ناچارم و ہم خستہ دل — در در رحمت بروے من کشا
سیلِ اندوہ و الم از سر گذشت — کشتی ام را شو خدایا ناخدا
مخزنِ عصیانم اے آمرزگار — عفو فرما ہر گناہ و ہر خطا
در خیال و یاد خود مدہوش کن — تا نہ گردم ساعتے از تو جدا
بادشاہ دو جہانے لطف کن — گوش نہ بر التجاے ایں گدا
مظہر آشفتہ دل را شاد کن — دامنش پر کن ز نقد مدعا

علالت: ۲۲ر دسمبر ۱۹۱۱ء شب گزشتہ کو شاید ایک یا دو مرتبہ مجھے بدخوابی ہوئی ہوگی ورنہ میں قریباً ۷ گھنٹے غریق نیند سویا۔ مگر یہ غریق نیند سلسلہ وار نہیں تھی بلکہ ایک یا دو گھنٹے سو گیا اس کے بعد جگ پڑا۔ یہ رات چنداں مجھے تکلیف سے نہیں گزری۔ البتہ فی الجملہ کھانسی کی شکایت پیدا ہو گئی جو خشک قسم کی تھی۔ اخراج کف کا نہیں ہوتا تھا۔ میں چھ بجے صبح کو اٹھا ہوں تو طبیعت میری چاق تھی اور اجابت بھی کسی قدر ہوتی رہی۔ اخراج مواد کا بھی بلا تکلف ہوتا رہا لیکن اس سے کم ہوا جو کل یا پرسوں ہوا تھا اور میرے داہنی جانب کا ورم اعضا تو کل ہی جاتا رہا اور بائیں جانب کا باقی تھا۔ بائیں جانب میں جہاں تک خیال کرتا ہوں اب کچھ کچھ تحلیل ہو گیا ہے اور ہوتا جاتا ہے۔

۲۳ر دسمبر ۱۹۱۱ء۔ چونکہ راجہ درگا پرشاد صاحب مدرسہ انگریزی کا روپیہ کسی وجہ خاص سے اپنے اہتمام میں رکھنا چاہتے ہیں لہٰذا انھوں نے مجھے یہ تحریری اطلاع دی ہے کہ جس قدر مدرسہ انگریزی بابت چندہ کے واجب الوصول ہوا اور جس قدر روپیہ کرنٹ اکاونٹ بنک کے ذریعہ واجب الادا ہو وہ مجھے بھیج دیا جائے۔ چنانچہ آج اس کا حساب کیا گیا تو ایک ہزار ایک سو تین روپیہ تین آنہ ایک پائی کی تعداد نکلی وہ ذریعہ ورنیکل دار مع ارسال کرتا ہوں کیونکہ رقم مذکورہ ہی میرے پاس موجود تھی۔ اسی وقت راجہ صاحب نے وہ چیرمین مدرسہ انگریزی کو بھیج دی اور باضابطہ رسیدان سے حاصل کر لی۔

۲۴ دسمبر ۱۹۱۱ء۔ صبح۔ کل میری طبیعت خوش شام کو نہ تھی اور ہپی کی شکایت زیادہ ہے اور رات کو بخیر بھی کچھ تیزی کناں جس سے مجھے انواع و اقسام کا اندیشہ ہے کہ آج کی رات کو شب سنیچر شروع ہوگی اور سنیچر کچھ میری اولاد کے حق میں مفید نہیں ہے اور عجب نہیں کہ مشکلات درپیش آئیں چنانچہ یہی حالت رات کو رہی کہ مجھے بوجوہ نیند کم آئی اور شاید ۴ گھنٹے سے زیادہ نہ سو سکا ہوں گا۔ برخلاف اس کے کہ میں قبل اس کے کم سے کم سات گھنٹے سوتا تھا اور دن کو طبیعت بہت صاف ہوتی تھی۔ لہٰذا شب کو میرے چاروں لڑکے براہ ہمدردی میرے کمرہ شب باشی میں رہے اور مولوی خلیل الدین (کھانجہ) نے بھی اس میں قیام کیا یعنی بیٹھے رہے اور شیخ سخاوت علی میرے کارندہ بھی میرے مکان ہی میں رہے اور میری حالت موجودہ کو دیکھتے رہے۔ اگرچہ کچھ ایسا تغیر میری ذات کو پیش نہ آیا جس سے مجھے بہت پریشانی لاحق ہوتی لیکن یہ ضرور ہوا کہ نیند نہ آنے سے مجھے بہت پریشانی لاحق رہی اور تمام رات کھانسی بذریعہ ہپی آتی رہی چند قسم کی ادویات یونانی استعمال ہوئیں جن سے شکایات لاحقہ دفع نہ ہوئی اور دو مرتبہ پانچ پانچ قطرے دوا ڈاکٹر برمن ساکن کلکتہ کی مجوزہ میں نے تھوڑے تھوڑے پانی میں پیے۔ اگرچہ وہ بیماری دمہ کے لیے بہت مفید ہے استعمال لایا مگر اس سے افاقہ دیر میں نظر آیا اور آج صبح کئی گھنٹے کی پریشانی برداشت کر کے میں اٹھا اور جب حکمائے یونانی حکیم ظہور الحسن و حکیم اخلاق حسین نے مجھے دیکھ لیا تب چاہا کہ سو رہوں لیکن افسوس کہ نیند نہ آسکی۔ اگرچہ اس رات کو میں اپنی دنیا سے دوں کو نہ چھوڑ سکا تاہم یہ رات پریشانی سے گزری۔

<u>وفات مولوی سید مظہر علی</u>: ۲۴ دسمبر ۱۹۱۱ء۔ آج سہ پہر کو بوقت ۳ بجے شام کے (مولوی سید مظہر علی صاحب ولد سید مظفر علی صاحب) راقم روزنامچہ ہذا نے بعارضہ ضیق النفس اس دار فانی سے رحلت فرمائی۔ اور بوقت شب ۸ بجے اپنی پھلواری میں حسب وصیت خود دفن ہوئے۔ اپنی قبر کے لیے پتھر عرصہ سے منگا کر رکھ لیا تھا۔ اسی کی قبر درست کرائی گئی اور اسی میں مدفون ہوئے۔ ہم لوگوں کو نہایت سخت صدمہ ہوا کہ ان کی ذات والاصفات سے ہر قسم کا اطمینان تھا۔ اپنی زندگی میں صاحب روح نے بڑی ترقی نمایاں کی۔ عزت و وقار کی افزونی رہی۔ جائداد کو ترقی دی۔ مکان قیام بہت وسیع تعمیر کرایا اور متعدد دکانات بنوائیں۔ مکانات رعایا بھی کئی موجود ہیں۔ کئی باغات اپنی ذات سے قصبہ ہذا میں اور نیز دیہات میں نصب فرمائے۔ غرض کہ تا بہ زلیست اپنی خوش اقبالی سے بہت عروجی حالت بسر کی جس کی کیفیت ان کے روزنامچہ سے ظاہر ہے۔ خدا غریق رحمت کرے۔ فقط

مرقومہ مجتبیٰ علی

تاریخ وفات مولوی مظہر علی مرحوم از راجہ درگا پرشاد مہر سندیلوی

مولوی مظہر علی مہر سپہر مردمی — نیک طینت نیک طبع و نیک خو نیکو شعار
دوئمی ماہ محرم بود ایام عزا — کرد زیں دار فنا رحلت سوے دار القرار
گرد تابوتش ہجوم اجر کار نیک بود — شان رحمت در ہمیں جوش شفاعت در یسار
حسرتا دامن کشاں از صحبت یاراں گذشت — وادریغا کایں فراقِ دائمی کرد اختیار
مخزنِ اخلاق و خوبی بود ذات پاک او — بود در عقل و فراست انتخاب روزگار
حلم بود او را انیس و صبر بود او را ندیم — بود طبعش مستقل ہم بود عہدش استوار
صد چراغ دانش او افروخت در بزم خرد — کرد در چشم جہاں صد گونہ حاصل اعتبار
در زمانِ فکر ما را بود یارے دل نواز — در ہجوم انتشارم بود دائم غمگسار
بہر سال انتقالش مہر چوں بنمود غور — در زمانِ اضطراب در اداں انتشار
از سر افسوس گفتم سید مظہر علی — سال ہجری گشت زیں الفاظ ہجرش آشکار
١٣٢٩ھ
چوں سنِ عیسی بجست از طبع در طرز جلی — یک ہزار و نہ صد و دہ یک در آید در شمار

از سید قمر الدین قمر سندیلوی شاگرد حضرت امیر مینائیؒ

دوسری ماہ محرم کی تھی آہ — سیزدہ صدی سنِ ہجری رواں
اور دسمبر کی بھی تھی جو بیسویں — روز یکشنبہ تھا جس میں ناگہاں
مولوی مظہر علیِ خوش صفات — دار فانی سے گئے سوئے جناں
تھی وصیت باغ میں مدفون ہوئے — ان کو حاصل ہے بہار جاوداں
آفتاب دانش و مہرِ عروج — ہو گیا زیر زمیں ہے ہے نہاں
سچ تو یہ ان کی روش ان کے اصول — قابل تقلید مہر دیگراں
تب کہیں ہوتا ہے پیدا ایسا شخص — جب بہت کھاتا ہے چکر آسماں
ہے یہ مصرع اے قمر لوح مزار — مولوی مظہر علی جنت مکاں
١٩١١ء

اب سیّد شہاب الدین دسنوی
تاج منزل، بی۔ این بنرجی روڈ، پٹنہ

اسلام جیسا میں نے سمجھا

خدابخش خطبات کے سلسلے میں تقریر کرنے کی دعوت ملی تو اس کے ساتھ عنوان بھی تجویز کر دیا گیا slam as I Understand it
میں نے دعوت قبول کر لی، پھر یکایک یاد آیا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان، زمین اور پہاڑوں کو بارِ امانت پیش کیا تو وہ سب کے سب کانپ اٹھے اور انکار کر دیا مگر روحِ آدم نے اسے اپنے سر اٹھا لیا کیونکہ انسان ظلوم و جہول تھا۔ یہ بات دھیان میں اس لئے آئی کہ ۱۹۲۵ء میں شاعرِ اسلام علامہ اقبال نے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کو ایک خط میں لکھا تھا کہ وہ (اقبال) ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے جس کا عنوان ہوتا Islam as I Understand it لیکن یہ کام ان سے نہ ہو سکا۔ اب آپ فرمائیں کہ اسی عنوان پر میرا یہاں کچھ بیان کرنا گویا اپنے کو بھی ظلوم اور جہول کے زمرے میں لانا نہیں تو اور کیا ہے۔ ایک بات صاف کر دینا چاہتا ہوں، میں جو کچھ عرض کرنے والا ہوں وہ کوئی عالمانہ یا تحقیقی مقالہ نہیں ہوگا، یہ میرا داخلی اور ذاتی بیان ہوگا، اسے نہ کوئی فتویٰ سمجھا جائے نہ تلقین۔

Islam as I Understand it کا مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح اسلام کو میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں، اس طرح آپ شاید نہ کرتے ہوں، اور جس طرح آپ اسے سمجھ رہے ہیں شاید میں اس طرح نہ سمجھتا ہوں۔ اس بات پر مجھے ایک پیر صاحب کا قصہ یاد آ گیا۔ وہ کسی شہر میں تشریف لے گئے تو ان کا بڑا پرتپاک استقبال ہوا، بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ ان کے سلوک، علم و فضل سے استفادہ کرنے کی غرض سے رات کو ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں کافی تعداد میں لوگ جمع ہوئے۔ پیر صاحب نے اسٹیج پر پہنچ کر ایک نگاہ مجمع پر ڈالی، فرمایا "تم لوگ جانتے ہو میں کیا کہنے والا ہوں؟" سب لوگوں نے ایک آواز ہو کر جواب دیا "جی نہیں حضور" حضرت نے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا "جب تمہیں معلوم ہی نہیں کہ میں کیا کہنے والا ہوں تو پھر میرا کچھ کہنا بیکار ہے" اتنا کہا اور اسٹیج سے اتر آئے، لوگ منہ تاکتے رہ گئے۔ دوسرے دن لوگ پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، اپنی غلطی کی معافی مانگی اور دوبارہ تقریر کی درخواست کی جو منظور ہوئی۔ اس رات بھی حضرت نے اسٹیج پر پہنچ کر وہی سوال دہرایا۔ پچھلے روز کے تجربے کی روشنی میں اس بار لوگوں نے کہا "جی ہاں حضور"۔ وہ بزرگ یہ کہتے ہوئے نیچے اتر آئے کہ "جب تم جانتے ہی ہو تو پھر میرے کہنے کی کیا ضرورت ہے؟" تیسرے دن پھر لوگوں کے اصرار پر جلسہ ہوا، حضرت نے اسٹیج پر پہنچ کر سوال دہرایا "تم جانتے ہو میں کیا کہنے والا ہوں؟" اب لوگ ہوشیار ہو چکے تھے، انھوں نے

فیصلہ کر لیا تھا کہ آدھے لوگ "ہاں" کہیں گے اور آدھے لوگ "نہیں"۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا تب پیر صاحب نے فرمایا "یہ تو بہت اچھی بات تو پھر جو لوگ جانتے ہیں وہ نہیں جاننے والوں کو بتا دیں" حضرت کا پیر رہ گیا اور لوگ لاجواب ہو گئے۔

حضرات! دنیا میں جتنے بھی مذاہب آئے ان کی تعلیمات کے دو حصے ہیں۔ ایک عقائد کا اور دوسرا عمل کا۔ اسلامی اصطلاح میں ہم اسے ایمان اور عمل صالح کہتے ہیں۔ ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایمان رکھتے ہیں اللہ پر، اس کے بھیجے ہوئے انبیاء پر اور ان پر نازل کی ہوئی کتابوں پر، آخرت پر اور ملائکہ پر۔ ملائکہ ایسی غیر مادی اور غیر مرئی مخلوق ہیں جن کے بارے میں نہ ہم کچھ زیادہ جانتے ہیں اور جن نہ ہم سے بلاواسطہ یا بالواسطہ کوئی تعلق قائم ہے۔ وہ اپنے تفویض کئے ہوئے فرائض انجام دیتے ہیں جن میں ہم کوئی دخل نہیں دے سکتے اس لئے ہم پہلے تین کی بات کریں گے۔ ان میں اللہ پر ایمان لانا سب سے اہم اور مشکل مسئلہ ہے کیونکہ بقول اقبال:

خوگر پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر

مگر ایک طرح سے یہ مسئلہ آسان بھی ہے۔ ہم زبان سے اقرار کر لیں اور دل کو سمجھا لیں کہ اللہ ایک ہے، رب العالمین ہے۔ نماز میں اللہ اکبر کہہ کر اس کی کبریائی بیان کر لیں۔ لیکن کبریائی پر یقین کیسے آیا؟ ایک طویل عرصے تک میرے لئے یہ سب کچھ رسمی بات رہی۔ اللہ اکبر کے معنی سمجھ نہ پایا۔ پھر ایک وقت آیا جب قرآن مجید پڑھتے ہوئے اس پر غور کرنے کی عادت سی ہونے لگی۔ قرآن میں آسمان، زمین، چاند ستاروں کا ذکر جا بجا آتا ہے۔ یہ چمکتے ہوئے اجرام فلکی ہم سے بہت دور واقع ہیں، اتنی دور کہ بقول قرآن ہماری نگاہ وہاں تک جاتی ہے تو تھک کر لوٹ آتی ہے۔ کتنا خوبصورت انداز بیان! آج دنیا کی بڑی بڑی دوربینوں اور فلکیات کے اصولوں کی مدد سے پتا چلتا ہے کہ ہم سے قریب ترین سیارہ ۹ کروڑ ۱۰ لاکھ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ ستاروں میں سب سے نزدیک ستارے کی روشنی ہم تک پہنچنے میں ۴ ۱/۲ سال لگتے ہیں۔ دوسرے ستاروں سے جو روشنی ۵۰۰ ملین برس قبل چلی تھی وہ اب پہنچی ہے اور کچھ ستارے ایسے بھی ہیں جہاں سے چلی ہوئی روشنی اب تک زمین پر پہنچی ہی نہیں ہے۔ اب ملکوت کے فاصلے کا حساب کیا لگایا جا سکتا ہے صرف تصور ہی میں یہ دیکھئے کہ روشنی کی رفتار تین لاکھ کیلومیٹر فی سکنڈ ہے تو سیارے سے نکلی ہوئی روشنی ۳۰۰,۰۰۰ x ۴۰ x ۱۵,۰ کیلومیٹر ایک دن میں اور اس کا ۱۵ گنا فاصلہ ۴ ۱/۲ سال میں طے کر کے زمین میں پہنچتی ہے۔ اب ایک ایسے کہکشاں کا تصور کیجئے جس میں کروڑوں کی تعداد میں ستارے تیر رہے ہیں اور ایسے کتنے ہی کہکشاں اور بھی ہیں۔ مشاہدات اور تجربوں سے جب یہ علم حاصل ہوتا ہے تب البتہ دل سے "اللہ اکبر" کا اقرار ہوتا ہے اور یہ ایمان محکم ہوتا ہے۔ امریکن خلاباز James Irvin آخری انسان تھا جس نے چاند پر قدم رکھے۔ اس نے اپنے خلائی سفر پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں وہ لکھتا ہے کہ اپنی زندگی میں وہ صرف ایک بار گرجا گیا تھا اور وہ اس کی شادی کا موقع تھا، دوسرے الفاظ میں وہ خدا کے وجود کا قائل نہ تھا لیکن خلائی سفر کے دوران میں وہ ان گنت اجرام سماوی سے ہو کر گزرا تو جس صفائی اور نفاست سے انہیں محو خرام اور ایک دوسرے سے بچ کر نکلتے ہوئے دیکھا تو اسے یقین آگیا کہ ایک ایسی قادر المطلق ہستی کے سہارے [illegible]

بالاتر ہے اور کوئی دوسری طاقت نہیں ہو سکتی تھی جو ایسا اکمل نظام قائم کر سکتی ہو۔ چنانچہ اب وہ دنیا کا سفر اسی مشن کو لے کر رہا ہے کہ لوگوں کو خدا کے وجود کا یقین دلائے۔ Irvin: کے اس بیان سے میری سمجھ میں آیا کہ ہم سبحان ربی العظیم اور سبحان ربی الاعلیٰ نماز میں کیوں پڑھتے ہیں۔ زبان سے اور دل سے اللہ تبارک و تعالیٰ کی بڑائی اور پاکی کا اقرار کیوں کرتے ہیں

میں یہاں وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے مسائل میں الجھنا نہیں چاہتا لیکن مجھے اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی مرضی یہی ہے کہ اس کی ذات کو اس کی قدرت کے ذریعے پہچانا جائے۔ اس جستجو اور تلاش میں ہم حق سے قریب اور توہماتی شرک سے دور ہو سکیں گے:

سورہ یونس میں ارشاد ربانی ہے: قُلِ انْظُرُوا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط کہدو کہ آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے اس پر نظر ڈالو۔

سورہ الجاثیہ میں ارشاد ہے: اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ بے شک آسمان اور زمین میں مومنوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

سورۃ آل عمران میں ارشاد باری ہے: اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط ان لوگوں کے لئے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت پر غور کرتے ہیں

اور جب ہم ان واضح ہدایات کے باوجود آسمانوں اور زمین پر اللہ کی قدرت اور حکمت کی نشانیوں پر غور کئے بغیر گزر جاتے ہیں (وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ (یوسف ۱۰۵) اور دیکھو آسمانوں اور زمین میں کتنی نشانیاں ہیں جن پر یہ لوگ منہ موڑ کر گزر جاتے ہیں) تو پھر ہم کو یہ بھی جتا دیا جاتا ہے وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ۔ اندھے اور دیکھنے والے برابر نہیں ہوتے ہیں۔

اس بدیہی حقیقت کے باوجود دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اٰيٰتِ اللّٰهِ (اللہ کی نشانیوں) کا انکار کرتے ہیں جس سے مراد یہ ہے کہ ان کا تعلق ایسی ذات سے انھیں نظر نہیں آتا ہے جو قادر مطلق ہے، جو خالق کل ہے تو ان کے بارے میں بھی اللہ کا حکم سن لیجئے:

سورہ انعام میں فرمان الٰہی ہے: فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ۔ اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جس نے اللہ کی نشانیوں کو جھٹلایا (انعام)

آیت کے معنی ہیں "نشانی" مجھے یاد آتا ہے کہ اس کے معنی "چھپی ہوئی نشانی" بھی میں نے دیکھا ہے جو زیادہ موزوں ہے۔ اللہ کی طرف سے ہم کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ اس کی چھپی ہوئی نشانیوں کو معلوم کرو۔ یہ نشانیاں کہاں چھپی ہوئی ہیں اور کیسی ہیں؟ ان سوالوں کے جواب قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں ملتے ہیں، مثال کے طور پر میں آپ کے سامنے سورہ روم کی چند آیتیں تلاوت کروں گا، آپ ان پر غور فرمائیں: (ترجمہ مولانا مودودی کا ہے)

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ۝ اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر یکایک تم بشر ہو کر (زمین میں) پھیلتے چلے جا رہے ہو۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ

وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ ۔ اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں، تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانشمند لوگوں کے لیے ہے۔ وَمِنْ اٰیٰتِہٖ مَنَامُکُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَ ابْتِغَآؤُکُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ۔ اور اس کی نشانیوں میں سے تمہارا رات کو سونا اور دن کو تمہارا اس کے فضل کو تلاش کرنا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (غور سے) سنتے ہیں۔ وَمِنْ اٰیٰتِہٖ یُرِیْکُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحْیٖ بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ہ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تمہیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے خوف کے ساتھ بھی اور طمع کے ساتھ بھی، اور آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اس کے ذریعے سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِہٖ ہ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔ (روم ۱)

انسان کی تخلیق، روئے زمین پر مختلف خطوں میں اس کا پھیل جانا اس طرح کہ موسمی اور جغرافیائی حالات سے اس کی حیات کی مطابقت بھی ہو۔ قطب شمالی کے اسکیمو اور افریقا کے خط استوا پر زندگی گزارنے والے حبشی ہر دو نوں انسان ہیں لیکن ان کی طبعی تخلیق کی بنیاد پر ان کے منتشر ہو جانے کا بھی التزام غور طلب ہے جس سے اللہ کی نشانی کا پتا ملتا ہے۔ زوجین کا ایک دوسرے کے لئے باعث سکون و رحمت ہونا، تنازع للبقا میں ایک دوسرے کا ممد ہونا، نفسیات کے اس پہلو میں قدرت الٰہی کا اظہار ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ارض و سموٰت کی تخلیق، دنیا میں بسنے والوں کی زبانوں، ان کی نسل و رنگت، سیاہ، سفید، زرد اور گندمی، اونچی ناک، چپٹی ناک، چھوٹا قد، اونچی قامت، ان سب میں سمجھنے والوں کے لئے نشانیاں چھپی ہیں۔ کلام پاک میں یہ بات بھی نوٹ کرنے کی ہے کہ جہاں جہاں قدرت الٰہی کے مظاہر کا ذکر آتا ہے وہاں آیت کے خاتمے پر عموماً لاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ، لاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ یا لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (سمجھ رکھنے والوں کے لئے نشان) جیسے الفاظ آئے ہیں، گویا قاری کو دعوت فکر دی جا رہی ہے کہ وہ ان آیات میں اللہ کی نشانیوں کو تلاش کرے جو اس کی مظہر قدرت ہیں۔ یہاں میں صرف دو آیتوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراؤں گا (ترجمہ مولانا مودودی):

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَالْفُلْکِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا وَبَثَّ فِیْھَا مِنْ کُلِّ دَآبَّۃٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ہ۔ ترجمہ: (حقیقت کو پہچاننے کے لیے اگر کوئی نشانی اور علامت درکار ہے تو) جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں ان کے لیے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد میں آنے میں، ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لئے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے،

ہے اس کے ذریعے سے زمین کو زندگی بخشتا ہے اور اپنے اسی انتظام کی بدولت زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں، بے شمار نشانیاں ہیں۔"

یہاں ذکر ہے زمین، آسمان کی تخلیق کا، دن اور رات کا، ہواؤں کے رخ کا، بارش، نباتات اور حیوانات کا اور انسان کا ان سب سے مستفید ہونے کا۔ مزید تفصیل سورہ النحل کی آیت ۸ سے ۱۷ میں ملاحظہ کیجئے جن میں انہی مضمون کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

جن نشانیوں پر قرآن متوجہ کرتا ہے ان کے اسباب و علل پر غور کیا جانا مقصود ہے۔ ایک ان پڑھ آدمی بھی اتنا جانتا ہے کہ دل کا دھڑکنا زندگی کی علامت ہے، دل کی حرکت بند ہو جانے سے موت واقع ہوتی ہے، یہ بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ہے مگر اسی نشانی کو طبی تحقیق کی بدولت اور غور و فکر کے بعد اس طرح سمجھا گیا کہ دل کی حرکت فی منٹ ۷۰ بار ہوتی ہے۔ گویا ایک دن میں ایک لاکھ بار، جس کی وجہ ۱۴ ہزار سے ۹ ہزار کلوگرام خون شریانوں میں سے ہو کر گزرتا ہے۔ کسی شخص کی عمر ۵۰ سال ہو تو اس کا دل ۲۰۲ کروڑ بار دھڑک چکا ہوگا اور تماشا یہ کہ اس کو اس بات کا مطلق احساس نہیں کہ ایسی کوئی بات اس کے جسم کے اندر ہو رہی ہے۔ تتلی کے پروں کی رنگینی سب کو بھاتی ہے لیکن اللہ کی نشانی دیکھنا چاہو تو اس کیڑے کے پر کے سرے کے برابر سفوف لے کر اسے خوردبین سے دیکھو تو حیرت ہو جائے گی کہ اس ننھے سے ذرے میں فلس ماہی کی طرح تہ بہ تہ رنگوں کے چھلکے جمے ہوئے ہیں۔ ایک حقیر سی مکھی کے سر پر دو آنکھوں کے بجائے آنکھوں کے مجموعے ہوتے ہیں۔ دمشق یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد اعجاز الحقیقت نے کہا ہے کہ قرآن مجید میں وضع قانون سے متعلق صرف ۵۰۰ آیتیں ہیں لیکن ۷۵۰ آیتیں ایسی ہیں جن میں مومن کو قدرت کے کارخانے پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے، عقل سے کام لینے کی تلقین کی گئی ہے اور سائنسی فکر کو زندگی کا جز بنانے کی طرف صاف صاف اور واضح اشارات دیئے گئے ہیں۔ یہ ۷۵۰ آیتیں گویا پورے کلام پاک کا آٹھواں حصہ ہے۔ شاید مذاہب عالم میں کوئی ایسی کتاب نہیں پائی جاتی ہے جن میں اس درجہ قدرتِ الٰہی پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہو۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا، جس میں حکم دیا گیا ہو۔

میں نے اب تک جو کچھ عرض کیا ہے اس سے آپ کو یہ غلط فہمی ہرگز نہیں ہوگی کہ میں قرآن مجید میں موجودہ سائنس کی تاویلات ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر ایمان رکھتا ہوں اس لئے مجھے اس پر بھی یقین ہے اس میں جو کچھ درج ہے وہ سب باتیں حق ہیں۔ میرا اصلی مقصد یہ بتانا ہے کہ توہمات اور شرک کے شائبے سے نکل کر توحید کی بنیادی تعلیم تک پہنچنے کے لئے قرآن مجید کی دعوت فکر کو کس طرح سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ سورج ہو یا چاند، ہمالیہ پہاڑ ہو یا گنگا، حیوانات ہوں یا نباتات ان کے وجود میں ان کی اپنی کوئی ہستی نہیں ہوتی۔ اگر اللہ تبارک و تعالیٰ کا ایک منظم قانون ان میں کارفرما نہ ہوتا اور جو ایسا قانون بنا سکتا ہے وہی قادر مطلق بھی ہوتا ہے۔ ملائکہ کے بارے میں ہمارا ایمان ہے کہ وہ اللہ کی بنائی ہوئی ایک خاص قسم کی مخلوق ہے جو تفویض کئے ہوئے فرائض یا یوں کہئے کہ اس کے بتائے ہوئے اصول کے تحت بلا کم و کاست انجام دے رہے ہیں۔ ہمان کے بارے میں اس کے

سوا وہ کچھ نہیں جانتے، کلام پاک میں یہ بات بھی صاف کردی گئی ہے کہ قدرت میں جو کچھ نظر آتا ہے، بارش کا ہونا، ہواؤں کا چلنا
کا چمکنا، نباتات کا اُگنا، چاند ستاروں کی گردش ان میں سے کوئی کام کوئی فرشتہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر رہا ہے، ہر جگہ ارشاد
ہوتا ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جو پانی برساتا ہے، وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو حکم دیتا ہے وغیرہ۔ یہ اسی لئے ضروری ہے کہ اللہ کے ذ
میں کہیں فرشتے کی شرکت بھی شامل نہ ہو جائے۔

توحید کے تصور کو خالص اور مستحکم کرنے کے لئے قرآن میں باری تعالیٰ نے مختلف موقعوں پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
بشریت کے پہلو کو بھی صاف صاف لفظوں میں واضح کردیا۔ قل اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحٰى اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ "ا
نبی! ان سے کہدو میں تو ایک بشر ہوں تم جیسا، مجھے وحی کے ذریعہ بتایا جاتا ہے کہ تمہارا خدا تو بس ایک اللہ ہے" بالکل یہی الفا
سورہ حم السجدہ میں دہرائے گئے ہیں۔

مالک رام لکھتے ہیں کہ بعض غیر مسلموں (غالباً آریہ سماجی) نے اعتراض کیا کہ اسلام تو تو
کا مخالف ہے پھر کلمۂ شہادت میں لا الہ اللہ کے ساتھ محمد رسول اللہ کیسے شریک ہوگیا! مالک رام کا کہنا ہے کہ محمد کے ساتھ رسول ا
جوڑ کر تاکید کی جارہی ہے کہ جب مومن دل سے اور زبان سے لا الہ اللہ کہے تو اس کے ساتھ اس کا بھی اعلان کرتا جائے کہ محمد اللہ کے
ہیں، نعوذ باللہ الٰہ نہیں ہیں۔ یہ تو عین توحید کا اظہار ہوا۔

ایمان کے اجزا میں یہ بھی ہے کہ تمام انبیاء کرام، نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، صحائف آسمانی اور آخری کتا
قرآن مجید پر ایمان لایا جائے۔ ۲۳ سال کی مدت میں جستہ جستہ قرآن مجید کی آیتیں کس طرح نازل ہوتی رہیں، پھر حضرت عثمانؓ کے زمانے
میں ان سب کو مصحف کی شکل کیسے دی گئی یہ سب جانتے ہیں۔ اس وقت سے لے کر اب تک کلام پاک کا مطالعہ دنیا کے گوشے گوشے
میں دن رات جتنے لوگوں نے کیا اور کر رہے ہیں ان کی تعداد کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ ان سب کے پڑھنے اور سمجھنے کے طریقے جدا جدا
جدا ہیں۔ عالموں کا عرفان اور ہوگا اور ہم جیسے کم علموں کا کچھ اور۔ سمندر میں غوطہ زن جتنی گہرائی میں جاتے ہیں اتنے ہی زیادہ آبدار
موتی نکالتے ہیں۔ کلام ربانی کی حکمت، اعجاز بیان اور پیام کے مطالب ہر زمانے میں لکھے گئے اور آئندہ بھی لکھے جاتے رہیں گے۔
یہ سلسلہ علم کے اضافے کے ساتھ جاری رہے گا۔ جیسے جیسے حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے، قرآن کے مطالب بھی زیادہ واضح ہوتے
جائیں گے۔ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن مجید کا پیغام ابدی پیغام ہے اس میں بنیادی حقیقتیں ہیں جن کو سمجھانے کی خاطر ہر زمانے میں

تشریحات اور تفسیریں لکھی جاتی رہی گیں۔ انس بن مالک، ابن عباس، سعید بن جبیر، عکرمہ سے لے کر زمخشری اور ہمارے ملک میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا مودودی، مولانا عبدالماجد دریابادی، ان سب نے قرآن سمجھنے میں ہمیں روشنی عطا کی ہے جس کی بدولت جو مسائل پہلے ہماری فہم سے باہر تھے ان میں سے بہت سی باتیں اب صاف ہو چکی ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ سب سے پہلی سورہ علق کی پانچ آیتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو نازل ہوئیں وہ تھیں: "اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ o خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ o اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ o الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ o عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ o"

آیئے ہم اس پیغام پر کچھ دیر کے لئے غور کر کے دیکھیں کہ اولین پیغام کی حیثیت سے اس کی اہمیت کیا ہے؟ یہ آیتیں ایک طرح سے Preamble ہے جو آگے کہا جانے والا ہے اور ایک طرح سے حکم ہے۔ پہلا لفظ "اقرأ" پڑھ ہے۔ پھر پڑھنے کا طریقہ بتایا گیا اپنے رب کے نام کے ساتھ پڑھو۔ یہ حکم اللہ کے رسول کے ذریعے انسانوں کے ایسے گروہ کے سامنے پیش کیا جانے والا تھا جو بدترین قسم کے شرک اور توہمات میں ڈوبے ہوئے تھے، جن کے نزدیک "رب" کا تصور "لات و عزیٰ" کی صورت میں تھا جو "ہبل اور منات" میں شان الوہیت دیکھتے تھے۔ ان کے اس غلط اور باطل تصور کو درست کرنے کے لئے ضروری تھا کہ انھیں بتلایا جائے کہ "اس رب کے نام کے ساتھ پڑھ جس نے جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی"۔ اب یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ اس عالم کون و مکان میں منجملہ آفتاب، پر نور ماہتاب، عریض ترین سمندر، بلند قامت کوہ، درخشندہ ستارے، چیونٹی جیسی حقیر شئے سے وھیل جیسی عظیم الجثہ جاندار کی موجودگی میں انسان کی آفرینش کا ذکر اولین پیغام الٰہی میں کیوں ہوا؟ یوں تو پورے عالم کی ہر ذی روح کی تخلیق کا عمل بالخصوص رحم مادر میں گزرنے والے مراحل، خداوند قدوس کی صناعی اور قدرت کا مظاہر ہوتا ہے لیکن انسانی تخلیق کا عمل سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔ یہاں نہ صرف جسمانی ساخت کی تدریجی منزلیں قابل توجہ ہوتی ہیں، پیدا ہونے والے بچہ میں جین (Gene) کی اہمیت جس سے آگے چل کر عقل، تمیز اور شعور آتا ہے جس کی بدولت اس کی صلاحیتیں اور نفسیات تشکیل پاتی ہیں، قدرت کا عجیب ترین کرشمہ ہے جس کی مثال پورے نظام فطرت میں اور کوئی نہیں ملتی ہے۔ خود اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے "لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ" ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔

غور کرنے کی بات ہے کہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہی "بہترین ساخت" کا انسان اپنی بداعمالیوں اور صلاحیتوں کے غلط استعمال سے ارذل بن جاتا ہے۔ یہی فرق انسان کو دوسرے جانداروں سے ممیز کرتا ہے۔ قرآن کا پہلا پیغام انسان کو اسی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس کے بعد اس کی توجہ قلم کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے جو نہ صرف علم کے لئے آلہ کار بنتا ہے بلکہ حصول علم کی علامت بن جاتا ہے، اسی کی بدولت انسان نے وہ سب کچھ جانا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ جس علم پر اسے ناز ہے وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا فیضان رحمت ہے۔ خلا کا سفر ہو یا کمپیوٹر کے محیر العقل کرشمے، ایٹمی طاقت کی دریافت ہو یا سمندر کی عمیق گہرائیوں کی تحقیق۔

یہ سب اسی ذات باری کی بدولت ہے۔

میری ان معروضات کو سننے کے بعد ممکن ہے آپ کے دل میں خیال پیدا ہو کہ میرا نقطۂ نظر بنیادی ہے اور میں توحید
کی تاویلات مادّی پہلو سے کر رہا ہوں، روحانی طریقوں کو نظر انداز کر کے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حق شناسی اور راہ سلوک
کی منزلیں دوسرے طریقوں سے بھی کامیابی کے ساتھ طے پا سکتی ہیں لیکن جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ ان سے بہت علاحدہ بھی
نہیں ہے۔ مشہور صوفی بزرگ اور عالم اولیں زمانہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ کا آج سے ایک سو برس پہلے کا
واقعہ سناتا ہوں۔ ایک روز ایک شخص نے حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر مسئلۂ توحید دریافت کیا۔ اس نے اپنے مرض کو ظاہر
کیا کہ دل جمتا نہیں کہ خدا ہے۔ حضرت نے بڑے زور سے چیخ ماری کہ گو میں ان کو نہیں دیکھتا ہوں مگر ان کی قدرت کو ضرور دیکھتا ہوں۔

ایمان کا ایک جز انبیاء کرام اور ان پر نازل کی ہوئی کتابوں پر ایمان لانا ہے۔ لیکن جب کہ نبی آخر الزماں تشریف
لے آئے اور آپ پر نازل کی ہوئی کتاب قرآن کریم بھی ہمارے درمیان موجود ہے تو پھر آپ سے قبل کے انبیاء اور ان کے صحیفوں
پر ایمان لانے کی ضرورت کیا ہے؛ اور وہ بھی ایسی صورت میں جب کہ قرآن مجید کے سوا باقی کتابوں میں اتنی تحریف ہو چکی ہو کہ موجودہ
شکل میں ان کو اللہ کی کتاب کہنا ہی درست نہ ہوگا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جس طرح کسی کتاب کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہوں تو
آخری ایڈیشن معتبر مانا جاتا ہے۔ اسی طرح جب ہمارے سامنے قرآن پاک آسمانی صحیفوں میں سب سے معتبر ایڈیشن موجود ہے تو
اس سے پہلے ایڈیشنوں کی طرف توجہ کیوں کی جائے؟ پھر اللہ کا حکم یہ بھی ہے کہ انبیاء کرام کے مابین امتیاز نہ برتا جائے۔ ہمارے
رسول کریمؐ ایک بار صحابہ کے درمیان تشریف فرما تھے۔ بات حضرت موسیٰؑ کی ہو رہی تھی۔ آپؐ نے ایک تنکا اٹھا کر فرمایا: "قسم
ہے اس اللہ کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، مجھ میں اور موسیٰ میں اس تنکے کے برابر بھی فرق نہیں ہے۔

ان باتوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں بھی عقیدۂ توحید مضمر ہے۔ رسول اللہ سے پہلے کے نبیوں کی بات نہ ہوتی
اور صرف محمد بن عبداللہ کو واحد رسول ماننے کے لئے کہا جاتا تو اس کا پورا امکان تھا کہ انسانی فطرت کے تقاضے کے تحت محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کو مسلمان رسول کے بجائے الوہیت کے مقام پر پہنچا دیتے اور توحید کا تصور زائل ہو جاتا۔ لوگ اسلام کو ایک بالکل نیا
دین سمجھنے لگتے اور زمان و مکان کے لحاظ سے احکام الٰہی کی جو تدریجی صورت انبیاء کرام کے سلسلے سے پیدا ہوئی وہ نہ ہوتی۔ آج ہم
قرآن کی مختلف سورتوں میں انبیاء کرام کا ذکر اور ان کی بنیادی تعلیم کا ذکر پڑھتے ہیں۔ حضرت نوحؑ کے ذکر میں ارشاد ہوتا ہے:
لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ (اعراف۔ ۵۹) "ہم نے نوحؑ کو اس
قوم کی طرف بھیجا اس نے کہا: اے برادران قوم، اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔" اللہ کا یہی حکم حضرت نوحؑ

کے بارے میں سورہ المومنون کی آیت ۳۲ میں، حضرت ہودؑ کے بارے میں سورہ الاعراف کی آیت ۶۵ میں، حضرت صالحؑ کے بارے میں سورہ الاعراف کی آیت ۷۳ میں، حضرت شعیبؑ کے بارے میں اسی سورہ کی آیت ۸۵ میں، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سورہ الانبیاء کی آیت ۱۰۸ اور سورہ النحل کی آیت ۲۲ میں پھر جملہ انبیاء کرام کے بارے میں سورۃ الانبیاء کی اس آیت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ " ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو" ان سب آیتوں میں یہ بھی خیال رکھئے کہ گو آیتیں مختلف مقام پر اور مختلف سورتوں میں آئی ہیں لیکن وحدانیت کے حکم کے الفاظ مشترک طور پر یکساں ہیں. یہ محض اتفاقی امر نہیں۔

انبیاء علیہم السلام کے ظہور کے سلسلے میں ایک پرانی بحث یہ رہی ہے کہ ہندوستان میں نبی مبعوث ہوئے یا نہیں؟ یہ بات عقل کو نہیں لگتی ہے کہ ہندوستان جیسی وسیع و عریض اور قدیم سرزمین جو علم و فن کا گہوارہ رہا ہو جس پر زمانے کے لحاظ سے آج بھی اعلا طرز کی تہذیب کے آثار نظر آتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے محروم رہی ہوگی؛ خصوصاً جب کہ سورہ النحل کی آیت ۳۶ میں ہم پڑھتے ہیں وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ " ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعہ سب کو خبردار کر دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو" پھر سورہ ابراہیم کی آیت ۴ میں بھی صاف کر دیا گیا ہے: وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ " ہم نے اپنا پیغام دینے کے لئے جب کبھی کوئی رسول بھیجا ہے، اس نے اپنی قوم کی زبان میں پیغام دیا ہے تاکہ وہ انھیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے۔

ان آیات کی روشنی میں یہ مان لینے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیئے تھی کہ اس ملک میں بھی نبی آئے ہوں گے مگر اسے تسلیم کرلینے میں ہماری الجھن دو باتوں کی وجہ سے بڑھتی ہے۔ اوّلاً تو یہ کہ کسی ہندوستانی نبی کا نام قرآن مجید میں نہیں آیا ہے، دوسرے یہ کہ یہاں اتنی شدّت کے ساتھ بت پرستی کی رسم و رواج پا گئی ہے کہ دل قبول نہیں کرتا کہ یہاں وحدانیت کی تعلیم آئی ہوگی. مگر تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ اسلام کے ظہور سے پہلے حضرت ابراہیم جیسے موحد کی بنائی ہوئی عبادت گاہ میں کیسے کیسے ۳۶۰ بت براجمان ہو گئے تھے۔ رہا ناموں کا قرآن میں نہ آنا تو اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ قرآن کے اوّلین مخاطب عرب تھے جو ہندوستان اور یہاں کی راہ و رسم سے لاعلم تھے، اس لئے وہ کوئی ایسا نام کیوں کر قبول کرنے پر آمادہ ہوتے جس سے وہ واقف نہیں تھے۔ وہ طرح طرح کے سوالات کرتے جن کا اس وقت جواب دیا جانا آسان نہ ہوتا۔ رہی بات بت پرستی کے رواج پانے کی تو عوام الناس کی جہالت اور ناواقفیت برہمنیت کے تسلّط اور توہمات پر عقیدے کی بنیاد کا لازمی طور پر نتیجہ یہی ہوتا تھا

ہندوستان میں ماضی بعید میں نبیوں کی آمد کی بات آج کی جائے تو اسے لازمی طور پر سیاسی رنگ دے دیا
اور سمجھا جائے گا کہ ایسا خیال ظاہر کرنا گویا نیشنل انٹیگریشن یا جذباتی ہم آہنگی کی تبلیغی کوشش ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ
بعض مسلمان بزرگوں نے یہاں کے حالات کا مطالعہ کر کے اور روحانی تصرف سے کام لیتے ہوئے اس خیال کی تائید کی
وستان میں نبی گزرے ہیں۔ تقریباً سو برس پہلے حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی گزرے ہیں جو مشہور
عالم اور صوفی تھے جن کے ایک خلیفہ مونگیر کے حضرت مولانا محمد علیؒ تھے۔ شاہ صاحبؒ کے سوانح و ملفوظات "کمالا
ن" کا ایک اقتباس سنئے:

"مولانا مولوی مفتی عبداللطیف صاحب نے فرمایا کہ حضرت (شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی) نے ہم سے سوال کیا
م کو یہ معلوم ہے کہ میں مرادآباد میں کیوں بیٹھا ہوں؟ ہم چپ رہے۔ پھر خود ہی فرمایا کہ حضرت مولانا شاہ آفاق رحمۃ
نے مجھے یہاں بیٹھنے کا حکم دیا ہے، اس لئے کہ یہاں ایک نبی کی قبر ہے۔ اس تقریر پر مولانا محمد علی مونگیری نے تصدیق
ں کہ مجھ سے بھی فرمایا ہے بلکہ وہ جگہ بھی بتادی کہ وہ ٹیلے پر مزار ہے۔ و نیز راقم الحروف سے بھی ایک مجمع عام علماء میں فرما
ہندوستان میں بہت مزار ایسے نبیوں کے ہیں بلکہ اس مرادآباد میں بھی ایک مزار ہے۔"

صوفی باعمل حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ علم ظاہر و باطن میں یگانۂ روزگار تھے۔ ان کا انتقال ١١٩٥ھ میں ہوا۔ ان کے
ید شاہ سید محمد بدایونیؒ کی مجلس میں ایک شخص نے اپنا خواب بیان کیا کہ اس نے کرشن کنہیا کو آگ کے شعلوں میں جلتے دیکھا
چندر کو دریا کے کنارے کھڑا دیکھا۔ شاہ صاحب نے خواب کی تعبیر پوچھی تو حضرت مرزا مظہر جانجاناں نے فرمایا کہ کرشن
ب تھا اس لئے وہ آتش عشق میں تھا اور رام چندر میں سلوک تھا اس لئے وہ آگ سے دور دریا کے کنارے پر کھڑا تھا۔
حب اپنے فارسی کے مکتوب چہاردہم میں فرماتے ہیں: "در ممالک ہند نیز بعثت انبیاء و رسول واقع شدہ است" یہ
کمالات رحمانی میں صفحات ١٠٢ تا ١٠٠ پر منقول ہے۔

زمانہ حال میں مولانا حسرت موہانی جیسا صوفی منش مسلمان جو تیرہ بار حج کر چکا ہو جس پابندی سے اجمیر کے عرس میں شرکت
اتنی ہی پابندی سے گوکل اشٹمی کے دنوں میں متھرا کی یاترا کیا کرتا تھا۔ دلی کے صوفی حضرت خواجہ حسن نظامی بھی کرشن جی سے عقیدت
ے۔ ان مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ اس کا قائل رہا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین بھی اللہ تعالیٰ کی ہدایات
ہیں رہی اور یہاں ایسی ہستیاں گزری ہیں جن کے نبی ہونے کا پورا امکان موجود ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے علماء کرام اور محققین
سئلے پر جتنی توجہ دینی چاہیئے تھی اتنی نہیں دی اس لئے صحیح صورت حال سے اب تک ہم پوری طرح واقف نہیں ہو سکے ہیں یہ
یاسی مصلحت کوشی نہیں ہوگی بلکہ حقیقت کی تلاش ہوگی، جو ہمارا فرض ہے۔

یہ مسئلہ ماضی میں کافی بحث کا موضوع بنا رہا کہ معجزہ نبوت کی دلیل ہے یا نہیں، اشاعرہ اس کے قائل تھے اور معتزلہ کو اس سے انکار تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی کی جلد سوم میں بہت تفصیل سے اس پر بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں: "سب سے زیادہ سیر گن بحث ابن رشد نے کی اور ثابت کیا ہے کہ معجزہ دلیل نبوت نہیں ہو سکتا کیوں کہ منطقیانہ حیثیت سے دعوا اور دلیل میں مناسبت کا ہونا ضروری ہے اور معجزہ اور نبوت میں کسی قسم کی مناسبت نہیں پائی جاتی ہے۔" میں اس خیال سے اتفاق کرتا ہوں۔ مجھے معجزہ کی حقیقت تسلیم ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ قادر مطلق ہے، وہ اپنے بنائے ہوئے قانونِ فطرت کو جب چاہے جس طرح چاہے بدل دے، لیکن اسے میں ایمان لانے کا وسیلہ نہیں سمجھتا۔ فرعون کے دربار میں جو جادوگر اکٹھے ہوئے تھے وہ حضرت موسیٰ کے عصا کو خوفناک اژدہے کی صورت میں بدلتے ہوئے دیکھ کر متاثر ضرور ہوئے اور ان پر ایمان لے آئے لیکن آج کے زمانے میں وہ معجزہ ہمارے لئے Relevance نہیں رکھتا ہے کیونکہ کوئی شخص محض اس واقعہ کو سن کر یا اسے پڑھ کر حضرت موسیٰ پر ایمان لانے کے لئے نہیں تیار ہوگا۔ حضرت ابراہیم پر آگ سرد ہوگئی۔ آج ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم نے تو یہ نہیں ہوتے دیکھا، اور اگر یہی ایمان لانے کا ثبوت ہو سکتا ہے تو پھر اس طرح کے جتنے خوارق اور مذہبوں کی کتابوں میں ملتے ہیں ان سب کو تسلیم کیوں نہ کر لیا جائے؛ پیغمبر اسلام سے کفار قریش نے طرح طرح کے معجزے طلب کئے، سورہ بنی اسرائیل میں اس طرح ان کا ذکر آیا ہے:

"اور کافروں نے کہا ہم تم پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک ہمارے لئے زمین سے ایک چشمہ نہ بہادو، یا تمہارے قبضہ میں کھجور اور انگور کا ایک باغ نہ ہو اور پھر تم اس کے بیچ میں نہریں نہ بہادو یا جیسا کہا کرتے ہو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گرادو، خدا اور فرشتوں کو ضامن بنا کر نہ لے آؤ یا تمہارے لئے ایک سونے کا گھر نہ ہو جائے، یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہاں تمہارے آسمان پر چڑھنے کا یقین اس وقت تک ہم کو نہ ہوگا جب تک وہاں سے کوئی ایسی کتاب نہ اتار لاؤ جس کو ہم پڑھ سکیں" (آیت ۹۰-۹۳)۔ اس مطالبے کے جواب میں رسول اللہ کے لئے ارشاد ربانی ہے: "اے پیغمبر ان لوگوں سے کہدو کہ میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو اس حکم کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف الہام کیا جاتا ہے۔" (سورہ انعام ۵۰) درحقیقت رسول اللہ کو بارگاہ الٰہی سے جو سب سے بڑا معجزہ عطا ہوا وہ قرآن مجید ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے (کفار کے مطالبۂ معجزہ پر) "کیا ان کو یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ ہم نے

اس پر کتاب اتاری جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے" (عنکبوت ۵) ۔ اسکی تشریح خود رسول اللہ نے فرمائی: "پیغمبروں میں سے ہر
اللہ تعالیٰ نے اس قدر معجزات عطا فرمائے جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے ۔ لیکن مجھے جو معجزہ مرحمت ہوا وہ وحی (قرآن)
جس کو اللہ نے مجھ پر اتارا" (سیرۃ النبی جلد ۳ ص ۵۱۲) ۔ قرآن مجید نازل ہونے کے زمانے میں بھی معجزہ تھا، آج بھی معجزہ ہے
قیامت تک رہے گا ۔ دوسرے معجزات جو خاص حالات اور مخصوص وقت میں ظاہر ہوئے ۔ دنیا کے دوسرے حوادث کی طرح فنا

اعجاز قرآن کے کئی پہلو ہم کو اس وقت بھی نظر آتے ہیں اور جیسے جیسے زمانے کے ساتھ علم اور تحقیق کے مزید در و
کھلتے جائیں گے اور پہلو بھی واضح ہوتے جائیں گے ۔ آج کی مجلس میں جی چاہتا ہے کہ اپنے ان خیالات میں آپ کو بھی شریک کرو
معجزہ قرآن کے سلسلے میں میرے ذہن میں آئے ہیں ۔

قرآن مجید کو مسلمانوں کے سوا اور لوگ اللہ کا کلام تسلیم کریں یا نہ کریں، اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جو کتاب
ہمارے ہاتھوں میں ہے اس کا ایک ایک لفظ وہی ہے جو پیغمبر آخر الزماں پر ۲۳ سال کے عرصے میں نازل ہوا ۔ مشہور ماہر اسلامیا
ڈاکٹر حمید اللہ نے ایک خطبے میں فرمایا کہ ... ۴۲ قرآنی نسخوں کے فوٹو لئے جا چکے ہیں سہو کاتب کے سوا کہیں اختلاف روایت نہ
ان نسخوں میں مطبوعہ نسخے بھی تھے اور قلمی بھی جو دنیا کے گوشے گوشے سے جمع کئے گئے تھے ۔ فرق صرف آیتوں کے نمبر لگانے م
مختلف مطبوعہ نسخوں میں ملتا ہے ۔ بعض میں ان کی تعداد ۶ ہزار، کسی میں ۶۲۴۶، کسی میں ۶۲۲۴ یا ۶۲۲۵ ہو جاتی ہے لیکن ع
میں کوئی فرق نہیں دکھائی دیتا ہے ۔ اب غور کیجئے کہ قرآن کی آیتیں ایک امی پیغمبر پر نازل ہوتی ہیں اس وقت جبکہ نہ کاغذ تھا
نہ طباعت کا کوئی ذریعہ ۔ پھر یہ بھی نہیں کہ یہ سب مسلسل ہوتا رہا ۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، وحی کا نزول ۲۳ سال کی مدت میں
وقتاً فوقتاً ہوا ۔ اور اب ساڑھے تیرہ سو سال کے گزر جانے پر بھی اس کتاب کی صحت برقرار ہے ۔ یہ اس لئے ممکن ہوا کہ
اللہ تعالیٰ نے خود ہی اس کی حفاظت کرنے کا وعدہ فرمایا ہے ۔ اسی نے ساری دنیا میں لاکھوں انسانوں کو یہ صلاحیت اور توفیق
بخشی کہ وہ اسے شروع سے آخر تک اپنے سینوں میں محفوظ کر لیں ۔ دلچسپ بات یہ کہ ان حفاظ کرام میں سے ایک بھاری
تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کے لئے قرآن کی زبان بالکل اجنبی ہے ۔ ایک بڑی تعداد ان کی ہے جو نابینا ہیں ۔ دنیا کی کوئی اتنی
ضخیم مقدس کتاب ایسی دیکھنے میں نہیں آئی جس کے حافظ قرآن کے حفاظ کی طرح ہوں ۔ یہ قرآن مجید کا بڑا معجزہ ہے جو ہمارے
سامنے اور بعد کے زمانے میں بھی ہمیشہ ظاہر ہوتا رہے گا ۔

یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ کوئی مصنف کتاب تصنیف کرتا ہے تو اسے شائع کرنے یا لوگوں کے سامنے پیش کرنے
سے پہلے خوب احتیاط برتتا ہے کہ کہیں متضاد باتیں تو نہیں آگئی ہیں ۔ لیکن قرآن مختلف وقتوں میں نازل ہوتا رہا اور ان ٹکڑوں
کی تدوین بعد میں ہوئی پھر بھی جیسا سورہ النساء کی آیت ۸۲ میں ارشاد ہوتا ہے: "کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے، اگر

یہ کسی غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو انھیں بہت سے اختلافات نظر آتے۔"

قرآن پاک کی زبان بھی ایک معجزہ ہے اور یاد رہے، آیتیں ایک اُمّی نبی کی زبان مبارک سے نکل رہی ہیں جن کا بچپن اور لڑکپن کسی مدرسہ میں یا کسی استاد کے سامنے بیٹھنے کے بجائے بکریاں چرانے میں گزرا ہو۔ جہاں تک زبان کے فصیح و بلیغ ہونے کا تعلق ہے، جو چیلنج قرآن نے فصحائے عرب کو اس وقت دیا تھا فاتوا بسورۃ من مثلہ وہ چیلنج آج کے بڑے سے بڑے ادیب اور اسکالروں کے لئے بھی قائم ہے۔ کیا آپ اسے معجزہ نہیں مانیں گے۔

مجھے مرتے دم تک اس بات کا افسوس رہے گا کہ عربی زبان سے جیسی واقفیت قرآن مجید کی باریکیوں کو سمجھنے کے لئے درکار ہے، وہ میں حاصل نہ کر سکا، اس وجہ سے قرآن کی فصاحت و بلاغت پر، جو خود معجزہ ہے، کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔ لیکن اپنی کم علمی کے باوجود جو چند باتیں قرآن کے مطالعے کے دوران سامنے آئیں وہ آپ کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں

قرآن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کی زبان نہ تو نثر ہے نہ نظم، اسے Rhythmic Prose کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اکثر و بیشتر آیتیں مقفّیٰ ہیں جن کی وجہ سے خاص انداز کا آہنگ پیدا ہوتا ہے۔ ایک آہنگ وہ ہے جو Long Vowels سے پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ کی پہلی چند آیتیں لے لیجئے، یہ جن لفظوں پر ختم ہوتی ہیں وہ ہیں: متقین، ینفقون، یوقنون، المفلحون، یؤمنون، مومنین، یشعرون، یکذبون، مصلحون، یعلمون، یعمہون، مھتدین، یبصرون، یرجعون وغیرہ یا پھر سورہ الرحمٰن کی آیتیں ہیں۔ آہنگ کی دوسری قسم وہ ہے جو Short Vowels سے پیدا ہوتا ہے، آواز میں جھٹکے پڑتے ہیں، دل لرزنے لگتا ہے۔ معنی نہ بھی سمجھ میں آئے، آواز کا زیر و بم اپنا اثر کرتا ہے۔ یہ آہنگ ان سورتوں میں پایا جاتا ہے جن میں اللہ تعالیٰ کے جلال کا ذکر آتا ہے یا قیامت کا منظر بیان ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ تکویر کی آیتوں پر غور کیجئے، اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝ وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝ وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝ وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝ ہر آیت Short Vowels کے لفظوں پر ختم ہوتی ہے۔ اسی طرح سورہ انفطار، سورہ البروج کی آیتوں پر غور فرمائیے یا پھر سورہ المرسلٰت کی ابتدائی آیتیں پڑھیے۔ المرسلٰت کی آیتیں ہیں :- وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ۝ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ۝ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ۝ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ۝ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ۝ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ۝ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۝ فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۝ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۝ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۝ وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ۝ یہ قرآن کی معجز بیانی ہے۔ اسی آہنگ کی وجہ سے جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو خواہ اس کے معنی سمجھ میں نہ بھی آئیں دل پر خاص قسم کا اثر ہوتا ہے، صرف مسلمانوں کے ہی نہیں بلکہ غیر مسلم، خواہ ان کے دلوں پر بھی بالخصوص جبکہ آیت کی تلاوت تجوید کے اصول سے کی جاتی ہو۔

Gills bilbert کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس نے کہیں ایک قاری کو کلام پاک کی کچھ آیتیں پڑھتے ہوئے سنا تو بےحد متاثر ہوا، قرأت میں اسے نغمگی دکھائی دی، اتنی زبردست کہ اس نے پورا قرآن اسی طرح قرأت کے ساتھ سننے کی خواہش کی۔ شاعری کسی زبان کی ہو اس کی تقطیع کر کے بحر میں ناپا جا سکتا ہے لیکن جب اسے بتایا گیا کہ قرآن نظم میں نہیں بلکہ نثر میں ہے تو اور زیادہ حیرت ہوئی، اس نے عربی سیکھ کر خود ہی قرآن پڑھنا شروع کیا۔ ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں کہ بیس سال ہوئے کہ ان سے گلبرٹ کی ملاقات استنبول میں ہوئی تو اس نے حیرت کا اظہار کیا کہ جبکہ کسی زبان کے اشعار ہوں انھیں تقطیع کر کے ٹھیک ٹھیک ناپا جا سکتا ہے لیکن سوائے عربی اور عربی میں صرف قرآن ایسا کلام ہے جس کی نثر اسی صحت کے ساتھ ناپی جا سکتی تھی اس لیے یہ کلام الٰہی ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کی آیت کا ایک حرف بھی چھوٹ جائے تو اس کا پتا فوراً چل جاتا ہے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد جب گلبرٹ، ڈاکٹر حمید اللہ سے پیرس یونیورسٹی میں ملنے گیا تو گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے اپنی پریشانی کا سبب بتایا کہ سورہ نصر میں یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا آیا ہے جو موسیقی کی measure کے اعتبار سے نہیں بیٹھتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے کہا کہ اَفْوَاجًا کی تنوین کو اگلے لفظ "فَسَبِّحْ" میں مدغم کر کے پڑھیے اور وقف نبی صلعم، وقف دوسرے لفظ پر ہونا چاہیے نہ کہ افواجًا پر۔ یہ سنتے ہی اس نے اطمینان کی سانس لی اور کہنے لگا "الحمد للہ میرا ایمان سلامت رہا، اب میری دقت دور ہو گئی۔ میں اس معاملے پر کوئی رائے نہیں دے سکتا ہوں لیکن ڈاکٹر محمد حمید اللہ نہایت ثقہ راوی ہیں اور وہ اپنا تجربہ بیان کر رہے ہیں اس لیے میں اسے بھی قرآن کا معجزہ ہی تسلیم کروں گا:

قرآن پاک کی زبان کلاسیکی عربی ہے، اس لئے جیسا کہ قاعدہ ہے یہاں ایک لفظ کے کئی معنی ہو سکتے ہیں جو سیاق و سباق سے تعلق رکھتے ہیں مثال کے طور پر الحمد للہ رب العالمین میں لفظ "عالمین" لے لیجیے جس کے معنی عام طور سے دنیا جمع دنیاؤں' لیے جاتے ہیں، لیکن یہی لفظ بنی اسرائیل کے بارے میں جب استعمال ہوتا ہے وَاِنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعَالَمِیْنَ یہاں 'قوم' کی جمع قوموں کے معنی میں آتا ہے۔ اس لئے قرآن کا ہر لفظ کمال احتیاط کے ساتھ منتخب ہوا ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ کسی شخص نے ایک بدو عرب کے سامنے وہ آیت پڑھی جس میں چور کے ہاتھ کاٹے جانے کا حکم آتا ہے۔ اس کے آخر میں "عزیز حکیم" کی جگہ وہ غفور الرحیم پڑھ گیا۔ بدو چونکا اور بولا "یہ آیت پھر پڑھو۔ دوسری بار اس شخص نے صحیح الفاظ عزیز حکیم پڑھے۔ بدو نے کہا: میں سمجھ گیا تھا کہ تم نے پہلے اسے غلط پڑھا تھا۔ اس شخص نے پوچھا تمھیں کیا یہ آیت یاد تھی؟ بدو نے کہا "نہیں۔ لیکن ہاتھ کاٹے جانے کا سیاق عبارت بتا رہا تھا کہ یہاں لفظ "غفور الرحیم" نہیں آ سکتا"۔ یاد رکھیے کہ یہ قرآن ہے جو ایک امّی رسول کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جیسے جیسے علم و تحقیق کا میدان وسیع تر ہوتا جائے گا اس کے الفاظ کی اہمیت اور معانی سے دنیا زیادہ سے زیادہ واقف ہوتی جائے گی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ آج ۱۹۸۶ء میں ہم ان

تمام باتوں تک پہنچ جائیں جہاں قیامت کے قریب محققین کرام پہنچنے والے ہوں گے۔

آپ میں سے جن لوگوں نے اصول قانون کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ قانون کی ایک خاص زبان ہوتی ہے جو ادبی زبان سے ذرا الگ ہوتی ہے۔ نہ تو کوئی لفظ فالتو ہوتا ہے نہ کم۔ دوسرے اس کا پورا خیال رکھا جاتا ہے کہ ایک طرح کی باتیں ہوں تو ایک طرح کے الفاظ اور ایک ہی طرح کی ترتیب بھی ہو۔ آپ اگر کسی قانون داں کے سامنے ایک ادارے کا دستور لے کر جائیں جس میں درج ہو کہ:

دفعہ ۲۹: ایک تعلیمی کمیٹی ایسی مقرر کی جائے گی جس میں چھ ارکان ہوں گے اور جس میں نائب صدر کا ہونا ضروری ہوگا۔

دفعہ ۳۰: چھ ارکان پر مشتمل ایک مالیاتی کمیٹی ہوگی جس کے نائب صدر بھی ایک رکن ہوں گے۔

دونوں دفعات کے مطالب یکساں ہیں اور معنی صاف ہیں، لیکن ماہر قانون اسے دیکھ کر ناک بھوں چڑھائے گا اور دفعہ ۳۰ کو بدل کر اس طرح لکھ دے گا، دفعہ ۳۰: ایک مالیاتی کمیٹی ایسی مقرر کی جائے گی جس میں چھ ارکان ہوں گے اور جس میں نائب صدر کا ہونا ضروری ہوگا۔ قرآن بھی یہی طریقہ اختیار کرتا ہے۔ ایک ہی طرح کی بات جہاں بھی آئی یکساں الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر۔ دنیا میں جو انبیاء کرام مبعوث ہوئے انھوں نے اپنی قوم کو مخاطب کر کے جو بنیادی تعلیم دی وہ بس اتنی تھی: "یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ"

اب دیکھئے یہی الفاظ حضرت نوحؑ کے ہیں (سورۃ المومنون ۲۳) حضرت ہودؑ نے استعمال کئے (الانبیاء ۵) حضرت صالحؑ نے استعمال کئے (الانبیاء ۱۱ اور سبحٰن الذی ۳۰)، حضرت شعیبؑ نے استعمال کئے (سبحٰن الذی ۵۰ اور الانبیاء ۸۰) اور جملہ انبیاء کرام کے لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ" "ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ بس تم لوگ میری بندگی کرو" اور نبی آخر الزماں کے لئے ارشاد ہوتا ہے: "قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ" "(اے محمد) کہدو کہ میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے۔"

قانون کے دفعات میں Proviso یا استثنا کی شق نہ رکھی جائے تو بسا اوقات اس کا اطلاق غلط طریقے سے بھی ہو سکتا ہے، گو ایک عام آدمی اس پہلو کی اہمیت نہیں سمجھتا ہے۔ ہندوستان کے دستور میں کئی بنیادی حقوق ہر شہری کو دیے گئے ہیں جنھیں Fundamen 1 Rights کہتے ہیں۔ لیکن یہ حقوق مطلق نہیں ہیں بلکہ مشروط ہیں۔ امن عامہ صحت عامہ اور اخلاق عامہ سے۔ یہ شرطیں نہ ہوں تو باغیانہ صورت حال پیدا ہو جائے۔ ایسے ہی مشروط حکم کی مثال کلام پاک میں ہے ... زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ

سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس کسی کی جان بچائی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔

اب اگر اس میں پہلی دو شرطیں یعنی کسی کے خون کے بدلے اور زمین میں فساد پھیلانے کے بدلے کا سوالیہ نہ ہوتا اور صرف اس کے بعد کی عبارت ہوتی تو اس حکم کے مطابق کسی قاتل یا کسی فسادی کو بھی موت کی سزا دینا ممکن نہ ہوتا۔ ایسی کئی مثالیں قرآن میں ملتی ہیں جس کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرآن تیرہ سو برس پہلے نہیں بلکہ زمانہ حال میں نازل ہوا ہے۔ اس کی عبارت میں غیر معمولی تازگی محسوس ہوتی ہے۔ قرآن کے مطالعہ کے دوران میں ایک بات میں نے یہ بھی دیکھی کہ بعض الفاظ ایک خاص ترتیب ہی سے آتے ہیں مثال کے طور پر آپ پڑھتے ہیں: السّمٰوٰتِ وَالْاَرض، اللّیلُ وَالنّھار، موت والحیاۃ والشمس والقمر، الرحمٰن الرحیم، ظلمٰت والنّور، وغیرہ قرآن مجید میں ۱۷۱ بار السمٰوٰت والارض کی ترکیب آئی ہے لیکن کہیں الارض والسموت نہیں آیا ہے۔ الیل والنھار ۷۳ بار ایک ساتھ آیا ہے، کہیں النھار پہلے نہیں آیا۔ ظلمت والنور ۸ بار آیا لیکن نور پہلے اور ظلمت بعد کو نہیں آیا ہے۔ یہ ترکیبیں ایک سورہ میں نہیں بلکہ مختلف مقامات پر آتی ہیں۔ پہلے خیال ہوا کہ شاید یہ ترتیب عربی زبان کے محاورے کے مطابق رکھی گئی ہو لیکن میرے استفسار پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اس خیال کی تائید کی کہ یہ یکسانیت قرآن کا اعجاز ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ ہمارے علماء کرام اور اسلامیات کے محققین ان ترکیبوں میں لفظوں کی ترتیب پر غور فرما کر اس کا راز معلوم کرتے۔

کچھ عرصہ ہوا کہ ایک مصری سائنسداں ڈاکٹر رشید خلیفہ اور ان کی امریکن انجینیر بیوی نے قرآن میں ۱۹ کے عدد کی اہمیت سے علمی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں ۱۹ حروف ہیں۔ یہ عدد بہت پُر اسرار اور معنی خیز ہے، انھوں نے قرآن مجید میں اس عدد کی اہمیت بتا کر ان نتیجوں کو جو انھوں نے حاصل کئے، قرآن کا معجزہ قرار دیا۔ ان کی تحقیق بہت دلچسپ ہے، مثالیں بھی انھوں نے کمپیوٹر کی مدد سے بہت سی اکٹھی کی ہیں۔ اس بات کا ساری دنیا میں بڑا چرچا ہوا، مضامین اور رسالے شائع ہوئے۔ لیکن اس تحقیق سے مقصد کیا حاصل ہوا؟ زیادہ سے زیادہ یہی نا کہ پہلے ہم بسم اللہ کے لئے جُمّل کے طریقے پر ۷۸۶ لکھا کرتے تھے اور اب ۱۹ لکھ سکتے ہیں۔

مطالعہ قرآن میں آپ نے غور کیا ہوگا کہ کئی آیتیں ایسی ہیں جو کسی صحابی کے یا ازواج مطہرات کے سلسلے میں کسی بات یا واقعہ پر نازل ہوئیں۔ مفسرین نے ان آیتوں کے شان نزول کی تفصیل بھی بتائی ہے۔ اس کے باوجود یہ سوچنے کی بات ہے کہ سوائے ابولہب اور زید بن حارثہؓ کے قرآن مجید میں کسی ہمعصر کا نام نہیں آیا ہے یہاں تک حضرت عائشہؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ جیسی عظیم المرتبت ہستیوں کے بھی نام نہیں آتے ہیں۔ سورہ برأت تو خاص طور سے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بارے میں نازل ہوئی مگر ان کا نام نہیں آیا۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کو ایک ایسا اصول بتانا مقصود تھا جو عالمی

نہ ہو بلکہ اس کا اطلاق ہر زمانے پر ہوتا رہے، ممکن ہے اس کے اسباب اور بھی رہے ہوں لیکن میرے نزدیک یہ ایک ایسی اہم بات ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اللہ ہی کے کلام میں ہو سکتی تھی۔

کچھ لوگوں کے بارے میں سننے میں آتا ہے کہ ان کے خیال میں دنیا کے سارے علوم قرآن مجید میں موجود ہیں، گویا قرآن ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔ مجھے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے۔ البتہ مجھے یہ تسلیم ہے کہ قرآن ہدایت کی کتاب ہونے کی وجہ سے مختلف علوم کے حصول کیلئے کبھی صاف صاف اور کبھی اشاروں میں کچھ گہری حقیقتوں کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ مثلاً سورہ رعد کی آیت ۸: وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ یا سورہ الطلاق کی آیت ۳: قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا "اللہ نے ہر شے، ایک مقررہ مقدار یا ناپ میں بنائی ہے" اب اس میں لفظ "قدر" پر جتنا بھی غور کیا جائے گا نئے نئے انکشافات ہوتے جائیں گے۔ قرآن حکیم میں بار بار ارشاد ربانی ہوتا ہے کہ روئے زمین کی سیر کرو اور دیکھو تم سے پہلے کی قوموں کا کیا حال ہوا۔ سورہ فاطر کی آیت ۴۴ میں آیا ہے: اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً "کیا یہ لوگ زمین میں کبھی چلے پھرے نہیں ہیں کہ انھیں ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں اور ان سے بہت زیادہ طاقتور تھے؟" کیا ٹکسیلا، ہڑپا کے آثار، مصر کے اہرام، پومپائی کے کھنڈر، ایتھنس کا ایکروپولس کے مطالعہ کی طرف یہ آیت اشارہ نہیں کر رہی ہے؟ گبن نے "عروج و زوال روما" کی ضخیم جلدوں میں جو بات کہی وہ اس مختصر سی قرآنی آیت کی ایک طرح سے تشریح ہی تو ہے۔

حضرات! اب میں ایک ایسے موضوع پر آنا چاہتا ہوں جو حال ہی میں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بڑے خلجان کا سبب بن گیا تھا۔ وہ ہے شریعت اسلامی کا مسئلہ، بالخصوص مسلم پرسنل لا کی حد تک۔ پہلے ہم یہ سمجھ لیں کہ اسلامی قانون دو طرح کے ہیں، شریعت کے قوانین اور فقہ کے اصول سے مرتب کئے ہوئے قوانین شریعت کے احکامات اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن میں متعین کئے ہوئے ہیں، ان میں عائلی قانون نکاح، وراثت اور طلاق کے بارے میں ہیں، تعزیراتی قوانین چوری، زنا وغیرہ سے متعلق ہیں، دیوانی قوانین شہادت وصیت وغیرہ، کھانے پینے کے لئے حرام و حلال کے قاعدے ہیں، فرائض کی ادائگی نماز، روزہ، زکات، حج کے احکامات ہیں۔

رسول اللہ کی مکی زندگی کے زمانے میں زیادہ تر توحید اور رسالت کی تلقین اور تبلیغ سے سروکار رہا، ہجرت کے بعد مدنی دور کا آغاز ہوا تو ریاستی کاروبار اور شخصی زندگی کے نظم و نسق کے لئے موثر اور باضابطہ قوانین کی ضرورت پیش آئی جسے قرآنی احکامات سے پورا کیا گیا، اس کے علاوہ نبی کریمؐ کی زندگی کے نمونے سے سنت کی تشکیل ہوتی رہی، ان دونوں یعنی قرآنی احکامات اور سنت رسول سے شریعت کی تدوین ہوئی۔ رسول اللہ کے وصال کے بعد خلفائے راشدین کے زمانے

میں ایسے معاملات اور حالات پیش آئے جن کے لئے قرآن اور سنت میں واضح ہدایت نہ مل سکی تو اس وقت حضرت معاذؓ کے سلسلہ سے حدیث نبوی سے ہدایت حاصل کی گئی۔ رسول اللہ نے حضرت معاذؓ کو ایک صوبے کا گورنر اور قاضی مقرر کیا ان کے روانہ ہونے سے پہلے آپ نے حضرت معاذؓ کی Briefing اس طرح فرمائی:

" رسول اللہ نے دریافت فرمایا: تم مقدموں کے فیصلے کس طرح کروگے؟ حضرت معاذ: احکام الٰہی کے مطابق یا رسول اللہ ● رسول اللہ: اگر ان میں تمھیں رہنمائی نہ ملے؟ حضرت معاذ: تو پھر سنت نبویؐ کے مطابق ● رسول اللہ: اور جو ان میں بھی تمھیں رہنمائی نہ ملے؟ حضرت معاذ: تو پھر میں اپنی عقل کے مطابق فیصلے کروں گا۔"

یہ سن کر رسول اللہ نے فرمایا "حمد و ثنا ہو اس اللہ کی جس نے اپنے نبی کے پیام رساں کو اس نعمت سے نوازا جو اس کے نبی کو پسند ہے۔" گویا اس طرح شریعت کے قانون میں عقلی استدلال کی گنجائش پیدا ہوگئی۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ گنجائش زماں و مکاں سے پیدا ہونے والے حالات کے لئے نکالنے کی اجازت تھی۔ بعض علما کرام اس گنجائش کو (جسے اجتہاد کہا) تسلیم کرنے میں تامل کرتے ہیں اور خطیبانہ انداز میں فرماتے ہیں "اگر کوئی دائمی، ابدی، مثالی و معیاری حقیقی و فطری، تمام زماں و مکاں کے لئے ہمہ گیر اور قابل عمل قانون ہو سکتا ہے تو وہ اسلام کا ربانی، و آسمانی قانون اور شریعت اسلامیہ ہے۔" اس بیان کے بعد اس پر غور فرمائیے کہ سورہ المائدہ میں چوری کرنے والے مرد یا عورت کا ہاتھ کاٹ دیئے جانے کا حکم آتا ہے۔ حکم بالکل صاف ہے۔ اس کے باوجود ایک سال عرب میں قحط پڑا تو خلیفۂ وقت حضرت عمرؓ نے اس حد کی تنسیخ کردی۔ یہ عقلی استدلال سے قرآنی حکم میں عارضی طور پر لچک پیدا کئے جانے کی ایک مثال تھی۔ مشہور مترجم قرآن اور اسلامی اسکالر محمد اسد لیوپولڈ نے اس آیت پر ایک نوٹ لکھا ہے جس میں ان کا کہنا ہے کہ فرائض اور حقوق لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ کسی حکومت کو چوری کے لئے حد نافذ کرنے کا حق اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جبکہ وہ اپنے ہر شہری کے لئے ریاست کے وسائل کے لحاظ سے اس کے کھانے، کپڑا اور مکان کی سہولت پہنچائے۔

دور نبوی کے بعد ۴۰ہجری تک خلفائے راشدین کا زمانہ رہا۔ ان کے سامنے جو معاملات آئے ان کا فیصلہ انھوں نے قرآن اور سنت کی روشنی میں کیا یا پھر حضرت معاذؓ کی طرح عقلی استدلال سے کام لیا لیکن اکثر و بیشتر انھوں نے صحابہ کرام سے بھی اجتماعی مشورے کرکے فیصلے صادر کئے۔ خلافت کے بعد ملوکیت کا دور آیا۔ اموی حکومت دوسری صدی ہجری تک برسر اقتدار رہی۔ اس کے بعد چوتھی صدی ہجری تک کے زمانے میں کئی بڑے بڑے ائمہ کا ذکر آتا ہے جنھوں نے حدیث و فقہ کی تدوین میں قیاس کو اصل بنانے میں بہت کچھ کام کیا۔ اسی دور میں کوفہ میں امام ابو حنیفہ (۸۰ھ-۱۵۰ھ)، امام مالک بن انس (۹۰-۱۷۹ھ) مدینہ میں، امام شافعی (۱۵۰-۲۰۴ھ) مکہ میں، اور امام احمد بن حنبل (۱۶۴-۲۴۱ھ) بغداد میں فقہ کی تدوین

اشغول ہے۔ ان سبھوں نے پہلے قرآن پھر سنت نبوی کو اصل ماخذ قرار دیا۔ پھر خلفائے راشدین اور صحابہ کرام کی روایتوں
سامنے رکھا۔ اس کے بعد ضرورت کے مطابق اجتہاد سے کام لیا۔ ان کے بعد ان ائمہ اربعہ کے بہت سے شاگردوں نے بھی
ے طور پر اجتہاد کیا جس میں کئی مقامات اور مسائل میں انھوں نے اپنے امام سے اختلاف بھی کیا۔ ان سب کارروائیوں کے بعد
مسلک یا مذہب تیار ہوا، عام طور سے آج بھی ان ہی کی تقلید کی جا رہی ہے۔ گویا مزید اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا
۔ اس مختصر تاریخ سے یہ ظاہر ہو چکا ہوگا کہ فقہ اسلامی کے چار ماخذ تھے، قرآن، سنت، قیاس اور اجماع۔ یہاں یہ بات ذہن میں
نی طور پر رہے کہ قرآن اور سنت کے احکامات سے قطع نظر قیاس اور اجماع سے جو قانون بنا وہ آسمانی اور ربانی نہیں بلکہ
سانی ذہن و فکر کا نتیجہ ہے جو صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک خاص وقت یا خاص سماج کے لئے صحیح
ہا ہو مگر آج یا ہر جگہ کے لئے نہیں ہے۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں: "یہی قیاس جو شروع شروع میں مجتہدوں کی ذاتی رائے کا ایک دوسرا
م تھا، آخرکار شریعت اسلامیہ کے لئے حرکت و زندگی کا سرچشمہ بن گیا۔"

خود ائمہ اربعہ نے بھی اس کا دعوا نہیں کیا کہ جو فقہ انھوں نے تدوین کی وہ حرف آخر تھی اور اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں تھی۔ امام
بوحنیفہؒ کا قول تھا: "یہ میری رائے ہے تمہیں اس سے بہتر رائے حاصل ہو تو بلا حجت اسے قبول کر لو۔" امام مالکؒ فرماتے تھے: "میں
بھی ایک بشر ہوں، میری رائے صحیح ہو سکتی ہے یا غلط، اس لئے میری رائے کو کتاب اللہ اور سنت کی کسوٹی پر جانچو۔" امام شافعیؒ
نے فرمایا: "جب تمہیں کوئی صحیح حدیث میری رائے کے برخلاف مل جائے تو میری رائے کو دیوار پر دے مارو۔" امام حنبلؒ اپنے پیروؤں
کو کہا کرتے تھے: "میری تقلید کرو نہ مالک کی اور نہ شافعی کی تم بھی اسی طرح غور و فکر سے کام لیا کرو جیسا کہ میں نے کیا ہے۔"

امام ابن تیمیہ (۸ ویں صدی ہجری) حنبلی مسلک کے تھے لیکن کئی مسئلوں میں امام حنبل کی فقہ سے مختلف رائے رکھتے تھے
طلاق کے معاملے میں تو وہ سنی فقہ کے بجائے شیعی فقہ کو ترجیح دیتے تھے یعنی ایک مجلس کی تین طلاقوں کو وہ ایک طلاق تسلیم کرتے
تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ استنباط مسائل میں فقہا میں اختلاف تھا، حنفیہ کو بہت شدت سے غلو تھا، حنابلہ اور مالکیہ اس سے بہت کم
کام لیتے تھے۔ شافعیہ ان دونوں فریق کے بین بین تھے۔ بعض اہل حدیث اور شیعہ اس سے الگ تھلگ تھے۔

ان ہی حالات کے پیش نظر ہندوستان میں بھی وقتاً فوقتاً فقہ اسلامی پر نظر ثانی کی آواز اٹھتی رہی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی
کے نام مولانا شبلی نعمانی نے ایک مکتوب میں لکھا کہ نکاح، وراثت، تعزیرات، تعدد ازدواج پر تحقیقی مضامین لکھنے کی ضرورت
ہے لیکن اس مسئلے کی اہمیت پر سب سے زیادہ علامہ اقبال نے زور دیا۔ فرماتے ہیں: "میں نے زندگی کا زائد حصہ اسلام اور
اسلامی فقہ و سیاست، تہذیب و تمدن اور ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔" میں اس قدر کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ
حالات زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب آجانے کی وجہ سے بعض ایسی تمدنی ضروریات پیدا ہو گئی ہیں کہ فقہا کے استدلالات جن کو

عام طور پر شریعت اسلامی کہا جاتا ہے، ایک نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ . . " قرآن شریف اور احادیث کے وسیع اصولوں پر جو استدلال فقہا نے وقتاً فوقتاً کئے ہیں ان میں اکثر ایسے ہیں جو خاص خاص زمانوں کے لئے واقعی مناسب اور قابل عمل مگر حال کی ضروریات پر کلی طور پر حاوی نہیں رہیں۔

ہر مسلک کے خواہ وہ سنی کے ہوں یا شیعہ کے، دو حصے ہیں: ایک کا تعلق عبادات کے طریقوں سے ہے مثلاً یہ کہ میں ہاتھ ناف سے نیچے باندھے جائیں یا سینے پر یا بالکل نہ باندھے جائیں، رکوع اور قیام میں رفع یدین کیا جائے یا نہیں امام کے پیچھے مقتدی بھی سورہ فاتحہ پڑھے یا نہ پڑھے۔ وتر کی نماز ایک رکعت ہو یا تین، دعائے قنوت بیٹھ کر پڑھی جائے یا کھڑے عیدین کی نماز میں کتنی زائد تکبیریں ہوں، افطار غروب آفتاب سے کتنی دیر بعد کیا جائے وغیرہ۔ ان اختلافات کا عام پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے، اس لئے اگر لوگ چاہیں تو یہ بدستور قائم بھی رہ سکتے ہیں۔ اگر ایک گھر میں باپ حنفی اور بیٹا حنبلی کے مطابق عبادت کرتا ہے تو اس میں کوئی ہرج نہیں۔ لیکن جب ہم ان مسائل پر نظر ڈالتے ہیں جن کا تعلق عائلی قوانین (پرسنل لا) یا تعزیراتی قوانین یا دیوانی مسئلوں سے ہوتا ہے تو معاملہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ طلاق کا مسئلہ لیجئے۔ حنفی مسلک کے مطابق اگر شخص کسی چیز کے تحت یا نشے کی حالت میں اپنی بیوی کو تین طلاق ایک ساتھ دیتا ہے تو طلاق ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر وہ اس عورت سے رجوع کرتا ہے تو یہ حرام کاری ہوگی جس کی سخت سزا مقرر ہے اور اگر اس کے بعد کوئی اولاد ہوتی ہے تو شریعت اسے ناجائز قرار دے گی لہٰذا وہ اولاد وراثت کی حقدار نہ ہوگی۔ فقہ حنفی کا یہ قاعدہ شریعت اسلامی کا ایک جز ہوگا۔ اس کا تعلق ایک مرد کی اپنی ذات سے بڑھ کر، ایک عورت اور اس کے ان تمام بچوں پر پڑے گا جو اس طلاق کے واجب ہونے کے بعد ہوں گے۔ اب فرض کر لیجئے کہ وہ شخص کہتا ہے کہ وہ شافعی مسلک رکھتا ہے تو اس صورت میں اس کی تین طلاقیں صرف ایک مانی جائیں گی، لہٰذا وہ اپنی بیوی سے رجوع بھی کر سکتا ہے اور اس کے بعد کی اولاد بھی جائز ہوگی اور وراثت کی حقدار۔ یہ بھی شریعت اسلامیہ ہوئی۔ تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ مسلم پرسنل لا کسے کہیں گے؟ شافعی مسلک کے قانون کو یا حنفی مسلک کے قانون کو میرے علم میں ایک واقعہ ہے کہ ایک صاحب کے ساتھ بالکل وہی صورت حال پیش آئی جو میں نے ابھی بیان کیا۔ نشے کی حالت میں انھوں نے بیوی کو طلاق دیدی۔ جب نشہ ہرن ہوا تو لوگوں نے انھیں بتایا کہ ان کی بیس سال کی بیاہتا بیوی ان پر حرام ہو چکی ہے۔ بہت سٹ پٹائے، جدھر گئے فتویٰ وہی ملا۔ اتفاق سے شہر میں ایک شافعی مصلیٰ کی مسجد تھی، اس کے امام کے پاس پہنچے، انھوں نے شافعی مسلک بتایا جس کی رو سے ایک طلاق مانی جاتی۔ بس ان حضرت نے فوراً اعلان کر دیا کہ اب وہ شافعی مسلک کے ہو گئے ہیں۔ آپ چاہیں تو اسے نامناسب طریقہ کہیں لیکن اس کے جائز ہونے میں کوئی کیسے معترض ہو سکتا تھا:

ایک اور مثال سنئے، راوی مولانا غلام احمد (کراچی) ہیں۔ ایک انگریز میاں بیوی مسلمان ہوئے۔ چند ہی دنوں آپس کی نا چاقی میں شوہر نے بیوی سے ایسے کلمات کہہ ڈالے کہ مذہب حنفی کی رو سے طلاق مغلظ ہو گئی۔ یہ ماجرا ایک مسلمان دوست نے سنا تو انھوں نے شوہر سے کہا تمہارا تو نکاح ہی فسخ ہو گیا۔ اب نو مسلم میاں بیوی بہت پریشان ہوئے ... بعض معتبر فقیہوں سے رجوع کیا گیا مگر ہر جگہ سے طلاق قطعی کا فیصلہ ملا۔ پھر وہ مولانا سید سلیمان ندوی کے یہاں پہنچے۔ انھوں نے پوچھا کہا مفتی محمد شفیع سے پوچھئے، انھوں نے بتایا کہ وہاں سے بھی یہی جواب ملا۔ مولانا نے مسکراتے ہوئے پوچھا "آپ کا کیا جی چاہتا ہے کہ جواب برعکس ملے؟" اس پر وہ چپ ہو رہے۔ دوسرے دن مفتی محمد حسن امرتسری، مولانا محمد ادریس کاندھلوی اور مفتی محمد شفیع ایک جلسے کے بعد چائے پی رہے تھے تو علامہ نے وہ مسئلہ چھیڑ دیا۔ سبھوں نے بالاتفاق یہی جواب دیا کہ طلاق واقعی ہو گئی۔ پھر سید صاحب نے اپنے قلم سے فتویٰ لکھ دیا کہ اہل سنت والجماعت میں مسلک اہل حدیث کی رو سے طلاق واقعی نہیں ہوئی، رجوع کرا دیا جائے۔ پھر ان علما سے فرمایا "وہ نو مسلم بیچارے تو ابھی نہ حنفی ہیں اور نہ شافعی۔ لہٰذا قانون میں کوئی گنجائش بھی نکلتی ہو تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ پھر مفتی اعظم پاکستان نے بھی اس کی تائید کی"۔

اس طرح کے اور بھی بہت سے اختلافی مسئلے ان چار سنی اور شیعہ اماموں کے مسلک میں پائے جاتے ہیں جن سے معاشرہ متاثر ہو سکتا ہے۔ ہم ان اختلافات کے بارے میں اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ان ائمہ نے جو اجتہاد کیا وہ ان کے زمانے اور ماحول کے پیش نظر نیک نیتی سے کیا گیا، وہ اپنے علم و فضل اور تقویٰ کے لحاظ سے اجتہاد کا حق بھی رکھتے تھے لیکن ان کے اجتہادی فیصلوں کو کتاب اللہ اور سنت رسول کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ترمیم و تنسیخ کی کسی تجویز کے بغیر ان ائمہ کبار کے مقررہ مسلک پر غور کیا جائے، خصوصاً ان مسائل پر جن سے معاشرہ متاثر ہو رہا ہے، علمائے کرام اور مسلمان ماہرین قانون ان سب مسلکوں پر ایک ایسا مشترکہ کوڈ مسلمانوں کے لئے تیار کریں جو قرآن اور سنت کے دائرے میں اور ائمہ کے قیاس و اجماع پر مبنی ہو، جو ترقی پسند ہو، جو وقت کے تقاضوں اور حالات سے پیدا ہونے والے مسائل سے زیادہ سے زیادہ مطابقت رکھتا ہو۔ یہ کام مشکل ضرور ہے لیکن آج نہیں تو کل اسے کرنا ناگزیر ہوگا۔ کیونکہ یہی ہمارے مسائل کا حل بھی ہے۔

شریعت اسلامیہ کے ذکر میں ایک اہم مسئلہ بینک کے سود کا ہے۔ یہ بڑا المیہ ہے کہ سود کی مخالفت شرعی بنیاد پر بہت سے لوگ کرتے ہیں لیکن اس سے مستفید سب ہی ہوتے ہیں۔ جو لوگ یا ادارے بینک کا سود لینا حرام سمجھتے ہیں وہ خود بھی تو اپنی رقمیں بینک میں رکھتے اور بینک ان کی رقم سے وہی سودی کاروبار کرتا ہے جس کے وہ مخالف ہیں۔ جب یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا کا رواج شروع ہوا تو علما نے اس کے جواز میں رائے دی۔ کیونکہ ٹرسٹ دینے لوگوں کے سرمائے سے مختلف صنعتی کمپنیوں کے حصص خرید کر کے حاصل شدہ منافع یونٹ کے خریداروں میں تقسیم کرتا ہے اور منافع کی رقم بھی ہر سال مقررہ نہیں ہوتی ہے۔ اس

لحاظ سے یہ سرمایہ اندازی جائز قرار پائی۔ لیکن جب یہ پتا چلا کہ یونٹ ٹرسٹ اپنے جمع شدہ سرمائے سے بعض کمپنیوں کو کاروبار میں مدد پہنچانے کے لئے سودی قرض بھی دیتا ہے تو علماء نے اپنا فتویٰ بدل کر یوپی یونٹ ٹرسٹ کو ناجائز قرار دے دیا۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ ناجائز ہے تو حکومت وقت کے کسی کاروبار میں حصہ لینا یہاں تک کہ ملازمت کی تنخواہ لینا بھی ناجائز ہو جانا چاہئے کیونکہ حکومت خواہ مرکزی ہو یا ریاستی، وقتاً فوقتاً تمسکات کا اجراء کر کے مقررہ شرح سے سود دیتی ہے اس لئے وہ بھی سودی کاروبار میں ملوث ہوئی۔

بینک کے سود کے بارے میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کا خیال عام علماء سے مختلف تھا۔ وہ اسے حرام نہیں بلکہ صرف ناپسندیدہ سمجھتے تھے۔ مولانا شبلی نعمانی اپنے ایک مکتوب میں مولانا سید ابوظفر ندوی کو لکھتے ہیں: "بینک کا سود میرے نزدیک جائز ہے۔ شاہ عبدالعزیز کا فتویٰ اس کے متعلق چھپ گیا ہے۔"

میں بینک کے سود کے جائز یا ناجائز ہونے پر اپنی کوئی رائے نہیں دے رہا ہوں، یہ ایک الگ بحث ہے جس کا یہ موقع نہیں۔ مجھے افسوس اس کا ہے کہ اب تک ایک متفقہ فیصلہ نہ ہونے یا متبادل صورت کی غیر موجودگی سے ہم سب ایک شدید احساس جرم میں مبتلا ہیں۔ ہم اپنے آپ کو بینکنگ سے قطعی طور پر بے تعلق بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ گھر میں رقمیں رکھنا بھی خطرے سے خالی نہیں تو آخر کیا کیا جائے؟ شاید اسی نوعیت کی الجھن میں علامہ اقبال نے اپنے کو پایا تھا جس کی وجہ سے انھوں نے یہ تجویز پیش کی:

"ایک جمیعتِ علماء قائم کی جائے جس میں وہ مسلمان قانون داں لازماً شامل ہوں جنھوں نے جدید قانونی تعلیم حاصل کی ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ شرعِ اسلام کی حفاظت کی جائے، اس کو وسعت دی جائے اور اگر ضروری ہو تو معاملات جدیدہ کی روشنی میں نئے سرے سے اس کی تعبیر و تاویل کی جائے جس سے اس کے اصول اساسی کا اسپرٹ کی خلاف ورزی ہرگز نہ ہونے پائے۔"

اگر ہم اقبال کو صرف شاعر نہیں بلکہ مفکرِ اسلام بھی مانتے ہیں تو اب وقت آ گیا ہے کہ ان کی فکر کو عملی جامہ بھی پہنایا جائے۔

●●

مراسلات

جناب ارشد القادری
ادارۂ شرعیہ بہار
سلطان گنج پٹنہ۔۶

کیا مولانا کا لفظ صرف خدا کیلئے مخصوص ہے

غیر اللہ پر لفظ مولٰنا کے اطلاق کے سلسلے میں کل جو آپ نے فرمایا تھا کہ قرآن کریم میں چونکہ یہ لفظ اللہ کے لیے استعمال ہوا ہے اس لیے اب کسی اور پر اس کا اطلاق صحیح نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نتیجہ اخذ کرنے میں آپ سے سہو ہو گیا ہے ـــــ اگر ضابطۂ کلیہ کے طور پر آپ کی بات تسلیم کر لی جائے تو وکیل، حکیم، قوی، کریم، اول، آخر اور نافع جیسے الفاظ کا اطلاق بھی غیر اللہ پر ممنوع قرار پاجائے گا کیوں کہ قرآن کریم میں یہ الفاظ بھی اللہ کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ حالانکہ ان الفاظ کا اطلاق غیر اللہ پر عرف عام کے علاوہ اصطلاح شرع میں بھی شائع و ذائع ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ترکیب نحوی کے اعتبار سے لفظ مولٰنا کی تشریح یہ ہے کہ لفظ مولیٰ کی اضافت "نا" کی طرف ہے جس کے معنی ہیں ہمارا مددگار جبکہ اسی قرآن میں ایک جگہ لفظ مولیٰ کی اضافت نہایت صراحت کے ساتھ غیر اللہ کی طرف بھی کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو ۲۸ ویں پارے کی سورۂ تحریم کے پہلے رکوع کی یہ آیت۔

فَاِنَّ اللّٰہ ھو مولاہ وجبریل وصالح المومنین (التحریم ۶۶/۴)

اس آیت میں لفظ مولیٰ کی اضافت اللہ کی طرف بھی ہے، جبریل کی طرف بھی ہے اور مومنین صالحین کی طرف بھی ہے۔ اتنی صراحت کے بعد اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ لفظ مولیٰ کی اضافت اگر غیر اللہ کی طرف ممنوع ہوتی تو قرآن میں غیر اللہ کی طرف اس لفظ کی اضافت کیوں ہوتی۔

پھر یہ بات بھی محسوس کرنے کے قابل تھی کہ اگر لفظ مولٰنا کا اطلاق غیر اللہ پر ناجائز ہوتا تو بلا تخصیص فرقہ و جماعت سارے علماء اس لفظ کا اطلاق غیر اللہ پر کیوں کرتے۔ رائے کی اتنی انفرادیت، جو سب کی رائے سے ٹکرا جائے کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

جناب عطاء اللہ پالوی
علی نگر پالی، ڈسٹرکٹ جہان آباد

مولانا خدا نے صرف اپنے لیے استعمال کیا ہے

محترم بیدار صاحب! سلام و نیاز

حضرت العلام جناب ارشد القادری صاحب کا گرامی نامہ نظر نواز ہوا۔ میں حضرت موصوف کے لیے ان کی ایک عمدہ تالیف کی وجہ سے اپنے دل میں جذبۂ عزت و احترام رکھتا ہوں۔ اور ان کی شائستگی کی بنا پر ان کی قدر کرتا ہوں۔

بات 'مولیٰ' کی نہیں بلکہ 'مولینا' کی ہے جو قرآن حکیم میں دو جگہ صرف ذات باری کے لیے استعمال ہوا ہے' اس لیے میں اسے غیر اللہ کے لیے استعمال کرنا درست نہیں سمجھتا "علام الغیوب"، قرآن حکیم میں چار مقامات پر ذات الٰہی کے لیے وارد ہوا ہے۔ میں کسی کو بھی "علام الغیوب" نہیں کہتا' مگر ان حضرات کے لیے جن کی عزت میرے دل میں ہے "علامہ" یا حضرت العلام" برابر استعمال کرتا ہوں۔

یہ موضوع بحث و تکرار کا نہیں' اس کا تعلق ذاتی ایمان و عقیدہ سے ہے۔ حضرات اہل تشیع' حضرت علی کا نام نہیں لیتے بلکہ انھیں "مولیٰ" کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔ یہ ان کے ایمان و عقیدہ کی بات ہے۔ ہند و حضرات ہر مسلمان کو' چاہے وہ عالم ہو یا جاہل "مولینا" کے خطاب سے مخاطب کرتے ہیں' یہ ان کے ایمان و عقیدہ کی بات ہے۔ اسی طرح میں' لفظ "مولینا" کو غیر اللہ کے لیے استعمال کرنا صحیح نہیں مانتا اور ایسا کرنے کو اس جذبۂ احترام کے منافی سمجھتا ہوں جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں رکھتا ہوں۔ یہ میرے ایمان و عقیدہ کی بات ہے جس میں کسی کا کوئی دخل نہیں۔

ڈاکٹر مغنی تبسم
حیدرآباد

تلگو یونیورسٹی کے بارے میں

آپ نے تلگو یونیورسٹی کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ اس یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم تلگو ہے۔ تمام سماجی علوم کی تعلیم
تلگو میں ہوتی ہے۔ اردو کا شعبہ بھی قائم کیا جا رہا ہے۔ اردو کی نصابی کمیٹی کا میں بھی رکن ہوں۔ اردو ام۔ اے۔ کے ہر پرچے میں
تین چوتھائی نصاب اردو کا رکھا گیا ہے' اور ایک چوتھائی میں تلگو اور اردو ادب کا تقابلی مطالعہ شامل کیا گیا ہے۔ مثال کے
طور پر جدید نظم کا پرچا ہے جس میں حالی سے حال تک منتخب نظم نگاروں کی تخلیقات نصاب میں رکھی گئی ہیں اب تلگو اردو کے تقابلی
مطالعے کے لیے تلگو کے چند جدید نظم نگاروں کو لیا گیا ہے' جن کا تقابل حالی، جوش وغیرہ سے کیا جا سکتا ہے۔ تلگو یونیورسٹی
کے وائس چانسلر سی نارائن ریڈی نے عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو ذریعہ تعلیم سے گریجویشن کیا تھا۔ وہ تلگو کے اچھے شاعر ہیں۔
میرے دوست ہیں۔ یونیورسٹی کا پتا یہ ہے:

TELGU UNIVERSITY, KALA BHAVAN, SAIFABAD, HYDERABAD-500004.

میرے علم میں اور زبانوں کی ایسی یونیورسٹیاں نہیں ہیں البتہ جنوبی ہند کی ہر ریاست میں ایسے کالج ہیں جن میں مقامی
زبانوں میں تعلیم دی جاتی ہے۔

عثمانیہ یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اگرچہ انگریزی ہے لیکن طالب علموں کو اجازت ہے کہ وہ کسی بھی زبان میں امتحانی پرچے
لکھ سکتے ہیں۔ سوالات کے پرچے بھی انگریزی کے علاوہ اردو اور تلگو میں چھاپے جاتے ہیں۔

●●

خدابخش لائبریری کی چند اہم مطبوعات

قیمت

- ہندوستانی مسلمان عصری دستاویزات کے آئینہ میں (علی گڑھ تحریک ۸۵ - ۱۹۸۰ء) — ۷۵/ روپے
- ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل — جناب سید حامد — ۳۰/ روپے
- مغربی تعلیم کا تصور اور اس کا نفاذ علی گڑھ میں — پروفیسر رشید احمد صدیقی، مرتبہ مہر الہیٰ — ۲۰/ روپے
- رقعات رشید صدیقی — " " مرتبہ پروفیسر مسعود حسین خاں — ۳۰/ روپے
- کانٹے (کشمیری انشائیے) — ڈاکٹر محمد زماں آزردہ — ۱۵/ روپے
- اورنگ زیب (ایک نیا زاویۂ نظر) — ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد — ۱۵/ روپے
- قومی یکجہتی کی روایت — مسٹر بی۔ این۔ پانڈے — ۱۵/ روپے
- مقدمہ طلسم ہوشربا — ۲۰/ روپے
- طلسم ہوشربا (نو جلدیں) — ۳۰۰/ روپے
- نوبت رائے نظر کے ماہنامہ "ادیب" الہ آباد (۱۳-۱۹۱۰ء) کے مضامین کا انتخاب، اشاریہ کے ساتھ — ۵۰/ روپے
- پیارے لال شاکر کے ماہنامہ "العصر" لکھنؤ (۱۷-۱۹۱۲ء) کے مضامین کا انتخاب، اشاریہ کے ساتھ — ۴۵/ روپے
- برج نرائن چکبست کے ماہنامہ "صبح امید" لکھنؤ (۲۱-۱۹۱۸ء) کے مضامین کا انتخاب — ۵۰/ روپے
- قاضی عبدالودود کے ماہنامہ "معیار" کی مکمل ری پرنٹ، اشاریہ کے ساتھ۔ — ۵۰/ روپے
- مولانا ابوالکلام آزاد کے ہفت روزہ "پیغام" کی مکمل ری پرنٹ اشاریہ کے ساتھ۔ — ۷۵/ روپے
- نوشتر سنگر دلی کے ماہنامہ "زبان" (۲۹-۱۹۲۸ء) کی مکمل ری پرنٹ، اشاریہ کے ساتھ — ۵۰/ روپے
- جدید غزلگو نیاز فتحپوری کے ۱۹۴۰ء کے نگار کا ری پرنٹ، آٹوگراف اور تصاویر کے اضافہ کے ساتھ۔ — ۲۵/ روپے
- داستان میر عماد (سوانح اور اہم معاصرین کا تذکرہ) — ڈاکٹر اقبال حسین — ۲۰/ روپے
- تذکرہ کاملان رامپور — مولفہ حافظ احمد علی خاں شوق، تصحیح و اضافہ شعائر اللہ خاں و حکیم محمد حسین خاں شفا۔ — ۵۰/ روپے

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

مکتوبات

بنام

قاضی عبدالودود

- سجاد ظہیر
- عندلیب شادانی
- قاضی عبدالغفار
- مسعود حسن رضوی ادیب
- نورالدین احمد
- امتیاز علی عرشی

ماہنامہ خاور

مدیر - عندلیب شادانی

...ڈل کیپٹن روڈ
...مذا - ڈھاکا

...نومبر ۱۹۵۲ء

محبی، تسلیم۔ اس وقت شام کے ۶ بجے ہیں۔ آپ کا ۲۵ ستمبر کا پوسٹ کارڈ ابھی ابھی ملا۔
...ڈاک اب کل ہی جائے گی مگر میں فی الفور جواب لکھ رہا ہوں۔ آپ کا رجسٹرڈ پیکٹ اور خط دونوں چیزیں
...ل ہو گئی تھیں جہاں تک مسٹر ... کی رسید کا تعلق ہے میں نے نذیر صاحب سے کہا تھا کہ وہ رسید بھیج دیں اور
...یاد پڑتا ہے کہ انہوں نے رسید بھیج بھی دی۔ آپ کا خط جو اُن کے نام تھا میں نے اُن سے لے لیا تاکہ اس کا
...ب میں لکھوں۔ مگر ادھر چند روز سے میری طبیعت بہت خراب ہے۔ بظاہر بیماری تو کوئی ایسی خطرناک
... وہی دیرینہ نزلہ اور زکام۔ مگر تکلیف بے حد ہے۔ دوا کا بھی استعمال کر رہا ہوں مگر تکلیف
...کی نہیں۔ سخت پریشان ہوں۔ کوئی کام نہیں کر سکتا۔ غنیمت ہے کہ چھٹیاں ہیں ورنہ رخصت لینی
...تی۔ میں بالقصد کبھی آپ کے خط کے جواب میں دیر نہیں کرتا مگر کبھی کبھی دیر ہو جاتی ہے۔ آپ نے
...ہیے تو اب اس کے سوا کہ آیندہ میں بھی آپ کی روش پر چلوں، کوئی صورت نظر نہیں آتی
...بلہ یہ تو بتائیے کہ میری جو روش آپ کو پسند نہیں اور خود مجھے بھی پسند نہیں آپ کیوں اس پر
...ہیں۔ قاضی صاحب آج پہلی بار میں آپ سے وہ بات لکھ رہا ہوں جو آج سے پہلے کبھی نہیں لکھی اور اس
ضرورت بھی نہ تھی۔ مگر آج ضرورت محسوس ہوئی۔ قاضی صاحب آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ
...پ کی خاطر مجھے کتنی عزیز ہے۔ اگر میری طرف سے کبھی کسی قسم کی کوتاہی سرزد ہو تو آپ اُسے میری کسی
...بوری پر محمول کر کے مجھے معاف کر دیں۔ یقین کیجیے آپ کے لئے میرے دل میں خلوص و ارادت کی کمی
...ی نہیں۔

...خاں کے دیوان اول میں (جو میرے پاس ہے) یہ غزل "صبا ہے بعد" "صبا ہے بعد" موجود نہیں۔ ...نگر
...کے دیوان دوم میں جس کا ایک قلمی نسخہ رام پور میں ہے یہ غزل موجود ہو۔ ضرورت ہو تو دریافت کروں۔

(۲) یہی عبارت اس طرح ہے — علی الطلاع وقت میتوان گفت کہ کاتب جوان و دانا نہ باشد؟

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔ بیگم صاحبہ کی مزاج پرسی۔ والسلام۔ اخلاص کیش شادانی

Telegram "ANJUMAN" Telephone

انجمن ترقی اردو (ہند)

Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (Hind)

Aligarh

کد ......

۲۰ اکتوبر ۶۸ء

مکرمی — تسلیم

معاف فرمائیے میں آپ کے عنایت نامے کا جواب جلد نہ بھیج سکا جس کا
سبب یہ ہوا کہ میں ایک مہینہ سے سخت بیمار ہوں اور کسی کام کے
قابل نہیں تھا۔ میں نے مکتبہ جامعہ کو لکھ کر دریافت کیا تھا کہ جب اردو
کے صفحے میں کیا رد و بدل کیا ہے۔ اس کا جو جواب آیا ہے وہ اصل چٹھی
میں بھیجتا ہوں اور آپ کی مزید ہدایات کا منتظر ہوں۔ اگر آخری
صفحات میں مزید رد و بدل ضروری ہو تو ان صفحات کو از سر نو
چھپوانے کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔

امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

احقر

سید عبدالغفار

جنرل سکریٹری

SYED MASUD HASAN RIZAVI. M. A.,
Head of the Department of Persian & Urdu.
LUCKNOW UNIVERSITY.
LUCKNOW.

مسعود حسن رضوی ادیب ایم اے
صدر شعبۂ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی
ادبستان - دین دیال روڈ - لکھنؤ

Dated ۱۰ مئی سنہ ۶۱ء

مشفقی تسلیم

عنایت نامہ مورخہ ۲۰ اپریل ۶۱ء کو وصول ہو گیا تھا۔ ارادہ تھا کہ آپ کی فرمائش کی تعمیل میں معاصر کے لیے کوئی چیز بھیجوں۔ مگر اس زمانے میں اپنی یونیورسٹی کے امتحانوں میں نگرانی کا کام، متعدد کمیٹیوں کی میٹنگوں میں شرکت، دوسری یونیورسٹیوں کے امتحانوں میں ممتحن کے فرائض، ان سب چیزوں کا اتنا ہجوم ہو گیا کہ کسی اور کام کی فرصت نہ ملی۔ اور اگر کچھ فرصت ملی بھی تو میری دماغی تکلیف نے زیادہ کام کرنے کی اجازت نہ دی۔ ہندستانی اکیڈمی کی اردو افسانوی کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت کے لیے دو دن الٰہ آباد میں صرف ہوئے۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ اب کچھ افاقہ ہے۔ ان حالات میں کیا پڑھوں کیا لکھوں۔ ضرورت تو کامل دماغی سکون کی ہے۔ مگر جیتے جی کامل سکون میسر کہاں۔

معاصر تو اب لکھنؤ چھپ جائے گا۔ اس کے آئندہ پرچے کے لیے کوئی چیز ضرور بھیجوں گا۔ آپ کمیٹی کے حالاتِ زندگی لکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے خطوط کمیٹی کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ میں شاید اس سال پٹنہ یونیورسٹی کی کسی کمیٹی کا ممبر نہیں رہا۔ اگر میرا پٹنہ جانا ہوتا تو میں خطوط کا نسخہ ساتھ لیتا جاتا۔ کتاب ایسی کمیاب اور میرے نزدیک اتنی قابل قدر ہے کہ اس کو اپنے سے الگ کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور یہ بھی جی نہیں چاہتا کہ آپ کا مضمون نامکمل صورت میں شائع ہو۔ کتاب کی نقل کروائی جائے تو وقت بھی بہت صرف ہوگا اور روپیہ بھی۔ پھر آخر کیا کیا جائے۔

دیوانِ ناسخ کی ترتیب آپ کو پسند آئی۔ میری جان فشانی کا صلہ مل گیا۔ ادبی تحقیق کرنے والوں کو جو جانکاہ محنت کرنا پڑتی ہے اس کا اعتراف کرنے والے بہت کم ہیں، قدر دانی کا کیا ذکر۔ آپ اس پر تبصرہ لکھنا چاہتے ہیں۔ ضرور لکھیے۔ اس میں جو غلطیاں یا کمیاں رہ گئی ہیں وہ اگر مجھے معلوم ہو جائیں تو میں آئندہ اڈیشن میں ان کی اصلاح اور تلافی کی کوشش کروں گا۔ یقین فرمائیے کہ اس کتاب کی ترتیب میں میں نے وقت، روپیہ، محنت کسی چیز سے دریغ نہیں کیا۔ مگر میری عرق ریزیوں کا کوئی معاوضہ کسی مادی منفعت کی صورت میں تو نہ سہی، محنت کے اعتراف کی صورت میں بھی نہ ملا۔ لیکن اس کی کوئی شکایت نہیں۔ کام کرنے والوں

کر لکھیں کہ ان کا ازالہ یا جانا خود بھی تمام، بالکل نیوں کا مسئلہ ہے - میرے پاس دیوان ناسخ کا صرف
پہلا فرمہ ہے جو فہرست مضامین وغیرہ بتاتا ہے دیکھنے کو مجھے بھیجا گیا تھا - اب ایک مدت کے بعد وہ بازار میں
آ گیا ہے - ایک نسخہ میں اس کا خرید لوں گا - میں نے تین ضمیمے ناسخ بھیجے تھے، ایک ماخذوں کا، ایک
مضمونوں کا اور ایک طباعت کی غلطیوں کا - ان میں سے پہلے دو ضمیمے چھپ گئے تھے اور انجمن
ترقی اردو کے دفتر میں ان کے کچھ نسخے موجود ہیں جن میں سے چار پانچ میں لیتا آیا تھا - ان کا ایک نسخہ
اسی خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں - آپ اپنے دیوان ناسخ والے نسخے میں اسے لگا لیجیے - غلط نامہ
معلوم نہیں کہ چھپا بھی تھا یا نہیں - بہرحال کتاب میں طباعت کی بہت سی غلطیاں موجود ہیں -

اب اس وقت اس سے زیادہ لکھنا ممکن نہیں - مجبوراً خط کو ختم کرتا ہوں -

اخلاص کیش

مسعود حسن رضوی